اپریل ۱۹۵۹ء

۸ ر

انجمن حمایت اسلام لاہور کے ۶۵ ویں سالانہ اجلاس کا افتتاح : صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خان جلسہ عام سے خطاب کر رہے ہیں
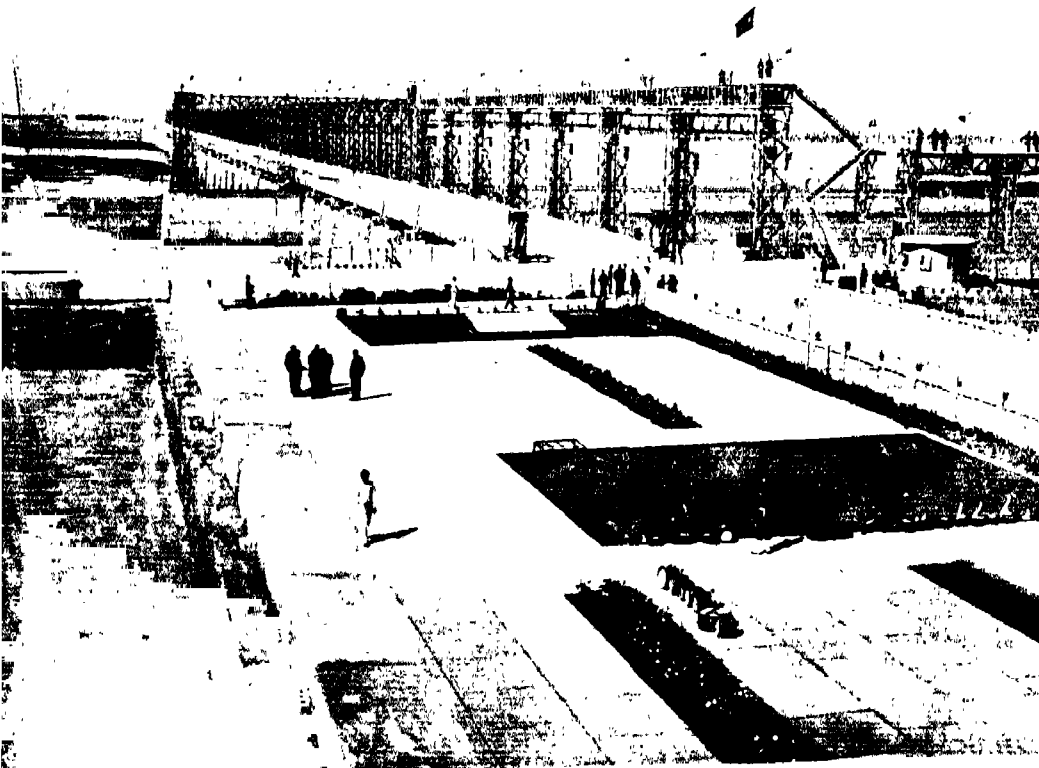
۳ مارچ کو صدر پاکستان نے تونسہ بیراج کا افتتاح فرمایا - ملتان سے ۲۷ میل دور دریائے سندھ پر یہ کثیرالمقاصد بند ساڑھے بارہ کروڑ روپے کے صرف سے تعمیر کیا گیا ہے - اور اس سے بیس لاکھ ایکڑ زمین سیراب ہوگی
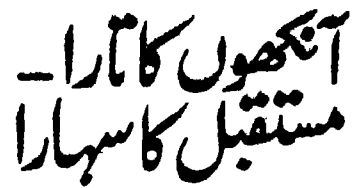
"لکس کا سفید رنگ
اس کے خالص ہونیکا ثبوت ہے
اسی لئے میں ہمیشہ
لکس ٹائیلٹ صابن
استعمال کرتی ہوں"
شمیم آرا کہتی ہے
LUX
TOILET SOAP
فلمی ستاروں کا سفید
اور خوشبودار حسن بخش صابن
LTS. 31-183 UD

پاکستان میں نئے
ہسپتال تعمیر ہو رہے ہیں۔
A·C·C
B·B·B
CEMENT
A·C·C
CEMENT
زیادہ سے زیادہ ہسپتال، دواخانے اور کلینک وغیرہ تعمیر کرکے حکومت پاکستان قوم کی صحت کا تحفظ کر رہی ہے۔ ترقی کی اس شاہراہ پر اے سی سی سیمنٹ حکومت کو مدد دینے میں پیش پیش ہے۔
اے سی سی سیمنٹ کی مضبوطی اور پائداری ہمارے ۴۵ سال کے عملی تجربہ پر منحصر ہے اور اے سی سی کا ٹیکنیکل مشورہ آپ کو کنکریٹ اسوسی ایشن کے ذریعہ مفت دیا جاتا ہے۔
مضبوطی اور پائداری کے لئے اے سی سی سیمنٹ استعمال کیجئے
دی اسوسی ایٹڈ سیمنٹ کمپنیز لمیٹڈ
(انکارپوریٹڈ ان انڈیا)
نیلسنز چیمبرز، میکلیوڈ روڈ، کراچی ——— اورینٹل بلڈنگز، دی مال، لاہور۔
ACC 432
JWT

شمارہ: ۴

جلد: ۱۲

اپریل ۱۹۵۹ء

مدیر: رفیق خاور

نائب مدیر: ظفر قریشی

شائع کردہ:
ادارۂ مطبوعات پاکستان
پوسٹ بکس ۱۸۳ ، کراچی

سالانہ چندہ
ساڑھے پانچ روپے

فی کاپی
آٹھ آنے

آپس کی باتیں

اقبالؒ نے جس والہانہ انداز میں رندوں کو اپنی محفل میں مدعو کیا تھا۔ ان کا خلوص بے کار نہیں گیا۔ ابتدا ہی سے بادہ گساروں نے اقبالؒ کی اس صلائے عام پر لبیک
کہا ہے۔ اور اُن کی محفل میں جوق درجوق آتے رہے ہیں۔ یہ شغل بادہ و ساغر "یک دو ساغر کش" کی رسمی حدوں کو عبور کر کے "اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے" کی منزل
پہنچ چکا ہے، اور اب ان رندانِ بلانوش کا عالم یہ ہے کہ ع بادہ چشیدن خطا است، بادہ کشیدن روا است!
اور یہ سلسلہ برصغیر پاک و ہند تک محدود نہیں رہا بلکہ ایران و عراق و عرب و شام سے گذر کر مشرق و مغرب میں دور دور تک پہنچ چکا ہے اور ہر جگہ حلقۂ رنداں میں
کیف و مستی کا ایک ہی عالم نظر آتا ہے۔ اس طرح ایک بار پھر خمخانۂ مشرق کی مے لعل فام مغرب میں بھی قبول عام پیدا کر چکی ہے اور وہاں ایک نئی ذہنی بیداری
اور تحریک کا باعث ہوئی ہے۔ اگرچہ یہ رجحانات فی الحال آنے والے دور کی دھندلی سی عکاسی ہی کرتے ہیں۔

اقبال نے جو شراب پیش کی، وہ ان کے پیر و مرشد رومی کی طرح تمام تر شرابِ حقیقت تھی، جس کو انہوں نے براہِ راست "میر خمستانِ حجاز" سے حاصل کیا تھا اور اس التزام
کے ساتھ کہ

آمیزشے کجا گہرِ پاکِ او کجا
از تاک بادہ گیرم و در ساغر افگنم

اور یہ عجم و یونان کی آمیزش سے پاک میخانۂ حجاز ہی کی صہبائے آتشیں ہے جس کو اقوامِ تازی نے اقبالؒ جیسے پیمانہ بردار خمستانِ حجاز سے دوبارہ حاصل کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ عرب کے لئے
یہ صہبائے آبگینہ گداز خاص کشش رکھتی ہے اور جو بھی اُن پر اس شرابِ روحانی کا نشہ طاری ہوا، وہ روز بروز اس میں اور بھی گہرے ڈوبتے گئے یہاں تک کہ ڈاکٹر عبدالوہاب عزام بے جیسا فردِ جلیل
سیاسیات کے ہنگامے میں الجھے ہونے کے باوجود آخری وقت تک اسی بادۂ سرجوش کی دھن میں کھویا رہا۔ اور ذوق و شوق و مستی کی انتہا کے باعث "اقبال مست" یا "فنا فی الاقبال" کے درجہ
تک پہنچ گیا۔ کیونکہ جو اطلاعات موصول ہوئی ہیں اُن کے مطابق وہ اقبال ہی پر ایک تقابلی مطالعہ تیار کرتے ہوئے جاں بحق تسلیم ہوئے اور یوں مجلسِ اقبال میں شغلِ بادہ خواری کو
تاب و تبِ دوام عطا کی۔ ہم اس شمارہ میں ایک مضمون پیش کر رہے ہیں جس میں مرحوم کی گوناگوں حیثیات کی چند در چند جھلکیاں نظر آتی ہیں ـــ انہی کے ساتھ مجلسِ اقبال کے ایک
اور حریفِ مے مرد افگنِ عشق کا ذکر بھی لازم ہے ـــ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم جنہوں نے برصغیر پاک و ہند کے باشندوں کو بالخصوص اور دیگر اقوامِ عالم کو بالعموم اقبال اور اُن کے فکر و فن
سے متعارف کرانے میں سعیِ بلیغ کی اور مریدِ ہندی کے ساتھ ہی ساتھ پیرِ رومی کو بھی بہت خوش اسلوبی سے روشناس کرایا۔ غالب کے "نقش ہائے رنگ رنگ" کی توضیح و تشریح ان دونوں پر
منتہا ہے۔ اقبال کے ساتھ مرحوم کی وابستگی خاص اور حال ہی میں سانحۂ ارتحال اُن کے ذکرِ جمیل کا متقاضی ہے جس کا حق اسی شمارہ میں ادا کرنا مناسب تھا تاکہ شمع و پروانہ جس
طرح زندگی میں مدتوں یکجا رہے اسی طرح اس کے بعد بھی یکجا رہیں ـــ رومی و اقبال، مریدِ ہندی اور پیرِ رومی، دونوں لازم و ملزوم ہیں اور اُن کی یکجائی دائمی و ناگزیر۔ یہ ایک خدا ساز
اتفاق ہے کہ اس موقع پر ہمیں عارفِ روم سے متعلق ایک نادر چیز دستیاب ہوئی ہے ـــ ایک مردِ جہاں بیں کے زیرِ طبع سفرنامہ کا کچھ حصہ جس میں "شبِ عروس" مولانائے روم کی
چشم دید تفصیلی کیفیت نہایت دلچسپ پیرایہ میں پیش کی گئی ہے اور جس کو ہم براہِ راست نہ دیکھتے ہوئے بھی چشمِ تصور میں بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ ضمناً جدید ترکیہ اور اس کے باشندوں،
پاکستان کے متعلق اُن کے دلی احساسات اور اقبال سے متعلق اُن کی شیفتگی پر بھی روشنی پڑتی ہے جو ہمارے اور اُن کے دیرینہ روابط کو مضبوط تر اور خوشگوار تر بنا دیتی ہے۔ موضوع کی
مناسبت سے مولانائے روم، اُن کے پیر و مرشد حضرت شمس تبریزؒ اور مولانا کے مزار کی تصاویر بھی تبرکاً پیش کی جا رہی ہیں جو اربابِ شوق کے لئے دلچسپی کا باعث ہوں گی۔

علامہ اقبال کا فیضان ہر اعتبار سے ایک فیضِ جاری ہے اور اس جوہری دور میں جبکہ "علم را بر تن زنی مارے بود" کی حقیقت، اور بھی زیادہ ہولناک حد تک نمایاں
ہوتی جاتی ہے، اس کی ضرورت و افادیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ اس کی روحِ رواں ایک اور صرف ایک ہے۔ یہ کہ ع علم را بر جاں زنی یارے بود
لہٰذا جوں جوں وقت گذرتا جائیگا۔ اقبال کے افکار کی اہمیت اور اثر بھی بڑھتا جائیگا اور ایک نئی دنیا کی تشکیل میں مدد دے گا جس کے آثار ابھی سے نمایاں ہیں
اور اس دعوے کو صحیح ثابت کر رہے ہیں کہ ـــ من شاید نخستیں آدم از عالمے دیگر ـــ مشرقی و مغربی زبانوں میں کلامِ اقبال کے تراجم اور پیشکش کا سلسلہ برابر بڑھتا چلا جا رہا ہے۔
آج عجم و عرب اُن کے آتشیں افکار سے شعلہ بداماں ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں تو اُن کی قدر و منزلت تقدیس کی حد تک پہنچ چکی ہے اور اُن کے آثار کی تلاش و نمود اربابِ علم و فن کا
مرغوب مشغلہ ہے۔ اسی ذوقِ طلب کے پیشِ نظر علامہ مرحوم کی یادگار کے طور پر ہم اس شمارہ میں بعض نوادر ہدیۂ ناظرین کر رہے ہیں مگر اس احساس کے ساتھ کہ یہ پیشکش ان یادگار
نقوش و تبرکات کے سلسلہ کی ابتدا ہے انتہا نہیں ـــ ز کمیں نشستہ صید کن ایں غزال را۔ اس خیال کے تحت نامور نقاش جناب عبدالرحمٰن چغتائی ایک عرصے سے "مرقعِ چغتائی"
کے انداز میں اقبال کے افکار کو مصور کر رہے ہیں۔ اس شمارہ کا سرورق اسی مجموعہ ہی کے ایک شاہکار سے آراستہ ہے جس میں مولانائے روم کا قرآن مجید سے والہانہ عشق ظاہر کیا گیا ہے*

ماہِ نو، کراچی - اپریل ۱۹۵۹ء

سکون وحرکت: اقبال کی نظر میں

ممتاز حسن

سکون وحرکت مادی دُنیا کے حقائق میں سے ہیں، اور علمی اور فکری موضوعات کی حیثیت سے سائنس اور فلسفے دونوں میں مشترک ہیں۔ اقبال عملی سائنسدان نہیں تھے۔ اور سکونیات اور حرکیات کے علوم طبیعی میں کوئی تجرباتی یا نظریاتی کاوش اُن سے منسوب نہیں ہے۔ مگر فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے سکون وحرکت کے موضوعات اُن کے نظامِ فکر میں ایک بنیادی اہمیت رکھتے ہیں، اُن کی ابتدائی نظم کا ایک شعر ہے ؎

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں ۔۔۔ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

یہ ایک خالص فلسفیانہ شعر ہے جو نظامِ کائنات میں سکون وحرکت کے مقام کے متعلق ایک فلسفیانہ نظریہ پیش کرتا ہے۔ اگرچہ اقبال نے مضمون کو اس خوبی سے ادا کیا ہے کہ شعر کی شعریت اس کی فلسفیانہ معنویت پر پورے طور سے غالب آگئی ہے۔ یہ شعر ایک غیر جانبدارانہ مشاہدے کی کیفیت لئے ہوئے ہے، جیسے کوئی شخص دریا اور اُس کے تلاطم کو ساحل پر کھڑا ہوا دیکھ رہا ہو۔ یہاں اقبال نے سکون وحرکت کے اخلاقی اور تخلیقی پہلوؤں سے بحث نہیں کی۔ مگر اُن کی ساری شاعری اور سارے فلسفے نے اسی ایک مسئلے کی فضا میں پرورش پائی ہے۔

سکون وحرکت روزمرّہ کے انسانی مشاہدے میں مبادیات کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہم جب بھی دیکھیں ہمیں اپنے گرد و پیش کی کچھ چیزیں ساکن اور کچھ متحرک نظر آئیں گی۔ خاموش سے خاموش اور ساکن سے ساکن فضا میں بھی اور کچھ نہیں تو ہم اپنی آنکھوں، سانس، دل اور غالباً ہاتھ پاؤں کو متحرک پائیں گے۔ ہمارا روزمرّہ کا تجربہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ زندگی اور حرکت لازم وملزوم ہیں۔ جب تک انسان کے جسم اور اُس کے دل کی حرکت باقی رہتی ہے۔ وہ زندہ رہتا ہے۔ جب یہ حرکت باقی نہیں رہتی اس کی زندگی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ سکون وجمود اور عدمِ حرکت عدمِ زندگی کی علامات ہیں، اور اگرچہ زندہ چیزیں گاہے گاہے عارضی طور پر یا بظاہر ساکن یا مائل بہ سکون نظر آتی ہیں، سکون کو کسی حالت میں زندگی کی خصوصیت نہیں کہا جا سکتا۔ زندگی کا تعلق زمان ومکان سے ہے۔ اسے ہر وقت کائنات کے زمانی اور مکانی فاصلے طے کرنے پڑتے ہیں، اور ان مسافتوں کو قطع کرنے میں جو چیز ممد ومعاون ہے وہ حرکت ہے سکون نہیں۔

سکون وحرکت کی طبیعی حیثیت کچھ ایسی پیش پا افتادہ قسم کی ہے کہ شروع شروع میں فلسفے کی نظر ان کی اہمیت پر نہیں پڑی۔ یونان کے قدیم ترین فلسفی تھیلیز کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ کائنات کی زندگی کا اصل سرچشمہ کیا ہے۔ غور وخوض کے بعد تھیلیز اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ سرچشمہ پانی ہے جو زندگی کے سارے مظاہر کا منبع اور ساری موجودات کا مبدا و معاد ہے۔ اسی طرح اینگزیمینیز نے یہ رائے قائم کی کہ کائنات کا سرچشمہ پانی نہیں ہوا ہے۔ ان فلسفیوں کے سامنے حرکت اور تغیر کے گوناگوں مظاہر تھے۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ پانی، ہوا اور مٹی سبھی ایک صورت سے دوسری صورت میں منتقل ہوتے ہیں۔ مگر ان لوگوں نے تغیر اور حرکت پر فی نفسہٖ غور نہیں کیا۔ سب سے پہلا فلسفی جس کی توجہ حرکت اور تغیر کی اہمیت پر مرکوز ہوئی۔ ہرقلیطوس تھا۔ (پانچویں صدی ق م)۔

ہرقلیطوس[1] نے کہا کہ کائنات کی بنیادی حقیقت تغیر ہے۔ دنیا کی ہر شے عارضی اور گذراں ہے۔ کوئی چیز پائدار نہیں۔ ہم ایک دریا میں دو دفعہ[2] پاؤں نہیں ڈال سکتے۔ کیونکہ دریا کا پانی ہر لمحہ نیا ہوتا ہے۔ اور جس پانی سے ہمارے پاؤں پہلی مرتبہ آشنا ہوئے تھے۔ دوسری مرتبہ وہ پانی وہاں نہ ہوگا۔ نہ صرف ہر شے مسافر ہے۔ بلکہ جادۂ سفر خود بھی اوروں کی طرح مسافر ہے۔ موجودات میں ہر شے تغیر پذیر ہے۔ تغیر ہی ایک ایسی چیز ہے جو پائدار ہے۔

ہرقلیطوس کی تعلیم نے لوگوں کو متاثر کیا۔ مگر اسی کے زمانے میں پارمینی ڈیز اور زینو جیسے فلسفی بھی پیدا ہو چکے تھے جن کا عقیدہ ہرقلیطوس کے

۱۔ یہاں ہرقلیطوس کی تعلیم کے ایک اہم جزو کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ مگر اس کے علاوہ اس کے فلسفے کے اور اجزا بھی ہیں۔ مثلاً اس نے تھیلیز اور اینگزیمینیز کی طرح پانی اور ہوا کے مقابلے میں آگ کو پیش کیا۔ فلسفۂ تضاد کا بابا آدم بھی وہی ہے۔ یہ اور اس کی تعلیم کے دوسرے پہلو موجودہ مضمون سے الگ ہیں۔

۲۔ ہرقلیطوس کے فلسفۂ تغیر پر کسی مسخرے نے یہ پھبتی کہی کہ اس کی رو سے قرضداروں پر قرضہ ادا کرنا واجب نہیں رہتا کیونکہ نہ قرضخواہ وہ قرضخواہ رہتا ہے جس نے قرضہ دیا تھا نہ مدیون وہ مدیون اور نہ ہی قرضہ وہ قرضہ!!

عقیدہ کے برعکس تھا۔ یہ لوگ شہر ایلیا کے رہنے والے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ حرکت اور تغیر ناممکن الوجود ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر بالفرض کائنات میں حرکت اور تغیر کا وجود مان بھی لیا جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ شے عدم شے سے پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ ناممکن ہے۔ حرکت اور تغیر جو بذاتہ حرکت ہی کی ایک صورت ہے۔ ان کے جو مظاہر ہماری آنکھوں کے سامنے آتے ہیں وہ محض ایک فریب نظر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ زینو نے اپنا نقطۂ نظر واضح کرنے کے لئے اڑتے ہوئے تیر کی مشہور مثال پیش کی۔ اس نے کہا کہ ہم بظاہر دیکھتے ہیں کہ تیر کمان سے چھوٹ کر اڑتا ہوا جاتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ تیر نہ اڑتا ہے نہ اڑ سکتا ہے۔ بلکہ وہ ہر متعین لمحے میں فضا کے ایک متعین نقطے پر ٹھیرا ہوا ہوتا ہے۔ یعنی اپنی ظاہری اڑان کے دوران میں سارا وقت ساکن رہتا ہے اور اڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہرقلیطوس اور اس کے مخالفین کے نظریاتی اختلاف نے اپنا پرتو کم و بیش بعد کے زمانے کے سارے فلسفے پر ڈالا ہے۔ افلاطون کے نظریۂ اعیان ثابتہ نے ایک ساکن، جامد اور غیر متغیر عالم مثال کا تصور پیش کیا، جس کا ایک دھندلا سا خاکہ افلاطون کے عقیدے کے مطابق ہمیں اپنی دنیائے آب و گل میں ملتا ہے۔ افلاطون کے نزدیک ہمارے گرد و پیش کی دنیا بے حقیقت ہے اور اس کا تخلیق کردہ عالمِ اعیان عین حقیقت۔ ہماری دنیائے محسوسات ناتمام اور نامکمل ہے اور اسی حرکت اور تغیر کی آماجگاہ ہے۔ حرکت اور تغیر اس دنیا کی ناپختگی کا پرتو ہیں۔ وقت کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ کہ وہ جاودانیت کا سایہ ہے۔

ارسطو نے جو افلاطون کا شاگرد تھا، اپنے استاد کے نظریۂ اعیان کو تسلیم کیا۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ یہ اعیان کسی اور دنیا کی چیز نہیں ہیں بلکہ ہماری دنیائے آب و گل ہی میں موجود اور کارفرما ہیں، عالمِ حقیقی کوئی اور عالم نہیں ہے۔ یہی دنیا جس میں ہم رہتے ہیں حقیقی دنیا ہے۔ ارسطو کے نزدیک حرکت مادّہ اور صورت، یا بقول افلاطون اعیان[1] کے اتصال کا نتیجہ ہے۔ یہ اتصال اور حرکت بے مقصد نہیں ہیں۔ ان کا مقصد تخلیقی ہے۔ مادّہ اور صورت کا اتصال اور امتزاج نو بنو نتائج پیدا کرتا ہے۔ اور یہی کائنات کا نصب العین ہے۔ حرکت کا آخری سرچشمہ ایک غیر متحرک محرک ہے۔ (جسے ہم خدا کے نام سے یاد کرتے ہیں)۔

اس سلسلے میں ارسطو اور افلاطون کے دو تین پیشروؤں کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ایمپی ڈوکلیز نے آب و آتش اور خاک و باد چار مفردات کو تسلیم کیا۔ اور حرکت اور تغیر کو ان مفردات کے اختلاط اور افتراق کا نتیجہ قرار دیا۔ انیگزاگورس نے مفردات کو چار کی بجائے لاتعداد گردانا۔ ومقراطیس نے نظریۂ جواہر کی تعلیم دی۔ اس کی نگاہ میں کائنات کی خشتِ بنیاد مختلف النوع مفردات نہیں ہیں۔ بلکہ لاتعداد اجزائے لایتجزیٰ ہیں۔ جو ماہیت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے کوئی اختلاف نہیں رکھتے۔ وہ خود غیر متغیر ہیں۔ مگر ان کا باہمی امتزاج ایمپی ڈوکلیز کے عقیدے کے مطابق مفردات کے امتزاج کی طرح کائنات میں حرکت اور تغیر پیدا کرتا ہے۔ ان نظریوں کا بعد کے فلسفیوں پر جن میں مسلمان فلسفی بھی شامل ہیں، گہرا اثر پڑا ہے۔ جو بجائے خود ایک مضمون ہے۔

اقبال نے سکون و حرکت کے فلسفیانہ مسئلے کا پہلے پہل اپنی تصنیف فلسفۂ عجم کے سلسلے میں جائزہ لیا۔ اس تصنیف میں انہوں نے ابن مسکویہ، اشراقیین، اور ملّا ہادی سبزواری کے فلسفۂ حرکت پر نظر ڈالی ہے۔ اور ان کے پیشرو یونانی فلسفیوں سے ان کے اتفاقاتِ رائے اور اختلافات واضح کئے ہیں۔ یہاں اقبال کا انداز بیشتر مورخانہ ہے۔ نقادانہ نہیں۔ ویسے بھی اس کتاب میں اقبال کے بعض وہ ابتدائی تاثرات جھلکتے ہیں، جنہوں نے بعد میں ارتقا کی بہت سی منزلیں طے کیں۔

اقبال کی مستقل فلسفیانہ تصنیف ان کے "خطبات"[2] ہیں۔ جو دورِ حاضر کی اہم ترین فلسفیانہ تصانیف میں سے ہیں۔ ان کا مقصد اسلام کے مذہبی تصورات کی تشکیلِ جدید ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے جدید اور قدیم فلسفیوں کے خیالات کا تجزیہ کیا ہے۔ سکون و حرکت کے سلسلے میں زینو کے نظریۂ عدمِ حرکت پر ابو الحسن اشعری، ابن حزم، برگساں اور برٹرنڈ رسل کے خیالات کی روشنی میں بحث کی ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ اقبال کی دقیقہ رس نگاہ پر یہ حقیقت پورے طور سے واضح ہے کہ موجودہ سائنس کی رو سے کائنات کی ہر شے ایک حرکت کے مترادف ہے۔ جوہر خود برقی قوت ہے نہ کہ برقی قوت سے متأثر شدہ کوئی شے۔ یعنی طبیعیات کی رو سے حرکتِ مسلسل کائنات کا بنیادی اصول ہے۔ اس نظریۂ مکانی کے ساتھ ساتھ اقبال کا نظریۂ زمانی بھی اصولِ حرکت کا حامل ہے۔ اقبال کی نگاہ میں وقت ایک تغیرِ مسلسل ہے جس میں منٹوں، مہینوں اور سالوں کا حساب نہیں۔ اور جس کا تسلسل تواتر کی قید سے آزاد ہے۔ چھٹے لکچر میں جس کا عنوان ہے "نظامِ اسلام میں حرکت کا اصول" اقبال نے قطعی طور پر یہ رائے قائم کی ہے کہ "ایک ثقافتی تحریک کی حیثیت سے اسلام کائنات کے پرانے جامد و ساکن

---

[1] فارسی کے کسی شاعر نے اپنی محبوبہ کی تعریف میں دیمقراطیس سے مدد لی ہے ~ اے آنکہ جزو لایتجزیٰ دہانِ تو ✿ طوطی کہ ہیچ عرض ندارد میانِ تو!!

[2] اقبال کے لکچروں کا یہ مجموعہ عام طور پر "چھ لکچروں" کے نام سے مشہور ہے مگر لکچر ہیں سات!

نظریے کا مخالف ہے۔ اس کا تصوّرِ[1] کائنات حرکی ہے۔"

حرکت اصولِ عمل ہے۔" "قرآن خیال کی بجائے عمل پر زور دیتا ہے۔"[2] "اسلامی تحریک ایک زبردست پیغامِ عمل تھی" "مگر وحدت الوجود اور اس کی شاعرانہ عجمی تفسیر نے عوام تک پہنچ کر اسلامی اقوام کو ذوقِ عمل سے محروم کر دیا۔"[3]

فلسفے کی طرح تصوّف اور مذہب کے میدان میں بھی سکون و حرکت یعنی موت و حیات کی راہیں نمایاں طور پر الگ الگ ہیں۔ ہندو مت اور بدھ مت میں مکتی اور نروان کا تخیل سکون و راحت کی طلب پر مبنی ہے اور سری کرشن کی تعلیم (جسے شنکر کی تفسیر نے نقصان پہنچایا ہے) حرکت اور جدوجہد کا پیغام۔ یہی حال مسلمانوں میں ابن عربی اور وحدت الوجود کے قائل دوسرے صوفیا اور ان کے روحانی مقام فنا فی اللہ کا ہے جو نروان کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ اس کے برعکس مجدد سرہندی کی طرح وہ مسلمان صوفیا بھی ہو گذرے ہیں جنہوں نے فنا فی اللہ پر بقا باللہ کو ترجیح دی۔ یا بالفاظِ دیگر زندگی اور عمل کو موت اور ترکِ عمل کے مقابلے میں اپنے لئے چن لیا۔

مسلمانوں کے علوم اور فلسفے پر مجموعی حیثیت سے نظر ڈالی جائے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جب تک صحیح اسلامی ثقافت کسی نہ کسی صورت میں اور کسی نہ کسی حد تک مسلمان قوموں میں باقی رہی، ان کی زندگی اور تخیل کو سکون و جمود سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ البتہ جب ان پر غیر اسلامی ثقافتی رجحانات غالب آگئے تو ان کے پاس سکون و جمود اور اس کے لازمی نتیجے یعنی یاس و حسرت کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔ ابن مسکویہ کا نظریۂ ارتقا اور ابن خلدون کا نظریۂ تاریخ اسلامی ثقافت کے خصوصی نقطۂ نظر کے آئینہ دار ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حرکت اور جدوجہد اسلام کا بنیادی تقاضا ہے اور سکون و جمود سے اسے بنیادی طور پر نفرت ہے۔ اقبال ہر اس جذبے اور تصوّرِ حیات کے مخالف ہیں جو انسان کو سکون و جمود کی طرف لے جائے۔ حکیم افلاطون اور خواجہ حافظ پر اقبال کی نکتہ چینی اسی وجہ سے ہے اور یہی وجہ ان کی اسلام سے محبت کی بھی ہے۔

اقبال نے ذوقِ عمل کی تجدید کے لئے ایک تو اسلامی افکار اور رجحانات کو غیر اسلامی افکار اور رجحانات سے جدا اور متمیز کرنے کی کوشش کی ہے۔ دوسرے زندگی کے اسلامی نصب العین کے تعین کی سعی۔ انہوں نے مسلمانوں کو اس پیغام کے لئے کیوں منتخب کیا، یہ خود ان کی زبان سے سنئے۔ ڈاکٹر نکلسن کے نام ایک خط میں فرماتے ہیں: "یہ درست ہے کہ مجھے اسلام سے بے حد محبت ہے۔ لیکن مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال صحیح نہیں کہ میں نے محض اس محبت کے پیشِ نظر مسلمانوں کو اپنا مخاطب ٹھیرایا ہے۔ بلکہ دراصل عملی حیثیت سے میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ایک خاص جماعت یعنی مسلمانوں کو اپنا مخاطب قرار دیا جائے۔ کیونکہ تنہا یہی جماعت میرے مقاصد کے لئے موزوں واقع ہوئی ہے۔"[4]

اقبال کی شاعری میں سکون و حرکت کیا مقام ہے؟ ان کے کلام کو ایک نظر دیکھا جائے تو ان کے ہاں ایسی نظمیں بہت ہی کم ملیں گی۔ جن میں سکون و راحت سے کسی قسم کی دلچسپی یا دل بستگی کا اظہار کیا گیا ہے۔ ایسی نظمیں زیادہ تر ان کے ابتدائی دور کی یادگار ہیں۔ ان میں غالباً سب سے مشہور ان کی "ایک آرزو" ہے۔ جہاں وہ دنیا سے تنگ آکر کسی کنجِ عزلت کی تلاش میں ہیں ؎

شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا ۔۔۔ ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو

---

[1] اس نظریے میں اکثر صوفیا اقبال کے ہمنوا ہیں۔ ابن الفارض۔ ابن العربی۔ ابوالحسن شاذلی اور ابو طالب مکی وغیرہم کا عقیدہ ہے کہ الحیاۃُ حرکۃٌ والسّکونُ موْتٌ۔ اس کے خلاف جمہور متکلمین سکون و حرکت کی فلسفیانہ بھول بھلیاں میں سرگرداں ہیں۔ اور اپنے متکلمانہ مقاصد کے ماتحت اس بات کے قائل ہیں۔ کہ الحرکۃ لیست حقیقۃً واقعیۃً بل ھی سکونات متوالیۃ۔ یعنی حرکت کی حقیقت سے منکر ہیں۔ مجھے مولانا منتخب الحق مدظلہ سے جن سے میں نے اس مسئلے میں استفادہ کیا ہے، معلوم ہوا کہ خیرآبادی مکتب خیال کے فلاسفہ (جن کے سب سے بڑے نمائندے آج خود مولانائے ممدوح ہیں) کے نزدیک اصل وجود حرکت ہے، سکون نہیں۔ اس سلسلے میں مولانا نے اپنے استاد مولانا سید برکات احمد مرحوم کی کتاب بنواس الحرکۃ کا حوالہ دیا ہے۔

[2] دیباچہ "تشکیل جدید" یعنی چھ لکچر

[3] دیباچہ اسرارِ خودی۔ طبع اوّل۔

[4] فلسفۂ سخت کوشی صفحہ ۱۱ "مضامین اقبال" مرتبہ تصدق حسین تاج۔ اقبال نے ایک مرتبہ یہی بات مجھ سے بھی کہی۔ انہوں نے فرمایا کہ میں نے کسی جذباتی وجہ سے اسلامی اقدار کو نہیں اپنایا ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جن اقدار کو میں نوعِ انسان کے لئے بہترین سمجھتا ہوں ان کی تعلیم براہِ راست اسلام ہی میں ملتی ہے۔

مگر یہ جذبہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا حتیٰ کہ اسی نظم میں انہوں نے فطرت کے دلفریب اور راحت آموز مناظر کا تصوّر باندھتے باندھتے اپنے متعلق ایک ایسی تمنا کا اظہار کیا ہے جو سکون و راحت کے منافی ہے اور جس سے ان کے عیش و آرام کا پروگرام سارے کا سارا منسوخ ہو جاتا ہے ؎

اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے ۔۔۔ تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو

دنیا سے بیزاری کا جذبہ اقبال پر شاذ و نادر ہی وارد ہوتا ہے۔ عموماً سکون کا تخیل ان کے ہاں مناظرِ قدرت سے خاص ہے۔ جیسے "خضرِ راہ" میں دریا کا نقشہ ؎

شب سکوت افزا، ہوا آسودہ، دریا نرم سیر ۔۔۔ تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویرِ آب

یا نیکر کے کنارے کی ایک شام ؎

فطرت بیہوش ہو گئی ہے ۔۔۔ آغوش میں شب کے سو گئی ہے

کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے ۔۔۔ نیکر کا خرام بھی سکوں ہے

جہاں تک انسان کا تعلق ہے۔ محسوسات کی دنیا میں اقبال کو کوئی چیز ایسی نظر نہیں آتی جسے انسان سے کوئی ہمدردی ہو ؎

کوئی نہیں غمگسارِ انساں ۔۔۔ کیا تلخ ہے روزگارِ انساں

سکون و حرکت کے فلسفیانہ مسئلے کے بارے میں اقبال زینو کی بجائے ہرقلیطوس کے ہمنوا ہیں اور ان کے اشعار کہیں کہیں تو خود ہرقلیطوس کے اقوال معلوم ہوتے ہیں ؎

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں ۔۔۔ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

یا ؎

ہر شے مسافر، ہر چیز راہی ۔۔۔ کیا چاند تارے، کیا مرغ و ماہی

"بانگِ درا" کی نظم "چاند اور تارے" میں ان کا نقطۂ نظر اور بھی واضح ہے ؎

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی ۔۔۔ یہ رسم قدیم ہے یہاں کی

اس رہ میں مقام بے محل ہے ۔۔۔ پوشیدہ قرار میں اجل ہے

چلنے والے نکل گئے ہیں ۔۔۔ جو ٹھیرے ذرا کچل گئے ہیں

اقبال زندگی کو ایک سفر جانتے ہیں۔ ایک ایسا سفر جس کی منزل سوائے ذوقِ سفر کے کچھ بھی نہیں ؎

گفتم کہ شوقِ سیر نہ دش بمنزلی ۔۔۔ گفتا کہ منزلش بہ ہمیں شوق مضمر است

زندگی کا سفر موت پر ختم نہیں ہوتا۔ خدا جانے کتنی زندگیاں اور ہیں ؎

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں ۔۔۔ ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

اقبال کے نزدیک انسانی زندگی محض حرکت سے مطمئن نہیں ہو سکتی۔ اس کا مقصد تخلیقی ہے "موجِ ناتواں" کے لئے لطفِ خرام ہی زندگی ہے[1]۔ اور موجِ دریا کی متاعِ زیست بھی اس کی روانی ہے[2]۔ مگر انسان کو کچھ اور کرنا ہے۔ زندگی کی حرکت اقبال کے نزدیک نہ صرف تخلیقی ہے بلکہ اس کا ایک واضح اور غیر مبہم نصب العین ہے۔ اور وہ یہ کہ انسان کی تخلیقی انفرادیت کو جسے اقبال خودی کہتے ہیں۔ اتنا بلند اور محکم کر دیا کہ وہ سب سے اعلیٰ اور برتر انفرادیت یعنی خدا سے قریب تر ہو جائے تخلقوا باخلاق اللہ اسی منزل کا راستہ ہے۔ وہ قوت جو کائنات اور انسان کو تغیر کی راہوں سے گذار کر ایک بلندی سے دوسری بلندی پر لے جا رہی ہے۔ یہ نصب العین بھی اسی کا تقاضا ہے۔ انسان کی حرکتِ ارتقائی غیر محدود ہے اور دنیا کے سب سے بڑے انسان کی زندگی میں اس حرکتِ ارتقائی کی بہترین مثال ملتی ہے ؎

بیتاب و تند و تیز و جگر سوز و بیقرار ۔۔۔ در ہر زماں بتازہ رسید از کہن گذشت[3]

یہاں خیر البشر کی شخصیت میں اقبال نے اس خدائی صفت کا پرتو دیکھا ہے۔ جو کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِی شَاْنٍ کے بے نظیر الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ اور یہ انسانیت کی معراج ہے۔

---

[1] آتی تھی کوہ سے صدا، رازِ حیات ہے سکوں ۔۔۔ کہتا تھا مورِ ناتواں لطفِ خرام اور ہے (بانگِ درا)

[2] موج ز خود رفتۂ تیز خرامید و گفت ۔۔۔ ہستم اگر می روم گر نہ روم نیستم (پیامِ مشرق)

[3] نعتِ محمدؐ۔ پیامِ مشرق

اقبال کا ایک ترجمان

(عربی ممالک میں)

ضیاء الحسن موسوی

"پرسوں ۱۰ جنوری کی شام کو ڈاکٹر عبدالوہاب عزام چل بسے، "ابوالطیب المتنبی ومحمد اقبال" کے عنوان پر سعود یونیورسٹی کے لئے 'محاضرہ' (لیکچر) لکھ رہے تھے، مضمون مکمل نہیں ہونے پایا اور قلم اقبال کی لام پر ہمیشہ کے لئے رک گیا۔ اُدھر مؤذن نے مغرب کی اذان شروع کردی: اللہ اکبر: رہے نام اللہ کا۔"

مولانا عبداللہ عباس ندوی، ناظم شعبۂ اردو سعودی ریڈیو، کا مکتوب پڑھتے ہوئے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ان آنسوؤں میں ڈاکٹر عزام کی صورت تھی، ایک عالم، ایک ادیب، ایک شاعر، ایک فلسفی، ایک مدبر عزام بے کی تصویر نہیں بلکہ ترجمانِ اقبال اور عاشقِ اقبال کی تصویر جو اقبال کی اس حسرت پر تڑپ اٹھا تھا کہ ع عرب ز نغمۂ شوقم ہنوز بے خبر است۔ اور جس نے طے کرلیا تھا کہ عربوں کو اقبال کے نغمۂ شوق سے باخبر کرکے دم لوں گا۔

میں نے عزام بے کے عشقِ اقبال کی کہانی انہی کی زبانی بار بار سنی ہے۔ ۱۹۵۵ء میں سفارت خانۂ پاکستان، جدہ نے "یومِ اقبال" منایا۔ اس وقت عزام بے سعودی عرب میں مصر کے سفیر تھے اور اس جلسے کی صدارت کررہے تھے۔ اس تقریب کے لئے انہوں نے اقبال کی نظم "مسجدِ قرطبہ" کا ترجمہ کیا تھا اور وہ منظوم عربی ترجمہ اصل اردو نظم کے ساتھ سفارت خانے کی طرف سے شائع کیا گیا تھا۔ عزام بے بہت خوش تھے۔ جب میں پریس میں اس کتابچہ کا پروف پڑھ رہا تھا اس دن وہ دو مرتبہ پریس آئے اور کتابچہ کی طباعت دیکھ دیکھ کے اپنی خوشی کا بار بار اظہار کرتے رہے۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ ترجمہ اُن کے تمام ترجموں سے بہتر ہے اور اُنکے "آیاتِ کمال" میں شمار ہوتا ہے۔

شام کو جلسے میں انھوں نے جو تقریر کی وہ بھی اپنی نوعیت کی عجیب تقریر تھی اس لئے کہ بالعموم اُن کی تقریر ایک عالم، ایک استادِ ادب اور ایک مفکر کی تقریر ہوتی تھی۔ وہ خطیب نہ تھے، نہ اُن کی عالمانہ شان کے لئے خطابت زیبا تھی۔ عربی خطابت میں ہوش سے زیادہ جوش اور مغز سے زیادہ الفاظ ہوتے ہیں اور عربی زبان کی تاریخ میں ایسے خطیب بہت کم گزرے ہیں جن کی خطابت میں الفاظ و معانی کا توازن باقی رہا ہو۔ مگر اس شام عزام بے کی تقریر خطابت کا انداز لئے ہوئے تھی۔ مجھے اُن کی تقریر کا ترجمہ کرنا تھا اس لئے میں نے اس کی یادداشت تیار کی تھی جو اب تک میرے پاس محفوظ ہے۔ انہوں نے اپنی تقریر شروع کرتے ہوئے کہا:

"یومِ اقبال مختلف ممالک میں منایا جاتا ہے اس لئے کہ وہ شاعرِ انسانیت تھے، بلادِ اسلامیہ میں ان کی یاد منانا اس لئے ضروری ہے کہ وہ شاعرِ اسلام تھے اور بلادِ عربیہ میں اس لئے کہ اقبال قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی تصویر تھے اور اس سرزمین مقدس حجاز میں ان کی یاد اس لئے منانا ضروری ہے کہ ان کی تمنا تھی کہ وہ یہاں مریں۔ مگر ہمارا فرض ہے کہ ہم اُن کو یہاں زندہ رکھیں!"

اس کے بعد عزام بے نے اقبال سے اپنے عشق کی کہانی اُسی انداز میں سنائی جو عربی شعراء کی غزل کا انداز ہے اور جو امرءالقیس سے آج تک قائم ہے یعنی دیار و آثارِ محبوب سے خطاب کرکے یا ان کا تذکرہ کرکے اپنے والہانہ جذبات کا اظہار۔ اس داستان کا خلاصہ یہ سمجھئے کہ: "میں نے ۲۵ سال قبل اقبال کا نام یورپ میں سنا مگر یہی کہ وہ مشرق کے صوفی شاعر ہیں۔ اس کے بعد جامعۂ لندن میں چند ہندوستانیوں سے اُنکا تذکرہ آیا۔ میری انگریزی اُس وقت اتنی کمزور تھی کہ میں ان طلباء کی گفتگو سے اقبال کی صحیح معرفت نہ حاصل کرسکا۔ پھر قاہرہ میں میرے دوست محمد عاکف بے، جو ترکی کے شاعرِ اسلام تھے، اُن کو کابل سے ترکی کے سفیر نے "پیامِ مشرق" کا ایک نسخہ بھیجا جسے دیکھ کے میں بہت متاثر ہوا۔ محمد عاکف بے نے بہت سے اشعار کے سامنے 'نفیس اور انفس' لکھا تھا مگر بعض بہترین شعر چھوڑ دیئے تھے۔ بہرحال اس کے بعد مثنوی اسرار و رموز دستیاب ہوئی تو ہم دونوں نے ایک ساتھ اس کا مطالعہ کیا اور میری محبت کا شعلہ بھڑک اٹھا اس کے بعد ہی سے میں نے اقبال پر لکھنا شروع کیا اور اُن کے تاثرات کو نظم کرنے لگا۔ ۱۹۴۷ء میں میں ہندوستان گیا۔ حالات بہت خراب تھے۔ دہلی سے لاہور تک

فقط ۱۱ گھنٹے کی مسافت باقی تھی مگر میں نے خطرات کے باوجود یہ سفر کیا۔ دہلی میں میں نے چار اشعار ایک سنگِ مرمر پر کندہ کرائے تھے جو میں نے اقبال کے مزار پر نذر کئے ۔۔۔ عربی یہدی لروضتٖ زھرا ۔۔۔۔۔ جن کا مطلب یہ تھا کہ ایک عرب آپ کے روضے کے لئے کچھ پھول پیش کر رہا ہے ۔۔۔ چونکہ یہ محبت کے پھول قرآن کی زبان میں ہیں اس لئے یہ حقیقی "ارمغانِ حجاز" ہے اسے قبول فرمائیے!

اس کے بعد میں اقبال کے مزار، اُن کے گھر، اُن کے آثار کی زیارت کے لئے بار بار گیا اور بار بار جانا چاہتا ہوں۔

۱۹۴۷ء میں جب استقلال پاکستان کی شکل میں خواب اقبال کی تعبیر نظر آئی تو خیال آیا کہ اُن کا کوئی پورا دیوان ترجمہ کروں۔ یہ تمنا اس وقت پوری ہوئی جب ۱۹۵۰ء میں مجھے قربِ اقبال نصیب ہوا اور میں دیارِ اقبال میں اپنے ملک کا سفیر ہو کے پہنچا۔ میں نے "پیامِ مشرق" کا ترجمہ مکمل کیا۔ یہ کتاب "رسالۃ الشرق" ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئی۔ پھر "ضربِ کلیم" کا ترجمہ کیا جو ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ پھر "اقبال، ان کی شاعری، ان کی زندگی اور ان کا فلسفہ" یہ کتاب لکھی جو قاہرہ سے ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی اور اس کے بعد "مثنوی اسرار و رموز" کا ترجمہ مکمل کیا جو توقع تھی آج (۲۲۔ اپریل ۵۵ء) شائع ہو جائے گی مگر ابھی اس میں کچھ تاخیر ہے۔ آج کی تقریب کے سلسلہ میں اقبال کی "دعا" اور "مسجدِ قرطبہ" کا ترجمہ میں نے ارضِ مقدس میں کیا ہے اور اس کی برکت سے میری یہ قدیم تمنا بر آئی ہے کہ میں نے ان کے کلام میں سے وہ نظم جو مجھے سب سے زیادہ پسند ہے اس کے ترجمے کا حق ادا کر سکا ہوں۔ اب میری ایک تمنا یہ بھی باقی ہے کہ حجاز میں "مجلسِ اقبال" کا ایک جلسہ ہو جس میں اقبال کے پیام اور کلام پر کام کرنے والے جمع ہوں۔"

اس کے بعد عزام بے نے اقبال کے تمام دواوین اور مجموعہ ہائے نظم و نثر کا تعارف کرایا، مختلف زبانوں میں جو اُن کے ترجمے ہوئے ہیں۔ ان کا تذکرہ کیا اور "فلسفۂ اقبال" پر دیر تک وجد آور تقریر کرتے رہے۔

عزام بے کی تقریر کا یہ اثر ہوا کہ حجاز و نجد کے ادبا اور شعراء نے اقبال کا تفصیلی مطالعہ شروع کیا اور ۱۹۵۷ء میں جب ہم نے "یومِ اقبال" منایا تو اس میں سعودی عرب کے ۱۲ ادبا و شعراء نے مقالات پڑھے اور حجاز کے سب سے بڑے شاعر "ابراہیم عزاوی" نے ایک طویل قصیدہ سنایا جو تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ ان سب کا مجموعہ "شاعر الاسلام" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

عزام بے عربی دنیا میں اقبال کے واحد ترجمان تو نہ تھے۔ البتہ پہلے ترجمان ضرور تھے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنی عمر کا بہترین حصہ یعنی آخری دس سال تقریباً سب کے سب اقبال ہی کے لئے وقف کر دیئے تھے۔

وہ روزانہ ادبی ڈائری لکھتے تھے جس کا ایک حصہ "الشوارد" کے نام سے شائع ہو چکا ہے اور باقی جو غیر مطبوعہ ہے اُس کا اکثر حصہ میں پڑھ چکا ہوں۔ اس میں بھی جا بجا اقبال کا ذکر ہے اور اس طرح کہ گویا وہ حیات و کائنات کو اقبال کی نظروں سے دیکھ رہے ہوں۔

انہوں نے اپنی محبوب بچی "ہالہ" کو بہت سے خطوط لکھے ہیں، ان میں سے چند خطوط چھپ چکے ہیں۔ ان خطوط میں انھوں نے ہالہ کو ایسی مسلمان عورت بننے کی تلقین کی ہے جو اقبال کے آئیڈیل "مادراں را اُسوۂ کامل بتولؓ" کے نقش قدم پر چلے۔

انہوں نے کراچی میں "قلندرانِ اقبال" کے نام سے ایک چھوٹی سی جماعت تیار کی تھی۔ جس کے ارکان ہفتے میں ایک مرتبہ جمع ہو کے اقبال کے کلام اور انکی تعلیمات پر گفتگو کرتے تھے۔

۱۹۵۵ء کے اوائل میں جب میں سعودی عرب گیا تو جدہ میں عزام بے بھی تھے اور عمر بہاء الامیری (سابق سفیرِ شام در پاکستان) بھی۔ عزام بے نے وہاں بھی "قلندرانِ اقبال" کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس میں ڈاکٹر انور اقبال قریشی اور مولانا عبداللہ ندوی بھی شریک ہوتے تھے۔ اس اجتماع میں اقبال کے علاوہ پاکستان کی تہذیب و ثقافت اور ادب پر بھی گفتگو ہوتی تھی۔ شیخ محمد اکرام صاحب کی مؤلفہ کتاب "ثقافتِ پاکستان" بھی ان محفلوں میں پڑھی جاتی۔ اسکا مفہوم عربی میں بھی بیان ہوتا، تاکہ اُردو سے نامانوس "قلندر" بھی اُس سے مستفید ہو سکیں۔

عزام بے سے میری آخری ملاقات گزشتہ سال مجلس مذاکراتِ اسلامی لاہور میں ہوئی تھی اور جو لوگ اس مجلس مذاکرہ میں شریک تھے۔ اُن کو علم ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اس کی کامیابی میں کتنا عظیم حصہ لیا تھا۔ "پاکستان" تو میزبان تھا اس لئے اُس کے مندوب تو انکسار و تواضع ہی کر سکتے تھے۔ مگر عزام بے نے نرم اور گرم مزاج مشرق و مغرب کے علماء میں توازن پیدا کرنے کی جو کوشش کی، مجلسِ مذاکرات کی کامیابی میں اُس کا بڑا حصہ تھا۔

یہ تو سب جانتے ہیں کہ علامہ اقبال کے افکار کو عربی دنیا میں عام کرنے میں عزّام بے نے بڑا حصہ لیا ہے مگر انھوں نے جو منظوم ترجمے کئے ہیں۔ اُن کا جائزہ لیتے ہوئے ہم کو عمر بہاء الامیری (شام)، امیرہ نورالدین (عراق)، صاوی شعلان (مصر)، امین زبیری (یمن) ایسے لوگوں کے منظوم ترجمے بھی پیش نظر رکھنا ہوں گے۔ اگرچہ ان میں سے کسی نے اقبال کے کسی ایک مجموعے کا پورا منظوم ترجمہ نہیں کیا ہے مگر فنی نقطۂ نظر سے ان کے ترجمے بعض نظموں کی حد تک عزّام بے کے تراجم سے زیادہ کامیاب ہیں۔

"امیرہ نورالدین" بغداد کی نوجوان شاعرہ ہیں۔ ان کے تراجم جو زیادہ تر علامہ اقبال کی اُردو نظموں پر مشتمل ہیں، پڑھ کے مجھے حیرت ہوتی تھی کہ وہ اُردو زبان کی باریکیوں سے اس قدر آشنا کیسے ہیں؟ مگر جب میں ان سے ملا تو مجھے معلوم ہوا اس کی وجہ یہ ہے کہ فارسی جو عراق کی دوسری مقبول و عام زبان ہے، وہ اس پر پوری طرح قادر ہیں۔ دوسرے یہ کہ عراق میں بہ نسبت دیگر ممالک کے زائرین کی وجہ سے اردو زبان زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے اقبال کی وہ نظمیں جن میں عربی افکار کا پس منظر کم ہے اُن کو بھی وہ بخوبی سمجھ سکتی ہیں۔ اگرچہ عزّام بے بھی فارسی سے آگاہ تھے اور انھوں نے شاہنامۂ فردوسی کے بعض اشعار کا عربی منظوم ترجمہ بھی کیا تھا مگر فارسی ان کی مادری زبان نہ تھی، علمی زبان تھی۔ مگر امیرہ کے لئے فارسی مادری زبان کا درجہ رکھتی ہے اور وہ اُردو سے بھی نامانوس نہیں ہیں۔

عزّام بے کو خود اس کا احساس تھا کہ امیرہ نورالدین اور صاوی شعلان نے اقبال کے بعض قطعات اور اشعار کا ایسا ترجمہ کیا ہے جس سے بہتر وہ نہ کر سکیں گے چنانچہ مثنوی اسرار و رموز کے ترجمے میں انھوں نے "سرِ شہادت" اور "تذکرۂ بتول" کے اشعار چھوڑ دیئے ہیں اور اس کا تذکرہ حاشیے میں کر دیا ہے مگر کوئی وجہ نہیں لکھی ہے۔ جب میں نے عزّام بے سے اس کی وجہ دریافت کی تو انھوں نے کہا کہ صاوی شعلان نے اِن منتخب اشعار کا ایسا ترجمہ کیا ہے کہ جب تک میں اس سے بہتر ترجمہ نہ کر سکوں ان کا ترک کر دینا ہی بہتر تھا۔ یہ کام میں پوری کتاب کے ترجمے کی تکمیل کے بعد کرنا چاہتا تھا مگر "سفارت" کی مصروفیات نے موقع نہ دیا اور کتاب چھپ گئی۔

عزّام بے نے اقبال کی جس کتاب یا جس نظم کا ترجمہ کیا ہے اس کو بار بار پڑھا ہے اور خوب سمجھا ہے اور کوشش کی ہے کہ مفہوم پورا کا پورا منتقل ہو جائے اور جہاں دقت محسوس کی ہے وہاں حاشیوں کی مدد سے اُس کو واضح کیا ہے۔ مگر دوسرے عربی مترجمین نے عربی نظم کی خوبصورتی کو مقدم رکھا ہے۔ عزّام بے عربی زبان کے بڑے عالم تھے اور زبان کے معاملہ میں فی الجملہ قدامت پسند تھے مگر بہاء الامیری، صاوی شعلان اور امیرہ نورالدین یا نئی نسل سے تعلق رکھتے ہیں یا نئے عربی ادب کی نئی تراکیب کو استعمال کرتے ہیں، اس لئے بھی ان کے اشعار میں شگفتگی اور آزادیٔ مفہوم کا زیادہ احساس ہوتا ہے مگر عزّام بے کے ترجمے میں اصل مفہوم کی مطابقت کی احتیاط نے بظاہر کہیں کہیں شعریت کا خون کر دیا ہے۔ تاہم میرا خیال ہے کہ "سفارت" جیسے محتاط اور غیر شاعرانہ مشغلہ کے باوجود ان کی شاعرانہ رُوح کو جہاں بھی ابھرنے کا موقع ملا ہے انھوں نے یہ کمی پوری کر دی ہے اور "مسجد قرطبہ" جیسی نظموں کے ترجمے میں تو انہوں نے اقبال کی "نغمگی" اور موسیقیت کا بھی عکس منتقل کر دیا ہے۔

سفارت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونے کے بعد اب وہ سعود یونیورسٹی ریاض کے قیام میں مصروف تھے اور اب پھر وہی عزّام بے ہو گئے تھے جن سے قاہرہ کی علمی و ادبی دنیا مانوس تھی۔ اے کاش وہ یہ آخری مقالہ ہی مکمل کر سکتے جس میں انہوں نے اقبال اور متنبی کا موازنہ کرنا چاہا تھا اور متنبی کی شاعری کی خصوصیات گنوانے کے بعد اقبال کی ویسی ہی خصوصیات کا ذکر کیا تھا اور اس کے بعد یہ لکھ رہے تھے کہ:

"مگر اقبال کے ہاں اس سے زیادہ بھی کچھ ہے اور وہ یہ کہ اقبال ———"

کہ قضا نے اُن کا وہ دھڑکتا ہوا دل خاموش کر دیا جو اقبال کے عشق سے معمور تھا۔ اس لئے کہ اُس دل کو اسلام سے محبت تھی اور مشرقِ عربی میں جمال الدین اور محمد عبدہ کے بعد کسی "دانائے راز" کی آواز ہی نہ سنائی دیتی تھی مگر جب اقبال کی آواز اُن کے کانوں تک پہنچی تو وہ بے چین ہو گئے اور اُن کے دل میں وہ چراغ جل اٹھا جس سے آج لاتعداد چراغ روشن ہیں۔

"مسجد قرطبہ" کے ترجمے میں عزّام بے نے حتی الامکان ہر بند کے قوافی کی یکسانیت کا بھی لحاظ رکھا ہے۔ مثلاً

سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات　　　سلسلۂ روز و شب اصلِ حیات و ممات

(ترجمہ) نهارٌ وليلٌ لغيرِ ثبات — هما سرّ أمر الحادثات
نهارٌ وليلٌ يكتبان فيناً — وأصل الحياة هما والممات

ہے مگر اُس نقش میں رنگِ ثبات و دوام — جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام
(ترجمہ) ولكن نقشاً حليف الدوام — بكف الولي قرين التمام

اے حرمِ قرطبہ! عشق سے تیرا وجود — عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود
(ترجمہ) أمسجد قرطبة للوجود — من العشق جئت فنلت الخلود

تیرا جلال و جمال مردِ خدا کی دلیل — وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل
(ترجمہ) على رجل الله أنت الدليل — فأنت كهذا، جليل جميل

کعبۂ اربابِ فن! سطوتِ دینِ مبیں — تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں
(ترجمہ) أكعبة فنٍّ وسطوة دين — بأندلس حرم القاصدين

وادیٔ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب — لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب
(ترجمہ) بوادي الجبال تلظّى السحاب — وفي شفقٍ، من عقيق هضاب

صرف پانچویں اور ساتویں بند میں یہ التزام باقی نہیں رہ سکا ہے، اس لئے کہ رازو گداز اور آسماں اور اذاں کے مماثل قوافی عربی نظم میں آنا بعض فنی اور لغوی وجوہ سے ممکن نہ تھا۔ اس سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ عزام بے نے علامہ اقبال کی اس معرکہ آرا نظم کے ترجمے میں اصل کی طرح روانی، ماضی و مستقبل و حال کے تاثرات و توقعات کی ترجمانی کے علاوہ قوافی کی یکسانیت کی کوشش کرکے "لزوم ما لا یلزم" سے بھی کام لیا ہے جو اگرچہ ایک "صنعت" ہے مگر ترجمہ میں اس صنعت کو لانا ایک قادر الکلام شاعر ہی کے بس کی بات ہے۔

اگر عزام بے چند سال اور زندہ رہتے تو شاید "نسیمِ حجاز" کے عنوان سے علامہ اقبال کے اُن افکار کو عربی نثر میں پیش کرتے جو اُن کے کلام میں بکھرے ہوئے ہیں اور جن کو مرتب کرکے وہ علامہ کے "فہمِ اسلام" کو عرب نوجوانوں کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے۔ مگر یہ کام کسی اور کے لئے چھوڑ کے وہ علامہ اقبال سے جا ملے۔ ؏ آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے! ؟

★

" اقبال نے کئی جگہ اپنے کلام میں جلال الدین رومیؒ کا ذکر کیا ہے۔ وہ اعتراف کرتا ہے کہ اس مرشدِ عظیم نے اس کو خوابِ گراں سے بیدار کیا، اس کی نگاہوں سے غفلت و جہالت کے پردے اٹھائے اور اس کے دل میں آگ سی لگا دی۔ اقبال نے جلال الدین رومیؒ کو افلاک کی جادہ پیمائی میں اپنا رہنما بنایا اور حق تو یہ ہے کہ جلال الدین کے فلسفہ اور شعر میں وہ چنگاریاں ہیں جن سے اقبال نے آتشِ دروں کو بھڑکایا اور اپنے لئے مشعلِ راہ بنایا۔

فلسفۂ خودی اور اس کے شاخ و برگ یعنی قوت و توانائی، عملِ پیہم اور جہادِ دائم کی طرف دعوت۔ ان سب کی جھلکیاں چشمِ بینا کو جلال الدین کے اشعار میں ملتی ہیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب میں ترکی کے شاعرِ اسلام محمد عاکف سے اقبال اور جلال الدین پر گفتگو کرتا تھا تو میں یہ کہتا تھا کہ اگر جلال الدینؒ اس زمانے میں جی اٹھیں تو وہ محمد اقبال ہی ہوں گے۔

یہ مختصر تحریر اس مطلب کی تشریح کے لئے ناکافی ہے۔ یہ تو محض ایک قطرہ ہے ایک ذخار سمندر کا اور ایک اشارہ ہے اُس شخص کیلئے جو ساتویں صدی ہجری کے جلال اور چودھویں صدی کے اقبال کو سمجھنا چاہتا ہے۔"

عبد الوہاب عزام بے

بہ یادِ رفتگاں:

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم
(مرحوم)

رئیس احمد جعفری

اب تک یہ فیصلہ کرنا میرے لئے آسان نہیں ہے کہ اسے اپنی خوش قسمتی قرار دوں یا بدقسمتی کہ غیر منقسم ہندوستان میں مجھے متعدد بلند پایہ عالی مرتبت اور والا جناب ہستیوں سے شرفِ تقرب حاصل رہا۔ انہیں میں نے بہت قریب سے دیکھا، لیکن اکثر حالتوں میں ہوا یہ کہ جس بارگاہ پر سرِ عقیدت جھکا کر پہنچا وہاں سے بدظنی اور کبھی کبھی نفرت کا توشہ لے کر واپس ہوا ؎

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

جن شخصیتوں سے مجھے شرفِ تقرب حاصل رہا ہے ان میں وہ لوگ بھی تھے جو اقلیمِ سیاست کے شہریار تھے اور وہ حضرات بھی جو شہرستانِ علم و فضل کے تاجدار تھے، وہ بھی جن کے سامنے لوگوں کی جبینِ نیاز خم ہوتی تھی، اور وہ بھی جن کی جبینِ نیاز کسی کے سامنے خم نہیں ہوتی تھی، وہ بھی جن کے طنطنہ سے قصرِ استعمار لرزتا رہتا تھا، اور وہ بھی جن کے ہمہمہ سے، شہر و دیار کے کوچہ و بازار میں طوفان اٹھتے تھے، زلزلے آتے تھے، اور انقلاب برپا ہوتے تھے، لیکن ان میں چند ہی ہستیاں ایسی تھیں جنہیں دیکھ کر، جن کے پاس بیٹھ کر، جن کی باتیں سن کے، جن کا قریب سے مطالعہ کرکے بے ساختہ۔ "آدمے بھی جی میں یہاں عمر بسر کرد" خلیفہ صاحب کی ذاتِ گرامی بھی مجھے ایسی ہی نظر آئی۔

وہ اردو کے جلیل القدر ادیب تھے، انگریزی کے نہایت اعلیٰ انشاپرداز تھے، مغربی فلسفہ کے رازداں اور مشرقی فلسفہ کے امین تھے علوم مغربی کے ماہر اور علوم مشرقی کے جامع تھے، وہ عرصۂ دراز تک جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں فلسفہ کے معلم رہے، پھر اپنے آبائی وطن کشمیر میں ڈائرکٹر محکمۂ تعلیمات رہے، وہ اپنے علم و فضل، وسعتِ مطالعہ اور وسعتِ نظر کے اعتبار سے یکتا تھے، دوست ان کی عزت کرتے تھے ہمعصران کا لوہا مانتے تھے۔ مخالف تک ان کی بارگاہِ عالی میں سر جھکا کر حاضر ہوتے تھے۔

خلیفہ صاحب کی ذات، مجموعۂ صفات تھی، وہ بہت اچھے مسلمان، اور اس لئے بہت اچھے انسان تھے، رومی کے عاشق اور اقبال کے پرستار تھے اقبال اور رومی کے گہرے مطالعہ نے، ان میں جذب و شوق کا عجیب عالم پیدا کر دیا تھا، وہ درویش بوریہ نشیں نہیں تھے، ملائے مسجد بھی نہیں تھے کسی خانقاہ کے شب بیداروں میں بھی ان کا شمار نہیں تھا، لیکن اسلام کی ترجمانی نئے تعلیم یافتہ اصحاب کے سامنے اور خاص طور پر فرنگی اہلِ علم و نظر کے سامنے اس خوبی سے کرتے تھے کہ لوگ سرتاپا غرقِ حیرت ہو کر ان کی باتیں سنتے تھے، وہ کئی مرتبہ امریکہ گئے، اور وہاں اسلام کے متعدد پہلوؤں پر بین الاقوامی مذہبی کانفرنسوں کے اجتماعات میں اثر آفریں اور ایمان افروز تقریریں کیں، ان تقریروں کی داد دینے والوں میں بڑے بڑے گرجوں کے پادری، اور نظامِ کلیسا کے اربابِ حل و عقد تک تھے، اقبال اور رومی سے وہ بہت متاثر تھے، اس تاثر نے ان کی طبیعت میں سوز و گداز کی عجیب کیفیت پیدا کر دی تھی، خاص طور پر ذاتِ رسالت مآب کا جہاں تک تعلق تھا وہ حدود و قیود کی پابندیوں سے یکسر آزاد تھے، ایک مرتبہ سرسید کا ذکر چھڑا، سرسید کا خلیفہ صاحب اتنا ہی احترام کرتے تھے جتنا ایک مرید کسی مرشد کا کر سکتا ہے، ملتِ اسلامیہ کا سب سے بڑا محسن وہ سرسید کو مانتے تھے، باتوں باتوں میں خلیفہ صاحب نے سرسید کے عشقِ رسولؐ کا ذکر چھیڑ دیا۔ اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا اس ذکر پر پہلے ان کی آنکھیں آب گوں ہوئیں، اور اس کے بعد بے ساختہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیے تھے، جو شخص زندگی کے طوفانوں کا ہنستا کھیلتا مقابلہ کرتا تھا، جو شخص زندگی کے بڑے بڑے حادثہ پر مسکراتا رہتا تھا، کوئی سانحہ کوئی واقعہ، کوئی المیہ، جس کے جاں نواز تبسم کو چھیننے پر قادر نہ تھا، رسول اللہؐ کے ذکر پر ہمیشہ اس کے سیلِ گریہ میں گرداں کف سیلاب تھا!

ایک مرتبہ ایک صاحب تشریف لائے۔ اور "تبلیغ" شروع کر دی، یہ صاحب ایک مدعیٔ نبوت کے عقیدت کیش تھے، اور ازراہ دوستی و ہمدردی چاہتے تھے کہ خلیفہ صاحب بھی ان کے ہم نوا بنکر اپنی عاقبت سنوار لیں، خلیفہ صاحب بڑی توجہ سے ان کی باتیں سنتے رہے پھر فرمایا دیکھئے صاحب مجھے کسی مدعیٔ نبوت کا دعوائے نبوت تسلیم کرنے میں تامل نہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ محمدؐ نے دعوائے نبوت کر کے سیرت و کردار کا ایسا معیار قائم کر دیا ہے کہ اس کے بعد اس طرح کے مدعیوں پر غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوتی تو وہ صاحب ایسے خاموش ہوئے کہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا، ——————
"یہ بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں"!

کچھ عرصہ ہوا، امریکہ سے عیسائی اور یہودی "علمائے دین" کی ایک جماعت مشرق کے دورے پر نکلی۔ مقصد یہ تھا کہ عیسائیت اور یہودیت کی علمی، نداز میں تبلیغ کی جائے۔ خلیفہ صاحب نے ان حضرات کو "ادارہ" میں مدعو کیا، انہیں اظہار خیالات کا موقع دیا، پھر "اسلام" پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا، اسلام کو جو چیز دنیا کے دوسرے تمام مذاہب سے ممتاز کرتی ہے، وہ ہے تمیز نسل و رنگ سے ماورا ہو کر ایک ہم عقیدہ جماعت کی تشکیل، اسلام میں کالا کو بھی وہی حقوق حاصل ہیں جو گورے کو۔ اس موقع پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس جماعت میں ایک سیاہ فام امریکی حبشی بھی تھا۔ حالانکہ دوسرے مذاہب عمومی تبلیغ کے باوجود، گورے کی عبادت گاہ الگ ہوتی ہے اور کالے کی الگ۔ اس تقریر نے حاضرین پر جو اثر کیا وہ تو کیا، لیکن قابل دید حالت اس سیاہ فام امریکی کی تھی جس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، اور ان سفید امریکیوں کی جن کا چہرہ زرد ہو رہا تھا!

ایک مرتبہ بحث چھڑی کہ یہ کیا بات ہے اسلام کتابیہ عورتوں سے مسلمان مردوں کو شادی کی اجازت دیتا ہے، لیکن کتابی مردوں سے مسلمان عورتوں کی شادی جائز قرار نہیں دیتا؟ خلیفہ صاحب نے فرمایا، اسلام نے عورتوں کو جو حقوق دئے ہیں وہ کسی مذہب نے نہیں دئے، ایک غیر مسلم عورت مسلمان شوہر کی بیوی بننے کے بعد ان تمام حقوق کی مالک ہو جاتی ہے جو مسلمان عورت کو مل سکتے ہیں، لیکن ایک مسلمان عورت، غیر مسلم کی بیوی بنکر ان تمام حقوق سے محروم ہو جاتی ہے جو اسلام نے عورتوں کو عطا کئے ہیں، بھلا اسلام اتنا بڑا ظلم کیسے برداشت کر سکتا تھا؟

خلیفہ صاحب کا دل بھی مسلمان تھا اور دماغ بھی، زبان بھی اور قلم بھی، وہ تنگ دل نہیں تھے، متعصب نہیں تھے، اس لئے کہ اسلام بھی تنگ دل اور متعصب نہیں ہے۔ قرآن کا انہوں نے دقت نظر سے مطالعہ کیا تھا، اور یہ مطالعہ کبھی ختم نہیں ہوا، حدیث پر ان کی گہری نظر تھی، ان کا اسلام، قرآن و حدیث کے دل آویز امتزاج کا نتیجہ تھا، وہ حدیث کے قائل تھے، اس کی افادیت، اہمیت اور دینی حیثیت کے معترف تھے، لیکن روایت کے ساتھ وہ درایت کے بھی قائل تھے، جو حدیث قرآن کی مخالف ہو، یا وقار رسالتؐ پناہ کے منافی ہو اسے ہرگز تسلیم نہیں کرتے تھے۔ خود ائمہ حدیث کا بھی مسلک یہی ہے، وہ بڑے عالی ظرف تھے، دوسروں کے خیالات سنتے تھے، دوسروں کو اختلافات کا حق دیتے تھے، بارہا ایسا ہوا کہ جن شخصیتوں کے وہ دل سے مداح اور قدر شناس تھے، ان پر میں نے تند و تلخ نکتہ چینی کی۔ مگر ان کے ماتھے پر شکن نہ آئی۔ ایسا بھی ہوا کہ اپنی بصیرت کے مطابق انہوں نے ایک رائے کسی دینی مسئلہ میں قائم کی، مگر نیاز مند اور ساختہ، ہونے کے باوجود میں نے اس سے اختلاف کیا۔ اس اختلاف کو انہوں نے خندہ جبینی کے ساتھ برداشت کیا، ایک مرتبہ ریڈیو پاکستان لاہور کی "مجلس" منعقد ہوئی۔ چراغ حسن حسرت مرحوم اس کے صدر تھے۔ میاں بشیر احمد، ایڈیٹر ہمایوں، مولانا صلاح الدین احمد ایڈیٹر ادبی دنیا، شاہ محمد جعفر صاحب ندوی، شریک بزم تھے۔ زیر بحث میرا مقالہ تھا، جس پر اختلاف و اتفاق کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ اسی اثنا میں زکوٰۃ کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ خلیفہ صاحب کی رائے تھی کہ یہ ایک ٹیکس ہے، اور اسلامی حکومت حسب حالات اس میں کمی بیشی کر سکتی ہے۔ حکومت جو ٹیکس بھی لیتی ہے وہ زکوٰۃ ہے، اس کے ادا کرنے کے بعد پھر زکوٰۃ کے نام سے الگ رقم صرف کرنے کی ضرورت نہیں۔ میرا عرض کرنا یہ تھا کہ حکومت اپنی صوابدید پر جتنے چاہے ٹیکس وصول کر سکتی ہے لیکن زکوٰۃ ایک خالص مذہبی چیز ہے، اس کی شرح معین ہے۔ اس کے مصارف مقرر ہیں، لہٰذا اس کا دوسرے محاصل سے قطع نظر کر کے ادا کرنا لازمی ہے۔ بہت جلد یہ مسئلہ دلائل کا میدان جنگ بن گیا، خلیفہ صاحب اپنی سوچی سمجھی رائے میں کیوں تبدیلی کرتے؟ اور میں ایک مذہبی مسلک میں کیوں مداخلت کرتا! جب تک "مجلس" جاری رہی دلائل کا ترکش ہم دونوں خالی کرتے رہے، لیکن جب مجلس برخاست ہوئی تو نہ کوئی اختلاف تھا نہ اس کا اثر، مذہبی معاملات و مسائل میں وہ بہت سوچ سمجھ کر کوئی رائے قائم کرتے تھے، اور جب کوئی رائے قائم کر لیتے تھے تو اس پر جم جاتے تھے، لیکن اگر کسی موقع پر ان کی رائے کی کمزوری ثابت ہو جاتی تو رجوع کرنے میں ذرا بھی تامل نہ کرتے۔

"ادارۂ ثقافت اسلامیہ خلیفہ صاحب کی زندگی کا آخری اور نہایت شاندار بلکہ لازوال اور زندۂ جاوید کارنامہ تھا۔ قیام پاکستان کے بعد ہمارے مدارس، جامعات، تصنیفی اور تالیفی ادارے، ہندوستان ہی میں رہ گئے تھے، پاکستان ایک نیا ملک تھا، اس کی بنیاد مذہب پر تھی ضرورت تھی کہ اس پرانی قوم اور نئے ملک کو اسلام کی صحیح اقدار سے روشناس کیا جائے۔ ادارہ کا یہی مقصد تھا، اور بلاشبہ خلیفہ صاحب کی سربراہی میں صرف دس سال کی مدت کے اندر ادارہ نے ایسا قابلِ قدر تصنیفی سرمایہ پاکستانی قوم کو عطا کیا، جو برس ہا برس میں بھی ہندوستان کے تصنیفی ادارے نہیں انجام دے سکے۔

ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے سیاہ و سفید کے مالک خلیفہ صاحب تھے، یوں تو ایک بورڈ آف ڈائرکٹرز بھی تھا، لیکن ڈائرکٹروں کو خلیفہ صاحب پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ اپنے صوابدید پر جو چاہتے تھے کرتے تھے اور بورڈ اس کی توثیق کر دیتا تھا۔ خلیفہ صاحب نے چن چن کر ادارہ میں ایسے افراد کو اپنی مردم شناسی سے جمع کیا، جن میں سے اکثر گم نام تھے، اپنا کوئی تصنیفی پس منظر نہیں رکھتے تھے، لیکن خلیفہ صاحب کی نگرانی میں انہوں نے جو کتابیں تصنیف کیں سارے ملک میں ان کی دھوم مچ گئی، علمی حلقوں نے خراج تحسین ادا کیا، پاکستان سے باہر کے علمی اداروں نے حوصلہ افزا طور پر انہیں سراہا۔ یہ تصنیفات مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں۔ تاریخ، سیرت، سوانح، فلسفہ، تصوف، قرآن، حدیث، فقہ۔ یہ کتابیں انگریزی میں بھی ہیں اور اردو میں بھی۔ ان پر تنقیدیں بھی ہوئیں۔ بعض حلقوں سے اختلاف کی صدا بھی بلند ہوئی، لیکن یہ کوئی نہ کہہ سکا کہ مغز و مواد کے اعتبار سے ان کا درجہ فروتر ہے۔ اس کا سب نے اعتراف کیا کہ کتابیں، وقتِ نظر، وسعت مطالعہ، تحقیق اور ذوق جستجو کا شاہکار ہیں۔

رفقاء ادارہ کے ساتھ خلیفہ صاحب کا برتاؤ وہی تھا جو خاندان کے سربراہ کا دوسرے افراد خاندان کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ اس طرح گھل مل کر ایسی اپنایت سے، اس درجہ مساوات کے ساتھ ادارہ میں اٹھتے بیٹھتے تھے کہ کسی غیر آدمی کے لئے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ اس گروہ میں کوئی "افسر اعلیٰ" بھی موجود ہے، نہ تمکنت، نہ غرور، نہ پندار، نہ رعب ہمدانی۔ رفقاء ادارہ کی مشکلات کا جتنا وہ احساس رکھتے تھے اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ کبھی گرانٹ کے وصول ہونے میں دو دو ہفتہ کی دیر ہو جاتی، خلیفہ صاحب اپنے پاس سے ساری تنخواہیں ادا کر دیتے۔ پھر رقم آنے کے بعد وصول کر لیتے۔ رفقاء ادارہ میں اگر کسی ناگہانی ضرورت کے باعث کوئی پریشان ہوتا، بے تامل خلیفہ صاحب ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو ہزار روپے دے دیتے، خود سے کبھی تقاضہ نہ کرتے۔ یہ قرض لینے والے کی صوابدید پر تھا، جس طرح سہولت دیکھے ادا کر دے۔ خواہ یہ سلسلہ کتنی ہی طویل مدت تک کیوں نہ جاری رہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کسی کو کوئی معقول رقم قرض دیتے۔ پھر اس کی مشکلات کا اندازہ کر کے خود ہی معاف کر دیتے، ادارہ کو اگر کبھی بھی کوئی مالی دشواری پیش آتی، بے تامل خلیفہ صاحب اپنا بینک بیلنس ادارہ کی طرف منتقل کر دیتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک مرتبہ بارہ پندرہ ہزار روپے کی ضرورت پیش آئی خلیفہ صاحب نے یہ رقم اپنے پاس سے دے دی، پھر جب ادارہ کے پاس رقم آگئی تو واپس لے لی۔

ادارہ کا نظامِ اوقات بھی وہی تھا جو دفتروں کا ہوتا ہے، اور شعبۂ انتظام و طباعت کے افراد ان اوقات کے پابند بھی تھے، لیکن مصنفین پر کسی طرح کی پابندی نہ تھی، نہ ان کی غیر حاضری شمار کی جاتی تھی۔ وہ فرمایا کرتے تھے، لکھنے پڑھنے والوں پر اس طرح کی پابندیاں ظلم ہیں۔ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ سال بھر میں، مقررہ صفحات پورے ہو جائیں۔ اور ان میں بھی اگر کبھی کمی ہوتی تو وہ باز پرس نہ کرتے۔ فرماتے تھے علم ناپا اور تولا نہیں جا سکتا!

دو سال کی مدت ہوئی مجھ پر قلبی دورہ پڑا۔ ایک مہینہ کے بعد دوسرا حملہ اور زیادہ سخت ہوا۔ امید زیست منقطع ہو گئی۔ ڈاکٹر تک مایوس تھے، لیکن خدا نے فضل کیا، بچ گیا۔ جب تک میں گنگا رام ہسپتال میں رہا خلیفہ صاحب کئی بار عیادت کو تشریف لائے، ہر تشریف آوری کے موقع پر مجھے یہ باور کرانے کی کوشش کرتے کہ اب آپ بچ گئے، پھر ہسپتال سے میں گھر آیا، اور ڈاکٹروں نے حکم دیا کہ کم از کم دس ہفتے تک بستر سے جنبش بھی نہ کروں۔ پھر اس مدت میں اور توسیع ہوئی، پھر بستر سے اتر کر کرسی پر ذرا دیر بیٹھنے کی اجازت ملی، پھر کچھ عرصہ بعد کرسی سے اٹھ کر دس بارہ قدم چلنے کی اجازت ملی پھر گھر میں دس پانچ منٹ ٹہلنے کی۔ ان مراحل کے طے ہونے میں تقریباً چھ مہینہ کی مدت گذر گئی۔ اس ساری مدت میں خلیفہ صاحب کا معمول یہ رہا کہ ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو میری تنخواہ گھر پر پہنچ جاتی۔ پھر جب مجھے کام کرنے کی اجازت ملی، تو میں نے ہفتہ میں دو تین بار ادارہ جانا شروع کیا۔ وہاں پہنچا تو دیکھتا کیا ہوں کہ ایک کمرہ میں مسہری لگی ہے۔ بستر لگا ہے۔ گاؤ تکیہ موجود ہے۔ خلیفہ صاحب نے فرمایا، ابھی آپ کمزور ہیں۔

(باقی صفحہ ۵۹ پر)

علّامہ اقبالؒ کے چند نوادر

اکبر علی خاں

شاعرِ مشرق کی چند نادر تحریریں پیش کر رہا ہوں۔ نثر میں بھی اور نظم میں بھی۔ پہلا خط "کشمیری میگزین" کے ایڈیٹر محمد دین فوق کے نام ہے۔ یہ کشمیری میگزین لاہور کی اپریل ۱۹۰۶ء کی اشاعت میں شامل ہے۔ فوق کے نام نقوش کے "مکاتیب نمبر" میں علامہ اقبال کے ۷ خط شائع ہوئے ہیں۔ "اقبال نامہ" حصہ دوم (عطاء اللہ) میں ایک خط ہے اور فوق کی ایک کتاب پر تقریظی رائے ۔۔۔۔ فوق کے بارے میں تفصیلات "شخصیات نمبر" نقوش میں عبد اللہ قریشی کے مقالے سے مل سکتی ہیں۔

دوسرا خط لکھنؤ کے ادبی ماہنامے "مرقع" کے ایڈیٹر وصل بلگرامی کے نام ہے اور "مرقع" کے اولیں شمارے جنوری ۱۹۲۶ء کی اشاعت میں شامل ہے جس میں یہ عکس تحریر کے طور پر شائع کیا گیا ہے۔ "مرقع" تین چار سال چل کر بند ہو گیا۔ اس کی امتیازی خصوصیات "زمانہ" کانپور کی طرح مشاہیر کی تحریروں کے عکس شائع کرنا تھی۔ علامہ اقبال کا خط ایڈیٹر "مرقع" کے کسی ایسے خط کا جواب ہے جس میں "مرقع" کے سرورق کے لئے کسی شعر کی فرمائش کی گئی ہے۔ جواب میں اقبال نے جو فارسی شعر بھیجا وہ "مرقع" کے سرورق کی زینت بنا رہتا تھا۔ اقبال کی یہ تحریر غالباً ۱۹۲۵ء کی آخری تحریروں میں لکھی گئی ہوگی۔ وصل بلگرامی کی شخصیت کے بارے میں شوکت تھانوی کا "شیش محل" دیکھئے۔

تیسری تحریر ڈاکٹر ہادی حسن (سابق پروفیسر مسلم یونیورسٹی) کی فاضلانہ تصنیف "ایرانی جہازرانی کی تاریخ" (انگریزی) کا پیش لفظ ہے جو "لندن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز" میں ڈاکٹر صاحب موصوف کی تحقیقات کا نتیجہ تھی اور لندن سے میلتھون اینڈ کمپنی نے ۱۹۲۸ء میں شائع کی۔ ۲۰۔ جون ۱۹۲۸ء مصنف کے حرفِ آغاز کی تاریخ ہے۔ اقبال کی تحریر بھی اسی کے لگ بھگ لکھی گئی ہوگی۔ ویسے تو اس میں کوئی خاص بات نہیں لیکن عام نظروں سے اوجھل اقبال کی ایک یادگار اُن کے طالب علموں تک پہنچانے کے جذبے نے مجھے اس کے ترجمے پر مجبور کیا۔

دوسرا پیش لفظ جمال الدین احمد اور محمد عبد العزیز کی مشترکہ تصنیف "افغانستان" (انگریزی) سے لیا گیا ہے۔ یہ کتاب کابل سے ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ افغانستان اور افغانوں سے اقبال کی دلچسپی ان کی متعدد فارسی اُردو نظموں سے ظاہر ہوتی ہے۔ ۳۳ء میں سید راس مسعود، سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر ہادی حسن (پروفیسر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی) اور علامہ اقبال حکومت افغانستان کی دعوت پر افغانستان کی تعلیمی تنظیم کا خاکہ تیار کرنے اور مشورہ دینے کے لئے چند دن افغانستان میں سرکاری مہمان رہے۔ اس سفر کی تفصیلات سید سلیمان ندوی کی "سیرِ افغانستان" میں درج ہیں۔ مختصر سا قیام تھا مگر اقبال پر گہرا تاثر لے کر لوٹے۔ اور "مسافر" جیسی خوبصورت نظم تخلیق کی۔ اسی سفر کا تاثر تھا جس نے اس پیش لفظ میں علامہ اقبال سے نثر میں شاعری کرا دی۔ بڑا ظلم ہوتا اگر یہ نثر کا مترنم گیت اب بھی انگریزی کے پردے میں چھپا رہتا۔ میں نے ترجمہ میں اقبال کے احساسات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

پانچویں تحریر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ۱۹۳۴ء کے انگریزی میگزین سے لی گئی ہے۔ طلبا کی یونین کی جوبلی کے موقع پر اس سال میگزین نے اپنا خاص نمبر شائع کیا تھا۔ جسے بدیع الدین نے ایڈٹ کیا تھا اور مشاہیر سے اس موقع کے لئے پیغامات منگوائے گئے تھے۔ اقبال کا یہ پیغام اپنے انگریزی کے خوبصورت اور بے ساختہ ترجمے کی وجہ سے اہمیت رکھتا ہے۔ ایسے ہی برجستہ ترجمے کی ایک مثال اور ملتی ہے جو "ماہِ نو" میں شائع ہو چکی ہے۔ کسی موقع پر اقبال نے یہ شعر

چناں بزی کہ اگر مرگ ماست مرگِ دوام
خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد

پڑھ کر فی البدیہہ اس کا انگریزی ترجمہ پیش کیا تھا۔

Live so beautifully that if death
Is the end of all,
God Himself may be put to shame,
for having ended thy career.

یہ میں نے یہاں اس لئے نقل کردیا کہ دونوں ترجمے ساتھ رہیں تو لطف دوبالا ہو جائیگا۔ اس کے بعد علامہ اقبال کے غیر معروف کلام اردو کا آغاز ہوتا ہے۔ چھٹے نمبر پر جو نظم درج ہے علامہ اقبال کے بالکل ابتدائی زمانے کی یادگار ہے۔ یہ بھی "کشمیری میگزین" مرتبہ فوق کے مارچ ۱۹۰۹ء میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کے ساتھ فوق کا تشریحی نوٹ بھی ملاحظہ فرمائیے :—

"ڈاکٹر اقبال صاحب کی مصروفیتیں ان کے لاہوری احباب سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ بیرسٹری کا کام بجائے خود ان کی عدیم الفرصتی کا شاہد ہے لیکن مختلف کمیٹیوں اور سوسائیٹیوں کی شمولیت نے ان کو عالمِ تخیلات یعنی شاعری سے کچھ عرصے کے لئے جدا ہونے پر اور بھی مجبور کردیا ہے۔ جب سے انہوں نے پریکٹس شروع کی ہے بہت کم نظم لکھتے ہیں۔ ایسی حالت میں ان کی طبیعت پر جبر کرکے ان سے نظم لکھوانا نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ اتفاق سے ان کی ایک پرانی نظم اور چند قومی رباعیاں مل گئی ہیں۔ یہ نظم انہوں نے فروری ۱۸۹۶ء میں سب سے پہلی بار مجلس کشمیری مسلمانان لاہور کے جلسے میں پڑھی تھی۔ اس وقت آپ نہ بی اے تھے نہ ایم اے نہ پروفیسر۔ ایک معمولی مگر ذہین طالب علم تھے۔ آج وہی نظم اُن کی نظرِ ثانی اور اجازت کے بعد میگزین میں اس وقت شائع ہو رہی ہے جب کہ آپ خدا کے فضل سے ایم اے بھی ہیں، بیرسٹر بھی ہیں، ڈاکٹر بھی ہیں اور ایل ایل ڈی اور پی ایچ ڈی بھی ہیں۔ اور سب سے زیادہ خوشی کی بات تو یہ ہے کہ باوجود اس شہرت اور علمی اعزاز کے اہلِ خطہ بھی ہیں بلکہ انجمن کشمیری مسلمانان کے جنرل سیکرٹری ہیں۔"

اس نظم کے صرف ۱، ۲، ۱۰، ۱۳، ۱۷، ۱۹، ۲۱، ۲۲، ۲۵، ۲۶، اور ۲۷ ویں شعر کو "کلیاتِ اقبال" اور "باقیات اقبال" میں کسی غلط فہمی کی بنا پر غزل کے عنوان کے تحت شامل کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ صاف طور پر نظم معلوم ہوتی ہے۔ نہ معلوم اس غلطی کا آغاز کہاں سے ہوا، اور اس کے بقیہ اشعار کیسے تخفیف میں آگئے۔

۷۔۸ : ایک ہی سلسلہ کی رباعیاں ہیں۔ پہلی بار "کشمیری میگزین" اکتوبر ۱۹۰۹ء میں چھپی تھیں۔ ان کا فوق کے مندرجہ بالا نوٹ میں حوالہ بھی ملتا ہے۔ یہ تعداد میں ۸ تھیں۔ ان میں سے چھ "باقیاتِ اقبال" (مرتبہ عبدالواحد معینی) میں شامل کی جا چکی ہیں۔

۹ : یہ رباعی بھی بہ سلسلۂ بالا ہی میں شمار کی جانی چاہیئے۔ اور اس کو ہم تک پہنچانے کا سہرا بھی فوق ہی کے سر ہے۔

۱۰ : یہ "بانگِ درا" میں مشمولہ غزل "مثالِ پرتوِ مے طوفِ جام کرتے ہیں" کے حذف کردہ بقیہ اشعار ہیں۔ یہاں "دکن ریویو" ستمبر ۱۹۰۵ء سے آپ کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں۔ علامہ اقبال نے یہ غزل دورانِ سفرِ یورپ کہی تھی۔ چنانچہ ایک شعر ؎

"ہرے رہو وطنِ مازنی کے میدانو جہاز پر سے تمہیں ہم سلام کرتے ہیں"

میں اطالیہ کے مشہور محبِ وطن مازنی کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔

۱۱ : اس شعر کی حیثیت مشکوک ہے۔ یہ اقبال کو پسند کرنے والے ایک بزرگ خورشید الحسن صاحب کی بیاض سے نقل کیا گیا ہے مگر مسلمہ طور پر اسے علامہ کا نہیں کہا جاسکتا اس لئے کہ کوئی مطبوعہ شہادت مجھے ابھی تک نہیں مل سکی اور مرتب بیاض کے بیان کو بھی رد نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ اسی میں علامہ کی کئی نظمیں اپنے ابتدائی متن کے ساتھ مندرج ہیں۔

۱۲ : یہ شعر ایک ماہوار گلدستے موسوم بہ "اصلاحِ سخن" کے شمارہ ۱، جلد ۱ مورخہ جون ۱۹۰۷ء سے نقل کیا گیا ہے۔ اس رسالہ کو حافظ سلطان احمد صاحب ترتیب دیتے تھے اور یہ لاہور سے شائع ہوتا تھا۔ مرتب نے اس شعر کے بارے میں لکھا ہے : "شیخ صاحب نے ایک مختصر سی غزل اسی طرح پر ہمیں لاہور میں سنائی تھی۔ ایک شعر یاد رہا، وہی لکھ دیا گیا"۔

۱۳ : یہ شعر کلامِ فوق کے دیباچے سے لیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۰۹ء میں پہلی بار شائع ہوئی تھی۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مصنف نے اپنی ہر نظم

اور غزل کی شانِ نزول بھی بیان کی ہے۔ کتاب کے آخر میں تلامذۂ داغ کی ایک مختصر سی فہرست ہے اور ہر ایک کے ساتھ مجملاً حالاتِ زندگی بھی درج کر دیئے گئے ہیں۔ اقبال کا بھی اس کے تحت تذکرہ ملتا ہے۔

۱۴: "کشمیری میگزین" اپریل ۱۹۰۹ء میں ایک مضمون شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا "حالاتِ اقبال"۔ اسی میں پہلی بار یہ شعر بھی مذکور ہوا ہے۔ کلیاتِ اقبال میں بھی یہ شعر شائع ہو چکا ہے۔

۱۵: یہ قطعۂ تاریخ متذکرہ بالا کتاب "کلامِ فوق" کے آخر میں شامل ہے۔

۱۶: دیباچہ "کلیاتِ اقبال" مرتبہ عبد الرزاق حیدر آبادی میں ان تینوں شعروں کا اندراج ملتا ہے۔ مرتب کا بیان ہے کہ یہ اشعار علامہ اقبال نے ۱۹۱۰ء میں کہے تھے۔

۱۷: یہ تہنیتی اشعار "مخزن" جنوری ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئے تھے۔ ان کا انداز اس بات کا غماز ہے کہ یہ کسی کی بے جا فرمائش کو یا دل ناخواستہ پورا کرنے کے لئے کہے گئے ہوں گے۔

۱۸: یہ رباعی بھی مذکورہ بالا قلمی بیاض سے ماخوذ ہے اور مشکوک معلوم ہوتی ہے۔

۱۹: یہ تین شعر "مخزن" فروری ۱۹۱۷ء کی اشاعت میں شائع ہوئے تھے۔ ایڈیٹر مخزن نے تشریحاً لکھا تھا: "ذیل میں ترجمانِ حقیقت کے وہ تین شعر درج کئے جاتے ہیں جو انہوں نے ۲۸ جنوری ۱۹۱۷ء کو "بزمِ اردو" کے جلسے میں سنا کر حاضرین پر بے خودی طاری کر دی تھی"۔

۲۰-۲۱-۲۲-۲۳-۲۴: یہ بھی قلمی بیاض سے منقول ہیں اور مشکوک ہیں۔ یہ اس لئے پیش کئے جا رہے ہیں کہ ان کا حتمی طور پر فیصلہ ہو جائے۔

۲۵: ایک نامکمل نظم کے یہ دو بند "نیرنگِ خیال" لاہور کے سالنامہ ۱۹۲۸ء میں بعنوان "علامہ اقبال کا تازہ ارشاد" شائع ہوئے تھے۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ غیر معروف کلام کا جو حصہ اس مضمون میں پیش کیا گیا ہے، اس کو کسی حیثیت سے بھی بلند نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ ہمیں ایک عظیم شاعر کی ذہنی ترقی کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ اس لئے میرے نزدیک ایسی تمام تحریروں کو سامنے لانا چاہیئے جو کسی نہ کسی حیثیت سے بھی علامہ اقبال کے سمجھنے میں معاون ثابت ہوں۔

اردو شاعری میں علامہ اقبال کے کلیدی مقام کے پیشِ نظر اس بات کی بیحد ضرورت ہے کہ ان کے کلام کو نئے ڈھنگ سے پیش کیا جائے، اس طرح کہ تاریخی ترتیب کے ساتھ شاعر کے ذہن کی ارتقائی منزلیں اُجاگر ہو کر قاری کے سامنے آجائیں۔ کسی بھی شاعر کی تفہیم کے لئے اس کے اشعار کا صحیح متن پیشِ نظر ہونا چاہیئے۔ اس کے بغیر ہم مصنف کے مافی الضمیر تک نہیں پہنچ سکیں گے اور اگر کوشش کی بھی جائے تو اس کے نتائج نہ تو سچا و درست ہوں گے اور نہ پسندِ خاطر۔ علامہ اقبال کا کلام کچھ بے ذوق اور کم استعداد کاتبوں کے بے باک اور بے رحم ہاتھوں کا اتنی بار شکار ہوا ہے کہ اب وہ اقبال کا کم اور ان بزرگوں کا زیادہ ہے! اور اسی لئے فریادی ہے۔ ان تصرفات سے نہ جانے کتنی چھوٹی بڑی غلطیاں کلامِ اقبال میں راہ پاگئی ہیں کہ ان کی اصلاح کے بغیر شاعر اور شعر دونوں کے ساتھ انصاف ممکن نہیں کیونکہ اس صورت میں ہم جو بھی سمجھیں گے وہ شاعر کا مقصود نہیں ہوگا۔ اور جو تاثر وہ ہم تک پہنچانا چاہتا ہے وہ ہم تک نہیں پہنچ سکے گا۔

اقبال نے "بانگِ درا" کی ترتیب کے وقت اپنے کلام میں اس حد تک قطع و برید اور حذف و اضافہ سے کام لیا تھا کہ اصل ماخذوں کو سامنے رکھ کر تقابلی جائزہ لیا جائے تو ایک نیا اقبال دریافت ہو جائے گا۔ شاعر کی عہد بعہد ترقی اور ذہنی رفتار کے تجزیئے کے لئے بھی ایک ایسے مجموعۂ کلام کی اشاعت اہم معلوم ہوتی ہے جو اُن کے سفرِ شعری کی داستان کو بیک وقت اور منزل بہ منزل ہماری نظر کے سامنے لے آئے۔ اقبال کا ابتدائی کلام جس کا معتد بہ حصہ "بانگِ درا" میں شامل نہیں کیا گیا اور وہ بھی جو جزواً "بانگِ درا" میں موجود ہے اپنی ابتدائی شکل میں غیر اصلاحی متن کے ساتھ مختلف قلمی بیاضوں، اخبارات اور رسائل کے فائلوں میں دبا پڑا ہے۔ شاعر کے تخیلی پس منظر اور ارتقا کو واضح کرنے کے لئے اس کو بھی منظرِ عام پر لانا ہوگا۔[۱]

---

[۱] ظاہر ہے کہ ان اجزائے پریشاں کی فراہمی بہت دشوار ہے اور کسی فردِ واحد کے لئے اس کو سرانجام دینا از بس مشکل۔ اس کی عملی صورت یہ ہے کہ صاحبِ مضمون نے فراہمیِ کلام کے سلسلہ میں جو کام شروع کر رکھا ہے اس کی تمام ممکن ذرائع سے توسیع کی جائے تاکہ منتشر پارے تلاش و جستجو کے بعد ایک جگہ فراہم اور مرتب و مدون ہو جائیں۔ ایسے کہ ہر اردو شعر تمام ضروری تعلیقات اور توضیحات کے ساتھ مندرج ہو جائے۔ ضروری حوالے (نام اخبار، صفحہ، سنہ و تاریخ وغیرہ) اور نقول وغیرہ فراہم کر دیتے جانے سے نہ صرف یہ کہ دار العلوم علیگڑھ کے ایک شیدائی اقبال کی آرزو پوری ہو سکے گی بلکہ اقبال کے سلسلہ میں ایک اہم ملی خدمت بھی سرانجام پا سکے گی۔ مدیر

اسرار و رموز اقبال رح
شارح اور مترجم

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم
(پاکستان)

ڈاکٹر عبدالوہاب عزام بے مرحوم
(مصر)

کلام اقبال کی تصویری پیشکش

عمل : عبدالرحمان چغتائی

علامۂ اقبال کا ایک خط

جنابِ من!

[illegible]

کے سوا میں اور کسی جنگ کو نہیں جانتا۔

[illegible]

فقط

اقبال

ایک اہم مکتوب

علامہ اقبال
(پیرس : ۱۹۳۳)

علمائے مصر کا ثقافتی وفد
(لاہور : ۱۹۳۴ء)

مؤتمر عالم اسلامی : مصر
(۱۹۳۲ء)
علامہ اقبال سامنے کی نشست
میں دائیں طرف

مزار حضرت مولانا جلال الدین رومی رح
قونیہ : ترکی

شبیہ : حضرت مولانا جلال الدین رومی رح

شبیہ : حضرت شمس تبریز ر

نوادراتِ اقبال

(۱)

مکتوب بنام محمد دین فوق

ڈیئر فوق۔ آپ کا کارڈ ملا، الحمد للہ کہ آپ خیریت سے ہیں۔ مجھے بھی یہ خیال تھا کہ جاتی دفعہ آپ سے ملاقات نہ ہو سکی، افسوس ہے۔ مجھے اس موقع پر فرصت کم تھی ورنہ کہیں نہ کہیں آپ سے ملنے کو آجاتا۔ اچھا ہوا کہ آپ نے وہ پرچہ[1] اپنی ذمہ داری پر چلانا شروع کیا۔ مجھے سخت افسوس ہے کہ یہاں کے مشاغل سے مطلق فرصت نہیں ملتی۔ ایسے حالات میں مضامین لکھنے کی کہاں سوجھتی ہے۔ البتہ شعر ہے جو کبھی کبھی خود بخود موزوں ہو جاتا ہے۔ سو شیخ عبد القادر (ایڈیٹر مخزن) لیجاتے ہیں۔ ان سے انکار نہیں ہو سکتا آپ سے بھی انکار نہیں، اگر کچھ ہو گیا تو حاضر کروں گا۔ والسلام محمد اقبال

ٹرنٹی کالج۔ کیمبرج۔ انگلینڈ

(۲)

مکتوب بنام سید مقبول حسین وصل بلگرامی

گفتند دلآزار کہ پر بستہ نکوتر — گفتم کہ ز بند دو جہاں رستہ نکوتر
گفتند زخلوت کدۂ خویش بروں آ — گفتم شررِ جستہ ز ناجستہ نکوتر
گفتند کہ دربارۂ او چیزے دگر گو — گفتم چو گل از بادِ صبا خستہ نکوتر (اقبال)

دانت کے درد سے اب افاقہ ہے۔ ہمدردی کا شکریہ قبول فرمایئے۔ ٹائیٹل پیج[2] کے لئے شاید یہ شعر موزوں ہو

تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ
عشق کارے است کہ بے آہ و فغاں نیز کنند (اقبال)

(۳)

پیش لفظ: "ایرانی جہاز رانی کی تاریخ": (انگریزی): (ڈاکٹر ہادی حسن):

میں نے پروفیسر ہادی حسن کی کتاب "ایرانی جہاز رانی" کے بعض حصوں کو بڑی دلچسپی سے پڑھا اور اس سے استفادہ کیا۔ ان گنت ایرانی، عرب اور چینی ماخذوں کے علاوہ انہوں نے تمام ممکن الحصول کتبوں، تصویروں اور سکوں سے مواد حاصل کیا ہے۔ جس کے نتیجے میں یہ بات طے ہو گئی ہے کہ یزدگرد کے زوال کے ساتھ ساسانیوں کی بڑی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا تاہم ایرانیوں کی بحری سرگرمیاں المتوکل کی خلافت تک جاری رہیں تاآنکہ عرب انکی جگہ لیتے گئے۔

ایک محنت طلب کام کے لئے مصنف کی غیر معمولی صلاحیت، شواہد کی تفصیلات کو ترتیب دینے کے لئے انتھک صبر و ضبط اور سب سے بڑھکر اپنے موضوعِ مطالعہ کے لئے پرجوش لگن، یہ سب کچھ ان کی فاضلانہ پیشکش سے بخوبی ظاہر ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ پروفیسر ہادی کی یہ تصنیف ایرانی اثریات پر موجودہ تاریخی تحقیقات میں ایک اہم اضافہ ہے۔ اس بات کا مزید اظہار بے ضرورت ہے کہ پروفیسر ہادی فارسی کے ایک ذہین عالم ہیں جن کے قلم سے اس سے بھی زیادہ بڑی چیزوں کی توقعات وابستہ ہیں۔ محمد اقبال۔ لاہور (ترجمہ)

(۴)

پیش گفتار: "افغانستان": (انگریزی): (جمال الدین احمد و محمد عبد العزیز): (۱۹۳۴ء):

مجھ سے کہا گیا ہے کہ افغانستان پر اس نفیس کتاب کے پیش گفتار کے طور پر چند سطریں لکھدوں۔ مجھے اس فرمائش کے پورا کرنے میں خوشی محسوس ہو رہی ہے، نہ صرف اس لئے کہ میں افغانوں کا ایک جفاکش اور سخت کوش جاندار قوم کی حیثیت سے احترام کرتا ہوں۔ بلکہ اس لئے بھی کہ مرحوم نادر شاہ کو شخصی طور سے

---

[1] "کشمیر میگزین"۔ [2] "مرقع" کے ٹائیٹل پیج کے لئے۔

جانشین کی عزت بھی مجھے حاصل ہے۔ وہ مجاہد سیاستداں جس کی شخصیت نے اس کی قوم میں ایک نئی جان ڈال دی اور جدید دنیا کو سمجھنے کے لئے نئی نظر بخشی۔ افغانوں کی تاریخ کو ابھی بہت کچھ پڑھے جانے اور سمجھے جانے کی ضرورت ہے۔ صرف واقعات کی کھتونی تاریخ نہیں بن سکتی۔ یہ تو محض تاریخ کا خام مواد ہوتا ہے۔ واقعات الفاظ کی مانند ہوتے ہیں جن کے معانی مؤرخ دریافت کرتا ہے اور افغانوں کی تاریخ کے سلسلے میں ہندوستان اور افغانستان دونوں جگہ بہت کام کرنا ہے۔ وہ قوم جس نے محمود غزنوی، علاء الدین خلجی، شیر شاہ سوری، احمد شاہ ابدالی، امیر عبدالرحمن خاں، شاہ نادر شاہ اور سب سے بڑھ کر ہمارے زمانے کے سب سے بڑے مسلمان اور عظیم ایشیائیوں میں سے ایک' مولانا سید جمال الدین افغانی جیسے لوگوں کو جنم دیا' وہ ایشیا کی زندگی میں ایک اہم عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔ زمانہ گزشتہ میں ایک عرصے تک بلخ، بامیان، حدہ، کابل، غزنی اور ہرات تہذیب کے اہم مراکز رہے ہیں اور موجودہ حکمران خاندان کی لگن سے تو امید ہے کہ وہ عظمتِ رفتہ پھر لوٹ آئے گی

میں جب بھی افغانستان کے بارے میں سوچتا ہوں' اور ایسا اکثر ہوتا ہے' تو میرے سامنے افغانوں کے دیس کی وہ تصویر گھومنے لگتی ہے جیسی میں نے پچھلے موسمِ خزاں میں دیکھی تھی: میں ایک سادہ سے آرام دہ کمرے میں بیٹھا ہوا ہوں' آس پاس باغ ہے' باغ سے پرے زمین کا ایک بڑا ٹکڑا آہستہ آہستہ اوپر کو ابھرتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ پہاڑی سلسلے میں جا ملتا ہے۔ ایک کے پیچھے بلند ہوتی ہوئی پہاڑیوں کی ایک قطار ہے۔ یہاں تک کہ یہ بلندیاں ہندوکش کے سلسلے تک جا پہنچتی ہیں۔ دور تک پھیلے ہوئے میدانوں کے اس پار اونچی اونچی روشیں ہیں' دور دراز سے آتی ہوئی طوفانی ہوائیں جنھیں چیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہیں۔ اوپر مغرب میں ڈوبتے ہوئے سورج کے حسین اور خوشنما رنگوں سے آراستہ آسمان نظر آتا ہے، نیچے وادیوں میں سائے تیزی سے رینگتے ہوتے ہیں لاتعداد پتلے لمبے اور سیدھے سرو کے درخت ان سایوں کے درمیان اپنے پر پھیلائے کھڑے ہیں۔ سبک سیر ہوا اُن کی پتیوں کو چومتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہے۔ شفق کے سکون میں وادی' وادی کے درخت' دور افتادہ گاؤں اور دھندلے کہر کے سمندر میں بہتے ہوئے پہاڑ خوابوں کا جیسا حسین منظر پیش کرتے ہوتے ہیں ہم ایکا ایکی شام کا جادو اذان کی آواز سے ٹوٹ جاتا ہے۔ میرے سب ساتھی اپنی اپنی جگہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ مؤذن کی دل کے پار اتر جانے والی آواز مجھے کہیں اپنے سے بھی دور لے جاتی ہے اور میں مسجد میں سب کے بعد پہنچتا ہوں جہاں میرے ساتھی مہمان اور مصاحبوں کے ساتھ شاہی میزبان جمع ہیں۔

یہ تذکرہ افغانوں کی تین امتیازی خصوصیات کا اظہار کرتا ہے: ان کی گہری مذہبیت؛ ان کا پیدائش اور حیثیت کے لحاظ سے کوئی تفریق و امتیاز نہ برتنا اور وہ مکمل توازن جو انہوں نے اپنے قومی اور دینی مقاصد میں قائم کر رکھا ہے۔ قدامت پرستی ہمیشہ کی طرح آج بھی افغانوں کے لئے ایک طاقت بخش ماخذ رہی ہے۔ یہ انہیں ان کے ماضی سے ایک جاندار رشتہ قائم کرائے رہتی ہے لیکن یہ رشتہ ایسا نہیں ہے کہ اس کے سبب وہ نئے زمانے کی دعوت پر لبیک نہ کہہ سکتے ہوں۔ ان کی قدامت پرستی انہیں اپنی روایات کا احترام سکھاتی ہے مگر یہ احترام ان کی اندرونی ترقی کی راہ میں حائل نہیں ہوتا۔ ابھی کچھ دن پہلے لاہور میں ایک بوڑھے افغان دوا فروش سے ملاقات ہوئی جو آدھی صدی سے زیادہ مغرب میں گذار چکا تھا۔ اور اب آسٹریلیا میں اقامت پذیر تھا۔ وہ لکھ پڑھ نہیں سکتا تھا لیکن آسٹریلوی انگریزی خاصی بول لیتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا: "تمہیں اپنی پشتو اب بھی آتی ہے؟" میرا سوال سیدھا اس کے دل پر لگا اور اس کی ہلکی ہلکی نم آلود آنکھیں اور زیادہ روشن ہو گئیں: جوانی کی یادیں اس کے ذہن پر چھائی معلوم ہوتی تھیں۔ یہاں تک کہ ان یادوں نے قدیم پشتو کے ایک عشقیہ گیت کو ذریعۂ اظہار بنایا جس نے تھوڑی دیر کے لئے اس دوست افغان کو لاہور کی جھلسا دینے والی گرمی سے اپنے وطن کی ٹھنڈی وادیوں میں پہنچا دیا— افغانی قدامت پرستی ایک معجزہ ہے۔ یہ جدید سے نفور ہوتے ہوئے بھی جدید تہذیبی دھاروں کو قبول کرنے میں کافی حساس ہے اور افغانوں کی نامیاتی صحتمندی کا یہی راز ہے۔

قدیم زمانہ میں افغانستان ایک بڑا تجارتی مرکز تھا، ازمنۂ وسطیٰ میں بھی اس کی یہ اہمیت برقرار رہی اور دورِ جدید میں بحری جہازرانی کے فروغ تک بھی اس کی اس اہمیت میں فرق نہ آیا۔ افغانستان، ایشیا کی تاریخ و سیاست میں بنیادی اہمیت کا مالک رہا ہے اور رہے گا۔ پروفیسر لائنڈ کے بقول: "یہاں ہمیں ایشیا کے اہم ترین علاقوں سے سابقہ ہے۔ یہ علاقے ان لوگوں کے لئے مسحور کن ہیں جو قومیت اور بین الاقوامیت دونوں میں یقین رکھتے ہیں لیکن اس پر یقین نہیں رکھتے کہ جنگ و پیکار ہمیشہ کے لئے دنیا کا مقدر بن چکا ہے۔"

یہ سیدھا سادا بے میل تذکرہ دو بھائیوں کے قلم سے نکلا ہے جنھوں نے اپنے طویل قیام کے ذاتی تاثرات کے ساتھ بہترین ماخذ اور سرکاری اطلاعات کو بھی استعمال کیا ہے۔ اسی لئے یہ اور زیادہ تحسین کا مستحق ہے۔ مصنفین نے بجا طور پر بے شمار جنگوں، حملوں اور اندرونی جھگڑوں کے زمانے کو چھوڑ کر،

پرامن دور پر زیادہ توجہ دی ہے۔ حالانکہ پہلی نظر میں یہ حملے اور جھگڑے ہی افغانستان کی تاریخ معلوم دیتے ہیں۔ افغانستان کے بارے میں بڑی قیمتی اور صحیح معلومات بہم پہنچانے کے ساتھ ساتھ مصنفین نے موجودہ دنیا کی تہذیب میں افغانستان کے مقام اور حیثیت کے سلسلے میں بعض دلچسپ سوال چھیڑے ہیں۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ افغانستان میں اثری اور تاریخی تحقیق، قدیم دنیا کے بارے میں ہماری معلومات میں بہت کچھ اضافہ کرے گی لیکن کام بہت بڑا ہے اور مجھے امید ہے کہ افغان محققین اپنے ملک کی عظمتِ رفتہ کے نقوش کو اجاگر کرنے میں کاوش سے کام لیں گے۔

محمد اقبال، ستمبر ۱۹۳۳ء۔ لاہور (ترجمہ)

(۵)

یقیں اللہ مستی۔ خود گزینی — یقیں مثلِ خلیل آتش نشینی
سن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار — غلامی سے بدتر ہے بے یقینی

Trust in God is ecstacy and emancipation,

Like Khalil to sit in conflagration,

Hark slave of present civilization,

Infidelity than bondage is worse an occupation.

(SD): MOHAMMED IQBAL.

(انگریزی میگزین، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۳۴ء)

(۶)

کیا تھا گردشِ ایام نے مجھے محزوں — بدن میں جاں تھی کہ جیسے قفس میں صید زبوں
چڑھائی فوج الم کی ہوئی تھی کچھ ایسی — علَم خوشی کا مرے دل میں ہو گیا تھا نگوں
کیا تھا کوچ جو دل سے خوشی کی فوجوں نے — لگائے خیمہ تھی واں رنج کی جنود و فشوں
غم و الم نے جگر میں لگا رکھی تھی آگ — بنا ہوا تھا مرا سینہ رشکِ صد کانوں
زبس کہ غم نے پریشاں کیا ہوا تھا مجھے — یہ فکر مجھ کو لگی تھی کہ ہو نہ جائے جنوں
جو سامنے تھی مرے قوم کی بری حالت — امڈ گیا مری آنکھوں سے خون کا سیحوں
انہی غموں میں مگر مجھ کو اک صدا آئی — کہ بیت قوم کی اصلاح کے ہوئے موزوں
پئے مریض یہ اک نسخۂ مسیحا تھا — کہ جس کو سن کے ہوا خرمی سے دل مشحوں
غبار دل میں جو تھا کچھ فلک کی جانب سے — دبے اسی میں غم و رنج صورتِ قاروں
ہزار شکر کہ اک انجمن ہوئی قائم — یقیں ہے راہ پہ آئیگا طالعِ واژوں!
ملے گا منزلِ مقصود کا پتہ ہم کو — خدا کا شکر کہ جس نے دیئے یہ راہ نموں
ہلال وار اگر منہ میں دو زبانیں ہوں — ادا نہ پھر بھی ہو شکرِ خدائے کُن فیکوں
مثالِ شانہ اگر میری سو زبانیں ہوں — نہ طے ہو زلفِ رہِ شکر از دلِ چوں
چلی نسیم یہ کیسی کہ پڑ گئی ٹھنڈک — چمن ہوئی مرے سینے میں نار سوز دروں
یہ کیا خوشی ہے کہ دل خود بخود یہ کہتا ہے — بعید رنج سے اور خرمی سے ہوں مقروں
خوشی سے آنکھ کے غدا جانے کیا کہا اس سے — اچھل رہا ہے مثالِ تموج جیحوں
کرم سے اس کے وہ صورت فلاح کی نکلی — کہ حصن قوم ہر اک شر سے ہو گیا مصؤں

خدا نے ہوش دیا متفق ہوئے سارے — سمجھ گئے ہیں تری چال گنبدِ گردوں
چراغ عقل کو روشن کیا ہے ظلمت میں — ہمارے ہاتھ میں آجائے گا دُرِ مکنوں
مزا تو جب ہے کہ ہم خود دکھائیں کچھ کرکے — جو مرد ہے نہیں ہوتا ہے غیر کا ممنوں
بڑھے یہ بزم ترقی کی دوڑ میں یارب — کبھی نہ ہو قدمِ تیز آشنائے سکوں
اسی سے ساری امیدیں بندھی ہیں اپنی کہ ہے — وجود اس کا پئے قصرِ قوم مثلِ ستوں
دعا یہ تجھ سے ہے یارب کہ تا قیامت ہو — ہماری قوم کا ہر فرد قوم پر مفتوں
کچھ ان کا شوق ترقی کا حد سے بڑھ جائے — ہماری قوم پہ یارب وہ پھونک دے افسوں
جو دوڑ کے لئے میدانِ علم میں جائیں — سبھوں سے بڑھ کے رہے ان کے فہم کا گلگوں
دکھائیں فہم و ذکا و ہنر یہ اوروں کو — زمانے بھر کے یہ حاصل کریں علوم و فنوں

جو تیری قوم کا دشمن ہو اس زمانے میں
اسے بھی باندھ لے اقبال صورتِ مضموں

(۷)
ظلم سہتے ہیں وطن اپنا نہ جن سے چھٹ سکا — شکوۂ حکام، پرائے دل نہیں تیرا بجا
کیا عجب کشمیر میں رہ کر جو ہیں ان پر جفا — پائے گل اندر چمن دائم پُراست از خارہا

(۸)
کشمیر کا چمن جو مجھے دلپذیر ہے — اس باغ جانفزا کا یہ بلبل اسیر ہے
ورثے میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائداد — جو ہے وطن ہمارا وہ جنّت نظیر ہے

(۹)
دہر کی شانِ بقا خطۂ کشمیر میں دیکھ — باغِ جنّت کی ہوا خطۂ کشمیر میں دیکھ
ذرّے ذرّے سے ہے اک حسن کا طوفاں برپا — جوش میں لطفِ خدا خطۂ کشمیر میں دیکھ

(۱۰)
ہوا جہاں کی ہے پیکار آفریں ایسی — کہاں عدم کے مسافر مقام کرتے ہیں
عجب فسانہ ہے مجھ کافرِ محبّت کا — صنم بھی سن کے جسے رام رام کرتے ہیں
رہینِ لذّتِ ہستی نہ ہو کہ مثلِ شرار — یہ راہ ایک نفس میں تمام کرتے ہیں
نظارہ لالے کا تڑپا گیا مرے دل کو — بہار میں اسے آتش بجام کرتے ہیں
جہاں کو ہوتی ہے عبرت ہماری پستی سے — نظامِ دہر میں ہم کچھ تو کام کرتے ہیں
نہ قدر ہو مرے اشعار کی گراں کیونکر — پسند ان کو وزیرِ نظام کرتے ہیں

(۱۱)
کہہ دے کوئی کسو سے کہ مرنا نہیں کمال — مر مر کے ہجرِ یار میں جینا کمال ہے

(۱۲)
نقشے کھنچتے ہیں ترے کوچے سے — یہ زمیں آسمان ہے گویا

(۱۳)
شعر اقبال کو آتا نہیں کہنا لیکن — تم جو کہتے ہو سخنور تو سخنور ہی سہی

(۱۴)
نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ اس پر نہیں نازاں — مجھے بھی فخر ہے شاگردیِ داغِ سخنداں کا

(۱۵)
جب چھپ گیا مطبع میں یہ مجموعۂ اشعار — معلوم ہوا مجھ کو بھی حالِ نظرِ فوق
شستہ ہے زباں جملہ مضامین ہیں عالی — تعریف کے قابل ہے خیالِ نظرِ فوق

تاریخ کی مجھ کو جو تمنا ہوئی اقبال　　ہاتف نے کہا لکھ دے کمالِ نظر فوقی
۱۳۲۶ھ

(۱۶) حلقۂ زنجیر کا ہر جوہر پنہاں نکلا　　آئینۂ قیس کی تصویر کا زنداں نکلا
وسعت افزائی آشفتگیٔ شوق نہ پوچھ　　خاک کی مٹھی میں پوشیدہ بیاباں نکلا
ہم گراں جان کے لائے تھے عدم سے بلبل　　باغِ ہستی میں متاعِ نفس ارزاں نکلا

(۱۷) ہمائے اوجِ سعادت ہوا شکار اپنا　　کہ تاج پوش ہوا آج تاجدار اپنا
اُسی کے دم سے ہے عزت ہماری قوموں میں　　اسی کے نام سے قائم ہے اعتبار اپنا
اُسی سے عہدِ وفا ہندیوں نے باندھا ہے　　اسی کی خاکِ قدم پر ہے دل نثار اپنا

(۱۸) پتھر ہے اگر علم سے بیگانہ ہے　　بے عقل ہے بے ہوش ہے دیوانہ ہے
کیا لہو و لعب میں آبرو پائے گا!　　نادان چھلکنے کو یہ پیمانہ ہے

(۱۹) بجلی کی زد میں آتے ہیں پہلے وہی طیور　　جو اس چمن سرا میں بلند آشیاں رہے
موقوف آرزو ہے توانائیٔ حیات　　پیری شباب ہے جو تمنا جواں رہے
کچھ اور شے نہیں ہے وہی زندگی ہے موت　　جس زندگی میں کاوشِ سود و زیاں رہے

(۲۰) کہیں جائیں تمہارے دشت پیما چھپ نہیں سکتے　　خود اُن کے نقشِ پا کہتے ہیں ان تلووں میں چھالے ہیں

(۲۱) عشقِ صادق ہے مجھے ترکی و ایران کے ساتھ　　دل کے ہمراہ یہ ہے وہ ہے مری جان کے ساتھ
ہند میں دور کی نسبت ہے مرا کو سے مجھے　　سلسلہ ملتا ہے اس کا عربستان کے ساتھ
وقعت خاص ہے کابل کی بھی میرے دل میں　　رشتہ مذہب کا ہے وابستہ ہر افغان کے ساتھ
جو مسلمان ہے دنیا میں مرا بھائی ہے　　میں مسلماں ہوں کہتا ہوں یہ ایمان کے ساتھ
بول بالا رہے اسلام کا دنیا میں صدا　　وعظ توحید و رسالت کا ہو قرآن کے ساتھ

(۲۲) تعجب تو یہ ہے کہ جنت کی بستی　　بنائے خدا اور بسائے محمدؐ
تماشہ تو دیکھو کہ نارِ جہنم　　لگائے خدا اور بجھائے محمدؐ

(۲۳) یہ مکتب یہ اسکول یہ پاٹھ شالے　　یہ تکیے یہ مندر یہ گرجے شوالے
یہ پنڈت یہ بنیے یہ ملّا یہ لالے　　یہ سب پیٹ ہیں اور ہم تر نوالے
غریبوں کا دنیا میں اللہ والی
وطن کیا ہے اک نوعِ سرمایہ داری　　بڑے سیٹھ ہیں قوم کے یہ بھکاری
وہ دیکھو چلی آرہی ہے سواری　　نئے جال لائے پرانے شکاری
غریبوں کا دنیا میں اللہ والی

(۲۴) طعنہ زن ہے عشق اور لذت بڑی انشا میں ہے　　ہے کوئی مشکل سے مشکل رہ [illegible]

★

شبِ عروسِ مولانائے رومؒ

بریگیڈیئر گلزار احمد

امروز مئے باقی بے صرفہ دہ اے ساقی — از بہر چہ کم گردد ایں یک دو سہ پیمانہ
من دانۂ افلاکم یک چند دریں خاکم — چوں عدل بہار آید سر سبز شود دانہ

شبِ عروس یعنی شبِ وصال عارفِ ربانی مولانا جلال الدین رومیؒ ۵ جمادی الثانی ہے جو شمسی کیلنڈر کے لحاظ سے سالِ گزشتہ ۱۷ دسمبر کو تھی۔ ۱۴ سے ۱۷ دسمبر تک قونیہ میں اس عاشقِ ذاتِ باری تعالیٰ کے افکارِ بلند سے پُر سخنانِ دلپذیر کی بازگشت ہر طرف سنائی دیتی ہے۔ ترک قوم میں ان دنوں فارسی داں کم سہی مگر مولانا کی تصانیف ترکی میں ترجمہ کی جا چکی ہیں اور اُن کا پیغام سمجھنے والوں کی کمی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عرس کے موقع پر قونیہ کی سڑک پر رونق دوبالا ہو جاتی ہے۔ "مئے باقی" سے سرشار ہونے والوں کو دھیمے دھیمے سروں میں کوئی نغمۂ رنگیں سنا رہا ہوتا ہے اور وہ جوق در جوق پیرِ مغاں کی طرف رجوع کرتے ہیں جو شاید یہ کہہ رہا ہوتا ہے ع

جانا بہ خرابات آ تا لذتِ جاں بینی
جاں را چہ خوشی باشد بے صحبتِ جانانہ

آج کے دن وہ واقعاً "بے صرفہ" و بے حد حساب پیتے ہیں اور لذتِ عشق و مستی سے دوچار ہوتے ہیں۔ اس دَورِ دُور دراز سوز و ساز میں جہاں انسان مشینوں کی سی سرعت سے اپنے شب و روز گزار رہا ہے بلکہ دن اور رات میں تمیز بھی نہیں کر سکتا وہاں ایسے مواقع غنیمت ہیں کہ جب کوئی مولانا کے الفاظ میں پکار پکار کر کہہ رہا ہو

اے عاشقاں اے عاشقاں امروز مائیم و شما
اُفتادہ در غرقابہ اے تا خود کہ داند آشنا

مولانا شاہ و بادشاہ نہ تھے مگر شاہانِ زمانہ اُن کی نظرِ کرم کے اُمیدوار رہا کرتے تھے۔ شاہ و شہنشاہ رخصت ہوئے، آج اُن کا نام بھی سوائے تاریخ داں کے کوئی نہیں جانتا مگر درویش صفت پیرِ رومی کے افکار سے آج بھی زندہ قوموں کے راستے منور ہو رہے ہیں۔ ان کا یہ کہنا بجا تھا کہ ؎

ملکِ جہاں گیرم چوں آفتاب — گرچہ سپاہی و سوارم نیست

اُن کے تحت پیادہ و سوار نہیں تھے مگر ان کے افکار کی روشنی میں صدیوں سے مملکتوں کے کاروبار چل رہے ہیں اور آئندہ بھی چلتے رہیں گے۔

قونیہ جانے کا شوق عرصہ سے تھا۔ قونیہ یوں تو ریل بھی جاتی ہے۔ مگر سڑک کے راستے انقرہ سے کوئی زیادہ مسافت نہیں اور سفر دلچسپ رہتا ہے۔ فاصلہ ایک سو ستر میل کے لگ بھگ ہے۔ سڑک نہایت عمدہ اور چوڑی ہے اور موٹر تمام راستہ اچھی رفتار سے جا سکتا ہے۔ ریل کے ذریعہ آدانہ اور قیصری سے ملاپ ہے۔ براہِ راست انقرہ اور قونیہ کا بذریعہ ریل ملاپ نہیں۔ سوچ رہے تھے کہ کب چلا جائے کہ ایک صاحب استنبول سے تشریف لائے اور قونیہ جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ چونکہ ان سے نئی نئی ملاقات تھی اس لئے اُن کے ساتھ رہنے کا کوئی خاص خیال پیدا نہ ہوا۔ بہرکیف انہوں نے قونیہ کی زیارت کا خیال تازہ کر دیا تھا۔ اسی شام ایک دیرینہ کرمفرما سے ملاقات ہوئی، ان سے مولانائے روم اور قونیہ کا ذکر ہوا تو انہیں یاد آیا کہ قونیہ جانے کے لئے بہترین موقع یہی ہے یعنی مولانا کا عرس دو روز میں منایا جانا تھا۔ مجھے بھی ساتھ چلنے کے لئے کہا اور خود اسی وقت ترکی وزارتِ خارجہ سے اپنے قیام کے لئے انتظامات شروع کر دئے۔ خوش قسمتی سے مجھے بھی دو تین ایک دن کی چھٹی مل گئی اور طے پایا کہ ملاقات قونیہ میں ہوگی۔

ہمیں معلوم نہ تھا کہ مولانا روم کے عرس کو دیکھنے اور "احتفال" میں شرکت کے لئے لوگ دور دراز سے آ رہے ہوں گے اور بلدیۂ قونیہ نے انقرہ میں مقیم اکثر سفارتوں کے افراد کے نام رقعے روانہ کر رکھے ہوں گے۔ محفل اور عرس میں شرکت کی دقتوں کے علاوہ ہمیں وہم و گمان بھی نہ تھا کہ رہائش کے لئے ہوٹلوں میں جگہ

مشکل ہو جائے گی۔ بالآخر ہماری یہ سادہ بے خبری اور حقیقی ناواقفیت ہمیں آڑے آئے گی اور صرف یہی نہیں کہ ہمارا اور ہمارے ساتھیوں کا ہوٹل میں نہایت عمدہ انتظام ہو گیا بلکہ "احتفال" میں بھی ہم معزز مہمانوں کی فہرست میں شامل کر لئے گئے۔

انقرہ سے چلے تو شہر پر ایک دھند چھائی ہوئی تھی۔ اس دھند میں دھوئیں کا امتزاج بھی ہوتا ہے، اسلئے کہ جونہی شہر کی حدود سے باہر پہنچے سڑک پر دھند کا فاصلہ گھٹ گیا مگر جب گل باشی کے قریب پہنچے تو دھند دوبارہ بڑھ گئی۔ گل باشی کا مقام انقرہ سے دس میل کے قریب ہے۔ یہاں ایک چھوٹی سی جھیل بھی ہے جس میں ماہی گیری کے شوقین انسانی فطرت کے قدیم جذبۂ دانہ و دام کو گاہے گاہے تسکین دیا کرتے ہیں۔ قریب ۳۵ میل پر ایک اور چھوٹی سی بستی بلکہ قصبہ ہے جس کا نام ہے۔ تازہ آباد شدہ شہر نظر آتا ہے۔ دورِ جمہوریت میں ترکوں نے لاتعداد نئی بستیاں آباد کی ہیں۔ انہیں لاکھوں کی تعداد میں یورپ سے آئے ہوئے مسلمان مہاجروں کو بسانے کا بوجھ اٹھانا پڑا ہے۔ پرانی بستیوں میں انہیں کھپانے کے علاوہ متعدد جگہوں پر وسیع علاقے زیرِ کاشت لائے گئے ہیں جہاں نئی بستیاں حکومت کی مدد سے آباد کرلی گئی ہیں۔ ان بستیوں کو دیکھ کر پاکستان میں تھل کا علاقہ یاد آتا ہے۔ یہاں البتہ زمین غیر ہموار اور ایک حد تک پہاڑی ہے۔ بالائی زمین پر مٹی کی تہہ ہے جو صدیوں سے بیکار رہ رہ کر خاصی زرخیز ہو چکی ہے۔

مٹی کا رنگ اکثر ہلکا قرمزی اور گہرا گلابی ہے مگر مختلف گہرائیوں کے سبز اور زمرد رنگوں کے خطے بھی ہیں۔ مٹی کی معمولی سی تہہ کے نیچے چونے کا پتھر ہے اور خاصی گہرائی پر جا کر گوناگوں رنگوں کا سنگِ مرمر۔ مرمر کو نہ معلوم کیوں ہم ہمیشہ سے سفید ہی سمجھتے رہے۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ سفید مرمر کی نسبت مختلف رنگوں کا مرمر زیادہ مضبوط اور کہیں زیادہ خوبصورت ہوتا ہے۔

انقرہ سے تقریباً پینسٹھ میل کے بعد اڈانہ کی سڑک علیحدہ ہوتی ہے۔ چند ہی میل بعد جہان بیلی کا چھوٹا سا قصبہ آتا ہے۔ قصبہ کے باہر گندم کا انبار ہے جسے آجکل کی اصطلاح میں "سیلو" کہتے ہیں۔ اس طرح کے انبار ملک کے طول و عرض میں بکھرے پڑے ہیں۔ ترکی زراعتی ملک ہے جس سال برف و باراں خوب ہو جائیں اس سال غلہ وافر ہو جاتا ہے۔ اس وافر غلہ کو ان انباروں میں جمع کر لیا جاتا ہے جسب موقع استعمال اور برآمد کے لئے آسانی ہوتی ہے۔ گزشتہ تین سال میں گندم کی فصل اچھی ہوگئی ہے۔ حکومت نے اس طرف خاص توجہ دے رکھی تھی۔ وادی اور نشیب کے علاوہ فرازِ کوہ پر بھی ہل چلا دیئے گئے اور یوں ملک میں وافر غلہ پیدا کر لیا گیا۔ یہاں گرمیوں میں بارش نہیں ہوتی اس لئے سال میں اکثر جگہوں پر ایک ہی فصل ہوتی ہے۔ کھیتوں میں بھی درختوں اور جھاڑیوں کا نام و نشان نہیں۔ صرف چشموں کے قرب و جوار اور آبادیوں میں میوہ دار درختوں یا سرو اور سفیدے کے درخت کا پتہ ملتا ہے۔ اب البتہ حکومت نے سڑکوں کے ساتھ ساتھ درخت لگانے کے تجربات شروع کر دیئے ہیں جہاں میلوں تک درخت کا نام و نشان نہ ہو وہاں جاڑوں میں ہوا اس شدت سے چلتی ہے کہ نوخیز پودا اس شدت کی سردی میں سوکھ جاتا ہے۔ کہر اور شدید سردی سے بچانے کے لئے تین سال تک درختوں کے تنوں کے نچلے تین چار فٹ کے حصہ کے گرد گھاس پھونس لپیٹ دیا جاتا ہے۔ یوں وہ دو تین سال کے بعد اپنی جگہ مستحکم ہو جاتے ہیں۔

دوپہر کا وقت ہوگا جب قونیہ میں داخل ہوئے۔ قونیہ کے باہر بھی گندم کا انبار یعنے "سیلو" ہے۔ اس کے سامنے پہنچے تو قونیہ کے مضافات نظر آنے لگے۔ سرو اور سفیدے کے درختوں اور مکانوں کی سرخ چھتوں کے ادھر سے سیاہی مائل پہاڑوں کی چوٹیاں نظر آرہی تھیں۔ ابھی برف پڑنا شروع نہیں ہوئی تھی ورنہ ان کے سر سفید عماموں سے ڈھکے ہوتے۔ داخل ہوتے ہی محسوس ہوا کہ یہ مشرق کے عام شہروں کی طرح نہیں۔ نفاست و نظافت کو یقیناً یہاں بلند مرتبہ دیا جاتا ہوگا۔ سڑکیں فراخ و کشادہ اور صوبائی شہر کے لحاظ سے نہایت اچھی۔ مکانوں کی بھی یہی حالت تھی، بیرونی حصے صاف ستھرے اور جاذبِ نگاہ۔ لوگوں کے چہروں پر خوشی اور آسودگی کے آثار۔ آج ان کے ہاں قونیہ کے مولانا کا عرس تھا اور وہ مہمانوں کا استقبال خندہ پیشانی سے کر رہے تھے۔ صرف وہی نہیں قونیہ کے در و دیوار اور قونیہ کی سڑکوں کے کنارے صف بستہ درخت بھی "خوش آمدید" کے علاوہ پکار رہے تھے ؎

بیائید بیائید کہ گلزار دمیدست

بیائید بیائید کہ دلدار رسیدست

دلدار بہ نفسِ نفیس نہ پہنچا نہ سہی۔ اس کے پیغام کو دہرانے کا دن یعنی اس کی "شبِ عروس" پہنچ چکی تھی۔ تین روز سے وہ اس خوشی میں مختلف محفلیں منعقد کر رہے تھے۔ آج آخری محفل تھی جسے وہ "احتفال" کہتے ہیں۔ مگر ابھی ہمیں اس کا پورا علم نہ تھا۔ ہم صرف اس قدر جانتے تھے کہ آج عرس ہو رہا ہے جس کی تفاصیل قونیہ پہنچے

پہ معلوم ہوئی تھی۔ ہم دو چار سڑکوں سے گھوم پھر کر ایک ہوٹل پہنچے۔ وہاں رہائش کے لئے کمرے مانگے۔ جواب ملا کہ کمرے نہیں ہیں۔ ہم نے کسی دوسرے ہوٹل کے متعلق پوچھا، اس پر وہ کہنے لگے کہ اور ہوٹلوں میں بھی جانا بیکار ہوگا۔ ہم قدرے حیران ہوئے اور پوچھا "کیوں کیا قونیہ کے سبھی ہوٹل پُر ہیں؟"

"نہیں، ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے۔ البتہ آج ہوٹل کے مالک آپ کو رئیس بلدیہ کی اجازت کے بغیر کمرہ نہیں دے سکتے۔"

ہم ترکوں کے انضباط اور حکومت کے ساتھ تعاون کے قصے بارہا سن چکے تھے۔ آج یہ سن کر مزید یقین ہوا کہ ان کے تمام کاموں میں قومی وقار کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ ہمارے ساتھیوں میں سے ایک اخباری دنیا سے بھی متعلق تھے اور ترکی سے بقدر "یہاں خیریت ہے اور خیریت آپ کی......" کے شناسا تھے۔ ان کے ذریعہ دریافت کرنے کی کوشش کی کہ آیا یہ فیصلہ بلدیہ کمیٹی کی متفقہ رائے سے دیا گیا یا محض رئیس بلدیہ نے حکم سنا دیا۔ کچھ ہماری محدود استعداد اور کچھ سوال کی نوعیت کی وجہ سے ہمارے مخاطب اصحاب کا جواب سمجھ میں نہ آیا۔ بعد میں خیال ہوا کہ وہ ہماری سمجھ بوجھ کو ملزم قرار دے رہے ہوں گے، اس لئے کہ حقیقی معنوں میں جو ملک آزادی قائم رکھنا چاہتے ہیں ان کے لئے "باتفاقِ رائے" یا "باکثریتِ رائے" کے الفاظ بے معنی ہوتے ہیں۔ وہ ہر حکم کو اچھا حکم سمجھتے ہیں اور ان کے اصحابِ حل و عقد ایسے احکام جاری ہی نہیں کیا کرتے جن کی غرض و غایت واضح نہ ہو اور جو مفادِ عامہ کے لئے نہ ہوں۔

اب ہم نے بلدیہ کا راستہ دریافت کرنا شروع کیا۔ قونیہ کوئی بڑا شہر نہیں۔ ہم بہت جلد بلدیہ کی چار منزلہ عمارت کے سامنے تھے۔ ہم نے مخدرات کو تو موٹر میں ہی رہنے دیا اور خود اُوپر گئے۔ پہلی ہی منزل پر ایک چپراسی رہنمائی کے لئے ساتھ ہو لیا تھا۔ وہ آخری منزل تک ساتھ رہا۔ بلکہ "رئیس بلدیہ" کے کمرے میں داخل ہونے تک اس نے ساتھ دیا۔ رئیس بلدیہ اس وقت کسی نائب کے ساتھ بحث میں مصروف تھے مگر چپراسی کے یہ کہنے پر کہ چند پاکستانی ملنا چاہتے ہیں وہ اٹھ کر دروازے پر استقبال کو آئے۔ ادھیڑ عمر، میانہ قد، گٹھا ہوا بدن، گورا رنگ، بال کنپٹیوں کے گرد سفید ہوتے ہوئے۔ آپ نے مسکراتے ہوئے مصافحہ کیا۔

"خوش گلدنز" اور پھر اپنا نام محمد صدقی بلگن۔

ہم سب کے نام اور شغل بتائے گئے۔ مزاج پرسی ہوئی۔ قونیہ آنے کا مقصد بیان ہوا۔ ہم نے ہوٹلوں میں رہائش کے کمروں کی ضرورت پیش کی۔ انھوں نے ایک ماتحت افسر بلوا بھیجا اور بہت جلد ہمیں اطلاع مل گئی کہ اگر ہم دو ہوٹلوں میں بٹ جانے کی زحمت قبول کر لیں تو انتظام ہو جائے گا۔ ہم اٹھنے ہی والے تھے کہ ہمارے ایک ساتھی نے رئیسِ بلدیہ صاحب سے پوچھا کہ رات مولانائے روم کے عرس کے سلسلہ کی محفل کہاں ہوگی۔ انہوں نے حیران ہو کر پوچھا کہ ہم اپنے دعوتی رقعے ساتھ نہیں لائے، یا کیا بات ہے۔ اب ہمیں تشویش ہوئی کہ ہم نے تو چلنے کا فیصلہ صرف ایک دن قبل کیا تھا۔ دعوتی رقعے کہاں سے مہیا کرتے۔

ہمارے ساتھی نے پوچھا "تو کیا دعوتی رقعوں کی ضرورت ہوگی؟"

"جی ہاں نشستیں محدود ہیں اور شائقین زیادہ۔" جواب ملا۔

"تو پھر کیا ہوگا" یہ ہم سب کے دل کی آواز تھی مگر بلند آواز میں صرف ہمارے اخباری دوست بول رہے تھے۔ اس مرتبہ شاید رئیس صاحب بھی بول اٹھے تھے:

"ہم کوشش کریں گے۔"

ہم سب خاموش تھے۔ قونیہ آنے کا مقصد فوت ہوا جا رہا تھا۔ اجنبی ملک تھا مگر تھا پیرِ رومی کا وطن۔ یہی نہیں بلکہ ہم اُن کے مسکن کے عین قریب تھے۔ ایسے میں ان کے دیوان کی طرف توجہ کیوں نہ جاتی۔ معاً نگاہ کے سامنے ایک موزوں شعر آیا؎

برما نظرے کن کہ دریں شہر غریبیم
برما کرمے کن کہ دریں شہر گدائیم

ان کے اپنے شہر میں اس بات کی گدائی ہو رہی تھی کہ اُن کے ذکر اور ان کے فکر پر جو کلمات کہے جا رہے ہوں، انہیں سن سکیں۔ ایسے میں مولاناؒ کے سوا کس کے کلام پر نظر جا سکتی تھی۔ اسی غزل کا ایک اور شعر ذہن میں گھوم رہا تھا؎

ما در رہِ عشقِ تو اسیرانِ بلائیم
کس نیست چنیں عاشقِ بیچارہ کہ مائیم

ہماری خاموشی کو مایوسی سمجھ کر رئیس بلدیہ مسکرا کر بولے:

"آپ گھبرایئے نہیں۔ انشاء اللہ انتظام ہو جائے گا۔"

"شکریہ" ہم سب یک زبان ہو کر بولے۔ البتہ یہ فکر ضرور تھا کہ یہ انتظام ہوگا کہاں سے۔

"ہاں تو آپ کو کتنے رقعے ضرورت ہوں گے۔"

ہم سب نے اپنے اپنے موٹر کی سواریاں گننی شروع کیں۔ جمع کا سادہ سا سوال دو بار غلط حل کرنے کے بعد تیسری بار اس نتیجے پر پہنچے کہ دس رقعے درکار ہوں گے۔ رئیس یہ تعداد سن کر خاموش سے ہو گئے۔ اپنے ایک نئے ماتحت کو بلایا۔ ان سے فہرست دریافت کی۔ آخر جواب ملا کہ سر دست ہم لوگ ہوٹلوں میں جا کر اپنے اپنے کمرے دیکھ لیں۔ چار بجے شام تک ہمیں اطلاع دے دی جائے گی کہ کتنے رقعے مہیا ہو سکتے ہیں۔ رئیس صاحب فرمانے لگے:

"آپ معاف فرمایئے گا۔ ہمیں آپ کے شوق کا پورا پورا احساس ہے۔ مگر آپ نے ہمیں بروقت اپنی ضروریات کی اطلاع نہیں دی۔ آپ کے سفیر کبیر نے تین رقعوں کی اطلاع دی تھی۔ وہ ہم نے اسی وقت روانہ کر دیئے تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ انقرہ سے اٹھاون سفارتوں کے نمائندے مدعو ہیں۔ البتہ ہمیں امید ہے کہ شام تک ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ کون کون سے مدعوئین تشریف نہیں لا رہے۔ امکان ہے کہ پارلیمان کے کچھ اراکین جو دور دراز مقامات میں رہتے ہیں، وہ نہ آسکیں۔"

یہ کہہ کر انہوں نے ایک رہنما ہمارے ساتھ کیا اور ہمیں اپنی شب گاہ دیکھ لینے بلکہ تھوڑی دیر آرام کر لینے کی ترغیب دی۔ ہم مصافحے کے لئے اٹھے تو رئیس فرمانے لگے:

"دنیا میں صرف ایک ملک ہے جس کا نام پاکستان ہے۔ اس کے باشندوں کے لئے بھی اگر ہم دعوت نامے مہیا نہ کر سکے تو ہمیں افسوس رہے گا۔ آپ فکر نہ کیجئے۔ انشاء اللہ رقعے ہوٹل پہنچ جائیں گے۔"

جن ہوٹلوں میں گئے ان میں سے ایک وہی ہوٹل تھا جس میں ہم پہلے گئے تھے اور ہمیں رئیس بلدیہ کی طرف رجوع کرنے کو کہا گیا تھا۔ ان کی طرف سے پیغام ملنے پر انہوں نے دو کمرے ہمارے سپرد کئے اور ہر طرح سے ہمیں آرام دینے کی کوشش کی۔

ہم چاہتے تھے کہ شام عرس کی محفل شروع ہونے سے قبل شہر اور مولاناؒ کا مزار دیکھ لیں مگر شہر اس لئے نہ دیکھ سکے کہ ہم اپنے موٹر کی چابی انقرہ میں بھول آئے تھے۔ ساتھ جو سامان تھا اس سے فائدہ اٹھانے کے علاوہ رات کے وقت موٹر کو بند کرنا بھی ضروری تھا۔ اس لئے ہوٹل پہنچتے ہی چابی بنانے والے کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ ایک صاحب نے ہمارے موٹر پر "ہیئت سیاسیہ" اور بغداد لکھا دیکھ کر رہنمائی کے فرائض عربی میں انجام دینے کی پیشکش کی۔ وہ کچھ عرصہ شام میں رہ چکے تھے اس لئے ہماری ترکی کی حد تک عربی سے واقف تھے۔ دو زبانوں کے مبتدی جب مل جاتے ہیں تو نتیجہ نہایت لطف انگیز ہوتا ہے۔ کلید ساز یعقوب سیار کے ہاں پہنچے تو وہ عصر کی نماز ادا کرنے پاس ہی "کابیر جامعتہ" میں گیا ہوا تھا۔ اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اس کے سامنے والے دکاندار نے اپنے ہاں بلوا کر چائے سے مہمان نوازی کی۔ دیر تک پاکستان کے متعلق معلومات حاصل کرتا رہا۔ میں نے کہا۔ "پاکستان اور ترکی دو دوست ملک ہیں۔"

"نہیں۔ دوست نہیں۔ بھائی۔" انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"جی ہاں۔ آپ بجا فرماتے ہیں۔" اور وہ سچ کہہ رہا تھا۔

یعقوب سیار پہنچے تو ہمیں اپنی چھوٹی سی دکان میں لے گئے۔ میں نے موٹر غلط طرف روکا تھا۔ پولیس کا سپاہی آیا کہ مجھے اپنی غلطی سے آگاہ کرے۔ دوسرے ہی کسی نے کہہ دیا کہ "مسافر" یعنی مہمان ہے اور پاکستان کا رہنے والا ہے۔ وہ وہیں سے لوٹ گیا۔ میں اس "آمد" و "رفت" کا مطلب سمجھ گیا تھا اور علاوہ بریں موٹر کو یعقوب کی دوکان کے قریب لانے کا بہانہ اچھا خاصہ تھا۔ اس لئے موٹر کو گھما کر صحیح جگہ لگایا۔ سب حاضرین مصر تھے کہ میری غلطی سہو ہے لہٰذا مجھے اس غلطی کو درست کرنے کی ضرورت نہیں۔ "مسافر" یعنی مہمان ان کی نگاہ میں کبھی کسی غلطی کا مرتکب ہو ہی نہیں سکتا!

یعقوب دیر تک کوشش کرتا رہا کہ کوئی چابی موٹر کو لگ جائے مگر کامیاب نہ ہوا۔ مجھے یہ جلدی تھی کہ واپس جا کر عرس کے دعوتی رقعوں کا پتہ کرنا تھا اور مولاناؒ کے مزار مبارک پر فاتحہ کے لئے جانا تھا۔ کوئی دو گھنٹے کے بعد میں نے یعقوب کو خدا حافظ کہا۔ بہت کوشش کی مگر یعقوب نے اپنی محنت کا صلہ

ایک کوڑی نہ لی۔ میں مُصر کہ اس نے کام کیا ہے اور وہ مُصر کہ کام ہوا نہیں۔ آخر لوگوں نے بیچ بچاؤ کر کے مجھے ہی ہار ماننے پر مجبور کیا اور فیصلہ صادر کیا کہ "مسافر" اور مہمان پیسے دینے پر اصرار نہیں کر سکتا۔ ترکی میں اجنبی اور بالخصوص پاکستانی مسافر جو چاہے کر لے مگر اس ایک بات میں اسے زک کھانی پڑتی ہے۔ یہ ترکی ہے۔ یہاں "ابھی اگلی شرافت کے نمونے" پائے ہی نہیں جاتے بلکہ عام ہیں۔ اور پھر یہ قونیہ تھا۔ سوز و ساز اور عشق و مستی کا درس اِس شہر میں خود مولانا جلال الدین رومیؒ نے دیا تھا۔ یہاں کلید ساز یعقوب کس طرح درد و داغ یا مہر و محبت سے عاری رہتا۔ اس روز قونیہ میں رئیس بلدیہ، ہوٹل کے منیجر، یعقوب جیسے فنکار، دکاندار، طالب علم، چپڑاسی اور نہ معلوم کس کس رتبے اور مقام کے لوگ دیکھے اور سب ہی کو دوست آشنا پایا۔ مولاناؒ کے شہر میں مولاناؒ کا شعر درست و صادق آ رہا تھا ؎

در شہر یکے کس را ہشیار نمی بینم
ہر یک بتر از دیگر شوریدہ و دیوانہ

اس بیسویں صدی کے سائنس، اس کے علوم اور اس کی مشینوں سے بہرہ ور ہونے کے باوجود قلب کی گرمی اور زبان کی مٹھاس قائم رکھی جا سکتی ہے۔ ہمیں اس روز خوشی محسوس ہوئی کہ قونیہ کے باشندے عہدِ حاضر کی اختراعات و ایجادات سے بہرہ ور ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی تاریخی روایات سے وابستگی قائم کئے ہوئے ہیں۔ ایک صاحب نے تو خوب کہا: قونیہ میں قند سازی کا بہت بڑا کارخانہ قائم کیا جا چکا ہے۔ اس مناسبت سے وہ فرمانے لگے کہ اگر قونیہ کے باشندوں کے رویّہ میں قند و شکر جیسی مٹھاس نہ ہوگی تو اور کہاں ہوگی۔ ایک صاحب جو یہاں موسمِ بہار میں بھی آ چکے تھے بول اٹھے۔ شکر کی مٹھاس نہ کہئے گل قند کی مٹھاس کہیئے۔ یہاں گلاب بھی بے مثل ہے۔ شام ہو چلی تھی، اس لئے ہوٹل واپس آتے ہی سب کو ساتھ لیا اور مزار پر فاتحہ کے لئے روانہ ہوئے۔ پہلے سلیمانیہ مسجد دیکھی۔ یہ مسجد سلطان سلیمان قانونی کے عہد کی بنی ہوئی ہے۔ اور سلطانِ معظم کو جو عقیدہ مولاناؒ کے ساتھ تھی اس کی مظہر ہے۔ مسجد اور مزار کی دیواروں کے درمیان بمشکل دس پندرہ گز کا فاصلہ ہے۔ مسجد کی طرزِ تعمیر عین ترکی ہے۔ چھوٹے چھوٹے گنبد مختلف سطحوں پر بلند ہوتے ہوئے مرکزی گنبد کا تناسب قائم رکھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اور مجموعی طور پر اس طرح کا احساس ہوتا ہے کہ عمارت بتدریج اوپر کو بلند کی گئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی صحیح وسعت کا باہر سے ہی پتہ چل جاتا ہے۔ ایک کونے میں گنبد ہے جو مؤذن کی آواز کو دور و نزدیک لے جانے کے علاوہ مرکزی گنبد کے لئے وہی حیثیت رکھتا ہے جو دستار کے لئے طرہ انجام دیتا ہے۔

مولاناؒ کے مزار کے اوپر گنبد کی بجائے قبہ ہے۔ جس کا رنگ سبز ہے اور دور سے دکھائی دیتا ہے۔ مولانا کے مزار کے گرد صحن کے چاروں پہلوؤں کو حلقہ کئے ہوئے چہار گوشہ فصیل ہے جس کے اندر کی جانب چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں ہیں۔ یہ کوٹھریاں چھوٹی بھی ہیں اور بڑی بھی۔ شاگردانِ ذہین اور سبق گیر کے لئے علیحدہ علیحدہ، اور مبتدی و سست رفتار شاگردوں کے لئے بڑی بڑی جن میں وہ ایک دوسرے کا ساتھ دینے کے علاوہ یکجا ہو کر سبق یاد کر سکیں۔ چھوٹی کوٹھریوں میں سے ایک کو زمانۂ قدیم یعنی اصل کے مطابق سجایا گیا ہے۔ دروازے سے داخل ہوں تو سامنے فرش پر بستر بچھا ہے جس کی اکثر اشیاء اونی ہیں۔ پاس ہی آفتابہ اور چلمچی ہیں۔ ایک کونے میں انگیٹھی سلگ رہی ہے بلکہ اس کے اوپر وضو کا پانی بھی گرم ہو رہا ہے۔ بستر کے سامنے رحل رکھا ہوا ہے جس پر بہترین خطاطی کا قرآن کریم رکھا ہے۔ بستر پر مثنوی معنوی کی جلدیں اور دیوانِ کبیر کی جلدیں بکھری پڑی ہیں۔ شاگردانِ مولانا کے دائمی ساتھی۔ یہ کوٹھری مزار کی فصیل کے اندر داخل ہوتے ہی بائیں جانب کو ہے۔ اس طرف جاتے ہوئے نگاہ نہیں پڑتی بلکہ یہ آخری شئے ہے جو مسافر دیکھتا ہے پہلی شئے نگاہ کے سامنے آتی ہے۔ وہ مولانا کا مزار ہے جس کے دروازے کے اوپر جلی الفاظ میں کاشی کی اینٹوں پر یہ شعر لکھا ہوا ہے ؎

کعبۃ العشاق باشد ایں مقام
ہر کہ ناقص آمد اینجا شد تمام

کعبۃ العشاق کی زیارت کرنے والے دروازے کے باہر جوتے اتار دیتے ہیں۔ اور چبوتروں کے اوپر ربڑ کے موزے پہن لیتے ہیں۔ دو دو یا ایک گز بلندی پر رسیاں پڑی ہوتی ہیں۔ ان کے بیچ میں سے جانے اور آنے کے علیحدہ علیحدہ راستے بنے ہوئے ہیں۔ جن پر مشین کے بنے ہوئے ہلکے بادامی رنگ کے قالین بچھے ہیں۔ مشتاقِ دید نظریں جھکائے آگے بڑھ جاتا ہے۔ یہاں اور لوگ بھی ہیں، کچھ جا رہے ہیں کچھ آ رہے ہیں مگر مشتاقِ زیارت مزید امام

اشتغالِ نورِ وحدت کی آنکھوں کے سامنے کوئی شے نہیں آتی۔ کمرے کے وسط میں پہنچ کر وہ رک جاتا ہے اور خاموشی سے ہاتھ فاتحہ کو اٹھ جاتے ہیں۔ فاتحہ سے فارغ ہو کر وہ دیکھتا ہے کہ پیرِ رومی کے مرقد کے اردگرد اُن کے شاگردانِ رشید اور اخلاف برگزیدہ کے مزار ہیں۔ تو قبہ کے یہ تابندہ ستارے اپنی اپنی جگہ پر بلند مقام عالم و فاضل تھے۔ مگر اس شمسِ عشق و محبت کے گرد انہیں ستاروں کا مقام ہی حاصل ہے۔ یہ دربارِ پیرِ روم ہے جنہیں اقبالؒ نے صاحبِ ذکرِ جمیل کہا ہے۔ وہی پیرِ رومی جنہوں نے اقبالؒ کے سامنے رازِ درونِ کائنات عریاں کیا۔

روحِ رومی پردہ ہا را بردرید	از پسِ کہ پارۂ آمد پدید
طلعتش رخشندہ مثلِ آفتاب	شیبِ اُو فرخندہ چوں عہدِ شباب
برلبِ او سرِّ پنہانِ وجود	بند ہائے حرف و صوت از خود کشود
حرفِ او آئینۂ آویختہ	علم با سوزِ درون آمیختہ

"علم با سوزِ درون" کمیاب صفت ہے۔ مگر جب حاصل ہو جائے تو ؎

زہرہ و ماہ و مشتری از تو رقیبِ یک دگر ۔۔۔ از پئے یک نگاہِ تو کشمکشِ تجلیات (اقبالؒ)

ہم نے بھی چاہا کہ اقبالؒ کے پیرِ رومیؒ کے دربار پر حاضری دے کر کوئی ایسا نسخہ حاصل کریں جو اس دنیا میں مشعلِ راہ کا کام دے۔ اس روز ذہن اقبالؒ کے اس سوال سے آگے نہ جا سکا جس میں وہ پوچھتے ہیں ؎

کاروبارِ خسروی یا راہبی؟ ۔۔۔ کیا ہے آخر غایتِ دینِ نبیؐ؟

اور پیرِ رومیؒ جن کے مزارِ مبارک پر اب کوئی "قبر فروش" نہیں، جن کی قوم نے ان کے افکار و اقوال کی رہنمائی تو قبول کر لی ہے مگر جو وہاں سجدہ دینے کی قائل نہیں، "بس قیامت، راہب ہیں" کہنے والے پیر و مرشد کیوں کر راہبی کے حق میں فیصلہ دے سکتے تھے۔ اقبالؒ اور اقبال کی قوم کو جواب ملتا ہے ؎

مصلحت در دینِ ما جنگ و شکوہ
مصلحت در دینِ عیسیٰ غار و کوہ

فاتحہ سے فارغ ہوئے تب محسوس ہوا کہ مولانا کے پہلو میں چند اور جلیل القدر ہستیاں بھی مدفون ہیں۔ ان کے فاتحہ کے لئے ہاتھ خود بخود بلند ہوئے۔ لباس جدید اور عصرِ حاضر کی ترکی خواتین کی ذہنی کشمکش کا مسئلہ اس روز ایک نئے رنگ میں دیکھا گیا جیسے ایک پاکستانی خاتون نے یوں بیان کیا: "ایک ترک خاتون فاتحہ پڑھ رہی تھیں کہ نظریں ننگی ٹانگوں پر جا پڑیں۔ معاً زمین کی طرف جھک گئیں اور جب تک فاتحہ ختم نہ ہوئی، وہ اپنے فراک سے ٹانگوں کو ڈھانپے رہیں۔"

مزار سے ملحقہ کمروں کو اب مولانا کے ایام اور علمی نوادرات کی نمائش گاہ بنا دیا گیا ہے۔ یہاں قرآن، فقہ، تصوف، اور کلام مولانا روم کے متعدد قلمی نسخے محفوظ ہیں جنہیں نہایت خوش اسلوبی سے شیشے کی الماریوں میں چنا گیا ہے۔ مختلف کمروں میں جانے اور وہاں سے لوٹنے کے مختلف راستے مقرر کئے گئے ہیں۔ اس طرح ابتری پیدا نہیں ہوتی اور انسان نہایت آرام سے ان چیزوں کو دیکھتا ہوا آگے بڑھتا رہتا ہے۔ قرآن کے نسخوں میں ۹۹۰ء کا، جلد آہو پر کوفی خط میں لکھا ہوا قرآن قابلِ دید ہے۔ مولانا فریدالدین عطار کی "منطق الطیر" ۶۴۳ ہجری یعنی ۱۲۴۴ عیسوی کی لکھی ہوئی مرکزِ توجہ بنی ہوئی تھی۔ بڑے ایوان کے وسط میں مثمن الماری میں حضور سرورِ کائنات علیہ الصلوات والسلام کی ریش مبارک کا ایک بال رکھا ہوا ہے جو سال میں صرف ایک دن دکھایا جاتا ہے۔ علمی نوادرات کے علاوہ اس عصر کے قیمتی لباس، جبہ، دستار، چولا اور انگرکھا غرضیکہ طالب علم سے لے کر شیخ طریقت تک کے لباس کے تمام تر لوازمات نمائش پر ہیں، ننانوے دانوں کی تسبیح، رحل، کوزہ، آفتابہ و چلمچی، نَے کی دس قسمیں، طبلہ، رباب اور دو تارا۔ یہاں کمخواب و اطلس، دیبا و حریر اور زربفت و زردوزی کے علاوہ عام اونی لباس تک دکھایا گیا ہے۔ یہاں صدیوں پرانے قالین ہیں جن پر بیٹھ کر علماء درس دے چکے ہیں۔ یہاں زربفت کے ایسے نمونے ہیں جو چار سو سال کی سردی گرمی اور بادِ تند و تیز کے جھونکوں کو برداشت کر چکنے کے بعد بھی آج کل کے بروکیڈ کو مات کرتے ہیں۔ دو چار نمونے تو ایسے تھے کہ خواتین ان کی الماریوں سے آگے بڑھنے کا نام نہ لیتی تھیں۔ اور جب باصرار کثیر بوجھل قدم آگے کو بڑھنے لگے تو آہ سرد ہونٹوں سے نکل ہی آئی۔ آستانۂ رومیؒ سے باہر نکلے تو شام ہو چکی تھی۔ جاڑوں میں اور راتوں کے علاوہ کاروباری ساعتیں اس قدر کم ہو جاتی ہیں کہ طلوع و غروب کے درمیان

بہت کم تکمیل ہو سکتا ہے۔ ابھی یہ دریافت کرنا تھا کہ رئیس بلدیہ صدقی بگین صاحب کی طرف سے عرس میں شرکت کے دعوتی رقعے موصول ہوئے تھے یا نہیں۔ ہوٹل پہنچنے پر معلوم ہوا کہ رقعے موصول ہو چکے ہیں۔ ہم حیران کہ انہوں نے دس نشستیں کس طرح پیدا کر لی ہیں۔ مگر ان کا یہ کہنا کہ ہم دوست ممالک نہیں بلکہ دو بھائی ممالک ہیں، کانوں میں گونج رہا تھا۔ خدا اس بھائی چارہ کو قائم رکھے اور اسے پھلنے پھولنے کے مواقع بہم پہنچاتا رہے۔

ساڑھے چھ بجے شہر کے بہترین ہوٹل "لوکانتا" میں عشائیہ تھا۔ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ انقرہ میں مقیم سب ہی سفارت خانوں کے نمائندے موجود ہیں۔ شہر پاکستان کی میز پر وزارتِ خارجہ کے اعلیٰ عہدہ دار موجود تھے۔ حقیقی برادری کا ثبوت علی الاعلان دیا جا رہا تھا۔ ہم بدیر حاضر ہونے پر نادم تھے مگر بہت سے وجوہات مل کر دیر کا باعث بنے تھے جن میں مزار سے بدیر واپسی بھی شامل تھی۔ وہاں ہم سب ساقی کچھ اس طرح وقت کا احساس کھو بیٹھے تھے کہ سورج اور گھڑیوں کی رفتار کا احساس ہی نہ رہا۔ جگہ ہی کچھ ایسی تھی۔ عشق و مستی کا پیمانہ جب گردش میں ہو تو زائر مست ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ خوش بختانہ ہمارے ساقی بھی کچھ اسی قسم کے تھے۔ اس روز مولانا کا شعر بار بار ذہن میں آیا ؎

من مست و تو دیوانہ مارا کہ برد خانہ

صد بار ترا گفتم کم خور دو سہ پیمانہ

عجیب بات ہے خود کم پینے کو مولانا کا دل بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ بھی اپنے ساقی کو باہوش رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ یہ نہ کہا کہ آج ہم باہوش رہیں گے اور تمہارے گھر تک رہبری کریں گے نہیں جب مئے الست بٹ رہی ہو تو اس سے محروم رہنے پر پیرِ مغاں بھی تیار نہیں ہوا کرتا۔ پھر ہم جو کسی گنتی میں نہ تھے اور جنہیں ایسے مواقع بہت کم میسر ہوتے ہیں، کس طرح مولانائے روم کے میخانے سے باہوش واپس لوٹتے۔ یہ بیخودی و مستی درحقیقت روح کی بیداری کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ جب ہی تو مولانا فرماتے ہیں "بندہ بدم شاہ شدم زہرہ بدم ماہ شدم" اور پھر ؎

مردہ بدم زندہ شدم گریہ بدم خندہ شدم

دولتِ عشق آمد و من دولتِ پائندہ شدم

کھانے کا انتظام جہاں کیا گیا تھا وہ تھا لوکانتا ہوٹل جو شہر کے سب سے اونچے حصے پر واقع ہے۔ ہم دریافت نہ کر سکے مگر خیال ہے کہ یہ پرانے قلعہ کے کھنڈرات کے اوپر تعمیر کیا گیا ہے۔ اور گرد پھولوں کی کیاریاں اور روشیں بچھائی گئی ہیں۔ اوپر تک موٹروں کے آنے کے لئے سڑکیں تعمیر کی گئی ہیں۔ گرمیوں میں تو شہر بھر شام کے وقت یہاں جمع ہوتا ہوگا۔ ایوان نہایت وسیع و عریض ہے جس میں پانچ سو کے قریب مہمان بیک وقت کھانا کھا سکتے ہیں۔

کھانے کے بعد قونیہ کے سب سے بڑے سینما میں پہنچے۔ "احتفال" کے متعلق کہا گیا تھا کہ شام کے ساڑھے آٹھ بجے شروع ہوگی۔ اور پانچ منٹ قبل تمام دروازے بند کر دئے جائیں گے۔ ہم نہ چاہتے تھے کہ اس قدر کوششوں کے بعد اور رئیس بلدیہ کی عنایات کے باوجود ہماری سستی کی وجہ سے ہم پر "شبِ عروس" کی اصل مجلس کے دروازے بند ہو جائیں۔ ہم نے کھانا جلد از جلد ختم کیا اور دو ایک بار راستہ پوچھنے کے بعد سینما جا ہی پہنچے۔

سینما کے باہر ہی معلوم ہو رہا تھا کہ محفل شروع ہونے کو ہے۔ موٹروں کی کئی قطاریں کھڑی تھیں اور جو لوگ پہنچ رہے تھے وہ نہایت عجلت سے سیڑھیاں عبور کر کے برآمدے سے ہوتے ہوئے اندر کے مجمع میں غائب ہو رہے تھے۔ سینما خاصہ بڑا تھا۔ ہم موٹروں کو ایک طرف پارک کر کے اندر پہنچے تو رہنمائی کے لئے دو چار آدمی آگے بڑھے۔ چونکہ ہمارے ساتھ خواتین بھی تھیں اس لئے ہمارا پاکستانی ہونا صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ مجمع میں دبے دبے الفاظ میں لفظ پاکستانی دو تین بار دوہرایا گیا۔ اور جیسے کسی نے "کھل سم سم" کہہ دیا ہو، راستہ خود بخود بن گیا۔ سینما کے ایوان کے بیچوں بیچ راستہ موجود تھا مگر اس میں بھیڑ کی سی کیفیت تھی۔ چونکہ ہمیں غیر حاضر مدعوئین کی نشستیں دی گئی تھیں اس لئے ہم ایوان کے مختلف حصوں میں بکھرے ہوئے تھے مگر نشستوں کے ڈھونڈنے کا مرحلہ جلد ہی طے ہو گیا۔

اسٹیج کے سامنے سبز پردہ کھنچا ہوا تھا جس پر اتاترک غازی مصطفٰے کمال پاشا کا معروف قول سنہری الفاظ میں لکھا تھا:

HAYATA EN HAKIKI MURSIT ILIMDIR: (ATATURK). "زندگی میں حقیقی رہنما علم ہے"۔

ایوان کی دیواروں کے ساتھ مزار مولانا سے متعلق اور دوسری علمی درسگاہوں کی عکسی تصویریں آویزاں تھیں۔ پردے کے اوپر والے حاشیہ کے

درمیان میں لکھا تھا۔ "یا حضرت مولانا!"

پردہ کے باہر اور اسٹیج کے وسط میں مقرر کے لئے ایک بلند منبر رکھا تھا جس پر شیشے کی صراحی اور ایک گلاس پڑا تھا۔ ہم نے سوچا کہ دیکھئے آج حضرت مولانا کے ذکر کے دوران کس کا حلق خشک ہوتا ہے اور کون ان کے الفاظ دہرانے کے قابل بنتا ہے ؎

شرابے کہ نوشیدم از سرِ غیب
ز مستیٔ انگور و صہبا نہ بود

گو مجلس دیر تک جاری رہی، صرف ایک جرمن خاتون کو اس صراحی و جام کے استعمال کی ضرورت پڑی۔

ایک نوجوان اسٹیج پر تشریف لائے۔ حاضرین کو خوش آمدید کہا اور اعلان کیا کہ رئیس بلدیہ آپ سے مخاطب ہوں گے۔

ہمیں رئیس بلدیہ کو پہچاننے میں دقت نہ ہوئی۔ وہی مسکراتا ہوا سرخ و سپید چہرہ، تدبر، ذمہ داری اٹھانے کی عادت، استقلال و بردباری سب ہی کچھ ظاہر ہو رہا تھا۔ ہم آدابِ محفل سے مجبور تھے ورنہ مجلسِ عرس میں شرکت کی اجازت اور اس موقع سے استفادہ اٹھانے کے شکریہ میں الحمد کرعلی الاعلان کہنا چاہتے تھے کہ ہم ان کے کتنے شکرگزار تھے مگر یہ عرس کی محفل تھی۔ یہاں گستاخ زبانوں کا گذر نہیں ہونا چاہیئے۔ رئیس بلدیہ نے سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ تقریر ترکی میں تھی مگر مضمون اسلامی تھا لہذا مقرر کے لئے ضروری تھا کہ قدیم ترکی زبان استعمال کریں۔ نفس مضمون عربی فارسی کے الفاظ کے استعمال کے بغیر پوری طرح ظاہر ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہم بھی اسے سمجھ سکے۔ کچھ اس طرح کے الفاظ تھے:

"آپ حضرات آج مولانا جلال الدین رومی، اسلام کے صوفیٔ کبیر کی شبِ عروس کی "احتفال" میں شرکت کرنے کی غرض سے دور دراز سے تشریف لائے ہیں۔ ہم سب آپ کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ قونیہ کے باشندے اپنی خوش بختی پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہ وہ سرزمین ہے جہاں علم و فضل کی مدام بہتی ہوئی ندیوں نے ذہن انسانی کی بلندیوں کا نشان دیا تھا، جہاں انسان کی برتری اس لئے ثابت ہوئی تھی کہ وہ جستجوئے علم اور تحصیل علم میں اپنی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ اور یوں فرشتوں پر فوقیت حاصل کر سکتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں "مثنوی معنوی" کی تشکیل مولانا کے ذہنِ بلند و بالا نے کی۔ یہاں عشق و ایمان کے بلند مراتب حاصل ہوئے اور یہاں ہی دنیا نے یہ دیکھا کہ اگر درویش صفت صاحبِ علم و فکر عشقِ الٰہی میں ڈوب جائے تو شہنشاہ بھی درویش کی چوکھٹ کو چومنا اپنے لئے باعث صد افتخار سمجھتے ہیں۔ قونیہ کو اس بات کا بھی فخر ہے کہ اس عاشق ذات باری کی ابدی آرام گاہ اس کی آغوش میں ہے۔ میں آپ حضرات کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں اور آپ سے اجازت چاہتا ہوں تاکہ آپ اس محفل کو رونق دینے والوں کے کلام سے دو رہ رہیں"

رئیس بلدیہ کے چلے جانے کے بعد معلن پھر آئے اور اب انہوں نے اعلان کیا کہ ڈاکٹر خلقی عال گہن تقریر فرمائیں گے۔ ہم نے پروگرام کو بعد میں دیکھا۔ اس پر ان کے نام کے بعد چلبی تحریر تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب مولانا کی اولاد میں سے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا نام اگر کسی کو نہ بھی معلوم ہوتا تو چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ آپ پروفیسر یا تجربہ کار استاد ہیں جن کی عمر شعر و ادب کے مطالعہ میں گزری ہے۔ آپ نے اپنی تقریر مولانا کے اشعار سے شروع کی:

سار بانا اُشتراں بیں سر بسر قطار مست
میر مست و خواجہ مست و یار مست، اغیار مست
آسمانا چند گردی گردشِ عنصر ببیں
خاک مست و آب مست و باد مست و نار مست

چلبی صاحب اس غزل کے ایک دو اور اشعار بھی پڑھ گئے مگر ہم عناصر کی گردش میں الجھ کر رہ گئے۔ عنصر، ذرہ، جوہر، یہ سب مادہ کی مہین ترین اشکال و مقدار کے مختلف نام ہیں مگر اس مہین ترین مقدار کے اندر عین گردشِ افلاک قسم کی گردش پیہم جاری رہتی ہے۔ اور جب اس گردش میں رکاوٹ پیدا ہو جائے تو قیامتِ صغریٰ بپا ہو جاتی ہے۔ ہیروشیما کے رہنے والے اس قیامتِ صغریٰ سے دوچار ہو چکے ہیں۔ شاید اسی طرح جب گردشِ آسماں میں خلل واقع ہوگا تو قیامتِ کبریٰ واقع ہو جائے گی جب سیارے ایک دوسرے سے ٹکرائیں گے اور پہاڑ روئی بن کر نابود ہو جائیں گے اور سورج — ہم سلج

کے مستقبل پر پہنچے تو، ڈاکٹر چلپی نے آخری شعر کا دوسرا مصرع پڑھا: ع

"اے پسر بر خیز و بنگر جامۂ ابرار مست"

ڈاکٹر صاحب مولانا کے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ علم و ادب کے مختلف پہلوؤں پر عبور نظر آتا تھا۔ زبان پہلوی سے شناسا تھے۔ کاش ہم ترکی سے اس قدر واقف ہوتے کہ ان کی تقریر سے کما حقہٗ مستفیض ہو سکتے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تقریر کا بنیادی نقطہ "مثنوی معنوی" کے مختلف پہلوؤں کو روشن کرنے تک ہی محدود رکھا۔ مثنوی کے افکار بلند اور معنیٰ دقیق کے ساتھ ساتھ زندگی کے بنیادی مسائل کا عام فہم زبان میں اظہار و بیان اپنے سامعین کے سامنے پیش کیا۔ فرمانے لگے "سالارِ عشاق کے عشقِ حقیقی کا اولین ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے انسانی معاشرے کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے، اور ہر مسئلے کے حل کی اساس، فرمانِ ربانی یعنی قرآن حکیم پر رکھی ہے نسلِ انسانی کی ان گنت نسلوں کے حق میں مولانا کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ انہوں نے زندگی کے اُلجھے ہوئے اور پیچ در پیچ مسائل کو قرآن کی روشنی اور عمومی زبان میں پیش کیا۔ اور یوں قرآن کو عوام کے قلب و ذہن سے قریب کر دیا۔"

ڈاکٹر خلقی عاتی اپنی تقریر ختم کر کے چلے گئے۔ ایوان میں معلن نے ایک نیا نام پیش کیا اور ہم اسی سوچ میں غرق رہے کہ قرآنِ حکیم کو ماننے والی قوم کی بیچارگی و کسمپرسی کی اصل وجہ کیا ہے۔ درست کہ انہوں نے قرآن کو تعویذ بنا ڈالا یا کہ فراموش کر کے اس سے روگردانی کی اور حسنِ مجازی کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے۔ یہ بھی بجا کہ اس کتاب "لاریب فیہ" پر ہم نے اپنا ایمان قائم نہ رکھا اور اس کی تعلیم کو عام کرنے والوں کو ہم غلط درجات دینے کے مجرم بنے۔ مگر جو بات ہماری سمجھ میں نہ آسکی وہ یہ تھی کہ اس غلط روش کی ذمہ داری عوام پر عائد ہوتی تھی یا خواص پر۔ اگر غلطی خواص کی تھی تو کون سے طبقہ کی۔ حکمران رہنما طبقہ کی یا علم و ہدایت دینے کے فرائض جنہوں نے اپنے اوپر لئے تھے ان کی کوتاہیوں اور خامیوں کی وجہ سے ہم قعرِ مذلت کی اتھاہ تاریکیوں میں جا پہنچے ہم ان ہی خیالات میں مستغرق تھے کہ ایوان تالیوں کی صدا سے گونج اٹھا۔ ہم نے اسٹیج کی طرف دیکھا وہاں ایک استانی نما خاتون کھڑی تھیں۔ میانہ قد، پتلی دُبلی، چہرے پر سرخی کم اور زردی زیادہ، کالا لباس پہنے تھیں۔ ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں، انگلیوں پر سونے کی انگوٹھیاں، گلے میں زنجیر اور آنکھوں پر موٹے شیشے کی عینک، مجموعی اثر کچھ عجیب قسم کا تھا۔

ہمارے پاس ایک ترک انجینیر تشریف فرما تھے۔ انہوں نے پروگرام پر اس خاتون کے نام پر انگلی رکھ دی۔ ہمیں معلوم ہوا کہ خاتون ایک پروفیسر ہیں۔ نام تھا ڈاکٹر اینے میری شمل۔ ہمیں یاد آیا کہ ہمارے ایک پڑھے لکھے دوست نے اس خاتون کا ذکر خاص طور پر کیا تھا۔ یہ خاتون جرمن ہیں۔ پاکستان میں قیام کر چکی ہیں۔ اردو اور سندھی جانتی ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے کلام کا خاصہ مطالعہ کیا ہے۔ جب ہمارے دوست ان سے کراچی میں ملے تھے تو اس وقت یہ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے کلام کا مطالعہ کر رہی تھیں۔ آج کل ترکی میں ہیں اور ترکی زبان پر عبور حاصل کر لینے کے بعد مولانا رومؒ کے کلام کا مطالعہ کر رہی ہیں۔ آج کی تقریر بھی ترکی میں تھی۔ جب ہم نے انہیں بغور دیکھا تو اس وقت وہ کہہ رہی تھیں کہ ہر قوم کے ادب کا ایک خاص عہد ہوتا ہے۔ اور پھر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہر عہد کا ادب مختلف ہوتا ہے۔ ہر زمانے کے افکار اس زمانے کے اہم مسائل کے پابند ہوتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ایک عہد اور ایک قوم کا ادب دوسرے عہد اور دوسری قوم کے ادب سے مختلف ہوتا ہے۔ مولانا کے زمانے کے افکار بھی اس قاعدہ کلیہ کے مطابق ہیں۔ مگر مولانا کے اپنے افکار اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔ یہ خاصیت خال خال انسانوں کو عطا ہوتی ہے۔ ان کے افکار میں ابدیت ہے۔ جب تک نسلِ انسانی قائم رہے گی، اس وقت تک مولانا کے افکار حسب حال رہیں گے۔ اور بلند نظر و فکر دقیق رکھنے والے حکما ان کے افکار کی روشنی میں اپنے ہم عہدوں کے لئے مشعل راہ کا کام دیں گے۔ مثنوی معنوی ایک نور ہے جس کی شعاعیں اب تک انسانی معاشرے کی رہنمائی کر رہی ہیں۔ اس عصر کے حکما میں سے جنہوں نے مولانا جلال الدین رومی کو سمجھا ہے ان میں مقام اول پاکستان کے شاعر محمد اقبالؒ کو حاصل ہے۔ اقبالؒ مولانا رومؒ کو اپنا پیر مانتے ہیں۔ اور مشرق و مغرب کے علما سے مستفید ہو چکنے کے باوجود اقبال اپنے خیالات و افکار کا منبع کلام مولانائے رومؒ کو بتلاتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان کے مطابق دنیائے اسلام کی نشاۃ الثانیہ کے بیج مولانا کے کلام سے لئے گئے۔ اس جرمن خاتون کا مولانا کو علامہ اقبالؒ کا پیر و مرشد کہنا تھا کہ ہمارا ذہن "جاوید نامہ" کی طرف منتقل ہو گیا۔ جہاں اقبالؒ اپنے متعلق مولانا کی طرف سے یہ کہتے ہیں کہ، ع

مردے اندر جستجو آوارۂ

ہاں جسے یورپ و ایشیا کے مفکر تسکین نہ دے سکے اُسے زبان پہلوی میں اُم الکتاب پیش کرنے والے کے افکار نے عشق و محبت کے رموز سے آشنا کیا۔ وہ رُکیں، صراحی سے گلاس پُر کیا۔ ہم یہ سمجھے کہ غیر زبان میں تقریر کرنے سے جو ذہنی تکان پیدا ہو جاتی ہے اس کے اثر سے گلا خشک ہو گیا ہے اور تقریر جاری رہے گی۔ تقریر تو جاری رہی مگر زبان بدل چکی تھی۔ اب وہ انگریزی میں تقریر کر رہی تھیں۔ انگریزی کی تقریر میں انہوں نے اپنی ترکی تقریر کا بہت کم حصہ دہرایا۔ اس تقریر میں اور باتوں کے علاوہ انہوں نے مولانا رومی اور شمس تبریز کے مرید و پیر والے تعلقات بھی بتلائے۔ پھر کہنے لگیں کہ مولانا اس عالم کون و مکان کی وسعت و بزرگی کا احساس دلانے کے لئے سورج کی اصطلاح کو استعمال کرتے تھے۔ اور چونکہ ان کے مرشد کا نام شمس الدین تھا، اس لئے اس استعارہ میں شعریت بھی پیدا کر لیا کرتے تھے۔ انگریزی داں طبقہ کے لئے فارسی اصطلاعات سمجھانے کی کوشش بھی کی۔ مثلاً کہنے لگیں کہ جہاں کہیں مولانا "دیروز" کا لفظ استعمال کرتے ہیں اس سے اکثر ان کے پیش نظر تخلیق عالم سے قبل کا زمانہ ہوتا ہے۔ انگریزی کی تقریر میں بھی انہوں نے علامہ اقبال کا ذکر کیا بلکہ اس تقریر میں شاہ عبداللطیف بھٹائی ؒ کا تذکرہ بھی کیا۔ اور مولانائے رومؒ کو جو مقام مشرق کے علم و ادب اور فکر پر ہے اس کا خاص طور پر ذکر کیا۔

ان کے بعد معلن نے اعلان کیا کہ کمال ادیب کرک چوگلو تشریف لائیں گے۔ کمال ادیب کے بعد پروفیسر مجتبٰی مینوی تشریف لائے۔ ان کی تقریر انگریزی میں تھی۔ فارسی اشعار پڑھنے کا انداز اور لہجہ ایرانی تھا۔ دیکھنے میں خوش سال زمیندار نظر آتے تھے۔ علامہ کے "دیوان" اور "مثنوی" کا مطالعہ وسیع نظر آتا تھا۔ انگریز مستشرقین میں سے نکلسن اور آربری کا ذکر کیا۔ مولانا رومؒ کا ذکر کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ وہ ترک و توران اور ہند و ایران کے جذبہ سے بہت بلند تھے۔ وہ انسانیت کی وسیع عالمی برادری کا فرد تھے، اور اپنے محبوب یعنی خالق عالم کو وہ ہر جگہ پا سکتے تھے۔ ان کا کوئی وطن نہ تھا۔ ہاں انہوں نے اپنے افکار کی ترجمانی کے لئے ایک زبان کا وسیلہ ضرور ڈھونڈا۔ مولانا کے درویشوں کے رقص کا ذکر کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ کلام مولانا کا زیر و بم، پس منظر میں رباب کا نالۂ دردناک اور الفاظ و بیان کا ہم آہنگ ہونا ایک ایسی کیفیت پیدا کرتا تھا کہ سننے والے بے آواز سی گردش پر مجبور ہو جاتے تھے۔ پھر مولانا کی اس غزل کے اشعار تحت اللفظ پڑھے، جنہیں علامہ اقبالؒ نے بھی "جاوید نامہ" کے شروع میں پیش کیا ہے اور جنہیں پڑھ کر وہ فرماتے ہیں:؎

روحِ رومی پردہ ہا را بر درید
از پسِ کُہ پارہ آمد پدید

پروفیسر مجتبٰی فرمانے لگے کہ یہ غزل ہو، مطرب اسے دھیرے دھیرے پڑھ رہا ہو، بلکہ گھُٹی گھُٹی آواز میں سوز سے گا رہا ہو، رباب اس کا ساتھ دے رہی ہو، اور پیر و مرشد سر جھکائے "شمس و قمر اور عالم کون و مکان اور ان سب کے خالق و مالک کا دھیان لگائے کشمکش تجلیات میں غرق ہوں تو مُرید کیوں نہ اس کے قریب حلقہ باندھ کر اس آب رواں سے اپنے اپنے جام پُر کرنے کے خواہشمند ہوں گے۔

ہم بھی قارئین کی خدمت میں اس معروف غزل کے چند اشعار پیش کرتے ہیں۔

بکشائے لب کہ قندِ فراوانم آرزوست — بنمائے رخ کہ باغ و گلستانم آرزوست
یک دست جامِ بادہ و یک دست زلفِ یار — رقصے چنیں میانۂ میدانم آرزوست
دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر — کز دیو و دد ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت — شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما — گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

بنمائے شمسِ مفخرِ تبریز روز شرق
من ہدہدم، حضورِ سلیمانم آرزوست

پروفیسر مجتبٰی کے بعد جناب عبدالباقی گول پناری صاحب تھے۔ عبدالباقی صاحب پروفیسر نما اور مُدبّر قسم کے انسان معلوم ہوتے تھے جنہیں شاید کتابوں کے علاوہ اور کسی شے سے کسی قسم کا واسطہ نہ ہو۔ عبدالباقی صاحب جونہی سٹیج پر آئے پس منظر میں رباب بجنا شروع ہو گیا، نہایت دھیمے سروں میں فرمانے لگے، مولانا رومیؒ ترکی نہیں۔ ایشیائی و اسلامی نہیں بلکہ دنیا کے مفکروں کے سردار تھے۔ انہوں نے پھر مولانا کے عہد کا تاریخی پس منظر پیش

کیا اور بتایا کہ دنیائے اسلام نے اپنے روحانی مرکز یعنی کتاب مبین کو ذہن سے ہٹا دیا تھا۔ مولانا آئے اور انہوں نے یہ کہکر کہ "من بندۂ قرآنم" عشق و مستی کا وہ درس دیا جس نے دنیائے اسلام کو ایک بار پھر زندہ کر دیا۔" مولانا ترجمانِ تجلیاتِ محمدیؐ" تھے اور پھر فرمانے لگے" روحِ ترجمانِ نورِ محمدیؐ ابھی زندہ ہے اور ہمیشہ رہے گی" اور جب تک مسلمان اس نور سے رہنمائی وہدایت لیتے رہیں گے وہ زندہ رہیں گے۔ عبدالباقی صاحب کے ایک ایک فقرے پہ تالیاں بج رہی تھیں، تالیاں رُکتیں تو وہ اپنی پُرجوش تقریر کو پھر جاری کر دیتے۔ کہنے لگے "مولاناؒ کا کلام لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ، کے پیغام کی بازگشت ہے" اس مرشدِ روشن ضمیر کے افکار کو عصرِ حاضر کے مفکرِ عظیم پاکستان کے شاعر محمد اقبالؒ نے اپنے کلام نظم و نثر میں پیش کیا ہے۔ مرید و مرشد ہر دو وجدانِ حقیقی اور خبر و نظر کو علم پر ترجیح دیتے ہیں مگر خبر کا پہلا مرحلہ علم کو بتاتے ہیں۔ عبدالباقی صاحب نے متعدد آیاتِ قرآنی کا ترجمہ مولانا کے کلام سے پیش کیا۔ مجمع چاہتا تھا کہ وہ اپنی تقریر ختم کریں مگر ہر اچھی شئے کی طرح ان کی تقریر بھی اختتام کو پہنچی۔

ان کے بعد دُبلی پتلی، ہڈیوں کا ڈھانچہ قسم کی لاغر و نحیف شاعرہ تھیں جن کا نام پروگرام کے مطابق خالدہ نصرت زورلوتانا' ہے۔ انہوں نے " یا حضرت مولانا" کہہ کے امامِ عاشقاں کی مدح میں ایک نظم پڑھی۔ ایک ایک مصرع پر ایوان تالیوں سے گونج رہا تھا اور خالدہ نصرت تھیں کہ غیر شاعرانہ انداز میں کھڑی اس شورِ تحسین سے بے نیاز دکھائی دیتی تھیں اور حضرت مولانا کی تعریف میں شعر پر شعر کہے جا رہی تھیں۔ اگر قونیہ کو فخر ہے کہ اس کی آغوش میں مرشدِ عاشقانِ رب العزت آرام کناں ہیں تو ہماری نگاہ میں قونیہ اور ترکی کے لئے خالدہ نصرت جیسی نوجوان لوڈ پر بھی ذاتِ باری میں ممنونیت کا اظہار کرنا حق بجانب ہوگا۔ خالدہ نصرت کے بعد رباب تھا اور پھر پروگرام میں" استراحت" "۵ دقیقہ" درج تھا۔ ہمیں یہ لفظ" استراحت" "انٹرول" سے کہیں زیادہ پسند آیا۔ ہمارے ہاں" ہاف ٹائم" کہنے کا بھی رواج ہے اور بعض جگہوں پر" وقفہ" استعمال ہوتا ہے، مگر ہماری رائے میں ان سب سے بہتر اور موزوں لفظ" استراحت" ہی ہے۔

" استراحت" کے بعد سفید سر، سرخ چہرہ، معزز وضع قطع اور دوہرے بدن والے رفیع جواد علونانی (چلبی) تھے۔ آپ مولانا کی اٹھارہویں پشت میں سے ہیں اور قونیہ کے معزز ترین شہری تصور کئے جاتے ہیں۔ انہوں نے" شبِ عروس" یعنی اس رات کی رُوداد بیان کی جس رات عاشقِ صادق کا وصال اپنے محبوب کے ساتھ ہوا تھا اور ان علماء کا ذکر کیا جنہوں نے اُن کے بعد اپنے شیخ کے طریقے کو جاری رکھا تھا۔ ہمیں ان کا ایک فقرہ ازحد پسند آیا" عشقِ پیغمبرؐ مولانا کی زندگی تھا"

رفیع جواد کے بعد وزیرِ اعظم کے مستشار' احمد صالح نے مولاناؒ کی مدح میں نظم پڑھی۔ نظم کے الفاظ میں رعد و برق کی سی بلندی و دبدبہ تھا۔ ہم نے اپنی بے بسی پر بہت پیچ و تاب کھائے مگر سوائے اس کے اور کیا کر سکتے تھے کہ ع

زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم

احمد صالح کے بعد پردہ کھینچ لیا گیا اور ہم یوں سمجھے کہ ہم تیرہویں صدی عیسوی یا ساتویں صدی ہجری میں تھے۔ اسلام کی سرزمین ایشیا و افریقہ میں پھیلی ہوئی تھی مگر مسجد کی ساخت کے علاوہ ان ممالک کے تمدن اور طرزِ بود و باش میں چنداں فرق نہ تھا۔ ہمارے سامنے غروبِ آفتاب کے بعد کا منظر تھا۔ پس منظر میں ترکی مسجد تھی، اور اس کے پہلوؤں میں سنترے کے درخت تھے۔ مسجد کی چھت کے اوپر آسمان پر سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ شاید کہیں پاس ہی الاؤ جل رہا ہوگا یا ڈوبے ہوئے سورج کی آخری سرخی ہوگی۔ مسجد کی دیوار کے سائے میں صوفی، یا یوں کہئے کہ اصحابِ طریقت حلقہ بنائے بیٹھے ہیں شیخِ طریقت مرکز میں ہے مگر کسی طرح کی مسند یا اور کوئی شئے نہیں جس سے طریقِ امتیاز دکھانا مقصود ہو۔ یہ تحت الشعور تھا یا قصداً یوں کیا گیا تھا۔ جونہی آنکھوں کے سامنے مسجد اور اس کے پائیں باغ میں سنتروں کے درخت نظر آئے ہمیں یہ محسوس ہوا کہ ایوان سنترے کی خوشبو سے مہک گیا ہے۔ ہم نے بار بار سونگھا اور یہی محسوس کیا۔ پروگرام پر لغت کا لفظ جمع کے صیغہ میں لکھا تھا مگر سٹیج پر کسی طرح کی حرکت نہ تھی، ایک لمحہ مکمل خاموشی رہنے کے بعد رباب نہایت ہی ہلکے اور دھیمے سروں میں بجنا شروع ہوا۔ ایک صاحب جو شاید نابینا بھی تھے، سٹیج کے مرکز میں آ گئے۔ رباب بجنا رک گئی۔ انہوں نے پڑھنا شروع کیا۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ اور پھر ایک رکوع قرآن کریم کا پڑھا۔ جونہی انہوں نے بِسۡمِ اللّٰہِ پڑھی ایوان میں حاضر خواتین نے ریشمی رومال نکالے اور سروں پر باندھ لئے۔ مردوں نے سگریٹ نیچے پھینک کر پیروں سے مسل دئے۔ ہم نے محسوس کیا کہ اب ایوان میں مکمل خاموشی تھی ــــ شاید تلاوت

قرآن کریم کے وقت ہم نے یہ سکون اور یہ خاموشی پاکستان، ایران اور عراق میں کہیں کبھی نہیں دیکھی، قرآن کا یہ ادب و احترام عین یورپ کی دہلیز پر خوش آئند شگون سے کم نہیں۔ تلاوت نہایت درجہ بلند پایہ طریق سے کی گئی۔ پڑھنے والے کے گلے میں سوز تھا اور سننے والے چاہتے تھے کہ اسے سنتے ہی رہیں۔ مگر شب محدود تھی اور ابھی پروگرام باقی تھا۔

تلاوت قرآن مجید کے بعد نعتیں پڑھی گئیں۔ نعت کے دوران پڑھنے والے کھڑے تھے۔ نعت کے بعد بیٹھ گئے۔ صوفی حلقہ اپنے اللہ اور رسول کی یاد کے بعد شیخ طریقت کی یاد تازہ کرنے کے لئے تیار تھا۔ دو زانو بیٹھے ہوئے، دونوں ہاتھ رانوں پر رکھے، سر جھکائے پورا حلقہ سانس روکے شیخ کا اسم محترم سننے کا منتظر تھا۔ ایک طرف سے آواز آئی "یا حضرت مولانا!" حلقے کے دوسرے کونے سے آواز آئی "یا سلطان العارفین" حلقہ کے وسط سے نہایت بارعب آواز نے مجمع کو اپنی طرف متوجہ کیا:-

"یا رسول اللہ، اُمّت رہنمائی کی منتظر ہے"

"یا رسول اللہ" کی آواز پر پورے حلقہ نے گردنیں جھکا دیں۔ ایوان میں اس قدر خاموشی تھی کہ دبی زبان میں کہی ہوئی "صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ" کی آواز ایک ایک لہر کی طرح پھیل گئی اور پھر مکمل خاموشی۔

ایک لمحہ بعد نَے وصالِ دوست کی فرقت کا فسانہ چھیڑ دیتی ہے۔ مع رباب اُس کا ساتھ دیتی ہے اور پھر طبلہ بھی شامل ہو جاتا ہے مگر اس کی سنگت نہایت دبی دبی ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد نَے نواز اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور ایک ایک کر کے کالی صُوف کے لبادے اُتار دیتے ہیں۔ نیچے سفید انگرکھا ہے جس پر سوزن کاری کا کام کیا ہوا ہے۔ انگرکھا کمر کے گرد تنگ اور نیچے وسیع گھیرا۔ انگرکھے کے نیچے چوڑی دار پاجامہ، سر پر لانبی ترپوش (ترکی ٹوپی) اور اس کے گرد عمامہ آہستہ، آہستہ، سرکتے ہوئے وہ دائرہ سا بنا لیتے ہیں اور دائیں سے بائیں یعنی گھڑی کی مخالف سمت کی نامحسوس سی حرکت شروع کرتے ہیں۔ پہلا شاگرد شیخ کے قریب پہنچتا ہے تو جھک جاتا ہے۔ جھکنے کے بعد سرو قد ہو کر شیخ کی جانب پیٹھ کئے بغیر پلٹتا ہے۔ اس دوران میں دوسرا شاگرد اب شیخ کے قریب پہنچ جاتا ہے اور دونوں آمنے سامنے ہو کر جھکتے ہیں۔ دونوں کے سروں کے درمیان صرف اتنا فاصلہ ہے جس میں سے شیخ کا بارعب چہرہ نظر آ رہا ہے۔ اس مرتبہ جب دونوں شاگرد سرو قد ہوتے ہیں تو پہلا شاگرد آہستہ سے پہلو بدل کر دائرے کو مکمل کرنے کے لئے آگے چل دیتا ہے۔ دوسرا شاگرد شیخ کی طرف پیٹھ کئے بغیر مڑتا ہے اور وہ تیسرے کے بالمقابل ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں اب جھک جاتے ہیں اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ حلقے میں شامل ہوتے ہی شاگرد پہلے تو دونوں ہاتھ سینے تک لے جاتا ہے۔ بایاں نیچے دایاں اوپر۔ جب شیخ کے سامنے سامنے گزر جاتا ہے، تو انہیں سینے سے ہٹا لیتا ہے اور آگے چلتا جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ اور بازو سینے سے ہٹ کر پرندے کے پروں کی طرح کھلنا شروع ہوتے ہیں۔ دائرے کا نصف فاصلہ طے ہونے تک وہ پورے پھیل چکے ہوتے ہیں اور سر سے اوپر ہو جاتے ہیں۔ داہنے ہاتھ کی ہتھیلی اوپر کی جانب۔ یہ ہاتھ ذاتِ باری کی طرف پھیلایا ہوا ہے۔ اس سے وصال کی خواہش ظاہر کرنا مقصود ہے۔ بائیں ہاتھ کی ہتھیلی زمین کی طرف ہے۔ یہ ہاتھ لا یعنی نفی و انکار کی علامت ہے گویا صوفی کو دنیا سے یا دنیا کی کسی شے کی حاجت نہیں اور یہ ہاتھ مانگنے پر رضامند نہیں یعنی ترکِ علائق کا رمز ہے۔ دائرے کی حرکت جاری ہے مگر ساتھ ہی ساتھ پاؤں، بدن اور بازو ہر دگز کے بعد ایک چکر پورا کر رہے ہیں۔ یوں سمجھئے دنیا کی گردش کی صورت گھوم رہے ہیں، اپنے محور کے گرد۔ پاؤں اٹھتا نہیں، کسی حرکت کو جھٹکے سے ادا نہیں کیا جاتا۔ پرندہ جب پر ہلانے چھوڑ دیتا ہے مگر پر پھیلائے ہوئے ایک غیر محسوس سی حرکت کے ساتھ آگے بڑھتا جاتا ہے، اُس کا احساس ہوتا ہے چکر کی حرکت اس قدر غیر محسوس طور پر کی جاتی ہے کہ گھٹنے بھی خم نہیں کھاتے۔ انگرکھا اس چکر کے دوران "پشواز" کی طرح پھیل کر دائرہ بنا لیتا ہے۔ اور کنول کے پھول کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ بلکہ انگرکھا اس توازن سے گھوم رہا ہوتا ہے جیسے کنول کو کوئی خوبرو شخص انگلیوں میں گھما رہا ہو۔ یہ پورا آسمان نگاہ کو اس قدر مسحور کر دیتا ہے کہ دیکھنے والوں کو دنیا و مافیہا کا احساس باقی نہیں رہتا۔ اے کاش مجھ میں یہ قدرت ہوتی کہ میں اس سماں کو بعینہٖ قلمبند کر سکتا، میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ؏:

ابھی اردو میں پیدا وہ روانی ہو نہیں سکتی

اس لئے کہ جب یہ مصرع لکھا گیا تھا اُس دَور اور آج کے دور میں فرق ہے۔ اب اردو کی زلفِ پریشاں اقبالؒ کے اَن گنت ہم وطنوں کے کہنہ مشق ہاتھوں

سے مشاطگی کا فخر حاصل کر چکی ہے۔ بات یہ ہے کہ اس عشق و مستی کے سماں کا نقشہ کھینچنے کے لئے مصورِ صنعت و وقائع نگار کے علاوہ ایسے مصنف کی بھی ضرورت ہے جس کے دل میں درد ہو، جو سالہا سال تک جستجو و آرزو کی بھٹی میں تپ کر کندن بن چکا ہو اور جسے سوز و ساز کے بیان کرنے کا ملکہ بھی ودیعت ہوا ہو اور جو خوش بختانہ مولانائے رومؒ کے اس درس پر عمل کر چکا ہو ؎

جملہ تن را در گداز اندر بصر　　　در نظر رو، در نظر رو، در نظر

ہلکی پھلکی، سفید پروں والی تیتریوں کو حلقہ بنائے فضا میں تیرتے دیکھنا بھی ایک عجیب تجربہ ہے۔ یہ تیتریاں بھی تھیں اور پروانے بھی۔ اس لئے کہ اُن کے سفید لبادے اور گھیر ڈالتے ہوئے انگرکھے ان پر تیتریوں کا شبہ ضرور ڈال رہے تھے مگر گھوم گھوم کر شمعِ طریقت تک آنا اور اس کے قلب کی آگ سے راکھ ہو جانے کی کوشش کرنا انہیں پروانے کا مقام عطا کرتا تھا۔ مگر وہ عام پروانے بھی تو نہ تھے جو جل کر راکھ ہو جاتے ہیں اور اس سوز و مستی سے یوں موت کی آغوش میں راحتِ دائمی حاصل کرتے ہیں۔ وہ ایسے بلند نظر اور مستقل مزاج پروانے تھے کہ جو خلشِ دل کو قائم و دائم رکھنا چاہتے تھے اور وصل کے اس لئے خواہشمند نہ تھے کہ اس کے حصول کے بعد زندگی بے کیف ہو جاتی ہے۔ ان کے لئے زندگی کو طول دینے کی خواہش کے یہ معنی تھے کہ ان کے قلب سرشار ہوتے رہیں، ہوتے رہیں۔ مگر وہ اپنا پیمانہ لبریز نہ ہونے دیں۔ اور جب ایک دن اپنے قلب و نظر کے مرکز، اپنے خالق و مالک کی طرف سے پیغام آئے تو اس روزِ وصال کی صدا پر لبیک کہتے ہوئے اس کی طرف مسکراتے ہوئے روانہ ہو جائیں۔ یعنی تسلیم و رضا کی تلقین۔

آج ہی کی رات مولانائے رومؒ نے وصالِ ذاتِ باری سے اپنے دہکتے ہوئے قلب کو تسکین پہنچائی تھی۔ اسی لئے آج کی رات مولانا کی "شبِ عروس" ہے اور ہم خوش بخت تھے کہ ہم نے اس شب کی یاد تازہ ہونے کی محفل میں شرکت کی ؎

بمیرید بمیرید ازیں مرگ مترسید
زایں خاک برآئید وسمٰوات بگیرید

★

مری کی ایک رات

یہ نظم کشمیر پوائنٹ مری پر لکھی گئی تھی جہاں سے مقبوضہ کشمیر کی چوٹیاں پاکستانی محبِ وطن کے لئے دلدوز منظر پیش کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

اخلاق اختر حمیدی

چاند کمہلا گیا، رات مرجھا گئی، دُور تک جھونپڑوں کے دیئے جل بجھے
ایسے بے بس سناٹے میں رات کے کس نے چھیڑی ہے یہ رات کی راگنی

اونچے اونچے پہاڑوں کی فرغلی چاندی پہ نمناک دھندلاہٹیں چھائی ہیں
روٹھ کر جیسے چپ چاپ شہنازِ شب پڑ گئی ہو یہیں اوڑھ کر اوڑھنی

بادلوں کی تہیں چوٹیوں سے اُلجھتی ہوئی ہولے ہولے اُترنے لگیں
کالے جوڑوں میں پریوں کا جھرمٹ ہے جو ہیں پرستاں کی محفل سجانے چلی

تہ بہ تہ لہریئے دار جنگل پہاڑوں کی آغوش میں ایسے بدمست ہیں
جھومتی جھومتی پیار کی گود میں ہیر جیسے مچل کر ابھی آ پڑی

ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں میں نیلی فضاؤں میں گھل مل رہا ہے سکوں اس طرح
جیسے سچ مچ اسی کوہ کی چوٹیوں پر پڑی تھی کبھی چھوٹ الہام کی

دامنِ کوہ میں سانولی برف پر نیند کا نشہ چڑھنے لگا
گاؤں کی جیسے گوری کوئی اونگھتے اونگھتے پیڑ کی چھاؤں میں سو گئی

راہِ کہسار چڑھتی اترتی ہوئی دامنِ کوہ میں زہر بھرتی ہوئی
جیسے دھرتی کی ناگن بپھرتی ہوئی طیش میں آسمانوں کو ڈسنے چلی

اے مری تو تکلف سے بیگانہ ہے کیا کوئی اور بھی تیرا دیوانہ ہے
ایک میں ایک تو ایک ویرانہ ہے پھر یہ انداز کیوں اجنبی اجنبی!

تیرے پھولوں میں پہلی سی رنگت نہیں وہ ملاحت نہیں وہ صباحت نہیں
تیری آغوش آغوشِ جنت نہیں کیا ہوئی تیری معصوم دوشیزگی

لو وہ دھرتی کے شعلے بھڑکنے لگے آسمانوں کے سینے دھڑکنے لگے
پھر وہ آواز گونجی فضاؤں میں سُن کے جیسے نبضِ کہسار بھی تھم گئی

کوہساروں سے لاوے اُبلتے ہوئے مدبھری کونپلوں کو کچلتے ہوئے
دور کشمیر کے باغ جلتے ہوئے سامنے دیکھ پھولوں کی بے حُرمتی!

اے عروسِ ہمالہ تری چاہ میں منتظر ہے کوئی آج بھی راہ میں
زہر سا گھل رہا ہے شبِ ماہ میں کیا بہاراں کے آتے خزاں آگئی

کیسی نمناک آنکھوں سے دیکھا کئے وادیٔ ارضِ کشمیر کی چوٹیاں
میں تو روتا رہوں گا انہیں دیکھ کر تو بھی رو ساتھ اے کوہ زادِ مری

اِن حریفانِ صدق و صفا سے کہو قافلے والے منزل پہ بڑھنے کو ہیں
جو کبھی زورِ باطل سے دبتی نہ تھیں گرم ہے اُن صفوں میں لہو آج بھی

گیت :

ہرا بھرا بنگال

انور فرہاد

سنو سنو، اے دنیا والو، آج ہمارا حال
جب تک غیر کے بس میں تھے ہم، تب تک تھے کنگال
جب سے ہم آزاد ہوئے ہیں، تب سے ہیں خوشحال رے ساتھی — تب سے ہیں خوشحال
ہرا بھرا بنگال رے ساتھی — ہرا بھرا بنگال

آج ہے سب کے تن پر کپڑا، پیٹ میں سب کے بھات
گھر گھر خوشیاں ناچ رہی ہیں، رنج اور غم ہیں مات
ہرے بھرے ہیں کھیت ہمارے، جل تھل سارے تال رے ساتھی — جل تھل سارے تال
ہرا بھرا بنگال رے ساتھی — ہرا بھرا بنگال

بستی بستی ہر سو رونق، جنگل جنگل مہکے
ذرہ ذرہ جھم جھم چمکے، غنچہ غنچہ دہکے
اپنے دیس کی مٹی میں ہیں، ہیرے موتی لعل رے ساتھی — ہیرے موتی لعل
ہرا بھرا بنگال رے ساتھی — ہرا بھرا بنگال

دریا پر البیلے مانجھی، اپنا سینہ تانے
کھیت میں دھوپ سے چمکیں ہردم، موتیوں جیسے دانے
روز مچھیرے گھر سے نکلیں، ہاتھ میں لیکر جال رے ساتھی — ہاتھ میں لے کر جال
ہرا بھرا بنگال رے ساتھی — ہرا بھرا بنگال

لہراتے، بل کھاتے آنچل، کالے ناگ سے گیسو
شرمیلی آنکھوں سے جھانکے، اس بنگال کا جادو
سب الھڑ دوشیزاؤں کے، دہکے دہکے گال رے ساتھی — دہکے دہکے گال
ہرا بھرا بنگال رے ساتھی — ہرا بھرا بنگال

اُبھرے اُبھرے زندہ بازو، چوڑے چکلے سینے
جاگے جاگے ذہن ہیں سارے، آزادی کے زینے
دھرتی ماتا کے بیٹوں کی ہے متوالی چال رے ساتھی — ہے متوالی چال
ہرا بھرا بنگال رے ساتھی — ہرا بھرا بنگال

یہ نذرالاسلام کی دنیا، یہ خوابوں کا خواب
یہ ہے مدھر گیتوں کی وادی، یہ ماہِ شب تاب
یہاں بہار کھڑی رہتی ہے، سدا سنہرے ہال رے ساتھی — سدا سنہرے ہال
ہرا بھرا بنگال رے ساتھی — ہرا بھرا بنگال

افسانہ:

غزال

طاہرہ کاظمی

غزال آج پھر اداس ہو گیا تھا۔ اس کا لگایا ہوا سب سے پیارا پودا مرجھا گیا تھا۔ جانے اسے کیسا لگ رہا تھا۔ کھلونوں سے کھیلنا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ آج نہ اس نے چھوٹے چھوٹے گھر بنائے تھے نہ مشینیں نہ پل۔ نہ اس نے ریل گاڑیاں زمین پر دوڑائی تھیں اور نہ کالے کاغذوں پر پھول اور جانوروں کی تصویریں بنائی تھیں۔ اس کا دل بہت گھبرا رہا تھا اور بار بار آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔ یہ پودا مرجھا گیا! اب یہ کبھی زندہ نہیں ہو سکتا! اب اس میں کبھی پھول نہیں کھلیں گے!

غمگین دل اور اداس آنکھیں لئے ہوئے باہر آ گیا۔ باغ میں کتنے ہی پیڑ تھے۔ ہرے بھرے، شاداب! نیبو اور امرود کی ڈالیاں پھلوں کے بوجھ سے جھکی جا رہی تھیں۔ اونچے اونچے یوکلپٹس کے پیڑ تیز ہوا میں سر اٹھائے جھوم رہے تھے۔ کتنے سڈول، اور چمکیلے ہیں یہ پیڑ اور کتنے اونچے اور شاندار! سامنے لان پر دور دور تک سبزہ پھیلا ہوا تھا اور اس کے ادھر ادھر گلاب کے تختوں کی قطاریں۔ گل مہر کے یہ پیڑ گرمی کے شروع میں پیلے، سرخ اور گلابی پھولوں سے بھر جاتے ہیں۔ غزال نے ایک نظر ان پیڑوں پر ڈالی۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان میں آگ لگ گئی ہو۔ سامنے یہ سرو کی قطاریں، انار اور فالسے کے یہ درخت، جو موسم پر خوب پھل دیتے ہیں۔ برآمدے پر چھائی ہوئی یہ بوگن ویلیا کی بیلیں۔ اس نے مڑ کر پورچ کی طرف دیکھا۔ یہ سب، شیراز میاں نے لگائی ہیں۔ آم کے نیچے نیچے سایہ دار درخت، یہ تو شیراز میاں ہر فصل پر آٹھ سو روپے پر اٹھا دیتے ہیں۔ بس ذرا بور کی کونپلیں آئیں، پیڑوں پر جھومر سے لٹکے، اور کوئل ہوا کو کی کہ خریدار ٹوٹ پڑتے ہیں۔ باغ کے یہ سب پیڑ پھلوں اور پھولوں سے لدے ہوئے یہ تمام درخت۔ ایک ایک پودا شیراز میاں نے اپنے ہاتھ سے لگایا ہے۔ غزال اپنے آپ سے باتیں کرنے میں کھو سا گیا۔

جب سے غزال اس نئے گھر میں آیا تھا وہ بہت خوش تھا۔ اندر کے ایک کمرے میں شیراز میاں رہتے تھے۔ عمر ہو گی یہی کوئی ستر بہتر سال۔ انہی کا تو یہ مکان تھا۔ غزال کی ابھی صرف ساتویں سالگرہ ہوئی تھی، لیکن عمر کے اس تفاوت کے باوجود بھی شیراز میاں سے اس کی گاڑھی چھنتی تھی۔ غزال کو بھی پودے لگانے کا بہت شوق ہو گیا تھا۔ وہ جب اسکول سے واپس آتا تو راستے میں اُگے ہوئے چھوٹے چھوٹے خود رو پودوں پر نظر رکھتا۔ گھاس میں اُگا ہوا کہیں چھوٹا سا پپیتے یا امرود کا پیڑ نظر پڑا جھٹ اسے احتیاط سے اکھاڑ لیا۔ وہ پودے کے ساتھ ساتھ آس پاس کی نرم مٹی بھی اکھاڑ لیتا اور جڑوں کو مٹی سے ڈھک کر سارے راستے احتیاط سے مٹھی میں دبائے رہتا۔ اس طرح اب تک وہ کئی آم، جامن، ککروندے، پپیتے امرود اور گیندے کے پودے شیراز میاں کو پیش کر چکا تھا۔ پھر دونوں خوشی خوشی اسے کسی گملے یا کیاری میں لگا دیتے اور اس کے بڑے ہونے کا انتظار کرنے لگتے۔

باغ کے ہرے بھرے سایہ دار درختوں کے نیچے کاکل بھی اپنی دوستوں کے ساتھ گھنٹوں بیٹھی رہتی۔ کاکل تھی تو غزال سے کئی سال بڑی تب بھی اسے پیڑ بہت اچھے لگتے تھے۔ اور پھول تو اسے بہت ہی پسند تھے غزال نے سوچا۔ گلاب اور بنفشہ کے پھول، جوہی اور موگرے کے پھول! اور یہ بہت ہی خوبصورت کارنیشن، نسٹرشیم اور کریز نتھمم کے پھول، ان پر تو اس کی جان جاتی ہے۔ جب میں اس کو تتلیاں پکڑ کر دیتا ہوں تو تھوڑی دیر تک انہیں غور سے دیکھتی ہے پھر انہیں اڑا دیتی ہے۔ وہ کہتی ہے تتلیوں کو دیر تک نہیں پکڑے رہنا چاہئیے، ان کے پر گیلے ہو جاتے ہیں اور پھر وہ اڑ نہیں سکتیں۔ اور وہ یہ بھی کہتی ہے کہ ان کی زندگی صرف تین دن کی ہوتی ہے۔ ان کو جی بھر کے خوشبو سونگھ لینے دو، رنگ چرا لینے دو پھولوں کا رس پی لینے دو۔ اور ایک دن تو اس نے بہت ہی عجیب بات کہی۔ اس نے کہا کہ یہ پھول بھی ہماری طرح دھیرے دھیرے سانس لیتے ہیں اور جیسے

ہم لوگ خوشی سے ہنس پڑتے ہیں اسی طرح یہ پھول بھی سانس لے کر کھل جاتے ہیں۔ اور ایک بات تو اس نے اس سے بھی عجیب کہی تھی کہ پھول بھی رات کو بچوں کی طرح سو جاتے ہیں۔ شام کے بعد انہیں نہیں چھونا چاہیئے پھولوں کے بھی کہیں آنکھیں ہوتی ہیں کہ وہ بچوں کی طرح سو جائیں؟ لیکن کوئی بات ہے ضرور۔ شام ہی سے سب پھول ایک دوسرے پر جھکنا بند کر دیتے ہیں اور پیڑ بھی خاموش ہو جاتے ہیں۔ غزال سوچتا رہا۔

شیراز میاں جب بالٹی لے کر پودوں کو پانی دینے نکلتے تو ہاتھ میں کھرپی اور دوسرا برتن لئے ننھا غزال بھی ساتھ ہوتا۔ ان کا فی حصہ دونوں باغ میں صرف کرتے اور غزال پورے وقت شیراز میاں سے طرح طرح کے سوالات کرتا رہتا۔

"یہ پیڑ آپ نے کب لگایا تھا؟"

"کوئی تیس سال سے پہلے"

"تو اتنا بڑا لگایا کیسے ہوگا؟"

"پودا لگایا تھا اب اتنا بڑا ہو گیا ہے"

"پھر تھوڑے دنوں میں سب پودے اتنے بڑے ہو جائیں گے کیا؟"

"سب پودوں کی اپنی اپنی بڑھوار ہوتی ہے"

"بڑھوار کیا ۔۔۔؟"

"یعنی بڑا ہونے کی طاقت"

"تو یہ یوکلپٹس کی بڑھوار بہت ہے کیا؟"

"ہاں ۔۔"

"۔۔ اور سب پیڑوں میں پھول کیوں نہیں لگتے؟"

"کسی میں پھل لگتے ہیں کسی میں پھول!"

"پھل کیسے لگ جاتے ہیں؟"

"اللہ میاں لگا دیتے ہیں"

"اللہ میاں کہاں ہیں؟"

"بیٹا اللہ میاں تو ایک نور ہیں وہ نظر نہیں آتے"

"تو پھر پھل کیسے لگا دیتے ہیں!"

"اللہ میاں میں بڑی طاقت ہے۔ جو چاہتے ہیں وہی ہوتا ہے"

باتوں ہی کے دوران میں شیراز میاں پودوں کو پانی دیتے، سوکھے پتے کیاریوں سے نکالتے اور چھوٹی چھوٹی سوکھی شاخیں درختوں سے علیحدہ کرتے۔ کئی مالی ہونے کے باوجود یہ ان کا روز کا مشغلہ تھا کیونکہ اس سے ان کی تھوڑی سی کسرت ہو جاتی تھی۔

غزال کی امی نے کتنی دفعہ اسے سمجھایا تھا کہ تم انہیں شیراز میاں نہ کہا کرو، چچا جان کہا کرو لیکن غزال ہمیشہ انہیں شیراز میاں کہہ کر مخاطب کرتا۔ وہ اس پر بہت خوش ہوتے۔

ان دنوں نہ جانے کونسی آفت آ گئی تھی۔ غزال نے سوچا۔ کچھ پیڑوں پر ہری ہری اور پیلی پیلی سوتیاں سی پھیلتی جا رہی تھیں۔ اور پھر ان کی ہی میں ہری بھری شاخ سوکھ جاتی۔ دن بھر شیراز میاں اور غزال پیڑوں پر سے یہ بیلیں چنتے رہتے لیکن دوسرے دن اسی طرح کی بیل دوسری طرف پھیل جاتی۔ شیراز میاں کہتے۔ "یہ امربیل ہے امربیل۔ کسی دشمن نے جان کر ہمارے ہرے بھرے باغ میں ڈلوا دی ہے۔" وہ کہتے تھے یہ اتنی جلدی پھیلتی ہے کہ شام کو گرے اور صبح پوری شاخ پر پھیل جائے پیڑوں کے پتے جھڑ جاتے ہیں۔ ڈالیاں سوکھ جاتی ہیں اور پیڑ بالکل

سوکھا شگفتہ ہو جاتا ہے۔ لیکن شیراز میاں نے اپنے ہاتھوں سے ساری بیلیں چن دیں۔ ان سے اپنے بچوں کی طرح محبت کرتے ہیں۔ ان کے بچے تو پڑھ لکھ کر دور چلے گئے ہیں۔ ملازم ہوگئے ہیں۔ اور سب کی شادیاں ہوگئی ہیں۔ پھر شیراز میاں پیڑوں سے پیار نہ کریں تو اور کس سے کریں؟ اسی طرح دیکھ بھال کرتے ہیں اسی طرح حفاظت! گھر کے باہر سے جو اس ہرے بھرے باغ کو دیکھتا ہے اس کا دل ایک دفعہ تو ضرور ہی چاہتا ہے کہ کاش اس کی سیر کر سکیں! اور میں تو یہاں ہر وقت کھیلتا ہوں، گھومتا ہوں، اور پڑھتا بھی انہیں پیڑوں کی چھاؤں میں ہوں!

اب غزال نیبو کے ایک پیڑ کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اس نیبو کے پیڑ کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا اور چند لمحے بغیر پلک جھپکائے اس کو دیکھتا رہا۔ موتی ۔۔۔۔! اس نے سوچا! موتی کو میں نے اس پیڑ میں لا کر باندھا تھا۔

ہوا یہ کہ ایک دن اسکول سے واپسی پر اس نے ایک بہت پیارا چھوٹا سا کتا دیکھا۔ مہترانی کی لڑکی اس کو بڑی بے دردی سے مار رہی تھی۔ آ نے کہا

"اے۔ یہ کتا تم ہم کو دیدو"

"یہ بہت شیطانی کرتا ہے۔"

"ہم اس کو پال لیں گے۔ اسے مار مت"

بس اس دن گھر لا کر غزال نے اس کتے کی بہت خاطر مدارات کی۔ چھوٹا سا سفید پلا تھا جس کی دم کے پاس اور کان کے پاس بھورے دھبے تھے۔ اس نے روٹی نہ کھائی تو اپنے حصے کا دودھ اسے پلا دیا۔ زمین میں ایک مٹی کا برتن گاڑ کر اس میں پانی کا انتظام کیا گیا۔ جب ماسٹر صاحب کے آنے کا وقت ہوگیا تو جلدی جلدی ہوم ورک کیا گیا۔ جیسے تیسے پڑھنے اور پہاڑے گننے کے بعد پھر کتے کے پاس آموجود۔! ادھر کتا تھا کہ اجنبی جگہ پر گھبرا رہا تھا۔ اچک اچک کر بھاگنے کی کوشش کرے تو کبھی غوں غوں کر کے عجیب عجیب آوازیں نکالے۔ غزال لاکھ اسے بہلائے پچکارے، منہ سے منہ ملائے ۔۔۔ لیکن اس کی آواز ہی نہ بند ہو۔ رات ہوئی تو اس کے آرام کی فکر ہوئی۔ خانساماں کی کوٹھڑی کے ایک کونے میں اس کے سونے کا انتظام کیا گیا۔ اور امی سے فرمائش کی گئی کہ اس کا گدہ بستر تیار کر دیجیے۔ امی دن بھر کی گندگی سے گھبرا چکی تھیں اوپر سے اس کے بستر کی فرمائش۔ بولیں کہ اب صبح کے لئے اس کے سوٹ اور ٹائی بھی تیار کرا لو۔ کوئی کسر نہ رہ جائے! پھینک کر آؤ اس نجاست کی پوٹ کو ورنہ ابھی خانساماں سے پھنکواتی ہوں! اتنا بھولا بھولا کتا بھلا نجس کدھر سے ہوگیا! اور سامنے کے گھر والے لوگ بڑی اپنے اسپیشین کتے کی شیخی بگھارتے ہیں۔ میرا موتی بڑا ہو کر سب کو ہرا دے گا۔ اس کے تو اتنے بڑے بڑے بال ہیں اور اتنا خوبصورت منہ۔ اسپیشین سے بھی بڑا ہو جائے گا تھوڑے دن بعد ۔۔۔ انہی خیالات میں غزال کی رات گذری۔

خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ اب یہ مسئلہ پیش آیا کہ یہ اسکول ساتھ جائے یا گھر پر رہے! کاکل کی خوشامد کر کے ایک روئی کا کوٹ تو اس کو پہنوا دیا تھا۔ نہ اس میں آستینیں تھیں نہ گلا۔ بس کچھ جسم ڈھانکنے کو ہو گیا تھا۔ لیکن میں اس کو اسکول لے جاؤں گا تو وہاں بچے اسے ستائیں گے، ماریں گے ۔۔۔! کلاس میں بیٹھایا اور کہیں زینت آپا نے دیکھ لیا تو بہت ڈانٹ پڑے گی۔ اور کہیں جو اس نے غوں غوں کی آوازیں نکالیں تو شاید کلاس سے ہی نکالا پڑے! لہذا چار و ناچار پھر کاکل کے پاس پہنچا۔

"کاکل۔ میری ککو ذرا میرے موتی کو دیکھتی رہنا۔ تب تک میں اسکول سے آؤں!"

"مجھے بہت ضروری کام ہے۔ اب کہاں تک میں اس کتے کے بچے کی خدمت کئے جاؤں"

"دیکھو بس آج اور۔ کل تو پھر اتوار ہے!"

"۔۔ لیکن چھٹی ہوتے ہی فوراً گھر آنا!"

"فوراً۔! میری اچھی ککو۔ اور دیکھو وہ پیالی میں میں نے دودھ رکھ دیا ہے وہ اس کو دیدینا۔ اور ابھی خانساماں بکر قصاب کے یہاں سے لے لئے چھیچھڑے لاتا ہوگا۔ وہ سب بھی دیدینا"

"اے اتنا کھا کر کوئی ایک دن میں پلے سے کتا تھوڑا ہی بن جائے گا!"

"اچھا میں گیا، ڈیڑھ بجے تک آجاؤں گا۔"

"کیسے؟ چھٹی تو پونے بجے ہوتی ہے۔"

"ڈرامے کی پریکٹس نہیں کروں گا۔"

اور غزال میاں بستہ سنبھالتے اسکول کو روانہ ہوئے۔ کاکل کو وہ اتنا ستاتا تھا لیکن پھر بھی اسے اس کے بغیر چین نہ پڑتا تھا۔ کاکل کی آنکھ صبح سویرے غزال کی آواز سے کھلتی۔ یا تو وہ امی کو کلمۂ الحمد شریف سنا رہا ہوتا یا کوئی حمد گا رہا ہوتا۔ اگر تب بھی کاکل بستر میں کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرتی وہ بلی کی طرح اس کے بستر میں آگھستا اور اس کے اوپر کود تا پھاندتا، ٹھنڈے ٹھنڈے ہاتھ پیر اس کے لگا دیتا، اس کے بال کھینچتا اور کانوں میں ریل گاڑیاں چلا دیتا۔ وہ دھمکیاں دیتی، خوشامد یں کرتی، ڈانٹتی لیکن غزال کی شرارتوں میں کمی نہ آتی۔ اور وہ اسے اٹھا کر ہی دم لیتا لیکن وقت پر کاکل اس کے کتنا کام آتی تھی۔!

دو دن موتی کی آؤ بھگت میں گذرے۔ تیسرے دن موتی میاں نے نہ کچھ کھایا نہ پیا بس گھٹی گھٹی آواز میں پڑے غوں غوں کرتے رہے۔ غزال اسکول گیا ہوا تھا۔ اور موتی کے گلے کی رسی بہت تنگ ہو گئی تھی۔ اب امی سے برداشت نہ ہوا۔ اول تو اس کی کربناک آواز، اور پھر اس کے وجود کی بجاست اور اس سے کراہت۔ خاموشی سے بھنگی کے لڑکے سے کہیں دور بھیج کر کھلوا دیا۔ جب غزال آیا تو اس سے کہا کہ پلا اپنی ماں کے ساتھ اپنے گھر چلا گیا ہے۔ غزال کو یقین نہ آتا تھا۔ وہ تو موتی کو اتنا پیار کرتا تھا۔ وہ چلا کیسے گیا!

اور جس دن موتی گیا تھا اس دن بھی اسے ایسا ہی لگا تھا اس کا دل کھیل میں بھی نہیں لگا تھا۔ وہ نیبو کے اس درخت کو پکڑے دیر تک روتا رہا تھا۔ امی نے لاکھ سمجھایا کہ بڑا ہو کر وہ واپس آجائے گا اس کی ماں سے کہہ دیا ہے۔ اگر نہ بھی آیا تو اس سے اچھا کتا منگا دیں گے۔ اسے یہ ڈر تھا کہ دوسرے بڑے کتے اسے ستائیں گے اور ماریں گے۔ بڑی مشکل سے کاکل نے اس کو بہلایا تھا اور اندر لے جا کر اسے مٹھائی دی تھی۔

۔۔ میں کاکل کو کتنا ستاتا ہوں۔ اس کی نظموں کی کاپی پر کتے بلی بنا دیتا ہوں۔ اس کے پڑھنے میں شور مچا دیتا ہوں۔ اس کے ہاتھوں سے چیزیں چھین کر کھا لیتا ہوں، اسکے بال کھینچ لیتا ہوں۔ اسکے ربن اور چڑیا توڑ دیتا ہوں۔ ایک دن میں نے اسکی دونوں کو شمع جلا کر دکھائی۔ شمع جلانے میں بھی کتنا مزا آتا ہے۔ لال، ہرے، نیلے پیلے، رنگ کی خوبصورت شمعیں۔ سالگرہ کے لئے آئی تھیں۔ بھلا اس میں ڈانٹنے کی کیا بات تھی؟ بس میں نے یہی تو کیا تھا کہ شمع اس کی دوست کی کرسی کے نیچے رکھ دی تھی۔ کرسی نیچی تھی اور لو بید تک پہنچ رہی تھی۔ بس اسی بات پر سب کے سامنے مجھے ڈانٹنے لگی۔

لیکن اصل میں تو یہ مجھے بہت پیار کرتی ہے۔ ایک دن اپنی دوست سے کہہ رہی تھی کہ یہ غزال سوتے میں بالکل فرشتہ معلوم ہوتا ہے۔ جیسے شرارت بالکل آتی ہی نہ ہو۔ کتنے کتنے دن میرے بال نہیں کٹنے دیتی کہ میں ایسے ہی مڑے مڑے بالوں میں اچھا لگتا ہوں۔ یہ سب میں نے چھپ کر سنا تھا۔ اور جب کاکل کا دل چاہتا ہے تو مجھے کتنی اچھی اچھی انگریزی کی کہانیاں سناتی ہے، اچھے اچھے رسالوں سے تصویریں دیکھنے کو دیتی ہے۔ تب تو مجھے بھی کچھ لطیفے سنانے کا موقع مل جاتا ہے۔ اور میں بھی اسے اچھی اچھی باتیں یاد دلاتا ہوں۔ جب میں نے اس سے کہا کہ میں آگرہ کے درزی کو "ابو لولو" کہا کرتا تھا تو وہ بس خوب ہنسی۔ اور میں ڈریسنگ کرنے والے کمپاؤنڈر کو "تو ندو" کہا کرتا تھا۔ ان باتوں پر ہم لوگ خوب ہنستے رہے تھے۔

ایک دن صبح صبح غزال شیراز میاں کی طرف گیا تو وہ اپنے مصنوعی دانت نکال کر ان میں برش کر رہے تھے۔ غزال نے اس سے پہلے کبھی مصنوعی دانت نہ دیکھے تھے۔ لہٰذا وہ بت بنا ہوا بہت دیر تک یہ تماشہ دیکھتا رہا۔ اور جب شیراز میاں نے دانت واپس اپنے منہ میں لگائے تو اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ جب ذرا ہوش آیا تو الٹے پاؤں وہاں سے بھاگتا ہوا کاکل کے پاس پہنچا۔

"ارے ککو۔ ککو۔ غضب ہو گیا!"

"کیا مصیبت ہے کیوں صبح صبح شور مچا رکھا ہے؟"

"شیراز میاں اپنے دانت کھا گئے۔" (ہانپتے ہوئے) "میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا!"

"دانت کھا گئے؟ کیسے؟"

(باقی صفحہ ۵۸ پر)

بنگالی افسانہ:

"درد سے بھر نہ آئے کیوں"؟

علاء الدین الآزاد
مترجمہ: احمد سعدی

"تم جب واپس آؤ گے تو دیکھو گے، اس وقت تک شاید میں مر چکی ہوں گی اور تمہارے لگائے ہوئے کامنی کے پیڑ کے نیچے میری قبر ہوگی
یا پھر میں اتنی بدل چکی ہوں گی کہ مجھے بار بار دیکھنے کے بعد بھی تم پہچان نہ سکو گے۔"

کیا یہ حقیقت ہے؟ یا یہ کسی کے مغرور دل کی خود ساختہ مبالغہ آرائی ہے؟ تاریک گلی سے نکلنے کے بعد روشن سڑک پر بھاگتے ہوئے
رکشا پر بیٹھا ہوا انور مختلف خیالوں میں گھرا ہوا تھا اور اس کا دل اُمید و یاس کی امتزاجی کیفیت سے دھڑک رہا تھا۔

ریزینہ اب کیسی ہے؟ گزشتہ سات برسوں میں اس نے جتنے خطوط لکھے تھے، اس کا ایک ایک جملہ اسے زبانی یاد تھا۔ صبح ہو یا دوپہر
سہ پہر ہو یا شام، ان خطوط کو وہ اتنی بار پڑھ چکا تھا کہ وہ اس کے دل پر نقش ہو چکے تھے۔ ان خطوط کا ایک ایک لفظ اس کے لئے امرت کا قطرہ
تھا۔ باہر سے جب بھی اس کے پاس کوئی خط جاتا، کسی نامعلوم خوف کے احساس سے اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا تھا۔ نہ جانے کاغذ کا
یہ لفافہ کون سی خبر لے کر آیا ہے، ان خطوط کو وہ فوراً کبھی چاک نہیں کرتا، پہچانی ہوئی تحریر میں لفافہ پر پتہ لکھا ہوا دیکھ کر وہ اُسے الٹ پلٹ کر دیکھنے
کے بعد اپنے گالوں سے لگاتا اور پھر کمبل کی تہہ میں رکھ دیتا، اس کے بعد جب سہ پہر ڈھل جاتی اور تھوڑی دور پر چہچہاتے ہوئے پرندوں کی آواز
بہشتی نغمہ کی طرح سنائی دینے لگتی تو وہ دیوار سے ٹیک لگا کر شام کی نیم تاریکی میں لفافہ چاک کر کے کاغذ نکالتا، پہلے وہ پورا خط سرسری طور پر پڑھ
جاتا، اس کے بعد وہ بڑے غور سے نظریں جما کر ایک ایک لفظ کو پڑھتا تھا۔ یہ کس دیس کا انجانا نغمہ ہے؟ کسی پتھر کے دیس کی شہزادی نے جیسے
اپنی مقید رُوح کے تکلیف دہ احساسات اور جذبات کو محبت کے الفاظ میں سمو کر کنول کے پتے پر بکھیر دیا ہو۔

"اے جی، کیا لکھوں، میں تمہیں کیا لکھوں بتاؤ؟ قلم پکڑتے ہی میرے ہاتھ کانپنے لگتے ہیں، اپنے جذبات کو سمیٹ کر الفاظ کا جامہ پہنانے
کی قوت مجھ سے چھن چکی ہے۔" ریزینہ نے اپنے پہلے خط میں لکھا تھا ——— "اس رات جب وہ لوگ تمہیں لے گئے، ہم لوگ دروازے پر
جا کر کھڑے ہو گئے تھے اور تمہارے جوتے کی چاپ آہستہ آہستہ دُور ہوتی سنائی دی تھی۔ تم نے کیا پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھا تھا؟ میرا نام لے کر مجھے
بلایا تھا؟ میں بھاگ کر تمہارے پیچھے جانا چاہتی تھی، لیکن امی نے مجھے مضبوطی سے پکڑ لیا تھا، اس کے بعد مجھے خیال ہوا، نہیں یہ میرا وہم تھا۔
میں برآمدے میں واپس آ گئی، دیکھا تو چاروں طرف گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا، گھر میں گئی تو وہاں بھی ویرانی چھائی ہوئی تھی، میں نے اپنے دل میں
سوچا، ابھی ابھی تو اس میز پر روشنی کے سامنے بیٹھا ہوا کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا، ذرا سا برآمدہ میں جاتے ہی پتہ نہیں وہ نٹ کھٹ کہاں چھپ
لیا۔ پلنگ کے نیچے، الماری کے پیچھے یا باہر جا کر کامنی کے پیڑ کے قریب چھائی ہوئی تاریکی میں؟ مجھے پریشان کئے بغیر جیسے تمہارے دل کو
چین نہیں ملتا ہے۔ کیوں؟ اچھا، ٹھہرو، میں بھی تمہیں اس کا مزہ چکھاتی ہوں۔ اگر سیدھی طرح واپس نہیں آئے تو بستر پر جا کر چپ چاپ پڑی
رہوں گی، کوئی بات نہیں کروں گی، اپنے سینے سے نہیں لگاؤں گی، پھر دیکھوں گی تمہاری رات کیسے بسر ہوتی ہے۔ اتنی دیر تک خود کو میری
نظروں سے پوشیدہ رکھ کر تم مجھے پریشان کرنا چاہتے ہو؟ کل میں اپنے بال نہیں سنواروں گی، پیشانی پر ٹیکہ نہیں لگاؤں گی، جوڑے میں پھول
نہیں لگاؤں گی، اس وقت دیکھا جائے گا، کون خوشامد کرتا ہے!

دیکھا، کتنا نٹ کھٹ ہے، ابھی تک نہیں آ رہا ہے!

"کہاں گئے میرے پیارے، جلدی آجاؤ، دودھ گرم کر کے لے آئی ہوں، ٹھنڈا ہو جائے گا!" ــــ چینی مٹی کا پیالہ میز پر رکھ کر میں پھر با
آئی، دیکھو تو ذرا خواہ مخواہ مجھے کتنا پریشان کر رکھا ہے!

امی اس وقت تک نہیں سوئی تھیں، وہ باہر آئیں، مجھے آہستہ سے پکڑ کر بولیں ــــ "چلو تو ماں، گھر کے اندر چلو، جو کچھ ہونا تھا وہ
اتنا سوچو گی تو تمہاری صحت خراب ہو جائے گی، اب تم ایکلی بھی تو نہیں ہو؟"

میں حیران رہ گئی، میں نے کہا ــــ "یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ وہ کہاں ہیں؟"

"وہ واپس آجائے گا، اس وقت تم گھر کے اندر چلو" امی نے مجھے پکڑ کر بستر پر سلا دیا، میں نے تکیہ ٹٹول کر دیکھا، وہاں کوئی نہیں ت
میرا سر چکرانے لگا اور تمام جسم جیسے بے جان سا محسوس ہونے لگا۔

مجھے کس وقت نیند آئی یہ میں نہیں کہہ سکتی، پڑوسی کے مکان سے مرغ کی آواز اور صبح کی اذان سن کر جب میری آنکھ کھلی، اس وقت
واقعات میری نگاہوں کے سامنے آ گئے۔ میں نے اتنے دنوں تک اپنی زندگی کے ایام کو قہقہوں کی گونج میں گوندھ کر رکھا تھا، اب آنسوؤں
ایک لڑی میں پرو کر زندگی کا نیا باب شروع کر رہی ہوں، اب میں سمجھ چکی ہوں کہ اس کے بعد میری زندگی کا ایک ایسا باب شروع ہو رہا ہے
بڑھ کر ہمیں انجانی راہ پر انجانی منزل کی طرف چلنا ہو گا۔ میرے دل کے اندر یہ کیسی دھڑکن ہے؟ ہاں، کوئی چیز دھڑک رہی ہے۔ کبھی کبھی ک
چیز آہستہ آہستہ دھڑکنے لگتی ہے، تم میرے قریب نہیں ہو نا، شائد اسی لئے۔ ورنہ اب میں مصائب بھری راہوں سے قطعی خوفزدہ نہیں ہوا

اس کے بعد بھی ریزینہ نے اور بھی جانے کیا کچھ لکھا تھا، شاید سخت سست باتیں تھیں، اسی لئے سنسر افسر نے ان پر سیاہی پھیر د
لیکن پھر بھی انور نے اپنے دل کی تپش سے ان سطروں کے معنی اخذ کر لئے تھے۔ گو کہ یہ اخذ شدہ معنی تخئیلی تھے لیکن رُوحی فیضان بھی تو
کو کہتے ہیں؟

"ٹرنگ ٹرنگ" کرتا ہوا رکشا آگے کی طرف بھاگا جا رہا تھا، اس نے اپنے دائیں ہاتھ کے پھولوں کے ہار کو ایک بار سونگھنے کے بعد سا
نظر اُٹھا کر دیکھا، اسے اپنے دونوں طرف کے مناظر پُراسرار خواب کی طرح نظر آ رہے تھے۔ خواب نہیں تو اور کیا تھا؟ حسبِ معمول آج ب
نیند ٹوٹی تھی، لیٹے ہی لیٹے اس نے بلند چہار دیواری کے دوسری طرف ٹریفک کا شور سنا تھا، "کرشن چوڑا" کی ڈالی پر ایک دو پنچھی چہک
رہے تھے اور اوور ٹائم کا گھنٹہ بج رہا تھا، لیکن اُسے ذرا بھی اس کا احساس نہیں ہوا کہ آج کا دن ایک نیا دن ہے، اس وقت تک یہ خ
ایک خواب ہی کی طرح تو تھا۔ تب رہا یہ کہ یہ خواب اس خواب سے مختلف تھا، ورنہ جہاں ذرا سی ہوا کے لئے جنگلے کے قریب بیٹھنے کے
آپس میں کھینچا تانی ہوتی تھی، وہاں آج اس کی نگاہوں کے سامنے زمین و آسمان کی وسعتیں پھیلی ہوئی تھیں۔ شام ہونے سے تھوڑی دیر قبل
اس کی رہائی کا پروانہ آگیا تھا، اس وقت تک کے تمام واقعات اُسے محض مذاق معلوم ہو رہے تھے، لیکن جب دو سنتری آ کر اس کا
لپیٹنے لگے تو مزید شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ پھر بھی انہوں نے کہا کہ اُسے اسی وقت وہ جگہ خالی کر دینی ہو گی کیونکہ اب وہاں رہنے کا
اس سے چھن چکا تھا۔ اور یہ سب کچھ سن کر وہ جیسے ششدر رہ گیا تھا، یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟ جسم کے تمام خون کو سرد کر دینے والی د
طرح بلند چہار دیواری کے باہر جا کر اپنی رکی ہوئی سانس کو درست کرنے کے لئے اس کی روح کتنی ہی بار چیخ اٹھی تھی، لیکن اس وقت تو ا
نے تھوڑی دیر کے لئے بھی "لاک اپ" نہیں کھولا تھا۔

انور زور سے قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے اپنے ایک دوست کے سینے سے لپٹ گیا۔ تو گویا آج وہ سچ مچ آزاد ہے! اب اسے اور آ
آہستہ موت کے منہ میں نہیں جانا پڑے گا۔

اس نے جیل کے افسر سے تیار ہونے کے لئے آدھ گھنٹہ وقت لیا، لیکن وہ آدھ گھنٹہ کس طرح گذر گیا یہ وہ خود بھی نہیں بتا سکتا
اکیلے رہائی پانے کی کتنی خوشی ہوتی ہے! جو لوگ اب بھی چہار دیواری کے اندر پڑے ہوئے تھے، ان تمام دوستوں کے لئے اس کا دل
ملول ہو گیا، وہ ان سے کیا باتیں کرے؟ کون سی گفتگو چھیڑے؟ جیل سے باہر جا کر وہ ان لوگوں سے متعلق تمام حالات دوسرے لوگوں کو بتا

لیکن یہ تو نہایت معمولی سی تسلی تھی، پھر بھی اُسے بار بار یہی کہنا پڑا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وسیع و عریض دنیا سے بچھڑنے کے بعد دن بدن وہ لوگ گھلتے جا رہے تھے، پھر بھی وطن کا شباب انہیں لوگوں سے قائم تھا اور ان کی بیدار روح سے کبھی نہ بجھنے والا چراغ روشن تھا۔ مر جانے کے بعد بھی وہ ان لوگوں کی دوستی سے ہرگز انکار نہ کر سکے گا۔

اندھیرے اُجالے کے درمیان مختلف آوازیں سنتے ہوئے وہ جیل کے پھاٹک پر آکر کھڑا ہو گیا تھا، لوہے کے عظیم پھاٹک کے کھُلتے ہی کئی لڑکے آگے بڑھ آئے تھے، نعرہ لگاتے ہوئے، اور اُن میں سے ایک کے ہاتھ میں پھولوں کے کئی ہار تھے، تھوڑی دیر تک ایک دوسرے سے بغلگیر ہونے کے بعد جب ان لوگوں کے خلاف توقع آنے کی وجہ دریافت کی تو اُسے معلوم ہوا کہ وہ لوگ برابر اسی طرح جیل کے دروازے پر آکر کھڑے رہتے تھے۔ حکومت کی بدلتی ہوئی پالیسی کے پیش نظر کون جانے کب کس کو رہائی مل جائے۔ اور یہی وجہ تھی کہ آج بھی وہ لوگ اسی امید پر آکر کھڑے ہوئے تھے۔

اس کے بعد جب وہ رکشا پر چڑھ کر بیٹھ گیا تو بہت دنوں قبل کی جانی پہچانی دنیا کی انوکھی جھنکار اس کے کانوں میں سنائی دے رہی تھی، کتنی حیرت کی بات تھی! صرف ایک چہار دیواری کے اندر اور باہر کتنا بڑا فرق ہے! اس نے اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا تو اسے ہر چیز بدلی ہوئی نظر آئی۔

نواب پور لیول کراسنگ پر آکر رکشا رک گیا، ٹرین ابھی تک اسٹیشن کے قریب تھی، اس لئے وہاں پر تھوڑی دیر تک رکنے کو کھڑا رہنا تھا اور اس میں کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ انور نے دیکھا، تھوڑی دور پر فٹ پاتھ کے قریب ایک آدمی کے ہاتھ میں رنگ برنگے غبارے اور کاغذ کے پھول تھے۔ اُسے یکایک اپنے لڑکے کی یاد آگئی۔ پتہ نہیں وہ دیکھنے میں کیسا لگتا ہے۔ ریزینہ نے اس کی تصویر ضرور بھجوائی تھی، لیکن تصویر میں صرف چہرہ دیکھا جا سکتا ہے۔ آدمی کو نہیں، اس نے لکھا تھا — "ہسپتال میں داخلہ لیتے وقت بے حد خوف محسوس ہو رہا تھا، لوگوں کی زبانی جس بدانتظامی کا حال سن چکی تھی اس میں کوئی بھی حادثہ پیش آسکتا تھا، لیکن میری قسمت اچھی تھی، دونوں ہی صحت یاب ہو کر واپس آئے ہیں۔

اس کی دونوں آنکھیں بالکل تمہاری آنکھوں کی طرح ہیں، ویسی ہی خوبصورت اور چمکیلی۔ اُسے بار بار پیار کرنے پر بھی میرا جی نہیں بھرتا، ایک لمحہ کے لئے بھی اگر اسے دیکھ نہیں پاتی ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تمہیں بھلا بیٹھی ہوں اور تمہیں بھلا دینا تو میری موت کے مترادف ہے۔ جب تم میرے قریب نہیں تھے تو کبھی کبھی میرے دل کے اندر ایک تہلکہ سا مچ جاتا، لیکن اب اس کے نازک و نرم چھوٹے سے چہرہ کو دیکھ کر یاس آمیز لمحوں میں بھی تھوڑا سا سکون محسوس کرتی ہوں۔"

اس خط میں ریزینہ نے مزید یہ بھی لکھا تھا — "میرے دن کس طرح گزر رہے ہیں، تم نے یہ جاننے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ اگر نہ جانتے تو کیا کوئی حرج تھا؟ اچھا تو پھر سنو، ہم لوگوں کے کھانے یا پہننے کے لئے تمہارے وقار کو ذرا بھی ٹھیس لگے یا تمہارا سر نیچا ہو، ایسا کوئی کام میں نے ابھی تک نہیں کیا ہے، کسی شریف آدمی نے پہلے مہینہ میں اپنا نام پوشیدہ رکھ کر ایک لڑکے کی معرفت کچھ روپیہ بھجوایا تھا، لیکن اپنا صحیح تعارف نہ کرانے کی وجہ سے میں نے وہ روپیہ لوٹا دیا۔ ممکن ہے وہ صاحب تمہارے کوئی بہی خواہ دوست ہوں، پھر بھی مجھے اطمینان نہیں ہوا۔ ہسپتال جانے سے قبل ابا نے بڑے بھیا کو مجھے یہاں سے لے جانے کے لئے بھیجا تھا لیکن میں نہیں گئی بلکہ میں نے اور بھی سخت سست باتیں کہلا بھیجیں۔ ان لوگوں نے تمہاری تذلیل کی تھی، یاد نہیں ہے؟ اس بات کو میں اتنی آسانی سے بھول جاؤں گی؟ وہ میرے یہاں آئے یہی کیا کم بے شرمی تھی! اس پر بڑی بڑی باتیں بنا رہے تھے، کہہ رہے تھے، تمہیں ایک دن ان مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا یہ بات پہلے ہی سے معلوم تھی اور اسی لئے ہم لوگ اس شادی کے خلاف تھے۔ غصہ کے مارے میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے، حالانکہ وہ میرے بڑے بھائی تھے پھر بھی میں نے سخت و سست باتیں کہہ کے انہیں گھر سے باہر کر دیا۔ انہیں ایک موقع مل گیا ہے، لیکن وہ ایسی بات کیوں کہیں — کیا میں ان کے پاس ایک مٹھی چاول مانگنے گئی تھی؟ کپڑے کی فرمائش کی تھی؟ اگر نہیں تو پھر ان کے دل میں یہ خیال آیا کیسے؟"

رکشا پر بیٹھے بیٹھے یادوں کے دیئے جلانے میں اُسے بڑی راحت مل رہی تھی اور اس کے دل کو یک گونہ سکون حاصل ہو رہا تھا۔ یہی یادیں قید کے ایام میں بھی اس کے سامنے قطبی ستارہ کی طرح جھلملاتی رہی تھیں۔

"سن کر خفا تو نہیں ہو گے نا؟ اچھا تو پھر بتاتی ہوں۔ کان کی ایرنگ اور گلے کی زنجیر کو چھوڑ کر باقی تمام زیورات میں فروخت کر چکی ہوں

اپنی عزت اور اپنا وقار کھو کر ان چیزوں کے رکھنے سے کیا فائدہ ہوتا، تم ہی بتاؤ؟ بچے کی پیدائش سے دو ماہ قبل اور اس کے بعد کئی ماہ اسی روپے سے بڑے آرام سے کٹ گئے۔ اسی درمیان گرلز انسٹی ٹیوٹ میں مجھے ٹیچر کی ملازمت مل گئی ہے، اس کے علاوہ تمہارے کہنے کے مطابق صمد نے مجھے ایک ٹیوشن بھی دلا دی ہے۔ اب مجھے پیسوں کی کوئی فکر نہیں ہے۔ صرف تمہاری اور کھوکن کی فکر ہے۔ دن اور رات کے درمیان دس گھنٹے تک مجھے گھر سے باہر رہنا پڑتا ہے اور اس عرصے میں میرا دل جیسے کھویا کھویا سا رہتا ہے"

پسنجر ٹرین کھٹ پٹ کی آواز بلند کرتی ہوئی لوہے کی پٹریوں پر پھسلتی ہوئی لیول کراسنگ سے گزر گئی اور رکشا پھر آگے کی طرف بھاگنے لگا۔

شاہراہ کو چھوڑ کر جب رکشا اس کی جانی پہچانی ہوئی گلی میں داخل ہوا تو ایک انجانی مسرت سے اس کے جسم کے تمام تار جھنجھنا اٹھے۔ سڑک پر بجلی کے لیمپ کی چمنی کے اندر سرخی مائل لو جل رہی تھی۔ شکستہ اونچی نیچی سڑک پر چلتے ہوئے رکشا بار بار ہچکولے کھا رہا تھا، لیکن اس طرف اس کا کوئی دھیان نہیں تھا۔ اسے اپنے دل کے اندر سے ایک ہی گونج سنائی دے رہی تھی، وہ لوگ کیسے ہیں؟ ریزینہ کیسی ہے؟ اور کھوکن؟ امی شاید جائے نماز پر بیٹھی ہوئی تسبیح کے دانوں کو گن رہی ہونگی۔

ان لوگوں کے ساتھ امی بھی تھیں۔ اسی امید اور ڈھارس کے سہارے جیل جا کر بھی اس کا دل بھرے ہوئے دریا کی طرح پرسکون تھا۔ پیدائش کے بعد سے لے کر چوبیس سال کی عمر تک انھوں نے اس کی دیکھ بھال کی تھی، سخت سے سخت مصیبت میں بھی ان کی شفقت بھری شخصیت اس کے سامنے امید اور اعتماد کے ساتھ آکھڑی ہوتی تھی اور اسے کبھی نا امید نہ ہونے دیتی تھی۔

ریزینہ تقریباً اپنے ہر خط کے آخر میں یہ ضرور لکھتی — "امی کے لئے فکر نہ کرو، وہ خیریت سے ہیں"

لیکن انور جانتا تھا کہ اس خیریت سے رہنے کے کیا معنی ہیں، جو لڑکا ان کے بڑھاپے کا آخری سہارا ہو جب وہ بھی قریب نہ ہو تو انکی زندگی کیسی گزر رہی ہوگی اس کا اندازہ بڑی آسانی سے لگایا جا سکتا ہے، لیکن اس سے زیادہ کچھ اور نہیں۔ ورنہ دکھ اور درد سے ان کا دل ٹکڑے ٹکڑے کیوں نہ ہو جائے وہ اس کا اظہار کبھی نہیں کرتی تھیں۔ ان کا دل اندر سے محبت کے جذبے سے معمور اور بے حد کمزور تھا، لیکن ان کے چہرے سے اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ ان کی یہ حالت آج سے بارہ سال قبل سے ہو گئی تھی، جب اس کے والد کا انتقال ہو گیا تھا اور وہ عین عالم شباب میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ آج اچانک اسے دیکھ کر وہ کیا کریں گی؟ کہیں زور سے پھوٹ پھوٹ کر رونا تو نہیں شروع کر دیں گی؟

اور ریزینہ؟ وہ تو اتنی جذباتی ہے کہ پہلے تو یقین ہی نہیں کرے گی۔ سوچے گی کہ یہ اس کی نظر کا فریب ہے، لیکن چند لمحوں کے بعد جب اسے اس کا یقین آجائے گا کہ جو کچھ وہ دیکھ رہی ہے وہ ایک بے حجاب حقیقت ہے تو شاید وہ اسی لمحہ بے ہوش ہو جائے گی۔ بے ہوش نہیں ہوگی! پندرہ دن قبل اس نے جو خط لکھا تھا، اس میں نہ تو پہلے جیسی تابناکی تھی اور نہ اس کے جذبات میں آگ کے شعلے جیسی تپش اور چمک تھی، صرف فریادیں تھیں، زندگی سے فراریت تھی، اب وہ صبر و ضبط کی انتہائی منزل پر پہنچ چکی ہے اس میں کوئی شک نہیں۔ بہت ساری باتیں لکھنے کے بعد اس نے لکھا تھا— "اتنے سارے لوگ رہا ہو رہے ہیں، لیکن تمام سختیاں کیا تمہارے ہی لئے ہیں؟ اوہ، اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا، نہیں ہوتا، نہیں ہوتا، نہیں ہوتا، میرے سامنے اب زندگی کے ہنگاموں کی کوئی قیمت نہیں ہے، اس طرح گھل گھل کر مرنے کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ کھوکن اب صرف کھوکن ہی میری زندگی کا واحد بندھن ہے، ورنہ میں بستر پر لیٹی ہوئی تمہارے متعلق سوچتے سوچتے کسی دن مر چکی ہوتی، لیکن اس وقت اگر میں اس طرح ہمت ہار بیٹھوں گی اور اگر مجھے کچھ ہو گیا تو اسے گود میں لے کر کون کھلائے گا؟ کون اسے دودھ پلائے گا؟ کون پیار کرے گا؟ میرا جادو رو رو کر مر نہیں جائے گا؟ اور تمہارے متعلق پھر کون سوچے گا؟ اگر تم کسی دن واپس آ گئے تو تمہاری دیکھ بھال کون کرے گا؟ تمہارے ساتھ محبت سے کون پیش آئے گا؟

"سچ مچ میں بھی کتنی عجیب ہوں! اس قدر بے قرار ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے، جس طرح بھی ہو مصیبتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے مجھے اپنے آپ کو مستعد کرنا چاہیئے، ورنہ پھر اس دنیا کا کام کیسے چلے گا؟ اب یہی کوشش کروں گی، دیکھوں اس میں مجھے کہاں تک کامیابی ہوتی ہے!"

رکشا کا ایک پہیہ نالے میں گرتے گرتے پھر اوپر راستے پر آگیا۔ انور نے دیکھا، وہ کھمبے کے قریب ٹھیک اسی جگہ پہنچ چکا تھا جہاں

اس کے گھر کا دروازہ تھا۔

شام کے بعد ابھی رات کی پہلی پہر ہی شروع ہوئی تھی، لیکن گھر کے اندر سے نہ تو کسی کی آواز سنائی دے رہی تھی اور نہ کسی قسم کا شور۔ گھر کے اندر روشنی بھی ہو رہی تھی یا نہیں، باہر سے یہ بھی نہیں معلوم ہو رہا تھا۔

لیکن یہ بھی تھا کہ گھر کے اندر ابتک کوئی نہیں سویا تھا۔ کمرے کا دروازہ بند کرکے امی بستر پر کروٹ کے بل لیٹی ہوئی تھیں اور کھوکن میز پر جلتی ہوئی بتی کی روشنی میں بیٹھا ہوا کوئی مصور رسالہ الٹ پلٹ کرکے دیکھ رہا تھا۔ امی اپنی دونوں اداس آنکھوں کو بند کئے سوچ رہی تھیں کہ آج سہ پہر سے ان کی بے چینی کیوں بڑھ گئی ہے؟ گھر کے چھوٹے موٹے کام کرتے ہوئے ان کا دل یکایک سخت مضطرب ہو اُٹھا تھا اور نماز کے بعد مناجات پڑھتے وقت بے اختیار رونے کو دل چاہ رہا تھا، مگر انھوں نے تھوک نگل کر بڑی مشکلوں سے اُمنڈتے ہوئے آنسوؤں کو پی لیا تھا۔ آج انہیں اپنی زندگی کے تمام واقعات بھی یکے بعد دیگرے یاد آ رہے تھے، اس کے معنی یہ تو نہیں کہ اب ان کی موت کے دن قریب آگئے ہیں؟ وہ مرنے سے ڈرتی نہیں تھیں اور نہ تو کوئی عذر یا بہانہ کرنا چاہتی تھیں، لیکن ابھی وہ کچھ دنوں تک زندہ رہنا چاہتی تھیں۔ صرف انور کے واپس آجانے تک زندہ رہنا چاہتی تھیں۔

"میں اپنے انو کو ایک بار دیکھے بغیر نہیں مر سکتی" خیالوں میں کھوئی ہوئی وہ بڑبڑانے لگیں اور ٹھیک اسی وقت دروازے کی زنجیر کھٹکھٹانے کی آواز سنائی دی۔

کون بلا رہا ہے؟ اس وقت کون آیا ہے؟ یہ زنجیر بھی کتنی قسم کے فریب جانتی ہے، اس قسم کی آواز سن کر کتنی ہی بار وہ دوڑ دوڑ کر گئی ہیں، لیکن دروازہ کھولنے کے بعد ہر مرتبہ انہیں مایوس ہوکر لوٹنا پڑا ہے۔

باہر تاریکی پھیلی ہوئی تھی، لالٹین ہاتھ میں لے کر انھوں نے کہا ــــ "دادو، تم ذرا بیٹھو، کیوں؟ دیکھوں کون آیا ہے، روشنی کے بغیر تمہیں ڈر تو نہیں لگے گا؟"

"نہیں" کھوکن نے دادی کی ساڑی سے اُلجھتے ہوئے کہا ــــ "میں بھی "داؤں" گا۔"

"اچھی بات ہے، تم بھی چلو۔"

"مجھے گود میں لے لو، ورنہ نہیں "داؤں" گا۔"

اب کے دادی نے ہنستے ہوئے کہا ــــ "بوڑھے ہوگئے ہو لیکن اب بھی گود میں چڑھنے کا شوق نہیں گیا، اتنی دور اپنے پیروں سے چل کر نہیں جاسکتے؟"

کھوکن نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموشی سے دادی کی گود میں چڑھ کر پلکیں جھپکانے لگا، اور دروازے پر زور زور سے زنجیر کھٹکھٹانے کی آواز سنائی دینے لگی۔

اس نے جلدی سے جاکر دروازہ کھولا، دیکھا باہر ایک آدمی کھڑا ہوا تھا، اس کے سر کے بال چھوٹے چھوٹے تھے، پچکے ہوئے گال اور سوکھے ہوئے چہرہ پر دو آنکھیں چمک رہی تھیں، اس کے ہاتھ میں پھولوں کے ہار تھے اور وہ کھڑا ہوا دھیرے دھیرے ہنس رہا تھا۔ اس کا چہرہ جانا پہچانا معلوم ہو رہا تھا، لیکن اُسے کہاں دیکھا تھا امی یہ فیصلہ نہ کرسکیں۔ انھوں نے رک رک کر پوچھا ــــ "آپ کون ہیں بابا، کس کو تلاش کر رہے ہیں؟"

وہ زور سے ہنس پڑا، اس کے بعد وہ چوکھٹ کے قریب آگیا اور لڑکے کی طرف دیکھ کر بولا ــــ "یہ کون ہے؟"

"یہ بتا کر کیا ہوگا بابا، یہ میرا پوتا ہے، میری کانی آنکھوں کا پانی، میرے خاندان کا چراغ" کہتے کہتے ان کی آواز گلوگیر ہوگئی۔

"سچ؟ دیکھوں، دیکھوں تو" انور نے جھپٹ کر کھوکن کو اپنی گود میں لے لیا اور بے تحاشہ اس کے چہرہ اور آنکھوں کو چومنے لگا۔ اور لڑکا پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

امی نے اپنے حواس درست کر کے پھر پوچھا ـــــ "آپ کون ہیں بابا؟"

انور کا دل جذبات سے مغلوب ہو کر بری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ نہیں، پہلے اُسے کس قدر خوف محسوس ہو رہا تھا، لیکن سات سال تک قید میں رہنے کے باوجود اس نے اپنا دل نہیں کھویا تھا۔

"اس کے باپ کی کوئی خبر معلوم ہے؟" انور نے امی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

"کہاں، نہیں تو؟" امی یکایک جیسے بدحواس سی ہو گئیں، انھوں نے پوچھا۔ "کیا ہوا ہے بابا، میرے انور کو کیا ہوا ہے؟"

"ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔" انور نے جواب دیا ـــ "آج وہ رہا ہو گیا ہے!"

ماں کے لئے اس سے بڑھ کر خوشی کی خبر اور کیا ہو سکتی تھی، لیکن انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے یکایک ان کے سر پہ بجلی گر پڑی ہو، ان کی آنکھوں کے حلقے پھیل گئے اور وہ بری طرح ہانپنے لگیں، انھوں نے کہا۔ "نہیں، نہیں، یہ نہیں ہو سکتا، کیا اس دنیا میں کوئی ایسا بھی موجود ہے جو میرے "بانچا" کو رہا کر دیگا؟ نہیں، نہیں۔ مجھے یقین نہیں آتا۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں، ناقابلِ یقین بات ہی ہے، لیکن کبھی کبھی حادثات تو ہوتے ہی رہتے ہیں، اسی لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ بالکل سچ ہے کہ آپ کا لڑکا رہا کر دیا گیا ہے۔" انور نے امی کے آمنے سامنے کھڑے ہو کر کہا ـــ "لالٹین کو اور ذرا اونچا کر کے دیکھئے تو سہی کہ میں کون ہوں؟"

یکایک ان کے تمام جسم میں زوروں کی لرزش ہونے لگی اور انھیں محسوس ہوا جیسے خواب دیکھتے دیکھتے ان کی آنکھ کھل گئی ہو، لالٹین کو اوپر اٹھاتے وقت ان کا دایاں ہاتھ بری طرح کانپ رہا تھا، ان کی یہ حالت چند ہی لمحوں تک رہی، حیرت و استعجاب بھری نظروں سے تھوڑی دیر تک وہ اس کے چہرے کو دیکھتی رہیں، اس کے بعد انھیں ایسا محسوس ہوا۔ جیسے ان کا ہاتھ شل ہو گیا ہو۔ وہ لالٹین کو زمین پر ٹیک کر خود ہی بیٹھ گئیں۔ اور بہت ہی کمزور آواز میں بولیں۔ ـــ "آ نو بابا، تو آ گیا! اچھا ہی ہوا۔ مجھے ذرا سنبھال کر لے چل اور بستر پر سلا دے۔"

"آپ کو کیا ہو گیا امی؟"

"کہاں، کچھ بھی تو نہیں ہوا" اپنا جھکا ہوا سر اوپر اٹھا کر انھوں نے کہا ـــ "دیر نہ کر، مجھے سنبھال کر پکڑ لے اور بستر پر سلا دے"

لالٹین کو امی کے چہرے کے قریب لا کر اس نے دیکھا، ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی، وہ بالکل خاموش تھیں، ان کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔

"آپ کیوں رو رہی ہیں؟ اب تو میں واپس آ گیا ہوں۔" بستر پر لٹا دینے کے بعد انور ان کی پیشانی کو ہات سے سہلانے لگا۔

"میرا دماغ ٹھیک ہی ہے رے، ٹھیک ہی ہے، سات سال تک میں صرف اس خیال سے اپنے آنسو پیتی رہی ہوں کہ اس سے تمہاری بدسلوکی ہوگی، اب جبکہ تو واپس آ گیا ہے تو کیا میں اب بھی نہ روؤں؟ مجھے رونے سے نہ روک، آج مجھے رونے دے، مجھے جی بھر کر رو لینے دے" امی کروٹ بدل کر بڑبڑانے لگیں ـــــ "بدقسمت اب تک وہاں کیا کر رہی ہے؟ چلی کیوں نہیں آتی؟"

برآمدے میں داخل ہوتے ہی جب اُسے رضیہ کی موجودگی کی کوئی علامت نظر نہ آئی، تو انور دل ہی دل میں سخت متفکر ہو گیا۔ وہ اس وقت گھر میں نہیں ہے، یہ سمجھنے میں اُسے کوئی دشواری پیش نہیں آئی، لیکن وہ گئی کہاں، یہ قیاس کرنے سے وہ قاصر تھا۔ لیکن امی کی بات یاد آتے ہی اس کے دل کو سکون مل گیا، وہ ضرور اپنے کام پر گئی ہوئی ہے۔ یہ اس کی ٹیوشن کا وقت بھی تو ہو سکتا ہے؟

اور اسی محلے کی ایک گلی میں ۳۰ نمبر مکان کے ایک کمرہ میں میز کے قریب بیٹھی ہوئی طالبہ کے لئے ریاضی کا سوال حل کرتے ہوئے رضیہ بے چینی محسوس کر رہی تھی، میرا سر کیوں چکرا رہا ہے! پانچ بجے شام تک اسکول میں چیختے رہنے کے بعد ٹیوشن کرنا بھی ایک جھنجھٹ ہی ہے، لیکن ٹیوشن کرنے کے سوا چارہ بھی کیا تھا! ٹیوشن کے روپیہ سے کم از کم گھر کا کرایہ تو ادا ہو رہا تھا ورنہ اسکول کی تنخواہ سے تمام اخراجات کس طرح پورے ہوتے۔

اسے اپنے کان بجتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ رضیہ نے میز پہ رکھے ہوئے اپنے دونوں ہاتوں پر اپنا سر ٹیک کر دیا۔

رشیلہ نے پوچھا ـــ "کیا ہوا آپا؟"

"میرا سر سخت درد کر رہا ہے" لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے ریزینہ نے جواب دیا ــــــ "ایک گلاس پانی لے آؤ، میں تم لوگوں کو آج نہ پڑھا سکوں گی اب میں چلی جاؤں گی"۔

اور تھوڑی دیر بعد وہ اسی گھر کے نوکر کو ہمراہ لے کر راستے پر چلتے ہوئے سوچنے لگی "میرا دل کیوں گھبرا رہا ہے؟ کھو کن نے رونا دھونا تو شروع نہیں کر دیا ہے؟ وہ ٹوٹی پھوٹی ناہموار سڑک پر سنبھل سنبھل کر قدم بڑھاتی ہوئی تیزی سے گھر کی طرف چلنے لگی۔

"یہی میرا گھر ہے، یہ میری تصویر ہے" سونے کے کمرہ میں جا کر پلنگ پر بیٹھتے ہی انور کے دل میں یادوں کے چراغ جل اٹھے۔ "میرج رجسٹریشن" کے دفتر سے باہر نکلنے کے بعد اسی شام ان دونوں نے شادی کے کپڑوں میں ایک ساتھ تصویر کھنچوائی تھی۔ اور اس دن کے وہ چند لمحے امٹ ہو کر رہ گئے تھے۔ ریزینہ کے حسین چہرے پر شرمیلی مسکراہٹ کی لکیریں اور اس کے اپنے چہرے پر فتح مندوں جیسی شان جھلک رہی تھی، لوگوں کا کہنا ہے کہ پرمسرت لمحے بہت جلد گزر جاتے ہیں، جھرنے کے دھارے کی طرح رواں رواں ہوتے ہیں، وہ اپنے پیچھے صرف چند بلبلے چھوڑ جاتے ہیں، کیا یہ بات سچ ہے؟ پھر ان تمام راتوں کے واقعات اُسے کیوں یاد آ رہے تھے؟

"میں آج کسی شہزادی کی طرح خوش ہوں" اسی بستر پر لیٹی ہوئی، پیار سے اس کے بالوں سے کھیلتی ہوئی ریزینہ نے سرگوشی کے لہجہ میں کہا تھا ـــــــ "اندھیرے سے تم مجھے روشنی میں لے آئے ہو، میں زندگی بھر اس کے لئے تمہاری احسان مند رہوں گی"

"لیکن میں نے تمہیں دیا ہی کیا ہے؟" اس کے ہاتھ کو اپنی مٹھی میں دبا کر انور نے گمبھیر لہجے میں کہا تھا۔

"تم نے مجھے سب کچھ دے دیا ہے" ریزینہ نے جواب دیا تھا ــــــ "اب اگر میں اپنی آنکھیں بند کر کے مر بھی جاؤں تو بھی میری زندگی کامیاب ہی کہلائے گی، میں ایک تیلی کی مانند تھی، تمہارے ہاتھوں نے مجھے زندگی بخشی ہے، اور اب یہ زندگی بھی تمہارے ہی ہاتھوں میں ہے، تم محب وطن رضاکار ہو، وطن کے لئے کام کر رہے ہو، میں تمہارے کاموں میں رکاوٹ پیدا نہیں کروں گی، اپنی دنیا میں خود بنا لوں گی، لیکن ایک بات ہے، میں کسی بھی حالت میں تمہارا اعتماد کھونا نہیں چاہتی"۔

"یہ خیال تمہارے دل میں کیسے پیدا ہوا؟"

"یہ خیال کیسے پیدا ہوا، اس کی وجہ تم بھی جانتے ہو" تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد ریزینہ نے کہا تھا ــــ "میں نے اپنے والدین کو ٹھکرا دیا ہے، ان کے خیال میں خاندان کے لئے میں کلنک کا ٹیکہ ہوں، اور یہ تو تم بھی جانتے ہو کہ صرف بڑے بڑے حاکم ہی نہیں اور بھی بہتیرے مجھ سے شادی کرنے کے خواہشمند تھے، لیکن میں نے کسی کو بھی اہمیت نہیں دی، اس لئے میرے دشمن بھی بہت ہیں، کسی کی لگائی بجھائی کی وجہ سے تمہارا اعتماد کھو دینا میرے لئے موت کے مترادف ہوگا"۔

انور نے اُسے اپنے سینے سے لگا کر کہا تھا ــــ "اگر ہم دونوں ٹھیک ہیں، تو دشمن کیا کریں گے؟ ڈرنے کی کوئی بات نہیں"۔

اور آج وہ اپنے دل کا جائزہ لے کر دیکھ رہا تھا کہ اس سات سال کی علیحدگی کے باوجود اس کے دل میں ایک بار بھی اس کے چال چلن سے متعلق کوئی شک یا شبہہ پیدا نہیں ہوا تھا۔

تھوڑی دیر تک وہ بڑی محویت سے اپنی شادی کی تصویر کو دیکھتا رہا، اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس روز کے چند پرمسرت لمحوں اور آج کے درمیان کوئی خلا پیدا نہیں ہوا تھا، ان تمام لمحوں میں ایک تسلسل تھا، تمام لمحے ایک دوسرے کے ساتھ مربوط تھے۔

"جس دن میں نہیں رہوں گی تم کس طرح زندہ رہ سکو گے؟ ممکن ہے اس وقت تم کسی جیل کی پتھریلی دیوار کے اندر پڑے ہو گے، مہینوں بعد کہیں تمہیں یہ خبر ملے گی کہ میں مر چکی ہوں" ریزینہ نے کہا تھا ــ "تمہارا دل خواہ غم سے ٹکڑے ٹکڑے کیوں نہ ہو جائے، پھر بھی تمہیں ایک دن کے لئے بھی رہائی نہ مل سکے گی، اور ہر میری قبر موسم سرما میں جھڑتے ہوئے پتوں سے ڈھک جائے گی اور ہر صبح گھاس پر شبنم کے قطرے موتیوں کی طرح جھلملاتے ہوئے نظر آئیں گے، لیکن تم کچھ بھی تو نہ دیکھ سکو گے، اس کے بعد آندھی اور بارش میں آہستہ آہستہ میری قبر دبتے دبتے زمین کے برابر ہو جائے گی اور شاید اس کا کوئی نشان بھی باقی نہ رہے گا"۔

اس وقت کیا میں تمہیں یاد آؤں گی؟ تمہیں یاد آئے گا کہ بارش میں بھیگی ہوئی ایک شام کو تمہارے ساتھ میری پہلی ملاقات ہوئی تھی؟ تم بارش میں بھیگنے کے ڈر سے ہماری بیٹھک کے اندر آ گئے تھے، مجھے اس کی کوئی خبر نہیں تھی، جب بارش ہوتی تو مجھ پر ایک سرور انگیز کیفیت چھا جاتی تھی، ایسا محسوس ہوتا جیسے میرے خون کا ایک ایک قطرہ نشے میں مخمور ہو گیا ہو۔ سیڑھیوں پر سے اترتے ہوئے، کسی گیت کا ایک بند گنگناتی ہوئی پتہ نہیں کس ضرورت سے میں اوپر کی منزل سے نیچے آئی تھی، میں سمجھ رہی تھی بیٹھک میں کوئی بھی نہیں ہے، اسی لئے کھلے سر میں بے پروائی سے بیٹھک میں داخل ہو گئی تھی اور وہاں تمہیں دیکھ کر چونک اٹھی تھی، لیکن اس سے پہلے ہی تمہاری دونوں چمکیلی آنکھوں کی گہرائی میں میری آنکھوں کی پتلیاں سما گئی تھیں۔ کیا کبھی تمہیں یہ سب کچھ یاد آئے گا؟"

اور یہ حقیقت تھی کہ انور سائنٹفک طور پر بھی اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا کیا انسانی زندگی کی ایک دوسرے سے وابستگی بھی معرفت کی گہرائی کی طرح اسرار و رموز میں پوشیدہ ہوتی ہے؟ اس روز بارش میں نہائی ہوئی شام کو اس کی شام ترحقیقت ایک تیز اور شدید جلن میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اس گھر میں وہ پہلے کبھی نہیں گیا تھا، لیکن اس وقت اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ کمرہ، دیوار پر ٹنگی ہوئی تصویر، کتابوں کا شیلف، میز، کرسی اور پھولدانی اس کی بہت دنوں کی جانی پہچانی ہو، جیسے اس کمرے میں جنگلہ کے قریب بیٹھ کر رات کی رانی کی خوشبو میں لپٹی ہوئی فضا میں نہ جانے کتنی خاموش راتوں میں وہ کسی کے ساتھ بات چیت کر گیا ہے، لیکن اس وقت اسے کچھ یاد نہیں آرہا ہے اور ٹھیک اسی وقت یکایک جنگلی ہرنی کی طرح ریزینہ بیٹھک میں داخل ہوئی تھی، یہ بھی کتنے حیرت کی بات تھی۔

اس کے بعد ان دونوں کی محبت، فراق اور وصال کی جو طویل کہانی تھی وہ بھی کچھ کم حیرت انگیز اور پر اسرار نہیں تھی۔

اپنی شادی کی تصویر کے علاوہ اس کی نگاہوں کے سامنے اور بھی کتنی ہی تصویریں رقص کر رہی تھیں اس لئے اسے پتہ بھی نہ چلا کہ کسی کے جوتے سے پیدا ہوتی ہوئی کھٹ کھٹ کی آواز دروازے کے پاس آ کر کب رکی، کسی مقناطیسی کشش کے زیر اثر یکایک اس کا چہرہ دروازہ کی طرف گھوم گیا، اس نے حیرت سے اپنی آنکھیں پھیلا کر دیکھا، کوئی دروازہ پر کھڑا ہے! کون ہے؟

"ریزینہ کہو کیسی ہو؟"

"کیسی رہ سکتی ہوں، تم ہی سوچو؟"

"تم خیریت سے تو ضرور ہی ہو۔ میں ابھی تھوڑی دیر پہلے آیا ہوں، امی روتے روتے شاید سو گئی ہیں، کھوکن بھی انھیں کے پاس ہے، میں بیٹھا بیٹھا سوچ رہا تھا، پتہ نہیں تم کب آؤ گی، اب کھڑی کیوں ہو؟ آؤ نا، اور ذرا قریب آجاؤ! کیا تم مجھے نہیں پہچان رہی ہو؟"

لیکن دراصل دونوں میں کوئی بات ہی نہیں ہوئی، دونوں خاموش نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، جیسے ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ دونوں ایک ٹک پلک جھپکائے بغیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اس کے بعد ریزینہ کے جسم کو حرکت ہوتی، وہ جو کھٹ پھلانگ کر اس کے قریب جا کر بولی ــــ" او، جب ہی تو میں سوچ رہی تھی کہ میرا سر آج کیوں درد کر رہا ہے، تم جو آئے ہو، اس کا تو مجھے گمان بھی نہیں تھا اُف، تم کتنے دبلے ہو گئے ہو"۔

انور کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ بکھر گئی، اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا ــــ "تم نے اپنی طرف بھی کبھی دیکھا ہے؟"

"میری بات رہنے دو، تم نہیں تھے اور میں ادھر موٹی ہو جاتی، کیوں؟ میں جو زندہ ہوں، یہ بھی بڑی بات ہے"۔ اس کی قمیص کے بٹن کھولتے ہوئے ریزینہ نے کہا۔ "کئی دن سے میں سوچ رہی تھی، ایک ایک دو دو کر کے لوگ رہا ہو رہے ہیں، انھیں کے ساتھ تم بھی رہا ہو سکتے ہو"۔

"تم نے ٹھیک ہی سوچا تھا، میں رہا ہو گیا ہوں"۔ کپڑے اتار کر رکھتے ہوئے انور نے کہا اور بات کرتے ہوتے بار بار اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی کوئی چیز گم ہو گئی ہے۔

"بہت تکلیفیں اٹھانی پڑی ہیں۔ کیوں؟" ریزینہ نے پوچھا۔

"یہ کہانی ایک دن میں ختم نہیں ہوگی" انور کا لہجہ یکایک خشک ہو گیا۔ اتنے دنوں کے بعد اس کی ملاقات ہوئی ہے، لیکن آخر اسے یہ کیا ہو گیا ہے؟

"رہنے دو، میں سب کچھ بعد میں سن لوں گی، برآمدے میں پانی، کھڑاؤں سبھی کچھ موجود ہے، ہاتھ منہ دھو لو" رزینہ نے عجلت سے کہا ــ "میں ذرا باورچی خانے میں جا رہی ہوں"۔

ہاتھ منہ دھونے کے بعد انور باہر جا کر چپ چاپ آنگن میں کھڑا ہو گیا۔ آسمان پر تارے چھٹکے ہوئے ہیں، کامنی کے پیڑ میں پھول بھی ضرور ہی کھلے ہوں گے! اس نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا، ریل سے آتے وقت گھر پہنچنے کا کس قدر اشتیاق تھا، لیکن یہاں آ کر یکایک اس کا دل کیوں بجھ گیا ہے!

کھانا کھاتے وقت سر جھکائے ہوئے وہ سوچنے لگا، اب وہ پہلے سے بہت زیادہ اسمارٹ ہو گئی ہے، کیوں! ایسا ہونا بالکل فطری بھی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب تو یہی گھر بھر کی کفیل ہے، ضرورت کے تحت اسے باہر بہت سے لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا پڑتا ہوگا، باتیں کرنی پڑتی ہوں گی، اس لئے اتنے دنوں میں اگر اس کی شخصیت مکمل ہو چکی ہے، تو کون سی حیرت کی بات ہے؟

بہت رات گئے تک بستر پر لیٹے لیٹے اس نے بہت کچھ کہا اور بہت کچھ سنا، لیکن کسی انجانے درد سے اس کا دل اندر ہی اندر روتا رہا، ہاں رزینہ اب پہلے سے زیادہ اچھی طرح باتیں کرنا سیکھ گئی ہے، اس کے بولنے کا انداز بھی کافی خوبصورت ہو گیا ہے، باہر کی دنیا سے متعلق اس کی معلومات بھی بہت بڑھ گئی ہیں، پھر بھی اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی کوئی شے گم ہو گئی ہے۔ سات سال کے بعد اس کی ملاقات ہوئی تھی، لیکن کہاں، وہ دوڑ کر اس سے کہاں لپٹی؟ اب وہ شوخی بھی کہاں ہے؟ وہ پہلے جیسی بے قراری بھی تو نہیں ہے؟ اگر تین دن کے بعد بھی وہ اس کے سامنے آتا تھا تو اس کی دونوں خوبصورت آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی تھیں، سات سال کم تو نہیں ہوتے، لیکن اب وہ آنسوؤں کی لڑیوں سے دل کی دنیا کو تہہ و بالا کر دینے والا مضطربانہ استقبال کہاں تھا؟

باہر تاریکی تھی، ہر طرف سکوت چھایا ہوا تھا، ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے چل رہے تھے اور ہوا میں بسی ہوئی پھولوں کی خوشبو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔

رزینہ تکیہ سے لپٹی ہوئی گہری نیند سو رہی تھی، انور نے آہستہ آہستہ اس کا ہاتھ تکیہ سے الگ کر دیا اور بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا، اس کے بعد اس نے تکیہ کے نیچے سے ٹٹول کر دیا سلائی نکالی اور لالٹین جلا دی۔

لالٹین کی بتی بڑھا کر اس کی سفید روشنی کو جب وہ رزینہ کے چہرہ کے قریب لے جانے لگا تو اس وقت اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا، اس کے چہرے سے کسی اجنبی کو پہچاننے کا عزم جھلک رہا تھا۔ وہ آج کیا دیکھے گا؟ کیا دیکھے گا؟؟

لالٹین قریب لے جا کر اس نے دیکھا، ہاں، سچ مچ رزینہ نے تمام مصیبتوں کا مقابلہ کرنے کی بے پناہ قوت حاصل کر لی تھی، پختہ انار کے دانے کی طرح اس کے سرخ ہونٹ، بے رنگ اور بے رس ہو چکے تھے، اس کے دونوں گال بیٹھ گئے تھے اور اس کے چہرے پر کبھی نہ ختم ہونے والی ملاحت کی جگہ پتھر جیسی سختی آ گئی تھی، اس نے دیکھا، زندگی سے جنگ کرتی ہوئی ایک پچیس سالہ عورت، جسم کی جوانی ڈھل چکی تھی، اس کے اندر سے اس کی اٹھارہ سالہ جنگلی ہرنی جیسی چنچل اور خوبصورت آنکھوں والی محبوبہ مر چکی تھی۔

اس کی دونوں آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے ٹپک کر آرام کی نیند سوئی ہوئی رزینہ کی آنکھوں کے گوشوں کے پاس آن گرے اور اُسے ایسا معلوم ہوا۔ جیسے یہ آنسو اس کی آنکھوں سے نہیں، رزینہ کی آنکھوں سے ٹپکے ہوں!

★

غزل

جمیل نقوی

غمِ عقبیٰ بقدرِ خیر و شر ہے
غمِ دنیا مگر دیوانہ گر ہے

نہ پردہ ہے نہ کوئی پردہ در ہے
ترا جلوہ ہے اور میری نظر ہے

نشاطِ جاوداں ہے لذتِ غم
حیاتِ شوق لیکن مختصر ہے

وہی اک شے کہیں شعلہ کہیں گل
یہ اپنا اپنا اندازِ نظر ہے

وہیں تک ہی جنوں کی دسترس تھی
جہاں تک اعتبارِ بال و پر ہے

حریمِ گل سے بزمِ کہکشاں تک
مرا حسنِ تخیل جلوہ گر ہے

مکمل ہو چکا افسانۂ گل
مگر ذوقِ جنوں نامعتبر ہے

بہاروں سے کہو گلشن سجائیں
ہمیں اندازۂ برق و شرر ہے

ابھی منزل سے محرومِ تماشا
نظر آلودۂ گردِ سفر ہے

کہاں چھوڑا ہے لاکر بیخودی نے
نہ منزل ہے نہ کوئی رہگذر ہے

مرا حسنِ بیاں ہے ایک پردہ
حدیثِ غم باندازِ دگر ہے

کہ جیسے چاند بزمِ کہکشاں میں
تصور میں کوئی یوں جلوہ گر ہے

مشفق خواجہ

دل کی بے تابی ترے غم کو بڑھا دیتی ہے
گمرہیِ عشرتِ منزل کا پتا دیتی ہے

جانے کس منزلِ گمنام کی ہے دل کو ہوس
ہر حسیں شکل نئی راہ دکھا دیتی ہے

کیوں ہے پرسانِ دلِ زار گلِ مژدۂ یاس
نگہِ شوق تو جلووں کو صدا دیتی ہے

دل سمجھتا ہے ترے غم کی حقیقت لیکن
اب کوئی اور خلش آگ لگا دیتی ہے

عاشقی کشمکشِ مرگِ مسلسل ہی سہی
زیست کرنے کا سلیقہ تو سکھا دیتی ہے

یہ ترے قرب کی خواہش ہے بہت کچھ لیکن
میری تنہائیوں کی عمر بڑھا دیتی

اس قدر بڑھ گئی حالات کی تلخی مشفق
کہ اجل بھی مجھے جینے کی دعا دیتی ہے

فوجی افسران کی تربیت گاہ

(کاکول)

علی ناصر زیدی

پاکستان ملٹری اکادمی ملک کا وہ واحد مایۂ ناز ادارہ ہے جہاں عساکر پاکستان کے لئے مستقل افسر تیار کئے جاتے ہیں۔ یہاں نہ صرف جدید ترین فنون جنگ ہی سکھائے جاتے ہیں بلکہ علمی اور ادبی حیثیت سے بھی کیڈٹوں یعنی فوجی امیدواروں کو مکمل تربیت دی جاتی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ تقسیم سے پہلے دہرہ دون میں پورے ہندوستان کے لئے ایک اکادمی قائم تھی جس کا نام انڈین ملٹری اکیڈیمی تھا۔ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی اس قسم کے ادارے موجود ہیں مثلاً امریکہ میں ملٹری اکیڈیمی، ویسٹ پوائنٹ۔ انگلستان میں رائل ملٹری اکیڈیمی، سینڈہرسٹ، کنیڈا، آسٹریلیا اور دوسرے آزاد ممالک میں بھی اپنی اپنی اکادمیاں قائم ہیں۔

پاکستان بنا تو ہمارے پاس اس طرز کا کوئی تربیتی ادارہ موجود نہ تھا۔ انڈین ملٹری اکیڈیمی سے جو کچھ ہمارے حصہ میں آیا وہ کچھ دفتر پارینہ، چند کیڈٹوں اور چند افسروں پر مشتمل تھا جنہیں پاکستان ملٹری اکادمی میں منتقل کر دیا گیا۔ اس وقت ہمیں فوجی افسروں کی سخت ضرورت تھی چند ہی ماہ بعد اکتوبر ۴۷ء حکومت پاکستان نے اس ادارے کے قیام کی منظوری دے دی اور کاکول جیسا صحت افزا مقام اس کے لئے منتخب ہوا۔

مغربی پاکستان کے ضلع ہزارہ میں ایبٹ آباد سے تقریباً پانچ میل کے فاصلے پر خوبصورت پہاڑیوں کے دامن میں کاکول نام کا ایک صاف ستھرا گاؤں آباد ہے جہاں چند قدرتی چشمے پھوٹتے ہیں اور پورے علاقے کو ضرورت کا پانی مہیا کرتے ہیں۔ اکادمی کا علاقہ اس سے تقریباً ایک میل پہلے آتا ہے۔ ایک سیدھی خوبصورت سڑک اسے ایبٹ آباد سے ملاتی ہے۔ یہاں تقسیم ہند سے پہلے آر۔ آئی۔ اے۔ ایس۔ سی۔ سکول قائم تھا۔ اس کی چند عمارتوں کو کام کے لائق بنایا گیا اور پاکستان ملٹری اکادمی شروع کر دی گئی۔ اس علاقے کی بلندی ساڑھے چار ہزار فٹ کے قریب ہے۔ گرمیوں کا موسم خوشگوار اور موسم سرما سخت ہوتا ہے کبھی کبھی برف بھی پڑ جاتی ہے۔ سامنے چند بلند و بالا پہاڑی سلسلے ہیں جنکی چوٹیاں پورے سال برف پوش رہتی ہیں۔

اکادمی کی ابتدا کرنے کے لئے جنرل ہیڈ کوارٹرس پاکستان نے بریگیڈیر ایف۔ ایچ۔ بی۔ انگل ڈی ایس او کا انتخاب بحیثیت کمانڈان یا افسر اعلیٰ کیا۔ ان کے تین اہم مشیر کار لیفٹیننٹ کرنل محمد لطیف خاں ایم سی۔ کو نائب کمانڈان اور بٹالین کمانڈر، لیفٹیننٹ کرنل ایم اے۔ رحمٰن۔ ایم سی۔ کو پہلا چیف انسٹرکٹر، لیفٹیننٹ کرنل محمد محمود احمد ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی (ریڈنگ) ڈی فل (ہاربرگ) کو چیف ایجوکیشن آفیسر مقرر کیا۔

۲۶ جنوری ۱۹۴۸ء کو اکادمی کا تعلیمی و تربیتی دور شروع ہوا۔ بریگیڈیر انگل نے کیڈٹوں کے نئے رجمنٹ کو ان حوصلہ افزا الفاظ کے ساتھ خوش آمدید کہا:

"ہم آج ایک نئی درسگاہ کا آغاز کر رہے ہیں جو ایک نئے ملک کی نئی فوج کا اہم جزو ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ پاکستان میں اول درجے کا عسکری مواد موجود ہے۔ ہم اپنی روایات الگ قائم کریں گے جو عسکری دنیا میں اپنی مثال آپ ہونگی ...... عساکر پاکستان کے آئندہ افسروں کی حیثیت سے آپ کا انتخاب آپ کے لئے یقیناً باعث افتخار ہے۔ کوئی ملک اپنے فرزندوں کو اس سے زیادہ عزت نہیں بخش سکتا ..... آپ کو اپنے تئیں اس اعزاز کا شایان شان ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرنا چاہیئے .... ہمارا مقصد پاکستان ملٹری اکادمی کو ترقی دے کر دنیا کے جدید ترین تربیتی اداروں کی صف میں کھڑا کرنا ہے"

یہ تھی پاکستان ملٹری اکادمی کی ابتدا جہاں سے تربیت یافتہ افسروں کی پہلی جماعت ۲۵ نومبر ۱۹۴۸ء کو پاس ہو کر نکلی۔ گورنر جنرل نے پریڈ کی سلامی لی۔ جب سے یہ سلسلہ اسی صورت سے جاری ہے کہ ہر چھ ماہ بعد ایک کورس تربیت پوری کرنے کے بعد یہاں سے نکلتا ہے اور ملک کی کوئی

مقتدر ہستی اس کی سلامی لیتی ہے۔

پاکستان ملٹری اکادمی میں ڈھائی سال کا کورس ہے۔ پہلے بری کیڈٹ ٹریننگ سکول، کوہاٹ میں چھ ماہ کی ابتدائی تربیت ہوتی تھی اور پھر یہ کیڈٹ دو سال اکادمی میں گذارتے تھے اور سیکنڈ لیفٹیننٹ کی حیثیت سے کمیشن کا عہدہ لے کر یہاں سے نکلتے تھے۔

جس طرح سال میں اکادمی سے دو کورس پاس کرکے افسران فارغ التحصیل ہوتے ہیں اسی طرح سال میں دو مرتبہ داخلے بھی ہوتے ہیں اور یہ سلسلۂ آمد و رفت یونہی جاری رہتا ہے۔ داخلے کے لئے سال میں دو مرتبہ ملک کے تمام اخباروں میں ایسے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو درخواست دینے کی دعوت دی جاتی ہے جو عسکری زندگی سے دلچسپی رکھتے ہوں۔ یہ اشتہار ایڈجوٹنٹ جنرل، جنرل ہیڈ کوارٹرس، راولپنڈی کی طرف سے شائع کئے جاتے ہیں۔ کچھ عرصے پہلے امیدواروں کا کم از کم میٹرک پاس ہونا ضروری تھا لیکن اب انہیں ایف۔اے۔ یا ایف ایس سی۔ پاس ہونا چاہیئے۔ انہیں آخری تاریخ سے پہلے ایک مقررہ فارم پر اپنی عرضی راولپنڈی بھیجنی پڑتی ہے۔

درخواستیں قبول ہو جانے پر امیدواروں کو انگریزی، حساب اور معلوماتِ عامہ میں ایک تحریری امتحان دینا پڑتا ہے۔ کامیاب امیدواروں کو ایک انتخابی بورڈ کے سامنے کوہاٹ میں پیش ہونا پڑتا ہے جہاں ان کی جسمانی و ذہنی ہر دو استعداد کا امتحان لیا جاتا ہے۔ جو اس آزمائش پر پورے اترتے ہیں وہ طبی معائنے کے بعد کاکول آجاتے ہیں۔

اکادمی میں کیڈٹوں کی تربیت دو مخصوص حصوں میں منقسم ہے۔ ایک حصہ علمی مضامین پر مشتمل ہے اور دوسرا فوجی یا عسکری تربیت سے تعلق رکھتا ہے۔ اول الذکر کے نگران کو ڈائریکٹر آف سٹڈیز یا ناظم تعلیمات اور موخر الذکر حصے کے افسر اعلیٰ کو بٹالین کمانڈر کہتے ہیں۔ دونوں کا عہدہ کرنل کا ہوتا ہے۔

اکادمی میں انگریزی، سائنس، ریاضیات، تاریخ و جغرافیہ، معاشیات و سیاسیات اور معلوماتِ عامہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ہر مضمون کی تدریس کے لئے قابل و تجربہ کار اساتذہ مقرر ہیں۔ یہ مضامین چار شعبوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ انگریزی، سائنس، ریاضیات اور علوم جدیدہ۔ یوں تو اکادمی میں ہر مضمون کی تعلیم کا معقول انتظام موجود ہے لیکن یہاں کا شعبۂ سائنس خاص طور پر قابل ذکر ہے جس کی دو منزلہ جدید عمارت قیام اکادمی کے بعد تعمیر کی گئی۔

اس کی تجربہ گاہیں اور اس کا سائنسی ساز و سامان کسی بھی جدید ترین سائنسی ادارے سے کمتر نہیں بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اس میں متعدد ایسے آلات موجود ہیں جو پاکستان کے دوسرے کالجوں اور تعلیمی اداروں میں شاید موجود نہ ہوں۔

تمام مضامین کی تعلیم ایسے دلچسپ انداز میں دی جاتی ہے کہ کیڈٹ اکتانے نہیں پاتے۔ چونکہ وہ بے حد مصروف رہتے ہیں اس لئے اساتذہ کوشش کرتے ہیں کہ کیڈٹوں کو جو کچھ بھی پڑھایا جائے وہ انہیں دوران لیکچر ہی یاد ہو جائے لہٰذا اکادمی کا طرزِ تدریس اور طریق تعلیم عام کالجوں اور دوسری درسگاہوں سے کافی مختلف ہے۔ سائنسی تعلیم کا دلچسپ ترین پہلو ان تمام آلات اور ساز و سامان کی نمائش ہے جو کسی لیکچر سے تعلق رکھتے ہیں۔ نظری تدریس کے علاوہ سائنس کے تجرباتی و عملی پہلو پر خاص زور دیا جاتا ہے۔

اسی طرح فوجی تربیت مختلف حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ جدید ترین فنونِ حرب کی تعلیم اور نئے ہتھیاروں کا استعمال سکھانے کے علاوہ یہاں نشانہ بازی، دفاعی اور جارحانہ حملوں کی مشق، قیادت، نظم و ضبط، باہمی ربط و تعاون، پیراکی، جسمانی ورزش، ڈرل اور پریڈ وغیرہ کی عملی تربیت دی جاتی ہے۔ ہر مضمون کی تعلیم کے لئے قابل فوجی افسر موجود رہتے ہیں۔ مشقوں کا سلسلہ دن کے علاوہ کبھی کبھی رات تک پہنچ جاتا ہے طویل مشقوں کے لئے کیڈٹوں کو کیمپ پر کاکول کے باہر بھی لے جایا جاتا ہے۔

جب کیڈٹ اکادمی میں آتے ہیں اور جب وہ کامیاب ہو کر فوجی افسروں کی حیثیت سے یہاں سے نکلتے ہیں تو ان میں زمین آسمان کا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ انہیں صحیح معنوں میں زندگی کا سلیقہ آجاتا ہے۔ چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، پہننا اوڑھنا، کھانا پینا، بول چال، رہن سہن۔ غرض زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جسے یہاں کی تربیت سنوارتی اور نکھارتی نہ ہو۔ پاکستان ملٹری اکادمی بہترین رہائشی ادارہ ہے جہاں حکومت اپنے خرچ پر تعلیم و تربیت دے کر ملک کے ایسے نوجوانوں کو عساکرِ پاکستان میں اچھے عہدے پیش کرتی ہے جو فوجی زندگی سے دلچسپی رکھنے کے علاوہ اپنی عمر ملک و قوم کی خدمت میں صرف کرنے کا اعلیٰ جذبہ بھی رکھتے ہوں۔

اس ادارے کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ یہاں اساتذہ و طلبا کے درمیان قریب ترین رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کیڈٹ کی زندگی کا شاید کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو اس کے اساتذہ کی نگاہ سے بچ جاتا ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لئے کیڈٹوں کو چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ ہر جماعت کو ایک "پلاٹون" (پلٹن) کہتے ہیں جس میں بالعموم پندرہ سولہ کیڈٹ ہوتے ہیں۔ وہ سب ایک فوجی افسر کی نگرانی میں رہتے ہیں جسے پلاٹون کمانڈر کہتے ہیں۔ وہ اپنے کیڈٹوں کے نجی حالات تک سے واقف ہوتا ہے اور ان کے اچھے برے کے لئے بہر طور ذمہ دار ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہر کیڈٹ پر نگاہ رکھتا ہے اور زیادہ سے زیادہ وقت اس کے ساتھ گذارنے کی کوشش کرتا ہے۔ علمی مضامین کی نگرانی کے لئے معلمین میں سے ایک اکیڈیمک پلاٹون کمانڈر متعین ہوتا ہے جو اپنی پلاٹون کے کیڈٹوں کے علمی مشاغل پر نظر رکھتا ہے۔ غرض دو پلاٹون کمانڈر مل کر چند کیڈٹوں کی خبر گیری کرتے ہیں اور ان کی تربیت کو بہتر سے بہتر بنانے میں کوشاں رہتے ہیں۔

چند پلاٹون مل کر ایک "کمپنی" کی تشکیل کرتی ہیں جس کی ذمہ داری ایک کمپنی کمانڈر پر ہوتی ہے۔ اس وقت اکادمی میں چار کمپنیاں ہیں۔ تمام کمپنیوں کے کیڈٹ مل کر ایک بٹالین کی تشکیل کرتے ہیں جس کا قدرے مفصل ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

اکادمی کی موجودہ بٹالین کو جو افواجِ پاکستان کی اہم ترین بٹالین ہے، شروع میں ہی نہایت موزوں اور مناسب نام "پہلی پاکستان بٹالین" دیا گیا تھا۔ مارچ ۱۹۴۸ء میں اس بٹالین کو یہ اعزازِ خصوصی نصیب ہوا کہ ہمارے محبوب قائدِ اعظم مرحوم نے اس کو اپنے کرنل انچیف ہونے کا شرف بخشا اور اجازت مرحمت فرمائی کہ ان کا نامِ نامی اس بٹالین کے ساتھ منسلک ہو جائے۔

شروع میں اس جماعت کو دو کمپنیوں میں تقسیم کیا گیا تھا لیکن ستمبر ۱۹۴۸ء میں دوسرے کورس کا اضافہ ہوا تو کیڈٹوں کی [illegible] تعداد کے پیشِ نظر ایک تیسری کمپنی وجود میں آئی۔

اگست ۱۹۴۹ء میں کیڈٹوں کی تعداد میں اور اضافہ ہوا۔ لہٰذا ایک چوتھی کمپنی قائم کی گئی۔

اب صورتِ حال یہ ہے کہ پہلی پاکستان بٹالین میں چار کمپنیاں ہیں جن کے مابین مختلف مقابلے جاری رہتے ہیں۔ ہر کمپنی دوسری کمپنی سے بازی لے جانے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ اس طرح معیارِ تربیت بلند ہوتا ہے۔ پہلی پاکستان بٹالین قائدِ اعظم اور اسلام کی اعلیٰ یادگار اور قائدِ اعظم مرحوم کے ممتاز اور بلند ترین کردار کا صحیح ترین پرتو ہے جن کی کاوشِ پیہم اور بے لوث خدمات کا نتیجہ خود پاکستان ہے۔ اس بٹالین کے امیدوار افسروں کا اہم ترین فرض مجاہدینِ اسلام کے قدم بقدم چلنا اور ان کی سی سیرت و کردار پیدا کرنا ہے۔

پاکستان ملٹری اکادمی میں زیرِ تربیت تمام کیڈٹ نہایت مصروف رہتے ہیں۔ ان کے ہر کام کا وقت مقرر ہوتا ہے اور ڈھائی سال کے مختصر عرصے میں ان کی عادات اس قدر پختہ کر دی جاتی ہیں کہ نہ صرف یہ کہ وہ اپنی سابقہ نامناسب عادات کو چھوڑ دیتے ہیں بلکہ باقی تمام عمر کے لئے پابندیٔ وقت اور عسکری نظم وغیرہ اچھی عادات کے پابند ہو جاتے ہیں۔ کوئی بھی موسم ہو انہیں طلوعِ آفتاب سے کافی پہلے بستر سے اٹھ بیٹھنا پڑتا ہے۔ گرمیوں میں ½ ۴ بجے صبح اور موسمِ سرما میں ½ ۶ بجے صبح یہاں پریڈ یعنی اکادمی کا کاروبار شروع ہو جاتا ہے۔ سورج ابھی پہاڑیوں سے نیچے ہی ہوتا ہے کہ یہاں زندگی پوری توانائی کے ساتھ جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ دوپہر تک ڈرل، پریڈ، علمی و عسکری مضامین کی تعلیم و تدریس اور دیگر متعلقہ مشاغل کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ تمام کیڈٹ مختصر دستوں میں ادھر سے ادھر نہایت منظم طور پر چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اور پوری فضا ایک مکمل عسکری نظام کی

ترجمانی کرتی ہے۔

آپ میں سے بہت سے لوگ کبھی کبھی یہ سوچتے ہوں گے کہ انسان فوجی ملازمت میں وقت پڑنے پر جان جیسی عزیز شے ملک و قوم پر کس طرح نثار کر دیتا ہے۔ یہ جاننا ہو تو پاکستان ملٹری اکادمی کی سیر کیجئے۔ کیڈٹوں کے لئے یہاں کی ڈھائی سالہ ٹریننگ ہر معنی میں کافی رہتی ہے۔ جہاں وہ دشمن کی سرکوبی کا عملی سبق حاصل کرتے ہیں وہاں وقت پڑنے پر ملک و قوم کی خدمت میں اپنی جان تک نثار کر دینے کا روحانی درس بھی لیتے ہیں۔ اکادمی میں ایک مسجد بھی ہے۔ جمعہ کی نماز کی تو خیر سب کے لئے خاص تاکید ہے ہی۔ ویسے بھی مسجد الحمدللہ آباد رہتی ہے اور پانچوں وقت پابندی سے نماز کے لئے کیڈٹ وغیرہ آتے ہیں۔

دوپہر تک کلاسوں سے فارغ ہونے کے بعد تمام کیڈٹ اپنی اپنی کمپنی کے میس میں کھانا کھاتے ہیں۔ کھانے میں لذت کے علاوہ صفائی اور غذائیت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ کھانے کے بعد تھوڑا آرام اور پھر چائے پینے کے بعد تمام لڑکے کھیل کے میدان میں آجاتے ہیں۔ کھیل یہاں کی تربیت کا جزو لاینفک ہیں۔ اکادمی میں ہاکی، فٹ بال، کرکٹ، ٹینس وغیرہ کی بڑی اچھی ٹیمیں موجود رہتی ہیں۔ ہر کیڈٹ اپنی اپنی پسند کے مطابق کوئی نہ کوئی کھیل کھیلتا ہے۔ ایک ایک گھنٹے تک کھیل ہوتے ہیں اور پھر سب اپنے کمرے میں واپس پہنچ جاتے ہیں۔ اس کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ تک آموختہ دہرایا جاتا ہے۔ اس گھنٹے میں بعض اوقات پلاٹون کمانڈر اور کمپنی کمانڈر بھی اپنے کیڈٹوں کو دیکھنے آجاتے ہیں تاکہ اُن کی مشکلات کا اندازہ کر سکیں۔

اتنے میں رات کے کھانے کا وقت ہو جاتا ہے اور تمام کیڈٹ لباس تبدیل کر کے اپنے اپنے میس میں پہنچ جاتے ہیں۔ کھانے سے قبل کمپنی اور اکادمی سے متعلقہ ضروری احکام و ہدایات شائع کی جاتی ہیں۔ سینیئر اور جونیئر کیڈٹ مختلف مسائل پر آپس میں تبادلۂ خیالات کرتے ہیں یا اگر وقت مل جاتا ہے تو کوئی فرشی کھیل کھیلتے ہیں۔ کھانے کے بعد اخبار بینی، ریڈیو سننے اور ایک آدھ آمر یح کے بعد سب کیڈٹ اپنے اپنے کمروں میں واپس پہنچ جاتے ہیں۔ تھوڑی بہت کتب بینی کے بعد دس، ساڑھے دس بجے تک سب سو جاتے ہیں کیونکہ پھر اگلی صبح پانچ بجے بیدار ہونا پڑتا ہے۔

پاکستان ملٹری اکادمی میں کیڈٹوں کی زندگی مصروف اور دلچسپ ہونے کے علاوہ نہایت منظم قسم کی ہے۔ تنظیم اور پابندی اوقات پر خاص زور دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ تمام کیڈٹ ساتھ ساتھ رہنے، ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے اور عملی زندگی میں ایک دوسرے کے لئے تھوڑا بہت ایثار کرنے کا اہم درس سیکھ جاتے ہیں۔ ہر کمپنی مختلف کھیلوں، مباحثوں اور دوسرے کاموں میں ہر دوسری کمپنی پر بازی لے جانے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ اس طرح کیڈٹوں میں مقابلے کا جذبہ بیدار ہوتا ہے اور وہ فتح و شکست کو قبول کرنا سیکھ جاتے ہیں۔

اکادمی کا اپنا سینما ہال بھی ہے جہاں ہفتے میں تین فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ کیڈٹوں کے چند کلب بھی ہیں مثلاً کیمرہ کلب، سائنس اور لاسلکی کلب، رائفل کلب، شکار کلب، ہائکنگ کلب وغیرہ جو فرشی کھیلوں کے علاوہ ان کے لئے بیرونی دوروں اور سیر و تفریح کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ سائنس کلب ملک کے مختلف قابل پروفیسروں اور دیگر ماہرین کو دوسرے شہروں سے اکادمی آنے کی دعوت دیتا ہے اور وہ اپنے لیکچروں سے کیڈٹوں کو مستفید کرتے ہیں۔

ہر پانچ ماہ کے بعد تقریباً ایک ماہ اور کبھی کبھی اس سے کچھ زیادہ عرصے کے لئے اکادمی بند رہتی ہے تاکہ کیڈٹ اور افسران تازہ دم ہو کر نئے دور کا آغاز کر سکیں۔ اکادمی کی تربیت کا لب لباب ہر کیڈٹ میں خود اعتمادی، جرأت و استقلال، راستبازی، احساس ذمہ داری اور جذبۂ حب الوطنی و ایثار پیدا کرنا ہے۔

☆

تصحیح:

"سندھ نام کی بستیاں" (مارچ ۱۹۵۹ء): قارئین حسب ذیل غلطیاں درست فرمالیں:۔

صفحہ: ۱۰۱، سطر: ۸ بجائے "قیصر"، "مصر" پڑھیے۔ صفحہ: ۱۰۱، سطر: ۱۷ بجائے "مصور"، "منذر" پڑھیے۔ صفحہ: ۱۰۳، سطر: ۱ "نہ اپنے" کی بجائے "انہوں نے اپنے" اور صفحہ: ۱۰۴، سطر: ۱ "کرنے پر" کی جگہ "کرنے کی بجائے" پڑھیے۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم (مرحوم): ——— بقیہ صفحہ (۱۷)

ادارہ جب آیئے جب تھکن نہ محسوس ہو۔ کرسی پر بیٹھیے، ذرا بھی تکان ہو یہ بستر موجود ہے۔ اس پر آرام کیجیے۔ یہ انتظام اب تک قائم ہے۔ ذرا بھی میری طبیعت خراب ہوتی، تو وہ خفا ہو جاتے۔ آپ کیوں آئے؟ جایئے دو چار روز بالکل آرام کیجیے۔ میں کہتا، اتنے دن آرام کرتے گزر گئے ہیں۔ اب کچھ کام کروں۔ وہ فرماتے۔ مجھے آپ پر اعتماد ہے۔ آپ آرام کرنے کے باوجود اپنا کام پورا کرلیں گے۔ خدا کا شکر ہے خلیفہ صاحب کا یہ اعتماد شکست نہیں ہوا۔

خلیفہ صاحب کی صحت بہت اچھی تھی، سرخ و سفید چہرہ۔ ہمہ وقت ہشاش بشاش رہنے کے عادی، غم اور فکر سے کبھی پالا نہیں پڑا۔ کھانے پینے، پڑھنے لکھنے۔ سونے جاگنے میں بہت محتاط اور اوقات کے پابند۔ ان کی زندگی سے مجھے آس تھی۔ میں ایک لمحہ کے لئے بھی اس کا تصور نہیں کر سکتا تھا کہ وہ مجھ سے پہلے اس جہان فانی سے رخصت ہو جائیں گے۔ وہ مجھ سے تقریباً بیس سال بڑے تھے، لیکن مرض قلب کے باعث میں لب گور تھا، اور وہ اپنی قابلِ رشک صحت کے باعث ایک شاندار مستقبل کے حامل، لیکن، انسان سوچتا کچھ ہے، ہوتا کچھ ہے۔ ان سطروں کے لکھنے کے وقت تک میں زندہ ہوں، اور وہ شخص جو زندگی سے بھرپور تھا، چشم زدن میں، اس دنیا سے رخصت ہو گیا، سچ ہے ع سبک بار مردم سبک تر روند!

خلیفہ صاحب اس دنیا سے رخصت ہو گئے، اتنے اچانک طور پر کہ اب تک یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ ادارہ جاتا ہوں، ان کی خالی کرسی دیکھ کر دل پر چوٹ لگتی ہے، ہا! یہ وہی جگہ ہے جہاں خلیفہ صاحب باغ و بہار بنکر بیٹھا کرتے تھے، اور اب یہاں ویرانی کا دور دورہ ہے۔ جسے موت کی منزل سے میں بہت دور سمجھتا تھا، کتنی سرعت سے اس نے یہ منزل سر کر لی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے خلیفہ صاحب کا روئے روشن سامنے ہے، وہی جاں نواز تبسم، وہی باوقار چہرہ، وہی دل میں کھب جانے والی صورت، اور وہ فرما رہے ہیں ؎

ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ

دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا؟

واقعی یہ طویل فاصلہ خلیفہ صاحب نے نفسِ چند میں طے کر لیا۔ ——— الوداع، الوداع!

"غزال": ——— بقیہ صفحہ (۴۴)

"پہلے منہ سے باہر نکالے، دھوئے، اور پھر کھا گئے۔"

"پگلے ۔ ان کے نقلی دانت ہوں گے" کاکل نے کہا

"نہیں انہوں نے سب جڑے جڑے ہی ہاتھ میں نکال لئے تھے"۔

"وہی تو نقلی دانت ہوتے ہیں، بوڑھے ہو کر سب دانت ٹوٹ جاتے ہیں اور ڈاکٹر دوسرے بنا دیتا ہے"۔

اسی دن یہ بات غزال کی سمجھ میں آسکی تھی۔ پھر کاکل نے یہ لطیفہ سنایا تھا کہ ایک صاحب اپنے مصنوعی دانت صاف کر رہے تھے تو ایک گنوار نے ان سے پوچھا "اجی کیا تم دیوتا ہو؟" انہوں نے کہا "کیوں"۔ "اس لئے کہ تم ہر چیز اکھاڑ کر پھر اس کی جگہ جما دیتے ہو"۔

— پھر کیا ہوا۔ یہ غزال کی سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا تھا۔ شیراز میاں کی بات تو خیر ٹھیک تھی کہ وہ اپنے بچوں سے ملنے پر دیس گئے ہیں۔ لیکن جب سے کاکل کی شادی ہوئی ہے اس کا دل اتنا اداس کیوں رہتا ہے؟ اس دن ... کتنے رنگ برنگے قمقمے سرو اور گل مہر کے پیڑوں میں چمکائے گئے تھے۔ بڑے بڑے شامیانے لگے تھے۔ بابا بھی آگرہ سے آگئے تھے۔ اور بہت سے لوگوں کی بڑی سی دعوت ہوئی تھی۔ لیکن مجھ سے تو کچھ بھی نہیں کھایا گیا تھا۔ پھر نہ جانے کون پھولوں کا سہرا باندھ کر آیا اور کاکل کو کار میں بٹھا کر لے گیا تھا، میرے رونے پیٹنے کی تو کسی نے بھی آواز نہ سنی تھی۔ بس کاکل نے جاتے وقت مجھے پیار کیا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ کتنی سجی ہوئی تھیں وہ جھلمل کرتے کپڑوں سے اور پھولوں سے لدی ہوئی! پھر جانے کیوں اس کا منہ بھی آنچل سے ڈھک دیا گیا تھا۔

— میری کاکل واپس آجاؤ میری کلکو۔ اب میں تم سے کبھی نہیں لڑوں گا۔ تمہاری کتابیں خراب نہیں کروں گا۔ تمہارے کمرے میں شور نہیں مچاؤں گا۔!

غزال ابھی تک یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ پودا کیوں مرجھا گیا تھا، موتی کہاں چلا گیا، اور کاکل واپس کیوں نہیں آئی!

جسم میں تازگی
محافظِ صحت لائف بوائے صابن کی بدولت
لائف بوائے کے جراثیم سے محفوظ رکھنے والے فرحت بخش جھاگ جلد کے مسامات
جراثیم آلود میل اور گرد کو الگ کر دیتے ہیں جس سے جسم صاف اور ستھرا ہو جاتا ہے
اور آپ دن بھر ایک لطیف تازگی محسوس کرتے ہیں۔ یہ اطمینان کر لیجئے
کے گھر میں سب کی صحت مفرح لائف بوائے صابن
سے محفوظ رہے۔
LIFEBUOY
SOAP
لائف بوائے صحتمند زندگی کا ضامن ہے

ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا - مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس میکلوڈ روڈ - کراچی
مدیر: رفیق خاور

دفاع پاکستان

فوجی افسران کی تربیت گاہ : کاکول ملٹری اکیڈمی

جنرل محمد ایوب خان : فارغ التحصیل افسران کو اعزازات کی تقسیم

فوجی تربیت کا ایک اہم جزو :
کھلی فضا میں کھیل کود اور تفریح

فارغ التحصیل ہونے پر الوداعی سلامی

Regd. S. No. 1086

مئی ۱۹۵۹ء

۱۹۲۹ء ٹین کے ڈبّوں کے ذریعہ

۱۹۳۹ء پمپ کے ذریعہ

۱۹۵۹ء جدید طرز کے سروس اسٹیشن کے ذریعہ

برماشیل کے وسیع نظام اور سالہا سال کے تجربہ نیز شیل جیسے عالمی ادارہ سے وابستگی کی بدولت یہ سہولتیں بہ آسانی فراہم کی جا سکی ہیں۔

موٹروں میں ڈبوں کے ذریعے پٹرول ڈالنا مشکل اور دیر طلب کام تھا۔

ہاتھ سے چلائے جانے والے پمپ نے ڈبوں کی جگہ لے لی مگر کوئی اس دور کے پمپ چلانے والے کے دل سے پوچھے۔

ایسے سروس اسٹیشن قائم کئے گئے جن میں موٹروں کے لئے کشادہ راستوں کے ساتھ ساتھ خاطر خواہ سروس کا انتظام کیا گیا۔

...آج شیل کے ماہرین آپ کی خدمت میں ایسا پٹرول پیش کر رہے ہیں جس میں آئی سی اے کی مناسب مقدار شامل ہے اور کل؟ ......

برماشیل ترقئ پاکستان کا حصہ ہے

جلد ۱۲ | شمارہ ۵

مئی ۱۹۵۹ء

مدیر: رفیق خاور | نائب مدیر: ظفر قریشی

سالانہ چندہ
ساڑھے پانچ روپے

شائع کردہ:
ادارۂ مطبوعات پاکستان
پوسٹ نمبر ۱۸۳، کراچی

[illegible]ی کاپی
آٹھ آنے

اپس کی باتیں

پُر آشوب طوفانی مرحلوں سے گزر کر ہم ایک ایسے دور میں داخل ہو چکے ہیں جس میں ٹھہراؤ ہے۔ اب نہ موجیں ہم سے دست و گریباں ہیں اور نہ ہم موجوں سے دست و گریباں۔ بلکہ ہمیں مدت کے بعد آسودۂ ساحل ہونے کا موقع ملا ہے اور یہ وقت ہے کہ ہم نئے سرے سے سامانِ سفر تازہ کریں۔ اب ہم پورے اطمینان سے ان معاملات پر غور و خوض کر سکتے ہیں جن کی قبل ازیں ناموافق حالات نے اجازت نہیں دی۔ یہ ایک لمحۂ فکر ہے اور ہماری کوششوں کے نتائج اسی قدر وقیع ہوں گے جتنا ہم اپنے معاملات کے بارہ میں صحیح قدم اٹھائیں گے۔ بہرحال اس ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ، ع

بازبر رفتہ و آئندہ نظر باید کرد

اور یہاں ہمارا روئے توجہ زیادہ تر ادب و ثقافت کی طرف ہے۔ ہمارا شروع ہی سے یہ مطمح نظر رہا ہے کہ ہم ایسے اسباب و عناصر فراہم کریں جن سے ہیئتِ ملیہ کی کماحقہٗ تشکیل ہو اور جو ہمارے ملی خصائص کو زیادہ سے زیادہ پیغام نمو دے۔ ہم اس مقصد کو حاصل کرنے کی برابر کوشش کرتے رہے ہیں اور ہمیں مسرت ہے کہ ذی شعور طبقہ نے اس سے کافی اثر لیا ہے۔ اب ہمیں اپنی سمت کو اور بھی واضح اور متعین کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ مقاصد اور ان کے ذرائع حصول میں اور بھی ہم آہنگی ہو۔

"ماہ نو" کی حد تک ہماری سمت بہت واضح ہے۔ ملی تشخص کے لئے ملی ادب و ثقافت اور ملت ساز عناصر و عوامل کی نشو و نما۔ اس سمت میں ہم نے پہلے بھی اقدام کئے ہیں۔ آثار کہن، تاریخ و تہذیب، علاقائی روایات و شعائر، مشاہیر، تحریکات سب اسی سعیٔ بلیغ کے آئینہ دار ہیں لیکن اب ضرورت ہے کہ تاروں کی گردش کچھ اور بھی تیز ہو اور اپنے جلو میں شدید تر کوششیں لائے تاکہ بنائے ملت استوار تر ہو اور حصول مقاصد کی سعی و کوشش اور بھی نتیجہ خیز ثابت ہو۔

پچھلے چند شماروں کی طرح اس شمارہ میں بھی یہ خصوصیت نمایاں نظر آئے گی۔ ہمارے کتنے ہی علمی خزانے، زندگی کے کتنے ہی گوشے، تہذیب و تمدن کے کتنے ہی نادر پہلو اور کتنی ہی مایۂ ناز شخصیتیں نگاہوں کی دسترس سے دور پڑی ہیں جن کو جاننے اور دنیا سے روشناس کرانے کی اشد ضرورت ہے۔ اگر ان اہم عناصر کو جو ہماری ثقافت کی بنیادی ہم آہنگی کا ثبوت اور اس کے مختلف مظاہر ہیں، اس طرح اجاگر کیا جائے کہ وہ ہمارے شعور کا جزو بن جائیں تو وہ ملی استحکام کا مؤثر ترین ذریعہ ثابت ہوں گے۔ ان سے ہمارا حصار ملت اور بھی مضبوط ہوگا اور ہم وثوق سے کہہ سکیں گے کہ: ع

بنا مثالِ ابد پائدار ہے اس کی

★

سرورق:

دھان کوٹنے والیاں: ——— عمل: قاضی عبدالباسط

صبح صادق

ابوالاثر حفیظ

عرش اعظم سے دعاؤں کا جواب آ ہی گیا
ارضِ پاکستان پر بھی انقلاب آ ہی گیا

انقلاب ایسا کہ عالم میں نہیں جس کی نظیر
نرم نرم اس مرتبہ اٹھا ہے دستِ "سخت گیر"

چھا گیا ابرِ کرم بجلی گرانے کے بغیر
خون کیا — آنسو کا اک قطرہ بہانے کے بغیر

ہوگئیں مظلوم بندوں کی دعائیں مستجاب
چیر کر ظلمات کے سینے کو اُبھرا آفتاب

آفتاب اُبھرا، گھٹا چھائی تجلّیات کی
ہوگئیں روپوش اولادیں اندھیری رات کی

عدل کی میزان قائم کرنے والا انقلاب
ہر تہی قسمت کا دامن بھرنے والا انقلاب

زخمِ محتاجی کا مرہم، دردِ ذلّت کی دوا
مژدۂ لَا تَقْنَطُوْا — رنجورِ ملّت کی شفا

خارجی خطروں کا سدِّ باب فرماتا ہوا
داخلی فتنوں کا زہرہ آب فرماتا ہوا

آگیا — دورِ مساوات و اُخوّت آگیا
دامنِ جمہور میں سامانِ قوت آگیا

آؤ ہم بھی — جان و تن میں روح کو جاری کریں
صبحِ صادق آگئی — اعلانِ بیداری کریں

آؤ رسمِ لَا اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ — تازہ کریں
چشمِ ابراہیمؑ سے ذوقِ یقیں تازہ کریں

ابرِ رحمت بن کے برسیں کائناتِ زیست پر
کِشتِ اُمیدِ بشر کو ہر کہیں تازہ کریں

عید کی صورت میں دیکھیں معنیٔ ذبحِ عظیم
عشق کے عہدِ کہن کو پھر یہیں تازہ کریں

گونج اُٹھے تھے آسماں جس نعرۂ توحید سے
پھر وہی ہنگامہ بالائے زمیں تازہ کریں

سرکشی نے کر دئے دھندلے نقوشِ بندگی
آؤ سجدے میں گریں لوحِ جبیں تازہ کریں

آؤ سینے میں بسا لیں پھر مدینے کی بہار
دل میں حُبِّ رَحْمَةٌ لِّلْعَالَمِیْنَ تازہ کریں

دوسروں سے کیوں کہیں قربان ہونے کو **حفیظ**
کیوں نہ اس رسمِ کہن کو پھر ہمیں تازہ کریں

فسانہ تھے وہ لوگ!

(میر تقی میر کی زندگی کا ایک واقعہ)

ڈاکٹر مولوی عبد الحق

آزاد نے میر صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ جب لکھنؤ چلے تو ساری گاڑی کا کرایہ بھی پاس نہ تھا۔ ناچار ایک شخص کے ساتھ شریک ہو گئے اور دلّی کو خدا حافظ کہا۔ تھوڑی دور آگے چل کر اس شخص نے کچھ بات کی، یہ اس کی طرف سے منہ پھیر کر ہو بیٹھے۔ کچھ دیر کے بعد پھر اس نے بات کی۔ میر صاحب چیں بجبیں ہو کر بولے: "صاحب قبلہ آپ نے کرایہ دیا ہے بیشک گاڑی میں بیٹھے مگر باتوں سے کیا تعلق! اس نے کہا حضرت کیا مضائقہ ہے۔ راہ کا شغل ہے۔ باتوں میں ذرا جی بہلتا ہے۔ میر صاحب بگڑ کر بولے کہ خیر آپ کا شغل ہے، میری زبان خراب ہوتی ہے۔"

آزاد نے یہ نہیں بتایا کہ گاڑی میں ان کا ساتھی کون تھا۔ اس کا پتا ہمیں ایک دوسری جگہ سے ملتا ہے:۔

خواجہ امیر احمد آرزی قادری، لکھنؤ کے امرا میں سے تھے۔ ان کے والد خواجہ بادشاہ خاں، نواب سعادت علی خاں کے مدار المہام تھے چنانچہ جب نواب صاحب گورنر ہسٹنگز سے ملنے کلکتہ گئے تو یہ ان کے ہمراہ تھے۔ خواجہ امیر کی یادگار ایک کتاب "معدن الجواہر" ہے جو انہوں نے ۱۲۲۵ھ میں تالیف کی جبکہ ان کی عمر ۵۵ سال تھی۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے۔ اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ امیر صاحب علم شخص تھے۔ ان کی تحریر منشیانہ ہے۔ کتاب بہت دلچسپ ہے۔ کتاب کے نام کی مناسبت سے فصل یا باب کو "جوہر" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ کل کتاب میں بیس جوہر ہیں اور ہر جوہر کسی خاص طبقے کے واقعات و حکایات پر مشتمل ہے۔ یہ بڑی دلچسپ اور عجیب کتاب ہے۔ مؤلف نے اس میں ایسی حکایتیں یا نقلیں یا واقعات جمع کر دئیے ہیں جو اس نے اپنے بزرگوں اور معتبر اشخاص سے سنے یا بچشم خود دیکھے اور بہت سی ایسی ظریفانہ اور عجیب و غریب حکایتیں ہیں جو بقول مؤلف "دروغ آمیز راست مانند" اور پڑھنے والے کے لئے "باعث معلومات و سرمایہ علم مجلس و موجب افراح متوافر" ہیں۔ یہ کتاب ۱۳۱۰ھ میں حیدرآباد دکن کے مطبع گلزار احمدی میں طبع ہوئی تھی۔

کتاب کے "جوہر دہم (در بیان صفات بدبخت زبون ہر کس)" میں یہ واقعہ لکھا ہے:۔

"نقل:۔ تقی تخلص میر کہ سر آمد شعرائے ہند بود و عمرش قریب بصد سال رسیدہ در عہد وزارت نواب سعادت علی خاں بہادر اکثر اوقات در خانہ ما می آمد و غزلہائے آبدار خود خواندہ مستمعاں را محظوظ ساخت۔ والد بزرگوار راقم آثم بادے سلوک ہائے نمایاں می کرد۔ زبانی چند کس معتمد بفرح سمع گردید کہ یک بار میر تقی و میر ضیاء الدین کہ او ہم شاعر زبر دستے بود، ہر دو بیک عرابہ بنشستہ عازم سفر بودند و قریب یک ماہ ہم سفر بودند۔ اما ہر دو کس مذکور بغرور شاعری خود شاں دریں مدت ہم کلام نشدند۔ یکے بہ یک پہلوئے عرابہ و روئے دومی بہ پہلوئے دیگر عرابہ بود و پشتہائے ہر دو ملاصق شدہ بود۔ گمرہ این بدخلقیہا لحاظا باید کرد کہ چہ قدر تنگ خو بودند۔ چنانچہ مولوی معنوی جلال الدین رومی ہم دریں معنی فرمایند:

اے بسا ہندو و ترک ہم زبان

اے بسا دو ترک چوں بیگانگاں"

ترجمہ۔ نقل:۔ تقی تخلص میر جو شعرائے ہند کے سرتاج تھے اور ان کی عمر تقریباً سو سال تھی۔ نواب سعادت علی خاں کے عہد وزارت میں اکثر ہمارے گھر آیا کرتے تھے۔ اور اپنی والا غزلیں پڑھ کر سننے والوں کو محظوظ کرتے تھے۔ راقم آثم کے والد بزرگوار ان سے بہت عمدہ سلوک فرماتے تھے۔ بعض لوگوں کی زبانی یہ بات تفریح سے سُنی گئی کہ ایک بار میر تقی اور میر ضیاء الدین جو خود ایک زبردست شاعر تھے، دونوں ایک گاڑی میں بیٹھے سفر کر رہے تھے اور ایک

مہینہ اکٹھے سفر کرتے رہے لیکن دونوں اشخاص مذکورہ اپنی شاعری کے گھمنڈ میں اس تمام عرصہ ایک دوسرے سے ہم کلام نہ ہوئے۔ ایک کا رخ گاڑی کے ایک طرف اور دوسرے کا دوسری طرف تھا اور وہ پشت بہ پشت بیٹھے تھے۔ یہ بدخلقی ملاحظہ فرمائیے کہ وہ کس قدر تنگدل تھے۔ چنانچہ مولوی معنوی مولانا جلال الدین رومی نے بھی اس بارہ میں بجا ارشاد فرمایا ہے کہ

" کتنے ہی ہندو اور ترک ہیں کہ ہم زبان ہیں، اور کتنے ہی ترک ہیں جو ایک دوسرے سے بیگانہ ہیں!"

میر ضیاء الدین ضیاء اردو کے مشہور شاعر اور استاد گزرے ہیں۔ میر حسن کو بھی ان سے تلمذ تھا۔ میر حسن نے اپنے تذکرے میں ان کی بہت تعریف لکھی ہے۔ ان کے تلامذہ کی تعداد کچھ کم نہیں۔ خواجہ امیر نے یہ واقعہ خود میر صاحب یا اپنے والد کی زبانی نہیں سنا بلکہ چند معتمد اشخاص کی زبانی سنا۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ اشخاص کون تھے۔ اس کی تصدیق کسی اور تذکرے وغیرہ سے بھی نہیں ہوتی۔ اس لئے صرف خواجہ امیر کے بیان کی بنیاد پر اس واقعہ کی صحت یا عدم صحت کے متعلق کچھ کہنا دشوار ہے۔ مگر بہر حال یہ بیان ایسا نہیں جو نظر انداز کر دیا جائے ممکن ہے آئندہ تحقیق اس پر کچھ روشنی ڈالے ۔

★

استفسار

دور جہانِ آب و گل سے   تم بستے ہو سدا دلوں میں
ہم انسانوں کی محفل سے   ان آنکھوں میں، ان سینوں میں
اے فردوس کو جانے والو!   ہم بھی اُس دُنیا کے مکینو!
لافانی، ملکوتی روحو!   دل میں تمہارے رہ پاتے ہیں؟
عالمِ بالا کے سیارو!   تم جیسے سالارِ جہاں تھے
تم ہمیں اکثر یاد آتے ہو   روحِ روانِ زندہ دلاں تھے
ہم بھی تمہیں یاد آتے ہیں؟   سینوں میں اک آگ بھری تھی
تم نے چھوڑا عالمِ ہستی   برقِ تپاں رگ رگ میں بسی تھی
سفلی انسانوں کی بستی   طوفانوں کا شور نفس میں
یہ دنیا، اس کے ہنگامے   بجلیاں لہراتی نس نس میں
اس کی صبحیں، اس کی شامیں   تم میں ایسا سحر نہاں تھا
شور و شغب اور ہاؤ ہو کو   سر تا سر مسحور جہاں تھا
عربدہ زارِ ما و تو کو   یاد ہے پھر محور دل و جاں
کھو گئے جیسے ایک نفس بھی   تڑپاتی ہیں سونی گھڑیاں
دنیا کو آواز نہ آئی!   اے فردوسِ بریں کے تارو!
ہاں ترسیں دن رات نگاہیں   ہم بھی تمہیں کیا تڑپاتے ہیں؟
جانے کھلیں کب دید کی راہیں

★

عاصمہ حسین

کینٹو:

ستارۂ انقلاب

سید جعفر طاہر

بنامِ خدائے سخن آفریں والٰہہ سخن گسترانِ زمانہ
بنامِ دبیرِ حکایاتِ ہستی، امیرِ سپہرِ کلام و فسانہ
بنامِ شہنشاہِ شیوا نگاراں، بنامِ جہاں داجادو بیاناں
بنامِ نویسندۂ دفترِ آرزو، خسروِ بزمِ شیریں کلاماں

بنامِ نگارش گرِ مصحفِ عالم و قصۂ آدم و خاک زاداں
بنامِ نگارندۂ لوحِ تقدیر و سرکاتبِ قسمتِ پاک زاداں
بنامِ ہمہ دانش و حکمت و علم و پروردگارِ ادب آفریناں
سزاوارِ حمد ہنر پرورانِ گرامی، خداوندِ باریک بیناں

خیالات کے طائرانِ سبک تاز کو اذنِ پرواز دینے لگا ہوں
زہے ذوقِ نغمہ سرائی کہ زاؔور زبانوں کو آواز دینے لگا ہوں
نہ "سدِ سکندر" کی سختی کا ڈر ہے نہ "دیوارِ چین" کے ستم کی ہے پروا
یہ دھرتی کے سینے پہ کھنچی لکیریں، لکیروں سے رکتا نہیں سیلِ دریا

مری راہ میں خوف کی ظلمتیں بھی گراں تاگراں ہوں تو پروا نہیں ہے
پرانا سپاہی ہوں اور مجھ کو ان سے کوئی خاص ایسا بھی پرخاش نہیں ہے
گرجتی چمکتی گنوں سے برستی ہوئی گولیوں میں غزلخواں رہا ہوں
گلے سے عروسِ اجل کو لگائے محاذوں پہ بے خوف رقصاں رہا ہوں

عناں برعناں ظلم کی دیویاں میری راہوں میں نعرہ زناں ہیں تو کیا ہے
یہ راہِ سخن ہے، تہِ راہ دمنزل کئی دامِ تیرہ نہاں ہیں تو کیا ہے
مرے دوستو میں سپاہی ہوں اور مصلحت کے تقاضوں سے بھی باخبر ہوں
مگر ایک شاعر بھی ہوں اور حالات کے ساز پر آج پھر زخمہ گر ہوں

رگ و پے کے بالین و بستر پہ سوئی ہوئی چاندنی پھر ہمکنے لگی ہے
ادھر موتیوں کے سفینے ستاروں کے زینے سے زہرہ اترنے لگی ہے
یہ طبعِ بہانہ طلب "رشحۂ فیض" کی داد پا کر برسنے لگی ہے
عروسِ سخن آسماں سے اتر کر نہاں خانۂ دل میں بسنے لگی ہے

بڑی دیر کے بعد آوازۂ کلکِ صد زمزمہ ساز آنے لگا ہے
شگافِ قلم سے برستی ہوئی شبنموں میں زمانہ نہانے لگا ہے
بڑی عمر کے بعد فکر و نظر کی سیہ بخت راتوں کی تقدیر جاگی
شبِ شبہ گوں کی سیاہی چھٹی، پو پھٹی، ہر طرف ایک تنویر جاگی

مری کانپتی انگلیاں پردۂ ساز پر چھیڑتی ہیں نرالا ترانہ
ترانہ کہ جس کے ابھرتے سروں کے جلو میں رواں عظمتِ خسروانہ
سپاہی کی بے لوث قربانیوں کا ترانہ، یہ اک نغمۂ فاتحانہ
نئے دور کی برکتوں کا فسانہ، نشید و نویدِ نصیبِ یگانہ

مگر کوئی سُر خونچکاں بن کے ابھرے تو خونِ رگِ جاں کی تصویر سمجھیں
جو ظلم ہو گا اگر ظلم کو آپ اہلِ نظر صرف تقدیر سمجھیں
مغنی کے سینے میں جو ٹوٹ کر رہ گئے ہیں ستم کے زبوں تیر دیکھیں
سُروں کے بہاؤ میں اپنی بدلتی ہوئی قسمتوں کی لکھی تفسیر دیکھیں

مرے ہمدمو، دوستو، ساتھیو! سن چکا ہوں ہزاروں حسیں داستانیں
وہی گیسوؤں کی برستی گھٹائیں، سنا برق سینوں کی تپتی سنانیں
لب و زلف و رخسار کے تذکرے ساحتِ دوش و بازو کی رنگین باتیں
گماں ہو رہا ہے خمِ ابرواں میں گذاری ہوں جیسے یہ پُرہول راتیں

ؔ زہرہ، غالب: ترکِ سپہر از نہیب شغلِ عطارد گزید ؛ قاضیٔ چرخ از نشاط پیشۂ زادر گرفت (مدیر)

حکایاتِ آہوئے نگاہانِ تاتار و کوثر لبانِ عدن کے فسانے
فسونِ ہوائے سرِ زلفِ خوباں، گنگتی ہوئی انکھڑیوں کے ترانے
جوانی میں دیکھے ہیں میں نے بھی کتنی جنوں خیز آنکھوں کے سچے نشانے
گلابی لبوں کے سبو، نقرئی انگلیوں کی لویں، نور کے آستانے

مجھے علم ہے نرم سرگوشیاں گرم سانسوں میں تبدیل ہوتی ہیں کیونکر
شبِ وصل انگڑائیاں ہولے ہولے نشہ بن کے تحلیل ہوتی ہیں کیونکر
مجھے علم ہے نازنینانِ پیماں شکن ہم سے لیتی ہیں ہر قول کیونکر
مجھے علم ہے ایک بوسے کی گہرائی میں ڈوب جاتا ہے ماحول کیونکر

مگر اے ستائش گرانِ فسوں کاریٔ لعلِ لب ہائے جادو طرازاں
پرستندگانِ شفق سازی و ارغواں زاریٔ روئے شعلہ عذاراں
یہ مانا کہ حسن و محبت کی پُر کیف باتوں سے ہے زینتِ ہر فسانہ
مگر اس گھڑی جب گلستاں میں کہرام برپا ہو، جلنے لگے آشیانہ

فریبِ ہوا و ہوس کے علاوہ بھی ہیں زندگی کے ہزاروں تقاضے
کہاں تک بھلا کوئی تکتا رہے آرزوؤں کے جلتے سلگتے جنازے
غمِ جاں کی تاریک راتوں میں انساں سراغِ سحر کیلئے ہو روانہ
نمِ اشک سے ریگ زاروں کو سینچے مہ و کہکشاں کو بنائے نشانہ

جنوں خیز انگڑائیوں کے بھنور سے ابھر کر یم زندگانی میں کھیلے
عناں بر عناں یہ بلاؤں کے ریلے، قیامت کے میلے دکھوں کے جھمیلے
وہی مرد ہے جو سپاہانہ انداز میں ان حقائق سے پنجہ ملائے
مصیبت زدوں کا بنے آسرا، بے نواؤں کو بندِ ستم سے چھڑائے

مقدس وطن کی محبت کے مارے ہوؤں کی سنانے لگا ہوں کہانی
کہانی جسے سن کے ہو پانی پانی، جوانانِ آہن قبا کی جوانی
کہانی کہ جس کے خم و پیچ میں سینکڑوں دم گرفتہ امیدوں کے لاشے
کہیں ٹوٹتی ہچکیاں ہیں، کہیں وہ فریبِ ہوس کے ہزاروں تماشے

سنا ہوگا تم نے کہ ہم بے نواؤں میں اک مردِ تقدیر ساماں ہوا ہے
دیارِ بتاں میں محمد علی نام کا ایک مردِ مسلماں ہوا ہے
جناح جگردار وہ صاحبِ جرأت و عزم و فہم و شعورِ یگانہ
وہ مومن کہ جس کی نگاہوں میں نرمی تو پاؤں کی ٹھوکر میں سارا زمانہ

اسی کا یہ اعجاز تھا ہم اسیروں نے پائی جو بندِ اجل سے رہائی
اسی کا یہ فیضان تھا پھر میسر ہوئی بار دیگر جو فرماں روائی
گدایانِ شب کوک و محروم برگ و نوا قائدِ قوم سے شادماں تھے
سپاہ محمد کے بانکے جیالے جواں آج پھر قوم کے پاسباں تھے

زمانے کے چالاک شاطر نے ہر چند چالیں چلیں دامِ رنگیں بچھائے
زر و سیم کے ڈھیر لعل و جواہر کے انبار فاقہ زدوں کو دکھائے
مگر قوم کے ناخدا کے ارادوں پہ گردش گرِ وقت بھی مسکرایا
بڑھا اور دم توڑتی آرزو کا سفینہ کنارے پہ خود کھینچ لایا

محبو! حکومت جو پائی تو اُس کے جلو میں ہزاروں پریشانیاں تھیں
نہ کوئی خزانہ، نہ قصرِ امارت، مگر دشمنوں کو بھی حیرانیاں تھیں
کئی قصر و ایواں سجائے، گلستاں گلستاں نئے آشیانے بنائے
غرض ایک ہی سال میں معترف ہو گئے عزمِ قومی کے اپنے پرائے

ادھر قائدِ قوم و بابائے ملت ہوئے جنتِ جاوداں کو روانہ
رفیقو! مصیبت کا طوفان ٹوٹا ہمیں آزمانے لگا پھر زمانہ
مگر اس نئی قوم کا یہ مقدر، بلندی پہ تقدیر کا تھا ستارا
لیاقت علی خاںؒ سا مضبوط انساں بنا اس نئی مملکت کا سہارا

لیاقت علی خاںؒ نے بھی مدتِ مختصر میں کئے کارہائے نمایاں
بسائے گئے شہر در شہر کتنے غریب الوطن خانہ برباد انساں
کئی کام جو قائدِ قوم سے رہ گئے تھے فقط آپ نے کر دکھائے
عدو کے لئے اب یہ دشوار تھا اس جگردار سے بڑھ کے پنجہ لڑائے

وطن کی حدوں کی حفاظت کبھی صاحبانِ ہنر کے لئے ساز و ساماں
نئی درسگاہیں، نئی کارگاہیں، نئے کارخانے چلانے کے فرماں
وطن کی محبت میں دنیا کے دورے، نئے حکمرانوں سے وہ آشنائی
مگر اس مجاہد نے بھی دوستو اک سپاہانہ انداز میں موت پائی

لیاقت علی خان کی موت نے یہ حقیقت ہے اپنی کمر توڑ ڈالی
یہ کیسا چمن تھا جہاں پر کوئی باغباں تھا نہ مالی نہ وارث نہ والی
بظاہر خدا کا تو یہ بھی کرم تھا کئی لوگ ہم پر ابھی مہرباں تھے
حکومت کے جنجال سے جی چراتے ہوئے بھی فقیروں پہ وہ حکمراں تھے

وطن کی حفاظت وطن کے جگر دار بیٹے برابر کئے جا رہے تھے
لگاتار قربانیوں کے صلے میں دلوں کی دعائیں لئے جا رہے تھے
وہ گردن کشانِ زمانہ سے بے خوف ہو کر برابر جئے جا رہے تھے
وطن کی حفاظت میں کتنے جواں سال دادِ شجاعت دئے جا رہے تھے

وہ سالارِ اعلےٰ کہ جس کی نگاہوں میں قوموں کی تقدیر کے راز پنہاں
وہ ایوب سا مردِ شاہیں جگر جس کی ہیبت سے کفار و اغیار ترساں
جوانِ ستودہ شیم جس نے ہر دورِ ناپاک میں خامشی سے بسر کی
وطن کی حفاظت میں ننگی چٹانوں پہ جاگا گھنے جنگلوں میں سحر کی

یہی شیرِ کہسار پیکر، یہی مردِ فولاد چہرہ فقط غم نشاں تھا
مصیبت کے ایام میں اک یہی آہنیں عزم اس قوم کا پاسباں تھا
مجتو! وگرنہ ہماری حکومت کے جو طور تھے وہ جہاں سے نرالے
غضب تو یہ تھا حکمرانوں سے بھی بڑھ کے ظالم تھے اُن حکمرانوں کے سالے

اسی ایک سالارِ اعلےٰ کے سائے میں ہر کارواں منزلوں کو رواں تھا
یہ مردِ قوی بال ہم میں نہ ہوتا تو دنیا میں اپنا ٹھکانہ کہاں تھا
اگر اس گھڑی کوئی سالار تھا بھی تو دنیا نے دیکھا وہ غدار نکلا
مجتو! یہی ایک سالارِ اعلےٰ، یہ بانکا سپاہی وفادار نکلا

چمن تھا کہ ننگِ چمن، ننگِ گلزار و نکہت فروشوں کی اک انجمن تھا
اور اس انجمن میں خلوص و شرافت تھے لب دوختہ، اہرمن خندہ زن تھا
بساطِ سیاست پہ پھولوں کے مہرے سجا کر نئی بازیاں ہو رہی تھیں
نہ جانے خداوندِ عالم کی وہ رحمتیں برکتیں اب کہاں سو گئی تھیں

جگر کوفتہ چشم و دل سوختہ نوجوانوں کی راہوں میں حیرانیاں تھیں
وہ دانا دلانِ وطن جن کی تقدیر میں جانے کتنی پریشانیاں تھیں
وہ دزدانِ بر قلۂ کوہ کی بے گماں کبریائی، وہ فرماں روائی
جو فریاد کے جیل خانوں میں پہنچے جو سونا سمگل کیا داد پائی

نہ جانے کہاں روٹھ کر چل دئے صبحِ اقبال کے مسکراتے سویرے
بسا رو ہیں قحط کی آندھیاں خوف کی ظلمتیں ذلتوں کے اندھیرے
وطن کی مقدس فضاؤں پہ کتنے غموں کی شبِ تیرہ گوں چھا گئی تھی
مجتو! کراں تا کراں، گوش تا گوش بس ایک آوازِ غم آ رہی تھی:

اے وائے وطن وائے!

کیا دن تھے کہ انوار یہاں سایہ فگن تھے
دریا ترے سرچشمۂ صد گنگ و جمن تھے
کوچے ترے یاروں کے لئے مصر و یمن تھے
ہر سمت رواں کتنے غزالانِ ختن تھے
اب لالہ و گل ہیں نہ کوئی کنجِ چمن ہائے

اے وائے وطن وائے!

حاکم ہیں مگر دشمنِ انصاف ہوئے ہیں
فریاد کبھی کی ہے تو کھر صاف ہوئے ہیں
ہونے کو سبھی صاحبِ اوصاف ہوئے ہیں
خصاف یہاں آن کے زرباف ہوئے ہیں
ندات بنے ساقیِ میخانۂ فن ہائے، اے وائے وطن وائے!

سنتے نہیں مفلس کا بیاں ظالم و راشی
گر جیب ہو خالی تو یہ لیں خانہ تلاشی
صاحب سے بھی بڑھ چڑھ کے ہیں صاحب کے حواشی
ہے ان کے لئے ایک ہی کعبہ ہو کہ کاشی

ہم و دینار، کجا نقدِ سخن ہائے، اے وائے وطن وائے!
ہیں دکانوں پہ کئی ایک لیٹرے
کا نہیں کچھ بھی کرد جتنے ہی پھیرے
نگاہوں میں ہیں بنکوں کے لبیرے
ں کے نہیں ہوں گے یہ کیا آپ کے میرے
زت و ناموس کے دلّالِ کہن ہائے، اے وائے وطن وائے!
رے کیا چیز ہیں اربابِ سیاست
نے ہیں سدا حق و صداقت سے بغاوت
ن کو خبر دوستی کیا شے ہے رفاقت
وہ ہیں جو ایماں کی بھی کرتے ہیں تجارت
نہ گرو تیرہ دل و شوردہن ہائے، اے وائے وطن وائے!
ہیرے وطن دیکھ یہ فرزند ہیں تیرے
ش ہیں گتے ہیں تو ہاتھوں میں بٹیرے
رّہ و دستار یہ شلوار کے گھیرے
تے ہوئے مونچھوں کے پُر ہول پھیریرے
تت جنہیں رہتی ہے دوٹوں کی لگن ہائے، اے وائے وطن وائے!
اکمِ ذیشان غضب کا تھا مدارِی
زم کی حالت پہ سدا گریہ و زاری
لتروں سے چوروں سے لٹیروں سے وہ یاری
نے کی سلاخوں کا تھا کمبخت پجاری
رۂ غربت ہے وہ ستیاد[1] دشمن، اے وائے وطن وائے!
نوش ہے یہ منڈیوں میں بیچ کے کاریں
رم کا بڑھے بھاؤ تو یہ گاتے ملا دیں

دیتا ہے کوئی ٹھیکے پہ گلشن کی بہاریں
تقسیم جو پرمٹ کریں تقدیر سنوا ریں
ہائے یہ وفادار، یہ غمخوارِ وطن ہائے، اے وائے وطن وائے!
کیا دَور ہے یہ سینہ زناں اہلِ ہُنر ہیں
کیا دَور ہے یہ نوحہ کناں اہلِ نظر ہیں
میں ہوں کہ کوئی اور سبھی خاک بسر ہیں
ہر جاہلِ مطلق کے لئے لعل و گہر ہیں
فنکار ہیں اور کاہشِ عریانیٔ تن ہائے، اے وائے وطن وائے!
کوئی بھی غریبوں کا نہ پُرساں ہے نہ والی
دل سوزِ وفا، نورِ یقیں سے ہوئے خالی
سرگشتہ و جاں باختہ اربابِ معالی
ہر کو دنِ دوراں ہے ابوالفضل و غزالی
آثرا گلِ نو رنگِ خزاں در کفِ من ہائے[2]، اے وائے وطن وائے!

یہ محفلِ شب، شکر کہ برخاست ہوئی ہے
اک صبحِ جواں پھر سے علم راست ہوئی ہے
اللہ نے سُن لی ہیں غریبوں کی دعائیں
منظور مری قوم کی درخواست ہوئی ہے
وہ لوگ جو میخانۂ ہستی کے مغاں تھے
سنتا ہوں کہ اب ان سے بھی واخواست ہوئی ہے
ابتوب حق آگاہ سمجھنے لگا سب سے
یاروں کو بھی اب فکرِ کم و کاست ہوئی ہے
آتے ہیں سلام ان کو لیسار اور یمیں سے
صد گونہ خوشی میرے چپ و راست ہوئی ہے

☆

---

[1] بُت، غالب: صبحے کہ در ہوائے پرستارئ وثن ٭ جنبد کلید بتکدہ در دستِ برہمن
[2] نظیری: اے دل از گلبنِ امید نشانے بمن آر ٭ نیست گر تازہ گُلے، برگِ خزانے بمن آر (مدیر)

ابوالاثر حفیظ

رفیق خاور

"تشکیل و تکمیلِ فن میں جو بھی حفیظ کا حصّہ ہے
نصف صدی کا قصّہ ہے، دو چار برس کی بات نہیں"

اور اب تو یہ قصّہ نصف صدی کی حدود سے کافی آگے بڑھ چکا ہے۔ کیونکہ آٹھ دس برس ہوئے اس شاعرِ شیریں نوا کی پچاس سالہ جوبلی بھی منائی جا چکی ہے، اور اب اس کا ذکر آتے ہی کتنے ہی شاہکاروں ––– "نغمہ زار"، "سوز و ساز"، "تلخابۂ شیریں"، "شاہنامۂ اسلام"، "ہفت پیکر" وغیرہ اور سب سے بڑھ کر پاکستان کا قومی ترانہ، نظروں میں گھوم جاتا ہے جو ایک مختصر مگر مستقل، گراں قدر، مقبولِ عام چیز ہوتے ہوئے ملّی اعتبار سے ان سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جس کی بدولت پاکستان کا بچّہ بچّہ حفیظ کو جانتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک پورا دور نئے سرے سے زندہ ہو کر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ وہ دور جس کو ہم میں سے کئی لوگوں نے خود دیکھا ہے، اس میں سے خود گزرے ہیں لیکن جو رفتہ رفتہ ہماری نظروں سے اوجھل ہوتا جا رہا ہے ––– اپنے تمام ہنگاموں اور ان یگانۂ روزگار شخصیتوں کے ساتھ جو ان ہنگاموں کی روحِ رواں تھے۔ ڈاکٹر تاثیر، پطرس، اختر شیرانی، میرزا یاس یگانہ چنگیزی، ہری چند اختر، میراجی ––– اور ان کی سرگرمیوں کا مرکز لاہور تھا جو اپنی تیز قدم بیداری سے شعر و ادب کے ساتھ ایک مناسبتِ خاص پیدا کر چکا ہے۔ ابوالاثر اس دور کی ایک ایسی قد آور شخصیت ہے جو ہر اعتبار سے نمائندہ حیثیت رکھتی ہے اور جب ہم اس دور کا ذکر کرنے لگتے ہیں تو قدرتی طور پر اس کی مختلف خصوصیتیں اس ہی کی ذات میں سمٹ آتی ہیں اور دعوتِ قلب و نظر دیتی ہیں۔ اس طرح کہ:

نظارہ ز جنبیدنِ مژگاں گلہ دارد

ہاں فردوسیٔ اسلام ابوالاثر حفیظ کے ساتھ یہ دور اور اس کی فضا ہی نہیں ابھرتی بلکہ اس کی نوا بھی ابھرتی ہے۔ یہ دور ہی زندہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے مغنّی بھی اپنے نغموں، اپنے گیتوں، اپنی گوناگوں خوش الحانیوں اور اپنے عظیم الشان مشاعروں کے ساتھ زندہ ہو جاتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے کسی نادیدہ ساحر نے چپکے سے "کھل سم سم" کہہ دیا ہو اور ہمارے سامنے یکلخت ایک طلسمی دنیا کے دریچے کھل جائیں۔ معنوی خزانوں سے بھرپور۔ حفیظ کے دوست پطرس نے انہیں "ساحر" کہا ہے۔ اور وہ "نغمہ زار" سے لیکر اب تک کتنی ہی صورتوں میں اسکا ثبوت بھی بہم پہنچ چکا ہے۔

ہم حفیظ کو اس فضا اور اس نوا سے الگ نہیں کر سکتے۔ یہ نوا یہ لحنِ داؤدی ہی اس کی زندگی ہے۔ یہ اس کو مبدا فیاض کا سب سے بڑا عطیہ ہے۔ ایک قدرتی دین جو شروع سے لیکر اب تک زندگی کے تمام نشیب و فراز میں اس کے ساتھ رہی ہے اور برابر نت نیا جادو جگاتی رہی ہے۔ یہ وہ نوا ہے، شعری بھی اور نغماتی بھی، جو سنتے ہی دل میں اُتر جاتی ہے، اپنی تمام سحر آفرینیوں کے ساتھ۔ وہ اُردو شاعری کا ایرئیل ہے جس کی رسیلی، نشیلی آواز آسمان و زمین میں ہر کہیں سمائی ہوئی ہے اور ہم جدھر جائیں اسی کے گنگناتے زمزمے اور مدبھری تانیں سنائی دیتی ہیں۔ جو لوگ ابتدا ہی سے حفیظ کی یہ نوا سنتے آئے ہیں اور انہوں نے حفیظ بے نوا کو ابھرتے دیکھا ہے، انہوں نے محسوس کیا ہوگا کہ اس میں ایک خاص اٹھان تھی۔ انہیں وہ عظیم الشان مشاعرے بھی یاد ہونگے جن میں حفیظ بڑے طمطراق سے شامل ہوتا اور اپنی جادو نوائی سے سامعین پر دھاک بٹھا دیتا۔ یہی مشاعرے اس کی شہرت و مقبولیت کے لئے بال و پر ثابت ہوئے۔ یہاں تک کہ زہرۂ افلاک ان کی لَے اڑا کرنے لگی۔ اور وہ رفتہ رفتہ ستاروں کی منزل تک پہنچ گیا۔

آپ پوچھیں گے اس نغمگی کا راز کیا ہے۔ یہ سبک، سجل، ہوائی نغمگی جس سے ساری فضا پر سیمیا کا سا اثر طاری ہو۔ اس کا راز اسکی حباب وار نزاکت میں مضمر ہے۔ قدرت نے حفیظ کو ایک بچے کی نظر عطا کی ہے۔ تمام تر حواس، تمام تر تخیل۔ بھولی بھالی سیدھی سادی طبیعت جو رنگ ہی رنگ

اور کیف ہی کیف کی متوالی ہے۔ اس کی دنیا حواس کی رنگ رلیوں کی دنیا ہے مگر عیاشانہ یا رندانہ نہیں، بالکل معصومانہ۔ اس کے دستِ شوق نے حُسن کو وہاں اپنایا ہے جہاں یہ کسی تصنع یا تکلیف سے آلودہ نہیں ہوا۔ اس میں ایک قدرتی سادگی اور بانکپن جھلکتا ہے۔ اس نے اپنی دنیا اس سنسنی سے بنائی ہے جس میں کوئی سنسنی نہیں۔ یعنی وہ کھری چاندی جیسی نکھری نکھری جھلکیاں جو حواس اور مشاہدہ کے ذریعے سے ذہن تک پہنچتی ہیں اور پھر رنگینیوں میں ڈوب کر دل کی راہ لیتی ہیں۔ اس کا فکر کسی فلسفی کا بوجھل فکر نہیں بلکہ چلبلا تخیل ہے۔ چلبلا، البیلا، جوبن مست۔ اگر اس کے یہاں فکر آتا بھی ہے تو حسن کا چولا پہن کر، جو اپنی ہلکی پھلکی وضع سے بہت ہی پیارا اور دلکش معلوم ہوتا ہے۔ اس کی شاعری شروع ہی سے اس ہلکے پھلکے جوبن کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ کیونکہ اس کا دل، جو اس سانچے کو ڈھالنے والا سانچہ ہے، بہت ہی نفیس اور سڈول ہے، بے حد بانکا، سادہ پرکار۔ اس کی بناوٹ، جو چیز بھی اس کے دامن میں آئے، اس کو غضب کی چھاپ عطا کر دیتی ہے۔

آواز جبھی بلند اڑ سکتی ہے کہ وہ خالص آواز ہو — جتنا بوجھ زیادہ ہوگا اتنی ہی وہ دبے گی، ابھرے گی نہیں۔ حفیظ کی نوا ہلکے سے ہلکا سامان لے کر اٹھتی ہے۔ سیدھے سادے ہلکے پھلکے محسوسات، اس لئے اس کی اڑان شوخ، چنچل ممولوں کی سی اڑان ہے کہ ابھی وہ زمین پر تھے اور ابھی دور کہیں اونچائیوں میں اڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ شروع ہی سے حفیظ نے اس ہلکی پھلکی اڑان کو اپنایا۔ اس کی دنیا ایک وسیع نغمہ زار ہے۔ وہ اپنی لَے وہاں سے اٹھاتا ہے جہاں ایک دھیما دھیما سوز چپکے ہی چپکے ہلکے پھلکے زمزموں کو جنم دیتا ہے۔ لہٰذا اس میں کاوش کو دخل نہیں ہوتا۔ اور لَو اپنے لئے جو ہیولیٰ تراشتی ہے وہ بھی چلبلی، چمکیلی کرنوں کے تانے بانے کا سیمیائی ہالا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے چاندرات کو چاروں کھونٹ ہلکی پھلکی ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی بکھری ہو۔ ابتدا ہی سے اس نے چھوٹی چھوٹی بحروں، اور چھوٹے چھوٹے بجروں کو اپنایا۔ جو قبل ازیں کہیں کہیں اقبال کے بجرے گراں بہی بڑی تیزی اور پھرتی سے رواں دواں نظر آتے ہیں اور ان کے ساتھ ہی وہ چھوٹے چھوٹے چپو اور پتواریں بھی۔ بڑے ہی نازک لچکیلے مصرعے جو آپس میں یوں بے ساختگی سے گھل مل جاتے ہیں جیسے دریا کے سینے پر مچلتی ہوئی لہریں۔

اس میں شک نہیں کہ حفیظ نے بڑی بحروں کو بھی اپنایا ہے۔ اور "شاہنامۂ اسلام" کی بحر سے زیادہ لمبی بحر اور کیا ہوگی؟ لیکن وہ یہاں بھی طبعاً ایرِیل[1] ہی ثابت ہوتا ہے۔ اور ان لمبی بحروں میں بھی وہی سبک اور تیز اڑان پیدا کر دیتا ہے جو اس کی چھوٹی بحروں کا خاصہ ہے۔ ان میں بھی وہی رنگ و آہنگ کی لہر نظر آتی ہے۔ اور دھیما دھیما سوز لئے ہی جیسے نرم نرم ساز کو جنم دیتا ہے۔ یہ آنچ، یہ راگنی جتنا طبیعت کو سلگاتی ہے اتنا ہی رجھاتی بھی ہے۔ اور شعر اور راگ کا وہ دوگونہ جادو جگاتی ہے جو حفیظ کے دل میں ازل سے کروٹیں لے رہا ہے۔ اس میں اس چوٹ کا لطف بھی ہے جو جل ترنگ کی پیالیوں پر رہ رہ کر پڑتی ہے اور وہ نغمگی بھی جو پیالیوں کی سریلی آواز اور جل کی ترنگ اپنے جلو میں لاتی ہے۔

حفیظ نے اپنے گرد و پیش اور خود زندگی کو وہاں اور اس وقت دیکھا ہے جبکہ ابھی فطرت کے ظلمت خانہ سے اُبھری ہی تھی دنیا، یعنی وہ قدرت کو اسی عالم میں دیکھتا ہے اور اسی انسان کی نظر سے جس نے اس کو اوّل اوّل اپنے نکھرے نکھرے اور کھرے کھرے رنگ میں دیکھا تھا۔ اور اسی سادگی احساس اور سادگی فکر و خیال کے ساتھ۔ یہاں پھر اس کی سوچ اور احساس کے ڈانڈے طفلِ صغیر کی سوچ اور احساس سے مل جاتے ہیں جس کو صرف دیکھنے اور دیکھے جانے سے غرض ہے۔ اور صبح ہو یا شام، اجالا ہو یا اندھیرا، اس کے لئے یکساں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اگر وہ ایک طرف یہ دیکھتا ہے کہ:

اٹھی حسینۂ سحر — پہن کے سر پہ تاجِ زر
وہ خندۂ نگاہ سے — پہاڑ طور بن گئے

تو دوسری طرف یہ بھی مشاہدہ کرتا ہے کہ

نیلم پری رات —— جادو بھری رات
بیٹھی ہے چپ چاپ —— ہر رہگذر میں

ایسے اشعار میں تصویر پوری طرح روشن بھی ہے اور مجسم بھی۔ جیسے کسی نے واقعی کوئی تصویر رنگ و روغن سے تیار کر کے چوکھٹے میں جڑ دی ہو۔ اور پھر "نیلم پری رات" میں اشارات کی ایک وسیع دنیا بھی بکھری پڑی ہے جیسے اس پر ایک طلسمی چھوٹ پڑ رہی ہو۔ اور اسکے سبب تصویر کے حاشیے دور دور تک پھیلتے چلے

[1] شیکسپیر کے TEMPEST کا ایک کردار

جائیں۔ اسی طرح جب حفیظ پہاڑوں کی اونچائیوں پر نظر ڈالتا ہے تو دن رات کے سارے روپ، سارے سمے اس کے لئے علیحدہ علیحدہ پیغام کیف و نظر لے کر آتے ہیں۔ اور ایک ابتدائی انسان، ایک نگاہ مست بچے کی طرح خالص نظر ہی نظر سنسنی ہی سنسنی کے رنگ میں شوب دیتے ہوئے :-

گوشے گوشے میں ہیں قائم کارخانے ابر کے — بن رہے ہیں تن رہے ہیں شامیانے ابر کے

صبح کا یہ فرض ہے معمول پر آیا کرے — جس قدر سونا فراہم کر سکے لایا کرے
لے کے آتی ہے زر خالص کی کانیں ہر سحر — لا کے رکھ دیتی ہے سونے کی چٹانیں شرق پر
کیمیا سازانِ چرخ، اٹھتے ہیں اپنے کام کو — آگ کی بھٹی میں رکھتے ہیں طلائے خام کو
دفعتاً شعلے نظر آتے ہیں یا رنگیں دھواں — چوٹیاں مشرق کی ہو جاتی ہیں سب آتش فشاں
دیکھتے ہی دیکھتے ہوتا ہے سونے کا یہ حال — کوئی شئے پگھلی ہوئی کچھ قرمزی کچھ لال لال
حکم یہ ہے اس میں جو ناقص ہے چھن جایا کرے — اور باقی اک طلسمی گیند بن جایا کرے

. . . .

شام آئی ہے سکوں کا جال پھیلائے ہوئے — ساحرہ بیٹھی ہے کالے بال بکھرائے ہوئے
کوہ پر ظلمات کی پریوں نے پر پھیلا دئے — ہر طرف تاریک دامن کھول کر پھیلا دئے
اس طرح اونچے پہاڑوں میں گھری ہیں وادیاں — جس طرح دیووں کے گھر میں قید ہوں شہزادیاں

حفیظ اپنے بالغ ترین لمحوں میں بھی اس "قرمزی کچھ لال لال"، اور دیووں کے گھر میں قید شہزادیوں کا جادو نہیں بھولتا۔ چنانچہ جب "شاہنامۂ اسلام" کے وسیع و عریض صحرا میں بھی نخلستان آتے ہیں تو یہ روپ لے کر :-

وہ ملک جو ایک سمندر ہے لمبے چوڑے میدانوں کا — مجموعہ ریگستانوں کا اور نا ہموار چٹانوں کا
طوفانی ریگِ رواں جس میں زہریلے طوفاں اٹھتے ہیں — غصے میں بھر کر کالے نیلے پیلے طوفاں اٹھتے ہیں
وہ وسعت، ذرے ذرے کو جو دشت بنائے بیٹھی ہے — گنتی کے نخلستانوں کو دامن میں چھپائے بیٹھی ہے

اس سے ظاہر ہے کہ حفیظ کی نظر حیاتی سے بھی زیادہ مشاہداتی ہے۔ وہ طبعاً شہودی ANTHROPOMORPHIC یعنی خوگر پیکر محسوس ہر شاعر طبعاً کم و بیش ایسا ہی ہوتا ہے، مگر کسی میں خارجیت ساتی زیادہ ہوتا ہے کسی میں کم۔ حفیظ سے کہا جائے تو وہ اپنی ساری اندرونی کیفیتوں بھول کر شاید سند باد جہازی کی طرح اژدہاؤں سے پُر، سنگلاخ اور ہیبت ناک پہاڑوں میں بھی لعل و جواہر چُننے لگ جائے! "نغمہ زار" کی حد تک اس کی ساری شاعری انہی خارجی مشاہدات ہی میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس کی دُنیا "دیکھتا چلا گیا" کی دنیا ہے۔ جس کو وہ بڑا ہو کر بھی نہیں بھولتا۔

کیا اس لگن کو زندگی کی لگن کہا جائے؟ اس میں ہرج ہی کیا ہے؟ بنیادی طور پر زندگی یہی ہے۔ ماحول سے کچھ لینے، ماحول کو کچھ دینے کا نام ـــ یہ ایک امنگ ہے، کسی کی طرف بڑھنے، ہاتھ بڑھانے اور اس کو جاننے کی کوشش۔ ایک خالص حیاتیاتی اقدام۔ جو ممکن ہے خشک مغز فلسفیوں کے ٹھوس افکار کی بہ نسبت زندگی، کائنات اور حقیقت سے زیادہ قریب، زیادہ جاندار ہو۔ شاید قدیم وحشی انسانوں میں زندگی کی وہ تڑپ ہو جو ہم تہذیب و تمدن کے مارے جدید انسانوں میں موجود نہیں۔ اور ایک بچہ، ایک شاعر فطرتاً اس قدیم، تندرست، چست و چاق زندگی سے زیادہ قریب ہوتا ہے اور ہمیں اس کی طرف پہنچنے میں مدد دیتا ہے۔ اور شاید اسی میں شاعری اور فنون لطیفہ کا حقیقی مصرف بھی پنہاں ہو جس کو ہم فلسفہ اور نفسیات کے نظریوں کے دبیز غلاف چڑھا چڑھا کر نظروں سے محو کر دیتے ہیں۔ حفیظ نے زندگی کا بھی اس کے حقیقی سوتوں ہی سے سراغ لگایا ہے جو پاتال کی گہرائیوں سے ابھرتے ہیں۔ اس کی دلچسپی عام انسانی زندگی سے ہے اور وہ اس کا خصوصیت سے رسیا ہے۔ اسی لئے اس کی شاعری میں روزمرہ زندگی کے مرقعے برابر اور مسلسل نظر آتے ہیں۔ ایسے کہ ان سے واقعیت کا ایک شاندار نگار خانہ تیار ہو سکے۔ وہ جو مہران اور استاد اللہ بخش کے لئے دلی مسرت کا باعث ہو۔ حفیظ کی باریک بیں نظر ماہر عکاس کے مانند باریک سے باریک اور لطیف سے لطیف جزئیات کو بھانپ لیتی

ہے اور اصلیت میں تخئیل کا رنگ بھر کے اور بھی مؤثر بنا دیتی ہے۔

حفیظ کے یہاں شاعری کا رچاؤ تو ہے ہی۔ اور اس کا تخئیل، اس کی بے نظیر قوتِ مشاہدہ، شگفتہ بیانی اور لطیف نغمگی کے ہوتے ہوئے اس کا پیدا ہونا لازم ہے۔ لیکن وہ اس کے ساتھ ہی راگ رنگ کا دھنی بھی ہے۔ کم از کم لَے کا اور سُر تال کی حد تک وہ موسیقی کے بنیادی گُروں کو خوب سمجھتا ہے۔ اور اس لئے بڑی ہی کامیابی سے برتتا بھی ہے۔ چنانچہ شروع ہی سے اس کے کلام میں خوشنوائی اور نغمہ سرائی کا یہ عنصر شدت سے نمایاں رہا ہے۔ اور مختلف صورتوں میں اپنا اثر دکھاتا رہا ہے۔ ایسا کہ اگر ان کا سرگم صوری شکل میں پیش نہ کیا جائے تو بھی ہم اس کی غنائی وسعتوں اور امکانات کا بخوبی تصور کر سکتے ہیں۔ ان کی ترتیل ہی کچھ ایسی ہے کہ یہ آپ ہی آپ غنا کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ اور بعض اوقات تو شاعری پیچھے رہ جاتی ہے اور موسیقی آگے نکل جاتی ہے۔ اس قدر کہ اس کو موسیقی قرار دینا زیادہ برمحل معلوم ہوتا ہے۔ حق یہ ہے کہ اس کے مصرعوں کی نشست ترتیب، لمبا چھوٹا ہونا سُروں سرتیوں کے استادانہ تال میل کا کام دیتا ہے — اور اس کو حسنِ اتفاق سمجھئے یا دستِ غیب کی قدرتی رہنمائی کہ حفیظ کا ملجا و ماوٰی وہی خطہ رہا ہے جو اب پاکستان کا ایک اہم حصہ ہے۔ اس کی نظر شروع ہی سے اس کے بہشتِ نظر کناروں، اس کی دھوپ چھاؤں اور اس کی بھرپور زندگی سے کھیلتی رہی ہے۔ اس لئے اس نے فطرت اور زندگی کے جو مرقعے بھی کھینچے ہیں ان میں پاکستان ہی پاکستان جھلکتا ہے جیسے پتوں کے جھرمٹ میں دھوپ کی جھلملیاں۔ چناب، درۂ خیبر، کشمیر یہ سب بڑے بڑے مظاہر اور پھر عام مناظر اور زندگی کے گوناگوں پہلو جو اس کے یہاں بالعموم ہیں ہی، یہ سب اس کے مرقع کو زیادہ سے زیادہ وسیع اور بھرپور بنا دیتے ہیں۔ چناب کا راگ سنئے:

مدتیں گزری ہیں اس فردوس میں رہتا ہوں میں — یہ پری زادوں کی وادی ہے یہاں بہتا ہوں میں

اس زمیں پر چاہنے والے مرے آباد ہیں — شاد ہیں دونوں کنارے ہر طرح سے شاد ہیں

حسن و صورت، عشق و الفت کا نہیں کال اس جگہ — ہر طرف آباد ہیں سوہنی مہینوال اس جگہ

ٹوٹتے ہیں میری موجوں پر کئی کچے گھڑے — روز دکھلاتے ہیں اک الفت نئی کچے گھڑے

یہ ہوا لہروں سے جو محوِ شکست و بست ہے — ہر نئے رانجھے کی میٹھی بانسری سے مست ہے

ہر دوشیزہ دیکھتی ہے مجھ میں نقشہ ہیر کا — بن گیا ہوں آئینہ میں ہیر کی تصویر کا

"صبح و شامِ کوہسار جس کے پردہ میں ہمالیہ کی سطوت اور شانِ دلربائی پنہاں ہے" کی کیفیت آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔ اب "درۂ خیبر" کی شان دیکھئے:

نہ اس میں گھاس اُگتی ہے نہ اس میں پھول کھلتے ہیں — مگر اس سرزمیں سے آسماں بھی جھک کے ملتے ہیں

کڑکتی بجلیوں کی اس جگہ چھاتی دہلتی ہے — گھٹا بچ کر نکلتی ہے۔ ہوا تھرّا کے چلتی ہے

۔ یہ ناہموار چٹیل سلسلے کالی چٹانوں کے — امانت دار ہیں گویا پرانی داستانوں کے،

ہوائے درۂ خیبر ہے محوِ انتظار اب بھی — کہ آ جائے کوئی رہوارِ وحشت پر سوار اب بھی

اسی تابش میں چمکی تھیں مسلمانوں کی شمشیریں — انہی فولاد کے دیووں سے ٹکرائی تھیں تکبیریں

اور جو نظر درۂ خیبر کی کالی چٹانوں کے ناہموار چٹیل سلسلوں سے یوں گل چینی کر سکتی ہے وہ کشمیر جنت نظیر سے کیا کچھ گلدستہ بندی نہیں کرے گی:

برف کی اونچائیاں برفاب کی گہرائیاں
رنگ و بو کی شوخیاں، پھولوں کی بے پروائیاں
سبز قالینوں پہ دیوداروں کی بزم آرائیاں
بنتے تنتے چلتے پھرتے ابر کی پرچھائیاں
آگے پیچھے دوڑنا تاریکی و تنویر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

باقی رہی عام پاکستانی زندگی تو حفیظ نے قیام پاکستان سے پہلے بھی اس کا ایک ایک روپ، ایک ایک رنگ، ایک ایک نقشہ اپنی پلکوں سے چنا اور بڑے ہی پیار، بڑے ہی چاؤ سے اپنے کلام کے سجل طاقچوں پر سجا دیا۔ خوبان ہندی یعنی خوبان پاک کا یہ عالم مشاہدہ و احساس کا کس قدر سادہ و پرکار امتزاج ہے:

اٹھلا رہی ہیں   اترا رہی ہیں
خوبانِ ہندی   حورانِ ارضی   رونق گھروں کی
نازک دوپٹے   رنگین ہلکے
سر پہ سنبھالے   شانوں پہ ڈالے
مینہہ لاکھ برسے   جی لاکھ ترسے
نکلیں نہ گھر سے
شوہر کے ڈر سے
اپنی نظر سے   شرما رہی ہیں

اگر ان حوران پاک کے پس پردہ کتنی ہی دیہی شہری الھڑ انیل ہیریں اور با حجاب سلمائیں جھلملاتی نظر آتی ہیں تو جو رکھوالا لڑکا اس منظر میں بنسی یعنی مجھلی کا رسیا دکھائی دیتا ہے، اس کے عقب میں محبت کے متوالے رانجھوں کا کیا کچھ تانا نظر نہیں آتا:

رکھوالا لڑکا   گیتوں کا دولھا
بنسی بجا کر   گانے کا رسیا
متوالے بن میں   اصلی پھبن میں

اب حفیظ شاید رچنا کے بیلوں میں جس طرح رانجھا کہیں گے۔

جہاں تک شخصیتوں کا تعلق ہے اقبالؒ، قائداعظمؒ، اور ـــ جنرل محمد ایوب خاں، ان پر اپنے موقلم کی جنبشیں صرف کر کے حفیظ نے گویا پورے پاکستان کو سمو دیا ہے۔ اور اس مثلث کی تکمیل کر دی ہے جو فطرت، زندگی اور انسان سے تیار ہوتی ہے۔

سُر سرتیاں آپس میں گھل مل جاتی ہیں تو آہنگ بڑھتے بڑھتے آخر میں پوری طرح گمبھیر ہو جاتا ہے۔ اور ہم آپ ہی آپ سرگم کی چوٹی یعنی ٹیپ تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شعر پارے بے اختیار گیتوں میں ڈھل گئے ہیں۔ کچھ عام کچھ فلمی۔ اگر ہمیں گیتوں کی تکنیک اور ان کے بنیادی گروں کو سمجھنا ہے تو اس کے لئے حفیظ کے گیت بہت کام آسکتے ہیں ان کی بناوٹ ایک بسیط تجزیہ کی مستحق ہے۔

حفیظ کے گیتوں کا یوں سرسری تذکرہ ان کی قرار واقعی داد سے گریز ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ گیت پابند شاعری ہی کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ لیکن اس پابندی ہی میں شاعر نے آزادی اور سبک خرامی کی ایک دنیا پیدا کر دی ہے۔ وہ مصرعوں اور قافیوں کا دروبست اس چابکدستی سے کرتا ہے جیسے سانہ کے تارزخموں کی کبھی ہلکی کبھی کڑی چوٹوں سے جھنجھنا جھنجھنا کر ایک مرکب راگنی کا روپ دھار لیتے ہیں جیسے تان قدرتی طور پر بڑھتے بڑھتے سرگم پر آن کر ٹوٹے۔

حفیظ کے بعض نقوش کہنے کو ہندی ہیں لیکن درحقیقت یہ بجتے ہوئے باجے اور سُر، چنگ و رباب کی سرہند طرہیں ہیں۔ ان ہی سروں کا خلا ملا ایک پُر اسرار اور پرفسوں ڈھنگ اختیار کئے جاتا ہے۔ اور جو نوائیں پہلے الگ الگ، بکھری بکھری تھیں وہ گھل مل کر ایک سمٹا ہوا سنگیت بن جاتی ہیں۔ یہ پھیلا یہ سمٹنا بجائے خود ایک نادر طلسم ہے۔ الفاظ کے سینہ سے ابھرتی ہوئی نوائیں کبھی اس غنائی پکار کی شکل اختیار کر لیتی ہیں جس کو ہم قریب قریب گیت کے نام سے یاد کرتے ہیں اور کبھی زیادہ پُردرد موسیقی صورت میں ٹھمری بن جاتی ہیں۔ کہیں کمل مصرعوں سے گریز بھی ہے اور یہاں شاعر پابندی سے ہٹ کر نظم آزاد کی طرف بھی مائل نظر آتا ہے۔ چند مثالیں شاید تسکین ذوق کا باعث ہوں۔

جاگ سوزِ عشق جاگ!
جاگ سوزِ عشق جاگ

تونے آنکھ بند کی — کائنات سو گئی
حسنِ خود پسند کی — دن سے رات ہو گئی
زرد پڑ گیا سہاگ
جاگ سوزِ عشق جاگ!

★

باغ میں بلبل بول رہی ہے — نرگس آنکھیں کھول رہی ہے
شبنم موتی رول رہی ہے
آم پہ کوئل کوک اٹھی ہے — سینے میں اک ہوک اٹھی ہے
بن جاؤں نہ کہیں سودائی — جانوروں کی رام دہائی
چبھتی ہے نس نس میں
دل ہے پرائے بس میں

★

آ رہا تھا حسن بھی اٹھکھیلیاں کرتا ہوا
آپ ہی اپنی ہوا خواہی کا دم بھرتا ہوا
بے حجاب ——— شوخیاں کرتا ہوا
بیش و کم سے بے خبر
زیر و بم سے بے خبر
شاد شاد
بامراد
بے خبر ——— رنج و غم سے بے خبر
بے حجاب ——— شوخیاں کرتا ہوا
آ رہا تھا حسن بھی اٹھکھیلیاں کرتا ہوا

★

مسافر
تیری منزل دور
نظارے اس آب و گل کے
رہزن ہیں تیری منزل کے
نغمہ ہو یا رنگِ گل ہو
سب پردے ہیں نگاہ و دل کے
تو ہے طالبِ نور
مسافر
تیری منزل دور

لیکن وہ پیکر شعر جو پابند ہونے کے باوجود پیکر موسیقی بن گیا ہے اور نظم آزاد سے اس طرح ہمکنار ہو گیا ہے کہ ہم دونوں میں بمشکل امتیاز کر سکتے ہیں، وہ "نغمہ زار" کی اس سراپا ترنم ابتدائی نظم میں دکھائی دیتا ہے:

یوں وقت گزرتا ہے
فرصت کی تمنا میں
جس طرح کوئی پتہ
بہتا ہوا دریا میں
چاہے کہ ٹھہر جائے
اور سیر ذرا کر لے
اُس عکس شجر کی
جو دامنِ دریا پہ
زیبائشِ دریا ہے
یوں وقت گزرتا ہے
فرصت کی تمنا میں

گیت اور غزل کو ایک ہی چیز، غنائیت کے دو روپ سمجھنا چاہئے۔ گو ان کی ساخت میں بہت فرق ہے۔ اگر حفیظ کے سلسلہ میں اس کی غزل گوئی کا ذکر نہ کیا جائے تو یہ داستان بالکل نا تمام رہے گی۔ اس نے غزل کو ایسی طرح دی ہے جو اسی سے مخصوص ہے اور اسی لئے اس کو منفرد بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کی غزل میں غنائیت کی روح رچی ہوئی ہے۔ اگر ایک دو غزلیں اس کے تیوروں کو نمایاں کر سکتی ہیں تو ان دو غزلوں کے چند اشعار جو کسی کاوش کے بغیر چن لی گئی ہیں شاید اس فرض سے عہدہ برآ ہو سکیں۔

نگاہِ آرزو آموز کا چرچا نہ ہو جائے — شرارت سادگی ہی میں کہیں رسوا نہ ہو جائے
بظاہر سادگی سے مسکرا کر دیکھنے والو! — کوئی کمبخت ناواقف اگر دیوانہ ہو جائے
ارادے باندھتا ہوں، سوچتا ہوں، توڑ دیتا ہوں — کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ایسا نہ ہو جائے

میرے خیال و خواب کی دنیا لئے ہوئے — پھر آ گیا کوئی رخِ زیبا لئے ہوئے
پھر دل میں آ بسی ہے کسی انجمن کی یاد — اُجڑے ہوئے بہشت کا نقشہ لئے ہوئے
یہ کم نگاہیاں ہیں تو پھر کس امید پر — بیٹھا رہوں فریبِ تمنا لئے ہوئے

شاعر منزل بہ منزل آگے بڑھتا رہا۔ شاعری اور موسیقی دونوں اس کا قدم قدم پر ساتھ دیتے رہیں۔ بعض مقامات ایسے بھی آئے جہاں اس کی آزاد نغمگی اشعار کے مقاصد کے لئے پا بجولاں ہو گئی۔ لیکن ان عوالم میں بھی اس کا زندگی سے پیار نہ گیا۔ جب اس کے منہ سے یہ بول نکلے کہ:

اب اڑوس پڑوسن کہے جو کہے
میں تو چھورے کو بھرتی کرا آئی رے

تو اس کی نظر اپنے وطن کی عام زندگی ہی پر رہی اور اس نے اسی کی زبان میں اس کی عکاسی اور ترجمانی دونوں کا حق ادا کیا۔ ایسے ہی جب حالات نے ایک اور تاریخی کروٹ بدلی اور ہماری آرزوؤں اور امیدوں کی سرزمین پاکستان نے جنم لیا تو وہی صلاحیتیں جو ناسازگار حالات میں طوعاً و کرہاً ایک اقتصادی مادی بیگار کا کام انجام دیتی رہیں وہ تمام تر وطن و ملت کے لئے وقف ہو گئیں اور ان کا بہترین نتیجہ پاکستان کا قومی ترانہ ہے جو آج ساری قوم کی آواز ہے اور بچوں بڑوں سب کی زبان سے ادا ہو کر ایک نوخیز، اولوالعزم ملت کے دلی احساسات اور بلند مقاصد کی ترجمانی کر رہا ہے اور جب تک پاکستان زندہ

(باقی صفحہ ۶۰ پر)

بیگم سلمیٰ تصدق حسین

ایک سپاہی سے بہتر اور کون جان سکتا ہے کہ زندگی حقیقتہً لہو ترنگ ہے۔ کیونکہ وہ ہر ہر قدم خونِ حیات ہی سے کھیلتا ہے، یہ لہو کی ترنگ ہی ہے جو اسے خطرناک سے خطرناک مرحلے سے بے باکانہ گذر جانے کی ہمت دلاتی ہے اور وہ گولیوں اور بموں کی خوفناک بوچھاڑ میں بھی، کانٹے دار باڑوں کو پھلانگتا ہوا فتح و نصرت کا پرچم گاڑ کر ہی دم لیتا ہے۔ خواہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اس کو جان کی قربانی ہی کیوں نہ دینا پڑے۔ اور ضمیر جعفری سے بہتر اس حقیقت سے اور کون واقف ہوگا جس کی زندگی سپاہی کی زندگی رہی ہے! اور وہ جتنا "باقاعدہ سپاہی" ہے اتنا باقاعدہ شاعر نہیں۔ کیونکہ پچھلی جنگ عظیم کے دوران اسے اپنے شعر و ادب، بذلہ سنجی اور صحافت کے ذوق کو دل میں لئے ہوئے خبر نہیں کہاں کہاں ملک ملک صحرا صحرا، جزیرہ جزیرہ انسان کے ازلی دشمن، موت کو اس کے خون کے ساتھ ہولی کھیلتے دیکھا۔ شاید اقبال کی نظر میں فطرت کا لہو ترنگ ہونا زیادہ تھا یعنی وہ پیالیوں میں جل کی جگہ خون ڈال کر سامانِ طرب پیدا کرتی ہے۔ اتنی سنگین کہ دوسروں کو خونیں کشمکش میں مبتلا کرنا اس کا مرغوب مشغلہ ہے۔ ضمیر جعفری نے اس کی تعبیر خونِ گرم کی ان ولولہ آفرینیوں، بے باکیوں اور معرکہ آرائیوں میں دیکھی ہے جن کو صرف "ترنگ" ہی کا لفظ ادا کر سکتا ہے۔

سپاہی کی زندگی وطن سے دور دمبدم بدلتے ہوئے محاذِ جنگ پر مورچہ بندی اور منزل بہ منزل کوچ، اندھا دھند یلغار اور خشکیوں، سمندروں، پہاڑوں، میدانوں میں دن رات گشت ہی کی زندگی ہے۔ اس لئے مشاہدہ و تجربہ کا تنوع، حقائق حیات سے آگاہی، عبرت و بصیرت، اور انسانی فطرت سے شناسائی جیسے اس کو میسر آتی ہے خانہ نشیں اور پابہ گل شہریوں اور سبکسارانِ ساحل کو میسر نہیں آسکتی۔ اسی لئے اس کے لہو میں دو طرح کی ترنگیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو جذبۂ ملی سے سرشار ہر سپاہی کے خون میں پیدا ہوتی ہیں — جو قوم و وطن کی عظمت و تقدیس کے نغموں کا روپ دھارتی ہیں اور جنہیں "ملت و وطن سے محبت رکھنے والا ہر شاعر گاتا آیا ہے۔" دوسری ترنگ وہ ہے جو "سپاہی کی زندگی و شخصیت، اس کے محسوسات و جذبات" سے ابھرتی ہے۔ اس کا تعلق ملک و وطن سے الگ اس کی اپنی ذات سے ہوتا ہے۔ جس میں شجاعت، غیرت، اخوت، قربانی، محبت اور عزم و ثبات کے کتنے ہی ارفع و اعلیٰ جوہر شعلہ زن نظر آتے ہیں۔

شاعر کو اپنی سپاہیانہ زندگی میں ملک ملک کے سپاہیوں اور جوانمردوں سے ملنے برتنے اور ان کے کارناموں، افسانوں اور روایتوں کو دیکھنے کا نادر موقع ملا۔ اسی کے ساتھ ان کے جذبات اور ملی حماسوں کو دیکھنے اور سننے کا بھی زیادہ سے زیادہ موقع ملا۔ یہ سب دھارے اس کے ذاتی احساس کے دھارے سے گھل مل کر زیادہ بھرپور ہوگئے یہاں تک کہ آزادی کی سیلِ تند و تیز نے ان کو اچھل کر بے کراں ہونے کی تحریک دلائی۔

یہاں سے ہماری زندگی، ہمارے سپاہیوں کی زندگی میں ایک زبردست بھاٹا آیا۔ اس سے پہلے جنس خودداری بہانے دیدۂ اغیار تھی۔ جو کچھ تھا اوروں کے لئے تھا۔ استعمار کی بھٹی کا ایندھن، اس کی توپوں کے لئے گولہ بارود۔ سپاہیوں کی سب سے بڑی ٹریجیڈی یہ تھی کہ وہ دوسروں کے لئے اپنی جان گنواتے تھے، دوسروں کی لڑائیاں لڑتے تھے۔ ان کے نعرے، ان کے بازوئے شمشیر زن، ان کی تلواریں دوسروں کے لئے تھیں۔ ان کی ہمت و شجاعت اور بے مثل جوہروں کے باوجود ان کی زندگی ایک جھوٹی، کھوکھلی اور رائیگاں زندگی تھی۔

آزادی نے یہ سب کچھ بدل ڈالا۔ اس نے ہماری تاریخ، ہماری زندگی کے دھارے کا رخ تبدیل کر دیا۔ اب جامِ اول اور تھا، دل کی

دھڑکنیں اور تھیں۔ اور دھڑکنوں کے ساتھ خونِ گرم جوش کی ترنگیں بھی۔ جیسے کسی ساحرِ عظیم نے ایکدم "کھل سم سم" کہدیا ہو، ہمارے لئے زندگی کے طلسمی دروازے وا ہو گئے۔ اور ہم نئی امنگیں، نئے مقاصد اور نیا ولولہ و جوش لئے ہوئے میدانِ حیات میں آگے بڑھے۔ ہماری افواج بھی اسی ملّت کا چشم و چراغ تھیں، ان کا دل و دماغ ملّت ہی کا دل و دماغ تھا، ان کے ارادے ملّت کے ارادے اور ان کی تمنائیں ملّت ہی کی تمنائیں تھیں۔ ایک جسم، ایک جان، ایک امنگ، اک ترنگ۔ اسی لئے ان کو شروع ہی سے ملّت کا پاس رہا اور ملّت کو ان پر شروع ہی سے مکمل اعتماد۔ اسی لئے ضمیر جیسے حساس شاعر جہاں ہمیشہ ہم پیشہ و ہم مشرب سپاہیوں کی حیثیت سے ان کے گن گاتے رہے وہاں عام شہریوں کی طرف سے بھی ان نگہبانانِ قوم و وطن کے ترانے گاتے رہے۔ "لہو ترنگ" میں ان دونوں حیثیتوں کا بھرپور رچاؤ ہے۔ آزادی نے ہماری رگ رگ اور ریشے ریشے میں جو خونِ تازہ دوڑا دیا تھا، اس میں از خود ایک سیلاب نما ترنگ پیدا ہونا لازم تھا۔ اور اسی ترنگ کی افتاں خیزاں لہریں ہیں جو ہمیں اس مجموعہ کے نقوش میں رواں دواں نظر آتی ہیں۔ اس کو ایک پیش آہنگ کہئے۔ اس لحاظ سے بھی کہ یہ ہمارے نئے آہنگِ حیات، آہنگِ رجز کا پیش خیمہ تھا یا اس لفظ کے قدیم مفہوم کے مطابق قافلہ کا ہراول دستہ، (الا یا خیمگی خیمہ فروہل کہ پیش آہنگ بیروں شد ز منزل — منوچہری) بہر حال یہ حیرت انگیز آنے والے واقعات، یعنی عساکرِ پاکستان، خصوصاً اس کے مایۂ ناز اولیں پاکستانی سپہ سالار جنرل محمد ایوب خاں نے جو معرکہ آرا انقلابی کردار ادا کیا، کی پیشینگوئی اور بشارت تھا۔ کیونکہ یہ مجموعہ اسی مردِ مجاہد کی خدمت میں ایک سپاہی کا نذرانہ ہے۔ بلاشبہ یہ مجموعہ جس کی نمود لہو کی ترنگ ہی کی شرمندۂ احسان ہے، ایک ملّت کی آواز ہے جو اس کے نہاں خانۂ ضمیر سے بلند ہوئی ہے۔ اور اگر اس کے غلغلہ سے دیارِ پاک کی فضا کے ساتھ ہر پاکستانی شہری کا رواقِ دل بھی گونج اٹھے تو کچھ عجب نہیں۔

یہ ملّی شاعری جہاں ہمارے ابھرتے ہوئے قومی شعور اور تندرست جوانمردانہ احساس کی آئینہ دار ہے وہاں اس کا ایک اور خوشگوار پہلو یہ ہے کہ ہم میں قومی لگن بیدار سے بیدار تر ہوتی جا رہی ہے اور اس کے ساتھ ملّی شاعری کا جذبہ بھی شدید سے شدید تر ہو کر ایک عوامی تحریک کی شکل اختیار کر رہا ہے۔ اس سلسلہ میں جن لوگوں نے ہراول کا کام کیا ہے، اور ضمیر جعفری ان میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، اردو ادب ان کا ہمیشہ گرویدۂ احسان رہے گا۔

پاکستان کی آزاد فضا میں حب الوطنی کا جذبہ کیا کیا صورتیں اختیار کر سکتا ہے، اس کا اندازہ اس مجموعہ سے کیا جا سکتا ہے۔ جس میں اس کو دانستہ بعض خیالی یا قیاسی سانچوں میں نہیں ڈھالا گیا بلکہ حالات اور واقعات سے جو نقوش قدرتی طور پر شاعر کے دل و دماغ پر مرتسم ہوتے ہیں، ان ہی کو اجاگر کیا گیا ہے۔ یا پھر ان نقوش کو جو دوسری زبانوں میں موجود ہیں بے تکلفی سے اپنا لیا گیا ہے۔ سوال صرف لگن کا تھا۔ جب شاعر کا ذہن حب الوطنی سے سرشار ایک خاص نہج پر کام کرنے لگ گیا تو زندگی نے خود ایسے واقعات مہیا کر دئے۔ جو ملّی پیشکشوں کے لئے موزوں ہوں۔ قومی ترانے تو بجائے خود ایک صنف ہیں۔ ان کے علاوہ قبائلی لشکر۔ شہید وطن۔ مارچ پاسٹ۔ واہ میں اسلحہ سازی کا پہلا ملّی کارخانہ۔ پاکستانی ہوا باز۔ سابق سپاہیوں کا اجتماع۔ پردیس کے ایک فوجی کیمپ میں ہلالِ عید دیکھ کر۔ صبحِ آزادی کا طلوع۔ سرحدی مورچہ۔ کُل پاکستان ملٹری اکیڈمی۔ موضوعِ سخن بن سکتے تھے۔ جو خود بھی حقیقی ہوا اور اس میں کوئی ایسا شخص دیدۂ بینا لئے ہوئے گھوم پھر رہا ہو جو واقعی سپاہی ہو اور اپنے سینے میں حبِّ ملّت و وطن سے سرشار دل رکھتا ہو۔ اس کے متعلق "فکرا و نگراست و با محسوس در خلوت نرفت، او رما کیاں کز زورِ مستی خایہ گیر دبے خروس" کا گمان نہیں پیدا ہو سکتا۔ ایسے ہی ملایا، برازیل، اطالیہ، شرق الہند اور برطانیہ وغیرہ سے جو "لہو ترنگیں" حاصل کی گئی ہیں، وہ ایک باقاعدہ سپاہی کی جہاں گردی و جہاں نوردی ہی کا نتیجہ ہو سکتی ہیں۔ اور ان کا اثر اس لئے زیادہ گہرا اور حقیقی تھا کہ سپاہی شاعر نے ان کو اپنے کانوں سے سنا اور دل میں سمویا۔ شاید یہ اسی تأثر کا نتیجہ تھا یا شاعر کا کرشمۂ فن جس کو اپنے ذریعۂ اظہار پر خوب قدرت تھی، کہ یہ اجنبی گیت بڑی کامیابی سے اپنائے گئے۔ ان میں ترجمہ بعد ہے اور تخلیق پہلے۔ اور حق یہ ہے کہ ایسے تراجم میں ان کا ترجمہ ہونا پسِ پشت جا پڑتا ہے۔ شاعر کی اپنی صلاحیت مقدم ہو جاتی اور ترجمہ مؤخر۔ لہذا ان بدیسی دھنوں کو بھی ضمیر کی اپنی ہی دھن تصور کرنا چاہیئے۔ جس کے لئے اس کے الفاظ، اس کی ترکیبیں، اس کی شوخیِ فکر اور طبعی جسارت کافی جواز مہیا کرتی ہے۔" ایک کتبہ کس صفائی سے کوہیما کے دیارِ غیر میں کام آنے والے انگریز سپاہیوں کی یادگار کو اردو کے سانچے میں ڈھال دیتا ہے:۔

وطن میں اہلِ وطن سے کہنا !
تمہاری صبحوں کی روشنی ہے
ہماری اس شام کے لہو سے

ان اجنبی دھنوں میں سب سے اہم اور جاذبِ نظر برازیل کا قومی ترانہ ہے جس پر اصل کے مقابلہ میں — وہ ہے دوم، یہ اول کا وثوق ہوتا ہے :

پرنگا کے ساحل کی خاموشیوں نے سنا تھا جو اک نغمۂ آتشیں
جیالے، جری، شیر مردوں کا نغمہ وہ اک گونج سی خشمگیں
افق در افق جگمگاتی ہوئی شوخ، آزاد کرنوں کا رقصِ حسیں
دمکنے لگا جن سے اپنا وطن

یہ مقدس زمیں یہ بہشتِ بریں

اگر شاعر شروع ہی میں یہ جتلا نہ دیتا کہ موسیقی کی مناسبت سے بحر کے ارکان میں کہیں کہیں ردّ و بدل سے کام لیا گیا ہے تو قاری اس کو خود محسوس کر لیتا۔ بحر کے انتخاب میں یوں بڑی ہوشیاری سے کام لیا گیا ہے کہ آخر میں ایک سببِ خفیف کم کر دیا گیا ہے جس سے آہنگ نرم اور ڈھیلا نہیں پڑتا بلکہ خوب چست رہتا ہے جو ایک قومی یا سپاہیانہ ترانے کے لئے بہت موزوں ہے۔ ٹیپ کے بند میں آخری مصرعے کے شروع میں ایک سببِ خفیف بڑھا کر قدموں کی کھڑکھڑاہٹ کا اثر پیدا کیا گیا ہے۔ اور یوں آہنگ کا سپاٹ پن دور ہو جاتا ہے۔ تیسرے بند میں ہیئیت پھر کچھ بدلتی ہے۔ اور اگلے بندوں میں اور بھی برابر بدلتی ہی جاتی ہے گویا ایک آہنگی سے بڑا ہی بے تکلف تنوع پیدا کیا گیا ہے

تجھے مرحبا ! — تجھے آفریں !

★

برازیل اک خوابِ شیریں ہے تو، ایک روشن کرن مسکراتی ہوئی
نکھرتے پگھلتے ڈھلے آسمانوں میں اک زندگی کسمساتی ہوئی
"جنوبی صلیب اپنے تاروں" کی جس سے ضیا در ضیا جگمگاتی ہوئی

عظیم و قوی — دلیر و جری
بہاروں کا گھر — ستاروں کا گھر
جمال آفریں — خیال آفریں
نگاروں میں ایک — ہزاروں میں ایک
مقدس زمیں — بہشتِ بریں

برازیل ہاں !

مادرِ مہرباں !

یہاں پھر مارچ کے وقت چلتے چلتے قدموں کی کھڑکھڑاہٹ زیادہ شدت اور وضاحت سے سنائی دیتی ہے۔ پھر تخلیقی توانائی نے کتنی ہی جگہ اپنی جودگی کا ثبوت دیا ہے۔ افق در افق، نکھرتے پگھلتے ڈھلے آسماں، زندگی کسمساتی ہوئی، ضیا در ضیا بسنتی ہرے رنگ کی نغمہ خواں سرسراہٹ۔ مصرع "جنوبی صلیب ......" خصوصاً اپنی پھلجھڑی جیسی کرن در کرن جگمگاہٹ اور نور پاشی یعنی متلازم اشاروں کی کثرت سے ایک عجیب سماں بندھ کر تا ہے۔ ایک نظر بند طلسم۔

مگر ہماری دلچسپی قدرتی طور پر اپنی ملت و وطن ہی سے متعلق لہو ترنگوں سے ہے۔ شاعر نے ان میں بھی نزاکتِ احساس اور ندرتِ تصور کا

ایک طلسم زار پیدا کر دیا ہے۔
پاک دیس کی فضا ان محبت بھرے نغموں میں پوری طرح رسی بسی ہوئی ہے۔ اور جا بجا اس کی سوندھی سوندھی خوشبوؤں کی لپٹ آتی ہے:

تیرے کھیتوں میں خوشے چراغاں رہیں
تیری شاموں کے چہرے درخشاں رہیں
تیری صبحوں کے سہرے فروزاں رہیں

اور اس مصرعے کی حد تک تو اس کا دعویٰ حرف بہ حرف درست ثابت ہوا ہے کہ:

تیری مدفون دولت نکالیں گے ہم

"شعلۂ خیال" میں احساسات اور شوخیٔ فکر دونوں کے اجالے صباحت کار ہیں۔ جن کے ساتھ ساتھ زندگی کی سرمستیاں بھی مچل مچل پڑتی ہیں:

طلائی گھاٹیاں، وہ ریشمیں اشجار وادی میں
لرزتی گنگناتی آہٹیں مستان راہوں میں
لبِ دریا، گھڑوں کے ساز، دوشیزاؤں کے نغمے
کنواری بیٹیوں کے ساتھ سادہ ماؤں کے نغمے
ہوا میں پھیلتی موسیقیاں ساکت اندھیروں میں
فضا میں جاگتی رعنائیاں دھندلے سویرے میں
کشادہ۔ گرد میں ڈوبے ہوئے ماتھے کسانوں کے
سنہری مچھلیوں والے بھرے بازو جوانوں کے
سہانی۔ سانس لیتی چاندنی میں رات کا منظر
کھری چاندی کے سوتے جاگتے ذرات کا منظر
مقدس، آسمانی سادگی۔ ڈھیلے لبادوں میں
نگاہوں میں حیا، پاکیزگی مبہم ارادوں میں

پاکستانی کردار کی جو مرقع کشی ان اشعار میں کی گئی ہے اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کو جس خوش اسلوبی سے ادا کیا گیا ہے، وہ جمالِ ہمنشیں یعنی شاعری پر بھی پلٹ کر ایک لطیف عکس ڈالتا ہے۔ شاعر نے بعض جگہ اکا دکا لفظوں سے بھی پاکستانی کردار کو اجالنے کی کوشش کی ہے۔ اور چھوٹے چھوٹے نگینوں میں ان کی ساری جوت سمیٹ کر دکھائی ہے یوں ۔

کاشتکار —— آہنیں
شہسوار —— آتشیں
کوہسار —— سرمگیں
شاخسار —— ریشمیں

منظر نگاری میں وہ برمحل الفاظ کے ساتھ برجستہ استعاروں، ترکیبوں اور تصورات کو بھی آمیز کرتے ہیں۔ اور اردو کو ایسے جواہر پارے بخشتے ہیں:

اک طرف نیلی چٹانوں کی کھڑی اونچائیاں
اک طرف چٹیل ڈھلانوں کی کڑی گہرائیاں

جھومتے اشجار، گاتے، سرسراتے، شاخسار
اونچے نیچے کھیت، گل در گل، بہار اندر بہار
گھومتے رستوں سے مڑتی پھوٹتی پگڈنڈیاں
دل میں کہساروں کے جاکر ٹوٹتی پگڈنڈیاں
شبنمستانوں کی برنائی چٹانوں کا وقار
پتھروں کے کھردرے سینے صنوبر در کنار

سنہرے کھیت کرنوں کے ⸺ نکھری چاندی اجالوں کی
نکھرے گیہوں، بکھرے دھان ⸺ جگ مگ پٹ سن کے کھلیان
نہروں کے لہراتے جال ⸺ لہروں کے اٹھتے ارمان

حبِ وطن کی جوت جگاتے ہوئے یہ شیدائی وطن شاعری کی لَو بھی اکساتا جاتا ہے۔ اکیلے دکیلے الفاظ: بہار بہ بہار آفریں۔ طوفاں بہ طوفاں، دیوار بر دیوار، خراماں شعلہ۔ سنہری مروّت، اور کبھی خوشہ خوشہ الفاظ کے جھرمٹ سے:-

چاندنی ⸺ یہ نقرئی گلزار تھرّائے ہوئے
ساحلوں کے نو دمیدہ خواب لہرائے ہوئے
اشکوں کی برسات میں چمکا ⸺ ساتھ ہلال کے تارا،
بیاباں میں جیسے الاؤ کے شعلے، گلستاں میں جیسے چراغوں کے گھیرے
زندگی منزل بہ منزل ⸺ آپ لاتی ہے سراغ
روشنی ⸺ ساحل بہ ساحل ⸺ خود جلاتی ہے چراغ
مگر وہ شب وداعِ یار کی شب، ساتھ ہے میرے
تری چشمِ ستارہ بار کی شب ساتھ ہے میرے
مری یادوں کے دامن پر فروزاں ہیں ترے آنسو
ترے اندیشۂ بیدار کی شب ساتھ ہے میرے

اور پھر ٹیپ کا نغمہ تو وہی نغمۂ پاک ہی ہے۔ جو ہماری نوزائیدہ ملت کی امیدوں اور درخشاں مستقبل کا نغمہ ہے۔ شاعر کی نظر مجاہدانِ سرحد پر پڑتی ہے تو وہ پکار اٹھتا ہے کہ ؎

دَورِ محکومی کی ذلت میں بھی جو آزاد تھے
اپنے کہساروں میں شیروں کی طرح آباد تھے

اسی مسلسل شعلہ زن احساس کا نتیجہ تھا جس نے سرحد تو کیا تمام برصغیر کے مسلمانوں میں حریت کا الاؤ بھڑکا دیا تھا:-

قید ⸺ بے میعاد بھی، جاں سوز بھی، دلگیر بھی
سلسلہ در سلسلہ، زنجیر در زنجیر بھی
زرد تھی چہروں کی رنگت، سرد تھی سینوں کی آگ
جم چکے تھے مضمحل ہونٹوں پہ آزادی کے راگ

(باقی صفحہ ۵۰ پر)

نذرالاسلام

یونس احمد

نذرل کی مشہور نظم "آمار کیفیت" کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے:

برتما نیرکو بی آمی بھائی بھوشیتر نائی نبی

(میں زمانۂ حال کا شاعر ہوں مستقبل کا پیغمبر نہیں)

اور آخری شعر یہ ہے:

"پرارتھنا کورو، جارا کیڑے کھانے تیتریش کوٹی موکھیر گراش

جینو لیکھا ہوئے آمار رکتو لیکھائے تا دیر شر بو ناش"

(دعائیں مانگو کہ جو تینتیس کروڑ انسانوں کو اپنا لقمہ بنا رہے ہیں ان کے لئے

خون میں ڈوبی ہوئی میری یہ تحریر پیام موت ثابت ہو)

ٹھیک ہے نذرل مستقبل کے پیغمبر نہیں تھے لیکن انہوں نے تابناک مستقبل کے لئے جو دعائیں مانگی تھیں وہ حرف بحرف قبول ہوگئیں اور سچ مچ ان کی خون میں ڈوبی ہوئی تحریر حاکم وقت کے لئے پیام موت ثابت ہوئی۔

نذرل زمانۂ حال کے شاعر تھے۔ "تھے" میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ان کی شاعری کا چراغ آج سے اٹھارہ سال پہلے ہی اپنی جلوہ سامانیاں کھو چکا ہے اور اب ان کے ذہن و فکر پر تاریک غلاف چڑھا ہوا ہے۔ انہوں نے اپنے ارد گرد جو کچھ دیکھا، دل و دماغ نے جو کچھ محسوس کیا، تفکرات و احساسات میں جو آندھیاں چلیں، وہ سب انہوں نے ہمارے سامنے پیش کر دیا۔ ان کی دور بین نگاہوں اور دوررس ذہن ہی کی تو یہ برق پاشیاں ہیں کہ سسکتی اور لولی لنگڑی زندگی کے خشک ہونٹوں میں انہوں نے امرت رس چھلکائے اور اماوس جیسی گہری تاریک راتوں میں ان گنت جگنو بکھیر دئے۔ وہ خیالی جنت کی چمن بندی اور تخیلی اصنام کے آگے سجدہ ریزی کو اعصابی کمزوری سمجھتے تھے۔ ان کے آگے ایسے شاعروں کی مثالیں بھری پڑی تھیں جو مرتے دم تک خیالی بت تراشیاں کرتے رہے لیکن ادھر ان کی سانسیں اکھڑیں اور ادھر ان کی "تخلیقات" بھی ہزاروں من مٹی کے نیچے دب کر رہ گئیں۔ شاعر کا کام صرف اختر شماری کرنا، ہجر و فراق کی راتوں میں سرد آہیں کھینچنا، سیاہ کاکلوں اور دھانی دوپٹوں کو دیکھ کر اپنا گریبان چاک کرنا اور چودھویں رات کی ہلکی ہلکی چاندنی میں معشوق کی بیوفائی کا گلہ کرنا نہیں ہے۔ وہ تو دراصل نباض فطرت ہے۔ زندگی کا نغمہ خواں ہے، ترجمان حال ہے۔ وہ زندگی کو اور اس کے تقاضوں کو اصلی روپ میں دیکھتا ہے۔ اسے حالات و واقعات کے ان مراحل اور مدارج سے گذرنا پڑتا ہے جہاں نہ تو چاند کی سحر انگیز مسکراہٹیں ہیں، نہ روپ رنگ کو عشوہ طرازیاں۔

نذرل نے اپنے دور کے دوسرے بنگالی شاعروں کی نسبت اپنی دنیا قطعی مختلف بنائی تھی۔ تعجب تو یہ ہے کہ انہوں نے اپنی اس نرالی اور مثالی دنیا کی نیو ایسے حالات میں رکھی جبکہ برصغیر ہند و پاک میں سیاسی ہنگامہ آرائیاں نقطۂ عروج پر تھیں۔ یہ پہلی جنگ عظیم کے فوراً بعد کا پُر انتشار اور پُر ہول زمانہ تھا جب آہنی سلاخوں کے پیچھے انسانیت سوز سلوک کیا جاتا تھا۔ جب زبان پر پہرے بٹھا دئے گئے تھے اور قلم چھین لیا گیا تھا۔ ایسے افراتفری کے دور میں اگر کوئی یہ نعرہ لگائے کہ:

"میں زمانۂ حال کا شاعر ہوں، مستقبل کا پیغمبر نہیں......"

تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ وہ عظیم شاعر ہے، پرستار حیات ہے، زندگی کا نغمہ گر ہے۔

نذرل کو بیک وقت کئی محاذوں پر لڑنا پڑا جس میں سب سے بڑا محاذ انگریز کے خلاف تھا۔ انگریز ان کو اپنا کٹر دشمن سمجھتے تھے کیونکہ ان کے

خلاف ان کی آوازیں شہروں کے علاوہ گاؤں، دیہاتوں، کھیتوں، کھلیانوں، کارخانوں تک میں بازگشت کر رہی تھیں۔ یہ تینوں محاذ بہت مضبوط اور مستحکم تھے۔ ان کی دیواریں صرف چونے اور گارے کی نہیں بنی ہوئی تھیں۔ اس کے باوجود ان کے ہونٹوں سے ہمیشہ یہی نغمہ پھوٹتا رہا:۔

ہم اندھیری رات کا جگر چاک کر کے رخشندہ صبح کی داغ بیل ڈالیں گے۔

ہم از سر نو دھول اور مٹی کا تاج محل تعمیر کریں گے۔

نذرل کی یہ للکار فضا میں اس وقت گونجی تھی جب رقص و نغمہ کی سرزمین بنگال کے آسمان پر قوس پر وردھنک نے شاعر و ادیب کو اپنے حسین رنگوں کے پردے میں چھپا لیا تھا، جب آفاقی شاعری کی دھوم مچی ہوئی تھی، جب خیالات کے تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر یہ شاعر چاند نگر کی طلسمی فضاؤں کی سیر کر آتے تھے۔ نذرل نے ایسا نہیں کیا۔ وہ چاند کو زمین پر بیٹھ کر ہی دیکھتے تھے۔ وہ اس زمین کے پرسوز اور دلرس گیت گاتے تھے جس کی کوکھ سے انہوں نے جنم لیا تھا۔ وہ ماورائی دنیا سے باتیں کرنے کی بجائے ان مانجھیوں سے ہمکلام ہونا بہتر سمجھتے تھے جن کے بادبان طوفانی ہواؤں سے تار تار ہو چکے ہیں، اس کے باوجود وہ مخالف سمت ناؤ کھیتے جا رہے ہیں۔ وہ چرواہے کے اس لڑکے کی دلجوئی کرنے میں دوامی خوشی محسوس کرتے تھے جو چھوٹے سے پیڑ کی چھاؤں تلے بیٹھ کر بانسری کی لے پر جھوم رہا ہے۔ وہ ان کاشتکاروں کے گیت گاتے تھے جن کے مٹی سے اٹے ہوئے ہاتھ نئی فصل کا پیغام لاتے ہیں۔

نذرل نے کبھی مستقبل کی پیشین گوئی نہیں کی۔ انہوں نے کبھی 'کل' کے بارے میں کچھ نہیں کیا۔ وہ تو وہی کہتے اور لکھتے تھے جو ان کا دل محسوس کرتا تھا، جو کچھ ان کی آنکھیں دیکھتی تھیں۔ وہ مستقبل سے قطعی لاپروا بے فکر اور دردمند تھے۔ یہ چیز ان کی نجی زندگی میں بھی پائی جاتی ہے۔ انہوں نے 'کل' کے لئے کچھ نہیں سوچا۔ ان کی لاابالی طبیعت اور مجتہدانہ فطرت اس بات کی متقاضی کیسے ہوسکتی تھی۔ وہ صرف حال پر نظر رکھتے تھے۔ انہوں نے کبھی "جام جمشید" کی خواہش نہیں کی۔ وہ تو امروز کے آئینہ میں کائنات کے خدوخال اور نقش و نگار کو دیکھ لیتے تھے۔ اسی آئینے میں انہوں نے زندگی کو اس کے اصلی رنگ روپ میں دیکھا۔ ان کا یہی وہ مشاہدہ تھا کہ وہ پکار اٹھے تھے:۔ "میں اسی کے گیت گاتا ہوں جو دنیا کو نئی فصل کا پیغام سناتا ہے۔"

یا پھر: "میں اسی کے گیت گاتا ہوں جو شاہراہ حیات پر کائنات کے ساتھ پیش روی کر رہے ہیں"۔

زندگی کو صحیح معنوں میں برتنا بہت کٹھن کام ہے۔ نذرل نے زندگی کو برتا تھا۔ وہ صرف اس کے ظاہری خدوخال پر نگاہ نہیں رکھتے تھے۔ وہ ان دکھوں، آنسوؤں چیخوں اور کراہوں کو بھی محسوس کرتے تھے جن کا کرب مشکل سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ چند ان پڑھ اور سطحی ذوق رکھنے والوں نے نذرل کا ان لفظوں میں مذاق اڑایا کہ ان کی شاعری میں صرف جذبات غالب ہیں اور لطیف احساسات کا فقدان ہے۔ اور اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ ایک سپاہی تھے اور گھن گرج اور نعرۂ انقلاب و بغاوت پر زیادہ زور دیتے تھے۔ نذرل کے ان رسیلے گیتوں، غزلوں اور نظموں سے قطع نظر جن میں خونِ جگر کی بوندیں شامل ہیں اور لطیف احساسات و محسوسات کی چبھن ہے اگر وہ ان کی باغیانہ نظموں ہی کا گہری نظر سے مطالعہ کرتے تو ان کے اندر بھی انہیں نئی آواز سنائی دیتی، لطیف احساسات ملتے تھے۔ نذرل سپاہی ضرور تھے لیکن ان کی انگلیاں صرف بندوقوں سے نہیں کھیلتی تھیں، یہ انگلیاں خونِ دل میں بھی ڈوبی رہی ہیں۔ ان کا دل لاشوں کو دیکھ کر سخت نہیں ہوا پگھل گیا ہے اور وہ محسوس کرنے لگے کہ زندگی کی کھالیں کس بیدردی سے ادھیڑی جاتی ہیں۔

"ادب" کسی کے سامنے "بازیچۂ اطفال" ہو تو ہو نذرل نے اس کے لئے شب بیداری کی ہے، دل کے ہزاروں چراغ جلائے بجھائے ہیں۔ نیند و بند کی صعوبتیں برداشت کی ہیں۔ اس جنون میں مبتلا رہے ہیں جہاں گھپائے رنگا رنگ کی سیج نہیں بچھتے اور جھلسے ہوئے ریگ زاروں کے کانٹے ہیں۔ انہوں نے "بنگلہ ادب میں مسلمان" کے عنوان سے اپنے اخبار "نوایگ" میں جو اداریہ لکھا تھا اس سلسلے میں اس کا اقتباس پیش کرنا غیر ضروری نہ ہوگا۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

> "ادب دلی کیفیت کے اظہار کا نام ہے۔ جس کا دل مردہ ہو چکا ہے اور جوانی رعنائیاں کھو چکا ہے وہ ادب پر بھینٹ کیسے چڑھا سکتا ہے؟ سچی بات تو یہ ہے کہ ادیبوں کی اکثریت بے گور و کفن لاش ہے جس میں نہ کوئی بوقلمونیت ہے، نہ حسن ہے نہ جمالیاتی ذوق۔۔۔۔۔۔۔۔۔
> ان دنوں نوجوان ادیبوں کی نگارشات پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ عہد ماضی کے بوڑھوں کی تحریریں ہیں کیونکہ ان کے اندر

نہ تو زندگی ہے، نہ غور و فکر ہے اور نہ مطلب و معنی۔ اگر ادب میں قوس قزح کے رنگوں کی طرح مسرت و کامرانی کی رنگ آمیزی کرنی ہے تو نوجوانوں کو ساز سنگیت کی طرف بھی توجہ دینی پڑے گی کیونکہ اس طرح ان کی نگارشات میں، ان کی تحریروں میں سنگیت کا جادو رس بس جائے گا اور پھر وہ حیاتِ دوام حاصل کرلیں گی۔"

نذرل ادب میں صداقت، سچائی اور حقیقت پسندی کے رسیا تھے۔ ان کے خیال میں وہی ادیب زندہ رہ سکتا ہے جس کی تحریروں میں صداقت ہے۔ مبالغہ آرائی ادب میں جائز نہیں کیونکہ ایسا ادب اور ایسے ادیب کی عمر مختصر ہوتی ہے۔ اسی اداریہ میں وہ کہتے ہیں:

"آرٹ کا مطلب صداقت کا اظہار ہے اور صداقت ہی دراصل حسن ہے، دائمی مسرت ہے۔"

مذکورہ بالا اقتباسات سے نذرل کے ادبی رجحانات کا اندازہ ہو سکتا ہے اور اس بات کا بھی سراغ مل جاتا ہے کہ وہ محض نعرہ باز شاعر تھے یا کچھ اور۔ حق تو یہ ہے کہ نذرل نے ہمیشہ ادب میں جمالیاتی قدروں اور حقیقت پسندیوں پر زور دیا ہے۔ وہ شاعر کے لئے موسیقار ہونا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جو شاعر موسیقی کا دیوانہ نہیں اس کی شاعری میں گداز پن نہیں آسکتا۔ وہ تاثر نہیں پیدا ہو سکتا جو شاعری کے لئے ناگزیر ہے۔ نذرل خود بہت بڑے موسیقار تھے۔ وہ اس زندگی کے گیت گاتے رہے جو امروز کی آگ میں تپ کر کندن بنی۔ وہ شاہراہ زندگی کے ایسے مسافر تھے جو اس وسیع و عریض کائنات میں تنہا چل پڑے تھے۔ انہیں اس کی فکر نہیں تھی کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ وہ ان سمندروں اور صحراؤں سے بھی خائف نہیں جو ان کے سامنے تھے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

کسے معلوم میں مسافر کہاں جا رہا ہوں؟
میرے دونوں جانب دکھ سکھ کے پردے اڑ رہے ہیں اور میں
دریا کے بیچوں بیچ بہہ رہا ہوں۔

نذرل کی زندگی دکھوں اور مسرتوں سے عبارت ہے۔ وہ افلاس کی زنجیروں میں جکڑے بھی رہے اور مسرتوں کے حسین مجسمہ سے بغلگیر بھی ہوئے۔ ان کی خوشیوں اور کامرانیوں کا حسین مجسمہ اگرچہ وقفے وقفے کے بعد منہدم ہو جاتا تھا، اس کے باوجود وہ برابر مسکراتے ہی رہے۔ افلاس ان کے ہونٹوں کی مسکراہٹیں نہ چھین سکا۔ ان کی آنکھوں کی وہ چمک ماند نہ پڑسکی جو حوادثِ روزگار میں بھی نظر آتی تھی۔ ان کے دل کا وہ سرگم خاموش نہ ہو سکا جو ہر رنگ میں کائنات کو وجد میں لاتا رہا۔

نذرل بیس بائیس سال تک افق شاعری پر جلوہ گر رہے اور اس عرصے میں وہ برابر حال کے نغمے الاپتے رہے۔ کبھی انہوں نے خونِ دل میں انگلیاں ڈبوئیں، کبھی حسن جہانتاب کے آگے سجدہ ریزی کی اور کبھی راگ رنگ کی پُرسکون دنیا بسائی۔ چنانچہ ان کی اس متنوع زندگی کی طرح ہم ان کو شاعری میں بھی متنوع پاتے ہیں۔

کتنے تعجب کی بات ہے کہ پانچ چھ سال تک فوجی زندگی گذارنے کے باوجود ان کا دل کتنا گداز تھا، ان کی مسکراہٹوں میں کتنی کشش تھی۔ ان کے محسوسات اور خیالات کتنے نازک تھے۔ انقلاب و بغاوت کے علاوہ وہ برابر حسن و عشق کی راگنیاں چھیڑتے رہے۔ عشق اور حسن اُن کی شاعری کا اہم موضوع رہا ہے۔ وہ بار ہا "حسن" کا شکار اور ان کے ہونٹوں سے نغمے پھوٹے۔

آئے گا اک بھیانک طوفاں کھل کے گریں گے بندھن سارے
آہ اُٹھے گی اک سینے سے تڑپے گا دل درد کے مارے
کھل کے گریں گے بندھن سارے
آئے گا میرا دھیان نہ کیونکر
بھاری ہو گا جسم کا پنجر

کاش وہ ہوتا چھیڑنے والا
میری محبت کا متوالا
آپ ہی اپنا مکھ چوموگی
اس دن مجھ کو یاد کروگی

٭

فن :

(ایک خود شبیہہ)

عبد الرحمٰن چغتائی

آرٹسٹ جب اپنی پہلی تصویر بناتا ہے تو وہ اس کی پیدائش کا پہلا دن ہوتا ہے۔ اس عقیدے کی رو سے میری پیدائش کا سال ۱۹۱۹ء ہوتا ہے اور یہی سال میرے مستقبل کی فال ہے۔ جب میری بنائی ہوئی تصویریں ۱۹۲۰ء میں پہلی بار پنجاب فائن آرٹ سوسائٹی لاہور کی نمائش میں پیش ہوئیں تو یکا یکی ایک طوفان امڈ آیا۔ تنقید اور نکتہ چینی کی شکل میں مختلف ذہنیتوں نے جو مظاہرہ کیا وہ میرے اور میرے آرٹ کے لئے ایک روشن اور نیک فال ثابت ہوئی۔ یہ نمائش جس کا میں ذکر کر رہا ہوں، ہندوستانی اور مغربی آرٹ اور آرٹسٹوں کی ایک نمائندہ نمائش تھی۔ یہ پہلی جنگِ عظیم کے بعد کی بات ہے جب مشرق میں بھی بیداری کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ ہر فرد اور قوم ترقی کے زینے طے کرنے کی فکر میں تھی اور ہندوستان میں یہ زمانہ جدید ہندوستانی اور بنگالی تحریک کے عروج کا زمانہ تھا۔ جس نے ہر اہلِ نظر کو مسحور کر رکھا تھا۔ گو اس سے پہلے پنجاب علوم و فنون کا گہوارہ رہ چکا تھا۔

ہمسایہ قوم کو چھوڑ، مجھے ایسے حالات کا بھی مقابلہ کرنا پڑا جن کے تصور سے دکھ ہوتا ہے۔ میرا فن اتفاقات کا کرشمہ نہیں، یہ پکا پکایا ہاتھ نہیں آیا۔ یہ اعتماد، تحمل اور محنت کا پھل ہے۔ آج میرے آرٹ، میری ٹکنیک کو بین الاقوامی درجہ حاصل ہے اور میری تصویریں دنیا کے ہر حصے میں موجود ہیں۔

جب میرے آرٹ نے جنم لیا، میرے اپنے ملک اور میری اپنی قوم میں ایسے اسباب موجود تھے جو ایک آرٹسٹ کی سلامتی کے لئے سدِ راہ ہو سکتے ہیں خصوصیت سے وہ قوم جس کا میں فرد تھا اسے اس وقت آرٹ کی صلاحیتوں سے دور کا بھی لگاؤ نہ تھا۔ اگرچہ وہ علوم و فنون، ذوق نظر اور ہنر پروری کے تمام ذرائع سے مالا مال تھی۔ جب پہلی بار میری بنائی ہوئی تصویر "موڈرن ریویو" کلکتہ میں شائع ہوئی تو مجھے برما، سیلون، پشاور، ہندوستان یہاں تک کہ افریقہ سے خطوط آئے تھے کہ کوئی مسلمان آرٹسٹ اس میدان میں بھی نظر آیا ہے۔ میرے عزیز دوست جو میری اس کوشش کو قومی نقطۂ نگاہ سے نیک فال خیال کرتے تھے، اس فکر میں مبتلا تھے کہ میں اس بڑھتی چڑھتی دنیا میں اپنے مستقبل کا ساتھ بھی دے سکوں گا یا نہیں۔

شروع سے لیکر آج تک ایک گروہ کسی نہ کسی صورت میری جدوجہد کا پیچھا کرتا چلا آیا ہے۔ اس نے ہمیشہ میرے آرٹ اور میرے مدعا کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے اور اس کی یہی کوشش رہی ہے کہ میں دل برداشتہ ہو کر اپنے برش اور رنگوں سے ہمیشہ کے لئے کنارہ کشی اختیار کر لوں، مگر باوجود ہزار شکست اور تخریبی حالات کے میں اس شاہراہ پر برابر گامزن ہوں جس کو میں نے پوری شد و مد سے سرگرم عمل رہنے کے لئے انتخاب کیا تھا۔ جو کچھ تھا اور جو کچھ ہے وہ کوئی معجزہ نہیں۔ یہ تمام تر اسی بات کا نتیجہ ہے کہ زندگی کی دشواریوں سے دوچار ہو کر اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کیا جائے اور جوشِ حیات کو کبھی سرد نہ ہونے دیا جائے، چاہے سرفرازی حاصل ہو یا نہ ہو۔

آرٹ کے سلسلہ میں میرے دل میں ایک ہی جذبہ کارفرما رہا ہے جو آج بھی میرے فنی شعور کا جزو اعظم ہے: یہ کہ آرٹ محض آرٹسٹ کی ذاتی لذتوں اور خوشیوں کا ذریعہ نہیں، اس میں انسان اور انسانیت کا بھی حصہ ہے، اور یہ وہ عالمگیر جذبہ ہے جس سے کائنات پھلتی پھولتی ہے۔ "مرقع چغتائی" کی اشاعت مسلمانوں کو آرٹ کی طرف توجہ دلانے میں بہت معاون ثابت ہوئی۔ چنانچہ میرا اعتماد، میری جدوجہد میری قوم کے کام آئی۔ مسلمانوں نے آرٹ کی اہمیت اور اس کی ضرورت کا احساس بڑی شدت سے محسوس کیا۔ میری کوشش اور ہمت نے ہمسایہ قوم کو بھی میری صلاحیتوں کا اعتراف کرنے پر مجبور کر دیا اور میرا آرٹ دیکھتے دیکھتے ہر ہندوستانی کے دل میں گھر کر گیا۔ یہاں تک کہ جدید ہندوستانی آرٹ کے بانی ڈاکٹر اَبندر ناتھ ٹیگور اور تمام بنگال کو میرے فن سے مرعوب ہوتے ہوئے اعتراف کرنا پڑا کہ چغتائی کو رنگوں کے امتزاج اور خطوط پر غیر فانی قدرت حاصل ہے۔

اکثر لوگ خیال کرتے ہیں کہ میں بنگال کی جدید تحریک سے وابستہ رہا ہوں۔ یا میں ان میں سے کسی استاد کا پیرو یا پروردہ ہوں۔ میں نہ تو بنگال اس غرض سے گیا ہوں نہ مجھے کسی کی شاگردی کی سعادت حاصل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب میرے آرٹ نے جنم لیا اس وقت جدید ہندوستانی آرٹ

کی تحریک اپنے پورے شباب پر تھی۔ اس تحریک میں میں نے بھی اپنی بساط بھر حصّہ لیا ہے اور آج جدید ہندوستانی آرٹ کی تاریخ میرے آرٹ کے وجود کے بغیر مکمل نہیں کہلا سکتی۔ میری آدمی سے زیادہ تصویریں ہندوستانی عجائب گھروں اور ریاستوں کی زینت ہیں اور ان لوگوں کے پاس موجود ہیں جو آرٹ کے دلدادہ ہیں۔

میرے فن، میرے عمل، میری تصویروں اور تحریروں میں اس مقصد کو ہمیشہ دخل رہا ہے جس سے انسانیت پھلتی پھولتی ہے۔ میں یہ سب کچھ اس لئے تحریر نہیں کر رہا کہ میں کوئی بڑا آدمی ہوں اور میری بھی کوئی غیر معمولی شخصیت ہے بلکہ اس لئے کہ قدرت ایک ادنیٰ درجے کے آدمی سے بھی کام لینے کے اسباب کس طرح پیدا کر لیتی ہے۔ جب میرے آرٹ کی ابتدا ہوئی تو مغل ایرانی آرٹ کو چھوڑ پورے مشرق پر الیا ادبار چھایا ہوا تھا اور کسی کو یہ بھی یاد نہ تھا کہ آج سے صدیوں پہلے انسان کو آرٹ کی ضرورت تھی یا آرٹ ہماری زندگی کا ایک حصّہ بھی رہا ہے۔ ہمارے قدیم فنکاروں نے آرٹ اور زندگی کے تعلقات کو گہرا بنا دیا تھا، زندگی کے ہر لمحہ پر ان کا فن غالب اور نمایاں تھا۔ فطری رجحانات ہی کے سبب مجھ میں جمالیاتی تصور پرورش پا رہا تھا۔ میں نے اپنی روایات، اپنی تہذیب کو اپنے فن کا جزوِ اعظم بنایا ہے اور مشرقی آرٹ، مشرقی روح کو پورے انہماک سے اپنایا ہے۔ میرے فن سے مشرقی آرٹ میں ایک نئے باب کا افتتاح ہوا ہے۔ میرا فن ایسے سانچوں میں ڈھل گیا ہے کہ قدیم استاد چاہے بہزاد، رضا عباسی، میرک محمدی، عبد الصمد، میر علی اور فرخ بیگ کیوں نہ ہوں، اگر میرا آرٹ دیکھیں تو یہ نہ کہیں گے کہ ہم جہاں آرٹ کو چھوڑ گئے تھے وہیں کا وہیں رکا پڑا ہے، وہ ضرور اس بات کا اعتراف کریں گے کہ تقاضوں کے مطابق اس کے آرٹ نے بھی وقت کا ساتھ دیا ہے۔ وہ تسلیم کریں گے کہ مشرقی آرٹ خصوصیت سے ایرانی اور مغل آرٹ کئی منزلیں طے کر کے کہاں سے کہاں آ پہنچا ہے۔ میرے فن کی انفرادیت نے دوست دشمن دونوں کو آرٹ کی طرف توجہ دلائی ہے اور آرٹ کے رجحانات کو سمجھنے میں مدد دی۔ میں اپنے فطری رجحانات کی بنا پر مشرقی واقع ہوا ہوں اور جب مشرقیت کا میں ترجمان ہوں، اس کا بڑی شدت سے لوگوں کو احساس دلایا ہے۔ مغربی آرٹ کے معیار کو بلند اور جامع بنانے میں مغربی آرٹ اور اس کی تاریخ کا بھی جی بھر کر مطالعہ کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ مشرقی آرٹ میں وہ تمام صلاحیتیں سمو دوں جو وقت کی ضرورت اور معاشرے کا تقاضا ہیں۔ اس سلسلہ میں میں نے دو دفعہ یورپ کا سفر بھی کیا ہے۔ میں یورپ مشرقی کی حیثیت سے گیا ہوں اور مشرقی کی حیثیت سے واپس آیا ہوں۔ جہاں تک مغرب نے ہماری مشرقی خوبیوں کو اپنانے اور اپنی تہذیب کا حصّہ بنانے میں سرگرمی دکھائی ہے۔ میں نے بھی اپنی مشرقیت کو جِلا دینے میں کمی نہیں کی۔ مجھے دکھ ہوتا ہے کہ بعض فنکار حدِ اعتدال سے تجاوز کر گئے ہیں اور تلاش اور کوشش کی قوت سے گریز کرنے لگے ہیں۔ کسی نقاد، شاعر اور آرٹسٹ کو جرأت نہیں کہ وہ برملا کہہ سکے کہ ہمارے برسرِ اقتدار آنے کے طریق ہماری قوم اور ہمارے معاشرے کے لئے کس قدر مفید ہیں۔

بعض کا خیال ہے کہ چغتائی ایک ماضی پرست آرٹسٹ ہے اور جو میرے زیادہ قریب ہیں، مجھے ایک جدید ترقی پسند آرٹسٹ خیال کرتے ہیں۔ وہ آرٹ جو اپنے نام و نسب، اپنی معاشرت، اپنی طرزِ نگارش سے پکارا جائے وہ آرٹ اپنے ملک، اپنی قوم، اپنے معاشرے کی نمائندگی کرتا ہے اور اس کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر جاپانی، چینی، فرانسیسی، جرمن، اور اطالوی آرٹ۔ آرٹ مشرق کا ہو یا مغرب کا، اگر وہ اپنی روایات اور ماضی سے متاثر نہیں تو اس کا کوئی مستقبل نہیں۔ اگر پوچھا جائے کہ چغتائی اور اس کا آرٹ کیا ہے، تو میرے خیال میں یہ وہی حقیقت ہے جو ایک فن کار کو دوسروں سے بلند کرتی ہے اور نئے کردار کی تخلیق کرتی ہے۔ میری تصویروں کی بندش نئی ہے، رنگ اور خطوں کا انداز نیا ہے، مرکزی خیال و شعور اور ان کا جمالیاتی تصور نیا ہے۔ میری طرزِ نگارش اور اسلوب مشرق و مغرب کے امتیاز کو اجاگر کرتا ہے۔ میری نئی راہیں، نئے تقاضے مشرق کی عظمت کا باعث اور مغرب پرستی کے خلاف جہاد ہیں۔ جس طرح مغرب کے قدیم و جدید فن کاروں نے اپنی تہذیب و تمدن کا ثبوت بہم پہنچایا ہے اسی طرح میرے فن نے بھی مشرقی تہذیب اور روایات کی نمائندگی کی ہے۔ جس زندگی کا خواہاں تھا، جس نظر سے وہ زندگی اور اس کی افتاد کو دیکھتا تھا، میں نے بھی اسی سوز و ساز اور زندگی کو رنگوں اور خطوں میں دیکھا اور میری مصوری میں ایسے کردار بھی نظر آئیں گے جن کو دیکھ کر اقبال کے اشعار خود بخود لبوں پر کھیلنے لگیں گے، کچھ ایسی صورتیں بھی نظر سے ہماری عظمت اور شوکت یاد آئے گی۔ مغرب پرستی کے خلاف اقبال نے تمام عمر جہاد کیا ہے۔ میرے جہاد کا تعلق بھی اسی بت پرستی سے ہے جس نے ہماری صلاحیتوں کا گلا گھونٹ کر رکھ دیا ہے۔ مغرب پرستی نے ہمارے خد و خال ہی کو مسخ نہیں کیا بلکہ ہمارے نظریہ کو

بھی بدل ڈالا ہے۔ میری مشرقیت نے ایک ایسی انفرادیت کو جنم دیا ہے جس کا مرکزی تصور اپنی سلامتی، اپنی صلاحیتوں اور اپنے جذبۂ حیات کو از سرِ نو دریافت کرنا ہے۔ اس لئے میرے کرداروں کے خدوخال، رنگ روپ، میری طرزِ نگارش، نقش و نگار سب مشرقی امتیاز کے حامل ہیں۔ ان میں زندگی، زندگی کا سوز و ساز، مشرقی خون کی حدت، سخت کوشی، مقصد آفرینی اور ماضی کی عظمت و شوکت مضمر ہے۔ خدا کی بخشش کو اس بناء پر نظرانداز کر دینا کہ مغرب کی نقالی سے تحسین اور سرفرازی حاصل ہوگی کوئی اہم مقصد پورا نہیں کرتا۔ اقبال نے ایسی ماؤں اور بچوں کی آرزو کی ہے جو سربکف مجاہدانہ زندگی کی تلخیوں سے لذت آشنا اور جلال و جمال کے مظہر ہوں۔ ایسے مشرقی جنہیں انتخاب و اختیار پر قابو حاصل ہو۔ یہی میری تخلیق کا مقصد اور حاصل ہے، کہ ہر فرد زندگی کے ترجمان اور زندگی کی سرمستیوں سے سرشار پیمانہ بردارِ حقائق کا متلاشی ہو۔ اگر موجودہ آرٹ کے انتشار کو دماغی خلل کہکر پکارا جائے تو میرے نزدیک یہ خلل محض اعصابی ہی نہیں، زندگی سے فرار اور احساس کمتری کا وہ سبب ہے جس سے نشوونما رک جاتی ہے اور انسان اپنے مقصد سے بھٹک جاتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں ابھی تک ہمارے ہاں کوئی تجریدی اضافہ نہیں ہوا۔ کسی ایسے آرٹ نے جنم نہیں لیا جس کی بناء پر ہم آرٹ چھوڑ کر اس گھٹیا آرٹ کی نقالی میں لگ جاؤں جسے مغرب پرستی اور مغربی آرٹ کی صحیح تقلید بھی نہیں کہا جا سکتا۔ مغرب پرستی کی بدعت اور نقالی کو میں سوائے فرار اور کمزوری کے اور کچھ نہیں سمجھتا کیونکہ اس میں بدحالی اور بے راہ روی کے سوا کچھ نہیں۔ اس نے کسی انفرادیت کو ابھرنے نہیں دیا اور نہ کوئی فرد کوئی ایسی راہ تلاش کر سکا ہے جس میں قومی کردار یا کسی عالمی تحریک کو پنپنے کا موقع ملا ہو۔ ہماری رجعت پسندی اور ترقی پسندی محض مطالعہ کی کمی کا نتیجہ ہے۔ بعض لوگ جب میری بنی ہوئی بابر، جہانگیر یا اورنگزیب کی کوئی تصویر دیکھ پاتے ہیں تو مجھ کو قدامت پسند یا مشرق زدہ کہنے پر اتر آتے ہیں اور نہیں جانتے کہ مغرب کے جدید سے جدید آرٹ نے بھی بی بی مریم اور حضرت مسیح کی تصویریں بنائی ہیں اور ان آرٹسٹوں نے بائبل کے واقعات کو بڑی اہمیت دی ہے۔ یورپین عیسائی آرٹ کے مقابلے میں مغلوں کا آرٹ کل کی بات ہے، ان کی تصویروں میں نہ کوئی مذہبی تبلیغ ہے اور نہ کسی رہبانیت کا تسلسل۔ صرف کرداروں کی تشکیل اور عظمت و شوکت کا اظہار ہے۔ ہو سکتا ہے میں ضرورت سے زیادہ مشرقی نظر آتا ہوں مگر میں سمجھتا ہوں کہ مشرقی کہلانے ہی میں ہماری نجات ہے۔ کیونکہ وہ قوم جس کے آرٹ کا نام ونسب، اس کی خصوصیت، اس کی طرزِ نگارش اور تکنیک اپنے ملک، اپنی قوم اور اپنے معاشرے سے وابستہ نہیں، اس کے آرٹ کا نہ کوئی حال ہے نہ مستقبل۔

میری مشرقیت نے ایک ایسی انفرادی تحریک اور مرکزی خیال کو جنم دیا ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ میری مشرقیت، تکنیک، میری طرزِ نگارش صدیوں تک ملک اور اس کے فن کاروں کی رہبری کرتے رہیں گے، اور انہیں زندہ ملکوں کے دوش بدوش کھڑا ہونے کی جرأت دلاتے رہیں گے۔ میں نے ایک ایسی ثقافت و معاشرت کی ترجمانی کی ہے جس کی نمائندگی کا مجھ کو حق پہنچتا تھا۔ میں نے کوشش کی ہے کہ تنقیدی دائرے سے نکل کر اور قدیم و جدید کے تقاضوں سے بلند ہو کر ایک ایسی شاہراہ تلاش کروں جس سے ہمارا تمدن، ہماری تہذیب ایک ایسے وسیع مقام پر جمع ہوں جہاں روایاتی تعلق منقطع نہ ہو۔ تعین مقاصد کے لئے اس حقیقت کا معلوم کرنا از حد ضروری ہے کہ آخر ہم کیوں اندھا دھند مغربی آرٹ کو ذریعۂ نجات سمجھ بیٹھے ہیں جس کی پشت پناہ گنتی کے آرٹسٹ ہیں اور ہم خود ایسے ملک اور ایسے آرٹ کے علمبردار ہیں جس کی طرف ان ملکوں کے باشندوں اور آرٹسٹوں کو دیکھنے کی فرصت بھی نہیں۔ ان کے نزدیک اس کی کچھ اہمیت ہی نہیں۔ آرٹ کا نظریہ فن برائے زندگی یا فن برائے فن زندہ قوموں کی بصیرت کا کرشمہ ہے۔ ہماری سابقہ بدحالی اور غلامی نے ہماری صلاحیتوں کو چھوڑ فن کا جو بھی مقصد ہو اسے مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ اور اہلِ ذوق کو اتنا موقع بھی میسر نہیں کہ وہ ذوق نظر سے کوئی فرق مراتب محسوس کر سکیں کیونکہ ہمارے آرٹسٹوں کا تعلق نہ تو ہماری شعوری زندگی سے ہے اور نہ اس جوہر سے جس سے تغیر اور انفرادیت کی شکل مرتب ہوتی ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ آرٹسٹ کی صلاحیتوں کے شناسا اس کے زمانے ہی میں پیدا ہوں۔ جب کبھی ایسا موقع فنکار کے ہاتھ آ جائے اور وقت مردِ زیرک (GENIUS) کا ساتھ دے اور اسے جاننے اور پرکھنے کی فضا اس کی زندگی ہی میں پیدا ہو جائے، تو اس کی تخلیق میں اس کی قوم اور اس کے افراد کے تقاضوں کا بھی بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔ فن کار کے عمل اور فرض میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہوتی، وہ بغیر کسی رکاوٹ کے نئے نئے راستے متعین کرنے

اور عوام وخاص کو قریب ترلانے میں منہمک رہتا ہے۔ اسلئے بھی کہ تخلیق اور عمل میں اپنے معاشرے اور روایات کی ترجمانی ضروری ہوتی ہے۔ میرا تخلیقی سرمایہ، میری خود اعتمادی کا ثبوت ہے۔ اگر میں رائج الوقت تجریدی آرٹ سے پیدا ہونے والی بے راہ روی اور انتشار کی پیروی کرتا اور بغاوت نہ کرتا تو میرا آرٹ بھی سطحی صورت اختیار کرلیتا اور کبھی دعوے سے نہ کہا جا سکتا کہ ہماری تہذیب، ہمارے آرٹ کا پس منظر کس قدر جامع اور پختہ ہے۔

نصف صدی سے زیادہ عرصہ ہونے کو آیا ہے کہ اس برصغیر کی جدید مصوری کا احیا ہوا تھا۔ اگرچہ اس کی تہہ میں انگریزی سیاست کا ہاتھ کارفرما تھا۔ مگر اس میں وہ خلوص بھی تھا جس سے مقامی مصوروں کی صلاحیتیں اجاگر ہوئیں اور یہاں کا جدید آرٹ دیکھتے دیکھتے دنیا کی نگاہوں کا مرکز بنگیا اور وہ تحریک اپنی روایات اور اپنے نام سے پکاری جانے لگی۔ مغربی نقادوں اور مبصروں کو بھی اس کے وجود اور انفرادیت کو تسلیم کرنا پڑا۔ اس کا محض یہ سبب تھا کہ کسی تجریدی آرٹ، کسی مغربی تحریک کی پیروی کا اس سے تعلق نہ تھا۔ برصغیر کے جدید آرٹ میں حصہ لیتے ہوئے مجھے پچیس سال سے زیادہ عرصہ ہونے کو آیا ہے۔ میں نے اپنے ہمعصروں کے دوش بدوش اس جدید تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے اور پر خلوص جدوجہد اور فرائض کی رو سے ایک قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے جس کا بڑے خوش آیند الفاظ میں دوست دشمن سب نے اعتراف کیا ہے یہاں تک کہ برصغیر کی جدید مصوری کی تاریخ میرے نام کے بغیر نامکمل سمجھی جاتی ہے۔ میں یہاں کا واحد آرٹسٹ ہوں جس کے متعلق زیادہ سے زیادہ لے دے ہوئی ہے اور جس پر سب سے زیادہ لکھا گیا ہے۔ میرے اسلوب کو ایک مستقل دبستان کی حیثیت حاصل ہے۔ امید ہے اس سے ہماری مصوری کا وجود زندہ اور تابندہ رہے گا جو تقریباً تین سو سال سے اپنی راہیں کھو چکی تھی۔ اقبال نے جب پہلا شعر یا غزل لکھی ہوگی اس کے سامنے "ضربِ کلیم"۔ "پیامِ مشرق"۔ "زبورِ عجم" یا "جاویدنامہ" کا تصور نہیں تھا۔ میں نے بھی جب پہلی تصویر، پہلا اسکیچ بنایا تھا، اس وقت آج کی مصوری اور آج کی طرزِ نگارش پیشِ نظر نہ تھی۔ میں پیکاسو، گوگین، برک اور دونگ ہے بننے کا خواہشمند نہیں۔ ہماری بقا کا راز ہمارے اپنے تقاضوں میں ہے تم بھی بہزاد، برک، رضا عباسی، میر علی عبدالصمد، فرخ بیگ اور نادر العصر منصور جیسے عظیم استادوں کے اندران امکانات کی تلاش کریں۔ جیسا کہ مغربی آرٹسٹوں نے اپنے آرٹسٹوں کے اندر رہ کر اور اپنے تقاضوں کی تلاش کرکے اپنے آرٹ کے وقار کو بلند کیا ہے۔

میرے آرٹ پر مختلف دور آتے رہے ہیں اور ہر دور میں میں نے اپنی انفرادیت کا ثبوت دیا ہے اور آج تک رنگ، برش اور پنسل کو اپنے ہاتھ سے نہیں رکھ دیا۔ میرے مطالعہ کا مرکز ایرانی، مغل، راجپوت اور بدھ آرٹ رہا ہے۔ میں نے وقت کی ضرورت کے تحت مغربی آرٹ کا بھی جی بھر کر مطالعہ کیا ہے، اپنے مطالعہ کو جلا دینے کی خاطر دو دفعہ یورپ بھی ہو آیا ہوں لیکن اپنی صلاحیتوں اور انفرادیت کو کسی کا مقلد اور پیرو نہیں ہونے دیا۔ میں نے شاہین صفت لوگ، مجاہد، قلندر اور ایسی ایسی محبوب ماؤں اور عورتوں کے کردار پیش کئے ہیں جو ہمارے کلچر اور ثقافتی قدروں کی اور عظمت اور شوکت کی ضامن ہیں۔ میری کندہ کاری نے جس کی تکنیک مغربی ہے، مشرقی آرٹ میں ایک عظیم اضافہ کیا ہے اور مغرب بھی اس کی دلکشی اور انفرادیت سے متاثر ہے۔

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

عبدالرحمان چغتائی
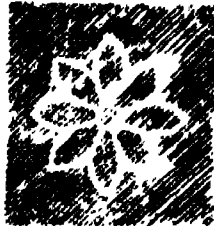
یوم پاکستان کی تقریب پر قومی اعزازات

سید ضمیر جعفری

ابوالاثر حفیظ

زین العابدین

حطیب

دردہ خانماں!

میلہ کی طرف

میلہ چنن پیر

(چولستان)

رقص —— رقص —— رقص!

بازگشت

کچھ عرصہ ہوا مجھے مدت دراز کے بعد اپنی زادبوم راولپنڈی جانے کا اتفاق ہوا، یہ نظم اسی موقع کی یادگار ہے۔

(د۔ خ)

وہی نظارے، وہی کھیت ہرے!
یہ ہنستی دھوپ، یہ کھلی فضا
یہ روپ انوپ پہاڑوں کا
گم سم چپ چپ خاموش فسوں
اک خواب نما دنیائے سکوں
جس سمت نگاہیں اٹھ جائیں
وہی لو پھیلی، وہی نور گھلا
آنکھوں کے مدھر گہوارے میں
ہلکورے لیتا اجیارا
رہ رہ کے چمک پارہ پارہ
سب دھرتی ہو جیسے شیش محل
لہراتے طلسماتی جلوے
ہر جانب کوندے ہی کوندے!

۲

وہ کھیت سہانے سرسوں کے
یہ کامنی متوالی سرسوں
اس کے وہ کنوارے گل بوٹے
قدرت کی کشیدہ کاری کے
پرکار نمونے سحر بھرے
تا دور زمیں پہ پھیلے ہوئے
کن ہاتھوں سے جانے کاڑھے ہوئے
دھرتی کی حریریں چادر پر
زردوز کرشمے پریوں کے
یہ پھیلے کھیت ہیں سرسوں کے
یا کسی طلسمی منتر سے
ہیں لاکھوں ہریل سوئے ہوئے!
وہ موجِ ہوا مستانہ اٹھی
ان سبز قباؤں کے سر پر
البیلی کلیاں جھوم اٹھیں
وہ کلغیاں پیلی پیلی سی

۳

اے ذوقِ نظر، اے دیدۂ دل!
اس دھوپ سی کوئی دھوپ نہیں
ان سایوں سا کوئی سایہ نہیں
اس روپ سا کوئی روپ نہیں
اس چھاؤں سی کوئی چھایا نہیں
وہ گرداگرد پہاڑوں کے
اک حلقہ بھورا بھورا سا
اور ان میں یہ وادی ہری بھری
انمول نگینہ جڑا ہوا
جادو کی انگوٹھی سر تا سر
افسونِ سلیماں جس کو کہیں
پنڈی، رومانوں کی بستی
اعجازِ بہاراں جس کو کہیں
ہر بول میں جس کے مستی ہے
اک سحرِ غزلخواں جس کو کہیں
ہر چیز نظر میں کھبتی ہوئی
ہر شے دل میں گھر کرتی ہوئی
ہر بات دلوں میں بستی ہوئی
سب دنیا ہنستی ہنستی ہوئی

۴

ہاں چھوڑ کے پھر میں دور کہیں
اس پیاری پیاری بستی کو
چلنے کو چلا جاؤں گا مگر
ان لوگوں کو کیسے بھولوں گا
جو اس بستی کے باسی ہیں
وہ پیار محبت کے پیکر
جو الفت کے متوالے ہیں
میں ان کی محبت کے بدلے
اپنا دل چھوڑ کے جاؤں گا

۵

وہ ہونٹ ہی کیا جن ہونٹوں پر
الفت کا رسیلا گیت نہیں
وہ دل ہی کیا ہے جس دل میں
انسانوں سے گہری پریت نہیں
میں مہر و محبت کا پیامی
اک پیار کا تحفہ لیتا ہوں
اک پیار کا تحفہ دیتا ہوں

غزل

یوسف ظفر

ہم گرچہ دل وجان سے بیزار ہوئے ہیں
خوش ہیں کہ ترے غم کے سزاوار ہوئے ہیں

اُٹھے ہیں ترے در سے اگر صورتِ دیوار
رخصت بھی تو جوں سایۂ دیوار ہوئے ہیں

کیا کہیئے نظر آتی ہے کیوں خواب یہ دنیا
کیا جانیئے کس خواب سے بیدار ہوئے ہیں

آنکھوں میں ترے جلوے لئے پھرتے ہیں ہم لوگ
ہم لوگ کہ رُسوا سرِ بازار ہوئے ہیں

کچھ دیکھ کے پیتے ہیں لہو اہلِ تمنّا
میخوار کسی بات پہ میخوار ہوئے ہیں

زنجیرِ حوادث کی ہے جھنکار بہر گام
کیا جُرم کیا تھا کہ گرفتار ہوئے ہیں

اظہارِ غمِ زیست کریں کیا کہ ظفر ہم
وہ غم ہیں کہ شرمندۂ اظہار ہوئے ہیں

غزل

حشمت فضلی

اب اس بات کا رونا کیا ہے اگلی سی وہ بات کہاں
تم بھی بدلے، ہم بھی بدلے، اب وہ دن وہ رات کہاں

جیسے بدلی بدلی سی ہیں پیار کی رت کی باتیں بھی
غم کی وہ گھنگھور گھٹائیں اشکوں کی برسات کہاں

ہم دکھیارے شام وسحر اشکوں کے ہار پروتے ہیں
ہم دکھیاروں کی قسمت میں آپ کے سے دن رات کہاں

بنجاروں نے صحرا صحرا اپنے دام بچھائے ہیں
اب بولو آوارہ غزالو گذرینگے دن رات کہاں

وہ اور ہم سے پیار کریں گے یہ امید بھی جھوٹی ہے
یارو آخر کچھ تو سوچو اپنی یہ اوقات کہاں

فضلی میری غزلوں میں بھی غم کی باتیں ہیں لیکن
میر کے رنگ میں غزلیں کہنا اپنے بس کی بات کہاں

*

غزل

شیدا انجرانی

پھر اُس نگاہ نے کی داستانِ دل تازہ
بکھر گیا مرے صبر و سکوں کا شیرازہ

مری نوا نے سنوارا ہے زندگی کا مزاج
مرا ہی خوں ہے رُخِ کائنات کا غازہ

نئی حیات کا دامن تہی ہی نغموں سے
سنے تو کون سنے دل کا نغمۂ تازہ

اُس انجمن میں خرد منفعل ہوئی کیا کیا
جنوں کا پھیل گیا دُور دُور آوازہ

میں نا امید نہیں تیری کم نگاہی سے
بکھر بکھر کے سنورتا ہی دل کا شیرازہ

بجز نگاہِ محبت کرے تو کون کرے
ہم اہلِ درد کی کیفیتوں کا اندازہ

بس اک نگاہِ کرم کا گناہگار ہے دل
تمام عمر بھگتنا پڑا ہے خمیازہ

★

غزل

آغا صادق

آئینے میں جلوہ فرما کون ہے؟
بے خودِ ذوقِ تماشا کون ہے؟

کون ہے محوِ تغافل ہائے ناز؟
اور سرگرمِ تقاضا کون ہے؟

کون ہے گرمِ سفر محمل نشین؟
دشت پیما آبلہ پا کون ہے؟

ساز کے پردوں میں ہے مستور کون؟
صورتِ نَے نالہ فرسا کون ہے؟

گوشہ گیرِ خلوتِ ناموس کون؟
آہ بازاروں میں رسوا کون ہے؟

بسترِ گل پر ہے محوِ خواب کون؟
میہمانِ خارِ صحرا کون ہے؟

حیرتِ آئینۂ تمکیں ہے کون؟
مثلِ جوہر ناشکیبا کون ہے؟

کون ہے مجلس فروزِ کبر و ناز؟
آستاں پر ناصیہ سا کون ہے؟

کون ہے گنجِ صدف کی آبرو؟
اضطرابِ موجِ دریا کون ہے؟

کون میخانے میں ہے ساغر بدست
تشنہ کامِ جامِ صہبا کون ہے؟

کون ہے عنوانِ مضمونِ نشاط
سُرخیٔ خونِ تمنا کون ہے؟

بے نیازی میں ہے صادق کون فرد؟
ناز برداری میں یکتا کون ہے!

غزل گو چنابی

بذلِ حق محمود

حکیم چنابی، اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کا ایک فارسی گو شاعر تھا۔ وہ گوجرانوالہ کے نزدیک ایک گاؤں گڑھ کیلاس کا رہنے والا تھا۔ اس کا باپ حکیم درویش شاہجہانی عہد میں مشہور طبیب تھا۔ چنانچہ اس نے "پران سکھ" کے نام سے ہندی طب میں ایک رسالہ لکھا ہے۔ حکیم چنابی موجودہ منٹگمری کے قریب کوٹ کمالیہ کے رئیس محبت خاں اور اس کے بیٹے سعادت خاں کھرل سے وابستہ تھا اور انہی کی فرمائش پر اس نے مغربی پاکستان کے مشہور رومان ہیر و رانجھا کو "عشقیہ پنجاب" کے نام سے ۱۱۰۰ ہجری قمری میں فارسی مثنوی میں تصنیف کیا۔ عشقیہ پنجاب کا اب تک ایک ہی نسخہ دریافت ہوا ہے جو میرے مرحوم والد پروفیسر قاضی فضل حق (صدر شعبۂ فارسی، گورنمنٹ کالج لاہور) کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ "عشقیہ پنجاب" پر مرحوم کا ایک مقالہ میرے تکملہ کے ساتھ حال ہی میں پنجابی ادبی اکادمی لاہور کی طرف سے شائع ہوا ہے[1]۔ اس مقالہ میں چونکہ والد مرحوم کی توجہ بیشتر مثنوی ہی پر مرکوز رہی تھی، اس لئے میں نے بھی "عشقیہ پنجاب" کی ان غزلوں کی طرف توجہ نہ کی جو مثنوی کی ہر فصل کے بعد بترتیب حروفِ تہجی درج ہیں اور ایک مکمل دیوان کا درجہ رکھتی ہیں۔ چونکہ یہ غزلیں "عشقیہ پنجاب" کے منحصر بفرد قلمی نسخہ ہونے کی وجہ سے اب تک اربابِ دانش کے مطالعہ میں نہیں آسکیں، اس لئے یہاں انکا ذکر ضروری ہے۔ یہ غزلیں اس لئے بھی قابلِ مطالعہ ہیں کہ مغربی پاکستان کے ایک گمنام شاعر کے فکر کا نتیجہ ہیں جس کا نظریۂ شعر اپنے ہم عصر شعراء سے مختلف بلکہ منفرد ہے۔

یہ مسلم ہے کہ عہدِ عالمگیری غزل گوئی کے انحطاط کا زمانہ تھا، مگر اس میں شک نہیں کہ اورنگ زیب خود بڑا عالم و فاضل شخص تھا اور شعر سے بھی کافی شغف رکھتا تھا گو وہ متین اور سنجیدہ طبع کا مالک تھا اور اس کی دلچسپیاں قرآن مجید کی کتابت، علمی و تاریخی کتابوں کے تراجم اور دینی درسگاہوں کے قیام تک محدود تھیں۔ وہ صرف نعت گوئی اور عارفانہ کلام کو پسند کرتا تھا اور مدح سرائی اور غزل گوئی کی مذمت کرتا تھا، چنانچہ اس نے دربار سے ملک الشعرا کا منصب ختم کر دیا تھا۔ اس اقدام کی وجہ سے بھی ایرانی اور مقامی غزل گوؤں اور قصیدہ سراؤں کا ہجوم، جو کبھی مغلیہ دربار کی زینت تھا، منتشر ہو گیا۔ کچھ لوگ ایران لوٹ گئے، باقی ماندہ دور افتادہ علاقوں میں پناہ گزیں ہوئے جہاں نہ تو تخت نشینی کی جنگ تھی اور نہ اورنگ زیب کے بیٹوں اور پوتوں کی یورشیں۔ ان دور افتادہ علاقوں کے منصب دار بھی شعرا کی قدر کرتے تھے اور شاعروں کو عاشقانہ مثنویاں اور رنگین غزلیں کہنے کے لئے پر امن فضا میسر آجاتی تھی۔ البتہ قصیدہ گوؤں کا برا حال تھا۔ انہیں اپنے ممدوحین کو خوش رکھنے کے لئے ان کی بے جا تعریف و توصیف کرنی پڑتی تھی۔ ان کی حالتِ زار کا نقشہ چنابی نے اپنی ایک غزل میں پیش کیا ہے ؎

چہ لازم است ایں کہ بہ فتح شکوہ در تفاکردن | نفاقی چوں بود در دل چہ سود از مرحبا گفتن
وزیر و شاہ را رازق زجہلِ خویش دانستن | تہے ایں را دعا کردن گہے آں را ثنا کردن
ثنائے خانۂ ظالم برائے مطلبی کردن | چنابی کلۂ قصاب را دار الشفا گفتن

ایک اور جگہ شعر کی قدر ناشناسی پر ماتم کیا ہے اور شعر سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے ؎

ای شعر ترا کسادی از چیست | بی قدری و نامرادی از چیست
از نقل تو نقلِ انجمن بود! | شور و طربِ تو در چمن بود
سودای ترا نہ رونق بازار! | کالای ترا نہ کس خریدار[2]

---

[1] پنجابی قصے فارسی زبان میں جلد اول۔ مرتبہ، ڈاکٹر محمد باقر ص ۱۰۸ و ص ۱۲۰۔ [2] یہ اشعار ہمیں بے اختیار حالی کی نظم "شعر سے خطاب" کی یاد دلاتے ہیں۔ مدیر

چنانچہ شعر کی اس ناقدر شناسی کے عالم میں چنابی بھی غزل گوئی کو ایک شغل اضافی سمجھنے لگا تھا اور اپنے آپ کو شاعر کہنے میں خجلت محسوس کرتا تھا۔ وہ اپنی غزلوں میں اکثر کہا کرتا تھا:۔

زبسکہ عام شدہ اشتہار شعر اکنون — خجل شوم چو بگوید کسی مرا مشہور
گمنام بہ چنابی کز بیم چشم خویش — گل را درون غنچہ نہانی بہار خوش
دانی زچہ گمنام بود شعر چنابی — فریاد شہید است بآوازہ نسازد

اس کے برعکس وہ باپ کی طرح طبیب ہونے میں فخر محسوس کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ ؎

اکنوں نشدہ است اعتبارم — وادہ نہ چنابی اشتہارم
ہم بودم مشتہر ازیں پیش — مینا پسر حکیم درویش
زخاک راہ او سرمہ برائے چشم خود سازم — حکیم تدرمیدانم زمن) ایں دانشِ عالی را
بہ روش رفت چنابی ونگفت روش خلق — خود طبیب است ولے بہر دوا می گردد

ایک اور سبب جو اس زمانہ میں شعر کی رسوائی کا باعث ہوا، یہ تھا کہ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں خود بعض شعراء متقدمین کی روش کو چھوڑ کر خیال بافی کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس دور میں صائب تبریزی کے بعض نااہل مقلدین نے نہایت عامیانہ غزلیں لکھنی شروع کر دی تھیں۔ وہ صائب کی خیال بافی کے فن کو نہیں سمجھتے تھے اور بے رنگ تشبیہات و استعارات، دقیق اشارات و کنایات اور بے محل صنائع بدائع کے استعمال کو مایۂ افتخار سمجھتے تھے اور شعر کو ظاہری حسن کا جامہ پہنا کر اسے فنی اعتبار سے ناپسندیدہ اور ناقابل فہم بنا دیتے تھے۔ عوام بھی شعر کے ظاہری حسن کو دیکھ کر کچھ ایسے کھو جاتے تھے کہ اس یاوہ گوئی کو معراج فن سمجھتے تھے۔ اپنی شعر نافہمی و ادب ناشناسی کے عیب کو چھپانے کے لئے ان شعروں کو نہایت بلند پایہ تصور کرتے تھے اور عامیانہ درجے کے شعراء کو استادِ فن قرار دیتے تھے۔ چنابی ان گمراہ شعراء اور ان کے ممدوحین سے نہایت برگشتہ تھا۔ شروع شروع میں وہ اس قسم کے شعر کہہ کر دل بہلا لیتا تھا ؎

فردوسی و سعدی نہ و گمنام چنابی — حالِ تو بایں خوبی اشعار نسازد
سعدی و خسرو بطاق افتادہ صائب در بغل
خندہ می آید مرا بر شعر فہمی ہائے خلق

لیکن بعد میں جب اس نے محسوس کیا کہ عوام کے ان پسندیدہ شعراء کی گمراہی بڑھتی جا رہی ہے تو وہ فریاد کرنے لگا ؎

فریاد ازیں خیال بندان — سنگ رہ فکر ملک سندان
از واضح و صاف بی نصیب اند — محظوظی خلق را رقیب اند
ہیہات کہ قدر واضح و صاف — دانند کہ نیستند چو اسلاف

مگر صائب اور اس کے حامیوں نے ایک باقاعدہ محاذ قائم کر لیا اور ایرانی و مقامی شعراء کو آپس میں بھڑا دیا، چنانچہ چنابی کو اپنی "عشقیہ پنجاب" کے منثور مقدمہ میں صاف صاف لکھنا پڑا:۔

"اگر بیت لبریز معانی است بے آں کہ از فلانی است یا از مصاحب فلانی است از
تورانی است یا از ایرانی است عزت نیابد منعم حقیقی بر ہر ملکی مہربانست۔"

بلکہ اس نے نہایت برگشتگی و مایوسی کے عالم میں یہاں تک کہہ دیا کہ ؎

طالب ز دمشق است و صائب ز صفاہاں
در من بود ایں عیب کہ از ملکِ چنابم

حکیم چنابی شعر میں اسلاف کی سنت اور متقدمین کی روش کا احترام کرتا تھا، چنانچہ اس نے کہا تھا:

نائب زیبیٔ نظامیم من   بر مسند میر و جامیم من

وہ اسلاف سے برابری کا دعویٰ نہیں کرتا تھا، بلکہ چاہتا تھا کہ روایت کی پابندی کرتے ہوئے بھی اپنے لئے ایک نئی روش تلاش کرے۔ چنانچہ اس نے ایک جگہ لکھا کہ:

کردم نہ تتبع نظامی   گشتم نہ شریک میر و جامی
جستم نہ برابریٔ اسلاف   کیں محض فضولی است و اسراف
گویم چو سلف اگرچہ من صاف   دارم نہ دلے قبولے ز اسلاف

یہاں حکیم چنابی کی غزلیات سے ایک انتخاب پیش کیا جاتا ہے جو اس کی "عشقیہ پنجاب" کے منحصر بفرد نسخہ میں محفوظ ہونے کی وجہ سے ارباب دانش کی دسترس سے باہر ہے اور جس میں اس کے مخصوص اندازِ بیان کے تمام پہلو نمایاں ہیں:

میکشائی گرہ از زلف، صبا می رقصد   چوں زدستے بسوئے جیب گدا می رقصد
بانگِ خلخال تو چوں گرم کند ہنگامہ   دست بر دست زند فتنہ بلا می رقصدا
از حنائی کفِ دستِ تو رود حلق ز دست   گل ز ہم رنگیٔ آں گونہ حنا می رقصد
مفلسے بود چنابی، بہ نگاہے بر خست   ایں تو انکر تو چہ پرسی کہ چرا می رقصدا

وداع از من چو آں دلدار سیم اندام میگردد   چہ دست انداختن در آتشی ہر گام می گردد
برخسار تو گیسو آشنا ز اعجاز حسنت شد   وگرنہ کفر کے ہم بزم با اسلام میگردد
اگر چشمت بریزد خونِ من جائے شکایت نیست   کہ مست ار ریخت می کے مورد الزام میگردد
چنابی کشتۂ نازش نباشد مضطرب چنداں   کہ بسمل تیغ گر کند است، بے آرام میگردد

ہردم بہ عیاشی جواں حالم چنیں، دل آں چناں   شیخم ولے ابیات خواں، حالم چنیں دل آں چناں!
در کف عصا و پشت خم، دنبالِ آں شیریں صنم   چوں ایں بود کے زیبد آں حالم چنیں دل آں چناں
ایں وقت ایں اشغالِ من، دردا کہ ہر ہمسالِ من   در حجرہ من در بوستاں حالم چنیں دل آں چناں
با من ندارد سر گراں سر دفترِ خیلِ بتاں   من پیر او خط جواں، حالم چنیں دل آں چناں

شرابے خوردہ، خو کردہ شرابم ساختی رفتی   عذار و قد بناز افروختی، افراختی رفتی
اگر جان و دلم بردی بہ اندوہش چہ بسپردی   چہ سود ایں نقد را کاندوختی انداختی رفتی
بہ یوسف ہم نمی باشد تلافیٔ وصالِ تو   بسانِ خانۂ ویراں کنارم ساختی رفتی
پریشاں کردہ طرزِ تو ام جاناں کہ از گیسو   کشودی یک گرہ صد بر دلم انداختی رفتی
علم بہر سپاہی فتنہ ہا گشتی و بگذشتی   ز پیشِ چشم من یعنی کہ قد افراختی رفتی
بہ تیغ غمزہ ات نازم بسر دادن سر افرازم   نہ سر بازم ندوش انداختی بنواختی رفتی
خوامش را بہ نقشی پائے کردی مصرعِ موزوں   کلام فتنہ انگیزِ مقفیٰ ساختی رفتی
نمیدانم کجا ہستی کہ ہشیاری و یا مستی   چنابی را ز بام صبرِ دل انداختی رفتی

چنابی نے اپنی غزلوں سے اپنے بعض پسندیدہ شعر خود بھی منتخب کئے ہیں اور غزلوں کے عنوان میں اس طرح کی عبارت دیکھی جاتی ہے کہ "انتخاب غزل خصوصاً بیت پنجم و ہفتم"۔ آخر میں چنابی کی غزلوں سے اسی کے منتخب کردہ ابیات درج کئے جاتے ہیں جن سے اس کے مذاقِ سخن کا اندازہ ہو سکے گا:

گرحیا در چشم باشد احتیاج سرمہ نیست — آب روی حسن کردہ خوبیٔ افعال ما

سنبل خجل از موی تو صد چشم گلشن سوی تو — لے در کمین روی تو در غنچہ ہا نظارہا

مطلع نیست کس از حالت مستان الست؟ — ورنہ ایں بے خبراں را خبرے نیست کہ نیست

ہر سجدۂ من سجدۂ سہو است چنابی — زیں جرم کہ من ترک کنم یادِ خدا را

شوی ایمن ز نفس تو اگر مرتاض میگردی — کہ از سگ آہوی تصویر ترسیدن نمی داند

از بہر شوخیٔ آں بتِ شیریں گل اندامی — کہ یک نقطہ بود کافی نشان انتخابی را

نقل کے پہلو زند با اصل زخم سینہ ام — مے کند بی آبرو چاک گریبانِ مرا

نشۂ چشم تو از مرگ کند ترسانم — سر عزیز لے صنم از بہر خمار ست مرا

شعر پُرسوزم پے اصلاح کس محتاج نیست — حاجتِ دیگر نمک دارد کجا آبِ نمک

افسوس کہ یہاں حکیم چنابی کی غزلوں اور غزلیہ شعروں سے زیادہ انتخاب پیش نہیں کیا جاسکا۔ وہ خود بھی تو کہتا ہے کہ ؎

از سبر حمن ہا دلِ مردم نکشاید
زاں گونہ کہ از خواندن دیوانِ چنابی

"ماہ نو" میں اشاعت مضامین سے متعلق شرائط

۱۔ ماہ نو میں شائع شدہ مضامین کا مناسب معاوضہ پیش کیا جاتا ہے۔

۲۔ مضامین بھیجتے وقت مضمون نگار صاحبان یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالے یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا۔ مضامین بھیجتے وقت "ماہ نو" کے معیار کا خیال رکھیں۔

۳۔ ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں مصنف کا نام اور دیگر ضروری حوالہ جات دینا ضروری ہیں۔

۴۔ ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔

۵۔ مضمون کے ناقابل اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

۶۔ ایڈیٹر مسودات میں ترمیم کرنے کا مجاز ہوگا مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

(ادارہ)

ماہ نو، کراچی، مئی ۱۹۵۹ء

گجراتی افسانہ:

اندھیرے کی اوٹ میں

فخر ماتری

یکایک چونک کر میں بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ نئی نویلی دلہن کو اپنے خاوند کی اچانک موت کی خبر پاکر جو صدمہ ہوتا ہے ویسا ہی کچھ مجھے بھی محسوس ہو رہا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا ہے۔ شاید ہی کسی رات میں چین کی نیند سو سکا ہوں۔ یہ بھی نہیں کہ مجھے کوئی سونے نہیں دیتا۔ لیکن کسی کی ایک گونہ لگاوٹ نے میری زندگی میں ہلچل مچا رکھی ہے۔ اگر تمہارے پاس دل کی سی کوئی شئے ہوگی تو تم میرے ان الفاظ پر تعجب نہیں کروگے۔ مجھ میں ایک خوبی بھی ہے۔ من کی بات کو اپنے پاس ہی رکھنے کی۔ یہاں پاس سے میری مراد پہلو کا سا قرب ہے اور تم یہی سمجھو اس کا مجھے تم سے تقاضہ بھی ہے۔ میں یہ بھی نہیں کہنا چاہتا کہ یہ عادت مجھی تک محدود ہے۔ اس بات پر زور دینے یا اس کو منوانے کا نہ مجھے کوئی شوق ہے نہ ضرورت۔ کیونکہ میرا یقین ہے کہ عادات و خصائل انسانوں ہی سے مخصوص ہوتے ہیں۔ حیوانات کے بارے میں مجھے کوئی علم نہیں۔ ان کے قریب آنے اور ان کا مطالعہ کرنے کا موقع کبھی نہیں ملا۔ کوئی جانور میرا رفیق نہیں۔ اس سے میرا مدعا یہ نہیں کہ انسان حیوان نہیں ہو سکتا لیکن میرے تمام شناسا مجھے انسان ہی نظر آئے ہیں۔ کم از کم انسان کا رویہ انسانوں ہی کی طرح رہا ہے۔ نہ کسی نے مجھے دھتکارا نہ دھکا دیا نہ کوئی کاٹنے کے لئے دوڑا۔ اور اس سے مجھے بھی محسوس ہوا کہ میں بھی ایک انسان ہوں۔

لوگ کہتے ہیں کہ یہ سال بڑا سخت ہے۔ ایسا ہی سہی! میری روزمرہ زندگی کو تو وہ کوئی خاص متاثر نہ کر سکا۔ شاید وہ خود تھک گیا ہو لیکن اس نے مجھے تھکا ہوا نہ پایا۔ میرا خیال ہے کہ اس کی وجہ مجھ پر کسی کی مہربانی ہے۔ تم کہوگے شاید وہ مہربان ذات خدا کی ہو۔ شاید، لیکن میں اس وقت بحث کرنے کے لئے تمہارے سامنے نہیں بیٹھوں گا۔ میری تو تمام شخصیت اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ زندگی کھڑی ہوئی ہے۔ خیالات اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ تم ہی بتاؤ میں ایسے میں کہاں بیٹھ سکوں گا؟

نہ جانے کیسے کسی تربیت کے بغیر ہی میں ایک رمز سے آشنا ہو گیا ہوں۔ دنیا میں جینا ہو تو جی کھول کر جیا ہو۔ جی کھول کر جینے سے میرا مطلب ہے محبت کرنا۔ کسی کی پرستش کرنا۔ من کا رس کسی کو گھول کر پلانا، دل کا نذرانہ پیش کرنا۔ نو شگفتہ غنچوں کی بھینی بھینی خوشبو کے ساتھ بلبل کی نغمہ سنجی میں مجھے زندگی کی وجد انگیز کیفیت ملتی ہے اور جاگے ہوئے احساس سے دل کی دھرتی جب ریگستان کی طرح تپ جائے تو کسی کا نرم و گداز ہاتھ بدن پر پھیرنے سے جو سکون اور راحت ملتی ہے، اسی کی تمنا کرنا۔ بادِ بہاری کے نرم جھونکے جب گلشن گلشن کلیوں کو کھلنے کے راز سے آشنا کرتے پھریں اور پرندوں کی چہچہاہٹ سنائی دے تب کسی کی پروا کئے بغیر گریباں چاک کر کے شور مچانے والا ماحول بنانا۔ یہ کام قدرت کے بس کا نہیں، صرف انسان ہی یہ کر سکتا ہے۔ کیونکہ صنفِ نازک کی نزاکت ہی اسے یہ سب کچھ کرنے کو ابھارتی ہے۔ میں تمہیں یہ بھی جتلا دوں کہ میں شادی شدہ ہوں۔

میری شادی کو آج پورے پانچ سال ہو گئے ہیں۔ پہلے کسی لڑکی کے ساتھ محبت کر کے شادی رچانے کا خیال مجھے ٹھیک نہ لگا۔ مجھے اس میں خود غرضی بے حیائی اور عیاری کی بھرپور گندگی پڑی ہوئی محسوس ہوتی تھی، ہمت کی شکست نظر آتی تھی، انسانیت کے دیوالیہ ہونے کا منظر نگاہوں کے سامنے کھنچ جاتا تھا۔ مجھے والدین کی غلامی پسند نہ تھی اسلئے میں نے ان لوگوں کا کہنا کبھی نہ مانا۔ بڑے لوگ یہی کہتے ہیں اسلئے یہ کرنا چاہئے جب میں نے یہ بات کی ہی نہیں تو پھر بڑے لوگوں سے کیا واسطہ؟ مجھے جو بھی ٹھیک لگا میں نے ہمیشہ وہی کیا۔ میں نے اپنے ہی خیالات اپنائے ہیں۔ میں خود اپنا خالق ہوں جسم کا نہ سہی، اپنے ارادوں کا۔ اور یہ بات میرے اختیار سے باہر تھی۔ لیکن دوسری بہت سی باتیں میرے ہاتھ میں تھیں اور میں نے ان کو اپنے طور پر سنوارا ہے۔ کسی کو ان میں خرابی نظر آئے نہ آئے، اس کی مجھے ذرا بھی پروا نہیں۔ لیکن مجھے اپنی ساری شخصیت بڑی خوبصورت نظر آئی ہے۔ میں نے کتابیں پڑھی ہیں۔ مجھے کہنے دیجئے کہ اکثر لوگوں کو کتابیں ہی پڑھ ڈالتی ہیں۔ لیکن اپنے ساتھ میں نے یہ نہیں ہونے دیا۔ میں نے کتابوں کو پڑھا، کتابیں مجھے نہ پڑھ سکیں۔ اس دنیا میں میرا کوئی ہمدم نہیں، کوئی دوست نہیں۔ میرے خیالات، میرے احساسات ہی میرے ساتھی ہیں جنہیں سدا میں نے گلے سے لگائے رکھا۔ میری فہم نے میری رہبری کی ہے۔ آج تک میں نے کسی سے مشورہ نہیں لیا۔ سگرٹ کا میں شائق رہا ہوں۔ میرے گاؤں کی بات چھوڑو۔ سارے ملک میں سگرٹ پینے کی دوڑ میں مجھے شکست دینے والا کوئی نظر نہ آیا۔ دھوئیں کے ان دائروں سے میری

ماہ نو، کراچی، مئی ۱۹۵۹ء

زندگی کے رنگین خوشنما بادل رچے ہیں اور ان بادلوں نے میری زندگی کو دھنک سے سجایا ہے۔ مجھے کسی مصور کے موقلم کا احسان مند نہ ہونا پڑا۔ مجھے ایک شخص ملا۔ وہ غریب تھا تو بھر کیا۔ اس کی دو لڑکیاں تھیں۔ میں نے کہا "ایک کے ساتھ میری شادی کر دو"

اس نے ذرا بھی پس و پیش نہ کی اور اس طرح معصوم نینا میری بیوی بن گئی۔

وہ کیسی تھی، یہ میں تم سے نہ کہوں گا۔ میری بیوی کے بارے میں کچھ جاننے کی تمہیں ضرورت بھی کیا ہے، یہی سمجھ لو کہ وہ تمہاری بیوی کی طرح خوبصورت تھی اور اسی کی طرح باعصمت بھی۔ لیکن شاید میں تم سے کچھ بہتر ہی ہوں۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں خود کو تم سے بہتر شوہر محسوس کرتا ہوں —— اس بات سے بھی میں تمہیں بغیر کسی جھجک کے آشنا کر دوں۔

جس طرح نینا میرے گھر آئی وہ دیکھتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ رات ہنس رہی تھی۔ گھر کی دیواروں سے شادمانی برس رہی تھی۔ میں خوش تھا۔ میرا دل باغ باغ تھا۔ پلنگ گلزار بنا ہوا تھا۔ یہ سب کیوں اتنے خوش تھے؟ اگر تم اتنا بھی نہ جانو تو پھر مجھے کچھ بھی نہیں کہنا۔ جنس کے بارے میں میرا مطالعہ صفر کے برابر ہے۔ شاعری سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں اور کوئی شاعر میرا دوست نہیں۔ لیکن نینا میرے اوّلیں پیار، اوّلیں قرب اور اوّلیں بات سے کھل اٹھی تھی۔ اس کی کشش روز بروز افزوں ہوتی گئی۔ روشنی کی طرح بڑھتی گئی، جال بنتی گئی۔

نینا عورت ہے، میں یہ جانتا تھا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ میری ہے۔ اپنی چیز کے لئے اب کچھ کرنے کی مجھے کیوں خواہش نہ ہو؟ پچھلے کچھ دنوں سے مجھے اس کے رویّے میں کچھ تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔ کل وہ میری ٹوپی اور پتلون پہنے ہوئے آرام کرسی میں بیٹھی اخبار کا مطالعہ کرنے میں مشغول تھی۔ آج صبح سویرے اس نے ایک عجیب ضد اختیار کر لی تھی اور اس پر مُصر تھی۔ اُسے سینڈل پہننا پسند نہیں۔ مخمل کی سلیم شاہی پہننے کا اسے بے حد شوق ہے۔ میں نے گھر میں طرح طرح کی مخملیں سلیم شاہیوں کا انبار لگا دیا۔ جب عورت سلیم شاہی پہنتی ہے تو اس کے پاؤں ایک عجیب نغمہ چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ میں نے محسوس کیا ہے۔ اور اگر میں تم سے یہ کہوں تو مجھے بیوقوف نہ سمجھنا۔ نینا نے مجھ سے کہا "آج باہر جاؤ تو بوٹ کی بجائے میری سلیم شاہی پہن لینا" اس ضد کو تم دلچسپ سمجھو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں تمہیں یہ نہ بتاؤں گا کہ آیا میں نے ایسا کیا یا نہیں۔ دوپہر کو وہ میرے بالوں کی لٹوں کے ساتھ اپنی زلفوں کو باندھنے لگی تھی۔ اس کی وجہ میری سمجھ میں نہ آسکی۔ اپنے سینے پر اس کا سر رکھ کر سونا میری عادت بن چکی ہے۔ اور ایسے میں نینا اگر ادھر اُدھر ہو جائے تو میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ اسی لئے مجھے چین سے سونا نصیب نہ ہو سکا اور مجھے کئی بار یکایک جاگ اٹھنا پڑا ہے۔

آج کا دن جس قدر سہانا اور روح افزا محسوس ہوا ہے اس سے پیشتر کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ آج ہماری شادی کو پورے پانچ سال ہو گئے تھے۔ آج کی رات ہی نینا میرے گھر حنا رنگ قدم لئے آئی تھی۔ اور آج کی رات وہ میرے بستر پر حیا کی پتلی بنی بیٹھی تھی۔ آج کی رات ہی میرے کمرے میں سارے جہان کے پھولوں کی خوشبوؤں کا کارواں ڈیرا جمانے آیا تھا۔

گاؤں کے باغبانوں کے گھر گھر پہنچ پہنچ کر میں نے پھول بیت کئے تھے۔ پھول حسیناؤں کے لئے ہوتے ہیں، یہ میں مانتا ہوں۔ مردوں کا تو بس یہی کام ہے کہ وہ یہ پھول اکٹھے کریں اور ان تک پہنچا دیں۔ میں نے ان پھولوں کا ایک گلدستہ ایک ہوشیار مالی سے تیار کروایا۔ اپنی محبوبہ تک تحفہ پہنچانے کے لئے میں یہ سب کچھ کر رہا تھا۔ اس رات کی بات مجھ سے نہ پوچھو۔ میرے دل میں میلہ لگا ہوا تھا۔ ایسی خوشیوں سے بھرا ہوا جس کے لئے تمام دنیا ہاتھ پاؤں پھیلاتی رہتی ہے۔!

یکایک میری آنکھ کھل گئی ..... نینا میرے پہلو میں نہ تھی۔ وہ میرے بستر پر ہی نہ تھی۔

چادر سلوٹوں سے پر تکیہ نیچے پڑا ہوا مسلے ہوئے پھول فرش پر گرے ہوئے —— اور نینا میرے پہلو میں نہ تھی، بستر پر نہ تھی! بڑی محنت اور دوڑ دھوپ کے بعد حاصل کیا ہوا وہ گلدستہ بھی نہ تھا!

میں چونک کر اٹھ کھڑا ہوا، چراغ روشن کیا۔ نینا کمرے میں نہ تھی۔ لیکن کمرے میں دوسرے کمرے میں پہنچا اور مجھے محسوس ہوا جیسے دونوں کمرے کھلکھلا کر ہنس رہے ہوں اور میں تماشہ بنا ہوا ہوں۔

دوسرا کمرہ چوپٹ کھلا پڑا تھا۔ نینا کے کپڑوں کا صندوق بیچ میں کھلا ہوا اور کچھ قیمتی پوشاکیں بکھری ہوئیں۔ کیا نینا مجھے سوتا چھوڑ کر کہیں چلی گئی؟ نئی پوشاک میں سج کر! کیا اس نے مجھ سے دھوکا کیا ہے؟ میں نے سن رکھا تھا کہ عورت میں بیشتر ایسی بے وفائی ہوتی ہے۔ تو کیا یہ بات میرے لئے حقیقت کا جامہ

پہن رہی ہے؟

لیکن میں نے اُسے کبھی کسی غیر مرد کے ساتھ بات چیت کرتے نہیں دیکھا۔ میرے نوکروں اور آنے جانے والوں کے ساتھ بھی اس نے کبھی طویل گفتگو نہیں کی تھی۔ اس کی آنکھوں کو میرے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ بزدل شخص ایسے میں بہت جلد عورت کے کردار پر شبہ کرنے لگتا ہے۔ کیا میں بھی بزدل ہوتا جا رہا ہوں؟

میں نے کمرے کو مقفل کیا، ہاتھ میں لالٹین لے کر تن تنہا گھر سے چل پڑا۔ جو چیز گھر کی چار دیواری میں نہ ہو وہ باہر ہی ہوگی۔ نینا کو بھی باہر ہی کہیں ہونا چاہیئے۔ اس کی تلاش میں میں نے رات گذارنے کا تہیہ کر لیا۔ کسی کو ساتھ لے کر اپنی ہنسی اڑواؤں، اتنا کم فہم نہ سمجھنا۔

نینا کی کوئی سہیلی نہ تھی۔ وہ کسی کے ہاں بیٹھنے نہیں گئی ہوگی۔ آدھی رات گئے میرا قرب چھوڑ کر کسی کے ہاں باتیں کرنے جانے — نینا اتنی بیوقوف تو نہیں۔ میں گاؤں کی دس پندرہ گلیاں چھان چکا۔ اف.... کتنے دنوں کے بعد میں اس طرح پھرنے کے لئے نکلا تھا۔ پینتیس سال کی عمر میں شاید دوسری ہی بار......

ان دس پندرہ گلیوں میں چار پانچ پولیس والوں کا سامنا ہوا۔ دس بارہ کتے ملے۔ سات اجنبیوں سے مڈبھیڑ ہوئی۔ لیکن نینا کہیں دکھائی نہ دی۔ میں دل گرفتہ ہو گیا، تھکنے لگا۔ دل گرفتہ شخص بہت جلد تھک جاتا ہے۔ مجھے بھی تھکن محسوس ہونے لگی، ہونی ہی چاہیئے تھی۔ میں ایک چبوترے پر بیٹھ گیا۔ گھڑیال نے تین بجائے۔ ٹن.... ٹن...... ٹن۔

پچھلی رات.... غضب ناک.... ڈراؤنی..... یکایک میں اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے کچھ یاد آ گیا۔ مغرب کی طرف ایک ویران سا گلشن ہے۔ وہاں پر ایک کھنڈر کھڑا تھا۔ پہلی نظر میں شاید کھنڈر نہ بھی لگے۔ لیکن خراب حالت میں ضرور ہے۔ وہ ہر شام اس جگہ سیر کو جانے کے لئے مجھے آمادہ کرتی تھی۔ ضد کرتی تھی۔ پورے پانچ سال کی زندگی میں نینا نے اس کے علاوہ کسی اور بات کے لئے اتنی ضد نہیں کی۔ ہاں آج سویرے مخملی سلیم شاہی پہن کر باہر جانے اور رات سونے سے پیشتر اپنے بالوں میں وہ گلدستہ رکھ کر مجھے گھوڑا بنانے کے سوا اس نے کوئی ضد نہ کی تھی۔ کبھی کبھار میں اسے لے کر وہاں جاتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس کھنڈر کے ساتھ اسے اتنا والہانہ عشق کیوں تھا؟ ایسی محبت کیوں تھی؟ اور وہ پلک جھپکائے بنا کھنڈرات کی طرف دیکھ کر، دل ہی دل میں، اس قدر کیوں خوش ہو جاتی تھی۔ لیکن ماضی کی یادگار عمارات سے اُس کی اس والہانہ عقیدت پہ مجھے کیا اعتراض ہونا چاہیئے! اس کی کونسی خواہش پر میں نے دل میلا کیا ہے؟

میں ان کھنڈرات کی طرف دوڑنے لگا۔ گاؤں کی سرحد قریب آنے پر چند کتے بھونکنے لگے۔ جیسے میں نہ صرف تین گھنٹے ہی میں سارے شہر کو لوٹ کر بھاگنے لگا ہوں بلکہ میری ہی ایک عزیز شے یہاں لٹ گئی تھی۔ یہ بات میں کس طرح ان پاگل کتوں کو سمجھا سکوں گا؟

پچھلی رات اور گاؤں کی سرحد...... بھونکتے کتے اور دور دور تک ان کے بھونکنے کی گونجتی ہوئی صدائے بازگشت یہ سب باتیں تجربہ کرنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ میں دوڑنے لگا۔ کسی قسم کا ڈر نہ تھا۔ پھر بھی دوڑتا ہی رہا۔ یکایک قندیل بجھ گئی۔ اندھیری رات کس قدر ڈراؤنی ہے۔ یہ جاننے میں دیر نہ لگی۔ دو ایک الوؤں کے جوڑے میری اس حالت پر ہنس دیئے.... گھو.... گھو.... گھو.....

لیکن مجھے ڈر کی سی کوئی کیفیت چھو بھی نہ سکتی تھی۔ میں موم کا بنا ہوا آدمی نہیں۔ مٹی سے بنا ہوا ہوں۔ کچھ دیر ٹھہر کر میں نے پھر قندیل روشن کی اور تیز قدموں سے ان کھنڈرات کی طرف چل پڑا۔ شاید نینا یہاں آئی ہو۔ کیا اس کا آج کا رویہ عجیب نہ تھا؟

میں نے اپنے آس پاس نگاہ ڈالی۔ وہاں کوئی آدم تھا نہ آدم زاد۔ میں نے قندیل کی لو کچھ اور بڑھائی۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر اُدھر دیکھا لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا! اب واپس چلا چلوں؟ شاید تالاب کے کنارے بیٹھی ہو۔ مگر جب یہاں تک آ ہی گیا ہوں تو کیوں نہ اس کھنڈر میں بھی دیکھ لوں؟ شاید وہاں کہیں سو گئی ہو۔ آج نینا کا کوئی اعتبار نہیں۔ میں قدم اٹھاتا ہوا کھنڈر میں داخل ہو گیا۔ ایسی اُجاڑ، سنسان... اور ڈراؤنی عمارت میں قدم رکھے۔ میرے قدموں کی چاپ سے ہزاروں چمگادڑ پروں کو پھڑپھڑاتے، شور مچاتے اڑنے لگے۔

قندیل کو ذرا اور اونچا کر کے میں نے اس کی روشنی دور تک ڈالنے کی کوشش کی۔ اندر دو خوبصورت لیکن ٹوٹے پھوٹے کمرے تھے۔ مجھے کیوں وہاں نہ جانا چاہیئے؟ مگر یہاں تک آ ہی پہنچا ہوں تو پھر تلاش تو کرنی ہی چاہیئے۔

اور میں ایک کمرے کی دہلیز پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ یکایک کسی کی آواز کان کے پردے سے ٹکرائی "اوہو! آ گئے نا؟ آؤ۔۔۔ آؤ۔۔۔۔ ذرا اندر آؤ۔۔۔۔۔۔ بیوی کی تلاش میں آئے ہو؟"

قندیل یکایک بجھ گئی۔ میرا بدن ڈھیلا پڑ گیا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے اپنے پاؤں تلے سے زمین نکلتی ہوئی محسوس ہوئی اور معلوم ہوا کہ انسان کا دل چاہنے کے علاوہ کانپ بھی سکتا ہے، سارا عالم گھومنے لگتا ہے اور آدمی بولنا چاہے تو بھی بول نہیں سکتا۔ نہ جانے کیوں ایسے میں میدانِ جنگ سے بھاگنے والوں کے ساتھ ہمدردی محسوس ہونے لگی ہے۔

کچھ ڈراؤنے، پُرسکوت لمحات کو چیرتی ہوئی وہی آواز پھر آئی۔ کسی نے کہا "بس گھبرا گئے؟ تاریکی سے ڈر گئے؟ پچیس سال سے میں اس گھر کے اندھیرے میں جی رہا ہوں۔ مگر تمہاری طرح نہیں ڈرا۔"

میری مردانگی پر کوئی کاری ضرب لگاتا ہوا محسوس ہوا۔ میری ہمت اور شجاعت کی ہنسی اڑاتا ہوا معلوم ہوا۔ ایسے تازیانے میں نے کبھی برداشت نہیں کئے۔ میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ پھر وہی آواز آئی۔

"قندیل بجھ گئی؟ میں نے ہی اُسے بجھایا ہے، ڈرو نہیں۔ دیکھو یہ قندیل بھی کیسی عجیب چیز ہے؟ جب تک جلی جلی۔ کسی کی پھونک لگی اور ختم!۔۔۔ اندھیرا۔۔۔ ہر سمت اندھیرا۔۔۔۔!"

اور الفاظ کی گونج ختم ہوتے ہی ایک ڈراؤنا قہقہہ ہر طرف گونجنے لگا۔ کوئی اور بھی ساتھ ہی ساتھ ہنس رہا ہے۔ میں یہ خیال کئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ دوسرا کمرا اس کمرے کے ساتھ ہم آہنگ تو نہیں ہو رہا یا پھر یہ اس قہقہہ کی صدائے بازگشت تھی؟

"اور دیکھئے صاحب۔ زندگی بھی کیسی چیز ہے۔ بالکل قندیل جیسی۔ خود ہی تیل بھرنا۔۔۔۔ تو کم یا زیادہ کرنا، ہوا کے جھونکے روشنی کو اڑا نہ لے جائیں، اس کا دھیان بھی رکھنا، ورنہ ۔۔۔ اندھیرا۔۔۔۔ گھور اندھیرا۔۔۔ اور پھر بس گُم!۔۔۔۔ جو لوگ بے دھیان ہوں ان کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔"

یہ فلسفہ کون چھانٹ رہا تھا؟ میرے ساتھ کون مصروفِ گفتگو تھا؟ یہ جاننے کی خواہش میرے دل میں جاگ اٹھی۔ لیکن کس سے پوچھوں؟ کس طرح پوچھوں؟

"کس فکر میں پڑ گئے؟ مجھ سے کیا چھپا ہے۔ یہ کون بول رہا ہے۔ یہی جاننا چاہتے ہو نا؟ تو پھر اندر آؤ۔ ڈرو نہیں۔ بہت عرصہ کسی سے گفتگو کرنے کا موقع نہ ملا تھا، سو آج ذرا زبان کو جنبش میں لانے کا خیال آ گیا۔ آپ اچھے آدمی ہیں، یہ جانتا ہوں۔ اور اسی لئے آپ سے ہمکلام بھی ہوں۔"

میں اندر گیا۔ ڈر کا کہیں آس پاس سان گمان بھی نہ تھا۔ میں کچھ اور چوکنا ہو گیا۔ پھونک پھونک کر قدم دھرنے لگا۔

"خوب۔۔۔ بہت دنوں کے بعد یہاں کوئی آیا۔ کتنے عجیب لوگ ہیں! یہاں بھوت رہتا ہے ۔۔۔ یہ سمجھ کر کوئی اس کمرے میں تو کیا کھنڈر میں بھی رات کے وقت بھی نہیں بھٹکتا۔ تم لوگوں سے تو یہ چمگادڑ ہی بہتر ہیں کہ مزے سے دن رات یہاں شور مچاتے رہتے ہیں۔ لیکن صاحب! ذرا سنبھل کر اندھیرے میں کہیں گر نہ جائیں۔ قندیل روشن کرنا ہو تو کر لیجئے ورنہ آپ کی مرضی۔ کیونکہ بعض اوقات روشنی میں جیسا ڈر لگتا ہے ویسا اندھیرے میں محسوس نہیں ہوتا۔ اسی لئے میں نے اُسے یوں بجھا دیا تھا۔ گھبرائیے نہیں۔ آپ کے سوا یہاں کوئی نہیں۔"

میں اس فرمان کا منتظر ہی تھا۔ میں نے جیب سے دیاسلائی نکال کر قندیل روشن کی۔ ہر طرف روشنی پھیل گئی۔ میں نے چاروں طرف نظریں ڈالیں۔ یقیناً کمرے میں کوئی بھی نہ تھا۔ کیا یہ آواز کمرے کی اپنی تھی؟ کیا عمارت کے خستہ سنگ و خشت کو زبان مل گئی تھی؟

"دیاسلائی پاس ہی رکھے رہتے ہو کیا؟ سگرٹ کا شوق معلوم ہوتا ہے۔ اُس طرف دیکھو۔ وہاں ایک خوبصورت الماری تھی۔ میرے مالک کی الماری! وہ نقش و نگار تھے کہ کیا کہوں۔ کشمیر سے اُن کے کسی دوست نے ان کی شادی پر سوغات کے طور پر بھجوائی تھی۔ یہ پوری الماری قیمتی سے قیمتی سگرٹوں کے ڈبوں سے بھری رہتی۔۔۔۔ اور میرا مالک بھی سگرٹ پر سگرٹ پھونکے جاتا تھا۔ اس قدر دھواں ہوتا کہ مجھے سانس رکتی محسوس ہوتی۔ کون جانے اُسے یہ لت کیسے پڑ گئی تھی۔ ایک بار تو ایسا بیمار ہوا کہ سب نے امید چھوڑ دی۔ مگر وہ بچ گیا۔ ڈاکٹروں نے کہا۔ "اب تم اچھے ہو گئے ہو لیکن سگرٹ کا زیادہ استعمال مضر ثابت ہوگا۔ بچ نہ سکو گے۔" لیکن وہ کب سنتا تھا۔ اس نے کہا، "میں مروں تو میری قبر پہ سگرٹوں کا مینار بنوانا!"۔۔۔ یہی الفاظ۔۔۔ ہاں یہی الفاظ میرے مالک نے کہے

تھے۔ یوں تو میری یادداشت بھی کافی اچھی ہے۔ یہاں اس کمرے میں جو کچھ بھی ہوا ہے۔ میں اسے نہیں بھلا سکا ہوں۔ آپ کھڑے کیوں ہیں؟ بیٹھیے نا۔ اسی پتھر پر بیٹھ جائیے۔ آپ بیوی کی تلاش میں نکلے ہیں میں یہ جانتا ہوں لیکن اب وہ نہیں ملے گی۔ واپس بھی نہیں آئے گی۔"

یہ الفاظ سن کر میں بیٹھتے بیٹھتے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور میرے کانوں پر الفاظ کے پھر حملے شروع ہو گئے۔

"آپ چونک اٹھے! اس میں مبہوت ہونے کی کیا بات ہے! بھاگی ہوئی عورت کب واپس آئی ہے .... لیکن یہ تو پاگل ہو گئی ہے۔ پاگلوں کا بھروسہ کیا؟ کیا اعتبار؟ ہو سکتا ہے کہ تالاب میں ڈوب جائے اور وہ تو جہاں تھی وہیں چلی گئی ہے اور اس بات کی مجھے بڑی خوشی ہے اور خوشی کیوں نہ ہو؟ اپنی نگاہوں کے سامنے ہونے والے واقعات کی یادوں ہی کے سہارے زندہ ہوں۔ یہ باہر کا حوض اور وہ خاص کمرہ، وہ باغیچہ، وہ منڈیر سب ٹوٹ پھوٹ گئے، اجڑ گئے۔ بارش کی بوچھار بھی محبت کی ماری کی طرح ہوتی ہے۔ نہ گریں تو پھر کیا ہو، مرجھا نہ جائیں تو پھر .... لیکن میں اس واقعہ کی راہ دیکھتے ہوئے آج تک قائم ہوں۔ مالک مجھے بہت عزیز رکھتا تھا۔ یہیں دن رات پڑا رہتا تھا۔ اِدھر کبھی باہر گیا اور اُدھر واپس ..... اوہ! کیا کیا کتابیں لاتے تھے۔ کتنی پنسلیں، کتنے کاغذ! اور اب جہاں آپ بیٹھے ہیں، اس پتھر کے آگے جھولتی کرسی پر، سامنے چھوٹی سی میز رکھ کر پڑھنے میں مصروف ہو جاتا اور کچھ لکھتا رہتا۔ سگرٹ ایک کے بعد دوسرا پیتا جاتا۔ کیا وقت ہے اس کی بھی کوئی پروا نہ تھی۔ کب سونا ہے، اس کی کیا پڑی تھی۔ سیالکوٹی قسم کا پلنگ تھا جو کشمیری چادر سے سجا ہوتا، پھر بھی اسی کرسی پر پڑے پڑے سو جاتا۔"

پھر ایک دن اس نے شادی کر لی۔ میں نے خیال کیا جب الماری میں اتنے سگرٹ ہیں تو پھر آدمی کتنے آئیں گے؟ مگر کوئی بھی نہ آیا۔ نہ مالک ہی نے کسی کو بلایا۔ وہ عورت کسی بڑے باپ کی بیٹی نہ تھی۔ اس سے پیشتر وہ یہاں کسی لڑکی کو نہیں لایا تھا۔ میں نے سوچا یہ دھوئیں کا راجہ اور کاغذ کے انبار کا عاشق عورت کیوں لے آیا؟ تیس سال کی پکی عمر کے باوجود؟ اس کو ایسی کونسی ضرورت پڑ گئی۔ وہ اسے کیا سمجھ سکے گا؟ لیکن ..... لیکن اس عورت کے آنے کے بعد مالک میں غضب کی تبدیلی ہوتی ہوئی محسوس کی میں نے۔"

"جب اس لڑکی نے کمرے میں قدم رکھا تھا تو میرے سینے پر لٹکتی ہوئی گھڑی نے رات کے نو بجائے تھے۔ کون جانے کیوں، لیکن اس کی یہ ٹن ٹن کی آواز مجھے بہت بھلی معلوم ہوئی تھی۔ مالک اس لڑکی کا ہاتھ تھامے ہوئے یہاں داخل ہوا۔ اُس گوشے میں پلنگ ہوتا تھا۔ اس پر اسے بٹھا دیا۔ دھیرے سے کواڑ بند کئے اور پھر اس کا گھونگھٹ ہٹاتے ہوئے کہا "تجھے دیکھے بغیر ہی شادی کی ہے۔ دوستوں نے مجھے نادان کہا ہے۔ وہ لوگ لڑکیوں کو شادی سے پہلے ہی بیوی بنا دینا چاہتے ہیں۔ مجھے اس میں دوشیزگی اور انسانیت کی توہین محسوس ہوتی ہے۔ اس لئے میں نے کسی کو بھی اپنی شادی پر نہیں بلایا۔ ناپاکی سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔ گناہ سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ میں نے بہت کچھ پڑھا ہے لیکن مجھے کسی کتاب میں فرحت نہ ملی۔ ان گنت سگرٹوں کے دھوئیں کے بادلوں سے ہوتا ہوا میں دھیان کی راہوں پر نکل گیا ہوں۔ عورت کی محبت اور زندگی پر میں نے سوچ بچار کیا ہے۔ ان سب کا حاصل تو ہے۔ میرے لئے تو ہم مذہب، نصف بہتر یا سیج کی ساتھی نہیں۔ یہ تو میری توہین ہو گی۔ میرا نصف ہی تو کیوں ہو؟ تو خود میں ہی کیوں نہیں؟ بڑے بڑے فیلسوف لوگوں کو میں نے یہیں چکراتے ہوئے دیکھا ہے اور مجھے بے حد افسوس ہوا ہے۔"

"یہ کہہ کر مالک نے اس کا گھونگھٹ ہٹا دیا اور اسے سینے سے لگا لیا۔ مجھے اس قدر شرم آئی کہ کیا کہوں اور پھر اس نے اس کے ماتھے پر ایسے بوسہ لیا کہ مجھے محسوس ہوا مجھے کوئی چیز آن لگی ہو۔

"وہ مالک کے سینے میں اپنا چہرہ چھپائے رہی۔ اس نے ایک ایسی گہری سانس لی جیسے ساری کائنات کا شکوہ گھول کر پی رہی ہے۔ مالک اس کے گیسوؤں پر ہاتھ پھیرتے رہے۔ کسی نے کچھ بھی نہ کہا۔ کوئی ہلچل نہ ہوئی۔ میں بھی متحیر ہو گیا۔ گھڑیال نے صبح کے ساڑھے سات بجائے لیکن دونوں یونہی کھڑے رہے۔ مالک کے سینے میں اس کا چہرہ چھپا ہوا تھا اور اس کی سیاہ زلفوں پر مالک کا ہاتھ اسی طرح پھر رہا تھا۔

صبح نوکر نے چائے کے لئے جب دروازہ کھٹکھٹایا تو دونوں جدا ہوئے۔ چائے آئی۔ مالک نے پیالی میں چائے ڈال کر خود اپنے ہاتھوں سے پلائی۔ خود بھی پی لیکن سگرٹ نہ سلگائی۔ سامنے چوکی پر کھلا ڈبا پڑا ہوا تھا لیکن مالک نے اس میں سے سگرٹ نہ نکالی۔ دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ عورت کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ مالک کی نظریں جیسے ان نیچی نگاہوں کا مطالعہ کر رہی تھیں۔ دونوں یونہی بت کی طرح بیٹھے رہے۔ اور پھر عورت نے بھی نگاہیں اونچی

کئی اور رات گئے تک دونوں یونہی ایک دوسرے کی نگاہوں میں نگاہیں پروئے بیٹھے رہے۔
دوسری صبح عورت ذرا خوش خوش دکھائی دی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی سی کوئی شے کھلنے لگی تھی۔ اس میں کچھ اوجھک کے آثار نظر آنے لگے۔
لیکن اس تمام عرصے مالک نے سگرٹ کو ہاتھ نہ لگایا۔ کتاب کی ورق گردانی نہ کی۔ گھر سے باہر قدم نہ نکالا اور ہدایت کردی کہ اسکے بلائے بغیر کوئی نوکر نہ آئے"

"اس شام مالک نے بنّوں کو بلا بھیجا۔ بنّوں کو آپ کیا جانیں۔ وہ اس گھر کا نوکر تھا۔ اس کے ہاتھوں میں کھیل کر وہ بڑا ہوا تھا۔ بنّوں سے کہا "یہ چٹھی" لے اور وہ رہے پیسے۔ شہر کے تمام اخباروں میں جا اور سبھی میں اس خبر کو چھپوانے کا بندوبست کر۔ سارا کام ٹھیک طرح ہو جائے"۔
مالک نے اخباروں میں "ایک ہوشیار باغبان کی ضرورت ہے" کے عنوان سے اشتہار دیا تھا۔ پانچ سات دن تو یہاں بہت سے لوگ طرح طرح کے سارٹیفکٹ لئے ہوئے آئے۔ ان میں سے ایک کو مالک نے منتخب کرلیا۔ اچھی قسم کے پھولوں کے پودے منگوائے گئے، اور کئی دنوں کی محنت کے بعد۔ وہاں۔ اس جگہ جہاں سے آپ داخل ہوئے تھے، اس نے ایک بہت خوشنما باغیچہ تیار کردیا۔
آپ نے کھلے ہوئے پھولوں کی خوشبو کبھی محسوس کی ہے؟ جوبن کی خوشبو بھی کچھ ایسی ہی ہے جس سے انسان کے دل کی کوڑیاں کھلنے لگتی ہیں اور یہ کیفیت دیکھ کر مالک پر بھی جیسے کیف طاری ہوگیا۔ باہر کی باتوں کا تو مجھے علم نہیں لیکن جب اس کی گردن میں ہاتھ ڈالے وہ اندر آتا تو پھولوں کی مست کن خوشبو سے مجھ پر بھی کیف طاری ہونے لگتا۔ اور تھوڑی دیر مجھ میں یہ احساس پیدا ہوتا کہ اے کاش! میں بھی اس عدم کے بدلے وجود کا حصہ ہوتا......
اور... اور...... اگر نصیب سے عورت ہوتا تو اس مست شخص کی آغوش میں اس کی بیوی کی طرح کھیلنے کا زریں موقع ملا ہوتا اور میری زندگی بھی خوش خوش گذرتی۔ سچ کہتا ہوں جس شخص کو صنف نازک سے رغبت نہیں وہ ہم سے بھی گیا گذرا آدمی ہے۔ کئی بار میں نے سوچا ہے کہ ایسے آدمی کو کسی زیر تعمیر عالیشان عمارت کی نیو میں مزدوروں سے ٹھونک ٹھونک کر گڑوا دینا چاہیئے۔ میں تخیل کے ذریعہ سے جان لیتا کہ مالک اسکے ایک ایک بال میں پھول گوندھتا تھا اور وہ خود یہ سب کچھ کرنے دیتی تھی۔ اور پھر میری آنکھوں کے سامنے کیا کیا دلفریب منظر آتے، میں کیسے بیان کروں۔ اس پلنگ پر وہ عورت اس ادا سے بیٹھتی جیسے دنیا کی تمام خوش ذوقی اس کے پاس پنکھا ہلا رہی ہو اور میرا مالک اس کے بالوں میں پروئے ہوئے پھولوں کو سونگھتا رہتا..... چاند نکل کر غروب ہو جائے تب تک۔ سورج بچپن، جوانی اور بڑھاپا تینوں ادوار سے گذر جائے تب تک.....
مالک نے پورے پانچ سال تک اس پر محبت کی موسلا دھار بارش کی۔ اس کی بوچھار بے پناہ تھی۔ اونچی پُرغرور چٹانوں کو ریزہ ریزہ کر ڈالنے والی بارش کا سامنا کون کرے۔ اس کے سامنے کس کا بس چل سکتا ہے۔ اس کا تمام جسم اس میں شرابور ہوگیا۔ اور اس نے بے حجابی اختیار کرلی۔ ایک داخلی عریانی۔ مجھے آج بھی وہ آخری دن اچھی طرح یاد ہے جس نے میری عالی شان دیواروں کو ہلا کر رکھ دیا، میری نیو کو کمزور کر دیا اور مجھے زلزلہ سے آشنا کیا۔ پھر یکایک میاں نے اپنا شباب کھو دیا۔ ایک میں نے بھی کیا، اس دھرتی کی تمام اشیا نے.....
"ہاں، تو اب آپ یہ جاننا چاہتے ہوں گے کہ کیا ہوا کیا۔ ذرا دل پر ہاتھ رکھ لیجئے تاکہ یہ کہیں درہم برہم نہ ہو جائے اور آپ کو ایسا صدمہ پہنچے کہ خود کو سنبھال نہ سکیں۔
"باغبان نے چن چن کر پھول جمع کئے، پردیس سے آئے ہوئے عطریات چھڑکے گئے۔ پلنگ پر پھولوں کی سیج بچھائی گئی۔ سارا کمرہ خوشبو سے مہک اٹھا۔ ہر طرف خوشبوؤں کا رقص جاری تھا۔ ایسے میں اس عورت کی خوشبو!.... مالک کی امیدوں اور آرزوؤں کے اختتام کی خوشبو۔ کچھ نہ پوچھئے۔
مالک کی شادی کی یہ پانچویں سالگرہ تھی۔ ہر پانچ سال کے بعد ایسا ایک من گھڑت تہوار منانا ان کی دلی خواہش تھی۔ اس دن کی رات کا اب پیش خیمہ تھا۔ آسمان پر کتنے چاند نکلے تھے، اس کی مجھے خبر نہیں۔ لیکن انداز سے کہوں تو دنیا اور زندگی کی تمام روشنی جیسے میری چار دیواری کے اندر سما گئی تھی۔
باغبان ایک گلدستہ لے کر آیا جسے تازہ اور مست خوشبو والے پھولوں سے تیار کیا گیا تھا۔ مالک نے اس کے بالوں میں پُرکیف دل اور رخسار آلود آنکھوں سے اٹکا دیا۔ آج دل کے تہوار کی بے مایہ رات آئی تھی"۔
یکایک کوئی رو دیا..... آہ و بکا کے ساتھ۔ میرا دل کانپنے لگا۔ بھیانک کیکپی سی طاری تھی۔ بات گلے میں اٹک گئی تھی۔ بھیانک سناٹا اور خاموشی ہر طرف مسلط تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا پچھلی رات کا سماں تھا۔ کیا میں اب تک ان دیواروں سے نغمہ سن رہا تھا؟ رونے کی آواز اور تیز ہوتی جارہی تھی۔
(باقی صفحہ ۵۰ پر)

دُکان

حمید کاشمیری

یہ دکان ڈی سوزا[1] کے پاس اس وقت بھی تھی جب اکثر دکانوں پر "کرایہ کے لئے خالی ہے" کی تختیاں آویزاں رہتی تھیں۔ کیسے کیسے انقلاب آئے، لوگوں کے رہن سہن اور طور طریق میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ ڈی سوزا کے ساتھ کے درزی ٹیلر ماسٹر بن گئے۔ چالیس پچاس روپے تنخواہ پر کام کرنے والے کاریگر دس دس کاریگروں پر انچارج مقرر ہو گئے اور ڈی سلوا، جو کبھی ڈی سوزا کے پاس بیٹھ کر کاج تر پائیاں سیکھا کرتا تھا، اپنی الگ دکان کا مالک بن گیا اور چھ درزی ملازم رکھ لئے۔ آبادی ٹڈی دل کی طرح بڑھی۔ دکانیں سونا اگلنے لگیں، چھوٹے چھوٹے کیبن ہزاروں کے مال سے کھچا کھچ بھر گئے، بازاروں میں تل دھرنے کو جگہ باقی نہ رہی، دکان کے پرانے ڈیزائن بدل گئے، تجارت نے نیا روپ دھار لیا، اور زمینیں اور دکانیں سونے کے مول بکنے لگیں۔ لیکن ڈی سوزا کی دکان کی پرانی وضع قائم رہی۔ وہی بغیر سائن بورڈ کی دکان، بغیر رنگ کے دروازے، دیواروں پر میلے کچیلے دھبے، چھت میں جابجا مکڑی کے جالے پچھلی دیوار کے ساتھ ایک بوسیدہ سی الماری جس میں کسی مفلوک الحال بابو کی پتلون یا قمیص پڑی اس کی مفلسی کا رونا روتی رہتی۔ اور ڈی سوزا جس کی عینک کا نمبر روز بروز اس کا ساتھ چھوڑتا جاتا، اپنی پرانی وضع کی کھٹارا سی مشین پر جھکا کچھ نہ کچھ سیتا ہی رہتا۔ اس کے سامنے والی دیوار کے ساتھ ایک بنچ بچھی رہتی جس پر کبھی کبھار اس کا کوئی گاہک یا ملنے والا آکر تھوڑی دیر سستا لیتا۔ پچھلے کمرے میں ڈی سوزا کی کھٹملوں بھری چارپائی بچھی رہتی لیکن بیچ کا دروازہ ہمیشہ بند رہتا۔ یہ دکان اچھے محل وقوع اور اپنی خستہ حالی کی وجہ سے بہت سے لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بنی، بڑے بڑے مالدار لوگوں نے اس کی قسمت بدلنے کا فیصلہ کیا، مگر کسی کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

اسی دکان کے برابر ایک جوہری کی دکان تھی جس کا کاروبار بہت ترقی پر تھا۔ اس جوہری کو تجارت میں شکست دینے کے لئے شہر کے اکثر جوہریوں نے ڈی سوزا کی دکان حاصل کرنے کی کوشش کی اور ہزاروں روپے کی پیشکش بھی کی، لیکن ہزاروں روپے کر وہ جاتا کہاں؟ اسے سر چھپانے کے لئے ٹھکانہ بھی چاہیئے تھا اور اسے معلوم تھا کہ ٹھکانہ حاصل کرنا کتنا دشوار ہے۔ اور یہ دکان تو اس کا بنا بنایا ٹھکانہ تھی جہاں وہ آزادی سے کام کر سکتا تھا اور اطمینان کی نیند سوتا تھا۔ اس نے دکان کو فروخت کرنے کے ارادے کو ذہن میں داخل ہی نہیں ہونے دیا۔ اور فیصلہ کر لیا کہ جہاں اس نے زندگی کا طویل حصہ تن تنہا اس دکان میں گزار دیا ہے وہاں وہ آخری لمحے بھی یہیں پورے کرے گا اور اس کے مرنے کے بعد جس کا جی چاہے اس دکان کا وارث بن جائے، وہ بے تعلق ہو جائے گا۔ لیکن دکان سونے کی ایک اینٹ تھی جس پر گرد و غبار کے پردے چھائے ہوئے تھے اور سوا ئے ڈی سوزا کے ہر آدمی ان پردوں کو اتارنے کے لئے بے تاب تھا۔ لہٰذا لوگوں نے اس کے فیصلے کو بدلنے اور دکان کو خریدنے کی سر توڑ کوششیں شروع کر دیں۔ آئے دن اس کے پاس ایک نہ ایک پارٹی آ جاتی، سبز باغ دکھاتی، دکان کی اہمیت، اپنی مجبوری اور روپے کی قوت کا اظہار کرتی۔ دلال اسے نت نئے چکر دے جاتے، مگر وہ اپنے ارادے پر اٹل رہا اور اپنے پیروں کو پیسے کی چکناہٹ پر سے پھسلنے سے روکے رکھا۔

بیکو جمیل درزی کا مطالبہ سب سے ہی الگ تھا۔ اس نے نہ تو ڈی سوزا کو سبز باغ دکھائے اور نہ روپوں کی جھلک، البتہ اپنی غربت بیکاری اور چھوٹے چھوٹے بچوں کی مجبوری کا اظہار ضرور کیا۔ پھر اس کی سیدھی سادی بات تھی کہ وہ لیڈیز کا کام کرتا ہے اور ڈی سوزا جینٹس کا۔ ایک طرف وہ مشین رکھ کے بیٹھ جائے اور اپنا لیڈیز کام شروع کر دے ـــــ دکان ایک ہی معلوم ہوگی اور کام تو ہوتے رہیں گے۔

---

[1] اس افسانہ کے تمام کردار فرضی ہیں

کمیشن طے کرنے کا فیصلہ اس نے ڈی سوزا ہی پر چھوڑ دیا۔ ڈی سوزا کو اس کی بیکسی پر رحم آگیا۔ اس نے جمیل کو ایک طرف مشین رکھنے کی اجازت دے دی۔ بلکہ دکان کا آدھا حصہ اس کے حوالے کر دیا۔ اور کمیشن کی بجائے صرف دکان کا نصف کرایہ ادا کرنے کے لئے کہا۔ ڈی سوزا کی اس مشفقانہ رضامندی سے جمیل کی خوشی کی انتہا نہ رہی اور اس کا انگ انگ ڈی سوزا کو دعائیں دینے لگا۔

اگلے دن جمیل نے صبح سویرے آکر دکان کی اچھی طرح جھاڑ پونچھ کی۔ ڈی سوزا کی مشین کے تختے کے نیچے سے مدتوں کا پڑا ہوا کوڑا نکالا۔ دروازے اور دیواروں سے صاف کیں مکڑی کے جالے اتارے، ڈی سوزا کے سامنے والی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی بنچ کو اٹھا کے پچھلے کمرے میں رکھ دیا اور آمنے سامنے دونوں مشینیں رکھ کے بیٹھ گئے۔ اس دن صفائی کی وجہ سے ڈی سوزا کی دکان کی نئی شکل نکل آئی۔

ڈی سوزا کا کام بدستور چلتا رہا، وہی پرانے گنے بندھے گاہک قائم رہے آمدنی کم ہوئی نہ بڑھی لیکن جمیل کا کام چند ہی روز میں خوب چمک اٹھا اس نے جب ڈریسوں کے نئے نئے اور اعلیٰ قسم کے ڈیزائن بنا کر باہر لٹکائے، تو عورتوں نے بہت پسند کئے، چند ایک بک بھی گئے، چند ایک کے آرڈر مل گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے جمیل بنکوں اور انگریزی فرموں میں کام کرنے والی کرسٹانیوں کا مقبول ترین درزی بن گیا۔ کام کی بہتات رہنے لگی اور اس نے محسوس کیا کہ کام ایک آدمی کے بس کا نہیں رہا، حالانکہ وہ دن کے علاوہ رات کو بھی گئی رات تک کام کرتا رہتا۔ اسے دوسرے آدمی کی ضرورت شدت سے محسوس ہونے لگی۔ اس نے کافی سوچ بچار اور ڈی سوزا سے مشورہ کرنے کے بعد ایک درزی بٹھا لیا۔ اس طرح اس کا بہت سا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ اور مہینہ گزر جانے کے بعد جمیل نے محسوس کیا کہ دوسرا درزی بٹھانے کے بعد اس کی آمدنی کافی حد تک بڑھ گئی ہے۔ وہ دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ اس کے کام کو اس قدر ترقی پر دیکھ کر کئی اور درزی، جن کا کاروبار اچھا نہیں تھا، جمیل سے حسد کرنے لگے اور اس کو اس دکان سے نکلوانے کی ترکیبیں سوچنے لگے۔

اس دن جب ڈی سوزا ہوٹل میں چائے پی رہا تھا تو فخرو درزی، ڈی سوزا کو دیکھ کر اندر ہوٹل میں داخل ہو گیا اور پھر جمیل کے خلاف زہر اگل کر ڈی سوزا کو پھسلانے کی کوشش کرنے لگا:

"جمیل تو تمہیں صرف دس روپے ماہانہ کرایہ دیتا ہے اور خود کم از کم پانچ سات سو کما لیتا ہے۔ تمہیں کیا فائدہ ہوا؟ مجھے بٹھاؤ، میں بھی لیڈیز کام کروں گا، تمہیں پچیس فیصدی کمیشن دوں گا۔ جتنا زیادہ کام ہو گا اتنا ہی تمہارا فائدہ"

فخرو بڑی بے تابی سے ڈی سوزا کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

"ہم کو کمیشن نہیں کرایہ مانگتا ہے، ہم کو جمیل کمیشن دیتا تھا ہم اپنی مرضی سے کرایہ لیا۔ تم ہم کو اس کے بارے میں اب جاستی بات مت بولو"

ڈی سوزا نے سر نہوڑائے چپکے سے اسے دو ٹوک جواب دے دیا۔ اور فخرو مایوس و نامراد ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ آخر رفتہ رفتہ اس کے ہم پیشہ لوگوں کو پورا یقین ہو گیا کہ ڈی سوزا کسی حالت میں بھی جمیل کی مخالفت پر آمادہ نہیں ہوتا، لہٰذا انہوں نے جمیل کی مخالفت اور اس کی جگہ حاصل کرنے کی کوشش ترک کر دی۔ اور اس طرح ڈی سوزا اور جمیل کے تعلقات کو مضبوط ہونے کا موقع مل گیا۔ وہ آپس میں یوں گھل مل گئے جیسے صدیوں کے پرانے دوست ہوں۔ جمیل خود اس دکان میں کام کرنے کے باوجود کچھ عرصہ فٹ پاتھ پر سوتا رہا، اب ڈی سوزا کے کہنے سے دکان کے پچھلے کمرے میں ڈی سوزا کے برابر چارپائی بچھالی تھی، اور اس طرح اس دکان کی یکتائی بالکل ختم ہو گئی۔ پہلے ڈی سوزا دکان میں ایک تھا اور اس کے لئے ہوٹل سے "ایک کھانا" آتا تھا۔ "ایک چائے اور ایک سگریٹ" اب وہ دکان میں دو تھے۔ اور ہر چیز دو سے بدل گئی تھی۔ اب ہوٹل سے دو کھانے آنے لگے، دو چائے اور سگریٹیں، اندر کے کمرے میں دو چارپائیاں بچھ گئیں اور دونوں میں جوئے میں جتے ہوئے بیلوں کا سا توازن پایا جانے لگا۔

جمیل کو خاصی معقول آمدنی ہونے لگی۔ اس نے لوگوں کے قرض چکا دئے۔ گھر اپنی بیوی کو بے دریغ روپیہ بھیجا اور خود ہر قسم کی پریشانیوں سے بے کھٹکے ہو کر بہت اچھے طریقے سے گذر بسر کرنے لگا۔ اب اس کی صرف ایک بڑی خواہش رہ گئی تھی کہ اسے کہیں کوئی ٹھکانے کا مکان مل جائے اور اپنی بیوی اور بچوں کو ہمیشہ کے لئے اپنے پاس بلوالے۔ بیوی بچوں کی مستقل جدائی اس کے لئے انتہائی تکلیف دہ ثابت ہو رہی تھی اس تکلیف کو رفع کرنے کے لئے اس نے بہت تگ و دو کی، کئی دلالوں کے چکر میں آیا، انہیں پیسے کھلائے مگر مکان حاصل کرنے میں اسے

کامیابی نہ ہوسکی۔ اگر کہیں کوئی امید پیدا بھی ہوئی تو روپیہ کا مطالبہ اس کی بساط سے باہر ہوا اور پھر اسے پچھلے کمرے کا خیال ہونے لگا۔ وہ سوچنے لگا ڈی سوزا کتنا بدنصیب ہے کتنے بڑے محل مکان کا مالک ہے جس کا پچھلا کمرا ایک پورے فلیٹ کا کام دے سکتا ہے لیکن اس نے کبھی اس سے کوئی کام نہیں لیا اور اپنی زندگی کا بڑا حصہ تن تنہا بغیر بیوی بچوں کے اس میں گذار دیا جبکہ لوگ اپنے سارے کنبے سمیت فٹ پاتھ پر بھی سوتے ہیں۔ پھر وہ کتنی دیر تک اسی انداز میں سوچتا رہا۔

اس دن جمیل کسی کام سے بازار گیا ہوا تھا۔ جب تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ دکان پر بہت بھیڑ لگی ہوئی ہے اور بھیڑ کے اگلے حصے میں بچوں کا ایک بہت بڑا گروہ بلند آواز میں دکان کی طرف منہ کر کے چیخ رہا ہے:

"پاگل ہے، چریا ہے"

"عینک والا چریا ہے"

"کالا کلوٹا چریا ہے" پھر وہ ہاتھ لہرا لہرا کے بیک آواز چیخنے لگے۔ "چریا .... چریا۔ چریا۔ چریا۔" اور چریا چریا کی رٹ سے جیسے آسمان گونج اٹھا۔ جمیل تھوڑی دیر کھڑا دیکھتا رہا، پھر جلدی جلدی ہجوم کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ دیکھا تو ڈی سوزا کی حالت قابل رحم ہو رہی تھی، اس کے ماتھے پر پسینے کے بہت سارے قطرے پھوٹ آئے تھے اور وہ بڑی انکساری سے بچوں کو چپ کرانے میں مصروف تھا لیکن وہ جتنی ہی التجا کرتا بچے اتنا ہی چڑ جاتے اور زور و شور سے "چریا۔ چریا" پکارنے لگتے۔ جمیل نے بیچ میں مداخلت کرنے کی کوشش کی اور کچھ گالی گلوچ سے بچوں کو چپ کرانے لگا۔ بچے تاؤ کھا گئے اور جمیل کو گھیر لیا۔ اور "ہائے ہائے، مونچھیل درزی ہائے ہائے" چلانے لگے۔ جمیل کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے اور وہ اپنی جان اور مونچھوں کے تحفظ کی خاطر جست بھر کے دکان میں چلا گیا اور جلدی سے کواڑ بند کر لئے۔ بچے دیر تک بند کواڑوں کے باہر "چریا چریا" کی رٹ لگاتے رہے۔

"کیا بات ہو گئی تھی؟" جمیل نے حیرت سے پوچھا۔

"ہم نہیں جانتا" ڈی سوزا نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ "ایسا بتر ر بتر دآیا اور خالی بیلی بوم مارنے لگا۔"

"تعجب ہے" جمیل نے حیرانی سے کہا۔ اور اس دن کافی دیر تک وہ دونوں بند دکان میں بیٹھے بچوں کی بیہودگی کے اسباب سوچتے رہے۔

اگلے دن جب صبح دکان کھلی تو ڈی سوزا بمشکل کل کے واقعہ کو تھوڑی دیر کے لئے بھلا سکا تھا اور ابھی مشین صاف کر کے کام پر بیٹھنے کی تیاری ہی کر رہا تھا کہ اچانک بچوں کا ایک ہجوم پھر آن دھمکا اور گذشتہ دن کی طرح گلا پھاڑ پھاڑ کر ڈی سوزا کے خلاف نعرے لگانے لگا:

"پاگل ہے، چریا ہے"

عینک والا چریا ہے"

"کالا کلوٹا چریا ہے"

"چریا، چریا۔ چریا۔ چریا"

ڈی سوزا نے اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور دل ہی دل فریاد کرتے ہوئے بچوں کی طرح منہ بنایا اور مدد کے لئے باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ جمیل اس وقت ناشتہ کرنے گیا ہوا تھا اور اس کا درزی ابھی تک آیا ہی نہیں تھا۔ باہر سے کسی آدمی نے بچوں کو اس حرکت سے منع نہیں کیا، بلکہ لحہ بہ لحہ تماشہ دیکھنے والوں کی تعداد بڑھتی ہی گئی۔ ڈی سوزا پر پہلے تو جیسے سکتہ سا طاری ہو گیا لیکن پھر دل مضبوط کر کے اٹھا اور دروازہ بند کرنے کی کوشش کی۔ وہ دروازے کی طرف لپکا ہی تھا کہ باہر سے ایک انڈا کسی نے ڈی سوزا کی طرف پھینکا جو اس کے سر کے اوپر سے ہوتا ہوا اندر الماری میں جا لگا، دوسرا ٹماٹر نالے سے ڈی سوزا کے منہ پر لگا، تیسرا سینے میں اور چوتھا .... چوتھا نجانے کہاں لگتا مگر ڈی سوزا نے جلدی سے کواڑ بند کر دئے اور اندر سے کنڈی لگا دی۔ کچھ دیر دروازے کے ساتھ ٹیک لگائے آنکھیں بند کئے کھڑا رہا۔ پھر پچھلے کمرے میں جا کے منہ صاف کیا اور کتنی دیر تک پاگلوں کی طرح آئینہ دیکھتا رہا۔ اس دوران میں کئی بار اس نے اپنی انگلیوں کو کاٹا، یہ سمجھ کر کہ کہیں وہ ایک

طویل اور بھیانک خواب نہ دیکھ رہا ہو، لیکن اسے اپنی بیداری کا یقین کر کے اور زیادہ پریشانی ہونے لگی۔ اور وہ پریشانی کے عالم میں شام تک چار ٹانکے بھی نہیں لگا سکا اور اس کے چھوٹے موٹے کام جمیل خود کرتا رہا۔

اگلے دن جب پھر دکان کھلی تو اس وقت دونوں دن کے واقعات ڈی سوزا کو ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں بھولے تھے اور وہ لگاتار ایک کانٹے کی سی چبھن محسوس کر رہا تھا۔ اسے دہشت سی ہو رہی تھی، وہ کتنی دفعہ مشین پر بیٹھا اور پھر بدک کے اٹھ گیا۔ کام کرنے کو اس کا قطعی جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے تھوڑی دیر میں چاروں طرف سے آدم خور بونے کہیں سے نمودار ہوں گے، اس کی لاش کو گھسیٹ کے بازار میں پھینک دیں گے اور وہ اپنی عزت کی بوٹیاں ہوتے دیکھ کر منہ سے ایک لفظ نہ کہہ سکے گا۔ لیکن جمیل کے کہنے سمجھانے سے وہ پھر کام پر بیٹھ گیا مگر اس کے بیٹھتے ہی آدم خور بونے نمودار ہو گئے اور آسمان سر پر اٹھا لیا:

"پاگل ہے۔ چریا ہے۔"

"عینک والا چریا ہے۔"

"کالا کلوٹا چریا ہے۔" اور پھر چریا۔ چریا کا ورد تیزی سے شروع ہو گیا اور سارے بازار میں آوازیں گونجنے لگیں۔ ڈی سوزا کے ہاتھ پیر جہاں تھے وہیں رہ گئے اور وہ کسی بت کی طرح اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا لیکن جمیل غصے میں بھڑک اٹھا اور تیزی کے ساتھ باہر نکل کر دونوں ہاتھوں سے ڈھکیل ڈھکیل کر بچوں کو دور کرنے لگا۔ بچے زیادہ مشتعل ہو گئے اور جمیل کو اپنے گھیرے میں لے کر نعروں کا رُخ جمیل کی طرف پھیر دیا۔

"مونچھ والا بھی چور ہے۔"

"کانا درزی ہائے ہائے" (کیونکہ جمیل کی ایک آنکھ قدرے چھوٹی تھی) جمیل کو جان بچانی مشکل ہو گئی۔ وہ دوڑ کے مکان میں گھس گیا اور اس سے پہلے کہ انڈوں کی برسات شروع ہوتی، اس نے دروازے بند کر دئے۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور چہرہ لال سُرخ ہو رہا تھا۔

"آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے ڈی سوزا؟" اس نے حیرت زدہ لہجے میں ڈی سوزا سے پوچھا، لیکن ڈی سوزا کسی مجسمے کی طرح بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اس کا چہرہ جذبات سے بالکل خالی تھا اور ہونٹ جیسے چپکے ہوئے تھے۔ وہ چپ چاپ ٹکٹکی باندھے سامنے دیوار کی طرف دیکھتا رہا۔

"تم ان میں سے کسی کو جانتے ہو؟" جمیل نے دوسرا سوال کیا۔ اور ڈی سوزا کے مجسمے نے گردن کو صرف نفی میں ہلا دیا۔ جمیل نے اس وقت ڈی سوزا کو زیادہ پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا اور چپ چاپ دروازے بند کئے بیٹھا رہا اور ہنگامہ تھمنے کا انتظار کرنے لگا، لیکن اس کے بعد یہ ہنگامہ تھما نہیں بلکہ بڑھتا ہی گیا۔ ایک لامتناہی سلسلے کی طرح بچوں کا معمول ہو گیا تھا کہ وہ دکان کھلنے کے فوراً ہی بعد آ جاتے اور ڈی سوزا کی طرف منہ کر کے تالیوں کی آواز پر "چریا ہے، چریا ہے" کے نعرے لگانے شروع کر دیتے۔ اور تماشہ دیکھنے والوں کا ایک بڑا مجمع لگ جاتا۔ ڈی سوزا بعض اوقات بت بنا بیٹھا رہتا اور مظاہرین کی طرف ایک آنکھ بھی اٹھا کر نہ دیکھتا، لیکن اگر نوبت انڈے پھینکنے تک آ جاتی تو وہ چپکے سے اٹھ کے پچھلے کمرے میں چلا جاتا اور پھر ادھر ہی سے کہیں باہر نکل جاتا۔ جمیل بھی اپنے بچاؤ کی خاطر اب مداخلت نہ کرتا اور خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہتا۔ یہ سلسلہ ایک طویل عرصے تک یونہی جاری رہا اور آخر ایک دن ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔

وہ رات عجیب تھی۔ جمیل تنہا پچھلے کمرے میں بتی بجھائے لیٹا تھا۔ دن بھر کی شدید تھکن کے باوجود نیند اس سے کوسوں دور تھی، اسی لئے وہ سونے کی خود بھی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ کمرے پر بلا کی وحشت اور تاریکی طاری تھی، لیکن جمیل وحشت اور تاریکی سے بے خبر کچھ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے وہ کہیں فضا میں معلق ہو۔ خیالات یکے بعد دیگرے اس کے ذہن میں داخل ہو رہے تھے اور وہ سر میں شدید درد محسوس کرنے لگا تھا۔ اچانک پچھلے دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی اور کمرے کا سناٹا ٹوٹا۔ جمیل چونک سا گیا اور کان باہر کی طرف لگا دیئے "کھٹ کھٹ کھٹ" دوبارہ دستک ہوئی۔

"کون؟" جمیل نے آہستہ سے پوچھا۔

"میں شیرو ہوں۔" باہر سے ویسی ہی مدھم سی آواز ابھری۔ جمیل نے لیٹے لیٹے چند لمحے کچھ سوچا اور پھر دھیرے سے اٹھ کے دروازہ کھول دیا۔ ایک شخص باہر اندھیرے میں کھڑا تھا جس کا چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا لیکن آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"کیا ہے شیرو؟" جمیل نے دروازے میں کھڑے کھڑے ہی پوچھا۔

"وہ ماسٹر تم دن میں گھر ایک لوگوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے، ہم اسی لئے تم کو اس وقت تکلیف دیا۔" اندھیرے میں کھڑا ہوا آدمی بڑے کاروباری طریقے سے بولا "اب تو وہ ڈی سو جا چکا ہے۔ گرا بھی پورے چکا ہوگا، اب تو ہمارا حساب کرو۔ تم نے جو رقم دیا تھا وہ ہم نے سب کچھ لوگ کا حساب چکلیا ہے۔"

"صبح اپنے سب پیسے لے جانا شیرو۔" جمیل نے بمشکل گلے رندھی ہوئی آواز نکالی اور پھر جلدی سے دروازہ بند کر دیا اور یوں کواڑوں سے چمٹ گیا جیسے اسے بجلی کا تار چھو گیا ہو۔ کمرے کی تاریک فضا میں دبی دبی سسکیاں پھیل گئیں۔

"لہو ترنگ" ۔۔۔۔۔۔ بقیہ صفحہ ۲۵

اور پھر:

مدتوں کے بعد بدلی پھر تری تقدیر دیکھ
اپنے دامن پر ابھرتی اک نئی تصویر دیکھ
دو فسردہ۔ مردہ و آزادہ صدیوں کا جواب
لے وہ ابھرا کاروانِ نو کا تازہ آفتاب
سامنے جو زندگی افروز منظر آج ہے
یہ ہمارے عزمِ نو کی اولیں معراج ہے

اور اب اس انقلاب اولیں کا دامن ہمارے موجودہ انقلاب سے مل کر پھر ہی حیات افروز منظر پیش کر رہا ہے۔ شاعر جانتا ہے کہ ہمارا عزم نو بے کار نہیں جا سکتا۔ کیونکہ ہمارے نژادِ نو کی صلاحیتیں اپنے اندر ایک غیر فانی امید کی نوید لئے ہوئے ہیں۔

ایک برتر روشنی کے انجم و خورشید تم
ایک بہتر زندگی کی اولیں امید تم

اور یہ انتہا شاعر کے کلام کی طرح ان تمام خوابوں کی انتہا بھی ہے جو ہمارے سونیا مندوں سے گرم تاب تخیل نے پاکستان سے وابستہ کر رکھے ہیں۔ یہاں شاعر کی فکر تمام قوم کی فکر بن جاتی ہے۔ اور ستارہ و ہلال میں کتنے ہی درخشاں آفتابوں کی تجلیات کا عکس دکھائی دیتا ہے۔

اندھیرے کی اوٹ میں ۔۔۔۔۔ بقیہ صفحہ ۵۴

میرے اعضا ڈھیلے پڑنے لگے تھے اور میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ محبت کی مستی بھری کہانی میرے دل میں مچل رہی تھی۔ کیسا آدمی! ۔۔۔ اور کیسی عورت! ۔۔۔ اور عشق! خالق نے کس مٹی سے بنا کر ہمیں یہاں بھیجا ہے اور میں! میری بیوی!

میں نے پھونک مار کے قندیل گل کر دی۔ اس روشنی کے سہارے میں اپنی بیوی کو ڈھونڈنے چلا تھا! ان نظروں سے میں اسے دیکھنا چاہتا تھا؟ کیا میرے دل کو اس سے زیادہ روشنی کی ضرورت نہ تھی؟ من کی روشنی جس چیز کو دکھاتی ہے اسے دوسری چیز کس طرح دکھا سکتی ہے؟

میں نے سوچا شاید اب نینا نہیں ملے گی۔ اس چاند یا اس سورج کی روشنی بھی اسے تلاش نہ کر سکے تو پھر میں کیا ہوں؟ مجھے اپنے من کا چراغ جلانا ہوگا اور اس کی روشنی نینا کو ڈھونڈ لائے گی۔

اور اس دہلیز کو جب میں عبور کر گیا تو بھی دیواروں کی ہچکیاں ختم نہ ہوئی تھیں ۔۔۔ لیکن اب میں کہاں جاؤں؟ ۔۔۔ کیا مجھے کوئی یہ بتائے گا؟

آثارِ سلف

حضرت شاہ جلالؒ

(سلہٹ)

سید مرتضیٰ علی

سلہٹ پاکستان کی شمال مغربی سرحد ہے۔ سارا علاقہ شاداب، ہرا بھرا، قدرتی مناظر کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ صاف ستھرے قریئے، قصبے، دھان کے لہلہاتے کھیت اور سلہٹ کی مشہورِ زمانہ نارنگیوں کے باغات کا مہکتا گہوارہ — بے شمار اچھی اچھی سڑکوں، ریلوں اور آبی راستوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا ہے۔ مغربی رخ کو چھوڑ کر ننھی ننھی پہاڑیوں کا ایک سلسلہ دور دور تک حلقہ کئے ہوئے۔ شمال، مشرق اور جنوب میں ہندوستان کا علاقہ ہے۔ اوپر کی طرف کھاسی اور جینتیا کی پہاڑیاں ہیں۔ جانبِ راست کچھار ہے اور نچلی طرف تریپورہ کی ریاست ہے۔ جانبِ چپ اور نشیب میں بیشمار دلدلیں اور جھیلیں پھیلی ہوئی ہیں جنہیں یہاں کے لوگ "ھورز" ؟ کہتے ہیں جب برسات زوروں پر ہوتی ہے تو یہ لبریز ہو جاتی ہیں اور ایک چھوٹے سے سمندر کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ خشک موسم میں ان کے پانیوں میں طرح طرح کی مچھلیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ برسات میں مطلع اکثر ابر آلود رہتا ہے۔ ہزاروں پُرشور ندی نالے تیز رفتاری کے ساتھ پہاڑیوں سے اتر کر نشیبی وادیوں میں پھیل جاتے ہیں۔ بس یوں معلوم ہوتا ہے جیسے سارا علاقہ سمندر ہی سمندر ہے اور اس کے بیچ بیچ میں جا بجا ٹاپو ابھر آئے ہیں جن پر گاؤں آباد ہیں۔ خزاں کے موسم میں پانی خشک ہونے لگتا ہے ابر چھٹ جاتا ہے تو ان نشیبوں میں دھان کے کھیتوں کا پھیلاؤ دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ فرازِ کوہ پر سنہری سنہری نارنگیوں کے مست کن باغات کا سلسلہ دور تک الگ نظر آتا ہے۔ چائے کے باغات کی اپنی ہی بہار ہے۔ چار چار پانچ پانچ فٹ بلند باڑھیں کٹی ہوئی اور یہ قطاریں تا حدِ نظر آنکھوں کو عجب سرور بخشتی ہیں۔ ننھے ننھے جنگل اور درختوں کے جھنڈ پہاڑی ڈھلانوں پر اگے ہوئے اور تختہ بندی کی وضع میں چائے کے پودوں کا سیلاب سا منڈلاتا ہوا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہرا ہرا سمندر ہے جو ہچکولے کھا رہا ہے۔ مرد اور عورتیں اپنے مقامی بھڑکیلے اور رنگا رنگ ملبوسات میں ایک عجیب نظارہ پیش کر کے آنکھوں کو آسودہ کرتے ہیں۔ یہ لوگ دن بھر ان باغوں میں محنت مزدوری کے کام کرتے ہیں۔ مگر دور سے صرف ان کے سر اور شانے نظر آتے ہیں کیونکہ وہ اپنی پھرتیلی انگلیوں سے چائے کی نرم و نازک پتیاں چننے میں جھکے رہتے ہیں۔

یہ ہے وہ سحر آگیں آغوشِ فطرت جس میں حضرت شاہ جلالؒ نے ۱۴ ویں صدی (عیسوی) کی ابتدا میں سرزمینِ سلہٹ پر قدم رنجہ فرمایا۔ وہ یہاں عرب جیسے دور ملک سے محض دعوتِ اسلام عام کرنے کے لئے پہنچے اور یہاں کے نواح میں دین کا جو بھی چرچا پھیلا اس میں حضرتؒ کے فیوض و برکات کو بڑا دخل ہے۔ حضرت شاہ جلال یمنیؒ نسباً قریشی تھے اور یمن کے ایک بزرگ 'محمد' کے فرزند تھے۔ شاہ جلال کی درگاہ میں ایک کتبہ محفوظ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یمن کے ایک مقام قونیہ کے رہنے والے تھے۔ مؤرخ بلوخمن کے نزدیک یہ جگہ یمن کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ حضرتؒ چھوٹے سے تھے کہ والدین کے سائے سے محروم ہو گئے اور ان کی تربیت کا بار اُن کے ماموں سید احمد کبیر نے اپنے ذمہ لیا۔ وہ حضرت جلال سرخ بخاری کے فرزند تھے۔ شاہ جلال کے ماموں انہیں مکہ مکرمہ لے گئے جہاں وہ دینی اور روحانی علوم و معارف سے بہرہ ور ہوئے۔ ان کے فیوضِ روحانی حاصل کرنے کے بعد ماموں کی ہدایت پر انہوں نے عزمِ ہند کیا تاکہ یہاں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کریں۔ عزمِ ہندوستان کے لئے ان کے ماموں نے اپنے آستانے کی خاک بھی ان کے سپرد کی اور بتایا کہ تم جس سرزمین سے گزرتے جاؤ اس زمین کو دیکھو۔ اس کے رنگ، روپ، ذائقہ کو پرکھو اور جس مقام کی زمین میں یہ اوصاف تم پاؤ بس وہیں اقامت اختیار کر لو۔ چنانچہ شاہ جلال نے یہ برکتوں والی مشتِ خاک اپنے ایک جلیس و ہمراز کو سپرد کر دی جو شاہ چشنی کہلاتے ہیں۔

وہ حضرت کے حکم کے مطابق راستوں کی خاک کو چکھتے جاتے تھے۔ بہرکیف، یہ لوگ دہلی پہنچے اور وہاں حضرت نظام الدین اولیا سے ملاقی ہوئے۔ شیخ نظام الدین اولیائ نے انہیں نیلے کبوتروں کے دو جوڑے بطور تبرک عنایت کئے۔ یہ بزرگ اپنے ساتھ ان کبوتروں کو سلہٹ لے کر آئے۔ ان کبوتروں کی نسل ابتک چلی آتی ہے اور وہ بیشمار ہو گئے ہیں۔ کوئی شخص بوجہ احترام درگاہ ان کبوتروں کو گزند نہیں پہنچاتا۔ اس کے بعد حضرت تروینی کے مقام پر پہنچے جو ستگاؤں کے پاس واقع ہے۔ یہاں ان کی ملاقات ایک مقامی باشندے، برہان الدین سے ہوئی۔ یہ شہر سلہٹ کے باشندہ تھے اور "ٹلتی کور محلہ" کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے اپنے ہاں فرزند تولد ہونے کی خوشی میں ایک گائے ذبح کی تھی۔ اس کی خبر راجہ گوڑ گوبند کو پہنچی۔ اس نے غصہ میں آکر اس بچہ کو مروا ڈالا اور میاں برہان الدین کا دایاں ہاتھ بھی کٹوا دیا! برہان الدین میاں نے اس کی فریاد مسلمان حاکم بنگالہ سے کی امداس نے اپنے بھتیجے سکندر خاں غازی کو مع ایک لشکر کے روانہ کیا۔ اس نے دو مرتبہ راجہ گوڑ گوبند پر حملہ کیا مگر ناکام رہا۔ برہان الدین نے حضرت شاہ جلال سے سکندر خاں غازی کی مدد کے لئے التجا کی اور حضرت نے اسے قبول کر لیا اور راجہ کے خلاف ایک بار پھر مہم شروع ہوئی۔ اس مہم میں حضرت کے ۳۶۰ معتقدین شریک تھے اور ان کی روحانی برکت کے سبب غنیم پر فتح حاصل ہوئی۔

ایک کتبہ برآمد ہوا ہے جس کی رو سے شاہ جلال کے ورودِ سلہٹ کی صحیح تاریخ متعین کی جا سکتی ہے۔ یہ کتبہ آجکل ڈھاکہ کے عجائب خانہ میں محفوظ ہے۔ اس کتبہ کی دریافت کا سہرا معصوم شمس العلما مولانا ابو نصر وحید کے سر ہے۔ یہ شہر سلہٹ کے محلے "عنبر خانہ" کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے اس کتبہ کو ڈھاکہ کے عجائب خانہ کی تحویل میں دے دیا۔ اس کی عبارت کو مسٹر سٹیپلٹن نے پڑھا ہے (حوالہ کتبہ: عجائب خانہ ڈھاکہ جے۔ اے۔ ایس۔ بی ۱۹۲۲۔ پی ۱۳ (۴۱۳) عبارت یہ ہے:

"شیخ المشائخ، عارف ربانی کے نام نامی کے جلال کے باعث (عرصہ) سرہٹ کے مقام پر اسلام کی پہلی فتح کی یادگار میں یہ فتح لشکر سکندر خاں غازی نے حاصل کی۔ بزمانہ سلطان فیروز شاہ دہلوی، ۳۔ ۷ مد یہ عمارت رکن خاں نے تعمیر کی جو فاتح "ہشت جھریاں ہیں نیز کامروپ، کامتا، جاگ نگر اڑلیسہ وغیرہ مقامات کی فتح کے دوران کئی ماہ بحیثیت وزیر و سپہ سالار بادشاہ کی لشکر کشیوں میں بن شریک تھے۔ (محررہ) ۹۱۸ھ"

اس سے شاہ جلال کا ورودِ سلہٹ ۱۳۰۳ء میں قرار پاتا ہے نہ کہ ۱۳۴۸ء میں جیسا کہ غلطی سے بلوخمین نے سمجھا تھا۔ شمس الدین فیروز کی آمد کے موقع پر اسلام بنگال میں دور دور تک پھیل چکا تھا یمن سنگھ کے ضلع سے ادھر برہمپترا کے پار سلہٹ تک۔ ستار گاؤں میں پٹھان بادشاہوں کے قدم جم چکے تھے اور اب ان کے لئے قدرتی طور پر یہ آسانی حاصل تھی کہ اپنی فتوحات کا دائرہ مشرقی بنگال کے دور دراز علاقوں تک پہنچا دیں اور ان تمام مقامات کو مسلم سلطنت کے زیرنگیں لے آئیں۔

کہا جاتا ہے کہ پرگنہ چوکی پہنچنے پر شاہ جلال کا گوڑ گوبند سے مقابلہ ہوا اور غنیم کو بڑی آسانی سے پسپا کر دیا گیا۔ وہ دریائے بارک (نزد بہادر پور) کو ایک مصلے پر بیٹھ کر عبور کر گئے۔ دریا پار کرنے سے پہلے حضرت نے ایک رات فتح پور میں گذاری تھی جو بہادر پور کے پاس ایک گاؤں ہے۔ اس واقعہ کی یادگار میں یہاں ایک جگہ بنی ہوئی ہے جسے لوگ "مقام" کہتے ہیں۔ جب شاہ جلال نے دریا پار کر لیا تو راجہ گوڑ گوبند نے اپنا ایک ایلچی شاہ کے پاس بھیجا اور اس کے ساتھ ایک زبردست آہنی کمان بھیجی۔ اس نے کہلا کر بھیجا کہ اگر کسی نے اس کمان کا چلہ چڑھا دیا تو میں بغیر لڑے ہتھیار ڈال دوں گا۔ حضرت نے اپنے ایک معتقد "سید نصیر الدین سپہ سالار" کو، جن کی نمازِ فجر کبھی قضا نہ ہوئی تھی، اس کام پر لگایا اور انہوں نے کمان کا چلہ چڑھا دیا اس کے بعد شاہ جلال نے دریائے سرما کو "شیک گھاٹ" کے مقام پر عبور کر لیا جس کی خبر پا کر راجہ گوڑ گوبند بھاگ کر پوچ گڑھ چلا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ راجہ گوڑ گوبند راجایانِ تریپورہ کا کوئی باجگذار تھا۔

یہاں پہنچنے پر شاہ جلال نے دیکھا کہ یہاں کی مٹی رنگ روپ، ذائقہ میں ان کے ماموں کی دی ہوئی مٹی کے موافق ہے۔ چنانچہ وہ وہیں ٹھہر گئے اسی مقام پران کا روضہ تعمیر ہوا۔

روایات کہتی ہیں کہ اس وقت حضرت کے ساتھ ۳۶۰ معتقدین تھے۔ ان کے اسمائے گرامی کی صحیح تعداد تو معلوم نہیں مگر ان کے بڑے بڑے معتقدین کے نام یہ بیان کئے جاتے ہیں: علی شہزادہ یمن، سید عمر سمرقندی، سید محمد غزنوی، شکر بہ عربی، سید علاء الدین بغدادی، شاہ کمال یمنی، شاہ گبھرو افغانی، شاہ جنید گجراتی، عارف ملتانی، شاہ داؤد قریشی، مخدوم جعفر، غزنوی، شاہ حشم الدین نارنولی، حسین الدین بہاری، سید قاسم

مظفر بہاری، خواجہ شریف اجمیری، وغیرہم۔ اس مختصر فہرست سے بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس وقت کی اسلامی دنیا کے کتنے دور دست علاقوں سے لوگ اشاعتِ دین کی خاطر شاہ جلال کے ہمراہ شریک ہو چکے تھے۔

جس وقت حضرت سلہٹ پہنچے ان کی عمر ۳۲ سال تھی اور ان کا وصال ۶۹ یا ۷۰ سال کی عمر میں ۷۵۰ھ یا ۱۳۴۰ء میں ہوا۔ ان کا سالِ وفات "شاہ جلال مجرد قطب الدین" سے متخرج ہے۔

فتح سلہٹ کے بعد آپ نے اپنے معتقدین سے کہا کہ وہ ضلع میں ہر طرف پھیل جائیں اور دعوت اسلام کو عام کریں اور رشد و ہدایت سے خدمتِ خلق کا فریضہ انجام دیں۔ جہاں وہ اپنا سلسلۂ ہدایت قائم کرنا چاہیں وہیں اپنا مستقر بھی بنالیں۔ زیادہ تر لوگ جینتیا کے باہر صدر سب ڈویژن میں مقیم رہے۔ اس وقت اس علاقہ میں ہندو راجہ مسلط تھے۔ سنام گنج سب ڈویژن میں ان کے معتقدین حلقہ جگن ناتھ پور اور رنگور کے مقامات میں رہے کیونکہ سب ڈویژن کا بقیہ حصہ زیادہ تر زیر آب تھا۔ چونکہ ضلع کا نواح جنوب اس وقت راجایان تریپورہ کی حکمرانی میں تھا اس لئے ان اللہ والوں نے وہاں جانا اس وقت مناسب نہ سمجھا۔

ڈاکٹر بھٹا شالی اور چند دیگر مورخین بنگال کا خیال ہے کہ مشہور مراقشی سیاح، ابن بطوطہ بھی شاہ جلال سے آکر ملا تھا۔ ابن بطوطہ کا یہ سفر (۴۷-۱۳۴۶ء) کے موسم سرما میں قرار پاتا ہے۔ وہ اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے:

> میں کامروپ کے پہاڑوں تک پہنچا۔ یہ پہاڑ دور تک چلے گئے ہیں اور جادو سے منسوب ہیں۔ شیخ جلال الدین سے ملاقات کے بعد میں ہبونگ کے مقام پر پہنچا۔ کامروپ کے پہاڑوں سے بہہ کر جو دریا نیچے اترتا ہے اسے "نہر ازرق" کہتے ہیں۔ اس کی وجہ سے یہاں کے شہر اور بستیاں بڑی خوبصورت اور خوش حال و وسیع نظر آتی ہیں، ان جگہوں میں ایک جگہ ہبونگ بھی ہے۔"

شہر ہبونگ، شب ساگر ضلع میں واقع ہے اور دریائے برہمپترا کا کنارہ ہے اور چودھویں صدی میں بڑا بارونق شہر تھا۔ بلوخمین اور چند دیگر مورخین نے "نہر ازرق" کو دریائے برہمپترا بتایا ہے۔ اس وقت دریائے سرما کی وادی میں کوئی جگہ ہبونگ شہر کے نام سے نہیں تھی۔ ابن بطوطہ نے چونکہ یہاں کے لوگوں سے سحر اور جادو کے تذکرہ کو منسوب کیا ہے اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ وہ کامروپ تک پہنچا ہو۔

★

آئیے اب چشم تصور سے سلہٹ میں شاہ جلال اور ان کے پاک نفس رفقا کی آمد کا نظارہ کریں۔

سن ۱۳۰۳ء ہے۔ موسم خزاں کی شام ہے۔ اگر مشرقی بنگال میں اس وقت کوئی شخص نظارہ کرتا تو اسے ۳۶۰ پردیسی وضع قطع کے آدمی گھوڑوں پر سوار آتے دکھائی دیں گے۔ یہ مقام وادی سرما کے گھنے جنگلات ہیں۔ دو دو سواروں کی قطار ہے۔ گھوڑوں پر کوئی سجاوٹ نہیں ہے بلکہ معمولی ساز و سامان ہے۔ شہسواروں کا لباس شلواریں ہیں اور ان پر لانبے لانبے، موٹے کپڑے کے کرتے، سروں پر بڑے بڑے عمامے چہروں پر بڑی بڑی نورانی ڈاڑھیاں۔ دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ مجاہد بھی ہیں اور اہل فقر بھی۔ کسی کے گلے میں جزدان لٹکا ہے تو کسی کی کلائی میں تسبیح لپٹی ہوئی ہے۔ بغرض ہر طور سے وہ دیندار لوگوں کا گروہ معلوم ہوتا ہے — لیجئے، سورج کی آخری کرنیں پتوں کے جھرمٹ کے پیچھے اپنا تانا بانا ختم کر کے غائب ہو گئیں۔ غلغلۂ اذاں سے جنگل کا ایوانِ ہزار ستون گونج اٹھا۔

بغرض ایسا نقشہ تھا کہ دعوت اسلام سلہٹ کی سرزمین تک پہنچی۔ شیخ طریقت نے اپنے روحانی تصرف، تلقین اور عمل صالح سے جلد ہی یہاں کے لوگوں کے دل میں جگہ پیدا کر لی اور لوگوں میں عزت و حریتِ نفس کا احساس بیدار ہونے لگا وہ کشائشِ حیات کے فیض سے آشنا ہوئے۔ حضرتؒ کے متوسلین نہ صرف ضلع سلہٹ میں رہے بلکہ بیٹرا، نواکھالی اور چٹگام تک جا پہنچے۔ اور اسلام وہاں تک پہنچا یا۔ ہدایت و اعانت خلق سے دریغ نہ کیا اور زندگی کی آسودگیوں اور ملک و مال و منال سے ان بے غرض انسانوں نے کوئی واسطہ نہ رکھا۔ جونہی ملک اسلام کے اثر میں آیا انھوں نے ملکی انتظام کی باگ ڈور سکندر غازی کے سپرد کر دی اور خود اللہ اللہ میں لگ گئے۔ شاہ جلال نے اپنی زندگی ایک حجرہ میں بسر کر دی اور یادِ الٰہی سے کبھی غافل نہ ہوئے۔ علائق زندگی سے کنارہ کش رہے بلکہ نکاح تک نہ کیا تاکہ زندگی کے بکھیڑوں سے بچے رہیں اور خدمتِ خلق

کے لئے وقف رہ سکیں۔ ان کے زہد و ورع کا حال جب دور دراز لوگوں تک پہنچا تو وہ جوق در جوق ان سے رجوع کرنے لگے اور ۳۰ سال تک یہ چراغِ ہدایت روشن رہا۔ وصال کے بعد ان کا مزار بھی وہیں بنا جہاں انہوں نے یہ عمر گزاری تھی۔

درگاہ شہر سلہٹ کے شمالی حصہ میں ایک مرتفع جگہ پر واقع اور مرجعِ خلائق ہے۔ ہر قوم و ملت کے لوگ زیارت کے لئے آتے رہتے ہیں۔ درگاہ کا قبہ بڑا شاندار ہے اور پہاڑی کی طرف واقع ہے۔ درگاہ کے چاروں طرف خشتی دیوار ہے۔ چاروں کونوں پر بڑے بڑے اونچے ستون ہیں اور مزار پُر انوار کے اوپر چھتری بنی ہوئی ہے۔ احاطہ کے مغربی جانب اور درگاہ کے ایک حصہ کے طور پر ایک چھوٹی سی مسجد بھی بنی ہوئی ہے۔ جسے مسٹر وائلز نے مکرر بنوایا تھا۔ یہ مسٹر وائلز ۱۷۸۹ء سے ۱۷۹۳ء تک سلہٹ میں کلکٹر رہے تھے۔ درگاہ کی سب سے بڑی عمارت جو "گنبد" کہلاتی ہے ۱۷۷۰ء میں تعمیر ہوئی۔ یہ امیر سلہٹ، فرید خاں کی بنوائی ہوئی ہے۔ گنبد کے جانب جنوب جو مسجد ہے اسے بہرام خاں، فوجدار سلہٹ نے ۱۷۴۴ء بنوایا تھا اور بوجہ وسعت سلہٹ کی سب سے بڑی مسجد مانی جاتی ہے۔

سلہٹ میں جب کبھی کوئی مسلمان حاکم تعینات ہوتا تھا اسے پہلی تقرری پر درگاہ کی زیارت کو بھی جانا لازم تھا اور جملہ عوائد رسمیہ ادا کرنی ہوتی تھیں۔ غیر مسلموں سے بھی یہ زیارت کرائی جاتی تھی، اس روایت کا ذکر مسٹر لنڈزے نے بھی کیا ہے۔ یہ صاحب ۱۷۷۹ء میں سلہٹ کے کلکٹر مقرر ہوئے تھے اور اپنی زیارت کا حال اس طرح لکھتے ہیں:۔

"اب مجھے بتایا گیا کہ انگریزی ریذیڈنٹ کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ قدیم رسم کے مطابق مشہور بزرگ حضرت شاہ جلالؒ کی درگاہ پر حاضری دے۔ یہاں ہندوستان کے ہر مقام سے مسلمان زائرین آتے رہتے ہیں۔ بعد میں مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ درگاہ کے مجاورین و خدام مذہبی جنونی یا خطرناک بالکل نہیں ہیں اور میرا یہ کام بھی نہیں ہے کہ مذہبی معتقدات سے تعرض کروں اور اس غرض سے میں بھی اپنے پیشرووں کی طرح زیارت درگاہ کے لئے بحالت جلوس روانہ ہوا۔ جوتے دروازہ ہی پر اتار دئے اور ۵ اشرفی نذرانہ پیش کیا۔ روحانی پاکی سے سرفراز ہو کر میں اپنی جگہ واپس آگیا اور یہ امر ہماری رعیت کی خوشنودی و دلجوئی کا باعث ہوا۔"

شاہ عالم کے فرزند مرزا فیروز شاہ بھی دہلی سے یہاں آئے تھے اور ۱۸۴۹ء میں انہوں نے بھی درگاہ کی زیارت کی تھی۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ حضرت شاہ جلال الدین سلہٹی، شیخ جلال الدین تبریزی سے مختلف شخصیت ہیں۔ آخر الذکر کا مزار پنڈوہ میں ہے اور ان کا وصال ۱۲۲۵ء میں ہوا تھا۔

حضرت شاہ جلال سلہٹی کے پہلے سوانح ۱۱۴۲ھ میں لکھے گئے جن کے تحریر کرنے والے وسطِ ہند کے بزرگ حمید الدین نارمولی کے خاندان کے کوئی صاحب تھے اور شاہ جلال کے ساتھ رہے تھے۔ ان کی لکھی ہوئی کتاب کا نام "روضۃ الصالحین" ہے۔ معین الدین، خادم درگاہ شاہ جلال نے بھی ایک سوانح لکھی تھی جو ۱۱۴۴ھ میں نواب نائب بنگالہ، مرشد قلی خاں کے حکم سے تیار ہوئی تھی۔ نصیر الدین حیدر، منصف سلہٹ نے بھی ۱۸۶۰ء میں شاہ جلال کی ایک سوانح لکھی جسے "سہیلِ یمنی" کا نام دیا گیا۔ مگر اس کتاب میں زیادہ تر ان دو سابقہ کتابوں ہی سے استفادہ کیا گیا ہے یا پھر کچھ مقامی روایات کا الحاق ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ بعد میں جو بھی سوانحی تذکرے لکھے گئے ان میں "سہیل یمنی" سے استفادہ کیا گیا ہے، چنانچہ ۱۸۷۳ء میں ڈاکٹر وائز نے بھی ایک سوانح تحریر کی اور "سہیلِ یمنی" کو بنیادی ماخذ بنایا۔ درگاہ محلہ سلہٹ کے رہنے والے مفتی اظہر الدین احمد نے بھی ۱۹۱۴ء میں ایک احوال بعنوان "شاہ جلال اور ان کے خدام" لکھا۔ اس کتاب (بنگالی) کا نظرِ ثانی کیا ہوا ایک ایڈیشن پھر ۱۹۳۴ء میں بھی چھپا اور اب شاہ جلالؒ کے حالات پر مکمل و مستند ماخذ سمجھا جاتا ہے:

ثقافت :

میلہ چنن پیر

محمد کریم

جہاں تک سننے میں آیا ہے یہ میلہ واقعی بہت دلچسپ اور دیکھنے کے لائق ہے۔ اس کا رنگ دوسرے میلوں سے بہت مختلف ہے۔ جیسے سارے علاقے کی آزاد روح اس میں پوری طرح سما گئی ہو۔ اسی لئے یہ حقیقی معنوں میں میلہ ہے، یعنی سارے لوگوں، عورتوں مردوں کی سانجھی اور گہری دلچسپی کا نتیجہ۔ ایک اجتماعی مشغلہ جیسے وہ اس میں اپنے دل کے ساتھ شامل ہو رہے ہوں اور اپنے دل کی ساری امنگیں اور مرادیں لئے ہوئے۔ ظاہر ہے کہ اس کی تہہ میں محبت کا وہ عالمگیر جذبہ ہی کارفرما ہوتا ہے جو انسانی فطرت کا بہترین جذبہ ہے اور ہشاش بشاش، تندرست و توانا انسانوں کی امتیازی خصوصیت۔

اس میلہ میں خلاملا اور میل جول کی پوری پوری آزادی نظر آتی ہے اور دیکھتے ہی خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہو نہ ہو یہ عربوں ہی کا اثر یا یوں سمجھئے فیض ہے۔ وہی آزادی، وہی بے باکی، وہی رومانوی زیست، جیسے انسانی روح ہر مصنوعی تکلف کا حجاب پرے پھینک کر اپنے فطری لاابالیانہ پن کے ساتھ سامنے آگئی ہو۔ چنانچہ اس میلہ کے عوامی رقص میں وہی کیف و مستی، وہی البیلاپن، وہی رومانوی ترنگ نظر آتی ہے، جس کا عربوں میں چرچا تھا اور میلہ کی رونق، اس کی دھوم دھام عکاظ اور ایسے ہی دوسرے زندگی کی امنگ سے لبریز میلوں کی یاد دلاتی ہے جن میں بدویت کی روح پوری طرح سمائی ہوئی ہے۔ میل ہا میل پھیلی ہوئی ریت کی ڈھیریاں ہی ڈھیریاں، چنن پیر کے مزار کی سہانی کھلی فضا، اس کے اردگرد اونچے لانبے، خوش شکل، خوش وضع ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے گبھرو اور سرخ، رنگین بھڑکدار کپڑوں میں ملبوس عورتیں، سب مل کر ایک ایسا سماں پیدا کر دیتے ہیں جو رہ رہ کر دشتِ عرب اور اس کے منچلے انسانوں کی یاد دلاتے ہیں اور دیکھنے والوں کا دل بے اختیار کیف و مستی کے عالم میں کھو جاتا ہے اور رقص کے ساتھ جو گیت ہونٹوں پر آتے ہیں وہ بھی ان لازوال احساسات میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ ملتانی ہو یا پنجابی، ان گیتوں کا موضوع، اُن کے بول، ان کا رنگ رس ایک ہی ہوتا ہے :

تیری ڈاچی دے گل وِچ ٹلیاں   میں تاں پیر منا ون چلیاں
تیری ڈاچی دے گل وِچ ہار وے   ڈاچی والیا موڑ مہار وے

(تیری اونٹنی کے گلے میں گھنٹیاں ہیں   میں تو پیر کو منانے چلی ہوں
تیری اونٹنی کے گلے میں ہار ہے   اے اونٹنی والے! اونٹ کی مہار موڑ دے!)

یہ پھر وہی عرب کا سماں! اور اونٹنی، ملتان اور بہاولپور کے وسیع ریگزاروں کی یاد دلاتی ہوئی اس سماں کا کیف اور بھی دوبالا کر دیتی ہے۔ غرض چنن پیر کا میلہ محض میلہ نہیں، زندگی ہے۔ اور جس نے اس کو ایک بار دیکھا ہو وہ اس کو عمر بھر فراموش نہیں کر سکتا۔

(مدیر)

چولستان کے ریگزاروں میں چنن پیر کے مزار پر بہار کا میلہ تعجب خیز ضرور ہے کیونکہ حدِ نظر تک پھیلے ہوئے ریت کے ٹیلوں اور بے آب و گیاہ صحراؤں میں بہار کا تصور ہی ایک بے معنی سی بات ہے چہ جائیکہ بہار کا میلہ، مگر خدا کی رحمت جوش پر آجائے اور بارش کے چار چھینٹے پڑ جائیں تو زمین کی قوتِ نمو اپنا رنگ ضرور دکھاتی ہے۔ خودرو جھاڑیاں اور پودے سرسبز ہو جاتے ہیں اور بعض مقامات پر لمبی لمبی گھاس بھی اُگ آتی ہے، ہر چند کہ یہ بہار نہیں مگر چولستانیوں کے لئے اس سے زیادہ بہار کا تصور اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ غرض یہ کہ بہار آتی ہے اور اپنے ساتھ نئی امنگوں اور نئے ولولوں کا ایک طوفان لے کر آتی ہے۔ خزاں کی دست درازیوں کے ستائے ہوئے انسان ذرا سستانے کے لئے اپنے اعتقادات کی آڑ لیکر چنن پیر

کے مزار پر جمع ہونے لگتے ہیں، جہاں روحانیت کا فیضان بھی حاصل ہوتا ہے اور تفریح کا سامان بھی۔

چنن پیر کا مزار چولستان کے عین وسط میں بھاولپور سے کوئی پچاس میل دور واقع ہے۔ یہاں ہر سال موسم بہار میں جمعرات کی جمعرات میلہ لگتا ہے۔ اور مکمل دو ماہ یعنی فروری اور مارچ گہما گہمی اور چہل پہل میں بیت جاتے ہیں۔

ذرائع آمد و رفت کی دشواری زائرین کی راہ میں حائل نہیں ہوتی۔ بے نام و نشان اور بے سنگِ میل راستوں پر اونٹوں کے قافلے منزلِ مقصود کی طرف بڑھتے رہتے ہیں اور سینکڑوں میل کا سفر طے کرکے خراجِ عقیدت پیش کرنے کا شرف حاصل کرتے ہیں۔ مغربی پاکستان کے مختلف شہروں سے معتقدین اسٹیشن ڈیرہ نواب صاحب پر ریل سے اُترتے ہیں اور ۵۳ میل اونٹ کی پشت پر سفر کرنے کے بعد شرف زیارت حاصل کرتے ہیں۔ کچھ لوگ مرّان کے راستہ ۲۵ میل کا سفر لاری پر اور ۳۰ میل کا سفر اونٹوں پر طے کرنے کے بعد مزار پر حاضری دیتے ہیں۔ قطار در قطار اونٹوں کے قافلے جن میں عورتیں اور بچے کجاووں میں بیٹھ کر کمر توڑ ہچکولوں کے اس سفر کا تجربہ کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں، اور مرد آگے پیچھے خواجہ غلام فریدؒ کی پرسوز کافیاں گا گا کر راستہ کی تکان مٹاتے ہوئے چولستان میں ہر سمت سے ایک ہی منزل کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ منزل چنن پیر کا مزار ہے۔

کہتے ہیں کہ آج سے اڑھائی سو سال پیشتر ایک ہندو راجہ چولستان پر حکومت کرتا تھا۔ اس کے ہاں ایک حسین و جمیل بچہ پیدا ہوا مگر جب راجہ اپنے بچہ کو دیکھنے گیا تو وہ آہستہ آہستہ کلمہ پڑھ رہا تھا۔ راجہ بہت برہم ہوا اور اس نے فیصلہ کیا کہ اس بچہ کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ رانی پھر بھی ماں تھی۔ وہ کیسے گوارا کرتی کہ اس کا لال مارا جائے۔ اس نے اپنے کچھ معتمد افراد کو بلا کر بچہ ان کے سپرد کیا اور ہدایت کی کہ جو شخص بچہ کی پرورش کرنے پر رضامند ہو بچہ اسے دے دیا جائے۔ رانی کے معتمدین نے لاکھ کوشش کی کہ کوئی اس بچہ کو گود لے لے مگر کافروں کی مملکت میں کوئی شخص مسلمان بچہ کو پالنے کی ذمہ داری لینے پر تیار نہ ہوا۔ وہ لوگ گھومتے گھامتے جب اس مقام پر پہنچے جہاں اب چنن پیر کا مزار ہے تو ان لوگوں نے تنگ آکر بچہ کو اس جگہ ایک درخت کے سایہ میں لٹا دیا اور خود واپس چلے گئے۔

جب رانی کو یہ بات معلوم ہوئی تو اسے بہت رنج ہوا۔ وہ بعجلت تمام ان لوگوں کو ساتھ لے کر اس مقام پر آئی تاکہ اپنے بچہ کو دیکھے مگر یہ دیکھ کر اس کی حیرانی کی کوئی حد نہ رہی کہ بچہ چپار کی لکڑی کے ایک جھولے میں پڑا ہوا ہے جو خود بخود ہل رہا ہے۔ یہ دیکھ کر کہ بچہ تندرست اور زندہ ہے رانی باغ باغ ہوگئی اور اس کو یقین ہوگیا کہ یہ بچہ زندہ رہنے کے لئے پیدا ہوا ہے اور کوئی فوق الفطرت طاقت اس کی نگہبانی کر رہی ہے۔ اسلئے رانی نے مزید تحقیق و تفتیش کی ضرورت محسوس نہ کی اور واپس چلی گئی۔ یہی بچہ جب جوان ہوا تو چنن پیر کہلایا۔

چنن پیر کا مزار روایتی قبہ و تعویذ سے بے نیاز محض ایک کچی قبر ہے جس پر کنکر پتھر چُن کر اسے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ یہ قبر تقریباً ۲۰ فٹ لمبی اور ۱۰ فٹ چوڑی ہے۔ اس قبر پر کسی قسم کا سائبان تک نہیں ہے۔ صرف ایک پرانا جنگلی درخت اس کے سرہانے کھڑا مزارِ مقدس کی نشاندہی کرتا ہے۔ جو لوگ اس مزار پر منتیں مانتے ہیں وہ اپنی ہر منت کے ساتھ درخت پر دھاگہ یا کپڑے کی کتر باندھ دیتے ہیں چنانچہ اس کی ہر ہر شاخ پر بے شمار دھاگے اور کترنیں پیر اور اس کے معتقدین کے درمیان ایک قول کی حیثیت رکھتی ہیں، اور مرید جب سال بسال زیارت کے لئے آتے ہیں تو منت کی ہر شرط پوری کرتے ہیں۔

مزار کے قریب ایک چھوٹی سی ویران مسجد بھی ہے اور ذرا دور ہٹ کر کوئی دو درجن کچے مکان ہیں۔ یہ گاؤں بھی چنن پیر کے نام سے موسوم ہے۔ ان مکانوں میں سے تقریباً نصف درجن مکان ان لوگوں کی ملکیت ہیں جو اس مزار کے متولی ہیں۔

میلہ کے دنوں میں مزار کے اردگرد دور دور تک ریت کے ٹیلوں پر انسانوں اور اونٹوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر نظر آتا ہے۔ ریگستان کی تاروں بھری راتوں میں یہ منظر اور بھی دلچسپ ہو جاتا ہے جب ہر ٹولی کی عورتیں جگہ جگہ چولہے جلا کر روٹیاں پکا رہی ہوتی ہیں اور ٹھنڈی ٹھنڈی پرکیف ہوا من کو گدگدا دیتی ہے۔ خور و نوش سے فراغت کے بعد جگہ جگہ جھومر ناچ کا نظارہ بڑا ہی دلکش منظر ہوتا ہے۔ بنسری کی ٹُمری اور درد بھری تانوں پر چولستان کا جھومر ناچ ایک ایسی کیفیت طاری کر دیتا ہے جس میں روحانیت اور تقدس کی چاشنی بھی ہوتی ہے اور تفریح طبع کا سامان بھی۔ اس میلہ کی ایک اور خصوصیت یہاں کے داستان گو ہیں جو "جنگ اور محبت" کی منظوم کہانیاں طبلے کی تھاپ اور سارنگی کی لے پر جھوم جھوم کر سناتے ہیں اور سننے والوں کے ذہن پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔

چولستان میں خواجہ غلام فریدؒ کی کافیوں کو وہ شہرت اور قبولیت حاصل ہے جو شاید کسی اور علاقہ میں کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں۔ میلہ میں لوگ خواجہ صاحبؒ کی معرفت سے لبریز کافیاں جگہ جگہ گاتے سنائی دیتے ہیں اور آدھی آدھی رات تک کافیوں کی چھوٹی چھوٹی محفلیں جمی رہتی ہیں۔

ر۔ غ

نقد و نظر

پیت کی ریت

از خواجہ دل محمد دلؔ
صفحات ۲۵۶، قیمت چار روپے
ناشر:۔ خواجہ بک ڈپو، اردو بازار لاہور

یہ مجموعہ ۵۰۰ دوہوں، ایک تعارف، ایک پیش لفظ اور ایک تمہید پر مشتمل ہے۔ دوہہ صدہا سال ایک نہایت مقبول صنف رہا ہے۔ یوں بھی شاعر کے تاثر کو سادہ ترین اکائی میں مرکوز کر دینے سے یہ صنف بڑی ہی قدرتی، بے ساختہ اور پُراثر بن جاتی ہے۔ اردو میں اس کا رواج نہیں ہوا۔ لیکن اہلِ ذوق اس کی لطافت و موزونیت سے بے خبر نہیں رہے۔ چنانچہ قیامِ پاکستان کے بعد جواں سال شاعر عالیؔ نے اس پر خاص توجہ دی ہے جس سے یہ صنف پھر جاگ اٹھی ہے۔ لیکن عالیؔ سے کہیں پہلے خواجہ صاحب واحد شاعر ہیں جنہوں نے اس کو اپنایا، اپنے خونِ جگر سے سینچا اور پروان چڑھایا۔ دوہوں کی ٹھیٹ زبان پر جو انہیں قدرت ہے اس کی وجہ سے وہ اس کام کے لئے موزوں بھی تھے۔ اور پھر اہلِ دل ہونے کی بنا پر انہیں گیان گن اور پیت کی ریت سے بھی وہ گہرا لگاؤ تھا جو کچھ دوہوں کی زبان ہی سے ادا ہو سکتا ہے۔ شاعر اور صنف دونوں کی وضع میں ایک فطری مناسبت ہے۔ جس نے دونوں کو ایک دوسرے کا دمساز بنا دیا ہے۔

خواجہ صاحب کی ذہنی فضا ایسے عناصر سے مرتب ہوئی ہے جو انہیں دورِ کہن سے قریب تر ہونے میں مدد دیتے ہیں۔ لہٰذا جس پیت کی ریت کا راگ انہوں نے گایا ہے، وہ آج کا شاید ہی کوئی شاعر گائے۔ اور ممکن ہے یہ میلان کسی قدر زیادہ معلوم ہو جس کی وجہ سے جدید طبائع ان کا ساتھ نہ دے سکیں۔ مثلاً ؎

داتا کا در چھوڑ کر دَر دَر پھرے نہ کوئے
اس کے دَر سے دَر ملیں، دَر دَر دُر دُر ہوئے

بہت بہتر ہوتا اگر بھاشا کی بجائے اس کو اردو سے قریب تر لا کر مانوس بنایا جاتا جیسا کہ عالیؔ اور خود خواجہ صاحب نے متعدد اشعار میں کیا ہے۔ پھر بھاشا ہی کے انداز میں تجنیسِ لفظی سے جو کام لیا گیا ہے وہ بھی عہدِ رفتہ کی یاد دلاتا ہے۔ بعض جگہ تمثیل اس حد تک قطعی ہے کہ اس میں تخیلی پھیلاؤ اور اشاریت کے لئے کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ اس کے باوجود اس مجموعہ کا دامن انمول موتیوں سے لبریز ہے۔

تیز ہوا اور تنہا پھول

از منیر نیازی
صفحات ۹۶، قیمت تین روپے
ناشر:۔ مکتبہ کارواں، لاہور

نظمیں، غزلیں، قطعے، گیت (کل ۸۰) سیرِ کہسار (پیش لفظ) اور گرد پوش کا تعارف یہ سب ایک شاہین ــ شاعر کی لاؔابالی روح ــ کو زیرِ دام لانے کی کوششیں ہیں لیکن یہ تدبیر شاید ہی کارگر ثابت ہو۔ کیونکہ جس پراسرار فضا میں یہ تنہا پھول اگا اور پروان چڑھا ہے وہ ــ اشفاق احمد نے "سیرِ کہسار" میں اس کا بہت ہی بھرپور نقشہ کھینچا ہے ـــ شاید کسی بھی تیز ہوا کا حریف ہو سکتا ہے۔ منیر نیازی اور اس کی شاعری کی فضا کو سمجھنے کے لئے اس کے دونوں افسانہ نما تعارفوں کا مطالعہ ضروری ہے۔ اور کچھ عجب نہیں کہ ایک ذہین قاری اس پراسرار فضا اور اس میں گھومتے پھرتے کردار کو خود بھی بھانپ لے جو ان مختصر مگر بھاری ـــ بعض گھروں کی طرح نظموں کو بھی بھاری کہنے میں کیا مضائقہ ہے؟ ـ نظموں کے پسِ پردہ جھلکتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ڈبلیو۔ بی۔ ایٹس کی طرح اس کے مجموعہ میں کوئی حرفِ راز کسی طلسمی دروازے کے پٹ کھول دیتا ہے۔ بلکہ سناٹا، ہو کا عالم، کھوئی کھوئی گونگی فضا، کم سم، ٹھہرا ٹھہرا ماحول، افسانوی سماں، گئے موسموں اور بچھڑے لوگوں کے لئے سسکیاں، سوچ، اکیلاپن، دوری، ویرانی، بھولی بسری باتیں، سرگوشیاں، جھلملاہٹیں، سائے۔ یہ سب ایک مبہوت کن کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ جن میں کہیں کہیں آسیبوں، چڑیلوں اور جشنوں کا ذکر بہکانے کے لئے کافی ہے۔ مگر جادوگر کے بھیس میں اصلی شاعر صاف دکھائی دیتا ہے۔ جو دوسرے شاعروں کی طرح بالعموم جانے پہچانے موضوعات ہی پر قلم اٹھاتا ہے۔ تیز ہوا اور تنہا پھول کی علامت شاید شاعر کی ذات پر حاوی ہو لیکن اسکی بیشتر نظموں پر حاوی ہے۔ چینی شعراء کی طرح چند ہی بولوں سے معنی کا

جادو جگانا اس کا بڑا وصف ہے۔ گو یہ پھلجھڑی سے زیادہ آوازہ کرنوں ہی کا جادو ہے۔ مثلاً دانت۔ موتیے کے خوبصورت ہار، ٹمٹمرے تاروں کے جگل سیلیٹی شامیں۔ رات کی نیلی چپ میٹھی کا متاؤں کا ہالا۔ اس سے ظاہر ہے کہ شاعر نے گھاٹ گھاٹ سے بولیوں کے موتی رول لئے ہیں۔

سروِ چراغاں

از جمیل ملک
صفحات ۲۰۴، قیمت چار روپے
ناشر: گوشۂ ادب، لاہور

غزل میں کامیابی کی ایک ہی شرط ہے۔ یہ کہ شاعر اپنی ذات کو اس صنف کی پارہ پارہ ہیئت پر حاوی کر دے۔ اس کے لئے ذہن کو ایک خاص انداز سے سدھانا پڑتا ہے۔ وہ ٹیڑھے ترچھے کونے جو فکر یا ہیئت کی بے ربطی سے پیدا ہوتے ہیں ان کو ایک تیز دھار شعور سے خرادا جائے۔ جمیل ملک نے اپنے مزاج اور یکرنگ تصور سے یہ کیفیت پیدا کرلی ہے۔ اس طرح اس نے خود کو بھی ایک حد تک روایت سے بچایا ہے اور غزل کو بھی۔

مینائے غزل

از بشیر فاروق
صفحات ۱۹۲، قیمت تین روپے
ناشر: مکتبۂ لالہ زار، حبیب جون بلڈنگ
الفنسٹن سٹریٹ۔ کراچی

اگر اس پیشکش کے باطن کا اندازہ اُس ظاہر سے کیا جائے جو اس کے سرورق پر "ذرا سی باقی" کا آئینہ دار ہے تو اس سے آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں۔ شاعر نے مقبولِ عام منجھی ہوئی زمینیں اختیار کی ہیں اور بساط بھر شاعری کی داد دی ہے۔ اس کی کوشش یہ ہے کہ وہ غزل کی زبان میں غمِ جاناں سے زیادہ غمِ دوراں کی تصویر کھینچے۔ جذبۂ قومی نے اس کی غزل سے روایتی عشقیہ تیور چھین کر ملی و اخلاقی تیور عطا کر دیئے ہیں۔ اگر فیشن میں داخل مضامین اور زمینیں چھٹ جائیں اور حقیقی تجربے کو وسیع تر فن سے آمیز کیا جائے تو نتائج بہتر ہوں گے۔

قیدِ فرنگ

از حسرتِ موہانی مرحوم
صفحات ۱۶۰، قیمت تین روپے ۸/
ناشر: نیا راہی، کراچی

یہ اس مکتبہ کی ان متعدد مطبوعات میں سے ہے جو بہت ہی کم مدت میں شائع ہو کر بے حد شہرت حاصل کرچکی ہیں۔ حسرت موہانی کی زندگی تمام تر جد و جہد کے لئے وقف رہی مشہور ہے کہ وہ ایک ایسے مضمون کی پاداش میں جیل گئے تھے جو ان کی کاوش قلم کا نتیجہ نہ تھا اور قید و بند کی شدید ترین سختیاں سہیں۔ "قیدِ فرنگ" اسم بامسمیٰ ہے کیونکہ اس میں اسی قید کے ظلم و ستم کی داستان درج ہے۔ آخر میں جیل کا کلام اس دلچسپ آپ بیتی پر مستزاد ہے۔

بندیا

از سلیم پانڈے
صفحات ۲۲۰، قیمت تین روپے
ناشر: کردار، پاکستان چوک کراچی

یہ ایک جواں سال افسانہ نگار کے افسانوں کا اولیں مجموعہ ہے۔ اے حمید نے پیش لفظ میں اس کے عیب اور گن تلاش کرنے کا کام نقادوں کے سپرد کر دیا ہے اور شاید بعض اس دعوت کو بڑے شوق سے قبول کریں۔ لیکن ذوقِ سلیم شاید اسے گوارا نہ کرے نگاہِ آشنا سے دیکھا جائے تو اس میں گن بہت ہیں۔ ایک بڑی بات یہ ہے کہ افسانہ نگار نے رسم و رہِ عام کی پیروی قبول نہیں کی۔ وہ اپنا ہی منفرد تصور لئے ہوئے اپنی ہی پسند اور ذوق کی راہ پہ چلا ہے۔ پہلا ہی افسانہ ترقی پسندوں کی نام نہاد آدرش بھگتی اور ادب و فن کے ڈھونگ کا پردہ چاک کرتا ہے اور بڑی جرأت سے ایک غیر رسمی رویہ کی حمایت کرتا ہے "ان ماڈرن لڑکیوں سے اچھری بہتر ہے جو اپنے خیالات اور مطلب کو چھپانا نہیں جانتی۔ اور سودا بازی کے فن سے واقف نہیں"۔ یہ افسانہ اٹھکھیلیوں اور قہقہوں میں لکھا گیا ہے۔ اسی طرح کئی اور افسانوں میں بھی بذلہ سنجی کی برق وش نقرئی لہر برابر موجود ہے۔ مشاہدہ و بیان میں انفرادی تیور ہیں۔ "ہیروئین کے آنسو" "خاندان کی ناک" "وہ لڑکی" "جارج کیف کی ملاقات"۔ شگفتہ ظرافت میں رچے ہوئے ہیں۔ اور بہت متنوع زاویۂ نظر ظاہر کرتے ہیں بعض چیزیں نقوش، خاکے اور تصورات ہونے کے باوجود افسانے کی تعریف پر پوری اترتی ہیں اور ان میں شعریت کا خاصا رچاؤ ہے۔

ریویو کے لئے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے۔ (ادارہ)

ابوالاثر حفیظؔ : بقیہ صفحہ (۲۰)

ہے یہ ترانہ تمام پاکستانیوں کے دل کو ابھارتا، گرماتا اور انتہائی گرم جوشی و اولوالعزمی کے ساتھ آگے بڑھنے کی تحریک دلاتا رہے گا۔

حفیظؔ کی ذات میں جو شاعر اور مغنی ہے وہ ابھی سویا نہیں۔ وہ برابر زندہ ہے۔ ایک طرف وہ دیہات کی ترقی کے لئے روز و شب انتہائی توجہ کے ساتھ سرگرم کار ہے۔ اور اس کے نغمے اس اعلیٰ قومی مقصد کو روشناس تکمیل کرنے کے لئے وقف ہیں تو دوسری طرف اس کی توجہ ملی جذبات و احساسات کے لئے بھی وقف ہے۔ اور جب ذمہ داریوں کا وہ بوجھ جس کی تصویر اس نے کبھی یوں کھینچی تھی کہ:

اے مصور ایک تصویر اس طرح کی کھینچ دے
بار دوش زندگی کوہِ گرانِ زندگی

کچھ ہلکا ہو جاتا ہے اور دل میں اس کے محبوب شغل شعر و نغمہ کی اُمنگ پیدا کرتی ہے تو وہ پوری قوم کا دل و دماغ اور زبان بن کر ایک ایسی شاعری تخلیق کرتا ہے جو تمام ملت کے احساسات و جذبات کی ترجمانی کرتی ہے۔ موجودہ انقلاب نے پھر شاعر کے دل میں ایک ولولۂ تازہ پیدا کیا ہے۔ اور اس کے درخشاں مستقبل کا نقیب، اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کا حدی خواں بن کر وہ ایک بار پھر وہ آواز بلند کرنے کو تیار ہے۔ جو ساری قوم کی آواز اور اس کو "تیز ترک گامزن" ہونے کا حیات افروز پیغام ہو۔ اگر شاعرِ رنگیں نوا، دیدہ بینائے قوم کی حیثیت رکھتا ہے تو کچھ عجب نہیں کہ وہ حقیقی معنوں میں ستارۂ پاکستان ثابت ہو۔

★

میری قمیص
پٹخنا بند کرو...
چٹاخ ! پٹاخ ! ٹوٹے بٹن تار تار کالر پھٹی آستین !
میں اس طرح اپنی قمیص پٹخوانا نہیں چاہتا۔
سن لائٹ صابن استعمال کیجئے
جی ہاں۔! جب سن لائٹ صابن کافی مل سکتا ہے تو کپڑوں کو اس طرح
کوٹ پیٹ کر دھونے کی کیا ضرورت سن لائٹ کے جلد اثر کرنے والے
جھاگ سے کونے کونے بغیر میل خود بخود صاف ہو جاتا ہے۔ کپڑے
بھگو دیجئے۔ سن لائٹ صابن ملئے اور دھو ڈالئے بس آپ کا کام
ختم ہو گیا۔ اپنے تمام کپڑے سن لائٹ صابن سے دھوئیے !
یہ آپ کے ہاتھ کی جلد کے لئے بھی مضر نہیں ہے
SUNLIGHT SOAP
سن لائٹ صابن
پٹخے بغیر کپڑوں کو
سفید اور اجلے
دھوتا ہے
S. 14—193 UD
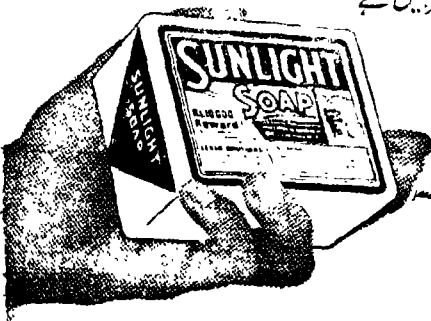
یہ خوف و ہراس کیوں ؟
سیریڈون استعمال کیجئے اور
تکلیف دہ ایام سے نجات پایئے!
ہر ماہ آپ کی زندگی کو تلخ کر دینے والی تکلیف اور درد سے
فوری طور پر نجات پانے کے لئے سیریڈون استعمال کیجئے
تسکین دیتی ہے
سیریڈون درد سے تقریباً فوراً نجات دلاتی ہے اور اس کے استعمال کے بعد نہ تو معدے میں کوئی تکلیف ہوتی ہے اور نہ مضمحل پن پیدا ہوتا ہے۔
آرام پہنچاتی ہے
سیریڈون اعصاب کو آرام پہنچاتی ہے اور درد کے رفع ہو جانے کے بعد آپ راحت و مسرت محسوس کرتی ہیں۔
تازگی بخشتی ہے
درد کی وجہ سے پیدا ہونے والی ذہنی اور جسمانی تھکاوٹ پر سیریڈون قابو پالیتی ہے اور اس کے استعمال کے چند ہی لمحوں بعد آپ پھرتی و تازگی محسوس کرتی ہیں۔
Saridon
اصلی سیریڈون صرف اصول صحت کے مطابق مُہر شدہ
کئے ہوئے ورقی پیکٹوں میں ہر جگہ دستیاب ہوتی ہے۔
JWT VB 226

ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا - مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس میکلوڈ روڈ - کراچی
مدیر: رفیق خاور

آپ کے روپیہ
کی قیمت بڑھ گئی
۶٪
شرح منافع
اب
قومی ترقی کے سیونگ سرٹیفکیٹ
کی شرح منافع میں مزید اضافہ
جو یکم اپریل ۱۹۵۸ء سے شمار ہوگا

جوُن ۱۹۵۹ء

جنرل محمد ایوب خان، صدر پاکستان:
جامع مسجد، واہ چھاؤنی کا افتتاح

صدر پاکستان اور صدر انڈونیشیا، ڈاکٹر سوئیکارنو، کی ملاقات

آل مشن کانفرنس بین الاقوامی ادارۂ تعاون (آئی - سی - اے)
کے اراکین کو صدر پاکستان کی طرف سے استقبالیہ

فلم لیباریٹری حکومت پاکستان (کراچی)
افتتاح: وزیر اطلاعات و نشریات، جناب حبیب الرحمن

سالانہ کانفرنس
انجمن بہبودیٔ اطفال میں
بیگم حبیب الرحمن کی تقریر

ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا۔ مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس میکلوڈ روڈ۔ کراچی
مدیر: رفیق خاور

یہ خوف و ، اسس کیوں ؟
سیریڈون استعمال کیجئے اور
تکلیف دہ ایام سے نجات پایئے!
ہر ماہ آپ کی زندگی کو تلخ کر دینے والی تکلیف اور درد سے
فوری طور پر نجات پانے کے لئے سیریڈون استعمال کیجئے
تسکین دیتی ہے
سیریڈون درد سے تقریباً فوراً نجات دلاتی ہے اور اس کے استعمال کے بعد نہ تو معدے میں کوئی تکلیف ہوتی ہے اور نہ بدحالی پن پیدا ہوتا ہے
آرام پہنچاتی ہے
سیریڈون اعصاب کو آرام پہنچاتی ہے اور درد کے رفع ہو جانے کے بعد آپ راحت و مسرت محسوس کرتی ہیں۔
تازگی بخشتی ہے
درد کی وجہ سے پیدا ہونے والی ذہنی اور جسمانی تھکاوٹ پر سیریڈون قابو پالیتی ہے اور اس کے استعمال کے چند ہی لمحوں بعد آپ پھرتی و تازگی محسوس کرتی ہیں۔
Saridon
اصلی سیریڈون صِرف اصول صحت کے مطابق مُہربند کئے ہوئے ورقی پیکٹوں میں ہر جگہ دستیاب ہوتی ہے۔
J.W.T. VS 226

قومی منصوبہ؟
برما شیل
جائے تعمیر پر
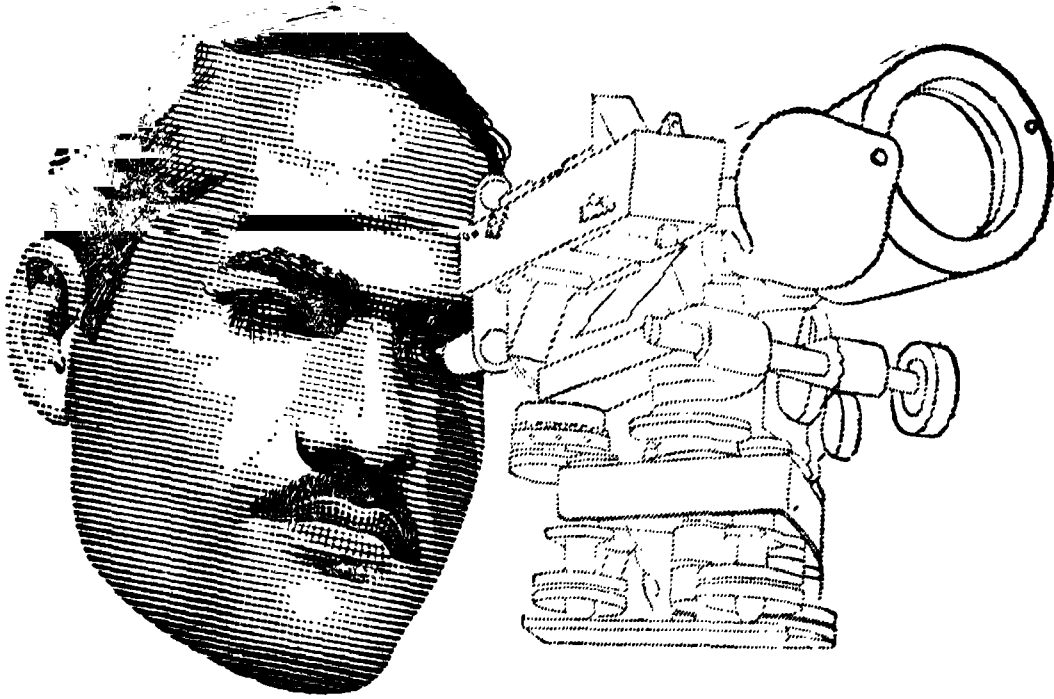
ہر منصوبہ ملک کی خوشحالی کا ضامن ہے ۔ جتنے زیادہ منصوبے مکمل ہو سکیں، ملک اتنا ہی زیادہ خوشحال ہوگا۔
بڑھتے ہوئے اخراجات کی پروا کئے بغیر برما شیل نے ہمیشہ اسی نظریہ کے ماتحت جائے تعمیر کے متصل اپنے ڈپو قائم کئے ہیں۔ جن میں کمپنی کا تربیت یافتہ عملہ رات دن اسی کوشش میں رہتا ہے کہ مزلقات کی خاطر خواہ مقدار ہر وقت موجود رہے تاکہ مشینیں برابر چلتی رہیں اور منصوبہ وقتِ معینہ پر مکمل ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اگر تیل کی مصنوعات ہر وقت مہیا نہ ہو سکیں تو نہ صرف منصوبہ کی تکمیل میں تاخیر ہوگی بلکہ اخراجات میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔

برما شیل کے نمائندے منصوبہ بندی کے افسران سے مشورہ کر رہے ہیں۔

ہماری مشینوں کے پہونچنے سے پہلے ہی عارضی ڈپو مکمل ہو چکا ہے۔

رسد کا انتظام کیا جا چکا ہے اور اس سلسلہ میں انجینیروں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

جائے تعمیر پر تیل کی فراہمی کا مناسب انتظام ہے۔

برما شیل ترقی پاکستان کا حصہ ہے

BSP—4—59

SUNLIGHT
NEW
SUNLIGHT
SOAP
SUNLIGHT
یہ دیکھئے
نیا سنلائٹ صابن
ایک نئے جادو اثر جزو کے ساتھ
کپڑے پہلے سے بہت زیادہ سفید دھوتا ہے
نیا سنلائٹ صابن
بغیر کپڑوں کو
سفید اور اُجلے دھوتا ہے!

جلد ۱۲ — ماہِ نو — شمارہ ۶

جون ۱۹۵۹ ء

مدیر: رفیق خاور — نائب مدیر: ظفر قریشی

سرورق: مزار مجوبہ بیرون مقبرہ میر کرم علی خاں (حیدرآباد سندھ) رنگین عکس ..... انور سعید

سالانہ چندہ: ساڑھے پانچ روپے — شائع کردہ: ادارۂ مطبوعاتِ پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی — فی کاپی: آٹھ آنے

فروغِ صبحگاہی

(آمدِ بہار کا ایک تاثر)

سید جعفر طاہر

عجیب سی روشنی نظر آ رہی ہے پیمانۂ نظر میں
مہ و نجوم و شہاب کا حسن ہے مرے حجلۂ ہنر میں
وہ نور کی چھوٹ ہے کہ دھرتی دلہن بنی مسکرا رہی ہے
وہ بادلوں کے جوان باراتیوں سے گویا لجا رہی ہے

وہ درد کے دامہائے تیرہ کے سخت جال تار کٹ رہے ہیں
گلی گلی میں حسیں شعاعوں کے نقرئی ہار بٹ رہے ہیں
وہ موت کی ڈائنیں کہ بیٹھی ہوئی ہیں خاموش سر بہ زانو
وہ جوہرِ خاک خاک ابھرا، وہ بام و در ہیں کہ آئینہ رو

سسکتی دم توڑتی ہوئی لاکھ آرزوئیں سنبھل رہی ہیں
نظر نظر میں غزل سرا ساعتوں کی پریاں مچل رہی ہیں
دلوں میں اٹکی ہوئی تھیں جو مدتوں سے پھانسیں نکل رہی ہیں
وہ آسمانوں کی گردشیں ہیں کہ آج محور بدل رہی ہیں

دورنگیٔ بخت ہرزہ کردار ختم ہے، آس ہو چلی ہے
جو زندگی دردِ سر بنی تھی وہ زندگی راس آ رہی ہے
نہ آہ و زاری نہ اشکباری نہ شورِ فریادِ ناتواناں
چمن چمن فرشِ سبزہ و گل، روش روش سیلِ خوش عناناں

مہک اٹھے سیسبان و صفصاف کے سیہ بخت سرو سائے
یہ آ رہی ہے کوئی سمن برِ سحر نوائے، گہر لٹائے
رخِ حیا آفریں سے بزمِ طرب نشاں میں نقاب اٹھائے
زہے جمالِ نظر فزائے، زہے ادائے و فاسمائے

حیات کی یہ حسینۂ سوختہ نظر مسکرا رہی ہے
یہ بانوئے غم نصیب اپنے دکھوں پہ اب گنگنا رہی ہے
خدا نے اس دردمند و حرماں زدہ کی سن لی ہیں التجائیں
اور آج اس کے جلو میں رقصاں ہیں آسمانوں کی اپسرائیں

وہ دن بھی تھے جب غموں کی چھائی ہوئی تھی ناپاک شام ہر سو
ستم کے ہر سمت جال پھیلے ہوئے تھے، نفرت کے دام ہر سو
اور آج سلمائیاں، دلآرائیاں ہیں محوِ خرام ہر سو
یہ ساقیٔ خوش ادا، یہ بٹتی ہوئی مئے لعل فام ہر سو

جہاں جہاں کوئی کشتِ ویراں ہے ابرِ نیساں گہرفشاں ہے
غبارِ خاطر کی آندھیاں ہیں نہ دل پہ بارِ غمِ گراں ہے
حزیں جوانوں کی سونی پیشانیاں خوشی سے چمک رہی ہیں
جٹورے ٹیلوں پہ ناچتے ہیں تو گوریاں بھی کنک رہی ہیں

حنائی ہاتھوں کی انگلیاں ہیں کہ شادیوں کے چراغ روشن
فضاؤں میں گیت گونجتے ہیں، نگاہ روشن دماغ روشن
گھڑوں پہ گاؤں کی چھوریاں چھیڑتی ہیں نغمے، نئے ترانے
لبوں پہ جاری ہیں ترنمِ ہستی کے حسنِ الطاف کے فسانے

فضا کو مسموم کر سکے گی نہ خوئے دشنامِ سرفرازاں
نہ وہ فسونِ فریب کاراں نہ دامِ تزویرِ چالباناں
وہ کھیتیاں سرسرا رہی ہیں، زبوں زمینیں چہک رہی ہیں
ستارۂ صبح کی تب و تاب سے جبینیں دمک رہی ہیں

زہے یہ دورِ طرب، یہ عہدِ کرم، یہ آغازِ جشنِ مستی
اجل کے طوفاں سمٹ گئے ہیں چھڑا ہوا ہے ربابِ مستی
یہ کوچہ و کو میں نکہت و نور و نغمۂ سرمدی کے جھالے
دلوں میں جینے کے ولولے، حوصلے، امیدیں، جگت اجالے

نوائے افلاکیاں یہی ہے جہاں جہاں مستنیر ہوگا
بشر بشر خود نگر، ستارہ شکار، خورشید گیر ہوگا
یہ ریگ زاروں کی گود میں سیلِ نور کی لہر لہر دیکھو
یہ کوہ و صحرا، یہ دشت و دریا، یہ نو بہ نو شہر شہر دیکھو

❁

یہ ابرِ بہاراں قطرہ زناں، یہ شمع و چراغاں نور فشاں
یہ لالہ و گل، یہ ساغرِ دل، یہ سرو و سمن، یہ آبِ رواں
یہ جلوۂ آتشِ دیرِ مغاں، یہ نائے نشاطِ امن و اماں
یہ مطرب و ساقی نغمہ سرا، یہ غلغلۂ عیسیٰ نفساں
یہ مومن و ترسا عیش کناں، یہ شاعر و صوفی زمزمہ خواں
نے وہم و گمانِ سود و زیاں، نے خوفِ نگاہِ محتسباں
اللہ یہ بساطِ ناز و نعم، نے صرصرِ غم، نے بیمِ خزاں
یہ طورِ طرب، یہ قافِ کرم، یہ انجمنِ صاحب نظراں
صیادِ اجل ترساں ترساں، جلادِ فلک لرزاں لرزاں
یہ بارگہِ صد اہلِ ہنر، یہ محفلِ پاکِ دیدہ وراں
یہ اہلِ ہمم، یہ اہلِ قلم، بہزاد رقم، استادِ زماں
مکتوبِ وفا، منشورِ دعا، یہ معجزۂ زرّیں قلماں
یہ اہلِ سخن، یہ صاحبِ فن، یہ لطفِ زباں، یہ حسنِ بیاں
یہ منزلِ عیش و سرورِ ابد، یہ جلوہ گہِ حورانِ جواں
یہ کوئے بتاں، یہ برقِ جمالِ ماہ وشاں، آئینہ براں
وہ شبنمی ٹیلوں کے دامن میں دخترِ صحرا نازکناں
پلکوں پہ ستاروں کی لڑیاں، پاؤں میں سر پیکا کہکشاں
کانوں میں پرن کے پھول پڑے، پوروں پہ حنائے لعل چکاں
زلفوں میں حسیں کھیتوں کی مہک، سانسوں میں شمیمِ خلد رواں
ہونٹوں پہ غزل شیر افضل کی، پہنائے بغل میں چاند نہاں

صحرا صحرا سامانِ طرب، وادی وادی رنگیں طوفاں
ہر منزلِ غم آغوشِ کرم، ہر دشتِ جنوں گہوارۂ جاں
افسانۂ دولتِ گلشنیاں، ہر خارِ الم کو نوکِ زباں
یہ زمزمۂ آہو نظراں، سیمیں ذقناں، زرّیں کمراں
پیلو کے مہکتے سایوں میں یہ رقصِ بہارِ گلبدناں
یہ لطفِ کلامِ گل نفساں، یہ طرزِ خرامِ خوش قدماں
یہ میکدۂ صد مخملیاں، یہ گنجِ کریمِ سرخ لباں
ہر فرد یہاں شاداں شاداں، دہقان و گدا فرحاں فرحاں
نگری نگری اذکارِ طرب، پیمانِ وفا ایواں ایواں
خورشید بکف مہتاب جبیں، سیماب قدم زاد رفشاں
یہ ذوقِ سماعت جلوتیاں، یہ طرز و طرازِ نغمہ گراں
اک تازہ غزل، اک تازہ غزل، او شعلہ زباں، او برقِ جہاں:

وہ جن کو موت پہ تھا اختیار ہم نفسو
ہمیں آج موت سے خود ہمکنار ہم نفسو
یہ اپنی شامتِ اعمال کی سزا پائی
کہاں کی گردشِ لیل و نہار ہم نفسو
جو سر جھکا کے چلیں اور لوگ ہوتے ہیں
نہیں یہ شیوۂ مردانِ کار ہم نفسو
حضورِ یار بہ اندازِ والہانہ چلو
مثالِ ابرِ سرِ کوہسار ہم نفسو
یہ صبحِ نو کی تجلّی، یہ حسنِ لالہ و گل
وہ ڈھل گئی ہے شبِ سوگوار ہم نفسو
امیرِ قافلۂ رنگ و بو تمہیں تو ہو
تمہیں سے حسنِ عروسِ بہار ہم نفسو
تمہیں ہو مملکتِ دل کے شہریار تمہیں
تمہیں کو ڈھونڈتی ہے چشمِ یار ہم نفسو
تمہیں ہو شہرِ نگاراں کی آبرو یارو
تمہیں کو ڈھونڈتی ہے چشمِ یار ہم نفسو
اسی سے پرچمِ زلفِ بتاں بلند ہوا
اڑا جو راہِ جنوں میں غبار ہم نفسو

تمہیں سے لطفِ غزل، حسنِ شعر، شانِ کلام
مزاجِ دہر کے آئینہ دار ہم نفسو
جلو میں لے کے زمانے کو پھر بڑھو کہ جہاں
پکارتا ہے تمہیں بار بار ہم نفسو

گئے وہ دن کہ لبِ ناز پر تھی مہرِ سکوت
بساطِ کون و مکاں پر جمود چھایا تھا
روش روش تھی گزرگاہِ آتشیں زنداں
کہیں پہ دیوِ اجل نے پرا جمایا تھا
گئے وہ دن کہ ترستے تھے عیشِ گلشن کو
جبینِ اہلِ جہاں پر غموں کا سایا تھا

کہاں کا شانۂ بادِ سحر، کہاں کی صبا
نفس بلرزہ، خمِ زلف ترساں تھا
کہاں کی روشنیٔ روشناں، کہاں کا نور
متاعِ دیدہ و دل صرفِ خونِ مژگاں تھا
ہوس کو پردگیانِ حرم سے شکوہ، اُدھر
مجھے گلہ مہِ کنعاں بھی جنسِ ارزاں تھا

وہ دن کہ نوحہ کناں تھی شمیمِ لالہ و گل
سمومِ و صرصرِ سوزاں، ہوائے راہگزار
بہ کنج کنج و بہر گوشہ صد ہجومِ بلا
وہ نَے سوار نہ وہ مطربانِ زمزمہ کار
صدائے ابرِ تنک مایہ تند و غیظ آلود
ادھر کچھ ایسی لگی جل بجھا نشیمِ بہار

نہ کوئی بزم نہ سبزانِ سبز بخت کی بات
نہ جوشِ محفلیاں تھا نہ رنگِ محفل تھا
فصیلِ شہر پہ رقصاں نہ تھا کوئی طاؤس
نہ گلستاں میں کہیں نغمۂ عنادل تھا
سیہ شبوں کی خموشی میں دل کی دھڑکن پہ
گمانِ صلصلۂ طوق و صد سلاسل تھا

حیاتِ نخل سراسیمہ و فسردہ تھی
نہ برگ و بر نہ وہ شاخوں کے سبز پوش ہلال
ہوائے گرم نے سنولا دئے تھے سرو و سمن
صریرِ سبزہ و گل تھا نہ رقصِ بادِ شمال
نہ کوئی گیت سرِ شاخ لہلہاتا ہوا
نہ پائے موج میں بجتا ہوا کوئی خلخال

نہ فکرِ شعر نہ آرائشِ غزل کی لگن
نہ تابِ عرضِ تمنا نہ شرحِ غم کا جنوں
ندیم و ہمنفساں دلفگار و زنداں تنگ
علاجِ خستگیٔ دل پیالہ پُر از خوں
شراب و شاہد و شیر و شکر ہوس کے لئے
وفا ہلاکِ فریبِ فسانہ و افسوں

نصیبِ اہلِ نظر دودِ شامِ حوصلہ سوز
نہ صبحِ عارضِ تاباں نہ جلوۂ رخسار
نہ کوئی عیش کا عنواں نہ کوئی تازہ نوید
نہ لطفِ بزم نہ وہ حسنِ شاہدِ گفتار
کہاں کا یوسفِ دل اور کہاں کا مصرِ خیال
نہ وہ ادائے زلیخائے کلکِ گوہر بار

فضائے عرضِ جہنم کہ سایۂ دیوار
کبھی جگر، جرسِ غنچہ چیر جاتی تھی
ورق ورق پہ سفیدی رہی کفن کی سی
صریرِ خامہ سے آوازِ تیر آتی تھی
نہ پوچھ نزع میں جب ہچکیاں کسی نے لیں
انہیں گمان یہ گزرا کہ ہیر گاتی تھی

قدم قدم پہ بھٹکتا تھا کارواں اپنا
کوئی ستارہ سرِ رہگذر نہ کوئی چراغ
طرف طرف وہ ابھرتی ہوئی سیہ دیوار
بجھے بجھے سے ادھر سینۂ جنوں کے داغ

نہ حوصلے ہی رہے تھے نہ ولولے باقی
نہ راستہ نہ کوئی منزلِ یقیں کا سراغ

گئے وہ دن کہ بہائے ہنر تھی قیدِ گراں
عطائے ظلِّ الٰہی —— قبائے زہر آلود
نظر نظر میں سلگتے ہوئے شرارے سے
نفس نفس میں رچی تھی ہوائے زہر آلود
گئے وہ دن کہ بنِ مُو سے آگ اٹھتی تھی
اور اس پہ قہر —— جہاں کی فضائے زہر آلود

خدا کا شکر کہ وہ دورِ مرگ بیت گیا
خدا کا شکر کہ اب ہر طرف بہاراں ہے
کہیں پہ چشمے کہیں آبشار گاتے ہیں
کہیں پہ رقصِ نگاراں، ہجومِ یاراں ہے
یہ سحر کاریٔ خوباں یہ ہمنشینیٔ گل
غریبِ شہر بھی ہمدوشِ شہریاراں ہے

یہ برف پوش، چمکتے ہوئے حسیں کہسار
یہ مرغزار یہ چشمے یہ مطرب و مہتاب
جواہرِ جگر پارہ پارہ کیا کہیے
کہ ذرّہ ذرّہ ہے الماسِ دلبراں کا جواب
یہ دورِ امن و اماں یہ زمانِ راحت و عیش
یہ شبنمیں یہ ستارے یہ پھول خواب ہی خواب

کشودِ کارِ جہاں آج ہے نسیمِ بہار
ضمیرِ دہر پہ فطرت کے راز کھل کے رہے

غزل سرا ہیں یہ کلیاں کہ محرمانِ عروس
خوشی کے گیت فضاؤں میں آج گھل کے رہے
ملا ہے فرقِ بشر کو جلالِ نو کا پیام
جبینِ زیست کے دیرینہ داغ دھل کے رہے

غبارِ تلخیٔ غم ہے نہ دودِ شامِ بلا
نہ اب کرے گا جہاں میں کوئی بھی ماتمِ نور
دھوئیں کے تیرہ و تاریک دائرے جو چھٹے
فضا کے دوش پہ لہرا گیا ہے پرچمِ نور
سسکتے ہونٹوں پہ نغموں کے نقرئی لہرے
اجل گرفتہ جبینوں پہ آج عالمِ نور

*

اصلاح و تجدید:

اُردو ادب کی تشکیلِ نو

رفیق خاور

ہماری تاریخ ایک عرصہ سے دوراہے پر ہے۔ اور ایسا ہونا لازمی ہے کیونکہ جب کبھی ایک نظام ٹوٹتا اور اس کی جگہ دوسرا ابھرتا ہے یا دو نظام ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں تو کچھ ایسی ہی کیفیت رونما ہوتی ہے۔ زندگی نہ اِدھر ہوتی ہے نہ اُدھر، بلکہ دو راہوں کے مابین ڈانواں ڈول ہوتی ہے۔ ایک طرف وہ کسی منزل کی طرف بڑھنا چاہتی ہے اور دوسری طرف پھر پیچھے کی طرف لوٹ جانا چاہتی ہے۔ اس میں مسلسل شکست و ریخت کے باعث تبدیلیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور اس وقت تک جاری رہتا ہے۔ جب تک ان کا تقاضہ پورا نہ ہو جائے اور زندگی تمام تر ایک نئے سانچے میں نہ ڈھل جائے۔ درمیان کا وقفہ ایک کشمکش، انتشار، تردد، افراتفری اور خلفشار کا وقفہ ہوتا ہے، جس میں بگڑنے اور بننے کا دوہرا عمل برابر جاری رہتا ہے۔ عقیدے، عقل، عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ آپس میں خلط ملط ہو کر نئے نئے روپ بھی دھارتے ہیں۔ جوں جوں پرانے عناصر چھٹتے جاتے ہیں ان کی جگہ نئے عنصر نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔ یہ ردِ عمل اور اختلاط کے گھٹتے بڑھتے جوار بھاٹے کا سلسلہ ہر ہر نقطے ہر ہر مقام پر دکھائی دیتا ہے ؛

اس قسم کی ایرا پھیری جس کو "جدلی مادیت" کی بھاری بھرکم اصطلاح کا نام دیا جاتا ہے، کچھ ہمیں سے مخصوص نہیں۔ ایسا تو شروع ہی سے ہوتا چلا آیا ہے۔ یونانا رومی تمدن، مصر، ایران، فلسطین، جہاں جہاں یہ پہنچا وہاں اس نے مخلوط تہذیبوں کو جنم دیا، نصرانیت نے کل یورپ میں ایسی ہی تہذیبوں کی بنیاد ڈالی، اسلام نے مشرق و مغرب کے تمدنی دھاروں کو نئے سرے سے آمیز کیا، مغربی نشاۃ الثانیہ نے، جو در اصل یونانا رومی تمدن کے احیاء اور اسلامی اثرات کا مجموعہ اور قرونِ وسطیٰ کے کلیسائی نظام کی ضد تھی، اس سے دست و گریباں ہو کر نت نئی چپقلشوں کا دروازہ کھول دیا جو آگے چل کر سائنسی ترقی کے سبب صنعتی انقلاب کا باعث ہوا۔ وہ انقلاب جو اپنے ساتھ دورِ جدید کے بے اندازہ مسئلے نئے نئے تصورات اور طرح طرح کے نصب العین لایا جن کی ایک صورت اشتراکیت ہے۔ یہی کیفیت مشرق و مغرب کے اختلاط سے مشرق میں بھی رونما ہوئی۔ چنانچہ جب سے یہ دونوں ایک دوسرے سے دوچار ہوئے ہیں، مشرق برابر بدل رہا ہے۔ مغرب میں جو شکست و ریخت ایک داخلی تحریک کے باعث رونما ہوئی تھی وہ مشرق میں ایک خارجی حملہ سے رونما ہوئی۔ ہم نے اس کو رد کرنے کی پوری پوری کوشش کی لیکن ساتھ ہی اس کا اثر بھی قبول کرتے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ آج فرنگ ہی نہیں مشرق بھی رہگذرِ سیل بے پناہ میں ہے اور اس سے مفر کی کوئی صورت نہیں۔

سن ستاون کا ہنگامہ مغرب کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کی سرتوڑ کوشش تھی۔ اس کے بعد مغرب سے قریب تر آنے اور مغربی تمدن کو اپنانے کی رفتار اور بھی تیز ہو گئی۔ روایت کی گرفت جو پہلے ہی کمزور پڑ چکی تھی اور بھی کمزور پڑ گئی۔ اور انقلاب ذہنی روشنی۔ در مع الدار کیف دار ا) کا زور اور بھی بڑھ گیا۔ چنانچہ اصلاح و تجدید کے پردہ میں سر سید اور ان کے ہمنواؤں نے اس کا علم بلند کیا۔ غور سے دیکھا جائے تو علی گڈھ کی تحریک میں روایت سے انحراف اور نئی روشنی کو لبیک کہنے کا پہلو ہی زیادہ نمایاں ہے۔ اس کی حیثیت بنیادی ہے اور روایت صرف ایک بتدریج محو ہوتے ہوئے ضعیف عنصر کے طور پر محفوظ ہے۔ صرف اس لئے کہ اس کو یکلخت کلیتہً محو کر دینا نہ ممکن تھا نہ قرینِ مصلحت۔ اس کی حیثیت ایک زیریں دھارے کی تھی جس کا آگے چل کر اور بھی دھیما پڑجانا لازمی تھا۔ سر سید پر "نیچری" اور "ہوا خواہِ فرنگ" ہونے کا الزام لگایا گیا تھا وہ اسی "کج بینی" پر مبنی تھا۔ سر سید اور ان کے رفقائے کار کے اقدامات صاف بتا رہے تھے کہ ان کا رخ کس طرف ہے۔ حالی نے تو برملا "پیرویِ مغربی" کا اعلان بھی کر دیا تھا۔

ظاہر ہے کہ ہماری ادبی تحریک اس عظیم تر تحریک کا ایک حصہ بلکہ بڑی حد تک آلۂ کار بھی تھی۔ جب سن ستاون کے حادثۂ خونیں کی

تباہی و بربادی سے قوم کی آنکھیں کھل گئیں تو بیدار مغز افراد نے سوچنا شروع کیا کہ یہ کیا ہوا اور کیونکر ہوا، ان کی فلاح و بہبود کس بات میں ہے۔ کیا وہ اپنے ماضی کی لاش سے لپٹے رہیں یا زندگی کی اصلیتوں اور تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی اور قدم اٹھائیں؟ اس کا ایک اور صرف ایک ہی فیصلہ ممکن تھا۔ پرانے ادب، اس کے تصورات، اس کے نظریات نئے دور کے لئے موزوں نہ تھے۔ وہ ایک ایسے دور کی یادگار تھے جس میں ادب، فن اور اس کے لوازمہ، تنقید نے کچھ اور ہی روش اختیار کر لی تھی۔ اب ہمارا ادب، ہمارے تصورات دوراہے پر کھڑے تھے اور سوچ رہے تھے کہ وہ کون سا رخ اختیار کریں۔ حالی کا "مقدمہ شعر و شاعری" محض ایک تنقیدی مرقع ہی نہیں بلکہ ادبِ جدید کا منشور، اس کا دستور العمل ہے۔ یہ ایک انقلابی تحریک کا نقیب اور اصلاح و تجدید کی پہلی آواز ہے۔ ایسی ہی آوازیں اپنے اپنے طور پر دوسروں نے بھی بلند کیں گو اُن میں وہ گمبھیرتا نہ تھی۔

"مقدمہ" قدیم ادب اور فنِ تنقید کا پہلا بھرپور جائزہ بھی تھا اور محاسبہ بھی۔ اس میں تغیر پر زور تھا نہ کہ انقلاب پر، اگرچہ اس کا حقیقی مقصود بالآخر انقلاب ہی تھا۔ اس کی حیثیت بڑی حد تک ایک اہم، دور رس ترمیم کی سی تھی۔ صرف رخ نئے رجحان کی طرف تھا اور زور معنویت پر۔ ساتھ ہی ساتھ "دیوان" کے دیباچہ میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ اس میں ادب و تنقید کے نئے نظام کی داغ بیل رکھی گئی ہے۔ اس پر نئی عالیشان عمارتیں تعمیر کرنا بعد میں آنے والے معماروں کا کام ہے۔ چنانچہ طرحِ نو کی اس پہلی دستاویز میں قدیم تصورات، اصناف، تخلیقات، مشاہیر وغیرہ پر تبصرہ بھی ہے اور محاکمہ بھی — غرض قدیم و جدید کے دوراہے پر کھڑے ہوئے ایک سمجھدار انسان جو معقول لائحہ عمل پیش کر سکتا تھا وہ پیش کر دیا گیا۔ اور اس کے ساتھ نقد و ادب کے کئی نمونے بھی۔ ادب اور زندگی یا ادب کی مقصدیت کے بارے میں جو کچھ کہا گیا تھا وہ صریحاً اضطراری حالات کا نتیجہ تھا۔ جو سن ستاون کے قومی حادثے سے رونما ہوئے تھے۔

زندگی اور آرٹ دونوں میں تفنن و تفریح کو بھی دخل ہے اور فن ٹھوس افادیت کے علاوہ جمالیاتی و نفسیاتی کیف و حظ کا بھی حامل ہے۔ قومی اصلاح کے افادی نقطۂ نگاہ نے اس اہم عنصر کو پسِ پشت ڈال دیا۔ اس افادی میلان کا احساس اقبالؒ تک پوری شدت سے قائم رہا اور ان کے بعد بھی مختلف صورتوں میں برقرار رہا۔ اب ہم اضطراری طور پر نہیں بلکہ ٹھنڈے دل سے ان مسائل پر غور کر سکتے ہیں۔ ان پر نظرِ ثانی اشد ضروری ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اصنافِ سخن، خصوصاً غزل، قصیدہ، مرثیہ اور نظم وغیرہ کے متعلق جو کچھ نئے دور کے مبصروں نے کہا اور ان کے جو نمونے پیش کئے گئے ان میں بھی توسیع کی ضرورت ہے۔

اگر ہمارا ادب اسی نہج پر آگے بڑھتا رہتا جس کی نشان دہی ابتدا میں کی گئی تھی اور ہم پیچ در پیچ تقاضوں کے جھمیلے میں سوجھ بوجھ سے کام لیتے ہوئے ایسی سمت کا تعین کرتے جو برجستہ اقدامات کی ضامن ہوتی تو آج ہمارا ادب کہیں کا کہیں ہوتا۔ لیکن پُرشور، افتاں و خیزاں موجوں کے تلاطم میں ہم اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے۔ ہم کچھ نہ کچھ کرتے ضرور رہے ہیں، لیکن سوال محض کرنے کا نہیں بلکہ مکمل شعور کا ہے۔ اور اس کے فقدان کا نتیجہ انتشار۔ اس کے کئی وجوہ ہیں۔ سب سے پہلے ذہنی دھارے کو لیجئے، کیونکہ اور سب کام اسی کا ظہورہ ہیں۔ سن ستاون کے بعد تمدنِ فرنگ کے خلاف ردِ عمل نے ذہنی و ادبی شکل اختیار کر لی اور جس شدت سے علیگڈھ کی تحریک میں صرف مادی حد تک اس کو اپنایا گیا تھا، اسی شدت سے اکبر الٰہ آبادی اور اقبالؒ نے اس کی مخالفت کی — ان کے موقف بظاہر مختلف معلوم ہوتے ہیں لیکن درحقیقت یہ دونوں اسلام اور روحانی اقدار کی تباہی پر اس کو درخورِ اعتنا خیال نہیں کرتے — اگر خودی وہی خودی ہے جو اخلاقی و مذہبی حیثیت سے مستحسن ہو تو یہ "روح" ہی کا دوسرا نام ہے۔ اور عمل بھی ایمان کی بدلی ہوئی صورت۔ لہٰذا مغرب کے متعلق اکبر اور اقبال کا رویہ یکساں ہے۔ اگرچہ اقبال نے اپنے طور پر دانشِ فرنگ کو قبول کیا جس سے بظاہر ان کا رجحان آگے کی طرف معلوم ہوتا ہے لیکن جن اخلاقی، روحانی اور مذہبی شرائط کے ماتحت وہ اس کو قبول کرتے ہیں، اس سے ظاہر ہے کہ ان کا کعبۂ مقصود حال و مستقبل کے بجائے ماضی میں ہے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ "دیکھتا ہوں دوش کے آئینہ میں فردا کو میں" ان کی کوشش مغرب کی نئی اقدار کو رد کرنے اور پرانے نظام کو، جو ان کی رائے میں صحیح اقدار پر مبنی تھا، برقرار رکھنے کی آخری کوشش تھی۔ لیکن سیلِ بے پناہ ہر بند توڑ کر آگے نکل گئی۔ سائنس کے جدید افکار، اس کی دریافتوں، اس کی ایجادات، جدید معاشری، نفسیاتی اور فنی نظریوں اور آئینی تصورات نے روایتی تصورات کو پیچھے ہٹا کر ادبی میلانات پیدا کر دئے۔ قدیم نظامِ فکر و تمدن کی جوئے رواں کچھ اس طرح پھٹ کر پریشاں ہو گئی کہ قدم قدم پر نئی نئی ندیاں نالے بہتے

دکھائی دینے لگے۔ چنانچہ اقبال کے بعد دنیائے فکر و فن پر نیرنگی ہی نیرنگی اور بوقلمونی ہی بوقلمونی چھا گئی۔ ساز ایک نہیں رہا بلکہ ہزاروں ساز بن گئے، راگ ایک نہیں رہا بلکہ بے شمار راگ راگنیاں پیدا ہو گئیں، مغنی چند ایک استاد ہی نہ رہے بلکہ سنگت سنگت، محفل محفل نئے نئے مغنی تھے اور نئے نئے الاپ جن کا آپس میں کوئی تال میل، کوئی ربط نہ تھا۔ افکار، انداز، اصناف، پیرائے، طور و طریق، ذوق، لہجے سب کے سب الگ الگ۔ نظام کہن ٹوٹ چکا تھا، اس کے اجزا ہوا پہ منتشر تھے اور انہوں نے مل جل کر نئی نئی صورتیں اختیار کرنی شروع کر دیں۔ کہیں انقلاب کے نعرے تھے، کہیں بازگشت کا شور و غل، کہیں ترقی پسندوں کے چرچے تھے، کہیں فرائڈ کے پیروؤں کی موشگافیاں، کہیں رومان کے پرستار تھے اور کہیں قوم و وطن کے شیدائی، کہیں فن برائے فن کے دلدادہ اور کہیں مقصدیت اور افادیت کے علمبردار، کہیں غزل اور پابند شاعری کے حامی تھے اور کہیں نظمِ آزاد کے نقیب۔ ایسے میں کسی قدرِ مشترک، کسی معین روش، کسی ہم آہنگی کی تلاش بے سود تھی۔ جب ایک جانی پہچانی شاہراہ کھو گئی تو پھر ہر طرف راستے ہی راستے تھے، تلاش ہی تلاش تھی، تجربے ہی تجربے تھے۔ جنوں جولانیاں ہی جنوں جولانیاں تھیں۔ جو لوگ پرانی ڈگر کے خوگر تھے وہ پرانی ڈگر پہ ہی چلتے رہے اور اگر انہوں نے نئی طرح کو اپنایا بھی تو اس طرح کہ اس پر ایک عجیب قسم کی قدامت کا سایہ غالب رہا۔ جو لوگ قدیم روش سے مطمئن نہ تھے وہ دانستہ یا نادانستہ نئے راستوں پر نکل گئے۔ اب اپنے آپ ہی پر انحصار کرنے کی کوئی قید نہ رہی تھی۔ سب دنیا اپنی دنیا بن گئی تھی اور اس کا تجربہ اپنا تجربہ ـــ روشنی جہاں سے بھی ملے اپنی ہی روشنی تھی۔ گویا نیا مسلک ہر چیز کو اپنانے اور اپنے اندر سمونے کا مسلک تھا۔ جیسا کہ ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔ نوع انسان کا میلان اسی طرف تھا کہ دوسروں سے جوت جگائی جائے تاکہ تہذیب و تمدن کا دائرہ اور بھی وسیع ہو اور اس سے بالآخر ایک زیادہ جامع اور پائیدار نظام رونما ہو۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا، ہم ایک برزخ ہی میں رہیں گے۔ ہمارا دور ایک طویل عبوری دور ہی رہے گا۔

ان حالات میں صحیح اقدام یہی ہو سکتا ہے کہ ہم پھر اپنے گرد و پیش کا احتیاط سے جائزہ لے کر انتشار کو دور کرنے کی شعوری یعنی بالقصد ارادہ کوشش کریں۔ ہم بے بسی کے عالم میں مختلف رووں میں بہتے ہی نہ جائیں بلکہ ان پر غالب آ کر کسی بھرپور دھارے میں بہیں۔ خودی کو ترقی دینے کی ایک صورت یہ ہے کہ ہم اس کو دوسروں کے اثر سے آزاد رکھیں اور اپنی محدود انا ہی کو سب کچھ سمجھیں۔ اس سے وہ محفوظ تو رہے گی لیکن اس میں وسعت یا ترقی نہیں ہوگی۔ دوسری صورت اوروں کا اثر قبول کر کے ایک زیادہ وسیع اور مرکب شخصیت پیدا کرنا ہے اور پھر اسی کو اپنی خودی بنا لینا ہے۔ ایک صورت میں سمٹنا ہے اور دوسری میں پھیلاؤ۔ ایک میں کلاسیت ہے دوسری میں رومانیت، ایک طرف زینس کی سکونیت ہے اور دوسری طرف ڈایونیسس کی حرکیت ـــ

ادب کی حیثیت زندگی سے مختلف نہیں۔ اس کی توسیع و ترقی بھی دوسرے اثرات کو اپنانے ہی پر موقوف ہے۔ اس کے سامنے دو ہی راستے تھے اور ہیں، یا وہ اپنے پرانے حدود میں ہی رہے ـــ وہی تصورات، اسالیب، مضامین، موضوعات، تکنیک، پیرائے، لب و لہجہ، ذوق، اصناف، ہیئت، تمثیلات وغیرہ۔ یا وہ دوسروں کا اثر قبول کر کے نت نئی جوت جگائے، اپنے حدود میں بیش از پیش وسعت پیدا کرے۔

ہم یہ دوسرا راستہ پہلے ہی اختیار کر چکے ہیں اور بجا طور پر۔ اب ہم اس کو چھوڑ کر پھر پرانے راستے کی طرف نہیں لوٹ سکتے۔ اگر ہم پرانی شاعری، پرانی اصناف، پرانی غزل، پرانے علم البیان، پرانے عروض ہی میں گھرے رہے تو آواگون کا چکر کبھی ختم نہ ہوگا۔ مغربی ادب، فن، تنقید اور جمالیاتی نظریات نے ہمیں نئے نئے حقائق اور تصورات سے روشناس کر دیا ہے۔ اس کے پیش نظر قدیم تصورات کو اپنانا خود کو دیدہ دانستہ ایک تنگنائے میں محدود کر دینے کے مترادف ہے۔ اس وقت تمام دنیا کا تخلیقی سرمایہ ہمارا سرمایہ ہے اور ہم اس سے اپنے ادب و فن میں زیادہ سے زیادہ وسعت، تازگی اور توانائی پیدا کر سکتے ہیں ـــ کیا یہ روش زیادہ سودمند ہے یا یہ کہ ہم پرانی روایت یا اب تک کے جانے پہچانے، آزمائے ہوئے طریقوں کو دہراتے جائیں؛ ہمارا مطمحِ نظر اپنی تخلیقات کو معنویت سے حتی الامکان قریب تر لانا ہے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم آرٹ کی ماہیت اور لوازمات کو سمجھیں۔ آرٹ کا جو نظریہ بھی کسی معقول تصور یا توجیہہ سے بلند ہوتا ہے، معنی اور ہیئت کی مطابقت اور مزید جدت کا ضامن ہے۔ اس لئے ہم ہر نظریہ میں کسی نئی روشنی کا سراغ پائیں گے۔

ظاہر ہے کہ ہماری قدیم انشا اور تنقید میں ادب و فن کے کتنے ہی پہلو نمایاں نہ تھے اور نہ ان کے کتنے ہی مظاہر ہمارے سامنے تھے۔ اسلئے

ہماری بنیادی ضرورت یہ ہے کہ ہم بار بار اپنے سابقہ ادب (کلاسیکی وجدید) اور اس کی تنقیدی و نظریاتی اساس کو پرکھیں، ان پر محاکمہ کریں، اور اگر ان میں ترمیم، اصلاح، تجدید توسیع کی بدستور ضرورت اور گنجائش ہے، تو اس کا وسیع تر پیمانے پر اہتمام کریں۔ کیا ہم نے فی الحقیقت ایسا کیا ہے یا نہیں، یا قدیم وجدید کی کم وبیش اس ابتدائی مفاہمت پر قانع ہیں جو آج سے برسوں پہلے سرسید کے عہد میں ہوئی تھی؟ ظاہر ہے کہ جدید ادب کے بانیوں نے ہمیں جو نمونے، جو تصورات، جو خاکے دئے تھے، وہ صرف سلسلۂ کار کو جاری کرنے کے لئے تھے، صرف اس قدر کہ وہ قدیم سے جدید اور صورت سے معنی کی طرف رخ بدل دیں تاکہ بعد میں آنے والے اپنی فکر و بصیرت اور جد وجہد سے اس عملِ اصلاح وتجدید کو اور بھی نمایاں کریں، اور اس رخ کو برابر بدلتے چلے جائیں تا آنکہ یہ درجۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔ اس کے یہ معنی نہیں تھے کہ ان کا نقش اول ہمیشہ نقشِ اول ہی رہے۔ اور ہم ہمیشہ بسم اللہ کے گنبد ہی میں رہیں۔ "من نتوانستم پسرم برداشت"۔ ان کے اقدام میں بالطبع یہ احساس جاگزیں تھا کہ بعد کے ارباب فکر و نظر اس مہم کو اور بھی آگے لے جائیں گے۔ کیا ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا ہے؟

بلاشبہ آج ہم پہلے سے کہیں آگے نکل چکے ہیں۔ ادب وفن کی عالمی سطح کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم نے بھاگم بھاگ اس تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ شاعری نے پہلے دور کے کوچے سے نکل کر کتنے ہی مقامات طے کئے ہیں اور صرف پابند نظم ہی میں غیر معمولی تنوع نہیں پیدا کیا بلکہ آزاد نظم کو بھی فروغ دیا ہے جس کے ہر نمائندہ شاعر کا ایک جداگانہ انداز ہے۔ شعری اصناف میں اضافہ ہوا ہے جس کا ثبوت سانیٹ، غنائیے، اوپرا، منظوم ڈرامے (یک بابی و پنج بابی) ڈرامائی مانولاگ، طویل نظمیں، بیلڈ، کینٹو وغیرہ ہیں۔ شعری تکنیک میں بھی نئے طریقے برتے گئے ہیں۔ شعری موضوعات اور تصور بھی کافی بدلے ہیں۔ یہ سب کچھ ہے پھر بھی بعض اہم اور بنیادی امور میں ایک کمی محسوس ہوتی ہے۔ جیسے یہ تمام فریب نظر ہے۔ جو بات ہونی چاہئے تھی وہ ابھی تک نہیں ہوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے بعد ہماری شاعری کچھ خالی الذہن سی معلوم ہوتی ہے۔ اور ہنگامی حالات یا میلان کے مطابق ایک موضوع سے دوسرے موضوع اور ایک لے سے دوسری لے کی طرف جست کرتی رہی ہے۔ "رست از یک بند تا افتاد در بندے دگر"۔ کبھی انقلاب، کبھی حب وطن، کبھی ترقی پسندی، کبھی رومانیت، کبھی فسادات، کبھی "کشمیر چلو"۔ کبھی "یہ وہ سحر تو نہیں"۔ اور کبھی ایک خلا! اس افتاں وخیزاں قسم کی شاعری میں، کسی بھرپور بات کی توقع بیکار ہے۔ اس مسلسل دقیانوسی وضع سے قطع نظر جو بعض غزلیات اور بعض اسی قسم کی قدیم وجدید "پیوندی" نظموں میں دکھائی دیتی ہے۔ اور آج بھی نظم و نثر اور نقد و نظر میں ہماری دنیائے ادب پر کافی حد تک حاوی ہے، ایک خاص قسم کی سہل بلکہ سہل انگار شاعری بھی رائج ہوگئی ہے جو اپنی مقبولیت اور سرسری اپیل کی وجہ سے ایک سدِّ گراں بن گئی ہے۔ کیونکہ ہمارے اذہان اس سے ہٹ کر زیادہ دقیع کوششوں کی طرف مائل نہیں ہوتے۔ بالخصوص ہم غزل میں ٹکے بندھے مضامین کو لگے بندھے پیرایوں میں ادا کردینا ہی کافی سمجھتے ہیں۔ اپنی شعری حیثیت سے قطع نظر غزل ہمارے نزدیک ایک علاماتی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ ایک مقدس حیثیت کیونکہ یہ ہمارے ماضی اور قدیم ثقافت کی سب سے بڑی یادگار ہے۔ یہاں اس صنف کے مثبت یا منفی پہلوؤں پر بحث کا موقع نہیں تاہم اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ یہ اپنی طرف خصوصی توجہ دیگر اصناف اور تازہ بہ تازہ نو بنو دریافتوں، اعلیٰ خصوصیتوں اور دوسری زبانوں کے اچھوتے اوصاف۔ نیز شعر وادب کے باب میں اقوامِ عالم کے گوناگوں سیر حاصل تجربوں اور خیال افروز پیرایوں، بیانی، تکنیکی، فنی وغیرہ ــــــ سے اغماض کی ترغیب دلاتی ہے کیونکہ اس کے مخصوص انداز اور شاعری کی آزاد وضع میں منافات ہے۔ یہ اب تک ہماری قوم کے دل ودماغ پر بری طرح حاوی ہے۔ ہمارے اسی فیصدی شعرا اسی کے دلدادہ ہیں اور بہت فرسودہ انداز میں یہاں تک کہ معروف شعرا بھی اسی قدامت نوازی کے ذیل میں آتے ہیں۔ ہماری ادبی پیداوار کا اسی فیصدی یا اس سے زیادہ غزلیات پر مشتمل ہے جس میں اعلیٰ درجہ کی غزلیں بہت کم ہیں، اور پرانے غزل گوؤں کے مقابلے میں نہیں جچتیں، شاید اس لئے کہ اس کی صلاحیتیں ماند پڑ چکی ہیں اور اس کا دورِ کمال ختم ہو چکا ہے۔ عاشقانہ، رسمی اور سستی وضع کے باعث اس صنف کا بیکار سرمایہ دنیا بھر کی شعری اصناف سے کہیں زیادہ ہے۔ بدقسمتی سے اس کے موافق یا مخالف جتنی بھی بحثیں ہوتی ہیں ان میں دکھتی رگوں کو چھیڑنے سے پہلو تہی کی گئی ہے۔ اسی لئے اس پر صحیح قسم کا محاکمہ نہیں کیا جاسکا۔ اور جب تک ایسا نہ ہوگا ہمارے راستے سے ایک بنیادی رکاوٹ دور نہیں ہو سکے گی۔ ہم کھل کر پوری جمعیت خاطر سے نادر تخلیقی کوششوں اور تجربوں کی طرف مائل نہیں ہو سکیں گے۔

اس وقت ہمارے سامنے سب سے بڑا سوال یہی ہے کہ شاعری میں وسعت کیسے پیدا کی جائے۔ ہمارے سامنے ترقی کے کیا کیا راستے ہیں مختلف

مغربی ممالک میں کتنی ہی تحریکیں جاری ہوئی ہیں اور شاعری نے کتنے ہی رنگ بدلے ہیں: امیج ازم (Imagism) دادا ازم (Dadaism) سرریل ازم (Surrealism)، سمبل ازم (Symbolism) - یوں بھی اول سے آخر تک شعرا کا ایک بے پایاں سلسلہ ہے جن میں سے ہر ایک ہمیں شعر و فن کا ایک نیا تصور دیتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور ہم اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں مثلاً جدید عہد میں ہاپ کنس اور ایلیٹ شاعری کے دو بڑے اہم سرچشمہ اثر ہیں اور ان سے ہیئت اور مادے کے متعلق کتنے ہی تصورات ابھرتے ہیں۔ مگر ہم نے ایک کی حزنیہ لَے اور طرز بیان کی بعض ادبی خصوصیتوں کے بغیر مغربی تصورات سے کچھ زیادہ حاصل نہیں کیا۔ اس لئے ہماری کوششیں بڑی حد تک ایک تنگنائے ہی میں محصور ہیں۔ نثر ہو یا نظم، فکر و خیال ہو یا نقد و نظر، تصور ہو یا پیشکش، موضوعات ہوں یا شخصیات، ہم نے چند ایک راہیں منتخب کرلی ہیں اور ہماری جولانیاں جو کم و بیش ایک ہی انداز رکھتی ہیں، تمام تر ان ہی میں کھپ جاتی ہیں۔

ادھر مشرق میں شعر و شاعری کا ایک وسیع سرمایہ پڑا ہے جسے ہم نے چھوا تک نہیں۔ عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی، چینی، جاپانی، سب میں ایسے نمونے اور فنی مثالیں موجود ہیں جن سے ہم بے انتہا استفادہ کرسکتے ہیں۔ مگر بدقسمتی سے یہ ہمارے لئے بڑی حد تک اچھوتے جام ہیں — دیگر زبانوں کی طرح ہندی کا مطالعہ بھی ہمارے لئے بڑا مفید ثابت ہوسکتا ہے کیونکہ پنگل اور اس کے ساتھ ساتھ کلاسیکی موسیقی کی تالیں عروض میں تنوع اور لچک پیدا کرنے کے لئے اشد ضروری ہیں۔ عظمت اللہ مرحوم نے اس طرف توجہ دی تھی اور انگریزی عروض کو بھی اردو میں لانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے بلکہ آخر میں بات پرانے عروض ہی پر آ ٹھہری اور نتیجہ لگھوؤں اور گروؤں کے ہیر پھیر کے سوا اور کچھ نہ ہوا جن سے کہیں کہیں کوئی انوکھی بات تو پیدا ہوتی ہے، لیکن یہ واضح نہیں ہوتا کہ اس کی بنیاد کیا ہے۔ یہ کوشش ٹھٹھر گئی ہے اور اب پہلے سے زیادہ آگاہی اور واقفیت کے ساتھ اس طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ عبدالعزیز خالد نے "تسکین اوسط" سے اس عقدہ کو حل کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ بڑی جزوی قسم کی کوشش ہے۔ سوال تو سارے عروض میں لوچ اور تنوع پیدا کرنے کا ہے، نہ کہ ایک آدھ گُر برتنے کا۔ جو لوگ اس مسئلہ سے شُدبُد رکھتے ہیں، کچھ وہی اس کی اہمیت کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ وہ محسوس کریں گے کہ یہ ہماری شاعری کا ایک بہت ہی اہم اور بنیادی مسئلہ ہے۔ چونکہ ہم ابھی تک پرانے عروض کی جکڑ بند سے آزاد نہیں ہوئے۔ اس لئے جب کوئی شاعر بجا یا بیجا عروض میں آزادی سے کام لیتا ہے تو اس پر شدت سے لے دے کی جاتی ہے۔ اگر ہم پرانے عروض کو سند سمجھ کر روایت پرستی کی بنا پر ایسا کرتے ہیں تو یکسر غلط ہے۔ اگر مسئلے کی وسعت کو سمجھتے ہوئے پوری معلومات کے ساتھ فراخ نظری سے گرفت کرتے ہیں تو یہ اور بات ہے۔ تاہم عروض میں لچک پیدا کرنے کا مسئلہ اپنی جگہ پر ہے۔

جو کچھ ہم نے اوپر کہا ہے اس سے لازماً شعر و فن کے تصور کا سوال پیدا ہوتا ہے یعنی ہم شاعری میں عروض کے علاوہ کس قسم کے پھیلاؤ، کس قسم کی تبدیلیاں، کس قسم کی گہرائیاں تلاش کریں۔ ہمارا مسلک کچھ بھی ہو، اتنا ظاہر ہے کہ ہمیں محض بیان یا حُسن نگارش سے بلند تر اوصاف کا سُراغ لگانا پڑے گا۔ اور تکنیک کے نئے نئے گُر، بیان کی نئی نئی حدیں تلاش کرنی ہوں گی۔ چند ایک برتے ہوئے گُر یا معلوم عوام پیرایے ہی کافی نہیں۔ کچھ اور رچاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے۔ یہ ضرورت اس لئے اور بھی اہم ہے کہ جو طریقے یا طرحیں پہلے پہل اختیار کی گئی تھیں یا بعد میں بروئے کار آئیں وہ دور از کار ہوچکی ہیں۔ مثلاً "نشاط امید" "برکھارت" ایسی طویل نظمیں اب خارج از بحث ہیں جس سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ جن نظموں میں اطناب سے کام لیا جاتا ہے، ان کی تکنیک متروک ہوچکی ہے۔ ان کی خصوصیت تشریح ہے اور اب فن کی روح اُس بلیغ قسم کے ایجاز کو تصور کیا جاتا ہے۔ جو اشاریت کے نام سے موسوم ہے اور جسے ایبر کرامبی نے (Incmtation) قرار دیا ہے۔ اب ہمارا تمام تر زور ایمائی ایجاز (Epitomisation) پر ہے۔ جس کی ایک نمایاں مثال (Waste Land) ہے۔

مختصر غنائی نظموں میں بھی وہی کیفیت نمایاں ہے، لہٰذا طویل قسم کی فکاہیہ یا بیانیہ، قدرتی اور تشریحی نظمیں، جواب بھی بڑی کثرت سے لکھی جارہی ہیں، فن کے تحت شمار نہیں ہوتیں۔ اب شاعری کی طرح خاصی پیچیدہ اور مرکب ہوچکی ہے۔ لہٰذا شاعری میں پرانی قسم کی بحثیں مثلاً صحتِ لفظی، محاورہ، سرقہ وغیرہ بے کار ہیں۔ ایلیٹ نے اپنی نظم (Waste Land) میں دوسرے شاعروں کا اگر کچھ اس طرح بے دریغ کیا ہے کہ ان کو بجنسہ اٹھا کر اپنے کلام میں لے آیا ہے۔ یہ اس لئے کہ اپنے کلام میں ادبی مرکب قسم کا اثر پیدا کرے۔ یہ اہتمام یہاں تک ہے کہ اس نے مضمون یا تشبیہیں تو در کنار

ترتیب قوافی کو بھی اڑا لیا ہے۔ لیکن ہمارے یہاں ایسی روش "سرقہ" کے رسوا کن نام سے تعبیر کی جاتی ہے! یہ ضرورت پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے کہ ہم اپنے معیار کو زیادہ وسیع اور فراخدلانہ بنائیں اور شاعری کی نادر خصوصیات اور اعلیٰ عناصر پر زور دیں مثلاً لب ولہجہ، ذوق، اٹھان، حشر معانی، سماں، صوتی اثرات، مسلسل محاکات، وغیرہ۔ بالفاظ دیگر ہمیں شعر وفن کا پورے کا پورا تصور بدلنا ہوگا۔ تاکہ ہمارا معیار رسا تر اور جلیل تر ہو۔

ہمارے بعض شعراء مثلاً شیر افضل جعفری، جعفر طاہر اور عبدالعزیز خالد نے کچھ نئے رنگ اُجالنے کی کوشش کی ہے۔ خصوصاً شیر افضل کا یہ تجربہ بہت اہم ہے کہ اس نے مقامی رنگ کو اُردو میں سمو دیا ہے اور ایک نیا سنجوگ پیدا کیا ہے۔ اس کی روش کو مختلف سمتوں میں ترقی دی جا سکتی ہے۔ یعنی بنگلا، سندھی، ملتانی، پشتو کی آمیزش سے ایسے ہی کئی اور سنجوگ۔ علاقائی تراجم نے ہمارے سامنے بعض نئی راہیں کھول دی ہیں اور ہم اپنی علاقائی زبانوں سے نئے نئے تصورات حاصل کر سکتے ہیں جن سے ہماری ادبی روایت میں نہایت اہم اضافے ہو سکتے ہیں۔ اور ہم ایک محدود چکر سے نکل کر نئے طور پر اونچی سوچ سوچ سکتے ہیں۔ یہ اسی صورت میں مفید ہو سکتا ہے کہ ہم ان سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں اور اپنی پچھلی میراث کی بھول بھلیاں ہی میں گم نہ رہیں۔

نثر میں بھی کچھ ایسی ہی کیفیت نظر آتی ہے۔ لگ بھگ ایک صدی کے عرصہ میں نثر نے پرانی قسم کی لفظی نگاری سے لے کر موجودہ ادیبوں کی بے تکلف تحریر تک بڑے اہم مدارج طے کئے ہیں۔ لیکن اس میں بھی وہی الجھی سلجھی سی کیفیت نظر آتی ہے۔ مثلاً ایک طبقہ اب بھی محمد حسین آزاد یا ابوالکلام آزاد کے اسلوب کو میکالے کے اسلوب کی طرح اُردو کا مثالی اسلوب قرار دیتا ہے۔ دورِ حاضر کے کتنے ہی ادیب اسی طرح الفاظ سے کھیلتے اور کھوکھلی قسم کی عبارت آرائی یا رنگین بیانی میں دلچسپی لیتے ہیں۔ دوسری طرف بعض تحریروں پر آج سے سو برس پہلے کی تحریر کا گمان ہوتا ہے۔ شاعری کی طرح یہاں بھی نئے پرانے کا بے ہنگم، انمل بے جوڑ پیوند نظر آتا ہے۔ عبوری دور اب بھی اپنے ایک پہلو میں پامال قدامت اور دوسرے میں کچھ سلجھی کچھ بگڑی ہوئی جدت کو لئے ہوئے ہے۔ ضرورت یہ ہے کہ نثر کے اسالیب پر کڑی نظر ڈالی جائے اور اُس مبتدیانہ مبہم قسم کے تصور سے آگے قدم بڑھایا جائے جس میں کھو کر انداز بیان کے اونچ نیچ کا شعور زائل ہو جاتا ہے۔

جو حال اور نظم میں غزل کی ہے وہی نثر میں افسانہ کی ہے جس میں زیادہ تر مختصر افسانے شامل ہیں اور اس کا نتیجہ بھی وہی ہے۔ رطب ویابس کی بھرمار جس سے آبروئے شیوۂ اہلِ نظر بھی جاتی رہتی ہے۔ لاناً اس صنف میں بھی خوب وزشت، ادنیٰ واعلیٰ میں تمیز کے لئے ایک کڑے معیار کی ضرورت ہے۔ ہمارے یہاں افسانہ کی نشو ونما بھی زیادہ تر ذہنی آوارگی کی مرہونِ منت ہے یعنی اس کی مختلف صورتیں، راہیں، طریقے، مقاصد کسی واضح شعور کے بغیر ہی اُبھرتے رہے ہیں اور افسانے من مانے طور پر تشکیل پاتے رہے ہیں۔ اس میں بھی لکھنے والوں کو ایک کے بعد دوسرا موضوع ہاتھ آتا رہا ہے اور وہ اس کی رو میں بہتے چلے گئے ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں جنس ہے جس کا سلسلہ دوسری افسانوی اصناف، ڈراموں اور ناولوں میں بھی اکثر وبیشتر بازارِ حسن تک پہنچتا ہے۔ اچھی خاصی تعداد ایسے افسانوں کی ہے جن کا مقصد پردہ دری، کھلا طنز یا تضحیک ہے۔ ایک عرصہ فسادات کے افسانوں کی گرم بازاری رہی۔ اس سے دو نتیجے نکلتے ہیں۔ ایک تو ہمارے افسانہ نگار چند کوچوں ہی میں گھرے ہوئے ہیں اور دوسرے وہ کسی نظامِ فکر یا واضح تصور کے ماتحت موضوعات تلاش کرنے کے بجائے، جن کا دائرہ بے حد وسیع ہو سکتا ہے، ہنگامی حالات ہی سے اشارہ پاتے ہیں۔ ان کا مشرب سیلانی ہے۔ اس طرح ہمارا مطلع نظر کبھی کشادہ نہیں ہو سکتا اور نہ ہمارے افسانوں میں وسعت یا تنوع پیدا ہو سکتا ہے۔ فنی حیثیت سے ہم بڑی حد تک قصہ پن کے تصور میں اسیر ہیں اور واقعات کے جوڑ توڑ سے خواہی نخواہی کہانی مرتب کرتے ہیں۔ یا پھر واقعات کو کھینچ تان کر ایک مضمون بنا دیتے ہیں۔ جن کی صحت پر یقین نہیں آتا۔

اگر ہمارے افسانہ نگار یہ جان لیں کہ جستہ جستہ تاثرات کے علاوہ، جو اپنی جگہ پر برمحل ہیں، ایک جامع فکر کے تحت بھی زندگی، ماحول اور انسانی فطرت پر نظر ڈالی جا سکتی ہے۔ تو اس میں زیادہ بھرپور اور متنوع اثر کا امکان ہوگا اور ہم عام مشاہدات سے ہٹ کر نادر نکات اور مسائل کو بھی اچھوتے پیرایوں میں بروئے کار لا سکیں گے۔

اس سلسلہ میں تنقید کا فرض سب سے اہم ہے۔ اور ہم اسی کے فیضان سے محروم ہیں۔ ایک طرف قدما کا علم انتقاد ہے جس کو علم البیان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یا اس کی وہ عملی صورت جس میں عہد ماضی کے تصورات کو عملی وادبی مظاہر یا شخصیتوں پر منطبق کیا گیا۔ اس کا مرقع تذکرے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان سب میں نقد ونظر کی کوئی ایسی سلجھی ہوئی صورت نہیں ملتی جس کو ہم آج کل شمع راہ بنا سکیں۔ مغربی علم ادب وتنقید اور جدید تصورات

نے ان کو ساقط از اعتبار کر دیا ہے۔ البتہ علم البیان کے بعض حصے جن میں معنویت کو تھوڑا بہت دخل ہے، اب بھی کار آمد ہیں۔ صنائع و بدائع، قافیہ و ردیف، عروض، شعری تصور، سرقہ و توارد، اسالیب، اقسام نظم و نثر وغیرہ کے سلسلہ میں بے حد چھان بین، رد و قبول اور اصلاح و تجدید کی ضرورت ہے۔ مگر ہمارے شعور پر اب تک قدیم مبادیاتِ تنقید کا گہرا سایہ ہے اور ہم سکہ بند تصورات سے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ علم البیان کی ابجد تین دلالتیں ہیں: لغوی، تضمنی اور التزامی۔ صریحاً ایماء و اشارہ، طنز (Irony) اور تمثیلیت بھی ایسی ہی دلالتیں ہیں، یہاں تک کہ ابہام بھی بعض اوقات ایک خاص دلالت رکھتا ہے۔ ادھر استفہام انکاری، معہود ذہنی اور فجائیہ (!) بھی واضح دلالتیں ہیں۔ لہٰذا دلالتوں میں توسیع لازم ہے۔ علم البیان میں صنائع و بدائع کو نہایت بھونڈی شکل میں جگہ دی گئی ہے۔ ان کی اعلیٰ ترقی یافتہ صورت صوتی اثرات ہیں جن سے فن اور معنی دونوں کا اثر دوبالا کرنے میں مدد ملتی ہے۔ علم البیان کا ایک اہم نظریہ یہ ہے کہ کلام مقتضائے حال کے مطابق ہو جس کی ادنیٰ و اعلیٰ کتنی ہی صورتیں ہیں۔ اس سے تحقیق و تلاش کے لئے ایک بہت وسیع میدان کھل جاتا ہے۔ ملیے ہی اول تا آخر بے شمار مسئلے ہیں جن کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات بہم پہنچانے اور وسعت نظر کو شمع راہ بنا کر ایک نیا علم البیان مرتب کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ ہم نے یہاں چند جستہ جستہ مثالوں ہی پر اکتفا کیا ہے۔

زندگی کی طرح ادب اور تنقید بھی متحرک ہیں۔ نئے حالات اور نئے انکشافات کے ساتھ ساتھ ان کو بھی بدلنا چاہیئے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہم محض بدلنا ہی کے لئے بدلیں اور اپنے قدیم ادبی و تنقیدی سرمایہ کو لازماً از کار رفتہ خیال کریں۔ سوال صرف بے لاگ تحقیق کا ہے جس میں حسنِ تناسب کو پورا پورا دخل ہو چاہیئے۔ یہی روش "مقدمہ شعر و شاعری" میں اختیار کی گئی تھی جو قدیم و جدید کے جائزہ اور مفاہمت کی بڑی معقول اور سنجیدہ صورت تھی اور یہی روش ہمیں اس نئے وسیع تر اور بسیط تر جائزہ اور مفاہمت میں اختیار کرنی چاہیئے جو ادب و فن اور نقد و نظر کا مرقع نو ہوگا۔ اس کی بنیاد استقراء پر ہوگی۔ مشرق و مغرب کے ادب و تنقید سے محرمانہ شناسائی اور حکیمانہ بصیرت پر تاکہ جو قدم اٹھایا جائے وہ زیادہ سے زیادہ موثر اور زیادہ سے زیادہ ارتقائی امکانات کا ضامن ہو۔ جن تنقیدی و ادبی تصورات کی نشاندہی نظری و عملی طور پر دور اول میں کی گئی تھی، خصوصاً "مقدمہ" میں، وہ حتی الامکان اپنا اثر طاری کر چکے ہیں۔ جو جو کچھ ان میں بالقوہ موجود تھی وہ عمل میں آ چکی ہے۔ اس لئے جس افادیت کی اب بھی اس میں گنجائش ہے، اس حد تک وہ بدستور مفید ہے لیکن وہ مزید توانائی وہ حرکی قوت جو ایک ولولۂ تازہ، ایک پر زور تحریک کو جنم دے۔ جو زندگی، ادب اور انتقاد کے سلسلے کو اور بھی آگے بڑھائے اس میں موجود نہیں۔ یہ بات صرف تازہ نگاہ، تازہ بصیرت، تازہ دریافتوں، تازہ محرکات ہی سے ہاتھ آ سکتی ہے۔ اور ہمارے عہد میں جو اضمحلال سا محسوس کیا جا رہا ہے۔ اس کا سبب اسی روشنی کا فقدان ہے۔ ایک نیا جائزہ، ایک نیا محاسبہ، ایک نئی روزن کشائی، یہ ہے وہ کام جو نئی نسل کے دیدہ وروں کے ذمہ ہے۔

ہم نے نئی تحریک کے آغاز سے لے کر اب تک اپنے تنقیدی مشرب میں کیا ترقی کی ہے۔ اس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ ہماری آراء، ہمارا مسلک ہمارے تصورات تقریباً وہی ہیں جن کی داغ بیل ہمارے بزرگوں نے رکھی تھی۔ مشاہیر —— ولی، میر، درد، غالب وغیرہ، ادبی تخلیقات اور ادبی تحریکات، ادوار، اصناف، سب کے متعلق ہماری رائیں کم و بیش وہی ہیں۔ جو تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ کچھ ایسی وقیع نہیں۔ اسلوب تنقید کا کینڈا ابھی وہی ہے جو "شعر العجم"، "یادگارِ غالب" اور "مقدمہ" میں اختیار کیا گیا ہے۔ سارا زور تفسیر و تشریح پر ہے جس کی اعلیٰ پیمانے پر مثالیں محاسن کلام غالب اور افکارِ غالب ہیں۔ صحیح جائزہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم نئی معلومات کی عینک لگا کر دیکھیں اور نئی نگاہوں سے پرکھیں۔ اس سے یقیناً نمایاں فرق پیدا ہوگا۔ یہی روش دور جدید کے سلسلہ میں بھی لازم ہے۔ صورت حالات کچھ اس وجہ سے اور بھی الجھ گئی ہے کہ فکر و نظر میں پرانی اور نئی روشیں مسخ بری طرح گڈمڈ ہو گئی ہیں۔ جس سے بسا اوقات حسنِ تناسب برقرار نہیں رہتی اور ہماری تنقیدات میں، خواہ وہ کتنی بلند ہی کیوں نہ ہوں عجیب انتشار کی پائی جاتی ہے۔ فیصلوں میں، آراء میں، نظریات میں، انداز بیان میں۔ یہی وجہ ہے ہمیں ادب و انشاء و تنقید کے ایسے نمونے برابر نظر آ رہے ہیں جن میں تحریر اور فکر کی نا ہمواری بُری طرح کھٹکتی ہے۔ اس سے مربوط و منظم فکر کا شیرازہ پریشان ہو جاتا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ افراتفری کو کھل کھیلنے کے لئے اذن عام مل جائے۔ اور کسی پُر وقار آواز کے برعکس جو زندگی اور ادب میں ربط و ضبط پیدا کرے، گوناگوں آوازوں سے ہڑبونگ کی سی کیفیت پیدا ہو۔ یا "مکمل سکوت یا موت"! اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ اگر شوخیٔ اندیشہ مناسب چارۂ کار پیدا کر لے تو ہماری آئندہ نشو و نما کی راہیں خود بخود وا ہو جائیں گی۔

ایسے موقعوں پر انسانی فکر کشود کار کے ذریعے پیدا کر ہی لیتی ہے۔ ہم کسی نہ کسی طرح اُس طلسمی حلقے سے باہر نکل جاتے ہیں جس نے ہمیں چاروں

طرف سے گھیر رکھا ہو اور آگے بڑھنے کی راہیں مسدود کر رکھی ہوں۔ اس سے پہلے کبھی ہم اپنی تاریخ کے ایک بے ڈھب موڑ پر ایسی ہی افتاد سے دوچار ہوئے تھے، لیکن دلِ زندہ کی تڑپ اور شعور کی کسک نے اس کا سامنا کیا اور اُس پر غالب آئی۔ آج بھی ہم ان اجالوں سے مدد لیں جو ہمارے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں اور فکرِ کارساز کو کام میں لائیں تو موجودہ افتاد سے بھی بخوبی عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ ادب و صحافت میں زندگی کی دھڑکن اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے کہ وہ زندہ مسائل کا سامنا کریں اور ان کا مناسب حل تلاش کریں۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہمارے مسائل اور ضروریات کا واضح تصور لازم ہے اور اس کے بعد ہوشمندانہ منصوبہ بندی تاکہ ہماری کوئی چال بیکار نہ جائے، کوئی وار اوچھا نہ پڑے۔ سب سے بنیادی بات جدید علم البیان یعنی علم انتقاد کی تدوین ہے۔ کیونکہ یہی ہمارے نئے ادب کا سرچشمہ ہوگا۔ ہمارے سامنے ایک طرف مشرقی قوموں کے فنی نظریے اور دستور العمل ہیں اور دوسری طرف یورپ و امریکہ کے ارسطو اور افلاطون سے لیکر آئی۔ اے رچرڈس، ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ، ہربرٹ ریڈ، سکاٹ لے جیمز، راجر فرائی وغیرہ کی خیال افروز توضیحات۔ ان سب کا کڑی نظر سے جائزہ لیکر، ان کو اپنے ذہن میں پوری طرح رچا کر، آپس میں آمیز کیا جا سکتا ہے تاکہ ہمیں ایک نیا تعمیری و تخلیقی دستور العمل ہاتھ لگے۔ ہمیں لازم ہے کہ پرانے اور نئے رجحانات کی کشمکش کو دور کر کے مکمل یکسوئی پیدا کریں — تاکہ ہم اپنی تخلیقی قوتوں اور سرگرمیوں کو پوری شدت اور ہم آہنگی سے ایک ہی نہج پر کام میں لائیں یہی ہماری آئندہ ترقیات میں بہترین رہنما ثابت ہوگا۔ اور اسی کی روشنی میں ہم اپنے قدیم و جدید مشاہیر، ادب و فن کے مظاہر، تخلیقی کارناموں، تحریکات، ادوار، اقدار اور اصناف پر نظر ڈالتے ہوئے ان کی صحیح تشخیص کریں گے، اپنے فکر، ادب، فن، تنقید کی دُکھتی رگیں پہچان سکیں گے، ان کا صحیح علاج کریں گے اور پھر پوری صحت و توانائی کے ساتھ آگے بڑھ سکیں گے جو اپنے ساتھ روز افزوں ترقی کی نوید لئے ہوئے ہو۔

•

رسائی

ڈاکٹر تصدق حسین خالد

تا بہ امکانِ نگاہ،

نرم و نازک بازوؤں پر

دن کی یادوں کو سمیٹے

دور سے اڑتے چلے آتے ہیں

اپنے گھونسلوں کی گود میں

طائروں کے قافلے،

روح کو تسکینِ جنت مل گئی

میں اسیرِ فکر ہائے بیش و کم

تیری یادوں کو سمیٹے

اڑ کے جا پہنچا ہوں تیری بارگاہِ ناز میں

اقبال کا ایک شعر

فیض الرحمن اعظمی

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اس شعر کے متعلق جناب شورش کشمیری نے مولانا نیاز فتحپوری سے رجوع کیا اور انہیں لکھا کہ یہ شعر احباب میں اختلاف کا موضوع بن گیا ہے۔ ایک خیال یہ ہے کہ مہمل ہے، دوسرا خیال یہ ہے کہ محض شاعرانہ اُپج ہے۔ نیاز صاحب نے 'نگار' بابتہ مارچ ۵۹ء کے 'باب الاستفسار' کے تحت اس شعر پر یوں روشنی ڈالی ہے:

"ہر شاعر کے کلام میں بعض مصرعے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو دیکھکر ہم بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ وہ ذہن شاعر میں دفعتاً القا ہوئے ہوں گے اور نظم اور غزل لکھنے کی تحریک انہیں سے پیدا ہوئی ہوگی۔ اقبال کے اس شعر کا دوسرا مصرع 'بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا' اسی نوع کا الہامی مصرع ہے جو بغیر کسی کاوش کے ذہنِ شاعر میں آیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس مصرع میں دو لفظ بنیادی حیثیت رکھتے ہیں: چمن اور دیدہ ور۔ اس لئے جب مصرع اول کی کاوش انہوں نے کی ہوگی تو مصرع دوم کے ان دو بنیادی الفاظ کے پیشِ نظر فوراً لفظ نرگس ان کے ذہن میں آیا ہوگا جو بالکل سامنے کا لفظ ہے اور اس طرح یہ مصرع تیار ہو گیا ع

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

لیکن افسوس ہے کہ شاعر نے یہ غور نہیں کیا کہ ہر چند دونوں مصرعے لفظاً اپنی اپنی جگہ بہت خوبصورت ہیں مگر معنوی حیثیت سے ان دونوں میں کوئی ربط نہیں۔ دوسرے مصرع میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ 'بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا' اس لئے پہلے مصرع میں اس کا ثبوت پیش کرنا چاہیئے تھا اور وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے کیونکہ نرگس کی بے نوری تو ظاہر ہے لیکن اس کی دیدہ وری کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا۔ اگر نرگس ہزاروں سال کیا لاکھوں سال بھی اپنی بے نوری پر روئے تو بھی وہ دیدہ ور نہیں ہو سکتی .... اس شعر کو مہمل کہنا یا محض شاعرانہ اُپج قرار دینا دونوں ایک ہی بات ہے کیونکہ حقائق کے خلاف شاعرانہ اُپج کوئی معنی نہیں رکھتی ......"

اس شعر کے حسن و قبح اور صحت اور عدم صحت سے قطع نظر، اس کی افہام و تفہیم کے سلسلے میں جناب نیاز نے چند ایسے مفروضے تراشے ہیں۔ جن کی تشریح و توضیح ضروری معلوم ہوتی ہے، اول یہ کہ نیاز صاحب نے تخلیق شعر اور تخلیقی طریق کار کے سلسلے میں ذہنی اعمال کو ملحوظ نہیں رکھا ورنہ وہ ہرگز یہ نہ کہتے ہیں کہ اچانک کسی جذبے کے ماتحت کوئی بنا بنایا شعر یا مصرع ذہن شاعر میں القا ہوتا ہے۔ اس شعر کے سمجھنے میں پہلی غلطی انہوں نے یہی کی ہے کہ الفاظ و نقوش کو حسبِ دلخواہ معنی پہنا کر نتائج کا استخراج کرنے کی کوشش کی ہے، حالانکہ تخلیقی عمل اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا وہ سمجھتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ یہ کوئی پُر اسرار یا ناقابل فہم عمل نہیں ہے لیکن عام آدمیوں کی بہ نسبت فنکار کی جذباتی اور تخلیقی کائنات میں ایک زبردست تموج اور ہیجان، طوفان اور تہلکہ برپا رہتا ہے۔ اس کے تحت الشعور میں ہزاروں قسم کے خیالات، احساسات، یادیں اور تجربے موجود ہوتے ہیں، اس کا تخیل ایسے تاثرات کی تخلیق بھی کرتا رہتا ہے جو بادی النظر میں کسی محسوس اور مادی شے کا نتیجہ نہیں۔ تخلیق کی خواہش فنکار کو اظہار پر اکساتی ہے۔ اظہار و ابلاغ کیلئے وہ ایسے الفاظ کا استعمال کرتا ہے جن کے نازک اشاروں، لطیف استعاروں، معنی خیز ایجاز و اختصار سے وہ اپنے اصل مقصد یعنی ابلاغ میں کامیاب رہے۔ ظاہر ہے ابلاغ کے لئے صحیح الفاظ و نقوش کا استعمال کس حد تک ضروری ہے۔ شاعری میں الفاظ بے جان اور منفعل نہیں ہیں بلکہ ہر لفظ بجائے خود

اُن مختصر خیالات و تاثرات سے ہے۔ ہر لفظ اپنے اندر ایک دنیا پوشیدہ رکھتا ہے۔ یہ دنیا محض اس لفظ کے لغوی معنی تک محدود نہیں، الفاظ اور شاعری میں اس ناگزیر ربط کے ساتھ ساتھ اس چیز کو بھی ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ محض الفاظ کی الٹ پھیر بھی شاعری نہیں ہے۔ شاعری میں الفاظ اظہارِ خیالات و جذبات کا ذریعہ ہیں۔ اگر انہوں نے تجربات سے زیادہ اہمیت اختیار کر لی تو پھر شاعری ممکن نہیں۔ کامیاب شاعری کے لئے تجربے، ان کی اصلیت، جذبات میں شدت اور اسلوب، (الفاظ، نقوش اور اوزان) پر قدرت یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔

فنکار یا شاعر کے ذہن میں کوئی خیال یا جذبہ پیدا ہونے کے نقطۂ آغاز سے فن یا شعری جامے کے درجۂ کمال تک پہنچنے کے لئے اسے مختلف مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ ہمارے یہاں اسے یعنی شعری تخلیق کے عمل کو بڑی سہل انگاری کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔ اور ان مختلف خارجی اور داخلی، نفسیاتی اور حیاتیاتی، انسانی اور آفاقی عوامل پر کڑی نظر نہیں ڈالی گئی ہے۔ لیکن مغربی ناقدین نے شعری تخلیق کے عمل کو بڑی دقتِ نظر اور سائنسی طریق پر سمجھنے کی کوشش کی ہے اور ہر فنکار کے تخلیقی فکر کے ہر ہر گوشے میں جھانکنے کی کوشش کی ہے۔ اقبال کا یہ خیال:

از نوا بر من قیامت رفت کس آگاہ نیست
پیشِ محفل جز بم و زیر و مقام و راہ نیست

یا غالب کے یہ اشعار:

اے ذوقِ نوا سنجی بازم بخروش آور | غوغائے شبیخونے بربنگہ ہوش آور
گر خود نہ جہد از سر از دیدہ فرو بارم | دل خوں کن و آں خوں را در سینہ بجوش آور

محض یونہی نہیں ہیں۔ ان میں فنکار کی اس جانکاہی اور جاں بازی کا ثبوت ملتا ہے جس کے یہاں قلم سے الفاظ اس طرح ٹپکتے ہیں جس طرح انگلیوں سے خون ٹپکتا ہے۔

اگر ہم تخلیقی عمل کے اس طریقِ کار کو مانتے ہیں تو ہمیں یہ تسلیم کرنے میں تامل نہیں ہونا چاہیئے کہ "طلوعِ اسلام" اقبال کی اُن چند نظموں میں سے ہے جن میں تجربات کی اصلیت، جذبات کی شدت اور اسلوب یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔ "طلوعِ اسلام" نظم ہے غزل نہیں ہے۔ ہماری بدقسمتی یہ بھی رہی ہے کہ ہم ہر شعر کو مفرد انداز میں سوچنے اور دیکھنے کے عادی ہیں۔ غزل میں تو یہ بات ایک حد تک صحیح ہو بھی سکتی ہے لیکن نظم ایک پیچیدہ شے ہے۔ اس میں ہر شعر یا ہر سطر بجائے خود زیادہ اہم نہیں بلکہ مکمل نظم کی ترقی کا سبب ہے۔ اس نقطۂ نظر سے بھی دیکھیئے تو بھی اقبال کے اس شعر میں کوئی خامی نظر نہیں آتی۔ نیاز صاحب کا یہ مفروضہ کہ پہلے مصرعِ دوم ذہنِ شاعر میں اچانک القا ہوا ہوگا، پھر اس کے بنیادی الفاظ کی روشنی میں مصرعِ اول کی جستجو ہوئی ہوگی اس کو باور کرنے کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اقبال کی نظم کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ قومیں سخت مصیبت اور ابتلاء کے بعد ابھرتی ہیں۔ اقوام و ملل کی زندگی میں مستقل آلام و آفات کے بعد کوئی ایسا دیدہ ور انسان پیدا ہوتا ہے جس کی مسیحا نفسی ملک و قوم کے عروقِ مردہ میں روحِ تازہ پھونکتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس مقصد کے ابلاغ میں فنکار نے جن الفاظ و نقوش اور رموز و علائم کا انتخاب کیا ہے۔ اس میں وہ کہاں تک کامیاب ہوا ہے۔

نیاز صاحب کے مفروضے کا منطقی نتیجہ تو یہی نکلتا ہے کہ اقبال نے مصرعِ اول کی تخلیق محض مصرعِ دوم کے بنیادی الفاظ (چمن اور دیدہ ور) کی رعایت سے کی ہے، اس لئے نرگس اور اسی کی رعایت سے اس کی بے نور آنکھوں کا ذکر کیا ہے۔ دونوں مصرعوں میں کوئی معنوی ارتباط نہیں، اس لئے کہ دوسرے مصرع میں جو دعویٰ کیا گیا ہے پہلے مصرع میں اس کا ثبوت ہونا چاہیئے تھا، لیکن شاعر نرگس کی دیدہ وری کا کوئی ثبوت نہیں پیش کر سکا ہے۔ مجھے اس اعتراض کی سطحیت پر تعجب ہے۔ نیاز فتح پوری جیسا فاضل اجل نقاد بھی دعویٰ اور دلیل کی بے معنی الجھنوں میں پھنس کر رہ گیا اور اس شعر کے حسن، تاثیر اور شاعرانہ صداقت پر اس کی نظر نہیں گئی۔ اردو شاعری میں یہ بڑا پرانا طریقہ رہا ہے اور اب بھی ہے کہ شاعر ایک مصرع میں کوئی دعویٰ کرتا ہے اور دوسرے مصرع میں اپنے دعویٰ کی توثیق کے لئے ثبوت و دلیل فراہم کرتا ہے ـــ اقبال کے اس شعر کو پرکھنے کے لئے مروجہ طریقِ کار ہی کو استعمال کیا جائے تو بھی کوئی پیچیدگی یا بے ربطی نہیں نظر آتی۔ دونوں مصرعے اسلوب اور معنی دونوں لحاظ سے باہم مربوط ہیں۔ نرگس کا لفظ محض یونہی چمن اور دیدہ ور کی رعایت ہی کو ملحوظ رکھ کر نہیں استعمال کیا گیا ہے بلکہ اس شعر کی لفظیات میں وہ ایک اہم اشارے اور علامت کا حامل ہے۔ اقبال نے نرگس کا لفظ محض ایک شاعرانہ علامت کے طور پر استعمال

کیا ہے، نیاؔز فتح پوری کا یہ کہنا کہ اگر ہزاروں کیا لاکھوں برس بھی نرگس روتی رہے تو وہ دیدہ ور کیسے ہو سکتی ہے' سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا قرآن پاک میں بارہا گمراہ انسانوں کے بارے میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ وہ آنکھیں رکھتے ہیں اور دیکھتے نہیں' کان رکھتے ہیں اور سنتے نہیں۔ دل رکھتے ہیں اور سوچتے نہیں؟ تو کیا نعوذ باللہ' ان جملوں اور ان الفاظ میں کوئی حقیقت اور ربط نہیں؟ نہیں' ایسا نہیں ہے بلکہ بات کو موثر انداز میں کہنے کا یہ ایک فصیح و بلیغ انداز ہے۔

شاعری کی دنیا منطق کی دنیا سے الگ ہے۔ جب شاعر اپنی دنیا آباد کرتا ہے تو اس میں سورج اور چاند، صبح و شام، موت اور زندگی، جنت اور دوزخ سب کو ایک ساتھ جلوہ گر کرتا ہے۔ شاعر کی تخیلی دنیا میں تو خوابوں کی دنیا کا نقشہ ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھئے تو اقبال کے اس شعر میں کوئی خامی نہیں۔ شعر پڑھتے ہی فوراً ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ یہ تو ایک استعارہ ہے۔ نرگس کو ایسے انسانوں سے تشبیہ دی گئی ہے جو آنکھیں رکھنے کے باوجود بھی دیدۂ بینا نہیں رکھتے۔ پھر کہیں ہزاروں برس کے بعد ان میں کوئی دیدہ ور اور صاحب نظر پیدا ہوتا ہے۔ لیکن نیاؔز صاحب اسے نہیں مانتے۔ ان کے خیال میں یہ محض شاعرانہ اُپج یا مہمل ہونا ایک ہی بات ہے کیونکہ حقائق کے خلاف شاعرانہ اُپج کوئی معنی نہیں رکھتی۔ نیاز صاحب کا یہ کہنا صحیح ہے کہ "دیکھئے" شاعری میں حقائق سے گریز ممکن نہیں، لیکن شاعرانہ اُپج کی اگر انہوں نے تشریح کر دی ہوتی تو بات سمجھنے میں آسانی ہو جاتی۔ اگر شاعرانہ اُپج سے ان کی مراد شاعر کی تخئیل ہے تو ہمیں اعتراض کی سطحیت پر اور بھی تعجب ہوتا ہے۔ حالیؔ بھی تخیل پر واقعیت کی بندش لگاتے ہیں اور خیال کے لئے اصلیت کو ضروری جانتے ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

"اصلیت پر مبنی ہونے سے یہ مراد نہیں ہے کہ ہر شعر کا مضمون حقیقت نفس الامری پر مبنی ہونا چاہئے، بلکہ یہ مراد ہے کہ جس بات پر شعر کی بنیاد رکھی گئی ہے وہ نفس الامر میں یا لوگوں کے عقیدہ میں یا محض شاعر کے عندیہ میں فی الواقع موجود ہو یا ایسا معلوم ہوتا ہو کہ اس کے عندیہ میں فی الواقع موجود ہے۔ نیز اصلیت پر مبنی ہونے سے یہ بھی مقصود نہیں ہے کہ بیان میں اصلیت سے سرِ مُو تجاوز نہ ہو بلکہ یہ مطلب ہے کہ زیادہ تر اصلیت ہونی ضروری ہے۔ اس پر اگر شاعر نے اپنی طرف سے فی الجملہ کمی بیشی کر دی تو کچھ مضائقہ نہیں۔"

ظاہر ہے اصلیت اور حقیقت پر لکھتے وقت حالیؔ کے پیش نظر شاعری کی سب سے مقدم اور ضروری چیز یعنی قوتِ متخیلہ یا تخیل رہی ہوگی۔ تخیل کی بے اعتدالیوں پر ٹوک تو سب نے کی ہے۔ لیکن اسے مہمل کہنا شاعری اور تنقید دونوں کے اُصولوں کے منافی ہے۔ شاعری تو تخیل ہی سے عبارت ہے۔ شاعر کے تجربے میں جذبہ بھی اپنے آپ کو تخیل کے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔ اس کی قوت کی کوئی انتہا نہیں۔ یہ وہ طاقت ہے جو شاعر کو وقت اور زمانہ کی قید سے آزاد کرتی ہے۔ وہ آدم اور جنت کی سرگزشت اور حشر و نشر کا بیان اس طرح کرتا ہے گویا اس نے یہ تمام واقعات اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں "روحِ اقبال" میں تخیل کی یوں تعریف کرتے ہیں:۔

"تخیل کی قوت کی کوئی انتہا نہیں۔ وہ عقل سے زیادہ قدیم اور قوی ہے۔ وہ اشیا کی تعریف و تحدید نہیں کرتا بلکہ انہیں محسوس کرتا ہے اور یہی احساس اس کے معانی و تصورات کا جوہر ہے۔ یہی احساس جب خواہش بن جاتا ہے تو اس میں ایسی دلکشی آجاتی ہے کہ شاعر اس کی خارجی صورت دیکھنے کے لئے خود بیتاب ہو جاتا ہے۔۔۔۔ سوائے تخیل کے جذبات کی دنیا کا کوئی محرم راز نہیں ہو سکتا۔ اس کی بصیرت کے آگے فکر ششدر و حیران رہ جاتی ہے جسے عقل ادھورا دیکھتی ہے اسے تخیل مکمل دیکھ لیتا ہے۔"

یہی تخیل کی کارفرمائی ہے جس سے شاعر اپنی تخلیق کی ہوئی دنیا میں محیر العقول اور باہم متضاد اشیاء ایک ساتھ جلوہ گر کرتا ہے' یہی شاعری کا ذریعۂ ابلاغ اور یہی آرٹ کا طریقِ کار ہے۔ فن کار اور شاعر فن کے اسی طریق کار کے ذریعہ حقائق کے چہرے سے نقاب کشائی کرتے ہیں اور انسانی فہم و آگہی میں اضافہ۔ مومنؔ کا ایک مشہور شعر ہے ؎

وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب
تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

ظاہر ہے یہ شعر اصلیت اور واقعے کے خلاف ہے۔ مرنے کے بعد سوچنے اور تمنا کرنے کی صلاحیت کیونکر باقی رہ سکتی ہے، لیکن آپ اس شعر کو محض اس بنا پر مہمل قرار نہیں دے سکتے، اسی طرح فیضیؔ کا یہ شعر ؎

سخت است سیاہیِ شبِ من
نیمے ز شب است کوکبِ من

(باقی صفحہ ۵۳ پر)

ماہِ نو، کراچی - جون ۱۹۵۹ء

حسرت موہانی - منفرد غزل گو

منیر فاروقی

ایک عرصے تک یہ خیال عام رہا بلکہ بعض حلقوں میں اب بھی اس امر کا اظہار کیا جاتا ہے کہ غالب کے عہد تک اردو غزل نے تمام تکمیلی مراحل طے کر لئے تھے۔ غالب کی غزل اردو غزل کی تاریخ کا نقطۂ عروج ہے ان کے بعد اردو غزل میں ارتقا نہیں ہوا۔ وہ جہاں غزل کو چھوڑ گئے تھے یہ ابھی تک وہیں قائم ہے۔ لیکن اس رائے سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا ــــ اس میں شک نہیں کہ غالب جیسا عظیم غزل گو اردو میں اور کوئی پیدا نہیں ہوا لیکن حالی، حسرت، اقبال اور چند ایک دوسرے غزل گو شعرا کی غزلیات کو دیکھ کر یہ بات بے جھجک کہی جاسکتی ہے کہ اردو غزل غالب کے بعد بھی ارتقا پذیر رہی ہے۔ اس میں ہر دور کی زندگیاں پورے طور پر نمایاں نظر آتی ہیں۔ اور جذبے کی ادائیگی باقاعدہ طور پر نکھرتی اور سنورتی رہی ہے۔

حالی بہت اچھے غزل گو تھے اور غالب ان کے مداح تھے لیکن حالی کے نزدیک غزل کچھ بے وقت کی راگنی تھی۔ انہوں نے شہر میں سب سے الگ دکان کھول لی، یہ خیال کئے بغیر کہ اکثر گاہک بے خبر ہیں لیکن اس یقین کے ساتھ کہ ان کا نایاب مال ضرور ایک دن گاہکوں کو اپنی طرف متوجہ کرے گا۔ حالی نے سر سید تحریک سے متاثر ہو کر اور مغربی ادبیات کا بالواسطہ مطالعہ کرنے کے بعد غزل کو مردود قرار دیا، اپنے ہمعصر شعرا کو پیغام دیا کہ اب بلبل کی چمن میں ہمزبانی چھوڑ دو، آؤ پیرویٔ مغربی کریں، بس اقتدائے مصحفی و میر کافی کر چکے، لیکن عین اسی دور میں داغ، امیر اور جلال کی غزل کی مقبولیت اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ ہرچند غزل زوال پذیر ہے لیکن سامعین کے مزاج اور مذاق سے زیادہ تعلق غزل ہی کو ہے۔ لیکن حالی، عظمت اللہ خاں اور دوسرے غزل کے مخالفین کی زوردار آواز سے اتنا ضرور ہوا کہ غزل کی اصلاح کا راستہ کھل گیا اور وہ مضامین جن کے لئے "پچوڑی ہوئی ہڈی" جیسے الفاظ استعمال ہونے لگے تھے یا تو یکسر ختم کر دئے گئے یا ان کی پیشکش کا انداز یکسر بدل گیا اور وہ سطح جس میں سستی جذباتیت تھی یا لفظی شعبدہ بازی وہ قطعی طور پر بدل گئی اور یہ احساس ہونے لگا کہ غزل کا نیا دور شروع ہوا ہے۔

غزل کے اس احیا میں حسرت موہانی کا بڑا ہاتھ ہے۔ حسرت نے غزل کا انتخاب سوچ سمجھ کر اپنے موضوع اور طرزِ اظہار کی مناسبت سے کیا تھا، اس کی روایات کو سمجھا تھا، مختلف اصناف اور اسالیب بیان کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اس وسیع مطالعے کے نتیجے میں غزل ہی ان کو اپنے مزاج کے حسبِ حال نظر آئی، چنانچہ خود بھی اپنے دیوان کے حصہ اول (طبع ثانی) متعلق بہ ضمیمہ الف ۱۹۱۶ء میں لکھا تھا:

> "۱۸۹۳ء اور ۱۹۰۲ء تک کی شاعری کا ایک بڑا مجموعہ نظموں قصیدوں قطعوں غزلوں اور نظمِ انگریزی کے ترجموں کی شکل میں راقم الحروف کے پاس موجود ہے جس کی نسبت گمان یہ تھا کہ نظرِ ثانی کے بعد قابلِ اشاعت ہو جائے گا لیکن بعد میں کچھ تو اس خیال سے ابتدائی کلام کی اصلاح و ترقی کی یہ کوشش کوہ کندن و کاہ برآوردن کی مصداق قرار پائے گی اور کچھ اس لحاظ سے کہ رفتہ رفتہ راقم الحروف کی طبیعت نے اپنے لئے اصنافِ سخن میں غزل کو اپنے حسبِ حال پاکر منتخب کر لیا ہے اس کل مجموعۂ خرافات کو یک قلم نظر انداز کر دیا البتہ چند غزلیں ضرور رہنے دیں لیکن ان کو بھی اپنے ابتدائی لباس میں بلا اصلاح چھوڑ دیا تاکہ اہلِ نظر کو ان کے مطالعے سے راقم الحروف کے مذاقِ سخن کی تدریجی ترقی کا اندازہ ہو سکے گا ..."

اشعار میں بھی اس کا اظہار کیا ہے کہ ؎

عشق حسرت کو ہے غزل کے سوا
نہ قصیدے نہ مثنوی کی ہوس

ایک نقاد کا کہنا ہے "حسرت کی شاعری یکسر جذبات کی شاعری تھی جو عمر کے مختلف حصول کے ساتھ ساتھ ابھری ٹھہری اور ختم ہوگئی۔"
معلوم نہیں جذبات کی شاعری سے ان کی کیا مراد ہے لیکن اتنا تو ماننا پڑتا ہے کہ ۲۳ء۲۴ء کے بعد کی بہت کم غزلیں ایسی ہیں جو حسرت کے اپنے مرتبے کی ہیں، بڑھاپے میں ان کی غزل بھی روبہ زوال رہی تھی۔ صرف قافیہ پیمائی والی بات محسوس ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے حسرت کی غزل کا زمانہ اواخر انیسویں صدی سے ربع اول بیسویں صدی تک ہے حسرت کی ایک ابتدائی غزل کے چند اشعار دیکھئے (نیا زفتح پوری اسے ان کی اولین غزل قرار دیتے ہیں)

میں تو سمجھا تھا قیامت ہوگئی	خیر پھر صاحب سلامت ہوگئی
مسجدوں میں کون جائے واعظا	اب تو اک بت سے ارادت ہوگئی
ان کو سب معلوم تھی طرز جفا	غیر کی صحبت قیامت ہوگئی

نومشقی، فنی ناپختگی اور رسمی انداز کے علاوہ ان کی اول دور کی شاعری میں احساس کی وہ شدت، لہجے کی وہ نرمی، گداز اور دھیما پن کہیں بھی محسوس نہیں ہوتا جو ان کی غزل کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غزل کا بنیادی عنصر یعنی محبوب کی شخصیت ابھی ان پر سوار نہیں ہوئی۔ ابھی وہ حسن نہیں ملا تھا جس میں گم ہو جانے کی بات ہو، ابھی وہ موضوع نہیں ملا تھا جس کو وہ اپنے اندر جذب کر لیتے، ابھی وہ زندگی نہیں ملی تھی جس کو وہ اپنا لیتے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کے مطالعے میں بھی اتنی وسعت نہیں آئی تھی جس سے بعد میں ان کو بہت سہارا ملا اور جس کا اظہار بارہا خود بھی کیا ہے ؎

غالب و مصحفی و میر و نسیم و مومن
طبع حسرت نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض

اول دور کے ذکر کے ساتھ ہی ان کے آخر دور کا ذکر بھی دیا جائے تو محسوس ہو جائے گا کہ اس دور میں کتنا پھیکا پن پیدا ہو گیا تھا، ان کے جذبات کس قدر سرد ہو گئے تھے ؎

اس شوخ کا شکوہ کیا حسرت یہ تو نے کیا کیا
اس سے تو اے مرد خدا بہتر تھا مرجانا ترا
دل ان سے مل کے اب ان کو بھلا نہیں سکتا
مگر یہ کیوں ہے میں خود بھی بتا نہیں سکتا

اس لئے ہماری زیادہ تر بحث ان کے اس دور شاعری سے ہے جو ۲۳-۲۴ء تک ختم ہو جاتا ہے۔ ایک نہایت نمایاں بات یہ بھی ہے کہ حسرت کے مزاج کا تلون اور رندانہ اور ان کی طبیعت کی بے باکی اور بے ساختگی اور لطیفہ سنجی ان کے مزاج میں انسانیت اور انسان پرستی کا جذبہ تھا اس سے بھی ان کی غزل کو بڑی مدد ملی جس سے اس صنف میں ایک آفاقی رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ غزل کے مزاج کی نفاست اور لطافت، روایتی ایمائیت، اثر اور غنائی کیفیت یہ سب باتیں جس طور پر ان کی غزل میں ۲۳-۲۴ء سے پہلے نظر آتی ہیں، دور آخر میں محسوس نہیں ہوتیں۔
حسرت کی غزل کا موضوع عشق و معاملات عشق اور حسن و متعلقات حسن ہے کہا جا سکتا ہے کہ حسرت ہی پر کیا موقوف ہے پوری غزل اسی سے عبارت ہے لیکن غالب اور اقبال کی غزلیں اس اعتراض کا جواب بن سکتی ہیں۔ ایک عظیم غزل گو کے نزدیک زندگی صرف حسن و عشق ہی نہیں، خود حسرت کی زندگی گواہ ہے کہ ان کا محبوب ہی سب کچھ نہیں ہے بلکہ اور بھی مسائل ہیں جو ان کے محبوب رہے لیکن ان کی غزل میں ان کا کہیں پتہ نہیں چلتا اور اگر کہیں تذکرہ آ بھی گیا ہے تو تغزل کا عنصر غالب رہتا ہے۔ اس میں وہ رس، وہ نکھار اور چاشنی نہیں جو محبوب کے بیان کے وقت محسوس ہوتی ہے۔ حسرت اپنے اور اپنے محبوب کے ذکر کو کئی کئی پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں۔ اس میں کبھی کبھی وہ اساتذہ کا رنگ بھی اختیار

کر لیتے ہیں لیکن مجموعی طور پر ان کا کردار کچھ اس انداز سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک سچے عاشق کی طرح وہ اپنے محبوب ہی کے ہو کر رہ جاتے ہیں، وہ اس کو مادی اور روحانی طور پر اپنے قریب ہی دیکھنا چاہتے ہیں، اس کی ایک ایک ادا سے واقف ہیں۔ جب وہ ان کی طرف سے نظر التفات ہٹا لیتا ہے تو یہ انہیں دھمکی بھی دیتے ہیں کہ ہم کسی اور کو پسند کر لیں گے جس سے اس میں پھر سے توازنِ عمل پیدا ہو جاتا ہے۔

حسرت کی غزلوں سے ان کے عشق کی داستان مرتب کی جا سکتی ہے یعنی کامیابی سے پہلے اور کامیابی کے بعد ساری داستان ان غزلوں میں موجود ہے۔ عشق کی ابتدا کے سلسلے میں ان کی ایک مشہور غزل ہے۔ اس میں انہوں نے جزئیات نگاری سے اپنے ان ایام کی تصویرکشی کی ہے جب وہ متوسط مسلم گھرانے میں رہنے کی وجہ سے کھل کھیل نہیں سکتے تھے۔ جب ان پر بہت سی سماجی بندشیں تھیں اور وہ ان بندشوں کو توڑ نہ سکتے تھے۔ اور نہ ان کو توڑنے کی ضرورت ہی محسوس کرتے ہوں گے ؎

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے	ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے
باہزاراں اضطراب و صد ہزاراں اشتیاق	تجھ سے وہ پہلے پہل دل کا لگانا یاد ہے
بار بار اٹھنا اسی جانب نگاہِ شوق کا	اور ترا غرفے سے وہ آنکھیں لڑانا یاد ہے
تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بے باک ہو جانا مرا	اور ترا دانتوں میں وہ انگلی دبانا یاد ہے
کھینچ لینا وہ مرا پردے کا کونا دفعتاً	اور دوپٹے سے ترا وہ منہ چھپانا یاد ہے

یہ انداز بالکل نیا ہے۔ اس سے پہلے ایسی فضا اردو غزل میں نظر نہیں آتی۔ یہ محاکاتی انداز پہلے کہیں نہیں ملتا۔ یہ آئیں بائیں، روٹھنا، پھر خود ہی صلح پر آمادہ ہو جانا اور اس طرح کی دوسری "رسم پابندیٔ اوقات" کی باتیں اردو غزل کے لئے نئی ہیں لیکن یہ خالص مقامی اور واقعاتی ہیں اس لئے مانوس ہیں۔ شاعری کو تخیل اور محاکات کا مجموعہ کہا گیا ہے۔ حسرت کے ہاں زیادہ رنگ محاکات کا ہے۔ ان کے اشعار سے بہت خوبصورت اور متحرک تصویریں بنتی ہیں ؎

جان کر سوتا تجھے وہ قصدِ پابوسی مرا
اور ترا ٹھکرا کے سر وہ مسکرانا یاد ہے

اور واقعیت کا اظہار یوں ہوتا ہے ؎

غیر کی نظروں سے بچ کر سب کی مرضی کے خلاف	وہ ترا چوری چھپے راتوں کو آنا یاد ہے
آ گیا گر وصل کی شب بھی کہیں ذکرِ فراق	وہ ترا رو رو کے مجھ کو بھی رلانا یاد ہے
دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لئے	وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

حسرت اپنے اس پہلو کے بیان میں بہت بے باک ہیں جس کو وہ اپنے "عہدِ ہوس کے فسانے" کا نام دیتے ہیں۔ وہ اس عہد کو "با وجود ادعائے اتقا" یاد رکھتے ہیں، اپنے آغازِ الفت کے قصے مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں، انہیں ان قصوں میں بہت رنگینیاں نظر آتی ہیں۔ اور وہ دوسروں کو بھی ان رنگینیوں میں جھانکنے تاکنے کی اجازت دیتے ہیں ؎

یاد ہیں وہ سارے عیشِ با فراغت کے مزے
دل ابھی بھولا نہیں آغازِ الفت کے مزے
حسن سے اپنے وہ غافل تھے میں اپنے عشق سے
اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے
صحتیں لاکھوں مری بیماریٔ غم پر نثار
جس میں اٹھے بارہا ان کی عیادت کے مزے

ماضی کو یاد کرتے وقت ان کے لہجے میں غم، یاس اور شکست کا احساس کہیں بھی نہیں ہوتا جیسے وہ اپنے عشق میں کامیاب رہے ہوں۔ وہ ان یادوں کو اس لئے تازہ رکھتے ہیں کہ ان میں حسن ہے اور حسن کو پانے کی آرزو ہے لیکن اظہار میں جو شائستگی اور توازن ہے اس سے بھی یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کو اپنی محبت میں ناکامی نہیں ہوئی۔ اس لئے بھی کہ ان کے ہاں رقیب کا کوئی ایسا کردار نہیں۔

اب ان کا محبوب ان کے قریب ہے، اس لئے اس کا ہر رنگ دیکھنے کا انہیں موقع ملتا ہے۔ وہ اس کے حسن سے ہر رنگ میں کیف اٹھاتے ہیں ؎

طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا ——— رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا

یا مثلاً ؎

رونقِ پیرہن ہوئی خوبیٔ جسم نازنیں — اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا

کیا کیجئے بیاں اس تنِ نازک کی حقیقت — خوشبو میں ہے گل بو تو لطافت میں ہو سب رنگ

اور کبھی کبھی یہ رنگ بھی اختیار کر لیتے ہیں ؎

یاد بھی دل کو نہیں صبر و سکوں کی صورت — جب سے اس ساعدِ سیمیں کو کھلا دیکھا ہے

حسرت جب بھی اپنے محبوب کے حسنِ ظاہری کا ذکر کرتے ہیں تو کبھی کبھی تو ان کی عملی زندگی کو پیشِ نظر رکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان کا محبوب ان کے پاس ہی کہیں سو رہا ہو اور وہ پاس بیٹھے اپنے ادبی سیاسی کام میں مشغول ہوں۔ حسرت نے جہاں کہیں بھی اپنے واردات عشق بیان کئے ہیں وہاں ان کی سادگی، خلوص اور واقعہ نگاری کا معتقد ہونا پڑتا ہے۔ جیسے وہ صرف انہی واقعات و کوائف کو بیان کرتے ہیں جو اُن کے عینی مشاہدہ میں آچکے ہوں۔ اس عہد میں کئی ایسے واقعات بھی رونما ہوتے ہیں جب محبوب سے ناخوشگواری بھی پیدا ہو جاتی ہے، جب یہ ان سے یا وہ ان سے ترکِ تعلق تک کی سوچتے ہیں لیکن ایسا ہونا ان کو ممکن نظر نہیں آتا ؎

توڑ کر عہد کرم ناآشنا ہو جائیے — بندہ پرور جائیے اچھا خفا ہو جائیے

میرے عذرِ جرم پر مطلق نہ کیجے التفات — بلکہ پہلے سے بھی بڑھ کر کج ادا ہو جائیے

مجھ سے تنہائی میں گر ملئے تو دیجے گالیاں — اور بزمِ غیر میں جانِ حیا ہو جائیے

جی میں آتا ہے کہ اس شوخِ تغافل کیش سے — اب نہ ملئے پھر کبھی اور بے وفا ہو جائیے

بھول کر بھی اس ستم پرور کی پھر آئے نہ یاد — اسقدر بیگانۂ عہدِ وفا ہو جائیے

لیکن آخر میں بات یہاں پہنچتی ہے ؎

ہائے ری بے اختیاری یہ تو سب کچھ ہو مگر — اس سراپا ناز سے کیوں کر خفا ہو جائیے

اس ساری غزل کی ناراضگی میں جو اپنائیت کا انداز ہے اور عاشق کا متوازن ذہن نظر آتا ہے وہ اردو غزل میں اس سے پہلے کہیں محسوس نہیں ہوتا یہ خصوصیت حسرت کی ایک عام خصوصیت ہے۔ چند اشعار اور بھی دیکھئے ؎

روشِ حسنِ مراعات چلی جاتی ہے — ہم میں اور ان میں وہی بات چلی جاتی ہے

اس ستمگر کو ستمگر نہیں کہتے بنتا — سعیٔ تاویلِ خیالات چلی جاتی ہے

لہجے میں توازن اور ٹھہراؤ اور پھر جذبے اور ذہن میں کامل ہم آہنگی، ان کے ہاں ہر جگہ موجود ہے ؎

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن وہ اکثر یاد آتے ہیں — الٰہی ترکِ الفت پر وہ کیوں کر یاد آتے ہیں

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی — مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

ہر اچھے غزل گو شاعر کے ہاں ایک مخصوص فضا بنتی ہے۔ اس فضا میں ایک خاص کردار جنم لیتا ہے جو یا تو شاعر کی شخصیت ہوتی ہے یا اس کا نصب العین جس تک وہ خود پہنچ کر اس کا ہمسفر بننا چاہتا ہے۔ حسرت کے ہاں دیسی معاشرے کے متوسط مسلم گھرانے کا ایک شریف زادہ نظر آتا ہے جو بنتِ عم سے محبت کرتا ہے، اس سے چوری چھپے ملتا ہے اور والہانہ محبت کرتا ہے، جسے ہجر کی طویل راتوں سے کم ہی سابقہ پڑتا ہے اور جو بالآخر اپنی محبت

میں کامیاب رہتا ہے۔ اس کی زندگی نارمل طریق پر گذرتی ہے۔ وہ نہ جنگلوں میں مارا مارا نہ گلیوں میں پاگلوں کی طرح آوارہ پھرتا ہے جس پر غالب کی یہ بات صادق آئے ؎

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

وہ ایک اوسط گھرانے میں باسلیقہ اور ہوشمند انسان کی طرح دن گذارتا ہے۔ وہ اپنی محبوب کو رفیقۂ حیات بناتا ہے اور اس پر مطمئن رہتا ہے۔ اس کردار میں اعتدال ہے، توازن ہے، ٹھہراؤ ہے۔ وہ سکون ناآشنا نہیں البتہ اس کے پاس دھڑکتا ہوا دل ضرور ہے۔ اس پر جنونی کیفیت طاری نہیں ہوتی۔ وہ اپنے ہوش وحواس قائم رکھتا ہے۔ وہ جو قدم بھی اٹھاتا ہے سوچ سمجھ کر اٹھاتا ہے۔ وہ سماج کے خلاف بغاوت نہیں کرتا اور نہ اسکو بغاوت کی ضرورت ہی پیش آتی ہے۔

اسی طرح حسرت کی شاعری میں محبوب کا تصور بھی نیا ہے۔ وہ بھی معاشرے کے متوسط گھرانے کی ایک عورت ہے جو حسرت سے بے پناہ محبت کرتی ہے، وہ دوپہر کی دھوپ اور ننگے پاؤں کا خیال کئے بغیر عاشق سے ملاقات کو آتی ہے۔ وہ آغازِ الفت میں سامنے سے ہونٹ کاٹ کر نکل جاتی ہے، وہ حنا لگاتی ہے، زیور پہنتی ہے۔ آغاز میں پردہ کا خاص خیال رکھتی ہے لیکن اس دوران میں بھی کبھی کبھی عمداً یا چلمن سے باہر نظر آجاتی ہے۔ اس کو اپنی رسوائی کا ڈر ہے لیکن ایسا بھی نہیں جیسا کہ مثلاً "زہرِ عشق" کی ہیروئن کو۔ اس میں اعتدال پسندی اور وفاداری ہے۔ اس کا کردار اس طوائف کے کردار سے کتنا زیادہ دلکش ہے جو حسرت سے پہلے ہمارے ہاں غزل میں نمایاں حیثیت اختیار کئے ہوئے ہے اور اکثر جس کا مقام ہیروئن کا ہے، یا پھر حسرت کی یہ ہیروئن عورت کے اس کردار سے کتنی زیادہ جاندار ہے جو پہلے غزل کے پس منظر میں پڑی رہی ہے اور پردے سے کبھی باہر نظر نہیں آتی۔ جس کا کوئی عملی پہلو نمایاں نہیں ہوتا لیکن اس کے برعکس حسرت کی یہ ہیروئن کتنی ہی باتوں میں اس کی معاون بنتی ہے۔

حسرت کی غزل کے یہ کردار ایک دوسرے پر مکمل بھروسہ رکھتے ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے لئے جیتے ہیں جبکہ اس سے پہلے کے کردار ایک دوسرے کے لئے زندہ رہنے کی بات شاذ ہی کرتے تھے۔ یہ نارمل انسان جو عاشق کے روپ میں حسرتؔ کی غزل کا ہیرو ہے عاشق کے اس تصور سے کتنا مختلف ہے جس کی خصوصیت بے اعتدالی اور بے راہ روی ہے، جو سینکڑوں ہزاروں رقیبوں ہی پر بات ختم نہیں کرتا بلکہ بسا اوقات خدا کو بھی رقیب تصور کر لیتا ہے۔ اس غیر عادی (Abnormal) انسان کے لئے صحت مند نظریات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جو ہر وقت "عشق" میں غرق رہتا ہے، جس کو وسیع تر زندگی اور اس کے امکانات سے قطعی طور پر کوئی غرض نہیں، جس کو ہر وقت شکوہ رہتا ہے۔ محبوب سے، رقیب سے، خدا سے، آسمان سے، حتیٰ کہ اپنے آپ سے بھی وہ ہر وقت بیزاری کے عالم میں رہتا ہے اور جس پر ہر وقت شکست خوردگی کا عالم طاری رہتا ہے۔ اس کے برعکس حسرت کے ہاں ایک صحت مند اور کشادہ فضا کا احساس ہوتا ہے جس میں صحت مند کردار زندگی گذارتے ہیں۔

اوپر جو اشارات کئے گئے ہیں ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اردو غزل میں حسرت کی انفرادیت کیا ہے، اور اس کی غزل کے امتیازی نشانات کیا ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ حسرت موہانی عظیم شاعر نہیں تھے۔ ممکن ہے وہ اپنی پوری زندگی کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے تو عظیم شاعر بن جاتے اور ہم میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کی صف میں حسرت کا نام بھی لے سکتے۔ لیکن اس سے حسرت کے مقام پر کوئی حرف نہیں آتا۔ وہ ایک منفرد غزل گو ہیں۔ انہوں نے زندگی کے بوقلموں پہلوؤں کو اپنا موضوع نہیں بنایا، انہی وسیع زندگی کے صرف جنیاتی پہلو کو ہی اپنی شاعری میں جگہ دی۔ ان کی غزل میں ہمیں اس زندگی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں جو بیسویں صدی کے نصف اول کی مسلم سوسائٹی کے گھرانوں سے مخصوص ہے۔ جس میں بیمار ذہنیت کام نہیں کرتی، جس میں زندگی کا نشاطیہ پہلو ملتا ہے، جس میں مشقِ سخن بھی جاری رہتی ہے اور چکی کی مشقت بھی۔

حسرت کی غزل کی صحت مند فضا کے یہ دونوں کردار مثبت ذہنیت کے مالک نظر آتے ہیں۔ اسی لئے ان میں جاذبیت بھی ہے۔ ان میں بلند نصب العینیت یا عظمت نہ سہی لیکن ان کی صحت مندی، خوش سلیقگی اور اچھے شہری ہونے پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نہ خلاؤں میں رہتے ہیں نہ تحت الثریٰ میں۔ ان کی سطح ارضی ہے، اس لئے کہ یہ متوازن ذہنیت کے حامل ہیں۔ حسرت کی غزل کا یہی پہلو ان کو انفرادیت بخشتا ہے۔

جمیل الدین عالی

ایک نگاہ بے حضور ایک نگاہ باریاب
یا دوام ہو سکوں یا دوام اضطراب

آج بھی مرے خیال بے حصول و بے مآل
آج بھی مرے سوال ناقبول و بے جواب

بجھ گئی ہے آرزو تھک چکی ہے جستجو
کتنے گل ہیں بے نمو کتنے جام بے شراب

اس کے ساتھ عمر بھر اپنی یوں ہوئی گذر
ایک آہ بے اثر ایک نماز بے ثواب

مے بھی جب کبھی ملی ساتھ تشنگی ملی
ایک زندگی ملی وہ بھی یوں رہی عذاب

تا بکے رہیں گی یاد چند مہربانیاں
میری بدگمانیاں بے شمار و بے حساب

اب وہ شوخ عشوہ گر کچھ نہیں رہا مگر
میں تمام اشتیاق وہ تمام اجتناب

کوئی جانتا نہیں کوئی مانتا نہیں
تیرے ساتھ رہ کے بھی ہم ہوئے بہت خراب

ماہِ نو کراچی۔ جون ۱۹۵۹ء

مثنویاتِ ہیر و رانجھا

قاضی یوسف حسین صدیقی

مغربی پاکستان خصوصاً مغربی پنجاب و سندھ میں علی العموم ایک ہم رنگ متجانس قسم کی ثقافت کا رواج رہا ہے۔ جو درحقیقت اس علاقے کی مشترکہ اسلامی زندگی اور تہذیب و معاشرت کا لازمی نتیجہ اور ثمرۂ شیریں ہے۔ چنانچہ مذہب و ایمان ہو یا سلوک و عرفان، فلسفہ و حکمت ہو یا علوم و فنون، تصورِ حیات ہو یا عملی زندگی۔ کشمیر اور خیبر سے لیکر کراچی تک جہاں سندھ کی موجیں اپنا سفر ختم کرتی ہیں، یکرنگی کی ایک خوش آیند ہمہ گیر کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ اور یہی اُن بے شمار قصّے کہانیوں اور رومانوں میں بھی منعکس ہے جو سندھ کی اس وادیٔ کبیر کی روحِ رواں ہیں۔ یہ قصّے کہانیاں اور رومان یہاں کی تندرست و توانا اور ولولہ انگیز زندگی کا ایک نہایت ہی شاندار پہلو ہیں اور ان کی کثرت بھی اتنی ہی حیرت آفریں ہے جتنی ان کی افسانوی دلکشی و دلآویزی۔ یہ رومان اس کی بھرپور زندگی کے سینے سے ابھرتے ہیں۔ اسی لئے ان میں وہ سوز، وہ حرارت، وہ کیف و رنگ، وہ شانِ دلربائی اور "ہرچہ از دل خیزد بر دل ریزد" والی کیفیت بھی ہے جو تمام انسانی طربوں اور المیوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہ یہاں کی آب و ہوا اور اس کے سراپا حیات ساکنوں کا جبلی فیضان ہی ہے جس نے گوناگوں اثر انگیز و معنی خیز داستانوں کی شکل اختیار کی ہے جن کو سالہا سال گزر جانے کے باوجود ہم اپنے دل و دماغ میں جگہ دیئے ہوئے ہیں اور اپنے سینوں سے لگائے پھرتے ہیں۔ سرحد ہو یا پنجاب، سندھ ہو یا بلوچستان، ان داستانوں کی مقبولیت یکساں ہے۔ اور سب نے ان کو اپنے اپنے رنگ میں رنگنے، اپنے دل و جان میں سمونے اور مختلف طریقوں سے مختلف مقاصد کے لئے برتنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی گونج ہمالہ کی برفانی چوٹیوں سے لیکر دور دور تک پھیلے ہوئے میدانوں اور متموج سمندروں تک سنائی دیتی ہے۔

ان داستانوں میں سے ہیر رانجھا کی داستان خاص طور پر مقبول ہے اور ہم اس کو بجا طور پر سارے مغربی پاکستان کی داستان کہہ سکتے ہیں اور اسکے قبولِ عام اس کے نفوذ و تاثیر کا یہ عالم ہے کہ یہ اپنی زادبوم سے گزر کر برصغیر میں بھی دور دور تک پہنچ چکی ہے۔ مغربی پاکستان کے لوگ جہاں جہاں گئے اس پرلطف اور رُلا دینے والی داستان کو اپنے ساتھ لیتے گئے۔ اور اپنی سحر نوائی سے اس کو سب کی داستان بنا دیا۔ اس تاثیرِ عام ہی کا اعتراف کرتے ہوئے تو انشا نے کہا تھا کہ ؎

سنایا رات کو قصہ جو ہیر رانجھے کا
تو اہلِ درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

یہاں تک کہ عوام سے گزر کر اس کا سلسلہ خواص تک جا پہنچا۔ چنانچہ شاہ ظفر نے بھی غالباً ہیر رانجھا کی حرماں نصیبی سے کلام میں سوز و گداز پیدا کیا ہے۔ شاید اس قبولِ اثر کا سب سے دلچسپ پہلو اور بھی زیادہ دور پورب کے قصبات و دیہات میں نظر آتا ہے۔ جہاں اس کا میٹھا جادو کچھ اور ہی رنگ رس پیدا کرتا اور دلوں کی گہرائیوں میں اتر کر وجدانی کیف و سرور اور سکون و راحت کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ دوآبے کی نچلی جاتیوں میں سادنی خون کو گرمانا اور بھڑکانا ہو تو آلہ اودل کی مخصوص لے کا دھن ہی کام آتی ہے اور وہ پرانے پشتینی تربیت راٹھور اور چوہان جوش کے مارے اچھل اچھل کر ایک دوسرے پر لپکنے کو تیار ہوتے ہیں یہاں تک کہ اکثر سر پھٹول تک بھی نوبت پہنچ جاتی ہے۔ ایسے میں سے کار دفعتاً ٹھاٹھ بدل دیتا ہے اور "ڈھولا" یعنی ہیر رانجھا کا سر ملا دیتا ہے۔ رگ رگ میں مستی اور جادو بھرا نشہ پیدا کرتا ہے اور اس رومانوی کیف کا اچرج اثر دیکھئے کہ وہی لوگ جو تھوڑی دیر پہلے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، محبت کے نشہ میں جھوم جھوم کر ایک دوسرے سے محبت کے مارے اٹھ اٹھ کر گلے ملتے ہیں اور سرمستانہ رہِ وادیٔ خیال طے کرتے ہوئے خبر نہیں کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔

اگر ہیر رانجھا کی داستان اپنے اصلی دیس سے دُور ایسا جادو جگا سکتی ہے۔ تو خیال کیا جا سکتا ہے کہ اس کا اپنے دیس کے باسیوں پر کیا اثر ہوگا۔ وہی جو ہیر وارث شاہ کے رسیلے اور چٹیلے کلام سے گاؤں گاؤں، شہر شہر گونجتی تانوں اور میٹھے الاپوں سے ظاہر ہوتا ہے اور جس کے متعلق ایک شاعر نے کہا ہے کہ ؎

وہ جنہیں کچھ ہیر کا حصّہ زبانی یاد ہے
ان کی پُرتاثیر تانوں سے فضا آباد ہے

اور یہی وجہ ہے کہ جب سے ہیر رانجھا کا قصہ سننے میں آیا ہے کتنے ہی شاعروں نے اس کو اپنے اپنے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس کا سلسلہ داستانی یا غنائیہ شکلوں میں آج بھی جاری ہے۔ اور ایسے کتنے ہی لوک گیت یا باریں ہوں گی جن میں بڑے پُرلطف طریقے سے ہیر رانجھا کی البیلی مگر ناکام حسرت انجام محبت کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔ پنجاب تو خیر اس کا اصلی وطن ہے، اس لئے وہاں اس کا نئے نئے پیرایوں میں ابھرنا اور پروان چڑھنا قدرتی بات ہے ہی، اور دامودر، بھائی گورداس بھلا، گوبند سنگھ، احمد، گورداس، شاہ چراغ اور مقبل نے یکے بعد دیگرے اس قصہ کو نظم کا جامہ پہنایا ہے، اور آخر میں وارث شاہ نے اس کو ایسے طمطراق سے نظم کیا کہ اس کے سامنے دوسری سب کوششیں گہنا گئیں اور اس کا نقش لوگوں کے ذہن پر کچھ اس طرح جم گیا کہ صرف اسی کی ہیر ہی کو ہیر سمجھا جانے لگا۔ اس کے باوجود قصہ کی دلکشی کم نہ ہوئی اور وارث شاہ کے بعد بھی پنجاب کے کتنے ہی شاعروں، جن میں سے احمد یار، سید فضل شاہ، اور میاں مولا بخش کشتہ زیادہ مشہور ہیں، نے اس کا سلسلہ بصد ذوق و شوق جاری رکھا۔

ہوتے ہوتے بات دوسری بولیوں تک بھی پہنچی۔ بلوچی میں تو خیر صرف ہیر رانجھا کے بارہ میں ایک مختصر سی روایت ہی بیان کی جاتی ہے لیکن سندھ کا دیس پنجاب سے جہاں اور باتوں میں سانجھا ہے، وہاں قصے کہانیوں میں بھی سانجھا ہے۔ چنانچہ سسی پنوں، سوہنی مہینوال وغیرہ سندھ اور پنجاب کا مشترکہ ورثہ ہیں اور سرائیکی اور سندھی میں ہیر رانجھا کا تذکرہ عام ہے۔ چنانچہ بلھا شاہ اور خواجہ غلام فرید ان کا خیالی یا روحانی عشاق کے طور پر بار بار ذکر کرتے ہیں۔ ادھر خالص سندھی شعراء مثلاً سچل سرمست اور فقیر حمل کے ہاں بھی ان کا ذکر عام ہے۔ ایسے اشعار کو اصطلاحاً "کافی" کہتے ہیں۔ ایک شخص حاجی احمد بخش خادم نے سندھی میں ہیر کا ایک "نمائش نامہ" لکھا ہے اور سید حیدر شاہ اور فقیر غلام نے تو اس کی پوری داستان نظم کر ڈالی ہے۔ ادھر خلیفہ نبی بخش نے ان کے بارہ میں ایک "سی حرفی" بھی تصنیف کی ہے۔

یہ ممکن نہ تھا کہ ہیر کی داستان کسی نہ کسی طرح سے اردو، فارسی، انگریزی اور دوسری زبانوں تک نہ پہنچے۔ یہ ایک طویل داستان ہے لیکن سندھ میں جو مثنویاتِ ہیر و رانجھا فارسی میں لکھی گئیں۔ وہ مغربی پاکستان میں ذہنی و ثقافتی اشتراک کے اعتبار سے خاص اہمیت رکھتی ہیں اور ایک ایسے قصہ کو پیش کرنے کی بنا پر جو مغربی پاکستان میں اس قدر مقبول ہے اور اب اردو میں تمام و کمال ترجمہ ہو کر مشرقی پاکستان اور کل برصغیر میں پہنچنے کو ہے، ان کی دلچسپی و اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ خوش قسمتی سے یہ تمام مثنویاں ایک مجموعہ کی شکل میں منظر عام پر آچکی ہیں جس کو "سندھی ادبی بورڈ" نے بڑی خوش اسلوبی سے ترتیب دیا ہے۔ اور ایک مبسوط مقدمہ میں "ہیر رانجھا" کے عہد بعہد مظاہر کے بارہ میں مفصل معلومات بہم پہنچائی ہیں۔

اس جگہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ ان مثنویات کا کسی قدر وسیع فنی و معنوی جائزہ لیا جائے تاکہ ہم اپنے مشترکہ ثقافتی ورثہ کا زیادہ کامیابی سے اندازہ لگا سکیں۔

ان مثنویوں کا سلسلہ لوٹ پھر کر اس دیس تک ہی پہنچتا ہے جہاں قصہ کا آغاز ہوا۔ فارسی مثنویات کے جائزہ کو زیادہ بھرپور بنانے اور انکے پس منظر اور خد و خال کو اجاگر کرنے کے لئے ان ابتدائی فارسی مثنویوں اور نثری داستانوں پر ایک سرسری نظر دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔ ڈاکٹر محمد باقر کی رائے میں قصہ اس قدر دلفریب اور مشہور تھا کہ فارسی شعراء نے پنجابی شعراء کی بہ نسبت اس کی طرف پہلے توجہ کی اور بہت سوں کا دعویٰ ہے کہ سب سے پہلے انہوں نے یہ قصہ تحریر کیا یا یہ ان کا طبعزاد ہے۔ تعجب یہ ہے کہ ان میں سے اکثر اس کو کسی نہ کسی کی فرمائش پر ہی تحریر کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ وارث شاہ نے بھی کسی مینہ بھاگ بھری کے عشق سے مجبور ہو کر نہیں بلکہ احباب کی فرمائش پر یہ قصہ جوڑا ہے اور کسی راوی کے بیان کا سہارا لیکر۔ یہ اُن تمام نظریوں کی نفی کرتا ہے جو تخلیقِ فن میں ذاتی تجربہ یا خلوص کو ضروری قرار دیتے ہیں۔

حفیظ ہوشیارپوری کی رائے میں، جنہوں نے سندھ کی فارسی مثنویات ہیر رانجھا کو تصحیح و مقدمہ کے ساتھ ترتیب دیا ہے، گورداس کی پنجابی تصنیف ۲۱۔۱۱۱۲ھ مطابق ۱۷۰۹ء سے پہلے فارسی میں کم از کم چار مثنویاں یا منثور داستانیں لکھی گئیں۔ ابتدائی مثنویات کی تفصیل یہ ہے:-

(۱) مثنوی باقی : ۱۰۴۱ - ۹۸۸ھ (۱۶۰۵ - ۱۵۸۰ء)

(۲) افسانۂ دلپذیر۔ سعید سعیدی مابین ۶۸ - ۱۰۳۷ھ (۵۷ - ۱۶۲۷ء)

(۳) عشقیۂ پنجاب یا قصۂ ہیر و ماہی۔ میتا پسر درویش چنابی ۔ ۱۱۱۰ھ (۱۶۹۸ء)

(۴) راز و نیاز۔ فقیر اللہ آفریں۔ ۱۱۴۳ھ (۱۷۳۰ء)

(۵) داستان ہیر و رانجھا از نواب احمد یار خاں یکتا۔ ۴۷۔۱۱۱۸ھ (۴۳۔۱۷۰۶ء)۔
(۶) مثنوی ہیر رانجھا۔ میر قمر الدین منت دہلوی۔ ۱۱۵۲ھ (۱۷۴۶ء)
(۷) مثنوی گلشن راز عشق و وفا منشی سندر داس آرام پنجابی ۱۱۷۳ھ (۱۸۵۹ء)
(۸) مثنوی لائق۔ جس کے خاتمہ پر اس کو امیر خسرو کی تصنیف قرار دیا گیا ہے۔ لیکن در اصل اس کا مصنف ہمت خان، اس کا بیٹا خان جہان درباری شاعر محمد مراد جونپوری یا محمد عاشق میں سے کوئی ایک تھا۔

محض نثر میں، یا مخلوط داستانیں یہ ہیں:۔
(۱) اولیں منثور فارسی قصہ مصنفہ گوردا‌س کھتری ۲۱۔۱۱۱۳ھ (۱۷۰۹ء) جو دمودر کے پنجابی قصہ پر مبنی ہے۔
(۲) قصۂ ہیر رانجھا، نثر و نظم میں۔ منسا رام خوشابی۔ ۱۱۵۷ھ (۱۷۴۴ء)
(۳) سراج المحبت (نثر) عبرتی عظیم آبادی۔ ۱۲۵۲ھ (۱۸۳۶ء)

ان کے علاوہ ایک مثنوی "نگارین نامہ" ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۱ء) جو نادر شاہ کے بعد لکھی گئی، ایک ایسے شخص کنھیا لال ہندی کے قلم سے ہے جو آگرہ کے ایک قصبہ جلیسر میں پیدا ہوا لیکن اس کی عمر پنجاب ہی میں بسر ہوئی۔ جیسا کہ سجان رائے مصنف "خلاصۃ التواریخ" (۱۱۰۷ھ) نے لکھا ہے "اہل پنجاب .... در محبت و آشفتگی ایں ہر دو (رانجھا و ہیر) نقش ہائے بدلیعہ و اشعار عجیبہ بستہ سرود و نغمۂ دلفریب می کنند"۔ اسی وجہ سے بارہویں صدی ہجری میں پنجاب میں خصوصاً اور ہندوستان میں عموماً یہ قصہ بہت ہر دلعزیز تھا۔ منت دہلوی، لائق اور عبرتی کی تصانیف اس غیر معمولی مقبولیت کی بیّن شہادت ہیں۔

سندھ میں فارسی تصانیف کا سلسلہ ان کے بعد شروع ہوا اور چار مثنویاں، دو نثری داستانیں اور ایک طویل قطعہ فارسی میں لکھا گیا جن کی تفصیل یہ ہے:۔

نظم:
(۱) مثنوی عظیم الدین ٹھٹوی۔ ۱۲۱۴ھ (۱۷۹۹ء)
(۲) مثنوی ضیاء الدین ضیاء۔ ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۰ء)
(۳) مثنوی آزاد۔ ۲۲۔۱۲۱۶ھ (۱۔۱۸۰۱ء)
(۴) مثنوی نواب ولی محمد خاں لغاری۔ مابین ۱۲۲۰۔۱۲۲۶ھ (۲۰۔۱۸۱۱ء)
(۵) طویل قطعہ: فقیر قادر بخش بیدل ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۶ء)

نثر:
(۱) محبت نامہ (نثر مسجع) از منشی شیوک رام عطارد ٹھٹوی مابین ۹۔۱۱۸۵ھ (۷۶۔۱۷۷۱ء)
(۲) داستان نثر: علی بیگ۔ ۱۲۳۰ھ (۱۸۰۵ء) سے پہلے۔

ان تصانیف کا سب سے حیرت انگیز پہلو ان کی تعداد ہے اور پھر داستان کے اصلی وطن سے دور، دوسری زبانوں میں! صرف پنجابی ہی کو لیا جائے تو مستقل کتابوں کی تعداد ساٹھ کے لگ بھگ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "ہیر رانجھا" نے شعرا کے لئے ایک شاہراہ عام کی حیثیت اختیار کرلی ہے اور ایک نہیں دور و نزدیک کتنے ہی "ہیر دوست" موجود ہیں جو اس دلنشیں لے کے رسیا بھی ہیں اور اس کو اور بھی آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔ سب لکھنے والوں نے اس ہر دلعزیز داستان کو اپنے اپنے طور پر بیان کیا ہے، اس میں نئے نئے نکتے بڑھائے ہیں، واقعات میں رد و بدل کیا ہے، ان کو نئے نئے انداز سے ترتیب دیا ہے، نوک پلک پیدا کی ہے، بنایا ہے سنوارا ہے، تصویر میں اپنی اپنی پسند اور شوق کے مطابق طرح طرح کے رنگ بھرے ہیں، طبع آزمائی کی بنیاد قرار دے کر اپنے طبعی جوہروں سے مالا مال کیا ہے اور اس قدر تنوع پیدا کیا ہے کہ انسان ششدر رہ جاتا ہے۔ یہ گوناگوں رنگ آمیزی اور ندرت کاری اپنی مثال آپ ہے۔

ایک ہی موضوع پر مسلسل طبع آزمائی میں تصنع اور نقالی کا احتمال ہے، لیکن شاید یہ بھی ہیر رانجھا جیسے عاشقان صادق کی اولیائی یا اللہ کے

طالبان صادق کے خلوص اور قدرتی استعداد کا نتیجہ ہے کہ اکثر تصانیف اپنے طور پر تازگی و جدت کی حامل ہیں۔ اور ہر شاعر نے اپنا رنگ برقرار رکھا ہے۔ یہ بھی اندیشہ تھا کہ داستان پنجاب کی فضا میں ڈھلی ہونے کی وجہ سے یہیں کی زبان میں ادا کی جا سکتی تھی لیکن ہیر ہر لباس میں ہیر ہی رہتی ہے۔ اس لئے فارسی میں بھی اس کا رنگ روپ کم و بیش برقرار رہا ہے۔ شاعر چلتے نظامی اور خسرو کے نقش قدم پر ہیں لیکن داستان کا سحر اس بدیسی وضع کو اپنا لیتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہیر رانجھا کا فارسی میں لکھا ہوا کوئی قصہ وارث شاہ کی معروف پنجابی بحر، نے یا وضع میں نہیں، حالانکہ ایک اور تصنیف "وقائع پنوں" میں ان سب کا التزام کیا گیا ہے، ملاحظہ ہو :۔

چوں در غم یار نزار بدم، خوں خوار و دل افگار چراں

بظاہر یہ اسی لئے ہے کہ فارسی میں نظامی ہی کی روش پر گامزن ہونے کا دستور تھا۔ جو بحریں بالعموم برتی گئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں :۔

۱۔ خفیف سالم مخبون محذوف —— یکتا۔ عظیم۔ آزاد۔ لغاری

۲۔ ہزج مسدس محذوف
مفاعیلن مفاعیلن فعولن —— منت دہلوی، آرام، کنھیالال ہندی، ضیا

۳۔ ہزج مسدس اخرب مقبوض محذوف
مفعول مفاعلن فعولن —— سعید سعیدی

صرف آفریں نے بحر متقارب سالم مقصور (فعولن فعولن فعولن فعول)، اور بیدل نے بحر مضارع سالم اخرب مکفوف محذوف (مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن) استعمال کی ہے۔ جہاں تک کردار نگاری، فضا، واقعات، تصور، اسلوب اور زبان کا تعلق ہے، شعرا کی راہیں بڑی حد تک الگ الگ ہیں۔ سعید سعیدی میں بیان واقعہ زیادہ اور شاعری کم ہے۔ بیان اور بندش بھی درمیانہ ہے۔ سستیٔ بندش کی یہ علامت کہ مصرع ثانی بھرتی کا ہو یا قافیہ پر مبنی، شدت سے نمایاں ہے اور اس کے ساتھ تسکین اوسط کی بھرمار بھی ؎

بشنو ز سعید تمام ایشاں — شیریں ز شکر کلام ایشاں
عالم ہمہ مبتلائے آں شخص — خوبان جہاں فدائے آں شخص
حسنے عجب میان مردم — افتادہ چہ در زبان مردم

بعض الفاظ کا استعمال بھی عجیب آ پڑا ہے :۔

کشتی بچلاں بآں کنارہ — در عشق خود اضطراب کردی
با چند سہیلیان خوش خو

اس نظم کا بہترین پارہ وہ خط ہے جو ہیر، رانجھا کو لکھواتی ہے :۔

بنویس فراق من بصد درد — صد قصہ ز رنگ چہرۂ زرد
بنویس کہ ایں چنیں خرابم — دور از رخ تو بصد عذابم
بنویس کہ اے جوان بیباک — در ہجر تو باد بر سرم خاک

قصے کا انجام یہ ہے کہ رانجھا بیمار پڑ کر مر جاتا ہے اور ہیر بھی صدمۂ فراق کی تاب نہ لا کر راہئ عدم ہو جاتی ہے۔ اور دونوں ایک دوسرے کے پہلو میں دفن کر دیئے جاتے ہیں۔

لائق کی مثنوی میں چند الفاظ بہت دلچسپ ہیں۔ مالیدہ کے لئے "نقرہ چرب"۔ کیدو کے لئے "بلائے یک پا" اور کاتب کے لئے "قلمزن" ٹھیٹھ کا نام شہدی نظر آتا ہے۔ اور پھر رانجھا کا بہ فراغت خاطر "زہر عشق" آتارنے کا منتر پڑھنا بڑا پر لطف چٹکلہ ہے۔ انجام اس کا بھی دونوں کی وفات ہے۔ صرف پہلو بہ پہلو دفن ہونے کی بجائے سچے عاشقوں کی طرح دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کر دیا گیا۔

مشرقی پاکستان

دیہی نظارہ

بستی

دریائے کرنافلی (رامو ٹاؤن کے پاس)

بازار

خاص وضع کے مکانات
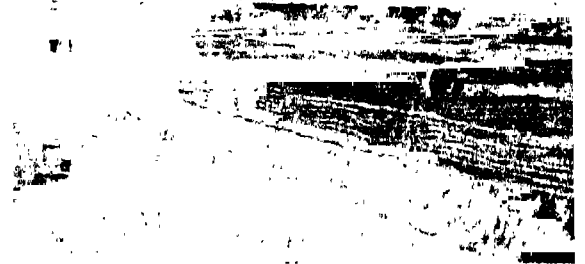
چناؔبی کا قصۂ "ہیر و ماہی" بہ وجوہ سب سے نرالا ہے۔ شاعر ایک دیہاتی تھا اور دیہی فضا میں رسا بسا ہوا۔ اس کی فکر بھی اسی طرح سیدھی سادی ہے۔ اسی لئے اس کو خیالی بندوں اور ان کی موشگافیوں سے سخت نفرت ہے۔ وہ اصلیت کا دلدادہ ہے۔ اس لئے اس کی نظم میں بھی اس کا بھرپور جادو ہے اور قصّے کا پنجابی پن، اس کی فضا، مقامی رسمیں، رنگینیں، طور طریق، رنگ ڈھنگ، پوری طرح ابھرتا ہے۔ چناؔبی بدیسی قصّے کہانیوں سے نفور ہے۔ کردم نہ تتبعِ نظامی ـــــ اور اسی طرح وہ قیس و فرہاد کے قصوں سے گریزاں ہے۔ اُسے اپنے ہی دیس کی خانہ زاد چیزوں سے رغبت ہے۔ اور اس کے لئے ہیر جیسی مٹیار سے بہتر اور کون ہوگا؟ اس نے اپنا مسلک خوب بیان کیا ہے :-

گفتند دگراں زنش چہ گویم	برگِ گل یاسمن چہ بویم
مشغول شدم بہ ہیر و ماہی	چوں خلق بہ وردِ صبحگاہی

خبر نہیں یہ شاعر کی روستائیت کا نتیجہ ہے یا نقل نویس کی فروگزاشت کہ نظم میں جابجا مسامحات ہیں۔ غور سے نظر کرنے پر آخر الذکر احتمال قوی معلوم ہوتا ہے۔ پھر بھی بعض مصرعوں میں وزن سے زیادہ لَے کی طرف میلان نمایاں ہے جو بندش میں عجیب کھلنڈرا پن پیدا کر دیتا ہے یعنی پابندی اور قواعد سے فرار کی بے تکلف کوشش جو تسکینِ اوسط سے کچھ آگے ہے اور پنجابی شعراء کی روش کے مطابق :-

دشوار پسند مردِ کامل	جامع دو صفت رئیس و فاضل
گفت ایں سبب بہر زن و مرد	تفتیش برسئے کو دسکے کرد
ملّا طلبید و طفل را بنشاند	ہر چیز کہ بود خواندنی خواند

چناؔبی کے یہاں نفسِ قصّہ اور اس کی طرح دوسروں سے کافی مختلف ہے۔ وہ پنجاب، ہزارہ یار انجھا کے حسب و نسب سے آغاز نہیں کرتا بلکہ ایک دن خوش و خرم چلتا پھرتا ایک مرغزار کی طرف جا نکلا اور پوچھا کہ یہ کس کی ملکیت ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ چوچک کا گاؤں چوچکانہ ہے جو اب ایک عبرتناک خرابہ ہے اور کبھی سوادِ ہیر و ماہی تھا۔ جن کی داستان اس نے ہر کسی سے سنی تھی۔ خلافِ معمول وہ پہلے ہیر کا ذکر کرتا ہے جس کے جوان ہونے پر اُس کا باپ مناسب بر کی تلاش میں ایک برہمن کو ملتان روانہ کرتا ہے اور وہ رشتہ ٹھہرا کر آتا ہے۔ اس کے بعد دفعتہً رانجھا کی نوبت آتی ہے جس کی تعریف یہ ہے کہ ؎

مقبولِ بتاں بہ نَے نوازی	نَے نے کہ فسونِ عشقبازی
ہر دختر دلکش فرایش	از خویش تہی پُر از ہوایش
از عشقِ رخش خراب، بیتاب	بیروں شدہ با بہانۂ آب

چنانچہ ان ہی عاشقانہ الّلّلوں کی وجہ سے بھائی اُسے گھر سے راندہ دیتے ہیں۔ راستے میں لوگوں کے کہنے پر وہ چوچکانہ کی طرف چل نکلا۔ جہاں ہیر اور اسکی سہیلیاں دریا کی سیر کر رہی تھیں۔ ایسے ہی عام نہج سے مختلف واقعہ میں سے واقعہ نکلتا آتا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے قصّہ خالصتاً جدید وضع کی واقعیت میں ڈوبا ہوا ہے۔ افسانہ انسانی عشق و محبت کی داستان ہے، افراد گوشت پوست کے پیکر اور واقعات روزمرہ کے مانوس واقعات :-

سے دید قطارِ گاؤمیشاں	شب رنگ بہار گاؤمیشاں
آنجی با دلئے رسمِ پنجاب	شُستہ تنِ خویش را بہ گرم آب
دستارِ مہینِ ارغوانی	از بہرِ عروسیش نشانی
پیچیدہ بسر زجائے جستہ	سرپوشِ گلیم بپا شکستہ
پیشِ ہر یک سلام می کرد	در دل زادنش مقام می کرد

ایسے ہی اور بھی بہت لطیف اور واقعاتی قسم کے جزئیات ہیں۔ صرف ایک جگہ اس ٹھیٹ واقعیت کا دامن چھوڑ کر جوگی کا کرشمہ اور اس کا کراماتی اثر دکھایا گیا ہے۔ کھیڑے خود ہی اپنے مال سے دستکش ہو جاتے ہیں اور ہیر اپنے ہی گھر شاد آباد۔ یہاں تک کہ رانجھا وطن جا کر وہیں فوت ہو جاتا ہے۔ اُدھر ہیر

نے بھی مرنے میں دیر نہ کی اور چوچکانہ میں دفن ہوئی۔ آخر ایک حاکم نے خواب میں ہیر سے اشارہ پاکر اس کو جھنگ میں لا دفن کیا اور اس کے مزار پر ایک روضہ تعمیر کیا ــــــ لیکن سرِاُد بہ سانِ دریانہ [1] آخری دم تک وہی واقعیت کہ رانجھا اور ہیر جدا جدا مدفون ہیں۔ اور رانجھا کا مزار :-

شانند بر و مجاور آگاہ　　　　در دست نیش بوضعِ دلخواہ

شاعری کی بعض طراحیاں قابلِ دید ہیں :-

ہمسال سوار دوش بادوش　　　　مانندِ بہار بادلہ پوشش

غلطید بہ فرش آں پری روی　　　　از پہلوے شدی بہ پہلوی

زد ہیر چو ایں حدیث بشنید　　　　بالیش بلب نگاہ بوسید

القصہ گزشت شب سحر شد　　　　خورشید بہار بام و در شد

باہم بہ بہانۂ طبیبی　　　　کردند گلی و عندلیبی

آفریں نے مثنوی میں خیال بندی کا حق ادا کیا ہے اور عجیب و غریب شاعرانہ نکتے پیدا کئے ہیں۔ موجوکی جگہ اس کے یہاں معزی یا معزالدین نظر آتا ہے اور تین یا آٹھ بیٹوں کی بجائے اس کے چار بیٹے ہیں۔ چوتھا ایک سرپھرا نوجوان تھا جو ہر آنے جانے والے سے قصے کہانیاں سنا کرتا تھا۔ ایک دن اس نے ایک مسافر کی زبانی ہیر کی تعریف سنی اور اس طرح داستان کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے۔ استعارات اور تراکیب کی آن بان دیکھئے :-

شفق ریز از تابِ رویش نقاب　　　　بخونی جگر گوشۂ آفتاب

بتے رنگِ بتخانۂ چیں شکن　　　　شکر آب کن قدرِ شیریں شکن

خزاں معجر آں صبح رخ مے کشود　　　　کہ بود از شفق پنبۂ تار و پود

ظاہر ہے کہ آفریں کی زبان میں معنوی اور لفظی آفرینش اور موشگافیوں کو بہت دخل ہے۔ اسی لئے بیان بہت ژولیدہ ہے۔

یکتا کی مثنوی کا نسبتہً زیادہ شہرہ رہا ہے۔ اور اس کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ ہے کہ یہ شعرائے سندھ کے لئے کشش کا باعث ہوئی۔ لیکن اس پر بھی خیال بندوں کی کاوش کا کچھ کچھ سایہ ہے اور بیان میں صفائی، روانی یا بھرپور شعریت نہیں :-

سخن ابرِ بہار نیرنگ است　　　　صفحہ گل موجِ جلوۂ رنگ است

لفظ گلدستہ بندِ نقطۂ نور　　　　سطر سنبل طرازِ طرۂ حور

گلدستہ بند [2] یوسفستان اور گل ہمیشہ بہار جیسی ترکیبیں اور الفاظ بے اختیار متاخرین شعرائے فارسی کی یاد دلاتے ہیں۔

آرام کی مثنوی میں ہیر و رانجھا کے "زبانِ عشق" سے نکاح ہونے کے علاوہ پانچ پیروں کا کراماتی کردار اور کارگزاری قصہ پر چھائی ہوئی ہے۔ آخر میں ایک حاجی کا عجیب واقعہ درج ہے کہ کس طرح جہاز غرق ہونے پر وہ ایک تختے سے چمٹ کر کنارے پر آلگا۔ سامنے ایک محل تھا جس میں ایک حور آسا عورت تھی اُس نے اس کے شوہر نے مہمان کی کھیر سے تواضع کی۔ جب حاجی چلنے لگا تو مرد نے کہا آنکھیں بند کرو۔ اس نے آنکھ کھولی تو وہ پنجاب میں تھا۔ یہ دونوں عورت مرد ہیر و رانجھا ہی تھے! مثنوی میں بعض قلم کاریاں خوب ہیں :-

چناں آمد رطوبت بر سرِ کار　　　　کہ شد کلکم رگِ ابرِ گہربار

چو کشتی جملہ آغوشِ تمنا　　　　بشوقِ وصلِ معشوقانِ رعنا

ہلالِ عیدِ عیشِ جملہ مردم　　　　لبش وا ماندہ از موجِ تبسم

چو گازہ پلسئے تا سر فرحت انگیز　　　　بمعشوقِ شجر زلفِ دلآویز

---

[1] غالب: نفس زخوے تو گلدستہ بند نکہی۔　[2] غالب: بھدرنگ ابر گہربار سراسر سہرا۔ (مدیر)

کنہیالال ہندی کی مثنوی "نگارین نامہ" وارث شاہ کے معروف قصّے اور پنجاب کی مقبول روایت کا چربہ ہے۔ اس میں ہیر وارث شاہ کی طرح اور فارسی کے دیگر قصّوں کے برعکس سسّی اپنے محبوب مراد کے ساتھ فرار ہوتی دکھائی گئی ہے۔

سندھ میں اس داستان کی مقبولیت کا آغاز یکتا کی تصنیف سے ہوا جو تالپوروں کے عہد حکومت میں یہاں پہنچی اور اس کو نظم کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ کچھ عرصہ پہلے ایک شخص منشی شیوک رام عطارد نے "محبت نامہ" کے نام سے اس کو فارسی نثر مسجع میں پیش کرنے کی ناتمام کوشش کی تھی۔ تالپوروں کی حکومت کے تیس سال بعد فقیر قادر بخش بیدل نے اس کو ایک طویل قطعہ کی شکل میں نظم کیا۔ مگر اس دور کی زیادہ وقیع کوششیں جو اس داستان کو ذوق و شوق کے نقطۂ عروج پر لے گئیں، مثنوی ہی کی شکل میں ظاہر ہوئیں۔ اور وہ بھی سندھی فرمانرواؤں کی ذاتی دلچسپی اور حوصلہ افزائی کے باعث۔ اس میں شکر اللہ کے مورث عالم و فاضل خاندان کو خاص دخل ہے جس نے میر علی شیر قانع ٹھٹوی، میر عظیم الدین عظیم، میر ضیاء الدین ضیا اور ایسے ہی کئی اور جوہر قابل پیدا کئے۔ میر عظیم اللہ عظیم نے پہلی بار اس قصہ کو شاہی فرمائش پر شاعری کا آب و رنگ عطا کیا اور بڑے اہتمام سے۔ اسی طرح ضیاء الدین ضیا نے اپنے طور پر ایک مثنوی لکھی۔ آزاد اور لغاری دو اور شاعر تھے جنہوں نے اس موضوع پر طبع آزمائی کی۔ غرض چراغ سے چراغ جلا اور خوب جلا اور یہ چاروں مثنویاں اس کی روشنی کو تیز تر کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان مثنویوں میں بھی بعض جزئیات دوسروں سے مختلف ہیں لیکن طرح اور سلسلۂ واقعات مشابہ ہے۔ روحانی عشق اور اولیائی کرامات کی چھاپ کافی گہری ہے۔

عظیم نے چند اشعار میں یکتا کی پیروی کی ہے لیکن انداز پیشکش اور مذاق میں دونوں کے مابین زمین آسمان کا فرق ہے۔ یکتا کا اسلوب بوجھل اور اس کی رفتار سست ہے۔ عظیم کے یہاں روانی، صفائی، لوچ، گھلاوٹ اور قصہ کے بڑھاؤ میں تیزی ہے۔ گو حفیظ ہوشیارپوری کی دانست میں فوقیت آزاد کو ہے مگر ہماری رائے میں جو بات عظیم کی مثنوی میں ہے وہ اور کسی میں نہیں۔ آزاد میں تمثیلوں کے جملہ ہائے معترضہ بیانِ قصہ میں جھمیلہ پیدا کرتے ہیں۔ گو مثنویٔ رومی سے مشابہت اپنی جگہ ایک قابلِ لحاظ خصوصیت ہی سہی۔ اور پھر اس کی عربیت منجھی ہوئی ہونے کے باوجود فارسی میں کچھ اجنبی معلوم ہوتی ہے۔ عظیم کو زبان و بیان پر زیادہ قدرت ہے۔ اسی لئے اس کے یہاں دلکش اشعار اور فصیح و بلیغ منتخب پاروں کی کثرت ہے۔

جرسم من نہ این و آں دارم	من ہمیں دل ہمیں زباں دارم
در رہِ تو نہ دست و پا دارم	چوں جرس من ہمیں صدا دارم
در رہت منزلِ جرس دارم	کہ بجز نالہ دسترس دارم
جرسِ کاروانِ وادیٔ شوق	کہ کند ہر نفس منادیٔ شوق

برجستہ ترکیبات نے کلام میں جا بجا غیر معمولی چستی اور نادر الکلامی پیدا کر دی ہے:۔

نام او شد چراغِ محفلِ عشق	نام او شد سراغِ منزلِ عشق
نام او مے زجامِ عشق دہد	گوشِ دل را پیامِ عشق دہد

اس سے ظاہر ہے کہ شاعر کے اپنے ولولے نے کلام میں والہیت پیدا کر دی ہے۔ ایک بہت بڑی بات یہ ہے کہ اس نے اپنے تصورِ عشق کی بہت ہی جامع تشریح کر کے اس کو ساری داستان پر حاوی کر دیا ہے۔ اس طرح نظم سے سالمیت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

ضیا کی مثنوی اس درجہ پر نہیں۔ وکی نے اپنے پیشروؤں پر سبقت لے جانے کی کوشش کی۔ اور گو انہوں نے مثنوی میں بہت زور مارا ہے، مگر اس میں وہ آن بان نہیں پیدا ہوسکی۔ بہرحال اس کی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بیدل کے قطعہ میں محض واقعات قلمبند کر دیئے گئے ہیں۔ اس لئے اس کی حیثیت بھی واجبی سی ہے۔

ان مثنویات کی فہرست کو مکمل کرنے کے لئے یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتابخانے میں اس موضوع پر فارسی کی ایک نامکمل مثنوی موجود ہے جس کو ایک شاعر فدائی یا ساقی نے نظم کیا ہے۔ اسی طرح مقبول احمد بن مولوی قدرت احمد فاروقی گوپاموی نے اس داستان کا کچھ حصہ فارسی میں منظوم کیا ہے۔ اور اس کے علاوہ اردو نثر میں بھی قصہ ہیر و رانجھا تحریر کیا ہے۔ اگر ان فارسی مثنویات کا متن بھی دستیاب ہو جائے

(باقی صفحہ ۴۱ پر)

شیر افضل جعفری

خلدزاروں کی راہ بھولا ہے
آدمی چیت کا بگولا ہے
دل گلوں کی تلاش میں اکثر
پھولتی سولیوں پہ جھولا ہے
زیست کے زہر زہر ساغر کو
عشق نے چوم کر تبولا ہے
ہم نے آہوں سے چاندنی لے کر
شامِ ہجراں پہ نور ڈھولا ہے
خونِ دل کے حسین نظروں سے
شاخِ غم پر گلاب پھولا ہے

★

پھول پیتا ہوں شعر کہتا ہوں
چیت بھر مست مست رہتا ہوں
زندگی ہے چناب رنگ میری
گھوم کر رقص رقص بہتا ہوں
جی، وہ منصور تھا جو رویا تھا
میں تو ہنس ہنس کے پھول سہتا ہوں
سرزمینِ غزل ہے میرا وطن
آسماں سے بلند رہتا ہوں

★

عبدالمجید بھٹی

اپنے پرائے سب ہیں بھلے
چپ چپ جب تک ساتھ چلے
آہِ سحر تک بات گئی
دیپ جلے تھے شام ڈھلے
شوقِ حیا کے پردوں میں
دھوپ سی مچلے چھاؤں تلے
وصل میں لذت ہے تو مگر
ہجر میں جب تک جان جلے
ذوقِ سفر ہے ذوقِ سفر
منزل بھی جب ساتھ چلے
دل جب تک اپنا دل تھا
وہ دن بھی تھے کتنے بھلے

★

رفعت سلطان

محبت میں ہزاروں دکھ سہیں گے
مگر پھر بھی ہمیشہ چپ رہیں گے
میں اُن کو بھول تو بیٹھا ہوں لیکن
وہ جب سن پائیں گے تو کیا کہیں گے
کرم فرما ہیں جب تک وہ نگاہیں
زمانے کے ستم ہنس کر سہیں گے
ابھی خوشیاں مقدر میں نہیں ہیں
ابھی وقفِ غمِ دنیا رہیں گے
ہنسے گا کوئی ہم اہلِ جنوں پر
کسی کی آنکھ سے آنسو بہیں گے
مجھے مرنا بھی ہے منظور، لیکن
تجھے اہلِ زمانہ کیا کہیں گے

★

خواتینِ مشرق!

صہبا اختر

خواتینِ مشرق! جو یوحنّا ہوتا تو تم سے یہ کہتا
بس اب آسماں سے برسنے کو ہے روشنی کا سمندر
بس اب سیمیائی دریچوں سے اُترے گا کوئی پیمبر
ہوائیں سرِ تختۂ سبزِ قالین نو بُن رہی ہیں
شعاعیں اُفق تا اُفق ایک دیبائے ضو بن رہی ہیں
کہ ساقیِ آبِ حیات و خرابات ہو آ رہا ہے
مسیحائے زیب و آرائشِ کاخ و کو آ رہا ہے
خواتینِ مشرق! میں کوئی بشارت نہیں دے سکوں گا
کہ تم پاک مریم کے انفاس سے خود کو مہکا چکی ہو
کہ تم فاطمہ اور خدیجہ کے نقشِ قدم پا چکی ہو
تمہیں ہر جبینِ محبت کے مسجود کی روشنی ہو
تمہیں خلدِ مقسوم و فردوسِ موعود کی روشنی ہو
ہلال و ستارہ کی روشن فضاؤں کی ہم راز تم ہو
کہ دراصل شعلہ نوایانِ مشرق کی آواز تم ہو
خواتینِ مشرق! میں دیوانہ شاعر یہی کہہ سکوں گا
کہ اب آنے والا زمانہ اندھیروں کی یلغار ہوگا
جب انسان دامِ ہلاکت میں از خود گرفتار ہوگا
تمہاری جبینوں پہ تقدیس کا ماہتابی تبسم
تمہارے لبوں پر محبت بھری آیتوں کا ترنم
اسے موت کے تیرہ و تار غاروں کے منہ سے ہٹا لے
اِسے جنگ کی آگ میں راکھ ہونے سے شاید بچا لے

غزل

جمیل نقوی

جنوں فریبِ خرد کھا گیا تو کیا ہوگا
غمِ حیات سے ٹکرا گیا تو کیا ہوگا
کسی کی یاد سے مہکی ہوئی ہے محفلِ غم
اگر یہ پھول بھی مرجھا گیا تو کیا ہوگا
نشاطِ جور مبارک مگر خیال رہے
مقامِ نقد و نظر آ گیا تو کیا ہوگا
دل و نظر کی ہم آہنگیٔ دوام کے بعد
نظامِ عشق جو بدلا گیا تو کیا ہوگا
میں اس کی سادگیٔ دلربا سے ڈرتا ہوں
وہ عرضِ حال پہ شرما گیا تو کیا ہوگا
یہ سوچتا ہوں کہ احساس کے اندھیرے میں
ترا خیال بھی گھبرا گیا تو کیا ہوگا
فسانۂ غمِ الفت میں میرے نام کے بعد
تمہارا نام اگر آ گیا تو کیا ہوگا
وہ ایک داغ کہ روشن ہے جس سے دل کی فضا
وہ ماہتاب بھی گہنا گیا تو کیا ہوگا
وہ شخص جس کے تصور سے دل دھڑکتا ہے
وہ بے نقاب اگر آ گیا تو کیا ہوگا
چلے ہو لے کے کہاں ساتھ آبگینۂ دل
کوئی نگاہ سے چھلکا گیا تو کیا ہوگا
ہو چراغ جلاؤ کہ روشنی پھیلے
افق کچھ اور بھی دھندلا گیا تو کیا ہوگا
بڑھے چلو کہ زمانہ ہے سازگار ابھی
کسے خبر کوئی موڑ آ گیا تو کیا ہوگا
جمیل خیر مناؤ کہ کوئی رمز شناس
شباہتِ غمِ دل پا گیا تو کیا ہوگا

سکھر بیراج کی ایک شام

سعید احمد اختر

شام کی سرد ہوا
اور گرمی کے مہینوں کا لبالب دریا
ڈوبتے دن کی شعاعوں میں تڑپتی ہوئی ضو پاش روپہلی موجیں
شورِ دریا میں کنارے کی خموشی کا فسوں
اپنے نظارے سے مدہوش ہے مرطوب فضا
تیری آنکھوں کی طرح
دور اُس پار گھنے پیڑوں پر
کس طرح تیرتے پھرتے ہیں گلابی بادل
اور شفقائے ہوئے پانی کو
چومتا یوں نظر آتا ہے سمٹتا سورج
شام کو آگ کی دیوی جیسے
غسل کرنے کے لئے
اپنی جلتی ہوئی رتھ چھوڑ کے تاروں کے قریب
بال کھولے ہوئے چاندی کے سمندر پہ اتر آئی ہو
اور ادھر جھک کے ذرا دیکھ کہ شہ رگ کا لہو
کس طرح جسم کی نس نس میں بٹا جاتا ہے
سنگ و آہن کے دریچوں سے گذرتا پانی
اور چشموں کی طرح
پُل کے نیچے سے یہ جھنجھلایا اُبھرتا پانی
جا کے صحراؤں کے سینوں کو کرے گا آباد
اور ویرانوں کو پھولوں کے چمن بخشے گا
راہِ دریا میں عجب شان سے بازو پھیلائے

بے نیازی سے کھڑا ہے بیراج
پورے اک میل کی لمبائی میں
کھردرے پتھر کے ستونوں پہ یہ اٹھتی ہوئی جھکتی ہوئی قوسوں کی قطار
جیسے دریا نے لرزتے ہوئے سینے پہ کچھا رکھا ہو
مہ جبینوں کی کماں ایسی بھنوؤں کا کنٹھا
لہلہاتے ہوئے کھیتوں کا زمرد اوڑھے
وسعتِ آب میں چھوٹے سے جزیرے دو چار
جیسے صحرا میں کوئی نخلستاں
جیسے دوشیزۂ کہسار کے ماتھے پہ خال
اور وہ دور بہت دور کھجوروں کے گھنے جھنڈ کے پاس
ہر طرف دور تلک پھیلے ہوئے سبزے میں
جگمگاتے ہوئے سیماب کی جھیل
سبز برقعے کے نقابوں سے بغاوت کر کے
جیسے آ جائے نظر
گردن و رخ کے چمکتے ہوئے سنگِ مرمر کی تکون
اور اُدھر دیکھ وہ بیراج کی محرابوں میں
غٹرغوں کرتے ہوئے مست دو کبوتر کیسے
شام کے رنگ میں بجھتے ہی چلے جاتے ہیں
کتنا پُر کیف ہے ساحل کا سماں
کتنے دلکش ہیں حسیں نظارے
اور اس جنتِ منظر میں ترے قرب کی باس
تیرے بالوں میں مہکتے ہوئے پھول

نیم وا آنکھوں کی جھیلوں میں سہاگن خوشیاں
حلق کے نیچے یہ چاندی کی کٹوری سا گڑھا
اور تیری مرمریں گردن پہ مچلتی ہوئی نازک سی طلائی زنجیر
جس میں جنت کی ابھرتی ہوئی سرحد کے قریب
قید ہے کب سے نہ جانے کوئی ہنستی ہوئی گھائل تصویر
اور وہ شیشے کی منقوش سبک رو کشتی

کیسے انداز سے لہروں پہ سفر کرتی ہے
جیسے اِندر کے اکھاڑے کی کوئی پھول پری
شبنمیں راہوں میں چپکے سے گزر کرتی ہے
اور کشتی کو چلانے والی
خود بھی اک رنگ بھری ڈولتی کشتی ہی تو ہے
جس کو عرصے سے ہے شاید کسی ملاح کے مضبوط سہارے کی تلاش
اس کے ابھرے ہوئے سینے کا خم
آسماں رنگ چُنریا کی اڑان
بھورے بادل کا سنہری گھیرا
شورِ دریا کے ترنم کا فسوں
تیرے ماتھے پہ مچلتی ہوئی لٹ
ڈوبتی دھوپ کا سایوں سے ملاپ
سب دلآویز مناظر ہیں یہاں ہم آہنگ
جیسے اک قوس میں پھیلے ہوں قزح کے سب رنگ
ڈوبتے ڈوبتے دن ڈوب گیا
کھو گئیں شام کی چادر میں سنہری لہریں
سو گئی دن کے نظاروں کی بہار
اور سیراج پہ اک کھینچ کے رکھی ہوئی مالا کی طرح
کتنی دلکش ہے دمکتے ہوئے بجلی کے چراغوں کی قطار

آؤ اب لوٹ چلیں
چاند کی بارھویں ہے
اور ذرا دیر کے بعد
اپنی بکھری ہوئی زلفوں میں ستارے ٹانکے
رات آجائے گی آغوشِ محبت لے کر

❀

غزل

قیوم نظر

چھڑ گئی وہ راگنی عشق کی جاں پر بنی
حُسن کے شانوں پہ ہیں شام کی زلفیں گھنی
رنگ و بو میں تیرتی مشعلیں ہیں دیدنی
آرزو کے سلسلے گفتنی ناگفتنی
اس سے پہلے تھی کہاں اتنی عریاں چاندنی
لاکھ ہنگاموں کی اصل ایک دل کی رہزنی
بے ضرورت دوستی بے ارادہ دشمنی
جوئے خوں لاتی ہوئی بے محل صید افگنی
چھا گئیں تاریکیاں لے اُڑی کیا روشنی
لطف دیتی تھی ابھی زندگی کی جانکنی
اہلِ دل تڑپیں نہ اور
پھیلتی ہے سنسنی

ماہِ نو، کراچی - جون ۱۹۵۹ء

افسانہ :

شاہیا

احسان ملک

ابھرے لانبے اور لچکیلے مضبوط بدن کا جیالا جوان شاہیا جب اپنی ہی برابر کی شہرت یافتہ گھوڑی "سسی" پر سوار "یا علیؑ" کا نعرہ لگا کر نیزہ بازی کے میدان میں آتا تو اپنے نیزے کی چمکتی انی پر لوگوں کے دل پرو لیتا۔ اس کی گھوڑی کے ٹاپوں کی ڈگر ڈگر کرتی متوازن صدا، اس کے آگے پیچھے جھومنے کا البیلا انداز اور نیزہ تھامنے کا وہ بانکپن لوگوں کے جی میں سما گیا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ محبت کے جذبے سے سرمست ہو جاتے۔ انہیں یوں لگتا جیسے شاہیا، شاہیا نہیں، ان کا اپنا گاؤں ہے۔ انہیں اپنی زندگی شاہیا کی شخصیت کے اندر دھڑکتی نظر آتی۔ شاہیا بڈھوں کا بیتا شباب، دیہاتی بالک کا مستقبل، اور عورت کا خواب تھا!

وارث شاہ کی ہیر اسے زبانی یاد تھی۔ وہ گاتا تو جوان مست اور بڈھے اشکبار ہو جاتے۔ چاندنی لمبی راتوں میں اس کی آواز کی لہروں کے میٹھے تیر گوریوں کے دل میں ترازو ہو کے رہ جاتے جن کی کھٹک سے وہ ساری ساری رات چپکے چپکے رویا کرتیں۔

شاہیا کی بہن نوراں اپنے حسن میں شاہیا کی گھوڑی کی طرح مشہور تھی۔ شاہیا کی جوانی اگر سیلاب تھی تو نوراں کا حسن چاند کا نور تھا جو اس سیلاب کی مانند ہر سو پھیل چکا تھا۔ حسن کے اسی نور سے شاہیا کی جان سوکھی رہتی۔ وہ چاہتا تھا کہ بستی بستی پھیلی ہوئی یہ روشنی اب سمٹ کر کسی گھر کا دیا بن جائے۔ کپاس کی فصل پر شاہیا کے مرحوم باپ کا سارا قرضہ اتر گیا تھا، گندم کی فصل کے بعد شاہیا نے نوراں کے ہاتھ پیلے کر کے باپ کا یہ قرضہ بھی چکا دینے کا ارادہ کیا۔

★

اور جب فصل پکی تو شاہیا بھی دن رات کی محنت سے پک گیا تھا۔ کاشتکار شاہیا اور اس کی فصل دونوں کو دیکھنے آتے تھے۔ فصل تن کر کھڑی تھی جیسے گاؤں کی مٹیار پانی بھری مشک سر پہ رکھے سینہ ابھارے چلتے چلتے رک کر آسمان پر اڑتی ہوئی کونجوں کو دیکھنے لگ گئی ہو۔

اب کی بار فصل اس قدر اونچی، اتنی خوبصورت، اتنی شاندار تھی کہ گاؤں کی ساری مٹیاروں کا جوبن بھی اس کے سامنے ماند پڑتا تھا۔

پھر ایک دن نور کے تڑکے گاؤں والوں کے کانوں میں ڈھول کی تال کی بھنک پڑی۔ یہی آواز رفتہ رفتہ قریب تر آتی گئی حتٰی کہ لوگوں نے باہر نکل کر دیکھا کہ شاہیا کی فصل ایک زوردار تال پر جھوم رہی ہے۔ آواز کے زنالے تیز سے تیز ہوتے چلے گئے، جھومتی ہوئی فصل لہرا کے اٹھی اور شیر جیسے جوانوں کی چمکتی تڑپتی مچھلیوں والے بازوؤں میں لشکارتی درانتیوں پر رقص کرنے لگی۔

کئی دن تک لوگوں نے یہی رقص دیکھا، وہی فصل دیکھی، وہی لشکارتی درانتیاں دیکھیں، وہی شاہیا دیکھا۔

اور پھر جب ایک روز سورج آدھا ادھر تھا آدھا ادھر اور جب ہر چیز لال گلال ہو رہی تھی اور آسمان نے رنگ بدل لیا تھا اور اس بدلے ہوئے رنگ میں نہاتی پکھیرؤوں کی ڈاریں بسیروں کی تلاش میں چل نکلی تھیں تو لوگوں نے اس بھیگی ہوئی شام میں دیکھا کہ شاہیا تھک کر گر پڑا ہے، جوان تھک کر گر پڑے ہیں، درانتیاں تھک کر گر پڑی ہیں اور ساری فصل تھک کر گر پڑی ہے۔ انسان تھک کر چور ہو چکے تھے۔ درانتیاں تھک کر بے حرکت ہو گئی تھیں اور شاہیا کی گلابی جاڑوں کی محبوبہ، گندم کا بے حس ڈھیر ہو کر گر پڑی تھی۔

صبح کو شاہیا اٹھا، جوان اٹھے، فصل اٹھی اور یہ بارات بیل گاڑیوں میں شہر تک پہنچی۔ یہاں وہی فصل کھری چاندی بنی اور سکڑ سمٹ کر شاہیا کی دھوتی کی ڈب میں جا چھپی۔

رات کے وقت دوستوں نے ٹھرا پی کر گلے میں موتیے کے ہار ڈالے اور شہر کی سیر کو چل نکلے۔ شاعیا کی پتلی مونچھیں بچھو کے ڈنک کی طرح تنی ہوئی تھیں۔ وہ سینہ تانے گھوم رہا تھا۔ بل دار سیندوری پگڑی بوسکی کی قمیص پر چمکیلی گوٹے دار نسواری صدری اور ریشمی تہبند پہنے وہ دیہاتی چھیلا بنا ہوا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں چھوی چمک رہی تھی اور دوسرے میں سگریٹ! شہر کی جھلملاتی جگمگاتی دکانوں سے پھل مٹھائیاں لیتے، پان کھاتے، سگریٹ پھونکتے، شاعیا اور اس کے ساتھی چلے جا رہے تھے کہ کیا دیکھتے ہیں وہ لوگ رنگین بازار کے اندر گھس آئے ہیں۔ شاعیا جو آج بالکل ماعیا نظر آ رہا تھا، یہ معاملہ دیکھ کر ٹھٹھا مار کے ہنسا اور پھر سگریٹ کا بھرپور کش لے کر مذاق ہی مذاق میں سینہ تانے آگے آگے چلنے لگا۔ اس کے یار پیچھے پیچھے کھسر پھسر کرتے، شرماتے، آنکھیں چراتے چلے آ رہے تھے۔ "کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا شاعیا؟" اور شاعیا نے بتایا کہ یہاں سوائے بجلی تار کے اور کوئی آنکھ نہیں ملاتا، دو بھائی پاس سے گزر جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو دیکھ نہیں پاتے۔ ان کو بھلا کوئی کیونکر دیکھ سکتا ہے۔

شاعیا اکڑ اکڑ کر چلتا رہا، کھڑکیوں سے مسکرا مسکرا کر تاکنے والیوں پر فقرے چست کرتا رہا اور زوردار قہقہے لگاتا رہا، حتیٰ کہ سارے بازار کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اس نے ٹپے گائے، لڈی ناچا اور مستانہ وار ھلڑ بازی اور تماش بینی کا شغل کیا۔ ابھی یہ لوگ دوسری نکڑ پر پہنچے ہی تھے کہ اوپر کی کھڑکی سے پھولوں کا ایک ہار شاعیا پر آن گرا، اس نے پیچھے مڑ کر اوپر تاکا، ایک البڑ البیلی جوانی اسے ہنس ہنس کر اشاروں سے اپنے پاس بلا رہی تھی۔ اس کے جواب میں شاعیا نے ایک برمحل اور خود ساختہ ٹپہ بلند آواز سے گایا جس کا مطلب تھا کہ ہم سچے عاشق ہیں، جو ایک بار ہمارا ہو گیا وہ پھر کسی کا نہیں ہو سکتا۔ اور تیرا کیا اعتبار؟ تو تو ہرجائی ہے۔ کیوں ایک غریب جوان کی پاک دامنی کو داغ لگاتی ہے۔ یہ سن کر ہرجائی نے ایک پل بھی صبر نہیں کیا، اس پر ایک پھول اور پھینکا اور طنز کا ایسا تیکھا تیر مارا کہ شاعیا تلملا کے رہ گیا: "میں مجبور تو وفا کر لوں گی۔ جوان تو مجھے یہاں سے نکال لے جائے تو جانوں؟" ایک ہٹا کٹا اوباش اس پر حقارت سے ہنسا: "چوڑیاں پہن لے چھوکرے" اور شاعیا کو یہ بات بہت بری لگی، اس نے تیوری پر بل ڈال کر اس آدمی کو گھور کے دیکھا اور اس نے استہزا کے ساتھ شاعیا کو کندھا مار کر دھکیل دیا۔ شاعیا کو یوں محسوس ہوا جیسے ایک آگ سی اس کے تلووں سے اٹھ کر سارے بدن کو شعلہ بناتی ہوئی سر تک چلی گئی۔ اس کو پھر اپنا ہوش نہ رہا، اس کی چھوی بجلی کی طرح کوندی اور ہاتھ میں اس کا سرخ پھل ہلال کی طرح ہوا میں لہرا گیا۔

اب شاعیا دیوانہ ہو چکا تھا، اس کی منہ زور مردانگی زنجیریں توڑ کر آزاد ہو گئی تھی۔ دروازے کی میخ ٹوٹ کر گر چکی تھی اور اوپر کھڑکی میں وہ اس نوجوان لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈالے کڑک رہا تھا، گونج رہا تھا اور کھلے بندوں چھوی لہرا لہرا کر اس خوبصورت عورت کو اٹھالے جانے کا اعلان کر رہا تھا۔ بازار میں ہلڑ مچ گیا، دروازے بند ہونے لگے، بتیاں گل ہو گئیں اور ذرا سی دیر میں سارا علاقہ سنسان ہو گیا!

★

شاعیا کو شاعیا ہونے کی سزا ملی۔ انصاف نے اس کی سفید مست گھوڑی کو پتھر کی چکی بنا دیا، اس کی لگامیں لوہے کی زنجیروں میں تبدیل کر کے شاعیا کے ہاتھوں میں تھما دیں اور کالی کالی سنگین دیواریں اس کی پہرہ دار بن گئیں۔

★

ایک صاف تاروں بھری رات تھی کہ شاعیا اپنے گاؤں کے سٹیشن پر اترا، گاڑی کوکتی ہوئی آگے چل دی، شاعیا نے اس چھوٹے سے سٹیشن کی ٹمٹماتی روشنیوں کو پیچھے چھوڑا اور اپنے گاؤں کی پگڈنڈی پر ہو لیا۔ گاڑی کی گڑگڑاہٹ کتنی ہی دیر تک اس کے کانوں میں گونجتی رہی، کتنی ہی دیر تک وہ اسے پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا رہا، پھر اندھیرے میں اس کی ٹمٹماتی روشنیاں غائب ہو گئیں اور جگمگاتی قندیلیں سی بجھ گئیں۔ اب ریل کی آہنی پٹری تاروں کی روشنی میں چمک رہی تھی اور آس پاس کا سارا جنگل خاموش تھا۔ وہ چپکے چپکے آگے چلتا گیا، آس پاس جھنڈ اور کریں کی وہی جانی پہچانی جھاڑیاں تھیں، کیکر کے اکا دکا پیڑ بھی وہی تھے، اور دور نہر کے کنارے کا آموں کا جھنڈ بھی جانا پہچانا تھا۔ نرم نرم زمین پر چلتے وقت شاعیا کو ایک نئی لذت اور بے پایاں آزادی کا احساس ہوا۔ وہ برسوں پہلے کی خوشبو اس کے نتھنوں میں پہنچی جو کہ زمین پر پانی پڑنے اور پودوں کی ہریالی سے پیدا ہو کر مشام جاں کو تازہ کر دیتی ہے۔ فضا میں ٹھنڈک تھی اور نم، اور شاعیا کو یہ سارا سماں اپنی کھوئی ہوئی آزادی کو دوبارہ پالینے سے غیر معمولی طور پر بھلا لگ رہا تھا۔ اس کا

جی چاہ رہا تھا وہ آسمان پر چکوروں کی طرح اڑنے لگے اور آزادی کا یہ نیا احساس اس کے رگ و ریشے میں سما جائے۔

یہ مہینے اور یہ سال اس نے چلتے چلتے سوچا، یہ کپاس اور گندم اور دھان کی بھرپور فصلیں اب کی بار قسمت کا دارو غنہ لے گیا۔ جانے اس کی گھوڑی مستی کا کیا بنا، اس کے دودھیا بیل کیا ہوئے، اس کی بہن نوراں کیسی ہے اور اس کی بوڑھی ماں۔ وہ تو بیچاری اس غم میں مر ہی گئی ہوگی، شاعیا چلتا رہا چلتا رہا اور جب دور ہی سے اپنا مٹی کا کچا گھر نظر آیا تو اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ وہ دوڑ پڑا لیکن جب وہ اپنے کھیت کی پرانی بیری کے قریب پہنچا تو ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کی ساری زمین پر گندم کی پکی فصل لہرا رہی تھی۔ یہ گندم کس کی ہے؟ شاعیا کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ پلٹا اور گھر کی طرف چل دیا۔

گھر کی چار دیواری کا چوبی دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے دیوار پھاندی اور چپکے سے اندر کود گیا۔

★

چاند اب کافی اوپر آ گیا تھا۔ چھٹکی ہوئی چاندنی میں اس نے دیکھا تھان پر دو چتکبرے بیل کھونٹے سے بندھے جگالی کر رہے ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ان بیلوں کے پاس آ گیا۔ مست بیل اسے اجنبی جان کر پھنکارنے لگے۔ شاعیا کو یہ بات بہت بری لگی۔ اس نے ان میں سے ایک کے ماتھے پر ہاتھ پھیرنا چاہا تو اس نے سینگ دکھا دئے۔ پھر دونوں بیل گھبرا کے اٹھ بیٹھے۔ ان کے گلے میں بندھے گھنگرو بجنے لگے۔ شاعیا روانکھا سا ہو کر وہاں سے ہٹ آیا۔ تب اس کی نظر کونے میں بندھی ہوئی مشکی گھوڑے پر جا پڑی۔ اس نے قریب جا کر اس گھوڑی کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ دیا، وہ اچھلی۔ بری طرح سے ہنہنائی اور خوف سے نتھنے پھڑپھڑانے لگی۔ شاعیا وہاں سے بھی گھبرا کے پلٹ آیا۔ اس نے گھوم کر سارے گھر کو دیکھا۔ سب کچھ بدل گیا تھا۔ وہ نہ بیل رہے تھے جو اسے دیکھ کر بلاتے، نہ وہ مستی ہی تھی جو اسے دیکھ کر خوشی سے اچھلنے لگتی۔ آنگن میں دو نئے پیڑ اگ آئے تھے اور پرانے سوہانجنے کے بھاری سایہ دار درخت کا تناب لنڈ منڈ ہو کر کٹا ہوا گھر کے پچھواڑے دیوار کے ساتھ رکھا تھا۔ اپنا گھر اسے بالکل اجنبی معلوم ہو رہا تھا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ گھر کے اندر کے دروازے کی طرف بڑھا اور اپنا ایک ہاتھ بند دروازے کی کنڈی پر رکھ دیا۔ اس کا دل اب زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ کنڈی کھٹکھٹانے سے پہلے اس نے دروازے کی جھری سے آنکھ لگا کر اندر تاکا: ایک لیمپ مدھم مدھم جل رہا تھا۔ اس کی ماں کا چرخہ سامنے رکھا تھا۔ دوسری طرف دودھ بلونے کی پرانی مٹکی پڑی تھی اور اوپر طاق پر بدستور تانبے کے برتنوں کی قطار تھی۔ اور ان برتنوں کے پاس روشن دان کے نیچے اس کی چھوی دیوار میں دو کیلوں کے درمیان ٹکی تھی۔ شاعیا کی نظر اپنی رنگدار ہتھے کی خوبصورت ہلکی پھلکی چھوی پر جم کر رہ گئی جس کا پھل اس مدھم روشنی میں آدھے چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ چھوی کے رنگدار ہتھے پر سے ہوتی ہوئی شاعیا کی نگاہیں دھیرے سے نیچے کود پڑیں اور فرش پر سوئی ہوئی ایک عورت کے چہرے پر آ کر ٹھٹک گئیں ـــــ نوراں اب دوشیزگی کے دور سے گزر کر ایک بھاری بھرکم عورت بن چکی تھی، جیسے گندم کی ہری بھری فصل دھوپ میں پک جائے۔ اس کا ننھا اس کی چھاتی سے چمٹا دودھ چوس رہا تھا، دوسرا اس کے ساتھ لیٹا نیند کے گہرے سانس لے رہا تھا۔ تھوڑی دور ادھر کو ایک بڑی مونچھوں والا بلونت جوان اپنے بھاری خراٹوں سے گھر بھر کو ہلا رہا تھا۔

وہ دیر تک اندر دیکھتا رہا۔ اس چھوٹے سے گھر میں اسے اپنی مہربان بوڑھی ماں کہیں بھی نظر نہ آئی۔ شاعیا کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، حلق گھٹ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ نوراں کی بھری گود دیکھ کر ہنس دے یا ماں کی جدائی میں رو دے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اسے پتہ نہ تھا یہ مسرت ہے یا غم۔ اپنی آنکھوں کو ہتھیلیوں سے پونچھتے ہوئے وہ گھوم کر مکان کے پچھواڑے چلا آیا، اور بلی کے سے بے آواز قدموں سے سوہانجنے کے کٹے ہوئے تنے پر کھڑے ہو کر اپنا چہرہ روشن دان کے قریب لاتے ہوئے چوری چوری ایک بار اندر جھانکا۔ لیمپ کی مدھم روشنی میں نوراں سو رہی تھی، اس کے بچے سو رہے تھے، ان کا رکھوالا سو رہا تھا۔ وہ دم سادھے ان سب کو دیکھ رہا تھا کہ نوراں کا دودھ پیتا ننھا جاگ اٹھا۔ شاعیا نے گھبرا کر جلدی سے روشن دان کے اندر ہاتھ ڈالا اور انتظار کی گھڑیاں گنتی ہوئی چھوی کو آہستہ سے اوپر کھینچ کے جلدی سے پیچھے کو مڑا لیکن اس کا دامن سوہانجنے کے ٹھنٹھ کی سوکھی ساخ میں الجھ گیا اور وہ دھڑام سے زمین پر آ رہا۔ اس کی چھوی دور جا پڑی۔ ابھی وہ اٹھ کر سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ قریب کا

آہٹ ہوئی اور اس کی آنکھیں لیمپ کی روشنی سے چندھیا گئیں اور پھر لیمپ کی روشنی میں اس نے نوراں کو بال بکھرائے ٹوٹی نیند کی اٹکی آنکھوں سے اپنی طرف گھورتے دیکھا۔ نوراں کے منہ سے بے اختیار ایک حیرت زدہ چیخ نکلی اور وہ جذبات سے کانپتی آواز میں "بھائی" پکارتی ہوئی شاھیا سے دیوانہ وار لپٹ کر رونے لگی۔ شاھیا نے پیار سے نوراں کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا، اس کا دل پھر بھر آیا، آنکھیں پھر نمناک ہوگئیں۔ نوراں کا خاوند آنکھیں ملتا ہڑبڑا کے باہر نکلا اور اپنی دھوتی کے پلو کمر سے کستے ہوئے بڑی حیرانی سے یہ ماجرا دیکھنے لگا۔

"خوش رہو، آباد رہو نوراں" شاھیا گلوگیر آواز سے بولا۔ "تمہیں سہاگن دیکھ کے میری زندگی کا سارا بوجھ ہلکا ہوگیا ہے"۔ یہ کہتے کہتے شاھیا نے نوراں کے تنومند شوہر کو الفت بھری نظروں سے دیکھا "تو سلامت رہے، جوان آباد رہے"۔ رقت بھری آواز میں یہ دعائیہ کلمات کہتا، آنکھیں پونچھتا، وہ باہر کے دروازے کی طرف بڑھا۔ نوراں نے جھپٹ کر اس کے کرتے کا دامن تھام لیا "کہاں جا رہے ہو؟"

"اپنے گاؤں کے کھوج میں"، شاھیا بدستور اداسیوں اور مسرتوں میں گڈمڈ ہو کے بولا "اپنی جھولی میں ڈالنے کے لئے آؤں گا تمہارے گھر اللہ بیلی!" اس نے اپنا دامن چھڑایا اور پیٹھ موڑ کے آگے چل دیا۔ نوراں نے اپنی بھیگی پلکیں پونچھ ڈالیں اور دیر تک دروازے پر کھڑی ایک سایہ کو دور درختوں کے پیچھے اوجھل ہوتے دیکھتی رہی۔

گاؤں سے باہر آنے والی پگڈنڈی پہ سے اجنبی راہگیروں کی طرح گذرتے ہوئے وہ ذرا کی ذرا اپنے پرانے کھیت کے قریب رکا اور اپنی زمین کے اس ٹکڑے کو جہاں بیری کا پرانا درخت کھڑا تھا ایک بار مسکرا کر الوداعی نظروں سے دیکھا۔ بیری کا درخت شاھیا کو پہچان گیا، اس کی ٹہنیاں یوں ہلنے لگیں گویا شاھیا کے خاموش سلام کا جواب دے رہی ہوں۔ سوتے ہوئے گاؤں پر اچٹتی ہوئی سی نگاہیں ڈال کر وہ مڑا اور آگے کو ہو لیا۔

آم کے بور کی بھینی بھینی خوشبو میں رچے ہوئے کھنڈروں کو پیچھے چھوڑ کر وہ تیز تیز قدموں سے چلتا لک کی پکی سڑک پر آن کھڑا ہوا، سڑک بالکل سنسان تھی۔ سڑک کے دونوں کناروں پر ٹاہلی کے درختوں کی قطاریں اونگھ رہی تھیں اور شاھیا گم سم کھڑا تھا۔ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے شاھیا کو دور سڑک پر ایک لالٹین کی روشنی دکھائی دی اور پھر روشنی کے اس ہیولے سے بتدریج ایک گڈے کے پہیوں اور بیلوں کے گھنگروؤں کی صدا آنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی کسی جوان کے ماھیا گانے کی بھنک اس کے کان میں پڑی۔ گڈا قریب آگیا تو اس نے دیکھا کہ اس پر کنک کے بورے لدے ہیں اور جوان لہک لہک کر گاتے ہوئے چلتے چلتے بیلوں کو بلاوجہ ہنکائے جاتا ہے۔ شاھیا کو ہنسی آگئی۔ جب گڈا کنک کے بوروں سے لدا ہو اور کنک شہر کے جا کر بیچنی ہو تو بیلوں پر خواہ مخواہ سست چلنے کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ "شہر چلے گا جوان؟" پاس سے گذرتے ہوئے جوڑی پر بیٹھا آدمی للکارا اور شاھیا غیر ارادی طور پر اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔

★

گڈے والے جوان نے شاھیا سے کوئی بات نہ کی۔ وہ اپنی ترنگ میں ہنکتا چلا گیا۔ شاھیا نے اپنی پگڑی کھول کے سر کے نیچے رکھ لی چھوی کو محبوبہ کی طرح پیار سے اپنے ساتھ لٹا لیا اور دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھ کے تازہ کنک سے مہکتے ہوئے بوروں پر لیٹ کر آسمان پر تاروں کا جھرمٹ دیکھنے لگا۔ تاروں کا جھرمٹ دیکھ کر نہ جانے کیوں شاھیا کو عورت کے ماتھے کا جھومر یاد آگیا۔ اس نے آنکھیں موند لیں، گیلی گیلی شبنم بھری ہوا میں ماھیا کی سریلی تان تھی۔ بیلوں کے پیروں میں بندھے گھنگروؤں کی جھنکار تھی آسمان پہ تاروں کی دھنک۔ زمین پر ٹاہلیاں سو رہی تھیں اور شاھیا ماضی کی داستان بن کے کہیں کھو گیا تھا!

اپنی منزل پر پہنچ کر گڈے والے جوان نے بیل کھولے اور ان کے آگے چارہ ڈال کر خود حقہ گڑگڑانے لگا۔ شاھیا کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے پھر اس گڈے والے جوان کی طرف دیکھا جس کے گیتوں کی لے ختم ہو چکی تھی اور چہرہ لیمپ کی مٹیالی روشنی میں سوچوں کی پکار بن گیا تھا۔ شاھیا سب کچھ سمجھ گیا۔ یہ اس کی اپنی ہی کہانی کی تمہید تھی۔

★

شہر کی سنسان گلیوں میں بے مقصد چلتے چلتے بجلی کے کھمبوں کی اداس روشنیوں کے دائرے لانگھتے، شاھیا ایسی جگہ آ نکلا جو اسے جانی پہچانی سی معلوم ہوئی۔ دکانیں بند، مکان خاموش اور گلیاں ویران تھیں۔ جگہ جگہ باسی پھول اور پھولوں کے ہار بکھرے تھے۔ مٹھائی کے

خالی دونے تھے، پھینکے ہوئے بجھے ہوئے سگریٹ تھے، پانوں کی پیک تھی، خوانچے والوں کی غلاظت تھی۔ اور سامنے وہی جگہ تھی جہاں سے کبھی شاعیا پھولوں کی چوٹ کھا کر پاگل ہو گیا تھا۔ وہ خواہ مخواہ مسکرانے لگا۔ اسے پھر ایک عجیب سا خیال آیا اور اس نے کپڑے جھاڑ کر پگڑی کو ٹھیک کر لیا۔ دونوں ہاتھ منہ پہ ملے اور مونچھوں کو بل دے کر زمین سے گلاب کا ایک پھول اٹھا کر پگڑی میں ٹانک لیا اور ڈگ بھر کے اس نے گلی پار کی اور سامنے کی ڈیوڑھی لانگھ کر اوپر دروازے پر زور سے دستک دی۔ "کون؟" رات کی جاگی ہوئی ایک نسوانی آواز پکاری۔ "دروازہ کھولو" شاعیا نے پہلے سے تیز تر شور پیدا کر کے قدرے تحکمانہ لہجے میں کہا اور ذرا سے توقف کے بعد دروازہ چوپٹ کھل گیا۔ شاعیا اندر داخل ہوا تو سب سے پہلے اس کی نظر لیمپ کی بڑھائی ہوئی بتی پر پڑی جس کا تیل غالباً ختم ہو چکا تھا۔ ساتھ والے کمرے سے کسی مرد کے خراٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ شاعیا نے لالٹین کی گھٹتی بڑھتی روشنی میں ایک گورے گورے حسین چہرے پر ٹھوڑی اور ہونٹوں کے درمیان وہی تل دیکھا جسے وہ اتنے عرصے کے بعد بھی نہیں بھولا تھا۔

"تم نے مجھے پہچانا؟" شاعیا دونوں ہاتھ پیٹھ پیچھے باندھ کر نظریں چراتے ہوئے کمرے میں گھوم کر بولا۔

"ہاں ...." اس نے قدرے توقف کے بعد یوں کہا جیسے شاعیا کو پہچان کر اس سے کوئی قصور ہو گیا ہو۔ "تمہیں معلوم ہے میں یہاں کیوں آیا ہوں؟" شاعیا نے لاتعلقی کے انداز میں دیوار پر ایک تصویر دیکھتے ہوئے ایک نمایاں احساس برتری کے ساتھ پوچھا جیسے کوئی ہنس کوے کا مہمان بنا ہو۔

"نہیں" اس نے ایک احساسِ جرم سے دبی آواز میں جواب دیا۔

جیسے ایک عظیم راز کا انکشاف کرتے ہوئے شاعیا نے سنجیدگی سے کہا "اس لئے کہ تم نے میرے لئے پینیاں بھگتیں اور جھوٹ بول کر میری جان بچائی، عدالت میں تم نے ایک حرف بھی سچ نہیں کہا۔ ورنہ شاید میں آج یہاں نہ ہوتا....." شاعیا بدستور تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا اور کمرے میں پھر تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔

"اور سنو....." شاعیا پلٹ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہوا، اپنی چھوی کو ہاتھوں میں جھلاتا ہوا پولیس انسپکٹروں کے سے انداز میں کہنے لگا "آئندہ کبھی کسی پر یوں پھولوں کے ہار نہ پھینکنا، ان چلتے ہوئے لوگوں میں کبھی کبھی کوئی مرد جوان بھی آ ہی نکلتا ہے"۔ شاعیا نے کٹیلے طنز کے ساتھ مسکرا کر اس کو دیکھا۔ اس نے مہندی رنگے ہاتھوں سے منہ چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی جیسے شاعیا نے کسی رستے ہوئے زخم پر اچانک زور سے نشتر مار دیا ہو۔ کچھ نادم کچھ حیرت زدہ سا ہو کر شاعیا نے چھوی کونے میں رکھ دی اور آگے بڑھ کر اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھنے لگا۔

"اچھا تو اب میں چلتا ہوں....." وہ اس کی دل آزاری کے خیال سے ڈر کے کونے سے اپنی چھوی اٹھائے پشیمانی سے بولا اور جلدی سے باہر نکل آیا۔ مبادا سسکیوں کی آواز سے کوئی جاگ اٹھے اور اس کے ساتھ ہی شاعیا کے اندر کا شاعیا بھی..... اندر سے بدستور سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔ شاعیا باہر بت بنا کھڑا تھا۔

بڑی مشکل سے اس نے اپنے آپ کو دروازے سے ہٹایا اور شاعیا کو گھسیٹتا ہوا باہر سڑک پر لے آیا۔ وہ مردہ سی چال چلتا ہوا شہر سے باہر آ گیا، وہ دل ہی دل میں پچھتا رہا تھا کہ وہ وہاں گیا ہی کیوں؟

آہستہ آہستہ چلتے وہ شہر کے باہر بہنے والی بڑی نہر کے کنارے نکل آیا۔ آس پاس کی بستیوں میں مرغ اذان دینے لگے تھے، گائیں ڈکارنے لگی تھیں، کتے بھونکنے لگے تھے، صبح کا وقت قریب تھا۔

نہر کے کنارے چلتے چلتے اسے یوں لگا جیسے اس کے کان گونج رہے ہیں، جیسے دور کہیں کوئی "شاعیا" "شاعیا" پکار رہا ہے۔ یہ آواز دھیرے دھیرے قریب آتی جا رہی تھی حتیٰ کہ شاعیا کو ایک بار پیچھے مڑ کر دیکھنا ہی پڑا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ کوئی عورت چادر اوڑھے وحشت کے ساتھ اس کے پیچھے پیچھے بھاگتی چلی آ رہی تھی۔ جیسے شاعیا اس کی کوئی انمول شے لئے جا رہا ہو۔ وہ ٹھٹک گیا، وہ بہت حیران تھا۔ اگر اس کی گھوڑ ستی کہیں سے جھنجھناتی آ جاتی یا اس کے سفید بیل کہیں سے گھنگرو بجاتے بھاگتے ہوئے یکلخت اس کے سامنے آ جاتے تب بھی شاید اس کو اتنی حیرت نہ ہوتی۔ وہ عورت پاگلوں کی طرح دوڑتی اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا رواں رواں پسینے سے تر تھا اور آنکھیں نمناک۔ وہ کانپ رہی تھی اور اس کے ساتھ اس کی آواز بھی "مجھے بھی ساتھ لے چلو شاعیا" شاعیا مسکرانے لگا۔ پھر نہ جانے کیوں اسے اس گاؤں کا خیال آیا جس کی تلاش میں وہ نکلا تھا اور جہاں سب کچھ اس کا اپنا تھا۔

افسانہ:

دورُخ

غُلام الثقلین نقوی

گفتگو گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی ہے!
سانپوں کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ننھے سے سنپولئے سے بات شروع ہوئی جو اتفاقاً ایک دن اشرف کے پاؤں تلے کچلا گیا تھا اور ایک اژدہے پر ختم ہوگئی جسے برما کی جنگ میں اشرف اور اس کے ساتھی سپاہیوں نے برین گن کی گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا۔ پھر نہ جانے کیسے موضوع یکدم بدلا اور ٹھگوں اور گرہ کٹوں کی لذیذ حکایات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔
نذر نے کہا: "مجھے دو بار ٹھگوں سے پالا پڑا ہے۔ ایک بار مجھے میری دیانت اور فطرتی شرافت نے بچا لیا اور کافی دنوں کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میں ٹھگوں کے پلے پڑ گیا تھا۔ دوسری بار مجھے پورا پورا احساس تھا کہ میں ٹھگا جا رہا ہوں لیکن میں اُس پرندے کی طرح جسے سانپ کی آنکھ نے مسحور کر لیا ہو اور وہ جتنا چلاتا اور پھڑپھڑاتا ہوا آخر بے بس ہو کر سانپ کے منہ میں چلا جاتا ہے، دامِ فریب میں پھنس کر رہ گیا اور ستم ظریفی تو یہ ہے کہ بعد میں اپنے کئے پر پچھتا بھی نہ سکا۔"
سب نذر کی طرف متوجہ ہو گئے۔ نذر سب کی توجہ ایک مرکز پر مرکوز دیکھ کر کھنکھارا اور کہنے لگا:۔
"یہ آج سے تین سال پہلے کا واقعہ ہے۔ مجھے ایک کام سے ملتان جانا پڑا۔ ملتان چھاؤنی کے اسٹیشن پر گاڑی سے اترا۔ ابھی پوری پوری روشنی نہ ہوئی تھی۔ میں نے باہر نکل کر ہاتھ منہ دھوئے اور پھر اٹیچی کیس اٹھا کر اس سڑک پر ہو لیا جو چھاؤنی میں سے گزرتی ہوئی شہر کی طرف جاتی ہے۔ سڑک کے دو رویہ سایہ دار درخت تھے اور صبح کی ہوا خنک تھی۔ میں نے تانگہ لینے سے پیدل چلنا بہتر سمجھا۔ رات جاگتے گزری تھی۔ رات بھر گاڑی کے ڈبے میں اُمس اور گرمی تھی۔ پسینے پر پسینے آتے رہے تھے لیکن یہ صبح کی لطیف ہوا کا معجزہ تھا کہ چند قدم چلنے کے بعد طبیعت ہشاش بشاش ہو گئی اور بند بند سے تھکن شبنم کے قطروں کی مانند اُڑ گئی۔
میں نے اٹیچی کیس زمین پر رکھا، ایک سگریٹ ہونٹوں میں دابا، دیا سلائی رگڑی لیکن وہ آگ نہ پکڑ سکی۔ رات بھر پتلون کی جیب میں رہ کر دیا سلائی پسینے میں بھیگ چکی تھی۔ میں مایوس ہو کر سگریٹ ہونٹوں سے نکالنے والا ہی تھا کہ شرر کی آواز آئی اور پیالی کی صورت میں بند دو ہاتھ میرے ہونٹوں تک آ پہنچے جن کے اندر ننھا سا شعلہ روشن تھا۔ میں چونک گیا، لیکن سگریٹ کو آگ لگ چکی تھی اور پہلا کش فضا میں نیلا دھواں بن کر منتشر ہو چکا تھا۔ میں نے شکریئے کے الفاظ کہے۔ نووارد نے مسکرا کر کہا: "کوئی بات نہیں صاحب!" میں نے نووارد کو بڑے غور سے دیکھا۔ شلوار قمیص اور اس کے اوپر خاکی کوٹ۔ آنکھوں پر رنگین چشمہ، نفیس ترشی ہوئی مونچھیں، بڑی صفائی سے منڈی ہوئی ڈاڑھی۔ میں اٹیچی کیس اٹھانے کے لئے جھکا۔ معاً وہ ہاتھ اٹیچی کیس کی طرف لپکا۔ پھر میں نے کہا: "صاحب آپ تکلیف نہ کیجئے۔" نووارد جواب میں محض مسکرا دیا۔ بڑی دلکش میٹھی مسکراہٹ جیسے کہہ رہی ہو: اس میں تکلف کی کونسی بات ہے، دوستا! میرے لئے یہ تکلیف عین راحت ہے۔
پھر ہم دونوں روانہ ہو پڑے۔ راستے میں اُس نے بڑے میٹھے انداز میں باتیں کیں۔ لاہور کی باتیں، پشاور کی باتیں، لندن اور نیویارک کی باتیں۔ اخبار کی باتیں۔ لیڈروں کی باتیں۔ جناح اور لیاقت کی باتیں۔ وہ باتیں جو بڑی معمولی معمولی تھیں لیکن کہنے والے کا انداز بہت نرالا تھا۔ اس نے پاکستان کا کونہ کونہ کھنگال ڈالا تھا۔ سیر و سیاحت اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ میں نے یہی سمجھا کہ وہ صبح کا ناشتہ لاہور میں کرتے ہیں۔ دوپہر کا کھانا ملتان میں کھاتے ہیں، سہ پہر کی چائے کراچی میں پیتے ہیں اور رات بلوچستان کے کسی صحرائی ٹیلے پر بسر ہوتی ہے جہاں رات رات بھر پریاں ناچتی گاتی اور ہوا ٹھنڈے سانس بھر کر

لوریاں دیتی رہتی ہے اور سمندر کی لہریں نغموں کی بارش کرتی ہیں۔ آبشار گنگناتے ہیں۔ ندیاں مستی کے عالم میں پتھروں پر سے رقص کرتی پھسلتی چلی جاتی ہیں۔

میں نے گھبرا کر کہا: "بلوچستان کے صحرا میں لہروں کے نغمے۔ آبشاروں کی گنگناہٹ۔ ندیوں کا رقص!"

"واہ صاحب!" اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا: "سمندر تو کراچی کے پاس ہے اور آبشار اور ندیاں مری اور ایبٹ آباد کے پہاڑوں پر لیکن ان کا صحیح لطف ریت کے ٹیلوں پر ہی آتا ہے۔ یہ اس کی قدرت کا ایک کرشمہ ہے۔ ہاں صاحب! سبحان اللہ۔ . . . آپ نے کبھی ریڈیو سنا ہے؟"

"آپ کا مطلب؟" میں نے بوکھلا کر کہا۔

"ایریل ہوا سے آواز کی لہروں کو پکڑتا ہے اور ارتھ زمین سے۔"

"لیکن بلوچستان کے ریت کے ٹیلوں سے اس کا تعلق؟" میں نے جھنجھلا کر کہا۔

اور معاً فضاؤں میں ایک قہقہہ گونج گیا۔ گونجیلا۔ لچکیلا۔ لرزتا کانپتا قہقہہ۔ وہ قہقہہ جس میں چھوت کے جراثیم ہوتے ہیں۔ میرا دل چاہا کہ میں بھی اتنا زور سے قہقہہ لگاؤں کہ پھیپھڑے پھٹ جائیں۔ میں نے اس خواہش کو بڑی مشکل سے روک کر کہا۔

"آپ قہقہے پر قہقہہ لگاتے ہیں۔"

"معاف کیجئے! میں قہقہہ لگانے کو صحت کے لئے نہایت ضروری سمجھتا ہوں پھیپھڑے کھل جاتے ہیں۔ دق اور سل سے انسان محفوظ رہتا ہے۔ . . اور ..... آپ کو معلوم ہے کیا؟"

"کیا؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"فرنگی ہندوستان چھوڑنے سے پہلے یہاں دق کے جراثیم پھیلا گئے تھے۔" اُس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

"دق کے جراثیم!" میں نے خوف سے کانپتے ہوئے کہا۔

"فرنگی سونے کی چڑیا کو بھلا کیسے چھوڑ سکتا تھا صاحب!" اُس نے کبوتر کی طرح چہرے کو معصوم بناتے ہوئے کہا؛ "فرنگیوں نے جانے سے پہلے بوتلوں کے منہ کھول دیئے۔ آپ یقین جانیں۔ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ ایک دن شہروں کی سڑکوں اور دیہاتوں کی گلیوں میں لاشوں کے انبار ہوں گے۔ ہاں گلی سڑی لاشوں کے انبار۔ ہڈیوں کے ڈھیر۔ کھوپڑیوں کے ہار۔"

"کھوپڑیوں کے ہار!" میں نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"لوگ کھوپڑیوں کے ہار پہنیں گے۔"

"کون لوگ؟" میں نے چیخ کر کہا۔

"وہی لوگ جو قہقہہ لگا کر ہنسیں گے۔ جن کے سینوں کے اندر تازہ ہوا آتی جاتی رہے گی یعنی میرا مطلب یہ ہے جو زندہ رہیں گے۔ میں اسی لئے تو قہقہے لگا کر ہنستا ہوں اور خوراک بھی تو اچھی کھاتا ہوں یعنی میرا مطلب ہے انڈا، گوشت، مرغی، مکھن اور دودھ۔ لکھنؤ کے باورچی بھی تو کمال کے کاریگر تھے۔"

"یعنی؟"

"ہمارے گاؤں کے ذیلدار نے لکھنؤ کے ایک باورچی کو ملازم رکھ لیا تھا۔ اُس نے ایک پاؤ مونگ کی دال پکائی اور تیس روپے خرچ مانگا۔ 'تیس روپے' ذیلدار نے حیران ہو کر پوچھا۔ باورچی کو غصہ آیا۔ اُس نے دال ایک سوکھے درخت کی جڑ میں انڈیل دی اور خود چلا گیا۔ دوسری صبح اُس ٹنڈ منڈ درخت میں سبز کونپلیں اور ہرے بھرے پتے تھے۔ میں نے اُس باورچی کو دیکھا ہے۔"

"آپ نے؟"

"جی ہاں! میں نے ان آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ باورچی لکھنؤ کے آخری نواب کے پاس تھا۔ اور پھر جب نواب غریب ہو گیا تو وہ روزگار کی تلاش میں پنجاب آ گیا۔ بہت بڈھا تھا۔ محض ہڈیوں کا ڈھانچہ۔"

"لکھنؤ کا انقلاب ہوئے سو سال گذر چکے ہیں۔"

"سو سال؟" اُس نے کچھ دیر سوچ کر کہا: "اُس کی عمر کم از کم ایک سو تیس سال ہوگی جس دال سے سوکھے درخت ہرے ہو سکتے ہیں۔ اُس سے عمر کے

چند سال نہیں بڑھ سکتے۔ آپ بھی تو کمال کرتے ہیں بابو جی!"

اور مجھے اپنے کمال پر کمال ندامت ہوئی۔

"کیا وہ اب بھی زندہ ہے؟"

"مر گیا ہے بیچارا!" اُس نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ "موت سے کس کو مفر ہے!"

اور مجھے حیرت ہوئی جس شخص کے پاس ٹنڈ منڈ درخت کو ہرا بھرا کرنے کا معجزہ ہے۔ وہ بھلا مر کیسے سکتا ہے؟

"کیسے شکر ادا کروں تیرا نیلی چھتری والے!" اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ "سچ جانیں بابو جی میرا کوئی دھندا نہیں۔ پھر بھی دو وقت کی روٹی مل ہی جاتی ہے۔"

"گزارے کی کوئی سبیل نہیں! پھر بھی ......" اس نے میری بات کاٹ لی۔

"بہت دیتا ہے۔ پیٹ بھر کے دیتا ہے۔"

"بغیر کسی کام کے"

"ہاں صاحب! بغیر کام کے چھپر پھاڑ کر ..... ایک سگریٹ۔"

میں نے جلدی جلدی سگریٹ اس کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ اُس نے اٹیچی کیس نیچے رکھا اور سگریٹ سلگایا۔ پہلا کش لیکر کہا۔ "اُس کے دینے کے ڈھنگ نرالے ہیں۔ میں جب اسٹیشن پر اترا تو میرے پاس صرف ایک آنہ تھا۔ وہ میں نے ایک فقیر کو دے دیا۔ سگریٹ کی سخت طلب تھی۔ ہاں! واقعی اس کے دینے کے ڈھنگ نرالے ہیں۔"

مجھے دوسری بار ندامت ہوئی۔ کم بخت نے اپنی بات کا عملی ثبوت دے دیا تھا۔ اُس نے منہ کو غنچے کی مانند سکیڑا۔ لمبا سا کش لیا۔ دھوئیں کے حلقے بنتے اور فضا میں تحلیل ہوتے گئے۔ اس کے سگریٹ پینے کا انداز بھی بڑا فنکارانہ تھا۔ ایک عرصے تک ہم دونوں خاموش رہے۔ پھر اس نے کہا۔

"آپ بہت کم باتیں کرتے ہیں۔" میں احتجاج کرنے کے لئے منہ کھولنے ہی والا تھا کہ اس نے کہا۔

"کچھ لوگ فطرتاً بہت خاموش ہوتے ہیں صاحب۔ میں بھی بعض اوقات اتنا کم گو بن جاتا ہوں کہ میرے دوست شکایت کرتے ہیں۔"

"لیکن آج تو آپ کی روانی پر مجھے رشک آ رہا ہے۔" میں نے بڑی جرأت سے کہا۔

"رشک!" اور وہی گونجیلے، لچکیلے قہقہے پھر ساکن فضاؤں میں گونجے۔ "آپ سے مل کر نجانے کیوں خواہ مخواہ بے تکلف ہونے کو جی چاہتا ہے۔ بالکل آپ ہی کی شکل و صورت کا میرا ایک دوست تھا۔"

"تھا" میں نے کہا۔

"ہاں صاحب کبھی تھا، اب نہیں۔"

"لڑ پڑے تھے آپ؟"

"نہیں صاحب میری دوستی کا محل ریت کی بنیادوں پر نہیں بنا کرتا۔ یہی مولا کی مرضی تھی۔ موت نے اُسے چھین لیا۔"

اُس کی آواز میں غم کی کپکپاہٹیں تھیں۔ "وہ گھر سے امیر تھا لیکن جب مرا تو اُس کے پاس کفن کے لئے پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ کہہ رہے تھے کہ وہ امیر تھا۔"

"دولت خواہ جوئے میں لٹائی جائے یا عیاشی کی نذر کر دی جائے یا حاتم طائی کی طرح فقیروں میں بانٹ دی جائے۔ آخر ختم ہو ہی جاتی ہے۔"

"وہ شرابی تھے یا ......؟"

"نہیں صاحب! وہ سخی تھا۔ دولت اس کے ہاتھوں کی میل تھی۔" میں نہ جانے کیوں مسکرا دیا۔ اس نے جواب میں پوری بتیسی کی نمائش کی۔ بڑی بتیسی جس کے سامنے کے دو دانت سنہری تھے۔ سونے کے پتروں میں مڑھے ہوئے دانت۔ یہ سنہری مسکراہٹ بہت دلآویز تھی۔ بڑی معصوم بڑی بے تکلف۔

"آپ کا اسم شریف؟" میں نے سیدھے سادے خالص ایشیائی انداز میں پوچھا۔ "میرا نام جان کر کیا ملے گا آپ کو؟ یہی سمجھ لیں کہ ایک مسافر ساتھی

کے ساتھ چند لمحے گزرے تھے ۔ مجھے آپ پردیسی کہہ لیا کریں" اور بات کرتے کرتے وہ یکدم چونک پڑا۔

" اُس عورت کو دیکھا آپ نے ؟"

" کس عورت کو ؟"

" وہ سامنے دیکھئے نا ! اس کے متعلق کیا خیال ہے آپ کا ؟"

" میرا خیال ! میں اسے نہیں جانتا "

" جانتا میں بھی نہیں لیکن تجربہ بھی تو کچھ چیز ہے "

" مجھے عورتوں کے متعلق بہت کم تجربہ ہوا "

" واہ صاحب ! تو سنیئے ! اس عورت کی کوئی چیز گم ہو گئی ہے ۔ آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کیا ؟"

" نہیں ! " میں نے چڑ کر کہا۔

اس نے مسکرا کر کہا" شرط لگاتے ہیں آپ ! میرا اندازہ کبھی غلط نہیں ہوا "

اس اثنا میں وہ عورت نزدیک آ چکی تھی ۔ ادھیڑ عمر کی عورت جس نے حد سے زیادہ شوخ اور رنگین کپڑے پہن رکھے تھے ۔ ہونٹوں پر سرخی آنکھوں میں کاجل ۔ پاؤں میں سفید لفٹی ۔ اس کی نگاہوں سے پریشانی کا اظہار ہو رہا تھا۔

میرے پردیسی دوست نے آگے بڑھ کر کہا " بی بی !"

عورت نے چونک کر دیکھا اور اس کی نگاہیں اور زیادہ پریشان ہو گئیں ۔

" بی بی ! تیری کوئی چیز گم ہو گئی ہے کیا ؟"

" ہاں ! بھائی !"

پردیسی نے مجھے گھور کر دیکھا ۔ میرے پاس الفاظ نہیں کہ ان نگاہوں کی اس چمک کو بیان کر سکوں جس میں ہٹلر، مسولینی، چنگیز اور دنیا کے تمام فاتحوں کی فتحمندی میں چور روحیں ہجوم کر آئی تھیں ۔ میں نے ہارے ہوئے دشمن کی مانند شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا۔

" کیا چیز تھی بی بی ؟ اور کہاں گم ہوئی ؟" اس نے اپنے لہجے میں دنیا بھر کی ہمدردی سمیٹتے ہوئے کہا۔

" یہیں اس سڑک پر ..... میں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر تھک چکی ہوں "

" کیا چیز تھی بی بی ؟" بی بی خاموش رہیں۔

" ڈرنے کی کونسی بات ہے ؟ ایک ہی ہاتھ کی پانچ انگلیاں بھی تو برابر نہیں ہوتیں "

" نیکلس تھا ۔ ایک سہیلی سے مانگ کر لائی تھی ۔ ایک شادی میں شریک ہونا تھا ۔ رومال میں لپیٹ کر جیب میں ڈال لیا تھا ۔ نہ جانے کیسے گر گیا ؟"

اُس عورت کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

ہم دونوں آگے چل پڑے ۔ کوئی دو فرلانگ چلنے کے بعد اُس نے سرخ رومال میں لپٹی ہوئی ایک پڑیا کو ٹھوکر لگا کر دور پھینک دیا اور پھر آگے بڑھ کر اٹھا لیا ۔ اُس نے پڑیا کھولی ۔ اس کے اندر سنہری چمکتا ہوا ہار تھا ۔ اس کا ہاتھ کانپا اور پھر اُس نے میری کلائی پکڑ لی اور کشاں کشاں مجھے سڑک سے ایک طرف لے گیا ۔ ایک پرانے قبرستان میں ٹوٹی پھوٹی قبروں کے درمیان، اس نے ایک بوڑھے ادکان کے تنے کے ساتھ ٹیک لگا لی۔

" خدا جب دینے پہ آتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے "

" یہ ہار تو اُس عورت کا ہے "

" ہوگا مجھے کیا معلوم ۔ میں نے رستے میں پڑا ہوا پایا " اُس نے بڑی خشونت سے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ۔ اس کی آنکھوں میں دنیا بھر کی ہوس جھلک رہی تھی ۔ ایک قاتل کی آنکھوں کی خونی چمک جیسے اس کے ہاتھ ابھی بڑھیں گے اور میرا گلا دبا ڈالیں گے۔

" تو پھر مجھے جانے دو " میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"مجھے پولیس کے سپرد کرنا چاہتے ہو دوست۔ میں ایسی چالاکیوں کو خوب سمجھتا ہوں۔" اُس نے دانت کٹکٹا کر کہا اور میری کلائی پر گرفت اور بھی سخت کر دی۔

"یہ ہار اُس عورت کا ہے۔ تم نے کہا تھا ایک ہی ہاتھ کی پانچ انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔" میں نے بڑی جرأت سے کہا۔

"میں اب بھی یہی کہتا ہوں۔"

"پھر بہتر یہی ہے کہ......" اُس نے مجھے بات پوری نہ کرنے دی۔

"بہتر یہی ہے کہ میں اسے لوٹا دوں، یہی کہنا چاہتے تھے نا آپ! میں آخری بار کہتا ہوں کہ یہ ہار مجھے سڑک پر گرا ہوا ملا۔ میں نے ڈاکہ نہیں ڈالا۔ چوری نہیں کی۔ میں ہار واپس نہیں کروں گا۔ تین ساڑھے تین سو پر لات کیسے ماروں؟ لیکن آپ میرے شریک ہیں۔"

"میں حصّہ نہیں لوں گا" میں نے بڑی شدّت سے انکار کیا۔ اس کے دو سنہری دانت ننگے ہو گئے۔ لیکن اب اس پر سونے کی بنی ہوئی مسکراہٹ نہیں تھی۔ ایک جھلائے ہوئے کتے کی غراہٹ تھی۔

"آپ کو حصّہ لینا پڑے گا۔ میں پولیس کے سپرد نہیں ہونا چاہتا۔" اس نے ہار کو بڑے غور سے دیکھا۔ "بڑی خوبصورت چیز ہے۔ اس کے دو ٹکڑے نہیں ہو سکتے۔ آپ نصف ہار کی قیمت ......" چھٹکارے کی اور کوئی سبیل نہ تھی۔ میں نے سر ہلا کر رضامندی کا اظہار کیا۔

"تو لائیے ڈیڑھ سو روپے" اس نے چہک کر کہا۔

میں نے چیخ کر کہا "تم نے نصف قیمت دینے کی پیشکش کی تھی۔"

"میں نے کہا تھا، میں نے کب کہا تھا؟ میں نے ابھی ابھی بھکاریوں کی طرح ہاتھ پھیلا کر آپ سے ایک سگریٹ کی بھیک مانگی تھی۔ گاڑی سے اترتے وقت میری جیب میں محض ایک آنہ تھا جو میں نے اپنے جیسے بھکاری کو خیرات کر دیا کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ ضرورت مند تھا۔" اور اُس کے چہرے کی کیفیات ہارے ہوئے مایوس جواری کی مانند اداسی، بےکسی، بےبسی اور شکست میں بدل گئیں۔ سچ جانئے! میں پھر شرمندہ ہو گیا۔ میرے لاشعور نے اس کی سیدھی سادی بات کو غلط معنی دے رکھے تھے۔

اُس نے امید بھری آنکھوں کے ساتھ ہار کو لہرا کر کہا "آپ کے پاس ڈیڑھ سو روپے ہیں؟"

"نہیں"

"ایک سو"

"نہیں"

"پچاس"

"نہیں"

"آپ بہت ضدی ہیں۔ میں پچاس میں ساڑھے تین سو کا ہار پیش کر رہا تھا۔ آپ نے سنہری موقع کھو دیا۔"

"میرے پاس کچھ بھی نہیں۔"

"کچھ بھی نہیں، آپ بہت بڑا جھوٹ بول رہے ہیں۔"

"جھوٹ!" میں نے غصّے سے کانپتے ہوئے کہا۔

"معاف کیجئے! میں پاگل ہو گیا تھا۔" اس نے آنکھیں میچ لیں اور خیالات کی دنیا میں کھو گیا۔ اس کے مایوس چہرے کی شکنیں ایک ایک کر کے ہموار ہونے لگیں جیسے کوئی اَن دیکھا ہاتھ حرص و ہوس کے نقوش کو آہستہ آہستہ مٹاتا چلا جا رہا ہے۔ پھر آنکھوں میں مسکراہٹ جھلکی اور ہونٹوں پر اتر آئی۔ بھینچے ہوئے ہونٹوں کے تالے کھلے اور اُن سنہری دانتوں پر شفق کے لالہ زار کھلنے لگے۔

"یہ ہار اس عورت کو دے دیجئے۔" میں نے زندگی میں پہلی بار ایسی مسرت کا لطف اٹھایا جو غرض کے ہر جذبے سے پاک ہوتی ہے۔ میں نے ایک انسان کے ابلیس کو زیر کر لیا تھا۔ ہم چپ چاپ سڑک پر آ گئے۔ وہ عورت ابھی تک ہار تلاش کر رہی تھی۔ میں نے اسے اشارے سے بلایا۔ قریب آنے پر

میں نے ہار اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ لیکن میں حیران رہ گیا کیونکہ اس کے چہرے پر خوشی کی ایک رمق بھی پیدا نہ ہوئی میرا پردیسی ساتھی ہاتھ ملا کر اور ایچی کیس میرے ہاتھ میں تھما کر رخصت ہو گیا۔ میں سارے راستے یہی سوچتا چلا آیا کہ وہ عورت ہار کو دوبارہ پا لینے پر خوشی سے پاگل کیوں نہ ہو گئی۔

اور یہ عقدہ جلد وا ہو گیا۔ چند دنوں کے بعد میں نے اخبار میں ایک خبر پڑھی۔ پولیس نے ٹھگوں کے ایک گروہ کو گرفتار کر لیا تھا جن میں عورتیں بھی شامل تھیں۔ وہ ہار پیتل کا تھا جس پر سنہری پانی پھرا ہوا تھا۔ پھر مجھے اپنی شرافت پر غصہ آیا۔ اپنی دیانتداری پر ڈوب مرنے کو جی چاہا۔

"کیوں؟" اشرف نے پوچھا

"اسلئے کہ جس شرافت، جس دیانتداری میں عقل کا فقدان ہو۔ وہ شرمناک طور پر قابل نفرت ہے۔"

"اور دوسرا واقعہ؟" اشرف نے بے قرار ہو کر کہا

یہ پچھلے سال کی بات ہے۔ میں چھٹی لے کر گھر آیا۔ معلوم ہوا کہ اہلیہ عرصے سے بیمار چلی آ رہی ہیں۔ انہیں گردے کا درد تھا۔ میں انہیں لیڈی ڈاکٹر سلیمہ کے پاس لے گیا۔ انہوں نے تشخیص کی کہ تلی بڑھ گئی ہے۔ انہوں نے دو روپے میں ایک بڑی بوتل بھر کر دوائی دی۔ میری اہلیہ نے دوائی پی۔ انہیں کچھ درد کا افاقہ بھی ہوا لیکن پورا آرام نہ آیا۔ دوائی شاید بہت کڑوی تھی یا وہم بڑھ گیا تھا۔ وہ لیڈی ڈاکٹر سلیمہ کے علاج سے مطمئن نہ ہو سکیں۔ اس لئے مجھے ڈاکٹر ارشد مرزا کے ہسپتال میں جانا پڑا۔ انہیں ڈاکٹری کے میدان میں بقراط سے بھی بڑھ کر شہرت حاصل تھی۔

ہم قریباً سات بجے صبح اُن کے ہسپتال میں پہنچے۔ ابھی مریضوں کا تانتا نہیں بندھا تھا۔ ارشد مرزا بہترین سوٹ پہنے کرسی پر دراز تھے۔ اُن کے ننگے سر کی چندیا انڈے کی طرح صاف اور شفاف تھی۔ پھولے پھولے گالوں پر ایک کھونٹی بھی نہ تھی اور سفید مونچھیں لبوں کے گوشے میں کچھ اس انداز سے لٹک رہی تھیں جیسے اپنے آپ سے محجوب ہوں۔ میں نے السلام علیکم کہی۔ ارشد مرزا کے چہرے کا ایک ایک نقش مسکرایا اور ہنسا حتّٰی کہ ان کی مونچھوں کا ایک ایک سفید بال تبسم کی نقرئی کرن بن گیا۔ وہ کرسی سے مسکراتے ہوئے اٹھے، مسکراتے ہوئے مجھ سے مصافحہ کیا اور پھر مسکراتے ہوئے کہنے لگے:

"آپ تشریف رکھیں۔ اوہ! معاف کیجئے آپ کے ساتھ لیڈیز بھی ہیں۔" اور دوسرے کمرے کی طرف اشارا کرتے ہوئے کہنے لگے "لیڈیز روم" اور پھر مسکراتے ہوئے آہستہ آہستہ کرسی پر بیٹھے اور دراز ہو گئے۔ وہ دائمی مسکراہٹ دیر تک اُن کے ہموار اور نرم چہرے اور ملائم مونچھوں پر مارچ کی خوشگوار دھوپ کی مانند پھیلتی اور سمٹتی رہی اور اس وقت مجھے افسوس ہوا کہ کاش میں ایک مصور ہوتا اور ڈاکٹر ارشد مرزا کو ماڈل بنا کر "اخلاق کا دیوتا" نامی تصویر بناتا اور شہرت دوام کا تمغہ حاصل کر لیتا اے کاش!

میں نے بیوی کو لیڈیز روم میں بٹھایا اور پھر ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں چلا آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے پھر مسکراہٹوں کا ریشمی لبادہ اوڑھ لیا۔ کہنے لگے "فرمائیے! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔" میں نے اپنی بیوی کی بیماری کا ذکر کیا۔ وہ ہمہ تن توجہ بن گئے۔ میں نے اس کی تکلیف بیان کی۔ اُن کے چہرے پر درد اور کرب کے نقوش اُبھرنے لگے۔ میں نے کہا کہ میری بیوی لیڈی ڈاکٹر سلیمہ کے علاج سے صحتیاب نہیں ہو سکیں۔ ان کے چہرے پر بے اطمینانی اور مایوسی کا اندھیرا چھانے لگا اور جب میں نے کہا کہ میری بیوی آپکے پاس آئے بغیر مطمئن نہ ہو سکتی تھیں تو اُن کی باچھیں خوشی سے کھل گئیں۔ موٹے موٹے گال غبارے کی مانند پھولے اور پھولتے چلے گئے اور مجھے ڈر لگا کہ یہ گال روایتی مینڈک ——— کی طرح نہ پھٹ جائیں۔ اس لئے میں نے مزید تعریف سے اجتناب کیا۔

ڈاکٹر نے گھنٹی پر ہاتھ رکھا۔ ایک ڈسپنسر نمودار ہوا۔ "ڈاکٹر مس قریشی سے کہیں کہ ذرا کنسلٹنگ روم میں تشریف لے آئیں۔"

میں اپنی بیوی کو لے کر کنسلٹنگ روم میں پہنچا۔ ڈاکٹر صاحب پہلے ہی سے موجود تھے۔ چند لمحوں کے بعد لیڈی ڈاکٹر مس قریشی صاحبہ بھی نمودار ہوئیں اور میں نے سمجھا کہ کوہ ہمالیہ کی بلندیوں سے لڑھکا ہوا کوئی برف کا ٹکڑا کمرے میں پھسل آیا ہے۔ سفید لباس۔ سفید بے داغ چہرہ۔ اُن کی تشریف آوری سے کمرے کا ٹمپریچر یکدم گرتا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے کپکپی سی محسوس کی۔

"کوئی سیریس کیس ہے کیا؟" اُن کا انداز گفتگو ان کے لباس اور چہرے سے بھی زیادہ برفیلا تھا۔

"سیریس...... نہیں...... شاید!" ڈاکٹر نے کہا۔ میں نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اس کا رنگ اڑا جا رہا تھا۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کی ہمت بندھانے کی کوشش کی لیکن بے سود۔

مس قریشی نے آگے بڑھ کر میری بیوی کی نبض کو ٹٹولا۔ آنکھوں میں جھانکا۔ پیٹ کو تھپتھپایا۔ سٹیتھیسکوپ کانوں سے لگا کر دل کی دھڑکن پھیپھڑوں کے زیر و بم کو محسوس کیا اور پھر برفیلے چہرے کو نقطۂ انجماد بناتے ہوئے بولیں "جگر بڑھ گیا ہے۔" ڈاکٹر ارشد مرزا نے سر ہلا دیا اور پھر محض نگاہوں سے کام لینا شروع کر دیا۔

"دل پروم ہے!" شاید اس نگاہ نے کہا۔

"تلی بڑھ گئی ہے۔" ہو سکتا ہے۔ نگاہ نے جواب دیا۔

"گردے پر زخم ہو گیا ہے۔"

"ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے۔" ڈاکٹر مرزا کہنے لگے۔ "یورن (URINE) ٹیسٹ کر لینا بہتر رہے گا۔" اور پھر انہوں نے ایسے لہجے میں جس میں شفقت اور ہمدردی کی ہر گہرائی موجود تھی، میری بیوی سے کہا:

"آپ ذرا پردے کے پیچھے ...... میرا مطلب ہے یورن ٹسٹ کرنا ہے۔"

میری بیوی پردے کے پیچھے چلی گئیں اور چند منٹوں کے بعد واپس آ گئیں۔ پھر دونوں ڈاکٹر پردے کے پیچھے چلے گئے۔ دو منٹ تین منٹ حتیٰ کہ دس منٹ گزر گئے اور آخر خدا خدا کر کے ڈاکٹر باہر آئے۔

"پیشاب میں البیومن ہے" ارشد مرزا نے کہا۔

"میں نے پس سیلز (PUS CELLS) بھی دیکھے ہیں۔" لیڈی ڈاکٹر بولیں۔

"پس؟" ڈاکٹر ارشد مرزا نے حیران ہو کر کہا۔

"گردے میں زخم معلوم ہوتا ہے۔" لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔

"زخم؟" میں نے گھبرا کر پوچھا

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میرا اور ان کا ڈفرنس آف اوپینین ہے۔ ابھی فیصلہ ہوا جاتا ہے۔" ڈاکٹر ارشد مرزا نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"میں کہتا ہوں 'البیومن' ہے۔ آپ کہتی ہیں 'پس' ہے۔ جب دو ڈاکٹر اگری نہ کر سکیں تو بیماری کی تشخیص میں شک پڑ جاتا ہے۔" ڈاکٹر ارشد مرزا نے بڑی مایوسی سے کہا اور گہری سوچ میں پڑ گئے۔ "ایکس رے" لیڈی ڈاکٹر مس قریشی نے سکوت توڑتے ہوئے کہا۔

اور میرے ذہن سے ایک عکس ریز شعاع لپکی اور دونوں ڈاکٹروں کے ذہن کے پردوں سے گزرتی ہوئی ایک مقام پر پہنچ کر رک گئی جہاں صاف لکھا ہوا تھا "دھوکا! دھوکا۔" یہ ڈرامہ دس منٹ سے محض اس لئے کھیلا جا رہا تھا کہ عکس ریزی نقطۂ عروج پر پہنچایا جا سکے۔ ڈاکٹر ارشد مرزا نے حال ہی میں ایکس رے مشین خریدی تھی۔ اور اس کا استعمال ضروری تھا۔ اور مجھے بے انتہا غصہ آیا۔ اپنی بیوی کی ضد پر۔ اپنی بیوقوفی پر۔ اخلاق کے دیوتا کی ساحری پر، برف کی قاش پر۔ لیکن اب میں جال میں پھنس چکا تھا۔ بیوی سے کیسے کہتا کہ اٹھو اور اللہ کا نام لے کر لیڈی ڈاکٹر سلیمہ کی بوتل خالی کر دو۔

پھر ایکس رے فوٹو لی گئی۔ دونوں ڈاکٹروں نے فوٹو کو غور سے دیکھا۔ اور پھر دونوں اگری کر گئے۔ میں نہیں جانتا کونسی بیماری کی تشخیص ہوئی۔ نسخہ لکھا گیا۔ ایک بڑی سی بوتل بھری ہوئی۔ ٹیکوں کا ایک ڈبہ میرے ایک ہاتھ میں تھما دیا گیا۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے پانچ پانچ کے پانچ نوٹ ڈاکٹر کی میز پر رکھ دئے۔ انہوں نے نوٹ میز کی دراز میں رکھے اور پھر اٹھ کر مجھ سے مصافحہ کیا۔ مسکراہٹوں کے طوفان میں "تھینکس" کا لوچدار لفظ ابھر کر ڈوب گیا۔

میں نے باہر آ کر بوتل کو غور سے دیکھا اور میں نے شرما کر نگاہیں جھکا لیں۔

"کیوں؟" اشرف نے پوچھا۔

"مجھے بوتل کے پیچھے لیڈی ڈاکٹر سلیمہ طنزیہ انداز میں مسکراتی نظر آئیں۔"

"وہ کیسے" اشرف نے پھر پوچھا۔

"اس بوتل کی دوائی کا رنگ بھی وہی تھا۔ جو لیڈی ڈاکٹر سلیمہ نے محض دو روپے میں دو روز قبل مجھے دی تھی!"

ماہِ نو، کراچی۔ جون ۱۹۵۹ء

شخصیات:

مولانا اکرم خاں

یونس احمر

مسلم بنگالی صحافت نگاری میں مولانا اکرم خاں کا نام ہمیشہ سرِفہرست رہے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان سے پہلے بھی صحافت کے میدان میں کچھ لوگ اپنے قلم کی جولانیاں دکھا چکے ہیں لیکن جس اولوالعزمی، استقلال اور ہمت سے مولانا نے بنگالی صحافت کی خدمت کی اور اب تک کر رہے ہیں اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ شیخ عبدالرحیم، مولانا منیر الزماں اسلام آبادی، یعقوب علی چودھری، شہادت حسین اور دوسروں نے بنگالی مسلمانوں کے خفتہ دلوں میں "عمل پیہم" کا جو چراغ روشن کیا تھا اسے مولانا نے نہ صرف "بادِ مخالف" سے بچائے رکھا بلکہ اس کی تابانی میں اضافہ بھی کیا۔

مولانا بیک وقت صحافی، سیاست داں اور ادیب ہیں۔ اور ان تینوں حیثیتوں سے انہوں نے اپنے لئے ایک الگ مقام پیدا کیا۔ ایک وقت ان کی صحافتی زندگی میں ایسا بھی آیا جب مخالفت کی آندھیاں چلیں لیکن وہ اپنے نصب العین پر قائم رہے اور آندھیوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ یہ تو مسلّمہ حقیقت ہے کہ صحافتی زندگی پھولوں کی سیج نہیں۔ قدم قدم پر کانٹوں سے الجھنا پڑتا ہے۔ مولانا نے ایسے دور میں صحافتی زندگی کا آغاز کیا جب بنگال کے مسلمان بنگالی ہندوؤں سے نہ صرف زندگی کے تمام شعبوں میں پیچھے تھے بلکہ وہ ان کے پنجوں میں اس طرح جکڑے ہوئے تھے کہ رہائی مشکل تھی۔ مثلاً یہی کیا کم افسوسناک بات ہے کہ اکثریت میں ہونے کے باوجود مسلمانوں کی اپنی کوئی آواز نہ تھی۔ زمینیں ہندوؤں کے پاس تھیں، تجارت میں وہ چھائے ہوئے تھے، سرکاری ملازمتوں میں ان کی اکثریت تھی، تعلیم میں وہ آگے تھے۔ غرضیکہ زندگی کا کونسا ایسا شعبہ تھا جس پر وہ قابض نہ تھے۔ اس کے علاوہ سب سے بڑی بدنصیبی تو یہ تھی کہ بنگالی مسلمانوں کا اپنا کوئی پریس نہ تھا کہ اس کے ذریعے حکومت وقت کے کانوں تک اپنی شکایتیں پہنچائی جاتیں، جائز حقوق کا مطالبہ کیا جاتا۔ ان اندوہناک حالات میں مولانا اکرم خاں کی دوربینی کام آئی۔ انہوں نے اس حقیقت کو بھانپ لیا تھا کہ جب تک مسلمانوں کا اپنا مضبوط پریس نہیں ہوگا اس وقت تک بنگالی مسلمانوں کی حق تلفی ہوتی رہے گی۔ وہ ہندوؤں کے مظالم کا شکار رہیں گے اور ان کی فریادوں کی دادرسی نہیں ہوگی۔

مولانا نے بنگلہ زبان میں کلکتہ سے روزنامہ "آزاد" جاری کیا۔ اس روزنامہ کے اجرا میں بھی انہیں بہت ساری دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے بڑی دقت ہندو پریس کا مقابلہ تھا۔ جہاں بنگال کے ہندو زندگی کے دوسرے شعبوں میں مسلمانوں سے بہت آگے تھے وہاں ان کا پریس بھی بہت مستحکم تھا۔ ان کے اخبارات بنگلہ کے علاوہ انگریزی میں بھی شائع ہوتے تھے۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں مولانا کو نہ جانے کن کن پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ سب سے بڑی پریشانی فنڈ کی کمی تھی۔ اس پر وہ کسی طرح حاوی ہوئے تو اخبار کی اشاعت بڑھانے کی فکر لاحق ہوئی۔ مسلمانوں میں تعلیم کی کمی بلکہ فقدان کے باعث اخبار بینی کا ذوق نہ تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اخبار کی اشاعت کا مقصد حاصل ہوتا نظر نہ آیا۔ لیکن مولانا کی ہمت، استقلال اور تگ و دو کی داد دینی چاہیے کہ وہ اپنی راہ پر ڈٹے رہے اور پیشانی پر بل تک نہ آیا۔ بنگالی مسلمانوں کے اندر وہ اپنے قلم سے تعلیم کا چرچا کرتے رہے۔ انہیں ان کی پستی اور غلامی کا احساس دلاتے رہے۔

مولانا کو بیک وقت کئی محاذوں پر لڑنا پڑا۔ ہندو ان کے کٹر دشمن تو تھے ہی۔ مسلمانوں کا ایک طبقہ بھی ان کا مخالف ہو گیا۔ ہندو اپنے اخبار اور ماہناموں کے ذریعے اپنی تہذیب، اپنی زبان، (سنسکرت بنگلہ) اپنی تاریخ اور اپنے تمدن کا خوب پرچار کرتے تھے۔ اگر کوئی مسلم ادیب و شاعر ان کے اخباروں، رسالوں میں چھپنے کے لئے کوئی چیز بھیجتا تو شائع کرنا تو درکنار وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ وہ برملا یہ کہتے تھے کہ مسلمانوں کو بنگلہ زبان نہیں آتی۔ مولانا نے اخبار جاری کر کے مسلم ادیب و شاعر کے لئے راہ کھول دی۔ ان کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ روزنامہ آزاد کے صفحات جب

ایسی تخلیقات کے لئے ناکافی ثابت ہوئے تو انہوں نے ہفتہ وار محمدی اور پھر ماہنامہ محمدی جاری کئے۔ دیکھتے دیکھتے مسلم ادیب و شاعر نے ایسے ایسے جواہر پارے پیش کئے کہ ہندوؤں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

میں نے اوپر تحریر کیا ہے کہ مسلمانوں کا ایک طبقہ مولانا کا مخالف تھا۔ اس مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ مولانا حتی الامکان سنسکرت کے الفاظ سے پرہیز کرتے تھے۔ وہ ان کی جگہ اردو، فارسی اور عربی کے الفاظ کا استعمال زیادہ سے زیادہ کرنا مناسب سمجھتے تھے۔ وہ اس چیز کو محسوس کر چکے تھے کہ جب تک بنگلہ زبان سے سنسکرت کے ان الفاظ کو جن سے ہندو تہذیب اور کلچر کی بو آتی ہے دور نہیں کیا جائے گا اس وقت تک مسلمانوں کی صحیح ذہنی تربیت نہیں ہو سکتی ہے۔ مولانا کی اس تحریک سے یہ طبقہ برہم ہو گیا۔ یہ وہ طبقہ تھا جو ہندو تہذیب کا مدح خواں تھا اور بنگالی قومیت کے جذبے نے ان کی بصیرت چھین لی تھی۔ ظاہر ہے کہ ہندو پریس کا تن تنہا مقابلہ کرنا کمزور آدمی کے بس کا روگ نہ تھا۔ مولانا ان دونوں محاذوں پر ثابت قدم رہے اور انہوں نے اس طرح ڈٹ کر ان کا مقابلہ کیا کہ دشمن بھی ان کا لوہا مان گئے۔

کچھ دنوں تک بنگلہ کے مشہور شاعر و ادیب شہادت حسین نے بھی مولانا اکرم کے ساتھ کام کیا۔ یہ ہفتہ وار محمدی کے مدیر تھے۔ ان کی زبان دانی کے آگے بڑے بڑے ہندو ادیب بھی سرنگوں ہو گئے۔ ان کے بہت سے شہپارے ہفتہ وار محمدی اور ماہنامہ محمدی میں شائع ہوئے ہیں۔

مولانا کے روزنامہ آزاد نے اگر ایک طرف بنگالی مسلمانوں کو گہری نیند سے بیدار کیا اور ان کے جائز حقوق دلائے تو دوسری طرف ہفتہ وار اور ماہنامہ محمدی نے ان کی ادیبانہ صلاحیتوں کو اجاگر کیا۔ گویا مولانا نے مسلمانوں کی نہ صرف سیاسی بلکہ ذہنی صلاحیت کو بھی بیدار کیا۔ اس اعتبار سے بنگالی مسلمانوں پر ان کے احسانات کم نہیں ہیں۔

صحافتی زندگی کے ساتھ ساتھ مولانا سیاسی زندگی میں بھی پیش پیش رہے۔ انہوں نے بنگال کے مسلمانوں کو منظم کیا۔ ان کے ان ملی جذبات کو ابھارا جو سو چکے تھے۔ ان کو اپنے اخبار کے ذریعہ سیاسی تعلیم دی۔ انہیں خواب سے بیدار کیا اور احساس دلایا کہ ان کے حقوق کس طرح پامال ہو رہے ہیں۔ میں نے مولانا کو ۱۹۴۵ء ۱۹۴۶ء میں محنت کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ان کی کوٹھی (واقع پارک سرکس کلکتہ) میں کس طرح مسلم رہنماؤں کا تانتا بندھا رہتا تھا اور رات گئے تک جلسے ہوتے رہتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بنگال کے سارے ہندو اخبارات (بنگلہ اور انگریزی) مولانا کے روزنامہ آزاد کے خلاف متفقہ طور پر زہر اگل رہے تھے۔ لیکن یہ ان کی اولوالعزمی تھی کہ وہ اپنی راہ سے نہیں ہٹے۔ یہاں تک کہ پاکستان بن گیا۔

پاکستان بن جانے کے بعد مولانا کے لئے کلکتہ سے اخبار کو جاری رکھنا آسان کام نہ تھا۔ وہ اپنا پریس ڈھاکے لے آئے۔ یہ زمانہ بڑا ہی بے سر و سامانی کا تھا۔

ڈاکٹر انعام الحق اپنی کتاب "مسلم بنگالی ادب" میں لکھتے ہیں:۔

"تقسیم سے پہلے کلکتہ بنگال کا دارالسلطنت ہونے کے ساتھ ساتھ بنگالی زبان کا بھی تہذیبی مرکز تھا۔ گویا ایک طرح سے تمام ادبی تحریکیں کلکتہ ہی میں جنم لیتیں اور پروان چڑھتی تھیں۔ اس لئے وہ ادیب جو ادب میں اپنی جگہ بنانا چاہتے تھے، لازمی طور پر کلکتہ ہی کی ادبی مجالس سے وابستگی کی فکر کرتے تھے ...... تقسیم کے وقت بنگال کے دونوں حصوں میں فرقہ وارانہ فسادات کے شعلے بھڑک اٹھے ..... تقسیم کا نتیجہ عام آبادی اور خصوصاً پڑھے لکھے لوگوں کے انخلاء کی شکل میں ظاہر ہوا۔ بنگالی ہندو مشرقی بنگال سے مغربی بنگال کیا گئے کہ مشرقی بنگال کی ادبی زندگی میں ایک وسیع خلاء پیدا ہو گیا .... اگرچہ اس خلاء کو مولانا اکرم خاں، شہادت حسین، شوکت عثمان اور اکبر الدین جیسے ادیبوں نے مشرقی پاکستان میں ہجرت کر کے پر کیا مگر صرف جزوی طور پر ..." لیکن اس کے باوجود مولانا ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹے۔ ان کا بڑھاپا ان کی راہ میں حائل نہ ہوا۔ شب و روز کی محنت اور جانفشانی کے بعد ڈھاکے میں انہوں نے پریس قائم کر ہی لیا۔ مشرقی پاکستان کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اتنا شاندار روزنامہ شائع ہوا۔ ماہنامہ محمدی بھی اسی آب و تاب سے نکل رہا ہے البتہ ہفتہ وار محمدی بند ہو گیا ہے۔

مولانا اپنی صحافتی اور سیاسی زندگی سے قطع نظر بلند پایہ ادیب بھی ہیں۔ ان کی کتاب "مصطفےٰ چرتر" (سیرت مصطفےٰ) بہت مشہور ہے۔ اس میں مولانا نے حضرت رسولِ خدا کی سیرت پاک کا نقشہ کھینچا ہے۔ انہوں نے "پارۂ عم" کی تفسیر لکھ کر تو بقول ڈاکٹر انعام الحق "بنگالی ادب میں

بے مثال اضافہ کیا ہے ؛ مولانا نے مذہب پر ایک اور کتاب مکمل کر لی ہے جس کا نام "سمسادھان" ہے ۔

مولانا کو اردو سے بھی کافی شغف ہے ۔ ان کی اردو دوستی اور قدردانی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا مل سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے اخبار کا نام "آزاد" رکھا ۔ بنگالی اخباروں کے اردو نام رکھنے کی ایسی روایت چل پڑی کہ قیامِ پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان کے دارالحکومت ڈھاکہ سے دو ایک کے علاوہ جو بھی اخبارات نکلے ان کے نام اردو ہیں ۔ مثلاً "اتفاق"، "انصاف"، "اتحاد" اور ماہناموں کے نام "سوغات"، "دلربا"، "محمدی" وغیرہ۔ "سوغات" اور "محمدی" کلکتہ سے بھی شائع ہوتے تھے ۔ "اتحاد" روزنامہ بھی کلکتہ ہی سے شائع ہونا شروع ہوا تھا۔

اس وقت مولانا کی عمر ۹۱ سال کی ہو چکی ہے لیکن اب بھی ان کے جوش و خروش اور ہمت و استقلال میں کمی واقع نہیں ہوئی ؛

★

" اقبال کا ایک شعر " : ——— بقیہ صفحہ : (۲۲)

اس پر منطقی طور سے یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ رات کی تاریکی سب کے لئے یکساں ہوتی ہے ۔ پھر ایک خاص شخص کی رات سب سے تاریک کیونکر ہو سکتی ہے ۔ پھر ایک خاص کوکب ایسا سیاہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ اس کو کالی رات کا ٹکڑا کہا جائے جب کہ کوکب کا تصور روشنی کے بغیر ممکن نہیں لیکن منطقی طور پر یہ شعر حقیقت کے خلاف ہونے کے باوجود کیا اس عالمِ یاس کی تصویر کشی نہیں کرتا جس کا مکمل اظہار ہی شاعر کا اصل مقصد تھا ؟

شعر کی تفہیم کے سلسلے میں جب بھی منطقی طرزِ استدلال کا استعمال ہوگا اور ریاضی کی طرح دو اور دو چار کی طرح سوچا جائیگا تو اس قسم کے غلط رجحانات اور تصورات نقد پر ورش پائیں گے ۔ آخر میں میں ایک مثال اور پیش کروں گا ۔ میر حسن کا یہ شعر:

درختوں کی کچھ چھاؤں اور کچھ وہ دھوپ

وہ دھانوں کی سبزی وہ سرسوں کا روپ

بھی مدتِ مدید تک نقادوں کے اعتراض کا ہدف بنا رہا ہے ' اور اعتراض ہمیشہ یہی رہا ہے کہ ایک ہی موسم میں دھان اور سرسوں دونوں یکجا نہیں ہوتے ۔ یہ تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف ہے ' اس لئے کہ دھان خریف میں بویا جاتا ہے اور سرسوں ربیع میں تعجب تو اس پر ہوتا ہے کہ حالی جیسا بالغ نظر نقاد بھی اس سے آگے نہیں دیکھ سکا ۔ حالانکہ میر حسن کے اس شعر کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ باغ میں واقعی ایک طرف دھان بوئے تھے اور دوسری طرف سرسوں ۔ بقول مجنوں دوسرا مصرع تو استعارہ ہے ۔ ' دھانوں کی سبزی ' اور ' سرسوں کے روپ ' سے ' درختوں کی کچھ چھاؤں ' اور ' کچھ دھوپ ' کو تشبیہہ دی گئی ہے اور اس طرح کہ تشبیہہ تشبیہہ معلوم نہیں ہوتی ۔

اب جو کچھ میں نے لکھا ہے اس کی روشنی میں آپ اقبال کا یہ شعر پڑھیں ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

تو آپ کو محسوس ہوگا کہ یہ شعر مہمل و بے ربط اور حقیقت کے خلاف نہیں بلکہ شاعر نے ایک بدیہی حقیقت کو ایک بلیغ استعارہ کے ذریعہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ کامیاب رہا ہے یہی شاعری کی زبان ہے ؛

★

ماہِ نو، کراچی۔ جون ۱۹۵۹ء

مشرق و مغرب

عارف حجازی

"مشرق اور مغرب۔ میرے دل پر ان کی جولانیوں کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا"۔ یہ تو ہوئی ایک مغربی شاعر کی بات۔ لیکن ہم بھی تو اپنے مشرق و مغرب کے متعلق کچھ ایسا ہی محسوس کرتے ہیں۔ شاید اس میں جذبات کو بھی کچھ دخل ہو کیونکہ مشرق ہو یا مغرب، شمال ہو یا جنوب، ہمیں اپنی ساری سرزمین ایک ہی نظر آتی ہے۔ ایک ہی رنگ میں ڈوبی ہوئی، ایک ہی جاودانی کیف کی حامل۔ اور اس میں بسنے والے، ان کے طور و طریق بھی ایک ہی جیسے لگتے ہیں۔ ان میں خشکیوں کے دور دراز فاصلے ہوں یا بے پایاں طوفانی سمندروں کے، ان کی وحدت، ان کی یکرنگی ایک نمایاں حقیقت ہے۔ اِدھر کے کوہ ودریا وادیاں میدان، ہرے بھرے کھیت، سبزہ زار، ساحل، سمندر بے اختیار اُدھر کے پہاڑوں، ندی نالوں، وادیوں، میدانوں، لہلہاتے کھیتوں، سبزہ زاروں، ساحلوں اور سمندروں کی یاد دلاتے ہیں۔ اور وہاں کا رہن سہن، رسمیں ریتیں، طور طریق، مزاج، عقائد ہر چیز یہاں کی زندگی میں اپنا ہی عکس پاتی ہے۔

یہ کوئی اتفاقی بات نہیں۔ اس کی تہہ میں کتنے ہی طبعی حالات اور کتنے ہی عناصر، کتنے ہی عوامل اور تاریخ و تہذیب کے کتنے ہی دھارے کارفرما ہیں۔ جو آپس میں ملکر ایک ہی دھارا بن جاتے ہیں۔ کیونکہ جو ہم رنگی روح میں ہے وہ لازماً خارجی مظاہر میں بھی رونما ہوتی ہے۔

طبعی حالات کا اس ہم آہنگی میں کچھ کم حصہ نہیں۔ دونوں ایک وسیع و عریض میدان، اس میں لمبے چوڑے دریا بہتے ہوئے اور آخر میں ہم آغوش سمندر ہونے سے پہلے چھوٹی چھوٹی شاخوں میں تقسیم ہو کر ڈیلٹا پیدا کرتے، ایک خاص قسم کی زندگی کو جنم دیتے ہوئے بیرونی حصوں میں سمندر کی وسیع پہنائی اور اس کا مخصوص رہن سہن۔ بعض حصوں میں پہاڑ اور وادیاں، سرسبز شاداب۔ میدانی علاقوں میں کھیتی باڑی اور کسانوں کا سیدھا سادا چلن۔ ادھر ساحل سے دور دور سفینے ہی سفینے۔ کہیں اکیلے اکیلے کہیں بیڑا بیڑا۔ چاروں طرف بل کھاتی قوس در قوس چمکتی لہریں۔ اَن گنت جیسے ہلال ہی ہلال اور ان میں چمکتا پانی۔ ستارہ ہی ستارہ۔ اس ستارہ و ہلال کی مسحورکن فضا میں مچھیرے اپنے جال اور ساز و سامان لئے دنوں رواں رہتے ہیں اور میلوں دور مچھلی کا شکار کرتے ہیں۔ اُدھر خلیج بنگالہ کے آس پاس نظر دوڑائیے۔ کیا وہاں بھی ہو بہو یہی سماں نظر نہیں آتا؟ بلکہ ندی ندی نالہ نالہ یہی سماں ہے۔ جہلم پر نظر ڈالئے۔ اس کی وادی کے کتنے جیالے مضبوط، جفاکش نوجوان ہیں۔ تیراکی میں ماہر۔ جن پر پاکستانی بحریہ کو ناز ہے۔ ایسے ہی مشرقی پاکستان کا بچہ بچہ تیراکی اور کشتی رانی میں ماہر ہے۔ مہران کے زندۂ جاوید فرزند، شاہ بھٹائیؒ نے ملاحوں اور مچھیروں کے کیا کیا گیت نہیں گائے۔ جن میں عرفان کے ساتھ ساتھ رومان کی جھلکیاں بھی ہیں۔ ادھر بھٹیالی، معرفتی، جاری گان۔ میں کیا کچھ نہیں۔ زندگی، غم، مسرّت، محنت مشقت، محبت، امید، دکھ سکھ، عرفان۔ اگر ادھر پنگھٹ پر پیار محبت کی پینگیں بڑھتی اور رومان کی قدرتی خواہش پروان چڑھتی ہے تو ادھر تال تلیا، جھیل ساگر نوجوان دلوں اور زندگی کی امنگوں کو رومان کے سانچوں میں ڈھلنے کی دل آویز فضا مہیا کرتے ہیں۔ اور اگر کبھی من کی ترنگ میں دل کے ساتھ ہاتھ پاؤں بھی رقص کا مدھ متوالا روپ اختیار کرلیں تو کیا تعجب ہے۔ اور وہ بھی تال سُر یا گیت اور گتوں کی سنگت میں۔ چنانچہ ایک طرف خٹک ناچ، لڈی اور بھنگڑا نظر آتے ہیں تو دوسری طرف رقص و موسیقی کی بے شمار رنگ برنگی صورتیں ہیں بلکہ یہ دونوں تو مشرقی پاکستان کی زندگی اور معاشرہ کا لازمی جزو اور روحِ رواں ہیں۔

مغربی پاکستان میں گرم مرطوب جنگلاتی علاقہ کی بے تحاشا برشگالی کیفیت نہ سہی لیکن جب برکھا کا موسم آتا ہے تو کیا یہ اسی طرح دھواں دھار طوفانی نہیں ہوتا اور وہی ہر جا ہر طرف ہریاول ہی ہریاول کا سماں نہیں پیدا کر دیتا، اور ویسے ہی گیتوں کو جنم نہیں دیتا؟۔ شاعر ہوں یا مغنی،

مرد ہوں یا عورتیں، بوڑھے ہوں یا بچے، سب کے دل میں بے پناہ ولولہ پیدا ہوتا ہے، اور زندگی اپنے نت نئے ہنگاموں جوش وخروش اور ترانوں کے ساتھ جاگ اٹھتی ہے۔ اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ مغربی پاکستان ہے یا مشرقی پاکستان۔

مشرقی اور مغربی پاکستان جغرافیائی اعتبار سے کتنے ہی دور کیوں نہ ہوں [illegible] تاریخی روایات کی روشنی میں دیکھا جائے تو ان میں کتنی ہی باتیں مشترک نظر آئیں گی۔ قدیم قوموں میں سے جو بھی مغربی پاکستان آئیں ان کی کوئی نہ کوئی شاخ مشرقی پاکستان میں بھی آئی اور اُن کے پیشروؤں سے نہ بچ سکا نہ وہ۔ اس طرح قدرت دونوں کی نسل دخون میں ہم رنگی کا برابر اہتمام کرتی رہی۔ خواہ سرحد کے آزاد قبائل ہوں یا چٹاگام کے ہرے بھرے جنگلوں میں پلتے ہوئے لشائی یا پہاڑوں کی خوشنما وادیوں میں بسنے والے چکما۔ قدیم تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ پاکستان کے ان دونوں پہاڑی حصوں کے آزاد قبائل اور چکما لوگوں کی رگوں میں بھی قدیم منگولی نسل کے لوگوں اور دیگر ایشیائی قوموں کا خون دوڑ رہا ہے۔ یہی حال پاکستان کے ان دونوں علاقوں میں بسنے والے لوگوں کا ہے۔ خواہ یہ علاقے سبزہ زار ہوں یا ریگزار۔

اسی طرح متحدہ پاکستان کے قدیم تاریخی ادوار اور پرانے شہروں کے آثار کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد جب ہم دور مغرب یعنی ایران، عراق، شام اور مصر کے قدیم آثار کا جائزہ لیتے ہیں تو خیال گذرتا ہے کہ شاید کسی زمانے میں مشرقی پاکستان کی خوبصورت فضاؤں سے لے کر وادیٔ نیل تک ایک ہی تہذیب وتمدن کا دور دورہ ہو۔ زمانۂ ماقبل تاریخ اور قدیم ترین زمانے کے متعلق کچھ کہنا دشوار ہے لیکن سامی قوموں خصوصاً فنیقیوں کی بحرپیمائی اور تاریخی زمانے میں ایشیائے کوچک کے سواحل سے لیکر عرب الہند اور چین تک نقل وحرکت کو دیکھتے ہوئے یہ قیاس شاید بعید از حقیقت نہ ہو کہ ان کے قدم جہاں وادیٔ سندھ میں پہنچے اور انہوں نے وہاں اپنے نسلی و تہذیبی اثرات چھوڑے وہاں مشرقی پاکستان بھی ان کے نقوش قدم سے بیگانہ نہیں رہا۔ برصغیر کے جنوبی حصے میں بالائی علاقے کے دراوڑی یا ان سے ملتی جلتی نسل کی آمد بھی قرین قیاس ہے۔ اور پھر آریاؤں، مغلوں، ترکوں کی مسلسل آمد، سکونت اور تسلط تو تاریخ جدید کا ایک اہم باب ہے۔ جن کی بنا پر وادیٔ مہران کو تہذیبوں کا محمل قرار دیا گیا ہے۔ ادھر ایسا ہی عمل قرن ہا قرن قدیم ترین زمانوں سے برابر جاری رہا ہے اور نسلی، تہذیبی، تمدنی ہیئتِ ترکیبی نے ویسی ہی مخلوط شکل اختیار کی ہے جس کا نقشہ دوسرے حصے میں نظر آتا ہے۔

ان دونوں علاقوں کے قدیم تاریخی رشتوں کی کہانی کتنی ہی نامکمل سہی لیکن جب اسلامی تہذیب وتمدن کا آفتاب طلوع ہوا تو اسلامی معاشرے نے باہمی رشتہ کو اور بھی مستحکم کر دیا۔ دونوں خطوں کے ہر ہر حصے کی بنیادی زبان کسی نہ کسی صورت میں کوئی نہ کوئی پرانی دیسی بولی ہی قرار پاتی ہے یا پراکرت۔ اور اس پر حاشیہ آرائی دوسری زبانوں کی ہے۔ پھر اسلامی زبانیں تو ظاہر سے لیکر باطن تک اس طرح سرایت کر گئی ہیں کہ سب زبانوں میں ایک ہی خاندان کے اراکین کی سی مشابہت محسوس ہوتی ہے۔

زندگی اور تہذیب کا رچاؤ بھی کچھ ایسا ہی نظر آتا ہے۔ چنانچہ زندگی کا مادی پہلو ہو یا روحانی، دونوں کے اوضاع واطوار تقریباً یکساں ہیں۔ یہ ہم آہنگی موجودہ سیاسی وحدت سے کہیں زیادہ قدیم اور بنیادی ہے اور یہی بات غیر معمولی دوری کے باوجود بالآخر ان کے سیاسی ربط باہمی کی محرک اور سبب ثابت ہوئی اور جو عناصر حقیقتاً اجنبی تھے وہ فوراً مسترد ہو گئے۔

پاکستان ایک زراعتی ملک ہے۔ یہاں کے آٹھ کروڑ باشندوں کے معاشرتی رشتے لہلہاتے ہوئے کھیتوں ہی سے وابستہ ہیں۔ یہاں کے تقریباً نوے فیصدی عوام انہی کھیتوں کے درمیان سانس لیتے ہیں۔ شہروں سے کوسوں دور وہ ان گنت گاؤں میں آباد ہیں۔ یہ معصوم، سیدھے سادے، پُر امن پاکستانی کسان خواہ وہ مشرقی پاکستان کے رہنے والے ہوں یا مغربی پاکستان کے، جس طرح رشتۂ ملی میں تسبیح کے دانوں کے مانند منسلک ہیں اسی طرح اُن کی دیہی زندگی کے صبح وشام اور ماہ وسال لہلہاتے ہوئے کھیتوں کے درمیان ملی جلی رومانی فضا میں گذرتے ہیں۔ سدا بہار ہریالی سے گھری ہوئی اور نرم نرم مٹی کے کچے پکے گھر اور زمین سے لے کر آسمان تک ان کی کڑی محنت سے حاصل کی ہوئی ہر دم جھومتی مسکراتی ہوئی فصلوں کا لامتناہی سلسلہ دیکھ کر کتنی مسرت اور طمانیت محسوس ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ تو کسی محنت کش کسان کے سیدھے سادے حقیقی دکھ سکھ سے بھرے گیتوں ہی سے ہو سکتا ہے۔ یہ گیت خوبصورت اور آزاد فضاؤں میں جنم لیتے ہیں اور جہاں یہ فصلوں اور دلکش ماحول کی تصویر پیش کرتے ہیں وہاں کروڑوں غریب کسانوں کی معاشرت اور تمدن کی سچی کہانیاں بھی سناتے ہیں۔ جہاں مشرقی پاکستان کے کسان اپریل کی جھلسا دینے والی دھوپ میں پسینے سے شرابور اپنے کام میں مصروف

تے ہیں۔ اُسی طرح وہ چھپروں اور کیکر کے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں زندگی کے ترانے یاد دینے والے گیت بھی گاتے ہیں۔ دور دراز پھیلے ہوئے دھان پٹ سن کے کھیتوں کے درمیان ان کی مترنم آواز بدمست فضاؤں میں نغمے بکھیرتی ہوئی گونج گونج اٹھتی ہے:۔

میرے سنہری پاکستان !
میرے مشرقی پاکستان !
جس کے ہرے بھرے کھیتوں میں
نیلی نیلی پیلی پیلی دھان کی بالیاں لہراتی ہیں
لہراتی ہیں بل کھاتی ہیں
بنوں میں، پیڑوں کے سائے میں
بھائیوں، بہنوں، ماؤں کے پیار
اور الفت سے رسی بسی
جھونپڑیاں ہی جھونپڑیاں
دور دور تک بسی ہوئی
جیسے جنت مٹی کی !

یہی جب مغربی پاکستان کے لاکھوں کسان اپنی گیہوں کی لہلہاتی ہوئی فصلوں کو دیکھ کر فرطِ مسرت سے جھوم جھوم کر غیر فانی گیت گاتے ہیں تو جیسے خوبصورت وں کے درمیان ان کی ہی دار، پرسوز اور نہایت دلکش صدائیں دونوں بازوؤں کے رشتہ باہمی کی استواری کا اعلان کرتی ہوئی سنائی دیتی ہیں:

کنکاں دیاں فصلاں پکیاں نی پکوان پکاندیاں جٹیاں نی
جٹ پیلی وے وچ گجدا اے

(گندم کی فصلیں پک گئی ہیں۔ جاٹنیاں پکوان پکاتی ہیں۔ کھیتوں میں جاٹ تڑا گرجتا ہے .....)

اور اب جبکہ غیر عناصر کا جغرافی، سیاسی و تہذیبی پیوند کٹ کر دونوں علاقے قریب تر آگئے ہیں اور ان میں ربط و اختلاط روز افزوں شدت سے روپذیر ہا ہے، ان کی ظاہری و باطنی ہم آہنگی اور بھی نمایاں ہوتی جاتی ہے اور اس کا ہر ہر پہلو اپنے اندر ایک مستقل دعوتِ نظارہ لئے ہوئے ہے ۔

سندھ کا فن تعمیر: ——— بقیہ صفحہ: (۶۱)

لئے بڑے کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں یہ شخص جس کا نام شاہ بہار دیا شاہ بہارا تھا، نور محمد کلہوڑہ کی فوجوں کا سپہ سالار تھا۔ رفاہ عام کے کاموں سے بہت شوق تھا۔ چنانچہ اس نے کئی نہریں، کنوئیں اور سڑکیں بنائیں اور چند قلعے بھی تعمیر کئے۔ یہ شخص ۱۱۴۸ھ میں فوت ہوا اور ولاڑکانہ میں ایک میں مدفون ہوا۔ اس مقبرے کی انفرادی خصوصیت وہ خشتی دروازہ ہے جس پر نہایت چابکدستی اور مہارت سے نقش ونگار کندہ ہیں۔ گنبد پر مرصع چینی رکھی ہے جو اس کی خوبصورتی کو دوبالا کرتی ہے۔ یہ دروازہ لکڑی کے کام کی صنعت کا نفیس نادر نمونہ ہے جو بہاولپوری لکڑی کے کام کی دلاتا ہے۔ عمارت کے اندرونی حصے میں ٹائلوں سے مرتب کئے ہوئے چند کتبے ہیں جو فارسی میں ہیں۔

یہ ہے ان چند مقبروں کا ذکر جو کلہوڑہ خاندان کے افراد نے اپنے لئے یا اپنے آباواجداد کے لئے تعمیر کرائے تاکہ وہ ان شاندار عمارتوں میں آرام ابدی نیند سو سکیں یہ عمارتیں کسی زمانے میں بڑی شاندار اور بارونق ہوں گی لیکن اب دستبرد زمانہ سے خراب و برباد ہو رہی ہیں —— اس خرابی کے جو دیکھنے والے کو ان کی عظمتِ رفتہ کا احساس بڑی شدت سے ہوتا ہے ؎

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ
آثار پدید است صنادید عجم را

—— اگرچہ سندھ کی مناسبت سے انہیں صنادید سلف کہنا ہی مناسب ہے۔

★

ماہ نو، کراچی، جون ۱۹۵۹ء

سندھ کا فن تعمیر

(مقابر، خاندان کلہوڑہ)

احمد نبی خاں

ریگزار سندھ مقابر و مزارات کی سرزمین ہے جہاں قدم قدم پر منقش پتھروں اور خوبصورت رنگین ٹائلوں سے مزین وسیع و بلند مزارات ملتے ہیں اور یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ مشرق کے دوسرے حصوں کے حکمرانوں کے عام رجحان کے بالکل برعکس جنہوں نے اپنی قابلیت اور اپنی دولت خوبصورت مساجد یا شاندار محلات کی تعمیر پر صرف کی، سندھ کے حکمرانوں نے خاص طور پر حیات بعد ممات کے استقرار ابدی کو پیش نظر رکھا چنانچہ سندھ کے حکمرانوں کی بنوائی ہوئی عمارات بیشتر مزارات و مقابر پر مشتمل ہیں۔ یہ لوگ اس قسم کی عمارتیں بنانے کے اسقدر شایق تھے کہ اپنے زمانۂ حیات ہی میں بڑی پُر شکوہ اور مکلف عمارتیں بنواتے اور وصیت کرتے کہ مرنے کے بعد ان کو ان عمارات میں دفن کیا جائے جہاں وہ آرام کی ابدی نیند سو سکیں۔ ٹھٹھہ جس کو نیکروپولس (NECROPOLIS) بھی کہا جاتا ہے اس قسم کے خوبصورت اور مزین مقابر کی بہترین مثال ہے لیکن اس کے علاوہ حیدرآباد، سکھر، روہڑی، حیدرآباد جیسے مقامات میں بھی کلہوڑہ اور تالپور خاندان کے حکمرانوں کے بنوائے ہوئے نفیس اور شاندار مقابر و مزارات آج بھی توجہ و حیرت کا مرکز ہیں۔

یہاں ہمیں کلہوڑہ خاندان کے مقابر و مزارات کا جائزہ لینا ہے۔ اس خاندان نے سندھ کے کچھ حصوں پر تقریباً سو سال تک حکومت کی۔ یہ لوگ جیسا کہ مختلف روایات سے پتہ چلتا ہے اپنا شجرۂ نسب حضرت عباسؓ سے، جو حضور سرورِ کائناتؐ کے چچا تھے، ملاتے ہیں۔ معلوم نہیں سندھ میں یہ خاندان کب اور کیسے آکر آباد ہوا بہرحال یہ یقینی ہے کہ ابتدا میں یہ لوگ فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے یا کچھ لوگ کاشتکاری کرتے تھے۔ ان کا مورث اعلیٰ محمد نامی ایک شخص تھا جس کے نام کے علاوہ ساری تفصیلات مفقود ہیں۔ کافی عرصے کے بعد اس سلسلہ کے ایک اور بزرگ کا پتہ چلتا ہے جن کا نام عادل شاہ تھا، یہی اس خاندان کے جد امجد کہے جاتے ہیں۔ یہ ایک صاحب کرامات خدا رسیدہ بزرگ تھے جن کے معتقد بہت سے لوگ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ وہ ملتان گئے جہاں کے لوگوں نے بڑے احترام و عقیدت کا ثبوت دیا اور کثیر تعداد میں ان کے مرید ہوگئے۔ ملتان کے حاکم کو ان کی یہ مقبولیت ناگوار گزری، اسے خیال ہوا کہ کہیں اس کی حکومت خطرے میں نہ آجائے چنانچہ اس نے ان کو گرفتار کرکے قتل کرا دیا۔ یہ واقعہ سولہویں صدی کے وسط کا ہے۔ بہرحال ان کی میت کو سندھ لایا گیا اور ان کی وصیت کے مطابق انہیں سکھر میں ایک پہاڑی کے پُر فضا ماحول میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ آج بھی ان کا سادہ مگر پُر شکوہ مقبرہ مرجع خلایق ہے۔

اس عہد میں یہ لوگ یا تو کاشتکاری کرتے تھے یا پھر پیری مریدی۔ لیکن رفتہ رفتہ موخرالذکر گروہ نے اہمیت اور طاقت حاصل کرنا شروع کی حتیٰ کہ شاہی حکمرانوں سے مستقل جھڑپیں ہونے لگیں۔ ۱۶۹۶ء میں اس خاندان کے ایک فرد میاں نصیر محمد نے جو ان بزرگ شہید کا جانشین تھا، باقاعدہ شہر کی بنیاد رکھی یہ نیا شہر گاڑی کے نام سے مشہور ہوا جو نصیر محمد کا صدر مقام یا مرکز تھا۔ میاں نصیر محمد کے بعد اس کا لڑکا میاں دین محمد اس کا جانشین ہوا جس کی وفات ۱۷۱۸ء کی بات ہے۔ اس کا مقبرہ دادو کے قریب خدا آباد میں ہے۔

کلہوڑہ خاندان کی سیاسی اہمیت نور محمد کے عہد سے شروع ہوتی ہے۔ یہ دین محمد کا لڑکا تھا۔ اس کو امور سلطنت طے کرنے میں خداداد ملکہ تھا۔ اس نے خدا یار خاں کا لقب اختیار کیا اور اطراف و جوانب کے علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرکے وسیع کر لیا۔ اس وقت تک کلہوڑہ خاندان کی توجہ سندھ کے بالائی علاقے پر مرکوز تھی لیکن ۱۷۳۶ء میں اس نے سہوان اور بھکر پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس عہد میں اس کی اہمیت اتنی ہوگئی کہ سلطنت دہلی نے ان لوگوں کی حکمرانی کو تسلیم کر لیا۔

میاں نور محمد کے عہد میں نادر شاہ نے برعظیم پر حملہ کیا۔ نور محمد اس کے حملے کی تاب نہیں رکھتا تھا چنانچہ جب اسے معلوم ہوا کہ نادر شاہ سندھ کی طرف بھی آنے کا منصوبہ بنا رہا ہے تو اس نے فوراً ایک سفارت روانہ کی تاکہ دوستی و یگانگت پیدا کی جائے۔ لیکن نور محمد کی یہ ترکیب

کامیاب نہ ہو سکی اور وہ مجبوراً اپنے لڑکے کو ساتھ لیکر امرکوٹ کے قلعے میں جا چھپا۔ خیال تھا کہ نادر شاہ اس دور دراز اور دشوار گزار مقام تک نہیں پہنچ سکے گا لیکن اس کا یہ گمان بھی غلط نکلا اور نادر شاہ نے قلعہ پر حملہ کر کے نور محمد اور اس کے لواحقین کو گرفتار کر لیا۔ بعد میں ایک معاہدہ ہوا جس کے ذریعہ نور محمد کو دوبارہ سندھ کا حکمران مقرر کیا گیا۔ نور محمد نے ایک مقررہ رقم سالانہ کابل بھیجنے کا وعدہ کیا۔ لیکن نادر شاہ احتیاط کے طور پر اس کے دو لڑکوں غلام شاہ اور محمد مراد یاب کو یرغمال کے طور پر اپنے ساتھ کابل لے گیا۔ ۱۷۴۹ء میں یہ دونوں لڑکے واپس سندھ پہنچے۔

۱۷۵۵ء میں نور محمد کا انتقال ہو گیا اور محمد مراد یاب جانشین ہوا۔ امور سلطنت کے نظم و نسق میں اسے خداداد ملکہ تھا اور وہ بڑا انصاف پسند حکمراں تھا۔ اسی وجہ سے عوام میں بہت مقبول تھا۔ اس نے نصرپور کے قریب ایک شہر آباد کیا جس کا نام مراد آباد رکھا لیکن کچھ عرصے کے بعد اس کے درباری اس کی سخت گیری سے تنگ آگئے اور انہوں نے سازش کر کے اسے تخت سے علیحدہ کر دیا۔ اس وقت نور محمد کے لڑکوں میں تخت گیری کے لئے کشمکش اور خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اس جدوجہد میں غلام شاہ کو کامیابی ہوئی اور وہ ۱۷۵۸ء میں گدی نشین ہو گیا۔ غلام شاہ نے نیرون کوٹ میں ایک قلعہ تعمیر کیا اور ۱۷۶۸ء میں ایک اور شہر آباد کیا جس کا نام حیدرآباد رکھا۔ ۱۷۷۲ء میں غلام شاہ فوت ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ نور محمد کا یہ لڑکا ایک مغنیہ کے بطن سے تھا جس کے حق میں سندھ کے معروف صوفی شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے دعا فرمائی تھی۔ یہ بالکل ان پڑھ تھا لیکن کاروبار سلطنت طے کرنے میں اسے بڑی مہارت تھی۔ حیدرآباد میں وہ ایک شاندار مقبرے میں دفن ہوا۔

نور محمد اور اس کے بعد غلام شاہ کا دور کلہوڑہ خاندان کی حکومت کا زریں دور ہے۔ غلام شاہ کی وفات کے بعد اس کا لڑکا سرفراز خاں وارث سلطنت ہوا۔ اسی عہد سے اس خاندان کا زوال شروع ہوتا ہے۔ میاں سرفراز خاں کے دور حکومت میں ڈیرہ غازی خاں اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں بھی سندھ کے علاقے میں شامل ہوئے۔ اس زمانے میں تالپور خاندان کے افراد کو سیاسی طور پر ابھرنے اور ترقی کرنے کا موقعہ ملا۔ ابتدا میں میاں سرفراز خاں کے تعلقات اس خاندان سے بہت اچھے تھے لیکن ایک ہندو امیر کے ورغلانے پر ۱۷۷۴ء میں اس نے اس خاندان کے چند افراد میر بہرام اور اس کے لڑکے میر صوبدار کو قتل کرا دیا۔ میر صوبدار کے چار لڑکے تھے فتح علی خاں، غلام علی خاں، کرم علی خان اور مراد علی خان۔

باپ اور دادا کے قتل کے بعد میر فتح علی خاں نے بلوچیوں کی ایک جمعیت اکٹھی کی اور سرفراز خاں کے خلاف خدا آباد کے قلعہ پر حملہ کر دیا۔ سرفراز خاں اس حملے کی تاب نہ لا سکا اور مجبور ہو کر حیدرآباد بھاگ گیا۔ یہاں اسے گدی سے دستبردار ہونے پر مجبور کیا گیا۔ اسی دوران میں میاں غلام نبی نے تخت پر قبضہ کر لیا۔ لیکن چند ہی دنوں بعد وہ بھی ہلاک کر دیا گیا۔ اس قتل کے بعد غلام نبی کے بھائی میاں عبدالنبی اور خاندان کے دوسرے افراد میں تخت کے لئے خانہ جنگی شروع ہو گئی اور حالات بہت زیادہ دگرگوں ہو گئے۔ اس وقت میر بہرام کے دوسرے لڑکے میر بجار نے مداخلت کی اور میاں عبدالنبی کو حکمراں مقرر کر دیا اور خود وزیر سلطنت بنا۔ اس افراتفری میں خزانہ بالکل خالی ہو چکا تھا اور کابل کو خراج نہیں بھیجا جا سکا تھا۔ چنانچہ ۱۷۸۱ء میں افغان بادشاہ نے سندھ کی طرف توجہ کی اور اپنے سپہ سالار عزت خاں کو گورنر سندھ بنا کر بھیجا۔ میر بجار نے اس کو شکارپور کے قریب شکست دے کر بھگا دیا۔ اس پر بادشاہ خود سندھ روانہ ہوا۔ اس وقت میر بجار کی فراست کام آئی اور بادشاہ مطمئن ہو کر لوٹ گیا۔ لیکن احسان ناشناس عبدالنبی خاں نے امراء کے ورغلانے پر اپنے محسن میر بجار کو قتل کرا دیا اور خود انتقام کے خوف سے بھاگ کھڑا ہوا۔

اس واقعہ کے بعد کلہوڑہ خاندان کی حکومت کا تقریباً خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اگرچہ بعد میں سرفراز خاں نے مختلف قبائلی سرداروں کی مدد سے تخت حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ اور بالآخر اسی جدوجہد میں اسے قتل کر دیا گیا۔ اور زمام سلطنت تالپور خاندان کے ہاتھ میں آگئی۔

اس طرح اس خاندان نے سندھ کی اس سرزمین پر تقریباً ایک صدی تک حکومت کی ان کے ابتدائی عہد میں سندھ خوشحال رہا ان کی زندگی بسر کرتا رہا لیکن آخر میں جب سیاسی چپقلش اور تخت و تاج کے لئے ہنگامے شروع ہوئے تو بدامنی اور بے اطمینانی کی لہر دوڑ گئی۔ بہرحال اس خاندان کے کارناموں میں زندۂ جاوید اُن کے وہ مقابر ہیں جنکو انہوں نے بڑے اہتمام سے بنوایا تھا۔ یہ شاندار مقابر حیدرآباد۔ خدا آباد اور سکھر میں ہیں کہ ان تاجداروں نے انہیں مقامات کو اپنی آخری آرام گاہ کے لئے منتخب کیا تھا۔ ان مقابر میں قدیم ترین اس خاندان کے جدامجد عادل شاہ کا مقبرہ ہے جو سکھر میں ایک پہاڑی پر بنا ہوا ہے۔ تعمیراتی نقطۂ نگاہ سے اس کی اتنی اہمیت نہیں کیونکہ یہ ایک سادہ سی عمارت ہے جس کی دیواروں پر باہر سے سادہ پلاسٹر کر دیا گیا ہے اور بعض جگہ معمولی قسم کی ٹائلیں لگا دی ہیں، جن پر کہیں کہیں ارغوانی رنگ کے بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں لیکن تاریخی اعتبار سے یہ مقبرہ خاصا اہم ہے کہ اس خاندان کے جدامجد کا مزار ہے۔

مقابر کے اس سلسلے میں غلام شاہ کلہوڑہ کا مقبرہ خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ یہ حیدرآباد میں ہے اور ایک شاندار وسیع مربع عمارت ہے جو ایک چبوترے پر بنائی گئی ہے۔ اس کی دیواریں باہر سے سرتاپا رنگین ٹائلوں سے مزین ہیں جن پر گلکاری اور رنگ برنگ کے ڈیزائن بنے ہیں۔ ان ٹائلوں کا بیشتر حصہ اب گر چکا ہے اور گنبد بھی گر چکا ہے۔ اس شکست و ریخت سے عمارت کے اندر سنگِ مرمر کی بنی ہوئی قبر کو بھی نقصان پہنچا ہے جو کئی جگہ سے ٹوٹ گئی ہے۔ اس کی خوبصورت جالی (RAILING) تو ختم ہی ہو چکی ہے اس کے علاوہ مرصع عمودی ستون (PANELS) جو اس عمارت میں نصب تھے، ان کو بھی نقصان پہنچا ہے۔

اس عمارت کا اندرونی حصہ، دیواریں، چھت اور گنبد بڑے مفصل انداز میں مختلف طریقوں سے مزین کئے گئے ہیں بعض جگہ سنہری کام بھی ہے۔ رنگین گلیز ٹائلوں کی ایک مسلسل قطار چاروں طرف دیوار میں لگائی گئی ہے۔ محرابوں اور پیشانی پر فارسی میں لکھے ہوئے کئی کتبے ہیں جن کو اسی طرح مختلف انداز میں مرتب کیا گیا ہے کہ بڑے دیدہ زیب معلوم ہوتے ہیں۔ ایک محراب میں فارسی کا ایک کتبہ غلام شاہ کے سب سے بڑے لڑکے سرفراز خاں کلہوڑہ نے یہاں نصب کرایا تھا۔

اس عمارت کی دیوار کے اندر ہی اندر ایک زینہ اوپر جاتا ہے جو گنبد کے چاروں طرف چھت پر جانے کے لئے ہے چبوترے کے چاروں طرف، جس پر یہ عمارت بنی ہے، ایک جنگلہ ہے جو پتھر کی پتلی پتلی سلوں سے بنایا گیا ہے۔ اس جنگلے میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر منقش ستون ہیں جو بڑی خوبصورتی سے نصب کئے گئے ہیں، ان پر خوبصورت نقش و نگار کندہ ہیں، خاص طور سے چاروں کونوں پر جو بڑے بڑے ستون ہیں ان کا کام بڑا دیدہ زیب ہے اور ایسا نفیس کہ دیکھنے والے کو فتح پور سیکری کا کارنامہ یاد آجائے۔ اسی قسم کا کام ٹھٹھہ میں عیسیٰ خان ترخان کے مقبرے میں بھی ملتا ہے۔ یہ پوری عمارت مٹی کی ایک بھدی سی دیوار سے محیط ہے۔

غلام شاہ کے مقبرے سے تھوڑے فاصلے پر اس کے بھائی نبی خاں کا مقبرہ ہے جس نے سرفراز خاں کے صدر مقام سے بھاگ کر گدی پر قبضہ کر لیا تھا۔ "سندھ گزیٹیر" کا مؤلف اس مقبرے کو سرفراز خاں کا مقبرہ بتاتا ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ بہرحال یہ مقبرہ بھی غلام شاہ کے مقبرے کی طرح مزین ہے اور کافی وسیع عمارت ہے جہاں تک اس کے تعمیراتی پہلو کا تعلق ہے یہ مذکورہ بالا مقبرے سے صرف اس قدر مختلف ہے کہ یہ مربع کی بجائے ہشت پہلو ہے۔ لیکن اندر سے اس کی شکل بھی مربع ہے۔

اس گروپ کا تیسرا مقبرہ سرفراز خاں کا ہے جو ایک پہاڑی کے دامن میں ہے۔ اس مقبرے کی اب بھی مرمت ہوتی رہتی ہے، اس لئے اچھی حالت میں ہے۔ سرفراز خاں کو اہل سندھ "روحانی رہنما" اور شہید مانتے ہیں اور بڑی عقیدت و احترام سے اس کے مقبرے کی حفاظت کرتے ہیں۔ ان عمارات میں ایک شان و شکوہ اور ہیبت و جلال ہے جو تالپور عہد کی عمارتوں میں نہیں ملتا۔

ان مقابر کے علاوہ دو مقبرے خدا آباد میں ہیں، یہ مقام بھی کچھ عرصے کے لئے کلہوڑہ خاندان کا صدر مقام رہا ہے۔ خاص طور سے میاں نور محمد یہاں کافی عرصے تک مقیم رہا۔ یہاں ایک جامع مسجد ہے جو سندھ میں مسلم طرز تعمیر کا نادر نمونہ ہے۔ اس مسجد سے تھوڑے فاصلے پر جنوب کی جانب اس خاندان کے حکمران یار محمد کا شاندار مقبرہ ہے۔ یہ ایک اونچی پر شکوہ مربع عمارت ہے جس کا سامنے کا حصہ خوبصورت ٹائلوں سے مزین ہے۔ اس کے علاوہ تینوں

سندھ کا فن تعمیر (مقبرے)
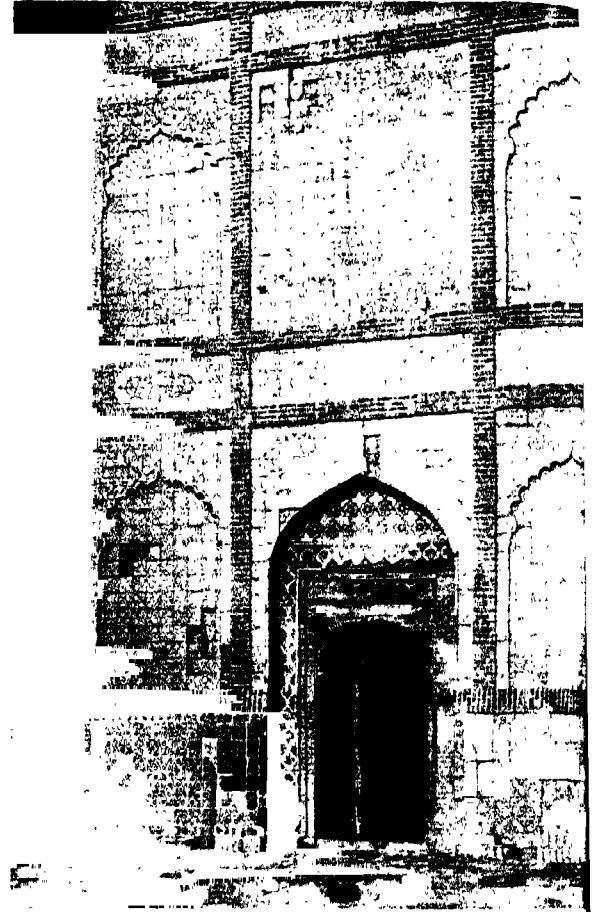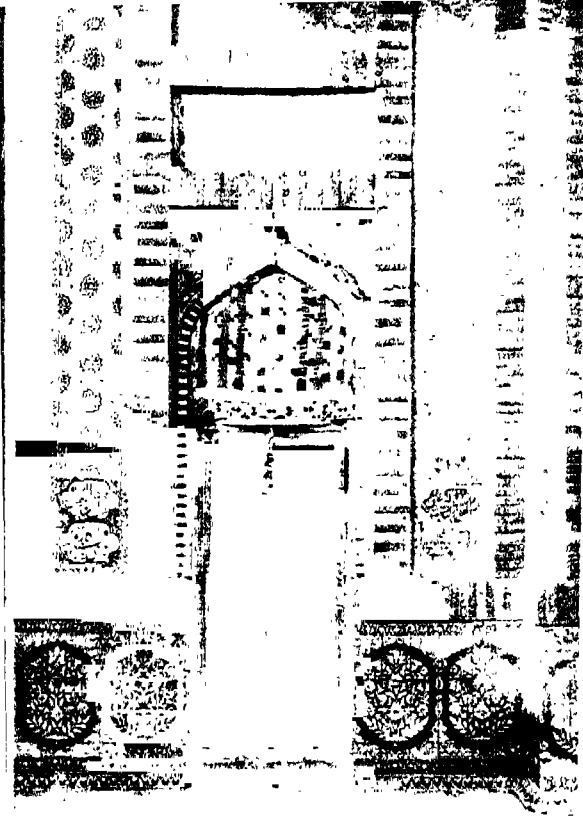
۱: مقبرہ شاہ خیرالدین رح (پرانا سکھر)

۲: مقبرہ یار محمد خان کلہوڑہ (خداآباد، ضلع دادو)

۳: میران تالپور کے مقابر (حیدرآباد)
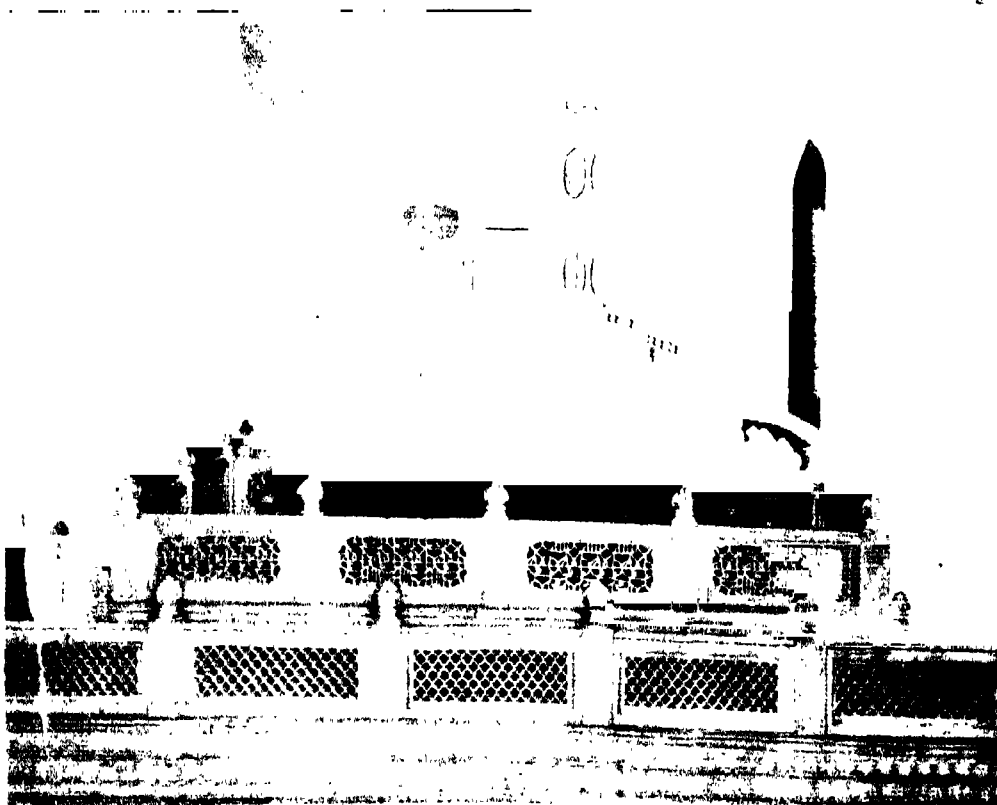
رفتار ترقی

جنرل محمد ایوب خاں کی خدمت میں
ساختہ پاکستان ٹیلیفون کی پیشکش
ٹیلیفون فیکٹری، (ہزارہ)

"تنی باراں دریا" کے سلسلہ
آب رسانی کا معائنہ
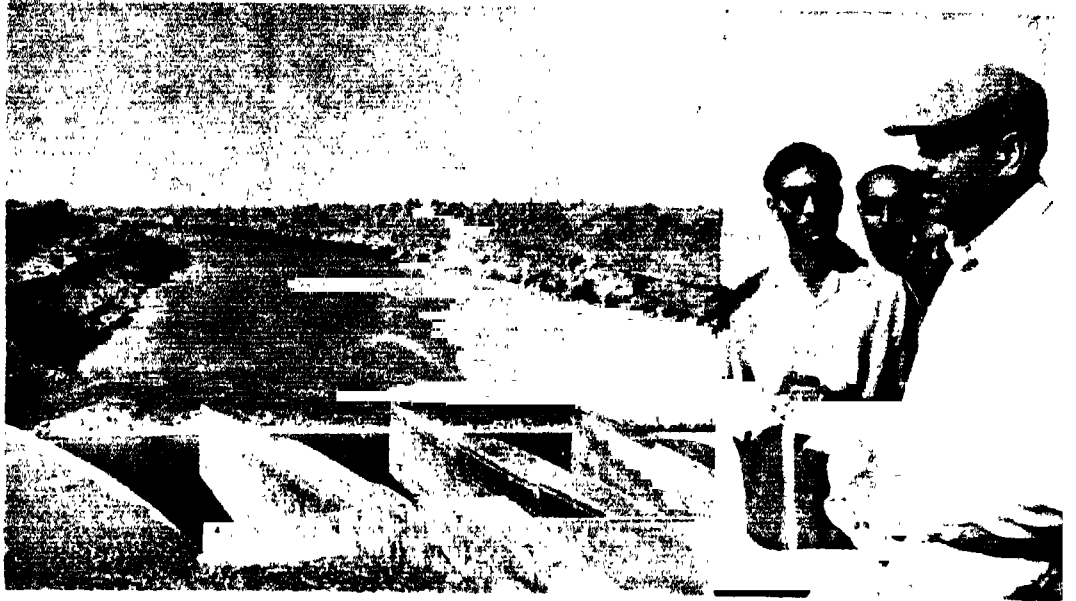
وزیر صنعت، جناب ابوالقاسم خاں، کپڑے کے
ایک کارخانے میں (میمن سنگھ، مشرقی پاکستان)

مغل پورہ ریلوے ورکشاپ لاہور میں مصروف کام

اطراف کی دیواروں میں اوپر کی طرف بڑی بڑی محراب دار کھڑکیاں ہیں۔ ان میں پکی ہوئی مٹی کی خوبصورت جالیاں لگی ہیں۔ یہ جالیاں کافی روشن ہیں جن سے گنبد کے گرد گیلری میں روشنی چھن چھن کر جاتی ہے۔ اسی قسم کی کھڑکیاں سامنے کی طرف بھی ہیں جو بڑے دروازے کے اوپر ہیں۔ ان میں گلیز ٹائلوں کی جالیاں لگی ہیں۔ سامنے کا دروازہ بڑی نفاست سے سجایا گیا ہے اور خوبصورت ٹائلوں کے بڑے بڑے پینل لگائے گئے ہیں۔ دس فٹ مربع جگہ میں تقریباً ۲۴۰ مربع شکل کی ٹائلیں جڑی ہیں۔ جن پر نقش و نگار اور بیل بوٹے بنے ہیں۔ ان بڑے بڑے پینل کے بنانے کا طریقہ یہ تھا کہ مقررہ جگہ میں سادہ ٹائلیں جما دیتے تھے اور پھر ان پر نقش و نگار بناتے تھے۔ بعد میں ان کو اس جگہ سے علیحدہ کر کے بھٹی میں پکاتے تھے تاکہ ان کے رنگ و روغن پختہ ہو جائیں۔ اس اہتمام کے بعد یہ ٹائلیں دوبارہ اپنی جگہ پر جما دی جاتی تھیں۔ اس طرح ان بڑے بڑے پینل پر اس قدر مینا کاری کی جاتی تھی جو دیکھنے میں پوری ایک ٹائل معلوم ہوتی تھی۔ بڑی بڑی محرابوں اور دوسرے پُرپیچ مقامات کے لئے بھی اسی انداز میں ٹائلیں بنائی جاتی تھیں۔ اس مقبرے میں یہ کام اتنی مہارت اور چابکدستی سے کیا گیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔

یہ وہی یار محمد ہے جو کافی عرصے تک شمالی سندھ اور بلوچستان میں مارا مارا پھرنے کے بعد خدا آباد میں مقیم ہوا۔ اسی نے اس جگہ کو یہ نام دیا۔ اس کی وفات ۱۱۳۱ھ کا واقعہ ہے۔

خدا آباد سے اٹھارہ میل دور ایک اور جگہ ہے جس کو دولت آباد کہتے ہیں اس مقام کے شمال مشرق میں سات میل کے فاصلے پر ایک اور اہم مقبرہ ہے جس میں یار محمد کا لڑکا نور محمد محوِ خواب ہے۔ اس مقبرے کا نقشہ بعینہٖ یار محمد کے مقبرے کی طرح ہے۔ یہ بھی بہت وسیع اور شاندار عمارت ہے لیکن قبل الذکر مقبرے کی طرح آراستہ و پیراستہ نہیں۔ اس مقبرے کے گنبد پر ایک چمنی (LANTERN) بھی لگائی گئی ہے۔ جو اس کی انفرادیت کو واضح کرتی ہے۔ اس مقام پر اور بھی کئی چھوٹے چھوٹے مقبرے ہیں۔

یہاں ایک اہم مقبرے کا ذکر اور باقی ہے جو کلہوڑہ حکمرانوں میں سے کسی کا تو نہیں لیکن ایک ایسے شخص کا ہے جس نے اس خاندان کی بقاء استحکام

(باقی ص ۵۷ پر)

★

"مثنویاتِ ہیر و رانجھا": ——— بقیہ صفحہ: (۳۵)

تو اس داستان کے فارسی مظاہر کی مجموعی کیفیت کا بہتر اندازہ کیا جا سکے گا اور جامع تقابلی مطالعہ کا امکان بھی ہوگا۔

ان مثنویات میں چند خصوصیتیں مشترک ہیں۔ ان کا سلسلہ نظامی، امیر خسرو اور جامی ہی کا سلسلہ ہے۔ چنانچہ بعض میں نظامی کی طرح بار بار ساقی کو یاد کیا گیا ہے۔ اکثر مثنویاں کسی راوی کے بیان پر مبنی ہیں اور فرمائش پر لکھی گئی ہیں۔ ان میں مقامی الفاظ بے تکلفی سے کھپائے گئے ہیں اور اسی بنا پر زبان و بیان میں بھی دانستہ یا نادانستہ کچھ بے تکلفیاں برتی گئی ہیں۔ یہ باتیں ان میں مقامی رنگ پیدا کرنے کے لئے ضروری تھیں اور یہی انہیں کلاسیکل ایرانی شاعری سے الگ حیثیت عطا کرتی ہیں۔ یہ ایران کے مقابلے میں برصغیر خصوصاً مغربی پاکستان کا فارسی زبان و ادب کو ایک غیر فانی فیضان ہے اور ہمارے ثقافتی ورثہ میں قابلِ قدر حیثیت رکھتا ہے۔

ان مثنویات اور وارث شاہ کی ہیر رانجھا میں ہر اعتبار سے زمین آسمان کا فرق ہے۔ اور یہی فرق خود پنجابی "ہیروں" میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ وارث شاہ نے اپنے مزاج، ذوق، ولولہ و آہنگ، زورِ طبع، ہنگامہ آرائی، ہر فن مولا شخصیت، تبحر علمی، مشاہدہ و تخیل، زندگی کی عکاسی، جزئیات نگاری، کردار آفرینی، حاشیہ آرائی، دانش و حکمت، واقعیت و تمثیلیت، سہتی مراد کے قصے نے زیادہ بسیط اور زوردار اضافہ وغیرہ سے کچھ اور ہی عالم پیدا کر دیا ہے۔ ہیر رانجھا کے دوسرے تمام قصے ایک طرف اور وارث شاہ کا قصہ دوسری طرف۔ اور اس کے فرق باہمی کی توضیح و تشریح کا حق علیحدہ مطالعہ ہی سے ادا کیا جا سکتا ہے۔

کلری جھیل

اقبال حامد

غیر ملکی کرنسی کی قدر و منزلت کے اس دور میں سیاحتی مقامات کی اہمیت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ ان کا برآمد ہونے والے خام مال اور صنعتی پیداوار کا سا تحفظ ضروری ہو گیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ کبھی کبھی خام مال برآمد کرنے والے ممالک تو زرِ مبادلہ کی کمی کا شکار ہو جاتے ہیں لیکن جو ممالک سیاحتی اور تفریحی مقامات کے مالک ہیں ان میں دنیا کے خوشحال اور آزاد ملکوں کے سکوں کی آمد کبھی بند نہیں ہوتی۔ آسٹریا اور سوئٹزرلینڈ اس ضمن میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جن کا محل وقوع، آب و ہوا، قدرتی دلکشی و رعنائی اور سیاحوں کے آرام و آسائش کے لئے فراہم کردہ انتظامات دنیا کے ہر کونے سے فرحت کے متوالوں کو کھینچ لاتے ہیں جس کی وجہ سے ان دو ممالک کے قومی خزانوں میں زرِ مبادلہ کی بہتات رہتی ہے۔

"پاکستان میں نہ معلوم کتنے آسٹریا اور سوئٹزرلینڈ بھرے پڑے ہیں"! یہ الفاظ کسی محبِ وطن پاکستانی کے نہیں بلکہ آسٹریا کے ایک نوجوان صحافی کے ہیں جو عالمی سیاحت کے لئے اس واسطے نکلا تھا کہ ساری دنیا میں اپنے ملک کے برف پوش پہاڑوں اور سرسبز و شاداب وادیوں کا پروپیگنڈہ کرے اور ساتھ ہی یہ بھی دیکھے کہ دنیا کے ممالک اپنے صحت بخش و تفریحی حصوں سے کس طرح فائدے اٹھا رہے ہیں۔ یہ نوجوان سیاح ویانا یونیورسٹی میں جرنلزم کا طالب علم تھا اور اس کے پاس آسٹریا کے تمام کوہستانوں، گلستانوں، وادیوں اور دنیوی حسن سے مالا مال شہروں کے رنگین سینما سلائڈ تھے جن کو وہ ہر شہر خاص کر ہر شہر کے تعلیمی اداروں میں دکھاتا۔ اس کے ساتھ ہی یہ نوجوان صحافی ان ممالک اور ان کے دلآویز مناظر دکھاتا تھا جہاں سے وہ ہو کر آ رہا تھا۔ تاریکی میں مشین چلتی رہتی، دیکھنے والوں کی نگاہیں پردے پر ہوتیں اور ہر سلائڈ کی تشریح یہ سیاح صحافی زبانی کرتا جاتا تھا۔ جب وہ سلائڈوں کے ذریعہ مشاہدین کو سیر کراتا ہوا کاغان اور چترال لایا تو بول پڑا کہ ان علاقوں کے قدرتی مناظر بالکل آسٹریا جیسے ہیں اور ان کے سلائڈ بناتے وقت مجھ کو یہی محسوس ہوا کہ خود اپنے وطن کی رعنائیوں کا عکس لے رہا ہوں"۔

یہ نوجوان صحافی کاغان، بسبیلہ، نتھیا گلی، ایبٹ آباد، مری، ہڑپہ، موہن جو دڑو، زیارت اور ٹھٹھہ، ہر اس جگہ گیا جس کی تاریخی، ثقافتی، سیاحتی یا آثارِ قدیمہ ہونے کی وجہ سے اہمیت ہے اور اس نے یہ تسلیم کیا کہ پاکستان سیاحتی نقطۂ نگاہ سے بڑا اہم ملک ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ سیاحوں کی دلچسپی کے تمام مقامات یہاں موجود ہیں۔ مثلاً بعض سیاحوں کی غرض تاریخی مقامات کا مشاہدہ و مطالعہ ہوتی ہے، اس کے لئے پاکستان میں ٹھٹھہ، عمرکوٹ، سیہون، ملتان اور لاہور وغیرہ ہیں۔ آثارِ قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ٹیکسلا، ہڑپہ اور موہن جو دڑو ہیں۔ پہاڑی مقامات کے شائقین کے لئے مری اور ایبٹ آباد ہیں۔ اور اقوام و ملل کی ثقافت سے شغف رکھنے والوں کے لئے مشرقی و مغربی پاکستان کے دامن موجود ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ گو ہمارا ملک قدرتی مناظر سے مالا مال ہے مگر اس کے سیاحتی مقامات وفاقی دارالحکومت سے سینکڑوں ہزاروں میل دور ملک کے کم ترقی یافتہ حصوں میں واقع ہیں جہاں پہنچنے کے لئے سڑکوں اور ریلوے لائنوں جیسی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے لئے پہاڑوں کو کاٹنا پڑتا ہے گھاٹیاں عبور کرنا پڑ رہی ہیں اور ہر موسم میں استعمال کے لائق پل بنانے پڑ رہے ہیں۔ یہ کام فوری طور پر تکمیل پذیر نہیں ہو سکتے بالخصوص اس عالم میں جبکہ ملک معاشی پسماندگی بلکہ تباہی سے نکل رہا ہو اور سیمنٹ، فولاد اور مشینری کو آبپاشی و آبادکاری کے کاموں میں استعمال کرنا لازمی ہو۔ لیکن اسی رفتار سے کام ہوتا رہا تو چند برس میں پاکستان کے سیاحتی مقامات کے لئے گذرگاہیں اور اقامت گاہیں مہیا ہو جائیں گی اور سیاح ہر جگہ حسبِ ضرورت قیام کر سکیں گے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ پاکستان کے تمام سیاحتی مقامات فی الوقت محتاجِ انصرام ہیں بلکہ ایسے کئی مقامات وجود میں آ چکے ہیں جو ذرائع

کوشش سے سیرگاہ خاص و عام بن سکتے ہیں۔ ان میں "کلری جھیل" خاص طور پر قابل ذکر ہے جو ۲۰ دسمبر ۱۹۵۸ء کو نمودار ہوئی ہے۔ اگرچہ اس کو جھیل ہی کہا جاتا ہے لیکن طول و عرض کے اعتبار سے یہ ایک طرح کا رود بار ہے کیونکہ ۵۰ مربع میل پر پھیلی ہوئی ہے اور بیضوی شکل کی اس جھیل کی لمبائی سترہ میل ہے۔ یہ جھیل ضلع ٹھٹھہ میں کراچی کے قریب قومی شاہراہ اور مین ریلوے لائن پر وجود میں آئی ہے۔ چنانچہ اندرون ملک سے کراچی کی طرف سفر کرنے والے اور کراچی سے مغربی پاکستان جانے والے عام آدمی تک اپنا سفر چند گھنٹوں کے لئے ملتوی کر کے قدرت کے اس شاہکار سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ قدرت کا شاہکار اس لئے کہ یہ جھیل قدرتی ہے۔ اس کو بنانے کے لئے نہ تو زمین کھودنا پڑی اور نہ کنارے ہی ابھارنے پڑے بلکہ نہ معلوم کتنے قرنوں سے یہ وسیع و عریض گڑھا بالکل خشک صورت میں اور گیتی کے سینے کے گھاؤ کی حیثیت سے پڑا تھا۔ دراصل جہاں اب کلری جھیل کا پانی چاندی کے پتر کی طرح دمک رہا ہے وہاں سنہری اور کنجر نام کی دو جھیلیں تھیں اور دونوں کے درمیان میلوں کا فاصلہ صدیوں سے کبھی بنجر علاقہ اور کبھی جنگلات کی شکل میں موجود رہا۔ اس کا ثبوت اس علاقہ کی مشہور رومانی داستان "جام تماچی" سے ملتا ہے۔ تاریخ میں بڑے اختصار کے ساتھ درج ہے کہ یہاں جام تماچی نامی ایک حکمراں تھا جس کو سنہری جھیل کے ایک مچھیرے کی لڑکی نوری سے محبت ہو گئی اور اگرچہ ان کی شادی بھی ہوئی مگر خبر نہیں کیا وجہ ہے کہ ان دونوں کی قبریں ایک دوسرے سے دور نظر آتی ہیں۔ ایک جھیل کے اندر نوری کا مزار ہے اور جام کی قبر اس سے بہت دور کنارے پر واقع ہے۔ ان قبروں کے علاوہ جام کے عہد کے محلات بھی ہیں جو اس حکمراں نے اپنی محبوبہ نوری کیلئے تعمیر کرائے تھے۔ اگرچہ تاریخ اپنے دامن میں جام تماچی کے رومان کو چند سطور سے زیادہ جگہ نہ دے سکی مگر سندھ کے صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے اس عشقیہ داستان کو نظم کر کے ان دو محبت کرنے والوں کو غیر فانی بنا دیا ہے اور شاہ کی یہ منظوم داستان آج بھی اس علاقہ کی سہانی راتوں میں کوئی چھیڑ دیتا ہے تو جہاں تک آواز جاتی ہے ہر فرد گوش بر آواز ہو جاتا ہے۔

قدیم تاریخی شہر ٹھٹھہ سے بھی بڑی کلری جھیل میں پانی غلام محمد بیراج کے دائیں کنارے کی واحد نہر کلری بگھار فیڈر کے ذریعہ لایا گیا ہے اور بیراج سے جھیل تک اس نہر کا فاصلہ کم و بیش ساٹھ میل ہے۔ چونکہ یہ نہر اور اس کی گذرگاہ خود پاکستانی انجینئروں کا انمٹ کارنامہ ہے اسلئے کلری جھیل کی سیاحتی اور تفریحی اہمیت بتانے سے قبل اس پر مختصراً روشنی ڈالنا دلچسپی کا باعث ہوگا۔

غلام محمد بیراج کے دائیں کنارے سے کلری بگھار کو کلری جھیل تک کھودنا بڑا ہی کٹھن کام تھا کیونکہ اس راہ میں بڑے سنگلاخ قطعے اور بڑی بڑی چٹانیں تک آ گئیں جن کو اڑانے کے لئے ہزاروں ٹن ڈائنامائٹ استعمال کرنا پڑا۔ ایک جگہ تو پورے آٹھ میل تک سنگین زمین کو آتش گیر مادہ سے شق کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ نہر کلری بگھار فیڈر کی راہ میں ایک دریا "نئی باراں" راستہ کاٹ کر گذرتا تھا چنانچہ اس دریا کی چوڑائی کے برابر ایک سرنگ بنائی گئی جس کو نصف قطر میں سیمنٹ کنکریٹ سے ڈھانپ دیا گیا۔ اس طرح کلری بگھار نہر دریائے "نئی باراں" کے نیچے سے نکلتی چلی گئی اور دریا حسب معمول اس نہر کے اوپر سے بہتا رہا۔ ان دو دریاؤں کا ایک دوسرے کی مخالف سمتوں میں بہاؤ جھرک کے مقام پر ہے جہاں ایک خوبصورت بند باندھا گیا ہے۔ اس بند اور نہر کی سرنگ پر کم و بیش ایک کروڑ روپیہ صرف ہوا ہے۔ اور اس میں مچھلیوں کے شکار کا بھی پورا بند و بست کیا گیا ہے۔ انجینئرنگ کا یہ لائق تحسین اور قابل دید منصوبہ بھی قومی شاہراہ سے تھوڑے ہی فاصلہ پر واقع ہے جہاں سیاحوں، امیروں اور شکاریوں کے قیام کے لئے ایک سیکنڈ کلاس سرکاری بنگلہ بھی ہے۔ اس مقام کو جہاں دریائے "نئی باراں سپر پیسج" کہتے ہیں یعنی "نئی باراں گذرگاہ خاص"۔ دریائے "باراں" جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے ایک برساتی ندی ہے۔ چونکہ اس میں پانی کا انحصار دور و نزدیک کی بارشوں پر ہے اس لئے دریا میں مچھلیاں پکڑنے کے لئے زینہ نما منڈیر نہیں بنائی گئی ہے البتہ ہمیشہ رواں اور کٹورے کی طرح لبریز رہنے والی نہر کلری بگھار کے اس مقام پر مچھلی پکڑنے کی جگہ خود بخود بن گئی ہے اس جگہ کلری بگھار کا اخراج ایک لاکھ نوے ہزار کیوسکس ہے۔ اس بند میں سات سرنگیں بنائی گئی ہیں اور سات دروازے ہیں۔ ہر سرنگ ۱۵۰ فٹ لمبی اور ۱۶ فٹ اونچی اور ۲۸ فٹ چوڑی ہے۔ دریا کی سطح پر صرف ایک ہی سرنگ کا نمونہ بنایا گیا۔ باقی سرنگیں نیچے ہیں۔ اس کے بعد کلری جھیل تک کوئی بند یا پختہ گذرگاہ نہیں۔ البتہ کلری جھیل کے ذخیرہ شدہ پانی کو زیریں حصے میں آبپاشی اور دوسری ضرورتوں کے لئے جن میں کراچی کی آب رسانی بھی شامل ہے، چھوٹی نہروں میں پانی پہنچانے کی غرض سے کلری بگھار فیڈر لوئر ریگولیٹر تعمیر کیا گیا ہے۔ اس طرح کلری جھیل کو پانی دینے اور اس سے پانی لینے، دونوں مقاصد کے لئے ہیڈ ورکس تعمیر کئے گئے ہیں یہ دونوں ہیڈ ورکس بذات خود

قابل دید ہیں اور بڑی پُر فضا جگہوں پر تعمیر کئے گئے ہیں۔

کلری جھیل جس مقام پر واقع ہے وہاں کی آب و ہوا نہایت صحت بخش ہے کیونکہ یہاں ہر موسم معتدل رہتا ہے نہ گرمی شدید پڑتی ہے نہ سردی اور بارش کی سالانہ اوسط ۵ انچ سے زیادہ نہیں۔ البتہ برسات کے دوران سیاہ سرمئی اودی گھٹائیں اس پر منڈلاتی رہتی ہیں۔ اس سے یہ علاقہ اور بھی خوشگوار ہو جاتا ہے۔ آج کل کے سیاح، سیاحت میں تفریحی مشاغل کو ترجیح دیتے ہیں، بالخصوص ایسے مشاغل جن سے تھوڑی بہت ورزش بھی ہوتی رہے۔ اور وقت بھی اچھی طرح گذر جائے، اس لئے کہ پر فضا اور صحت بخش مقامات پر مشاغل کے بغیر محض آرام ہی آرام کے چند دن بھی اکتاہٹ پیدا کر دیتے ہیں بالخصوص مصروفیت کے خوگر تعطیلات کے چند دنوں میں بھی بے کار نہیں رہ سکتے چنانچہ ایسے مقامات پر بالعموم تین قسم کی تفریحی ورزشوں کا اعلیٰ انتظام ہوتا ہے: پیراکی کشتی رانی اور شکار۔

خوش قسمتی سے کلری جھیل ان تینوں مشغلوں کے لئے انتہائی موزوں ہے یعنی پچاس مربع میل کے علاقہ پر صاف شفاف پانی میں پیراکی اور کشتی رانی کو شوق، فن اور پیشہ ہر اعتبار سے منظم کیا جا سکتا ہے۔ سیاح ان مشغلوں کو شوق کی حد تک جاری رکھ سکتے ہیں اور حکومت یا اسپورٹس کنٹرول بورڈ پیراکی اور کشتی رانی کے قومی اور بین الاقوامی مقابلوں کا مرکز بنا کر (جہاں تھوڑے سے خرچ سے ان دو فنون یا کھیلوں کے تمام فنی اور تربیتی لوازمات مہیا کئے جا سکتے ہیں) کلری جھیل کو کئی سو گنا اہم، پرکشش اور آمدنی کا ذریعہ بنا سکتا ہے۔ شکار کے سلسلہ میں صرف مچھلی پکڑنے تک ہی کلری جھیل کی اہمیت محدود نہیں بلکہ اس کا پانی بطوں اور مرغابیوں کا گھر ہو سکتا ہے اور حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے کناروں پر تیتر بٹیر فی الحال پڑے پڑے ہیں۔ اس کے علاوہ ہرن، ہریل اور دوسرے شکار کے قابل جانوروں کی نہ ختم ہونے والی نسلیں بڑی آسانی سے پیدا کی جا سکتی ہیں اور مغربی پاکستان کے محکمہ شکار کے لئے یہ کام کافی کم خرچ بھی ہے۔ اس لئے کہ کلری جھیل کے کناروں پر جنگلات اور باغات لگانے کی کئی اسکیمیں تیار ہو چکی ہیں۔ ان پر عملدرآمد کے ساتھ ہی لائقِ شکار جانوروں کی نسل کشی کا کام شروع کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک ماہی گیری کا تعلق ہے اس کے لئے کلری جھیل کی اہمیت اور موزونیت شروع سے ہی حکومت کے پیش نظر ہے چنانچہ اس کے ہیڈ ورکس کی افتتاحی تقریبات پر جو لٹریچر شائع ہوا اور تقاریر کی گئیں ان میں کلری کی ماہی گیری کا خاص طور پر حوالہ دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ اس لمبی چوڑی جھیل کا پانی آمد و رفت کے دونوں مرحلوں میں انسانی قبضہ و اختیار میں ہے اور پانی کے اس انسانی کنٹرول کے مقامات پر ایسا انتظام کیا گیا ہے کہ بلا اجازت ایک بھی مچھلی نہ جھیل میں آ سکتی ہے اور نہ جھیل سے باہر جا سکتی ہے۔ مچھلی کی اعلیٰ نسلیں پیدا کرنے اور ان کو یکجا اور محفوظ رکھنے کے لئے جس طرح کے نہ ختم ہونے والے مگر محدود ذخیرۂ آب کی ضرورت ہوتی ہے کلری جھیل اس کے لئے بہترین جگہ ہے جو اس وقت بھی کئی نسلوں کی چھوٹی بڑی مچھلیوں کی دولت سے مالامال ہے، مگر کچھ دن بعد جب حکومت ماہی گیری کا انتظام خود سنبھال لے گی تو اس سے قومی دولت میں باقاعدگی کے ساتھ لاکھوں کا اضافہ ہونا شروع ہو جائے گا۔

صدیوں قبل جام تماچی کے عہد میں ممکن ہے یہ علاقہ خوشحال ہو لیکن اس کے بعد سے کلری جھیل کے وجود میں آنے تک یہ مثالی طور پر خشک اور بنجر سرزمین تھی جہاں آب پاشی برائے زراعت تو درکنار پینے کے پانی تک کے لئے لوگ بادلوں کی آس لگائے رہتے تھے مگر اب یہاں کے دہقانوں کے کڑے دن گذر گئے ہیں اور ان کی نگاہیں امید و بیم سے لبریز آسمانوں کی طرف نہیں بلکہ اس لاکھوں ایکڑ زمین پر ہیں جو اب تک بنجر پڑی تھی مگر کلری جھیل سے سیراب ہو کر لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں تبدیل ہو جائے گی اور جوں جوں وقت گذرتا جائے گا زیر کاشت رقبہ میں اضافہ ہی ہوتا رہے گا۔ علاقہ کلری کے لوگوں کو اس کا یقین اسی وقت ہو گیا تھا جبکہ کلری بگھار فیڈر کے دہانے سے پہلا دھارا جھیل میں گرا۔ نہ معلوم اس پانی میں کیا تاثیر تھی کہ صدیوں کی تیز دھوپ سے جھلسے ہوئے دہقانوں کے چہرے کھل اٹھے اور انہوں نے اپنے مخصوص ساز اٹھا کر شاہ لطیفؒ کی رومانی نظم جام تماچی کی دھن چھیڑ دی۔ یہ نظم یہاں ہمیشہ گائی جاتی رہی ہے لیکن صدیوں سے اس کے ہر لفظ میں کرب و سوز کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا جسے محسوس کر کے سننے والے بھی تڑپ اٹھتے تھے مگر اب اس میں کرب و درد کی جگہ مسرت اور سرخوشی بھری ہوئی ہے اور اس کے مسرت آفریں اثر کا یہ عالم ہے کہ جس عورت، مرد اور بچے کی سماعت سے یہ نغمہ ٹکراتا ہے وہ وہیں جھومنا اور رقص کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ انقلاب عطیہ ہے کلری جھیل کا اور کلری جھیل عطیہ ہے قدرت کا جو وہ ہر محنت کش، باعمل اور اپنا مقدر آپ بنانے والی قوموں کو ازل سے دیتی آئی ہے۔

کلری جھیل

(ملاحظہ ہو مضمون صفحہ ۶۲)

جنگل کا ایک منظر

جولائی ۱۹۵۹ء

افتتاح : صدر پاکستان، جنرل محمد ایوب خان

صنعتی ترقیاتی کانفرنس کراچی

نہری پانی کے مذاکرات : لندن میں پاکستان اور عالمی بینک کے مسٹر یوجین بلیک کے ساتھ ابتدائی گفتگو

سوئٹزرلینڈ کے وفد کی وزیر اطلاعات و نشریات، جناب حبیب اللہ کے ساتھ ملاقات

کراچی میں نقاشی کی ایک نمائش : جس میں امریکی خیرخواہان مشرق وسطیٰ نے مشرقی پاکستان کے ایک نوجوان مصور، مرتضیٰ بشیر، کی تصاویر پیش کیں

۱۹۲۹ء ٹین کے ڈبوں کے ذریعہ
۱۹۳۹ء پمپ کے ذریعہ
۱۹۵۹ء جدید طرز کے سروس اسٹیشن کے ذریعہ
BURMAH-SHELL SERVICE
برما شیل کے وسیع نظام اور سالہا سال کے تجربہ نیز شیل جیسے عالمی ادارہ سے وابستگی کی بدولت یہ سہولتیں بہ آسانی فراہم کی جاسکی ہیں۔
موٹروں میں ڈبوں کے ذریعہ پٹرول ڈالنا مشکل
طلب کام تھا۔
ہاتھ سے چلائے جانے والے پمپ نے ڈبوں کی جگہ لے لی مگر کوئی اس دور کے پمپ چلانے والے کے دل سے پوچھے۔
ایسے سروس اسٹیشن قائم کئے گئے جہاں موٹروں کے لئے کشادہ راستوں کے ساتھ ساتھ خاطر خواہ سروس کا انتظام کیا گیا۔
... آج شیل کے ماہرین آپ کی
پٹرول پیش کر رہے ہیں جس میں
مناسب مقدار شامل ہے اور کل! ——
برما شیل ترقیٔ پاکستان کا حصہ ہے

یہ خون دہ ... ایسے کیوں؟
اسپریڈون استعمال کیجئے اور
تکلیف دہ ایام سے نجات پائیے!
ہر ماہ آپ کی زندگی کو تلخ کر دینے والی تکلیف اور درد سے
فوری طور پر نجات پانے کے لئے اسپریڈون استعمال کیجئے
تسکین دیتی ہے
اسپریڈون درد سے فوراً نجات دلاتی ہے اور اس کے استعمال کے
بعد نہ تو معدے میں کوئی تکلیف ہوتی ہے اور نہ بدحالی پیدا ہوتی ہے۔
آرام پہنچاتی ہے
اسپریڈون اعصاب کو آرام پہنچاتی ہے اور درد کے رفع ہو جانے
کے بعد آپ راحت و مسرت محسوس کرتی ہیں۔
تازگی بخشتی ہے
درد کی وجہ سے پیدا ہونے والی ذہنی اور جسمانی تھکاوٹ پر اسپریڈون
قابو پالیتی ہے اور اسکے استعمال کے چند ہی لمحوں بعد آپ پھرتی و تازگی محسوس کرتی ہیں۔
اصلی اسپریڈون صرف اصولِ صحت کے مطابق مُہر بند
کئے ہوئے ورقی پیکٹوں میں ہر جگہ دستیاب ہوتی ہے۔
Saridon
JWT

New
SUNLIGHT
SOAP
SUNLIGHT
یہ دیکھئے
نیا سنلائٹ صابن
ایک نئے جادو اثر جزو کے ساتھ
کپڑے پہلے سے بہت زیادہ سفید دھوتا ہے
نیا سنلائٹ صابن
بغیر کپڑوں کو
سفید اور اُجلے دھوتا ہے!

ماہِ نو

جلد ۱۲ — شمارہ ۷

جولائی ۱۹۵۹ء

مدیر: رفیق خاور — نائب مدیر: ظفر قریشی

سرورق: سوات کا ایک منظر: رنگین عکس: محمد اسلم

سالانہ چندہ: ساڑھے پانچ روپے • شائع کردہ: ادارۂ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳، کراچی • فی کاپی: آٹھ آنے

ماہِ نو، کراچی۔ جولائی ۱۹۵۹ء

شاعرِ مشرق

(دو تقریریں: بہ سلسلۂ یوم پاکستان لندن)

رش بروک ولیمز

سر مالکم ڈارلنگ

آج سر محمد اقبالؒ کا شہرہ غالباً اس سے زیادہ ہے جتنا کہ ان کی وفات کے وقت تھا۔ کئی شاعر، فلسفی بلکہ سیاست داں بھی اپنے انتقال کے بعد چند ہی سال کے عرصہ میں بالکل فراموش ہو جاتے ہیں۔ اقبال اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔ ان کی شہرت پہلے سے بدرجہا زیادہ ہے۔ یہ کوئی ذوق و شوق کی ہنگامی رَو نہ تھی جس کے تحت اُن کا ایک عظیم انسان کی حیثیت سے خیر مقدم کیا گیا۔ جو لوگ ان کا ایک شاعر، فلسفی یا سیاسی مبشر کی حیثیت سے مطالعہ کرتے ہیں، اُن کی تصانیف میں ایسے ارشاداتِ عالیہ اور حقائق و بصائر پاتے ہیں جن کی صداقت آج بھی اُسی طرح برقرار ہے جتنی کہ اس وقت جب وہ معرضِ اظہار میں آئی تھیں۔

میرے اقبال کے ساتھ روابط اِس آخری یعنی سیاسی مبشر ہی کی حیثیت سے پیدا ہوئے تھے۔ میرا مطلب وہ کردار ہے جو انہوں نے ایک سیاسی مبشر کی حیثیت سے انجام دیا تھا۔ مجھے لاہور میں کئی بار اُن کی ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ اگرچہ میں یہ دیکھ کر خوش ہوں کہ آج کی محفل میں سر مالکم ڈارلنگ بھی شامل ہیں جن کے اُس زمانہ میں اقبال کے ساتھ روابط مجھ سے کہیں زیادہ قریبی تھے۔

سر محمد اقبالؒ کے ساتھ میرے تعلقات حقیقی معنوں میں تین گول میز کانفرنسوں کے دوران پیدا ہوئے تھے اور انہی کانفرنسوں کے دوران ہی مجھے اُن کے سیاسی افکار کی وسعت اور گہرائی کو کما حقہٗ سمجھنے کا موقع ملا۔

اِس زمانے پر ایک نظرِ بازگشت ڈالی جائے تو ایسا معلوم ہوگا کہ ہم میں سے اکثر جو اُس وقت ایک متحدہ ہندوستان کا وفاقیہ قائم کرنے کی اُمید میں سرگرم کار تھے، سر اقبال کی حکیمانہ بصیرت کو کم اہمیت دینے کی طرف مائل تھے۔ بلکہ میں تو اس سلسلہ میں قائدِ اعظم کو بھی کلی طور پر مستثنیٰ نہیں کروں گا۔ کیونکہ مجھے یاد ہے کہ میں کئی ایسی صحبتوں میں شریک تھا جن میں سر اقبالؒ ہمیشہ یہی اصرار کرتے تھے کہ ہندوستان کی مسلم آبادی کی کسی بھی مجوزہ وفاقیہ میں مکمل شرکت کی متقدم شرط ایک ہی ہے: ان کا فرقہ وارانہ انتخابات سے مسلسل تحفظ۔ اُس وقت قائدِ اعظم بھی اس بارہ میں متیقن نہ تھے اور میں بھی جو ہندوستانی ریاستوں کے مندوب اور نمائندہ کی حیثیت سے کام کر رہا تھا، یہی خیال کرتا تھا کہ سر اقبالؒ جو کچھ کہتے ہیں خواہ وہ ماضی میں کتنا ہی اہم کیوں نہ رہا ہو، بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں غالباً بالکل بے محل ہو چکا ہے۔ لیکن سچ پوچھئے تو وہ کس قدر صحیح تھے اور ہم کس قدر غلط! کیونکہ جونہی ۱۹۳۷ء میں وفاقیہ کے پہلے مرحلہ کی شروعات ہوئیں، وہ تمام اندیشے جن کی توضیح اقبال نے ہندوستان کی مسلم اکثریت کے زاویۂ نگاہ سے اس قدر سنجیدگی اور پیغمبرانہ پیش بینی و بصیرت کے ساتھ کی تھی، وہ حرف بحرف درست ثابت ہوئے۔

۱۹۳۷ء میں اقبال بہت علیل ہو چکے تھے، پھر بھی جو اثر انہوں نے قائدِ اعظم پر ۳۸-۳۷ء کے نازک، بحرانی سالوں میں ڈالا وہ ہمیشہ اُن پر شدت سے حاوی رہا اور مجھے آپ کو یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ یہ اقبال ہی تھے جنہوں نے قائدِ اعظم کو یہ تحریک دلائی کہ وہ مسلم لیگ کی تنظیم اس طرح کریں کہ اس کی طاقت کی بنیاد ہندوستان کے اعلیٰ طبقے یعنی خواص کی بجائے عوام پر ہو۔ یہ تبدیلی سر اقبال کے اُس سیاسی فلسفہ سے جس کا پرچار وہ برسوں سے کر رہے تھے، محض ہم آہنگ ہی نہیں بلکہ پوری طرح ہم آہنگ تھی۔

میرے خیال میں ان واقعات کی طرف دوبارہ رجوع کرنا تحصیلِ حاصل ہے۔ کیونکہ سب جانتے ہیں کہ اقبالؒ نے آئندہ اسلامی مملکت کا جو پیغمبرانہ رویا یا تصور سب سے پہلے مسلم لیگ کے الہ آباد سشن منعقدہ ۱۹۳۰ء کے خطبۂ صدارت میں پیش کیا تھا، وہ کیا تھا۔ اُس وقت مسلمانوں کا کل ہند میں اسلامی ہند کا مطالبہ چنداں واضح نہ تھا لیکن اس معرکہ آرا تقریر میں سر اقبالؒ نے اس علاقہ کی ہئیتِ ترکیبی بیان کی جو اب مغربی پاکستان کے نام سے موسوم ہے۔ ابھی اس تصور کو مسلم عوام کے دل و دماغ میں بسا دینے کے لئے بہت کچھ کرنے کی ضرورت تھی لیکن یہ تصور پیدا ہو چکا تھا۔

تاہم یہ سر اقبالؒ کی عظمت کا بیّن ثبوت ہے کہ وہ ہندوستان میں اسلامی مملکت کے تصور اور اس کے جغرافیائی حدود کی توضیح ہی پر مطمئن نہیں ہوئے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر قدم رکھا۔ انہوں نے اُن خصوصیات کی توضیح بھی کی جن کا اس مملکت کو حامل ہونا چاہیئے۔ تاکہ یہ فرد اور اس جماعت میں جس سے وہ وابستہ ہے، وہ تعاون و تعامل پیدا کر سکے جو اقبال جانتے تھے ان دونوں کی انتہائی نشو و نما کے لازم ہے۔ آئیے میں آپ کو اُن آٹھ بنیادی امور کی یاد دلاؤں جو اُنہوں نے ایسے معاشرہ کے لئے لازم قرار دیئے ہیں۔

ان میں سب سے اولی تھی توحید جس کو وہ بنی نوع انسان کی اخوت کے لئے لازمی خیال کرتے تھے۔ دوسرے، پُرخلوص اور والہانہ قیادت۔ تیسرے، ایک ایسا ضابطۂ اخلاق جو معاشرہ کے آدرشوں اور فضاؤں کا آئینہ دار ہو۔ چوتھے، اُس مملکت کا ایک معین جغرافی محل وقوع ہونا چاہیئے۔ اُن تمام سرگرمیوں اور وفاداریوں کا علاقائی مستقر اور مرکز و محور جن کو یہ مملکت وجود میں لائے۔ پانچویں، اس مملکت کا ایک نصب العین ہو یعنی ایک ایسا مقصود جس کی تحصیل کے مملکت اور اس کے شہری پابند ہوں۔ چھٹے، یہ ذرائع فطرت پر قادر ہو جس کے معنی اقبال کے تصور میں یہ تھے کہ اہلِ مغرب کے مشینی و سائنسی کمالات سے استفادہ کیا جائے مگر اس طرح نہیں کہ ان سے مغربی روح کی پیروی لازم آئے کیونکہ انہیں اس سے کئی امور میں اختلاف تھا۔ ساتویں، اس مملکت کو ایک مرکب اجتماعی خودی پیدا کرنی چاہیئے جو بیک وقت اس کے آزاد شہریوں کی ذاتی خودی کی توسیع بھی ہو اور تکمیل بھی۔ آٹھویں اور آخری بات یہ ہے کہ یہ ریاست خواتین کی نشو و نما کے لئے مکمل گنجائش پیدا کرے خواہ وہ بالقوۃ ہو یا بالفعل۔

تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں یہ کہوں گا کہ ان آٹھ خصوصیات کی اہمیت پاکستان کی تاریخ سے بخوبی نمایاں ہے۔ ان کا جب بھی التزام کیا گیا ہے، ملک ان مقاماتِ عروج پر پہنچا اور قائم رہا ہے جن کا تصور اقبال اور قائدِ اعظم نے کیا تھا۔ اور جب ان کو نظر انداز کیا گیا ملک میں تنزل رونما ہوا۔ آج پاکستان میں، جیسا کہ مجھے اور میری اہلیہ کو چند ہفتہ ہوئے دیکھنے کا اتفاق ہوا، ان بنیادی اصولوں کی طرف رجوع کرنے کا عزم بالجزم نظر آتا ہے۔ تاکہ یہ پاکستان کو وہی مثالی چیز بنانے کی طرف پیش قدمی ہو جو قائدِ اعظمؒ اور اقبالؒ کے تصور میں تھی۔ چنانچہ ہم ان اصولوں کا مظاہرہ ان گوناگوں اقدامات میں پاتے ہیں جن کے ذوق و شوق سے پاکستان کی نئی حکومت سرشار ہے۔

ان اصولوں میں جو بات سیاحانِ مغرب کے تخیل کو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ رواداری ہے یعنی یہ عقیدہ کہ پاکستان میں دنیائے مغرب کے ساتھ بھائی چارہ اور دوستی کا پورا پورا امکان ہے۔ جب ہم پاکستان کی تاریخ پر اُس وقت سے نظر ڈالتے ہیں جب کہ یہ ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے وجود میں آیا، تو بعض ادوار سے یہ اندیشہ لاحق ہوتا ہے کہ کہیں اخوت و رواداری کی جگہ یہاں اندھیر گردی کا دور دورہ نہ ہو جائے۔ اس سلسلہ میں بھی دیگر اُمور کی طرح اقبال ہی کا ارشاد آخری اور قطعی ہے ؎

نہیں فردوس مقامِ جدل و قال و اقول ‏ بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت!

ہے بد آموزیٔ اقوام و ملل کام اس کا ‏ اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت!

ان اشعار اور ایسے ہی کئی اور اشعار میں جو اقبال نے کہے ہیں، میں محسوس کرتا ہوں کہ اس عظیم انسان نے پاکستانی معاشرہ کی ہمیشہ کے لئے نہج اور طرح مقرر کر دی ہے۔

آج جب ہم اس کی برسی منانے کے لئے جمع ہوئے ہیں، میرا خیال ہے کہ اگر ہم دنیا پر گہری نظر ڈال کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اس وقت اس کی زندگی سے بھی کہیں زیادہ نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا کے تمام ممالک کو اس سیاسی فلسفہ کی ضرورت ہے جس کا اس نے اپنے حینِ حیات میں پرچار کیا تھا۔

●

میں آپ کی انجمن کا بہت شکر گذار ہوں کہ اس نے مجھے ایک ایسے شخص کو اپنا ناچیز خراجِ عقیدت پیش کرنے کی دعوت دی ہے جس کی دوستی میری اہلیہ اور میرے لئے برسوں سامانِ مسرت رہی اور جس کی شخصی جاذبیت میری چھوٹی سی بچی نے بھی محسوس کی جو پانچ چھ سال کی عمر میں اس کے گھٹنوں پر بیٹھا کرتی تھی اور اب بھی اس خوشی اور مسحور کن کیف کی یاد تازہ کر کے مسرور ہوتی ہے جو وہ ایسے موقعوں پر محسوس کیا کرتی تھی۔

اس وقت میری طرف سے اقبالؒ پر بہ حیثیت فلسفی یا شاعر کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اگرچہ ان دونوں حیثیتوں سے ان کا مقام بہت بلند ہے۔ کیونکہ میں اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں پاتا اور ان حیثیات سے سر محمد اقبالؒ کو کئی اہل الرائے بہت ہی عمدہ خراجِ تحسین ادا کر چکے ہیں۔ اس موقع پر

میں یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ اس شخص کا بحیثیت انسان تھوڑا بہت نقشہ آپ کے سامنے لاؤں جس کی دوستی کا مجھے ستائیس سال شرف حاصل رہا اور میں نے کئی ملاقاتوں میں اس کے متعلق نقوشِ تاثر فراہم کئے تھے۔ یہ ادھورا سا نقشہ بھی میں شاید اس خط کی بنا پر پیش کرسکوں گا جو مجھے اپنے کاغذات میں دستیاب ہوا ہے۔ یہ خط میں نے اگست ۳۴ء میں اپنی بیٹی کو لکھا تھا جس کا میں نے ابھی ابھی تذکرہ کیا ہے۔

میں ہندوستان کافی طویل عرصے کے بعد واپس آیا تھا۔ لاہور اور وہ بھی اگست یعنی گرمیوں کے مہینے میں جس دن میں یہاں پہنچا اور وہ اتوار کا دن تھا، میں نے آتے ہی ڈاکٹر اقبالؒ کو اپنے ساتھ چائے پینے کی دعوت دی۔ اسی کے متعلق میں نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ:

"یہ نہ جانتے ہوئے کہ وہ لاہور میں ہیں یا نہیں، میں نے انہیں ایک رقعہ لکھا کہ وہ آج میرے ہاں تشریف لاکر چائے نوش فرمائیں۔ جب ان کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو میں یہ سمجھا کہ وہ کہیں گئے ہوئے ہیں لہٰذا پیچھے پڑ پھر تو میں یہ بات بھول ہی گیا تھا۔ آج سہ پہر میں اپنے آدھی آستین کی قمیص پہنے ہوئے اسٹینوگرافر کو خط لکھوا ہی رہا تھا کہ ڈاکٹر اقبالؒ برآمدے میں تشریف لے آئے۔ مجھے نہایت خوشی ہوئی۔ وہ مجھے بہت پسند ہیں۔ وہ ساڑھے چار بجے آئے اور ساڑھے سات بجے تک میرے پاس رہے۔ میں تمہیں کیا بتاؤں کہ ہماری گفتگو کس قدر دلچسپ رہی۔ مشرق سے لے کر مغرب، سیاسیات سے لیکر تصوف اور ہٹلر سے لے کر مسولینی سب کو محیط۔"

اس خط میں دو واقعات کا ذکر ہے جن سے وہ ۱۹۳۱ء کے دورۂ یورپ میں دوچار ہوئے تھے۔ ایک اقبال کے قرطبہ جانے سے متعلق ذکر ہے، جیسا کہ میرے دوست آغا محمد اشرف نے ابھی بتایا ہے۔ میں پھر اسی خط سے کچھ سطور پیش کروں گا جن میں اقبالؒ کے بیان کا معاصرانہ تذکرہ ہے۔ یہ خط میں نے اس شام تحریر کیا تھا جبکہ اقبالؒ نے میرے ساتھ وہ بہت پر لطف گفتگو کی تھی۔ اس خط میں لکھا ہے:

"اقبالؒ نے مجھے اپنے قیام ہسپانیہ کی بہت ہی دلچسپ داستان سنائی۔ وہ قرطبہ کی قدیم مسجد کو تشریف لے گئے جو اب کلیسا بن چکی ہے۔ انہوں نے گائیڈ سے کہا کہ وہ وہاں نماز ادا کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ یہ جگہ کبھی ایک مسجد تھی۔ گائیڈ نے کہا پادریوں کو یہ بات ناگوار ہوگی۔ اقبالؒ اس مقام پر جہاں کر بیٹھ گئے جس کو بے حد مقدس سمجھا جاتا تھا۔ جب انہوں نے ایسا کیا تو جھٹ ایک پادری نے پہنچ کر زور و شور سے احتجاج کیا۔ مگر اقبالؒ نے بڑی مضبوطی ایمان کا ثبوت دیا اور پادری کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا۔ اسے بتاؤ کہ ایک دفعہ مکہ میں عیسائیوں کا ایک وفد کوئی التماس لے کر پیغمبرِ اسلام کے پاس مکہ آیا تھا۔ اس کے اراکین کو آنحضرت صلعم کی اپنی مسجد یعنی مسجد نبویؐ میں ٹھہرایا گیا اور جب اُن کی عبادت کا وقت آیا تو وہ متردد تھے کہ انہیں اس کی اجازت دی جائیگی یا نہیں۔ یہ سن کر آنحضرت صلعم نے کہا کہ وہ یقیناً اپنے طور طریق کے مطابق مسجد میں عبادت کرسکتے ہیں۔ اقبالؒ نے کہا اگر عیسائیوں کو پیغمبرِ اسلامؐ نے اپنی ہی مسجد میں عبادت کرنے کی اجازت دی تھی تو انہیں ایک ایسی جگہ اپنے طور پر نماز ادا کرنے کی اجازت کیوں نہیں جو کبھی آخر ایک مسجد ہی تھی! جب وہ یہ باتیں کہہ چکے تو کلیسا کے سارے پادری ان کو دیکھنے آ نکلے اور ایک نے ان کا فوٹو بھی لے لیا۔ اقبالؒ نے ایک گونہ تسلی کے ساتھ کہا کہ غالباً وہ واحد مسلمان ہیں جنہوں نے گذشتہ چار سو سال میں اس مسجد میں نماز ادا کی ہے۔"

اس واقعہ سے اقبالؒ کی استواریٔ ایمان ظاہر ہوتی ہے۔ دوسرا واقعہ مسولینی کے ساتھ ایک نہایت ہی دلچسپ ملاقات پر مشتمل ہے۔ جو چند منٹ جاری رہی اور اقبالؒ نے اس کی کیفیت کچھ ایسے دل پر نقش ہوجانے والے پیرایہ میں پیش کی کہ یہ مجھے اب تک یاد ہے۔ بلکہ یوں کہئے نقش کالحجر ہے۔ اسلئے میں نے اپنے خط میں اس پر کافی وقت صرف کیا۔ میں نے لکھا:

"مسولینی نے ان سے پلیزیو ڈی وینشیا کے ایک عظیم الشان ہال میں ملاقات کی۔ جب وہ اندر داخل ہوئے تو انہوں نے کشادہ ہال کے دوسرے کنارے پر عظمت کے دیوتا مسولینی کو ایک اونچی شہ نشین پر بظاہر کام میں منہمک پایا۔ اس قدر کہ اسے آنکھ اٹھا کر دیکھنے کا موقع ہی نہ ملا کہ اس کی طرف کون آرہا ہے۔ جب سر محمد اقبالؒ اس شہ نشین کے پاس پہنچ گئے تب کہیں مسولینی نے نظر اٹھا کر دیکھا اور ان کی طرف بڑے کریمانہ اور بندہ نوازی کے انداز میں مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ ابتدائی آداب و مراسم کے بعد مسولینی نے کہا "سنا ہے آپ ایک ہفتہ سے اٹلی میں ہیں۔ کیا خیال ہے اس کے بارے میں؟" یہ ایک بڑا خطرناک سوال تھا جس کا بے تکلف جواب کسی ابتدائی حکمتِ عملی کے بغیر ممکن نہ تھا۔ سر اقبالؒ اسقدر نکتہ رس تھے کہ وہ سوال کے اس پہلو کو فوراً سمجھ گئے۔ اسلئے انہوں نے کہا "جناب والا! میرے تاثرات آپ کے لئے کیا معنی رکھ سکتے ہیں جب کہ مجھے جناب کے ارشاد کے مطابق یہاں آئے صرف ایک ہفتہ گذرا ہے"۔ مگر مسولینی نے کہا "میں یہ تاثرات جاننا چاہتا ہوں"۔ چنانچہ اس نے

اصرار کیا اور آخر اقبالؒ نے اپنے آپ کو کافی مضبوط بنیاد پر محسوس کرتے ہوئے کہا مجھ جواب دالا! اگر آپ میرے تاثرات جاننا ہی چاہتے ہیں تو کیا میں سب کچھ صاف صاف کہہ دوں؟ اس کے جواب میں مسولینی لازماً "ہاں" ہی کہہ سکتا تھا۔ تب اقبالؒ نے کہا "میں اطالویوں کے متعلق یہی سمجھتا ہوں کہ وہ ایرانیوں سے بہت ہی ملتے جلتے ہیں۔" اس پر مسولینی ندا چونکا۔ "وہ بڑے ذہین وفطین، خوب رو، فن پرست ہیں، اور اُن کے پیچھے تہذیب و تمدن کی کتنی ہی صدیاں ہیں۔ مگر ـــ" اقبالؒ نے کہا۔ "ان میں کوئی خون نہیں!" اس پر مسولینی کچھ اور چونک کر سراپا توجہ بن گیا ـــ "کوئی خون نہیں؟ کیا مطلب؟" تب مجھے خوب یاد ہے کہ اقبالؒ نے کس طرح اپنا بازو کھول کر دکھایا اور کہا "ان میں یہ سرخ چیز نہیں ہے جس کو خون کہتے ہیں۔ لیکن پھر اقبالؒ نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "ایرانیوں کو ایک فائدہ ہے جو اطالویوں کو حاصل نہیں ـــ اُن کے ارد گرد مضبوط، توانا قومیں ـــ افغان کرد اور ترک آباد ہیں جن سے وہ تازہ خون حاصل کرسکتے ہیں مگر آپ، اطالوی ایسا نہیں کر سکتے۔ اسلئے آپ کمزور ہی رہیں گے۔" "اچھا" مسولینی نے کہا "پھر اطالویوں کو کیا کرنا چاہئے؟" اقبالؒ نے جواب دیا "اور اس وضع کا جواب میرے خیال میں اسی سے مخصوص ہے کہ یورپ سے منہ موڑ کر مشرق کا رخ کرو۔ یورپ کا اخلاق، افسوس ہے، ٹھیک نہیں لیکن مشرق کی ہوا تازہ ہے، اس میں سانس لو۔" بعد میں مسولینی نے اقبالؒ کو خط لکھا اور پوچھا کہ اطالیہ میں بسنے والے مسلمانوں یعنی مسلمان رعایا کی خوشنودی کے لئے ان کے ذہن میں کوئی تجویز ہے؟ اقبالؒ نے دو تجویزیں پیش کیں، ایک یہ کہ روم میں ایک مسجد بنائی جائے کیونکہ اقبال نے یہاں تین سو ایرانی آباد دیکھے ـــ دوسرے، عربی، علماء کی ایک کانفرنس سسلی میں منعقد کی جائے جس کو وہ ایک عرب شہر قرار دیتے تھے۔"

" مسولینی کے متعلق انہوں نے ایک بہت دلچسپ بات بیان کی۔ اور وہ یہ کہ اس کی آنکھیں بڑی عجیب تھیں ـــ ان میں کچھ ایسی بات تھی جن سے اقبالؒ بہت مرعوب ہوئے۔ مگر یہ کہانی یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ کیونکہ جب وہ قصر وینس سے باہر نکلے تو انہوں نے خود کو نصف درجن صحافیوں سے دوچار پایا۔ جو یہ جاننا چاہتے تھے کہ یہ عظیم فلسفیٔ ہندوستان ـــ میں ہندوستان پرانی اصطلاح کے مطابق کہہ رہا ہوں۔ ان کے عظیم ڈوچے کے متعلق کیا رائے رکھتا ہے۔ اور یہاں پھر اقبالؒ نے ان کو ہاتھ بیٹھے پر نہ رکھنے دیا۔ انہوں نے کہا کہ ان کا اس بارہ میں اُن سے کچھ کہنا خلاف مصلحت ہے کیونکہ پوپ اس کو ناپسند کریں گے۔"

" یہ ۱۹۳۱ء کی بات ہے جب گاندھی جی اور ان کی تحریک "ستیہ گرہ" کا بہت چرچا تھا۔ اس پر ایک صحافی نے کہا "اگر آپ نہیں بتائیں گے تو ہم ستیہ گرہ کرکے آپ کو مجبور کریں گے!" تب اقبال نے کچھ نرم پڑتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے آپ کا ڈوچے ایک لوتھر ہے مگر بے انجیل"۔

" اگر تم اس اس پر غور کرو تو یہ بہت گہری بات تھی کیونکہ لوتھر اپنی انجیل کے بغیر کیا ہوتا؟"

یہ دونوں واقعے میں نے خیال کیا آپ کو بتانے کے لائق ہیں۔ کیونکہ یہ اس انسان کی بھی یاد دلاتے ہیں اور اس فلسفی و شاعر کی بھی جس کے متعلق ہم نے آج کی سہ پہر اس قدر پُرلطف باتیں سُنی ہیں۔

آپ یہ بھی جاننا چاہیں گے کہ جب اقبالؒ کی مجھ سے ملاقات ہوئی تو وہ کیسے لگتے تھے۔ میں نے اس کے بارہ میں اپنی بیٹی کو یوں لکھا تھا:

"ڈاکٹر اقبالؒ درمیانے قد کے ہیں۔ عمر میں مجھ سے کچھ سال بڑے ـــ شاید سات سال ـــ چہرہ خوب بآب و رنگ، تیکھے تیکھے گنجان بال، اور چھوٹی چھوٹی مگر تیز آنکھیں ہم روحانی دنیا کے متعلق بہت کچھ باتیں کرتے رہے جس پر ان کو پختہ یقین ہے۔"

یہ باتیں اگست ۱۹۳۴ء میں اقبال کی وفات سے کوئی چار سال پہلے لکھی گئیں، اور اس صحبت میں موت ہی کے متعلق زیادہ گفتگو رہی۔ یہ حصہ میں آپ کو پڑھ کر سنانا مناسب نہیں سمجھتا لیکن اس میں ایک بات قابل ذکر ہے۔ انہوں نے ایک بڑی حیرت انگیز بات کہی اور وہ یہ کہ "موت میں ایک زبردست قوت مضمر ہے۔ کسی شخص کی وفات، کسی زندگی کا خاتمہ، سینکڑوں زندگیوں کو بدل دینے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن کیا موت خود حیات نہیں؟" آج میرے خیال میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ گو اقبالؒ کو فوت ہوئے کئی سال گزر چکے ہیں، پھر بھی وہ ہمارے دلوں اور روحوں میں برابر زندہ ہیں اور میں یہ کہوں گا کہ خصوصاً وہ میرے دل میں ضرور زندہ رہے ہیں جو ستائیس سال ان کے قریب رہا اور تمام عرصہ ان سے برابر محبت کرتا رہا۔

★

بنگلہ تنقید

ڈاکٹر سجاد حسین

مترجمہ: محمد نہال وارث خاں

اُردو ہو یا بنگلہ یا ہماری کوئی اور زبان، ان سب کے مسائل ایک جیسے ہیں۔ ان میں سب سے اہم ہے ادب و فن اور تنقید کا ایک اعلیٰ تصور جو ارباب قلم کو ایک بلند سطح تک پہنچنے میں مدد دے۔ یہ صریحاً عالمگیر ذہنی و ادبی رجحانات کا اثر قبول کرنے اور روایتی اثرات سے آزاد ہونے کی پر زور جد و جہد ہی پر موقوف ہے۔ امید ہے زیر نظر مقالہ اس لحاظ سے خیال افروز ثابت ہوگا۔ (مدیر)

۴۷ء سے آج تک بنگلہ میں جو تنقیدیں لکھی گئی ہیں اُن کا مطالعہ کیا جائے تو اولیں احساس یہ ہوگا کہ ہمارے ملک میں ایسے لوگوں کی بڑی کمی ہے جن کی صلاحیتیں تنقید کے لئے خصوصی طور پر وقف ہوں اور جنہیں اس اعتبار سے پیشہ ور نقاد کہا جا سکتا ہے۔ اس سے میری مراد ایسے لوگ ہیں جو تنقید نگاری کی حیثیت سے اپنے فرائض نہایت سنجیدگی سے ادا کرتے ہیں اور اپنی صلاحیتوں کو ادب اور ادبی مسائل کی باقاعدہ وضاحت کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ مثلاً لسنگ، آئی۔ اے۔ رچرڈز، ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ، بے شک ہمارے ہاں چند حضرات ایسے ہیں جو کبھی کبھار تنقیدیں لکھتے ہیں لیکن انہیں "پیشہ ور" نقاد نہیں کہا جا سکتا۔ ضروری نہیں کہ اس قسم کا نقاد دوسرے نقادوں کے مقابلے میں ادب کا بہتر ناقد ہو لیکن کسی معاشرے میں پیشہ ور نقادوں کی موجودگی اس بات کی علامت ضرور ہے کہ اس میں تنقید نے ایک مخصوص سرگرمی کی حیثیت سے باعزت مقام حاصل کر لیا ہے اور وہ ایک خاص معیار پر قائم ہے۔

ایک ادبی گروہ کی حیثیت سے باقاعدہ نقادوں کی عدم موجودگی کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ ہم ادبی اور غیر ادبی تنقیدوں میں شاید ہی کوئی فرق کر سکتے ہیں۔ حالانکہ یہ بہت ضروری ہے۔ ہم ہر اس شخص کو نقادوں کی فہرست میں شامل کر لیتے ہیں جس نے کبھی ادبی، سماجی، سیاسی یا تاریخی مسائل پر کچھ لکھا ہو۔ بعض کو اصرار ہے کہ اسمٰعیل حسین شیرازی اور واجد علی کو نقاد کہا جائے۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی صحیح معنوں میں "ادبی نقاد" نہیں تھا۔ یہ اور بات ہے کہ بنگلہ نثر کی تاریخ میں دونوں حضرات ایک بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ ممکن ہے اس قسم کی کڑی تقسیم میں کچھ خلا رہ جائیں مثلاً اس قسم کی سخت حد بندی سے ہماری زبان میں تاریخی اور فلسفیانہ تحریریں بالکل نظر نہ آئیں لیکن ہم جب تک ادبی تنقید اور تنقیدی نثر کی دوسری قسموں میں واضح فرق قبول نہیں کرتے۔ اس وقت تک ہمیں اپنی ادبی تنقید کی خوبیوں اور خامیوں کا صحیح شعور نہیں ہو سکتا۔

میرے خیال میں ادبی تنقید کی حدود کے اندر ایک اور حد بندی کی بھی شدید ضرورت ہے جو مشرقی پاکستان میں بالکل مفقود ہے۔ ضروری ہے کہ ہم تبحر علمی اور تنقید میں فرق کریں۔ اور اس بات کو واضح طور پر جان لیں کہ ان دونوں کے امتیازی فرائض کیا ہیں۔ اچھی تنقید نگاری عمدہ علمیت سے مواد اور زندگی حاصل کرتی ہے۔ ایک اچھے نقاد کا صحیح اور دیانت دار عالم ہونا ضروری ہے لیکن اس بات کو تسلیم کرنے کے ساتھ یہ اعتراف بھی ضروری ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں ہم مشرقی پاکستان والے غلطی کرتے نظر آتے ہیں کہ تبحر علمی اور تنقید دونوں ایک چیز نہیں۔ عالم وہ ہے جو مبہم متن کی توضیح، الفاظ و محاورات کی تحقیق اور عبارت کی غلطیوں کو درست کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہے لیکن بنیادی طور پر وہ نقاد نہیں

ہوتا۔ مثال کے طور پر مغرب میں اسکیٹ، پولارڈ، گریگ اور اس کے چیمبرز وغیرہ کو لیجئے جو بنیادی طور پر عالم تصور کئے جاتے ہیں۔ ادب میں ان کی خدمات بے حد قابل قدر ہیں۔ اسکیٹ اور پولارڈ، چوسر کی تصانیف کے زبردست عالم ہیں اور گریگ اور اس کے چیمبرز، شیکسپیر کے عالموں میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ جدید تنقید نگاری ان کی خدمات کو نظر انداز نہیں کر سکتی لیکن جب ہم انگریزی تنقید نگاری کے متعلق سوچتے ہیں تو ہمارے سامنے کولرج، بریڈلے، مارک وان ڈورن یا میتھیسن کے نام آتے ہیں۔ ان لوگوں کا تعلق ادبی مسائل خصوصاً تشریح و تحلیل کے مسائل سے ہے نہ کہ متن کی صحت کی تحقیق و تعین سے۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مشرقی پاکستان میں تنقید نگاری اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک اس بنیادی فرق کو تسلیم نہ کر لیا جائے۔ مثال کے طور پر یہ بات ڈاکٹر شہید اللہ اور منشی عبدالکریم کے لئے یقیناً باعث شرف ہے کہ ان کو عالم اور کتابوں کے شیدائی تسلیم کیا جائے جس میں وہ یقیناً نہایت بلند درجہ رکھتے ہیں۔ اس طرح پروفیسر منصور الدین جیسے شخص کو بھی، جن کی خدمات بنگلہ لوک گیتوں کے سلسلہ میں مشہور ہیں، عالموں میں شمار کرنا چاہیئے۔

ہم ادبی مورخوں اور سوانح نگاروں کو بھی نقاد تسلیم کرتے نظر آتے ہیں۔ اگر ادب کی تاریخ اور سوانحِ عمری لکھنے والے واقعی نقاد ہوتے تو انگریزی اور امریکی ادب کی ایسی تاریخیں جو طلباء کے کام آتی ہیں ان کے مصنف بھی بڑے نقاد ہونے کا دعویٰ کرتے۔ کومپٹن ریکٹ جو ایک مشہور انگریزی کتاب کے مصنف ہیں یا ہڈسن جنہوں نے انگریزی ادب کے مطالعہ کے بارہ میں کتاب لکھی ہے۔ ان دونوں کو نقاد کی حیثیت سے پرکھ کر دیکھئے۔ جس معیار کے مطابق کومپٹن اور ہڈسن کو نقاد تسلیم نہیں کیا جا سکتا اس میں اور ہمارے معیار میں اس قدر واضح فرق ہے کہ اس پر زور دینے کی ضرورت نہیں۔

رہا ان تنقیدوں کا معیار جو ۱۹۴۷ء سے لیکر اب تک لکھی گئی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بیشتر نقادوں کی سب سے بڑی دشواری بنگلہ میں ایسی معیاری تصانیف کا فقدان ہے جن کی روشنی میں موجودہ تحریروں کی قدر و قیمت متعین کی جا سکے۔

جدید بنگلہ ادب کی بیشتر اصناف مغرب سے مستعار ہیں مثلاً ڈراما، ناول، مختصر افسانے اور شاعری میں بیلڈ، سانیٹ اور بلینک ورس وغیرہ۔ یہ سب کی سب ان لوگوں کی کاوشِ فکر کا نتیجہ ہیں جو مغربی نمونوں سے متاثر ہوئے۔ اگر کوئی جدید نقاد ان اصناف کی قدر و قیمت متعین کرنا چاہتا ہے تو اس کا علمی پس منظر وہی ہونا چاہیئے جو ان اصناف کو برتنے والے شعرا کا ہے۔ کسی شخص کا ملٹن سے پوری واقفیت کے بغیر بنگلہ نظم معرا پر بحث کرنا یا ہومر اور ملٹن کی شاعری پر عبور حاصل کئے بغیر کیقباد اور میکائل دت کے بیلڈوں پر تنقید کرنا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح مولیر، شیکسپیر، فیلڈنگ یا فلوبیر کو پڑھے بغیر بنگلہ ڈراموں یا ناولوں پر تنقید ناممکن ہے۔ ٹیگور اور سرت چٹرجی سے بنکم چندر چٹرجی کا موازنہ ہمیں ادب کو سمجھنے میں کوئی مدد نہیں دے سکتا۔

بعض لوگ سنسکرت کی تنقیدِ شعر کو ارسطو کی بوطیقا کا مشرقی نعم البدل سمجھتے ہیں۔ اس میں یہ خیال کارفرما نظر آتا ہے کہ مغربی نمونوں کے بغیر مشرقی ادب پر بحث کی جا سکتی ہے۔ مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ مذکورہ تنقیدِ شعر کی خوبیوں سے انکار نہیں لیکن اس سے نئی اصناف کو سمجھنے میں کوئی مدد نہیں ملتی جو مغرب کی پیداوار ہیں اور جنہیں انیسویں اور بیسویں صدی میں بنگلہ ادب نے اپنایا ہے۔

معیاری تصانیف کی عدم موجودگی سے قطع نظر بنگلہ میں فن تنقید نگاری کے ترقی نہ کرنے کی ایک معاشی وجہ بھی ہے۔ جب کوئی نقاد کسی ادیب پر تنقید کرتا ہے تو اس پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ وہ کسی ہمعصر ادیب کے ذریعۂ معاش کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہا ہے۔ چونکہ کسی کتاب پر تنقیدی اعتراضات اس کے مصنف کی ادبی حیثیت کو خطرے میں ڈال سکتے ہیں، اس لئے یہ شبہ بے جا بھی نہیں۔ ہمارے ہاں تنقید محض تنقید تصور کی جاتی ہے، اسے نقاد کی بدنیتی پر محمول کیا جاتا ہے اور ناقد کو جائز تحقیق کے باب میں اقدار متعین کرنے والے کی بجائے ذاتی دشمن سمجھ لیا جاتا ہے (جیسا کم و بیش دنیا میں ہر کہیں ہوتا ہے) بدقسمتی سے ابھی تک یہ تصور پیدا نہیں ہو سکا کہ بے تعلقی یا غیر جانبداری کے ساتھ ایک دوست کی ادبی کاوشوں پر بھی نظر ڈالی جا سکتی ہے۔ ہماری تنقیدی تحریروں میں جو ذاتی تلخی پائی جاتی ہے اس کی بڑی وجہ یہی ہے۔ اسی بنا پر عموماً

(باقی صفحہ [illegible] پر)

لالۂ کہسار

خوشحال خاں خٹک
مترجمہ: شہاب رفعت

پیشِ نظر ہیں کتنے جہاں — تو ہی نہ دیکھے اے ناداں
کئی زمینیں ایسی ہی — اور فلک بھی بے پایاں
تیرے دل میں سبھی سمائے — عرش سے برتر، اے انساں!
دل کا آئینہ صیقل کر — دیکھ لے تا وہ جانِ جہاں
دیکھ لے گر یہ نظارہ — تجھ سے جدا ہو کب یزداں

★

قاز بھی ہے پردار اور باز — اور ممگران کی پرواز
جیسا قد ویسی پوشاک — جیسی صورت ویسا ناز
چادر عقل کی کاڑھی ہوئی — اور نہ سونے کی پشواز
کشتی اتھلے جل میں چلے — گہرے دریاؤں میں جہاز
موش ہو کتنا ہی تیراک — کب ہو مگر مچھ کا انباز
جنگلی بلے میں یہ تاب — چیتے پر ہو دست دراز

★

کیسی دلکش ہے یہ بہار — اور اس پر یہ بانگ ہزار
اسپ عراقی، برق خرام — ران تلے چنچل رہوار
ہاتھوں پر وہ باز ہی باز — ہر سو بے اندازہ شکار
سب سے بانکا باز آگے — اور عقب میں باز ہزار
کتے شکاری ڈور بندھے — کھلتے ہی جا لیں جو شکار!
ہر صورت تسکین تمام — دل میں صرف خیالِ یار
ایسے شغل پر اے خوشحال — فرصتِ صبح و شام نثار

زیرِ نقاب وہ جانِ جہاں — عاشق سے ہے نازکناں
بال جنہیں کاڑھا ہے ابھی — شانوں پر ہیں آویزاں
جب وہ آنگن میں آئے — ہائے پھر آنگن کا سماں
جانِ عاشق کے درپے — اور غیروں سے خندہ زناں
ڈھنگ ستم کا ڈھونڈ لیا — گھونگٹ کاڑھ کے میں قرباں
اے خوشحال رہے یہ فن — ایسی غزل، ایسے عنواں

★

جب تک مرد ہو بے کردار — کیا اس کی خالی گفتار
گالیاں سن کر جو چپ ہو — ننگِ صفِ مردانِ کار
وہ ہے جری جو بدلہ لے — بدلہ ہے مردوں کا شعار
بس وہ کرم ہے حسنِ کرم — جس کے سبب ہو ننگ نہ عار
مرد ہی کیا ہے جس کو نہ ہو — کوئی بھی پاس عزّ و وقار
مہرہ بھی ہیں زہر بھی ہیں — ایسے لوگ ہیں صورتِ مار
برق و باراں سر تا پا — اُن مردوں پر جان نثار
اپنے کمال میں آپ لگن — نے زر چاہیں نے دینار
مرد کو ہے فکرِ ناموس — عزت کا بس اک معیار
نامردوں کو فخرِ نسب — مرد ورائے بند و حصار
یہ باتیں خوشحال کی دیکھ
لعل و گوہر تار بتار!

★

"اگر اعتبار ہوتا"

(ایک ایکٹ کا ڈرامہ)

آغا ناصر

کردار:-

* درشہوار
* عدنان ملک
* سکینہ ——— درشہوار کی خادمہ
* چمن ——— عدنان ملک کا خادم

وقت : موجودہ

مقام : ایک پارک

*

(منظر کسی شہر کے ایک پرانے پارک کا ایک حصّہ ——— داہنی طرف ایک پتھر کی بنچ خالی پڑی ہے ——— موسم سرما کی چمکیلی خوشگوار صبح ——— درشہوار پارک کے بائیں دروازے سے داخل ہوتی ہے اس کی عمر ساٹھ سال کے قریب ہے لیکن ابھی تک حسین نظر آتی ہے۔ اس کے بال روئی کے گالوں کی طرح سفید ہیں، ضعیفی کے باوجود اس کی آنکھوں میں چمک اور اس کے چہرے پر شادابی کا رنگ نمایاں ہے ——— وہ اپنی نوجوان خادمہ سکینہ کے کاندھے پر ہاتھ رکھے آہستہ آہستہ باغ میں داخل ہوتی ہے۔ دوسرے ہاتھ میں ایک چھڑی ہے جسے وہ سہارے کے طور پر استعمال کرتی ہے)۔

درشہوار: (پھولے ہوئے سانس کے ساتھ) ہا۔ ہا۔ ہم ٹھیک وقت پر آگئے مجھے ڈر تھا کہیں ہماری بنچ گھر نہ گئی ہو۔ کس قدر حسین صبح ہے آج کی :

سکینہ: دھوپ کتنی بھلی معلوم ہو رہی ہے۔

درشہوار: ہاں خصوصاً تمہاری جیسی نوجوان کے لئے (بنچ پر بیٹھ جاتی ہے) آج میں روزانہ سے زیادہ تھک گئی ہوں (سکینہ کی طرف دیکھ کر) اوہ ۔ تم جانا چاہتی ہو۔

سکینہ: جی ۔ نہیں تو مالکن ۔ میں تو ——— وہ ......

درشہوار: گھبراؤ نہیں میں جانتی ہوں تمہیں بچے اچھے لگتے ہیں۔ جاؤ تم پارک کے اس حصہ میں ہو آؤ جہاں آیائیں بچوں کو لیکر آتی ہیں لیکن دیکھو زیادہ دیر نہ کرنا۔

سکینہ: (خوش ہو کر) بہت اچھا مالکن۔

(سکینہ جانے کے لئے مڑتی ہے لیکن درشہوار اسے روک لیتی ہے)

درشہوار: ٹھیرو.....

سکینہ: (مڑکر) جی مالکن ؟

درشہوار: تم وہ دانے بھی ساتھ ہی لئے جا رہی ہو جو میں چڑیوں کو چگانے کے لئے لائی تھی۔

سکینہ: اوہ ۔ معاف کیجئے گا ۔ میں بالکل بھول گئی تھی۔

(سکینہ کپڑے کی ایک چھوٹی سی تھیلی درشہوار کو دیکر چلی جاتی ہے)

درشہوار: (تھیلی کھولتے ہوئے) بس اب آپ ہی آپ سب آجائیں گی۔

(وہ تھیلی سے مٹھی بھر کر دال کے دانے نکالتی ہے اور زمین پر بکھیرنے لگتی ہے۔ قسم قسم کی چڑیاں، جن میں طوطے، کبوتر اور چھوٹی چڑیاں شامل ہیں، چاروں طرف کے درختوں سے اتر کر نیچے آجاتی ہیں اور دانے چگنے لگتی ہیں)۔

درشہوار: یہ مجھے پہچاننے لگی ہیں۔ (وہ بار بار تھیلی میں ہاتھ ڈال کر مٹھیاں بھر کر دانے نکالتی ہے اور بکھیرتی ہے) یہ طوطوں کے لئے ہے۔ اور یہ بڑے بڑے پرندوں کے لئے ہیں اور یہ چھوٹی معصوم چڑیوں کے لئے ——— اور یہ ——— ارے ارے یہ چڑیا کتنی پیاری ہے۔ بالکل ڈرتی نہیں ——— آ۔ میری تھیلی پر بیٹھ کر کھالے۔ آ۔ آ ——— ارے ارے ارے۔ تم دونوں جھگڑنے کیوں لگے۔

والے بہت ہیں۔ کل میں اور زیادہ لاؤں گی ۔۔۔ لے لے۔

آ ۔ جا ۔ ہا ہا ۔

(پارک کے دائیں جانب والے دروازے سے عدنان ملک اپنے نوکر چمن کے کاندھے کا سہارا لئے داخل ہوتا ہے۔ وہ ستر سال سے زیادہ عمر کا آدمی ہے۔ اور اپنی ایک ٹانگ گھسیٹ کر چلتا ہے ۔ چہرے سے بدمزاج قسم کا بڈھا معلوم ہوتا ہے۔)

عدنان ملک: (بڑبڑاتے ہوئے) خوامخواہ ۔ بالکل فضول ۔ وقت کی بربادی ہے اور کیا ۔ وہ قصے کہانیاں سنا کر ایک دوسرے کا وقت برباد کر رہے ہیں۔

چمن : لیکن آپ یہاں بیٹھ سکتے ہیں ملک (درشہوار والی بنچ کی طرف اشارہ کر کے) وہاں اس بنچ پر صرف ایک بڑی بی بیٹھی ہیں آپا۔

(درشہوار اپنی گردن موڑ کر ان کی طرف دیکھتی ہے اور ان کی گفتگو سننے لگتی ہے)۔

عدنان : نہیں نہیں چمن ۔۔۔ میں اپنے لئے ایک تنہا بنچ چاہتا ہوں ۔

چمن : مگر خالی بنچ تو یہاں کوئی بھی نہیں ہے مالک ۔

عدنان: لیکن وہ ادھر کونے والی بنچ میری ہے۔

چمن : مگر اس وقت تو اس پر وہ تین مولوی قسم کے لوگ بیٹھے ہیں مالک۔

عدنان : خوامخواہ۔ بالکل فضول ۔۔۔ وہاں بیٹھے قصے کہانیاں سنا رہے ہیں ۔ ہونہہ ۔ وہ کتنی دیر میں اٹھیں گے وہاں سے۔

چمن : میں کیا کہہ سکتا ہوں مالک !

عدنان : اونہہ ۔ جیسے بنچ خرید لی ہے انہوں نے۔ جم کر ہی رہ گئے ہیں کم بخت ۔۔۔ چلو ۔ چلو یہاں سے چمن۔

(وہ دونوں دانے چگتی ہوئی چڑیوں کے قریب سے گزرتے ہیں)

درشہوار : (گھبرا کر) ذرا دیکھ کر ۔ ذرا دیکھ کر۔

عدنان : (مڑ کر) کیا آپ مجھ سے کچھ کہہ رہی ہیں محترمہ ؟

درشہوار : جی ہاں ۔ آپ ہی سے

عدنان : کیا چاہتی ہیں آپ ؟

درشہوار : آپ نے چڑیوں کو اڑا دیا ۔ وہ بیچاری دانہ چگ رہی تھیں ۔

عدنان : ہونہہ ۔۔۔ میں چڑیوں کا پابند نہیں ہوں ۔

درشہوار : لیکن میں تو ہوں ۔۔۔ !

عدنان : تو اس سے کیا ہوتا ہے ۔ یہ پبلک پارک ہے ۔

درشہوار : تو پھر آپ یہ شکایت کیوں کر رہے تھے کہ مولویوں نے آپ کی بنچ پر قبضہ کر لیا ہے ۔

عدنان : محترمہ آپ سے تعارف تک نہیں ہے ۔ آپ کو مجھ سے مخاطب ہونے کا کوئی حق نہیں ہے ۔۔۔ جی ۔۔۔ چمن ۔ آؤ ۔

(دونوں چلے جاتے ہیں)

درشہوار : بڈھا کس قدر بدمزاج ہے ۔ آخر بعض لوگ بوڑھے ہو کر اس قدر چڑچڑے کیوں ہو جاتے ہیں ۔ کتنا مزہ آئے اگر اسے آج پورے پارک میں کوئی بنچ ہی خالی نہ ملے ۔ ایسے لوگوں کا یہی علاج ہے ۔ اوہ ۔ وہ پھر آ رہا ہے ۔۔۔ کس قدر دھول اڑاتا ہے چلتے ہوئے ۔ جیسے کچی سڑک پہ گدھا گاڑی ۔

(عدنان ملک اپنے نوکر کے ہمراہ پھر داخل ہوتا ہے)

عدنان : خوامخواہ ۔ بیہودہ بات ہے ۔ منتظمین کو موسم سرما میں زیادہ بنچوں کا انتظام کرنا چاہئے کس قدر واہیات بات ہے ۔۔۔ خیر چمن میاں ۔ میرا خیال ہے میں اسی بنچ پہ بیٹھا جاتا ہوں ، جس پر یہ ضعیف خاتون بیٹھی ہیں ۔

(وہ بڑبڑاتا ہوا درشہوار والی بنچ کے آخری کنارے پہ بیٹھ جاتا ہے ۔ چند لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا ہے پھر اس کی چھتری کو چھوتے ہوئے آہستہ سے کہتا ہے آداب عرض ۔

درشہوار : تو آپ پھر آ گئے ۔۔۔ ؟

عدنان : میں پھر دہراؤں گا محترمہ کہ ہم ایک دوسرے سے متعارف نہیں ہیں ۔

درشہوار : میں آپ کے آداب کا جواب دے رہی ہوں ۔

عدنان : سلام کے جواب میں سلام کیا جاتا ہے ۔

درشہوار : آپ کو میری بنچ پر بیٹھنے کی اجازت لینی چاہئے تھی ۔

عدنان : یہ بنچ اس پارک کی ہے آپ کی نہیں ۔۔۔ اور یہ ایک پبلک پارک ہے ۔

درشہوار : تو آپ نے اس بنچ کو جس پر مولوی صاحبان بیٹھے تھے اپنا کیوں کہا تھا ؟

عدنان : بہت خوب ۔ خوب ۔ میں لاجواب ہوں ۔۔۔ (بڑبڑاتے ہوئے) اتنی ضعیف العمر عورتوں کو تو گھر میں بیٹھنا چاہئے نہ کہ ......

درشہوار : (بڑبڑانا بند کر دیجئے میں یہاں سے اس طرح جانے والی نہیں ہوں

عدنان: (جیب سے رومال نکال کر اپنے جوتوں کی گرد صاف کرتا ہے)۔
ابھی اس پارک کی سڑکوں پہ پانی کے چھڑکاؤ کی بہت ضرورت ہے۔
کس قدر گرد ہے۔

درشہوار: واہ وا کیا بات ہے ـــ رومال سے جوتے صاف کرنا۔

عدنان: کیا کہا؟

درشہوار: (مسکراتے ہوئے) کیا آپ منہ پونچھنے کے لئے جوتے کا برش استعمال کرتے ہیں؟

عدنان: آپ کو مجھ پر تنقید کرنے کا کیا حق ہے؟

درشہوار: اس وقت ایک پڑوسی کی حیثیت سے یہ میرا فرض ہے ـــ

عدنان: (نوکر سے) چمن۔ میری کتاب دو۔ اب زیادہ دیر یہ حماقت میں برداشت نہیں کرسکتا۔

درشہوار: معاف کیجئے خاتون۔ مجھے واقعی افسوس ہے۔ لیکن دیکھئے نا اگر آپ ایسی باتوں میں دخل اندازی نہ کریں جن سے آپ کا کوئی واسطہ نہیں ہے تو ـــ کوئی حرج تو نہیں ہے محترمہ!

درشہوار: میں عام طور پر وہ سب کہہ دیتی ہوں جو سوچتی ہوں۔

عدنان: اچھا تو پھر کہتی رہیئے ـــ چمن لاؤ میری کتاب دو ـــ

چمن: لیجئے مالک۔

(عدنان کتاب لے کر کھول لیتا ہے۔ پھر جیب سے چمڑے کا ایک بٹوا نکالتا ہے اور اپنی آنکھوں سے چشمہ اتار کر چمڑے کے بٹوے میں سے پڑھنے کا چھوٹا شیشہ نکال کر چشمہ کے شیشوں پہ لگاتا ہے ـــ اور عینک آنکھوں پر لگا لیتا ہے)

درشہوار: میں سمجھی تھی کہ ابھی آپ خورد بین بھی لگائیں گے۔

عدنان: کیا کہا ـــ! پھر وہی ـــ

درشہوار: معلوم ہوتا ہے آپ کی نگاہ بالکل کمزور ہے۔

عدنان: ہو یا نہ ہو ـــ آپ سے پھر بھی ہزار درجہ اچھی ہے۔

درشہوار: جی بجا ارشاد فرمایا۔

عدنان: اس کی گواہی وہ لاتعداد خرگوش اور ہرن دے سکتے ہیں جو میری گولی کا نشانہ بن چکے ہیں۔

درشہوار: اچھا۔ تو کیا آپ شکار سے بھی شوق فرماتے ہیں۔

عدنان: ہاں میں بڑا اچھا شکاری تھا اور اب بھی کبھی کبھی میں شکار پہ جاتا ہوں ـــ وقت گذاری کے لئے۔

درشہوار: وقت گزارنے کے لئے ـــ ؟؟ ہاں ٹھیک ہی ہے، وقت گزاری کے سوا اب اور آپ کر ہی کیا سکتے ہیں۔

عدنان: کیا سمجھتی ہیں آپ ـــ آپ اُس چیتے کی کھال دیکھ سکتی ہیں جو ۳۵ سال پہلے میں نے مارا تھا۔ ابھی تک اس کی کھال میری بیٹھک میں لٹکی ہوئی ہے۔

درشہوار: اور میں آپ کو اپنے گھر میں دس چیتوں کی کھالیں دکھا سکتی ہوں ـــ واہ وا صاحب کیا دلیل ہے

عدنان: اچھا محترمہ۔ آپ مجھے معاف فرمائیں۔ میں ذرا کچھ پڑھنا چاہتا تھا۔

درشہوار: بہتر ہے۔ آپ پڑھئے نا کس نے منع کب کیا ہے۔

عدنان: شکریہ۔ (عدنان جیب سے بٹوہ نکال کر پان کھاتا ہے) کیا آپ بھی شوق فرمائیں گی؟

درشہوار: شکریہ (وہ ایک پان لے لیتی ہے)

عدنان: میں مرادآبادی تمباکو کھاتا ہوں۔

درشہوار: اور میں بھی (دونوں ہنستے ہیں) کیا خوب اتفاق ہے!

عدنان: لیجئے۔

درشہوار: شکریہ ـــ (خود سے) تو پان نے ہم دونوں کی دوستی کرادی۔

عدنان: آپ برا تو مانیں گی اگر میں بلند آواز میں کتاب پڑھوں۔

درشہوار: قطعی نہیں ـــ آپ کا جیسے جی چاہے آپ پڑھ سکتے ہیں۔

عدنان: (پڑھتا ہے) "تب تو مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہئے ہے نا؟ ساہوکار کی بیوی نے کہا "جلد ہی ہم ایک دوسرے کے بے تکلف دوست بن جائیں گے"۔ ماستیناک بولا "اگرچہ آپ کی دوستی میرے لئے نعمت غیر مترقبہ ہوگی لیکن اس دوستی سے جی ڈرتا ہے" ـــ یہ بالزاک کے ناول "پیر گودیو" کا اقتباس ہے جسے نسیمہ جہانی نے ترجمہ کیا ہے۔ سن رہی ہیں نا آپ ـــ؟

درشہوار: غالباً۔

عدنان: (پڑھتا ہے) "جن لوگوں کو اس قسم کی گفتگو کا پہلے پہل موقعہ ملا ہے انہیں اس قسم کے مہمل فقرے گھڑے گھڑائے مل جاتے ہیں۔ لیکن عورتوں کو ہمیشہ بہت پسند آتے ہیں ـــ"

درشہوار: (ہنسنے لگتی ہے)

عدنان: اس میں کچھ نظمیں بھی ہیں (وقفہ)

میرے پہلو بہ پہلو جب وہ چلتی تھی گلستاں میں
فراز آسماں پر کہکشاں حیرت سے تکتی تھی

درشہوار: آپ کو اتنی ساری عینکوں اور شیشوں کی مدد سے پڑھتے ہوئے دیکھ کر مجھے بہت ہی عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔

عدنان: تو کیا آپ بغیر عینک کے پڑھ سکتی ہیں؟

درشہوار: یقیناً۔

عدنان: آپ کی عمر کیا ہے؟ —آپ یقیناً مذاق کر رہی ہیں۔

درشہوار: لائیے کتاب دیجئے مجھے (وہ کتاب درشہوار کے ہاتھ میں دیتا ہے)
(وہ پڑھتی ہے)

مرے پہلو بہ پہلو جب وہ چلتی تھی گلستاں میں
فراز آسماں پر کہکشاں حیرت سے تکتی تھی
محبت جب چمک اٹھتی تھی اس کی چشم خنداں میں
خمستان فلک پر نور کی صہبا چھلکتی تھی

عدنان: کمال ہے۔ آپ کی نگاہ واقعی بہت اچھی ہے۔

درشہوار: (خود سے) یہ نظم مجھے زبانی یاد تھی۔

عدنان: مجھے شاعری سے بہت دلچسپی ہے۔ نوجوانی میں میں نے بھی چند ایک نظمیں کہی تھیں۔

درشہوار: کس قسم کی نظمیں؟

عدنان: ہر قسم کی — چند ایک امریکہ کے سفر کے دوران کہی تھیں؛ وہ بہت اچھی تھیں۔

درشہوار: کیا؟ —— تو کیا آپ امریکہ بھی جا چکے ہیں؟

عدنان: کئی مرتبہ —— پہلی بار جب میں امریکہ گیا تو میری عمر صرف چھ سال کی تھی۔

درشہوار: تب تو غالباً آپ کولمبس کے ساتھ گئے ہوں گے۔

عدنان: (بے اختیار ہنستا ہے) خوب، بہت خوب! — اور چند نظمیں میں نے سرتاج پور میں کہی تھیں۔ سرتاج پور ایک بہت ہی پُرفضا مقام ہے۔ دریائے جہلم کے کنارے ایک بہت ہی حسین بستی۔ لہلہاتے ہوئے کھیتوں اور سبزہ زاروں سے گھرا ہوا۔ آہ، کتنی میٹھی یاد ہے اس بستی کی۔ سرتاج پور میں وہیں کا رہنے والا ہوں۔

درشہوار: واقعی؟

عدنان: ہاں میں وہیں پیدا ہوا۔ وہیں بڑھا پلا۔ کیا آپ نے کبھی وہ بستی دیکھی ہے؟

درشہوار: کیوں نہیں۔ میں کتنی دفعہ یہاں گئی ہوں۔ سرتاج پور سے دو میل دور مغرب میں دریائے جہلم کے عین کنارے ایک بہت بڑی حویلی تھی۔ جو شاید آج بھی وہاں ہو۔ اس حویلی میں میری بہت سی یادیں دفن ہیں۔ بہت ہی خوبصورت جگہ تھی۔ اس کے چاروں طرف شہتوت اور کھجوروں کے درخت تھے۔ بڑا پیارا سا نام تھا اس کا۔ دیکھئے میں بھول گئی۔ بھلا سا نام تھا۔ ہاں یاد آیا۔ "راج محل"

عدنان: (جذباتی سا ہو کر)۔ راج محل؟؟

درشہوار: کیوں؟ کیا یہ نام آپ کا جانا پہچانا ہے؟

عدنان: ہاں بہت زیادہ جانا پہچانا۔ راج محل۔ دریائے جہلم کے کنارے۔ سرتاج پور سے ۲ میل۔ آہ۔ آج سے چالیس سال پہلے اس راج محل میں ایک لڑکی رہتی تھی۔ بہت ہی حسین۔ بے حد خوبصورت۔ میں نے زندگی میں اس سے خوبصورت لڑکی کبھی نہیں دیکھی۔ کیا نام تھا اس کا—؟ ہاں۔ شہوار۔ شہوار۔ درشہوار!

درشہوار: (جذباتی ہو کر) درشہوار؟

عدنان: ہاں (وہ دونوں ایک دوسرے کو عجیب عجیب نگاہوں سے دیکھتے ہیں)

درشہوار: (خود پر قابو پاتے ہوئے) کچھ بھی نہیں۔ مجھے اپنی پیاری سہیلی کا خیال آ گیا۔ درشہوار۔ وہ میری سہیلی تھی۔

عدنان: اوہ کتنی عجیب بات ہے!

درشہوار: اسے لوگ راج محل کا کنول کہہ کر پکارتے تھے۔

عدنان: ہاں۔ "راج کنول"۔ وہ سارے علاقے میں اسی نام سے مشہور تھی۔ آہ۔ میں آج بھی۔ اس کے تصور کو حقیقت سمجھ کر دیکھ سکتا ہوں۔ دریا کی طرف والے دریچہ میں جہاں سرخ گلابوں کی جھاڑیاں تھیں۔ ہر صبح وہ اس دریچہ میں کھڑے ہو کر دریا کا نظارہ کیا کرتی تھی۔ آپ کو یاد ہے؟

درشہوار: ہاں اچھی طرح۔ وہ اس کا کمرہ تھا۔

عدنان:۔ ہر صبح وہ اس دریچہ میں کھڑی ہوتی تھی۔

درشہوار:۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) ہاں مجھے یاد ہے۔

عدنان:۔ وہ حسن کی شہزادی تھی۔ گلاب کی طرح شاداب۔ اس کی آنکھیں بالکل سیاہ تھیں اور بال بہت لانبے تھے۔ اس کے چہرے پر ہر وقت ایک عجیب سی چمک رہتی تھی — یوں لگتا تھا جیسے۔ وہ کوئی آسمانی روح ہے جو بھول کر اس دنیا میں آنکلی ہے، وہ ایک خواب تھی۔

درشہوار:۔ (خود سے) اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ وہ خواب اس وقت تمہارے برابر ہی بیٹھا ہوا ہے تو تمہیں اس خواب کی تعبیر کا بھی اندازہ ہو جائے۔ (بلند آواز میں) لیکن وہ بہت بدقسمت تھی۔ اس کی محبت کی کہانی بڑی پُر درد ہے۔

عدنان:۔ (آہ بھر کر) بہت ہی پُر درد؟

(دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں)

درشہوار:۔ کیا آپ کو معلوم ہے؟

عدنان:۔ ہاں۔

درشہوار:۔ (خود سے) قسمت کے کیا کرشمے ہیں۔ یہ آدمی میرا عاشق ہے۔

عدنان:۔ اس کی کہانی کسے معلوم نہیں۔ اور پھر اس کا عاشق تو میرا خالہ زاد بھائی تھا۔ وہ مجھے اپنا دوست سمجھتا تھا اور اس لئے ہمارے درمیان کبھی کوئی بات راز نہیں رہی۔

درشہوار:۔ اوہ۔ میری سہیلی نے اپنے ایک خط میں اپنی محبت کی کہانی لکھ کر بھیجی تھی مجھے۔ تمہارا بھائی ہر روز علی الصبح گھوڑے پر سوار اس راستے سے گذرتا تھا جس طرف درشہوار کا دریچہ تھا۔ وہ دریچہ میں کھڑی ہوتی تھی اور گذرتے گذرتے تازہ گلاب کے پھولوں کا ایک گلدستہ بالکونی کی طرف اچھال دیتا اور میری سہیلی دریچے سے ہاتھ بڑھا کر اسے دبوچ لیا کرتی۔

عدنان:۔ اور دوپہر ڈھلے جب وہ شہسوار اسی راستے سے واپس ہوتا تو آپ کی سہیلی سفید پھولوں کا ایک ہار اپنے دریچہ سے نیچے پھینکتی اور میرا بھائی اسے دبوچ لیتا۔ کیوں — ؟ ایسا ہی تھا نا؟؟

درشہوار:۔ ہاں۔ مگر میری بدقسمت سہیلی کے والدین اس کی شادی کسی تاجر سے کرنا چاہتے تھے جسے وہ بالکل پسند نہ کرتی تھی۔

عدنان:۔ اور ایک رات جب میرا بھائی اس کی بالکونی کے نیچے گلابوں کی جھاڑیوں میں اس واسطے چھپا ہوا تھا کہ چاندنی رات میں اسے گاتے ہوئے سنے۔ تو وہی تاجر جو اس کا منگیتر تھا جانے کہاں سے آگیا تھا۔

درشہوار:۔ اور اس نے تمہارے بھائی کو برا بھلا کہا تھا۔

عدنان:۔ اور میرے بھائی کو اس کی اس حرکت پر سخت غصہ آیا تھا

درشہوار:۔ اور پھر ان دونوں میں باقاعدہ لڑائی ہوئی تھی۔

عدنان:۔ اور میرے بھائی نے اس کے منگیتر کو قتل کر دیا تھا، پھر گرفتاری کے ڈر سے میرا بھائی دو تین روز گاؤں ہی میں چھپتا پھرا تھا اور پھر کسی نامعلوم مقام کو بھاگ گیا تھا۔

درشہوار:۔ معلوم ہوتا ہے آپ کو یہ کہانی اچھی طرح معلوم ہے۔

عدنان:۔ اور میرا خیال ہے آپ کو بھی — ؟

درشہوار:۔ میں نے کہا نا میری سہیلی نے سارے حالات مجھے لکھے تھے۔

عدنان:۔ اور میرے بھائی نے مجھے بتائے تھے (خود سے) یہ عورت یقیناً درشہوار ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ قسمت نے آج ہمیں اک بار پھر ملا دیا ہے۔

درشہوار:۔ (خود سے) یہ مجھے پہچان نہیں سکا ہے۔ یا پھر آخر میں اسے کیوں بتاؤں — ! اس کے ماضی کی حسین یادوں کے طلسم کو اسی طرح قائم رہنا چاہیئے۔

عدنان:۔ (خود سے) اس بیچاری کو کیا معلوم کہ وہ اس وقت اپنے محبوب سے باتیں کر رہی ہے۔ یہ جان کیسے سکتی ہے؟۔ میں اسے کبھی نہیں بتاؤں گا۔

درشہوار:۔ اور کیا وہ آپ ہی تھے جس نے اپنے خالہ زاد بھائی کو درشہوار کو بھول جانے کا مشورہ دیا تھا؟

عدنان:۔ یہ کیسے — ؟ میرا بھائی اسے کبھی بھی نہ بھلا سکا — ایک لمحے کے لئے بھی نہیں۔

درشہوار:۔ لیکن میں کس طرح یقین کر لوں؟

عدنان:۔ میں بتاتا ہوں۔ کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ سرتاج پور سے فرار ہونے کے بعد اس نے میرے گھر میں پناہ لی —

چند دن وہاں گزارنے کے بعد جھانسی چلا گیا اور پھر جھانسی سے شیلانگ کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس عرصہ میں اس نے درشہوار کو بہت سے خطوط لکھے لیکن اس نے ایک کا بھی جواب نہ دیا۔ شاید اس کے والدین نے وہ خط راستے ہی میں روک دیئے ہوں آخر عدنان ملک کو یقین ہوگیا کہ اب وہ اس سے کبھی نہ مل سکے گا۔ ناامید اور مایوس ہوکر اس نے فوج میں نوکری کرلی اور افریقہ کے محاذ پہ چلا گیا۔ جہاں وہ بہادری کے ساتھ لڑتا ہوا مارا گیا۔ کہتے ہیں مرتے وقت بھی اس کے ہونٹوں پر صرف ایک ہی نام تھا۔ درشہوار۔ درشہوار۔ درشہوار!

درشہوار۔ (خود سے) کس قدر عالیشان جھوٹ ہے۔

عدنان :۔ (خود سے) میں خود کو اس سے زیادہ بہادری کے ساتھ نہیں مار سکتا تھا۔

درشہوار۔ آپ کو اس کی موت کا سخت رنج ہوا ہوگا!

عدنان :۔ بے شک۔ وہ مجھے اپنی جان کی طرح عزیز تھا۔ اور پھر میں یہ بھی سوچتا تھا (ٹھنڈی سانس بھر کر) کہ درشہوار اس کے حالات اور موت سے بے خبر اپنے باغیچہ میں تتلیاں پکڑتی پھرتی ہوگی، ویسی ہی شوخی اور بے فکری کے ساتھ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

درشہوار۔ نہیں یہ غلط ہے۔

عدنان :۔ عام طور پر عورتیں ایسا ہی کرتی ہیں۔

درشہوار۔ نہیں۔ درشہوار عام عورتوں سے بہت مختلف تھی۔ میری سہیلی نے دنوں۔ ہفتوں اور سالوں عدنان کے خط کا انتظار کیا۔ لیکن اس کے پاس کوئی خط نہ آیا اور آخر ایک شام سورج غروب ہونے کے فوراً بعد جب آسمان پر پہلا ستارہ طلوع ہوا تو درشہوار اپنے گھر سے نکل کر دریا کی طرف روانہ ہوئی۔ بس اب وہی دریا تو اس کا محبوب تھا وہ دور تک اس راستہ پر چلتی گئی جس پر اس کا محبوب گھوڑے پر سوار گزرا کرتا تھا۔ آخر بہت دور جاکر وہ رک گئی یہاں دریا کا پاٹ بہت چوڑا تھا۔ وہ دیر تک کنارے پر بیٹھی دوڑتی شور کرتی موجوں کو دیکھتی رہی۔

اس نے ریت پر اپنی انگلی سے اپنے محبوب کا نام لکھا: عدنان عدنان۔ عدنان ملک۔ اور پھر وہ قریب کے ایک ٹیلے پر چڑھ گئی۔ اس کی نگاہیں افق پر لگی ہوئی تھیں۔ دور کھجوروں کے جھنڈ کی آڑ سے آخری تاریخوں کا چاند جھانک رہا تھا۔ دریا زخمی شیر کی طرح چنگھاڑ رہا تھا، اور اس کے بعد۔ اس کے بعد۔ کیا میں بتاؤں کیا ہوا؟

عدنان :۔ بس کرو۔ بس کرو۔ خدا کی پناہ!

درشہوار:۔ اس مچھیرے نے جو اس کی لاش دریا سے نکال کر لایا تھا بتایا کہ ریت میں عدنان کا نام موجوں کی روانی کے باوجود اسی طرح چمک رہا تھا جیسا اس نے لکھا تھا (خود سے) تم مجھ سے جیت نہیں سکتے۔ میری موت تمہاری موت کی کہانی سے کہیں زیادہ دلدوز اور دردانگیز ہے۔

عدنان :۔ (خود سے) یہ مجھ سے زیادہ کامیاب جھوٹ بولنا جانتی ہے۔

درشہوار:۔ (آہ بھر کر) آہ بیچاری درشہوار!

عدنان :۔ (آہ بھر کر) آہ بیچارہ عدنان ملک!

درشہوار:۔ (خود سے) میں اسے ہرگز نہیں بتاؤں گی کہ اس کے فرار ہونے کے چھ مہینے بعد ہی میں نے شادی کرلی تھی۔

عدنان :۔ (خود سے) میں اسے ہرگز نہیں بتاؤں گا کہ سرتاج پور سے بھاگ کر میں نے تھیٹر میں ملازمت کرلی تھی اور نہایت عیش و عشرت کی زندگی گزارنے لگا تھا۔

درشہوار:۔ قسمت بھی کیسے عجیب عجیب کھیل ہمارے ساتھ کھیلتی ہے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ میں اور تم دو اجنبی، جو اتفاقیہ طور پر ایک دوسرے سے مل گئے ہیں، چند ہی لمحوں بعد اس طرح گفتگو کریں گے جیسے ہم پرانے دوست ہوں۔

عدنان :۔ بڑی عجیب سی بات ہے واقعی۔ اور پھر یہ کہ ہماری ملاقات کا آغاز جھگڑے سے ہوا تھا۔

درشہوار:۔ آپ نے چڑیوں کو جو اڑا دیا تھا۔

عدنان :۔ ہاں۔ میں اس وقت خراب موڈ میں تھا۔

درشہوار:۔ ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے دیر سے پہلے سے، کیا آپ کل بھی آئیں گے؟

(باقی صفحہ ۔۔۔ پر)

ماہ نو، کراچی، جولائی ۱۹۵۹ء

افسانہ :

کالی اُنگلی

انور ممتاز

ساری دنیا میں ایک پیرس ہے اور پیرس میں ایک شانزالیزے اور شانزالیزے میں سب کچھ ہے۔ پھر میں کسے ڈھونڈ رہا ہوں؟ مجھے کس کی تلاش ہے؟

اس وے سائڈ کلفے کی دیواریں پلاسٹک کی بنی ہوئی ہیں۔ ان میں سے شانزالیزے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نظر آرہا ہے۔ خوبصورت کاریں چمکدار سڑک پر تیزی سے گزر رہی ہیں۔ ملک ملک کے سیاح اپنے کندھوں سے کیمرے لٹکائے حسین عورتوں کے بازوؤں میں بازو ڈالے ہشاش بشاش ٹہلتے پھر رہے ہیں۔ حسین عورتوں کے حسین لباسوں میں حسین جسم نظر آرہے ہیں۔ شانزالیزے ایک دلہن کی سج دھج کے ساتھ میرے سامنے ہے۔ پھر میں کیوں بے تاب ہوں؟ میں کیا دیکھنا چاہتا ہوں؟

اور اگر اس وے سائڈ کلفے کی پلاسٹک کی دیواروں میں سے میں کچھ نہیں دیکھ سکتا۔ تو یہاں کیوں بیٹھا ہوں؟ میں کتنا بے وقوف ہوں۔ اور میرے پاس سیّاحوں کے لئے انٹروڈکشن لیٹر ہے۔ میں اس کو ڈھونڈنے کے لئے کیوں نہیں چلا جاتا؟ آج صبح جب میں ایک بک سٹال سے پیرس کا ہینڈ بک خرید رہا تھا، تو ایک نیلی آنکھوں والی دلفریب عورت نے مجھے کہا تھا "میں آپ کے لئے گائیڈ بک سے زیادہ مفید ثابت ہوں گی۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلئے۔" میں نے اُسے "نو تھینک یو" کیوں کہا۔ وہ میرے لئے یقیناً گائیڈ بک سے زیادہ مفید ثابت ہوتی، اور میں اس وے سائڈ کلفے کے شور و غل میں تنہائی محسوس نہ کرتا۔

میں بہت دیر سے اس میز پر تنہا بیٹھا ہوں۔ کتنی دیر تک اس میز کے ارد گرد پڑی ہوئی تین خالی کرسیاں میری غمگسار بنی رہیں۔ اب دو کرسیاں کافے کے دوسرے گاہکوں نے میری اجازت سے لے لی ہیں۔ اب میرا تنہائی کا احساس زیادہ گہرا ہو گیا ہے۔ میرے دو خاموش دوست مجھ سے جدا ہو گئے ہیں۔ اب صرف ایک خالی کرسی میرے سامنے سے اٹھا کر کیوں نہیں لے جاتا؟

او میرے خدا! میں سمجھ گیا۔ اس کرسی پر کوئی نہیں بیٹھے گا۔ میں سفید قوموں کی دنیا میں ہوں۔ میں کالی قوم کا فرد ہوں۔ سفید قومیں ترقی یافتہ ہیں، کالی قومیں پسماندہ۔ سفید قومیں حاکم ہیں، کالی قومیں غلام۔ یہ کرسی خالی رہے گی۔ اس کرسی پر کوئی نہیں بیٹھے گا۔

اے میرے خدا! اس کرسی پر کوئی سفید قوم کا نمائندہ نہ بیٹھے۔ سفید قوموں کے نمائندے سیاہ قوموں کے نمائندوں سے بہتر نہیں ہیں۔ سیاہ قوموں کے نمائندے سفید قوموں کے نمائندوں سے بہتر انسان ہیں۔ سفید قوموں کے نمائندے اپنے وطن کی محبت کے ثبوت میں ہیروشیما پر ایٹم بم پھینک دیتے ہیں، سیاہ قوموں کے نمائندے اپنے وطن کی محبت میں اپنے خون کا آخری قطرہ بھی پیش کر دیتے ہیں۔ اے میرے خدا! اس خالی کرسی پر کوئی سیاہ فام انسان آکر بیٹھے۔ مجھے کسی کالی قوم کے فرد کی تلاش ہے۔ میں شانزالیزے کی دلکش فضا میں کسی کالے بدصورت انسان کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ مجھے وے سائڈ کافے کی پلاسٹک کی دیواروں میں سے سب کچھ نظر آتا ہے، لیکن کوئی کالا آدمی نظر نہیں آتا۔

کوئی الجیریا کا کالا باشندہ میرے سامنے بیٹھا ہو تو میں اُسے کہوں: "اپنے وطن پر اپنے خون کا آخری قطرہ بھی قربان کر دو۔ اپنے وطن کے لئے خود مٹنا اپنے وطن کے لئے دوسروں کو مٹانے سے بہتر ہے۔ مٹ جاؤ، اپنے وطن کی آزادی پر قربان ہو جاؤ۔"

کوئی میرا سیاہ فام ہم وطن اس کرسی پر بیٹھا ہو تو میں اسے ایک خوش خبری سناؤں۔ میں اسے بتاؤں کہ پاکستان گیارہ سال کی صبر آزما مدت کے بعد سیاستدانوں کے خود غرض پنجوں سے آزاد ہو گیا ہے، وزارتوں اور اسمبلیوں کو توڑ دیا گیا ہے، ملک میں مارشل لا کا نفاذ ہو گیا ہے اور تمام ملک

میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی ہے۔
کاش میرے سامنے کوئی کالا آدمی بیٹھا ہو!

یکایک ایک کالی انگلی میری نظروں سے ٹکرائی۔ کالی انگلی خالی کرسی کی بیک پر نمودار ہوئی، پھر اُس کے پیچھے خوبصورت سیاہ لباس میں ملبوس ایک خوبصورت سفید فام عورت نمودار ہوئی اور اس نے کالی انگلی سے کرسی کی طرف اشارہ کر کے مجھے کہا:
"کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟"
میں اُس کو غور سے دیکھنے لگا۔ سفید عورت! سیاہ لباس! کالی انگلی! یا خدا اب کیا کروں!
میں نے کہا:
"تشریف رکھئے"
وہ تعارف کرانے کے لئے بولی: "میں زی زولین کریمر ہوں۔ میرے دوست مجھے زینا کہتے ہیں۔ میں یونیورسٹی میں آرٹ کی سٹوڈنٹ ہوں"
میری رُوح نے اُسے خوش آمدید نہ کہا۔ میری زبان نے بداخلاقی گوارا نہ کی۔ میں نے اپنا تعارف کرایا اور جب دیر تک کوئی بات نہ سوجھی تو میں نے خاموشی کی بدمزگی سے بچنے کے لئے کہا:
"غالباً آپ تھوسی میکفرسن کو تو نہ جانتی ہوں گی۔ وہ بھی یونیورسٹی میں آرٹ کی سٹوڈنٹ ہیں"
"اوہ! تھوسی! خوب جانتی ہوں۔ تھوسی کو سب جانتے ہیں"
"میرے پاس اس کے باپ کا خط ہے"
"میں ملا دوں گی تھوسی سے آپ کو"
"آپ کیا پئیں گی؟ شمپین؟"
"جی نہیں۔ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں"
میں کھسیانا ہو گیا۔ اس کے جواب میں روکھا پن تھا۔ جیسے وہ میری بات سے ناراض ہو گئی ہے۔ چند لمحوں کے بعد مجھے اس کے لہجے میں غرور اور بدتہذیبی بھی محسوس ہونے لگی۔ میں نے اپنے اردگرد دیکھا۔ دوسری میزوں پر بھی کرسیاں خالی تھیں۔ پھر وہ میرے سامنے آ کر کیوں بیٹھ گئی ہے اور اس کی گفتگو کا آغاز تو بالکل عام لڑکیوں جیسا تھا۔
اس نے اپنا ہینڈ بیگ کندھے سے اُتار کر میز کے دائیں کونے میں رکھ دیا اور کتاب بائیں کونے میں۔ پھر اس نے کتاب کو بائیں کونے سے اٹھا لیا اور اس کو دائیں کونے میں رکھ کر اس کے اوپر ہینڈ بیگ رکھ دیا پھر وہ اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گئی اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولی:
"آپ کیا کھائیں گے؟"
میرا خیال تھا کہ وہ اب مجھ سے کوئی بات نہ کرے گی اور میرا بھی اس سے بات کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس کے اچانک سوال سے میں بوکھلا گیا اور یہ کچھ عجیب بات بھی تھی۔ ہوٹلوں میں پیشکش ہمیشہ مرد کی طرف سے ہوتی ہے۔ مجھے پوچھنا چاہئے تھا آپ کیا کھائیں گی؟ لیکن میں تو پوچھ چکا تھا۔ فیشن کے مطابق پینے کے بارے میں پوچھا جاتا ہے۔ میں نے بوکھلا کر جواب دیا:
"جی، میں ـــــ میں کچھ نہیں کھاؤں گا ـــــ"
وہ جلدی سے میری بات کاٹ کر بولی: "میں ہوسٹل سے کبھی کبھی نکلتی ہوں۔ جب نکلتی ہوں، تو پینے کے لئے نہیں، کھانے کے لئے۔ ہوسٹل کے کھانوں سے اکتائے ہوئے ہیں ہم لوگ۔ کبھی کبھی چینج کے طور پر باہر کھانے میں لطف رہتا ہے۔ آپ کھا چکے ہیں؟"
میں سراسیمگی کے عالم میں بولا: "جی نہیں"

وہ چلائی: "گارسان، گارسان"
گارسان (بیرا) آگیا۔
"دو پلیٹ پوٹیٹو چپس اینڈ فش!"
میرے چہرے پر احتجاج کے آثار دیکھ کر وہ جلدی سے بولی: "مجھے تلے ہوئے آلو اور روسٹ کی ہوئی مچھلی بہت پسند ہے۔ اگر میں آپ کو آرڈر دینے کی اجازت دے دیتی تو آپ پوٹیٹو چپس اور فش کی بجائے فرانس کے مشہور پُرتکلف کھانوں کا آرڈر دیتے۔ مجھے پُرتکلف کھانوں اور شرابوں سے نفرت ہے۔ آلو اور مچھلی غریبوں کا کھانا ہے، میں غریب ہوں۔ اس سے زیادہ پیش نہیں کر سکتی۔"
میں نے کہا: "میڈم، میں بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے اجازت دیجئے۔"
اس نے فوراً موضوع بدل دیا: "مجھے میڈم کا لفظ پسند نہیں۔ آپ مجھے زیزا کہہ سکتے ہیں لیکن مجھے زیزا کہتے ہوئے آپ کو کوئی رومانٹک احساس نہیں ہونا چاہئے۔ زیزا بڑا آرٹسٹک لفظ ہے۔ اس میں حروف اور آواز رنگوں کے امتزاج کی طرح ایک دوسرے میں تحلیل ہو گئے ہیں۔ مجھے کوئی زیزا کہتا ہے تو میں محسوس کرتی ہوں میں ایک آرٹسٹ ہوں۔ اور زیزا میری تخلیق۔ آپ مجھے زیزا کہئے، میں دیکھنا چاہتی ہوں آپ کی آواز میں موسیقی ہے یا نہیں۔"
اب مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ زیزا ایک دلچسپ اور ذہین لڑکی ہے، عام لڑکیوں سے مختلف۔ اس لئے میری بات میں میرے جذبات شامل ہوگئے۔
میں نے کہا: "زیزا، مجھے اجازت دیجئے، میں آپ کے لئے لنچ کا آرڈر دوں۔"
لیکن بیرا دو پلیٹ پوٹیٹو چپس اور فش لے کر آگیا اور ہم کھانے میں مشغول ہو گئے۔

کچھ دیر تک ہم چپ چاپ آلو اور مچھلی کھاتے رہے۔ پھر وہ بولی:
"جب میں ہوسٹل سے باہر آتی ہوں تو کسی سے ملنا پسند نہیں کرتی۔ اکیلی رہنا چاہتی ہوں۔ ہوسٹل کی شور شرابے کی زندگی سے باہر نکل کر کچھ عرصہ بالکل تنہا اور خاموش رہنے کو دل چاہتا ہے۔ میں مردوں کے ڈانس اور سینما کے پروگراموں کو بڑی حقارت سے ٹھکرا دیتی ہوں۔"
میں نے پریشان ہو کر کہا: "زیزا، مجھے افسوس ہے میں آپ کی تنہائی کی لذتوں میں خلل انداز ہو رہا ہوں۔"
اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں: "لیکن جب کبھی مجھے کسی سیاہ قوم کا فرد نظر آجاتا ہے، تو میرا سر احترام سے جھک جاتا ہے اور میں اسکی تعظیم کے لئے اس کے پاس چلی جاتی ہوں۔"
میں حیران ہو گیا: "زیزا، کیا آپ اس بات کی وضاحت کر سکتی ہیں؟"
وہ ہنس پڑی: "اس بات کی وضاحت نہایت ضروری ہے۔ سنا ہے سفید عورتیں نیگرو اور دوسری کالی نسل کے مردوں کو بہت پسند کرتی ہیں۔ آپ کو میری بات سے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے۔"
میں بھی ہنس پڑا۔
"میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میں ایک آرٹسٹ ہوں اور رنگوں سے حُسن کی تخلیق میرا کام ہے۔ عجیب بات ہے کہ مجھے رنگوں میں سب سے زیادہ کالا رنگ پسند ہے۔ یقیناً کالے رنگ کو تمام دوسرے رنگوں کی ملکہ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ یہ رنگ سب سے افضل ہے۔ میرے رنگ بڑے گہرے ہوتے ہیں۔ میں ہر رنگ میں کالا رنگ شامل کر دیتی ہوں۔ میرے سٹوڈیو میں ایک پورٹریٹ ہے جس کو پینٹ کرنے میں میں نے اپنی تمام صلاحیتیں صرف کر دی ہیں۔ وہ تصویر میری نمائندہ پینٹنگ ہے۔ وہ میرا ماسٹر پیس ہے، اس میں ایک جوانمرد کا سیاہ فام چہرہ ہے۔ سیاہ فام چہرے کے پیچھے گہرے سرخ خون کا سمندر ہے، خون کے سمندر میں حرکت اور قوت کا طوفان ہے۔"
میں مرعوب آواز میں بولا: "زیزا، کیا مجھے اس ماسٹر پیس کو دیکھنے کا شرف حاصل ہو سکتا ہے؟"

"آپ موسیٰ کو ملنے جائیں گے۔ ہم دونوں ایک ہی سٹوڈیو میں کام کرتی ہیں آپ وہاں پینٹنگ بھی دیکھ سکیں گے۔"
زیزا نے یہ فقرہ جلدی جلدی کہا۔ جیسے اس کو میری قطع کلامی پسند نہیں آئی۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی "یہ پورٹریٹ پینٹ کرنے کے بعد مجھ پر ایک بہت بڑی حقیقت کا انکشاف ہوا۔ میرا تخیل وسیع ہو گیا اور کالا رنگ میرے سٹوڈیو سے نکل کر دنیا کی کالی قوموں کی حدود تک پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا کہ سیاہ رنگ سفید رنگ کے پیروں کے نیچے پڑا سسک رہا ہے۔ پھر میں نے دیکھا کہ سیاہ رنگ میں حرکت اور قوت پیدا ہوئی اور وہ سفید رنگ کی غلامی سے آزاد ہونے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اب جہاں بھی میں کسی سیاہ قوم کے فرد کو دیکھتی ہوں میرا سر احترام سے جھک جاتا ہے اور میں اس کی تعظیم کے لئے اس کے پاس چلی جاتی ہوں۔"
میں نے زیزا کی سیاہ انگلی اور اس کے سیاہ لباس کو دیکھتے ہوئے کہا :
"تھینک یو، زیزا"

آملاو مچھلی ختم ہو گئی۔ کوفی آگئی۔ زیزا نے کوفی بناتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے آپ الجیریا کے باشندے ہیں۔ آپ کا ملک آزادی کے لئے لڑ رہا ہے۔ میری ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔"
میں نے کہا "جی نہیں۔ میں الجیریا کا باشندہ نہیں ہوں۔ میرے ملک کا نام پاکستان ہے۔"
وہ جلدی سے بولی "میں جانتی ہوں۔ میرے والد وہاں ۱۹۳۷ء میں سفیر تھے۔ بڑا اچھا ملک ہے پاکستان۔ انگلش میں اس کو انڈیا کہتے ہیں۔"
میں ہنس پڑا "انگلش میں جس ملک کو انڈیا کہتے ہیں، وہ ہندوستان تھا۔ پاکستان ۱۹۴۷ء میں ایک نیا ملک وجود میں آیا ہے اور ۱۹۴۷ء ہی میں ہم نے انگریزوں کی حکومت سے آزادی حاصل کی۔"
وہ کسی قدر کھسیانی ہو گئی اور اپنے کھسیانہ پن کو چھپانے کے لئے بلند آواز میں بولی۔
"او۔ لا، لا۔ آپ کا ملک آزاد ہو گیا ہے۔ مبارکباد!"

ہم کچھ دیر خاموشی سے کوفی پیتے رہے۔ میں زیزا کے بارے میں کچھ زیادہ جاننے کا متمنی تھا۔ لیکن مجھے ذاتی سوالات کرنے کی جرأت نہیں ہو رہی تھی۔ آخر میں نے براہِ راست سوالات کرنے کی بجائے دوسرے طریقوں سے اس کے بارے میں معلومات کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے کہا :
"آپ مجھے فرانسیسی لڑکی معلوم نہیں ہوتیں۔"
وہ فرانسیسی لڑکی کے الفاظ پر کچھ چیں بجبیں ہو گئی اور بولی،
"میں ایک جرمن لڑکی ہوں۔ مجھے تعجب ہے آپ اندازہ نہ لگا سکے؟"
"مجھے یقین تھا کہ آپ فرانسیسی لڑکی نہیں ہیں۔ آپ کی سطح عام لڑکیوں سے بہت بلند ہے۔"
"دنیا میں صرف جرمن لڑکیوں نے عورت کے بنیادی وقار کو بلند کیا ہے۔ عورت کو مرد کے برابر کی حیثیت دینے کی صدائیں ہر ملک سے اٹھی ہیں لیکن اس جدوجہد میں کامیابی صرف جرمن لڑکیوں کو حاصل ہوئی ہے۔ صرف جرمن لڑکیوں پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ عورت دنیا کو حسن و عشق کی داستانوں سے سجانے کے لئے پیدا نہیں ہوئی۔ انسان کی سوسائٹی میں عورت کا سب سے اہم رول حسن و عشق نہیں ہے۔ عورت کا رول انسانی سوسائٹی کی تشکیل میں حسن و عشق سے بہت بلند ہے۔ حسن و عشق عورت کی منزل نہیں۔ دنیا کا غم دوست کے غم سے زیادہ اہم ہے۔ ملک کے مسائل محبوب کی محبت سے زیادہ اہم ہیں۔ ملک کے مسائل محبوب کی محبت سے زیادہ دلکش ہیں۔ حسن و عشق کی داستان میں عورت مرد کے سامنے ایک ذیلی حیثیت اختیار کرنے پر مجبور ہوتی ہے حسن و عشق عورت کو ایک گڑیا اور ایک کھلونا بنا کر مرد کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں اور اس طرح عورت مر

کے برابر کی حیثیت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاتی ہے۔ صرف جرمن لڑکیوں نے اس حقیقت کو پہچانا ہے۔ اور میں ایک جرمن لڑکی ہوں۔"

میں بہت مرعوب ہو گیا، میری زبان بند ہو گئی۔ لیکن میں تو زیزا کے زندگی کے حالات جاننا چاہتا تھا۔ جو کچھ اس نے بتایا ہے وہ تو مجھے اسی وقت معلوم ہو گیا تھا جب اس نے میری شمپین کی پیشکش ٹھکرا دی تھی۔

میں چپ بیٹھا رہا

وہ بھی چپ بیٹھی رہی

پھر اُس نے اپنی کالی انگلی کوفی کپ کے ہینڈل میں ڈالنے کے لئے آگے بڑھائی۔ میں نے کہا:

"آپ اپنی کالی انگلی کے بارے میں کچھ بتا سکیں گی؟"

اُس نے کوفی کپ کے ہینڈل سے اپنی کالی انگلی نکال لی اور میز پر کہنی رکھ کر اس کو میری آنکھوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اور بولی:

"میری کالی انگلی کے پیچھے میرا سفید ہاتھ ہے۔ میرے سفید ہاتھ کے پیچھے میرا سنگِ مرمر جیسا بازو ہے اور میرے سنگ مرمر جیسے بازو کے پیچھے میرا دودھ جیسا بدن ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سفید انگلی سفید ہونے کے باوجود کالی ہو سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سفید قوموں کی قسمت سفید ہونے کے باوجود کالی قوموں کی قسمت جیسی ہو سکتی ہے۔ میرا پیارا ملک جرمنی ادبار کی اُسی گہرائی میں ہے جہاں افریقہ ہے۔"

غضب ہو گیا۔ اُس کی نیلی نیلی بلور جیسی خوبصورت آنکھیں بھیگ گئیں۔ میں نے جلدی سے کہا:

"زیزا، تم آرٹسٹ ہو۔ تم بہت بڑی آرٹسٹ ہو۔"

اس نے میری بات نہ سُنی۔ اپنی بات کرتی رہی

"لیکن میری کالی انگلی اگر کالی قوموں کی قسمت کی یاد دلاتی ہے۔ تو یہ کالے ناگ کی اور گرانڈیل سیاہ ہاتھی کی بھی یاد دلاتی ہے۔ یہ اس سیاہ فام پورٹریٹ کی یاد بھی دلاتی ہے جس کے خون کے سمندر میں حرکت اور قوت کا طوفان ہے اور جس کو اس کالی انگلی نے خود بنایا ہے۔"

میں ہمہ تن گوش بیٹھا رہا۔ میں نے داد دینی بھی مناسب نہ سمجھی۔ ایسا نہ ہو اُس کی موڈ بگڑ جائے اور اُس کی روانی میں فرق آ جائے۔

میری توقع کے خلاف اس نے اپنی کہانی شروع کر دی۔

"جب ۱۹۴۷ء میں آپ کا ملک آزاد ہوا، میں قید میں تھی۔"

میں نے اُس کو اکسانے کے لئے خواہ مخواہ حیرت کا اظہار کیا۔

"آپ قید میں؟ کیوں؟ کہاں؟"

"آئرن کرٹن کے پیچھے۔ روس کے فولادی پردے کے اندر مشرقی برلن میں۔ میں، میرا بھائی، میری ماں، میرا باپ۔ میرا باپ فورین سروس میں تھا۔ ہمارے فیوہرر ہٹلر کو میرے باپ پر بڑا اعتماد تھا۔ اس نے میرے باپ کو بڑے بڑے اہم غیر ملکی مشنوں پر بھیجا۔ اسی سلسلے میں وہ ۱۹۳۷ء میں انڈیا گیا۔ پچھلی جنگ کے دوران میں میرا باپ فیوہرر کا دایاں بازو بن گیا۔ بدقسمتی سے جرمنی جنگ میں ہار گیا۔ برلن تقسیم ہو گیا۔ ہمارا خاندان مشرقی برلن میں آ گیا۔ میرا بھائی فیوہرر کی فوج کا بڑا ہونہار افسر تھا۔ ہمارے سارے کنبے کو جیل میں پھینک دیا گیا اور ہمارے گھر پر قبضہ کر لیا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد مجھے اور میری ماں کو رہا کر دیا گیا۔ میں اُس وقت بارہ تیرہ سال کی تھی۔ میری ماں ایک ہوٹل میں ملازم ہو گئی اور ہمیں سیڑھیوں کے نیچے ایک خلا میں رہنے کی جگہ مل گئی۔ ایک دن میری ماں ہوٹل کی سیڑھیاں دھو رہی تھی کہ ہوٹل کے سامنے دو لاشیں آئیں۔ وہ میرے باپ اور بھائی کی لاشیں تھیں۔ میرے بھائی کی کنپٹیوں میں گولی ایک طرف سے دوسری طرف نکل گئی تھی۔ اور خون کانوں، آنکھوں اور ناک پر بہتا ہوا کپڑوں پر گر کر جم گیا تھا۔ میرے باپ کے سر کے پیچھے گولی نے کھوپڑی کو توڑ کر ایک انچ قطر کا گول سوراخ کر دیا تھا۔ میری ماں اور میں ایک ہفتہ تک دھاڑیں مار مار کر روتے رہے۔ پھر ہوٹل میں رہنے والے میری ماں کے ساتھ ہمدردی اور دوستی کا سلوک کرنے لگے۔ میری ماں اور میں اکثر ہوٹل کے کسی جوان کے ساتھ ڈنر، ڈانس اور سینما میں چلے جاتے۔ لیکن زیادہ تر میں اکیلی گھر پر رہتی اور میری ماں آدھی آدھی رات تک واپس نہ آتی۔ مجھ اکیلی کو بڑا ڈر لگتا، لیکن میں کیا کر سکتی تھی۔

"ایک دن ہوٹل میں ایک مہمان آکر ٹھہرا۔ اس کے بال لمبے تھے، سر چھوٹا اور منہ لمبا جو فرنچ کٹ ڈاڑھی سے اور بھی لمبا ہو گیا تھا۔ اس کی کنپٹیوں کے بال سفید تھے، گال خشک اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی۔ اس کی عینک کے موٹے موٹے شیشوں میں سے اس کی آنکھوں کے ڈھیلے موٹے موٹے اور ڈراؤنے نظر آتے تھے۔ اس کا نام البرٹ بکواسو تھا۔"

میں چونک پڑا۔

"کون البرٹ بکواسو! یہاں کی فرنچ فائن آرٹس اکیڈمی کا پرنسپل؟"

"جی ہاں۔ وہ وہاں روس کی دعوت پر اپنی تصویروں کی نمائش کرنے گیا تھا۔ میں نے اس کے حلیہ کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، اس کو نہ بھولئے۔ اس کا آنے والے واقعات سے بڑا تعلق ہے۔"

میں نے کہا: "نہیں، یہ حلیہ بھولنے والی چیز نہیں۔"

"پروفیسر البرٹ بکواسو میری ماں کا بہت گہرا دوست بن گیا۔ وہ اکثر میری ماں کو کئی کئی گھنٹوں کے لئے باہر لے جاتا اور میں گھر پر اکیلی ڈرا کرتی۔ ایک دن میری ماں کہیں گئی ہوئی تھی۔ پروفیسر البرٹ بکواسو آیا۔ اس کے بعد جو واقعات پیش آنے والے ہیں۔ ان کو بتانے سے پہلے آپ کی یادداشت تازہ کرنا چاہتی ہوں۔

میں نے کہا:

"جی۔ کیجئے۔"

"آپ کو یاد ہے میری عمر اس وقت کتنی تھی؟"

"بارہ تیرہ سال۔"

"اور آپ کو پروفیسر البرٹ بکواسو کا حلیہ یاد ہے؟"

"جی ہاں۔"

"پروفیسر البرٹ بکواسو اندر آیا۔ میں اس کے پیروں پر گر پڑی۔ اور گڑگڑا کر بولی: پروفیسر بکواسو، مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے مجھے یہاں سے لے جاؤ۔ مجھے اپنی بیوی بنا لو۔ مجھے یہاں بہت ڈر لگتا ہے۔" پروفیسر بکواسو کچھ دیر مجھے حیرت سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے مجھے اپنے پیروں سے اٹھا کر اپنی گود میں لے لیا۔ اور بہت پیار کیا۔ دوسرے دن میں سیڑھیوں میں کھیل رہی تھی۔ پروفیسر بکواسو اور میری ماں اندر بیٹھے تھے۔ میری ماں نے مجھے آواز دی۔ میں اندر گئی۔ جونہی میں نے اندر قدم رکھا۔ میری ماں اور پروفیسر بکواسو زور زور سے ہنسنے لگے۔ میری ماں نے کہا: 'زینیا، تم پروفیسر بکواسو کی بیوی بننا پسند کرتی ہو؟' میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ میں شرم کے مارے زمین میں گڑ گئی۔ میری ماں اور پروفیسر بکواسو نے ایک اور قہقہہ مارا اور دیر تک ہنستے رہے۔ پھر میری ماں نے پروفیسر بکواسو سے کہا: 'البرٹ، تم ٹھیک کہتے ہو۔ زینیا یہاں بے حد ناخوش ہے اور کسی نہ کسی بہانے اس ماحول سے نکل جانا چاہتی ہے۔ اس کی مدد کرو۔ میں ممنون ہوں گی۔' پھر جس دن پروفیسر بکواسو واپس آنے کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی تصویروں کا بڑا صندوق کھولا۔ کچھ تصویریں نکال کر میری ماں کو دے دیں۔ اور ان کی جگہ مجھے لٹا کر صندوق کو قفل لگا دیا۔ اور میں پیرس آگئی۔"

بیرا بل لے کر آگیا۔ میرے بہ اصرار منع کرنے کے باوجود زینیا نے دونوں بل ادا کر دئے اور سیٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں نے کہا:

"زینیا، میں نے آپ کو کالی انگلی پر کچھ روشنی ڈالنے کے لئے کہا تھا۔"

"شوٹیو میں آپ کو شوسی سے ملنا ہے۔ اور اگر آپ کے پاس وقت ہوا تو مجھے آپ کو اپنا ماسٹر پیس دکھانا ہے۔"

ہم کافے سے باہر آگئے۔

میرے اصرار کے باوجود اس نے ٹیکسی سے انکار کیا۔ اور ہم پیدل سائن کی طرف چل پڑے۔
سائن کے پل کو عبور کرکے اور تھوڑی دور دائیں کنارے پر چل کر ہم یونیورسٹی پارک میں داخل ہو گئے۔ یونیورسٹی پارک میں گھاس کی مخمل بچھی ہوئی تھی، پھولوں کی پریاں ناچ رہی تھیں، ہوا کے جھونکے خوشبو بکھیر رہے تھے اور یونیورسٹی کے لڑکے لڑکیاں مغربی پارکوں کی آزاد محبت سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ دریائے سائن شرم کے مارے پانی پانی ہوا جا رہا تھا اور شام چار بجے کا سورج مغرب کی گہرائیوں میں غرق ہونے کے لئے بھاگا جا رہا تھا۔

زنیرا نے کہا:
"غور سے دیکھیے، یہ ہماری تہذیب کا قبرستان ہے۔"
میں نے کہا:
"مجھے شرم آ رہی ہے۔"
اس نے کہا:
"شرمانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ ہماری زندگی کی سینما سکوپ فلم ہے جب ہماری بیٹیاں، بہنیں، مائیں اور بیویاں رات کو سینما ہالوں میں جا کر بڑی جرأت سے ایسی فلمیں دیکھ آتی ہیں، پھر آپ دن کو زندگی کی یہ فلم دیکھنے سے کیوں شرماتے ہیں؟"
میں نے کہا:
"زنیرا، جلدی اپنے سٹوڈیو کو چلیے۔"
"لیکن ذرا ٹھہریے۔ اس سیب کے درخت کے نیچے دیکھیے۔ وہ جہاں پانی کا فوارہ موتی بکھیر رہا ہے اور گلاب کے پھولوں کا تختہ جھک رہا ہے۔"
میں نے طوعاً و کرہاً ادھر دیکھا۔
وہ بولی:
"یہ شوسی ہے۔"
میری چیخ نکل گئی
"شوسن؟"
"شوسن میکفرسن"
دونوں کے ہونٹ ملے ہوئے تھے، دونوں کے چہرے جذبات سے سرخ ہو گئے تھے، دونوں ایک نہایت مکروہ منظر پیش کر رہے تھے۔ میں بھاگ اٹھا۔
"زنیرا، مجھے شوسن سے نہیں ملنا، خدا کے لئے اپنے سٹوڈیو میں چلو۔"

سٹوڈیو سادہ سا گندہ سا تھا۔ گرد و غبار اور بے ترتیبی تھی۔ فریم کی ہوئی تصویریں دیوار کے ساتھ ایک دوسرے کے سہارے رکھی ہوئی تھیں۔ میں ایزل کے پاس چلا گیا۔ ایزل پر زنیرا کے تاریک ہیرو کی تصویر چڑھی ہوئی تھی۔ اس کا رنگ کالا تھا۔ اس کے ماتھے پر سیاہ رنگ کی لکیریں تھیں۔ اس کو پہچاننا مشکل تھا۔ وہ الہ دین کا دیو معلوم ہوتا تھا۔
زنیرا بھی ایزل کے پاس آ گئی۔ اس نے اپنی کالی انگلی کو اپنے ہیرو کے ماتھے کی سیاہ لکیروں پر پھیرا اور کھوئے کھوئے انداز میں بولی:
"میرا ہیرو"
پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولی:

"پروفیسر بکواسو کو میرے ہیرو سے نفرت ہے، میں اس کی تصویر پینٹ کر رہی تھی۔ وہ اندر آیا۔ کینوس پر میرے ہیرو کی تصویر دیکھ کر آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے کینوس کو ایزل سے اتار کر زمین پر پٹخ دیا۔ اور اس کو پیروں سے مسل مسل دیا۔ اور اس کے اوپر کھڑا ہو کر چلانے لگا: اس ذلیل کتے نے ایک مقدس سرزمین کو اپنے ناپاک پیروں سے روند ڈالا۔ اس جاہل انسان نے میرے سٹوڈیو کو جلا کر خاک کر دیا۔ یہ خونخوار ٹیریا میری اکیڈیمی میں داخل نہیں ہوگا! میں غصے سے دیوانی ہو گئی میں نے چلا کر کہا: پروفیسر بکواسو، اپنی بکواس بند کرو۔ اور دروازے کی طرف بھاگی۔ دروازے کے پاس کھڑی ہو کر میں نے کہا: اگر میرا ہیرو اکیڈیمی میں داخل نہیں ہو سکتا تو میں بھی یہاں نہیں رہ سکتی اور میں نے باہر نکلتے ہوئے زور سے دروازہ چوکھٹ کے ساتھ دے مارا۔ میری انگلی دروازے میں آگئی اور کالی ہو گئی۔"

میں نے کہا:

"لیکن زیزا تو یہیں ہے۔ اور اس کا ہیرو بھی ایزل پر ہے۔"

"میں جا رہی تھی۔ پروفیسر بکواسو میرے کمرے میں آیا۔ اور میرے پیروں پر گر گیا۔ اور گڑ گڑا کر بولا: زیزا تمہیں یاد ہے۔ تم چھوٹی سی تھیں۔ تم نے میرے پیروں پر گر کر کہا تھا، مجھے تم سے محبت ہے۔ وہ ایک مذاق تھا لیکن میں مذاق نہیں کر دوں گا۔ زیزا! میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھے تم سے محبت ہے، تمہارے خوابوں کا دیوتا ایزل پر آگیا ہے اور زیزا یہاں سے کہیں نہیں جا سکتی۔"

کالی انگلی کا راز کھل گیا۔

اب مجھے زیزا کا ماسٹر پیس دیکھنا تھا۔

میں نے کہا:

"زیزا، میں آپ کا ماسٹر پیس دیکھنے کے لئے بے قرار ہوں۔"

زیزا ایک کونے میں گئی۔ وہاں سے مخمل کے غلاف میں چھپی ہوئی پینٹنگ اٹھا لائی۔ اس کو بڑے احتیاط سے مخمل کے غلاف میں سے نکالا۔ اور تصویر کو ایزل پر رکھ دیا۔ اور مجھے آواز دے کر بولی:

"یہ ہے میرا ماسٹر پیس!"

میں ایزل کے سامنے گیا۔

اور خوشی سے نعرے کے انداز میں چلایا: "ٹیپو سلطان!"

سیاہ فام خون کا سمندر تھا۔ حرکت اور قوت کا طوفان تھا۔

میرا سر احترام سے جھک گیا۔ میں آہستہ آہستہ پینٹنگ کی طرف بڑھا۔ اور میں نے انتہائی تعظیم سے ٹیپو سلطان کے ماتھے کو بوسہ دیا۔

پھر میں نے اسی احترام اور تعظیم کے جذبات کے ساتھ زیزا کو مخاطب کیا:

"محترمہ، آپ ایک عظیم آرٹسٹ ہیں۔"

اس نے جواب دیا: —— "تھینک یو!"

میں نے کہا: "محترمہ، کیا آپ میری ایک تمنا پوری کر سکتی ہیں؟"

"کیا؟"

"کیا آپ مجھے اس ہاتھ کو چومنے کی اجازت دیں گی جس نے ٹیپو سلطان جیسا شاہکار پیدا کیا ہے۔"

زیزا نے اپنا ہاتھ میرے سامنے کر دیا۔

میں نے ادب سے جھک کر زیزا کی کالی انگلی کو چوم لیا۔

ایک جھونکا

احمد ندیم قاسمی

سرد جھونکا کوئی آیا کہ بگولا گذرا
آدمی ہو کہ لبِ جُو کا سرافراز درخت
اپنی نظروں میں تو قدموں سے اُکھڑتا گذرا
سر جُھکائے ہوئے، سوئے ہوئے گل یوں چونکے
جیسے بھونچال میں جاگ اٹھتے ہیں پیڑوں پہ پرند
اور چلاتے ہیں یوں گونجتی تاریکی میں
جیسے بستی سے بپھرتا ہوا دریا گذرا

★

دُھوپ جھلّا کے نکلتی ہے تو ابر آتا ہے
مینہہ برستا ہے تو بڑھ جاتا ہے ماحول کا حبس
شب کی تو بات ہی کچھ اور ہے — آخر شب ہے
دن کو ہر چیز کا، ملبوس اُتر جاتا ہے
میری تہذیب کا پردہ — مری قدروں کا نقاب
سانپ کی کینچلی بن کر، کسی چورا ہے پر
آدھے جاگے ہوئے انسان کو دہلاتا ہے

★

کن تضادوں میں تپاں ہے مری پروازِ خیال
دستِ تخلیق کی زنجیرِ طلائی کی قسم
ابھی انسان سے پوشیدہ ہے انساں کا جمال
ایک کہتا ہے غزل —— ایک بناتا ہے بم
ایک کو دل بھی بہت —— ایک کو آفاق بھی کم
اور پسِ ظلمتِ تہذیب کئی صدیوں سے
چاند بننے کو ہمکتے ہیں محبت کے ہلال

طنز و مزاح:

خاندانِ کیخسرو

سیّد ضمیر جعفری

سلطان راجہ مبارز خاں حکمرانوں کے ایک معزول بلکہ اب دو صدیوں سے تو گویا مفلوج کیخسرو خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ یہ "چشم و چراغ" میں نے یونہی ازراہِ اخلاق و مروّت نہیں کہہ دیا بلکہ وہ لفظاً و معناً یعنی کیا محاورہ اور کیا روزمرہ ہر لحاظ سے اپنے تاریخی خانوادے کے چشم و چراغ واقع ہوئے ہیں۔

مثلاً چشم کو لیجئے اور اتفاق دیکھئے کہ سلطان مبارز خاں صرف ایک ہی چشم رکھتے ہیں۔ مدت ہوئی جنگل میں ایک نوآموز عقاب کو "جھپٹ کر پلٹنے اور پلٹ کر جھپٹنے" کی مشق کرا رہے تھے کہ نامراد پلٹ کر سلطان صاحب کی پوری آنکھ ڈھیلے تپلی سمیت صاف کر گیا۔ لوگوں نے پتھر کا ڈھیلا ڈلوانے کی رائے دی مگر پتھر کی آنکھ ان کے مذاقِ لطیف پر گراں گزری۔ بعض ڈاکٹروں نے یورپ جانے کا مشورہ دیا کہ شاید وہاں کے ماہرین کسی مُردہ انسان کی کوئی ایسی نیم زندہ آنکھ ڈال دیں جو تھوڑا بہت دیکھ بھی سکتی ہو۔ لیکن سلطان مبارز خاں اس پر بھی آمادہ نہ ہو سکے۔ ایک تو انہیں سرے سے سفر کے خیال ہی سے وحشت ہوتی تھی کہ ریل جہاز وغیرہ میں دوسرے لوگوں کے ہمراہ جمہوری طرز کا سفر کرنا انہیں سخت ناگوار تھا۔ چنانچہ انہوں نے کوئی پچاس برس پہلے زندگی کا پہلا اور آخری سفر کیا تھا۔ پھر یورپ جا کر انسانی آنکھ ڈلوانے میں ایک بڑا خطرہ یہ بھی تھا کہ نہ معلوم کس خوانچہ فروش کی آنکھ ان کے سر تھوپ دی جائے جو خدانخواستہ ان کی زندگی کا زاویۂ نظر ہی بدل کر رکھ دے۔

سوچ بچار کے بعد آخر طے پایا کہ حکمرانوں، کشور کشاؤں کو باز و عقاب کی آنکھ ہی کچھ زیب دے سکتی ہے۔ چنانچہ ہاتھ کے بدلے ہاتھ، ٹانگ کے بدلے ٹانگ کے اُصول پر اُسی عقاب کی آنکھ نکلوا کر ان کی آنکھ میں فٹ کر دی گئی۔ مگر یہ آنکھ دُور سے صاف پہچانی جاتی ہے کہ باز کی آنکھ ہے کیونکہ ہر وقت باز رہتی ہے۔ کچھ یہ آنکھ، اس کے اوپر اُن کی پھیلی ہوئی گھمبیر مونچھ، آدمی اگر کچھ زیادہ غور نہ کرے تو راجہ سلطان مبارز خاں ایک اڑتا ہوا عقاب معلوم ہوتے ہیں اور چڑیٰ، فاختہ، کبوتر وغیرہ کی قبیل کے امن پسند پرندے تو سچ مچ ان کو دیکھتے ہی اڑ جاتے ہیں۔ البتہ کوّوں کو شاید پتہ چل گیا ہے کہ یہ باز کی مری ہوئی آنکھ ہے اور بازوں سے وہ غالباً کوئی خصومت بھی رکھتے ہیں کہ جب موقع ملتا ہے بیٹھ دیا ہے اس آنکھ پر ٹھونگ مار جاتے ہیں چنانچہ بیچارے سلطان مبارز خاں دستار پر اکثر غلیل باندھ کر باہر نکلتے ہیں۔

یہ تو تھی چشم ——— رہا چراغ تو گو زندگی کی چہل پہل کی شمع تو ان کے ہاں مدت سے گل پڑی ہے لیکن حویلی کے ایک تہہ خانے میں جس کو توشہ خانے کہتے ہیں، پیتل کا ایک قدیم چراغ پچھلی کئی صدیوں سے روشن ہے۔ روایت یہ ہے کہ خاندانِ کیخسرو کے مورثِ اعلیٰ سلطان راجہ ممارز خان نے بہرام پور کے قلعے کی تعمیر یا تسخیر (اغلباً تسخیر کیونکہ تعمیر کی اُنہیں فرصت ذرا کم نصیب رہی) کی خوشی میں یہ چراغ اپنے ہاتھ سے روشن کیا تھا۔ اور یہ وصیت کی تھی کہ اس کو ہرگز کبھی بجھنے نہ دیا جائے۔ چراغ کے ساتھ سلطان مرحوم نے اپنی ایک شمشیر آبدار بھی توشہ خانہ میں رکھی تھی مگر چونکہ اسی کے بارے میں کوئی وصیت کرنا بھول گئے تھے لہٰذا شمشیر تو بعد میں کوئی مغل صوبیدار اٹھا کر لے گیا ——— مزید بعد وہ ایک بھونسلہ سردار اور پھر لارڈ کارنوالس کے اردلی کی کمر میں دیکھی گئی ——— ہاں چراغ آج تک برابر جل رہا ہے!

قلعہ بہرام پور کو اس خاندان کی تاریخ میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ان کی تاریخ اصل میں چلتی ہی اسی قلعے سے ہے۔ مگر بدقسمتی سے خود اس قلعے کو کوئی خاص تاریخ نصیب نہیں ہو سکی۔ قیاس یہ ہے کہ ایک طوائف الملوکی میں جو اس زمانے میں اکثر پھیلا کرتی تھی، یہ قلعہ سلطان ممارز خاں کے ہاتھ پڑ گیا اور دوسری طوائف الملوکی میں ہاتھ سے نکل گیا۔ اور یہ دوسری طوائف الملوکی کچھ ایسی بے قابو ہو کر پھیلی کہ اب اس قلعے کے آثار تک بھی کہیں نظر نہیں

آتے۔ ویسے لوگ کہتے ہیں کہ بڑا عالیشان قلعہ تھا۔ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس پرگنے میں بعض دوسرے قبائل کے جو دس بارہ قلعے آج تک موجود ہیں' یہ دراصل بہرام پور کے قلعے ہی کے دمدموں، کنگروں، برجوں اور دیواروں کو اکھاڑ کر بنائے گئے تھے اور یہ خیال قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ سب قلعے وضع قطع میں خلیے، ممیرے، چچیرے بھائی نظر آتے ہیں ـــــــ قلعے کی بنیاد میں جو پتھر تھے، اُن سے پہلے تو بہرام پور کے لوگوں نے اپنے مکان بنوائے، بعد میں وہی پتھر ان کی قبروں پر صرف ہوئے اور آج نہ بہرام پور کا قلعہ موجود ہے، نہ وہ قصبہ، نہ وہ لوگ، نہ ان کی قبریں ع

حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے!

کیخسرو خاندان قلعے سے ہتھیلی پر جلتا ہوا چراغ رکھکر جو بھاگا تو نہ معلوم کہاں کہاں گھومتا ہوا بالآخر اس حویلی میں پناہ گزیں ہوا، جو اصلاً تو ایک عظیم قلعہ نما حویلی تھی مگر اب عرصے سے اس کا اصطبل ہی قابلِ رہائش رہ گیا تھا جس میں وقتاً فوقتاً جابجا دیواریں اٹھا کر یا جہاں دیواریں نہ اٹھ سکیں وہاں ٹاٹ تان کر زنان خانے، دیوان خانے، توشہ خانے، ہاتھی خانے اور وزیر ڈیوڑھیاں اور غلام گردشیں وغیرہ بنالی گئی ہیں۔

معزولی کے وقت پہلے سلطان کو معقول موروثی پنشن کے ساتھ خاص بڑی زرعی جاگیریں ملی تھی۔ مگر کئی نسلوں کی تقسیم و تفریق کے بعد اب یہ آمدنی محض ایک علامتی امتیاز رہ گئی ہیں۔ جو ہرگز اس لائق نہیں کہ "وضعِ سلطانی" کے بوجھ کو جو ناتوانیوں سے نہیں اٹھتا سنبھال سکے مگر بوڑھا سلطان مبارز خاں اسی بوجھ کو اپنے سر کا تاج سمجھتا ہے۔

محل ڈھیر ہو چکا لیکن ڈیوڑھی پر چوبدار کھڑا ہے۔ مصاحب کوئی نہیں مگر دیوانِ عام موجود ہے۔ یہی نہیں بلکہ نشست و برخاست کے جو قواعد سلطان راجہ ممارا خاں کے وقت میں بندھ گئے تھے، ان معمولات پر آج بھی نہایت باقاعدگی سے عمل ہو رہا ہے۔ ادھر آفتاب سوا نیزے پر بلند ہوا' (یہ معلوم نہ ہو سکا کہ نیزہ لیکر آفتاب کو ناپتا کون ہے) ادھر آپ محلسرا سے سوا جریب چل کر دالان کے ایک چبوترے پر رونق افروز ہو گئے۔ سامنے پیچوان رکھا ہے اور بازو میں ایک طشت کے اندر کلیجی کی بھنی ہوئی چند بوٹیاں، مونگ پھلی کے مغز، باجرہ، سونف اور مصری وغیرہ کے علاوہ سبز چارے کی چند چھوٹی چھوٹی گڈیاں رکھی ہیں۔ سلطان صاحب نے حقے کے دو کش لیکر آواز دی :

"وزیر ڈیوڑھی"

اور مولوی اللہ بخش جو مسجد میں امامت بھی کرتے ہیں، ڈیوڑھی کی ایک بغلی کوٹھڑی میں سے نکل کر دست بستہ حاضر ہو گئے۔

"کوئی عرضی پیشی ؟" سلطان نے پوچھا۔

"حضور سب خیریت ہے۔" وزیر ڈیوڑھی نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا۔ اور سامنے بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئے۔

"میر شکار"

اس آواز پر میر شکار جو دراصل نذرو مراثی ہے، ہاتھ کے انگوٹھے پر باز بٹھائے آ گیا۔ سلطان نے باز کے سر پر دستِ شفقت پھیرا اور طشت میں سے کلیجی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر باز کی چونچ میں رکھ دیا۔ باز کو کھونٹی سے باندھ کر تھوڑی دیر میں وہی نذرو مراثی داروغۂ اصطبل کی حیثیت میں سلطان کے سمرقندی ٹٹو کو باگ سے پکڑ لایا جس کو انہوں نے اپنے ہاتھ سے سبز چارے کی گڈی کھلائی۔ اسی طرح پھر یکے بعد دیگرے محل کے طوطے، بٹیر، مرغ اور بکریاں سلام کو حاضر ہوئیں اور اپنے اپنے حصے کا چارہ دانہ لے گئیں۔

اب چار ساعتیں آفتاب کی طرف تکنے کے بعد یہ آفتاب کے کسی زاویئے پر منحصر ہے کہ آپ چبوترے سے اٹھ کر دیوانِ خاص میں جائیں گے، توشہ خانے میں یا واپس محلسرا میں۔

حویلی سے باہر آپ شاذ ہی قدم رکھتے ہیں۔ لیکن وہ اس بات کو خوب سمجھتے ہیں کہ : "نکل کر پھول سے خوشبو ذلیل و خوار ہوتی ہے" ـــ اور دوسری بڑی قیامت یہ ہے کہ ان کے بزرگ ہاتھیوں پر نکلتے تھے۔ پھر چار گھوڑوں کی فٹن پر نکلتے رہے۔ رفتہ رفتہ چار کے دو گھوڑے رہ گئے۔ اور اب سلطان صاحب کے پاس جو سمرقندی ٹٹو ہے' وہ مجذوبیت کے اُس مقام پر ہے کہ اگر فٹن کو کھینچنے لگے تو فٹن اس کو کھینچ کر لے جائے۔ پھر خود فٹن کا بھی یہ حلیہ کہ اگر آپ اُس میں بیٹھ کر نکلیں تو یوں معلوم ہو گویا کسی عاشق کا جنازہ دھوم سے نکل رہا ہو۔

توشہ خانہ تو ہاتھی خانے کی طرح شاید خالی پڑا ہے۔ البتہ دیوانِ خاص کی بعض چیزیں قابلِ ذکر ہیں۔

مخملیں غلاف میں ایک بہت بڑی منقش، مجلّا و مطلّا کتاب رکھی ہے جس میں سلطان ممارا خاں سے لیکر آج تک کے جملہ سلاطین کے روزنامچے درج ہیں۔ ابتدائی دور کے روزنامچے تلواروں اور یلغاروں کے تذکرے سے لبریز ہیں۔ تلوار ہر وقت نیام سے باہر رہتی تھی۔ نیام میں غالباً راشن بھرا رہتا تھا۔ شہسواری کا یہ عالم تھا کہ دوڑتے گھوڑے کی پشت پر سو جاتے تھے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ خود تو گھوڑے کی پشت پر سو رہے ہیں اور گھوڑا میدان مار کر قلعہ میں واپس بھی آگیا۔ ایک سلطان نے محمد غوری کے تعاقب میں گھوڑا دوڑا تو حالانکہ محمد غوری ابھی جہلم کی پہاڑیوں میں بھٹک رہا تھا کہ سلطان غزنی پہونچ کر قتل بھی ہو چکا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ محمد غوری بھی بچ کر نہ جا سکا۔ کیونکہ اس کو ادھر جہلم کے ایک "گوہر" قبیلے نے کھخر سلطان کے شبہ میں قتل کر دیا۔

دوسرا دور شورشوں، خانہ جنگیوں اور طوائف الملوکی کا دور تھا۔ کھخر سلاطین، اُس زمانے میں کبھی دشمنوں سے اور کبھی خود اپنے آپ سے لڑتے رہے۔ اس دور میں کوئی دس پندرہ چچے اپنے بھتیجوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ چنانچہ بھتیجوں نے چچا بننے کے خوف سے بعد میں اپنے بھائیوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ مصروفیت بیکار اور فتح و شکست کی بے یقینی کا یہ عالم تھا کہ رانیوں کو میدانِ جنگ میں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ فتح ہوتی تو دوسروں کی رانیاں گھر میں ڈال لیتے۔ چنانچہ اولادِ نرینہ کا سلسلہ عموماً دشمن رانیوں ہی کے بطن سے قائم رہا۔

ہاتھی، تیر، چیتے، عقاب وغیرہ کے شکار کے رسیا تھے۔

تیسرے دور میں اگرچہ معرکہ جوئی کا ولولہ تو سرد پڑ چکا تھا اور دوڑتے ہوئے گھوڑے کی پشت پر اگر سونے کی کوشش کرتے تھے تو گر پڑتے تھے، تاہم ہنوز خاصہ دم باقی تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پنجاب میں سکھوں کا "طوطا" بول رہا تھا۔ سکھوں سے ابتداءً ان کے تعلقات کافی خوشگوار تھے مگر پھر ایک ذرا سی غلط فہمی پر ان سے لڑائی چھڑ گئی۔ قصہ یوں ہوا کہ تہل سنگھ یا میوہ سنگھ نامی ایک سکھ جرنیل مع لشکر ان کے ہاں اترا ہوا تھا کہ ان کے ایک سادہ لوح رکاب دار نے مدارات کے طور پر حقّہ لاکر اُس کے سامنے رکھدیا۔ اس پر وہ تلوار چلی کہ جب تلوار تھمی ہے تو اس علاقے پر انگریزوں کا تسلط قائم ہو چکا تھا۔ خاندانِ کھخر میں یہ لڑائی "حقوں کی لڑائی" کے نام سے مشہور ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو انگریزوں کی کامیابی میں کھخر خاندان کے اس حقّے کا بہت اہم حصہ ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بعد میں بعض انگریز حکام چاندی، تانبے، پیتل وغیرہ کے چھوٹے چھوٹے حقّے تحفتاً بطور یادگار کے طور پر اپنے ڈرائنگ روم میں رکھتے اور ولایت بھیجتے تھے۔

چوتھے دور میں جو راجہ سلطان مبارز خاں کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے؛ روزنامچہ میں کچھ اس قسم کے اندراجات ملتے ہیں:۔

- "دن بھر پلنگ پر پڑے پڑے حقّہ پیتا رہا۔"
- "سلطان طہماسپ خاں کے کرسند کو دیمک چاٹ گیا۔"
- "مروان سے عمدہ نسوار منگوائی ہے۔"
- "چترالی عقاب بیمار ہے۔"
- "اس زور کی آندھی چلی کہ دیوانِ عام کی چھت اُڑ گئی۔"
- "ہاضمہ سخت خراب ہے۔"
- "کچھ بھی نہیں۔"

یہ اندراجات بھی سلطان مبارز خاں کے ابتدائی روزنامچوں میں ملتے ہیں۔ ورنہ بعد میں تو انہوں نے اپنے شاہی روزنامچہ میں دورہ پر آنے والے افسروں سے ریمارکس اور سرٹیفکیٹ لکھوانے شروع کر دیئے ہیں۔ چنانچہ پونا ہارس کے ایک میجر ایل۔ بی۔ ڈبلیو ہڈسن صاحب سلطان مبارز خاں کی مونچھوں، ان کی حویلی کی محرابوں، بانکی ٹانگوں میں بندھے ہوئے گھنگھروؤں اور ان کے باورچی خانے کی تعریف میں پورے دو صفحے لکھ گئے ہیں۔ آخری ریمارک ایک سب ڈویژنل افسر مسٹر ایلین ہارٹلے کا لکھا ہوا ہے جس پر یکم اپریل ۱۹۲۷ء کی تاریخ ثبت ہے۔ آزادی کے بعد

ماہِ نو، کراچی، جولائی ۱۹۵۹ء

روزنامچہ خالی پڑا ہے۔ سلطان مبارز خاں کہتے ہیں کہ اب ہم ریمارک لکھوائیں تو کس سے لکھوائیں۔ جو افسر آتا ہے وہ پہلے کبھی نہ کبھی اسی علاقے میں قانونگو، گرداور، تحصیلدار، تھانیدار رہ گیا ہے۔ رہے بڑے بڑے سینیئر افسر تو وہ نہ معلوم کس افراتفری میں مبتلا ہیں کہ دورے پر کبھی اس طرف آتے ہی نہیں۔ آتے ہیں تو نہ انھیں شکار کھیلنے کا شوق نہ روزنامچہ لکھنے کی فرصت۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں ان سے ریمارک لکھواتے ہوئے کچھ شرم سی آتی ہے۔

مجموعی حیثیت سے اگر تاریخی واقعات کی اوسطاً نی صد نکالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس مسلمان خاندان کے سلاطین اکثر و بیشتر دوسرے مسلمان سلاطین کے خلاف نبرد آزما رہے ہیں۔

باز و عقاب سے شکار کھیلنا کیخسرو خاندان کا مرغوب مشغلہ رہا ہے چنانچہ آج بھی کوئی بیس پچیس نامی گرامی عقاب جن کی کھال میں بھوسہ بھرا ہوا ہے۔ دیوانِ خاص کی دیواروں پر جابجا بیٹھے نظر آتے ہیں۔ ہر عقاب کے نیچے ایک تختی لگی ہے جس پر خطِ نسخ کوفی میں فارسی کا کوئی مشکل سا شعر کندہ ہے اور اُس کے نیچے مرحوم عقاب کی مختصر سی سوانحِ عمری ——— آخری عقاب وہ ہے جس کی آنکھ نکلوا کر خود سلطان مبارز خاں نے اپنی آنکھ میں فٹ کروا رکھی ہے۔

دیوانِ خاص میں آبنوس کا ایک بہت بڑا چوبی بورڈ آویزاں ہے جس پر عہد بعہد کے مصوروں نے سلاطینِ کیخسرو کی تصاویر بنا رکھی ہیں۔ مورثِ اعلیٰ سلطان ممارا خاں کی تو قدِ آدم تصویر موجود ہے۔ مگر باقی سلاطین کے گردن تک صرف چہرے ہی دکھلائے گئے ہیں لیکن اس سے تصویر میں کوئی خاص کمی نظر نہیں آتی کیونکہ بعد کے تمام سلاطین وہی سلطان ممارا خاں کا چُغہ، کمربند اور پاجامہ پہنتے تھے۔

چہروں میں بھی مصوروں نے زیادہ کمال مونچھوں پر صَرف کیا ہے کہ مونچھ اس خاندان کی قومی و تاریخی علامت سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ تصاویر کا یہ بورڈ عملاً گویا مونچھوں کا ایک کیلنڈر ہے جس میں بڑی بڑی جابر، گھنی اور گھمبیر، بلند و بالا مونچھیں نظر آتی ہیں۔ بعض سلاطین کے بارے میں تو مشہور ہے کہ وہ مونچھوں کے دونوں کونوں پر الگ الگ دو تلواریں لٹکا کر چلا کرتے تھے۔ داناؤں کا کہنا ہے ان مونچھوں کے طول بلد اور عرض بلد سے خاندانِ کیخسرو کے عروج و زوال کی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔ جن سلاطین کی مونچھیں شاندار تھیں۔ ان کا دورِ حکومت بھی شاندار ثابت ہوا۔ خود بوڑھے سلطان مبارز خاں کی مونچھیں دیکھ کر آدمی دنگ رہ جاتا ہے کہ اس پیری و ضعیفی میں اتنی گنجان مونچھیں یہ کہاں سے لائے ہیں اور اتنے نحیف و نزار جسم کے ساتھ اتنا بوجھ لیکر چلتے کس طرح ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر سلطان مبارز خاں کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا جائے اور اُن کی مونچھوں کو دوسرے میں، تو مونچھوں والا پلڑا شاید کچھ بھاری ہی نکلے۔ بہرحال سلطان مبارز خاں کی مونچھیں گھنی بھی ہیں، گنجان بھی ہیں، اور ان کا رُخ بھی ہنوز اوپر کی طرف ہے اور سلطان مبارز خاں خوش ہیں کیونکہ خاندان کا ستارۂ عروج انہیں مونچھوں سے بندھا ہوا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ستارہ بلندی کی طرف جا رہا ہے۔

★

قلوپطرہ کا رومانی سفر

ولیم شیکسپیئر
مترجم: رفیق خاور

(نظم کی چھکیلی، ڈولتی بحر میں دریا کی لانبی لانبی، ہولے ہولے اٹھتی لہروں کا سماں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی طرح الفاظ میں بھی اس شاہانہ سفر کے کر و فر اور دریا کے ٹھاٹھ کے ساتھ مختلف سُروں اور آوازوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔)

سفینہ جس میں بیٹھی تھی وہ ملکۂ پری دِ شاں
غضب تھا اس کے تیرنے کا جادو بھرا سماں
دھیرے دھیرے تیرے جیسے تختِ رواں کوئی
وہ اس کی چمک دمک، وہ اس کی دہکتی لَو
ہو دریا کے دل میں جیسے آگ سی لگی ہوئی
وہ کشتی بھلا کہاں، سنہری سریر تھا
بھبوکا سی روشنی تھی، پانیوں کی تھرتھری
یہ عالم کوئی کہے کہ اک ٹکڑا ابھر کا[1]
بج بج کر بھڑا کے سے ہو پانی میں گر پڑا
وہ دنبالہ سونے کا ڈھلکتا، شفق نما
شعلِ خور بھی جس کے آگے جھک جھک کرے سلام
وہ خوش رنگ بادبان عطر میں بسے ہوئے
سماں ہو بہو جیسے بادلوں میں پینگ[1] کا
وہ خوشبوئیں کہ ان پر ہوا لوٹ لوٹ جائے
جو اک بل ادھر پڑے تو یاں بل پہ بل پڑیں
وہ چپو جیسے سانچے میں نور کے ڈھلے ہوئے
ملے جلے سنہری روپہلی، شعاع دار
اور ان کے نیچے موج جیسی کشتی کی آن بان
تمام جیسے نیلم ایسی انگھڑیوں کے خم پہ ہوں

نفیس ہلکی ہلکی نرم پلکوں کی جھالریں
تھپکتے پانیوں کو تھے کچھ اس طرح سے دمبدم
نفیریوں کے میٹھے میٹھے زمزموں کے ساتھ ساتھ
کہ تال مست ہو کے پانی ناچتا تھا اور کبھی
ہمک ہمک کے پاس آ کے "اک تھاپ اور بھی!"
وہ کامدار سائبان، حریری سنہری بھی
اور اس کے تلے وہ حور لیٹی تھی ناز سے
وہ پیکر کی آن بان، جوبن کی دھوم دھام
مجال کیا بیاں کرے جو کوئی حسن کی ادا
کہ بول اس کے سامنے تھے کھوئے قدرتِ بیاں
کوئی کہے کہ وینس کے ساحروں نے زہرہ کی
عجیب ہی ہنر سے جو تراشی ہے مورتی
بعینہٖ وہی ہے یہ وہی وہی وہی وہی!
مگر جو دیکھیں غور سے تو وہ بت تھا یہ پری
مقابلہ ہی کچھ نہ تھا کچھ ایسی گداز تھی
تھا انگ انگ اس کا نیر، سیال چاندنی
جو تن سیمِ خام کا تو مکھڑا نرا کنول
کہ فطرت ہو پانی پانی اس کے ڈھلاؤ سے
اِک اس طرف اک اس طرف دو لڑکے پری جمال
کمال کے بھنورے تھے جن کی ٹھوڑیوں کی اوٹ میں
وہ مسکراتے جس طرح ہوں کیوپڈ ہی ہو بہو
اُتر کر جو آئے ہیں ابھی آسمان سے
وہ جھلتے تھے مورچھل تو اللہ وہ سماں!
کہ جن نرم نرم گالوں کو ہوا سے ٹھنڈ دیں
وہ گال دہکاتے تھے، بھڑکتے تھے اور بھی
ادھر جو کام وہ کریں ادھر تمام پٹ کریں!

[1] پنجابی: قوس قزح

ماہِ نو کراچی، جولائی ۱۹۵۹ء

فن:

ہماری موسیقی میں جدید تجربے

انور عنایت اللہ

کسی بھی ترقی یافتہ قوم کی سماجی زندگی میں موسیقی کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور شاید اسی لئے فنونِ لطیفہ میں موسیقی کو سب سے اونچا درجہ دیا گیا ہے۔ موسیقی کا تعلق حسِ سمع سے ہے۔ موسیقار گویا ہوا میں گرہ لگاتا ہے۔ یہ ایک نہایت دشوار اور نازک فن ہے۔ دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرح یہ آنکھوں کے سامنے ٹھہرا نہیں رہتا۔ شاعری، اصنام گری، تعمیر اور مصوری کی طرح اس کی کوئی دیرپا شکل نہیں ہوتی کہ اس میں اصلاح و ترمیم ہو سکے یا کسی بہتر فنکار سے امداد لیکر اس کے حسن میں اضافہ کیا جا سکے۔ مغنی کو بر وقت کمال فن کے ساتھ نغمہ کی ایک تصویر ہوا میں بنانی پڑتی ہے اور اس تصویر کو ایک مختصر یا محدود وقت میں اِس درجہ مکمل بنانا پڑتا ہے کہ سننے والا زیادہ سے زیادہ سرور حاصل کر سکے۔

"سُر" موسیقی کی اکائی ہے جو ارتعاش سے پیدا ہوتا ہے۔ خواہ یہ ارتعاش ضرب سے پیدا ہو، خواہ رگڑ سے، خواہ ہوا سے۔ گانے اور ساز، دونوں کی موسیقی کی بنیاد ہی ارتعاش ہے۔ جیسے جیسے ارتعاشات کی تعداد بڑھتی جاتی ہے، سُروں کی آواز چڑھتی جاتی ہے اور ایک حد ایسی آتی ہے کہ تیز سے تیز تر آہنگ میں یہ سُر پھر اپنے آپ کو دہرانے لگتے ہیں۔ غالباً اسی اُصول سے 'برسوں پہلے' فیثاغورث کو سُروں کی سپتک متعین کرنے کا خیال آیا۔ چنانچہ اُس نے سات سُروں کی ایک بنیادی سپتک مقرر کر دی جسے ہماری موسیقی میں بلاول کی سپتک کہتے ہیں۔ اس میں سات سُر مقرر کئے گئے۔ "سا، رے، گا، ما، پا، دھا اور نی" بعد کو ان کے علاوہ پانچ اور درمیانی سُر تشخیص کئے گئے۔ ان ہی بارہ سُروں میں دنیا کی تمام موسیقی سمائی ہوئی ہے۔ یہ وہ سُر ہیں جنہیں گوشِ انسانی آسانی سے تمیز کر سکتا ہے۔

ہماری موسیقی کی بنیاد راگوں پر رکھی گئی ہے۔ راگ چند خوش آہنگ سُروں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ بارہ سُروں کے امتزاج سے لاکھوں متفرق شکلیں بن سکتی ہیں۔ ان ہی مختلف شکلوں کو راگ راگنیوں سے موسوم کیا گیا۔ ان ہی راگ راگنیوں پر ہماری کلاسیکی موسیقی مشتمل ہے۔ کلاسیکی موسیقی سے میری مراد ہماری وہ موسیقی ہے جو صدیوں پرانی ہے اور جسے عوام پکے گانے اور فنی موسیقی کے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کی موسیقی اس علاقے کی تہذیب و تمدن کی طرح بے حد قدیم ہے۔ لیکن ابتدائی زمانے میں موسیقی اتنی ترقی یافتہ نہ تھی۔ ساز بھی گنے چنے ہی ہوتے تھے اور انہیں شاذ و نادر گانے یا ترنم سے اشلوک پڑھنے والوں کے ساتھ بجایا جاتا۔ جب رفتہ رفتہ موسیقی نے ترقی کی تو اس نے دھرپد کی شکل اختیار کی۔ اِس صنف کو بھی مسلمان فنکاروں نے ترقی دی۔ اس کو ہماری موسیقی کی سب سے قدیم شکل سمجھئے۔ یہ نہایت سادہ اور مردانہ طرز کا گانا ہوتا ہے جس میں خدا کی حمد کی جاتی ہے یا شجاعت اور تاریخ کے واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔ اس کا رواج اب بہت کم ہو گیا ہے۔ اس کے بعد 'خیال' گائکی کی ابتدا ہوئی۔ یہ بھی مسلمانوں ہی کی مرہونِ منت ہے۔ دُھرپد میں تانوں کی اجازت نہیں ہے۔ اس بندش سے بچنے کے لئے غالباً 'خیال' کا رواج ہوا جس میں ایک مخصوص ہئیت کے اندر برجستہ تان پلٹوں کے ذریعے تزئین و آرائش کی بہت گنجائش رکھی گئی ہے۔

مسلمان عرب اور ایران سے آئے تو اپنے ساتھ ایک نئی ترقی یافتہ تہذیب لائے۔ ہندوستان اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ یہاں مسلمانوں نے زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں انقلابات پیدا کئے وہاں مقامی موسیقی کو کچھ اس طرح اپنایا اور اس میں اتنی نمایاں تبدیلیاں کیں کہ آج تک یہ اسی نہج پر قائم ہے۔ حضرت امیر خسرو سے لیکر روشن آرا بیگم اور نزاکت علی سلامت علی تک بیسیوں اساتذہ نے اس کو اپنے خونِ جگر سے سینچا اور اس کی نشوونما میں بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ آج جو فن موسیقی برصغیر میں رائج ہے وہ صرف مسلمانوں ہی کا مرہونِ منت ہے۔ مسلمانوں نے نہ صرف خیال، ٹھمری، ترانہ، ٹپہ، غزل وغیرہ گانے کا سلسلہ رائج کیا بلکہ سازکی موسیقی کے سلسلے میں بھی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ طبلہ، ستار، دلربا، سارنگی، سرود، رباب،

وچتر وینا وغیرہ سب کی ایجاد اور ساز کی موسیقی پر صدیوں سے چھائے رہنے کا سہرا مسلمان فنکاروں ہی کے سر ہے۔

ایک عجیب اتفاق دیکھئے کہ جس موسیقی کو صدیوں تک مسلمان موسیقاروں نے اس قدر محنت و مشقت سے پروان چڑھایا۔ اس کو مندروں اور درباروں کے شکنجے سے آزادی دلائی اور عوام تک پہنچانے کی سالہا سال کوشش کی، اس کی زندگی میں ایک ایسا دور بھی آیا جب عوام اس سے دُور بھاگنے لگے۔ اس کی بھی بڑی معقول وجہ ہے۔ شروع شروع میں ہماری موسیقی نے شاہی سرپرستی میں ترقی کی جس سے یہ بڑی حد تک حکمرانوں کے درباروں کا اجارہ بن کر رہ گئی۔ دوسرے لفظوں میں نتیجہ یہ نکلا کہ عوام الناس سے اس کا تعلق برائے نام رہ گیا۔ کلاسیکی فن کی پابندیاں عوام کو نہیں بھائیں تو ٹھمری دادروں کا رواج ہوا۔ یہ عوام کا من دوبارہ موہ لینے کی ایک اچھی کوشش تھی۔ اس کا سہرا تاجدار اودھ واجد علی شاہ کے سر ہے جو موسیقی میں اختر پیا تخلص فرماتے تھے۔ اس کے بعد ایرانی اثرات کے تحت غزلیں گانے کا رواج ہوا۔ موسیقی کی یہ نئی طرز طوائفوں کو بہت بھائی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے سرپرستوں کی تفریح کے لئے زیادہ تر غزل اور پھر اس کے بعد ٹھمری دادرے کو اپنایا جن میں نرت کے ذریعے سامعین کو بھلانے کی بڑی گنجائش تھی۔ کبھی کبھار بندھے ہوئے خیال کو بھی مجروں میں جگہ دی جانے لگی۔ ان سب تغیرات کا نتیجہ یہ بھی نکلا کہ موسیقی ایک ایسے طبقے کی میراث بن گئی جسے عوام اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ اس کی مشکل ٹیکنک کے ساتھ ساتھ اسے گانے والی طوائفوں کی سوقیانہ اور غیر سنجیدہ حرکتوں نے اس کو خاصہ بدنام کر دیا۔ چنانچہ تعلیمیافتہ شریف طبقہ اس سے دُور بھاگنے لگا۔ اب حالات یہ ہیں کہ صرف "گلے بازی" اور کسی راگ یا راگنی کی گرامر کی وضاحت یعنی دوسرے لفظوں میں بے معنی اور بے ہنگم شور و غل کو لوگ کلاسیکی موسیقی سمجھنے لگے ہیں۔ اس کی ذمہ داری فن کی اس نوع سے زیادہ اُن استادوں پر عائد ہوتی ہے جو اپنی لاعلمی کے باعث آواز کے حسن، ادائیگی کے مناسب اور متناسب اُصولوں اور سننے والوں کے میلانِ طبع سے زیادہ راگ کی گرامر اور آواز کی شعبدہ بازی کو اہمیت دینے لگے۔

یوں تو تھیٹروں اور فلموں نے موسیقی کو عوام الناس سے قریب لانے اور مقبول کرنے میں بڑی خدمات انجام دیں لیکن سائنٹیفک اُصولوں پر پہلے گراموفون اور پھر ریڈیو ہی کی آمد سے موسیقی کی ترویج شروع ہوئی۔ اچھی موسیقی کو پہلی بار گھر گھر تک پہنچانے کا سہرا گراموفون اور ریڈیو ہی کے سر ہے۔ پاکستان میں اب تک اچھی موسیقی کو عوام میں مقبول کرنے کی کوششیں سب سے زیادہ ریڈیو ہی نے کی ہیں۔ اس سلسلہ میں جدید تجربے بھی ریڈیو ہی پر کئے جا رہے ہیں۔

پاکستان میں کلاسیکی موسیقی کے احیائے ثانی کا دور ۱۹۴۸ء کے بعد شروع ہوا۔ شروع ہی سے یہ محسوس کیا جانے لگا کہ اس قدیم فن کے متعلق عوام میں بڑی غلط فہمیاں ہیں۔ ان کو دور کیا جانا بے حد ضروری تھا۔ سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی تھی کہ کلاسیکی موسیقی کا صحیح روپ عوام کے سامنے پیش کیا جاتا تاکہ وہ اچھی اور بری موسیقی کا فرق محسوس کر سکتے۔ اس سلسلے میں فلم والوں کے بعض تجربے مفید ثابت ہوئے۔ جنھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ اگر کسی بھی راگ یا راگنی کو صحیح اور معقول طریقے پر پیش کیا جائے تو عوام اس کا بھی اتنے ہی جوش و خروش سے استقبال کر سکتے ہیں جتنا کہ عام ہلکے پھلکے گیتوں کا۔ عرصہ ہوا استاد جھنڈے خاں مرحوم نے ایک مشہور فلم "چترلیکھا" میں ایک انتہائی دلچسپ تجربہ کیا تھا جو بے حد کامیاب رہا۔ انہوں نے اس فلم کے تمام گانوں کی دھنیں ایک ہی راگ "بھیرویں" میں باندھی تھیں۔ اس کے تمام نغمے بے حد مقبول ہوئے۔ اس کے بعد ہماری فلموں میں ایک سے زیادہ گیتوں کو خالص راگوں میں پیش کیا گیا۔ مثلاً خورشید انور نے پاکستانی فلم "انتظار" میں نور جہاں سے ایک گیت ٹوڈی میں گوایا۔ خورشید انور ہی کی ایک دوسری فلم "زہرِ عشق" میں ایک نغمہ راگ پیلو میں ہے جسے ناہید نیازی نے گایا ہے۔ اسی طرح فلم "قسمت" میں روشن آرا کی گائی اور باندھی ہوئی ایک ٹھمری ہے اور فلم "وعدہ" میں نائک سدارنگ کا مشہور درباری کا خیال ہے "نین سے نین ملائے راکھو نیکو بلماں" جسے پاکستان کے دو اچھے کلاسیکی موسیقاروں 'زاہدہ پروین' اور فتح علی خاں نے مل کر گایا ہے۔ اگرچہ یہ تمام گانے راگوں کے پابند تھے پھر بھی یہ عوام میں بے حد مقبول ہوئے۔ ان تجربوں نے ایک بار پھر یہ ثابت کر دیا کہ جہاں تک کلاسیکی موسیقی کی عوام میں نامقبولیت کا تعلق ہے، قصور موسیقی کا نہیں بلکہ ان لوگوں کا تھا جو راگوں کی روح اور اس کے صحیح تاثرات کو سمجھنے کی بجائے ان کی ظاہری وضع پر جان دیتے تھے۔ گانے والوں کے مختلف گھرانوں میں اختلافات کے باعث ہر موسیقار بڑی تندہی سے کوشش کرنے لگا کہ راگوں کو ثقیل سے ثقیل تر بنا کر پیش کیا جائے۔ اس سے بتدریج راگوں کا روپ اس قدر بھیانک ہوتا گیا کہ لوگ ان سے دور بھاگنے لگے۔

ان تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد پاکستان میں سب سے پہلے یہ کوشش کی گئی کہ راگوں کے قالب سے زیادہ ان کی روح کو اہمیت دی جائے۔ عوام کو راگوں سے مانوس کرنے کے لئے ریڈیو نے ایک دلچسپ تجربہ یہ کیا کہ غزلیں اور گیت راگوں میں پیش کئے جانے لگے۔ اس کے ساتھ ساتھ کلاسیکی موسیقی کا ایک پروگرام "راگ رنگ" شروع کیا گیا جس میں سامعین کی موجودگی میں ایک ہی خیال کو کئی فنکاروں نے مل کر گانا شروع کیا۔ اس سے فائدہ یہ ہوا کہ پہلی بار سب نے مل جل کر راگ کے صحیح روپ، اس کے صحیح تاثر کو ابھارنے کی کوشش کی ورنہ اب تک تو ہر استاد کو صرف اپنے ہی فن کے مظاہرے کی فکر ستایا کرتی تھی۔ اسے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ اس شعبدہ بازی میں راگ کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ جب دو یا دو سے زیادہ فنکاروں کو ایک ساتھ کوئی راگ پیش کرنا پڑا تو "گلے بازی" اور "شعبدہ بازی" بڑی حد تک ختم ہو گئی۔ یہ سلسلہ اب بھی ایک عبوری دور سے گزر رہا ہے۔ یہ تجربہ کس حد تک کامیاب ہو سکتا ہے، اس کا جواب تو وقت ہی دے سکے گا۔

عوام میں ہماری موسیقی کی مقبولیت کے سلسلے میں ایک اور دقت 'خیال' کے بولوں کی تھی۔ یہ محسوس کیا گیا کہ عوام اس وقت تک کسی نغمے کو قبول نہیں کر سکتے جب تک ان کے بول، چاہے یہ نغمے کلاسیکی ہوں یا ہلکے پھلکے، معقول نہ ہوں۔ چونکہ ہماری موسیقی کی ابتدا صدیوں پہلے دیوتاؤں کے مندروں میں ہوئی۔ اس لئے اکثر قدیم راگوں کے بول بھجنوں کا رنگ لئے ہوئے تھے۔ حضرت امیر خسروؒ پہلے عظیم موسیقار تھے جنہوں نے پہلی بار راگوں کو ان سنسکرت بولوں اور دیوی دیوتاؤں کی شان میں قصیدوں کے چکر سے آزاد کرنے کی کوشش کی۔ مثال کے طور پر ان کے باندھے ہوئے بول ملاحظہ فرمائیے:۔

حضرت خواجہ سنگ کھیلئے دھمال

بیٹھ خواجہ تم بن ٹھن آئے حضرت رسول صاحب جمال

حضرت خواجہ سنگ کھیلئے دھمال

اور ——

نجام الدین پیر اولیا

نجام الدین شانِ انبیا

خسرو آن پڑے چرنن میں، کرپا کرو بہر کریا

نجام الدین پیر اولیا

یہ سلسلہ حضرت امیر خسرو سے لیکر میاں تان سین، محمد شاہ رنگیلے کے درباری گویّے سدا رنگ اور بہادر شاہ ظفر تک جاری رہا اور نئے نئے بول باندھے گئے۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں ایک ایسا دور بھی آیا جب موسیقی چند مخصوص گھرانوں کی میراث بن کر رہ گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو بول ورثے میں ملے۔ اُن میں ترمیم کو بدعت قرار دیا گیا۔ اور اس طرح ہم تک زیادہ بول ایسے آئے جو نہایت فرسودہ اور بے معنی تھے۔ بہت جلد سمجھدار لوگوں کو یہ احساس بھی ہو گیا کہ عوام ان بے معنی بولوں کی وجہ سے بھی کلاسیکی موسیقی سے دور بھاگتے ہیں۔ اب ہماری موسیقی کے اس اہم پہلو کے سلسلہ میں بھی بعض اچھے تجربے ہو رہے ہیں۔ اس سلسلے میں وہی لوگ کام آ سکتے ہیں جو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ موسیقی سے بھی شغف رکھتے ہوں اور جنہیں عروض کی پابندیوں کے ساتھ ساتھ راگوں کے تاثر کی بھی سوجھ بوجھ ہو۔ چنانچہ بعض ایسے ہی ذہین فنکاروں نے اب اس کی طرف دھیان دینا شروع کیا ہے جن میں اوروں کے علاوہ افضل پرویز اور "خوش رنگ پیا" نے اچھے اچھے نئے بول باندھے ہیں۔ اول الذکر کے باندھے ہوئے راگ بھیروں کے خیال کے بول ملاحظہ ہوں (تال چو تالہ):۔

استھائی:۔ "نور سحر پھیلا ہے ہر سو، جھلمل کرتے نیارے تارے سارے لرز رہے ہیں —— نور سحر ——!

انترا:۔ "چھٹنے کو ہے گھور اندھیرا —— کوچ ہوا ہے رین کا ڈیرا —— اندھیارے کے سنگی تارے لاج کے مارے لرز رہے ہیں —— نور سحر ——؟

بھیروں صبح کا راگ ہے۔ اس کی مناسبت سے خیال کے ان بولوں کا تاثر بہت عمدہ ہو جاتا ہے۔

"خوش رنگ پیا" کے یہاں بھی راگوں کا صحیح تاثر ملتا ہے۔ ان کے دلکش اور سادہ بول اب اکثر ریڈیو پر سنائی دیتے ہیں۔ ان کے خیال دد باری کے بول ملاحظہ فرمائیے:۔

"نظر کرم فرماؤ —— گو ہر طرب برساؤ —— دد باری کے گن جن، مل کے خوش رنگ کے سنگ —— داتا کے گن گاؤ —— گو ہر طرب برساؤ —— نظر کرم فرماؤ"

اور غالباً یہ بھی خوش رنگ ہی کے بول ہیں۔ یہ 'خیال' بہار ہے جو ایک تال میں گایا جاسکتا ہے:-

استھائی:- "آئی ہے بہار قلب ونظر کا قرار"۔

انترا:- "زندگی سپنا تو نہیں ہے ــــ جلوہ ہے پردا تو نہیں ہے ــــ کاکلیں سنوار آئی ہے بہار ــــ!"

پاکستان میں لوک گیتوں کا سرمایہ ایسا ہے جس پر ہم بجا طور پر ناز کرسکتے ہیں۔ ریڈیو ہی نے ہلکے پھلکے گانوں کے لئے ان لوک دھنوں کو بڑی کامیابی سے اپنانے کی کوشش کی ہے۔ لوک دھنوں میں اکثر گیت بھی نشر کئے جاتے رہے ہیں اور غزلیں بھی۔ اس کے علاوہ ایک علاقے کی دھنوں میں دوسرے علاقے کے گیت کی طرزیں بھی کانوں کو بھلی لگتی ہیں۔ مثلاً بھٹیالی کی دھن میں کوئی پنجابی گیت یا ہیر کی دھن میں کوئی بنگالی نغمہ۔ ابھی یہ تجربہ بھی عبوری دور سے گذر رہا ہے لیکن آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ سلسلہ عوام کو بہت پسند آئے۔

ہماری موسیقی میں اب تک انفرادی کوششوں کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اسی لئے ہمارے یہاں شروع سے مغربی انداز میں آرکسٹرا کبھی پنپنے نہیں پایا۔ کئی سال ہوئے قیام پاکستان سے پہلے استاد علاء الدین خاں نے بعض تجربے کئے تھے۔ اس کے بعد فلموں نے آرکیسٹریشن کی کوشش کی۔ ان کوششوں کو ریڈیو نے اپنایا اور اب اس سلسلے میں بھی خاصے کامیاب تجربے کئے جارہے ہیں۔

خیال کے نئے بولوں کے سلسلے میں تو نہیں لیکن راگ راگنیوں کو اچھے اشعار کے روپ میں ڈھالنے کی بعض دوسرے شعراء نے بھی خاصی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ مثلاً قتیل شفائی، سیف الدین سیف، مختار صدیقی، احمد راہی وغیرہ۔ یہ تجربے اس لئے بھی اہم ہیں کہ راگوں کے تاثر کو شعر کے قالب میں پیش کرنے کی غالباً یہ پہلی کوششیں تھیں۔

شعر و نغمہ کے ذریعے سامعین کے ذہن میں مختلف تاثرات پیدا کرنے کے بھی بعض تجربے کئے جاتے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں رفیق غزنوی نے عرصہ ہوا صرف سازوں کی مدد سے ایک دلچسپ کوشش کی تھی۔ اس پروگرام کا عنوان "سناٹا" تھا۔ صرف آوازوں کی مدد سے تصویر کشی خاصا مشکل کام ہے کیونکہ صوتی اثرات کا بھلا تصویروں سے کیا تعلق۔ لیکن متذکرہ بالا ریڈیو پروگرام میں مختلف آوازوں کے ذریعے، ان کے اتار چڑھاؤ اور ایک خاص انداز میں، مختلف سازوں کی ہم آہنگی سے سناٹے کو ابھارنے کی خاصی کامیاب کوشش کی گئی تھی۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے، عربی اور عجمی موسیقی کے میل ملاپ کے بعد ہی ہماری موسیقی نے اپنی موجودہ شکل اختیار کی ہے۔ غالباً اسی لئے قیام پاکستان کے بعد سے اردو غزلوں اور گیتوں کو عربی اور ایرانی دھنوں میں پیش کرنے کے تجربے کئے جاتے رہے ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں دقت یہ آن پڑی کہ اِدھر ہم نے تو خالص عربی اور ایرانی دھنوں کو اپنانے کی کوشش کی اور اُدھر عرب اور ایران میں موسیقی نے کچھ اور ہی رخ اختیار کیا۔ وہاں موسیقار اب "میلوڈی" کو خیرباد کہہ کر بڑی تیزی سے "ہارمونائزیشن" یعنی تالیفی موسیقی کی طرف جارہے ہیں۔ اسی لئے آئے دن وہاں خالص مغربی موسیقی کو مکمل طور پر اپنانے کی پُرخلوص کوششیں ہورہی ہیں۔ ہمارے ہاں بھی بعض موسیقاروں کا رجحان کچھ ایسا ہی ہے: ہارمونائزیشن کے تجربے ہورہے ہیں۔ لیکن ہماری موسیقی کا مزاج ہی کچھ ایسا ہے کہ شاید ہی وہ مغربی رنگ آسانی سے قبول کرسکے۔ اسی لئے ہمارے خالص دیسی سازوں پر یہ بدیسی نغمے کچھ عجیب سے لگتے ہیں۔

ان کے علاوہ آئے دن ہماری فلموں میں بھی بعض عجیب وغریب تجربے کئے جارہے ہیں۔ پچھلے سات آٹھ سال کی پاکستانی فلموں کا جائزہ لیا جائے تو بڑے خطرناک رجحانات کارفرما نظر آتے ہیں۔ میرا اشارہ ہماری فلمی موسیقی پر مغرب کے اثرات کی طرف ہے۔ میں ان اثرات کا مخالف نہیں کیونکہ میرا یقین ہے کہ فن کی کسی بھی نوع کی صحیح نشو ونما کے لئے ضروری ہے کہ اس کے دروازے ہمیشہ کھلے رہیں تاکہ وہ مناسب حد تک بیرونی اثرات قبول کرسکے۔ لیکن ان دنوں جس قسم کے رجحانات کارفرما ہیں۔ وہ موسیقی کو غلط راستے پر لئے جارہے ہیں۔ بدقسمتی سے آجکل ہماری فلموں میں جس قسم کی مغربی موسیقی کی نقالی ہورہی ہے اسے خود مغرب میں کبھی اعلیٰ درجہ کی موسیقی نہیں سمجھا گیا۔ جیز اور ریگ ٹائم وغیرہ کا رونا ہی کیا، اب تو راک اینڈ رول کی قسم کی بھونڈی موسیقی کی نقالی بھی شروع ہوگئی ہے۔ فنی طور پر یہ تجربے غلط ہیں۔ ان سے ہماری موسیقی کے مزاج کو نقصان پہنچنے کے امکانات ہیں اگر فلمی موسیقی کے معیار کو بلند کرنا ہے تو اس نقالی کی خطرناک وبا کو فوراً سختی سے روکنا ہوگا۔ اس کا سدباب ضروری ہے ورنہ مجھے یقین ہے ہمارا بھی وہی حشر ہوگا جو اُس روایتی کوے کا ہوا تھا جس نے اپنی چال بھول کر ہنس کی چال چلنے کی کوشش کی تھی۔

غزل

تابش دہلوی

کبھی دنیا سے کوشش بھی اگر کی دور جانے کی
ہمارے پاؤں میں زنجیر تھی گردش زمانے کی

جراحت ہے تبسم کا نتیجہ، باوجود اس کے
گلوں کو دیکھ کر کرتا ہوں کوشش مسکرانے کی

ہوائے فصلِ گل رکھتا ہے پیہم اس خرابی پر
ابھی چھوٹی نہیں ہے دل کی عادت زخم کھانے کی

حیاتِ جاوداں بخشی گئی اہلِ محبت کو
تمنا رہ نہ جائے تجھ کو خنجر آزمانے کی

یقیں کرتے نہیں اب وعدہ ہو یا وہ عذرِ وعدہ ہو
کہ ہم لیتے ہیں لذت اس طرح تیرے بہانے کی

دلِ حیراں کو اک نقشِ تصور کے سوا حاصل
ترا اس طرح آنا، ایک صورت ہے نہ آنے کی

ہمیشہ ٹوٹ کر گرنے کو ہے بیتاب اے تابش
یہ ہے برقِ بلا یا شاخ کوئی آشیانے کی

نظر حیدرآبادی

ملا نہ فصلِ گل و وصلِ گل رخاں سے مجھے
فغاں کہ چین میسر ہوا فغاں سے مجھے

وہ اور ہوں گے اکیلے گئے جو منزل تک
نشانِ راہ ملا گردِ کارواں سے مجھے

شباب، شعر، ترنم، شراب، حسن، سرور
حیات لے کے چلی ہے کہاں کہاں سے مجھے

بتاؤ کیوں نہ کروں ایسے حادثوں کو سلام
گزارتے ہیں جو ہر راہِ امتحاں سے مجھے

ملے ہیں کتنے خرد آزما رموز نہ پوچھ
جنوں کی چند حکایاتِ خونچکاں سے مجھے

ابھی تو قصۂ آدم تمام ہونا ہے
مگر یہ کس نے پکارا ہے درمیاں سے مجھے؟

بچا لیا غمِ دوراں کے تازہ مضموں نے
قفس سے، دام سے، بجلی سے، آشیاں سے مجھے

نظر زبانِ غزل سے فروغِ نظم ہوا
ملا یہ نکتہ تری شوخیٔ بیاں سے مجھے

شرق

(ایک مغربی سیاح —

پاکستان میں جو آٹھ کروڑ لوگ آباد ہیں ان میں سے آدھے مشرقی پاکستان میں بستے ہیں اور اگرچہ یہ مغربی پاکستان سے گیارہ سو میل دور واقع ہے، پھر بھی پی آئی اے کے تیز پرواز طیارے اس طویل فاصلے کو ایک ہی رات میں طے کر کے صبح سے پہلے ہی یہاں کے پُرسکون دارالحکومت ڈھاکہ پہنچا دیتے ہیں جہاں سمندر کی مخصوص بو ہوا میں رسی بسی ہوتی ہے اور لہلہاتی ہوئی ہریاول ہر طرف وہ جادو جگاتی ہے جو گرم مرطوب علاقوں کی روحِ رواں ہے۔ اور انسان کو کراچی کی بین الاقوامی فضائیں بھلا دیتی ہے جیسے یہ بڑی دور کی چیز ہو۔

کئی اور حیثیتوں سے بھی مشرقی حصہ کی رفتارِ زندگی بہت مختلف ہے۔ یہاں زندگی ہولے ہولے پگ بھرتی ہے اور مغربی پاکستان کے بڑے بڑے شہروں کی ما دہوا در ہلچل بالکل مفقود نظر آتی ہے۔ ڈھاکہ، جس کی بنیاد بنگال کے مغل نواب نے رکھی تھی، اپنی پتھر کی موجودہ پکی بل پیچ کھاتی سڑکوں اور بہت بڑے ٹاپو کے باوجود بدستور اپنی مشرقی وضع لئے ہوئے ہے۔ گو اُردو اور انگریزی سارے مشرقی پاکستان میں بولی اور سنی جاتی ہیں، لیکن مقامی زبان بنگالی ہی ہے۔

مشرقی پاکستان کی دلکشی اس کے مخصوص وضع کے لوگوں میں مضمر ہے۔ بعض فرنگیوں کی طرح بالکل صفاچٹ، بعض لمبی لمبی داڑھیوں والے یعنی اسرائیلی فریسیوں اور فقیہوں کی طرح ریشائیل اور بعض بودھی چپ چاپ، چلچلاتی دھوپ میں ننگی چندیا کے ساتھ رواں۔ ایشیا کا پس منظر اس ملک میں کہاں نہیں؟ وہ برمی وضع کے پگوڈا، وہ سیامی وضع کے راہب خانے، کسی گلی یا پہاڑی پر جھرمٹ بنائے، مسجدوں سے دور — اور پھر کہیں کہیں گرجے بھی۔

ڈھاکہ کی اپنی ہی انفرادیت بھی ہے اور اہمیت بھی۔ اس کا ماضی اس کی پرشکوہ عمارتوں میں محفوظ ہے۔ مثلاً لال باغ جس میں بی بی پری کا مزار ہے۔ ان عمارات کی نادر طرح اور کاریگری مغل دور کی صناعی کا دلآویز نمونہ ہے۔ یہاں شاہجہاں نے بڑے بڑے شاندار محل بنائے۔ تمام مسجدیں تاریخی اہمیت رکھتی ہیں۔ ہندوؤں کے مندر اور ہی کشش رکھتے ہیں۔ مسافروں کے لئے ایک تقریباً نیا ہوٹل "شاہ باغ" تیار ہوا ہے جو ایک عظیم الشان حویلی معلوم ہوتا ہے۔ تمام فرشوں پر سنگ مرمر کے اتنے ستون نصب ہیں کہ بے اختیار کسی کے یہ الفاظ یاد آتے ہیں:۔

"مجھے خواب آیا کہ میں ایک ایوان مرمریں آسودہ ہوں!" سامنے نظر اٹھا کر دیکھیں تو ہرے ہرے تختوں پر نیا ریڈیو اسٹیشن ایک قلعہ کی طرح سر اٹھائے کھڑا ہے۔ اور "شاہ باغ" کی چمک دمک کے ساتھ اپنی آب و تاب ملا کر خوب جگمگ جگمگ کرتا ہے۔

مشرقی پاکستان کے پیچ بل کھاتے دریا لگاتار بارش سے اُمڈ اُمڈ کر بہتے ہوئے اپنی ہی ایک زندگی رکھتے ہیں۔ سارے علاقے میں پٹ سن کے کارخانے جو ہزارہا لوگوں کو برسرِ روزگار رکھتے ہیں، یہاں کی مرطوب ہوا کا فیضان ہیں۔ کریم جوٹ ملز کو ملتے ہوئے لنگی پوش کارکنوں کا تانتا، دریا کے تنگ تنگ کناروں پر نہ صرف بڑا دلکش سین پیش

ماہ نو، کراچی، جولائی ۱۹۵۹ء

غرب

-کی نظــر میں)

کیمل میرلوئی

خواہ آپ ہوائی جہاز سے آئیں یا سمندر کی راہ سے، بہرحال آپ کو کراچی ہی سے گزرنا پڑے گا جو دنیائے مشرق کا باب داخلہ ہے۔ اور سچ پوچھئے تو ایک مغربی سیاح کی نظر میں یہ شہر ہو بہو "مشرقیت" کی تصویر معلوم ہوتا ہے۔ جونہی انسان طیارے یا سمندری جہاز سے نیچے اترتا ہے، پاکستان کے گہما گہمی سے پُر دارالحکومت کا جادو اس کے دل پر طاری ہو جاتا ہے۔ بڑے لطف کی بات یہ ہے کہ وہی نفیس نئی وضع کی سڑکیں جن پر جدید ترین ماڈل کی کاریں تیزی سے دوڑتی نظر آتی ہیں، انہی پر اونٹ بھی اپنی دھن میں مست اسی طرح بے تکلف چلتے پھرتے نظر آتے ہیں جس طرح انسان۔ ٹھیک ہے اونٹ یونہی شتر بے مہار نہیں ہوتے کہ آپ ہی آپ اینڈتے پھریں بلکہ وہ غریب بھاری بھرکم ٹھیلوں سے جتے ہوئے انہیں کھینچے لئے جاتے ہیں اور یوں لگتے ہیں جیسے کسی گھنے جنگل میں بڑے بڑے، زمین ہموار کرنے والے دبابے جنہیں "بل ڈوزر" کہتے ہیں، اور ہم مغرب کے رہنے والوں کو بڑے عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہمارا تصور ان کے بارے میں بہت رومانوی یا الف لیلوی قسم کا ہے۔ یعنی یہ صحرا کے جہاز لق و دق صحراؤں میں کاروانی شاہراہوں پر گامزن رہتے ہیں۔ یا اہرام مصر کے ارد گرد دور دراز مقامات کا چکر کاٹتے پھرتے ہیں۔ بے شمار گدھا گاڑیاں جن سے چلتے وقت گھنگھروؤں کی جھنکار بلند ہوتی ہے، اور سہ پہیہ سائیکل رکشہ گھومتے جھولوں کی طرح گل بوٹوں سے آراستہ ایک میلے کا سا سماں پیدا کرتے ہیں۔ اگر آپ زیادہ خوش قسمت واقع ہوئے ہوں تو شاید صدر پاکستان کا حفاظتی دستہ اپنی رنگا رنگ کی پوشاک زیب تن کئے گھوڑوں پر سوار آپ کی نظر سے گزر جائے، یا گھوڑ سوار پولیس کا دستہ یا کوئی بارات جس کے سامنے بینڈ بجانے والے رنگ برنگی پوشاک پہنے بینڈ بجا رہے ہوں، دولہا پھولوں سے آراستہ گھوڑے پر سوار اور اس کے پیچھے پیچھے براتی چلے جا رہے ہوں۔ حق یہ ہے کہ بڑی آب و تاب سے چمکتا ہوا سورج، گہرے نیلے رنگ کا آسمان اور مردوں عورتوں کے لباس کی حیرت انگیز گونا گونی، یہ سب آپ کی نظر میں کسی تیوہار کا سماں پیدا کر دیتے ہیں۔

کراچی بس یہی چمک دمک اور چہل پہل ہی نہیں۔ جیسا کہ صریحاً ڈیڑھ لاکھ آبادی کا کوئی شہر نہیں ہو سکتا۔ آخر یہ آج سے سو برس پہلے محض مچھلیاں پکڑنے کی ایک چھوٹی سی بستی ہی تو تھا۔ اس لئے گو اس کے بعض حصے ترقی کرتے کرتے جدید وضع کے بڑے بارونق علاقے بن گئے ہیں لیکن ان سے ہٹ کر جو علاقے نواحیات میں ہیں وہ ویسے ہی پرانے لگتے ہیں۔

دو باتوں نے کراچی کو ترقی کرنے میں مدد دی: یہ ایک بڑی بندرگاہ بھی تھی اور بین الاقوامی ہوائی اڈہ بھی۔ جو براعظم ایشیا اور یورپ کا سنگم ہونے کی وجہ سے بڑی اہم کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اور مشرق و مغرب کو آپس میں ملاتا ہے۔ یہ تقریباً ہر ہوائی شاہراہ کا پڑاؤ ہے۔ اور یہاں آنے جانے والے مسافروں کے لئے اس کے بڑے بڑے ہوٹلوں میں جو آسائش مہیا کی جاتی ہیں وہ لندن، پیرس اور نیویارک کے ہوٹلوں کا مقابلہ کرتی ہیں۔ دوستانہ تعلقات کی بنا پر یہ پرتگیزی ہند کے دارالحکومت، گوا پہنچنے کا واحد ہوائی

شرق:

کرتا ہے بلکہ صنعت کے حق میں بھی بے حد مفید ہے۔ ستلیاں، رسّے، ٹوکریاں، اور قالین جو دنیا کے نصف حصہ میں دُور دُور تک پہنچتے ہیں، زیادہ تر مشرقی پاکستان ہی میں تیار ہوتے ہیں۔ میرا آدھے سے زیادہ وقت بڑے بڑے شہروں سے دور دیہات ہی میں گزرا لیکن مجھے وہاں کی زبانوں میں بولنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ لوگ مسکراہٹوں اور حرکات و سکنات ہی سے اپنا مطلب ادا کر لیتے تھے۔ مشرقی پاکستان کے ایک سرے سے دوسرے تک دوستی ہی دوستی ہے۔ جونہی کوئی اجنبی وہاں پہنچتا ہے یہ اس تک لپک کر پہنچتی اور اس کو گھیر لیتی ہے۔

چاٹگام کی چہل پہل اور ہلچل سے پُرعظیم بندرگاہ میں ساتوں سمندر کے جہازوں کا نظارہ، ہری بھری پہاڑیوں کے پس منظر میں، عجیب سنسنی سی پیدا کرتا ہے۔ میل ہا میل لمبا دریائے کرنافلی پیچ و خم کھاتا، پہاڑیوں کے دامن دامن رواں، سطح پر ہر طرح کی کشتیاں، ہاؤس بوٹ وغیرہ، لوگوں سے کھچا کھچ بھرے لانچ، آس پاس اُگنے والے گیلے پٹ سن اور دوسری زرعی پیداوار سے لدے بڑا سہانا منظر پیش کرتے ہیں۔

پہاڑی علاقے تک دریا سے، بذریعہ رنگامتی یا جیپ کے پہنچتے ہیں۔ یہ بھی مشرقی پاکستان کے اندر ایک اور ہی دنیا ہے — وادیوں میں دھان کے کھیتوں، اور پرانی وضع کے فارموں کی دنیا جہاں لوگ اس طرح رہتے سہتے ہیں جس طرح ان کے آباؤ اجداد — صرف ایک لنگوٹی پہنے، دھقانی ماماہی کی طرح بھوری بھوری۔ یہ تمام دیہاتی لوگوں کی طرح ڈھور ڈنگروں کے ساتھ اور ان میں مل جل کر ہی رہتے ہیں، جو کبھی کبھی ان کے گھاس پھونس کے جھونپڑوں میں عین اس وقت گھس آتے ہیں جبکہ گھر والے کھانا کھا رہے ہوں اور اپنی تھوتھنی سے بڑی بے تکلفی کے ساتھ ٹہوکا دے دے کر روٹی کا ٹکڑا یا لقمہ طلب کرتے ہیں۔

ضلع جات کے کمشنر اور عمال کی بھی ایک روش خاص ہے۔ پرانی وضع کے رعونت پسند حکام اب کہیں نہیں رہے۔ نئے ملک کے عمال ایک نئی روح سے سرشار ہیں۔ اگر کوئی مہمان ریسٹ ہاؤس میں تنہا محسوس کرے تو وہ اسے اپنے یہاں قیام کی دعوت دیتے ہیں اور وہ بھی یہ معذرت کرتے ہوئے کہ افسوس ہے ان کا مکان مہمان کے شایانِ شان ایوان نہیں — عوام ان عمال تک بآسانی پہنچ سکتے ہیں۔ اور حکومت کا کاروبار زیادہ تر عمال اور جمہوریوں کی باہمی فلاح و بہبود کے لئے مل جل کر کام کرنے پر موقوف ہے۔

یہی روح کاروباری حلقوں میں بھی دکھائی دیتی ہے چنانچہ چندر گونہ کے عظیم الشان کارخانۂ کاغذ سازی میں جہاں مشینیں دیہاتی ماحول میں بڑی گھڑ گھڑاتی ہیں، کارکن اپنے ہی گھروں میں رہتے ہیں۔ ان سب کو ملک کے مستقبل میں بڑی دلچسپی ہے اور وہ فخر کرتے ہیں کہ کرنافلی کے مہتم بالشان کارخانے اتنی بھاری مقدار میں کاغذ تیار کرتے ہیں جو پاکستان کے لئے بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ اور وہ بھی تمام تر اپنے ہی کچے مال یعنی بانسوں سے اپنے ہی کارکنوں اور ماہرین کی بدولت۔ چنانچہ ایک خوش خلق اور مستعد منتظم کے زیرِ نگرانی دل، دماغ، سائنس، خام مال، اور بہترین سب مل کر طلسمی تیز رفتاری سے وہ نفیس چیز تیار کرتے ہیں جو کارخانے سے باہر نکلنے سے پہلے ہی بک جاتی ہے۔

یہاں سے کوئی پچاس میل دور موضع کپتائی واقع ہے۔ جہاں جدید امریکی پن بجلی کی مشین نصب ہے۔ یہ مشین سچ مچ جادو کرتی ہے۔ اور برسوں کے وحشی لاابالی بے قابو پانی کو بڑی استادی سے قابو میں لے آتی ہے اور اتنے وسیع علاقے کی جملہ ضروریات کے لئے بجلی مہیا کرتی ہے۔ دو ملکوں کا یہ باہمی تعاون اور اس سے پیدا شدہ ترقی کی روح پاکستان کے خوشتر مستقبل کے لئے ایک نیک فال ہے۔

کارخانوں کی فضا سے ہٹ کر تفریح گاہوں کی طرف رُخ کیا جائے تو ہماری نظر "کاکس بازار" پر پڑتی ہے۔ یہ بڑا ہی دلکش، بڑا ہی خوبصورت ساحلی علاقہ، جو طولِ ساحل میں اپنی مثال آپ ہے۔ گھنے جنگلات سے ڈھکی پہاڑیوں کے دامن میں واقع ہے۔ کراچی کا "ہاکس بے" بھلا اس کا کیا مقابلہ

غرب:

اڈہ ہے۔ اگر ہم سات سمندروں میں سے کسی پر بھی سفر کرنا چاہیں تو کراچی کی بندرگاہ سے کسی جگہ کے لئے بھی جہاز پر سوار ہو سکتے ہیں۔ اس سے سیاحوں کو بڑا خوشگوار احساس ہوتا ہے کہ ان کے لئے آمد و رفت کا صرف ایک ہی راستہ نہیں۔

کراچی کی گرینہ پا ترقی کا حقیقی سبب وہ خدا ساز اتفاق ہے جس نے اس کو ۱۹۴۷ء میں دنیا کی چھٹی سب سے بڑی مملکت کا دارالحکومت بنا دیا اور چند ہی سالوں میں اس کی آبادی تین گنا ہو گئی۔ نیز دنیا کے تقریباً تمام بڑے ملکوں نے یہاں اپنے سفارت خانے قائم کر دئے۔

کراچی ایک ایسی جگہ ہے جہاں مسلم، ہندو، عیسائی، پارسی اور بہائی سبھی بستے ہیں اور سڑکوں پر سے گذرتے وقت ان سب کی عبادت گاہیں دکھائی دیتی ہیں۔ زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ مذہب، تہذیب، لباس، طور طریقوں کا تلون کچھ بھی ہو، انسانوں کے اس بے پایاں سلسلے میں یہ بالکل قدرتی خیال کیا جاتا ہے۔ اور کوئی شخص کسی دوسرے کو دیکھ کر متعجب نہیں ہوتا۔ چنانچہ آپ کو سڑکوں پر یورپین اور امریکن خواتین مغربی لباس میں نظر آئیں گی اور ان کے پاس ہی سندھ کے بالائی حصے کی سانولی مگر خوش اندام عورتیں بڑی نفاست سے کاڑھے اور رنگے ہوئے سرخ و سیاہ پارچات پہنے چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ انہی کے ساتھ آپ آجکل کی پاکستانی ملازمت پیشہ خواتین کو بھی لہراتی ساڑیاں یا شلوار قمیض پہنے بڑی اولوالعزمی کے ساتھ رواں پائیں گے۔ ان کے علاوہ بلوچی اور پارسی خواتین بھی ہیں اور وہ بھی جو قیام پاکستان کے بعد برصغیر سے یہاں آئیں، سب اپنے اپنے لباس میں۔ مختلف النوع لوگوں کے گوناگوں لباس بڑا ڈرامائی اثر رکھتے ہیں۔ اور چاہے وہ کتنی ہی غریب کیوں نہ ہو، بڑی بوڑھیوں سے لے کر چھوٹی چھوٹی بچیوں تک، سبھی چم چم کرتی چوڑیوں سے ضرور آراستہ ہوں گی۔

اُن بازاروں کی سیر جہاں گاہکوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے۔ بجائے خود ایک سامانِ کیف ہے۔ گھوڑا گاڑیوں کے ساتھ ہی ساتھ صاف ستھری چمکتی دمکتی کاروں کا تانتا لگا رہتا ہے اور بسیں مسافروں سے کھچاکھچ بھری رستی چلی جاتی ہیں۔ تنگ تنگ پیچ پیچ ٹیڑھے میڑھے گلی کوچوں میں عجیب و غریب وضع کی نوکدار جوتیاں، چمکیلے موتیوں سے جڑی انوکھے اور نادر ڈھنگ کی، اتنی ہی عام اور مقبول ہیں جتنے ہمارے یہاں پانچ پانچ سینٹ کے کینڈی بار یا شکر پارے۔ اتنے کم قیمت روپہلی زری سلیپر اور چپلیں، ایسی کامدار اور موتیوں سے ٹکی ہمارے لئے تو بڑا حیران کن سودا ہیں۔ انسان چاہتا ہے اس کے پاس بے اندازہ وقت بھی ہو اور جگہ بھی کہ ان بیش بہا چیزوں کو سمیٹتا چلا جائے۔ صرافے میں دستی بنے ہوئے بڑے ہی خوبصورت اَن گنت کنگن اور ہار انسان کو اپنی طرف کھینچے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اہل پاکستان کو اس قسم کی چمک دمک بہت پسند ہے جو سورج کی کنگرہ کنگرہ کرنوں سے ملتی جلتی ہے۔ اس حیرت انگیز سرزمین کے فنون اور دستکاریاں ہاٹ بازاروں میں عام دکھائی دیتی ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں کے معمولی سے معمولی اَن پڑھ لوگ بھی فن کا کتنا سلیقہ رکھتے ہیں۔ شاید یہ مسلمانوں کا موروثی جوہر ہے کیونکہ ساڑیاں بنانے والے، جڑاؤ کام کرنے والے اور پیتل کو بڑی ہی محنت سے پیٹ پیٹ کر نفیس برتن بنانے والے کاریگر، سب میں وہ فطری ذوق اور شعور پایا جاتا ہے جس سے انمول، یادگار چیزیں وجود میں آتی ہیں۔

کراچی کے نواح میں سماجی بہبود کے کارکنوں نے ان ہنرمند کاریگروں کی ایک پوری بستی آباد کر دی ہے۔ اسی طرح ملتان کے نواح میں بھی ایک بستی ہے اور کچھ عجب نہیں کہ ایسی اور بھی کئی بستیاں ہوں۔

مشرق:

کر سکتا ہے ۔ میل ہا میل پھیلا ہوا ساحلی علاقہ جہاں موجیں نرم و سبک رو ہیں اور رنگین پوش مچھیرے پانی میں بار بار جال ڈال ڈال کر ہر قسم کی مچھلیوں کی کھیپ کی کھیپ کنارے پر لا ڈالتے ہیں! جب رام گڑھ کی طرف جاتے ہوئے میں نے جنگلاتی سڑک کے کنارے مچھیروں ماہی گیروں کا ہنگامہ برپا دیکھا تو باز نہ رہ سکی اور کچھ مچھلیاں خریدنا چاہیں۔ کوئی ان کا ایک آنہ بھی تو نہیں لیتا تھا! ایک پردیسی دوست کے لئے یہ سب کرارے کرارے کیکڑے اور کھانے کی سمندری چیزیں مفت ہیں!!

ہاں، وہ بڑی بڑی سیاہ چھتریاں۔ انگریزی دور کی یادگار۔ شہروں کے گلی کوچے ہوں یا دیہات کے، ہر شخص کے ہاتھوں میں دکھائی دیتی ہیں۔ مشرقی پاکستان کی قدرتی دولت، اس کا تیزی سے آگے بڑھتا ہوا دارالحکومت ڈھاکہ، اس کے لوگ باگ، ان کے لوک گیت، گانے، ہنسی کھیل سب ایک پوری کتاب چاہتے ہیں۔ مگر جو چیز اس کے متعلق سب سے زیادہ یاد رہتی ہے، وہ یہاں کے لوگوں کا سبھاؤ ہے جو معمولی کسان ہوں یا پڑھے لکھے بیدار مغز لوگ، ہر اجنبی کو اپنا لیتے ہیں، اس کا دل موہ لیتے ہیں۔ مسلمان اکثریت سے قطع نظر یہاں بودھی بھی ہیں اور پارسی بھی، ہندو بھی، عیسائی بھی، اور یہ سب پاکستان کے شاندار مستقبل، اس کے اعلیٰ مقدر پر پورا پورا یقین رکھتے ہیں ٭

مبل انسٹی ٹیوٹ آف کلچر کی سرگرمیاں :
رقص اور ڈرامہ کی ایک دل آویز پیشکش

ن ایران کلچرل ایسوسی ایشن کا سالانہ اجتماع :
رنی شو میں ایک نفیس با شمشانی رقاص کا
دلچسپ مظاہرہ

ڈرامہ '' انار کلی '' کا
ایک منظر :
یہ ڈرامہ گورنمنٹ ٹیچرز
ٹریننگ کالج (کراچی) نے
معذور بچوں کی امداد کیلئے
اسٹیج کیا

ضی نذرالاسلام
سٹھویں سالگرہ پر
یڈیمی (کراچی)
تفریحی پروگرام

مشرقی پاک

عظیم الشان دریاؤں پر
دھوپ چھاؤں کا
سہانا منظر

وجد آفریں رقص (منی پوری)
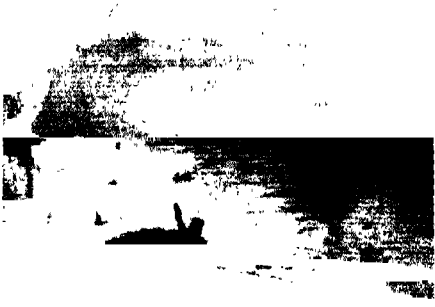
تاڑ کے درخت:
قطار اندر قطار

خلیج بنگالہ کا سماں
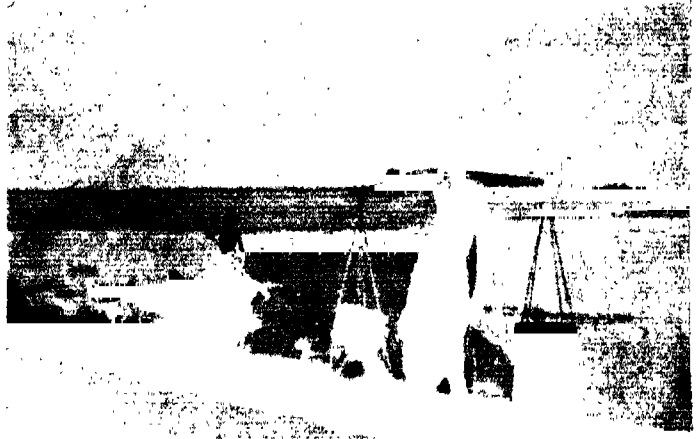
ہزارہ:
وادیٔ جنت [illegible]

سیبوں کے درخت:
بہار اندر بہار

[illegible]: نا چھوتا ہوا رومان

بحیرۂ عرب: ''موج رقصاں اس کے ساحل کی چٹانوں پر مدام''

سوات

(سر زمین لالہ و گل)
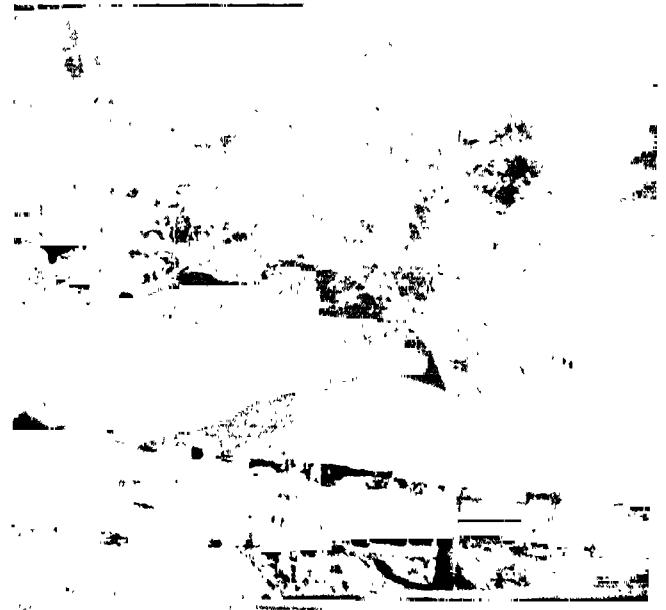
'' کہسار کے سبز پوش خاموش! ''

'' آئی ہے ندی جبین کوہ سے گاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی ''

دامن کہسار میں

هنر:
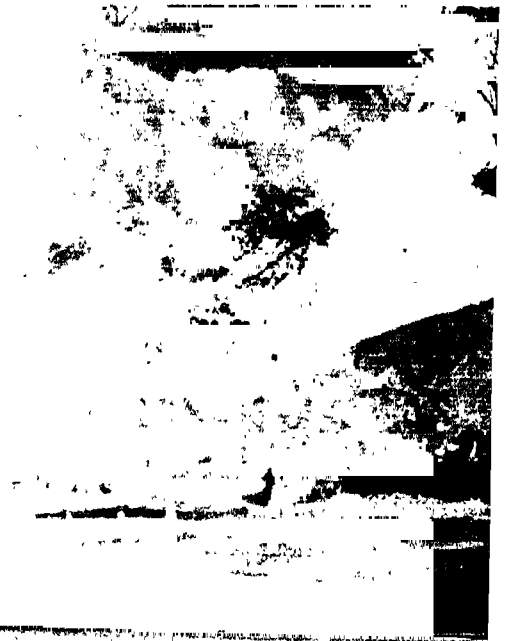
کراچی سے باہر ایک بڑا وسیع صنعتی علاقہ ہے۔ جہاں پچھلے بارہ سالوں میں کتنی ہی صنعتیں پروان چڑھی ہیں۔ بلکہ پاکستان کی ساری صنعت کا ایک تہائی یہیں ہے۔ کراچی کے اردگرد بے شمار آبادیاں حشرات الارض کی طرح پھوٹ پڑی ہیں اور ان کا سلسلہ برابر بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ کراچی کے قریب کورنگی میں کاریگروں کے لئے تیس ہزار مکانات کی ایک خوبصورت بستی بسائی گئی ہے۔ درمیانے طبقے کے لوگوں کو زمینیں دی گئی ہیں۔ اور انہوں نے درجنوں ہاؤسنگ سوسائٹیاں قائم کر کے بہت ہی شاندار نو آبادیاں قائم کی ہیں۔ اسی طرح دیگر بڑے شہروں۔ لاہور، ملتان، لائلپور، اور سادھر ڈھاکہ میں بھی نو آبادیاں اور نئی بستیاں بنائی گئی ہیں۔

کلفٹن کا متمول علاقہ سمندر کے قریب اتنا خوبصورت اور ہرا بھرا ہے کہ اس سے کراچی کا صحرائی محلِ وقوع بالکل بھول جاتا ہے۔ پرانی وضع کی محلوں سے ملتی جلتی عمارات میں بالکل جدید وضع کے قطار در قطار بنگلے اضافہ ہوئے ہیں جو دنیا کے بہترین بنگلوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ کلفٹن کراچی کی سفارتی دنیا کا مرکز بھی ہے۔ کلفٹن عوام و خواص کی مقبول تفریح گاہ ہے۔ کیونکہ اس کا ساحل بے حد خوبصورت ہے اور اس کا باغ نہایت ہی دلآویز۔ تفریح کے شوقین یہاں جوق در جوق آتے رہتے ہیں، خاص طور پر شام کو؛ اور بحیرۂ عرب کے کنارے بڑی آزادی سے سیر کرتے ہیں۔

مجھے لاہور بھی ایک برق رفتار گاڑی میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اسکی دلکشی کراچی سے بہت مختلف ہے۔ یہاں مشرق کے جادو میں فرنگی عنصر بھی شامل ہو گیا ہے۔ کون ہے جو شالیمار کے جادو سے مسحور نہ ہو۔ قلعہ کے طلسمی اثر نے اپنے ٹھنڈے ٹھنڈے فواروں کے ساتھ وقت کی رفتار کو روک لیا۔ میں اس عالم میں بخوبی ان قدیم مغلوں کا تصور کر سکتی تھی جو اتنی اس قدر نفاست سے بنائی ہوئی شہ نشینوں پر بیٹھے، کھیلتے ہوئے فواروں کا نظارہ کرتے، قدرت سے لطف اندوز ہوتے تھے، جیسا کہ ہم میں سے آج کوئی بھی نہیں کرتا۔ یہ تھی دولتِ سکون ایک گزشتہ عہد میں۔ جہانگیر کے مقبرہ پر میں نے روزانہ نذرِ عقیدت کا منظر دیکھا اور ان تمام لوگوں کا سرور و نشاط جو اس کے اردگرد کے خوبصورت باغات میں آ کر اس باغ و بہار طبیعت کے مالک شہنشاہ کی زندہ دلی اور خوشی و خرمی کی روایات کو تازہ کرتے ہیں۔

اور واپس کراچی، میٹروپول ہوٹل میں یہ احساس ہوا جیسے میں پھر گھر لوٹ آئی ہوں، رومانوی باغات میں شبینہ طعام تاروں کی چھاؤں تلے، سہانے گیت سنتے ہوئے! کچھ عجب نہیں کہ دور دراز سے آنے والے مسافر یہاں پہنچ کر ایسا محسوس کرتے ہوں گویا وہ کسی پرستان میں پہنچ گئے ہیں! (ختم)

رپورتاژ :

سوات

(ایک جنتِ ارضی)

فیاض احمد نعیم

ریل گاڑی طویل مسافت طے کر کے ہانپتی کانپتی درگئی اسٹیشن پر ایک جھٹکے کے ساتھ رکی۔ میرے ہمراہیوں کے چہروں پر مسرّت ناچنے لگی کہ وہ افسانہ جسے ہم کل تخیل کا شعبدہ سمجھ رہے تھے، آج حقیقت کا لبادہ اوڑھے ہمارے سامنے آ رہا تھا۔ ہماری وہ خیالی منزل جو سفید براق برف پوش وادیوں، چنار کے خوب صورت پیڑوں اور تاڑ کے طویل قامت اشجار پر مشتمل تھی، ہم سے صرف چالیس میل دور رہ گئی تھی۔ ہم نے جوں توں کر کے اپنے آپ کو بسوں پر لادا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہم بس میں اس طرح ٹھونسے گئے جیسے ماچس کی ڈبیا میں تیلیاں۔ اس کے باوجود ہمارے دل اس ارضی جنت کے قرب کی وجہ سے جانے کن خوشیوں کے راگ گنگنا رہے تھے کہ میرے ہمراہیوں کے میدانی علاقوں کی جھلستی ہوئی لو سے متاثر چہروں پر قوس قزح کے رنگ پھوٹنے لگے۔ اگرچہ ہم اپنی منزلِ مقصود سے دس میل دور تھے۔ پھر بھی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے عطر بیز جھونکے ہماری خواہشات کے احترام کے لئے تیزی سے بھاگے چلے آ رہے تھے۔ بالآخر منگورہ کی معتدل آب و ہوا نے ہمارا گرمجوشی سے استقبال کیا اور ہم ممتاز ہوٹل میں قیام پذیر ہو گئے۔

ہماری پارٹی کے لیڈر ہماری طرح اس دیس میں اجنبی تھے۔ وہ کسی گائیڈ کی تلاش میں تھے کہ ایک مسکراتے ہوئے چہرے نے ہمیں خوش آمدید کہہ کر ہماری مشکل حل کر دی۔ یہ نوجوان کوہ پیما ہمارے ایک قریبی عزیز نکلے۔ وہ وادی سوات کے چپہ چپہ سے اس طرح واقف تھے جیسے وہ یہاں کے مقامی باشندہ ہوں۔ وہ ہمارے قافلہ کے میرِ کارواں ثابت ہوئے اور ہمیں خاکستری پہاڑوں پر اُگے ہوئے اخروٹوں، خوبانیوں، ناشپاتیوں اور خود رو پھولوں میں اس طرح لئے لئے پھرے جیسے کوئی شوخ تتلی پھولوں پر منڈلا رہی ہو۔ ہماری یہ کوہ پیمائی ایک چشمہ پر آ رکی۔ جو ہمارے قائد کے خیال کے مطابق تھوڑی دور واقع تھا۔ درحقیقت وہ "تھوڑی دور" نصف میل سے کسی طرح کم نہ تھا۔ چند دوستوں نے غسل کے لئے پر تولنے شروع کر دئے۔ قائد کی رہنمائی میں بچی کھچی جمعیت ذرا اوپر پہاڑ پر رینگتی ہوئی ایک ایسے مقام پر پہنچی جو ہزارہا سال پیشتر مہاتما بدھ کے "زرّیں دور" سے روشناس ہو چکا تھا۔ یہاں آثار قدیمہ کے ماہرین کھدائی میں مصروف تھے چنانچہ مہاتما بدھ کی مورتی اور چند سکے دیکھنے میں آئے جن سے "منگورہ" کی تاریخی حیثیت اور قدامت پر روشنی پڑتی تھی۔ واپسی پر ہم نے خنک اور میٹھے پانی سے دو دو ہاتھ کئے اور اس محاورے کے حقیقی مفہوم سے آشنا ہوئے۔ ہم سردی کے مارے مسلسل بجتے ہوئے دانتوں کے ساتھ لحافوں میں آ گھسے۔

دوسرے دن سورج کی تیز اور شوخ و شریر کرنوں نے ہمیں لحاف چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ دن کافی چڑھ آیا تھا کل کی تکان دور ہو چکی تھی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر ہم نے خرید و فروخت کے لئے بازار کا ارادہ کیا۔ اشیا خوردنی کی ارزانی نے ہمیں ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ لوٹر کی بڑی بڑی کھالیں ہم نے صرف ایک ایک روپیہ میں خریدیں۔ مرغے چھ چھ آنے اور انڈے تین تین پیسے میں خرید کر ہم اس طرح خوش و خرم ہوٹل کو لوٹے جیسے ہمیں لوٹ کا مال ہاتھ آ گیا ہو۔ چونکہ یہاں لذتِ کام و دہن کے لئے بافراط سامان مہیا ہو گیا تھا۔ جس کے مقابلہ میں ہم گویا فاقہ زدہ علاقے سے آئے تھے، اسلئے ہم نے چند یوم اس فاقہ زدگی کی کسر پوری کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا۔ شام جب سورج کی الوداعی کرنیں منگورہ کے شاداب پہاڑوں کو آخری بوسہ دے رہی تھیں ہم دریائے سوات پر جا دھمکے۔ اگرچہ اس دریا کی وسعت ہماری عام چھوٹی نہروں سے زیادہ نہ تھی تاہم اس کا پتھروں پر سر ٹپکتا اور شور مچاتا ہوا پانی اس قدر تیز و تند تھا کہ تین آدمی ایک دوسرے کا مضبوطی سے ہاتھ پکڑے ہوئے بھی اس کے سامنے کھڑے نہیں ہو سکتے تھے۔ رات کے سائے گہرے ہونے سے پیشتر ہم اپنے ہیڈ کوارٹر آ پہنچے۔

صبح کی پہلی کرن نمودار ہونے پر ہم نے اپنا بوریا بستر باندھا۔ اور مدائن کو روانہ ہو گئے۔ ہماری بس دشوار گزار پہاڑوں اور عمودی چٹانوں پر

اس طرح دھیرے دھیرے اور احتیاط سے گزر رہی تھی جیسے کوئی شیشے کا سامان دونوں ہاتھ میں اٹھائے کسی بڑی بھیڑ کو چیرتا ہوا گزر رہا ہو۔
مدائن پہنچنے پر ہمیں سرد مرطوب آب و ہوا کا سامنا کرنا پڑا۔ غیر ملکی دوا ساز اور ہوائی کمپنیوں کے کیلنڈروں پر سوئٹزرلینڈ کے جو برف پوش اور اودے اودے یا سرخ پہاڑ ہم نے دیکھ رکھے تھے وہ بے حقیقت معلوم ہونے لگے اور ہمارے دل مسرت سے اچھلنے لگے کہ ہمارے ملک میں سوئٹزرلینڈ سے بھی زیادہ خوب صورت مقامات پائے جاتے ہیں۔ مدائن ہوٹل میں یک روزہ مختصر قیام کے دوران ہم تمام دن کیمرے کے لئے دل آویز برف پوش چوٹیوں اور گل پوش خطوں پر پھیلے ہوئے قدرتی لازوال حسن کو سلولائیڈ پر منتقل کرتے رہے۔ اگلے روز ہم بحرین کو روانہ ہوئے۔ یہ مدائن سے چند میل کے فاصلے پر ایک دل فریب قصبہ ہے جس کے گرداگرد پہاڑوں نے دیوار سی چن رکھی ہے۔ ان پہاڑوں میں ٹھنڈے ٹھنڈے میٹھے میٹھے پانی کے چشموں کی بہتات ہے۔

اسی شام ہم کالام روانہ ہو گئے جو وہاں سے ۲۶ میل دور بلندی پر واقع ہے اور اس ساری حسین وادی کا دل سمجھا جاتا ہے۔ یہی جگہ ہے جس کا پرکشش حسن غیر ملکی سیاحوں کو کشاں کشاں لئے آتا ہے۔ چنار کے خوب صورت شگوفوں، جابجا پھیلے ہوئے جنگلی پھلوں کے درختوں اور خودرو پھولوں کے سبب اس برف پوش سرزمین کا حسن سوئٹزرلینڈ سے کسی طرح کم نہیں۔ کالام کے دو روزہ قیام کا عرصہ آنکھ جھپکتے گزر گیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم کسی خوابوں کی حسین وادی میں آنکلے ہیں۔ ہمیں اپنے میدانی علاقوں کی نومبر دسمبر کی سردی بھی یہاں کے موسم کے سامنے ہیچ نظر آتی تھی۔ چشموں کے انتہائی خنک پانی میں ہاتھ ڈالتے ہی یخ ہو جاتا چہ جائیکہ غسل کرنے کی جسارت یا حماقت کی جائے۔

دو روز بعد جب چڑیوں کی مترنم چہچہاہٹ نے ہمیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر میٹھی نیند سے جگایا تو ہم نے بادلِ ناخواستہ اس ارضی جنت کو آخری سلام کہہ کر منگورہ کے لئے رختِ سفر باندھا۔ منگورہ پہنچنے پر ہمارے سالارِ قافلہ نے والیٔ سوات، اعلیحضرت جہاں زیب صاحب سے ملاقات کا انتظام کیا۔ انہوں نے ہمیں شرفِ ملاقات بخشا۔ وہ ہمارے سروں پر سواتی ٹوپیاں دیکھ کر بہت خوش ہوئے ہم نے انہیں بتایا کہ ہمیں ان کی اس فردوس نما دنیا کی اکثر چیزیں بہت ہی پسند آئی ہیں۔ وہ ہم سے اس طرح گھل مل کر باتیں کرتے رہے جیسے وہ ہمیں سالہا سال سے جانتے ہوں۔ ہم نے یادگار کے طور پر ان کے آٹوگراف لئے۔ اور ایک گروپ فوٹو بھی۔ انہوں نے بڑی مہربانی سے ہمیں اپنی کار پیش کی اور ہمیں اپنے آبائی محل روانہ کر دیا جو مرغزار میں واقع تھا۔ ۱۳ میل کا سفر طے کرنے کے بعد ہم منزلِ مقصود پر پہنچے۔ سنگِ مرمر کا سفید محل جدید طرزِ تعمیر کا عدیم النظیر شاہکار ہے۔ ایسا معلوم ہوا جیسے ہم کوہ قاف کے کسی پرستانی محل میں آگئے ہیں۔ تین طرف آسمان سے باتیں کرتے ہوئے پہاڑ پاسبانوں کی طرح ایستادہ تھے۔ پھلوں اور پھولوں کے حسن نے بیحد تازگی اور لطافت پیدا کر دی تھی۔ ہم گرد و پیش سے آنے والے عطر بیز جھونکوں سے اپنے قلب و نظر کو محظوظ کر رہے تھے۔ ہم نے محل کی خوب سیر کی اور اس کا ایک ایک کونہ ہماری نگاہوں کی دست برد سے نہ بچ سکا۔ ہم مہمان خانہ میں گئے جہاں پکی ہوئی پیازی انجیروں، زرد ناشپاتیوں اور گہرے سبز اخروٹوں سے ہماری خاطر مدارات کی گئی۔ ہم طلبہ کی اس قدر افزائی پر بہت خوش ہوئے۔

کوئی پون گھنٹے بعد ہم جہاں زیب کالج دیکھنے گئے۔ اس ڈگری کالج میں مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ بھی نئے طرزِ تعمیر کا نہایت عمدہ نمونہ ہے۔ وہاں کے طالب علموں نے ہمارا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا اور ہمیں اپنے تمام اساتذۂ کرام سے ملایا۔ ہم نے جی بھر کر کالج کی سیر کی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ ہمارا اپنا ہی کالج ہے۔ اس کے بعد ہم نے کچہری کا رخ کیا۔ وہاں کے طریق کار اور مقدموں کے فوری فیصلہ کے متعلق سن کر بہت حیران ہوئے کیونکہ وہاں اکثر مقدمات کا فیصلہ ایک دو روز ہی میں سنا دیا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ باعثِ فخر بات عدالتوں میں اسلامی قانون کی پیروی ہے۔

ڈیڑھ ہفتہ پاکستان کے اس سوئٹزرلینڈ میں گزارنے کے بعد ہم پھر اپنے دوزخ 'ملتان' میں جھونک دئے گئے اور ایسا معلوم ہوا جیسے ہمیں جنت سے دیس نکالا مل گیا ہو۔

شہتوت کی شاخوں کے اوپر — پتوں کے ننھے گھروندوں میں
خوشیوں کے جھولے ڈالے ہیں — اک روحِ مسرت بستی ہے
کچھ ہلکے ہلکے نغموں کی بوندوں کی ترادش ہوتی ہے — کرنوں سے آنکھ مچولی ہے

غزل

عبداللہ خاور

کبھی جو اہلِ درد ناصبور ہو گئے
خیال سے وہ اور دُور دُور ہو گئے

مٹیں تمام حسرتیں، مگر مٹیں بھی کیا؟!
شعور کے صنم، پسِ شعور ہو گئے

وہی ہیں تم سے چاہتوں کو نسبتیں مگر
خود اپنی اس روش سے ہم نفور ہو گئے

کبھی تھیں عشق میں نیازمندیاں بہت
وہ ٹھوکریں لگیں کہ ہم غیور ہو گئے

ہزار بے قراریاں، ہزار ولولے
ترے حضور آ کے بے حضور ہو گئے!

نظر اٹھی، نظر میں قلب جھلملا اٹھا
حضورِ حُسن پھر کئی قصور ہو گئے

رفاقتوں سے قربتوں سے کس کو کیا ملا
مگر دلوں میں فاصلے ضرور ہو گئے

وہ اہلِ شوق بھی جیتے ہیں اہلِ انجمن
جو التفات کی حدوں سے دُور ہو گئے

روش صدیقی

یہ طلسمِ خیال سا کیا تھا
ہجر میں بھی وصال سا کیا تھا

شمع کے زرد زرد چہرے پر
آخرِ شب، جلال سا کیا تھا

ارتقائے کمالِ عشق نہ پوچھ
یہ مسلسل زوال سا کیا تھا

ہم تو برباد ہو کے بھی خوش ہیں
مگر اُن کو ملال سا کیا تھا

اُس ادائے جواب میں پنہاں
ہم نشیں! اک سوال سا کیا تھا

پردۂ جسم و روح میں اے دوست
عمر بھر یہ وصال سا کیا تھا

عشق نے جس کے خواب دیکھے تھے
ہاں وہ حسنِ خیال سا کیا تھا

بارِ ہستی اگر نہ تھا تو روشؔ
دوش پر یہ وبال سا کیا تھا

بلوچی لوک گیت

سلیم خاں گمّی

وادی بولان دہقانوں، ساربانوں اور چرواہوں کی وادی قریب قریب بارہ لاکھ نفوس پر مشتمل ہے اور اس کا کل رقبہ تقریباً انیس لاکھ مربع میل ہے۔ اس طرح آٹھ مربع میل میں صرف ایک انسان بستا ہے۔ اس کے برعکس مشرقی پاکستان کو دیکھئے تو ایک مربع میل میں چھ سو افراد اقامت پذیر ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس وادی کا ماحول کیا ہوگا اور اس میں قدرت کی بے اندازہ پہنائی اور سکوت کا زندگی اور اس کی گہما گہمی سے کیا تناسب ہے۔ آب و ہوا میں بھی سابق بلوچستان کے مختلف مقامات میں زمین و آسمان کا فرق ہے سبی دنیا بھر کے گرم ترین علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔ چنانچہ گرمیوں میں اس کا درجۂ حرارت ایک سو بیس ڈگری تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کے برعکس زیارت کی پُر بہار وادی ہے جہاں سردیوں میں سخت سردی پڑتی ہے۔ یہ سطح سمندر سے سات ہزار فٹ بلند ہے۔ وادی بولان کو جن پہاڑوں نے اپنے نرغے میں لے رکھا ہے ان میں سے اکثر دس ہزار فٹ سے بارہ ہزار فٹ تک بلند ہیں۔ یہ پہاڑ بالکل بنجر اور بے آب و گیاہ ہیں اور سال کا بیشتر حصہ برف سے ڈھکے رہتے ہیں۔ نوشکی اور خاران کے ریگستان ایران اور افغانستان تک پھیلے ہوئے ہیں۔ گرمیوں میں ان ریگستانوں سے سخت گرم اور تند و تیز ریت سے بھرپور ہوائیں میدانوں اور وادیوں کا رخ کرتی ہیں۔ ان ہواؤں کو مقامی طور پر "لوار" کہا جاتا ہے۔ جو انسانوں، حیوانوں اور نباتاتی زندگی کے لئے پیغام اجل ہیں۔ وادئ بولان کے شمال اور شمال مشرق کے علاقے کوہستانی ہیں۔ ان کوہساروں میں سرسبز و شاداب وادیاں ہیں جہاں کھیتی باڑی ہوتی ہے اور رنگا رنگ کے پھول اور قسم قسم کے پھل اس کثرت سے ملتے ہیں کہ تمام علاقے پر جنت کا گمان ہوتا ہے۔ یہ ہیں وہ جغرافیائی حالات جن سے بلوچ چرواہوں، ساربانوں اور دہقانوں کا واسطہ ہے۔ مظاہر فطرت کی اس رنگا رنگی اور دل آویزی میں کوہ وقار اور پاک دل بلوچ بستے ہیں اور اپنی صحت مند اور توانا ثقافتی اقدار سے پاکستان کے اجتماعی تمدن کو اپنے میں حسین اور دل نواز عطیے پیش کرتے ہیں۔ بلند بالا پہاڑوں، سیاہ دل ریگستانوں اور سرسبز و شاداب وادیوں میں بسنے والا بلوچ صحیح معنوں میں فطرت کا پروردہ ہے۔ جسمانی لحاظ سے صحت مند اور توانا، طبعاً سادہ اور فراخدل۔ جب وہ بلند پہاڑوں وسیع صحراؤں اور شاداب وادیوں میں اپنے روزمرہ کے کام کاج کے لئے نکلتا ہے تو اُس کے قلب و نظر فطرت کی ملکوتی عظمت اور حیات بخش توانائی سے بے پناہ اثر لیتے ہیں یہی وہ ملکوتی عظمت اور حیات بخش توانائی ہے جو اس کی معاشرت اور کلچر میں جاری و ساری ہے۔ اور اسی کے پیش نظر بڈھے بلوچ نے اپنے بیٹے کو یہ نصیحت کی تھی کہ ؎

ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا

بلوچ سرزمین دہقانوں، شتربانوں اور چرواہوں، پہاڑوں، ریگستانوں اور وادیوں، میٹھے اور پُر سوز نغموں کی سرزمین ہے۔ بلوچ اپنے گھر میں ہوں یا لہلہاتے کھیتوں میں، پہاڑوں کی ڈھلوانوں اور گھاٹیوں میں گلہ بانی کر رہے ہوں یا تاریک لمبی راتوں میں اپنے اونٹوں پر سوار ریگستانوں کا سفر کر رہے ہوں، ہر وقت کوئی نہ کوئی گیت الاپتے رہتے ہیں۔ اور ان لمحات میں ان کا کوئی نہ کوئی محبوب ساز مثلاً نڑ، سرود، چنگ، رباب، سرائندہ، دونلی، یک تارہ ان کا دمساز ہوتا ہے۔ ان سازوں کی رفاقت میں شمشیر بکف بہادروں کی داستانیں بیان ہوتی ہیں، رنگ و نکہت کے پیکر ترتیب پاتے ہیں، سمن پوش وادیوں میں وفا کی تجدید کے قصے دہرائے جاتے ہیں۔ اندوہ وفا کے چرکے سینہ کھول کر اہل دنیا کو دکھائے جاتے ہیں، خوش اندام نازنینوں کی

فرقت دلوں کو پارہ پارہ کرتی ہے، سردار کی موت پر رو رو کر آنکھیں گنوائی جاتی ہیں، دلہن کی سہیلیاں اپنے چھچھوں سے دولہا بھائی کو تنگ کرتی ہیں، مرشد کامل کی نگاہِ حقیقت بیں کو خراجِ تحسین ادا کیا جاتا ہے۔ غرضیکہ سینکڑوں موضوعات ہیں جو ان گیتوں میں صدیوں سے ادا ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔

ہمیں یہ حقیقت فراموش نہیں کرنا چاہئیے کہ وادی بولان اور اس سے پرے دور دور مغربی پاکستان کا تمام شمالی و شمال مغربی علاقہ بڑی مضبوط، جفاکش، اور جری قوموں کا وطن ہے اور صدہا سال نہ صرف بے باک و آزاد منش انسانوں کا گہوارہ بلکہ ان کی جولاں گاہ بھی رہا ہے۔ یہ وہ دشتِ خطرناک ہے جس میں فطرت نے ریت کے ٹیلے تعمیر نہیں کئے بلکہ بڑے بڑے گراں ڈیل، جلے بھنے خاک سیہ ڈراؤنے پہاڑ ہی پہاڑ تعمیر کئے ہیں جو یہاں کے باشندوں کے دل کو بھی ایسے ہی مبہوت کن سانچے میں ڈھال دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بلوچوں نے تاریخ میں بڑا نمایاں اور قابلِ قدر حصہ لیا ہے۔ یہ شجاعت و جواں مردی قدرتی طور پر رزمیہ گیتوں کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے اسی لئے ہم اس کو ان کی زندگی کے ساتھ ساتھ شاعری اور گیتوں میں بھی شدت سے کارفرما پاتے ہیں۔ بلکہ سچ پوچھئے تو گیت بزمیہ ہوں یا رزمیہ سب میں یہی شجاعانہ رنگ جھلکتا ہے۔ مثلاً لوک گیتوں کی ایک بڑی ہی ہر دلعزیز صنف "لاڈیا" "لاڈوگ" ہی کو لیجئے۔ ہے تو یہ شادی بیاہ کا گیت، چنانچہ جب کسی بلوچ نوجوان کی شادی ہوتی ہے تو اس کی ماں بہنیں اور دوسری رشتہ دار خواتین بڑے زور شور سے یہ گیت گاتی ہیں۔ لیکن ان میں تمام تر دولہا کی شجاعت، شہسواری اور شمشیر زنی ہی کی تعریف ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہا جاتا کہ ؎

رُخ پہ دولہا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
بھر گیا ابرِ گہر بار سراسر سہرا

بالفاظ دیگر دولہا محض ایک رنگین ہیولیٰ ہی نہیں ہوتا بلکہ پیکرِ شجاعت اور رزم و پیکار کا دھنی ہوتا ہے۔ اس کی امتیازی خصوصیت حسن و جمال نہیں بلکہ جلال ہوتی ہے۔ ہٰذا اس کی تعریف حقیقی معنوں میں تعریف ہوتی ہے۔ ایسے جواں مرد کے لئے رفیقۂ حیات بھی محبت اور ایثار کا پیکر ہونی چاہیئے۔ چنانچہ جب لڑکی کی سہیلیاں گیت گاتی ہیں تو ان میں دلہن کے حسن اور پاکبازی کو خراجِ تحسین ادا کیا جاتا ہے۔ یہ بات ان کے سپاہیانہ مزاج اور جنگی روایات کے ساتھ پوری مناسبت رکھتی ہے کہ جب عہد قدیم میں ایک قبیلہ دوسرے پر چڑھائی کرتا تو خواتین اپنے بہادر بیٹوں، بھائیوں اور شوہروں کا دل بڑھانے کے لئے ان کی جواں ہمتی اور بہادری کی تعریف کرتیں۔ اور جب کوئی قبیلہ حملہ آور کے خلاف صف آرا ہوتا تو خواتین "لاڈوگ" میں ان سے مطالبہ کرتیں کہ وہ اپنی زمینوں اور چراگاہوں کی حفاظت کے لئے ڈٹ کر مقابلہ کریں اور اگر مرنا ہو تو سینے پر گولی کھا کر مریں نہ کہ پشت پر۔

قدرتی طور پر جب کوئی قبیلہ کامران ہوتا تو اس کے نوجوان فتح کی خوشی میں "لاڈوگ" گاتے اور اپنے کارناموں کا ذکر بڑے پُر وقار انداز میں کرتے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اب قبائل کی باہمی آویزش ایک قصۂ پارینہ بن چکی ہے اور شجاعت کا رخ دشمنانِ قوم و وطن کی طرف مڑ گیا ہے۔ اور بلوچ قوم اس سلسلہ میں کتنے ہی کارہائے نمایاں دکھا چکی ہے۔

ایک ایسی قوم جس میں تندرستی و توانائی پر زور رہو، قدرتی طور پر اپنی نئی پود کی بہترین صحت کی خواہشمند ہوگی۔ چنانچہ بچے کی پیدائش کے موقع پر بھی اس کی صحت مندی، سلامت روی اور بلند کرداری کے لئے "لاڈوگ" ہی گائے جاتے ہیں۔

یہ گیت جو بلوچوں کا مایۂ ناز ورثہ ہیں اب بھی ہر جگہ گائے جاتے ہیں جس سے ان کی شجاعانہ روح برابر تقویت پاتی ہے۔ یہ گیت بلوچ خواتین، مردوں کی تعریف میں اکیلی یا مل کر گاتی ہیں۔ اور ان کی خالق بھی وہی ہوتی ہیں۔ دیکھئے ایک خاتون اپنے جذبات کی ترجمانی کس پیرایہ میں کرتی ہے۔ جس میں بزم کا انداز بھی ہے اور رزم کے تیور بھی۔

---

[1] اس مضمون کے جملہ منظوم تراجم شہاب رفعت کے قلم سے ہیں۔ (مدیر)

جانم کی راہ پڑی دیکھوں
آنگن میں گم سم بیٹھی ہوں
جانم۔ وہ نڈر جانباز مرا
وہ اُس کی تفنگ دلندیزی
کب اس کا نشانہ چوک سکے
رفتار ہے ایسی شاہانہ
سر کرنے کو جیسے قلعہ چلے
جب آنکھیں گھما کر دیکھتا ہے
اوسان خطا ہوں دشمن کے
اقرار کیا ہے ملنے کا
میں جانتی ہوں بلوچ ہے وہ
اور اپنا قول نبا ہے گا

جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے یہی شجاعانہ روح بعض اور لوک گیتوں مثلاً ہالو، شئیر، یہاں تک کہ نازنک جیسی گھریلو صنف میں بھی پائی جاتی ہے۔ اور اس طرح بزم کا دامن کبھی رزم سے جدا نہیں ہوتا۔

جہاں آئے دن جنگ و جدل کے معرکے ہوں وہاں انسان پر مصیبتیں بھی آتی ہیں۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوتا کہ فاتح قبیلہ مفتوح قبیلے کی عورتوں کو پکڑ کر کنیزیں اور لونڈیاں بنا لیتا۔ اس طرح ان خواتین کی زندگی سراپا آہ بن کر رہ جاتی۔ وہ اپنی گذشتہ پر وقار اور آزاد زندگی کو یاد کرتیں، انہیں اپنے شوہروں کی محبت یاد آتی، تو ماضی کا خوش و خرم زمانہ اُن کی نظروں میں پھر جاتا اور ان کے ہونٹوں پہ بے اختیار رنج و غم سے بھرے بول آ جاتے۔ یہ دکھ درد کی پکار جو گیتوں کی شکل اختیار کر لیتی "زہیروگ" کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ ان سوگوار گیتوں کی تاثیر لازمی طور پر دائمی و غیر فانی ہے۔ اس لئے یہ قدیم درد بھرے گیت اب بھی وادیٔ بولان میں گائے جاتے ہیں۔ جن کو سن کر بے اختیار درد و سوز محمد کے یہ الفاظ یاد آتے ہیں:۔

شاید یہ پُر درد نوائیں	غم سے بھری دلدوز صدائیں
اگلے دنوں کی بڑی پرانی	بپتا کی ہیں رام کہانی
وہی نزاعیں، بیر کی باتیں	دل کو دکھانے والی گھاتیں
جنگ وجدل اور کشت وخوں کی	وحشی انسانوں کے جنوں کی
یا کوئی اور ہی سیدھی سادی	اپنے زمانے کی جگ بیتی
باتیں یہی جانی پہچانی	رنج اور دکھ اور غم کی بانی
جو دل پر نت طاری ہوں گے	آج بھی ہیں اور کل بھی ہوں گے!

رزمیہ و طربیہ گیتوں کے برعکس یہ المیہ گیت زندگی کا دوسرا رُخ پیش کرتے ہیں جن کا اثر دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔

عوامی گیتوں کی یہی صنف درد مند انسانوں کے دیگر غمناک احساسات کی ترجمانی بھی کرتی ہے۔ بستی کے علاقے میں اسے ڈیہی اور مکران میں لیکو کہتے ہیں۔ بعض اور علاقوں میں ان گیتوں کو ڈیکہا اور ہلیلی مور کہتے ہیں۔ اگر لاڈوگ میں اتک اور کھنک ہے تو زہیروگ میں سوز اور محرومی ہے۔ جذبے کی آنچ لہجے کا ٹھہراؤ اور دھیمی لے یہ سب ان کی بے پناہ مقبولیت کے راز دار ہیں۔ زہیروگ گانے

میں کسی کی تخصیص نہیں۔ یہ ہر انسان کا نغمہ ہے اور عورتیں مرد، بچے بوڑھے سبھی اس کو گاتے ہیں۔

نالہ پابندِ نے نہیں تو پابندِ مقام بھی نہیں۔ اس لئے جہاں کہیں کسی کا دل بھر آئے یہ پرسوز نغمہ خود بخود دل کی گہرائیوں سے ابھر آتا ہے مثلاً جب کسی خاتون کا شوہر دیس سے دور ہو تو اس کی یاد میں اس کا دل گھائل ہو جاتا ہے اور زہیروگ اس کے ہونٹوں سے آہ بن کر نکلتا ہے۔ اگر شومئی قسمت سے اس کا رفیق حیات فوت ہو جائے تو انہی گیتوں کی دکھ بھری لے اس کی مونس و غمخوار بنتی اور اس کے دل کی بے چینی اور درد و کرب کو دور کرتی ہے۔ اسی طرح جب کسی ماں کا بچہ مر جاتا ہے تو وہ اس کی جدائی میں زہیروگ گا کر اپنے دکھے ہوئے دل کو تسکین دیتی ہے۔ اور اندھیری رات میں ایک گونہ تسلی کی لو پاتی ہے۔

پھر ان اندھیری راتوں کا تصور کیجئے جب ساربان پُرخطر راہوں پر سفر کرتے ہیں۔ وطن سے دوری اور محبوب کی جدائی کا احساس انہیں مغموم بنا دیتا ہے۔ یہ احساس ان کے دل میں گھر اور محبوب کی یاد کو شعلۂ جوالہ کی طرح بھڑکا دیتا ہے۔ اور وہ اپنی پرسوز آواز میں محرومی کے گیت گاتے ہیں۔ زہیروگ کی اس قسم کو بجا طور پر نغمۂ ساربان کہا جا سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ہر انسان اپنا اپنا دکھ ہی جھیلتا اور اپنا ہی غم کھاتا ہے۔ اس لئے یہ گیت بھی الگ الگ گائے جاتے ہیں۔ ہر شخص، مرد ہو یا عورت، اُن سے تنہائی میں ہی اپنا غم غلط کرتا ہے۔ اس لئے انہیں مل کر نہیں گایا جاتا۔ جدائی عارضی ہو یا دائمی، دیکھئے اس کے دلگداز نغمے کیا کیف رکھتے ہیں:۔

اے میرے محبوب، اے پیارے!
یونہی رہیں گے کیا دن رات؟
بدلیں گے اک دن حالات
چمکیں گے آکاش پہ تارے

موقع ہاتھ آئے گا بارے
جب بن کر بادل کا ٹکڑا
بھاگتا بھاگتا آجاؤں گا
آخر کار میں تیرے دوارے

ساون کے بادل کی صورت
آنکھوں سے آنسو ہی آنسو
چھلکاتا برساتا ہر سو
آؤں گا تجھ تک حسن کی مورت!

وہ وعدے وہ بھولے بسرے
پیار کے لمحے تازہ کرنے
پھر سے محبت کا دم بھرنے
آؤں گا اے جاں پاس ترے

اپنے سُموں سے میرا گھوڑا
اونچے اونچے کہساروں کو
اور قلعے کی دیواروں کو
توڑ کے آخر جا پہنچے گا

قید جہاں پر راحتِ جاں ہو
لمبے چوڑے میدانوں کو
تند اُمڈتے طوفانوں کو
روند کے پہنچوں یار جہاں ہو

لیکو کا انداز یہ ہے:

مرا دل تھا
کھلے میدان میں تنہا اُگا پھول
جواب تُو نے
جدائی کی ہے مرجھایا ہوا پھول
مرا دل اب
ہے جیسے کوئی بنجر کھیت ویراں
نہیں جس میں
کوئی آثار ہستی کے نمایاں

ڈہی میں بھی یہی پکار ہے:-

ایک دن وہ تھا ترے دیدار سے سرشار تھا　　　ایک دن یہ ہے کہ دل افسردہ و بے بس ہوں میں

جہاں انسان ہے وہاں محبت بھی ہے۔ اور ماں کی محبت سے زیادہ لطیف چیز اور کیا ہوگی۔ سراپا شفقت و ملائمت۔ نازنک اسی ممتا کا میٹھا رسیلا اور چٹیلا گیت ہے۔ جب کوئی ماں اپنے بچے کی صحت اور خوش نصیبی کے لئے یہ گیت گائے تو اس صورت میں یہ لوٹی — یا لوری کہلاتا ہے۔ بگانی بلوچ اسے لیکو کہتے ہیں۔ جب کوئی بہن اپنے بھائی کی منگنی یا شادی کے موقع پر یہ گیت گاتی ہے تو اس میں بھائی کی بہادری اور حسن و وجاہت کا ذکر کیا جاتا ہے۔ محبوبہ اپنے محبوب کی شیر دلی اور جواں ہمتی کا بڑے فخر سے ذکر کرتی ہے۔ شادی کے موقعوں پر ہنسی ٹھٹھول اور خوشدلی کا مظاہرہ تو ہر کہیں ہوتا ہے۔ اور بلوچ اس زندہ دلی سے کیسے بیگانہ ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ جب ایسے موقعے آتے ہیں اور دلہن کی سہیلیاں نازنک گاتی ہیں تو اس میں از راہِ شوخی و تفنن دولہامیاں کی فرضی کمزوریوں کا ذکر کر کے اس کی خوب گت بناتی ہیں۔ اس صورت میں نازنک کا موضوع ان پنجابی لوک گیتوں سے ملتا ہے جو سٹھنیاں کہلاتے ہیں۔ دیکھئے ایک بلوچی ماں کس انداز سے اپنے بچے کا ذکر کرتی ہے:-

مرا یہ پھول سا بچہ جواں ہوگا، جواں ہوگا
میں اپنے لاڈلے کو تیغ و خنجر سے سجاؤں گی
کندھے پہ اپنے وہ بندوق کو رکھ کر رواں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا — مرا ننھا جواں ہوگا

چمکتی ہوگی اک تلوار ان مضبوط ہاتھوں میں
بہت منہ زور گھوڑا ہو، اسے چک پھیریاں دے گا
اگرچہ تو سن سرکش سراسر بے عناں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا ۔ مرا ننھا جواں ہوگا
میں اس کو دیکھ کر مسرور ہونگی، شادماں ہونگی
میں اس کی عظمتِ جاوید کے گیت گاؤں گی
خدا رکھے! جوانمردی کا چرچا جاوداں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا ۔ مرا ننھا جواں ہوگا

اس کے ساتھ ہی بہن کے احساسات ملاحظہ ہوں :۔

بھیا، مرا پیارا بھیا	چاند سی دلہن لائے گا
میرے بھیا کی تلوار	مصری لوہے سے تیار
اس کا جیالا سرکش گھوڑا	کہساروں کو روندنے والا
نام مرے بھیا کا سن کر	دشمن کانپ اٹھتے ہیں تھر تھر
بھیا مرا پیارا بھیا	چاند سی دلہن لائے گا

اب ذرا سوت کی طرف آیئے۔ یہ وہ سوت نہیں جس کا جلا پا ہر عورت کو جلاتا ہے اور جس کو وہ بیرن کہتے نہیں تھکتی۔ یہ بلوچی زبان کی قدیم غزل ہے جو شادی بیاہ اور اس قسم کی دوسری تقریبوں کے علاوہ فصل کٹنے پر بھی گائی جاتی ہے کبھی اکیلے کبھی مل جل کر۔ اس کے موضوعات وہی محبوب کا دیدار، وصل، دردِ فراق اور محبوب کی تعریف ہیں :۔

ہوں تیری یاد میں جاناں میں بلبل کی طرح نالاں
گنہ میرا بتا دینا
ہوں تپتی ریگ پر استادہ تیری دید کا خواہاں
خطا میری بتا دینا
ہے سوتے جاگتے تصویر طاقِ دل پہ آویزاں
گنہ میرا بتا دینا

تالو، جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے، مبارک سلامت کا گیت ہے جو خواتین گاتی ہیں کبھی لڑکے کی پیدائش پر کبھی اس وقت جب دولہا یا دلہن کو مہندی لگائی جائے یا دولہا کسی بزرگ کی خانقاہ پر سلام کے لئے جا رہا ہو وغیرہ وغیرہ۔ پچھلے زمانے میں جب فاتح قبیلے کے بہادر لڑائی میں جیت کر گھر لوٹتے تھے تو خواتین فتح کی خوشی میں چراغاں کرتی اور ناچ ناچ کر ہالو گاتی تھیں۔ اب بھی بعض علاقوں میں ہالو گانے وقت گانے والے ڈھول کی تال پر ناچتے ہیں۔ ایسے ہی کسی اور خوشی کی تقریب پر بھی نوکر اور خادم یہی گیت گاتے ہیں۔

بلوچی زبان میں دیہاتی بولیاں بھی ہیں۔ جنہیں سوال و جواب کی صورت میں گایا جاتا ہے۔ یہ موڈ کہلاتی ہیں اور ان کو میلوں یا موسمی تہواروں کے موقع پر گایا جاتا ہے۔ گانے والے آمنے سامنے بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک شخص گا کر سوال کرتا ہے اور دوسرا گا کر اس کا جواب دیتا ہے۔

ایک: پگلے بالکے تجھے کس سے پیار؟

دوسرا: لمبی زلفوں والی نار!
یہ بڑے بڑے کہسار
گئی چھوڑ کے ان کے پار
چھپ گئی کہیں دلدار!

سپت (شاید صفت کی بدلی ہوئی شکل ہو) ایک اور دلچسپ صنف ہے جس کے معنی ہیں تعریف۔ اس کا مضمون سندھی وائی پنجابی کافی اور بنگالی مرشدی سے ملتا جلتا ہے۔ اگر کوئی فرق ہے تو یہ کہ وائی، کافی اور مرشدی کو مرد اور عورتیں یکساں طور پر گاتی اور سنتی ہیں۔ لیکن سپت صرف بلوچ خواتین گاتی ہیں۔ بچے کی پیدائش پر رشتہ دار اور اڑوس پڑوس کی خواتین مسلسل سات راتیں سپت گا کر گزارتی ہیں جس میں خدا کی حمد و ثنا، رسول اکرمؐ اور اولیائے کرام کا تذکرہ اور ماں اور بچے کی صحت کی دعائیں ہوتی ہیں۔ اس کا رنگ ملاحظہ ہو:

سپت و ثنا با خدا الائق است خدا الائق است و رسولؐ لائق است

کئے واب و کئے آگاہ بندہ واب و خدا آگاہ

(کوئی سوتا اور کوئی جاگتا ہو — انسان سوتا ہے اور خدا جاگتا ہے)

اس سلسلہ کی آخری اور بہت دلچسپ کڑی ہے شیئر یعنی بلوچی کی منظوم داستانِ حسن و عشق۔ اس کے علاوہ اس صنف میں دوسری قوموں سے جنگوں، باہمی آویزشوں اور چراگاہوں کی حفاظت کرتے ہوئے کسی بہادر بلوچ کے کارناموں کا ذکر ہوتا ہے۔ گویا اس کا موضوع ہنگامہ خیز واقعات اور حادثات ہوتے ہیں۔

شیئر کو بلوچی شاعری کا حسین ترین سرمایہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس میں وہ تمام واقعات بڑی سادگی، خلوص اور خوبصورتی سے پائے جاتے ہیں جنہوں نے بلوچ تاریخ مرتب کی ہے۔ کلاسکی بلوچی شاعری کی یہ منظوم داستانیں پہلے بے قافیہ ہوتی تھیں لیکن اٹھارویں صدی کے بعد قافیہ و ردیف کا التزام بھی ہونے لگا ہے۔

بلوچ اس صنف پر جان چھڑکتے ہیں۔ اسے سننا یا گانا باعثِ فخر خیال کیا جاتا ہے۔ گھر، چوپال میلوں اور محفلوں میں یہ ولولہ انگیز داستانیں پڑھی اور سنی جاتی ہیں۔ ان کو سُر تال سے بھی گایا جاتا ہے۔

رات خنک ہے، ایسی خنک کہ زمیں ساری
برف کی صورت ڈھیر ہوئی ہے جم جم کر
جونہی محبوبہ کا سندیسہ پایا میں نے
اپنی سانڈنی پر ہلکا سا پاکھڑ رکھا
اس کی ناک میں ریشمی پھولوں والی سجل مہار
ڈال کے نکلا اپنے احاطہ سے باہر
اس کی پشت اتنی آرام دہ، اس پر بیٹھا
چابک جا رجو مارے، سانڈنی ہرنی کے مانند

بے تابی سے اچھلنے لگ پڑی اور بولی!
اے مالک! مجھ پر یہ عتاب، غضب کیسا
بس میری مہار ہی پکڑے رہو، میں آپ ہی آپ
سوئے نشیب رواں کہسار کی ندی
کے مانند چلی جاؤں گی بہتی ہوئی
اور بلندی کی جانب سیاہ بگولے کی صورت
تند ہوا کے دوش پر تیرنے والے بادل کے مانند
تیز چلوں گی اور تجھے پہنچا دوں گی دلجاناں تک

غرض ان لوک گیتوں میں بلوچوں کی زندگی، ان کی روح اور ان کا ماحول ہر چیز اس وضاحت اور خوش اسلوبی سے جھلکتی ہے کہ ان کو سن کر ہم بھی ان میں شامل ہو جاتے ہیں اور خود کو بلوچ ہی سمجھتے ہیں۔ جیسے ان کے گیت، ان کی زندگی، ان کی روح، ان کا ماحول ہمارا اپنا ماحول ہو۔ فن - اگر اس قسم کی بے ساختہ شاعری کو فن کہا جا سکے۔ کی کامیابی اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے؟

★

کراچی آرٹس تھیٹر سوسائٹی کے زیرِ اہتمام

کُل پاکستان ڈرامہ نگاری کا انعامی مقابلہ

شرائط و ضوابط

۱۔ یہ مقابلہ صرف اردو ڈراموں کے لئے منعقد کیا جا رہا ہے، لہذا ڈرامے اردو زبان میں ہونے چاہئیں اور نثر میں لکھے گئے ہوں۔

۲۔ کسی خاص موضوع، طربیہ، المیہ وغیرہ کی پابندی نہیں۔ البتہ ڈرامہ نگاروں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ جدید دنیا کے تقاضوں خصوصاً پاکستان کی قومی روایات، معاشرت اور آئیڈیالوجی کو خاطر خواہ طور پر ملحوظ رکھیں گے۔

۳۔ ڈرامہ اسٹیج پر بہ سہولت پیش کئے جانے کے قابل ہو۔ تقریباً ڈھائی گھنٹے میں مناسب وقفوں کے ساتھ پیش کیا جا سکے۔ سٹ کی تبدیلیاں کم سے کم واقع ہوں اور کرداروں کی تعداد محدود رکھی جائے۔

۴۔ ڈرامہ طبعزاد، اَن کھیلا، غیر مطبوعہ، اور مقابلے میں شریک ہونے والے مصنف کی اپنی ملکیت ہونی چاہیئے۔

۵۔ جن ڈراموں پر انعام پیش کیا جائیگا انہیں کم از کم ایک بار پبلک کے سامنے اسٹیج پر پیش کرنے کا پہلا اختیار کراچی آرٹس تھیٹر سوسائٹی کو حاصل ہوگا۔

۶۔ ہر مسودے کی تین صاف نقلیں وصول ہونی چاہئیں۔ مسودے بذریعہ رجسٹری سکریٹری کراچی آرٹس تھیٹر سوسائٹی کے نام بھیجے جائیں یا دستی طور پر ان کی رسید حاصل کی جائے۔

۷۔ ایک مصنف کے ایک سے زیادہ ڈرامے بھی مقابلے میں شرکت کے لئے بھیجے جا سکتے ہیں لیکن تینوں انعامات تین مختلف ڈرامہ نگاروں کو پیش کئے جائیں گے۔ البتہ کسی مصنف کے ایک سے زیادہ ڈرامے انعام کے قابل سمجھے گئے تو سوسائٹی اعلان کردہ انعامات کے علاوہ کوئی مزید انعام بھی دے سکتی ہے۔ یہ سوسائٹی کی صوابدید پر منحصر ہوگا۔

۸۔ پہلا انعام مبلغ ۵۰۰ روپے، دوسرا مبلغ ۳۰۰، اور تیسرا مبلغ ۲۰۰ روپے کا ہوگا۔ انعامات کا فیصلہ ایک بورڈ کے مشورہ سے ہوگا جو سوسائٹی نامزد کرے گی۔ انعامات نیز اس مقابلے سے متعلق جملہ امور کی بابت کراچی آرٹس تھیٹر سوسائٹی کا فیصلہ قطعی تصور کیا جائیگا۔

۹۔ ڈراموں کے مسودات ۱۵ ستمبر ۱۹۵۹ء تک سکریٹری کراچی آرٹس تھیٹر سوسائٹی کے پاس مذکورہ ذیل پتہ پہونچ جانے چاہئیں۔

سکریٹری کراچی آرٹس تھیٹر سوسائٹی ۱۵۴ میکلوڈ روڈ کراچی

۱۰۔ اگر کوئی اور امر وضاحت طلب ہو تو سکریٹری سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

"بنگلہ تنقید" ——— بقیہ صفحہ: (۱۳)

ہمارے ادیب یہ پسند نہیں کرتے کہ کسی بڑے حلقہ میں ان پر تنقید کی جائے۔

ہمارے نقادوں اور تخلیقی کام کرنے والوں نے خاموشی سے ایک قسم کے دوہرے معیار کو قبول کرلیا ہے۔ ایک وہ جو اپنے ملک کے قارئین کے لئے برتا جاتا ہے اور دوسرا باقی دنیا کے لئے۔ جس طرح آزادگی کا اظہار بنگلہ میں لکھے ہوئے تنقیدی مضامین پر کیا جاتا ہے اس سے زیادہ انگریزی میں لکھی ہوئی تنقیدوں پر ہوتا ہے کیونکہ یہ ہر قسم کے قارئین کی نظروں سے گزرتی ہیں۔ ایسے مضامین کے خلاف ہمیشہ یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ اپنے ملک کو دوسروں کی نظروں میں نہ گراؤ۔ یہ ذہنیت بڑی عجیب ہے اور اُس معاشی بے اطمینانی کی آئینہ دار ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے لیکن یہ ذہنیت اچھی تنقید کے منافی ہے جس کا فرض صاف گوئی اور غیر جانبداری کے ساتھ ادب پاروں کی قدر و قیمت کا تعین ہے۔ وہ نقاد جو سچی بات کہنے سے ڈرتا ہے یا بلند معیار کو قبول نہیں کرتا، اپنے فرائض کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ ہمیں اپنے تنقیدی ادب کی تنگ خیالی کو دور کرنے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے: وسعتِ علم اور بے باکی۔

"اگر اعتبار ہوتا!" ——— بقیہ صفحہ: (۲۰)

عدنان :۔ ضرور ۔ خدا کرے کل کی صبح بھی ایسی ہی خوشگوار ہو۔ کل میں بھی چڑیوں کے لئے تھوڑا سا دانہ لاؤں گا۔

درشہوار :۔ شکریہ۔ چڑیوں کو دانہ کھلانا ثواب کا کام ہے۔ معلوم نہیں میری خادمہ کہاں چلی گئی۔ (درشہوار کھڑی ہو جاتی ہے اور آوازیں دیتی ہے) سکینہ — سکینہ۔ کیا وقت ہوگا؟

عدنان :۔ گیارہ بج چکے ہیں۔ معلوم نہیں میرا نوکر کدھر نکل گیا (آوازیں دیتا ہے) چمن چمن —

(عدنان دائیں جانب اور درشہوار بائیں طرف چل دیتی ہے

درشہوار :۔ (خود سے) نہیں نہیں میں ہرگز اسے نہیں بتاؤں گی کہ میں ہی درشہوار ہوں۔ اس کے تصور میں بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والی درشہوار ہی کا رہنا زیادہ اچھا ہے۔ جس کے بال لانبے لانبے تھے اور جس کا چہرہ گلاب کی طرح شاداب تھا۔ اور جو ہر سہ پہر اپنے دریچہ سے سفید پھولوں کا ہار اس کی جانب پھینکدیا کرتی تھی۔

عدنان :۔ (خود سے) نہیں نہیں میں اسے ہرگز نہیں بتاؤں گا کہ میں ہی عدنان ملک ہوں۔ میرا چہرہ مسخ ہو چکا ہے۔ یہی اچھا ہے کہ اس کے ذہن میں اسی عدنان کی تصویر رہے جو بڑا وجیہہ اور بہادر تھا اور جو ہر صبح گلابوں کا ایک گلدستہ اس کے دریچہ کی طرف پھینکا کرتا تھا۔

(سامنے سے سکینہ اور چمن نمودار ہوتے ہیں۔ وہ دونوں ہنستے ہوئے آرہے ہیں)

درشہوار :۔ کہاں چلی گئی تھیں تم؟

سکینہ :۔ کہیں بھی نہیں مالکن

عدنان :۔ کہاں تھے چمن؟

چمن :۔ بس قریب ہی تو تھا مالک

(درشہوار سکینہ کے کاندھے کا سہارا لے لیتی ہے۔ عدنان ملک چمن کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیتا ہے اور دونوں اسی طرح دائیں اور بائیں جانب روانہ ہو جاتے ہیں جس طرح پارک میں داخل ہوئے تھے۔ جانے سے پہلے وہ ایک دوسرے کی جانب مڑ کر دیکھتے ہیں)

عدنان :۔ (بہ آواز بلند) خدا حافظ کل تک کے لئے۔

درشہوار :۔ خدا حافظ!

عدنان :۔ صبح بہت خوشگوار تھی۔

درشہوار :۔ بہت خوشگوار۔ کل پھر ایسی ہی صبح ہوگی!

(دونوں مخالف سمتوں میں روانہ ہو جاتے ہیں)

عدنان :۔ اللہ کی پناہ وہ کسقدر بدل گئی ہے!

چمن :۔ جی مالک؟

درشہوار :۔ کتنا بدہیئت ہو گیا ہے وہ!

سکینہ :۔ کیا مالکن؟

(پردہ آہستہ آہستہ گر جاتا ہے)

(مرکزی خیال ماخوذ)

باب مراسلات

کل پاکستان انجمن ترقی اُردو
اُردو بورڈ، کراچی
۲۴ جون ۵۹ء

مکرمی رفیق خاور صاحب سلمہ اللہ تعالےٰ

میں نے آپ کا مضمون "اردو ادب کی تشکیل نو" پڑھا خوب لکھا ہے۔ آپ کی نظر قدیم اور جدید اردو ادب پر بہت صحیح اور گہری ہے۔ آپ نے مقدمۂ حالی کی اہمیت، افادیت اور اس کے انقلاب انگیز اثر کو جتانے کے بعد اس سلسلۂ انتقاد کو آگے بڑھانے کے متعلق جو بات سجھائی ہے وہ نہایت معقول، ضروری اور قابل توجہ ہے۔

اس مضمون کو پڑھ کر مجھے خوشی ہوئی اور میں نے کچھ حاصل بھی کیا۔ اُردو کی قسمت اب آپ ہی جیسے وسیع النظر اور پرخلوص اہل قلم کے ہاتھ میں ہے۔

عبدالحق

اپریل، مئی اور جون کے ماہِ نو پڑھنے کے بعد چند نتائج اخذ کر چکا ہوں۔ ماہِ نو کے لئے رجحانات کا انداز واضح ہو رہا ہے۔

آپ کے مضمون "اردو ادب کی تشکیل نو" کا بغور مطالعہ کیا اور اس سے راہ نمائی حاصل کرنے کی پرخلوص کوشش کی۔ یہ مضمون بے حد خیال افروز ہے اور واضح اشارات موجود ہیں جن کی روشنی میں منزل کا ہیولیٰ بھی ابھرتا ہے اور منزل کی طرف بڑھنے کی تحریک بھی ملتی ہے۔ پھر بھی تشنگی باقی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ فطرتاً انسان سہل انگار ہے۔ خود سوچنے کی بجائے دوسروں کے فکر سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ خود سوچنا اور پھر اپنے فکر کو راہ نما بنا کر آگے بڑھنا خال خال تابناں دیگر کا کام ہے۔ اور ایسے لوگ کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں جو ماضی اور حال کی ہر تحریک کو اپنے اندر جذب کر کے نئی راہیں تراشتے ہیں اور جدید روایات کی تشکیل کرتے ہیں۔ اسی قسم کے دو چار اور مضامین شائع ہوں تو آپ کی تحریک کا وہ رخ واضح ہو سکے جسے روشنی میں لانا انتہائی ضروری ہے۔ امید ہے کہ آپ توجہ کریں گے۔ (یہ مضمون ایک طویل سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ مدیر)

یہ ایک فطری امر ہے کہ اگر انسان اپنے ماضی اور اس کی روایات کو فرسودہ اور بے کار سمجھ کر یک قلم ترک کر دے تو اسے لامحالہ ان تحریکات کا سہارا لینا پڑتا ہے جو کرۂ ارض کے کسی حصے میں کامیاب ہوئیں یا ہو رہی ہوں لیکن دوسروں کے سہارے آگے بڑھنا بھی تو عقوبتِ دوزخ کے برابر ایک مقام ایسا آتا ہے کہ انگلی پکڑ کر چلانے والے ساتھ چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ ہر ملک اور ہر قوم کے اپنے اپنے مسائل ہیں اور ایک کا جامہ دوسرے پر صحیح نہیں بیٹھتا۔ لیبل بنتے اور بھٹکتے رہتے ہیں۔ شہاب ثاقب کی چمک چند لحظوں کے لئے بہت شوخ و شنگ ہوتی ہے لیکن اس کر ہ نیپا ر روشنی کسب نور کرنے والے بھی چند لحظوں کے لئے ہی زندہ رہ سکتے ہیں اور ان کا فن چند لمحوں کی چکاچوند کے بعد تاریکیوں میں گم ہو جاتا ہے۔

آپ کے مضمون کا لب لباب یہی ہے کہ ہمارا فن 'اپنا' ہونا چاہئے۔ ایسا فن جس کے متعلق ہم جرأت سے کہہ سکیں کہ یہ ہمارے ارادوں، ہماری اُمنگوں، روایتوں اور خواہشات کا مظہر ہے۔ اس کی ہر دھڑکن ہمارے اپنے دل کی لرزش ہے۔ ہماری روح کا ساز دوسروں کے مضراب کا ممنونِ احسان نہیں بلکہ اس کا ہر نغمہ ہماری اپنے مضراب سے لرزاں وجود میں آیا۔ مستعار خیالات اور مانگے تانگے کے جذبات کسی بڑے ادب کی تخلیق نہیں کر سکتے۔ اپنے من میں اور اپنے من سے زیادہ اس ماحول اور اس کے مخصوص رجحانات میں ڈوب کر لکھنا ہی عظمت کا آئینہ دار ہے اور یہ عظمت بڑی کاوش اور سخت جانی کے بعد نصیب ہوتی ہے۔

غلام الثقلین نقوی

"ماہِ نو" اپریل ۱۹۵۸ء میں ڈاکٹر میری این شمیل کا مضمون "حلاج اقبالؒ کی نظر میں" پڑھا۔ یہ ایک قابلِ غور مضمون ہے جو اپنے اندر گہرائی لئے ہوئے ہے۔

علامہ اقبالؒ میں مسائل اور شخصیات پر حکم لگانے کی جرأت جو ایک بڑی بات ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انہیں اپنے خیالات کو ناگزیر طور پر از سر نو ترتیب دینا پڑا۔ چنانچہ شیخ اکبر اور حافظ کے متعلق ان کے تصورات میں تبدیلی ہوئی۔ منصور حلاج کے متعلق بھی جاوید نامہ کے حوالے سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اقبالؒ کے خیالات میں بڑی ہی نمایاں تبدیلی ہوئی۔

منصور کے بارے میں جو منفی نقطۂ نظر اقبالؒ نے شروع میں اختیار کیا تھا وہ نہ عجیب تھا نہ دوسروں سے مختلف کیونکہ علی بن عثمان ہجویری (حضرت داتا گنج بخشؒ) نے بھی حسین فارسی (منصور حلاج) کے حلولی فرقے کو ملامت کی نظر سے دیکھا تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں "میں نہیں جانتا کہ فارسی کون ہے اور ابو سلمان کون۔ انہوں نے جو کچھ اور کیا کہا لیکن جو شخص تحقیق اور توحید کے خلاف چلتا ہے اس کو

نصیب نہیں ہوتا۔"

علی بن عثمان ہجویریؒ کی رائے محض ایک عام صوفی کی رائے
ی۔ وہ عالمانہ اور مجتہدانہ نظر رکھتے تھے۔ اسی طرح کی ایک
دھی سادی اور پرخلوص رائے اقبال نے بھی شروع میں اختیار
حلاج ایک صاحبِ علم کی نگاہ میں کھٹکتی ہے کیونکہ منصور پر اب
ت کچھ لکھا جاچکا ہے اور میسی نان جیسے مستشرق نے منصور کے
لک میں جان ڈال دی ہے جس کی تحقیق کے آگے شاید اقبال کو
سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔

ڈاکٹر میری این شیمل کے سامنے نہ مجھے صائب الرائے
نے کا دعویٰ ہے نہ ان سے اختلاف کی مجال، تاہم یہ کہنے کی جسارت
ضرور کروں گا کہ منصور حلاج کے مسلک سے اقبال کا متاثر ہونا
ما میسی نان کی مطبوعات کے بعد کچھ زیادہ قابلِ اعتبار معلوم
ہوتا۔ اقبال کے کلام کا مطالعہ ہمیں یہ باور کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ
ال اور منصور میں بُعد المشرقین ہے۔ اقبال اور منصور کے ہاں
اللہ کا مفہوم جدا جدا ہے۔ ان کے درمیان خودی سے بیکر بیخودی
وسیع و عریض خلیج حائل ہے منصور کے انا الحق اور اقبال کے
ین میں کوئی موافقت نہیں۔ اقبال کا مردِ مومن رومیؒ کے شیرِ خدا
نٹشے کے فوق البشر کے قریب تو ہے لیکن منصور کے انا الحق کے
کے نزدیک نہیں۔ نعرۂ انا الحق بُدھ کے نروان اور شوپنہاور
ت دنیا کے قریب تو ہے لیکن ایک کلیم سربکف اور حسینؓ بکنارِ فرات
واسطہ نہیں۔

ڈاکٹر موصوف نے انا الحق کی تشریح وحدت الوجود اور
الشہود کے نظریات کی روشنی میں کی ہے اور رومیؒ کا حوالہ دیا
ال سے حلاج کا منشا واضح نہیں ہوسکا حالانکہ فاضل مضمون
حلاج کے شارح روزبہان باقلی کا حوالہ بھی دیا ہے۔ یہ باور
جاسکتا کہ ڈاکٹر موصوف کی نظر رومیؒ کی تصنیف " فیہ ما فیہ " پر
کیونکہ لوہے اور آگ والی تمثیل اسی سے ماخوذ ہے۔ "فیہ ما فیہ"
کا اپنی زبان سے انا الحق کی تفسیر ایک نشست میں بیان ہوئی
ہے اور حلاج کے مسلک کے بالکل قریب ہے۔ فرمایا۔
طلٹے انا الحق کہہ کر کونسی بڑی بات کی؟ بڑی بات تو وہ کہتے ہیں
کہتے ہیں۔ انا العبد کہنے سے دو ہستیوں کا اقرار ہوتا ہے یعنی

اللہ اور بندہ۔ لیکن انا الحق کہنے سے تو اپنی مکمل نفی ہوتی ہے، صرف
خدا کا اقرار ہے۔ دوئی کا تصور بھی محال ہے۔ اس سے زیادہ عجز کیا ہے۔
اس سے بڑھ کر انکساری کیا ہو۔"

یہاں عجز اور انکساری تو ممکن ہے حاضرین پر اثر ڈالنے کے لئے
کہا گیا ہو کیونکہ اصل تحویل وحدت الوجود کے ایجاب کی صاف غمازی
کرتی ہے۔ خود منصور کی بھی (جس نے فضا الہندیہ کی خاک چھانی تھی اور
فلسفۂ ویدانت سے ناواقف نہ تھا) انا الحق سے مراد وحدت الوجود کے
اقرار باللسان کے سوا کچھ نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ وحدت الوجود کا مسئلہ
سراسر اسلامی توحید و تحقیق کے خلاف پڑتا تھا۔ ان حالات میں اقبال
جیسا قرآن فہم تصورِ منصور کی کبھی حمایت نہیں کرسکتا تھا۔

فاضل مقالہ نگار رومیؒ کے مقام و شرف سے ضرور واقف
ہوں گی اور اقبال تو رومیؒ سے بیحد مرعوب تھے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ
اقبال، منصور حلاج کے متعلق زاویۂ نگاہ بدلنے میں میسی نان کے
رجحانات اور انکشافات سے تو متاثر ہوئے لیکن مولانا روم کی تشریح
سے ناواقف رہے یا جان بوجھ کر چپ سادھ لی؟ درحقیقت ایسا
نہیں ہے۔ اقبال کا تصورِ حلاج اسی مسلک پر مبنی رہا جس کا ذکر
انہوں نے اپنے لیکچروں میں کیا اور جاوید نامہ مرتب کرتے وقت بھول
نہیں ہوئی۔ "جاوید نامہ ایک جامع اور عظیم الشان نظم ہے جس میں کئی
مغربی نظموں پر تبصرہ اور شاہکاروں کا جواب ہے"۔ جاوید نامہ
میں زروان فرشتہ، سروش نازنیں، منصور حلاج، افغانی یا رومیؒ
کوئی ہو، ہر ایک میں اقبال خود ہی بول رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے ہی
مرکزِ فکر کو مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے جلا بخشی ہے۔ رہی اقبال کی
اپنی زبان میں انا الحق کی تعریف تو ان کے کلام سے صرف ایک جواہر
پارہ پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں:۔

انا الحق جز مقامِ کبریا نیست	سزائے او چلیپا ہست یا نیست
اگر فردے بگوید سرزنش بہ	اگر قومے بگوید نا روا نیست

سلیم صادق

> مراسلات " ماہِ نو " میں آپ کی دلچسپی کا عملی ثبوت ہیں۔ جو آپ کے افکار و تاثرات کو بروئے کار لانے میں آپ کا ہمیشہ ممد و معاون رہا ہے اس کے ذریعہ تبادلۂ خیالات میں سرگرمی سے حصہ لیجئے۔ (مدیر)

ر۔خ

نقد و نظر

شرحِ دیوانِ غالب

از پروفیسر یوسف سلیم چشتی
ناشر: عشرت پبلشنگ ہاؤس،
ہسپتال روڈ، انارکلی، لاہور۔

صفحات: ۹۵۲ قیمت: آٹھ روپیہ

اس کتاب میں کلامِ اقبال کے ایک کار آزمودہ شارح نے دیوانِ غالب کی طرف رجوع کیا ہے۔ سابقہ شرحوں کی موجودگی جہاں اس کے لئے سہولت کا باعث ہوئی وہاں حصولِ امتیاز میں دقت آفریں بھی ثابت ہوئی۔ اس کے باوجود وہ اپنا نقش درست کرنے میں کامیاب رہے ہیں، مگر — جو مشکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے۔ کلامِ غالب کی تشریح ایک لامتناہی چکر بن کر رہ گئی ہے اور کسی شرح کے حرفِ آخر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً یہ شعر لیجئے ؎

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

شارح نے حالی کا سہارا لیتے ہوئے کہہ دیا ہے کہ "اگر یہ کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو اس کی فہم کا قصور ہے۔" حالی نے جو معنی بتائے ہیں وہ اپنی جگہ معقول ہیں، لیکن "ہمت" ایک صوفیانہ اصطلاح بھی تو ہے جس کے معنی ہیں: ترکِ دنیا کی ہمت۔ چنانچہ غالب نے مثنوی "رنگ و بو" میں تین پریوں۔ دولت، قوت اور ہمت کا ذکر کیا ہے جو ایک بادشاہ کے خواب میں آئیں۔ آخر الذکر کے بارے میں غالب نے جو کچھ کہا ہے اس سے اس کی نوعیت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ اس کی روشنی میں اس شعر کو دیکھا جائے تو کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ جو قطرہ دنیا کو ترک کر دینے کی ہمت رکھتا ہے ہم اس کو اپنی آنکھوں میں جگہ دیتے ہیں۔ اسی طرح "رہا آباد عالم......" میں جو گنجلک سی نظر آتی ہے وہ 'ہمت' کے اس مفہوم سے فوراً دور ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی ہی شرحِ تازہ کی گنجائش کئی اور اشعار میں بھی ہوگی۔

شارح کو عربی و فارسی پر خوب عبور ہے۔ اس سے اس نے کافی فائدہ اٹھایا ہے اور اسلامی افکار و نظریات کے اصلی ذرائع سے استفادہ کرکے وحدت الوجود کے بارہ میں نہایت اہم انکشافات کئے ہیں۔

ایک جدید شارح سے لازماً یہ توقع بھی ہوتی ہے کہ وہ ذوق اور تنقید کے تقاضوں کو کما حقہٗ پورا کرے گا۔ قاری کو یہ دیکھ کر بے حد مایوسی ہوتی ہے کہ مقدمہ میں من و عن دوسروں کی پامال آراء کو دوہرا دیا گیا ہے۔ غالب کے متعلق کئی باتیں قصۂ پارینہ بن چکی ہیں، خصوصاً اس کی فارسی شاعری کے بارے میں۔ تعجب ہے کہ شارح نے ان کے فارسی کلام سے واقف ہونے کے باوجود ان کے متعلق روایتی رائیں دوہرا دی ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ تصوف کے "برائے شعر گفتن" ہی کی حد تک قائل تھے۔ اگر تعارف میں مکتبی و رسمی رنگ غالب نہ ہوتا تو کتاب کی افادی حیثیت زیادہ بلند ہوتی +

قادر نامۂ غالب

مرتب:۔ تحسین سروری
ناشر:۔ مکتبہ نیا راہی

صفحات:۔ ۶۴، قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ

آثارِ غالب کی تلاش اب بجائے خود ایک مقصود بن چکی ہے اور ہم آئے دن اس میں کسی نئی دریافت کا اضافہ پاتے ہیں۔ انہی میں سے ایک "قادر نامہ" ہے جس کا مقصد بچوں کو فارسی کے عام الفاظ اور ان کے معانی ذہن نشین کرانا ہے۔ یہ کتاب ایسے پیرایہ میں لکھی گئی ہے کہ بچے اسے شوق سے پڑھیں۔ یہ نظم مدتوں نایاب رہی اور اس کا غالب کی تصنیف ہونا بھی مشتبہ تھا۔ مرتب نے اس کا سراغ پا کر ضروری معلومات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جن لوگوں نے غالب کے فارسی کلام کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ "قادر نامہ" کے کئی الفاظ کو مانوس پائیں گے۔ یہ اس منظوم کتابچے کے غالب کی تصنیف ہونے کی ایک اور بین شہادت ہے۔

کلامِ بینظیر

مرتب:۔ محمد اکبر الدین صدیقی
ملنے کا پتہ:۔ کتاب خانہ عابد روڈ حیدرآباد

صفحات:۔ ۴۴۶، قیمت چھ روپے

سید محمد بینظیر شاہ وارثی بینظیر صحیح معنوں میں ایک منش اور درویش سیرت شاعر تھے۔ گو ان کا حرچا ایک فطرت شاعر ہی کی حیثیت سے رہا ہے۔ اسلئے ان کے اس نئے اور حقیقی رنگ کو دیکھ کر اکثر لوگوں کو تعجب ہوگا۔ در حقیقت ان کی فطر

اپنے سُموں سے میرا گھوڑا
اونچے اونچے کہساروں کو
اور قلعے کی دیواروں کو
توڑ کے آخر جا پہنچے گا

قید جہاں پر راحتِ جاں ہو
لمبے چوڑے میدانوں کو
تند اُٹھتے طوفانوں کو
روند کے پہنچوں یار جہاں ہو

لیکو کا انداز یہ ہے:

مرا دل تھا
کھلے میدان میں تنہا اُگا پھول
جواب تُو سے
جدائی کی ہے مرجھایا ہوا پھول
مرا دل اب
ہے جیسے کوئی بنجر کھیت ویراں
نہیں جس میں
کوئی آثار ہستی کے نمایاں

ڈیہی میں بھی یہی پکار ہے:۔

ایک دن وہ تھا ترے دیدار سے سرشار تھا ایک دن یہ ہے کہ دل افسردہ و بے بس ہوں میں

جہاں انسان ہے وہاں محبت بھی ہے۔ اور ماں کی محبت سے زیادہ لطیف چیز اور کیا ہوگی۔ سراپا شفقت و ملائمت۔ نازینک اسی ممتا کا [illegible]ارسیلا اور چٹیلا گیت ہے۔ جب کوئی ماں اپنے بچے کی صحت اور خوش نصیبی کے لئے یہ گیت گائے تو اس صورت میں یہ لوری۔ یا لوری کہلاتا ہے بکانی [illegible]اسے لیلو کہتے ہیں۔ جب کوئی بہن اپنے بھائی کی منگنی یا شادی کے موقع پر یہ گیت گاتی ہے تو اس میں بھائی کی بہادری اور حسن و وجاہت کا [illegible]کیا جاتا ہے۔ محبوبہ اپنے محبوب کی شیر دلی اور جواں ہمتی کا بڑے فخر سے ذکر کرتی ہے۔ شادی کے موقعوں پر ہنسی ٹھٹھول اور خوشدلی کا مظاہرہ [illegible]یں ہوتا ہے۔ اور بلوچ اس زندہ دلی سے کیسے بیگانہ ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ جب ایسے موقعے آتے ہیں اور دلہن کی سہیلیاں نازینک [illegible]تی تو اس میں از راہِ شوخی دلہن دولہا میاں کی فرضی کمزوریوں کا ذکر کر کے اس کی خوب گت بناتی ہیں۔ اس صورت میں نازینک کا موضوع [illegible]ان لوک گیتوں سے ملتا ہے جو "سٹھیاں" کہلاتے ہیں۔ دیکھئے ایک بلوچی ماں کس انداز سے اپنے بچے کا ذکر کرتی ہے:۔

مرا یہ پھول سا بچہ جواں ہوگا، جواں ہوگا
میں اپنے لاڈلے کو تیغ و خنجر سے سجاؤں گی
کندھے پر اپنے وہ بندوق کو رکھ کر رواں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا ـــ مرا ننھا جواں ہوگا

چمکتی ہوگی اک تلوار ان مضبوط ہاتھوں میں
بہت منہ زور گھوڑا ہو اسے چکپھیریاں دے گا
اگرچہ توسنِ سرکش سراسر بے عناں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا۔ مرا ننھا جواں ہوگا
میں اس کو دیکھ کر مسرور ہونگی، شادماں ہونگی
میں اس کی عظمتِ جاویدی کے گیت گاؤں گی
خدا رکھے! جوانمردی کا چرچا جاوداں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا۔ مرا ننھا جواں ہوگا

اس کے ساتھ ہی بہن کے احساسات ملاحظہ ہوں:۔

بھیا، مرا پیارا بھیا	چاندسی دلہن لائے گا
میرے بھیا کی تلوار	مصری لوہے سے تیار
اس کا جیالا سرکش گھوڑا	کہساروں کو روندنے والا
نام مرے بھیا کا سن کر	دشمن کانپ اٹھتے ہیں تھرتھر
بھیا مرا پیارا بھیا	چاندسی دلہن لائے گا

اب ذرا سوت کی طرف آیئے۔ یہ وہ سوت نہیں جس کا جلا یا ہر عورت کو جلاتا ہے اور جس کو وہ بیرن کہتے نہیں تھکتی۔ یہ بلوچی زبان کی قدیم غزل ہے جو شادی بیاہ اور اس قسم کی دوسری تقریبوں کے علاوہ فصل کٹنے پر بھی گائی جاتی ہے کبھی اکیلے، کبھی مل جل کر۔ اس کے موضوعات وہی محبوب کا دیدار، وصل، دردِ فراق اور محبوب کی تعریف ہیں:۔

ہوں تیری یاد میں جاناں میں بلبل کی طرح نالاں
گنہ میرا بتا دینا
ہوں تپتی ریگ پر استادہ تیری دید کا خواہاں
خطا میری بتا دینا
ہے سوتے جاگتے تصویرطاقِ دل پہ آویزاں
گنہ میرا بتا دینا

ہالو، جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے، مبارک سلامت کا گیت ہے جو خواتین گاتی ہیں۔ کبھی لڑکے کی پیدائش پر، کبھی اس وقت جب دولہا یا دلہن کو مہندی لگائی جائے یا دولہا کسی بزرگ کی خانقاہ پر سلام کے لئے جا رہا ہو وغیرہ وغیرہ۔ پچھلے زمانے میں جب فاتح قبیلے کے بہادر لڑائی میں جیت کر گھر لوٹتے تھے تو خواتین فتح کی خوشی میں چراغاں کرتی اور ناچ ناچ کر ہالو گاتی تھیں۔ اب بھی بعض علاقوں میں ہالو گانے کے وقت گانے والے ڈھولوں کی تال پر ناچتے ہیں۔ ایسے ہی کسی اور خوشی کی تقریب پر بھی نوکر اور خادم یہی گیت گاتے ہیں۔

بلوچی زبان میں دیہاتی بولیاں، بھی ہیں۔ جنہیں سوال و جواب کی صورت میں گایا جاتا ہے۔ یہ موَرد کہلاتی ہیں اور ان کو میلوں موسمی تہواروں کے موقع پر گایا جاتا ہے۔ گانے والے آمنے سامنے بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک شخص گا کر سوال کرتا ہے اور دوسرا گا کر اس کا جواب دیتا ہے۔

ایک: پگلے! کہہ تجھے کس سے پیار؟

دوسرا، لمبی زلفوں والی نار،
یہ بڑے بڑے کہسار
گئی چھوڑ کے ان کے پار
چھپ گئی کہیں دلدار!

سپت (شاید صفت، کی بدلی ہوئی شکل ہو) ایک اور دلچسپ صنف ہے جس کے معنی ہیں، تعریف۔ اس کا مضمون سندھی وائی پنجابی کافی اور بنگالی مرشدی سے ملتا جلتا ہے۔ اگر کوئی فرق ہے تو یہ کہ وائی، کافی اور مرشدی کو مرد اور عورتیں یکساں طور پر گاتی اور سنتی ہیں۔ لیکن سپت صرف بلوچ خواتین گاتی ہیں۔ بچے کی پیدائش پر رشتہ دار اور اڑوس پڑوس کی خواتین مسلسل سات راتیں سپت گا کر گزارتی ہیں جس میں خدا کی حمد و ثنا، رسول اکرمؐ اور اولیاء کرام کا تذکرہ اور ماں اور بچے کی صحت کی دعائیں ہوتی ہیں۔ اس کا رنگ ملاحظہ ہو:

سپت و ثنا ہا خدالائق است — خدالائق است و رسولؐ لائق است
کئے واب و کئے آگاہ — بندہ واب و خدا آگاہ
(کوئی سوتا اور کوئی جاگتا ہو — انسان سوتا ہو اور خدا جاگتا ہو)

اس سلسلہ کی آخری اور بہت دلچسپ کڑی ہے شیئر یعنی بلوچی کی منظوم داستانِ حسن و عشق۔ اس کے علاوہ اس صنف میں دوسری قوموں سے جنگوں، باہمی آویزشوں اور چراگاہوں کی حفاظت کرتے ہوئے کسی بہادر بلوچ کے کارناموں کا ذکر ہوتا ہے۔ گویا اس کا موضوع ہنگامہ خیز واقعات اور حادثات ہوتے ہیں۔

شیئر کو بلوچی شاعری کا حسین ترین سرمایہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس میں وہ تمام واقعات بڑی سادگی، خلوص اور خوبصورتی سے پائے جاتے ہیں جنہوں نے بلوچ تاریخ مرتب کی ہے۔ کلاسکی بلوچی شاعری کی یہ منظوم داستانیں پہلے بے قافیہ ہوتی تھیں لیکن اٹھارویں صدی کے بعد قافیہ و ردیف کا التزام بھی ہونے لگا ہے۔

بلوچ اس صنف پر جان چھڑکتے ہیں۔ اسے سننا یا گانا باعثِ فخر خیال کیا جاتا ہے۔ گھر، چوپال میلوں اور محفلوں میں یہ ولولہ انگیز داستانیں پڑھی اور سنی جاتی ہیں۔ ان کو سُر تال سے بھی گایا جاتا ہے۔

رات خنک ہے، ایسی خنک کہ زمیں ساری
برف کی صورت ڈھیر ہوئی ہے جم جم کر
جونہی محبوبہ کا سندیسہ پایا میں نے
اپنی سانڈنی پر ہلکا سا پاکھڑ رکھا
اس کی ناک میں ریشمی پھولوں والی سجل مہار
ڈال کے نکلا اپنے احاطہ سے باہر
اس کی پشت اتنی آرام دہ، اس پر بیٹھا
چابک چار جو مارے، سانڈنی ہرنی کے مانند
بے تابی سے اچھلنے لگ پڑی اور کہا!
اے مالک! مجھ پر یہ عتاب، غضب کیسا
بس میری مہاریں پکڑے رہنا میں آپ ہی آپ
سوئے نشیب رواں کہسار کی ندی
کے مانند چلی جاؤں گی بہتی ہوئی
اور بلندی کی جانب سیار بگولے کی صورت
تند ہوا کے دوش پہ تیرنے والے بادل کے مانند
تیز چلوں گی اور تجھے پہنچا دوں گی دیرِ جاناں تک

غرض ان لوک گیتوں میں بلوچوں کی زندگی، ان کی روح اور ان کا ماحول ہر چیز اس وضاحت اور خوش اسلوبی سے جھلکتی ہے کہ ان کو سن کر ہم بھی ان میں شامل ہو جاتے ہیں اور خود کو بلوچ ہی سمجھتے ہیں۔ جیسے ان کے گیت، ان کی زندگی، ان کی روح، ان کا ماحول ہمارا اپنا ماحول ہو۔ فن۔ اگر اس قسم کی بے ساختہ شاعری کو فن کہا جا سکے۔ کی کامیابی اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے! +

★

کراچی آرٹس تھیٹر سوسائٹی کے زیر اہتمام
کُل پاکستان ڈرامہ نگاری کا انعامی مقابلہ

شرائط و ضوابط

۱۔ یہ مقابلہ صرف اردو ڈراموں کے لئے منعقد کیا جا رہا ہے، لہٰذا ڈرامے اردو زبان میں ہونے چاہئیں اور نثر میں لکھے گئے ہوں۔

۲۔ کسی خاص موضوع، طربیہ، المیہ وغیرہ کی پابندی نہیں۔ البتہ ڈرامہ نگاروں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ جدید دنیا کے تقاضے خصوصاً پاکستان کی قومی روایات، معاشرت اور آئڈیالوجی کو خاطر خواہ طور پر ملحوظ رکھیں گے۔

۳۔ ڈرامہ اسٹیج پر بسہولت پیش کئے جانے کے قابل ہو۔ تقریباً ڈھائی گھنٹے میں مناسب وقفوں کے ساتھ پیش کیا جا سکے۔ سٹ کی تبدیلیاں کم سے کم واقع ہوں اور کرداروں کی تعداد محدود رکھی جائے۔

۴۔ ڈرامہ طبعزاد، اَن کھیلا، غیر مطبوعہ، اور مقابلے میں شریک ہونے والے مصنف کی اپنی ملکیت ہونی چاہیئے۔

۵۔ جن ڈراموں پر انعام پیش کیا جائیگا انہیں کم از کم ایک بار پبلک کے سامنے اسٹیج پر پیش کرنے کا پہلا اختیار کراچی آرٹس تھیٹر سوسائٹی کو حاصل ہوگا۔

۶۔ ہر مسودے کی تین صاف نقلیں وصول ہونی چاہئیں۔ مسودے بذریعہ رجسٹری سکریٹری کراچی آرٹس تھیٹر سوسائٹی کے نام بھیجے جائیں یا دستی طور پر ان کی رسید حاصل کی جائے۔

۷۔ ایک مصنف کے ایک سے زیادہ ڈرامے بھی مقابلے میں شرکت کے لئے بھیجے جا سکتے ہیں لیکن تینوں انعامات تین مختلف ڈرامہ نگاروں کو پیش کئے جائیں گے۔ البتہ کسی مصنف کے ایک سے زیادہ ڈرامے انعام کے قابل سمجھے گئے تو سوسائٹی اعلان کردہ انعامات کے علاوہ کوئی مزید انعام بھی دے سکتی ہے۔ یہ سوسائٹی کی صوابدید پر منحصر ہوگا۔

۸۔ پہلا انعام مبلغ ۵۰۰ روپے، دوسرا مبلغ ۳۰۰، اور تیسرا مبلغ ۲۰۰ روپے کا ہوگا۔ انعامات کا فیصلہ ایک بورڈ کے مشورہ سے ہوگا جو سوسائٹی نامزد کرے گی۔ انعامات نیز اس مقابلے سے متعلق جملہ امور کی بابت کراچی آرٹس تھیٹر سوسائٹی کا فیصلہ قطعی تصور کیا جائے گا۔

۹۔ ڈراموں کے مسودات ۵ ستمبر ۱۹۵۹ء تک سکریٹری کراچی آرٹس تھیٹر سوسائٹی کے پاس مذکورہ ذیل پتہ پہونچ جانے چاہئیں۔

سکریٹری کراچی آرٹس تھیٹر سوسائٹی ۱۵۴ میکلوڈ روڈ کراچی

۱۰۔ اگر کوئی اور امر وضاحت طلب ہو تو سکریٹری سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

"بنگلہ تنقید" ــــــــــــ بقیہ صفحہ : (۱۳)

ہمارے ادیب یہ پسند نہیں کرتے کہ کسی بڑے حلقہ میں ان پر تنقید کی جائے۔

ہمارے نقادوں اور تخلیقی کام کرنے والوں نے خاموشی سے ایک قسم کے دوہرے معیار کو قبول کر لیا ہے۔ ایک وہ جو اپنے ملک کے قارئین کے لئے برتا جاتا ہے اور دوسرا باقی دنیا کے لئے۔ جس طرح آزادگی کا اظہار بنگلہ میں لکھے ہوئے تنقیدی مضامین پر کیا جاتا ہے اس سے زیادہ انگریزی میں لکھی ہوئی تنقیدوں پر ہوتا ہے کیونکہ یہ ہر قسم کے قارئین کی نظروں سے گزرتی ہیں۔ ایسے مضامین کے خلاف ہمیشہ یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ اپنے ملک کو دوسروں کی نظروں میں نہ گراؤ۔ یہ ذہنیت بڑی عجیب ہے اور اُس معاشی بے اطمینانی کی آئینہ دار ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے لیکن یہ ذہنیت اچھی تنقید کے منافی ہے جس کا فرض صاف گوئی اور غیر جانبداری کے ساتھ ادب پاروں کی قدر و قیمت کا تعین ہے۔ وہ نقاد جو سچی بات کہنے سے ڈرتا ہے یا بلند معیار کو قبول نہیں کرتا، اپنے فرائض کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ ہمیں اپنے تنقیدی ادب کی تنگ خیالی کو دور کرنے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے : وسعتِ علم اور بے باکی ؎

"اگر اعتبار ہوتا !" ــــــــــــ بقیہ صفحہ : (۳۰)

عدنان :۔ ضرور ــ خدا کرے کل کی صبح بھی ایسی ہی خوشگوار ہو۔ کل میں بھی چڑیوں کے لئے تھوڑا سا دانہ لاؤں گا۔

درشہوار:۔ شکریہ۔ چڑیوں کو دانہ کھلانا ثواب کا کام ہے۔ معلوم نہیں میری خادمہ کہاں چلی گئی۔ (درشہوار کھڑی ہو جاتی ہے اور آوازیں دیتی ہے) سکینہ ــ سکینہ۔ کیا وقت ہوگا؟

عدنان :۔ گیارہ بج چکے ہیں۔ معلوم نہیں میرا نوکر کدھر نکل گیا (آوازیں دیتا ہے) چمن چمن ــ

(عدنان دائیں جانب اور درشہوار بائیں طرف چل دیتی ہے)

درشہوار :۔ (خود سے) نہیں نہیں میں ہرگز اسے نہیں بتاؤں گی کہ میں ہی درشہوار ہوں۔ اس کے تصور میں بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والی درشہوار ہی کا رہنا زیادہ اچھا ہے۔ جس کے بال لانبے لانبے تھے اور جس کا چہرہ گلاب کی طرح شاداب تھا۔ اور جو ہر سہ پہر اپنے دریچہ سے سفید پھولوں کا ہار اس کی جانب پھینکدیا کرتی تھی۔

عدنان :۔ (خود سے) نہیں نہیں میں اسے ہرگز نہیں بتاؤں گا کہ میں ہی عدنان ملک ہوں۔ میرا چہرہ مسخ ہو چکا ہے۔ یہی اچھا ہے کہ اس کے ذہن میں اسی عدنان کی تصویر رہے جو بڑا وجیہہ اور بہادر تھا اور جو ہر صبح گلابوں کا ایک گلدستہ اس کے دریچہ کی طرف پھینکا کرتا تھا۔

(سامنے سے سکینہ اور چمن نمودار ہوتے ہیں۔ وہ دونوں ہنستے ہوئے آرہے ہیں)

درشہوار :۔ کہاں چلی گئی تھیں تم ؟

سکینہ :۔ کہیں بھی نہیں مالکن

عدنان :۔ کہاں تھے چمن ؟

چمن :۔ بس قریب ہی تو تھا مالک

(درشہوار سکینہ کے کاندھے کا سہارا لے لیتی ہے۔ عدنان ملک چمن کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیتا ہے اور دونوں اسی طرح دائیں اور بائیں جانب روانہ ہو جاتے ہیں جس طرح پارک میں داخل ہوئے تھے۔ جانے سے پہلے وہ ایک دوسرے کی جانب مڑ کر دیکھتے ہیں)

عدنان :۔ (بہ آواز بلند) خدا حافظ! کل تک کے لئے۔

درشہوار:۔ خدا حافظ !

عدنان :۔ صبح بہت خوشگوار تھی۔

درشہوار:۔ بہت خوشگوار۔ کل پھر ایسی ہی صبح ہوگی !

(دونوں مخالف سمتوں میں روانہ ہو جاتے ہیں)

عدنان :۔ اللہ کی پناہ وہ کسقدر بدل گئی ہے ؟

چمن :۔ جی مالک ؟

درشہوار:۔ کتنا بدہئیت ہو گیا ہے وہ !

سکینہ :۔ کیا مالکن ؟

(پردہ آہستہ آہستہ گر جاتا ہے)

(مرکزی خیال ماخوذ)

باب مراسلات

کل پاکستان انجمن ترقی اُردو
اُردو بورڈ، کراچی
۲۴۔ جون ۵۹ء

مکرمی رفیق خاور صاحب سلمہ اللہ تعالٰے

میں نے آپ کا مضمون "اردو ادب کی تشکیل نو" پڑھا خوب لکھا ہے۔ آپ کی نظر قدیم اور جدید اردو ادب پر بہت صحیح اور گہری ہے۔ آپ نے مقدمہ حالی کی اہمیت، افادیت اور اس کے انقلاب انگیز اثر کو جتانے کے بعد اس سلسلۂ انتقاد کو آگے بڑھانے کے متعلق جو بات سجھائی ہے وہ نہایت معقول، ضروری اور قابل توجہ ہے۔
اس مضمون کو پڑھ کر مجھے خوشی ہوئی اور میں نے کچھ حاصل بھی کیا۔ اُردو کی قسمت اب آپ ہی جیسے وسیع النظر اور پرخلوص اہل قلم کے ہاتھ میں ہے۔

عبدالحق

اپریل مئی اور جون کے ماہِ نو پڑھنے کے بعد چند نتائج اخذ کر چکا ہوں ماہ نو کے نئے رجحانات کا اندازہ واضح ہو رہا ہے
آپ کے مضمون "اردو ادب کی تشکیلِ نو" کا بغور مطالعہ کیا اور اس سے راہ نمائی حاصل کرنے کی پرخلوص کوشش کی یہ مضمون بیحد خیال افروز ہے اور واضح اشارات موجود ہیں جن کی روشنی میں منزل کا ہیولےٰ بھی ابھرتا ہے اور منزل کی طرف بڑھنے کی تحریک بھی ملتی ہے۔ پھر بھی تشنگی باقی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ فطرتاً انسان سہل انگار ہے۔ خود سوچنے کی بجائے دوسروں کے فکر سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ خود سوچنا اور پھر اپنے فکر کو راہ بنا بنا کر آگے بڑھنا خال خال نابغانِ دہر کا کام ہے۔ اور ایسے لوگ کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں جو ماضی اور حال کی ہر تحریک کو اپنے اندر جذب کر کے نئی راہیں تراشتے ہیں اور جدید روایات کی تشکیل کرتے ہیں اسی قسم کے دو چار اور مضامین شائع ہوں تو آپ کی تحریک کا وہ رخ واضح ہو سکے جسے روشنی میں لانا انتہائی ضروری ہے۔ امید ہے کہ آپ توجہ کریں گے۔ (یہ مضمون ایک طویل سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ مدیر)
یہ ایک فطری امر ہے کہ اگر انسان اپنے ماضی اور اس کی روایات کو فرسودہ اور دقیانوسی سمجھ کر یک قلم ترک کر دے تو اسے لامحالہ ان تحریکات کا سہارا لینا پڑتا ہے جو کرۂ ارض کے کسی حصے میں کامیاب ہوں یا ہو رہی ہوں لیکن دوسروں کے سہارے آگے بڑھنا بھی تو عقوبتِ دوزخ کے برابر ہے۔ ایک مقام ایسا آتا ہے کہ انگلی پکڑ کر چلانے والے ساتھ چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ ہر ملک اور ہر قوم کے اپنے اپنے مسائل ہیں اور ایک کا جامہ دوسرے پر صحیح نہیں بیٹھتا ڈھیلے بنتے اور پھٹتے رہتے ہیں۔ شہاب ثاقب کی چمک چند لحظوں کے لئے بہت شوخ و شنگ ہوتی ہے لیکن اس گریزپا روشنی سے کسبِ نور کرنے والے بھی چند لحظوں کے لئے ہی زندہ رہ سکتے ہیں اور ان کا فن چند لمحوں کی چکا چوند کے بعد تاریکیوں میں گم ہو جاتا ہے۔
آپ کے مضمون کا لب لباب یہی ہے کہ ہمارا فن "اپنا" ہونا چاہئے۔ ایسا فن جس کے متعلق ہم جرأت سے کہہ سکیں کہ یہ ہمارے ارادوں، ہماری اُمنگوں، روایتوں اور خواہشات کا مظہر ہے۔ اس کی ہر دھڑکن ہمارے اپنے دل کی لرزش ہے۔ ہماری روح کا ساز دوسروں کے مضراب کا ممنونِ احسان نہیں بلکہ اس کا ہر نغمہ ہماری اپنے مضراب سے لرزا اور وجود میں آیا۔ مستعار خیالات اور مانگے تانگے کے جذبات کسی بڑے ادب کی تخلیق نہیں کر سکتے۔ اپنے من میں اور اپنے من سے زیادہ اپنے ماحول اور اس کے مخصوص رجحانات میں ڈوب کر لکھنا ہی عظمت کا آئینہ دار ہے اور یہ عظمت بڑی کاوش اور سخت جانی کے بعد نصیب ہوتی ہے

غلام الثقلین نقوی

"ماہِ نو" اپریل ۱۹۵۸ء میں ڈاکٹر میری این شیمل کا مضمون "منصور حلاج اقبالؒ کی نظر میں" پڑھا یہ ایک قابلِ غور مضمون ہے جو اپنے اندر معنی خیز گہرائی لئے ہوئے ہے۔
علامہ اقبالؒ میں مسائل اور شخصیات پر حکم لگانے کی جرأت تھی جو ایک بڑی بات ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انہیں بعض خیالات کو ناگزیر طور پر از سر نو ترتیب دینا پڑا۔ چنانچہ شیخ اکبر اور حافظِ شیراز کے متعلق ان کے تصورات میں تبدیلی ہوئی۔ منصور حلاج کے متعلق تو جیسا جاوید نامہ کے حوالے سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اقبال کے تصور میں بڑی ہی نمایاں تبدیلی ہوئی۔
منصور کے بارے میں جو منفی نقطۂ نظر اقبالؒ نے شروع ہی سے اختیار کیا تھا وہ نہ عجیب تھا نہ دوسروں سے مختلف کیونکہ علی بن عثمان ہجویری (حضرت داتا گنج بخشؒ) نے بھی حسین فارسی (منصور حلاج) کے حلولی فرقے کو ملامت کی نظر سے دیکھا تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:
"میں نہیں جانتا کہ فارسی کون ہے اور ابو سلمان کون۔ انہوں نے کیا کیا اور کیا کہا لیکن جو شخص تحقیق اور توحید کے خلاف چلتا ہے اس کو دین میں

کچھ نصیب نہیں ہوتا۔"

علی بن عثمان ہجویریؒ کی رائے محض ایک عام صوفی کی رائے نہ تھی۔ وہ عالمانہ اور مجتہدانہ نظر رکھتے تھے۔ اسی طرح کی ایک سیدھی سادی اور پرخلوص رائے اقبال نے بھی شروع میں اختیار کی جو آج ایک صاحبِ علم کی نگاہ میں کھٹکتی ہے کیونکہ منصور پر اب بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور میسی نان جیسے مستشرق نے منصور کے مسلک میں جان ڈال دی ہے جس کی تحقیق کے آگے شاید اقبال کو بھی سر تسلیم خم کرنا پڑا۔

ڈاکٹر میری این شیمل کے سامنے نہ مجھے صائب الرائے ہونے کا دعویٰ ہے نہ ان سے اختلاف کی مجال، تاہم یہ کہنے کی جسارت ضرور کروں گا کہ منصور حلاج کے مسلک سے اقبال کا متاثر ہونا، خصوصاً میسی نان کی مطبوعات کے بعد کچھ زیادہ قابلِ اعتبار معلوم نہیں ہوتا۔ اقبال کے کلام کا مطالعہ ہمیں یہ باور کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ اقبال اور منصور میں بُعد المشرقین ہے۔ اقبال اور منصور کے ہاں فنا فی اللہ کا مفہوم جُدا جُدا ہے۔ ان کے درمیان خودی سے لیکر بیخودی تک کی وسیع و عریض خلیج حائل ہے منصور کے اناالحق اور اقبال کے مردِ مومن میں کوئی موافقت نہیں۔ اقبال کا مردِ مومن رومی کے شیرِ خدا اور نیٹشے کے فوق البشر کے قریب تو ہے لیکن منصور کے اناالحق کے مفہوم کے نزدیک نہیں۔ نعرۂ اناالحق بدھ کے نروان اور شوپنہاور کی نفرتِ دنیا کے قریب تو ہے لیکن ایک کلیم سربکف اور حسینؓ بکنارِ فرات سے کوئی واسطہ نہیں۔

ڈاکٹر موصوف نے اناالحق کی تشریح وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے نظریات کی روشنی میں کی ہے اور رومی کا حوالہ دیا لیکن اناالحق سے حلاج کا منشا واضح نہیں ہوسکا حالانکہ فاضل مضمون نگار نے حلاج کے شارح روزبہان باقلی کا حوالہ بھی دیا ہے۔ یہ باور نہیں کیا جاسکتا کہ ڈاکٹر موصوف کی نظر رومی کی تصنیف "فیہ۔ فیہ" پر نہ پڑی ہو کیونکہ لوہے اور آگ والی تمثیل اس سے ماخوذ ہے۔ "فیہ مافیہ" میں رومی کی اپنی زبان سے اناالحق کی تفسیر ایک نشست میں بیان ہوئی جو بڑی جاندار ہے اور حلاج کے مسلک کے بالکل قریب ہے۔ فرمایا:

"حلاج نے اناالحق کہہ کر کونسی بڑی بات کہی؟ بڑی بات تو وہ کہتے ہیں جو انا العبد کہتے ہیں۔ انا العبد کہنے سے دو ہستیوں کا اقرار ہوتا ہے یعنی اللہ اور بندہ۔ لیکن اناالحق کہنے سے تو اپنی مکمل نفی ہوتی ہے، صرف خدا کا اقرار ہے۔ دوئی کا تصور بھی محال ہے۔ اس سے زیادہ عجز کیا ہے۔ اس سے بڑھ کر انکساری کیا ہو۔"

یہاں عجز اور انکساری تو ممکن ہے حاضرین پر اثر ڈالنے کے لئے کہا گیا ہو کیونکہ اصل تحویل وحدت الوجود کے ایجاب کی صاف غمازی کرتی ہے۔ خود منصور کی بھی (جس نے قصا الہندیہ کی خاک چھانی تھی اور فلسفۂ ویدانت سے ناواقف نہ تھا) اناالحق سے مراد وحدت الوجود کے اقرار باللسان کے سوا کچھ نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ وحدت الوجود کا مسئلہ سراسر اسلامی توحید و تحقیق کے خلاف پڑتا تھا۔ ان حالات میں اقبال جیسا قرآن فہم تصورِ منصور کی کبھی حمایت نہیں کرسکتا تھا۔

فاضل مقالہ نگار رومی کے مقام و شرف سے ضرور واقف ہوں گی اور اقبال تو رومی سے بیحد مرعوب تھے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اقبال، منصور حلاج کے متعلق زاویۂ نگاہ بدلنے میں میسی نان کے رجحانات اور انکشافات سے تو متاثر ہوئے لیکن مولانا روم کی تشریح سے ناواقف رہے یا جان بوجھ کر چپ سادھ لی؟ درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ اقبال کا تصورِ حلاج اسی مسلک پر مبنی رہا جس کا ذکر انہوں نے اپنے لیکچروں میں کیا اور جاوید نامہ مرتب کرتے وقت بھول نہیں ہوئی۔ "جاوید نامہ" ایک جامع اور مہتم بالشان نظم ہے جس میں کئی مغربی نظریوں پر تبصرہ اور شاہکاروں کا جواب ہے۔ "جاوید نامہ" میں زروان فرشتہ، سرودش نازنیں، منصور حلاج، افغانی یا رومی کوئی ہو، ہر ایک میں اقبال خود ہی بول رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے ہی مرکزِ فکر کو مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے جلا بخشی ہے۔ رہی اقبال کی اپنی زبان میں اناالحق کی تعریف تو ان کے کلام سے صرف ایک جواہر پارہ پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں:۔

اناالحق جز مقامِ کبریا نیست	سزائے او چلیپا ہست یا نیست
اگر فردے بگوید سرزنش بہ	اگر قومے بگوید ناروا نیست

سلیم صادق

مراسلات "ماہ نو" میں آپ کی دلچسپی کا عملی ثبوت ہیں۔ جو آپ کے افکار و تاثرات کو بروئے کار لانے میں آپ کا ہمیشہ ممد و معاون رہا ہے اس کے ذریعہ تبادلۂ خیالات میں سرگرمی سے حصہ لیجئے۔ (مدیر)

ر۔خ

نقد و نظر

شرحِ دیوانِ غالب

از پروفیسر یوسف سلیم چشتی
ناشر: عشرت پبلشنگ ہاؤس،
ہسپتال روڈ، انار کلی، لاہور

صفحات : ۹۵۲ قیمت : آٹھ روپیہ

اس کتاب میں کلامِ اقبال کے ایک کار آزمودہ شارح نے دیوانِ غالب کی طرف رجوع کیا ہے۔ سابقہ شرحوں کی موجودگی جہاں اس کے لئے سہولت کا باعث ہوئی وہاں حصولِ امتیاز میں دقت آفریں بھی ثابت ہوئی۔ اس کے باوجود وہ اپنا نقش درست کرنے میں کافی کامیاب رہے ہیں۔ مگر ـــ جو مشکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے۔ کلامِ غالب کی تشریح ایک لامتناہی چکر بن کر رہ گئی ہے اور کسی شرح کے حرفِ آخر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً یہ شعر لیجیے ؎

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

شارح نے حالی کا سہارا لیتے ہوئے کہہ دیا ہے کہ "اگر یہ کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو اس کی فہم کا قصور ہے۔" حالی نے جو معنی بتائے ہیں وہ اپنی جگہ معقول ہیں، لیکن "ہمت" ایک صوفیانہ اصطلاح بھی تو ہے جس کے معنی ہیں، ترکِ دنیا کی ہمت۔ چنانچہ غالب نے مثنوی "رنگ و بو" میں تین پریوں۔ دولت، قوت اور ہمت کا ذکر کیا ہے جو ایک بادشاہ کے خواب میں آئیں۔ آخرالذکر کے بارے میں غالب نے جو کچھ کہا ہے اس سے اس کی نوعیت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ اس کی روشنی میں اس شعر کو دیکھا جائے تو کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ جو قطرہ دنیا کو ترک کر دینے کی ہمت رکھتا ہے ہم اس کو اپنی آنکھوں میں جگہ دیتے ہیں۔ اسی طرح "رہا آباد عالم......" میں جو گنجلک سی نظر آتی ہے وہ 'ہمت' کے اس مفہوم سے فوراً دور ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی ہی شرحِ تازہ کی گنجائش کئی اور اشعار میں بھی ہوگی۔

شارح کو عربی و فارسی پر خوب عبور ہے۔ اس سے اس نے کافی فائدہ اٹھایا ہے اور اسلامی افکار و نظریات کے اصلی ذرائع سے استفادہ کر کے وحدت الوجود کے بارہ میں نہایت اہم انکشافات کئے ہیں۔

ایک جدید شارح سے لازماً یہ توقع بھی ہوتی ہے کہ وہ ذوق اور تنقید کے تقاضوں کو کماحقہٗ پورا کرے گا۔ قاری کو یہ دیکھ کر بے حد مایوسی ہوتی ہے کہ مقدمہ میں من و عن دوسروں کی پامال آرا کو دوہرا دیا گیا ہے۔ غالب کے متعلق کئی باتیں قصۂ پارینہ بن چکی ہیں۔ خصوصاً اس کی فارسی شاعری کے بارے میں۔ تعجب ہے کہ شارح نے ان کے فارسی کلام سے واقف ہونے کے باوجود ان کے متعلق روایتی رائیں دوہرا دی ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ تصوف کے 'برائے شعر گفتن' ہی کی حد تک قائل تھے۔ اگر تعارف میں مکتبی و رسمی رنگ غالب نہ ہوتا تو کتاب کی افادی حیثیت زیادہ بلند ہوتی۔

قادر نامۂ غالب

مرتب: تحسین سروری
ناشر: مکتبۂ نیا راہی

صفحات: ۶۴، قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ

آثارِ غالب کی تلاش اب بجائے خود ایک مقصود بن چکی ہے اور ہم آئے دن اس میں کسی نئی دریافت کا اضافہ پاتے ہیں۔ انہی میں سے ایک "قادر نامہ" ہے جس کا مقصد بچوں کو فارسی کے عام الفاظ اور ان کے معانی ذہن نشین کرانا ہے۔ یہ کتاب ایسے پیرایہ میں لکھی گئی ہے کہ بچے اسے شوق سے پڑھیں۔ یہ نظم مدتوں نایاب رہی اور اس کا غالب کی تصنیف ہونا بھی مشتبہ تھا۔ مرتب نے اس کا سراغ پا کر ضروری معلومات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جن لوگوں نے غالب کے فارسی کلام کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ "قادر نامہ" کے کئی الفاظ کو مانوس پائیں گے۔ یہ اس منظوم کتابچے کے غالب کی تصنیف ہونے کی ایک اور بہت عمدہ شہادت ہے۔

کلامِ بینظیر

مرتب: محمد اکبرالدین صدیقی
ملنے کا پتہ: کتاب خانہ عابد روڈ حیدرآباد دکن

صفحات: ۴۶۴، قیمت چھ روپے

سید محمد بینظیر شاہ وارثی بینظیر صحیح معنوں میں ایک صوفی منش اور درویش سیرت شاعر تھے۔ گو ان کا چرچا ایک فطرت نگار شاعر ہی کی حیثیت سے رہا ہے۔ اس لئے ان کے اس نئے اور حقیقی عارفانہ رنگ کو دیکھ کر اکثر لوگوں کو تعجب ہوگا۔ در حقیقت ان کی فطرت نگاری

جس میں وہ زیادہ کامیاب رہے ہیں، عرفان و سلوک ہی کا جزو ہے۔ ان کا رشتہ ایک طرف وارثی قادری مجددی سلسلوں سے ملتا ہے تو دوسری طرف سنائی اور عطار جیسے شاعروں سے۔ انکی شاعری مذہب و تصوف کے دبیز پردوں ہی سے گزر کر آتی ہے۔ اسلئے اس کا اپنا رنگ نسبتہً کم نمایاں ہے۔ قاری زیادہ تر مجذوبیت ہی کا احساس لے کر اٹھتا ہے۔ بنابریں شاعر ایک گزشتہ دور کی یادگار کی حیثیت ہی سے قابلِ توجہ ہے۔

اقبال کا سیاسی کارنامہ

صفحات:- ۵۳۳، قیمت چھ روپے
ناشر:- کاروانِ ادب، کراچی

از محمد احمد خاں

اقبال کا شعری و فکری کارنامہ اس قدر نمایاں رہا ہے کہ اس کے سامنے ان کے سیاسی کارنامے کو ابھرنے کا موقع نہیں ملا لیکن قیامِ پاکستان نے ثابت کر دیا ہے کہ ان کے سیاسی فکر کی اساس کس قدر مضبوط تھی۔ کیونکہ یہ درحقیقت ان کے عکیمانہ فکر کا جزو تھا۔ زیرِ نظر کتاب میں اس اہم موضوع کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اندازِ بیان بہت صاف اور دلکش ہے جس میں عنوانات کی طرحداری اور بھی کیف پیدا کرتی ہے۔

حسرت کدہ

از شفقت کاظمی
ناشر: علمی کتب خانہ، مظفر گڑھ
صفحات: ۱۷۶۔ قیمت: تین روپے

"کس قدر حیرت ہوتی ہے یہ دیکھ کر کہ ہم ان کی پہلی اور آخری غزل میں کوئی فرق محسوس نہیں کر سکتے؟"

بات نیاز فتحپوری کے انہی الفاظ پر ختم ہو جاتی ہے لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہ جاتا ہے کہ آخر یہ حسرت کدے تعمیر کرنے کی خواہش کیوں؟ شفقت کاظمی کے علاوہ جلیل قدوائی بھی تو خاکپائے حسرت ہونے کے مدعی ہیں۔ کوئی شخص کسی دوسرے شاعر کی ریس کرنے سے نہ تو شاعر بن سکتا ہے اور نہ اس جیسا شاعر اور نہ بڑا شاعر۔ خواہ وہ میر ہو یا غالب یا اقبال۔ اور پھر ریس بھی وہ جس میں اپنی خودی تمام تر غیر کی خودی بن جائے۔ رنگِ حسرت کو اگر وسیع بھی تسلیم کر لیا جائے تو نہ شفقت کاظمی کے یہاں اس کی کوئی علامت ہے نہ جلیل قدوائی کے یہاں۔ جب وہ بنیادی احساس و تجربہ ہی نہیں یعنی حسن سے گہرا لگاؤ اور عشق کی سرمستی اور سوز و گداز تو پھر کلام میں تاثیر کہاں؟ اس قسم کی شعری پیر پرستی اور مریدانہ ذہنیت شعر و ادب کے لئے کوئی اچھی فال نہیں۔

تاریخ آزاد پٹھان

(جلد اول)

از ماللہ بخش یوسفی
صفحات:- ۳۱۲، قیمت چار روپے آٹھ آنے
ملنے کا پتہ:- محمد علی ایجوکیشنل سوسائٹی۔ کراچی ۵

کچھ عجب نہیں کہ آزاد پٹھانوں کی اس پہلی مبسوط تاریخ سے نہ صرف سردارانِ قبائل کے چہرے چمک اٹھیں بلکہ تمام ملتِ پاکستان کے دل میں بھی فخر و مسرت کی لہر موجزن ہو۔ کیونکہ یہ اسی کے شجیع و دلاور فرزند ہیں جن کی ساری تاریخ آزادی و حریت اور جہاد ہی کی تاریخ ہے۔ مصنف نے موضوع کے تمام پہلوؤں کا بڑی خوش اسلوبی سے احاطہ کیا ہے اور مورخانہ تحریر کی متانت اور صفائی کو بھی بڑی کامیابی سے برقرار رکھا ہے، جو تاریخی کتابوں میں شاذ ہے۔ غرض مند عناصر اور ناساز حالات نے پشتونوں کے متعلق جو غلط فہمیاں پیدا کر رکھی تھیں ان کو حتیٰ سے دور کیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں پٹھانوں کی صورت و سیرت اور نسل و قوم کے حقیقی خد و خال جلوہ گر ہیں۔

زلیستم

از لفٹننٹ کرنل مشتاق احمد
صفحات: ۱۲۸، قیمت: درج نہیں۔
ملنے کا پتہ:- مکتبہ رحمانیہ [illegible] راولپنڈی

ہست ہم تقلید از اسمائے عشق۔ [illegible] کے اس مجموعہ پر جو ایک سپاہی شاعر کی کاوش [illegible] شروع سے آخر تک عشق ہی عشق چھایا ہوا ہے۔ یہاں تک [illegible] مرشد اقبال کا گمان ہوتا ہے۔ یہ ہم آہنگی حکیم ملت کے اس دعوے کی تصدیق کرتی ہے کہ "یہاں اب مرے ہم زباں اور بھی ہیں"

(۱) "سیارہ" فیڈریشن آف [illegible]
(۲) "ارم"۔ [illegible] کراچی
(۳) "ہونہار" گورنمنٹ [illegible] کراچی
(۴) "سید رضا علی کالج میگزین" (۱۹۵۸ء)۔ کراچی

یہ چاروں رسالے ہماری نئی پود کی سرگرمیوں کے آئینہ دار ہیں اور ان کی ابھرتی ہوئی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے بہت امید افزا بھی۔ [illegible] کہ ہم ان آئینوں میں حسنِ فرداکی جھلک [illegible] میں مواد اور ٹیکنیک کے اعتبار سے [illegible] ریحان کے خاکوں اور کارٹون [illegible] سامان نظر آتا ہے۔ امید ہے یہ کوششیں آئندہ اور بھی وقیع ثابت ہوں گی۔

بچے کی
پیدائش
سے پہلے ...
ماں کی زندگی کے تحفظ میں کیا چیز مدد دیتی ہے ؟
آپ کا ڈاکٹر آپکو بتائیگا کہ پیدائش کی نالی کی بیرونی جلد یا اندرونی جھلی میں اگر ذرا سی بھی خراش ہو جائے تو جراثیم کو گھس داخل ہونے کا موقع مل جاتا ہے اور نتیجے کے طور پر زچہ چھوت کی بیماری یا زچگی کے بخار میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ بہت سی خواتین اس بات کو نہیں جانتیں کہ زچگی کے وقت جو چھوت لگ جاتی ہے اُس سے زچہ کو نہایت شدید تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے اور اُس کے بعد یہ حالت مستقل صورت اختیار کر لیتی ہے اور کبھی کبھی اس کا نتیجہ بانجھ پن ہوتا ہے۔ اپنے ڈاکٹر سے مشورہ لیجئے کہ زچگی کے موقع پر ڈیٹول کس طرح استعمال کرنا چاہیے۔
بچے کی پیدائش سے پہلے، پیدائش کے دوران میں اور پیدائش کے بعد ڈاکٹر اور دائیاں حاملہ خواتین کی حفاظت کیلئے ڈیٹول پر اعتماد کرتے ہیں۔ انکی تقلید کیجئے۔ ڈیٹول کی ایک بوتل ہمیشہ اپنے گھر میں موجود رکھئے۔
DETTOL
ڈیٹول
* ایک زود اثر دافع سمیت دوا ہے جو جراثیم کو بہت جلد ہلاک کر دیتی ہے۔
* یہ آیوڈین یا لائی سول کی طرح زہریلی نہیں ہے۔
* اسے ایک بچہ بھی محفوظ طریقہ پر استعمال کر سکتا ہے۔
* یہ جس جگہ لگائی جائے وہاں ذرا بھی تکلیف نہیں ہوتی۔
* اس کی بو ناگوار ہرگز نہیں۔
پیشہ ور ڈاکٹر ڈیٹول استعمال کرتے ہیں اور استعمال کا مشورہ دیتے ہیں۔
ڈیٹول کی ایک بوتل ہمیشہ اپنے گھر میں موجود رکھئے۔
ریکٹ اینڈ کولمین آف پاکستان لمیٹڈ۔
پوسٹ آفس بکس نمبر ۴۶۳۸ - کراچی نمبر ۱
RC 812
JWT

ادارۂ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا۔ مطبوعہ: ناظر پرنٹنگ پریس میکلوڈ روڈ کراچی ⁂ مدیر: رفیق خاور

اگست ۱۹۵۹ء

صدر پاکستان ، جنرل محمد ایوب خاں کی زیر صدارت
نتھیا گلی میں گورنروں کی اہم کانفرنس

صدر پاکستان ، جنرل محمد ایوب خاں :
دوتھوهار کے علاقہ کا معائنہ ، جہاں نیا دارالحکومت بنایا جائے گا

جناب محمد شعیب ، وزیر مال حکومت پاکستان
(نئے سال کے بجٹ کا اعلان)

صدر پاکستان ، جنرل محمد ایوب خاں ، آزاد کشمیر کے
صدر مقام مظفرآباد میں

شعبہ فلمسازی ، حکومت پاکستان ، کی بنائی ہوئی پہلی اخباری فلم :
تقریب افتتاح کے موقع پر وزیر خارجہ جناب منظور قادر
مہمانوں کی کتاب پر دستخط کر رہے ہیں

آپ کی ہونہار لڑکی ایک لائق طبیبہ بن سکتی ہے

اس کی صحت پر خاص توجہ دیجئے!

آپ چاہیں تو اپنی ہونہار لڑکی کو طبیبہ بنا سکتے ہیں۔ لیکن فی الوقت اس کی صحت کا خیال رکھنا ضروری ہے کیونکہ اچھی صحت پر ہی اس کی آئندہ کامیابی کا انحصار ہے۔ نشو و نما کی عمر میں مناسب غذا کے علاوہ کسی اچھے ٹانک کی ضرورت بھی رہتی ہے تاکہ جسمانی اور دماغی قویٰ اچھی طرح پرورش پا سکیں۔

سِنکارا ایسے ہی قوت بخش اجزا سے بنایا ہوا ایک مکمل اور متوازن ٹانک ہے۔ مفید و موثر جڑی بوٹیوں کے نچوڑ کے علاوہ ضروری حیاتین کے اضافے نے اسے ایسا جامع مرکب بنا دیا ہے جس کا استعمال ہر ایک کیلئے ہر موسم میں یکساں مفید بلکہ ضروری ہے۔
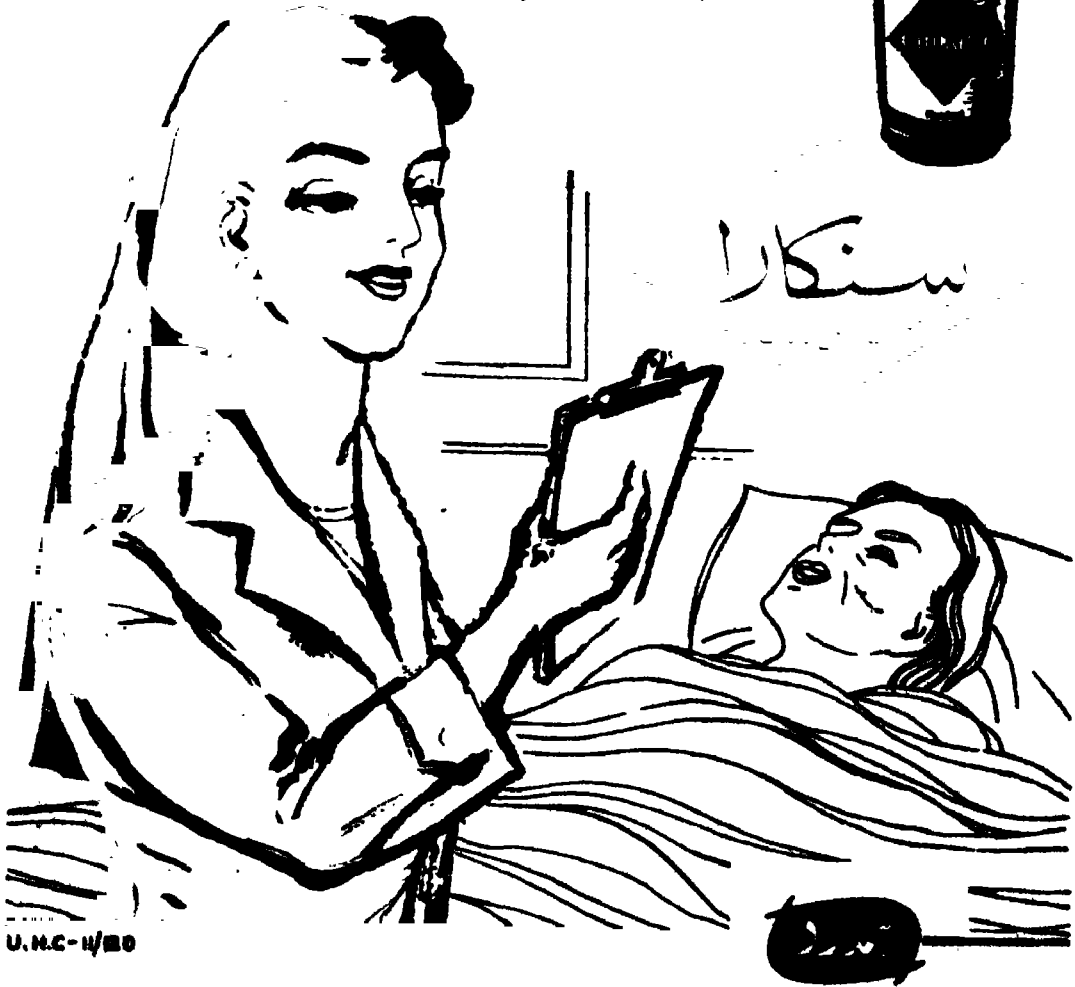
U.H.C-11/80

لہلہاتی کھیتیوں کے محافظ
جب کبھی فصل خراب ہوئی کاشتکار نے "شومئی قسمت" کا گلہ کیا اور
یہ کبھی نہ سوچا کہ کم پیداوار کا باعث "شومئی قسمت" نہیں بلکہ
پودوں کی بیماریاں اور وہ مہلک کیڑے ہیں جو فصلوں کو تاراج کرتے ہیں۔
محکمۂ تحفظ نباتات کے دوش بدوش برماشیل نے بھی ان گنت تجربوں اور مظاہروں کے ذریعہ یہ بات کاشتکاروں
پر واضح کر دی ہے کہ "شیل ایگری کلچرل کیمیکلز" ہی ان کی لہلہاتی ہوئی کھیتیوں کے بہترین محافظ ہیں۔
پاکستان کیلئے غیرملکی زرمبادلہ بچانے میں بھی شیل کی تجربہ گاہوں سے نکلی ہوئی مصنوعات کو بڑا دخل ہے کیونکہ یہی مصنوعات
کیڑوں کا قلع قمع کر کے فصلوں کو تباہ کاریوں سے بچا رہی ہیں اور اس طرح ملک میں غلہ کی پیداوار روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔
برماشیل ترقی پاکستان کا حصہ ہے
BSP 7 59

جسم میں تازگی
لائف بوائے
صابن
کی بدولت
لائف بوائے کے جراثیم سے محفوظ رکھنے والے فرحت بخش جھاگ جلد کے ہر مسام سے جراثیم آلود میل اور گرد کو الگ کر دیتے ہیں جس سے جسم صاف اور ستھرا ہو جاتا ہے اور آپ دن بھر ایک لطیف تازگی محسوس کرتے ہیں۔ یہ اطمینان کر لیجئے کہ آپ کے گھر میں سب کی صحت مفرح لائف بوائے صابن سے محفوظ رہے۔
LIFEBUOY
SOAP
لائف بوائے صحتمند زندگی کا ضامن ہے
L. 19—193 UD
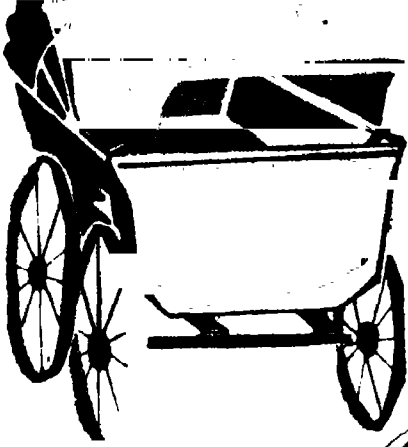
بچے کی
پیدائش
سے پہلے ...
ماں کی زندگی کے تحفظ میں کیا چیز مدد دیتی ہے؟
آپ کا ڈاکٹر آپکو بتائیگا کہ پیدائش کی نالی کی بیرونی جلد یا اندرونی جھلی میں اگر ذراسی بھی خراش وغیرہ آجائے تو جراثیم کو اسمیں داخل ہونے کا موقع مل جاتا ہے اور نتیجے کے طور پر زچہ چھوت کی بیماری یا زچگی کے بخار میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ بہت سی خواتین اس بات کو نہیں جانتیں کہ زچگی کے وقت جو چھوت لگ جاتی ہے اس سے زچہ کو نہایت شدید تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے اور اس کے بعد یہ حالت مستقل صورت اختیار کر لیتی ہے اور کبھی کبھی اس کا نتیجہ بانجھ پن ہوتا ہے۔ اپنے ڈاکٹر سے مشورہ کیجیے کہ زچگی کے موقع پر ڈیٹول کس طرح استعمال کرنا چاہیے۔
بچے کی پیدائش سے پہلے، پیدائش کے دوران میں اور پیدائش کے بعد ڈاکٹر اور دائیاں حاملہ خواتین کی حفاظت کیلئے ڈیٹول پر اعتماد کرتے ہیں۔ انکی تقلید کیجیے۔ ڈیٹول کی ایک بوتل ہمیشہ اپنے گھر میں موجود رکھیے۔
* ایک زود اثر دافع سمیت دوا ہے جو جراثیم کو بہت جلد ہلاک کر دیتی ہے۔
* یہ آیوڈین یا لائی سول کی طرح زہریلی نہیں ہے۔
* اسے ایک بچہ بھی محفوظ طریقہ پر استعمال کر سکتا ہے۔
* یہ جس جگہ لگائی جائے وہاں ذرا بھی تکلیف نہیں ہوتی۔
* اس کی بو ناگوار ہرگز نہیں۔
ڈیٹول
DETTOL
ڈیٹول کی ایک بوتل ہمیشہ اپنے گھر میں موجود رکھیے۔
ریکٹ اینڈ کولمین آف پاکستان لمیٹڈ۔
پوسٹ آفس بکس نمبر ۴۶۳۸ - کراچی نمبر ۱
پیشہ ور ڈاکٹر ڈیٹول استعمال کرتے ہیں اور استعمال کا مشورہ دیتے ہیں۔

ماہِ نو

جلد ۱۲ شمارہ ۵

اگست ۱۹۵۹ء

مدیر: رفیق خاور نائب مدیر: ظفر قریشی

سرِ ورق: ایوب نیشنل پارک (راولپنڈی) کا ایک منظر رنگین عکس: محمد اسلم

چندہ سالانہ ۵؍ ادارۂ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی فی کاپی ۸ آنے

"دورِ فلک بکامِ ما"

قاضی یوسف حسین صدیقی

ہماری قومی زندگی میں کتنے ہی اتار چڑھاؤ کیوں نہ ہوں، ۱۴ راگست کی اہمیت کبھی زائل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ وہ تاریخی دن ہے جب ہماری صبح آزادی طلوع ہوئی تھی، اور ہماری نظروں نے ایک بار پھر وہ اجالا دیکھا تھا جو کوئی دو صدیوں سے پردۂ ظلمات میں مستور ہو چکا تھا۔ یہ دن ہمارے لئے دلی مسرت کا پیغام ہے اور ہم اس کا کسی عملی صورت میں اظہار کریں یا نہ کریں، اس کا وجدانی طور پر ولولہ آفریں ہونا لازمی ہے۔

اگر ہم اس موقع پر شاداں ہوں کہ ہم نے اپنی آزادی کے بارہ سال پورے کر لئے ہیں اور تیرھویں میں قدم رکھا ہے، تو بیجا نہیں۔ یہ ہمارے لئے فخر کا باعث ہے کہ ہم نے ایک ایسے پُر آشوب دور میں اپنے قومی وجود کو برقرار رکھا ہے جس کا ہر لمحہ پیغامِ مرگ تھا۔ اور ایسی افتادوں کا سامنا کیا ہے جن کے سامنے بڑی بڑی قوموں کے قدم بھی ڈگمگا جاتے ہیں۔ دراصل کسی قوم کی توانائی کا صحیح معیار بھی یہی ہے کہ اس نے حالاتِ زمانہ کا مقابلہ کیسے کیا ہے۔ اپنی زندگی کی پیچیدہ گتھیاں کیسے سلجھائی ہیں، شدید سے شدید آزمائشوں میں کیسے پوری اُتری ہے اور ٹیڑھے سے ٹیڑھے موڑ مڑ کر کس طرح ایسے راستے پر گامزن ہوئی ہے جو اس کی بقا اور ترقی کے ضامن ہوں۔

کسی قوم، خصوصاً نئی قوم کا راستہ ہمیشہ پُرپیچ و خم ہوتا ہے۔ بلکہ اسے اپنا راستہ خود تلاش کرنا اور تراشنا پڑتا ہے۔ اگر کسی آڑے وقت پر اسکی صلاحیتیں جواب دے دیں، اس کی نگاہیں حدِ نظر سے آگے نہ دیکھ سکیں، وہ کسی موقع پر آزمائش میں پوری نہ اُترے اور صحیح اقدام نہ کرے تو عین ممکن ہے کہ اس کا چراغ گل ہو جائے اور وہی عناصر جنہوں نے اس کو جنم دیا تھا اس کو اپنے اندر جذب کر لیں۔ ہم اس بات کو فخر و کامرانی کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ گو ہم رہ رہ کر تند و تیز طوفانوں سے دوچار ہوئے ہیں اور ہمیں بہت ہی بے ڈھب افتادوں سے نپٹنا پڑا ہے پھر بھی ہم نے ہمت و استقلال کا دامن نہیں چھوڑا اور ہماری صلاحیتیں برابر برقرار رہی ہیں۔ یہاں تک کہ ہم نے نہ صرف مخالف عناصر کا ہر وار سنبھالا بلکہ ان کو ٹھکانے بھی لگا دیا۔ اور اب ایسے عناصر کو خضرِ راہ بنا کر منزلِ مقصود کی طرف جادہ پیما ہیں جن کی وضع بالکل مختلف ہے۔ ان کا مقصد قومی مسائل کو پورے خلوص اور دیانت داری سے حل کرنا ہے اور عوام کو ان کے چھینے ہوئے حقوق عطا کرنا ہے۔ ان کا راستہ تعاون، اشتراکِ عمل، ہمدردی اور محبت کا راستہ ہے کیونکہ : ع

محبت ہی سے پائی ہے دوا بیمار قوموں نے

دورِ حاضرہ کا ایک عام مرض گوئبلز کے مسلک کی پیروی ہے۔ بے سر و پا مبالغہ آمیزی، میکاولی جیسی فریب کاری، کھوکھلی نعرہ بازی، ڈھنڈورے پیٹنا اور مصنوعی نمود و نمائش، لیکن یہ روِیہ آپ اپنے لئے پیغامِ مرگ ہے۔ ع مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید۔ اسلئے آخر کار نوبت افراد قوم ہی تک پہنچتی ہے۔ وہی حکومتوں اور قائدوں کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہیں اور خواہ کتنی ہی تدبیریں کیوں نہ کی جائیں بالآخر ان کی طرف رجوع کئے بغیر کوئی چارہ نہیں، اور ہماری بارہ سالہ تاریخ نے اس کا بار بار ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ لہٰذا جو لائحۂ عمل اب اختیار کیا گیا ہے اس میں اس حقیقت کو ملحوظ رکھنے کی پوری پوری کوشش کی جا رہی ہے۔

جہاں تک حالات کا رُخ اجازت دیتا ہے، بعض قیاس آرائیاں کچھ بے جا بھی نہیں۔ یہ وہ نتائج ہیں جن کا ہم بہ آسانی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ہمارے لئے مسرت کا باعث ہے کہ ہماری قوم نے کافی دیر ہی سے سہی، ایک بہت بڑی مہم سر کر لی ہے۔ یہ نہایت پُرامن طور پر وہ موڑ مڑنے میں کامیاب ہو گئی ہے جس کے لئے قوموں کو بالعموم دریائے خون سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور اب حالات اندرونی و بیرونی دونوں طور پر، اس قدر اطمینان بخش ہیں کہ دوسری قومیں ہم پر رشک کرتی ہیں۔ ہمارا انقلاب موجودہ یومِ استقلال سے تھوڑا ہی عرصہ پہلے واقع ہوا ہے۔ اسلئے مقامِ مسرت ہے کہ ہمارا تیرھواں سالِ آزادی

بلکہ جا بجا بہتر حالات کی نوید لئے ہوئے ہے۔

نئے دور میں جو پے در پے اقدامات ہوئے ہیں ان کا تذکرہ تحصیل حاصل ہے۔ ہم میں سے کوئی ہے جو اُن سے واقف نہ ہو؟ ان کی حیثیت بلاشبہ نہایت ڈرامائی ہے۔ اور وہ آناً فاناً اس کثرت اور برق وش تیز رفتاری سے کوندکوند گئے ہیں کہ تعجب ہوتا ہے۔ زرعی اصلاحات، مہاجرین کی آبادکاری، متروکہ جائدادوں سے متعلق دعاوی کا فیصلہ، ناجائز درآمد برآمد کا سدباب، قوم دشمن عناصر اور سیاسی جماعتوں کا استیصال، انتظامی صفائی و تطہیر، قانون، تعلیم، پریس وغیرہ کی اصلاحیں، معاشری فلاح و بہبود اور ترقی کی تدابیر اور سب سے بڑھ کر قومی مزاج، ضروریات اور روایات سے ہم آہنگ اور مناسب ترین آئینی نظام کی تشکیل کے لئے جد و جہد۔ یہ تمام امور ہماری تاریخ میں ایک نیا باب مرتب کر رہے ہیں۔ اور ان کا نتیجہ ایک نئی فضا ہے جس میں زندگی از سرِ نو جاگ اٹھی ہے، اور اس کے حوصلے، اس کے تقاضے، اس کے عزائم ایک نیا ولولہ، ایک نیا شوق ہنگامہ آرائی پیدا کرتے ہیں۔ اور وہ اطمینان و دلجمعی حاصل ہوگئی ہے جو قوائے فکر کو پیغامِ نمو دیتے ہوئے ذہنی و ثقافتی سرگرمیوں کی رفتار تیز کرتی ہے۔

موجودہ زمانے میں اربابِ قلم کی اہمیت سے کون انکار کرسکتا ہے کیونکہ معاشرہ کا دل و دماغ، اس کی روحِ رواں وہی اربابِ فکر و نظر ہیں جو ادب و فن کی مشعل روشن کر کے "جہانِ نابصیر" کو راستہ دکھاتے ہیں۔ قبل ازیں یہ طبقہ بھی دوسروں کی طرح کس مپرسی کا شکار تھا۔ ایک کے بعد دوسری خود غرض و بے پروا حکومت آتی رہی اور یہ طبقہ پریشان حال و سرگرداں ہی رہا۔ نئے دور کے طلوع ہوتے ہی صورتِ حال بدل گئی۔ اس جماعتِ بے امام کو ایک امام، ایک سرپرست مل گیا۔ صدرِ پاکستان کی چشمِ حقیقت شناس شعر و ادب کی اہمیت سے بخوبی واقف تھی۔ اسلئے انہوں نے شعرا و ادبا کی قدردانی میں نمایاں حصہ لیا اور متعدد ذاتی و سرکاری انعامات سے حوصلہ افزائی کی۔ ان کے پیشِ نظر ادبی کاوشوں سے زیادہ جذبۂ ملی کی قدردانی تھی۔ اسلئے انہوں نے ہر پیشکش کو قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا، اور بعض صورتوں میں خود اپنی جیب سے انعامات دے کر داد و دہش کی دیرینہ روایات کو تازہ کیا۔ ایک بہت بڑا کام ان ادیبوں اور فنکاروں کی دستگیری تھی جو معذور یا مفلوک الحال ہوں۔ چنانچہ ایسے افراد کی اعانت کا بندوبست کیا گیا ہے۔

ان حالات نے ادب و فن کی دنیا میں ایک نئی ہلچل پیدا کردی۔ ادیبوں کو اپنے وجود کا احساس ہوا اور انہوں نے اپنے آپ کو ایک منظم جماعت بنانے کی جد و جہد شروع کی۔ اس کا نتیجہ پاکستان رائٹرز گلڈ کا قیام ہے جو تمام برعظیم میں اپنی قسم کا پہلا اور مہتم بالشان ادارہ ہے، اور جس سے کتنی ہی امیدیں وابستہ ہیں۔ اس کی آئندہ کارگزاریوں کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ لیکن تاحال اس نے جو اقدامات کئے ہیں ان کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ خستہ حال اور معذور ادیبوں کے لئے جو کچھ کیا گیا ہے وہ اسی کے مشورہ اور جد و جہد ہی کا نتیجہ ہے۔ پھر اراکین کی زندگی کا نہایت آسان اور ارزاں شرائط پر بیمہ فی الحقیقت بہت بڑا کارنامہ ہے جس کی ادبی اداروں کی تاریخ میں شاید ہی کوئی نظیر دکھائی دے۔ ایک پبلشنگ ہاؤس کا قیام جو ہر قسم کی کتابوں کی اشاعت کا اعلیٰ پیمانے اور مصنفین کے لئے بہترین شرائط پر اہتمام کرے گا، ایک اور نہایت اہم اقدام ہے جس کی اشد ضرورت تھی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ کئی اور بے حد اہم امور مثلاً ادیبوں کے حقوق کا تحفظ، بیجا پابندیوں کو دور کرانے کی سعی و کوشش وغیرہ ایسی باتیں ہیں جن کا ایک منظم و مضبوط ادارہ کے بغیر سرانجام ناممکن تھا اور ہمیں خوش ہونا چاہیئے کہ ایسا ادارہ رائٹرز گلڈ کی شکل میں وجود پذیر ہوچکا ہے۔ جو ادب کے لئے بھی اچھی فال ہے اور ادیبوں کے لئے بھی۔

اس مختصر جائزہ سے ظاہر ہے کہ ہم اپنی آزاد قومی زندگی کے تیرھویں سال کا آغاز ایسے حالات میں کررہے ہیں جو بہت خوشگوار اور امید افزا ہیں۔ اگر "تیز ترک گام زن" کے حیات افروز پیغام پر عمل کی یہی کیفیت رہی تو ہم نہایت اعتماد سے کہہ سکتے ہیں کہ منزلِ مادرِ ملت کی بشارت کے پورا ہونے کی نوبت دور نہیں اور ہمارے قدم بہت جلد اس منزل کو جالیں گے۔

★

حمد

فیض احمد فیض

ملکہِ شہرِ زندگی تیرا، شکر کس طور سے ادا کیجے
دولتِ دل کا کچھ شمار نہیں، تنگدستی کا کیا گلا کیجے

جو ترے حُسن کے فقیر ہوئے، اُن کو تشویشِ روزگار کہاں
درد بیچیں گے، گیت گائیں گے، اس سے خوش وقت کاروبار کہاں

ساز چھیڑا تو جم گئی محفل، منّتِ طبعِ غمگسار کسے
اشک ٹپکا تو کھل گیا گلشن، رنجِ کم ظرفیٔ بہار کسے

خوش نشیں ہیں کہ چشم و دل کی مُراد، دیر میں ہے نہ خانقاہ میں ہے
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں، ہر صنم اپنی بارگاہ میں ہے

کون ایسا غنی ہے جس سے کوئی نقدِ شمس و قمر کی بات کرے
ہم سے شوقِ نبرد ہو جس کو، جائے تسخیرِ کائنات کرے

کیمبرج میں میرے دو دن

ممتاز حسن

میں کیمبرج کا طالب علم تو نہیں ہوں۔ مگر اس دانشگاہ سے مجھے ہمیشہ ایک عقیدت سی رہی ہے۔ کیمبرج عربی اور فارسی کی تعلیم و تحقیق کا مرکز ہے۔ براؤن اور نکلسن اسی دانشگاہ کے استاد تھے۔ اور دونوں علمی دنیا میں اس حیثیت کے مالک ہیں کہ دنیا کی جس درسگاہ سے بھی ان کا تعلق ہوتا، اسے ایک پائدار عزت اور شہرت بخش دیتے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ کیمبرج وہ جگہ ہے جہاں اقبال نے اپنی علمی اور تحقیقی زندگی کا ابتدائی دور گزارا۔ اقبال، پروفیسر نکلسن کے شاگرد تھے۔ اور استاد اور شاگرد دونوں کو ایک دوسرے پر فخر تھا۔ جب "اسرار خودی" شائع ہوئی تو نکلسن مرحوم اس کی شاعرانہ اور فلسفیانہ عظمت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔ اگر یہ ترجمہ نہ ہوتا۔ تو اقبال کی بین الاقوامی شہرت کا آغاز اتنا جلد نہ ہوتا۔ اور شاید خود ہندوستانی حکومت بھی اقبال کی شاعرانہ عظمت سے ناآشنا رہتی۔

براؤن، نکلسن اور اقبال کے ناموں کے ساتھ اگر عمر خیام اور فٹز جیرالڈ کے نام بھی شامل کر دیئے جائیں تو کیمبرج کی علمی عظمت کی تصویر زیادہ مکمل ہو جاتی ہے۔ فٹز جیرالڈ جس نے ترجمے سے مغربی دنیا کو عمر خیام کی رباعیات سے روشناس کیا کیمبرج یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ اور اقبال کی طرح ٹرنٹی کالج میں داخل تھا۔ رباعیات کا دنیا میں قدیم ترین نسخہ کیمبرج یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ اور فٹز جیرالڈ کے مختلف مسودات بھی اسی یونیورسٹی میں محفوظ ہیں۔

میرا کیمبرج جانے کو ویسے بھی جی چاہتا تھا۔ جب یہ معلوم ہوا کہ فٹز جیرالڈ کے ترجمے کی صد سالہ یادگار کے سلسلے میں جو نمائش کیمبرج میں منعقد ہوئی تھی، وہ ابھی جاری ہے۔ تو اور بھی شوق ہوا۔ چنانچہ جب برٹش کونسل نے، جو یہاں میرے میزبان ہیں، میرے کیمبرج جانے کی تجویز کی، تو میں نے اس دعوت پر فی الفور لبیک کہا۔ دوسری مصروفیتوں کے پیش نظر میرے لئے کیمبرج میں دو دن سے زیادہ ٹھہرنا ممکن نہ تھا۔ مگر جو دو دن وہاں گذرے۔ وہ مجھے یاد رہیں گے۔

سب سے پہلے میں نے کیمبرج یونیورسٹی لائبریری میں عمر خیام کی نمائش دیکھی۔ اور رباعیات کا وہ قدیم ترین نسخہ بھی دیکھا۔ جسے پروفیسر آربری منظر عام پر لا چکے ہیں یہ نسخہ عمر خیام کی وفات سے تراسی سال کے بعد کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں عمر خیام، سنائی اور دوسرے شعرا کے کلام کا انتخاب شامل ہے۔ اس نسخے کے علاوہ فٹز جیرالڈ کے ترجمے کا پہلا ایڈیشن بھی نمائش میں موجود ہے پہلے ایڈیشن کا وہ نسخہ بھی ہے جو کیمبرج یونیورسٹی لائبریری کو کاپی رائٹ لائبریری ہونے کی وجہ سے ۱۸۵۹ء میں بھیجا گیا تھا۔ اس وقت لائبریری کے ارباب اختیار نے اسے قابل اعتنا نہ سمجھا اور ایک طرف پھینک دیا۔ ۱۹۱۹ء میں کسی نے اسے ردی کے انبار میں سے نکالا اور نسخہ ضائع ہوتے ہوتے بچ گیا۔ آج پہلے ایڈیشن کے نسخوں کی قیمت ۱۵۰۰ اور ۲۰۰۰ پونڈ کے لگ بھگ ہے۔

یونیورسٹی لائبریری میں فارسی اور عربی کی کتابوں کا معقول ذخیرہ ہے۔ مگر مجھے یہاں اردو کی کتابیں دیکھ کر خاص طور پر خوشی ہوئی۔ یہ کتابیں خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ اور ان کی فراہمی میں پروفیسر آربری کی، جو براؤن اور نکلسن کے جانشین ہیں اور جنہوں نے نکلسن کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اقبال کی "رموز بیخودی"، "لالۂ طور" (پیام مشرق کا ایک حصہ) اور "زبور عجم" کا ترجمہ بھی فرمایا ہے، ذاتی توجہ کو دخل ہے۔ خود پروفیسر آربری سے بھی ملاقات ہوئی انہوں نے مجھے پروفیسر براؤن مرحوم کی تاریخی قیام گاہ دکھائی اور پھر خود اپنے مطالعے کے کمرے میں لے گئے۔ جہاں پروفیسر صاحب اور ان کی کتابوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ خیر جلیس فی الزمان کتاب۔

شام کو ایوری صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ ایک زمانے میں رائل انڈین نیوی میں افسر تھے۔ آج کل کنگز کالج میں عربی اور فارسی کے لیکچرار ہیں۔ فارسی زبان، ایران اور ایرانیوں سے خاص شغف رکھتے ہیں۔ میں نے کنگز کالج کے ہال میں ان کے ساتھ کھانا کھایا۔ کھانا ختم ہوا تو وہ مجھے اپنے مکان پر لے گئے۔ رات کے بارہ ساڑھے بارہ بجے تک گفتگو رہی۔ ان کے دو شاگرد بھی موجود تھے۔ میں نے علمی معاملات میں اتنا شگفتہ انہماک کم دیکھا ہے۔

ایوری صاحب سے ملنے سے پہلے میں نے کیمبرج کی پرانی کتابوں کی دکانوں کا گشت کیا ایک آدھ چیز ہاتھ بھی آئی۔ مگر پرانی کتابوں کے بارے میں جو کیفیت لندن کی ہے وہ نہ کیمبرج کی ہے نہ آکسفورڈ کی، نہ اس ملک میں کسی اور شہر کی۔

دوسرے روز ٹرنٹی کالج کی لائبریری دیکھنے کا موقع ملا۔ دو قدیم اور نفیس فارسی کے قلمی نسخے دیکھے۔ ایک کلیات سعدی اور دوسرا جامی کی مثنویات۔ اس کے بعد ڈاکٹر ڈاڈویل صاحب نے، جو یہاں لائبریرین ہیں۔ مجھے ایڈورڈ فٹز جیرالڈ کے ذاتی کاغذات کا ذخیرہ دکھایا جو تمام تر اسی لائبریری میں محفوظ ہے۔ یہ ایک بیش بہا اور نادر ذخیرہ ہے۔ اس میں فٹز جیرالڈ کے ذاتی خطوط، اس کے مطالعے کی یادداشتیں، اس کے ہاتھ کی بنائی ہوئی تصویریں، اس کی تصنیف کردہ موسیقی، سب کچھ موجود ہے۔ ایک آدھ غیر مطبوعہ تصنیف بھی ہے۔ میں فٹز جیرالڈ کی مصوری اور موسیقی سے محض سرسری طور پر واقف تھا۔ اس ذخیرے میں جو کچھ دیکھا اس سے واضح ہو گیا کہ ابھی عمر خیام کے اس شہرۂ آفاق اور زندۂ جاوید مترجم کی پوری شخصیت دنیا کی آنکھوں کے سامنے نہیں آئی۔

ٹرنٹی لائبریری سے فارغ ہوا تو ڈاکٹر ڈاڈویل نے کالج ہال میں دوپہر کے کھانے کی دعوت دی۔ یہ وہ ہال ہے جہاں اقبال نے ٹرنٹی کالج کے طالب علم کی حیثیت سے بارہا کھانا کھایا ہوگا۔ اس کے بعد مجھے شوق ہوا کہ اقبال کی طالب علمی کے زمانے کی قیامگاہ دیکھوں۔ معلوم ہوا کہ وہ زیادہ تر وہ کیسل روڈ پر رہے ہیں۔ کچھ عرصے ہنٹنگٹن روڈ پر بھی اقیام رہا۔ ڈاکٹر ڈاڈویل نے رہنمائی کی اور ہم دونو کیسل روڈ پر جا پہنچے۔ یہ مکان ایک گرجا کے پہلو میں واقع ہے۔ اس کی نچلی منزل میں آجکل بھی طالب علم ہی رہتے ہیں۔ ہم ہنٹنگٹن روڈ پر نہ جا سکے۔ مجھے لندن واپس آنا تھا اور گاڑی کا وقت ہو چکا تھا۔ (بشکریہ بی بی سی، لندن)

★

درسِ عمل

مشتاق مبارک

ہر عیش اہل کفر پہ دنیا میں عام ہے
عشاق اہل بیت کو جینا حرام ہے

شیرازۂ حیات پریشاں ہے آج بھی
مشکل میں اب بھی امت خیرالانام ہے

ہیں بے کسوں پہ جبر و تشدد کی یورشیں
اب بھی حیات صورتِ مرگِ دوام ہے

قائم ہیں اب بھی حق و صداقت پہ بندشیں
باطل بساطِ دہر پہ محوِ خرام ہے

یوں تو بڑے خلوص سے ملتے ہیں اہل کیں
لیکن دلوں میں جذبۂ صد انتقام ہے

اے بے نیاز ہوش تجھے کچھ خبر بھی ہے
مدت سے تو رہینِ غمِ صبح و شام ہے

اٹھ اور اٹھ کے وقت کے دھارے کو موڑ دے
پینا اگر تجھے بھی شہادت کا جام ہے

اک اور انقلاب پئے امن و عافیت
رودادِ کائنات ابھی ناتمام ہے

عزم حسینیت کو زمانے میں عام کر
تو عاشق حسین علیہ السلام ہے

ذہنی و ادبی نشاۃ الثانیہ

(چند حقائق و بصائر)

ڈاکٹر محمد صادق

بادی النظر میں یہ سوال ایک جداگانہ حیثیت کا حامل نظر آتا ہے مگر غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ دراصل یہ ایک متنوع سوال کا جزو ہے۔ "ہمارے نظام تعلیم میں انگریزی کا مقام" "ہمارے نظام تعلیم میں اردو کا مقام"۔ "اردو بحیثیت ذریعہ تعلیم"، درحقیقت ایک ہی اہم اصل سوال کے مختلف پہلو ہیں اور ان کی حد بندی اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ لہذا اگر میں اپنے مخصوص موضوع سے ذرا پرے ہٹ کر متذکرہ بالا عنوانات میں مداخلت بے جا کا خطاوار ٹھہروں تو مجھے معذور رکھا جائے۔

میں محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے یہاں انگریزی علم و ادب کی کوئی منظم مخالفت نہیں اور جو کچھ ہے وہ محض جذباتی ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہم میں ایک ایسا طبقہ ضرور ہے جو انگریزی کے رواج و عروج کا شاکی ہے۔ اس کی رائے میں انگریزی کی حمایت کرنا یا اس کی تعلیم دینا ذہنی غلامی کی علامت ہے۔ اور چونکہ ہم نئے نئے آزاد ہوئے ہیں اور اپنی آزادی پر کسی قسم کی پابندی کے لئے تیار نہیں، اس لئے یہ حربہ اکثر کامیاب ہوتا ہے۔ ان لوگوں کا طرز استدلال عموماً یہ ہوتا ہے کہ انگریزی زبان کو ہمارے بدیشی حکمرانوں نے ہم پر مسلط کیا تھا، جب تک وہ یہاں رہے ہمیں طوعاً و کرہاً یہ طوق غلامی پہننا پڑا۔ اب چونکہ غلامی کا دور ختم ہو چکا ہے۔ اس لئے اسے گلے سے اتار پھینکنا چاہئے۔ اس نظریئے کے مؤیدین تین قسم کے لوگوں پر مشتمل ہیں: زمانہ ساز سیاست داں یا گھٹیا قسم کے صحافی جو وطن پرستی کا ڈھنڈورا پیٹ کر عوام کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہیں یا السنہ و علوم مشرقیہ کے چند نام لیوا۔ موخرالذکر طبقہ کی مخالفت محض ذاتی ہے۔ چونکہ فرنگی دور حکومت میں ان کی وہ قدر و منزلت نہ تھی جس کے وہ بوجہ اپنے علم و فضل کے مستحق تھے۔ اس لئے غالباً غیر شعوری طور پر وہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر مغربیت سے، جس کی ایک بڑی نشانی انگریزی زبان ہے، مکمل نجات مل جائے۔ تو وہ اپنا کھویا ہوا وقار پھر سے حاصل کر لیں گے۔ لیکن جیسا کہ میں آگے چل کر بتاؤں گا۔ یہ ایک خیال خام ہے ـــــ میری اپنی خواہش ہے کہ ہماری سرکاری زبان اردو کو عروج حاصل ہو اور اس کا دنیا کی متمدن زبانوں میں شمار ہو لیکن یہ کام انگریزی کی مخالفت سے نہیں ہو سکتا۔ باقی رہا غلامی کا سوال تو ہر وہ شخص جس نے ہماری ثقافتی تاریخ کا بے لاگ مطالعہ کیا ہے، ایسے گمراہ کن نظریے سے ہرگز متفق نہ ہوگا۔ پچھلے سو سال کے محدود عرصہ میں ہماری زبان کے ادب نے جو ارتقائی منازل طے کئے ہیں ان سب کے لئے ہم انگریزی کے مرہون منت ہیں نہیں تو کس کے ہیں؟ آج سے سو سال پہلے ہمارے ہاں نثر قریباً قریباً مفقود تھی۔ ہماری زبان محض جذبات کی زبان تھی۔ اور اگرچہ متغزلین کی کاوشوں نے اس میں لچک اور روانی پیدا کر دی تھی لیکن غزل کے طلسمی دائرے کے باہر اس کی فسوں گری مفقود تھی۔ علمی مضامین اور ٹھوس واقعات کے اظہار کی اس میں اصلا سکت نہ تھی۔ اگر ہماری شاعری "تنگنائے غزل" سے نکل کر زندگی کے بیشتر شعبوں پر حاوی ہو گئی، اگر ہمارے ادب میں افادی نثر کا آغاز و ارتقا عمل میں آیا۔ اور فن تنقید، ناول اور اس کے بعد افسانے نے ترقی کی اور جدید صحافت نے جنم لیا تو اسے انگریزی ہی کا فیضان سمجھنا چاہئے۔ ہماری زبان نے انگریزی کے ہزاروں الفاظ محاورے، جملے، تراکیب اپنے اندر جذب کر لی ہیں۔ اور ان میں سے بیشتر اس میں ایسے گھل مل گئے ہیں کہ ان پڑھ اور تعلیم یافتہ، مرد اور عورتیں بچے بوڑھے انہیں بے تکان استعمال کرتے ہیں۔ اور انہیں خیال تک نہیں گزرتا کہ یہ سب کے سب غیر ملکی ہیں۔ پرانا طمطراق آمیز اسلوب متانت میں تبدیل ہو رہا ہے ادب میں نت نئے ہیئتی تجربے اور اسالیب بیان میں خوشگوار تبدیلیاں اسی اثر کی بدولت ہیں۔ دانش وروں کا طبقہ اور اس کی مخصوص ذہنیت کی تشکیل اسی کے زیر اثر ہوئی ہے۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے

کہ انگریزی آج تمام علوم جدیدہ کی کلید ہے اور صرف اسی کی بدولت یورپ کے علوم، ادبی تحریکات اور جدید ترین انکشافات ہم تک پہنچ سکتے ہیں اور پہنچ رہے ہیں۔ اس تعلق کو قطع کر دیجئے تو ہم پر پھر وہی بے حسی، وہی جمود طاری ہو جائے گا جس سے محض انگریزی زبان کی بدولت ہمیں نجات ملی ہے۔ صرف یہی نہیں۔ وہ اصحاب جو انگریزی تعلیم کو غلامی کے مترادف خیال کرتے ہیں، یہ حقیقت فراموش کئے ہوئے ہیں کہ آزادی کے لئے جدوجہد کا آغاز اور اس میں کامیابی کا سہرا انہیں لوگوں کے سر ہے جنہوں نے پہلے پہل انگریزی تعلیم حاصل کی۔ اور انہی ان تھک کوششوں سے نہ صرف سیاسیات میں قوم کی رہنمائی کی بلکہ ان تمام مذہبی اور سماجی بدعتوں اور بدعنوانیوں سے بھی نجات دلائی جن کے مہلک اثرات سے ہمارے ذہنی اور روحانی قویٰ مضمحل ہو رہے تھے۔

اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ سید احمد، حالی، شبلی اور ان کے رفقائے کار کی ادبی و اصلاحی سرگرمیاں اسی انگریزی تعلیم کا ثمر الیس تھیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اگر انگریزی تعلیم نہ ہوتی تو نہ صرف سیاسی اعتبار سے بلکہ ذہنی طور پر بھی ہم غلام ہوتے۔

مانا کہ ہم نے مغرب سے بہت کچھ سیکھ لیا ہے لیکن ابھی ہمیں اس سے اور بہت کچھ سیکھنا ہے۔ لہٰذا علمی اور ادبی درآمد کا یہ سلسلہ ابھی عرصہ دراز تک جاری رہنا ہوگا۔ اور چونکہ یہ سلسلہ انگریزی زبان کے علم سے وابستہ ہے اس لئے ہم عرصہ دراز تک انگریزی زبان سے کلیتاً مستغنی نہیں ہو سکتے — میں یہاں صرف انگریزی زبان کی اہمیت پر زور دے رہا ہوں میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ہمارے تعلیمی نظام میں اس کا وہی مقام ہو جو اب تک رہا ہے یا آجکل بھی ہے۔ بے شک ہم نے انگریزی سے بہت فوائد حاصل کئے ہیں لیکن انگریزی کے وقار اور ہمارے انہماک کا ایک یہ نتیجہ ہوا کہ ہم نے اپنی زبان یا زبانوں کی تہذیب و ترقی پر بہت کم توجہ کی۔ آخر اس کا کیا سبب ہے کہ سید احمد، حالی، شبلی اور آزاد کے بعد ہماری ادبی ترقی کی رفتار دھیمی پڑ گئی ہے حالانکہ ان کے سامنے انگریزی ادب و تہذیب کا ایک دھندلا سا نقش تھا اور بعد کا تعلیم یافتہ طبقہ اس کی پیداوار تھا؟ جہاں تک میں سمجھتا ہوں فرق یہ تھا کہ انہوں نے اپنی تمام تر توجہات کو قوم کی خدمت اور تربیت کے لئے صرف کیا۔ ہمارے انگریزی خواں طبقہ کی یہی معراج کمال تھی کہ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر انگریزی تعلیم سے بہرہ ور ہوئے۔ لیکن چونکہ وہ اپنی زبان سے بے اعتنائی برتتے رہے لہٰذا نہ ان میں اہلیت تھی اور نہ انہیں یہ توفیق ہوئی کہ مغربی علوم کو اپنی زبانوں میں منتقل کر کے انہیں وسعت دیں۔ آجکل ہمارے ملک میں علوم کی فراوانی ہے لیکن بخیل کی دولت کی طرح انکا کوئی نکاس نہیں۔ اب ہمیں ایسے تعلیم یافتہ اصحاب کی ضرورت ہے جو بیک وقت انگریزی اور اردو میں مہارت تامہ رکھتے ہوں تاکہ وہ انگریزی علوم کو اردو میں منتقل کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ اس کام کے لئے ایک محدود لیکن مستعد اور ممتاز جماعت کی ضرورت ہے۔ یہ اصحاب تہذیب کے منتقل کرنے والے ہوں گے اور انگریزی علوم و ادب کو اردو میں منتقل کرنے کے فرائض سرانجام دیں گے۔ ہمارے موجودہ سلسلۂ تعلیم کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ طلبا کی زندگی کے بہترین سال انگریزی سیکھنے پر اس لئے صرف ہوتے ہیں کہ وہ مغربی علوم کو انگریزی میں سیکھ سکیں۔ اگر انہیں یہی علوم اردو میں پڑھائے جائیں تو انہیں تین فائدے ہوں گے: (۱) اعلیٰ تعلیم کا آغاز مقابلتہً چھوٹی عمر میں ہو سکے گا (۲) مطلب کے اخذ کرنے میں آسانی ہوگی (۳) تھوڑے سے وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل ہو جائے گی۔ میں نے حال ہی میں ایک تجربہ کیا تھا۔ جو نتائج کے لحاظ سے بہت اہم ہے اس لئے اس کا ذکر دینا بے جا نہ ہوگا۔ میں نے سالِ اول کے اوسط درجے کے دو طلبا سے کہا کہ وہ مقبرہ انارکلی پر اردو میں مضمون لکھیں اور ساتھ ہی سالِ چہارم کے دو اوسط درجے کے طلبا سے کہا کہ وہ بھی انگریزی میں اسی موضوع پر طبع آزمائی کریں۔ جب وہ لکھ کر میرے پاس لائے تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سالِ اول کے مضامین میں روانی، شگفتگی اور زبان کا رواں استعمال تھا۔ اور ان کے مضامین بھی کافی طویل تھے۔ مگر سالِ چہارم کے طلبا کے مضامین مختصر اور بے جان تھے۔ ان کی زبان ایک جسد بے روح کی طرح تھی۔ پھر انہیں اقتصادیات کا ایک معمولی سا مسئلہ انگریزی میں سمجھایا گیا اور سالِ اول کے طلبا کو اردو اور سالِ چہارم کے طلبا کو انگریزی میں لکھنے کے لئے کہا گیا۔ پہلے تجربہ کی طرح اس میں بھی اردو والے جوابات نسبتاً بہتر تھے۔ حالانکہ انگریزی والے طلبا نے میرے انگریزی کے الفاظ سے بھی فائدہ اٹھایا تھا۔ اور اردو والوں کو اپنی تجویز سے اردو الفاظ تلاش کرنے پڑے تھے۔

یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ مغربی طلبا کی معلومات ہمارے طلبا کی معلومات سے بہت زیادہ ہیں۔ اس کا سب سے بڑا سبب غالباً یہی ہے کہ

وہ ہماری طرح دوسری زبانوں کا بھی مطالعہ کرتے ہیں لیکن ان کا ذریعۂ تعلیم اپنی مادری زبان ہے۔ آپ بھی تھوڑی دیر کے لئے کسی ایسی زبان میں اظہار خیال کی کوشش کیجئے، جس پر آپ کو کامل دسترس حاصل نہیں اور دیکھئے کہ آپ کو کتنی اعصابی اور ذہنی الجھن ہوتی ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے بیشتر طلبا اسی الجھن میں مبتلا ہیں۔ اظہار خیال کے وسائل پر دسترس کا فقدان احساس کمتری اور اعصاب زدگی کا ایک بڑا سبب ہے۔ اور ہمارے ہاں اس کی وجہ انگریزی کی غیر مناسب اہمیت ہے۔

میں انگریزی کی غیر مناسب اہمیت کا مخالف ہوں۔ اس کی اہمیت کا مجھے اقرار ہے۔ میں اوپر کہہ آیا ہوں کہ متمدن اقوام کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے ہونے کے لئے اعلیٰ انگریزی تعلیم لابدی ہے لیکن صرف انہیں افراد کے لئے جو خود کو اس کے کام کے لئے مخصوص کرنا چاہتے ہیں اور جن میں اس سے عہدہ برآ ہونے کی اہلیت ہے۔

اگر انگریزی علوم و ادب کی صرف اتنی ہی ضرورت ہے کہ ان کی معلومات و ذخائر کو اردو میں منتقل کیا جائے تو طلبا کی اکثریت انگریزی تعلیم کیوں حاصل کرے اور اگر کرے تو اس کی کیا نوعیت ہونی چاہیئے؟

انگریزی زبان دنیا کی مہذب زبانوں کی صفِ اول میں جگہ رکھتی ہے۔ جدید وسائل نقل و حرکت کی وجہ سے پرانی جغرافیائی حد بندیاں ٹوٹ چکی ہیں اور روز بروز قومیں ایک دوسرے کے قریب تر آ رہی ہیں۔ تجارت، صنعت و حرفت، سفر کی ضروریات، سیاسی تعلقات۔ ان سب کی وجہ سے ہمیں ایک ایسی زبان کی ضرورت ہے جس سے ہم دوسرے ممالک سے خط و کتابت کر سکیں۔ یا رشتۂ ارتباط بڑھا سکیں۔ اس سے پہلے بھی انگریزی زبان تمام دنیا میں عموماً سمجھی جاتی تھی لیکن دوسری عالمی جنگ کے بعد اس کا وقار بہت بڑھ گیا ہے اور اس نے عالمی زبان کی حیثیت سے فرانسیسی کی جگہ لے لی ہے۔ دنیا کا کوئی مہذب ملک ایسا نہیں جہاں یہ زبان نہ پڑھائی جاتی ہو۔ سیاسی اور ادبی دونوں لحاظ سے اسے ایک عدیم المثال وقار حاصل ہے۔ چونکہ ہم یہ زبان مدت سے سیکھ رہے ہیں اور اس میں اس کی تعلیم کی بے شمار وسائل اور صلاحیتیں حاصل ہیں۔ لہٰذا اس کا بطور ثانوی زبان کے سیکھنا ہمارے لئے بے حد موزوں ہوگا۔

چونکہ توقع کی جاتی ہے کہ عنقریب ہماری آبادی کا بیشتر حصہ اسے ثانوی زبان کی حیثیت سے حاصل کرے گا، اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے لئے کس قسم کا ادب زیادہ مفید ہوگا۔ میری رائے یہ ہے: چونکہ ان لوگوں کا مطمح نظر ادب برائے ادب نہیں ہوگا، بلکہ وہ اسے زندگی کی روزانہ ضرورتوں کے لئے حاصل کریں گے، اس لئے یہی مناسب ہوگا کہ ان کے نصاب میں افادیت کا خاص خیال رکھا جائے۔ انگریزی نثر کے بیشتر انتخاب جو آجکل داخلِ نصاب ہیں ادب کے ارتقائی پہلو کو پیش نظر رکھ کر مرتب کئے گئے ہیں اور ان میں جدید ادب کے ساتھ پرانے ادب کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ میں کہوں گا کہ ایسے طلبا کے لئے مجوزہ نصاب صرف جدید ادب تک محدود رکھا جائے۔ یہی نہیں بلکہ ایسے جدید مصنفین جو افادی نقطۂ نظر سے سود مند نہ ہوں، نظر انداز کر دیئے جائیں۔

میرے خیال میں ایسے طلبا کو مطالعۂ نظم کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ کسی دوسری زبان کے صوتی اثرات، ترنم، نغمگی سے متاثر ہونے کے لئے فطری صلاحیت اور لگاتار کوشش کی ازحد ضرورت ہے۔ شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لئے الفاظ کے معانی کے علاوہ ان کی نوک پلک، مزاج، وضع قطع اور تلازمات سے کامل واقفیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ غیر ملکی تو ایک طرف اہل زبان بھی عام طور پر شاعری سے متاثر ہونے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ ورڈز ورتھ لکھتا ہے:

"یہ ایک چونکا دینے والی حقیقت ہے کہ بیس میں سے انیس افراد میں شاعری سے کیف اندوز ہونے کی صلاحیت نہیں پائی جاتی۔"

اگر خود انگریزوں کا یہ حال ہے تو ہم لوگ کس گنتی میں ہیں؟

مجھے اس بات کا اقرار ہے کہ نظم کے مطالعے کے بغیر انسان کی ذہنی تربیت ادھوری رہ جاتی ہے اور انگریزی شاعری معراج کمال تک پہنچ چکی ہے۔ لیکن طلبا کی اکثریت کو غیر ملکی شاعری کے مطالعہ پر مجبور کرنا جب کہ ان میں اس سے مستفیض ہونے کی صلاحیت نہ ہو، نیز اس کے مطالعہ سے کوئی بدیہی فائدہ مرتب نہ ہو سکتا ہے۔

باقی رہا یہ سوال کہ آیا اردو زبان میں فی الوقت اتنی وسعت اور صلاحیت ہے کہ اسے انگریزی کی جگہ ذریعۂ تعلیم قرار دیا جائے اس کا جواب صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ جب کسی زبان کو اعلیٰ مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تو اس میں آہستہ آہستہ تمام مطلوبہ صلاحیتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ دنیا میں کوئی زبان خود بخود ترقی نہیں کرتی۔ بلکہ جب اسے اعلیٰ مطالب کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تو اس کی وسعت، گہرائی اور لطافت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

انگریزی کے مخالفین اور ان کی نفسیات کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ اردو کے مخالف بیشتر وہ اساتذہ ہیں جو انگریزی کو بطور ذریعۂ تعلیم استعمال کر رہے ہیں۔ ان کی انگریزی سے شیفتگی صرف ایک عادت ہی کا سوال نہیں بلکہ انسان بالطبع آرام پسند واقع ہوا ہے اور یہ حضرات محسوس کرتے ہیں کہ اگر انگریزی ذریعۂ تعلیم نہ رہی تو انہیں نئے ذریعۂ تعلیم پر دسترس حاصل کرنے کے لئے محنت شاقہ کی ضرورت ہوگی۔ نیز انہیں حفظِ مراتب کا بھی خیال ہے۔ "حوادث سن ستاون" کے بعد مسلمان علماء نے انگریزی تعلیم کی مخالفت اس لئے بھی کی تھی کہ سلسلۂ تعلیم مسجدوں اور خانقاہوں سے نکل کر کالجوں اور مدارس میں جا رہا تھا۔ چنانچہ انہوں نے مذہب کی آڑ لیکر مغربی تعلیم کی تکفیر کی۔ بالکل اسی طرح آجکل کے اساتذہ جو علوم مغربی کی تعلیم انگریزی زبان کے ذریعہ دے رہے ہیں، محسوس کرتے ہیں کہ اگر انگریزی کے وقار میں فرق آگیا تو ان کے ذاتی وقار میں بھی فرق آجائے گا چنانچہ وہ اردو کی کم مائیگی پر زور دیتے ہیں اور خواہش مند ہیں کہ پرانا نظام تعلیم قائم رہے۔ سچی بات یہ ہے کہ جو لوگ انگریزی کی مخالفت کرتے ہیں وہ یا تو جذباتی ہیں یا خود غرض یا دونوں۔ اسی طرح وہ لوگ جو اردو کے خلاف ہیں۔ اپنے آرام کو ملکی اور قومی ضروریات پر مقدم خیال کرتے ہیں۔

وہ صورتِ حال جس سے ہم آجکل دوچار ہیں انئی نہیں ہے۔ بیشتر زبانوں کو انہیں مراحل سے گذرنا پڑا ہے اور زباں دانوں نے قومی ضروریات کے پیش نظر آرام طلبی کی خوشگوار راہوں پر کوشش اور عزیمت کے کٹھن اور دشوار گذار رستے کو ترجیح دی ہے۔ اورنگ زیب کی وفات سے بیشتر فارسی کو وہی وقار حاصل تھا جو ہمارے ہاں آجکل انگریزی کو ہے۔ خاندان مغلیہ کے زوال کے بعد ہندوستانی علماء نے یہ محسوس کیا کہ انہیں اردو کو فروغ دینا چاہئے۔ اس تحریک میں خان آرزو سب سے آگے تھے۔ وہ اور ان کے رفقاء اس مشن میں کامیاب ہوئے چنانچہ فارسی کی جگہ اردو نے لے لی۔ لیکن اردو کو فروغ دینے کا ان کے پاس صرف ایک ہی ذریعہ تھا —— یہ کہ اردو کو فارسی کی دولت سے مالامال کیا جائے۔ اگر آج ہم اردو کو فروغ دینا چاہتے ہیں تو ہمارا بھی ایسا ہی فیصلہ ہونا چاہیئے یعنی انگریزی علوم کو عرق ریزی اور جانفشانی سے اردو میں منتقل کریں۔

اس عمل کی بہترین مثالیں آپ کو مغربی نشاۃ الثانیہ کی تاریخ میں ملتی ہیں۔ یہ مثالیں اتنی وقیع ہیں، نیز وہ ہماری موجودہ صورت حال سے اس قدر ملتی جلتی ہیں کہ وہ بلاشبہ ہمارے لئے شمعِ ہدایت بن سکتی ہیں۔ نشاۃ ثانیہ درحقیقت السنۂ قدیم اور ان کے ادب کی احیاء و ترویج کا دوسرا نام ہے۔ اس احیاء میں جو لوگ آگے تھے انہیں HUMANISTS کہا جاتا ہے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ یورپ کی ورنیکلر زبانیں یونانی اور لاطینی کا مقابلہ نہیں کر سکتیں اور وہ ان قدیم زبانوں سے بالکل اسی طرح مرعوب تھے جیسے آجکل ہم انگریزی سے ہیں۔ آہستہ آہستہ ان علماء کے نظریہ میں تبدیلی ہونی شروع ہوئی اور انہوں نے عوام کی زبانوں کو اپنی ادبی کاوشوں کا مرکز بنایا۔ یہاں تک کہ انہیں زبانوں میں جن کی کم مائیگی زبان زدِ خلائق تھی، اعلیٰ درجہ کی کتابیں تصنیف ہوئیں اور انہیں بعد میں "کلاسکس" یا ادب عالیہ کا درجہ دیا گیا۔

دیکھئے ذیل کے اقتباسات ہمارے کتنے حسب حال ہیں :-

سپیرونی (SPERONI) لکھتا ہے :-

"زبانیں قدرتی پیداوار نہیں ہوتیں۔ ان کی تشکیل انسان کی اپنی ضروریات اور منشا کے مطابق ہوتی ہے۔ زبانیں درختوں کی طرح نہیں ہوتیں کچھ کمزور اور دوسری توانا۔ جو انسانی افکار کے بوجھ کی متحمل ہو سکیں بلکہ ان سب کی صلاحیتیں استعمال کرنے والوں کی کاوشوں سے صورت پذیر ہوتی ہے۔ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جس میں اظہار خیال کی طاقت خود بخود پیدا ہو جائے۔ اس کا دارومدار اس کے استعمال کرنے والوں کی قوتِ ارادی اور سعیٔ پیہم پر ہوتا ہے۔"

(باقی صفحہ ۳۸ پر)

واقعۂ کربلا اور ہمارا علاقائی ادب

ضیاء الحسن موسوی

بزمِ ترا شمع و گل خستگیٔ بوتراب
سازِ ترا زیر و بم واقعۂ کربلا (غالب)

ہمارا علاقائی ادب ہماری مذہبی اور ثقافتی زندگی سے فطری طور پر مربوط ہے۔ ہمارا وطن بظاہر مختلف علاقوں میں رہنے بسنے والوں، مختلف بولیاں بولنے والوں کا مجموعہ ہے مگر یہ اختلاف ویسا ہی ہے جیسے ایک نظم کے مختلف اشعار میں ہوتا ہے۔ ہر شعر کا مطلب اپنی جگہ الگ مگر ہر شعر کا وزن و قافیہ و آہنگ ایک۔ ایک ہی مرکزی خیال سب اشعار کو مربوط کر کے نظم کی شکل دیتا ہے۔ یہی مرکزی خیال ہمارا وطن ہے جو ہمارے ہر علاقے میں مشترک ہے۔

ہماری قومی روایات میں قربانی کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور ہر زندہ قوم کی گرمیٔ حیات میں یہی عنصر سب سے اہم ہے۔ قربانی کے لئے جتنی بلند مثالیں جس قوم میں ہوتی ہیں اُتنا ہی اس کا اجتماعی جذبۂ فدویت بھی ہوتا ہے۔

استقلالِ پاکستان کی صد سالہ تحریک میں، جس کو غیروں کی لکھی ہوئی تاریخیں مختلف ناموں سے یاد کرتی ہیں، مسلمانانِ برصغیر نے بے شمار قربانیاں دی ہیں اور ان قربانیوں سے وہ اخلاقی طور پر ضرور فاتح ہو کر نکلتے رہے ہیں تا آنکہ ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کو انہوں نے اخلاقی اور مادی کشمکش کا آخری مورچہ بھی فتح کر لیا اور اپنی قومیت اور روایات کے تحفظ کے لئے ایک عظیم وطن حاصل کیا۔ یہی ان کی مختلف تحریکوں کا مقصد تھا۔

آزادی کے بعد زندگی کے دوسرے پہلوؤں کی از سرِ نو تنظیم و ترتیب کے ساتھ ہم کو اپنے ادبی ورثہ کی بھی تنظیم و ترتیب کرنی تھی اور اسی شعور کا نتیجہ ہے کہ ہم اپنے علاقائی ادب کو جگر لخت لخت کی طرح جمع کر رہے ہیں اور اُس کے مختلف رجحانات کا جائزہ لے رہے ہیں۔ ابھی یہ کام بالکل ابتدائی منزل میں ہے اب تک تو ہمارے اہلِ قلم ناقدری اور ناموافق حالات ہی سے دوچار تھے مگر اب اس نئے دور میں پاکستانی اہلِ قلم کے وجود اور مستقبلِ آزادی اور خودداری کی ضمانت مل گئی ہے اور اب ہم اپنے سرمائے کی طرف خود اعتمادی سے متوجہ ہو رہے ہیں۔

ہماری قومی روایاتِ فدویت و قربانی میں معرکۂ کربلا "سجدہ گہِ عزم و یقیں" کی حیثیت رکھتا ہے اور بقول اقبال "مقامِ شبیری" حقیقتِ ابدی ہے، اور ادب ہمیشہ ابدی حقائق سے بھرپور تاثر حاصل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے علاقائی اور قومی ادب میں اس واقعہ کے تاثرات عام ہیں۔ ان تاثرات کے جائزے کے لئے وسیع مطالعے اور چھان بین کی ضرورت ہے۔ سرِدست ان تاثرات کی چند جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں اور اس توقع کے ساتھ کہ دوسرے اہلِ قلم ان ادھورے خاکوں میں رنگ بھریں گے اور ان کو زیادہ بھرپور اور جاذبِ نظر بنانے کی کوشش کریں گے۔

پشتو ادب

پشتو ادب تمام کا تمام شجاعت اور بہادری کے جذبات سے لبریز ہے۔ ۵۰۰ھ کے بعد سے پشتو شاعری نے فارسی شاعری کے اثرات قبول کئے اور عارفانہ شاعری کا آغاز ہوا۔ پشتو کی سب سے پہلی دریافت شدہ کتاب "تذکرۃ الاولیاء" ہے۔ یہ ۶۱۲ھ (۱۲۰۰ء) میں سلمان ماکو نے لکھی جو قندھار کا رہنے والا تھا۔ ملا نور المشائخ مرحوم کے قول کے مطابق اس میں ایک پورا باب امام حسن اور امام حسین کی شہادت سے متعلق تھا۔ یہ کتاب نایاب ہے اور اس کے چند ہی اوراق مورخینِ ادب کے ہاتھ آسکے ہیں۔

پشتو کا مشہور شاعر، خوشحال خان خٹک، اپنے ایک قصیدہ میں لکھتا ہے:

په یزید باندې لعنت شه په اعوان ئے   چه په تیغ ئے د نبي نمسی مظلوم درے

پشتو غزل اگرچہ ایرانی غزل سے متاثر نظر آتی ہے لیکن اس میں "جمال وجلال" کا توازن ہے اور تصوف کے ذوق نے اس کو سوز وساز بھی عطا کیا ہے اور قبائلی زندگی کے مردانہ صفات نے اس کو حماست اور رجز کا انداز بھی بخشا ہے۔

پٹھانوں کی زندگی میں غیرت، شجاعت، سرفروشی، جانبازی، ایفائے عہد اور قربانی کے جذبات کو بڑی اہمیت حاصل ہے چنانچہ پشتو ادب میں واقعۂ کربلا کے اشارات فطری ہیں اس لئے کہ تاریخ اسلام کا یہ واقعہ صدیوں سے مسلمانوں کے جذباتِ فدویت و قربانی اور شجاعت و وفائے عہد کے لئے ایک جاودانی محرک کی حیثیت رکھتا ہے۔

پشتو کے نوحے اور مرثیے بھی عربی مراثی کی طرح صفات شجاعت وعزم و مہمان نوازی، بلندی نسب اور مثالی روایات کی یاد سے بھرپور ہیں گویا بقول جوش ملیح آبادی ؎

آنکھ میں آنسو ہو، سینے میں شرارِ زندگی
شعلۂ آتش بھی ہو بہتے ہوئے پانی کے ساتھ

بنگال میں تیرھویں صدی عیسوی میں جب پٹھانوں کی حکومت قائم ہوئی اور پٹھان حکمرانوں کے زیر اثر جو بنگلہ ادب پروان چڑھا، اُس میں اسلامیات کا عنصر نمایاں تھا۔ اس دور کی ایک کتاب "مقتل حسین" کا تذکرہ بنگالی ادب کے سلسلہ میں آیا ہے۔ اس ادب سے بھی پٹھانوں کے رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔

اب پشتو کے نئے ادب میں بھی پاکستانی قومیت کے واضح نقوش نظر آنے لگے ہیں اور اپنی روایات پر نازاں ہونے کے ساتھ ساتھ پشتو ادیب کو اس کا پورا احساس ہو چکا ہے کہ وہ ایک عظیم وطن کا باشندہ اور عظیم افتخار کا حامل ہے اور اس کے ماضی کا سلسلہ ایک "حال" تک پہنچتا ہے اور یہ حال عظیم ماضی کے مطابق ہونا چاہیے۔

سمندر خان بدرشی کا ترانہ (زه اوس آزاد او په عمل لکه فولادیم۔ مومن همه جادیم...) "میں اب آزاد ہوں، آباد ہوں اور شاد ہوں، اپنی سرزمین پر قربان ہوں اور سرمال کی بازی لگا چکا ہوں۔ میں مسلمان ہوں، پاکستان میرا وطن ہے۔ وطن کیا گویا چمن ہے جو لہلہا رہا ہے میں سعی وعمل میں مانند فولاد ہوں۔ میں مومن ہوں اور سخی ہوں" ان نئے رجحانات کا مظہر ہے۔

پشتو کے نئے ادب میں آفاقی شراب ہاشمی کے ایک مرثیے کے دو بند ملاحظہ ہوں جس کا عنوان ہے: "ذکر بلاند اوسے"

غمه ده، خوره دښته ده، سیلي طوفانونه
پس تاد سپینو تورو، تورے لمبے، خوگردونه
لختی لختی په زخمه، د سر وینو قطارونه
سینه سوری سوری، د تیرو غشو بارونه
صحرا د کربلا په سور کوي وښکلاله شراس ده
فضا کښې سرگردانه قافله دخرخباس ده
پوخوا په وینو رنګ اکبر علی اکبر دی
بل خوا په کرم رنګ پسوت ماشوم علی اصغر دی
به یاس وصله دګار پاتے نمسے د پیغمبر دی
نری نری ګردونه هسکید او ماڼیګر دی
خپل سر ئے هم آخر کښې د اسلام په نامه نذر کړو
چمن ئے د توحید په خپلو وینو لاله زار کړو

سیلِ طوفان، دشمنوں کی قطاروں، تیروں کی بارش، خونِ شہداء سے صحرائے کربلا کی لالہ زاری اور سردارِ قبیلۂ آلِ محمدؐ کے خون سے فضا کی غبار آلودگی، اکبر و اصغر کی شہادت، نواسۂ رسول کی تنہائی، ان سب مصائب کا مقصد وہی تھا جسے اقبال نے اپنے الفاظ میں یوں ادا کیا ہے کہ ؎

نقشِ الا اللہ بر صحرا نوشت   سطرِ عنوانِ نجاتِ ما نوشت

بنگالی ادب

۱۲۰۰ء کے بعد سے بنگال مسلسل مسلمان حکمرانوں کے زیرِ نگیں رہا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ بنگلہ زبان نے ادبی حیثیت اختیار کی اور اس میں ایک ثقافتی روایت پیدا ہوئی جس میں اسلامی اثرات بہت نمایاں ہیں بلکہ مسلمان مصنفین کی عہد بہ عہد تصانیف سراسر اسلامی خصوصیات رکھتی ہیں۔ بنگالی زبان کا بیشتر سرمایہ مسلمان شاعروں، عالموں، صوفیوں اور حکمرانوں کی کاوش کا نتیجہ ہے۔

واقعۂ کربلا کے متعلق بنگالی ادب میں سب سے پہلی چیز ہم کو سولہویں صدی کے مسلمان شاعر شیخ فیض اللہ کی "جینبیر چوتیشا" (۳۴ حرفی مرثیۂ حضرت زینب) نظر آتی ہے جس کے متعلق ڈاکٹر انعام الحق "مسلم بنگالی ادب" میں لکھتے ہیں :-

> "مرثیے" :- سولہویں صدی میں بنگالی میں حزنیہ موضوع پر قصے کہانیاں لکھنے کا رواج نہ تھا۔ لیکن بقول ایک انگریز شاعر کے ہمارے سب سے میٹھے گیت وہی ہیں جن میں زیادہ سے زیادہ حزن و ملال کے خیالات ہوں چنانچہ بنگالی ادب کے اس دور میں مسلمان شاعر شیخ فیض اللہ نے حضرت زینب پر 'چوتیشا' لکھ کر بنگالی ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔
>
> چوتیشا جسے ۳۴ حرفی کہنا چاہئے بنگالی نظموں کی ایک بہت قدیم صنف ہے۔۔ سنسکرت سے یہ صنف بنگالی ادب میں منتقل ہوئی اور یہاں شیخ فیض اللہ نے اس کو ایک نئی شکل میں پیش کیا۔ شیخ نے واقعۂ کربلا کے بعد حضرت زینب کا نوحہ نظم کیا ہے۔ اس نوحے کے بعد پھر "ضریح" گیتوں اور دوسری نظموں مثلاً "مقتل حسین" کا رواج شروع ہوا۔" (ص ۱۲۸ - ۱۲۹)

یہ بھی ایک حُسنِ اتفاق ہے کہ شہادتِ امام حسینؑ کے بعد سب سے پہلا نوحہ یا مرثیہ جناب زینبؑ ہی کا ملتا ہے اور بنگالی ادب میں بھی صنف مرثیہ کا آغاز اسی کے ترجمے سے ہوا ہے۔

اس طرح بنگالی ادب میں "چوتیشا" مرثیے کی شکل میں ظاہر ہوا، پھر کربلا کے متعلق عوامی گیت "ضریح" کہلائے۔ یہ غالباً ویسے ہی ہوں گے جیسے اودھ کے دیہاتوں میں "دُھمے" ہوتے ہیں اور پھر مرثیے کی ایک اور شکل کا نام "مقتل حسین" ہوا۔

یوں تو بنگلہ زبان دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے مگر چند پوتھیاں عربی رسم الخط میں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً "جنگ نامۂ حضرت علیؑ" اور محمد خاں کی مشہور تصنیف "مقتلِ حسینؑ"۔

"مقتل حسینؑ" ایک طویل نظم ہے اور محمد خاں کی سب سے ضخیم کتاب ہے۔ چند سال قبل کلکتہ میں "بڑتلہ" سے شائع کی گئی تھی مگر اب کمیاب ہے۔ محرم کے مہینے میں یہ کتاب جگہ جگہ گھروں میں اور باہر لوگ بلند آواز سے پڑھتے ہیں۔ یہ کتاب تاریخی نوعیت کی ہے لیکن اس کی بڑی خوبی شاعرانہ بلند خیالی ہے۔

ڈاکٹر انعام الحق کا خیال ہے کہ محمد خاں نے یہ کتاب "مہابھارت" کے جواب میں لکھی تھی۔ ہندوؤں کی کتابیں مسلمانوں میں عام تھیں سید سلطان نے اپنے شاگرد محمد خاں کو ہدایت کی کہ وہ تاریخ اسلام سے ایسی نظمیں تیار کریں جو مسلمانوں میں مقبول ہوں، وہ اپنے ماضی کی عظمت سے آگاہ ہوں اور ہندوانہ خیالی قصوں کی جگہ حقیقی بہادری اور جرأت و مردانگی اور مقابلۂ حق و باطل کی داستانوں سے سبق اندوز ہوں۔

ڈاکٹر انعام الحق کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ محمد خاں نے "قاسمیر لڑائی" یعنی "حضرت قاسم کی جنگ" کے نام سے بھی ایک مرثیہ تصنیف کیا تھا سترھویں صدی کے ایک شاعر، فقیر غریب اللہ نے بھی "مقتل حسین" لکھی تھی جو نامکمل رہی۔ اس کو ایک اور شاعر، محمد یعقوب نے مکمل کیا۔ محمد یعقوب چوبیس پرگنہ کے باشندے تھے۔ کتاب کی تکمیل کی تاریخ ۱۶۹۴ء ہے۔ یہ جنگ نامہ بھی ایک ضخیم کتاب ہے۔

عہدِ مغلیہ کے آخری شاعر حیات محمود نے جو ضلع رنگپور کے تھے، ۱۷۳۰ء میں "جنگ نامہ" یا "محرم تہوار" کے نام سے ایک طویل نظم تصنیف کیا ہے جو حضرت جبرئیلؑ کی زبان سے بیان کیا گیا ہے اور حسنینؑ کی شہادت کے مکمل واقعات نہایت مؤثر انداز سے بیان کئے گئے ہیں۔

چاٹگام کے رہنے والے ایک اور شاعر حمید اللہ خان (۱۸۰۰ - ۱۸۰۸ء) کو جمہوری دور کا بہترین شاعر کہا جاتا ہے۔ ان کی ایک نظم "گلزار شہادت" ہے۔ یہ اُس عہد کا کارنامہ ہے جب بنگالی ادب کے میدان پر غیر مسلم ادیب و شاعر چھائے ہوئے تھے۔

نذر الاسلام کی شاعری کو واقعۂ کربلا سے ایک خاص تعلق ہے کیونکہ اس کی ابتدا اسی سرزمین میں ہوئی۔ قاضی نذر الاسلام "شط العرب" کے قریب ایک خندق میں بیٹھے تھے، پہلی جنگِ عظیم کی ایک رات تھی، اس ماحول میں ان کی شاعرانہ طبیعت پر الہامی کیفیت طاری ہوئی اور انہوں نے اپنی پہلی نظم "شاتی العرب" تخلیق کی اور ان کی شاعری پر واقعۂ کربلا کے تاثرات اس طرح چھا گئے کہ اس مجاہدِ حق کی مصطلحات جا بجا اُن کی نظموں میں جھلکنے لگے۔ وہ اپنی نظم "مجاہد کی صدا" میں کہتے ہیں:۔

"نئی زندگی فرات کے دھارے کی طرح بہ رہی ہے
لیکن اُس کا ساحل قربانی کا پیاسا ہے
ظلم و ستم کی فوجیں موج در موج چڑھتی آتی ہیں
اور میں عباسؑ کی طرح اس دریا کو اپنی تشنہ لبی کا پیغام سنانے جا رہا ہوں......"

سندھی ادب

"وادیٔ مہران" یا "وادیٔ سندھ" قدیم ترین تہذیبوں کا گہوارہ رہی ہے برصغیر کا یہی وہ خطہ تھا جہاں سب سے پہلے اسلام کا پیام پہنچا اور تقریباً ساڑھے سترہ سو سال کے بعد یہ خطہ بھی دنیا کی پانچویں بڑی اور سب سے بڑی مسلم مملکت کا جزو بن گیا۔ ابتدائے عہدِ اسلام ہی سے سندھ کے باشندے علومِ اسلامی کی تشنگی میں حجاز و عراق و ایران پہنچنے لگے اور وہاں سے یہ تاثرات لاکے شمالی برصغیر میں پھیلانے لگے۔ سندھ کے ادب میں سچل سرمست اور شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ کے نام سے کون واقف نہیں؟

سندھ کے مشہور شاعر سید ثابت علی شاہ میاں غلام شاہ کلہوڑو کے دورِ حکومت میں ۱۷۴۰ء ۱۱۵۵ھ میں پیدا ہوئے۔ وہ شہزادہ میاں سرفراز خاں کے ہم عصر شاعر تھے۔ اسی زمانے میں میاں مسکین پنجابی کی مرثیہ گوئی کا شہرہ تھا جن کا ذکر سودا نے بھی کیا ہے۔ خود شاہ صاحب سندھی میں بڑے پائے کے مرثیے کہتے تھے۔ ایک مرثیے میں انہوں نے ذکر کیا ہے کہ "ہند میں مسکین اور سندھ میں میں نے مرثیے کہے ہیں۔" ثابت علی شاہ میر انیس (ولادت ۱۲۱۶ھ) اور میرزا دبیر (ولادت ۱۲۱۸ھ) سے پہلے اور میر ضمیر اور میر حسن کے ہم عصر تھے۔

سندھ کے آخری تاجدار ہز ہائی نس میر محمد حسن علی خاں جب قید ہو کے کلکتے گئے تو وہاں انہوں نے مراثی انیس و دبیر سنے اور رجب رہا ہو کر واپس آئے تو اپنے استاد مرزا فتح علی بیگ کے مشورہ سے سندھی میں اس طرز کے مرثیے تصنیف کرنے لگے۔ انہوں نے انیس و دبیر کے مراثی کا سندھی میں ترجمہ بھی کیا۔ ان کے علاوہ مرزا مراد علی بیگ سائل، آخوند محمد عالم، مرزا فتح علی بیگ، مرزا بدھل بیگ، مرزا قلیچ بیگ، اور خواجہ ناصر علی ناصر نے بھی مراثی انیس و دبیر کے ترجمے کئے ہیں۔

شاہ عبد اللطیفؒ نے اپنی نظموں کے لئے ایک خاص "سُر حسینی" ایجاد کیا تھا[1]۔

شاہ صاحب نے واقعات کربلا پر ایک طویل مرثیہ لکھا ہے جس کے منتخب اشعار کا رئیس امروہوی نے اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے اور وہ "تحفۂ لطیف" شائع کردہ محکمہ اطلاعات مغربی پاکستان میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ عجیب و غریب مرثیہ ہے جو ترجیع بند بھی ہے اور جس میں "محرم آگیا امت کے شہزادے نہیں آئے" ٹیک ہر بند کے بعد تکرار ہے اس میں جا بجا نوحے بھی ہیں، جس طرح اردو کے طویل قصائد کے درمیان غزل آجاتی ہے۔

اس مرثیے میں ایسے زندہ اور حرکت میں لانے والے مضامین ہیں کہ اس کو شاہ عبد اللطیفؒ کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ اندازہ کے لئے جستہ جستہ اشعار ملاحظہ ہوں:

حسینی قافلہ صحرا کی جن راہوں سے گزرا تھا ۔۔۔ وہ راہیں آج تک اس قافلہ کو یاد کرتی ہیں

---

[1] ملاحظہ ہو مضمون بعنوان "سُر حسینی" ماہِ نو اگست ۱۹۵۸ء (مدیر)

شہادت کیا ہے اک درسِ محمد کے گھرانے کا — کوئی شکوہ نہ تھا مولا کو اعدا کے ستانے کا
شہید عشق ہی واقف ہے اسرارِ شہادت سے — وگرنہ کس کو آتا ہے سلیقہ سر کٹانے کا
مدینے سے چلے تھے امتحاں گاہِ مصائب کو — جہاد فی سبیل اللہ کی دھن میں خدا والے
مصائب تھے مگر حضرت نے ماتھے پہ نہ بل ڈالا — شجاعت سے نظامِ زندگی سارا بدل ڈالا
شکستِ ظاہری فتحِ مبینِ عشق ہوتی ہے — حسینی فوج نے باطل کی قوت کو کچل ڈالا
حسین اللہ اکبر اے حسینؑ اے کربلا والے — سبق لیں تجھ سے ایثار و شجاعت کا وفا والے

نوحہ کے اشعار ملاحظہ ہوں:

اٹھو غم رسیدوں کا ماتم کرو — خدارا شہیدوں کا ماتم کرو
اٹھو فخرِ امت کا ماتم کرو — قتیلِ صداقت کا ماتم کرو

پنجابی ادب

پنجابی ادب عہدِ نو سے پہلے پنجاب کے ہرے بھرے دیہات کا ادب تھا اور زمانۂ ما قبل اسلام کی عربی شاعری کی طرح سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا۔ اس میں داستانیں بھی تھیں اور رتانیں بھی، چھوٹے چھوٹے رسیلے اور دلسوز گیت بھی اور ماہیے جیسے متنوع اور رسیلے گانے بھی۔

مسلم پنجاب نے عربی فارسی اور اردو کو اس طرح اپنایا کہ اس میں اہل زبان کے درجے کے افراد پیدا ہوئے، خصوصاً اردو پر ان کے احسانات کو احسان فراموش بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس لئے مسلم پنجاب کا زیادہ مذہبی ادب فارسی اور اردو میں ہے پھر بھی پنجابی عوامی ادب ان کے بعض عظیم کارنامے ہیں۔ پنجابی کی مختلف منظوم داستان ہائے حسن و عشق کے آغاز میں واقعۂ کربلا کا تذکرہ ہے مثلاً:

حضرت حسن حسین دی ذات علیؑ شیر بغداد دے شیر دونویں
لختِ جگر رسول بتول جائے عاشق رب دے مرد دلیر دونویں
جنہاں کدی سوال نہ رد کیتا وکے راہ مولیٰ گئی دیر دونویں
منزلِ عشق دی جنہاں ثبوت کیتی مڑے ذرہ نہ قدم پھیر دونویں

(ہیر وارث شاہ)

پنجابی کے نوحے اور مرثیے جو منتشر ہیں اگر یکجا ہو جائیں تو معلوم ہوگا کہ پنجاب نے صرف "میاں سکین" ہی نہیں پیدا کیا بلکہ اور بھی صدہا عاشقِ اہلبیت پیدا کئے ہیں اور پنجابی میں ایسے سخن پارے ہیں جو فنی اعتبار سے بھی اور سوز و گداز کے اعتبار سے بھی پاکستان کے علاقائی ادب میں نہایت قیمتی ورثہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بلوچی اور مکرانی ادب

بلوچی زبان جو شمالی اور شمال مشرقی علاقے میں بولی جاتی ہے اس کو سلیمانی کہتے ہیں اور جنوب مشرقی اور مشرقی علاقے کی زبان مکرانی کہلاتی ہے۔ بلوچی زبان جدید فارسی سے بہت مشابہ ہے اور پاکستانی اور ایرانی ثقافت کی ایک درمیانی کڑی سمجھی جاتی ہے۔ پھر بھی بلوچی زبان فارسی کی شاخ نہیں بلکہ ایک مستقل زبان ہے۔

بلوچی ادب بھی زیادہ تر سینہ بسینہ روایات کے سہارے زندہ ہے اور اپنے ماحول کی ترجمانی کرتا ہے۔ بلوچی شاعری میں مذہبی شاعری کا بڑا حصہ ہے اور اس میں بکثرت نوحے اور مرثیے موجود ہیں اس کی اکثر نظموں میں جا بجا واقعۂ کربلا کی تشبیہیں، اشارات اور استعارات پائے جاتے ہیں۔

بلوچی ادب کے متعلق ابھی بہت کچھ کام ہونا ہے۔ جب یہ ذخیرہ مرتب ہو جائے گا اسی وقت اس کا تنقیدی جائزہ ممکن ہو سکے گا۔ مشرق وسطیٰ کے ایک سفر کے دوران کوئٹہ میں ایک بلوچی مرثیہ گو نے، جو فارسی سے بھی واقف تھا، مجھے بلوچی کے چند مرثیے سنائے تھے جن سے اندازہ ہوا کہ ان مراثی پر فارسی مراثی کا کافی اثر ہے۔ مگر یہ اسلوب کی حد تک ہے، مضامین میں مشرقِ اسلامی کی جاگتی ہوئی روح

آزادی کی گونج کس قدر واضح طور سے سنائی دیتی ہے۔

کشمیری ادب

کشمیری ادب بھی تصوف کے سرچشموں سے سیراب ہوا ہے اور کشمیر میں مسلمانوں کی ذہنی اور ثقافتی زندگی شہید کربلا کی نسل سے مبلغین، اہل علم و عرفان اور ان سے فیض یافتہ علماء کی مساعی کی احسان مند ہے۔

کشمیری ادب میں نوحوں اور مرثیوں کی کثرت ہے اور کشمیری مرثیہ ادب کی ایک اہم صنف ہے۔ اس موضوع پر اب تک بہت کم لکھا گیا ہے پھر بھی سید رضا ہمدانی نے اپنے مضامین میں کشمیری مرثیے کی جھلکیاں پیش کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:-

کشمیری ادب میں صنف مرثیہ بڑی مالا مال صنف ہے اگرچہ موضوع کے اعتبار سے یہ بڑی محدود ہے یعنی صرف واقعات کربلا، شہادت حسین، اور مصائب اہلبیت پر مشتمل منظوم کلام ہے، لیکن اس کے باوجود ادب کے تمام اصناف کا احاطہ کرتا ہے۔ کشمیری مرثیہ فن کی کسوٹی پر کسا جائے تو اردو، فارسی سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ کشمیری مرثیہ تکنیک کے لحاظ سے اردو یا فارسی مرثیوں سے قطعاً جداگانہ نوعیت کا حامل ہے۔ اسی طرح کشمیری نظم تکنیک کے اعتبار سے فارسی یا اردو نظم سے یکسر جدا ہے، کشمیری مرثیے کے لئے لازمی ہے کہ وہ کسی عنوان کے تحت لکھا جائے۔ شاعر مرثیہ تصنیف کرنے سے پہلے عنوان تجویز کرے۔ عنوان شاعر کی اپنی پسند اور رجحان پر منحصر ہے مثلاً مرثیہ نگار نے "قفس" عنوان پسند کیا تو اب اسی عنوان کی رعایت سے سارے کا سارا مرثیہ مرتب ہونا چاہیئے۔ آغاز سے اختتام تک کہیں بھی تلازمے اور رعایت کا دامن نہیں چھوٹنا چاہیئے۔

کشمیری مرثیہ بالعموم طویل ہوتا ہے اور طویل نظم کی طرح اس میں مختلف بند ہوتے ہیں۔ ہر بند کو "چھیڑ" کہتے ہیں جس کے پہلے دو شعر الگ الگ قافیوں میں ہوتے ہیں پھر دو مصرعے الگ پھر دو چار یا چھ مصرعے الگ قافیوں میں آخری مصرع پھر ایک الگ قافیے میں ہوتا ہے۔ یہ التزام دوسرے بندوں میں بھی ہوتا ہے اور جو قافیہ ردیف پہلے بند میں اختیار کیا جاتا ہے وہی مرثیے کے آخری بند تک قائم رہتا ہے۔

کشمیری مرثیے کا پہلا بند یا چھیڑ حمد باری پر مشتمل ہوتا ہے، دوسرا نعت سرور کائنات اور منقبت امیرالمومنین علی پر۔ اس کے بعد گریز کے بند ہوتے ہیں اور پھر غیر محدود بند مصائب اور واقعات کربلا پر۔

دوسری زبانوں کے مراثی کی طرح کشمیری مرثیہ بھی اگرچہ رونے رلانے کے لئے کہا جاتا ہے تاہم اس کے چہرے میں علمی، ادبی، فقہی اور تاریخی واقعات و مسائل اور اخلاقی تعلیمات کا ذکر ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کی تعلیمی افادیت بھی مسلم ہے۔ کشمیری مرثیے کے چند عنوانات ملاحظہ ہوں: عرش و پیدائش۔ قفس۔ مدینہ۔ عطش۔ دماغ اور آئینہ۔ نصرت، مرزا، کعبہ۔ چہار فصل۔ ماہ و سال۔ قرآن۔ عرش۔ اصول دین قیم۔ انگشتری، کیمیا، کاغذگری، حکمت، میراث، سفینہ، حج، ماہ صیام وغیرہ۔

کشمیری مرثیہ گو بڑے عالم و فاضل و زاہد و عابد گزرے ہیں۔ بعض کو کشمیری میں "ولی" کا درجہ حاصل ہے قدیم مرثیہ نگاروں میں مرزا ابوالقاسم، یوسف بابا، حبیب ملہ، منشی صفدر علی، حکیم حسن، منشی صادق علی خواجہ، دویم حنفی، مولوی عبداللہ اسد، رضا شاہ، عظیم اور رحیم کافی شہرت کے مالک ہیں۔

کشمیری مرثیہ خوانی کا طریقہ بھی کشمیریوں کی اپنی ایجاد ہے۔ امام باڑے میں آٹھ یا دس افراد دائرہ کی شکل میں بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ دائرہ "پس خواں" کہلاتا ہے۔ دائرے بہت سے بھی ہوتے ہیں "ذاکر" جیسے ہی مرثیہ شروع کرتا ہے تو پس خواں اس کو دہراتے ہیں اور ہم نوائی کرتے ہیں۔ کشمیری مرثیہ خوانی کی طرز سادہ اور حسن شعری شیریں ہوتا ہے کشمیر کے علاوہ لاہور، پشاور، کراچی وغیرہ میں بھی ایسی کشمیری مجالس ہوتی ہیں۔

یہ تھیں پاکستانی علاقائی ادب کے ایک خاص موضوع کی چند جھلکیاں۔ وہ ادب جو اب از سر نو اپنی روایات کے مطابق آراستہ ہو رہا ہے اور جس میں ہر روز نئی نئی اور زندگی آموز آوازیں شریک ہو رہی ہیں۔ وہ آوازیں جو مل کے ایک وطن عظیم کی عظمت کا ترانہ بن جاتی ہیں۔ ان آوازوں کے لئے معرکۂ کربلا ہمیشہ ایسے ہی دو سرچشمۂ حق و باطل کے معرکے، ہمیشہ نئے نئے گوشے، نیا اعتقاد، نئی قوت اور نیا تاثر فراہم کرتے رہیں گے۔ اس لئے کہ معرکۂ کربلا کا سب سے بڑا پیغام یہ ہے: "ذلت کی زندگی سے عزت کی موت اچھی" اور پاکستان کی آزاد فضا جو صدیوں کی قربانی کا حاصل ہے عزت کی زندگی کا حامل ہے اور اس کو برقرار رکھنے کا پہلا فرض ادیبوں ہی کا ہے۔
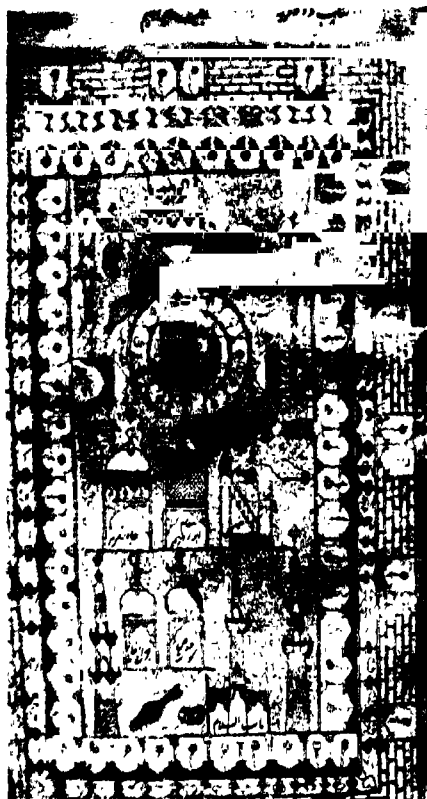
"فتوح الحرمین"

(دور مغلیہ کا ایک نادر مخطوطہ)
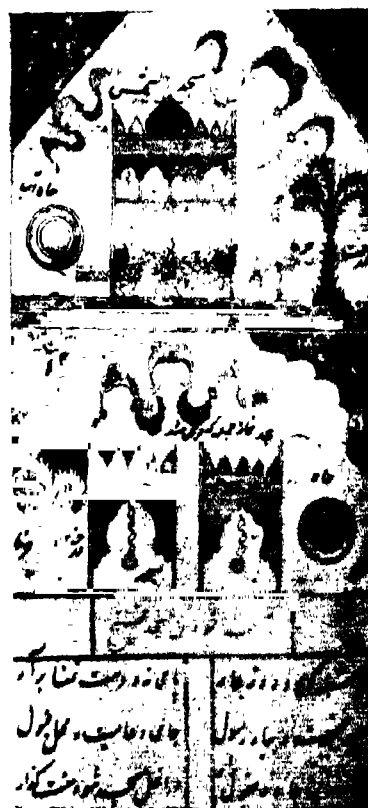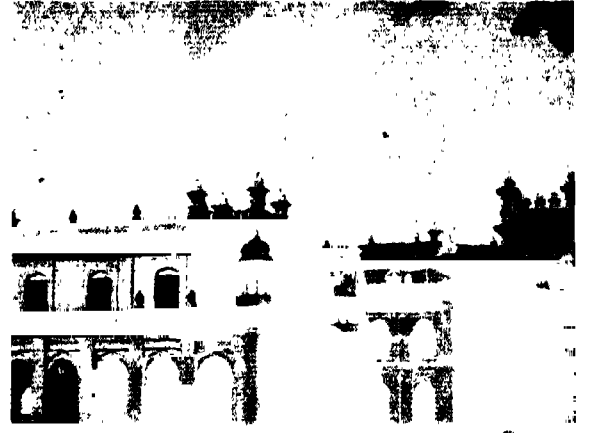
ڈھاکہ یونیورسٹی

پنجاب یونیورسٹی

پاکستان کی دانش گاہیں

کراچی یونیورسٹی

پشاور یونیورسٹی
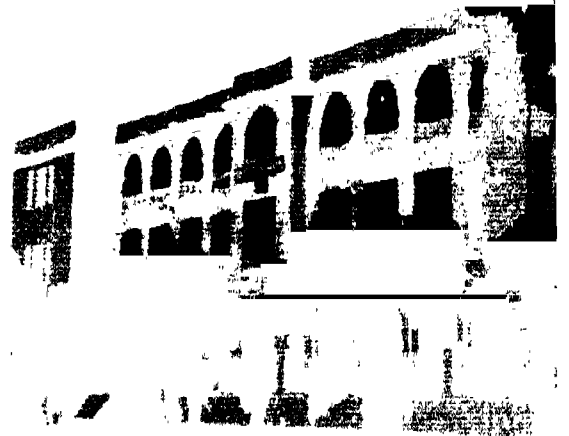
"فتوح الحرمین"

(عہدِ مغلیہ کا ایک نادر مخطوطہ)

لفٹننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید

فریضۂ حج ہمیں بار بار اُس عہد اور اُن مقامات کی یاد دلاتا ہے جن سے اس کا آغاز ہوا تھا اور ہم بصد شوق یہ پکار اٹھتے ہیں کہ ؎

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

اس سلسلہ میں ہماری نظر فارسی کی ایک مثنوی "فتوح الحرمین" پر پڑتی ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کا تعلق پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عہد سے ہے اور اس میں حرمین شریفین اور ان کے مضافات کے اہم مقامات کا تذکرہ ایک خاص انداز میں کیا گیا ہے۔

یہ کتاب ایک فارسی مثنوی کے چھوٹے سے مسودے پر مشتمل ہے جس میں ۱۱۰۰ کے لگ بھگ اشعار ہیں۔ حرمین اور ان کے مضافات وغیرہ کی کیفیت بیان کرنے کے علاوہ اس میں احکامِ حج کی بجا آوری کی مفصل کیفیت بھی درج ہے۔

یہ کتاب گزشتہ صدی کے اواخر میں دہلی میں شائع ہوئی تھی اور اب آسانی سے دستیاب نہیں ہوتی۔ گو اس کے کئی نسخے مختلف لائبریریوں یا ذاتی کتب خانوں میں ضرور پائے جاتے ہیں۔ میرے پاس جو مخطوطہ ہے وہ کئی وجہ سے خاص دلچسپی کا حامل ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ خاص مدینۂ منورہ میں لکھا گیا اور اس سے رسول کریمؐ اور خلفائے راشدین کے عہدِ مبارک کے تاریخی مقامات کے سنہرے اور نیلے رنگوں میں سترہ نقوش ہیں۔ یہ نقوش دو اَبعادی ہیں۔ مصنف کا نام محی لاری ہے جیسا کہ مثنوی کے دو آخری ابیات سے ظاہر ہے ؎

محی ازاں ہر دو طلب کام خویش — محو کن از لوحِ کساں نام خویش
گرم شد از سعیِ تو بازارِ حج — ختم بنظمِ تو شد اسرارِ حج

یہ بات کہ مثنوی مدینہ میں لکھی گئی، کاتب کے ان الفاظ سے ظاہر ہے:

"تحریر یافت در مدینۂ منورہ"

یہ بات اس مخطوطہ میں اور بھی دلچسپی پیدا کر دیتی ہے کہ اس صفحہ پر مشہور ایرانی شاعر حکیم محمد آتشی کا نام درج ہے جو سلطان عادل شاہ ﷺ؟ کا درباری شاعر تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آتشی کوئی اور کاتب ہو جس نے مثنوی کی کتابت میں حصہ لیا۔ آتشی کے نام کے بعد فوراً ہی مصنف کا نام اس طرح آتا ہے:

الفقیر آتشی
از تصنیف محی علیہ رحمۃ

ایک اور بات جو اس نسخہ کی دلچسپی کو اور بھی بڑھا دیتی ہے یہ ہے کہ یہ دراصل مشہور ایرانی شاعر طالب ہمدانی کی ملکیت تھا جس نے وصلی پر اپنے ہاتھ سے یہ اشعار تحریر کئے ہیں ؎

عرب تام کہ با من.....
لطف او با من نہفتہ نگاہ خفیست
مردان منع کنندم کہ مدہ دل بعرب
با عرب چوں ندہم دل محمد عربیست

ان اشعار کے بعد طالب ہمدانی کے ہاتھ سے یہ الفاظ بطور تکملہ درج ہیں مگر تاریخ تحریر درج نہیں :

این ساعی بجہت یادگاری مشفق مرزای میرک حسین ....

فقیر حقیر طالب ہمہ ....

اسی عبارت کے نیچے مشہور خطاط، محمد صالح مشکین قلم ولد میر عبداللہ زرین رقم کے ہاتھ سے چند الفاظ تحریر ہیں جو عبدالرحمٰن رشیدی کے ملازمت سے سبکدوش ہونے پر شاہی خطاطی اور مہتمم کتب خانہ کے عہدہ پر فائز ہوا تھا[1]

اسی جگہ تحت میں محمد صالح نے مخطوطہ کے کاتب کا نام رسول محمد خاں بیان لکھا ہے۔ اس عبارت پر ۲۲۔ جمادی الاولیٰ، سال جلوس ۳۲ شاہجہانی مطابق ۱۰۶۷ھ تحریر ہے۔

میرا خیال ہے کہ یہ نسخہ اس وقت سے کہیں پہلے طالب ہمدانی کی ملکیت رہا ہوگا کیونکہ یہ ظاہرا العہد جہانگیر شاہی کتب خانہ میں پہنچا۔ اس لئے کہ اس کے صفحہ اول پر جہانگیر کی مہر ثبت ہے۔ شاید یہ اس کے کچھ عرصہ بعد باقاعدہ طور پر مہتمم کتب خانہ کی تحویل میں آیا، جیسا کہ محمد صالح کے عہد شاہجہانی میں بحیثیت مہتمم دستخط ثبت کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ اس کی تصدیق دیگر معاصر مخطوطات سے ہوتی ہے جن پر اس کے دستخط ثبت نہیں ہیں مثلاً دیوان کامران پر بھی وہی تاریخ درج ہے جو زیر نظر مخطوطہ پر ہے یعنی ۳۲ سال جلوس۔ "رقعات عالمگیری" میں اس مخطوطے کے خاتمہ کا عکس طبع ہوا ہے۔ مخطوطے پر جہانگیر کی مہر کے علاوہ دو اور مہریں بھی ہیں جو پڑھی نہیں جا سکتیں۔ پانچ اور جگہ یہ الفاظ تحریر ہیں: عرض دیدہ شد۔ جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض اور عمائدین نے بھی اس مخطوطہ کو دیکھا ہے۔ ان الفاظ کا آغاز اللہ اکبر سے ہوتا ہے۔ ان سب کے نیچے مختلف تاریخیں درج ہیں یعنی ۷، ۱۶، ۲۳ - دو اور تاریخیں بھی ہیں جو مٹی مٹی سی ہیں اس لئے پڑھی نہیں جاتیں۔ یہ سب تاریخیں غالباً سال جلوس ہی کی نشان دہی کرتی ہیں۔ مگر ایک جگہ سال ۱۰۵۵ھ تحریر ہے جو آسانی سے معلوم ہو جاتا ہے۔ بگمان غالب یہ اورنگ زیب عالمگیر کے دستخط ہیں کیونکہ یہ دستخط عالمگیر کے ان دستخطوں سے ملتے ہیں جن کے عکس میری نظر سے گزرے ہیں۔

جہانگیر کی مہر کے نیچے لفظ "الہدیہ" تحریر ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اصلی مالک نے یہ کتاب ہدیہ یا نذرانہ کے طور پر جہانگیر کی خدمت میں پیش کی تھی۔

کتاب ۷۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور اس کی تقطیع ۳ انچ × ۶ انچ ہے۔ لیکن مسودہ بمشکل ۲" × ۴" جگہ میں لکھا گیا ہے۔ ہر صفحے میں ۵ اسطور بہ خط نستعلیق ہیں۔ عنوانات سنہرے اور سرخ رنگ میں مرقوم ہیں۔ تقریباً ہر دوسرے تیسرے صفحے پر کوئی رنگین خاکہ یا نقش ہے کوئی سارے اور کوئی آدھے صفحے پر۔ تصاویر کی کیفیت حسب ذیل ہے :-

۱۔ صورت حرم محترم	۲۔ صفا و مروا
۳۔ جائے کہ بلال اذان گفت	۴۔ مولود حضرت صلعم و حضرت فاطمہ
۵۔ گنبد حضرت خدیجہ و شہدائے معلّا	۶۔ گنبدے کہ تکلم حضرت جبرئیل پُر نور کرد
۷۔ جبل ثور	۸۔ عرفات
۹۔ گنبد مزدلفہ	۱۰۔ بازار منا
۱۱۔ چاہ امیر المومنین حضرت علی	۱۲۔ تخلین بی بی فاطمہ بین باب جبرئیل و باب رحمۃ

---

[1] ملاحظہ ہو "شاہ جہاں نامہ" جلد دوم۔ معلوم ہوتا ہے کہ میر محمد صالح نے ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی خطاطی کو ترک نہیں کیا، کیونکہ اپنی زندگی کے آخری حصہ میں وہ عالمگیر کے عہد حکومت میں دائی انگہ کے مقبرہ کے اندرونی حصہ کی آرائش پر مامور رہا۔ چنانچہ اس مقبرہ پر اس کا نام بقید سال (۱۰۸۲ھ) درج ہے۔

۱۳۔ گنبد امیر المومنین عباسؓ و امام حسنؓ و امام زین العابدینؓ

۱۴۔ چاہ کہ درون خاتم حضرت از دست حضرت سلیمان افتاد۔

۱۵۔ مسجد فتاح

۱۶۔ مسجد آنحضرتؐ

۱۷۔ جبل اُحد

ان میں سے اکثر تصاویر ابیات کے مضمون کی توضیح کرتی ہیں ؛

•

(ایران کے مشہور شاعر خاقانی نے بھی اپنے بعض قصاید میں سفرِ حج کی اول تا آخر نہایت ہی دلچسپ اور مفصل کیفیت پیش کی ہے اور دورانِ سفر کے چشم دید حالات و کوائف اس تفصیل سے درج کئے ہیں کہ سارے راستہ، اس کی منازل و اوقات، مقامات اور خطرات نظر کے سامنے آجاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی تاریخی واقعات کا بھی تذکرہ ہے اور حجاج کے دلی احساسات و کیفیات کی بھی بہت خوش اسلوبی سے عکاسی کی گئی ہے۔ آخر میں مناسک حج کے تمام جزئیات کی موقع بہ موقع اور درجہ بدرجہ نہایت حقیقت پسندانہ پیرایہ میں تصویر کھینچی گئی ہے جو ایک نہایت اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ اور اس قسم کے دیگر نوادر جہاں بھی ہوں قابل قدر ہیں) (مدیر)

•

ارضِ مراد

نظر حیدر آبادی

زندہ باد ارضِ مراد، اے کشورِ امن و اماں ۔۔۔ روشن و رخشاں رہیں تیرے زمین و آسماں

چھا گئے مہرِ یقیں اور چھٹ گئی گردِ گماں ۔۔۔ اپنی منزل میں ہے اب اہلِ وفا کا کارواں

جانتی ہے تو کہ عزم و جوش کا پیکر ہیں ہم

جانتی ہے تو تری بنیاد کا پتھر ہیں ہم !

مل گئی منزل، اندھیرے نور افشاں ہوگئے ۔۔۔ راہ کے کانٹے گلستاں در گلستاں ہوگئے

لطفِ دورِ نو سے پھر جینے کے ساماں ہوگئے ۔۔۔ صبح چمکی، رات کے نغمے پریشاں ہوگئے

عشرتِ ذوقِ طلب کیا ہے، دلِ اندوہ گیں سے پوچھ

امنِ ساحل کیا ہے ہم طوفاں کے ماروں سے پوچھ

وقتِ مبتلا، گردشِ دوراں سے واقف ہوگئے ۔۔۔ حادثوں کی کشمکش واحساں سے واقف ہوگئے

لطفِ آزادی غمِ زنداں سے واقف ہوگئے ۔۔۔ ہم مزاجِ عالمِ امکاں سے واقف ہوگئے

انتہائے یاس میں بھی مسکرانا آگیا

زندگی کو زندگی بن کر بتانا آگیا !

اے وطن پیارے وطن اے سرزمینِ رنگ و بو ۔۔۔ فکرِ مسلم کو رہی ہے کب سے تیری جستجو

تیری راتیں ماہ پیکر تیری صبحیں مہر رُو ۔۔۔ تیری تابانی کا ضامن ہے شہیدوں کا لہو

تو سلامت! ہم ترے پرچم کو لہرائیں گے

ہم اندھیرے میں کرن امید کی بن جائیں گے!

دَورِ بہار

جمیل نقوی

مرے تصور میں پرفشاں ہیں، کچھ ایسی صبحیں، کچھ ایسی شامیں
کہ جن کی براق روشنی میں وجودِ شام و سحر نہیں تھا
وہ نور، جو روشنی اثر ہے، بذاتہ جلوہ گر نہیں تھا
کہ جیسے تاروں کی سرزمیں میں نظامِ شمس و قمر نہیں تھا

★

فضا میں اک انتشار سا تھا، نگاہ محسوس کر رہی تھی
بیان پابندِ مصلحت تھا، لبوں پہ تالے پڑے ہوئے تھے
تپش سے سوزِ غمِ نہاں کی، زباں پہ چھالے پڑے ہوئے تھے
صبا گلوں سے الجھ رہی تھی، چمن کے لالے پڑے ہوئے تھے

★

عرق عرق تھی جبینِ شیریں، نگاہِ پرویز مطمئن تھی
کہ تیشۂ سنگ پاشِ آہن صدا سے محروم ہو چکا تھا
دوانہ اک بے ستوں بنا کر سکون کی نیند سو چکا تھا
پہونچ کے ساحل پہ آرزوؤں کے دل کی کشتی ڈبو چکا تھا

★

بجھی بجھی سی تھی شمعِ محفل، اداس تھی کارگاہِ ہستی
دلِ فسردہ رہِ محبت میں جیسے ناکام ہو گیا تھا
خود اپنے ذوقِ طلب کی قدروں پہ چل کے بدنام ہو گیا تھا
دماغ یوں مضطرب تھا جیسے خرد کو سرسام ہو گیا تھا

غبار میں چھپتے جا رہے تھے نشانِ منزل، نقوشِ جادہ
تھکا تھکا سا تھا ہر مسافر، جرس کی آواز مضمحل تھی
نگاہِ رہبر اگر کبھی اٹھ گئی تو دیکھا کہ منفعل تھی
مگر وہ اک آگ جو تصور کے دشت و صحرا میں مشتعل تھی

★

ہزار فتنے کھڑے ہوئے تھے خلوص و غیرت کے راستوں میں
حیات دوزخ بنی ہوئی تھی تمام تر جن کے دم قدم سے
بنامِ تکمیلِ آدمیت الجھ رہا تھا ستم کرم سے
زمانہ تاریخ لکھ رہا تھا ثبات کے آہنی قلم سے

★

یہ فکر تھی باغباں کو ہر دم کوئی کلی پھول بن نہ جائے
کہیں نہ سبزہ کی نیند ٹوٹے، چلے نہ بادِ صبا مچل کے
چہکنے پائے نہ کوئی بلبل، کہیں نہ لالہ کا جام چھلکے
خزاں رسیدہ چمن کے وارث نہ اٹھ کھڑے ہوں کہیں سنبھل کے

★

بنامِ تکمیلِ خود شناسی، بقدرِ احساسِ نامرادی
مرے جنونِ برہنہ سر نے خرد کو سو آئینے دکھلائے
کبھی اجالوں سے بھیک مانگی کبھی لہو سے دیے جلائے
نقوشِ ماضی جو مٹ گئے تھے، افق پہ اکثر ابھر کے آئے

خود اپنی ہستی سے تنگ آ کر مرے دلِ جذب آفریں نے
حریفِ احساسِ ناامیدی کو رازدارِ جنوں بنایا
خلوص کو نیند سے جھنجھوڑا، عروسِ غیرت کو گدگدایا
چمن کو پھر تازگی عطا کی، گلوں کو پیغامِ نو سنایا

اٹھو کہ دَورِ بہار آیا
اٹھو کہ دَورِ بہار آیا

افسانہ:

گھر سے گھر تک

احمد ندیم قاسمی

حاجی مقتدر احمد کے دیوان خانے میں قدم رکھتے ہی شیخ نورالزماں کی بیوی عشرت خانم، ان کی بیٹی ہما اور بیٹے وقار کا سارا رعب داب صابن کے جھاگ کی طرح نشا فش غائب ہو گیا۔ یہ لوگ جس کار میں حاجی صاحب کے ہاں آئے تھے وہ اتنی لمبی تھی کہ اگر ہوائی اڈے پر کھلے دروازوں کے ساتھ کھڑی ہوتی تو لوگ اسے طیارہ سمجھ بیٹھتے۔ حاجی صاحب کی گلی میں مڑتے ہوئے، ڈرائیور کو اسی لئے خاصی دقت ہوئی تھی۔ پھر یہ کار جتنی لمبی تھی اتنی ہی خوبصورت اور چمکیلی بھی تھی۔ اسے دیکھ کر عام آدمی کا ایکا ایکی جی چاہتا تھا کہ اسے چھونا اور محسوس کرنا چاہیئے مگر فوراً خیال آتا تھا کہ اس ٹھاٹھ کی کار کو چھونا یقیناً خلافِ قانون ہوگا اور پولیس پکڑ کر لے جائے گی۔

کار حاجی مقتدا احمد کے مکان کے سامنے رکی تو باوردی ڈرائیور نے اتر کر کار کے باقی تینوں دروازے کھولے۔ عشرت خانم، ہما اور وقار پھول میں سے بھونروں کی طرح برآمد ہوئے۔ پھر ڈرائیور نے ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ تینوں دروازے تڑاخ پڑاخ بند کئے تو گلی کے اس سرے سے اُس سرے تک کھڑکیوں میں سے جھانکتی ہوئی عورتوں اور آدھی آدھی لٹکتی ہوئی لڑکیوں کے کلیجے دھک سے رہ گئے۔ ڈرائیور بائیں بازو کو ہوا میں لہرا کر کلائی کو آنکھوں کے قریب لایا اور گھڑی میں وقت دیکھا۔ پھر اپنی سیٹ پر بیٹھ کر مونچھیں مروڑنے لگا۔

حاجی مقتدا احمد کی بیوی نورالنساء نے دروازے پر عشرت خانم، ہما اور وقار کا استقبال کیا اور کار کی طرف یوں دیکھا جیسے بچے پیسٹری کی طرف دیکھتے ہیں۔ پھر جب تینوں مہمان حاجی صاحب کے دیوان خانے کا ریشمی پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوئے تو پائدان پر ذرا دیر کو یوں کھڑے رہ گئے جیسے آگے قدم بڑھایا تو بے ادبی کا ارتکاب کر بیٹھیں گے۔

سب سے آگے عشرت خانم تھیں۔ انہوں نے قالین پر قدم رکھا تو ڈگمگا گئیں جیسے پھسلنے سے بچی ہیں۔ پلٹ کر انہوں نے ہما کی طرف دیکھا اور شلوار کے پائنچوں کو ذرا سا اٹھا کر صوفے کی طرف بڑھیں جیسے تالاب میں اُترنے چلی ہیں۔ ہما اور وقار پر بھی کم و بیش یہی عالم گزر گیا۔ نورالنساء نے سلیپر پائدان پر اتار دیئے اور ایک ڈگ بھر کر تخت کے پاس کھڑی ہو گئیں۔ سب اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھنے لگے تو وقار ایک قدم پیچھے ہٹ کر دروازے کے پاس پلش میں لپٹے ہوئے ایک مونڈھے پر دربان کی طرح بیٹھ گیا۔

نورالنساء چونک کر بولیں۔ "ارے ہے وقار میاں، یہ کیا کر رہے ہو؟ اے بہن عشرت خانم، اسے سمجھایئے۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ وہیں مونڈھے پر ہی ٹک گیا۔ اٹھو بیٹا اٹھو، صوفے کس لئے رکھے ہیں؟"

عشرت خانم نے وقار سے کہا۔ "سن رہے ہو میاں، تمہاری خالہ جان کیا کہہ رہی ہیں؟"

وقار کچھ اس طرح چل کر صوفے کی طرف گیا جیسے ایک ایک سیڑھی چھوڑ کر زینہ اترا ہے۔

اس کے بعد تکلّفات شروع ہوئے۔ تہذیب برتی جانے لگی۔ موسم کی بوالعجبیوں کا ذکر چلا۔ پھر نورالنساء اٹھیں۔ "ہائے میں نے معصومہ کو تو بتایا ہی نہیں کہ تمہاری خالہ جان آئی ہیں۔"

وقار جو دائیں ٹانگ کو بائیں ٹانگ پر رکھے بیٹھا تھا، بائیں ٹانگ کو دائیں ٹانگ پر رکھ کر اور ہما کی طرف دیکھتے ہوئے یوں سکڑا جیسے کہہ رہا ہے۔ "دیکھئے باجی، انہیں منع کیجئے۔"

ہما کھڑکھڑاتے ہوئے ریشم کے لباس کو سنبھالتی ہوئی اٹھی اور مسکرا کر بولی۔ "آپ تشریف رکھئے خالہ جان، معصومہ کو میں لئے آتی ہوں۔"

نور النساء فوراً بولیں۔ "نہیں نہیں ہما بیٹی۔ تم بیٹھو۔ میں نوکروں سے چائے لگانے کو بھی تو کہہ دوں۔"
نور النساء سلیپر پٹخاتی سیڑھیوں پر چڑھنے لگیں تو ہما بولی۔ "دیکھا اماں۔ میں نہ کہتی تھی؟"
"اسی لئے تو میں آتی نہیں تھی۔" عشرت خانم بولیں۔ "سمجھ میں نہیں آتا حاجی صاحب نے اتنی بہت سی دولت کہاں سے بٹور رکھی ہے؟"
"غالیچہ دیکھئے جیسے سمندر کا جھاگ ہے" ہما نے ہاتھ بڑھا کر غالیچے میں انگلیوں کی پوریں ڈبو دیں۔ "پاؤں رکھو تو تھاہ نہ پاؤ۔ ایک ہزار کا تو ہوگا۔"
"ایک ہزار کا؟" وقار پہلی بار بولا۔ "کمال کرتی ہیں باجی۔ دس ہزار کہیئے۔"
"آہستہ بولو" ہما نے آہستہ سے کہا۔ "جب لڑکیوں کو دیکھنے آتے ہیں تو آہستہ بولتے ہیں۔ یوں سمجھو کہ ہر پردے کے پیچھے کوئی کھڑا تمہاری بات سن رہا ہے۔"
"دس ہزار کا اگر صرف یہ غالیچہ ہے تو اس دیوان خانے کا پورا سامان ایک لاکھ سے کم کا کیا ہوگا۔" عشرت خانم نے صوفے میں گھوم کر پورے دیوان خانے پر نظریں دوڑائیں۔ "ایک لاکھ کوئی معمولی رقم نہیں ہے۔ منہ میں سماتی ہے، جیب میں رکھو تو پھٹ کر نیچے جا پڑے۔"
ہما جو دروازے کے قریب والے صوفے پر بیٹھی تھی جھکتے ہوئے پردے کو چھو کر کہنے لگی۔ "خالص ریشم کے تو پردے ہیں۔" پھر وہ پردے کو ذرا سا جھٹک کر بولی "یہ دیکھئے۔ ذرا سی شکن جو پیدا ہوتی ہے وہ پانی کی لہر کی طرح آخر تک چلی جاتی ہے۔ یہ دیکھئے۔ یہ دیکھئے۔" ہما نے پردے کو دو تین بار جھٹکا۔
"اسے رہنے دے۔" عشرت خانم نے سرزنش کی۔ "کیا کر رہی ہے۔ پردہ گر پڑے گا۔" پھر دائیں ہاتھ کی انگشتِ شہادت سے پردے گنتی ہوئی بولیں۔ "ایک دو تین چار پانچ اور چھ۔ اکٹھے چھ پردے ہیں ایک جیسے۔"
"کچھ نہیں تو چھ سو کے تو یہی ہوں گے۔" ہما بولی۔
"لیجئے اور سنیئے" وقار تڑپ اٹھا۔ "باجی تو کمال کر رہی ہیں۔ دو ہزار سے کم کے نہیں ہوں گے۔ لکھوا لیجئے مجھ سے۔"
"صوفہ دیکھئے، بالکل نئے فیشن کا ہے۔" ہما نے تبصرہ جاری رکھا۔ "تپائیوں پر رکھے ہوئے عجائبات دیکھئے۔ وقار مینٹل پیس پر جو ہرن رکھا ہے وہ مٹی کا ہے کہ لکڑی کا؟"
وقار نے ہرن کی طرف جوہری کی طرح دیکھتے ہوئے کہا۔ "نہ مٹی کا ہے نہ لکڑی کا۔ مجھے تو کسی قیمتی پتھر کا معلوم ہوتا ہے شاید عقیق کا ہے۔"
"عقیق کا؟" عشرت خانم ہرن کو دیکھنے کے لئے آدھی اٹھ گئیں۔
"بڑے بڑے گھروں کے دیوان خانے دیکھے ہیں۔" ہما نے جھوم کر کہا۔ "ایسے ٹھاٹھ کہیں نظر نہیں آئے۔"
عشرت خانم ہاتھ مل کر بولیں۔ "اتنے بڑے گھر کی لڑکی جانے مزاج کی کیسی ہوگی۔"
"میں نے تو کہا تھا کہ پہلے دیکھ دکھا لیجئے۔" وقار نے کہا۔
"ہما سے پوچھو۔" عشرت خانم بولیں۔ "مجھے تو یہی گھسیٹے لئے پھر رہی ہے۔"
"تو کیا ہے اماں؟" ہما بولی۔ "اس میں نقصان کونسا ہے۔ اتنا بہت سا جہیز ملے گا۔"
"تم بھی تو اتنے بڑے گھر کی بہو بن کر گئی تھیں۔" عشرت خانم اداس ہو گئیں۔ "بتاؤ کیا ملا؟"
"چُپ" ہما نے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔
تینوں یوں سنبھل بیٹھے جیسے ان کی تصویر اترنے والی ہے۔ سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ آ رہی تھی۔ ساتھ ہی بغل والے کمرے میں ریشمی پردے کے اُدھر چینی کے برتن بجنے لگے تھے۔
نور النساء پردہ ہٹا کر بولیں۔ "آجا بیٹی۔ شرمانے کی کونسی بات ہے۔ اپنی خالہ ہیں۔ اپنی باجی ہما ہیں جن سے تو سلیمہ کے ہاں ملی تھی۔

سب اپنے ہیں۔ آجاؤ"

معصومہ کی صورت میں ریشم اور نائلون کا ایک ڈھیر دیوان خانے میں داخل ہوا۔ وقار ادب سے کھڑا ہو گیا۔ عشرت خانم اور ہما نے معصومہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور نور النساء نے معصومہ کو وقار کے بالکل سامنے والے صوفہ پر بٹھا دیا۔

معصومہ نے ایک دو بار سر پر سے کھسکتے ہوئے دوپٹہ کو درست کرنے کے لئے اپنا ہاتھ یوں ہولے سے اٹھایا جیسے ذرا تیزی سے اٹھایا تو ریشم کہیں نہ کہیں سے ضرور مسک جائے گا۔ وہ عمر کے اس حصے میں تھی جہاں بدصورتی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ہما معصومہ سے باتیں کرنے کی کوشش کرتی رہی مگر "جی" یا "جی نہیں" سے زیادہ اسے کسی سوال کا جواب نہ ملا۔ وقار معصومہ کو یوں چوری چوری دیکھتا رہا جیسے اپنے مکان کی چھت پر کھڑا ہے۔ نور النساء معصومہ کی سلیقہ مندیوں اور کشیدہ کاریوں کے قصے سناتی رہیں اور عشرت خانم "ماشاء اللہ، ماشاء اللہ" سے جواب دیتی رہیں۔

پھر جب لٹھے کی صاف ستھری شلوار قمیص میں ملبوس ملازم نے بغل والے کمرے کا دروازہ کھول کر پردہ سرکایا اور سب لوگ طعام گاہ میں داخل ہوئے تو عشرت خانم تو جیسے گونگی ہو کر رہ گئیں۔ اتنی بڑی میز پر بچھے ہوئے منقش پلاسٹک پر انہیں ایسی کراکری نظر آئی، جس کے بارے میں انہوں نے بازار میں سے گزرتے ہوئے کئی بار کہا تھا کہ ایسے برتنوں کے لئے دو ہی جگہیں مناسب ہیں۔ دکانوں کے شوکیس یا وزیروں، وزراء کی طعام گاہیں۔ مگر یہ تو حاجی مقتدا احمد کا گھر تھا جس کے بارے میں ہما نے انہیں بتایا تھا کہ منیاری کی دکان ہے اور خاصے کھاتے پیتے آدمی ہیں۔ "یہ تو خاصے کھاتے کھلاتے پیتے چھلکاتے آدمی معلوم ہوتے ہیں!" عشرت خانم نے سوچا۔ طعام گاہ کے بڑے پن کو صرف ایک ریفریجریٹر کی کمی نے بھٹیس پہنچا رکھی تھی یا معصومہ کی انتہا درجے کی شرم و حیا نے۔ معصومہ نے نہ تو بڑے گھروں کی لڑکیوں کی طرح چہک چہک کر چائے بنائی۔ نہ کوئی پلیٹ اٹھا کر وقار تو چھوڑ، ہما اور عشرت خانم تک سے کہا کہ یہ خاص میرے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیز ہے۔ نہ اس نے کسی ذرا سی بات پر بڑا سا قہقہہ لگایا اور نہ اس انداز سے تعجب کا اظہار کیا کہ سب لوگوں کی نگاہیں اس پر گڑ جاتیں اور اس کی بھووں کے کٹیلے پن اور آنکھوں کے ہوشربا طول و عرض سے لے کر اس کی لمبی گردن کے مرمر تک کا جائزہ لے آتیں۔ وہ ہما اور اپنی اماں کے درمیان بیٹھی دیر تک مسلسل ایک ہی بسکٹ کو ذرا چکھتی رہی اور پیالی میں سے ایک ایک قطرہ چائے پی کر پرچ میں اسے یوں کوئی آواز پیدا کئے بغیر رکھتی رہی جیسے پیالی اور پرچ دونوں گتے سے بنی ہیں۔

"حاجی صاحب جب عدن میں بزنس کرتے تھے"، نور النساء نے بتایا۔ "تو وہ دنیا جہان کے عجائبات اپنے گھر میں بھرتے رہے۔ چھ قسم کے تو چائے کے صرف روسی سیٹ تھے۔ کافی کے تین سیٹ انہوں نے ولایت جانے والے ایک دوست کے ہاتھ جرمن کے ملک سے منگائے اور ان کی قیمت جو ادا کی اس کا اندازہ آپ سے زیادہ کس کو ہوگا۔ ایران سے وہ جس آدمی کے ہاں سے قالین منگاتے تھے وہ ان سے یوں خط و کتابت کرتا تھا جیسے حاجی صاحب عدن میں قالینوں کے سوداگر ہیں۔ ایک بار انہیں کھانے کے کمرے کی میزیں خریدنے کا شوق چرایا تو ایک دو سال کے اندر ساگوان کی اکٹھی پانچ میزیں جمع کر لیں۔ میں چیخی چلائی تو بجائے اس کے کہ نیلام کر دیتے، اپنے انگریز دوستوں کو مفت میں دے آئے۔ نیلام کرتے تو چار پانچ ہزار روپے تو ضرور آ جاتے۔ اب آپ سے زیادہ کس کو اندازہ ہوگا کہ اگر نیلام کے دام یہ ہیں تو اصل قیمت کیا ہوگی۔ پھر جب اتنے بڑے بنگلے میں ایک نیا تنکہ تک رکھنے کی جگہ نہ رہی اور ادھر اپنے وطن کی آزادی کے بعد انہوں نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا تو ساری عمر کی کمائی وہیں اونے پونے بیچنا پڑی۔ بڑے بڑے انگریز افسروں اور عرب شیخوں نے آ کر بولیاں دیں۔ گھر سے باہر تانا لگ گیا۔ معصومہ اس وقت یہی کوئی چار پانچ سال کی ہوگی۔ اسے بھی یاد ہوگا کہ اس روز کیسے سارا عدن ہمارے گھر سے باہر امڈ پڑا تھا۔ یاد ہے بیٹی؟"

"جی" معصومہ بولی۔

"اور بہن عشرت خانم"۔ نور النساء نے کہنا شروع کیا۔ "واپس وطن آ کر ــــ"

باہر کا دروازہ کھلا اور صاف ستھرے ملازم نے اندر آ کر پوچھا۔ "اور چائے لا دوں بی بی؟"

"اے آؤ" نورالنساء فوراً بولیں

عشرت خانم اور ہما چلا اٹھیں۔ "نہیں نہیں۔ ابھی رکھی ہے"

کچھ دیر خاموشی رہی اور ملازم ٹھہرے ادب سے وہیں کھڑا رہا۔

سلسلۂ کلام جاری رکھنے کے لئے نورالنساء نے گلا صاف کیا اور عشرت خانم کی طرف متوجہ ہوئیں مگر فوراً سیدھی ہو بیٹھیں اور بولیں "ضرورت ہوئی تو بلا لیں گے۔ جاؤ"

ملازم چلا گیا تو نورالنساء بولیں۔ "تو بہن۔ وہ میں کہہ رہی تھی کہ وطن واپس آ کر حاجی صاحب نے کتابیں جمع کرنے کا سلسلہ شروع کیا تو اب تک ختم ہونے میں نہیں آیا۔ ادھر جس کمرے میں بھی جائیے، کتابیں ہی کتابیں ٹھنسی پڑی ہیں۔ معصومہ اور میں کسی اور بات کی عادی تھیں۔ سو یہ سب غریبانہ چیزیں جو آپ کو یہاں نظر آ رہی ہیں وہ ہم دونوں ہی کی دوڑ بھاگ کا نتیجہ ہیں۔ چیزیں میں نے جمع کر دی ہیں۔ انہیں ترتیب سے لگانے کا سلیقہ معصومہ کا ہے۔"

"ماشاءاللہ، ماشاءاللہ" عشرت خانم بولیں۔

"سلیقہ ہی تو سب کچھ ہے" ہما بولی۔ "ورنہ مشین تو آدمی سے بھی زیادہ تیزی سے کام کر سکتی ہے۔" وقار اپنے مکان کی چھت پر کھڑا نظر آنے لگا۔

واپس دیوان خانے میں آ کر سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے مگر معصومہ کھڑی رہی اور اسے کھڑا دیکھ کر وقار بھی ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر نورالنساء نے کہا۔ "ادھر آج میری بیٹی جمیلہ کے بچے آئے ہوئے ہیں۔ صبح سے دھما چوکڑی مچا رکھی ہے۔ معصومہ کو اجازت دیجئے کہ جا کر انہیں سنبھالے۔ چائے پینے میں کپڑے سان دیں گے۔ چھوٹے چھوٹے سے ہیں۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" عشرت خانم بولیں۔

"میں بس ایک منٹ میں حاضر ہوئی۔" نورالنساء نے کہا اور بیٹی کے ساتھ باہر چلی گئیں۔ چند منٹ تک ماں بیٹی اور بیٹا چپ چاپ بیٹھے رہے جیسے مینار کی سیڑھیاں طے کرنے کے بعد چوٹی پر آئے ہیں تو چکرا گئے ہیں۔

"اماں جی" ہما بولی۔ "دیکھا؟"

عشرت خانم ابھی جواب نہیں دے پائی تھیں کہ باہر سے ڈرائیور کی آواز آئی۔ "بی بی جی۔"

"کیا بات ہے؟" عشرت خانم جلدی سے باہر نکلیں۔ ڈرائیور کی بات سن کر بولیں۔ "بس کوئی پانچ منٹ میں۔ زیادہ نہیں۔" ڈرائیور واپس اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔ عشرت خانم نے اوپر جاتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ ذرا دیر کھڑی سوچتی رہیں۔ پھر دیوان خانے کے دروازے کا پردہ ہٹا کر بولیں۔ "تم دونوں یہیں بیٹھو۔ میں ایک منٹ میں اوپر سے ہو کر آتی ہوں۔ نورالنساء کے نواسوں نواسیوں کو ایک ایک روپیہ دے آؤں۔"

"ایک ایک روپیہ؟" ہما بولی۔ "نہیں اماں۔ دو دو دیجئے گا۔ کیوں وقار؟"

"اماں کی مرضی ہے۔" وقار بولا۔

"دو دو دے دوں گی پر نہ جانے ہیں کتنے؟" عشرت خانم سوچنے لگیں۔

ہما نے بڑی ناگواری سے کہا۔ "افوہ اماں کبھی کبھی تو آپ حد کر دیتی ہیں۔ جتنے بھی ہوں پر دیجئے گا دو دو۔"

عشرت خانم نے کچھ کہے بغیر پردہ گرا دیا اور آہستہ آہستہ اوپر چلنے لگیں۔ سیڑھیوں کے پہلے ہی موڑ پر رک گئیں کیونکہ اوپر سے نورالنساء اتر رہی تھیں۔ انہوں نے عشرت خانم کو یہاں کھڑے دیکھا تو پہلے تو ہکا بکا رہ گئیں۔ پھر بولیں۔ "اے بہن۔ دیوان خانے میں جا کر بیٹھئے۔ یہاں کھڑی کیا کر رہی ہیں؟"

"یونہی ذرا جی چاہا کہ اوپر سے بھی ہو آؤں۔" عشرت خانم نے مسکرا کر کہا۔ "دو تین منزلوں والے مکان میں گھر کا ماحول اوپر کے حصے ہی میں ملتا ہے اور میں گھریلو عورت ہوں۔ پھر آپ کے نواسے نواسیوں کو بھی تو نہیں دیکھا۔ چلئے۔ ملا دیجئے ان سے۔"

"میں انہیں نیچے ہی بلائے لیتی ہوں۔" نورالنساء بضد رہیں۔ "ایک تو اوپر بچوں نے دنیا جہان کا کوڑا کباڑ جمع کر رکھا ہے۔ دوسرے ——"

"تو کیا ہوا؟" عشرت خانم نے اگلی سیڑھی پر قدم رکھ دیا اور نورالنساء کو بازو سے پکڑ کر کہا۔ "آئیے۔"

"نیچے ہما بیٹی اور وقار بیٹا کیا کہیں گے کہ ——" نورالنساء نے احتجاج کیا۔

"کچھ نہیں کہیں گے۔" عشرت خانم نے نورالنساء کو کھینچا۔ "میں ان سے کہہ آئی ہوں کہ میں اوپر جا رہی ہوں۔"

نورالنساء چپ چاپ عشرت خانم کے ساتھ ہولیں۔

آخری سیڑھی تک پہنچی تھیں کہ معصومہ کی کھنکتی ہوئی آواز آئی۔ "اے کلثوم۔ اس زاہد کے بچے کو پکڑ۔ یہ چائے سے سنے ہوئے ہاتھ لئے میرے کپڑوں کی طرف بڑھ رہا ہے۔ میں نے تو اتنی دیر تک نیچے بیٹھ کر ان کی استری تک خراب نہیں ہونے دی اور یہ اسے دھولنے چلا ہے۔ سلیمہ کیا کہے گی کہ ——"

یکایک نورالنساء نے اونچی آواز میں باتیں کرنا شروع کر دیں۔ "میری تو سمجھ میں نہیں آتا بہن کہ آپ کو کس کمرے میں لے جاؤں۔ آج تو یہ یہاں سے وہاں تک بچوں کا گھر بنا ہوا ہے۔ وہ اُدھم مچا رکھا ہے انہوں نے کہ اللہ میری توبہ ہے۔" پھر جس طرح انہوں نے یکایک بولنا شروع کیا تھا اسی طرح یکایک رک گئیں اور چہرے پر ایسی کیفیت طاری کر لی جیسے کان لگا کر کچھ سن رہی ہیں۔

عشرت خانم نے اپنی میزبان کو ایک لمحہ غور سے دیکھا۔ پھر بولیں۔ "ادھر بچوں کے پاس چلتے ہیں۔"

"ہائے بہن وہاں تو ——" نورالنساء جیسے رونے کے قریب پہنچ گئیں۔ مگر عشرت خانم کو بڑھتا دیکھا تو ان کے ساتھ ہولیں۔

"اے ہے بیٹی، کپڑے بدل لئے؟" عشرت خانم دروازے کے سامنے جا کر بولیں اور نورالنساء نے قدم روک لئے جیسے معصومہ سے ان کا پردہ ہے۔

میلی داغی دیواروں اور جالوں بھری چھت والے اس کمرے کے دروازے پر پرانے دوپٹے کا ایک ادھورا سا پردہ لٹک رہا تھا جس کا ایک سرا اٹھا کر کواڑ سے اٹکا دیا گیا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں ٹوٹی ہوئی ادوائن کا ایک کھٹولا پڑا تھا جس پر معصومہ کے ریشمی لباس کا ڈھیر رکھا تھا اور پائینتی کے پاس پانچ چھ برس کا ننگا زاہد کھڑا جلیبی سے سنی ہوئی انگلیاں چوس رہا تھا۔ اکھڑے ہوئے سیمنٹ کے فرش پر مختلف عمروں کے پانچ لڑکے لڑکیاں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ چائے ایک کالی بھجنگ تپلی میں تھی۔ چائے پینے والوں میں سے کسی کے ہاتھ میں مٹی کا پیالہ تھا تو کسی کے سامنے مرادآبادی کٹورا رکھا تھا۔ ایک بچے کے ہاتھ میں چینی کی پیالی تھی جس کی دستی ٹوٹ چکی تھی۔ ایک لڑکی نے ہاتھوں کو چائے کی تپش سے بچانے کے لئے ایلومونیم کے ایک ٹیڑھے میڑھے گلاس کو اپنی فراک میں لے کر اسے دونوں ہاتھوں میں یوں اٹھا رکھا تھا کہ اس کا ننھا سا پیٹ دکھائی دے رہا تھا۔ بڑی لڑکی کلثوم کے سامنے ایک پلیٹ میں لال شکر رکھی تھی جسے مکھیوں نے سیاہ کر ڈالا تھا۔ وہ کرے ہوئے کناروں والی ایک پرچ میں چائے پی رہی تھی۔ معصومہ میلی چیکٹ شلوار اور قمیص پر ایک چھلنی چھلنی دوپٹہ اوڑھے ننگے پاؤں یوں کھڑی تھی جیسے اسے چھو لیا جائے تو گر پڑے گی۔ اس کی لمبی سیاہ آنکھوں میں خوف گھس گیا تھا اور اس کے گلابی ہونٹوں پر نیل پڑ رہے تھے۔

عشرت خانم دروازے میں کھڑی بغور دیکھتی رہیں۔ پھر مسکرا کر نورالنساء کی طرف دیکھا تو وہ غائب تھیں۔ "اے بہن نورالنساء۔" وہ پکاریں جواب نہ پا کر سنجیدہ ہو گئیں اور ادھر ادھر دیکھ کر آگے بڑھ گئیں۔ ساتھ والے کمرے سے برتنوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کے دروازے پر پہنچیں تو دیکھا کہ نورالنساء جلدی جلدی سے برتن سمیٹ رہی ہیں۔ "بہن" انہوں نے کہا اور نورالنساء سناٹے میں آ گئیں۔ پھر بولیں۔ "یہ باورچی خانہ ہے مگر بچوں نے آج اسے کباڑ خانہ بنا رکھا ہے۔ ہائے بہن، مجھے تو ——"

پھر وہ خاموش ہو گئیں۔ ان کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو خاموش ہو جاتا۔ وجہ یہ تھی کہ عشرت خانم ہنس رہی تھیں۔

معصومہ پرلے دروازے میں سے ڈری ڈری جھانک رہی تھی جیسے وہ ایک ایسی گاڑی میں سوار ہے جس کی بس ایک دو لمحوں کے اندر مخالف سمت سے آتی ہوئی گاڑی کے ساتھ ٹکر ہونے والی ہے۔

عشرت خانم ہنسے جا رہی تھیں اور اب پیٹ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی تھیں۔ "ہائے میرے اللہ" وہ بڑی مشکل سے بولیں۔ "توبہ ہے۔" انہوں نے بڑی محنت سے ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا اور پھر سامنے دیکھا۔

نورالنساء کے ایک ہاتھ میں پتیلی اور دوسرے ہاتھ میں اپنا سر تھا اور وہ یوں بیٹھی تھیں جیسے مٹی کی بیٹھی رکھی ہیں۔

عشرت خانم پر ہنسی کا ایک اور دورہ پڑا۔ "اے بہن معاف کرنا" وہ بولیں۔ "آپ نے مجھے یہ ٹوٹے ہوئے پیالے اور یہ پچکی ہوئی پتیلیاں پہلے کیوں نہیں دکھائیں؟ یہ کالی میلی دیواریں اور یہ پرانے دوپٹوں کے پردے آپ نے اور کیوں چھپا رکھے تھے؟ یہ ننگے اور ادھ ننگے بے دھلے بے نہائے بچے، وہ ٹوٹا ہوا کھٹولا اور یہ بے کنڈے کا توا۔ اے بہن نورالنساء۔ آپ نے یہ سب کچھ مجھ سے کیوں چھپایا؟ اور ذرا ادھر تو ہٹئے بہن" عشرت خانم اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "وہ کیا رکھا ہے؟ اچھا تو وہ تام چینی کی چوٹ لگی پلیٹیں ہیں جن کے کناروں پر چنے کی دال اب تک جمی ہوئی ہے۔ ادھر معصومہ بیٹی کے کمرے میں جو چارپائی رکھی ہے اس کی ادوائن کو پورا کرنے کے لئے رسی کے ساتھ کسی کا کمربند بھی تو باندھ دیا گیا ہے۔" عشرت خانم نے یہاں رک کر دو تین قہقہے مارے۔ پھر آنکھیں پونچھنے کے لئے اپنے دوپٹے کا پلو پکڑا مگر دوپٹے کو ابھی آنکھوں تک نہیں لے گئی تھیں کہ وہ نورالنساء کو یوں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگیں جیسے گھنی دھند میں راستہ ڈھونڈ رہی ہیں۔ "بہن" وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئیں۔

عشرت خانم باورچی خانے میں داخل ہو کر نورالنساء کے پاس بیٹھ گئیں۔ نورالنساء کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں سے بینائی جیسے چوس لی گئی تھی۔

"دیکھئے بہن۔ مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" عشرت خانم نے کہا "نیچے سیڑھیوں میں۔ الگ سے۔"

نورالنساء گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھیں تو ان کی ریڑھ کی ہڈی میں سے چٹاک چٹاک کی دو تین آوازیں آئیں جیسے تیز ہوا میں خشک ٹہنیاں ٹوٹ رہی ہیں۔

عشرت خانم منہ میں دوپٹے کا ایک پلو ٹھونسے اور ادھر ادھر دیکھے بغیر چند سیڑھیاں اتر گئیں۔ پھر رک کر اوپر دیکھا۔ نورالنساء برسوں کے مریضوں کی طرح سیڑھیوں کے جنگلے کے سہارے آہستہ آہستہ اتر رہی تھیں۔ جب وہ عشرت خانم کے قریب آئیں تو آنکھیں جھکا کر اترتی چلی گئیں مگر عشرت خانم نے انہیں بازو سے پکڑ کر روک لیا۔ پھر انہیں اپنے مقابل کھڑا کر کے منہ میں سے دوپٹہ نکالا اور بجائے بولنے کے ہنسنے لگیں۔

"جوتیاں ماریئے بہن عشرت خانم" نورالنساء کی کہیں دور سے آواز آئی۔ "پر یہ جو آپ کی ہنسی ——"

نورالنساء آگے کچھ نہ کہہ سکیں کیونکہ نیچے کسی نے دروازے پر دستک دے دی۔ نورالنساء بھڑک کر تیزی کے ساتھ نیچے اتریں مگر جب تک وہ سیڑھیاں اترتیں، ایک لڑکے نے دروازہ کھولتے ہی کڑک کر کہہ دیا۔ "بی بی جی سلام۔ آپا جی کہہ رہی ہیں کہ جب مہمان چلے جائیں تو ہمیں جلدی سے بتا دیجئے گا۔ کہتی ہیں قالین اور صوفہ اور پردے بے شک کل تک رکھے رہیں۔ برتن اور سجاوٹ کی چیزیں ہم آج ہی واپس منگا لیں گے۔ صبح سویرے ہمارے ہاں بھی مہمان آ رہے ہیں۔"

نورالنساء آخری سیڑھی پر جنگلے کو مٹھی میں دبوچے کھڑی تھیں۔ انہوں نے صرف گردن کی جنبش سے "اچھا" کہا۔ لڑکا دھڑ سے دروازہ بند کر کے چلا گیا اور نورالنساء آخری سیڑھی پر جیسے گر پڑیں۔

"ڈرائیور۔" عشرت خانم زور سے پکاریں۔ اور دیوان خانے کا پردہ ہٹا کر ہما نے جھانکتے ہوئے پوچھا "کیوں اماں جی۔ کیا ہے؟"

"میں نے ڈرائیور کو بلایا ہے۔ تم اندر بیٹھو۔" عشرت خانم بولیں۔ "اور دیکھو صوفے پر احتیاط سے بیٹھو۔ کپڑوں میں شکن نہ آئے۔ تمہاری سہیلی کیا کہے گی کہ مانگ کر پہننے کو لے گئیں اور گنجلا کر واپس کئے۔"

"اماں۔" ہما کے سینے پر عشرت خانم نے جیسے مکا مار دیا۔ پھر وہ تیورا کر پیچھے ہٹ گئی۔

"بڑی بے لحاظ ہوتی ہیں اس زمانے کی لڑکیاں۔" عشرت خانم نے نورالنساء کے پاس آخری سیڑھی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "مانگے کے کپڑے یوں پہنتی ہیں جیسے باپ نے خرید کر دئے ہیں۔" پھر وہ ہنسنے لگیں اور ادھر پہلی بار نورالنساء کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ کا پرتو پڑا۔

"ڈرائیور" عشرت خانم نے اٹھ کر باہر کا دروازہ کھول دیا۔ ڈرائیور سامنے آیا تو وہ بولیں "بھئی دیکھو۔ تم کار واپس لے جاؤ۔ ہم لوگ تانگے سے آجائیں گے بیگم صاحب کو سینما دیکھنے جانا ہے تو یہ مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا کہ کار کے مالک تو دوسروں سے کار مانگتے پھریں اور جو ایک گھنٹے کے لیئے کار مانگ کر لائے ہیں وہ اس پر قبضہ جما کر بیٹھ جائیں۔ کہنا بہت بہت شکریہ" ــ پھر پانچ روپے کا ایک نوٹ بڑھا کر بولیں "یہ لو۔ تمہارا انعام ہے"

ڈرائیور سلام کرکے پلٹ گیا تو عشرت خانم دروازہ بند کرکے ہنسنے لگیں۔ پھر وہ اسی طرح ہنستی ہوئی بڑھیں اور نورالنسا سے لپٹ کر بولیں "اے بہن نورالنساء۔ خدا کے لئے ہنسنے۔ کیا یہ ہنسی کی بات نہیں ہے! اے بہن کیا یہ ہنسی کی بات نہیں ہے کہ انسان اپنے گھر سے نکل کر کسی دوسرے کے گھر جائے تو اپنے ہی گھر جا نکلے۔ اور بہن۔ میری معصومہ بھی اپنے گھر سے چلے گی تو اپنے ہی گھر جائے گی۔

اب نورالنسا کھل کر مسکرا رہی تھیں۔

باہر کار سٹارٹ ہوئی اور ڈرائیور نے رخصت کا ہارن دبا تو وقار جھپٹ کر دیوان خانے کے دروازے پر آیا "اماں جی۔ کار تو جا رہی ہے"

"جا رہی ہے تو جانے دو" عشرت خانم بولیں "کیا یہ تمہارے باپ کی کار ہے؟"۔

وقار تیورا کر پیچھے ہٹ گیا اور نورالنسا پہلی بار قہقہہ مار کر عشرت خانم سے لپٹ گئیں۔ دونوں کی ہنسی وقار اور رہا کو ایک بار پھر دیوان خانے کے دروازے پر کھینچ لائی۔ جہاں وہ ریشمی پردہ ہٹا کر بتوں کی سی گول گول حیران حیران آنکھوں سے دونوں کو دیکھنے لگے۔ اوپر سیڑھیوں کے پہلے موڑ پر معصومہ کھڑی نیچے یوں دیکھ رہی تھی جیسے مداری نے ٹوکری کے نیچے جلا ہوا کاغذ رکھنے کے بعد اس میں سے کبوتر نکال لیا ہے۔ اور عشرت خانم کہہ رہی تھیں۔ "ہائے بہن نورالنسا میرے تو پیٹ میں بل پڑ گئے۔ قسم قرآن مجید کی۔ پسینہ سرخی پوڈر بہائے جانے تو نیچے سے کیسے کیسے اور کھرے چہرے نکل آتے ہیں۔ ہائے مجھے کتنا پیار آ رہا ہے آپ پر۔ آیئے ذرا دیر کو اوپر باورچی خانے کے ننگے فرش پر جا بیٹھیں"۔

★

ادبِ لطیف کراچی، اگست ۱۹۵۹ء

حوّا اور سانپ

اعجاز حسین بٹالوی

وہ میرا نیا مؤکل تھا اور قانونی مشورہ کرنے آیا تھا۔

اس کی عمر بیس اکیس سے زیادہ نہ ہو گی۔ اکہرا بدن، لمبا قد، باریک سی مونچھیں اور چہرے پر ہلکی سی اُداسی جیسے جوانی میں کبھی کبھی ہوتی ہے۔ گفتگو میں ذرا سا حجاب۔ میں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ اگر میں اس کے چہرے کی طرف دیکھوں تو اسے گفتگو کرنے میں اور زیادہ دقّت ہوتی ہے۔ بعض مؤکلوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہ کرو تو انہیں تسلی نہیں ہوتی۔ بعضوں کے چہرے کی طرف دیکھتے رہو تو ان کے لئے گفتگو کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں کبھی سامنے کی دیوار پہ لگے ہوئے کیلنڈر کی طرف اور کبھی کتابوں کی الماریوں کی طرف دیکھتا رہا۔

اس نے کہا۔ "جناب میں آپ سے ایک مشورہ کرنے آیا ہوں۔" پھر اس نے ذرا سا رک کر آہستہ سے کہا، جیسے کوئی سازش کی بات ہو۔ "کیا عورت اپنے خاوند کو طلاق دے سکتی ہے؟"

"جی نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے آپ مسلمان عورت کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ وہ خاوند کو طلاق نہیں دے سکتی، اس سے طلاق حاصل کرنے کے لئے عدالت میں دعویٰ دائر کر سکتی ہے۔"

وہ خاموش ہو کر کسی گہری سوچ میں کھو گیا۔ میں نے پوچھا۔ "آپ شادی شدہ ہیں؟"

"جی نہیں۔" وہ پھر خاموش ہو گیا۔

میرا اصول ہے کہ جب تک مؤکل ایسے موقع پر خود کھل کر بات نہ بتائے اس سے کرید کرید کر پوچھنا مناسب نہیں سمجھتا۔ کیا معلوم وہ اس وقت اپنے آپ سے کونسی جنگ لڑ رہا ہو۔ میں نے سوچا یہ سوال اب تک مجھ سے کئی ایسی عورتوں نے پوچھا ہے جو شادی شدہ زندگی کی ناکامیوں اور مصیبتوں سے تنگ آ کر مجھ سے قانونی مشورہ کرنے آئی تھیں مگر ایک غیر شادی نوجوان مرد یہ سوال کیوں پوچھ رہا ہے۔ میں نے اس کے چہرے پر تذبذب اور کشمکش کے آثار دیکھ کر پوچھا۔ "آپ کیا کرتے ہیں؟"

"میں..... جی میں ریلوے ورکشاپ میں ملازم ہوں۔ ایف ایس سی میں دو مرتبہ فیل ہونے کے بعد مجھے نوکری کرنی پڑی۔ ہم انبالہ کے ریفیوجی ہیں۔ والد کے کاروبار کا بھٹہ بیٹھ گیا تو میں تعلیم جاری نہ رکھ سکا، اب ورکشاپ میں کام کرتا ہوں۔ والدین کے پاس رہتا ہوں۔ ہمارا گھر شہر کے اندر ہے۔ ہم کو صرف نچلی منزل الاٹ ہوئی ہے۔ اُوپر والی منزل میں جالندھر کے ریفیوجی رہتے ہیں۔ ہم پانچ بہن بھائی ہیں۔"

میرے مختصر سے سوال کے جواب میں جب اس نے اتنی باتیں یکدم بتا دیں تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کہنے کی کوئی بات چھپا رہا ہے اور اس کے عوض ان باتوں کو غیر ضروری سمجھ کر اگلتا جا رہا ہے۔ وہ مجھے نچلے درجے کا سمجھدار نوجوان معلوم ہوتا تھا جس کی تعلیم اگر مکمل ہو جاتی تو زندگی میں ذمہ داری کا کوئی کام اچھی طرح سے انجام دے سکتا تھا۔

پھر وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔ "کیوں صاحب، اس مقدمے کا فیصلہ ہونے میں کتنا وقت لگے گا اور کیا اس میں کامیابی یقینی ہوتی ہے؟" میرا جواب سن کر وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔ "تو جناب اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ ممکن ہے ایسے مقدمے میں ایک دو برس لگ جائیں اور یہ بھی ممکن ہے آخر میں طلاق بھی نہ ہو۔"

"یہ ٹھیک ہے" میں نے جواب دیا۔ "یہ سب کچھ تو مقدمے کے واقعات پر منحصر ہے اگر شہادت اچھی ہے اور وجہ مضبوط ہے تو طلاق ہو جائیگی

ورنہ مشکل ہے۔" پھر میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ "آپ کا کیا خیال ہے، وہ صاحب جن کے خلاف یہ مقدمہ دائر کیا جائے گا کیا وہ پوری شد و مد سے اس کی پیروی کریں گے؟"

"جی ہاں ضرور کرے گا۔ وہ بڑا ظالم انسان ہے۔" اور نوجوان کے چہرے پر غصے اور نفرت کے رنگ پھیلنے لگے۔ "اس کا بس چلے تو وہ اپنی بیوی کی ناک کاٹ ڈالے، اس کی آنکھیں پھوڑ دے، اس کے چہرے پر تیزاب ڈال دے، وہ تو بڑا مردود آدمی ہے جناب۔" اور پھر یک لخت اسکے چہرے پر اداسی کا سایہ پڑ گیا اور میری طرف دیکھ کر اس نے یوں زہرخند کیا جیسے نہ کہنے کی باتیں کہہ گیا ہو۔ پھر اس نے ایک عجیب و غریب سوال کیا۔ "یہ تو بتایئے کہ جب تک طلاق کا مقدمہ چلتا ہے، کیا میاں بیوی ایک ہی گھر میں رہ سکتے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "یہ تو ناممکن ہے۔ کم از کم میں نے کبھی یہ سنا نہیں، میرا خیال ہے اس سے تو مقدمہ کمزور ہو جائے گا۔"

پھر وہ کسی گہری سوچ میں پڑ گیا اور اٹھ کر دروازے کی طرف چلا گیا۔ پھر وہاں سے پلٹ آیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب اس کی پریشانی اور اضطراب نمایاں ہو گئے تھے۔ میں نے سوچا وہ بات جو اس کے دل میں اس طرح کھٹک رہی ہے۔ اب کہلوا ہی کیوں نہ لی جائے۔ میں نے چہرے پر وکیلوں کی سی بے تعلقی پیدا کرتے ہوئے کہا: "میرا خیال ہے آپ کسی ایسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں جو کسی اور کی بیوی ہے۔"

طوفان ختم ہو گیا اور اس کے چہرے پر سکون کے آثار نظر آنے لگے۔ "جی ہاں یہی بات ہے۔ بالکل یہی بات ہے۔ وہ لڑکی ایک بہت ظالم آدمی کے چنگل میں پھنسی ہوئی ہے۔ وہ اسے گھر سے باہر نکلنے نہیں دیتا۔ لڑکی کچھ پڑھی لکھی ہے، وہ خود جاہل ہے۔ خود بڈھا ہے نا، ہوٹل کا کام کرتا ہے اور ہر روز رات کو کام سے گھر آتا ہے تو اپنی بیوی کو پیٹتا ہے۔ میں نے ابھی آپ سے کہا تھا کہ ہمارے مکان کی اوپر والی چھت پر جالندھر کے ریفیوجی رہتے ہیں۔ یہ میں انہیں کا ذکر کر رہا تھا۔"

میں نے قانون کے ترازو میں زندگی کے بٹے ڈالتے ہوئے اس سے پوچھا: "بچے بھی ہیں ان کے کوئی؟"

"جی نہیں، ان کا کوئی بچہ نہیں، صرف میاں بیوی اس گھر میں رہتے ہیں اور سارے محلے والوں کو معلوم ہے کہ وہ اپنی بیوی کو مارتا ہے۔"

"تو یہ بتلایئے کہ آپ جو اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو یہ محض اپنے ارادے کا اظہار کر رہے ہیں یا اس میں اس لڑکی کی خواہش بھی شامل ہے۔"

نوجوان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے چور آنکھ سے دروازے کی طرف دیکھا اور پھر ذرا میز پر آگے کی طرف جھک کر کہا۔ "وہ بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے لیکن اگر اسے طلاق نہ ہو سکی تو کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔ ہم دونوں برباد ہو جائیں گے۔" محبت کی نرمی اس کی آواز میں آگئی اور مجھے یوں لگا جیسے وہ میرے اندر بیٹھے ہوئے وکیل کو زندگی کی لوری سنا کر خاموش کرتا جا رہا ہے۔

اس کے عشق کی داستان طویل نہ تھی۔ میں اندرون شہر کے ایسے مقدموں کی نوعیت سے واقف ہوں۔ وہاں عشق کا آغاز اکثر ہمسائے میں ہوتا ہے۔ انجام کی صورتیں البتہ مختلف ہوتی ہیں مگر یہ نوجوان تو اپنی محبت میں نہا کر پاکیزہ ہو چکا تھا اور اس لڑکی کی باتیں کرتے ہوئے اس کے چہرے پر ایسی روشنی آجاتی جیسی بعض مصوروں نے فرشتوں کے چہروں پر بنائی ہے۔ اس کی وارفتگی دیکھ کر مجھے اس پر رشک آنے لگا شاید ایسی بے پناہ محبت جو طوفان کی طرح ہر طرف چھا جاتی ہے جوانی کے اسی حصے میں ہوتی ہے اور پھر انسان باقی عمر اسی محبت کے بہانے چھوٹی چھوٹی محبتوں میں گزار دیتا ہے۔ یہ نوجوان جو زندگی کی دہلیز پر قدم رکھ رہا تھا ایک ایسی محبت سے سرشار ہو چکا تھا جو اپنا راستہ خود متعین کرے گی اور میں تو محض ایک وکیل تھا۔ میں نے اسے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ "یہ طلاق کا مقدمہ اس لڑکی کو خود دائر کرنا پڑے گا۔ آپ اس کی طرف سے پیروی نہ کریں تو اچھا ہوگا۔ لڑکی کے والدین میں سے کسی کو یہ فرض انجام دینے دیجئے اور ہاں یہ بھی یاد رکھئے کہ مقدمے کے واقعات کو ثابت کرنے کے لئے شہادت کی ضرورت ہوگی۔"

وہ نوجوان چلا گیا تو میں دوسرے مقدموں کی تفصیلات میں الجھ گیا۔ کہیں زندگی کی قبا پر کھونچ آگئی ہے تو قانون اسے سینے کی کوشش کر رہا ہے کہیں زندگی کے جامے پر خون کے دھبے ہیں تو قانون انہیں دھونے کی فکر میں ہے اور عدالتیں شہادتوں پر فیصلے کرتی چلی جاتی ہیں۔

چند دن گزرے ہوں گے کہ وہی نوجوان پھر میرے دفتر میں آیا۔ اس دفعہ اسکے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔ کالا برقع پہنے ہوئے۔ جب وہ دونوں میرے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے تو لڑکے نے ایک جھجک کے ساتھ مجھ سے کہا: "انہیں کے بارے میں اس دن میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔" پھر اس نے لڑکی کو نام سے پکارتے ہوئے کہا: "ہاجرہ نقاب اٹھاؤ!" اور لڑکے کے کہنے پر اس نے نقاب اٹھادیا۔ اٹھارہ انیس برس کی ایک خوش شکل لڑکی تھی۔ غریب گھرانے کی مگر سلجھی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے پوچھا:

"آپ اپنے میاں سے طلاق لینا چاہتی ہیں؟"

وہ شرما گئی اور بولی۔ "جی ہاں!"

"وجہ کیا ہے؟"

وہ اور شرمائی اور اس کے رخساروں پر سرخی کی لکیریں دوڑنے لگیں لڑکے نے اس کی طرف دیکھکر کہا۔ "ہاں ہاں بتاؤ شرماتی کیوں ہو؟" لڑکی نے ہمت کر کے کہا۔ "جی وہ مجھے مارتا بہت ہے۔ ہماری بنتی نہیں اور وہ مجھ پر ظلم بہت کرتا ہے۔ اور پھر......" یہاں پہنچکر لڑکی رک گئی۔

"اور پھر......؟" میں نے دہرایا۔

"اور پھر اگر مجھے طلاق ہو جائے تو میں کسی اچھے آدمی کے ساتھ شادی کر لوں گی۔" میں نے چور نظر سے دیکھا تو میز کے نیچے اس لڑکی نے لڑکے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا اور ان دونوں نے اس طرح ایک دوسرے کی طرف دیکھا جیسے انہیں میری موجودگی کا قطعاً احساس نہیں رہا۔ خدا جانے وہ کیا نگاہ تھی کہ مجھے یوں معلوم ہوا جیسے کمرے میں چاروں طرف موتیا کی ہلکی ہلکی مہک پھیل گئی ہو۔ محبت بھی کیا عجیب چیز ہوتی ہے۔ لڑکے نے پہلی دفعہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:

"یہ بتایئے اگر ہم اس وقت گھر جانے کی بجائے کہیں اور چلے جائیں تو کیا ہوگا؟"

میں نے کہا۔ "آپ دونوں گرفتار ہو جائیں گے۔"

"اور اگر ہم نکاح پڑھوالیں تو؟"

"تو آپ کے ساتھ وہ مولوی بھی گرفتار ہو جائے گا جو آپ کا نکاح پڑھے گا۔ شادی شدہ عورت سے شادی کرنا جرم ہے۔"

میں نے لڑکے کے چہرے کی طرف دیکھا تو مجھے اطمینان ہوا کہ یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی ہے۔

لڑکی کی طرف دیکھکر میں نے کہا۔ "اگر آپ طلاق کا دعویٰ دائر کرنا چاہتی ہوں تو اپنے والد یا کسی اور عزیز کو میرے پاس بھیجدیجئے۔" چلتے ہوئے میں نے نوجوان کو پھر تاکید کر دی کہ اس نے لڑکی کے ساتھ بھاگ جانے کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا ان پر عمل نہ کرے۔ اس میں سراسر نقصان ہوگا اور کوئی اچھا نتیجہ نہ نکلے گا۔ لڑکی کی آنکھوں میں تشکر کی جھلک تھی جیسے کہہ رہی ہو۔ "اچھا کیا آپ نے ہم کو سیدھے راستے پر ڈال دیا۔"

اس واقعے کو مہینوں گزر گئے۔ ایک روز دفتر میں کام کر رہا تھا کہ منشی جی نے کہا: "ایک صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔ کہتے ہیں ضروری کام ہے۔"

میں نے کہا۔ "اندر بھیج دیجیے۔" ایک بزرگ صورت کمرے میں داخل ہوئے۔ عمر کوئی ساٹھ سے دو ایک برس کم۔ چہرے پر سفید ہوتی ہوئی چھوٹی سی داڑھی، لبریز آنکھیں، کچھ پریشان سے دکھائی دیتے تھے۔ بیٹھتے ہی بولے۔ "میرے لڑکے نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ آپ کو سب قصہ معلوم ہے۔" انہوں نے اپنے لڑکے کا نام بھی لیا مگر مجھے کچھ یاد نہ آیا کہ کس کا ذکر کر رہے ہیں۔ اور میں یونہی اس امید میں ہوں ہاں کرتا رہا کہ کہیں نہ کہیں سے اس بات کا سرا ہاتھ لگ جائے گا۔ وہ کچھ اکھڑی اکھڑی سی باتیں کر رہے تھے۔ میں نے کہا۔ "آپ اپنے لڑکے کو کیوں نہیں بلالیتے؟"

انہوں نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور بولے "آپ کو نہیں معلوم اسے تو تین سال قید بامشقت کی سزا ہوگئی ہے"۔ اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے کاغذوں کا ایک پلندا میرے سامنے رکھ دیا۔ میرا تو خیال تھا آپ کو سب معلوم ہے۔ وہ ہمارے گھر کے اوپر والی منزل پر جالندھر کا ایک ریفیوجی رہتا ہے ہوٹل کا کاروبار کرتا ہے، اس کی ایک جوان بیوی ہے"۔

میرے ذہن میں تو بس کھلبلی سی مچی اور میں نے بے صبری سے پوچھا۔ "تو وہ نوجوان لڑکا اسے اغوا کر کے لے گیا آخر؟"

"جی نہیں اغوا کر کے لے جاتا تو مجھے افسوس نہ ہوتا۔ اس عورت کے خاوند کو جب ان دونوں کے بارے میں علم ہوگیا تو اس نے تھانے میں جھوٹی رپٹ لکھادی کہ جب وہ عورت گھر میں اکیلی تھی تو وہ بری نیت سے اس کے گھر میں گھس گیا اور......"

مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی اور میں نے جلدی سے پوچھا۔ "یہ کیسے ہوسکتا ہے، کیا یہ وہی لڑکی نہیں جو آپ کے لڑکے کے ساتھ میرے دفتر میں آئی تھی۔ اپنے خاوند پر طلاق کا مقدمہ دائر کرنے؟"

اس بزرگ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں جیسے وہ یہ بات پہلی دفعہ سن رہا ہے۔ اس نے کہا "یہ مجھے معلوم نہیں۔ میرے لڑکے نے یہ مختار نامہ آپ کے نام دیا ہے۔ میں اسے جیل میں ملنے گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ میں آپ سے ملوں اور مقدمے کے کاغذ اور اپیل دائر کرنے کے لئے مختار نامہ آپ کو دیدوں۔ وہ تو یہی کہتا تھا کہ آپ کو سب معلوم ہے"۔

اور جب میں نے جلدی جلدی کاغذات دیکھنا شروع کئے تو مجھے احساس ہوا کہ مجھے تو خاک بھی معلوم نہیں۔ مقدمے کی رپٹ خاوند نے لکھوائی تھی کہ جب وہ دوپہر کو غیر متوقع طور پر گھر پہنچا تو مکان کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس کی بیوی کے چیخنے چلانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ دروازہ توڑ کر اندر پہنچا تو ملزم اسکی بیوی کے ساتھ زیادتی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے جلدی سے مسماۃ ہاجرہ بی بی کا بیان پڑھنا شروع کیا۔ میں جوں جوں اس کا بیان پڑھتا جاتا تھا۔ الجھن اور بے یقینی کا جال میرے گرد تنگ تر ہوتا جا رہا تھا۔ کیا یہ وہی لڑکی تھی جو اس خوبرو نوجوان کے ساتھ میرے دفتر میں آئی تھی۔ اس نے نہ صرف اپنے خاوند کے بیان کی تائید کی تھی بلکہ جرح میں یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ اس ملزم کو سرے سے جانتی ہی نہیں اور نہ اس سے پہلے کبھی اس سے ملی ہے۔

میں نے سفید چگی داڑھی والے بزرگ سے پوچھا "کیا آپ بتاسکتے ہیں اس عورت نے آپ کے لڑکے کے خلاف شہادت کیوں دی؟"

بوڑھے نے میری طرف یوں دیکھا جیسے اس لمحے میں اسے دنیا کا بیوقوف ترین آدمی نظر آرہا تھا اور پھر اس نے کہا: "میاں صاحب آپ تو سمجھدار آدمی ہیں۔ آپ کو تو معلوم ہوگا کہ عورت جس کے قبضے میں ہو ہمیشہ اسی کی شہادت دیتی ہے۔ سارا محلہ جانتا ہے میرا لڑکا بے گناہ ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ ہوٹل والے نے عدالت میں لے جانے سے پہلے اپنی بیوی کو مارا بھی، اسے قرآن بھی اٹھوایا اور منتیں بھی کیں کہ اگر اس نے یہ گواہی نہ دی تو اس کے خاوند کی عزت ختم ہوجائے گی"۔

میں نے نظریں میز پر جھکالیں اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرنے لگا جیسے کاغذات کو دیکھنے میں مصروف ہوں۔ مگر دل تو یہی پوچھ رہا تھا کہ آخر اس لڑکی نے یہ بیان کیوں دیا۔ یہ تو وہی لڑکی ہے جو اس ملزم کے ساتھ میرے دفتر میں آئی تھی اور ان دونوں نے میری آنکھ بچا کر میز کے نیچے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ چگی داڑھی والے بزرگ نے دفتر کی گہری خاموشی کو توڑا۔ "میرے لڑکے کا آخری سہارا آپ ہیں اسے آپ سے بڑی امیدیں ہیں"۔

میں سوچنے لگا کہ میں اس بزرگ کو کیسے سمجھاؤں کہ مجھے تو اس مقدمے میں وکیل نہیں گواہ ہونا چاہئے تھا۔ عدالتیں تو مقدموں کے فیصلے شہادت پر کرتی ہیں۔ دفتر میں ہر طرف دیمک لگے ہوئے بوسیدہ کاغذوں کی بو پھیلنے لگی تھی۔

★

ایک پاکستانی فن کار

(دنیائے مغرب میں)

مصنف:۔ السانڈرو بوزانی

مترجم: صوفی احمد وحید اختر

سجاد سے میری پہلی ملاقات کئی سال قبل اٹلی میں مقیم پہلے پاکستانی سفیر کے ہاں ہوئی۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں علامہ اقبال کی کتاب "جاوید نامہ" کا اطالوی زبان میں منظوم ترجمہ کر رہا تھا۔ سجاد اس وقت ایک نوجوان لڑکا تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں سے جو ذہانت ٹپکتی تھی اور سنجیدگی نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ اس کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو سنجیدگی ہے۔

فارسی کے عظیم صوفی شاعر بابا طاہر عریاں کی شاعری سے متعلق اس کی معلومات اس وقت بھی بڑی ذہنی اور ٹھوس تھیں۔ جن سے پتہ چلتا تھا کہ اسے اپنی تہذیب اور ثقافت یعنی اسلامی روایات سے کس قدر لگاؤ اور عقیدت تھی۔

سجاد جیسے شخص کے لئے روم کے فنی حلقوں میں مقام پیدا کرنا آسان نہ تھا۔ اس کی پرورش اور تعلیم ایک بالکل جدا ماحول میں ہوئی تھی۔ جسے یورپی ثقافت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ لیکن اس کے باوجود آج ایشیا کے اس نوجوان فنکار کا اٹلی میں بہت چرچا ہے۔ حال ہی میں اسے "انٹرنیشنل آرٹسٹک ایسوسی ایشن" کا روم میں کونسلر چنا گیا ہے۔ اس کے تین ہزار سے زائد ممبر ہیں۔ جو زیادہ تر آرٹسٹ، شاعر، موسیقار اور معمار ہیں۔ اس کے صدر اور بارہ کونسلروں کا انتخاب ہر دو سال کے بعد ممبران کے ووٹوں سے کیا جاتا ہے۔ اور یہ دوسری بار ہے کہ سجاد کو ایک بھاری اکثریت سے کونسلر چنا گیا ہے۔

سجاد کونسل کے باقی تمام ممبروں سے کم عمر ہیں۔ اس کی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ ہے کہ ایشیا کا ایک فنکار اس کا ممبر کونسلر چنا گیا ہے۔ اور اہلِ پاکستان کو اس اعزاز پہ بجا طور پہ ناز ہونا چاہئے۔ کیونکہ یہ نہ صرف سجاد ہی کی کامیابی اور عزت کا باعث ہے۔ بلکہ اس نے پاکستان کی شہرت کو بھی چار چاند لگا دئے ہیں۔

مشکلات بالعموم لوگوں کی زندگیوں کو کامیابی و کامرانی سے روشناس کرتی ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ وہ مشکلات اور تکالیف کو اپنے مقصد کے حصول کے لئے برداشت کریں۔ اور حصولِ مقصد میں ان رکاوٹوں کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کر دیں۔ جیسا کہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔ سجاد کی زندگی، مشکلات کا مجموعہ رہی ہے۔ ابھی وہ بچہ ہی تھا کہ اس کے والد کا انتقال ہو گیا جس نے اس پہ مشکلات کا پہاڑ گرا دیا۔ اسے بچپن ہی سے مصوری کے ساتھ گہرا لگاؤ تھا چنانچہ اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں وہ اپنی زندگی فن کے لئے وقف کر دے گا۔

علی گڑھ یونیورسٹی لائبریری میں اس نے مائیکل اینجلو، لیونارڈو ڈی ونچی، رافیل وغیرہ کے فن پارے دیکھے۔ جنہوں نے سمندِ شوق پر تازیانے کا کام کیا اور اس نے تہیّہ کر لیا کہ جیسے بھی بن پڑے وہ مصوری کی تعلیم کے لئے روم جائے۔ اس کے پاس کوئی ذرائع نہ تھے۔ لیکن وہ فن کار تھا اور اسی لئے ثابت قدم رہا۔ چنانچہ اس نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے کوشش جاری رکھی۔

آج سے ساڑھے آٹھ برس قبل سجاد کی محنت پھل لائی اور فن کے بعض پرستاروں کی کوشش سے اسے روم کے پاکستانی سفارت خانہ میں اکاؤنٹنٹ کی اسامی مل گئی۔ روم پہنچتے ہی اس نے ایک "مانٹ سکول" میں داخلہ لے لیا۔ اور وہاں مصوری کی تعلیم حاصل کرنے لگا۔ وہ دن بھر دفتر میں کام کرتا اور رات کو پینٹنگ سیکھتا۔ اِن دنوں اسے سخت محنت کرنی پڑتی تھی۔ سارا دن فائلوں اور رات مصوری کی نذر ہو جاتی۔ اس کے

بعض ساتھی اس کا مذاق اڑاتے اور بعض نصیحت کرتے کہ وہ اپنی طاقت اور دولت کو خواہ مخواہ ایک فضول اور بیکار شغل میں ضائع نہ کرے۔ مشکلات اور رکاوٹیں دن بدن بڑھتی گئیں لیکن اس نے اپنا کام بڑے انہماک سے جاری رکھا۔ سفیروں اور دوسرے اعلیٰ افسروں نے اس کی ہر ممکن طریق سے مدد کی اور وزارتِ خارجہ کے اعلیٰ، باذوق افسروں نے اس کی سرگرمیوں کو سراہا۔ کئی سال کی جدوجہد اور محنت کے بعد سجاد نے مصوری کی نمائشوں میں حصہ لینا شروع کیا اور بہت جلد غیر معمولی مقبولیت حاصل کرلی۔

اٹلی جیسے ملک میں سجاد کا مقبول ہونا تعجب انگیز ہے کیونکہ گذشتہ دو ہزار سال سے اٹلی کو فنون کا گھر سمجھا جاتا ہے۔ اور ایک ایسے شخص کا جسے زندگی میں لاتعداد مشکلات نے گھیر رکھا ہو اور جس کے پاس دفتر کے کام سے فارغ ہونے کے بعد بہت تھوڑا وقت رہ جاتا ہو جسے وہ اپنے فن کی نذر کرسکے، اتنی شہرت اور مقبولیت حاصل کرلینا واقعی قابلِ داد ہے۔

گزشتہ چند سالوں میں سجاد نے تیس سے زائد نمائشوں میں حصہ لیا ہے، اور مندرجہ ذیل انعامات حاصل کئے ہیں۔

(۱) طلائی تمغہ (اوّل انعام)، انٹرنیشنل فیسٹول آف ماؤنٹیز ۱۹۵۸ء ۔ ۲۔ چاندی کا تمغہ۔ (دوئم انعام)، انٹرنیشنل فیسٹول آف ماؤنٹیز ۱۹۵۶ء ۔ ۳۔ چاندی کا تمغہ (اوّل انعام)، اگزیبیشن آن اٹالین لینڈسکیپ ۱۹۵۵ء ۔ ۴۔ چاندی کا تمغہ؛ پینٹنگ اگزیبیشن، سان وائیٹورومانا ۱۹۵۷ء ۔ ۵۔ ڈپلوما برائے قابلِ تعریف کام؛ پینٹنگ اگزیبیشن، روم ۱۹۵۸ء۔

ان انعامات کے علاوہ سجاد نے کئی ایک سندیں اور سرٹیفیکیٹ مختلف سکولوں اور فنی درسگاہوں سے حاصل کئے ہیں۔ روم کے ثقافتی و تہذیبی حلقوں میں وہ بہت مقبولیت حاصل کرچکا ہے۔ لہٰذا آج سجاد کی کوششیں بڑی ہمدردی اور ستائش کی مستحق ہیں۔ مجھے اس کے متعلق صرف اتنا کہنا ہے کہ وہ معدودے چند افراد میں سے ہے۔ جنہوں نے اپنے ملک سے باہر، وقت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ اور اپنے ملک کے پرچم کو سربلند کیا ہے۔ جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے "مشکلات ہی عظیم انسان پیدا کرتی ہیں"۔ لیکن حد سے زیادہ مشکلات اور سرپرستی کی عدم موجودگی بسا اوقات باشعور افراد کے لئے سمِ قاتل ثابت ہوتی ہے۔ فنکار کے لئے مادی فوائد ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کی محنت اور ریاضت فن کی عظمت ہی کے لئے ہوتی ہے، نہ کہ مادی فوائد کے لئے!

تاریخ شاہد ہے کہ ادب اور آرٹ کا زریں دور وہی رہا ہے جس میں حکومتِ وقت یا حاکمِ عہد نے ادب اور فن کی سرپرستی کی ہو۔ لیکن جونہی سرپرستی سے ہاتھ کھینچ لیا گیا، ادب و فن کی ترقی بھی رک گئی۔ اور بسا اوقات زوال پذیر بھی ہوتی چلی گئی۔ اس کی واضح مثال سلطنتِ روم کا زوال ہے۔ پانچویں صدی عیسوی میں جب اس سلطنت پر زوال آیا تو ادب اور آرٹ کو یکسر فراموش کردیا گیا۔ اور عالموں اور دانشوروں سے بے حد بے اعتنائی برتی گئی۔ نتیجتاً ایک ایسا دور آیا جو سات سو سال تک قائم رہا۔ اس دور میں آرٹ اور ادب کا سخت قحط رہا۔ بالآخر چودہویں اور پندرہویں صدی میں شاہی خاندان نے دوبارہ ان کی سرپرستی اختیار کی۔ اور کلاسیکی روایات کو حیاتِ نو بخشی۔ اس ذہنی انقلاب نے سینکڑوں ذہین اہلِ علم و فن پیدا کئے۔ جن کی شخصیت اور کمال کا آج بھی چار دانگِ عالم میں ڈنکا بج رہا ہے۔ اسی قسم کے واقعات سے دوسری اقوام کی تاریخوں کے صفحات بھی مزیّن ہیں۔

دورِ حاضرہ میں وہ پرانا سلسلہ تو باقی نہیں رہا۔ شہنشاہیت بڑی حد تک ختم ہوچکی ہے۔ لہٰذا حکمرانوں کی سرپرستی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب فردِ واحد کی جگہ جمہوریت نے لے لی ہے۔ لہٰذا اب یہ جمہوری حکومت کا فرض ہے کہ وہ فنکاروں کی سرپرستی کرے اور ادب و فن کی ترقی میں معاون ثابت ہو۔

آج دنیا کے اکثر ترقی یافتہ ممالک میں چوٹی کے اہلِ قلم اور فنکاروں کو پارلیمنٹوں اور اسمبلیوں کا ممبر چنا اور بنایا جاتا ہے۔ انہیں معذوری کی صورت میں زندگی بھر کے لئے معقول پنشن دی جاتی ہیں۔ اُن کے فن پاروں اور کتابوں کی خرید میں عوام اور حکومت اپنی پوری دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ تاکہ اُن کی مالی اعانت ہوتی رہے۔ سڑکوں اور پارکوں کو ان کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ تاکہ ان کی یاد باقی رہ سکے۔ اور یہی نہیں بلکہ ہر سال ایک کثیر رقم انعامات کی صورت میں دی جاتی ہے۔ تاکہ ابھرتی ہوئی نسل کو ادب و فن کی قدر کا احساس ہو۔

اب مجھے نوجوان پاکستانیوں سے چند ایک باتیں کرنی ہیں :-

میں پاکستان کے نوجوان طبقہ کو یہ نصیحت کروں گا کہ وہ مجاہد کی زندگی سے سبق سیکھیں۔ وہ زندگی میں جو بھی پیشہ اختیار کرنا چاہیں کریں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ انہیں فنونِ لطیفہ یعنی موسیقی، مصوری اور سنگ تراشی وغیرہ میں بھی ضرور حصہ لینا چاہئے۔ فنونِ لطیفہ سے ہماری جمالیاتی حس بیدار ہوتی ہے۔ ان کے مطالعہ سے ہماری نظر میں وسعت اور خیالات میں طہارت پیدا ہوتی ہے۔ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ فنونِ لطیفہ انسان کو سُست اور بے کار بنا دیتے ہیں۔

اگر اطالوی مصوری، سنگ تراشی اور فنِ تعمیر، مغرب میں ایک عظیم انقلاب لا سکتے ہیں، اگر جرمن شاعری، موسیقی اور فلسفہ انہیں موجودہ سائنسی ترقی عطا کر سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اگر پاکستان میں انہیں اپنایا جائے تو یہ آپ کو ترقی کے راستے پر گامزن نہ کریں۔

دنیا میں ہر چیز بیک وقت مفید و غیر مفید ہو سکتی ہے۔ یہ ہمارے استعمال پہ منحصر ہے کہ ہم اسے اپنی ترقی کے لئے استعمال کریں یا تنزل کے لئے۔ آج پاکستان کو سائنس دانوں، انجنیئروں، معماروں، ڈاکٹروں، دیانت دار سیاست دانوں اور قانون دانوں کی ضرورت ہے۔ لیکن ان کے ساتھ ہی ساتھ ایسے دانشوروں کی بھی ضرورت ہے جو عوام الناس کو خوابِ غفلت سے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کریں۔

تعلیم واحد ذریعہ ہے جس سے کسی ملک کو ایک مثالی ملک بنایا جا سکتا ہے۔ پاکستانیوں کو حالیہ انقلاب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نئے جوش اور ولولے سے اپنی منزل کی طرف گامزن ہونا چاہئے۔ خداوند کریم پاکستان کے عوام الناس کو ترقی اور خوش حالی کے راستے پر گامزن کرے۔ آمین!

★

" ذہنی و ادبی نشاۃ الثانیہ " :—————— بقیہ صفحہ : (۱۴)

اور انگلستان کا مصنف رچرڈ ملکاسٹر (RICHARD MULCOSTER) لکھتا ہے :-

" کوئی زبان فی نفسہٖ کسی دوسری زبان سے بہتر نہیں ہوتی۔ اس کی فوقیت کا انحصار اس کے بولنے والوں کی ہمت اور محنت پر ہوتا ہے جو اسے فصیح بناتے ہیں اور مختلف علوم سے مالا مال کرتے ہیں۔ لہٰذا یورپ کی علمی زبانیں اپنی قوم کے اُن افراد کی مرہونِ منت ہیں جنھوں نے اسے اپنے گھر میں سنوارا۔ اور باہر اس کی مقبولیت کا سبب بنے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ان کے وہ ادبی کارنامے جن کی خوبیوں پر آج ہمیں حیرت ہوتی ہے کبھی شرمندۂ تحریر نہ ہوتے۔"

" کیا یہ غلامی قابلِ افسوس نہیں کہ محض علوم کی خاطر ہم ایک دوسری زبان کے غلام بن جائیں۔ اور سارا وقت اس کی تحصیل پر ضائع کر دیں جب کہ اس کے سب خزانے ہم اپنی زبان میں منتقل کر سکتے ہیں خصوصاً جب ہماری اپنی زبان ہماری آزادی کی مظہر اور لاطینی ہماری غلامی کی علامت ہے ؟"

" مجھے روم سے محبت ہے لیکن لندن مجھے اس سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ میں اٹلی کا حامی ہوں لیکن مجھے انگلستان سے اس سے بھی زیادہ دلبستگی ہے۔ مجھے لاطینی کا احترام ہے لیکن مجھے انگریزی سے عشق ہے۔"

★

مضمون نگاران اور دیگر حضرات سے گزارش ہے کہ وہ ادارہ سے خط و کتابت کرتے وقت اپنا نام اور پتہ مکمل، صاف اور خوشخط تحریر فرمایا کریں۔ (ادارہ)

★

غزل

سراج الدین ظفر

ل عشق ہے آزاد سزا و جزا سے
ہرشے کے لئے ورنہ سزا بھی ہے جزا بھی

تا صبح تری زلفِ سمن بو رہی موضوع
شب خلوتِ میخانہ میں ہم بھی تھے صبا بھی

بیٹھے ہوں اگر دست درازانِ خرابات
پنجوں سے دبے پاؤں گذرتی ہے قضا بھی

اُن سے مری بیماریٔ دل میں ہے اضافہ
ہے روحِ شفا جن کے تنفس کی ہوا بھی

خلاص ہو مفقود تو اے واعظِ خوشگو
لفاظ ہی الفاظ ہیں تسبیح و ثنا بھی

کیا اُلٹا زمانہ ہے کہ ہر سمت ہیں پہرے
ہے بندِ سلیماں کے لئے شہرِ سبا بھی

اے زہرہ وشو راہِ وفا میں مرے ساتھ آؤ
اس راہ میں رہزن بھی ہوں میں راہنما بھی

معلوم ہوا زہد فروشانِ حرم سے
اک جنس ہے بازارِ عقیدت میں خدا بھی

کچھ رشتہ تو ہوگا کہ ہے یارِ گل اندام
بھٹکوں تو مرے ساتھ بھٹکتی ہے صبا بھی

اے تازگیٔ روئے غزالانِ خرابات
دم سے ہے ترے تازگیٔ آب و ہوا بھی

کیا کیا سفرِ راہِ محبت میں کشش ہے
چلتے ہیں مرے ساتھ نقوشِ کفِ پا بھی

اس طرح کیا تیز سبو نے مرا احساس
سنتا ہوں سکوتِ ابدیت کی نوا بھی

کہدو کہ جو کردے قدحِ بادہ مقرر
گردش اسی رستے پہ کریں ارض و سما بھی

اے آہوئے آوارہ ارادہ ہے کہاں کا
دل بادہ گساروں کا ختن بھی ہے خطا بھی

دونوں سے مری روح نے باندھے تھے پیماں
کل رات کہ بت بھی تھے مرے ساتھ خدا بھی

حوروں ہی سے مقصد ہے تو کیا شرطِ تقدس
کچھ اور طریقے ہیں تقدس کے سوا بھی

ہوتا ہے یہاں مثبت و منفی میں تصادم
قوسِ لبِ شاہد میں فنا بھی ہے بقا بھی

وہ پردۂ اسرار ہو یا پردۂ محمل
ہاتھ اپنے پہنچ جائیں گے بے اذنِ صلا بھی

کام آ ہی گیا تجربۂ زلفِ نگاراں
آسودہ ہیں میخوار تہِ دامِ بلا بھی

رکھا ہے مری خاک میں تونے شررِ ہوش
اب کیا اسے سمجھوں کہ ستم بھی ہے عطا بھی

بہکا ہی نہ دے ہمنفسو مجھ کو مرا علم
عالم بھی ہوں آئینۂ جہلِ علما بھی

دیکھا ہے ظفر تجھ کو خرابات میں ہم نے
تجھ کو بھی ہے دعوائے کرامت، اسے جا بھی

غزل

ناصر کاظمی

کیا زمانہ تھا کہ ہم روز ملا کرتے تھے
رات بھر چاند کے ہمراہ پھرا کرتے تھے

اُٹھ گئی رسمِ مروّت ہی دلوں سے ورنہ
یار میخانے میں بیٹھے ہی رہا کرتے تھے

جہاں تنہائیاں سر پھوڑ کے سو جاتی ہیں
ان مکانوں میں عجب لوگ رہا کرتے تھے

کر دیا آج کسی غم نے انہیں بھی مجبور
کبھی یہ لوگ مرے دکھ کی دوا کرتے تھے

دیکھ کر جو ہمیں چپ چاپ گزر جاتا ہے
کبھی اس شخص کو ہم پیار کیا کرتے تھے

تم جفا بھی نہیں کرتے تو جفا کرتے ہو
وہ وفا کرتے رہیں گے جو وفا کرتے تھے

اتفاقاتِ زمانہ بھی عجب ہیں ناصر
آج وہ دیکھ رہے ہیں جو سنا کرتے تھے

★

صہبا اختر

کب تک بنامِ فکر نہ پھوٹے گی روشنی
محرومِ نطق ہیں کئی نغمے شنیدنی

رکھتی ہے اُس تبسّمِ سادہ کو رنگ رنگ
وہ غنچگیٔ لب کہ ہے ہر دم شگفتنی

پلکیں کہ جیسے چاند کی کرنیں سمٹ گئیں
کرنیں، کہ جن کا کام ہے بس تیر افگنی

میں چشمِ گُل بنوں کہ صبا کی طرح چلوں
وہ چہرہ دیدنی ہے وہ دامن کشیدنی

تیرے نثار تیری محبت ہے جاوداں
ہر رنج رفتنی ہے ہر اک غم گذشتنی

کیوں سنگِ راہِ سلسلۂ رنگ و نور ہو
اے وسعتِ بہار! مری تنگ دامنی

صہبا غریبِ شہرِ سخن ہے مگر سنو
پھر کس سے سُن سکو گے سخنہائے گفتنی

★

کتے کا کاٹا

ابن انشاء

ہمارے ایک دوست ہیں جمیل الدین عالی۔ غزل گو، دوہا نویس، خوش گلو، خوش گل، بذلہ سنج، حاضر جواب ــــ آندھی طوفان، بجلی، پارے اور ڈائنامیٹ کا آمیزہ ــــ چونکہ دوست ہیں اس لئے ان کی خیریت ہمیں معلوم رکھنی پڑتی ہے۔ لہٰذا کل ہمارے ایک دوست نے جو فلسفی، نقاد، سنجیدہ مزاج اور گنجے ہیں، سرِ راہ ہمیں روک کر پوچھا:

"میاں یہ تمہارے عالی کو کس کتے نے کاٹا ہے؟"

ہم نے کہا۔ "کتے کا نام پتہ تو ہمیں معلوم نہیں۔ یہ سنا ہے کہ ایک روز گوشت کے ناغے کے دن عالی صاحب اپنے دوست ابن سعید کے پھاٹک پر اپنے چھکڑے سے اترے ہی تھے کہ موصوف نے ان کی سڈول ٹانگ کو بیف کا ٹکڑا یا نہ جانے کیا سمجھ کر دانت گاڑ دیئے تھے۔ خیر فکر کی کوئی بات نہیں موصوف اب پچھتا رہے ہیں، سلوتری ہر روز یہ موٹی سوئی ان کے پیٹ میں گھونپتا ہے۔"

کہنے لگے۔ "سلوتری؟ عالی صاحب کسی باقاعدہ ڈاکٹر سے انجکشن کیوں نہیں لگواتے۔"

میں نے کہا۔ "چشمِ بددور۔ عالی صاحب کو کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔ انجکشن کتے کو لگ رہے ہیں۔ خدا کرے تندرست ہو جائے۔ سنا ہے خوب صورت ہے لیکن آپ کو کہاں سے خبر ملی؟"

کہنے لگے۔ "حاشا! مجھے اس کی خبر نہ تھی۔ یہ تو آپ سے معلوم ہوا۔ میں نے تو محاورہ بولا تھا۔ اور یہ بھول گیا تھا کہ آپ اہلِ زبان نہیں ہیں۔ میں نئی کرن کا ذکر کر رہا ہوں۔ وہ بیہودہ سی کتاب انہوں نے لکھی ہے نا؟ بھائی تم اپنے دوہے دوہے لکھو۔ کیوں نثر میں معنیٰ ٹھونکتے ہو۔ کیوں سیاست کے پھٹے میں ٹانگ اڑاتے ہو۔"

میں نے کہا۔ "کیا چیز ہے نئی کرن۔ میں نے نہیں دیکھی۔"

کہنے لگے۔ "ضرور پڑھیے گا۔ نئی حکومت کا ڈھنڈورا پیٹا ہے۔ بندۂ خدا۔ اپنے نام کا تو خیال کرنا چاہیئے تھا۔"

میں نے نہایت نادم ہو کر کہا۔ "واقعی بڑی ناشائستہ حرکت ہے۔ میں اسے سمجھا دوں گا۔ لیکن مجھے ایک دن کے لئے وہ کتاب دیجئے تو۔"

تب میں نے وہ کتاب پڑھی جس کے متعلق جمیل الدین عالی نے لکھا ہے کہ میں رات بھر بتی جلائے اپنے اینڈے بینڈے ہینڈ رائٹنگ میں لکھتا رہا اور صبح دم ختم کی۔ یہ کوئی ایسی اونچی کتاب نہیں ہے۔ ٹالسٹائی کی 'وار اینڈ پیس'، وکٹر ہیوگو کی 'لامزریبلے' اور شبلی کی 'شعر العجم' سے اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، وہ کہیں بہتر تخلیقات ہیں تاہم میں نے اسے رغبت اور دلچسپی سے پڑھا اور ایک ہی نشست میں جماہیاں لئے بغیر ختم کر لیا۔ کراچی سے "کاشانۂ اردو" نام کے کسی پبلشر نے معمولی سا ٹائیٹل لگا کر چھاپ رکھی ہے اور بارہ آنے قیمت ہے۔ لیکن اس کی فروخت سے مجھے قطعی دلچسپی نہیں۔ کوئی صاحب اسے خریدنا چاہیں تو اپنی ذمہ داری پر خریدیں۔

جمیل الدین عالی، ایک چھوٹی سی ریاست کے آخری نواب کے فرزندِ دلبند ہیں۔ یہ ریاست پاکستان میں نہیں اور عالی صاحب کو چند سال قبل کلرکی کا چرخہ کاتتے ہم نے خود دیکھا ہے۔ ان کے اس دور کا ہم دوسروں سے مصلحتاً ذکر نہیں کرتے تھے لیکن حضرت نے اس کتاب میں خود یہ تسلیم کیا ہے۔ بہرحال نواب ہیں نہ ملک بھی۔ ان کے اہل خاندان کے سو سوا سو مربعے پاکستان میں بھی ہیں۔ جس شام زرعی اصلاحات کا اعلان

ہوا یہ عالی صاحب رات بھر مضطربانہ جاگتے رہے۔

"ہائے اب کیا ہوگا۔ میرے بچوں کا مستقبل کتنا تاریک ہے۔ یہ زمینیں میرے خاندان میں رہتیں تو میں ہر سال یورپ جایا کرتا اور لندن میں اپنے زیر تعلیم بچوں سے مل کر فرانس میں انگور کے باغ کی تازہ کشید شراب پی کر دوشیزاؤں کے بارے میں دوہے کہا کرتا۔ مجھے سچ مچ کا دکھ ہے۔ کیا مجھے اسی نسل میں پیدا ہونا تھا؟"

یہ سوچ قدرتی سوچ تھی۔ ایک ایسے شخص کے لئے جس کی بیٹھک میں اب تک دقیانوسی عباؤں والے کج کلاہ بزرگوں کی تصویریں ٹنگی ہوں۔

"یہ تصویر ابا جان کی ہے۔ یہ ان کے برابر لارڈ لینسڈون ہیں۔ ریاست میں شکار کھیلنے آئے تھے۔ غالب نے ہمارے ابا جان ہی کو لکھا تھا، میں تمہارا دادا نہیں دلدادہ ہوں۔"

"انقلاب آیا۔ مارشل لا کا اعلان ہوا اور عالی جی کی آنکھوں کے سامنے ٹائم میگزین کے صفحے ناچنے لگے۔ نوری سعید کی دست و پا بریدہ لاش، کیوبا میں گولیوں کی باڑھ کے آگے سرنگوں اجسام ــــــ" ہم پڑھے لکھے افسران خوف کے مارے لرز لرز جاتے تھے۔ قتل عام سے اتنا نہیں جتنا اپنی انا کے قتل سے۔ ہم ہر حکومت کے مستعد فرمانبردار اور چاق و چوبند افسران اس انقلاب سے لرز رہے تھے۔ سات بجے ایوب خاں کی تقریر سنی۔ مجھے ان کے ایک ایک لفظ سے خوف آرہا تھا۔ میرے بچے میری دہشت زدہ صورت دیکھ کر بھاگ گئے تھے۔ مجھے اپنا اکیلا کمرہ ایسے لگ رہا تھا جیسے کوئی سنسان جنگل ہو۔ جہاں چاروں طرف شیر گرج رہے ہوں۔

اب جو مارشل لا کے ضابطے چھپنے شروع ہوئے۔ "اس کی سزا موت۔ فلاں بات کی سزا چودہ برس۔ دس برس۔ سات برس" تو عالی صاحب کو قدرے عافیت معلوم ہوئی۔

"مجھے اپنی انگریز والی دلی یاد آگئی۔ گورا بارے گزرا تو ذرا پرے ہوگئے۔ باقی نہ دس برس نہ موت۔"

"میں مارشل لا سے مطمئن نہ تھا۔ وہ پرانے لوگ کچھ بھی تھے لیکن موت کی سزا تو نہ دے سکتے تھے۔ ایک دستور تھا۔ اس میں بنیادی حقوق تھے۔ عدالتیں ان کی حفاظت کرتی تھیں۔"

ادھر ان کا یہ عالم تھا۔ اُدھر کافی ہاؤس میں بڑے سے بڑا دقیقہ رس، بزرجمہر بیٹھا بلا معاوضہ حکمت کے موتی رولتا اور آپ کو ہر چیز کی اصل حقیقت سے آگاہ کرنے کے لئے ہمہ تن تیار ملتا۔ اسے کوکسی قسم کا نظری دھوکا دینا ناممکن تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں دوربین اور دوسرے میں خوردبین تھی۔ سامنے ٹسٹ ٹیوبوں کی قطار تھی۔ وہ ہر چیز کا کیمیکل تجزیہ کرتے ہوئے اور ہر اعلان کی کنہ کو پہنچتے ہوئے آپ کو بتاتا تھا کہ:

"بوگس دعوے بھارت نے واپس کرائے ہیں۔"

"زرعی اصلاحات روس نے کرائی ہیں۔"

"چھپی ہوئی دولت برطانیہ نے نکلوائی ہے۔"

"سونا قارون صاحب کی وصیت کے مطابق نکالا گیا ہے۔"

"تعلیمی اصلاحات کی تجویز میکالے صاحب کر گئے تھے۔"

"امپورٹ لائسنس کی فروخت جرمن حکومت کے مفاد کے خلاف تھی۔"

"مہاجرین کا مسئلہ مصر نے طے کرایا۔"

"چیزوں کی قیمتیں اس لئے کم کی گئیں کہ غیر ملکی سیاحوں کو فائدہ پہنچے۔"

"رشوت کے خلاف مہم اسکاٹ لینڈ یارڈ کو خوش کرنے کے لئے ہے۔"

اس آب و ہوا میں عالی صاحب نے نئی کرن دیکھی تو یقیناً اسے کسی گمنے نے کاٹ کھایا تھا۔ ابن سعید کے دید دولت کے کھلنے نہیں کسی

بڑے ہی ظالم اور زہری کتے تھے ——

وہ کتا جمیل الدین عالی کا DOG BENEATH THE SKIN ہے۔ ایک شاعر کا مضطرب ضمیر۔ اس کتے کے کاٹنے کا علاج ہے —— عالی ہی کے الفاظ میں :

"پیسے کھانے کی ترکیبیں، نقد، وظیفہ سیر"

"ہائے وہ دولت گھروں کی شامیں وہ ان جانے کوچ
شیتل مدرا جلتی ناریں، میٹھے میٹھے بھوج"

"دس ڈالر میں یورپ پیرنگ سے پیار جتائیں
دس روبل میں لوئی فشر کو ننگا ناچ نچائیں"

عالی نے یہ علاج اور یہ حفظ ما تقدم پسند نہیں کیا۔ اچھا کیا یا بُرا کیا اس سے بحث نہیں۔ موجودہ قضیہ کی ابتدا یوں ہوئی کہ ایک روز ان کے کمرے کے باہر ایک چپراسی ایک دفتری سے بحث کر رہا تھا۔

"اچھا ایک بات بتاؤ"۔ ان پڑھ چپراسی نے دفتری سے پوچھا۔ "قانون کا کیا فرض ہے" پھر اس نے خود ہی جواب دیا۔ "قانون کا فرض ہے کہ ہم کو گھر دے۔ اناج دے اور ہسپتال کھولے۔ بولو ہے کہ نہیں ؟"

"یہ فرض قانون کا نہیں" مڈل پاس دفتری بولا۔ "یہ فرض حکومت کا ہے"۔

"اچھا تو حکومت اور قانون الگ الگ ہے ؟ تم ہمیں کیا سمجھتا ہے بھائی! ہم خود سب بات جانتا ہے"۔ چپراسی دباؤ میں نہیں آیا۔

"اچھا تو بڑا تیرے لئے گھر بنا دیا ہے اس حکومت نے ؟ جا آرام سے گھر پر قبضہ کر لے"۔ دفتری اس کی جہالت پر بھنانے لگا۔

"یہ بات نہیں ہے" چپراسی نے فتح محسوس کی۔ "مگر تم پہلے بتاؤ تمہارا دستور نے ہمارے لئے کیا کیا ؟ اتنا قانون تھا مگر کون سا قانون چلتا تھا بولو"۔

"اچھا نہیں چلتا تھا مگر اب کیا چل رہا ہے"۔ اب دفتری سوالوں پر اتر آیا۔

"دیکھو بھائی"۔ چپراسی بولا۔ "تم فیل ہو گیا۔ اب دوسرا آیا ہے اسے دیکھو اس کا کام دیکھو۔ جب وہ فیل ہوگا ہم یہی بات کرے گا۔ نہیں تو ہم اور بات کرے گا۔ ہم تو کام مانگتا ہے۔ بات کرنا نہیں مانگتا"۔

یہ سوجھ بوجھ کے ڈھائی انچھر جمیل الدین عالی کو کافی ہاؤس کے فیشنا غورثوں کی عقل پر بھاری نظر آئے۔ اور اس نے کام دیکھنا شروع کیا۔

"میں کون دھنتر خاں ہوں جو نظریاتی الجھنوں میں تپتا پھروں"۔

(۱)

"ہماری ایک فوج تھی بے حد طاقتور فوج۔ اس کے پاس ۶ اکتوبر کے بعد نئے اسلحہ نہیں آئے۔ وہی ٹینک، وہی توپیں، وہی رائفلیں جو ۸ اکتوبر کو اس کے پاس تھیں، ۶۔ اکتوبر کو بھی تھیں۔

۶۔ اور ۸۔ اکتوبر کے درمیان اس کے جوان اور افسر بھی نہیں بدلے گئے۔

یہ فوج ہماری سرحدوں کے قریب ٹھہری رہتی تھی مگر ۸۔ اکتوبر کے بعد ہمارا غلہ سرحدوں کے اندر ہی رہتا ہے —— کیوں ؟"

ملک بیرونی سفارت خانے۔

(۲)

"۶۔ اکتوبر کو زمینداروں کے پاس غلہ نہیں تھا۔ نیا ترقی یافتہ ڈپٹی کمشنر پہلے ان کو حکم دیتا تھا پھر خوشامدیں کرتا تھا۔ " میرا خیال تو کیجئے سردار صاحب ۔ ابھی الکشن بھی آرہا ہے۔ میں بھی یہیں موجود ہوں۔ آپ بھی ہیں۔ برابر کے ضلعے میں انہوں نے اتنا جمع کرلیا ہے۔ اب آپ میرا تبادلہ ہی چاہیں تو اور بات ہے"

سردار صاحب کبھی رحم کھا کر دو ہزار من غلہ ظاہر کردیا کرتے ۔ کبھی بلیک بہت اونچی جارہی ہوتی تو الکشن میں ہارنے کا خطرہ مول لیکر بھی انکار کردیتے اور ڈپٹی کمشنر نا اہلی کا الزام لگوا کر تبادلے یا رخصت پر چلا جاتا"

اور آج ان ہی زمینداروں کی جماعتیں اسی ڈپٹی کمشنر کے اہلکاروں کے سامنے قرینے سے صف میں لگی ہوئی لاکھوں من غلہ ظاہر کررہی تھیں۔

(۳)

ایک نواب صاحب کا چودہ لاکھ کا کلیم منظور ہوچکا تھا۔ انہوں نے اسے گھٹا کر اٹھاسی ہزار کردیا۔ وہ ساتھ ساتھ تشریح بھی کرتے جاتے تھے۔

" یہ جو گھٹایا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ چودہ لاکھ جھوٹا تھا۔ چودہ لاکھ تو جملہ خاندانی جائداد کے تھے ۔ تبن نواب وہاں مرگئے۔ گو لاولد مرے مگر ان کا حصہ ہمیں نہیں آتا۔ ہم نے احتیاطاً دکھادیا تھا کہ ان کی بیوہ طوائف تھی۔ نہ جانے گھر رہی ہو کہ چھوڑ بھاگی ہو۔ دوسرے چھ آنے کا حصہ دار قبلہ تایا میاں کا لڑکا تھا۔ وہ امریکہ میں بس گیا ہے۔ ہم نے اس کا حصہ بھی اپنے ہاں ڈال دیا تھا۔ پھر ایک کم بخت سوتیلی والدہ تھیں۔ ان کے نام باوا جان نے چار آنے ہبہ کردیئے تھے۔ جب تک ہم رہے انہیں تکلیف نہ دی مگر قبضہ نہ ہونے دیا۔ کلیم میں وہ بھی ہم نے اپنا بتادیا تھا اور واقعہ بھی یونہی تھا مگر کبھی اب"

(۴)

بھنٹ اور بابا جزیروں کے شاہ ہمگلر میرے ٹیکس گزاروں میں رہ چکے تھے۔ پچھلے وقتوں میں ان کی گفتگو کا یہ انداز تھا۔ " ساب ادھر ہماری طرف آؤ نا کبھی ۔ مچھی کھلائے گا ہم" وہ اینڈ اینڈ کر کہتے جیسے یہ کہتے ہوں۔ " ساب تم ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ ہم بڑے سابوں کے آدمی ہیں"۔

اب یہی سمندر اور جزیرے منوں نہیں ٹنوں سونا اور ڈھیروں سامان اگل رہے تھے"

(۵)

۳۱۔ دسمبر کو ہمارے کمروں کے باہر تاجروں اور افسروں کی قطاریں کھڑی تھیں۔ پوشیدہ دولت کے اعلان نامے داخل کرنے کے لئے۔ ان میں تیسوں روزے رکھنے والے حجاج تھے۔ بعض اوقات ان کی لمبی سفید ڈاڑھیاں دیکھ کر ہم اپنے نپے تلے سوالات بھول جاتے تھے اور انکے حلفناموں پر فوراً یقین کرلیتے تھے۔

مگر ۳۱۔ دسمبر کی رات کے حلف نامے پہلے حلف ناموں سے مختلف ہوگئے تھے۔ کیوں ؟ ایک آدمی نے اس کا جواب دیا۔" صاحب ہمیں تو یہ خیال ہوا کہ جنرل ایوب خاں نہیں چھوڑے گا۔ اب اس نے کہہ دیا کہ سچ بولو اور خطرہ نہ کرو تو ہم بھی آہی گئے ؟"

میں نے سوچا۔" جنرل ایوب خاں کو حساب کتاب کا کتنا علم ہے۔ شاید بہت معمولی۔ کیا وہ اس کے بہی کھاتے دیکھتے ؟ اور دیکھتے تو پکڑ لیتے ؟"

اس کا جواب بھی اس نے دیا (شاید میرے خیالوں میں) ——

"تم جو پکڑ لیتے ۔ تم تو یہ کام جانتے ہو"

" تو وہ کہاں سے آگئے"

" ارے تم اپنے اندر جھانک کر دیکھو۔ وہ تمہارے اندر بیٹھے ہیں' اور مجھے دیکھو۔ وہ میرے اندر جو بیٹھے ہیں"

٭

پس حالی صاحب نے یہ کتاب لکھدی اور ہمارے فلسفی ، نقاد اور گنجے دوست کو ناراض کرلیا۔ بہت سے اصحاب مجھ قسمیہ رازداری کا

حلف اٹھوا کر بتلا چکے ہیں کہ عالی کا اصل مقصد اس کتاب کے لکھنے سے کیا ہے۔ پچھلے دنوں لاہور سے میرے اور عالی کے دو مدمنہ دوستوں نے جو اعلیٰ انٹلکچول طبقے سے تعلق رکھتے ہیں (بائیں بازو والے نہیں۔ وہ تو بد اچھا اور بدنام بُرا کی ذیل میں مارے جاتے ہیں) مجھے پیغام بھیجا کہ عالی سے کہدو آج سے ہماری اُن کی کٹی۔ ہم اس سے برأت کا اظہار کرتے ہیں۔ اس نے ہماری ناک کٹوادی۔"

میں نے کہا۔ "خیر باشد"

کہنے لگے۔ "میاں نئی کرن لکھ کر، حکومت کا ڈھنڈورچی بن کر، اس نے اپنے مستقبل پر لات ماری ہے۔ کونسی نئی کرن پھوٹی ہے بھلا۔ ہمیں بھی تو پتہ چلے۔"

میں نے اپنی عقل کے مطابق کچھ چنیں وچناں کرنے کی کوشش کی تو ان دوستوں کی زبانی معلوم ہوا کہ میں فرسٹ ایئر کے طالب علموں کی سی انتہائی سطحی اور سوقیانہ باتیں کر رہا ہوں اور یہ ضمیر کی خلش اور POSITIVE THINKING وغیرہ اصطلاحیں سن کر ان کو بے اختیار ہنسی آرہی ہے۔

اس ہنسی کے ڈر سے بے نیاز ہو کر میں نے کچھ اور مبتذل باتیں بھی کہہ دیں اور میرا واقعی خیال ہے :

(۱) جمیل الدین عالی نے صرف اپنے ادبی مستقبل کو خطرے میں ڈالا ہے، کسی اور کے ادبی مستقبل کو نہیں۔

(۲) کسی ادیب کو (خواہ وہ پاکستان کا ہے یا روس کا یا وینزویلا کا) اپنے ہاں کی حکومت یا اپنے ہاں کے انقلاب کی موافقت میں کچھ کہنے کا حق حاصل ہونا چاہیئے۔ جب وہ ایسا ایمانداری سے محسوس کرے۔

(۳) دیانت، خلوص، بصیرت، اور حب الوطنی ایسی چیزیں نہیں کہ ٹینڈر طلب کر کے کسی کو ان کا ٹھیکہ دیا جا سکے۔ یہ خواص کے علاوہ کبھی کبھی عامیوں کو بھی مل جاتی ہیں۔ ان کے لئے بہت بڑا صحافی، پروفیسر، وکیل یا حکومت کا سکتر یا وزیر ہونے کی ضرورت نہیں۔

(۴) حضرت جبرئیل کے بنفس نفیس آ کر اہلِ زمین کی حکومت سنبھالنے اور خدا کی بے داغ بادشاہت قائم کرنے کے امکانات بہت کم ہیں، انسانی کاموں میں خطا و لغزش کی ملاوٹ معمولی بات ہے۔

(۵) قومی اور انفرادی زندگی میں ایسے موڑ آتے ہیں جب نامقبولیت یا زیاں کا خطرہ مول لے کر بھی دل کی بات کہنی چاہیئے۔

اور پھر عالی نے خاقانی کی زمین میں کوئی قصیدہ تھوڑا ہی لکھا ہے۔ احتیاط کا دروازہ بھی کھلا رکھا ہے :

"یہ صدرِ حکومت جو ہر محاذ پر آلائشوں سے جنگ کر رہا ہے، اچھے ارادوں کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اس نے اب تک تو اپنے وعدے پورے کئے ہیں۔"

"تاریخ بڑی بے رحم تلوار ہے۔ وہ نہ جنرل ایوب کی دوست ہے نہ میری۔ وہ بڑی بے باک، نڈر اور صاف گو ہے۔"

★

عالی کی کتاب کو دیکھ کر کئی سوال پیدا ہوتے ہیں۔ اگر یہ کتاب بُری ہے تو عالی نے کیوں لکھی۔ اگر اچھی ہے تو دوسرے لکھنے والے کہاں ہیں۔ کیوں چپ ہیں۔ ایک وجہ اس کتاب کے لکھنے کی یہ ہو سکتی ہے کہ مصنف کا منہ موتیوں سے بھرا جائے گا یا کم از کم خلعتِ فاخرہ عنایت ہوگی۔ یہ بات ہوتی تو اس کے بہترین موقعے گزشتہ حکومتوں کے ساتھ گزر گئے۔ جو حکومتیں خود کچھ کام نہ کرتی ہوں وہ پراپیگنڈسٹوں کی محتاج ہوتی ہیں اور ان کی خوب سرپرستی کرتی ہیں لیکن کام کرنے والی یا انقلابی حکومتوں کو مداحوں کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ عالی کا شمار ان لوگوں میں کبھی نہیں رہا جو ہر حکومت کے مدح خواں ہوتے ہیں اور جن کے نزدیک سرکاری مصالح اور دعاوی سے ذرا سا انحراف بھی تخریبی کارروائی ہے۔ تو گویا ادبائے سخن کچھ اور بات ہے۔ ان لوگوں کا شاعرانہ خلوص سے خیر مقدم کرنا جو اس کے خوش آئند جاگیر دارانہ مستقبل پر اثر انداز ہوئے ہیں، مداح کی بھی خوبی ہے ممدوح کی بھی۔ حکومتِ وقت کی حمایت، خواہ وہ حکومت کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو، لوگوں میں نامقبولیت کا مجرب نسخہ ہے، اور ہمارے دوستوں نے عالی کے ادبی مستقبل کے متعلق جو تشویش ظاہر کی ہے وہ بے بنیاد نہیں۔ لیکن یہ ایک نفسیاتی سوال ہے۔

ہمارے اہلِ شعور میں بشرطِ استواری والے خوش عقیدگان اور دہریت حکومت کی طرف قبلہ راست کرنے والے ان افلاطونوں کے مقابلے میں دو طبقے اور ہیں۔ ایک جس کا خمیر کلبیت سے اٹھا ہے۔ یہ طبقہ آنکھیں اور کان موندے بیٹھا ہے اور صرف زبان کھولے ہے۔ ان لوگوں کے لئے اسلامی، جمہوری، اشتراکی یا فاشی کسی حکمراں کی تخصیص نہیں۔ یہ کسی کی رو رعایت کے قایل نہیں۔ ان کا ایمان یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مسائل ان کے سوا نہ کوئی سمجھ سکتا ہے نہ ان سے مشورہ لئے بغیر حل کرسکتا ہے۔ جب کبھی ملک پر کوئی افتاد پڑے یہ خوش ہو کر اور سر ہلا کر کہتے ہیں: "دیکھا میں نہ کہتا تھا۔" "میں نے تو پہلے ہی رونا رو دیا تھا کہ یہ گاڑی چلنے کی نہیں۔" ان کا کام محض ستاروں کی چال دیکھنا اور مستقبل کے زائچے بنانا ہے اور یہ لوگ اپنے خمارِ گندم کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ دوسرا طبقہ کلبی نہیں لیکن اپنے مزعومات کو الہام کا درجہ دیتا ہے۔ وہ اس بات کا قایل ہے کہ ہر چیز بطریقۂ راسخہ شعرا ہونی چاہیئے اور اگر انقلاب کو آنا ہے تو ان کی نظریاتی بائبل کے احکامِ عشرہ کے مطابق آئے ورنہ یکسر غلط ہوگا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ زرعی اصلاحات ہو ہی نہیں سکتیں بھلا جو لوگ خود زمیندار یا کھاتے پیتے طبقے سے تعلق رکھتے ہوں وہ اپنے حقوق سے دستکش ہو سکتے ہیں؟ جب یہ اَن ہونی بات ہو گئی تو اب کہتے ہیں ذرا اسے عملی صورت ملے تو جانیں ـــ جب عملی صورت بھی مل جائے گی تو ان کے پاس کوئی اور برہانِ قاطع نکل آئے گی۔ یہ لوگ اس مشہور ریاضی داں کے ہاتھ پر بیعت ہیں جس نے دریا عبور کرتے وقت اس کی گہرائی کا حساب نکالا تھا۔ ایک جگہ دو فٹ تھی، بیچ میں سات فٹ اور ایک کنارے تین فٹ ـــ اوسط نکلا چار فٹ۔ مطمئن ہو کر دریا میں قدم رکھ دیا۔ بیچ میں آکر کنبہ ڈوب گیا۔ خود قسمت کے سکندر تھے ڈبکیاں کھاتے ہاتھ پاؤں مارتے کنارے پر آ لگے۔ پھر اوسط نکالی، وہی چار فٹ۔ حیران ہو کر کہنے لگے عجیب بات ہے۔ اوسط گہرائی برابر چار فٹ نکلتی ہے۔ کنبہ ڈوبا تو کیوں؟

زرعی اصلاحات بھی ہوئیں خفیہ آمدنیاں بھی باہر آ گئیں۔ اسمگلنگ بھی رک گئی، بدعنوان افسر بھی نکالے گئے۔ لیکن یہ کیسے ہوا؟ 'کتاب' کی رو سے تو ناممکن ہے ـــ میاں ذرا میرے چٹکی لینا ـــ دیکھوں خواب کا عالم ہے یا بیداری کا ـــ

★

ہاں تو وہ کونسا نفسیاتی نکتہ ہے جو عالی یا کسی بھی ادیب کے لئے جو اثباتی نقطۂ نظر سے کوئی بات لکھتا ہے، خطرے کا باعث ہو سکتا ہے؟ وہ یہ ہے کہ کوئی کارنامہ کتنا ہی تعمیری کیوں نہ ہو اس کے حق میں کچھ کہہ کر مقبول ہونا بہت مشکل ہے، ہاں اس کے خلاف آپ جھوٹوں بھی آواز بلند کریں گے یا شاعری کے پردے میں چھپا ہوا احتجاجی یا تعریضی حملہ کریں گے تو لوگ طرح طرح کی رعایتوں اور چشم پوشیوں سے کام لے کر اسے سراہیں گے۔ دنیا کے ان ادیبوں کی شہرت اور مقبولیت کا جنہیں ہم "DISILLUSIONED" کے زمرے میں رکھتے ہیں، یہ بھی ایک بڑا راز ہے۔ انسانی فطرت کسی کی اچھائی سننے کی طرف اتنی راغب نہیں ہوتی جتنی برائی سننے کی مشتاق ہوتی ہے۔ روس اور چین دنیا کے دو ملک ہیں جہاں سوشلزم کے عملی تجربے ہوئے، وہاں بلاشبہ اکثر تعمیری اقدامات اس قسم کے ہوئے جیسے ہمارے ہاں ۷، اکتوبر کے انقلاب کے بعد ہوئے، یا متوقع ہیں۔ زرعی اصلاحات، تعلیمی اصلاحات، دستوری اصلاحات، روزگار کا تحفظ، بلیک مارکیٹ کا خاتمہ، دولت کے ارتکاز کا سدباب وغیرہ۔ ظاہر ہے ان کے متعلق نظمیں، مضمون، ڈرامے، افسانے، ناول وغیرہ بھی لکھے گئے ہوں گے۔ ان بے شمار تخلیقات میں سے کچھ چیزیں یقیناً اچھی بھی ہونگی ـــ یعنی جو افادی بھی ہوں اور ادب بھی۔ لیکن ہم ان میں سے نہ کسی تخلیق کا نام جانتے ہیں نہ اس کے لکھنے والے کا۔ ہمارا پیمانہ وہی مفرور کراوچنکو، وہی تیس برس پرانا آندرے ژید اور وہی سنکی جارج آرویل ہیں۔ آج اگر سکرینگ میں کوئی مشہور لکھنے والا نااہلی یا بدعنوانی کی بنا پر معتوب ہو جائے اور ایک رقت آمیز ناول لکھ کر جس میں صاحبِ دولت طبقے کو نزع کے عالم میں گرفتار دکھایا گیا ہو، انٹرنیشنل مارکٹ میں بھیج دے تو یقیناً وہ ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا اور پاکستان کی صحیح تصویر سمجھا جائے گا لیکن وہ تصویر حقیقت بھی ہوگی؟ کوئی عالی پاکستان کے موجودہ نظام کی ہجو کو اگر کسی ترکیب سے اپنے دیس سے اسمگل کر سکے تو خواہ اس کا موقف کیسا ہی سست بنیاد اور مغالطہ آمیز کیوں نہ ہوتا، اس کے ادبی مستقبل کی سبھی لوگ ضمانت لینے کو تیار ہو جاتے ـــ آخر کیوں؟

دانشور طبقہ ہر معاشرے میں بہت اہم طبقہ ہوا کرتا ہے لیکن اسے ریڑھ کی ہڈی نہیں کہا جاسکتا ـــ یہ حیثیت غیر دانشور اکثریت ہی کو حاصل ہے۔

کسی صحیح انقلاب کا منصب دانشوروں کے لئے جنت شداد بنانا نہیں ہوتا۔ خیر کثیر اصل منزل ہوتی ہے۔ پاکستان کا انقلاب اگر کافی ہاؤس یا ڈرائنگ روم یا پولیس کلب میں بیٹھے سو دو سو چار سو بقراطوں کو خوش نہیں کر سکتا تو کوئی حرج نہیں۔ اس کا مقصد اسمگلروں، خائنوں، بلیک مارکیٹیوں اور عیاش جاگیرداروں کی خوشنودی بھی نہیں، خواہ وہ معاشرے میں کتنا ہی اونچا مقام کیوں نہ حاصل کر چکے ہوں۔ اس کی کسوٹی باقی آٹھ کروڑ غیر ادیب، غیر وکیل، غیر جرنلسٹ، غیر پروفیسر، غیر افسر اور غیر نواب آبادی کا ردّ عمل ہے اور وہ ردّ عمل واضح ہے۔ موجودہ حکومت سے غالباً بعض فروگذاشتیں بھی ہوئی ہونگی اور آگے چل کر بھی ہو سکتی ہیں لیکن دو باتیں بدیہی ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ لوگ پہلوں سے مختلف ہیں اور کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے دار و رسن کا ڈراما کھیلے بغیر چپ چاپ وہ کچھ کر دکھایا ہے جو عموماً کشت و خون والے انقلاب کے بعد ہوتا ہے (اکثر اوقات نہیں بھی ہوتا)۔ لہذا ان لوگوں کو معاف کر کے جو مرمریں برجوں میں بیٹھ کر آسمانی پریوں کے متعلق لکھتے ہیں یا حجاب امتیاز کے افسانوں کے کرداروں کی طرح دھنک دیکھتے، خوشبوئیں سونگھتے اور ہوائی بلبلوں سے کھیلتے زندگی بسر کرنے کے قایل ہیں ـــــ باقی سب کو سوچنا ہے کہ ملک کی تقدیر کے ایک اہم موڑ پر ان کا کیا فرض ہے۔ انہیں کس کا ساتھ دینا ہے۔ حالی کو لوگ جذباتی کہیں گے لیکن دنیا میں جذباتی ہونے کے مواقع بھی تو آتے ہیں، جس شخص نے دس سال تک نفسا نفسی کا ڈراما دیکھا ہوا سے جب معلوم ہوا کہ اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہو گیا۔ بڑے صاحبوں کو مچھی کھلانے والے شاہ اسمگلروں اور دیہات کے کھیتوں میں کسان زادیوں کا شکار کرنے والے زمینداروں کے دن ختم ہو گئے، اور انسانی تعلقات میں سکّے کے چلن کے علاوہ زندگی کی دوسری قدروں کی بھی پوچھ شروع ہو گئی ہے، تو وہ کیوں نہ جذباتی ہو گا۔ سرحد کا ڈیڑھ سو سالہ پیر مرد اقبال خاں سوچتا ہے یہ کون سا بادشاہ ہے جس کے راج میں پہلی بار میرے گاؤں میں قتل بند ہوئے ہیں۔ ایک صوبے کا حاکم حیران ہے کہ یہ کیسا صدر ہے جو ہدایت کرتا ہے کہ زمینوں کی ملکیت کی حد ایسی رکھنا کہ مجھے بھی اپنی زمین کا ایک ٹکڑا چھوڑنا پڑے۔ سکریٹری حیران ہے کہ اہل سیف کے طبقے میں سے یہ آدمی کہاں سے آ گیا جس کی زندگی کا ایک لمحہ بھی ذاتی عشرت میں صرف نہیں ہوتا، جس کا مطالعہ اتنا وسیع اور رائے اتنی صائب ہے، جو درویشوں فقیروں فلاکت زدوں اور اہل علم کے سامنے خاکساری سے گداز ہو جاتا ہے۔ جو برادری میں سب کی برداشت کر لیتا ہے لیکن ایک عزیز کو جس کا نام قرعے میں نہیں نکلا سفارش کر کے حج پر نہیں بھجوا سکا، جو ایک سالن کا کھانا کھاتا ہے اور اس مد میں خرچ کے لئے حکومت کی طرف سے جو رقم مقرر ہے اس کا ایک حصہ بچا کر سرکاری خزانے میں داخل کرتا ہے۔ یہ باتیں چھوٹی سہی لیکن حکومت کی پالیسیوں میں منعکس ہو کر چھوٹی نہیں رہتیں۔ یہ باتیں نامعلوم سہی لیکن جسے معلوم ہو نگی اسے ضمیر کا کانٹا ضرور کانٹے گا۔ حالی نے کتاب لکھ کر اپنی عاقبت، خراب کر لی ہے۔ دیکھیں:

کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد!

★

مان سون کا دیس

بیگم سلمیٰ تصدق حسین

وہ لوگ جو برسات کی رت میں مان سون کے دیسوں کے سبزہ زاروں اور مرغزاروں کے پُر لطف نظاروں سے کیف اندوز ہوئے ہیں اور انہوں نے ان مرغزاروں اور کہساروں میں موسلا دھار بارش اور طوفانی برسات کے مناظر دیکھے ہوں صرف وہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سیلون، سنگاپور، جاپان، تھیلا بلکہ تمام مشرق بعید کے ممالک اور مشرقی پاکستان کے دلفریب نظارے ایک دوسرے سے کس قدر مماثلت رکھتے ہیں۔ خاص طور پر برکھا رت کا دلفریب اور روح پرور حسن وہ کبھی فراموش نہیں کرسکتے۔ صبح ہو یا شام مطلع ابرآلود، گھٹا ٹوپ بادل، مست ہاتھیوں کی طرح جھومتے ہوئے، پانی سے لدے سیاہ بادل تہہ در تہہ لحافوں کی طرح اُلٹ پلٹ چلے آتے ہیں اور فضا پر یوں چھا جاتے ہیں جیسے نیلی چھتری کے نیچے ایک اور کالی چھتری پھیل گئی ہو۔ اور اس چھتری میں سے کوئی چھاجوں بھر بھر کے پانی اُنڈیل رہا ہو۔ اور پھر یوں مینہ برستا ہے کہ کئی کئی دن آسمان نظر نہیں آتا۔ اور اگر آسمان دم بھر کے لئے کھل جائے تو سورج کی کرنوں سے دُنیا چمک اُٹھے۔ آٹھوں پہر دھوں دھار بارش۔ ہر طرف جل تھل۔ ندیاں نالے بھر بھر کر اچھلتے ہیں۔ گھر گھر تال تلیاں، جھولے اور پکوان، غریبوں کی بستیاں ٹپکے سے حیران و پریشان نظر آتی ہیں۔ یہ سب پانی کے دیس، دھرتی کے پن کٹوروں کی طرح کناروں تک بھرے ہوئے، ڈل ڈل کرتے ہیں۔ اور لوگ جل پریوں کی طرح پانی میں تیرتے پھرتے ہیں۔ اوپر سے موسلا دھار پانی برستا ہے، اور نیچے دھرتی پر بھی پانی ہی پانی نظر آتا ہے۔

اگر آپ ہوائی جہاز کی بلندیوں سے یہ نظارہ دیکھیں تو اور بھی دلفریب معلوم ہوتا ہے۔ بے پایاں سمندر کی طرح کنارہ نظر ہی نہیں آتا۔ گاؤں کے گھروندے پانی میں گھرے ہوئے، بانسوں پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے آسمان سے یہ ننھے ننھے گھروندے زمین پر بکھیر دئے ہیں۔ کوئی یہاں جا پڑا ہے کوئی وہاں۔ اور اب یہ سارے بانسوں کے سہارے پانی کی سطح پر کھڑے ہیں۔

اگر تیز ہوا چلے تو شاید یہ گھر ناؤ کی طرح بہنے لگیں، لوگوں کی آمد و رفت ننھے ننھے شکاروں، کشتیوں اور درختوں کے کھوکھلے تنوں پر ہوتی ہے۔ جگہ جگہ سبز پودے اور پیڑ پانی سے باہر جھانکتے نظر آتے ہیں۔ خشکیوں کے رہنے والے پانی کے دیس میں حیرت سے منہ تکتے اور سوچتے ہیں کہ الٰہی خشک زمینوں پر ہم پانی کی ایک ایک بوند کو ترستے ہیں۔ اور یہاں تیری رحمت کا یہ عالم کہ زمین کو دم بھر کے لئے خشک نہیں ہونے دیتی۔

ان پانی کے دیسوں کے باشندے آدھے خشکی اور آدھے پانی ہی میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ کوئی جگہ ایسی نہیں ہوتی جہاں پانی انسانوں کی زندگی میں اس طرح گھلا ملا نہ ہو جیسے شیر و شکر۔ خشکی کے رہنے والے ایسی رُت میں ضرور کپڑوں کو سنبھالیں گے، جسم کو چھپائیں گے اور کوشش کریں گے کہ وہ پانی سے بچ کر رہیں۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی اور ہے۔ عورتیں سروں پر گاگریں اٹھائے بے تکلفی سے پانی میں اُتری جاتی ہیں۔ انہیں ذرا بھی دھڑکا نہیں ہوتا کہ ان کی ساڑھی بھیگ جائے گی۔ یا جسم پانی سے شرابور ہو جائے گا۔

مرد ہیں تو وہ بھی جگہ جگہ کشتیوں میں گھومتے۔ مچھلیاں پکڑتے اور سودا سلف لاتے نظر آتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو مشرقی پاکستان کا یہ موسم اور یہ آب و ہوا، ایک نئی زندگی۔ اور نیا ہی نظریہ پیش کرتے ہیں۔ لوگ بے دھڑک پانی میں چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ سروں پر بانس کی چھتری نما ٹوپیاں رکھے ہوئے بارش سے بچاؤ کی صورت پیدا کر لیتے ہیں، اور روزمرہ کے کام کاج میں کوئی رکاوٹ نہیں آنے دیتے۔

دیہاتوں کا منظر تو جو ہوتا ہے سو ہے، شہروں میں بھی پانی ہی پانی نظر آتا ہے۔ بلند اور عمدہ عمارات اونچی سطح پر بنی ہوئی طویل سڑکیں شہری آبادی کے لئے ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچاتی ہیں۔ سڑکوں کے دونوں جانب بارش کا پانی ہوتا ہے جبکہ قدرتی تالاب پانی سے لبا لب اور کنول کے پھولوں سے بھرے ہوتے ہیں۔

مان سون کا دیس
(مشرق پاکستان)

۱ :

''آئے بدروا گھر گھر کے''

۲ :

۳ :

۱ : ''مجھے جانا ہے اس پار''

۲ : '' کشتی لوں یا لانچ''
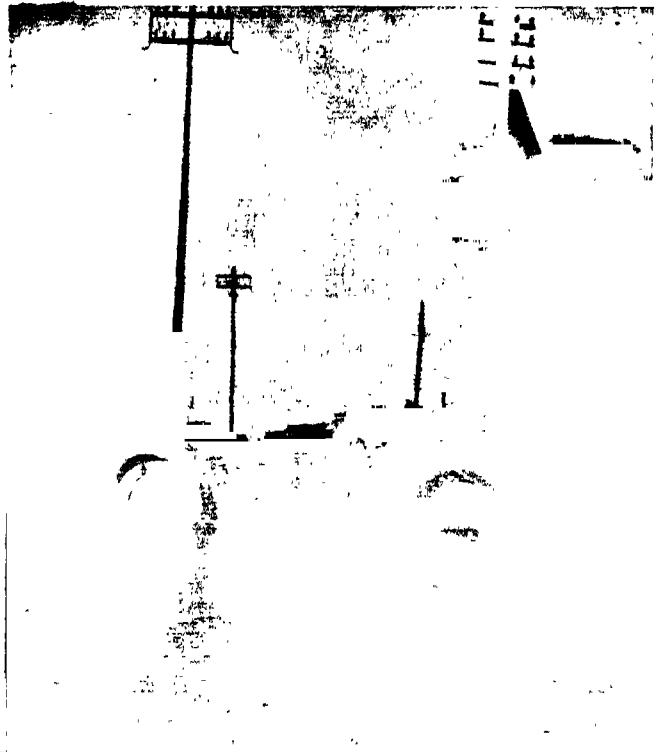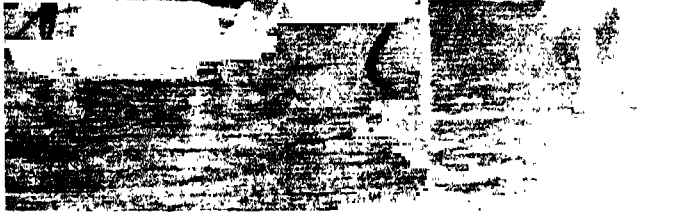
۳ : '' دوجہ و بازار بھی اک جوئے آب''

ارض نغمہ
(وادیٔ مہران)

سرود بے خودی
(ڈھولک ، بانسری اور گھڑے پر سنگت)

'' مرلی کی دھن بجائے جا''

نغمات سرمدی
(روضہ شاہ عبداللطیف بھٹائی رح)

سوز نے (الغوزہ)

اونچے سر سبز درخت، پھولدار بیلیں، ہری ہری گھاس اور شام کے وقت چہکتے ہوئے پرندے، قمری کی کوکو کسی وقت بھی بند نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ بنگالی شاعری حسن کے اِن خوبصورت پیامیوں سے بھری پڑی ہے۔ قدرت کی اَن گنت حسین چیزوں کے علاوہ اُٹھتے پھرتے بادل، قدرت کے انگڑائی اور سفید ہرکارے، جگہ جگہ دوڑتے نظر آتے ہیں۔ یہ شعراء کے لئے ایک لاثانی دنیا کا نہایت دلکش اور حسین منظر ہے اور حسن و عشق کا لاجواب سرچشمہ ــــــ۔ قدرت نے مشرقی پاکستان کو پانی اور ہریاول کا دیس بنا کر اس کے باسیوں کو زرخیز تخیل اور دلآویز طرزِ بیان بھی عطا کیا ہے۔ ایک مسلسل سبزہ زار جس میں پانی اَن گنت شکلوں میں بکھرا پڑا ہے۔ اس کے لئے خلیج بنگالہ کی وسیع پہنائی کیا کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اُدھر ہمالہ کی فلک بوس دیوار خلیج بنگالہ سے اٹھنے والے بے پناہ بخارات سے لدی ہوئی ہواؤں کے سامنے سینہ تان کر کھڑی ہو جاتی ہے اور انہیں حکم دیتی ہے کہ وہ اپنے طوفانی جوش و خروش کے ساتھ واپس لوٹ جائیں، اور جل تھل کا عالم رچا دیں۔ بخارات بھی اس حکم کی تعمیل میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔ بادلوں کے کارواں پر کارواں اُمڈ اُمڈ کر آتے ہیں، فضا دھواں دھار ہو جاتی ہے۔ اور برسات کا گھن گرج ڈراما بڑے زور و شور سے شروع ہو جاتا ہے۔ جیسے کسی زبردست رَن میں رتھ ہی رتھ گڑگڑاہٹ پیدا کرتے چلے آ رہے ہوں۔ اس برسات کا ہر دن کیف انگیز ہوتا ہے۔ آپ نے فلم "تان سین" میں دیکھا ہوگا کہ جب دیپک راگ گانے سے تان سین کا تن من پھنکنے لگتا ہے تو اس کی محبوبہ "میگھ" راگ الاپنے لگتی ہے "اُمڈ گُمڈ کر برسو۔ پیا پہ برسو" بادل کشتۂ محبت کی یہ درخواست سُن کر روئی کے گالوں کی طرح اِدھر اُدھر اُبھرنے لگتے ہیں۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے۔ تمام آسمان پر چھا جاتے ہیں۔ اور پھر ایک طوفان ــــــ بجلی رہ رہ کر چمکتی ہے، سیاہ بادل آپس میں ٹکراتے ہیں ــــ کڑک، خوفناک کڑک، دھرتی کا دل ہلا دیتی ہے، برسات کی اس جلالی شان کو دیکھنا ہمت سے تعلق رکھتا ہے۔

ہم خشک خطوں کے رہنے والے اگرچہ ان کیفیات سے بے بہرہ نہیں، مگر برسات کی جلالی اور قہرمانی شان سے آشنا نہیں ہو سکتے۔ ہمارے ہاں بھی برکھا رت کچھ ایسے ہی طمطراق اور کر و فر سے آتی ہے۔ ہمارے یہاں بھی خلیج بنگالہ سے اٹھنے والے بخارات پہاڑوں کے سینوں سے ٹکرا کر برسات کا حسن و جمال پیدا کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ ہریاول بکھیرتے ہوئے اِدھر سے اُدھر نکل جاتے ہیں۔ ایک آدھ موقعہ پر ہمارے یہاں بھی دھرتی پر مشرقی پاکستان کا گمان ہونے لگتا ہے۔ ندی نالے ہر طرف ہاتھ پاؤں پھیلا دیتے ہیں۔ اور ایک بے پناہ سیلاب بن کر لوگوں کو طوفانوں سے نبرد آزما ہونے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ زندگی خطروں میں گھر جاتی ہے۔ اور موت کے منہ میں بھی حیات کا سُراغ نکلنے لگتی ہے۔ مشرقی پاکستان اور دیگر خطہ ہائے وطن جیسے ایک ہو جاتے ہیں۔ اور ان طوفانی مصائب کا مقابلہ دونوں میں یگانگت پیدا کر دیتا ہے۔ خلیج بنگالہ کا پانی کراچی کی جانب منہ موڑ لیتا ہے۔ کون یقین کر سکتا ہے کہ سمندر کے کنارے پر آباد کراچی، جو برساتی طوفانوں سے ناآشنا تھی، اس کے گلی کوچے بھی ان طوفانوں سے ہمکنار ہوں گے۔ درحقیقت قدرت تند و تیز گھٹاؤں کے ذریعے کراچی اور سندھ کو اپنے وطن کے اس خطۂ دور دراز سے مانوس کرانا چاہتی ہے۔ اب کراچی بھی مشرقی پاکستان کے تصور سے محروم نہیں۔ وہاں بھی قدرت اسی زور شور سے ساون کا حسین موسم مہیا کر دیتی ہے۔ اور اس کے گلی کوچوں کو ندی نالوں میں تبدیل کر دیتی ہے۔

مگر سچ پوچھئے تو یہاں کی برسات اور مشرقی پاکستان کی برسات کا کیا مقابلہ! آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے، اس قدر بے پناہ کہ الامان و الحفیظ! اس کا نقشہ تو وہی کھینچ سکتا ہے جس نے اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ مری اور اکثر دوسرے پہاڑوں کی طرح یہاں بھی بعض گھروں کی چھتیں چادر کی ہوتی ہیں۔ جب ان پر بارش کے موٹے موٹے قطروں کی اندھا دھند بوچھاڑ ہوتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے وحشی جنات نے ہزاروں ٹین کے کنستروں کو بے تحاشا پیٹنا شروع کر دیا ہو اور کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔ اس قہرمانی شور و غل سے حسِ سماعت شل ہو جائے تو بعید نہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ اس جلال میں ناقابلِ بیان جمال بھی پنہاں ہے۔ افسوس ہے کہ مغربی پاکستان کا اردو ادب اس جمالِ فطرت سے آشنا نہیں ہوا۔ ہمارے اکثر ادیبوں کو وہاں جانے کا موقعہ نہیں ملا۔ ورنہ آج سحرِ بنگالہ کے ساتھ ساتھ حسنِ فطرت کے سحر کا بھی چرچا ہوتا۔ برسات کے قہرمانی پہلو کی جھلک فضل احمد کریم فضلی کے ناول "خونِ جگر ہونے تک" میں اس طرح پیش کی گئی ہے کہ اس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

یہ تو مشہور ہے کہ زندگی اور ماحول میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ پھر کیا بعید ہے کہ جہاں افق پر بادل چھا جائیں۔ وہاں انسانی ذہن پر بھی

بادل بھی بادل منڈلانے لگیں۔ برسات کے موسم کی رومانی اور جذباتی کہانیاں شاعر کے لئے ایسا مواد مہیا کرتی ہیں کہ وہ دیوان کے دیوان مرتب کر سکتا ہے۔ اور بچاری عورت کے نام سے برسات کو مناسبت دے کر پریم کہانیاں لکھی جاتی ہیں۔ پی کی لگن اور برہ کی آگ اور جذبہ جلنے کیا کیا جادو نہیں جگاتے جاتے۔ جس برہن کے پیا پردیس سدھارے ہوں، اس کی نظروں میں اُڑتے پھرتے بادل قدرتی پیغام بر نظر نہیں آئیں گے تو اور کیا ہو گا؟ یہی وجہ ہے کہ مشرقی پاکستان کی شاعری میں ان خوبصورت ہرکاروں کا بار بار ذکر آتا ہے، اور گویا لکھنے والے انہیں کے گن گاتے ہیں۔ وہاں پیا بادل اور پانی ہی دو چیزیں زندگی میں حُسن وجمال اور محبت کی روح پیدا کرتی ہیں۔ پنگھٹوں کا سلسلہ، گاگروں کا بھرنا اور چھلکنا، سانولیوں کا مٹک مٹک کر چلنا، بادلوں کی دلفریب آنکھ مچولیاں، ندی نالوں کا اٹھکیلیاں کرتے ہوئے بہنا، کشتیوں کی روانی، کھوتیوں کے گیت، پپیہوں کی آواز، ملہروں کا بن بن کر ٹوٹنا، پانی میں مچھلیوں کا اچھلنا اور چھلانا، کسانوں کا پانی سے بھر پور کھیتوں میں دھان لگاتے ہوئے گیت گانا اور بھونروں کا ڈال ڈال پات پات گھومنا۔ یہ سب زندگی کو ایک ناقابلِ بیان کیف عطا کرتے ہیں۔ سینکڑوں رومان اس کے آغوش میں پرورش پاتے ہیں۔ اور شاعری کا ایک وسیع حصّہ انہیں رومانوں کے سہارے جیتا ہے۔ بادلوں میں قوسِ قزح کی اٹھان حسن کی کمان بن کر عشق کے دیوتاؤں کو بلاتی ہے۔

ادھر کسانوں کی سوئی ہوئی امیدیں خود بخود جاگ اٹھتی ہیں، زندگی کھیلنے کودنے اور ناچنے لگتی ہے۔ شاعری اسی ماں سون کی فضا میں پروان چڑھتی ہے۔ شعر و ادب کی گود بھری ہو جاتی ہے اور سینکڑوں جذبات مایوسی کی گرفت سے نکل کر حیاتِ نو سے ہم آغوش ہوتے ہیں۔ چنانچہ بنگلہ شاعری جہاں ندی نالوں، کشتیوں اور مانجھیوں کے گیت سناتی ہے، وہاں کھیتوں کھلیانوں، دھرتی اور انسانوں کے راگ بھی الاپتی ہے۔ بنگلہ کے مایہ ناز شاعر نذرالاسلام اسی زندگی کے گیت اور انہیں طوفانوں کی کہانیاں سناتے ہیں، اور انہیں ملاحوں اور دہقانوں کے من کی جوت جگاتے ہیں۔ ان سب کا دامن اسی برسات کے موتیوں سے مالا مال ہے۔ اور ہر چیز اسی کی زلفِ گرہ گیر میں اسیر ہے۔ جو زلفِ بنگال سے کم دلآویز نہیں۔ دوسری طرف اس بانسوں کے دیس میں بنسری کا نغمہ بھی وہ کیف پیدا کرتا ہے جو بے اختیار شاعری کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔

یہ دیکھتے ہوئے کہ ماں سون اس دیس کے چپے چپے کو گلزار بنا کر جنگل میں منگل کا سماں پیدا کر دیتی ہے، یہاں کے رہنے والے بجا طور پر اپنے دیس کے لازوال حسن پر، جو فطرت نے سے اس دریا دلی سے عطا کیا ہے، فخر کرتے ہیں اور اس سے لطف اندوز ہو کر شعر و نغمہ کا ایک ایسا ذخیرہ چھوڑ جاتے ہیں جو صدیوں تک ان کی یاد تازہ رکھتا ہے ❊

راولپنڈی — میرے خوابوں کا شہر

رفیق خاور

اگر میرے ذہن میں راولپنڈی کا تصور کتنی ہی یادوں سے لپٹا ہوا آئے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ کیونکہ میں نے اسی میں آنکھ کھولی اور اسی میں پروان چڑھا۔ میری نظر میں یہ بچپن کے دیکھے ہوئے نظاروں کی خواب نما دنیا ہے جس کی کشش میرے دل سے کبھی نہیں مٹ سکتی۔ اور اب جب حالات نے اسی کے پاس نئے دارالحکومت کی طرح ڈال دی ہے، کچھ عجب نہیں کہ میرا خوابوں کا شہر اوروں کے خوابوں کا شہر بھی بن جائے۔

مجھے وہ دن یاد ہیں جب میں صبح سویرے اٹھتا تھا تو نظروں کے سامنے برف کی سفید براق دیوار کھڑی نظر آتی تھی جیسے کوہ ہمالیہ کا بے پایاں برف پوش سلسلہ میرے بالکل پاس کھڑا ہو۔ اور اقبال کے شعر کی مکمل تفسیر کہ ؎

اک تجلّی تھی کلیمِ طورِ سینا کے لئے
تو تجلّی ہے سراپا چشمِ بینا کے لئے

اور یہ کہ ؎

برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہِ مہرِ عالمتاب پر

اس برف کے دامن پر جو زمین سے آسمان تک پھیلی نظر آتی تھی جا بجا دھاریں سے دکھائی دیتے تھے۔ جیسے سفید بادلوں پر بجلی کوند کر شاخ در شاخ نظر آتی ہے اور پھر جس طرف نظر اٹھائیں ٹیلے ٹیلے پہاڑ ہی پہاڑ۔ نورپور اور رشید پور کی پہاڑیاں جن کے نشیب میں نیا دارالحکومت آباد ہونے کو ہے تو دس میل ہی تو دور ہیں نورپور کے پہاڑ پر دور سے ایک بڑا سا سفید نشان نظر آتا ہے۔ اس کے متعلق ایک بڑی دلچسپ کہانی سننے میں آئی تھی۔ یہ کہ کسی شخص کی گائیں سیلاب میں ڈوب گئی تھیں وہ ایک بزرگ کے پاس پہنچا اور رو دھو کر اپنی بپتا سنائی اس نے کہا تم اپنے گھر کا رخ کئے چلے جاؤ اور گائیں نکل نکل کے تمہارے پیچھے چلتی آئیں گی لیکن خبردار! پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا ورنہ وہ سب پتھر ہو جائیں گی۔ اس نے بزرگ ــ (شاید وہ شاہ تھی لطیف ہی ہوں) ــ کے کہنے پر عمل کیا اور گھر کی طرف منہ کر کے چلنے لگا تھوڑی دور چلا تو خیال آیا دیکھوں بزرگ کی بات کہاں تک سچ ہے۔ اس وقت تک صرف ایک بچھڑا باہر نکلا تھا وہی پتھر بن کے رہ گیا! بظاہر یہ عوامی ذہن کی من گھڑت کہانی معلوم ہوتی ہے جو بچھڑے سے ملتی جلتی کسی چٹان کو دیکھ کر گھڑی گئی ہے۔

کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ پہاڑ پر سے دھواں اٹھتا معلوم ہوتا اور آگ کی ٹیڑھی میڑھی لکیریں دکھائی دیتیں جو کبھی لمبی ہو جاتی کبھی چھوٹی۔ جیسے "تو ا ہنس رہا ہو ـــــــ"! ـ خبر نہیں یہ کہاں تک سچ ہے لیکن یہی بتایا جاتا تھا کہ یہ پہاڑی جنگلوں میں آگ لگ گئی ہے۔ کچھ بھی ہو یہ آگ کا سماں بہت دلکش معلوم ہوتا تھا جی چاہتا ان پہاڑوں کو قریب سے دیکھیں چنانچہ مری کی تنگ سڑک پر جو زمین کی سطح سے ڈیڑھ دو گز اونچی بنائی گئی تھی اور جس کے دونوں طرف ٹوٹے ہوئے پتھروں کے ڈھیر کے ڈھیر لگے رہتے تھے کبھی مستطیل کبھی مربع سائیکل چلاتے چلاتے ہم نورپور پہنچ ہی جاتے۔ اس وقت بھی اندازہ ہوتا کہ پہاڑ کتنے پُرفضا ہوتے ہیں اور ان کی آب و ہوا کتنی خوشگوار۔ نیچے بیس پچیس فٹ کی گہرائی میں ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کا شفاف نالہ کتنا عجیب لطف دیتا اور اس سے پہلے بری شاہ لطیف اور دوسرے بزرگوں کے خوشنما مزار بڑے باوقار معلوم ہوتے اور ساری جگہ

لگتی جیسے یہ ایک بہت ہی خوش آیند باغ ہو۔ اگر یہاں میلہ لگا ہوتا تو اس کی رونق کیا کہنے۔ طرح طرح کے لوگ دور دور سے آئے ہوتے اور لے کو چار چاند لگاتے۔ راگ رنگ اور ناچ گانا تو خیر ہوتا ہی ہے۔ لیکن جوئے کے رسیا دُور دُور سے آتے۔ کوئی ہارتا کوئی جیتتا اور جو ہار جاتا وہ اپنے مخصوص پشاوری انداز میں کہتا "خو شاہ بری لطیف نہ ہوسی طوطا دبا ہوسی" یعنی یہاں شاہ لطیف دفن نہیں ہیں طوطا دفن ہے جب ہی میں اُن کی مدد سے کامیاب نہیں ہوا ——!

یہ تو یہاں کی زندگی کا مزاحیہ پہلو ہوا، جو کہاں نہیں ہوتا؟ کہتے ہیں نالے کا پانی چشموں سے آتا ہے اور ہم ان کا سراغ لگانے کے لئے بڑی بڑی چٹانوں پر لپک لپک کر چڑھتے اور چشموں تک پہنچ کر ہی دم لیتے۔

نورپور سے ذرا پرے جائیں تو بل پیچ کھاتی پہاڑی سڑک کا اندازہ ہونے لگتا ہے۔ اور میل ڈیڑھ میل آگے بڑھیں تو لوکاٹ کے لمبے چوڑے باغات سے ہوتا ہوا انسان سید پور کے ہمسایہ پہاڑ تک پہنچ جاتا ہے۔ جہاں ہندوؤں نے اپنے مخصوص انداز میں مندر بنائے ہوئے ہیں اور نیچے مردوں اور عورتوں کے لئے علیحدہ علیحدہ غسل خانے بنائے ہیں۔ جن کے بیچوں بیچ ایک نالہ ہو کر نکلتا ہے۔ ان عمارتوں کے پیچھے بھی کچھ تاریخ ہے یا شاید کوئی تحریک تھی جو مجھے بھول چکی ہے۔

ان چھوٹے چھوٹے پہاڑوں کو جو سڑک جاتی ہے وہ مری روڈ کے اس طرف ایک اور سڑک ہے۔ مری روڈ کی دوسری طرف بھاری بھرکم چٹانوں میں سے بل پیچ کھاتا ایک بہت بڑا نالہ آتا ہے۔ بڑا اول پر آبشار بنا کر گرتا ہے جس کا سماں دیکھنے کے لائق ہے۔ ہم اکثر دیکھتے کہ کوئی مچھلی کے شکار کا شوقین کنڈی میں کیچوا لگا کر پانی میں ڈال دیتا اور تھوڑی ہی دیر میں ایک لمبی سی بام مچھلی سانپ کی طرح تڑپتی باہر نکل آتی۔

اور ہاں، تھوڑی ہی دور ایک اور بزرگ عورت کا مزار بھی تو ہے۔ بالکل سڑک کے کنارے، دائیں طرف جس پر ہنڈیاں ہی ہنڈیاں دکھائی دیتی ہیں —— اس کے متعلق بھی چوروں کی کوئی کہانی مشہور ہے، بڑی دلچسپ۔ مگر آپ کہیں گے یہ تو ہوئیں راولپنڈی سے دور کی باتیں۔ ہمیں تو خاص راولپنڈی کی باتیں سنائیے۔

شاید راولپنڈی کا نام راول ہی کا مرہونِ منت ہے۔ اگرچہ ہم بچپن میں سنا کرتے تھے کہ اس کو 'راولوں' یعنی ایک قسم کے فقیروں، نے آباد کیا ہے —— خاص راولپنڈی کی دلچسپیاں بھی کچھ کم نہ تھیں، اور وہ بھی ہم چھوٹے چھوٹے بچوں کی نظر میں۔ حدنگاہ تک پھیلے ہوئے کھیت ہی کھیت۔ کبھی مکا کبھی چری کبھی سرسوں اور کہیں کہیں چنوں کی اک ہری بھری دنیا جن کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہوتا۔ شہر کا شہر اور گاؤں کا گاؤں۔ شہر اب اور بھی بڑھ گیا ہے بہت دور، مری روڈ کے دونوں کنارے کئی میل تک۔ کتنی ہی جگہ "سیٹلائٹ ٹاؤن" نے گھیر لی ہے —— اگرچہ یہ کافی کھلا کھلا بنایا گیا ہے۔ گاؤں یعنی ہرے بھرے کھیت بہت پیچھے ہٹ گئے ہیں لیکن یہ اپنی بہار ضرور دکھاتے ہیں۔ پیازی پیازی زمین پر لہلہاتے کھیت یوں لگتے ہیں جیسے کسی نے سبز ریشمی تارکشی سے بڑی ہی استادی کے ساتھ کشیدہ کاڑھا ہو۔ باجرا، مکی اور چری کے بھٹے اور سرسوں کے پیلے پیلے پھول مجھے ابھی تک یاد ہیں ان ہی سے میرے ذہن میں ترو تازگی یا ہرے بھرے پودوں اور سرسوں کی گندل یعنی ساگ کے ڈنٹھلوں کی لہلوٹ کا تصور رس بس گیا ہے۔ باجرے اور مکا کے بھٹے یا ان کی گھی میں رچی میٹھی روٹیاں کھانا، یہ بھی پنڈی ہی پر ختم ہے۔

کھیتوں سے کوئی ایک میل دور زمین دوز قلعہ کتنا پُراسرار معلوم ہوتا تھا! جیسے کسی بہت ہی بڑی کچی عمارت کا گنبد زمین پر آ رہا ہو اور اس کی سطح پر گھاس ہی گھاس اُگی ہو۔ گرداگرد لوہے کی تیکھی تیکھی چپٹی چپٹی سلاخوں کا جنگلا، گہری کھائی کبھی خالی کبھی پانی سے بھرپور۔ اور سامنے لوہے کا سرخ گیٹ۔ ایسی ہی کہیں دوسری طرف ایک اور زمین دوز قلعہ بڑی طلسمی چیز معلوم ہوتا تھا۔ قریب ہی بڑے بڑے میدان تھے جہاں آئے دن ہاکی فٹبال کے میچ اور ٹورنامنٹ ہوتے اور عجیب گہما گہمی نظر آتی۔ اور کھیل ہی کھیل میں کبھی بے تحاشا دنگا فساد بھی شروع ہوتا۔ پانی سے بھری نہر کا سماں ہی کچھ اور تھا۔ آس پاس اونچے اونچے درختوں پر فاختائیں حق سرہ کرتیں اور ان سے ملتی جلتی ایک اور چیز جسے بٹیر کہتے ہیں، جھاڑیوں میں اڑتی پھرتی جن کا ہم کبھی غلیلوں اور کبھی چھرے والی بندوقوں سے شکار کرتے پھرتے کیونکہ اتفاق سے ہمارے بڑے ہی شوقین تھے۔ اور اُن کے پاس ہر طرح کی بندوقیں تھیں۔ وہ شکار یا یوں کہئے اس کے گوشت کے بہت ہی دلدادہ تھے۔ یہاں کے پہاڑی کوّے اتنے بڑے بڑے، پھولے پھولے، چونچ ذرا سی سفید بھاری کلاؤنتوں جیسی

آواز میں قاقا کرتے، اپنے بھاری بھاری پر ہلاتے آتے اور جھٹ چھروں والی بندوق کا شکار ہو جاتے۔ 'کڑوت' کھانا بھی ہم نے اپنے پڑوسیوں سے سیکھا۔ 'کرمٹ' پنیر کے سخت سخت یا گول ڈھیلوں کو کہتے ہیں جن سے دانتوں اور جبڑوں کی ورزش بھی ہوتی ہے اور آزمائش بھی۔

بلا کی سردی، بلا کی گرمی۔ بھر دیوں میں زمین پر کہرا ہی کہرا جما ہوا اور تالابوں کی سطح پر برف کی پپڑی جم جاتی ہے۔ ایک بلور کا صاف ستھرا ہموار تختہ جس پر پتھر لڑھکایا جائے تو وہ تیزی سے تیرتا ہوا دوسری طرف نکل جاتا ہے اور اگر اس کو کنکر مار کر توڑ دیا جائے تو خوبصورت کرچیں ہی کرچیں نظر آتی ہیں۔ پانی جمنے کی نوبت تو نہیں آتی تھی لیکن ہم رات کو کٹوروں میں پانی بھر کر کھلی ہوا میں رکھ دیتے ــ اور وہ صبح ہونے تک جم جاتا۔ پھر ہم اس میں شکر ڈال کر مزے سے چبا چبا کر کھاتے اور یہ خوب لطف دیتی۔ برسات آنے پر کچھ اور ہی رنگ ہوتا۔ جو ہڑ بپیازی رنگ کے گدلے پانی سے بھر جاتے اور کناروں پر یہ بو لیعنی بُرادے کی سی باریک چیز تنکے اور کچرا تیرتا نظر آتا۔ اس کے ساتھ ہی بے شمار بڑے بڑے کالے بھونڈ بھی چلے آتے جنہیں ہم "سانڈ" کہتے تھے۔ (بعض جگہوں پر ان کیڑوں کو "اللہ میاں کی بھینس" بھی کہا جاتا ہے) ہم اُن کا سر گیلی زمین میں گاڑ دیتے اور یہ اس کو اپنے کالے کالے سینگوں سے زور شور کے ساتھ کھود کھود کر اندر گھسنے لگ جاتے۔ جب یہ ذرا زیادہ دور چلے جاتے تو بل میں پانی چھوڑ دیا جاتا اور یہ بیچارے باہر نکلنے پر مجبور ہو جاتے۔ اسی طرح "سانڈوں" کی لڑائی کرا کر اس کا تماشہ دیکھتے۔ برسات کے کلاونت 'مینڈک' جتنے بڑے اور پاٹ دار آواز کے یہاں دیکھنے میں آئے شاید ہی کہیں ہوں۔ اور بارش ختم ہونے پر زمین سے اَن گنت سوراخوں سے نکل نکل کر ہوا میں اڑنے والے بھورے بھورے ننھے ننھے پروانے جنہیں چڑیاں لپک لپک کر کھائیں!

برسات کا زور سب سے زیادہ نالہ لئی میں دکھائی دیتا۔ اتنا تنگ کہ چڑھا ہوا پانی اس میں اندھا دھند ریلا مار کر آتا اور کمپنی باغ کے پاس، جو اب 'لیاقت باغ' کہلاتا ہے، آکر پھیل جاتا۔ چنانچہ برسات کے بعد یہ ابلتی ہوئی ندی بھی دیکھنے کی چیز ہے۔ اور کمپنی باغ۔ اتنی خوبصورتی سے بنایا ہوا، اس کی شامیانوں جیسی برگی وضع کی بارہ دریاں، ان کے ارد گرد چھوٹے بڑے شہتوتوں کے درخت، کھیلنے کا میدان جہاں ہم ماموجی اسلامیہ ہائی اسکول کے طالبعلم سالانہ جلسوں کے موقع پر کاغذی پھولوں سے سجاوٹ کے لئے دن بھر بانسوں کی کچائیں بناتے اور جس کے ایک طرف تھوہر کی گھنی جھاڑیاں اُگی تھیں اور ان تھوہروں میں وہ گہرے ارغوانی رنگ کا گاڑھا پانی، خونِ شہیداں کی طرح، جس سے زیادہ خالص سرخ رنگ شاید ہی تصور کیا جا سکے۔

راولپنڈی کی رگِ حیات مری روڈ ہے اور یہاں کی زندگی کی ساری دوڑ دھوپ اسی پر ہوتی ہے۔ کوئی ہے جس نے اس سے گزرتے ہوئے شاہ کی ٹاہلیاں یعنی شیشم کے پیڑ نہیں دیکھے؟ کہتے ہیں ان ٹاہلیوں کے شاہ صاحب کہیں سے روانہ ہوئے تو یہ شیشم کے پیڑ بھی ان کے ساتھ چل پڑے۔ اور جب وہ یہاں آکر رکے تو یہ چالیس ٹاہلیاں بھی یہیں رک گئیں یہ بھی عوامی تخیل کی کتنی اچھوتی پرواز ہے۔ جو شاید شیشم کے درختوں کا جھنڈ دیکھ کر پیدا ہوئی۔ ویسے راولپنڈی ٹاہلیوں کا گھر ہے۔ جہاں دیکھو شیشم کے بڑے بڑے تناور پھیلے ہوئے درخت جو سڑک کے دونوں طرف عجیب بہار دیتے ہیں اور برسات میں بارش اور گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں چلتے پھرتے انسانوں کے لئے قدرتی شامیانے بن جاتے ہیں۔ ان کے گول گول پتے، ان کی سوندھی سوندھی خوشبو اور سفید سفید بور بھلائے نہیں بھولتے۔

مری روڈ پر پہلی عالمگیر جنگ کے زمانہ میں کیسی کیسی رنگ برنگی فوجیں بینڈ بجاتے گزرتے، ہائی لینڈر اپنے بیگ پائپ بجاتے اور دیسی زور شور سے ڈھول بجاتے، مارچ کرتی تھیں اور پھر خچر بیٹریوں اور رسالوں کا ایسا سلسلہ شروع ہوتا کہ ختم ہی نہ ہوتا۔ ان رسالوں میں تھوڑے تھوڑے وقفے پر توپیں اور گن مشینیں لگی ہوتیں۔ اسی مری روڈ پر چھاچھیوں کے خوبصورت ٹانگے اپنے بانکے گھوڑوں کے ساتھ رواں دواں دکھائی دیتے۔ ایک تو مضبوط و تنومند چھاچھیوں کی مخصوص وضع اور دوسرے ان کے نفیس ٹانگے جو پشاوری ٹانگوں کے بعد اپنا جواب نہیں رکھتے، کون ہے جو ان سے مسحور نہ ہو۔ ان گھوڑوں سے وہ میلہ اسپاں یاد آگیا جو درحقیقت میلہ مویشیاں ہوتا تھا اور چھاچھی محلہ کے سامنے ہی ایک وسیع میدان میں لگتا تھا۔ کمپنی باغ کی بارہ دریوں سے ملتی جلتی ایک خوش وضع بارہ دری یہاں بھی تو تھی جو ہمارے لئے طلسمی کشش

رکھتی تھی۔ جب میلہ لگتا تو اس میں خبر نہیں کہاں کہاں سے گھوڑے خچریں اور گدھے امڈ آتے اور ہنہنانے، رینکنے اور گھنگروؤں کی چھن چھن کرنے سے ایک عجیب سماں بندھ جاتا —— جا بجا تنبو بھی لگے ہوتے اور ہم لڑکے بالے سارا دن دیوانہ وار انہیں گھومتے رہتے۔ چونکہ اس میلے میں مویشیوں کا سودا ہوتا تھا، اس لئے جا بجا تنبو لگے ہوتے جن میں لین دین کے دستاویز تیار ہوتے۔ ان سودوں میں ہمارے لئے خاص کشش بالکل نئی سنہرے رنگ کی چکنی دمکتی پائیوں کی ہوتی جو خبر نہیں اتنی تعداد میں کیوں آتی تھیں۔

مری روڈ ہی کی دلچسپیوں میں سے ایک کشمیریوں کی آمد کا سلسلہ تھا کبھی اکا دکا، کبھی ٹولے کے ٹولے۔ کالی کالی لوئیاں پہنے اور گردن یا پیٹھ پر نمک کے بھاری بھاری ڈھیلے اٹھائے۔ اس وقت تو آنا جانا قدرتی حالات کے تحت تھا لیکن اب! ایک ناسازِ تقدیر اور "اجنبی کے دستِ غارت گر" کی چیرہ دستیوں نے خاک و خوں میں غلطاں ہونے والے "کشمیری" کو ترک وطن کرتے ہوئے ادھر ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا ہے؛ اور یہی مری روڈ ہے جس پر بلکہ سارے شہر میں لمبے تڑنگے پوٹھوہاری، ادھوڑی جوتے پہنے رواں نظر آتے ہیں۔

شہر کے اندر "شاہ چن چراغ" کی درگاہ پر ہر سال زوروں کا میلہ لگتا ہے جس میں گانا بجانا تو الگ رہا، سال بھر حال پڑنے کا سماں عجیب کیف رکھتا ہے۔ ہم لوگ راجہ بازار جاتے وقت اس کے پاس گذرتے تو دو چار آدمیوں کو درختوں کے ٹہنوں سے الٹا لٹکے "حق حق" کرتے دیکھ کر بڑے حیران ہوتے۔ ہم راجہ بازار سے جھنگی محلہ واپس آئیں اور سرداروں کے لمبے چوڑے شاندار باغ سے نہ گذریں، یہ ناممکن تھا۔ یہ باغ سردار سوہن سنگھ کا تھا، اسی لئے اس کو سرداروں کا باغ کہا جاتا تھا۔ ادھر سے آتے وقت لگے ہاتھوں جامع مسجد کا نظارہ بھی ہو جاتا جس کے تالاب میں سرخ رنگ کی مچھلیاں تیرتی تھیں۔ اور جس طرح یہ مسجد تعمیر ہوئی وہ بھی اچنبے یا یوں کہئے معجزے سے خالی نہیں۔ ہر گھر والی آٹا گوندھتے وقت مٹھی بھر آٹا ہنڈیا میں الگ رکھ لیتی جس کو جمع کرنے والے ہر جمعہ گھر گھر جا کر فراہم کر لیتے۔ اور اس کو بیچ کر جو روپیہ ملتا وہ مسجد کی تعمیر پر صرف ہوتا۔

راولپنڈی ہی کی یادوں میں محرم کے دنوں کی ہماہمی بھی شامل ہے جب گھر گھر شہدائے کربلا کی یاد میں کھیر یا فیرنی تیار کر کے چھوٹے چھوٹے کوزے بھرے جاتے جنہیں وہاں 'کُجی' کہا جاتا ہے۔ یہاں کی ایک دلچسپ ریت یہ ہے کہ بچے ٹولیاں بنا بنا کر گلی کوچوں میں پھرتے ہوئے اونچی آواز میں "کوئی نادر و کہاری۔ کوئی ...... " کہتے پھرتے ہیں اور گھروں والے انہیں بلا بلا کر یہ چھوٹی چھوٹی خوبصورت 'کجیاں' دیتے ہیں۔

ایسے ہی کھیلوں میں چھپن چھوت یا آنکھ مچولی سے ملتا ہوا دلچسپ کھیل ہے جو لڑکے رات کو جمع ہو کر کھیلتے ہیں۔ ایک ہانک لگاتا ہے "یوسف پھل گلاب دا، کالی انگل ٹی لو" اور دوسرے لڑکے آواز کی سمت کا پتہ چلا کر اسے پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔

پھلوں میں ملوک سوکھا ہوا گہرے نیلے یا کالے رنگ کا، ہاڑیاں (زرد آلو) خوبانیاں اور گرنڈے (بہت ہی چھوٹے قسم کے کالے کالے دانے جن کی شکل اور ذائقہ جامنوں سے ملتا جلتا ہے) یہ سب برسوں گذر جانے پر ذہن، اور ذہن سے زیادہ دل سے محو نہیں ہوتے۔

صدر کی دلچسپیاں اپنی جگہ پر ہیں۔ یہ گوروں کی بسائی ہوئی بستی ہے جنہوں نے چھاؤنی اور صدر کو اپنی ضرورت اور ذوق کے مطابق بہت ہی شاندار بنایا تھا۔ اور پنڈی میں گوروں کے ساتھ ساتھ ان کے چرچے بھی رہتے تھے۔ چنانچہ دلیسوں کی بہادری کے سلسلے میں یہ اکثر سننے میں آتا کہ کس طرح ایک گل مچھوں والے چاچی کو جوان نے کتنے ہی نشے میں دھت گوروں کو پیٹ ڈالا اور ان کی ساری نقدی چھین لی!

یہ تو تھا زندوں کا کارنامہ۔ مردوں —— اور وہ ظاہر ہے پیروں فقیروں کے سوا اور کون ہو سکتے ہیں۔ کی کرامات بھی کچھ کم نہ تھی۔ چنانچہ یہ بات آئے دن سننے میں آتی کہ ریلوے اسٹیشن کی دیوار کے پاس جو ایک سائیں کا مزار ہے وہاں کسی گورے نے حسب عادت کھڑے ہو کر نازیبا حرکت کی۔ سائیں نے جلال میں آکے اسے الٹا کر ساری رات سر کے بل کھڑا رکھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ پھر یہ بھی سننے میں آتا کہ جہاں ریل گاڑی اس مزار کے پاس آئی، الٹ گئی۔ انگریز بھی ایک استاد تھا اور پرلے درجہ کا مدبر۔ جھٹ جھنڈی سے سلامی دینے لگا اور سائیں جی کو راضی کر لیا ——!

صدر یوں تو سب کا سب دیکھنے کے لائق ہے۔ نفیس ڈاک خانہ، طویل اور شاندار پشاور روڈ، جا بجا توپیں نصب، فوجی ہیڈ کوارٹر

جہاں سے ادھر ادھر نظر ڈالی جائے تو پہاڑیوں کا گول دائرہ ایک انگوٹھی سا لگتا ہے جس میں پنڈی نگینہ کی طرح جڑا ہے، لال کرتی جس کی وجہ تسمیہ خبر نہیں کیا ہے لیکن نام کتنا دلکش ہے! اور پنڈی سے تین چار میل دور ٹوپی رکھ کتنا پیارا نام ہے! آپ پوچھنے لگ جائیں گے کہ یہ نام پڑا کیسے۔ شاید اس کی شان نزول یہ ہو کہ صاحب لوگ یہاں تفریح کے لئے آتے تھے اور ہیٹ رکھ کر بیٹھ جاتے تھے! رکھ، کے معنی شاید آپ نہ سمجھیں یہ وہ ہری بھری جگہ ہے جو پھولوں پودوں وغیرہ کے لئے رکھ لی جائے۔ جیسے نرسری۔ گرین ووڈیا "پریزرو" انگریز لوگ اسے "پارک" کہتے تھے۔ دیسی "رکھ" کہنے لگے۔ اور یہ میلوں تک پھیلا ہوا بیلا یا دریائی جنگل واقعی "رکھ" کہلانے کا مستحق ہے۔ ڈاکٹر خالد نے اسی کی بنا پر لکھا ہے کہ

رکھ میں پرانے جھنڈ کے اندر
ایک پکھیرو درد کا مارا پیہو پیہو کرتا ہے
کون سنے یہ غم کی باتیں کون کسی کی سنتا ہے!

ٹوپی رکھ کے ادھر دریائے سہاں ایک عجیب شانِ محبوبی سے رواں ہے۔ ذرا اور پرے جائیں تو چک لالہ کی چھاؤنی نظر نواز ہے۔ پھر اسی کی ہم قافیہ دوسری جگہیں۔ سہالہ، مانکیالہ وغیرہ۔ سارا علاقہ گیروا رنگ کی چٹانوں سے بھرا پڑا ہے اور پھر ادھر سے ادھر جائیں یا ادھر یعنی جہلم گجرات سے ادھر آئیں، پہاڑیاں ہی پہاڑیاں اپنی گود میں ہری بھری پیاری پیاری خوبصورت کیاریاں لئے ہوتے اور سرنگوں پر سرنگیں جو ایک طلسم سے کم نہیں۔ دوسری طرف نکل جائیں تو "شاہ کی ڈھیری" زبانِ حال سے عہدِ رفتہ کے جاہ و جلال کی داستان سنا رہی ہے۔ ٹیکسلا کے کھنڈرات اگر شاہ کی ڈھیری نہیں تو اور کیا ہیں؟ اور اس کی دلچسپیاں اور دلآویزیاں تو ایسی چیزیں ہیں جو تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور اسی نظر سے ان کو دیکھنا بھی لازم ہے۔

مگر پنڈی اور اس کے گرد و پیش کے علاقے کی سب سے بڑی دلچسپی اور دولت تو اس کے لوگ ہیں۔ مضبوط، توانا، جفاکش، جیالے۔ جو پیدائشی فوجی ہیں اور پاکستانی فوج کا ایک نہایت اہم حصہ۔ ہزارہ اور دوسرے پہاڑی علاقوں کی طرح پوٹھوہاری بھی نہایت بلند بالا، وجیہہ، دلیر اور بیباک ہیں۔ کھردری زبان اور لب و لہجہ جس سے وقار اور مردانگی ظاہر ہو۔ اس رزمیہ وضع کے باوجود وہ بزم یعنی شعر و شاعری میں بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ اُن کی بولی، اُن کے ٹپے، ان کے گیت اک ناقابلِ بیان اور مسحور کن کیف، تازگی، چٹخارے اور سب سے بڑھ کر اصلیت کے حامل ہیں جنھیں سنتے ہی انسان پھڑک اٹھتا ہے۔ گریرسن نے ان کی زبان کو آریائی زبانوں کے بیرونی حلقے میں شمار کیا ہے۔ اور جو لوگ ہندکو، سندھی، ملتانی، سرائیکی وغیرہ کی ساخت اور لب و لہجہ سے آشنا ہیں وہ اس ہم وضعی کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ ایک الگ موضوع ہے جس کی داد کوئی ماہر لسانیات ہی دے سکتا ہے۔ ہماری دلچسپی تو محض بولی کے چٹخارے اور اس کے لوک گیتوں اور ٹپوں کی دلآویزی تک ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور ——— آخری بات بھی سن لیجئے۔ شروع شروع میں پنڈی کی بولی اور لب و لہجہ مجھ پر بُری طرح حاوی تھا ——— ہوسی ——— ویسی ——— آسی، جاسی ——— کھاسی اور دوسرے پوٹھوہاری الفاظ زبان پر چڑھے ہوئے تھے۔ چنانچہ جب میں اپنے آبائی وطن "بٹالہ" آیا تو میرے ہم جماعت اس عجیب بولی کو سن کر لگے ہنسی اُڑانے ——— رفتہ رفتہ زبان اور لہجہ مجھ مجھ کر ایسے صاف ہو گئے کہ اچنبھے سے خالی نہیں ——— اگرچہ میرے بعض احباب ——— سید ضمیر جعفری، احمد ندیم قاسمی، اور زیڈ۔ اے۔ بخاری کے لہجے سے اب تک جہلم، سرگودھا اور پشاور کا لہجہ صاف جھلکتا ہے۔ بالعموم جن لوگوں پر شروع ہی سے ان علاقوں کا لہجہ حاوی ہوتا ہے وہ اس سے کم ہی دامن چھڑا سکتے ہیں۔

ایوب نیشنل پارک (راولپنڈی)

"راولپنڈی سے تقریباً تین میل کے فاصلہ پر ایک جگہ اب سے کچھ دن پہلے تک ٹوپی پارک کے نام سے موسوم تھی۔ لانبے لانبے سرو، چیڑ اور بہت سے خود رو درختوں سے گنجان اس جگہ کو کبھی "ٹوپی رکھ" کے نام سے بھی پکارا جاتا رہا ہے۔ گرد و نواح کے غریب عوام یہاں سے خشک لکڑیاں اور ایندھن جمع کر کے لے جاتے تھے۔ یہ ویران جنگلی علاقہ بد معاشوں کا مسکن اور لٹیروں کی جائے پناہ تھا۔ لوگ نصف النہار کی تیز روشنی میں بھی وہاں کی فضا کو تاریک اور گناہ آلود محسوس

کرتے تھے۔ انگریزی دورِ حکومت میں اس کا نام "ٹوپی پارک" رکھا گیا، اس کے باوجود اس کی ویرانیوں میں کمی نہ ہو سکی۔ لوگ نام سن کر جس شوق و اشتیاق سے جاتے، وہاں پہنچ کر انہیں اُسی قدر مایوسی ہوتی۔ وہی ہُو کا عالم، ہر سو وحشت، ویرانیاں، جنگل بیابان ایسا کہ غالب کو اپنا گھر یاد آئے ..... لیکن مجرموں کا وہ مسکن اب ایک صاف ستھری بہترین تفریح گاہ میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اس کا نیا نام "ایوب نیشنل پارک" ہے جس کا افتتاح خود صدرِ پاکستان جنرل محمد ایوب خاں نے ۵ مارچ ۱۹۵۹ء کو کیا۔

چکنی سپاٹ سڑکیں، گل ہائے رنگا رنگ کے دلفریب تختے، خوشنما ریسٹورینٹ، خوبصورت بارہ دری، وسیع مصنوعی جھیل اور دیگر آرائش و زیبائش نے مل کر نہ صرف ٹوپی پارک کو ایوب نیشنل پارک بنا دیا بلکہ اسے ایسا حسن بھی بخشا ہے کہ وہ ایک نہایت عمدہ تفریح گاہ بن گیا ہے۔ چاروں طرف لوگوں سے خوب چہل پہل اور گہما گہمی ہوتی ہے اور جیسے جیسے شام کی گلابی فضا میں پارک کے ہرے بھرے ماحول پر چھاتی ہیں یہاں کا ذرّہ ذرّہ زندگی کی گوناگوں خوشیوں سے چمک اٹھتا ہے۔ شام کی کجلاہٹوں کے ساتھ ساتھ کاروں، تانگوں اور سائیکلوں کی قطاروں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ جدید طرز کے پرتکلف اور صاف ستھرے ریسٹورینٹ زبانِ حال سے "تنگیٔ داماں" کی شکایت کرتے نظر آتے ہیں۔ جھیل میں کشتی رانی کا معقول انتظام ہے۔ لیلیٰ شب اپنے لانبے گیسوؤں سے جب سارے عالم کو ڈھانپ لیتی ہے، چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ درخشاں ہوتا ہے اور کہکشاں دو رنگ کسی عروسِ نو کی زرتار اوڑھنی کی طرح جگمگاتی ہے۔ کسی دوشیزہ کے دل کی معصوم دھڑکنوں کی طرح جھیل کی لہروں پر چاند ہلکورے کھاتا ہے تو اکثر باذوق لوگ کشتیوں میں محفلِ موسیقی کا رنگ جماتے ہیں۔ کبھی کشتیوں پر مشاعرہ منعقد ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے فلک کے باسی بھی جھیل میں اُتر آئے ہیں اور شعرا حضرات اس سحر انگیز فضا سے مسحور ہو کر شعر پر شعر کہتے چلے جاتے ہیں۔

پارک میں جگہ جگہ پختہ سائبان بنے ہوئے ہیں۔ کہیں کہیں رنگ برنگی بڑی چھتریاں جن کے نیچے پتھر کی ترشی ہوئی آرام دہ کرسیاں، کئی جگہ موتی لٹاتے ہوئے فوارے، حوضوں میں آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی خوش رنگ مچھلیاں، یہ سب مل کر پارک کے حسن کو اور بھی رنگین بنا دیتے ہیں۔ بچوں کا پارک، جس کی دیدہ زیبی بڑوں کو بھی دعوتِ نگاہ دے کر کچھ دیر کے لئے روک لیتی ہے بچوں کے لئے علیحدہ تفریح کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ پارک کے ایک حصہ میں گولف کلب اور کھیل کا میدان بھی ہے جس کا افتتاح بھی کچھ دن پہلے صدرِ محترم جنرل ایوب خاں ہی کے ہاتھوں ہوا تھا۔

راولپنڈی بذاتِ خود حسین جگہ ہے۔ اس کے بہت سے نواحی مقامات پکنک منانے اور فرصت کے اوقات گذارنے کی دعوت دیتے ہیں۔ لیکن ایوب نیشنل پارک اپنی خوبصورت ترتیب و تعمیر کی وجہ سے سب سے زیادہ پُرفضا مقام بن گیا ہے۔ پارک کو موجودہ ہیئت اور حُسن بخشنے میں جنرل ایوب کی دلچسپی اور راولپنڈی کینٹونمنٹ بورڈ کے افسران کی کارکردگی شامل ہے۔ (قدیر نعیمی)

★

★

"ماہِ نو" میں مضامین کی اشاعت سے متعلق شرائط

(۱) "ماہ نو" میں شائع شدہ مضامین کا معاوضہ پیش کیا جائے گا۔

(۲) مضامین بھیجتے وقت مضمون نگار صاحبان "ماہ نو" کے معیار کا خیال رکھیں اور یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالہ یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔

(۳) ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر حوالجات دینا ضروری ہیں۔

(۴) ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔

(۵) مضمون کے ناقابلِ اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

(۶) ایڈیٹر مسودات میں ترمیم کرنے کا مجاز ہوگا مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

نقد و نظر

نفرت کی دیوار

مصنف: منظور ممتاز
ناشر: ممتاز پبلیکیشنز لاہور
ضخامت: ۳۱۷ صفحات
قیمت: ساڑھے آٹھ روپے

مصنف کا خیال ہے کہ "اس دنیا میں کوئی ہرجائی نہیں ہے۔ لڑکے لڑکیاں اور لڑکیاں لڑکے بدلتے رہتے ہیں۔ دونوں کو ایک گم گشتہ روپ کی تلاش ہوتی ہے۔ کبھی حاصل کرنے کے لئے اور کبھی چھن جانے کے بعد!" چنانچہ ناول کے ہیرو مقصود کا قصہ اسی نظریے کے حق میں بطور دلیل پیش کیا گیا ہے۔ ابتدا میں اسے زینو سے دلچسپی ہو جاتی ہے جو اس کے خوابوں کی ملکہ ہے۔ زینو اسے نہیں ملتی لیکن اس کی سہیلی ریحانہ جو خود ایک متمول اور ترقی پسند گھرانے کی لڑکی ہے مقصود سے متاثر ہو کر اس کے حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ مقصود بحرین چلا جاتا ہے اور وہاں ایک یہودن میں زینو کی جھلک پاکر اس کے ساتھ اسرائیل بھاگ جانے کو تیار ہو جاتا ہے مگر یہودی رقیب کے ہاتھوں زخمی ہو کر پھر ریحانہ کی آغوش میں واپس آ کر پڑ جاتا ہے۔

قصے کے واقعات عام قسم کے ناولوں سے مختلف نہیں البتہ مصنف نے رومانی محاکات میں خاصی دلچسپی لی ہے اور اس قسم کے مناظر کا اعادہ و تکرار نازک مزاج قاری کو شاید ضرورت سے زیادہ نظر آئے گا۔ ناول کا انداز بیان سیدھا سادا اور بے پیچ ہے اور نوجوان مصنف نے اس میں کسی نئے تجربے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ عام اسلوب شگفتہ ہے لیکن بعض جگہ زبان کی غلطیاں کھٹکتی ہیں۔

نوجوان مصنف تجرباتی دور سے گزر رہے ہیں اس لئے ان کا اسلوب نکھرنے اور بننے میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔ وقت گزاری کیلئے اس ضخیم ناول کا مطالعہ دلچسپ ثابت ہو سکتا ہے لیکن کتاب پڑھنے کے بعد وثوق کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہوگا کہ مصنف اپنے عجیب و غریب نظریے کی تاویل میں پورے طور پر کامیاب ہو گیا ہے۔ اخلاقی و مجلسی نقطۂ نظر سے مصنف کے نظریے پر گفتگو کی بہت کچھ گنجائش ہے لیکن ناول کی پستی میں ان امور کا تذکرہ غالباً بے محل سمجھا جائے گا۔ (ش-ا-ز)

بولتی تصویریں

از عبدالمجید بھٹی
ناشر: خاور پبلشنگ کوآپریٹیو سوسائٹی۔ لاہور۔
صفحات ۴۰، قیمت مجلد دو روپے

"تازہ خبر

کوے نے کچھ کم تولا تھا	آج اس کو بھی پکڑا گیا
چیل نے سونا چھپا رکھا تھا	آج اس کو بھی پکڑا گیا
اُلو نے نقلی گھی بیچا تھا	آج اس کو بھی پکڑا گیا
بلی نے چوری دودھ پیا تھا	آج اس کو بھی پکڑا گیا

ایسے تو پکڑے جائیں گے"

رنگین، خوبصورت، تصویروں اور نظموں کی یہ کتاب ننھے منے بچوں کے لئے بنائی گئی ہے جس کا رنگ ڈھنگ اور پیش کئے گئے نقش سے بخوبی ظاہر ہے۔ جیسے یہ اس کی منہ بولتی تصویر ہو۔ اور یہ خبر شاید مارشل لا کے بعد کسی اخبار سے لی گئی ہو۔ صرف یہ نہیں بتایا کہ کسی شاعر نے کیا کہا تھا کہ وہ بھی پکڑا گیا! اس کتابچے کی نظمیں بچوں کیلئے من بھاتی روحانی غذا بھی ہیں اور سبق آموز بھی۔ ابن انشا کی "بلو کا بستہ" کے بعد یہ انگریزی وضع کی بچوں کی نظمیں اردو میں داخل کرنے کی دوسری کوشش ہے۔ لیکن ان کے تیور اتنے شوخ، تیز تیکھے اور رنگا رنگ نہیں کیونکہ تقریباً تمام نظموں کی وضع ایک ہی سی ہے۔

ایک بات اور۔ بچوں کے لئے نظمیں کہتے کہتے شاعر خود بھی ان میں شامل ہو گیا ہے۔ اور اس کی سنجیدہ شاعری میں بھی چھلاوا

اور مکتبہ کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ یہ کیفیت تابکے؟

مجید لاہوری

از شفیع عقیل
ناشر: مکتبۂ ماحول بہادر شاہ مارکیٹ
کراچی۔ صفحات ۲۵۰
قیمت ساڑھے چار روپے

"میں ہوں مجید لاہوری"
حرف و حکایت کا کالم

لیکن مجید محض ایک اخبار کا بے حس و حرکت کالم ہی نہ تھا بلکہ ایک لحیم شحیم، زندہ و توانا اور زندہ دل انسان بھی تھا جس نے صحافت کی حد تک اردو کو بعض نرالی چیزیں عطا کی ہیں، اُن کا ملکی فضا کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ چنانچہ اس کی نظم و نثر کی تحریروں میں ایک رچی ہوئی واقعیت صاف نمایاں ہے۔ اس نے ایک ذکی الحس اور زندہ انسان کی حیثیت سے اپنے ماحول کے خلاف ردعمل کیا اور بعض بڑی اچھوتی چیزیں یادگار چھوڑیں۔ ایسے شخص کی زندگی اور علمی و ادبی سرگرمیوں کا مطالعہ دلچسپی اور اہمیت سے خالی نہیں اور شفیع عقیل نے اس کا پورا پورا حق ادا کیا ہے اس کی حیثیت بوسول کی تو نہیں پھر بھی اس نے اس گوشت پوست کے انسان سے قریب رہ کر اس کا بڑا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا ہے جو ہمدردانہ ہوتے ہوئے حقیقت پسندانہ بھی ہے۔ جو لوگ پاکستان کے ابتدائی دور میں دلچسپی رکھتے ہیں وہ "مجید لاہوری" سے بے نیاز نہیں رہ سکتے اور زیرِ نظر کتاب سے جس میں حرف و حکایت کے اس کالم کو زندہ کر کے دکھایا گیا ہے۔

"منتخبات خوشحال خان خٹک"

شائع کردہ: پشتو اکیڈمی
یونیورسٹی آف پشاور
مع اردو ترجمہ
از ڈاکٹر سید انوار الحق
صفحات ۳۲۰۔ اشاریہ ۴ صفحات
قیمت درج نہیں۔

چونکہ پاکستانی زبانوں، ان کے ادب اور علاقائی مشاہیر پر روز افزوں توجہ ہے۔ اور اس سے ہماری ملت اور اس کی تہذیب و ثقافت کے خدوخال روز بروز زیادہ اجاگر ہو رہے ہیں۔ چنانچہ اس مقصد کو بوجہ احسن حاصل کرنے کے لئے مشرقی پاکستان اور سندھ، مغربی پنجاب اور سرحد میں متعدد ادارے سرکاری امداد سے قائم ہوئے ہیں جنہوں نے اس کام کو بروئے کار لانے میں بڑی اہم خدمت انجام دی ہے۔ "منتخبات خوشحال خان خٹک" انہی میں سے ایک ہے جو پشتو اکیڈمی یونیورسٹی آف پشاور کے سلسلۂ مطبوعات کی تیسری کڑی ہے۔ اور اس لحاظ سے بے حد اہم ہے کہ اس میں پہلی دفعہ نہایت اہتمام سے پشتو کے نامور شاعر خوشحال خان خٹک کا منتخب کلام پیش کیا گیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ڈاکٹر سید انوار الحق کا اردو ترجمہ بھی ہے جس سے پہلی بار اردو خواں حضرات کو اس شاعر کے دل و دماغ اور فکر و بیان تک رسائی کا موقع ملتا ہے۔ شروع میں متعدد تمہیدی تحریروں سے اکیڈمی کے مقاصد، پختون قوم اور اس کی تہذیب و ثقافت اور خوشحال خان خٹک کی شخصیت و کلام پر بسیط روشنی پڑتی ہے۔ یہ تمام باتیں اس شاعر کی زندگی اور شاعری کے بسیط مطالعہ کی دعوت دیتی ہیں۔ جس کا حکیم ملت نے اس قدر و اہمیت سے ذکر کیا تھا اور جو انہی کی طرح شاہین و عقاب کا شاعر تھا۔ ایک مردِ مجاہد جس نے آج سے کوئی ساڑھے تین سو سال پہلے اپنے طور پر خودی کی تربیت، تحفظ اور نشو و نما کی تعلیم دی تھی۔

پنجابی قصے فارسی زبان میں

باہتمام ڈاکٹر محمد باقر
شائع کردہ: پنجابی ادبی اکیڈمی
۱۷ جے ماڈل ٹاؤن لاہور۔
صفحات ۲۷۸۔ قیمت نو روپے

پشتو اکیڈمی کی طرح پنجابی ادبی اکیڈمی اپنے یہاں کی ادب و ثقافت کے سلسلے میں اہم خدمات انجام دے رہی ہے۔ پنجاب کی مایۂ ناز چیز اس کی واریں اور طویل منظوم داستانیں ہیں جو اپنے دیس سے نکل کر برعظیم کے اکثر حصوں پر چھا گئی ہیں۔ ان میں ہیر رانجھا خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ دنیا میں ایسی اور کوئی نظم موجود نہیں جس کو اتنے لوگوں نے اتنی زبانوں میں نئے نئے رنگ میں پیش کیا ہو۔ صرف پنجابی ہی میں اس کی مختلف شکلوں کی تعداد بہتر ہے۔ اردو میں بھی اس داستان نے کتنے ہی روپ دھارے ہیں یہاں تک کہ سابق پنجاب و سندھ میں متعدد مقامی فارسی شاعروں نے اس کو فارسی نظم میں بھی نظم کیا۔ اور غیر معمولی قدرت دکھاتے ہوئے تنوع اور آب و رنگ پیدا کیا۔ یہی کیفیت دیگر قصص و حکایات کی بھی ہے مثلاً سسی پنوں، مرزا صاحبان، سوہنی مہینوال۔ یہ واقعی سب ایک نہایت

ہتم بالشان ادبی سرمایہ ہیں جس کو مذکورہ اکیڈمی نے فراہم کرکے بہ صورتِ کتاب لانے کا تہیہ کیا ہے۔ زیرِ نظر کتاب ایسے حصوں کا پہلا مجموعہ ہے جس میں چار مشہور داستانوں کی تقریباً ڈیڑھ درجن صورتیں پیش کی گئی ہیں۔ یہ سب مطالعہ سے تعلق رکھتی ہیں اور تحقیق کے لئے ایک وسیع میدان مہیا کرتی ہیں۔ اگر انہیں فارسی زبان و ادب کی "بہارِ ہند" کی بہارِ تازہ قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

خطاطی اور ہمارا رسم الخط

یوسف بخاری

طباعت: اردو ٹائپ

ضخامت ۲۱۳ صفحات

قیمت مجلد تین روپے آٹھ آنے غیر مجلد تین روپے

ملنے کا پتہ: ایچ۔ ایم سعید کمپنی ناشران کتب پاکستان چوک۔ کراچی

خطاطی اور رسم خط کے موضوع پر اردو میں مواد بہت کم ہے۔ چند مختصر رسالوں اور منتشر تحریروں کو چھوڑ کر اس موضوع پر کوئی مبسوط کتاب موجود نہ تھی۔ بخاری صاحب نے اس موضوع کا خاص طور پر مطالعہ کیا ہے اور نوادرات کی فراہمی کا شوق بھی ہے جو اس کتاب کی تدوین و ترتیب سے ظاہر ہے۔ زیرِ نظر کتاب کا بڑا حصہ "ماہِ نو" کی مختلف اشاعتوں میں چھپ چکا ہے۔ رسم خط کی بحث پر بخاری صاحب نے بہت سے زاویوں سے نظر ڈالی ہے۔ ملکی، تعلیمی، انتظامی اور طباعتی موضوعات پر بھی گفتگو کی ہے مگر رسم خط کے مبحث پر ان کی تحریر جوش کی حد میں داخل ہو گئی ہے۔ اعداد و شمار اور حقائق کو جمع کرنے میں ان کی کاوش قابلِ داد ہے۔ اور ٹائپ کی تجدید و اصلاح اور رسم خط کے باب میں ان کی بعض تجاویز قابلِ غور و عمل ہیں۔ (ظ۔ق)

باغی چٹانیں

مصنف: سراج رضوی

ناشر: ایچ۔ ایم۔ سعید کمپنی پاکستان چوک کراچی

صفحات: ۳۳۶

قیمت: ساڑھے چار روپے

اس ناول میں سابق صوبۂ سرحد کے ایک مشہور "باغی اکبر خاں" کی مہم جو زندگی کے حالات پیش کئے گئے ہیں۔ باغی اکبر خاں کی ایک انگریز خاتون سے شادی اور پھر اس شخص کا فرنگیوں کے ہاتھوں دھوکہ سے قتل، اس کے لڑکے جہرگل کا انتقام لینا، وغیرہ۔ بڑے ہوشربا حالات بیان کئے گئے ہیں۔ ناول کے مطالعہ سے پٹھانوں کے رہن سہن، رسم و رواج، معتقدات اور ان کی ثقافتی زندگی کی جھلکیاں نظروں کے سامنے آجاتی ہیں۔ (ظ۔ق)

جب آپ
متوازن غذا کا ذکر کرتے ہیں
تو یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ چکنائی متوازن غذا کا
ایک اہم جزو ہے. چکنائی اپنے ہم وزن چاول یا گیہوں سے
ڈھائی گنا زیادہ قوت بخش ہے، اور اس کی مدد سے نہ صرف
حیاتین آپ کے جسم میں تحلیل ہو جاتے ہیں بلکہ یہ قوت کی
ایک خاص مقدار بھی جسم میں محفوظ رکھتی ہے. ڈاکٹروں کی رائے
ہے کہ نوعمر بچوں اور بالغوں کے لئے کم از کم دو آونس چکنائی
کا روزانہ استعمال نہایت ضروری ہے۔
کھانے کی لذت اور غذائیت میں اضافہ کے لئے
ڈالڈا برانڈ وناسپتی گذشتہ ایک پشت سے اس ملک
میں مشہور ہے. اس کے بنانے میں صحت اور صفائی کے
اصولوں کی کڑی پابندی کی جاتی ہے. یہ ہاتھوں سے چھوئے
بغیر تیار ہوتا ہے، اور مہربند ڈبوں میں خالص اور تازہ دستیاب
ہوتا ہے. یہ ڈبے کھجور کے درخت کے نشان سے پہچانے جاتے
ہیں. اس میں وٹامن "اے" اور "ڈی" کثرت سے شامل
ہونے کی وجہ سے اس کی غذائی قوت دوبالا ہو گئی ہے۔
ڈالڈا صحت مند گھرانوں کی روزمرہ غذا کا
ایک اہم جزو ہے!
DALDA
VANASPATI
ڈالڈا (برانڈ) وناسپتی
ڈالڈا ایک وناسپتی ہی نہیں بلکہ مکمل غذا ہے!
HVM 23—193 UD

بنگالی زبان کا مشہور ناول

عبداللہ

بنگلہ زبان کا یہ مشہور ناول اردو میں پہلی بار منتقل کیا گیا ہے۔ ,, عبداللہ،، عبوری دور کے معاشرہ کی جیتی جاگتی تصویر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے جس میں نئی زندگی پرانی زندگی کے ساتھ محو کشمکش ہے اور آخر کار نئے تقاضے حیات کا رخ بدل دیتے ہیں۔

ناول کا پس منظر مشرقی پاکستان کا ہے، مگر اس کی کہانی ہم سب کی اپنی ہی کہانی ہے۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کے دونوں حصوں کا تاریخی ارتقا کس طرح ایک ہی نہج پرہوا اور ہم ایک دوسرے سے کس قدر قریب ہیں۔

۴۰۰ صفحات ۔ کتاب مجلد ہے ۔ سرورق دیدہ زیب

سادہ جلد والی کتاب کی قیمت : چار روپے

طلائی لوح سے مزین مجلد کتاب کی قیمت : ساڑھے چار روپے

ادارہ مطبوعات پاکستان ۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ ۔ کراچی

ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا - مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس میکلوڈ روڈ - کراچی
مدیر: رفیق خاور

راولپنڈی

جنرل محمد ایوب خاں: نیشنل پارک کی رسم افتتاح

نیشنل پارک میں خوبصورت بارہ دری اور جھیل

نیشنل پارک میں مصنوعی جھیل

نئے دارالحکومت کا محل وقوع: (پوٹھوہار: فضائی نظارہ)

نیشنل پارک: دور اونچے ٹیلے پر صدر پاکستان کی ذاتی رہائش

ماہِ نو

ستمبر ۱۹۵۹ء
قیمت ۸/

جنرل محمد ایوب خاں
(سنگ بنیاد کورنگی کالونی کراچی)

کورنگی میں حکومت کی طرف سے ایک
مکان کی پیشکش۔ (پہلا خوش نصیب آب

علاقہ لیاری (کراچی) میں صفائی کی مہم

''کتاب بحریہ'': لفٹننٹ جنرل محمد اعظم خاں نے کمانڈر انچیف
پاکستانی بحریہ کو یہ نادر ترکی مخطوطہ پیش کیا

جی! میں کپڑے گھر ہی میں
دھوتی ہوں!
New SUNLIGHT SOAP
SUNLIGHT
نئے سنلائٹ
سے یہ
اور بھی آسان ہوگیا ہے!
نئے سنلائٹ صابن میں ایک نیا
جادو اثر جزو شامل کیا گیا ہے، جو سفید کپڑوں کو
پہلے کی نسبت کہیں زیادہ سفید دھوتا ہے اور
رنگین کپڑے اور بھی خوشنما ہو جاتے ہیں۔ آپ کے
تمام کپڑے نئے سنلائٹ صابن میں
دُھلنے کے بعد ایک نئی چمک دکھائیں گے۔
نیا سنلائٹ استعمال کیا جائے
تو کوٹنے پیٹنے کی مصیبت سے بھی چھٹکارا
مل جاتا ہے۔ بس آپ کپڑوں کو
نیا سنلائٹ لگا کر ذرا سا مل دیجئے
اور پھر نچوڑ ڈالئے۔ دیکھئے سارا میل نکل گیا،
اور کپڑے بلور کی طرح صاف و شفاف ہو گئے
نیا سنلائٹ صابن
پٹخے بغیر کپڑوں کو
سفید اور اُجلے
دھوتا ہے!
S. 21—793 UD

جب آپ
متوازن غذا کا ذکر کرتے ہیں
تو یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ چکنائی متوازن غذا کا ایک اہم جزو ہے۔ چکنائی اپنے ہم وزن چاول یا گیہوں سے ڈھائی گنا زیادہ قوت بخش ہے، اور اس کی مدد سے نہ صرف حیاتین آپ کے جسم میں تحلیل ہوجاتے ہیں بلکہ یہ قوت کی ایک خاص مقدار بھی جسم میں محفوظ رکھتی ہے۔ ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ نوعمر بچوں اور بالغوں کے لئے کم از کم ۲ ½ اونس چکنائی کا روزانہ استعمال نہایت ضروری ہے۔
کھانے کی لذت اور غذائیت میں اضافہ کے لئے ڈالڈا برانڈ وناسپتی گذشتہ ایک پشت سے اس ملک میں مشہور ہے۔ اس کے بنانے میں صحت اور صفائی کے اصولوں کی کڑی پابندی کی جاتی ہے۔ یہ ہاتھوں سے چھوئے بغیر تیار ہوتا ہے، اور مہر بند ڈبوں میں خالص اور تازہ دستیاب ہوتا ہے۔ یہ ڈبے کھجور کے درخت کے نشان سے پہچانے جاتے ہیں۔ اس میں وٹامن "اے" اور "ڈی" کثرت سے شامل ہونے کی وجہ سے اس کی غذائی قوت دوبالا ہوگئی ہے۔
ڈالڈا صحت مند گھرانوں کی روزمرہ غذا کا ایک اہم جزو ہے!
ڈالڈا (برانڈ) وناسپتی
ڈالڈا ایک وناسپتی ہی نہیں بلکہ مکمل غذا ہے!
DALDA
VANASPATI
HVM. 23—193 UD

جلد ۱۲

شمارہ ۹

ستمبر ۱۹۵۹ء

مدیر: رفیق خاور — نائب مدیر: ظفر قریشی

چندہ سالانہ: پانچ روپے ۸ / ر

شائع کردہ: ادارۂ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳، کراچی

فی کاپی: آٹھ آنے

بیادِ قائدِ اعظمؒ:

ایک شخصیت، ایک یاد!

میاں کفایت علی

قیامِ پاکستان سے کوئی دس برس پہلے "اے پنجابی" کے قلم سے "CONFEDERACY OF INDIA" کے نام سے ایک ضخیم کتاب شائع ہوئی تھی جو مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس، منعقدہ لاہور (۱۹۴۰ء) کی جلسہ گاہ، اور تمام برِّعظیم میں اپنی اردو تلخیص کے ساتھ تقسیم ہوئی۔ اور بانیٔ پاکستان کی نظر سے بھی گذری۔ بعد میں اسی مصنف کے قلم سے پاکستان کے موضوع پر متعدد کتابیں شائع ہوئیں۔ اور ان کے قائدِ اعظم سے ذاتی مراسم بھی رہے۔ اسی بنا پر ہم نے موصوف سے التماس کی تھی کہ وہ ہمیں بانیٔ ملت کے بارے میں اپنے تاثرات سے مستفیض فرمائیں۔ چنانچہ وہ اپنے حالیہ گرامی نامے میں تحریر فرماتے ہیں:

"عزیزی۔ کل تمہارا تار ملا۔ چند اوراق قائدِ اعظم پر لکھ کر ارسال کر رہا ہوں۔ ان کی شخصیت کا یہ اندازہ میرے ذاتی تعلق اور تجربہ کی بنا پر ہے۔ ۱۹۴۰ء-۱۹۴۷ء میں تم بھی میرے ساتھ تحریکِ پاکستان میں شامل تھے۔ لہٰذا سب کچھ تمہارے پیشِ نظر ہونا چاہئے۔ کوئی بیس سال کے بعد لوگ مجھے بھول چکے ہوں گے، اور کسی ایسے شخص کا کچھ کہنا کیا معنی دارد؟ میں نے اس مضمون میں قائدِ اعظم سے ایک ملاقات کا حال بیان کیا ہے اور اپنے تاثرات کو قلمبند کرکے بھیج رہا ہوں۔ قائدِ اعظم کا کوئی خط میرے پاس موجود نہیں۔ جو تھے وہ بٹوارہ [illegible] رہ گئے۔ مجھے اس کا افسوس ہے۔ — کفایت علی" بہرکیف ہم ان کا مقالہ یہاں پیش کر رہے ہیں۔ حقائق اور آرا صاحبِ مضمون کے اپنے ہیں۔ (مدیر)

اکثر نامور شخصیتیں تنہا ہوتی ہیں اور وہ اپنے کارنامے تنہا ہی انجام دیتی ہیں۔ قائدِ اعظم کا شمار بھی ان ہی منفرد شخصیتوں میں ہے۔ اس لئے ان کا یہ دعویٰ کہ انہوں نے پاکستان محض اپنے "ٹائپسٹ" کی مدد سے حاصل کیا، بالکل درست تھا۔ ان کی شخصیت اس قدر بلند تھی کہ ان کے ساتھی، ان کے نائب اس تک پہنچنے سے قاصر تھے۔ اور یہ بات کچھ قائدِ اعظم ہی سے مخصوص نہیں۔ اکثر بڑے انسانوں کے سلسلے میں یہی ہوتا چلا آیا ہے۔ ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ کس طرح کسی قائد کے جانشینوں کا چھوٹا پن، ان کی کوتاہ نظری، نااہلی اور اخلاقی و ذہنی پستی اگر اس کی تحریک کے لئے فوری خطرہ کا باعث نہیں ہوتی تو بعد میں کسی نہ کسی موقع پر اس کی تخریب اور انحطاط کا باعث بن جاتی ہے۔ شومیٔ قسمت سے ہمارے یہاں بھی یہی ہوا ہے۔ ایک دو شخصیتوں کو مستثنیٰ کرتے ہوئے ہماری صفِ دوم کے تمام قائد کسی اعلیٰ کردار اور غیر معمولی قابلیت کے مالک نہ تھے۔ ان میں قیادت کی صلاحیتیں مفقود تھیں۔ اس سے قطع نظر کہ وہ اعلیٰ مقاصد کو ادنیٰ اغراض کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانے کی طرف مائل ہوں، وہ قوم کے لئے زیادہ تعمیری نہج پر سوچ بچار کرنے سے قاصر تھے۔ یہ ان کی دانستہ مذمت نہیں، امرِ واقعہ ہے۔ زیادہ تدبر و فراست کی باتوں میں ان پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ کوئی مفید مشورہ دینے کے اہل بھی نہ تھے۔ اس لئے جب وہ ایک دو قائد بھی اٹھ گئے جنہوں نے ابتداءً قوم کی رہنمائی کی تھی، تو مطلع بالکل تاریک ہوگیا اور ہماری نوزائیدہ مملکت کا وہی حشر ہوا جس کے نتائج سے ہم انقلابِ اکتوبر تک دوچار رہے اور جن سے ہمیں "مردے از غیب برون آید و کارے بکند" کے مصداق لفظاً و معناً ایک فرشتۂ غیب نے نجات دلائی۔ قائدِ اعظم کو ایسے نائبین کی موجودگی اور ہمرکابی کا فائدہ صرف اس قدر تھا کہ مخالفین مسلمانوں کے باہمی اتفاق اور ہم آہنگی سے مرعوب ہو جاتے تھے۔ ایسے نائبین کو جس چیز نے قائدِ اعظم کی شخصیت سے وابستہ رکھا وہ ان کے عام بلند کردار اور رائے عامہ کا دباؤ تھا۔ یہ ایک قابلِ لحاظ بات ہے کہ قائدِ اعظم کو اپنے ہمراہیوں کی شخصی اہلیتوں کا پورا پورا علم تھا اور وہ اس کے نتائج و عواقب سے بھی بے خبر نہ تھے۔ پھر بھی ایک صاحبِ عمل انسان کی حیثیت سے انہوں نے یہی قرینِ مصلحت سمجھا کہ وہ ان "ہمرہانِ سست عناصر" سے ان کی صلاحیتوں کے مطابق کام لیں۔

قائدِ اعظم کی غیر معمولی قد آور شخصیت کی وجہ سے ان کے رفقائے کار ان کو سمجھنے میں بالعموم غلطی کرتے تھے۔ ہم نے دوسری صف کے اکثر لیگی لیڈروں کو پس پشت یہ کہتے ہوئے بھی سنا کہ قائدِ اعظم خود پسند اور خود رائے واقع ہوئے ہیں۔ اور ان کی طبیعت میں ضد کا عنصر بدرجۂ اتم موجود ہے۔ لیکن میرا

تجربہ یہ ہے کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ یہ تاثر میں خود اپنے تجربہ سے پیش کرتا ہوں۔ ۱۹۴۲ء کا زمانہ تھا، میں اس وقت دہلی میں تھا۔ اس سال کے اواخر میں میرے عزیز دوست حمید نظامی، چند دکروں کے ساتھ دہلی تشریف لائے اور میرے ہاں ہی ٹھہرے۔ ان کے قیام کے دوران میں ہمارا معمول تھا کہ میں تو صبح نو بجے اپنے دفتر چلا جاتا اور وہ اپنے کاموں کے سلسلے میں نکل کھڑے ہوتے۔ اگر پانچ بجے شام سے پہلے نظامی صاحب اپنے کاموں سے فارغ ہو جاتے تو دفتر میں میرے پاس تشریف لے آتے۔ پانچ بجے شام دفتر بند ہونے پر ہم دونوں کناٹ سرکس سے ہوتے ہوئے واپس گھر پہنچ جاتے۔

ایک شام نظامی صاحب کو قائد اعظم سے ملنا تھا۔ ہمارے درمیان یہ طے پایا تھا کہ میں دفتر سے فارغ ہو کر شام کو سیدھا ۱۰ اورنگ زیب روڈ، جہاں قائد اعظم کی کوٹھی تھی، پہنچ جاؤں اور پھر ہم وہاں سے اپنا کام ختم کرنے کے بعد گھر لوٹ آئیں گے۔ اس شام میری اہلیہ بھی دفتر پہنچ گئیں۔ ہم دونوں نے ٹانگہ لیا اور قائد اعظم کے دولت خانے پر پہنچ گئے۔

وہاں جا کر معلوم ہوا کہ نظامی صاحب ایک گھنٹہ سے قائد اعظم سے تخلیہ میں کچھ ضروری باتیں کر رہے ہیں۔ ہم دونوں مخل ہونا نہیں چاہتے تھے لیکن انتظار کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ قریباً نصف گھنٹہ گذر گیا۔ ہم نے محسوس کیا کہ ان دونوں حضرات کی باہمی گفتگو کے شاید ابھی ابتدائی مراحل بھی طے نہیں ہوئے۔ ہم قائد اعظم کے اسٹینوگرافر کے کمرہ میں بیٹھے تھے۔ اسٹینوگرافر کے علاوہ وہاں مسٹر ٹی۔ آر۔ طوسی بھی موجود تھے۔ چند کرسیاں اور ایک چھوٹی میز جس پر ٹائپ رائٹر رکھا تھا، اس کمرے کا تمام فرنیچر تھا۔ شاید یہی وہ ٹائپ رائٹر تھا جس کی مدد سے قائد اعظم نے پاکستان حاصل کیا تھا! لیکن اس وقت مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی ورنہ میں اس ٹائپ رائٹر کی پوری پوری تعظیم بجا لاتا! خیر، میری اہلیہ کے لئے یہ انتظار کچھ "بورنگ" ثابت ہو رہا تھا چنانچہ وہ میرے کان میں کہنے لگیں "کیوں نہ ہم بھی قائد اعظم سے مل لیں؟"۔ میں نے بات کو ٹالنے کی کوشش کی۔ اس اثنا میں ہمارے کمرے کا دروازہ کھلا اور ہم نے سمجھا کہ نظامی صاحب کی قائد اعظم سے ملاقات ختم ہو گئی ہے لیکن خلاف توقع ایک سرخ و سفید، فربہ اندام نوجوان کو دروازہ میں کھڑا پایا جو چند سکنڈوں تک ہم کو بری طرح گھورتے رہے۔ (اس لفظ کے لئے معافی کا خواستگار ہوں) پھر گھورنے والے صاحب بغیر دروازہ بند کئے لوٹ گئے۔ اور سامنے کا دروازہ، جس کے پیچھے نظامی صاحب اور قائد اعظم بیٹھے باتیں کر رہے تھے، جا کھولا۔ اور پھر اسی بے تکلفی سے اندر جھانکا، پھر دروازہ بند کیا اور گیلری میں سے گزر کر اندرون خانہ تشریف لے گئے۔ دو منٹ بعد پھر واپس آئے۔ کھلے دروازے میں سے ہماری طرف پھر دیکھا، قائد اعظم کے کمرے کے بند دروازے پر نگاہ دوڑائی، منہ بنایا اور باہر لان میں تشریف لے گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ حضرت ایک بہت بڑے لیڈر تھے۔ مگر ان کے اس طریقے اور حرکات سے طبیعت میں قدرے اشتعال پیدا ہو گیا۔ میں نے اپنی اہلیہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا "تم کچھ کہہ رہی تھیں"۔ انہوں نے کہا "بس یہی کہ قائد اعظم سے مل لیں"۔

میں نے اپنا تعارفی کارڈ اسٹینوگرافر کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ کہنے لگے کہ ملاقات نہیں ہو سکتی۔ ہم نے اصرار کیا۔ وہ کارڈ لے کر چلے گئے اور نفی میں جواب لے کر فوراً لوٹ آئے، اور کارڈ مجھے واپس کر دیا۔ کارڈ پر نام تھا "کیپٹن میاں کفایت علی"۔ ہم نے قدرے تامل کیا اور کارڈ پھر ان کے ہاتھ میں دے دیا، اور درخواست کی ایک دفعہ پھر کوشش کریں شاید ہماری قسمت یاوری کرے۔ لیکن اس دفعہ قائد اعظم کی خدمت میں عرض کریں کہ کیپٹن کفایت علی اور "اے پنجابی" ایک ہی شخص کے دو نام ہیں۔ اور "اے پنجابی" ملاقات کا متمنی ہے نہ کہ کوئی فوجی کپتان۔ اب کے کامیابی ہوئی اور ہم بلا لئے گئے۔ قائد اعظم بڑے اخلاق سے پیش آئے۔ سامنے پڑے ہوئے صوفے کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر عام رسمی مزاج پرسی کے بعد فرمانے لگے "آپ کانفیڈریسی چاہتے ہیں، اور ہم پاکستان کے حامی ہیں"۔ میرے کان اس فقرے سے پہلے ہی آشنا ہو چکے تھے۔ طبیعت میں کچھ شک سا پیدا ہو گیا۔ اور میں نے دل ہی دل میں واقعات کی کڑیاں ملانی شروع کر دیں اور فیصلہ کیا کہ اس بات کا فیصلہ آج ہو ہی جانا چاہئے۔ کیونکہ ایسا موقع پھر ہاتھ نہ آئے گا۔ چنانچہ کانفیڈریشن اور فیڈریشن کے باہمی فرق پر بحث شروع ہو گئی۔ اور میری تصنیف "کانفیڈریسی آف انڈیا" کے اصل موضوع پر بھی گفتگو ہوئی۔ ایک معمولی فوجی کپتان کے استدلال سے حقیقت پسند قائد اعظم متاثر ہو گئے اور تسلیم کیا کہ کتاب کا اصل موضوع پاکستان ہی ہے اور نام محض ایک پردہ ہے۔ لیکن مجھے یاد تھا کہ میں کم درجے کے لیڈروں سے یہ فقرہ پہلے بھی سن چکا ہوں۔ چنانچہ میں نے اس پہلے موضوع کے ختم ہونے پر قائد اعظم کے نائبین کی صلاحیتوں پر تبصرہ شروع کر دیا۔ میرا آخری فقرہ یہ تھا "وہ سب نااہل ہیں"۔ اس پر وہ جوش میں آ گئے۔ اور فرمانے لگے "کیا آپ ایماندارا

تو پھر کسی ایک کا نام لے سکتے ہیں جو آپ کی نظر میں نااہل ہو؟" میں نے اس کا جواب یوں دیا: "بہت خوب۔ کیا آپ ان میں سے کسی ایک کا نام لے سکتے ہیں جس کے بارے میں آپ کی دیانت دارانہ رائے یہ ہو کہ وہ کسی کام کا اہل ہے؟"۔

اس پر وہ عظیم المرتبت شخص فکر میں کھو گیا۔ سکوت توڑنے کے لئے میں نے سلسلۂ کلام جاری کیا: "مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کے بعد یہ لوگ آپ کے کئے پر پانی پھیر دیں گے"۔

میری اس بات نے انکو پھر سوچ میں ڈال دیا مگر کچھ توقف کے بعد فرمانے لگے "کیا آپ مجھے بارہ ایسے اشخاص کے ناموں کی فہرست مہیا کر سکتے ہیں جن کو میں پبلک لائف کے لئے تیار کر سکوں؟" میں نے یہ کہہ کر بات "ٹالنے کی کوشش کی کہ" میں تو فوج میں ملازم ہوں، اہلِ کمال کو ڈھونڈ نکالنا میرا کام ہی نہیں۔ آپ اپنے نائب اور معین کا خود ہی بہتر تلاش کر سکیں گے"۔ مگر خلاف توقع انہوں نے کئی بار اس بات پر اصرار کیا کہ میں ایسے لوگوں کی فہرست ضرور ان کو مہیا کروں۔ بالآخر مجبور ہو کر میں نے دو اشخاص کے نام تو اسی وقت پیش کر دئے جنہیں میں خدمتِ پاکستان عقل و دانش اور پختگیٔ کردار کے لحاظ سے قائد اعظم کے تمام نائبین پر سبقت دیتا تھا۔ جب میں دوسرے صاحب کا نام لے چکا تو وہ کہنے لگے "اور تیسرا؟" اس پر میں نے کہا "بعد میں بتاؤں گا"۔ زیرک ہستیوں کا ڈھونڈ نکالنا مشکل ہوتا ہے تو ان کو میدان میں لا کر ان کی صلاحیتوں کو کما حقہٗ کام پر لگانا مشکل تر مرحلہ ہوتا ہے۔ ہمارے حالات ہی کچھ ایسے واقع ہوئے ہیں۔

غرض، مذکورہ گفتگو قریباً دو گھنٹے جاری رہی۔ میں نے قائد اعظم کو نہ تو خود پسند پایا اور نہ خود رائے ہی۔ کیونکہ وہ ایک منطقی رجحان کے آدمی تھے اور صحیح استدلال کی قوت کو فوراً قبول کر لینے میں فراخدل۔ ٹھیک بات کے ماننے میں انہیں کوئی عار نہ تھی۔ افسوس ان کے نائب ان کی شخصیت کا صحیح اندازہ نہ کر سکے۔ مجھے یاد ہے کہ جب بھی میں نے بذریعہ خط و کتابت کوئی صحیح بات ان کی خدمت میں پیش کی تو انہوں نے اسے شرف قبول بخشا۔ یہ برتر و عظیم شخصیت کی دلیل ہے۔

۱۹۳۹ء میں ڈاکٹر سید عبداللطیف (حیدرآباد دکن) کی پاکستان کی اسکیم میری کتاب "کانفیڈریسی آف انڈیا" کی اشاعت سے پہلے شائع ہو چکی تھی مگر ان کی اسکیم قطعی ناقابلِ عمل تھی۔ اور اس بارہ میں علامہ اقبالؒ کے پیش کردہ "خیال" سے دست و گریباں۔ چنانچہ میں نے ان کی اسکیم پر ایک خط میں تبصرہ بھی کیا تھا اور شاید یہی اس اسکیم کے مسترد کئے جانے کا باعث بنا۔ ورنہ لیگ والوں نے تو مذکورہ ڈاکٹر صاحب کو لاہور آ کر اپنی اسکیم پیش کرنے کی دعوت تک دے دی تھی۔ اس دعوت پر وہ لاہور تشریف بھی لائے اور "ممدوٹ ولا" میں لیگی حضرات کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا اور ان سے داد بھی حاصل کی۔ اسی طرح سر سکندر حیات کی "زونل اسکیم" بھی تھی جس کے استرداد کی تہہ میں بھی کچھ ایسے ہی حالات تھے۔ سر سکندر کی اسکیم کی غرض پاکستان کی تنسیخ تھی۔

بعض غیر پاکستانی اہلِ قلم نے بھی قائد اعظم پر اس قسم کے الزام عائد کئے ہیں۔ لیکن انہوں نے بھی ان کی شخصیت کا صحیح اندازہ لگانے میں غلطی کی ہے، اور اپنی کم نظری کے باعث ان سے بے انصافی کی ہے۔ ان کی وفات کے بعد جو کچھ پاکستان پر بیتی وہ قارئین کے پیش نظر ہے۔ اور وہ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس وقت ہم لوگوں کے اندیشے کس قدر بجا تھے اور بعد کو واقعی یاروں نے ان کے عظیم کاموں پر کس طرح پانی پھیر دیا اور میرا تو خیال یہ ہے کہ لیگی حضرات نے تو بساطِ پاکستان کو اُلٹ ہی دیا تھا۔ ویسے بحمد اللہ پاکستان قائم ہے مگر یہ ایک علیحدہ بات ہے۔ ہم اس کے لئے ایسے عناصر کے ممنون ہیں جو پیشہ ور سیاست داں نہ تھے اور ان کی طرف توقع نجات کے لئے شاید عام نظریں بھی نہ پڑتی تھیں۔ مگر یہ صاحبِ سیف لوگ صحتِ فکر اور عمل صالح کی تیغ بے دریغ لے کر نکلے اور ایک عظیم قائد کی رہبری میں انہوں نے ایک پُرامن انقلاب لا کر پاکستان کو بر وقت بچا لیا۔ اور قائدؒ کے پاکستان کو پھر ایک حقیقت بنا کر ہمارے لئے ایک قابلِ فخر وطن و مامن بنا دیا ؏

جب ناؤ ڈگمگائی پاس آ گیا کنارا
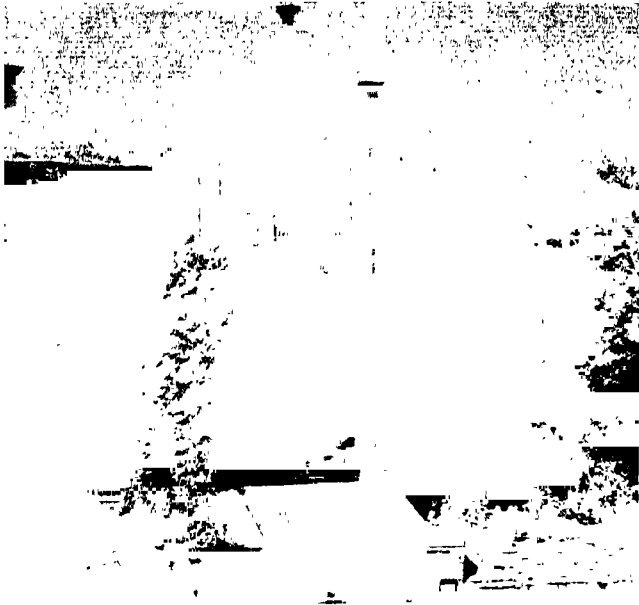
★

لکڑی کا بنگلہ (جہاں قائد اعظم ٹھہرے تھے)

دیہی بستی

چراگاہ

زیارت
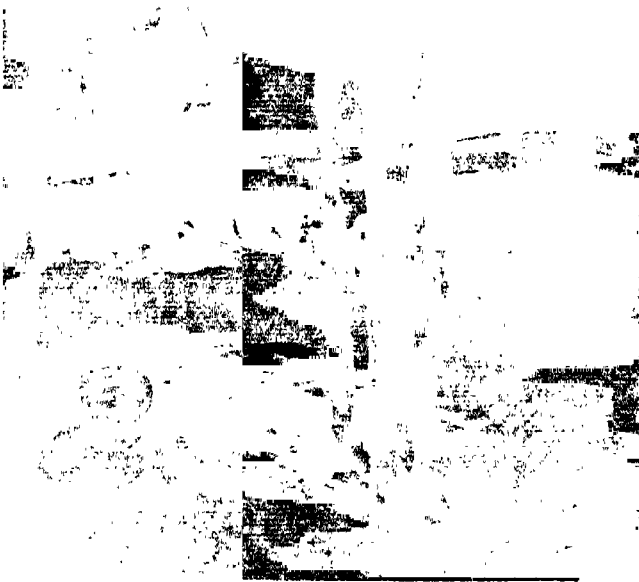
(قائد اعظم رح کی آخری قیام گاہ)

خوشنما منظر
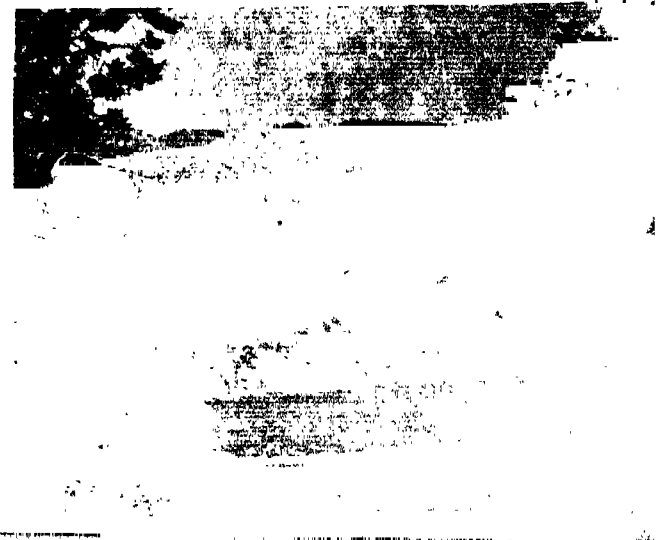
آستانہ کے سامنے زائرین کا ہجوم

میلہ کی گہما گہمی

عرس شاہ عبداللطیف بھٹائی رح

(اجتماعات اور میلہ کی رونق)

'' ملاکھڑا '' (کشتی)

روضہ کے سامنے جھیل پر چہل پہل

قائدِ اعظمؒ کی آخری قیام گاہ

(زیارت)

مشتاق احمد نیّر

گاڑی کا بڑی بے چینی سے انتظار ہو رہا تھا۔ اسٹیشن پر ہمارے سامان کا ڈھیر لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ خدا خدا کر کے گاڑی آئی۔ ہم نے کوئٹہ کے ڈبہ میں سامان کو ترتیب سے رکھا اور اطمینان کا سانس لیا۔ گرمی کی شدت سے برا حال ہو رہا تھا اور غضب یہ ہوا کہ ڈبہ بھی کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

سب دوستوں نے مختلف جگہوں پر قبضہ جمایا اور ہم گاڑی کے چلنے کا انتظار کرنے لگے۔ انجن نے آخری سیٹی دی اور ہم ملتان کو الوداعی نظروں سے دیکھنے لگے۔ آہستہ آہستہ اسٹیشن ہماری نظروں سے دور ہونے لگا اور ہم زیارت کے حسین تصورات میں کھو گئے۔

زیارت کو ہم نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا لیکن اس کا عکس ہمارے دماغوں میں ضرور تھا۔ قائدِ اعظمؒ کی محبوب جگہ اور ان کی زندگی کا ایک جزو زیارت جس کو ہم دیکھنے جا رہے تھے دراصل یہ ہم طلباء کے اپنے ذوق و شوق کا نتیجہ تھا کسی کی سربراہی میں نہیں۔ اسی لئے ہم پروفیسر صاحبان کی کڑی نگرانی سے بھی آزاد تھے۔ اس سفر کو ایک "اسٹڈی ٹور" یعنی سفر برائے تلاش و تحقیق کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ کیونکہ ہمارا خیال کوئٹہ اور زیارت جیسے مقامات سے ایسے پتھر یعنی "کرومیٹ" لانا تھا جن سے دھاتیں وغیرہ نکلنے کا امکان ہو۔

گاڑی کی رفتار ہر لحظہ تیز ہو رہی تھی۔ گرمی کی وجہ سے ہم سب کھڑکیوں ہی میں لٹک رہے تھے اور پنکھے کی ہوا یوں لگتی تھی جیسے سخت لو چل رہی ہو۔ گاڑی کی رفتار میں پھر کمی ہونی شروع ہوئی اور ہماری پریشانی اور بڑھنے لگی۔ کیونکہ آنے والے اسٹیشن پر زیادہ بھیڑ کی توقع تھی۔ جب اسٹیشن پر گاڑی کھڑی ہوئی تو ہم نے گارڈ سے اپنی مشکلات کا ذکر کیا۔ اس نے ہمیں ایک چھوٹا سا کمپارٹمنٹ خالی کروا دیا اور یوں ہماری مشکلیں آسان ہو گئیں۔ گاڑی نے پھر رینگنا شروع کیا۔ اور ہم کچھ دیر کے لئے باہر کے مناظر میں کھو گئے۔ گاڑی بڑی تیزی سے درختوں اور جھاڑیوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی جا رہی تھی۔ اور ہم زیارت کی طرف بڑھ رہے تھے۔

ہم تعداد میں تقریباً سات تھے اور خوش قسمتی سے تقریباً سب ہم جماعت۔ کالج کے کام سے فارغ ہو چکے تھے اس لئے سب کے چہروں سے خوشی جھلکتی تھی۔ ہم نے اپنی پارٹی کا سردار سعید ظفر کو بنایا کیونکہ وہ ہم سب میں زیادہ سمجھدار سمجھے جاتے ہیں۔ ابھی تک وہ کھڑکی ہی میں لٹک رہے تھے۔ لیکن گرمی نے انہیں وہاں بھی نہ ٹھہرنے دیا۔ اور وہ اندر آ دھمکے اور آتے ہی فرمانے لگے کہ اس طرح بیٹھے رہنے سے تو اتنا لمبا سفر کٹنا مشکل ہے۔ چنانچہ یہ مختصر قافلہ دو حصوں میں بٹ گیا یعنی ہماری دو پارٹیاں بن گئیں۔ ایک تاش میں اور دوسری لوڈو میں کھو گئی۔

شام کے سائے بڑھ رہے تھے اور گاڑی چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں کو چھوڑتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ رات کو ساڑھے گیارہ بجے ہم روہڑی پہنچے۔ یہاں پہلی بار ہم خوش گپیوں میں مشغول ہوئے اور ایک بار پھر قہقہے عود کر آئے۔ تقریباً سوا بارہ بجے ہماری گاڑی سکھر بیراج سے گذر رہی تھی اور وہ عظیم الشان منصوبہ ہماری نظروں میں پھر گیا جس نے ریگستانِ سندھ میں زندگی کی ایک نئی روح دوڑا دی ہے۔ اور نہ صرف مقامی لوگوں کے لئے خوشحالی کی نوید ہے بلکہ پاکستان بھر کے لئے نہایت وسیع امکانات لئے ہوئے ہے۔ اس سے ہماری ملت کی گریز پا ترقی، جدوجہد اور عزم و ارادے سے ایک نہایت ولولہ انگیز احساس پیدا ہوا۔ دریائے سندھ خاموش تھا، بالکل خاموش۔ جیسے یہ قدیم دریا ہمارے ملک کی گذری ہوئی تاریخ کی یادوں میں گم ہو اور اپنے پر شکوہ سینے میں تہذیب و تمدن کے ان گنت نقوش لئے ہوئے ہو یا پھر وہ آئندہ عروج و کامرانی کے خواب دیکھ رہا ہو جن کو دورِ نو نے پیغام نمو دیا ہے۔

سکھر سے ہمارے ڈبے میں دو فوجی آ گئے جنہیں ہم نے بڑی خوشی سے سوار کیا اس لئے کہ ان کے چہرے ان کے مضبوط جسم ہماری زندگی میں ایک نئی سطوت اور وقار کے آئینہ دار ہیں ہم کیرو کے شاگرد یا مسٹر کلک کے بہت شوقین تھے۔ اس لئے ہم نے کہا چلو ان فوجیوں کے ہاتھ ہی دیکھیں یقیناً ان کی لکیروں میں ترقی کے ساتھ ملّی عروج و ترقی کی پگڈنڈیاں اور شاہراہیں بھی ہوں گی۔ اور ان کی تہہ میں اس کی صاف صاف جھلکیاں دکھائی دیتی ہوں گی جیسے کہ ان کے چہروں سے صاف ظاہر تھا۔ ان ناموس ملّت کے نگہبانوں سے مل کر دل بہت خوش ہوا اور راستہ بڑے مزے سے یوں کٹنے لگا جیسے وہ ہمیں میں سے ہوں۔ اور ہمارے اپنے گھر کے لوگ ہوں اور حق یہ ہے کہ انہوں نے اس کا آگے چل کر پورا پورا ثبوت بھی دیا کیونکہ انہوں نے باقی سفر میں ہمیں بہت سی سہولتیں بہم پہنچائیں۔

رات کا ایک بج رہا تھا۔ سوائے گاڑی کی آواز کے اور کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ باہر تاریکی تھی اور ہم کھیل سے اکتا کر بستروں کی طرف لپکے اور یہ نہیں کہہ سکتے کہ کب سوئے۔ صبح تقریباً چھے بجے ہم سبّی پہنچے، وہی مقام جو اپنی قیامت آفریں گرمی کے لئے مشہور ہے اور جہاں چیل واقعی انڈا چھوڑ جاتی ہوگی۔ ہم نے منہ ہاتھ دھویا اور اسٹیشن پر ناشتہ ڈھونڈنے لگے لیکن یہاں روٹی تو درکنار چنے بھی میسر نہ تھے۔ مجبوراً کچھ پھل جو ہم ملتان سے ساتھ لائے تھے کھا کر ناشتہ کیا۔ یہاں سے پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ ہماری گاڑی میں دو انجن لگے اور آہستہ آہستہ گاڑی منزل مقصود کو روانہ ہوئی۔ سبّی سے کوئٹہ تقریباً سو میل کا راستہ ہے جس کو گاڑی سات گھنٹوں میں طے کرتی ہے راستے میں تقریباً ۲۰ سرنگیں آتی ہیں۔ ایک بجے دوپہر کو ہم کوئٹہ پہنچے۔ بھوک کے مارے بے دم ہوئے جاتے تھے اور اس بارے میں چوہوں کا مشہور محاورہ صحیح ثابت ہو رہا تھا۔

سامان باہر نکالا اور تانگہ میں سوار ہو گئے۔ قندھاری بازار میں رہائش کا انتظام کیا ہوا تھا۔ یہاں ایک فلیٹ میں ہمیں دو کمرے مل گئے۔ ہر چیز کا معقول انتظام تھا۔ نہا دھو کر ہم کھانا کھانے ہوٹل میں چلے گئے۔

کوئٹہ پہاڑ کے دامن میں واقع ہے۔ یہ ایک بڑا ہی خوبصورت شہر ہے۔ چاروں طرف آتش فشاں پہاڑ فصیل کا کام دیتے ہیں۔ ہوٹلوں کی کثرت اس کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اگر کوئٹہ کو پھلوں کی زمین اور ہوٹلوں کا شہر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا ہم دو دن کوئٹہ میں رہے۔ اور آس پاس کے علاقے کی خوب سیر کی۔ ہڑک، جہاں سے کوئٹہ کو پانی مہیا کیا جاتا ہے اور خوبصورت ھنا جھیل دیکھنے کی چیزیں ہیں۔ ان سے طبیعت بے حد بشاش ہوئی اور جی چاہا انہیں کے سحر آفریں ماحول میں پہروں بیٹھے رہیں۔ اسٹاف کالج اور بروری سینیٹوریم انسانی سعی و کوشش کو خراج تحسین ادا کرتے ہیں۔ تیسرے روز ہم زیارت روانہ ہوئے جو کوئٹہ سے ۷۶ میل شمال مشرق میں ہے۔ ہم صبح ۹ بجے بس میں بیٹھے اور تین بجے زیارت پہنچے۔

زیارت ایک چھوٹا سا پہاڑی گاؤں ہے جو سطح سمندر سے آٹھ ہزار آٹھ سو فٹ اونچا ہے جیسا کہ اس کی اونچائی سے ظاہر ہے چھ ماہ تک یہاں دس گیارہ فٹ برف پڑتی ہے۔ اور انہیں مہینوں میں چار یا پانچ چوکیدار نگرانی کے طور پر رہ جاتے ہیں۔ لوگ بہت ایماندار ہیں۔ رات کو عموماً لوگ دروازہ کھلا چھوڑ کر ہی سوتے ہیں۔

ہر طرف سبزہ زار، ہر سمت سبزہ ہی سبزہ، جیسے یہ سبزہ ہی کا شہر ہو۔ زیارت کا نام دو فقیروں کی وجہ سے مشہور ہوا ہے جن میں سے ایک کا مزار تو زیارت ہی میں ہے۔ اور دوسرے کا زیارت سے چار میل دور۔

ہم نے پہلے ایک ہوٹل میں قیام کیا لیکن اس کی فضا کچھ راس نہ آئی۔ بہت بد دل ہوئے۔ خیال آیا شاید ہمیں بے نیل و مرام ہی واپس جانا پڑے۔ مگر ایک کرم فرما کے توسط سے ہم ایک اعلیٰ پولیس افسر کے مہمان بن گئے۔ جنہوں نے نہ صرف رات کا کھانا کھلایا بلکہ رہائش کے لئے ایک بنگلے کا انتظام بھی کر دیا۔ اور ہمیں ایک بار پھر احساس ہوا کہ ہمارے ملک میں افسران کس قدر خوش خلق اور مردم نواز ہیں۔ اس کے بعد یہ افسر، راجہ صاحب، (آخر ان کا نام لے دینے میں کیا حرج ہے) ہر روز ہمارے ہاں آتے اور جس چیز کی ضرورت ہوتی فوراً پوری کر دیتے۔ بہرحال ہم ابتدائی حالات کے سبب پہلے دن زیارت کی صحیح زیارت سے محروم رہے۔

زیارت کی پہلی رات بڑی بے کیف تھی۔ سفر کی دوسری ٹریجڈی نے تو ہمیں بالکل ہی سنجیدہ بنا دیا تھا۔ دسویں کا پھیکا چاند آسمان پر دعوتِ نظارہ دے رہا تھا۔ لیکن ہمارے لئے اس رات کی رنگینیاں بے معنی تھیں۔ لحاف اوڑھے ہوئے پڑے تھے اور سردی کا یہ عالم کہ لحاف بھی چادر سے

زیادہ اہمیت نہ رکھتے تھے۔ ہمارے لئے تو زیارت میں "گرمیوں کی سردی" تھی سب لحافوں میں دبکے پڑے تھے۔ اگر کوئی شرارت کے لئے اپنا سر بھی باہر نکالتا تو پھر اندر کر لیتا۔ مجھے اس وقت پنجاب کی گرمی یاد آتی۔ کتنا فرق تھا زیارت کی رات اور پنجاب کی رات میں۔ تھوڑی دیر بعد ہم میٹھی نیند کے مزے لوٹ رہے تھے۔ اس طرح خوابوں میں ایک بار پھر گھر کی سیر، ریل کا سفر اور نہ جانے کن کن دنیاؤں کی زیارت ہو گئی۔

صبح ہوئی۔ غضب کی سردی تھی لیکن ہمارے من میں وہی پرانی "گرمی" تھی۔ ٹھنڈے پانی سے غسل کیا طبیعت "صاف" ہو گئی۔ آئندہ صبح نہانے سے توبہ کی۔ نوکر نے ناشتہ بنا کر دیا۔ اور ہم کپڑے بدل کر گلاب خان کی قیادت میں قائدِ اعظمؒ کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ شخص اچکزئی قبیلہ کا ایک پٹھان تھا۔ قائدِ اعظمؒ جتنے عرصہ زیارت رہے وہ بطور خانساماں کے ان کی خدمات بجا لاتا رہا۔ ہمارے پانچ روزہ قیام کے دوران میں وہ ہمارے ساتھ ایک رہنما کے طور پر رہا تھا اور مختلف مقامات کی سیر کروائی۔ اگر ہم کہیں کہ ہماری زیارت سے دلچسپی صرف اس کی وجہ سے تھی تو بیجا نہ ہوگا۔

قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کی رہائش گاہ ہماری جائے قیام سے تقریباً ایک فرلانگ اوپر کو تھی۔ پہاڑی پر ایک چھوٹا مگر خوبصورت بنگلہ تھا۔ لکڑی کا بنا ہوا یہ بنگلہ اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ اس نے بھی کبھی بہار دیکھی تھی۔ ماحول اداس تھا۔ جیسے اس ماحول کو قائدِ اعظم اور صرف قائدِ اعظم کا انتظار تھا۔ لیکن اس اداسی میں بھی مسرت و شادمانی کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ اس لئے برسوں بعد ایسی فضا پیدا ہو گئی ہے جس میں قائدِ اعظم کے خواب حقیقی معنوں میں شرمندۂ تعبیر ہو سکیں اور ایسی سرزمین میں جو ویران ہو چلی تھی پھر سے بہار آ رہی ہے۔ ہم نے وہاں مختلف جگہوں کے فوٹو لئے۔ کچھ دیر قائدِ اعظمؒ کی یاد میں کھوئے رہے۔ کتنا مختصر تھا یہ بنگلہ جس میں اتنی عظیم ہستی قیام کر چکی تھی۔ ایک پرسکون ماحول۔ ایک عجیب شام ایک موہوم اور عجیب سی اداسی اور عجیب سی مسرت۔ لان میں اخروٹ اور سیب کے درخت شاہد تھے کہ کبھی ان کے نیچے بھی کوئی بیٹھا تھا گویا اس زبان ماضی سے کہہ رہی تھی کہ میں بھی قائدِ اعظم کے قدم چومنے کا شرف حاصل کر چکی ہوں۔ ایک ہمدرد انسان جس کے دل میں سوائے قوم کی بھلائی کے اور کوئی خیال نہ تھا۔ گلاب خاں نے ہمیں بتایا کہ آخری ایام میں بھی جب قائدِ اعظمؒ کی طبیعت علیل تھی اور ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش نے آپ کو کام کرنے سے منع کر دیا تھا، وہ رات کے دو دو بجے تک اپنی میز پر کام کرتے دکھائی دیتے تھے۔ ان کے چہرے پر کبھی بھی مسکراہٹ نہ دیکھی جاتی۔ کون جانے ان کی سنجیدگی میں کون سا راز پنہاں تھا۔ گلاب خاں نے مزید بتایا کہ جب ہم باورچی خانے میں یا کسی اور جگہ کام کیا کرتے تھے تو قائدِ اعظمؒ وہاں آ جایا کرتے اور ہم سے استفسار کرتے۔ کیا ہم موجودہ زندگی سے خوش ہیں؟۔ ایک بڑا انسان جس نے ملک کے بہت معمولی لوگوں کو قوم کا صحیح معیار تصور کیا۔ وہ جانتے تھے کہ یہی وہ لوگ ہیں جن کے کندھے ملک کا بار اٹھائے ہوئے ہیں۔ قائدِ اعظمؒ کی بیماری کا ذکر کرتے ہوئے گلاب خاں نے کہا جب آپ بیمار ہوئے تو آپ کو زیارت سے کوئٹہ لے جایا گیا۔ ۷۰ میل کے راستے میں قدم قدم پر لوگ اپنے محبوب قائدِ اعظمؒ کا آخری بار چہرہ دیکھنے کے لئے بے قرار تھے۔ آپ نے ہر شخص کو سلام کا جواب دیا۔ یہاں تک کہ جب کوئٹہ میں اتنی طاقت بھی نہ رہی کہ آپ اٹھ سکیں تو آپ کی ہدایت پر آپ کے ہاتھ کے نیچے ایک تکیہ رکھ دیا گیا۔ تاکہ آپ اپنے لوگوں کے سلام کا جواب دے سکیں۔ کتنی حیرت ہے کہ ہمارے قائدِ اعظمؒ کو اپنی قوم کی ایک معمولی خواہش کا اتنا پاس تھا۔ قائدِ اعظم کی موت نے زیارت کو سوگوار کر دیا۔ ہر راستہ اب بھی قائدِ اعظمؒ کو پکارتا ہے۔ کاش قائدِ اعظمؒ اب بھی ان کی پکار کو سن سکے۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ اس پکار کے لئے ہمیشہ گوش بر آواز ہیں۔ عالم بالا میں بھی ان کی بہترین تمنائیں اپنی قوم، اپنے لوگوں کے لئے وقف ہیں اور یہ انہیں کی برکت ہے کہ حالات نے پھر ایک زبردست کروٹ لی ہے اور پاکستان ایک سرے سے دوسرے سرے تک قائدِ اعظمؒ ہی کے خلد آثار خوابوں کا عکس معلوم ہوتا ہے۔

ہم اس جگہ کافی دیر تک ٹھہرے رہے۔ اس کے بعد کمشنر ہاؤس دیکھنے چلے گئے۔ پھر ہمارا معمول ہو گیا کہ ہم ہر روز قائدِ اعظمؒ کی رہائش گاہ پہ جاتے اور کافی دیر وہاں بیٹھے رہتے۔ آخر میں "سنڈیمان تنگی" یعنی سنڈیمان آبشار دیکھنے گئے۔ یہ آبشار زیارت سے چار میل دور دو پہاڑوں کو عبور کرنے کے بعد آتا ہے۔ ایک معمولی مگر خوفناک آبشار ہے جو بالکل پہاڑوں کے اندر ہے۔ وہاں سے ہم نے وہ پتھر بھی لئے جن سے کوئلہ، لوہا، کرومیم وغیرہ نکلتا ہے۔ چقماق یہاں عام ہے جس کو رگڑنے سے چنگاریاں نکلتی ہیں۔ ہم نے اس جگہ کے بھی کئی فوٹو لئے اور اگلے روز کوئٹہ آ گئے اور اس کے بعد ملتان روانہ ہو گئے۔ کیونکہ یومِ استقلال اپنے شہر ہی میں منانے کا پروگرام تھا۔ اور حق یہ ہے کہ زیارت میں بابائے ملتؒ سے روحانی ربط اور تازگی و بشاشت پیدا کرنے کے بعد اس تقریب کو منانے میں بھی ایک خاص لطف تھا۔ نہ معلوم اس کی زیارت نے قائدِ اعظمؒ سے رشتۂ عقیدت استوار کر کے ہمارے دلوں میں کیا جوت پیدا کر دی کہ ان میں اب تک ایک روشن فضا نظر آتی ہے حالانکہ ہم کو زیارت کی پرکیف و پرسکون فضا کو خیرباد کہے مدت ہو چکی ہے ؏

جہاں تاب

مجید شاہد

وقت ہے جملہ اسبابِ عالم کی تشکیل و تغیر کا محورِ بے نشاں
وقت ہے صدیوں، قرنوں، زمانوں کے آئندہ و رفتہ حالات کا رازداں

وقت کجرو بھی ہے برق رفتار بھی، وقت خاکہ ہے ترتیبِ حالات کا
وقت صورت گرِ دورِ ایّام ہے، وقت راوی ہے جملہ روایات کا

وقت ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہو جلوۂ صبح بھی منظرِ شام بھی
وقت ہر داستاں کا ہے آغاز بھی، وقت ہے ہر کہانی کا انجام بھی

وقت نے کتنے منفی و مثبت خد و خال اُبھارے ہیں انساں کی تصویر کے
وقت نے جاوداں زندگی کے سنہرے اصول و ضوابط مرتب کئے

وقت جغرافیائی حدوں میں مقید نہیں بلکہ جغرافیائی حدیں
وقت ہی کے سہارے نکھرتی سنورتی رہیں ہر زمانے میں ہر دور میں

داستانیں، حکایات، قصے، روایات، غرضیکہ جتنے بھی موضوع تھے
وقت نے کہنہ تاریخ کے سادہ اوراق و ابواب کو خود مہیا کئے

★

کتنی صدیاں ہوئیں اک جوانِ عرب آکے دیبل کے ساحل پہ اترا تھا جب
چشمِ افلاک شاہد ہے اس امر کی وقت ہی نے کیا تھا اسے منتخب

تاکہ پیغامِ حق سندھ سے ہندیوں کو سنائے وہ رمز آشنائے حرم
اور پھر ہند کی وسعتیں رفتہ رفتہ ہوئیں آشنائے نوائے حرم

وقت بڑھتا رہا اور پیشانیٔ ارضِ ہندوستاں پر یونہی دمبدم
ثبت ہوتے رہے، ماند پڑتے رہے کچھ نئے کچھ پرانے نقوشِ قدم

★

مدتوں کے تعطل کے بعد ایک ایسی ہی بھرپور انگڑائی لی وقت نے
سندھ ہی کے افق پر نمودار جب وہ ستارہ ہوا جس کی تنویر سے

ابتدا میں تھی ناآشنا ہر نظر — اس حقیقت کی لیکن کسے تھی خبر
اس ستارے کی سمٹی ہوئی روشنی اصل میں ہے دلیلِ نمودِ سحر

اے وطن، کیا خبر تھی کہ اُس کی ضیا سے فضا تیری ہوگی منور کبھی
پردۂ ظلمتِ شب سے ابھرے گا وہ آفتابِ جہاں تاب بنکر کبھی

★

اے وطن، وقت کی اس ادا پر ہمیں ناز ہے اور بجا طور پر ناز ہے
کیونکہ یہ روشنی، یہ سماں، یہ سحر وقت کی گردشوں ہی کا اعجاز ہے

تاریخ، تہذیب اور پاکستان

سید محمد تقی

پاکستان کا قیام تاریخ کا کوئی اتفاق نہیں تھا۔ تہذیب جن متعین ثقافتی راہوں سے گذر رہی تھی ان کا لازمی تقاضہ ایک ایسے تہذیبی منطقہ کا قیام تھا جو ہندی عرب ثقافتی مرکب کا امن بن سکے لیکن پاکستان کے قیام کے ۱۲ سال بعد بھی یہ بات عجیب بلکہ افسوسناک ہے کہ ان تہذیبی و ثقافتی عناصر کا تجزیہ کرنے کی کوئی ٹھوس سعی نہیں کی گئی جو اس عہد آفریں واقعہ کا سبب بنے تھے۔ وہ واقعہ جو برکوچک کے عظیم تہذیبی تصادم میں عرب ہندی تہذیبی ملغوبہ کو بچانے کی کامیاب سعی کی حیثیت رکھتا تھا۔

مارچ ۱۹۴۰ء سے لیکر اگست ۱۹۴۷ء تک برصغیر کے سیاسی حلقے پاکستان کے مطالبہ کے سلسلہ میں جن بحثوں میں الجھے رہے وہ یک قومی اور دو قومی تصور سے متعلق بحثیں تھیں۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی جو متحدہ ہندوستان کی حامی تھی' اس نظریہ پر مُصر تھی کہ ہندوستان ایک ہی قوم کا وطن ہے' اس لئے برصغیر کی تسلیم کا مطالبہ غیر صحیح ہے۔ اس کے برعکس مسلم لیگ کا موقف یہ تھا کہ ہندوستان ایک سے زیادہ اقوام کا امن ہے، اس لئے مسلم ہندوستان کا حق خود اختیاری کا مطالبہ بالکل جائز ہے۔ مسلمانان ہند ایک قوم تھے یا نہیں' یہ بحث سیاسیات سے ایک قدم پیچھے ہٹ کر سماجیات کے دائرے میں داخل ہو کر کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح ہندوستان کے ایک قوم ہونے نہ ہونے کی بحث بھی سماجیات کے اساسی اصولوں سے تعلق رکھنے والی بحث ہے۔

انسان کی معلومہ تاریخ کو جو گذشتہ چھ ہزار سال کے عرصہ پر پھیلی ہوئی ہے' آپ دو طرح سمجھ سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ اسے تہذیب کے ایسے بہاؤ سے تعبیر کریں جو وادیٔ نیل' دجلہ و فرات کے ساحلی سبزہ زاروں اور وادیٔ سندھ کے زرخیز نخلستان سے اٹھ کر بنی نوع انسان کو مادی راحتیں مہیا کرتی ہوئی مغربی یورپ اور امریکہ کے شاندار محلوں یا ماسکو اور پیکنگ کی ان فیکٹریوں پر اختتام پذیر ہوا جہاں مادی راحتوں کے مہیا کرنے کی زبردست جدوجہد کی جا رہی ہے۔ تاریخ کے خطِ مستقیم پر ارتقار کا یہ نظریہ انسان کی مربوط فکر کے لئے بڑا دل خوش کن معلوم ہوتا ہے۔ تاریخ کی اس تعبیر کے پیشِ نظر انسانی تہذیب' مادی آسائشوں کے حصول کی جدوجہد سے عبارت ہے۔ اس نظریہ کی رو سے ہندوستان کے باشندوں کو متحدہ طور پر اپنی مادی آسائشوں کے حصول کی سعی کرنی چاہیئے تھی جس کے لئے انگریزوں کی غلامی سے آزادی ناگزیر تھی۔ تاریخ کی یک تہذیبی تعبیر کا یہ نظریہ مارکس کے مادی تعبیر کے نظریہ سے بہت ہم آہنگ ہے لیکن یہ حیرت انگیز اتفاق ہے کہ مارکس جیسے ذہین مبصر کی نظریں مسئلہ کے اتنے وسیع اطلاقات تک نہ پہنچ سکیں اور وہ تاریخ کی تعبیر کی بحث میں مسائل کے مذکورہ مضمرات کو نہ سمجھ سکا۔ مارکس ہی کی طرح آل انڈیا کانگریس کے وہ زعماء بھی جو مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان کے مخالف اور غیر شعوری طور پر اسی قسم کی تہذیبی تعبیر کی اساس کو اپناتے تھے' مسائل کی اُن پیچیدگیوں کو نہ سمجھ سکے جو اُن کے موقف سے قدرتی طور پر پیدا ہوتی تھیں۔ مسائل کے ان پہلوؤں سے مارکس کی ناآگہی کا یہ نتیجہ نکلا کہ اسٹالین نے ۱۹۱۱ء میں قومیتوں کے حق خود اختیاری کا تصور پیش کیا جو مختلف قومیتوں کے وجود کا اعتراف تھا لیکن مختلف قومیتوں کا تصور مختلف تہذیبی نمونوں کے وجود کو مستلزم ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی تہذیب ایک نہیں بلکہ وہ متعدد نمونے' متعدد نشوونما رکھتی ہے۔ ساتھ ہی اس کا یہ بھی مطلب تھا کہ تہذیب صرف مادی آسائشوں کے حصول کی جدوجہد سے عبارت نہیں ہے بلکہ وہ کچھ اور بھی ہے جو ایک قومیت کو کسی دوسری قومیت سے ممتاز کرتی ہے۔ مارکس اور اسٹالین کی طرح آل انڈیا کانگریس کے زعماء بھی اپنے موقف کے منطقی نتائج کو نہ سمجھ سکے۔ متحدہ ہندوستان کے نظریہ کا تحت شعوری پس منظر صرف یہی تھا کہ ہندوستان کے باشندے مادی آسائشوں سے محرومی میں مشترک ہیں۔ اس لئے انہیں متحد ہو کر غلامی کے خلاف منظم ہونا چاہیئے لیکن اگر یہی اشتراک' یک قومی نظریہ کی دلیل بن سکتا تھا تو پھر زیادہ منطقی نعرہ وہ ہونا چاہیئے تھا جو مارکس نے دنیا کے مزدوروں کو سکھایا تھا کہ عالم کے محروم عوام متحد ہو جاؤ۔ یوں تاریخ کے بہاؤ کو صرف یک تہذیبی جدوجہد خیال

کرنے کی صورت میں ہندوستان کے یک قومی ہونے کا نظریہ صحیح قرار نہیں دیا جاسکتا کہ اس صورت میں ہندوستان ہی تنہا ایک قوم نہیں تھا، ساری دنیا ایک ہی قوم تھی۔

تاریخ کو یک تہذیبی بہاؤ تعبیر کرنے کا تصور کئی ناقابل حل دشواریوں سے دوچار ہوتا ہے۔ سب سے پہلے اس کی رو سے جنوبی امریکہ کی قدیم تہذیبوں کو تاریخی بہاؤ سے ایک غیر متعلق حقیقت گردانا پڑے گا اور جنوبی امریکہ کی قدیم تہذیبوں ازٹک اور انکاس کے باشندوں کی اس دلیل کا جواب دینا مشکل ہوجائے گا کہ تاریخ کی ارتقائی رفتار اُس وقت ختم ہوگئی جب قدیم دنیا کے باشندوں نے امریکہ کو دریافت کیا اور ہسپانوی آبادکاروں نے جنوبی امریکہ کی پرانی تہذیبوں کو مٹانے پر کمر باندھی۔ تاریخ کے خط مستقیم پر ارتقاء کا یہ نظریہ، جو جدید عہد کے انسان کے غرور اور خود پرستی کی علامت ہے، اپنی منطق ڈارون کے نظریۂ ارتقاء سے حاصل کرتا ہے۔ ڈارون کا نظریۂ ارتقاء جو علمی سائنسی ضرورتوں کے لئے کتنا ہی ناگزیر کیوں نہ ہو، اعلیٰ فکری سطح پر انسان کے اس نسلی غرور کی پیداوار ہے جس کی رو سے یہ بھیانک وسعتوں والی کائنات صرف مغربی یورپ اور ماسکو و پیکنگ کے نظریہ بازوں کو وجود میں لانے کے لئے اربوں سال سے متحرک رہی ہے۔ کچھ بھی ہو اتنا تو بالکل صاف ہے کہ انسان کی بزرگی و برتری اور کائنات کی ساری حرکت کو ارتقاء کے محترم فرزندوں، آئزن ہاور اور خروشچیف کو پیدا کرنے سے مخصوص کر دینے کا یہ نظریہ بنانے والے حضرات نے اپنا نظریہ گھڑتے وقت سب سے پہلے ذی حیات، وائرس (VIRUS) سے کوئی مشورہ نہ لیا تھا، اس لئے اگر وائرس کی رائے اُن سے مختلف ہو تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیئے۔

تاریخ کی تعبیر کا دوسرا انداز ہر تہذیب کو ایک جداگانہ اکائی خیال کرتا ہے جو کسی دوسری تہذیبی اکائی کا ضمیمہ نہیں بلکہ بجائے خود ایک خود مختار ذات ہے۔ تاریخ کی تعبیر کا یہ انداز جدید سماجیاتی اصولوں کے ساتھ انصاف کرتا ہے اور تہذیبوں کے مختلف نمونوں کے وجود کو تسلیم کرتا ہے۔ دراصل اس بحث کے ساتھ انصاف کرنے کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم دو اصطلاحات کے جدا جدا مفہوم معین کرلیں۔ کلچر (ثقافت و تہذیب) اور سویلزیشن (تمدن) دو بظاہر مترادف المعنی اصطلاحات ہیں لیکن فی الواقع ان کے اطلاقات کافی مختلف ہیں۔ سویلزیشن یا تمدن کسی عہد کے مادی ذرائع راحت کی نوعیت پر دلالت کرتا ہے جب کہ کلچر یا ثقافت کسی مخصوص انسانی گروہ کے ذہن، مزاج، کردار اور کائنات یا اپنے ماحول سے متعلق کسی انسانی جماعت کا متعین اندازِ نظر بتاتا ہے۔ مذکورہ اصطلاحوں کے اگر یہ مختلف اطلاقات صحیح ہوں تو پھر مادی راحتوں کی نوعیت کے پیش تاریخ کی تعبیر اور متعدد تہذیبی نمونوں کی موجودگی کا تصور ہم آہنگ ہوجائے گا اور وہ اختلاف جو دونوں تعبیروں میں نظر آتا ہے، باقی نہ رہے گا۔

بہرحال بات کو دو جداگانہ اصطلاحات کی جداگانہ تشریح کے طرز پر کہا جائے یا تاریخ کی دو جداگانہ تعبیروں کا سوال اٹھایا جائے، تاہم اتنا واضح ہے کہ انسانی تاریخ متعدد تہذیبی و ثقافتی نمونوں کا مجموعہ رہی ہے۔ عرب ثقافت بھی انہی ثقافتی مجموعوں میں شامل ہے۔ یہ عرب ثقافت خواہ مجوسی تہذیب کی زوال آمادہ شکل ہو، جیسا اشپنگلر کا خیال ہے یا اُس تصادم کی پیداوار جو مغربی تہذیب کے مشرق وسطیٰ میں داخلہ کی وجہ سے رونما ہوا جیسا ٹوئنبی اور گب باور کرتے ہیں، ہندوستان آکر ہندی آریائی تہذیبی اکائی سے متصادم ہوکر ایک نئے ثقافتی مرکب کا نتیجہ بنی جو آیندہ ۸ سو سال میں ایک جداگانہ ثقافتی اکائی بن گیا۔ مسٹر ایم۔ این رائے اپنی اس رائے میں صحت پر ہیں کہ یہ عرب تہذیب ہندی آریائی ثقافت سے زیادہ جاندار تھی، اسلئے اس کی ہندی تہذیب پر گہری چھاپ لگی۔ عرب تہذیب کا یہ نیا نمونہ اٹھارویں صدی میں ایک متعین اور مخصوص شکل اختیار کرچکا تھا جس کے زندہ رہنے کے لئے ایک سیاسی خول کی ضرورت تھی۔ پاکستان کا مطالبہ شعوری طور پر بہت کم اور غیر شعوری طور پر بہت زیادہ اسی تقاضہ کا جواب تھا۔ عرب ہندی آریائی تہذیب اپنی زندگی آزاد ماحول میں بسر کرسکتی تھی ورنہ خالص ہندی آریائی تہذیب اور عرب ہندی آریائی تہذیب کا تصادم اس برصغیر کا امن غارت کئے رہتا۔ یوں پاکستان کا قیام نہ صرف سیاسی بلکہ ثقافتی و تہذیبی حل تھا اُس کشمکش کا جو گزشتہ آٹھ سو سال سے کبھی خفیہ اور کبھی اعلانیہ ہوتی رہی تھی۔ ثقافت و مذہب دو جدا جدا دائرے ہیں جن کے نقاط کئی جگہ ملتے ہیں لیکن یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ وہ تمام کے تمام نقاط پر ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہیں۔ اب اگر یہ صحیح ہو کہ پاکستان کا قیام ایک ثقافتی ضرورت کی حیثیت رکھتا تھا تو پھر یہ کہنا کہ پاکستان محض ایک مذہبی مطالبہ ہی تھا، پوری طرح صحیح نہ ہوگا۔ اس لئے کہ مذہب اس ثقافت کا صرف ایک ہی جزو تھا گو سب سے اہم جزو سہی جس کی اساس پر پاکستان بنا تھا۔

قیام پاکستان سے پہلے یہ بحث بڑی شدت کے ساتھ کی جاتی رہی کہ ہندوستانی مسلمان ایک جداگانہ ثقافتی نمونہ کی نمائندگی کرتے ہیں یا

نہیں۔ ایک گروہ جو کانگرسی طرز تفکر کی حمایت کرتا تھا، ہر صوبہ، ہر علاقہ کی مخصوص تہذیب پر زور دیتا تھا اور اس متحدہ ثقافت کے وجود سے منکر تھا جو مسلم ہند کے ساتھ مخصوص ہو۔ اس کے برعکس ایک دوسرا گروہ تھا جو مسلم ہند کی علاقائی خصوصیات کے اعتراف کے باوجود ایک متحدہ مسلم ثقافت کے وجود پر بھی اصرار کرتا تھا اور یہی وہ خیال ہے جس سے پاکستان کا جواز پیدا ہوتا تھا۔ پاکستان کا مطالبہ مسلم ہند کے ایک جداگانہ قوم ہونے کی اساس پر کیا جا سکتا تھا ورنہ اگر غیر منقسم ہند کے تمام باشندوں کے مسائل یکساں ہوتے تو پھر کسی ایک گروہ کے لئے جداگانہ سلطنت قائم کرنے کا مطالبہ جائز نہ ہوتا لیکن مسلم قوم کی جداگانہ قومیت کو خاص طور پر ایسی حالت میں کہ وہ محکوم اور جغرافیائی طور پر برصغیر کے مختلف حصوں میں پھیلی ہوئی تھی، صرف مذہب یا جداگانہ ثقافتی نمونہ ہونے کی بنا ہی پر جائز قرار دیا جا سکتا تھا۔ مسلم ہند کا مذہبی امتیاز جداگانہ سلطنت کے مطالبہ کا جواز نہ بن سکتا تھا کہ اگر صرف مذہب ہی آزادی کا واحد جواز قرار دیدیا جائے تو دنیا کی ہر مختلف العقیدہ حکومت کی اقلیت خود مختاری کا مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہوگی۔ دراصل ہندوستانی مسلمانوں کی تعداد اور مذہبی امتیاز کے ساتھ ساتھ ان کی مجلسی و سماجی خصوصیات جو لفظ ثقافت کے مفہوم میں شامل ہیں، اتنی ممتاز تھیں کہ انہیں جداگانہ ثقافتی نمونہ اور جداگانہ قوم کہنا بالکل صحیح تھا، اس لئے ان کا حق خود اختیاری کا مطالبہ بالکل جائز تھا۔ اس بحث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ پاکستان ایک مشترک ثقافتی نمونہ کے امین کی حیثیت رکھتا ہے۔ پاکستان کے معماروں کو قیام پاکستان کے بعد یہ حقیقت پوری شدت کے ساتھ پیش نظر رکھنی چاہیئے تھی کہ اس نئی مملکت کے مختلف علاقوں کی ممتاز تہذیبی خصوصیات کے باوجود ایک مشترک ثقافت بھی ہے جو اس پوری مملکت، اور ایک ممتاز قوم کے موجود ہونے کی اساس ہے۔

آزادی کے بعد نظریاتی سطح پر سب سے اہم کام یہ تھا کہ پورے پاکستان کی مشترک ثقافت کے تحفظ کے لئے قومی شعور کو بیدار اور مضبوط کرنے کی جدوجہد کی جاتی اور یوں اس مملکت کے نظریاتی استحکام کے لئے موثر اقدامات عمل میں لائے جاتے لیکن انقلاب اکتوبر سے قبل جس حقیقت کو بڑے دردناک انداز میں بھلا دیا گیا وہ پاکستان بھر کی ثقافتی وحدت تھی۔ انقلاب اکتوبر سے پہلے تنگ نظریوں کو بڑے اہتمام سے پالا پوسا گیا اور قومی شعور کو ابھارنے کے بجائے تنگ نظریوں کو انتہائی غیر ذمہ دارانہ انداز میں اچھالا گیا۔ ہر چند علاقائیت اور گروہ بندی کو برا کہنے کا یہ مطلب لازماً نہیں ہے کہ مختلف علاقوں اور گروہوں کے جائز حقوق اور اختیارات چھین لئے جائیں اور ملک کو ناراض وحدتوں اور گروہوں کا مجموعہ بنا دیا جائے۔ ملک کے مختلف علاقوں اور گروہوں کا اطمینان اور ان کے ذہنی سکون کا مہیا کرنا متحدہ قومی شعور پیدا کرنے کی شرط اولین ہے لیکن متحدہ قومیت بہرحال وہ مقصد ہے جس تک ہم سب کو پہنچنا ہے اور جس کو زندہ رکھکر پاکستان کے استحکام کی ضمانت دی جا سکتی ہے نئے انقلاب سے پہلے ان پہلوؤں پر کوئی توجہ نہ دی گئی تھی لیکن انقلاب اکتوبر کے بعد یہ مسائل اپنی جائز اور ضروری اہمیت حاصل کر رہے ہیں اور اس طرح اب شعوری طور پر ٹھوس کام کرنے کی سعی کئے جانے کی توقع ہے۔

تہذیبی دائرہ میں یہ ٹھوس کام اس احساس پر کیا جانا تھا کہ پاکستان ایک مشترک عرب۔ ہندی۔ آریائی تہذیب کا وطن ہے۔ دہلی کے اسلامی اقتدار کے عہد میں جو تہذیبی نمونہ ابھرا تھا اور اٹھارویں صدی میں جس کے اہم مرکز دہلی، لکھنؤ، لاہور اور ڈھاکہ تھے وہ پاکستان کی تہذیب کا جوہری ورثہ تھے۔ اس تہذیب میں ادب، تعمیرات، لباس، مجلسی زندگی، کھانے، رسم و آداب، موسیقی و مصوری اور رہن سہن کے طریقے وغیرہ سب آجاتے ہیں۔ برصغیر کے مسلمانوں کے اس اجتماعی ورثہ میں پاکستان کے اپنے تہذیبی منطقوں کی امتیازی خصوصیات کے امتزاج کے بعد وہ تہذیبی نمونہ پیدا ہو جائے گا جو ایک طرف اس ملک کے ثقافتی ماضی کی نمائندگی کر سکے گا اور دوسری طرف ان تہذیبی عناصر کا مجموعہ ہوگا جو پاکستان کے مختلف علاقوں کی تہذیبی خصوصیات کے حامل ہیں۔ ماضی کے تہذیبی ورثہ کی تشکیل و تنظیم کا یہ کام ایک عظیم تحقیقاتی سعی و کوشش کا متقاضی ہے لیکن یہ سعی و کوشش بھی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکتی اگر ماضی کے اس ورثہ کا جدید زندگی اور حالات میں جائزہ نہ لیا جائے۔ ماضی کے تہذیبی ورثہ میں سے ہر حصہ ایسا ہے جس کو جدید حالات کی روشنی میں پرکھا اور زندگی کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ بنایا جائے گا۔ تاریخ میں تہذیبی ارتقاء و تغیر غیر شعوری طور پر ہوتا رہا ہے لیکن پاکستان میں تہذیب کی قدروں کا یہ تعین اور تعمیر شعوری انداز میں ہوگا جو ایک نیا، ایک عجیب تجربہ ہوگا۔ انسان کی تہذیبی تاریخ کا قیام پاکستان کے بعد ہی نئی مملکت کے ان ثقافتی عناصر کے تعین کی سعی کی جاتی

چاہیئے تھی لیکن سیاسی دھڑے بندیوں میں اس ٹھوس کام کی طرف کوئی متوجہ نہ ہو سکا۔ مگر اب کہ زندگی کے ہر شعبہ میں تعمیری کام کیے جا رہے ہیں ملک کے مفکروں، ادیبوں اور محققوں کو اس کام کی تکمیل کا بیڑہ اٹھانا چاہیئے کہ اس تہذیبی اساس ہی پر اس معاشرہ کے قیام کی سعی کی جا سکتی ہے۔ جو رفاہی انداز پر منظم ہوگا۔ مآل کار پاکستان میں ایک ایسی رفاہی مملکت اور معاشرہ کو وجود میں لانا ہے جس میں اس مملکت کے ہر فرد کو اپنی مادی و روحانی ترقی کے آزادانہ اور مکمل مواقع مل سکیں۔ رفاہی مملکت کا یہ تصور ہی اس جدوجہد کا مقصود تھا جو مسلم ہند نے آزادی کے لئے کی تھی۔

قیام پاکستان کے بعد توقع یہ تھی کہ اس ارتقاء پذیر معاشرہ یا رفاہی مملکت کے قیام کی جدوجہد کی جائے گی لیکن آزادی کے فوراً بعد مختلف تنگ نظریوں نے ملک کے مختلف ٹکڑوں میں اتنا انتشار پیدا کر دیا کہ رفاہی مملکت کا مثالیہ پس پشت جا پڑا اور معاشی، مادی اور مالی افراتفری نیز مجرمانہ تنگ نظریوں اور بعد از وقت عقیدتی مطالبات نے وہ کیفیت پیدا کر دی کہ ملک کا استحکام خطرے میں پڑ گیا۔

انقلاب اکتوبر نے اس صورتِ حال کا کامیابی کے ساتھ اختتام کیا اور رفاہی مملکت کے مثالیہ کو پھر قومی مساعی کا مقصود بنا دیا۔ اب رفاہی مملکت اور ایک ایسے معاشرہ کا قیام جو فرد کو اپنی ترقی و خوشحالی کے پورے مواقع مہیا کر سکے، وہ منزل ہے جہاں اس قوم کو پہنچنا ہے لیکن اس مقصد تک رسائی اس وقت تک ممکن نہ ہوگی جب تک اس مملکت کے وہ تمام طبقات، جو قومی تشکیل میں کوئی پارٹ ادا کر سکتے ہیں خواہ وہ حکومتی دائرہ میں ہوں یا عام قومی زندگی کے اندر، ان تنگ نظریوں، سڑے بسے تصورات اور کلیسائی رجحانات سے محفوظ نہ رہیں جو قوم کے مختلف گروہوں، علاقوں اور طبقوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتے اور جدید عہد کے تقاضوں سے متصادم ہوتے ہیں۔ پاکستان وسیع سطح پر انسان دوستی اور نظریہ نوازی کے ذریعہ اپنی منزل مقصود پر پہنچ سکتا ہے۔ عقیدتی صلابت، جو ذہن کے رجعت کیشانہ رجحان کو بیدار کر کے انسان دشمنی پیدا کرتی ہے، اس مشن کی تکمیل میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوگی جس کے لئے اس مملکت کا قیام عمل میں آیا تھا۔ انقلاب اکتوبر کے بعد اس قوم کو پھر اپنی جدوجہد کو صحیح معنی، حقیقی مفہوم نکھار اور رجحال عطا کرنے کا ایک نادر موقع ملا ہے۔ تاریخ بار بار ایک راہ سے گزرنے کی عادت نہیں رکھتی۔

انقلاب اکتوبر ارتقاء اور عظیم قومی خوشحالی کو حقیقت بنانے کا ایک فیصلہ کن موڑ ہے اگر اس سنہری موقعہ سے فائدہ نہ اٹھایا گیا تو عہد نامۂ عتیق کی زبان میں:

"میرے بعد ایک بھیانک سیلاب کا آنا مقدر ہو چکا ہے۔"

★

"قائداعظمؒ نے فرمایا تھا کہ تخلیق پاکستان بجائے خود کوئی مقصود نہیں تھا بلکہ صرف ایک وسیلہ تھا اپنے نصب العین کو حاصل کرنے کا۔ اس لئے اب ہمیں عمل کے دور میں داخل ہو جانا چاہیئے۔ پاکستان صرف عمل اور پیہم عمل کے ذریعے ہی ترقی کر سکتا ہے نہ کہ خالی نعروں سے۔"

جنرل محمد ایوب خان

(یوم پیدائش قائداعظمؒ: ۲۵ دسمبر ۱۹۵۸ء)

نادر کاکوروی

ممتاز حسن

۱۹۱۰ء میں جب "جذباتِ نادر" کا دوسرا حصہ چھپا ہے، نادر کے کلام پر رائےزنی کرتے ہوئے مولانا عبدالحلیم شرر نے لکھا تھا کہ "حضرتِ نادر نے اردو کی ایک نئے میدان میں رہبری کی ہے، اور ایک بہت وسیع حد تک کامیاب ہوئے ہیں، لہٰذا قدر دانانِ ادبِ اردو کو ان کا شکرگزار ہونا چاہیے۔" لیکن آج وہ زمانہ ہے کہ لوگ نادر اور نادر کے ادبی کارناموں کو بھول چکے ہیں، اور ادبی تاریخیں اور تذکروں میں اردو شاعری کے اس راہبر کا ذکر شاذ و نادر ہی ملتا ہے۔ "شعرالہند" کے مصنف نے صرف ان کا اور ان کی تین نظموں کا نام لیا ہے۔ اور سمجھ لیا ہے کہ تذکرہ نگاری کا فرض ادا ہو گیا۔ رام بابو سکسینہ نے اس سے زیادہ توجہ فرمائی ہے، اور اپنی "تاریخ ادبِ اردو" میں نادر کے کلام اور شاعرانہ مقام پر ایک مختصر سا پیراگراف قلمبند کیا ہے، اور انہیں "طرزِ جدید کے بہت عمدہ کہنے والوں" میں سے شمار کرتے ہوئے اُن کی موت کو ایک "بے ہنگام سانحہ" کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ سردار موہن سنگھ نے اپنے مضمون "جدید اردو شاعری" میں ان کا ذکر اردو شاعری کی نئی تحریک کے علمبرداروں میں منشی درگا سہائے سرور جہاں آبادی کے بعد کیا ہے۔ ڈاکٹر گراہم بیلی نے اپنی کتاب "اردو ادب کی تاریخ" میں فرمایا ہے۔ کہ نادر، سرور کے مقابلے میں انگریزی بہت اچھی جانتے تھے، اور یورپ کی شاعری کا اثر بھی اُن پر زیادہ تھا۔ ڈاکٹر گراہم بیلی کی کتاب مختصر ہے اور انہوں نے نہ صرف نادر کے متعلق اختصار سے کام لیا ہے بلکہ کسی شاعر کا تذکرہ بھی تفصیل سے نہیں لکھا۔

رہا نادر کا کلام، تو اس وقت "جذباتِ نادر" جو اُن کی شاعری کا واحد مجموعہ ہے، صحیح معنوں میں نادر بلکہ نایاب ہے۔ مجموعہ کا دوسرا حصہ آج سے کچھ سال پہلے ہندوستان میں مل سکتا تھا۔ اب وہاں بھی قریب قریب ناپید ہے۔ پہلا حصہ میں نے کہیں بازار میں نہیں دیکھا، نہ پاکستان میں نہ ہندوستان میں۔ البتہ ایک غیر معروف لائبریری سے عاریتہً حاصل کیا تھا۔ اس لائبریری کے نسخے کے علاوہ کہیں نشان نہیں ملا۔ سردار موہن سنگھ نے نادر کے کلام کا غالباً کوئی مجموعہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ فرماتے ہیں کہ نادر کاکوروی کا کلام زندہ اور مردہ رسالوں کے صفحات میں پراگندہ اور پوشیدہ ہے۔

یہ تو نادر کی شاعری کا حال ہے۔ نثر کا کوئی مستقل کارنامہ ان سے منسوب نہیں ہے، البتہ اُن کے ایک ابتدائی ناول "دولہن ڈاکو" کا ذکر ملتا ہے، اور اس کا بھی محض نام ہی نام ہے، نشان کہیں نہیں۔

نادر کا پورا نام ہے شیخ نادر علی عباسی، وہ کاکوری کے مشہور و معروف عباسی خاندان میں پیدا ہوئے۔ یہ ایک پرانا علم دوست خاندان ہے جس میں اچھے اچھے صاحبانِ علم و فضل ہو گزرے ہیں۔ آجکل اس خاندان کے متعدد افراد پاکستان منتقل ہو چکے ہیں، اور ان میں بعض اعلیٰ سرکاری عہدوں پر تعینات ہیں۔

نادر ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام شیخ حامد علی عباسی اور دادا کا شیخ طالب علی عباسی تھا۔ نادر کی شادی شریف النسا بیگم عرف ننھوبی بی سے ہوئی۔ جو منشی نقی علی کی صاحبزادی تھیں۔ شادی کے بعد تین اولادیں ہوئیں۔ دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ مشفق النسا بیگم، جو اولادِ اکبر تھیں، جوانی میں ناکتخدا فوت ہوئیں۔ دوسری لڑکی کا نام احسن النسا اور عرف منا بی بی ہے۔ ان کی شادی شیخ مظفر علی عباسی سے ہوئی۔ نادر کے صاحبزادے کا نام شیخ یاور علی عباسی ہے۔

نادر کا انتقال ۱۹۱۲ء میں ہوا۔ کل پینتالیس برس کی عمر پائی۔ اُن کی زندگی کے حالات تفصیل سے نہیں ملتے۔ "عباسیانِ کاکوری" کے نام سے ان کے خاندان کا ایک مبسوط تذکرہ چھپا ہے۔ جو اسی خاندان کے ایک رکن کی تصنیف ہے۔ اس تذکرے میں خاندان کے اکثر افراد کے

حالات کے بیان میں خاصی تفصیل سے کام لیا گیا ہے۔ مگر نادر کا ذکر بہت ہی سرسری سا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وضعدار اور قدامت پسند خاندان کے تذکرے میں نادر جیسے آزاد طبع انسان کے لئے زیادہ گنجائش نہیں نکل سکی۔ میں نے احباب کے وسیلے سے مزید حالات معلوم کرنے چاہے مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ البتہ اُن کی شاعری کہہ رہی ہے کہ وہ ایک اچھے پڑھے لکھے انگریزی داں، شگفتہ مزاج اور قوم پرست انسان تھے۔

نادر اردو شاعری کی نئی تحریک میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ یہ تحریک حالی اور آزاد کی "نیچرل شاعری" سے شروع ہوتی ہے۔ اگرچہ اس تحریک کے عناصر حالی اور آزاد سے پہلے بھی میر، انشا، نظیر اور دوسرے شعراء کے کلام میں پائے جاتے ہیں، مگر اس کا فروغ حالی اور آزاد کی کوششوں سے ہوا جن میں کرنل ہالرائڈ، ناظمِ تعلیمات پنجاب کی سرپرستی کو بہت کچھ دخل تھا۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ اردو شاعری کو زندگی کے حقائق اور واقعات سے قریب لایا جائے۔ اور تصنع اور تکلف کو ترک کر دیا جائے۔ تشبیہہ اور استعارے کی بنیاد عام زندگی کے مشاہدات پر رکھی جائے۔ تاکہ شاعری زیادہ مؤثر ہو سکے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس تحریک کے دو شاعرانہ نصب العین تھے۔ سادگی اور واقعیت یہی وہ "نیچرل شاعری" تھی۔ جسے حالی نے اپنے مقدمے میں منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی۔ اور جس کے نمونے ہیں آزاد کی "شبِ سیاہ" اور حالی کے "مناظرہ رحم و انصاف" میں ملتے ہیں۔ یہ تحریک انگریزی شاعری سے متاثر تھی۔ مشکل یہ تھی کہ جو لوگ اس تحریک میں پیش پیش تھے۔ ان میں سے اکثر انگریزی زبان سے پوری واقفیت نہیں رکھتے تھے اور اس سے براہِ راست استفادہ نہیں کر سکتے تھے۔ مثلاً حالی اور آزاد کے گروہ میں پیارے لعل آشوب ہی ایک ایسے شخص تھے جو انگریزی جانتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئی تحریک اپنے اصلی سرچشمے یعنی انگریزی زبان اور ادب سے دور رہی۔ اور "نیچرل شاعری" نے جسے فطری جذبات اور احساسات کا آئینہ دار ہونا چاہیئے تھا، بہت جلد سادگی اور واقعیت کے تصورات کو محض پھسپھساہٹ کی بنیاد پر لا قائم کیا۔ ان حالات کا تقاضا تھا کہ اگر اردو شاعری کو اپنے شاعرانہ انقلاب کی حفاظت کرتے ہوئے خود اپنی ہستی ہی کو ختم نہیں کر دینا ہے۔ تو اسے "ایک لڑکی نکھارتی ہے دال" یا "کہتے ہیں خدام ماموں کے بہت گستاخ تھے" کی سطح سے بلند کیا جائے۔ اور الفاظ کی سادگی اور مضامین کی واقعیت کو جذبات کی گرمی اور ندرت سے دوبارہ آشنا کیا جائے۔ یہ کام نادر اور سرور نے کیا، اور سرور اور نادر، حالی اور اقبال کی درمیانی کڑی بن گئے۔ سرور اور نادر، دونوں کی شاعری مشاہداتِ فطرت اور قومی اور انفرادی جذبات سے مالا مال ہے۔ مگر سرور کے ہاں جذبہ زیادہ ہے، اور نادر کے ہاں سادگی زیادہ۔

نادر کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت اس پر انگریزی شاعری کا اثر ہے۔ انہوں نے انگریزی نظموں کے متعدد ترجمے کئے ہیں۔ مگر یہ اثر ترجموں تک محدود نہیں ہے۔ اُن کی وہ نظمیں بھی جو ترجمہ نہیں ہیں، انگریزی نظموں کا انداز لئے ہوئے ہیں۔ عبدالحلیم شرر نے "جذباتِ نادر" حصہ دوم کے متعلق اظہارِ رائے کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:-

> "حضرت نادر نے کوشش کی ہے کہ انگریزی شاعری کے لطیف مذاق کو اردو میں پیدا کریں۔ چنانچہ اس مجموعے میں اکثر تو انگریزی کی مشہور نظموں کے ترجمے ہیں۔ اور بہت سی نظمیں جو شاعر کے اصلی خیالات و جذبات کو ظاہر کر رہی ہیں۔ وہ بھی اسقدر انگریزی شاعری کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں، کہ ان پر بھی ترجمے ہی کا دھوکا ہوتا ہے۔"

عبدالحلیم شرر کے اس قول پر یہ اضافہ ضروری ہے کہ نادر کے بعض ترجمے بھی ایسے ہیں کہ ان پر ترجمے کا گمان نہیں ہو سکتا۔ رہا اُن کی شاعری پر انگریزی کا دھوکا، سو اس میں کچھ شک نہیں کہ نادر ایک نئی طرز کے موجد تھے جو انگریزی شعراء کے طرزِ بیان سے قریب تھی۔ اُن کا مقصد شعر کے ذریعے اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار کرنا تھا۔ نہ کہ روایتی اردو شعراء کی طرح محض ردیف قافیوں میں لفظی اور صوتی ہم آہنگی پیدا کرنا۔ اردو کے پختہ کار نقادوں کے لئے یہ ایک نئی بات تھی اور وہ نادر کی ہر نظم کو محض اس لئے کہ وہ عام روش سے الگ ہوتی تھی، انگریزی شاعری ہی کا چربہ سمجھتے تھے۔ ورنہ اس تنقید کی حقیقت اس سے کچھ زیادہ نہیں کہ نادر کی شاعری ایک انفرادی کیفیت کی حامل ہے۔

نادر نے جن انگریزی شعراء کی نظموں کے ترجمے کئے ہیں، اُن میں ٹینیسن، بائرن اور ٹامس مور خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مور کا کلام انہیں غیر معمولی طور پر مرغوب تھا۔ انہوں نے اس کی ایک لمبی نظم "لالہ رُخ" کے ایک حصے "لائٹ آف دی حرم" کا ترجمہ ایک لمبی مثنوی کی صورت میں کیا ہے جو جذبات

نادر" حصہ دوم میں شامل ہے۔ یہ ایک قابلِ قدر ترجمہ ہے۔ بقول مولوی عزیز مرزا " اگرچہ اصل سے انہوں نے تجاوز نہیں کیا ہے، مگر اُن کا طرزِ بیان اس قدر نیچرل اور اُن کے الفاظ ایسے خوشنما واقع ہوتے ہیں کہ ترجمے کی بجائے نظم اصل معلوم ہوتی ہے۔"

قاضی تلمذ حسین نے اس ترجمے کو اس سے بھی بڑھ کر خراجِ تحسین پیش کیا ہے:۔

"کسی زبان کی تخئیل کو دوسری زبان میں بعینہٖ منتقل کرنا یعنی اس طرح کہ اس کی تمام شاعرانہ خوبیاں اور تخئیل کی باریکیاں قائم رہیں، حقیقت میں نہایت ہی مشکل کام ہے، لیکن، قابل مترجم نے اس کام میں حیرت ناک کامیابی حاصل کی ہے۔ یہ مثنوی اردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے ....

.... میں نے اس ترجمے کو بہت احتیاط سے اصل مثنوی سے مقابلہ کیا اور میں معتبر طور پر کہتا ہوں کہ واقعی مترجم نے وہ کام کیا ہے کہ اُن قدردانوں کو جو اردو ادب کو نئے محاسن اور نئی خوبیوں سے آراستہ دیکھنا چاہتے ہیں، حضرت نادر کا ممنون اور شکر گذار ہونا چاہئے۔"

"لائٹ آف دی حرم" کے ترجمے کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

وہ منظرِ شہرِ عشرتِ منزل — آئینہ وہ جھیل کا مقابل
ہر چیز پہ محویت کا عالم — ہر شے سے خوشی کا خیر مقدم
منہ باندھے کہیں کھڑی ہیں کلیاں — غنچے ہیں کہیں پہ نیم خنداں

شاعر نے ترجمے میں اصل سے لفظی اور معنوی مطابقت کی کوشش کی ہے اور جہاں کہیں اصل سے انحراف کیا ہے اُس کی وضاحت کر دی ہے ان کے ترجمے کا ایک شعر ہے:۔

محفل میں بن سنور کے آئے — اور وہ گھونگھرو بجا کے گائے

اس پر نادر نے مندرجہ ذیل نوٹ دیا ہے:۔

"گھونگھرو بجا کے گائے۔" ٹامس مور نے اس موقعہ پر طائفہ کا کمر میں گھونگھرو باندھ کر ناچنا نظم کیا ہے لیکن چونکہ کمر میں گھونگھرو باندھ کر ناچنے کا رواج بظاہر ہندوستان میں پایا نہیں جاتا، اور غالباً کشمیر میں بھی نہ ہو، لہٰذا کمر کی لفظ ترجمے میں نہیں رکھی گئی۔ نادر"

سارا ترجمہ صاف اور دلکش ہے۔ یہ خوبیاں قریب قریب نادر کے ہر ترجمے میں پائی جاتی ہیں۔ ترجموں میں "شاعر کا دل"، "مرحومہ کی یاد میں" اور "گذرے ہوئے زمانے کی یاد" بہت مشہور رہیں" شاعر کا دل" ٹینیسن کی ایک نظم کا ترجمہ ہے۔ نادر نے ترجمے کی صحت کی اتنا خیال رکھا ہے کہ جہاں کہیں مضمون کی وضاحت کے لئے کچھ الفاظ اپنے اشعار میں بڑھائے ہیں، وہاں اُن کے گرد خطوطِ وحدانی کھینچ دئے ہیں۔ یہ نظم اسی التزام سے نوبت رائے نظر کے رسالے "خدنگِ نظر" میں چھپی تھی۔

"مرحومہ کی یاد میں" ٹامس مور کی ایک نظم کا ترجمہ ہے۔ یہاں بھی مترجم نے حتی الامکان ترجمے کی صحت لفظی کی پابندی اپنے اوپر عائد کر رکھی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس قسم کی پابندی سے ترجمے کی خوبی میں اضافہ نہیں ہوتا۔ اگرچہ ان حدود کے اندر رہ کر شستہ ادبی قسم کا ترجمہ کر لینا اور وہ بھی شعر میں، ایک تکنیکی کامیابی ہے۔ جہاں کہیں نادر نے ان قیود میں سختی نہیں برتی، وہاں اُن کا فن معراج پر ہے۔ "ٹامس مور" کی نظم کا پہلا شعر ہے۔

"In the mid hour of night when stars are weeping, I fly
to the love lane we loved"

نادر نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

رات کے پچھلے پہر روتی ہے جب چشمِ نجوم — اُلفتِ دیرینہ کی وادی میں اُڑجاتا ہوں میں

یہاں "رات کے پچھلے پہر" اور "اُلفتِ دیرینہ کی وادی" میں اصل پر اضافہ کیا ہے۔ اور اس نے ترجمے کی شاعرانہ سطح بلند کر دی ہے۔

نادر کا ایک ترجمہ تو ایسا ہے کہ ترجمہ معلوم ہی نہیں ہوتا۔ "گذرے ہوئے زمانے کی یاد" نہ صرف نادر کا بہترین ترجمہ ہے، بلکہ اسے اردو شاعری کا بہترین ترجمہ کہنا چاہئے۔ اس کی ادبی اہمیت اصل اور ترجمے کو ساتھ ساتھ دیکھنے ہی سے واضح ہو سکتی ہے۔

مور کی نظم کا پہلا بند ہے:

THE LIGHT OF OTHER DAYS

Oft, in the stilly night
    Ere slumber's chain has bound me
Fond memory brings the light
    Of other days around me:
        The smiles, the tears
        Of boyhood's years,
    The words of love then spoken,
        The eyes that shone
        Now dimm'd and gone,
    The cheerful hearts now broken;
Thus, in the stilly night
    Ere slumber's chain has bound me,
Sad memory brings the light
    Of other days around me.

اب اس کا ترجمہ سنئے:

اکثر شبِ تنہائی میں — کچھ دیر پہلے نیند سے
گذری ہوئی دلچسپیاں — بیتے ہوئے دن عیش کے
بنتے ہیں شمعِ زندگی — اور ڈالتے ہیں روشنی
میرے دلِ صد چاک پہ

وہ بچپن اور وہ سادگی — وہ رونا وہ ہنسنا کبھی
پھر وہ جوانی کے مزے — وہ دل لگی وہ قہقہے
وہ عشق وہ عہدِ وفا — وہ وعدہ اور وہ شکریہ
وہ لذتِ بزمِ طرب — یاد آتے ہیں ایک ایک سب — دل کا کنول جو روز و شب — رہتا شگفتہ تھا سو اب
اس کا یہ ابتر حال ہے — اک سبزۂ پامال ہے
اک پھول کمھلایا ہوا — ٹوٹا ہوا بکھرا ہوا
روندا پڑا ہے خاک پہ

یوں ہی شبِ تنہائی میں — کچھ دیر پہلے نیند سے
گذری ہوئی ناکامیاں — بیتے ہوئے دن رنج کے
بنتے ہیں شمعِ بیکسی — اور ڈالتے ہیں روشنی
ان حسرتوں کی قبر پر

جو آرزوئیں پہلے تھیں　　پھر غم سے حسرت بن گئیں

غم دوستوں کی فوت کا　　ان کی جوانا موت کا

ہاں دیکھ شیشے میں مرے　　ان حسرتوں کا خون ہے

جو گردشِ ایام سب　　یا قسمتِ ناکام سے　　یا عیشِ غم انجام سے　　مرگِ بتِ گلفام سے

خود دل میں میرے مرگئیں　　کس طرح پاؤں میں حزیں

قابو دلِ بے صبر پہ

یہی انداز دوسرے بند کے ترجمے کا ہے۔ یہ ترجمہ اگرچہ اصل نظم کے الفاظ کا احاطہ کئے ہوئے ہے، مگر اس کا مقصد اور اس کی خوبی انگریزی اصل کی روح کو اردو شاعری کا جامہ پہنانا ہے۔ یہ ترجمہ نہیں ترجمانی ہے۔ یہی مقصد رباعیات عمر خیام کے ترجمے میں فٹز جیرالڈ کا تھا۔ اور حق یہ ہے کہ اس نظم میں نادر کی فنی کامیابی فٹز جیرالڈ سے کسی صورت میں کم نہیں۔

اس طرح کا معنوی ترجمہ کوئی آسان چیز نہیں ہے اس کے لئے الفاظ کا لغوی اور صوتی انتخاب، ترجمے کی بحر کی اصل بحر سے ہم آہنگی۔ اور اصل نظم کی جذباتی فضا کا مترجم کے دل پر صحیح تاثر لازم ہیں۔ نظم حیدر طباطبائی نے گرے کے مرثیے کا جو ترجمہ کیا ہے، وہ کتنا مشہور ہے مگر پہلے ہی مصرعے کا ترجمہ دیکھئے۔ گرے کہتا ہے:۔

The curfew tolls the knell of parting day.

وداعِ روزِ روشن ہے گجر شامِ غریباں کا

دیکھئے اصل اور ترجمے کی فضا میں کتنا فرق ہے۔ گرے کا انداز ماتمی ہے۔ اس کا مصرعہ رُک رُک کر ایک مغموم لے میں ڈوب کر آگے بڑھتا ہے۔ اس کے برعکس طباطبائی کے مصرعے میں 'وداع' اور 'شامِ غریباں' کے الفاظ کے باوجود شادیانے بجتے سنائی دیتے ہیں۔ اور اس کا اثر الٹا ہوتا ہے۔

نادر کی ساری شاعری، ترجمے ہوں یا طبعزاد نظمیں، ایک انفرادی خلوص اور بے تکلفی کی حامل ہے۔

نادر اپنے خیالات اور احساسات کو رنگین الفاظ کے پردے میں غائب نہیں ہونے دیتے۔ ان کے خیالات براہِ راست لفظوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور وہ ایسا بے تکلف کہے چلے جاتے ہیں جیسے باتیں کر رہے ہوں۔ ان کی شاعری میں سادگی اور بے تکلفی اس قدر نمایاں ہے کہ اردو کے بہت کم شاعر اس میدان میں ان کے دوش بدوش کھڑے ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی ایک نظم "رات کے بچھن گھنٹے" کے چند شعر دیکھئے۔ شاعر چاند سے خطاب کر رہا ہے اور اپنی کہانی کے پردے میں ساری نوعِ انسانی کی سرگزشت اسے سنا رہا ہے:۔

اے چاند حال میرا تجھ سے چھپا نہیں ہے　　تو اور میں ہوں کوئی یاں دوسرا نہیں ہے

سن کان دھر کے اپنی بیتی تجھے سناؤں　　میرا تو حال یہ ہے میں تجھ سے کیا چھپاؤں

طوفاں کا جیسے مارا ساحل کو ڈھونڈتا ہو　　یا وہ تھکا ہوا جو منزل کو ڈھونڈتا ہو

صدیاں گذر گئی ہیں مجھ کو تلاش کرتے　　خالق کو اور اس کے اسرار فاش کرتے

جا پہنچا ہوں میں برسوں خورشید کی شعاعیں　　ذروں پہ میں نے برسوں دوڑائی ہیں نگاہیں

تحت الثریٰ سے گذرا اڑتا زقند بھرتا　　اجرام پھاڑتا اور اجسام قطع کرتا

اونچا بہت غباروں میں بیٹھ کر اڑا ہوں　　بادل میں چھپ گیا ہوں تاروں میں مل گیا ہوں

سیرِ عدم کر آیا میں اسپتل اڑاتا　　گذرا صراط پر سے بائسکل اڑاتا

جنت میں جا کے دھرے لے آیا حوروں سے میں　　دوزخ کا دیکھ آیا دروازہ دور سے میں

شمس و نجوم کی میں رفتار دیکھ آیا　　اور کائنات کے کل اسرار دیکھ آیا

...

اے چاند دو بجے ہیں اور میں ابھی تھک گیا ہوں ــــ یہ نیند کا نشہ ہے جو کچھ بہک گیا ہوں

ایک اور مثال کے طور پر "بوڑھے دنیا پرست کی موت" کے چند اشعار دیکھئے:۔

یا الٰہی آج دل میرا بجھا جاتا ہے کیوں ــــ اور کلیجہ میرا بے قابو ہوا جاتا ہے کیوں
شمعیں روشن ہیں نظر مجھ کو نہیں آتی ہیں کیوں ــــ ہائے آج آنکھیں مری دھندلی ہوئی جاتی ہیں کیوں
میرا سن کیا ہے ابھی تو سو برس کا بھی نہیں ــــ میں نے دنیا کو ابھی جی بھر کے دیکھا بھی نہیں

"قاضی الحاجات اور اشرف المخلوقات" ان کی ایک لمبی نظم ہے جس میں زر یعنی دنیا کے مال و دولت کو خطاب کیا ہے:۔

چلا ہے دنیا میں اور عقبیٰ میں راحتیں بے قیاس دینے ــــ بڑا بنا پاسبانِ جنت چلا ہے جنت کا پاس دینے
بہشت سے تجھکو واسطہ کیا؟ بہشت ہم کو دلائے گا تو؟ ــــ گنا ہگار! اپنی تو خبر لے کہ خود جہنم میں جائے گا تو!
نکالا دوزخ سے کسکو تو نے؟ غموں سے کس کو نجات دیدی؟ ــــ بچایا کس کس کو موت سے؟ اور بہشت کس کس کو مول لے دی؟

ان کی غزلیں بھی سادگی، بیساختگی اور تسلسلِ معنی کے لحاظ سے ایک انفرادی حیثیت رکھتی ہیں:

وہ ہیں کہ بات ہی نہیں سنتے غریب کی ــــ میں ہوں کہ دفترِ گلہ ہائے دراز ہے
پہلے تھا سر میں حبِ وطن کا مرے جنوں ــــ اب خبطِ یادہ گردئ دور و دراز ہے
اچھا تھا وہ شباب کہ کچھ سوجھتا نہ تھا ــــ اب ہر قدم پہ خوفِ نشیب و فراز ہے

نمازِ پنجگانہ سے ہے بہتر کام کیا زاہد ــــ مگر نیت سے پہلے ٹھیک کر لے اپنی نیت بھی

مری طبعِ رواں کا یہ حال ہے کہ بس ایک بار گھٹا اٹھی
وہ بڑھی وہ گھِر آئی وہ چھا گئی وہ برس چکی وہ نکل گئی

ان کی ایک نظم ہے:

یہ وضعِ قومیت آئندہ رخصت ہونے والی ہے ــــ نئی تہذیب سے تجدیدِ ملت ہونے والی ہے
نئے سامانِ آرائش فراہم ہوتے جاتے ہیں ــــ فراہم کیوں نہ ہوں ان کی ضرورت ہونے والی ہے

اس نظم کے آخر میں انہوں نے چند شعر ایسے کہے ہیں جیسے وہ پہلی اور دوسری جنگ عظیم اور ان کے الم افزا اخلاقی اور سیاسی نتائج کو تصور کی آنکھ سے دیکھ رہے ہوں:۔

تمہیں معراجِ دنیاوی تو حاصل ہو چکا آگے ــــ ترقی ہونے والی کیا ہے ذلت ہونے والی ہے
ترقی انتہائے حد پہ پہنچی عقلِ انساں کی ــــ اب آگے از سرِ نو پھر جہالت ہونے والی ہے
غرض دنیا بدلتی جا رہی ہے ایسی تیزی سے ــــ کہ کوئی دن میں مخدوش اسکی سرعت ہونیوالی ہے
تمہیں کیا سوء تا آدم نہ ہوگے اور نہ دیکھوگے ــــ جو کچھ اچھی بری آئندہ حالت ہونے والی ہے

وہ اپنے اشعار میں جا بجا فارسی کے اشعار بھی کہہ جاتے ہیں جن کی کیفیت ان کی اردو شاعری سے مختلف نہیں ہے۔ ایک فارسی کی غزل کے شعر ہیں:۔

یادِ منصورم صلیب اندر کلیسا می دہد ــــ نعرۂ چند از انا اللہ و انا الحق برزنم
کودکاں گردند موزوں شعر ہا بر مرگِ من ــــ مردہ دآوارہ در ہر کوچہ و ہر برزنم

نادر از نے نلئے موسیقار پیدا می کنم　　ساختے دیگر نشیں تا نغمۂ دیگر زنم

واقعہ یہ ہے کہ حالی اور آزاد نے جس شاعری کو "نیچرل شاعری" کا نام دیا تھا، نادر نے اس میں فطری جذبات اور ایک دلچسپ طرز ادا کا اضافہ کیا۔ وہ بلاشک وشبہ حالی اور آزاد کی تحریک کے گلِ سرسبد ہیں۔ وہ اردو شاعری کی پرانی فرسودہ روش اور بے کیف تصنع سے بیزار تھے اور اسے ایک نئی نہج پر دیکھنا چاہتے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے آنکھیں بھی پتھرانے لگیں　　تیغ قاتل ہے وہی اور رقصِ بسمل ہے وہی

وہ چاہتے تھے کہ دل کی بات کو جوں کا توں زبان پر لائیں، اسے خواہ مخواہ پیچ نہ دیں۔ شعر کا اصل جوہر ان کے نزدیک وہ جذبہ تھا جو شعر کہلوائے:۔

مانا نغمہ مرا خوش آیند نہیں　　اور پردگیانِ عشق خورسند نہیں

لیکن یہ خروشِ دل ہے یہ ہیں جذبات　　جذبات کبھی ادب کے پابند نہیں

وہ اپنی شاعرانہ کوتاہیوں کے معترف ہیں۔ مگر یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ ان کی شاعری میں ادبی حسن نہیں ہے۔ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ نادر نے فطری شاعری کو سادگی کی بے کیفی سے بچایا ہے۔ ان کی شاعری کی جو مثالیں دی جا چکی ہیں، وہ اس کے لئے کافی ہیں۔ ان کے ہاں ادب بھی ہے، شعر بھی اور فلسفہ بھی۔ ان کی نظم "شمع مزار" ان کے فلسفیانہ انداز کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے:۔

اے شمع روشنی ہے تری نغمۂ سکوت　　ہے تیرا نور زمزمۂ سوز کا ثبوت

تیرا سکوت نائے نواہائے راز ہے　　سوز و گداز میں ترے در پردہ ساز ہے

فانوس میں خموش کہاں یک نفس ہے تو　　بلبل کی طرح نغمہ طرازِ قفس ہے تو

آخر میں شمع سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:۔

دو تیرے دردمند ہیں اقبال اور میں

معلوم ہوتا ہے، اقبال سے دوستی تھی۔ ان دونوں کی باہمی خط وکتابت تو کہیں سے دستیاب نہیں ہو سکی۔ مگر دونوں کی نظمیں شیخ عبدالقادر مرحوم کے "مخزن" میں چھپا کرتی تھیں۔ اور اغلب ہے کہ دونو ایک دوسرے کو ذاتی طور پر بھی جانتے تھے۔ اقبال کا ایک پرانا مصرع ایک دوست کی زبانی سننے میں آیا:۔

نادر کا کوروی نے دور سے دیکھا مجھے

مگر اس سلسلے کے کوئی اور شعر نہیں مل سکے۔ اور یہ بھی تحقیق نہیں ہو سکا کہ یہ مصرع اقبال کا ہے بھی یا نہیں!

نادر کی طبیعت میں دو متضاد چیزیں موجود ہیں۔ ایک طرف تو ان کے کلام میں ایک حد تک قنوطیت کا رنگ جھلکتا ہے:۔

کوئی ایسے تھے کہ جو ہنستے ہنساتے اٹھ گئے　　کوئی ایسا تھا کہ جس نے روتے روتے کاٹ دی

ہوشیاری بھی ہے دنیا کی فریبوں سے بھری　　تھے وہی اچھے جنہوں نے عمر سوتے کاٹ دی

ان کی ایک نظم ہے "آہ یہ ہوگا!" جس میں انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ہر شخص کی ایک خاص دنیا ہوتی ہے۔ جو اس کے ساتھ پیدا ہوتی، اس کے قدم بقدم چلتی، اس کی وسعتِ معلومات کے ساتھ وسیع ہوتی، اس کے انحطاط کے ساتھ روبانحطاط ہوتی اور یہانتک کہ اس کی موت کے ساتھ ہی تنگ وتاریک ہو کر اس کی قبر بن جاتی ہے۔

مگر اس تاریک بینی کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں شگفتگی اور زندہ دلی بھی اس درجے کی ہے کہ اکبر الہ آبادی یاد آ جاتے ہیں۔ نادر کی ظرافت طبع کی وجہ سے ان کا کلام "اودھ پنچ" میں اکثر چھپا۔ ہر نظم میں ان کی طبیعت کی شوخی ان سے کچھ نہ کچھ کہلوا لیتی ہے۔ مہدی حسن نواب محسن الملک کا انتقال ہوا تو جہاں انہوں نے اس صدمے سے متاثر ہو کر یہ المناک رباعی کہی کہ:۔

(باقی)

نئے بنگالی افسانہ نگار:

علاء الدین الآزاد

یونس احمر

جب پاکستان بنا، اُس وقت بنگلہ زبان کے چند ہی افسانہ نگاروں کے نام سُننے جاتے تھے۔ مثلاً یہی سیّد ولی اللہ، محبوب العالم، شوکت عثمان اور ابوالکلام شمس الدین اور یہ وہ افسانہ نگار ہیں جن کی شہرت بنگال میں پاکستان بننے سے پہلے ہی مسلّم ہو چکی تھی۔ بنگال کے ہندو ادیبوں نے بھی ان کی تحریروں پر حوصلہ افزا تبصرے کئے تھے اور ان کی عظمت کے قائل ہو چکے تھے۔ یہ واقعہ ہے کہ ہندو ادیبوں کے سامنے مسلمان ادیبوں کا چراغ مشکل ہی سے جلتا تھا کیونکہ ادب میں سو فیصدی ان ہی کی اجارہ داری تھی۔ ان کے اپنے جریدے تھے، اخبارات اور پریس تھے۔ نشر و اشاعت کے سارے کل پرزوں پر ان ہی کا قبضہ تھا۔ لہٰذا ایسی صورت میں بنگالی مسلمان ادیب بالکل بے بس تھے بلکہ دوسرے لفظوں میں وہ ہندوؤں کے رحم و کرم پر تھے۔ یاد رہے بات ہے کہ ادب میں ہندوؤں کی جاگیرداری سے تنگ آکر بنگالی مسلمانوں نے بھی اپنی ادبی تحریک شروع کی۔ دو ایک پرچے اور اخبار بھی شائع کئے۔ نشر و اشاعت کا بھی انتظام کیا لیکن یہ تو بحرِ ذخار کے آگے ایک قطرۂ آب والی بات تھی۔

پاکستان بننے کے بعد البتہ ان کو اُبھرنے اور کام کرنے کا موقع ملا۔ وہ دماغ جن کے اندر سمجھ بوجھ اور تلاش و جستجو کی صلاحیتیں تھیں ان کو ایک نئی راہ ملی۔ ان کے سامنے نئے موضوعات اور جدید خیالات کے خوش رنگ پھول نکل رہے تھے، نئے تقاضوں اور نئی راہوں نے اُن کے ذوق اور وجدان کو نمو بخشی۔ وہ غلامی کے تاریک زندان سے نکل کر بہتر اور خوشگوار زندگی کی قوس قزحی فضا میں داخل ہوئے تھے۔ ان کا ملک ایک نئے دَور میں سانس لے رہا تھا۔

اس گیارہ بارہ سال کی مختصر مُدت میں بے سرو سامانی کے باوجود بنگالی اصناف ادب نے جو حیرت انگیز ترقی کی ہے اس کا اعتراف نہ کرنا ممکن نہیں ــــ خصوصاً شاعری اور افسانہ نگاری کے میدان میں بنگالی ادب نے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ پرانے افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ نئے افسانہ نگار بھی اُبھرتے دکھائی دئے۔ قابلِ تحسین بات تو یہ ہے کہ اس قلیل مدت میں جتنے افسانے لکھے گئے ہیں وہ بے مقصد نہیں۔ ہر افسانہ کم و بیش ایک اہم مسئلہ اور ایک خاص موضوع کے گرد گھومتا ہے۔ پاکستان بننے سے پہلے ہی سے بنگالی مسلمانوں کی زندگیاں ان گنت مسئلوں میں گھری ہوئی تھیں۔ جہالت، غربت کال، سیلاب، بھوک وغیرہ جیسے روح فرسا حالات نے ان مسلمانوں کی زندگی کو موت سے بدتر بنا دیا تھا۔ وہ کاشتکار تھے مگر زمین اپنی نہ تھی۔ وہ لاکھوں من غلہ اگاتے تھے لیکن خود دانے دانے کے لئے محتاج تھے۔ وہ کمر کمر پانی میں ڈوب کر پٹ سن کی بوائی اور کٹائی کرتے تھے اور ان کا یہ سنہرا ریشہ ان کی قسمت کے اندھیرے کو دور نہ کر سکتا تھا ظاہر ہے حساس اور زندگی سے قربت رکھنے والا افسانہ نگار ان روح فرسا مناظر سے اپنی آنکھیں کیسے بند کر سکتا تھا۔ جب کوئی مچھیرا غضب ناک لہروں اور طوفان بردوش ہواؤں سے لڑتا ہوا اپنی چھوٹی اور شکستہ کشتی کو دریا میں ڈال دے اور اللہ کا نام لے کر مچھلیاں پکڑنے کے لئے چل کھڑا ہو لیکن موجیں اُسے اپنا لقمہ بنالیں تو ایسی حالت میں آپ کے دل کی کیفیت کیا ہوگی۔ یہ حادثے مشرقی پاکستان کے دریاؤں میں ہوتے رہتے ہیں مگر زندگی ہمت نہیں ہارتی۔ ان حادثوں پر بے شمار کہانیاں لکھی گئیں اور لکھی جائیں گی۔

علاء الدین الآزاد بھی مشرقی پاکستان کا ایسا ہی ایک افسانہ نگار ہے ــــ اس کی ژرف نگاہی اور چابکدستی کا اچھے اچھے نقاد بھی لوہا مان گئے ہیں۔ یہ نو عمر افسانہ نگار جس کی عمر اس وقت چھبیس سال سے زیادہ نہیں ادب کی اس بلندی پر پہنچ گیا ہے جہاں پہنچنے کے لئے برسہا برس ریاضت کرنا پڑتی ہے۔ اس عرصے میں اس کی مختصر کہانیوں کے تین مجموعے، دو ناول، مضامین کا ایک مجموعہ، ایک شعری انتخاب اور ڈراموں کے دو مجموعے شائع ہو کر سامنے آ چکے ہیں۔ اس کی بسیار نویسی سے یہ نتیجہ نہ نکالا جائے کہ اس نے بیکار باتیں کی ہونگی۔ حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ اس بسیار نویسی اور کم عمری کے باوجود اس کی

ہر افسانہ زندگی کے تلخ حقائق سے بھرپور ہے۔ اس نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کا ہر زاویہ سے مطالعہ کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے خیال کی گہرائی اور نظر کی وسعت کسی افسانے میں بھی مفقود نہیں۔ وہ ایک معمولی واقعہ کو لیکر زندگی کا ایسا محل کھڑا کرتا ہے جس کے در و دیوار کے نقش و نگار نے آرائش جمال میں مسکراہٹیں بھی ہوتی ہیں اور آنسو بھی دکھتے ہیں۔

مشرقی پاکستان اپنے چھوٹے چھوٹے ہرے بھرے گاؤں میں بستا ہے۔ یہاں کی زندگی پُر پیچ نہیں، سیدھی سادی ہے۔ کاشتکاروں کو بیک وقت اپنے کھیتوں اور اپنی مجلسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے تو پھر وہ اپنے سارے دکھ درد بھول جاتے ہیں کہ ساون اور بھادوں کے مہینے نزدیک ہیں اور ان کی جھونپڑیوں کی چھتیں اب تک مرمت طلب ہیں۔ انہیں ایسے عالم میں بیساکھ کی بھی پروا نہیں ہوتی جب ٹین کی چھتیں بیساکھی ہواؤں سے اڑجاتی ہیں اور بیٹھے کی جھونپڑیاں گرپڑتی ہیں۔ ان ہی گاؤں میں اقتصادی اور معاشی زبوں حالی کے باوجود الھڑ ناریاں چوری چھپے محبت بھی کرتی ہیں۔ ان کی محبت دریاؤں کے جوار کی طرح بہت شدید ہوتی ہے اور کنول کی طرح نرم بھی۔ وہ اندر ہی اندر اس آگ میں تپتی رہتی ہیں مگر زبان سے کچھ نہیں کہتیں۔

ان چیزوں کے علاوہ مشرقی پاکستان کے گاؤں کا ایک رُوپ اور بھی ہے ــــ اور یہ روپ بڑا ہی پراسرار ہے اور خطرناک بھی۔ اس کے خلاف گاؤں کے سیدھے سادے لوگ احتجاج نہیں کرتے، انہیں ایسا سوچنے کی جرأت بھی نہیں ہوتی۔ یہ رُوپ ہے وہاں کے نام نہاد جاہل مولویوں ملاؤں کا۔ یہ مولوی ملا اسلام اور مذہب کی آڑ لیکر صدیوں سے گاؤں کی صاف ستھری زندگی کو ناپاک کرتے چلے آرہے ہیں۔ یہ کنواری اور کم عمر لڑکیوں سے نئی شادیاں رچاتے ہیں اور پھر چھوڑ دیتے ہیں۔ بہو بیٹیاں بھی ان کے پنجۂ استبداد سے آزاد نہیں۔ چور بازاری میں بھی ان کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔

مشرقی پاکستان کی زندگی کے یہ وہ موضوعات ہیں جن پر علاء الدین الآزاد نے بڑے ہی فنکارانہ انداز میں کہانیاں لکھی ہیں۔ ان کہانیوں کو پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آزاد نے ان موضوعات پر کچھ لکھنے سے پہلے زندگی کے مختلف روپوں کو ہر زاویے سے دیکھا ہے، ان کا گہرا مطالعہ کیا ہے، ان پر غور کیا ہے۔

اس کی مشہور کہانی "بارش" ایسے ہی ایک موضوع کے گرد گھومتی ہے۔ آسمان پر دور دور تک بادل کا نام و نشان نہیں ہے۔ گرمی کی شدت کا یہ عالم ہے کہ زمین پھٹ چکی ہے۔ دوپہر کے وقت کھیتوں میں کھڑا ہونا ممکن نہیں۔ گاؤں والوں نے سمجھا کہ ضرور ہم سے کوئی خطا سرزد ہوئی ہے۔ ہم میں ایسا یقیناً کوئی گنہگار ہے جس کی وجہ سے گاؤں پر یہ مصیبت نازل ہوئی ہے۔ اس نفسا نفسی کے عالم میں گاؤں کے مولوی محی الدین منبر پر کھڑے ہوکر بلند آواز سے کہنا شروع کرتے ہیں: ــــ "برادران اسلام! میں خدائے برتر کا ادنیٰ بندہ ہوں۔ لہٰذا میں آپ لوگوں کی خدمت کیسے کرسکتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں خدا نے اپنی کتاب میں کتنے واضح لفظوں میں فرمایا ہے کہ دنیا میں خدا کا غضب اسی وقت نازل ہوتا ہے جب دنیا گنہگاروں سے بھر جاتی ہے۔ آج ہماری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں ــــ بیٹا باپ کی نافرمانی کر رہا ہے، عورتیں بے پردہ گھوم رہی ہیں، چوری ڈاکہ زنی اور دوسری برائیوں کا بازار گرم ہے۔ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کو ہم بھول چکے ہیں۔ آئیے ہم اپنے گناہوں سے توبہ کریں۔ خدا بڑا رحیم و کریم ہے وہ ہماری دعا ضرور سنے گا۔"

اور دوسرے دن مولوی محی الدین صاحب بیمار پڑ گئے تو گاؤں والوں نے حاجی کلیم اللہ صاحب کو، بڑی منت سماجت کرنے کے بعد امام بننے پر رضامند کیا۔ حاجی صاحب نے دونوں ہاتھوں کو اٹھاکر دعا مانگنی شروع کی: "بارالٰہا! اپنے مجبور بندوں پر رحم فرما۔ تو آسمان، زمین، چاند اور سورج کا خالق ہے۔ تیرے ایک اشارے سے سمندر کی لہریں غضبناک ہوجاتی ہیں، ہواؤں میں طوفان سما جاتا ہے۔ خدایا میگھ دے، پانی دے، چھایا دے، شانتی دے۔"

اور مغرب کی نماز سے فارغ ہوکر حاجی کلیم اللہ تسبیح کے دانے گنتے گنتے سوچ رہے ہیں۔ "فکر کرنے کی کیا بات ہے۔ سُوت کی چور بازاری میں تو میں نے ہزاروں روپے کمائے ہیں۔ نصف رقم خرچ کر کے میگھنا کنارے گودام بھی خرید لیا ہے اور باقی نصف رقم سے زمین حاصل کرلی ہے...."

پچھلے سال حاجی صاحب ہوائی جہاز پہ سوار ہوکر حج بھی کر آئے ہیں۔ لیکن حج کے لئے روانہ ہونے سے پہلے جب لوگوں نے تیسری شادی کرنے پر مجبور کیا تو کہنے لگے: "ساٹھ کی عمر ہونے کو آئی۔ مجھے اپنی لڑکی کون دے گا۔" لوگوں نے کہا۔ "کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ صرف ہاں کیجئے اور پھر

دیکھئے۔ ایسی لڑکی آپ کو ملے گی کہ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔"

ساٹھ سالہ حاجی کلیم اللہ کے گھر میں جوان لڑکی آگئی لیکن چوری چھپے اس نے اس کے بڑے لڑکے خالد کو پھانسنا چاہا۔ ایک دن دونوں ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ زہرہ کی گود میں چھوٹا بچہ تھا۔ خالد نے اس کی گود سے بچے کو لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے دیجئے، آپ تھک جائیں گی"۔ زہرہ نے ترچھی نظروں سے اس کی طرف دیکھا، بولی۔ "تمہیں تکلیف نہیں ہوگی؟" دونوں چلتے رہے۔ ایک جگہ آکر زہرہ رک گئی۔ آگے گھٹنوں گھٹنوں پانی تھا۔ اس نے اپنا کپڑا ٹھیک کیا۔ پھر اس کی نگاہ چاند پر پڑی۔ اس کے من میں کیسی جوالا دہکنے لگی تھی۔ اس نے پکارا۔ "خالد! اوہ تمہیں کیسے بتاؤں۔ تم تو کچھ نہیں سمجھتے۔"

اور پھر جب بارش چھما چھم ہونے لگی تو زہرہ بے اختیار صحن میں نکل آئی۔ حاجی کلیم اللہ نے گھبرا کر کہا۔ "ارے ارے، یہ کیسا پاگل پن ہے۔ سردی لگ جائے گی تمہیں۔ آتنی رات کو یہ کیا سوجھا؟"

زہرہ برآمدے کے پاس آگئی۔ اس نے آنکھوں پر سے بالوں کے ایک گچھے کو ہٹاتے ہوئے اور ہونٹوں پر ہنسی لاتے ہوئے کہا۔ "آپ نہیں جانتے، یہ تو موسم کی پہلی برکھا ہے۔ نہانے میں بڑا مزا آتا ہے۔ اسی پانی سے فصل پیدا ہوتی ہے اور پھل آتے ہیں۔"

افسانے کے اختتام پر افسانہ نگار نے زہرہ کی زبان سے جو کچھ کہلوایا ہے اس میں کتنا بھرپور طنز ہے علاء الدین نے اشارے میں افسانے کی پوری حقیقت بیان کر دی ہے۔ بڑھاپے کی شادی، جوان بیوی اور پھر اس کے لڑکے سے بیوی کے ناجائز تعلقات۔ اور پھر اس کا بھیانک انجام۔ گاؤں کے مولوی اور حاجی جو گاؤں کے سیدھے سادے لوگوں کو اللہ کے غضب سے ڈرا دھمکا کر اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں۔ آج بھی اس ایٹم اور ہائیڈروجن بم کے زمانے میں وبا کی طرح پھیلے ہوئے ہیں اور ان گنت روپ بدل بدل کر گاؤں کی الھڑ گوریوں کی زندگی تباہ کر رہے ہیں۔ اس میں خالد اور زہرہ کا کیا قصور ہے۔ اس میں اس چاندنی رات اور چاند کے حسین مکھڑے کی کیا خطا ہے جسے دیکھ کر زہرہ کے جذبات میں آتش فشاں دہک اٹھتا ہے۔ زہرہ کوئی مافوق البشر تو ہے نہیں کہ وہ فضا سے متاثر نہ ہو اور اپنے آتشیں جذبات پر قابو پالے۔

علاء الدین الآزاد نے اپنے اس افسانے کی تکنیک اور ہیئت میں بڑی سادگی سے کام لیا ہے۔ اس میں نہ کوئی الجھن ہے اور نہ پیچیدگی۔ ایک عام موضوع ہے جسے اس نے فنکارانہ رنگ دے کر بڑا ہی موثر اور دلکش بنا دیا ہے۔ خصوصاً افسانے کے اختتام پر تو اس نے کمال کر دیا ہے۔ "یہ تو موسم کی پہلی برکھا ہے۔ نہانے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ اسی پانی سے فصل پیدا ہوتی ہے اور پھل آتے ہیں۔"

"تاریک زینے" علاء الدین الآزاد کا دوسرا افسانہ ہے جس میں زندگی کے گھناؤنے پہلو کی عکاسی کی گئی ہے۔ بھوک، بیکاری، افلاس، تنگ دستی انسان کو عجیب و غریب پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ لینا کا بھائی دلیپ پڑھا لکھا جوان ہے مگر مسلسل بیکاری نے اس کی زندگی اجیرن کر دی ہے۔ وہ ملازمت حاصل کرنے کے لئے اپنی بہن کو "ہوس" کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ مگر اسے نہیں معلوم کہ اس کی بہن پہلے ہی اپنے ہمسائے ڈاکٹر کریم کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ وہ ڈاکٹر جس نے لینا کو یقین دلایا تھا کہ اس محبت، اس ملن کا نتیجہ سنگین نہیں ہوگا لیکن جب لینا نے محسوس کیا کہ اس کا جسم غیر متناسب ہوتا جا رہا ہے تو اسے شبہ ہوا۔

"جب رات گہری ہو گئی اور گھڑیال نے ایک بجایا تو لینا بچھونے سے نیچے آگئی۔ اس نے روشنی تیز کر دی۔ اس وقت کوئی جاگ تو نہیں رہا ہے۔ نہیں کوئی نہیں۔ دیوار کے پاس پرانی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو کر ...... آخر ...... وہ کیا تلاش کر رہی تھی؟

نہیں، نہیں۔ اب تو شک و شبہ یقین سے بدل چکا ہے۔ یکایک اس نے لالٹین بجھا دی اور پھر وہ سرنگوں ہو کر دھپ سے بیٹھ گئی۔

"ٹن، ٹن، ٹن، گھڑیال نے تین بجائے۔ لینا اٹھ کھڑی ہوئی۔ آج کی رات کتنی حسین ہے۔ لیکن لینا کو اس رات کی قدر و قیمت معلوم ہے۔ ایسی ان گنت حسین راتوں میں اسے محبت کا تحفہ ملا ہے۔ ان لمحوں میں اس کے ہونٹوں پر ہزاروں بوسے ثبت کئے گئے ہیں۔

تین بج گئے مگر وہ کہاں ہے۔ دستک نہیں ہوئی اب تک؟ آخر اسے ہوا کیا؟

"لینا نے کپڑے پہن لئے۔ وہ باہر آگئی اور آہستہ آہستہ زینہ طے کرنے لگی۔ ایک جگہ آکر اس کے پاؤں رک گئے۔

"یہ آپ نے کیا کر دیا۔ اعتماد کی اچھی قیمت چکائی آپ نے!"
"اعتماد ــــ نہیں میں نے تو دل کی خوشنودی حاصل کی تھی!"
کئی زینے طے کرنے کے بعد لینا پھر رک گئی۔
"تم کانپ رہی ہو؟"
"نہیں کچھ نہیں۔ تم سے کچھ کہنا ہے۔ بیحد ضروری۔"
"تو کہو"
"تم نے کہا تھا کہ کچھ نہیں ہوگا مگر ــــ"
"تو کیا ــــ مطلب؟ ذرا واضح لفظوں میں بتا دو"
اور لینا نے جب اس کی آنکھوں پر پڑا ہوا پردہ تار تار کر ڈالا تو اندھیرے میں اس کے پاؤں کانپنے لگے۔
"حادثہ" میں ڈاکٹر ہوں اور مجھ سے ایسا حادثہ سرزد ہوگیا۔ خیر ڈرنے کی بات نہیں۔ گناہ کی جڑ کاٹ کر پھینک دونگا۔"
"نہیں" لینا نے جواب دیا۔
"مگر میں تو تمہارے ساتھ شادی نہیں کر سکتا۔ کیا میں نے تمہیں نہیں بتایا کہ چند دن پہلے میرے بڑے لڑکے کی موت واقع ہوگئی ہے۔ ویسے ہی بہت پریشان ہوں۔ مزید پریشانی میں مبتلا نہ کرو۔"
یہ سن کر لینا کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا مگر اس نے خودکشی نہیں کی البتہ اس کے دل میں بیک وقت کئی سوال جاگ اٹھے ــــ "کیا اس کے بعد اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں؟ کیا اس وسیع دنیا میں ایک ننھی جان اور اس کی بے سہارا ماں کے لئے کوئی جگہ نہیں؟"
یہ سوال آج ہماری سماج کے لئے نئے نہیں ہیں۔ یہ سوال بہت پرانے ہو چکے ہیں لیکن کیا جواب ملا؟ ان سوالوں کا جواب دے گا کون؟ ہم؟ آپ؟ پھر کون؟
علاالدین آزاد نے اپنے افسانے میں ان ہی سوالوں کے جواب طلب کئے ہیں۔ کتنی موثر اور دل گداز کہانی ہے! ہماری سماج کے ایک گھناؤنے روپ کو اس نے کتنے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ یہی تو اس کی کامیابی کی دلیل ہے۔

*

"نادر کاکوروی": ــــــــ بقیہ صفحہ: (۲۳)

اب قوم کو کچھ کرنے کا یارا نہ رہا ۔۔۔ اب تنکے کا بھی اس کو سہارا نہ رہا
ہر قوم کا ہادی ہے کوئی لیکن آہ ۔۔۔ ہم کس کے ہوں کوئی بھی ہمارا نہ رہا

وہاں وہ یہ بھی کہہ گئے کہ:۔

ینیا د کوئی چندے کی ڈالی ہے وہاں ۔۔۔ یا عہدہ سیکرٹری کا خالی ہے وہاں
کیوں ملکِ عدم کو تم چلے اے مہدی ۔۔۔ کیا کانفرنس ہونے والی ہے وہاں

یہ ایک مختصر سی جھلک ہے نادر داوران کے کلام کی۔ ان کا سارا کلام جمع نہیں کیا گیا، خصوصاً ۱۹۱۰ء کے بعد کا کلام جب جذبات نادرؔ کا دوسرا حصہ شائع ہو چکا تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی کے باقیماندہ دو سال میں جو کچھ لکھا، وہ ابھی پراگندہ ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کی طرف توجہ کی جائے اور ان کا سارا کلام دوبارہ چھپوایا جائے۔ ورنہ اردو شاعری احسان فراموشی کے اس الزام سے بچ نہیں سکے گی۔ جو اس سلوک کی وجہ سے جو نادر کے ساتھ اب تک روا رکھا گیا ہے، اس پر عائد ہوتا ہے۔

سندھی رومان:

"نوری جام تماچی"

(سُر کاموڈ)

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ
مترجم: عاصمہ حسین

جون کے شمارے میں مشہور سندھی رومان "نوری۔ جام تماچی" کا ذکر آیا تھا جس کو شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کی دلچسپی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم اس شمارہ میں ان کی دو "داستانوں" یعنی حصوں میں سے ایک کا منظوم ترجمہ پیش کر رہے ہیں جو شیخ احمد لاشاری کے نثری ترجمہ پر مبنی ہے۔

شاہ بھٹائیؒ کے فکری مرکز و محور دو ہیں: الٰہ و عبد، حق و روح، جن کا آپس میں بنیادی تعلق ہے۔ لہٰذا وہ الوہیت کے ساتھ "روح" کے شاعر بھی ہیں اور ان کا کلام روح کی بلندی و پستی، فتح و شکست، عروج و زوال کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ ان کی ہیروئنیں سسوئی، سسّی، ماروی اور نوری بنیادی کیفیتوں اور اقداروں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ نوری کیا ہے؟ انسانی فطرت، اپنی تمام کمزوریوں اور سفلی رجحانات کے ساتھ۔ اسے درجہ بلند حاصل کرنے کے لئے جام تماچی کی ضرورت ہے۔ وہ ہستی جو انسان کو پستی سے بلندی کی طرف جانے کی تحریک دلاتی ہے۔ نظم کے بسیط مطالعہ سے جام کی علامتی حیثیت بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ نوری پہلے گندری ہے اور پھر نوری۔ اسی لئے اس کی ذات میں وہ ڈرامائی دلچسپی اور کشش نہیں جو سسوئی، سسّی اور ماروی میں ہے یا ان سے متعلق شعروں میں پائی جاتی ہے۔ کیونکہ موضوع کی نوعیت کلام پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ تاہم بھٹائیؒ کے بنیادی تصور کو واضح کرنے کے لئے اس کی اہمیت ظاہر ہے۔ ہیروئنوں کے نام بھی اسی لئے نسوانی ہیں کہ وہ "روح" کی تمثیل ہیں۔ (ادارہ)

تو سمہ ہے میں گندری
تو اوج سراپا میں پستی
مرا دل ہے گناہوں کی بستی
کہیں دیکھ سکے گی دنیا جن کو
اور ان کا سحر ہیرا جوبن
مجھے چھوڑ نہ دینا اے ساجن!
منہ موڑ نہ لینا اے راجن!

(۲)

تو سمہ ہے میں گندری
مرے دل میں ہیں عیب ہی عیب بھرے
مرے تن پر مچھلی کے ریشے
کہیں دیکھ کے یہ اوگن میرے
جن سے ہے بھرا میرا تن من
مجھے چھوڑ نہ دینا اے ساجن!
منہ موڑ نہ لینا اے راجن!

(۳)

تو سمہ ہے میں گندری
ہیں مجھ میں کروڑوں عیب نہاں
مرے تن پر ہے مچھلی کے نشاں
یہ نہ کہ ہوں برگشتہ دل و جاں
ہاں دیکھوں ان ہی کے کارن
مجھے چھوڑ نہ دینا اے ساجن!
منہ موڑ نہ لینا اے راجن!

(۴)

تو سمہ ہے میں گندری
عیبوں کا پتلا من میرا
تن میرا مچھیروں کا پالا
میں کیا ہوں مری اوقات ہے کیا
میں مے، تو جام، برائے خدا!
کہیں بھول کے یہ پھر ہو پرگن

---

[1] سندھ کے مچھیروں کا ایک قبیلہ جو گندری کہلاتا ہے۔ ماہ کنول گرگانہ

مجھے چھوڑ نہ دینا اے ساجن!
منہ موڑ نہ لینا اے راجن!

(۵)

تو سمّہ ہے میں گندری
مجھ میں ہے ہزار اک عیب بھرا
معلوم ہے تجھکو حال مرا
ہاں بہر خدائے بے ہمتا!
باندھا تھا جس نے یہ بندھن
مجھے چھوڑ نہ دینا اے ساجن!
منہ موڑ نہ لینا اے راجن!

(۶)

تو مالک ہے اس بستی کا
ہم بستے ہیں تیرے سائے میں
ہیں ایک مچھیرن بے مایہ
مت دیجیو داغ جدائی کا
ترے نام سے میری آن بچا
تو مان ہے میری ہستی کا

(۷)

تو جام ہے سب پر راج ترا
دریائی بستی سب تیری
میں غربت کی گودی میں پلی
تو اپنا ہے، اس کارن ہی
کر ہم کو معاف لگان سبھی
گو سب پہ ہے واجب باج ترا

(۸)

یہ رشتہ کن سے جوڑ لیا
جن میں نہیں کوئی تاب و تواں
ہیں مچھلیاں کھانے کا ساماں
یہ ڈھیر ہی ڈھیر عفونت کے
انبار ہیں ان کی دولت کے
سب پھرتے ہیں مارے مارے

تجھ سے ہی امید کھیں سارے
ہے جام! سہارا تو ان کا

(۹)

یہ آتے ہیں بھاری جال لئے
یہ کشتیاں برگ و ساز ان کا
اور ٹوکروں پر ہے ناز ان کا
جب پھیلیں سورج کی کرنیں
دربار میں حاضر ہو جائیں
سمّہ نے خویش بنایا انھیں
نوری کی اتھاہ محبت میں
جو لوگ غریب مچھیرے ہیں
اور ذات قبیلے می کے ہیں
غربت میں سدا اک حال لئے

(۱۰)

بدبوئیں بسی پٹاروں میں
اور چھاج بھی سارے آلودہ
ہر تنکے میں مچھلی کا ریشہ
سمّہ ہے کہ ان لوگوں میں کھڑا
دن رات کرے کیا کچھ نہ دیا
کھویا ہے انھی ہنگاموں میں

(۱۱)

وہ کالی بھونڈی بدصورت
بے ہنگم بھدی ناریاں ہیں
لئے بیٹھی اپنی پٹاریاں ہیں
ہو کون بھلا غمخوار ان کا؟
ہے جام پہ دارومدار ان کا
وہ ان کے لئے عین رحمت

(۱۲)

یہ جال، پٹارے چھاج ان کے
مچھلی کو دل و جاں سے چاہیں
دریا کے کنارے بیٹھیں انھیں

مچھلی کی بو سے بسے ہوئے
نت ان کی بساند میں کھوئے ہوئے
سیّد کہے: مچھووں کی صورت
ان لوگوں کو پانی سے الفت
ان مانجھیوں ہی کی دلجوئی
سمّے نے اپنے ذمے لی
ہے ٹھیک اسی سے کاج ان کے

۱۳

وہ گھاس کہ جس سے گھن آئے
چمٹی ہوئی ان کے لہنگوں سے
تن ڈھانپیں پھول پہوڑے کے
تو، راجہ ان کے جھونپڑوں میں
کس شوق سے آئیں، دیا کریں
جو دیکھے ان کا جس گائے

(۱۴)

ہے گند کی گھاس ان لہنگوں میں
اور تن پر پھول پہوڑے کے
یہ پھول ہی انگ سدا ڈھانپے
سب جھیل بٹی ان لوگوں میں

(۱۵)

خوش ہو کر جام کی آمد پر
سب ناریاں شوقِ سلام لئے
شکرانہ تو ہر گام لئے
لہنگوں پر گھاس ہی گھاس جمی
اور سروں پہ گٹھڑی پر گٹھڑی
اٹھ کر تیار ہوئیں گھر گھر

(۱۶)

گھل مل گئے جام سے وہ سارے
ہر ایک مچھیرن چھوٹی بڑی
اونچے محلوں میں رہنے لگی
اک کینجھر جھیل کی بات ہی کیا

ہر ماہی گیر قوم کے ساگر کا
خورشیدِ فلک ہے سرمایہ

(۱۷)

نوری، اس کی دنیا بدلی
نہ وہ مچھلیاں پکڑے نہ پاس رکھے
نہ وہ مچھلیاں کاٹے نہ بیچے
سب ٹوکرے کنوئیں میں پھینک دیے
نت پیار کی نظروں سے دیکھے
کسکو؟ اپنے من راجن کو
اُس پریت کے رسیا ساجن کو
وہی رنگ اُسکا وہی ریت اُسکی
سمّہ کے راج محل والی
اب اُس کی شان ہی اور ہوئی

(۱۸)

کم تول زیادہ تول ہے کیا
کیا کرتی اس کا اندازہ
کیا پاس تھا اُس کے پیمانہ
اس شے کا ترازو کوئی نہ تھا
نے باٹ تھا کوئی نے پلّہ
نوری نے وہی ڈھنگ اپنایا
جو راج محل میں آ دیکھا
اُس کا معیار وہی ٹھہرا

(۱۹)

نوری کے دل میں شوق اُٹھا
اک پھول پوڑے کا توڑا
اور بڑھ کر جام کی نذر کیا
سمّے کے محل کی سب ناریں
گم ہو گئیں عالمِ حیرت میں
اور جام کا دل یوں لوٹ آیا
اک مہر کا دریا پھوٹ پڑا
کچھ نرمی سے کچھ الفت سے
ہاتھ اپنا بڑھایا شفقت سے
اور ہاتھ پکڑ کر گندری کا
گاڑی میں بٹھا کر چلا گیا
وہ جام، وہ گندری شانِ خدا!

(۲۰)

کیا دل میں غرور تھا نوری کے؟
تھا اس کو روپ گمان کوئی؟
کیا اس کو تھا خود پر مان کوئی؟
نہیں، اس نے تو اپنی آنکھوں سے
اُن پیاری مدبھری آنکھوں سے
مخمور کیا تھا راؤ کو
مسحور کیا تھا راؤ کو
اور اپنی فہم و فراست سے
ہشیاری، دانش و حکمت سے
سب بیگموں کا دل موہ لیا
کی سب کے دل میں رہ پیدا
سب لوگ تھے اس کے متوالے

(۲۱)

نوری کا نیاز بھی کیا شے تھا
اک جادو خیز کرشمہ تھا
گویا اعجاز سراپا تھا
اُس شخص کے دل پر سحر کیا
سردار تھا جو سب لوگوں کا
وہ ایک مچھیرن کے سر پر
جھلتا تھا پنکھا رہ رہ کر
یوں مورچھل اس کو جھلتا ہوا
جیسے وہ اس کا چاکر تھا
وہ رانیاں اونچے سر والی
سب ختم ہوئی حجت ان کی
کٹ حجتیاں اور تکراریں
وہ زہر میں ڈوبی تلواریں
یہ فیصلہ پہلے ہی طے تھا

(۲۲)

ہاتھوں میں مچھیرن کے پنچھی
پر دل میں گہری سوچیں ہیں
کیا جانئے کیسی موجیں ہیں
آنکھوں میں راجہ ہی راجہ
اور من میں اسی کا روپ بسا
پیار اس کا چٹکیاں لے دل میں
اور خواب ہی خواب بھرے دل میں
دل کیا تھا خوابوں کی بستی

(۲۳)

کیا صورت میں کیا سیرت میں
وہ اور مچھیرن کیا کہنا
ہر رنگ میں وہ کچھ اور لگے
جس طرح ستارے تاروں میں
ان دھیمی دھیمی دھاروں میں
ڈھل گئے کا اجلا روپ جگے
اندھیارے میں جیسے دھوپ لگے
یونہی نوری لگتی تھی رانیوں میں
نورانی فرشتہ ناریوں میں
فطرت ہی تھی اس کی شاہانہ
اونچا تھا نظر کا پیمانہ
جبھی جام نے اس کو جان لیا
اور باندھا کلائی میں ڈورا
یکسر سرشار محبت میں

(۲۴)

وہ روپ انوپ وہ آب اس کی
جھیل اس کے سامنے پانی بھرے
کب حسن و جمال کی تاب رکھے
نے ڈھیر لگائے مچھلیوں کے
نے گندریوں کے سنگ بسے
وہ ڈونگے کشتیاں کھینے کی

سب محنت اس کو معاف ہوئی
خود مور چھل اس کو جام جھلے
اور شوق سے صبح و شام جھلے
ایسی تھی بلند جناب اُس کی

(۲۵)

یہ بستی جام تماچی کی
وہ اس بستی کا راجہ ہے
ہر شخص اس کے گن گاتا ہے
اے کھیجی[1] اس کے دوارے جا
اور اس کی شان میں گانے گا

تا اس کی شان کو جان سکے
اصلیت کو پہچان سکے
کیا ظرف ہے اس کا کیا دل ہے
کیا اس کی حقیقی منزل ہے
کیا اُس کا مرتبۂ عالی

(۲۶)

یہ مچھیاں، سومریاں ساری
دھتکارنے کے لائق ہیں سبھی
سر اونچا اٹھا کر چلتی ہوئی
اچھلے جلا ڈالیں ان کو

نظروں سے گرا ڈالیں ان کو
ان سے تو بھلی وہ بالیاں ہیں
کیچڑ میں جو کھیلنے والیاں ہیں
دل میں جو بسائیں تماچی کو
اور یاد میں لائیں تماچی کو
یہ جتنی اُتم رانیاں ہیں
یوں جن کی چرب زبانیاں ہیں
ان میں سے ہیرا کس کو ملا
جو رات کو بھی دن کرتا تھا؟
یہ چیز مچھیرن ہی کو ملی!

وائی

رہی مچھیرنوں میں وہ لیکن ڈال دئے ہیروں پر ہاتھ
نوری پر تھی صرف نوازش جام تماچی کی دن رات
کیا کہنے ہیں اس کے کرم کے، احسانوں کی وہ برسات!
اُس کا کارن؟ ترکِ غلاظت، اور وہ شوقِ عطریات

★

اندھوں لولوں لنگڑوں سب پر کیا سخاوت کا در وا
داد و دہش اس مردِ سخی کی، دیا دھڑا دھڑ مال لُٹا
ہر ہر رُت پر تحفے نئے ان ناچیزوں کو کئے عطا
جو ہری ہُن برسانے والا ہوا زمانے میں پیدا
مچھلی بیچنے والوں کو دئے لعل و گہر بے مول عطا

★

پہلے بانٹ دیں ساری مہریں نوری نے ناداروں میں
پھر یہی مشغلہ ڈھونڈا اس نے سب چاندی کے سکوں میں
پھر ذوقِ کرم مشغول ہوا انمول اور نادر چیزوں میں
فیروزے ہزاروں بخش کئے محتاجوں اور فقیروں میں
بے انت جواہر بکھرائے دھرتی کے گونڈے باسیوں میں
تسید کہے اس نے یہ کام کئے بیٹھے ہوئے اپنی مچھیرنوں میں

---

[1] ڈوم۔ جو بے حد لالچی ہوتے ہیں۔ کھیجی میں صریحاً ایہام ہے۔ یہ لفظ شاہ بھٹائیؒ نے خود وضع کیا ہے۔

افسانہ

آئینہ

عنایت اللہ

میں آئینے کے سامنے کھڑا ہوں۔

آئینہ دیکھتے ایک عمر گزر گئی ہے لیکن آج آئینہ مجھے دیکھ رہا ہے۔

میں شاید بوکھلا گیا ہوں یا شاید میری شکل و صورت ہی ایسی ہے۔ چہرے کا رنگ روپ ہی بدلا ہوا ہے۔ وہ نکھار ہی نہیں جو چند روز پہلے تک تھا۔ میں نے آئینے کو اچھی طرح دیکھ بھال لیا ہے۔ یہ وہی بلجیم کا اصلی شیشہ ہے، جو دو برس ہوئے عوامی پولیٹیکل فرنٹ کے کنوینر کی کوٹھی سے میں اٹھا لایا تھا۔ ایک بار نیلوفر اس آئینے پہ روٹھ گئی تھی۔ میں نے اسے کسی بات پہ کبھی ناراض تو نہیں کیا تھا لیکن یہ آئینہ مجھے اس قدر اچھا لگتا ہے کہ اس نے مانگا اور میں نے نہ دیا۔ اگر حاجی نور دین گورنمنٹ کنٹریکٹر نیلوفر کو نیا قد آدم آئینہ نہ دے دیتا تو جانے وہ میرے ساتھ کب تک روٹھی رہتی یا مجھے اپنا آئینہ قربان کرنا پڑتا۔ حاجی نور دین کے ہاں کیا کمی ہے۔ وہ ۱۹۴۵ء میں ایک سرکاری محکمہ میں چپڑاسی تھا۔ اس زمانے میں وہ نورا چپڑاسی کے نام سے مشہور تھا اور اب دس برس کے عرصے میں آٹھ بار حج کر آیا ہے۔ کراچی میں اس کی تین محل نما کوٹھیاں ہیں اور ہر سال کار اور ہر تیسرے سال بیوی کا ماڈل تبدیل کرتا ہے۔

اس آئینے میں یہ خوبی ہے کہ نزدیک سے دیکھئے یا دور سے، اس میں لہریں نہیں پڑتیں لیکن آج اس میں مجھے چہرے کے خدوخال ہی ڈھلتے، جھولتے اور ڈگمگاتے نظر آ رہے ہیں جیسے میں ساکن جھیل پر جھکا ہوا تھا کہ کسی نے پانی میں کنکری پھینک دی ہے۔ چہرہ تیرا تیرا دکھائی دے رہا ہے۔

آئینہ تو اچھی قسم کا تھا، شاید میری شکل و صورت بدل گئی ہے۔ میں اپنی صورت دیکھنے سے گھبرا رہا ہوں۔ گریز سا کر رہا ہوں۔ خفیف سی جھینپ سے کہیں سکڑ بھی رہا ہوں۔ ایک غبار سا ہے کہ میرے سینے میں پھیلتا ہی جا رہا ہے۔ میرے نقش دنگاریوں مڑے تڑے اور مضحکہ خیز سے تو نہیں تھے۔ میری پیشانی پر گرے ہوئے بال دلیپ کمار سے کہیں زیادہ دلکش تھے۔ میری آنکھوں میں نسوانی دلوں کو موہ لینے والی چمک تھی۔ باقی ناک نقشہ ٹونی کرٹس سے ملتا جلتا تھا۔ گو مجھے کبھی بھی کسی نے نہیں بتایا تھا کہ میں مردانہ حسن کا مرقع ہوں لیکن کسی کے کہنے یا نہ کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کالج کے زمانے میں نیلوفر، مسرت اور ثریا کا مجھ سے کھچے کھچے رہنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میرے چہرے مہرے اور جسم کی ساخت میں کوئی کشش نہیں تھی۔ آغاز میں انہوں نے اگر مجھے لفٹ نہیں دی تھی تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ میں خورشید اور شوکت سے کم خوبرو تھا۔ مجھے اپنی خوبصورتی اور دلکشی پر ہمیشہ ناز رہا ہے۔ لیکن آج آئینہ مجھے میرا وہ روپ دکھا رہا ہے جو میرے تصوروں نے کبھی قبول نہیں کیا تھا۔ کیا میں یہی نقش و نگار لے کے پیدا ہوا تھا؟ کیا یہی تھے وہ خدوخال جن پہ میں ناز کرتا رہا ہوں؟ کیا میں اپنے آپ کو فریب دیتا رہا ہوں؟ یا کیا آئینہ .... لیکن آئینہ تو وہی ہے۔ بلجیم کا بڑھیا شیشہ۔ اس میں تو کوئی نقص نہیں ہو سکتا۔ یہ جب سے بنا ہے بے عیب ہے اور جب تک رہے گا بے عیب ہی رہے گا۔

"تم آئینہ ہر روز دیکھتے ہو۔ کبھی آئینے میں اپنے آپ کا سامنا بھی کیا ہے؟"

کمرے میں برسوں پرانی سرگوشی کی سرسراہٹ سی سنائی دے رہی ہے۔ یہ میرے کالج کے ایک پروفیسر کی آواز ہے۔ "ہیملٹ" پڑھاتے پڑھاتے ایک روز پروفیسر موڈ میں آ گیا تھا۔ پروفیسر کے منہ میں صرف دو لمبے لمبے دانت تھے۔ دونوں ہلتے تھے۔ جب وہ مسکراتا تھا تو ایک دانت اندر کو ہو جاتا تھا اور دوسرا نیچے والے ہونٹ پہ ٹک کر ناچنے لگتا تھا۔ اگر یہ دانت زمانے کی دستبرد سے بچا ہوا نہ ہوتا تو ہم پروفیسر کے موڈ کا کبھی اندازہ نہ کر سکتے۔ ایک روز لیکچر کے دوران میں ہونٹ پہ اس ناچتے ہوئے اور منہ میں چھپے ہوئے دانت کے درمیان سے پروفیسر کی کانپتی ہوئی سرسراتی آواز آئی تھی ــــ

"تم آئینہ ہر روز دیکھتے ہو، کبھی آئینے میں اپنے آپ کا سامنا بھی کیا ہے؟"

خدا جانے اسے کیا سوجھی تھی اور ہیملٹ کا آئینے کے ساتھ کیا تعلق تھا؟ اس نے کلاس کی طرف دیکھا تو اس پر سناٹا چھا گیا تھا۔ اشرف اور رضا کی کھسر پھسر جو کبھی بند نہیں ہوتی تھی، بند ہو گئی تھی۔ شوکت کی پنسل جو میز پر ٹیلیگراف آفس والوں کی طرح کھٹ۔ کھٹ۔ ٹکا ٹک کرتی رہتی تھی اس روز پہلی بار خاموش ہوئی تھی۔ پچھلی سیٹوں پر "ہی ہی ہی ہی" کی ہنستی ہوئی آوازیں پچھلی سیٹوں میں ہی فوت ہو گئی تھیں۔

"کبھی آئینہ میں تم نے اپنا سامنا کیا ہے؟"

پروفیسر کی بوڑھی آواز نے سکوت کو اس فقرے سے جھنجھوڑنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھنے سے پہلے ساری کلاس کا جائزہ لیا تھا میں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ ہر لڑکے اور لڑکی کا سر جھکا ہوا تھا۔ حد یہ کہ نیلوفر اور ثریا کی شوخ آنکھیں بھی جھکی ہوئی تھیں۔ تب مجھے محسوس ہوا تھا کہ پروفیسر نے کوئی ایسی بات کہہ دی ہے جو گہرے رمز کی حامل ہے لیکن میں نے اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں نے کلاس میں کبھی کوئی بات سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں کبھی سنجیدہ نہیں ہوا تھا۔ میں نے صرف اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش ضرور کی تھی کہ آج کلاس کے بڑے بڑے تیس مار خاں، بڑے بڑے فرہاد اور بڑے بڑے "دل کے بہلا دینے والے" تمام "سنتوش" اور "دلیپ کمار" اور وہ بھی جو اپنے آپ کو "میریلین منرو" "شیاما" اور "صبیحہ" اور جانے کیا کیا سمجھتی ہیں، ان کی نظریں کیوں جھک گئی ہیں؟ مسرت کے سرخی تلے چھپے ہوئے ہونٹوں پر کھسیانی سی مسکراہٹ کیوں ہے؟ یہ سب لوگ پروفیسر کی طرف کیوں نہیں دیکھتے؟ پروفیسر کا چہرہ آئینہ تو نہیں۔ وہ تو بے چارہ خود اس عمر میں آئینہ دیکھنے سے گھبراتا ہوگا۔ اپنے آپ کو اپنے یہ دانت کون دکھاتا ہے۔ سب طلباء اور طالبات پروفیسر کی بے نور مگر مسکراتی ہوئی آنکھوں کا سامنا کرنے سے گریز کر رہی تھیں۔ صرف میں تھا جو اس منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا — کچھ نہ سمجھ سکنے میں کتنا لطف ہوتا ہے — جب میں نے شوکت اور خورشید کی رقیب نگاہوں اور نیلوفر، ثریا اور مسرت کی تمر یراور ہرجائی نگاہوں کو جھکا ہوا دیکھا تو میری گردن ضرورت سے زیادہ تن گئی تھی۔ پھر میں نے فاتحانہ انداز سے پروفیسر کی طرف دیکھا تھا اور پروفیسر مجھے یوں اکڑا ہوا دیکھ کر اس طرح ہنسا تھا جس طرح میں سرکس کے مسخروں کو دیکھ کر ہنسا کرتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ پروفیسر کا دوسرا دانت بھی باہر آ گیا تھا۔ اور اس کا سال خوردہ قہقہہ حلق میں ہی خر خر کر رہا تھا۔

آج ساڑھے دس برس بعد بلجیم کے اس آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر پروفیسر کا خراٹے نما قہقہہ پھر سن رہا ہوں اور اس کی بوڑھی آواز بھرپور طنز بن کر میرے کمرے میں گونج رہی ہے — "کبھی تم نے آئینے میں اپنا سامنا کیا ہے؟" — مجھے یوں لگتا ہے جیسے آج میری نگاہیں جھکی جا رہی ہیں اور کلاس کی درجنوں آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں۔ وہ ذرا سی بات جو میں اس وقت نہیں سمجھ سکا تھا آج بغیر کسی کے سمجھائے سمجھ رہا ہوں۔ زمانے نے اتنی سی بات سمجھانے کو پورے ساڑھے دس سال کا عرصہ صرف کیا ہے۔ کاش! میرا پروفیسر "اپنے آپ کا سامنا کرنے" کا فلسفہ اس روز تفصیلاً سمجھا دیتا، وہ مجھے ہنس کے ٹال نہ دیتا اور آج میں اس آئینے کے سامنے کھڑا یوں اپنے آپ کو دیکھنے سے گریز نہ کر رہا ہوتا۔ ابھی ابھی دیکھا ہے کہ آج دوسرا روز ہے میں نے شیو نہیں بنائی مجھ پر پہلی بار انکشاف ہوا ہے کہ میری داڑھی کے آدھے بال سفید ہو چکے ہیں۔ سر کے بال سیاہ ہیں۔ (سفید بال حجام سے نکلوا لیتا ہوں) آنکھوں کے گرد شب بیداری، تعیش اور شراب نے سیاہی مائل رنگ کے گھیرے ڈال دئے ہیں اور یہ انکشاف بھی ہوا ہے کہ میرا رنگ جو غالباً ہمیشہ سانولا رہا ہے اب کراچی کی مرطوب ہواؤں اور دھوپ نے گہرا سانولا کر دیا ہے۔ ہونٹ جو کل تک اچھے بھلے تھے آج مرجھائے سے ہیں۔ چہرہ یوں لٹک آیا ہے جیسے گناہوں سے لدے ہوئے ضمیر پر ایک اور گناہ کا بوجھ آخری تنکے کا کام کر رہا ہے۔

اور میرے عکس کی آنکھیں دور بہت دور کسی شے کو دیکھ رہی ہیں جیسے برسوں پرانے اور گذرے، وقت کی ریت میں گمشدہ شب و روز کو تلاش کر رہی ہوں۔

کہاں گئے وہ دن، وہ راتیں، کالج کا وہ زمانہ، وہ رقیبوں کی چوٹیں، وہ ثریا کی ادائیں، وہ ہنسی وہ قہقہے — آج دوپہر تک تو مجھے کچھ بھی یاد نہیں آیا تھا۔ ذہن کبھی یوں پسپا تو نہیں ہوا تھا۔ پچھلے پہر آئینے کے سامنے کھڑے ہوتے ہی یہ کیا ہو گیا ہے؟ .... شاید نیلوفر نے بات ہی ایسی کہہ دی ہے، یا میں نے یا حالات نے ایسی بھونڈی سی قلابازی کھائی ہے کہ گرد و پیش کی ہر شے کا وہ رنگ روپ ہی نہیں رہا۔ ہر چیز الٹی الٹی سی دکھائی دے رہی ہے۔ ہوٹل کی اس تیسری منزل کے کمرے میں بھاگ بھاگ کر آتے ہوئے کراچی کی مرطوب ہواؤں کے تھپیڑوں میں وہ گداز ہی نہیں رہا۔ ان میں اعصاب کو سہلانے والی وہ خنکی ہی نہیں رہی۔ اعصاب کھنچتے ہی جا رہے ہیں۔ میں آئینے کے سامنے سے ہٹ جانے کی کوشش کر چکا ہوں، لیکن

کاسامنا کیوں ہوتا ہے۔ عکس نے مجھے ہپناٹائز کر لیا ہے۔

میں گھوم کر پیچھے دیکھنا نہیں چاہتا کیونکہ میں نے اپنے عکس کے عقب میں بوڑھے پروفیسر کا چہرہ دیکھا ہے۔ شاید واہمہ ہوگا لیکن میں نے ایک جھلک دیکھی ہے اور میں لرز گیا ہوں۔ وہم تو غیر محسوس ہوتا ہے مگر میرا لرزہ تو غیر محسوس نہیں۔ میرا رُواں رُواں ہل رہا ہے عکس کے پس منظر میں لمبا سا ایک دانت مرجھائے ہوئے ہونٹ پر ناچ رہا ہے اور میں نے چیلنج کے انداز میں ایک بار عجب آواز سُنی ہے ——

"کبھی آئینہ میں تم نے اپنا سامنا کیا ہے؟"

"اوہ! ...... یہ کون ہے؟ ...... میرے سینے میں سے کسی نے جواب دیا ہے؛ جیسے نالائق سا کوئی طالب علم بول اٹھا ہو۔

"جی ہاں میں آجکل یہ جرأت طلب تجربہ کر رہا ہوں —— اُف کس قدر ہوش رُبا ہے یہ بات"

کاش! میرا وہ ضعیف پروفیسر ایک بار پھر مجھے مل جائے۔ میں اس کے سامنے دوزانو ہو کر گناہوں کا اعتراف کر دوں۔ میں اسے کہوں "میرے بزرگ استاد! ایک بار، چند ثانیوں کے لئے ہی سہی، آ اور میرے سر پر ہاتھ رکھ دے میں ڈر رہا ہوں۔ اپنے آپ سے خوف کھا رہا ہوں۔ دل ڈوب رہا ہے، بد اعمالیوں کا بوجھ عمر کی کشتی کو ڈبو رہا ہے" —— نہیں! وہ نہیں آئے گا۔ وہ لاہور کے ایک وسیع قبرستان کی کسی گمنام قبر میں سو رہا ہے۔ کالج کے زمانے کا ایک لمحہ بھی اب لوٹ کے نہیں آئے گا۔ اس دور کے اور میرے درمیان ساڑھے دس سال کا مہیب عرصہ حائل ہو چکا ہے۔ وہ لمحات جنہیں میں آج ڈھونڈ رہا ہوں دُور بہت دُور فضاؤں میں تحلیل ہو گئے ہیں۔ وہ رنگینیوں سے بھرپور اور حسینوں کی محفلیں ویران ہو گئی ہیں۔ اب خاک اُڑ رہی ہے اور اس خاک میں سے تلخ و شیریں یادیں ابھر رہی ہیں۔ لاہور کے وسط میں میرے کالج کی عمارت تو اسی طرح کھڑی ہوگی۔ جی چاہ رہا ہے کہ بھاگ کر اس عمارت کے کسی کمرے میں جا چھپوں، اس کے تقدس میں جا پناہ لوں، لیکن میں اب اس عمارت کا بھی سامنا نہ کر سکوں گا۔ اب تو اس کی دیواریں بھی مجھ سے پوچھیں گی "تم نے آئینے میں اپنا سامنا کیا ہے؟" —— اُن مقدس دیواروں کے سائے میں، اُن برآمدوں اور اُن کمروں میں اس طنز آلود سوال کے سوا کچھ نہیں رہا۔ اس محفل کو اُجڑے دس سال اور چھ مہینے گذر گئے ہیں۔

وہ لاہور کی بات تھی، میں کراچی میں ہوں۔ یہاں میں اور کوس نہیں، سال اور مہینے درمیان میں آگئے ہیں۔ وہاں اب وہ بات نہیں رہی خورشید جو میرا رقیب تھا اور صبیحہ کے مقابلے میں ہیرو کا رول ادا کرنے کو تڑپتا رہتا تھا اور بی۔ اے میں دو سال فیل ہو کر ثریا کو ساتھ لے کے کراچی آ پہنچا تھا، چند روز ہوئے مارشل لاء کے تحت اپنے کیفر کردار کو پہنچا اور ایک سمگلر کے ساتھ گرفتار ہو گیا۔ ثریا ایکسٹرا کے رول اور اپنے "سرپرست" کی شرائط سے اکتا کر تین سال ہوئے منوڑا کے ساحل سے ٹکراتی ہوئی لہروں میں جا چھپی تھی! ساتویں روز لہروں نے اس کی لاش کو منوڑا کے ہی ساحل پر واپس لا پھینکا تھا۔ فطرت کے باغیوں کو کون قبول کرتا ہے۔ میرا ایک اور کلاس فیلو، شوکت، نقلی فوجی افسر بن گیا اور بلیک میلنگ کے جرم میں تین سال قید بامشقت بھگت رہا ہے۔ مسرت تیسرے خاوند سے طلاق لے کر پھر گناہ کی زندگی کی طرف دوڑی اور ایک گھناؤنے جرم کی سزا میں پانچ سال کے لئے کراچی جیل کی دیواروں میں جذب ہو گئی ہے۔ میں مسرت کی مدد کو تیار تو نہ تھا۔ کالج کے زمانے میں اس نے مجھے ہمیشہ نظر انداز کیا تھا لیکن اس دور کی یاد نے مجبور کیا۔ آخر وہ کلاس فیلو تھی۔ معلوم ہوا کہ وہ بھی ہمارے معاشرہ کی ایک بُری لڑکی ثابت ہوئی۔ اس کے ایک نئے امیدوار مہینہ بھر پہلے تک سنا ہے نائب وزیر بھی رہے تھے۔ میں اسے ان صاحب سے متعارف کرانے کے لئے لے گیا تھا اور انہیں مسرت کی مدد کے لئے آمادہ کیا۔ میں خود بلیک میلر ہونے کی وجہ سے اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس گھناؤنے گناہ کا موجب یہی شخص تھا لیکن اس سابق نائب وزیر کی اپنی ہی حالت مفرور ملزم کی تھی! راتیں گرانڈیل ہوٹل میں گذارنے والا "وزیر" گمنام سے ایک ہوٹل میں دبکا ہوا کہیں دور بھاگ جانے کی سکیمیں بنا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ سے منظور کئے ہوئے دو درآمدی لائسنس پکڑے جا چکے تھے۔ وہ بھی اپنے انجام کی طرف آہستہ آہستہ پہنچنے ہی والا تھا۔

مجھے ناہید بھی یاد آرہی ہے۔ ناہید شاید کتابیں ہی پڑھنے کے لئے پیدا ہوئی تھی۔ ہماری کلاس میں وہ بدھو اور چپ چاپ سی لڑکی تھی۔ اس نے کالج میں چار برس اس طرح خاموشی سے گذار دیئے تھے جیسے وہ گونگی اور بہری تھی۔ ہماری پھبتیاں، سیٹیاں اور فقرے شاید اسے سنائی ہی نہیں دیتے تھے۔ ہم نے کئی بار برآمدوں میں اس کا رستہ روکا لیکن وہ بغیر احتجاج یا ناک بھوں چڑھائے، سر جھکائے ہوئے، ایک

طرف ہو کر گنگنا جاتی میں نے ایک دن یہاں تک کیا تھا کہ پروفیسر کے آنے سے پہلے اپنی سیٹ سے اٹھ کر ناہید کی سیٹ تک پہنچا۔ ایک ہاتھ اس کے کندھے اور دوسرا اس کی میز پر رکھ کر اس کے اوپر اس قدر جھک گیا تھا کہ اس کے بالوں کی بھینی بھینی خوشبو کو میں بہت قریب سے سونگھ رہا تھا اور جب اس نے اوپر دیکھا تو اس کی پیشانی اور میرے درمیان صرف میری سانس کا ہی فاصلہ رہ گیا تھا۔ آہ! معصومیت، پاکیزگی اور اخلاق کی عظمت۔ اس وقت میں اندھا تھا۔ آج برسوں بعد زمانے نے میری آنکھوں کے سامنے سے پردے اٹھائے ہیں۔ مجھ جیسا ڈھیٹ آدمی ان شربتی آنکھوں کی کنواری چمک کو برداشت نہ کر سکا تھا۔ یہ میری پہلی شرارت تھی جس کے ارتکاب نے مجھے ڈرا دیا تھا۔ اس دور میں میرے لئے کچھ بھی اجنبی اور بیگانہ نہ تھا۔ بیگانگی تھی تو کتابوں اور لکچروں سے۔ اپنی کتابوں سے میری واقفیت صرف ان کے سرورق تک تھی جب کہ گناہ کی زندگی کو میں عشقیہ ناول کی طرح صفحہ بہ صفحہ اور لفظ بہ لفظ جانتا تھا!

میں جب ناہید کے اس قدر قریب پہنچا تھا تو میں نے پہلی بار یہ خطرہ محسوس کیا تھا کہ وہ یقیناً پرنسپل تک شکایت پہنچائے گی اور مجھے کالج سے نکال دیا جائے گا حالانکہ میں ہمیشہ نڈر ہو کر بڑی خطرناک بلکہ شرمناک شرارتیں کرنے کا عادی تھا۔ میں نے وہاں سے ہٹ آنا چاہا تھا لیکن پیچھے سے آواز آئی، شاید اشرف تھا۔ "رنگ ماسٹر! کرتب ادھورا نہ رہے!" ـــــ مجھے ایک مدت بعد یاد آیا ہے کہ کالج میں مجھے رنگ ماسٹر کے نام سے یاد کیا جاتا تھا کیونکہ میں بڑے خطرناک کرتب کیا کرتا تھا۔ وہ میں ہی تھا جس نے فرسٹ ائیر کے ایک نئے طالب علم کی زنگ آلود، عمر خوردہ، صدیوں پرانی چرخہ نما سائیکل، سٹینڈ سے اٹھا کر پرنسپل کے دفتر میں رکھ دی تھی عین اس وقت جب پرنسپل کی کار کالج کے گیٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ اس "کرتب" میں سب سے زیادہ خوفناک اور سنسنی خیز بات یہ تھی کہ پرنسپل کا وہ ادھیڑ عمر پٹھان دربان جس کے "خو تم برانڈہ کے نیچے نیچے جاؤ۔ اندر ساب بیٹھا ہے" کے حکم سے سارا کالج لرزتا تھا، برآمدے کے نیچے سڑک پر پرنسپل کے استقبال کے لئے کھڑا تھا۔ اسے میں نے کانوں کان خبر نہیں ہونے دی ورنہ ......

میں ناہید کی طرف جھکا ہوا تھا اور وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اشرف کی آواز نے مجھے نیا حوصلہ دیا اور میں نے ناہید کو کہا تھا "مس ناہید! کل سنڈے ہے پک نک پہ چلئے گا؟ بخدا آپ کے بغیر ہماری محفل ویران رہے گی۔" مجھے (اور ساری کلاس کو بھی) توقع تھی کہ ناہید مجھے دھتکارے گی، شاید کچھ کہے بھی۔ اور کچھ نہیں تو شکایت کرنے کی دھمکی ضرور دے گی۔ لیکن اس کے ذرا بھولے بھالے چہرے پر ذرہ بھر تبدیلی نہ آئی۔ نہ اس کی دلکش پیشانی پر ہی ہلکی سی شکن پیدا ہوئی۔ اس نے ناک سکیڑی نہ ہونٹوں کو دانتوں تلے دبایا بلکہ ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم پیدا کر کے معذرت کے لہجے میں بولی: "مجھے افسوس ہے میں آپ کا ساتھ نہ دے سکوں گی۔ آپ کے ساتھ جانے میں کیا حرج ہے؟ آپ میرے بھائی ہیں لیکن میں مجبور ہوں۔"

اگر وہ میرے منہ پر تھپڑ مار دیتی تو میں اس کا صدمہ ذرہ بھر محسوس نہ کرتا۔ لیکن اس کے ان الفاظ اور لب و لہجہ نے مجھے چکرا دیا۔ مجھے توقع نہ تھی کہ ناہید ایسی کاری ضرب بھی لگا سکتی ہے۔ میں اس کے کندھے اور میز سے اس طرح ہاتھ ہٹا کر پیچھے ہٹا تھا جیسے کالے ناگ نے مجھ پر حملہ کر دیا ہو۔ میں نے شدت سے محسوس کیا تھا کہ اس سے معذرت کروں، اسے کہوں۔ "معاف رکھنا ناہید بہن! میں بہت نادم ہوں۔" لیکن اخلاقی جرأت میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ میں وہاں سے ہٹتے ہوئے کہنے لگا تھا "معاف رکھنا ناہید!" کہ ناہید کی حجاب آلود آواز نے میرے ہونٹ سی دیئے۔ وہ معصوم سی آواز میں بولی: "معاف رکھنا بھائی جان! میں آپ کو مایوس کر رہی ہوں" اور میں کھسیانی اور ہاری ہوئی سی ہنسی ہنستا ہوا اپنی سیٹ پر آگرا تھا!

ناہید سے یہ میری پہلی اور آخری ہم کلامی تھی۔ اس کے بعد میری جرأت نے کبھی ساتھ نہ دیا تھا کہ اسے "پک نک" پہ مدعو کروں، یا کم از کم چلتے چلتے پاس سے گزرتے ایک آدھ فقرہ ہی چست کروں۔ میرے دوست مجھے اکثر اکساتے رہے کہ فراسی بھی شرافت ہو جائے لیکن میں نہیں مانتا تھا۔ لگاتار دو سال تاکتا رہا تھا۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ اتنی دلکش لڑکی کو اس قدر خاموش طبع نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ تعلیم میں اس قدر ہوشیار اور ذہین لیکن ذرہ بھر سوشل نہیں۔ مجھے اس کے ہونے والے خاوند پہ رحم آ رہا تھا۔

کالج سے فارغ ہونے کے بعد میں ناہید کو بھول گیا تھا۔ مُردہ دلوں کو کون یاد رکھتا ہے۔ میں گزشتہ سال "عوامی پولیٹیکل فرنٹ" کے جلسے کے اہتمام و انتظام کے لئے بھاگ دوڑ رہا تھا۔ سٹیج، میز کرسیاں اور لاؤڈ اسپیکروں کا بندوبست تو ہو چکا تھا لیکن حاضرین کا کچھ بھروسہ نہیں تھا۔ شہر کے غنڈوں نے نرخ چڑھا دیئے تھے کیونکہ میونسپل کارپوریشن کے انتخاب کا ہنگامہ شروع ہو چکا تھا جہاں تین روپے میں ایک نعرہ باز مل جاتا تھا۔ اب دس روپے سے کم کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ حریف پارٹی نے جلسے میں ہڑبونگ مچانے کا پورا بندوبست کیا ہوا تھا۔ اُدھر ہماری پارٹی کا کنوینر غیر حاضر تھا۔ عدن سے کھجوریں لانے والی ایک دخانی کشتی میں اس کا "مال" کسٹم والوں نے پکڑ لیا تھا اور سی۔ آئی۔ اے کو رپورٹ ہو چکی تھی۔ کنوینر اس طرف مصروف تھا۔ جلسے کا سارا بوجھ میرے سر تھا۔ شہر کے تمام جیب کترے، قفل شکن، اٹھائی گیر اور دیگر جرائم پیشہ میونسپل کارپوریشن کے امیدواروں اور دوسرے چھوٹے بڑے سیاستدانوں نے بُک کر لئے تھے۔ میں اسی بھاگ دوڑ میں "شمع مارکیٹ" کے قریب سے گزر رہا تھا کہ ٹیکسی اسٹینڈ پر کھڑی ایک پرائیویٹ کار میں سے ایک نسوانی آواز آئی۔ "رِنگ ماسٹر صاحب!" میں نے چونک کے دیکھا۔ کار کی پچھلی سیٹ پر ناہید بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اسے دس برس بعد دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ دو پیارے پیارے بچے تھے۔ میں رُک گیا۔ ناہید کے ہونٹوں پر وہی تبسم تھا جو پہلے کا تھا۔ وہی تھا، معصومیت وہی، شربتی آنکھوں میں چمک وہی اور ان تاثرات کے ملے جلے اثر میں سحر وہی جو دس سال پہلے تھا۔ وہی سیاہ برقع جو اکثر ہماری پھبتیوں کا نشانہ بنا کرتا تھا۔ میں بہت جلدی میں تھا۔ زیادہ باتیں نہ ہو سکیں۔ اس نے مجھے اپنے خاوند کا (جو اس وقت مارکیٹ میں شاپنگ کے لئے گیا ہوا تھا) ایڈریس دیا۔ مختصر سی چند ایک باتوں میں اُس نے بتایا کہ اس نے بی۔ اے کر کے شادی کر لی تھی۔ اس کا خاوند ڈاکٹر ہے۔ وہ پرائیویٹ پریکٹس کرتا ہے اور وہ خود ایک کنڈر گارٹن اسکول میں ہیڈ مسٹریس ہے۔ دو بچے پیدا ہو چکے ہیں۔ ناہید بچوں کا ذکر کرتے وقت بیحد مسرور ہونے لگی تھی۔ مطمئن اور گھریلو زندگی کے تاثرات اس کے حسن کے وقار اور جلال کو دوبالا کر رہے تھے۔ وہ دس سال پہلے والی چپ چاپ سی طالبہ اُس روز بولتے بولتے چُپ ہی نہیں ہو رہی تھی۔

"یہ دیکھی آپ نے میری رُوحی؟" اُس نے دو سالہ بچی کو گود میں اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اور یہ میرا روغی ہے۔۔۔۔۔ لیکن بھائی جان! اسے میں رِنگ ماسٹر نہیں بننے دوں گی۔" اور لطیف سا ایک قہقہہ ملہ مارکیٹ کے مہیب شور شرابے میں تیرتا ہوا شور میں تحلیل ہو گیا۔ "۔۔۔۔ رِنگ ماسٹر صاحب!۔۔۔۔ اوہ! معاف رکھنا بھائی جان! میں آپ کا نام بھول گئی ہوں۔ آپ کس ڈیپارٹمنٹ میں ہیں؟ گزیٹڈ پوسٹ پہ ہیں نا آپ؟"

اگر ناہید یہ سوال نہ پوچھ بیٹھتی تو شاید میں تھوڑی دیر اور اس کے پاس کھڑا رہتا اور اس کی مسرت بھری باتوں اور مطمئن مسکراہٹوں سے لطف اندوز ہوتا رہتا۔ میں گردوپیش سے بے خبر ہو چکا تھا لیکن اس نے میرے ڈیپارٹمنٹ کی بات پوچھی تو مجھے یاد آ گیا کہ میں بہت جلدی میں ہوں۔ میں چند غنڈوں کو کرائے پر نعرے لگانے اور چند ایک جرائم پیشہ لوگوں کو جلسے کی رونق بڑھانے کی خاطر جمع کرنے کی فکر میں ہوں۔ ناہید نے مجھے یاد دلا دیا تھا کہ میں ایک سیاسی پارٹی کا پروپیگنڈا سیکرٹری ہوں۔ بلیک میلنگ میں ماہر ہو چکا ہوں۔ ناہید کو میں بتانا نہیں چاہتا تھا کہ اگر ہماری پارٹی میں سے غنڈوں کو نکال لیا جائے تو پیچھے ہم چھ آدمی رہ جاتے ہیں جو پارٹی کے عہدیدار ہیں اور چار صفحے کے اخبار کا ایک ایڈیٹر ہے جو ہمارا یہ اخبار بلیک میلنگ کے زور پر چلا رہا ہے لیکن میں ناہید کو اپنا "ڈیپارٹمنٹ" کیسے بتاتا۔ اتنی جرأت کہاں سے لاتا۔

"معاف کرنا ناہید بہن!" میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "میں بہت جلدی میں ہوں۔ اس ایڈریس پر کسی وقت حاضر ہوں گا۔" اور میں بھاگنے ہی والا تھا کہ ناہید نے پوچھا۔ "اور ہمارے کالج کی وہ گلنار آجکل کہاں ہیں؟"

"گلنار؟" جیسے میں گلنار کو بھول گیا تھا۔ میں نے اپنا ایک جرم چھپاتے ہوئے کہا۔ "اچھا! وہ گلنار۔۔۔۔۔۔ کالج کے بعد آج تک میں نے اسے دیکھا ہی نہیں۔"

اگر مجھ میں سچ بولنے کی ہمت ہوتی تو ناہید کو تفصیلاً بتاتا کہ گلنار حاجی نور دین کی چوتھی بیوی ہے۔ یہ شادی میری "پیشہ ورانہ کوشش" کا نتیجہ ہے۔ حاجی نور دین سے میں نے دو ہزار روپیہ اس سلسلے میں وصول کئے تھے۔ وہ گلنار کے باپ کا ہم عمر ہے اور گلنار کے ماں باپ کی آنکھیں حاجی کے سنگل ٹے ہوئے سونے کی چمک سے خیرہ ہو گئی تھیں۔ میں ناہید کو کیسے بتاتا کہ وہ گلنار جو کالج میں ہمارے لئے ایک "ناول" تھی آجکل جاسوسی افسانہ

بنی ہوئی ہے بجد سنسنی خیز اور راتوں کی نیند حرام کر دینے والی کہانی۔ لیکن میں نے ناہید کو کچھ بھی نہ بتایا۔ مجھ میں اعترافِ گناہ کی ہمت نہیں تھی اور نہ میں نے کوئی ایسی ضرورت ہی محسوس کی تھی۔ ملک کے سیاستدانوں نے گناہ کئے ہیں۔ سزا قوم نے بھگتی ہے، اعتراف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں ناہید کو کار کی پچھلی سیٹ پر مسکراتا چھوڑ کر بھاگ آیا تھا۔

آج آئینے کے سامنے کھڑے مجھے بہت کچھ یاد آ رہا ہے۔ میں کچھ بھی یاد نہیں کرنا چاہتا لیکن میرے عکس کے پس منظر میں تصویریں سی چلتی پھرتی دکھائی دے رہی ہیں جنہیں میں دیکھنا نہیں چاہتا پھر بھی دیکھ رہا ہوں۔ میں سمجھتا تھا کہ میری اوباش طبیعت نے سیاست بازی اور بھٹکے ہوئے دماغ نے گذرے ہوئے دنوں کو فراموش کر دیا ہے لیکن آج دیکھ رہا ہوں کہ ان دنوں کا ایک ایک لمحہ میرے چہرے کے خطوط میں زندہ ہے۔

شاید میں آئینے میں اپنے آپ کا سامنا کر رہا ہوں۔ یہ آئینہ یا آئینے میں میرا عکس میرا ضمیر بن گیا ہے ـــــ عریاں اور ننگ دھڑنگ ضمیر ـــ نیلوفر نے ابھی ابھی ایسی بات کہہ دی ہے کہ میرے کردار کا ذرّہ ذرّہ تصویر بن کر میرے سامنے آگیا ہے۔ نیلوفر ساتھ والے کمرے میں لیٹی ہوئی ہے۔ شاید وہ رو رہی ہے۔ میں اُسے تنہا چھوڑ کر بھاگ سکتا ہوں اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ وہ پانی کی طرح اپنا راستہ بنا لے گی، لیکن میں انقلاب کے دَور میں جس کا آغاز ۷۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء سے ہوا ہے، اس کا ساتھ چھوڑنا نہیں چاہتا۔ سوچتا ہوں کہ میں بھی تو اب مجبور ہوں۔ ہمارے "عوامی پولیٹیکل فرنٹ" کو دوسری سیاسی پارٹیوں کی طرح غیر قانونی قرار دیا جا چکا ہے۔ اخبار بند ہو چکا ہے۔ دفتر سربمہر ہو گیا ہے۔ کنوینر اور صدر اس سوچ میں دیوانے ہو رہے ہیں کہ "مال" فوجی حکام کے حوالے کر دیں اور گلو خلاصی کرائیں یا کہیں زیرِ زمین کر لیں لیکن ہمارا کنوینر آستین میں جن سانپوں کو پال رہا ہے ان کے ڈنک کا خطرہ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اسے مجھ پر بھی بھروسہ نہیں۔ میں اس کا پروپیگنڈہ سیکرٹری تھا مگر تھا تو میں پیشہ ور بلیک میلر ہی۔ صرف میں ہی نہیں اکثر چھوٹی بڑی سیاسی پارٹیوں کے عہدیدار بلیک میلر تھے کسی نہ کسی وضع قطع کے۔ وہ لمبے لمبے جلوس اور "فدایانِ اسلام کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے" جلسے۔ کوئی مجھ سے پوچھے کہ ان میں فدایانِ اسلام کی تعداد کتنی تھی اور کرائے کے "عوام" کتنے تھے۔

میں اب ملک کے سابق سیاستدانوں کو بیانگ بلند کہتا ہوں کہ آئینہ نہ دیکھنا۔ اپنے عکس کا سامنا نہ کرنا ورنہ جل بھن کر راکھ ہو جاؤ گے تمہارے ضمیر تمہیں ایسی سزا دیں گے جس کا تمہارے بنائے ہوئے قوانین اور دستور میں کہیں بھی ذکر نہیں آتا۔

لیکن یہ باتیں میرے لئے اب محض بیکار ہیں میرے لئے تو اب نیلوفر مسئلہ بن گئی ہے اور اس مسئلے نے ایسے پچھتاوے کو جنم دیا ہے کہ میں اپنے آپ اور ماضی میں الجھ گیا ہوں۔ ذہن نے حقائق سے بھاگ کر دور بیتے ہوئے دنوں میں جا پناہ ڈھونڈی ہے مستقبل کی کیا سوچوں!

بارہ برس پہلے کی بات ہے ـــ

نیلوفر، مسرت اور ثریا میری کلاس فیلو تھیں۔ تینوں امیر گھرانے کی لڑکیاں تھیں۔ شوخ اور شیطان۔ اپنی اپنی جگہ تینوں سارے کالج کے لوفر لڑکوں کی توجہ کا مرکز بن گئیں۔ ان کے ماں باپ کا شاید ان پر کوئی اثر اور قابو نہیں تھا۔ ہر پک نک اور پارٹی میں وہ حاضر ہوتی تھیں۔ کلاس سے اکثر غیر حاضر اور کالج سے باہر کی زندگی کے سراب میں گم۔

ہم اس وقت سیکنڈ ایئر میں تھے۔ اس وقت میری دلچسپی گلنار کے ساتھ تھی۔ در نظر نیلوفر پر بھی رہتی تھی جیسا کہ اوباش فطرت لوگوں کا وطیرہ ہے، مگر یہ تینوں سہیلیاں ذرہ بھر لفٹ نہیں دیتی تھیں۔ لائل پور، سرگودھا اور کامونکے کے چند ایک جاگیرداروں کے لڑکوں نے روپے پیسے نت نئے سوٹوں اور سینڈلوں سے انہیں اپنے جال میں آخر کار پھنسا ہی لیا۔ وہ میرے گروہ کے کسی لڑکے کے ساتھ آنکھ بھی نہیں ملاتی تھیں۔ میں تمام ہتھکنڈے استعمال کر کے ہار گیا تھا۔ آخر ایک ہی صورت قابلِ قبول نظر آئی کہ انہیں نظر انداز کر دیا جائے۔ چنانچہ کھٹے انگوروں کو نظر انداز کر دیا گیا۔ لیکن نیلوفر از سرِنو میرے اعصاب پر سوار ہو گئی۔ وہ اس طرح کہ انہی دنوں میرے والد صاحب، دو مکان لاہور میں، لاہور کے گرد و نواح میں ایک سو ایکڑ زمین اور ستر ہزار روپیہ نقد میرے نام منتقل کر کے فوت ہو گئے۔ تین چار روز بعد گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہو گئیں۔ ان تین چار دنوں میں ہی سارے کالج میں میرے والد کی وفات کی خبر کم اور میرے دولتمند اور صاحبِ جائداد ہو جانے کی خبر زیادہ پھیل گئی۔ موت زندگی تو ان کے ساتھ لگی ہوئی ہے انہیں خود زیادہ دلچسپی دولت اور جائداد کے ساتھ تھی۔

میں نے دو ہزار روپیہ بنک سے نکلوایا اور کتابیں گھر میں پھینک کراچی کا رُخ کیا۔ والدین کا میں اکیلا بچہ تھا۔ بیس برس کی عمر میں بھی ماں مجھے بچہ (اور اب یتیم بچہ) سمجھ کر مجھ پر جان نثار کرتی تھی۔ اس نے مجھے کراچی جانے سے نہ روکا۔ اگر وہ روکتی بھی تو میں رک تھوڑے ہی جاتا۔ میں نے خیبر میل کے ائیر کنڈیشنڈ ڈبے میں سیٹ بک کرائی تھی۔ اس سے پہلے میں نے لاہور سے لمبا سفر گجرات تک کیا تھا وہ بھی تھرڈ کلاس میں۔ والد صاحب اس سے اوپر سفر کرنے کی اجازت نہیں دیا کرتے تھے۔ میرا کل جیب خرچ ساٹھ روپے ماہوار تھا جس میں جھوٹ کی برکت سے چالیس پچاس کا اضافہ کر لیا کرتا تھا۔ اب میں باپ کی دولت کا واحد مالک تھا کسی طرف سے کوئی پابندی نہیں تھی۔ چنانچہ میں نے زندگی میں پہلی بار ائیر کنڈیشنڈ ڈبے میں سفر کیا۔ اس چمکدار اور دلکش ڈبے کا نام ریلوے والوں نے "نیلوفر" رکھ کر مجھ پر یہ ظلم کیا کہ نیلوفر کی یاد اور اسے حاصل کرنے کا خبط دماغ میں تازہ ہو گیا۔ اس لئے نہیں کہ میں نیلوفر کو بھول گیا تھا اور ریلوے والوں کی "نیلوفر" دیکھ کر وہ یاد آ گئی تھی بلکہ اس لئے کہ یہ ڈبہ نیلوفر کی طرح ہی خوبصورت اور روح افزا تھا۔ اس ڈبے میں فردوسی کشش اور آسودگی تھی۔ چلچلاتی گرمی میں یہ کسقدر ٹھنڈا تھا اور اس کے فرش کے نیچے رکھے ہوئے برف کے بلاک نیلوفر کے دل کی ہی طرح یخ تھے۔ میں کراچی تک نیلوفر کی صحت افزا خصوصیات میں محو رہا اور دل میں مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ نیلوفر کو حاصل کر کے ہی رہوں گا۔ میں نے کراچی میں ایک ہوٹل میں ایک ماہ رہ کر وہ رنگ اور رستہ دیکھا کہ جن کے قصے کہانیاں (جو مجھے الف لیلیٰ کی داستانیں معلوم ہوتی تھیں) سنا کرتا تھا۔ ہوٹل کے بیروں نے دو ہزار روپے میں مجھے ان کہانیوں کے تمام کرداروں سے روشناس کرایا اور زمین دوز دنیا کی وہ بہشت بھی دکھائی تھی جسے صرف روپے پیسے والے ہی دیکھ سکتے ہیں۔ (روپیہ کسی دوسرے کے خون پسینے کی کمائی کا ہونا ضروری ہے) یہ خصوصیت کراچی ہی کی نہیں ہے ہر نو دولتے شہر کی ہو جاتی ہے۔

میں "نیلوفر" میں ہی واپس لاہور گیا تھا۔ لاہور جا کر معلوم ہوا تھا کہ والدہ کو فوت ہوئے پندرہ روز ہو گئے ہیں۔ اس وقت مجھے یاد آیا تھا کہ کراچی ایک رات بیرے نے مجھے ایک تار دیا تھا لیکن میں وسکی کے نشے میں اس قدر مدہوش تھا کہ تار بغیر پڑھے کہیں پھینک دیا تھا۔ کالج کھلا تو میں نیلوفر کا دل جیتنے کے ارادے سے نئے حوصلے سے لیس ہو کر کالج گیا تھا۔ راستے میں سائیکل پر میں کراچی کے بیروں اور زیر زمین دنیا کے دو تین ماہرین کے بتلائے ہوئے ہتھکنڈوں کو ازبر کرتا رہا تھا اور دل ہی دل میں ریہرسل کرتا رہا تھا لیکن ایسی کوئی ضرورت پیش نہ آئی۔ میں جونہی سٹینڈ پر سائیکل رکھ کر برآمدے میں داخل ہوا تو نیلوفر اور ثریا نے میرا اس طرح استقبال کیا کہ میں نے اپنے آپ کو ایک بار پھر کراچی کی اندھی گلیوں میں محسوس کیا تھا۔ خصوصاً نیلوفر میرے ساتھ اس طرح بے تکلفی (بلکہ بے حجابی) سے پیش آ رہی تھی کہ جیسے میرا اور اس کا بچپن کا ساتھ رہا ہے اور وہ صرف میرے لئے ہی زندہ ہے۔

اور ثریا اس ڈرامہ میں سائڈ رول ادا کرتی رہی۔

پھر وقت بہت تیزی سے گذرنے لگا۔ میرے ماں باپ کا روپیہ وقت سے زیادہ تیز رفتار سے ختم ہونے لگا۔ فورتھ ائیر میں پہنچے تو میری آدھی زمین فروخت ہو چکی تھی۔ لائل پور، سرگودھا اور کاموکے کے جاگیرداروں کے بیٹے ہمارے ساتھ دو تین جھڑپیں لے کر ہار چکے تھے۔

ایک دن اڑتے اڑتے سنا کہ امتحان سر پر آ رہا ہے۔ کالج کی فضا اور ماحول میں ہنگامہ اور سرگرمی شروع ہو گئی تھی۔ ہر طرف گھبراہٹ اور بھاگ دوڑ تھی لیکن ہم اس خطرے سے آزاد تھے۔ اپنی خواہش اور نیلوفر کی سکیم کے مطابق میں نے ساری زمین بیچ ڈالی۔ ایک مکان کرائے پر رہنے دیا دوسرا نیلام کیا اور امتحان سے ایک روز پہلے ہم دونو "دور اس دنیا میں جہاں اور کوئی نہ ہو۔" اور جہاں محبت کرنے والے دو دلوں پر کوئی پابندی نہیں ہوتی چپکے سے روانہ ہو گئے۔ ہم جیسے نوفروں کی یہی زندگی ہوتی ہے۔ خیر۔ یہ دنیا کراچی میں آباد تھی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ میرا تو دنیا میں کوئی نہ تھا مجھے کون تلاش کرتا۔ سوچتا ہوں کہ نیلوفر کو بھی کسی نے تلاش نہ کیا حالانکہ اس کی فیشن پرست ماں زندہ تھی اور اس کے تین مغرب زدہ بھائی (گھر میں بھی پنجابی لہجے میں انگریزی بولنے والے) زندہ تھے۔

دس سال گذر گئے ہیں ہمیں کوئی تلاش کرنے نہیں آیا۔ ان دس برسوں میں کیا کیا انقلاب آئے۔ وقت نے کیا کیا رنگ بدلے میں نے ان پر کبھی غور نہیں کیا تھا۔ آج بلجیم کا یہ آئینہ مجھے اپنے وطن کی وہ ساری باتیں سنا رہا ہے اور وہ سارے رنگ دکھا رہا ہے کہ جنہوں نے ملک میں

ایک عظیم اور تاریخی انقلاب کو جنم دیا ہے۔ یہ سارے رنگ مل ملا کر گہرا سانولا رنگ بن کر میرے چہرے پر چھا گئے ہیں۔ میں چند اور چہرے بھی دیکھ آیا ہوں جو ایک ماہ پہلے تک شراب اور غازے سے لال سرخ تھے اب ان کا رنگ گہرا سانولا بھی نہیں رہا۔ سب رنگ اڑ گئے ہیں۔

ایک وہ وقت کہ میں کراچی کی زیر زمین دنیا کو اجنبی کی حیثیت سے دیکھنے آیا تھا اور دو ہزار روپیہ نقد ادا کر کے الف لیلیٰ کی بستی کا ذرہ ذرہ دیکھا تھا پھر وہ وقت بھی آیا کہ میں اور نیلوفر اسی دنیا کا (جس کی ہما ہمی اور گہما گہمی راتوں کو بیدار ہوتی ہے) جزو بن گئے اور اجنبی لوگوں نے ہمیں نقد روپیہ ادا کر کے دیکھا۔ نیلوفر کے واسطے میں کہاں کہاں تک نہیں پہنچا۔ حاجی نور دین کی شادی گلنار سے کرا کے میں نے اس سے نقد روپیہ ہی نہیں لیا تھا بلکہ حج کے بہانے سمگل کرنے کے ہنر سیکھے۔ سیاستدانوں کو نیلوفر کی جھلک دکھا کر سیاسی بلیک میلنگ سیکھی! نیلوفر تو کالج میں ہی ماہر ہو چکی تھی۔ دل لے کے بھلا دینے والے کھیل کی وہ پرانی کھلاڑی تھی۔ اس نے مجھے اونچی سوسائٹی سے متعارف کرایا اور سیاسی میدان میں میرے لئے نمایاں جگہ اور اہمیت پیدا کی۔ اس اونچی سوسائٹی کا نیچ پن مجھے آج اس آئینے میں دکھائی دے رہا ہے اور اس آئینے میں مجھے وہ بوڑھا پروفیسر بھی نظر آ رہا ہے جس کی دس سال پہلے کی مضحکہ خیز مسکراہٹ آج زہرخند بن کر میرا منہ چڑا رہی ہے۔

کاش! وقت ایک بار پھر دس بارہ برس پیچھے لوٹ جائے۔ میں ان کتابوں اور لیکچروں میں جذب ہو کے رہ جاؤں میں اس بوڑھے پروفیسر کے سامنے سجدے کروں اور اسے کہوں "میرے بزرگ استاد! مجھے وہ راہ دکھا جو تو نے اختر بیگ کو دکھائی تھی۔ وہ بھی تو میرا کلاس فیلو تھا اور آج وہ کراچی ہائی کورٹ کا مانا ہوا ایڈووکیٹ ہے۔ مجھے فضل کریم بنا دے جس کی غربت کو اور پیوند لگی ہوئی اچکن کو دیکھ کر ہم اسے یتیم خانے کا مہتمم کہا کرتے تھے لیکن آج وہ مرچنٹ نیوی میں انجینئرنگ آفیسر ہے۔ مجھے اس اونچی شلوار والے رشید کی طرح بنا دے جو تیرے سامنے اگلی سیٹ پر بدھو بن کے بیٹھا کرتا تھا آج وہ فوج کی ایجوکیشن برانچ میں میجر ہے...... میرے بزرگ استاد! میں نے جن کتابوں کو کبھی نہیں کھولا تھا مجھے آج یاد آ رہی ہیں لیکن وقت انہیں اپنے ساتھ اڑا کے لے گیا ہے۔ وہ مجھ سے بہت دور چلی گئی ہیں۔ اتنی دور جتنا میں ان سے دور رہا کرتا تھا۔ اور دیکھ! میں آئینے میں اپنے آپ کا ماتم کر رہا ہوں۔ آ اور مجھے بتا کہ اس سے اگلا سبق کیا ہے۔ میں سخت اذیت میں ہوں۔ ضمیر گناہوں کے بوجھ تلے کچلا جا رہا ہے۔ میں نے شوکت، خورشید، اشرف، ارشد، رضوی اور سرگودھے اور لائل پور کے چوہدریوں کے ساتھ مل کر اپنی شخصیت میں جو بیج بوئے تھے وہ آج خاردار جھاڑیوں کی طرح اگ کر میرا کردار بن گئے ہیں اور میرے ہی دل و دماغ کو لہولہان کر رہے ہیں۔ اور جو لڑکے ہماری بدمعاشیوں اور مذاق کا شکار رہتے تھے وہ آج مطمئن اور مسرور زندگیاں گذار رہے ہیں!"

او خدا!...... نیلوفر دوسرے کمرے میں رو رہی ہے۔ اس نے ابھی ابھی ایسا فقرہ کہہ دیا ہے کہ مجھ جیسا ماہر بلیک میلر اور سیاسی غنڈوں کا سرغنہ بھی گھبرا گیا ہے۔ سوچ اور فکر مفلوج ہو گئی ہے اور میں اپنے آپ میں الجھ گیا ہوں۔ میں کل حاجی نور دین کی کوٹھی پہ گیا تھا۔ چھ سات ماہ سے وہ نیلوفر کے ساتھ شادی کرنے کے لئے پیچھے پڑا ہوا تھا اور میں ٹال رہا تھا۔ اس لئے نہیں کہ گلنار کو ملا کر اس کی چار بیویاں موجود تھیں بلکہ اس لئے کہ میں نیلوفر کی "سرپرستی" کسی قیمت پر کسی کو سونپنا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ نیلوفر تو میرے سیاسی بلکہ معاشی مسائل کا بھی حل ہے۔ دس سال سے وہ میرے مسائل حل کر رہی ہے۔ کل میں حاجی کی کوٹھی پہ اسے یہ کہنے گیا تھا کہ وہ نیلوفر سے شادی کر لے لیکن وہ ہاتھ جوڑ کر بولا "خدا کے لئے آئندہ یہاں نہ آنا یہی آئی ڈی سائے کی طرح منڈلاتی رہتی ہے اور مارشل لاء والوں کی کالی فہرست میں میرا نام درج ہونے والا ہے۔ یہ لو تین چار سو روپیہ لے جاؤ اور پھر یہاں نہ آنا۔ اور سنو!" اس نے مجھے قریب بلا کر کان میں کہا "نیلوفر کی کہیں اور شادی کر دو وہ ہمارے اندر باہر کے بھید جانتی ہے۔" آخر کیا بھروسہ؟

اور میں نے آگ بگولا ہو کر سو سو کے چاروں نوٹ اس کے سامنے پھینک کر کہا۔ "تم آخر نور دین چپڑاسی ہو نا!" اور میں اس کی کوٹھی سے کہ جس کی اونچی پیشانی پر دو گز لمبی اور ایک گز چوڑی مرمر کی سل پر ھٰذا مِن فضلِ ربّی لکھا ہوا ہے، نکل آیا۔

عوامی پولیٹیکل فرنٹ کا کنوینر (ہمارا) مدد کرنے سے قاصر ہے۔ وہ روپوش ہو چکا ہے۔ ہمارے اخبار کے ایڈیٹر نے اخبار بند کر کے آئس کریم بیچنی شروع کر دی ہے۔ پہلے وہ یہی کاروبار کرتا تھا۔ دوسرے بڑے بڑے عظیم اور اعظم لیڈر کونوں کھدروں میں چھپ گئے ہیں۔ نیلوفر اپنے طور پر ہر جگہ اور ہر کوٹھی میں گھوم آئی ہے۔ سرکاری کوٹھیاں خالی پڑی ہیں۔ جہاں لمبی لمبی کاریں کھڑی رہتی تھیں وہاں اب جیپیں اور تھری ٹن ٹرک کھڑے ہیں۔

وہ سابق وزیر جو نیلوفر کے ساتھ شادی کرنے کو ہمارے لئے کیا کچھ نہیں کرتا تھا اور جو نیلوفر کو اکثر ہاکس بے لے جایا کرتا تھا اب اس کے ساتھ بات کرتے بھی گھبراتا ہے۔ نیلوفر اب اپنے مستقبل کی طرف سے مایوس ہو چکی ہے اور اب ہم دونو ڈوبتی کشتی میں ہچکولے کھا رہے ہیں۔

ہوٹل کے منیجر نے صبح کہا تھا۔ "اگر بل ادا کر سکتے ہو تو کر دو نہیں تو دونو کمرے رات تک خالی کر دو، میں بل بخش دوں گا ...... اور ستمبر یا سات اکتوبر تک تم شہزادے تھے اور اب اشتہاری مجرم ہو اور کنگال۔ بھاگ جاؤ ورنہ ......"۔ بوڑھے منیجر کی آواز میں غصہ نہیں تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ تھی جسے میں بڑی اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ میں مسکرانے کی آٹھ قسمیں جانتا ہوں۔ بلیک میلنگ کا یہ سبق سب سے زیادہ مشکل اور اہم ہے۔

میں آج پچھلے پہر سر ہاتھوں میں تھامے راہ فرار ڈھونڈتی رہا تھا کہ نیلوفر نے کہا "میں نے نہیں بتایا نہیں کہ میں دو فلم پروڈیوسروں کے پاس بھی گئی تھی۔ وہ فی الحال ایکسٹرا یہ لینے پہ رضا مند ہوئے ہیں لیکن ......" وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ میں نے اس کی طرف ہاری ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔ اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے اسے جھوٹی تسلیاں دیں تو وہ لا وارث بھولے بھٹکے بچے کی طرح بولی "کل شام سے کالج یاد آ رہا ہے۔ اگر ہم بھی اچھے انسانوں کی طرح کچھ دماغ میں بٹھا لیتے تو ......" وہ پھر چپ ہو گئی۔ اس کی پھٹی پھٹی نم آلود نگاہیں فرش پر بچھی ہوئی دری پہ اس طرح بھٹکنے لگیں جیسے اس گذرے ہوئے، بلکہ اپنے ہاتھوں ضائع کئے ہوئے دور کے لمحات تلاش کر رہی ہوں جب ہم اندھے تھے۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ مجھ پر رقت طاری ہو رہی تھی۔ میں اسے کوئی اور جھوٹی تسلی دینے ہی والا تھا کہ اس نے میری طرف دیکھا۔ میں اسے دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس کا چہرہ جو ہمیشہ سفیدی مائل گلابی رہتا تھا لال سرخ ہو گیا تھا۔ خون آنکھوں کی راہ بہا چاہتا تھا۔ وہ بلا جھجک بولی۔

"اگر ہم اپنے آپ کو فریب نہیں دے رہے تو آؤ ہم ایک دوسرے کو بتا دیں کہ ہم دونوں کسی اچھے معاشرہ کے معزز افراد نہیں ہیں۔ ہم جرائم پیشہ ہیں، ہمارا چلن داغدار ہے۔ لاہور جانے کی نہ سوچنا، بے شک وہاں تمہارا ایک مکان ہے اور میرے بھائی بھی زندہ ہیں لیکن اب ہم اس دنیا میں لوٹ کے نہیں جا سکیں گے۔ وہاں اب ہمیں کوئی شریف انسان قبول نہیں کرے گا۔ ہم دونوں جو کچھ کرتے رہے ہیں وہ ہم سے پوشیدہ نہیں رہنا چاہیئے ... سوچ کیا رہے ہو؟ اس مسئلے کا آسان ساحل یہی ہے کہ میں جس غلاظت میں پھنس چکی ہوں اس میں ہمیشہ کے لئے پھنسی رہوں۔ اب میری اصلاح ناممکن ہے"۔

"نیلو!" میں گھبرا اٹھا۔ "کیا کہہ رہی ہو تم؟"

"کوئی نئی بات تو نہیں کہی میں نے ...... وہ سیاستداں مر گئے ہیں جنہیں تم جیسے بلیک میلروں اور مجھ جیسی بری لڑکیوں کی ضرورت رہتی تھی۔ تم نے قوم کو دھوکے دیئے ہیں، آؤ ہم اپنے آپ کو دھوکہ نہ دیں۔ آؤ ہم وہی بن جائیں جو ہماری سرشت بن چکی ہے۔ دنیا کو دھوکہ کب تک دیتے رہیں گے۔"

نیلوفر دوسرے کمرے میں لیٹی ہوئی ہے اور میں جانے کیوں آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا اور جانے کب تک کھڑا رہوں گا۔ اور جانے کب تک کھڑا رہ سکوں گا۔ اف، یہ ظالم آئینے کیوں جھوٹ نہیں بولتے! ✿

✱

"ماہِ نو" کی توسیع اشاعت میں حصہ لے کر پاکستانی ادب و ثقافت سے اپنی دلچسپی کا اظہار فرمائیے

افسانہ:

شیرا نمبردار

سید غلام الثقلین نقوی

مغرب کی نماز پڑھ چکنے کے بعد جب بابا شیرا مسجد سے نکلا تو آسمان دُھل کر نکھر آیا تھا، مدھم تارے ڈھلک رہے تھے اور بے داغ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ گیلی مٹی سے ابھی تک سوندھی سوندھی خوشبو اُٹھ رہی تھی۔ ہوا کے جھونکے نمی سے بوجھل تھے اور ان میں دُھلے ہوئے پتوں اور جڑی بوٹیوں کی تازہ باس بھی رچی ہوئی تھی۔ یہ اساڑھ کے مہینے کی پہلی بارش تھی اور دھوپ سے تپتے ہوئے کھیتوں کے سخت سینے نرم پڑ چکے تھے اور ہل کا پھالا مٹی کے نم ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ کل ایک کھیت میں ہل چلا کر "وتر" دبانا اور اسے جوار کی کاشت کے لئے تیار کرنا ضروری تھا۔ اس لئے ابھی سے جا کر بہادر کو اس سنہری موقعے سے پورا پورا فائدہ اُٹھانے کے لئے تیار کرنا بھی لازمی تھا۔

دالان میں بھی چاندنی کا نکھار اپنے پورے جوبن پر تھا۔ بابا شیرے نے دالان میں قدم رکھا تو کھنکار کر گویا بہو رانی کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ بہو چاٹی میں دودھ ڈال کر کھٹا لگا رہی تھی۔ اس نے جلدی سے دوپٹہ سر پر کر لیا اور کام کاج چھوڑ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ دالان کے ایک کونے میں چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ بابا شیرے نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا "بہو رانی ؟"

"جی !"

"بہادر کنوئیں سے آ چکا ہے ؟"

"نہیں بابا۔ میرو دودھ لے کر آیا تھا"

"بہادر کہاں گیا ؟"

"میرو نے بتایا تھا کہ آج مبارک پور کے چودھری کے بیٹے کی شادی تھی۔ وہاں کوئی لوہار گانے کے لئے آیا ہوا ہے۔"

"اوہ ! جوانی کتنی بے سمجھ ہوتی ہے۔ کل صبح ایک پورے کھیت میں ہل چلانا تھا۔ اب وہ آدھی رات گذرنے پر آئے گا اور پھر تھکے ہوئے بیل کی طرح گر پڑے گا۔ خرّاٹے بھرتا رہے گا اور کل سورج نکلے اُٹھے گا....." اور بابا شیرے نے بڑبڑا کر بات ختم کر دی اور اتنے میں بہو نے چنگیر اور دودھ کا لبالب بھرا ہوا ایک پیالہ اس کے سامنے رکھ دیا۔ پہلا لقمہ دودھ میں بھگوتے ہوئے بابا شیرے نے کہا "ننھا تو سو گیا ہے کیا ؟" شیماں جو دالان کے دوسرے کونے میں بیٹھی ننھے کو سلانے کے لئے تھپک رہی تھی، چہک کر بولی "بابا ! بس سونے ہی والا ہے۔"

"اچھا !" بابا شیرا مطمئن ہو گیا اور روٹی دودھ میں بھگو بھگو کر کھانے لگا۔

★

جوانی میں وہ صرف شیرا تھا جب داڑھی میں سفید بال آئے تو بھی شیرا ہی رہا۔ اگرچہ وہ اپنے چھوٹے سے گاؤں کا نمبردار تھا اور ایک علیحدہ کنوئیں کا مالک جس کے ساتھ دس بارہ گھماؤں زمین تھی۔ اب لوگوں نے اس کے نام کے ساتھ "بابا" کا اضافہ بھی کر لیا تھا۔ اکثر لوگ اُسے شیرا نمبردار کہہ کر پکارتے تھے۔

بابا شیرا جوانی میں بڑے کلّے ٹھلّے کا گبھرو تھا۔ اب بھی اس کی چال میں بانکپن تھا اور آنکھوں میں چمک۔ چونکہ عمر کے ساتھ ساتھ وقار کا اضافہ بھی ہو گیا تھا، اس لئے اب وہ اکڑ کر نہ چلتا۔ سر پر بڑا سا پگڑ، لٹھے کا دُھلا ہوا سفید تہمد، سردیوں میں کھیس کی بُکل، گرمیوں میں کندھے پر ململ کا صافہ، چہرے پر اطمینان کی جھلک، گذری ہوئی زندگی گویا طمانیت کی ایک مستقل مسکراہٹ بن کر انگ انگ میں رچ گئی تھی۔ سہ پہر کی

لے منی

نرم نرم دھوپ اور آنے والی شام کے خنک سایوں کا امتزاج۔ جیسے زندگی نے اس کے ساتھ اور اس نے زندگی کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا۔

زندگی کو اس نے کبھی طوفانِ بادو باراں نہ سمجھا تھا کہ زنّاٹے کے چند تھپیڑوں کے ساتھ گذر جاتا ہے۔ وہ اُن لوگوں میں سے نہیں تھا جو طوفانوں سے کھیل کر تھک جاتے ہیں اور پھر زندگی میں اُن کے لئے کسی دل بستگی کا سامان باقی نہیں رہتا۔ زندگی پر اس اعتماد نے صرف ایک بار شکست کھائی تھی جب موت کے سرد سائے نے اس کے گھر میں قدم رکھا تھا۔ بہادر کی ماں نے تیسرا بچّہ جنا تو گویا تخلیق کا فرض تو ادا ہو گیا لیکن موت کے بلاوے کے ساتھ اس وقت بہادر کی مَسیں بھی نہیں بھیگی تھیں اور شیاں تو ابھی سات آٹھ سال کی بچی تھی۔ یہ صدمہ اتنا اچانک، اتنا شدید اور غیر متوقع تھا کہ شیرا دنوں تک اس منوں مٹی کے نیچے دب کر رہ گیا جس کے نیچے بہادر کی ماں کا جسم تھا۔ کھلے کھیت، لہلہاتی ہوئی فصلیں، مٹی کی مہک، شگوفوں کی باس، کنوئیں کی رواں رواں اور پرندوں کے چہچہے قبر کی تاریک گہرائیوں میں دفن ہو گئے تو زندگی رنگ و بو سے محروم ہو گئی اور اس نے گھر کے آنگن میں پناہ لے لی۔ میرو اکیلا کھیتی باڑی کا کام کرتا رہا اور میرو کی بیوی شیرے کے گھر آ کر صبح شام سرد چولھے میں آگ روشن کرتی رہی۔ بہادر کبھی کبھار کنوئیں پر چلا جاتا اور شیاں باپ کے گھٹنے سے لگ کر روتی رہتی اور ماں کو یاد کرتی رہتی۔

پھر ایک دن میرو نے کہا "نمبر دار! مرنے والوں کے ساتھ لوگ مر تو نہیں جایا کرتے۔ میں تیرے گھر کا پرانا نمکخوار ہوں، پر کھیتی سائیں سیتی کبھی کبھی تو کنوئیں پہ آ جایا کر۔ دیکھ تو سہی آج کل کیا رنگ ہیں کھیتوں کے"۔

"میرو!" نمبردار نے بجھی بجھی آواز میں کہا "جس سے زندگی کی بہار تھی، وہ ہی نہ رہی تو جینے کا کیا مزا؟"

"واہ نمبردار! جس کے گھر میں دو ہیرے ہوں، وہ بے آس کیوں ہو۔ دیکھ تیرا بہادر اب جوان ہو چکا ہے۔ کل اس نے دوپہر تک میرے ساتھ ہل چلایا۔ مجال ہے تھکنے کا نام بھی لیا ہو اور پھر جینے، اور تیلے نے کل بہادر کے سامنے وہ وہ چُنگیاں بھریں کہ گورے، اور لاکھے کے پسینے چھوٹ گئے"۔

"سچ؟" شیرے نمبردار نے گھٹنوں پر سے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تو میں جھوٹ بول رہا ہوں نمبردار؟" میرو نے چمک کر کہا۔

"بہادر!" شیرے نے اونچی آواز میں پکارا۔

"بابا کیا بات ہے؟"

"ادھر تو آ"

بہادر سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ شیرے نے نظر اٹھا کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ بہادرے کی ماں کے مرنے کے بعد اس نے آج تک کبھی اُسے اس نگاہ سے نہیں دیکھا تھا جو اس کے سارے سراپا کا جائزہ لے رہی تھی۔ یہ نگاہ جو بہادرے کے پٹھوں اور مچھلیوں پر سے تیرتی ہوئی جا رہی تھی۔ بہادر کا جسم ابھی محنت کی کٹھالی میں ڈھل کر لوہے اور فولاد کا نہیں بنا تھا لیکن مچھلیاں ابھر رہی تھیں اور پٹھے تن رہے تھے اور اوپر کے ہونٹ پر روئیں سیاہ پڑ رہے تھے اس نے چارپائی سے اٹھتے ہوئے کہا "او بہادرے! تو تو جوان ہو گیا ہے۔ واہ بھئی واہ! میں بھی کتنا نادان تھا کہ مرنے والی کے ساتھ مر گیا"۔ اور شیرے کا جسم تن گیا۔ وہ بڑھاپا جو موت کے سایوں کے ساتھ رینگ کر آیا تھا ایک دم لوٹ گیا۔ اور اس کی آنکھوں میں جوانی کی توتوں نے پھر جنم لے لیا۔ اس نے جذبات سے گلوگیر آواز میں کہا "میرو! چل ہم اپنے کھیتوں کی بہار دیکھ آئیں"۔

کنوئیں کے ساتھ کے کھیتوں میں دور دور تک گندم کے شگوفے پھوٹ رہے تھے اور وہ کھیت جو آج سے چند دن پہلے خالی میدان تھے مخمل کے فرش سے ڈھکے ہوئے تھے۔ اُن کے درمیان پگڈنڈیاں چمک رہی تھیں اور ننھے ننھے پودوں پر اوس کے قطرے موتیوں کی طرح ڈھلک رہے تھے۔ نرم نرم دھوپ میں پگھلا ہوا سونا تھا اور درختوں کے سبز پتوں کی اوٹ میں پرندے تھے جو چہچہا رہے تھے اور چہچہا کر اڑ رہے تھے۔ زندگی ہوا کے نرم ہلکوروں کے ساتھ بیدار ہوئی اور ایک اڑان لے کر اُس کے جسم اور روح میں رچ گئی۔ اُس نے پھر مٹی کے پیار میں اپنے دُکھ کا مداوا ڈھونڈھ لیا، مٹی جو ماں ہے اور جس کی کوکھ سے انسان نے جنم لیا اور جس کی گود میں پروان چڑھا، کبھی لہلہاتی فصلوں کا روپ دھار لیتی ہے۔ کبھی چٹیل میدانوں کا کبھی اس چلچلاتی

دھوپ گرد و غبار کے بادل اٹھاتی ہے اور کبھی ابرِ رحمت کے چند چھینٹے وہ سوندھی سوندھی خوشبو اڑاتے ہیں جو مٹی کے ساتھ مخصوص ہے۔

لیکن اس کے باوجود جب سارے دن کے کام کاج سے تھک کر شیرا نمبردار گھر لوٹتا تو اُجڑا اُجڑا گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ وہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر ڈیوڑھی میں قدم رکھتا۔ آنگن مُردہ اور بےحس نظر آتا، بہادر حقہ بھر کر لاتا، میرو کی بیوی دودھ بڑھاتی اور کھانا لگا کر چلی جاتی تو شیرا کہتا "بہادر بیٹا! شیماں ذرا سیانی ہوتی تو گھر کا سارا کام خود سنبھال لیتی۔ گھر عورت کے بغیر کہاں سنورتا ہے؟ تیری ماں زندہ تھی تو گھر میں کتنی چہل پہل تھی، پر تقدیر سے کون لڑ سکتا ہے۔ اچھا!" اور یہ کمی بھی جلد پوری ہو گئی۔ دو سال بعد بہادر کی مونچھیں کالی ہوئیں تو شیرے نمبردار نے اس کا بیاہ رچا دیا۔ بہو ابھی الھڑ مٹیار تھی۔ پندرہ سولہ سال کی نادان لڑکی لیکن وہ عورت تھی اور اس کے آنے پر شیرے نمبردار کے گھر میں سرِ شام دیا جلنے لگا اور آہستہ آہستہ یہ نادان لڑکی عورت بن کر گھر کا اُجالا بن گئی اور شیرا زندگی سے پھر مطمئن ہو گیا۔

★

صبح سویرے شیرا کنوئیں پر پہنچ گیا۔

میرو نے بیلوں کی گردنوں میں جوا ڈالا اور ہل کے پھالے دھرتی کا سینہ پھاڑنے لگے۔ زمین نرم اور گیلی تھی، اس لئے ہل گویا تیرتے ہوئے چلے جا رہے تھے اور صبح اوس سے بھیگی ہوئی تھی اور ہوا کے ہلکوروں میں امرت رس تھا۔ سورج کی پہلی کرن پھوٹی تو آدھے کھیت میں سیدھی لکیریں ابھری ہوئی نظر آئیں۔ گیلی مٹی کے بھربھرے ڈھیلے ہر طرف بکھرے ہوئے تھے، آسمان دھلا ہوا تھا اور سورج کی کرنوں نے بہت جلد گرم اور تیز ہونا شروع کر دیا۔ جب ہل کا رُخ سورج کی طرف ہوتا تو کرنوں کی تیز چمک آنکھوں کو چندھیا دیتی۔ شیرا ایک ہاتھ ہل کی ہتھی پر اور دوسرا آنکھوں پر رکھ لیتا۔ پھر کسی نے ہتھی پر ہاتھ رکھ دیا۔ شیرے نے کہا "بہادرے تو آ گیا ہے۔"

"ہاں بابا" اور شیرے کا جی چاہا کہ بہادر کو تھوڑی سی گرما گرم نصیحت کر دے، ہلکی سی سرزنش، لیکن دوسرے لمحے شیرے کو یاد آ گیا کہ آدھی رات کے بعد آنگن کا دروازہ کھلا تھا اور بہادر اچوروں کی طرح اندر آیا تھا۔ بہو نے اس کا بستر پہلے سے لگا رکھا تھا۔ بہادر اچپکے سے لیٹ گیا تھا اور بابا شیرے نے ابھی کروٹ بھی نہ بدلی تھی کہ جوانی مستِ خواب ہو گئی تھی۔ "آہ جوانی کی نیند!" اور شیرے کا دل پگھل گیا۔ اس نے کہا "بہادر بیٹا! جا بیلوں کے لئے چارا کاٹ۔ تھوڑا سا کام باقی رہ گیا ہے۔"

اور پورے بگھے میں سے صرف دو چار مرلوں میں ہل چلنا باقی تھا کہ بہو چھاہ[۱] ویلا لے کر آ گئی۔ کھیت کی مینڈھ پر کیکر کی چھدری چھاؤں میں بہو لسی کا مٹکا اور روٹیوں کا چھابا[۲] سامنے رکھ کر بیٹھ گئی۔ میرو نے چنبے اور تیلے اور شیرے نے للکے اور گورے کو چھیڑا تو دیکھتے دیکھتے پورا کھیت جُت گیا۔ بہادرے نے بیلوں کے گلوں سے جوئے اتارے اور انہیں ہانک کر کنوئیں کی طرف لے گیا۔ شیرا اور میرو کیکر کی چھاؤں تلے آ کر بیٹھ گئے۔ بہو نے مٹی کے پیالوں میں لسی انڈیلی، نمک کا ڈلا پھیرا اور چھابا ان کے سامنے بڑھا دیا۔

شیرے نمبردار نے چپڑی ہوئی روٹی کا پہلا ٹکڑا منہ میں رکھا اور ٹھنڈی چھاچھ کا ایک گھونٹ بھرا تو گویا سینے سے لے کر پیٹ تک نرم نرم خنکی بھر گئی۔ تھکا ہوا جسم راحت کے احساس میں ڈوب ڈوب گیا تو شیرے کو محسوس ہوا کہ زندگی بڑی میٹھی شے ہے۔ اس کا ایک لمحہ بھی بیکار گیا تو سمجھو زندگی نے اپنی مٹھاس کھو دی۔

ناشتہ کر کے شیرے نے اپنے ارد گرد دیکھا۔ کنوئیں کے عین ساتھ والے کھیت میں شفتل کی سر سبز سبزیاں چمکیلی دھوپ میں زمرد کا تختہ لگ رہی تھیں اور نظروں کو ٹھنڈک اور راحت پہنچ رہی تھی اور دور دور تک خالی کھیت تھے جن میں گندم کے ٹھنڈ قطار در قطار افق کی چمکیلی گولائیوں سے جا ملے تھے۔ ان پر تیز دھوپ کے پیچ در پیچ ہیولے تیر رہے تھے۔ کہیں کہیں ننھے ننھے بگولے اُٹھ رہے تھے جو ہمیں دھول اور تنکوں کو ایک چکر دے کر دھوپ میں گم ہو رہے تھے اور درخت سبز عمامے پہنے سر نہوڑائے کسی گہری سوچ میں غرق تھے۔ بگلوں کی ٹکڑیاں اُن کی پھننگوں سے چھوتیں تو شاخیں جھومتیں اور

---

[۱] صبح کا ناشتہ [۲] چھوٹی چنگیر

پتے لرز جاتے اور جب بگولا گذر جاتا تو یہ لرزشیں پھر سکون کے گہرے سینے میں دفن ہو جاتیں۔

★

اسی کیکر کی چھدری چھاؤں میں بیٹھے بیٹھے نکین اور ٹھنڈی چھاچھ کے گھونٹوں کے ساتھ زندگی بنتی اور بیتتی رہی۔ کھیتوں میں ہل چلتے رہے اور پھالے دھرتی کا سینہ چیر کر اُسے بیجوں سے بھرتے رہے۔ کنوئیں کی روں روں کے ساتھ چمکیلے پانی کی ایک نقرئی لکیر نغمۂ مسلسل کی طرح دھرتی کے سینے میں زندگی کا ارتعاش بنتی رہی۔ شگوفے پھوٹتے اور پروان چڑھ کر لہلہاتے کھیتوں کا روپ دھارتے رہے۔ بادل آتے رہے اور پیاسے کھیتوں کو سیراب کر کے فضاؤں میں تحلیل ہو جاتے رہے۔ سبزے کی چادریں پھیلیں اور سنہری خوشوں سے دامن بھرتی رہیں۔ پھر یہی سنہری خوشے کھلیانوں میں جمع ہوتے رہے اور چلچلاتی دھوپ میں سونا بھوسے سے جدا ہوتا رہا۔ شیرے نمبردار کے گھر میں اناج کے انبار لگتے رہے اور بہادر کا جسم محنت کی کٹھالی میں ڈھل کر لوہے اور فولاد کا بن گیا، مچھلیاں اُبھر آئیں، ہاتھ کھُردرے اور انگلیاں لوہے کی سلاخوں کی طرح مضبوط ہو گئیں۔ مسیں سیاہ ہوئیں اور ننھی ننھی مونچھوں کی نوکیں نکل آئیں۔ کبھی یہ مونچھیں پسینے میں بھیگ کر مہین دھول سے اَٹ جاتیں، کبھی انہیں تیل سے چپڑا جاتا تو ان کی سیاہی کوّے کے پروں کی طرح چمک اٹھتی۔ بہو تین بچوں کی ماں بن گئی۔ اب وہ بھرے گھر کی رانی تھی۔ اس کی ہر ادا میں وقار تھا اور ایک ایک بات دانا عورتوں کی طرح جچی تلی تھی۔

انہیں لہلہاتے کھیتوں کے ساتھ شیماں کا بچپن بھی گذر گیا۔ شگوفہ پروان چڑھا اور شاداب پودا بن گیا تو شیرے کی آنکھ نے پہلی بار اسے شعور کی نگاہ سے دیکھا اور اُس کا رُواں رُواں کانپ گیا۔ اس نے زیرِ لب کہا "اس کی ماں کا سایہ سر پر ہوتا تو مجھے کس بات کا ڈر تھا؟" اور سوتے جاگتے شیماں کی اُلھڑ جوانی شیرے کے خوابوں کا بھوت بن گئی۔ وہ کھیتوں میں کام کرتا ہوتا تو دھیان شیماں کی طرف لگا رہتا۔ شیماں ذرا مٹک کر چلتی تو شیرا بول اُٹھتا "شیماں بیٹی! شریف گھروں کی لڑکیوں کی چال میں ٹھہراؤ ہوتا ہے۔ وہ چلتی ہیں تو نظریں نیچی رکھتی ہیں، اُن کے پاؤں کی چاپ بھی نہیں آتی، وہ بولتی ہیں تو اُن کی آواز دوسرے کان تک نہیں پہنچ پاتی۔" اور شیماں کا دوپٹہ ذرا سرک جاتا تو شیرا کھنکار کر کہتا "شیماں بیٹی!" اور شیماں سراسیمہ ہو کر اِدھر اُدھر دیکھتی اور سمجھ نہ پاتی تو شیرا دھیمی آواز میں کہتا "شیماں بیٹی! مجھے باپ ہو کر وہ فرض ادا کرنا پڑتا ہے جو تیری ماں کا تھا۔ مرنے والی آج زندہ ہوتی تو مجھے کیا پروا تھی؟ دیکھ تیری اوڑھنی کا پلّو سر سے ڈھلک گیا ہے۔"

چند دنوں تک شیماں اس ٹوکم ٹاک کو لاشعوری طور پر برداشت کرتی رہی۔ آہستہ آہستہ اس کے نسائی غرور نے جاگ کر کہا "شیماں! بابا کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ ہر بات پر تجھے ٹوکتا ہے۔" اور اس کے بعد ناسمجھ جوانی سراسیمہ ہو کر پھر کوئی ننھی سی غلطی کر گئی تو شیرے کی ٹوک زہر میں بجھی ہوئی محسوس ہوئی اور جوانی کے حساس دل میں نشتر کی طرح اتر گئی اور شیماں کی آنکھوں میں خود بخود آنسو آ گئے۔ یہ آنسو اس کے گالوں پر گر کر چلتے ہوئے پانی کی بہتی ہوئی دھار بن گئے اور شیماں نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا "بھابی! ایک بات پوچھوں؟"

"کہو شیماں۔"

"بابا کچھ دنوں سے مجھے زہر بھری نظروں سے کیوں دیکھتے ہیں؟"

"تو جوان ہو چکی ہے نا!" بھابی نے دانا عورت کا روپ بھرتے ہوئے کہا۔

"لڑکیاں جوان ہو جائیں تو باپ اُن سے نفرت کرنے لگ جاتے ہیں؟"

"نفرت! ..... نہیں ..... ہاں ......" بھابی نے دانا تجربہ کار عورت کا چولا اُتار دیا اور جوان لڑکی کا روپ دھارتے ہوئے کہا "کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ جب میں جوان ہوئی تھی تو میرے بابا بھی کچھ اسی قسم کی باتیں کرتے تھے اور ایک دن جب پگڈنڈی کے دونوں طرف اونچی گندم کے کھیت لہرا رہے تھے اور میں اکیلی ان میں سے گذر رہی تھی اور سماں بڑا پیارا تھا تو میرے ہونٹوں پر ڈھولک گیت کے دو بول آ گئے اور میں گنگناتی رہی اور میں بھول گئی کہ میں کس کے سامنے کھڑی ہوں اور بابا نے کہا تھا 'نادان لڑکی! تو اکیلی کنوئیں پر کیوں آئی؟ تیری ماں کو اتنا بھی یاد نہ رہا کہ تو جوان ہو چکی ہے اور تجھے اکیلا بھیج دیا' اور میں نے چمک کر کہا تھا 'کیوں بابا؟ راستے میں کوئی جن بھوت ہیں کہ مجھے کھا جائیں گے۔ میں تو ہر روز کنوئیں پر انہی کھیتوں میں سے گذر کر آتی ہوں' اور بابا نے دھیمی آواز میں کہا تھا 'نہیں بیٹی جن بھوت تو نہیں، پر اب تو جوان ہو چکی ہے' اور مجھے بڑی دیر بعد سمجھ میں آیا تھا کہ بابا کیا کہتے تھے اور جوان لڑکیوں سے باپ نفرت کیوں کرتے ہیں۔"

شیماں کے آنسو پھر بہہ نکلے۔ اور وہ چند دنوں تک جوانی کی الھڑ آگ کو بجھاتی رہی۔ گلیوں میں سے دبے پاؤں گذرتی رہی اور اس کے پاؤں کی چاپ بھی نہ آتی۔ اس کی نظریں خطِ مستقیم سے اِدھر اُدھر نہ ہوتیں۔ ایک دن جب وہ گلی میں سے گذر رہی تھی اور اس کے سر پہ اوڑھنی کا پلو اس طرح جما ہوا تھا کہ اس کے کانوں کی لویں تک بھی ننگی نہ تھیں اور اس کی پیشانی ڈھکی ہوئی تھی اور آنکھیں بھی اوڑھنی کے پیچھے چھپ کر رہ گئی تھیں کہ کانوں نے کچھ سنا، کیونکہ زبان پر تالے ہوں اور آنکھیں بھی نہ دیکھتی ہوں تو کان پھر بھی کچھ نہ کچھ سن لیتے ہیں۔

"شیماں"

وہ تڑپ گئی۔ اس نے اوڑھنی کی اوٹ سے جھانکا اور اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پکارنے والے کو اس نے کئی بار پہلے بھی دیکھا تھا۔ یہ اُسی کی برادری کے ایک چوہدری کا بیٹا تھا لیکن آج اس کی پکار میں ایک عجیب اسرار تھا اور یہ اسرار اس کے کانوں کے راستے بجلی کی رو بن کر در آیا۔ اس کے اعصاب جھنجھنا اٹھے اور اس کی پیشانی پسینے سے تر ہو گئی۔ اس نے تیز تیز قدم بڑھائے لیکن یہ آواز، یہ پکار نغموں کا مسلسل دھارا بن کر اس کی روح کو تھرتھراتی رہی اور جب اس نے آنگن میں قدم رکھا تو وہ خود ایک تھرتھراتا ہوا نغمہ بن گئی تھی۔ برسات میں گھنے پتوں میں چھپی ہوئی کوئل کی کوک، جس میں آگ بھی ہوتی ہے اور چھما چھم برستی ہوئی بوندوں کا ارتعاش بھی۔

بھابی نے کہا۔ "شیماں! آج گھبرائی گھبرائی سی ہو؟"

"بھابی! آج گلی کے نکڑ پہ اُس نے میرا نام لے کر پکارا۔"

"کس نے؟" بھابی کا منہ غنچے کی طرح سکڑ گیا۔

"وہی..... حیدر....." اور بھابی نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "اسی لئے تو بابا تجھے ٹوکتے تھے کہ یہ آواز تیرے کانوں میں نہ پڑے۔"

"اب کیا ہوگا؟" شیماں نے گھبرا کر کہا۔

"میں کیا جانوں؟" بھابی نے چمک کر کہا۔ "پر اب تُو باہر نہ جایا کر۔ میں تجھ پر کڑا پہرہ رکھوں گی۔"

اور شیماں کے حواس پر مُردنی چھا گئی، نغمہ مر گیا۔ کوئل کی کوک پاتال میں اتر گئی اور شیماں کے پاؤں لڑکھڑا گئے۔ تب بھابی اچانک کھلکھلا کر ہنسی جیسے کالے اور گہرے بادلوں میں چاند نکل آیا ہو۔

"بھابی!" شیماں نے گویا دوبارہ زندہ ہو کر کہا۔ پر بھابی نے کوئی جواب نہ دیا اور کام کاج میں لگ گئی۔

اور ایک دن شیماں کے آنگن میں برادری کے سرکردہ لوگ جمع ہوئے۔ بابا شیرا اُس دن بڑا متفکر تھا، بہادر بھی کچھ کم سنجیدہ نہیں تھا اور بھابی بڑی مصروف تھی۔ شیماں کوٹھڑی میں دبکی پڑی تھی اور باہر محفل میں باتیں ہو رہی تھیں پر شیماں کے پلے کچھ نہ پڑا۔ جب لوگ ایک ایک کر کے چلے گئے تو شیماں ڈرتے ڈرتے باہر آئی۔ اس نے بھابی سے پوچھا۔ "بھابی! آج اتنے سارے لوگ اکٹھے کیوں ہوئے تھے؟"

"میں کیا جانوں؟" بھابی نے بے تعلق بنتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھابی!" شیماں نے ٹھنک کر کہا۔ "بتاؤ بھی۔" اور بھابی نے اٹھ کر شیماں کے سر پہ ہاتھ رکھا اور کہا۔ "ضرور پوچھو گی؟"

"ہاں!" شیماں نے جواب دیا۔

"تو پھر کلیجہ تھام لو۔" شیماں ڈر گئی۔ بھابی کچھ لمحے چپ رہی۔ پھر شیماں نے دور بہت دور سے آنے والی یہ آواز سنی۔

"پگلی یہ اُس پکار کا جواب تھا جو تو نے گلی کی نکڑ پر سنی تھی!"

"ہائیں" شیماں نے کہا اور اسے چکر آ گئے، زمین و آسمان گھوم گئے، آندھیاں چلیں، جھکڑ چیخے، وہ بے بس ہو کر بھابی کے گلے سے لپٹ گئی، اس کے سینے سے ایک غبار اٹھا اور آنکھوں سے چھم چھم آنسو برسے۔ بھابی نے اپنے دوپٹے کے پلو سے اس کے آنسو پونچھے اور اس کے گال سہلائے۔

"پگلی تو رو رہی ہے پر یہ آنسو بھی تو زندگی میں صرف ایک ہی بار نصیب ہوتے ہیں۔"

۱۱ نو، کراچی - ستمبر ۱۹۵۹ء

بہادر نے حقہ تازہ کیا۔ کڑوے تمباکو کی ایک چلم بھری اور حقہ شیرا کے سامنے رکھ دیا۔ شیرا اس مزدور کی طرح تھکا ہوا تھا۔ جس نے مدتوں ایک بھاری بوجھ اٹھائے رکھا ہو اور اب وہ بوجھ اس کے سر سے اتار لیا گیا ہو۔ اس نے پہلا کش لیا اور کہا۔ "بہادر! ادھر میرے پاس آکر بیٹھ" بہادر پائنتی پر بیٹھ گیا تو شیرا نے بڑی شفقت سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔ "بہادر بیٹا! آج میرے سر سے ایک پہاڑ اترگیا ہے۔ شیماں اپنے گھر چلی گئی" بہادر نے سر جھکا لیا۔ ہنگامہ گزر چکا تھا۔ اب گھر میں سناٹا تھا۔ اس کی مونچھیں تھرتھرائیں اور ہونٹ خم کھا گئے۔ آنکھوں کے کونے تر ہوئے تو شیرا نے کہا۔ "بیٹیاں پرایا دھن ہوتی ہیں۔ پرائے گھر میں کب تک مہمان بن کر رہ سکتی ہیں۔ تجھے تو خوش ہونا چاہئے تھا کہ تیرا فرض ادا ہو گیا"

"ہاں بابا! میں نے خود شیماں کی ڈولی کو کندھا دیا۔ میں نے خود اسے اس گھر سے نکالا جہاں ہم اتنے دنوں اکٹھے رہ کر پلے اور جوان ہوئے"
"واہ واہ! شیماں کونسا کالے کوسوں دور چلی گئی ہے۔ اسی گاؤں میں تو ہے، جب جی چاہو اس سے مل لینا" بہادر نے آنکھیں پونچھ لیں۔

اور اس رات حیدر نے کہا۔ "شیماں!"
یہ وہی پکار تھی جو اس نے ایک دن گلی میں سنی تھی اور اس کی رگ رگ کانپ گئی تھی۔ کنپٹیاں جلنے لگی تھیں اور پیشانی گرم لوہے کی طرح تپ گئی تھی لیکن آج یہ پکار اس کے خون میں مل جل کر نرم رو نغمے کی مانند رواں دواں ہو گئی تھی اور اسے نیند آنے لگی تھی۔ نیند جس میں شبنم کے خنک قطروں کی بارش تھی اور زندگی کا پیار تھا۔ سبک اور خمار آلود نیند۔۔۔۔۔۔

اس سال بہادر نے بڑی محنت سے کام کیا۔ شیماں کی شادی پر سارا جمع جتھا اڑ گیا تھا۔ کچھ قرض بھی لینا پڑا تھا۔ بابا شیرے نے کہا تھا۔
"بہادر! تیری ایک ہی تو بہن ہے، اپنے دل کی حسرت نکال لے۔ پھر یہ موقع کہاں آئے گا؟" اور بہادر نے سینہ ٹھونک کر جواب دیا تھا۔
"بابا! اگر شیماں کے لئے مجھے اپنی ہڈیاں بھی بیچنا پڑیں تو میں دریغ نہیں کروں گا" لیکن جب ان تھک محنت، پسینے، چلچلاتی دھوپ اور کڑکڑاتی سردی کا یہ سال گزر گیا تو بہادر کا قرض ادا ہو چکا تھا۔ اور بابا شیرے کے کندھے جھک گئے تھے۔ اس کی داڑھی میں اب کالے بال خال خال ہی نظر آتے تھے۔ زندگی کی شام پڑ چکی تھی اور ابھی تک عاقبت کے لئے زاد راہ تیار نہیں ہوئی تھی۔ وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا۔ ایک دن اس نے بہادر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "بہادر بیٹا! ساری عمر دنیا کماتے گذر گئی۔ اب کہو تو کچھ عاقبت سنوارنے کا کام بھی کر لوں"
"بابا!" بہادر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
"بہادر! موت تو برحق ہے!"
"بابا! موت کا نام نہ لو" بہادر کے جسم میں تھرتھری آئی۔
"واہ بھئی واہ!" شیرے نے کہا "میں نے کوئی نئی بات کی"
"نہیں ۔۔۔۔ پر ۔۔۔۔ ساری برکتیں تیرے دم سے ہیں۔ تو نے کنوئیں پر آنا چھوڑ دیا تو ۔۔۔۔۔"
"نہیں ۔۔۔ میں ہر روز کنوئیں پر آیا کروں گا۔ جس نے ساری عمر مٹی سے نباہ کیا، وہ اس سے جدا کیسے ہو سکتا ہے"

بہادر نے شیرے کی جگہ لے لی، ہل کا پھالا دھرتی کا سینہ چیرتا رہا، بہادر کے چہرے پر مہینوں اور سالوں کی گرمی اور سردی نے اپنے نقوش ثبت کرنے شروع کر دیئے۔ اب وہ گاؤں کا سربراہ نمبردار تھا۔ وہ بڑی سنجیدہ باتیں کرتا۔ پنچایت میں بیٹھتا تو ذمہ داریوں کا بوجھ

ماہ نو، کراچی ستمبر ۱۹۵۹ء

اس کی آنکھوں کی چمک بن جاتا اور ماہ و سال کی یہ گردش گورے اور لاکھے، چنبے اور تیلے پر بھی اپنے نقوش کاڑھ گئی۔ گورا جو ان چاروں بیلوں میں سردار تھا اب بہت زیادہ عمر رسیدہ ہو چکا تھا۔ اب وہ ان کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر نہ چل سکتا۔

ایک دن شیرے نے ہنس کر کہا۔ "بہادر! گورا بھی اب میری طرح دنیا داری سے اکتا چکا ہے۔ اسے بھی اب اللہ اللہ کرنے کے لئے چھٹی دے دے۔" بہادر نے جلد ہی ایک نیا بیل خرید لیا۔ گورا اب تھان پر بندھا رہتا اور دوسرے بیلوں کو گدلی گدلی آنکھوں سے دیکھتا رہتا۔ اور دنیا کی بے ثباتی پر غور کرتا رہتا۔ اس کی کھال ڈھیلی پڑ کر جھریوں کی صورت میں لٹک آئی تھی۔ اس کی پسلیاں نکل آئی تھیں اور بڑھاپے کا نکما پن اس کی ٹانگوں کی لڑکھڑاہٹ بن گیا تھا۔ بابا شیرے نے سوچا کہ گورا چند دنوں کا مہمان ہے۔ اس لئے اس نے کہا۔ "بہادر بیٹا! گورے کے چارے پانی کا خیال رکھنا۔ بیس سال کا ساتھی ہے۔"

"بابا! مجھے تو ہر قسم کا خیال ہے، پر تیرا گورا کچھ زیادہ ہی فقیر بن گیا ہے۔ کبھی جی چاہے تو دو چار منہ مار لیتا ہے!"

بابا شیرے نے ہنس کر گورے کی گردن پر ہاتھ پھیرا۔ گورے نے گدلی گدلی نگاہوں سے شیرے کو دیکھا اور اسے پہچان لیا۔ آخر بیس سال کا ساتھی تھا۔ بابا شیرے نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کھلے کھیتوں کی طرف دیکھا جہاں مکی، باجرے اور جوار کے پودے پلٹن باندھے کھڑے تھے۔ برسات کا موسم گذر رہا تھا اور اپنے پیچھے سرسبزیاں چھوڑ رہا تھا۔ بابا شیرے نے سوچا۔ "کتنی رتیں بیت گئیں، کتنی برساتیں آئیں اور پیاسی زمین کی پیاس بجھا کر اپنا دامن خالی کر گئیں۔ زندگی میں کتنے الٹ پھیر ہیں۔ اب گورا بھی ساتھ چھوڑ رہا ہے!" اس خیال سے اسے جھرجھری سی آئی، جیسے ہوا کا ایک یخ بستہ جھونکا سر سے پاؤں تک سن سے گذر گیا ہو۔ "میں موت سے ڈر گیا۔" شیرے نے سوچا۔ "واہ! میں بھی کتنے تھوڑے دل کا ہوں۔"

گورا روز بروز لاغر ہوتا چلا گیا اور بابا شیرا ہر صبح یہ وہم لئے ہوئے کنوئیں پر آتا کہ گورا رات کی تاریکیوں میں اپنا سفر ختم کر چکا ہوگا لیکن ہر صبح گورے کو ناند پر کھڑے دیکھ کر اسے اطمینان بھی ہوتا اور حیرت بھی۔ اچانک ایک دن گورے کی بجائے چنبے نے چارا چھوڑ دیا۔ بابا شیرا جب کنوئیں پر آیا تو بہادر نے گھبرا کر کہا۔ "بابا! آج چنبا چارے کو منہ نہیں لگا رہا۔" شیرے نے ٹھوکر مار کر چنبے کو کھڑا کیا تو اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ شیرا بھی گھبرا گیا۔ اس نے کہا۔ "بہادر بیٹا! چنبے کا پیٹ پھولا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ میرو سے کہو۔ گاؤں سے گڑ، اجوائن اور سرسوں کا تیل لے آئے۔ اگر آم کا پرانا اچار مل جائے تو بڑا اچھا ہے۔" میرو بھاگا بھاگا گاؤں گیا اور گڑ، اجوائن اور سرسوں کا تیل لے آیا تو شیرے نے مرکب بنا کر اسے بانس کی ایک نال میں بھرا۔ بہادر نے چنبے کا منہ کھولا اور شیرے نے مرکب اس کے منہ میں انڈیل دیا۔ شیرا سارا دن کنوئیں پر رہا۔ شام تک چنبے کو مرکب کی کئی خوراکیں پلائی گئیں اور آم کا اچار چٹایا گیا۔ شیرا شام کو گھر جانے لگا تو اس نے کہا۔ "بہادرے! آج رات تو کنوئیں پر رہ جا چنبے کو پیٹ اپھارا ہے، رات دو تین بار جاگ کر دوائی پلا دینا اور ہاں......" شیرے نے رک کر کہا۔ "فکر کی کوئی بات نہیں۔ صبح تک چنبا بھلا چنگا ہو جائے گا۔"

لیکن شیرے کو رات بھر نیند نہ آئی۔ علی الصبح وہ اذان کے بلاوے پر مسجد گیا۔ اور نماز پڑھنے کے فوراً بعد کنوئیں پہنچ گیا۔ بہادر اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ شیرے نے دور سے ہی بھانپ لیا کہ رات چنبے نے دم توڑ دیا ہے۔ اس نے بہادر کے پاس آکر کہا۔ "بہادر بیٹا! چنبا مر گیا ہے؟"

"ہاں بابا!" اور بہادر کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔

"واہ بہادرے! ایک چنبے کے مرنے پر تو اتنا غم کر رہا ہے۔ خدا زندگی دے تو چنبے سے بھی اچھا بیل خرید لیں گے۔" بابا شیرا کہنے کو تو یہ کہہ گیا پر اس کی آنکھوں کے سامنے گھپ اندھیرا چھا گیا۔ وہ تھان کی طرف بڑھا۔ چنبا ایک طرف بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بے نور تھیں اور اس کا پیٹ غبارے کی طرح پھولا ہوا تھا۔ گورا دوسرے کھونٹے پر بندھا مردہ چنبے کو گھور رہا تھا اور اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ بابا شیرا، چنبے تک پہنچتے پہنچتے خود بھی لڑکھڑا گیا۔ میرو نے آگے بڑھ کر سہارا دیا اور کہا۔ "نمبردارا! تو اتنا تھڑ دلا تو نہیں تھا۔"

"نہیں میرو، مجھے چنبے کے مرنے کا افسوس نہیں۔ ایسے نقصان ہوتے ہی رہتے ہیں، پر میں سوچ رہا تھا کہ مرنا تو گورے کو تھا اور دم توڑ دیا چنبے نے!"

"کس کو پتہ موت کس کو پہلے آئے گی؟"

"ہاں میرو...... پر گورے کا تو وقت اخیر تھا اور چنبے نے ابھی جوانی کا میٹھا میوہ بھی سیر ہو کر نہ کھایا تھا" شیرے نے کہا اور اُس کا جی بیٹھ گیا۔ موت کا اندھا شکاری نشانہ کہیں باندھتا ہے اور لگ کسی اور کو جاتا ہے۔ چنبا تو ابھی بھرجوان تھا، اس کی رگ رگ میں بجلیاں تھیں۔ پٹھے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتا تھا، ذرا چھیڑو تو بل کو لے کر ہوا ہو جاتا، ذرا سے لمس سے اُس کی حساس جلد پر تھرتھری طاری ہو جاتی، ملائم اور چکنی کھال پر پانی کی ایک بوند بھی نہ ٹھہر پاتی اور چنبے کو موت یوں اُچک لے گئی جیسے وہ ننھا سا مولا ہو جسے شکرا ایک جھپٹ میں دبوچ لے جاتا ہے اور سوچتے سوچتے شیرے کی جھریاں گہری ہو گئیں، آنکھوں کی چمک پر غم کی راکھ چھا گئی اور نہ جانے کیوں وہ دو چار روز تک کوئیں پر آنے اور بہادر کو آنکھ جما کر دیکھنے کی جرأت نہ کرسکا۔ اور گورا ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ گیا، پر سانس کی دھونکنی چلتی رہی۔ قدرت کے کھیل نیارے ہیں۔ ان کا راز کس نے پایا ہے۔

بابا شیرے نے گورے کی طرح یکدم دنیا سے جی اُٹھا لیا! گھر سے مسجد اور مسجد سے گھر۔ وہ کبھی کبھار کوئیں پر آتا بھی تو مہمانوں کی طرح۔ ایک نظر کھیتی پر ڈال لیتا اور بس۔ بہادر البتہ نئی فصل بونے سے پہلے یا کوئی سودا طے کرتے وقت اس سے ضرور مشورہ لے لیتا۔

چنبے کی موت کے بعد سارے گاؤں کی قسمت گویا شیرے اور بہادر کے گھر اٹھ آئی۔ بہادر نے مٹی پر ہاتھ ڈالا تو وہ بھی سونا بن گئی اور دنیا کی ساری دولتیں، برکتیں، اور نعمتیں اس کے قدموں پر نچھاور ہو ہو جاتی رہیں۔ لوگ کہتے: "یارو! بڑے اچنبھے کی بات ہے۔ رحمت کی برکھا ہماری زمینوں پر بھی ہوتی ہے، پر بہادر کی کھیتی میں تو سونا بکھیر جاتی ہے۔"

"یہ اپنی اپنی نیت کی بات ہے" کوئی کسان کہتا۔

"نیت نہیں قسمت کہو۔ قسمت کے بھی کئی روپ ہیں۔ یہ عورت کی طرح کسی پر مہربان ہونے پر آتی ہے تو اپنا سب کچھ لٹا دیتی ہے۔"

بابا شیرا مطمئن قلب لیکر گاؤں میں پھرتا۔ دولت اور عزت کی زیادتی نے اس کے پندار کو انگیخت نہ کی تھی۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ عاجز اور نرم دل ہو گیا تھا۔ دوسروں کی مصیبت پر سب سے پہلے ہمدردی کا تحفہ لیکر پہنچتا لیکن یہ اطمینان، یہ مسکراہٹیں، یہ زندگی جس میں بہار کے موسم کی نرم نرم دھوپ تھی، شیرے کے دل پر بوجھ بننے لگی۔ روشنیوں کے اس نرم رو سیلاب میں سے کبھی کبھار اندھیرے کی کوئی اندھی کرن بھی اپنی جھلک دکھلا جاتی، شیرے کے جسم میں تھرتھری آجاتی اور روئیں روئیں سے ٹھنڈا پسینہ پھوٹ بہتا جیسے اس نے کسی بل کھاتے ہوئے سانپ کی گیلی جلد کو چھو لیا ہو اور شیرے نمبردار نے آئے دن صدقہ دینا اور کھانا پکا کر غریبوں میں بانٹنا شروع کر دیا لیکن ان دیکھے بھوت کا یہ ٹھنڈا ہاتھ اس کے سینے سے دور نہ ہوا اور شیرے نے دعا مانگی "مولا! میں نے آج تک دنیا کی اتنی خواہش نہیں کی تھی۔ میرا سب کچھ لے لے پر مجھے وہ اطمینان لوٹا دے جو تنگی میں میرا ساتھی تھا!"

★

سردیوں کی ایک رات کو بابا شیرا عشا کی نماز سے فارغ ہو کر آیا ہی تھا اور گھر میں ابھی تک دیا جل رہا تھا اور بہو نے رات کے کام کاج سے فارغ ہو کر ڈیوڑھی کا دروازہ بھی بند نہیں کیا تھا کہ بہادر کنوئیں سے لوٹ آیا۔ شیرے نے پوچھا "بہادر! آج تو نے کہا تھا کہ گندم کو پانی لگانا ہے اور تجھے رات کو کنوئیں پر ہی رہنا تھا، پر تو چلا کیوں آیا؟"

"بابا! مجھے سردی لگ رہی ہے۔ میری پسلی میں درد ہے۔"

"پسلی میں درد ہے؟" بابا شیرے کی آواز کپکپا گئی۔

"کوئی فکر کی بات نہیں بابا۔ ابھی لحاف اوڑھ کر لیٹوں گا اور پسینہ آئے گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

لکڑی پر کندہ کاری (پنجاب: ۱۹ویں صدی)

سوار اور سمند

(ہمارے فن کی تلاش میں)

شہسوار چغتائی (اکبر اعظم: مختصر مغلیہ تصویر)

جدید روغنی تصویر (عمل: شاکر علی)

'' گھوڑے: شہر پناہ کے سامنے ''
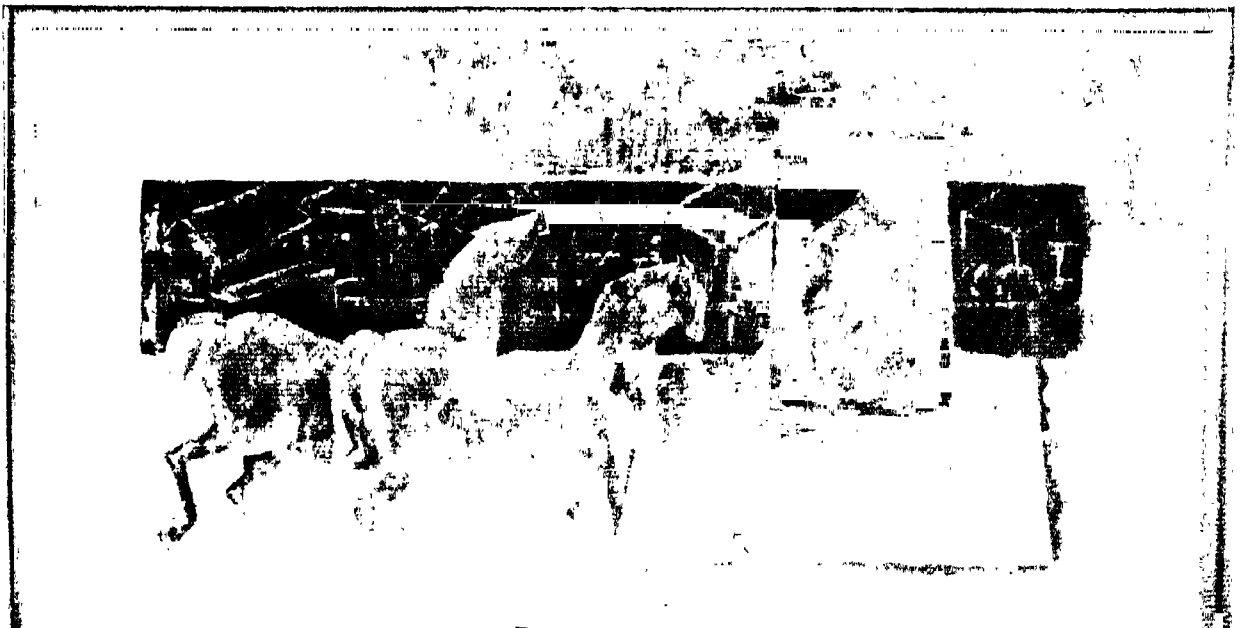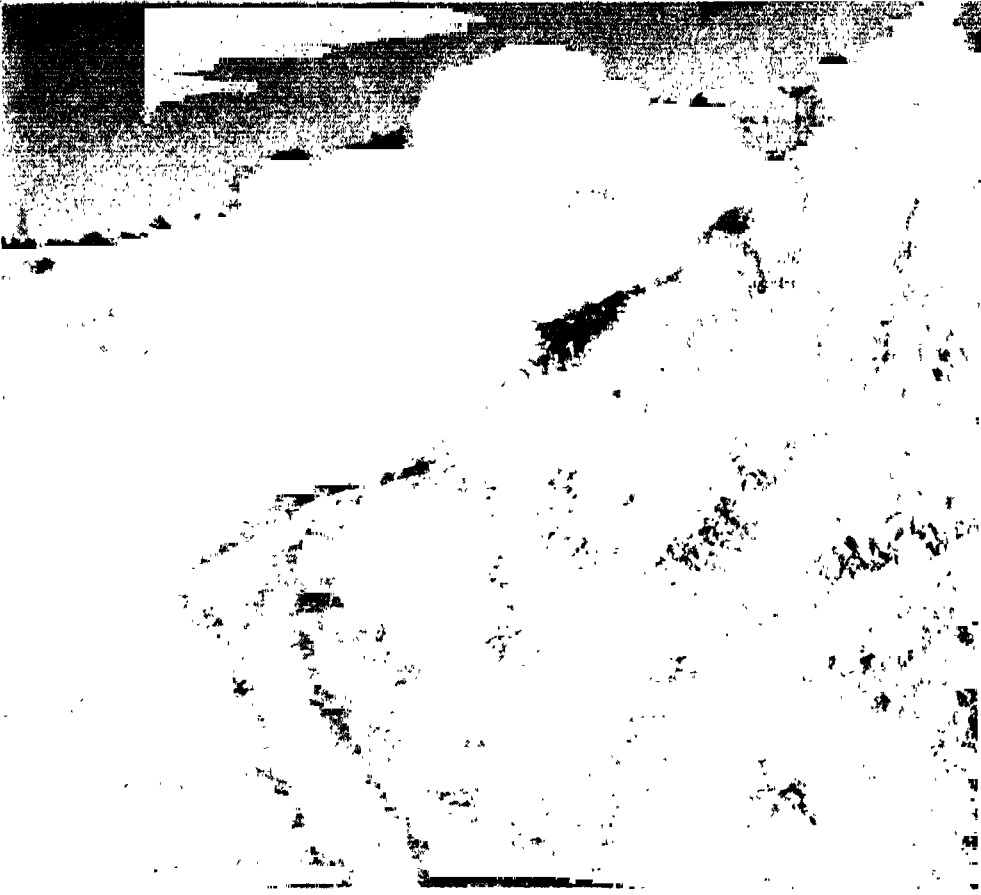
مشرقی پاکستان

خوننما رهگذر (چاٹگام)

بانس : کاغذسازی کے لئے همارا انمول سرمایه
(دریائے دریا فلی)

زندگی : (لب دریا)

"پر تیری پسلی میں درد ہے۔" بابا شیرے نے کہا "پسلی میں درد!" اور وہ گھبرا کر گھر سے باہر نکل گیا۔

بہادر نے لحاف میں لیٹتے ہوئے اپنی بیوی سے کہا "بابا کو چھوٹی سی بات کا فکر لگ جاتا ہے۔ میرا جسم گرم ہوا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

لیکن لحاف میں لپٹ کر بھی اس کے درد کو کوئی افاقہ نہ ہوا۔ اس کی بیوی نے چولھے میں سے کوئلے نکال کر مٹی کی انگیٹھی میں ڈالے اور انگیٹھی اس کی چارپائی کے پاس رکھ دی لیکن بہادر کو پہلے سے بھی زیادہ سردی محسوس ہونے لگی اور درد کے مارے سانس لینا بھی دوبھر ہو گیا۔ کچھ عرصے کے بعد بابا شیرا گاؤں کے بوڑھے حکیم کو لے کر آ گیا۔ حکیم نے بہادر کی نبض پر ہاتھ رکھا اور پھر کچھ کہے بغیر چلا گیا۔ دس پندرہ منٹوں کے بعد وہ تین پڑیاں لے کر آ گیا۔ اس نے کہا "یہ بارہ سنگھے کے سینگ کا کشتہ ہے۔ بڑی اکسیر شے ہے۔ تھوڑا سا دودھ تو گرم کر دو بہو۔" دودھ گرم ہوا تو بہادر کو ایک پڑیا کھلا دی گئی۔ حکیم نے کہا "دوسری پڑیا آدھی رات کو دے دینا۔ میں علی الصبح آؤں گا۔ نمبردار! کوئی فکر کی بات نہیں۔"

پڑیا کھانے کے کچھ دیر بعد بہادر کو کچھ افاقہ محسوس ہوا اور اس کی آنکھ لگ گئی۔ بابا شیرے نے کہا "بہو! میرا مصلےٰ بچھا دو۔ دوا کے ساتھ دعا بھی ہو تو اللہ ضرور رحم کرتا ہے۔" آدھی رات کو دوسری پڑیا کھلائی گئی اور بہو تھک کر سو گئی لیکن بابا شیرا جاگتا رہا۔ وہ گڑگڑا کر دعا مانگتا رہا۔ نفل پڑھتا رہا اور بار بار بہادر کی پیشانی پر دم کرتا رہا لیکن اس کے دل پر سے بوجھ نہ اترا۔ غم اور مصیبت کے منحوس سایوں کا بادل گہرا ہو کر سنگِ خارا کی چٹان بن گیا جو اس کے دل کا گلا گھونٹ رہی تھی۔

اور صبح نے آتے آتے بہت دیر لگا دی۔

جب صبح کا ستارا نکلا تو بابا شیرا گھبرا کر گھر سے باہر نکل آیا۔ اس نے اپنے داماد حیدر کے دروازے پر دستک دی۔ حیدر آنکھیں ملتا ہوا باہر آیا تو شیرے نے کہا "حیدر بیٹا! بہادر کو رات سے پسلی میں درد ہے۔ تو شہر چلا جا اور کسی ڈاکٹر کو لے آ۔ دیکھ روپے پیسے کے معاملے میں کنجوسی نہ کرنا۔ ڈاکٹر منہ مانگی فیس دینا۔"

"پر بابا ابھی تو بہت سویرا ہے اور سردی بھی کڑاکے کی پڑ رہی ہے۔"

"حیدرا!" شیرے نے کہا "تو رات کے اندھیرے اور سردی سے ڈرتا ہے اور میری جان پر بنی ہوئی ہے۔ تو ابھی باپ نہیں بنا تجھے کیا پتہ؟"

حیدر نے کھیس کی بکل ماری اور لاٹھی ہاتھ میں لے کر شہر کی طرف نکل گیا جو وہاں سے دس کوس دور تھا۔

بابا شیرے نے صبح کی نماز امید و بیم کی کشمکش کے درمیان پڑھی۔ جب وہ مسجد سے واپس آیا تو بہو رو رہی تھی۔ اس نے بہو کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا "واہ بہو رانی! دل چھوٹا کیوں کر رہی ہو؟ میرا جی کہتا ہے کہ بہادر کے سر سے بلا ٹل گئی ہے۔" لیکن اس کے دل نے بغاوت کرتے ہوئے کہا "واہ شیرے! تو مجھے دھوکہ دینے کی کوشش کر رہا ہے۔" بہادر کا درد بڑھ گیا تھا۔ وہ کراہ رہا تھا۔ "بہادر بیٹا! صبر کر۔ کڑیل جوان تو اتنے درد کو ماں کا دودھ سمجھ کر پی جاتے ہیں۔" بہادر نے ہونٹ بھینچ لئے۔ درد کی ٹیسیں آنکھوں کا کرب بن گئیں۔ کرب جو بپھری ہوئی موجوں کی طرح صبر کے بند سے رہ رہ کر ٹکراتا، بہادر کی پتلیاں پھیل جاتیں، حواس تنکوں کی طرح منتشر ہو جاتے اور بھینچے ہوئے ہونٹ کھلتے اور جوانی کا ضبط دبی سی کراہ کے ساتھ ہتھیار ڈال دیتا۔

ڈاکٹر بہت دیر سے پہنچا۔ اس وقت تک بہادر کی آنکھوں سے ہوش و حواس رخصت ہو چکے تھے۔ اس کی پتلیاں یوں گھومتیں جیسے وہ اپنے گرد و پیش کو حسرت کی نگاہ سے دیکھ رہی ہوں۔ اس کی زبان میں ژولیدگی بھی آ گئی تھی۔ ڈاکٹر نے ٹیکہ کیا، دوا پلائی، چند خوراکیں دوائی کی اور ہدایات دیں تو بابا شیرے نے پوچھا "ڈاکدار صاحب! بہادر اچھا تو ہو جائے گا نا؟"

ڈاکٹر نے کہا "کیوں نہیں؟ جوان آدمی کے اندر مقابلے کی قوت زیادہ ہوتی ہے۔ بیماری کا حملہ بے شک شدید ہے لیکن مریض طاقتور ہے۔" بابا شیرے نے سر نہوڑا کر سوچا "جب جوان آدمی پر بیماری حملہ کرتی ہے تو وہ اپنی پوری طاقت سے لیس ہو کر آتی ہے۔" اور اس نے مایوسی کی شدت میں اپنے ہونٹ کاٹ لئے۔ گاؤں سے باہر آ کر ڈاکٹر نے حیدر سے کہا "مریض کو سرسام ہو گیا ہے۔ اگر کل صبح تک ..... میرا مطلب ہے ..... یعنی ..... کل صبح سویرے مجھے لینے کے لئے آ جانا۔"

★

لیکن دوسری صبح ہڈیوں کا پنجر گورا ابھی تک تھان پر کھڑا تھا۔ اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں اور سانس کی دھونکنی چل رہی تھی۔ چنبا جس کی رگ

رگ میں جوانی کی آگ تھی، دیئے کے کمزور شعلے کی طرح موت کے ایک سانس سے ہی پھڑپھڑا کر بجھ گیا تھا!

شیرے نمبردار نے جو ساٹھ سال سے دنیا کے گرم سرد کا مردانہ وار مقابلہ کر رہا تھا۔ یک لخت ہتھیار ڈال دئے۔ اس نے جوانی کی بجھی ہوئی راکھ کو کھیا تو اسے اپنے لڑکھڑاتے ہوئے بڑھاپے پر غصہ آگیا۔ غصہ جو اچانک غم کے تندریلوں پر حاوی ہو گیا تھا، بپھری ہوئی موج کی طرح ابھرا اور اس کی آنکھوں کی بالوں راکھ میں دو زخ کی دہکتی ہوئی آگ کا شعلہ بن گیا تھا۔ اس نے غصے سے چیخ کر کہا "لوگو! تم لوگ مرے کا گلا کیوں نہیں گھونٹ دیتے جس کا منحوس بڑھاپا چنبے کی جوانی کو کھا گیا؟" اس کے ہاتھ بڑھاپے کے گلے کی طرف لپکے۔ اس نے بڑھاپے کے نحیف و نزار گلے کو اس زور سے گھونٹا کہ ہاتھوں کی رگیں ابھر آئیں اور پیشانی کا ایک ایک سلوٹ، ایک ایک جھری ابھری اور تنی اور پھر ہاتھوں کی گرفت خود بخود ڈھیلی پڑ گئی اور...... ان لوگوں نے لپک کر بڑھاپے کو تھام لیا جو جوانی کی آگ کو سرد ہونے سے نہ بچا سکے تھے۔

★

اس شام ایک قبر پر کھڑے ہو کر جس پر نئی نئی مٹی پڑی تھی، شیرے نے کہا "حیدر! یہ قبر شیرے نمبردار کی ہے نا!" حیدر نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ "بہادر! جب مبارک پور سے لوٹ کر آئے تو اسے کہنا کہ اس پر ایک مٹھی خاک کی ضرور ڈال دے۔ تم اسے منا لاؤ گے نا؟"

"ہاں! ہاں!" حیدر نے گلے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ شیرے نے بڑبڑا کر کہا "بہادر روٹھ گیا ہے۔ پر وہ جا بھی کہاں سکتا ہے! آخر اسی گھر میں لوٹ کر آئے گا۔"

★

لیکن روٹھا ہوا بہادر لوٹ کر نہ آیا!

شیرے کے گھر میں خاک اڑنے لگی۔ وفادار میر دکنوں پر تند ہی سے کام کرتا لیکن اکیلا آدمی سارا کام نپٹا نہ سکتا تو کہتا "نجانے نمبردار کو کیا ہو گیا ہے!" اور جب وہ گاؤں آتا، تو بہادر کے تین بچوں کو کھیلتے کودتے دیکھ کر سوچتا "جس کے گھر میں تین لال ہوں، وہ دنیا سے منہ کیوں موڑے؟" شیرے نے بہادر کا بہت انتظار کیا۔ وہ بہادر کو ڈھونڈھنے کے لئے ہر روز مبارک پور جاتا اس کے سر پر نہ پگڑی ہوتی نہ پاؤں میں جوتا۔ سر اور ڈاڑھی کے بالوں میں خاک جم گئی تھی۔ وہ ہر روز شام کو بہو سے پوچھتا "ابھی بہادر نہیں آیا بہو؟"

"نہیں تو" بہو کہتی اور منہ موڑ کر چپکے سے دو آنسو بہا لیتی اور شیماں اٹھ کر اندر چلی جاتی تاکہ خوب دل کی بھڑاس نکال سکے۔ "جوانی کتنی بے سمجھ ہوتی ہے۔ کل صبح ایک پورے کھیت میں ہل چلانا تھا۔ اب وہ آدھی رات گذرنے پر آئے گا اور پھر تھکے ہوئے بیل کی طرح گر پڑے گا اور خراٹے بھرتا رہے گا۔ صبح سورج نکلے اٹھے گا۔" شیرا بڑبڑاتا ہوا چارپائی پر لیٹ جاتا۔ آدھی رات بھی گذرتی جاتی اور بہادر نہ آتا تو شیرا مایوس ہو کر تارے گننے لگتا۔

★

آخر تین ماہ بعد شیماں کو اپنے سسرال جانا پڑا تو بہو نے میکے سے اپنی ماں کو بلا لیا۔ بہو کی ماں نے گھر کا ابتر حال دیکھا تو رو پڑی "بیٹی! تجھے یہ گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہوگا؟"

"ہاں ماں!"

"پھر کچھ دنوں کے لئے میرے ساتھ چلی چلو۔"

"پر میرے پیچھے بابا کا کیا حال ہوگا؟"

"شیماں کو بلا لو۔"

"شیماں آج ہی سسرال گئی ہے۔"

ماں چپ ہو گئی۔ اتنے میں شیرا بھی باہر سے آ گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں، کرتہ پھٹا ہوا تھا، ننگے پاؤں زخمی تھے۔ اس نے آتے ہی پوچھا "بہو بیٹی! بہادر آ گیا؟"

"نہیں تو" بہو نے منہ پھیر کر ماں کو دیکھا۔ بہو کی ماں پہلے اس بات کا مطلب نہ پا سکی۔ پھر اس نے بیٹی کے چہرے کو دیکھا اور وہ بے اختیار رو پڑی۔ اس نے کہا "نمبردار! تو نے یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟"

"بہادر جو روٹھ گیا ہے تو کیا ہوا؟ اس کی نشانیاں تیرے پاس ہیں"

شیرے نے چارپائی پر گرتے ہوئے کہا "بہادر بیٹا! تو کب لوٹ کر آئے گا؟ اب تو میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک چکا ہوں"

نانی نے دوہتوں کو آگے بڑھایا۔ شیرے نے پہلے انہیں گھور کر دیکھا۔ پھر دیے کی ہلکی سی روشنی میں انہیں پہچان لیا اور ان کے سروں پر ہاتھ پھیرا۔ سمدھن کے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے تو شیرے نے پوچھا "بہن تو کیوں رو رہی ہے؟"

"نمبردار!" سمدھن نے شیرے کے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا "تجھے معلوم نہیں میں کیوں روتی ہوں؟"

"نہیں"

"تو سُن" سمدھن نے اپنے عزم کی تمام قوتوں کو مجتمع کرتے ہوئے کہا "بہادر اب لوٹ کر نہ آئے گا۔ وہ وہاں چلا گیا ہے جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا"

"ہائیں!" شیرے نے تڑپ کر کہا "بہادر لوٹ کر نہیں آئے گا؟"

"چوہدری!" سمدھن نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا "بہادر لوٹ کر نہیں آئے گا۔ تیرا یہی حال رہا تو بہادر کی یہ نشانیاں، یہ ننھی سی کلیاں بھی مرجھا کر رہ جائیں گی" شیرا سر جھکا کر سوچنے لگا۔ سمدھن نے موقع کو غنیمت جانا اور کہا "نمبردار! تیرے سوا ان کا کون ہے؟ تو نے ان کو سہارا نہ دیا تو یہ موتی خاک میں مل جائیں گے۔ چوہدری ہوش میں آ۔ لوگ مرنے والوں کے ساتھ مر تو نہیں جایا کرتے۔ بن آئی موت تو منہ مانگے بھی نہیں ملتی۔ کہو تو میں ان کو ساتھ لے جاؤں"

"کن کو؟"

"تیری بہو اور بہادر کی نشانیوں کو۔ تو بہادر کے لوٹ آنے کا انتظار کرتا رہ"

"نہیں... نہیں..." شیرے نمبردار نے چونک کر کہا "نہیں..." اور اس کا سر جھک کر گھٹنوں سے جا لگا۔ بہو نے سہارا دے کر اسے چارپائی پر لٹا دیا۔

حقیقت کا احساس شیرے پر بجلی بن کر نہ گرا۔ نرم رو ہوا کے ایک دھیمے جھونکے کی طرح آیا اور شیرے نے اپنے جسم کے ساتھ اپنی روح کو بھی ایک خمار آلود نیند میں پایا۔ شیرے کے انگ انگ میں جنوں کی آگ سرد ہوئی تو اس کے جسم اور دماغ سے ہر قوت یوں رخصت ہوئی جیسے جوار بھاٹا کے اترنے کے بعد ریت اور خس و خاشاک باقی رہ جاتے ہیں۔ وہ کئی دنوں تک چارپائی سے نہ اٹھ سکا اور آہستہ آہستہ راکھ میں پھر زندگی کا شرارا چمکا تو شیرا چارپائی سے اٹھا اور بہادر کی قبر پر پہنچا۔ اس نے قبر کے سرہانے بیٹھ کر پہلی بار فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھائے تو اس کے دل کا دوزخ سرد پڑ گیا جیسے کسی نے کوثر کا ایک جام لنڈھا دیا ہو۔

سمدھن نے کہا "چوہدری! کہو تو میں تیری بہو کو چند دنوں کے لئے ساتھ لے جاؤں؟"

"بہن! بہو سے پوچھ لو، پر...... یہ خالی گھر مجھے کاٹ کھانے کو نہ دوڑے گا؟"

بہو نے کہا "ماں! ابھی کیا ضروری ہے۔ ذرا بابا کی طبیعت ٹھیک ہو لے تو میں آ جاؤں گی" اور سمدھن مطمئن ہو کر اپنے گاؤں لوٹ گئی۔

ایک دن اساڑھ کی پہلی موسلا دھار بارش ہوئی اور جلی ہوئی مٹی سے نئی زندگی کی خوشبو اٹھی تو شیرے کے دل کا وہ پیار جاگ اٹھا جو مٹی کے خمیر سے وابستہ ہے۔ اس نے رات کو میرو سے کہا "کل صبح ایک کھیت کو جوار کی بوائی کے لئے تیار کرنا ہے۔ میں صبح سویرے کنوئیں پر پہنچ جاؤں گا" اور میرو کا بڑھاپا بھی خوشی سے تھر تھر کانپنے لگا۔ وہ ساتھی جو تھک ہار کر راہ میں ہی بیٹھ گیا تھا، پھر ساتھ دینے پر آمادہ ہو گیا تھا۔

٭

سورج کی پہلی کرن پھوٹی تو چند مرلوں میں ہل چلنا باقی رہ گیا تھا۔ بھربھری گیلی مٹی کے ڈھیلے ہر طرف بکھرے ہوئے تھے، ہل کی سیدھی لکیریں

رگ میں جوانی کی آگ تھی، دیئے کے کرزاں شعلے کی طرح موت کے ایک سانس سے ہی پھڑپھڑا کر بجھ گیا تھا!

شیرے نمبردار نے جو ساٹھ سال سے دنیا کے گرم سرد کا مردانہ وار مقابلہ کر رہا تھا۔ یک لخت ہتھیار ڈال دئے۔ اس نے جوانی کی بجھی ہوئی راکھ کو دیکھا تو اسے اپنے لڑکھڑاتے ہوئے بڑھاپے پر غصہ آ گیا۔ غصہ جو اچانک غم کے تندریلوں پر حاوی ہو گیا تھا، بپھری ہوئی موج کی طرح ابھرا اور اس کی آنکھوں کی بالائی راکھ میں دوزخ کی دہکتی ہوئی آگ کا شعلہ بن گیا تھا۔ اس نے غصے سے چیخ کر کہا۔ "تو گو اتم کورتے کا گلا کیوں نہیں گھونٹ دیتے جس کا منحوس بڑھاپا چھینے کی جوانی کو کھا گیا؟" اس کے ہاتھ بڑھاپے کے گلے کی طرف لپکے۔ اس نے بڑھاپے کے نحیف و نزار گلے کو اس زور سے گھونٹا کہ ہاتھوں کی رگیں ابھر آئیں اور پیشانی کی ایک ایک سلوٹ، ایک ایک جھری ابھری اور تنی اور پھر ہاتھوں کی گرفت خود بخود ڈھیلی پڑ گئی اور...... ان لوگوں نے لپک کر بڑھاپے کو تھام لیا جو جوانی کی آگ کو سرد ہونے سے نہ بچا سکے تھے۔

★

اس شام ایک قبر پر کھڑے ہو کر، جس پر نئی نئی مٹی پڑی تھی، شیرے نے کہا "جیدر! یہ قبر شیرے نمبردار کی ہے نا؟" جیدر نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ "بہادر! جب مبارک پور سے لوٹ کر آئے تو اسے کہنا کہ اس پر ایک مٹھی خاک کی ضرور ڈال دے۔ تم اسے منالاؤ گے نا؟"

"ہاں! ہاں!" جیدر نے گلے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ شیرے نے بڑبڑا کر کہا "بہادر روٹھ گیا ہے۔ پر وہ جا بھی کہاں سکتا ہے؟ آخر اسی گھر میں لوٹ کر آئے گا۔"

★

لیکن روٹھا ہوا بہادر لوٹ کر نہ آیا!

شیرے کے گھر میں خاک اُڑنے لگی۔ وفادار میر وکنوں پر تندہی سے کام کرتا لیکن اکیلا آدمی سارا کام نپٹا نہ سکتا تو کہتا "نجانے نمبردار کو کیا ہو گیا ہے؟" اور جب وہ گاؤں آتا، تو بہادر کے تین بچوں کو کھیلتے کودتے دیکھ کر سوچتا "جس کے گھر میں تین لال ہوں، وہ دنیا سے منہ کیوں موڑے؟" شیرے نے بہادر کا بہت انتظار کیا۔ وہ بہادر کو ڈھونڈنے کے لئے ہر روز مبارک پور جاتا اس کے سر پہ نہ پگڑی ہوتی نہ پاؤں میں جوتا۔ سر اور ڈاڑھی کے بالوں میں خاک جم گئی تھی۔ وہ ہر روز شام کو بہو سے پوچھتا "ابھی بہادر نہیں آیا بہو؟"

"نہیں تو" بہو کہتی اور منہ موڑ کر چپکے سے دو آنسو بہا لیتی اور شیماں اٹھ کر اندر چلی جاتی تاکہ خوب دل کی بھڑاس نکال سکے۔ "جوانی کتنی بے سمجھ ہوتی ہے۔ کل صبح ایک پورے کھیت میں ہل چلانا تھا۔ اب وہ آدھی رات گذرنے پر آئے گا اور پھر تھکے ہوئے بیل کی طرح گر پڑے گا اور خراٹے بھرتا رہے گا۔ صبح سورج نکلے اٹھے گا" شیرا بڑبڑاتا ہوا چارپائی پر لیٹ جاتا۔ آدھی رات بھی گذرتی جاتی اور بہادر نہ آتا تو شیرا مایوس ہو کر تارے گننے لگتا۔

★

آخر تین ماہ بعد شیماں کو اپنے سسرال جانا پڑا تو بہو نے میکے سے اپنی ماں کو بلا لیا۔ بہو کی ماں نے گھر کا ابتر حال دیکھا تو رو پڑی "بیٹی! تجھے یہ گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہو گا؟"

"ہاں ماں!"

"پھر کچھ دنوں کے لئے میرے ساتھ چلی چلو۔"

"پر میرے پیچھے بابا کا کیا حال ہو گا؟"

"شیماں کو بلا لو۔"

"شیماں آج ہی سسرال گئی ہے۔"

ماں چپ ہو گئی۔ اتنے میں شیرا بھی باہر سے آ گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں، کرتہ پھٹا ہوا تھا، ننگے پاؤں زخمی تھے۔ اس نے آتے ہی پوچھا "بہو بیٹی! بہادر آ گیا؟"

"نہیں تو۔" بہو نے منہ پھیر کر ماں کو دیکھا۔ بہو کی ماں پہلے اس بات کا مطلب نہ پا سکی۔ پھر اس نے بیٹی کے چہرے کو دیکھا اور وہ بے اختیار رو پڑی۔ اس نے کہا "نمبردارا! تو نے یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟"

"بہادر جو روٹھ گیا ہے تو کیا ہوا؟ اس کی نشانیاں تیرے پاس ہیں۔"

شیرے نے چارپائی پر گرتے ہوئے کہا "بہادر بیٹا! تو کب لوٹ کر آئے گا؟ اب تو میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک چکا ہوں۔"

نائی نے دو ہوتوں کو آگے بڑھایا۔ شیرے نے پہلے انہیں گھور کر دیکھا۔ پھر دیے کی ہلکی سی روشنی میں انہیں پہچان لیا اور ان کے سروں پر ہاتھ پھیرا۔ سمد صن کے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے تو شیرے نے پوچھا "بہن تو کیوں رہی ہے؟"

"نمبردارا!" سمد صن نے شیرے کے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا "تجھے معلوم نہیں میں کیوں روتی ہوں؟"

"نہیں۔"

"تو سن" سمد صن نے اپنے عزم کی تمام قوتوں کو مجتمع کرتے ہوئے کہا "بہادر اب لوٹ کر نہ آئے گا۔ وہ وہاں چلا گیا ہے جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔"

"ہائیں!" شیرے نے تڑپ کر کہا "بہادر لوٹ کر نہیں آئے گا؟"

"چوہدری!" سمد صن نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا "بہادر لوٹ کر نہیں آئے گا۔ تیرا یہی حال رہا تو بہادر کی یہ نشانیاں، یہ ننھی سی کلیاں بھی مرجھا کر رہ جائیں گی۔" شیرا سر جھکا کر سوچنے لگا۔ سمد صن نے موقع کو غنیمت جانا اور کہا "نمبردارا! تیرے سوا ان کا کون ہے؟ تو نے ان کو سہارا نہ دیا تو یہ موتی خاک میں مل جائیں گے۔ چوہدری ہوش میں آ۔ لوگ مرنے والوں کے ساتھ مر تو نہیں جایا کرتے۔ بن آئی موت تو منہ مانگے بھی نہیں ملتی۔ کہو تو میں ان کو ساتھ لے جاؤں۔"

"کن کو؟"

"تیری بہو اور بہادر کی نشانیوں کو۔ تو بہادر کے لوٹ آنے کا انتظار کرتا رہ۔"

"نہیں... نہیں ....." شیرے نمبردار نے چونک کر کہا "نہیں ..." اور اس کا سر جھک کر گھٹنوں سے جا لگا۔ بہو نے سہارا دے کر اسے چارپائی پر لٹا دیا۔

حقیقت کا احساس شیرے پر بجلی بن کر نہ گرا۔ نرم رو ہوا کے ایک دھیمے جھونکے کی طرح آیا اور شیرے نے اپنے جسم کے ساتھ اپنی روح کو بھی ایک خمار آلود نیند میں پایا۔ شیرے کے انگ انگ میں جنوں کی آگ سرد ہوئی تو اس کے جسم اور دماغ سے ہر قوت یوں رخصت ہوئی جیسے جوار بھاٹا کے اترنے کے بعد ریت اور خس و خاشاک باقی رہ جاتے ہیں۔ وہ کئی دنوں تک چارپائی سے نہ اٹھ سکا اور آہستہ آہستہ راکھ میں پھر زندگی کا شرارا چمکا تو شیرا چارپائی سے اٹھا اور بہادر کی قبر پر پہنچا۔ اس نے قبر کے سرہانے بیٹھ کر پہلی بار فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھائے تو اس کے دل کا دوزخ سرد پڑ گیا جیسے کسی نے کوثر کا ایک جام لنڈھا دیا ہو۔

سمد صن نے کہا "چوہدری! کہو تو میں تیری بہو کو چند دنوں کے لئے ساتھ لے جاؤں؟"

"بہن! بہو سے پوچھ لو، پر...... یہ خالی گھر مجھے کاٹ کھانے کو نہ دوڑے گا؟"

بہو نے کہا "ماں! ابھی کیا ضروری ہے۔ ذرا بابا کی طبیعت ٹھیک ہو لے تو میں آ جاؤں گی۔" اور سمد صن مطمئن ہو کر اپنے گاؤں لوٹ گئی۔

ایک دن اساڑھ کی پہلی موسلا دھار بارش ہوئی اور جلی ہوئی مٹی سے نئی زندگی کی خوشبو اٹھی تو شیرے کے دل کا وہ پیار جاگ اٹھا جو مٹی کے خمیر سے وابستہ ہے۔ اس نے رات کو میرو سے کہا "کل صبح ایک کھیت کو جوار کی بوائی کے لئے تیار کرنا ہے۔ میں صبح سویرے کنویں پر پہنچ جاؤں گا۔" اور میرو کا بڑھاپا بھی خوشی سے تھر تھر کانپنے لگا۔ وہ ساتھی جو تھک ہار کر راہ میں ہی بیٹھ گیا تھا، پھر ساتھ دینے پر آمادہ ہو گیا تھا۔

★

سورج کی پہلی کرن پھوٹی تو چند مرلوں میں ہل چلنا باقی رہ گیا تھا۔ بھربھری گیلی مٹی کے ڈھیلے ہر طرف بکھرے ہوئے تھے، ہل کی سیدھی لکیریں

ابھری ہوئی تھیں۔ دھوپ تیز ہوئی تو شیرے نے ایک ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیا اور دوسرا ہل کی ہتھی پر اور جب وہ ایک موڑ کاٹ چکا اور اس کی پیٹھ سورج کی طرف ہوئی تو اس نے بھو کو دیکھا جو صبح کا ناشتہ لے کر آ رہی تھی۔ شیرے نے کہا "میرو! بھو روٹی لے کر آ گئی ہے۔" دونوں نے ہل چھوڑ دئے اور کیکر کی چھدری چھدری چھاؤں تلے آ کر بیٹھ گئے۔ بھو نے پیالوں میں لسی بھری، نمک کا ڈلا پھیرا لسی اور روٹیاں ان کی طرف بڑھا دیں۔ شیرے نے پہلا لقمہ منہ میں رکھا تو وہ حلق میں اٹک گیا۔ اس نے لسی کا ایک گھونٹ بھرا تو لقمہ اتر گیا اور یہ گھونٹ زندگی کی ٹھنڈک بن کر حلق سے سینے تک پہنچ گیا اور اسے ایسا لگا جیسے اسے جلتے بلتے ریگزار میں اچانک ٹھنڈا سا سایہ مل گیا ہو۔

زندگی کے سفر میں کہیں نہ کہیں مسافر کو سایہ مل ہی جاتا ہے!

اس نے کہا "واہ بھو! آج مدتوں بعد روٹی اور لسی کا مزا آیا بیٹی تو نے روٹی میں کتنا گھی ڈال دیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ آج میرو کو ایک لقمہ بھی نہ دوں۔"

"کھا لے نمبردارا! میرے حصے کا بھی کھا لے۔" میرو نے چہک کر کہا۔

بھو نے خالی مٹکا سر پہ دھرا، اس کے اوپر چھابا رکھا اور اس پگڈنڈی پر ہولی جو گاؤں کی طرف جاتی تھی۔ بابا شیرا اسے دیکھتا رہا۔ بھو ایک موڑ پر کماد کے ایک کھیت کی اوٹ میں چھپ گئی تو اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا "اٹھ میرو تھوڑے سے سیاڑ باقی رہ گئے ہیں۔"

"نمبردارا تو تھک گیا ہے۔ ذرا آرام کر لے۔"

"ہاں میرو! میں تھک تو گیا ہوں پر میں نے آج ہل کی ہتھی پر ہاتھ نہ رکھا اور بھو نے مڑ کر دیکھ لیا تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔" اور شیرا کمر پہ ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا "میرو! ہمارا بڑھاپا تو آخری منزل پہ ہے، پہ بھو کو ابھی پہاڑ جیسی جوانی کاٹنی ہے۔ آہ! تقدیر نے زندگی کے کس موڑ پر دھوکا دیا۔" اور شیرے کا چہرہ خزاں رسیدہ پتے کی طرح سکڑ گیا تو میرو نے کہا "نمبردارا!"

"ہاں!"

"تیرے بہادر کی تین نشانیاں تیرے پاس ہیں۔ تو کس لئے جی میلا کرتا ہے؟"

"میرو!" شیرے نے سنجیدہ ہو کر کہا "کونپلیں پھوٹتی ہیں تو کسان آس لگا کر بیٹھتا ہے کہ کب یہ شگوفے بڑھیں گے، پروان چڑھیں گے اور لہلہاتے پودے بن جائیں گے۔ لو کا ایک جھونکا آئے تو یہ کونپلیں جھلس جاتی ہیں اور کسان کا دل لہو ہو جاتا ہے۔ یا دل گھر گھر کر بن برسے گذر جائیں تو پیلے منہ کھلے کے کھلے رہ جاتے ہیں اور ان میں ایک قطرہ بھی نہیں ٹپکتا۔ کون جانتا ہے کہ جو کونپل مٹی کا سینہ چیر کر نکلی وہ پروان چڑھ کر پھل پھول بھی دے گی؟"

خزاں رسیدہ پتے پر ساٹھ سال محنت اور غم، دھوپ اور بارش، آس اور نراس کے نقوش ابھرے تو جھریاں گہری ہوئیں اور صدیوں کا دکھ ایک لمحے میں سمٹ آیا۔ پھر بڑکھا لگی اور میرو نے سوچا "اچھا ہوا آج کئی مہینوں کے بعد نمبردار نے پہلی بار بہادر کو رو دیا۔"

آنسو گرد سے اٹے ہوئے چہرے پر گدلی ندیاں بن کر بہنے لگے ...... طوفان تھما تو میرو نے کہا "نمبردارا! دھوپ تیز ہو رہی ہے، تھوڑے سے سیاڑ باقی رہ گئے ہیں۔"

میرو نے ہل کی ہتھی پر ہاتھ رکھ کر بیلوں کو چھیڑا تو وہ لمحہ جو شیرے پر گذر گیا تھا اب اچانک میرو کے دل میں اتر آیا۔ میرو کو بہادر کی جوانی اور رفاقت یاد آ گئی اور پھر شیرے کا بڑھاپا اور بھو کی جوانی کی تصویر ابھری تو وہ گہری سوچ میں کھو گیا۔

اچانک شیرے نے کڑک کر کہا "اوئے میرو! ہاڑا اوے ہاڑا۔"[1]

میرو نے گھوم کر شیرے کو دیکھا اور اسے شیرے کی آنکھوں میں وہی چمک نظر آئی جو کبھی اس نے شیرے کی جوانی میں دیکھی تھی۔ اس نے ہل اٹھا کر سیاڑ سے سیاڑ ملا دیا۔

---

[1] سیاڑ سے سیاڑ ملا ہوا نہیں جا رہا۔

چند برس بعد

قیوم نظر

جس سے پہلے آرزو ویراں ستوں پر بھٹکتی گرد تھی
جس کے بعد آنکھوں میں آنسو، سر میں سودا، لب پہ آہ سرد تھی
جس کے ہونے سے کچھ نہ تھا، جو کچھ نہ ہونے پر بھی یکسر فرد تھی

سنگِ مرمر کا وہ پیکر — زندگی کے جس پہ کیا کیا جال تھے
طرفہ تر شیرازہ بندی روپ کی، نایاب خد و خال تھے
اک دمکتی لہر کے شانوں پہ رقصاں جھاگ تھی یا بال تھے

ابر پارہ تھا، ہوا کے دوش پر اڑتا ہوا آیا — گیا
حسن کا اک گرم رو شعلہ جو لمحہ بھر کو تھرایا، گیا
کائناتِ دل پہ صد کیفیتوں کو کیسے پھیلا گیا

ذہن کے گوشوں میں اتری کرچیاں ہوں جس طرح دھنستی ہوئی
میری دنیائے تصور میں ہیں یادیں وقت پر ہنستی ہوئی
راج ہنسوں کی طرح اڑتی، مگر پھندوں میں بھی پھنستی ہوئی

زندگی کی ملار

شیر افضل جعفری

زندگی کی ملار بنتِ عجم — گنگناتے چناب کا سرگم
چہرہ و زلف، چاند او گھٹا — سرخ آنچل گلاب کا موسم
عمر میں کم سنی کی آمیزش — انکھڑیوں میں بھی سرخیاں کم کم
چوری چوری شباب آتا ہوا — دل میں لیتا ہوا سرورِ جنم
قدِ بالا شرار کا بوٹا — گندمی رنگ چاندنی کا بھرم
ڈولتی چال میں نشوں کا ہجوم — لغزشوں میں شراب کا عالم
باہوں میں چوڑیوں کی مست چھنک — پاؤں میں چال تال کی چھم چھم
خامشی میں نگاہ کے نغمے — گفتگو میں دھنوں کا زیر و بم
دل میں آب و ہوائے لالہ و گل — آرزوؤں پہ چیت کی شبنم
بار اس کی بہار سے کشمیر — جھنگ اسی کے قدم سے رشکِ ارم
حسن قدرت نے اپنے سانچے میں — ڈھال رکھا ہے بے مثال صنم

یہ ہے اس سرزمیں کی سلطانہ
چوم لے اے آسمان اس کے قدم

ظلمت و نور

(دو تصور)

شاہد عشقی

میرے لب کی طرح خاموش ہر اک بزمِ طرب
اک سیاہی سی اُفق تا بہ اُفق قلب بہ قلب
جیسے کچھ سوچ کے، کیا سوچ کے معلوم نہیں

میرے دل کی طرح ویران ہر اک راہ گزر
اک اداسی سی بہ ہر گوشہ و تا حدِ نظر
زندگی ٹھہر گئی ہو کسی دوراہے پر

میکدے سونے، خم و ساغر و مینا خالی
ہر طرف رقص کناں نیند کے بوجھل سائے
دور تک بکھرے ہوئے انجم و مہتاب کے زخم

ظلمتِ شب کی طرح دیدہ و دل تیرہ و تار
دیومالا کے خداؤں کی طرح پُر اسرار
آسماں صبحِ بہاراں کے لئے سینہ فگار

ایسے عالم میں کہ جب پاس نہ ہو کوئی رفیق
ایک لمحہ کو ٹھہر کر جو ڈھلک جاتا ہو
خرمنِ دل کے لئے ہراس جو آجائے فضا

غمِ جاناں کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے
سرِ مژگاں وہ ستارہ بھی بہت ہوتا ہے
ایک بے مایہ شرارہ بھی بہت ہوتا ہے

اور کچھ ایسا ہی عالم تھا کہ دل نے چاہا
شغل کوئی تو ملے دستِ جنوں کو آخر
یاد آئی نہ مگر کوئی مسیحائی کو

آج کی شب غمِ جاناں کے سہارے ہی کٹے
کوئی اک شمع تو اس غمکدۂ شب میں جلے
درد نے گرچہ سحر تک کئی پہلو بدلے

درد نے پچھلے پہر تک کئی پہلو بدلے
لاش مرحوم تمناؤں کی کاندھے پہ اٹھائے
کھو کھلے سینہ کے تاریک نہاں خانے میں

رات مفلس کی جوانی کی طرح ڈھلتی رہی
زیست انجانی سی منزل کی طرف بڑھتی رہی
صرف اک شمع سرِ مرقدِ دل جلتی رہی

ٹمٹماتی ہوئی امید کی ننھی سی یہ لو
کھِل اٹھیں عارض و رخ، جھوم اٹھیں قامت و لف
شمع کی زد میں نہ آئیں جو اندھیرے شب کے

تیز کر دو کہ در و بام منور ہو جائیں
درد تھم جائے، شبِ ہجر کے مارے سو جائیں
اک نئی صبح کی ضو میں وہ اندھیرے کھو جائیں

★

ضمیر اظہر

چناروں کے اس پار مغرب کی جانب

وقار آفریں گنبدوں سے گزر کر

سکوں آشنا آسماں کی فضائیں،

لچکتی ہوائیں،

خراماں ہیں سرمست بادہ کشوں کی طرح

ابر کے تیرہ و تار پارے

سیہ ابر پاروں سے کچھ دور

اک شادماں، سحر افشاں، منور ستارہ

مری آرزوؤں کی تقدیر بنکر

سہانے سہانے، سجیلے سجیلے

ارادوں کی شفاف تعبیر بن کر

عجب شان سے نور برسا رہا ہے

مگر ابر پارے بڑھے آرہے ہیں

ستارے کی جانب - خراماں خراماں!

غزل

سید ضمیر جعفری

آدمی جب حسن بن جاتا ہے اپنی ذات میں
اک ستارہ ذہن میں، سو چاند امکانات میں

کارگاہِ ماہ و انجم ہے دلِ ظلمات میں
کتنے تارے ٹوٹتے دیکھے اندھیری رات میں

ہائے وہ مستی کہ تھی حسنِ دو عالم پر محیط
تیرا دامن تھا کہ تھا دامانِ ہستی ہات میں

زندگی اپنے تسلسل میں تو اک الزام تھی
لوگ جی لیتے ہیں چند اک منتشر لمحات میں

کاش تم پوچھو کبھی مجھ سے مری چاہت کا شوق
کاش تم دیکھو کبھی مجھ کو بھی، میری ذات میں

کر دی ماحول نے کتنے ارادوں کی سحر
بجھ گئیں کتنے چراغوں کی لَویں برسات میں

تلخیوں سے بھی چمک اٹھتی ہے روحِ زندگی
حادثے بھی رنگ بھر دیتے ہیں محسوسات میں

اہلِ دل سے پوچھو دریشانیِ تشنہ لب کی بات
آئینوں سے الٹ دیتے ہیں دریا ہات میں

ایک شگفتہ درد، اک شعلوں میں بجھتی چاندنی
اجنبی شہروں سے یہ چیزیں ملیں سوغات میں

غیر آخر غیر ہیں کیا اُن سے تلخی کا گلہ؟
دوست بھی تو زہر سے جلتے ہیں میٹھی بات میں

اک نگاہِ دلکشا، اک چشمِ باطن آشنا!
رنگ قلبِ سنگ میں، سورج دلِ ذرّات میں

چشمِ آہو کو جلا دیتا ہے صحراؤں کا درد
غم بہت حالات میں، خوشیاں بہت جذبات میں

سوچتا ہوں، شاید اس سوچ کے امکاں ہی نہیں
وہ حریمِ کہکشاں ہے میرے احساسات میں

یاد رکھے بھی تو کیوں رکھے ہمیں دنیا ضمیر
منتخب کس فن میں تھے ہم منفرد کس بات میں

مشفق خواجہ

اس قدر حیرتیِ جلوہ تھے دیوانے ترے
کچھ نہ کہنے پہ بھی کہتے رہے افسانے ترے

کائناتِ دلِ ویراں فقط اک ذوقِ طلب
وادیاں تیری، گلستاں ترے ویرانے ترے

جانے کیا رنگ ہو پھر جلوہ گہہِ ناز ترا
ہم سے منسوب اگر ہو گئے افسانے ترے

تیرے ملنے کی جہاں کوئی بھی امید نہیں
اب وہاں ڈھونڈھ رہے ہیں تجھے دیوانے ترے

کاش ہم وقت سے اس طور ہم آغوش رہیں
ہم کو ہر لمحہ سناتا رہے افسانے ترے

ہم نے ہر شے کو، تجھے دیکھ کے، دیکھا اکثر
ہم نے ہر روپ میں سو روپ ہیں پہچانے ترے

اُجڑی راہوں پہ سدا، صورتِ نقشِ کفِ پا
جانے کیا سوچ کے بیٹھے رہے دیوانے ترے

اب وہ پہلی سی پرستاریِ اوہام کہاں
یاد ہیں پھر بھی غمِ دوست کچھ افسانے ترے

کاش تو جان سکے، اے نگہِ میکدہ ساز!
تشنگی اور بڑھا دیتے ہیں پیمانے ترے

تجربہ ہے کہ پسِ پردۂ ہر قصۂ غم
ہم نے مشفق سنے بھی تو یہ افسانے ترے

سوار اور سمند

(ہمارے فن میں عکاسی)

"میں اپنے رخشِ تیز گام پر سوار جاؤں گا" ــــ یہ محض شاعری ہی نہیں۔ گھوڑے کو اگر تہذیب کی علامت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ ہم کسی ایسے وقت کا تصور نہیں کر سکتے جب یہ بے حد شریف، جفاکش اور وفادار جانور ہم انسانوں کا یار و آشنا نہ رہا ہو۔ یہ تو ہماری زندگی میں تاریخ سے بھی کہیں پہلے داخل ہو چکا تھا۔ ابتدا میں اس کی زندگی، عوامی تصور کے مطابق، خود انسانوں کی طرح عالم بالا ہی میں تھی۔ اسلئے کہ فرشتوں کی طرح یہ بھی ایک مقدس مخلوق تھا جس کے بڑے ہی شاندار اور خوبصورت پر تھے۔ جب یہ انسان کی طرح اس دنیائے سفلی میں اترا تو اس کے پر بھی نہ رہے لیکن اس کے فرشتہ خصلت ہونے میں کوئی فرق نہ آیا۔ اور اس کا دامن انسان اور اس کی تہذیبی زندگی کے ساتھ ایسا مل گیا کہ تب سے اب تک اس باہمی ربط و الفت کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ اور گھوڑا مختلف رنگوں میں انسانی زندگی اور تہذیب کے ساتھ عناں بہ عناں رہا۔ اس لئے یونانِ قدیم کے شہرۂ آفاق المیہ نگار سوفکلیز کے مشہور ڈرامہ "انٹگونی" میں کورس کی زبانی، جو عموماً شاعر، مردِ دانا یا عوام کی آراء کی ترجمانی کرتا ہے، انسان کے گھوڑے کو سدھانے اور قابو میں لانے کا تذکرہ سن کر کوئی حیرانی نہیں ہوتی۔ رزم و بزم دونوں اس کا میدان ہیں۔ زندگی کے رومان میں اپنی سج دھج کے ساتھ یہ دولھا کا ہمرکاب یا دولھا اس کا ہمرکاب اور پھر مغرب میں تو کاشتکاری کا سارا بوجھ بھی اسی کے شانوں پر ہے جب کہ کاشتکاری ہزارہا سال سے تہذیب کا مرکز و محور رہی ہے۔ باقی رہی رزم تو مشرق سے لے کر مغرب تک اس کی جولانیوں کے لئے میدان کھلا نظر آتا ہے، اور تاریخ کے صفحات اس کے کارناموں سے لبریز ہیں۔ عرب، ایران اور تاتار کی تہذیبی روایت بقول ٹائن بی بہے ہی گھوڑے کی پشت پر سوار۔ راکب اور مرکب دونوں یک جان و دو قالب۔ وہ ربط و تعلق جسے رستم، اور رخش نے ضرب المثل بنا دیا ہے۔ مغلوں نے شہسواری کو فن ہی نہیں زندگی بنا رکھا تھا۔ لہٰذا ان کے نزدیک "سوار سمندِ ناز" اور "عالی گُہری" ایک عملی حقیقت تھی۔ ابھی حال ہی تک ہم اپنے بزرگوں کے متعلق بھی یہی سنتے آئے ہیں کہ وہ گھوڑے ہی کی پیٹھ پر جیتے اور اسی کی پیٹھ پر مرتے تھے۔ شاید ہی کوئی سچ مچ صاحبِ فراش ہو کر بستر میں جان بحق تسلیم ہوتا ہو۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جہاں زندگی اب بھی رزم کے آغوش میں پلتی ہے، سوار و سمند کی چست و چاق زندگی کی روایت بدستور تازہ ہے۔ اور ہماری مسلح افواج کو بجا طور پر خوبصورت اور مضبوط و توانا رخش ہائے تیز گام پر ناز ہے۔ جو ہمارے فوجی رسالوں کی روح رواں ہیں ــــ اور ہمارے دیہاتوں اور پہاڑی علاقوں میں تو اعلیٰ قسم کی نسل کشی ایک چہیتا مشغلہ، ایک فنِ لطیف بن چکا ہے۔ رخش کا نام یقیناً ایسے ہی چست و چاق چمکدار جسم والے شاندار گھوڑوں کی بنا پر رکھا گیا تھا۔ جو واقعی اپنے پُٹھے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتے۔ اور زندگی سے فن تک ایک ہی قدم تو ہے۔ اگر گھوڑا اور اس کا لازمہ شہسواری ہماری زندگی کا جزو ہیں تو فن کیوں نہ ان کی عکاسی کرے۔ ہمارے ادب اور شاعری کا دامن تو گھوڑوں کے دلفریب مرقعات اور شہسواروں کی تعریف سے لبریز ہے۔

تاریخ میں ٹرائے کے گھوڑے کی داستان سے لیکر براق کی خیالی تصویر کشی تک گھوڑے کو طرح طرح کے روپ ملتے رہے ہیں۔ ادب میں شاید ہر جگہ ہی اس کی صاف اور روشن جھلکیاں نظر آئیں گی اور کوئی عہد بھی اس کی داستان سرائی سے خالی نہ دکھائی دے گا۔ مگر مشرق میں فن و حسن کاری کے مظاہروں اور تخلیقات میں تو اسے بہت ہی نمایاں اور مخصوص جگہ مل چکی ہے۔ سیر و شکار، مہم جوئی، فوج کشی اور فتح و ظفر کے کارناموں میں اس شریف "مردِ میدان" کا مذکور اس کثرت سے آیا ہے کہ بعض بعض جگہ وہ اصنام خیالی کی صف میں پہنچ گیا ہے اور یہ سب خراج ہے انسان کی طرف سے اس حیوانِ عزیز کو جو اس کی زندگی میں پوری طرح رس بس گیا ہے۔

پاکستان کو قدیم الایام سے گھوڑے کی پرورش اور شہسواری کے فن میں لازوال شہرت حاصل رہی ہے۔ اور وہ ہمارے اولوالعزم جیالے انسانوں کی

محبوب مرکب ہی نہیں رہا ہے بلکہ اس کے حسن کاروں کا تخلیقی موضوع بھی بنا رہا ہے۔ ہمارے حسن کاروں نے اس حیوان میں وہ سب خوبیاں دیکھی تھیں جو خود اس سرزمین کے باسیوں کی فطرتِ جبلّت ہے ۔ کڑیاں جھیلنا، نرت پھرت، سیمابی جست وخیز، شجاعت، تہوّر، متانت، صبر وتحمل، وفاکیشی اور معرکہ پسندی۔ ہمارے مصوروں نے اپنی تصویروں میں اس حیوان کو خاص طور پر اپنایا ہے اور اگر ہم اپنے صُوری خزانوں کو ذرا کھنگالیں تو معلوم ہوگا کہ اس موضوع پر بھی ہمارا دامنِ فن بڑا مالامال ہے ۔

پاکستان کے باشندوں کو اس جانور سے جو دلی شغف ہے وہ اکثر طرح طرح سے ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ اسی طرح کا ایک مظاہرہ وہ نمائش اسپاں ہے جو ہمارے ہاں ہر سال بڑے طمطراق سے منعقد ہوتی ہے۔ شہسواری کے کھیلوں اور گھوڑوں کے سدھانے ، ان کی نسل کشی اور اس حیوان کے اعلیٰ نمونے پیش کرنے کا جذبہ شریفانہ مسابقت کی مہمیز سے نئے نئے روپ اختیار کرتا رہتا ہے۔ پچھلے دنوں لاہور میں نمائش اسپاں بڑے کروفر کے ساتھ منعقد ہوئی۔ جس کو دیکھنے کے لئے منجملہ دیگر اکابر کے خود ہمارے صدرِ پاکستان بھی تشریف لے گئے تھے۔ شہسواری وجواں مردی کے اس شغل کو ان کی آمد سے چار چاند لگ گئے۔ ادھر نمائش کے ساتھ ساتھ فکر ونظر کی دعوت بھی یوں میسر آگئی کہ نیشنل کالج آف آرٹس (سابق میو سکول آف آرٹ) میں دلدادگانِ فن نے ایک ایسی نمائش کا اہتمام کیا جو اس نمائش اسپاں کا گویا صوری پہلو تھا۔

مصوری کی اس مشہور درسگاہ میں یہ نمائش جو "سوار وسمند" کے موضوع پر ترتیب دی گئی تھی، لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ دیکھنے والوں کا ہجوم لگ گیا۔ میں بھی "پانچویں سوار" کی حیثیت اختیار کر گیا اور اس نمائش میں ایک معمولی ناظر کی طرح حصہ لیا۔

•

نمائش میں جو تصویریں اور مجسمے لاکر جمع کئے گئے تھے انہیں بڑی خوش سلیقگی کے ساتھ ترتیب دیا گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ تاریخی ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور ایک عام ناظر کو اس سرزمین میں گھوڑے کی داستان کا مطالعہ کرنے میں بڑی مدد ملتی تھی۔ مثلاً یہ کہ تیسری صدی قبل مسیح کا ایک کھلونا جو کھریا مٹی کا بنا ہوا تھا دکھائی پڑا۔ کہنے کو تو یہ ایک کھلونا ہی تھا مگر اس قدر مکمل، نفیس اور نک سے سُک تک درست کہ بچہ تو دیکھکر ہی مچل جائے کہ مجھے اس پہ بٹھا دو! بڑے کا بھی جی چاہے کہ بس اس خوبصورت فن پارے کو دل میں جگہ دے لے۔

یہاں سے کچھ چیزیں دیکھتا بھالتا جب میں آگے بڑھا تو ایک نئی چیز نے دامن نگاہ کو کھینچ لیا۔ یہ قدیم کے مقابلہ پر جدید کام کا مطالعہ تھا۔ کھریا مٹی کی بجائے آجکل کی سیمنٹ سے کام لیا گیا تھا۔ یہ ایک ماڈل تھا جس کا عنوان تھا "دوست"۔ یہ ایک بڑا گھوڑا تھا جو بڑی نفاست کے ساتھ "براہ راست" سانچہ سازی کا مرہونِ منت تھا۔ بنانے والی ایک غیر ملکی خاتون ہیں مس میری لیوس۔ یہ مجسمہ سازی کے فن پر ایک سال کے لئے ہمارے اس کالج میں لیکچرار کے فرائض انجام دینے کے لئے آئی ہوئی ہیں۔

میری نظریں یوں تو کئی نمونوں پر جاکر ٹھہریں مگر یہ جبتی فن کے کئی نمونے دیکھکر نظریں واقعی آسودہ ہوگئیں۔ خصوصیت کے ساتھ ایک ابرقی لوح دیکھکر آنکھوں میں نور بھر گیا۔ یہ تراش تیسری صدی قبل مسیح کی تھی اور ٹیکسلا کے عجائب گھر سے لائی گئی تھی۔ مجھے ادھر ادھر دیکھنے پر قدیم صناعی کے چند اور نمونے بھی دکھائی دیئے۔ اور قدرتی بات تھی کہ گندھرا مجسمہ طرازی اور کافرستانی گڈّوں کو دیکھکر اس سرزمین کے قدیم فنکاروں کی حسن کاری کا قائل ہونا پڑا۔

میں سوچ رہا تھا کہ سوار وسمند کی اس بزم میں میدانِ رزم کے ہمارے جیالوں نے بھی کچھ حصہ لیا ہے یا نہیں۔ میری گرداں نظریں زیادہ دیر تک تکلیف انتظار میں نہ رہیں کیونکہ جیسے ہی میرے دل میں یہ خیال گذرا، وہیں میری نظریں بعض ایسی ٹرافیوں پر پڑگئیں جو ہمارے فوجی احباب نے اس نمائش کے لئے یہاں بھیجی تھیں۔ شہسواری کے کرتبوں کی یہ ٹرافیاں ہماری گھوڑسوار رجمنٹوں کے افسروں کی میسوں سے لائی گئی تھیں۔ کیا کیا چہرے سواروں کے، کیا کیا روپ ان کے مرکبوں کے، کیا آن کیا چھل بل۔ بس یوں سمجھیے خون کی گرمی، خو کی تندی، رگ پٹھوں کی کھنچاوٹ اور پارہ کی طرح مچلتی ہوئی ادائیں، جوش، عمل، حرکت کی منہ بولتی تصویریں تھیں۔ "لانسر رجمنٹوں" کے ان نمونوں کے علاوہ بھی مغربی پاکستان کے اور مقامات سے بعض چیزیں لائی گئی تھیں جو اپنی اپنی جگہ بڑی خوب تھیں۔

سوار وسمند کی گفتگو ہو اور "شہسوارانِ چغتائی" کا مذکور بیچ میں نہ آئے، یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ نمائش کے ذخیروں میں مغلیہ مصوری ونقاشی

کے بھی بہت سے نمونے موجود تھے۔ خاص کر مختصر تصویریں۔ یہ زیادہ تر نجی ذخیروں سے حاصل کی گئی تھیں۔ ہز ہائینس امیر بہاولپور کے ذخائر میں سے بھی بعض نفیس چیزیں مجھے یہاں ہی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ایک دوسرے صاحب ذوق میجر فقیر سید مغیث الدین بخاری ہیں۔ ان کے ذخیروں کی بعض نادر چیزیں بھی یہاں بہت پسند کی گئیں۔

مغلیہ نقوش کے شاید تمام مدارج ترقی موجود تھے۔ وضع و موضوع کے اعتبار سے اگر ایک طرف "جل جلالہٗ اکبر" اپنے کر و فر شاہی کے ساتھ موجود تھا تو دوسری طرف اسی کے دربار کا "حیوانِ ظریف" ـــ "ملا دو پیازہ" بھی مع اپنی ہیئت کذائی اور اپنے روایتی گھوڑے کے یہاں دکھائی دیا۔ نقیب صاحب موصوف کے ذخیرے میں مجھے چند اور چیزیں بھی بڑی عمدہ نظر آئیں مثلاً راجپوت اور سکھ نقاشی کے نمونے۔ ان کے جداگانہ شمائل الگ سے اپنی انفرادیت کا اعلان کر رہے تھے۔ یہاں ایک اور بڑی عمدہ تصویر جو میری طرح سب ہی کی نظروں کا مرجع بنی وہ "نواب محمد مبارک خان عباسی" کی تھی۔ یہ تصویر عام طور پر صادق گڑھ پیلس (ڈیرہ نواب صاحب) کے "ایوان ضیافت" کی زینت دکھائی دیتی ہے۔ مجھ جیسے عام ناظر کو ایسی چیز غالباً ایسی ہی کسی جگہ دیکھنے کا اتفاق ہو سکتا تھا۔

٭

مشرق کی صورت گری اور یورپی روشِ فن کا امتزاج اپنی جگہ اور ہی بہار دکھاتا ہے، گویا پرتگالی شراب حلبی شیشوں میں بند تھی مثلاً یہاں میں نے ایک تصویر دیکھی "پروبین شہسواروں کا حملہ"۔ اس تصویر میں حملہ کی تیزی، تندی، طراری اور سوار و سمند دونوں کا خروش بھی بڑی ہی چابکدستی سے دکھایا گیا تھا۔ اسی طرح "میجر ملک احمد خاں" کی شبیہہ بھی منہ بولتی ہوئی تھی۔ غالباً یہ تصویر سیوان ہیٹمین کی کاوشوں میں سب سے اول و فائق مانی جاتی ہے۔

تنگیٔ داماں حائل تھی ورنہ عصری فنکاروں کے بہت سے نمونے نمائش گاہ میں لائے جا سکتے تھے۔ پھر بھی بعض نقش بڑے اچھے نظر آئے۔ مثلاً شاکر علی کا کینوس پر بنا ہوا روغنی عمل "گھوڑے: شہر پناہ کے سامنے" اس میں رنگ، ماحول اور "زمین" کو بڑے ڈرامائی انداز میں چھوٹ دی گئی تھی اور بہت ہی خوبصورت نتیجہ برآمد ہوا تھا۔ جن لوگوں کو شکل طرازی کی روایتی خوبیاں زیادہ پسند ہیں ان کے ذوق نے حاجی محمد شریف کی تصویر "پاکستانی چوگان باز" کو بہت سراہا۔

فنون لطیفہ کے ان مظاہروں کے علاوہ نمائش میں دستکاری اور صنعتی ڈیزائن کے پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا تھا۔ موضوع وہی تھا "سوار اور سمند"۔

انسان نے اپنے اس بے زبان شریف دوست کو ظاہری سجاوٹ اور لباس و زیور کی خوبصورتیوں سے بھی ہر طرح نوازا ہے تاکہ اس کا دل میلا نہ ہو اور وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے کہ اس کا یار بھی خالی دانہ گھاس ڈال کر نہیں ٹرخا دیتا ہے بلکہ اس کی خدمات کا اعتراف تحائف و ملبوسات سے بھی کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ مجھے یہاں خیر پور اور بہاولپور سے آئے ہوئے گھوڑوں کے زرق برق ساز اور دیگر لوازمات مرصع بھی نظر آئے۔ لکڑی کی کھدائی کے نمونے، کشیدہ کا کام۔ تانبے پر ابھرواں کام۔ دستی چھاپے کی سوتی چھینٹیں۔ اپنی جگہ الگ بہار دکھا رہی تھیں۔ اس موقع پر کلٹیکس ٹیکسٹائل ملز ملتان نے ایک بہت نفیس و دلآویز میز پوش تیار کر کے بھیجا تھا جو واقعی دیکھنے کی چیز تھی۔

ہر چند کہ یہ نمائش مختصر پیمانہ پر تھی مگر تھی بڑی نمائندہ اور بھرپور۔ یہاں آ کر یہ بات تو بخوبی واضح ہو جاتی تھی کہ ہمارے فنکار اور حسن کار حسین نمونا اور وضع و ہیئت کو بھی اپناتے ہیں اس میں اپنے اس پرانے رفیق کو نہیں بھولتے۔ سوار اور سمند کا موضوع چونکہ پاکستانی فنکاروں کی شجیع ذہنیت اور تصویری ذوق سے بہت قریبی نسبت رکھتا ہے اس لئے وہ ان کی تخلیقات میں برابر نمود پاتا رہتا ہے۔

مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ آئندہ سال اسی نوعیت و اہمیت کی نمائش پھر منعقد کی جائے گی اور اس موقع پر ہمیں اپنے فنکاروں کی قدیم و جدید کاوشوں کے اور زیادہ وسیع و متنوع نمونے دیکھنے کا موقع فراہم ہوگا۔

آپ کے
پیدا ہونے والے
بچّے کی زندگی...
آپ کی دایہ کے ہاتھوں میں ہے۔
وضع حمل سے پہلے جب کبھی آپ کی دایہ زچگی کے لئے آئے تو یہ ضرور دیکھ لیجے کہ اسے اپنے ہاتھ اور اوزار کو جراثیم سے پاک کرنے کے لئے صاف برتن، صاف پانی اور ڈیٹول دیا گیا ہے یا نہیں۔ اگر اوزار اور ہاتھ ڈیٹول کے جراثیم کش محلول سے صاف نہ کئے جائیں تو وہ آپ کے اور آپکے بچے کے لئے مہلک خطرہ کا باعث ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ ان سے زچہ کو چھوت کی بیماری ہو جانے اور اس کے خون میں زہر پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔
چھوت سے زچہ کی حفاظت کیجئے۔ زچگی سے پہلے، زچگی کے دوران میں اور زچگی کے بعد ڈیٹول کا استعمال کیجئے۔
ANTISEPTIC
DETTOL
NON-POISONOUS
ڈیٹول
* زود اثر اور دافع سمیت ہونے کی وجہ سے جراثیم کو بہت جلد ہلاک کر ڈالتا ہے۔
* جس جگہ لگایا جائے وہاں ذرا بھی تکلیف نہیں ہوتی۔
* اس کی بو خوشگوار ہے۔
اسے تمام ڈاکٹر استعمال کرتے ہیں اور استعمال کا مشورہ دیتے ہیں۔
۱۶، ۸ اور ۴ اونس کے سائزوں میں ملتا ہے۔
آج ہی ایک بوتل خریدئیے۔
ریکٹ اینڈ کولمین آف پاکستان لمیٹڈ
پوسٹ بکس نمبر ۴۶۲۳۸ - کراچی۔
RC 804
JWT

جسم میں تازگی
لائف بوائے
صابن
کی بدولت
لائف بوائے کے جراثیم سے محفوظ رکھنے والے
فرحت بخش جھاگ جلد کے ہر مسام سے جراثیم آلود
میل اور گرد کو الگ کر دیتے ہیں جس سے جسم صاف
اور ستھرا ہو جاتا ہے اور آپ دن بھر ایک لطیف
تازگی محسوس کرتے ہیں۔ یہ اطمینان کر لیجئے کہ
آپ کے گھر میں سب کی صحت مفرح لائف بوائے
صابن سے محفوظ رہے -
LIFEBUOY
SOAP
لائف بوائے صحتمند زندگی کا ضامن ہے
L 19—193 UD

ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا ۔ مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس میکلوڈ روڈ ۔ کراچی
مدیر: رفیق خاور

رنگی

ہا کستان میں بے خانماں لوگوں کو بسانے کے
سلسلے میں کئی ذیلی شہر تعمیر کئے جائینگے۔
لا ذیلی شہر کورنگی (کراچی) میں تعمیر ہو چکا ہے

رسم تاسیس: جنرل محمد ایوب خاں

دروازے بن رہے ہیں

تعمیری مراحل: ابتدا

خشت سازی

تکمیل: تعمیر شدہ بستی

ماہ نو
اکتوبر ۱۹۵۹ء

جنرل محمد ایوب خاں کی سربراہی میں تعمیر ملت کے اہم مشورے (ڈھاکہ)

یوم آزادی (۱۴ اگست) کو جنرل محمد
کا قوم سے نشری خطاب

الم کے ہوائی اڈے پر صدر پاکستان ، جنرل محمد ایوب خاں اور پنڈت نہرو کی
اہم ملاقات

فنون لطیفہ :

نقاشی :

کراچی میں جنرل محمد ایوب خاں نے نقوش چغتائی
نمائش کا افتتاح کیا

موسیقی:

شاہ عبداللطیف بھٹائی رح کے عرس کے موقع پر
سندھی موسیقی کے مظاہرہ سے دلچسپی

آنکھوں کا تارا — مستقبل کا سہارا

بچے والدین کی آنکھوں کا تارا اور مستقبل کا سہارا ہیں، کیونکہ آگے چل کر یہی قوم کے دست و بازو بنیں گے۔ ان کی صحت و توانائی اور صحیح تربیت پر ملک کی بہتری کا انحصار ہے۔ کیا مرد اور کیا عورتیں، اب تو سب کو مل کر اپنے ملک کو عروج پر پہنچانا ہے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر معالجوں اور دواساز اداروں پر بھی فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ قوم کے ہر فرد کو امراض سے نجات دلانے میں پوری پوری کوشش کریں۔

ہمدرد اس فریضے کو ادا کرنے میں مقدور بھر کوشاں ہے۔ اس کے ماہرین جو قدیم تجربات اور جدید تحقیقات سے بہرہ ور ہیں، دن رات اسی دُھن میں لگے رہتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ اور نئی نئی دوائیں کم سے کم قیمت پر مہیا کریں، تاکہ ہر خاص و عام کو فائدہ پہنچے۔

ہمدرد دواخانے نے اپنے آپ کو نوعِ انسانی کی خدمت کے لئے وقف کر رکھا ہے تاکہ بہتر سے بہتر طبی سہولتیں میسر آسکیں۔

ہمدرد

— یونانی طِب کے علمبردار اور دواساز

ہمدرد ٹرسٹ لیبوریٹریز (پاکستان) کراچی

زچّگی کے موقع پر
آپ کا تحفظ

جلد ۱۲

ماہِ نو

شمارہ ۱۰

مدیر: رفیق خاور — اکتوبر ۱۹۵۹ء — نائب مدیر: ظفر قریشی

چندہ سالانہ: پانچ روپے آٹھ آنے — شائع کردہ: ادارۂ مطبوعاتِ پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی — فی کاپی: آٹھ آنے

لیاقت علی خاں مرحوم

(چند تاثرات)

رئیس احمد جعفری

لیاقت علی خاں کو اس دنیا سے رخصت ہوئے آٹھ سال ہوگئے، لیکن دلوں میں ان کی یاد باقی ہے، اور شاید ہمیشہ باقی رہے گی۔ حب وطن کا دعویٰ کرنے والے نہ لیاقت علی خاں کے زمانے میں کم تھے نہ آج کم ہیں، ملک و ملت پر جان نثار کرنے، اور اپنا سب کچھ لٹا دینے کا اعلان کرنے والے ہر دور میں موجود رہے ہیں، یہ آواز حلقوم و گلو کی پوری قوت کے ساتھ لیاقت علی خاں کے زمانے میں بھی در و دیوار سے ٹکرایا کرتی تھی، اور ان کے بعد بھی بلکہ اب سے کچھ عرصہ پہلے تک، تو اس آواز کا شور اتنا بڑھ گیا تھا کہ نقار خانے کی آواز معلوم ہونے لگی تھی، جس میں دوسری آوازیں گم جاتی ہیں اور جو خود بھی اچھی طرح سنائی نہیں دیتی۔

لیکن لیاقت علی خاں کی بات ہی اور تھی، اس نے کہا کم، کیا زیادہ، اس نے مرنے سے چند دن پہلے اعلان کیا تھا۔ میں اپنا سب کچھ ہندوستان میں چھوڑ آیا، صرف جان ساتھ لایا ہوں، اور وقت آنے پر سب سے پہلے میرا خون، ملت کی حرمت اور ملک کے دفاع پر بہے گا۔ اس نے جو کچھ کہا تھا، اسے سچ کر دکھانے کے لئے زیادہ انتظار نہ کر سکا۔ ایک روز وہ اپنے "برادران ملت" سے خطاب کر رہا تھا کہ پستول کی گولی اس کے دل میں لگی، اور وہ پاکستان زندہ باد کہتا ہوا مر گیا، مر گیا، لیکن زندۂ جاوید بھی ہو گیا۔

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن   خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

وہ اس دنیا میں خالی ہاتھ آیا تھا، خالی ہاتھ گیا۔ اس کی جیب بھی خالی تھی، اور بنک بیلنس بھی صفر، ہاں لیکن ایک توشہ اپنے ساتھ لے گیا۔ بلکتی ہوئی ملت کے آنسوؤں کا توشہ، اپنے خون ناحق کا تحفہ، اپنے داغ داغ دل، اور پھٹے ہوئے سینہ کا نذرانہ لے کر بارگاہ الٰہی میں پہنچ گیا۔ اس دنیا سے جاتے وقت اپنی قوم کے لئے وہ اپنی یاد چھوڑ گیا، ــــ نہ بھولنے والی یاد، نہ مٹنے والی یاد، حالانکہ اس کے ہم عصروں میں ایسے اصحاب بھی تھے، جو اس دنیا سے گئے، لیکن قوم کے لئے اگر کوئی چیز چھوڑی تو تلخی، اور خاندان و متعلقین کے لئے لاکھوں روپے کا بینک بیلنس، کتنا عجیب شخص تھا یہ لیاقت علی، خود تو نواب زادہ تھا، لیکن قوم کے لئے، فقیر بن گیا، اور کتنے عجیب تر تھے اس کے بعض معاصر، غریب تھے، لیکن قوم کے بل پر لکھ پتی بن گئے!

لیاقت علی خاں کی کچھ جھلکیاں میں نے دیکھی ہیں، اور وہ چند جھلکیاں ایسی ہیں جو بھلائے نہیں بھولتیں۔

یوم آزادی کے موقع پر، گورنر جنرل کی طرف سے استقبالیہ (ریسپشن) کا اہتمام ہوا کرتا تھا، ۱۹۴۸ء میں قائد اعظم بیمار تھے، اور زیارت میں مقیم، لہٰذا وزیر اعظم نے اس کا انتظام کیا، نواب صدیق علی خاں، پولیٹیکل سکریٹری نے، دعوت نامہ مجھے بھی بھیجا۔ لیاقت علی خاں کی سرکاری قیام گاہ کا وسیع لان، معززین شہر، حکام والا مقام، وزراء حکومت اور سفراء سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، بینڈ کا نغمۂ جاں فزا فردوس گوش ثابت ہو رہا تھا، اتنے میں لیاقت علی خاں سیاہ شیروانی میں ملبوس، جناح کیپ سے آراستہ، وقار و شکوہ کی تصویر بنے برآمد ہوئے: ہونٹوں پر تبسم رقصاں، آنکھوں میں سحر انگیز چمک، مہمانوں کی مزاج پرسی کرتے، ہنستے بولتے، یہاں اور وہاں گشت کرتے رہے، ــــ لیاقت علی کے اس پیکر میں نشاط و مسرت کی روح جھانک رہی تھی۔

پھر کچھ روز بعد قائد اعظم کا انتقال ہو گیا، قوم یتیم ہو گئی، اس نو زائیدہ مملکت کی بنیادیں لرزنے لگیں، ــــ شب تاریک و بیم موج و گرداب چنیں حائل، "اب کیا ہوگا؟" ہر شخص کی زبان پر یہی سوال تھا۔ اپنے آپ سے بھی، اور دوسروں سے بھی، لیکن اس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا اگر تھا تو ہراس اور دہشت کی صورت میں، اندیشہ ہائے دور و دراز کی حکومت تھی، امید دم توڑ رہی تھی، حوصلہ جواب دے رہا تھا، ــــ امنگ دم توڑ چکی تھی!

ماہ نو، کراچی، اکتوبر ۱۹۵۴ء

"یکایک ہوئی غیرتِ حق کو حرکت!" دفعتہً لیاقت علی خاں نمودار ہوئے، یہ کوئی نئے شخص نہ تھے، مدت کے جانے پہچانے، قائدِ اعظم کے دستِ راست، پاکستان کے وزیرِ معظم، لیکن آج قائدِ اعظم کی وفات کے بعد جب یہ نمودار ہوئے تو بالکل نئے آدمی تھے ——— تیور بدلے ہوئے، آواز بدلی ہوئی، لہجہ بدلا ہوا، شخصیت بدلی ہوئی، لیاقت علی خاں کی تقریریں بارہا سنی تھیں لیکن آج کی تقریر چیز ہی کچھ اور تھی، اس تقریر نے قوم کا مزاج بدل دیا، وہی دل جو سہمے ہوئے تھے دفعتہً ان میں طوفانوں سے کھیلنے اور پہاڑوں سے ٹکرانے کا ولولہ پیدا ہو گیا، لوگ جلسہ گاہ میں جب آئے تو اُن کی گردن ڈھلکی ہوئی تھی، جلسہ گاہ سے نکلے تو سینہ تنا ہوا تھا ——— وہ سینہ! ؎

جس کی زد کھا کے لرز جاتی ہے بنیادِ زمیں
جس سے ٹکرا کے بکھر جاتے ہیں اوراقِ دیار

لیکن وقت کے ترکش میں ابھی ایک تیر اور باقی تھا!

حیدرآباد کا سقوط! ؎

مصائب اور تھے پر دل کا جانا!
عجب اک سانحہ سا ہو گیا تھا

اس حادثہ نے قیامت برپا کر دی، حیدرآباد گیا ——— "کیا پاکستان رہ سکے گا!"

اس موقع پر وہ جادوگر، اپنے حیات آفریں نطق و کلام کا معجزہ لیکر، پھر نمودار ہوا، اس کے چہرے پر نہ ہراس تھا، نہ دہشت، نہ فکر، نہ اندیشہ، نہ کم حوصلگی، نہ پست ہمتی، وہ آیا اور اس نے نعرہ لگایا ؎

کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے

دنیا میں الفاظ اور آواز سے بڑھ کر کوئی طاقت نہیں، بشرطیکہ اس میں خلوص ہو، حوصلہ ہو، زندگی ہو، ——— لیاقت علی خاں کے الفاظ میں خلوص تھا، حوصلہ تھا، زندگی تھی، اور یہ ساری چیزیں آن کی آن میں قوم کے جسمِ ناتواں میں منتقل ہو گئیں، اور واقعی اس میں شوکتِ طوفاں پیدا ہو گئی ——— دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں!

وہ قوم کے ساتھ چلتا رہا، قوم اس کے ساتھ چلتی رہی، دونوں ایک دوسرے کے رفیق اور دمساز، ہمدرد اور جاں نثار تھے، لیاقت علی خاں نے زندگی کی آخری سانس تک، اپنے اور قوم کے درمیان وہ رشتہ نہیں پیدا ہونے دیا، جو طالع آزما سیاست دانوں کا شیوہ ہوتا ہے، یعنی آقا اور غلام کا رشتہ! وہ جانتا تھا اس کی قوت کا سرچشمہ قوم ہے، اور قوم جانتی تھی اس کی عظمت اسی مردِ کار کے خلوص سے وابستہ ہے، دونوں میں کبھی تلخی نہیں پیدا ہوئی، کبھی کشمکش کی نوبت نہیں آئی۔

لیاقت علی خاں اس دنیا سے رخصت ہو گئے، "سرخ رو" آکر، بارگاہِ رسالت مآب میں پہونچے، اور نذر پیش کرنے کا حق لیکر ——— اقبال کے الفاظ میں ؎

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
یہ چیز وہ ہے جو جنت میں بھی نہیں ملتی

——— آبگینہ، جس میں لیاقت علی خاں کا خون جھلک رہا ہے۔

۷ اکتوبر

آسد ملتانی

یہی دن تھا کہ پاکستان میں اک انقلاب آیا
فلک سے دردمندوں کی دعاؤں کا جواب آیا

جزا دیکھی، سزا دیکھی، ثواب آیا، عذاب آیا
نظر کے سامنے اک نقشۂ روزِ حساب آیا

جو اُلجھاتے رہے ہیں قوم کو پُر پیچ باتوں میں
اب اُن لوگوں کے حصے میں مسلسل پیچ و تاب آیا

تجارت سے یکایک کم ہوا عنصر شرارت کا
جو بدعنوانیوں کے حق میں حکم سدِّ باب آیا

زمینداروں کی بھی جاتی رہی سب آسماں اری
کہ حارث بن گئے وارث، وڈیروں پر عتاب آیا

ملا پھر ملک و ملّت کو نیا پیغامِ بیداری
نئی تعبیر بن کر شاعرِ مشرق کا خواب آیا

مسلمانوں کے اندازِ نظر کا امتحاں ہوگا
نیا دستور بننے پر جو وقتِ اِنتخاب آیا

نئی نسلوں کی ذہنیت میں تبدیلی جبھی ہوگی
ہماری درسگاہوں میں جب اسلامی نصاب آیا

یہ جب باعث بنا اسلامیوں کی سربلندی کا
آسد کے ساتھ مل کر سب کہیں گے، کامیاب آیا

دورِ نغمہ

(دورِ نو کا استقبال)

نظر حیدر آبادی

اے واقفِ طلسمِ غمِ روزگار آ — اے ناقدِ سیاستِ لیل و نہار آ
چھٹنے لگا چمن سے خزاں کا غبار آ — آ، اے امینِ زمزمۂ نو بہار آ

گل ریز و عطر بیز ہوائیں قبول کر
سرو و سمن کی تازہ دعائیں قبول کر

آ، زندگی سُرور بداماں تجھی سے ہے — جوشِ نشاط و عیشِ فراواں تجھی سے ہے
یہ دورِ نغمہ، عہدِ بہاراں تجھی سے ہے — روشن چراغِ بزمِ گلستاں تجھی سے ہے

جی چاہتا ہے چاند ستارے بکھیر دوں
قدموں پہ تیرے نور کے دھارے بکھیر دوں

تو آرہا ہے کیسے حسیں لالہ زار سے — عرشِ نشاط و کعبۂ ابرِ بہار سے
بزمِ شباب و شعر سے، شہرِ نگار سے — رنگوں کی سرزمیں سے گلوں کے دیار سے

پرتو سے تیرے خاک بھی گلزار ہو گئی
اپنی زمین مطلعِ انوار ہو گئی

آ، اور دیکھ روح ہے سرشار یا نہیں — تازہ ہے ذوقِ شوخیٔ گفتار یا نہیں
اس انجمن میں ساز ہے بیدار یا نہیں — زندہ ہوئی ہے فطرتِ احرار یا نہیں

یوسفؑ کو حسنِ دیدۂ یعقوبؑ مل گیا
اہلِ وطن کے صبر کو ایوبؑ مل گیا

آ، پھر دکھائیں جہد و عمل کا ہی کیا مقام — کرتے ہیں کیسے جشنِ بہاراں کا اہتمام
کس طرح عام ہوتے ہیں انوارِ دورِ جام — کن ظلمتوں کو چیر کے نکلا مہِ تمام

تو نے بدل کے رکھ دیا رخ ماہ و سال کا
اونچا فضا میں ہو گیا پرچم ہلال کا

حیاتِ تازہ

جمیل نقوی

شفق شفق فضا میں رنگ بھر رہی ہے زندگی
فلک فلک ستارہ وار اُبھر رہی ہے زندگی
چمن چمن جمیل رقص کر رہی ہے زندگی
سنور رہی ہے زندگی

بہار مسکرا اُٹھی گلوں میں رنگ بھر گیا
رخِ حیات تازہ دم دمک اٹھا نکھر گیا
وطن کے اک سپوت کا خلوص کام کر گیا
یہ شور تا قمر گیا

سحر طلوع ہو گئی غموں کی رات کٹ گئی
وہ تیرگی جو ڈس رہی تھی جسم و جاں کو چھٹ گئی
بساطِ جورِ ناروا کی آخرش لپٹ گئی
ردائے ظلم پھٹ گئی

جلو میں اپنے عظمتوں کا کارواں لئے ہوئے
یقین و سوز و ساز و عزمِ نوجواں لئے ہوئے
بڑھے چلو دلوں میں جوش بے کراں لئے ہوئے
قرارِ جاں لئے ہوئے

بڑھے چلو کہ وقت کو تمہارا انتظار ہے
بڑھے چلو کہ کاہلی، عمل کو ناگوار ہے
بڑھے چلو کہ آج اپنا بخت سازگار ہے
حیات کامگار ہے

روشنیوں کے شہر

رضا ہمدانی

اجلا ہے نشان راہگذر
منزل ہے عیاں آساں ہے سفر
روشن ہیں چراغ فکر و نظر
آتے ہیں نظر آثار سحر
ظلمات کا جادو ٹوٹ گیا

کس کنج سے یہ سورج ابھرا
ظلمت کا نگر پامال ہوا
جو دیس غموں کا مسکن تھا
اس دیس میں غم کا کال ہوا

اب روشنیوں کے شہر ہیں وہ
کل تک جو کرن کو ترسے ہیں
جو گھر تھے اندھیروں کے مسکن
آج ان پہ اجالے برسے ہیں

مکاری کے بت چور ہوئے
اب اہل ہوس کا راج نہیں
اب کوئی یہاں سردار نہیں
اب کوئی یہاں محتاج نہیں

ہر کھیت میں دولت اگتی ہے
ہر کھیت میں اب ہریالی ہے
مزدوروں اور دہقانوں کی
تقدیر بدلنے والی ہے
آتے ہیں نظر آثار سحر
وہ رات کا جادو ٹوٹ گیا

ہوائے آزادی

بشیر فاروقی

ہوا یہ کاوشِ اہلِ نظر سے اندازہ
کریں گے اہلِ جنوں عظمتِ سلف تازہ

چلی تھی آج کے دن ہی ہوائے آزادی
کھلا تھا آج کے دن ہی قفس کا دروازہ

مرے جنوں نے طلسمِ خرد کو توڑ دیا
مرے جنوں کا ہے سارے جہاں میں آوازہ

سنور رہے ہیں عروسِ بہار کے گیسو
بکھر رہا ہے فریبِ خزاں کا شیرازہ

کہیں لہو ہے مرا سرخیٔ فسانۂ عشق
کہیں ہے شوخیٔ رخسارِ حسن کا غازہ

شگفتِ غنچہ و گل کی تو ہے خبر معلوم
نسیم صبح چمن لا کوئی خبر تازہ

یہ سوز و درد ہے کس جرم کی سزا یا رب
یہ کاہشِ غمِ دل کس خطا کا خمیازہ

اس انقلابِ حقیقت نوا نے فاروق
دلِ فسردہ کو بخشے ہیں ولولے تازہ

"زندگی دوام ما"

(ایک انقلاب، ایک تاریخ)

تسلیم عارفی

ایک نوعمر ادیب اور ساتھ ہی ناظر بھی — جو شاید ہی کسی شمار قطار میں ہو لیکن اپنے طور پر — آنکھ ہے میری تماشائی نیرنگِ جہاں — اور اس دنیا کے رنگ، اس کے نقشے، اس کے طور طریقے نظروں سے گزر کر دل میں اترتے جاتے ہیں اور اپنے نقوش مرتسم کرتے جاتے ہیں. گویا میری زندگی ایک مستقل "دیکھتا چلا گیا" کی تفسیر ہے. اس سلسلے میں غالب کا حوالہ کیا دوں جو شاعروں کا شاعر اور ادیبوں کا ادیب تھا — خاک کو آسماں سے کیا نسبت — لیکن دونوں کے سامنے شب و روز تماشا ضرور ہوتا رہا ہے. اس لئے اگر اس کی زبانی یہ کہہ دوں تو کچھ بے جا نہ ہوگا کہ ؎

محرمِ رازِ نہانِ روزگارم کردہ اند
تا بحر فم گوش ننہد خلق خوارم کردہ اند

نوعمر ہوں، سرد و گرم جہاں ناچشیدہ، اس لئے میری سوچ کا ڈھنگ نہ صرف غیر ادیبوں بلکہ پرانے ادیبوں سے بھی مختلف ہے. بہرحال صیغۂ واحد متکلم میں کچھ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ ادیبوں اور ان سے بڑھکر شاعروں کا پرانا مرض ہے.

میں نے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ہوش سنبھالا اور ہوش سنبھالتے ہی ایک تاریخی انقلاب سے واسطہ پڑا. یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں نے غیر ملکی حکمرانوں کی غلامی کے دَور کو محسوس نہیں کیا. میں نے ہوش سنبھالتے ہی اپنی تحریکِ آزادی کا مطالعہ کیا. سراج الدولہ سے شاہ ظفر تک اور شاہ ظفر سے قیامِ پاکستان تک کے حالات پڑھے. اِس کے علاوہ جنگ و جدل سے بھرپور فلمیں دیکھیں. تاریخی مطالعہ اور فلم بینی کے اثر نے میرے ذہن میں انقلاب کا ایک عجیب مفہوم پیدا کر دیا. میں سمجھتا تھا کہ انقلاب لانے کے لئے نقاب پوش گھوڑ سواروں کی موجودگی بیحد لازمی ہے.

مجھے یاد ہے جب قائدِ اعظم فوت ہوئے تھے تو ہر شخص کی زبان پر تھا" اب کیا ہوگا ؟ کون اب ہماری رہنمائی کرے گا. ؟ اِس ملک کا کیا بنے گا ؟" وہ پہلا دن تھا جب میں نے دوسروں سے ہٹ کر سوچا تھا. میں نے سوچا تھا کہ یہ قوم جو بنیادی طور پر نیک اور سادہ لوح ہے پیغمبرؐ کے بعد امام یا مخلص رہنما کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی. میری نظروں کے سامنے میرا ملک جو فاضل اناج پیدا کرتا تھا اپنے عوام کو فاقوں مرتا دیکھتا رہا. میری نظروں کے سامنے اشیاء کی قیمتوں میں ناقابلِ برداشت اضافہ ہوتا رہا. سمگلر اور ذخیرہ اندوز پھولتے پھلتے رہے. کسان اور مزدور تباہ حال ہوتے رہے. چور بازاری، رشوت ستانی، کنبہ پروری اور اقربا نوازی زور پکڑتی رہی. مذہب کے نام پر عوام کے جذبات سے کھیلا جاتا رہا. ہر قسم کے جوڑ توڑ ہوتے رہے. سیاسی جماعتیں اور وزارتیں بنتی بگڑتی رہیں. عوام سے وفا نہ ہونے والے وعدے کئے جاتے رہے. میں نے سوچا انقلاب آنا چاہیئے. کوئی بھی لائے مگر آنا چاہیئے. پھر سوچا کون لائے، کسان، مزدور، طالب علم مولوی یا کمیونسٹ. کسانوں اور مزدوروں کے پاس گھوڑے کہاں. گھوڑے تو زمینداروں کے پاس ہیں. طالبِ علم تو جلوس نکال کر نعرے ہی لگا سکتے ہیں. مولوی گھوڑے، تلواریں اور بندوقیں کہاں سے لائیں گے. کمیونسٹوں کو اگر غیر ملکی امداد مل جائے تو گھوڑے خرید کر کہاں باندھیں گے. کیونکہ یہ لوگ تو پاکستان کے شہروں میں آباد ہیں. اِتنے سارے گھوڑے کہاں باندھیں گے ؟ میں ہر قیمت پر انقلاب چاہتا تھا. میں پیاسا تھا، پانی پینا چاہتا تھا. اچھا برا جیسا بھی ہو تاکہ مرنے سے بچ سکوں. مگر مجھے اپنے ملک میں انقلاب ناممکن نظر آیا، اپنے ملک کے بارے میں میرے ذہن میں یہ کبھی نہیں آیا کہ فوج بھی انقلاب پیدا کرا سکتی ہے. میرا ذہن زیادہ سے زیادہ پولیس تک جاتا اور مایوس ہو جاتا. پھر بھی میں کبھی کبھی سوچتا کہ نقاب پوش گھوڑ سوار بازاروں اور گلی کوچوں میں ایک نہ ایک دن ضرور گولی اور تلوار چلاتے ہوئے پولیس اسٹیشنوں پر قبضہ کر لیں گے اور کسی ریڈیو اسٹیشن سے اعلان کر دیں گے کہ حکومت بدل گئی ہے. مگر میری فلم بینی

اور جاسوسی ناولوں کا مطالعہ اس وقت بالکل غلط ثابت ہوا جب پوری کی پوری قوم تباہی و بربادی کے گہرے گڑھے کے کنارے پہنچ گئی۔ چنانچہ میں نے موت کو قریب آتے دیکھ کر کلمۂ شہادت پڑھ لیا۔

۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کی رات اور ۸ اکتوبر کی صبح میں کبھی نہ بھولوں گا جو مجھے اطلاع دیئے بغیر آئی۔ اس صبح جب میں نے اخبار دیکھا تو حیران رہ گیا۔ . . . .

. . . "تمام ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ . . . پارلیمنٹ، قانون ساز اسمبلیاں، مرکزی اور صوبائی وزارتیں توڑ دی گئیں۔ . . . جنرل محمد ایوب خاں نے ناظم اعلیٰ مارشل لا کی حیثیت سے اختیارات سنبھال لئے۔" میں نے انتہائی مسرت کے عالم میں بازار کا رخ کیا۔ پھر گلی کوچے دیکھے مگر نقاب پوش گھوڑ سوار کہیں دکھائی نہ دیئے۔ کہیں کہیں اکّا دکّا فوجی دکھائی دیا جو لوگوں کو فٹ پاتھ پر چلنے کی ہدایت کر رہا تھا۔ یا پھر بس کے اڈے پر عوام کو قطار بندی کی تربیت دے رہا تھا۔ سخت مایوسی ہوئی۔ نہ گولی چلی نہ تلوار اور نہ گھوڑ سوار نقاب پوش آئے۔ یہ کیسا انقلاب ہے۔ شام جب ریڈیو سنا تو جنرل ایوب خاں تقریر کر رہے تھے: "پاکستان کے عزیز شہریو! السلام علیکم۔ میں آپ کے سامنے جن مسائل پر تقریر کر رہا ہوں وہ اہم بھی ہیں اور بڑے سنجیدہ بھی۔ اس لئے ضروری ہے کہ آپ میری باتوں کو بڑی سنجیدگی کے ساتھ سنیں۔ اور بڑی اچھی طرح سمجھ لیں تاکہ آپ تعمیری طریق پر عملدرآمد کر سکیں۔ کیونکہ ہم سب کی بلکہ ہماری آئندہ نسلوں کی نجات صحیح عمل میں ہے۔" تقریر جاری رہی اور میں نے سوچنا شروع کر دیا کہ یہ جنرل تو قائدِ اعظم کے لب و لہجہ میں بول رہا ہے۔ یہ اس قوم کے لئے سخت الفاظ استعمال کیوں نہیں کرتا جو اس قدر ظلم و تشدد سہنے کے باوجود بے حس رہی۔ میں نے پھر توجہ کی . . . "جیسا کہ آپ کو معلوم ہے یہ انتشار انگیز حالات اِن خود غرض لوگوں کے پیدا کئے ہوئے ہیں جنہوں نے سیاسی لیڈروں کے روپ میں ملک کو تباہ کیا یا ذاتی فائدوں کے لئے اس کا سودا کرنے کی کوشش کی۔" ایک شخص بولا "حقیقت ہے۔" سب لوگ اُس کی طرف متوجہ ہوئے اور اُس نے ہیرو کا پوز بنا کر سب پر ایک نگاہ ڈالی۔ براڈ کاسٹ جاری تھا "اس دوران کمزور اور کم حوصلہ حکومتیں انتہائی غفلت کوشی اور بزدلی کے ساتھ صرف تماشہ دیکھتی رہیں۔ اور حالات کو بگڑنے، ابتر ہونے اور ضبط و نظم کو یونہی تباہ ہونے دیا۔ . . ."

. . . میں نے سوچا یہ کیوں نہیں بتاتا کہ فوج کو انقلاب لانے کی کیوں سوجھی۔ کان دھرے تو آواز آ رہی تھی: "لیکن کچھ عرصہ سے مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہمارے عوام فوج پر بھی اپنا اعتماد کھونے لگے ہیں کہ اِس نے انہیں اس ظلم اور اس ذہنی و روحانی اذیت سے نہیں بچایا۔" . . . . . . ایک شخص نے جو بنیان اور دھوتی پہنے کھڑا تھا پنجابی زبان میں نعرہ لگایا "شاباش اوئے شیر دیا پُترا۔" مجھے اِس نعرے سے اتنی خوشی ہوئی کہ میں نے حلوائی کو جس کی دکان کے سامنے میں کھڑا خبریں سن رہا تھا آدھ سیر دودھ میں ایک پاؤ جلیبیاں ڈالنے کا آرڈر دیا۔ اور سوچا کہ اب انقلاب آگیا ہے صحت بنانی چاہئے۔ میں نے دودھ کے چند ہی گھونٹ پیئے تھے کہ توجہ پھر براڈ کاسٹ کی طرف مبذول ہو گئی۔ . . . . "انتشار پسندوں، اسمگلروں، چور بازاری کرنے والوں اور معاشرہ دشمن ذلیلوں سے بھی میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ سپاہی اور عوام تمہاری صورت سے بیزار ہیں۔ اس لئے اگر عافیت چاہتے ہو تو اپنی زندگی کو بدل دو۔ ورنہ سزا ملے گی اور یقینی ملے گی۔ ان کا اب کسی صورت میں بھی چھٹکارا پانا مشکل ہے۔ ہم اِن کو جلد از جلد پکڑنے کی کوشش کریں گے۔"

میری نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ داڑھی منڈھانے کی مجھے عادت ہے۔ گو یہ قدرے غیر شرعی ہے مگر خدا مجھے اِس کے لئے معاف کرے۔ ۶ اکتوبر کو بازار میں بلیڈ کہیں نہیں مل رہے تھے۔ آخر ایک دوکاندار نے تمہید کے بعد فروخت کرنے کی یوں حامی بھری کہ "بلیڈ آجکل بننا اور آنے بند ہو گئے ہیں۔ میں نے چند دانے بلیک میں خریدے تھے۔ چار دانے باقی رہ گئے ہیں۔ آٹھ آنے دے دیجئے۔" . . . . میں نے غنیمت جان کر خرید لئے۔ ۸ اکتوبر کو وہی دوکاندار آٹھ آنے کے دس بیچ رہا تھا۔ اور اُس کی دکان سے اتنے بلیڈ نکلے کہ سارے شہر کو سال بھر کے لئے کافی تھے۔

مارشل لا کے نفاذ کے بعد چند ہی روز میں ہر کمیاب شے بہتات کے ساتھ کھلے بازار میں آگئی تھی۔ دام اتنے گر گئے تھے کہ گیارہ برس کی گرانی کے شکار عوام کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنے پیسے کہاں سے لائیں کہ سب کچھ خرید لیں۔ لوگ عمر بھر کی ضروریاتِ زندگی بلکہ غیر ضروری اشیاء بھی جلد از جلد خرید لینا چاہتے تھے۔ اِس لئے کہ بدعنوان سیاسی رہنماؤں اور نااہل حکومتوں نے انہیں اتنے فریب دئے تھے کہ بے یقینی اُن کا جزوِ ایمان بن چکا تھا۔ جن لوگوں نے اناج کی خرید کے لئے پیسے بچا رکھے تھے وہ خوشبویات سنگھار کا سامان اور ولایتی چیزیں خرید کر لے گئے۔ اِس صورتِ حال کے پیشِ نظر انقلابی حکومت نے تمام بڑے شہروں میں اشیاء کی خرید کے لئے ایک حد مقرر کر دی۔ ایک تو اس لئے کہ امیر لوگ موقع سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے زیادہ سے زیادہ اشیاء خرید کر اپنے گھر نہ بھر لیں اور دوسرا اس لئے کہ غریب عوام غیر ضروری اشیاء زیادہ خرید کر ضروریاتِ زندگی کے لئے مصیبت میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ ۲ نومبر کو

۱۰ نو کراچی، اکتوبر ۱۹۵۸ء

صدرِ پاکستان جنرل محمد ایوب خاں نے اپنی ایک نشری تقریر میں تمام اشیاء کو تین حصوں میں تقسیم کر کے کارخانہ داروں اور خوردہ فروشوں کے نفع کی ایک معقول حد مقرر کر دی۔

مارشل لاء کے نفاذ سے ایک روز قبل امام بخش "خالص دودھ فروش" جب سائیکل کے آگے پیچھے ڈبے لٹکائے ہمارے مکان پر دودھ دینے آیا تھا تو اپنی پندرہ بھینسوں کی تعریف کرتے اُس کی زبان نہ تھکتی تھی۔ مگر ۸، اور ۹، اکتوبر کو وہ نہ آیا تو ہم سمجھے شاید بیمار ہو گیا ہے بیچارا۔ جب ۱۰، اکتوبر کو مارکیٹ میں میں نے اُسے پھل بیچتے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ میں نے پوچھا "بھئی۔ امام بخش۔ دودھ دینے کیوں نہیں آتے" کہنے لگا "جناب میری پندرہ کی پندرہ بھینسیں سوکھ گئی ہیں۔ کیا کروں۔ اللہ کی مرضی یہی ہوگی" میں نے حیرت سے پوچھا "کمال ہے۔ پندرہ کی پندرہ بھینسیں رات کی رات سوکھ گئیں" مسکرا کر کہنے لگا۔ "جی ہاں! جنرل ایوب کے خوف سے۔" پھر خود ہی کہنے لگا "جنرل صاحب نے کہہ دیا ہے کہ پرانی عادتیں چھوڑ دو۔ اس لئے اب آپ سے کیا چھپاؤں۔ میرے پاس ایک بھینس بھی نہیں تھی۔ میں چار سیر دودھ میں ایک من پانی ڈال کر اُس میں پاؤڈر گھول دیتا تھا۔ اور وہ آپ کو فروخت کرتا تھا۔

عملی طور پر ۷، اور ۲۷، اکتوبر میں کوئی فرق نہیں۔ مگر ۲۷، اکتوبر اس لئے زیادہ اہم ہے کہ فوجی انقلاب کے قائد جنرل محمد ایوب خاں نے اِس دن سے واضح طور پر صدرِ مملکت کا عہدہ سنبھال کر عوام کی خواہش کے عین مطابق پُرانی سیاست کی آخری کڑی کو جو ٹوٹنا چاہتی تھی توڑ دیا۔ صدرِ پاکستان نے فوج کو انتظامیہ میں زیادہ مدغم نہ ہونے دیا۔ اور سول اداروں سے زیادہ سے زیادہ کام لیا۔ تعجب ہے کہ مارشل لاء کے ایک ہی مہینہ میں عوام اور سول حکام پر فوج کو اتنا بھروسہ ہو گیا کہ ۱۰، نومبر کو مغربی پاکستان (ماسوا کراچی و ملیر) سے تمام فوجی دستے ہٹا لئے گئے۔ اور تمام فوجی عدالتوں کو ختم کر دیا گیا۔ یہی اقدام دوسرے روز کراچی اور پورے مشرقی پاکستان میں کیا گیا۔ یہ اقدام محض اِس لئے کیا گیا کہ ہماری فوج کو اطمینان ہو گیا تھا کہ مارشل لاء کا فوری مقصد حاصل ہو چکا ہے۔ انتظامیہ اب بیرونی اثرات سے آزاد ہو گئی ہے۔ اور سارے ملک کی فضا اب بالکل تبدیل ہو چکی ہے۔ گو فوجی دستے واپس بلا لئے گئے مگر مارشل لاء جاری رہا اور اب بھی افواج ملک کو اپنی حفاظت میں لینے کو تیار ہیں۔

ہم بچپن میں جب ساروں کو دریا کے کنارے ریت چھانتے دیکھتے تو اُن کے پاس جا بیٹھتے اور سنار ہمیں بُرا بھلا کہہ کر بھگا دیتے۔ اس لئے کہ کہیں کوئی سونے یا چاندی کا ذرہ ہمارے ہاتھ نہ لگ جائے۔ میرا خیال ہے کہ ہر سنار مسلسل تگ و دو کے بعد سال بھر میں کہیں ایک تولہ سونا اکٹھا کرتا ہوگا۔ مارشل لاء کے نفاذ کے بعد ایک دیہاتی سنار مجھ سے کہنے لگا "بابو جی۔ سنا ہے کراچی کے سمندر سے لوگ بہت سونا نکال رہے ہیں" میں نے جواب دیا "ہاں"

"کتنا سونا نکلا ہوگا؟"

"دو ٹن"

"دو من" حیرت سے اُس کی آنکھیں پھٹ گئیں اور منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"دو من نہیں۔ دو ٹن" میں نے اُسے پھر سمجھایا۔

"ٹن کیا ہوتا ہے؟" اُسے کچھ تشویش ہوئی۔

"۲۸ من کا ایک ٹن ہوتا ہے۔ اور دو ٹن میں ۵۶ من ہوتے ہیں۔"

سنار چونکہ جتنی آنکھیں پھاڑ چکا تھا اُس سے زیادہ نہ پھاڑ سکتا تھا اور جتنا منہ کھول چکا تھا اُس سے زیادہ نہ کھول سکتا تھا اس لئے اِس سے پہلے کہ چکرا کر گر پڑے میں نے اُسے سنبھال لیا۔ جب ہوش میں آیا تو کہنے لگا "میرا خیال ہے سمندر میں مچھلیوں نے اتنا سونا بنایا ہوگا" میں نے جواب دیا "نہیں۔ یہ انسانی شکل و صورت رکھنے والے ان مگرمچھوں نے اکٹھا کر رکھا تھا جنہیں عرف عام میں سمگلر کہا جاتا ہے۔ انہوں نے نہ صرف یہ سونا بلکہ اسکے علاوہ لاکھوں روپے کی مالیت کے ہندوستانی سکے اور لاکھوں روپے کی مالیت کی سمگل شدہ اشرفیاں اور سونے کے تھیلے بھی نکالے" سنار کچھ سوچ کر کہنے لگا "میں بھی جاؤں" میں نے کہا "کہاں؟" بولا "کراچی" میں نے اسے سمجھایا کہ یہ کام پاکستان کی بحری فوج انجام دے رہی ہے حکومت اُسے تکلیف نہیں دینا چاہتی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جنوری ۵۹ء کے دوسرے ہفتہ میں میرے گاؤں سے آیا ہوا ایک کسان میرے پاس ٹھہرا تھا اور مجھے بار بار مجبور

کرتا تھا کہ میں نئی حکومت کے کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالوں۔ میں نے اُسے سمجھایا۔ "میں ملک سے باہر کوئی جنگ میں حصہ لیکر نہیں لوٹا ہوں کہ تمہیں کارنامے سناؤں۔ تم بھی اسی ملک میں رہتے ہو۔ اور میں بھی۔ اگر تم محسوس کرتے ہو کہ تمہارے گاؤں کی زندگی میں کوئی بڑی تبدیلی واقع ہوئی ہے تو یہ کارنامہ ہے اور اگر نہیں ہوئی تو کوئی کارنامہ نہیں" کسان سمجھا میں اسے ٹال رہا ہوں ــــ کہنے لگا۔ "کچھ تو بتایئے"۔ میں نے کہا۔ "میری رائے میں اس حکومت نے سمگلنگ بند کرکے ملک پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ چور بازاری ختم ہو رہی ہے۔ سرکاری دفتروں میں کام کی رفتار تیز ہو گئی۔ عدالتیں پرانے بدعنوان سیاست دانوں کے اثر سے آزاد ہیں۔ ذخیرہ اندوزی ایک بڑا جرم قرار دیا گیا ہے۔ کسان بولا۔ "مگر اس حکومت کو ان کاموں سے کوئی فائدہ بھی ہوا ہے یا نہیں؟"

"فائدہ! صرف ذخیرہ اندوزی اور پوشیدہ دولت کے اظہار، زرعی لگان اور انکم ٹیکس کے بقایاجات وغیرہ سے جو کئی برسوں سے واجب الادا تھے، حکومت کو ایک ارب چونتیس کروڑ روپے کا فائدہ ہوا ہے"...... کسان میری طرف حیرت سے دیکھ کر کہنے لگا۔

"ایک عرب سے چونتیس کروڑ روپے کا فائدہ! بڑا ہی امیر عرب ہوگا"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "عرب نہیں ارب۔ میری مراد ملکِ عرب کے باشندہ سے نہیں"

کسان نے حیرت سے پوچھا۔ "تو پھر آپ کی مراد کیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "دیکھو۔ سو ہزار کا ایک لاکھ ہوتا ہے۔ سو لاکھ کا ایک کروڑ اور سو کروڑ کا ایک ارب"۔ کسان نے سمجھتے ہوئے کہا۔ "اچھا! تو گویا چالیس کروڑ یہ اور سو کروڑ وہ"۔ میں نے کہا۔ "صرف یہی نہیں اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے جو مجھے اس وقت یاد نہیں۔ ملک کے دونوں حصوں میں بچت کی کئی اسکیموں پر عمل ہو رہا ہے اور بہت کامیاب ثابت ہو رہی ہیں۔ بچت بھی تو فائدہ ہے"۔

یہی کسان جب مجھے چند روز بعد ملا تو بیحد خوش تھا۔ میں نے اسکا سبب دریافت کیا تو کہنے لگا۔ "جنرل صاحب نے موروثیوں کو زمینوں کا پکا مالک بنا دیا ہے"۔ اس کی مراد زرعی اصلاحات سے تھی۔ میں نے پوچھا۔ "بس۔ تمہیں اس معاملے میں صرف اتنا ہی علم ہے یا کچھ اور بھی؟" کہنے لگا۔ "ہم ان پڑھ لوگ کیا جانیں۔ صرف سنی سنائی بات کر رہا ہوں"۔ میں اس وقت اسے سمجھانے کے موڈ میں نہیں تھا مگر چونکہ اس نے اپنے ان پڑھ ہونے کا اعلان کر دیا تو مجھے ثابت کرنا پڑا کہ میں پڑھا لکھا ہوں۔ حالانکہ پڑھے لکھے لوگ مجھے بھی ان پڑھ ہی سمجھتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ اسے صرف اتنی بات بتانی چاہیئے کہ زیبِ داستاں کے لئے کوئی اضافہ نہ کرسکے ورنہ یہ بھی جھوٹی افواہ پھیلانے کے جرم میں پکڑا جا سکتا ہے اور میں بھی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ زرعی اصلاحات کے تحت کوئی شخص مالک یا قبضہ دار کی حیثیت سے پانچ سو ایکڑ نہری یا ایک ہزار ایکڑ بارانی زمین سے زیادہ نہیں رکھ سکے گا۔ مالکوں اور قبضہ داروں کو اس بات کی اجازت بھی ہوگی کہ ایک سو پچاس ایکڑ باغاتی رقبہ رکھ سکیں اور اپنے وارثوں کے نام کچھ رقبہ ہبہ بھی کرسکیں۔ اس حد بندی کے بعد جو زمین رہ جائے گی وہ حکومت اپنے قبضہ میں لیکر مزارعین میں تقسیم کر دے گی تاکہ وہ اسے خرید لیں، اور پچیس سال میں قسطوں کے ذریعہ قیمت ادا کر دیں۔ حکومت اس بات کا بھی خیال رکھے گی کہ ٹکڑوں میں بٹی ہوئی زمین کو اکٹھا کر دے تاکہ پیداوار میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہو۔ اس کے علاوہ جاگیرداری کا بھی بلا معاوضہ خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ کسان ضبط کئے خاموشی سے سنتا رہا مگر آخر پھٹ پڑا۔

"نہیں جی! ایسا بھی کبھی ہو سکتا ہے، آپ مجھے خوش کرنے کے لئے کہہ رہے ہیں"

میں نے کہا۔ "جی ہاں، آپ کی خوشنودی جیسے مجھے گورنر بنا دے گی"

کہنے لگا۔ "تو گویا یہ سب کچھ سچ ہے مگر بڑے بڑے زمیندار ایسا ہونے دیں گے۔ وہ تو بڑے سیاستداں ہیں۔ ان کا حکومت میں بڑا اثر رسوخ ہے"

میں نے کہا۔ "بھائی میرے کس زمانے کی بات کر رہے ہو۔ وہ دن گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ زرعی اصلاحات کے قانون سے کوئی چھ ہزار بڑے زمینداروں پر اثر پڑے گا۔ مگر ان کے لئے باعزت طور پر زندگی بسر کرنے کے لئے کافی کچھ رہ گیا ہے۔ اس قانون نے ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی بلکہ کسانوں کے ساتھ انصاف کیا ہے جن کی آبادی اس ملک میں تقریباً نوے فیصدی ہے۔ چھ ہزار

لوگوں کے فائدے کے لئے ایک بیوقوف یا خود غرض حکومت ہی چھ کروڑ لوگوں کو بھوکا ننگا اور جاہل رکھ سکتی ہے۔"

میں نے ابھی اپنی بات ختم نہیں کی تھی کہ اوپر سے میرا ایک نہایت بے تکلف "انقلابی دوست" آدھمکا۔ اس دوست کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ وہ ہر جگہ میری کم علمی کا بھانڈا پھوڑے۔ چنانچہ آتے ہی کہنے لگا: "کیوں بیچارے پر رعب ڈال رہے ہو، ہاں اگر تقریر کی مشق کر رہے ہو تو ٹھیک ہے۔" کسان مسکرا دیا اور مجھ سے اجازت لیکر رخصت ہوا۔ میرا موڈ کچھ خراب ہو گیا۔ مگر میرے دوست نے اسے قطعی اہمیت نہ دی۔ "میں بڑی دیر سے کھڑا تمہاری باتیں سنتا رہا۔ نہ جانے تم مارشل لا سے اس قدر خائف کیوں ہو؟"

میں نے قدرے سختی برتی: "خائف تو میں جب ہوتا کہ سارے ملک میں گولی چل رہی ہوتی۔ بازار ٹینکوں سے لرز رہے ہوتے اور فوج عام لوگوں کو کتوں کی طرح مار رہی ہوتی۔ میں اپنے گھر میں بیٹھا کس سے خائف ہو سکتا ہوں۔ اور پھر تم تو مجھے جانتے ہی ہو۔ جو بات سمجھ میں آتی ہے۔ وہی کرتا ہوں۔ تمہاری یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آتی کہ جو انقلاب عوام چاہتے ہیں، وہ آجائے جب بھی اُس کی مخالفت ہی کرنی چاہیئے۔"

میرے دوست نے مجھے ٹھوڑی سے پکڑ کر اپنی طرف متوجہ کیا۔ "کیا کوئی لائسنس ملنے والا ہے یا سرکاری ملازمت؟"

غصہ تو مجھے بہت آیا مگر میں نے تحمل سے کام لیا۔ "آپ کی اطلاع کے لئے عرض کروں کہ موجودہ حکومت جب تک سرکاری ملازمین کی اسکریننگ کا کام مکمل نہیں کر لیتی کسی کے ملازم رکھے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور پھر میں تو بقول آپ کے ان پڑھ ہوں۔ رہا لائسنس کا معاملہ تو جملہ درآمد اور برآمد کے صحیح مفہوم کا مجھے آج تک پتہ نہیں چل سکا۔ اسلئے پہلے آپ کو میرے سامنے اس کی تشریح کرنا ہوگی ویسے غلطی سے کہیں پڑھا تھا کہ درآمد برآمد کا نئے لائسنسوں کے اجراء کے ساتھ کوئی تعلق ضرور ہے اور کچھ لائسنسوں کو منسوخ کر دیا جائیگا۔ واللہ علم بالصواب۔"

میرا دوست مسکرا دیا۔ "بھئی ایک بات کی خوشی مجھے ضرور ہے۔ وہ یہ کہ تم طنزیہ گفتگو کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ رہی موقع محل پر اس کے صحیح استعمال کی بات۔ تو یہ بڑی دیر میں سیکھو گے خیر جانے دو۔ سنو۔ تمہارے پاس لینن پر ایک کتاب ہے جو تم نے ۴۸ء میں لاہور سے خریدی تھی۔ اس کی مجھے ضرورت ہے۔" میں نے الماری سے کتاب نکالکر اس کے حوالے کی اور کہا۔ "تم اسے اپنے پاس ہی رکھ سکتے ہو۔"

اس نے پھر فقرہ چست کیا۔ "کیوں، گھبرا گئے؟"

میں نے جیب سے قلم نکالتے ہوئے کہا۔ "لاؤ۔ میں اس پر اپنا نام پتہ لکھ کر اپنی ملکیت کا اعلان کر دوں۔ تاکہ تمہیں یہ معلوم ہو سکے کہ جب تم جیسے دوستوں سے مجھے بحث کرنا پڑتی ہے تو یہ ثابت کرنا پڑتا ہے کہ تم اشتراکیت کے مطالعہ سے بھی اتنے ہی بے بہرہ ہو جتنا کہ مذہب کے مطالعہ سے۔"

کچھ روز بعد میرا دوست لاہور چلا گیا۔ مگر کافی عرصہ تک اس کا کوئی خط نہ آیا۔ آخر اگست ۵۹ء کے آخری ہفتہ میں اس کا خط ملا۔ جس میں علاوہ دیگر باتوں کے یہ بھی درج تھا۔ "کہو، تمہارا انقلاب کن مراحل میں ہے؟" میں نے اُسے جواب دیا۔

"کامریڈ!

آخر خدا خدا کرکے ـــــ معاف کرنا ـــــ لینن لینن کرکے، تمہارا خط ملا۔ آجکل کون مصروف نہیں ہے۔ ایک سطر اپنی خیریت کی اطلاع کے طور پر تو جلد لکھ بھیجی ہوتی، میں ناحق پریشان رہا۔

تم نے لکھا ہے "کہو تمہارا انقلاب کن مراحل میں ہے۔" معلوم ہوتا ہے تم نے شہر سے باہر ایک ایسی جگہ کسی نہر کی کھدائی کا ٹھیکہ لے رکھا ہے جہاں اخبارات نہیں پہنچ پاتے۔ ورنہ تم یہ سوال ہرگز نہ کرتے۔ میرا مقصد ہے۔ اچھا کہتے، برا کہتے۔ مگر یوں کورا سوال نہ کرتے۔ بہرحال تمہیں یہ سن کر دکھ ہوگا کہ انقلاب کافی مراحل طے کر چکا ہے۔ کچھ مراحل تو یہاں تمہاری موجودگی ہی میں طے کر چکا تھا جنہیں تم مانتے تو تھے مگر بین الاقوامی اہمیت نہ دیتے ہوئے معمولی سمجھتے تھے۔ مثلاً چور بازاری، سمگلنگ، ذخیرہ اندوزی کا قلع قمع کرنا، ہر قسم کے واجبات کی ادائیگی، زرعی اصلاحات وغیرہ۔ زرعی اصلاحات تمہیں یوں تو قدرے پسند آئیں کہ بڑے بڑے زمینداروں سے مقررشدہ حد سے زائد زرعی زمینیں لے لی جائیں گی مگر یوں پسند نہ آئیں کہ یہ زمینیں روسی کسانوں میں کیوں نہ تقسیم کرنے کی سفارش کی گئی۔ گو تم نے یہ الفاظ استعمال

انقلاب اکتوبر

(چند علمی ،ادبی و ثقافتی سرگرمیاں)

ادب :

ملک کے ادیبوں کا پہلا کنونشن
جنرل محمد ایوب خاں کا کنونشن کے
آخری اجلاس سے خطاب

فن : ثقافتی کی دوسری قومی نمائش (کراچی)
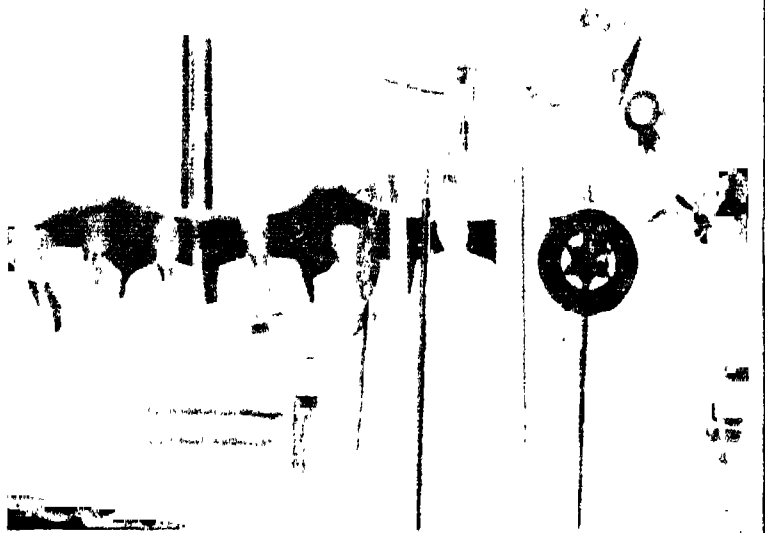
سائنس : کراچی میں سائنس کانفرنس کا افتتاح

تعلیم :

ملک کے تعلیمی نظام کی
تجدید و اصلاح کے لئے
کمیشن کا تقرر: پہلے
اجلاس کا افتتاح :
جنرل محمد ایوب خاں

انقلاب اکتوبر

(معاشرتی و ملی تعمیر کے چند اہم قدم)

جنرل محمد ایوب خان کا
عوام یا کسان سے خطاب

صنعتی ترقیاتی کانفرنس (کراچی) زیر صدارت جنرل محمد ایوب خان

صدر، جنرل محمد ایوب خان، کی زیر قیادت نتھیا گلی میں
گورنروں کی اہم کانفرنس

ملتان کے پاس تونسہ بیراج کی تعمیر سے
بہتر آبپاشی کا انتظام
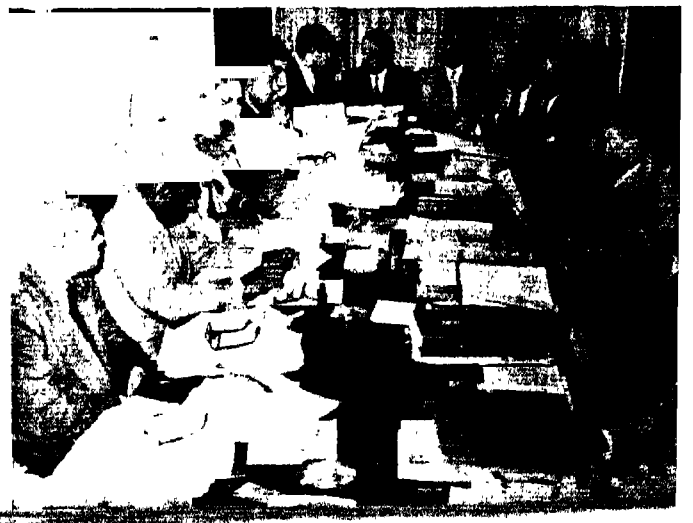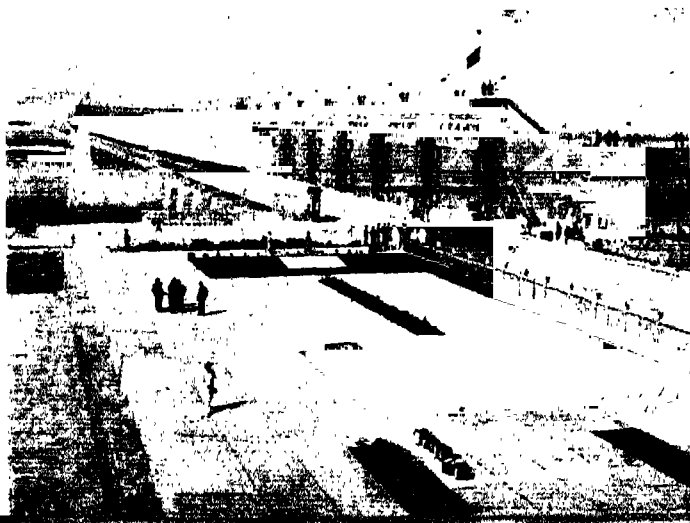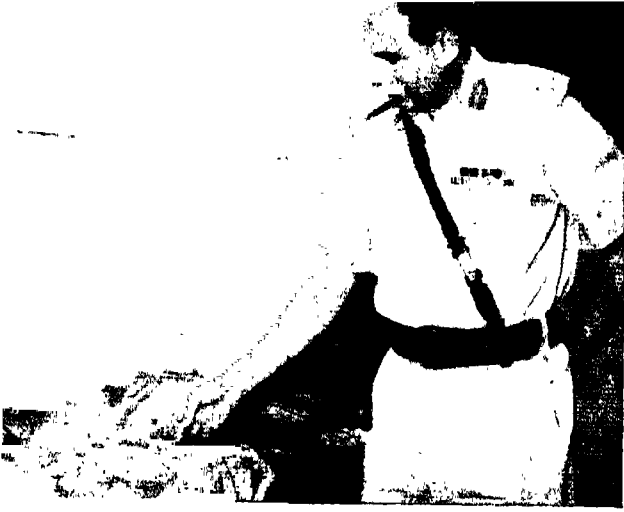
مہاجرین کی آباد کاری: لفٹیننٹ جنرل محمد اعظم خان
کا طلبہ کراچی یونیورسٹی سے خطاب

اسمگلنگ کی روک تھام

ناجائز درآمد شدہ سونا پکڑا گیا
(مارشل لا کا پہلا ہی ہفتہ)

صفائی کی مہم

شہری سہولت: قطار بندی کی عادت

ملک کے زرعی نظام میں انقلاب
(زرعی اصلاحات کا نفاذ)

ڈھاکہ

(۱۹ویں صدی میں)

ڈھاکہ میں
عید کا میلہ

مسلم خواتین کا قدیم لباس

عید کا جلوس

محرم

مسلم شرفا
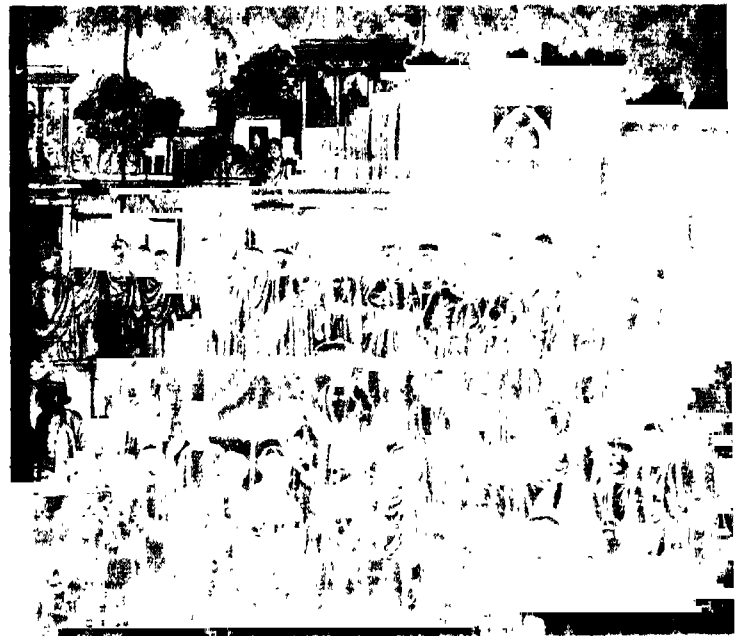
نہ کرتے تھے مگر تمہارے لب و لہجہ سے اخذ ہوتا تھا۔ کامریڈ! اگر تم نہ پوچھتے تو میں یہ تکلیف دہ خبریں تمہارے مطالعہ کے لئے ہرگز سپردِ قلم نہ کرتا۔ گذشتہ چند ماہ میں سکریننگ کے طور پر سرکاری دفاتر سے سینکڑوں بدعنوان، راشی اور نااہل ملازمین کو ملازمت سے الگ کر دیا گیا ہے۔ ان میں چند اسی اعلیٰ حکام بھی شامل ہیں۔ کچھ لوگ وہاں بھی ہوں گے۔ ان سے کبھی کبھی ملتے رہا کرو اور غم غلط کرنے کے مواقع ہاتھ سے نہ جانے دو۔ دوسری جانگسل خبر یہ ہے کہ کورنگی میں حکومت نے پانچ ماہ کے قلیل عرصہ میں پندرہ ہزار کوارٹر تعمیر کر کے مہاجرین کو ان میں بسا دیا ہے۔ جب کورنگی کالونی کا سنگِ بنیاد رکھا گیا تھا تو تم نے کہا تھا کہ جنرل اعظم خاں تکمیلِ تعمیر کا وقت مقرر کر کے پاگل پن کا ثبوت دے رہا ہے۔ واقعی تم نے ٹھیک کہا تھا۔ کیونکہ یہ فوجی افسر "پاگل" نہ ہوتا تو پانچ ماہ کے اندر پندرہ ہزار کوارٹر تعمیر کرا کے ریکارڈ قائم نہ کر دیتا!

طبی اصلاحات سے چونکہ تمہیں دلچسپی نہیں ہے اس لئے ان کا ذکر نہیں کرتا۔

تعلیمی، قانونی، اور سائنسی کمیشن عنقریب اپنی سفارشات پیش کرنے والے ہیں، جنہیں امید ہے تمہارے خط کا جواب موصول ہونے سے پہلے قانونی شکل دے دی جائیگی ...... ملک کا دارالحکومت کراچی سے راولپنڈی منتقل ہو رہا ہے مگر چونکہ تمہیں صحت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اسلئے آب و ہوا کا ذکر کرنا بے سود ہے۔

جنرل محمد ایوب خاں نے ایک نہایت ہی مایوس کن اعلان کیا ہے کہ مارچ ۶۰ء تک نئے آئین کے تحت ہونے والے انتخابات کیلئے رائے دہندگان کی فہرستیں ہر حالت میں تیار کر لی جائیں گی۔ بنیادی جمہوریتوں کا قانون عنقریب پاس ہونے والا ہے۔ جس کے تحت دیہات میں پنچایتی نظام رائج کیا جائیگا مگر پرانے بدعنوان سیاستدانوں کو جن پر جرم ثابت ہو جائیگا، ان انتخابات میں حصہ نہیں لینے نہیں دیا جائے گا۔ تم کہو گے، کیوں؟ اگر بدعنوان سیاست دانوں کو پنچایتوں یا اس سے اوپر کے انتخابات میں حصہ نہیں لینے دیا جائیگا۔ تو ہم کن کو گالیاں دیکر "انقلابی" کہلائیں گے۔

کامریڈ! میں زیادہ لکھکر تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ اور آج ہی مارشل لا والوں کو درخواست بھیجتا ہوں کہ وہ اپنی تجویزوں کو عملی صورت نہ دیں کیونکہ اس سے میرے ایک عزیز دوست کی حرکتِ قلب بند ہو جانے کا اندیشہ ہے!

جب حالات نے مجھے اپنی رائے تبدیل کرنے پر مجبور کیا تو سب سے پہلے تمہیں اطلاع دونگا۔ فقط

تمہارا، تسلیم

+ + +

غزل

مضطر اکبر آبادی

ٹھہر ٹھہر کے سفرِ زندگی کا طے نہ کرو — قیام بھی تو ذوقِ سفر ہے ہم سفرو

قدم بڑھاؤ ستاروں کی انجمن کی طرف — حسین راہ نورد و جمیل راہبرو

مناؤ بادہ کشو جشنِ اوّلینِ بہار — بڑھاؤ ہاتھ صراحی اٹھاؤ جام بھرو

مغنّیو! کوئی سحر آفریں غزل چھیڑو — جگاؤ ذہن کوئی جادو جگاؤ نغمہ گرو

سکھاؤ دیدہ کے آداب دیدۂ دل کو — اٹھاؤ دیدہ و دل سے حجاب دیدہ ورو

ابھی ہزار مراحل ہیں رنگ و بو کے سوا
ابھی کچھ اور مذاقِ نظر بلند کرو

مذاکرہ*

مرتبہ: شہرت بخاری

نئے ادبی دور کا آغاز؟

موضوعِ بحث:

"کیا قیامِ پاکستان کے بعد
ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے یا نہیں؟"

ریاض احمد:

جب ہم یہ سوچنے بیٹھتے ہیں کہ کسی نئے ادبی دور کا آغاز ہوا کہ نہیں، تو دو باتیں فوراً ہمارے ذہن میں آتی ہیں: ایک یہ کہ تخلیقات میں کسی نئی افتادِ طبع کا اظہار ہوتا ہو، دوسرے یہ کہ ہیئت کے لحاظ سے ایسے تجربے سامنے آئیں جو پہلے موجود نہ تھے یا پہلے تجربوں کے مقابلے میں کچھ الگ سے ہوں۔ ایک اور بات بھی سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ تاریخی لحاظ سے بھی کسی ادبی دور کا تعین کیا جاتا ہے۔ کسی ملک میں معاشرتی، سیاسی اور مجلسی لحاظ سے جو تبدیلی واقع ہوتی ہے، اس سے کسی نئے ادبی دور کا آغاز عمل میں آتا ہے۔ سال ۱۹۴۷ء ہماری تاریخ کا بڑا اہم سال ہے۔ اس سے ایک نئے ملک، ایک نئی قومیت کا تعین ہوتا ہے۔ قدرتی طور پر پڑھنے والا لکھنے والوں سے یہ توقع رکھتا ہے کہ جو کچھ وہ اس سال سے قبل کہہ رہے تھے، وہ بعد کی تخلیقات سے واضح طور پر مختلف ہونا چاہئے تاکہ ہم یہ اندازہ لگا سکیں کہ ہم نے تاریخی طور سے ایک نئی زندگی حاصل کی ہے۔ ذرا ماضی میں حالی اور آزاد کے زمانے میں جا کر دیکھئے۔ فن کی ہیئت اور مواد کا جہاں تک تعلق ہے، اسی زمانے سے جدید نظم کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ زبان اور خالص جمالیاتی اقدار سے ہٹ کر ملکی اور ملی مسائل کی طرف توجہ مبذول ہوئی۔ "مسدس" کی طرف اس معاملے میں خاص طور پر اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ پھر اکبر الہ آبادی کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد ترقی پسند تحریک سیاسی اور سماجی اقدار پر زیادہ زور دیتی ہے۔ جو دور حالی سے شروع ہوا تھا وہ اقبال پر ختم ہوا۔ اقبال نے جو کام کیا وہ ہمارے سامنے ہے۔ اس پر زیادہ بحث کی گنجائش نہیں۔ اُس کی زندگی ہی میں ادب کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ یہ سلسلہ حصولِ آزادی تک ہماری رہا۔ شعر اور افسانہ دونوں میں تبدیلی ہو چکی تھی۔ انشائے لطیف ایک نیا تجربہ تھا۔ مگر ۱۹۴۷ء کے بعد کوئی ایسی چیز نہیں ملتی کہ ان معین اصناف سے علیحدہ ہو۔ جہاں تک تمام ادب کی افتادِ مزاج کا تعلق ہے، اس میں صرف اتنا احساس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی کسی نئی چیز میں دلچسپی لے رہا ہو یا نئے علوم کو آشنا کرانے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ اس پورے ادب کا پس منظر وہی تحرکات ہیں جو تقسیمِ ملک سے پہلے تھے یعنی ترقی پسند اثرات اور نفسیات۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور چیز بھی ہے جسے احساسِ بغاوت کہنا چاہیئے۔ اس بغاوت کو ہم اچھے معنی میں لیتے ہیں۔ اس لئے کہ طلوعِ آزادی سے پہلے جو بغاوت کا احساس تھا، اس کا رجحان یا میلان منفی تھا، وہ ایک ایسی حکومت یا قوت کے خلاف بغاوت تھی جو باہر سے ہم پر ٹھونسی گئی تھی لیکن لکھنے والوں میں آج جو احساسِ بغاوت پایا جاتا ہے وہ مثبت ہے۔ وہ ایسا تنقیدی انداز ہے جس پر ہمیں شرم نہیں آتی یا جو تخریبی نہیں بلکہ تعمیری ہے، اور جسے ہم اپنا کہہ سکتے ہیں۔ جہاں تک مختلف اصنافِ سخن کا تعلق ہے، ان سب میں یہی اقدار کارفرما ہیں۔ اگر ہم غزل سے قطع نظر کر لیں، جسے بعض لوگ جاگیرداری عہد کی یادگار کہتے ہیں، تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہماری تمام اصنافِ سخن من و عن وہی ہیں جو ۱۹۴۷ء سے پہلے تھیں، اس لئے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد بغاوت کے احساس کی گنجائش نہیں رہتی اور اس نئے موڑ پر ہم اپنے نقطۂ نظر کو اس جوش و خروش کے ساتھ پیش نہیں کر سکتے جس طرح پہلے کر سکتے تھے۔ وہ دور ایسا تھا کہ مروجہ اقدار کے خلاف آواز اٹھانا فخر کا باعث ہوتا تھا، مگر لکھنے والوں کی مشکلات کا احساس بھی سامنے رکھنا چاہیئے کہ ان کے سامنے ایسی اقدار نہیں ہیں جن سے وہ متاثر ہوں اور نہ ہم میں اتنی جرأت ہے کہ نئی اقدار وضع کر سکیں۔ اردو ادب کا پس منظر یوپی کی زندگی تھی جس ادب کو ہم نے اب اپنایا ہے اس کا پس منظر

---

* حلقۂ اربابِ ذوق، لاہور

ثقافتی لحاظ سے لاہور کے سوا کچھ نہیں۔ اب سندھ یا سرحدی علاقوں کا پس منظر ہمیں تحریک دے تو دے۔ شہری زندگی ہمارے لئے تحریک کا باعث نہیں ہو سکتی، اسی لئے ہم اس دور میں جو کچھ کر سکے ہیں، وہ یہی ہے کہ جو تحریک حالی سے شروع ہوئی اور مختلف مرحلوں سے گزرتی ہوئی ۱۹۴۷ء تک پہنچی، اسے کسی نہ کسی طرح آگے بڑھاتے رہیں۔ صرف احساسِ بغاوت ہے جس میں نیم فرسودہ دلی پائی جاتی ہے، یہ چیز بھی غزل کے سوا کسی اور صنفِ سخن میں نہیں ہے۔ کوئی تحریک منفی یا مثبت نہیں ملتی جو کسی نئے افق کا سراغ دے۔ جب کوئی ادبی روایت کسی خاص مرحلے پر پہنچ جاتی ہے تو پھر وہ خارجی تحریک ادیبوں کو تحریک دیتی ہے یا پھر کوئی خاص شخصیت ایسی ہوتی ہے جو اس پورے دور کو اپنے ساتھ لیکر آگے بڑھتی ہے۔ اس دور میں ان میں سے کوئی چیز موجود نہیں ہے جو ہمیں گزشتہ اقدار کے مقابلے میں آگے بڑھا سکے۔

قیوم نظر:

ریاض صاحب نے بڑی خوبی سے جائزہ لیا ہے، لیکن میرے خیال میں یہ بات مسلّم ہے کہ کسی ادبی دور کا آغاز کسی خاص تاریخ سے نہیں ہوتا، ہم بعض ادوار کو متعین کرنے کے لئے کسی خاص واقعہ کے ساتھ اس کا تعلق پیدا کر دیتے ہیں مثلاً جدید دور کا تعلق ہم اقبال سے یوں بتلاتے ہیں کہ یہ اس کی وفات سے شروع ہوا۔ حالانکہ صورتِ حال یہ نہیں ہے۔ اقبال کی زندگی ہی میں زمین ہموار ہونا شروع ہو گئی تھی۔ اسی طرح ۱۹۴۷ء کا سال بھی متعین کر لیا گیا ہے، اور جیسا کہ خود ریاض صاحب نے کہا کہ ہماری ثقافت کا تعلق دلی اور لکھنؤ سے تھا، جو اب منقطع ہو گیا ہے اور لاہور ہمارا ادبی اور ثقافتی مرکز مقرر ہو رہا ہے، لہٰذا یہ قبل از وقت بات ہے کہ ہم ۱۹۴۷ء کے بعد اب تک کے ادب پر کوئی خاص محاکمہ کریں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس دور میں وہ احساسات موجود ہیں جن کا تقاضا ہے یا وہی ہیں جو ۱۹۴۷ء سے پہلے پشاور سے راس کماری تک پھیلے ہوئے تھے؟

ریاض احمد:

میں نے اس امر سے انکار نہیں کیا کہ ۱۹۴۷ء سے کوئی ادبی تحریک شروع نہیں ہوئی تھی۔ میں نے زور اس بات پر دیا ہے کہ ۴۷ء کے واقعہ کے بعد وہ تمام تحریکیں ختم ہو گئی ہیں جنھوں نے ہم میں ایک جوش اور ولولہ پیدا کیا ہوا تھا، ان میں پاکستان کی تحریک بھی تھی۔ بغاوت کا شدید احساس تھا۔ ۴۷ء کے بعد ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور کے کچھ اپنے تقاضے ہیں جنھیں ہم پورا نہیں کر رہے۔ بغاوت کا جو رجحان ہم میں پایا جاتا ہے، وہ حسب عادت ہے۔ ہم نے زیادہ سے زیادہ جو کہا، وہ یہ کہ ؎

یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر

سوال یہ ہے کہ کیا ہم ایسی باتیں فخر کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں؟

محمد صفدر میر:

ادب میں کسی نئے دور کو شروع کرنے سے پہلے ہم یہ اندازہ کرتے ہیں کہ فلاں دور ختم ہو گیا۔ اگر ایسا ہے تو وہ تقاضے کیا تھے جو اب نہیں ہیں، دوسرا سوال یہ ہے کہ اس تمام دور کی تاریخ میں، جو زیرِ بحث ہے، کوئی ایسا مرکزی نکتہ ہے جس سے ہم ادبی روایت کو علیحدہ کر سکیں؟ اگر کچھ ایسی اقدار ہیں جو ۱۸۵۷ء سے ہم تک پہنچ رہی ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دور جو ۱۸۵۷ء سے شروع ہوا تھا، ابھی تک جاری ہے اور جس کی طرف ریاض احمد نے بھی اشارہ کیا تھا۔ اس مرکزی خیال کو حوالے کا نکتہ بنا کر ہم آگے چل سکتے ہیں اور غور کر سکتے ہیں کہ کیا واقعی ایسا دور شروع ہوا ہے۔ ریاض صاحب نے تو یہ کہا تھا کہ ایسا نہیں ہوا اور اب قیوم نظر کے جواب میں کہا ہے کہ ایسا ہوا ہے اور اس کا مرکز قومیت کو بتاتے ہیں، گویا ہم میں پہلے قومیت کا احساس نہیں تھا۔

ریاض احمد:

میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ نئی صورتِ حال کے ساتھ نئی باتیں اور نئی صورتیں پیدا ہونی چاہئیں تھیں جو نہیں ہوئیں۔

عارف امان:

ریاض صاحب نے اس بحث کے سلسلے میں تحریک کے لفظ کو جو معانی پہنانے چاہے ہیں، ان کا ادب سے کوئی تعلق نہیں۔ تحریک سیاست میں

ہوتی ہے ادب میں نہیں۔ ادب میں میلانات تبدیل ہوتے ہیں، ڈھانچے بدلتے ہیں، تحریکیں جنم نہیں لیتیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد صرف ایک تحریک ہے اور وہ سیاسی۔ وہ تحریک غیر ملکی سامراج کے خلاف تھی۔ ریاض صاحب نے کہا ہے کہ ۴۷ء سے پہلے بغاوت کا رجحان تھا۔ وہ ۴۷ء کے بعد بھی تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ قائم رہا۔ اردو ادب نے کسی خاص صوبے کی عکاسی نہیں کی۔ یہ خیال بھی درست نہیں ہے کہ اردو ادب پورے طور سے شہریوں کا ادب رہا ہے۔ ریاض صاحب نئے ادب کے لئے دیہاتوں میں جانا چاہتے ہیں حالانکہ شہر کی زندگی ایک ارتقا پذیر زندگی کا نام ہے۔

امجد الطاف :

یہ موضوع کہ ۴۷ء سے کسی نئے ادبی دور کا آغاز ہوتا ہے یا نہیں، بعض اوقات خاصی سنجیدگی اختیار کر لیتا ہے۔ ہم ادب میں کسی تاریخ کا تعین نہیں کر سکتے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد نیا ادب شروع ہوتا ہے۔ اس مسئلے پر زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ۴۷ء کے بعد جو ادب پیدا ہوا، اس میں جنگِ آزادی کے اثرات اور ماحول کے تقاضوں سے پیدا شدہ نئے مسائل پر غور کرنے کا رجحان عام ہو گیا تھا۔ ریاض صاحب نے یہ کہا ہے کہ ۴۷ء کے بعد کے ادیب چونکہ نئے قومی مسائل پیش نہیں کر سکے اس لئے نیا ادب پیدا نہیں ہوا اور یہ کہ ۴۷ء کے بعد نئے حالات اور تقاضوں کی روشنی میں احساس و فکر میں جو تبدیلی واقع ہوئی ہے، وہ پہلے بھی تھی۔ ۴۷ء سے پہلے یہ احساس تھا کہ ایک بیرونی حکومت جو ہم پر ٹھونسی ہوئی ہے۔ اُسے ختم کرنا ہے یعنی 'جو کچھ تھا' اسے ختم کر کے 'جو کچھ ہونا چاہیئے' اسے شروع کرو۔ ہمارا میلان اب تعمیری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہیجانی انداز ختم ہو گیا ہے، فکر زیادہ ہے، تخریب کا رجحان کم ہے، تعمیر زیادہ ہے۔ تنقید میں ہم زبان و بیان کی مین میخ سے آگے نکل گئے ہیں۔ افسانے جو پہلے بہترین ہوا کرتے تھے، ان کا ردِ عمل رقیق القلبی تھا لیکن اب افسانوں کا انداز بہت مختلف ہے۔ ان تمام چیزوں کے باوصف ہم کلیتے کے طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ واقعی کوئی نیا دور شروع ہوا ہے یا نہیں۔

انتظار حسین :

۴۷ء سے کسی دور کا آغاز ہوا ہے یا نہیں، اس مسئلے کو ہم تحریک کے معنی میں دیکھتے ہیں۔ اور ایسا کرنے میں واقعی کسی نئے دور کا آغاز نہیں ہوا۔ واقعہ یوں ہے کہ محسوس کرنے اور سوچنے کے سانچے جب بدل جاتے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ نیا دور شروع ہو گیا۔ ریاض صاحب نے آزادی سے پہلے کے ادیبوں کو اپنے سامنے رکھا ہے۔ وہ ساری سوچ ۴۷ء سے پہلے کے دور سے حاصل کر رہے ہیں۔ اگر وہ یہ دیکھتے کہ کسی واقعہ کو کوئی نسل فوراً نہیں اپنا لیتی، وہ صرف اس کی تصویر کشی کرتی ہے اور آہستہ آہستہ کوئی واقعہ تاریخی واقعہ کے طور پر قبول کر لیا جاتا ہے۔ جب یہ مرحلہ آتا ہے تو نئے دور کا آغاز ہو جاتا ہے۔ ریاض صاحب نے یہ بتایا ہے کہ ۴۷ء سے پہلے کا رجحان ہر سطح پر بغاوت کا رجحان تھا۔ ماضی سے بغاوت تھی اور سنسنی پیدا کرنا اس دور کی خصوصیت تھی۔ منٹو اور کرشن کے افسانے اور راشد کی نظمیں اس رجحان کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ۴۷ء کے بعد ادیب بدل جاتے ہیں اور اب وہ اپنی روایت یا ماضی سے رشتہ قطع نہیں کرتے، بلکہ رشتہ جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔

امجد الطاف :

مجھے انتظار صاحب سے پورا پورا اتفاق ہے۔ مثال کے طور پر افسانوں ہی کو لے لیجئے۔ وہ افسانہ نگار جو ہندوستان میں ہیں اور وہ افسانہ نگار جو پاکستان میں ہیں، ان کے پیشِ نظر موضوعات خواہ ایک ہی کیوں نہ ہوں، لیکن ان کا انداز یہ بات واضح کر دیتا ہے کہ وہ کس ملک سے تعلق رکھتے ہیں۔ انتظار حسین میرٹھ کی فضا پیش کرتے ہیں لیکن ان کا انداز یہ واضح کر دیتا ہے کہ وہ پاکستانی ہیں۔ یوں احساس ہوتا ہے کہ ۴۷ء کے موڑ پر ایک ندی تھی جس نے دو مختلف راستے اختیار کر لئے۔

محمد صفدر میر :

کوئی فن کار اس طرح نہیں لکھتا کہ اس کی ۴۷ء سے پہلے کی عمر کا حصہ کاٹ کر الگ پھینک دیں۔ ہمارے ہاں اس عظیم سیاسی تبدیلی سے شعور کے لحاظ سے کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ ابھی تک جو کچھ ہم لکھ رہے ہیں، وہ ایسا ہے جیسے ہم اپنے بچپن کو یاد کر رہے ہیں۔ کسی نے اس عہد کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ میں افسانے یا پورے ادب سے سیاسی سبق حاصل نہیں کرتا، مزے لیتا ہوں۔ جہاں تک روایت کا تعلق ہے، صرف غزل میں سیاسی

اشارے ملتے ہیں، لیکن ہم میں سے کسی نے اس روایت کو کریدنے کی کوشش نہیں کی۔

انتظار حسین:

زاویۂ نظر کی تبدیلی ہی کسی ادبی دور کی تبدیلی کا نام ہے۔ جب ایک دور ختم ہوتا ہے اور اس طرح کہ آپ کا تعلق آپ کی تاریخ یا روایت سے کٹ جاتا ہے تو ایک ادیب کو اس کا احساس ہوتا ہے اور وہ اپنے ماضی کو محفوظ کرنے کے لئے اس کی یادوں کو اپنی تخلیقات میں پیش کرتا ہے۔ تاج محل ہمارے کلچر کی علامت تھا۔ آج وہ ہم سے چھن گیا ہے لیکن ہم اُسے بھلا نہیں سکتے اور اپنی تخلیقات میں اُسے مختلف طریقوں سے سموتے رہتے ہیں اور تاج محل کے حوالے سے ہم اپنے پورے ماضی اور اپنی روایت کی 'جو ہم سے کٹ گئی ہے' تجدید کرتے ہیں اور اُسے محفوظ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی میلان نے ایک نئے دور کو جنم دیا ہے جو ۴۷ء کے بعد شروع ہوتا ہے۔

عزیز الحق:

کوئی ادبی دور تخلیق سے نہیں بلکہ تنقید سے تبدیل ہوتا ہے۔ اگر تنقید کے زاویۂ نظر میں تبدیلی واقع ہو گئی ہے تو تخلیقات میں خود بخود ایسا ہو جائے گا۔ پرکھنے کا انداز بدل جائے گا اور یوں ایک نیا دور شروع ہو جائے گا۔ ادب کی تعریف تنقید کرتی ہے۔ ایک ہی غزل میں دو پڑھنے والے مختلف رجحانات تلاش کر لیتے ہیں۔

محمد صفدر میر:

یوں تو تمام زمانوں میں کچھ قدریں مختلف ہوتی ہیں۔ نظیری کی غزل میں ہم اپنے زمانے کا آئینہ دیکھتے ہیں۔ اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ تنقید بدل گئی ہے اس لئے ادب بھی بدل گیا ہے۔ ہر زمانے میں مختلف رجحانات پائے ہیں اور سب اپنی اپنی جگہ قابل قدر ہوتے ہیں۔ اقبال کے زمانے میں وحشت کلکتوی اور جگر مراد آبادی بھی تھے۔ +

انقلاب سے پہلے

صادق نسیم

یہ غزل کوئٹہ میں خاص حالات کے تحت مارشل لا کے نفاذ سے چند دن پیشتر کہی گئی۔ دشمنانِ وطن نے نہایت عجیب و غریب اور خطرناک منصوبے باندھ رکھے تھے اور "غریب شہر" آبادی قدرتی طور پر فکر مند تھی اور ایک بروقت اقدام کی آرزو مند۔ خوش قسمتی سے یہ توقع انقلاب نے پوری کر دی۔ (صادق نسیم)

عہدِ حاضر میں بھی ہر عیب ہنر ہے کہ نہیں
وہی بیداد بہ اندازِ دگر ہے کہ نہیں

خون برسانے لگی ہے نگہِ نرگس و گل
باغباں تجھ کو گلستاں کی خبر ہے کہ نہیں

رہنماؤں پہ بھی الزام بجا ہے لیکن
قافلے والو! تمہیں ذوقِ سفر ہے کہ نہیں

کس قدر تیز ہے گلشن میں حوادث کی ہوا
جانے بلبل کو خیالِ گلِ تر ہے کہ نہیں

بات اب اہلِ جنوں تک ہی نہیں ہے محدود
آج ہر اہلِ خرد خاک بہ سر ہے کہ نہیں

آج ہر سمت عجب شورِ شکستِ دل ہے
بزمِ ہستی میں کوئی آئینہ گر ہے کہ نہیں

آج ہر ہاتھ میں خنجر ہے، ہر اک آنکھ میں خوں
کس سے پوچھوں کہ مرے دوش پہ سر ہے کہ نہیں

ماہ و انجم کو جو تسخیر کیا بھی تو کیا
آج انساں کو خود انساں کی خبر ہے کہ نہیں

عارض و لب مرے اشعار کی زینت نہ سہی
نبضِ ہستی پہ مرا ہاتھ مگر ہے کہ نہیں

گرد حالات نے دھندلا دیئے سب آئینے
جانے اب میری نظر تیری نظر ہے کہ نہیں

عہدِ حاضر کے دھندلکے بھی عجب ہیں صادق
جانے اس رات کے دامن میں سحر ہے کہ نہیں!

غزل

عارف عبدالمتین

ہم سراپردہ احساس میں روپوش ہوئے
دشتِ ادراک میں جب شعلہ آغوش ہوئے

وقت کے ساتھ چلے، وقت کے تیور بن کر
کبھی فردا، کبھی امروز، کبھی دوش ہوئے

ذہن میں نشۂ غمہائے ابد گھول لیا
تشنہ لب یوں بھی کبھی میکدہ بردوش ہوئے

گرمیٔ محفلِ امکاں ہے ہمارے دم سے
ساغرِ زیست میں ہم بادۂ سرجوش ہوئے

بیخودی سوزِ تخیّل کی اک گردش ہے
جس کے اعجاز سے ہم بخیہ گرِ ہوش ہوئے

رفتگاں عجزِ ہنر دیکھ کے یاد آتے ہیں
کس قیامت کے سخنور تھے کہ خاموش ہوئے!

ہم میں اقرار کی جرأت نہیں ورنہ عارف
تیری آواز سے روشن ارمِ گوش ہوئے!

شہرت بخاری

روبرو اس کے کئی صاحبِ اعجاز آئے
ہو کے مرہونِ نگاہِ غلط انداز آئے

میرے تکیے سے گیا جو بھی سو حیران گیا
تیری محفل میں سبھی آئینہ پرداز آئے

اس قیامت میں تری یاد نے وہ کام کیا
آخری وقت میں جیسے کوئی دمساز آئے

عمر گزری ہے اسی دشت کے سناٹوں میں
آسماں ٹوٹ پڑے پر کوئی آواز آئے

شق ہوا جاتا دل شورشِ سرِ غم سے
کاش ایسے میں کہیں سے کوئی ہمراز آئے

چاند تھا جائے شکوں اہلِ جنوں کو ـــ نہ رہا
وائے اے روشنیٔ طبع کہ ہم باز آئے

دل سمجھتا ہے کہ دو دن کا ہے اب دمِ نفس
خواب میں بھی جو خیالِ پرِ پرواز آئے

جان ہاروں سے رہی رزمگۂ شوق تہی!
ورنہ اس بزم میں کیا کیا نہ سخن ساز آئے

اب کے پتّوں کو بھی یہ حکم ہوا ہے شہرت
سوکھ کر شاخ سے ٹوٹیں تو نہ آواز آئے

غزل

احمد ظفر

یہ نہ کہو یہ چاند ہے میرا میں اُس پھول پہ دل سے فدا ہوں
اس دُنیا میں چاند ہے تنہا پھول ہے تنہا میں تنہا ہوں

تیرے حُسن کے آئینے میں جانے کیا کیا دیکھ رہا ہوں
کون سمجھتا ہے یہ باتیں کون سمجھتا ہے میں کیا ہوں

نرم ہوا کی جن لہروں نے جلتے دیپ بجھا ڈالے تھے
نرم ہوا کی ان لہروں نے پھول کھلائے دیکھ رہا ہوں

ایک ہی پل میں ان آنکھوں نے جانے کیا کیا دیکھ لیا ہے
ایک ہی پل میں جانے کتنی صدیاں پیچھے چھوڑ گیا ہوں

وَقت نے مجھ سے رفتہ رفتہ کتنے نغمے چھین لئے ہیں
اب میں صحرا میں خاموشی اب میں جنگل میں دریا ہوں

کل اس راہگذر میں یارو لوگ مری آواز سُنیں گے
آج یہاں میں گمنامی کے پتھر سے سر پھوڑ رہا ہوں

اس دُنیا کی دورنگی نے کیسے کیسے رنگ دکھائے
راہ پہ آؤں تو میں رہزن بھٹکوں تو میں راہنما ہوں

لوگ مجھے دیوانہ کہہ کر اپنی بات بنا لیتے ہیں
لوگ ظفر فرزانے ٹھہرے، میں دیوانہ سوچ رہا ہوں

وشوا ناتھ درد

میری خندہ لبی ہی نہیں دوستو، میرے نغمے بھی دنیا نے زخمی کئے
میں نے اس پر بھی شکوہ نہیں کچھ کیا، میں نے اس پر بھی ہنس ہنس کے آنسو پیئے

مجھ کو منزل کا کوئی پتہ ہی نہیں میری منزل کو میری خبر ہی نہیں
میں نے پھر بھی فریبِ طلب کیلئے خود کو صد رنگ دھوکے پہ دھوکے دیئے

میری ناکامیاں، میری محرومیاں مجھ کو آخر تو اتنا بتا ہی گئیں
جس کا جادہ نہیں جس کی منزل نہیں زندگی وقف ہے اس سفر کیلئے

میری تنہائیاں مجھ کو راس آگئیں میری ناکامیاں دل کے کام آگئیں
اے غمِ زندگی میں تصدق ترے تو نے کیا سوچ کے مجھ کو چرکے دئے

مجھ کو سود و زیاں کا کوئی غم نہیں، لٹ گیا ہوں مگر کچھ گیا بھی نہیں
میں نے دُنیا کا دامن خوشی سے بھرا مجھ کو بدلے میں دنیا نے غم دے دئے

میری بربادیاں کس سے منسوب ہوں کیا کسی سے کہوں کس کا میں نام لوں
دردؔ خود سے میں خود بے مروّت رہا میں نے خود پر ہزاروں ستم خود کئے

★

رپورتاژ:

فن سے عرفان تک

سلیم خاں گمی

میرے اکثر احباب کو شکایت ہے کہ میں بہت بے ذوق ہوں۔ میں کسی نمائش میں دیوانہ وار گھومتا پھرتا دکھائی نہیں دیتا۔ موقع بھی ہاتھ لگے تو بھی کسی اسٹڈیو یا نگار خانے کے چکر نہیں کاٹتا۔ کسی استاد کا شہہ پارہ سن کر اس کی زیارت کے لئے پاپیادہ روانہ نہیں ہو جاتا اور نہ کسی نقش یا مجسمے کے لئے اس قدر بے قرار ہو جاتا ہوں کہ جب تک اسے دیکھ نہ لوں نہ دن کو چین ہو اور نہ رات کو قرار۔ یہی کیفیت ادب کی بھی سمجھ لیجئے۔ ہوگا کسی شاعر کا کلام بے پناہ۔ میں اس کو سو بار داد دینے کو تیار ہوں۔ پطرس بخاری مرحوم کے "کتے" ابن انشا کے "کتے کا کاٹا" یا قدرت اللہ شہاب کا "سرخ فیتہ" نظر پڑ جائے تو کون کافر ہے جو پھڑک نہ اٹھے۔ لیکن ہم ہر کس و ناکس کے شجرۂ نسب کی تلاش میں کیوں مارے مارے پھریں اور ہر چھوٹے بڑے آستانے پر کیوں سجدۂ نیاز پیش کریں۔ آخر بزرگوں ہی کا کہنا ہے کہ خاک از تودۂ کلاں بردار۔

لیکن اگر تودہ واقعی بڑا ہو اور آستانہ واقعی سجدۂ نیاز کے لائق تو پھر کون ہے جو اس تودے سے خاک نہ اٹھائے اور اس آستانے کی طرف بصد شوق رجوع نہ کرے؟ ایک مقناطیسی کشش۔ بس یہ چیز ہے جو دیدۂ و دل کے ساتھ پائے شوق کو پلک جھپکنے میں کہیں کی کہیں لے جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِدھر میری نظر ایک چیز پر پڑی اور اُدھر میں ایک شاندار عمارت کے سامنے کھڑا تعجب کر رہا تھا کہ کہیں الہ دین کے چراغ نے تو رات کی رات میں یہ طلسم بپا نہیں کر دیا۔ تصور سے حقیقت تک کا مرحلہ کچھ اس طرح طے ہو گیا کہ مجھے اس کی خبر تک نہ ہوئی۔ عمارت کی دل کشی تو خیر حیران کن تھی ہی لیکن اس سے زیادہ حیرت انگیز وہ ذوق و شوق، وہ چابکدستی تھی جس نے کراچی میں ایک عظیم الشان مرکزِ ثقافت قائم کر کے شیدایانِ فن کی ایک دیرینہ آرزو پوری کر دی۔ کیا یہ بیان کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ مرکزِ ثقافت پاکستان آرٹس کونسل کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ یہ راز اب پوری طرح معلومِ عوام ہو چکا ہے۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جو پاکستان کی ثقافتی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔

میں بڑی دیر تک کھڑا اس پُرشکوہ عمارت کو دیکھتا رہا وہ جو ہماری ثقافتی عظمت کا مایۂ ناز مظہر ہے۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا تھا اور میں بار بار سوچتا تھا کہ ——— ایں کہ می بینم بہ بیداری است یا بخواب۔ ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا مجھے یہاں سے گزرنے کا اتفاق ہوا تھا بالکل سپاٹ اور ویران سی جگہ تھی، اونچی نیچی سفید زمین جس پر تاحدِ نظر کوڑا کرکٹ اور پتھریلی پتھر بکھرے پڑے تھے اور اب؟ ——— اب یہاں ایک ایسی عالی شان عمارت کھڑی تھی جو فنونِ لطیفہ کا مسکن ہی نہیں بلکہ خود بھی فن کا ایک شاندار نمونہ تھی۔ پورے گیارہ برس ہماری جمالیاتی روح تشنہ کام رہی اور فنونِ لطیفہ بھی اکثر افرادِ قوم کی طرح بے خانماں رہے اور اب پاکستان آرٹس کونسل کو اپنے معاونین اور بہی خواہوں کی انتھک جدوجہد کی بدولت ایک مستقل اور شایانِ شان مسکن میسر آ گیا تھا۔ آج سے کوئی ڈیڑھ سال پہلے کی بات ہے۔ ۱۷ اپریل ۱۹۵۸ء کو اس کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ کون جانتا تھا کہ ہمارا ذوقِ فن اس تیزی سے جادہ پیما ہوگا کہ اتنے قلیل عرصے میں منزلِ مقصود کو پالے گا۔ اور ہمارے صدرِ مملکت جنرل محمد ایوب خاں یومِ پاکستان کے موقع پر مرکزِ ثقافت کا افتتاح کریں گے جو ہماری ثقافتی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بھی ہمارے دورِ انقلاب ہی کا کرشمہ تصور کیجئے جس نے ساری قوم میں زندگی کی ایک نئی روح پھونک دی ہے اور جاری سرگرمیوں کو اس طرح مہمیز کیا ہے کہ جن باتوں کے لئے سالہا سال درکار تھے وہ دنوں میں طے ہو رہی ہیں۔

ثقافتی اداروں کی ضرورت تو بہر حال مسلم ہے یہی ادارے ساری قوم کی روح کی عکاسی کرتے ہیں اور اس کے فنی شعور کی علامت بن کر اس کو دوسری قوموں سے روشناس ہی نہیں کراتے بلکہ ایک امتیاز بھی عطا کرتے ہیں۔ ناساز گار ملکی و سیاسی حالات نے ہمیں عرصۂ دراز تک ان اداروں خصوصاً مرکزِ ثقافت سے محروم رکھا جو بیک وقت فنونِ لطیفہ کی جلوہ گاہ بھی ہو اور تربیت گاہ بھی۔ محلِ اجتماع بھی ہو اور محلِ نمائش بھی، مل بیٹھنے کا مقام اور

نتہا دلہ خیالات کا مرکز بھی ہوا اور ثقافت کا صوری مظہر بھی جاندرون وبیرونِ ملک ہر دیدہ ور پر ہماری فنی صلاحیتیں آشکار کرے۔ اس لحاظ سے دورِ انقلاب سے قبل ہماری زندگی داغِ ناتمامی کا شکار تھی" ہماری ثقافت کا چراغ بجائے کسی فانوس میں روشن ہونے کے چراغِ خانۂ درویش بنا ہوا آندھیوں کی آغوش میں بارہ سال تک ٹمٹماتا رہا اور ہمارے فنونِ لطیفہ خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور رہے۔" آج یہ مرکزِ ثقافت، یہ عظیم الشان ایوانِ فن ہر طرح سے مکمل اور آراستہ و پیراستہ تیار ہے اور ایک عالم اس شعبدۂ تعمیر کا حیرت سے تماشائی ہے۔ ایک جدید شاعر کے الفاظ ہیں :-

پرندے کو جو رات دن گرمِ پرواز تھا
چمکتی ہوئی رہگزر مل گئی !

اور اب فنونِ لطیفہ سے متعلق ہماری تمام سرگرمیاں، ہمارے فنکاروں کی تخلیقی کوششیں اس مرکز پر مجتمع ہو کر شانِ جمالی کے ساتھ شانِ جلالی بھی پیدا کر رہی ہیں۔ وہ دن دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا جب ایک قوم کی فنی جد و جہد اور ثقافتی روح نے اس جلیل القدر مظہر کی شکل اختیار کی اور ہمارے ہزاروں ہم وطن اس کے افتتاح کا دل افروز منظر دیکھنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ صدرِ مملکت نے جو ملت و حیاتِ ملیہ کے نقیب بھی ہیں اور زندہ و گویا علامت بھی، اپنے مبارک ہاتھوں سے اس کا افتتاح کیا اور ایک ولولہ انگیز تقریر میں قوم کی ثقافتی روح اور مقاصد کو بیش از بیش نمو دینے پر زور دیا۔

ایسے ثقافتی مرکز کا افتتاح ایک ایسے یگانۂ روزگار فنکار کے شاہکارانہ نقوش سے مناسب تھا جس کی شخصیت و تخلیقات نہ صرف ملی حیثیت اختیار کر چکی ہیں بلکہ ان کو عالمگیر اہمیت بھی حاصل ہے۔ ہمارا یہ نازِ نقاش ــــ عبدالرحمٰن چغتائی ــــ اگر مرکزِ ثقافت بجائے خود ایک علامتی حیثیت رکھتا ہے تو چغتائی کی تصاویر کی اس مرکز میں نمائش بھی، اتنی ہی علامتی ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کا اثر دوبالا کرتے ہوئے اربابِ نظر کو ایک مستقل اہمیت و جاذبیت کا احساس دلاتے ہیں۔

اگر ہم فن سے ادب کی طرف آئیں تو اس کا منظر بھی کچھ کم پرکشش نہیں۔ اور خوش قسمتی سے صدرِ پاکستان کی ہمہ گیر، حیات افروز شخصیت اس پر بھی حاوی ہے۔ اس کو فن و ادب کی بہترین نشو و نما کی نوید سمجھنا چاہئے۔ یہاں بھی میری بے ذوقی و بے حسی دعوتِ ذوق و شوق کی تاب نہ لا سکی۔ ابھی میں کچھ سوچنے بھی نہ پایا تھا کہ بے اختیار انسانوں کے اُس سیلِ بے پایاں میں شامل ہو گیا جو موج در موج وادئ مہران کے عارف شاعر ــــ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے روضۂ مطہر کی طرف رواں تھا اور حالیہ پایۂ تخت کراچی سے بھٹ شاہ تک یوں نظر آتا تھا جیسے ایک اور مہران موجزن ہو اور ایک مہران ہی کیا میں نے تصور کی آنکھ سے دیکھا تو پاکستان کے گوشے گوشے سے اربابِ شوق کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا کے دریا موجزن نظر آئے۔ رہا شاہ بھٹائی کا اپنا وطن تو وہاں کیا شہری اور کیا دیہاتی، کیا مرد اور کیا عورتیں، کیا تعلیم یافتہ اور کیا اَن پڑھ، کیا امیر اور کیا غریب، کیا خوش پوش اور کیا گودڑ پوش جوق در جوق ایک ہی منزل کی طرف رواں نظر آئے۔ اور طرح طرح کی پوشاکیں، رنگین سادہ دھاری دار پھول دار، زیب تن کئے ہوئے ریل گاڑیوں، موٹروں، کاروں، بسوں، چھکڑوں، بیل گاڑیوں میں اونٹوں گھوڑوں اور طرح طرح کی سواریوں پر اور ہزاروں ایسے تھے جو اس منزلِ شوق کی طرف ازراہِ عقیدت یا حصولِ ثواب کے لئے پاپیادہ ہی روانہ ہو گئے تھے۔ غرضیکہ زندگی کا ایک میلہ، ایک جھمیلہ، ایک بے پایاں تانتا۔ رنگ رنگ بھانت بھانت۔ اور اس کے ساتھ ایک ہماہمی، چہل پہل، جیسے زندگی کے سوتے یکایک پھوٹ پڑے ہوں، اُبل پڑے ہوں۔ یہ تھی اس کاروانِ شوق و عقیدت کی مجموعی کیفیت۔ یا ایک ولی کامل کے روحانی اثر کا کرشمہ جس نے اس قدر دور دور سے وارفتگانِ شوق کو نذرانۂ عقیدت پیش کرنے اور روضے کی زیارت کے لئے آنے کی تحریک دلائی۔

اس سال وادئ مہران کے اس ہر دل عزیز شاعر اور ولی اللہ جس کو یہاں کے لوگ پیار سے "لال لطیف" کہتے ہیں کا دو سو سا تواں عرس تھا۔ اور تمام پچھلے عرسوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر۔ کیوں؟ اس کا جواب ایک ہی لفظ سے ملتا ہے۔ پاکستان۔ یہ ہماری نئی مملکت۔ پاکستان ہی کا قیام ہے جس نے اس سرزمین کے ہر ہر پہلو میں ایک نئی دلچسپی پیدا کر دی ہے اور ہم سب کے دلوں میں مشرقی پاکستان کے شاہ جلال سلہٹی سے لے کر مغربی پاکستان کے وارث شاہ، بلھے شاہ خوشحال خان خٹک، رحمان بابا، جو آتسال، شاہ بھٹائی جیسے عارفین و مشاہیر کو جاننے پہچاننے اور ان کی قدر و منزلت کرنے کا ایک نیا جذبہ پیدا کر دیا ہے چنانچہ اب شاہ بھٹائی صرف سابق سندھ کے ہی 'لال لطیف' نہیں رہے بلکہ سارے پاکستان کے 'لال لطیف' بن گئے ہیں اور ان کا گھر گھر چرچا ہے۔ ہر

لئے جہاں پہلے اُن کا عرس صرف ایک مقامی چیز تھا وہاں یہ پاکستان کے قائم ہوتے ہی کُل پاکستانی بن گیا اور ان کے زائرین کے سیل میں سندھ کے ساتھ ساتھ آبادی کے ہر حصے کے عقیدت مند شامل ہو گئے اور رونق روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ رفتہ رفتہ اردو جاننے والے بھی شاہ بھٹائی کا کلام پڑھنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے متعدد شاعروں۔ ابن انشا۔ رشید احمد لاشاری۔ شیخ ایاز۔ رفیق خاور۔ شہاب رفعت۔ عاصمہ حسین۔ جمیل نقوی۔ حمایت علی شاعر۔ اور رئیس امروہوی نے شاہ کا کتنا ہی کلام اردو نظم ونثر کے سانچے میں ڈھال دیا اور آج لالِ لطیف اردو کا بھی اتنا ہی شاعر ہے۔ جتنا سندھی کا بلکہ اردو کے ذریعے ان کا تعارف بہت دور دور پہنچ چکا ہے۔ اور اُن کے کلام کے مطالعہ نے تو تنقید میں بھی۔ نئے بال و پر پیدا کر دیے ہیں۔

ابھی چند سال کی بات ہے شاہ بھٹائی کی اس بڑھتی ہوئی مقبولیت کی شروعات ہی تھی۔ ریڈیو پاکستان۔ ادارۂ مطبوعات پاکستان اور پریس کے نمائندے قافلہ در قافلہ حیدرآباد۔ ٹنڈوآدم اور وہاں سے سندھ کے ایک بہت ہی معمولی گاؤں ـــــ بھٹ شاہ کو رواں دواں نظر آئے کاریں اور بسیں ہر علاقے اور ہر زبان کے پڑھے لکھے لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی ایک ہی سمت رواں تھیں۔ بازار اور ہوٹل اُنہی کے ہمہموں سے گونج رہے تھے۔ جیسے شہر میں ایک نئی جان پڑ گئی ہو اور موضوع ایک اور صرف ایک تھا۔ شاہ بھٹائی۔ اُن کا کلام۔ اُن کے افکار۔ رومی اور اقبال سے موازنہ۔ بھٹ شاہ کی سڑک تنگ۔ ٹوٹی پھوٹی کچی پکی گرد وغبار کے دَل بادل اٹھتے ہوئے چاروں طرف اجاڑ بیابان سناٹا۔ نکمی قسم کی خود رو جھاڑیاں، ببول آک ارنڈ، سب کی سب بُری طرح غبار آلود، یہ وہ راستہ تھا جس پر ایک دنیا اُمڈی چلی آ رہی تھیں۔ فوٹو گرافر کیمروں سے لیس، لوگوں منظروں، جانوروں، غرضکہ جو چیز سامنے آئے اُن کی تصویروں پر تصویریں لیتے ہوئے۔ روضہ کچھ دور سے ہی دکھائی دینے لگتا پاس پہنچنے پر کچی زمین ٹائیروں اور پہیوں سے بری طرح رگیدی ہوئی اور دور دور تک ان کے کئی کئی انچ دھنسے ہوئے نشانات ہی نشانات۔ ایک وسیع لق ودق میدان پر بُل ڈوزر ہی بل ڈوزر زمین کو بالکل ہموار کرتے ہوئے۔ اور پھر جیسے زمین کے دامن پر ارد گرد کے کھیتوں کی طرح خیموں کی شکل میں، بڑے بڑے کپاس کے پھول دفعتاً ابھرتے ہوئے۔ اس سے آگے بڑھیں تو گرد وغبار سے ڈھکی ہوئی پست پست جنگلی جھاڑیوں میں کچے دیہاتی کوٹھے۔ کچی دیوار چاروں طرف پھیلی ہوئی اور میل سوا میل کے پھیر میں میلے کی مخصوص چہل پہل اور گہما گہمی قہقہوں سے جگ مگ کرتا ہوا پنڈال۔ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا۔ اور پھر روضے کے ارد گرد ایک بے پناہ ہجوم۔

اور ایک دو سال ـــــ اور وہ مشہور جھیل ـــــ کراڑ۔ گندے گدلے مٹیلے پانی کا ایک بے ڈھب جوہڑ۔ اس میں دُور دُور سے نہروں کا پانی لا ڈالا گیا۔ سچ مچ ایک لمبی چوڑی جھیل بن گیا جس کو دیکھ کر طبیعت میں تر وتازگی کی لہر دوڑ جائے۔ ہوتے ہوتے کشتیاں بھی چلنے لگیں، لوگوں پر سیر وتفریح کی دُھن سوار ہوئی اور پھر چاندنی راتوں نے تو اس کو سچ مچ چار چاند لگا دیئے جیسے جھیل کی سیال چاندنی پر ایک اور چاندنی بچھی ہو اور طلسمات کا سماں پیدا کر دے۔ سعدی نے ٹھیک ہی تو کہا ہے ؎

هر کجا چشمہ بود شیریں
مردم و مرغ و مور گرد آیند

سو یہاں بھی کیا انسان اور کیا چرند و پرند جھوم جھوم کر آئے اور ایک سنسان ہُو کی بستی میں اور ہی چہل پہل نظر آنے لگی، گویا گاؤں میں شہر کا سا عالم پیدا ہو گیا اور جب عالم فاضل لوگ بھی کاغذوں کے گٹھے کے گٹھے اور کتابوں کے انبار کے انبار اٹھائے جوق در جوق آنے لگے تو یہی گاؤں علم وادب کا گہوارہ بھی بننے لگا۔ اور اب ـــــ یارانِ تیز گام نے اور بھی قدم بڑھائے ہیں۔ دورِ انقلاب کی معارف پروری اور ادب نوازی نے علم وادب اور حکمت و عرفان کے فروغ کو ملّی نصب العین قرار دے کر یکے بعد دیگرے کتنے ہی معرکہ آرا اقدامات کئے ہیں جن سے ہماری فکری اور علمی اور ادبی زندگی ہی نہیں بلکہ تمام زندگی میں نئی ہل چل پیدا ہو گئی ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی وادیٔ مہران کے چشم وچراغ، شاہ بھٹائی کے فیضان کو عام کرنا ہے۔ جس کا بیڑا ہماری انقلابی حکومت نے صدرِ مملکت جنرل محمد ایوب خاں کی سربراہی میں اٹھایا ہے۔ اب کی مغربی پاکستان اور مرکزی حکومتوں اور عوام کی متفقہ کوششیں اس کے لئے وقف رہیں۔ اس لئے عرس، میلے اور ادبی کانفرنس کا وہ ہنگامہ دیکھنے میں آیا جس کی نظیر اس سے پہلے دکھائی نہیں دیتی۔ پریس فوٹو گرافر فلم ساز ارباب قلم۔ فن کار بھی اس انبوہِ عظیم میں شریک تھے۔ میلے کی گہما گہمی بجائے خود دلچسپ اور مقامی زندگی کے بوقلموں عناصر اور متنوع سرگرمیوں کا مرقع تھی۔ چنانچہ نت نئے تماشے دکھلانے والوں، مداریوں بازی گروں، سرکس والوں، رقاصاؤں

اور صحیوں سے لے کر پھل فروشوں، ظروف سازوں۔ نیاریوں اور دوسرے ہزارہا کاروباری لوگوں کے باعث کھوے سے کھوا چھل رہا تھا اور جھولوں کے شور اور تماشائیوں کے غل غپاڑے سے واقعی کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اُدھر روضہ کا خوبصورت گنبد رنگا رنگ قمقموں سے آراستہ اس طرح جگ مگ کرتا کہ چم چم جھم جھم کرتے ستاروں کا گمان ہوا اور رات کو دن کرتا ہوا دور سے ایک بقعۂ نور معلوم ہوا اور دیکھنے والوں کے دل و نگاہ دونوں کو روشن کر رہا ہو، مزار کے باہر صحن میں اپنی دُھن اور شاہ کے کلام میں مست موسیقار اکتارے پر اس انداز سے جو شاہ سے مخصوص سمجھا جاتا ہے چوکڑی مار کر بیٹھے یا کسی درخت سے شاہ کے انداز میں ٹیک لگائے ان کا کلام گا رہے تھے۔ شہنائیوں۔ ماشکی اور بینڈوں کے طنطنے اور غلغلے الگ ایک شان رکھتے تھے۔

جیسا کہ میلوں میں ہوتا ہی ہے عرس کے ساتھ ساتھ زندگی کے ہنگامے بھی آپ ہی آپ اُبھر آتے ہیں ہوٹل طرح طرح کی دکانیں دُلھنوں کی طرح سجی سجائی اور بے شمار بوقلموں اسٹال کہیں اونٹوں کے دلنواز ساز و سامان دھڑا دھڑ فروخت ہو رہے ہیں۔ کہیں طوائفوں کے رقص کی جھنکار اور اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک کا عالم ہے کہیں درختوں کی گھنی چھاؤں ایسے ہاری ہل بل کر شاہ کا کلام گا رہے ہیں جو نہ جانے زندگی کی کتنی بہاریں دیکھ چکے ہیں۔ اور اس دور کو بھی دیکھ رہے ہیں جس نے ان کو وڈیروں کے چنگل سے نجات دلا کر خود اپنی قسمت کا مالک وحقدار بنا دیا ہے۔ کہیں فقیروں کے غول کے غول پھر رہے ہیں یہاں تک کہ کوئی من چلا کشکول چمٹوں اور چیتھڑوں سے لیس علماء و فضلا کے پنڈال میں بھی جا دھمکتا ہے۔ کوئی دو سال پہلے کی بات ہے سابق سندھ کے وزیر اعلیٰ بڑی سنجیدگی سے شاہ کے کلام پر تقریر فرما رہے تھے اور جلسے کی ساری کارروائی کو فلمایا جا رہا تھا۔ دفعتاً ایک ہٹے کٹے بھاری ڈیل ڈول کے کالے بھجنگ ملنگ کو جوش آگیا تو وہ عین اسٹیج پر آ دھمکا اور اس زور شور سے دھم دھم کر کے ناچنے لگا کہ ایک سماں بندھ گیا۔ بھلا زندگی اپنی ان اصلیتوں کو کیسے بھول سکتی ہے اور پھر شاہ عبداللطیف بھٹائی جیسے ولی اللہ کے دربار میں جہاں شاہ و گدا۔ اعلیٰ و ادنیٰ سب برابر ہیں۔

روضے کے باہر دروازے کے پاس ایک درخت پر بھاری سا گجر لٹک رہا ہے جو شاید زائرین کی آمد پر اطلاعِ حضور کا کام دیتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ مگر زندگی کا سب سے دلچسپ مظاہرہ جو درحقیقت ہماری قومی توانائی اور ہشاش بشاش روح کا مظاہرہ ہے سندھ کی مشہور و معروف کُشتی "ملاکھڑا" ہے جسے بلوچی میں "بل" کہا جاتا ہے اور شاید اس کا ملاقات سے کوئی تعلق ہو لیکن یہ ملاقات بھی عجیب قسم کی ہے بڑی تکڑی قسم کی کشتی جسے دیکھنے کے لئے لوگ بیس بیس ہزار کی تعداد میں آتے ہیں اور پھر تماشائیوں کے کیا کہنے کوئی دکان کوئی چھت، کوئی میدان، کوئی ٹیلہ کوئی درخت شاید ہی ان سے خالی ہو۔

مگر ہم آپ پڑھے لکھوں کی دلچسپیاں تو کچھ اور ہی ہیں کھلے میدان یا روضے کے صحن کے بجائے جہاں دعائیں اور مرادیں مانگنے والے مردوں اور عورتوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ نظر آتے ہیں پنڈال میں جلسوں اور کانفرنسوں کا اہتمام اور اس سال کی دلچسپیوں کا تو ذکر ہی کیا جب کہ صدر مملکت اور گورنر مغربی پاکستان تشریف لائے ہوں۔ جنرل محمد ایوب خاں نے رزم کے ساتھ بزم کا حق ادا کرتے ہوئے ایک بار پھر پاکستانی ادب و ثقافت کو بدرجۂ اتم فروغ دینے پر جو زور دیا وہ ہماری بنائے ملت کے استوار تر ہونے کی نوید ہے۔

تو یہ ہیں فن و ادب کی وہ ساحرانہ پیشقدمیاں جو بے حس سے بے حس اور بے ذوق سے بے ذوق شخص کو بھی خلوت سے جلوت میں لے آتی ہیں اور انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے ایک نئے دورِ انقلاب کی خبر دیتی ہیں یقین ہے کہ ان حالات میں ہماری ثقافت اور زندگی کا افق کچھ اور بھی تابناک ثابت ہوگا۔

"ماہِ نو" کی توسیع اشاعت میں حصہ لے کر پاکستانی ادب و ثقافت سے اپنی دلچسپی کا اظہار فرمائیے۔

زمانے کی دستبرد سے ماضی کی یادگاریں مٹتی رہتی ہیں۔ لیکن کاغذ کے
آئینے میں آج بھی ہم اپنے ماضی کی تصویر دیکھ سکتے ہیں۔ یادگار ناموں،
فرمانوں، روایتوں، صحافت، دستاویزات، کتابوں اور اسی طرح کی
اصلی نگارشوں کے انبار میں سے چند کو ہم نے اب بھی کاغذ پر محفوظ کرکے
لازوال بنا دیا ہے اور آئندہ بھی بناتے رہیں گے۔ پاکستان اب
خود کاغذ تیار کر رہا ہے تاکہ ملکی ضروریات پوری ہو سکیں۔
نیز ماضی کے سرمائے کو محفوظ کیا جاسکے۔

پاکستان کی تاریخ اب پاکستانی کاغذ پر لکھی جارہی ہے۔

پاکستان کی صنعتی کارکردگی کی اعلیٰ مثال

منیجنگ ایجنٹس۔ پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

افسانہ:

کالے میگھا پانی دے....!

محمد عمر میمن

مینہہ تو جیسے کہہ رہا تھا، آج برس لوں، جتنا برسنا ہے، کل جانے برس بھی پاؤں یا ہوائیں دور بھگا لے جائیں۔ کون جانے؛ چنانچہ دھیمی دھیمی پھوار اب بھی پڑ رہی تھی، موسم میں کچھ تازگی سی آگئی تھی، ہلکی ہلکی خنکی — باہر اب بھی بوندیں کثیف، نیم روشن، تعفن سے بھرپور گلی میں اپنی شوریدہ سری کا مظاہرہ کر رہی تھیں، گلی میں پانی کھڑا تھا اور دھیمے دھیمے گرتی ہوئی یہ بوندیں، اس کھڑے پانی کی پُرسکون سطح پر گر گر کر ننھی منی لہروں کو جنم دے رہی تھیں، اور ٹاٹ اور چٹائی سے تیار شدہ چھت پر یہ بوندیں ٹپ ٹپ کرتی ٹپک کر جھگی کے سیلے ہوئے کچے فرش پر برس رہی تھیں۔

بوڑھا فضلو اپنے کٹھن جیون کو لئے بھیگی ہوئی کھرّی چارپائی پر بیٹھا تھا، گذرتے وقت نے اس کے چہرے کو شکنوں سے پُر کر دیا تھا اور اب یہی شکنیں بوڑھے فضلو کے چہرے پر عجیب گنجان سا جال بن رہی تھیں۔ اس کا ذہن خیالات کے سمندر میں غوطہ زن تھا، بھیگی ہوئی خوشگوار ہوا، کواڑوں سے بے نیاز موٹے سے ٹاٹ کے پردے کو جو جھگی کے مکینوں کی مدافعت کے لئے کسی تپتے ہوئے ریگستان میں کہیں دور، طویل کھجور کے تنہا درخت کی چھدری چھاؤں سے زیادہ فرحت بخش نہ تھا، دھیمے دھیمے سرکا کر آ رہی تھی، اس میں نم مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو تو تھی لیکن یہ سوندھی سوندھی خوشبو بستی کی غلیظ اور تعفن سے لبریز فضا میں آکر کچھ آلودہ سی ہو گئی تھی۔ اور مٹی کی سوندھی خوشبو کے ساتھ گلی میں سڑتے غلاظت کے ڈھیر کی بدبو بھی شامل ہو گئی تھی، بوندیں ٹپ ٹپ کرتی فضلو کے پڑوسی، اللہ بخش کی ٹین کی چھت پر پڑ رہی تھیں۔ ایک ہلکی ہلکی موسیقی اور ترنم ان برستی بوندوں کے گرنے سے پیدا ہو رہا تھا ٹپ، ٹپ ٹپ، ٹپا ٹپ، ٹپ۔ بابا فضلو، اگر آج وہ برلی والے اپنے پکے مکان میں ہوتا تو ضرور بوندوں کے اس دلفریب رقص اور موسیقی کے آہنگ سے متاثر اور محظوظ ہوتا، لیکن اس برستی جھگی میں؟ یہاں کے مکین تو بارہ برس سے یہ بھی بھول گئے تھے کہ موسیقی نام کی کسی شئے کا بھی دنیا میں وجود ہے۔ اس برستی، رقص فرماتی موسیقی کو جنم دیتی ہوئی بوندوں نے زندگی کے ریگ زار میں بارہ طویل برسوں سے بادسموم کے طوفانی جھکڑوں سے جھلستے ہوئے بوڑھے فضلو کے دل میں تنہائی، یادوں اور خوش و خرم ایام کا ملا جلا درد پیدا کر دیا اور خیالات میں غرق بوڑھے فضلو کو محسوس ہوا —— باہر جھگی کی چھت کے نم ناہموار چھجے سے رستی ہوئی بوندوں کی اس گمزدہ ہوا میں اس کے ماضی کی حسین یادیں سر جھکائے کھڑی بھیگ رہی ہیں۔

کتنے ہی سال بیت گئے۔ کبھی وہ بھی تو جوان تھا۔

ساون بھیگ رہا تھا، اور جوان فضلو اپنے جوان سینے میں آرزوؤں کے ہزاروں دیپ روشن کئے ایسے بھیگے سمے گھر سے بھاگم بھاگ چچا اللہ رکھے کے گھر پہنچ جاتا۔ ماں لاکھ منع کرتی! "ارے دیوانا ہو رہا ہے کیا۔ ایسی برسات اور تو چچا کے گھر جا رہا ہے۔" مگر وہ بھلا ماں سے کیا کہتا کہ وہ کیوں جا رہا ہے، بس مسکراتا اور ماں ایسے مدھر سمے گھر کے اندر کس کا جی چاہے گا" کہتا یہ جا وہ جا۔ بات یہ نہ تھی، بات تو ساری یہ تھی کہ چچا اللہ رکھے کی جوان رشیدن کی مسکراہٹ اس کے سینے میں جیسے دور، بہت دور تک اتر کر رہ گئی تھی، اور بھلا وہ برستے ساون میں گھر میں کیسے پڑا رہتا۔ ماں مسکراتی، بڑی معنی خیز مسکراہٹ! اور جوان فضلو وہ تو بہت دور نکل گیا ہوتا۔

چچا اللہ رکھے کے گھر کے سامنے بڑے سے پیپل کی شفیق باہوں میں ڈلے ہوئے جھولے پر جھولتی رشیدن اور اس کی سکھیوں کی آنکھ بچا کر وہ پیپل کے موٹے تنے کی اوٹ چھپ جاتا، اور جب بلند سے بلند تر ہوتے ہوئے جھونٹوں کے ساتھ، گھور بدلی کو تکتی ہوئی، جوانی کے انوکھے جذبہ کی حدت سے مخمور، مسکراتی کانپتی رشیدن کے موٹے موٹے رسیلے ہونٹوں سے۔

"تیرے بادلوں کی خیر، تیرے گاگروں کی خیر

میرے پیا کی تلیا کو بھی پانی دے، میرے پیا کی تلیا کو بھی پانی دے ۔"

جیسا ادھر نغمہ نکلتا تو وہ کسی اندرونی مسرت سے سرشار ہو کر تنے کے پیچھے ہی مسکرا دیتا۔ اور پھر چپ چاپ تنے کے پیچھے سے نکل کر رشیدن پر ایک مسکراتی نگاہ ڈال کر کمرے میں حقہ گڑگڑاتے چچا اللہ رکھے کے پاس پہنچ جاتا۔ ادھر رشیدن "اوئی اللہ" کہتی آنگن میں بھاگ جاتی۔ کچھ اس طرح کہ نہ بہتی بوندوں کا خیال نہ بدن پر سے ڈھلکے دوپٹہ ہی کا پاس۔

چچا اللہ رکھا بھی سارا زمانہ دیکھا ہوا اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہوا تھا، آخر کو سارے بال دھوپ میں ہی تھوڑی سفید کئے تھے۔ وہ روز ساون کے بھیگتے لمحوں میں جوان فضلو کی آمد اور اس کے ایک ایک عمل سے چھلکتے اس کے اضطراب کا مدعا خوب جانتا تھا، اسی لئے کہتا:

"دیکھ رے پھجلو، تجھ سے لاکھ بار نائیں کر دی پر تو رو جینہ (روز) آجات ہے، اب کلہے کی دیر ہے، پر تجھ سے تو جیسے انتجار ہوت ہی نائیں۔ بس بیٹا، اگلے ساون (ساون) تک اور انتجار کرے۔"

اور اگلے ساون کی آمد سے پہلے ہی مضطرب فضلو رشیدن کی مسکراہٹ لے آیا تھا، دونوں جوان تھے وقت تھا اور وقت کا تقاضہ، ماں پھولی نہ سماتی تھی، ایسی چاندسی بہو! اور فضلو کو تو جیسے کسی نے جگمگاتی کہکشاں لا دی تھی۔ رشیدن کے پیا کی سوکھی، پیاسی تلیا تو اب فضلو کے وجود سے جل تھل سی ہو گئی تھی۔

لیکن آج بھی ساون بھیگ رہا تھا۔ اور سامنے ایک کونے میں کانپتی، ٹھٹھرتی، اپنے جسم کو چھدرے کپڑوں میں سمیٹتی ہوئی دمہ کی مریض رشیدن اپنے بوجھل وجود کو کھانسی کے طوفانوں میں سمونے کی کوشش کر رہی تھی، لیکن آج بوڑھے فضلو نے اس سے نہ کہا "اری وہ گانا ہی سنا دے!"

"کونسا؟"

"وہی جو تو اس روز جھولے میں گا رہی تھی!"

فضلو تو اب کہیں اور گم تھا، اس کے کانوں میں تو اب سے بارہ سال پہلے سنے ہوئے وہ فقرے گونج رہے تھے جن میں اس زبوں حال مستقبل کی بشارت دی گئی تھی، پیش گوئی کی گئی تھی۔

"دیوانا ہوا ہے رے کیا۔ وہاں، سرحد پار کوئی نیا خدا بیٹھا ہے تیرے لئے کیا؟"

"بجرگوں (بزرگوں) اور پرکھوں کی کبریں (قبریں) تو ادھر ہیں، کیوں اپنی مٹی خراب کرتے ہو۔"

"تم یہاں کون سے لاٹ صاحب ہو جو وہاں جا کر گبرو بن جاؤ گے!"

"بھوکوں مروگے بھوکوں، فاقہ کروگے فاقہ۔"

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ چلا آیا تھا، بوڑھا تھا، لیکن — "پاکستان کا مطلب کیا؟ — لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" اور "لے کے رہیں گے پاکستان" جیسے گرم نعروں نے اس کے وجود میں آتش سی گھول دی تھی، جوان روح! اور وہ سفر کی صعوبتیں، موسم کی شدت برداشت کرتا، فاقہ کرتا "پاک سرزمین" میں داخل ہو ہی گیا تھا۔ لیکن اس وقت بھی اسے معلوم نہ ہو سکا، یہاں کوئی نیا خدا نہیں۔ اور جب وہ قائدآباد میں آکر سکونت پذیر ہوا تب بھی اسے کسی صبح نو کی امید تھی، جوان عزم اور جوش۔ لیکن آج تو اسے یوں محسوس ہو رہا تھا یقیناً یہاں کوئی نیا خدا نہیں اور وہ فقرے —— ان میں سے ہر ایک میں سچائی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، وہ بھوکوں بھی مرا تھا، فاقے بھی کئے تھے، اور بعض اوقات تو اس کی بوڑھی مضمحل زندگی اس مرحلے تک بھی آ پہنچی تھی جب اس نے شدت سے بے اختیار ہو کر سوچا تھا، یہ تو وہ مرحلہ ہے جہاں آکر بدقسمتی کی ساری حدود بھی دم توڑ دیں گی۔

بارش ختم ہو چکی تھی، لیکن مطلع اب بھی ابر آلود تھا، باہر مینہ کے تھمتے ہی گلی کے بچے ننگ منگ تالیاں بجاتے ہوئے گا رہے تھے:

"کالے میگھا پانی دے! کالے میگھا پانی دے!"

معصوم بچے! بارش کی تباہ کاریوں کے احساس ہی سے ناآشنا، ادھ گلی کی سیلی ہوئی صدیوں کی بوسیدہ فضا میں متفکر بیٹھے ہوئے بابا فضلو کے احساس میں بچوں کے گانے کی صدا نشتر چبھو رہی تھی، کچھ کہے سے لگا رہی تھی۔ گلی کے بچے بابا فضلو سے بہت ڈرتے تھے۔ ایک تو عمر کا تقاضہ دوسرا اس کا ہر لمحہ

کسی سوچ میں غرق رہنے والا انداز جو اس کے چہرے کی کالی جھریوں کو اور بھیانک، پراسرار کر دیتا۔ "جانے بابا فضلو ہر وقت کیا سوچتا رہتا ہے"۔ بچوں کو چھوڑ یہ سوال قائد آباد کے کتنے ہی نوجوانوں کے ذہن میں کتنی ہی بار گونجا ہوگا۔ اس کی بے نام سی سوچ اور آنکھوں کا یہ درد منتشر ہوں۔

جب اس کے احساس کے ایک ایک گوشے میں جاکر یہ کالے میگھ اسے پانی کی خواہش کے تیر پیوست ہو گئے اور جب اس کے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا تو ڈبڈبائی آنکھوں اور دھیمے قدموں سے چلتا ہوا باہر گلی میں نکل آیا۔

"چلو بھاگو شیطانو، نہیں تو ابھی ہڈی پسلی ایک کر دوں گا"۔

بچے بابا فضلو کے غضبناک چہرے کو دیکھ کر جو اب خاصی بھیانک شکل اختیار کر چکا تھا، اِدھر اُدھر بسرعت تتر بتر ہو گئے گرمی سے بولائے ہوئے بچے یہ نہ سمجھ سکے موسم کی یہ فرحت اور تازگی بابا فضلو کو کیوں گراں گذر رہی ہے۔ بابا فضلو کو بچوں سے کوئی خدا واسطے کا بیر تو نہ تھا لیکن اس احساس ہی سے کہ پانی کے پڑتے ہی نشیب میں مہاجروں کی بستی سیلاب کا سا سماں دے گی وہ دور ہی رہنا چاہتا تھا۔ ابھی وہ بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر اپنی بوسیدہ جھگی کی طرف لوٹ ہی رہا تھا کہ گھور گھٹائیں گھر آئیں، بادل کڑکے، بجلی چمکی اور ایک بوچھار چھپ چھپ کرتی بابا فضلو کی سپید ڈاڑھی کے بالوں کو تر کرتی، اس کے کپڑوں میں جذب ہو گئی۔ بچوں کو خوش کرنے کو کالے میگھا نے پانی کی ایک پھوار بھیج دی تھی۔ بابا فضلو نے بڑی بے چارگی سے کالی گھٹاؤں کو دیکھا، اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں..... اب تو جیسے فطرت بھی اس سے مذاق کرنے لگی تھی۔

ہلکی ہلکی پھوار تھم گئی۔ بادل گھر گھر کراتے رہے، اور بادل کی ہر گرج کے ساتھ بابا فضلو کا دل کسی اندرونی خوف سے لرزنے لگتا مطلع ابر سخت ابر آلود تھا، اور باسٹھ سالہ بابا فضلو اپنی بوسیدہ جھگی کو دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ ابکی بار جھگی بنانے کے لئے پیسے کہاں سے آئیں گے۔ ان طویل بارہ سالوں میں اس کے بوڑھے رعشہ زدہ ہاتھوں نے آٹھ بار جھگی کی ان نیم پختہ کچی دیواروں کو استوار کیا تھا، دیواروں ہی پر کیا منحصر ہے، آٹھ بار پوری جھگی کو ان کانپتے ہاتھوں نے نئی زندگی بخشی تھی۔ ہر سال چلچلاتی دھوپ میں تعفن سے بھرپور، گرمی اور گھٹن سے تنگ آکر جب ننھے ننھے بچے دھوپ کی تمازت سے کمھلائے ہوئے جسموں کی خارش اور جلن سے تنگ آکر رل مل کر گاتے "کالے میگھا پانی دے، کالے میگھا پانی دے" تو وہ اس تصور ہی سے لرز جاتا کہ اگر کہیں ان بچوں کی دعا قبول ہو گئی اور بارش ہوئی تو پھر دو تین دن کی بارش ہی نجانے کتنے جھگی نشینوں کو گرمی سے تو نجات دلا دے گی لیکن ایسی تباہی میں مبتلا کر دے گی جس کا کوئی مداوا نہ ہو سکے گا —— اور مداوا ——؟ اس کے گرد تو تباہیوں اور بربادیوں کا ایک جال سا تنا تھا پہلی بار جب اس نے سرحد پار کی تھی جبھی سے مصیبتوں، غموں اور آلام، المناکیوں اور بربادیوں کا ایک ایسا اٹوٹ، مضبوط ایسا طویل سلسلہ چل نکلا تھا کہ اس کی کمر ٹوٹ کر رہ گئی تھی، ادھر ایک مصیبت سے چھٹکارا ملا تو دوسری منہ پھاڑے اسے نگلنے کو کھڑی تھی۔ ان گنت غموں میں سے کس کا مداوا ہو سکا تھا ابھی جو اب وہ امید کرتا۔ اس نے تو اب امید ہی کرنی چھوڑ دی تھی۔ سو میں سے دس امیدیں بھی اگر بار آور ہو جائیں تو نوّے ناکامیوں کو بھول کر انسان پھر ایک سنہری امید کر بھی سکتا ہے مگر سو فیصدی ہی ناکامی ہو تب؟ اب تک تو وہ وعدوں کے سہارے ہی جیتا آیا تھا، کونسا وعدہ پورا ہوا۔ ملک کے بانی کا عزم راسخ، اس کی قوت، اس کا استقلال دیکھ کر وہ سر دھڑ کی بازی لگا کر سرحد پار کر آیا تھا لیکن موت تو وقت اور محل کا انتظار نہیں کرتی۔ وہ جس سے کئی وعدوں کے ایفا کی امید تھی، اس کو موت نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ چراغ بجھ گیا اور قوم نے قائد کے وعدوں کو پورا کرنے کی بجائے اس کا بے جان لاشہ ٹھیک ان ناتواں مہاجروں کے ضعیف شانوں پر لا پٹکا جن کے غم پہلے ہی کونسے کم تھے۔ "لو اب یہی تمہارے غم کا مداوا بنے گا"۔ اور وہ اس مزار کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھ کر اسے سینے سے لگائے رہے۔ اب بھی تو صبح کی امید کی جا سکتی تھی، نئے چراغوں کی! لیکن اس امید کی کرن کو تو خود قوم نے سرخ لہو میں ڈبو کر یاسیوں کے ڈھیر تلے دبا دیا تھا۔ ایک اور لاش، ایک اور مزار، شہر سے دور۔ پھر تو وہ تاریکی پھیلی کہ صبح کی کوئی امید نہ رہی، حالانکہ بابا فضلو اپنے بچپن سے سنتا آیا تھا۔ اندھیرے صبح پر ختم ہو جاتے ہیں! اور ہر نشیب کے بعد ایک فراز بھی مقدر ہے! ٹھیک جس طرح ظلمت کے طلسم کو آنے والی صبح کی پہلی کرن توڑ دیتی ہے۔ یہ عقیدہ تو وہ عقیدہ تھا جس پر بابا فضلو کو اپنے وجود سے زیادہ یقین اور اعتماد تھا۔ لیکن یہ تو سرزمین ہی عجیب تھی، اور یہاں کا نظام؟ بابا فضلو کو محسوس ہوا —— وہ جانے اپنی فضا اپنے ماحول سے نکل کر کسی اجنبی سرزمین میں چلا آیا ہے، بھولا بھولا سا، یہاں آکر تو وہ خود اپنے وجود ہی سے انکار کر بیٹھا ہے۔ یہاں اس کے جھوٹے ہیں کے کس قدر جھوٹے ثابت ہو رہے ہیں اور اس کے عقیدے...... ہر آنے والا یہ یقین دلاتا رہا "ہم اس تاریکی کو دور کر دیں گے" لیکن اب تو وہ چراغ ہی

بجھ گئے تھے جن سے اندھیرے کو دور کرنے کی امید کی جا سکتی تھی۔ اور یوں اندھیرا بڑھتا ہی گیا۔ تاریکی گہری اور گہری ہوتی گئی ——

"کیا سوچ رہے ہو چاچا؟" ٹاٹ کا دبیز مگر پھر بھی اِدھر اُدھر سے پھٹا اور ادھڑا پردہ سرکاتے ہوئے رمضان دودھ والے نے اس کے خیالات کی پرسکون سطح پر آ کر کوئی وزنی سا کنکر اچھال دیا۔ گول گول ننھی ننھی موجیں دائرے کی صورت میں کنکر کی سطح پر معدوم ہوتے ہی اس کے خیالات کی سطح پر ابھر کر تلاطم برپا کرنے لگیں۔ وہ چونک گیا۔ کچھ ایسے جیسے کسی نازک اور اہم مسئلہ پر غور و خوض کر رہا ہو اور چونک جائے۔

"ہنہ! کیا کہا ہے رمضان تو نے؟"

"کچھ نہیں چاچا! بس یونہی پوچھ لیا تھا، کیا سوچ رہے ہو؟"

"ہوں!" وہ بڑے ٹھہراؤ سے بولا "بس یہی سوچ رہا ہوں، جھگی کیسے بنے گی؟"

"چاچا! کیسی باتیں کرتے ہو، ارے ہم جو جوان ہیں، تمہیں کاہے کی فکر ہے!"

"اور دس سال پہلے تو کونسا بچہ تھا رے رمجو! یہ جھگی! تو بارہا گری ہے مگر ان کانپتے ہاتھوں نے ہی انھیں نئی زندگی بخشی ہے!"

اس چوٹ پر رمضان کچھ مضطرب سا ہو گیا۔ فضلو نے کتنا سچ کہا تھا۔ آج تک کتنی ہی بار یہ جھگی گری تھی۔ لیکن ......؟

"چاچا، یہاں کس کے غم کم ہیں!" وہ اپنی صفائی میں بولا "جھگی! چاچا جھگی میں رہنا اب بھی پسند کرو گے؟"

"ہنہ! ارے پگلے تو تو یوں کہہ رہا ہے جیسے ہم اور تم اپنی خوشی سے ہی رہ رہے ہیں نا، کیوں رے" وہ مسکرایا، ایک تلخ مسکراہٹ جس کے ساتھ ہی اس کے احساس کی ساری کڑواہٹ چلی آئی "ہنہ ہنہ ہنہ! بڑے آرام سے ہیں نا یہاں جیسے۔"

اس کا جواب رمضان دودھ والے نے کچھ بھی نہ دیا — اور فضلو اپنی سوچ کے انہیں طولانی گنجلک سلسلوں میں پھر گم ہو گیا۔

اگر آج اس کا راجو زندہ ہوتا تو پورے چھتیس ۳۶ سال کا ہوتا، کڑیل جوان! اور اس کے جوان شانوں کے آسرے بڑھاپے میں یوں اس کی مٹی نہ خراب ہوتی لیکن اس کے راجو کو تو ٹھیک بیس سال کی عمر میں ہی موت کھا گئی تھی، اور اب سے سولہ سال پہلے وہ اس کڑیل نوجوان کو اپنے ہاتھوں قبر کی نامعلوم گہرائیوں میں اتار آیا تھا۔ اگر آج وہ زندہ ہوتا تو جھگی کا غم اسے یوں نہ کھا جاتا۔ لیکن ہائے قسمت! جانے کون سے ان دیکھے ان جانے گناہوں کے کفارے میں قسمت یوں چن چن کر اس سے بدلے لے رہی تھی .... شدتِ اندوہ سے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور آنسوؤں کے اس ملگجے دھندلکے میں دور بہت دور ان دیکھے قبرستان کا وہ منظر گھوم گیا جہاں ایک شکستہ سی قبر میں اس کا کڑیل راجو جوانی کی لاکھوں حسرتیں چھپائے ابدی نیند سو رہا تھا "بزرگوں اور بڑکھوں کی قبریں تو یہاں ہیں، کیوں وہاں جا کر اپنی مٹی خراب کرتے ہو۔" تیزی سے صدائے بازگشت بن کر یہ سوال اس کے ذہن پر ہتھوڑے سے برسانے لگا۔ لیکن اسے بزرگوں کی اور بڑکھوں کی قبروں کا کب اتنا پاس تھا، وہ تو اس ملک کا مطلب لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کے ماسوا کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے چلا آیا تھا، تب اسے شدت سے محسوس ہوا اسے زندگی کی کتنی بڑی غلطی کی تھی اس نے اپنے راجو کو وہاں تنہا سلا کر یہاں چلے آتے ہیں۔

یکایک کھانسی کا ایک شدید دورہ رشیدن پر پڑا، اور اس کا پورا وجود کھانسی کی شدت سے یوں لرزنے لگا جیسے تند آندھی میں کسی صدیوں کے بوڑھے سوکھے ہوئے پتوں سے عاری درخت کا کھوکھلا تنہ لرزے! پاس ہی بیٹھی بتول اپنی ماں کی دھونکنی کی مانند چلتی ہوئی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر اسے دلاسا دینے لگی —— اپنی بیوی کی یہ حالت فضلو سے نہ دیکھی گئی، اور وہ رمضان کے ساتھ اٹھ کر باہر آ گیا۔ جیون مرن کے ساتھی کو یوں تنہا چھوڑ کر باہر آتے سمے اس کا دل تو بہت جلا لیکن اس کے اپنے غم ہی کون سے کم تھے۔ بارش اب تھم چکی تھی، لال دین اپنی کھاٹ گلی میں نکال لایا۔ بابا فضلو اس پر بیٹھ گیا۔ ایک طرف لال دین اور رمضان بیٹھے ہوئے تھے۔ بارش کے تھمتے ہی گلی میں زندگی جو اب سے کچھ دیر پہلے کچھ مبہم کچھ مفقود سی ہو گئی تھی، اب پھر کروٹیں لینے لگی تھی، اور لوگ گلیوں میں نکل آئے تھے۔ کہیں سے شلبجے مستانہ، کھنکھناتا آ پہنچا۔ شلبجے حیدرآباد (دکن) کا تھا، اس کا سن یہی کوئی پینتیس ۳۵، چالیس کا رہا ہو گا، پر سرحد پار کرتے سمے اپنی بیوی کی لاش کو روند کر آتے ہوئے اس کا دل پھٹ گیا تھا، اور اس کا ذہن اپنا توازن کھو بیٹھا تھا۔ پھر جب یہاں آ کر قسامِ ازل نے اس سے اس کے دونوں لڑکے بھی چھین لئے تو اس کے غم اور بڑھ گئے۔ ذہن جو کچھ متوازن سا ہو چلا تھا، پھر ڈگر سے بہک گیا۔ پر شلبجے مستانہ کسی کو کوئی ضرر نہیں پہنچاتا۔ ان غموں کے باوجود وہ بڑا خوش خوش رہتا۔ یا پھر ایسا چپ پڑ جاتا کہ ہفتوں کسی سے نہ بولتا۔ کسی نے روٹی آگے ڈال دی تو کھا لی ورنہ یونہی سہی۔

زندگی سے بیزار ان لوگوں کی گفتگو کی تان مختلف موضوعات سے گزرتی ہوئی شدید بارش اور اس کی تباہ کاریوں اور اپنی زبوں حالی پر آ کر ٹوٹ رہی تھی ـــ اور اپنی محفل میں خوابیدہ سا بابا فضلو ان باتوں میں دلچسپی لیتا ہوا بھی کچھ گم صم سا تھا۔ اپنے اسی روایتی انداز میں بیٹھا کسی سوچ میں گم تھا، وہ اب بھی جھگی سے اٹھتی رشیدن کی دلدوز کھانسی کی آواز سن رہا تھا۔

"بابا ـــ بارہ سال ہو گئے، پر ہم لوگ جہاں تھے وہیں ہیں، یہاں تو حکومت اس طرح بدلتی ہے جوں لوگ میلے کپڑے بدلیں۔ اور ہر آنے والے نے یہی کہا ہم بے گھر مہاجروں کو بسا کر ہی دم لیں گے، لیکن نتیجہ، وہی ڈھاک کے تین پات!" لال دین بڑی افسردگی سے بولا۔

"ابھی کیا ہے! ابھی تو صدیاں گذر جائیں گی اور ہم اپنے ہاتھوں سے بنائی ان غلیظ جھگیوں میں سڑتے گلتے رہیں گے۔"

بابا فضلو کہہ رہا تھا، وہ بابا فضلو جس کو اپنی گرتی، ٹپکتی جھگی کی فکر تھی، رشیدن کی کھانسی اور شادی کے انتظار میں بتول کی سوکھتی جوانی کی فکر تھی ـــ یہ بابا فضلو نہیں بول رہا تھا، زندگی کے ہزارہا تجربات بول رہے تھے۔ یکایک پائنتی پر بیٹھا شاجے مستانہ اچھلا اور بولا:

"ایسی باتیں نکو کرو فضلو بابا۔ صدا حالاں ایک سے نہیں رہتیں، دیکھو نا یہ سبھی لوگاں کیسے ہنٹیں۔ سب اچھے ہنٹیں۔ ہو بابا پھر تم بھی غم نکو کرو سچی بات تو ایچ ہے، اپون خانئے اعظم ہماری سنگت داعدہ کئے تھے نا، بس تو انہوں کا داعدہ یہ سپاہیاں پورا کر کے چھوڑیں گے! اتو، بابا۔ اب ختم بھی کرو نا یہ باتاں!"

اور فضلو بڑے تیقن سے شاجے مستانہ کی گدلائی ہوئی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

"شاجے! میں تیرا غم جانتا ہوں، جانتا ہوں میں تیرا غم شاجے!" بابا فضلو کی آواز بھرا گئی، شاجے مستانہ کی آنکھوں میں سارے زمانے کا درد تھا لیکن ہونٹ پھر بھی مسکرا رہے تھے، یکایک ذہنی رو پھر بہک گئی،

"اجی حضرت! کیا بول کے بولے، شاجے مستانے کو کوئی غم نہیں ہے! اپن کی سمجھ میں تو تمہاری باتاں آتچ نئیں۔ تم تو حضرت خالی پیلی بوٹریاں مارتے بیٹھے ہو ـــ ـــ وہ اور بہک گیا، بہکتا ہی چلا گیا "اماں رشیدہ اور بیٹی بتول کیسے ہیں؟" وہ عجیب بے ربط سی باتیں کر رہا تھا، مستانہ جو ٹھہرا۔ پھر یکایک وہ پائنتی سے اچھلا اور "بابا فضلو زندہ باد" کا نعرہ لگاتا ہوا یہ جا وہ جا۔

"دیوانہ! بیچارہ!" فضلو نے سرگوشی کی۔

گلی میں باتوں کی بھنبھناہٹ سن کر کرم دین سقہ بھی اپنا ہاتھ بھر کا حقہ لے کر گڑگڑاتا آ پہنچا۔ کرم دین کی عمر ابھی زیادہ نہ تھی۔ یہی کوئی تیس پینتیس کے پھیرے میں تھا، اپنی کٹھن زندگی سے، جس نے اس کے وجود کو دیمک کی طرح چاٹ کر اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا، وہ آج بھی مایوس نہ تھا۔ اسے تو اب بھی کسی صبحِ نو کی آمد کا انتظار تھا، وہ صبحِ نو جس کا انتظار کرتے کرتے ان جھگی نشینوں میں سے بیشتر نے اس کی امید ہی چھوڑ دی تھی ـــ حالات صدا ایک سے نہیں رہتے، ان میں تبدیلی ضروری ہے، جلد یا بدیر! ـــ سو یہ وہ یقین تھا جس کے آسرے کرم دین سقہ اپنی زندگی کے ان گنے چنے دنوں کو گھسیٹے جا رہا تھا۔

"اوئے پھجلو! اچھے دن آ رہے ایں، اب تو خوش ہو جا ـــ" پر جب اس نے بابا فضلو کے چہرے کو دیکھا جس پر غم واندوہ کی لکیریں آج کچھ زیادہ ہی نظر آ رہی تھیں تو اس نے اسے دلاسہ دینے کی کوشش کی۔

"اے بھیا" وہ وہاں بیٹھے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا "اے بھیا ہم کہت ہیں کی کا ئدِ اعظم لبعدہ (وا عدہ) کرن تھے کی پاکستان اپن لئے جنت سے کم نہیں ہوگا، پر بھیا ہمیں پوچھو تو ہم ابھن (ابھی) دوزخ میں ہیں ـ اس سے بھلے تو ہم باڈر (بارڈر) پار تھے تنک سوچو تو صموٗ (ہمیں) اکو تو ایک ٹھو کٹی بھی نہیں ملی۔ اپن تو نہ ساون ہرے نہ بھادوں سوکھے۔ پر بابوجی اپنی جورو بڑی جیوٹ ہے۔ میں تو پھجلو سے کہت ہوں کہ تو کیوں روتا ہے؟ میری لگائی کو دیکھو خوب پان کھاتی تھی واں (وہاں) سو وہ بیچ دیا سونے کا کنٹھا ایک گیا تو ڈورا باندھ کر گزارا کر رہی ہے، مگر پھجلو تو آس کھو بیٹھا ہے، یونہی بیٹھا آنسو بہایا کرے گا کیا۔ ارے پھجلو اب تو خوش ہو جا، بھلے دن آ رہے ایں۔"

"جرور، جرور، بارہ سال سے آ رہے ہیں نا جواب آئیں گے کرمو!" فضلو اسی یاسیت سے بولا جو اس کا خاصہ اور حالات کا صریح تقاضہ تھی

تب ایک آتے ہوئے نوجوان شبّو نے بابا کی یہ بات سن لی اور بڑے پُرجوش لہجہ میں بولا:

"بابا اکرم دین ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے، یہ سپاہی ہیں، اور سپاہی اپنے وعدے کے پکے اور اپنی آن پر جان دینے والے ہوتے ہیں!"

شبّو جوان ہونے کے ناطے اپنی شریانوں میں وہ گرم خون رکھتا تھا جو ناسازگار حالات میں بھی سرنگوں ہونا نہیں جانتا۔

"کون جانے کیا ہونے والا ہے!" دمغو، شبّو کی بات کاٹتے ہوئے بڑی مایوسی سے بولا۔

"مگر ابھی کچھ دن پہلے ہی تو چیکن (چیکنگ) ہوئی تھی، بس اکی بار تو ہرا یا ری سمجھو"

یکایک بابا کی بوڑھی آنکھوں میں اب سے کچھ دن پہلے ہونے والی چیکنگ کا منظر گھوم گیا۔ اسے یاد آیا اس نے سرکاری عملے اور سپاہیوں کو دیکھ کر کچھ عجیب یاسیت اور سکون کے ملے جلے انداز میں کرم دین سقّے سے کہا تھا "اوکرمو الو آرہے ہیں گرفتار کرنے، ہاں بھائی سارے جلنے کے بھوگ بھگتنے کو ہیں تو اکیلے رہ گئے ہیں۔ خیر (خیر) ہمیں جیل جانا منظور ہے۔ جیل میں کم از کم پکی چھت نیچے تو رہنے ملے گا، جھگی تو نہیں بنانی پڑے گی" اور کرم دین بڑی امید سے بولا تھا۔

"کیوں جی تھوڑا اکرتا ہے رے پھلو! چنتا مت کر، کھاتر جما رکھ! اس بار گڑبڑی کا اندیشہ نہیں، بس، نِسا کھاتر رہ" اور بابا فضلو اس کے جواب میں اسی قدر بولا تھا: "اے کرمو! اپنی تو بھلی بری جیسی تیسی گجر ہی گئی، اس جھگی ہی میں مریں گے، پر تو اپنی نبیڑ۔"

اور اب اس نے شبّو کی بات کا یوں جواب دیا۔

"پہلے بھی تو جھگی والوں کے کارڈ بنے تھے، تصویریں لی گئی تھیں، چیکن ہوئی تھی، یہ تو بارہ برس میں کتنی ہی بار ہولے ہے شبّو بیٹے! اور پھر وہ اسکول کالج کے لڑکے بھی تو آئے تھے، یہ تماشہ تو روجینہ ہوتا ہی ہے ہماری جندگی میں۔ ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں۔ جو پہلے تھے سو اب بھی ہیں۔ بہت ہوا تو تھوڑے دن بعد حکومت توپ لگا کر ہمیں اڑا دے گی، کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری!"

"پر بابا وہ کہہ رہے ہیں، پہلی اگست کو کورنگی بھیجدئے جائیں گے۔ صدر سے گذر رہا تھا تو اخبار والے چلّا چلّا کر کہہ رہے تھے۔"

"میں تو بس اتنا ہی جانو ہوں! یہ پہلی ہماری تمہاری جندگی میں تو کبھی نہ آئے گی، شاید کبھی آئے لیکن ...." بابا فضلو جانے کیوں چپ ہو گیا اور پھر بولا "میری دنیا تو یہی جھگیوں کی بستی ہے اور یہ دو کبریں جس میں اب تیسری کا بھی اجافہ ہو گیا ہے۔ میں تو ان کبروں کو ہی سینے سے لگائے منوں مٹی نیچے جا سوؤں گا!"

"اتنے مایوس نہ ہو بابا" شبّو یوں بولا جیسے عنقریب اُسے اپنے خوابوں کی تعبیر مل جائے گی۔ اس نے بھی تو ایک پکے گھر کے خواب دیکھے تھے ٹپکتی جھونپڑی کی متعفن فضا سے دور۔۔۔ کہیں ایک چھوٹا سا پکّا سا مکان جس کی چھت چوماسے میں نہ ٹپکتی ہوگی اور جس میں وہ اپنی بتول کو بیاہ کر لائے گا۔ اور پھر وہ ہوگا اور اس کی بتول۔ اور چند سالوں میں یہ گھر کھیلتے کودتے گول مٹول بچوں سے بھر جائے گا۔ وہ اس احساس ہی سے دور رہنا چاہتا تھا کہ اس شب تار کی کوئی سحر نہ ہوگی۔

رُکی بارش، گھور گھٹاؤں، چمکتی بجلی اور کڑکتے بادل کے آنچل تلے پھر تھل تھل برسنے لگی اور کرم دین، شبّو، رحمت علی، لال دین، دمغو اور بابا فضلو سب کے سب کھلے آسمان میں بھیگنے سے بہتر اپنی جھگیوں میں بھیگنے چل دئے۔

باہر شاجے مستانہ اپنی دلدوز آواز میں عجیب ہذیانی انداز میں اکیلا چیخ رہا تھا۔

"بابا فضلو زندہ باد۔ خائد اعظم زندہ باد۔ ہر۔ ہر۔ ہر۔ ہش۔ خائد اعظم۔ ہش!" اس کی آواز ڈوب گئی۔

★

ساری رات مینہ برستا رہا۔

سارا دن پھوار پڑتی رہی۔

ساری شام ساون بھیگتا رہا۔۔۔

اور۔۔۔ ان کے ہمراہ قائد آباد کے ہزاروں بے گھر انسانوں کی محنت اور مشقت سے تیار کردہ جھگیاں فطرت کی الناکیوں اور موسم کی

شدت کا شکار ہوتی رہیں ——

★

وہ جانے کیسی صبح تھی —— ابھی دس ہی بجے تھے اور بابا فضلو اپنی جھگی سے باہر ہی نکلا تھا کہ شبّو ہنستا کھیلتا، مسکراتا، گنگناتا اس کے پاس گیا۔
"لو چاچا —— دیکھو نا میں ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا" وہ "آئے تھے اور پہلی کو کورنگی جانے والے سو آدمیوں میں تمہارا نمبر بھی ہے۔ چاچا —— ہم تو بعد میں آجائیں گے پر تم جا کر ہمیں بھول ہی نہ جانا! —— مبارک ہو چاچا"
اور فضلو کو سوچنے کی بھی مہلت نہ ملی، وہ ہکا بکا رہ گیا۔ پھر تو مبارکباد کا وہ سلسلہ چلا کہ رکنے میں ہی نہ آیا۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا بجز اس کے کہ یار لوگوں نے بڑھاپے میں بھی اسے چین نہیں لینے دیا اور لگے ہیں اُسے بنانے۔ اچھا خاصہ تماشہ کھڑا کر دیا ہے انہوں نے۔
"کیوں بے وقوف بناتے ہو بھائی! بوڑھے آدمی کے ساتھ مخول بازی کرتے ہو" وہ بڑی معصومیت، عجز اور بے چارگی سے بولا۔
"نہیں بابا۔ تمہیں یقین کیوں نہیں آتا، کیا ہم سب جھوٹ بول رہے ہیں؟" شبّو نے بڑے تیقن سے کہا اس کو اعتبار دلانے کو، ادھر شبّو کے پیچھے کھڑے کرمو نے بھی اس کی تائید میں گردن ہلا دی۔
اس میں شلجے بھی تھا۔
"ہو بابا فضلو، شبّو ٹھیک کہے۔ الوں خانڈ اعظم ......! پھر جانے رد کہاں بہک گئی اور "تاک دنا دن" کہتا شلجے بھاگ کھڑا ہوا۔
مگر فضلو کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ اسے یقین آتا بھی کیسے؟ یہ سب یوں اس قدر اچانک ہو جائے گا اور کچھ ایسے وقت میں جب وہ کسی خوشحال مستقبل کی امید ہی چھوڑ بیٹھا ہوگا۔ اسے اس کا تو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ اور چنانچہ وہ رنجیدہ سا بے اعتباری اور حیرت کے ملے جلے احساس کے ساتھ اپنی جھگی میں لوٹ آیا۔
وہ رات اس نے کس تذبذب اور پریشانی میں کاٹی، یہ تو کچھ وہی جانتا تھا۔ بڑھاپے کی کچی نیند اور پھر پریشانیوں کا یہ طویل سلسلہ اور اوپر سے یار لوگوں کی مخول بازی۔ نیند آتی بھی تو کیسے؟ اور رات بھر اپنے بوسیدہ اور نم بستر پر کروٹیں بدلتے بدلتے اس نے صبح کر دی۔ اس نے سوچا، اگر کبھی ایسا سچ مچ ہو گیا تو؟ مگر اس کے تجربات نے ہر بار اس قسم کی ہر امید کا بڑھ کر گلا دبا دیا۔ نہیں یہ ممکن نہیں۔ وہ کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے؟ اور وہ تو سچ مچ اس رات ایک خواب سا دیکھنے لگا تھا جس میں اسے ایک چھوٹا سا پکا سا کوارٹر دکھائی دیا۔ اس میں وہ اور اس کی رشیدن تھی، اور تبول بھی تو جو زرق برق لباس پہنے جوانی کے نشے میں چور اِدھر اُدھر خوشی خوشی گھر میں منڈلا رہی تھی، یکایک اس نے اپنے پکے کوارٹر کی جامد اور سخت دیواروں کی ساخت کا اندازہ لگانے سے چھونا چاہا۔ یکایک اس کی نیند ٹوٹ گئی۔ سندر سپنا بکھر گیا۔ اور اس کا ہاتھ پاس ہی جھگی کی تنکوں سے آراستہ دیوار پر تھا اور کلمے والی انگلی میں ایک تنکا کھب گیا تھا جس کی سوزش سے اس کی نیند ٹوٹ گئی تھی۔ اپنے چاروں اُور حقیقت اور تنکوں کی ان دیواروں کو دیکھ کر اسے اپنے اوپر بڑا رحم آگیا۔ رحم اور ساتھ ہی اپنے پر غصہ بھی، اور اپنی اس خوش فہمی پر اسے مذاق بھی سوجھا۔
"واہ رے واہ! یہ تو وہی بات ہوئی، بلّی کو خواب میں چھیچھڑے نظر آنے لگے ہیں، رہیں جھگیوں میں اور خواب دیکھیں کوارٹروں کے ارے نادان احمق! تو زندگی بھر کسی جامد اور پختہ دیوار کے لمس سے ناآشنا ہی رہے گا" وہ عجیب استہزائیہ انداز میں بڑبڑایا لیکن اس نے تو مدت سے اب ایسے خواب دیکھنے بھی چھوڑ دیئے تھے، مگر آج —— لوٹ کر ایسے خواب پھر اسے کیوں پریشان کر رہے ہیں۔" اسی تگ و دو میں صبح ہو گئی اور زندگی پھر محو کار ہو گئی۔
جولائی کی آخری تاریخ تھی، اور آخری تاریخ ہی پر کیا منحصر ہے، اس بستی کے رہنے والوں کا بجٹ تو ماہ کی بیس تک ہی بمشکل پورا ہو پاتا تھا۔ اور یہ باقی ماندہ دس گیارہ روز کیسے پہلے وہ کس طرح گذارتے تھے، یہ تو کچھ وہی جانتے تھے۔ صبح پہلی ہوگی! لوگوں کے چہروں پر دبی دبی سی مسرت تھی کہ کل گیارہ دن کی طویل بے دلی ختم ہو جائے گی۔
بابا فضلو اپنی چھوٹی سی ٹھیلیا دھکیلتا ہوا قائد آباد کے باہر بڑی سڑک پر نکل آیا۔ اور پھر گرم گرم چھولے اور دہی بڑے کی چاٹ لو" کی صدا لگاتا ہوا بچوں کے اسکول تک آگیا۔ ۱۱ بج رہے تھے اور اسکول میں انٹرول ہو گیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچے اسکول کی حدود عبور کرتے سڑک پر نکل آئے تھے اور وہاں کھڑے خوانچے والوں کا سستا اور گندہ مال خرید خرید کر کھا رہے تھے۔

بابا فضلو روز ہی یہاں آتا تھا۔ انٹرول میں اور پھر جب انٹرول کے ختم ہوتے ہی بچے اپنی اپنی جماعتوں میں لوٹنے لگتے تو وہ بھی اپنی ٹھلیا دھکیلتا ہوا چھٹی کے وقت تک اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا۔ اور ٹھیک چھٹی کے وقت اسکول پہنچ جاتا۔ فضلو کا دھندا ہی یہی تھا، دہی بڑے اور آلو کی چاٹ، گرم چھولے، کھٹے اور پانی پوری ——— اور جب وہ ننھے منے بچوں کو اپنا سستا اور گندہ مال جس پر مکھیاں بھنک بھنک کر اسے آلودہ کر رہی ہوتیں اور ہزاروں مہلک بیماریوں کے ہزاروں جراثیم پھیلا رہی ہوتیں، کھاتے دیکھتا تو اس کا دل اندر سے جلنے لگتا۔ قوم کے یہ معمار ——— یہ گندی چیزیں! لیکن اگر قوم کے معماروں کی صحت کا خیال کیا جاتا تو خود بابا فضلو اس کی رشیدن اور بتول بھوکے مر جاتے۔ وہ صفائی کو دیکھتا یا اپنی زبوں حالی کو! بچوں کے مانگنے پر چاٹ بناتے وقت اس کا دل شدت سے لرزنے لگتا معاً اپنی زبوں حالی کا نقشہ سامنے آتے ہی یہ احساس ہونے لگتا، اگر اس کے اندرونی ہیجان اور اس کے دل میں کیا ہے کا اندازہ ان بچوں نے اس کے چہرے سے لگا لیا تو کیا ہوگا ——— ؟ فضلو تو مر ہی جائے گا، اور اس کا مختصر سا خاندان؟ اور تب وہ جلتے دل پر چہرے کی بناوٹی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے ان بچوں کو زہر مہیا کر دیتا ——— معصوم بچے! انہیں برے بھلے کی تمیز کہاں تھی! بابا اگر غمزدہ ہوتا اور اس کے چہرے پر اس کا اندرونی غم چھلکتا تب بھی وہ کہاں سمجھ پاتے! انہیں تو چٹ پٹی چاٹ بہت پسند تھی۔

انٹرول ختم ہو گیا! لیکن آج بِکری روپے سے زیادہ نہ بڑھ سکی۔ پہلے تو انٹرول تک ہی بابا فضلو دو تین روپے کما لیتا تھا جس میں سے اشیاء کی قیمت حذف کر کے روپیہ بارہ آنے بچ ہی جاتے تھے۔ یہ سوچتے ہوئے کہ شاید چھٹی میں اس کی کسر پوری ہو جائے وہ انٹرول کے ختم ہوتے ہی اپنی ٹھلیا دھکیلتا ہوا دوسری جانب چل دیا۔ لیکن چھٹی میں بھی بِکری ٹھیک نہ ہوئی، بچے حسرت سے اس کے مال کو دیکھتے رہے، پیسے کہاں تھے آج ان کے پاس! مہینہ کی بالکل آخری تاریخ جو تھی نا۔ اور یہ تاریخ دوسروں کو چھوڑ درمیانی اور نچلے طبقے کے لوگوں کی زندگی میں ہمیشہ آتی تھی، اپنی تمام تر شدت کے ساتھ!

شام کو پھر بوندا باندی جاری رہی۔

رات آئی ——— اور پھر ......

..... اندھیرے کے اس طلسم کو توڑنے کے لئے صبح کی جگمگاتی، چمکیلی پوتر دیوی نے روشنی کی ایک کرن پھینکی! ——— لیکن وہ ——— وہ تو سیاہی کی دبیز تہوں میں کہیں معدوم ہو گئی، ایک اور کرن مشرق کی منور جبیں سے پھسلی ——— اور اندھیرے کے سینے میں پیوست ہو کر رہ گئی، پھر ایک اور کرن، ایک اور ——— اندھیرے کسمسائے، گھبرائے، پھر تو کرنوں کا ایک جال سا بچھ گیا۔ اندھیرے چاک ہو گئے اور صبح کی منور دیوی کے لب لعلیں پر ایک بڑی پیاری شیریں اور چمکیلی مسکراہٹ پھیل گئی ———

وہ صبح بڑی عجیب تھی، بڑی چمکیلی، بڑی منور مطلع بالکل صاف تھا، اور کون کہہ سکتا تھا کہ بارش نے اپنی تباہ کاریوں کا سلسلہ کل تک پھیلایا ہوا تھا، وہ تو کچھ نشان ہی ایسے رہ گئے تھے جو گذشتہ بارش کے غماز تھے، ورنہ وہ صبح تو اتنی چمکیلی اور شفاف تھی کہ بارش کا گمان بھی نہ ہوتا تھا۔ اور پھر وہ یکم اگست کی صبح بھی تو تھی۔ اس کی جگمگاہٹ اور معنوی حیثیت تو یوں بھی اور بڑھ گئی تھی کہ آج بہت سوں کو تنخواہ ملنے والی تھی۔

لیکن آج صبح تو خلاف معمول بابا بڑی دیر تک سوتا رہا۔ اس کا ایک ایک انگ درد کی شدت سے ٹوٹا جا رہا تھا، اور جب چمکتی ہوئی کرنوں نے ٹاٹ کا دبیز پردہ اٹھا کر ٹھیک بابا کے چہرے پر یلغار سی کر دی تو وہ کسمسا کر بیدار ہو گیا۔ صبح بڑی چمکیلی اور باہر خلاف معمول بہت شور تھا، یہ معمہ اس کی سمجھ میں نہ آسکا! اس نے رشیدن اور بتول کے چہروں کو گھورا جو جلد جلد سامان باندھ رہی تھیں ——— وہ ابھی کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے اس انوکھے معمہ کو سلجھانے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ باہر سے شبو بھاگا بھاگا آیا، اس کے چہرے پر بڑی مسرت تھی، جیسے اسے اپنے خوابوں کی تعبیر مل گئی تھی، بتول کو دیکھتے ہی وہ بڑے پیار سے مسکرایا۔ اور بتول نے بھی اسے دیکھتے ہی ہاتھ بھر لمبی گھونگھٹ تان لی جس کے پیچھے اندر وہ بھی مسکرا رہی تھی ———

"بابا، بابا" وہ خوش خوش عجیب اضطراری انداز میں بولا جیسے وہ سب کچھ ایک ہی سانس میں بابا سے کہہ دینا چاہتا تھا" بابا، بابا۔ پڑے سوتے ہو، جلدی کرو، باہر ٹرک تیار ہیں، دوسروں کے تو سامان بھی بندھ گئے، جلدی کرو، بس کو رنگی جا پہنچو بابا۔ ارے اٹھو بھی نا" اور وہ بابا کی بوسیدہ رضائی پھینکتا ہوا، بابا کا شانہ پکڑ کر اٹھلاتے ہوئے، مزید کسی بات کا انتظار کئے بتول پر ایک بڑی معنی خیز نظر ڈالتا یہ جا وہ جا۔

"ارے شبو بیٹے، ارے سنو تو، ارے بھئی معاملہ کیا ہے؟" وہ پوچھتا ہی رہ گیا اور شبو ——— وہ تو اس کی آواز کے محدود حلقے کو کب کا پار کر چکا

تھا، تب اس نے مسکراتی بتول سے پوچھا:
"کیوں ری کیا بات ہے؟"
"ابا! آج ہم لوگ کو رنگی بھیجے جا رہے ہیں، جلدی کرو نا ابا!"
"سچ!" اور اس کے ناتواں درد سے ٹوٹتے ہوئے جسم میں ناگہانی کہاں سے اتنی قوت آگئی کہ وہ یہ لمبی قلانچ بھر کر بستر سے کود پڑا اور اپنی اس جلدبازی میں مستقل مسکراتی ہوئی بتول کی مسکراہٹ کی وجہ ہی نہ سمجھ سکا۔ شبتو اور بتول! محبت تو قائد آباد چھوڑ جہنم کی سلگتی آگ میں بھی ہو سکتی ہے اور پیار — پیار انسان کو انسان سے ہو جاتا ہے — کس کی میراث ہے پیار؟
اور جب اس کا ماؤف اور معطل ذہن کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا اور وہ اس مسکراہٹ کی وجہ جان گیا تو اس کی مسرت دگنی ہو گئی ——

باہر بچے مارے خوشی کے ناچ رہے تھے۔
"کالے میگھا پانی دے! کالے میگھا پانی دے!!"
لیکن آج فضلو نے انہیں منع نہیں کیا اور نہ ڈانٹا ہی — بچے اس تبدیلی پر حیرت زدہ سے اور چیخ چیخ کر گانے لگے، ہر شخص شاداں و فرحاں تھا، اور آج برسوں کی افسردگی کے پختہ، پژمردہ رنگ جیسے یکلخت ان کے چہروں سے غائب ہو گئے تھے، کہیں یہ سب خواب تو نہیں، برسوں کے تھکے مضمحل ذہن نے سوچا! لیکن جوں ہی اس نے اپنی انگلی کاٹی — اس کی شدت نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا — خواب — نہیں یہ خواب ہرگز نہیں بعض اوقات تو خواب بھی حقیقت کا روپ دھار لیتے ہیں۔

..... اور کے۔ ڈی۔ اے ٹرک میں بیٹھا فضلو مستقل یہی سوچے جا رہا تھا، آخر یہ سب کس قدر ڈرامائی انداز میں بالکل طلسماتی انداز میں کیسے ہو گیا — ؟

چار میل — اسے تو اپنی سوچ میں وقت اور فاصلے کا اندازہ ہی نہیں رہا، اور جب وہ اپنی سوچ کے اتھاہ ساگر سے نکلا تو ٹرک یکلخت ایک جھٹکے کے ساتھ ٹھہر چکا تھا، اور اس کی نظروں کے آگے بڑی دور تک چمکیلے شفاف کوارٹروں کی یہ لمبی سی قطار کھڑی تھی، سورج کی سنہری کرنوں میں چمکتے ہوئے یہ کوارٹر — بس یوں دکھائی دیتے تھے، جیسے گرد سے اٹے ہوئے پتے بارش کے بعد سورج میں دھلے دھلائے سے جگمگا رہے ہوں! چمک رہے ہوں — !!

وہاں بڑا شور تھا ——
بڑی آوازیں تھیں وہاں! نقرئی، دلفریب، مترنم آوازیں — لوگ بڑے مسرور تھے کسی بھی متنفس کے چہرے پر غم کا ہلکا سا شائبہ تک بھی نہ تھا لوگ جوق در جوق آ رہے تھے۔ ایک سجے سجائے سے کوارٹر کے پاس بڑی بھیڑ تھی، وہاں بڑا شور تھا۔ کہیں سے شبتو بھی نکل آیا۔
"بابا! لوہے کے انسان دیکھو گے؟"
"ہاں۔ ہاں شبتو بیٹے! مجھے دکھاؤ وہ انسان ....." وہ بڑے اشتیاق سے بولا۔
"ہٹ جاؤ — مجھے دیکھنے دو 'انسان' —!" وہ شبتو کے ہمراہ بھیڑ کا سینہ چیرتے ہوئے بولا اور ٹھیک مجمع کے اگلے حصہ میں نکل آیا۔
"ارے شبتو! یہ تو آگرے والے اپنے حافظ جی ہیں!" اسے بڑی حیرت ہوئی، حافظ رحمت اللہ کو نئے لباس میں دیکھتے ہوئے، وہ شبتو سے بولا۔
"ہاں بابا — دیکھو حافظ جی کے قریب جو ایک مسکراتا سا چہرہ ہے نا۔ دیکھ رہے ہو نا وہ، وہ ہمارے صدر ہیں! اور ان کے برابر وہ شخص ہے جس کے عزائم کے آگے فولاد بھی ہیچ ہے، یہ ہیں لوہے کے انسان"۔

مسرت کے آنسو بے اختیار اس کی آنکھوں میں اُمڈ آئے، اس نے مسرت سے چیخنا چاہا، لیکن شدتِ جذبات سے آواز دب گئی، وہ صرف اسی قدر کہہ سکا:

"اس دور میں جب انسان دیکھنے کو بھی نہیں ملتے۔ یہ انسان کہاں سے آ گئے ہیں؟"

اور جب اس نے کوارٹروں کو دیکھا تو:- "ارے یہ تو کچھ خواب والے ہی معلوم ہوتے ہیں رے شبّو!"

"ہاں بابا — خواب کبھی حقیقت میں بھی تبدیل ہو جاتے ہیں!"

اور اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا:

"کالے میگھا پانی دے —— پانی دے!"

اس کے ہاتھ آسمان کی طرف تھے اور شبّو اس کا کندھا ہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا، مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا:

"بابا —— وہ!" دائیں ہاتھ کی کلمے والی انگلی بھیڑ کے ٹھیک درمیان میں کھڑے مسکراتے انسان کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

"بابا —— وہ —— وہ —— بڑی مشکل سے ہوتے ہیں چمن میں دیدہ ور پیدا —"

اور کہیں دور، بھیڑ میں گم —— شلجے مستانہ کہہ رہا تھا۔

"خانِدے اعظم زندہ باد —— صدا حالاں ایکو سی نہیں رہتیں [illegible] بڑی تراوٹ آ رئی اے۔"

★

ہمارے ملک کو کئی اہم مسائل درپیش ہیں مگر مجھے ان دو سے زیادہ کوئی اہم نہیں معلوم ہوتا۔ زرعی پیداوار کی کمی اور آبادی میں تیز رفتار اضافہ۔ یہ دونوں بنیادی مسائل ہیں۔ اگر ملکی ترقی کے دوسرے دائروں میں ہم نے کچھ کامیابی حاصل کر بھی لی تو وہ ان دونوں دائروں میں ناکامی کی تلافی نہیں کر سکتی۔ زرعی پیداوار، بالخصوص غذائی اجناس کی پیداوار میں معقول اضافہ اور آبادی کو مناسب حدود میں رکھے بغیر نہ تو ہمارے کم حیثیت لوگوں کی اہم ضروریات پوری ہو سکیں گی اور نہ ان کی زندگی کا عام معیار ہی بلند ہو سکے گا..... اس لئے ہم جتنی جلد ان پر توجہ دے سکیں اتنا ہی بہتر ہے —

جنرل محمد ایوب خان

(نشری تقریر بہ سلسلہ دوسرا پنجسالہ منصوبہ)

۲۳ر جون ۱۹۵۹ء

★

ماہِ نو، کراچی، اکتوبر ۱۹۵۹ء

سہرے کے پھول

نصرت یٰسین

صبح سے نوری کام کرتے کرتے ہلکان ہوگئی تھی مگر اماں تھیں کہ سوائے ڈانٹ کے بات نہ کرتیں۔ ٹوٹے پھوٹے فرنیچر پر مدتوں سے جمی ہوئی گرد کی تہیں اتارنا کوئی آسان کام نہ تھا لیکن نوری نے صابن سے دھو دھو کر میز کرسیوں کو یوں تیل سے چمکا دیا کہ رفو آپا بھی داد دئے بغیر نہ رہ سکی۔ مگر اماں تھیں کہ کسی طرح مطمئن نہ ہوتی تھیں۔ آتشدان پر رکھی ہوئی تاج محل کی پرانی گرد آلود تصویر صاف کرتے کرتے نوری جمنا کے کنارے پہنچ گئی جہاں جمیل مدتوں سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے گھنگھریالے بال اور عینک میں سے جھانکتی ہوئی منی منی مسکراتی آنکھیں اس قدر قریب محسوس ہوئیں کہ اس کا دم گھٹنے لگا۔

"ارے کمبخت نوری، تو آتشدان ہی کے پاس کیوں جم کر رہ گئی ہے"؟ اماں نے گرجدار آواز سے اسے چونکا دیا۔ نوری نے گھبرا کر دیکھا تو اماں ہاتھ میں دھلی ہوئی چادریں اور میز پوش لئے کھڑی اسے گھور رہی تھیں۔

"توبہ ہے اماں، آپ بھی کیا بات بات پر غضبناک ہو جاتی ہیں" نوری جھلا گئی۔ "یہ اللہ ماری نری جھاڑ پونچھ ہی تو سب کچھ نہیں۔ ابھی ہزاروں کام پڑے ہیں اور مہمان آنے میں صرف دو گھنٹے باقی ہیں۔ تم جلدی سے یہ چادریں بدل ڈالو، میں صندوق میں سے گدیاں نکال کر لے آؤں" اماں بوکھلائی دوسرے کمرے میں چلی گئیں اور نوری بڑبڑاتے ہوئے جلدی جلدی کرسیوں کو ترتیب دینے لگی۔

رفو آپا جوان کیا ہوئی ایک جان کو مصیبت میں ڈال دیا۔ آئے دن کوئی نہ کوئی ٹنٹا رہتا۔ کبھی بی زینا کی خاطر و مدارات ہو رہی ہوتی تو کبھی پیغامات کے سلسلے میں بات چیت کرتے ہوئے ابا کی آواز اسقدر تیز ہو جاتی کہ رفو آپا سہمی سہمی نظروں سے دیکھتے ہوئے ایک سے دوسرے کمرے میں یوں چکر لگانے لگتی جیسے اس میں کوک بھر دی گئی ہے۔ منے بھائی شرارت سے آپا کو دیکھ دیکھ کر مسکراتے تو وہ بیچاری مجرم بنی اداس سی میز پوش لیکر کاڑھنے بیٹھ جاتی۔

ہاشمی صاحب کا گھرانا کسی زمانے میں امارت و عزت کی مثال تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ حالات بدلتے گئے اور باپ دادا کی جائداد صرف چند کاغذوں میں منتقل ہو کر رہ گئی جنہیں اب وہ اکثر فرصت میں نکال کر دل کو تسلی دیا کرتے کہ یہ سب چکر صرف فیصلہ ہونے تک ہے۔ اتنی بہت سی جائداد کے بدلے میں عزت کی زندگی گذارنے کے لئے کیا دو چار دکانیں اور رہنے کو ایک اچھا سا گھر بھی نہ مل سکے گا۔ "آجکل تو انارکلی میں ایک تھڑا بھی مل جائے تو ہزاروں کی آمدنی ہوتی ہے اور ہمیں تو دکانیں ملیں گی دکانیں" ہاشمی صاحب جوش میں زور زور سے حقہ گڑگڑانے لگتے اور بیگم آنسو بھری آنکھوں سے پسینے میں شرابور رفو آپا کو روٹیاں پکاتے ہوئے غور سے دیکھنے لگتیں۔

"پھر میں اپنی رفو کو وہ جہیز دوں گی کہ خاندان والوں کو ایک بار معلوم ہو جائے کہ پاکستان میں ہم کنونڈے بن کر نہیں رہتے" بیگم ذرا سا اطمینان کا سانس لیکر کہتیں۔

روٹیوں کی تھاپ مدھم پڑ جاتی اور رفو آپا چونک کر کہتی۔

"اماں، کیا آپ نے کچھ مجھ سے کہا ہے؟"

"ارے نہیں میں تو نوری کو پکار رہی تھی، کمبخت کو دو گھنٹے سے پنسل ہی نہیں مل رہی"

ہر روز جہیز کی فہرست بنائی جاتی اور اماں اپنی بچا کر لائی ہوئی چند ساریوں اور سہاگ کا جوڑا گنتی کرتے ہوئے بار بار غلطی کر جایا کرتیں۔

ابا جھنجھلا کر پنسل رکھ دیتے۔

"یہ تو سب بعد میں ہوتا رہے گا، پہلے یہ تو بتاؤ کہ لڑکا کس قسم کا ہونا چاہیئے۔ اُسی کے مزاج کے مطابق چیزیں ہوں گی۔ آجکل کے لڑکے تو بیوی کو کپڑے تک اپنی مرضی کے پہنواتے ہیں۔" ابا ذرا موڈ میں ہنستے ہوئے کہتے۔

"واہ واہ! یہ کہاں کی باتیں کر رہے ہو۔ ہمیں تو کبھی اپنی پسند کا جوتا بھی لا کر نہ دیا۔ مرد ذات کے چاؤ چونچلے چار ہی روز کے ہوتے ہیں۔" اماں شکایتوں پر اتر آتیں اور جہیز و بَرکھٹائی میں پڑ جاتے۔

رفو سے اماں کی محبت دوسرے بہن بھائیوں کے لئے خاصی تکلیف دہ تھی۔ بات بے بات وہ بس انہیں کے گن گایا کرتیں۔ اس کے مزاج کی نرمی تو بچاری نوری کے لئے طعنہ بنکر رہ گئی تھی۔ "سلیقے میں تو رفو بیٹا اپنی ماں سے بھی چند قدم آگے ہے۔" ابا شرارت سے اماں کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہتے۔ اور رفو آپا جلدی جلدی باورچی خانے کے برتن سمیٹنے لگ جاتی۔ نوری گھورتے ہوئے ان کے سامنے سے گزرنے کی کوشش میں ہلکا سا رُک جاتی تو رفو آپا بڑے پیار سے کہتی "بھئی نوری کھانا کھا لو ناں۔ آج ارہر کی دال تو تمہارے لئے ہی پکائی ہے۔ جتنی بھی پلیٹ میں رکھی ہے سچ بڑے مزے کی ہے۔"

نوری رفو آپا کی اس نرمی سے بالکل متاثر نہ ہوتی اور غصے میں کھٹا کھٹ الماری سے کھانا نکال کر بڑے بڑے نوالے کھانا شروع کر دیتی۔ رفو آپا آہستگی سے پانی کا گلاس اس کے پاس رکھ کر باہر چلی جاتی۔

"بڑی آئی ہیں فرشتہ سیرت، مکاری سے ابا اماں کی لاڈلی بنی ہوئی ہیں۔" نوری اپنی ننھی سی ناک پھلا کر بڑبڑانے لگتی۔ "ایسی چار سو بیسیاں ہمیں نہیں آتی ناں کہ اماں ابا کو دیکھتے ہی زبان گنگ ہو جائے اور ہاتھ پٹا پٹ چلنے لگیں۔ یہاں تو جو کام ہزار محبت سے بھی کر دو تو بدلے میں وہی ڈانٹ اور پھوہڑپن کے طعنے۔" نوری غصے میں پانی پئے بغیر ہی اٹھ گئی اور دھڑ دھڑ کرتی سیڑھیاں اتر گئی۔

"یہ نگوڑی تو پنجاب میں آکر زینے سے اترنا بھی بھول گئی۔ یوں سینڈلیں چٹخا کر چلتی ہے کہ کلیجہ دہل جاتا ہے۔" اماں نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا مگر نوری نے تو جیسے کچھ سنا ہی نہ تھا۔ منہ پھلائے وہ دروازے میں کھڑی چاٹ خرید رہی تھی کہ خالہ بی آگئیں۔ انہیں دیکھتے ہی نوری زرد پڑ گئی کہ دروازے میں کھڑے ہونے پر خدا جانے اب کیا کیا قصے گھڑے جائیں گے۔ سلام کے جواب میں خالہ بی نے نوری کو محبت سے گلے لگایا۔ اماں کی خیریت پوچھی اور اوپر چلی گئیں۔ خالہ بی کے اسقدر پرشفقت رویے کے متعلق نوری ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ ان کے صاحبزادے جمیل میاں آگئے۔

"ارے نوری یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو؟ اماں کیا اوپر چلی گئیں؟" جمیل نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"جی کیا کہا آپ نے؟ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" نوری بوکھلا کر رہ گئی تھی۔ جمیل نے زوردار قہقہہ لگایا اور نوری سہم گئی۔

"جمو بھائی آپ اوپر چلئے ناں۔ اماں آپ کو......"

"بھئی نوری بس اب بھائی والی کا قصہ سرے سے پاک کر ڈالو۔ اماں تو آج ہی بات کرنے آئی ہیں۔" جمیل نے اسے شرارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

نوری پریشان ہو کر ادھر اُدھر تکنے لگی۔

"آخر کب تک انتظار کروں۔ اب تو سچ پوچھو کسی پل چین نہیں۔" جمیل نے ہنستے ہوئے کہا۔ نوری سُرخ پڑ گئی اور بھاگتی ہوئی اوپر چلی گئی۔

اماں بیٹھی خالہ بی سے خوب گھل مل کر باتیں کر رہی تھیں۔ رفو آپا شربت بنا کر لے آئی۔ اماں حسب معمول آپا کے خوبصورت کاڑھے ہوئے میز پوش، اور گڑیوں کو زیوں کا تذکرہ لے بیٹھیں اور رفو آپا شربت انڈیلتے ہوئے گلاس گراتے گراتے بچی۔ خالہ بی نے اسے ترچھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا "ارے ہاں بھیا، آخر جوان جہان لڑکی ہے اور شادی بیاہ کی تیاریاں تو بہت محبتوں سے کی جاتی ہیں۔"

رفو آپا چپکے سے باہر چلی آئی اور پھر شادی بیاہ کے طویل موضوع سے نوری کا دل بار بار دھڑکنے لگا۔

"یہ جمیل بھی بہت بے صبر ہے۔ اماں جب تک اس رفو آپا کو دلہن نہ بنا لیں گی خالہ بی کا پیغام بھلا کب قبول کریں گی۔ اور انہیں دلہن بننے میں جانے کتنی صدیاں لگ جائیں گی اور ہم سفید بال لئے پٹر پٹر دیکھتے اللہ کو پیارے ہو جائیں گے۔" نوری بیٹھی مسلسل یہی سوچے جا رہی تھی۔

"اے ہے توبہ بجیا، یہ تمہیں رات کو نیند کیسے آ جاتی ہے؟ گھر میں اتنی جوان لڑکی ہو تو بھلا کہاں چین پڑتا ہے۔ میری زہرہ بی تو خیر سے تیرھویں میں لگی تھی تو میں نے جھٹ منگنی پٹ بیاہ کر ڈالا۔ اپنی رفو سے پورے پانچ برس چھوٹی ہے اور ماشاءاللہ تین تین بچے کھیلتے ہیں۔ اب تم بھی کچھ کر ڈالو۔ کیا کوئی پیغام نہیں؟" خالہ بی مسلسل اماں کو کچوکے لگا رہی تھیں۔

"اے بہن پیغام تو ہزار ہیں مگر ان کے ابا کسی کو پسند ہی نہیں کر پاتے۔ ہر ایک میں تو کچھ نہ کچھ کیڑا نکال لیتے ہیں۔ اور پھر سچ پوچھو تو آخر ہماری بیٹی اب ایسی گئی گزری بھی تو نہیں کہ جہاں جو نظر آیا اس کے آگے اٹھا کر پھینک دیا۔ آخر باپ دادا کا خاندانی نام بھی تو رکھنا ہے۔ یہاں پرائے دیس میں کون کسی کو کچھ جانتا ہے۔" اماں نے خالہ بی کو بڑے درد کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کی۔

"اے ہے بجو تم خاندان کی آن لئے بیٹھی رہو اور لڑکی کو کمر جھکوا کر سسرال بھیجنا۔ ابھی سے بچاری کے رنگ روپ پر راکھ اڑنے لگی ہے۔" خالہ بی نے ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ ساتھ کے باورچی خانے میں بیٹھی آپا نے نمناک آنکھوں سے منے بھائی کو دیکھا جو وہاں بیٹھے اسے ترکاری بنانے میں مدد دے رہے تھے۔

"میں تو خیر سے اب اپنے جمو کے لئے بھی تیاری کرنے لگی۔ تین سو روپیہ اسی عمر میں کمانے لگا ہے، گھر نوکر سب سرکاری اور ترقی کا یقین۔" خالہ بی نے شادی کا اشتہار دیتے ہوئے کہا۔

"کہیں لڑکی بھی پسند کی؟" اماں نے اپنی دکھ بھری آواز پر کچھ قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"اے واہ بجیا تم بھی کمال ہی کرو گی۔ بھلا کون ایسے لڑکے کو ہاتھ جوڑ کر بیٹی نہ دے گا۔ لاکھوں میں ایک ہے میرا چاند۔" خالہ بی نے پاس بیٹھی نوری کو اچٹتی نگاہ سے دیکھا جو بظاہر بے توجہی سے سلائیاں بننے میں محو تھی۔ نوری کا دل دھڑک کر رہ گیا اور سلائیوں کی رفتار تیز ہو گئی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ تڑاخ سے خالہ بی کو ایسا جواب دے کہ ایک بار تو وہ سمجھ جائیں کہ لوگ نواں کے کیا ہاتھ جوڑیں گے، ابھی ان کا اپنا لاڈلا ہی اس کی خوشامد کر رہا ہے مگر مارے لحاظ اور جمو میاں کی مسکراتی ہوئی میٹھی میٹھی نظروں کی خاطر چپ چاپ نیز سہتی رہی۔

نوری کو خالہ بی کسی طرح اماں کی بہن نہیں لگتی تھیں۔ معمولی سی معمولی ساری کو وہ اسقدر سجا کر پہنتیں کہ جی پھڑک جاتا۔ ہلکی سی لپ اسٹک کے ساتھ ہی اپنے مقیشی بالوں میں وہ کلپ اور پنیں لگانا تو کبھی نہ بھولتیں۔ اس ڈھلتی عمر میں بھی انہیں ہمیشہ بناؤ سنگھار کا خیال رہتا۔ پیشانی کی جھریوں میں اٹکی ہوئی کریم دیکھ کر تو نوری ہنسی ضبط ہی نہ کر سکتی تھی لیکن خالہ بی کی تیز نظروں سے وہ خوب واقف تھی، اس لئے ٹھکا پڑتے ہی وہ کسی نہ کسی بہانے فوراً باہر نکل جاتی اور پھر گھنٹوں رفو آپا کے سامنے کھڑی ہاتھ چلا چلا کر خالہ بی کی نقلیں اتارا کرتی، مگر رفو آپا تھیں کہ عمدہ سے عمدہ اداکاری پر بھی صرف ہلکا سا مسکرا دیا کرتی اور "چل ہٹ شریر کہیں کی" کہہ کر یوں مصروف ہو جاتی کہ نوری جل کر رہ جاتی اور پاس بیٹھے منے بھائی کا آم چھین کر ندیدوں کی طرح چوسنے لگتی۔ منا بھائی نوری سے بہت عاجز تھا۔ جہاں آپا اسے کچھ کھانے کو دیتیں یہ نوری کمبخت فوراً کہیں نہ کہیں سے حصہ بٹانے آ جاتی اور بچارے منے کی کیا مجال تھی جو وہ انکار کر جائے۔ اگر وہ کبھی بھولے سے اس کی شکایت اماں سے کر دیتا تو وہ یوں ہاتھ نچا نچا کر باقاعدہ لڑنا شروع کر دیتی کہ دیوان خانے سے ابا قلم ہاتھ میں پکڑے غصے میں دندناتے آ جاتے۔ منا سہم کر اماں کے پیچھے کھڑے ہونے کی کوشش میں نوری کو گھورتا جو خوب زور دار آواز میں منے کی زیادتی کے متعلق ابا کو سنا رہی ہوتی۔ اماں منے کی صفائی میں کچھ کہنے ہی کو ہوتیں کہ ابا فوراً بول اٹھتے۔

"یہ سب تمہارا ہی بگاڑا ہوا ہے۔ ہر بات میں اس کی پشت پناہی کر کے تم نے اسے اتنا بدتمیز اور بے غیرت کر دیا ہے کہ اب وہ اتنی بڑی بہن تک کو مارنے پیٹنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔"

نوری کے تین مدھم پڑ جاتے اور رفو آپا چپکے سے نہ جانے کہاں سے آ کر منے کو ہاتھ سے پکڑ کر کمرے سے باہر لے جاتی۔ ابا بڑبڑاتے ہوئے واپس چلے جاتے اور نوری اماں کے خوف سے فوراً اٹھ کر جھاڑو لئے ابا کے سونے والے کمرے کی صفائی میں لگ جاتی۔

"کمبخت نے ایسی اجاڑ دی ہے بد حال ہو کر سارے جہاں پر جھاڑو پھیر کر رکھ دیا ہے۔ میں تو اس لونڈیا کی زبان سے بالکل عاجز آ گئی ہوں" اماں پاگل غصے میں بڑبڑاتی رہتیں اور نوری صفائی میں مگن ہو جاتی۔ ویسے یہ بات تھی بالکل کہ نوری آئے دن نیا جھگڑا لیے بیٹھتی۔ کبھی رفو آپا کے اچھے کپڑے پہن کے گھومتی بھاگی کھڑی ہوتی، کبھی اور مٹھائی ملنے پر آفت مچائے رہتی۔ ابا اس کی طرفداری کی ہلکی سی کوشش کرتے تو اماں غصے میں انہیں مختصر آمدنی کے طعنے دینے لگتیں اور ابا بیچارے اداس سے ہو کر نوری سے حقہ دیوان خانے میں لے کر آنے کا کہہ کر فوراً چلے جاتے اور نئے "کلیم نامہ" کو خوب سوچ سمجھ کر پُر کرنے میں مصروف ہو جاتے۔

خالہ بی کی ملاقاتیں اب زیادہ طویل ہو گئی تھیں۔ اکثر وہ صبح سے شام تک جہان بھر کی باتیں کیا کرتیں مگر ان کا پسندیدہ موضوع ہمیشہ شادی بیاہ ہوتا۔ رفو آپا ان کی آمد سے اور زیادہ مصروف ہو جاتی اور نوری کلیجے میں کئی مرتبہ ابال اٹھنے کے باوجود انتہائی ضبط سے کام لیتی۔ اسے اپنی ہونے والی ساس کے چہرے پر خلوص کم اور خباثت زیادہ نظر آتی تھی۔ منے بھائی سے اس روز خوب دوستی رہتی اور مسلسل اماں کی خدمتوں میں لگے رہنے کی کوشش کرتی۔ خالہ بی باتوں ہی باتوں میں کئی مرتبہ جمیل کے رشتے کے سلسلے میں ذکر کر چکی تھیں مگر اماں سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی کچھ نہ سمجھنے کی کوشش میں تھیں۔ جمیل کو وہ بچپن سے بہت پسند کرتی تھیں۔ اس کی دلچسپ باتیں سن کر وہ گھنٹوں محظوظ ہوا کرتیں مگر یہ سوچ کر اداس ہو جاتیں کہ رفو اس سے پورے تین سال بڑی ہے۔ پھوہڑ، بدزبان اور شوخ نوری تو ان کے ذہن میں کبھی اس سلسلے میں آتی ہی نہ تھی لیکن جمیل تو شاید نوری کی بدتمیزیوں پر ہی ریجھ گئے ورنہ رفو آپا اگر دو چار سال بڑی تھیں تو کیا ہوا اور سب باتوں میں تو وہ اس سے کہیں آگے تھی۔ گندمی رنگ، پرستواں سی ناک اور سیاہ نیم وا آنکھیں بہت دلکش تھیں۔ الجھے الجھے بال ہمیشہ چہرے پر لہرایا کرتے اور کام کرتے کرتے آپا انہیں ذرا سا ہٹاتے ہوئے ٹھنڈی سانس بھر کر یوں مصروف ہو جاتی کہ ان کی موجودگی کا احساس ہی نہ رہتا۔ اداسی اور نکھار کی آمیزش چہرے پر عجیب سی کیفیت پیدا کرتی۔ جب وہ چلتی تو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کہیں سے آ رہی ہے یا کہیں جا رہی ہے۔ چپ چاپ سب کام کرتی رہتی اور نوری کی تلخ سے تلخ بات بھی یوں سہہ جاتی کہ اس کے اس اطمینان سے اسے اور غصہ آ جاتا۔

"اسی چپ میں تو آپ سب کچھ کر کے بھی معصوم بنی رہتی ہیں" نوری کچھ زوردار جواب کے انتظار میں طنز پر طنز کیے جاتی لیکن رفو آپا بت بنی سب کچھ سنتی رہتی اور کام یونہی ہوتے رہتے۔ منا بھائی بیچارا صرف غرا کر رہ جاتا اور موقع پاتے ہی فوراً آپا سے لپٹ جاتا۔ پیاز بگھارتے ہوئے آپا کی آنکھوں سے آنسو تیر کر گردن تک پہنچ جاتے مگر وہ ان سے یوں بے خبر رہتی جیسے یہ آنسو اس کے نہیں کسی اور کے ہیں۔ اس بے تعلقی پر نوری دھیمی پڑ جاتی اور اس کا جی چاہتا کہ وہ دوڑ کر آپا سے لپٹ جائے اور فوراً معافی مانگ لے مگر آن میں وہ بے توجہی سے گھڑے سے پانی کا گلاس بھر کر ایک ہی دم سے پی جاتی اور اطمینان کا سانس لے کر باورچی خانے سے باہر چلی جاتی۔

ساتھ کے کمرے میں اماں رفو کے نئے پیغام کے متعلق دھیمی باتیں کر رہی ہوتیں۔ نوری کچھ سننے اور کچھ نہ سننے کی کوشش میں پاس سے گزرتی ہوئی اماں کے اداس اور غمگین چہرے کو دیکھ کر کڑھ جاتی۔

"بس ایک ہی بیٹی جنی ہے دنیا میں۔ کیا کیا اس کی فکریں لگا کر جان کو ہلکان کر رہی ہیں" نوری پلنگ پر لیٹ کر باقاعدہ چپ چاپ خود ہی سوال و جواب کرتی رہتی۔

ابا کو مشاطاؤں پر قطعاً یقین نہیں تھا۔ ان کے خیال میں دولت بٹورنے کے فن میں بی زینا تو بہت ہی ماہر تھی۔ خود اماں بھی دل میں اکثر یہی رائے قائم کرتیں مگر پرائے دیس میں کوئی جاننے والا نہ تھا کہ پرانی امارت سے ہی متاثر ہو کر پیغام بھیجتا۔ اعلیٰ خاندان کا غرور بٹوارے میں منفی ہو کر رہ گیا تھا۔ اب تو نیچ ذات لوگ کیا کیا بنے بیٹھے تھے۔ ایسے حالات میں اگر وہ بی زینا سے بھی بگاڑ لیتیں تو رفو کو سسرال بھیجنے کی حسرت دل ہی میں رہ جاتی۔ اس لیے باوجود ابا کی مخالفت کے اماں رشتے ناطوں کی سیاست پر خوب گرما گرم بحث کیا کرتیں جس میں مشاطاؤں کے فن پر وہ انہیں چچی بی کی مثال ضرور یاد دلایا کرتیں جو ان کے سسرال میں دور کی رشتے دار تھیں اور بدسلیقہ اور غریب ہونے کے باوجود نوابوں کے خاندان میں بیاہی گئی تھیں اور بقول ان کے "نواب صاحب تھوڑے سے بوڑھے ہیں تو کیا ہوا لاکھوں میں تو کھیلتے ہیں اور چچی بی مہارانی

بنی ہیش کرتی ہیں: "مگر یہ تمہاری بی زینا نے آج تک کون سا کام کا رشتہ بتایا ہے؟" ابا اصل موضوع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے۔

"واہ بھول گئے؛ وہ وکیل صاحب کے بھانجے میں کیا عیب تھا؛ تم نے ہی خوامخواہ بے کار کے عیب نکالے۔ کہ سگریٹ بہت پیتا ہے، ہر وقت یار دوست ساتھ لگے رہتے ہیں، وہ لڑکا ہاتھ سے جاتا رہا۔ سنا ہے اب تو کسی جج نے اسے بیٹی دی ہے" اماں ٹھنڈی سانس بھر کر کہتیں۔

ابا اپنے کہے پر نادم سے ہو کر لیٹ جاتے اور اماں غمگین ہو کر آہیں بھرنے لگتیں۔

"آج بی زینا کو پھر بلاتی ہوں شاید کوئی موزوں رشتہ بتائے اور میری بٹیا کا نصیبا جاگ اٹھے" اماں کسی طرح مایوس نہیں ہونا چاہتی تھیں۔

شام کو منے بھائی ہاتھ میں ستویوں کے زردے کی پلیٹ سفید کاڑھے ہوئے رومال سے ڈھانپ کر بی زینا کے گھر پہنچے۔ بی زینا اس وقت اپنی بہو سے لڑنے میں مصروف تھی۔

"ارے کیا تڑ تڑ کئے جاتی ہے۔ تیری خاطر اور تیرے بچوں کی خاطر دن بھر جوتیاں چٹخاتی ہوں اس بڑھاپے میں جھوٹ سچ کر کے اپنی عاقبت خراب کر رہی ہوں، اس پر بھی تم مجھ سے لڑتی ہو۔ باپ نے تو مجھے پچاس روپے ماہوار کمانے والے کے سپرد کیا تھا۔ دیکھتی اگر آج میرا لال زندہ ہوتا تو تجھے پانچ پانچ سو روپیہ کما کر دیتا اور تو یوں پھول پھول کر بھینس بن رہی ہوتی۔ میں نے تو جو کمایا وہ تجھے لا کر دے دیا؛ جو کھانے کو ملا وہ بچوں کے لئے اٹھا لائی اور جو عمدہ سے عمدہ کپڑا پایا وہ تیرے حوالے کر کے خود چیتھڑوں میں گزر کی۔ آج تک حج کے لئے بھی کچھ بچا کر نہ رکھا مرنے سے پہلے سرخرو ہو لیتی۔ ہائے آج میرا بیٹا زندہ ہوتا تو پھر میں دیکھتی یہ تیری زبان کس طرح قینچی کی طرح چلتی ہے" بی زینا اپنے جواں مرگ بیٹے کو یاد کر کے دھاڑیں مارنے لگی۔

سہمے ہوئے منے میاں سیڑھیوں میں پلیٹ کو مضبوطی سے تھامے کھڑے تھے کہ گلی سے باہر موٹر کا ہارن سنائی دیا۔ بی زینا گھبرا کر اٹھی بقچی ہاتھ میں پکڑی، جلدی جلدی آنکھیں پونچھیں اور جوتی برقع پہن کر سسکیاں بھرتی دروازے پر پہنچی۔ منے میاں نے پلیٹ تھماتے ہوئے اماں کا سلام اور ضروری کام کا پیغام دیا۔ بی زینا نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے دوسری صبح آنے کا وعدہ کیا اور تیز تیز قدم اٹھاتی گلی کے موڑ پر کھڑی کار میں جا بیٹھی۔

رشتے کے ضرورت مندوں میں اس کے بہت سے گاہک موٹروں کاروں والے بھی تھے جو وقتاً فوقتاً اس کے تانگے بسوں کا کرایہ بچا لیتے تھے۔ اسی لئے وہ معمولی گھرانوں کے لڑکے لڑکیوں کی طرف ذرا کم ہی متوجہ ہوتی تھی۔ جتنے زیادہ غریب اتنے ہی زیادہ حریص! "فلاں چیز دلوا دو، ماں کو سونے کے بندے ضرور دیں۔ لڑکا ڈیڑھ سو روپیہ ضرور کماتا ہو، ساس نہ ہو تو انعام میں دس روپے زیادہ" اس قسم کی شرائط بی زینا حتی المقدور پوری کرتی مگر بڑے گھرانوں میں یہ بات نہ تھی، وہاں صرف حسن اور جائداد کی باتیں ہوتیں اور منہ مانگا انعام ملتا۔ بی زینا اپنے کام میں بہت تیز تھی۔ وہ ایک ہی نظر میں سارا معاملہ سمجھ جاتی اور پھر جہاں چاہتی ٹانکا بھر دیتی۔ معمولی غریب خاندانوں کی شریف زادیاں اب اس کی وجہ سے محلوں میں رہ رہی تھیں۔ شرافت، ذات پات اور عمر کی قید جس نے لگائی وہ چپکے سے اس کے معاملے سے ہاتھ کھینچ لیتی اور "سہرے کے پھول کھلنے میں ابھی کچھ دیر ہے" کہکر دعا کرنے لگتی کہ الٰہی سب کو بچے بچیوں کے فرائض سے سبکدوش کر اور پھر وہ اپنے فرض سے یوں سبکدوش ہو جاتی کہ لاکھ بلایئے اور الجھن پر اُدھر کا رخ نہ کرتی۔

اماں نے جب پہلی مرتبہ دس روپے کا نوٹ باتوں ہی باتوں میں چپکے سے اس کے ہاتھ میں تھمایا تو بی زینا نے چونکے بغیر نوٹ کو تہہ کر کے نیفے میں اڑس لیا۔ اِدھر اُدھر کے رشتے ناطوں کا ذکر کرتے ہوئے بی زینا نے اپنی چھوٹی سی بقچی کھولی جس میں کاغذ کے سینکڑوں چھوٹے چھوٹے پرزے بھرے پڑے تھے۔ طرح طرح کی تصاویر ایک کاغذ کے تھیلے میں بند تھیں۔ اماں نے للچائی ہوئی نظروں سے پیغامات سے بھری ہوئی بقچی کو دیکھا اور مسکرا کر بی زینا سے اس کی بہو کی شکایات سننے کی کوشش کرنے لگیں۔ انہیں اس بچاری محنتی بڑھیا سے بہت ہمدردی ہو رہی تھی جو جہان بھر کے والدین کی مشکلات آسان کرتے کرتے خود سب سے بڑی مشکل کا شکار ہو گئی تھی۔ بی زینا نے بہت

تکیے کے نیچے ایک میلا سا سفید کاغذ کا پرزہ نکالا جو نہ جانے کتنی مرتبہ پکڑنے پڑھنے میں گل سڑ کر رہ گیا تھا۔ نوری کو بلایا گیا، وہ شرارت سے مسکراتی، یک ہی آواز پر بھاگتی ہوئی آئی۔ الٹ پلٹ کر کاغذ کو دیکھا اور پڑھنے لگی۔ "نام ایس ایم ادریس؟" "نام تو بہت اچھا ہے۔" اماں نے دل ہی دل میں خوش ہو کر کہا۔

"تعلیم ایف اے" اور اماں کا منہ اتر گیا۔ ان کی رفو گھر پر قرآن مجید پڑھنے کے علاوہ اردو بھی پڑھ لکھ لیتی تھی۔ انگریزی پڑھنے کے لئے ابا نے بہت سر مارا مگر اماں کو یہ میںڈ کوں کی سی ٹر ٹر بہت بری لگتی تھی۔ ساتھ ہی انہیں لڑکی کے بگڑنے کا پورا پورا یقین تھا اسلئے رفو ابھی مشکل سے "سی ڈی" تک ہی پہنچی تھی کہ گھر میں فساد مچ گیا اور ابا، ہمیشہ کی طرح چیخ چلا کر ہار مان گئے۔ مگر اس کا مطلب یہ تو نہ تھا کہ اماں کا داماد صرف ایف۔ اے ہو۔ وہ خود بالکل پڑھنا لکھنا نہیں جانتی تھیں مگر ان کے میاں اس زمانے کے میٹرک تھے جب لوگ پرائمری کر کے تحصیلدار بن جاتے تھے۔ اماں کو اپنی جہالت اور میاں کے اسقدر تعلیم یافتہ ہونے پر بہت فخر تھا کبھی کبھار محفل میں پڑھنے پڑھانے کی بات چلتی تو وہ اپنے سگھڑ اپے کی تعریف میں جہالت کو کامیاب زندگی کی وجہ بتا کر بڑی بوڑھیوں کو خوب خوب خوش کیا کرتیں۔

"لباس انگریزی" نوری یہ پڑھتے ہوئے ہنستے ہنستے لوٹ گئی مگر اماں نے اسے اتنے غصے سے گھورا کہ باقی کی تفصیلات نوری ایک ہی سانس میں پڑھ گئی۔ "گھرانہ نہایت شریف مگر پردے کی پابندی نہیں۔" اماں نے پریشان ہو کر رفو کو دیکھا جو دوپٹے میں لیٹی لپٹائی کاڑھنے میں بالکل محو تھی۔

"تنخواہ معقول اور باپ صاحبِ جائداد" اماں ڈوبتے ڈوبتے اچانک سطح پر آ گئیں۔

اسی شام ہاشمی صاحب اپنے دوست یوسف صاحب سے ملنے گئے جنہیں وہ پچھلے کئی برس سے بھلا چکے تھے۔ ادریس صاحب انہی کے ہمسائے میں رہتے تھے اور بھلا پڑوسیوں سے زیادہ کون سمجھ بوجھ رکھتا ہے۔ اماں شام کو ٹہلتے ٹہلتے ہانپنے لگیں مگر پلنگ پر بیٹھتی ہی تھیں کہ ذرا سی آہٹ پر فوراً اٹھ کھڑی ہوتیں۔ ابا منہ لٹکائے جب کمرے میں داخل ہوئے تو اماں کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ "یا اللہ خیر" اماں بالکل ہولا کر رہ گئی تھیں۔ نوری کو حقہ لیکر آنے کا کہکر ابا آرام کرسی پر دراز ہونے کی کوشش میں جھول کر رہ گئے۔

"کیا ہوا؟ کیسا لڑکا ہے؟ اچھا نہیں۔ کچھ جھوٹ نکلا؟" اماں بے چینی سے سوال پر سوال کئے جا رہی تھیں۔

"میں نہ کہتا تھا یہ مشاطائیں شیطان کی خالائیں ہوتی ہیں۔ ایسی ایسی چکنی چپڑی لگاتی ہیں کہ تم جیسیوں کے بھی کان کتر جاتی ہیں۔" ابا نے اماں کو طنز سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہائے ہائے ایسی کیا بات ہو گئی جو ایک دم پل پڑے ہو۔ اس بڑھاپے میں بھی تمہاری جوانی کی یہ عادت نہ گئی۔ آخر ہوا کیا؟" اماں بے چین ہو رہی تھیں۔

"میں تو یوسف صاحب سے بات کر کے ہی شرمندہ ہوا۔ اور تو جو کچھ بتایا گیا درست بتایا مگر فرق اتنا پڑا ہے کہ تمہاری اس بی زینا کی آنکھ صرف دو سال کے بعد کھلی ہے۔ ادریس صاحب پچھلے دو برس سے بیاہے جا چکے ہیں اور اس وقت ایک عدد بچے کے باپ بھی ہیں" دروازے سے لگی ہوئی نوری نے لمبی سی ٹھنڈی سانس بھری اور حقہ لیکر کمرے میں آ گئی۔ اماں لٹ لٹا کر بی زینا کو کوسنے لگیں۔

"اے واہ بہن خوب پاگل سمجھا تھا ہم لوگوں کو" اماں نے دوسری صبح ہی بی زینا کو پکڑ لیا۔ زینا بی اطمینان سے بیٹھی اماں کی تفصیل سنتی رہی۔

"ہاں جی بی بی میں کب کہتی ہوں کہ اس کی بیوی نہیں۔ اس کی پہلی شادی میرے ہی ہاتھوں ہوئی تھی۔" زینا بی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"تو پھر کیا ہماری بیٹی کو سوت بنا کر بھیجنے کا ارادہ تھا؟" اماں نے ذرا غصے سے کہا۔

"ہائے توبہ کرو بہن، کیسی باتیں کرتی ہو۔ میں بھلا ایسی نیک اور سیدھی لڑکی کو کیوں ایسے جنجال میں پھنسانے لگی۔ بات یہ ہے کہ اللہ میاں کی پہلی بیوی پچھلے چھ مہینوں سے تپ دق لگائے بیٹھی ہے۔ اب تو بالکل آخری وقت آن لگا ہے۔ میں نے سوچا تم لوگوں کی تیاری

ہیں آخر دو چار ماہ تو لگ ہی جائیں گے، اتنے میں بچاری کے دم پورے ہو جائیں گے تو چالیسویں کے فوراً بعد ہی کوئی نہ کوئی رسم کر دیں گے۔ تم جانو بہن، لوگ تو گِدھوں کی طرح منتظر بیٹھے ہیں۔ ایسا اچھا لڑکا اور اتنا ٹھاٹ کا گھرانہ ہر ایک کے نصیب میں نہیں ہوتا؟ زینا بی تعریفوں کے پل باندھنے لگی۔ اماں اداس اور غمگین ہو کر چھالیہ کترنے لگیں۔

اس واقعے کے بعد مہینوں زینا بی کبھی اُدھر نہ آئی مگر اس کے نہ آنے سے تو خیر کیا ہوتا، یہاں خالاؤں، چچیوں اور پھوپھیوں نے آآ کر اسقدر ہمدردیاں کیں کہ اماں کے کلیجے پر پھوڑا بنا دیا۔ "جلدی کرو، ہائے جلدی کرو، کیا سوچ رہی ہو؟" سنتے سنتے اماں عاجز آ گئی تھیں بشب برات آئی تو زینا بی کے ہاں مٹھائی کا سب سے بڑا تھال بھیجا گیا۔ اور پھر دو چار دن بعد ہی بی زینا مسکراتی ہوئی اماں کے پاس بیٹھی نئے پیغام کی تفصیل بتا رہی تھی۔ اماں نے پانچ کا نوٹ ہاتھ میں تھمایا تو وہ اداس سی ہو کر رُک رُک کر مسلنے لگی۔ نقچی کا ڈھکنا جلدی سے بند کر دیا۔ ایک رقعہ اماں کے ہاتھ میں تھمایا اور جلدی سوچنے کی تاکید کر کے چلی گئی۔

ریلوے افسر کی تفصیلات بالکل درست نکلیں۔ نہایت خوش پوش اور اچھے گھرانے کا لڑکا تھا۔ نیک سیرت اور خوبصورت۔ اماں یہ سب بار بار سننے پر بھی کسی طرح مطمئن نہ ہو رہی تھیں۔ اور مسلسل ابا سے پوچھے جا رہی تھیں۔ گھر میں چہل پہل سی ہو گئی۔ اماں بات بے بات مسکرا دیتیں ابا جلدی جلدی کا غذات کا تھیلا لیکر کلیم کی اپیل کے دن گننے لگتے۔

"شکر ہے تم لوگوں کو کچھ پسند تو آیا" بی زینا نے اطمینان کا سانس لیکر کہا۔ "اے بہن آخر کچھ مقابلہ بھی تو ہوتا۔ بیٹی کی شادی پر جگ ہنسائی تو نہیں کروانی تھی"۔ اماں خوشی کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بولیں۔

"تو پھر وہ لڑکی کو کب دیکھنے آئیں؟ ان لوگوں کی طرف سے تو ابھی کوئی سلسلہ نہیں ہے ناں"! بی زینا شوخ شوخ آنکھوں والی نوری کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "ہماری بیٹی میں کون سا کج ہے۔ ضرور دیکھیں، جب جی چاہے آ کر دیکھیں، مگر بھئی بی زینا اطلاع ذرا پہلے سے دے دینا، سو ہر ض مرض ہو جاتا ہے" اماں نے چاروں طرف بکھرے ہوئے ٹوٹے پھوٹے برتنوں اور میلے کپڑوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ سلائیاں بنتے بنتے اچانک رفو آپا کو الجھے ہوئے بالوں کو ترتیب دینے کا خیال آ گیا اور ساری اُون الجھ کر رہ گئی۔

مہمان آنے سے دو روز پہلے ہی گھر کی صفائی شروع ہو گئی۔ بچاری نوری، رفو آپا کو سسرال بھیجنے کے شوق میں کام کرتے کرتے شل ہو گئی تھی۔ اماں احکام جاری کر کے انہیں بار بار دہرا رہی تھیں۔ فلاں چیز پکے گی۔ میٹھا وہ خود تیار کریں گی۔ نوری بالکل سامنے نہیں آئے گی خوامخواہ لوگ اس کی چٹی چمڑی پر ریجھ جایا کرتے ہیں۔ رفو کیا پہنے گی؟ ہاتھ کان میں ضرور کچھ نہ کچھ ہونا چاہیئے۔ منے کے ابا بھی زیورہ کے بندے جا کر لے آئیں۔" نوری یہ سب کچھ مسلسل سنتے سنتے تنگ آ چکی تھی۔ چٹی چمڑی کا طعنہ سنکر اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنی کھال ادھیڑ کر رفو آپا کو بخش دے تاکہ اماں کسی طرح تو اس کی جان چھوڑیں۔

گھر کا نقشہ بالکل بدل کر رہ گیا تھا۔ خالی خالی الماری میں ہمسائے سے منگوایا ہوا پانچ پیالیوں کا ٹی سیٹ سجا دیا گیا۔ اجلے اجلے میز پوشوں اور چادروں نے پرانے سے فرنیچر کو یوں چھپا دیا جیسے زرد مدقوق چہرے پر غازہ مل دیا ہو فرش دھو دھو کر آئینے کی طرح چمکانے سے البتہ ایک نقصان ضرور ہوا کہ اکھڑا ہوا سیمنٹ جا بجا نظر آنے لگا اور نوری اسے دیکھ دیکھ کر الجھنے لگی۔ پسینے سے گرد کی تہہ نوری کے چہرے پر بہنے لگی، وہ کھڑی اپنے میلے سے دوپٹے کے ساتھ منہ پونچھتے پونچھتے دیوان خانے کو آخری نظر دیکھ رہی تھی کہ بی زینا کی باتوں کی آواز آئی۔ نوری مہمانوں کو ایک نظر دیکھنے کے لئے تڑپ اٹھی مگر اماں کا حکم اسے فوراً ہی یاد آ گیا اور اپنی چٹی چمڑی کے یاد آتے ہی تو وہ دیوانی ہو کر باورچی خانے کی طرف بھاگ گئی۔ رفو آپا ہاتھوں میں صابن لگائے خالی خالی نظروں سے دروازے کی طرف کھڑی گھور رہی تھی۔ نوری کو دیکھتے ہی وہ جلدی جلدی ہاتھ دھونے لگی اور اچھی بھلی ترتیب سے رکھی ہوئی چیزوں کو ترتیب دینے لگی۔

مہمان خاتون چمکیلے سے لباس میں نوری کو بالکل خالہ بی لگیں "ساری دنیا کی ساس ایک جیسی ہوتی ہے۔ بندوں کو زبان کے ساتھ ہلانا کیا ضروری ہے؟" نوری دروازے کی درز سے لگی مہمان خاتون کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

بات چیت تو سادہ سی تھی مگر بار بار وہ اپنی کوٹھی اور نوکروں کا ذکر ضرور لے آتیں اور اماں نظر بچا کر مٹی کوٹ کی پھٹی اور لٹکتی ہوئی لیس کو چھپانے میں لگ جاتیں۔ رفو آپا نے اس روز اس غضب کا کھانا پکایا کہ ہمیشہ کے نقص میں اباتک پھڑک اٹھے۔ مل کر برتن چمکاتے ہوئے نوری کا جی چاہتا تھا کہ اتنے بہت سے نوکروں والے گھر جانے والی آپا سے یہ آخری خدمت ضرور کروالے مگر آپا کی محویت دیکھ کر نوری ہلکا سا مسکرا پڑی اور زور آزمائی میں مصروف ہوگئی۔ منے بھائی اپنا عید والا نیا جوتا پہنے چرچر کرتے آ جا رہے تھے اور مہمان خاتون کی تفصیلات بتا رہے تھے۔ کھانے کے بعد رفو آپا نے ہلکے پیازی رنگ کی ساری پہنی، نوری نے بڑے پیار سے اس کے بال بنائے اور نہ نہ ہوتے ہوئے بھی زبردستی ہلکی سی لپ اسٹک بھی لگا دی۔ نوری نے غور سے رفو آپا کو دیکھا تو پل بھر کے لئے واقعی اسے اپنی سفید رنگت سے نفرت سی ہونے لگی۔ سنہرے گندمی رنگ پر ہلکا سا میک اپ کیا غضب ڈھا رہا تھا۔ رفو بھی سجائی یوں نوری کو شرما کر دیکھنے لگی جیسے وہ اس کی نند ہو!

زینا بی آ کر بڑے پہلنے سے آپا کو ساتھ لے گئی۔ نوری دروازے کی آڑ میں کھڑی لجی ہوئی آپا اور مہمان خاتون کو باری باری دیکھ رہی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی اور فیصلے کے تصور سے ہی اسے اپنی منگنی کا خیال آنے لگا۔

"زینا بی کیا چاند سی لڑکی کو تاڑا تھا۔ جی خوش ہوگیا، بہن اور بچیاں بھی ہیں؟" مہمان خاتون نے مسکراتی ہوئی اماں کو چونکا دیا۔

"جی ہاں ایک اور چھوٹی سی بچی ہے، اپنی خالہ کے ہاں گئی ہوئی ہے۔" اماں گھبرا کر بولیں۔ نوری کا جی چاہتا تھا کہ جھٹ سے دروازہ کھول کر سامنے چلی جائے۔ ہمیشہ اماں اُسے جھوٹا اور گپ باز کہتے ہوئے اُسے خوب جلایا کرتی تھیں لیکن آج ان کی ہر بات میں جھوٹ کی کیا بہتات تھی۔ نوری پلٹ کر باورچی خانے میں جا کر ستریوں پہ ہاتھ صاف کرنے لگی۔

رات گئے تک اماں مہمان خاتون سے باتوں ہی باتوں میں ان کے لڑکے کا ذکر چھیڑ کر کچھ خوش ہونا چاہتی تھیں مگر وہ بڑی صفائی سے ٹال مٹال جاتیں اور بی زینا فوراً لڑکے کی تعریف میں قصیدے کہنے لگتی۔ "ایسا خوش مزاج بچہ ہے کہ ہنساتے ہنساتے پیٹ میں بل ڈال دیتا ہے۔" اماں مسکرا کر اپنی سوکھی ہوئی کلائیوں میں طلائی کنگن گھمانے لگیں جو انہیں ناپ میں بہت بڑے تھے مگر زہرہ نے زبردستی پہننے کیلئے بھجوا دیئے تھے۔

"لاہور سے گجرات تک خاصا لمبا سفر ہے، آپ یقیناً تھک گئی ہونگی۔ اب آرام کیجئے ناں؟" اماں انہیں سونے والا صاف ستھرا کمرہ دکھلانے کے لئے بے چین ہو رہی تھیں۔

بی زینا اور مہمان خاتون کو کمرے میں پہنچا کر اماں چمکدار مخملی لحاف کو غور سے دیکھنے لگیں جسے پاکستان میں آنے کے بعد پہلی مرتبہ صندوق میں سے نکالا گیا تھا۔ کمرے میں فنائل کی ہلکی ہلکی بدبو پھیلی ہوئی تھی اور مہمان خاتون نتھنے پھلا پھلا کر سونگھنے کی کوشش میں اماں کو پریشان کر رہی تھیں۔ پانی کے جگ کو رومال سے ڈھانپتے ہوئے اماں کسی اور ضرورت پر تکلف نہ کرنے کی تاکید کرتے ہوئے کمرے سے چلی گئیں۔

رفو آپا برتن سمیٹنے کے بعد پلنگ پر لیٹ گئی۔ دن بھر کی تھکان کے باوجود اس کے چہرے پر اطمینان اور آسودگی تھی۔ کروٹ بدلتے ہوئے خواب میں نوری مسکرا پڑی اور منے بھائی نے ٹانگ الجھا کر کمبل لحاف پر سے اتار کر فرش پر گرا دیا۔ آپا گھبرا کر اٹھی اور میلے سے بوسیدہ لحاف کو پھر اچھی طرح کمبل سے چھپا دیا۔

دیر تک اماں کچھ نہ سوچنے کی کوشش میں مسلسل سوچے جا رہی تھیں۔ کبھی رفو دلہن بنی ان سے لپٹ جاتی اور کبھی ہاشمی صاحب پریشان اور اداس ہاتھ میں فہرست لئے پاس آ کر بیٹھ جاتے۔ چونک کر اماں نے دیکھا تو ابا اطمینان سے سو رہے تھے۔ ان کے حقے کی نے منہ سے نکل کر نتھنوں کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اماں ہلکا سا مسکرا پڑیں اور سونے کی کوشش میں خدا جانے کب تک جاگتی رہیں۔

رفو کا گلا خشک ہو رہا تھا مگر اٹھ کر پانی پینے سے وہ سخت گھبرا رہی تھی۔ "خوامخواہ کسی کی آنکھ کھل جائے تو سمجھے شاید میں بہت بے چین ہو رہی ہوں" آپا نے سوئی ہوئی نوری کو غور سے دیکھتے ہوئے سوچا۔ سرما کی ٹھنڈی راتوں میں اتنی شدت کی

پیاس آپا پہلی بار محسوس کر رہی تھی۔ ڈرتے ڈرتے وہ ہولے سے پلنگ سے اٹھی اور دبے پاؤں باورچی خانے میں جاکر پانی انڈیلنے لگی۔ پچھلے کمرے سے بی زینا کی کھسر پھسر رات کے سناٹے میں صاف تو نہیں مگر سنائی ضرور دے رہی تھی۔ آپا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ "۔۔میری ہی باتیں کر رہی ہوں گی۔ معلوم نہیں میں انہیں اچھی لگی ہوں یا نہیں۔ اتنے خوبصورت اور قابل آدمی کے مقابلے میں بھلا میں کیا چیز ہوں۔" رفو کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ آہستہ سے آگے بڑھی۔ صحن میں سے گزرتے ہوئے اسے اپنا سایہ دیکھ کر خوف سا محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے چوری کرتے ہوئے موقع پر پکڑ لیا ہو۔ چاند دیوار پھاند کر ٹنڈ منڈ بیری کے پیچھے چھپا دیکھ کر اسے ایکا ایکی منے بھائی کا خیال آیا اور وہ گھبرا کر ایک ہی لمحے میں سارا راستہ طے کر گئی اور دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔

"گھرانہ تو اچھا معلوم ہوتا ہے" مہمان خاتون نے ہولے سے کہا۔

"ہاں ہاں بہت شریف لوگ ہیں۔ اب تو آمدنی معمولی سی لگتی ہے مگر کسی زمانے میں اچھے کھاتے پیتے لوگ ہوں گے"۔ بی زینا نے اپنی زوردار آواز پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔ "لڑکی بھی کچھ بری نہیں۔ تو پھر تم رشتہ طے کیوں نہیں کروا دیتیں؟"

"ارے بہن کیا کروں۔ آجکل تو لوگ ہزاروں لاکھوں کی باتیں کرتے ہیں اور یہاں وہ سلسلہ نظر نہیں آتا"۔ بی زینا کی آواز میں ہمدردی سی تھی۔ "مجھے تو تم نے یہاں لاکر پریشان کر دیا ہے۔ اتنے اچھے لوگوں سے یوں دھوکا کرتے ہوئے تمہارا جی نہیں ڈرتا؟ میرا تو حلق سے نوالہ نیچے نہیں اتر رہا تھا۔ کل کو میری اپنی کلثوم بھی جوان ہونے والی ہے۔ توبہ ہے زینا، پھر میں تیری باتوں میں کبھی نہ آؤں گی سچ پوچھو تو خوف کے ساتھ مجھے بہت ترس بھی آ رہا تھا۔ اللہ جوان بیٹی کا بوجھ کسی پر نہ ڈالے"۔ مہمان خاتون کی آواز بھرا گئی۔

"ارے واہ یہ کیا بات بنی۔ تمہارا حصہ تمہیں مل جائے گا۔ دس روپے نقد اور جو خاطر تواضع ہو رہی ہے وہ الگ۔ بہو فساد تو بہت کرے گی مگر یہ جوڑا جو تم پہنے ہوئے ہو وہ بھی لے لینا مجھے ایک شادی کے گھر سے ملا تھا۔ رنڈاپے میں بہو بھلا ایسے کپڑے کہاں پہنے گی۔ بعد کی باتوں کی تم بالکل فکر نہ کرو، میں سب ٹھیک کر لوں گی۔ ہزاروں بہانے پڑے ہیں، کہدوں گی لڑکی پڑھی لکھی کم ہے۔ محنت تو سب میری ہے تمہارا کیا ہے رات کی رات گزار لو، اور چلو چھٹی ہوئی۔ لڑکی تو نہ ان کی کنواری رہ جائے گی اور نہ ہمارا روزگار بند ہو جائے گا۔ یہ سب نصیبے کی بات ہے، پھر تم کیوں گھبراؤ؟" صحن میں سے ایک سایہ بھٹکی ہوئی روح کی طرح گزر کر غائب ہو گیا!

ہندوستان کے خریداروں کی سہولت کے لئے

ہندوستان میں جن حضرات کو ادارۂ مطبوعات پاکستان، کراچی کی کتابیں، ہلال اور دیگر مطبوعات مطلوب ہوں وہ براہ راست حسب ذیل پتہ سے منگا سکتے ہیں۔ استفسارات بھی اسی پتہ پر کئے جا سکتے ہیں۔ یہ انتظام ہندوستان کے خریداروں کی سہولت کے لئے کیا گیا:

"ادارۂ مطبوعات پاکستان، معرفت پاکستان ہائی کمیشن شیر شاہ میس روڈ۔
نئی دہلی۔ ہندوستان۔

منجانب:- ادارۂ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس ۱۵۱ کراچی

★

قدیم ڈھاکہ

(چند جھلکیاں)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مغربی اور مشرقی پاکستان کا ربطِ باہمی پہلے ہی مقدر ہوچکا تھا۔ اگر لاہور میں جہانگیر آسودۂ خواب ہے تو اس کی یاد تازہ کرنے والا نام "جہانگیر نگر" جو ڈھاکہ کا پرانا نام ہے، اشارہ کرتا ہے کہ ہماری مشترک ثقافتی میراث اور باہمی اتحاد و یگانگت کی طنابیں قدیم عہد سے ملی ہوئی ہیں، اور وجودِ پاکستان نے ان رشتوں کو اور بھی مضبوط بنا دیا ہے۔ آج ہم قدیم ڈھاکہ کی جھلکیاں تاریخ و آثار اور ثقافتی میراث کے نمونوں میں ڈھونڈیں تو بڑی مسرت ہوتی ہے اور اپنائیت کا احساس بڑھنے لگتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ لاہور اور ڈھاکہ ایک ہی پھل کی دو قاشیں ہیں۔

۱۹ ویں صدی شروع ہوتے ہی مسلم اقتدار کا زوال شروع ہوگیا تھا بنگالہ خاص طور پر اس کی زد میں آیا کیونکہ یہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کا عمل دخل بہت زیادہ ہوگیا تھا بلکہ ملکی بندوبست میں بھی "کمپنی بہادر" نے باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ اقتدارِ سلطنت کے کھو جانے پر مسلم ثقافت بھی رو بہ انحطاط ہوئی تھی۔ "یارانِ وطن" نے آنے والے وقت کو بھانپ لیا تھا اور انگریزی تعلیم و تمدن سے آشنائی پیدا کرکے مسلمانوں سے کہیں آگے بڑھ چکے تھے۔ مگر خیر، طاقت و اقتدار ابھی بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے بالکل ہی نہیں گیا تھا اور اس دور کی بچی کھچی نشانیاں ۱۹ ویں صدی کے ابتدائی دور میں برقرار رہیں۔

ڈھاکہ بنگالہ کا دارالسلطنت رہا تھا اس لئے بڑا بارونق تھا۔ مگر زوال کے ساتھ آبادی بھی کم ہونی شروع ہوگئی۔ ۱۸۳۰ء میں ڈھاکہ کے ایک انگریز جج اور مجسٹریٹ تھے مسٹر ہنیری والٹرز۔ انھوں نے ۱۸۳۰ء میں پورے ڈھاکہ کی مردم شماری کرائی اور ایک بڑی اچھی رپورٹ یادگار چھوڑ گئے۔ اس رپورٹ کے مطالعہ سے کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً آبادی کا حال کچھ ایسا تھا: مسلمان ۳۵،۲۳۸ — ہندو ۳۱،۴۲۹ اور غیر ملکی ۳۲۲۔ ان غیر ملکیوں میں شاید وہ فرنگی شامل نہیں ہیں جو شہر میں بہت زمانہ سے بسے ہوئے تھے یا انگریزی پلٹنوں وغیرہ کے گورے یا افسر جو وقتاً فوقتاً آتے جاتے رہتے تھے۔ اس مردم شماری سے معلوم ہوا کہ اس وقت ڈھاکہ میں ۱۲۶ ارمنی، ۱۴۴ پرتگالی، ۴۸ یونانی اور ۴ فرانسیسی بھی تھے۔ ۱۸۱۴ء میں ڈھاکہ کے مکانوں کا شمار کیا گیا تھا جن کی تعداد ۲۱،۶۳۱ تھی۔ ۱۸۳۰ء میں یہ گھٹ کر صرف ۱۰،۷۰۸ رہ گئی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آبادی گھٹ رہی تھی۔ لیکن اہمیت کے لحاظ سے یہ شہر پھر بھی بڑا تھا۔ چنانچہ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ "ڈھاکہ اپنی پرانی عظمت کھو چکا ہے، پھر بھی ہم اسے درجۂ دوم کے بڑے شہروں میں شمار کرسکتے ہیں۔ اس کی آبادی اب بھی ڈیون پورٹ اور برسلز سے زیادہ ہے اور پوری آبادی فائف کے ضلعے کے برابر ...."

۱۸۳۰ء میں یہاں دس تھانے تھے جن کے ماتحت ۱۸۷ محلے تھے۔ مسلمانوں کی غالب آبادی گرد قلعہ، بیجیت پور اور پورب دروازہ کی طرف تھی یا پھر ڈھاکہ کٹیرہ کے علاقے میں۔ ہندو زیادہ تر اعلیٰ گولہ، نرائن دیا، شرافت گنج اور اسلام پورہ میں تھی۔ باقی شہر میں ہندو مسلم آبادی ملی جلی تھی۔

والٹرز کو اس بات پر بڑا تعجب ہوا کہ ڈھاکہ میں مرد زیادہ اور عورتیں کم ہیں یعنی مرد ۳۷،۴۲۳ اور عورتیں ۲۹،۲۴۵ تھیں۔ مگر یہ تعجب بیکار ہے پردہ کی وجہ سے مستورات کی صحیح مردم شماری اس وقت ممکن نہ ہوسکی ہوگی۔ بہرحال عورتوں کی زندگی یا تو صحن خانہ میں گزرتی یا کم حیثیت لوگوں میں یہ روزی کمانے میں مردوں کا ہاتھ بٹاتیں۔ ہندو عورتیں جینو کا دھاگہ بٹنے، ٹوکریاں بننے وغیرہ کا کام کرتیں اور مسلمان ٹوپیاں، جامدانیاں، کرتے وغیرہ کاڑھنے میں مصروف نظر آتیں۔ رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس وقت ڈھاکہ میں چند سو گانے بجانے والی عورتیں بھی تھیں، جن میں ۵۲۶ ہندو اور ۲۰۰ مسلمان تھیں۔ ہندوؤں کی نیچ ذات عورتیں دکانوں پر بھی بیٹھتی تھیں اور طرح طرح کے سودے بیچتی تھیں۔ خاص طور پر سبزی اور تیل۔ دھوبنیں تو خیر ہوتی ہی تھیں غرض اس طرح عورتیں بہت سے کاموں میں مردوں کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔

مسلمانوں کی رواداری مشہور ہے مسلم سلطنت کے زمانہ میں ان کا ہندو رعایا کے ساتھ جو سلوک تھا اس کے بے شمار ثبوت موجود ہیں۔ دور کیوں

چاہیئے قدیم مندروں کو ہی دیکھ لیجئے جو ویسے کے ویسے موجود ہیں۔ چنانچہ سترھویں صدی عیسوی میں تعمیر شدہ ڈھاکیشری کا مندر اس کا بیّن ثبوت ہے۔ حد یہ کہ سکھوں تک کے تین گوردوارے خاص ڈھاکہ میں موجود تھے جو "نانک پنتھیوں" کے مندر کہلاتے تھے۔ ایک گوردوارہ شجاعت پور میں تھا۔ نواب عبدالغنی بہادر کے بنائے ہوئے "شاہ باغ" کے عین پائیں ہیں۔ دوسرا جعفرآباد میں تھا، جو آج کل دھان منڈی کے علاقے میں ہے۔ تیسرا گوردوارہ "سکھ سنگت" کہلاتا تھا اور سنگت ٹولہ گلی میں واقع تھا۔

مسلمان چونکہ کثرت سے تھے اور سلطنت کے وارث بھی وہی تھے اس لئے ان کی زندگی کی جھلکیاں زیادہ نمایاں تھیں۔ بنا بریں مسلمانوں کے آثار و معابد کی بھی کثرت تھی۔ اسی لئے ڈھاکہ کو "سات سو مساجد کا شہر" کہا جاتا ہے۔ درگاہیں اور اوقاف بھی یہاں بہت کافی ہیں۔ مذہبی عمارتوں میں "حسینی دالان" یعنی امام باڑہ ڈھاکہ کی خاص تعمیر ہے جو ۱۶۴۲ء میں میر مراد نے بنوایا تھا۔ اس کی دیوار کے پاس نوابینِ ڈھاکہ اور ان کے اہلِ خاندان کی قبریں بنی ہوئی ہیں۔ چوک بازار میں شائستہ خاں کی بنوائی ہوئی مسجد (۱۶۷۶ء) بھی بہت مشہور تھی۔ لال باغ میں بھی ایک بہت بڑی مسجد تھی جو مدت تک نا تمام ہی رہی۔ بڑی مساجد میں چوڑی حاطے کی مسجد جو ۱۶۴۹ء کی بنی ہوئی ہے، کافی کشادہ اور بڑی تھی۔ پولو گراونڈ کے اُس طرف ڈھوکو صاحب کی مسجد بھی مشہور تھی۔ ۱۸۶۰ء تک اس میں ایک اللہ والے بزرگ جو صاحبِ کرامت مشہور تھے، دیکھے گئے۔ مساجد کے علاوہ شہر کی ایک بڑی عید گاہ بھی تھی جو فیل خانہ سے ذرا آگے تھی اور ۱۶۴۰ء میں بنی تھی۔ شاہ مبارک کا مقبرہ (۶۴۲ھ = ۱۲۴۶ء) بھی آماجگاہ عوام تھا۔ یہ بزرگ شاہ جلال سلہٹی کے ساتھیوں میں سے تھے۔ ـــــــ یہ عمارت اب بھی "ایڈن" بلڈنگ کے نزدیک موجود ہے اور اس پر ایک گنبد بھی بنا ہوا ہے جسے نواب سلیم اللہ خاں نے ۱۹۰۹ء میں بنوایا تھا آج کل جہاں ہائی کورٹ بلڈنگ بنی ہوئی ہے اس کے نزدیک حضرت چشتی بہشتی کا مزار تھا۔

جہاں زندگی ہے وہاں زندگی کے ہنگامے بھی ہیں۔ چنانچہ میلہ ٹھیلہ اور تفریح پسندی کے اعتبار سے بھی ڈھاکہ والے مشہور رہیں۔ جس طرح لاہور میں چراغاں کا میلہ اور دوسرے بڑے بڑے میلے ہوتے رہتے ہیں، ڈھاکہ والے بھی اس طرح کے میلے منانے کے بڑے شوقین تھے۔ تقریبات کے سلسلے میں عید اور محرم خاص طور پر منائے جاتے تھے۔ پانچویں محرم سے جلوس نکلنے شروع ہو جاتے تھے۔ ان کے ساتھ اکھاڑوں کا وہی اہتمام ہوتا تھا جو کراچی، ملتان، لاہور وغیرہ میں آج کل دکھائی دیتا ہے۔ ان میں بڑے بڑے استاد لکڑی، پھیری، تلوار، بنوٹ، لکڑی وغیرہ کے کرتب اسی طرح دکھایا کرتے تھے جیسے محرم کے جلوسوں میں شمالی ہند و پاکستان کے موجودہ علاقوں میں اب بھی دکھائے جاتے ہیں، ان جلوسوں میں عقیدت مند ہندو بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ عید کو خاص طور پر منایا جاتا تھا۔ اور بوڑھی گنگا میں رنگ برنگی جھنڈیوں سے سجے ہوئے بجروں اور کشتیوں کی دوڑ بھی ہوتی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد سے ان اجتماعات میں اور بھی رونق ہونے لگی ہے۔

اگر جنم اشٹمی اور درگا پوجا کے تہواروں کی ایک طرف رونق تھی تو دوسری طرف محرم اور عید کے اجتماعات تھے۔

تکلف اور نفاست پسندی کے باب میں بھی ڈھاکہ کے لوگ بڑھے ہوئے تھے۔ مسلم ثقافت کی مخصوص جھلکیاں، جن میں رمضان کی گہما گہمی اور اہتمام افطار و سحر خاص طور پر نمایاں ہیں، جس طرح شمالی ہند کے مسلمانوں میں نظر آتی تھیں اسی طرح ڈھاکہ والے بھی ان پر فخر کر سکتے ہیں۔ رمضان آنے سے پہلے ہی اہتمام شروع ہو جاتے تھے اگر مغربی پاکستان کے لوگ شربت اور لسی کے زیادہ شوقین ہیں تو ڈھاکہ والے بھی رمضان میں طرح طرح کے شربت اور ٹھنڈائیاں تیار کرنے میں قدیم سے مہارت رکھتے ہیں۔ گھروں میں تخم ریحاں، کیوڑہ وغیرہ ڈال کر شربت بنائے جاتے تھے۔ افطار سے عین قبل گھر والیاں صراحیاں ٹھنڈی کرنے کے لئے رکھ دیتیں۔ مرد حقہ تازہ کرنے کا اہتمام کرتے۔ گویا حقہ بھی دونوں جگہوں اسی طرح مقبول ہے۔ گھروں میں طرح طرح کے کھانے حسب توفیق پکوائے جاتے۔ سحری کے وقت جگانے کے لئے لڑکوں کی پارٹیاں گاتی بجاتی آتیں، نعتیں پڑھتیں اور لوگوں کو سحری کے لئے اٹھاتیں جس طرح لاہور، ملتان، پشاور وغیرہ میں لوگ افطار کا اہتمام کرتے، مساجد میں جاکر روزہ کھولتے، غربا کا روزہ کھلواتے ہیں۔ اسی طرح ڈھاکہ والے بھی مسجدوں میں جلد جلد پہنچ جاتے، کشتیوں میں افطاری لگ کر آتی رہتی اور سب مل کر افطار کرتے۔

یہاں کے ہندوؤں کا لباس وہی تھا جو بنگال کے دوسرے علاقوں کا، مسلمانوں کا لباس وہی تھا جو شمالی ہند کے مسلم شرفا کا عام لباس تھا۔ ہندو عورتیں سوتی ساڑھی باندھتیں۔ مرد سر پر ٹوپی نہ پہنتے سوائے اعلیٰ سرکاری عہدہ داروں یا راجوں اور بڑے زمینداروں کے، ہاں مسلمانوں میں ٹوپی

کا رواج عام تھا۔ اگر مغربی پاکستان میں پگڑی طرح طرح سے باندھی جاتی ہے تو ڈھاکہ والے بھی شرعی احترام میں صافہ باندھنا سنت سمجھتے ورنہ قسم قسم کی ٹوپیوں سے سر کو ڈھانکتے تاکہ نماز کے وقت دقت نہ ہو۔ مسلم آبادی میں اچکن عام تھی۔ قبا اور صدری کا بھی رواج شرافت و نجابت کی دلیل سمجھی جاتی۔ ڈھاکہ میں ایسی ایسی عمدہ پگڑیاں بنتیں اور ان پر ایسی کشیدہ کاری ہوتی کہ عرب و ترکستان تک ان کی مانگ تھی۔ مخملی یا سوتی گول وضع کی ٹوپی ہمہ وقت پہنی جاتی۔ یہاں بھی ان ٹوپیوں کو "چوگوشیہ" اور "پنج گوشیہ" ہی کہتے ہیں۔ نہایت باریک ململ کی "کشتی ٹوپی" تو گویا ہمہ شما کے استعمال میں رہتی۔

اونچے طبقہ کی مسلم خواتین کرتا پاجامہ اور غرارہ پہنتیں۔ پشواز کا بھی چلن تھا۔ ساڑھی زیادہ نہ برتی جاتی تھی۔ یہ بعد کی پیداوار معلوم ہوتی ہے۔ ڈھاکہ کی مشہور صنعتیں جیسے ململ، جامدانی، آب رواں، شبنم، کشیدہ اور گلبدن کے ملبوسات مسلمان عورتوں میں زیادہ مقبول تھے۔

جس طرح شمالی ہند کے مسلمان نفیس کھانوں کے شائق ہیں اور انھوں نے کھانے کی چیزوں میں طرح طرح کی اختراعات کی ہیں اسی طرح ڈھاکہ کے لوگ بھی خوش خوراکی کے سلسلے میں چاول، طرح طرح کی روٹیاں، جیسے لاہور اور پشاور وغیرہ میں پکتی ہیں انھیں پٹھان، ترک اور ایرانی آباد کار بنگال تک لے گئے۔ خمیری روٹی کو نان یا تنوری روٹی ہی کہا جاتا ہے۔ کلکتہ کو چھوڑ کر یہ روٹی بس صرف ڈھاکہ میں پکتی تھی۔ "شیرمال" مغلوں کی ایجاد تھی اور اس کی ایک معمولی شکل جو کم استطاعت لوگوں میں مرغوب تھی "ٹپور" کہلاتی تھی۔ "باقرخانی" بھی ڈھاکہ والے خوب بناتے تھے اور پھر ایسی عمدہ بنانے والے وہاں پیدا ہوگئے کہ یہ روٹیاں شمالی ہند تک سوغات میں جانے لگیں یہ شیرمال کی طرح سخت اور ملائم دونوں قسموں کی بنتی تھیں۔ ان روٹیوں پر ڈھاکہ کا مشہور پنیر بھی چیڑا جاتا تھا۔ پنیر تل کر بھی کھانے کا یہاں عام رواج تھا۔ سالنوں میں قورمہ، قلیہ عام پکتے تھے، کوفتے اور کباب بھی اچھے بنتے تھے۔ ڈھاکہ والے چپاتی سے زیادہ واقف نہیں ہوئے۔ سنا ہے نوابین ڈھاکہ میں سے کسی نے ۱۹۰۴ء میں ایک چپاتی پکانے والا بنارس سے بلوایا تھا۔ مگر چپاتی کی کسر پراٹھے نے پوری کردی تھی۔ ڈھاکہ والے قدیم سے بہت باریک اور سات سات آٹھ آٹھ پرت کے نہایت نفیس پراٹھے بنانے میں کمال رکھتے ہیں۔ اور لاہور کے کلچوں کی طرح یہ بھی صبح ناشتے میں بہت مقبول و مرغوب تھے۔ دور دور ان پراٹھوں کی مانگ تھی۔

پلاؤ یہاں بھی اچھے اچھے پکائے جاتے۔ ماہی پلاؤ اور مرغ پلاؤ عمدہ بنتے۔ ہلسا مچھلی، روہو مچھلی وغیرہ کے پلاؤ بہت عمدہ پکاتے تھے۔ خاصہ پلاؤ اور طاہری پلاؤ کو بھی لوگ پسند کرتے تھے۔ عوام پسند کھچڑی تو خیر آئے دن پکتی رہتی۔ تورہ بندی کا رواج مغلوں کے ساتھ یہاں بھی پہنچا۔ ڈھاکہ کے خوش حال گھرانوں میں جب شادی ہوتی تو تورہ بندی کا عام رواج تھا۔ اس میں پلاؤ، کباب اور نانخورش یعنی سالن مثلاً قلیہ، قورمہ یا کوفتے ضرور ہوتے۔ انھیں بڑے بڑے خوبصورت خوانچوں میں سجا کر عزیزوں کے ہاں بھیجا جاتا۔ امارت کے ساتھ ثقافت بھی زوال میں آگئی اور اب لوگ اس نام تک کو بھول گئے، تورہ بندی کرنے کا کسے حوصلہ!

پان سارے مشرقی پاکستان میں بکثرت ہوتا ہے اور پورے برصغیر میں پاکستان کا یہ خطہ اپنے پانوں کی اقسام کے لئے مشہور ہے۔ ڈھاکہ میں لوگ پان کے بہت شوقین رہے ہیں۔ ساچی یا میٹھا پان زیادہ چلتا تھا اور اب بھی چلتا ہے۔ پان کی گلوریوں کو "کھی لی" کہتے ہیں۔ پان کی "کھی لی" بنانا اور پیش کرنا مسلم خواتین کے سلیقہ اور خوش ذوقی کی علامت مانا جاتا تھا اور ان کی معاشرتی حیثیت زیادہ تر اسی سے جانچی جاتی تھی۔

مرفہ الحال مسلمان یا تو نوابین ڈھاکہ سے منسلک تھے یا خود بڑے تاجر اور زمیندار تھے۔ آخری نواب ڈھاکہ، نواب غازی الدین تھے۔ ان کے ہاں بڑے بڑے عہدوں پر مسلمان فائز تھے مگر بعض شعبے، خاص کر انتظامی اور حسابی کارخانے ہندو منشیوں اور متصدیوں کے رحم و کرم پر تھے۔

ڈھاکہ کی ململ ساری دنیا میں مشہور تھی۔ ہر سال یہاں کے کاریگروں کو پچیس پچیس لاکھ روپے پیشگی وصول ہو جاتے تھے۔ یہاں کے ململ بنانے والوں سے زیادہ وہ "تانتی" مشہور تھے جو آنکھ سے نہ دکھائی دینے والا ڈورا ان ململوں کے لئے بناتے تھے۔

مسلمانوں کی تعلیم مکتبوں اور مدرسوں میں ہوتی تھی اور مسلمانوں میں تعلیم کا عام رواج تھا۔ ہندو پاٹھ شالاؤں میں پڑھتے تھے۔ ۱۸۶۰ء تک انگریزی وضع کے صرف تین اسکول ڈھاکہ میں تھے اور یونیورسٹی کی قسم کی کوئی چیز اس وقت تک موجود میں نہیں آئی تھی۔ نئی تعلیم کی سب سے پرانی درسگاہ "ڈھاکہ کالج" تھا جو ۱۸۴۱ء میں قائم ہوا۔

★

مری کے سائے میں

قدیر نعیمی

راولپنڈی کے قریب بلند پہاڑوں کے دامن میں ہرا بھرا سبزے سے لہلہاتا پوٹھوار کا دیس ہے۔ یہاں جب مکئی پھولتی ہے تو دور دور تک سبزہ ہی سبزہ دکھائی دیتا ہے۔ پہاڑوں سے آنے والی خنک ہوا جب اس کی سنہری سنہری بالیوں کو گدگداتی چلتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سبزہ زاروں کی شہزادیاں اپنے سنہرے بالوں کو سکھا رہی ہوں۔ ایسے میں اس دیس کی الہڑ دوشیزائیں کبھی چاندنی راتوں میں آنکھ مچولی کھیلتی ہیں، کبھی شیشم کے درختوں پر جھولے ڈالے جاتے ہیں اور مینہ کی رم جھم پر لوک گیتوں کی مٹھاس فضا کو رومانوی بنا دیتی ہے۔ اور کبھی کہیں دور چرواہا کسی چشمے کے کنارے، درخت کی جڑ سے ٹیک لگاکر، بانسری پر سُریلی تان بجاتا ہے تو کسی کی شرمیلی آنکھیں بارِ حیا سے اور جھک جاتی ہیں، گالوں پر گلال بکھر جاتا ہے، چُنری ڈھلک جاتی ہے، دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں، اور لب کچھ کہنے کے لئے کپکپا کر رہ جاتے ہیں۔ یہ اس دیس کی چھوٹی چھوٹی تصویریں ہیں۔
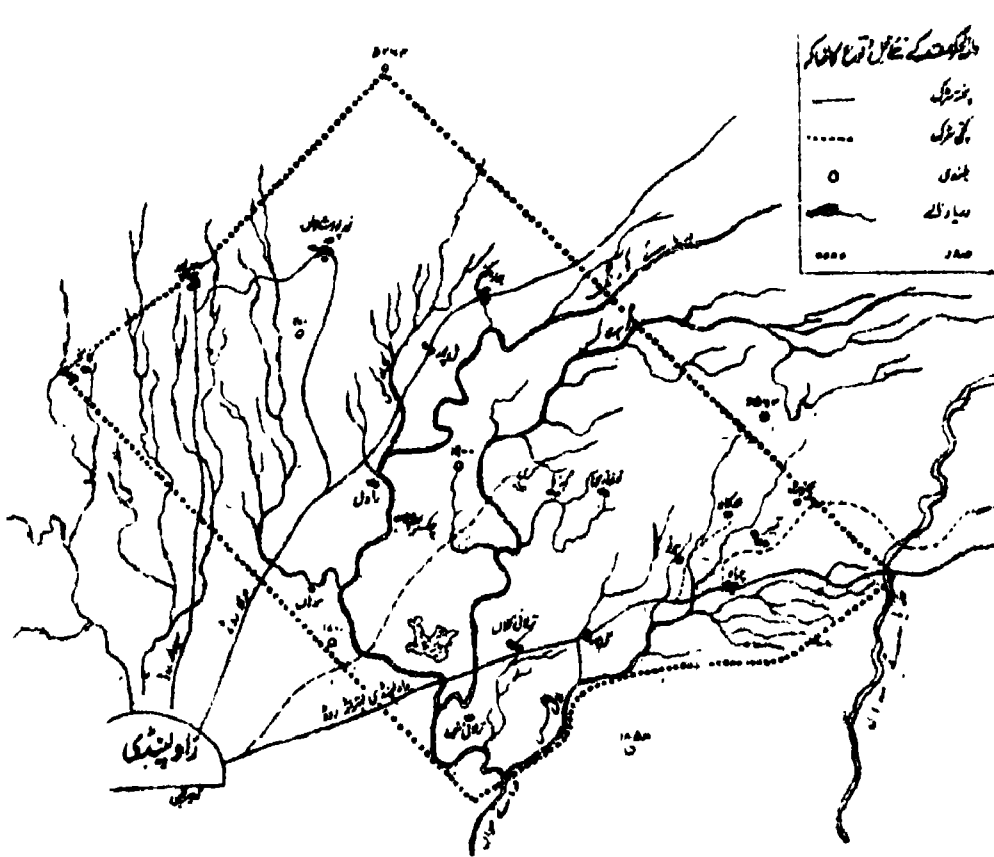
اس دیس میں صدیوں سے رومان پلتے آئے ہیں۔ آبادیاں بستی رہی ہیں، اجڑتی رہی ہیں، راج پاٹ قائم ہوئے اور یہیں کے چشموں کے پانی کی طرح وقت کے دھارے پر بہہ کر کہیں دور فنا ہوگئے! وقت کا مہیب چکر چلتا رہا، تاریخیں بنتی رہیں اور آج ہمارے ملک کی تاریخ کے صفحات اس علاقے کے تذکروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ اگر ہم کچھ دیر کے لئے ماضی کی طرف لوٹ جائیں تو بہت سی قدیم گذرگاہوں پر ہمارے آباؤ اجداد کے ان گنت نقشِ پا نظر آئیں گے جنہیں زمانے کی گردش نے ہزاروں من مٹی کے نیچے دفن کر دیا ہے اور اگر ہم یہ مٹی ہٹا سکیں تو "سرکپ" (ٹیکسلا) جیسی بستیوں

کے مٹے مٹے خدوخال ابھر آتے ہیں۔ ٹیکسلا کا علاقہ قبل از تاریخ دور کی انتظامیہ اور سپاہیانہ اہمیت کی مبہم سی یاد دلاتا ہے۔

وسط ایشیا سے سرزمین ہند میں آنے والے سیاحوں تجارتی قافلوں اور حملہ آوروں کا صدیوں یہی راستہ رہا ہے جس پر ٹیکسلا واقع تھا۔ پھر اس کے قریب ہی راولپنڈی آباد ہوا۔ وسط ایشیا سے ہند و پاک میں آنے کے لئے شمال مغربی پہاڑی سرحدوں کی وجہ سے آنے والے کو مختلف قدرتی دروں سے گزرنا پڑتا تھا چنانچہ کابل سے جلال آباد اور جلال آباد سے خیبر، ٹیکسلا، راولپنڈی، سیالکوٹ، لاہور اور پھر دہلی۔ یہی راستہ سب سے زیادہ استعمال ہوتا رہا۔ موجودہ گرینڈ ٹرنک روڈ تقریباً ان ہی مقامات سے گزرتی ہے۔ اس شاہراہِ عظیم کے متعلق تاریخی ثبوت اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ یہ بہت پہلے چندر گپت موریا کا پشاور سے پٹنہ تک شاہی راستہ تھا جسے بعد میں شیر شاہ سوری نے کلکتہ تک بڑھا کر از سرِ نو تعمیر کرایا اور سڑک کے دو رویہ سایہ دار درخت لگوا کر اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سرائیں بنوا کر مکمل کیا۔ یہ راستہ کچھ اس لئے اہم ہے کہ مغربی علاقے میں یہ سب سے شوالک حصہ سے ملا ہوا ہے جہاں دریا آسانی سے عبور کئے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ اس راستہ پر ٹیکسلا اور راولپنڈی اپنے علاقے کے قدیم اور اہم مقامات ہیں۔

اگرچہ یہ سرزمین اپنی ہزار سالہ تاریخ کی وسیع آغوش میں چار مختلف تہذیبوں کو سمیٹ کر خاموش ہے لیکن کہیں کہیں مختلف قسم کی بود و باش کے نشان اور کھنڈروں کی ہیئت چار بار اجڑنے اور بسنے کے افسانے سناتی دکھائی دیتی ہے۔ ٹیکسلا کی عمارتوں اور آبادیوں کے وہ ٹوٹے پھوٹے منقش اور دیواریں انقلاب زمانہ کی نوحہ خواں ہیں۔ یونانی، بدھ مت اور کئی دیگر تہذیبوں کے مٹے مٹے نشان اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ علاقے اپنے ادوار میں ہمیشہ مرکزی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ راولپنڈی سے تقریباً ۴ میل جنوب میں نکیالا اس علاقہ میں ایک اور قدیم مقام ہے۔ بدھ مت کی روایات اور کچھ کھنڈروں کی ساخت کی بنا پر اسے بھی بدھ مت کے عہد سے متعلق کیا جاتا ہے۔

راولپنڈی بذاتِ خود ایک قدیم مقام ہے۔ ایک مشہور و معروف ماہرِ آثارِ قدیمہ اے۔ کننگھم اس کو قبل مسیح کے ایک بھٹی قبیلے کی جائے رہائش بتلاتے ہیں۔ جب اس کا نام گاجی پور یا گاجنی پور تھا۔ کسی طرح یہ محمود غزنوی کے قبضہ میں آیا اور کچھ عرصہ بعد پھر اس نے گھکڑ قبیلے کو عطا کر دیا۔ گھکڑ قبیلے کے ایک سردار جھنڈا نے اس کا نیا نام راولپنڈی رکھا۔ یہ نام راول سے متعلق ہے۔ راول راولپنڈی سے شمال میں چند میل کے فاصلے پر کسی زمانے میں اپنے وقت کی بہت خوشحال بستی تھی جو کہ اب بھی پنڈی مری روڈ پر واقع ہے ۱۷۶۵ء کے بعد سردار ملکا سنگھ کے زمانے میں راولپنڈی شاہراہ ترقی پر گامزن تھا۔ انگریزوں کے تسلط کے بعد ۱۸۴۹ء میں یہ اپنے ہی نام کے ڈویژن کا صدر مقام قرار پایا اور پھر اپنی جغرافیائی اہمیت کی وجہ سے رفتہ رفتہ ہندوستان کی بڑی چھاؤنی میں شمار ہونے لگا۔

قدرت انسان کو بہت سی ممکنات عطا کرتی ہے اور انسان اشرف المخلوقات اور عالم و عاقل ہونے کے سبب بہترین شے، بہترین جگہ اور بہترین حل چن لیتا ہے۔ انسان کی بالغ نظری اپنی ضروریات کے مطابق حالات کو تبدیل کر لیتی ہے۔ ڈارون کا نظریۂ ارتقا مزید تصدیق کرتا ہے کہ جاندار پہلے خود کو ماحول کے مطابق ڈھالتا ہے، پھر ضرورت کے تحت حالات کو بھی تبدیل کر لینے کی اہلیت رکھتا ہے۔ انسان چونکہ سب سے ذہین واقع ہوا ہے اس لئے وہ یہ کام اور بھی زیادہ خوش اسلوبی اور مہارت سے انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

یہ فیصلہ کہ حکومت کا نیا مرکز راولپنڈی کے قریبی علاقے میں بنایا جائے کچھ تو اپنی جگہ پر کشش ہے اور کچھ اس خوشگوار فضا کی بنا پر جس کا نقشہ اور پرمیشن کیا گیا ہے یہ اس بات کی بھی یاد دلاتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے۔ راولپنڈی اور ٹیکسلا کا علاقہ ایک مدت تک اس سرزمین میں بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے مگر گردشِ افلاک نے مدتوں اسے ماضی کی داستانِ پارینہ بنائے رکھا اور اب ایک طویل عرصہ کے بعد ملک کا مرکز اسی تاریخی علاقے کی طرف منتقل ہو رہا ہے جہاں کی آب و گل تہذیبوں کی جنم داتا رہی ہے۔

نئے وفاقی دارالحکومت کا رقبہ تقریباً دو سو مربع میل ہے اور سرحدی مقامات کو سیدھی لکیروں سے ملانے پر علاقے کی شکل بگڑے ہوئے متوازی الاضلاع کی طرح بنتی ہے۔ انتہائی بلندی ۴۲۶۵ فٹ اگر ہم راولپنڈی سے اُتریں تو ہمارے داہنی طرف نالہ ملال کس حد بناتا ہوا چلتا ہے، پھر کچھ دور اوپر دریائے سواں حد بندی کرتا ہوا مجوزہ علاقے کے جنوب مشرق میں اُتر روڈ کے نیچے

سے گزرتا ہے۔ شمال مغربی سمت میں موضع کا کنجر بھی اس علاقے کی حد ہے۔ کا کنجر سے نور پور سید پور ہوتی ہوئی یہ سرحد علاقے کے انتہائی بلند مقام یعنی ۵۲۶۴ فٹ پر جا ملتی ہے۔ راولپنڈی روڈ اس علاقے کے تقریباً درمیان سے گذرتی ہے۔

نئے دارالحکومت کا یہ محلِ وقوع مختلف قسم کی ٹوٹی پھوٹی اور نیم کوہستانی زمین پر مشتمل ہے۔ ضلع راولپنڈی میں یہ نیم کوہستانی پوٹھوار کا علاقہ دو ذیلی میں منقسم ہے۔ (ا) کہا ــــ یہ علاقہ کہیں مری کی زیریں پہاڑیوں کے درمیان اور کہیں اُن سے مل کر چلتا ہے۔ اس علاقے میں بارش کافی ہوتی ہے۔ علاوہ بریں قدرتی چشموں کی افراط ہے۔ (ب) کانڈھی ــــ یہ علاقہ راولپنڈی سے کہوٹے تک پھیلا ہوا ہے۔ اس حصہ میں جا بجا کم سخت ریتلے پتھر (SOFT SAND STONE) کی پہاڑیاں ہیں۔ راولپنڈی کے قریب علاقے کے مغربی حصہ میں نہایت زرخیز اور عمدہ میدان ہیں۔ کہیں کہیں چھوٹی پہاڑیاں بھی ہیں اور شمال کی طرف کوہ مری کی کچھ چٹانیں ایسے لگتی ہیں جیسے وہ سبزہ زاروں کے نظارے کے لئے زمین میں سے سر نکال کر جھانک رہی ہوں۔ یہ حصہ شروع سے آخر تک نہایت سرسبز اور ہموار وادیوں پر مشتمل ہے اور خانہ بدوشوں کے بے ترتیب خیموں کی طرح وہاں یا دامی مخروطی پہاڑیوں اور چٹانوں میں گھرا ہوا ہے۔

راولپنڈی اور پہاڑوں کے درمیانی علاقے میں مری روڈ اور لہتراڑ روڈ کے درمیان کا حصہ مقابلتاً زیادہ ہموار ہے۔ اس میدان کے مشرق میں مری کی زیریں پہاڑیاں اور کہوٹے کے پہاڑوں کے جنوب میں پتھریلی پہاڑیاں پوٹھوار کے اس علاقے کو وادیوں اور ریتلی مٹی کی سطح مرتفع میں تقسیم کرتی ہیں۔ راولپنڈی کے جنوبی علاقے میں دریا اور نالے عجیب شان سے لہراتے بل کھاتے گزرتے دکھائی دیتے ہیں۔

اگرچہ اس سارے علاقے کا بیشتر حصہ اونچی نیچی زمین اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر مشتمل ہے لیکن تعمیر کے وقت انسان کی ذہانت یقیناً ان قدرتی حالات سے فائدہ اٹھا کر حد درجہ خوشگوار اور خوبصورت شہری مناظر پیدا کر سکتی ہے۔

دارالحکومت کا یہ نیا محلِ وقوع سطح مرتفع پوٹھوار کے شمال مشرقی حدود تک اور کوہ مری کی جنوبی حدود تک پھیلا ہوا ہے۔ اس متوازی العمود کی شمالی اور مغربی حدیں پہاڑی ہیں۔ زمین تقریباً جنوب سے شمال کی طرف ۱۷۰۰ فٹ سے ۵۲۶۴ فٹ تک بتدریج بلند ہوتی چلی گئی ہے۔ اس علاقے میں بے شمار چھوٹے چھوٹے برساتی نالے بھی موجود ہیں۔ جن کی ڈھلوان گہرائی عموماً سطح زمین سے ۲۰ سے ۴۰ فٹ تک ہے۔ شمال مغربی حصہ میں فی الحال دو پختہ سڑکیں ہیں۔ ایک راولپنڈی سے سید پور دوسری نور پور شاہاں سے چلتی ہے جو مری روڈ پر اڈل کے قریب آکر مل جاتی ہے۔ نور پور شاہاں اور سید پور کو بھی ایک پختہ سڑک ملاتی ہے۔ مجوزہ علاقے کے شمال مشرق میں متعدد دریائی وادیاں اور پہاڑیوں کا سلسلہ ہے جن کا رخ مغرب سے مشرق کی طرف ہے اس حصہ کی زمین کا ڈھال جنوب مشرق سے شمال مغرب کی طرف ہے اور زمین کی بلندی ۱۷۰۰ فٹ سے ۲۰۰۰ فٹ کے اوپر تک چلی گئی ہے۔

وفاقی دارالحکومت کے اس علاقے کا ایک تہائی جنوبی حصہ غیر ہموار ہے جس میں کہیں کہیں کٹی پھٹی زمین شامل ہے۔ سب سے وسیع اور ہموار میدان راولپنڈی کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ دریاؤں، نالوں اور چشموں کے کنارے چھوٹی چھوٹی بستیاں آباد ہیں۔ بیشتر دیہاتی اسی پانی سے کھیتی باڑی کرتے ہیں اور بعض زمینیں بارانی ہیں۔ گیہوں، مکئی، باجرہ، چری اور جوار کی کاشت ہوتی ہے۔ اور بستیوں کے علاوہ کھنہ، ترلائی کلاں، سہالہ، ڈھوک حیات، علی پور اور چراہ کی بستیاں اس علاقے میں قابلِ ذکر ہیں۔ یہ علاقہ تقریباً شمال سے جنوب کی طرف کچھ ڈھلوان ہوتا چلا گیا ہے۔ جتا کھیل نامی گاؤں کے جنوب مغرب کی طرف اس وسیع میدان کے تھوڑے سے حصہ میں دلدلی زمین بھی ہے۔ فی الحال اس حصہ میں ایک پختہ سڑک ہے جو راولپنڈی سے لہتراڑ جاتی ہے دوسری چراہ سے کرور کو جانے والی سڑک زیرِ تعمیر ہے۔

اس پورے علاقے کے زیادہ تر دریا اور نالے سلسلۂ سواں سے تعلق رکھتے ہیں۔ نالہ گرہے کس، دریائے کورنگ اور نالہ ملال کس سواں سے نکل کر راولپنڈی کے جنوب مشرق میں آکر ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں اور بحیثیت ایک دریا کورنگ کے نام سے بہتے ہیں۔ ڈھوک کدگال کے قریب نالہ گرہے کس کورنگ دریا سے مل جاتا ہے اور پھر کچھ دور بہنے کے بعد ملال کس بھی اس سے آملتا ہے۔

راولپنڈی کے شمال مغرب میں سید پور، نور پور شاہاں، ناول، مل پور اور بارہ کہو قابلِ ذکر گاؤں ہیں۔ سید پور کی آبادی کے بالکل پشت پر پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو نور پور سے ہوتا ہوا آگے چلا گیا ہے۔ اس پہاڑ سے قدرتی چشمے نکل کر نور پور اور سید پور کی آبادیوں کے درمیان سے گزرتے ہیں۔ یہ علاقہ نہایت خوشنما اور سرسبز ہے۔ سال میں ایک بار نور پور میں بے حد رونق ہوتی ہے جب بری شاہ امام کا عرس اور میلہ لگتا ہے تو چار دن

طرف سے خلقت کا ایک سیلاب امڈا آتا ہے۔

مری روڈ سے شمال کی طرف ایک چھوٹی سی بستی راول ہے جس کے نزدیک نالہ کلاپن کس دریائے کورنگ سے جاملتا ہے اور پھر ایک مصنوعی آبشار کی شکل میں گر کر پہاڑوں کے درمیان سے گزر کر دور تک بل کھاتا چلا جاتا ہے۔ راول ڈیم اسی دریائے کورنگ پر مری روڈ سے نزدیک شمال کی جانب زیر تعمیر ہے۔ اس پر تقریباً ۳ لاکھ روپیہ خرچ آئے گا۔ مکمل ہونے کے بعد پچاس ہزار ایکڑ فٹ پانی جمع رہا کرے گا جو راولپنڈی اور وفاقی دارالحکومت کی ضروریات کے لئے کافی ہوگا۔ مرکز کے نئے محلِ وقوع میں زمین دوز پانی بھی بہ آسانی مہیا کیا جا سکتا ہے۔ فی الحال تو اس علاقے میں زیادہ کنوئیں نہیں ہیں لیکن پانی کا دباؤ کافی ہے، اس لئے ضروریات کے تحت بہ آسانی پانی مہیا ہو سکتا ہے۔ کھنّہ کے قدرتی چشموں کے پانی کو صرف ایک کنٹرول کرنے والے بڑے پائپ کی ضرورت ہے۔ علاوہ بریں پہاڑوں کے زیریں حصہ میں ایسے بہت سے چشمے ہیں جن سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

اس محلِ وقوع کی آب و ہوا سونے پر سہاگہ ہے۔ سردی کا موسم آسانی سے قابلِ برداشت ہوتا ہے۔ موسم گرما بھی شدید نہیں ہوتا۔ راولپنڈی میں اکتوبر سے مارچ تک حرارت کم ہوتی ہے اور اپریل سے جون تک بڑھتی ہے۔ جون سب سے گرم مہینہ ہوتا ہے۔ اس میں زیادہ سے زیادہ درجۂ حرارت ۱۰۳٫۵ اور کم سے کم ۵ر۷۵ درجے ہوتا ہے۔ ستمبر تک گرمی کا موسم رہتا ہے، اس کے بعد موسم نہایت خوشگوار ہونے لگتا ہے۔ راولپنڈی میں اوسطاً سالانہ بارش ۳۰ر۳۶ انچ ہوتی ہے جبکہ لاہور میں ۲۱ر۱۹ انچ ہوتی ہے۔ لاہور کے مقابلہ میں بارش کے دنوں کی تعداد اور ابر آلود فضا راولپنڈی میں زیادہ رہتی ہے۔ راولپنڈی میں سردی کے موسم میں بھی بارش کافی ہوتی ہے۔ گرمی کے موسم میں اگست اور سردی کے موسم میں جنوری سال کے سب سے زیادہ بارشوں کے مہینے ہیں۔ اسی طرح راولپنڈی سے مری کی طرف بارش میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ جہاں کی سالانہ بارش کا اوسط ۳۶ر۵۹ انچ ہے۔

غرض جغرافیائی حالات اور تاریخی اہمیت کی وجہ سے مجوزہ علاقہ وفاقی دارالحکومت کے لئے مناسب ترین جگہ ہے۔ دفاعی لحاظ سے بھی یہ علاقہ کراچی سے بہتر ہے۔ اور پھر یہ امر مسلم ہے کہ کراچی کی روز بروز بڑھتی ہوئی آبادی نے کراچی میں کئی سوشل خرابیاں پیدا کر دی تھیں جن کی وجہ سے ہمارے معاشرہ کے مختلف طبقوں پر غلط قسم کے اثرات پڑ رہے تھے۔ اس سے پیشتر دو حکومتیں بھی تبدیل مرکز پر غور و خوض کرتی رہی ہیں چنانچہ اس وقت بھی موجودہ وفاقی علاقے میں یا کہیں نزدیک نیا مرکز تعمیر ہونے کے امکانات تھے۔ سیکرٹیریٹ، پارلیمنٹ ہاؤس اور دیگر کئی عمارتوں پر ابھی خطیر رقم خرچ کرنا باقی تھی، کیوں نہ یہ سب اخراجات مرکز کی تعمیرِ نو پر صرف ہوں۔

مجوزہ علاقہ بہت جلد ایک حسین اور مثالی شہر میں تبدیل ہونے والا ہے۔ وہ تصویریں جو آجکل چھپ رہی ہیں آئندہ تاریخی حیثیت اختیار کریں گی۔ ان وادیوں اور پہاڑوں پر کیا کیا عمارتیں ہوں گی، اس کٹی پھٹی زمین پر زندگی کے آثار کس کس طرح نمو پائیں گے، آج ہماری چشمِ تصور یہ سب کچھ دیکھ رہی ہے۔ سرسبز و شاداب علاقے ہیں، ٹیلوں اور پہاڑوں پر خوشنما بنگلے، نالوں اور دریاؤں کے کنارے بل کھاتی سڑکیں، جا بجا عوامی پارک، وسیع و عریض میدان میں بنگلے، کوٹھیاں، دفاتر، اس علاقے کو یہ نئی بستیاں اور نئی آبادیاں کیا سے کیا بنا دیں گی۔ وہ دن دور نہیں جب چشموں، دریاؤں اور جھیلوں کے پانی کے تھرتھراتے سینے پر رنگ برنگ قمقموں کا عکس جشنِ چراغاں بن کر ہر کس و ناکس کے دیدہ و دل کو اپنی طرف کھینچے گا اور زبانِ حال سے پکار پکار کر کہے گا کہ جا اینجا است!

★

اقوامِ متحدہ اور مسائل عالم

عظیم الدین شمسی

گزشتہ چند مہینوں سے سیاسی اور بین الاقوامی مذاکرات اور اہم ممالک عالم کے وزرائے خارجہ و سیاستین کی ملاقاتوں کا سلسلہ بہت سرگرمی کے ساتھ جاری ہے جس میں چند بڑے ممالک کے سربراہوں کی بالمواجہ ملاقات بھی شامل ہے۔ توی توقع ہے کہ ان سلسلوں کا نقطۂ آخر وہ کانفرنس ہوگی جسے عام طور پر "اعلیٰ سطحی کانفرنس" کہا جاتا ہے۔ دریں اثنا ممالک عالم کے مختلف علاقائی دفاعی اداروں کے بھی اجتماعات ہوتے رہے ہیں۔ غرض ان تمام مساعی کا ایک ہی مقصود معلوم ہوتا ہے ـــــ دنیا میں سیاسی کشاکش اور کشیدگی کو دور کرکے امن عالم کو قریب تر لانا بلکہ نظریۂ باہمی بقا کو آگے بڑھانا تاکہ اس وقت دنیا کے امن کو جو خطرات لاحق ہیں ان کا سدِباب کیا جا سکے۔ یہ تمام سرگرمیاں اقوامِ متحدہ کے دائرۂ امور سے باہر ہی ہو رہی ہیں۔ اس لئے ایک قدرتی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ من حیث الہیئت اقوامِ متحدہ کیا کر رہی ہے اور مسائل عالم میں اس کا درجہ و مقام کیا ہے۔ نیز یہ بھی پوچھا جاتا ہے کہ اس وقت وہ کن کاموں کو سنبھالے ہوئے ہے۔

بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر یہ جائزہ لیا جائے کہ اقوامِ متحدہ آج کی دنیا میں کیا کردار ادا کر رہی ہے۔ پہلی بات تو یہ سمجھ لینی چاہئے کہ اقوامِ متحدہ ایک طرف تو وسیط اور وسیلہ ہے باہمی گفت و شنید اور مذاکرات و مشاورت کا اور دوسری طرف ایک ہیئت ہے جو چند مخصوص امور کا انصرام کرتی رہتی ہے۔ ان امور میں فوج، پولیس، سفارت و سیاست اور نظم و نسق کے کاموں کا دائرہ آتا ہے۔

دُنیا کو عدل و صیانت کی راہ پر لانے کے لئے جس پُرامن ارتقا کی ضرورت ہے اس کے لئے اقوامِ متحدہ بہت بڑا وسیلہ ہے۔ اور چونکہ کوئی عالمی نظامِ صیانت موجود ہی نہیں ہے اس لئے اس ادارہ کی لابدی ضرورت و اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ اگر اس وقت دنیا میں امن و سلامتی کا کوئی فعّال ادارہ موجود ہے تو وہ اقوامِ متحدہ ہے۔ اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ادارہ کے سکرٹری جنرل نے اپنی سالانہ رپورٹ میں روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا: "اگر اقوامِ متحدہ سے صحیح طریقہ پر کام لیا جائے تو وہ ان ذرائع سے، جو رکن ممالک کو اور طرح حاصل ہیں، سب سے بہتر وسیلہ بن سکتا ہے۔ سیاسی مصالحت کوشی اور صلح جوئی کے لئے وہ کہیں بہتر سطح ثابت ہو سکتا ہے۔ دنیا کے مختلف مفادات اور عزائم و تصورات اگر صحیح طور پر کسی ایک معین جگہ پر مرتکز ہو سکتے ہیں تو وہ منشورِ اقوامِ متحدہ کا نقطہ ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی متفقہ حل نہ نکل سکے اور سیاسی مناقشات قائم رہیں اور کچھ ممالک عالم اپنے مخصوص و علاقائی مفادوں کے تحفظ کے لئے فعّال جدّ و جہد بھی کرتے رہیں، اور یہ بھی ہوتا ہے کہ سیاسی کشاکش کا نتیجہ شدت اختیار کرلے اور ملک سمتِ مخالف کی طرف جھک جائیں ـــــ لیکن ان سب باتوں کے باوجود، بلکہ باوصف، یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ رجحان پھر بھی موجود رہتا ہے کہ اقوامِ متحدہ کے دامن کو نہ چھوڑا جائے۔ دائرۂ اختلافات کو کم کیا جائے، معاملات کو بگڑنے نہ دیا جائے بلکہ رفع دفع کیا جائے اور ایسا حل نکالا جائے کہ باہمی مفاد اور تحفظِ اصولِ منشور کا مقصد بھی فوت نہ ہونے پائے۔"

اقوامِ متحدہ کا ایک نہایت ہی اہم پہلو یہ ہے کہ نمائندگانِ رکنِ ممالک کو اپنے بڑے سیاسی مسائل کے حل کے لئے باہمی مشاورت کے غیر رسمی مواقع مسلسل حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ گو ان مساعی کی عام اشاعت نہیں کی جاتی۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اقوامِ متحدہ کا ادارہ ایک ایسی ہیئت بن گیا ہے جس کے دائرہ میں بہت سے انصرامی امور آتے ہیں اور باہمی تبادلۂ خیال و عمل کی راہیں کھلتی چلی جاتی ہیں کیونکہ یہ بہت اغلب رہتا ہے کہ سفارتی و سیاسی سطح پر گفت و شنید کے بعد کسی موقع پر اسے انصرام و اہتمام کے فرائض سنبھالنے کے لئے دعوت دی جائے۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ اقوامِ متحدہ کے دائرۂ سے الگ ہوکر بھی جو گفت و شنید کی جائے یا افہام و تفہیم کی صورتیں پیدا کی جائیں ان کا

پس منظر بھی اقوامِ متحدہ کا منشور ہی رہتا ہے۔ کیونکہ دنیا "باہمی بقا" کے تصور و منہاج کو حاصل کرنے کے لئے اگر کوئی رہنما اصول ہو سکتے ہیں تو وہ منشور کے سائے ہی میں ہو سکتے ہیں۔ باہمی آویزشوں کے پُرامن حل کی تلاش، ہر رکن ملک کی سالمیت و آزادی کا احترام، مسلح جارحیت کی حالت میں اجتماعی تحفظ و دفاع وغیرہ کے جملہ امور کا اہتمام منشورِ اقوامِ متحدہ میں پہلے ہی سے موجود ہے۔

اقوامِ متحدہ کی کامیابی یا ناکامی کے باب میں خواہ کچھ بھی کہا جائے یہ واقعہ اپنی جگہ ناقابلِ تردید ہے کہ اس وقت اقوام و ممالکِ عالم جن مسائل سے دوچار ہیں ان سے نبٹنے کے لئے صرف دوگانہ مشاورت کوئی مضبوط و دائمی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی، اس کے لئے ایک تیسرے فریق، ایک ثالث اور وسیط کی ضرورت لازمی طور پر پڑتی ہے۔ یہ کام اقوامِ متحدہ کرتی ہے۔ دنیا کے ملکوں کے مابین افہام و تفہیم کی نئی راہیں اسی نے کھولی ہیں۔ دو فریقوں کی بات چیت اور علاقائی روابط کی مساعی کو بہتر و موثر مواقع اسی نے فراہم کئے ہیں اور پھر اقوامِ متحدہ ہی وہ سطح ہے جس پر سے ایشیا اور افریقہ کی نئی اقوام و ملل ابھر کر سیاسیاتِ عالم کا ایک جزو بن سکتی اور اپنا وجود منوا سکتی ہیں۔

گزشتہ "چودہ" سال میں اقوامِ متحدہ کے سامنے بہت سی مشکلیں آئیں۔ لاینحل مسائل سے نبٹنا پڑا۔ اس ضمن میں اسے کامیابیاں بھی ہوئی ہیں۔ اقوامِ متحدہ ہی نے کئی ممالک کو آزادی دلوائی یا بالادست حکومتیں قائم کرائیں۔ سوئز کے خطرناک مسئلہ کا حل اور جنگ کے نزدیک آجانے والے ملکوں میں قیامِ امن کے لئے اقوامِ متحدہ کی "ہنگامی فورس" کا بنایا جانا، چند ایسی مثالیں ہیں جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ امنِ عالم کے لئے اقوامِ متحدہ کیا کچھ کر سکتی ہے۔

اس بات کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اقوامِ متحدہ کسی قسم کا آزاد و خود مختار ادارہ نہیں ہے کہ بالجبر ہر ایک سے اپنی بات منوا سکے نہ وہ ساری دنیا کی بالادست حکومت و مملکت سی کوئی چیز ہے (شاید یہی عام غلط فہمی ہے کہ لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اقوامِ متحدہ جو چاہے خود مختارانہ طریق پر کر سکتی اور فیصلے صادر فرما سکتی ہے خواہ رکن ممالک انہیں اچھا جانیں یا نہ جانیں) واقعہ بالکل یہ نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اقوامِ متحدہ ایک سطح ہے، ایک ہیئت ہے، جس کے دائرۂ آغوش میں آکر رکن ممالک افہام و تفہیم سے کام لیکر حلِ مشکلات تلاش کرتے اور امنِ عالم کے متلاشی بنتے ہیں۔ اس ہیئت کا کام یہ ہے کہ حکومتوں کو یوں تو روایتی طرز کی سفارتی سہولتیں گفت و شنید کی صورت میں حاصل ہی رہتی ہیں لیکن اسکے علاوہ بھی کچھ کام ہونا چاہیئے۔ یہ کام اقوامِ متحدہ کا دائرہ اثر کرتا ہے۔ اس ہیئت کی اصل قوت اس بات پر منحصر ہے کہ رکن ممالک اس کے اثر و قوت کے عوامل سے کس طرح اور کس قدر فائدہ اٹھاتے ہیں۔

حال ہی میں اقوامِ متحدہ کے کاموں کی ایک ارتقائی منزل اور آئی اور وہ خاص طور پر غور طلب بات ہے۔ سکرٹری جنرل کے دائرۂ امور کی وسعت تاکہ منشور کے دائرہ میں رہتے ہوئے اس ہیئتِ عالم کے اصول و مقاصد کو زیادہ سے زیادہ اظہار و نمو مل سکے۔ اس نوع کی سیاسی مساعی کی ایک مثال وہ ہے جب تھائی لینڈ اور کمبوڈیا کے درمیان نقیض ہوا تو سکرٹری جنرل نے اپنا ایک شخصی نمائندہ فوراً اس مشکل کا حل تلاش کرنے کے لئے روانہ کر دیا۔ یہ مشن کامیاب رہا۔ دونوں ممالک پھر اچھے پڑوسیوں کی طرح رہنے لگے۔

گزشتہ سال دنیا میں کئی اہم منصوبوں کو بروئے کار لانے یا مکمل کرنے کا مسئلہ بھی آیا تو اقوامِ متحدہ سے رجوع کیا گیا اور اس نے اپنی تحویل و نگرانی و تعاون سے ان منصوبوں کی تکمیل و تعمیر میں ہاتھ بٹایا۔ ان منصوبوں کے ساتھ اقوامِ متحدہ کی نسبت قائم ہونے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اقوامِ متحدہ عالمی مسائل کے حل اور تدبیر منزل کے سلسلے میں کن کن مسائل سے نبٹتی رہتی ہے۔ مثال کے طور پر جنوب مشرقی ایشیا کے دریائے میکونگ کے زیریں طاس کا منصوبہ لیجیے۔ اسے اقوامِ متحدہ کے تعاون سے مکمل کیا گیا۔ لاؤس، کمبوڈیا، جنوبی ویت نام، اور تھائی لینڈ کے ملکوں کو براہ راست الگ الگ اعانت دی گئی۔ علاوہ ازیں "اقتصادی کمیشن برائے ایشیا و مشرقِ بعید" ("ای کیفے") الگ اپنا کام سنبھالے ہوئے ہے "اقوامِ متحدہ کا تکنیکی پروگرام" بھی مفید خدمات انجام دے رہا ہے۔ دریائے میکونگ کا منصوبہ زیرِ تکمیل ہے اور جب یہ کام ختم ہو جائے گا تو توی امید ہے کہ اس سے ان چاروں ممالک کے عوام کا معیارِ زندگی بلند ہونے اور اصلاحِ احوال میں بڑی مدد ملے گی۔

دریائے سندھ کے پانی کا مسئلہ کئی سال سے پاکستان اور ہندوستان کے مابین مشکلات پیدا کرنے کا باعث بنا ہوا ہے۔ اس الجھن کو دور کرنے کے لئے عالمی بینک کی خدمات سے فائدہ اٹھایا گیا ہے اور باہمی مذاکرات کا اچھا نتیجہ نکلنے کی امیدیں روشن تر ہو گئی ہیں۔ خیال ہے کہ دونوں ملک ان مشکلات کا حل نکالنے میں نہ صرف کامیاب ہو جائیں گے بلکہ یہ بھی ہو سکے گا کہ اس عظیم دریا کے آبی وسائل کو مزید ترقی دی جاسکے۔

مشرق وسطیٰ میں اقوام متحدہ کی زیر نگرانی ایک جماعت عارضی صلح کو قائم رکھنے کے کام میں لگی ہوئی ہے۔ مشرق قریب میں اقوام متحدہ کی جماعت امداد و تعاون برائے مہاجرین فلسطین اور اقوام متحدہ کی "ہنگامی فورس" برابر اس کام میں لگی ہوئی ہیں کہ دنیا کے ان حصوں کا امن برقرار رہے۔

افریقہ میں ایک نہایت اہم کام یہ ہوا ہے کہ اس براعظم کے لئے گذشتہ سال ہی ایک اقتصادی کمیشن مقرر کیا گیا۔ اس کا کام یہ ہوگا کہ اقوام متحدہ کے اصول و مقاصد کی بنیادوں پر رکن ممالک کے درمیان اقتصادی و سماجی تعاون اور مرکزیت کارپیدا کی جائے۔ جنرل اسمبلی کے گذشتہ اجلاس کے دوران گنی کو بھی اقوام متحدہ کا رکن بنا لیا گیا۔ چونکہ یہ ملک ابھی اپنی نئی آزادی کے ابتدائی مراحل سے گذر رہا ہے اس لئے کچھ مشکلات سے دوچار ہے۔ اقوام متحدہ نے اس ملک کی درخواست پر اقتصادی و سماجی ترقی کے لئے منصوبہ سازی کے کام میں ہاتھ بٹانا شروع کیا ہے۔ اس غرض کے لئے سکرٹری جنرل نے اپنا ایک خصوصی نمائندہ وہاں بھیج رکھا ہے تاکہ وہ اقوام متحدہ اور خصوصی ماہرین کے اداروں سے مدد لے کر منصوبہ بندی کے کام کو مکمل کرے۔ افریقہ کے سلسلے میں کئی مسائل ہیں جن کو اقوام متحدہ حل کر رہی ہے۔ منجملہ ان کے وہ مسائل بھی ہیں جو اقوام متحدہ کی تولیتی کونسل کے دائرہ توجہ میں آتے ہیں۔ اقوام متحدہ کی تولیت میں آنے والے چار افریقی علاقے ایسے ہیں جنہیں ۱۹۶۰ء میں یا تو کامل آزادی مل جائے گی یا درجۂ خود اختیاری حاصل ہو جائے گا۔ ان میں سے ایک سمالی لینڈ ہے جو فی الوقت اطالیہ کے زیر انتظام ہے۔

گذشتہ سال عوام اور حکومتیں مل کر لوگوں کی عام بھلائی اور رفاہ عام کے کاموں کو ترقی دیتی رہیں تاکہ عوام کا معیار زندگی بلند ہو سکے اور ان کی حالت سدھر سکے۔ سماجی ترقی کے کام اکثر سست رفتار رہے کیونکہ اکثر ممالک میں مالی اور انتظامی مشکلات حائل رہیں۔ آبادئ عالم میں تیز رفتار اضافہ اور آبادیوں کو شہری بستیوں میں بسانے کے کام کی وجہ سے ہر جگہ مکانات کی قلت کا سوال درپیش رہا۔ دنیا کے اکثر ملکوں کی آبادی آجکل اس تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ پہلے کبھی اتنی نہ بڑھی تھی۔ ان ممالک میں پاکستان بھی شامل رہے۔ عین اغلب ہے کہ کوئی بیس سال میں آبادی دوگنی کے قریب ہو جائے گی۔ سماجی ترقیات کے سلسلے میں بہت سے جائزے لئے گئے اور ان کے مشاہدات و کوائف کو اقوام متحدہ نے شائع کیا ہے۔ بعض چیزیں آئندہ چند سالوں میں اشاعت پذیر ہوں گی، ان مطبوعات کا تعلق آبادی اور مسائل معاشرہ سے ہوگا۔

جن معاشرتی مسائل کو اقوام متحدہ نے اعانت بہم پہنچائی ہے ان میں شہری اور دیہی رفاہ عامہ کے بہت سے کام ہیں خاص کر بستی سدھار کے کام۔ ان میں سے ایک منصوبہ تو مشرقی پاکستان ہی کا ہے جہاں حکومت عوامی اصلاح و ترقی کے کاموں کے لئے انتھک کوشش کر رہی ہے۔

رکن ممالک کے بڑے منصوبوں میں مدد دینے کے لئے سب سے بڑا کام جو حال ہی میں ہوا ہے وہ "اسپیشل فنڈ" کا قیام ہے۔ یہ فنڈ "تکنیکی امداد کے توسیعی پروگرام" کو مکمل کرنے کی طرف ایک اور قدم ہے تاکہ مخصوص منصوبوں کے لئے جن میں سرمایہ کاری کی ضرورت ہو، روپیہ فراہم کیا جاسکے۔ اس فنڈ نے اپنے قیام کے چھ ماہ کے اندر اندر ۱۳ منصوبوں کو جو مختلف ممالک کے تھے، مالی امداد دینی شروع کر دی ہے۔ جیسے جیسے کام آگے بڑھے گا مزید ممالک کو منصوبہ جات کی تکمیل و ترقی کے لئے سرمایہ مہیا کیا جاتا رہے گا۔ اس فنڈ کے لئے دس کروڑ ڈالر کا سرمایہ تجویز ہے اور امید ہے کہ یہ رقم سال آئندہ جمع ہو جائے گی۔ اور فنڈ اس قابل ہو سکے گا کہ ساری دنیا میں عوام کی مالی حالت سدھارنے کے لئے نئے رکن ممالک کو امدادیں دی جائیں گی۔

"تکنیکی امداد کے توسیعی پروگرام" کی دسویں سالگرہ منائی گئی ہے۔ اس کا ریکارڈ یہ ہے کہ اس نے ۸۰۰۰ ماہرین کی خدمات سے کام لیا اور ۱۴۰ علاقوں یا ملکوں میں تقریباً (۱۴۰۰۰) وظائف دیئے۔

"جوہری قوت کے امن پسندانہ استعمالات" کے ادارہ کو اور ترقی دینے کے لئے "جوہری قوت کی بین الاقوامی ایجنسی" "ٹیکنیکل امدادی بورڈ" کی بھی رکن بن گئی۔

اقوام متحدہ کا "ٹیکنیکی امدادی پروگرام" برائے پاکستان دنیا کا دوسرا بڑا پروگرام ہے۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے اس کام میں ۹۰ ماہرین لگے ہوئے ہیں جن میں دنیا کی ۲۶ اقوام کے لوگ ہیں۔ یہ غیر ملکی اپنے پاکستانی ساتھیوں کے ہمرشتہ کام کر رہے ہیں اور ان کے کاموں کا سلسلہ کافی دراز ہے جو سارے ملک میں پھیلا ہوا ہے۔ مثلاً ڈھاکہ ہی میں "یو این ٹیکنیکل اسسٹینس آپریشن" کے زیر نگرانی ماہرین کی ایک جماعت دیہی ترقی کے کاموں کو سنبھالے ہوئے ہے۔ نیز ڈھاکہ اور لاہور میں سماجی اصلاح کی سرگرمیوں سے متعلق کام ہیں جہاں تربیت بھی دی جاتی ہے۔ اسی طرح گنڈیر پراجیکٹ (مغربی پاکستان) کی ٹیکنیکی امداد کا کام ہے۔ امداد باہمی اور آجر و اجیر کے تعلقات کے کاموں کے سلسلے میں مدد دینے کے لئے "آئی ایل او" (بین الاقوامی ادارۂ عمال) کی ایک جماعت بھی یہاں کام کر رہی ہے۔ پاکستان میں کوئی پانچ سال سے بین الاقوامی ٹیلی کمیونیکیشن کے ماہرین بھی کام کر رہے ہیں اور اس باب میں مدد دے رہے ہیں کہ ایشیا میں ٹیلی کمیونیکیشن کے جو چند سب سے بڑے سلسلے ہیں ان میں سے ایک پاکستان میں قائم و نصب کر دیا جائے۔ چنانچہ یہ عمل خاص کراچی کے بالکل نزدیک تکمیل پذیر ہے۔

"خوراک اور زراعت کا ادارہ" بھی پاکستان میں کافی کام کر رہا ہے اور اس نے سب سے زیادہ ماہرین (۲۴ سے زیادہ) یہیں لگا رکھے ہیں مثلاً گنگا کوباڈک اسکیم (مشرقی پاکستان)، بند کی نقشہ سازی، کھجور کو ڈبے میں بند کرنے کا عمل، زرعی جائزہ، حیوانات کے لئے مصنوعی نسل کشی، دریاؤں کا کنٹرول، زمین کی بالیدگی بڑھانے کا کام اور دوسرے زرعی مسائل۔ یونیسکو کے ۱۶ ماہرین پاکستان میں کام کر رہے ہیں۔ ان ماہرین کے کاموں کا سلسلہ تعلیم، سائنس اور ثقافت سے متعلق ہے۔ یونیسکو نے پاکستان ہی میں ایک علاقائی مرکز مواد مطالعہ قائم کیا ہے۔ جو کراچی میں قائم ہے اور پاکستان، ہندوستان، برما، لنکا اور ایران کو اپنی خدمات پیش کرتا ہے۔ ایک مرکز قائم کیا گیا ہے جو سائنسی اور ٹیکنیکی معلومات و مطالعہ کی ترتیب کاری (ڈوکیومینٹیشن) سے متعلق ہے اور اس کام پر تین ماہرین تعینات ہیں۔ بعض دوسرے ماہر تعلیمی اعداد و حقائق ارضیاتی طبعیات، فلکیات، سماجیات اور تدریس ارضیات کے کاموں سے متعلق ہیں۔ "بین الاقوامی ادارۂ صحت" کے ماہرین نرسوں کی تربیت علاج الامراض، اور صحت و صفائی کی انجینئری کے کاموں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ "عالمی بینک مشن" بھی پاکستان میں کام کرتا ہے جس میں ایک مشیر ایک صلاح کار برائے زراعت اور ایک ماہر اقتصادیات شامل ہیں۔

یونیسیف، بین الاقوامی فنڈ برائے اطفال کا بھی اس ملک میں کافی بڑا کام ہے۔ اس ضمن میں توسیع کے لئے ۵ بڑے منصوبے مکمل ہونے ہیں جس کے لئے حکومت پاکستان نے (۷۸۴،۰۰۰) ڈالر مالیت کی امداد مانگی ہے۔ اس امداد سے کراچی میں ایک جدید قسم کی ڈیری بنائی جائے گی جو (۲۵۰۰۰) "لٹر" دودھ یومیہ تیار کر سکے گی۔ اس امداد سے زچگی اور بہبود اطفال کے کاموں کو بھی امداد دی جائے گی۔ گاڑیاں فراہم کرنے، سلائی کی مشینیں دینے، ٹائپ رائٹر، اوزار اور فلم و ریڈیو وغیرہ کے پرزے مہیا کرنے کے لئے کوئی ۲۵ دیہات کو یہ امداد دی جائے گی نیز تپ محرقہ کی روک تھام اور معذور بچوں کی مدد و علاج کے لئے بھی رقوم مہیا کی جائیں گی۔

غرض اقوام متحدہ سماجی و اقتصادی کاموں کے سلسلے میں بہت کچھ کر رہی ہے گو یہ بات دوسری ہے کہ سیاسی مسئلوں کے شور شغب میں مخلوق خدا کے فائدے کے ان کاموں کا چرچا ذرا کم ہو جاتا ہے حالانکہ ان کاموں کی اپنی بڑی زبردست اہمیت ہے کیونکہ دنیا کے ہر حصہ میں لاکھوں انسانوں کی زندگیوں پر ان سرگرمیوں کا اثر پڑتا ہے۔ دنیا کو ایک بہتر مقام زیست بنانے کے لئے ہر ملک میں ہی کام ہو رہا ہے اور بڑی تندہی سے ہو رہا ہے۔ اقوام متحدہ ان امور اور سرگرمیوں میں اپنا کردار ادا کر رہی ہے ٭

★

جی! میں کپڑے گھر ہی میں
دھوتی ہوں!
New
SUNLIGHT
SOAP
SUNLIGHT
نئے سن لائٹ
سے یہ
اور بھی آسان ہو گیا ہے!
نئے سن لائٹ صابن میں ایک نیا جادو اثر جزو شامل کیا گیا ہے جو سفید کپڑوں کو پہلے کی نسبت کہیں زیادہ سفید دھوتا ہے اور رنگین کپڑے اور بھی خوشنما ہو جاتے ہیں۔ آپ کے تمام کپڑے نئے سن لائٹ صابن میں دھلنے کے بعد ایک نئی چمک دکھائیں گے۔
نیا سن لائٹ استعمال کیا جائے تو کوٹنے پیٹنے کی مصیبت سے بھی چھٹکارا مل جاتا ہے۔ بس آپ کپڑوں کو نیا سن لائٹ لگا کر ذرا سا مل دیجئے اور پھر کھنگال لیجئے۔ لیجئے سارا میل نکل گیا اور کپڑے پہلے کی طرح صاف و شفاف ہو گئے
نیا سن لائٹ صابن
پیٹے بغیر کپڑوں کو
سفید اور اجلے
دھوتا ہے!

جب آپ
متوازن غذا کا ذکر کرتے ہیں
تو یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ چکنائی متوازن غذا کا
ایک اہم جزو ہے۔ چکنائی اپنے ہم وزن چاول یا گیہوں سے
ڈھائی گنا زیادہ قوت بخش ہے، اور اس کی مدد سے نہ صرف
حیاتین آپ کے جسم میں تحلیل ہو جاتے ہیں بلکہ یہ قوت کی
ایک خاص مقدار بھی جسم میں محفوظ رکھتی ہے۔ ڈاکٹروں کی رائے
ہے کہ نوعمر بچوں اور بالغوں کے لئے کم از کم دو آونس چکنائی
کا روزانہ استعمال نہایت ضروری ہے۔
کھانے کی لذت اور غذائیت میں اضافہ کے لئے
ڈالڈا برانڈ وناسپتی گذشتہ ایک پشت سے اس ملک
میں مشہور ہے۔ اس کے بنانے میں صحت اور صفائی کے
اصولوں کی کڑی پابندی کی جاتی ہے۔ یہ ہاتھوں سے چھوئے
بغیر تیار ہوتا ہے، اور مہربند ڈبوں میں خالص اور تازہ دستیاب
ہوتا ہے۔ یہ ڈبے کھجور کے درخت کے نشان سے پہچانے جاتے
ہیں۔ اس میں وٹامن "اے" اور "ڈی" کثرت سے شامل
ہونے کی وجہ سے اس کی غذائی قوت دوبالا ہوگئی ہے۔
ڈالڈا صحت مند گھرانوں کی روزمرہ غذا کا ایک اہم جزو ہے!
DALDA VANASPATI
ڈالڈا (برانڈ) وناسپتی
ڈالڈا ایک وناسپتی ہی نہیں بلکہ مکمل غذا ہے!

ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا - مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس میکلوڈ روڈ - کراچی
مدیر: رفیق خاور

''مری کے سائے میں''

(نئے دارالحکومت کے لئے دلکش قدرتی ماحول)

زیر تعمیر راول بند کی تعمیر کے لئے چٹانیں
بارود سے صاف کی جا رھی ھیں

راول کے نزدیک نالہ ''کلاپن کس'' اور دریائے کورنگ کا سنگھم

نور پور شاھاں کا خوبصورت چشمہ

زمین ھموار کر کے پانی روکنے کیلئے ۲۲ فٹ
اونچا پشتہ بنایا جارھا ھے (راول بند)

نومبر ۱۹۵۹ء

قیمت فی کاپی: ۸۰ر

قدرت اللہ شہاب　احمد ندیم قاسمی　انور عنایت اللہ

جلیل قدوائی　صہبا اختر　طاہرہ کاظمی

یونس احمر　ضمیر اظہر　اشرف صبوحی

اللہ بخش یوسفی　شفیع عقیل　عبداللہ خاور

جنرل محمد ایوب خاں اور وزیراعظم برما کی ملاقات

جنرل محمد ایوب خاں کی خدمت میں مسٹر جسٹس
ایس۔ اے۔ رحمان ''قانون کمیشن'' کی
رپورٹ پیش کر رہے ہیں

صدر پاکستان کے باڈی گارڈ کے لئے پرنس صدرالدین
کا تحفہ (ٹرافی نیزہ بازی)

ک ماہر تعلیم ، ڈاکٹر فرید بخش ، جنرل محمد ایوب خاں سے ملک میں
پہلی دیہی یونیورسٹی قائم کرنے کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں

صدر پاکستان' جنرل محمد ایوب خاں نے کراچی میں ایک
جدید وضع کی مچھلی مارکیٹ کا افتتاح کیا

ماہِ نو

جلد ۱۲ شمارہ ۱۱

نومبر ۱۹۵۹ء

مدیر: رفیق خاور نائب مدیر: ظفر قریشی

چندہ سالانہ: پانچ روپے آٹھ آنے

شائع کردہ: ادارۂ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

فی کاپی: آٹھ آنے

بنیادی جمہوریتیں

(صدر پاکستان، جنرل محمد ایوب خان کے تاثرات)

•

جب تک ہمارے دل میں خدا کا خوف اور عوام کے ساتھ محبت کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا اس وقت تک نہ ہم اچھے انسان بن سکتے ہیں نہ اچھے مسلمان اور نہ اچھے پاکستانی ہی۔ جب ہزاروں لاکھوں انسانوں نے جان، مال اور آبرو کی قربانیاں دے کر اس ملک کو حاصل کیا تھا اس وقت ہرگز یہ مقصد نہ تھا کہ یہاں آکر صرف چند لوگ یا چند خاندان پھلیں پھولیں اور قبضہ جما کر بیٹھ جائیں۔ یہ ملک آپ نے حاصل کیا تھا، یہ ملک آپ کے لئے بنا تھا۔ اس لئے آپ کو آگے بڑھنا، اسے چلانا اور زندہ رکھنا ہے۔ پچھلے سال جب انقلاب آیا تھا تو شاید کچھ لوگوں کے دلوں میں یہ خیال گزرا ہو کہ حکمرانوں کی ایک ٹولی چلی گئی، شاید اب یہ نئے لوگ ساری عمر حکومت پر قبضہ جمائے بیٹھے رہیں گے۔ مگر میں نے اسی روز آپ سے وعدہ کیا تھا کہ ملک میں صحت مند اور اچھی قسم کی جمہوریت قائم کرنے کے لئے جلد از جلد اقدامات کئے جائیں گے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے اپنا وعدہ پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائی اور اب انشاء اللہ بہت جلد اس سال کے آخر تک سارے ملک میں بنیادی جمہوریتوں کا نظام قائم کر دیا جائے گا۔

بنیادی جمہوریتوں کا یہ نظام ہم نے دوسرے ملکوں کے تجربات اور اپنے ملک کے حالات دونوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا ہے۔ جمہوریت کے سلسلے میں ہمیں دوسروں کی اندھا دھند نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم کو اپنے ملک کے حالات اور اپنے عوام کی افتادِ طبع کے مطابق کام کرنا ہے۔ بنیادی جمہوریتوں میں ہم نے تین باتوں کو خاص طور پر مدِ نظر رکھا ہے۔ ایک تو یہ کہ جمہوریت اوپر سے عوام کے سروں پر نہیں تھوپی جائے گی بلکہ اس کی بنیاد بالکل نیچے کی سطح سے شروع کر کے اوپر تک منزلیں تعمیر کی جائیں گی۔ دوسرے یہ کہ عوام کو اپنا نمائندہ چننے کے لئے دور نہیں جانا پڑے گا۔ تعلیم کی کمی کی وجہ سے خاص طور پر دیہات میں، تیس چالیس ہزار یا ایک لاکھ کی آبادی میں سے ایک اچھا نمائندہ چننا بہت مشکل ہے۔ ایسے انتخابات میں ایک عام رائے دہندہ کو اتنا تک معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ جس آدمی کو ووٹ دے رہا ہے، وہ ہے کیسا آدمی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے الکشنوں میں جو ووٹ پڑتے تھے وہ دباؤ یا ناواقفیت کی وجہ سے پڑتے تھے یا پھر ناجائز طریقوں سے ووٹ حاصل کئے جاتے تھے۔ لیکن بنیادی جمہوریتوں میں ایسی کوئی بات قطعی ممکن نہیں ہوگی۔ اب صرف ہزار پندرہ سو آدمی ایک نمائندہ چنیں گے۔ اتنے چھوٹے سے حلقے میں لوگ ایک دوسرے کو ضرور جانتے پہچانتے ہوں گے۔ اور الکشن کے موقع پر ہر ایک کو معلوم رہے گا کہ وہ جس کو آدمی ووٹ دے رہا ہے وہ اچھا آدمی ہے یا بُرا۔ اس طریقے سے جو جمہوری نظام قائم کیا جائے گا وہ عوام کا حقیقی معنوں میں نمائندہ ہوگا۔

بنیادی جمہوریتوں کی تیسری خاص بات، اور بڑی اہم بات، یہ ہے کہ اب جو کونسلیں قائم ہوں گی وہ سیاسی جوڑ توڑ اور دھواں دھار تقریریں کرنے والے سیاسیئین کے وجود سے آزاد ہوں گی، جو ماضی میں ہماری اسمبلیوں کی خصوصیت بن گئے تھے۔

اب جو کونسلیں تشکیل پائیں گی وہ اپنے دیہات یا وارڈ کی ایسی باعمل جماعتیں ہوں گی جو حکومت کے ساتھ

ترقیاتِ عامہ کے کام میں ہاتھ بٹائیں گی۔ ان کونسلوں کی خاص ذمہ داری ترقیاتِ عامہ کے مسائل ہوں گے۔ ان کونسلوں کو جو ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں ان میں خاص طور پر صحت، تعلیم، زراعت اور سماجی بہبود کے عملی کام ہیں۔ یہ بہترین طریقہ ہے جس کے ذریعہ رائے عامہ کو حکومت سے اور عمالِ حکومت کو عوام سے نزدیک تر لایا جائے گا۔ اگر ان کونسلوں نے اپنی ذمہ داریاں اور فرائض بخوبی سرانجام دیئے تو ملک کے ہر گاؤں اور ہر گاؤں کا باشندہ حکومت کے کام میں برابر کا شریک ہو جائے گا۔ عمومی تخمینہ یہ ہے کہ کوئی (۸۰،۰۰۰) نمائندگان بنیادی جمہوریتوں کے نظام میں کام کریں گے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے حکومت کی مشینری کے (۸۰،۰۰۰) کل پرزے ہوں گے جو خود عوام مہیا کریں گے۔ اگر یہ مشینری بھی اب صحیح طرح کام نہ کرے — یعنی یہ کہ اس نوعیت کی جمہوریت بھی کامیاب نہیں ہوئی — تو پھر خدا ہی ہمارا حافظ ہے۔ مگر مجھے پکا یقین ہے کہ انشاء اللہ یہ نظام ضرور کامیاب ہوگا۔

بنیادی جمہوریتوں کے نظام کو کامیاب بنانے کی ذمہ داری بڑی حد تک اب خود آپ پر ہے۔ اس وقت ملک میں کوئی سیاسی جماعت نہیں ہے اس لئے اس بات کا قطعی کوئی امکان نہیں ہے کہ آپ پر اس نمائندہ یا اُس نمائندہ کو ہی ووٹ دینے یا نہ دینے کا دباؤ ڈالا جاسکے گا۔ یعنی انتخابات بالکل آزادانہ ہوں گے اور قطعی منصفانہ۔ کسی سرکاری افسر کو اس بات کی اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ الکشنوں پر اپنا اثر ڈال سکے۔ اس لئے اب یہ آپ کا اور صرف آپ کا کام ہے کہ ایسے نمائندے اپنے لئے چنیں جو دیانت دار ہوں، بے غرض ہوں اور خدمتِ خلق کے جذبہ سے ہی متاثر ہوں۔ اب آپ کو چاہیئے کہ ایسے آدمیوں کا انتخاب کریں جو آپ کی پرخلوص نمائندگی کر سکیں اور ان پر آپ جب بھروسہ کریں تو وہ اس بھروسہ پر پورا اتر سکیں۔

یونین کونسلیں جو اب بنیادی جمہوریتوں کے نظام کے تحت قائم کی جائیں گی وہ اس عظیم جمہوری نظام کا سنگِ بنیاد بنیں گی۔ یونین کونسلوں ہی سے نمائندے تحصیل کونسل اور تھانہ کونسل میں جائیں گے۔ اور اسی طرح ڈسٹرکٹ کونسلوں اور ڈویژنل کونسلوں میں۔ یہ نمائندے تمام ان کاموں میں جو تعمیرِ وطن سے متعلق ہوں گے حکومت کا ہاتھ بٹائیں گے۔ اس لئے یہ بڑا ضروری ہے کہ یونین کونسلوں میں معاشرہ کے تمام مفید عناصر کو مناسب نمائندگی حاصل رہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہوں جنھیں عوام اپنے حلقے سے نمائندہ بنا کر بھیجنا چاہیں مگر وہ بوجہ تکلف آگے نہ بڑھیں یا انھیں یہ گمان ہو کہ اب بھی الکشنوں کا کھیل پُرانے رنگ میں ہی ڈوبا ہوا رہے گا۔ ان بعض لوگوں میں خواتین بھی ہو سکتی ہیں جو زیادہ بہتر حالات میں واقع نمائندگان کے مقابلہ پر برابری کے ساتھ مقابلہ کرنے کے وسائل نہ رکھتی ہوں۔ اس لئے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ یونین کونسلوں کو ایسے حضرات و خواتین کی موجودگی کے فوائد سے محروم نہیں رہنے دینا چاہیئے۔ اس نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے ہم نے طریقۂ نامزدگی کا بھی اصول طے کیا ہے۔ مگر یہ بات بالکل صاف سمجھ لینی چاہیئے کہ ان نامزدگیوں کا مقصد ہرگز ہرگز یہ نہیں ہے کہ ان لوگوں کو یونین کونسلوں میں حکومت کے پٹھو بنا کر بٹھایا جائے۔ ہمارا مقصد اس سے صرف یہ ہے کہ ایسے لوگ جنھیں خصوصی علم و تجربہ ہے انھیں بھی ترقیاتِ عامہ کے کاموں میں، جو ان یونین کونسلوں کے علاقوں میں کئے جائیں گے شریکِ کار کیا جاسکے تاکہ وہ بھی اس سلسلے میں مفید خدمت انجام دے سکیں۔

اب تک جو نظامِ حکومت چل رہا تھا وہ ورثہ تھا ایک غیر ملکی دورِ حکمرانی کا جو اس کے اپنے مقاصد کے لئے وضع کیا گیا تھا۔ اب ہمیں آہستہ آہستہ اس نظام کو اس طرح بدلنا ہے کہ وہ ہماری آزاد قوم کی ضروریات کو پورا کر سکے۔ ہم درجہ بہ درجہ مرکزیتِ اختیارات کو صوبوں، ڈویژنوں اور اضلاعی حکام کے سپرد کر رہے ہیں۔ اس کا

نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہر ہر علاقے کے لوگوں کے اپنے مسائل وہیں کے وہیں حل ہو جایا کریں گے۔ لوگوں کو اپنے فوری اور بڑے ضروری مسائل کے حل کے لئے لاہور، راولپنڈی کراچی یا ڈھاکہ کے چکر لگانے اور دور دراز کے تکلیف دہ سفر کرنے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ اب ڈویژن اور ڈسٹرکٹ کے کمشنر صاحبان ہی اپنے اختیارات استعمال کریں گے اور اس سلسلہ میں ان نمائندوں سے مشورہ کرتے رہیں گے جو یونین کونسلوں کے واسطے سے ڈسٹرکٹ اور ڈویژن کونسلوں میں آئے ہوئے ہوں گے۔

میں اس نظام جمہوریت کو جس قدر زیادہ اپنے ذہن میں سوچتا ہوں اتنی ہی مجھے یہ امید بندھتی ہے کہ میرے ملک کا مستقبل بہتر ہو جائے گا۔ مجھے ان بنیادی جمہوریتوں میں اس بات کی پہلی جھلک دکھائی دیتی ہے کہ عوام اپنی بھلائی اور فلاحِ ملک کے کاموں میں اپنے حق کو صحت مندانہ اور مفید طریقہ پر پورا ہوتے دیکھ سکیں گے۔ لہٰذا ہمیں خدا سے دعا کرنی چاہیئے کہ وہ بنیادی جمہوریتوں کے اس نظام کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کی ہمیں توفیق عطا فرمائے۔

بنیادی جمہوریتوں کا قیام بجائے خود کوئی مقصد نہیں ہے بلکہ ایک وسیلہ ہے ایک نصب العین کا۔ نصب العین ہے ملک کی تعمیرِ نو۔ جیسے ہی ملک میں بنیادی جمہوریتوں نے اپنا کام کرنا شروع کیا ملک کی تعمیرِ نو کا کام دراصل شروع ہو جائے گا۔ ہم نے اس سال میں جو کچھ بھی کیا ہے دراصل تمہید ہے ان بہت سے بڑے کاموں کی جنھیں ہمیں مکمل کرنا ہے۔ ✦

(اقتباس تقریر، لائل پور۔ ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۵۹ء)

•

پاک جمہوریت

چوتھا زینہ — ڈویژنل کونسلیں

تیسرا زینہ — ضلع کونسلیں

دوسرا زینہ — تحصیل/تھانہ کونسلیں

پہلا زینہ — یونین کونسلیں

ماہ نو، کراچی، نومبر ۱۹۵۹ء

پرانی حویلی

صہبا اختر

پرانی جمہوریت کی یہ سرنگوں حویلی
یہی حویلی سنا ہے خوش رنگ و مشکبو تھی
یہی حویلی جو آج بوسیدہ ہو چکی ہے
سنا ہے اپنے مکین کی طرح خوبرو تھی
یہی حویلی کہ آج جز خاک کچھ نہیں ہے
سنا ہے آفاق میں کبھی اس کی گفتگو تھی
سنا ہے اس کے دراز سائے نشہ اثر تھے
سنا ہے ہر خشت اِن در و بام کی سبو تھی
مگر لیاقت کے خون کے بعد یہ حویلی!
شہید خونیں کفن کی صورت لہو لہو تھی

پرانی جمہوریت کی یہ سرنگوں حویلی
اِسی حویلی میں رات کے شہریار کھیلے
اسی حویلی کے گوشۂ تیرگی میں چھپ کر
زمین کی قسمتوں سے جاگیردار کھیلے
اسی حویلی کے ایک اک نقش مضمحل سے
ہزار، عزت مآب، دیوانہ وار کھیلے
اِسی حویلی میں چھپ کے جمہور کے شکاری
مرے وطن کی مسرتوں کا شکار کھیلے
اسی حویلی میں وہ سیاست سے کھیل کھیلا
کہ جیسے شطرنج گھر کی باندی سے زار کھیلے

پرانی جمہوریت کی یہ سرنگوں حویلی
ہمارے پرچم کی سربلندی پہ طعنہ زن تھی
وہ خستہ دیوار جس کے اندیشے لازمی تھے
شکستگیِ قریب سے خطرۂ وطن تھی

وہ موجِ زہراب جانے کتنوں کی موت بنتی
جو اس کی مسموم خواب گاہوں میں موجزن تھی

تھے اس کے اوراقِ شب پہ تحریر وہ اندھیرے
کہ جس سے پیشانیِ مورّخ بھی صد شکن تھی
مگر حویلی کی مرگ آشام ظلمتوں سے
الجھ پڑی وہ سحر کہ خود شعلہ پیرہن تھی

عطا ہوئی ہے اُسے بھی بارے زبانِ صہبا
وہ حلقۂ ملک دوست جو کم سخن رہا ہے
کسان، مزدور، اہلِ فن، علم دوست شہری
وطن سے بے لَوث عشق جن کا چلن رہا ہے
وہ سب کے سب جمع ہو رہے ہیں نئے افق پر
نئے ستاروں کا حُسن رہ رہ کے چھن رہا ہے
عوام، سلطانِ دورِ جمہورِ پاک ہوں گے
عوام، جن کو عزیز پیارا وطن رہا ہے
بہ تیشۂ عزمِ کہنہ جمہوریت کے بدلے
"چہار منزل" کا اک نیا قصر بن رہا ہے

★

صبحِ امید

محمد صادق شاذ

وہ پَو پھٹی گجر بجا!
گجر کے ساتھ ہی وطن کا بختِ خفتہ جاگ اٹھا
مجاہدوں کے نعرہ ہائے پرخروش کی صدا
سوادِ پاک سے اٹھی
فضاؤں میں بکھر گئی
حیاتِ بے کراں سے تازہ دم مرا وطن ہوا
شباب کی رگوں میں خونِ گرم موجزن ہوا
پکارتا ہوا یہ وقت کا نقیب آگیا!
نشانِ منزلِ وطن بہت قریب آگیا!
خزاں گئی چمن کھلا
چمن کا ذرہ ذرہ نورِ زیست سے چمک اٹھا
خدا کا شکر ہے کہ دورِ انحطاط کٹ گیا

ہوا کا رُخ پلٹ گیا
غموں کا ابر چھٹ گیا
کہ ملتِ غیورِ پاک کو زعیم مل گیا
جو منتشر تھے اُن کو رہبرِ عظیم مل گیا
ہوا ہے ابر خیمہ زن
چمن میں کاروانِ شاہدِ بہار آگیا
وطن کے اوج پر وطن کا غمگسار آگیا
ہوائیں سنسنا اٹھیں
فضائیں مسکرا اٹھیں
وطن کی دل گرفتہ روح کو قرار آگیا!
وطن میں دورِ انقلابِ خوشگوار آگیا!

★

بنیادی جمہوریتوں کی چار منزلیں

اللہ بخش یوسفی

برصغیر میں مسلمانوں کی سلطنت ختم ہونے کے بعد ملت پر ادبار کی گھٹائیں چھا گئیں اور وہ ہر طرح تہی دست اور تہی دامن ہو گئے۔ ترقی اور فلاح کی سب راہیں ان پر مسدود نظر آتی تھیں کہ سر سید نے افق پر نمودار ہو کر ملت کو صحیح رہنمائی دی اور اسے ترقی کی راہ پر ڈال دیا اور ملت کی کشتی کا پتوار اس طرح سنبھالا کہ یہ سفینہ ڈوبنے سے بچ گیا۔

ایک صدی تک ملت اپنی بقا کے لئے جد و جہد کرتی اور ۱۹۴۷ء تک مختلف محاذوں پر مخالف قوتوں سے نبرد آزما رہی۔ اس نے اپنی انفرادیت اور بقا کے لئے بڑی سے بڑی قربانی پیش کی اور جیسی جیسی کٹھن منزلیں اس نے طے کیں وہ تاریخ کا بڑا ہوشربا باب ہے۔ ۱۹۴۰ء کے بعد سے قائد اعظم کی انتھک اور مخلصانہ کوششیں اور ملت کا جوش عمل ایک نئے شعور کا سبب بنا رہا اور بالآخر پاکستان کے وجود میں ہمارا قومی نصب العین حاصل ہو گیا۔ لیکن بانیٔ پاکستان کے ذہن میں جو تصور حکمرانی تھا اسے اُن کی اچانک وفات کے باعث پوری طرح بار آور ہونے کی مہلت نہ مل سکی۔ صرف ایک قطعۂ ارض حاصل کر لینا بجائے خود اتنا بڑا مقصد نہ تھا جتنا یہ نصب العین کہ مسلمانوں کے لئے ایک ایسی سرزمین میسر آئے جہاں کی قوم کے لئے ایک مامن اور ان کی ملی حیات اور معاشری و معاشی بہبود کا گہوارہ ہو، جہاں وہ اپنی قومی صلاحیتوں کو ترقی دے سکیں اور اپنی ثقافت کو محفوظ رکھ سکیں جہاں ہر فرد کو زندگی کے مساوی حقوق اور مواقع حاصل ہوں، جہاں معاشری انصاف ہو اور زندگی صحیح اسلامی نہج پر گامزن ہو۔

قائد اعظم کی وفات کے بعد عوام کو ترقیٔ وطن کے جذبے سے پُرخلوص لگاؤ باقی رہا لیکن اسی زمانے سے ایسے عناصر نے بھی سر اٹھانا شروع کر دیا جن کے سامنے نہ مفاد ملت تھا نہ خدمت وطن کا جذبہ بلکہ سیاسی آدمیوں کی جنگ زرگری تھی یا معاشرہ کے دوسرے عناصر کی قوم دشمن سرگرمیاں جس نے ملک کو تباہ کر دیا اور ہم ساری دنیا کے لئے مایۂ تضحیک بن گئے۔ ملک کی اس بارہ سالہ تاریخ میں ہمیں "اپنے" رہنماؤں میں کی ان کوششوں کا نمونہ دکھائی دیتا ہے جو انہوں نے صرف اپنی اغراض کے لئے کیں اور اسے نام دیا گیا "جمہوریت" کا۔ وہ کروڑوں انسانوں کو اسی بنا پر فریب دیتے رہے اور ملک ہر شعبہ میں تباہ ہوتا رہا۔

مگر یکایک غیرتِ حق کو حرکت ہوئی اور پچھلے سال ۸ / اکتوبر کو جب مؤذن میناروں سے اللہ کی بڑائی کا اعلان کر رہے تھے ایک نئی صبح اس ملک میں طلوع ہوئی۔ ایک مرد مجاہد نے ملک کے افق پر نمودار ہو کر ان ابن الوقت زعماء کے ہاتھ سے اقتدار سلطنت چھین لیا اور اس قابلیت اور جرأت کے ساتھ کہ ایک قطرۂ خون بھی نہ بہنے پایا۔ یہ ایک انقلاب تھا، پُرامن اور ہمہ گیر، مگر اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل خلاف معمول۔ اس انقلاب کا سہرا جنرل محمد ایوب خاں کے سر ہے۔ قیادت سنبھالتے ہی انہوں نے اعلان کر دیا تھا کہ ملک اہل ملک کا ہے۔ اور یہ عوام ہی کی ملکیت رہے گا۔ اس وقت جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ صرف تطہیر کا عمل ہے اور جمہوریت (جو عوام کا فطری حق ہے) انہیں بہت جلد واپس مل جائے گی۔ یہ وعدہ بھی وہ اپنے دوسرے وعدوں کی طرح، بالکل کھرے اور سچے ثابت ہوئے۔ چنانچہ بنیادی جمہوریتوں کے قیام کا انہوں نے اعلان کر دیا ہے اور اس کے لئے انتخابات اور تشکیل کا عمل اب صرف چند روز کی بات ہے۔ لیکن جمہوریتوں کے قیام سے قبل انہوں نے ملک کو ان تمام عناصر سے بھی پاک کر دیا جو جمہوریت کو عملاً بے معنی بنا رہے تھے۔ سیاسی جماعتوں کا خاتمہ، زمینداری کی تنسیخ اور معاشرے و انتظامیہ کی دوسری خرابیوں کو دور کر دینا ان کی دور اندیشی اور عملی سیادت کی روشن نشانیاں ہیں۔ کیونکہ زمینداروں کے چنگل، سیاسی آدمیوں کی ریشہ دوانیوں اور انتظامیہ کی تطہیر کے بغیر

صحیح جمہوری نظام کا کوئی بھی عمل کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا تھا۔

اب اس سلسلہ میں یہ پوچھا جاتا ہے کہ پچھلے جمہوری نظام اور ان بنیادی جمہوریتوں میں فرق کیا ہے۔ یہ فرق بہت بڑا اور بنیادی ہے۔ "بنیادی جمہوریت" کے الفاظ بجائے خود انقلابی تصور کو ہمارے سامنے لے آتے ہیں۔ کیونکہ پہلے جمہوریت کا آغاز اوپر سے تصور کیا جاتا تھا۔ اب اس تعمیر کا کام بنیاد یعنی عوام سے شروع کیا گیا ہے۔ بالخصوص دیہات کے عوام جو ملک کا ۸۰ فی صد حصہ ہیں اور پاکستان کے لئے ریڑھ کی ہڈی کے مصداق ہیں۔ پہلے مکان کا ڈھانچہ کھڑا کرنے کے بعد اس کی بنیادیں بنانے کی سعی کی جاتی تھی! اب پہلے بنیادیں رکھی جائیں گی بعد میں اس پر عمارت تعمیر ہوگی۔ سابقہ جمہوریت میں رائے دہندہ اپنے حالات سے مجبور تھا اور دوسروں کے اشاروں پر عمل کرتا تھا۔ اب وہ آزادانہ طریقہ پر اپنی رائے کو استعمال کر سکے گا۔ زرعی اصلاحات اور دوسرے قوانین کے تحت چونکہ عوام کو زمیندارا ور سرمایہ دار سے نجات مل چکی ہے اس وجہ سے اب اسے کسی کے اشاروں پر اظہار رائے کی ضرورت یا مجبوری باقی نہیں رہی اور رائے دہندگی چونکہ حق رائے دہی بالغان کے اصول پر ہوگی۔ اس لئے ملک کے ہر بالغ باشندہ کو اپنی سمجھ اور عقل سلیم کے مطابق اظہار رائے کا حق حاصل ہوگا اور وہ اسے آزادانہ استعمال بھی کر سکے گا۔

اس سلسلہ میں جنرل محمد ایوب خاں نے ۱۲ جون ۱۹۵۹ء کو "بنیادی جمہوریتوں" کے قیام کا اعلان کر دیا ہے۔ اس جمہوری نظام کو انہی چار منزلوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

(۱) **یونین کونسلیں**: ایک یا ایک سے زاید دیہاتی آبادیاں جن کے بالغوں کی تعداد ایک ہزار سے ڈیڑھ ہزار تک ہوگی باہم مل کر اپنی یونین کونسل کے نمائندوں کا انتخاب کرے گی۔ ظاہر ہے کہ اتنے مختصر حلقہ انتخاب میں رائے دہندگان ان لوگوں سے پوری طرح واقفیت رکھتے ہوں گے جو کنبہ کے امیدوار کی حیثیت سے منظر عام پر آئیں گے۔ اب وہ بہ آسانی معلوم کر سکیں گے کہ امیدوار کس قابلیت واہلیت کا مالک ہے اس کی گذشتہ زندگی کیسی گذری۔ اس کے عادات واطوار کیا ہیں۔ اسے اپنے علاقہ یا رائے دہندوں اور ان کے مفاد سے کس قدر دلچسپی ہے۔ وہ ان کی نمائندگی کر بھی سکے گا یا نہیں۔ اور ان کے حقوق ومفاد اس کے ہاتھ میں محفوظ رہ سکیں گے یا نہیں۔ اور اب رائے دہندگان چونکہ جدید اصلاحات کی برکت سے ہر طرح کی دھونس سے آزاد ہو چکے ہیں اور اب وہ کسی زمیندار، سرمایہ دار، یا جماعت کے سامنے بے بس ومجبور بھی نہیں اس وجہ سے آزادانہ اظہار رائے کا انہیں پورا پورا موقع مل گیا ہے۔ ہر یونین کونسل دس ارکان پر مشتمل ہوگی۔

ہو سکتا ہے کہ بعض ایسے افراد بھی ہوں جن کی قابلیت واہلیت یا تجربے سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہو لیکن وہ لوگ انتخابات کی ہنگامہ آرائیوں میں الجھنا پسند نہ کرتے ہوں۔ یا بعض خاص طبقے مثلاً مستورات، یا مزدوروں وغیرہ کی نمائندگی اس یونین میں نہ ہو سکتی ہو تو اس کے لئے حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ چند نشستیں بذریعہ نامزدگی پُر کر دی جائیں گی۔ لیکن ان نامزدگان کی تعداد یونین کی کل تعداد کے ۱/۳ سے زائد نہ ہوگی۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ دس ارکان کی یونین کونسل میں صرف تین ارکان نامزد کئے جا سکیں گے۔ یہی یونین کونسلیں حقیقت میں بنیادی جمہوریتیں ہیں اور حکومت کی باقی عمارت انہی بنیادوں پر کھڑی کی جائے گی۔ شہری آبادیوں کو بھی اسی طرح چھوٹے چھوٹے حلقوں میں تقسیم کر کے کونسلیں قائم کی جائیں گی۔ یہ کونسلیں اپنا صدر خود منتخب کیا کریں گی۔

(۲) **تحصیل یا تھانہ کونسلیں**: جب ابتدائی یا یونین کونسلیں بن جائیں گی تو مغربی پاکستان میں تحصیل وار اور مشرقی پاکستان میں تھانہ وار کونسلیں مرتب ہوں گی۔ ان کونسلوں کے لئے عام انتخابات نہ ہوں گے بلکہ یونین کونسلوں کے صدر ہی ان کے رکن متصور ہوں گے۔ اور جہاں میونسپل کمیٹیاں موجود ہوں گی وہاں ان کے صدر بھی رکن سمجھے جائیں گے۔ یہ کونسلیں بیشتر امور ترقیات عامہ سے متعلق ہوں گی اس وجہ سے ان کا تعلق ان محکموں کے افسروں سے بھی رہے گا۔ اس لئے حکومت نے اتحاد و یکجہتی اور باہمی طور پر مل جل کر کام کرنے کے خیال سے فیصلہ کیا ہے کہ ان کونسلوں میں ان محکموں کے افسروں کو بھی شامل کیا جائے تاکہ ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ چنانچہ تحصیل یا تھانہ کونسلوں میں امور ترقیات عامہ سے متعلق افسروں کو نامزد کیا جائے گا لیکن ان کی تعداد منتخب ارکان کے نصف سے زائد نہ ہوگی۔

(۳) **ضلع کونسلیں** : اس کے بعد تیسری منزل میں "ضلع کونسلیں" مرتب ہوں گی ان کونسلوں میں ضلعوں کی ترقیاتی پالیسیاں طے ہوں گی۔ اور چونکہ اس کام میں حکومت اور عوام دونوں کا باہمی تعاون ضروری ہے۔ اس لئے دونوں سے اراکین کی تعداد ان کونسلوں میں نصف نصف کی بنیاد پر رکھی جائے گی یعنی نصف سرکاری اور نصف غیر سرکاری یا عوامی نمائندے ہوں گے، اور جن میں یونین کونسلوں کے ارکان شامل ہوں گے۔

(۴) **ڈویژن کونسلیں** ۔ اس سکیم کی چوتھی منزل ڈویژن کونسل ہوگی۔ جو ہر ڈویژن میں قائم کی جائے گی۔ اس کے اراکین میں بھی ضلعی کونسل کی طرح سرکاری اور غیر سرکاری اراکین اسی نصف نصف کی نسبت سے ہوں گے۔ اور ہر ڈویژن کا کمشنر اپنی ڈویژن کونسل کا صدر ہوگا۔

اس طرح ابتدائی بنیادی کونسلیں جن کے سپرد انتظامی معاملات میونسپلٹی سے متعلق کام عدالتی اور پولیس کا نظام نیز ترقیات عامہ وغیرہ جیسے اہم امور ہوں گے۔ درجہ بدرجہ تحصیل ضلع یا ڈویژن کونسلوں میں دکھائی دینے لگیں گی۔ ان کے منتخب اراکین وہی ہوں گے جنہیں رائے دہندوں نے جان پہچان اور سوچ سمجھ کر منتخب کیا ہوگا۔ اور جن کے ساتھ حکومت ایسے ہی افسروں کو نامزد کرے گی جو ہر حیثیت سے امور ترقیات عامہ اور قومی ترقی یا تعمیر نو میں پوری طرح ممد و معاون ثابت ہوں گے۔ اور ہر یونین کونسل کو چند ٹیکس عائد کرنے کے بھی اختیارات دے دئے جائیں گے اور انہیں سرکاری مطالبات زر وصول کرنے کے اختیارات بھی حاصل رہیں گے یقین کیا جاسکتا ہے کہ یونین کونسلیں عوام کے لئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوں گی اور ان پر تعمیر شدہ عمارت ملک و قوم کی ترقی کی مستقل ضمانت ہوگی۔

یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ ملک کے لئے نیا دستور مرتب کرنے والوں نے اگر صدر مملکت یا پارلیمنٹ کے انتخابات کے لئے بالواسطہ طریقۂ انتخاب پسند کیا۔ تو ہو سکتا ہے انہی اداروں سے کام لیا جائے اور یہ بہت ہی موزوں حلقہ ہائے انتخاب قرار دئے جا سکتے ہیں۔

غرض اس طرح حکومت کے کاروبار میں شرکت کرنے کا ایک عملی موقع فراہم کر دیا گیا ہے۔ اب یہ عوام کا کام ہے کہ وہ اس نظام سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہونے کی سعی کریں۔ اور اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ لوگ اپنے اپنے حلقوں میں جو نمائندے چنیں انہیں اچھی طرح جانچ لیں ان کو دیانت دار مفید خلائق اور مخلص محب وطن اور ملک و معاشرہ کے مفاد کا بے غرض امین ہونا چاہئے۔ صحیح لوگوں کے انتخاب پر ہی اس نظام کے کامیاب ہونے کا انحصار ہے اور یہ جمہوری نظام دراصل ایک بہت بڑے کام ۔ یعنی ملک کی تعمیر نو کا سنگ بنیاد ثابت ہوگا۔

*

"ماہ نو" کی اشاعت خاص

جمہوریت نمبر

دسمبر ۱۹۵۹ء

انقلابی حکومت کے سربراہ فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے ۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو عوام سے خطاب کرتے ہوئے یہ وعدہ کیا تھا کہ ملک میں سیاسی جماعتیں توڑنے کے بعد معاشرہ اور انتظامیہ کی تطہیر کی جائے گی اور اس کے بعد جمہوری نظام بحال کر دیا جائے گا۔ انقلابی حکومت نے یہ وعدہ پورا کر دکھایا اور آج ملک میں بنیادی جمہوریتیں قائم کرنے کے انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔ تفصیلات کے اس اہم کام کی تفصیل عوام تک پہنچانے کے لئے "ماہ نو" کی اگلی اشاعت ایک خصوصی اشاعت ہوگی جس میں بتایا جائے گا کہ جمہوریت کا مفہوم کیا ہے اور اس کی عملی شکل اس ملک کے لئے کس طرح موزوں ہے۔ اس کے بعد ملک کو دستوری نظام حکمرانی کے لئے کس طرح تربیت دی جائے گی اور ان اقدامات میں عوام کی بہبود اور ہمہ جہتی ترقی کے کیا کیا امکانات مضمر ہیں۔ نیز یہ بھی بتایا جائے گا کہ جمہور کے حقوق کیا ہیں اور فرائض کیا اور ہم ان سے کس طرح عہدہ برآ ہو کر ملک کو ایک فلاحی مملکت بنا سکتے ہیں۔ اس خصوصی اشاعت کے لئے مشتہرین اور ایجنٹ صاحبان فی الفور توجہ کریں ۔ (ادارہ)

ماہ نو، کراچی، نومبر ۱۹۵۹ء

ادیب اور قومیت

قدرت اللہ شہاب

میں "ادیب اور قومیت" کے مسئلہ پر گفتگو کا آغاز دو حصّوں میں کرنا چاہتا ہوں۔
پہلے تو میں پاکستان کے علاقائی و ثقافتی سیاق و سباق میں قومیت کی بنیاد و ہیئت کی تشریح کرونگا اور پھر اس سیاق و سباق میں ادیب کی اہمیت اور ذمہ داریوں کو واضح کروں گا۔ ہمیں یہ اعتراف کرنے میں کوئی حجاب محسوس نہ کرنا چاہیئے کہ اس تمام مدت کے دوران ہمارے پاس جس چیز کی سب سے زیادہ کمی رہی وہ ایک قوم نہ ہونے کا احساس ہے۔ غالباً دنیا میں ہمارا واحد ایسا ملک ہے جہاں جمہور کو اکثر یہ یاد دہانی کرنا ضروری ہوتا ہے کہ محب وطن ہونا اچھی بات ہے اور اس نیک مشورہ پر جمہور کچھ ناراضگی بھی محسوس نہیں کرتے!۔ ان کے اس عجیب و غریب رویہ کی تاریخی وجوہ ہیں۔ ایک بات تو یہ ہے کہ ہم میں سے واقعی کوئی شخص پاکستانی کی حیثیت سے پیدا نہیں ہوا ہے۔ ہم میں سے بیشتر سب سے پہلے تو مسلمان، اور پھر ہندوستانی اور اس کے بعد بنگالی، پنجابی، سندھی، اور پٹھان وغیرہ، کی حیثیت سے پیدا ہوئے ہیں۔ جب ہم نے برصغیر میں اپنے ایک علیحدہ قوم ہونے کا اعلان کیا تو ہمارے اس اعلان کی بنیاد علاقائی نہیں بلکہ مذہبی و روحانی تھی۔ لیکن تقسیم ملک کے بعد ہمیں فوری طور پر اپنی روحانی قوم پرستی کو علاقائی قوم پرستی میں منتقل کرنے کا مسئلہ درپیش ہوا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ کیونکہ پچھلے ۱۲ سال کی بے اصولی سیاست کے تماشے نے اسے اور زیادہ دشوار بنا دیا تھا۔ لیکن اب ہمیں حقیقتوں کو تسلیم کرنا چاہیئے۔ علاقائی لحاظ سے ہمارا ملک دُو دور دراز حصّوں میں منقسم ہے۔ لسانی اور ثقافتی اعتبار سے دیکھئے تو ہمارے یہاں بہت سی زبانیں اور ثقافتیں ہیں۔ لہذا ہماری قومیت ان طوطات پر مبنی نہیں ہوسکتی۔ ہماری قومیت کی واحد اور تنہا بنیاد مذہب ہے اور یہ مذہب اسلام ہے۔ خواہ ہمارے ذاتی خصائل کے لئے اسلام مناسب ہو یا نہ ہو۔ خواہ وہ ان متعار ثقافتوں سے جو ہم نے اختیار کر رکھی ہیں ہم آہنگ ہو یا نہ ہو۔ خواہ وہ ہماری غیر ملکی تعلیم سے مطابقت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ بحیثیت قوم کے ہم اسلام سے فرار نہیں کرسکتے۔ ہم اس سے جتنا دور ہونگے اتنا ہی زیادہ ہم انتشار کے غار میں گرتے جائیں گے اس لئے اگر ہم کسی اعلیٰ مقصد کے لئے ایسا نہ بھی کریں تب بھی قومی یگانگت اور بقا کے خالص دنیاوی مقصد کے لئے ہم اسلام کو اپنی مملکت کی بنیاد اور جوازی حیثیت سے نظر انداز نہیں کرسکتے۔ پاکستان کے سیاق و سباق میں اسلام کے لئے یہ پہلی دلیل ہے اور اس سے وسیع تر اور اعلیٰ تر سیاق و سباق میں دوسری دلیل یہ ہے، کہ ؎

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشہ ہو!
جدا دیں ہو سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

وسیع معنوں میں ہمارے نجی اور قومی معاملات میں مذاہب کو تسلیم کرنے کی تیسری وجہ بھی ہے اور اس کا تعلق فلسفۂ جنگ سے ہے۔ ایک ادبی مناظرہ میں لفظ جنگ کے استعمال پر بلاوجہ شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ انسان اپنی معجز نما ترقیوں کے باوجود ابھی تک جنگ کا بدل نہیں نکال سکا ہے۔ انسانی ذہن اور ثقافت کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ جنگ کے ادعا اور مقاصد میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ ابتدائی دور میں جانوروں، بستیوں، یا عورتوں پر جنگیں ہوئیں۔ جیسے جیسے انسان وسیع النظر ہوتا گیا علاقوں اور ملکوں کی جنگ ہونے لگی۔ مزید ارتقاء کے بعد صرف قومیت ہی جنگ کا باعث نہ رہی بلکہ اعلیٰ قومی سیاسی و اقتصادی گروہوں میں رقابت جنگ کا سبب بنی۔ اب ہم ایک ایسی منزل پر پہنچ چکے ہیں جہاں جنگ صرف نصب العین کی بنا پر چھڑے گی۔ لیکن انسانی ترقی کا یہی انجام نہیں۔ انسانی بصیرت مادی نصب العین سے بلند ہو کر ہی

جس کا بلند ہونا یقینی ہے آخری جنگ ایسی تہذیبوں کے درمیان چھڑے گی جو مادی دنیا کے بجائے روحانی دنیا میں انسان کے فرائض سے متعلق مختلف تصورات کی حامل ہوں گی۔ اس فیصلہ کن جنگ میں اسلامی تہذیب جو انمٹ روحانی اقدار کی حامل ہے ایک عظیم فریق کی حیثیت سے شریک ہوگی۔ آج ان ہی اقدار کو مضبوط کرکے ہم اس آخری جنگ میں حصہ لے سکیں گے۔ جو ہو سکتا ہے ۱۰ سال بعد، پچاس سال بعد، یا مستقبل کی ان گنت صدیوں بعد، جو ابھی وقت کی گود میں پوشیدہ ہیں، لڑی جائے۔ اگر ۸ کروڑ انسانوں کی قوم اپنے وسائل اور شاندار صلاحیتوں کے باوجود اس اہم مقصد کو نظر انداز کردے یا انسانی تقدیر پر اپنی مہر لگانے میں ناکام رہے تو تاریخ کا فیصلہ قطعی ہمارے خلاف ہوگا۔ جسے معاف نہیں کیا جاسکے گا۔

اس طرح ہماری قومیت کی تشکیل جدید ایسی ہی ہے جیسی کہ ایک نگینہ کی ہشت پہل تراش خراش اور جو قوس قزح کی طرح ہفت رنگ لیکن خود ایک ٹھوس ہیرے کی طرح شفاف و چمکدار ہوگی۔

یہ کام چار باتوں پر منحصر ہے پہلے تو ہمیں آزادی سے قبل کے جذباتی و نفسیاتی ماضی سے نکلنا ہے دوسرے یہ کہ ایک مشکل جغرافیائی صورت حال پر قابو پانا اور ایک ایسی سرزمین سے اپنے کو وابستہ کرنا ہے جو ۱۱۰۰ میل کے درمیانی فصل کے باوجود ایک ہی سرزمین کا ٹکڑا ہے۔ تیسرے ہمیں بے شمار علاقائی ثقافتوں اور زبانوں کے تانے بانے سے یک رنگی ثقافت کو جنم دینا ہے۔ جو اپنی گوناگونیوں کے باوصف رنگا رنگ اور نہایت شاندار ہو۔ چوتھے ہمیں اپنی قومیت کے عناصر قوت کو اسی طرح بروئے کار لانا ہے کہ وہ ملت کے ناگزیر دھارے کی معاون بن جادیں۔ میں اسے ناگزیر اس لئے کہتا ہوں کہ اسلام میں، قومیت کا مفہوم تمام سیاسی تصوروں اور نظاموں کے مقابلہ پر سب سے زیادہ آفاقیت کو محیط اور بے شمار صلاحیتوں کا حامل ہے۔

اس چار پہلو کام کی تکمیل صرف ایک سیاسی و انتظامی عمل ہی نہیں بلکہ درحقیقت ایک تخلیقی عمل ہے۔ اس لئے ادیب اس چیلنج اور اس کو قبول کرنے کے وسیع بلکہ لامحدود میدان میں اتر کر اپنا غیر معمولی کردار ادا کرسکتا ہے۔

ہر ادب بنیادی طور پر یا تو بڑی حد تک ذات کے متعلق یعنی داخلی ہوتا ہے یا بڑی حد تک ماحول کے متعلق یعنی خارجی ہوتا ہے۔ یہ مصنف کی فنکارانہ صلاحیت ہوتی ہے جو اسے بدیہی اور کلی حیثیت دیتی ہے۔ مصنف کی عظمت اس امر میں ہے کہ وہ اپنی روح کے اندرونی تجربوں اور اپنے ماحول کے بیرونی اثر کو سچائی اور حسن کی اعلیٰ تر حقیقتوں میں بدل دے۔ ایک دوشیزہ کی زلفوں کی آب و تاب، اس کی حسین آنکھوں کی چمک، اس کے اعضاء کا تناسب، اور اس کے وجود کی مہک، ادب کے وجدان اور تخلیق کے لئے غالباً کافی ہیں۔ لیکن یہ ادب اسی وقت کوئی مقصد اور کوئی رُخ رکھ سکتا ہے جب اس میں اس ماحول کا بھی لحاظ رکھا جائے جس میں وہ پیدا ہوا اور سانس لے رہا ہے۔ لیکن اگر شاعر کے خوابوں کی یہ دوشیزہ ایسی معاشرت سے تعلق رکھتی ہے جہاں اعلیٰ امارت کے پردوں نے اسے غریب مداحوں کی نظر سے پوشیدہ رکھا ہے تو یقیناً وہ ایسے ادب کو جنم دے گی جس میں طبقاتی فرق اور ناانصافیوں پر خاص زور دیا جائے گا۔ لیکن اگر یہ دوشیزہ ظلم و جور کے ایسے معاشرہ میں پرورش پارہی ہے جس میں اس کا بہ آسانی اغوا کیا جاسکتا ہے اور اسے محلوں اور شاہی حرم کی کنیز بنا کے رکھا جاسکتا ہے تو بے شک وہ انارکی اور بغاوت کے ادب کو جنم دے گی۔ ہاں اگر اس کے برخلاف اس کی زندگی اور معاشرہ کے حالات اسے اپنا حسن بازار میں فروخت کرنے پر مجبور کرتے ہیں تو وہ لازماً معاشرتی انصاف اور اصلاح کا ادب پیدا کرنے کا باعث بنے گی۔ غالباً ادب مقصد اور رُخ کے اس حس کے بغیر بھی پیدا کیا جاسکتا ہے اور یہ ادب ایک اچھا ادب بھی ہوسکتا ہے لیکن لازماً یہ بڑا ادب نہ ہوگا۔

لہٰذا مقصد و رُخ کے اس جذبہ پر پاکستان کے مصنفین کو پورے خلوص اور حقیقت پسندی کے ساتھ توجہ دینا چاہئیے ہم طبعی اور مابعد الطبعیات کی زندگی کے متعدد مسائل سے دوچار ہیں۔ لیکن زندہ رہنے کے لئے ہمارے سامنے سب سے بڑا مسئلہ حب الوطنی اور قومی یکجہتی کا ہے۔ مستقبل کے قاری کو یہ کہنے کا موقع نہ دیجئے کہ آج کا مصنف اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہ ہوسکا۔ ★

★ (مباحثہ رائٹرز گلڈ۔ ڈھاکہ)

★

غزل

احمد ندیم قاسمی

میں ہوں، یا تو ہے خود اپنے سے گریزاں جیسے
میرے آگے کوئی سایہ ہے خراماں جیسے

تجھ سے پہلے تو بہاروں کا یہ انداز نہ تھا
پھول یوں کھلتے ہیں، جلتا ہے گلستاں جیسے

یوں تری یاد سے ہوتا ہے اُجالا دل میں
چاندنی میں چمک اٹھتا ہے بیاباں جیسے

دل میں روشن ہیں ابھی تک ترے وعدوں کے چراغ
ٹوٹتی رات کے تارے ہوں فروزاں جیسے

تجھے پانے کی تمنا، تجھے کھونے کا یقیں
تیرے گیسو مرے ماحول میں غلطاں جیسے

وقت بدلا، پہ نہ بدلا مرا معیارِ وفا
آندھیوں میں سرِ کہسار چراغاں جیسے

اشک آنکھوں میں چمکتے ہیں تبسم بن کر
آ گیا ہاتھ ترا گوشۂ داماں جیسے

تجھ سے مل کر بھی تمنا ہے کہ تجھ سے ملتا
پیار کے بعد بھی لب رہتے ہیں لرزاں جیسے

میرے اشعار میں یوں دفن ہیں اسرار ترے
پردۂ ساز میں آواز ہو پنہاں جیسے

بھری دُنیا میں نظر آتا ہوں تنہا تنہا
مرغزاروں میں کوئی قریۂ ویراں جیسے

چھا گئی ضبطِ فغاں پر کبھی یوں شدتِ غم
گونج اٹھے شورشِ زنجیر سے زنداں جیسے

غمِ جاناں، غمِ دوراں کی طرف یوں آیا
جانبِ شہر چلے دخترِ دہقاں جیسے

عصرِ حاضر کو سناتا ہوں اس انداز میں شعر
موسمِ گل ہو مزاروں پہ گل افشاں جیسے

زخم بھرتا ہے زمانہ، مگر اس طرح ندیم
سی رہا ہو کوئی پھولوں کے گریباں جیسے

چراغِ زندگی ہوگا فروزاں ہم نہیں ہوں گے
چمن میں آئے گی فصلِ بہاراں ہم نہیں ہوں گے

جوانو! اب تمہارے ہاتھ میں تقدیرِ عالم ہے
تمہیں ہو گے فروغِ بزمِ امکاں ہم نہیں ہوں گے

اگر ماضی منور تھا کبھی تو ہم نہ تھے حاضر
جو مستقبل کبھی ہوگا درخشاں ہم نہیں ہوں گے

سالک

مولانا عبدالمجید سالک مرحوم

مسلم ٹاؤن لاہور
۲۴۔ اپریل

عزیز مکرم، السلام علیکم۔

خط ملا۔ سوالات کا جواب لکھ کر بھیجتا ہوں۔ تبصرہ ذکرِ اقبال پر نظر سے گزرا تھا۔ شکریہ۔

آپ نے کبھی "انجمن خدام الصوفیہ" کا نام اور اس کے رسالے کا نام "انوار الصوفیہ" چھپا ہوا دیکھا ہے یا نہیں؟ صوفیا لکھنا درست نہیں۔ صوفیہ یا پھر ہر ایک قرینہ صحت کا موجود ہے گو صحیح یہ بھی نہیں۔ آپ کسی مستند ادیب یا عالم کی کتاب میں صوفیا نہیں پائیں گے۔ صوفیہ البتہ جابجا ملے گا۔

"ہامی بھرنا" ہاں کرنے کو کہتے ہیں۔ اور خالص دہلی کا اردو محاورہ ہے اس لئے اس پر جائے تعلق کا کوئی دخل نہیں۔ حامی بھرنا حمایت کرنے کو نہیں کہتے۔ صرف "ہاں کرنے" میں آمادگی ظاہر کرنے کو کہتے ہیں۔

آپ نے جن حضرات سے دریافت کیا۔ اور جنہوں نے صوفیا اور "حامی بھرنا" کو درست بتایا وہ زبان سے بے خبر ہیں۔

سالک

عکس تحریر
(خط بنام سفیع عقیل)

مغلیہ مصوری

۲

۱

۴

۳

۱- طاؤس (قلم: استاد عبدالصمد ، عہد اکبری)

۲- دربار شاہجہاں (عہد شاہجہانی کی تصویر)

۳- اشرف زمانی بیگم زوجہ بہادر شاہ ظفر (مختصر شبیہ نگاری)

۴- ایک مغل شہزادی (اٹھارویں صدی) (مختصر شبیہ نگاری)

بہ یادِ رفتگاں :

مولانا عبدالمجید سالک مرحوم

(چند یادیں)

شفیع عقیل

یہ سنہ ۱۹۵۰ء کا ذکر ہے۔ شام کا وقت تھا اور، میں اور مجید لاہوری سڑکوں پر بیکار گھومنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ نہ کوئی پروگرام تھا اور نہ کوئی خاص دلچسپی۔ مقصد صرف گھومنا تھا بے ارادہ اور وہ بھی پیدل۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ ابھی شام ہی تھی اور رات بھیگنے میں خاصی دیر تھی۔ اس لئے نہ کلفٹن جا سکتے تھے اور نہ نیٹی جیٹی کے پُل پر بیٹھ کر سمندر کی خنک ہوا سے لطف اندوز ہو سکتے تھے شاید یہی وجہ تھی کہ ہم چند منٹ گھومے اور تھک گئے۔ اور یہ گھومنا بھی صرف بندر روڈ تک ہی محدود رہا۔ اس بے کیفی کو دیکھتے ہوئے طے یہ ہوا کہ مولانا سالک کے پاس چلا جائے۔ کچھ لطیفے ہوں گے اور کچھ باتیں سنیں گے۔ پرانے یاروں کے قصے چلیں گے اور بیتی یادیں دہرائی جائیں گی۔ اور اس طرح وقت آسانی سے کٹ جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ہمارے پیشِ نظر سالک صاحب کے پاس جانے کا محض یہی ایک مقصد تھا۔ اس وقت نہ تو ہم علم کے موتی رولنا چاہتے تھے اور نہ ادبی مسائل پر گفتگو سننے کا اشتیاق تھا۔ مجید کا تو معلوم نہیں، لیکن میرا یہی تصور تھا۔ اور جہاں تک مجھے اندازہ ہے اس وقت مجید بھی اسی موڈ میں تھے —— لیکن ہاں، میں آپ کو یہ بتانا تو بھول ہی گیا، کہ اس سے پہلے میں مولانا عبدالمجید سالک سے کبھی نہیں ملا تھا! بارہا ان کے تذکرے ضرور ہوئے، کئی بار اُن کے بارے میں گفتگو بھی ہوئی اور سینکڑوں دفعہ ان کے لطیفے اور چٹکلے سنے مگر ان سے ملاقات ابھی تک نہ ہو سکی تھی۔ جہاں تک ان کی تحریروں کا تعلق تھا وہ تو اس زمانے سے پڑھتے آ رہے تھے جب وہ "مولانا عبدالمجید سالک" کم اور "عبدالمجید سالک بٹالوی بی۔ اے" زیادہ تھے۔ تاہم اُن کی تحریروں سے دلچسپی اور اُن کی شخصیت کا احترام دل میں بہت تھا۔ ان سے دو چار بار مراسلت بھی ہو چکی تھی، لیکن ان سب باتوں کے باوجود کبھی ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اور اس وقت ان کے پاس جانے کا پروگرام بے مقصد اور اچانک تھا۔ جب ہم سالک صاحب کے پاس جا رہے تھے، عین اسی وقت ایکا ایکی مجید کو نہ جانے کیا یاد آ گیا کہ بولے : "تم مولانا کے پاس چلو —— میں ابھی آتا ہوں۔"

اس وقت مجید سے یہ پوچھنا قطعی لاحاصل تھا کہ انھیں کیا کام یاد آ گیا ہے، کیونکہ عام طور پر ان کے کام اچانک اور ایسے ہی موقعوں پر یاد آ جایا کرتے تھے۔ اور ان کے متعلق دریافت کرنا پرلے درجے کی حماقت تھی۔

ان دنوں مولانا عبدالمجید سالک لاہور سے کراچی آئے ہوئے تھے اور ان کا قیام نگار ہوٹل میں تھا۔ وہ جب بھی کبھی کراچی آئے ان کا قیام ہمیشہ نگار ہوٹل ہی میں ہوا اور یہ بھی انُ کی وضعداری کی ایک دلیل تھی۔ خیر، میں کہہ یہ رہا تھا کہ مجید تو اچانک یاد آنے والے کام کے سلسلے میں چلے گئے۔ اور میں نگار ہوٹل میں پہنچ گیا۔ سالک صاحب ایک ہی روز پہلے کراچی پہنچے تھے اور اُن کے کمرے کا نمبر مجھے یاد تھا۔ اور میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ ان کے حلیہ کے بارے میں، میں نے طرح طرح کی باتیں سوچ رکھی تھیں۔ نام کے ساتھ مولانا ہونے کی وجہ سے میرا خیال تھا کہ ان کی بڑی سی داڑھی ہوگی، مونچھوں کی لبیں کٹی ہوں گی اور قرأت کے انداز میں باتیں کرتے ہوں گے۔ سرسید اور حالی کی تصویریں دیکھنے کے بعد ان کے متعلق یہ خیال اور بھی پختہ ہو گیا تھا۔ جب میں نے یاد کئے ہوئے نمبر والے کمرے کے دروازے پر دستک دی تو اندر سے ذرا بھاری اور بارعب آواز آئی : "کون —— ؟ اندر آ جائیے —— !"

لیکن جونہی میں دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا تو ایک لمحہ کے لئے تو کچھ سٹپٹا گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کمرے کا نمبر بھول کر کسی دوسرے کمرے میں آپہنچا ہوں۔ کیونکہ اس وقت کمرے میں جو صاحب سامنے بیٹھے تھے وہ میرے تصور کے بالکل خلاف تھے۔ نہ ان کی لمبی لمبی داڑھی تھی، نہ مونچھیں، اور نہ مولویانہ طرز تکلم ــــ درمیانہ قد، جسم قدرے بھاری، رنگ گندمی اور خط و خال موزوں، آنکھوں میں چمک اور چہرے پر بشاشت، داڑھی صاف اور مونچھیں بہت چھوٹی، سر پہ چھوٹے چھوٹے اٹھتے بال جن کی سفیدی اور سیاہی آپس میں دست و گریباں، آنکھوں پر سفید شیشوں کی عینک اور کلے میں نہ ہونے کے برابر پان، کشادہ پیشانی اور گول چہرہ۔ یہ تھے مولانا عبدالمجید سالک۔ ان کا یہ سراپا میں نے ایک ہی نظر میں دیکھ لیا تھا۔ اس وقت وہ ململ کا سفید کرتہ اور سفید شلوار پہنے کہنی کا سہارا لئے چارپائی پر یوں نیم دراز تھے جیسے گندم کا کوئی بہت بڑا بیوپاری ابھی ابھی چڑھتے بھاؤ سودا کرکے فارغ ہوا ہو!

انھوں نے لیٹے لیٹے مجھے ایک نظر دیکھا اور پھر ذرا مسکرا کر بولے:ــ "بیٹھیے"۔

اور پیشتر اس کے کہ وہ میرا نام، یا میرے آنے کا سبب، دریافت کرتے، میں نے جلدی سے اپنا تعارف کرا دیا۔ میرا نام سنتے ہی وہ اور بھی خندہ پیشانی سے بولے: "اچھا ــــ تو آپ ہیں شفیع عقیل!"

اس وقت انھوں نے 'اچھا' اور 'شفیع عقیل' کے الفاظ کو خاصا کھینچ کر ادا کیا تھا۔ "وہ ٹرک کہاں رہ گیا۔؟" انھوں نے پوچھا۔ ٹرک سے ان کی مراد مجید لاہوری سے تھی۔ ضرورت سے زیادہ موٹا ہونے کی وجہ سے وہ مجید کو عام طور پر ٹرک کہا کرتے تھے۔ اور ٹرک بھی جس میں مٹی بھری ہوئی ہو۔ انھوں نے مجھ سے یہ سوال کرنے کے ساتھ ہی اپنے دائیں ہاتھ سے ناک دبائی۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ یہ ان کی عادت تھی۔ باتیں کر رہے ہوں یا تنہائی میں بیٹھے ہوں، کوئی ادبی مسئلہ زیر بحث ہو یا محض لطیفے ہو رہے ہوں، وہ اپنے دائیں ہاتھ سے درمیان میں کبھی کبھی ناک کو چھوتے اور یا پھر دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں سے فضا میں اس طرح لکھنے لگتے جیسے باقاعدہ کتابت کر رہے ہوں۔ اس طرح فضا میں لکھنا بھی اُن کی عادت میں شامل تھا۔ بلکہ ایک بار تو میں نے پوچھا بھی کہ۔ "مولانا! آپ یہ فضا میں اس طرح کیا لکھتے رہتے ہیں۔؟" جواب میں ہنس کر بولے۔ "بس عادت سی ہو گئی ہے"۔ اور پھر لمحہ بھر رُک کر خود کہنے لگے: "میں سمجھتا ہوں میرا خط لکھنے سے اتنا پختہ اور صاف نہیں ہوا جتنا اس طرح فضا میں لکھتے رہنے سے ہوا ہے"۔ بہرصورت اس وقت وہ فضا میں نہیں لکھ رہے تھے انھوں نے ہاتھ سے منہ صاف کیا اور پھر میرا جواب سُنے بغیر بولے: "اچھا تو شفیع صاحب ــــ اور سنائیے؟"

بھلا میں کیا سناتا۔ میں تو خود سننے گیا تھا اور وہ بھی لطیفے۔ مگر مجید کے نہ ہونے سے وہ پروگرام یونہی رہ گیا۔ میری ان سے پہلی ملاقات تھی۔ نہ ان سے بے تکلفی سے بول سکتا تھا اور نہ قہقہہ مار کر ہنس سکتا تھا۔ لہٰذا ہوا یہ کہ میں عقیدت، احترام، اور رعب میں کرسی پر یوں بیٹھا رہا، جیسے کسی نے زبردستی پکڑ کر بٹھا دیا ہو اور اب وہی آکر اٹھائے گا۔ سالک صاحب اس دوران برابر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے اور میں درمیان میں کبھی ہنس دیتا اور کبھی سنجیدہ ہو جاتا لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس وقت میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ ہنسنا کب شروع کروں اور سنجیدہ کب سے بنوں۔ بہرحال مجید کو نہ آنا تھا اور نہ آئے۔ میں نے جوں توں کرکے، جس طرح بھی بن پڑا وقت گزارا، اور وہاں سے بھاگ نکلا۔

اس کے بعد یہ معمول بن گیا کہ اِدھر شام ہوتی اور اُدھر میں اور مجید نگار ہوٹل جا دھمکتے۔ پھر سالک صاحب کی باتیں ہوتیں اور ہم۔ ابھی یہاں کا قصہ چھڑا ہوا ہے تو تھوڑی دیر بعد کہیں اور کا ذکر ہو رہا ہے۔ تاثیر کی باتیں ہو رہی ہیں، پطرس کے لطیفے سنائے جا رہے ہیں، حفیظ کے معرکوں کی داستانیں دہرائی جا رہی ہیں۔ "نیاز مندانِ لاہور" کے تذکرے چھڑ جاتے یا سالک صاحب کی صحافتی زندگی کی کہانیاں چل نکلتیں تو وقت کا احساس تک نہ رہتا۔ لطیفے پر لطیفہ ہو رہا ہے، چٹکلے پر چٹکلا چلا آرہا ہے، اور جملے پر جملہ کسا جا رہا ہے لیکن مجال نہیں کہ پاسِ ادب ہاتھ سے چلا جاتے۔ سالک صاحب اپنی وضع داری کو کبھی نہ بھولتے تھے۔ رکھ رکھاؤ کا دامن کبھی ان کے ہاتھ سے نہ چھوٹتا تھا۔ وہ چھوٹوں میں چھوٹے اور بڑوں میں بڑے تھے لیکن اس کے باوجود ان کی وضع داری میں کبھی فرق نہ آیا۔ "نیاز مندانِ لاہور" کے حلقہ میں صف اول کی ادبی شخصیتیں شامل تھیں، پطرس، تاثیر، حفیظ، صوفی، مہر، مجید ملک، چغتائی، تاج، سبھی لوگ تھے لیکن یہ لوگ "نیاز مندانِ لاہور" میں شریک ہوتے ہوئے بھی سالک صاحب کے نیاز مند رہے۔ اور یہاں

کے بڑے ہونے کی دلیل تھی ۔ بڑے ادیب یا فنکار تو بہت ہوتے ہیں لیکن ایسے فنکار یا ادیب جن کی شخصیت بھی بڑی ہو بہت کم ہوتے ہیں۔ سالک صاحب کی ادبی اور علمی حیثیت کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت بھی بڑی تھی ۔ اور اسی بڑی شخصیت کی دلکشی تھی کہ شام ہوتے ہی میں باقاعدگی سے میں اور مجید ان کے پاس پہنچ جاتے ۔ ادھر ان کا یہ معمول تھا کہ وہ صبح ہی صبح اٹھتے اور ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر پہلے وقت میں جو کام ہوتا اس سے فرصت پا لیتے اور سیدھے تکلا ان کے دفتر آ جاتے۔ گرمیوں کے دن ، دوپہر کا وقت "نمکدان" کا دفتر دوسری منزل میں تھا۔ مولانا کا سانس چڑھا ہوا ہوتا ، آتے اور اپنی بھاری آواز میں السلام علیکم کہہ کر شیروانی ایک طرف ٹانگ دیتے چھتری دیوار سے ٹیک جاتی ، جناح کیپ میز پر رکھ دیتے اور دفتر میں بچھے ہوئے تخت پر گاؤ تکیہ کا سہارا لے کر نیم دراز ہو جاتے ۔ نیچے ایرانی کے ہوٹل سے ایک ٹھنڈا سوڈا منگوا کر پیتے اور پھر ان کی چٹخارے دار باتیں شروع ہو جاتیں ۔ یوں معلوم ہوتا جیسے مصری کی ڈلیاں چبائے چلے جا رہے ہیں ۔ روزانہ کوئی نہ کوئی تازہ لطیفہ ہوتا ، کوئی نہ کوئی نیا واقعہ سناتے ۔

سالک صاحب کا طنز بڑا دھیما مگر تیز ہوتا تھا ۔ اور اس دھیمے پن کی وجہ ان کی ذات تھی ۔ ان کے لہجہ تک میں دھیما پن تھا ۔ دراصل وہ میانہ روی اور آہستہ روی کے قائل تھے ۔ زندگی کے کسی شعبہ میں بھی وہ جلد باز نہ تھے ۔ اپنی روزمرہ کی زندگی میں بھی ان کے چند اصول تھے جن کی سختی سے پابندی کرنا ، ان کا ایمان تھا ۔ دوستی ہو یا دشمنی ، ان کے ہاں جلد بازی نام کو نہ تھی ۔ وقت کو دیکھ کر بات کرتے اور حالات کو سمجھ کر قدم اٹھاتے تھے ۔ ان کی نظر جس قدر گہری تھی اتنی ہی محتاط بھی ۔ یہ قرینہ ان کی زندگی میں ہمیشہ برقرار رہا ۔ یہاں تک کہ انہوں نے ادب اور سیاست میں بھی وقت اور حالات کو دیکھ کر اپنے لئے راستہ کا تعین کیا دراصل وہ وقت اور حالات سے سمجھوتہ کرتے رہنے کی عملی دانش سے واقف تھے ۔ اور یہ خصوصیت ان کی تحریر و تقریر میں بھی موجود تھی ۔ چنانچہ وہ طنز بھی کرتے تھے تو بڑا دھیما دھیما میٹھا میٹھا ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار کراچی کے ایک تاجر نے اپنے گھر پر مشاعرے کی مخصوص نشست کا انتظام کیا ۔ کھانا بھی تھا اور کھانے کا انتظام ایک کھلے لان میں میزوں پر کیا گیا تھا ۔ جونہی کھانے کے لئے بلایا گیا یار لوگ اس طرف لپکے ۔ مجید کھانے میں بہت تیزی دکھایا کرتے تھے ۔ میں اور سالک صاحب ایک طرف کھڑے کھا رہے تھے کہ اتنے میں مجید آئے ۔ ان کے ہاتھ میں پلیٹ تھی جو اس وقت بھی بھری ہوئی تھی اور وہ خاصا کھا بھی چکے تھے ۔ وہ جلدی سے میری طرف بڑھے اور بولے ۔

" شفیع کھانے میں کیا کیا ہے ۔ ؟ " پیشتر اس کے کہ میں مجید کو کوئی جواب دیتا سالک صاحب ہاتھ سے لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسکرا کر بولے : " یہ لوگ بچ گئے ہیں " ۔ اور مجید تلملا کر رہ گئے ۔

سالک صاحب نے اس وقت کی حکومت کی ایک باقاعدہ ملازمت اختیار کر لی تھی اور اب ان کا قیام مستقل طور پر کراچی ہی میں ہو گیا تھا ۔ رامچندر ٹمپل روڈ پر انھوں نے ایک فلیٹ پگڑی پر لے لیا تھا ۔ اور اب وہیں محفلیں جمنے لگی تھیں عقیدت مندوں ، دوستوں ، اور ملنے والوں کا یوں تانتا بندھا رہتا تھا جیسے کسی مشہور معالج کا مطب ہو ۔ ایک آتا اور دوسرا جاتا ۔ یہاں تک کہ رات ہو جاتی اور مجید کہیں گھومنے کا پروگرام بناتے یا پھر مشورہ دیتے ۔ " مولانا ! آج کوئی فلم دیکھیں ۔ ؟ " اور کبھی کبھار سالک صاحب بھی فلم دیکھنے کے لئے تیار ہو جاتے ۔ اس سلسلہ میں میری بدقسمتی نے جو مجھے پکارا تو ایک روز ان کے ساتھ میں بھی فلم دیکھنے چلا گیا ۔ مجید کہنے لگے ۔ " شفیع تو بھی چل ۔ "

لہذا " میں وی چل دیا " لیکن جب وہ ایک پرانے اور تیسرے درجے کے سینما کے پاس جا کر رک گئے تو بڑی پریشانی ہوئی وہاں ایک محیر العقول قسم کی نام نہاد سائنسی فلم چل رہی تھی ۔ میں نے کہا بھی کہ :

" فلاں سینما میں اچھی فلم چل رہی ہے " ۔ لیکن مجید اور سالک صاحب دونوں کا کہنا یہ تھا کہ ۔ " یہی دیکھتے ہیں ۔ سائنس کی فلم ہے معلوماتی ہو گی " ۔ معلوم نہیں اس میں مجید کے ذوق کو زیادہ دخل تھا یا سالک صاحب کی پسند کو لیکن ہوا یہ کہ فلم کے دوران مجید اور سالک صاحب دونوں بڑی محویت سے فلم دیکھتے رہے اور میں بیٹھا دل ہی دل میں کڑھتا رہا ۔ اس کے بعد جب بھی کبھی مجید نے میرے سامنے فلم دیکھنے کا ذکر چھیڑا ، میں وہاں سے سر پہ پیر رکھ کر بھاگ کھڑا ہوتا تھا ۔

غالباً ۱۹۵۲ء کی بات ہے ۔ پطرس پاکستان آئے ہوئے تھے ۔ انہی دنوں اتفاق سے ایک دن سالک صاحب کے فلیٹ میں پانی نہیں آیا تھا ۔ گھر میں بڑی پریشانی تھی ۔ لیکن شام کو دیکھا تو پطرس مرحوم اپنی کار میں پانی کا ایک بڑا سا گھڑا رکھے ۔ چلے آ رہے ہیں ۔ ملازم نے

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

کلمۂ حصر

محمد اقبال سلمان

"ہی" ایک کلمہ ہے، جسے قواعد اردو میں کلمۂ تخصیص کہتے ہیں۔ مختلف موقعوں پر جن مختلف معنوں میں اسے استعمال کیا جاتا ہے، ذیل میں ان کی وضاحت کی جاتی ہے:

۱۔ صرف، فقط کے معنوں میں۔ غالب:

منہ نہ دکھلاوے نہ دکھلا پر بانداز عتاب
کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

۲۔ مطلق، قطعاً کے معنوں میں۔ جلال:

ناصح بتائیں کیا ہمیں چپ لگ گئی ہے کیوں
جس کا جواب ہی نہیں یہ وہ سوال ہے

۳۔ بلاشبہ، یقیناً کے معنوں میں۔ "تم بات ہی ایسی کرتی ہو کہ نہ رکھی جائے اور نہ اٹھائی جائے" (رویائے صادقہ)

۴۔ بالآخر، آخرکار کے معنوں میں۔ داغ:

در وا زے پر آ ہی گئے وہ میری صدا سے
ملتا تھا بہت غیر کی آواز کا انداز

۵۔ فوراً، بلا تاخیر کے معنوں میں۔ "میں درگاہ سے شہر میں آیا۔ آتے ہی میں نے فصد کھلوائی" (نادراتِ غالب)

۶۔ تاکید کے معنوں میں، جیسے، نہ حامد ہی آیا نہ محمود؛ زید ہی نے کہا تھا، عمرو ہی گیا تھا۔ محزوں:

نہ تو نامہ ہی نہ پیغام زبانی بھیجا
حیف محزوں مجھے یارانِ وطن بھول گئے

۷۔ کم کو مزید کم اور زیادہ کو اور بھی زیادہ کر کے دکھانے کے لئے نیز مبالغے کے لئے بھی آتا ہے۔ جیسے وہ بڑا ہی عالم ہو، وہ بہت ہی شریر ہے۔ "یاد رکھو! مردم آزاری بہت ہی بری چیز ہے" (امراؤ جان ادا)

<u>ہی ضمائر و اسماء کے ساتھ:</u>

جب "ہی" ضمائر، اسمائے اشارہ اور بعض دوسرے حروف کے متصل واقع ہو، تو عموماً اپنی الگ شکل میں باقی نہیں رہتا۔ بلکہ اپنے ماقبل میں مدغم ہو جاتا ہے بعض صورتوں میں دوسرے کلمے کے ساتھ اس طرح گھل مل جاتا ہے کہ بظاہر اس کے وجود کا احساس تک نہیں ہوتا جن الفاظ میں کسی نہ کسی شکل میں "ہی" پایا جاتا ہے، وہ حسب ذیل ہیں:

یہی۔ اصل میں "یہ ہی" تھا۔ اب الگ الگ نہیں بولتے۔ اشارہ قریب (یہ) پر زور دینے کے لئے "خصوصاً یہ" یا "ایسا ہی" کے معنوں میں مستعمل ہے۔ داغ:

گر یہی قسمیں ہیں تو مجھ کو یقین آپ کے سر کی قسم بس ہو چکا

وہی۔ "وہ ہی" کا مخفف۔ "یہ ہی" کی طرح "وہ ہی" بھی متروک ہے۔ خاص کر "وہ" یا "صرف وہ" کے معنی دیتا ہے۔ مومن:

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی، یعنی، وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

نظم میں کبھی "وہ ہی" بھی استعمال کر لیتے ہیں۔ مومن:

نہیں اس کے خواں سے کوئی تلخ کام
وہی اشتہا بخشے، وہ ہی طعام

اُسی۔ "اُس ہی" کا مخفف۔ اسم اشارۂ قریب (اس) اور اسم اشارۂ بعید (اُس) کے حصر کے لئے آتا ہے۔ الگ الگ لکھنا بولنا قریباً متروک ہے۔ امیر:

ہو رو آنسوؤں کا قحط اگر ہے
اسی دن کے لئے خونِ جگر ہے!

غالب:

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

اُنھیں۔ بکسر اول و دوم و سکون یائے معروف۔ "ن" کی ہائے ہوز، ہائے مخلوط سے اور یائے معروف، یائے معروف و نون غنہ سے بدل گئی ہے۔ اسم اشارۂ قریب جمع (اِن) اور اسم اشارہ بعید جمع (اُن) کے حصر کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ تعظیماً واحد کے لئے بھی آتا ہے۔ اس کی جگہ "اُن ہی" کا استعمال غیر فصیح ہے۔

(الف) اُنھیں "ان کے بیٹے کی شادی کی تقریب میں آئے تھے۔ اُنھیں کے ہاں اترے تھے" ("نادراتِ غالب")
(ب) اِنھیں۔ امانت لکھنوی:

سرشکِ دیدہ ہائے تر سے دھو ڈالوں گا عصیاں کو
اِنھیں چشموں سے اے دل آبرو محشر میں پانی ہے

"اُنھیں" جب یائے مجہول سے پڑھا جائے، تو "اُن کو" کے معنی دیتا ہے۔ اکبر الہ آبادی:

اُنھیں شوقِ عبادت بھی ہے اور گانے کی عادت بھی
نکلتی ہیں دعائیں اُن کے منہ سے ٹھمریاں ہو کر!

مجھی (مجھ ہی)، ضمیر واحد متکلم (مجھ) کے حصر کے لئے آتا ہے۔ ذوق:

یا تو پاسِ دوستی تجھ کو بہت بے باک ہو
یا مجھی کو موت آ جائے تو قصہ پاک ہو

تجھی (تجھ ہی)، ضمیر واحد مخاطب (تجھ) کے حصر کے معنی دیتا ہے۔ خواجہ میر درد:

بستے ہیں ترے سائے میں سب شیخ و برہمن
آباد تجھی سے تو ہے گھر دیر و حرم کا

ہمیں (ہم ہی) بفتح اول و کسرۂ دوم و سکونِ سوم۔ ضمیر جمع متکلم (ہم) کے حصر کے لئے مستعمل ہے۔ داغ:

ہمیں تھے وہ جو کبھی تھے خزانۂ عرفاں
ہمیں ہیں اب کہ جو ڈھونڈو تو ہم میں خاک نہیں

کبھی نظم میں "ہم ہی" بھی لے آتے ہیں، جیسے:

دھول دھپّا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہمہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

اگر یائے مجہول کے ساتھ پڑھا جائے، تو اس کے معنی ہوں گے: ہم کو۔ غالبؔ:

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں؛
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں؟

تمھیں (تم ہی) بضم اول وکسر دوم وسکونِ سوم۔ ضمیر مخاطب (تم) کے حصر کے لئے آتا ہے۔ غالبؔ:

جو بات بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

تمھیں (بیائے مجہول "تم کو" کے معنی دیتا ہے۔ "انھوں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا کہ جاتے کہاں ہو؟ اب تو مجھے اور تمھیں جل کر راکھ کا ڈھیر ہونا ہے" (آبِ حیات)

سبھی۔ "سب ہی" کا مخفف ہے اور "سب" کے حصر کے لئے آتا ہے۔ میر دردؔ:

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بت خانہ تھا
ہم سبھی مہمان تھے واں تو ہی صاحب خانہ تھا

کہیں: "کہاں ہی" کا مخفف ہے۔ متعدد معنوں میں مستعمل ہے، لیکن زیادہ تر "کسی جگہ" کے معنی دیتا ہے۔ جلالؔ لکھنوی:

اُٹھے جو بزمِ یار سے تنہا ہم آئے گھر
طاقت کہیں، حواس کہیں، دل کہیں رہا

وہیں: "وہاں ہی" کا مخفف ہے۔ اُسی جگہ، اسی مقام پر۔ حالیؔ:

مگر ہم کہ اب تک جہاں تھے وہیں ہیں
جمادات کی طرح بارِ زمیں ہیں

یہیں: "یہاں ہی" کا مخفف ہے۔ اسی جگہ، اسی مقام پر۔ ناسخؔ:

جسمِ خاکی کو یہیں چھوڑیں عدم کی راہ لیں
اب وطن کو چلیے گردِ دشتِ غربت جھاڑ کر

جونہیں، جونہی، جُھوہیں: اکیلا "جوں" حرفِ تشبیہ[1] ہے، لیکن جب اس کے ساتھ "ہی" مل جائے، تو حرفِ شرط بن جاتا ہے۔ حالیؔ:

جونہی کان میں حق کی آواز آئی
لگا کرنے خود ان کا دل رہنمائی

یُونہیں، یُونہی: (یوں ہی) یہ لفظ "یُہیں" (بضم اول وکسر دوم وسکون سوم) بھی بولا جاتا ہے۔ اساتذہ نے اسے زمین اور قرین کے قافیہ میں نظم کیا ہے۔ بعض کے نزدیک "یونہی" یا "یوں ہی" صحیح ہے اور "یونہیں" غلط، لیکن اکثر اہل علم کے نزدیک ترجیح "یونہیں" کو حاصل ہے، کیونکہ حرفِ علت پر ختم ہونے والے الفاظ کے آخر میں نون غنہ کا اضافہ اردو میں عام ہے۔ اسی طرح، ایسیں:

---

[1] ذوقؔ: جوں سبزۂ دمیدہ تہِ سنگ ہمارا سر زیرِ گراں بارِ الم اٹھ نہیں سکتا

یوں نہیں گر روتا، ہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

کبھی (کب ہی) کب (ظرفِ زمان) کے حصر کے لئے آتا ہے۔ کسی وقت۔ غالب:

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

تبھی[1] (تب ہی) اسی وجہ سے، اسی سبب سے۔ خواجہ میر درد:

یوں وعدے ترے دل کی تسلی نہیں کرتے
تسکین تبھی ہووے گی جب آن ملے گا

جبھی[2] (جب ہی، اسی لئے، اسی واسطے۔ جلیل:

بتوں کے ذکر سے رکتی نہیں زباں کم بخت
جبھی تو اپنی دعا میں اثر نہیں آتا

یہ کلمات ہیں، جن میں "ہی" شامل ہے۔ ان کے علاوہ ایک لفظ "آپ" بھی ہے جس کے متصل "ہی" واقع ہو، تو مخفف صورت "آپی" بن جاتی ہے۔ داغ نے کہا ہے:

لن ترانی سے غرض کیا حسنِ عالم سوز کو
ہم نظر آپی چرا جاتے ہیں اکثر دیکھ کر

لیکن ادھر کچھ مدت سے مخفف صورت کا استعمال صرف زبانوں پر رہ گیا ہے۔ تحریر میں مکمل شکل "آپ ہی" کو ترجیح دی جانے لگی ہے۔

"ہی" کا محل استعمال:

قواعدِ زباں کی رو سے "ہی" مندرجہ ذیل موقعوں پر استعمال ہوتا ہے:

(الف) (حرفِ جار) سے پہلے، مومن:

جو پہلے دن ہی سے دل کا کہا نہ کرتے ہم
تو اب یہ لوگوں سے باتیں سنا نہ کرتے ہم

(ب) میں (علامتِ ظرف) سے پہلے۔ ناسخ:

ہر پھر کے دائرے ہی میں رکھتا ہوں میں قدم
آئی کہاں سے گردشِ پرکار پاؤں میں؟

(ج) نے (علامتِ فاعل سے پہلے، جیسے:

تم ہی نے داغ نہ اے نہیں اٹھائے ستم
یوں ہی سلف سے مرے یار ہوتی آئی ہے

یہ قاعدہ صرف ضمیر مخاطب، ضمیر غائب اور ضمیر جمع متکلم پر عاید ہوتا ہے۔ ضمیر متکلم واحد کی صورت میں ہی کا استعمال علامت

---

[1]، [2] تب اور جب حروفِ شرط میں بھی شمار ہوتے ہیں اور اسماء موصولہ میں بھی۔

فاعل کے بعد ہوگا۔ مثلاً "میں نے ہی لکھا تھا"۔ "میں ہی نے" لکھنا اور بولنا غلط ہے۔

(ہ) پہ اور پر (حرفِ ربط) سے پہلے۔ اکبر آلٰہ آبادی:

اے دوست! مجھے تو ہے خدا ہی پہ بھروسا
دشمن کو مبارک ہو مری گھات میں رہنا

(و) تک (حرفِ انتہا) سے پہلے — "جو کچھ راستے کی صعوبتیں اور خرابیاں تھیں، وہ بھی ان بھوتوں ہی تک تھیں"۔ (بھوت گنگا جمنی)

(ی) کو (علامتِ مفعول) سے پہلے "حالانکہ تم بالتخصیص مسلمانوں ہی کو ملزم ٹھہراتے ہو"۔ (ابن الوقت)

(ز) کا، کے، کی (حرفِ اضافت) سے پہلے، جیسے:

ہے قطع رہِ عشق میں اے ذوق ادب شرط
جوں شمع تو اب سر ہی کے بل جائے تو اچھا

مختصر یہ کہ "ہی" کا استعمال اس لفظ کے بعد ہونا چاہیے جس کی تخصیص تاکید یا حصر مطلوب ہو۔ اس صورت میں حروفِ ربط "ہی" کے بعد آسکتے ہیں، اس سے پہلے نہیں۔ اسی طرح دو منفی جملوں میں "ہی" کو حرفِ نفی کے ساتھ نہیں لایا جاسکتا، جیسے "کسی شخص کو بھی، خاندانی، گھریلو یا اس کے مماثل امور میں مستبدانہ مداخلت کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا اور نہ ہی اس کی عزت اور شہرت پہ حملہ کیا جائے گا"۔ یہاں دوسرا منفی جملہ یوں ہونا چاہیے: "نہ اس کی عزت اور شہرت ہی پر حملہ کیا جائے گا"۔

بعض کے نزدیک "نہایت" کے بعد "ہی" کا استعمال جائز نہیں۔ دلیل یہ دی جاتی ہے کہ نہایت کے معنی ہیں "بہت ہی" اور "نہایت ہی" کے معنی ہوں گے "بہت ہی ہی"۔ یہ استدلال صحیح نہیں۔ اساتذہ کی نظم و نثر میں "نہایت ہی" برابر استعمال ہوا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد "محصنات" میں لکھتے ہیں:

"بیا ہتک مبتلا کی زندگی نہایت ہی فکر سے گزری"۔

بہادر شاہ ظفر کا ایک مقطع ہے:

زمیں نہایت ہی تھی پر مشکل ظفر ہے استاد پر وہ کامل
غرض دکھائے وہی بنا کر زمیں پہ گو ہر فلک پہ اختر

★ ★ ★

ہمارے سامنے جو کام ہے اس کو انجام دینے کے لئے ہمیں یقیناً مشکلات کا سامنا کرنا پڑیگا قدرتی عوامل ہمیشہ مہربان نہیں ہوتے اور نہ عالمی حالات ہی ہمیشہ سازگار ہوتے ہیں لیکن ہم ایک جفاکش اور تنومند قوم ہیں جو مشکلات سے نہیں جھجکتی۔ ہمیں معجزات کی بھی توقع نہیں کرنی چاہیئے بلکہ اس عزم کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیئے کہ جو لوگ جی لگا کر کام کرتے ہیں وہ اپنی محنت کا پھل ضرور پاتے ہیں۔

(جنرل محمد ایوب خان: قوم سے نشری خطاب
بہ سلسلہ دوسرا پنجسالہ منصوبہ)

ماہِ نو کراچی، نومبر ۱۹۵۹ء

افسانہ

"مہمانِ عزیز"

انور عنایت اللہ

وہ چپکے سے ڈرائینگ روم میں آیا اور اس نے بڑی احتیاط سے دروازہ بند کیا اور اچھی طرح سے اطمینان کر لینے کے بعد کہ آس پاس کوئی نہیں تھا، اس نے باہر کا دروازہ کھولا۔ سِل وآنا اب بھی بڑی فرمانبرداری سے باہر اس کی منتظر تھی!

شام ہو گئی تھی۔ بادلوں کی وجہ سے قبل از وقت تیزی سے اندھیرا ہو رہا تھا۔ بڑی بی اب تک غالباً اپنی خوابگاہ سے باہر نہیں آئی تھیں۔ ملازم باورچی خانے میں تھے۔ گھر پر ایک عجیب پُراسرار سکوت چھا گیا تھا۔ یہ اچھا تھا کہ یہ کوٹھی شاہراہِ عام پر نہیں تھی بلکہ ایک گلی میں تھی ورنہ آج سِل وآنا کی فکر اسے علیحدہ ستاتی۔ اب امجد کو کم از کم اس کی طرف سے مکمل اطمینان تھا۔ اس نے بے چینی سے گھڑی دیکھی اور چپکے سے اپنے کمرے کی خاموش فضا میں لوٹ کر اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے کچھ دیر اور صبر سے حالات کا انتظار کرنا ہوگا۔ دریچے کے قریب ایک آرام کرسی پر وہ بیٹھ گیا اور ایک ٹھنڈی سانس لینے کے بعد اس چیخ کا انتظار کرنے لگا جس پر اس کے مستقبل کی خوشیوں کا دار و مدار تھا۔

اسے کراچی آئے آج دس دن ہو رہے تھے اور اب تک وہ سِل وآنا کے بارے میں کسی قسم کا فیصلہ نہ کر سکا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے لئے آخر کیا انتظام کرے۔ کراچی پہنچتے ہی خود اس کے قیام کا مسئلہ دردِ سر بن گیا تھا۔ عارضی طور پر اپنے لئے ایک کمرہ کرایہ پر لینے کے بعد اس نے سِل وآنا کی خاطر فوراً مکان کی تلاش شروع کر دی۔ فی الحال اسے اپنے ایک گوا نیز شناسا ڈاکٹر برگانزا کے یہاں ٹھہرایا اور پھر دن بھر کراچی کی سڑکیں ناپنے کے بعد اسے احساس ہو گیا کہ کراچی میں مناسب کرایہ پر بغیر پگڑی یا پیشگی کرایہ دا کئے معقول گھر مل ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کا ہوٹل بھی بس غنیمت ہی تھا اس کے باوجود خاصا مہنگا تھا۔ چنانچہ جب دو دن گذر گئے اور حالات حوصلہ شکن نظر آنے لگے تو امجد نے فیصلہ کر لیا کہ کل شام کو وہ یقیناً کسی نسبتاً سستے ہوٹل کا رخ کرے گا۔

شام کو اپنی ذہنی الجھنوں سے بچنے کے لئے وہ ایلفی پر نکل آیا۔ سردیاں شروع ہو چکی تھیں۔ عموماً شام کو بادل بھی گھر آتے لیکن بارش شاذ و نادر ہی ہوتی۔ مہینے کا دوسرا ہفتہ شروع ہو چکا تھا اس کے باوجود دکانوں میں خاصی بھیڑ تھی۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے کتابوں کی ایک دوکان پر پہنچا اور پل بھر کے لئے رک کر رنگ برنگے سرورق کی نئی کتابوں کا جائزہ لینے لگا۔ ایک کتاب اٹھا کر یونہی ورق گردانی شروع کی ہی تھی کہ یکایک کسی نے بڑی محبت سے اسے لپٹا لیا۔

"تم یہاں کہاں امجد؟ کب آئے بھئی؟ کہاں ٹھہرے ہو؟" نووارد نے ایک سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔ آج تقریباً دو سال کے بعد دونوں دوست ملے تھے۔ رفیق اسے کافی ہاؤس لے گیا۔ کافی کا آرڈر دے دیا گیا اور پھر باتیں شروع ہو گئیں۔ امجد نے اپنی بپتا سنائی تو رفیق نے کہا: "اماں یار۔ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو۔ سب انتظام ہو جائے گا۔ آخر ہم کس مرض کی دوا ہیں۔ تم تنہا ہو۔ اگر بیوی بچے ساتھ ہوتے تو پھر یہ مسئلہ دقت طلب تھا۔ میری رائے میں تم علیحدہ مکان کرائے پر لینے کا خیال فوراً دماغ سے نکال دو۔۔۔ ایں خیال است و محال است و جنوں۔ میں تمہیں آج ہی ایک کمرہ دلوا دیتا ہوں جہاں تم پئینگ گیسٹ بن کر مزے میں رہ سکتے ہو۔ مہمانی کا یہ سلسلہ مجھے بہت پسند ہے۔ اب تک میں بھی ایک بہت ہی معقول جگہ پئینگ گیسٹ تھا۔ بقول شخصے مالکن ایک ستم ظریف بیوہ تھیں صرف ڈھائی سو روپے لیتی ہیں۔ کشادہ ہوادار صاف ستھرا کمرہ ہے۔ معقول فرنیچر ہے۔ کھانا بہت عمدہ۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ گھریلو ماحول ہے بس تم آج ہی میری جگہ آ جاؤ۔" اس نے ایک سگریٹ امجد کو پیش کرتے ہوئے کہا۔

"تمہاری جگہ؟ — تم کہاں جا رہے ہو؟" امجد نے پوچھا۔

"ارے بھئی معاف کرنا۔ یہ بتانا یاد ہی نہیں رہا کہ میرا تبادلہ ہو گیا ہے۔ کل میں ڈھاکہ جا رہا ہوں۔ میں بیگم زیدی سے تمہاری شرافت کی پُرزور سفارش کر دوں گا۔ مجھے یقین ہے وہ تمہیں رکھ لیں گی۔ دراصل ان کا دنیا میں کوئی نہیں۔ خاصی بڑی کوٹھی ہے۔ کرایہ پر اس لئے نہیں دیتیں کیونکہ اکثر کرایہ دار ستاتے ہیں۔ بڑی بی نے ایک کمرہ "مہمانوں" کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ عموماً ایک سے زیادہ گیسٹ نہیں رکھتیں۔"

چنانچہ اس طرح بیگم زیدی سے تعارف ہوا اور امجد کی رہائش کا مسئلہ طے ہو گیا۔ پہلی ہی رات کو کھانے کے بعد باتوں باتوں میں چوروں کا ذکر آ گیا۔ پچھلے دنوں اس محلے میں چوری کی کئی وارداتیں ہو چکی تھیں۔ اس کی وجہ سے بیگم زیدی خاصی خائف تھیں، کہنے لگیں "رات کو بڑا پھاٹک اور صدر دروازہ میں خود اپنے ہاتھ سے بند کرتی ہوں۔ نوکر یوں تو پرانے ہیں لیکن یہاں مجھے اس وقت تک چین سے نیند نہیں آتی جب تک خود یقین نہ کر لوں کہ دروازے بند ہیں۔ ذرا آپ بھی اس کا خیال رکھئے گا۔ اگر رات کو کبھی دیر سے آنا ہو تو مجھے بتا دیجئے گا میں جاگتی رہوں گی۔ ویسے بھی مجھے راتوں کو بہت کم نیند آتی ہے۔"

"آپ اطمینان رکھئے میں ان معاملوں میں خود بے حد محتاط ہوں — آپ اچھا سا کتا کیوں نہیں پال لیتیں؟ — بڑا وفادار اور قابل اعتماد ہوتا ہے!" امجد نے ازراہ ہمدردی مشورہ دیا۔

"جی؟ — کتا؟؟؟ — ارے نہیں میاں۔ انتہائی نجس جانور ہے جس گھر میں ہو وہاں فرشتے نہیں آتے۔ نہیں نہیں میاں۔ اگر مجھے دنیا میں کسی چیز سے نفرت ہے تو کتے سے۔ چھوٹے کتوں سے گھن آتی ہے۔ بڑوں سے روح کانپتی ہے۔ نہیں نہیں بھئی کتے وتے کی علت نہیں نے کبھی پالی اور نہ ارادہ ہی ہے۔ کئی سال ہوئے۔ ایک ریٹائرڈ فوجی افسر میرے پئینگ گیسٹ تھے۔ دو دن تو وہ بڑے معقول طور پر رہے۔ لیکن تیسرے دن نہ جانے کہاں سے ایک کتے کا پلہ لے آئے۔ انتہائی ذلیل۔ سیاہ فام۔ کریہہ شکل۔ کہنے لگے مجھے کتوں سے عشق ہے۔ میں نے اسی دن انہیں چلتا کیا۔ وہ دن اور آج کا دن۔ خدا کے فضل سے کسی کتے کی ہمت نہیں ہوئی کہ اس طرف کا رخ کرتا۔"

بڑی بی سے کتوں کے خلاف اتنی لمبی چوڑی تقریر سن کر امجد کا دل بیٹھنے لگا۔ اس کی ہمت نے ساتھ چھوڑ دیا اور اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ اس نازک موضوع پر وہ کسی اور دن، جب حالات زیادہ حوصلہ افزا نظر آئیں، تبادلۂ خیال کرے گا۔

چنانچہ پہلی رات جوں توں کٹ گئی۔ دوسرے دن صبح ناشتے کے بعد دفتر جانے سے پہلے امجد، ڈاکٹر بھگاترا کے یہاں گیا، سِل دانا کی مزاج پرسی کی، ڈاکٹر کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا، اپنی مشکلات بیان کیں اور دس بارہ دن کی مہلت اور مانگی۔ سِل دانا ایک طرف بیٹھی بڑی سنجیدگی سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ دراصل وہ کتوں کی اس نسل سے تھیں جو انسان کی ذہانت کے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں رکھتی۔ سِل دانا کو یوں تو امجد کی شکل پسند تھی لیکن اپنی نسلی عادتوں سے مجبور اسے یقین کامل تھا کہ امجد ضرورت سے زیادہ خبط الحواس تھا۔ ورنہ آخر وہ اسے اس اجنبی گھرانے میں چھوڑ کر خود الگ کیوں رہتا۔ اب تو مجبوری تھی۔ امجد نے آگے بڑھ کر پیار سے تھپتھپایا تو اس نے کوئی خاص لفٹ نہیں دی۔ وہ ایک عجیب بیگانہ انداز سے منہ کھولے اسے چپ چاپ دیکھتی رہی۔ آنکھیں گویا کہہ رہی تھیں۔ عجیب مالک ہو تم میرے۔ مجھے غیروں کے یہاں چھوڑ کے اب آئے ہو منہ صورت بنائے؟ جاؤ ہم نہیں بولتے!

دفتر میں دن بھر امجد کا مطلق جی نہ لگا۔ سِل دانا کا مستقبل رہ رہ کر اسے ستا رہا تھا۔ بڑی بی کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ حشر تک سِل دانا کے داخلے کی اجازت نہ دیں گی۔ دن کسی نہ کسی طرح کٹ گیا۔ شام اپنے ساتھ تمام تر اداسیاں لے آئی۔ وہ دفتر سے نکلا اور نہ جانے کب تک صدر کی پُررونق سڑکوں پر کھویا کھویا سا اِدھر اُدھر بھٹکتا پھرا حتیٰ کہ اندھیرا ہو گیا۔ وکٹوریا روڈ سے وہ ایک گلی میں مڑا تو آگے چل کر ایک چھوٹے سے ہوٹل کے پچھواڑے اسے کئی کتے نظر آئے جو بڑے ذوق و شوق سے ہڈیاں کھا رہے تھے۔ نہ جانے کیوں ان کتوں کو دیکھتے ہی یکایک برق رفتاری سے اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ وہ پل بھر کے لئے رک گیا، اپنی ٹھوڑی کھجائی اور کچھ سوچ کر

ہوٹل میں داخل ہوا۔ ہوٹل کے مالک نے ایک خاصے معقول خوش پوش صاحب بہادر کو اپنے گندے ہوٹل میں داخل ہوتے دیکھا تو قدرے حیرانی اور خوشی کے ساتھ اپنی کرسی پر سے اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔ ہوٹل غریب مزدور قسم کے گاہکوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک طرف ریڈیو گلا پھاڑ رہا تھا اور دوسری طرف گاہکوں نے زور زور سے باتیں شروع کر رکھی تھیں۔ امجد نے ہچکچاتے ہوئے موٹے مالک سے سرگوشیوں میں باتیں کیں اور تھوڑی دیر بعد جب وہ ہوٹل سے باہر نکلا تو اس کی جیب میں کاغذ کا ایک پیکٹ تھا جس میں تلا ہوا ایک چاپ تھا!

امجد سیدھا ڈاکٹر برگانزا کے یہاں پہنچا۔ وہاں سے ٹہلانے کے بہانے سے سل وانا کو لیا اور اسے سیدھا اپنے گھر لے آیا۔ گھر سے ذرا دور رک کر اس نے بڑی احتیاط سے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ یہ محلہ خاصا پرسکون تھا۔ گھر پر حسب معمول سکوت چھایا ہوا تھا۔ بڑی بی اور نوکروں کا زیادہ وقت گھر کے اندر گذرتا۔ وہ کتیا کو صدر دروازے تک لے گیا، جیب سے چاپ نکالا اور عین دروازے کے سامنے سیڑھیوں پر چاپ رکھ دیا۔ تلے ہوئے گوشت کی بو ناک میں پہنچی تو سل وانا کے معدے کا منہ کھل گیا اور اس نے زور لگا کر آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ امجد نے چپکے سے اسے اجازت دے دی۔ سل وانا نے وہیں آرام سے بیٹھ کر چاپ کھا لیا اور ساتھ ہی اس دروازہ کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کی جہاں یہ نعمت ملی تھی۔ جب ہڈی کی باری آئی تو امجد نے چپکے سے زنجیر تھام لی اور اسے گھسیٹتا واپس ڈاکٹر برگانزا کے یہاں لے گیا۔

اب روز یہ اس کا معمول ہو گیا کہ دفتر سے سیدھا صدر جاتا، اسی ہوٹل سے تلا ہوا چاپ خریدتا، ڈاکٹر کے یہاں جاتا، سل وانا کو ساتھ لیتا۔ جب اندھیرا ہو جاتا تو اپنے یہاں لے جاتا۔ دور ہی سے اطمینان کر لینے کے بعد کہ میدان صاف ہے، کتیا کو صدر دروازہ تک لے جاتا۔ اسے سیڑھیوں پر بٹھا کر چاپ کھلاتا اور واپس ڈاکٹر کے یہاں پہنچا دیتا۔

سل وانا کی یوں تو امجد کے بارے میں کوئی بہت اچھی رائے نہیں تھی لیکن اس کے باوجود اسے اپنے مالک کی یہ ادا خوب بھائی۔ وہ روزانہ بے چینی سے شام کا انتظار کرتی۔ دن کو جب بھی وہ آنکھیں بند کرتی، وہ فراخدل دروازہ اس کے ذہن میں ابھرتا جہاں سے روزانہ اسے ایک مزیدار چاپ ملتا۔ دسویں دن تک سل وانا کے ذہن میں وہ دروازہ کچھ اس طرح مرتسم ہو گیا تھا کہ اس کے تصور کے ساتھ اسے چاپ یاد آتا اور بے اختیار اس کی رال ٹپکنے لگتی۔ اب وہ بڑی سنجیدگی سے اپنے نوجوان صاحب ذوق مالک کے بارے میں رائے بدلنے کی سوچ رہی تھی۔ حالات یہ بتا رہے تھے کہ وہ اتنا احمق نہیں تھا جتنا کہ وہ اپنے موٹے موٹے شیشوں کی عینک سمیت نظر آتا۔

دس دن تو مزے میں گذرے۔ گیارہویں دن پانچ بج گئے تو بھوک سے سل وانا کی بے چینی میں اضافہ ہو گیا۔ آج نہ جانے امجد کو کیوں دیر ہو رہی تھی۔ وہ عموماً پانچ بجے تک آ جاتا۔ خدا خدا کر کے چھ بجے امجد صاحب تشریف لائے اور سل وانا کی جان میں جان آئی۔ آتے ہی حسب معمول اس نے چند لمحے ڈاکٹر اور ان کی بیگم سے گفت زیادہ کی شنید کم۔ پھر سل وانا کو پیار سے تھپتھپایا، اس کی زنجیر کھولی اور دونوں ٹہلنے نکل پڑے۔

آج سل وانا کو راستہ بھی معمول سے زیادہ طویل لگا۔ خدا خدا کر کے شام کے دھندلکے میں دور سے وہ دلکش دروازہ نظر آیا تو سل وانا خوشی سے جھوم اٹھی، پیار سے غرائی اور پھر اس نے زور لگا کر خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔ لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ خلاف معمول آج امجد نے مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ بڑے پھاٹک سے کوٹھی میں داخل ہو کر امجد نے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور پھر اچھی طرح سے اطمینان کر لینے کے بعد آج زنجیر کے ساتھ ساتھ کتیا کے گلے کا پٹہ بھی کھول دیا۔ آزاد ہوتے ہی وہ تیزی سے دم ہلاتی ہوئی آگے بڑھی اور بند دروازہ پر رک گئی کیونکہ خلاف معمول آج چاپ کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔ اس نے ادھر ادھر سونگھ کر دیکھا لیکن اسے مایوسی ہوئی۔ آخر تھک کر اس نے ایک سرد آہ بھری اور دم سے فرش صاف کیا اور

چپ چاپ صبر کے ساتھ سیڑھیوں پر منہ لٹکائے پنجوں پر سر رکھے بیٹھ گئی۔ غالباً گوشت اندر کہیں تلا جا رہا ہے۔ کوئی بات نہیں۔ دیر ہو ہی جاتی ہے۔ انتظار کر لوں گی!۔ اس نے آنکھیں بند کئے سوچا۔

امجد دور کھڑا سب کچھ دیکھتا رہا۔ پھر اس نے زنجیر اور پٹہ پودوں کے ایک جھنڈ میں چھپا دیا اور چپکے سے سِل دانا کے کان میں صبر سے یہیں بیٹھے رہنے کی تلقین کرنے کے بعد وہ گھر میں داخل ہوا۔ ڈرائینگ روم میں حسب توقع کوئی نہ تھا۔ بڑی بی غالباً اپنے کمرہ میں تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ وہ روزانہ مغرب کے بعد، سڑک کی دوسری طرف، اپنی ہم عمر ایک دوسری بڑی بی کے یہاں جاتیں۔ اس نے بےچینی سے گھڑی دیکھی۔ مغرب کا وقت قریب تھا۔ وہ چپ چاپ اپنے کمرہ میں چلا گیا، دریچے کے قریب ایک آرام کرسی پر بیٹھ گیا اور ایک ٹھنڈا سانس لینے کے بعد اس چیخ کا انتظار کرنے لگا جس پر اس کے مستقبل کی خوشیوں کا دارومدار تھا!

اسے سِل دانا پر مکمل بھروسہ تھا۔ نہ جانے وہ کب تک یوں ہی خاموش بیٹھا اپنے خیالوں میں کھویا رہا۔ آسمان پر بادل اب بھی منڈلا رہے تھے اور ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ یکایک حسب توقع بڑی بی کی چیخ سنائی دی تو وہ تیزی سے اٹھا اور ڈرائینگ روم میں جا پہنچا۔ بیگم زیدی عین اس وقت صدر دروازہ اندر سے بند کر رہی تھیں۔ انہیں قدموں کی چاپ سنائی دی تو وہ تیزی سے مڑیں۔ "امجد صاحب۔ کتا" وہ چیخ پڑیں۔

"جی۔۔! کیا فرمایا؟؟" امجد نے حیرت سے پوچھا۔

"دروازہ پر بتا بڑا خوفناک کتا بیٹھا ہے" وہ تیزی سے بولیں۔

"کتا؟۔ یہاں؟۔ ٹھہریئے۔ میں دیکھتا ہوں" یہ کہتے ہوئے امجد تیزی سے آگے بڑھا۔ وہ جوں ہی دروازہ کے قریب پہنچا، بیگم زیدی تیزی سے ڈرائینگ روم کے دوسرے سرے پر پہنچ کر سہمی سہمی نگاہوں سے صدر دروازہ کو دیکھنے لگیں۔ امجد نے باہر نکل کر دروازہ باہر سے بند کر لیا اور چند لمحوں کے بعد دوبارہ لوٹ آیا۔ بیگم زیدی اب بھی خاصی سہمی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

"جی ہاں۔ کتا ہی ہے۔ لیکن عجیب لیچڑ قسم کا ہے۔ وہ تو ملتا ہی نہیں" اس نے اطلاع دی۔

"لیکن۔ عجیب مصیبت ہے۔ مجھے تو باہر جانا ہے۔ بیگم شمسی انتظار کر رہی ہوں گی۔ اسے مار کر کیوں نہیں بھگا یا آپ نے؟"

"اجی۔۔ السا شین ہے۔ یوں تو پالتو نظر آتا ہے۔ لیکن سنا ہے۔ اس نسل کے کتے بدتمیزی مطلق پسند نہیں کرتے۔ میں نے شوں شا کیا تو بھی وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ میرا خیال ہے راستہ بھٹک کر اس طرف آ گیا ہے۔ غالباً تھک کر سستا رہا ہے۔ آیئے۔ کچھ دیر یہیں بیٹھ کر باتیں کریں۔ مجھے یقین ہے دس پندرہ منٹ سستا کر چلا جائے گا۔" امجد نے تسلی دی۔ یہ بات بڑی بی کی سمجھ میں آ گئی اور دونوں بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ جب پندرہ بیس منٹ گذر گئے تو امجد اٹھا اور ایک بار پھر اٹھ کر باہر گیا اور چند لمحوں کے بعد لوٹ آیا۔

"کیوں؟۔ گیا وہ؟" بڑی بی نے اشتیاق سے پوچھا۔

"جی نہیں۔ وہ تو ملتا ہی نہیں۔ میں نے پتھر اٹھا کر مارنے کی کوشش کی تو پیار سے دم ہلا کر اٹھا اور ایسی رحم طلب نگاہوں سے مجھے دیکھا کہ میرا تو دل پسیج گیا۔ وہ تو بے حد معصوم ہے بیگم زیدی۔ مجھے تو بیمار نظر آیا۔ مجھے یقین۔ ہے پالتو ہے۔ رات ہو گئی ہے موسم خراب ہے۔ پڑے رہنے دیجیے باہر۔ صبح خود ہی چلا جائے گا۔" امجد نے سادگی سے سفارش کی۔ بنیادی طور پر بیگم زیدی رحم دل تھیں ویسے پالتو جانور انہیں پسند تھے سوائے کتوں کے۔ اس وقت غالباً وہ امجد کی لفاظی سے متاثر ہو گئی تھیں۔ انہوں نے کچھ سوچ کر اجازت دے دی۔ اس پر امجد نے فوراً کہا:

"ارے۔ میں یہ تو بھول ہی گیا تھا کہ آپ کو بیگم شمسی کے یہاں جانا ہے۔ چلئے۔ میں پہنچا آتا ہوں۔ گھنٹہ بھر بعد خود آپ کو لے آؤں گا۔" یہ تجویز بیگم زیدی کو پسند آ گئی۔ دونوں باہر نکلے تو سل دانا نے بڑی پرامید نگاہوں سے سر اٹھا کر دیکھا۔ بڑی بی سہمی سہمی

امجد کے پیچھے پیچھے باہر نکلیں۔ امجد نے ایک بار پھر شوں شاں کیا۔ لیکن اس چھیڑ چھاڑ کا کتیا پر مطلق کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بدستور زبان نکالے مسکراتی رہی۔

"دیکھ لیا نا آپ نے؟ — بے حد مسکین ہے۔ مجھے تو لگتا ہے بیچاری ستم رسیدہ ہے۔ دیکھئے۔ بالکل کچھ نہیں کرتی" یہ کہہ کر امجد نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو فوراً بڑی بی نے اس کا بازو تھام لیا "نہیں نہیں امجد صاحب — کہیں حملہ نہ کر دے"۔ انہوں نے روکا۔ "ارے نہیں بیگم زیدی — یہ تو بے ضرر ہے۔ مجھے تو یہ بھوکی نظر آ رہی ہے۔ دیکھئے لمبی زبان باہر لٹک رہی ہے" امجد نے ہمدردی جتائی۔ بڑی بی دور سے خاموش کھڑی غور سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ سِل وانا بھی دلچسپی سے ان کا جائزہ لے رہی تھی۔ اسے بڑی بی امجد سے زیادہ معتبر نظر آئیں۔ اب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس گھر کے باورچی کو آج ہو کیا گیا؟ آج امجد صرف زبانی جمع خرچ پر کیوں تلا ہوا تھا؟ — اس نے بیزاری سے ایک انگڑائی لی اور اٹھ کر ایک ٹانگ سے کان کھجانے لگی۔

"مجھے بھی بھوکی لگ رہی ہے" بیگم زیدی نے کہا۔

"اگر آپ اجازت دیں تو اسے کھانے کو کچھ دے دوں۔ شاید کھانا کھا کر یہ چلی جائے" امجد نے ایک نئی تجویز پیش کی۔ بیگم زیدی کے دل پر کتیا کی بیکسی کا اثر ہونے لگا تھا۔ انہوں نے حامی بھر لی۔

جب وہ گھنٹہ بھر بعد ڈرتے ڈرتے پھاٹک میں داخل ہوئیں اور انہیں کتیا نظر نہیں آئی تو ان کی جان میں جان آئی۔ وہ خوش خوش ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں تو امجد کو منتظر پایا۔

"آپ خود ہی آ گئیں؟ میں آپ کو لینے آنے ہی والا تھا — میں ابھی اسے بھگاتا ہوں — کمبخت یہاں یوں سو رہی ہے جیسے اس کے باوا کی میراث ہے" امجد نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"کیا کہا؟ — یہاں سو رہی ہے؟ — کون؟" بڑی بی نے گھبرا کر پوچھا۔

"آپ گھبرائیے نہیں سب بے حد مسکین کتیا ہے۔ کتوں سے میری بھی جان نکلتی ہے۔ لیکن خدا کی قسم — یہ تو بھیڑ ہے بلکہ بھیڑ سے بھی زیادہ بے ضرر — وہ دیکھئے۔ پیٹ بھر کھانا ملا تو اس کونے میں کتنے آرام سے سو رہی ہے — شی۔ اٹھ بھئی۔ موسم خراب ہے تو کیا ہوا۔ ہم نے کوئی ٹھیکہ لے رکھا ہے؟ چل نکل یہاں سے!"

امجد نے دوبارہ شوں شاں شروع کر دی۔ اس بدتمیزی کا سِل وانا پر مطلق کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے بیزاری سے ایک آنکھ کھول کر اسے دیکھا۔ عجیب نامعقول انسان ہے۔ اتنی دیر بعد کھانا دیا اور اب چین سے سونے بھی نہیں دیتا — سونے دو بھئی۔ کیوں ستاتے ہو؟ — پنجوں پر سر رکھے وہ دوبارہ سکڑ کر سو گئی۔

"میرا خیال ہے اسے سردی لگ رہی ہے" بیگم زیدی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"جی ہاں جی ہاں" امجد نے خوش ہو کر فوراً کہا۔ "سنا ہے اس نسل کے کتے بے حد نازک ہوتے ہیں۔ بہت زیادہ حساس۔ سنا ہے فوراً نمونیا ہو جاتا ہے۔ اور پھر یہ تو کتیا ہے بیچاری — اگر آپ مناسب سمجھیں تو — یعنی اگر آپ اجازت دیں تو رات بھر بیچاری یہیں پڑی رہے۔ باہر بارش کے آثار ہیں" اس نے ڈرتے ڈرتے تجویز پیش کی۔ بیگم زیدی کو ہچکچاتے دیکھا تو اس نے فوراً کہا۔ "صبح یہ نہ بھی گئی تو پولیس اور اخبار کی مدد سے اس کے سنگدل مالک کو ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کروں گا۔ مجھے تو یہ کسی بڑے گھرانے کی پالتو کتیا نظر آتی ہے"

اب کے امجد کی ترکیب کارگر ثابت ہوئی اور سِل وانا کو گھر کے اندر رات گزارنے کی اجازت مل گئی۔

دوسرے دن امجد نے سِل وانا کے فرضی مالک کی تلاش شروع کر دی۔ حسب توقع اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ ان حالات میں ایسی مسکین، اتنی بے ضرر، اس حد تک معقول کتیا کو کیسے گھر سے نکال دیا جاتا؟ — بیگم زیدی نے فیصلہ کیا کہ جب تک اس کے اصل مالک کا پتہ نہیں چلتا کتیا یہیں رہے گی۔ غالباً انہیں سِل وانا بہت پسند آ گئی تھی۔

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

بنگلہ افسانہ:

"زندگی ہے یا کوئی....."

علاء الدین الآزاد
مترجم: یونس احمر

بہت پہلے بادل چھٹ گئے تھے۔ لیکن جب شام کو نیرو گملے میں پانی دینے کے لئے آئی اور زینے کے پاس ایک خالی جگہ پر نظر پڑی تو اس کا جی ایکدم سے اداس ہوگیا۔ بہت دیر تک وہ چپ چاپ ہاتھ میں بالٹی لئے کھڑی رہی۔

اگرچہ پھول کا گملہ چھوٹا اور بہت ہی معمولی سا تھا لیکن اس کے لئے نیرو ہمیشہ فکرمند رہتی۔ دوسروں کے لئے تو یہ بہت ہی معمولی بات ہو سکتی ہے لیکن جو قرینے سے زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں انہیں اس کی اہمیت معلوم ہو سکتی ہے۔ کوئی چیز حقیر اور چھوٹی ہی کیوں نہ ہو، لیکن دل میں اگر اس کی عزت ہے تو پھر یہی چھوٹی سی چیز بڑی بن جاتی ہے۔ نیرو کا دل بھی ایسا ہی تھا —— بڑا ہی نازک، نرم اور حساس! اس کے دل کو کوئی بات ناگوار گذرتی تو وہ کمرہ بند کر کے دیر تک روتی رہتی اور اس طرح دل کا بار ہلکا کرتی۔

کل جو واقعہ پیش آیا کوئی اتنا سنگین واقعہ نہ تھا۔ کالج سے واپسی میں ظہیر کو کچھ دیر ہوگئی تھی۔ وہ گھبرایا ہوا تھا اور اس گھبراہٹ کے عالم میں اس نے برآمدے کے اوپر قدم رکھا ہی تھا کہ پھول کا گملہ جوتے سے ٹکرا گیا اور گر پڑا۔ اس نے گملے کو جھٹ سے پکڑنے کی کوشش بھی کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔

"کون ہے؟" آواز سُن کر اندر سے نیرو نے پوچھا۔

"میں، میں ہوں" ظہیر نے جواب دیا: "نیرو ذرا تم بھی آکر دیکھو۔"

ظہیر کی گھبراہٹ کا اندازہ لگا کر نیرو پریشان ہوگئی۔ خالہ اماں کی طبیعت زیادہ خراب تو نہیں ہوگئی؟ چار دن پہلے وہ عیادت کو گئی تھی۔ مرض نازک صورت اختیار کر گیا تھا۔ اُسی دن سے نیرو گھبرائی گھبرائی سی رہنے لگی تھی۔ اس نے اسی عالم میں آکر پوچھا —— "کیا ہوا؟ کیا بات ہے!"

"وہ دیکھو" ظہیر نے اُنگلی کے اشارے سے دکھاتے ہوئے کہا۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتی اُس کی آنکھوں نے ٹوٹے ہوئے گملے کو دیکھ لیا تھا۔ مٹی بکھر گئی تھی۔ وہ جلدی جلدی چیختے ہوئے اُدھر گئی اور بولی —— "کیسے ٹوٹا؟ کس نے توڑا اسے؟" اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔

تھوڑی دیر تک تو ظہیر مجرم کی طرح چپ چاپ کھڑا رہا پھر آہستہ آہستہ بولا "قصور میرا ہی ہے۔ مجھے ذرا ہوشیاری سے چلنا چاہئے تھا لیکن اب کیا کیا جائے۔ نیا گملہ لا دوں گا —— کل ہی!"

نیرو خاموش رہی۔ کتنی خوشامدیں کرنے کے بعد وہ اپنی ایک سہیلی کے گھر سے رجنی کے تین چار بیج لائی تھی۔ بہت دنوں تک گملے کی حفاظت کرتی رہی، پانی دیتی رہی، تب جا کر پودا ابھرا تھا۔ اگرچہ وہ سمجھ گئی تھی کہ ظہیر کا کوئی قصور نہیں پھر بھی وہ اس سے روٹھ ضرور گئی۔

بچپن ہی سے نیرو کی طبیعت اور لڑکیوں سے مختلف تھی۔ اس کی شادی کو تین سال ہو چکے تھے مگر خانہ داری سے اسے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ البتہ گھر کی زینت بڑھانے میں اس کی طبیعت خوب لگتی تھی۔ ماہانہ ڈھائی سو تو ملتے تھے ظہیر کو، اس کے باوجود وہ ہر ماہ کچھ نہ کچھ بچا لیتی اور ان پیسوں سے گھر کو خوب سجاتی۔

عمارت ایک منزلہ تھی۔ ایک حصے میں مکان کی بیوہ مالکہ خود رہتی تھی، دوسرا حصہ نیرو کے قبضے میں تھا۔ دو بڑے بڑے کمرے تھے۔ کمرے سے نکل کر کھلی ہوئی چھت تھی۔ صحن بھی کہہ لیجئے اسے۔ برآمدہ کوئی بڑا اور کشادہ نہ تھا تاہم اس میں تقریباً پندرہ گملے قرینے سے رکھے ہوئے تھے۔ پھولوں کے

پردے بھی مختلف قسم کے تھے۔ جن میں دلیسی بھی تھے اور ولایتی بھی۔ دروازوں اور دریچوں پر خوب صورت پردے لٹکتے تھے۔ بیٹھک میں بید کی کرسیوں کے بیچ میں ایک تپائی بھی تھی جس پر سبز رنگ کا کپڑا بچھا ہوا تھا۔ دو الماریاں کتابوں سے بھری پڑی تھیں۔ دیوار پر ایک آرٹسٹ سے تین طرح کے لینڈ سکیپ بنوائے گئے تھے۔ سونے کا کمرہ بھی صاف ستھرا تھا۔ پلنگ کے اوپر کئی گدے بچھے ہوئے تھے۔

نیرو اکثر کہتی۔ "محض پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہے۔ سلیقہ سب سے بڑا آرٹ ہے۔" چنانچہ گھر دیکھ کر ہر آدمی اس کے سلیقہ کی داد ضرور دیتا تھا۔ ظہیر کی عمر ستائیس سے زیادہ نہیں ہوگی اس کے باوجود اس کا جسم ڈھیلا ڈھالا تھا۔ بچپن ہی میں والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ ورثہ میں کچھ نہ ملا۔ پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا اسلئے شہر چلا آیا۔ دنیا کے گرم و سرد چکھے، تب جا کر وہ آدمی بنا تھا۔ اس نے مسلسل جان توڑ محنت اور کوشش کی۔ ہزاروں لاکھوں انسانوں کے مقابلہ میں آکر اپنی جگہ خود بنائی تھی۔

یہ جانتے ہوئے بھی کہ خانہ داری کی طرف سے نیرو کی بے پروائی فطری ہے وہ بعض اوقات پنجرے میں بند پنچھی کی طرح ہانپ اٹھتا۔ وہ اس سے کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا۔ دل شکنی کا بہت خیال تھا اسے۔ کیونکہ دنیا میں وہی تو اس کے لئے ایک سہارا تھی، وہی تو اس کی کل کائنات تھی۔ اس کے علاوہ وہ بھی بن ماں کی بچی تھی۔ خالہ نے اس کی پرورش کی۔ دونوں ایک دوسرے سے وہیں ملے تھے —— وہ بھری برسات کا دن! اس دن کو یاد کر کے ظہیر خلا میں بھٹکنے لگتا، اس کی آنکھوں تلے کتنی تصویریں ناچ اٹھتیں۔

ظہیر کا ساتھی محفوظ بھی اکنامکس میں دوسرے پارٹ کا امتحان دے رہا تھا جس دن گورنری راج کا اعلان کیا گیا اسی روز وہ اپنی کتابیں لیکر محفوظ کے گھر آگیا تھا۔ محفوظ نے اُسے خوش آمدید کہا۔ اُس کی بڑی خاطر مدارات کی۔ کوئی دوسرا ہوتا تو شاید اُسے اپنے گھر میں جگہ نہ دیتا کیونکہ اس کی حرکتیں ہی ایسی تھیں لیکن اس نے ظہیر کی پریشانی کو دور کرتے ہوئے کہا تھا —— اگر میرے والدین کو تمہارے کرتوتوں کا علم ہوا تو انہیں صدمہ پہنچے گا۔ میں ان سے جھوٹ بولوں گا کہ تم امتحان میں میری مدد حاصل کرنے کے لئے میرے پاس آگئے ہو۔ میری باتوں کا انہیں ضرور یقین آجائے گا۔"

یہ سن کر ظہیر کا چہرہ خوشی سے روشن ہوگیا۔ اس نے کہا۔ "تمہارا یہ احسان میں کبھی نہیں بھولوں گا۔"

محفوظ کو ہنسی آگئی۔ "اس میں احسان کی کیا بات ہے۔"

ظہیر دن بھر کمرے میں بند، کتابوں میں غرق رہتا۔ اس کے ذہن میں مختلف قسم کے سوالات اُبھرتے لیکن کسی ایک سوال کا بھی اسے جواب نہ ملتا۔ دوسرے دن شام کو وہ گھر سے باہر نکلا تھا اور رات کے بارہ بجے جب کچھ سرگرداں گھر لوٹا تو اس کی آنکھوں نے ایک لڑکی کو بھاگتے ہوئے دیکھا۔ اسے دیکھتے ہی اس کے منہ سے یہ آواز نکلنے ہی والی تھی —— "کون" مگر اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اس نے سوچا —— "میں یہاں مہمان ہوں اسلئے ممکن ہے کوئی لڑکی مجھ سے شرما کر بھاگ رہی ہو۔"

وہ گیٹ بند کر کے آگے بڑھا ہی تھا کہ اُسے ٹھیس لگی اور منہ سے "اُف" نکل گئی۔ وہ بڑی مشکل سے کمرے کے پاس آیا۔ اس نے پاؤں کی انگلی کو غور سے دیکھا۔ اس میں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ ایک دم سے اس کا دماغ معطر ہوگیا "رجنی" کی بھینی بھینی خوشبو سے کمرہ معطر ہو رہا تھا۔ اس نے غور سے کمرے کا جائزہ لیا۔ کون سو رہا ہے اُدھر؟ محفوظ؟ سونے دو اُسے۔ وہ میز کے قریب آگیا۔ اس نے لالٹین کی روشنی تیز کردی۔ پلنگ کے پاس پھولدان رکھا ہوا تھا اور اس میں رجنی کے پھول مسکرا رہے تھے۔ ایک طرف کتابیں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں اور پاس ہی کھانا ڈھکا ہوا رکھا تھا۔ بچھونے کے اوپر جو چادر تھی اسے دیکھ کر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ابھی ابھی بچھائی گئی ہو۔

زخم کی ہیکلی بھول کر ظہیر بید کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اتنے میں دروازے کے باہر روشنی نظر آئی پھر آہستہ آہستہ بات کرنے کی آواز!

کچھ دیر کے بعد دس گیارہ سال کا ایک بچہ کمرے میں داخل ہوا اور ایک شیشی دیتے ہوئے بولا۔ "ڈیٹول ہے، زخم دھو ڈالئے اس سے۔ اور پھر کھانا کھا کر سو جایئے۔"

ظہیر حیران رہ گیا! اس بچے کو کس نے یہاں بھیجا؟ اس نے لڑکے کو آواز دی "میاں ذرا سننا"۔
"کہئے" لڑکے نے کہا "جلدی کہئے مجھے نیند آ رہی ہے"۔
ظہیر نے پوچھا "کیسے معلوم ہوا تمہیں کہ میری انگلی میں چوٹ لگی ہے؟"
"مجھے کچھ نہیں معلوم" اور یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلا گیا۔
تھوڑا بہت کھانے کے بعد ظہیر جب سونے کے لئے گیا اس وقت ڈیڑھ بج چکا تھا۔ بارش شروع ہو چکی تھی اور دریچے سے سرد ہوائیں بھی آ رہی تھیں۔ ظہیر کو نیند آ گئی۔ تاریکی، بارش، ہوائیں ـــــ فضا کیسی سحر آلود بن گئی تھی!

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کا چہرہ گلاب کی طرح کھلا ہوا تھا۔ وہ بیحد خوش تھا۔ کتنے دنوں کے بعد اُسے پُرسکون نیند آئی تھی۔ اس نے ایک سرد آہ کھینچی اور بچھونے سے کود پڑا۔ ایں یہ کیا! اس کی زخمی انگلی میں پٹی کس نے باندھ دی تھی؟ اُسے اس گھر کے در و دیوار پُراسرار نظر آنے لگے۔

اس دن بھی وہ حسب معمول شام کو باہر گیا مگر پندرہ منٹ کے بعد ہی واپس آ گیا۔ اس نے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے دریچے سے جھانکا۔ خواب تو نہیں ہے یہ؟ لالٹین کی روشنی دھیمی کر کے سفید ساڑی میں ملبوس ایک لڑکی اس کی کتابوں اور بچھونے کو درست کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ ظہیر چپ چاپ کمرے میں داخل ہوا۔ لڑکی نے آہٹ محسوس کی۔ اس نے مُڑ کر دیکھا۔ وہ بھاگ جانا ہی چاہتی تھی کہ ظہیر نے اس کو روک لیا اور پوچھ بیٹھا "تم کون ہو؟ تم؟"

لڑکی نظریں نیچی کر کے بولی "دیکھئے کوئی آ جائے گا۔ مجھے جانے دیجئے"۔ اس کے بعد دونوں خاموش ہو گئے۔ دونوں کی زبانیں گُنگ ہو گئی تھیں کیونکہ اسی دن دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔ لڑکی کمرے سے چلی گئی۔

نیرو نے اس کی اداس اور پژمردہ زندگی کو جو رس اور رنگ بخشا تھا اس کا نتیجہ تھا کہ اس کی نگاہیں ہر وقت اُسے سکھی دیکھنا چاہتی تھیں۔ گملا خرید کر لا دینے کی بات اُسے یاد تھی۔ دوسرے ہی دن وہ بازار گیا۔ دکان سے پلٹ ہی رہا تھا کہ ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھا اور فریاد سنائی دی ـــــ "بابا دیا کیجئے۔ مجھ پر نہیں میرے بچوں پر۔ خدا تمہیں سکھی رکھے گا"۔

ظہیر سے یہ منظر نہ دیکھا گیا۔ اس نے اکنی اس کی طرف پھینکی اور رکشا پر بیٹھ گیا لیکن اس کا دل برابر دھڑک رہا تھا۔ اس کی فریاد برابر اس کے کانوں میں آتی رہی اور گزشتہ شام کا ایک دردناک واقعہ اُس کے ذہن میں تازہ ہو گیا۔ گزشتہ شام کو وہ پیدل گھر جا رہا تھا عثمان غنی روڈ کے موڑ پر آیا ہی تھا کہ دیوار سے لگ کر بیٹھے ہوئے ایک شخص پر اس کی نظر پڑی۔ اس کی نگاہیں ظہیر کو برابر گھور رہی تھیں۔ ظہیر اس کے پاس آیا اور کھڑا ہو گیا لیکن پھر چل پڑا۔ اس شخص نے پکارا۔ ظہیر کو بُرا معلوم ہوا۔ وہ رُکا نہیں وہ شخص دوڑتا ہوا ظہیر کے پاس آ گیا اور اس کی جیب میں ہاتھ ڈالنے لگا اور کہا "میں پیسے نہیں لوں گا"۔

"پھر؟"

اُس شخص نے پھر گہری نظر سے ظہیر کو دیکھا اور یکایک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کہتا تھا "مجھے پہچان نہ سکے۔ ہاں کیسے پہچانو گے مجھے میں انسان کہاں ہوں؟"

ظہیر حیران رہ گیا۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے کوئی ناٹک کھیلا جا رہا ہے۔ وہ بہت دیر تک اُسے دیکھتے رہنے کے بعد یکایک بول اُٹھا ـــ "ارے تم؟ تم ناجو؟"

"تو تم پہچان گئے مجھے۔ ہاں میں ہوں ناجو۔ رتن پور کا معین الدین"۔ اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہنا شروع کیا ـــ "ظہیر میں جانتا ہوں کہ زندہ نہیں رہوں گا لیکن مرنے سے پہلے زندگی حاصل کرنے کی لگن میں ڈھاکہ آ گیا ہوں۔ تین دن ہسپتال گیا مگر داخل نہ ہو سکا۔ مجھے نکال دیا گیا"۔

بچپن کی بہت سی باتیں یاد کر کے ظہیر کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ سا جو کہہ رہا تھا ـــ یکایک اپنے ایک ایم ایل اے دوست کی بات یاد آ گئی۔ ان کا پتہ یاد تھا۔ ان کے گھر کے برآمدے میں پڑا رہا۔ ایک دن اتفاقاً ملاقات ہو گئی۔ وہ اپنی گاڑی میں سوار ہو رہے تھے۔ پہچان تو گئے مگر بولے ـــ "مجھے فرصت

مطلق نہیں ہے۔ اس لئے معافی چاہتا ہوں۔"

ظہیر نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا۔ نہ جانے وہ کیا سوچ رہا تھا۔

ماجو کہتا گیا ۔۔۔ "بعد میں تمہارا خیال آیا۔ اتنا معلوم ہوا تھا کہ تم کالج میں پروفیسر ہو گئے ہو۔ لیکن گھر کا پتہ نہیں معلوم تھا۔ میں یہاں بیٹھا یہی سوچ رہا تھا اب کیا کروں کہ تم آگئے۔ ظہیر! مجھے بچالو۔ ہسپتال میں داخل کرادو۔ شہر میں تمہاری عزت ہے!" اتنا کہنے کے بعد وہ ہانپنے لگا۔

ظہیر نے کش لیتے ہوئے کہا۔ "ہاں! مگر آج تو وقت نہیں ہے۔ کل صبح نو بجے داخل کرا دوں گا۔"

ماجو نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "میں جانتا تھا تم یہ کام کر دو گے۔" اس کی آنکھیں ساون بھادوں بن گئیں۔ "بچ گیا تو قرضہ اتار دوں گا بھائی۔"

"پریشان نہ ہو ماجو۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ سوچ رہا ہوں آج کی رات تم کہاں گذارو گے؟"

"کہاں گذاروں گا۔ ہاں ٹھیک کہتے ہو؟"

"میرا مکان چھوٹا سا ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو ڈھاکے میں مکان کتنی مشکل سے ملتا ہے۔ کس طرح بس ہم میاں بیوی کو سر چھپانے کی جگہ مل گئی ہے۔"

یہ کہنے سے پہلے ظہیر کے ضمیر نے ملامت کی تھی لیکن وہ کرتا بھی کیا۔ اس مریض اور گندے آدمی کو دیکھ کر نیرو پریشان ہو جاتی۔ ماجو نے اپنے دوست کے دل کی گہرائی کا جائزہ لے لیا تھا۔ اس نے کہا "نہیں میں تم لوگوں کو تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ یہیں رات گذار دوں گا۔ البتہ سویرے ٹھیک وقت پر آجاؤ ۔۔۔ آؤ گے نہ؟

"ہاں، ہاں کیوں نہیں۔" ظہیر نے کہا۔ "ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے پہنچ جاؤں گا۔ ویسے گھر پہنچ کر میں تمہارے لئے جگہ نکالنے کی کوشش کروں گا۔ اگر گنجائش نکل آئی تو فوراً آ کر لیجاؤں گا۔ اچھا جاتا ہوں۔"

اور وہاں سے رخصت ہونے کے بعد ظہیر پھٹ پڑنا چاہتا تھا۔ اس نے جھوٹ کیوں بولا؟ وہ تو اس کے لئے کمرے میں نہ سہی برآمدے میں جگہ نکال سکتا تھا۔ اس نے نیرو کو تیار کرنے کا ارادہ بھی کیا تھا لیکن گملہ ٹوٹ جانے کے بعد دونوں کے درمیان خاموشی کا جو پردہ آ گیا تھا اس کی وجہ سے یہ واقعہ اس کے ذہن سے دُور ہو گیا۔

اور جب ظہیر کا رکشا نواب پور روڈ سے عثمان غنی روڈ کے موڑ تک آگیا تو سڑک کے بائیں جانب لوگوں کی بھیڑ نظر آئی۔ اس کا دل دھڑک اٹھا۔ اس نے دیکھا ایک لاش چادر سے ڈھکی ہوئی پڑی ہے۔ اور کچھ لوگ اس کے کفن دفن کے لئے چندہ جمع کر رہے ہیں۔

ظہیر تھوڑی دیر تک رکشا پر چپ چاپ بیٹھا رہا پھر نیچے اترا اور بھیڑ کو چیرتا ہوا لاش کے پاس آیا۔ اس نے چادر اٹھائی۔ چہرے کو دیکھا بھیڑ میں سے ایک شخص نے پوچھا۔ "صاحب آپ پہچانتے ہیں اسے؟" لیکن وہ تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "نہیں، نہیں۔ میں نہیں پہچانتا اسے۔ نہیں پہچانتا۔" یہ کہہ کر وہ رکشا پر بیٹھ گیا۔ گھر واپس آگیا ۔۔۔ گم سم! میز پر کھانا لگا کر نیرو اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے جوڑے کو پھولوں سے سجایا تھا۔ گلے میں ہار تھا اور ساڑی بھی نئی تھی ۔۔۔ دونوں نے پہلے ہی سے پکچر دیکھنے کا پروگرام بنایا تھا۔ ظہیر نے عجیب نظروں سے اُسے دیکھا اس کے بعد دونوں گملے رکھے اور کچھ کہے بغیر وہ خواب گاہ میں چلا گیا اور کسی نہ کسی طرح جوتے اتار کر بچھونے پر لیٹ گیا۔

نیرو اس کے پیچھے پیچھے آئی۔ اور ظہیر کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بولی ۔۔۔ "کیا درد ہے؟ منہ ہاتھ دھو لیں۔"

ظہیر نے اس کی طرف دیکھا اور ایک درد بھری آواز میں کہا۔ "نیرو ذرا دیکھنا میری آنکھوں سے خون تو نہیں ٹپک رہا ہے؟"

"نہیں تو" یہ کہہ کر نیرو نے اس کے گالوں کو چھوتے ہوئے کہا۔ "مگر جسم تپ رہا ہے۔ کیوں؟ کیا بخار ہے یا کوئی اچانک صدمہ ہوا ہے۔ چلو۔ کوئی بات نہیں۔ اٹھو جلدی۔"

ظہیر کچھ نہ کہہ سکا صرف نیرو کو خاموش نگاہوں سے دیکھ کر بچھونے سے اٹھ بیٹھا۔

★

افسانہ :

حکیم روشن دین

منظور عارف

حکیم روشن دین جب فوت ہوئے تو اُن کے احباب نے اللہ تعالیٰ سے اُن کی تین بیواؤں اور نو بچوں کو صبرِ جمیل عطا فرمانے کی دُعا کی اور چلے گئے۔ مرحوم ایک درمیانہ درجہ کے حکیم اور بے ضرر سے انسان تھے تعلیم معمولی تھی اس لئے اکثر و بیشتر سنی سنائی باتوں پر ایمان لے آتے اور اُن پر سختی سے عمل بھی کرتے۔ ویسے پابندِ صوم و صلوٰۃ بھی تھے اور کبھی کبھی امامت بھی کرتے۔

حکیم صاحب سرخ و سفید رنگت، میانہ قد اور دُہرے بدن کے آدمی تھے۔ اُن کی پہلی شادی بیس برس کی عمر میں جب قاضی احمد دین کی بڑی لڑکی سلطانہ سے ہوئی تھی تو اُن کے والد بقیدِ حیات تھے۔ یہی وجہ تھی کہ حکیم صاحب اُن دِنوں ذرائع آمدنی سے اگر بالکل نہیں تو کافی حد تک بے نیاز تھے۔

سلطانہ نہ تو زیادہ خوبصورت تھی نہ پڑھی لکھی اور نہ گھریلو کام کاج ہی میں ہوشیار۔ البتہ شریف تھی، جوان تھی۔ شادی سے پہلے نہ سلطانہ نے حکیم صاحب کو دیکھا تھا نہ حکیم صاحب نے سلطانہ کو۔ مگر چونکہ حکیم صاحب کے والد سلطانہ کے والد کو زبان دے چکے تھے اس لئے نیک فرزند کی حیثیت سے حکیم صاحب کو یہ رشتہ منظور کرنا پڑا۔ اُن کی پہلی تین لڑکیاں ساجدہ، زینب اور کلثوم اُن کے والد کی زندگی ہی میں پیدا ہوئیں حکیم صاحب نے کچھ روایتی آرزوئیں خواہ مخواہ اپنے دِل میں پال رکھی تھیں۔ نہ جانے کیوں انھیں لڑکیوں کی پیدائش سے نفرت تھی۔ وہ اپنے بے تکلف دوستوں سے اکثر ایک لڑکے کی پیدائش کی آرزو کا اظہار کرتے۔ معلوم نہیں یہ اُن کے حقیقی جذبات تھے یا محض دوسری شادی کرنے کا بہانہ۔ ساجدہ کے بعد زینب اور زینب کے بعد کلثوم کی پیدائش نے انھیں سلطانہ کی طرف سے بالکل مایوس کر دیا تھا۔ جب اُن کے والد فوت ہوئے تو وہ ایک سال تک نہایت سنجیدگی سے مطب کی طرف توجہ دیتے رہے۔

ایک روز ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی اپنے چھوٹے بھائی کو، جس کے جسم پر بہت بُری طرح خارش تھی لے کر حکیم صاحب کے مطب میں آئی۔ حکیم صاحب اُس وقت پچیس برس کے لگ بھگ تھے، اور داڑھی بھی نہ رکھتے تھے۔ انھوں نے لڑکے کو دیکھنے کے بعد اُسے پینے اور مالش کرنے کی دوا دی اور ساتھ ہی غذا میں پرہیز کی بھی ہدایت کی۔ ابھی تک حکیم صاحب نے لڑکی کا چہرہ نہ دیکھا تھا۔ صرف ہاتھ ہی دیکھے تھے جنھیں دیکھ کر انھیں معلوم ہو گیا کہ لڑکی خوبصورت ہوگی۔ لڑکی کو ایک روز پیشتر بخار ضرور ہوا تھا۔ مگر اب اتر چکا تھا۔ اِس کے باوجود احتیاطاً اُس نے پینے کی دوا مانگی۔ حکیم صاحب نے اُس کی نبض دیکھنے کے بعد اُس کی زبان دیکھنا چاہی۔ لڑکی نے جب چہرے سے نقاب ہٹائی تو حکیم صاحب کو گویا اپنے کسی پرانے خواب کی تعبیر مل گئی۔ وہ بڑی دیر تک اُس کے چہرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے۔ لڑکی نے شرما کر نقاب ڈال لی اور کھڑے ہو کر آہستہ سے بولی "دوا نہیں دیں گے آپ؟" حکیم صاحب کچھ سٹپٹا گئے اور کہنے لگے "ہاں، ضرور، مگر کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں خود بیمار ہو گیا ہوں" اس عجیب جواب پر لڑکی مخمصہ میں پھنس گئی اور اُس نے جھٹ بھائی کا ہاتھ تھام لیا اور دوا کے پیسے پوچھنے لگی۔ حکیم صاحب اپنی ترنگ میں کافی آگے بڑھ چکے تھے۔ کہنے لگے۔ "کیوں شرمندہ کرتی ہو۔ خیر اگر لیتے ہوئے تو بعد میں لے لوں گا۔ لڑکے کو ابھی کچھ روز اور دوا لینے بھیج دیا کرو۔ اگر ساتھ لے آیا کرو تو بہتر ہے"۔ لڑکی چپ چاپ دُکان سے باہر نکل گئی۔ البتہ ایک بار اُس نے مڑ کر ضرور دیکھا۔ یہ فریدہ اور حکیم صاحب کی پہلی ملاقات تھی۔

حکیم صاحب کو اب واقعی عشق کا بخار چڑھنے لگا اور وہ فریدہ کے خیال میں کچھ ایسے محو رہنے لگے کہ سلطانہ مکمل بے توجہی اور تغافل کی نذر ہو گئی۔ سلطانہ اکثر سوچتی کہ اُس کا قصور کیا ہے۔ آخر کیوں حکیم صاحب نہ اُس کی طرف توجہ دیتے ہیں نہ بچوں کی طرف۔ وہ کیوں ہر وقت

گھونٹے گھونٹے رہتے ہیں۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ انھیں فریدہ سے محبت ہوگئی ہے، جو اُس سے زیادہ حسین اور زیادہ ہوشیار تھی۔ آخر اُس نے ایک روز حکیم صاحب سے وجہ پوچھ ہی لی۔ حکیم صاحب ہرگز نہ بتاتے اگر فریدہ کے والد اپنی لڑکی کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دینا منظور نہ کر چکے ہوتے چنانچہ حکیم صاحب نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں جو از روئے "اسلام" نہ صرف جائز بلکہ اُن کے معاملہ میں تو فرض ہے! سلطانہ بہت چیخی چلائی مگر انھوں نے سنی اَن سنی ایک کردی۔ ان کی دلیل ایک ہی تھی اور وہ یہ کہ انھیں نرینہ اولاد کی ضرورت ہے۔ چنانچہ سلطانہ کو یہ زہر پینا ہی پڑا۔ اور حکیم صاحب کی شادی فریدہ سے ہوگئی۔ اُنھوں نے اپنے والد کے اندوختہ سے اپنے مکان کی ساتھ والی چھوٹی سی حویلی بھی بھگے داموں خرید لی اور بیچ کی دیوار ہٹا کر دونوں حویلیوں کو ایک کر دیا۔

سلطانہ گو دل میں بے حد کڑھتی تھی مگر شوہر کی خوشنودی حاصل کرنے کے خیال سے اُسے فریدہ کی خدمت کرنا ہی پڑتی۔ اُس کی حیثیت بالکل نوکرانیوں کی سی ہو چکی تھی۔ فریدہ کی شادی کو لگ بھگ آٹھ ماہ ہو چکے تھے اور ساجدہ اب قریب قریب چھ برس کی تھی۔ اس لئے گھریلو معاملات کی کچھ نہ کچھ شدھ بدھ رکھنے لگی تھی۔ وہ اپنی ماں کو اداس دیکھ کر اکثر اُس کا گھٹنا تھام کر حیرت سے اُس کی طرف دیکھتی رہتی۔ بعض اوقات عجیب عجیب سوال کرتی۔ "ماں، ہمالے گھل میں ابا پچھے سے آئے ہیں۔؟ یہ عولت کون ہے۔ یہ مجھے گھُولتی ہے۔ مگل ابا کے چھات، پیچ پیچ کے باتیں کلتی ہے، ماں ابا اُچھ کے چھات کھیلتے ہیں۔ میلے چھات کیوں نہیں کھیلتے۔ ماں کلثوم کے ساتھ کیوں نہیں کھیلتے۔ جلینب لوتی ہے تو اُچھ کو مالتے ہیں۔ ماں تمہالے چھات کیوں نہیں کھیلتے؟" اور ماں اُسے سینے سے لگا کر آنسو بہانا شروع کر دیتی۔ ساجدہ رونی صورت بنا کر پھر سوال کرنا شروع کر دیتی۔ "ماں تم لوتی کیوں ہو؟" ماں دل پر قابو پاکر جواب دیتی۔ "نہیں بیٹی، دیکھو، میں تو ہنس رہی ہوں۔ میں کب روتی ہوں"۔ ماں اسے اپنے سامنے بٹھا لیتی اور ہنسنے کی کوشش کرتی۔ "ماں، یہ عولت کون ہے؟"۔ وہ پھر سوال کرنا شروع کر دیتی۔ ماں جواب دیتی۔ "بیٹی وہ تمہاری نئی ماں ہے ان کی بات مانا کرو۔ ابا مٹھائی لاکر دیں گے"۔ یہ بات ساجدہ کی سمجھ میں نہ آتی۔ "نہیں ماں میلی ماں تو تم ہو۔ یہ تو مجھے گھُولتی ہے۔ مالنے کو دولتی ہے۔ آبا کے چھامنے بلاتی ہے تو آبا کہتے ہیں۔ بھاگ جا منحوچھ۔ ماں منحوچھ کیا ہوتا ہے؟"

"منحوس اچھی لڑکی کو کہتے ہیں" اور ماں پھر رونے لگتی۔

حکیم صاحب کی دوسری شادی کے بعد چاند دسویں بار ڈوب چکا تھا۔ آج فریدہ نے اپنی حالت کچھ ایسے الفاظ میں حکیم صاحب کو بتادی تھی کہ عصر کی نماز کو مسجد جاتے انھیں سلطانہ سے پہلی بار نرمی کے ساتھ بات کرنا پڑی۔ "سلطانہ فریدہ کا خیال رکھنا۔ میں جاتے ہوئے یوسف صاحب سے بھی ملوں گا۔ اُن کی بیگم بھی آجائیں گی۔ ضرورت پڑی تو مجھے مسجد سے بلا لینا"۔ حکیم صاحب کے یہ بول سلطانہ کے کانوں میں رس گھول گئے۔ اس نے دل ہی دل میں دعا کی کہ خدا اس کے شوہر کو فریدہ کے بطن سے چاند سا بیٹا عطا کرے۔ اُس کا خیال تھا کہ اگر اُس کے شوہر کی یہ آرزو پوری ہوگئی تو وہ اس کی طرف ضرور توجہ دیں گے اور پھر بیٹے کی پیدائش کے بعد بیٹیاں بھی اُنھیں پیاری لگیں گی۔ وہ انہی خیالوں میں کھوئی فریدہ کے کمرے میں داخل ہوئی۔ فریدہ پلنگ پر لیٹی تھی۔ سلطانہ ادوائن کی طرف پاؤں اوپر کرکے بیٹھ گئی۔ اور اس کے پاؤں دابنے لگی۔ وہ بڑی دیر تک خاموش بیٹھی رہی۔ آخر اُس نے خاموشی توڑی۔ "فریدہ، میں دل سے دعا کرتی ہوں کہ خدا تمھیں خوبصورت بیٹا عطا کرے۔ اُسے میں پالوں گی، میں کھلاؤں گی، میں سلاؤں گی۔ میں اُسے بالکل اپنا بیٹا سمجھوں گی"۔ فریدہ اگر آج مجبوری کی حالت میں نہ ہوتی تو اُس کے گال پر تھپڑ رسید کر دیتی اور کہتی تم بکواس کرتی ہو۔ جھوٹ کہتی ہو۔ اس میں ضرور تمہاری کوئی غرض پوشیدہ ہے۔ جنسی یا اقتصادی۔ مگر وہ خاموش رہی۔ کیوں کہ آج اُسے سلطانہ کی مدد کی ضرورت تھی۔ سلطانہ جواب نہ پاکر خاموش ہوگئی، اور پاؤں دابتی رہی۔

یوسف صاحب کی بیگم، محمودہ کے آنے نے اس خاموشی کو توڑا۔ محمودہ نے داخل ہوتے ہی ہنس ہنس کر باتیں کرنا شروع کردیں۔ محمودہ ایک زمانے میں بیحد زندہ دل تھی مگر گیارہ برس میں سات بچوں کی پیدائش اور اُن کی پرورش نے اسے جسمانی طور پر اتنا کمزور اور ذہنی طور پر اتنا تھکا دیا تھا کہ اب جب کبھی اُسے ہنسنے کا موقع ملتا تو ایسا لگتا گویا اس کے ہونٹ ہنس رہے

ہوں اور آنکھیں حیرت سے تماشہ دیکھ رہی ہوں۔ محمودہ کے شوہر یوسف صاحب اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز تھے۔ فارسی کے ایم۔ اے تھے اور بی۔ ٹی بھی۔ معلم ہونے کی وجہ سے اُن کی طبیعت میں انکساری اور عادات میں سادگی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ اُن کی آمدنی سات بچوں کی پیدائش اور اُن کی اچھی پرورش کی متحمل نہ تھی مگر بچارے لوگوں کے سامنے قدرت کی دین کہہ کر اور قدرت کو رازق ثابت کر کے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کر لیتے۔ قدرت تو واقعی پیدائش کے بعد سب کو رزق دیتی ہے اور یوسف صاحب کے بچوں کو بھی وہ رزق پہنچا رہی تھی۔ مگر اُس نے یوسف صاحب کے دنوں کا چین اور راتوں کی نیند حرام کر دی تھی۔ اس لئے کہ اُس نے یوسف صاحب کو عقل اور تعلیم دونوں نعمتیں عطا کر رکھی تھیں۔ اور اُن کے سامنے اُن کے والد کی مثال بھی پیش کر دی تھی۔ جسے اُس نے اُن کی بساط اور خواہش کے مطابق صرف دو بچے عطا کئے تھے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ یوسف اور ثمینہ۔ اگر یوسف صاحب کے والد فیاض محمد خاں چاہتے اور شادی شدہ زندگی کی احتیاطیں نہ کرتے تو قدرت اپنے اٹل قوانین کے تحت انھیں ضرور اولاد کی کثرت کی سزا دیتی۔ بچوں کو رزق تو ملتا مگر فیاض محمد خاں کی زندگی ضرور عذاب بن جاتی اور پھر اولاد پر مصیبتیں نازل کرنا بھی قدرت کی طرف سے والدین کے لئے ایک منتخب سزا ہے۔ اگر فیاض محمد خاں کی اور اولاد ہوتی تو آج ثمینہ گریجویٹ اور یوسف صاحب ایم۔ اے، بی، ٹی نہ ہوتے۔ ثمینہ کوآپریٹو بنک کے ایک انسپکٹر کی بیوی تھی اور گیارہ برس کی شادی کے بعد اب وہ صرف دو بچوں کی ماں تھی۔ روبینہ اور ناصر۔ پیارے پیارے خوبصورت، صاف ستھرے مہذب بچے۔ بیگم یوسف کو جب کبھی ثمینہ کے گھر جانے کا اتفاق ہوتا تو اُسے اُس کی صحت اور اُس کے بچوں کی پرورش پر رشک آتا۔ ایک بار تو اُس نے ثمینہ سے پوچھ بھی لیا تھا۔ "تمہارے ہاں اور بچے کیا اب نہیں ہوں گے؟"۔ بھابی کے اس سوال پر ثمینہ کچھ شرما سی گئی تھی مگر اُس نے جواب ضرور دیا تھا۔ "آدمی اگر سمجھ دار ہو اور جانتا بھی ہو کہ خاندان کو کتنی حد میں رکھا جائے تو بہت کچھ ہو سکتا ہے"۔ بیگم یوسف اس جواب پر حیران رہ گئی تھیں اور اسی حیرت کے عالم میں انھوں نے پوچھ لیا تھا۔ "مگر روبینہ کے ابا ....." اور ثمینہ نے بات کاٹ دی تھی۔ "وہ اور ہم دونوں ہمخیال ہیں جبھی تو ایسا ہے"۔ بیگم یوسف جو کم تعلیم یافتہ تھی۔ اور یہ غلط تصور لئے ہوئے تھی کہ یہ سب کرشمہ قدرت ہے اس سوال سے مطمئن نہ تھی چنانچہ ایک بھرپور سوال کر دیا۔ "کارخانۂ قدرت میں دخل؟" اس پر ثمینہ نے فوراً جواب دیا تھا۔ "قدرت ہم پر بہت مہربان ہے۔ وہ میرے دو بچوں کو تمہارے سات بچوں جتنا رزق پہنچا رہی ہے۔ اور ساتھ ہی ہمیں ذہنی سکون بھی حاصل ہے"۔ اس پر بیگم یوسف خاموش ہو گئی تھیں۔ آج اس کے گھر ثمینہ آئی ہوئی تھی۔ اپنے دو بچوں کے ساتھ۔ اس لئے محمودہ کو اطمینان تھا کہ اس موقع پر اس کے بچے بھاگے بھاگے حکیم صاحب کے گھر اُدھم مچانے نہیں آ دھمکیں گے۔ اسی خیال سے آج محمودہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ اور فریدہ کو بھی ہنسا رہی تھی۔ ایک لطیفہ تو اس نے ایسا سنایا کہ فریدہ بھی اپنی غیر حالت بھول کر بے تحاشا ہنس پڑی اور چونکہ ہنس ہنس کر اس کے پیٹ میں بل نہ پڑ سکتے تھے، اس لئے بچہ پیدا ہو گیا۔ محمودہ نے فریدہ کو سہارا دیا اور سلطانہ نے بچہ کو۔ مگر سلطانہ نے جب دیکھا کہ لڑکا نہیں، لڑکی ہے۔ تو اُس نے ڈر کے مارے خاموشی سے یہ خدمت محمودہ کے سپرد کر دی اور خود فریدہ کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئی۔

حکیم صاحب کو جب اِس کی اطلاع ملی تو وہ اُس رات گھر نہ آئے۔ علی الصبح مطب میں چلے گئے۔

دوسری رات جب آئے تو بچی کی صورت تک نہ دیکھی۔ رسماً فریدہ کی طبیعت پوچھی اور سلطانہ کو قہر آلود نظروں سے دیکھ کر الگ کمرے میں جا کر سو رہے۔ کچھ روز بعد جب فریدہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گئی تو اس نے حکیم صاحب کے کان بھرنے شروع کر دیئے۔ "سلطانہ منحوس ہے، اس گھر میں اُس کی موجودگی بُراشگون ہے"۔ مگر حکیم صاحب چونکہ رائے عامہ سے بہت ڈرتے تھے۔ اس لئے انھوں نے سلطانہ کو گھر سے نکالنا بھی خلافِ مصلحت سمجھا۔

فریدہ اپنے حسن اور اپنی چالاکیوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تین سال تک حکیم صاحب جیسے سادہ مزاج انسان کا دل اپنے دل میں سلئے رہی۔ اس مدت میں اس کی دو لڑکیاں اور پیدا ہو چکی تھیں۔ ہاجرہ اور فاطمہ۔ فاطمہ کی پیدائش نے حکیم کے صبر کا پیمانہ لبریز کر دیا تھا۔ اب انھیں فریدہ کی ہر بات میں بناوٹ کی بُو آنے لگی تھی۔ اوّل اوّل تو انھوں نے بے رخی اختیار کی۔ پھر مکمل تغافل برتنا شروع کر دیا۔

کراچی میں بین الاقوامی یوم اطفال

صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خاں :
بچوں کی سلامی

شریک تقریب :
جنرل محمد ایوب خاں ، لفٹننٹ جنرل برکی اور چند مہمان

تفریحی کھیل ، پریڈ اور دیگر مظاہرے

لڑکوں کی پریڈ

معاشرتی و ثقافتی سرگرمیاں

ن کی بڑھتی ہوئی آبادی کی روک تھام کے لئے خاندانی منصوبہ بندی
کی اہمیت اب ہر جگہ محسوس کی جا رہی ہے
ٹیننٹ جنرل برکی (وزیر صحت و معاشرتی بہبود) اور اراکین بورڈ ،
خاندانی منصوبہ بندی' کے درمیان ایک غیر رسمی بات چیت
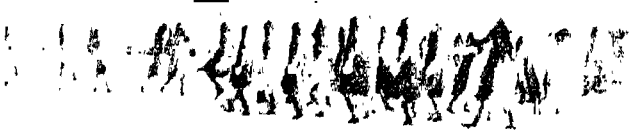
لفٹیننٹ جنرل ، محمد اعظم خاں ، وزیر بحالیات و آبادکاری ،
امریکی سفیر (متعینہ پاکستان) کو ایک نئی بستی
(شمالی ناظم آباد ، کراچی) کی تعمیر کا نقشہ
سمجھا رہے ہیں

*

فلمی انجمن اطفال پاکستان (ڈھاکہ) کے پیش کردہ
ڈرامہ میں ننھے اداکار

یوم اطفال کے موقع پر فریئر گارڈن کراچی میں
بچوں کی تقریب کا ایک منظر

اس تغافل کی تاب نہ لاکر فریدہ بات بات پر سلطانہ سے جھگڑ پڑتی۔ مگر چونکہ حکیم صاحب کو اپنی دونوں بیویوں سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی اس لئے سلطانہ بھی اب فریدہ کی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے لگی۔ حکیم صاحب مطب سے جب تھک تھکا کر گھر آتے تو بچہ بچیوں کے شور غل سے اُن کے کان گویا پھٹنے لگتے۔ بعض اوقات تو وہ انھیں اتنا پیٹتے کہ بے ہوش ہونے لگتیں! فریدہ اور سلطانہ چپ سادھے بیٹھی رہتیں کیونکہ دونوں کو معلوم تھا کہ زبان کھولی نہیں اور طلاق کی نوبت آئی نہیں! کثرت اولاد کا اکثر یہی انجام دیکھا گیا ہے۔

ایک روز حکیم صاحب کے مطب میں ایک دیہاتی بڑھیا میلے کچیلے کپڑے پہنے داخل ہوئی اور رونی صورت بناکر اُن کی منت سماجت کرنے لگی کہ وہ اُس کے بیمار شوہر کو دیکھنے اس کے گاؤں چلے چلیں۔ حکیم صاحب نے اس کی حالت سے اندازہ تو لگا لیا کہ فیس تو برائے نام ہی ملے گی مگر اُن کی خدا ترسی کی ایک شہرت قائم ہو چکی تھی۔ اس لئے انکار بھی نہ کر سکے۔

حکیم صاحب جب بڑھیا کے ہمراہ ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں داخل ہوئے تو صحن میں ایک انتہائی لاغر، سفید ریش، بزرگ چارپائی پر پڑا کھانس رہا تھا۔ ان کے بالکل قریب ہی ایک اور چارپائی پڑی تھی حکیم صاحب اس کے اوپر بیٹھ گئے اور بیمار کی نبض دیکھنے لگے۔ پھر زبان، آنکھیں، پیٹ اور پسلیاں دیکھیں اور تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گئے۔ بڑھیا کو کچھ تشویش لاحق ہوئی۔ اس لئے ہاتھ جوڑ کر اُن کے قریب زمین پر بیٹھ گئی اور زار و قطار رو رو کر التجا کرنے لگی کہ وہ خدا کے لئے اُس کے شوہر کو کسی نہ کسی طرح بچالیں ورنہ وہ اور اُس کی بیٹی دنیا میں بالکل بے سہارا رہ جائیں گی۔ اس پر بیمار نے آنکھیں کھولیں اور نحیف آواز میں کہنے لگا۔ "بے سہارا تو تم اُس وقت سے ہو گئی تھیں جب تمھاری آنکھوں کے سامنے تمھارے چار لڑکوں نے ایک ایک کرکے دم توڑ دیا تھا۔ میرے دم کا کیا بھروسہ۔ دو روز اور جی لوں گا۔" حکیم صاحب نے اسے تسلی دی اور کہا کہ خدا نے چاہا تو اُن کی دوا سے بیمار کو ضرور شفا حاصل ہوگی۔ بڑھیا کو اچانک کچھ یاد آیا اور اُس نے آواز دی "بیٹی۔ چائے تیار ہوئی یا نہیں؟" آواز سنتے ہی ایک نوجوان، سرو قد اور حسین و جمیل لڑکی قدرے پھٹے مگر صاف کپڑے پہنے اور دونوں ہاتھوں میں پرانی ٹرے تھامے سامنے کے کمرے سے نمودار ہوئی۔ حکیم صاحب نے اُس کی طرف دیکھا تو بس دیکھتے ہی رہ گئے! لڑکی نے سلام کیا اور ٹرے اُن کے سامنے چارپائی پر رکھ کر ماں کے قریب زمین پر بیٹھ گئی، اور ایک تنکے سے کچی زمین پر الٹے سیدھے خطوط کھینچنے لگی۔ حکیم صاحب چائے کے ہر گھونٹ کے ساتھ لڑکی پر بھی ازراہِ اخلاق نظر ڈال لیا کرتے تھے۔ اچانک انھیں کچھ سوجھا اور کہنے لگے۔ "مائی! تم بالکل فکر نہ کرو۔ چچا میاں انشاء اللہ بالکل تندرست ہو جائیں گے۔ میرے بارے میں سب جانتے ہیں۔ دوسروں کا دکھ میرا دکھ ہے۔ اور دوسروں کا آرام میرا آرام ہے۔ اور پھر تم تو بہت مظلوم ہو تمھاری اور چچا میاں کی مدد کرنا تو میرا فرض ہے۔ خدا کے لئے میری فیس یا دوا کے پیسوں کا خیال ہرگز اپنے دل میں نہ لانا ورنہ مجھے بہت دکھ ہوگا۔ مجھے تم اپنا ہی سمجھو اور روز میرے مطب سے دوا لے جایا کرو۔ کہو تو میں خود روز چچا میاں کو دیکھنے آجایا کروں۔ یا پھر کسی اور کو.... بلکہ اِس کو، کیا نام ہے اس کا؟" بڑھیا بولی "جی زرینہ"۔ حکیم صاحب کو زرینہ کا نام اُس وقت سے یاد تھا جب اُس کی ماں نے اُسے آواز دی تھی وہ پھر تو چھپانا چاہتے تھے اور پھر اس نام کا لطف لینا چنانچہ انھوں نے دہرایا۔ "زرینہ۔ اچھا۔ اچھا۔ ہاں تو بیشک زرینہ کو بھیج دیا کرو۔ مگر دوا کے استعمال میں ناغہ نہ ہونا چاہیئے۔"

اس کے بعد زرینہ نے روزانہ ان کے مطب میں آنا شروع کر دیا۔ زرینہ تین میل سے چل کر آتی، اس لئے حکیم صاحب اُسے آرام کرنے کے بہانے بٹھائے رکھتے جس روز مطب میں اور کوئی مریض نہ ہوتا حکیم صاحب موقع کو غنیمت جان کر اُس کے قریب جا بیٹھتے اور اس سے نہ صرف اظہار ہمدردی کرتے بلکہ ہر قسم کی امداد کا وعدہ کرتے۔ ایک روز انھوں نے زرینہ سے پوچھا۔ "زرینہ میرے متعلق تمھاری کیا رائے ہے، میں اچھا آدمی ہوں یا برا؟" زرینہ نے نظریں جھکالیں اور جواب دیا۔ "آپ بہت اچھے آدمی ہیں۔" انھوں نے دوسرا سوال کر دیا۔ "نہیں، بلکہ تمہارے دل کو میں اچھا لگتا ہوں یا برا۔" زرینہ خاموش رہی۔ بھلا اس مہمل اور بے محل سوال کا وہ کیا جواب دیتی۔ حکیم صاحب نے اصرار کیا۔ "بتاؤ۔ سچ سچ بتاؤ۔ اگر برا لگتا ہوں تو صاف صاف کہہ دو۔" زرینہ خاموش رہی۔

حکیم صاحب بھی الخاموشی نیم رضا۔ اب حکیم صاحب نے اپنا راستہ تیار کر لیا تھا، کہنے لگے۔ زرینہ مجھے تم سے دلی لگاؤ ہو گیا ہے۔ بے پناہ۔ میں ہر وقت تمھارے ہی متعلق سوچتا رہتا ہوں۔" زرینہ نے اپنا سر اور بھی جھکا لیا۔ آنکھیں نیچی کر لیں۔ اور بالکل بے حس و حرکت بیٹھی رہی حکیم صاحب نے پھر پوچھا۔ مگر وہ خاموش ہی رہی۔ اس پر حکیم صاحب نے کہا۔ "کیا میں نے یہ سوال پوچھ کر کوئی غلطی کی ہے؟"۔ زرینہ نے زبان کھولی "میں کیا کہہ سکتی ہوں"۔ وہ یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی، اور پھر حکیم صاحب کی طرف دیکھا اور سلام کر کے مطب سے باہر چلی گئی۔ حکیم صاحب دور تک اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے اور اُس کے خیال میں کھوئے رہے۔

دوسرے ہی روز حکیم صاحب زرینہ کے گاؤں گئے اور اس کی ماں سے اس کی شادی کا ذکر چھیڑ دیا۔ اندھے کو کیا چاہیئے دو آنکھیں۔ ماں فوراً مان گئی۔ اب زرینہ حکیم صاحب سے پردہ کرنے لگی۔ اگر زرینہ کا والد ذرا بھی چلنے پھرنے کے قابل ہو جاتا تو اُن کی شادی میں کوئی دیر نہ لگتی۔ مگر زرینہ کے والد کی یہ آخری خواہش بھی پوری نہ ہو سکی اور وہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ زرینہ کے والد کی وفات کی وجہ سے حکیم صاحب کی شادی بھی پورے ایک برس تک رکی رہی۔

ایک برس کے بعد جب حکیم صاحب اور زرینہ کے نکاح کا دن مقرر ہو گیا تو انھوں نے اپنی دونوں بیویوں کو بلایا اور اُن سے اپنی ہونے والی تیسری شادی کا ذکر چھیڑا۔ دلیل، زرینہ اولاد کی خواہش کے سوا کچھ نہ تھی۔ سلطانہ، جو ایک بار پہلے بھی یہ زہر پی چکی تھی، زیادہ سدِ راہ ثابت نہ ہوئی۔ مگر فریدہ نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اس پر حکیم صاحب کو وہی حربہ یاد آیا۔ جس کے استعمال کا حق مرد کو ہر وقت حاصل ہے۔ مگر انھوں نے قدرے احتیاط سے کام لیا۔ اور فریدہ کو اجازت دی کہ اگر وہ ناخوش ہے تو وہ طلاق حاصل کر سکتی ہے۔ طلاق کا نام سنتے ہی فریدہ ٹھنڈی پڑ گئی۔

زرینہ کے نکاح کی رسم نہایت ہی خاموشی اور سادہ طریقہ پر ادا ہوئی۔ اور جب وہ لاکھوں آرزوؤں اور لاکھوں تمناؤں کے ساتھ حکیم صاحب کے گھر میں داخل ہوئی تو اُن کی چھ لڑکیوں اور دو بیویوں نے اڑی اڑی رنگت اور خاموش نگاہوں کے ساتھ اُس کا استقبال کیا۔

اب کے بھی چاند جب دسویں بار ڈوبا تو حکیم صاحب کی مراد پوری نہ ہوئی۔ زرینہ نے حکیم صاحب کی معمولی سی بے رخی سے اندازہ لگا لیا کہ اُس کا حشر بھی سلطانہ اور فریدہ کا سا ہونے والا ہے۔ وہ ہر وقت اسی خیال میں کھوئی رہتی۔ چونکہ وہ گاؤں کی رہنے والی تھی اس لئے اس کے سوچنے کا طریقہ شہریوں کے طریقے سے مختلف تھا۔ ایک روز وہ دیر تک سوچتی رہی تو اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی، اور بہت خوش ہوئی۔ اُسی روز اُس نے تھوڑی دیر کے لئے اپنی ماں کو اپنے پاس بلانے کا پیغام بھیجا جس کا علم حکیم صاحب کو نہ ہو سکا۔ اُس نے اپنی ماں کے سامنے ایک تجویز پیش کی اور اُس کی ماں نے اُسے یقین دلایا کہ اس پر عمل کیا جائے گا۔

ایک صبح حکیم صاحب نماز کے لئے اٹھے تو زرینہ بھی ایک قہقہہ لگا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ حکیم صاحب نے سبب دریافت کیا تو وہ فوراً سنجیدہ ہو گئی۔ آنکھیں مل کر کلمہ پڑھا۔ اور اپنا خواب بیان کیا کہ اُس نے خواب میں دو ر ایک شاخ پر گلاب کا ایک پھول دیکھا ہے مگر جب وہ اُسے توڑنے کے لئے دوڑی تو دو مرتبہ بُری طرح گری اور اُس کے پاؤں میں دو بڑے بڑے کانٹے چبھے مگر تیسری بار وہ پھول کے قریب پہنچ گئی اور پھول توڑ لیا۔ اس پر وہ خوش ہو کر اس زور سے ہنسی کہ اُس کی آنکھ کھل گئی۔ حکیم صاحب نے کافی دیر تک سوچنے کے بعد اُس سے وعدہ کیا کہ وہ کسی سے ضرور اس کی تعبیر پوچھیں گے۔ زرینہ نے اُسے اپنے گاؤں کے دو مشہور تعبیر بتانے والوں کے نام بتائے حکیم صاحب نماز سے فارغ ہو کر سیدھے اس کے گاؤں گئے اور تعبیر بتانے والوں سے جا کر ملے۔ دونوں نے فیصلہ دیا کہ جس عورت نے یہ خواب دیکھا ہے اُس کی دو لڑکیاں ہوں گی۔ اور اس کے بعد اُسے خدا بیٹا دے گا۔ گرنے اور کانٹے لڑکیوں کی طرف اشارہ ہے۔ اور پھول بیٹے کی طرف۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ایسے اچھے اور واضح خواب بہت کم خوش نصیب دیکھتے ہیں۔ حکیم صاحب بیحد خوش ہوئے اور اسی خوشی کے بعد ڈیڑھ برس بعد جب زرینہ کے بطن سے دوسری لڑکی پیدا ہوئی تو انھیں ذرا بھی ملال نہ ہوا۔ سلطانہ اور فریدہ حیران تھیں کہ زرینہ نے حکیم صاحب پر کیا جادو کر دیا ہے۔

سلطانہ کا ایک ہی بھائی تھا۔ ناصر۔ جو عمر میں اُس سے چھوٹا تھا۔ ناصر کی شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی۔ اس لئے وہ اپنی بہن اور حکیم صاحب کو اپنے ساتھ جہلم سے راولپنڈی لے جانے کو خود چلا آیا تھا۔ اُس نے حکیم صاحب کی بہت منت سماجت کی کہ وہ ضرور چلیں۔ چنانچہ حکیم صاحب نے وعدہ کر لیا کہ وہ عین شادی کے دن پہنچ جائیں گے۔ وہ فی الحال اپنی بہن کو لے جائے۔ حکیم صاحب دنیا دکھاوے کو شادی کے دن راولپنڈی پہنچ گئے۔ برات گئی اور دلہن بھی آگئی۔ رات تک لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ حکیم صاحب کے لئے رات بسر کرنے کو ایک الگ تھلگ چھوٹے سے کمرے میں پلنگ بچھا دیا گیا۔ اُن کی عادت تھی کہ سونے سے پہلے دودھ ضرور پیا کرتے۔ سلطانہ کو اس کا علم تھا۔ اس لئے جب وہ دودھ سے بھرا گلاس تھامے اُن کے کمرہ میں داخل ہوئی تو حکیم صاحب کی نظر بلا ارادہ اس کے چہرے پر پڑ گئی۔ بھائی کا بیاہ تھا سلطانہ نے کیا کچھ سنگھار نہ کر رکھا تھا۔ بھڑکیلا لباس۔ ہونٹوں پہ سرخی، گالوں پہ سرخی۔ آنکھوں میں کاجل۔ وہ کوئی حکیم صاحب کو دکھانے بن ٹھن کے تھوڑا آئی تھی۔ اس کے بھائی کا بیاہ تھا۔ حکیم صاحب کو یقین نہیں آرہا تھا کہ سلطانہ اتنی حسین بھی ہو سکتی ہے۔ وہ حسین تھی مگر کئی برس پہلے۔ حکیم صاحب کو یوں محسوس ہوا جیسے اُس رات دلہن ناصر کے گھر نہیں اُن کے اپنے گھر آئی ہے۔ وہ سوچنے لگے سلطانہ سے کیا بات کریں۔۔۔

دوسرے روز حکیم صاحب واپس چلے گئے۔ سلطانہ دس روز تک بھائی کے گھر رہی اور پھر ناصر اُسے حکیم صاحب کے گھر چھوڑ آیا۔ حکیم صاحب ذہنی طور پر بیحد پریشان رہنے لگے تھے۔ ان کی صحت بھی گرتی جا رہی تھی۔ ناصر کی شادی کے چھ ماہ بعد تک تو انھیں کوئی شدید بیماری لاحق نہ ہوئی تھی مگر اُس کے بعد وہ مسلسل تین مہینے بستر پر ایسے پڑے کہ چلنا پھرنا تو درکنار اٹھ کر بیٹھنے کے قابل بھی نہ رہے۔ اب کے جب زرینہ نے پھر ایک لڑکی کو جنم دیا تو ان پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اور زرینہ کے خواب کا پھول تیسرا کانٹا بن کر اُن کے سینے میں ایسا چبھا کہ وہ درد کی شدت سے چیخ اٹھے۔ آخری دنوں میں انھوں نے سب سے بولنا بند کر دیا تھا۔

ایک روز جب سلطانہ نے پانی سے بھرے ہوئے دو گھڑے دوسری جگہ رکھنے کے لئے دو ہاتھوں میں اٹھائے تو گھڑے ہاتھ سے چھوٹ گئے اور وہ بے ہوش سی ہو کر گر پڑی۔ حکیم صاحب جس چارپائی پر پڑے تھے وہ صحن ہی میں بچھی تھی۔ فریدہ اور زرینہ جھٹ اُس کے پاس پہنچیں۔ اور اُس کے اوپر چادر اڑھا دی تھوڑی دیر کے بعد جب بات شک کی حد سے گزر کر یقین تک پہنچی تو فریدہ خوشی سے پکاری "لڑکا ہے"۔ زرینہ نے سلطانہ کو سنبھالا اور فریدہ بچے کو کمرے میں لے گئی۔ حکیم صاحب نے پہلی بار اپنی بڑی لڑکی سلمیٰ کو اشارے سے مسکرا کر بلایا۔ ان کی آواز بیحد نحیف ہو چکی تھی اس لئے کان میں کہا۔ "بھائی کا خیال رکھو"۔

آج لڑکے کی پیدائش کا تیسرا دن تھا۔ اور حکیم صاحب کی تینؔ بیویاں اور نوؔ بچے اُن کے پلنگ کے دائیں بائیں بچھی ہوئی چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ حکیم صاحب کی زبان بند ہو چکی تھی۔ پہلے انھوں نے ایک نظر نومولود پر ڈالی۔ دوسری نظر سب پر۔ پھر دونوں ہاتھ ملنے لگے۔ آخری ہچکی لی۔ اور آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے موند لیں۔

حکیم روشن دین مرحوم کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر اُن کے احباب و اعزا خدا سے ان کی تینؔ بیواؤں اور نوؔ بچوں کو صبر جمیل عطا فرمانے کی دعا کرتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ ●

★

خاکہ:

پنکھے والے حافظ جی

اشرف صبوحی

آج سے کوئی پچاس برس ہوئے دلی میں ایک بزرگ جاڑے گرمی پنکھا ہاتھ میں لئے پھرا کرتے تھے۔ قاضی کے حوض سے سرکی والوں، لال کنوئیں تک بازار میں اور پنڈت کے کوچے، نیاریوں، شاہ گنج اور شاہ تارا کی گلی کے اندر اندر انہیں چکر لگاتے دیکھا۔ یوں سننے کو ہزاروں باتیں سُنیں۔ ایک ہی دن میں کسی نے کہا ہم نے قطب کی لاٹھ کے نیچے دیکھا ہے تو کسی نے بیان کیا کہ ہم ابھی روشن چراغ دہلی میں چھوڑ کر آئے ہیں۔ بلکہ اجمیر سے آنے والوں نے اجمیر میں اور کلکتے سے آنے والوں نے کلکتہ میں بھی دیکھا۔ مگر ہم نے تو سارے دن دوپہر شام انہی گلیوں اور انہی بازاروں میں پنکھا ہلاتے اور پھیرتے دیکھا۔

لوگ انہیں مجذوب کہتے تھے ہوں گے۔ اللہ ہی جانے مگر ہم نے تو کبھی ان کی ایسی حالت نہیں دیکھی جیسی عام طور پر مجذوبوں کی ہوتی ہے۔ ہمیشہ کپڑے پہنے ہوئے۔ لٹھے کا انگرکھا۔ بغیر کرتے کے جس میں سے چھاتی کے بال نظر آتے۔ ایک بر کا پاجامہ۔ اُجلا بے داغ۔ پاؤں میں گول پنجے کی جوتی۔ البتہ سر سے ننگے۔ ٹوپی پہنے کبھی نہیں دیکھا۔ ہمارا لڑکپن تھا اور ان کا بڑھاپا۔ اس وقت وہ کم از کم ستر برس کے پیٹے میں ہوں گے۔ ہاڑ کے معمولی تھے۔ دُبلے پتلے۔ بال کھچڑی۔ چاول زیادہ اور دال کم۔ رنگ گندمی تھا کسی قدر میلا۔ صورت نورانی۔ چھوٹی کسی ڈاڑھی لبیں کتری ہوئیں۔ چہرے پر متانت۔ نہ بڑبڑانا نہ کسی سے کچھ بات کرنا۔ کوئی سلام کرتا تو پنکھا ہلا دیتے اور گزر جاتے۔ نہ لڑکوں کا غول ان کے پیچھے رہتا اور نہ کوئی ان سے بات چیت کرتا۔

دیوانہ کو دیوانہ بنا دینے کے بھی اسباب ہوا کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ مجذوب پرست انہیں بھی چھیڑ چھیڑ کر پاگل بنا دیتے اور یہ بھی پتھر مارنے اور گالیاں بکنے لگتے۔ لیکن چونکہ ان کے بھتیجے محمد نذیر تھانیدار تھے۔ اپنے وقت کے بڑے مشہور تھانے دار۔ اور اسی علاقے میں قاضی کے حوض کے تھانے پر ان کی تعیناتی تھی اس لئے کس کی ماں نے دھونسا کھایا تھا جو انہیں ستاتا یا ان کے ساتھ گستاخی سے پیش آتا۔

ہم نے محمد نذیر تھانے دار کو بھی دیکھا ہے۔ اگرچہ ہمارے ہوش میں انہوں نے پنشن لے لی تھی لیکن رعب داب ان کا بدستور تھا۔ سرکی والوں کے بازار میں لال دروازے کے سامنے ایک کوچہ ہے جس کو نور اللہ بیگ کا کوچہ کہتے ہیں۔ اس کوچہ میں ان کا مکان تھا۔ شام کے وقت جاڑے گرمی کوچہ کے آگے ٹیڑی پر کئی مونڈھے بچھ جاتے۔ ایک مونڈھے پر تھانے دار صاحب بیٹھے ہوئے دکھائی دیتے اور دوسرے پر مرزا نذیر بیگ۔ نذیر بیگ بڑے ہاڑ کے آدمی تھے شیر کا سا چوڑا چکلا چہرہ۔ مہندی سے رنگی ہوئی گول ڈاڑھی کے ساتھ لال۔ آواز ایسی جیسے بادل گرجا۔ محمد نذیر تھانیدار بھی مہندی لگاتے تھے مگر مرزا کے مقابلے میں ان کا جثہ بہت حقیر تھا اس لئے یاروں نے ان پر پھبتی اڑائی تھی کہ لال مرغے میں ایک اصیل ایک تیتی۔ بہرحال ان دونوں کا گٹھ جوڑ اتھا جب تک یہ دونوں زندہ رہے کوچے کے آگے کی بیٹھک نہیں چھوٹی اور کبھی دونوں میں سے ایک کو اکیلا نہیں دیکھا۔ تھانے دار صاحب کے چچا جس وقت اپنے گشت میں اُدھر سے گزرتے تو دو چار منٹ کے لئے ایک مونڈھے پر ہو بیٹھتے اور خاموش بیٹھے رہتے۔ اتنی دیر تک یہ دونوں بھی کوئی بات نہ کرتے نیچی نگاہیں کئے مؤدب انہیں دیکھا کرتے۔

محلے اور بازار کے شیر جب ان کے آگے گردنیں جھکا لیتے تو لومڑیاں کیا ان کے گرد ہوتیں۔ دوسرے ان کی نہ صورت ایسی تھی کہ لوگ ہنستے نہ کوئی حرکت ایسی کہ لڑکے بالے چھیڑیں۔ اب رہے درویشوں کے پرستار یا مجذوبوں کے متوالے وہ اکیلے دُکیلے ضرور ان سے عرض معروض کرتے ہوں گے۔ ہم نے اس کے متعلق کچھ سنا نہیں۔ درحقیقت درویشوں کی شہرت ان کی شوریدہ مزاجی ہی سے ہوتی ہے۔ یہ خاموش تھے اس لئے علانیہ نہ ان کا پہنچے ہوئے فقیروں میں شمار تھا نہ مجذوبوں میں۔

ہم نے ان کا نام معلوم کرنا چاہا۔ افسوس جس سے پوچھا اس نے لاعلمی ظاہر کی اور یہی کہا کہ محمد نذیر تھانیدار کے چچا ہیں۔ پھر ہم نے بعض اپنے

بڑوں سے پوچھا کہ ان کی یہ کیفیت کب سے ہے؟ اس کا جواب بھی نفی ہی میں ملا۔ یہی کہ ہم نے جب سے دیکھا اسی حالت میں دیکھا۔

بچپن کی ایک خصلت یہ بھی ہے کہ جس بات کا پتہ نہیں لگتا اس کی کرید ہو جاتی ہے۔ ایک دن میں اپنے مکان کی ڈیوڑھی پر نانا کے ساتھ کھڑا تھا کہ سامنے سے حضرت پنکھا ہلاتے گزرے۔ میں نے نانا سے بھی ان کے متعلق سوالات شروع کر دیئے۔ اتنے میں کریم اللہ خاں آ گئے۔ یہ شیدی گوہر کے پوتے تھے۔ محلے میں سب سے بڑی عمر کے آدمی۔ ہمارے مکان کے سامنے ان کا گھر تھا۔ پوچھنے لگے "کیوں بھئی نانا سے کیا باتیں ہو رہی ہیں؟" نانا نے کہا۔ "محمد نذیر کے چچا کو پوچھتا ہے کہ کب یہ دیوانے ہوئے"۔ کہنے لگے "آؤ بیٹا ہم بتائیں۔ ہم نے ان کا بچپن بھی دیکھا ہے بلکہ مسجد میں ہم دونوں کئی مہینے تک ساتھ پڑھے ہیں۔ یہ بڑے شریر تھے۔ مُلّاجی ان کی خوب ٹھکائی کیا کرتے مگر ذہن ایسا اچھا تھا کہ چھ مہینے میں قرآن حفظ کر لیا"۔

اس دن معلوم ہوا کہ واقعی حافظ ہیں۔ لوگ یونہی نہیں کہتے۔ میں نے پوچھا کہ اچھا پھر ان کا دل کس طرح اُلٹا؟ انہوں نے بتایا کہ یہ سامنے جو سید کا تھان ہے جمعرات کی جمعرات اب تو اتنے نہیں پہلے بہت چڑھاوا چڑھا کرتا تھا۔ بیسیوں چراغ جلتے۔ کبھی کبھی کوئی قوال یا مناجاتی آ بیٹھتا۔

یہاں میں چاہتا ہوں کہ سید کے تھان کی جگہ بھی آپ کو بتا دوں۔ جہاں اب پیرجی عبدالصمد مرحوم کا مکان ہے یہاں کچھ کچے مکان اور کچھ کھنڈر تھے اسی لائن میں شاہ گنج کی طرف چلو تو ان کچے ڈھابوں کے برابر سفید گھوڑے والے میر صاحب کا اصطبل تھا۔ اصطبل کے آگے میدان۔ لڑکے کبڈی گلی ڈنڈا۔ گیند چڈی اور گیڑیاں کھیلا کرتے تھے۔ میدان کے خاتمے پر کسی پرانی عمارت کی ایک محراب سی باقی تھی اور اس میں ایک طاق بنا ہوا تھا۔ اسی طاق پر کسی سید صاحب کا گزر سمجھنا چاہیئے۔ وہیں سہرے لٹکائے جاتے۔ کھیلیں بتاشے ریوڑیاں وغیرہ چڑھائی جاتیں۔ گھی کے چراغ جلتے۔ جمعرات کو یہ بہار ہم نے بھی دیکھی ہے۔ جھاڑو ملتی چھڑکاؤ ہوتا اور شام سے رات گئے تک بیسیوں عورتیں اور مرد چڑھاوا چڑھانے آتے۔ نوچندی جمعرات کو ڈھولک بھی پٹتی۔ کسی کسی کے سر پر کبھی کبھی سید صاحب بھی آ جاتے۔ ہمیں ممانعت تھی کہ جمعرات کو اُدھر ہرگز نہ جانا۔ ہم بھی کچھ ڈر سے اور اس لئے کہ گھر والوں میں سے کسی نے دیکھ لیا تو خفا ہوں گے اس طرف نہ جاتے۔ دور ہی دور سے تماشا دیکھا اور گانا سنا کرتے۔

اچھا تو کریم اللہ خاں نے سنایا "مشہور تھا کہ تھان والے سید کوئی بڑے جلالی ہیں۔ جب بگڑ جاتے ہیں تو بچے بوڑھے عورت مرد کسی کو نہیں دیکھتے۔ کئی قصے بھی کہے جاتے تھے کہ جمعرات کو طاق میں فلاں شخص کو اس صورت میں نظر آئے تو فلاں کو اس روپ میں۔ کیا مقدور ان کے نام کے چڑھاوے کو کوئی ہاتھ تو لگا لے۔ رنگیلی پہلوان نے منع کرتے کرتے جلیبیوں کا دونا اٹھا لیا تھا ایسا پٹخنا دیا کہ خون تھوکتے تھوکتے آخر مر گیا۔ دھنو دھنوا ایک نٹنی تھی بڑی شہدن خلیفہ کلن نے اس کو ڈال لیا تھا کسی نے کھیر کا پیالہ چڑھایا۔ اس کی رال ٹپک پڑی۔ ہاتھ ڈالتے ہی لوٹن کبوتر بن گئی۔ غرض یہ ہے کہ ایسی ایسی کہانیاں سنا کر بچوں کو وہاں جانے سے روکتے تھے لیکن بچے کیا مانتے۔ ریوڑیوں اور میٹھی کھیلوں کے لالچ میں آس پاس لگے ہی رہتے۔ کیونکہ بعض لوگ چڑھاوا چڑھانے کے بعد تھوڑی تھوڑی مٹھائی بچا کر بچوں کو بھی بانٹ دیتے۔ مُلّاجی نے ہم کو منع کر رکھا تھا اور چونکہ مسجد سامنے ہی تھی ان کے ڈر سے کوئی لڑکا نہ جاتا۔ جاتا بھی تو آنکھ بچا کر۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مُلّاجی کہیں دعوت میں گئے ہوئے تھے۔ نوچندی جمعرات تھی۔ ہم کو موقع ملا جا پہنچے۔ یہ حافظ جی بھی آ گئے ایک عورت نے برفیوں کا دونا چڑھایا۔ حافظ جی کے منہ میں پانی بھر آیا۔ کہنے لگے یار اس پر ہاتھ مارنا چاہیئے۔ میں نے کہا اگر تم نے یہ دونا اُچک لیا تو صبح کو اتنی ہی برفیاں اور کھلاؤں گا۔ بولے اچھا ٹھہرو۔ ذرا سوفتہ ہو جانے دو۔

چنانچہ ہم پرے ہٹ کر کھڑے ہو گئے اور سوفتہ ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ عشاء کی نماز کے بعد بھیڑ چھٹنی شروع ہوئی اور نو بجتے بجتے آنے جانے والوں کا تانتا ٹوٹ گیا۔ ان دنوں آج کل جیسا حال تو تھا نہیں کہ آدھی آدھی رات تک گلی کوچے چلتے رہیں۔ عشا کی نماز کے بعد گلی میں کون چلتا پھرتا۔ تھان کے چراغ بھی ٹمٹمانے شروع ہو گئے۔ حافظ جی اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے آگے بڑھے اور جاتے ہی طاق پر جھپٹا مارا۔ برفیوں کے دونے پر ہاتھ پڑنا تھا کہ طاق کے اندر سے ایک پنجہ نکلتا ہوا دکھائی دیا۔ حافظ جی "شیر شیر" کہتے ہوئے طاق کی حد کے باہر آ کر گر پڑے اور ہم بھاگ کر اپنے گھروں میں گھس گئے۔ رات بھر مجھے بخار چڑھا رہا۔ حافظ جی پر کیا گزری کچھ خبر نہیں۔

صبح کو جب میرا بخار اترا اور مجھے ہوش آیا تو گھر میں چرچا سنا کہ حافظ جی کا برا حال ہے۔ لینے کے دینے پڑے ہوئے ہیں۔ لڑکے مانتے ہی نہیں لاکھ دفع منع کیا کہ سید صاحب کے تھان پر بچوں کا کام نہیں۔ اب مزہ آیا اور جائیں۔ معلوم ہوا کہ جب مولا بخش بڑھئی صبح کی نماز پڑھنے جا رہا تھا تو اس نے

حافظ جی کو بیہوش پڑے ہوئے دیکھا بڑی مشکل سے اٹھاکر مسجد میں لے گیا۔ نماز کے بعد ملا جی نے بہتیرا جھنجھوڑا کر دیکھا مگر حافظ جی کو ہوش نہ آیا۔ آخر ان کے
گھر والوں کو خبر کی۔ بیچارے رات بھر پہلے ہی پریشان رہے تھے۔ سنتے ہی بے اوسان ہو کر بھاگے ہوئے آئے اور ڈولی ڈنڈا کر کے اٹھا لے گئے۔
پیرجی سنگھاڑا پیرجی پھڑے۔ سید حسن، مولوی نیک عالم، فراشخانے میں اخوند جی ان دنوں یہی دو چار آدمی جھاڑ پھونک کرنے والے تھے اور
سفلی کرنے والوں میں امیر بیگ یا بھگت کہار کسی نے فلیتے کی دھونی ناک میں دلوائی۔ تعویذ دئے نقش لکھے کسی نے ڈورو بجائے سارے کرتوت کئے
مگر حافظ جی نے آنکھ نہ کھولی۔ چار دن کے بعد آنکھ کھلی تو نہ منہ سے بولتے ہیں نہ سر سے کھیلتے ہیں۔ بالکل گم صم نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کی پروا لیٹے ہیں تو لیٹے
ہیں کھڑے ہیں تو کھڑے ہیں۔ کچھ پوچھو تو جواب نہیں۔

اس زمانے میں کبھی کبھی گھڑ چڑھے فقیر آیا کرتے تھے۔ اس اثنا میں وہ بھی آ گئے۔ گھڑ چڑھے فقیروں کی صدا جو حافظ جی کے گھر والوں کو پہنچی تو
حافظ جی کو پکڑ ان کے سامنے لائے۔ انہوں نے دیکھتے ہی کہا "مائی یہ تو میراں کی جھپیٹ میں آگیا ہے۔ پیران کلیر والے کے ہاں لے جاؤ نہیں تو پاگل ہو جائے گا"
حافظ جی کے گھر والوں میں کوئی مرد نہیں تھا۔ دُکھڑا پیٹنے والی عورتیں ہی عورتیں تھیں۔ ماں بیچاری جس طرح بنا ممتا کی ماری پیران کلیر لے گئی۔
طبیعت میں ایک قسم کی وحشت جو چلی آتی تھی۔ وہ تو جاتی رہی لیکن آدمی کی جون میں نہ آئے۔ پھر ایک مرتبہ سنا کہ مدار کی چھڑیوں والوں کے ساتھ اجمیر شریف
کی طرف نکل گئے۔ لوگ ڈھونڈ ڈھونڈ کر بیٹھ رہے۔ عورتوں نے بھی ان کو صبر کر لیا۔ کوئی گیارہ برس کے بعد خود بخود آ گئے۔ لیکن آنا نہ آنا یکساں تھا نہ
گھر کے کام کے رہے نہ باہر کے۔ چپ یہاں کھڑے ہیں وہاں بیٹھے ہیں۔ کھانا کھلا دیا کھا لیا۔ پانی پلا دیا پی لیا۔ ورنہ کچھ نہیں۔ کپڑے میلے ہیں بلا سے۔
پھٹ گئے تو پھٹ جائیں، نہ نہانا نہ دھونا نہ نائی نہ دھوبی۔

اتنے میں محمد نذیر سپاہیوں میں نوکر ہو گئے تھے۔ ان کے آتے ہی یکایک حولدار ہو گئے۔ ان کی کرامت سمجھی گئی۔ انہوں نے ان کا خیال رکھنا شروع
کیا۔ جمعہ کے جمعہ ان کا خط بنواتے نہلواتے کپڑے پہناتے۔ چنانچہ اس وقت سے ان کی یہی کیفیت ہے۔ دیوانے تو البتہ نہیں ہیں لیکن دن رات
پنکھا ہلاتے پھرنے سے کام ہے۔ اللہ ہی جانے کس خیال میں مست رہتے ہیں اور مجذوبوں یا فقیروں میں ان کا کیا درجہ ہے۔ ہم تو بھئی ایسی باتوں کے
قائل نہیں۔"

کریم اللہ خاں کی زبان سے یہ سن کر کہ ہم تو ان باتوں کے قائل نہیں مجھ کو بڑا تعجب ہوا اس لئے کہ اس زمانے میں ظاہری حکومت کے ساتھ باطنی
حکومت کی بڑی دھوم تھی۔ ہر اوگھا فقیر اور مجذوب خدائی فوجدار سمجھا جاتا تھا۔ علاقے بٹے ہوئے تھے۔ فلاں صاحب دلی دروازے سے
جامع مسجد تک کے قطب ہیں تو فلاں بزرگ کی عملداری کشمیری دروازے سے لاہوری دروازے تک ہے۔ حافظ جی کو بھی بعض لوگ اپنے علاقے کا
حاکم سمجھتے۔

مختصر یہ کہ حافظ جی کے متعلق کوئی خاص کرامت تو منسوب نہ تھی تاہم ان کی قطبیت میں بھی شبہ نہ تھا۔ مجھے ان سے ایک قسم کی دلچسپی ہو گئی
تھی۔ اکثر ان کے ساتھ ساتھ دور تک چلا جاتا۔ شوق تھا کہ کبھی ان کی آواز سنوں۔ مہینوں گزر گئے۔ کبھی کبھی ہونٹ ہلتے ہوئے تو ضرور دیکھتا لیکن
آواز سننے میں نہیں آئی۔

ایک روز ٹھیک دوپہر کا وقت تھا اور ٹھیٹ گرمی کا موسم۔ خدا معلوم کیوں میں ڈیوڑھی کے باہر آیا۔ گلی بالکل سنسان تھی۔ دیکھتا کیا ہوں
کہ حافظ جی غیر معمولی تیز قدمی کے ساتھ جا رہے ہیں۔ پنکھا بھی زور زور سے ہل رہا ہے۔ تیور بدلے ہوئے۔ آپ ہی آپ کچھ بول بھی رہے تھے۔ میں پیچھے پیچھے
ہو لیا کہ سنوں کہتے کیا ہیں۔ چند قدم کے بعد صاف آواز آنے لگی۔ ایسی جیسے کوئی وعظ کہتا ہے۔ ان کے الفاظ تو کیا یاد رہتے۔ یہ بھی ان کی کرامت سمجھو کہ
مفہوم آج تک مجھ کو یاد ہے۔ اس وقت تو میں کچھ سمجھا نہیں لیکن آج جب ان کی بڑ کا خیال آتا ہے تو ان کے صاحب نسبت ہونے میں شک نہیں رہتا۔
واقعی خاموش اللہ والے تھے۔ ان کی بڑ کا مفہوم میں اپنے لفظوں میں آپ کو سناتا ہوں۔ سمجھ لیجئے اللہ والوں میں ان کا کیا درجہ ہوگا۔

"دور ہو دور، او دنیائے دلفریب دور دور! تو نے مکار دھوکے باز مجھے کن مصیبتوں میں پھنسا دیا ہے۔ میں مختار نہیں بندۂ مجبور
ہوں۔ اپنی خوشی ایک لمحہ یہاں قیام نہیں کر سکتا۔ کیا مقدور اپنے ارادے سے سانس تک لے سکوں۔ میں آزاد نہیں پابند ہوں۔ اپنی مرضی سے

کچھ نہیں کرسکتا۔ ہر وقت چشم براہ اور ہر لحظہ گوش برآواز ہوں۔ آقا کے حکم کا انتظار ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کس وقت میری طلبی کا فرمان آجائے۔ آہ اس فرمان کے بعد اس کے سوا چارہ کار نہیں کہ جس طرح بیٹھا ہوں اسی طرح اٹھ کھڑا ہوں۔ پھر تو ہی انصاف کر کہ یہ آخری لمحہ میرے لئے کس قدر دشوار ہو جائے گا۔ اگر میں ابھی سے اپنے آپ کو اس کے لئے آمادہ نہ کروں اور اس رہ گزار سے آگے بڑھنا میرے لئے کس قدر تکلیف دہ ہوگا اگر میں ابھی سے ان کانٹوں کو نہ ہٹالوں جو خواہشوں نے بچھا رکھے ہیں اور ان پتھروں کو دور نہ کر دوں جن کی موجودگی میں قدم جنبش نہیں کر سکتے۔

لوگ مجھے دیوانہ کہتے ہیں میں دیوانہ ہی سہی کسی نے میرا نام مجذوب رکھا ہے۔ قربان اگر میاں اپنے اندر مجھے جذب کرلیں۔ دنیا مجھ کو گونگا بہرا اپنے حال سے بے خبر سمجھتی ہے۔ لیکن نہ میں گونگا ہوں نہ بہرا نہ اپنے حال سے بے خبر۔ جو اپنے آقا کی آنکھیں دیکھ چکا ہو جس نے اپنے مالک کی پکاریں سنی ہوں کون ہے جو اسے بے خبر کہے۔

دور ہو دنیا مجھے اپنی آرائشوں سے معاف کر۔ میں ان بالوں کو کیا سنواروں جن کا رنگ چند روز میں تبدیل ہو جاتا ہے اور جو سودائے اعتدال میں ذرا کمی ہونے سے موت کا پیام دینے لگتے ہیں۔ آہ! میں اس چہرے کو کیا آئینہ میں دیکھوں جس کی نجانے کونسی ادا پیا کو بھاتی ہے جس کی تر و تازگی چند روز کی مہمان ہے اور جو تھوڑے دن میں ڈراؤنی شکل اختیار کرنے والا ہے۔ بتا میرا منہ کیا دیکھتی ہے بتا۔ آخر میں کس امید پر اس پیکر فانی کو لباس فاخرہ سے آراستہ کروں جس کے انتظار میں قبر کے پرشور ذرات بے چین ہو رہے ہیں۔ میں تو جیسا ماں کے پیٹ سے نکلا تھا ویسا ہی پھرتا تجھ کو اور تیری فتنیات کو دعوت دیتا کہ آ اور مجھ سے شرما یا مجھ کو شرما۔ لیکن کیا کروں میرے مالک کا حکم نہیں۔

اری چڑیل، چھل پائی! تو مجھے طعنے دیتی ہے۔ اضطراب کے طعنے، آخر میں ان در و دیوار کے اندر کیوں کر چین سے بیٹھوں جن سے عنقریب جبری طور پر یا بدستِ دگرے دست بدستِ دگرے مجھ کو جدا کیا جائے گا، اور میں تیرے اس ساز و سامان سے کس طرح دل خوش کروں جبکہ تھوڑے ہی عرصے میں یہ میرے قبضے سے باہر ہونے والا ہے۔ تیرے میکدے کے متوالوں کی رنگین صحبتیں مجھے بھی غفلت کی ترغیب دے چکی ہیں لیکن میں ان تماشوں سے کیوں آنکھیں بند کر لیتا جو میرے سامنے ہو رہے ہیں۔ میں کس طرح واقعات کو دل سے بھلا دوں۔ جانتا ہوں کہ یہ صحبتیں عنقریب برہم ہو کر رہیں گی اور وہ زمانہ کچھ دور نہیں کہ محبت و یکجائی کا شیرازہ ٹوٹ جائے گا۔ تو ہنسے گی اور سب روئیں گے۔

غرض میں نے جدھر نظر اٹھائی اور اب بھی جس طرف نظر اٹھاتا ہوں تیری ہر شے میں مکار بیوا کی دلفریبی پائی اور آج بھی پاتا ہوں۔ لیکن ایک ایسی دلفریبی جس کے اندر زوال کا اضطراب اور فنا کی افسردگی موجیں مارتی دکھائی دیتی ہے۔ اور اس لئے مجھ کو چین نہیں۔ مجھے تو خوشی کی جگہ ملال امن و عیش کی جگہ بیقراری و تکلیف کا سامنا رہتا ہے۔ خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہیں، اندر ہی اندر گھٹ کر دل ہی دل میں حافظ کا یہ شعر پڑھنے لگتا ہوں:

مرا در منزل جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم
جرس فریاد می دارد کہ بربندید محمل ہا

اب میں حافظ کو کیا کہوں۔ تجھ کو جس میں فریب کے سوا کچھ نہیں منزلِ جاناں بتاتے ہیں۔ منزلِ جاناں اگر یہی ہے تو ایسی منزلِ جاناں کو سلام لیکن نہیں منزلِ جاناں کو اس سے زیادہ دغابازی کا گھر ہونا چاہئے۔ عشق و ہوس کا امتحان آخر کس طرح ہوتا۔ کیوں! پتہ کی سن کر گھبرائی۔ حافظ جیسے خوش مذاق لوگوں نے تجھ کو منزلِ جاناں کہہ دیا تو اکڑ گئی لگی ہم کو بھی اپنا ٹھنی پن دکھلانے۔ اپنی آرائش و دلکشی کے لحاظ سے تو منزلِ جاناں سہی۔ ہم بھی حافظ کی لے میں لے ملا کر کہتے ہیں کہ تو منزلِ جاناں، منزلِ جاناں، منزلِ جاناں۔ لیکن منزلِ جاناں کہنے کے بعد یہ بھی دیکھا کہ حافظ جی نے آنکھیں کس طرح نیچی کرلیں سر کیسا جھکا لیا۔ انہیں فوراً یاد آگیا کہ ایک بے قرار راہرو کو اس منزل میں امن و سکون اور راحت و آسودگی کے کیا معنی جہاں ہر لحظہ فریاد جرس بلند ہو رہی ہے کہ اٹھو اسباب سنبھالو۔ کمر باندھو۔ سفر کی تیاری کرو۔ یہ جرس کیا ہے؟ نفس کی آمد و شد جو ہر دم عمر کی کمی اور موت کے قرب کا پتہ دے رہی ہے۔

اے غافلو! دم اندر آتے جاتے ہے
سوچو کہ نخلِ عمر کو یہ کھائے جاتے ہے

(باقی صفحہ [illegible] پر)

دھوپ چھاؤں

طاہرہ کاظمی

(۱)

دھوپ روز آتی ہے
اوٹ سے پہاڑوں کی
سُرخ آتشیں تھالی
روز یوں اُبھرتی ہے
جیسے زندگی اُبھرے
چوٹیاں پہاڑوں کی
دھوپ میں نہاتی ہیں
پتھروں کے سینے میں
دھوپ آگ بن بن کر
جذب ہوتی جاتی ہے
تند، گرم دھاتوں کا
کھولتا ہوا لاوا
سرد قلبِ گیتی میں
کروٹیں بدلتا ہے

(۲)

گرم اور سنہری دھوپ
جنگلوں میں جاتی ہے
مدّتوں پُرانے پیڑ
اپنی جڑ کے پنجوں پر
اٹھ کے سانس لیتے ہیں
تاکہ سرد شریانیں
زیست کا لہو پائیں
مسکرا کے خود رو پھول
گردنیں اٹھاتے ہیں

(۳)

دھیمے دھیمے قدموں سے
دھوپ شہر آتی ہے
شہر کے مِناروں سے
سیڑھیاں لگاتی ہے
شہر کے نظاروں میں
روشنی لٹاتی ہے

(۴)

صبح اپنے آنچل میں
رنگ بھر کے لاتی ہے
پیڑ جاگ اٹھتے ہیں
سُرخ چمپئی گلنار
پھول شاخساروں میں
آگ سی لگاتے ہیں
اودے اودے غنچوں کے
بوجھ سے لدے کچنار
جھوم جھوم جاتے ہیں
شب کی نیند کے ماتے
پھول آنکھ ملتے ہیں
کاسنی رسیلے پھول
سرخ پیلے نیلے پھول
بند بند غنچوں کی
دلنواز رعنائی
رَس بھرے ہوئے ڈنٹھل
بوجھ سے جھُکے ڈنٹھل
سبز کرُکرُے پتے
شاخ شاخ کلیوں پر
سُرخ مکھیوں کی گونج
پھُول پھُول کے اوپر
سَرد اوس کے قطرے
کانپتے ہیں یہ بھونرے
سرو کی قطاروں میں
ننھی ننھی چڑیوں کی
میٹھی میٹھی آوازیں
نرم مخملیں سبزہ
ہر روش پہ خوابیدہ
ہر خبر سے بے پَروا

(۵)

دھوپ سے بھرے دن بھی
داغ داغ رہتے ہیں
لمبے لمبے پیڑوں کے
سائے رقص کرتے ہیں
دھوپ چھاؤں بنتی ہے
سائے جال پھیلائے
دھوپ کی تمازت کو
سرد کرتے رہتے ہیں

(۶)

رات اپنی چادر میں
نرم نرم یادوں کی
چھاؤں لے کے آتی ہے
جیسے رات کی رانی
دور خواب میں مہکے
جیسے موتیا جوہی
شب کو عطر سے بھر دیں
تارے گیت گاتے ہیں
چاند گنگناتا ہے
یہ سکوت گویا ہے
بیکراں خموشی بھی
اک حسین نغمہ ہے
یہ طویل تاریکی
دن کا پیش خیمہ ہے

(۷)

دن ہے کس قدر تاریک
رات کتنی چمکیلی
دن اداس رہتا ہے
آنے والی ظلمت کے
خشمگیں تصوّر سے
ظلمتیں فضاؤں میں
پھیلتی ہی جاتی ہیں
زندگی کی راہوں میں
گر کبھی سرِ منزل
اک چراغ بجھتا ہے
سو چراغ جلتے ہیں
چاند ڈوب جاتے ہیں
آفتاب اُبھرتے ہیں
رات مسکراتی ہے
بھر کے مانگ میں افشاں
صبح کے جھروکوں سے
پرنیاں کے پردوں کو
تہہ بہ تہہ اٹھاتی ہے

(۸)

سایہ اک حقیقت ہے
دھوپ بھی حقیقت ہے
دھوپ اور سائے کے
امتزاجِ باہم سے
کائنات رنگیں ہے
کائنات باقی ہے

یاد

ضمیر اظہر

نسیمِ سحر کا سکوں پاش جھونکا
کسی شاہزادی کے خوابِ منقش کی صورت جلو میں کئی رنگ لیکر
بہاروں کے شاداب نیرنگ لیکر
بہ اندازِ آہو خراماں خراماں
ریاضِ تصور کی جانب رواں ہے

سبک چاپ، مدھم صدا لہلہاتی
ریاضِ تصور میں خوشبو نے نغمہ چھلکتی ہوئی بے حجابانہ آئی
درختوں میں، شاخوں میں، پتوں میں، پودوں میں ہے جوشِ بالیدگی کارفرما
گلوں سے ہے موجِ تبسم ہویدا
پرندوں کی چہکار ہے کتنی سادہ

نسیمِ سحر کا فسوں ساز جھونکا
ریاضِ تصور سے ہو کر کسی اور وادی کی جانب روانہ ہوا ہے!
اور اس کی جدائی میں ہر ایک طائر ریاضِ تصور کا نوحہ کناں ہے
خزاں کے پلٹنے کا امکان پھولوں کی سہمی ہوئی صورتوں سے عیاں ہے
فضا پر مسلط غمِ بیکراں ہے!

★

غزل

عبداللہ خاور

ہے صبحِ عیش بھی یوں، غم کی شام ہو جیسے
ہمارا غم بھی غمِ ناتمام ہو جیسے

ترے حضور بھی پابندِ احتیاط رہوں
یونہی سا ربطِ پیام و سلام ہو جیسے

مگر نظر کے اجالے سلام کرتے ہیں
پیامِ لغزشِ پا، گام گام ہو جیسے

شفق میں صبح کی پہلی کرن ہوئی تحلیل
تری جبیں پہ نظر کا خرام ہو جیسے

ہر ایک غنچہ ہے لب بستہ اے لبِ رنگیں
شگفتِ گل کو ترا احترام ہو جیسے

چھڑی ہوئی ہے چمن میں حدیثِ غنچہ و گل
فسانہ لبِ مینا و جام ہو جیسے

بہار ہے تو، مگر چشمِ ملتفت کی قسم
ترا کرم ہو بہاروں کا نام ہو جیسے

ترے بغیر یہ عالم نگاہِ یاس کا ہے
سنے بغیر فسانہ تمام ہو جیسے!

ہر ایک لمحہ مرا، مجھ سے بے تعلق ہے
حیات تیرے تغافل کا نام ہو جیسے

میں کیا کہوں کہ شکستہ ہے سازِ زندگی کے
رکا رکا نفسِ کم خرام ہو جیسے

بہت ہی نرم ہے آہنگِ عرضِ غم خاور
زبانِ عشق کا طرزِ کلام ہو جیسے

غزل

جلیل قدوائی

جب سے وہ شوخ مجھ سے برہم ہے
کیا بتاؤں جو دل کا عالم ہے

بے رخی مجھ سے ہے مگر پھر بھی
میری اُمید سے بہت کم ہے

شاید اُن کو مرا خیال آیا
درد کیوں آج دل میں کچھ کم ہے؟

کیا وہ اپنی جفا پہ نادم ہیں؛
کس لئے اُن کی آنکھ پُرنم ہے؟

میرے دل میں بسی ہے اک دُنیا
اُن کی آنکھوں میں ایک عالم ہے

جس کو منظور ہو خوشی اپنی
اس کو اُن کی خوشی مقدم ہے

سادگی حسن کا شعار نہیں
عشق کی سادگی مسلّم ہے

دستِ ہر رند میں ہے جامِ سفال
دستِ ساقی میں کاسۂ جم ہے

گُل کا مُنہ آنسوؤں سے دھو ڈالا
کس قدر خوش نصیب شبنم ہے

پیار میں ہو گئے خفا وہ جلیل
دل کو اس بات کا بہت غم ہے!

مجید شاہد

بیاضِ ارض وطن پہ تحریرِ نور بنکر جو ضو فشاں ہے
وہ روشنی کی کرن ازالۂ ظلمتوں کا تو جاوداں تو ہے

غرورِ منصب ہے ٹمٹماتے چراغ کا آخری سنبھالا
سیاہیِ شب فقط سسکتے ہوئے ستاروں کی داستاں ہے

یہ کائناتِ حسیں حدودِ خیال ہی میں حسیں ہے ورنہ
تعیناتِ نظر کی حد تک بساطِ عالم دھواں دھواں ہے

وہاں بڑی تمکنت سے رازِ حیات ہوتا ہے آشکارا
جہاں گماں پردۂ یقیں ہے یقیں سراپردۂ گماں ہے

ہوس کے پاتال سے نکالا جسے بصد بیاض ہم نے
نفس کا وہ زیر و بم اگر ہو محیطِ عالم تو بیکراں ہے

زوالِ فکر و نظر محرک ہے پستی و پاشکستگی کا
کمالِ عزمِ بشر کی زد پر ستارہ و ماہ و کہکشاں ہے

تراش لی ہیں یہ اصطلاحات مہمل انکاریٔ نظر نے
تلاش کرنے چلو چمن میں تو پھر قفس ہے نہ آشیاں ہے

عجیب سے سرمدی خد و خال کا مرقّع ہے ابنِ آدم
قریب سے دیکھنے پہ ہر چند خاک کا تودۂ رواں ہے

جنم دیا لاشعور نے اور شعور نے جس کی پرورش کی
وہ غم سلامت رہے، وہ غم ہی مسرتوں کا مزاج داں ہے

نئے زمانے کو جملہ اقدارِ زندگی پر محیط کر لو
گئے زمانے کا ذکر بھی اب سماعتِ عام پر گراں ہے

نزاعِ عقل و جنوں کے ردِ عمل سے شاہد خدا بچائے
متاعِ سوزِ دروں کا حاصل تمام ترکیفِ جاوداں ہے

تیموریوں کا فنِ تصویر

احمد نبی خاں

ہندوستان، جسے تیموریوں نے جنت نشان کہا، ابتدا ہی سے فنونِ لطیفہ کا امین و مرکز رہا ہے۔ یہاں کے باسی سنگ تراشی سے لے کر مصوری تک میں دلچسپی رکھتے تھے۔ یہاں کا فن کار عہد قدیم سے ہی اپنے شاہکار نمونوں سے دنیا کو محو حیرت بناتا رہا ہے۔ مصوری کے نمونے بھی اس برعظیم میں گیارھویں صدی عیسوی سے ملتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہندوستان کا مزاج ہے، اس دور کا مصور اپنے دور کے فنکار ساتھیوں کے ساتھ مذہب و فلسفہ کی موشگافیوں کے لئے "تعبیرات" کا سہارا لے رہا تھا۔ اس کی قوت تخیل ہندو، جینی اور بدھ مذاہب کے دیوی دیوتاؤں کے مختلف روپوں کی عکاسی تک محدود تھی۔ زندگی کے دوسرے جیتے جاگتے موضوعات سے نہ اسے دلچسپی تھی اور نہ وہ ان سے سروکار ہی رکھتا تھا۔ پھر کاغذ کا استعمال بھی اس دور کے مصور کو یا تو معلوم نہ تھا یا اسے پسند نہ تھا، غرض کہ تیموریانِ ہند ایران کے اس دل کشا حصے سے اٹھ کر آئے تھے جہاں زندگی کی جیتی جاگتی رعنائیوں سے اہتزاز حاصل کرنا اور ان سے بھرپور لطف اندوز ہونا ہی حاصل زیست سمجھا جاتا تھا۔ جبھی تو "عالم دوبارہ نیست" کی طرف اشارہ کر کے دنیا سے اپنا حصہ لینے کی کسی نے دعوت دی تھی۔ ادب و شعر کی محفلیں اور مصوری و نقاشی کے مراکز اس مقصد کی تکمیل کا ذریعہ تھے۔ اور یہی راز ہے اس حقیقت کا کہ یہ تیموری سلاطین ان فنونِ لطیفہ کے اس قدر قدرداں تھے اور ان کی سرپرستی ادبی و ثقافتی فریضہ سمجھتے تھے۔ اور مصوری سے تو ہر با مذاق تیموری کو لگاؤ رہا ہے۔ چنانچہ بابر سے لے کر بہادر شاہ ثانی تک سب اس فن لطیف کے دلدادہ رہے۔ سیاسی تاریخ کا یہ ایک معمولی واقعہ ہی سہی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمایوں کا یہ اقدام کہ ایران سے واپسی پر وہ دو باکمال ایرانی مصوروں، میر سید علی تبریزی اور عبدالصمد کو اپنے ہمراہ لایا اور ان کو داستان امیر حمزہ کا مصور نسخہ تیار کرنے کا حکم دیا، اس عظیم کام کی ابتدا تھی جس کو اکبر اور جہانگیر جیسے با مذاق شہنشاہوں نے پروان چڑھایا اور ان کی سرپرستی میں مصوری کو وہ فروغ و عروج نصیب ہوا کہ اس دور کی مصوری کو باقاعدہ "تیموری اسکول" کا نام دیا جانے لگا۔

ہندوستان میں تیموری مصوری کا اولین نمونہ داستان امیر حمزہ کا وہ مصور نسخہ ہے جس کی تدوین ۱۵۵۰ء میں کابل میں ہمایوں کے حکم سے شروع ہوئی۔ اس کتاب کی تیاری میں پچیس سال کا عرصہ صرف ہوا اور اکبر کے عہد میں آگرہ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ یہ کپڑے پر ہزار سے زیادہ صفحات پر مشتمل تھی اور اس میں ۱۳۷۵ تصاویر تھیں جنہیں عبدالصمد کی نگرانی میں میر سید علی تبریزی نے چند مقامی مصوروں کی مدد سے تیار کیا تھا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ اتنے طویل عرصہ میں مختلف ہاتھوں سے مختلف عرصے میں تیار ہوئی، یہ امر قابل ذکر ہے کہ ساری کتاب میں یکسانیت اور توازن نہایت کامیابی سے برقرار رہا ہے۔ جہاں تک ان تصاویر کے اسلوب کا تعلق ہے یہ بنیادی طور پر ایرانی ہے۔ لیکن ہندوستانی اور مقامی اثر بھی جا بجا جھلکیاں دکھاتا نظر آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالباً خاکے (SKETCH) تو ان ماہر ایرانی مصوروں نے تیار کئے لیکن رنگ آمیزی کا کام ہندی مصوروں نے کیا۔ ان تصویروں میں ایرانی عناصر مثلاً نازک شگفتہ پھولوں سے لدے ہوئے درخت، سرسبز و شاداب جھاڑیاں، تین چوتھائی چہرے کی عکاسی۔ قالینوں کے خوبصورت ڈیزائن اور رنگ برنگے ٹائلوں سے بنے ہوئے فرش عام طور سے ملتے ہیں۔ مقامی مصوروں نے بھی ان خوبیوں پر اضافہ کیا اور انسانی چہرے کی عکاسی میں تناسب کا خاص طور سے خیال رکھا۔ داستان امیر حمزہ میں ہندوستانی اثر کے لئے ایک تصویر خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ اس تصویر میں رسول اکرمؐ کی پیدائش پر

ظہور میں آنے والے معجزات کی عکاسی کی گئی ہے مثلاً کعبہ میں رکھے ہوئے بتوں کو گرتے ہوئے دکھایا ہے، مجوسیت کی آگ بجھ رہی ہے۔ پجاری ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں اور عجیب افراتفری کا عالم ہے۔ اس تصویر کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ بت پرست شکل و صورت اور وضع قطع میں بدھ مذہب کے بھکشوؤں سے زیادہ ملتے جلتے ہیں! اسی طرح زرتشتی مجاوروں کو برہمنوں کے لباس میں دکھایا ہے جو دھوتی اور دوپٹہ پہنے ہوئے ہیں اور جن کے گلے میں مالا پڑی ہے۔!

یہاں اس بات کے اعادے کی ضرورت نہیں کہ اکبر مصوری کے تیموری اسکول کا بانی تھا۔ اس نے مصوروں کے لئے ایک کارخانہ قائم کیا جہاں ایک سو سے زیادہ مصور عبد الصمد اور میر سید علی تبریزی جیسے باکمال مصوروں کی زیر نگرانی کام کرتے تھے۔ اس دور میں قلمی کتابوں کو تصاویر سے مزین و آراستہ کرنے کا رواج عام تھا چنانچہ اس کارخانے میں مختلف کتابوں کے متعدد مصور نسخے تیار کئے گئے۔ ان نادر نمونوں میں سے اکثر آج دنیا کے مختلف کتاب خانوں میں محفوظ بھی ہیں۔ مثلاً حمزہ نامہ، بابر نامہ (برٹش میوزیم) تیمور نامہ (اورینٹل لائبریری بانکی پور پٹنہ) رزم نامہ (جے پور لائبریری) انوار سہیلی (اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز لندن) لیلیٰ مجنوں (انڈیا آفس لائبریری) بہارستان جامی (بوڈلین لائبریری آکسفورڈ) خمسۂ نظامی (پیرس)، بابر نامہ (ماسکو)۔

ان کتابوں کی تصاویر کا باقاعدہ تفصیلی مطالعہ کرنے کے لئے ان کو عصری ترتیب کے لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس ترتیب میں داراب نامہ اور بابر نامہ (برٹش میوزیم) پہلے شمار ہوتے ہیں جو اکبر کے ابتدائی عہد میں غالباً ۱۵۸۹ء میں تیار ہوئے۔ جہاں تک ان تصاویر کی فنی حیثیت کا تعلق ہے یہ ابھی تکمیل و ترقی کے ابتدائی مراحل میں نظر آتی ہیں اور گو بھیم، سور، مسکین، نینھا اور بساوان جیسے باکمال مصور ان کتابوں کی تیاری میں شریک تھے لیکن مصوروں کی انفرادیت تصاویر میں نمایاں نہ ہو سکی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مصوروں نے پوری آزادی سے اپنے فکر و تخیل کو تصویر بنانے میں استعمال کیا۔ بہر حال، دوسرا حصہ رزم نامہ اور تیمور نامہ پر مشتمل ہے جو نسبتاً بعد کے عہد میں (غالباً ۱۵۹۵ء) یا اس کے لگ بھگ تیار ہوئیں۔ رزم نامہ کی تزئین کا کام خاص طور پر تین مصوروں دسونت، بساوان اور لال کے سپرد ہوا تھا لیکن انھوں نے دوسرے کم درجے کے مصوروں کو بھی اس کام میں شریک کر لیا یہی سبب ہے کہ ان تصاویر میں بہت کم تصاویر انفرادی کوشش کا نتیجہ ہیں۔ یہی حال تیمور نامہ کا بھی ہے۔ بایں ہمہ فنی اعتبار سے یہ مجموعہ پہلے مجموعے سے نسبتاً بہتر ہے جس میں تناسب ترتیب اور یکسانیت کے عناصر نمایاں ہیں۔ تیسرا حصہ بہارستان اور خمسۂ نظامی پر مشتمل ہے ان دو کتابوں کی تیاری میں اکبری دربار کے سولہ باکمال، مصوروں نے حصہ لیا اور اس مجموعہ کی بیشتر تصاویر انفرادی کوشش کا نتیجہ ہیں یعنی مکمل تصویر ایک ہی مصور کے قلم کا نتیجہ ہے خاص طور پر اکبری دربار کے پانچ مایۂ ناز مصوروں مسکین، مادھو، مکند، بساوان اور لال نے پورے پورے صفحات کی تصاویر تیار کی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان دو کتابوں میں تزئین اور مختصر تصویر کشی (ILLUMINATION AND MINIATURE) کے ہنر تکمیل و عروج پر پہنچے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان تصاویر میں بساوان کی تصویر فن مصوری کا بے مثال نمونہ ہے۔

اکبری عہد کے مصوروں کو شوخ رنگ زیادہ مرغوب تھے، ظاہر ہے کہ یہ اثر ایران کا تھا چنانچہ گہرا نیلا خاص طور سے لاجوردی رنگ نیل زنگار شنگرف، پیوڑی اس دور میں استعمال ہوتے تھے۔ مرکب رنگوں کا استعمال اس دور میں عام نہیں تھا۔

جہاں تک قدرتی مناظر کی عکاسی کا تعلق ہے، ان مصوروں نے اس موضوع پر زیادہ توجہ نہ دی۔ مثلاً انھوں نے درختوں کو بالکل سیدھے تنوں کی حالت میں دکھایا ہے، پتیاں اور شاخیں نیلے پس منظر پر بنائی ہیں، ایرانی انداز میں درختوں کو ہوا میں ہلتا بھی دکھایا ہے۔ درختوں کے بعد پہاڑ ان تصاویر میں نمایاں ہیں، یہاں بھی ایرانی اثر ظاہر ہے۔ چنانچہ بعض جگہ تو یہ بالکل لق و دق پہاڑ ہیں اور سبزے کا کہیں نام و نشان نہیں نظر آتا۔ لیکن بعض جگہ ان کے ساتھ درخت بھی ہیں۔ ان کے اوپر بادل ہیں جنھیں عام طور سے نیلے رنگ سے نمایاں کیا گیا ہے۔

نسائی چہروں کو اس دور میں یا تو تین چوتھائی نمایاں کیا گیا ہے یا یک رخی چہرہ (PROFILE) رکھا ہے۔ صنف نازک کی تصویروں میں نہ صرف لباس و آرائش بلکہ ناک نقشہ اور رنگ، روپ سب کچھ ہندوستانی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ انسانی شبیہ کی عکاسی میں اس دور کے

مصوروں نے تناسب کا خیال کم رکھا ہے۔ مگر یہ خامی ابتدائی عہد میں ہے جو رفتہ رفتہ دور ہوتی گئی اور ہندوستانی اثر نمایاں ہوتا گیا ہے۔ مثلاً بعد کی تصویروں میں آنکھیں بادامی، ناک ستواں، لب باریک، کمر نازک اور سینہ نمایاں نظر آتا ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا اکبری دور میں سیکڑوں مصور تھے جن کے نام مختلف جگھوں پر ملتے ہیں۔ لیکن باقی تفصیلات مفقود ہیں۔ ابوالفضل نے "آئینِ اکبری" میں اس دور کے اہم ترین مصوروں کی ایک سرسری سی فہرست دی ہے اس کے علاوہ ان کے سوانحِ حیات اور دوسرے کارنامے معلوم نہیں۔ ان سارے مصوروں میں ایک مصور عبدالصمد استثنا کی حیثیت رکھتا ہے جس کے حالات شروع سے آخر تک محفوظ ہیں۔ یہ مایۂ ناز مصور ہمایوں کے ساتھ ایران سے ہندوستان آیا بادشاہ اس کی فنی قابلیت کا بڑا معترف تھا اور اسی اعتراف میں اس نے اسے "شیریں قلم" کا خطاب بھی دیا تھا۔ اکبر کے عہد میں اسے مزید منصب و جاہ عطا ہوا۔ اور چار صدی افسر کا معزز عہدہ ملا کہ وہ اس کا استاد تھا اور کابل میں اس سے طرح (ڈرائنگ) سیکھی تھی۔ پھر عبدالصمد کی مشاقی اور مہارت کا بھی جواب نہ تھا وہ شبیہ سازی (PORTRAITURE) خاص طور خد و خال (FEATURES) اور جذبات کی عکاسی میں لاثانی تھا۔ عبدالصمد کا شاگردِ رشید دسونت تھا جو استاد کے بعد اپنے فن کا ماہر تھا عبدالصمد کی فنی قابلیت کا نتیجہ تھا کہ ۱۵۷۷ء میں اسے شاہی ٹکسال کا مہتمم بھی مقرر کیا گیا۔ آخر عمر میں وہ ملتان کے صوبے کا "دیوان" یعنی ریونیو کمشنر بھی بنایا گیا۔ اس کا لڑکا اشرف، جہانگیر کے عہد میں امیرالامرا کے ممتاز عہدے پر فائز نظر آتا ہے۔

عبدالصمد کا دوسرا ساتھی مصور میر سید علی تبریزی تھا لیکن اسے یہ عروج و رتبہ حاصل نہ ہو سکا۔ ان کے علاوہ ایرانی اور ترکستانی مصوروں میں فرخ بیگ، خسرو قلی، جمشید اور مسکین تھے جنھوں نے اپنے شاہکاروں سے شاہی کتاب خانے کی کتابوں کو ارفع و اعلیٰ نمونہ بنانے میں سعی کی۔

یہ وہ مسلمان مصور تھے جو ایران و ترکستان جیسے ملکوں سے دربارِ اکبری میں آ کر جمع ہو گئے تھے۔ مصوری کے قبولِ عام سے دیسی اور مقامی مصوروں نے بھی ترقی کی اور انھیں بھی بلا لحاظ مذہب و ملت دربارِ شاہی میں جگہ ملی جو سلاطینِ تیموریہ کی اور مسلمان استادانِ فن کی عالی ظرفی اور رواداری کی ایک اور مثال ہے۔ ان ہندو مصوروں میں دسونت بڑا ماہر فن کار تھا۔ ادھیڑ عمر میں دماغی عارضہ میں مبتلا ہو گیا تھا چنانچہ ۱۵۸۴ء میں ایک روز تلوار سے خود کو زخمی کر لیا۔ زخم اتنے گہرے تھے کہ ان سے جانبر نہ ہو سکا۔ بہت سی تصاویر اس سے یادگار ہیں خصوصاً رزم نامہ میں تقریباً ۲۴ تصاویر پر اس کا نام لکھا ہے۔

دسونت کے علاوہ دو اور مصور بساون اور لال بھی قابلِ ذکر ہیں ان کو بھی ابوالفضل کی اہم فہرست میں شامل ہونے کا فخر حاصل ہے جس نے ان دونوں کے فن کی بڑی تعریف کی ہے۔ خاص طور سے مؤخر الذکر مصور مختصر تصویر کشی (MINIATURE PAINTING) میں مہارت رکھتا تھا۔ رزم نامے میں اس کی ۲۹ تصاویر ملتی ہیں۔

اکبری دور کے ان مصوروں اور ان کے کارناموں پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مختلف نسلوں اور قوموں کے یہ مصور، دور و دراز ملکوں سے آ کر بادشاہ کے دربار میں جمع ہو گئے تھے۔ ان کی روایات، معاشرت، طور طریقے اور فنی مہارت سب کچھ مختلف تھا مگر اکبر کی فراست نے نہ صرف ان سب کو ایک جگہ رکھا بلکہ ان کے فن کے مختلف عناصر و اجزا کو اس طرح ترتیب دیا کہ ایک نئے طرز و اسلوب کا آغاز ہو گیا۔

جہانگیر کے عہد میں مصوری عروج و ترقی کے منازل کی طرف تیزی سے گامزن نظر آتی ہے جہانگیر کا جمالیاتی ذوق اس ترقی کا سبب تھا۔ وہ فنونِ لطیفہ کا دلدادہ تھا اور مصوری کی جمالیاتی قدروں سے اسے خاص طور سے لگاؤ تھا۔ اس نے اپنے ذوقِ لطیف کی تسکین کے لئے مصوروں کی سرپرستی کی اور انھیں ترقی کرنے کا موقع دیا۔ چنانچہ اس دور میں مصوری کے لاتعداد شاہکار نمونے تیار ہوئے اور مستقل و مسلسل مشق سے نفاست پیدا ہونے لگی۔ اب خارجی (ایرانی) اور دیسی (ہندوستانی) مصوری کی بلا امتیاز تقلید کا دور ختم ہوا اور تیموری مصوری نے مستقل رنگ و اسلوب اختیار کیا۔ اس اسلوب میں دونوں ملکوں کی مصوری کے محاسن شامل تھے۔ جن پر

مغربی مصوری کے اثر و نفوذ نے اس دو آتشہ کو سہ آتشہ بنا دیا تھا۔

اس دور میں کتابوں کی آرایش و تزئین (ILLUMINATION) اور مختصر تصویر کشی (MINIATURE PAINTING) گو وہ قبول عام حاصل نہ رہا۔ اور بادشاہ، شاہزادوں اور امرا و دربار کی شبیہوں (PORTRAITS) اور دربار، حرم، مناظر قدرت اور جیتی جاگتی دنیا کی تصویروں نے اس کی جگہ لے لی۔ بات یہ ہے کہ جہانگیر کا تصور زندگی اکبر سے مختلف تھا وہ رنگینیٔ حیات کا زیادہ قائل تھا اور زندگی کی ہماہمی اور رنگینیوں سے پوری طرح لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ چنانچہ گلگشت چمن، سیر باغ و راغ، نالۂ بلبل، جام و صراحی اور نرگس و محبوب میں جو دلکشی اسے نظر آتی تھی وہ بے جان کتابی تصویروں میں کہاں مل سکتی تھی۔ یہی سبب ہے کہ اس دور کی ہر شے میں جس کا تعلق جہانگیر کی ذات سے ہے، ایک رنگینی، ایک حسن اور ایک نفاست جلوہ گر ہے۔ ظاہر ہے کہ حسن پرست بادشاہ کا مصور ان جزئیات سے بے خبر نہیں رہ سکتا تھا۔ بادشاہ کے ان رجحانات کی وجہ سے مصور کا دائرہ کار وسیع ہو گیا اور وہ تخیلی اور مافوق الفطرت چیزوں کی عکاسی کی بجائے جیتی جاگتی دنیا کی نقاشی کرنے لگا۔

شبیہ سازی (PORTRAITURE) کے بعد جہانگیری عہد کی مصوری کا دوسرا بڑا کارنامہ پرندوں اور جانوروں کی عکاسی ہے جہانگیر کو پرندوں کی ہیئت و ماہیت جاننے کا بڑا شوق تھا۔ اس نے اپنی تزک میں جگہ جگہ پرندوں اور حیوانات کا ذکر بڑے انہماک سے کیا ہے اور مصوروں سے ان کی تصاویر بنوائی ہیں۔ اس نوع کی تصاویر بنانے میں استاد منصور کو کمال حاصل تھا اور اسی وجہ سے جہانگیر نے اس کو "نادر القلم" کا خطاب دیا تھا۔

اس دور میں جہاں مصور کا دائرہ کار وسیع ہو رہا تھا وہاں فنی تکمیل کے دوسرے مراحل بھی آہستہ آہستہ طے ہو رہے تھے، چنانچہ مصوری کے جو نمونے اس دور میں تیار ہوئے وہ اعلیٰ ترین نمونے ہیں اور ان میں صفائی، پاکیزگی اور تناسب کا اعلیٰ ترین معیار قائم رکھا گیا ہے۔ مثلاً انسانی شبیہ کی عکاسی میں بڑا حقیقت آمیز رویہ اختیار کیا گیا ہے۔ اکبری اسکول کے مصور جو ہرات اسکول سے بہت زیادہ متاثر تھے، شبیہ سازی میں تناسب کا خیال نہیں رکھتے تھے لیکن اس دور کے ماہر فن کاروں نے اس روایت کا پورا لحاظ رکھا ہے۔ اس کے علاوہ اکبری عہد کی یہ روایت کہ انسانی چہروں کے تین چوتھائی حصوں کی نمائش کی جائے، اس دور میں قائم رہی لیکن یک رخی چہرے (PROFILE) زیادہ بنائے گئے بلکہ بعض تصاویر میں ابروؤں کے آخری حصے اور شقیقہ تک کو نمایاں کیا گیا ہے۔

مناظر قدرت کی عکاسی بھی اس دور کے مصور کا محبوب مشغلہ تھی پہاڑوں کی بلند چوٹیاں، اور لہراتے ہوئے سرسبز و شاداب درخت عام طور سے تصاویر کے پس منظر میں بنائے گئے ہیں۔ جہانگیری دور کے آخری حصے میں تو مصور نے مناظر قدرت کی عکاسی میں بڑی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ ساری جزئیات کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ تصویر اصل سے ہو بہو مل جاتی ہے۔ اور ہر حصہ اور ہر جزو بالکل نمایاں۔ علیحدہ علیحدہ نظر آتا ہے۔ یہ بات بڑی حد تک مغربی مصوری کے اثر کا بھی نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن کنول کی موجودگی ہندی اثر کی غمازی کرتی ہے۔ رنگوں کے استعمال میں بھی اس دور کے مصور نے مہارت کا ثبوت دیا۔ مختلف رنگوں کی آمیزش سے نئے نئے رنگ بنائے گئے اور ان رنگوں سے تصویر کی دلکشی میں اضافہ کیا گیا۔

جہانگیری عہد میں مصوروں کی اس باقاعدہ جماعت بندی کا سراغ نہیں ملتا جس کی داغ بیل اکبر نے ڈالی تھی۔ اس دور کے مصوروں کی ایسی کوئی فہرست بھی نہیں ملتی جیسی کہ ابوالفضل ہمیں دے گیا ہے لیکن تزک جہانگیری اور تاریخ و ادب کے دوسرے ماخذوں سے ان فنکاروں کے بارے میں کچھ معلومات ضرور ملتی ہیں۔ جہانگیر جس مصور کے کام سے خوش ہوا ہے، اس نے اس کا ذکر تزک میں ضرور کیا ہے۔ گویا اس دور کے تقریباً تمام عظیم فنکاروں کا تذکرہ تزک میں موجود ہے اس لحاظ سے جہانگیر کی تزک نے وہی کام کیا ہے جو ابوالفضل کی آئین اکبری نے کیا تھا۔ بہرحال، تزک کے مطالعہ سے جن مصوروں کا پتہ چلا ہے وہ بشن داس، فرخ بیگ، ابوالحسن اور منصور ہیں۔ یہ اپنے دور کے مایۂ ناز فنکار تھے جن کو جہانگیر جیسے باذوق سرپرست کی تائید و خوشنودی حاصل تھی۔ ان میں فرخ بیگ کو دربار جہانگیری میں وہی مقام حاصل تھا جو اکبر کے عہد میں میر سید علی اور عبدالصمد کو حاصل تھا۔ ان کے علاوہ وسط ایشیا کے دو باکمال مصور، محمد نادر اور محمد مراد سمرقندی بھی تھے جو سیاہی قلم

میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔

جہانگیر کا دستور تھا کہ وہ سفر میں بھی مصوروں کی ایک جماعت اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ یہ مصور موقع پر ہی ان مقامات کی تصاویر بنا لیتے جن کو بادشاہ نظر تحسین سے دیکھتا۔ بعد میں یہ تصویریں بادشاہ کے ملاحظہ کے لئے پیش ہوتیں اور پھر یا تو تزک کی تزئین کا کام دیتیں یا مرقع شاہی کی زینت بنتیں۔ گویا اس طرح ایک طرح کی قلمی دستاویز سی بنتی چلی جاتی۔ علاوہ ازیں درباری مصوروں کی نگارشات سے ہی بادشاہ کے ذوق مصوری کی تسکین نہ ہوتی تھی بلکہ وہ دنیا کے دوسرے حصوں کے مصوروں کی نگارشات بھی جمع کرتا رہتا تھا۔ ایران، ترکستان اور مغربی ملکوں سے بادشاہ کے لئے تصاویر خریدی جاتی تھیں اور ذاتی شاہی کتاب خانے میں یہ نوادرات محفوظ رہتے۔

جہانگیر کی وفات ۱۶۲۷ء کے بعد شاہجہاں تخت کا وارث ہوا، ایام شہزادگی میں اسے بھی مصوری سے بڑی دلچسپی تھی لیکن بعد میں فن تعمیر ہی اس کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ بایں ہمہ اس عہد میں بھی مصوری نے ترقی کی اور تکمیل کے مختلف مراحل طے کئے۔ اس دور میں مصوری کے موقلم نے چار قسموں کی تصویروں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور انھیں قبول عام حاصل ہوا:

۱۔ انفرادی شبیہ سازی (PORTRAITS)، شاہی خاندان کے افراد درباری وزراء و امراء اور دوسری برگزیدہ ہستیوں کی لاتعداد تصاویر پوری صحت و صفائی سے تیار ہوئیں اور ان کو اصل سے قریب تر لانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ ان تصاویر میں شاہزادوں اور امراء دربار کو ان کے مکلف و زرق برق لباس اور شمشیر و نیزہ اور زرہ بکتر میں مسلح، اور چاق و چوبند دکھایا ہے، گویا دربار شاہی میں بصد ادب کھڑے شاہی حکم کے منتظر ہیں۔ ان تصاویر میں جزئیات کو بڑی مشاقی سے نمایاں کیا گیا ہے جس سے فنی تکمیل و مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔

۲۔ صنف نازک کی تصاویر بھی اس دور کی مصوری کا شاہکار ہیں۔ حرم شاہی کی اجتماعی تصویروں کے ساتھ ساتھ انفرادی تصویریں بھی پوری تفصیل اور جزئیات کے ساتھ بنائی گئیں جو حسن و جمال اور زیب و زینت کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان شبیہوں کی تاریخی حیثیت کے بارے میں تو شک و شبہ کیا جا سکتا ہے کیوں کہ مصور کو تیموری حرم میں بار عام کبھی بھی حاصل نہیں رہا پھر اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ان مصوروں میں سے کسی کو ان بیگمات کی شبیہ بنانے پر مامور کیا گیا ہو۔ اس لئے یہ کہنا کہ یہ شبیہ نورجہاں کی ہے اور یہ جہاں آرا بیگم کی، صحیح نہیں۔ البتہ ان تصویروں میں فنی کمال اور تناسب نیز رنگوں کی ترتیب دوسری تصاویر سے زیادہ ہے اور اس سے فنی مشاقی کا ثبوت ملتا ہے۔

۳۔ درویشوں اور فقرا اور قلندروں کی تصویریں۔ عرفا و فقرا کی محفلوں میں کبھی کبھی بادشاہ بھی مع اپنے درباریوں اور شاہزادوں کے جاتا تھا۔ چنانچہ بعض تصاویر میں بادشاہ اور شاہزادوں اور درباریوں کو ان اولیاء اللہ کے دربار میں بیٹھے دکھایا گیا ہے۔ ان تصاویر میں اصلیت و حقیقت قدم قدم پر نمایاں ہے۔ فقرا کا استغنا اور بے نیازی اور بادشاہ کا ان کے لئے اظہار احترام و عقیدت ان تصویروں کی جان ہے۔

۴۔ رات کے وقت شکار کی منظر کشی بھی اس دور کی خصوصیت ہے۔ شاہجہاں کا یہ محبوب مشغلہ تھا۔ یہاں بھی فن کار کی مہارت پوری طرح جلوہ گر ہے۔

ان تمام تصاویر میں فنی تکمیل کے شواہد قدم قدم پر ملتے ہیں۔ مثلاً اس دور کی تصویروں میں رنگوں کا استعمال اور زیادہ نفاست سے کیا گیا کہ کاغذ کی سطح شیشے جیسی گلیز بن گئی ہے۔ گہرے اور شوخ رنگوں کی جگہ ہلکے سادہ رنگ پسند کئے گئے۔ جہانگیر کے دور میں مختلف رنگوں کی آمیزش سے نئے رنگ بنائے جاتے تھے ان رنگوں کو استعمال کرنے کے بعد تصویر کی سطح کو ہموار کرنے اور یکساں بنانے کے لئے نقطہ کاری (STIPPLING) کی ضرورت ہوتی تھی جو فن کاری کے اعلیٰ ترین اصولوں کے منافی ہے، مگر اس دور میں سادہ اور مجرد رنگ استعمال ہوئے جس سے نقطہ کاری کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔

مصوری کے اس قدر قبول عام نے مصور کے لئے دقیقہ رسی اور تکمیل فن کے بہت مواقع پیدا کئے۔ چنانچہ مستقل مشق سے اس دور میں خاکہ کاری (DRAUGHTSMANSHIP) بہت زیادہ پُرکار ہو گئی۔ لائنوں کا باقاعدہ مطالعہ کیا گیا اور ان میں

اس قدر نزاکت اور باریکی پیدا کی گئی کہ ان کو دیکھنے کے لئے آتشی شیشے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ انسانی شبیہوں میں جسم کے ہر حصے کو پوری طرح نمایاں کیا گیا اور پوری تفصیل پیش کی گئی چنانچہ اس دور کی تصویروں میں جسم کا ہر بال اور مسام تک نمایاں ہے۔ یہ خصوصیت اس دور کے مصور کا کارنامہ ہے۔ پھر شبیہوں کے چہروں میں منگولی اثر جو اس سے پہلے نظر آتا تھا، اب بالکل مفقود ہو گیا اور خط و خال مصور کے اپنے گرد و پیش کی دنیا سے ملنے لگے۔

تصاویر کی جدول کشی اور حاشیہ نگاری جسے "تحریر" کہتے تھے اس دور کی مصوری کا امتیاز ہے ان حاشیوں کو مختلف چھوٹی چھوٹی تصاویر، پھول پنکھڑیوں اور مختلف پرندوں سے مزین کیا گیا ہے یہ مختلف تصاویر مرقع کی زینت ہوتی تھیں۔

شاہجہاں کے درباری مصوروں میں استاد فقیر اللہ خاں ممتاز مصور تھا، دوسرا مصور ہاشم تھا جس کے فن کی تعریف سارے فن شناسوں نے کی ہے یہ نامی گرامی مصور اور چند دوسرے جن کے حالات معلوم نہیں، دربار شاہی سے منسلک تھے۔ باقی تمام مصور دوسرے امراء و وزراء اور شائقین فن کے درباروں سے متوسل تھے۔ یہ روایت اس سے پہلے ادوار میں بھی ملتی ہے۔ لیکن شاہجہاں کے دور میں تو تقریباً تمام مصور انھیں امراء کے دربار میں موجود تھے۔ اور بقول برنیر اس عہد میں کہ فن تعمیر کا زریں دور ہے، اگر یہ امراء مصوری جیسے فن لطیف کی کما حقہٗ سرپرستی نہ کرتے تو یہ فن بہت پہلے کس مپرسی اور زوال کا شکار ہو جاتا۔ زوال سلطنت کے ساتھ مصوروں کی سرپرستی میں وہ شاہانہ انداز تو نہ رہا۔ لیکن مصور مطمئن ضرور تھا۔ اب مصور کو وسیع اور آزاد ماحول مل گیا تھا جس سے اس کے فن میں ہمہ گیری اور تنوع پیدا ہوا۔ دربار شاہی میں تو بادشاہ کا رجحان اور اس کا نکتہ رس ذہن ہی مصور کے رہنما تھے لیکن اب عوام کی پسند کا بھی دخل ہونے لگا اور فن میں عمومیت کا رجحان بڑھنے لگا۔ مصوروں نے عوام کی پسندیدہ تصویریں بنا کر فروخت کیں اور وہ فن جو اب تک شاہانہ دربار اور امراء کی محفلوں کی ہی زینت تھا۔ عوامی پسند اور مصور کی حقیقت پسندی کا آئینہ دار بن گیا۔

اسی دور میں ایک اور اہم روایت کا آغاز ہوا۔ ان ماہر مصوروں نے دربار سے الگ ہو کر باقاعدہ اسٹوڈیو بنائے جہاں نہ صرف تصویریں بنائی جاتی تھیں بلکہ نئے مصوروں کی تربیت کا کام بھی ہوتا تھا۔ ان اسٹوڈیوز نے سیکڑوں مصور پیدا کئے جنھوں نے تیموری اسکول کی مصوری کی روایات کو زندہ رکھا۔

زوال سلطنت کے بعد امراء دربار نے بھی مصوروں سے باقاعدہ انہماک اور دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ لے دے کر عوام تھے جو مصوری کے فن کو زندہ رکھنے میں معاون و مددگار ہوتے۔ اور انھیں کی قدردانی سے یہ فن زندہ رہا۔ لیکن ایک خامی یہ پیدا ہو گئی کہ کوئی خاص معیار نہ ہونے کی وجہ سے تیزروی میں تصاویر بنائی گئیں یہی سبب ہے کہ اس دور میں عمدہ تصاویر خال خال ہی نظر آتی ہیں۔

فرخ سیر اور بعد میں آنے والے دوسرے بادشاہوں کے عہد میں مصوروں کی پھر ضرورت ہوئی۔ کیونکہ ان میں سے اکثر نقاشی سے لگاؤ رکھتے تھے، مصوروں کو دربار میں پھر رسوخ حاصل ہونا شروع ہوا اور تصویریں بننے لگیں۔ چنانچہ اس دور کی بنائی ہوئی بہت سی تصاویر مختلف مرقعوں کی زینت ہیں جن میں گذشتہ زمانوں کی شان و شوکت، نفاست و شائستگی اور ذوقِ سلیم کے کچھ آثار بھی جلوہ طراز نظر آتے ہیں لیکن یہ مختصر دور بھی جلد ہی ختم ہو گیا اور سلطنت کے زوال نے مصوری کو پھر پنپنے کا موقع نہ دیا۔ یہ آخری بہار تھی، جو اس دور کے مصور نے دیکھی، پھر اس کے بعد خزاں کا مستقل دور شروع ہو گیا اور مصوری کا یہ دور اپنی شاندار روایات کے ساتھ سن ستاون پر آکر ختم ہو گیا۔

★

رپورتاژ:

چاٹگام کا پہاڑی علاقہ

اگر مغربی پاکستان کی گل پوش وادیاں جیسے گلگت، آزاد کشمیر اور کاغان ہمارے لئے جنت نگاہ ہیں تو مشرقی پاکستان کی سرزمین آب رواں اور اس کے پہاڑی علاقوں کی دلکشی و نفاست بھی اپنی جگہ کچھ کم جاذب نظر نہیں۔ کوہستان چاٹگام کا علاقہ اپنی قدرتی خوبصورتیوں کے لئے دور دور مشہور ہے۔ سیاحوں کے لئے یہاں وہ سب کچھ ہے جسے وہ دیکھنے کے آرزومند رہتے ہیں۔ کوہستانی علاقہ کی سادگی یہاں کی مترنم ندیاں یہاں کے رنگا رنگ لباس، قبائلی لوگوں کے رسم و رواج اور چائے کے باغات کے خوشنما قطعے اور ان کی بھینی بھینی فضا انسان کو "سحرِ بنگالہ" سے لفظاً و معناً آشنا کر دیتے ہیں۔ چاٹگام کے پہاڑی علاقے، ضلع چاٹگام کے دھان کے کھیتوں کا سلسلہ اور یہاں کی سرزمین کی رومانی کیفیت ایک جنت ارضی سے کم نہیں۔ آئیے میرے ساتھ ذرا اس پاک سرزمین پر قدم رکھئے۔ مٹی کو دیکھئے۔ کہیں تو گلاب کی طرح دمکتی سرخ ہے تو کہیں اس کا رنگ گہرا مٹیالا ہے۔ یہ عطریت کہاں سے آگئی۔ یہ آپ نے غور کیا۔ یہ یہاں کے باغ و راغ کی قدرتی باس ہے، دھرتی کی سوندھی سوندھی باس، نباتات کی فراوانی، باغوں کی قطاریں، ان سب نے مل کر فضا کو معطر کر رکھا ہے اور حواس اس کے سحر سے متاثر ہو جاتے ہیں۔

ان کی وضع قطع سے تو آپ نے اندازہ کر ہی لیا ہوگا کہ یہ یہاں کے پہاڑی لوگ ہیں۔ مغربی پاکستان کے گلگتی اور کافرستانی وغیرہ بھی اکثر دیکھے ہوں گے۔ اب اپنے اس حصۂ ملک کے پہاڑیوں کو بھی دیکھیں۔ وہی سادگی و پرکاری، وہی خصوصیات مزاج صرف آب و ہوا اور ماحول و نسل کے امتزاج کا قدرتی فرق تو بیشک ہے ورنہ ان کو ہم کسی طرح اپنے سے جدا نہیں سمجھ سکتے۔ آئیے ذرا ان کی مہمان نوازی کا بھی حال دیکھیں۔ سنا تو یہی ہے کہ مغربی پاکستان کے سرحدی اور قبائلی دوستوں کی طرح ان لوگوں کی بھی مہمان نوازی اور حسنِ سلوک کی داستانیں دور دور مشہور ہیں۔ یہ تو آپ نے دیکھ لیا کہ جدید تمدن کی ملمع کاری نے ابھی ان کے لباس، رہن سہن، گھر مکانات کسی چیز کو بھی ملوث نہیں کیا ہے مگر ان کی سادگی اور روایتی طرز زندگی میں بھی ایک البیلا پن ہے۔ معصومیت ہے۔ سچائی ہے اور ان کے خط و خال بھی یہاں کے دوسرے لوگوں کے خط و خال سے کچھ جدا ہیں۔ اس کی وجہ کچھ برمی اثرات ہیں کیونکہ برما اور اس علاقہ کے ڈانڈے ملے ہوئے ہیں۔

اس وقت میں آپ کو جس سڑک پہ لئے جا رہا ہوں یہ ۱۹۴۸ء میں پاکستان بننے کے بعد بنائی گئی تھی۔ یہ چاٹگام سے ۴۰ میل دور تک چلی گئی ہے۔ لیجئے ذرا انہیں دیکھئے۔ ان کا لباس کیا ہے بس ایک لنگوٹی ہے جسم تانبے کی طرح دمک رہا ہے۔ ان صاحب کو یہاں کے گاؤں والوں کا نمونہ سمجھئے۔ اس آب و ہوا میں ان کا یہی لباس موزوں ہے۔ ادھر ان کا کھیت ہے۔ دھان کا کھیت جو پہاڑی ڈھلان پر دور تک چلا گیا ہے۔ یہاں ابھی حال تک جنگل ہی جنگل تھا۔ اسے کاٹ کاٹ کر ڈھلان صاف کی گئی ہے اور دھان بو دیا گیا ہے۔ آپ نے ابھی مجھ سے کیا پوچھا تھا؟ ہاں! یاد آیا۔ یہ جو لوہے کا آنکڑا سا ان کے ہاتھ میں ہے یہ ان کا بہت بڑا اوزار ہے اور غالباً یہی ایک اوزار ہے۔ اسے یہ لوگ "داؤ" کہتے ہیں۔ اسی سے زمین کھودنا اور فصلیں کاٹنا، سب کام لیا جاتا ہے۔ دھان تو خیر بہت ہوتا ہے مجھے تو سرسوں اور لگمیا بھی بویا ہوا نظر آتا ہے۔ جس چیز کی فصل آئی وہ تیار ہوتی چلی گئی۔ مغربی پاکستان کی زمینوں کی طرح سے یہاں بھی زمین بڑی زرخیز ہے۔ روئی بھی یہاں پیدا ہوتی ہے۔ زمین میں پہاڑی ذرے ملے ہوئے ہیں اس لئے پیداوار کو ہر طرح کی قوت بخش کیمیاوی غذا ملتی رہتی ہے۔

یہ ان صاحب کی بیوی ہیں۔ دوسری خاتون ان کی یا تو بھانجی ہیں یا بھتیجی۔ ان خواتین کا لباس ٹھاٹ صاف ستھرا رنگین اور نفیس ہے۔ اب ذرا ان بچوں کے چہروں کو دیکھئے۔ یہ کالی کالی دھاریاں کیوں بنائی ہیں، بھوتوں کی بد نظر سے بچانے کے لئے اور یہ کتے بلی کی سی آوازیں بھی بھوتوں کو بھگانے کے لئے نکالتے رہتے ہیں۔

پیاسے کو پانی پلانا جس طرح مغربی پاکستان میں عام کارِ ثواب سمجھا جاتا ہے یہاں کے کوہستانی باشندے بھی اپنے عقیدے کے مطابق پانی پلانا بہت بڑی نیکی سمجھتے ہیں۔ اس غرض سے یہ لوگ اپنی عورتوں سے متوقع رہتے ہیں کہ وہ پانی کا گھڑا بھر کر راہ میں لیکر چلیں گی اور اگر کوئی راہگیر پانی مانگ بیٹھا تو اسے پانی پلائیں گی۔ گھرداری کی مصروفیتوں کے علاوہ یہاں کی پہاڑنیں پانی کے گھڑے بھی بھر کر کھیتوں کی طرف جاتی رہتی ہیں۔ جس وقت بچے گاؤں میں واپس آتے ہیں تو سب سے پہلے مائیں ان کے چہروں سے کلونس کی دھاریاں دور کرتی ہیں گویا کہ نظرِ بد کا خوف ختم ہوگیا۔

وہ سامنے کیا عمارت ہے۔؟ غالباً تھانہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ کچھ پہرہ چوکی دکھائی دے رہی ہے۔ پاکستان کا جھنڈا اب تو صاف نظر آنے لگا۔ جی ہاں۔ یہ تھانہ انگریزی عملداری میں بنا تھا۔ نئے زمانہ کی شہری ضرورتوں کا خیال کرتے ہوئے پاکستانی سرکار نے تمام علاقے میں تھانے قائم کردئے ہیں۔ ویسے امن و امان ہی رہتا ہے اور جرائم کی بھی کوئی کثرت نہیں ہے کیونکہ یہ لوگ نہ شری طبیعت ہیں، نہ جرائم پیشہ۔

ان لوگوں کے کھپریل والے گھر کیسے صاف ستھرے نظر آرہے ہیں۔ آیئے کسی راہگیر سے پوچھیں یہاں کے لوگ گھر کو کیا بولتے ہیں۔ باقی بنگال میں تو "باڑی" بولا جاتا ہے ـــــ کیا بتایا انہوں نے ـــــ "باشا"۔ یوں کہئے کو یہ جھونپڑی سی ہے مگر یہ "باڑی" یا "باشا" اپنی جگہ بہت عمدہ گھر ہے۔ یہ مارکیٹ ابھی نئی ہے۔ پہلے یہاں گھنے جنگل ہوتے تھے۔ زرا زرا سی ضرورتوں کے لئے ان کوہستانی باشندوں کو دور دور کی بستیوں میں جانا پڑتا تھا مگر اب پختہ سڑکیں بن جانے سے مال آنے جانے لگا ہے اس لئے سب ضروری چیزیں اس مقامی مارکیٹ میں مہیا ہو جاتی ہیں بازار میں یہ مجمع کیسا لگا ہوا ہے ڈھول جھانج کی برابر آواز آرہی ہے۔ آیئے آگے بڑھکر دیکھتے ہی چلیں۔ بازار میں خوب چہل پہل ہے ـــ خرید فروخت کا سلسلہ تو چل ہی رہا ہے یہ جھن جھن جھن جھن اور بھی مزا دے رہی ہے۔ یہ ناچ ہو رہا ہے۔ قبائلی مرد اور عورت مل کر ناچ گا رہے ہیں۔۔ ان کے بول آپ کچھ سمجھے۔ مجھے کچھ کچھ بنگالی آتی ہے۔ یہاں کے لوگوں کی بولی کچھ تو بنگالی ہوتی ہے اور کچھ برمی۔ یہ ناچ بھی بڑا رومان انگیز معلوم ہوتا ہے۔ مغربی پاکستان کے بھنگڑا ناچ سے کچھ کچھ ملتا جلتا ہے۔

بازار میں کیا کیا پھل ہیں۔ آیئے ان لوگوں سے کچھ خرید کر اپنے دیس کے ان پھلوں کا ذائقہ چکھیں۔ انناس تو ضرور ہی کھانے چاہئیں، پپیتے بھی بہت میٹھے اور ملائم نظر آتے ہیں یوں کراچی میں بھی پپیتا اچھا خاصا ہوتا ہے۔ مگر یہاں کی زمین میں تو مٹھاس اور رس ہی رس گھلا ہوا ہے۔ سنا ہے پپیتا اور انناس اب ڈبوں میں بند کر کے باہر بھی بھیجا جاتا ہے۔ شاید وہ دوراسی چیز کی فیکٹری نہ ہو۔ چاٹگام کے ان پہاڑی علاقوں میں کافی اور ربڑ کی پیداوار بہت اچھی ہوتی ہے۔ عمدہ قسم کے پودے باہر سے منگا کر ان لوگوں کو دیئے گئے ہیں۔ لیجئے اب موٹر سے اتر جایئے۔ اوپر چوٹی تک پہنچنا ہے۔ یہ سرکاری ریسٹ ہاؤس ہے۔ یہاں ہم بھی کچھ دیر سستائیں گے ـــ آپ ادھر کیا دیکھ رہے ہیں۔ ہاں وہ سمندر، بحیرۂ بنگال ہے، اور میری طرف نگاہ کریں تو یہ دور تک میدانی علاقہ جو چلا گیا ہے یہ چاٹگام کا ضلع ہے۔ یہ پہاڑ ایک سلسلۂ کوہ کا حصّہ ہے جسے اپچاری سلسلۂ کوہستان کہتے ہیں۔ ادھر کے اونچے اونچے پہاڑ جو ایک اونچی سیڑھی سی بناتے چلے گئے ہیں سو بالانگ کے پہاڑ کہلاتے ہیں اور برما تک۔ یونہی چلے گئے ہیں۔

اچھا صاحب، اب یہاں سے چلنا چاہیئے اور پہلے اس پل کو دیکھ لیں۔ دور سے بڑا خوشنما دکھائی دیتا ہے۔ ہرا اور سفید رنگ اس طرح پینٹ کیا گیا ہے کہ پاکستان کا جھنڈا معلوم ہو۔ یہ نبلٹ پل کہلاتا ہے۔ اس کے نیچے جو ندی بل کھاتی گذر رہی ہے، مانک چاری کہلاتی ہے۔ بارشوں کے زمانہ میں اس کی تندی و تیزی غضب کی ہوتی ہے۔ اس تمام کوہستانی علاقے کا صدر مقام رنگامتی ہے۔ واقعی یہ رنگ و نور کی بستی ہے اور اس کا یہی نام ہونا چاہیئے تھا۔ نباتات کی بڑی کثرت ہے۔ کیلا بڑا نفیس ہوتا ہے دھان بکثرت اور انناس، پپیتا، چائے، کافی، ربڑ، غرض قدرت نے اس سرزمین کو بہت کچھ دے رکھا ہے۔

یہ سامنے کوئی مندر معلوم ہوتا ہے۔ اسے شاید یہ لوگ کیانگ بولتے ہیں۔ ذرا دیکھنا، یہ پہاڑی بھینسا ہے۔ کیسا تنو مند

ہے۔ نوشانی کی پہاڑیاں نزدیک ہی تو ہیں۔ یہاں کے لوگ ان بھینسوں کو وہاں سے گھیر لاتے ہیں اور نسل کشی کے لئے کام میں لاتے ہیں۔ آزادی کے بعد سے بہت سے جنگلات کاٹے گئے ہیں تاکہ صاف شدہ زمینوں پر دھان بویا جاسکے۔ اب یہاں کی ضرورت کا پورا غلہ یہیں پیدا ہو جاتا ہے۔ اس جگہ ایک مقام کا نام جنرل محمد ایوب خاں کے نام نامی پر رکھا گیا ہے۔ یہ خراج عقیدت ہے اس زمانہ کا جب وہ پاکستان کے کمانڈر انچیف تھے۔ جنگلوں کو اب بھی صاف کیا جا رہا ہے۔ جب درخت، جو بڑے قد آور ہوتے ہیں، گرا دیئے جاتے ہیں تو ہاتھیوں سے ان درختوں کو کھنچوایا جاتا ہے۔ درختوں کے بڑے بڑے لٹھے اور شہتیر دور دور جاتے ہیں۔ چاٹگام کی بندرگاہ سے یہ کراچی کی بندرگاہ کو بھی بھیجے جاتے ہیں۔ جس طرح دریائے سندھ میں لکڑی بہادی جاتی ہے اور وہ اپنی منزلوں پر پہنچ جاتی ہے خاص کر جہلم پر۔ اسی طرح بانس اور شہتیروں کے لٹھے دریائے کرنا فلی کے دھاروں پر ڈال دیئے جاتے ہیں۔ کاسالونگ کے جنگل کی لکڑی اسی طرح آتی ہے۔ ہمارا ملک اب کرنا فلی کا کاغذ ہی برت رہا ہے۔ اس کے لئے خام مال، بانس یہیں سے مہیا ہوتا ہے

جس جنگل کے پاس ہم پانی پینے کے لئے ٹھہرے تھے یہ "کنج جناح" کہلاتا ہے۔ یہاں دیودار کے درخت بہت ہیں۔ ایک ایک درخت پانچ پانچ سو روپے بلکہ ہزار ہزار روپے تک کا ہوتا ہے۔ تھہالگنی نامی لکڑی کی دنیا میں بڑی شہرت ہے۔ قدرت کی یہ دولت بھی مشرقی پاکستان کے پاس بڑی کثرت سے ہے۔ یہاں کے جنگلات کوئی ۱۲۰۰۰ مربع میل کو گھیرے ہوئے ہیں۔ یہاں کی چائے اور ربڑ بھی بہت عمدہ ہوتے ہیں۔ اس سرزمین کی سرخ مٹی نے چائے کے رس اور بو باس کو بہت عمدہ بنا دیا ہے۔ آیئے اس ریستوران میں بیٹھ کر چٹگامی چائے کے دو گھونٹ پی کر دن بھر کی تکان دور کریں •

●

تبصرہ: "خاتون پاکستان" کا انقلاب نمبر

مدیر: شفیق بریلوی

"خاتون پاکستان"، ہمارے جدید اور قدیم نسائی ادب کا ایک خوشگوار امتزاج ہے یہ غیر ضروری روایت پرستی اور بے ڈھنگی ترقی پسندی سے مبرا ہے۔ انقلاب نمبر کے مضامین اور اس کی ترتیب و تدوین نسائی شعور اور حسن قبول کا پورا پورا ساتھ دیتی ہے جس کی انقلابی اشاریت اور ترویجی افادیت کا احترام کرنا ہی پڑتا ہے، انقلاب کے معنی اور اس کا مفہوم کیا ہے؟ انقلاب کیوں آیا؟ انقلاب سے صحیح معنوں میں قوم استفادہ کس طرح کر سکتی ہے؟۔ یہ وہ لازمی سوالات ہیں جو مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین کے ذہنوں میں بھی پیدا ہونا چاہئیں، اور "خاتون پاکستان" اپنے انقلاب نمبر میں ان تمام سوالات کا جواب اس خوبصورتی سے پیش کرتا ہے جو پاکستانی خواتین کی ذہنی سطح اور انداز فکر کے عین مطابق ہے۔ اردو ادب کے ممتاز قلم کاروں سے اس نمبر کی فہرست مزین ہے۔ ہماری رائے میں "خاتون پاکستان" کا یہ نمبر نہ صرف خواتین بلکہ مردوں کے لئے بھی خصوصی دلچسپی اور معلومات میں اضافہ کا باعث ہوگا۔ قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ: ۵/۷۰ لالہ زار، کراچی۔ (ط۔ق)

* * *

مولانا عبدالمجید سالک مرحوم بقیہ صفحہ ۱۹

پانی اوپر چڑھایا۔ پطرس ہنستے ہوئے سیڑھیاں چڑھے اور سالک صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے بولے:

"مولانا دیکھئے۔ آپ کو پانی پانی کر دیا۔"

بھلا سالک صاحب پر اتنی آسانی سے وار کیسے کیا جا سکتا تھا۔؟ وہ مسکرائے اور میری طرف دیکھتے ہوئے برجستہ بولے:

"دیکھا آپ نے، یہاں کیسے کیسے لوگ پانی بھرتے ہیں؟"

اور ان کے اس بھرپور طنز پر پطرس مرحوم نے جلدی سے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ پکڑ لئے اور بولے: "جائیے استاد خالی"

عام طور ہوتا یہ تھا کہ سالک صاحب گاؤ تکیہ کا سہارا لے کر بیٹھ جاتے اور پھر واقعات اور معلومات کا ایک دریا بہہ نکلتا۔ واقعہ سے واقعہ جڑتا چلا جاتا اور بات سے بات نکلتی۔ گفتگو کا موضوع چاہے کچھ بھی ہو، کسی ملک یا قوم کا ذکر ہو، کوئی ادبی مسئلہ ہو یا سیاست کا پہلو سامنے آجائے، میں نے دیکھا ہے کہ سالک صاحب اس روانی سے بولتے کہ سننے والا منہ دیکھتا رہ جاتا۔ ان کی گفتگو کے لئے موضوع کی پابندی نہیں ہوتی تھی، بلکہ موضوعات ان کے پابند ہوتے تھے۔ اور ان کی یادداشت تو حیرت انگیز طور پر قابل رشک تھی جب کبھی گذشتہ حالات و واقعات کی بات چل نکلتی تو وہ اس طرح سن، تاریخ، دن، اور وقت کا حوالہ دیتے چلے جاتے جیسے کوئی تحریر پڑھ رہے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ سالک صاحب ایک چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا تھے جس کے اوراق میں برصغیر پاک و ہند کی سیاسی، ادبی، علمی، صحافتی، اور مجلسی تاریخ۔ قلمبند تھی۔ افسوس کیسے کیسے لوگ تھے کہ اٹھتے چلے جا رہے ہیں۔ اور قحط الرجال کا یہ عالم ہے کہ نئی تانتی میں تو شاید کبھی بھی ایسی جامع شخصیتیں دکھائی نہ دیں گی۔

مہمان عزیز: بقیہ صفحہ ۲۹

اگلے دس دن خیریت سے گذر گئے۔ گیارہویں دن امجد خلاف معمول رات گئے گھر واپس آیا تو بیگم زیدی کو اپنا منتظر پایا۔ سل وانا ان کے پیروں کے قریب آنکھیں بند کئے بیہوش سو رہی تھی اور بیگم بڑی ہی پیار سے اس کا سر سہلا رہی تھیں۔

"آیئے آیئے امجد صاحب۔ دراصل مجھے آپ ہی کا انتظار تھا۔ آپ تشریف رکھئے۔ مجھے آپ سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔" وہ بولیں امجد آج بہت خوش تھا۔ وہ اطمینان سے بیٹھ گیا۔

"دیکھئے امجد صاحب۔ آپ کو شاید علم ہو۔ یہ بڑا گھر تنہائی میں مجھے کاٹنے کو دوڑتا۔ چوروں اچکوں کا بھی مجھے اکثر ڈر لگا رہتا۔ دراصل انہی تنہائی ہی کے خیال سے، صرف کمپنی کی خاطر اب تک میں پینگ گیسٹ رکھنے کی دردسری مول لیتی رہی ہوں۔ لیکن جب سے سل وانا آئی ہے میرے دل کو بڑا اطمینان ہے۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے بڑے پیار سے سل وانا کی کھال سہلائی۔ "تو امجد صاحب۔ اب حالات بدل گئے ہیں۔ اب مجھے گیسٹ رکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ یعنی اگر آپ ایک ہفتہ کے اندر کمرہ خالی کر دیں تو نوازش ہوگی۔ مجھے بے حد افسوس ہے۔ لیکن مجبوری ہے۔!!!"

پنکھے والے حافظ جی: بقیہ صفحہ ۴۳

پھر وہ پھر کیا ایک "عابر سبیل اور ایک عالِ کُن فی الدنیا غریباً" کو راستے کی روح افزائیوں اور دلکشائیوں سے کیا لطف حاصل ہو سکتا ہے جب تک وہ اپنے اصلی وطن کی سرزمین پر قدم نہ رکھے جہاں پھول مرجھانا نہیں جانتے اور جہاں خزاں کا نام کسی کو معلوم نہیں۔ نہ رُتیں بدلتی ہیں نہ اندھیرے اُجالے سے واسطہ رہتا ہے۔"

اتنا کہنے کے بعد حافظ جی نے یکایک پلٹ کر دیکھا اور پنکھا زور زور سے ہلانے لگے۔ اس وقت ان کے چہرے پر ایک عجیب جلال تھا۔ میں ڈر کر بھاگا اور گھر میں آکر دم لیا۔ اس کے بعد کوئی ایک ہفتے تک وہ بالکل نظر نہ آئے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا پردہ کر گئے۔ ایک دن خلاف معمول شام کے وقت گھر میں گئے۔ وضو کیا نماز پڑھنے کھڑے ہوئے۔ اللہ اکبر کہتے ہی سجدے میں گر پڑے۔ عورتیں دیکھنے کو دوڑیں تو ختم تھے۔ سدا رہے نام اللہ کا۔

جسم میں تازگی
لائف بوائے صابن کی بدولت
لائف بوائے کے جراثیم سے محفوظ رکھنے والے فرحت بخش جھاگ جلد کے
ہر مسام سے جراثیم آلود میل اور گرد کو الگ کر دیتے ہیں جس سے جسم صاف اور
ستھرا ہو جاتا ہے اور آپ دن بھر ایک لطیف تازگی محسوس کرتے ہیں۔ یہ اطمینان
کر لیجیے کہ آپ کے گھر میں سب کی صحت مفرح لائف بوائے صابن سے محفوظ رہے
لائف بوائے صحت مند زندگی کا ضامن ہے
L-20.193-UD.
LIFEBUOY
SOAP

یہ خوف و ہراس کیوں؟
سیریڈون استعمال کیجئے اور
تکلیف دہ ایام سے نجات پائیے!
ہر ماہ آپ کی زندگی کو تلخ کر دینے والی تکلیف اور درد سے
فوری طور پر نجات پانے کے لئے سیریڈون استعمال کیجئے
تسکین دیتی ہے
سیریڈون درد سے تقریباً فوراً نجات دلاتی ہے اور اس کے استعمال کے بعد نہ تو معدے میں کوئی تکلیف ہوتی ہے اور نہ بدحالی پیدا ہوتی ہے
آرام پہنچاتی ہے
سیریڈون اعصاب کو آرام پہنچاتی ہے اور درد کے رفع ہو جانے کے بعد آپ راحت و مسرت محسوس کرتی ہیں۔
تازگی بخشتی ہے
درد کی وجہ سے پیدا ہونے والی ذہنی اور جسمانی تھکاوٹ پر سیریڈون قابو پالیتی ہے اور اسکے استعمال کے چند ہی لمحوں بعد آپ پھر چستی و تازگی محسوس کرتی ہیں۔
Saridon
اصلی سیریڈون صرف اصول صحت کے مطابق مُہر بند
کئے ہوئے ورقی پیکٹوں میں ہر جگہ دستیاب ہوتی ہے

"میں
لکس ٹائیلٹ صابن
استعمال کرتی ہوں"
جمیلہ رزاق کہتی ہے
فلمی ستاروں کا سفید
اور خوشبودار حسن بخش صابن

ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا - مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس میکلوڈ روڈ - کراچی

مدیر: رفیق خاور

چاٹگام کا پہاڑی علاقہ

"بانسی" (پہاڑی گھر)

دریائے کرنافلی میں باربرداری (بانس اور شہتیر)

باغ

گاؤں کا خوشنما تالاب

بستی

خانگی مسرّت اور خوشحالی

ہماری قوم ہمارے گھروں ہی کا مجموعی نام ہے۔ افراد کی خوشحالی قوم کی خوشحالی کے ساتھ وابستہ ہے۔ قوم کی خدمت کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ ہم اپنے گھروں کو بہتر اور زیادہ خوشحال بنائیں۔ اس کے لئے خرچ میں کفایت اور سلیقہ مندی کی بھی ضرورت ہے۔ ہماری آمدنی کا کچھ حصہ بچانے کے لئے بھی ہوتا ہے، اور بچت کی بہترین صورت یہی ہے کہ بچت کے سرٹیفکیٹ خرید لئے جائیں جس سے قومی ترقی کو بھی مدد پہنچتی ہے ان پر ۶ فیصد منافع ملتا ہے۔ یہ زائد آمدنی یقیناً ہماری خانگی خوشحالی میں اضافہ کا باعث ہوگی۔

سیونگ سرٹیفکیٹ میں روپیہ لگائیے

۶ فیصدی منافع - انکم ٹیکس معاف

ہر ڈاک خانے سے مل سکتے ہیں
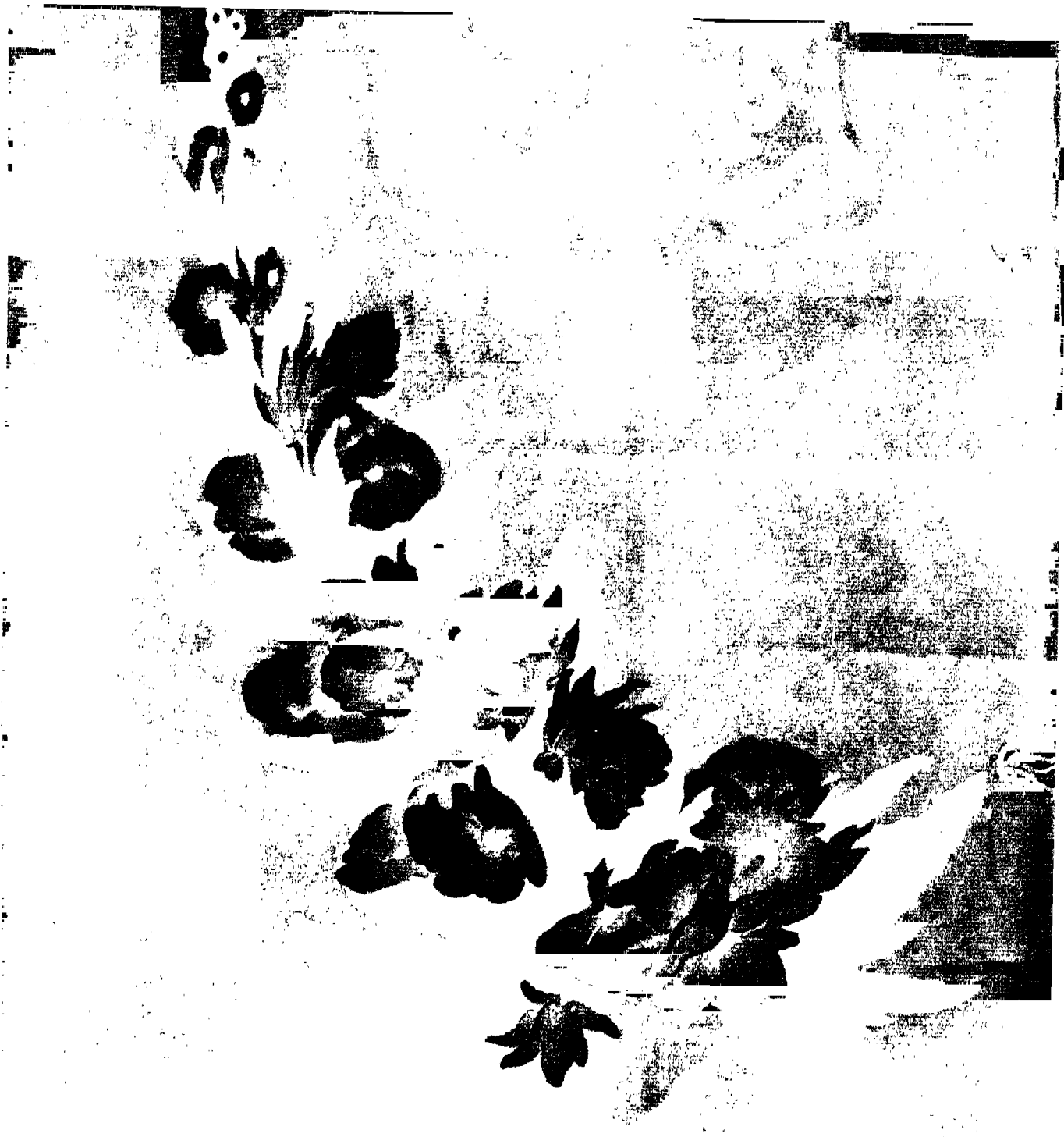
جنوری ۱۹۶۰ء

قیمت ۸ ر
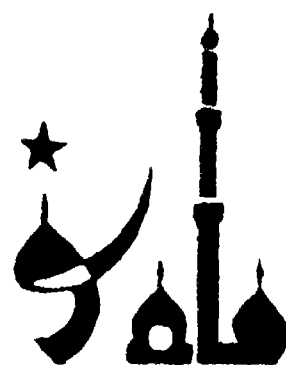
پاکستانی رقص

(صدر آئزن ہاور اور امریکی مہمانوں کے اعزاز میں رقص کے چند مظاہرے)

: ۱

: ۴

: ۳

: ۲

: ۵

: ٦
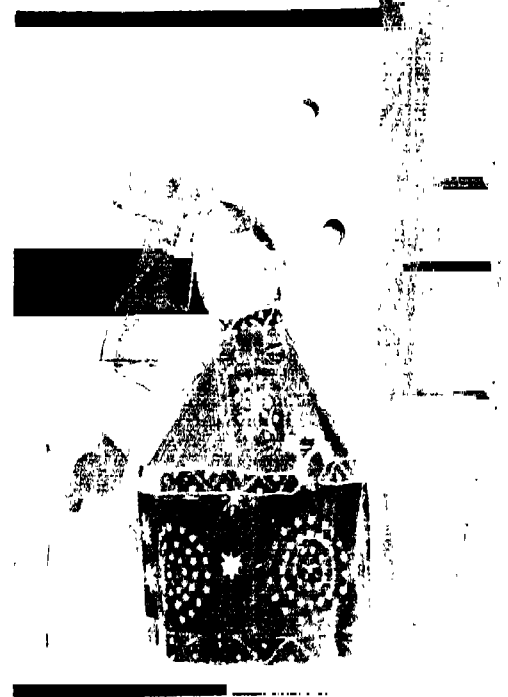
۱- خٹک (سرحد کا ولولہ انگیز رقص)

۲- سنی پوری

۳- ''اک شمع رہ گئی تھی. . . .''

۴- لڈی

۵- ''ہو جمالو''

٦- ناگن

سب ایک دوسرے
سے پوچھتے ہیں!
"کہیئے مزاج کیسا ہے؟"
یہی وہ الفاظ ہیں جو ملاقات کے وقت سب سے پہلے زبان پر
آتے ہیں۔ مگر کیا سچ مچ اس کا جواب ہمیشہ درست اور حسبِ دلخواہ
ہوتا ہے؟ صحت کی طرف تھوڑی سی توجہ ہماری بہت سی عام
شکایات کا خاتمہ کر سکتی ہے۔
ماء اللحم کا استعمال خصوصاً اس موسم میں ہماری صحت اور توانائی کی
ضمانت ہے۔ جدید طبی تحقیق کی مدد سے اس کے خواص اور خوبی کو کمال تک پہنچا دیا
گیا ہے اور اب یہ ہر لحاظ سے ایک مکمل اور مؤثر ٹانک ہو گیا ہے جو
صحت اور شباب کو قائم رکھتا ہے۔
ماءُ اللحم دو آتشہ
ہمدرد
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان کراچی - ڈھاکہ - لاہور - چاٹگام
ماء اللحم

فارهنس خاندان کے لئے ٹوتھ پیسٹ!

مضبوط اور صحتمند
مسوڑوں کے معنی ہیں
چمکدار اور سفید دانت!

فارهنس استعمال کیجئے۔

آپکا دنداں ساز آپکو بتائیگا کہ مسوڑوں کی حفاظت ہی دانتوں کی صحیح حفاظت ہے، مضبوط مسوڑے صحتمند دانتوں کی بنیاد ہیں۔ ہر روز فارہنس سے برش کے ذریعہ اپنے دانتوں کو صاف کرتے وقت مسوڑوں پر بھی برش ملنے کی عادت ڈالئے۔ فارہنس آپکی سانس میں خوشبو اور مسکراہٹ میں دلکشی پیدا کردے گا۔

بڑے سائز کا ٹیوب۔ قیمت ۲ روپے ۲ آنے۔ چھوٹے سائز کا ٹیوب۔ ایک روپیہ ۲ آنے ۶ پائی۔

اِس سے زیادہ ہرگز نہ دیجئے۔

تیار کنندگان

ڈاج اینڈ سیمور انڈسٹریز (پاکستان) لمیٹڈ

ویسٹ وھارف۔ کراچی۔

DS 1882		JWT

جلد ۱۳ — ماہِ نو — شمارہ ۱

جنوری ۱۹۶۰ء

مدیر: رفیق خاور — نائب مدیر: ظفر قریشی

چندہ سالانہ: پانچ روپے آٹھ آنے — شائع کردہ: ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی — فی کاپی: آٹھ آنے

ڈرامے کی فنی اور ادبی قدریں

وقار عظیم

ادب میں جو چیزیں مختلف وقتوں میں بحث و تمحیص اور اس لئے ادبی اور فنی اختلاف کا موضوع رہی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ڈرامے کو ادب کہا جائے یا فن۔ جن لوگوں نے ڈرامے کو ادب کی ایک صنف تسلیم بھی کیا ہے، ان کا انداز عموماً ایک طرح کی معذرت کا رہا ہے۔ ایسے لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ ادبی اوصاف ڈرامے کے لئے بنیادی حیثیت نہیں رکھتے۔ وہ اس کے حسن میں البتہ اضافہ کر سکتے ہیں۔ اور اس کے برخلاف سوچنے والوں کا ایک گروہ تو ایسا بھی ہے کہ وہ ڈرامے کے لئے کسی طرح کے ادبی سہارے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا اور اس لئے اسے ادب کہنے کے بجائے فن کہتا ہے۔

اس بدیہی طور پر دلچسپ اور ادبی اور فنی نقطۂ نظر سے اہم مسئلے کی صحیح حیثیت کے متعلق کسی ایسے نتیجے تک پہنچنے کے لئے جسے معقول بھی کہا جا سکے اور قابلِ قبول بھی، تجزیے کے مراحل کا طے کرنا ضروری ہے اور تجزیے کی منطق کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی سب سے پہلے یہ سوچے کہ ڈراما جس خاص شکل و صورت میں اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے وہ اسے کس طرح ملی، اس کا آغاز کیوں اور کیسے ہوا؟ اور آغاز کی ابتدائی منزل میں وہ کون کون سی باتیں تھیں جنھیں اس کی امتیازی خصوصیات سمجھا گیا۔

جدید تحقیق نے انسان کی تہذیبی زندگی کے آغاز اور اس کے گوناگوں مظاہر کے متعلق جو نتائج ہمارے سامنے پیش کئے ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ انسان نے اپنے تجربات کے اظہار و ابلاغ کے جو وسائل و ذرائع اختیار کئے ہیں ان میں سب سے پہلی شکل ڈرامے کی ہے۔ ابتدائی انسان نے اپنے ان تجربات کی کہانی کو جو روپ دیا اور اپنے ہمسروں کے سامنے اپنی زندگی کے جو کارنامے بیان کئے ان میں اشاروں اور حرکات و سکنات سے لفظوں کو موثر اور دل نشین بنانے کا کام لیا گیا اور اس طرح گویا عہدِ عتیق کی ہر کہانی ایک ڈراما ہے۔

انسان کہانی کے ذریعے اپنے تجربات کا اظہار کرتا ہے تو اظہار کے اس عمل کے پیچھے اس کی یہ خواہش اور یہ آرزو کام کرتی دکھائی دیتی ہے کہ وہ اپنے باطن کو ظاہر کی شکل دے اور اپنے چھپے ہوئے آپ کو ظاہر کی نظر کے سامنے لائے۔ اپنے باطن کو ظاہری روپ دینے کی یہ خواہش جس طرح بچوں میں ہوتی ہے اور طرح طرح کی حرکات اور مختلف قسم کے اعمال و افعال کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے اسی طرح ابتدائی انسان کے دل کو بھی بے چین رکھتی تھی یہی بے چینی اظہار و ابلاغ کا وسیلہ تلاش کر کے بیان کا پیکر اختیار کرتی اور یہ کہانی بنتی ہے۔ لیکن اس کہانی میں لفظ اتنی اہمیت نہیں رکھتے جتنے اشارے اور حرکات۔ کہانی کی یہی ابتدائی صورت حقیقت میں ڈراما ہے اور آج بھی غیر مہذب اور غیر متمدن قبیلوں میں اسی صورت میں موجود ہے۔ آج بھی ان کے ناچ گانے اور کھیل تماشے، جو ان کے تجربات اور مشاہدات اور اندرونی کیفیات کی ظاہری صورتیں ہیں، تاثیر اور دل نشینی کے لئے لفظوں کے زیادہ محتاج نہیں۔ تاثیر اور دل نشینی کی صفات ان میں حرکات اور اشارات سے پیدا ہوتی ہیں اور اسی لئے ڈرامے کے آغاز و ابتدا کے متعلق کسی کا یہ فقرہ مزے دار بھی ہے اور معنی خیز بھی کہ ڈرامے کی زندگی کا نقطۂ آغاز کہانی کہنے والا نہیں بلکہ اداکار ہے۔ یوں گویا، ڈرامے میں حرکت اور عمل کی بنیادی حیثیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اسی خیال کو ایک مغربی مبصر نے یہ کہہ کر ادا کیا ہے کہ "ڈرامے کا فن ڈراما نگار کا نہیں بلکہ اداکار اور ہدایت کار کا فن ہے"۔

ڈرامے کے آغاز اور اس کی ابتدائی شکل صورت کے متعلق یہ چند بیانات جن باتوں کی طرف اشارے کرتے ہیں انہیں اگر مرتب کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شخصی تجربے کے اظہار کے وسیلے کی حیثیت سے کہانی جب سب سے پہلے دوسروں کے سامنے آئی تو اس کا انداز وہی تھا جس نے آگے چل کر ڈرامے کی

شکل اختیار کی۔ یعنی ایک شخص نے اپنے تجربات دوسروں کے سامنے پیش کئے اور انہیں پیش کرنے کے لئے کچھ تو الفاظ سے اور اس سے زیادہ اشارات و حرکات سے مدد لی اور یوں کہانی سننے والوں کو اپنی طرف متوجہ رکھا۔ بیان کی ہوئی اس کہانی کا جو نقشہ ہماری نظر کے سامنے آتا ہے اس میں بعض چیزوں کا وجود ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے کہانی ایک شخص بیان کر رہا ہے جو اپنی کہانی میں دلچسپی اور اثر پیدا کرنے کے لئے الفاظ، حرکات اور اشارات استعمال کرتا ہے۔ یہ کہانی سننے والوں کے ایک گروہ کے سامنے بیان کی جاتی ہے، جو ایک خاص وقت میں کسی ایسی جگہ جمع ہیں جو بعض اسباب کی بنا پر کہانی سننے اور سنانے کے لئے ایک موزوں جگہ ہے۔ یہ خاص جگہ جہاں کہانی سنائی جا رہی ہے اور کہانی سننے والے ایک خاص انداز سے بیٹھے ہیں وہی جگہ ہے جسے آگے چل کر ڈرامے اور تھیٹر کے فن میں اسٹیج کا نام ملا اور جس کی نوعیت مختلف زمانوں میں حالات اور مذاق کے مطابق بدلتی رہی۔ کہانی سنانے والا جو کہانی سناتے وقت حرکات و اشارات کا استعمال ضروری سمجھتا ہے، اس اسٹیج کا ایکٹر ہے، اور جن سننے والوں کو یہ کہانی سنائی (اور ساتھ ساتھ دکھائی جا رہی ہے) وہ تماشائی ہیں جن کے وجود کے بغیر کسی ڈرامے کے وجود کا تصور ممکن نہیں یہی اسٹیج، یہی اداکار اور یہی تماشائی ہیں جو آگے چل کر ڈرامے کے فن کے بنیادی عناصر بنے اور یہی عناصر ہیں جن کے الگ الگ اثرات نے مل جل کر وہ چیزیں پیدا کیں جنہیں ہم ڈرامے کے فن، اور یقیناً عظیم فن، کی روایات کہتے ہیں۔

ان روایات میں سے بعض کا تعلق اسٹیج سے ہے، بعض کا ایکٹر سے اور بعض کا تماشائیوں سے۔ لیکن ڈراما نگار کو ڈراما لکھتے وقت چونکہ زیادہ خیال اس بات کا رکھنا پڑتا ہے کہ وہ جو کچھ لکھے گا اسے اسٹیج پر پیش کیا جائے گا اور تماشائیوں کے سامنے پیش کیا جائے گا اس لئے ایک طرف تو اس کا فنی مقصود یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ تماشائیوں کے سامنے آئے وہ ان کے لئے دلچسپ ہو اور انہیں اپنی طرف متوجہ رکھ سکے اور دوسری طرف یہ کہ سب کچھ ان حدود کے اندر رہ کر اور ان پابندیوں کا لحاظ رکھ کر کیا جائے جو اسٹیج نے اس پر عائد کی ہیں یہی وجہ ہے کہ ڈرامے کی روایات کی تشکیل میں ان دو چیزوں نے زیادہ نمایاں حصہ لیا ہے اور اس کے اصول و ضوابط کی تعیین طور پر صد بار اثر انداز ہوتی ہیں۔ البتہ ان اثرات میں سے بعض اہم ہیں اور بعض غیر اہم اور اس لئے ان اثرات کے تحت وجود میں آنے والی روایات کی نوعیت بھی اہم اور غیر اہم، فروعی اور اصلی، ضمنی اور بنیادی ہے۔

مثال کے طور پر اگر ہم ان روایات پر ایک سرسری نظر ڈالیں تو ڈرامے کی بے شمار ایسی روایات ہمارے سامنے آئیں گی جنہیں ڈرامے کی نشو و نما کے مختلف دوروں میں اہم تر سمجھا گیا ہے لیکن انہیں بنیادی نہیں کہا جا سکتا۔ ان کی حیثیت البتہ ایک طرح کے سمجھوتے یا مفاہمت کی ہے جو فن کار اور اس کے مخاطب یا ڈراما نگار اور تماشائی کے درمیان قائم اور استوار ہوتی ہے اور اس مفاہمت کی بنا پر ڈراما نگار کی پیش کش تماشائی کے لئے دلچسپ اور پرکشش بھی بنتی ہے اور ذہنی لطف و انبساط کا سرمایہ بھی مہیا کرتی ہے۔ ڈرامے کی یہ روایتیں حقیقت اور صداقت کے نقطۂ نظر سے تو ہرگز قابلِ قبول نہیں ہوتیں لیکن اسٹیج، تماشائی اور ڈراما نگار کے باہمی رشتے کے پیدا کئے ہوئے حدود انہیں جواز کی سند دے دیتے ہیں اور اس لئے انہیں وہی مرتبہ حاصل ہوتا ہے جو حقائق کو۔ ڈرامے کے کردار نثر کے بجائے نظم، یا سیدھی سادی روزمرہ کے بجائے مقفیٰ اور مسجع اور رنگین باتیں کرتے ہیں، بسترِ مرگ پر زندگی کی آخری سانسیں لیتا ہوا انسان بھیرویں کی تانیں لگاتا ہے، عرب، ایرانی، افغانی، چینی، جاپانی اور ہندوستانی سب آپس میں ایک ہی زبان بولتے اور سمجھتے ہیں، کردار جو کچھ اپنے دل میں سوچ رہا ہے یا کسی دوسرے کردار کی سرگوشی کے انداز میں کہہ رہا ہے اسے اجازت ہے کہ ایسی آواز میں کہے کہ تماشائی اس کی بات سن سکیں۔ کردار جنگل کی تنہائیوں میں گانا گائے تو اسے سازوں کی پوری سنگت ہے، وہ رات کی بھیانک تاریکی میں کسی عمل میں مصروف ہو تو اس پر اتنی روشنی ڈالی جائے کہ اس کی چھوٹی سے چھوٹی حرکت بھی تماشائیوں کی نظر سے پوشیدہ نہ رہے۔ یہ اور اس طرح کی بہت سی چیزیں ہیں جنہیں ہم عام حالات میں ہرگز قابلِ قبول نہیں سمجھتے لیکن اسٹیج کے تقاضے اور تماشائی کی طلب نے انہیں اس حد تک جائز بنا دیا ہے کہ ان پر کسی طرح کا اعتراض وارد کرنے کے بجائے ہم انہیں ڈرامے کی تاثیر کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔

اسٹیج کی مجبوریاں اور ان مجبوریوں کے پیدا کئے ہوئے تقاضے ہیں جنہوں نے ڈرامے کے فن میں اس چیز کی تخلیق کی ہے جسے ہم ڈرامے کی وحدتیں کہتے ہیں۔ ڈراما نگار کو اسٹیج کی حد بندیوں اور پابندیوں

کی وجہ سے ڈرامے کے عمل کو وقت اور مقام کے لحاظ سے اس حد کے اندر رکھنا پڑتا ہے جو آسانی سے اسٹیج پر بھی پیش کی جا سکے اور جس سے تماشائی کی توجہ بھی ایک ہی نقطہ پر مرکوز رہے۔ اس کی اس فنی کوشش کو وحدتِ زمان، وحدتِ مکاں کے فنی نام دیئے گئے ہیں اور ان کی اہمیت پر اس لئے زور دیا گیا ہے کہ جب تک ڈراما نگار تماشائی کے سامنے وقت اور مقام کا کوئی واضح تصور نہ پیش کر سکے اور جب تک وہ ڈراما دیکھتے وقت یہ نہ محسوس کر سکے کہ اسٹیج پر کردار جس عمل میں مصروف ہیں اور جس پر حقیقت میں ڈرامے کی دلچسپی کی ساری بنیاد قائم ہے، وہ کس مقام اور کس وقت پر پیش آیا ہے، وہ اس عمل میں کوئی براہِ راست دلچسپی نہیں لے سکتے۔ ان کا اپنے آپ کو اس عمل کا ایک حصہ سمجھنا (خواہ ناظر ہی کی حیثیت سے سہی) صرف اسی بات پر منحصر ہے کہ ان کی نظر کے سامنے وقت اور مقام کی ایسی تصویر موجود ہو کہ انہیں ڈرامے کے کرداروں کا عمل حقیقی معلوم ہو۔ یوں گویا ان دو وحدتوں کے فنی تصور پر اس تیسری وحدت کے موثر وجود کا انحصار ہے جسے ڈرامے کے فن کی اساس کہا گیا ہے۔ اس وحدت کا نام وحدتِ عمل ہے۔ عمل اور حرکت کے وجود کے بغیر فنی حیثیت سے کسی ڈرامے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ ڈراما نگار کے فنی منصب اور فنی چابک دستی کا امتحان اسی میں ہے کہ وہ کس طرح ڈرامے کو عمل کے راستے پر ڈالتا اور اسے مختلف مدارج و مراحل سے گزارتا ہے۔

ڈراما نگار کے فنی عمل کا تجزیہ کرتے ہوئے ہمیشہ اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ڈراما نگار کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ عمل کا آغاز کس طرح کرے کہ اس کے سفر کی اگلی منزلیں بغیر کسی رکاوٹ کے طے ہوتی چلی جائیں اور ایک مرحلہ دوسرے مرحلے کی طرف رہنمائی کرتے کرتے بالآخر عمل کو منطقی انجام تک پہنچا دے۔ عمل کی ابتدا ہو جائے اور واقعات ایک معین رخ اختیار کر لیں تو ڈراما نگار کا کام یہ ہے کہ وہ عمل کے مختلف مرحلوں اور منزلوں میں تماشائی کی توجہ اس عمل کی طرف سے نہ ہٹنے دے۔ یوں گویا ڈرامے کے عمل اور تماشائی کی دلچسپی اور توجہ میں ایک لازمی رشتہ قائم ہوتا ہے۔ ڈرامے کا عمل واقعات کی شکل میں آگے بڑھتا رہتا ہے، اور عمل کو وہ کردار جن کی زندگی ڈرامے کے واقعات کا موضوع ہے اپنی گفتار و رفتار سے آگے بڑھاتے رہتے ہیں اور جوں جوں عمل کبھی دھیمی اور ہموار اور کبھی تیز اور ڈرامائی رفتار سے آگے بڑھتا اور ابھرتا رہتا ہے تماشائی کی دلچسپی اور توجہ ایک مرکزی حیثیت حاصل کرتی رہتی ہے۔ عمل کی حرکت کی اسی رفتار کے انداز سے تماشائی کے جذبات میں مد و جزر کی ہلتی ہوئی کیفیتیں نمایاں ہوتی رہتی ہیں۔ اس کے دل کی دھڑکن کبھی ہلکی اور کبھی تیز ہوتی رہتی ہے۔ گویا تماشائی کے دل کو اپنی مٹھی میں رکھے کہ جس فنی عمل کا آغاز ڈراما نگار نے ڈرامے کے ابتدائی حصوں میں کیا تھا اس کی کامیابی اسی بات پر منحصر ہے کہ ڈرامے کا عمل ایک موزوں اور مناسب رفتار سے حرکت کرتا اور آگے بڑھتا رہے اور کسی ایک جگہ بھی اتنی دیر تک رک کر نہ رہ جائے کہ تماشائی کو اپنے خیال اور جذبے میں رکاوٹ اور ٹھیراؤ محسوس ہونے لگے۔ ہاتھ ڈرامے میں خیال اور جذبے کا یہ ہلکا سا ٹھیراؤ یا معمولی سی رکاوٹ بھی اس کے لئے گھٹن بن جاتی ہے۔ تماشائی کو گھٹن کے اس احساس سے محفوظ رکھنا ڈراما نگار کا فنی منصب ہے اور یہ بات ڈرامائی عمل کے متحرک رہنے سے پیدا ہو سکتی ہے۔

ڈرامے کے عمل کے متحرک رہنے اور اس کے برابر آگے بڑھتے رہنے پر فنی اعتبار سے جو زور دیا جاتا ہے وہ ڈرامے میں اس چیز سے پیدا ہوتا ہے جسے فن کی اصطلاح میں تصادم یا کشمکش CONFLICT کہا گیا ہے۔ جس چیز کو ہم ڈرامائی عمل کہتے ہیں وہ کسی کردار کی عملی حالت میں ظاہر یا نمودار ہونے کا دوسرا نام ہے۔ کردار اس عملی حالت میں تماشائی کے لئے اس وقت تک کوئی دلچسپی ممکن نہیں جب تک اسے کسی الجھن، اور کشمکش میں مبتلا نہ دکھایا جائے یہی الجھن اور کشمکش ہے جو حقیقت میں عمل کو آگے بھی بڑھاتی ہے اور اس میں اتار چڑھاؤ کی وہ کیفیتیں بھی پیدا کرتی ہے جن سے تماشائی کی توجہ ایک نقطے پر مرکوز رہتی یا اس نقطے کے محور پر گردش کرتی ہے۔ یہ الجھن یا کشمکش ڈرامے میں مختلف صورتیں اختیار کرتی ہے۔ کبھی اس کی شکل دو افراد کے درمیان ایک تصادم کی ہوتی ہے، کبھی یہ کشمکش حالات اور تصورات کے اختلاف اور تصادم سے پیدا ہوتی ہے، کبھی خود انسان کے اپنے جذبے کی متفرق اور متضاد کیفیتوں سے۔ اسی کشمکش اور تصادم سے پلاٹ بنتا اور اس کے مختلف مدارج قائم ہوتے ہیں۔ ابتدا کے بعد اضطراب (بحران)، نقطۂ عروج اور انجام اسی تصادم کی مختلف منزلیں ہیں۔ ڈراما نگار ان مختلف مرحلوں اور منزلوں کو وحدت کے ایک رشتے میں جوڑتا اور اس طرح تماشائی کی توجہ کے سفر کے لئے

ایک راستہ معین کرتا ہے تاکہ وہ ادھر ادھر نہ بھٹکے، ڈرامے کے شروع میں اس نے تماشائی کے جذبۂ تجسّس کو روشن کیا اور آہستہ آہستہ اس کی لَو کو بھڑکاتا رہا اور آخر اس کی تسکین کا سامان مہیا کرنا اس کے فن کی کامیابی ہے، اور یہ کامیابی حقیقت میں اس بات پر منحصر ہے کہ اس نے ڈرامے کے اس عمل کو کس طرح اور کس حد تک اپنے فکر، تخیل اور جذبے کی آنچ سے پختہ کیا ہے جس پر ڈرامے کی اساس قائم ہے اور جسے فنی حیثیت دینے میں ڈراما نگار اور تماشائی بیک وقت برابر کے شریک ہیں۔ اس ڈرامائی عمل میں اگر کشمکش کا رنگ موجود ہے اور ڈراما نگار نے اس کشمکش کو پوری طرح کرداروں کی زندگی سے مربوط کیا ہے تو اس کی حرکت اور رفتار میں بھی تسلسل اور موزونی ہوگی، اور تماشائیوں کی توجہ کا مرکز بھی قائم رہے گا اور وہ ڈرامے کو شروع سے آخر تک دلچسپی کے ساتھ دیکھیں گے۔ اس چیز کا نام ڈرامے کے فن میں اشتیاق، تذبذب یا SUSPENSE ہے۔ ڈراما نگار ایک طرف تو یہ کرتا ہے کہ تماشائی کی نظر دلچسپ اس عمل کی طرف رہے جو اس وقت اسٹیج پر پیش آرہا ہے اور دوسری طرف اس سے بھی زیادہ یہ کہ آگے کا ذہن برابر آنے والے واقعات اور ہونے والے عمل کا منتظر رہے جو کچھ اس وقت اسٹیج پر ہو رہا ہے وہ اپنے لئے کشش انگیز ہو لیکن اس سے بھی زیادہ کشش اس خیال اور احساس میں ہو کہ دیکھیں اس کے بعد کیا ہو۔ یہی خیال، یہی احساس اور یہی اشتیاق ہے جس سے تماشائی کے لئے ڈراما ایک لذت آور تجربہ بنتا ہے۔

ڈرامائی تجربے کو تماشائی کے لئے مسلسل دلچسپی، کشش اور انبساط کی ایک چیز بنانے کے لئے ڈرامے کے فن میں تنوع اور تضاد کو بھی اہمیت دی جاتی ہے اور ڈراما نگار کبھی واقعات کی رفتار میں، کبھی کرداروں کے مکالمے کے لہجے میں، کبھی عمل کی کیفیت میں اور کبھی بیان کے اسلوب میں شدت و خفت اور کبھی واقعات کی نوعیت کرداروں کے عمل اور خود اظہار کے لہجے اور اسلوب میں تضاد کی کیفیتیں نمایاں کرکے تماشائی کے جذباتی ہیجان میں توازن اور نرمی پیدا کرتا ہے اور اسی لئے ڈرامائی عمل کی پیش کش اور ڈرامائی صورتِ حال کی تعمیر و تشکیل میں ان دونوں وسائلِ فن کو بھی کم و بیش وہی دخل حاصل ہوتا ہے جو اشتیاق یا SUSPENSE کو۔ ادبی اصولوں ڈرامے

کو ایک ایسی صنفِ ادب سمجھا جاتا ہے جس کے ادبی مرتبے کا تعین کرتے وقت ہمیں یہ بات پیشِ نظر رکھنی پڑتی ہے کہ ڈراما ڈرامانگار کا نہیں بلکہ اسٹیج اور تھیٹر کا فن ہے، اور ہم اسے ناول، افسانے، رزمیہ نظم اور انشا کی طرح محض ادبی قدروں سے نہیں جانچ سکتے۔ چونکہ ڈراما نگار ڈرامے کی تخلیق یہ بات پیشِ نظر رکھ کر کرتا ہے کہ ایکٹر انہیں اسٹیج پر تماشائیوں کے دیکھنے کے لئے پیش کریں گے اس لئے ان کی اچھائی برائی کی کسوٹی یہ خیال ہے کہ وہ اسٹیج پر کامیاب رہا یا نہیں۔ ڈرامے اور اسٹیج کو لازم و ملزوم قرار دینے کی یہ روایت دنیا کے ڈرامے کی پوری تاریخ کا بنیادی عنصر ہے۔ یہاں تک کہ دنیا کے بعض بڑے بڑے ڈراما نگاروں نے جن میں مولیئر اور شیکسپیر بھی شامل ہیں، کبھی اس خیال کو اہمیت نہیں دی کہ ان کے ڈرامے چھاپے بھی جائیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی عام مشاہدے اور تجربے کی ہے کہ بعض ایسے ڈرامے جو اسٹیج پر حد درجہ کامیاب سمجھے گئے تھے جب چھپ کر پڑھنے والوں کے سامنے آئے تو ان کی ساری تاثیر اور کشش ختم ہوگئی۔

ان سب باتوں سے جو بدیہی نتیجہ نکلتا ہے اور جس کی تائید ڈرامے کی پوری تاریخ کو دیکھ کر ہوتی ہے یہ ہے کہ ڈرامے کی تخلیق میں اصل بنیاد اس کے فن کو بنایا گیا ہے اور اس کے ادبی پہلو کو محض ضمنی حیثیت دی گئی ہے۔ اس سلسلے میں عموماً دنیا کے دو عظیم ڈراما نگاروں کے بیانات پیش کئے جاتے ہیں اور ان کے بیانات کو اس خیال کی تائید میں استعمال کیا جاتا ہے کہ ڈرامے میں ادبی انداز کی باری فنی اقدار کے بعد آتی ہے SCRIBE کہا کرتا تھا کہ "میرے ڈرامے کا موضوع اچھا ہو اور میں اس کا ایک واضح اور مکمل خاکہ بنا لوں تو اسے لکھنے کا کام اپنے ملازم کے سپرد بھی کر سکتا ہوں۔ ڈرامے کی مجموعی فضا اس کے لکھنے کا کام کرنے کی اور ڈراما اسٹیج پر کامیاب رہے گا۔" یونانی ڈراما نگار میناندر سے ایک مرتبہ کسی نے پوچھا کہ آپ کا نیا ڈراما، اب کس منزل میں ہے تو اس نے جواب دیا۔ "ڈرامے کی موسیقی مرتب ہو چکی ہے اور وہ بالکل تیار ہے، اب صرف اسے نظم کرنا باقی ہے۔" ان دونوں بیانات میں سے پہلے پر یقیناً مبالغے کا گہرا رنگ ہے لیکن مجموعی حیثیت سے دونوں میں واضح طور پر یہ اشارہ موجود ہے کہ ڈراما لکھنے میں اصل چیز اس کی فنی تشکیل و ترتیب ہے۔ ادبی تہذیب اس کے مقابلے میں

محض ایک ثانوی اور فروعی چیز ہے اور حقیقت میں ڈرامے کی کامیابی کا انحصار اس دوسری چیز پر نہیں بلکہ پہلی پر ہے۔ ڈرامے کو ایک فن سمجھنے والوں کے اس دعوے نے (جس کی بنیاد یقیناً ڈراما نگاروں کا عمل ہے) کہ ڈرامے کی کامیابی میں بیان کے حسن کو کوئی دخل نہیں ڈرامے کی ادبی اہمیت پر حد درجہ اثر انداز ہوئی ہے اور ڈرامے کی قدر و اہمیت کا تعین کرتے وقت اس کی فنی اور ادبی حیثیتوں میں امتیاز کیا جانے لگا ہے اور اس امتیاز میں فن کو ادب پر تفوق دینے کا رجحان عام ہو گیا ہے۔ اور یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ ایک اچھے ڈرامے کی تخلیق لفظوں کے اس سرمائے کی طرف سے بے اعتنائی برت کر بھی ہو سکتی ہے جو ادب میں اظہار کا واحد وسیلہ بھی ہے اور حسنِ اظہار کا موثر ذریعہ بھی۔ اس میں شک نہیں کہ ڈراما نگار بھی اپنے خیال کے اظہار کے لئے الفاظ ہی کا محتاج اور دست نگر ہے لیکن ناول نگار اور افسانہ نگار کی طرح وہ لفظوں کے نازک اور لطیف صرف اور استعمال کا پابند نہیں۔ اس کے استعمال کئے ہوئے لفظوں کی نزاکت اور لطافت اسی وقت مکمل نہیں ہو جاتی جب وہ اس کے قلم سے نکل کر صفحۂ قرطاس پر وارد ہوتے ہیں۔ یہ ادھورا کام اس وقت مکمل ہوتا ہے جب اسٹیج پر اداکار اسے اپنی زبان سے ادا کرتا ہے اور اس لئے لفظوں کی اپنی حیثیت کے علاوہ انہیں زبان سے ادا کرنے والے اداکار کی شخصیت، آواز، لہجہ، حرکات و سکنات، اشارے بھی ان کے لطیف اور نازک تصور کو مکمل کرنے میں حصہ لیتے ہیں۔

ڈرامے کی تاریخ کے ہر دور میں اس رجحان کے خلاف احتجاج کیا گیا ہے اور ایک طرف تو یہ کہا گیا ہے کہ بے شک ڈرامے کا مکمل وجود تھیٹر اور اسٹیج کے بغیر ممکن نہیں، لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ تھیٹر کا مکمل وجود بھی ڈرامے کے بغیر ممکن نہیں، اور دوسری طرف اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اس کے باوجود کہ ڈراما نگاروں نے ڈرامے اسٹیج کے لئے لکھے عظیم ڈراما نگاروں کا عمل یہ ثابت کرتا ہے کہ انہوں نے ڈرامے کو ایک عظیم فن سمجھتے ہوئے بھی یہ بات کبھی فراموش نہیں کی کہ وہ ادب بھی ہے اور یہی ادب ہے جس کی بدولت ڈرامے کو حیات جاوداں ملتی ہے۔

ڈرامے پر فنی حیثیت سے نظر ڈالی جائے تو اس بدیہی حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ چونکہ ڈراما نگار ڈراما فوری تاثر پیدا کرنے کی غرض سے لکھتا ہے اس لئے اس کی نظر فن کے ان وسائل پر ہوتی ہے جو اسے اس مقصد کے حصول میں مدد دیں اور جن کی مدد سے وہ طلسم و فریب کی ایک عارضی دنیا کی تشکیل کر سکے۔ ڈرامے کی پوری دنیا عارضی طلسم کی یہی دنیا ہے اور اس دنیا کی قدروں پر تصنع اور تکلف کا سایہ ہے۔ تصنع اور تکلف کی انہیں قدروں کا نام ڈرامے کا فن ہے۔ اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ ایک سچا اور حقیقی فنکار فریب و طلسم کی اس دنیا میں خوش نہیں رہ سکتا اور اپنے تصور، تخیل اور فکر کو اس کی محدود قدروں کی زنجیروں کا پابند نہیں رکھ سکتا۔ حقائق کی کشادہ و فراخ سرزمین کو ترک کر کے تکلفات کی اس گھٹن پیدا کرنے والی دنیا کا مکین بننا اس کے فنکارانہ مزاج کے منافی ہے۔ اسی لئے اچھا ڈراما نگار، اس کے باوجود اپنے فن کی بنیاد تکلفات و طلسمات کی عارضی قدروں پر رکھتا ہے، اپنے آپ کو انہیں کے اندر مقید اور محصور نہیں رکھ سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ اس کی فنی تخلیق کا جائزہ اسی محدود دنیا کے ضابطوں کے مطابق لیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی فنی تخلیق کا سرچشمہ اس دنیا سے باہر کی حقیقی دنیا اور زندگی ہے اور اس لئے اگر ہم ڈرامے کی پوری تاریخ کا مطالعہ ذرا دقتِ نظر سے کریں تو یہ حقیقت ہماری نظر کے سامنے آتی ہے کہ دنیا کے سب عظیم ڈراما نگاروں نے تھیٹر اور اسٹیج کے حدود میں رہ کر بھی، اور ان کی فنی قدروں کو اپنے تخلیقی فنی عمل کا رہنما بناتے وقت بھی ان قدروں کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کیں جو زیادہ مستقل، زیادہ پائدار اور اس لئے ہمیشہ زندہ رہنے والی ہیں — یہ قدریں روحانی حقائق، انسانی صداقت، اور ادبی حسن کی قدریں ہیں۔ اور چیز دوسری قطع نظر ادبی حسن کی یہی قدریں ہیں جن کی بدولت ڈرامائی ادب کے شاہکاروں کو ہمیشگی ملی ہے۔ ادبی قدروں کی اسی اہمیت کا احساس ہے جو ڈراما نگاری کے مختلف ادوار میں مختلف صورتیں اختیار کرتا رہا ہے۔ اس احساس کا اظہار سب سے زیادہ لفظوں کے فن کارانہ اور حسن آفریں استعمال کی شکل میں ہوا ہے۔ اور جن ڈراما نگاروں نے اس جمالیاتی احساس کو ڈرامے کے تخلیقی عمل کی شکل دی ہے انہوں نے گویا اس عام خیال کی تردید کی ہے کہ

ڈرامے کے حسن اور تاثیر میں الفاظ کے موزوں استعمال کو کوئی دخل نہیں۔ حالانکہ اس بحث سے قطع نظر کہ ڈراما اسٹیج کے لئے خاص ہونے کی وجہ سے کوئی ادبی اہمیت رکھتا ہے یا نہیں عام ادبی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس بات سے انکار ممکن ہی نہیں کہ ڈراما فن ہونے کے ساتھ ساتھ ادب بھی ہے۔ ادب تخیلی تجربے کے اظہار اور ابلاغ کا دوسرا نام ہے جس میں لفظوں کی ایک خاص ترتیب و تنظیم سے کام لیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے ڈراما بھی ادب ہے کہ وہ الفاظ کی موزوں ترتیب و تنظیم کے ساتھ تخیلی تجربے کے اظہار کی ایک خاص صورت ہے۔ چونکہ الفاظ کی اس ترتیب و تنظیم میں ڈراما نگار کے فنی اور جمالیاتی ارادے، احساس اور عمل کو دخل ہے اس لئے یہ بھی ادب کی دوسری اصناف کی طرح ادب کی ایک صنف ہے۔ یہ صحیح ہے کہ الفاظ کی اس ترتیب و تنظیم کا مقصد یہ ہے کہ انہیں کوئی کردار یا کئی کردار اسٹیج پر ادا کریں گے اور اس طرح اپنی ادائیگی سے ایک تخیلی تجربے کو دوسرے تک پہنچائیں گے لیکن اس مقصد کی تکمیل میں الفاظ ابلاغ کا واحد وسیلہ ہیں اس لئے اُن کی حیثیت محض ثانوی یا جزوی ہونے کے بجائے بنیادی ہے۔

ڈرامے کو طلسم و فریب کی ایک دنیا کہا گیا ہے اور طلسم و فریب کی اس دنیا میں کرداروں کے حرکات و سکنات اور اس سے بھی زیادہ مکالمے سے جان پڑتی ہے، اس لئے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہیں کہ طلسم و فریب کی اس دنیا کی تشکیل و تعمیر لفظوں کی ایک خاص طرح کی ترتیب و تنظیم کے بغیر ممکن نہیں۔ اور لفظوں کی اس ترتیب و تنظیم کا نام ادب ہے۔ یہ بات لفظوں کے اس استعمال پر بھی صادق آتی ہے جس میں مکالمے کو زندگی کی عام سطح پر رکھا جاتا ہے اور اس نظم و ترتیب پر بھی جس میں شاعر بقول شخصے انسانوں کی زبان کے بجائے "دیوتاؤں کی زبان" استعمال کرتا ہے پچھلی ایک صدی کا مغربی ڈراما اس بات کی جیتی جاگتی مثال ہے کہ عام بول چال کی زبان اور بیان کے حسن اور رنگینی میں کتنا قریبی اور ایک حد تک لازم و ملزوم کا تعلق ہے۔

ابسن ——— IBSEN کے ڈرامے اس لحاظ سے سادگی و پرکاری اور بہ یک وقت فنی اور ادبی حسن کے شاہکار ہیں کہ اس نے سیدھی سادی روزمرہ زبان کو نازک سے نازک تخیلی تجربے اور پیچیدہ سے پیچیدہ انسانی کیفیت کے اظہار کا وسیلہ بنایا اور یوں ڈرامے میں زبان و بیان کی حیثیت کو مسلّم بنایا ہے۔ یہ الفاظ اسی کے ہیں کہ "میں ڈرامے کے ذریعے انسانی زندگی کی مصوری کرنا چاہتا ہوں اس لئے ان سے دیوتاؤں کی زبان میں گفتگو نہیں کرواتا"۔ ابسن نے جس زبان کو دیوتاؤں کی پُرتکلف اور پُرشکوہ زبان کہا ہے اس کے مقابلے میں انسانوں کی بے تکلف اور سادہ زبان لکھنے کا فن کہیں زیادہ دشوار اور اس سے کہیں زیادہ فنی اور ادبی کاوش اور عمل کا طالب ہے۔ بحیثیت ڈراما نگار کے ابسن کی تخلیقی زندگی کو چار ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان چار ادوار میں سے تیسرا دور نثری ڈراموں کا وہ دور ہے جس میں اس نے اپنے ڈرامے GHOST اور A DOLL'S HOUSE لکھے۔ ان دونوں ڈراموں کو جہاں ایک طرف ڈرامائی فن کے نقطۂ نظر سے شاہکار سمجھا گیا ہے، دوسری طرف ان کے ادبی محاسن کی بنا پر پچھلی صدی کے چند منتخب ڈراموں میں جگہ دی گئی ہے۔

ڈرامائی فن کی ادبی اہمیت کے متعلق اس دور کے عظیم ڈراما نگار برنارڈ شا کا نقطۂ نظر بھی ابسن کے نقطۂ نظر سے مشابہ ہے۔ اپنے ایک بہت مشہور ڈرامے کے متعلق (جو نظمِ معرّیٰ میں لکھا گیا ہے) شا نے یہ بات لکھی ہے کہ "میں نے یہ ڈراما نظمِ معرّیٰ میں اس لئے لکھا کہ مجھے فرصت کم تھی"۔ گویا شا کے نزدیک ادنیٰ درجے کی نظم کا لکھنا اعلیٰ درجے کی نثر لکھنے کے مقابلے میں آسان ہے۔ شا نے ایک اور جگہ تھیٹر اور ڈرامے کے رشتے کے ضمن میں ڈرامے کی ادبی اہمیت کی بڑی پرزور وکالت کی ہے۔ وہ کہتا ہے "تھیٹر ڈرامے کی بدولت زندہ ہے نہ کہ ڈراما تھیٹر کی بدولت وہ اسٹیج کے سہارے سے نہیں بلکہ اس قوت سے زندہ اور قائم ہے جو اس کی فطرت کا جزو لازم ہے"۔ ڈرامے میں ایک نیا انقلاب پیدا کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے اس نے کہا ہے "ڈرامے کو ایک بار اس کا ادبی مقام ملنا چاہیئے۔ ڈرامے کو دوسروں کے سہارے سے نہیں بلکہ اپنے ادبی اوصاف کی قوت سے ایک نئی زندگی مل سکتی ہے" B. SHAW کے بیان کی تائید انگریزی کے شاعر اور نقاد W.B. YEATS کے ایک معنی خیز جملے سے ہوتی ہے "ڈرامے کو اس کی عظمت لفظوں کی بدولت ملی۔ اور اب اسے شاندار مقام صرف لفظوں ہی کی بدولت

مل سکتا ہے؟

لفظوں کی یہی عظمت اور ان کا یہی شاہانہ مقام ہے جسے پہچان کر عہد الزبتھ کے ڈراما نگاروں اور خصوصاً شیکسپیئر نے ڈرامے کو ادبی عظمت بھی دی اور اس کی ادبی حیثیت میں وہ شاہانہ شکوہ بھی پیدا کیا جس کی طرف ابسن اور برنارڈ شا نے اشارتاً اور ڈیلس نے واضح لفظوں میں اشارہ کیا ہے۔ عہد الزبتھ کے ڈراما نگاروں نے ڈرامے کی فنی اہمیت کو پوری طرح محسوس کرتے ہوئے بھی اس کی ادبی اہمیت کو اس پر قربان نہیں کیا اور زبان و بیان کے حسن کو بھی ڈرامائی فن کے لازمی عناصر میں سے ایک جانا اور اسی ادبی احساس کا نتیجہ ہے کہ شیکسپیئر کے ابتدائی ڈراموں کے متعلق مبصروں نے یہ حکم لگایا ہے کہ انہیں محض ان کے حسن بیان کی وجہ سے حیات جاوداں ملی ہے۔ شیکسپیئر کے ڈراموں کی انہیں خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے برنارڈ شا نے دو باتیں لکھی ہیں جن سے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے کہ فنی اقدار سے زیادہ اپنی ادبی اقدار کی وجہ سے زندہ اور قائم ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ شیکسپیئر بحیثیت ایک خوش فکر اور نغز گو شاعر، ایک ولولہ انگیز خطیب، ایک سحر طراز فسانہ گو اور دل نواز مطرب کے بے مثل اور لاثانی ہے اور اپنے ڈراموں میں اپنے ان سب اوصاف سے سحر و طلسم کی کیفیت پیدا کرتا ہے کسی ایسے ڈرامے کا خالق نہیں بن سکا جسے ڈرامے کے فن کے لحاظ سے ایک مربوط اور مرتب وحدت کہا جا سکے یا جسے ڈرامائی فن کے علمی تقاضوں کا بہترین مظہر سمجھا جا سکے — دوسری بات یہ کہ شیکسپیئر کے ڈراموں کے مطالعے کے بعد سوائے چند سطروں کے (جو یقیناً ادبی لحاظ سے بھی زیادہ اہم نہیں ہیں) باقی سب جسے آسانی سے سمجھ لیتا ہے اور اس کے مقابلے میں عہد جدید کے زیادہ ڈرامے جنہیں اسٹیج پر انتہائی کامیابی حاصل ہوئی، ایسے ہیں کہ انہیں اسٹیج کے باہر لا کر سمجھنا بھی مشکل ہے — اور یہ سب کچھ شا کے نزدیک اس لئے ہے کہ ان ڈراما نگاروں نے ڈرامے کی ادبی قدروں کو نظر انداز کر کے اپنے آپ کو فنی قدروں کا پابند اور حلقہ بگوش بنا لیا ہے — یعنی ڈرامے میں لفظوں کی جو بنیادی حیثیت ہے اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔

ڈرامے کی فنی قدروں کے مقابلے میں اس کی ادبی قدروں کا جو مقام ہے اس کا اندازہ ایک طرف یہ دیکھ کر ہوتا ہے کہ دنیا کے عظیم ڈراما نگاروں نے ڈرامائی فن میں لفظوں کو یا بیان کے حسن کو کتنی اہمیت دی ہے اور دوسری طرف یہ دیکھ کر کہ ان مختلف چیزوں کے متعلق ان کا نقطۂ نظر اور انداز فکر کیا ہے جنہیں ڈرامے کے فن کی اساس یا اس کی فنی قدروں کا بڑا اہم جزو سمجھا جاتا ہے۔ ہم بحیثیت مجموعی ادبی تخلیق کے عمل کا تجزیہ کریں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ادب کی سطح خواہ کچھ بھی ہو ادیب، افسانہ نگار یا ڈراما نگار کی بنیادی دلچسپی کہانی سے، کہانی کے کردار سے یا کردار کے عمل سے نہیں ہوتی۔ بلکہ حقیقت میں وہ ان چیزوں کو مختلف وقتوں میں یا کبھی کبھی بیک وقت اپنے احساس اور جذبے کے اظہار کا وسیلہ بناتا ہے۔ ڈراما نگار کے دل میں زندگی کے مشاہدے سے کسی خاص تاثر کے ماتحت ایک جذبہ پیدا ہوتا ہے اور اس نے ایک خیال یا فلسفے کی صورت اختیار کی ہے۔ اسی جذبے، خیال یا فلسفے کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے وہ کہانی سے، کردار سے، اس کے عمل سے کام لیتا ہے اور یوں گویا یہ چیزیں تو اس کے تجربے کے اظہار کا ایک وسیلہ اور علامت بنتی ہیں۔ ان کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ڈی۔ ایچ۔ لارنس نے ان فنی مظاہر کو انسانی شعور کی علامتی تخلیقات یا مخلوق کہا ہے۔ ان کی حیثیت محض شاعرانہ تخیل یا تصور کی علامتوں کی سی ہے۔ جن ڈراما نگاروں نے ان علامتوں کو علامت کے بجائے حقیقت سمجھا انہوں نے ڈرامے کی ادبی حیثیت کو اس کی فنی حیثیت پر قربان کیا لیکن چونکہ بڑے فن کاروں نے ہمیشہ حقیقت اور علامت کا یہ امتیاز قائم رکھا ہے اس لئے ان کے ڈراموں نے ڈرامے کی ادبی قدروں کو زندہ رکھا ہے۔

ڈرامے کی ان ادبی قدروں نے اپنی حیات کو مستحکم بنانے کے لئے ڈرامائی فن کے ہر شعبے میں علامتوں سے مدد لی ہے اور ابسن اور چیخوف جیسے ڈراما نگاروں نے اس احساس کے تحت کہ لفظ اپنے روزمرہ کے لغوی مفہوم میں گہرے اور لطیف معانی اور مفاہیم کے حامل نہیں ہو سکتے انہیں علامتی سطح پر استعمال کرنا شروع کیا اور لفظ کو تصویر کی جگہ دے کر ہر طرح کی نزاکت اور لطافت کے اظہار کے لئے آسانی پیدا کر لی۔ عام ڈراما نگاروں نے کردار اور عمل کو مقصود بالذات بنا کر ان دونوں چیزوں کی علامتی حیثیت میں جو غیر ضروری اور غیر معمولی مفہوم پیدا کر دیا تھا، ابسن اور چیخوف نے حقیقت کی فطری سطح پر

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

سرودِ رفتہ: مولانا محمد علیؒ کی ایک قدیم تحریر

اکبر علی خاں

مولانا محمد علی صرف ہندوستان کی تحریکِ آزادی و حریت کے رہنما ہی نہیں تھے بلکہ تعلیم کے معاملے میں بھی ایک باغی اور انقلابی سوچ رکھتے تھے۔ انہیں ایک کامیاب ماہرِ تعلیم کہا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اپنی سیاسی مشغولیتوں کے ساتھ ساتھ علی گڑھ سے مایوس ہو کر جامعہ ملیہ کا جو عملی نقشہ مرتب کیا وہ ان کے بھرپور خلوص، توجہ اور لگن کی وجہ سے ہندوستان کے تعلیمی تجربات میں بہت اونچا مقام رکھتا ہے۔ وہ ہمارے سیاسی رہنماؤں میں اپنے نونہالوں کی تعلیم و تربیت کی ضرورت کو سختی سے محسوس کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ آزادی کی تحریک کے ساتھ ساتھ نئے ذہنوں کو ذہنی اور روحانی غذا بھی میسر آتی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود اُن کی رہنمایانہ زندگی میں بے باک جذباتیت کا کوئی نشان نہیں۔ وہ شاید اس حیثیت سے بھی منفرد قرار دئیے جائیں گے۔

خود ان کے ذہن کی تشکیل میں بی اماں کا ہاتھ برائے نام نہیں تھا۔ ان کی سوجھ بوجھ، ان کے انداز فکر اور ان کی تربیت کا اقرار مولانا محمد علی نے بھی سرسری طور پر نہیں کیا ہے۔ وہ پوری شدت سے بی اماں سے متاثر ہوئے۔ ان کی تعلیمی زندگی ختم ہونے کے بعد قومی مصروفیتوں میں بھی ان کا بہت بڑا سہارا بنی رہیں۔ وہ بڑی روشن دماغ اور پیش بیں ہستی تھیں۔ اسی لئے انہوں نے اپنے قدامت پرست خاندان کی شدید مخالفت کے باوجود محمد علی کو مغربی تعلیم کے سپرد کر دیا۔ شاید ان کا یہ اقدام ہندوستانی مسلمانوں کی بیداری کے لئے ایک بیش قیمت انعام تھا جس نے محمد علی کو وہ کچھ بنا دیا جو دوسری صورت میں ممکن نہ تھا۔

محمد علی کی قومی تحریکات اور مشغولیتوں میں جو رُخ بی اماں نے اختیار کیا تھا اس سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کے سامنے محمد علی کی دنیاوی زندگی ہی کا سدھار نہیں تھا بلکہ وہ اپنے بیٹے کو قوم کے سپرد کرنے کے لئے تیار کر رہی تھیں۔ "جان بیٹا خلافت پہ دیدو" صرف لفظی اور کھوکھلا نعرہ نہیں ہے، اس کے ذریعے بی اماں کے سارے جذبات اور ان کی بزرگ، ہمدرد اور وطن دوست شخصیت مجسم ہو کر سامنے آجاتی ہے اپنے تمام انقلابی ولولوں کے ساتھ۔

محمد علی بھی اپنے بچپن ہی سے تنگ و تاریک روایات کے حبسِ بیجا سے باہر نکلنے کے لئے بے چین نظر آتے ہیں اور ان کی قائدانہ شان کے نقوش بہت واضح طور پر مل جاتے ہیں۔ وہ سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود نہ رہ سکے۔ اور بچپن میں اُن کے ذہن نے جس روشنی کا اکتساب کیا وہ ہندوستان کے چپے چپے پر پھیل کر رہی۔

جو تحریر ہم آگے چل کر پیش کرنے والے ہیں اس سے اُس محمد علی کا سراغ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی جو مغربی تعلیم کو فقط پسند ہی نہیں کرتا تھا بلکہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اس دولتِ بیدار کو عام کر دیا جائے جس کا وہ خود سرمایہ دار ہے۔ اس تحریر سے تنگ اور محدود زندگی کی نفی بھی ہوتی ہے اور وسعتِ خیال کا پتہ بھی چلتا ہے۔

یہ تحریر مولانا محمد علی کی عام شاعرانہ بے کیفی کو پرکھنے میں بھی مددگار ہو سکتی ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں مجاہدانہ سج دھج اختیار کیے اس کے لئے ان کے ذہن میں بچپن ہی سے زمین ہموار ہو چکی تھی۔ اور وہ "امتحان دئے دو ندیم" کو کامل کو ادا کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ پاکبازی سے دلدادگی کا رجحان اور شاعرانہ رندی و بیباکی سے دوری کا اظہار، یہ دونوں باتیں اسی تحریر میں ان کے قلم سے نکل چکی ہیں۔ وہ کسی بھی "شعریت" کو زندگی میں دیکھنا اور شعریت شاعری میں بھی داخل کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا کلام ملاحظہ کیجئے۔ وہ تو امیر مینائی بھی نہ بن سکے۔ اسی لئے ان کے

ہاں شاعرانہ تاثرات، رنگ رنگ احساسات اور بالغ و بہار خیالات کا فقدان ملے گا۔ ان کی شاعری صرف وہیں جاندار نظر آتی ہے جہاں انہوں نے اپنے انسانی خلوص کے تحت شاعری کی ہے۔ اس میں سیاست بھی شامل ہے اور دین سے محبت بھی، تو م بھی موجود ہے اور قوم پر سب کچھ نچھاور کر دینے کا جذبہ بھی۔

یہ تحریر رام پور کے اسٹیٹ گزٹ کی اشاعت دوشنبہ ۲۲ ستمبر ۱۸۹۰ء مطابق ۷ صفر ۱۳۰۸ھ جلد ۲ نمبر ۳۸ صفحہ ۱۷ پر درج ہے۔

مولانا محمد علی نے اپنی عمر اپنی خود نوشت سوانح میں یوں لکھی ہے:

"جس خالق نے مجھے ۱۵ ذی الحجہ ۱۲۹۵ھ کو پیدا فرمایا تھا اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آج بتاریخ ۱۵ ذی الحجہ ۱۳۴۵ھ میں میں نے اپنی عمر کے پچاس سال پورے کئے"

یہ ہجری تاریخ پیدائش عیسوی حساب سے ۱۰ دسمبر ۱۸۷۸ء ہوتی ہے۔ گویا اوّل الذکر تحریر لکھتے ہوئے وہ اپنی عمر کے بارہویں سال میں تھے۔ انہوں نے ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ سے بی اے کیا۔ سن ۱۸۹۰ء میں انہیں مڈل کلاس کا طالب علم ہونا چاہئے۔ لیکن مولانا محمد علی کے کسی سوانح نگار اور خود مولانا نے بھی رام پور کے کسی اسکول میں طلب علم کا ذکر نہیں کیا۔ "حیات جوہر" میں عشرت رحمانی کا بیان ملاحظہ فرمائیے:

"ابتدا میں مولانا کو قرآن کریم کی مکمل تعلیم دلائی گئی اور جب اس کی تکمیل ہوگئی تو حسب اصول کے مطابق ضروری درسیات سے فراغت ہوئی بعد ازاں بریلی ہائی اسکول میں داخل کرا دیے گئے۔ ابنائے وطن کے لئے عموماً اور تمام اعزا و احباب کے لئے خصوصاً یہ طریقہ تعلیم پسندیدہ نہ تھا اور انگریزی تعلیم کے مضر اثرات سے خوف دلایا گیا اور اظہار حیرت و افسوس بھی ہوا مگر دھن کی پکی جلیل العزم روشن دماغ خاتون نے کسی کے کہنے سننے کی پرواہ نہ کی اور اپنی رائے کے مطابق اپنے بچوں کی تعلیم جاری رکھی۔

کچھ عرصہ بریلی اسکول میں رہے۔ چند سے بعد علی گڑھ کالج اسکول میں داخل ہو گئے اور وہاں نہایت شاندار کامیابی کے ساتھ اسکول سے فراغت کر کے مسلم اینگلو اورینٹل کالج میں اعلیٰ تعلیم پانے لگے۔ اس وقت تک یونیورسٹی کی داغ بیل بھی نہیں پڑی تھی جو اعلیٰ کامیابی اسکول میں حاصل ہوئی تھی اُس سے زیادہ اپنی خاص ذہانت اور طباعی کا ثبوت کالج میں دیا اور نہایت شان و شوکت کے ساتھ بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی"

(صفحہ ۴۵ کتاب مذکور)

رئیس الاحرار کے مشہور سوانح نگار رئیس احمد جعفری کی عبارت بھی دیکھتے چلئے۔

"بچپن کی دو بہاریں دیکھی تھیں کہ داغ یتیمی برداشت کرنا پڑا لیکن خوبی قسمت سے آغوشِ مادر سے جدا نہیں ہوئے تھے۔ بی اماں مرحومہ نے جس بے نظیر استقلال اور ایثار سے کام لے کر اپنے صاحبزادوں کو انگریزی تعلیم دلائی وہ یقیناً تاریخ نسائیات کا ایک اہم باب ہے۔ پہلے اردو فارسی کی تعلیم تو مکان ہی پر ہوئی پھر بریلی کے ہائی اسکول میں داخل کر دئے گئے" "سیرت محمد علی" ص ۳۰

گھر اور بریلی ہائی اسکول کے درمیانی وقفے کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ ان بیانات کے پیش نظر تو یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ گھریلو تعلیم کے فوری بعد وہ بریلی کے ہائی اسکول میں داخل کر دئے گئے۔ اس طرح رام پور کی کسی باقاعدہ درسگاہ میں ان کی موجودگی کا علم ابھی تک کسی کو نہیں۔ جو تحریر میں آج پیش کر رہا ہوں وہ اس راز سے بھی پردہ اٹھاتی ہے اور عظیم رہنما کی پرخلوص، پرمحبت اور پرعزم، باشعور زندگی کی داستان کی یہ کڑی اس شکل میں سامنے آتی ہے کہ بچپن کا محمد علی اپنی غور و فکر کی پرچھائیاں بھی واضح اور نمایاں طور پر آشکار کر دیتا ہے۔

گزٹ کے اسی شمارے میں انسپکٹر مدارس کی ایک رپورٹ بھی شریکِ اشاعت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ:

"مارچ ۱۸۸۸ء میں انگریزی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ شہر میں کھولا گیا اس مدرسے نے اس وقت تک جو ترقی کی ہے بہ وجوہ باقاعدہ اور قابلِ اطمینان ہوئی ہے"

رپورٹ میں آگے چل کر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ:

"ابتدا میں یہ صرف جماعت ششم تک تھا۔ پھر ۱۸۹۰ء میں درجہ مڈل بھی قائم کر دیا گیا۔" (مذکورہ رام پور گزٹ صفحہ ۱۲)

اسلئے ۱۸۸۹ء میں مولانا محمد علی کا اس مدرسۂ انگریزی کے درجۂ مڈل میں ہونا قرین قیاس ہے۔

بیعنہ نتیجے کا مطلب یہ ہے کہ اپنی تعلیم سے فراغت کے بعد علی گڑھ چھوڑ کر مولانا محمد علی رامپور آئے ہیں جس انگریزی اسٹیٹ ہائی اسکول کے پرنسپل مقرر کئے گئے تھے دراصل اُسی کے وہ اولڈ بوائے بھی تھے اور اُس نے بھی اپنے لائق منتظم کی تعمیر میں ایک رول ادا کیا تھا۔

یہ مضمون مولانا محمد علی کی ذہنی اور مادی زندگی کے دو رخ پیش کرتا ہے۔

۱۔ انگریزی تعلیم کے لئے فراخ دلی اور ذہنی وسعت۔

۲۔ گھریلو دینی تعلیم کے بعد اور بریلی ہائی اسکول میں داخلے سے پہلے درمیانی وقفے کی تعلیمی مشغولیت کا حال اسکول کے باقاعدہ طالب علم کی صورت میں۔

مولانا نے اپنی اس تحریر میں انگریزی تعلیم کی جس شدومد سے حمایت کی ہے اس کو رانہ فیصلہ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ مضمون مولانا حالی اور سرسید احمد خاں کے قلم سے نکلا ہوا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ انہیں کی بازگشت ہو۔ لیکن اس کو سمجھنے کے لئے بھی مولانا محمد علی کی عملی زندگی کو دیکھنا چاہئیے۔ جس کے بعد یقیناً یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ وہ بنیادی طور پر خالص مشرقی عادات وخصائل کے آدمی تھے۔ اپنے لباس میں بھی کسی نہ کسی حد تک اپنی عمر کے ہر حصے میں انہوں نے مشرق ومغرب کو برقرار رکھا ہے۔ وہ ان لوگوں میں کبھی نہ تھے جو مغربی ماحول کے سامنے سربسجود ہو جاتے ہوں اور احساس کمتری کا شکار اس انداز میں ہوتے ہوں کہ اپنی مادری زبان بولنا بھی انہیں گناہ معلوم ہو۔ انہوں نے خود سپردگی کی وہ روش بھی اختیار نہ کی جس میں قومی مزاج کی نفی اور مذہبی احترام سے لاپرواہی ثابت ہوتی ہو۔ وہ جذباتی ضرور تھے لیکن بگڑے ہوئے نہیں سنبھلے ہوئے، افراط و تفریط سے دور۔

اصل تحریر سے پہلے یہ بات اور بتا چلوں کہ انسپکٹر مدارس کی رپورٹ اور طالب علم محمد علی کے مضمون کی تاریخ ایک ہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں مدرسہ انگریزی کے سالانہ جلسے میں پڑھی گئی تھیں۔ اس لئے گزٹ میں دونوں جگہ ۱۰ / اگست ۱۸۸۹ء اندراج تاریخ ہے۔

مولانا محمد علی کا یہ مضمون اس لئے قابل قدر ہے کہ یہ ایک ذہنی انقلاب کا نمائندہ ہے اور ایک تعلیمی انقلاب کی یادگار ہے جو آگے چل کر ہندوستان کی سرزمین خصوصاً مسلمانوں کی دنیا میں آیا، لیکن یہ اس لئے بھی مزید قابل قدر اور اہم ہو جاتا ہے کہ یہ اب تک کی قدیم ترین معلومہ تحریر ہے جسے رئیس الاحرار مولانا محمد علی سے نسبت کا شرف حاصل ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس ایک چراغ سے ابھی کئی اور چراغ جلائے جا سکیں اور امید ہے کہ بطلِ حریت کی یہ قدیم ترین تحریر اپنی افادیت اور تاریخی اہمیت کے پیش نظر ملک کے ثقافتی سرمایہ میں اضافہ کا باعث ہوگا۔

مضمون محمد علی خاں طالب علم مدرسۂ انگریزی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جب ہم غور سے دیکھتے ہیں ایک بڑا حصہ ہماری ابتدائی عمر کا افسوسناک نمونہ دکھاتا ہے۔ ہماری ابتدائی تعلیم محض ناقص اور ادھوری بلکہ خطرناک مرحلہ ہے۔ ایک مدت بغیر معنی الفاظ کے تعلیم پاکر فقط قوتِ حافظہ کو کام میں لاتے ہیں، فکر و غور کا کوئی موقع نہیں ملتا۔ غرض کرنے کے عادی نہیں ہوتے۔ یہی سبب ہے کہ فکر و تامل کے معرکے میں ہماری عقل غیر مفید اور فکر نارسا ثابت ہوتی ہے۔ وہی ابتدائی زمانہ عجب زمانہ ہے، جس میں دل و دماغ صاف اور غیر مکدر ہوتے ہیں۔ فکر و غور کرنے کی عمدہ اور مضبوط بنیاد اسی وقت قائم ہو سکتی ہے۔ اس قوت کے پیدا ہو جانے سے شائستگی، تہذیب، علم و ہزار انواع اقسام کی دولت پر ثابت قدمی سے تصرف کر سکتے ہیں۔ اور جو باقی زندگی کہ ہم کو اس دنیا میں بسر کرنا ہے نہایت فارغ البالی سے بسر

گر سکتے ہیں۔ لیکن ہم ایسے اقبال مند کہاں تھے جو یہ دولت ہمارے ہاتھ آتی۔ ہم کو تو اوّل ہی حسن و عشق کی سوسائٹی میں شامل ہونا پڑا۔ قیس و فرہاد کی آشفتہ حالی کا نقشہ لیلیٰ و شیریں کے خوبی و جمال کی تصویر ہماری تعلیم کا جزو سمجھی گئی اول جب ہی مکتب میں قدم رکھا کسی کے یہ شعر بر زبان تھا:

اے داغ بر دل از غم حال تو لالہ را
شرمندہ ساخت آہوئے چشمت غزالہ را

اور کوئی یہ شعر ازبر پڑھتا:

ما مقیمان کوئے دلداریم رخ بدنیا و دیں نمی آریم

یہ پرانے فیشن کی (دقیانوسی) تعلیم ہے۔ جس تعلیم میں حکایاتِ عشق آمیز اور فسانہ ہائے جنوں خیز داخل ہوں اس سے بہتر نتیجے کی امید رکھنا محض فضول خیال ہے۔ بلکہ سادہ اور صاف طبیعت کو بڑے [illegible] رنگ میں رنگتی ہے۔

ہر تعلیم کے واسطے قدیم ہو یا جدید طبیعت کا یکسو ہونا بہت ضروری بات ہے۔ شاعرانہ خیال کی پابندی یا عشقیہ شعر و سخن کا مطالعہ طالب علم کے واسطے خراب اثر پہنچاتا ہے جیسے رداءت موسم، ہوا کو اور ہوا طبیعت کو اور طبیعت جسم کو اور جسم جان کو۔ تعلیم جدید کی جو ایشیائی رنگ سے بالکل سادہ اور جس کے اصول نہایت قیمتی اور قابل قدر ہیں ہمارے واسطے نہایت ضرورت ہے جیسے نابینا کو بینائی کی۔ باوجود کسی قدر تعلیم قدیم پانے کے ہنوز نامبارک لقب نیم وحشی انسان کا ہم سے واپس نہیں ہوا ہے۔ لیکن اب زمانہ بدل چلا ہے، زمانہ پہلے سے غیر ہے۔ مگر پیشتر ہم کو اپنی عادت کی اصلاح کرنا فرض ہوگی۔ ہماری رفاہ اور صلاح کا سارا سامان مہیا ہے، ہماری حالت بھی بدل جائے گی، ترقی کے زینے پہ قدم جمائیں گے اور انشاء اللہ ضرور ترقی مدارج کو طے کریں گے۔

خدا کے فضل سے عالی جناب جنرل محمد اعظم الدین خاں صاحب بہادر وائس پریذیڈنٹ نے ان ضرورتوں کو ملاحظہ فرما کر یہ مدرسہ علوم جدید نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ قائم کرایا۔ جناب ممدوح کی دلی توجہ اس مدرسے کی سرپرستی میں مصروف ہے۔ یہ ہونہار و تعلیم یافتہ نوجوان کا فرض ہے کہ اپنی عمدہ کوشش سے اپنی اعلیٰ لیاقت کا ثبوت جناب محتشم الیہ کے حضور میں پیش کرے۔ اس روز عالی جناب اپنی خاص توجہ کا آخری نتیجہ ملاحظہ فرما کر کس درجہ اظہار خوشنودی فرمائیں!

اے خدا جلد وہ مبارک دن دکھلا

محمد علی طالب علم مدرسہ انگریزی رام پور اسٹیٹ

۱۸ راگست ۱۸۹۰ء

★

رضا ساہ پہلوی کے مزار پر

ساہی محافظ دستہ کی سلامی (ایران)

فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں :

(دورۂ ایران و ترکی)

فیلڈ مارشل اپنے شاہی میزبان ، شہنشاہ ایران کے ساتھ
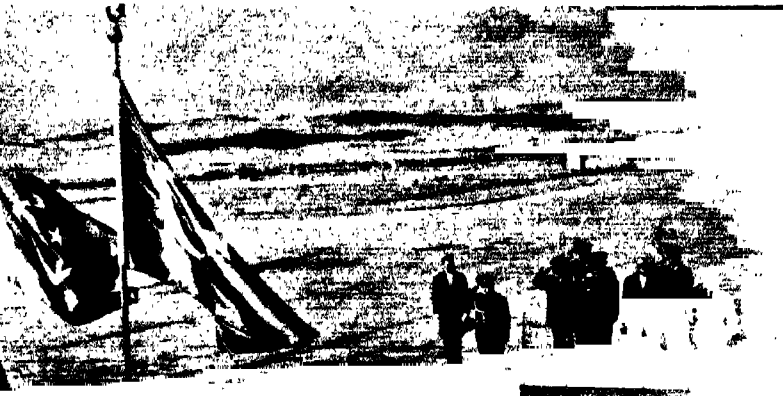
اتاترک کو خراج عقیدت
(مزار کی طرف روانگی)

ترکی پرچم کی سلامی

۱ :

۲ :

صدر آئزن ہاور پاکستان میں

۱ : صدر پاکستان کے خیر مقدم کا جواب
۲ : شاہی سواری
۳ : فضا سے کورنگی کی نوآبادی کا نظارہ

۳ :

۴ :
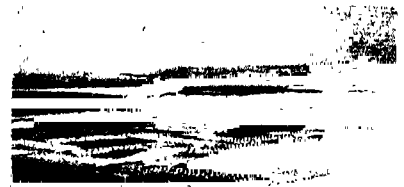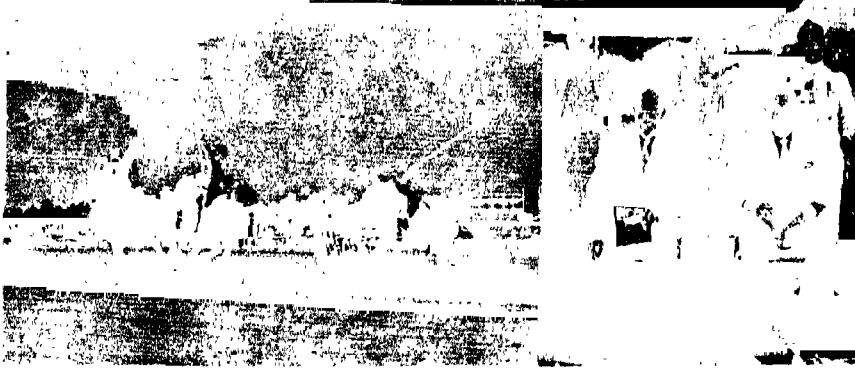
۴ : محافظ دستہ صدر پاکستان (مظاہرہ نیزہ بازی)
۵- ''آئی لائیک آئیک''
۶ : ''خوش آمدید''

۵ :

اک شمع رہ گئی تھی....

جمیل نقوی
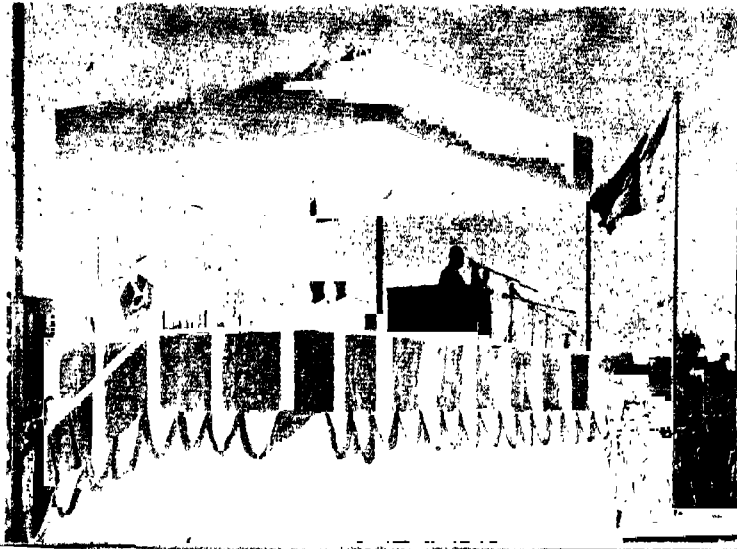
بزمِ سخن آج پھر ماتم میں ہے۔ اسد ملتانی جو سے حالی، اکبر اور اقبال کے دور کی یادگار تھے ہم سے رخصت ہو گئے۔ اس جہان کو چلے اقبال ہی کے الفاظ میں، بزمِ ہستی کے سب مسافر ہم نشیں ہیں۔ مرحوم کو ماہِ نو کے ساتھ ایک ربطِ خاص تھا اور وہ ہمیشہ بعد شوق اسے اپنے رشحاتِ قلم سے مستفید فرماتے رہے۔ ہم آج اپنی محرومی کو بڑی شدت سے محسوس کر رہے ہیں جو تمام دنیائے ادب کی محرومی بھی ہے۔ ہم ذیل میں مرحوم اسد ملتانی کے متعلق ایک مختصر نگارش پیش کر رہے ہیں جس میں ان کے سوانح کے ساتھ ساتھ ان کے کلام کے خدوخال ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے (مدیر)

محمد اسد خان اسد ملتانی ۱۳ر دسمبر ۱۹۰۲ء کو کوی افغانان ملتان شہر میں پیدا ہوئے ـــــ نومبر ۱۹۵۹ء بمقام راولپنڈی داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون۔ ان کے والد خان غلام قادر خان قوم افغان شیرانی سے تعلق رکھتے تھے۔ اسد ملتانی مرحوم نے مشن اسکول ملتان اور گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم پائی۔ ۱۹۲۲ء میں بی۔اے کیا۔ ۱۹۲۶ء میں امتحان مقابلہ میں کامیاب ہو کر گورنمنٹ آف انڈیا سیکرٹریٹ میں ملازم ہوئے۔ فارن اینڈ پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ میں اسسٹنٹ اور سپرنٹنڈنٹ رہے۔ پاکستان بننے کے کچھ دنوں بعد وزارت ریاستہائے سرحدات میں اسسٹنٹ سکرٹیری مقرر ہوئے، اور آخر وقت تک اپنے فرائض منصبی کو بڑی دیانت اور خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔

اسد مرحوم بڑے مرنجان مرنج اور ملنسار بزرگ تھے۔ ان کی نظر اردو اور فارسی شاعری پر بہت وسیع تھی۔ اردو کے علاوہ کبھی کبھی فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے اور اکثر اچھے شعر نکال لیتے تھے۔ کراچی آنے کے بعد ہی، غالباً ۱۹۴۹ء میں، میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ ایک شاعر کی حیثیت سے خواہ ان کا مقام کچھ ہی ہو لیکن بحیثیت ایک انسان انھوں نے مجھے ہمیشہ متاثر کیا۔ ان کی خاکساری کم سخنی، بزرگانہ شفقت اور ایک ایسا خلوص جو عام طور پر میسر نہیں آتا، ان سب خصوصیتوں نے مل کر ان کی شخصیت کو بڑا پُرکشش اور محبوب بنا دیا تھا۔ اس پر خدا ترسی اور اسلام دوستی مستزاد تھی۔

مرحوم اسد ملتانی آج کی دنیا میں اگلے وقتوں کے بزرگوں کا ایک عمدہ نمونہ تھے۔ مغربی تعلیم نے انہیں مشرقی تصورات اور اسلامی معاشرت کا اور بھی زیادہ گرویدہ کر دیا تھا۔ انہیں اسلام اور مسلمانوں سے عشق تھا۔ قرآن اور حدیث پر انہیں کامل ایمان تھا۔ اور اس سلسلہ میں وہ کوئی بات سننے کو تیار نہ ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ ان کے ایک دیرینہ عزیز دوست نے ایک مشہور رسالہ میں جب اس مسئلہ پر ایسے خیالات کا اظہار کیا جن سے اسد مرحوم کو اختلاف تھا تو مرحوم نے اپنے مکان پر ہفتہ وار جلسوں کا انتظام کیا اور ایک مشہور عالم دین کو اس "فتنہ" کو دبانے کے لئے مواعظ کی دعوت دی۔ پند و موعظت کا یہ سلسلہ اُن کے راولپنڈی جانے تک جاری رہا۔

خود اسد ملتانی صاحب کے بیان کے مطابق انہوں نے نو دس برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا لیکن کالج میں پہنچنے کے بعد باقاعدگی سے شاعری کرنے لگے تھے۔ ۱۹۲۱ء میں کالج میں نظم گوئی کا ایک مقابلہ ہوا تھا جس میں ان کی نظم کو اول قرار دیا گیا تھا اور انعام بھی ملا تھا۔ مقابلہ میں داخل کرنے سے پہلے انہوں نے اپنی نظم علامہ اقبالؒ کی خدمت میں پیش کی تھی جس پر انہوں نے ازراہِ کرم اصلاح فرما دی اور نظم کہیں سے کہیں پہنچ گئی، اور انعام کی مستحق قرار پائی۔ زمانہ طالب علمی میں سخن وری اور سخن فہمی کالج کی چار دیواری تک ہی محدود تھی لیکن یہی وہ زمانہ تھا جبکہ اسد ملتانی نے مشقِ سخن بہم پہنچائی اور فنِ شعر پر عبور حاصل کیا۔ تعلیمی مشاغل سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے باقاعدہ شعر کہنا شروع

کر دیا۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی اکثر نظمیں لکھیں جنہیں افغانستان کے رسائل میں بھی اکثر نقل کیا گیا۔ روزنامہ "زمیندار" اور "انقلاب" میں بھی نظمیں شائع ہونے لگیں۔ نیرنگ خیال، ہمایوں اور دوسرے ادبی رسائل میں بھی بالالتزام لکھنا شروع کیا۔ لیکن ۱۹۲۵ء سے زیادہ تر نظمیں رسالہ معارف اعظم گڑھ میں ہی چھپتی رہیں۔ یا پھر تقریباً ۱۹۳۸ء سے رسالہ "طلوع اسلام" میں باقاعدگی سے لکھنا شروع کیا اور یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ "ماہِ نو" میں بھی وقتاً فوقتاً ان کا کلام شائع ہوتا رہا۔ لیکن بجز "مرثیہ اقبال" اور "بانگِ حرم" کے جنہیں مرحوم نے کتابی شکل میں شائع کیا تھا، ان کا مجموعۂ کلام ابھی تک اشاعت پذیر نہ ہو سکا۔ سنا ہے وہ عرصے سے اپنے کلام کو مجموعہ کی شکل میں مرتب کر رہے تھے مگر "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

یوں تو اسد ملتانی نے صنف غزل کو بھی بہت کچھ نوازا ہے لیکن ان کا اصل میدان نظم ہے۔ فی الحقیقت وہ بنیادی طور پر نظم ہی کے شاعر تھے اور ان کا بیشتر ادبی سرمایہ نظم ہی کی صورت میں ہم تک پہنچا ہے۔ لیکن ان کی نظمیں جدید شعرا کی نظموں سے باعتبار مزاج اور باعتبار انداز بیان یکسر مختلف ہیں۔ ان کی نظموں کو مذہبی، سیاسی، وطنی، اور اصلاحی وغیرہ عنوانات کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

اسد ملتانی کی نظموں میں اکبر کا طنز، حالی کے پند و نصائح قومی درد اور اقبال کا تفکر اور حب الوطنی کا ایک نہایت عمدہ امتزاج ملتا ہے۔ موجودہ دور میں وہ واحد شاعر تھے جس نے حالی اور اقبال کی روش شاعری کو نہ صرف کامیابی کے ساتھ برتا بلکہ اس کو آگے بڑھایا اور اس کی مصلحانہ شان برقرار رکھی۔ قومی شاعری جدید انداز میں بھی کی جاتی ہے لیکن وہ دل سے زیادہ دماغ کی شاعری ہے۔ حالی اور اقبال کی شاعری میں جو بات ہے وہ جدید قومی شاعری میں نہیں ملتی۔ حالی اور اقبال براہِ راست قلب و روح کو متاثر کرتے ہیں۔ اسد ملتانی بھی اسی ڈگر پر چلے ہیں اور انہوں نے بھی اپنی شاعری کی بنیاد خلوص اور حب الوطنی پر رکھی ہے۔ انہوں نے یہی باتیں بڑی سادگی اور سلاست کے ساتھ بڑے مخصوص انداز میں پیش کی ہیں۔ خواہ غزل ہو یا نظم ان کے یہاں دونوں کا مزاج یکساں ہے۔ وہی اصلاح کی کوشش، اسلام اور مسلمانوں کی بہبودی و بہتری کے مضامین، مذہبی اور سیاسی مسائل کا بیان۔ قومی اور ملی عظمت کے ترانے اخلاقی اور اجتماعی قدروں کا پرچار۔ حسن عمل کی تلقین، بنی نوع انسان کا درد۔ یہ تمام موضوعات یوں دیکھنے میں تو بہت آسان نظر آتے ہیں مگر انہیں شعر کے قالب میں اس طرح ڈھالنا کہ شاعرانہ وقار بھی قائم رہے اور عام فہم انداز میں بات نہ صرف پسندیدہ طور پر ادا ہو جائے بلکہ قاری اور سامع کے دل و دماغ پر وہ تاثر بھی پیدا کر سکے جو اس کا اصل مقصود ہے۔ یہ بڑا مشکل کام ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر شاعری صنعت گری ہو جاتی ہے۔ اور اگر شاعر کا خلوص کارفرما نہ ہو اور اس کے اپنے دل و دماغ پر موضوع کلام کا بھرپور وجود نہ ہو اور اس کی تمام جزئیات پر اسے عبور حاصل نہ ہو تو ایک مصرعہ ترتیب دینا بھی مشکل ہو گا۔ اکبر، حالی اور اقبال کی طرح اسد ملتانی نے بھی یہ ہفتخواں بڑے اہتمام سے طے کیا ہے اور اکثر و بیشتر وہ خاطر خواہ طور پر کامیاب ہوئے ہیں۔

یوں تو اسد ملتانی نے غزلیں بھی کافی تعداد میں کہی ہیں اور عام روش سے ہٹ کر اچھے اچھے شعر نکالے ہیں لیکن ان کا اصل میدان نظم ہے جہاں ان کے فطری جوہر پوری آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہوئے ہیں خصوصاً مسائل حاضرہ پر ان کی بعض نظمیں بڑی کامیاب ہیں۔ مثلاً جب شہید ملت مرحوم کی قیادت میں قراردادِ مقاصد منظور کی گئی تو اسد ملتانی نے اس بنیادی اقدام کا بڑے لطیف انداز میں خیر مقدم کیا ہے۔

اب پھر کسی کے حسن کا چرچا ہوا تو ہے
اس دور میں بھی عشق کا دعویٰ ہوا تو ہے
تو مضطرب کہ جلوہ ابھی عام کیوں نہیں
میں اس پہ مطمئن کہ تقاضا ہوا تو ہے
پھر ہو چلی ہے جرأتِ پرواز کی امید
روئے نگاہ سوئے ثریا ہوا تو ہے
آثار سربلندی اسلام ہیں عیاں
دنیا و دیں کا سلسلہ یکجا ہوا تو ہے
انجام کے لئے بھی خدا کارساز ہے
آغاز کار حسب تمنا ہوا تو ہے
افرنگ سے حجاز کی جانب پھرا ہے رخ
قبلہ بنائے قوم کا سیدھا ہوا تو ہے

ایک اور موقع پر انہوں نے کیسی اچھی بات کہی تھی ؎

ملت کی عمارت ابھی تیار نہیں

سامان تو موجود ہے معمار نہیں

ترشی ہوئی اینٹوں کے کچھ انبار تو ہیں

اک سیسہ پلائی ہوئی دیوار نہیں

اسد ملتانی کی ملی نظموں میں مجھے ان کی نظم "آئینِ نو" سب سے زیادہ پسند ہے۔ جو ۱۹۵۶ء میں انہوں نے نیا دستور جاری ہونے پر لکھی تھی اس کا ایک ایک لفظ کیف و اثر میں ڈوبا ہوا ہے ؎

سبز ہوئی شاخ شاخ پھول بنی ہر کلی

باغ ہوا باغ باغ، بادِ بہاری چلی

تاکہ عروسِ بہار اس پہ ہو گرمِ خرام

سبزۂ نورستہ کا فرش بچھا مخملی

صحنِ گلستاں میں پھر ذکرِ محبت چلا

دل کے شبستاں میں پھر شمعِ مسرت جلی

تھی افقِ شرق پر چھائی جو کالی گھٹا

اس کی سیاہی ذرا رنگِ شفق میں ڈھلی

دورِ تذبذب گیا، ختم ہوا اضطراب

دل کو سکوں مل گیا، دور ہوئی بیکلی

آج ہوئی رونما حریت کاملہ

سایۂ اغیار کی سر سے مصیبت ٹلی

اقبال کو تو اپنا امام تصور کرتے تھے انہوں نے اپنی شاعری کا نصب العین ہی اس بات کو قرار دے رکھا تھا کہ اقبال کے "نورِ بصیرت" اور "سوزِ عشق" کو عام کریں۔ ان کی کامیاب ترین نظمیں وہی ہیں جہاں انہوں نے روحِ اقبال سے فیض حاصل کیا ہے۔

قائدِ اعظم کے متعلق یہ اشعار تمام تر حقیقت ہی کے آئینہ دار ہیں:

قائدِ اعظم نے ملت پر یہ احساں کر دیا

عقل و تدبیر و سیاست کو مسلماں کر دیا

ہے کمی کوئی تو کوتاہی ہماری ہے اسد

اس نے تو آزادیٔ کامل کا ساماں کر دیا

شاعرِ مشرق نے پاکستان کا دیکھا تھا خواب

قائدِ اعظم نے ساماں کر دیا تعبیر کا

اگرچہ اسد ملتانی نے اپنی نظمیں ایک اضطراری کیفیت اور وقتی تاثر کے ماتحت لکھی ہیں لیکن با وجود ان کی ایک مستقل حیثیت بھی ہے۔ وہ آج بھی اتنی ہی نئی ہیں جیسی وہ تخلیق کے وقت تھیں۔ مجھے یقین ہے ہماری ملی شاعری میں انہیں ایک با وقعت مقام حاصل رہے گا یا پھر وہ نظمیں جو مذہبی مسائل پر لکھی ہیں۔ ان کی دائمی افادیت سے کسی وقت بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

"سفینۂ عرب" کے عنوان سے حاجیوں کی پاکستان سے روانگی کا سماں کتنے دلکش انداز میں پیش کرتے ہیں ؎

وہ دن بھی آخر آ گیا	کہ جس کا انتظار تھا
ادھر حرم کا قافلہ	اُدھر عزیز و اقربا
دلوں میں خیر کی دعا	سلام شوق برملا

یہی تھا سلسلہ کہ جب

چلا "سفینۂ عرب"

وہ دوستوں کی انجمن	وہ ہم نشیں وہ ہم سخن
وہ دلبرانِ سحر فن	وہ گھر وہ کشت و چمن
عزیز خطۂ وطن	لگی دلوں میں کیا لگن

کہ چھوڑ کر یہ سب کے سب

چلا "سفینۂ عرب"

ایسے ہی اردو کو قومی زبان بنانے کی کس خوبصورتی کے ساتھ وکالت کرتے ہیں ؎

ہر چند کہ اردو بھی محاسن میں چلی

اغیار سے جو داد اُسے ملنی تھی مل لی

کیا رنج کی بات اس سے اگر چھٹ گئی دلی

ہے اب بھی جہاں سے لئے سرمایۂ ملی

ارباب وطن ہمدم و ہمراز ہیں اس کے

یک دل ہیں اگر دیس نے ہم آواز ہیں اس کے

اور آگے چل کر نظم کو اس طرح ختم کرتے ہیں ؎

واپس وطن آئی ہے مسافر نہیں اردو

اس ملک کی مالک ہے مہاجر نہیں اردو

حالانکہ اسد ملتانی بنیادی طور پر میدانِ نظم کے ہی یکہ تاز ہیں لیکن غزل بھی ان کی شاعرانہ صلاحیتوں سے کافی فیضیاب ہوئی

(باقی صفحہ ۶۳ پر)

اِک فرد، اِک دَور

(مولانا عبدالمجید سالک مرحوم کی یاد میں)

جگن ناتھ آزاد

پھر آئی ہے اردو کے گلستاں میں خزاں آج
پھر ہے لبِ افکار و حوادث پہ فغاں آج
پھر سینۂ الفاظ سے اٹھنے لگا دھواں آج
پھر دیدۂ معنی سے ہوا خون رواں آج

پھر نالہ و زاری ہے صحافت کی زباں پر
ماتم کا ہے اک شور ظرافت کی زباں پر

اے بزمِ وفا! کون تجھے چھوڑ چلا ہے
ہر لب پہ جو فریاد ہے نالہ ہے بکا ہے
دنیائے سخن کون الگ تجھ سے ہوا ہے
اے شعر و ادب! تم پہ یہ کیا وقت پڑا ہے

ماتم ہے یہ آزاد! نئے دور کا ماتم
اک فرد کا ماتم ہے کہ اک دور کا ماتم

محفل کو گیا چھوڑ کے محفل کا وہ محبوب
ہر بات رہی جس کی پسندیدہ و مرغوب
جس کی نگہِ فیض سے ناخوب ہوئے خوب
کہتے تھے جسے اہلِ نظر کعبۂ مطلوب

اب کعبۂ مطلوب وہ پائیں تو کہاں ہم
اے وحشتِ دل بول کہ جائیں تو کہاں ہم

جس بزم میں تازہ تھا بخاری کا ابھی غم
اختر کا الم، حسرت و تاثیر کا ماتم
کیفی کی جہاں یاد ہوئی تھی نہ ابھی کم
جس بزم میں اک دردِ مسلسل کا تھا عالم

اس بزم سے سالک بھی ہوئے آج روانہ
یا بزم سے ہے بزم کا سرتاج روانہ

وہ پیار کا شفقت کا عنایت کا خزینہ
اخلاص و محبت کا مودّت کا خزینہ
وہ مہر و وفا کا وہ مروّت کا خزینہ
مٹتی ہوئی دیرینہ شرافت کا خزینہ

آخر کو لٹا گردشِ ایام کے ہاتھوں
یا صبح کی تنویر مٹی شام کے ہاتھوں

کتنوں کو شرابِ سخن و شعر پلا کر
کتنوں کو حسیں نثر کے جادے پہ لگا کر
کتنوں کو نشانِ منزلِ مقصد کا بتا کر
کتنوں کو غمِ عشق کے آداب سکھا کر

ہر راہ میں نقشِ کفِ پا چھوڑ گیا ہے
قندیلِ محبت کی ضیا چھوڑ گیا ہے

اے وقت! خبر ہے کہ وہ کیا دے کے گیا ہے
کیا شے وہ تجھے مردِ خدا دے کے گیا ہے
اک دل وہ تجھے درد بھرا دے کے گیا ہے
اک روشنیٔ مہر و وفا دے کے گیا ہے

جو دردِ ازل اُس کی زباں پر تھا ترانہ
وہ درد ہے اب تیرا گراں مایہ خزانہ

سالک کے حسیں طرزِ بیاں، طرزِ ادا سے
اک سوز میں ڈوبی ہوئی پُر کیف نوا سے
جو دے کے گیا ہے تجھے اس درسِ وفا سے
اے نسلِ نوی اس کے تفکر کی ضیا سے

ممکن ہو تو کسبِ ادب و کسبِ ہنر کر
تاریکیٔ شب ہائے غمِ دل کی سحر کر

اے خاکِ وطن! اے منزلِ مقصودِ محبت
قرباں ترے ذرّوں پہ مرے اشکِ ارادت
مانا کہ ہے ناچیز بہت میری عقیدت
پہلے بھی کچھ آسان نہ تھی تیری زیارت

اس راہ میں اب ایک رکاوٹ سی پڑی اور
اک ٹوٹ گئی رشتۂ اُلفت کی کڑی اور

★

ڈرامہ:

وہ لوگ

ہاجرہ مسرور

کردار:

بابا خیرو: لمبی سفید داڑھی، سیاہ رنگت، سامنے کے دو دانت ٹوٹے ہوئے ہیں۔ سیاہ تہمد اور کھدر کی آستینوں والی صدری جسم پر۔ ننگے پاؤں۔ گلے میں کپڑے سے منڈھا ہوا تعویذ۔

اماں: خیرو کی بیوی۔ ادھیڑ عمر کی دُبلی پتلی عورت۔ ملگجے سیاہ کپڑے کی پٹی بندھی ہوئی ہے سر پہ۔ ڈھیلے ڈھالے چوڑی دار پاجامے اور لمبے کرتے میں ملبوس۔ سر پر دوپٹہ جس میں سے کندھوں پر پڑے ہوئے کھچڑی بال جھانکتے ہیں۔ گلے میں موٹے منکوں کی تسبیح۔

زینب: ان کی بڑی بیوہ بیٹی۔ عمر تیس سال۔ کالے دوپٹے لمبے کرتے اور چھوٹے پائنچوں کی سیاہ شلوار پہنے ہوئے ہے۔

جنت: چھوٹی بیٹی۔ عمر بیس سال جسم پہ سستے ریشم کی قدرے میلی شلوار اور قمیص۔ کانوں میں چاندی کی بالیاں اور ہاتھوں میں چاندی کی چوڑیاں۔

رجو: زینب کی بارہ تیرہ سال کی لڑکی۔ بے ڈھنگی شلوار اور ڈھیلی سی قمیص پہنے، سر پہ گز بھر کا میلا دوپٹہ، ننگے پاؤں، بکھرے ہوئے بال ہر بات پہ ہنس کر لاپروائی ظاہر کرتی ہے۔

صمد: زینب کا لڑکا۔ عمر دس سال [illegible] میں ملبوس۔ پاؤں میں کینوس کا پرانا جوتا۔ جلدی جلدی بولنے [illegible]

گلو: بابا خیرو کا بیٹا۔ عمر سترہ اٹھارہ سال۔ نئی نئی پھوٹی ہوئی داڑھی مونچھیں۔ جسم پہ پاجامہ اور کرتہ، سر پہ [illegible] کی گول ٹوپی۔ پاؤں میں جوتا۔

ننھا: جنت کا ڈیڑھ سال کا بچہ

مقام: ایک چھوٹا قصبہ

زمانہ: جو چاہے سمجھ لیجئے۔

منظر:

(پردہ اٹھتا ہے تو ایک جھونپڑی نظر آتی ہے جس کا صرف سامنے کی طرف ایک دروازہ ہے۔ جھونپڑی کے اگلے حصے پہ پھوس کا چھپر ہے۔ اس چھپر تلے ایک طرف بہت کر مٹی کا چولھا بنا ہوا ہے جس میں بے تحاشہ راکھ بھری ہوئی ہے۔ اس کے قریب ہی ذرا ہٹ کے ٹوٹی ہوئی چند سوکھی ٹہنیاں، دو چار اُپلے اور سوکھے پتے ڈھیر ہیں۔ ساتھ ہی چند المونیم کے برتن اور مٹی کا گھڑا پڑا ہوا ہے۔ دائیں بائیں مٹی کی کچی چار دیواری پہ اُپلے سوکھ رہے ہیں۔ صحن میں ایک طرف مٹی کے بدھنے اور روڑے ڈھیر ہیں۔ یہ ہلکی سردیوں کی ایک شام ہے، سورج ابھی غروب نہیں ہوا اس لئے زرد ہوتی ہوئی دھوپ سے چھپر کا کچھ حصہ اور بائیں ہاتھ کی دیوار روشن ہے۔ اس دیوار سے ٹیک لگائے اماں حقہ سامنے رکھے بیٹھی اونگھ رہی ہے۔ چھپر تلے کھاٹ پہ جنت کنگھی کر رہی ہے لیکن کنگھی سے زیادہ وہ اپنے چہرے کی طرف متوجہ ہے۔ بار بار وہ چھوٹے سے شیشے میں جھک کر اپنا چہرہ دیکھتی ہے، کبھی ناک کی کیل گھماتی ہے، اور کبھی گریبان کے چاندی کے بٹنوں کو چھوتی ہے۔ اس دوران میں اکثر وہ نظر اٹھا کر باہر کی طرف دیکھتی ہے جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہو۔ زینب چرخے کے پاس اکڑوں بیٹھی ہوئی تکلے کو ٹنکیاں لگا رہی ہے اور بار بار غصے اور حقارت سے جنت کی طرف دیکھتی جاتی ہے۔ — چند لمحے بعد اماں [illegible] سے جھک کر حقے کی نے ہونٹوں میں دباتی ہے اور پھر کھانسنا شروع کر دیتی ہے۔)

اماں: (کھانسی سے نجات پاکر لمبا سانس لیتے ہوئے بڑی بیٹی زینب سے) زینب، چولھے میں آگ ڈال دے ذرا سی۔

زینب: ہاں وہ موئی جنت سے کہا تھا تب کہ چولھا سلگا دے۔ اب اسی

سے آگ مانگو۔ گھنٹے بھر سے بیٹھی مانگ پٹی کر رہی ہے۔

جنت: (ہاتھ پھیلا کر لڑنے کے انداز سے) ابھی سے چولھا سلگا دوں؟ جیسے بڑے پلاؤ قورمے پکنے ہیں۔

زینب: (منہ بنا کر) ہنہ تیری سسرال میں تو روج (روز) پلاؤ پکتا ہے نا!

جنت: لے، پھر میری سسرال کا نام لیا!— دیکھ لے اماں! میں کوئی کہتی ہوں میرے گھر روج (روز) پلاؤ پکتا ہے! ہاں جب کوئی مہمان آئے تب تو جرور (ضرور) پلاؤ پکتا ہوا۔

(غصہ کر کے آئینے میں منہ دیکھتی ہے اور چوٹی گوندھنے لگتی ہے)

اماں: اور کل دال نہیں پکوائی تھی اس کمیال سے کہ تیرا میاں آتا ہوگا۔

زینب: اور گھی سے بگھار بھی تو لگایا تھا — کیسی منت کی تھی بابا نے فضلو پرچونئے کی تب اُدھار دال اور گھی اس نے دیا تھا

(جلدی جلدی آٹے پر مکیاں لگاتی ہے)

جنت: (گندھی چوٹی پشت پر پھینک کر) ہاں تیرے تو دل پر لکھ گیا۔ اگر وہ آکر گھی سے بگھاری دال کھا لیتا تو جانے کتنے جکر (ذکر) کرتی دنیا بھر میں۔

زینب: (ہونٹوں پر حیرت سے انگلی رکھ کر) ہائے ری جنت تو تو یوں ہی بگھری جاتی ہے۔ میں نے تو یوں ہی کہا تیری بات پر— (سر جھکا کر دوبارہ آٹے کی طرف متوجہ ہو کر) تیرا میاں بیچارہ کون روج روج آتا ہے۔ میں نے تو آپ اماں سے کہا تھا کہ دال جرور پکے، جنت کا میاں ایک دن کو آئے اور روکھی روٹی کھا کر جائے کیسی سرم (شرم) کی بات ہے۔

جنت: (منہ پھلا کر مگر نسبتاً کم غصے میں) کل اس کو روکھی روٹی دینا سرم (شرم) کی بات تھی اور آج؟ آج تو وہ جرور (ضرور) پہنچے گا — پھر؟

اماں: (تھوڑا سا کھانس کر) تیرے سامنے مہرو کو پرچونئے کی دکان پر نہیں بھیجا تھا؟ اب وہ اُدھار نہ دے تو تیری میا کیا کرے۔ (کمر پکڑ کر اٹھتے ہوئے ٹھنڈی سانس بھر کر جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہو کر) تیرا بابا کیا کرے؟ اپنے حصے کے رزق پر تو سمجھنے والے بابا خضر کا سایہ پڑ گیا جیسے — کتنے دن ہوگئے آج؟ کوئی نہ آیا۔ (کچھ سوچ کر تیز آواز میں) "لا" جینب وہ [illegible]

کی دیگچی اٹھا دے، اسے رکھ کر تو پھر چوتیا دال [illegible]۔

جنت: (کھاٹ سے اٹھ کر ایک دم ہنستے ہوئے) لے بھلا اماں کی باتیں! دیکھ جینب (زینب) (ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر) دیگچی پر چولھے کے پاس رکھ دے گی تو دال کاہے میں پکائی گی؟

زینب: (سنجیدگی سے) اور کیا —

(جنت ہنستے ہنستے چپ ہو جاتی ہے۔ وہ پھر آئینہ اٹھا کر کوٹھری کے دروازے میں غائب ہو جاتی ہے۔ اس دوران میں بڑھیا اماں چولھے کے پاس بیٹھ کر ٹھنڈا چولھا کریدتی ہے۔ آگ نہ پا کر دیوار میں بنے ہوئے چھوٹے سے طاق پر سے ماچس کی ڈبیا اٹھاتی ہے۔ اسے ہلا کر دیکھتی ہے اور پھر ماچس خالی پا کر اس کے ڈھکنے سے ایک تنکا توڑ کر دوبارہ آہستہ آہستہ چلتی دیوار کے پاس دھوپ میں بیٹھ کر تنکے سے خلال کرنے لگتی ہے۔ جنت کوٹھری سے نکل کر دوبارہ کھاٹ پر بیٹھ جاتی ہے۔)

زینب: (جنت کی طرف ہمدردی سے دیکھتے ہوئے) سورج ڈوبے رچ کر بیٹھوں گی۔ شاید کوئی دیا جلا جائے۔ تیرا میاں آگیا تو اس کی روٹی پر تیل چپڑ دیں گے۔

(جنت کوئی جواب نہیں دیتی، صرف اپنی ٹانگیں ہلاتی رہتی ہے اور بار بار دروازے کی طرف دیکھتی ہے۔ بڑھیا آنکھیں بند کئے خلال کئے جاتی ہے، اور زینب سر جھکا کر زور زور سے آٹے پر مکیاں لگانے لگتی ہے)

(چند لمحے کے وقفے کے بعد)

(مہرو اندر بھاگتا ہوا آتا ہے۔ اس کے چہرے پر ہنسی ہے اور آنکھیں خوشی سے چمک رہی ہیں۔ وہ بے حد بے تابی سے ادھر ادھر جیسے کچھ نظروں ہی نظروں میں تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے)

زینب: مہرو دال لایا؟

مہرو: وہ — وہ — آگیا

جنت: (کھاٹ سے اٹھ کر) آگیا؟ اندر لے آ اسے مہرو۔ (سر پر ڈوپٹہ ٹھیک کرتی ہے)

مہرو: (ٹھٹھک کر پھر ہنستے ہوئے) خالو تو پھر آئے گا — بابا؟ — بابا نہیں ہے؟ (بھاگ کر کوٹھری میں دیکھ کر لوٹتا ہے) بابا کدھر ہے!

اماں: کیا ہے رے کیوں ہر وقت بابا، بابا کرتا ہے — جب سے موا بابا کو آکر آوازیں مار گیا — بابا کو تو سیل سپاٹا چاہئے۔ ذرا کوئی بات ہوئی اور بگڑ کر گھر سے نکل گیا۔

مہرو: (عجب تعجب سے ہنس کر) ارے بابا کا کام آیا ہے نانی — (تینوں عورتیں کھل اٹھتی ہیں)

اماں: (آسمان کی طرف منہ اٹھا کر) اللہ! (ایک ہاتھ اٹھا کر مسکراتی ہے)

مہرو: (ادھر ادھر بے تابی سے گھوم کر) ماموں کو لے گئے موٹر میں بٹھا کر میں مسجد کے پاس کھڑا تھا۔

اماں: (حیرت اور خوشی سے ہاتھ پٹخاکر) موٹر میں بیٹھ کر گیا ہے تیرا ماموں؟

(جنت اور زینب بھی خوشی سے کھڑی ہو جاتی ہیں)

جنت: ہا — سچ؟

مہرو: ماموں نے چلتے وقت (وقت) کہا جلدی سے بابا سے کہدے کھودنا شروع کر دے — اور کھودے بڑی۔

زینب: (آٹے میں سنے ہوئے ہاتھ بڑھا کر جلدی جلدی) ہائے میرے لال تو نہیں جانتا بابا سویرے کا روٹھ کر گھر سے نکلا ہے تیرے سامنے ہے — ادھر کیا ڈھونڈنے آیا ہے۔ جا رکھو کے اڈے پر دیکھ میرے چاند۔ بابا وہاں ہو تو اسے چپکے سے بلانا الگ اور دیکھ رکھو کے سامنے کچھ د کہیو — نہیں تو —

جنت: (بے حد بے تابی سے) ہاں وہاں نہ ہو تو پیر جھنے کی دکان پر بھی دیکھنا۔ حقے (حقّے) کی للک میں وہاں جرور ایک آدھ بار جائے گا۔ ہائے جلدی کر مہرو۔ کہیں تو جرور ہو گا بابا — (مہرو باہر کی طرف بھاگتا ہے۔ جنت چلا کر) اور دیکھ مہرو یوں ہنستا ہوا نہ جا۔ شاہ دین نہ تاڑ لے پرسوں کی طرح۔

مہرو: (ہاتھ اٹھا کر بھاگتے ہوئے) اچھا — اچھا۔

(جنت لوٹ کر اماں کی طرف آتی ہے جو ابھی تک آسمان کی طرف منہ اٹھائے مسکرا رہی ہے)

جنت: اری اماں اللہ سے باتیں پھر کر لیجیو — ذرا تو بھی باہر ایک نجر مار لے دیکھ بابا یہیں کہیں پھر رہا ہو شاید۔

(اماں غصے سے سر جھٹک کر تیز تیز چلتی کوٹھری کی طرف جاتی ہے)

زینب: اے اماں ادھر کہاں — (حیرت سے اس کا راستہ روکتی ہے)

اماں: (زینب کا ہاتھ جھٹک کر) چل ہٹ سامنے سے۔ (اندر جا کر دوسرے لمحے پھاوڑا کدال کندھے پر اٹھائے بے حد شان سے صحن میں آ جاتی ہے۔)

زینب: (تقریباً چیخ کر) اماں! (پھاوڑا ہاتھ سے لینے کی کوشش کرتی ہے)

اماں: (آنکھیں نکال کر اور لفظ چبا چبا کر) کیا میں تیرے باپ کے انتجار میں بیٹھی رہوں گی؟ اس دن بھی تو تیرا بابا گھر سے روٹھا تھا اور شاہ دین نے اپنی جیب گرم کی تھی — تو چاہتی ہے آج بھی شاہ دین — ہنھ

(بڑے غرور سے سر اٹھا کر باہر چلی جاتی ہے
جنت اور زینب ایک دوسرے کو حیرانی سے دیکھتی
ہیں۔ اور پھر جنت آنکھیں جھپکا کر ہنس پڑتی ہے)

جنت: (کچھ سنجیدہ ہو کر) اماں کھودے گی جینب؟

زینب: (سنجیدگی سے) اماں گھصے (غصے) میں ہو تو کیا نہ کر لے۔! (ذرا رک کر) شاہ دین کی عورت نے دیکھ لیا تو کیا کیا باتیں نہ بنائے گی

جنت: ہنھ! باتیں بنائے گی تو بنانے۔ ہمیں کچھ دے تو نہ دے گی؟

زینب: (بے دھیانی سے دور دیکھتے ہوئے) کوئی کسی کو کچھ نہیں دیتا بس اللہ میاں دینے والا ہے۔ لوگ تو دوسروں کے منہ کا نوالہ چھیننے کو پھرتے ہیں۔

جنت: (اٹھی کر کے دروازے کی طرف جا کر) بابا تو نظر نہیں پڑتا اماں کیسے کرے گی اتنی جلدی۔ کیوں جینب (زینب) کل بابا نے اُدھر ٹیلے پر تھوڑی کھدائی تو کی تھی — اماں بھی وہیں سے مٹی نکالے گی نا؟

زینب: ہاں — کل بابا نے کام پورا کر لیا ہوتا تو کوئی فکر نہ تھی۔ پر اسے کیا پتہ تھا کہ آج جمعرات اللہ رزق بھیجے گا۔ (فکرمندی سے ہو کر دروازے کے پاس جنت کے قریب آ کر) رجو بھی گھنٹہ بھر سے تیرے ننھے کو لے کر باہر گئی تو اب تک نہ لوٹی — وہ ہوتی تو اس کو اماں کے پاس بھیجتی۔ بے چاری نے کب سے تمباکو نہیں پی۔

جنت: (بے حد بے چینی سے) موٹر والوں کے سب کام جلدی کے ہوتے ہیں۔

ہوتے ہیں۔ اماں بیٹھ کر حکہ (حقہ) پئے گی تو کام کیسے بنے گا۔
دیکھو تیجو بس جرا (ذرا) میں آپہنچیں گے لے کر۔۔۔ میں نے
تو سنا ہے لوگ روتے بھی نہیں جی بھر کے۔ بس جلدی جلدی اٹھا
لیتے ہیں۔۔۔

(جنت اس اضطراری کیفیت میں ہاتھ ملتی دروازے کے
پاس سے ہٹ کر اس جگہ دیوار کی ٹیک لگا کر بیٹھ جاتی ہے
جہاں پہلے اماں بیٹھی ہوئی تھی۔ دھوپ اب دیوار کے اوپری
حصے پر پہنچ چکی ہے۔۔۔ زینب بھی دھیمے دھیمے قدم اٹھاتی
دوبارہ چولہے کے پاس بیٹھ کر آٹے میں مکیاں مارنے لگتی ہے)

جنت: (منمنا کر جیسے خود سے) بابا کو اتنا کھیال (خیال) نہیں کہ میں سسرال
جانے کو بیٹھی ہوں، کیا کھالی ہاتھ جاؤں گی۔۔۔ آج ہی کے دن اسے
بھی روٹھنا تھا۔۔۔ کسی کو میرا کھیال نہیں۔۔۔ سال بعد مائیکے
آئی، میری ساس نہیں پوچھے گی لا دکھا کیا لائی بابا بھیا کے گھر
سے ہائے بھلا دیکھو تو۔۔۔

زینب: اری جنت کسی کو کسی کا خیال نہیں۔ میری بے باپ کی لونڈیا
بارہ برس کی ہو جائے گی اب کے رجب کے چاند۔ اس کے
بیاہ کے لئے تولہ بھر چاندی بھی کسی نے کھرید (خرید) کر نہ رکھی۔
(لمبی سانس لے کر مدھم آواز میں) بابا کے پاس تو اب محنت
کرنے کو ہاتھ پاؤں میں طاکت (طاقت) نہیں ایک جمانہ (زمانہ)
تھا اس جگہ ایک ایک دن میں دو دو تین تین کو دھرنے کا ٹھکانہ
کر لیتا تھا۔۔۔ کڑاکے کی سردی ہوتی یا تڑاکے کی گرمی ایسے دن
بابا پر رزق برستا۔

جنت: بھیا کلو کو جو بابا نے پڑھوا پڑھوا کر حافظ بنوایا تو کس کام کا۔۔۔
نماج (نماز) وہ پڑھا لے۔ گسل (غسل) وہ ڈال لے۔ مسجد
(مسجد) کے امام صاحب بھی بڑے دل کے نہیں آج بھی دیکھ
آپ رہ گئے بھیا کو موٹر میں بھیج دیا۔ میرے ہوتے دو تین گسل
تو اس نے ڈالے۔ پھر اس کی کمائی کدھر جاتی ہے؟

زینب: (جل کر آٹے پر دو ایک تھپڑے لگا کر کونڈی ایک طرف ہٹا کر)
مجھ سے پوچھ حساب کتاب۔ میری لونڈیا تو سورج چھپے دیے
ڈھونڈتی پھرتی ہے اور جیا بہت تیل اکٹھا کرتی ہے۔ وہی
تیل بیچ کر تو میں نے ایک شفوندگی اوڑھنی کھر یدی سوئی تجھے

دیکھی اسباب پڑھ کر بھائی کی کمائی کا حساب لینے لگی مجھ سے۔
(جھٹکے سے اٹھ کر دیوار پہ ٹنگی ٹوکری اتارتی ہے اور آٹے
پہ الٹی ڈھک دیتی ہے) اب تو اللہ مارے لوگ بیٹے بھی کم
ہی جلاتے ہیں۔ بس موم بتیاں۔ ان جلی موم بتیوں کا کیا
بنے؟

جنت: (نرمی سے) اری تو میں نے کب کہا کہ شنون کی اوڑھنی بھیا
لے لے کر دی ہو گی۔۔۔ تیل چن چن کر میں نے بھی چاندی کی
انگوٹھیاں نہیں بنائی تھیں۔ تجھے کیا پتہ کہ تو اس جمانے (زمانے)
میں اپنی سسرال میں رہتی تھی۔

(باہر سے جنت کے ننھے بچے کے رونے کی آواز سنائی دیتی ہے
دونوں بہنیں ادھر متوجہ ہو جاتی ہیں۔ رجو جنت کے ننھے
کو کولہے پر لٹکائے اندر آتی ہے)

رجو: (ایک دم ہنس کر) اماں شاہو چچا کے گھر آج بھی گوشت پک رہا
ہے۔ (بچے کو اتار دیتی ہے)

زینب: اری دیوانی تو دہیں بیٹھی اب تک دوسروں کی ہانڈی
سونگھ رہی تھی۔۔۔ میں نے جو پہرو کے پیچھے بھیجا تھا تجھے
کہ فضلو کے ہاں سے دال لے آ۔۔۔

رجو: (اٹھلا کر) فضلو دادا نے کہا نہیں تھا پہلے پیسے لے ادھار کے
پیسے دو پھر کچھ اور ملے گا۔۔۔ (ایک دم ہنستے ہوئے) اماں
شاہو چچا آج بھی پھاوڑا لئے ادھر جا رہا تھا۔ (ہاتھ سے
سمت کا اشارہ کرتی ہے)

(زینب اور جنت چونک پڑتی ہیں اور اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی
ہوتی ہیں۔ زینب رجو کے قریب آکر مدھم آواز میں)

زینب: اری کب جا رہا تھا؟

رجو: ابھی۔۔۔ ادھر گیا ہے۔ (ہاتھ سے اشارہ کر کے یوں ہنستی
ہے جیسے خوش خبری سنا رہی ہو)

جنت: (اپنے سینے پہ ہلکا سا ہاتھ مار کر) ہائے لے۔۔۔ میں دیکھ شاہو
تاڑ گیا نا۔۔۔ اری جلدی سے جا رجو! بابا کو کہیں سے ڈھونڈ لا۔

رجو: (آہستہ آہستہ دروازے کی طرف جاتے ہوئے) آں۔۔۔ بابا۔۔۔ بابا
کو ڈھونڈوں!

(دونوں بہنیں بھاگ کر اس سے پہلے دروازے پہ پہنچ کر

(بھائی پوٹلی کھول کر دیکھتا جاتا ہے اور دال ہانڈی میں الٹ دیتا ہے۔ پھر باہر کی طرف بھاگتا ہے)

زینب: (چلا کر) ارے او رے موے۔ جرا تو دم لے — بابا کے لئے روٹی تو لے جا — پتہ نہیں سویرے کا کچھ کھایا بھی اس نے کہ نہیں۔

(پھر لوٹ کر اندر آتا ہے۔ تیر کی طرح کوٹھری کے اندر جاتا ہے اور ہاتھ میں ایک موٹی روٹی لئے اسی تیزی سے باہر کے دروازے کی طرف بھاگتا ہے اور پھر اندر آتی ہوئی اماں سے ٹکراتا غائب ہو جاتا ہے)

اماں: (پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ) ارے مٹا نے دیکھتا نہیں۔

زینب: اماں! (قریب جاکر اسے تھامنا چاہتی ہے)

جنت: اماں رجو کہتی تھی شاہو پھاوڑا لئے اپنی کوٹھری سے نکلا تھا ابھی

اماں: (ہاتھوں سے مٹی جھاڑ کر) اب کھودے گا اپنی اماں کی کبر (قبر) ہاتھ دو ہاتھ مٹی تو میں نے ہٹالی۔ اس وخت (وقت) تیرا بابا ہزار جوان کا ایک جوان ہے آتے ہی جو دو چار پھاوڑے مارے تو کمر تک مٹی ہٹالی۔
(کمر کو اپنے ہاتھوں سے سہارا دے کر تنتے ہوئے۔ اری ذرا پانی تو پلائیو جنت۔

زینب: اماں لیٹ جا میں تیری کمر دبا دوں۔

(اماں کھاٹ پر بیٹھ جاتی ہے اور زینب اس کی کمر دبانے لگتی ہے۔ جنت پانی کا کٹورا لئے آتی ہے اور اپنے بچے کو زمین پر بٹھا کر پانی ماں کو دیتی ہے۔)

جنت: لا اماں میں تیرے پاؤں دباؤں۔

اماں: رہنے دے تو تو میری چلم بھر دے۔ (جمائی لے کر) کتی (کتنی) دیر سے تماکو نہیں پی۔ (جنت حقے پر سے چلم اٹھا کر چولھے کے پاس جاتی ہے اور چولھا کرید کر واپس آجاتی ہے۔ پھر کچھ سوچ کر ادھر ادھر طاق پر اور کوٹھری میں کچھ تلاش کرتی ہے اور پھر دیاسلائی کی ایک تیلی حاصل کر کے آگ جلا دیتی ہے)

زینب: (کمر دباتے ہوئے) کیسے تو نے پھاوڑا اٹھایا ہوگا اماں!

اماں: ہنھ! اے بھلا پھاوڑا اٹھانا بھی کچھ مشکل ہے۔
(اماں کھاٹ سے اٹھ کر پھاوڑا اٹھانے کی نقل کرتی ہے)

اماں: یوں پھاوڑا اٹھایا۔ یوں جمین پہ مارا — بس اس طرح مٹی اٹھائی اور دور پھینک دی۔ آج تو تیرا بابا مجھے دیکھ کر حیران (حیران) رہ گیا۔ اب تیرے آگے منہ کھولے گا کبھی۔

جنت: (چلم لاتی ہے) اماں رکھو نے یا شاہو نے تجھے دیکھا تو نہیں؟

اماں: دیکھ تو کیا بنالے گا۔ عورت جات ہوں تو کام نہ کروں! واہ اب اب تک تیرے بابا کی اتجاری کرتی تو بس — ابھی دیکھیو موٹروالوں کا کام ہے دم کے دم میں لے کو آجائیں گے۔

جنت: اماں آج تو اچھے پیسے ملیں گے بابا کو اور بھیا کو۔ ایک بار پہلے بھی موٹروالوں کا کام کیا تھا تو بیس روپے ملے تھے بابا کو

اماں: اللہ مالک ہے۔ (اماں حقے کے لمبے لمبے کش لیتی ہے — اور کھانستی ہے)۔

زینب: جا ری جنت تو دال چڑھا دے چولھے پر۔ اتنا وقت ہوگیا۔ بچے بھوکے ہوں گے۔

جنت: جا تو ہی چڑھا دے (کھاٹ پر بیٹھنے لگتی ہے۔)

زینب: پھر کل کی طرح تو کہے گی کہ میرا میاں آنے والا تھا دال میں اتا (اتنا) پانی ڈال دیا جینب نے — تو آپ ہی ہانڈی روٹی دیکھ۔

جنت: (ٹھنک کر) نہیں کہوں گی۔ تو کوئی میرے میاں سے جلتی ہے! میں نے ہنسی میں کہی تھی بات۔ (بے حد محبت سے) جا تو ہانڈی روٹی کر لے جلدی جلدی میں اماں کو دباتی ہوں۔

زینب: (ایک دم بگڑ کر) کیوں تو کوئی بڑی لاٹ صاحب ہے۔ میں روج ہانڈی روٹی کروں۔ ایک دن تو کر لے۔ میرے ہاتھوں میں کوئی کانٹے لگے ہیں جو میں اماں کو نہ دباؤں؟

جنت: (تیز ہو کر) میں یہاں کوئی بیٹھی رہوں گی۔ ننھے کا ابا آکے پہنچے گا تو کل مجھے لے جائے گا۔ پھر تو اکیلی کھوب کھدمت کر لیجیو اماں کی۔

زینت: (چلا کر) چل چل بڑی آئی کھدمت کرنے والی۔ آج بابا اور بھیا کا کام لگا تو تجھے محبت آئی اماں کی۔ روج تو پلنگ پسارے کھاٹ پر بیٹھی رہتی تھی۔

جنت: (روہانسی ہو کر) دیکھ لے اماں — کیا کہہ رہی ہے جینب۔

زینب: (ٹھوکر کھا کر چلانے کے انداز سے) کبھی کبھی تو یہیں گنگنی تھی۔

اماں: (بے حد بیزار انداز سے سر ہلا کر) تو بھی کبھی یہ بھی کہتی۔ جا جنیب آج ابھی تو اس ہانڈی کی رونی کر لے۔ یہ آج کی رات ہے دو گھڑی میرے پاس بیٹھ لے۔

زینب: (جھاڑ کر چولھے کے پاس بیٹھتے ہوئے) ہاں۔ ہاں یہ جنت تیری لاڈلی کل سسرال چلی جائے گی اس لئے اس کی کدر (قدر) ہے میں تیرے دروازے (دروازے) بیٹھی ہوں۔ اللہ نے مجھے لاکر بٹھایا ہے، میری کیا کدر (قدر)!

(اماں جواب میں کچھ کہنا چاہتی ہے مگر گلا سی کا پھندا پڑ جاتا ہے اور وہ ہاتھ سے نفی میں اشارے کرتی رہ جاتی ہے)

جنت: (ہاتھ بڑھا بڑھا کر) تیری کدر تھوڑی ہے۔ بابا اور بھیا کی ساری کمائی کو کوک مرغی کی طرح چھاپ کر بیٹھ گئی ہے۔ اب سن تو مجھ سے۔

زینب: (ماتھے پر ہاتھ مار کر) اری میں کمائی چھاپ کر بیٹھی ہوں۔ میرا ملک جیتا دفن ہو گیا، میرے بچے یتیم ہو گئے اور تو کہتی ہے میں کمائی چھاپ کر بیٹھ گئی ہوں۔ جیسے میں بیٹھی ہوں ویسے سب بیٹھیں آکر۔

جنت: (ایک دم رو کر) دیکھ لے اماں، اور کو سنے دلوا لے۔

اماں: (کھاٹ سے اٹھ کر تھر تھر اتا ہاتھ اٹھا کر) جنیب جبان روک لے۔

زینب: (اسی طرح) میں تو یوں ہی کہوں گی

اماں: (دھاڑ کر) اری رانڈ کلموہی بہن کو کوستی ہے۔ تیرے منہ میں خاک۔

(زینب ایک دم خاموش ہو کر عجیب سے انداز سے ماں کو دیکھتی ہے اور پھر جھک کر چولھے میں پھونک مارنے لگتی ہے)۔

(جنت اپنے بچے کو گود میں اٹھا کر کھاٹ پر بیٹھ جاتی ہے اور منہ ڈھانک کر رونے لگتی ہے)

جنت: (روتے روتے بین کرتے ہوئے) اس سال بھی یا تجھے آئی تو میری بہن کو برا لگا۔ اری میں نے کس کا کیا لے لیا، دو نوالے روٹی کھائی تھی۔ اور آج بہن کے کوسنے سن لئے۔ سارے اماں مجھے کیوں بلایا تھا ری۔

زینب: (گھٹنوں میں سر رکھ کر آواز سے روتے ہوئے) میں بابا کے گھر نہ بیٹھتی تو کہاں جاتی۔ میرے بچوں کی دو روٹیاں سب کو کانٹے کی طرح لگتی ہیں ساری اماں، میں کلموہی تھی تو مجھے اس کے ساتھ جیتا کیوں نہ دفن ہونے دیا۔

(اماں پہلے تو کبھی ایک بیٹی کی طرف، کبھی دوسری کی طرف، ہاتھ پھیلا پھیلا کر روکنے کی کوشش کرتی ہے۔ "اری جنیب" "اری جنت" کہہ کہہ کر رہ جاتی ہے آخر ہار کر اپنے سر پہ ایک دوہتڑ مار کر صحن میں بیٹھ جاتی ہے)

اماں: (جیسے اللہ سے فریاد کر رہی ہو) اے اللہ میں کیا کروں۔ دونوں وکت (وقت) ملنے پہ آئے اور گھر میں ہائے ہائے پڑی ہے ——— آج کتنے (کتنے) دن بعد رنق اترا اور ادھر شکر کے دو بول نہیں ——— (دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیتی ہے۔ پھر ایک لمحے کی خاموشی کے بعد ایک دم مسکرا کر سرگوشی کرتی ہے جیسے اپنے آپ سے مشورہ کر رہی ہو)

اماں: رونے اور جھگڑنے کی کیا بات ہے۔ تمہارا اگلو بھیا جو لائے وہ جنت کا ——— اور جو بابا کو ملے وہ جنیب کا ——— (زمین سے اٹھ کر کرتے کا دامن جھاڑتی ہے اور کھاٹ پہ بیٹھ کر حقے کا لمبا کش لیتی ہے)

زینب: (ہانڈی میں پانی ڈال کر دال دھرتے ہوئے) تو میں نے جنت کو کیا کہا تھا ——— اس نے آپ ہی میرے بچوں کی نعمتی گنی۔

جنت: (آنسو پونچھ کر) تو میں نے لے کیا کہا آپ ہی تو مجھے کوسا اس نے!

اماں: (دونوں طرف ہاتھ پھیلا کر دانت کچکچاتے ہوئے) اری چپ ہو بابا نے یہ جھگڑے سن لئے تو رات نہیں کٹے گا گھر۔

زینب: ہاں اسے بڑا کھیال ہے بابا کا۔

جنت: اور بابا کو میرا بڑا کھیال ہے۔ پچھلے ساون آئی تھی تو بابا نے دو روپے کی اوڑھنی بھی نہ دی ——— (پھر رونے کی کوشش کرتی ہے)

اماں: ہاں ری رونڈیا اب تو بابا کو برا دیکھے گی تو کیسے کہے گی۔ بابا نے تجھے پرائے گھر کا کر دیا تھا ——— تیری برات کو بلاؤ جردہ (زردہ) دیا۔

جنت: (ہاتھ جھٹک کر) دیا ہو گا برات کو ——— مجھے کیا دیا بابا نے ——— میں کوئی اتنی (اتنی) بچی تھی جب جنیب کا بیاہ ہوا تھا۔ اسے

زینب اس کے پیچھے بھاگتی ہے)

زینب: او رے مہرو کدھر چلا۔

مہرو: (ٹھٹھک کر) وہ دیکھ آ گئے رے کرے۔ مسجد میں بڑا مولوی نماج پڑھا رہا تھا۔

اماں: ان کو تو آنا ہی تھا۔ بابا نے کام ختم کر لیا!

مہرو: (باہر کی طرف قدم اٹھاکر جرا سی مٹی اور نکالتا ہے۔ اندھیرے میں بابا کو نجر نہیں آرہا۔

جنت: ارے بتی جلا تو لینے دے۔ (مہرو کے ہاتھ سے لالٹین لیکر اسے روشن کرتی ہے اسٹیج پر ایک لمحے کو روشنی ہوتی ہے اور پھر مہرو کے پھٹے میلے پیروں کے ساتھ یہ روشنی غائب ہو جاتی ہے اور اسٹیج پر گہرا اندھیرا چھا جاتا ہے)۔

[ایک لمحے کی خاموشی اور اندھیرے میں قریب کسی کتے کے رونے کی صدا بلند ہوتی ہے اور پھر اسٹیج پر روشنی ہو جاتی ہے وہی منظر ہے۔ طاق پر رکھا چراغ مدھم سی روشنی دے رہا ہے۔ چھپر تلے اب تین کھاٹیں بچھی ہوئی ہیں۔ بابا مٹی کے بدھنے سے ہاتھ دھو کر اپنے تہمد سے ہاتھ اور منہ خشک کر رہا ہے۔ مہرو اور رجو کے سامنے کھاٹ پر المونیم کی پلیٹوں میں روٹی پڑی ہے۔ مگر وہ کھا نہیں رہے ہیں۔ زینب چولہے سے آگ نکال کر چلم میں رکھ رہی ہے اور جنت چپ چاپ اپنے ننھے کو سینے لحاف میں لئے کھاٹ پر بیٹھی ہے۔)

رجو: (روٹی پر انگلیاں پھیرتے ہوئے) شاہو چاچا کے ہاں گوشت پکا ہے آج بھی۔ (ہنستی ہے)۔

مہرو: ہمارے گھر کل پکے گا۔ کیوں بابا؟

بابا: ہوں ــ ہوں

جنت: (جل کر) ہاں پانچ روپے ملے ہیں بابا کو کل تک سب کر لو اپنے لئے۔

زینب: (چلم اٹھا کر بابا کے قریب آتے ہوئے) سن لے بابا۔

بابا: ہوں ــ (چلم لے کر کوٹھری میں چلا جاتا ہے)

(چند لمحے کو سب خاموشی سے ایک دوسرے کو شکایت بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ باہر کوئی کتا روتا ہے۔ ہوا کی سائیں سائیں بڑھ جاتی ہے۔ زینب اپنے بچوں والی

کھاٹ پر ٹک جاتی ہے)

زینب: اے روٹی نہیں کھاتے تم دونوں۔ (رجو بے تکے پن سے ہنستی ہے)

مہرو: نانی آئے گی پھر کھائیں گے۔

زینب: (فکرمند ہوکر) تی (اتنی) دیر ہو گئی اماں نہیں آئی۔ مسجد اتنی دور بھی نہیں۔

جنت: کیوں رے مہرو تونے اچھی طرح دیکھا تھا تیرا ماموں لوگوں کے ساتھ نہیں آیا تھا؟

مہرو: نہیں۔ بالکل ماموں آیا ہی نہیں

جنت: (اداس لہجے میں) آتا کیسا۔ سمجھا ہوگا گھر گیا تو بہن کو کچھ دینا پڑے گا۔

رجو: (ہنس کر) ماموں آج "سلیما" گیا ہوگا کھاد۔

زینب: (ڈر کر) شی! ــ چپ! بابا سن لے گا تو بھیا سے رات ہی کو جھگڑے گا۔ ایک بار پہلے کتا (کتنا) جھگڑا ہوا تھا، مردار، بھول گئی ــ (اپنے آپ سے) بابا نے سچ تو کہا تھا میں نے تجھے حافج (حافظ) مولوی بنایا اور تو "سلیما" جاکر گندہ ہوتا ہے۔

رجو: سلیما کیسا ہوتا ہے اماں؟

مہرو: ہا ــ تجھے نہیں معلوم۔ میں بتاؤں تصبیریں (تصویریں) ناچتی اور گاتی ہیں ــ

(بیٹھے بیٹھے کمر پر ہاتھ رکھ کر مٹکتا ہے) "آجا مورے بالما تیرا انتجار ہے"

زینب: (ہنستی ہے اور مہرو کو دھمکانے کے لئے ہاتھ اٹھاتی ہے) چپ بے حیا۔ بابا سنے گا تو چمڑی ادھیڑ دیگا تیری۔

جنت: (تھکے ہوئے اداس لہجے میں) جو جس کی مرجی ہو کرے میں اب سے جاؤں تو آکر منہ نہ دکھاؤں گی کبھی ــ اماں کہہ رہی تھی آج جیادہ پیسہ ملے گا۔ بابا نے آکر پانچ دکھائے۔ بھیا نے صورت بھی نہ دکھائی آکر۔

زینب: کیوں ایسی باتیں کرتی ہے بھیا کوئی برا ہے ــ دیکھ لیجیو اس کو جرور اچھے پیسے ملے ہوں گے۔

آنے دے۔ اسے کوئی کام پڑ گیا ہوگا جواب تک نہ آیا۔
(دور لکڑی کے کھڑاؤں کی آواز آتی ہے۔ مہرو دوڑ کر دروازے
تک جاتا ہے۔ اور شور مچاتا ہے)

مہرو: مائی آگئی۔

(اماں کھڑاویں بجاتی لالٹین جھلاتی ہانپتی اندر آجاتی ہے جنت
سہمی ہوئی سے لحاف سر سے اتار دیتی ہے۔ سب سوالیہ نظروں سے
اسے دیکھتے ہیں۔ اماں کسی کی طرف دیکھے بغیر بیچ والی کھاٹ پر
بیٹھ کر اکھڑی اکھڑی سانسیں لیتی ہے)

بابا: (کوٹھری کے دروازے پر حقہ اٹھائے آکر) آگیا گلو؟

اماں: (ہاتھ سے نہیں کا اشارہ کرتی ہے اور بے حد دل جمعی سے
ہانپتی رہتی ہے)

بابا: کیوں نہیں آیا۔ کدھر گیا۔ حرام جادہ مجھے کرنے۔ آنے دو آج
ادھیڑ کر رکھ نہ دیا ہو تو خیرو نام نہیں۔

اماں: (سانس ٹھیک کر کے) کیوں ادھیڑے گا میرے لال کو۔ بہت
تیرے دس پانچ بیٹے ہیں جو مارے گا میرے گلو کو۔

بابا: (دھاڑ کر) جان نکال لوں گا جو بیٹے کی طرف سے بولی (مارنے
کو بڑھتا ہے)

(زینب اور جنت ایک دم بیچ میں آجاتی ہیں۔ زینب باپ کے
ہاتھ سے پٹ جاتی ہے۔ مہرو رونے لگتا ہے اور رجو مہرو کی
طرف دیکھ کر منہ پھیر کر ہنستی ہے)

بابا: چھوڑ دے مجھے آج بتاؤں بڑھیا کو بیٹے کی طرفداری کرتی ہے۔

اماں: (بابا کی طرف بڑھنے کی جد و جہد کرتے ہوئے) لے آج دل
کا ارمان نکال لے۔ آ مار مجھے۔ مگر خبردار جو میرے بیٹے کو کچھ
کہا — ہاں۔ (جنت ماں کو پیچھے ڈھکیلتی ہے)

بابا: (ہوا میں مکے چلا چلا کر) ایک بیٹا ہے یہی سوچ کر میں نے کہا
اس سے کیا پھاوڑا اٹھواؤں، آپ محنت کی اور اسے مولبی کے
پاس بٹھا دیا۔ اب کسی لائک (لائق) ہوا تو کمائی اپنی جیب میں
ڈال کر سیلے دیکھتا پھر رہا ہے۔ اور تو اس کی طرفداری کرتی
ہے میت کے کپھن (کفن) پہ خون تھا۔ جس پر اس نے گسل
ڈالا۔ یہ تو نہیں کہ بستر پہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے والا ہو جو
گھر والے پہلے سے انگوٹھی چھلے اتار لیں۔

اماں: (بات کاٹ کر) ہاں تو میں کب کہتی ہوں کہ اسے انگوٹھی
نہیں ملی — پھر تجھے کیا؟

بابا: مجھے کیا؟ آکر کہہ دے گا کچھ نہیں ملا۔ اچھا میں اس کی ٹانگیں
نہ توڑ دوں تو کہنا — بہن سسرال جانے کو بیٹھی ہے اور
تو کہتی ہے مجھے کیا؟

جنت: (اماں کو چھوڑ کر بابا کے قریب جا کر ہنستے ہوئے) بابا، اماں ہی
کو کھیال نہیں میرا تو مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔

زینب: میرے بچوں کا کسی نے خیال کیا کبھی؟

بابا: (آپے سے باہر ہو کر) بتا مجھے سونا دکھا کر کدھر گیا؟ بتا وہ
آیا کیوں نہیں۔

اماں: (بے تعلقی سے) مولبی کے پاؤں دبا رہا ہے۔ مولبی چاہتا تو
آپ جاتا موٹر میں بیٹھ کر۔ چاہتا تو دوسرے لڑکوں کو بھیجتا
اب میرا بیٹا مولبی کے پاؤں نہ دبائے تو تیرے دبائے۔

بابا: (اور بھڑک کر) میت نہلا کر جب سے پاؤں دبا رہا ہے۔ مجھے
بناتی ہے بڑھیا۔ بول کہاں گیا تیرا بیٹا۔

(اماں بڑے غرور سے بابا کی طرف بڑھتی ہے اور بے پروائی
سے اس کے ہاتھ سے حقہ لے کر ایک کش لگاتی ہے)

اماں: سنار کے پاس گیا تھا انگوٹھی لے کر سیدھا۔ اس کی دکان
بند تھی۔ پھر اس کے گھر گیا کہ تلوا کر کسوٹی پہ پرکھوا لے۔ دیر
نہ لگتی تو کیا ہوتا؟

(بابا ایک دم کوٹھری کی دہلیز پر بیٹھ جاتا ہے اور لاجواب
ہو کر حقہ کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ اماں اسے حقہ پکڑا کر
یوں کھاٹ پر بیٹھ جاتی ہے جیسے سارے جہان کی دولت
اس کے قدموں تلے پڑی ہو)

جنت: (خوشی سے بمشکل آواز نکالتے ہوئے) اماں! سونے کی ہے؟

زینب: (خوشی سے آنکھیں پھاڑ کر جیسے اپنے آپ سے) اور چاندی
ہوتی تو بھیا یوں مارا مارا پھرتا؟

(ہوش میں آکر رجو سے) اٹھ اماں کے پاؤں دبا رجو!
اماں مسجد سے چل کر آئی ہے۔ رجو ہنستی ہے اور بیٹھی
رہتی ہے)

(باہر کتے کے بھونکنے کی آواز آتی ہے، ساتھ ہی جوتوں کی چاپ)

زینب: گلو بھیا آرہا ہے۔
(جنت جھپٹ کر لالٹین اٹھاتی اور دروازے کی طرف بھاگتی ہے۔ اس کے پیچھے زینب اور مہرو بھی دوڑتے ہیں۔)
جنت: (چلا کر) بہت مٹی کے ڈھیر دیکھ کر۔ ٹھوکر نہ کھائیو۔
مہرو: (خوشی سے اچھلتے ہوئے) ماموں آگیا۔ ماموں آگیا۔ بابا ماموں!
(گلو بھاری بھاری قدم رکھتا جھومتا جھامتا اندر آتا ہے۔ وہ سب اسے ایک طرف ہٹ کر راستہ دیتے ہیں۔ گلو چھپر تلے ایک دم کھاٹ پر یوں لیٹ جاتا ہے جیسے بہت تھکا ہوا ہو۔ زینب، جنت سے آگے بڑھ کر پوچھتی ہے)
زینب: بھیا روٹی کھائے گرم گرم دال پکی ہے۔
گلو: کھاؤں گا۔ بہت تھک گیا آج تو (ٹانگیں اور ہاتھ اکڑا کر ایک جماہی لیتا ہے۔ اور پھر کھاٹ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ جاتا ہے)
زینب: (ہنستے ہوئے بڑے پیار کے ساتھ) لے بھلا حافظ مولوی ہوگیا۔ جھوٹ بولنے کی عادت نہ گئی تیری۔ کیا مجھے معلوم نہیں موٹر میں بیٹھ کر گیا تھا گسل دینے۔ لا پاؤں دبوانے کو جی کرتا ہو تو دبا دوں۔ (گلو کی طرف جھکتی ہے)
گلو: (پاؤں سمیٹ کر) نہ ــــ نا آپا۔
جنت: مجھ سے دبوالے، بھائی چھوٹا جو تب بھی بہن سے بڑا ہی ہوتا ہے۔ (جنت گلو کی طرف جھکتی ہے)
اماں: دبوالے میرے لال، کہاں کہاں مارا پھرا ہے تھک گیا ہے۔
بابا: (اماں سے مخاطب ہو کر) ہاں تیرا لونڈا بڑے کنوئیں کھود کر آیا ہے۔ جو بیٹھا ٹانگیں اینٹھا رہا ہے۔ (دونوں بہنیں سیدھی ہو کر غصے سے بابا کو دیکھتی ہیں۔ اماں کچھ کہنے کی کوشش میں کھانسی کا شکار ہو جاتی ہے)
گلو: (رنجیدہ ہو کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے) بابا تجھے اپنا کام دکھتا ہے دوسرے کا نہیں۔ تو قبر کھودتا ہے بس گندے مڑے مردے نہلاتا ہوں۔
(جھرجھری لے کر منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بدلی ہوئی خوفزدہ آواز میں) توبہ الٰہی توبہ۔ کیا بری میت نہلائی ہے آج
مہرو: ماموں موٹر والوں کی میت بھی گندی ہوتی ہے۔
رجو: (ایک دم بے تکے پن سے ہنس کر) کیوں ماموں، موٹر والے تو روز تیل کے دیئے جلائیں گے قبر پر!
گلو: (دونوں بچوں کی طرف دیکھ کر ایکدم چیخ پڑتا ہے) موٹر والے۔ موٹر والے (آواز دھیمی کر کے) وہ تو موٹر والوں کو خدا کا خوف تھا۔ کل ان کی موٹر تلے آکر کچلا گیا تھا۔ غلطی مرنے والے کی تھی، پھر بھی ان موٹر والوں کے دل میں اللہ تعالیٰ نے رحم ڈالا انہوں نے پولیس سے کہا سنا اور لاش ہسپتال سے اٹھا لائے کہ ہم آپ کفن دفن کریں گے ــــ ایسے بھی اچھے لوگ ہوتے ہیں دنیا میں ــ (ایک لمحہ رک کر) بابا! قسم ہے اللہ پاک کی منہ تو بالکل پچی ہوگیا تھا۔ پانی پہ پانی ڈالتا گیا۔ پھر بھی خون ہی خون۔ (جھرجھری لے کر منہ پر ہاتھ پھیرتا ہے)
بابا: (تجلا کر) جیاوہ نقشے (نقشے) نہ کھینچ وہ تو قبر میں آتے وقت کفن پر خون میں نے بھی دیکھا تھا ــــ یہ بتا تو تھک کیسے گیا۔
اماں: واہ رے بڈھے، میں نے نہیں بتایا کہ سنار کے گھر کے چکر لگا رہا تھا۔ لے حکہ پی۔ پھر یاد آجائے گا۔ (حقہ اٹھا کر بابا کے سامنے رکھ دیتی ہے اور بابا غصے میں دو ایک لمبے لمبے کش لیتا ہے)
زینب: ہا ــ کون تھا مرنے والا؟
گلو: جانے کون تھا۔ موٹر والے صاحب کہتے تھے اس کی جیب سے پانچ روپے اور کڑی کی گجک نکلی تھی۔ گجک اور روپے سے کسی کا کیا پتہ نشان ملتا۔
اماں: (بے حد دانشمندی سے سر ہلا کر) اور کیا ــ ٹھیک تو ہے۔
جنت: (ایک دم ہنس کر) اور انگوٹھی جو تھی اس کے ہاتھ میں اس کا جکر (ذکر) نہیں کرتا بھیا۔ ڈرتا ہے جنت کو کچھ نہ دینا پڑ جائے۔ اس واسطے نا! (اٹھلا کر گلو کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے) لا میں بھی دیکھوں انگوٹھی۔
گلو: (جلدی سے دونوں ہاتھ اپنی بغلوں میں چھپا لیتا ہے) چل چل میرے پاس نہیں ہے انگوٹھی۔
جنت: تو میں کھا جاؤں گی تیری انگوٹھی۔ (روٹھ کر بچوں کی طرح ہونٹ لٹکا لیتی ہے۔ لیکن ہاتھ پھیلائے رکھتی ہے)

گلو: (کچھ سنجیدگی اور کچھ ہنسی سے) اماں دیکھو جنت کو — ہر سال آکر یہ لاڈ وہ لاڈ کرنے لگتی ہے۔

جنت: (ایک دم غصے میں آکر) دیکھ لے اماں کیا کہہ رہا ہے بھیا —

اماں: ٹھیک تو کہہ رہا ہے۔ جا کل شفون کی اوڑھنی لادے گا تیرے لئے — اب بھیا کے بیاہ کے لئے بھی کچھ رہنے دے گی یا نہیں۔

جنت: (آگ بگولہ ہوکر) میں نے کیا لیا تیرے گھر سے — جیب کو سونے کے جھمکے دیئے تھے — میں یہ انگوٹھی لوں گی آج۔ لا مجھے انگوٹھی دے — (گلو کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے) (ایک دم بابا کھیرو کوٹھری کی دہلیز سے اٹھتا ہے، سامنے پڑا حقہ ہاتھ سے الٹ دیتا ہے اور پھر گردن اور ہاتھ بڑھائے گلو کی طرف تول تول کر قدم بڑھاتا ہے)

بابا: (گمبھیر آواز میں) انگوٹھی مجھے دے۔

گلو: بابا اس انگوٹھی سے میں —

بابا: (چیخ کر) انگوٹھی مجھے دے (خوفناک انداز سے دونوں ہاتھ گلو کی طرف بڑھاتا ہے — گلو کھڑا ہوجاتا ہے اور اپنی جیب کو بازو سے چھپا لیتا ہے)

بابا: مجھے دے نہیں تو — نہیں تو گلا گھونٹ دوں گا تیرا۔ (سب دم بخود بابا کو دیکھتے ہیں گلو کے ہاتھ نیچے گر جاتے ہیں۔ بابا اپنی اکڑی ہوئی انگلیاں اس کی جیب میں ڈال کر انگوٹھی نکال لیتا ہے۔ اماں، باپ بیٹے کے بیچ میں آنے کی کوشش کرتی ہے مگر بابا اُسے زور سے دھکا دیتا ہے۔ وہ اس خوفناک اور پُر اسرار آہستگی سے لالٹین کی طرف انگوٹھی والا ہاتھ بڑھاتا ہے اور انگوٹھی کو غور سے دیکھ کر زور سے کہتا ہے)

بابا: اللہ (انگوٹھی ہاتھ میں لئے چھپر تلے سے نکل کر صحن میں رینگ آتا ہے)

بابا: (آہستہ آہستہ) اللہ! اللہ!

گلو: (اس کے پیچھے آکر غصے سے) بابا یہ میرا حصہ ہے

بابا: (لاڈ دارانہ طریقے سے) یہ پوری تو نہ بھر ہے نا — (گلو اثبات میں سر ہلاتا ہے)

بابا: اور اس پہ اللہ تعالیٰ کا نام کھدا ہوا ہے نا — تو نے اسے نہلایا یہ تجھے مل گئی میں نے کبر کھودی، پانچ روپے میرے حصے میں آگئے۔ اور گجک — اور گجک — (ایک دم پاگلوں کی طرح ہنستے اور چیختے ہوئے) جنت او جنت تیرے ننھے کو گڑ کی گجک لادوں۔ اس کے حصے کی گجک موٹر تلے آگئی — ہاہاہا — (انگوٹھی اوپر اٹھا کر دیکھتا ہے اور پھر اُسے زمین پر گرا کر باہر نکل جاتا ہے۔ جنت لالٹین لے کر دوڑتی ہے اور انگوٹھی اٹھا کر دیکھتی ہے۔ اُس کے ہاتھ سے لالٹین گر جاتی ہے اسٹیج پر گھپ اندھیرا ہو جاتا ہے باہر سے بابا کے قہقہوں اور کتوں کے بھونکنے کی آواز آتی ہے۔ پھر سب مل کر روتے ہیں۔ اندھیرے بڑھیا اماں کے بین کی صاف صدا آتی ہے۔

اماں: ارے میرے لال — پڑوس میں ہو، بولو تو جیا —!

(پردہ)

افسانہ :

کہی، ان کہی

دیویندر ستیارتھی

اس وقت میں آپ کو ایک واقعہ سنانے جا رہا ہوں۔ آپ چاہیں تو اسے ایک کہانی بھی سمجھ سکتے ہیں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا اب وہ گھونٹے والا بابا میری یاد کی دہلیز پر اسی طرح کھڑا رہے گا۔ آپ بھی اس زندہ کردار کو خوب پہچان لیں شاید کہیں اس سے آپ کی ملاقات ہو جائے۔ سر پر بھاری بھرکم پگڑی، کندھوں پر چادر، آنکھوں میں اداسی، چہرے پر کسی سے ملنے کا اشتیاق۔

میں نے اس کا نام نہ پوچھا، اس کا تو مجھے کوئی خاص افسوس نہیں۔

اس کا لہجہ بہت سہما ہوا تھا پھر بھی معلوم ہوتا تھا کہ اب اسے اپنے سامنے ایک نیا مستقبل نظر آ رہا ہے۔ آجکل اسی طرح کے کردار مجھے پسند آتے ہیں، جن کے دائیں بائیں کھڑا ہو کر میں اپنے نظریے کا جائزہ لے سکوں۔

گھونٹے والے بابا کو میں نے قد میں اپنے سے بہت بلند پایا۔ حالانکہ ہماری ملاقات پہلی ملاقات تھی اور وہ بھی نہایت مختصر۔

بجلی کی روشنی لاہور ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر چاندنی کی طرح بچھی ہوئی تھی۔ یقین کیجیے چودہ برس بعد لاہور کا یہ روپ دیکھنا مجھے میسر ہوا تھا۔ اور میں بہت خوش تھا۔ اپنی کلپنا میں مجھے دور تک ایسے ہی دھندلے نظر آ رہے تھے جیسے پرانی یادوں کی گلیوں میں بزم چراغاں کا منظر پیش نظر ہو سکتا ہے۔ وہ گھونٹے والا بابا بھی کسی چراغ کی لو کی طرح لپک کر سامنے آ گیا۔

میرے ساتھ ایک صاحب تھے، جو کہانیاں لکھتے ہیں۔ اسٹیشن پر پہنچنے سے پہلے لاہور کے ایک کالج کی بزمِ ادب میں ہم اکٹھے ہوئے، جہاں ایک کہانی پڑھی گئی۔۔ وہ کہانی میری ہی لکھی ہوئی تھی۔ اور بحث کے دوران میں میں نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ اس کی تخلیق میں میں نے اپنا تجربہ سا اس کو سامنے رکھا تھا جس کی ذہنی الجھن یوں شروع ہوتی تھی کہ بیٹی کے گھر کا تو پانی بھی نہیں پیتے اور وہ ایک پاپن کی طرح سوا سال سے بیٹی کے گھر میں روٹیاں توڑ رہی ہے۔

بحث میں ایک صاحب بولے کہ ایسے کردار تو ہمارے معاشرے سے رخصت ہو چکے ہیں۔ اور اب نئی پود کے صفتہ اور پڑھنے والے اس طرح کی چیز سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ اور اس کے جواب میں میں نے صرف اتنا عرض کیا تھا کہ کسی بھی کہانی کا خاکہ ایک ایسی وحدت ہے جسے تخیل کی مدد کے بغیر مرتب کرنا ناممکن ہے۔ اور اگر یہ صحیح ہے کہ ایک کہانی کا وجود بھی ادراک آگہی کی سوگند کھاتا ہے تو پھر اسی ادراک آگہی کے بل بوتے پر آپ کسی کہانی کا جمالیاتی حظ حاصل کر سکتے ہیں۔ بزمِ ادب سے اٹھ کر ریلوے اسٹیشن پہنچنے تک ہم اسی بحث میں الجھے رہے کہ کیسے ایک کردار یا واقعہ کو لے کر کہانی کا تانا بانا بن ڈالتے ہیں اور پھر کیسے ہمارے کردار ہمارے ساتھ سانس لینے لگتے ہیں۔ اور جناب کچھ ایسی ہی ہماری ذہنی کیفیت تھی، جب گھونٹے والے بابا سے ملاقات ہوئی۔

جیسے کسی جانے پہچانے رنگ نے مجھے آواز دے کر بلا لیا۔ اور مجھے یہ احساس ہوتے دیر نہ لگی کہ بلانے اور سننے والے میں سب دوریاں مٹ چکی ہیں —— اور لفظوں کو توڑے مروڑے بغیر ہی میں اس رات کی بات کہہ رہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ میرے اور میرے دوست کے ذہن میں ان گنت احساسات رچ بس گئے، جب گھونٹے والے بابا سے ہماری ملاقات ہوئی۔

یہ پوچھنے کا تو سوال ہی نہ تھا کہ بابا تمہاری تعلیم کہاں تک ہوئی۔

نہ یہ دریافت کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ کیا کبھی ایسا بھی ہوا کہ تم نے مٹی میں ہاتھ ڈالا اور وہ سونا ہو گئی۔

لمبا اونچا قد، پاؤں میں دیسی جوتی، گھنی بھری داڑھی، بڑی بڑی مونچھیں، خوش گفتار گھونٹے والے بابا کی یہ باتیں تو اب ہمیشہ یاد رہیں گی۔

جیسے کوئی گیت جاگ اٹھا۔ بابا کی تپلیاں پھیل گئیں۔ اور ہاتوں میں پھولوں کی باس نزدیک آ گئی۔

اس گوٹے والے بابا کی آنکھوں میں وہ جوت تھی، جو کسی سچے سچے دل کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔ یہ بات تو پہلی ہی نظر میں کھل گئی کہ گوٹے والے بابا کو غصہ بالکل نہیں آتا ہوگا۔

ہم دونوں ایسے ملے جیسے دو پربت گلے ملیں۔ میں نے مڑ کر دیکھا میرا ساتھی بھی گوٹے والے بابا کی شخصیت کی چھاپ محسوس کر رہا تھا۔

اب سنیے! قصہ یوں ہوا کہ میں نے دور سے دیکھا ایک بوڑھا میری طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ میں نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ سمجھانا چاہا۔ وہ جواب میں مسکرایا لیکن میں نے مسکرانے کی چنداں ضرورت نہ سمجھی۔ اب وہ بوڑھا میرے قریب آ چلا تھا۔ اس نے بازو پھیلائے۔ اب میں بھی جواب میں بازو پھیلائے بغیر نہ رہ سکا۔

اور پھر ہم گلے لگ کر ملے۔

میں نے کہا "پہچانے کہاں سے آئے بابا؟"

"پٹیالے سے"!

میں دوبارہ بابا سے گلے لگ کر ملا۔ اور میں نے کہا "اچھا تو آپ پٹیالے سے آئے نا بابا! میرا گاؤں بھی تو کبھی پٹیالے میں ہی تھا"

"بچھڑے ساتھی مل ہی جاتے ہیں" اس نے ہولے سے کہا۔

اور مجھے محسوس ہوا کہ اس کی آواز بزم چراغاں بن اٹھی۔

میں نے پوچھا "یہاں کہاں رہتے ہو تم"؟

وہ بولا "سکھر میں"۔

"وہاں کیا کرتے ہو"؟

"دریاں بانٹتا ہوں۔ اور خدا کے فضل سے روزگار میں فرق نہیں پڑا"

میں نے کہا "یہ تو بری بات نہیں، بابا! پیٹ لگا ہے تو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوتا ہے۔ اور محنت تو ضروری ہے"

بابا نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔

میرے ساتھی نے کہا "اب چلنا چاہیئے" میرے ساتھی کو جیسے اس وقت کسی کہانی کے کردار سے ملاقات کرنے میں ذرا بھی دلچسپی نہ تھی۔

مجھے خاموش پا کر میرے ساتھی نے کہا "تمہاری تو وہ بات ہے کہ چپک گئے تو بس چپک ہی گئے۔ اب گاڑی آنے میں دیر نہیں۔ بابا سے چھٹی لی جائے"

"تھوڑا رکو" کہتے ہوئے میں نے اپنے ساتھی سے آنکھوں ہی آنکھوں میں معذرت کی اور پھر میں نے بابا کے قریب ہو کر کہا:

"وہاں پٹیالے میں کیا کام کرتے تھے بابا؟"

بابا بولا "وہاں اپنا گوٹے کا کام تھا"

"اور اب وہ گوٹا کیا ہوا؟" میں خاموش نہ رہ سکا۔

"وہ گوٹا تو وہیں رہ گیا!" اور پھر میں نے بابا کی آنکھوں میں قطرے کو گہر بنتے دیکھا۔

ظاہر تھا کہ یہ کوئی ایسا مصرعہ نہیں جس پر سینکڑوں ہزاروں لوگ نعرہ لگائیں۔ جواب میں میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن الفاظ نے میرا ساتھ نہ دیا۔

میں بابا سے گلے ملے بنا نہ رہ سکا۔

جواب میں اپنی بات خاموشی میں ہی کہہ پایا۔

میرے ساتھی نے کہا "اب بابا سے اجازت لی جائے"

جونہی میں نے اپنی بانہیں بابا کے گلے سے ہٹائیں، بابا نے مجھے اپنی بانہوں میں کھینچ لیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ وہاں ایک نئی دوستی کا سورج طلوع ہو رہا تھا۔

میں نے کہا "ایسے منحوس دن بھی آتے ہیں بابا، جب کسی کا گوٹا چھن جاتا ہے لیکن ——"

معلوم ہوتا تھا، میرے الفاظ کہیں چھن گئے۔ میرا گلا بھر آیا۔ میں نے کچھ کہنے کے لیے زبان ہلائی لیکن الفاظ نے میرا ساتھ نہ دیا۔

میرے ساتھی نے کہا "بابا تم یہاں ٹھہرو ہم لوٹ کر آتے ہیں"

"ضرور آؤ گے نا؟" بابا نے آنسو بھری آنکھوں سے ہماری طرف دیکھا۔ رنگ گھلتا ہوا گندمی، یہ نقش پٹیالے والا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے اس گراموفون ریکارڈ کی یاد آ گئی جس کے آخر میں یہ آواز ابھرتی تھی "بھائی چھیلا، پٹیالے والا"۔ اور جب میں نے یہ بات اپنے ساتھی کو بتائی تو اس نے اس کا یہ جواب دیا۔ "بھائی چھیلا" پٹیالے والا کا جواب نہیں۔ بھائی چھیلا پٹیالوی میں یہ رنگ پیدا نہ ہوتا"

میں نے بڑے غور سے بابا کے چہرے کے گندمی رنگ سے

جائزہ لیا۔ اور اس کے خالص پٹیالے والے لہجہ کو جھک کر سلام کیا، اور میں نے کہا: "بابا! ہمارے سامنے ایک نیا مستقبل ابھر رہا ہے!"

اور پھر اپنے ساتھی کی بات مان کر میں نے بابا سے سردست اجازت لی۔

"تو آپ لوٹ کر آ رہے ہیں نا!" گوٹے والے بابا نے پوچھ لیا۔

"ضرور" میرے منہ سے نکل گیا۔

پلیٹ فارم پر بدستور بجلی کی روشنی چاندنی کی طرح بچھی ہوئی تھی۔ پتہ چلا کہ گاڑی آنے میں ابھی بیس منٹ رہتے ہیں۔

چند لمحوں کے لئے ایک جگہ میرا ساتھی رکا پھر ایک بک اسٹال کی طرف گھوم گیا۔ مجھے یہ سوچ کر کوفت ہو رہی تھی کہ آخر بک اسٹال پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالنے کے لئے ہی میرا ساتھی بار بار تاکید کر رہا تھا کہ گوٹے والے بابا سے اب چھٹی لی جائے۔

بک اسٹال کے قریب کھڑے کھڑے میں سوچ رہا تھا کہ آخر گوٹے والے بابا نے کیسے یہ پتہ لگا لیا کہ میں بھی پٹیالے والا ہوں۔ آخر کیسے اس نے پتہ چلا لیا کہ میں بھی ایک بھٹکی ہوئی منزل کا مسافر ہوں۔

جناب مجھے بے حد کوفت ہو رہی تھی۔ اور میرا ساتھی یونہی بک اسٹال پر اچھے برے میگزینوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اور بار بار جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ گویا سوچنے لگتا کہ ادھنی بس کے ٹکٹ کیلئے بچا کر رکھے ہوتے پیسے یہاں کیسے خرچ کئے جا سکتے ہیں۔

اس سرد ماحول میں میرے دل و دماغ ٹھٹھر رہے تھے۔ اور مجھے اپنے ساتھی پر بری طرح غصہ آ رہا تھا، جسے کہانیوں کے لئے نئے سے نیا موضوع تلاش کرنے کی ہمیشہ دھن رہتی تھی لیکن آج اس نے ایک زندہ کردار میں دلچسپی دکھانے میں بری طرح کنجوسی سے کام لیا تھا۔

میری آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی میرے دل و دماغ کی بے بسی سے گلے مل رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ اپنے ساتھی کا سنگ چھوڑ کر گوٹے والے بابا کے پاس چلا جاؤں اور اس سے کہوں کہ اب پچھلی باتیں یاد کر کے سسکتے رہنے سے تو کام نہیں چلے گا۔

ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر چاندنی کی طرح بچھی ہوئی روشنی بھی یہی بات کہتی معلوم ہو رہی تھی کہ ہماری آنے والی خوشیوں کی باگ ڈور تو ہمارے اپنے ہاتھ میں رہنی چاہیئے۔

میں گوٹے والے بابا سے یہ بھی تو نہ پوچھ سکا کہ اس کے گھر والے کتنے آدمی ہیں۔ کم سے کم مجھے یہ تو پوچھ لینا چاہیئے تھا کہ کبھی دیوالے کر پٹیالے کا وہ گوٹے والا بازار دیکھنے کا اس کا ارادہ کب دوستی کے محل بوٹے کاڑھے گا!

میں گوٹے والے بابا کے حضور میں جھک کر کہنا چاہتا تھا کہ انسان ابھی زندہ ہے اور دوستی کی بزم چراغاں کے لئے ہم انتظار کر سکتے ہیں، جب روٹھے ہوئے دل گلے مل کر کہیں گے — آؤ ہم چند باتوں میں مل کر چلنے کا تجربہ کریں۔

میرا ساتھی بک اسٹال کی دنیا میں گم ادھر ادھر ہاتھ بڑھا رہا تھا۔ اس کا دوسرا ہاتھ متواتر جیب میں پیسے گن رہا تھا۔

میں نے اس کا کندھا جھنجوڑ کر کہا:

"یہاں کیا رکھا ہے؟ چلو گوٹے والے بابا سے دو باتیں اور کر لی جائیں۔"

"ارے یار تم بھی کیسے کہانیاں لکھتے ہو گے!" میرا ساتھی جھنجلایا۔ "ارے بابا کے پاس جاؤ گے تو خود بھی بور ہو گے اور اسے بھی بور کرو گے۔"

"مطلب؟"

"مطلب یہی کہ کہانی کو پیاسی رہنے دو۔"

"تو دوبارہ گوٹے والے بابا کے پاس نہ چلا جائے؟"

"ہرگز نہیں۔"

"لیکن ہم اس سے وعدہ کر کے آئے ہیں۔"

"وعدے کی ایسی تیسی!"

میرا ساتھی بدستور بک اسٹال پر جھک گیا۔

میں بڑی الجھن میں تھا۔ میرے ساتھی نے میرے جذبات کا گلا گھونٹنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔

معلوم ہوتا تھا کہ پلیٹ فارم پر چاندنی کی طرح پھیلی ہوئی روشنی سے بھاپ اٹھ رہی ہے۔ بیچ بیچ میں میرا ساتھی میری طرف یوں دیکھنے لگتا جیسے وہ گھوڑے کا ساز کس رہا ہو۔ جیسے میں انسان نہ تھا، اس کے تانگے میں جتا ہوا گھوڑا تھا۔

اچانک اس نے بک اسٹال سے دور ہٹ جانے کا فیصلہ کیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دوسری طرف چل پڑا۔

میں نے کہا: "ہم ایک بار بابا کے پاس ہو آئیں۔ تاکہ وہ

جہاں پہنچا تو کہنے لگے "

"وہ ہمیں چھوٹا سمجھے گا تو ہمارا کیا لے گا؟ میرے ساتھی نے ہنس کر کہا: میاں کہانی کو پیاسی رہنے دو۔"

کاش میں ایک منہ زور گھوڑے کی طرح تانگے سے چھوٹ کر دوبارہ بوڑھے بابا کے سامنے جا کھڑا ہوتا لیکن میرا ساتھی تو میرے کندھے پر ہاتھ دھر کے زبردستی مجھے دوسری طرف لئے جا رہا تھا۔

پلیٹ فارم پر طرح طرح کے لوگ نظر آ رہے تھے۔ میں دوبارہ بوڑھے بابا کے پاس جا کر پوچھنا چاہتا تھا۔ بابا، تم یہ تو سمجھ گئے ہو یا نہیں کہ تمہارے ووٹ کی بہت قیمت ہے۔

بس اتنے میں گاڑی کے پہیوں کی دندناتی آواز ہمارے کانوں پر طبلہ سا بجانے لگی۔

میں چاہتا تھا کہ اپنے ساتھی کا ہاتھ چھڑا کر دوڑتا ہوا اس بوڑھے بابا کے پاس جا کر اسے ڈبے میں سوار کرانے میں مدد دوں۔ لیکن میری بھی تو ایک مشکل تھی۔

راولپنڈی کی طرف سے آنے والی اس گاڑی پر کراچی جانے والے ایک صاحب سے میرا ساتھی مجھے ملانے لایا تھا جن کی مدد سے کراچی میں میری رہائش کا انتظام ہو سکتا تھا۔

گاڑی ٹھیک وقت پر لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر آ کر رکی۔ میرا ساتھی مجھے اپنے دوست سے ملا کر یہ وعدہ لینے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ کراچی میں میری مدد کرے گا۔

اس گونگے والے بوڑھے سے دوبارہ نہ مل سکنے کا مجھے بہت افسوس تھا۔ جب بھی مجھے کسی کردار کی ضرورت پڑتی میں نے اسے یاد کی دہلیز پر کھڑے پایا۔ اور زور زور سے کہانی کے کردار کہیں بے موسم کے پھلوں کی طرح کسی مداری کے تھیلے سے تو نہیں نکلتے۔ کہانی کو پیاسی نہ رہنے دو، پیارے!

ہاں تو اب سنئے سارا قصہ، گاڑی چھوٹ چکی تھی۔ جونہی ہم دروازے کی طرف بڑھے یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی حد نہ رہی کہ گونگے والا بابا بدستور کھڑا ہمارا انتظار کر رہا ہے۔

ڈرامے کی فنی اور ادبی قدریں ——— بقیہ صفحہ ۱۲

لائے اور اس کے ساتھ ساتھ "علامتوں" کو خیال کے وسیع تر اور عمیق تر اظہار کا وسیلہ بنایا اور یوں ایک بار پھر ڈرامے کی فنی اور ادبی قدروں میں صحیح توازن پیدا ہوا اور ڈرامے کو محض ایک فن سمجھنے کے بجائے اسے ادب سمجھنے کے رجحان کو محض ایک محدود اور مخصوص گروہ کا رجحان نہیں بلکہ پوری ادبی دنیا کا رجحان سمجھا جانے لگا۔ چیخوف نے کمتر اور ابسن نے ایک وسیع تر پیمانے پر حقیقت پسندی اور رمزیت کے نطیف اور مکمل امتزاج سے ڈرامے کو پھر اپنی وہی ادبی حیثیت حاصل کرنے میں مدد دی ہے جو اس میں فطرتاً موجود تھی، لیکن فکر اور عمل کے غلط اندازوں نے اسے نظر سے پوشیدہ کر دیا تھا۔ اور اب ڈرامے کو جس طرح ایک خاص طرح کا فن سمجھا جاتا ہے اسی طرح ادب کی بھی ایک خاص صنف تصور کیا جاتا ہے۔ اسٹیج کے ڈرامے اور ادب کے ڈرامے کو دو الگ الگ چیزیں تصور کرنے کے بجائے بجا طور پر ایک ہی فنی حقیقت کے دو رخ سمجھا گیا ہے، جس کی ترتیب، تشکیل، تنظیم اور تعمیر ایسی قدروں کے امتزاج سے ہوئی ہے جن میں سے بعض کو ہم آسانی کے خیال سے ڈرامے کی "فنی قدریں" کہتے ہیں اور بعض کو "ادبی قدریں" — حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ بقول ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے "ڈرامے کو اسٹیج سے الگ کر کے محض ایک ادبی صنف کی حیثیت سے دیکھنا اور جانچنا بھی اتنا ہی غلط ہے جتنا یہ سمجھنا کہ ڈرامے کے لئے ادب ہونا ضروری نہیں ہے"۔

۱ :

۳ :

۲ :
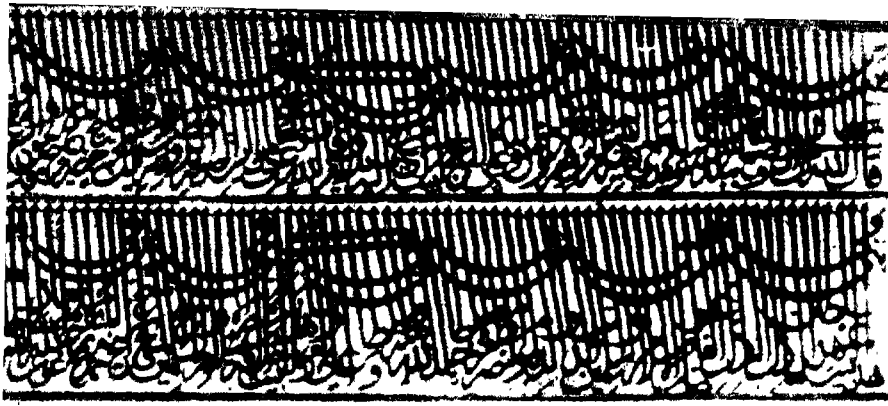
مشرقی پاکستان میں خطاطی

۱- خط طغریٰ (''نیر کمان'' کا اسلوب عہد مظفر شاہ ، پا

۲- نسخ (درگاہ شاہ جلال رح ، سلہٹ)

۳- ثلث (مسجع) (عہد سلطان ناصرالدین محمود شاہ ، اول)

۴- ثلث (عہد محمود شاہ)

۵- کوفی : (محراب مسجد ادینہ ، پانڈوہ)

۵ :

۴ :
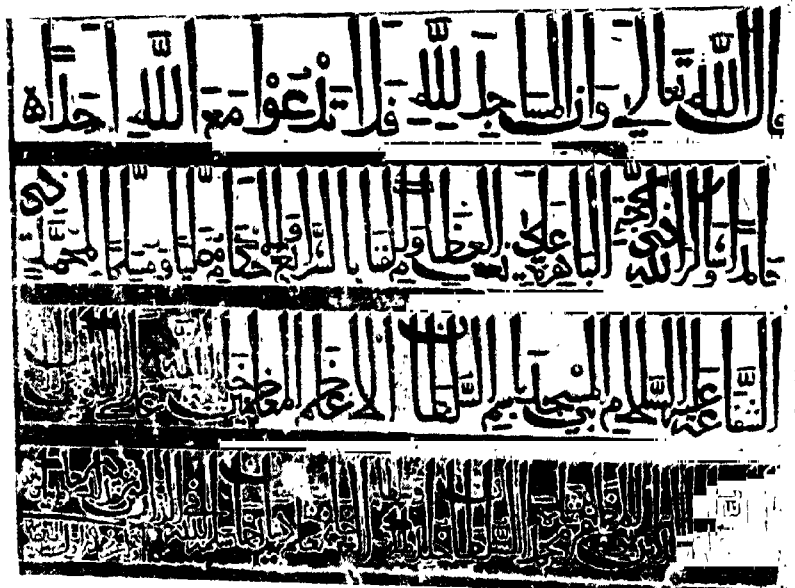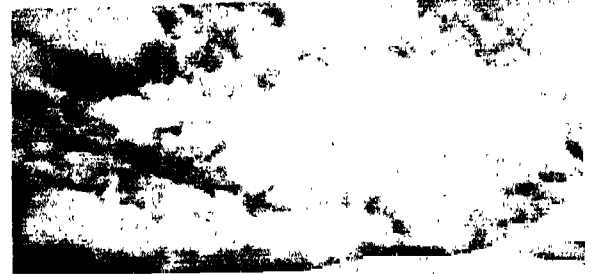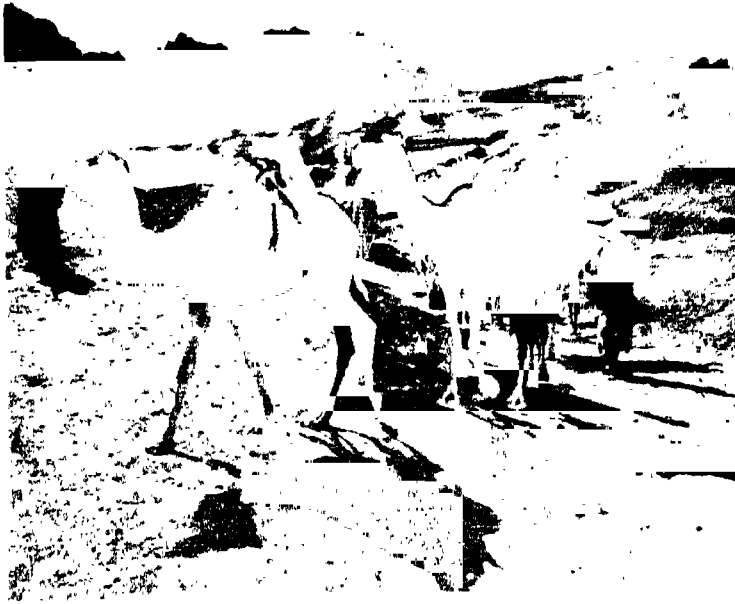
وادیٔ بولان

۱- پہاڑی گڈوں
۲- برفباری
۳- اونٹوں کے قافلے
۴- شام صحرا

بتانِ وہم و گماں

یوسف ظفر

وقت کی خاک میں صدیوں کی صدا سے گردا
بت بنی اپنے تبسم کے سکوں میں گم تھی
مردہ لمحات کے تابوت میں اک عمر یہ بت
اپنے خالق کی تمنا کے تراشیدہ صنم
خاک میں خاک ہوئے مدت سے ہم دوش رہے
موت صدیوں کے جنازوں پہ کھڑی سجتی تھی
کون ان لاشوں کا اندازِ نظر جانے گا!
کون ان بگڑے ہوئے چہروں کو پہچانے گا!!

ٹیکسلا! تیرے دفینوں میں بہت کچھ ہوگا
وقت کی ہنستی ہوئی گاتی ہوئی تصویریں
تیری آغوش میں ہیں، تیری فسانہ خواں ہیں،
مردہ ماضی کا صنم خانہ ہے پیکر تیرا،
تیرے سینے کے یہ ارماں، یہ پتھر کے صنم
کتنی تہذیبوں کی میراث ہیں، سرمایہ ہیں،
موت کی مٹی کے اگلے ہوئے ہر بت کی نظر
چیخ کر اپنے زمانے کی خبر دیتی ہے
دیکھنے والے کو اک اور نظر دیتی ہے

میں نے دیکھے ہیں وہ بت راہوں پہ چلتے پھرتے
جن کے سینے بھی صنم خانے ہیں، جن کے ارماں
اُن کے چہروں کی لکیروں میں نظر آتے ہیں
ہر کوئی ٹیکسلا ہے، اپنے بتوں کا مدفن
میرا سینہ بھی دفینہ ہے تمناؤں کا
لیکن اس دور میں ہم لوگ یہی چاہتے ہیں
اجنبی نظروں پہ یہ راز عیاں ہونے نہ دیں
دل کو ہم خون کریں سنگِ گراں ہونے نہ دیں

ٹیکسلا! تیرے صنم خانے میں کیا کچھ ہوگا!
لیکن اک چہرہ مری روح سے کچھ کہتا ہے
اس کو میں دیکھنے لگتا ہوں تو چپ رہتا ہے
اس کے چہرے پہ سکونِ دلِ آسودہ ہے
اس کی پیشانی پہ ہیں ثبت محبت کے نقوش
اس کی آنکھوں سے ازل اور ابد جھلکتے ہیں
اور ہونٹوں پہ وہ نوخیز تبسم کی لکیر
جو خدا دے تو دو عالم کو خوشی مل جائے
گلِ آدم کو بتِ سنگ کی ہستی مل جائے

اے بتِ سنگ! اگر تو بھی ہے اک خوابِ سکوں
تیرے خالق نے تجھے اپنی تمنا جانا
اس کی مایوس نگاہی نے تراشا تجھ کو
اس نے پایا تجھے امیدوں کے گورستاں میں
اس کی حسرت نے ترے رخ کو تبسم بخشا

تو مری روح کو مت چھیڑ کہ مجبور ہیں ہم
اپنے خالق کی تمنا کے تراشیدہ صنم

★

غزل

سراج الدین ظفر

شوق راتوں کو ہے درپے کہ تپاں ہو جاؤں
رقصِ وحشت میں اٹھوں اور دھواں ہو جاؤں

کھو کے چھوڑوں تو تپش قافلۂ شام و سحر
اک بھٹکتی ہوئی آوازِ فغاں ہو جاؤں

اب یہ احساس کا عالم ہے کہ شاید کسی رات
نفسِ سرد سے بھی شعلہ بجاں ہو جاؤں

لبِ معجز نفساں کی ہو اگر بخششِ خاص
ناگہاں نے کی طرح زمزمہ خواں ہو جاؤں

لا صراحی کہ کروں وہم و گماں غرقِ شراب
اس سے پہلے کہ میں خود وہم و گماں ہو جاؤں

میں نہیں خضر کہ بس زہد و طاعت کے لئے
وقت کے دوش پہ اک کوہِ گراں ہو جاؤں

مجھ کو پیری ہے جو منظور تو اس شرط کے ساتھ
صبح کو پیر تو راتوں کو جواں ہو جاؤں

وہ تماشا ہوں ہزاروں مرے آئینے ہیں
ایک آئینے سے مشکل ہے عیاں ہو جاؤں

یوں جلا ہے تپشِ سینہ درِ خانۂ بتاں
سرمۂ دیدۂ صاحب نظراں ہو جاؤں

بوئے مے آئے گی انفاس سے ورنہ میں تو
حلقۂ زندگی کی روح رواں ہو جاؤں

ہاتھ اس زلف سے ہیں دور مگر کیا معلوم
کس گھڑی بے خبرِ سود و زیاں ہو جاؤں

شوق کا جب کسی صورت نہ ادا ہو مفہوم
دہن عین خموشی میں زباں ہو جاؤں

اس طرح تیز ہوا ہے گردشِ پیمانہ کہ میں
سینۂ گردشِ دوراں میں سناں ہو جاؤں

ایسی چھلکا کوئی اے پیرِ خرابات نشیں
صبح تک واقفِ اسرارِ بتاں ہو جاؤں

میں ترے بندِ قبا سے کہ ہے بے شرح و بیاں
الجھوں اس طرح کہ بے شرح و بیاں ہو جاؤں

غرق ہو کر بھی ہے برحق ابدیت میری
پھر نہ ابھروں جو زماں سے تو زماں ہو جاؤں

ایسا اندازِ غزل ہو کہ زمانے میں ظفر
دورِ آئندہ کی قدروں کا نشاں ہو جاؤں

★

غزل

اختر احسن

راتیں دیدۂ تر سے پہلے راتیں دیدۂ تر کے بعد
منزلیں مجھ سے دور رہتی ہیں میرے سیر و سفر کے بعد

ایک کرن بھی درد کی سرخی توڑ کے دل تک آ نہ سکی
دل میں کوئی رنگ نہ جاگا رنگ شام و سحر کے بعد

دید کا دروازہ نہ کھلا صحرا کی پھیلی وسعت پر
وحشت سایۂ در سے پہلے، وحشت سایۂ در کے بعد

دشت ہے وہ ویرانی کا، شب کو دیس نکالا ہے
نام نہ لوں گا ریگِ رواں کا منظرِ ریگِ سحر کے بعد

یاد کا اک تارا بھی نہیں جو شامِ افق پر آن بسے
دھول سی بن کر اڑ گئی شامیں رحلتِ شمس و قمر کے بعد

چار طرف اب ویرانی کا پانی تنہا بہتا ہے
درد میں گھل کر بہہ گئی راہیں قتلِ شام و سحر کے بعد

نالۂ دل جب بیچ میں اٹھا نالۂ شب بھی ماند ہوا
رات ستارے نے کر بھاگی درد کے اس منظر کے بعد

کوئی ثمر اس دل پہ نہ آیا اشک کے ایک ثمر کے بعد
آنکھ کو کوئی پھول نہ بھایا دل کے غنچۂ تر کے بعد

کوئی بھی پیاری شکل نہ دیکھی دل کی پیاری شکل کے بعد
کوئی صورت دل میں نہ جاگی صورتِ غنچۂ تر کے بعد

دل سے گئے پر ایک اداسی شام و سحر میں چھوڑ گئے
خامشیوں کی خاک جمی ہے شورشِ شمس و قمر کے بعد

پھول ہنسے تھے لیکن اب دل مدت سے ہے بھول چکا
ہاتھ قلم ہیں شاخوں کے اس قتلِ لعل و گہر کے بعد

آب و ہوا میں خاک کی آخر خاک ہی ہو کر بیٹھ رہا
کوئی الفت دل کو نہ بھائی الفتِ لعل و گہر کے بعد

کیا کیا جھوٹ تھے نور سے بن کر منزلِ دل میں آ کے رہے
نالۂ حسرت دل میں جاگا لمحہ لمحہ بھر کے بعد

شاخ شاخ پر پھول کھلے ہیں صورتِ غنچۂ تر کے بعد
نخلِ دل بھی رقص میں آیا رقصِ تیغ و تبر کے بعد

ایک گرج سی بن کے اڑی ہے رات کی پھیلی تنہائی
پرزے پرزے خامشیاں ہیں یورشِ شمس و قمر کے بعد

سیلِ نور نے آن دبوچا خاک کو گھول کے پی ہی گیا
نور کا اک طوفان اٹھا ہے قتلِ لعل و گہر کے بعد

رات کہانی بن کر آئی دن بن کر اک افسانہ
رنگ میں سارے منظر بھیگے منظرِ شام و سحر کے بعد

صبح نئی اک آن کے پھر سے آئینۂ دل میں اتری
کیا کیا پھیلے منظر جاگے وحشتِ دیدۂ تر کے بعد

کونہ کونہ صحراؤں کا نقشِ قدم سے آگ ہوا
چار طرف اک گلشن دہکا میرے سیر و سفر کے بعد

اک اک شاخ پہ ایک عجب سی صورت آن کے بیٹھ گئی
باغ تھا حیرانی کا عالم میرے ذوقِ نظر کے بعد

فیچر

ہمارے عوامی رقص

شفیق بریلوی

مجھے ذوقِ تماشا اکثر کہیں نہ کہیں لے ہی جاتا ہے — جہاں سانولی سلونی شامیں فن کی گوناگوں جلوہ آرائیوں سے جگمگ جگمگ کرتی ہیں اور بھیگی ہوئی سرشار راتیں رقص و نغمہ کی سحرکاریوں سے وہ "جنت نگاہ، یہ فردوس گوش ہے" کا سماں پیدا کرتی ہیں۔ چنانچہ صدر آئزن ہاور اور ان کے ہمراہ آنے والے امریکی مہمانوں کے اعزاز میں جن تفریحی پروگراموں کا اہتمام کیا گیا تھا، میں بھی ان میں شریک تھا۔ بزمِ طرب جہاں بھی ہو بزمِ طرب ہے۔ اور پھر ہوٹل میٹروپول کی مدہوش کن سراپا بہار فضا میں۔ ان نغمہ ہائے دلنشیں اور رقص ہائے دلنواز نے بے اختیار پاکستان کے گوشے گوشے کی یاد تازہ کر دی۔ خواہ وہ مشرقی پاکستان ہو جہاں ہم چاروں طرف خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں یا مغربی پاکستان جس کے کوہسار، میدان، ریگ زار سب ایک انوکھی، ایک دلآویز فضا لئے ہوئے ہیں۔

ہمارے عوامی ناچوں کی یہی بات مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔ جیسے زندگی خود رقص کے سانچے میں ڈھل گئی ہو۔ جیسے ہر مقام کے باشندوں کی روح نے ایک نرالی وضع اختیار کر لی ہو جیسے دھرتی خود جی اٹھی ہو اور ایک عجیب شانِ دلربائی کے ساتھ انگڑائیاں لے اور اس کا انگ انگ اس کی ہر ادا، ہر حرکت دل کی گہرائیوں میں اتر جائے۔ ان رقصوں کی دلآویزی اور فنی نفاست اپنی جگہ پر ہے۔ لیکن ان کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے۔ یہاں تازگی اور قدرتی وضع۔

دلبری بے قاہری جادوگری است — یہ ایک حقیقت ہے۔ اسی طرح دلبری با قاہری پیغمبری است۔ اور اس کا بین ثبوت سرحد کا سنگلاخ علاقہ ہے۔ یہ سرحد کی چٹانوں کے فرزند جن کی رگ رگ میں ایک بہادر اور جنگجو قوم کا خون گرم موجزن ہے۔ یہ لوگ صدہا سال سے رزم و پیکار کے دھنی ہیں۔ اور ان کے لئے شمشیر و سناں ہی زندگی ہیں۔ اگر یہ نہیں تو کچھ نہیں۔ اس روح اور اس زندگی کی عکاسی خٹک، لختہ اور رتی سے بہتر اور کیا کرے گا؟ یہ رقاص نہیں سرحد کے جیالے جنگجو شمشیر زن ہیں۔ اور ان کا والہانہ رقص تیزی سے گھومنے، اعضا کے پُرزور جھٹکوں اور ولولہ و جوش کا ایسا پُرجلال مظاہرہ ہے۔ جس میں قاہری ہی قاہری ہے — جس سے نرم رگ انسان دہم ہو جاتے ہیں۔ اور بزمیہ وضع کے تفریحی مشاغل کے شوقینوں کے دل دہل جاتے ہیں۔ یہ قاہرانہ جمال ایک ایسا قوی اور پُرزور اثر دکھاتا ہے جو ناظر کے دل و دماغ پہ مدت العمر چھایا رہتا ہے۔ خٹک ناچ کی حرکات تمام تر زندگی ہیں۔ اور ان میں خالصتاً اجتماعی روح کارفرما ہے۔ کیونکہ ڈھول کی گرجتی کڑکتی آواز، رقاصوں کے پاؤں کی دھمک ہی سے نہیں دھڑکتے دلوں کی شورش سے بھی ہم آہنگ ہوتی ہے — اور ڈھول کی سنگت رقص و مستی کی شان اور اٹھان کو دوبالا کرتی ہے۔

خٹک اور لختہ، زندہ دلانِ سرحد کی قومی شجاعت کا بھرپور عکس ہیں اور یہاں کے گرم خون نوجوانوں کے پسندیدہ اور محبوب ناچ ہیں جن میں رزم کا پہلو زیادہ نمایاں ہے تو رتی رزم و بزم اور مردانگی و نسائیت کا ایک لطیف مجموعہ ہے۔ کیونکہ اسے مرد اور عورتیں مل کر ناچتے ہیں۔ اور گو اس میں بھی ورزش کا انداز پایا جاتا ہے۔ پھر بھی صنفِ نازک کا لطیف پرتَو جلال کو جمال سے نرم و سبک، لوچدار اور نشیلا بنا دیتا ہے۔

بلوچستان — یہ جری بلوچوں، قندھاریوں، چرواہوں، جفاکش دہقانوں کا مسکن جن کی زندگی پہاڑوں، ریگستانوں اور وادیوں ہی کی زندگی ہے — سرحد سے دور نہیں اور نہ اس سے کچھ مختلف ہے۔ اس لئے یہاں کے لوگ ناچ بھی سرحد کے مردانہ لوک ناچوں کے ہم وضع بھی ہیں اور حریف بھی۔ لہٰذا یہ کہنا تحصیلِ حاصل ہے کہ وہ لوگ جن کے متعلق حکیمِ ملت علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ — ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا — ان کے عوامی رقصوں

میں ان کی پوری زندگی جھلکتی ہے۔

اور وہ پنجاب انتخاب ہفت کشور — اس کے جیالے جاٹ، بلند ہمت اور بلند قامت کسان شیشم اور دھریک (شاہ بلوط) کے پیڑوں کی طرح فضا میں ابھرتے ہوئے۔ از زانی کے ساتھ وہ سرو ہی کی طرح بلند اور خوبصورت جاٹنیاں اور مٹیاریں ان کا رقص بے تحاشا گھومتا ہوا قاہرانہ رقص نہیں۔ بلکہ اچھلتا کودتا ہوا جو بھال رقص ہے۔ متوازی اور حلقہ دار نہیں بلکہ عمودی۔ جب پری وشوں کا کوئی جھرمٹ دن کے بھرپور اجالے یا رات کی سحرکن سیمیائی چاندنی میں حلقہ باندھ کر یہ ناچ ناچتا ہے تو بھی گھومنے سے زیادہ یہی اچھلنے کودنے کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ جیسے کوئی اپنی توانائی کی شدت سے اچھل کر ہوا میں نکل جانا چاہے۔ جیسے یہ کسی دلی خوشی کی لہر یا فتح و کامرانی کے محرک انگیز جذبہ کا نتیجہ ہو۔ اب وہ پری وش ایک ہو یا البیلی پری وشوں کی ٹرت ٹولی، وہ اپنی گھریلو زندگی اور باہر کھلے کھیتوں کی زندگی ہی کی حکاسی کرتی ہے — شاید یہی باتیں تھیں جن سے لعبتانِ چین کا وہ طائفہ جو کچھ عرصہ ہوا ہمارے یہاں آیا تھا مسحور ہوا اور اس کی نظر انتخاب ایسی چلبلے بہت ہی چلبلے ناچ پر پڑی۔ ناچنے والیاں بانہوں کو لہراتی، بڑی ہی مستی و بیخودی کے عالم میں ناچتی ہیں۔ کبھی کبھی تو ناچتے ناچتے صبح سے شام اور شام سے صبح ہو جاتی ہے کوئی منچلا نوجوان شیخ سعدی کی اس تعلیم کے برعکس کہ "ہوناں بگو شید - تا جاہ زناں نہ پوشید" — بڑی بے باکی سے عورتوں کا لباس پہن لیتا ہے۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دہقانوں کی اس سرزمین کو دیکھنے ایک بار پھر آسمان سے ہیر اتر آئی ہو اور پھر نہ جانے کتنے رانجھے اس کے گرد منڈلانے لگتے ہیں۔

بھنگڑا — جاٹوں کے اس مقبول ناچ کی آن بان ہی کچھ اور ہے۔ جہاں گیہوں کی بالیاں گدرائیں اور پیلی ہو ہو کر لہرانے لگیں، دیہات کے لوگ خوشی سے مست بلکہ بدمست ہو کر بے اختیار بھنگڑا ناچنے لگتے ہیں۔ اُف اس کی بے پناہ دھمک اور ہڑبونگ کا سا عالم! اور جب شورش و مستی اس قدر عام ہو جائے تو بچوں، بوڑھوں جوانوں کا امتیاز کیا۔ سبھی ایک ہی موج میلے میں ڈوب جاتے ہیں۔ ایک شخص گلے میں ڈھول ڈالے اس کو زور شور سے بجاتا رہتا ہے اور ناچنے والے رنگین لنگیں اور لانبے لانبے کرتوں میں ملبوس اس کے گرد حلقہ سا بنا کر ڈھول کی تال پر قدم اٹھاتے، تالیاں بجاتے گھنٹوں ناچتے رہتے ہیں۔

جھمر ہو یا جھومر بات تو ایک ہی ہے۔ اس میں جھوم جھوم کر لہرانے کی سی ادا ہے۔ وہی سوز، وہی نور، وہی لوچ اور بانکپن جو سابقہ مغربی پنجاب یعنی ملتان اور بہاولپور وغیرہ کے علاقوں میں ہے۔ اور لہندا اور مرکزی علاقہ میں فرق پیدا کرتا ہے۔ نوجوان ڈھول پر جھومر کی تال سن کر مدہوشی کے سے عالم میں اس کے گرد ناچتے ہیں۔ جیسے فانوس کی گردش کرتی ہوئی شکلیں لذت جلتی ہوئی شمع کے گرد۔ اور اگر مردوں کی جگہ یہاں کی البیلی لانبی لانبی ڈھیلے ڈھالے لباس والی جادوگرنیاں ہوں تو پھر کیا کہنے۔

سمّی، گدّا اور کلکلی — ان ناموں ہی میں شوخی و شرارت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی۔ سمّی یا سماع شاید ایک ہی چیز کے دو روپ ہوں۔ اس دیہاتی ناچ کا سلسلہ ملتان اور سندھ سے ہوتا ہوا شاید عرب تک پہنچ جاتا ہو۔ سمّی کیا ہے؟ نوجوان البیلی دیہاتی لڑکیوں کا ناچ جب ان کے ولولے اور امنگیں چند گھنٹوں کے لئے سماج کی چادر ہٹا کر سامنے آجاتے ہیں۔ اور اُن کے چہرے ایک دلی خوشی کی لہر سے کھل اٹھتے ہیں۔ اس ناچ میں جب لڑکیاں مٹکتی تھرکتی، آنچل لہراتی، چوڑیاں اور پازیب بجاتی مستی کے عالم میں کھوئی ہوتی ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس سمّی یا سہیلی کی یاد میں یہ ناچ ناچا جا رہا ہے وہ ابھی کہیں سے نکل کر آجائے گی اور ان مہ جبینوں میں شامل ہو کر ناچنے لگے گی۔

گدا یعنی تالی — یہ بھی دلی ترنگ اور کیف و مستی کی ایک پُرلطف علامت ہے۔ اس میں لڑکیاں تو لڑکیاں بچے اور لڑکے بھی شامل ہوتے ہیں۔ جب اس ناچ کا سماں بندھتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے ستارے آسمان سے ٹوٹ کر زمین پر آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں۔

کلکلی کلیر کی — یہ ہیں ایک پنجابی لوک گیت کے الفاظ جیسے کوئی کلی چٹک رہی ہو یا طبیعت میں گدگدی ہو۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کا چست اچھلتا کودتا ناچ، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے تیزی سے اچھلتی کودتی گاتی گلہریاں۔ جہاں "کلکلی کلیر دی" کے الفاظ زبان پر آتے ہی آنکھوں کے سامنے ایک دھن بالا اور بگنیاں ہی بگنیاں گھوم جاتی ہیں۔

فتح باغ کے ویرانوں میں

عارف حجازی

دوپہر کے گہرے سناٹے میں ویران، اُداس ٹیلوں پر جیسے موت کی دہشتناک پرچھائیاں چل پھر رہی تھیں۔ آس پاس ہُو کا عالم طاری تھا لیکن جب نیم گرم ہوا کے جھکڑ سرسراتے ہوئے چلنے لگتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے سینکڑوں زخموں سے نڈھال انسان تپتے ٹیلوں کے درمیان پڑے سسک رہے ہیں۔

میں بڑی دیر تک فتح باغ کی خاک و خوں میں ڈوبی ہوئی داستان کے بارے میں سوچتا رہا۔ یہ کوئی انوکھی داستان نہ تھی بلکہ اُن قدیم تاریخی روایات کی آئینہ دار تھی جن سے دنیا کی تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ میں نے بیٹھے بیٹھے اپنے گردوپیش ایک اچٹتی نگاہ ڈالی اور دل میں کہا "قرطاجنہ، ہڑپہ، بابل اور نینوا جیسے قدیم شہروں کو تو فنا ہوئے ہزاروں برس بیت چکے ہیں۔ مگر فتح باغ کو مٹے ابھی کونسی اتنی صدیاں گزر گئی ہیں کہ زمانہ اسے یکسر بھلا بیٹھا؟"

یہ سوچ کر مجھے بڑا تعجب ہوا اور مدفون شہر کے ٹیلے پر بسنے والوں پہ غصہ بھی آیا لیکن جب میں نے اپنے ملاقاتی گدّو فقیر کو اپنے قریب بیٹھے پایا تو جیسے دل کا غبار آپ ہی آپ چھٹ گیا۔ اب اس ٹیلے پر جہاں کسی زمانے میں پُر رونق شہر ہوگا۔ گھاس پھونس کے صرف چند گھر بنے تھے اور ان کے چاروں طرف ویران ٹیلے! ایک طرف یہ منظر اور دوسری طرف اذیت ناک افسردگی چھائی ہوئی۔ میں نے یہ سماں دیکھ کر گدّو فقیر سے باتیں چھیڑ دیں: "گدّو سائیں! تمہیں فتح باغ کے اُجڑنے کی کہانی یاد ہے؟"

یہ سن کر حبشی نژاد سو سالہ بوڑھے کے مرجھائے ہوئے چہرے پر سنجیدہ مسکراہٹ دوڑ گئی اور اس نے بڑے فلسفیانہ انداز میں جواب دیا۔

"میرے نوجوان مسافر! آج تم نے بڑی بھولی بسری یاد تازہ کر دی۔ خدا کی شان دیکھئے، جہاں ہم آج بیٹھے ہوئے ہیں یہاں کسی زمانے میں بڑا خوبصورت شہر آباد تھا۔ یہی دو سو سال پہلے کی بات ہے۔"

میں نے فوراً کہا "اتنا تو مجھے بھی معلوم ہے لیکن اس کی تباہی کے اصل اسباب کیا تھے؟"

بوڑھا پھر مسکرایا اور کہنے لگا "آہ! اس شہر کی تباہی کے اسباب پوچھتے ہو۔ وہی انسانی ہوسِ اقتدار اور لوٹ کھسوٹ جس کی مثالیں تاریخ میں بھری پڑی ہیں۔" گدّو نے ایک لمبی سانس لیکر کہا "کلہوڑہ کا آخری حکمران میاں عبدالنبی' جو نواب سندھ کے نام سے مشہور تھا۔ اسی کے زمانے میں یہ شہر تباہ ہوا۔ نواب بڑا بزدل تھا۔ اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر بلوچی سردار فتح علی خاں تالپور نے اس کی مملکت پر چڑھائی کر دی اور طہنائی کے مقام پر دونوں میں گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ آخر نواب شکست کھا کر کابل بھاگ گیا۔"

"کابل؟"

"ہاں۔ کابل پہونچ کر اس نے والیٔ افغانستان سے مدد حاصل کی اور افغان جرنیل 'عزت یار خاں' کے ہمراہ ایک بڑی فوج لیکر سندھ آیا۔ عزت یار خاں نے اس کی کھوئی ہوئی حکومت بحال کر دی لیکن ابھی اسے کابل واپس ہوئے تھوڑے ہی دن گزرے ہوں گے کہ بلوچی سردار فتح علی خاں تالپور نے نواب کو پھر ملک بدر کر دیا۔ آخر نواب کو پھر شاہ افغانستان کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔

"یہ وہ زمانہ تھا جب مغلوں کے عروج کا چراغ دم توڑ رہا تھا۔ ہر سُو ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ ادھر سندھ پر افغانوں کا اثر بڑھ گیا تھا چنانچہ

اس دفعہ شاہ افغانستان سے نواب عبدالنبی کی اس شرط پر مدد کرنے کا وعدہ کیا کہ وہ اسے بھاری خراج ادا کرے گا۔

"نواب کیلئے اب کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اس شرط کو تسلیم کرلے۔ چنانچہ افغان بادشاہ نے اپنے ایک آزمودہ جرنیل مدد خاں کو نواب کے ساتھ بھاری فوج دیکر روانہ کیا۔ مدد خاں نے سندھ پہونچکر نواب کو بڑی آسانی سے اس کی کھوئی ہوئی حکومت دوبارہ دلوادی لیکن ادھر مدد خاں کی آمد کی خبر پاکر فتح علی خاں تالپور تمام قیمتی ساز و سامان اور خزانہ لیکر فرار ہوگیا تھا۔ چنانچہ جب مدد خاں واپس کابل جانے لگا تو اس نے نواب سے خراج طلب کیا۔ اس پر نواب بڑا اسٹپٹایا۔ خزانہ پہلے ہی خالی ہوچکا تھا اور کوئی دوسری صورت ایسی نہ تھی کہ وہ مدد خاں کو ٹال سکتا۔ آخر کئی روز انتظار کرنے کے بعد مدد خاں کی فوج رسد کی کمی کی وجہ سے فاقہ کرنے لگی۔ اس پر مدد خاں بہت بگڑا۔ یہ دیکھکر خود غرض اور بزدل نواب نے مدد خاں کو مشورہ دیا کہ وہ ملک کے پُرامن اور نہتّے عوام کو لوٹ کر خراج وصول کرلے۔ مثل مشہور ہے 'اندھا کیا چاہے دو آنکھیں'۔ مدد خاں کے لئے نواب کا اتنا اشارہ بہت کافی تھا۔ چنانچہ اس کی ٹڈی دل فوج شہر، گاؤں، بستی جو سامنے آیا تخت و تاراج کرتی چلی گئی اور لوٹ مار قتل و غارتگری کا ایک ایسا ہولناک کھیل شروع ہوگیا کہ ہزاروں بے گناہ عوام موت کی نیند سلادیئے گئے۔ ان کی عزت و آبرو، مال و دولت غرضیکہ سب کچھ لوٹ لیا گیا اور اس طرح وادیٔ سندھ کے کئی خوبصورت، پُررونق شہر جن میں فتح باغ، جون، بدین، چھا چھرو اور ناصرپور قابلِ ذکر ہیں، سب نذرِ آتش کردیئے گئے اور اب ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا!"

گدّو فقیر نے پھر ایک لمبی سانس لیکر چاروں طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ "آج فتح باغ کی خوبصورتی کا کوئی تصور نہیں کرسکتا۔ کسی زمانے میں یہ مقام سندھ کا نہایت مشہور صنعتی مرکز تھا۔ اس کی خوشحالی، دلکشی، سرسبز باغات، رسیلے پھل، جھکتے ہوئے پھول اور مصنوعات دُور دُور تک مشہور تھیں۔ اس زمانے میں دریائے سندھ، جو اب یہاں سے دس کوس پر ہے، شہر کے دامن سے لپٹ کر بہا کرتا تھا۔ دریا کے کنارے مال بردار کشتیاں لنگر انداز رہتی تھیں جن کے ذریعہ یہاں کی بنی ہوئی سینکڑوں چیزیں دور دور مقامات کو بھیجی جاتی تھیں۔ تجارتی مرکز ہونے کی وجہ سے لوگ بڑے خوشحال تھے اور پُرامن زندگی بسر کرتے تھے۔ مگر آج اس پُررونق شہر کی بجائے اینٹوں اور ملبے کے ڈھیر رہ گئے ہیں جہاں اب دن کے وقت بھی حسرت برستی ہے۔ یہ ہے شہر فتح باغ کی تباہی کی کہانی!"

اتنا کہکر گدّو سائیں اپنی لاٹھی کا سہارا لیکر کھڑا ہوگیا۔ میں اپنی جگہ خاموش تھا اور میرے ذہن میں چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔ میں نے کھڑے ہوکر سامنے نگاہ اٹھاکے دیکھا تو ویرانوں سے پرے دھان کے کھیت لہلہا رہے تھے۔ کہیں کہیں آم کے پُرانے درختوں کے دو چار جھنڈ بھی تھے۔ جن کے گہرے سائے پر حیات آفریں طمانیت اور سکون طاری تھا۔

ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے ایک مسجد کے کھنڈر کی طرف نکل آئے۔ اس کے صدر دروازے کی نصف کمان باقی رہ گئی تھی جو اینٹ اور چونے کے ایک مضبوط ستون کے سہارے کھڑی تھی۔ کمان کا اتنا حصہ نہایت بھڑکیلا تھا اور اس پر چمکیلی ٹائلیں جڑی ہوئی تھیں۔ گدّو نے اس شکستہ کمان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"یہاں اکبری عہد کی ایک یادگار مسجد تھی جس کے ایک سو گنبد تھے۔ میں نے اپنی اٹھتی ہوئی جوانی کے زمانے میں جب اس مسجد کو دیکھا تھا تو یہ تقریباً ٹھیک حالت میں تھی لیکن اب تو یہ بھی زمانے کی چکّی میں پس کر خاک کا ڈھیر بن چکی ہے۔"

گدّو سائیں کا یہ جملہ سنکر مجھے ہسپانیہ کی مسجد قرطبہ یاد آگئی اور علامہ اقبالؒ کی نظم میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ میں نے مسجد کی شکستہ کرسی اور کھنڈر کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا جہاں اب چاروں طرف اینٹوں اور ٹائلوں کے اونچے ٹیلے کے سوا کچھ باقی نہ تھا اور اس کے کھنڈر کے علاوہ کوئی ایسی جگہ نہ تھی جس کے ابھرتے ہوئے نشانات اس کی شان و شوکت کی کہانی دہرا سکتے۔ ہر طرف ٹیلے ہی ٹیلے تھے جن پر ریت کی چادریں چڑھی ہوئی تھیں۔

مسجد کے کھنڈر سے ہوتے ہوئے ہم اس ویرانے کی طرف نکل آئے جہاں کسی زمانے میں راجہ بیربل کا گھر تھا۔ گدّو نے بڑے یقین سے بتایا کہ اکبر کے نورتنوں میں راجہ بیربل، تان سین اور گنگ بھٹ فتح باغ کے دلکش ماحول میں پیدا ہوئے تھے۔ اور یہیں پرورش پائی تھی۔ پھر گھومتے گھامتے

ہم مدفون شہر کی ایک ویران شاہراہ پر نکل آئے جو سنسان ٹیلوں کے بیچوں بیچ سیدھی سپاٹ تقریباً ایک میل تک چلی گئی تھی۔ اسی شاہراہ پر مغل حاکم کی محسرا تھی جس نے بے رحم حملہ آوروں سے فتح باغ کو بچانے کے لئے اپنی جان کی بازی لگادی تھی اور خود بھی دوسرے مظلوم انسانوں کی طرح فنا کی گود میں سو گیا تھا!

اس شاہراہ کے درمیان کھڑے ہو کر جب میں نے فتح باغ کے ماضی کا تصور کیا تو جیسے سچ مچ نگاہوں کے سامنے شہر کی خوبصورتیوں کا سماں کھنچ گیا۔ ۱۸۵۷ء سے کچھ پہلے اس شہر کے پُر رونق گلی کوچوں، بازاروں، دلکش باغات، ڈیوڑھیوں اور حویلیوں کی چہل پہل کا خیال آتے ہی مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں جنت کے کسی گوشے میں آگیا ہوں لیکن پھر یکایک ان ویرانوں کو دیکھتے ہی جیسے میرے کان دردناک چیخ پکار سے معمور ہو گئے۔ تلواروں کی کھٹا کھٹ، بندوقوں اور توپوں کی دل ہلادینے والی آوازوں کے درمیان عورتوں، بچوں اور مردوں کی دردناک آہوں، سسکیوں اور رونے پیٹنے کی دردبھری صداؤں سے زمین و آسمان میں ایک کہرام مچ گیا۔ نگاہوں کے سامنے آگ کے سربلند شعلے رقصاں تھے اور ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے آن کی آن میں ساری دنیا ہوس، لوٹ اور ظلم کی آگ میں جل کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھسم ہو جائے گی۔

اس خیال کے آتے ہی جیسے کسی نے مجھے زور زور سے جھنجھوڑا لیکن جب میں نے گھبرا کر اپنے آس پاس دیکھا تو چاروں طرف خاموشی تھی، ویرانے تھے، اداس ٹیلے کھڑے تھے اور سرسراتی ہوائیں جیسے کوئی گنگنا رہا تھا ؎

کتنے شب رنگ خیالوں کے منقش محراب
گرمیٔ وقت کی رفتار سے کجلاسے گئے
کتنے گلنار تصور کے سحر تاب محل
ان حوادث کے گراں تیشوں سے مسمار ہوئے!

کوئی خاموش فضاؤں میں گنگناتا ہوا جیسے میرے قریب سے گزر گیا۔ اب جو میں نے نظر دوڑا کے دیکھا تو گائڈ سائیں مجھ سے کافی دور ایک ویرانے کے پاس کھڑا میری راہ تک رہا تھا!

جنتِ تعبیر

(کورنگی کے کنارے)

آثر جلیلی

کراچی کے نواح میں بے خانماں مہاجرین کی آبادکاری کے لئے کورنگی کے پرفضا مقام پر نئی اور دلفریب بستی کی تعمیر رفاہی سرگرمیوں کی ایک شاندار مثال ہے اور اس دور کی خبر بھی دیتی ہے جس میں حقیقی آزادی اور جمہوریت کا دور دورہ ہوگا۔ اس نظم میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

زندگی مسئلۂ قالب و جاں
زندگی ہمہمۂ سیل رواں
زندگی غلغلۂ تاب و تواں
گرچہ ظاہر میں ہے اک بارِ عظیم
لیکن ادنیٰ سی نگاہ غلط انداز سے یہ بارِ گراں
غیرتِ دولتِ کونین بھی بن سکتا ہے۔
بادۂ حسن و لطافت سے ہو پر صبح کا رنگین ایاغ،
حجلۂ ناز سے اٹھلا کے چلے
میکدے اپنے جلو میں لے کر
بادۂ کوثر و تسنیم کو چھلکاتی ہوئی
ایک دوشیزۂ پروردۂ آغوش جمال
جس کا ہلکا سا اشارہ پا کر
نکہت و رنگ کا سرمایہ لٹا دیں غنچے
اور جنت کے دریچے کھل جائیں
زیبِ دوشِ گل نو رستہ ہو مشکل کا کل
زیست کا بارِ گراں

○

زندگی زمزمہ سازِ تمنا بھی ہے
از ازل تا بہ ابد زخمہ دِہ تار رگِ ابرِ بہار
آتشیں نغمہ زنِ جلوہ گہِ لیل و نہار۔
یہ حقیقت تری نظروں میں فقط خوابِ پریشاں ہی سہی
لیکن افسونِ نگاہِ غلط انداز سے یہ خوابِ پریشانِ حیات
رشکِ جنتِ تعبیر بھی ہو جاتا ہے
اعتبارات بدل جاتے ہیں، صدیوں میں سہی
دشت شائستۂ تعمیر بھی ہو جاتا ہے!

★

بولان کی وادیوں میں

رفیق خاور

بولان ہو یا بلوچستان۔ ان کا نام سنتے ہی مجھے اپنے ایک بہت ہی قریبی عزیز یاد آتے ہیں جن کی جغرافیہ دانی قابلِ رشک ہے۔ اور جو ا چھوٹی قسم کی معلومات وہ بہم پہنچاتے ہیں ان سے کون ہے جو محظوظ نہ ہو؟ یقین جانئے آپ ان کو سن کر ملا نصیر الدین کے سب لطیفے بھول جائیں گے۔ مثلاً اگر ان سے یہ پوچھا جائے کہ انڈیمان کہاں ہے اور کیوں مشہور ہے تو وہ جواب دیں گے انڈیمان کہیں تبت کے شمال میں ایک خاصا بڑا گرم مرطوب علاقہ ہے جہاں اتنا بھینسے ہی اتنا بھینسے پائے جاتے ہیں۔ کوئی گھر ایسا نہیں جہاں ایک دو ارنا بھینسے نہ ہوں۔ اور اپنے اس بیان کو تقویت دینے کے لئے وہ حوالے دینے میں بھی طاق ہیں۔ ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں کہ مشہور جغرافیہ داں ڈوڈلے اسٹمپ لکھتا ہے کہ ٹراک یا ٹرانگلے کی طرح یہ جانور بھی سواری اور بار برداری کے کام آتا ہے۔ اور جہاں ہاتھی نہیں جا سکتا یہ آناً فاناً پہنچ جاتا ہے۔ اس نے لوگوں کو خود اس پر ہودہ کس کر سواری کرتے دیکھا ہے۔ یہ بھی اچھا ہے کہ وہ اکثر و بیشتر ڈوڈلے اسٹمپ کا حوالہ دیتے ہیں ورنہ اگر وہ:

کیوں نہ دوزخ میں بھی جنت کو ملا لیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

کے مصداق مزید رعب ڈالنے کے لئے بڑے بڑے پرانے جغرافیہ دانوں ادریسی، بلاذری وغیرہ کو بھی گواہوں کی فہرست میں شامل کرنا شروع کر دیں تو انہیں کون روک سکتا ہے؟ خیر جہاں سوال صداقت کا ہے وہاں سوگند اور گواہ کی حاجت ہی کیا۔ اگر ان حضرت سے پوچھا جائے کہ فارموسا کہاں ہے اور کیوں مشہور ہے۔ تو وہ فضا میں بازو پھیلا کر ایک خاص سمت میں اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں یہ اس طرف ایک برِ عظیم ہے جس کے پایۂ تخت کا نام بھی یہی ہے۔ بہت بڑا شہر ہے۔ اس میں ایک چڑیا گھر، ایک عجائب گھر اور ایک ریڈیو پاکستان ہے۔ ظاہر ہے کہ ریڈیو پاکستان سے ان کی مراد محض ریڈیو ہی ہے، اور چڑیا گھر اور عجائب گھر تو ہر مسالے پیپلا مول، جس شہر کے متعلق بھی، پوچھا جائے ان کا ذکر لازمی ہے۔ لاہور کیوں مشہور ہے؟ اس لئے کہ اس میں ایک چڑیا گھر ہے اور ایک عجائب گھر۔ کراچی کیوں مشہور ہے؟ اس لئے کہ یہاں بھی ایک چڑیا گھر ہے اور ایک عجائب گھر اور کوئٹہ۔ اب کی ان کا تیر ٹھیک نشانہ پر بیٹھا۔ کوئٹہ بلوچستان میں ہے مگر خود بلوچستان کہاں ہے اور کیوں مشہور ہے؟ ظاہر ہے کہ اس میں چڑیا گھر اور عجائب گھر تو ضرور ہوں گے لیکن بلوچستان، یہ ہے ایشیائے کوچک کے وسط میں ایک بہت بڑا تاریخی ملک بلکہ جزیرہ۔ کسی زمانے میں یہاں اژدہے بہت تھے لیکن انگریزوں نے مشین گنوں سے اڑا دئے۔ شاید ایک آدھ چڑیا گھر یا عجائب گھر میں یادگار کے طور پر رکھا ہو۔ بڑا ہی سرسبز و شاداب جنگلاتی علاقہ ہے۔ اور بولان۔ یہ برما کی سرحد پر ایک بہت بڑا درہ ہے جہاں سے چینی ہندوستان میں گھس آتے ہیں۔ ایک بہت ہی دلچسپ اطلاع جس سے اہلِ ذوق پھڑک ہی تو اٹھے، یہ تھی کہ بلوچستان کی سب سے مشہور چیز مرغ ہے جس کے مور جیسے بڑے بڑے چکنے چکنے پر ہوتے ہیں۔ اتفاق سے ہمارے جغرافیہ داں کے اپنے بال بھی کچھ اسی قسم کے تھے۔ اس لئے ہم نے ان کو بھی کسی قدر گستاخی سے اسی نوع میں شمار کر لیا تھا۔ اور مرغ کے لئے "کاک" سے بہتر مترادف اور کیا ہو سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ ان حالات میں کون ہے جسے کوئٹہ، بلوچستان اور بولان میں دلچسپی نہ ہوگی۔ اس لئے ہمیں بھی غائبانہ طور پر ان مقامات کے ساتھ بے حد انس پیدا ہو گیا تھا مگر کہاں ہم کہاں یہ دور دراز مقامات۔ یہاں خواب و خیال تو کیا اس طاؤس مرغ کے پر بھی مل جاتے جو بلوچستان میں عام ہے تو ہم شاید یہاں پہنچ سکتے۔ ہماری معلومات میں اتنا اضافہ ضرور ہوا تھا کہ کوئٹہ میں ایک بہت بڑا زلزلہ آیا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں اور اس کا منظر ایک فلم میں

بھی دیکھا تھا۔ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ بلوچوں کا دیس ہے۔ جن کو سسّی کے محبوب مرزا دبلوچ اور سسّی کے محبوب نو تقدیر نے غیر فانی حیثیت عطا کر دی ہے۔ بلوچ اور ڈاچی والے پنجابی گیتوں کا چہیتا موضوع ہیں۔

ڈاچی والیا موڑ مہار وے

تیری ڈاچی دے گل وچ ہار وے

(اے ڈاچی والے! اپنی مہار موڑ دے۔ تیری اونٹنی کے گلے میں ہار)

وے جی اڑیا ڈاچی والے دے نال

(او رے میرا دل اونٹنی والے کے ساتھ جا اڑا)

بلوچا ظالما نہ مار سیٹی

(ظالم بلوچ! خدا کے لئے سیٹی نہ مار)

غرض مضبوط، تنومند، چیالے بلوچوں سے جھنگ سے لے کر سندھ اور کچھ تک کا علاقہ بھرا پڑا ہے، تاریخ میں جا بجا ان کے بہادرانہ کارناموں کا ذکر آتا ہے اور خود ہماری بلوچ رجمنٹ کے کارہائے نمایاں کس کو معلوم نہیں! اس لئے یہ بے تاب خواہش ہمیشہ دل ہی دل میں پرورش پاتی رہی کہ جب بھی موقع ملے اس دریا اور اس کے کوہ و صحرا کو دیکھا جائے جو ان کا حقیقی وطن ہے۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ قیامِ پاکستان نے ان دور دراز علاقوں کا جن کا ذکر ہم تاریخ و جغرافیہ کی کتابوں میں پڑھا کرتے تھے اور عجب نہیں کہ ان کے متعلق خیالی گھوڑے دوڑانے میں اپنے آن عزیزوں سے بھی بازی لے جاتے، اب اس قدر قریب آ گئے ہیں جیسے کسی غیر معمولی طاقت کی دوربین نے معجزہ کر دیا ہو۔ اور یہ امکان بھی پیدا کر دیا ہے کہ ہم پشاور سے اڑیں تو کراچی جا پہنچیں، کراچی سے اٹھیں تو مری جا دھمکیں یا ادھر نہیں تو کوئٹہ، زاہدان کی طرف جا نکلیں۔ یہی احساس تھا جس کے ماتحت ہم نے تہیہ کیا کہ —— آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی۔ اور کوئٹہ، بلوچستان، وادیٔ بولان سب کی سیر کو روانہ ہو گئے۔ خواہ یہ سیر زیادہ تر کوئٹہ اور اس کے گرد و نواح کے علاقائی مشاہدات ہی پر مشتمل کیوں نہ ہو۔

اگرچہ کراچی اور کوئٹہ میں سینکڑوں میل کا فاصلہ ہے اور سفر کرتے وقت زمین ہے کہ آپ ہی آپ کہیں سے نکلتی ہی چلی آتی ہے لیکن بلوچستان کی ریگستانی فضا کی جھلک سبی سے نظر آنی شروع ہو جاتی ہے۔ جسے وادیٔ بولان کا دروازہ کہتے ہیں۔ خود سبی نامی شہر میں بلوچ سردار میر چاکر خان رند کا قلعہ بلوچوں کی گذشتہ عظمت کا آئینہ دار ہے۔ علاقہ کیا ہے۔ لق و دق صحرا میں ریت کے تودے اور ان چھوٹے تودوں میں کچھ کچھ فاصلے پر بڑے بڑے تودے جنہیں پہاڑ کہتے ہیں۔

انہی دنوں بارانِ رحمت کے نزول کا نتیجہ تھا کہ سبی کا روتیلا جہنم بھی اعراف نما لگتا تھا۔ اور پھر سبی سے پار ہوئے تو سمجھئے وادیٔ مہران سے نکل کر وادیٔ بولان میں داخل ہو گئے۔ پہاڑوں کا چپ چاپ سونا سونا ماحول لمحہ بہ لمحہ بڑھتا ہی جاتا ہے۔ اور ریلی پیلی فضا برابر سنہری آنچل پھیلائے ہی جاتی ہے۔ کیا یہ اس لئے ہے کہ یہاں کی ریت گندھک ملی ہے؟ اس لئے اینٹیں تک زرد ہیں۔ اور ان سے بنی ہوئی جو چھوٹی بڑی عمارت بھی نظر آتی ہے وہ ایک تماشا سا گندمی اور کہیں کتھئی رنگ لئے ہوئے ہے۔ جہاں تھوڑی تھوڑی بوٹیاں اُگی ہوں وہاں ہلکی ہلکی ہری ہری جھلک نظر آتی ہے۔

ان سنہری، کتھئی، ہری ہری راہوں اور پہاڑی نالوں کی پتھریلی گذرگاہوں سے ہوتے ہوتے ہم بہت دور ہی نکل آئے۔ آب گم، مچھ، سر آب عجیب نام ہیں یہ۔ مچھ بہت پیاری جگہ ہے۔ یہیں سے کوئٹہ اور اس کے گرد و پیش کا حقیقی ماحول جھلکنے لگتا ہے۔ اسقدر صاف ستھری نکھری نکھری فضا۔ وہ مقام جہاں چڑھائی اور بھی بڑھنے لگتی ہے اور سرنگوں پر سرنگیں چھوٹی لمبی، بے شمار تیزی سے آنے لگتی ہیں۔ ریل ایک پُراسرار چلتے جاگتے دو منہ والے سانپ کی طرح کیونکہ اس کے آگے پیچھے دو انجن کوئلہ پھانکتے اور دھواں پھینکتے ہوئے لگے رہتے ہیں، پہاڑوں کے گرد چکر پر چکر کاٹتی ہی جاتی ہے۔ جس طرح ریل کی پٹری چٹانوں کا جگر کاٹ کاٹ کر بنائی گئی ہے وہ واقعی انجینئرنگ کا بہت بڑا کمال ہے۔ چاروں طرف اونچے پہاڑ، کچھ سنگلاخ، کچھ بھربھرے ایسے اندازہ شکلیں اور صورتیں اختیار کرتے ہوئے، سلیٹی، بھوسلے، کتھئی، پیلے مٹگیلے، کالے بھجنگے۔ جیسے یہ زمین نہیں ایک دیو زاد ہے، کولپور وادیٔ بولان کا بلند ترین ریلوے اسٹیشن ہے اس کی ڈھلان میں ایک نہایت خوشنما بستی، دامن کا ایک تما چھوٹے چھوٹے گھروندوں سے بھرا پڑا، اور کہیں پہاڑوں میں کھود کھود کر بڑی استادی سے بنائے ہوئے ٹھکانے یا خانہ بدوشوں کے خیمے ہی خیمے نظر سے

کہیں دور سفید بل کھاتی سڑک کوئٹہ کی خوفناک تاریک کانوں میں گھستی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ جہاں زندگی کا پیوند کٹتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

تاریخی جغرافیہ اور نسلوں کے گورکھ دھندوں سے قطع نظر سپیزنڈ نامی جنکشن اسٹیشن سے ایک اور بات بھی ابھرنے لگتی ہے۔ صدہا سال قدیم طرز زندگی۔ کاروانوں پہ کارواں چلتے ہوئے۔ خانہ بدوش رہن سہن، اونٹوں کے ذریعہ چھوٹی موٹی کھیتی باڑی، کٹھن گذران۔ گداگری یعنی خانہ بدوشوں کے چھوٹے چھوٹے جھونپڑے دور دور بکھرے ہوئے کبھی کرنچ یعنی سرد زمہریری ہوا اور کبھی لوار یعنی بادِ سموم کے شکار۔ شاید یہ اس بکھرے بکھرے غیر مربوط رہن سہن ہی کا نتیجہ ہے کہ یہاں کی شاعری بھی آزاد ہے۔ یعنی قافیہ و ردیف کی بندشوں سے آزاد۔ ایران جانے والے سپیزنڈ ہی سے زاہدان کا رخ کرتے ہیں۔ اس خطے کا بین الاقوامی محل وقوع یہیں سے واضح ہونا شروع ہو جاتا ہے جیسے ہم روس، افغانستان، مشرقی ترکستان، ایران اور اس سے بھی پرے بغداد، انقرہ، روم اور لندن جانے والی شاہراہ پر ہوں۔

زندگی کے ساتھ زبان میں بھی ایک خاص وضع نمایاں ہوتی ہے۔ سرآب، آبِ گم۔ خالص فارسی۔ یہ دو اسٹیشنوں کے نام ہیں۔ "سرآب" کی وجہ تسمیہ یہی ہو سکتی ہے کہ بستی کسی ندی نالے کے کنارے واقع ہوگی۔ وہ ندی نالے جو کبھی تو بالکل خالی نظر آتے ہیں اور کبھی آناً فاناً ایک گونجتا گرجتا اژدہا بن جاتے ہیں۔ "آبِ گم" شاید کاریز کا دوسرا نام ہو۔ پانی تو ان خشک پہاڑوں میں ہے ہی نایاب۔ اس لئے برسات کا جو پانی جمع ہوتا ہے وہ زیر زمین نالیوں سے گزر گزر کر کھیتوں تک پہنچایا جاتا ہے۔ اور جہاں جہاں پانی ہو وہ جگہیں باغ و بہار اور مرغزار و گلزار بن جاتی ہیں۔ یہ کاریز بڑی دلچسپ چیز ہے۔ ایران میں بھی بکثرت ہیں۔ چنانچہ وہاں کا مشہور بادشاہ بہرام گور گھوڑے سمیت زیر زمین دریا میں ڈوب کر مر گیا تھا۔ یہ کاریز تھوڑے تھوڑے فاصلے پہ کھلے ہوتے ہیں بالکل کنوؤں کی طرح۔ اور ان کے ارد گرد کنوؤں جتنی ہی بڑی کچی مینڈھ باندھ دی جاتی ہے۔

کوئٹہ کے تیور۔ شہری، تہذیبی، قدرتی اس کی آمد سے پہلے ہی ابھرنے لگ جاتے ہیں۔ کارخانے، باغات، وادیاں، مکانات۔

کوئٹہ ایک پشتو لفظ کواٹ سے ماخوذ ہے جس کے معنی قلعہ کے ہیں۔ کہتے ہیں سکندر اعظم کا ایک جرنیل وادی مہران میں داخل ہوا تھا۔ یہ سطح سمندر سے ۵۵۰۰ فٹ بلند ہے۔ کوئٹہ کا ریلوے اسٹیشن بجائے خود شہر کا آئینہ دار ہے۔

آپ آتے ہی پانی کے بڑے بڑے نلکوں پر بکریوں کے گھنگھریالے بالوں جیسے سیاہ ریشے لپٹے پائیں گے۔ یہ جاڑوں کی پیش بندی ہے جب روس سے آنے والی سرد ہوا اور برف باری کے باعث نلکوں کے اندر پانی جم جاتا ہے۔ اور بعض اوقات وہ پھٹ بھی جاتے ہیں جیسا کہ امسال ہو بھی چکا ہے۔ برف باری کے زمانے میں کوئٹہ کے برف پوش پہاڑوں کا نقشہ دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ مری اور ایبٹ آباد کا حریف۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ گھروں اور گلی کوچوں میں برف ہی برف نظر آتی ہے اور دروازے تک بند ہو جاتے ہیں۔ تب برف کھودنے والے برف کھود کھود کر راستے کھولتے ہیں اور گھروں میں بند لوگوں کو باہر نکلنے کا موقع دیتے ہیں۔ اتنا عرصہ بھنے ہوئے گوشت پر گزارہ ہوتا ہے جسے سجی کہتے ہیں۔

سارا شہر قدرتی طور پہ صاف ستھرا ہے۔ نیچی نیچی چھتیں، چھوٹے چھوٹے ڈبیا جیسے گھر، شاذ و نادر کوئی عمارت دو منزلہ یا اونچی۔ اینٹیں تمام پیلی پیلی، گندھک جیسی۔ چاروں طرف پہاڑ ہی پہاڑ اور کوئٹہ ایک خوشنما قطعہ کی طرح ان کے درمیان گھرا ہوا۔

سڑکوں کے دونوں طرف بادام کے پیڑ ہی پیڑ۔ بیریوں سے بھی زیادہ عام اور جنگلی گلاب کے پودے مہکتے ہوئے پھولوں سے لدے ہوئے اور باہر نکل جائیے تو یہی گلاب کے پودے انار، سیب، نارنگی، آڑو، گدالو، بہی وغیرہ کے پیڑ جھاڑیوں سے بھی زیادہ۔ گہرے سرخ رنگ کے گدرائے ہوئے سیبوں سے تو سارے پیڑ انگاروں کی طرح لال سرخ گیندوں کا پشتارہ معلوم دیتے ہیں۔ میل ہا میل تک یہی نقشہ اور جہاں یہ نہیں وہاں بلا کی خوشبودار نفیس جھاڑیاں۔ انگور کی بیلیں جا بجا پھیلی ہوئیں اور ان میں ہر قسم کے انگور لگے۔ جتنی گرمی ہو اتنا ہی انگور پکتا اور رسیلا بنتا ہے اور پک کر کھجور کی طرح مٹھاس دیتا ہے۔ سرخ قسم کا بڑا انگور تو نرا شہد لگتا ہے۔ اور اتنا نازک کہ باہر نہیں جا سکتا۔ اور کسی طرف نکل جائیں یا کوئی پینتیس چالیس میل راستے ہی میں رک جائیں، جہاں ایک بہت بڑا

پہاڑی نالہ جھرنوں پر زناٹے سے بہتا چلا آتا ہے۔ اور باغیچوں والوں نے
جھرنوں کو باڑوں سے جگہ جگہ کر بند باندھے ہوئے ہیں، تو فضا ایسی
خوشگوار معلوم ہوتی ہے جیسے یہ بھی کشمیر کا حصہ ہو۔ چھوٹی چھوٹی
نالیوں میں دوڑتا ہوا تیز ٹھنڈا ٹھنڈا پانی خود بخود رگ رگ میں
اترا جاتا ہے۔ اور پینے میں بے حد خوش ذائقہ اور مفرح معلوم ہوتا ہے۔
کسانوں نے پانی کے اوپر سے نیچے آنے کا خوب فائدہ اٹھایا ہے۔
پانی کی تند دھار پن چکی کی لٹو جیسی ایک سطح پر ترچھی پڑتی ہے۔
جس سے وہ زور سے گھومنے لگتا ہے۔ اوپر ایک کچے کوٹھے میں چکی
نصب ہے جو گھمر گھمر چلتی ہے۔ یہ لٹو جیسا پہیہ تین چار گز لمبے پل نما
چھپر کے نیچے ہوتا ہے جس کی دوسری طرف نیچے سے پہیے کو تیزی
سے گھومتا دیکھ سکتے ہیں۔ اور ٹھنڈی ٹھنڈی بوندوں کی تیز بوچھاڑ
بہت ہی لطف دیتی ہے۔

گرد و پیش کے پہاڑوں کے نت نئے بدلتے ہوئے منظر اور
زاویے اور ان کے رنگ ایسے لگتے ہیں جیسے ہم سچ مچ کوئی رنگین فلم
دیکھ رہے ہوں۔

اوڑک والی سڑک سے ہٹ کر اونچائی کی طرف کچھ
میل کے فاصلے پر وہ نہایت ہی خوش نما حنا جھیل ہے۔ جس کے
عین وسط میں ایک چھوٹی سی نہایت دلکش رنگین سی چیز بنائی گئی
ہے۔ لوگ کشتیوں میں سوار ہو ہو کر اسے دیکھنے جاتے ہیں۔ یہاں کی
عمارتوں کے بالائی حصے ٹین یا لکڑی کے بنائے جاتے ہیں کہ گریں بھی
تو زیادہ نقصان نہ دیں۔

کہاں کوئٹہ اور کہاں لاہور یا کراچی جیسی ادبی، فنی، تعلیمی،
صحافتی سرگرمیاں لیکن وہاں پہنچتے ہی صاف معلوم ہوتا ہے کہ خود۔
غلط بود آنچہ ما پنداشتیم۔ ان تمام امور میں خصوصاً قیام پاکستان
کے بعد کوئٹہ بھی دوسرا لاہور یا کراچی ہے۔ آبادی کا کتنا ہی حصہ
باہر آنے والوں پر مشتمل ہے۔

یہاں ادب اور صحافت کے لئے بہت ہی خوشگوار فضا
موجود ہے۔ مقامی بلوچوں کو اپنے رنگ میں دیکھنا ہو تو دامن میں دیکھئے۔
یہی ان کا ہوٹل ہے اور یہی ان کا کلب جہاں کھانے کے دوران میں
گویئے یا سازندے ان کا دل بہلاتے ہیں۔ کبھی کوئی شخص منہ میں چنگ
دبا کر بجاتا ہے۔ یہ بڑی چھوٹی سی چیز ہے۔ اسے ہاتھ سے بجاتے ہیں۔
اسی لئے ممکن ہے اس کا نام چنگ پڑ گیا ہو۔ غپ شپ کے ساتھ سیاسی
بات چیت بھی ہوتی ہے مثلاً آجکل بھی "نئی کرت" یا بنیادی جمہوریتیں زیر
بحث ہیں۔ کوئٹہ سے مستونگ تک لمبی چوڑی بنجر زمینوں، خشک پہاڑوں
اور کہیں کہیں سرسبز و پر بہار جگہوں کا ایک عجیب مجموعہ ہے۔ چوکی
چنگل کے قریب سنگ میل پر لندن کا فاصلہ بھی درج ہے۔ کہیں اسی
سمت میں قلعۂ سفید بھی ہے۔ غالباً وہی جسے شاہنامہ میں گژدژ سفید
کہا گیا ہے اور جس کا محاصرہ سہراب نے کیا تھا۔ مستونگ کے راستے
میں سب سے خطرناک وہ مقام ہے جسے "لکی پاس" کہتے ہیں یہاں کا
"باب المندب"۔ جو یہاں سے بچ کر نکل آیا وہ بہت خوش قسمت ہے۔

مستونگ اس علاقہ کی بہت ہی بڑا۔ با رونق، ترقی یافتہ
اور آباد قصبہ ہے۔ جو برابر ترقی کر رہا ہے۔ مارشل لا کی برکات
یہاں تک بھی آ پہنچی ہیں پچھلے سال میلے کے ساتھ ہی ساتھ یہاں ایک بہت
بڑا جرگہ بھی ہوا جو بنیادی جمہوریت کا نہایت عمدہ نمونہ تھا۔
اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اردو اس دور افتادہ مقام میں بھی
کس قدر مقبول ہے۔ اور عام طور پر سمجھی ہی نہیں جاتی۔ بلکہ اس کو تعلیم و
تدریس اور ادب و صحافت کے لئے بھی برتا جاتا ہے خود زندگی کی
طرح یہاں پشتو، بلوچی، سندھی، اور اردو کا سنگم بھی نظر آتا ہے۔
یہ سب کچھ ہے مگر خود وادیٔ بولان کے فرزندوں کا کہنا یہ ہے کہ
ان کی تاریخ، ان کی تہذیب، ان کی زندگی کسی مستقل ادارہ میں
نہیں بلکہ سینہ بہ سینہ روایات اور داستانوں میں چلی آتی ہے
یا پھر ان کی عکاسی عوامی گیتوں میں ہوتی ہے۔ اے کاش!
بلوچ خود اس کی نشان دہی کر سکیں۔

●

اقوامِ متحدہ:

مہاجرین کا عالمی سال

فضل حق قریشی دہلوی

عالمگیر نوعیت کے بعض مسائل پر غور و خوض کرنے اور بین الاقوامی سطح پر ان کو حل کرنے کا طریقہ کچھ عرصے سے مقبول ہو رہا ہے۔ اس ضمن میں اقوامِ متحدہ کے ممبر ملک پیش پیش رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ارضی طبیعیات کا بین الاقوامی سال، جس کی مدت اٹھارہ ماہ تھی، نہایت کامیاب نتائج کے ساتھ حال ہی میں ختم ہوا ہے۔ شاید اسی اندازِ فکر کے بموجب مہاجرین کا عالمی سال منانے کا خیال برطانیہ کے چند نوجوانوں کے دل میں پیدا ہوا جنہیں مہاجرین کی بحالی سے خاص دلچسپی تھی۔

کچھ دن بعد اقوامِ متحدہ کے مہاجر فنڈ کی مجلسِ انتظامیہ کے سامنے یہ خیال ایک تجویز کے پیرائے میں پیش ہوا جسے تبادلۂ خیالات کے بعد ۲۶ ستمبر ۱۹۵۸ء کو منظور کر لیا گیا۔ پھر اقوامِ متحدہ کے دس ممبروں کی تحریک پر یہ موضوع اسی سال ۵ دسمبر کو جنرل اسمبلی کے تیرھویں اجلاس کے سامنے آیا اور ۵۹ موافق، ۹ مخالف اور ۸ غیر جانبدار ووٹوں سے منظور ہونے والی ایک نئی قرارداد کے ذریعہ اقوامِ متحدہ اور اس کے مخصوص اداروں کے ممبر ملکوں پر زور ڈالا گیا کہ وہ مہاجرین کا عالمی سال منانے میں پوری طرح تعاون کریں اور دامے، درمے، قدمے، غرض ہر صورت میں اعانت کر کے اس تحریک کو کامیاب بنائیں تاکہ ساری دنیا میں انسان دوستی کے نقطۂ نظر سے جملہ مہاجرین کی زیادہ سے زیادہ امداد اس طرح ہو سکے کہ پھر کوئی مہاجر اپنے آپ کو مہاجر نہ سمجھنے پائے۔

اس تجویز میں اقوامِ متحدہ کے سکریٹری جنرل مسٹر داگ ہامرشولڈ سے بھی درخواست کی گئی کہ وہ مہاجرین کے عالمی سال کو فروغ دینے میں ایسے اقدامات سے کام لیں جو ان کے نزدیک معقول اور مناسب ہوں۔ اس تجویز کے مطابق سال منانے کی کارروائی جون ۱۹۵۹ء سے شروع کی جا چکی ہے۔

مہاجرین کے عالمی سال کی نوعیت، اہمیت اور افادیت کا بھرپور جائزہ لینے سے پہلے ضروری ہے کہ مہاجرین کے مسئلے کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔

مہاجرین کا مسئلہ پچھلے بارہ سال میں صرف پاکستان ہی کے لئے پریشان کن نہیں رہا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ شدت سے ساری دنیا میں اس نے تشویشناک صورت پیدا کر رکھی ہے۔ اسے قومی اور بین الاقوامی انداز میں حل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے لیکن منزل ہر جگہ ابھی دور ہے۔ پاکستان میں یہ مسئلہ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد درپیش ہوا لیکن یورپ اور مشرقِ بعید میں دوسری جنگِ عظیم کے بعد سے اور مشرقِ قریب میں تنازعۂ فلسطین کے بعد سے اپنا رنگ جمائے ہوئے ہے۔

دوسری جنگِ عظیم ختم ہونے کے بعد عالمگیر پیمانے پر تعمیرِ نو کی غرض سے اقوامِ متحدہ کا قیام عمل میں آیا تو اربابِ حل و عقد نے سیاست کے میدان سے ذرا ہٹ کر معاشرت و ثقافت اور انسان دوستی سے تعلق رکھنے والے بہت سے پہلوؤں پر بھی غور کیا اور ترقی کی مناسب تدابیر اختیار کرنے کے لئے چند ایسے ماتحت ادارے قائم کئے جن کے عملی دائرے الگ الگ رکھے گئے۔ ان میں سے ایک ادارہ یورپی مہاجرین سے بھی متعلق تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ لڑائی کے باعث بےگھر ہو جانے والوں کو یا تو وطن واپس بھیجا جائے یا نئے سرے سے نئی سرزمین پر اس طرح بسایا جائے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر کسی کے محتاج نہ رہیں۔ یہ بین الاقوامی ادارۂ مہاجرین اقوامِ متحدہ کے دوسرے مخصوص اداروں میں سے ایک تھا۔ لیکن پھر اقوامِ متحدہ نے اسے براہِ راست اپنے زیرِ انتداب کر لیا اور وہ مہاجرین سے متعلق اقوامِ متحدہ کے ہائی کمشنر کا دفتر کہلانے لگا۔

کچھ عرصے بعد ہنگری کے فسادات رونما ہوئے اور ہزاروں باشندگان ملک وطن چھوڑ کر آسٹریا اور یوگوسلاویہ میں پناہ گزیں ہو گئے۔ مہاجرین کے ہائی کمشنر نے ان کی آبادکاری وغیرہ کا کام بھی اپنے ذمہ لے لیا۔

اس سے بہت پہلے مشرقِ قریب میں اسرائیل کے ہنگاموں اور اس کی ہلاکت آفرینیوں سے تنگ آ کر بہت سے باشندگانِ فلسطین ترکِ وطن کے لئے مجبور ہوئے اور پڑوسی ملکوں میں چلے آئے تھے۔ ان کی آبادکاری اور بحالی کی ذمہ داری بھی اقوامِ متحدہ نے اپنے سر لے لی تھی۔ اس مقصد کے لئے

جو ادارہ قائم ہوا، وہ مہاجرینِ فلسطین سے متعلق اقوامِ متحدہ کا ادارۂ بحالیات و امور تھا مختصر الفاظ میں "انروا" کہلاتا تھا۔

یہ دونوں ادارے ہنوز قائم ہیں اور تیزی سے کام کر رہے ہیں۔ البتہ کوریا کی تعمیرِ نو سے متعلق اقوامِ متحدہ کا ادارہ (انکرا) کسی نہ کسی طرح اپنا فرض ادا کر کے بند ہو چکا ہے۔

برصغیر پاک و ہند کی تقسیم کے بعد دونوں حصوں کے کچھ کچھ باشندے ایک علاقے سے ترکِ وطن کر کے دوسرے علاقے میں پہنچ گئے۔ ان کی آبادی کا کام اقوامِ متحدہ کے سپرد نہیں کیا گیا لیکن دونوں جگہ کے مسائل اس کے لئے باعثِ تشویش ضرور رہے۔

ایک اندازے کے مطابق دوسری عالمگیر لڑائی ختم ہونے کے بعد سے تقریباً چار کروڑ مرد عورتیں اور بچے ترکِ وطن کر کے دوسرے علاقوں میں پناہ لیتے رہے۔ ان میں وہ مہاجرین بھی شامل ہیں جو سرزمینِ چین سے ترکِ وطن کر کے ہانگ کانگ اور تائیوان چلے گئے۔ آبادکاری کی انتہائی کوششوں کے باوجود ۱۹۵۸ء کے آخر تک شاید ڈیڑھ کروڑ انسان پھر بھی ساری دنیا میں پناہ گزیں کی حیثیت سے عارضی طور پر آباد تھے جبکہ اقوامِ متحدہ نے مذکورہ بالا قرار داد منظور کی تاکہ یہ مرحلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے ان ڈیڑھ کروڑ میں سے بیس لاکھ کے قریب مہاجرین کسی نہ کسی صورت میں اقوامِ متحدہ کی امداد کے محتاج تھے۔

مہاجرین کا عالمی سال شروع کر کے کوشش کی جانے لگی کہ دنیا میں ہر جگہ اس مسئلے پر زیادہ سے زیادہ توجہ دی جائے، حکومتوں، رضاکار اداروں اور عوام سے مزید مالیاتی چندے جمع ہوں اور ایسی صورتیں پیدا ہوں کہ خالص انسان دوستی کی بنیاد پر مہاجرین کا باہمی تبادلہ برضا و رغبت عمل میں آ سکے، ان کو دوسرے علاقوں میں الگ آباد کیا جا سکے یا مقامی باشندوں میں مدغم کر دیا جائے۔

اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی اور اس کی تیسری کمیٹی میں بحث و تمحیص کے وقت اور پھر قرار داد کے الفاظ میں بات واضح کر دی گئی تھی کہ ہر ملک اپنی ضرورت، امکانات اور وسائل کے بموجب یہ سال منانے میں شریک ہو۔ اس کے ساتھ ہی یہ امید بھی ظاہر کی گئی کہ وہ ملک جن کو بذاتِ خود مسائلِ مہاجرین کا سامنا نہیں ہے۔ مختلف طریقوں سے اس اسکیم کی حمایت کریں۔ اور حیثیت مہاجرین سے متعلق اقوامِ متحدہ کے اس کنونشن کی توثیق کریں جو ۲۲ اپریل ۱۹۵۴ء سے نافذ ہے۔

اس سال جنرل اسمبلی اور اس کی تیسری کمیٹی میں جو معاشرتی، ثقافتی اور انسان دوستی کے امور سے تعلق رکھتی ہے، مہاجرین کا عالمی سال منائے جانے کا موضوع زیرِ بحث آیا تو مہاجرین کے ہائی کمشنر ڈاکٹر لنٹ نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ ۱۹۵۸ء کے موسمِ خزاں تک یورپ میں ایک لاکھ ساٹھ ہزار غیر آباد مہاجرین ایسے تھے جن کا تعلق ان کے دفتر سے تھا۔ ان میں سے چالیس ہزار اشخاص آسٹریا، وفاقی جمہوریت جرمنی، یونان اور اٹلی کے کیمپوں میں پڑے تھے۔ تاہم نئی کوششوں کی بدولت پچھلے سال نومبر کے شروع میں غیر آباد مہاجرین کی تعداد گھٹ کر ایک لاکھ دس ہزار رہ گئی جبکہ کیمپوں کی آبادی میں بھی اٹھارہ ہزار کی کمی ہو گئی۔

انہوں نے بتایا کہ ہنگری کے مہاجرین میں سے جو مختلف ملکوں میں پناہ گزیں تھے، سترہ ہزار چھ سو کا رضاکارانہ طور پر تبادلہ ہو چکا ہے۔ اب آسٹریا میں دس ہزار کے قریب باقی ہیں۔ ان میں سے ڈیڑھ ہزار کسی اور ملک میں چلا جانا چاہتے ہیں۔ امید ہے کہ بہت جلد ان میں سے ۸۰۰ ریاست ہائے متحدہ، ۱۹۶ آسٹریلیا، ۱۰۲ کینیڈا، ۷۳ جنوبی افریقہ، ۲۶ نیوزی لینڈ اور باقی یورپ کے چند دوسرے ملکوں میں چلے جائیں گے جنہوں نے ان کو آباد کرنے کی حامی بھر لی ہے۔

الجزائر کے ایک لاکھ اسی ہزار مہاجرین تیونس اور مراکش میں عارضی طور پر مقیم ہیں۔ ایک خاص فنڈ سے جو مہاجرین سے متعلق اقوامِ متحدہ کے ہائی کمشنر کے ماتحت قائم ہے، ان کی بنیادی ضرورتیں پوری کی جا رہی ہیں۔ ان ضروریات میں بعض اشیائے خوراک، لباس اور کمبل شامل ہیں۔ لیکن اس فنڈ کو قائم رکھنے کے لئے مزید چندے درکار ہیں۔ یہ بھی کوشش کی جا رہی ہے کہ ان مہاجرین کو خود کفیل بنانے کے لئے مناسب تربیت دی جائے تاکہ سیاسی حالات سدھرنے کے بعد ان کے لئے وطن واپس جانے کی صورت پیدا ہو تو نئے سرے سے ان کی آبادکاری میں دقت نہ ہو اور وہ حکومت کے لئے بار نہ بنیں۔

ڈاکٹر لنٹ نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ ۱۹۵۹ء کے لئے بین الاقوامی امداد کا جو حسبِ معمول پروگرام بنایا گیا تھا، اس پر ۴۷ لاکھ ڈالر خرچ ہونے تھے، لیکن پوری رقم جمع نہیں ہو سکی۔ اب مہاجرین کے عالمی سال کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو پروگرام ۱۹۶۰ء کا بنایا گیا ہے، اس پر ساری دنیا میں ایک کروڑ بیس لاکھ ڈالر خرچ ہونے کا اندازہ ہے۔ اس دوران میں کوشش کی جائیگی کہ یورپ میں مہاجرین کے تمام کیمپ خالی

(باقی صفحہ ۶۴ پر)

فکاھیہ :

کیا زمانہ آ لگا ہے!

تسلیم عارفی

بھائیو! زبان نہ کھلواؤ - سچ نہ بلواؤ - کیوں دار پر کھنچواتے ہو - دیکھتے نہیں کیا زمانہ آ لگا ہے - وہ بھی زمانہ تھا جب ہر طرف چھل پھل ، ہر سو گہما گہمی تھی - قدم قدم پر خوشیوں کے سوتے پھوٹتے تھے- اب یہ بھی زمانہ ہے کہ .... بھائیو! میں ذرا کھڑکی سے جھانک کر دیکھ لوں ، کوئی ہماری باتیں نہ سن رہا ہو!- دیکھ لیا - اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ابھی تک اپنی امان میں رکھا ہوا ہے - ہاں تو میں کہہ رہا تھا- کیا کہہ رہا تھا - اب تو اتنا بھی ہوش نہیں رہا - توبہ اللہ - کیا زمانہ آ لگا ہے - ہاں تو بھائیو! اس سنہری دور کو یاد کرتا ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے - کیا کیا نیک کام کئے تھے ہم نے - حج مبارک کے نیک فریضہ ہی کو لے لیجئے - ہر سال اپنی نیک کمائی سے حج کا فریضہ ادا کرتے تھے - بیگمات بھی ساتھ ہوتی تھیں - واپسی پر سونے سے لد کر آتی تھیں - کچھ جاہل لوگ اعتراض بھی کرتے تھے - مگر بھائیو! کیا عورتوں کیلئے سونا پہننا ہمارے مذہب میں ناجائز ہے - یہ عین جائز بلکہ واجب ہے - بلکہ میں تو کہوں گا فرض ہے - کیونکہ سونے کے زیور عورتیں نہیں پہنیں گی تو کیا مرد پہنیں گے؟ مگر بھائیو! اب تو آتے جاتے تلاشیاں ہوتی ہیں - تلاشیاں تو پہلے بھی ہوتی تھیں - مگر اب اور جب میں زمین آسمان کا فرق ہے - اگر یہی صورت حال رہی تو ہم جیسے الحاج حج مبارک کا فریضہ ادا کرنا ہی چھوڑ دیں گے - اور روز قیامت اس گناہ عظیم کی تمام تر ذمہ داری موجودہ حکومت کے سر ہوگی - موجودہ حکومت! سبحان اللہ - یہ نئے لوگ نجانے کس مٹی سے بنے ہیں - صرف تنخواہ پر کام کرتے ہیں - معلوم ہوتا ہے یا تو انکے بیوی بچے ہیں ہی نہیں یا پھر یہ انہیں بھوکا ننگا رکھنے پر تلے ہوئے ہیں - بھائیو! اولاد کی محبت بڑی چیز ہے - مگر یہ خاندانی منصوبہ بندی کرنے والے اولاد کی محبت کیا جانیں- یہ تو یہی جانیں کہ زیادہ بچوں کی پیدائش کو روکا جائے - کیونکہ آبادی اگر ملک کے ذرائع پیداوار سے اتنی بڑھ جائے کہ توازن قائم نہ رہ سکے تو

قوم مفلسی اور تباھی کا شکار ھو جاتی ھے - اخبار میں یونہی لکھا تھا۔ حالانکہ بھائیو! حقیقت یہ ھے کہ فوجی حکومت، جسے یہ جاھل قوم انقلابی حکومت، بھی کہتی ھے۔ لوگوں سے صرف تنخواہ پر گذارہ کرانا چاھتی ھے .... ھمارے سنہری دور میں تو یہ مسئلہ کبھی پیدا نہ ھوا - ھم ھر کام کرانے کے بعد مساوات اور اخوت کے اصولوں پر عمل کرتے ھوئے تمام متعلقہ افسران اور کارندوں کو اپنی نیک کمائی میں سے حصہ دیتے رھے - یوں ایک طرح ھم خیرات دینے کا فریضہ بھی ادا کرتے رھے اور ثواب دارین بھی ملتا رھا - فوجی حکومت کی منطق ھی نرالی ھے - یعنی یہ کیا تک ھے کہ چیزیں سستی ھو جائیں تو تنخواہ میں گذارہ ھو سکتا ھے - بھئی! چیزیں سستی ھو جائیں گی تو دکاندار غریب ھو جائیں گے - اور اگر دکاندار ھم جیسوں سے سستے داموں خریدیں تو ھمیں نقصان ھو گا - ایک کروڑ کے پچاس لاکھ رہ جائیں گے - پچاس لاکھ کا نقصان! ھائے میرے

طرہ باز خاں

اللہ - حالات کیا ٹھیک ھوں گے - کیسا زمانہ آ لگا ھے - کب اس پاگل حکومت سے جان چھوٹے گی - پاگل نہیں تو اور کیا - نہ اسے زر و جواھر سے محبت، نہ رشتہ داروں کا لحاظ، نہ دوستوں کا پاس - اور تو اور کسی کاروبار میں یہ فوجی لوگ اپنا حصہ تک مقرر نہیں کرتے - کیا پاگلوں کے سر سینگ ھوتے ھیں - بھئی جو اپنے فائدے تک کی نہ سوچے وہ پاگل نہیں تو اور کیا ھے - اسمگلنگ، چلیئے مان لیتے ھیں بری بات ھے - مگر اس جرم میں دوستوں تک کو جیل بھیج دیا ــ کہاں کی عقلمندی ھے

بھائیو! تم نے دیکھا ھوگا ان پاگلوں نے ھمارے کیسے کیسے بزرگوں کو ایسی جگہ پہنچا دیا ھے جہاں ھمارا تصور تک نہیں پہنچ سکتا تھا - کسی نے سچ کہا ھے - انقلابات ھیں زمانے کے - اب تو کسی غیر کے سامنے لب تک نہیں ھلا سکتے - آپ کے سامنے اس لئے زبان کھول رھا ھوں کہ آپ بھی میری طرح فلک کج رفتار کے ستائے ھوئے ھیں۔

سلطانیٔ جمہور

اگر ہم ایک دوسرے کے آنسو نہیں پونچھیں گے تو کیا آسمان سے فرشتے اتر کر ہمارے آنسو خشک کرینگے ؟ بھائیو ! آپ سوچ رہے ہونگے کہ فلک کج رفتار کے معنی کیا ہیں ؟ اس لفظ کے معنی تو میں خود بھی نہیں جانتا مگر مجھے یقین ہے کہ میں نے اسکا استعمال صحیح کیا ہے ۔ کیونکہ میں نے اسے دو موقعوں پر استعمال ہوتے سنا ہے ۔ ایک تو اس وقت جب میرے ایک مولوی دوست کو، جو ہوٹل کا مالک تھا ، صفائی کی مہم کے تحت فوجیوں نے جالی لگانے کا حکم دیا تھا۔ اس وقت اسنے آسمان کی طرف دیکھکر یہ لفظ استعمال کیا تھا ۔ اور دوسرا اس وقت جب ایک بہت بڑے افسر کو جو میرا دوست تھا سرکاری ملازمت سے الگ کر دیا گیا تھا ۔ یہ فوجی کام زیادہ چاہتے ہیں ۔ اور باتیں کم ۔ تو بھائیو! اب اگر میرا دل باتیں کرنے کو چاہے ۔ تو کیا کروں ۔ ظاہر ہے ہونٹ سی لوں ۔ منھ کو تالا لگالوں تاکہ اس حکومت کی خوشنودی حاصل کرسکوں ۔ جی ، خوشنودی ۔ دیکھا آپ نے کیا زمانہ آ لگا ہے۔

هم خرما و هم ثواب!
(حج بیت‌اللہ سے واپسی)

کاہی دفتر کے معنی...

اللہ تبارک تعالیٰ اس پرانے زمانے کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے جس میں محکموں کے بڑے بڑے افسر ہم ایسے شریفوں اور رئیسوں کے استقبال کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ اور انتہائی تپاک سے مصافحہ کرتے تھے ۔ دفتر کے کام کاج چھوڑ کر ہماری خاطر مدارات کرتے تھے ۔ مگر اب تو کلرکوں تک کو ایسی ہوا لگی ہے کہ ہمیں پہچاننے کی بھی کوشش نہیں کرتے ۔ اگر ہم سے ایک ذرا سی بھول نہ ہوتی تو یہ جاہل عوام اس فوجی حکومت کو خوش آمدید نہ کہہ سکتے ۔ وہ یہ کہ ہم شریفوں اور رئیسوں کا طبقہ دو تین گروہوں میں بٹ گیا ۔ اور انہوں نے ایک دوسرے سے بڑھکر فائدہ اٹھانے کی خاطر مختلف سیاسی جماعتیں بنا ڈالیں ۔ جو آپس میں جھگڑ پڑیں ۔ اور لوگوں کو بےاطمینانی کے اظہار کا موقع مل گیا ۔ اگر ہم میں اتحاد رہتا تو سیاسی جماعتوں میں بھی اتحاد رہتا ۔ اور یوں ساری عمر یہ کمینے اور بھوکے ننگے لوگ ہم جیسے شریفوں کے سامنے سر اٹھاکر نہ چل سکتے اور فوج کو کبھی موقع نہ ملتا کہ انکی رہائی کیلئے میدان میں اترتے ۔ مگر افسوس ہماری یہ ذرا سی بھول ایک بہت بڑی خطا ثابت ہوئی ۔ جسکا خم — خم — وہ کیا لفظ تھا ۔ ہاں ہاں — خمیازہ ہمیں آج بھگتنا پڑ رہا ہے ۔ مگر بھائیو! غیب کا علم کون

"مہاجر کو ٹھکانہ....."

جانتا ہے۔ عالم الغیب تو بس اللہ ہی کی ذات ہے۔ لیکن فوج میں ذرا بھی ایمان کی رمق ہوتی تو وہ ہماری صلح کرادیتی۔ مگر بھائیو! وہ تو ہمارے خدا واسطے کے دشمن ہیں۔ اسے ہم خاندانی شریفوں کا سکھ چین سے رہنا کب گوارہ تھا۔ بھلا یہ کوئی شرافت ہے کہ زمین کی ملکیت کی حد مقرر کر کے بقیہ ان کمینے اور کنگال کسانوں کے حوالے کر دی جائے جن کے باپ دادا نے بھی کبھی ملکیت کا تصور نہ کیا ہو۔ جن لوگوں کو ہم سبز باغ دکھاتے تھے اب تو سچ مچ ان باغوں کے مالک بن رہے ہیں۔ فوجیوں کے کھیل سچ مچ نیارے ہیں۔ یعنی تیرے نام کی خاطر جو لوگ گھر بار چھوڑ کر پاکستان آئے اور مہاجرین کہلائے انہیں اب آباد کر کے مہاجرین اور انصار کی تمیز ہی ختم کر دی جائیگی۔ دیکھا بھائیو! مہاجرین کے خلاف کیسی کیسی سازشیں ہو رہی ہیں۔ گو میں خود انصار ہوں مگر سوچئے تو یوں بھی کسی کو مٹایا جاتا ہے۔ بھائیو! ایک نئی بات سنی آپ نے۔ میری مراد بنیادی جمہوریتوں کے قانون سے ہے۔ آپ حیران نہ ہوں۔ پہلے میری سمجھ میں بھی کچھ نہ آتا تھا کہ یہ کیا بلا ہے۔ مگر جیسا کہ آپ کو معلوم ہے مجھے شروع ہی سے علم حاصل کرنے کا شوق رہا ہے۔ اسلئے معلوم کر ہی لیا کہ اس قانون کے تحت دیہات میں انتخابات ہونگے ، پنچایتیں بنینگی۔ مگر ہم لوگ انتخابات میں، جیسے کہ امید ہے، حصہ نہیں لے سکینگے۔ صرف غریب اور جاہل دیہاتی اپنے نمائندے چنینگے۔ اور یوں دیہات کے اکثر ضروری معاملات وہیں طے ہو جایا کرینگے۔ یعنی آپ سن رہے ہیں۔ ننگے بھوکے چھوٹے پیمانے پر حکومت کرینگے! ہم شریفوں اور رئیسوں سے بوچھے بغیر اپنے نئے سکول ، ہسپتال اور کھیلوں کے میدان تیار کریں گے۔ بھائیو! ہنسی نہ آئے تو کیا آئے۔ ہر روز ایک نیا اور عجیب تماشہ لگ رہا ہے اس ملک میں۔ یہ رائٹ لفٹ کرنے والے کیا جانیں کہ سیاست کیا شے ہے؟.......... کیا کہا؟ آپ سمجھائینگے مجھ کو؟..... عدالت میں لے جا کر؟ تو کیا آپ میرے ہم خیال نہیں ہیں۔ بھائیو! انہیں کچھ سمجھاؤ۔ میں تو سمجھا تھا کہ یہ آپ کی طرح میرے ہم خیال ہیں۔ میری ہی طرح فلک کج رفتار کے ستائے ہوئے ہیں۔ کیا کہا ہوش ٹھکانے لگ جائینگے؟ .... یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ توبہ! یا اللہ توبہ۔ کیا زمانہ آ لگا ہے!!

جائیں تو جائیں
کہاں؟
ان فوجیوں نے
تو زمین کا بھی
راشن کر دیا!

طغریٰ: (ترکمان کا اسلوب: عہد علاء الدین حسین شاہ)، باڑگرام، مرشد آباد

اے۔ کے۔ ایم عبد العلیم

قدیم ترین عہد سے خطاطی مسلمانوں کا محبوب فنی شغل رہا ہے۔ مسلم خطاطی دراصل قرآن مجید کی کتابت و تزئین کے ذوق و عقیدہ کی پیداوار ہے۔ مسلمان نہ صرف اس کتاب مقدس کو حفظ کر کے اس کی حفاظت کرتے تھے، بلکہ اس کی جمالیاتی پیشکش کو بھی ایک کار ثواب سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی فنون لطیفہ میں نقاشی سے زیادہ خطاطی کو عروج و قبول حاصل رہا۔ بعض کے نزدیک اسلام میں ذی روح کی تصویر کشی اور صورت گری ممنوع ہے اس لئے شروع ہی سے ذوق آرائش و زینت نگاری یا خطاطی کے جوہر نمایاں ہوئے۔ تقوی پسند مسلمان فن کاروں نے اپنی صلاحیت اور ذوق جمال کو زیادہ تر اسی کام پر صرف کیا اور یہ واقعہ ہے کہ انہوں نے اپنے فن کے نمونوں سے ایک چمنستان قلم کھلا دیا۔

یوں خطاطی میں جمالیاتی حس کی تسکین کا ویسے بھی سامان موجود تھا کیونکہ عربی اور فارسی حروف کو اقلیدسی اشکال اور ترتیب و آرائش کے خطوط و نقوش میں نفاست کے ساتھ برتا جا سکتا تھا چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آہستہ آہستہ تحریر مخصوص طریقہ پر اسلامی فنون لطیفہ میں خطاطی کو ایک ممتاز مقام حاصل ہوتا چلا گیا۔ حروف زیادہ تر افقی یا عمودی اشکال میں ہیں۔ اس لئے تحریری آرائش کے لئے موزوں عناصر فوراً مل جاتے ہیں اور جب ان کی پیچیدہ یکجائی ہوئی شکلیں ترتیب میں موزوں کی جائیں تو تناسب و توازن بنتے چلے جاتے ہیں جو دیکھنے والے کو دکھائی دیتے اور ترتیبی آہنگ پیدا کیا جاتا ہے۔ انہی حروف کے تکرار اور تسلسل کا نتیجہ مرتب ہوتے دیکھا ہے۔ بعض حروف کے جوڑ ملانا ضروری ہوتا ہے اس لئے پیچیدہ اشکال بنانے کا رجحان ترقی کرتا رہا۔ قط، شوشہ، دوائر، میدان قلم، اعراب، سطر بندی، بین السطور، بین الفصل نے مل جل کر روپ کا اور ہی جامہ پہنا ہے۔ بعض نمونے ایسے ہوتے ہیں کہ کسی شوشے اور گردش قلم کو بھی زوائد میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ کتابت حروف میں خوبصورتی کب آنے لگتی ہے اس کا جواب دیتے ہوئے پوپ نے ایک جگہ لکھا ہے:

"اگر حروف و اجزائے حروف خوبی کے ساتھ متوازن ہوں اور ا کی آ اور ل دراز قد ہوں، پٹڑی سیدھی، سطر بندی صحیح اور موٹے باریک، اترتے چڑھتے قط صحیح لگے ہوئے ہوں، ع کھلا، و اور د [illegible] کی طرح نہ دکھائی دے تو ایسی تحریر میں یکسانیت و ہمواری آجاتی ہے اور بین السطور نپا تلا پیدا ہو جاتا ہے، یہی خوبصورتی ہے۔"

خطاطی تمام اسلامی ملکوں میں فروغ پاتی رہی [illegible] مسلم ہند اور مشرقی پاکستان میں بھی اس کی پذیرائی کی گئی ہے اور نہایت نفیس نمونے اس فن کے پیدا ہوتے رہے۔ خان بہادر مولوی ظفر حسن نے لکھا ہے کہ اس فن کو ملک ہند میں عروج و ترقی کہیں جا کر مغلوں کے عہد میں حاصل ہوئی۔

مشرقی پاکستان اور خطاطی: اس میں شک نہیں کہ دیگر علوم و فنون کی طرح دہلی ہی خطاطی کا اول مرکز رہا ہے۔ ترک اور پٹھان سلاطین کے عہد میں بالعموم اور مغلیہ سلاطین کے زمانہ میں بالخصوص اس فن شریف کو بہت عروج ہوا۔ مشرقی پاکستان قدیم بنگالہ

[illegible]

بہ عہد قسمت کہاں کہاں موجود ہیں ان کا کوئی مبسوط مطالعہ نہ کبھی کیا گیا ہے نہ مواد ہی میسر ہے۔ پھر بھی بعض علمائے تاریخ و آثار نے اس طرف توجہ ضرور کی ہے مثلاً ڈاکٹر اے۔ ایچ۔ دانی نے ۱۵۳۸ء تک کے کتبات بنگال کی ایک فہرست مرتب کی ہے۔ لیکن انہوں نے بھی پاکستان کے اس حصہ میں فنِ تحریر پر کوئی خاص روشنی نہیں ڈالی ہے اور مطالعہ کا یہ پہلو ہنوز تشنہ ہے۔

عجائب خانہ ڈھاکہ کے چند اہم ذخیرے: اس وقت ڈھاکہ کے عجائب خانہ میں مشرقی پاکستان کے کوئی بیس کتبات محفوظ ہیں۔ ان میں سے کوئی چھ الیاس شاہی اور حسین شاہی دور کی یادگار ہیں اور باقی عہد مغلیہ کے۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے جرنل (۱۹۲۲-۵۲ء) میں ان کتبات کے نمونے طبع ہوتے رہے ہیں۔ نیز "ڈھاکہ ریویو" اور کتاب "آثارِ دکن" (ANTIQUITIES OF DECCAN) (سید اولاد حسین) میں بھی کچھ نمونے موجود ہیں لیکن ان کتابوں میں بھی فن خطاطی، اس کی خصوصیات اور خوبصورتی پر کوئی نظر نہیں ڈالی گئی ہے۔

ضیاء الدین نے اپنی کتاب "اے مونوگراف آن مسلم کیلیگرافی" "A MONOGRAPH ON MUSLIM CALLIGRAPHY" میں مشرقی پاکستان کے فن خط پر بیشک ایک معقول نظر ڈالی ہے۔ مثلاً ایک جگہ وہ لکھتے ہیں: "عہد انگریزی سے قبل بنگال میں آرائشی طغری نگاری کے جو اسلوب نظر آتے ہیں اس کی بہترین مثالیں ہمیں ۱۵ ویں صدی تک مرشد آباد میں نظر آتی ہیں۔" لیکن مشرقی اور مغربی بنگال میں طغری کے علاوہ دیگر خطوں کی پرورش کس طرح بڑے یا ادنیٰ پیمانہ پر ہوتی رہی اس سلسلہ میں یہ کتاب بھی خاموش ہے۔ مگر میں اس جائزہ میں یہ بات

[illegible] ہمیشہ ہی طغری میں دکھائی دیتی ہے۔

قدیم ترین نمونہ ہائے کتابت: کتابت کے سلسلے میں سب سے پرانا نمونہ جو اس وقت ہمارے پاس موجود ہے وہ رکن الدین کیکاؤس (نبیرہ غیاث الدین بلبن) کے عہد (۱۳۰۱-۱۲۹۱ء) کا ہے جو تربینی اور گنگا رامپور کے کھنڈرات سے دستیاب ہوا ہے۔ رسم عربی ہے اور نسخ کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ شمس الدین الیاس شاہ (۱۳۴۲-۵۷ء) کے عہد کا بس ایک ہی نمونہ دستیاب ہوا ہے۔ یہ نمونہ آج کل کی ایک مسجد سے ملا ہے، یہ عام اینٹ کی بنی ہوئی مسجد ہے اور کلکتہ کے پاس "بنیاپور کور" میں بنی ہوئی ہے۔ یہ کتبہ دو سطروں میں ہے رسم عربی اور خط طغری ہے اور "تحریر" یعنی اردگرد کی جدول یا حاشیے کے خط سادہ ہیں۔ اسے بنگال کی خطاطی کا بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ حروف کے کھڑے حصوں کو ایسی خوبصورتی کے ساتھ سجا کر مرتب کیا گیا ہے جیسے نیزوں کی قطاریں چلی گئی ہوں۔ سکندر شاہ کے عہد (۱۳۵۸-۸۹ء) میں نسخ، ثلث اور کوفی کا رواج بڑھا۔ طغری کو بھی اپنی جگہ مقبولیت حاصل رہی۔ اس وقت بنگال میں خط کوفی کا ایک ہی نمونہ رہ گیا ہے جو وہ مسجد آدینہ میں پایا گیا ہے، جو پانڈوہ کے مقام پر ہے۔ پیش امام کی محراب میں ایک پتھر پر یہ کتبہ کندہ ہے۔ اور قابل دید نمونہ ہے۔ خط کوفی کو قرآن مجید اور سکوں کی کتابت کے لئے مخصوص اندازسے مخصوص رکھا گیا ہے۔ ابتدا میں یہ بالکل سادہ ہوتا تھا۔ مگر بعد کو اس میں بیل بوٹے اور طرح طرح کی انداز اس طرح کی گئی کہ خط کوفی سے نمائش و زینت اور آرائش و نگارش لطیف کا کام زیادہ لیا جانے لگا۔ اور بارہویں صدی کے پہنچتے پہنچتے خط کوفی ایسی گنجلک تحریر ہو گئی کہ اس کو پڑھنا سوائے

ہے کہ دو [illegible] پر حاشیہ تیار کر دیا جاتا تھا۔ نستعلیق خط میں حروف کے دوائر کو بہت [illegible] کیا جاتا تھا۔ نرائن گنج سے کوئی پانچ میل دور چاپاتال [illegible] گاؤں میں ایک خستہ پل ہے جس پر ایک کتبہ نصب ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پل [illegible] نے ۱۱۰۲ھ میں تعمیر کرایا تھا یعنی عہد اورنگ زیب میں۔ چار سطروں میں ایک شعر فارسی کا مسلسل چلا گیا ہے۔ روش نستعلیق ہے۔ ایک اور کتبہ بھی خاد (ڈھاکہ) کی ایک مسجد میں سے ملا ہے۔ یہ مسجد ۱۸۹۷ء کے زلزلہ میں تباہ ہوگئی تھی۔ سن تعمیر ۱۱۱۷ھ معلوم ہوتا ہے۔ عبارت فارسی۔ بانی کا نام مسعود ہے۔ طرز خط نستعلیق ہے۔ مگر معمولی۔ "قدم رسول" کی زیارت گاہ نرائن گنج کے بالمقابل بنی ہوئی ہے۔ اس کی تعمیر غلام نبی خاں نے ۱۱۹۱ھ کرائی۔ اس کا کتبہ بھی قابلِ غور ہے۔ اس زیارت گاہ کی بنا کسی شخص معصوم خاں کابلی نے رکھی تھی۔ اور قدم رسول کا نقش یہاں زیارت گاہ عام ہوگیا۔ سید حسین نے اس کتبہ کی صرف عبارت دینے پر اکتفا کیا ہے۔ زبان فارسی ہے، خط نفیس نستعلیق۔ نستعلیق کا ایک اور نمونہ باقر گنج کی ایک مسجد میں ملا جو سلطان لودی نام کے گاؤں میں واقع تھی۔ اس مسجد کی بنا کسی صاحب غلام محمد نے ڈالی تھی اور یہ ۱۱۵۱ھ میں مکمل ہوئی۔ غالباً اس سے بہتر اور نفیس خط نستعلیق پورے مشرقی پاکستان میں کہیں نہیں ملا۔

دور مغلیہ میں نستعلیق کو رواج عام ہوا مگر نسخ بھی [illegible] رہا۔ خود بہادر شاہ ظفر تک کی ایک وصلی خط نسخ میں ملی ہے۔ [illegible] کے اکثر ازاں خط طغریٰ میں لکھے گئے ہیں۔

برصغیر میں بالعموم اور مشرقی پاکستان میں بالخصوص فن خط کی جو روش رہی ہے اس کا مختصر تعارف ان چند سطروں میں پیش کیا گیا۔ ان سے اس بات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سلاطین وقت، امراء اور اشراف وقت نے فنِ خط کو بہت قدردانی کی نگاہ سے دیکھا اور فنکاروں کی ہمت افزائی کی۔ ان فنکاروں نے اپنے جوہر دکھانے میں ان سے نہ صرف پرورشِ لوح و قلم ہوتی رہی ہے بلکہ تاریخ بھی محفوظ ہوگئی ہے۔ اگر یہ کتبے، کتابے، اور وصلیاں نہ ہوتیں تو عمارتیں اور احوال واقعات سب گونگے ہوتے اور ان کی خاموشی کی وجہ سے ان کی تاریخی اہمیت کم ہوجاتی +

اک شمع رہ گئی تھی — بقیہ صفحہ ۱۹

ہے۔ بلحاظ موضوع کے اعتبار سے ان کی غزلیں بھی اصلاحی اور مقصدیت کی حامل ہیں اور بعض موقعوں پر وہ خالص فلسفیانہ انداز اختیار کر لیتے ہیں لیکن انہوں نے غزل کے فطری مزاج اور اس کی روایتی دلکشی اور رکھ رکھاؤ کو حالی کی طرح بڑے فن کارانہ طور پر قائم رکھا ہے۔

ابھی تک کافری سے عقل ایماں تک نہیں پہونچی
کہیں دیر و حرم کے درمیاں معلوم ہوتی ہے

زاہد شعور حسن سے بیگانہ ہی رہا
حسن نظر نہیں ہے تو حسن عمل کہاں

کی مسلماں نے ترقی جو فرنگی بن کر
وہ فرنگی کی ترقی ہے مسلماں کی نہیں

ہر شخص بنا لیتا ہے اخلاق کا معیار
خود اپنے لئے اور زمانے کے لئے اور

ہمت ہے تو پیدا کر فردوس حیات اپنا
بخشی ہوئی جنت سے دوزخ کا عذاب اچھا

مندرجہ بالا اشعار خالصتاً اقبال کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ خصوصاً وہ مسلسل غزل جسے انہوں نے "مخطیب سے خطاب" کا عنوان عطا کیا ہے:

ذوق ایثار و عمل کا نہ تجھے ہے نہ مجھے
زیست اس طرح کی زیبا نہ تجھے ہے نہ مجھے

شاید یہ اقبال کی اس نظم کی صدائے بازگشت ہو کر:

ہوس منزل لیلیٰ نہ تو داری و نہ من

انہوں نے اپنی غزل کے بارے میں ایک جگہ کہا ہے ؎

تعریف ہو کہ طنز یہ فغاں کا تبصرہ
پہونچا ہی ہے اسد تو کہاں سے غزل کہاں

اسے شاید ہی تعلی کہا جا سکے۔ جب بات غزل کی چل نکلی ہے تو لیجئے، غزل کے کچھ اور موتی بھی رول لیجئے:

خلاف موج بھی اکثر اسے رواں پایا
خود کشتی دل میں سوار ہے کوئی

دل بے تاب کرے کیوں نہ طواف منزل
ہے سفر ختم مگر شوق سفر باقی ہے

اسی سے بجھتی ہے شمع اور اسی سے روشن ہے
خبر نہیں یہ ہوا دوست ہے کہ دشمن ہے

ترک الفت کا بہانہ مری حالت سے ملا
مشکل ارباب ہوس کی ہوئی آساں مجھ سے

وہ بوالہوس بھی جنہیں جرأت گناہ نہیں
اب ان میں ڈھونڈ رہے ہیں مذاق تشنہ لبی

آ گیا حضرت واعظ کی زباں پر بھی اثر
یاد تھے اہل محبت کے جو افسانے چند

خیال کو بھی اسیر نگاہ کرتا ہے
مری نظر میں مصور گناہ کرتا ہے

حضرت ناصح کے چہرہ پر جو ہیں آثار کیف
پند ترک مے میں بھی شاید سرور بادہ ہے

جو کہتے یار کو جاتے ہیں ہوشیار رہیں
کہ غلط راہ میں پڑتا ہے امتحاں کے لئے

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اسد ملتانی کے کلام میں زبان و بیان کی طلسم کاریاں نظر نہ آئیں گی۔ ان کے کلام میں بیشک جہاں تہاں کوتاہیاں بھی ملیں گی لیکن شدت احساس اور خلوص مقصد ان کے کلام کی جان ہے جس سے ساری کوتاہیاں خود بخود نظر سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ اپنے ہم وضع پیشروؤں، حالی اور اقبال کی طرح اسد ملتانی کے کلام کا بیشتر حصہ روایتی تغزل کی عنصر سے مبرا ہے۔ ان کی تمام تر کوشش یہی ہوتی ہے کہ کسی طرح ہمارے روحانی اور ذہنی جمود کو دور کر کے زندگی کے صحیح اور صالح عمل کے راستے پر گامزن کر دیں۔ وہ بالطبع صلح جو اور امن پسند ہیں اس لئے ان کے یہاں جوشیلے انقلابی تاثرات کا فقدان ہے۔ وہ "ستائش کی تمنا" اور "صلہ کی پروا" کئے بغیر اپنے حقیقی تاثرات عوام تک پہونچانا چاہتے ہیں اسی لئے وہ ظاہری شاعرانہ طمطراق کو نظر انداز کر کے موضوع کی جزئیات کو بڑے سیدھے سادے انداز میں پیش کر دیتے ہیں۔ وہ سارا زور کلام جذبات کی عکاسی پر صرف کرتے ہیں۔

مہاجرین کا عالمی سال

بقیہ صفحہ ۵۲

کئے جاتے ہیں۔ اس اہم کام کے ساتھ ساتھ ان مہاجرین کی آباد کاری کو ترجیح دی جائیگی جو یورپ سے ترکِ وطن کرکے مشرقِ بعید میں پڑے ہیں۔ ان کی واپسی کے لئے تین ہزار آٹھ سو ویزا تیار کرا لئے ہیں اور مصارف سفر کے لئے ساڑھے بائیس لاکھ ڈالر جمع ہوئے ہیں۔

جیسا کہ شروع میں لکھا گیا ہے جنرل اسمبلی نے ۵ دسمبر ۱۹۵۸ء کی قرارداد میں اقوامِ متحدہ کے سکریٹری جنرل سے بھی یہ درخواست کی تھی کہ وہ مہاجرین کے عالمی سال کو فروغ دینے میں ایسے اقدامات سے کام لیں جو ان کے نزدیک معقول اور مناسب ہوں۔ چنانچہ انہوں نے مسٹر کلاڈ ڈی کیمولاریا کو اپنا خاص نمائندہ مقرر کرکے ہدایت کی کہ وہ ساری دنیا کا خصوصاً ان ملکوں کا جہاں مہاجرین کی آباد کاری کا مسئلہ درپیش ہے، دورہ کرتے ہوئے حکومتوں کو مشورہ دیں کہ وہ عالمی سال میں شریک ہو کر اس دشوار کام کو جلد پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی صورت پیدا کریں۔

مسٹر کیمولاریا اس غرض سے ایشیائی ملکوں کا دورہ کرتے ہوئے پچھلے سال ماہ اگست میں پاکستان میں آئے تھے۔ انہوں نے پاکستان کے وزیر خارجہ اور وزارتِ آباد کاری کے اعلیٰ افسروں سے تبادلۂ خیالات کیا۔ ان کو بتایا گیا کہ پاکستان میں یہ مسئلہ کچھ عرصہ پہلے یقیناً دشوار معلوم ہوتا تھا اور کسی طرح اس کا آخری حل نظر نہیں آتا تھا لیکن نئی حکومت نے روزِ اوّل سے اس مسئلے پر خاص توجہ دے رکھی ہے۔ نہایت تیزی سے مکانات تعمیر ہو رہے ہیں اور مہاجرین کی مستقل آباد کاری عمل میں آ رہی ہے یہاں تک کہ چند ماہ بعد یہ مسئلہ باقی نہیں رہے گا۔ [illegible] حکومت نے مسٹر کیمولاریا کو یہ اختیار بھی دے دیا کہ وہ مہاجرین کے عالمی سال میں پاکستان کی شرکت کا اعلان کر دیں۔

مسٹر کیمولاریا دنیا بھر کا دورہ کرنے کے بعد اقوامِ متحدہ کے صدر مقام پر واپس پہنچ گئے ہیں۔ ان کے ایک [illegible] اعلان سے پتہ چلتا ہے کہ اس عالمی سال کی تقریب میں چونسٹھ ملک اور پانچ علاقے شرکت کر رہے ہیں۔ ان چونسٹھ ملکوں کے نام یہ ہیں: پاکستان، افغانستان۔ ارجنٹائن۔ آسٹریا۔ آسٹریلیا۔ بلجیم۔ بولیویا۔ برازیل۔ برما۔ کمبوڈیا۔ کینیڈا۔ سیلون۔ چلی۔ جمہوریتِ چین۔ کولمبیا۔ کوسٹاریکا۔ کیوبا۔ اسرائیل۔ اٹلی۔ جاپان۔ اردن۔ جمہوریت کوریا۔ لے اوس۔ لبنان۔ لائبیریا۔ لکسمبرگ۔ میکسیکو۔ موناکو۔ مراکش۔ نیدرلینڈ۔ ناروے۔ ڈنمارک۔ ڈومینیکن ریپبلک۔ ایکویڈور۔ وفاق ملایا۔ فن لینڈ۔ فرانس۔ وفاقی جمہوریت جرمنی۔ گھانا۔ یونان۔ گواٹی مالا۔ ہائیٹی۔ ہولی سی۔ ہنڈورس۔ آئس لینڈ۔ ایران۔ آئرلینڈ۔ پاناما۔ پیرو۔ فلپین۔ پرتگال۔ سویڈن۔ سوئٹزرلینڈ۔ تھائی لینڈ۔ تیونس۔ ترکی۔ متحدہ عرب جمہوریت۔ برطانیہ۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ۔ اروگوئے۔ وینزوئیلا۔ جمہوریتِ ویت نام اور یوگوسلاویہ۔ ان کے علاوہ شرکت کرنے والے پانچ علاقوں کے نام برطانوی ہونڈورس۔ گامبیا۔ ہانگ کانگ۔ سنٹ لوسیا (ویسٹ انڈیز) اور [illegible] ہیں۔

"ماہِ نو" میں مضامین کی اشاعت سے متعلق شرائط

(۱) "ماہِ نو" میں شائع شدہ مضامین کا معاوضہ پیش کیا جائے گا۔

(۲) مضامین بھیجتے وقت مضمون نگار صاحبان "ماہِ نو" کے معیار کا خیال رکھیں اور یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالہ یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔

(۳) ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر حوالہ جات دینا ضروری ہیں۔

(۴) ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔

(۵) مضمون کے ناقابلِ اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

(۶) ایڈیٹر کو مسودات میں ترمیم کرنے کا مجاز ہوگا مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

(۷) مضامین صاف اور خوشخط کاغذ کے ایک طرف تحریر کئے جائیں اور مکمل صاف پتہ درج کیا جائے۔

وادی مہران

د بیت العتیق کی طرح تھی وہ ، نقشہ کعبے سے اس کا اتارا ہوا''
(وارث شاہ)

''اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے''

''حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں''

''ہاری کو ملے کھیت . . .''

''ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں''
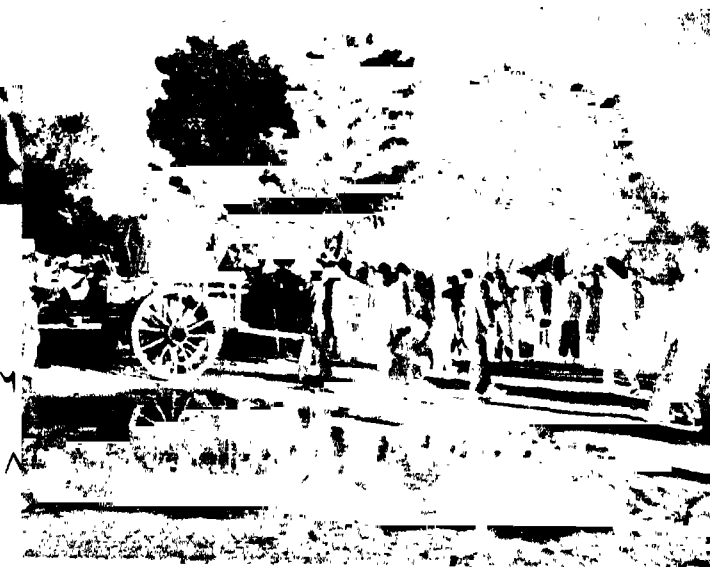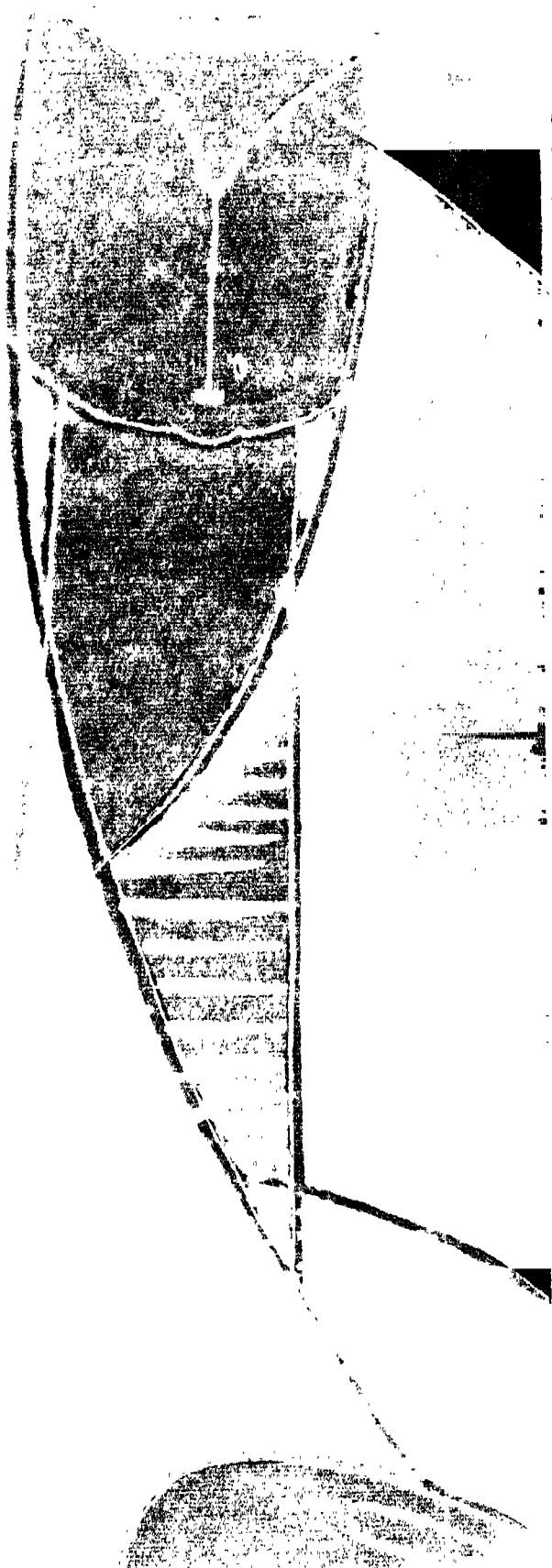
مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا - مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پرس مکلوڈ روڈ - کراچی
مدیر: رفیق خاور

خدیجہ مستور　قتیل شفائی　صہبا اختر　رفعت شفیع

تابش دہلوی　رضی ترمذی　یوسف بخاری　قدرت نقوی

احسان ملک　احمد سعدی　اکبر علی خان　شاہد عشقی

فروری ۹۶۰
قیمت ۸ آنے
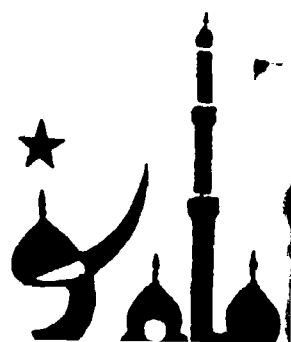
وَمَن یُؤتَ الحِکمَۃَ فَقَد اُوتِیَ خَیراً کَثِیراً
جس کو حکمت ملی اُسے بڑی عظیم نعمت ملی (قرآن حکیم)
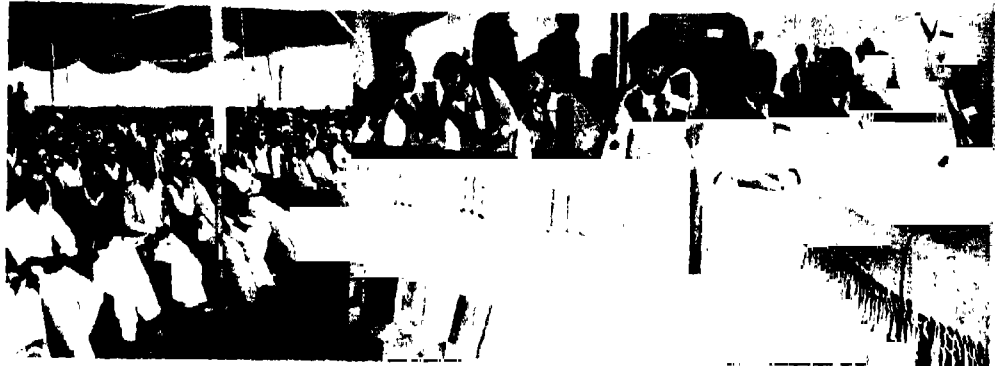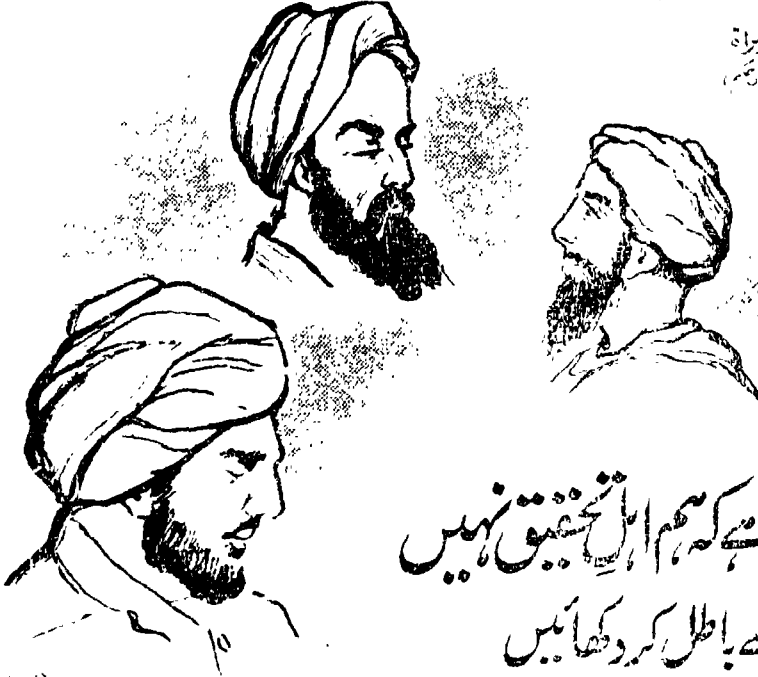
ہم پر الزام ہے کہ ہم اہلِ تحقیق نہیں

آئیے اسے باطل کر دکھائیں

ہمارے پاس علم و حکمت کے ایسے بیش بہا دفینے موجود ہیں جن کی تحقیق و تلاش پر ہمارے اسلاف نے اپنی زندگیاں صرف کر دیں۔ لیکن پوشیدہ ہونے کی وجہ سے وہ انسانیت کے کسی کام نہیں آ رہے۔ ان کا چھپائے رکھنا انسان دشمنی کے برابر ہے۔ آیئے انہیں ظاہر کر کے ثابت کر دیں کہ ہم اب بھی دُنیا کو بہت کچھ دے سکتے ہیں۔

آپ یا آپ کے جاننے والوں میں سے کسی کے پاس کوئی مجرب نسخہ یا جڑی بوٹیوں کے متعلق کسی قسم کی معلومات محفوظ ہوں تو انہیں تفصیلاً لکھ کر ہمیں بھیجئے۔ ہم اُن پر خود بھی تحقیق و تجربات کریں گے اور دوسروں کو بھی اُنہیں پرکھنے کی دعوت دیں گے۔

بھیجنے والوں کے نام سے سب نسخوں کی بجنسہٖ اشاعت کا زیادہ سے زیادہ انتظام کیا جائے گا تاکہ طبی ادارے اور عوامی صحت سے دلچسپی رکھنے والے اہلِ تحقیق ان پر مزید کام کر سکیں۔

یہ پوشیدہ طبی نوادر قوم کی امانت ہیں آیئے انہیں جمع کر کے انسانیت کے نام پر عام کریں۔
وقت کا تقاضا ہے کہ قومی صحت کی حفاظت کیلئے ایک جامع کوشش کی جائے۔ اس تقاضے کو پورا کیجئے۔

انسٹی ٹیوٹ آف ایسٹرن میڈیسن

ہمدرد منزل۔ نیو ٹاؤن کراچی-۵

UNITED HG 3/248
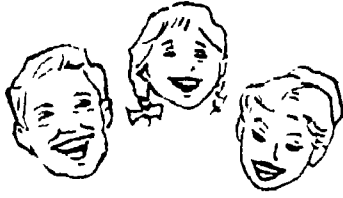
فارہنس، خاندان کے لئے ٹوتھ پیسٹ۔
اپنے بچوں کو فارہنس
کے ذریعہ دانتوں اور
مسوڑوں کی حفاظت
کرنا سکھائیے۔
For the gums
فارہنس استعمال کیجئے۔
بچوں کو خواہ وہ چھوٹے ہی کیوں ... ہنس کے ذریعہ اپنے دانت صاف ... اور
مسوڑوں پر بھی برش ملنا سکھائیے۔ آپ کا ڈاکٹر آپ کو بتائے گا کہ مضبوط مسوڑے صحتمند
دانتوں کی بنیاد ہیں۔ دانتوں کو صاف کرنے کی صحیح عادت بچپن ہی میں سیکھی جاتی ہے جو آپ کے
بچوں کی مسکراہٹ میں دائمی دلکشی کا باعث ہوتی ہے۔
اب پاکستان میں آسانی سے دستیاب ہو سکتا ہے۔
بڑے سائز کا ٹیوب دو روپے دو آنے۔ چھوٹے سائز کا ٹیوب ایک روپیہ چھ آنے چھ پائی۔
اس سے زیادہ ہرگز نہ دیجئے۔
تیار کنندگان:-
ڈاج اینڈ سیمور انڈسٹریز (پاکستان) لمیٹڈ
ویسٹ وھارف۔ کراچی۔
JWT DS 1033

خیابان پاک

پاکستان کی علاقائی شاعری کے منظوم متراجم کا انتخاب

علاقائی شاعری کی روایات - سہانے گیت اور میٹھے بول پاکستان کی نغمہ ریز سرزمین کی خاص پیداوار ہیں - ان کے منظوم اردو تراجم کا یہ انتخاب چھ زبانوں کے اصل نغمات کی صدائے بازگشت ہے - ساٹھ سے زیادہ مقبول شعراء کا کلام -

کتاب نفیس اردو ٹائپ میں بڑے سائز پر وضع داری کے ساتھ طبع کی گئی ہے -

گرد پوش مصور - ضخامت: تین سو صفحے -

قیمت چار روپے - علاوہ محصول ڈاک -

ادارہ مطبوعات پاکستان - پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ - کراچی

* * * * * * * * *

نوائے پاک

ملک میں ایک ایسے مجموعۂ منظومات کی بڑی ضرورت محسوس کی جارہی تھی جو ہمارے وطنی احساسات کو بیدار کرسکے اور ہمیں اپنے وطن کی پاک سرزمین کی عظمت اور محبت سے روشناس و سرشار کر سکے - "نوائے پاک" میں ملک کے نامور شعرا کی لکھی ہوئی وطنی جذبات سے لبریز نظمیں، گیت اور ترانے درج ہیں - کتاب مجلد ہے - خوبصورت گرد پوش سے آراستہ ، "گیٹ اپ" بہت نفیس اور دیدہ زیب -

قیمت صرف دو روپے

ملنے کا پتہ:

ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ - کراچی

پاکستان شاہراہ ترقی پر

ہمارے نئے باتصویر کتابچوں کا سلسلہ

ملک کی اہم صنعتوں پر "ادارۂ مطبوعات پاکستان" نے مصور کتابچوں کا سلسلہ حال ہی میں شروع کیا تھا ۔ جو ملک میں اپنی افادیت اور تزئین آرائش و طباعت کی خوبیوں کے باعث بہت مقبول ہوا ہے ۔ یہ کتابچے ہر موضوع سے دلچسپی رکھنے والے ماہروں سے مرتب کرائے گئے ہیں اور انکی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ملک کی اہم صنعتوں پر مختصر، مگر جامع معلومات، اعداد و شمار اور اہم حقائق، عام پڑھنے والوں کی دلچسپی اور استفادہ کے لئے پیش کئے گئے ہیں ۔

ہر کتابچہ آرٹ پیپر پر چھپی ہوئی بارہ صفحے کی تصاویر سے مزین ہے۔ ان تصویروں کو دیکھنے سے ہر صنعت کے مختلف مراحل تیاری وغیرہ کی کیفیت پوری طرح ذہن نشین ہوجاتی ہے ۔

ہر کتاب میں جہاں ضروری معلومات اور اعداد و شمار پیش کئے گئے ہیں ۔ جن سے ہر ملکی صنعت کی رفتار ترقی کا پورا جائزہ ہر شخص کی نظر کے سامنے آجاتا ہے ۔

استفادۂ عام کے پیش نظر ہر کتابچہ کی قیمت صرف چار آنے رکھی گئی ہے ۔ یہ کتابچے اب تک شائع ہوچکے ہیں :

* کپڑے کی صنعت
* چائے کی کاشت اور صنعت
* پن بجلی کی صنعت
* اشیائے صرف
* کاغذ کی صنعت
* سیمنٹ کی صنعت
* چمڑے کی صنعت
* ماہی گیری
* ذرائع آبپاشی کی صنعت
* غذائی مصنوعات
* شکر سازی

ملنے کا پتہ : ادارۂ مطبوعات پاکستان ۔ پوسٹ بکس ۱۸۳ ۔ کراچی

جلد ۱۳ — شمارہ ۲

فروری ۱۹۶۰ء

مدیر: رفیق خاور — نائب مدیر: ظفر قریشی

چندہ سالانہ: پانچ روپے آٹھ آنے

شائع کردہ: ادارۂ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

فی کاپی: آٹھ آنے

مثنوی ابرِ گہربار

سید قدرت نقوی

مرزا غالب کو اردو نظم و نثر میں سنگ میل کا مرتبہ حاصل ہے اور فارسی نظم و نثر میں بھی ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اگر اقبال اپنے فلسفہ کے اظہار کے لئے فارسی زبان کو ذریعہ نہ بناتے تو غالب ہندوستان میں فارسی زبان کے آخری شاعر ہوتے۔ قدیم طرز کا دور ان پر ختم ہو گیا اور جدید دور کے لئے انہوں نے ایک راستہ کی نشاندہی کی۔ اسی راستہ پر چل کر علامہ اقبال اردو اور فارسی شاعری میں اپنے موجودہ مرتبہ پر پہنچے۔ اسلوب بیان اور مضمون آفرینی، دونوں میں غالب ہی کی روش ان کے سامنے رہی بلکہ بعض امور کا سرچشمہ بھی غالب کا کلام ہے۔

غالب نے اپنا زور بیان، غزل، قصیدہ، رباعی اور مثنوی غرض ہر صنفِ سخن میں دکھایا ہے اور اتنا بلند درجہ حاصل کیا کہ ہندوستان کے علاوہ ایران میں بھی ان کو بلند مرتبہ شاعر تسلیم کیا گیا۔ بلکہ کلکتہ میں ایک ایرانی فاضل مرزا کوچک نے بھری مجلس میں غالب کے متعلق کہا کہ اس درجہ کا شاعر آج سرزمین ایران میں بھی کوئی نہیں[1]۔ غالب کے فارسی کلام میں سے قصیدہ و غزل وغیرہ پر بہت کچھ لکھا جا چکا۔ اس صحبت میں ان کی سب سے بڑی اور اہم مثنوی "ابرِ گہربار" پر کچھ لکھا جاتا ہے۔

مرزا غالب کے کلیات میں صرف گیارہ مثنویاں ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی چھوٹی چھوٹی مثنویاں پائی جاتی ہیں۔ ان سب میں مثنوی "ابرِ گہربار" طویل بھی ہے اور زیادہ وقیع بھی۔ مرزا اس مثنوی میں "شاہنامۂ فردوسی" کی طرح غزوات نبوی بیان کرنا چاہتے تھے لیکن یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا کیونکہ تاریخ نگاری غالب کے بس کی بات نہ تھی۔ چنانچہ جب وہ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں تاریخ نویسی پر مامور ہوئے تو حکیم احسن اللہ خاں اردو میں تاریخ کا خلاصہ لکھ کر بھیج دیتے اور غالب اس کو اپنی طرز خاص میں ادا کرتے تھے۔ منشی نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں:

"میں فن تاریخ و مساحت و سیاق سے اتنا بیگانہ ہوں کہ ان فنون کو سمجھ بھی نہیں سکتا۔ کارپردازان دفتر شاہی خلاصۂ حالات اردوئے کتب اردو میں لکھ کر میرے پاس بھیج دیتے ہیں۔ میں اس کو فارسی کر کر حوالہ کرتا ہوں[1]"

یہی وجہ ہے کہ یہ مثنوی محض تمہیدی عنوانات تک لکھی گئی۔ اس کے ناتمام رہنے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ غالب کو وہ فراغت نصیب نہ ہوئی جو مثنوی گوئی کے لئے لازمی ہے۔ کیونکہ مثنوی کے لئے تسلسلِ بیان انتہائی ضروری ہے اور اس تسلسل کے برقرار رکھنے کے لئے بیفکری اور فارغ البالی لازمی۔ غالب ۱۸۲۶ء سے بہت زیادہ پریشانیوں کا شکار رہے ہیں۔

غالب نے یہ مثنوی کب لکھنی شروع کی اور کب ختم کی، اس کا سراغ ان کی تصانیف میں کہیں نہیں پایا جاتا۔ غالب کے متعلق تحقیق کرنے والے حضرات بھی اس سلسلہ میں کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچے۔ سب سے پہلے اس مثنوی کا ذکر سر سید احمد خاں کی کتاب "آثار الصنادید" میں پایا جاتا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:

"ایک مثنوی مشتمل اوپر غزوات رسالت دستگاہی ختمی پناہی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی اگرچہ ہنوز ناتمام ہے لیکن پھر بھی قریب پندرہ سولہ جزو کے ہو چکی ہے انشاء اللہ تعالیٰ جس وقت اتمام کو پہنچے گی گلدستۂ بزم احباب ہوگی"[2]۔

"آثار الصنادید"[3] بقول شیخ محمد اکرام ۱۸۴۵ء میں چھپی[4]۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ مثنوی ۱۸۴۵ء تک لکھی جا چکی تھی۔ سر سید نے اس کی ضخامت پندرہ سولہ جزو لکھی ہے اور اب بھی اس سے زیادہ نہیں۔ مولانا حالی نے آخری زمانہ کی تصنیف بتایا ہے[5]۔ مولانا مہر اور مسٹر مالک رام نے مثنوی کے زمانہ تصنیف کے متعلق کوئی رائے قائم نہیں کی۔ ڈاکٹر عبداللطیف نے

---

[1] غالب از مہر حاشیہ صفحہ ۱۲۳

[1] نادرات غالب ۲۹ [2] ماہِ نو فروری ۵۰ صفحہ ۲ [3] جمیل نقوی نے "ماہِ نو" فروری ۵۰ میں خلاصہ احوال غالب از "آثار الصنادید" طبع کرایا تھا۔ سن تصنیف ۱۸۴۷ء لکھا ہے۔ رام بابو سکسینہ نے تاریخ ادب اردو میں ۱۸۴۶ء تا ۱۸۵۴ء کی تصنیف بتایا ہے۔ میرے خیال میں بھی ۱۸۴۷ء کو ترجیح دینی چاہئے۔ [4] آثار غالب صفحہ ۱۰۱ [5] یادگار غالب ۲۳۲

اپنی تصنیف "غالب" میں لکھا ہے،

" ۱۸۵۹ء کے بعد بھی غالب اردو میں نئے شعر لکھنے کی طرف مائل نظر نہیں آتا۔ اس دور کی سنجیدہ کوشش صرف اس کی فارسی مثنوی "ابر گہربار" ہے[5]۔"

ڈاکٹر عبداللطیف کا یہ بیان حقیقت کے خلاف ہے۔ نہ معلوم انہوں نے کس بنا پر اس کو ۱۸۵۹ء کی تصنیف قرار دیدیا کیونکہ جب غالب کی زندگی کو ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے تو ایک دور ۱۸۵۷ء سے وفات تک قائم کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ۱۸۵۹ء اسی دور میں واقع ہوتا ہے۔ سرسید کے بیان کی موجودگی میں کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ یہ مثنوی ڈاکٹر عبداللطیف کے بیان کردہ دور کی تخلیق ہے۔

شیخ محمد اکرام نے "آثار غالب" میں اس مثنوی کو ۱۸۲۷ء تا ۱۸۴۷ء کے دور میں شامل کیا ہے اور زمانہ تصنیف ۱۸۳۸ء تا ۱۸۴۵ء متعین کیا ہے[6]۔ لیکن میرا احساس یہ ہے کہ یہ مثنوی ۱۸۳۸ء سے پہلے لکھنی شروع کی جا چکی تھی۔ شیخ محمد اکرام نے دیوان منقولہ ۱۸۳۸ء یعنی "میخانۂ آرزو" میں اس کے شامل نہ ہونے سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ یہ اس منقولہ مرتبہ دیوان کے بعد کی تصنیف ہے اور اگر سرسید "آثار الصنادید" میں اس کا ذکر نہ کرتے تو غالباً یہ ۱۸۴۵ء کے بعد کی تصنیف قرار پاتی کیونکہ ۱۸۴۵ء کے مطبوعہ دیوان میں بھی یہ مثنوی شامل نہیں۔ ایسا معلوم دیتا ہے کہ غالب اس مثنوی کی اشاعت تک[7] سے پہلے خلاف مصلحت سمجھتے تھے اور اسی وجہ سے اس کا ذکر[8] ۱۸۴۴ء سے پہلے نہیں ملتا۔

غالب نے یہ مثنوی ایام شباب میں لکھنی شروع کی تھی چنانچہ ۱۸۶۴ء کی مطبوعہ مثنوی جب صوفی منیری کو بھیجی تو لکھا۔

" ایام شباب میں کہ جبر طبع روانی پر تھا۔ جی میں آیا کہ غزوات صاحب ذوالفقار لکھنا چاہیئے۔ حمد و نعت و منقبت و ساقی نامہ و مغنی نامہ لکھا گیا۔ داستان طرازی کی توفیق نہ پائی ناچار آٹھ نو سو شعر کو چھپوا لیا[9]۔"

غالب پر جوانی کے زمانہ میں دو قسم کے خیالات مستولی تھے۔ اولاً مذہبی رجحان زیادہ تھا۔ دوم وہ شاعری میں ایسا بلند مقام حاصل کرنا چاہتے تھے جو ہندوستان میں کسی کو نصیب نہ ہوا ہو۔ غزل و قصیدہ میں کمال حاصل کرنے کے بعد انہوں نے مثنوی کی طرف توجہ کی ہوگی کہ جس طرح وہ غزل و قصیدہ میں اساتذۂ سلف کی صفِ اول میں در آئے ہیں، اسی طرح مثنوی میں بھی فردوسی و نظامی کے ہم پلہ شمار ہونے لگیں۔

مثنوی لکھنے کے متعلق جب غور کیا ہوگا تو ایرانی تاریخ کے سلسلہ میں شاہنامہ اور سکندر نامہ موجود تھے اس موضوع پر قلم اٹھانا بے سود خیال کیا ہوگا۔ خاندان مغلیہ کی منظوم تاریخ لکھنے میں انہیں کسی قسم کی امید نہ تھی کیونکہ اولاً بادشاہ برائے نام تھا جس سے کسی خاص مالی منفعت کی توقع نہ تھی۔ دوسرے ذوق استاد شاہ تھے۔ غالب کو اس بات کا بھی یقین نہیں تھا کہ وہ اس طرح شاہی دربار سے متعلق ہو جائیں گے کیونکہ مرزا نے اکبر شاہ ثانی کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا اور گزرانا ممکن ہے کچھ انعام مل گیا ہو۔ لیکن حسب توقع عزت و حوصلہ افزائی نہیں ہوئی۔ اسی طرح بہادر شاہ ظفر کی مدح میں بھی درباری تعلقات سے پیشتر کئی قصیدے لکھ کر نذر کئے جا چکے تھے۔ جن کے صلے میں صرف تحائف و انعام ملتا رہا، باریابی نہ ہو سکی۔ ان حالات میں فردوسی و نظامی کا مقابلہ مثنوی میں صرف اسی صورت میں کیا جا سکتا تھا کہ غزوات نبوی نظم کریں۔ کیونکہ یہ موضوع کسی نے نہ اپنایا تھا۔ حضرت علی علیہ السلام سے ان کی عقیدت و محبت کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ اسلام کی ابتدائی لڑائیاں بیان کریں جن میں اہم کردار حضرت علی علیہ السلام کا ہے۔ انہی وجوہ کی بنا پر انہوں نے مثنوی "ابر گہربار" لکھنی شروع کی۔ میرا احساس ہے کہ غالب کی اس مثنوی کا آخری حصہ یعنی ساقی نامہ ۴۷ - ۱۸۴۵ء کے زمانہ ہی میں لکھا گیا ہے۔ بعض اشعار اس خیال کے مؤید ہیں جن میں پیری کا ذکر پایا جاتا ہے یہ آگے پیش ہوں گے۔ ۱۸۵۰ء سے پہلے کے ایک قلمی دیوان کے آخر میں اسی کاتب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ مثنوی موجود ہے (بشکریہ مولانا عرشی) یہ نسخہ رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ۱۸۴۵ء میں دیوان کی طباعت کے بعد غالب نے مثنوی کی تکمیل کا ارادہ ترک کر دیا تھا اور اس کو دیوان میں شامل کر لیا تھا۔

یہ مثنوی ۱۸۶۳ء کے مطبوعہ کلیات میں طبع ہوئی لیکن حکیم غلام رضا کے اصرار پر اس کو الگ چھاپنے کی اجازت دے دی۔ اس کے

---

[5] غالب اردو ترجمہ صفحہ ۳۰۔ [6] آثار غالب صفحہ ۲۳۰۔ [7] "آثار الصنادید" ۱۸۴۷ء ہی کی تصنیف ہے کیونکہ غالب نے مولوی رجب علی ارسطو جاہ کو خود "آثار الصنادید" بھیجی تھی جس خط میں اس کا ذکر ہے وہ غیر مطبوعہ ہے۔ "دریں زمانہ" کے الفاظ قریبی زمانہ پر دلالت کرتے ہیں۔ یہ خط ۵ دسمبر ۱۸۴۷ء کا ہے۔ [8] خطوط غالب جلد دوم مرتبہ مولانا مہر صفحہ ۴۳۸۔ غالب نے تعداد اشعار اندازے سے لکھی ہے۔ صحیح تعداد ۱۰۹۸ ہے۔

ساتھ وہ قصیدے، چند قطعے اور کچھ رباعیاں بھی شامل کر دیں۔ اس کی اشاعت ۱۸۶۴ء میں ہوئی۔ غالب نے خود دیباچہ و خاتمہ لکھا۔ تقریظ صاحب عالم، رضوان، عزیز اور کامل نے قطعات تاریخ لکھے۔ اس کا ایک نسخہ مولانا مہر کے پاس موجود ہے۔ یہ نسخہ اس وجہ سے اہم ہے کہ دیباچہ و خاتمہ کی عبارت کلیات نثر میں شامل نہیں ہے۔

اسی مطبوعہ مثنوی کے متعلق علاء الدین خاں علائی نے غالب کو شکایتاً لکھا ہوگا کہ مثنوی نہیں بھیجی۔ ۳۰ مئی ۱۸۶۴ء کو غالب نے جواباً لکھا:

"اے میری جان! مثنوی "ابر گہربار" کون سی فکر تازہ تھی کہ میں تجھ کو بھیجتا؟ کلیات میں موجود ہے۔ لہٰذا شہاب الدین خاں نے بھیج دی میں مکرر کیا بھیجتا؟"[1]

غالب نے کسی تذکرہ کے لئے اپنے حالات خود لکھے تھے۔ یہ خود نوشت حالات رسالہ "اردو" (دکن) بابت جولائی ۱۹۲۸ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئے۔ اس تحریر کا عکس بھی چھپا تھا۔ اب "احوال غالب" میں دوبارہ ان حالات کی مع عکس تحریر اشاعت عمل میں آئی۔ ان حالات کے ضمن میں غالب نے حاشیہ پر مثنوی کے ذکر کا اضافہ کیا ہے:

"اور ایک مثنوی غزوات رسالت پناہی میں بہت عمدہ، بہت طویل لکھی جس کے اشعار حد سے زیادہ ہوں گے۔"

لطف کی بات یہ ہے کہ اظہار الحق ملک نے اس بیان کو نستعلیق کرتے وقت بالکل نظر انداز کر دیا۔ اس تحریر کو ۱۸۶۴ء سے متعلق بتایا ہے۔ تحریر میں لاہور کے دربار میں شرکت نہ کرنے پر اظہار افسوس کیا ہے جس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ تحریر اس دربار کے بعد کی ہے۔ دربار اکتوبر ۱۸۶۴ء میں ہوا تھا۔ البتہ صوفی منیری کو یہ مثنوی ۱۸۶۶ء کے اوائل میں بھیج دی گئی تھی۔

مرزا صاحب نے اس مثنوی کے ایک شعر کی شرح منشی نبی بخش حقیر کے استفسار پر بیان کی ہے:

"تو گوئی مگر مہر زیر زمیں [2] فروزاں فرو بود پشت نگیں

یہ شعر شب معراج کی توصیف میں ہے کہ وہ شب ایسی روشن تھی کہ بہ سبب روشنی کے زمین ایسی چمکتی تھی جیسے ڈانک سے نگینہ چمک جاتا ہے۔ آفتاب رات کو تحت الارض ہوتا ہے اور ڈانک بھی نگینے کے تلے لگاتے ہیں اور نگینہ بقدر ڈانک کی حقیقت کے چمکتا ہے۔ پس جس نگیں کے نیچے آفتاب ڈانک ہوگا وہ نگیں کتنا درخشاں ہوگا۔ ڈوہ فارسی لغت ہے بمعنی ڈانک کے۔"[1]

غالب کی یہ مثنوی خود غالب کی نظر میں بہت وقیع تھی۔ اس کے اشعار آخر عمر تک خطوط و تصنیفات میں تمثیلاً استعمال کرتے رہے ہیں۔

میجر جان جاکوب نے نہایت جانفشانی سے دیوان حافظ کی صحت کی اور اس کو چھپوانا چاہا تو غالب سے دیباچہ لکھنے کی فرمائش کی اور دیباچہ میں اپنی تحقیق وغیرہ بیان کرنے کے متعلق لکھا لیکن پورے نتائج تحقیق غالب کے پاس نہ بھیجے۔ غالب نے دیباچہ نہ لکھا بلکہ تقریظ لکھ کر بھیج دی[2]۔ اس تقریظ کا ذکر جس خط میں ہے وہ میجر جان جاکوب کے نام پہلا خط ہے۔ اس کے بعد کا خط جس میں مکان کی منظوم تاریخ لکھی ہے، ۱۸۴۸ء کا ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ غالب نے سب سے پہلے اسی تقریظ میں اشعار مثنوی تمثیلاً لکھے ہیں[3]۔ ترتیب بدلی ہوئی ہے۔ پہلا شعر یہ ہے:

دو لی بے کفن مردہ در رہش
خودی داد گر شحنہ در گہش

میاں محمد نجف کو ایک خط میں تین شعر تمثیلاً لکھے ہیں[4]۔ یہ شعر مناجات کے ہیں اور ترتیب بدلی ہوئی ہے:

زناسازی و ناتوانی بہم — دم اندر کشاکش ز پیوند دم

ایک خط میں نواب ضیاء الدین کو ایک شعر لکھا ہے[5]۔ یہ شعر بھی مناجات کا ہے:

نہ رقص پری پیکراں بر بساط — نہ غوغائے رامشگراں در رباط

اردو کے چار خط ہیں جن میں اس مثنوی کے اشعار تمثیلاً لکھے ہیں۔ میر مہدی مجروح[6] اور غلام غوث خاں بیخبر کو یہ شعر لکھا ہے[7]:

اُفق ہا پُر از ابر بہمن مہی — سفالینہ جام من از مے تہی

نواب علاء الدین خاں کو دو شعر لکھے ہیں[8] جن میں دوسرا شعر وہی ہے جو ضیاء الدین خاں کو لکھا ہے۔ پہلا یہ ہے:

نہ بستاں سرائے نہ میخانہ — نہ دستاں سرائے نہ جانانہ

۱۔ اردوئے معلیٰ لاہور صفحہ ۱۶۳، خطوط غالب جلد اول صفحہ ۲۔ کلیات میں تو کی جگہ کہ ہے۔

۱۔ نادرات غالب صفحہ ۱۵۲ ۲۔ کلیات نثر صفحہ ۱۶۱ ۳۔ کلیات نثر صفحہ ۱۶۵ کلیات نظم صفحہ ۱۲۴ ۴۔ کلیات نثر صفحہ ۱۹۸ کلیات نظم صفحہ ۱۲۳ ۵۔ نثر ۱۸۹ نظم ۱۲۴ ۶۔ خطوط غالب جلد اول ۳۵۳ ۷۔ خطوط غالب جلد دوم ۸، نظم ۱۲۴ ۸۔ خطوط غالب جلد اول ۲۳، نظم ۱۲۴۔

ایک خط میں نواب انور الدولہ شفق کو یہ شعر مناجات کا لکھا ہے[1] ؎

در ین خستگی پوزش از من مجوئے ۔۔۔ بود بندۂ خستہ گستاخ گوئے

۱۸۵۰ء میں جب غالب خاندانِ مغلیہ کی تاریخ نویسی پر مامور ہوئے اور "پرتوستان" کا پہلا حصہ "مہرِ نیمروز" لکھنا شروع کیا تو حسبِ موقع اسی مثنوی کے اشعار کام میں لائے۔ حمد کے سلسلہ میں پانچ شعر نقل کئے ہیں[2] جن کی ترتیب بدلی ہوئی ہے اور اس شعر کے مصرعے مقدم و مؤخر کر دئے ہیں ؎

اگر مومناں در پرستاریش ۔۔۔ دگر کافر انت بہ زنہاریش

نعت کے موقع پر دو جگہ مثنوی کی نعت کے اشعار کام میں لائے ہیں پہلی جگہ چار شعر مسلسل اور دو شعر بہت آگے سے نقل کئے ہیں اور اس شعر کے مصرعے آگے پیچھے کر دئے ہیں[3] ؎

بہ پیوند پیرایۂ خاکیاں ۔۔۔ بہ دم حرزِ بازوئے افلاکیاں

نعت کے خاتمہ میں دو شعر تمثیلاً لکھے ہیں[4]۔ آخری شعر یہ ہے ؎

کہ تا گردشِ چرخِ نیلوفری ۔۔۔ بود سبز جا لُشش بہ پیغمبری

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ "ساقی نامہ" ۴۷-۵۴ء کے زمانہ میں لکھا گیا کیونکہ پیہم صدمات کی وجہ سے غالب کی صحت گر چکی تھی۔ جوانی کا زمانہ ختم ہونے لگا تھا۔ "ساقی نامہ" میں اس حالت کو بیان کیا ہے۔ "مہرِ نیمروز" میں اپنی حالت بیان کی تو "ساقی نامہ" ہی سے نو اشعار نقل کر دئے[5] ؎

دریغا کہ در ورزشِ گفتگوئے ۔۔۔ بہ پیری خود آرائی آورد روئے

"مہرِ نیمروز" میں جب ظہیر الدین بابر کا حال لکھنا شروع کیا تو "ساقی نامہ" کے چھ ابتدائیہ شعر نقل کئے[6]۔ ساتواں شعر ایسا ہے کہ ساقی نامہ میں موجود نہیں۔ اسی وقت موزوں کیا ہوگا۔ جو درج ذیل ہے ؎

نہ ہر کس فزوں مے بمن دہ کہ من ۔۔۔ ز شاہِ مے آشام رانم سخن

امیر قزعن نے توران کے چغتہ قازانی سردار سلطان پر حملہ کیا۔ اس کی کامیاب بازگشت کے موقع پر دو شعر نقل کئے ہیں[7]۔ آخری شعر یہ ہے ؎

کہ دم جنبش از چرخ آرام یافت ۔۔۔ ز دادار پیروزگر کام یافت

[1] خطوط جلد دوم ۳۴۶ نظم ۱۲ [2] نثر ۲۵، نظم ۱۱۵ [3] نثر ۳۱۶ نظم ۱۲۷ [4] نثر ۳۴۵ نظم ۱۲۴ [5] نثر ۳۲۷، نظم ۱۵۷ [6] نثر ۳۳۸ نظم ۱۵۳ - یہ شعر قلمی نسخہ مہرِ نیمروز مملوکہ سید آغا حسین صاحب اسطرجاہی میں نہیں۔ یہی نسخہ غالب نے خود اسطرجاہ کو بھیجا تھا۔ [7] نثر ۳۲۹ نظم ۱۲۰

نصیر الدین ہمایوں کے حالات لکھنے شروع کئے تو "مغنی نامہ" کے ابتدائیہ اشعار تمہیداً لکھے ہیں[8] ؎

مغنی دگر زخمہ بر تار زن ۔۔۔ گل از نغمہ تر بدستار زن

جب آگرہ کے قریب آتشِ فتنہ و فساد بھڑکی تو اس کی سرکوبی کے لئے ہمایوں نے لشکر بھیجا اس موقع پر مثنوی کے تین شعروں کو استعمال کیا ہے۔ یہ شعر مناجات کی ضمن میں بیان کردہ حکایت سے متعلق ہیں[9] ؎

گزیں شہ سواراں عناں بر عناں ۔۔۔ ہمیں نیزہ داراں سناں بر سناں

جب ہمایوں ہندوستان سے بھاگ کر ایران پہنچا اور شاہ طہماسپ صفوی سے امداد کا طالب ہوا تو شاہ طہماسپ صفوی نے از راہِ مہماں نوازی ہمایوں کا شاندار استقبال کیا۔ اسی کی کیفیت میں مثنوی کی حکایت سے بارہ شعر نقل کر دئے[10] ؎

خود آہستہ رد بود در رہ ز پیش ۔۔۔ فرستاد فرماں بہ دستورِ خویش

کہ فرماں دہ ہر تا بہر گونہ بہر ۔۔۔ بہ بندند آئین شادی بہ شہر

سر سید احمد خاں پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس مثنوی کا ذکر کیا اور رائے قائم کی۔ ان کے بعد مولانا حالی نے "یادگارِ غالب" میں اس مثنوی پر اپنی رائے کا اظہار سرسری طور پر کیا۔ زیادہ تحقیق و جستجو سے کام نہ لیا۔ شعروں کی تعداد ۲۸۹ لکھی حالانکہ صحیح تعداد ۱۰۹۸ ہے۔ اس کو آخری زمانہ کی تصنیف قرار دیا جو سر سید کے بیان کے ذریعہ ۴۷-۵۴ء سے پہلے کی تصنیف خیال کی جاتی ہے۔ خود غالب نے بھی اس کو ایامِ شباب سے وابستہ بتایا ہے۔ اس لئے مولانا حالی کا بیان باور کرنے میں تامل ہے مگر مولانا حالی نے غالب کو بحیثیت مثنوی نگار بلند مرتبہ بتایا ہے[11] چنانچہ لکھتے ہیں[12] :-

"مرزا کا موازنہ نظیری و عرفی کے ساتھ صرف قصیدہ اور غزل میں ہو سکتا ہے۔ کیونکہ مثنوی میں نظیری محض صفر ہے۔ اس نے اس صنف کو چھوا تک نہیں عرفی نے بے شک چند مثنویاں لکھی ہیں مگر صاحبِ "آتشکدہ" نے ان میں سے ایک کی نسبت لکھا ہے کہ "بد نگفتہ است" اور باقی کی نسبت اس کا یہ قول ہے "بسیار بد گفتہ"۔ حکیم ہمام کا بیٹا حکیم ذوقی عرفی کی نسبت لکھتا ہے ؎

ثنولیش طرز و فصاحت نداشت ۔۔۔ کان نمک بود ملاحت نداشت

[8] نثر ۳۵۲ نظم ۱۴۷ [9] نثر ۳۵۶ نظم ۱۲۰ [10] نثر ۳۶۸ نظم ۱۲۰ [11] یادگارِ غالب ۳۳۲ [12] یادگارِ غالب ۲۲۸ - ۲۲۶

البتہ ظہوری کے "ساقی نامہ" نے ہندوستان میں بہت شہرت حاصل کی ہے مگر اس کا قصیدہ چنداں وزن نہیں رکھتا۔ بخلاف مرزا کے اس کو مثنوی پر بھی تقریباً اسی قدر قدرت حاصل ہے جیسی قصیدے اور غزل پر۔"[1]

آگے چل کر بطور نتیجہ تحریر فرمایا ہے:

"الغرض مرزا کی فارسی نظم و نثر کے متعلق ہماری رائے کا ماحصل یہ ہے کہ ان کا مرتبہ قصیدہ اور غزل میں عرفی و نظیری کے لگ بھگ اور ظہوری سے بڑھا ہوا۔ مثنوی میں ظہوری کے لگ بھگ اور عرفی و نظیری سے بالاتر ہے۔"[2]

مولانا حالی نے موازنہ صرف عرفی، نظیری اور ظہوری سے کیا ہے۔ کاش وہ فردوسی یا نظامی کی مثنویوں سے موازنہ کرتے۔ مرزا کی مثنوی "ابرِ گہربار" اس قابل ہے کہ بعض مقامات کا "شاہنامہ" اور "سکندرنامہ" سے مقابلہ کیا جاسکتا تھا اور غالب کے کمال اور بلند پروازی کا درجہ قائم کیا جا سکتا تھا۔

مولانا مہر نے "ابرِ گہربار" اور مثنوی گوئی پر کافی لکھا ہے۔ ایک جگہ غالب کے متعلق لکھتے ہیں:

"جو شخص قصائد میں عرفی کا ہمسر اور غزل میں نظیری کا ہم پلہ تھا جو مثنوی میں فارسی کے بہترین مثنوی نگاروں سے ٹکر کھاتا تھا۔"[3]

مولانا مہر نے مثنوی کے اشعار گیارہ سو سے زائد بتلائے ہیں۔[4] مولانا کو سہو ہوا۔ صحیح تعداد ۱۰۹۸ ہے جن کی تفصیل یہ ہے: حمد ۱۱۴۔ مناجات معہ حکایت ۲۲۴۔ نعت ۵۷۔ معراج ۲۸۰۔ منقبت ۱۲۸۔ مغنی نامہ ۱۴۰۔ ساقی نامہ ۱۵۵۔ کل تعداد = ۱۰۹۸۔

شیخ محمد اکرام نے "آثارِ غالب" میں مثنوی پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ مثنوی "ابرِ گہربار" کے عام تعارف کے بعد لکھا ہے:

"ساقی نامہ" میں انہوں نے بیچارے نظامی کا مذاق اڑایا ہے ..... لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا ساقی نامہ بہت پھیکا ہے۔ اور مناجات و معراج کے آخری حصہ میں شاعری کا جو بلند معیار انہوں نے قائم کیا تھا اسے وہ بالعموم نباہ نہیں سکے۔"[5]

ساقی نامہ ایسے زمانہ کی تصنیف ہے جب کہ غالب ہجومِ غم سے نڈھال ہو گئے تھے۔ ان کے قویٰ میں انحطاط آنے لگا تھا۔ جوانی ختم ہو رہی تھی۔ پیری کے آثار نمایاں تھے۔ لیکن ابھی ہمت باقی تھی چنانچہ اس کا اظہار ساقی نامہ میں کیا ہے ؎

دریغا کہ در روزِش گفتگوئے ۔۔۔ بہ پیری خود آرائی آورد روئے
بہ برنائیم روئے پیری سیاہ ۔۔۔ ز موبود بر فرقِ مشکیں کلاہ
کنوں نیست ظلِ ہمایم بسر ۔۔۔ بہ پیری فتادایں ہوایم بسر
ننالم ز پیری جوانم ہنوز ۔۔۔ ہنوزم بود طبع زور آزمائے

ایسی حالت میں اگر "ساقی نامہ" پھیکا ہو بھی تو تعجب کی کوئی بات نہیں۔ لیکن یہ مقام بھی بہت مشکل ہے کیونکہ یہ مثنوی کسی شاہ میخوار کے حالات میں نہیں لکھی جا رہی تھی بلکہ سید المرسلین کے غزوات نظم ہونے تھے اس لئے ساقی سے اس طرح کھل کر باتیں نہیں ہو سکتی تھیں جس طرح کسی اور مثنوی میں کی جاسکتی ہیں۔ یہاں ادب مانع ہے۔ غالب نے جو کچھ اور جس انداز میں کہا ہے وہ نہایت مناسب ہے۔ نظامی نے سکندر کے حالات لکھے ہیں۔ وہاں ہر طرح کی گنجائش ہے۔ کوئی امر مانع نہیں۔ شیخ محمد اکرام نے اس نکتہ کو ملحوظ نہ رکھا اور ساقی نامہ کو پھیکا بتا دیا ؎

بہ اقبالِ ایمان و نیروئے دیں ۔۔۔ سخن رانم از سیدالمرسلیں

بتقاضائے ادب و احترام جو لکھا ہے خوب لکھا ہے۔[6]

آگے چل کر شیخ محمد اکرام نے مثنوی نامکمل رہنے کی دو وجہیں بیان کی ہیں۔ ایک مضمون کی مشکلات دوسرے واقعہ غدر کے اثرات۔[7] پہلی وجہ ایک حد تک قابلِ تسلیم ہے کیونکہ غالب نے خود مثنوی کے دیباچہ میں لکھا ہے:

"نیافتن توفیق داستاں طرازی سببے دارد عام کہ در قلمرو ہند از شہری و روستائی و دانا و نادان و پیر و جواں کم کسے باشد کہ آں را ندانند"[8]

مضمون کی مشکلات ہر ایک پر نمایاں ہیں۔ غالب تاریخ سے بالکل

---

[1] یادگارِ غالب ۲۲۰ - ۲۲۱ [2] یادگارِ غالب ۲۲۹ [3] غالب از مہر ۲۹۱ [4] غالب ۲۹۷ [5] آثارِ غالب ۱۰۳-۱۰۲

[6] مضمون نگار کی یہ رائے یقیناً صحیح ہے۔ غالب کے ساقی نامہ کے لئے کسی اعتذار کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے ساقی نامہ کا جس انداز سے تصور کیا ہے وہ دوسروں کے ساقی ناموں سے صریحاً ممیز ہے اور اسی کے مطابق اس کا حق بھی ادا کیا گیا ہے۔ خالص ساقی نامہ کے رندانہ اشعار جتنے بھی ہیں نہایت خوب اور برجستہ ہیں۔ درحقیقت نہ صرف غالب کے ساقی نامہ بلکہ ساری مثنوی "ابرِ گہربار" کے بسیط مطالعہ کی ضرورت ہے تاکہ ہم غالب کے "نقش ہائے رنگ رنگ" کا اندازہ کر سکیں۔ (مدیر)

[7] آثارِ غالب ۱۰۳ [8] دیباچہ مثنوی "ابرِ گہربار"۔

نابلد تھے۔ واقعات کی صحت اور حقیقت کا استنباط ان کے بس کی بات نہ تھی۔ اسلامی تاریخ میں بعض واقعات ایسے ہیں کہ جن کا بیان کرنا مشکل کام ہے کیونکہ ان میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان اختلافی مسائل میں پڑکر غالب الجھنا نہیں چاہتے تھے۔ محبت اہلبیتؑ ان کی رگ رگ میں سمائی ہوئی تھی اور اس پہ ان کو ناز بھی تھا۔ چنانچہ مثنوی میں بھی حضرت علی علیہ السلام کا ذکر گہری عقیدت سے کیا ہے اور کسی کا ذکر کرنا گوارا بھی نہیں کیا۔ اگر تاریخی واقعات میں بھی وہ ان حقائق کو بیان کرتے جو اکثر مورخ نظرانداز کر جاتے ہیں یا پردہ پوشی سے کام لیتے ہیں تو یقیناً ایک گروہ کثیر ان کا مخالف ہو جاتا۔ غالب تھے صلح جو۔ وہ احباب و عوام سے اس سلسلہ میں مخالفت مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ مولانا شبلی نے نظامی کے "سکندرنامہ" لکھنے کا سبب یہی قرار دیا ہے کہ ایرانی تاریخ فردوسی لکھ چکا تھا۔ غزوات نبوی میں شاعری کی گنجائش کم تھی۔ کیونکہ اصلیت سے بال برابر بھی ہٹتے تو مذہبی عدالت میں مجرم قرار پاتے[1]۔ مرزا غالب کے سامنے بھی یہی دشوار مراحل تھے جنہوں نے اس مثنوی کی تکمیل سے باز رکھا ہوگا۔

دوسری وجہ قابل قبول نہیں کہ غالب نے مثنوی لکھنے کا ارادہ قید ہونے کی وجہ سے ترک کیا ہوگا۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، غالب یہ ارادہ ۱۸۴۵ء کے بعد ترک کر چکے تھے۔

مولانا عرشی نے راقم کے نام ایک خط میں تحریر فرمایا ہے کہ مثنوی کلیات مطبوعہ ۱۸۶۳ء سے پہلے علیحدہ بھی طبع ہوئی تھی۔ ابھی تک اس کے متعلق مزید معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ اگر یہ طباعت عمل میں آئی ہوگی تو ۱۸۴۵ء سے ۱۸۵۷ء تک ہوئی ہوگی۔

غالب اپنے کلام کے خود مرتبہ شناس تھے۔ انہوں نے ہمیشہ زمانہ کی قدرناشناسی کی شکایت کی ہے۔ غزل و قصیدہ کے سلسلہ میں وہ خود کو شیخ علی حزیں، طالب آملی، عرفی، ظہوری اور نظیری کے ہم پلہ خیال کرتے تھے چنانچہ کلیات کی تقریظ میں اس ہمسری کو عجب انداز میں بیان کیا ہے:

"تا بہ دراں ہنگام پیش خراماں را بہ خجستگی اندیش ہمقدمی کہ در من یافتند مہر بجنبید و دل از آزرم بدرد آمد، اندوہ آوارگیہائے من خوردند۔ آموزگارانہ درمن نگرستند۔ شیخ علی حزیں بخندہ زیرلبی بیراہہ روی ہائے من بنادر نظر جلوہ گر ساخت و زہر نگاہ طالب آملی و برق چشم عرفی شیرازی مادۂ آں ہرزہ جنبش ہائے ناروا در پائے رہ پیمائے من سوخت، ظہوری بسرگرمی گیرائی نفس حرزے بباز و وتوشہ بر کمرم بست و نظیری لاابالی خرام بہ ہنجار خاصہ خودم بچالش آورد۔ اکنوں بہ یمن فرہ پرورش آموختگی ایں گروہ فرشتہ شکوہ، کلک رقاص من بخرامش تدرو است و بہ نوا موسیقار، بجلوہ طاؤس است و بہ پرواز عنقا[1]"

مثنوی "ابر گہربار" کے دیباچہ میں فردوسی و نظامی کی ہمسری کو اسی نوعیت سے بیان کیا ہے۔ پہلے قصیدہ و غزل کے سلسلہ میں عرفی و نظیری وغیرہ کا ذکر کرکے مثنوی کے متعلق لکھا ہے:

"بسیج بستن مثنوی دلنشیں افتاد۔ فردوسی طوسی را بہ رہنمائی و نظامی گنجوی را بہ نیرو فزائی گماشتند[2]"

اگر غالب کی یہ مثنوی مکمل ہو جاتی تو یقیناً "شاہنامہ" اور "سکندرنامہ" کے ہم پایہ ہوتی۔ اب بھی بعض مقامات ایسے ہیں کہ قدیم شعراء کا کلام ان کا حریف نہیں بن سکتا۔ مناجات کا انوکھا اور اچھوتا انداز بیان اس کا بیّن ثبوت ہے جس میں تصور جنت کے متعلق عجیب و غریب باتیں بیان کی ہیں۔ خرد و دانش کی ستائش میں ان کا مدمقابل کوئی نہیں۔ مقابلہ و موازنہ کے لئے حمد، نعت، منقبت، "مغنی نامہ" و "ساقی نامہ" کے علاوہ اور بھی عنوانات قائم کئے جا سکتے ہیں مثلاً لشکرکشی، استقبال بادشاہ، آرائش شہر، بیان نامرادی و ناکامی، حسرت و یاس جوانی و پیری، خرد و دانش وغیرہ۔

حمد میں وہ بہت بلندی پہ پہنچے ہیں۔ مناجات کے انداز کا مقابلہ ہو نہیں سکتا۔ نعت میں معراج کا بیان منفرد ہے۔ دیباچہ میں مناجات و معراج کے متعلق خود لکھتے ہیں:

"و ترشحہ در مناجات بہ شیوۂ ابداع بداں ساں رندانہ و قلندرانہ سخن سرودہ شد کہ مردشان بہشتی را لب از شور ہا یا ہوئے تبخالہ زود و باز معراج عروج فکر آں پایہ یافت کہ سخن از جائیکہ معرفت بدانجا رسید[3]"

غالب نے جتنا کچھ لکھا ہے اس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی مثنوی گو سے پیچھے نہیں رہے اور یہ بہت بڑا کمال ہے کیونکہ ایسے باکمال بہت کم ہوتے ہیں جو ہر صنف سخن میں یکساں دستگاہ رکھتے ہوں۔

۱؎ شعر العجم جلد اول ۲۵۹

۱؎ کلیات نظم ۵۱۰ ۲؎ نثر ۶۸ ۳؎ دیباچہ مثنوی ۱ ۴؎ دیباچہ مثنوی ۲۔

غالب کا درباری اعزاز اور منصب

(چند نئی اطلاعات کی روشنی میں)

اکبر علی خاں

غالب نے اپنی معاشرتی سربلندی کے جذبے کو تسکین دینے کے لئے اپنا نسب نامہ تور سے جا ملایا ہے اور زادشم وا فراسیاب کی بات کرتے ہوئے انہیں ہمیشہ خوشی محسوس ہوتی ہے۔ جب کبھی خاندانی شجرے کا ذکر آجاتا ہے تو خواہ مخواہ ان کا جی تفصیلات میں جانے کو چاہتا ہے۔ انہوں نے اپنے آپ کو تُرکانِ تُوم سے ہم پیوند کرنے کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور اس حکایت کو دراز تر کرکے لذت کام و دہن کا اہتمام کیا ہے۔ سپہ گری کو سو پشت سے پیشۂ آبا بتاتے ہوئے جو فخریہ لہجہ وہ اختیار کرتے ہیں اس کے دور رس اثرات پڑھنے والے سے چھپے نہیں رہتے۔

"درفشِ کاویانی"، "دستنبو"، اور ملن کے لباس کا ایک جزو کلاہ پاپاخ یہ سب کچھ ایرانی النسل ہندوستانی کی شخصیت کے اظہار کی مختلف راہیں تھیں جو شعوری اور غیر شعوری طور پر تمام عمر نمایاں ہوتی رہیں۔ ان کی انفرادیت نے کوئی مقام ایسا نہ چھوڑا جہاں اپنے آپ کو خوش اسلوبی سے پیش نہ کر دیا ہو یہی وجہ ہے کہ وہ زمانے کے ایک بہت مشہور آدمی رہے ہیں۔ انہوں نے ایک خاص تہذیب کی نمائندگی بڑی خوبصورتی سے کی ہے جس میں لاکھ زوال کے نشانات ہوں مگر مٹتے مٹتے بھی ایک آن بان تھی۔

یہ حقیقت ہے کہ غالب کا بچپن اور جوانی کا بھی ایک حصہ آسودہ و خوش حال رہا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ انہوں نے جوانی تک دادِ عیش دی اور خوب رنگ رلیاں منائیں۔ چوسر بازی اور شراب نوشی کی عادتیں انہیں ابتدا ہی سے تھیں جو اس خیال کی مزید تائید کرتی ہیں۔ باپ اور چچا کے انتقال کے بعد وہ اپنی ننہال میں رہے جو کھاتے پیتے لوگ تھے۔ اس لئے ان کی ناز برداری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی گئی۔ انہوں نے آغاز میں شاعری بھی جس انداز کی کی ہے وہ ذہنی اطمینان کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ معمے اور پہیلیاں بجھوانا اور چیستاں بنانا وقت کی افراط اور دل و دماغ کے یک گونہ سکون پر دلالت کرتا ہے۔

غالب تمام عمر بہکی چال چلتے رہے لیکن انہوں نے اپنے آپ کو کبھی بے طرح مست نہیں بنایا۔ نہ وہ کبھی اتنے نیچے گئے کہ پھر ابھرنا مشکل ہو جائے۔ وہ سدھ بدھ سے بے خبر ہو کر کبھی نہیں رہے یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی میں جذباتیت کا گمان بھی نہیں ہوتا۔ وہ دل کی لگی میں کبھی نہ گریباں چاک پھرے اور نہ آوارہ و رسوا سر بازار ہوئے۔ یہاں شاید انہیں ان کی حسِ برتری بچا لے گئی جس کا ذکر انہوں نے یوں کیا ہے "مغل بچے جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔" اپنی انگشت نما موزونی اور چمپئی رنگ پر بھی وہ اپنے آپ ہی مٹے ہوئے تھے۔

غالب کی اس انفرادیت نے اُن میں جو انانیت پیدا کی تھی وہ بلند اور مقدس نہیں کہی جا سکتی۔ اُس سے نہ تو مزاج کو کوئی نیا رخ ملا اور نہ غالب کو قرار۔ اگر اسی ایک نکتہ کو سامنے رکھا جائے تو یہ نتیجہ نکال لینا مشکل نہ ہوگا کہ اپنے نام و نسب کی برتری و بلندی کی داستانیں سناتے ہوئے وہ ایک کرب اور تکلیف میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ جوانی کی پہلی منزل گزر جانے کے بعد جب وہ اپنے خاندان کے ذمہ دار آپ ہو گئے اور اُن کے اوقات تنگ اور آلام شدید ہوتے گئے تو اُن کے اُن مردہ احساسات نے کتنی اذیتیں پہنچائیں۔ ماضی کے تابناک تصور اور مستقبل کے ہولناک خوف نے اُنھیں عجیب کشمکش میں الجھائے رکھا جس سے الگ ہو جانا اُن کے بس کی بات کبھی نہیں تھی۔ اس احساس کے ریشے اُن کے دماغ میں اس طرح پا گزیں ہو گئے تھے کہ اُن کو جدا کرنے کی ہر کوشش کے معنی یہ تھے کہ غالب کے ذہن کے پردوں کو ایک ایک کرکے آسودگی سے صاف کیا جائے جو اس لئے

ممکن نہیں تھا کہ مرتبہ میں محبوب تصورات، خوبصورت تمنائیں اور حسین آرزوئیں چراغانِ دوالی کی طرح صف بصف روشن تھیں جن کے بجھائے بغیر علاج ممکن نہیں تھا۔ لیکن غالب سے یہ روشنی چھین لی جاتی تو تسکین کا ایک موہوم آسرا بھی ٹوٹ جاتا۔

انہیں جذبات و عوامل کے تحت دولت انگلشیہ سے غالب کے تعلقات پر غور کیجئے۔ غالب کسی قیمت پر بھی اس کے لئے راضی نہ تھے کہ انگریزی حکومت انھیں بے تعلق سمجھے۔ انگریزوں سے اُن کے تعلقات کی ابتدا اُن کے چچا، مرزا نصر اللہ بیگ خاں کے ذریعے ہوتی ہے۔ وہ مرہٹوں کے زمانے میں اکبر آباد کے صوبے دار تھے۔ لارڈ لیک نے جب اس علاقے پر چڑھائی کی تو نصر اللہ بیگ خاں نے بغیر کسی مزاحمت کے اپنی عملداری کو حملہ آور کے سپرد کر دیا۔ اس حسن سلوک کے صلے میں لارڈ لیک نے انھیں چار سو سوار کا رسالدار بنا دیا اور سو روپے تنخواہ مقرر کی گئی۔ نصر اللہ بیگ خاں دلیر آدمی تھے۔ انھوں نے اتنے ہی پر قناعت نہیں کی اور سونک سونسا کے دو زرخیز پرگنے ریاست ہلکر کے سپاہیوں سے ہتھیا لئے، جو تاحیات ان کے قبضے میں رہے اور انگریزوں نے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا۔

غالب اپنے باپ کے مرنے کے بعد چچا کی زیر سرپرستی آ گئے تھے۔ لیکن ۱۸۰۶ء میں اُن کے چچا کا انتقال ہو گیا تو لارڈ لیک نے اُن کی جاگیر واپس لے لی رسالہ توڑ دیا اور وفادارانہ سلوک کے بدلے میں متعلقین کے لئے ۵ ہزار روپے سالانہ کی پنشن مقرر کر دی۔ اس رقم میں سے غالب کو ساڑھے سات سو روپے سالانہ یا ساڑھے ۶۲ روپے ماہوار ملنے کا حکم ہوا۔ غالب کی خاندانی فارغ البالی کے مقابلے میں جو انہیں ننہیال اور ددھیال دونوں طرف سے میسر تھی یہ بڑی معمولی رقم ہے۔ لیکن پہلی جنگ آزادی میں انگریزوں نے جو رستخیز بیجا مچا رکھی تھی اُس کی زد میں آ کر غالب کی یہ موروثی پنشن بھی ختم کر دی گئی۔

غالب فطرۃً حکومت دوست تھے۔ یا یوں کہئے اُن کی ضرورتوں نے اُن کو امن پسند بنا دیا تھا۔ انھوں نے ہر موقع پر اسی میں عافیت سمجھی کہ انگریزوں کا ساتھ دیا جائے۔ اسی حکومت دوستی کا صلہ تھا کہ اُن سے اس ہنگامۂ آتشیں کے فرو ہو جانے کے بعد کوئی باز پرس نہ کی گئی لیکن جب انھوں نے پنشن کا مطالبہ کیا تو یہ جواب دیا گیا کہ:

"ایام غدر میں تم باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے۔ اب گورنمنٹ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟" (اردوئے معلیٰ۔ بنام بیخبر ۲۱) اب کہ اُن ہزاروں روپے کی ادائیگی کا سوال تھا جو وہ اپنی امیرانہ طبیعت کی تسکین کے لئے نہیں، زندگی گزارنے کو قرض لیتے رہے تھے، اور رام پور کی آمدنی کے سوا کوئی ذریعۂ معاش نہیں رہا تھا ایسے موقع پر انگریزی حکومت کی طرف سے یہ اطلاع پا کر اُن کے ہوش و حواس گم ہو گئے۔ انہوں نے اپنے آپ کو بے قصور اور بے جرم ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مدلحان حکومت انگلیشیہ میں اپنا نام درج کرا کے وزرائے ملکۂ دارا دربان کے دو سارٹیفکٹ حاصل کئے۔ رام پور سے اُن کے شاگرد، نواب یوسف علی خاں بہادر ناظم بلاتے رہے تاکہ اُن کے دکھ کا کچھ ازالہ ہو سکے لیکن غالب کے لئے معاملے کو ناتمام چھوڑ کر دلی کے باہر جانا مناسب نہیں تھا۔ اور وہ اسی لئے اپنی جگہ سے نہ ہلے اور بن کھائے جینے کی مشق کرتے رہے۔ اس معاملے نے خاصا طول کھینچا۔ ۸ نومبر ۱۸۵۹ء کو اُنہوں نے ناظم کو لکھا ہے:

"اب تک میں اپنے آپ کو یہ بھی نہیں سمجھا کہ بیگناہ ہوں یا گناہ گار مقبول ہوں یا مردود۔ مانا کہ کوئی خیر خواہی نہیں کی جو شئے انعام کا مستحق ہوں لیکن کوئی بیوفائی بھی سرزد نہیں ہوئی جو دستور قدیم کو برہم کرے۔ بہرحال راہ چارہ مسدود اور دکھ موجود"۔ (مکاتیب غالب۔ متن ص ۱۵)

غالب کی ان اطلاعات کا مقصد یہ تھا کہ وہ نواب صاحب کو اپنا سفارشی بنائیں، اس لئے کہ ۱۸۵۷ء کی وفاداری سے نواب صاحب کا انگریز حکام میں خاصا رسوخ اور اثر تھا۔ نواب صاحب کے دل میں بھی غالب کے لئے بڑی قدر و منزلت تھی جس کا ہلکا سا اندازہ اُن عطیات سے ہو سکتا ہے جو غالب کو وقتاً فوقتاً پہنچتے رہتے تھے وہ مختلف مواقع پر غالب کی برأت اور "نیک چلنی" کا افسران بالا کو یقین دلاتے رہے اور اُن مدارج کے لئے جو قدیم سے غالب کو حاصل تھے کوشاں رہے تا آں کہ اُن کی سفارش بارآور ہوئی۔

پنشنداروں کا نقشہ جن میں غالب کا نام شامل تھا وصول پا کر غالب نے نواب صاحب کو لکھا:

"عالم دو ہیں ایک عالم شہادت ایک عالم غیب جس طرح عالم شہادت میں آپ میری دستگیری کر رہے ہیں عالم غیب میں آپ کا اقبال مجھ کو مدد پہنچا رہا ہے ..." (مکاتیب۔ متن ص ۱۶)

اور اس کے بعد ۴ مئی ۱۸۶۰ء کو پنشن کی واجب الادا رقم وصول کر لی۔ لیکن ابھی غالب معاملے کے صرف ایک حصے (پنشن) کو سلجھا پائے تھے۔ دربار میں باریابی اور خلعت کے اجرا کا سوال باقی تھا۔ درباری حیثیت کے بارے میں غالب کے بیانات مختلف ہیں۔ مناسب ہو اگر یہاں ہم غالب کی متعلقہ تحریروں کے اقتباسات سامنے رکھیں۔ انھوں نے اپنے محسن نواب یوسف علی خاں ناظم ہی کو ایک بار لکھا تھا:

"میں انگریز سرکار میں علاقہ ریاست دودمانی کا رکھتا ہوں معاش اگرچہ قلیل ہے مگر عزت زیادہ پاتا ہوں۔ گورنمنٹ کے دربار میں دسواں نمبر اور سات پارچے اور جیغہ، سرپیچ مالائے مروارید خلعت مقرر ہے"۔ (مکاتیب۔ متن ص ۱۵)

۱۸۵۷ء کی جدوجہد آزادی سے پہلے دہلی میں صرف گورنر جنرل

کی آمد پر دربار ہوتا تھا۔ ۱۸۲۸ء میں غالب کو پہلی بار دربار میں حاضری کی اجازت اور داہنی صف میں دسویں نمبر کی نشست کا اعزاز دیا گیا۔ یہ دربار لارڈ بنٹنک نے کیا تھا۔ لارڈ الن برا کے عہد میں خلعت ہفت پارچہ اور سہ رقم جواہر فرید فیہ قرار دی گئی۔ ۱۸۴۵ء میں لارڈ ہارڈنگ کے دربار میں بھی غالب شریک ہوئے لارڈ ڈلہوزی ۱۸۴۸ء میں بغیر دربار کے واپس چلے گئے۔ غالب نے ۱۸۵۶ء میں لارڈ کیننگ گورنر جنرل کے ذریعے ملکہ وکٹوریہ کی خدمت میں ایک مدحیہ قصیدہ پیش کیا اور یہ درخواست بھی کی کہ اُنھیں خطاب عطا کیا جائے، نیز پنشن کی رقم میں اور خلعت کے اعزاز میں اضافہ کیا جائے۔ لیکن اضافہ درکنار، ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے اُن کی موجودہ پنشن اور خلعت دونوں کو یک قلم ختم کر دیا۔ جب ۱۸۵۹ء میں لارڈ کیننگ نے میرٹھ میں انعقاد دربار کا اعلان کیا تو غالب کو خلعت فاخرہ پانے کی کوئی صورت نظر نہیں آئی اس لئے کہ وہ بقول خود نہ مقبول تھے نہ مردود نہ مخبر تھے نہ مفسد، جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ حاکم نے اُن کا نام دربار کے فرد میں نہیں لکھا ہے تو اس کے مرثیے کی سوچنے لگے۔ یکم جنوری ۱۸۶۰ء کو مجروح کو لکھا ہے :

" پنجشنبہ ۲۹ ر دسمبر کو پہر دن چڑھے لارڈ صاحب یہاں پہنچے کابلی دروازے کی فصیل کے تلے ڈیرے ہوئے۔ اُس وقت توپوں کی آواز سنتے ہی میں سوار ہو گیا۔ میر منشی سے ملا، اُس کے خیمے میں بیٹھ کر صاحب سکر تر کو خبر کروائی۔ جواب آیا کہ فرصت نہیں۔ یہ جواب سن کر نومیدی کی پوٹ باندھ کر لے آیا۔" (خطوط : ۱۔ ۲۰۶)۔

اس کے بعد وہ مختلف اشخاص کو بتاتے رہے کہ حکام متعلقہ نے انھیں باغیوں سے اخلاص رکھنے والا جانا ہے، حالانکہ یہ اخلاص مظنہ، محض ہے۔ چنانچہ انھوں نے حکومت سے تحقیقات کی درخواست بھی کی تاکہ ان کی صفائی اور بے گناہی ثابت ہو جائے۔ لیکن یہاں بھی ناکامی نے پیچھا نہ چھوڑا اور غالب کو یہ جواب مل گیا کہ تحقیقات نہیں کی جائے گی۔ اس طرح غالب اس نتیجہ پر پہنچے کہ دربار و خلعت بند ہو گئے اور اب مدت العمر کی مایوسی ان کے حصے میں آئی۔

لیکن وہ ایسی جلدی ہار ماننے والے نہیں تھے۔ قصائد اور درخواستوں کے پیش کرنے میں انہوں نے کبھی کمی نہ کی۔ جنوری ۱۸۶۲ء میں لارڈ الگن کے گورنر جنرل مقرر ہونے پر انھوں نے پھر یہ درخواست دی کہ میری پنشن کا اجرا میری بے گناہی کا ثبوت ہے۔ پھر مجھ سے دربار کا حق کیوں چھین لیا گیا ہے انھیں اپنے اقربائے بے آزرم سے شکوہ تو تھا ہی۔ اس خلعت اور پنشن کے قضیے میں حاکمان ناانصاف سے داد چاہتے ہوئے بھی وہ چیخ چیخ اٹھے لیکن ۱۸۶۳ء سے حالات نے ایک نیا رُخ اختیار کیا اور توقعات کی نئی کرنیں طلوع ہوئیں۔

فروری ۱۸۶۳ء میں گورنر پنجاب نے دہلی میں دربار کیا، تو انھوں نے اس کے بارے میں تفتہ کو ۴ ر مارچ ۱۸۶۳ء کے مکتوب میں لکھا :

" اب جو یہاں لفٹنٹ گورنر جنرل آئے میں جانتا تھا کہ یہ بھی مجھ سے نہ ملیں گے۔ کل انھوں نے مجھ کو بلا بھیجا۔ بہت سی عنایت فرمائی اور فرمایا کہ لارڈ صاحب دلی میں دربار نہ کریں گے۔ میرٹھ ہوتے ہوئے اور میرٹھ میں اُن اضلاع کے علاقہ داروں اور مالگزاروں کا دربار کرتے ہوئے انبالے جائیں گے دلی کے لوگوں کا دربار وہاں ہوگا۔ تم بھی انبالے جاؤ۔ شریک دربار ہو کر خلعت معمولی لے آؤ۔

بھائی کیا کہوں کہ میرے دل پر کیا گزری گویا مردہ جی اٹھا۔ نذر معمول میرا قصیدہ ہے۔ ادھر قصیدے کی فکر ادھر روپے کی تدبیر حواس ٹھکانے نہیں ....." (اردوئے معلیٰ ص۱۱)

اسی واقعے کا بیجبر کے خط (اردوئے معلیٰ ص۲۸) میں بھی تذکرہ کیا گیا ہے :

" اواخر ماہ گزشتہ یعنی فروری ۱۸۶۳ء میں نواب لفٹنٹ گورنر پنجاب دلی آئے اہالی شہر سب ڈپٹی کمشنر بہادر، صاحب کمشنر بہادر کے پاس دوڑے اور اپنا نام لکھوا لائے۔ میں تو بیگانۂ محض اور مطرودِ حکام تھا جگہ سے نہ ہلا کسی سے نہ ملا دربار ہوا ہر ایک کامگار ہوا۔ شنبہ ۲۸ ر فروری کو آزادانہ منشی من پھول سنگھ صاحب کے خیمے میں چلا گیا۔ اپنے نام کا لکٹ صاحب سکر تر بہادر کے پاس بھیجا مہربان پاکر نواب صاحب کی ملازمت کی استدعا کی۔ وہ بھی حاصل ہوئی۔ حاکم جلیل القدر کی وہ عنایتیں دیکھیں جو میرے تصور میں بھی نہ تھیں۔

جملہ معترضہ: میر منشی لفٹنٹ گورنری سے سابقہ تعارف نہ تھا وہ بطریق حسن طلب میرے خواہاں ہوئے تو میں گیا۔ جب حکام بلا مجرد استدعا مجھ سے بے تکلف ملے تو میں قیاس کر سکتا ہوں کہ میر منشی کی طرف سے حسن طلب بایمائے حکام ہوگا وللرحمٰن الطاف خفیہ

بقیہ روداد یہ ہے کہ دوشنبہ دوم مارچ کو سواد شہر مخیم خیام گورنری ہوا۔ آخری روز میں اپنے شفیق قدیم جناب مولوی اظہار حسین صاحب بہادر کے پاس گیا اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ تمہارا دربار و خلعت بدستور بحال و برقرار ہے۔ متحیرانہ پوچھا کہ حضرت کیونکر؟ حضرت نے کہا

کہ حاکم نے ولایت سے آکر تمہارے علاقے کے سب کاغذات انگریزی و فارسی دیکھے اور باجلاس کونسل حکم لکھوایا کہ اسد اللہ خاں کا دربار اور نمبر بدستور بحال و برقرار رہے۔ میں نے پوچھا کہ حضرت یہ امر کس اصل پر متفرع ہوا ہے ـــ؟ فرمایا کہ ہم کو کچھ نہیں معلوم بس اتنا جانتے ہیں کہ یہ حکم دفتر میں لکھوا کہ چودہ دن یا پندرہ دن ادھر کو روانہ ہوئے ہیں۔ میں نے کہا سبحان اللہ کارساز ما بفکر کار ما۔ شنبہ ۳ مارچ کو ۱۲ بجے نواب لفٹنٹ گورنر بہادر نے مجھ کو بلا کر خلعت عطا فرمایا اور ارشاد ہوا کہ لارڈ صاحب کے یہاں کا دربار اور خلعت پاؤ گے۔ عرض کیا گیا۔ حضور کے قدم دیکھے خلعت پایا لارڈ صاحب بہادر کا حکم سن لیا نہال ہو گیا۔ اب انبالے کہاں جاؤں جیتا رہا تو اور دربار میں کامیاب ہو رہوں گا۔"

(اردوئے معلّی ــ ۲۸۰)

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ کو سکرتر صاحب کے دفتر میں بلایا نہ گیا تھا، بلکہ یہ از خود گئے تھے۔ وہاں جا کر سکرتر صاحب کے پاس اپنا کارڈ بھیجا اور جب انھوں نے طلب کیا تو ملاقات کی۔ بہر حال اس موقع پر غالبؔ انبالے نہیں جا سکے اور اس مبارک تقریب میں شریک نہ ہو سکے جس کی وہ مدت سے آس لگائے بیٹھے تھے۔ ۲۷ مارچ ۱۸۶۳ء کو میر سرفراز حسین کو لکھا ہے:

"رجب کے مہینے میں سیدھے ہاتھ پر ایک پھنسی ہوئی، پھنسی پھوڑا ہو گئی، پھوڑا پھوٹ کر زخم بنا، زخم بگڑ کر غار ہو گیا۔ اب بقدر یک کف دست وہ گوشت مردار ہو گیا۔ انبالے نہ جانے کی بھی یہی وجہ ہوئی"۔ (اردوئے معلی ص۱۰۲)

اسی کے بارے میں ۳ مئی کے خط میں شیو نرائن کو لکھا:

"..... اس پھوڑے کا بُرا ہو انبالے نہ جا سکا"

(اردوئے معلی ۳۸۲)

تفتہ کو یہی اطلاع ان الفاظ میں دی ہے:

"نواب صاحب، ہم نے لفٹنٹ گورنر کی ملازمت اور خلعت پر قناعت کر کے انبالے جانا موقوف کیا اور بڑے گورنر کا دربار اور خلعت اور وقت پر موقوف رکھا۔ بیمار ہوں ہاتھ پر ایک زخم کیا غار ہو گیا ہے دیکھئے انجام کار کیا ہوتا ہے۔ (خطوط، ۱، ۸۰)

اس کے علاوہ اخراجات سفر کا برداشت کرنا بھی غالبؔ کے لئے آسان نہ تھا اور شاید اسی لئے عرصۂ دراز کی اس آرزو کے بر آنے پر بھی دربار میں شریک نہ ہو سکے۔ دل کی اس کھٹک کو نواب فردوس مکاں کے نام مکتوب مورخہ ۴ اگست ۱۸۶۳ء میں ظاہر کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۶۳ء میں غالبؔ کا خلعت دوبارہ جاری ہو گیا تھا اور انبالے کے دربار میں وہ اپنی مجبوریوں کی وجہ سے نہ جا سکے۔

یہاں چند باتیں غور طلب ہیں۔ غالبؔ کا کہنا ہے کہ جب وہ کسی دربار میں شریک ہوتے تھے تو نقد رقم کی جگہ بطور نذر قصیدہ یا مدحیہ قطعہ یا کوئی نظم گزرانتے تھے اور انہیں دربار کی سیدھی صف میں دسویں نشست، سات پارچہ اور تین رقم جواہر خلعت ملتا تھا۔ غالبؔ کے اپنے الفاظ ایک بار پھر سامنے رکھئے:

"نذر معمولی میرا قصیدہ ہے" (مکتوب بنام تفتہ۔ اردوئے معلی ص۱۱۱)

"دربار میں سیدھی صف میں دسواں نمبر اور سات پارچہ اور تین رقم جواہر خلعت پاتا تھا....." (مکتوب بنام قدر بلگرامی۔ خطوط ۱، ۱۹۴)

لیکن سرکاری اندراجات میں نہ یہ نذر ہے جو غالبؔ نے بیان کی اور نہ یہ خلعت ہے جس کے غالبؔ دعویدار ہیں۔ ذخیرۂ کتب ریاست لوہارو ـــ (موجودہ رام پور رضا لائبریری) میں ایک ایسا مجموعہ محفوظ ہے جس میں دو درباروں کے دستور العمل اور چند متعلقہ فہرستیں وغیرہ شامل ہیں۔ ان مشمولات کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ "دستور العمل عطائے اسٹار آف انڈیا بروسا ہند" ـــ ۴ صفحے مطبوعہ مطبع پنجابی لاہور۔

۲۔ دستور العمل دربار خاص نواب مستطاب معلی القاب وایسرائے و گورنر جنرل بہادر کشور ہند[1] جو بمقام لاہور بروز شنبہ ۱۵ اکتوبر ۱۸۶۴ء کو منعقد ہوگا" ـــ ۴ صفحے از طرف سی یو ایچیسن انڈر سکرتری گورنمنٹ ہند شملہ ۲۲ ستمبر ۱۸۶۴ء مطبوعہ کوہ نور

۳۔ "فہرست روسا جو دربار خاص نواب وائسرائے و گورنر جنرل بہادر کشور ہند میں باریاب ہوں گے" ـــ ۲ صفحے سی یو ایچیسن 'انڈر سکرتری گورنمنٹ ہند' مطبوعہ کوہ نور لاہور۔

۴۔ پروگرام یعنی دستور العمل دربار عام نواب صاحب مستطاب معلی القاب وائسرائے و گورنر جنرل کشور ہند جو بتاریخ ۱۸ اکتوبر ۱۸۶۴ء

---

[1] یہاں لارڈ لارنس (JOHN LAIRD MAIR LAWRENCE) مراد ہیں۔ ۱۲ جنوری ۱۸۶۴ء سے ۱۲ جنوری ۱۸۶۹ء تک اس عہدے پر فائز رہے: ڈکشنری آف انڈین بیوگرافی" مصنفہ بک لینڈ صفحہ ۲۴۔

یوم سہ شنبہ بمقام لاہور منعقد ہوگا"۔ ۳ صفحے، دستخط سی یو ایچیسن انڈر سکرٹری گورنمنٹ ہند مقام شملہ ۲۳ ستمبر ۱۸۶۴ء

۵۔ "فہرست نمبروار رؤسا و عمائد پنجاب و مضافات پنجاب جو کہ کوہستان شملہ جہ دربار عام نواب مستطاب نائب السلطنت و گورنر جنرل بہادر کشور ہند میں باریاب ہوں گے"۔ ۲۶ صفحے، مطبوعہ مطبع کوہ نور لاہور۔

۶۔ "نمبر ۹۹۵ مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۸۶۶ء دربار نواب لفٹنٹ گورنر بہادر ممالک پنجاب [1] وغیرہ معسکر دہلی واقع ۱۷ دسمبر ۱۸۶۶ء"۔ صفحے

مشمولہ نمبر ۵ کے صفحہ ۳۴ پر مندرجہ ذیل تفصیل غالب کے بارے میں ملتی ہے:

قسمت	نمبر	تعداد ہمراہیاں	نام	نذرانہ	خلعت
دہلی	۵۵۸	۸	مرزا نوشہ	صـہ	صحـہ

اس طرح یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ دربار میں غالب ۵۵۸ نمبر کی نشست اور ۵۰ روپے کا خلعت پاتے تھے اور نذر میں ۵۰ روپے گزارتے تھے۔

ان اطلاعات کی موجودگی میں غالب کا یہ دعویٰ کہ وہ نذر معمولی قصیدہ پیش کیا کرتے تھے اور اُن سے دام و درم کی صورت میں کچھ نہیں لیا جاتا تھا۔ مشکوک ہو جاتا ہے یہ بات بھی قابل قبول نہیں رہتی کہ اُن کی دربار کی نشست سیدھی صف کے دسویں نمبر میں تھی۔ غالب نے میکلوڈ بہادر لفٹنٹ گورنر پنجاب کے لئے ایک قصیدے میں شکایتاً یہ لکھا ہے:

میری سنو کہ آج تم اس سرزمین پہ
حق کے تفضلات سے ہو مرجع انام
اخبار لودھیانہ میں میری نظر پڑی
تحریر ایک جس سے ہوا بندہ تلخ کام
ٹکڑے ہوا ہے دیکھ کے تحریر کو جگر
کاتب کی آستیں ہے مگر تیغ کا نیام
وہ فرد جس میں نام ہے میرا غلط لکھا
جب یاد آ گئی ہے کلیجہ لیا ہے تھام
سب صورتیں بدل گئیں ناگاہ یک قلم
نمبر رہا نہ نذر، نہ خلعت کا انتظام
ستر برس کی عمر میں یہ داغ جانگداز
جس نے جلا کے راکھ مجھے کر دیا تمام
تھی جنوری مہینے کی تاریخ تیرھویں
استادہ ہو گئے لب دریا پہ جب خیام
اُس بزم پُر فروغ میں اس تیرہ بخت کو
نمبر ملا نشیب میں، ازروئے اہتمام

. . . .

. . . .

خود ہے تدارک اس کا گورنمنٹ کو ضرور
بے وجہ کیوں ذلیل ہو غالب ہے جس کا نام
امرِ جدید کا، تو نہیں ہے مجھے، سوال
بارے قدیم قاعدے کا چاہیے قیام
ہے بندے کو اعادۂ عزت کی آرزو
چاہیں اگر حضور تو مشکل نہیں یہ کام

(دیوان غالب اردو۔ نسخۂ عرشی)

متذکرہ اشعار سے یہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کبھی غالب کے اعزاز میں کوئی کمی کی گئی تھی۔ عرشی صاحب نے میکلوڈ کے نام اس قصیدے کی تاریخ کا تعین کرنے کے بعد یہ لکھا ہے:

"اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف الذکر نے کسی سال ۱۳ جنوری کو لبِ دریا خیمے کھڑے کرا کے دربار کیا تھا۔ میرزا صاحب کا نام دربار کی فہرست میں غلط لکھا گیا تھا۔ اور بوقت ضرورت شرکت نمبر، نذر اور خلعت کا پچھلا انتظام برقرار نہ رکھا گیا تھا۔ یہ طرزِ عمل ۷۰ برس کی عمر تک میرزا صاحب کے لئے بہت جگر خراش ثابت ہوا۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ کسی اخبار نویس نے اخبار لودھیانہ میں روداد دربار کے اندر اُن کا نام سب الفاظ میں ذکر کیا۔ میرزا صاحب کو اہل دربار کی چشمک کا ہی کافی صدمہ تھا۔ اس سے اور زیادہ دکھ پہنچا۔ وہاں اژدحام کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکے تھے۔ گھر آ کر اس قصیدے کے ذریعے پچھلے مدارج کی برقراری کی استدعا کی۔ میکلوڈ صاحب نے منٹگمری کے ۱۰ جنوری ۱۸۶۵ء کو مستعفی ہونے کے بعد گورنری عہدہ سنبھالا تھا۔ ۱۳ جنوری ۱۸۶۵ء کو دربار کرنا اور فہرست شرکا کا جاری ہو کر سب کو پہنچ جانا محال ہے۔ ۱۳ جنوری ۱۸۶۷ء کو بھی دربار کرنا ناممکن ہے۔

---

[1]: سر ڈانل میکلوڈ کی طرف اشارہ ہے۔ وہ ۱۸۶۵ء سے ۱۸۷۰ء تک پنجاب کے لفٹنٹ گورنر رہے۔ پنجاب یونیورسٹی کی داغ بیل انہوں نے ہی ڈالی تھی۔ "مکاتیب غالب" حواشی ۱۸۰۔

اس لئے کہ اس سے ۲۸ دن پہلے ۱۷ دسمبر ۱۸۶۶ء کو ان کا دربار دلّی میں ہو چکا تھا۔ جس میں میرزا صاحب بھی شریک ہو کر خلعت پہن چکے تھے۔ ۱۳ جنوری ۱۸۶۹ء کو میرزا صاحب کی شرکت کو عقل نہیں مانتی۔ اس لئے کہ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ جب وہ دسمبر ۱۸۶۶ء میں بغیر آشوب کے سہارے کے دربار میں چل پھر نہ سکتے تھے تو مرنے سے ایک ماہ قبل کب اس قابل ہوں گے۔ اب جنوری ۱۸۶۷ء اور جنوری ۱۸۶۸ء رہ جاتے ہیں۔ اُن کے متعلق اس سوال کا جواب کیا ہوگا کہ جب میکلوڈ انہیں دسمبر ۱۸۶۶ء میں خلعت دے چکے تھے تو اب کیوں نہ دیا۔" (مکاتیب غالب، حاشیہ دیباچہ)

اسی قصیدے کے بارے میں ایک اور مقام پر انہیں کی یہ تصریحات بھی ملتی ہیں:

"مرزا غالب مرحوم کا ایک غیر مطبوعہ قصیدہ کے عنوان سے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے اخبار الہلال میں ایک مضمون لکھا تھا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ لارڈ کیننگ کے دربار آگرہ منعقدہ ۱۳ جنوری ۶۰ء کے موقع پر میرزا صاحب نے لکھا تھا لیکن میری دانست میں یہ تاریخ درست نہیں ہے۔ اول اس بنا پر کہ اس میں میکلوڈ صاحب کو فرمانروائے پنجاب بتایا ہے اور وہ ۱۰ جنوری ۶۵ء کو مسٹر منٹگمری کے مستعفی ہونے کے بعد فنانشل کمشنری پنجاب کے عہدے سے ترقی پا کر لفٹنٹ گورنر پنجاب ہوئے تھے۔ (تاریخ پنجاب از منشی دیبی پرشاد، ۱۹ مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۸۷۲ء) دوسرا سبب یہ ہے کہ اس کے ۱۹ویں شعر میں ریل کے کھلنے کا ذکر ہے اور اس کا واقعہ یہ ہے کہ سنہ ۱۸۵۰ء میں ایسٹ انڈیا ریلوے کلکتے سے رانی گنج تک جو ۱۲۰ میل کا فاصلہ ہے جاری تھی۔ تعمیر کا کام برابر دلّی تک جاری رہا۔ پہلے آگرے سے جمنا کے غربی کنارے تک داغ بیل ڈالی گئی۔ غدر کے بعد اُس کی جگہ ٹونڈلا جنکشن سے علی گڑھ ہوتی ہوئی جمنا کے مشرقی کنارے تک کا حصہ سنہ ۱۸۶۴ء میں کھولا گیا اس وقت جمنا کا پل بن رہا تھا۔ سنہ ۱۸۶۶ء کے آخر میں یہ پل بن کر تیار ہوا اور یکم جنوری ۱۸۶۷ء کو پہلی بار اس پر سے ریل گزری (واقعات دارالحکومت دہلی ۱: ۳۴۳، ۲: ۲۲۳)۔ تیسرے اس وجہ سے کہ تیرھویں شعر میں میرزا صاحب نے اپنی عمر ۷۰ برس کی بتائی ہے چونکہ ان کا سال پیدائش سنہ ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) ہے اور اس میں ۷۰ کا اضافہ کیا جائے تو ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۷ء) ہوتے ہیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر یہ قصیدہ جنوری ۱۸۶۷ء سے پہلے کا نہیں ہو سکتا۔ اور چونکہ اس کے ۱۴ویں شعر میں ۱۳ جنوری کا ذکر ہے۔ لہٰذا اس تاریخ کے بعد کا ہونا چاہیئے۔"

(دیوانِ غالب، عرشی)

ان تمام پیچیدہ اطلاعات کو مدنظر رکھتے ہوئے غالب کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اس نئی اطلاع اور قصیدے میں اعزاز کی کمی کی شکایت دونوں میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ عرشی صاحب کی متعینہ تاریخ کو اگر صحیح مان لیا جائے (اور اس کے غلط ماننے کے لئے ہمارے پاس شواہد ہیں بھی نہیں) تو یہ ماننا پڑے گا کہ غالب کے اعزاز کی کمی کی اطلاع پہلی بار انہیں دربار لاہور کے موقع پر نہیں مل سکی ورنہ وہ ۱۳ جنوری کے بجائے دربار لاہور کی تاریخ ۱۸ اکتوبر کی طرف اپنے قصیدے میں اشارہ کرتے۔ غالبیات میں دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ غور طلب اور دلچسپ بات ہے۔

اسی سلسلے میں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ غالب کے دربار لاہور میں شریک ہونے کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

مشمولہ نمبر ۲ سے بھی غالب کے سلسلے کی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ جدوجہد آزادی کو کچلنے میں انگریزوں نے جو سختیاں برتی تھیں اور تہذیبی و تمدنی نشانات کو مسخ کرنے کی جو کوشش شدومد سے کی گئی تھی وہ حکومت کرنے کی حکمتِ عملی کے قطعاً خلاف تھی اس لئے حکامِ انگلشیہ کے لئے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ اس افراتفری کے دور کے مذموم اور مسموم اثرات کو معتدل بنایا جائے۔ چنانچہ کالج، اسکول سوسائٹیاں قائم کرکے اور ان کی زور و شور سے سرپرستی کرکے اس مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش بھی شروع کر دی گئی تھی چنانچہ مشمولہ ایک ایسے ہی دربار سے متعلق ہے جس کا مقصد یہ تھا کہ دیسی شرفا کو نوازتے ہوئے ان کی علمی و ادبی مشاغل کی سرپرستانہ تعریف و توصیف کرکے دلوں کو غلامانہ اظہار وفاداری اور جذبات تشکر سے لبریز کر دیا جائے۔ یہاں تک کہ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر نے "بزبانِ اردو" تقریر فرمائی۔

اس دربار کی روداد کو مختصراً نقل کیا جاتا ہے:

فہرست شرکا میں سے جو اہم لوگ تھے ان کے نام بھی لکھے جاتے ہیں۔

ان میں پیارے لال غالب کے عزیز شاگرد۔ ماسٹر پیارے لال آشوب مراد ہیں اور بدرالدین دہلی کے مشہور مہرکن تھے۔ انہوں نے ملکہ وکٹوریا کی بھی مہریں تیار کی تھیں۔

تاریخ ۱۷ دسمبر ۱۸۶۵ء روز شنبہ کو نواب لفٹنٹ گورنر بہادر نے ہندوستانی رئیسوں اور شریفوں کی باریابی کے واسطے مکان انسٹی ٹیوٹ کے بڑے ایوان میں دربار منعقد فرمایا۔

نواب لفٹنٹ گورنر بہادر بمعیت اپنے مصاحبین کے چار بجے شام کے وقت داخل ایوان دربار ہوئے اور ...... بہت سے صاحبان سررشتہ دہلی اور رفقا اور دیگر صاحبوں سے ملاقات کی۔

ہندوستانی رئیسان اور رعمائد مفصلۂ ذیل حضور نواب لفٹنٹ گورنر بہادر میں پیش ہوکر شرف یاب ملازمت ہوئے ا

مختار حسین خاں رئیس پاٹودی۔ مرزا الٰہی بخش از خاندان شاہی دہلی۔ مرزا سلیمان شکوہ خلف مرزا الٰہی بخش آنریری مجسٹریٹ۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں از خاندان لوہارو۔ مرزا علاء الدین احمد خاں خلف رئیس لوہارو۔ نواب سید احمد خاں صدر الصدور علی گڑھ۔

—— مرزا نوشہ۔ شاعر۔ مرزا موصوف کو بہ سبب ان کی مشہور و معروف لیاقت علمی کے اور بہ جلدوی امداد کے جو سرکار کو اس نے افسران سررشتۂ فوج کے امتحان کے واسطے نئی کتابیں طیار کرنے میں دی۔ خلعت نو پارچہ کا عطا ہوا۔

بدرالدین مہرکن

پیارے لعل ہیڈ ماسٹر مدرسۂ تعلیم المتعلمین دہلی

مولوی ضیاء الدین اسسٹنٹ پروفیسر عربی دہلی کالج

حکیم احسن اللہ خاں طبیب

جب حاضرین دربار کا نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کے حضور میں پیش ہونا ختم ہوا تو پیارے لعل آنریری سکریٹری نے ایک درخواست انجمن علمی دہلی کی طرف سے بدیں مضمون کہ نواب ممدوح الوصف انجمن مذکور کا مربی ہونا منظور فرماویں پیش کی۔

اوس کے بعد نواب لفٹنٹ گورنر بہادر نے حاضرین جلسۂ دربار کی طرف مخاطب ہوکر زبانِ اردو فرمایا کہ اے رئیسان و ساکنان دہلی

آپ کو اس شہر میں دربار عام میں مجتمع کرنے کا یہ موقع اولین حاصل ہوا ہے اور آپ کے شہر اور بہت مشہور شہر کی کئی عالیشان عمارتوں کو دیکھ کر اور کتنے ہی دلکش مقامات اور ترقی کی علامتوں کے ملاحظے کے بعد جو آپ سے ملاقات کرنے کا حاصل ہوا میں نے بہت خوشی سے جلسہ ملاقات کا اس عمدہ ایوان میں قرار دیا۔

اس بات کے بیان کرنے کی حاجت نہیں ہے کہ دہلی مدت مدید سے مشہور رہی ہے نہ فقط اس واسطے کہ پے در پے ہندوا پٹھان، اور مغل بادشاہوں کی دارالسلطنت رہی ہے بلکہ نیز اس واسطے کہ علم اور ہنر کا مخزن رہی ہے اور تجارت کی ایک ایسی بڑی پینٹ کی جگہ کہ ہندوستانِ شمال میں کوئی اور جگہ پینٹ کی اوس کے برابر نہیں یہ بات بخوبی مشہور و معروف ہے اور اس کا خاص ذکر کرنے کی ضرورت نہیں لیکن جو اب حکمراں ہیں ان کو آپ کے ذہنوں میں یہ بات منقوش کرنی مناسب اور واجب ہے کہ زمانۂ گذشتہ کے امتیاز فخریہ کو ہاتھ سے نہ جانے دینا اور اس کو برقرار رکھنا اور اس بات میں کوشش کرنا کہ اگر ممکن ہو تو جو ترقی اور رجوع رونق دہلی کو کبھی پہلے حاصل ہوا ہے اوس سے زیادہ حاصل کیا جاوے آپ کے واسطے فرض ہے علم و ہنر کے باب میں۔ البتہ وہ انعام اور وہ ترغیبیں نہیں رہیں ہیں جو شاہنشاہوں کے دربار میں تھیں لیکن ایک نئی حالت ایسی پہلی حالت کے جابجا آگئی ہے کہ جس سے آئندہ کے واسطے بہت امید معلوم ہوتی ہے۔ ایک کالج جو کلکتے کی یونیورسٹی سے متعلق ہے اس جگہ مقرر ہوا ہے۔ اور یہ کالج مسٹر ولیمنٹ صاحب اور ان کے مددگاروں کے اہتمام کے سبب سے جو لیاقت اور چستی کے ساتھ کیا جاتا ہے سرعت کے ساتھ درجہ فائق کارگری کا حاصل کرتا جاتا ہے شہر کے یعنی ٹون TOWN اسکولوں اور پادری صاحبوں کے مدرسوں میں بھی انگریزی پڑھائی جاتی ہے۔ طلبا کی تعداد کثیر ہے اور انگریزی زبان اور مغربی قوموں کا علم حاصل کرنے کی خواہش فتہ ابی کے ساتھ عام ہوتی جاتی ہے کہتے ہیں کہ کالج کی جماعتوں میں سے سولہ طلبا نے اس سال میں بیش مواجب نوکریاں محکمجات سرکاری میں یا غیر سرکاری حاصل کی ہیں اور امید ہو سکتی ہے کہ دو حاصل دنیاوی فائدہ اس طرح حاصل ہو جاتا ہے اخلاق اور عقل میں بڑی ترقی ہوتی جاتی ہے اور ممالک مغربی کے علم و ہنر سے اعلیٰ قسم کے آدمی بخوبی آگاہ ہوتے جاتے ہیں۔

---

[1] اس کالج کی تفصیلات کے لیے عبادات اصدیقی صاحب کا مضمون دیکھئے۔ دہلی سوسائٹی اور مرزا غالب (احوال غالب ۲ ص)

مجھے خصوصاً اس بات کے یقین ہونے کی خوشی ہے کہ جیسے انگریزی کی تحصیل ہوتی جاتی ہے اس کے ساتھ یہ بھی امر ہے کہ اپنے اپنے ملک کی زبانوں اور علم کی تحصیل کو ترک نہیں کر دیا ہے۔ دہلی کی اردو بولی اب تک جملہ اردو بولیوں سے جو ہندوستان شمالی میں جابجا بولی جاتی ہیں نہایت شستہ اور فصیح ہے۔ چنانچہ اس کی شہادت آپ کے مشہور شاعر مرزا نوشہ کے کلام سے جن کو ابھی خلعت دیا گیا ہے ظاہر ہے اور آپ کی انجمن علمی کے مقرر ہونے سے جس کے ممبروں کی درخواست آپ کے روبرو ابھی پڑھی گئی ظاہر ہے کہ آپ اپنے ملک کے علم کی تحصیل کی ترغیب دینے کو اور اپنے ملک کی زبانوں میں ممالک مغربی کے علم کو جمع کرنے کی ضرورت اور خوبی کو سمجھتے ہیں۔ میری رائے میں یہ امر ہندوستان کی بہبودی آئندہ کے واسطے بہت عظمت رکھتا ہے۔ چنانچہ اسی سبب سے مجھے ایسی ایسی انجمنوں کی ترقی کا جیسی دہلی اور لاہور میں مقرر ہوئی ہیں اور جیسی علی گڑھ میں آپ کے نامی ہم وطن سید احمد خاں صدر امین علی نے مقرر کی ہے۔ اس جلسے میں شریک ہو کر ہم سب کو ممنون کیا بہت خیال اور شوق رہتا ہے۔۔۔۔۔۔۔"

اسی کا حال نواب کلب علی خاں خلد آشیاں والی رام پور کو انعقاد دربار کے دوسرے ہی دن غالب نے لکھا لیکن وہ مندرجہ بالا رپورٹ کے اقتباسات سے کہیں کہیں مختلف بھی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اُسے بھی نتیجہ نکالنے کے لئے نقل کیا جائے۔ لکھتے ہیں:

"پیش از غدر گورنمنٹ کے دربار میں، پارچے اور جیغہ، سرپیچ، مالائے مروارید، تین رقمیں جواہر کی ملتی تھیں۔ بعد غدر اگرچہ پنشن اور دربار بحال رہا، لیکن خلعت موقوف ہو گیا۔ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب کا کل ۱۲ بجے دربار تھا۔ حکم سب درباریوں کو پہنچ گیا تھا۔ میں نواب مہدی علی خاں صاحب کو رخصت کر کے گھر آیا۔ دو گھنٹے کے بعد دربار میں گیا۔ خیال یہ کہ ملاقات ہوگی، ایک رباعی کاغذ مذہب پر لکھی ہوئی نذر کروں گا، کلمات عنایت سن کر چلا آؤں گا۔ نہ مجھے احتمال، نہ صاحب کمشنر بہادر شہر کو علم بارے بوقت ملاقات تعظیم معمولی اور مصافحہ کر کے لارڈ صاحب نے کھڑے کھڑے جیغہ، سرپیچ میری ٹوپی پر باندھا اور فرمایا کہ یہ ہم نے آپ کے واسطے رکھا تھا۔" مالائے مروارید میر منشی نے گلے میں ڈال دی۔ پارچے سات مرحمت ہوئے:

دو شالا، کمخواب کا تھان ا، بنارسی تھان سنہری بوٹے ا، بنارسی سیلا ا، الوان کی چادر کنارہ کلابتون ا، کنا ویزہ کا تھان ا، الوان کی چادر بے کنارہ ا۔

میں اس عطیے کو آپ کی بخشش معنوی سمجھا ہوں اور دوسری بخشش یعنی اس خط کے جواب کے جلد حاصل ہونے کا متوقع ہوں۔۔۔"

(مکاتیب - ۶۴)

اس خط سے یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ زیر بحث دربار میں شرکت کا علم نہ تو غالب کو تھا اور نہ صاحب کمشنر بہادر وغیرہ کو جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ۱۸۶۳ء میں غالب نے اپنی خلعت کی بحالی کا جو ذکر نواب یوسف علی خاں بہادر ناظم اور دوسرے احباب سے کیا ہے وہ خوش فہمی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ غالب نے خلعت کی بحالی کی خبر کسی اپنی مصلحت سے اڑا دی ہو۔ یہیں یہ بات بھی کھٹکتی ہے کہ وہ غدر کے بعد اپنی پنشن اور دربار کے بند ہو جانے پر ان کی پریشانی اور دوبارہ اجراء کے لئے ان کے بحال رہنے کا ذکر کرتے ہیں۔ حالانکہ حقیقتِ حال اس کے بالکل خلاف ہے اور غدر کے بعد پنشن اور دربار کے دوڑ دھوپ کی سرگذشت تفصیل سے ابھی گزر چکی ہے۔

مذکورہ بالا ۱۸۶۶ء کے دربار کی روداد کے اندراج کے مطابق غالب کو خلعت کا اعزاز کسی خاندانی سربلندی کے پیش نظر نہیں دیا گیا تھا۔ بلکہ غالب نے فوجیوں کی تعلیم کے لئے کتابیں تیار کرنے میں حکومت کی جو مدد کی تھی اس کے صلے میں اس اعزاز کے وہ مستحق قرار دئے گئے تھے لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ خود غالب نے کہیں ان کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ انہیں خاندانی اعزاز کے طور پر خلعت زیادہ عزیز تھا اپنے کارناموں اور خدمات علمی کے صلے میں نہیں ورنہ وہ ان لوگوں میں تھے کہ بصورت پسندیدگی کسی نہ کسی پہلو فوجیوں کے لئے کتابوں کی تصنیف اور اس کے صلے میں خلعت پانے کا ذکر ضرور کرتے۔

اس روداد کے مطابق غالب کو نو پارچہ کا خلعت عطا ہوا تھا جب وہ مذکورہ مکتوب بنام کلب علی خاں میں سات پارچہ کا اقرار کرتے ہیں اور اس کی تفصیل بھی دیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ نو پارچہ کا لفظ روداد میں کاتب کے سہو کا نتیجہ ہے اس لئے کہ اپنے اعزاز میں کمی غالب تو کیا کسی کے لئے بھی خوش آیند بات نہیں ہے۔

ان تمام اطلاعات کی روشنی میں اگر ہم یہ فیصلہ کریں کہ غدر کے بعد پہلی بار ۱۸۶۶ء میں غالب کو خلعت سے نوازا گیا تو غلط نہ ہوگا اس لئے کہ اس کے علاوہ اور کوئی مستند ثبوت اس سے پہلے ہمیں نہیں ملتا نیز غالب کے بیانات سے ہر جگہ اتفاق نہ ممکن ہے اور نہ درست۔

ان حالات کے ساتھ غالب کے ان دعاوی کو بڑی ٹھیس پہنچتی ہے جو کہ "اسلئے پھر آئے در کعبہ اگر وانہ ہوا" یا ع ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے — کہہ کر کئے گئے تھے۔

یہاں ہمارا وہ عظیم شاعر جسے یہ احساس ہے کہ:

غلیم وسلے نوز چشم محیطم
غریبم وسلے روشناس جہانم

اپنے ہی ہاتھوں اپنا شیشۂ خودی پاش پاش کرتا نظر آتا ہے وہ ہر قدم پر اپنی عظمتِ رفتہ کا نوحہ خواں ہے۔ وہ آپ اپنے ماضی کی لاش کا مقبرہ تیار کرتا ہے اور مجاور بن کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس نے خودی کا ایسا مضبوط حصار اپنے اردگرد بنا لیا تھا کہ وہ خود بھی اسے توڑ کر باہر نکلنا چاہتا تو یہ بے حد مشکل تھا۔

جو کچھ بھی ہو غالب اس طرح خود اپنے منکرین گئے تھے، اس لئے کہ جن بزرگوں سے انہوں نے اپنا رشتہ جوڑا تھا ان سے نسبت کے بعد احساس خودداری کو اپنے ہی ہاتھوں مجروح کرنا کسی طرح زیب نہیں دیتا تھا۔ "غالب دوستوں" کے لئے تسلی کا ایک ہی راستہ ہے بقول غالب:

تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا!

★

بھول

قتیل شفائی

میں فقیرانہ ترے در پہ چلا آیا تھا
یہ سمجھ کر کہ مرے عہد کی فنکار ہے تو
میں نے سوچا تھا کہ احساس ہے بیدار ترا
مجھ سے بس نقدِ محبت کی طلب گار ہے تو
مجھ کو اس بات کا خود تو نے دلایا تھا یقیں
اپنے ماحول کے دستور سے بیزار ہے تو
مال و زر، جاہ و حشم، کچھ بھی نہیں تیرے لئے
پیار کی راہ میں ایثار ہی ایثار ہے تو

میں نے سوچا تھا تری محفلِ رسوائی میں
دل مرا کاکلِ عصیاں کا اسیر اچھا ہے
اصل میں کچھ بھی نہیں سلسلۂ نام و نسب
وہی اچھا ہے یہاں جس کا ضمیر اچھا ہے

ایک تسکین تو ملتی ہے ہر اک ٹھیس کے ساتھ
تو نے جو مجھ پہ چلایا ہے وہ تیر اچھا ہے
جو کسی کو نہیں حاصل وہ ہے مجھ کو حاصل
بادشاہوں سے کہیں مجھ سا فقیر اچھا ہے

آج لیکن ترے بدلے ہوئے حالات کے ساتھ
طعنے دیتی ہے مری شانِ فقیرانہ مجھے
بے زری جرم ہے اس محفلِ رسوائی میں
لاکھ سمجھاتے رہے شیشہ و پیمانہ مجھے
کیسے آیا مجھے مستقبلِ زریں کا خیال
یاد تھا جب ترے ماضی کا بھی افسانہ مجھے
میں بہر حال ترے پیار کا دم بھرتا ہوں
غور سے دیکھتی ہے جراتِ رندانہ مجھے
آج کچھ ہوش میں آیا ہوں تو میں سوچتا ہوں
اب تو دیوانہ بھی کہہ سکتا ہے دیوانہ مجھے

★

جانشینیٔ غالب کا مسئلہ

یوسف بخاری

ماخذ تاریک تھا، روایات غیر مستند تھیں، شاہی اقبال اثر انداز تھا، بعض ملکی و غیر ملکی متعصب مؤرخین نے ناجائز تصرف سے کام لیا۔ انفرادی یا اجتماعی نفع و نقصان کی خاطر تحریف کی گئی۔ بظاہر یہ چند نمایاں وجوہات ہیں جن کے نتیجہ میں ہماری تواریخ میں متعدد ایسے واقعات پائے جاتے ہیں جو سرتاپا غلط اور بے بنیاد ہیں۔ مثلاً شاہ علاء الدین خلجی اور پدمنی کا واقعہ، جہانگیر کے متعلق انارکلی اور نور جہاں کے عشق کی حکایتیں۔ بہ تیرکا شاہزادی جہاں آرا کے بارے میں حضرت شاہجہاں پر بہتان، زیب النساء مخفی اور عاقل خاں کا افسانہ، حضرت عالمگیر کی "عالمگیرانہ ناانصافی اور ظلم و ستم" وغیرہ وغیرہ۔

سیاسی تاریخ سے قطع نظر ہماری ادبی تواریخ میں بھی اس قسم کا غلط مواد موجود ہے۔ حضرت داغ ہی کو لیجئے تمام ادبی تواریخ اور تذکروں میں درج ہے کہ وہ نواب احمد بخش خاں والئی فیروزپور جھرکہ و لوہارو کے بیٹے نواب شمس الدین احمد خاں کے فرزند تھے لیکن خاندان لوہارو کے بیشتر مرحوم اور زندہ افراد کا یہ قول ہے کہ نواب شمس الدین احمد خاں مرحوم اولاد نرینہ سے محروم تھے لہٰذا یہ محض غلط ہے کہ ان کے فرزند حضرت داغ تھے وہ حضرت داغ پر بھی حیرت زدہ ہیں کہ وہ کس بنیاد پر اپنے آپ کو فرزند لوہارو کہتے تھے۔

نوابین لوہارو کے پاس اس دعوٰی کا ثبوت یہ ہے کہ اگر یہ فرزندی کوئی امر واقعہ ہوتا تو نواب شمس الدین کی وفات کے بعد فیروزپور جھرکہ کی جائیداد حضرت داغ کے حق میں منتقل ہوتی۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان کو قتل فریزر کی پاداش میں پھانسی ہوئی تھی اور ریاست جھرکہ بحق سرکار ضبط ہو گئی تھی تب بھی داغ کا دامن تو بے داغ تھا منجانب سرکار ان کی بسر اوقات کے لئے کم از کم کوئی وظیفہ ہی مقرر ہوتا جس طرح حضرت بہادر شاہ ظفر کے بعد ان کی اولاد کے لئے سرکار نے وقف قائم کیا تھا۔ دلیل معقول ہے، داغ کا کوئی وظیفہ یا منصب سرکار کی طرف سے مقرر نہ تھا لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چونکہ نواب احمد بخش خاں کے عقد میں علاوہ دیگر بیگمات کے مدی بیگم عرف بہو خانم نامی میواتن ایک غیر کفو کی عورت تھی اس لئے نوابین لوہارو بپاس حرمتِ خاندان اپنی اس کمزوری کو مخفی رکھنا چاہتے تھے اور اسی باعث وہ داغ کو خلف شمس الدین تسلیم کرنے سے گریز کرتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ مرزا غالب اور شمس الدین کے مابین ہمیشہ کشمکش اور مقدمہ بازی رہی لیکن اس کے باوجود مرزا غالب نے نواب شمس الدین کے ناموس کو اپنی نظم و نثر میں کبھی عریاں نہیں کیا اور یہ یقیناً مرزا غالب کے کردار کی ایک اعلیٰ تصویر ہے اور ناقابلِ فراموش۔ البتہ حضرتِ داغ اگر وہ فی الحقیقت فرزندِ شمس الدین تھے تو ظاہر ہے کہ اس باب میں وہ بچارے قطعاً مجبور اور معذور تھے۔

لیکن اس وقت ہمارے روبرو یہ مسئلہ نہیں، اسے کسی اور وقت پر اٹھا رکھئے۔ فی الحال ہمیں یہ تحقیق اور ثابت کرنا ہے کہ مرزا غالب کا جانشین کون تھا؟ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر درخشاں فرزند نواب احمد بخش خاں یا ان کے بھتیجے نواب علاء الدین احمد خاں تسیمی و علائی فرزند نواب امین الدین احمد خاں اوّل، یا دونوں، بصورت خلیفہ اوّل اور خلیفہ ثانی،

عام طور پر تمام ادبی تذکروں میں نیر کو خلیفہ اوّل اور علائی کو خلیفہ ثانی بتایا گیا ہے، اس کے ثبوت میں غالب کے اس خط کو اساس بنایا گیا ہے جو ۱۸ اپریل ۱۸۶۱ء کو علائی کے نام لکھا گیا تھا اس خط کا ضروری خلاصہ یہ ہے:-

"تم کیوں خفا ہوتے ہو؟ ہمیشہ سے اسلاف و اخلاف ہوتے آئے ہیں، اگر نیر خلیفہ اوّل ہے تو تم خلیفہ ثانی۔ اس کو عمر میں تم پر تقدمِ زمانی ہے، جانشین دونوں مگر ایک اوّل ہے اور ایک ثانی .... تم سخنور ہو گئے حسنِ طبع خداداد رکھتے ہو........ تیری جان کی قسم میں نے پہلے لڑکے کا اسم تاریخی نظم کر دیا تھا اور وہ لڑکا نہ جیا۔ مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے کہ میری نحوست طالع کی تاثیر تھی۔ میرا ممدوح جیتا نہیں ...... نہ صاحب دوہائی خدا کی میں نہ تاریخِ ولادت کہوں گا نہ نام تاریخی ڈھونڈوں گا۔"

بلاشبہ خط کی عبارت کے یہ الفاظ بالکل صاف اور واضح ہیں۔ "تیر خلیفۂ اوّل، تم (علائی) خلیفۂ ثانی ہو" لیکن بغیر کسی عبارتی تقدیم و تاخیر کے اس میں اس کی وضاحت بھی موجود ہے۔ اس (تیر) کو عمر میں تقدم زمانی ہے۔ غالب نے تقدمِ رتبہ یا تقدمِ علم و قابلیت نہیں کہا۔ "تم کیوں خفا ہوتے ہو؟" اس مدلل اور ذو معنی فقرے میں غالب نے علائی کی خفگی کے دو سبب بتائے ہیں اور دونوں کے تعلقات عزیزِ خاطر رکھ کر بڑی دانائی اور حکمت سے اس کی جواب دہی کی ہے۔ اوّل خفگی کی ظاہری اور ضمنی وجہ یہ ٹھہرائی ہے کہ تمہارا (علائی) کا خفا ہونا (جو فی الحقیقت نہیں ہے) عبث ہے "ہمیشہ سے اسلاف و اخلاف ہوتے آئے ہیں" اصل وجہِ خفگی ولادتِ فرزند کا نہ کہنا اور تاریخی نام کا نہ ڈھونڈنا ہے۔ چنانچہ اس کی صفائی میں انہوں نے اپنے آخری فقروں میں کافی دلائل و براہین سے کام لیا اور علائی کی جان کی قسم کھا کر یقین دلایا ہے۔ غالب کے اس طویل اور مشرح جواب سے ایک خاص بات یہ بھی ثابت ہوتی ہے کہ وہ تیر و علائی دونوں کو بیک وقت خوش اور مسرور رکھنا چاہتے تھے لیکن باوجود اس قدر صلح جو اور مرنجاں مرنج ہونے کے انہوں نے اصل وجہ خفگی اور دونوں کے مرتبہ و اعزاز میں فرق و امتیاز قائم رکھنے کے لئے اپنی بیباکی اور راست گوئی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

۴ر اپریل ۱۸۶۱ء کے اس خط میں محض ذکرِ خلافت آیا ہے یہ کوئی توقیع یا سندِ جانشینی نہیں ہے۔ لہٰذا اب ہم کو یہ معلوم کرنا ہے کہ مرزا غالب نے یہ سندِ خلافت کس کو اور کب عطا فرمائی اور جس کو یہ اعزاز عطا کیا گیا وہ فی الاصل اس کا مستحق بھی تھا یا نہیں۔ خطوطِ غالب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت علائی کو پہلے فارسی کی سند مئی ۱۸۶۳ء میں عطا کی گئی لیکن مئی ۱۸۶۳ء کے برعکس اس سند کا تذکرہ ۱۵ر اکتوبر ۱۸۶۱ء کے ایک خط میں بھی ملتا ہے جو غالب نے علائی کو لکھا تھا:

"توقیع جانشینی مجھ سے تم کو ملا، خرقہ پایا، سبحہ و سجادہ کا یہاں پتہ نہیں ورنہ وہ بھی عزیز نہ رکھتا۔"

اس خط سے مترشح ہوتا ہے کہ سندِ فارسی مئی ۱۸۶۳ء میں نہیں دی گئی۔ بلکہ ۱۸۶۱ء سے قبل دی گئی۔ اگر ۴ر اپریل ۱۸۶۱ء سے قبل نہیں تو کم از کم ۱۵ر اکتوبر ۱۸۶۱ء سے ضرور پہلے دی گئی لیکن اس سند کے مطبوعہ فوٹو (بلاک) جو مولانا غلام رسول مہر نے "غالب" (مطبوعہ مئی ۱۹۳۶ء) میں شائع کیا ہے اس کی پیشانی پر مئی ۱۸۶۳ء کی تاریخ بالکل روشن اور نمایاں ہے، پیشانی اور اختتام پر غالب کی دو مہروں سے بھی مزین ہے جن کا مضمون جدا جدا ہے۔ اس لحاظ سے بلا کسی شک اور شبہ کے یقین کرنے کی گنجائش موجود ہے کہ سند تو فی الاصل مئی ۱۸۶۳ء ہی میں دی گئی۔ لیکن اس کی تحریک اور تذکرہ کا آغاز ۴ر اپریل ۱۸۶۱ء سے بھی پہلے ہی جاری تھا۔ اس سند میں تیر یا تیر کی جانشینی کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

اس عطائے سند کے بعد بھی غالب وقتاً فوقتاً اپنے خطوط میں علائی کو مختلف اسناد دیتے رہے ہیں۔ ادب کے سلسلہ میں اُن کی اجتہادی کوششوں کو سراہتے اور اُن کی قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ۲۱ رجون ۱۸۶۳ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"ہر چند تمہارا ہر ایک کلمہ ایک بذلہ ہے لیکن اس "خُسرو اور خُسرانی" نے مار ڈالا۔ کیا کہوں جو مجھ کو مزا ملا ہے۔ کہاں خُسر و خُسران عربی الاصل اور کہاں لفظ متر ہ ۔۔۔۔۔۔ یہ پرسش نہ بسبیلِ استہزا ہے بلکہ بطریقِ استفسار و استعلام جو تمہیں معلوم ہو بلکہ اگر تم پر مجہول ہو تو معلوم کر کے مجھے لکھ بھیجو۔"

اسی ضمن میں ۳۱ر جولائی ۱۸۶۳ء کا خط ملاحظہ ہو:

"لفظ خُسر کے باب میں اتنی توضیح کیا ضرور تھی ۔۔۔۔۔۔ تم سے اس کی تحقیق چاہی تھی کہ یہ لغت عربی الاصل نہ ہو۔ وہ معلوم ہوا کہ عربی نہیں لغت ہندی ہے، مفرس اور یہی تھا میرا عقیدہ۔"

۱۸ر مئی ۱۸۶۴ء کے خط میں غالب جیسی شخصیت قضیۂ "برہانِ قاطع" کے سلسلہ میں حضرت علائی کو اپنا حکم بناتی ہے:

"بھائی تم میرے فرزند بلکہ بہ از فرزند ہو، اگر میرا صلبی بیٹا اس دید و دانست و تحریر و تقریر کا ہوتا تو میں اس کو اپنا یارِ وفادار اور ذریعہ افتخار جانتا ۔۔۔۔۔۔ یہ رسالہ موسوم بہ "محرقِ قاطعِ برہان" جو تاقب نے تم کو بھیجا ہے، میرے کہنے سے بھیجا ہے اور ارسال سے میرا مدعا یہ ہے کہ اس کے معائنہ کے وقت اس کتاب کی بعض بعض عبارات پڑھ کر میری اپنی قرابت اور نسبت ہائے عدیدہ پر نظر نہ کرو۔ بیگانہ وار دیکھو اور از روئے انصاف حکم دو۔"

۲۳ر فروری ۱۸۶۵ء کے خط کا یہ فقرہ بھی قابلِ دید و شنید ہے:

"علاء الدین خاں، واللہ تو میرا فرزندِ معانی و معنوی ہے، فرق صرف اس قدر ہے کہ میں جاہل ہوں اور تو مولوی ہے۔"

دوسال بعد ۲۱ رجب ۱۲۸۴ھ کو علائی کو اردو کی سند اور فرمانِ جانشینی ان الفاظ میں عطا ہوتا ہے۔

"سال بنگارش تم کو یاد ہوگا۔ میں نے دبستانِ فارسی کا تم کو جانشین و خلیفہ قرار دے کر ایک سجل لکھ دیا ہے ...... اپنے ثباتِ حواس میں اپنے دستخط سے یہ توقیع تم کو لکھ دیتا ہوں کہ فن اردو میں نظماً نثراً تم میرے جانشین ہو، چاہیئے کہ میرے جاننے والے جیسا مجھ کو جانتے ہیں ویسا تم کو جانیں اور جس طرح مجھکو مانتے تھے تم کو مانیں۔"

یہ قلمی سند اس وقت سر امیر الدین احمد خاں موجودہ نواب لوہارو کے پاس موجود ہے۔ اس میں بھی نیّر کا نہ کوئی حوالہ ہے اور نہ کوئی ذکر۔ اس سند کے عطا کرنے کے بعد غالب صرف ۹ ماہ اور ۲۴ دن زندہ رہے۔ غالب کا آخری خط وہ تھا جو انہوں نے اپنی وفات سے ایک دن پہلے ۱۴ فروری ۱۸۶۹ء کو حضرت حالی کے سامنے لکھوایا تھا اور جس کا ایک دردناک ٹکڑا یہ تھا:

"میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا۔"

حقیقت یہ ہے کہ مرزا غالب نے روزِ آغازِ مراسلت سے مرتے دم تک جس کو سب سے زیادہ خطوط لکھے وہ حضرت علائی ہی کی ذات اور ادبی شخصیت تھی۔ غالب ۱۷۹۷ء علائی کے والد امین الدین خاں ۱۸۱۴ء اور علائی ۱۸۳۳ء میں پیدا ہوئے۔ اس لحاظ سے مرزا غالب علائی اور ان کے والد دونوں سے ۱۷ اور ۳۶ سال بزرگ تھے۔ لہٰذا بقول مرزا غالب، حضرت علائی "ثمر نورس تھے اُس نہال کے کہ جس نے اُن کے سامنے نشو و نما پائی"۔ وہ اس ثمرِ نورس کے ایک دو دن، دو چار ماہ، برس دو برس نہیں پورے ۲۳-۲۴ سال تک دلّی میں اُن کے دعاگو، ہمراہ، شب و روز کے انیس و جلیس اور رفیق شفیق استاد رہے چنانچہ اپنے ایک خط میں علائی سے اس طرح مخاطب ہوتے ہیں:

"اے میری جان! یہ وہ دِلّی نہیں جس میں تم پیدا ہوئے ہو، وہ دِلّی نہیں جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے، وہ دِلّی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے۔"

۱۸۵۷ء میں حضرت علائی اپنے والد کے ہمراہ لوہارو چلے گئے اور ایک دو مرتبہ کے سوا اُن کو کبھی دِلّی آنا اور غالب کو اُن کے پاس لوہارو جانا نصیب نہ ہوا۔ دونوں اپنے ہجر کے دن اور فرقت کی راتیں خطوں میں باتیں کر کے گذارا اور کاٹا کرتے تھے۔ اس کے برعکس نیّر اکثر و بیشتر دلّی ہی میں رہے اور روزانہ بلاناغہ غالب کی خدمت میں حاضر ہوتے، زانوئے ادب طے کرتے، اصلاح پاتے اور نیّرِ سخن کہلاتے۔ نیّر بھی مرزا غالب سے چھوٹے ہی تھے۔ لیکن غالب نے جو قصیدہ نیّر کی شان میں لکھا ہے اُس میں حضرت غالب نیّر جیسے قابل جوہر کے اُستاد ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ یہ شعر غالب و نیّر کی روزانہ ملاقات کی یاد تازہ کرتا ہے:

زمینِ کوئے مرا آسماں کُند ہر صبح — طلوعِ نیّر درخشِ نظرف منظرِ من

نیّر نے علمِ تفسیر و حدیث مولوی کریم اللہ شاگرد حضرت شاہ عبد القادرؒ، ادب و فقہ مولوی صدر الدین آزردہ شاگرد حضرت شاہ عبد العزیزؒ منطق و فلسفہ مولینا فضلِ حق خیر آبادی سے حاصل کیا۔ تاریخ جغرافیہ علم الانساب، علم اسماء الرجال، تحقیق لغت کے عالم اور بالغ نظر ہوئے۔ اردو میں محض تفننِ طبع کے لئے اشعار کہے لیکن فارسی کلام میں اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ مسٹر ایلیٹ، سکرٹری حکومتِ ہند کو تاریخِ ہند کی تصنیف میں مستند تاریخی مواد فراہم کیا۔ محمد حسین آزاد نے "آبِ حیات" کے حصول میں نیّر ہی کو اپنا خضرِ راہ بنایا۔

غالب کی زندگی میں غالب کا فارسی دیوان پہلی مرتبہ ۱۸۶۱ء میں نواب صاحب ہی کے اہتمام سے چھاپا گیا۔ خود نیّر نے اس کا دیباچہ لکھا۔ وہ کسی وجہ سے دیوان کے ساتھ تو شائع نہ ہو سکا۔ لیکن "آثار الصنادید" میں شائع ہوا۔ غالب کی وفات کے بعد غالب کا آٹھ سو روپے کا قرض بھی خود نیّر نے ادا کیا اور ان کے مراسمِ تدفین بھی اپنی ذاتی مداخلت سے اہلِ سنّت کے مطابق ادا کرائے۔ ۱۸۸۵ء میں جب یہ نیّر ادب غروب ہوا تو دلّی کے مولوی ضیاء الدین احمد خاں نے جو ایک مشہور خطاط اور عالم فاضل تھے ان کی تاریخ وفات کہی۔ شبلی نعمانی نے ایک غمناک اور دردناک مرثیہ لکھا لیکن سر سید اعظم تو نیّر کو پہلے ہی "آثار الصنادید" میں ایک اعلیٰ مقام دے کر حیاتِ جاوید عطا کر چکے تھے۔

ان تمام تاریخی واقعات اور شواہد سے ہمیں یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ غالب، نیّر اور علائی میں پاس اور دور رہ کر بھی کس درجہ قربت، یگانگت، عقیدت

اور اخلاص تھا اور غالب کی نظر میں نیر و علائی دونوں کی ادبی قابلیت کس قدر متوازن تھی لیکن ادبی دنیا میں نیر نے اپنے زمانۂ حیات اور بعد وفات دونوں اوقات میں اپنے علم و قابلیت کی بناء پر علائی سے زیادہ عزت اور شہرت پائی۔ اس ادبی اور تاریخی پس منظر کے پیش نظر فارسی اور اردو کی سند کے حقدار علائی سے زیادہ نیر تھے تو پھر وہ ان کو کیوں نہیں ملی۔

اس سوال کا ایک جامع اور مسکت جواب تو یہ ہے کہ علائی اپنی ذات سے ایک انجمن ہوتے ہوئے بھی ادب کے ایک خاموش اور ٹھوس خدمت گزار تھے۔ انہیں ادبی دنیا کی وقتی و ہنگامی واہ واہ کا کوئی ارمان نہ تھا، نہ داد خواہی کی تمنا نہ صلہ کی پروا۔ دوم یہ کہ قابل باپ نے لائق فرزند کے جوہر قابلیت کا اندازہ لگا کر ۱۸۶۳ء میں کم عمر ولیعہد تھے ریاست کا نظم و نسق ان کے حوالے کر دیا تھا۔ ان کی یہ مصروفیت و ابتلا ان کے ادبی شوق کے تقاضوں میں ایک مستقل سنگ راہ تھی۔ سوم یہ کہ لوہارو دلّی سے کالے کوسوں دور نہ سہی پھر بھی وہ ایک ایسا دور افتادہ مقام تھا کہ ریل کا سفر طے کرنے کے بعد بھی ۵۰ میل کی طویل مسافت کئی کئی بے آب و گیاہ منزلیں شتر، اسپ، رتھ اور بہلی کے ذریعہ سر کر کے منزل مقصود حاصل ہوتی تھی۔ جب ہی تو غالب جیسا علائی کا عاشق زار "ہیں کوچ دم واپسیں برسرراہ" کی نوبت تک علائی کی دھن لگی ہوئی تھی لیکن سفر آخرت تک لوہارو نہ جا سکا۔ خود علائی کو صرف ایک یا دو بار سے زائد دلّی جانا نصیب نہوا۔ ہمارے علم و اطلاع کے مطابق وہ ۵ مئی ۱۸۶۶ء میں مسٹر میکاہن ڈپٹی کمشنر دہلی کے ایما پر دلّی سوسائٹی کے جلسہ میں شریک ہوئے تھے جہاں انہوں نے اردو زبان پر اپنا تحقیقی مقالہ پڑھا تھا۔ یہ مقالہ اپنی تاریخی معلومات کا ایک خزانہ تھا اور اس وقت بھی ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ (مطبوعہ "ماہ نو" مارچ ۱۹۵۹ء)

الغرض حضرت علائی اپنے کاشانۂ ادب کی خود ہی شمع تھے جو ایک مدت تک حصار لوہارو میں روشن رہی اور جب وقت آیا تو دنیا کی بے ثباتی پر بھڑکی اور ۳۱ اکتوبر ۱۸۸۴ء کو خاموش ہو گئی لیکن اس انجمن خاموش میں یہ شمع جب تک خنداں اور گریاں رہی ادب کے پروانے دور دور سے اڑ کر اس کے گرد جمع ہوتے۔ اس وقت یہ مختصر سا گاؤں لوہارو تشنہ دانوں کے لئے دہلی، آگرہ، لکھنؤ، رامپور، لاہور اور کلکتے جیسا ادب کا مرکز بن جاتا جہاں شعر و ادب کی محفلیں گرم ہوتیں، علم و ادب کی تحقیق، اصلاح و ترقی کے لئے غور و فکر ہوتا۔ آنے والے اپنی علمی پیاس بجھانے کے لئے علائی کے اس عظیم الشان کتب خانہ سے خوش کام ہوتے جس میں کتب دینیات، طبیعات، فلسفہ، تاریخ، سیر، لغات اور مختلف تذکرہ و دواوین سے لے کر کھٹک کی تاتھئی اور مداری کی شعبدہ بازی کے رسائل تک موجود تھے۔ غالب کے فارسی اور اردو کلام کی دولت بھی اسی امین کے گھر میں پاتے۔ ان ۶۴ بیاضوں کو پڑھتے جو ۱۳ برس کی عمر سے آخر عمر تک نت نئے انداز اور پیرایوں میں لکھی گئی تھیں جن میں ۵۰۔۶۰ کے قریب طلوع و غروب کے دلکش مناظر کے قلمی مرقعے بھی شامل تھے۔

یہ علائی ہی کا شوق تھا کہ "فخر المطابع" کے نام سے لوہارو میں ریاست کا ایک پریس قائم کیا۔ سب سے پہلی کتاب "مثنوی ہمائے ہمایوں" جو ایران کے مشہور شاعر بے بدل خواجو کرمانی کا ایک دل پسند افسانہ تھا، اسی پریس سے شائع ہوئی۔ بعد ازاں غیاث الدین اصفہانی کا شہرۂ آفاق شاہکار "دانش نامۂ جہاں" اسی مخزن سے نکل کر منظر عام پر آیا۔

نواب صاحب نے عربی اور اس کی صرف و نحو مولانا اخوند حمزہ سے پڑھی جن کا قائم کردہ مدرسہ محلہ اخوند جی فراش خانہ دلّی میں اب تک موجود ہے۔ علم تفسیر، تجوید، قرأت اور حدیث و فقہ کے اسباق مولوی حبیب اللہ نے دئے۔ منطق و معقولات کا درس مولانا فضل حق خیر آبادی سے لیا۔ انگریزی ایک پادری سے اور سنسکرت ایک پنڈت سے بقدر ضرورت پڑھی۔ علوم متداولہ اور شعر گوئی میں مرزا غالب کے سامنے زانوئے ادب طے کیا۔ علائی کے کلام فارسی اور اردو کی مجموعی تعداد لم از کم دس ہزار سے کسی طرح کم نہیں۔ کلام کا بیشتر حصہ فارسی پر مشتمل ہے اور اس میں بھی قصائد جو فن شعر کا نظام شمسی ہے کا عنصر زیادہ ہے۔ ان کا سب سے بڑا شاہکار "حدیقۂ سنائی" باب اول کی شرح ہے جس کے اجزائے پریشاں "فخر المطابع" میں آخر وقت منتشر اور پریشان ہی پڑے رہے۔ کبھی طباعت کی نوبت نہ آئی۔

خوشی اور حیرت کا مقام ہے کہ یہ شمع جس کی روشنی اپنے ہی کاشانہ میں محدود اور محصور تھی پھر بھی اس کی کرنیں بلاد و امصار ہندوستان سے نکل کر یورپ تک پہونچیں۔ ۱۸۷۲ء میں جب حکومت ہند نے ان کو ان کے خاندانی خطابات سے نوازا تو ملک کی رائے عامہ نے ان کا احترام کیا۔ فرانس کا مشہور مستشرق گارساں دتاسی کے خطبات تک میں علائی کے ذکر اور خطابات نے نمایاں جگہ پائی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب خطابات لٹتے اور بکتے نہ تھے بلکہ لئے جاتے

مایہ تھا کہ ہر آدمی کو جب تک وہ صاحبِ علم نہ ہو "صاحب" بھی نہ کہا جائے بلکہ اُسے بھی ایک سرکاری خطاب قرار دیا جائے۔

اِن امثال تاریخی سے قارئین کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ نیّر اصغر بھی آسمانِ ادب پر اسی طرح "درخشاں" تھا جس طرح نیّرِ اعظم۔ اس کی تابانی کا اس ہ کر اور ثبوت کیا ہوگا کہ غالب جیسی شخصیت جو شاذ و نادر ہی کسی کو خاطر میں لاتی تھی تحقیقِ لغات کے وقت صرف علائی سے مشورہ و استفسار قی۔ بلا شبہ غالب کی نگاہ دوربیں میں نیّر و علائی کی ادبی حیثیتوں میں بڑا فرق تھا۔ نیّر، غالب کی جان تھے اور علائی ان کی روح۔ غالب کو جان رح دونوں پیاری تھیں لیکن زبان و ادب کے معاملہ میں وہ نہایت محتاط، حق پسند، صاف گو اور بیباک تھے۔ اس باب میں وہ کسی دوست کی دوستی اور ت داری کی قرابت کو کبھی نظر انداز کر جاتے تھے۔ تقریظ نگاری کے نازک مواقع پر وہ اپنی تقریظ کا بیشتر حصہ مصنف کے باطنی کمالات اور ذاتی محبت و ے کے بیان میں صرف کرتے اور آخیر میں اصل کتاب پر دو تین جملے اس طرح لکھ جاتے کہ کتاب کی صحیح صحیح تعریف ہو جائے اور مصنف بھی خوش ہو جائے۔ روابط خاندانی کی رعایت سے اور تقدیم زمانی کے لحاظ سے غالب نے نیّر کو صرف ایک بار خلیفۂ اوّل تحریر کر کے ان کا سرِ افتخار بلند کیا اور ان کی ی کی۔ دوسری جانب بہ اعتبار تقدمِ رتبہ و علم علائی کو خلیفۂ دوم ٹھہرایا۔ لیکن اس تحریر کا درجہ زبانی اظہارِ خیال اور گفتگو سے ہرگز زیادہ نہ تھا۔

اگر اب بھی آپ کے دل میں علائی کے خلیفۂ اوّل و آخر ہونے میں شک و شبہ باقی ہے تو ہم آپ کو ایک دو اور پتے کی باتیں بتاتے ہیں۔ حقِ وراثت سند نشینی سے کوئی قابل اور ذی ہوش شخصیت خاموشی کے ساتھ دست بردار نہیں ہوتی۔ کوشش کے باوجود اگر کام نہ بنے تو تحریر و تقریر کے ذریعہ ع اور اپنے حق کا اعلان کیا جاتا ہے۔ نیّر جب اپنے حقیقی برادرِ بزرگ، نواب امین الدین خاں اوّل سے اپنے ریاستی و امارتی حقوق کے لئے مقدمہ میں مبتلا ہوئے تو خلافتِ سخن اور مسئلۂ جانشینی کے معاملہ میں وہ بخیالِ خود مستحق ہوتے ہوئے بلا وجہ کیسے کنارہ کش ہو جاتے۔ اگر فی الحقیقت اس کا کوئی تنازعہ چچا اور بھتیجے کے درمیان ہوتا تو نیّر اپنی کثرتِ قربت اور اپنے ذاتی تعلقات سے کام لیکر جو اس وقت ان کو علائی کی بہ نسبت قت حاصل تھے، اپنے حق کو غالب سے ضرور حاصل کر لیتے۔

ہمارے اس خیال کو اس لئے اور بھی تقویت حاصل ہوتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حضرت نیّر نے ٹکسالی اور مثالی مغل ہوتے ہوئے ایک پنی اصل ملکی و قومی نسبت 'برلاسی و چغتائی' کو چھپا کر خاندانی خواجگی کے پردے میں اہلِ سادات ہونے کا دعویٰ کیا اور اپنے آپ کو خواجہ احمد یسوی کی لاد سے ظاہر کیا۔ اہلِ سادات ہونے کی اس فرضی اختراع کا واحد سبب یہ تھا کہ وہ اپنے فرزند نواب احمد سعید خاں طالب کی شادی تحصیل موضع میرٹھ (یو۔ پی) کے ایک امیر سید زادہ کی بیٹی سے رچانا چاہتے تھے جو ۱۸۴۲ء میں کابل سے جلا وطن کیا گیا تھا۔

جانشینی سے بے نیاز رہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بہ اعتبار علم و فضل اور شہرت نیّر، نیّرِ زمانہ نہ تھے۔ اس لئے اس باب میں انہوں بزعمِ خود خلافتِ غالب سے اپنے آپ کو مستغنی تصور کیا ہو۔ اور عطائے اعزاز کے وقت قیل و قال کو غیر ضروری سمجھا ہو۔ لہٰذا اب تحفظِ حقوق خری تدبیر صرف یہ رہ جاتی ہے کہ غالب اور علائی دونوں کی وفات کے بعد ان کے سامنے میدانِ خلافت بالکل صاف تھا۔ لہٰذا وہ مرزا غالب ۱ اپریل ۱۸۶۱ء کی تحریری اساس پر اپنے آپ کو غالب کا خلیفۂ اوّل یا کم از کم خلیفۂ آخر مشہور کرتے۔ اس وقت بھی کچھ نہ کیا اور ۱۸۸۵ء م اللہ کو پیارے ہو گئے۔

باپ کی وفات کے بعد نواب احمد سعید خاں طالب نے اپنے باپ کے حالات اور تبرکاتِ کلام پر مشتمل ایک مجموعہ "صحیفۂ زریں" کے نام سے شائع انہوں نے بھی نیّر کو صرف غالب کا شاگرد عزیز اور یارانِ طریقت میں ظاہر کیا۔ ان کی خلافت اور جانشینی کا کوئی تذکرہ اور شکوہ زبان پر نہیں لائے۔

ان تاریخی واقعات اور دلائل کی روشنی میں ہم بجا طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ نیّر کی بجائے فارسی اور اردو میں جو سندیں غالب نے علائی کو عطا کیں اور جانشین ٹھہرایا، علائی فی الحقیقت اس کے مستحق تھے اور غالب کا یہ فیصلہ قرینِ قیاس و عقل اور از روئے انصاف بالکل درست اور صحیح تھا۔ اردو کے اُدبا اور نقادانِ ادب نے بھی جو معاصرِ غالب، نیّر اور علائی کے ہم عصر تھے، بلکہ ان کے ہم صحبت اور ہم مشرب بھی تھے، بالخصوص حالی اور آزاد، کسی نے بھی اپنی کسی تصنیف میں نیّر کو غالب کا خلیفہ تحریر نہیں کیا۔ چنانچہ حضرت حالی "یادگارِ غالب" میں رقم طراز ہیں:۔

* ناظم ہروی کی بیتیں مشہور ہیں جن میں عنصری سے لے کر جامی تک ہر زمانے میں جو شاعر سر برآوردہ ہوا ہے اس کا نام لیا ہے (باقی ص ۷۱ پر)

"افسانہ ہائے غیر مکرر کنیم طرح"

عبدالرؤف عروج

"شگفتہ" کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے"
شعلہ برانِ لالہ و انجم کہ واہ واہ
عشوہ گرانِ شوخ و دل آرا کہ ہائے ہائے

"اک عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ" کو
سرمستیِ نشاطِ وفا یاد آگئی
آئینہ در کنار زمانوں کا در کھلا
خوابوں کی دلبرانہ فضا یاد آگئی
مجموعۂ خیال و سکوں فرد فرد تھا
کلکِ جنوں کو اس کی جفا یاد آگئی
یاد آگیا زمانہ "وداعِ بہار" کا
گم گشتہ زندگی کی ادا یاد آگئی

پھر گرمِ نغمہ ہائے گہر بار ہے سکوت
سب کچھ نثارِ جذبۂ پنہاں کئے ہوئے
پھر بڑھ چلا ہے جوشِ تمنائے رنگ و بو
سامانِ صد ہزار گلستاں کئے ہوئے
پھر بڑھ چلی ہیں شہرِ نگاراں کی وسعتیں
گم گشتگی کو زیست کا ارماں کئے ہوئے
پھر لے چلا ہے حوصلۂ دید سوئے دوست
رنگینیِ جمال کو ارزاں کئے ہوئے
پھر آ رہا ہے کوئی خیال و نگاہ میں
تسکینِ اضطرابِ دل و جاں کئے ہوئے
پھر گردشِ حیات کو ٹھکرا رہا ہے دل
یادوں کی نے پہ غم کو غزل خواں کئے ہوئے
"پھر چاہتا ہے جی وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے"

سوچا ہے ہم نے سنگ اٹھانے سے پیشتر
ہم بھی تو رہ نورد تھے دشتِ غزال کے
ہم نے "عیارِ طبعِ خریدار" کے لئے
شیشوں میں رکھ دیا تھا کلیجہ نکال کے
آباد تھے ہماری رگ و پے میں زمزمے
ہم نغمہ گر تھے "رام کلی" کے خیال کے

پوچھے تو کوئی قصۂ "آشوبِ آگہی"
سرگشتۂ خمارِ غمِ دوستاں تھے ہم
"بہرِ امتیازِ ناقص و کامل" کے باوجود
جلوہ طرازِ انجمنِ خوش دلاں تھے ہم
کہتا ہے کون "عشق خلل ہے دماغ کا"
محسوس ہو رہا ہے کبھی نوجواں تھے ہم

تائیدِ یک نگاہِ کرمِ آشنا کے بعد — تمہیدِ صد ہزار فسانہ کہاں گئی
تقدیرِ انقلابِ محبت کو کیا ہوا — تہذیبِ ارتقائے زمانہ کہاں گئی
رکھے گا کون "گردنِ مینا پہ خونِ خلق" — وہ انجمن وہ بزمِ شبانہ کہاں گئی

اک ظلم ہے "شگفتنِ گلہائے ناز و رنگ" — اس فصل میں دماغ تماشا کہاں ہمیں
ممنونِ "قرضِ دوست" ہیں بادہ پرستیاں — کیا کیا ہوئی ہے عمرِ سبک تر، گراں ہمیں
اک دردِ جانگداز اتر تا خمار ہے — ملتی ہجومِ یاس سے کب تک اماں ہمیں
شہ کے "وظیفہ خوار" ہوئے "نوکری" بھی کی — "مارا زمانے نے اسد اللہ خاں" ہمیں

"عشقِ نبرد پیشہ" کی ہمت کو دیکھنا — ہم نذرِ طفلیٔ غم و آفات ہو گئے
رُسوا ہوا خیالِ "معاشِ جنونِ عشق" — کیونکر کہیں کہ "مستِ مئے ذات" ہو گئے
ہم کیا ہیں "داغِ حسرتِ دل کا شمار" کیا — ہم تو ہلاکِ خنجرِ حالات ہو گئے

مانگو کسی "مغنیٔ آتش نفس" کی خیر — نغمہ ہے زندگی نہ ترنم ہے زندگی
"تاچند باغبانیٔ صحرا کرے" جنوں — کلیوں کا رنگ ہے نہ تبسم ہے زندگی
دیکھے کوئی ادائے "ستم ہائے روزگار" — اک نامراد دل کی طرح گم ہے زندگی
کیونکر کریں مشاہدۂ حق کی گفتگو — پروردۂ فریبِ تکلم ہے زندگی
"سر برہوا ہے وعدۂ صبر آزما" سے کون — صیدِ زبونِ دامِ توہم ہے زندگی

"وارستگی، بہانۂ بیگانگی" ہوئی — اک دو دیے چراغ، شبِ ناو نوش ہے
رکھے نہ مفلسی نے کسی سے معاملات — برہم مزاج میکدۂ فکر و ہوش ہے
نقد و نگاہِ شعر کے اثبات کے لئے — آہنگ ہر خیال کا آزار کوش ہے
دنیا کو جس کی "بات سمجھنا محال" تھا — یہ تو نہیں کہ وہ سخن آرا خموش ہے

کل بھی "صریرِ خامہ نوائے سروش" تھا
اب بھی "صریرِ خامہ نوائے سروش ہے"

پاتال

صہبا اختر

کتنی راتیں آج اکٹھی ہو کر مجھ پر ٹوٹ پڑیں

خوابوں کے الحمرا جن کی تاریکی میں ڈوب چلے

شعر، کتابیں، تصویریں سب تیز ہوا کے ساتھ ہیں

میرے صنم خانے سے اُٹھ کر میرے سب محبوب چلے

موگھ قبیلے کی وہ لڑکی زین کی جو تصویر بنی

وہ پرمیلا جس نے نذرل کو گیتوں کے چنگ دئے

یا وہ ہیر کہ جس نے وارث سے لکھوائی ہیر نئی

یا وہ مغل شہزادی جس نے چغتائی کو رنگ دئے

کب ایسے پاتال مری آنکھوں نے پہلے دیکھے تھے

میں تو ابتک صرف اُجالوں کی شبنم سے کھیلا ہوں

مجھ سے میرے فن کی جوالا چھین نہ لے یہ تاریکی

کوئی آئے کوئی بچائے رات ہے اور اکیلا ہوں

دشتِ بیوفائی میں

سید رضی ترمذی

تم یہاں مارے مارے پھرو، ہم چلے
تم یہاں یاد کی ایک دہلیز پہ بیٹھ کر سونی راہوں کو تکتے رہو، ہم چلے
سونی راہوں کو تکتے رہو، اور کہو:
" دور، اُڑتی ہوئی گرد کے قافلوں سے اُدھر
اک سبک گام محمل،
مری آرزو کی حسیں رہگذر میں چلا آ رہا ہے ——"
تمہیں کیا خبر
یہ جو معبد کی دہلیز کے ساتھ اڑتے ہوئے خشک پتے ہیں
کتنے شکستہ دلوں کے فسانے سناتے ہیں
جو چاندنی رات میں
پیار کی شبنموں کے لئے آنسوؤں کے خزانے لٹاتے رہے
اور جب صبح کی سب سے پہلی کرن ایک آہٹ بنی
اُن کے خوابوں کے سب روپ
گیتوں کے سب پھول
بیجان لفظوں کا اک ڈھیر تھے
پیکرِ ناز بن کر کھڑی مورتی اُن کی حیرت پہ اک قہقہہ بن کے گم ہو گئی،

تم یہاں مارے مارے پھرو، ہم چلے
ہم تو یہ جانتے ہیں —— یہاں
پتھروں کی فصلوں میں دھڑکتی ہوئی آبجو
ریت ہی ریت ہے
اور ان بستیوں میں
یہ اُڑتی ہوئی گرد کے قافلے ہی ازل سے ابد کو رواں ہیں،

★

یوم مسلح افواج

اس سال ۱۰ جنوری کو سارے پاکستان میں افواج بڑے جوش کے ساتھ منایا گیا اور اسی ہر سال منایا جائیگا۔ اس دن کی اہمیت و اس دن ہم اپنی ملت کے پاسبانوں کی سرگرمیوں، مشاغل ان کے ساز و سامان اور تربیت کے مدارج سے براہ راست واقفیت حاصل کر سکیں۔ اس صفحہ کی تصویریں کراچی کی جملہ تقریبات سے متعلق ہیں۔

۱ :

یوم مسلح افواج کے یادگاری ٹکٹ : ڈیزائن : محمد حنیف

۲ :

۴ :
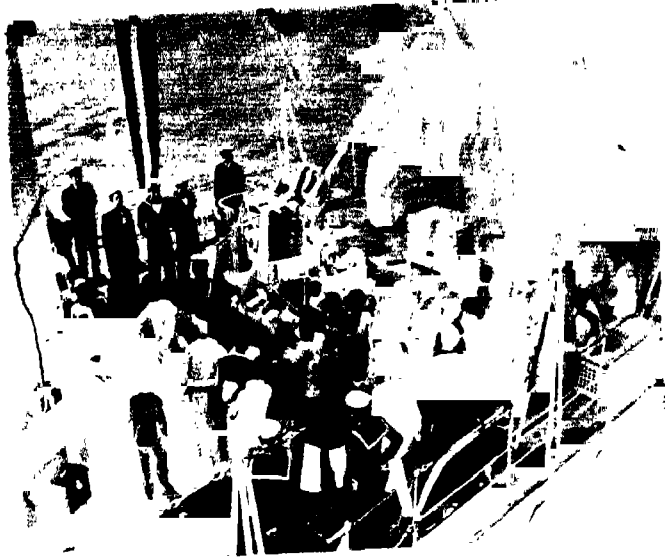
۱ : پاکستانی بحریہ کا بینڈ (فریئر ہال کراچی)
۲ : عوام دن بھر پاکستانی بحریہ کے جہازوں کو دیکھنے کے لئے آتے رہے۔
۳ : فضائیہ پاکستان کے جہازوں کو دیکھنے کے لئے عوام کا ہجوم (ماری پور)
۴ : طیاروں کے ماڈل بنانے کا مظاہرہ۔

۳ :

۱ :

۲ :

حمیدالرحمان

مشرقی پاکستان کا ایک فنکار

(ملاحظہ ہو مضمون صفحہ ۵۵)

۱ : نقاش اپنے اسٹوڈیو میں (ڈھاکہ)

۲ : کسان (ایک تصویر)

۳ : ایک درخت (سیاہ و سفید)

۳ :

ناول کا ایک باب:

ماضی

خدیجہ مستور

اس دن اسکول کی نگراں نے گھر آنے کو کہا تھا۔ اماں اور آپا سارا دن گھر سجاتی رہیں۔ دیواروں میں تنے ہوئے مکڑی کے جالے تک صاف کئے گئے۔ علوی بھائی گیندے اور گل عباسی کے پھول لے آئے جو نیلے گلدانوں میں سجا دئے گئے۔ خانساماں نے بالٹیاں بھر بھر کر صحن دھویا اور وہاں مہندی کے درخت کے پاس آرام کرسیاں اور میز بچھا دی گئی۔ میز پر آپا کے ہاتھوں کا کڑھا ہوا سب سے خوبصورت میز پوش بچھایا گیا۔ چائے کے لئے نیا جاپانی سٹ نکالا گیا۔ وہ سٹ اسی وقت نکالا جاتا تھا جب خاص قسم کے مہمان آتے۔ چائے کے ساتھ کھانے کو کئی چیزیں تلی گئیں۔ اماں اس دن بے حد خوش اور مسرور نظر آ رہی تھیں۔ دوپہر میں انہوں نے نہ خود آرام کیا نہ خانساماں کو کمر ٹکانے دی۔

"بھئی حد ہے، انگریز ہو کر خود ہمارے گھر آنے کو کہا۔" اماں بار بار آپا سے کہتیں اور کھِل جاتیں۔

اماں کی اس بات پر اس نے کئی بار محسوس کیا تھا کہ علوی بھائی اپنی مسکراہٹ کے لئے ہونٹ کھینچ لیتے ہیں۔

"میرا خیال ہے کہ زیادہ لوگوں کو چائے پر نہ شریک ہونا چاہئے وہ انگریز ہے، شاید اسے پسند نہ کرے۔" چار بجنے میں جب تھوڑی سی دیر رہ گئی تو اماں نے تیوری پر بل ڈال کر اپنے حساب بڑی عام سی بات کی اور علوی بھائی اسی وقت اپنے کمرے میں چلے گئے۔

ٹھیک چار بجے مسز ہاورڈ آ گئیں۔ اماں اور آپا نے ان کا خیر مقدم کیا۔ مسز ہاورڈ کی نیلی کانچ کی گولیوں جیسی آنکھیں، گھوم گھوم کر گھر کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ کرسی پر بیٹھتے ہی جلدی جلدی بولنے لگیں۔

"آپ لوگوں سے مل کر ہم بہت خوش ہوا ہے، آپ کا گھر بڑا اچھا ہے، بڑا صاف ہے، دوسرا یہاں کا لوگ تو بڑا گندا گھر رکھتا ہے، بڑا ہما بیگم بھی گھر صاف نہیں رکھتا، ہم پھر ضرور آئے گا آپ لوگ کے پاس۔"

"ہاں! اس ملک کے لوگ بڑے گندے ہوتے ہیں، ہماری بھابی، یعنی ہمارے بھائی کی بیوی انگریز ہے۔" اماں نے بڑے فخر سے کہا۔

"اچھا!" نیلی کانچ کی دونوں گولیاں مارے حیرت کے گول سی نظر آنے لگی تھیں۔

مسز ہاورڈ کی گہری نیلی آنکھیں اسے کتنی پیاری لگتی تھیں۔ اسکول میں جب وہ ان کے کمرے میں جاتی تو چپکے چپکے ان کی آنکھوں کو دیکھتی رہتی۔

"یہاں کی عورتیں مرغیاں پالتی ہیں، اور ان کی گندگی۔" اماں جانے اور کیا کہتیں کہ آپا بیچ میں بول اٹھیں۔

"اب چائے پی جائے۔"

جب سے علوی بھائی اماں کی بات پر اپنے کمرے میں چلے گئے تھے اس وقت سے آپا بیزار ہو رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر اچانک تھکن کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔

"ہاں ہاں تہمینہ بیٹی خانساماں سے کہو۔" چائے کے نام پر اماں بوکھلا گئیں۔ ان کا چہرہ پھیکا پڑ گیا جس وقت ابا دفتر جا رہے تھے تو اماں نے ان سے کئی بار کہا تھا کہ چائے کے وقت پہنچ جائیں تاکہ مسز ہاورڈ سے انگریزی باتیں کر کے اسے خوش کر سکیں۔

"تم ہمارے پاس بیٹھنا مانگتا عالیہ؟" مسز ہاورڈ نے پیار سے دیکھا اور وہ آپا کے پاس سے سرک کر ان کے قریب بیٹھ گئی۔ مگر جیسے ہی چائے پیالیوں میں انڈیلی گئی تو وہ جلدی سے ایک پیالی اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ اماں نے گھور کر دیکھا مگر وہ علوی بھائی کے کمرے کی طرف لپک گئی۔

علوی بھائی اپنے کمرے میں اوندھے منہ پڑے تھے۔ وہ جانے اس وقت کیا سوچ رہے تھے۔ کمروں کے اندر کتنی جلدی شام

ہو جاتی ہے، ان کے کمرے میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا — "علوی بھائی چائے" اس نے پیالی میز پر رکھ دی۔

"ارے واہ —" وہ اٹھ کر بیٹھ گئے — "عالیہ بٹو، تم بھی میرے ساتھ پیو"

"نہیں! مسز ہاورڈ کے ساتھ پیونگی"

وہ باہر آ گئی۔ مسز ہاورڈ مزے لے لے کر شامی کباب کھا رہی تھیں اور مرچیں آنسوؤں کی شکل میں ٹپک رہی تھیں۔

"آپ کا لڑکی بڑا ہوشیار ہے، خوب پڑھتا ہے" مسز ہاورڈ نے اس کی تعریف کی تو وہ شرما گئی۔

"جی ہاں، ہماری لڑکی بہت ہوشیار ہے، ویسے یہاں کی لڑکیاں بڑی کوڑھ مغز ہوتی ہیں، پڑھنے کے نام سے بھاگتی ہیں۔ ہندوستانی لوگ اپنی لڑکیوں کو جاہل رکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ اماں پھر ترنگ میں آ گئی تھیں۔

"کوڑھ مغز؟" مسز ہاورڈ نے سمجھنا چاہا۔

"ڈل ہوتی ہیں"

"اور آپ کی اس لڑکی نے کتنا پڑھا؟" مسز ہاورڈ نے ہنس کر پوچھا۔

"دس درجے، پھر بیمار پڑ گئی" اماں نے کہا۔

آپا اس پورے وقت کو خاموشی سے گزارتی رہیں۔ انہوں نے مسز ہاورڈ سے ایک بات بھی تو نہ کی۔

شام سنولا چکی تھی۔ بسیرا لینے والے پرندوں کی قطاریں جانے کس سمت اڑی جا رہی تھیں۔ مسز ہاورڈ بوکھلا کر اٹھ گئیں۔

"آپ کا صاحب نہیں آیا، ہمارے کو اس سے ملنے کا بڑا شوک تھا۔ کہیں چلا گیا ہوگا دفتر کے کام کو؟"

"جی ہاں، جی ہاں آج ان کے ایک دوست مر گئے تھے اس لئے ان کے گھر گئے ہوں گے"

اماں اس سے بڑا اور کیا بہانہ کر سکتی تھیں۔ ایک انگریز عورت کے ساتھ چائے نہ پی سکنے کی کوئی بڑی وجہ ہی ہو سکتی تھی۔

مسز ہاورڈ کے جاتے ہی اماں جیسے جھنجلا اٹھیں۔

"دیکھا، چائے پر نہیں آئے نا، وہ تو کہو مجھے اچھا بہانہ یاد آ گیا ورنہ کیا سمجھتیں مسز ہاورڈ، دیکھ لینا یہ اپنی نفرت کے

پیچھے کچھ کر کے رہیں گے۔ بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ انگریز سے زیادہ اچھا حکمراں کون ہوگا۔ اپنے لوگ تو ایسے ہیں کہ ایک دوسرے کا گلا کاٹتے رہتے ہیں، اسے کون سمجھائے اس شخص کو؟"

"کوئی کام لگ گیا ہوگا" آپا نے ابا کی صفائی پیش کی۔

"کام؟" — اماں بپھر اٹھیں — "کوئی کام نہیں ہوگا۔ ارے وہ شخص" —

اماں جانے اور کیا کچھ کہتی رہیں — وہ جلدی سے علوی بھائی کے پاس چلی گئی۔ چائے کی پیالی اسی طرح میز پر رکھے رکھے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ علوی بھائی لالٹین کی پیلی پیلی روشنی میں عجیب سے لگ رہے تھے۔

"علوی بھائی آپ نے چائے نہیں پی"

"ارے تو کیا میں نے نہیں پی" وہ پیالی اٹھا کر پانی کی طرح پی گئے۔

"میں نہیں بولتی آپ سے، اب پی ہے تو کیا؟" وہ کمرے سے نکل رہی تھی تو علوی بھائی پکار رہے تھے مگر اس نے جواب تک نہ دیا۔

جب کافی اندھیرا ہو گیا تو خانساماں نے میز کرسیاں ہٹا کر پلنگ بچھا دئے۔ خانساماں تھکن سے چور ہو رہی تھیں اور افیون کے نشے سے آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ ان کے ہر مرض کا علاج صرف افیون سے ہوتا تھا۔ ننھی سی کالی گولی نگلتے ہی وہ سارا دن کی دُردُر پھٹ پھٹ بھول جاتیں، تھکن غائب ہو جاتی اور وہ ملکہ جیسی شان سے سو جاتیں۔

خانساماں بستر لگا کر باورچی خانے میں گئیں تو ابا آ گئے۔ اماں انھیں دیکھتے ہی بکھر گئیں۔

"اب آئے ہیں خانصاحب، کیا وہ نہ سمجھتی ہوں گی کہ آپ کو ان کا آنا برا لگا، حد ہے، وہ انگریز ہو کر ہمارے گھر آئے اور صاحب بہادر پروا بھی نہ کریں۔ اگر وہ رپورٹ کر دے کہ جناب نے اس سے بدسلوکی کی ہے تو پھر ہوش ٹھیک ہو جائیں گے" اماں نے اتنی زور سے پاندان بند کیا کہ خانساماں گھبرا کر باورچی خانے سے باہر نکل آئیں۔

"اب وہ زمانے لد گئے جب تمہارے انگریز کے نام سے تھرتھری چھٹتی تھی، یہ دوسری بات ہے کہ میں کچھ نہ کر سکوں تو کیا

نفرت بھی نہیں کرسکتا ـــــ ابا نے سختی سے کہا ـــــ "یہ بدنیت
تاجر، یہ حکمراں کیا مجھے تو ان کی ساری قوم سے نفرت ہے۔ اگر میرا
دماغ بڑے بھائی جیسا ہوتا تو پھر دیکھتا، مگر میں تو بندھا ہوا ہوں
نوکری کرنے پر مجبور ہوں۔"

"ہوں! وہ تو میں جانتی ہوں کہ تم ہر وقت سب کو بھوکا
مارنے پر تلے ہوئے ہو۔"

"یہی تو وجہ ہے کہ نوکری کر رہا ہوں ورنہ میں تو بڑے بھائی کی طرح
دکان کرکے بیٹھ جاتا مگر تم تو سب کچھ اپنے بھائی کے پاس رکھ آئیں، وہ
بڑا دیانت دار آدمی ہے، اس کی بیوی انگریز ہے۔"

"میں نے دس دفعہ کہا کہ میرے بھائی بھاوج کا نام مت لیا
کرو۔" اماں ایک دم سسکیاں بھر بھر کر رونے لگیں۔

آپا بڑی خاموشی سے پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھیں، ان کی
آنکھوں میں آنسو تھے۔ میلی میلی چاندنی میں ان کے آنسو کتنے دردناک
معلوم ہو رہے تھے۔

"سب لڑو، سب لڑو، وہ گھر سے بھاگ جائے گی" ـــــ
اس نے بڑے بوڑھوں کی طرح سوچا تھا۔ لڑائی اور آنسو اس کی
روح میں لرز رہے تھے۔

وہ اپنے بستر پر اوندھی لیٹ گئی تھی اور زور زور سے سسکیاں
لے لے کر رونے لگی۔

"دیکھو بیگم، ان بچوں پر کیا اثر پڑ رہا ہے، یہ سب تباہ ہو جائیں گے
اور ـــــ"

ابا کپڑے تبدیل کرنے کے لئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اماں
نے آنسو پونچھ لئے۔

"خانسامن کھانا لے آؤ، عالیہ نہ سو جائے۔" اماں نے آواز دی۔

"میں نہیں کھاؤں گی۔" وہ زور سے چیخی اور پھر رونے لگی۔

کھانا آیا تو اس نے ابا کے نرم نرم ہتھیلیوں والے ہاتھ اپنی پیشانی
پر محسوس کئے مگر وہ سوتی بن گئی، وہ تو اس دن اعلانیہ سب سے روٹھ گئی تھی۔

دن گزرتے جا رہے تھے، گھر کی فضا دھوپ چھاؤں کی طرح
بدلتی رہتی۔ ابا کی شامیں بیٹھک میں گزرتیں، دوستوں کے جمگھٹ میں
وہ زور زور سے باتیں کرتے۔ خانسامن چائے بنا بنا کر باہر لے جاتے
ہوئے چپکے چپکے بڑبڑاتی رہتیں اور اماں جیسے بڑے اضطراب کے ساتھ
ادھر ادھر پھرتی رہتیں یا کسی کئے ہوئے کام کو پھر سے کرنے لگتیں۔ آپا
بدستور خاموش رہتیں اور کسی کتاب کے ایک ہی صفحے کو پڑھے چلی
جاتیں۔

خدا جانے آپا اتنا کم کیوں بولتی تھیں۔ کیا محبت لوگوں کو
گونگا بنا دیتی ہے؟ کیا محبت کا نام الفاظ کی موت ہوتا ہے؟ پھر لوگ
اتنی گھٹیا چیز کے پیچھے کیوں بھاگتے ہیں؟ آپا تم کتنی معصوم تھیں۔

گھر کے اسی دردناک ماحول سے گھبرا کر وہ بیٹھک کے دروازے
پر جا کھڑی ہوتی۔ نہرو، جناح، گاندھی وغیرہ کے سنے ہوئے ناموں کے
علاوہ اس کی سمجھ میں صرف اتنا ہی آتا کہ سب انگریزوں کی برائی کر رہے
ہیں۔ اسے کوئی بھی مزے کی بات نہ سنائی دیتی۔ اس کے ابا اسے
دیکھتے ہی اندر جانے کا حکم دیتے۔ علوی بھائی اس کے آنکھوں آنکھوں
میں کئے ہوئے اشارے سمجھنے سے انکار کر دیتے۔ وہ بھی تو شام کے وقت
بیٹھک سے اٹھنے کا نام نہ لیتے تھے۔

وہ رنجیدہ ہو کر باہر چبوترے پر جا بیٹھتی اور اسے اپنی پہلی جگہ
یاد آنے لگتی۔ کتنی دور رہ گئی تھی وہ جگہ، وہاں سے آتے ہوئے ٹرین کی
کھڑکی کے پاس بیٹھ کر اس نے اتنے درخت گنے تھے کہ سارے حساب
نے دم توڑ دیا تھا۔

جیٹھ کا مہینہ تھا۔ سارا دن لو چلتی رہتی، آموں اور پیپل کے
درختوں میں چھپے ہوئے پرند سارا دن شور مچاتے رہتے۔ صحن میں لگا ہوا
مہندی کا چھوٹا سا درخت سوکھ چلا تھا۔ خانسامن لاکھ پانی ڈالتیں مگر
اس کی پتیوں پر رونق نہ آتی۔ چاندنی راتوں میں ٹھاکر صاحب کے
گھر سے کسم دیدی کے ہارمونیم پر گانے کی آواز آتی تو آپا اٹھ کر ٹہلنے
لگتیں۔ کسم دیدی ان دنوں ایک ہی گیت گوئے جاتیں۔

اماں ابا کے انتظار سے تھک کر آپا سے باتیں شروع کر دیتیں،
وہی علوی خاندان سے دشمنی کی داستانیں، بجو پھوپی کی خود غرضی کے
قصے، بھائی اور بھاوج کے محبت بھرے گیت۔ آپا پلکیں جھکا جھکا کر
سب کچھ سنتیں مگر خود کچھ نہ کہتیں۔ ابا کی بیٹھک جب سونی ہوتی تو وہ
کسی دوست کے گھر چلے جاتے اور دس گیارہ سے پہلے واپس نہ آتے۔

رات سونے سے پہلے وہ علوی بھائی کے پاس چلی جاتی۔ باہر
چبوترے پر ان کا پلنگ بچھا ہوتا جہاں وہ خاموش پڑے کچھ سوچتے رہتے۔
"علوی بھائی کہانی سنائیے۔" وہ جاتے ہی فرمائش کرتی اور

ان کی کمر سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتی۔ علوی بھائی اپنے بچپن میں سُنی ہوئی کہانیاں یاد کرنے لگتے اور جب کہانی یاد آجاتی زور سے ہنسنے لگتے۔ وہ ہمیشہ ایک شہزادی اور ایک غریب آدمی سے کہانی شروع کرتے تھے۔ غریب آدمی شہزادی کو نہ پاسکنے کے غم میں مر جاتا تھا۔

"علوی بھائی آپ تو کسی شہزادی سے شادی نہیں کریں گے۔" ایک بار اس نے بڑی فکر سے پوچھا تھا۔

"لاحول ولا، میں کیوں مروں گا بھئی۔" وہ اس قدر ہنسے تھے کہ وہ جھنپ کر رہ گئی تھی۔

گرمیوں کی چھٹیاں گزرتی جا رہی تھیں۔ وہ خوش تھی کہ اسکول کھلنے کے دن قریب آ رہے ہیں۔ جتنا وقت اسکول میں گزرتا وہ خوش رہتی ساری دنیا کو بھول جاتی۔

اس دن دوپہر میں جب وہ سو رہی تھی تو اماں کے زور زور سے باتیں کرنے کی آواز نے اسے جگا دیا تھا۔ ابا کی آواز مدھم مگر جھلائی ہوئی تھی۔ وہ گھبرا کر دالان میں آگئی جہاں آپا پہلے سے کھڑی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر بات کیا ہے۔

ذرا دیر بعد باہر سے ٹھاکر صاحب کی آواز آئی اور ابا باہر چلے گئے، آپا ابا کے باہر جانے سے پہلے ہی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

"اس گھر میں علوی دولھا بن کر اسی وقت آئے گا جب میری لاش نکل جائے گی۔" ابا نے جاتے جاتے اماں کی بات ایک لمحے کو رک کر سُنی اور پھر چلے گئے۔

ابا جیسے ہی بیٹھک میں گئے اماں نے آکر آپا کو لپٹا لیا۔

"دیکھ لینا میں زہر کھا لوں گی، وہ تم کو اس کمینے علوی کے ساتھ بیاہنے کی سوچ رہے ہیں، ہائے ان کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے، یہ اس شخص سے شادی کریں گے جس کے باپ دادا نے خاندانی عزت لوٹ لی، میرا راج پاٹ چھین لیا۔" اماں روتے روتے پلنگ پر بیٹھ گئیں ——— "اب اس کمینے کو بی اے کرنے کے لئے علیگڑھ بھیج رہے ہیں، میں آج ہی تمہارے ماموں کو خط لکھوں گی، پھر دیکھوں گی کہ سب کچھ کیسے ہوتا ہے۔"

وہ ڈر گئی کہ ماموں میاں جانے کیا کریں گے، مگر پھر یہ سوچ کر اسے کچھ تسلی ہوئی کہ اماں تو ہمیشہ ہی ماموں میاں کو خط لکھا کرتی ہیں مگر وہ دو تین مہینے بعد ہی جواب دیتے ہیں۔

"تمہاری دادی بے شرم تھیں جو علوی کے باپ کو داماد بنا کر اب تک زندہ بیٹھی ہیں، میں تو اسی وقت زہر کھا لوں گی۔"

"آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں، کچھ بھی نہ ہو گا۔" آپا جیسے کنوئیں کی تہ سے بولیں، ان کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔

اے ہمارے آسمانی باپ تو ہمارے گھر سے لڑائیاں ختم کرا دے! علوی بھائی کے کمرے میں جاتے ہوئے وہ چپکے چپکے دعا کر رہی تھی مس مری کی یاد کرائی ہوئی یہ دعا اسے بہت سے دکھوں سے نجات دلا دیتی تھی۔

کمرے میں جا کر دیکھا کہ وہاں تو علوی بھائی بھی رو رہے تھے۔ کچھ نہیں کرتا یہ آسمانی باپ بھی! وہ آسمانی باپ سے بھی روٹھ گئی تھی اور روتے ہوئے علوی بھائی سے لپٹ گئی۔

"سب رو رہے ہیں۔ اللہ کرے میں مر جاؤں۔" وہ بہت سنجیدہ ہو رہی تھی۔

"ارے میں تو علیگڑھ جا رہا ہوں نا، اس لئے رو رہا ہوں۔ مجھے اپنی عالیہ بٹیا یاد آئے گی۔" انہوں نے ہنستے ہوئے آنسو پونچھ لئے۔ تم دس گیارہ سال کی ہو کر کتنی بڑی ہو گئی ہو۔" انہوں نے قہقہہ لگایا۔

"مجھے معلوم ہے سب جھوٹ بول رہے ہیں۔"

علوی بھائی صرف ایک ہفتے بعد علیگڑھ جا رہے تھے۔

ایک ہفتہ ماہ پوس کے سورج کی طرح جلدی جلدی ڈوبا جا رہا تھا اور وہ بیتتے ہوئے دنوں کو انگلیوں پر گنتی رہ جاتی۔ وہ کتنی رنجیدہ رہنے لگی تھی۔ اسے یقین تھا کہ آپا کے بعد صرف علوی بھائی اس کا خیال کرتے ہیں۔ آپا خاموشی سے محبت کرتی ہیں، مگر علوی بھائی تو اس کے ساتھی ہیں جن سے وہ کھیلتی ہے کہانیاں سنتی ہے۔ وہ چلے جائیں گے تو پھر وہ کیا کرے گی؟

علوی بھائی نے یہ دن اپنے کمرے میں بند ہو کر گزار دئے۔ ان دنوں آسمان پر بادل چھانے لگے تھے۔ بھیگی بھیگی ہوائیں چلتی رہتیں۔

اماں نے علوی بھائی کی صورت دیکھنے سے انکار کر دیا تھا۔

ابا نے اماں سے بات کرنی چھوڑ دی تھی۔ وہ دس گیارہ بجے رات تک انگریز دشمنی کے زبانی اظہار میں مصروف رہتے۔ آپا کا مطالعہ بہت ترقی کر گیا تھا۔ وہ جو کچھ پڑھتیں اسے حفظ کرنے لگی تھیں۔ گھنٹوں گزر جاتے مگر صفحہ الٹنے کی نوبت نہ آتی۔

وہ گھر کے ماحول سے گھبرا کر باہر چبوترے پر جا بیٹھتی جہاں

چپراسی بیٹھا گڈگڑی پیا کرتا۔ وہ چپراسی سے باتیں کرنے لگتی۔

"تم اپنی بیوی کو کیوں مارتے ہو؟ ایں؟" شاید ہی کوئی دن جاتا جب وہ اپنی بھولی بھالی جاپانی سی گڑیا کو نہ پیٹتا ہو۔ کئی دفعہ تو اس کا جی چاہا تھا کہ چپراسی کو اتنا مارے کہ بس مر کر رہ جائے مگر اماں کا حکم تھا کہ کمینوں کے معاملات میں دخل نہ دیا جائے۔

"بٹیا رانی جب تک عورت کو مارو نہیں نہ وہ سیدھی نہیں رہتی" وہ بڑی سنجیدگی سے کہتا۔

"تمہارے ابا تمہاری اماں کو بھی مارتے ہوں گے" جب وہ پوچھتی تو وہ ذرا دیر کو چپ رہ جاتا۔

"ہاتھ پاؤں نہ توڑ دیتا اس کے"

"ارے تو کیا تمہاری اماں عورت نہیں تھی؟"

"وہ تو اماں تھی"

"تمہاری کتنی تنخواہ ہے؟"

"پندرہ روپے"

"تم نے اپنا گھر اینٹوں کا کیوں نہیں بنایا؟"

"ہم غریب جو ہیں بٹیا، پکا گھر بنا کر بابو لوگوں کی برابری تھوڑی کرسکتے ہیں"

اسے ایک دم علوی بھائی کے ابا یاد آ جاتے جو جیتے جی کسی سے عزت نہ کرا سکے۔ اسے وہ ساری کہانی یاد آنے لگتی جو اماں نے کتنی بار آپا کو سنائی تھی۔ اس کا کلیجہ دکھتا تو وہ اٹھ کر علوی بھائی کے پاس چلی جاتی مگر وہ تو ان دنوں بات کرنا بھول گئے تھے۔

دوسرے دن صبح علوی بھائی علیگڑھ جا رہے تھے۔ ان کا سامان بندھا رکھا تھا۔ کمرہ بالکل، جاڑ معلوم ہو رہا تھا۔ اماں اس دن بڑی بیتابی سے سارے گھر میں ٹہلتی رہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر خانسامن کو ڈانٹتیں اور آپ ہی آپ بڑبڑاتی رہیں۔

"گھر سے نکالنے کے بجائے اسے پڑھنے کو بھیجا جا رہا ہے، اس مردود کو ہماری دولت سے پڑھا کر، ہمارے سر پر بٹھانا چاہتے ہیں۔ اللہ اسے واپسی نصیب نہ کرے!"

شام کو ابا علوی بھائی کے کمرے میں گئے اور بڑی دیر بعد باہر نکلے، پھر بیٹھک میں چلے گئے۔ اتنی دیر اماں تلملائی تلملائی پھرتی رہیں۔

وہ رات بڑی اندھیری تھی۔ آندھی بارش کے آثار تھے۔ اس رات دالان میں بستر لگائے گئے تھے۔ کھانے کے بعد سب لوگ لیٹ گئے۔ بڑے طاق میں رکھی ہوئی لالٹین کی بتی نیچی کر دی گئی۔

سونے سے پہلے اس نے بڑے انہماک سے دعا کی تھی کہ آسمانی باپ علوی بھائی کو روک لے۔ صبح کبھی بھی نہ ہو۔ اس دعا کے بعد وہ سو گئی تھی۔

صبح کے خوف نے ایک بار اس کی آنکھ کھول دی تھی۔ اس نے دیکھا کہ آپا علوی بھائی کے کمرے کی طرف سے دبے قدموں آ رہی ہیں۔ پھر وہ اپنے بستر پر لیٹ گئیں۔ اس نے ان کی دھیمی سی سسکی کی آواز سنی تھی اور پھر سو گئی۔

علوی بھائی صبح تانگے پر بیٹھ کر چلے گئے۔ جانے سے پہلے وہ اماں کے پاس آئے تھے۔ ذرا دیر کھڑے رہے مگر جب اماں نے ان کی طرف دیکھا تک نہیں تو خانسامن کی دعائیں لیتے چلے گئے۔

وہ دروازے تک ان کے ساتھ گئی مگر جب تانگہ کچی سڑک پر دھول اڑاتا چل دیا تو وہ ابا کی ٹانگوں سے لپٹ کر رونے لگی۔ وہ پہلا موقعہ تھا کہ وہ ابا کی ٹانگوں سے لپٹ گئی تھی۔ اور وہ سر پر ہاتھ پھیر رہے تھے ورنہ ابا کو فرصت ہی کب ملتی جو کسی سے محبت کا اظہار کرتے۔ انگریز دشمنی نے ساری محبتوں کو کھا لیا تھا۔

دوپہر کو سیم دیدی آگئیں جو چپکے چپکے آپا سے باتیں کرتی رہیں۔ شام کو چائے کے بعد ابا نے اماں سے پورے بننے کے بعد بات کی تھی۔

"جب وہ بی اے کر لے گا تو وہ کام ضرور ہوگا" سمجھ گئیں۔

"ہم بھی دیکھیں گے" اماں کی آواز میں چیلنج تھا۔

★

بنگلا افسانہ :

دھوپ چھاؤں

ابوالکلام شمس الدین

ترجمہ : احمد سعدی

ایک روز وہ اچانک وہاں آگیا تھا۔

سردیوں کی رات تھی اور باورچی خانہ کے سامنے آنگن میں الاؤ جل رہا تھا اور وہ سب الاؤ کے قریب بیٹھے ہوئے بات چیت کر رہے تھے۔ قاسم خاں اس کی ماں، بہن، اور دو کاشتکاروں نے تھوڑی دیر قبل ہی رات کا کھانا ختم کیا تھا اور اس کے بعد سب الاؤ کے پاس بیٹھ کر آگ سے اپنے اپنے ہاتھ پاؤں سینک رہے تھے۔ ٹھیک اسی وقت یکایک انہیں کسی کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔

تھوڑی دیر پہلے کچہری کے مکان کے قریب کتے بھونکتے رہے، ان کے چپ ہو جانے کے بعد رات کا سناٹا اور بھی گہرا ہو گیا تھا، اس عمارت کے چاروں کونوں میں چار مکان بنے ہوئے تھے، مگر دوسرے اور تیسرے مکان میں رہنے والے سو چکے تھے اس لئے یکایک کسی کی کھانسی کی آواز سن کر وہ بھی چونک اٹھے اور قاسم خاں کی پندرہ سالہ بہن اپنی ماں کے قریب کھسک کر بیٹھ گئی۔

"کون ہے"؟

پچیس سالہ قاسم خاں مضبوط اور گٹھے ہوئے جسم کا آدمی تھا۔ اس کی آواز بھی کافی کرخت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اسے دوبارہ اپنا سوال دہرانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ بانس کے گھیرے کے اس پار سے کسی نے نحیف آواز میں جواب دیا "میں ہوں"!

یہ آواز کسی کی بھی پہچانی ہوئی نہیں تھی۔ قاسم خاں سبھوں کا منہ دیکھنے لگا۔ اس کے بعد اس نے اپنی ماں اور بہن کو گھر کے اندر جانے کا حکم دے کر کہا "اس طرف آیئے تو دیکھوں"۔

کھجور کے پتے کا دروازہ دھکیل کر انیس بیس برس کا ایک سیاہ فام نوجوان اندر آکر کھڑا ہو گیا۔ مرجھایا ہوا چہرہ، ایک لاٹھی میں بندھی ہوئی گٹھری اس کی پشت پر جھول رہی تھی اور آنکھوں سے تھکن ظاہر ہو رہی تھی، بائیں ہاتھ سے لاٹھی پکڑ کر اس نے دایاں ہاتھ بند کیا اور سہمی ہوئی آواز میں کہا "السلام علیکم"

سلام کا جواب دیتے ہوئے قاسم خاں نے ایک مونڈھا اس کی طرف بڑھا دیا۔ "آپ کو میں نے نہیں پہچانا"۔

وہ مونڈھے پر نہیں بیٹھا۔ اس نے پتوں کی ڈھیری سے تھوڑے سے پتے اٹھا کر الاؤ کے قریب بچھا دئے اور انہی پر بیٹھ گیا۔

"میں پردیسی آدمی ہوں، میرا مکان ترکا بندر میں ہے، آپ مجھے کیسے پہچانیں گے"؟ اس نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے سب کی طرف دیکھ کر کہا "بندر رحیم کی سمت پریسیڈنٹ کے مکان کے قریب ہی میرا مکان ہے۔ میرے والد کا نام اصغر علی ہے، چار پانچ سال پہلے ان کا اس طرف آنا جانا تھا، شاید آپ انہیں پہچانتے ہوں"؟

"کون اصغر علی جو تالند میں احمد شریف کے یہاں کام کرتے تھے"؟ قاسم خاں کے کھیتوں میں ہل جوتنے والے کاشتکار نے پوچھا۔

"ہاں، لیکن ان کا مکان کس طرف ہے، یہ مجھے معلوم نہیں۔ اس سے پہلے میں کبھی اس طرف آیا بھی تو نہیں تھا"۔

"چار پانچ سال سے تو انہیں اس طرف دیکھا ہی نہیں، آپ کے والد سے میری بڑی جان پہچان تھی"۔ تمباکو سجاتے ہوئے اس کاشتکار نے بڑی محبت اور یگانگت کے لہجہ میں نوجوان سے کہا۔ "انہیں آپ کیسے دیکھیں گے جبکہ وہ اس دنیا میں ہیں ہی نہیں"۔ نوجوان نے غمگین مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"نہیں ہیں"!

"نہیں یہاں سے جو نجارے کر گئے تھے، اسی سے ....."

"لو، تمباکو پیو"

"نہیں، نہیں۔ پہلے آپ پیجئے" نوجوان نے لجالجت بھرے انداز سے حقہ قاسم خاں کی طرف بڑھا دیا۔

قاسم خاں نے دو کش لے کر کہا "جانے دو اب بیتی باتوں کو یاد

کرنے سے کیا فائدہ۔ یہ بتاؤ اس طرف کس کام سے آئے تھے۔ کوئی عزیز یا رشتہ دار ــــ"

"نہیں، نہیں۔ میرا کوئی عزیز یا رشتہ دار نہیں۔ گھر میں صرف ایک بوڑھی دادی ہے۔ اس طرف کسی کام دام کی تلاش میں آیا ہوں۔ پوس کا مہینہ ہے۔ اگر کسی کے ہاں کوئی نوکری مل جاتی۔" اتنا کہہ کر اس نے ہچکچاتے ہوئے قاسم خاں کے ہاتھ سے حقہ لے لیا۔

وہ سیاہ فام ہوتے ہوئے بھی قبول صورت تھا اور اس کے بات کرنے کا انداز بھی بہت اچھا تھا۔ باتیں کرتے وقت مسکرانا اس کی عادت تھی۔ اس نے حقہ پیتے ہوئے کہا۔ "میں نے سوچا تھا، آبائی پیشہ اختیار نہیں کروں گا۔ تین بیگھے کھیت ہے، اسی میں دونوں آدمی کسی طرح اپنا پیٹ بھر لیں گے لیکن میں اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا اور آج مجھے بھات کی تلاش میں گھر سے باہر نکلنا ہی پڑا۔ میں شام ہی کے وقت مل چھنٹیا پہنچ گیا تھا، وہاں سے تا لند گاؤں کا نام پوچھتے پوچھتے اپنی راہ چلتا ہوا جب ایک دیہاتی بازار میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ گاؤں پیچھے ہی رہ گیا ہے۔ وہاں ایک دکاندار کی زبانی آپ کا نام سن کر یہاں چلا آیا ہوں۔ اگر آپ مجھے رات بھر ٹھہرنے کی جگہ دے سکیں تو ....."

قاسم خاں نے کہا "ٹھیک ہے ہاتھ پاؤں دھو کر آنگن میں آ کر بیٹھو۔ اسحاق تم انہیں تالاب دکھا دو۔ میں کھانے کا انتظام کرتا ہوں رات بہت زیادہ ہو چکی ہے"۔

اس گاؤں میں قاسم خاں سب سے بڑا گرہست تھا۔ اس کا خاندان کل تین افراد پر مشتمل تھا، لیکن اس کی آمدنی بہت تھی۔ صرف گاؤں میں ہی اس کی پچاس بیگھہ کاشتکاری تھی۔ جنوبی میدانی علاقہ میں بھی ایک بہت بڑا پلاٹ تھا جس میں دھان کی بہت عمدہ فصل ہوتی تھی، گاؤں کے کھیتوں کو کارندوں کے تعاون سے وہ خود کاشت کرتا تھا اور میدانی علاقہ کی زمین کارندوں کو بٹائی پر دے دیا کرتا تھا اس کے علاوہ ناریل اور سپاری کے چار پانچ باغ تھے۔ ان کے پھل چوری ہو جاتے تھے، ورنہ یہ باغات بھی معقول آمدنی کا ذریعہ تھے۔ بٹائی کے کھیتوں کے علاوہ خود کاشت زمین میں وہ جن کارندوں کے تعاون سے کھیتی کرتا تھا، انہیں میں سے ایک ان باغوں کی دیکھ بھال کرتا تھا، مگر وہ تنہا اس کام کو اچھی طرح انجام نہ دے سکتا تھا، اس لئے اس نے صادق کو بھی اپنے یہاں ملازم رکھ لیا اور کھانے کپڑے کے علاوہ دس بوجھ دھان کے عوض وہ بھی قاسم خاں کے یہاں کارندہ کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔

کھیت کا تمام دھان آہستہ آہستہ کاٹ کر آنگن میں ڈھیر کر دیا گیا رات رات بھر دُائی ہونے لگی۔ دونوں کارندوں کے ساتھ قاسم خاں خود بھی کام کرتا رہتا اور صادق لطیفے اور مزاحیہ کہانیاں سناتا رہتا۔ دوسری طرف برآمدے پر تھالی میں پان لئے ہوئے قاسم کی ماں اور بہن، رابعہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتیں۔ رات بڑھتی رہتی، کام کاج ہوتا رہتا اور جب کہانی ختم ہو جاتی تو رابعہ صادق کے ہاتھ میں پان دیتے ہوئے التجا آمیز لہجہ میں کہتی "کوئی دوسری بڑی سی کہانی سناؤ صادق بھائی"!

اور صادق پان چبا کر پیک تھوکتے ہوئے بڑے پُر جوش انداز میں کسی شہزادی کی کہانی سنانے لگتا، ایک شہزادی تھی، ڈاکوؤں نے اسے اغوا کر کے سمندر کے نیچے قید کر رکھا تھا۔ جب وہ روتی تو اس کی آنکھوں سے ٹپکے ہوئے آنسو موتی بن جاتے۔ ایک شہزادے کو جب اس شہزادی کا حال معلوم ہوا تو وہ اپنی فوج لے کر اسے قید سے چھڑانے کے لئے چل پڑا۔

کہانی یہیں تک پہنچی کہ ستارے ڈوبنے لگتے اور رابعہ گہری نیند میں بے خبر ہو جاتی، کوئی آنگن میں کھانستی تو وہ خراٹے لیتی رہتی اور پھر سبھی لوگ بیلوں کو گوہال میں باندھ کر اپنا کام ختم کر دیتے۔

جاڑے کا موسم بیت گیا۔ صادق ناریل کے باغ میں پہرہ دینے لگا۔ وہ باغ میں بنے ہوئے مکان کے پاس ناریل کے درخت کے نیچے بیٹھ کر بانسری بجاتا رہتا اور دوسری طرف تالاب کے کنارے آم کے درخت کے نیچے کھڑی ہوئی رابعہ کا دل بانسری کی آواز پہ جھومنے لگتا۔

بانسری سے پُوآد، پُوآدپوت، پُوآد پُوآد کی بلند ہوتی ہوئی آواز جیسے قیدی شہزادی کے سوگ میں گاؤں کی فضا کو سوگوار بنا دیتی، بھری دوپہری میں جب آسمان کی نیلی چھت کی وسعتوں میں چیلیں چلچلاتی ہوتیں اور ہوائیں دھیرے دھیرے چل رہی ہوتیں تو وہ ایسی مدھر اور خوبصورت لے میں بانسری بجاتا کہ اس کی آواز سن کر گاؤں میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کا دل مضطرب نہ ہو جاتا ہو۔

چیت کا مہینہ اسی طرح گزر گیا۔ بیساکھ کی پندرہ تاریخ کو صادق وہاں سے واپس آ گیا۔ اس کے بعد قاسم خاں اسے اپنے ساتھ لے کر میدانی علاقہ میں چلا گیا۔ وہاں سے بھادوں میں وہ پھر چلا دل اللہ

دھان سے کر واپس آ گیا اور اس طرح پہلا سال ختم ہو گیا۔

اس عرصے میں قاسم کے یہاں صادق کا شمار خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے ہونے لگا تھا۔ اس کے کام، اخلاق اور خوش مزاجی نے قاسم کو اس کا گرویدہ بنا لیا تھا، اور دوسرے کارندوں کے مقابلے میں وہ بالکل اپنوں کی طرح رہنے لگا تھا۔

آسن کے مہینے میں وہ اکیلا ہی میدانی علاقہ چلا گیا۔ اس بار وہ قاسم خاں کا نمائندہ تھا اور دوسرے کارندوں کو بٹائی پر زمین دینے کی ذمہ داری بھی اس ہی کے سپرد تھی۔ آسن اور کاتک کا مہینہ بھی گزر گیا، پھر اگھن آیا، پوس بیتا اور پھر ماگھ میں ان کارندوں نے جو قاسم خاں کے یہاں رہتے تھے آ کر دھان پہنچا دیا۔ ماگھ کے آخر میں قاسم کو صادق کی بیماری کی خبر ملی اور وہ اسے خود جا کر گھر لے آیا۔

صادق کا تمام جسم چیچک سے بھر گیا تھا پھر بھی قاسم خاں نے کسی خوف اور جھجک کے بغیر اسے اپنے ہی گھر میں رکھا۔

لیکن اس کی اس حرکت پر گاؤں بھر میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ قاسم خاں گاؤں بھر کو مار ڈالنا چاہتا ہے۔ چھوت کی بیماری گھر میں لے آیا ہے۔ اس بیماری میں تو کوئی ایک قطرہ پانی دینے والا بھی نہیں ملتا۔ قاسم خاں کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اپنی جان تو سب کو پیاری ہوتی ہے۔

قاسم خاں کے یہاں لوگوں کا آنا جانا بند ہو گیا اور پڑوسی وغیرہ دور سے اسے ہدایتیں دینے لگے۔ یہ بیماری بہت خطرناک ہوتی ہے قاسم خاں! اسے جلدی یہاں سے ہٹاؤ ورنہ سارا گاؤں ویران ہو جائے گا۔ کوئی کہتا، جلد اس کا کوئی انتظام کرو، ورنہ پولیس کو خبر کر دوں گا، اسے ہسپتال میں داخل کرا دو۔

ہسپتال! جہاں مریض کو ایک بڑے سے ٹوکرے میں بٹھا کر چاروں طرف سے مچھر دانی میں گھیر کر بانس میں باندھنے کے بعد جھلاتے ہوئے لے جاتے ہیں، قاسم خاں نے برسوں پہلے ایک بار دیکھا تھا۔ ٹن ٹن گھنٹی بجاتا ہوا ایک شخص آگے آگے چلا جا رہا تھا اور دو آدمی مچھر دانی سے گھرے ہوئے ایک ٹوکرے کو بانس میں باندھے ہوئے لئے جا رہے تھے۔ اس طرح تو ہسپتال میں جاتے جاتے مریض کی آدھی جان نکل جاتی ہو گی۔ دوسروں کی ہدایت پر کام کرنے کی عادت قاسم خاں کی نہیں تھی، لیکن خود صادق بھی اپنے گھر جانے کے لئے بارہا خوشامد کر رہا تھا۔

"آپ کی بڑی مہربانی ہو گی بھائی۔ جب مجھے اتنی دور لے آئے ہیں تو میرے گھر پہنچا دیجئے۔ میری بات مانئے، اس طرح اپنی موت کو دعوت نہ دیجئے، گھر جانے کو میرا دل بہت چاہتا ہے۔ سوچ کر دیکھئے، میرے یہاں رہنے سے آپ لوگوں کا کتنا نقصان ہو گا۔ میری ہی وجہ سے آپ کا تمام کام رک گیا ہے۔ آدمی نہ ملنے کی وجہ سے دھان اُبالنے اور کوٹنے کا کام بند ہے، کھلیان میں دھان پڑا پڑا سڑ رہا ہے، کھیتوں کا کام بھی رکا ہوا ہے۔" صادق کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور وہ ہانپنے لگا۔

قاسم خاں نے بڑے پیار سے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا "اچھی بات ہے، میں سوچ کر دیکھتا ہوں مجھے کیا کرنا چاہئے، تم کوئی فکر نہ کرو۔"

آخر کافی سوچ بچار کے بعد وہ اس بات پر رضامند ہو گیا کہ وہ خود صادق کو کشتی پر چڑھا کر اس کے گھر چھوڑ آئے۔ دوسرا اس کے ساتھ جانے والا کوئی نہیں تھا، دو کارندے دھان چرا کر پہلے ہی بھاگ گئے تھے، لیکن اگر وہ ہوتے تو بھی اس کے ساتھ جانے کو ہرگز تیار نہ ہوتے۔ صادق کے پورے جسم کے زخم اب پکنے لگے تھے، اس لئے قاسم کی ماں بھی اسے گھر چھوڑ آنے پر رضامند ہو گئی تھی۔ صرف ایک رابعہ تھی جو دبے ہوئے لہجے میں اس کی مخالفت کرنا چاہتی تھی، مگر قاسم خاں پر نگاہ پڑتے ہی وہ اپنا جملہ ادھورا ہی چھوڑ کر خاموش ہو گئی۔

قاسم خاں چند لمحے کچھ سوچتا رہا، پھر اس نے ہنستے ہوئے پوچھا "تم منع کرنا چاہتی ہو کیا؟"

قاسم خاں کے اس جملے میں پتہ نہیں کیا اثر تھا کہ وہ چونک کر ماں اور بھائی کا چہرہ تکنے لگی۔ آخر اس نے ہچکچاتے ہوئے آہستگی سے جواب دیا "میں کیا جانوں تم لوگوں کی جو خوشی ہو وہ کرو۔ مگر کہیں وہ راستے ہی میں مر نہ جائے۔"

اتنا کہہ کر وہ کسی کام سے باہر چلی گئی۔

قاسم خاں چند لمحے اسے جاتے ہوئے خاموش نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کہا "کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں، ٹھیک ہی کہا ہے۔ اب ڈرنے کی کونسی بات ہے ماں؟ گاؤں کے لوگ تو بلا وجہ

ہنگامہ کئے ہوئے ہیں۔ میں اسے کیوں نہیں لے جا رہا ہوں، جانتی ہو ماں۔ میرا دل کسی طرح اُسے اپنے سے جدا کرنے کو نہیں چاہتا، کیا کروں؟"

تمام دھان اب بھی ڈھیریوں کی شکل میں پڑا ہوا تھا اور صادق کو لے جانے سے پہلے ان ڈھیریوں کو اٹھا کر گھر میں رکھ دینا ضروری تھا۔ قاسم خاں خود ہی ان ڈھیریوں کو اٹھا اٹھا کر کوٹھیوں میں بھرنے لگا۔ اس کام میں ہاتھ بٹانے کے لئے اس نے اپنی بہن کو بلایا مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ماں نے کہا "شاید اس کے سر میں درد ہے، میں نے ذرا ساگ کاٹنے کے لئے کہا تھا ساگ کی بجائے اپنا ہی ہاتھ کاٹ بیٹھی۔"

پڑوسیوں نے پہلے ہی دن سے اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیا تھا اور اب تو وہ لوگ آواز دینے پر بھی کوئی جواب نہ دیتے تھے۔ قاسم خاں خود بھی انہیں بلانا نہیں چاہتا تھا۔ اگر وہ لوگ جان کے خوف سے کانپ رہے ہیں تو کانپتے رہیں۔

پھر کافی سوچ بچار کے بعد اس نے صادق کو اس کے گھر پہنچا آنے کا فیصلہ کر لیا۔ صادق خود بھی اپنی دادی کے پاس جانے کے لئے بے چین تھا۔ یکایک قاسم کا چہرہ بھی بڑا عجیب سا ہو گیا تھا۔ خدا نہ کرے اگر کہیں وہ مر گیا تو وہ اس کی دادی کو کیا جواب دے گا؟

دوسرے دن صبح کے وقت قاسم روانہ ہونے والا تھا، لیکن کام میں ایسا الجھا کہ نہ جا سکا۔ دھان اٹھا کر گھر میں رکھتے رکھتے دوپہر ہو گئی، پھر بھی کئی ڈھیریاں باقی رہ گئیں، اور اتنی جلدی ان تمام ڈھیریوں کو اٹھا کر گھر میں رکھنا اس کے لئے ناممکن تھا۔ کام کے دوران میں وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد صادق کی مزاج پرسی کر رہا تھا۔ اس دن صادق کی حالت اور بھی نازک ہو گئی تھی۔ اس کا چہرہ بے رونق ہو گیا تھا، لیکن اچانک جب قاسم کی نگاہ صادق کے کمرہ کی طرف گئی تو اس نے دیکھا رابعہ بڑی تیزی سے اس کے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

اس کی اضطراری کیفیت دیکھ کر قاسم خاں حیران تھوڑی دیر اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ صادق کے کمرہ میں اپنے سوا دوسروں کو جانے کی ممانعت کر رکھی تھی۔ اس دن وہ اپنی بہن کو صبح سے بے چینی کے عالم میں اِدھر اُدھر بھاگتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس وقت اسے یوں صادق کے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر اس کے سامنے ایک حقیقت بے نقاب ہو گئی پھر بھی اپنا شک دور کرنے کے لئے وہ ہوشیاری سے درے کی دیوار کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا اور کان لگا کر سننے لگا۔

کمرہ میں رابعہ بول رہی تھی اور اس کی آواز گلوگیر تھی۔

مجھ پر خفا مت ہو۔ تم ایسے ناسمجھ کیوں ہو۔ تم خود ہی سوچ کر دیکھو، میاں بھائی اور ماں نے میری شادی کسی بڑے گرہست کے یہاں طے کر دی ہے۔ آج اگر میں نہیں روکتی ہوں تو مجھے بے شرم بن کر تمام بات کھل کر کہنی پڑے گی، لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی اور چونکہ میں ایسا نہیں کر سکتی اسی لئے تم دادی سے ملاقات کرنے کا بہانہ بنا کر یہاں سے چلے جانا چاہتے ہو؟ مجھ پر خفا نہ ہو، غصہ نہ کرو۔ تم اگر جانا نہ چاہو تو کوئی بھی تمہیں یہاں سے نہیں لے جا سکتا۔ کہو تم نہیں جاؤ گے؟"

"اس مرض کو دیکھ کر اگر میں یہاں رہوں گا تو تم لوگوں کی جانیں بھی لے لوں گا! تم تو دیکھ ہی رہی ہو۔ جواب کیوں نہیں دیتیں؟ مجھے جانا ہی پڑے گا رابعہ ..... لیکن کہیں میں رستے ہی میں نہ مر جاؤں! نہیں، تم جاؤ، تمہیں خدا کا واسطہ، رابعہ تم میرے قریب نہ آؤ، یہ بیماری بہت خطرناک ہے۔"

"ہونے دو، کہو تم نہیں جاؤ گے؟"

"پھر وہی بچپنے کی باتیں مجھے رلائے بغیر کیا تم خوش نہیں رہ سکتیں؟ تم جاؤ کسی طرف سے کوئی آ گیا تو تمہارے لئے شرم کی بات ہو گی۔ جانے کے سوا میرے لئے کوئی چارہ نہیں۔ اگر رستے میں مر نہ گیا اور زندہ رہا تو ایک دن ضرور واپس آؤں گا۔ اس وقت تم دیکھو گی کہ اس دنیا کی کوئی طاقت ہم دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہ کر سکے گی"

قاسم خاں دھان کی ڈھیری کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحے بعد اس نے دیکھا رابعہ آنسو پونچھتی ہوئی کمرے سے نکل کر ایک طرف چلی گئی۔ ماں نے اسی وقت اُسے کھانے کے لئے آواز دی۔ اور نہانے کے بعد ماں کے بار بار بلانے پر وہ کھانے کے لئے گئی۔

قاسم خاں نے کھانا کھاتے ہوئے کہا۔ "اب دیر کرنے سے کیا فائدہ ہے ماں؟ صادق کی جیسی حالت دیکھ رہا ہوں، اس میں آج ہی شام کو یہاں سے روانہ ہو جانا بہتر ہے۔"

ماں نے دکھ بھرے لہجے میں جانے کیا جواب دیا، مگر اُدھر دھیان دئے بغیر قاسم نے آنکھ کے گوشے سے دیکھا کہ اس کی بہن نے یکایک کھانا چھوڑ دیا۔

دو چار نوالے کھانے کے بعد قاسم بھی اٹھ گیا۔ "کھانا اچھا نہیں لگتا ...."

قاسم نے صادق کو گود میں اٹھا کر کشتی میں سلا دیا اور اس کے بعد ماں کے ہاتھ سے تھیلا کو پیچھے کا سامان لے کر ایک طرف سجا کر رکھ دیا۔

جب کشتی کھلنے لگی تو صادق نے نحیف آواز میں کہا: "میرا گناہ قصور معاف کر دو گی ماں؟"

قاسم کی ماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے "یہ تم کیا کہتے ہو بابا! قصور کیسا۔ اچھے ہو جانے کے بعد پھر چلے آنا۔ مجبور ہو کر تمہیں گھر جانے دے رہی ہوں، ورنہ...."

صادق نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے رابعہ کو مخاطب کیا۔

"میں جا رہا ہوں رابعہ!"

"رابعہ یہاں نہیں ہے"، قاسم نے کشتی پر کھڑے ہو کر لگی اٹھاتے ہوئے کہا۔

قاسم کی ماں نے کئی آوازیں دیں، لیکن رابعہ کا کہیں پتہ نہ تھا۔

"نہیں آئی"۔ صادق کی نحیف آواز میں جتنا اشتیاق تھا اس کی آنکھوں میں اتنی ہی مایوسی تھی۔

"نہیں!"

کشتی کھلنے کے بعد قاسم کی ماں نے کہا "تم اسے پہنچا کر لوٹ آؤ گے، سمجھے قاسم۔ ورنہ مجھے بڑی فکر لگی رہے گی!"

"اچھا"

نہر کا پہلا موڑ گھومنے کے بعد ہی قاسم کا گھر چھپ گیا۔ اس کے گھر کے قریب ہی نہر تھی اور نہر کے کنارے اسی کا بنایا ہوا رستہ بہت دور تک جانے کے بعد ضلع بورڈ کی سڑک سے مل گیا تھا۔ رستے کے کنارے قاسم نے اپنے ہی ہاتھوں سے بیر، ناریل، جامن اور آم کے درخت لگائے تھے۔

نہر کا پانی بیلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس لئے کشتی کو آگے بڑھانے میں اسے بڑی دقت ہو رہی تھی۔ کشتی پانی کی بیلوں میں بری طرح الجھ گئی تھی اور ان بیلوں کی گرفت سے اس کو چھڑانے میں وہ زور زور سے ڈول رہی تھی۔

بڑی مشکلوں سے وہ تھوڑی ہی دور تک کشتی کو آگے بڑھا کر لے گیا تھا کہ یکایک کسی کے پھوٹ پھوٹ کر رونے کی آواز سن کر قاسم نے چونک کر کنارے کی طرف دیکھا۔ جنگل گابھ کے درخت کے قریب ایک جھاڑی سے ٹیک لگا کر اپنی آنکھوں کو آنچل سے چھپائے رابعہ تیزی سے گھر کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔

قاسم کو ایسا محسوس ہوا جیسے لگی تھامے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ شل ہو گئے ہوں۔ اس نے پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھا۔ اس کی ماں بھی اس وقت تک کنارے پر کھڑی ہوئی اسی کی طرف دیکھ رہی تھی اور رابعہ اس کے قریب سے ہوتی ہوئی گھر کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔

قاسم نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کشتی کا رخ گھر کی طرف موڑ دیا "رہنے دو۔ میں نہیں جاؤں گا۔"

قاسم کی آواز سن کر یکایک رابعہ کے قدم رک گئے اور اس کے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔

لیکن جس کے لئے یہ سب کچھ ہو رہا تھا، جب قاسم نے اسے گود میں اٹھانا چاہا تو دیکھا کہ وہ مر کر پتھر کی طرح بے جان اور برف کی طرح سرد ہو گیا تھا!

سوکھے پتّے

رفعت شفیع

الماریوں میں چند روز ہوئے تارکول کا ہلکا سا حاشیہ کروایا تھا تاکہ گئی برسات کی طرح آنے والی برسات میں ورق چاٹنے والے جرثومے نہ پیدا ہو جائیں آج میں نے تارکول پہ ہاتھ لگا کر دیکھا۔ وہ بالکل خشک تھا اور میں نے کتابوں کو دوبارہ الماریوں میں بند کرنا چاہا مگر پرانی ترتیب پسند نہ آئی۔ حالانکہ پرانی ترتیب میں میرے ماضی کی داستانیں ہیں اور میں اپنے ماضی سے محبت کرتی ہوں۔ مگر اب شاید ماضی کے تمام نقوش میرے سینے میں اتنے گہرے ہو چکے ہیں کہ اُن کے لئے مجھے کبھی کسی نمائشی نشانی کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی۔ اس لئے سوچا لاؤ آج نئی ترتیب سے رکھوں۔ اور میں نے گنگناتے ہوئے پیار سے اپنی کتابوں کے چہرے رومال سے صاف کئے اور الماری میں لگانے لگی۔ کتابیں، چھوٹی بڑی کتابیں، رسائل، موٹی موٹی جلدوں کے رسائل۔ جن میں میری نشانیاں تھیں۔ وقت بے وقت رکھی ہوئی پھولوں کی پنکھڑیاں، ٹافی کے رنگین چمکیلے ورق، چرمی فیتے، پلاسٹک کے رنگین ربن، کہیں کاغذی پرزوں پر خود میری تحریر۔ میں انہیں نکالے بغیر جوں کی توں رکھے چلی جاتی یہ چیزیں جو میرے لئے پرانے سکوں کا درجہ رکھتی ہیں، میں اُن کے چہرے پڑھ کر اپنے ماضی کی داستانیں آج بھی دہرا سکتی ہوں مگر انہیں دیکھ کر میرے ہونٹوں پر تبسم لہراتا رہا۔ میرے ہاتھ لرزتے رہے اور ذہن میں ماضی کی چاندنی اور اندھیروں سے جال بُنا جاتا رہا..... ہاں میرے ماضی کی چاندنی اور اندھیرے یہ میرے اعصاب کی کمزوری تھی یا تحت الشعور کی کوئی دکھتی ہوئی یاد کہ اچانک یہ گلابی جلد کی کتاب میرے ہاتھ سے پھسل گئی اور اوراق منتشر ہو گئے۔ میں انہیں سمیٹنے کے لئے جھکی تو میرے ہاتھ میں یہ چند سوکھے پتے آگئے اور میں وہیں بیٹھ گئی۔

بظاہر یہ خشک پتے محض بے جان سوکھی فرسودہ چیزیں مگر جانے کیوں مجھے محسوس ہوا گویا یہ کسی مردہ عہد کے چند نوادرات میرے ہاتھ لگ گئے۔ جیسے یہ میرے اُن خیالوں کی تشکیل ہیں جو عرصہ ہوا میرے ذہن میں ابھرے اور پھر برسوں پہلے کا ماضی مجھے اُن پتّوں پر رقص کناں نظر آیا۔ اُن دنوں مجھے پتے سُکھانے کا جنون سا ہو گیا تھا۔ میں ہر سائز کے چھوٹے بڑے پتے اکٹھا کر لاتی، کتابوں میں دباتی، سکھاتی اور اُن پر لکھنے کی مشق کیا کرتی، پھر میں بیٹھی اُن پر اپنی پیاری پیاری سہیلیوں کے نام لکھتی یا افسانوں کے عنوان۔ کبھی کبھی اپنا پسند کیا ہوا شعر بھی یا زندگی کے واقعات پر صرف ایک ایک لفظ اور یہ میرا اچھا خاصا شغل تھا۔ جسے دیکھ کر سب نے اپنی طنزیہ مسکراہٹ بکھیری اور کہا۔ "کتابوں میں خشکی تھی مگر کہیں کہیں ان میں زندگی کا صحت مند احساس تو ملتا ہے، مگر یہ سوکھے پتے..... یہ زندگی کو مرجھانا سکھا دیں گے۔ توبہ! یہ بھی کوئی مشغلہ ہے۔ ہوں!"

مگر میں ہمیشہ کی طرح اِن تیز تیز فقروں کو نظر انداز کیا اور اس "ہوں" سے قطعی بے نیاز ہو گئی جو سکڑی ہی ناک، اٹھے ابرو اور ٹیڑھے ہونٹوں نے بارہا مجھ پر اگل دی تھی۔ کیونکہ زندگی میں اتنا کچھ بھرا پڑا ہے کہ یہ "ہوں" میرے لئے بے معنی بن گئی۔ میں نے پتوں پر ایک دن مختلف روغن کئے۔ چمکیلے چمکیلے شوخ شوخ آئل کلر، پھر انہیں بلوری جار میں پانی چھوڑ کر اُن میں ڈال دیا۔ اُس دن گھر کے سب مرد آئے، عورتیں آئیں، اور اتوار کو شام گئے تک بچوں نے اس میز کا محاصرہ کئے رکھا جن پر ان کی دانست میں رنگین مچھلیوں بھرا بلوری جار پڑا تھا۔ وہ میز کو ہلاتے اور پھر ہلتی ہوئی مچھلیوں کو دیکھ کر تالیاں بجانے لگتے۔ اس رات میرے کمرے میں کئی چیزیں بے ترتیب پڑی بچوں کی آمد کی اطلاع دے رہی تھیں۔ مگر اس سے دوسری شام کا

ذکر ہے، میں دریچے میں کھڑی ڈوبتے سورج کو دیکھ رہی تھی کہ اچانک میرے کندھے پر ہلکا سا ہاتھ دھرا گیا۔ میں نے چونک کر دیکھا تو آپ بولیں :-

"میں سمجھا کرتی تھی بے جان کتابوں اور سوکھے پتوں میں ہر وقت کھوئی کھوئی رہنے والی لڑکی بھی محض ایک سوکھا پتا بن گئی۔ مگر تمہارے ذہن میں تو حُسن بھی ہے اور ندرت بھی بٹیا پیاری۔"

تو میں نے آپ کا پلّو پکڑتے ہوئے کہا :

"بھلا آپ سی شخصیتوں میں رہ کر میں حُسن و ندرت سے کیسے دُور رہ سکتی ہوں فرخ آپا — میری خاموشیوں میں بھی تو دراصل آپ لوگوں کے قہقہے بسے ہوتے ہیں۔"

اور شاید میں کچھ اور کہتی کہ معاً ہمارے آنچلوں پر اڑتی ہوئی سنہری کرنیں مٹ گئیں۔ میں نے گھوم کر دیکھا سامنے کے اونچے پیڑ پر اُترتے ہوئے پرندوں پر قدرے کرنیں باقی تھیں، سورج بالکل چمک کھو کر محض آتشی رنگ کا ایک گولا سا بن گیا تھا اور ہمارے چہروں پر شفق کے سائے گہرے ہو گئے۔ اس وقت میں نے آپ کے چہرے کو بغور دیکھا کیونکہ کچھ عرصہ سے میں محسوس کر رہی تھی کہ آپ کے چہرے پر ایک ایسی شفق بھی پھوٹنے لگی ہے جس کا آفتاب آپ کے سینے کی دھڑکنوں میں طلوع ہوا ہے۔ مگر آپ پلٹ کر جار کے قریب گئیں اور بولیں۔ "بٹیا! یہ سب خیال تمہارا ہی ہے یا اس میں واجد کا بھی ہاتھ ہے؟"

میں نے آپ کے چہرے پر ابھرتی ہوئی اس اندرونی شفق کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "خیال تو صرف میرا ہے مگر پتے رنگنے میں واجد بھیا نے بھی ہاتھ بٹایا۔ سچ فرخ آپا، واجد بھیا بھی بالکل آپ کی طرح ہی ہیں۔ پہلے ہر روز مجھ سے باتیں کرتے رہے اور پھر خود بھی برش تھام کر رنگنے لگے۔ اور آپ نے جار میں ہاتھ ڈال کر پتوں کو چھو چھو کر دیکھا اور پوچھا۔ بھلا واجد نے کونسے پتے رنگے تھے؟"

میں آپ کی اس دیوانگی پر بڑی سادگی اور معصومیت سے مسکرائی اور کہا۔ "پتوں پر کوئی خاص نشانی لگائی نہیں

تھی ہم نے۔" آپ کے جانے کے بعد میں اور بھی ہنسی۔ پھر بظاہر میں نے ذہن سے آپ لوگوں کا خیال جھٹک دیا۔ مگر جیسے تحت الشعور میں اس شدید کھوج کا احساس اور بھی گہرا ہو گیا جو عسکری نے یہ کہہ کر لگایا تھا کہ :

"— واجد سے فرخ کو بڑی محبت ہے" اور واقعی پھر دو دن بعد جب آپ میرے کمرے میں آ کر کہنے لگیں۔ "لو بٹیا ان بلاٹنگ پیپروں میں پتے رکھ کر سکھایا کرو۔ دیکھو نا ان میں رکھ کے اوپر وزن ڈال کر دھوپ میں سکھانے سے ان کا رنگ نہیں بدلے گا۔" تو مجھے حیرت ہوئی۔ بھلا آپ کو میرے اس بے جان شغل سے کیا دلچسپی مگر مجھے سوچنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑی۔ عسکری اور واجد بھیا آئے۔ عسکری سے میں نے اپنے کمرے کے لئے دو پہاڑی مناظر منگوائے تھے۔ میں ان کے ہاتھ سے لے کر انہیں دیکھنے لگی۔ مگر جب اُن سے نظریں ہٹا کر آپ کی طرف دیکھا تو آپ واجد بھیا کو دیکھ رہی تھیں۔ اس وقت میں نے آپ کی آنکھوں سے وہ کرن پھوٹتی دیکھی، جس میں مسکراہٹیں بھی تھیں اور حُسن بھی۔ جس میں ساز بھی تھا اور موسیقی بھی۔ جو بظاہر خاموش تھی مگر جذبات کی ترجمان۔ ہاں فرخ آپا میں نے وہ کرن دیکھی تھی جسے لوگ زبان سے ادا کرتے ہوئے حرفوں سے بنا کر محبت کرتے ہیں میرا جی چاہا میں آپ کا ہاتھ پکڑ کر بڑے پیار سے کہوں :

"آپ کی پسند پر آپ کو مبارک باد دیتی ہوں آپا۔" مگر عسکری نے دریچے کے قریب فاصلہ ناپنے کے لئے مجھے پکار لیا۔

شاید ماضی کی وہ رنگین سی چمکیلی صبح آپ کو یاد ہو، میں اُن دنوں اس بھرے سبزے پر ننگے پاؤں چلنے کے لئے صبح صبح سبزے بھرے لان میں نکل جایا کرتی تھی۔ اُس دن صبح سورج کی اولین شوخ کرنیں "بائل برش" کے درخت پر اتری ہی تھیں کہ میری نظریں اُن پر جا پڑیں۔ بھیگی سی صبح میں سبز سرخ جھالروں ایسی گیلی گیلی شاخوں والا بائل برش کا نازک پیڑ مجھے اتنا پسند آیا کہ میں بے اختیار سوچنے لگی یہ سرو سے کتنا مختلف ہے۔ عہد قدیم کے شعراء نے جانے سرو پر ہی کیوں لکھا۔ یہ بائل برش اُن سے اوجھل کیوں رہا۔ ورنہ اس میں بھی نزاکت ہے، قد کی

موزونیت ہے بلکہ اس کی لٹکتی ہوئی سُرخ سبز جھالروں نے اس میں کتنا حسن بھر دیا ہے۔ اور عہدِ قدیم کے شعراء کا خیال آتے ہی مجھے ان کے خیالی محبوب کا خیال آگیا جانے کیوں جب بھی کبھی اُن کے شعروں کی مدد سے میں ان کے محبوب کا خیالی ہیولا بناؤں میں خود بخود لرز اٹھتی ہوں اور سوچتی ہوں اگر ہماری مصوری کی بنیاد اس محبوب پر رکھی جاتی تو آج تجریدی آرٹ کا کیا بنتا؟ اُف اُن کے خیالی محبوب کی غیر مجبوبانہ ادائیں اور سفاکانہ رویہ میرے لئے خواہ مخواہ ناقابلِ برداشت بوجھ بن جاتا ہے اور آج میں نے اس تصوراتی ہیولے سے فرار پانے کو بائل برش کے نازک گیلے پیڑ سے ٹیک لگا کر اپنے آپ کو اس لٹکتی ہوئی سرخ سبز جھالروں ایسی شاخوں میں چھپا سا لیا کہ آپ میری طرف آتی نظر آئیں۔ آپ مسکراتی مسکراتی یوں چلی آرہی تھیں کہ مجھے آپ کی چال میں بھی مسکراہٹ نظر آئی شاید اس لئے کہ میرے ذہن میں اس وقت شاعری اور محبوب کا خیال بھرا پڑا تھا۔ آپ نے جھک کر ٹہنیوں تلے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا" بٹیا! کیوں کسی خیال سے فرار پانے کو یہاں چھپی کھڑی ہو؟"

اور میں نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر اپنا سارا خیال آپ کو سنا دیا۔ آپ نے میرے وہم اور خیال پر بڑا زوردار قہقہہ لگایا۔ جانے کیوں آپ اُن دنوں اتنا زیادہ ہنسنے کے موڈ میں کیوں رہتی تھیں۔ اور آپ نے کہا۔" وہ زمانہ بدل گیا بٹیا، آج کی محبوبہ اتنی سفاک نہیں"۔

اور پھر آپ نے سیمنٹ کے تختہ پر بیٹھ کر مجھے محبت اور محبوب کے بارے میں اپنے اتنے پیارے پیارے خیال سنائے کہ میں پوچھ ہی بیٹھی:

"آپ بھی محبت کرتی ہیں نا فرخ آپا؟"

"محبت۔ ہاں بٹیا۔ زندگی، جہاں تک میرا خیال ہے، چند احساسات کا مجموعہ ہے۔ زندگی کے لئے دل، احساس اور محبت کی ضرورت ہے اور مجھے خوشی ہے کہ میرے پاس احساسات سے بھرپور دل بھی ہے، شوخ شوخ سی مسکراتی محبت بھی اسی لئے تو آجکل مجھے اپنی زندگی بھی اس قدر پسند ہے"۔

اور میرا جی چاہا میں آپ سے لپٹ کر کہوں:

"آپ ذرا اپنے منہ سے میرے سامنے واجد کا نام لے دیں فرخ آپا"۔ مگر اچانک یوکلپٹس کا ایک سوکھا ہوا پتا بڑی بلندی سے ہوتا ہوا میرے ہاتھ پر آن گرا۔ ہم دونوں اس کی آمد پر کانپ اٹھیں، اور پھر مسکرائیں۔ آپ نے پتا اٹھایا۔ پکڑا، توڑا اور پھینک دیا۔ میں لرز اٹھی۔

زندگی کی وہ شام اتنی اداس نہ تھی اور پھر مجھے تو بعض اوقات بہار کی دوپہریں بھی اتنا اداس کر دیتی ہیں کہ خزاں کی شامیں بھی اتنا اداس نہیں کرتیں۔ اور پھر یہ تو گرمی کی ایک شام تھی جس میں حدت تھی، اداسی نہ تھی۔ مگر واجد بھیا نے بتایا کہ آج شام بے حد اداس ہے، کیونکہ وہ پہلی بار ان گنگناتے ہوئے کمروں اور خاموش دریچوں کو چھوڑ کر ملازمت کے سلسلے میں باہر جا رہے تھے۔

اور آپ بھی اداس تھیں فرخ آپا۔ مگر عسکری اور بشیر نے اس شام کو اداسی کی گہرائیوں میں ڈوبنے سے بچا لیا۔ عسکری نے اپنی شاعرانہ آواز میں ایک الوداعی غزل چھیڑ دی اور وہ شام واقعی گیتوں کی محفل بن گئی۔ اس محفل میں غزل سے قوالی تک سب کچھ سنا اور سنایا گیا۔ اور ابھی پنجابی گیتوں کا آغاز ہوا ہی تھا کہ مجھے یاد آگیا۔

"نی سیو! کونج وچھڑ گئی ڈاروں، تے لبھدی سکھیاں نوں"

(اے سکھیو! کونج اپنی ٹولی سے بچھڑ گئی ہے۔ اور اپنی سکھیوں کو ڈھونڈ رہی ہے)

مگر جونہی یہ گیت بیگم اور شاقبہ نے ختم کیا، ہمیں محسوس ہوا کہ محفل میں چند پلکیں بھیگ چکی ہیں۔ اور میں نے افسردگی دور کرنے کے لئے کہا۔" واجد بھیا کونج تو اور بھی سکھیاں بنا لیگی جا کر مگر یہ ٹولی جو باقی رہ گئی ہے اپنی جانے والی کونج کو ہمیشہ یاد رکھے گی"۔

اور بیگم نے بڑے دکھ سے کہا "ہاں جب محفل بنا کر بیٹھیں گے تو آپ شدت سے یاد آئیں گے"

مگر عسکری جلدی سے بولا۔" نہیں نہیں وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ وعدہ نہ کیجئے گا کیونکہ انسانی نظریے بدل جاتے ہیں"

میں نے پلکیں اٹھا کر دیکھا۔ آپ شانہ کے کندھے سے لگی بڑی اداس سی تھیں مگر آپ نے کہا: "ہاں اس وقت مستقبل کا خیال عبث ہے۔ ہمیں آج کا ذکر کرنا ہے اور آج واجد دور جا چکے ہیں"

مگر پھر فرخ آپا واجد بھیا کے جانے کے بعد آپ نے میری تنہائی اور خاموشی پر کبھی اعتراض نہیں کیا۔ بلکہ خود پہروں میرے کمرے کی دھندلاہٹوں میں اپنے جذبات بکھیرتی رہتیں، آپ کا ہر موضوع واجد بھیا پر جا کر ختم ہو جاتا۔ واجد بھیا کے وہ تمام خطوط میرے تکیے تلے سے نکال کر پڑھ ڈالتیں جو بظاہر میرے نام ہوتے مگر اس میں پورے گھرانے کا ذکر ہوتا۔ اور پھر دیر تک انہی خطوط کے اشارے ہمارے موضوع بنے رہتے۔ اور سب کہتے کہ فرخ اور بینا میں گہری دوستی ہو گئی۔ حالانکہ میرے خلوص اور رویے میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ میرا نظریہ آپ کے لئے وہی تھا۔ میں چاہت سے ملتی جیسے شروع دن سے ملتی آئی ہوں، اس کے جواب میں آپ اکثر مجھے خشک پتہ کہا کرتی تھیں۔ آپ کا خیال تھا میں حقیقتوں کا سامنا کرنے سے گھبرا کر تنہائی میں فرار کرتی ہوں۔ حالانکہ میں نے تنہائی میں زندگی سے کبھی فرار نہیں کیا۔ بلکہ ہمیشہ زندگی کی حقیقتوں کو جا چھوا ہے۔ زندگی کے شدید احساس کے ساگر میں غوطے لگا لگا کر اس کی تہہ میں بچھے ذرّے چنے تھے اور انہی ذرات کی ضیا نے مجھے اتنی بصیرت بخش دی ہے کہ میں آپ کے چہروں کو ایک نظر دیکھ کر آپ کے جذبات پڑھ لیتی ہوں۔ آپ اسے زندگی سے فرار کہتے ہیں۔ جو شخص ہمیشہ زندگی کی قدروں اور حقیقتوں کو سمجھنے اور پانے میں محو رہے، ہاں ہاں میں نے زندگی کی قدروں کو سمجھا اور حقیقتوں کو ٹٹولا تھا۔ اور آپ، فرخ آپا جو زندگی کا سامنا کرنے سے گریز کرتے ہوئے دنیا میں الجھ گئی تھیں — یہ بات مجھے یہاں خواہ مخواہ ہی یاد آ گئی شاید ابھی آپ کو ان خشک پتوں سے کوئی تعلق نہ نظر آئے ان کا — مگر شاید اس سے آگے مجھے یہ کہنا تھا کہ آپ کے دلی لگاؤ کی خبر آپ کے والدین تک جا پہنچی تھی۔ اسی لئے دونوں کے بزرگوں نے اس مقدس رشتے کی اجازت دے دی تھی ہم سب نے واجد بھیا کو مبارک کے خطوط لکھے تھے۔ ان کے جواب میں واجد بھیا کے خط سب کے نام آئے اور انہوں نے اپنے جذبات کا اظہار تو یہاں تک کر دیا تھا کہ "اب میں پردیس میں بڑا رومینٹک محسوس کرنے لگا ہوں اپنے آپ کو۔"

مگر ادھر میری نظروں نے بارہا پڑھا کہ آپ کے چہرے پر اب واجد بھیا کے ذکر سے وہ شفق نہیں پھوٹتی جو ہمیشہ پھوٹتی تھی، دل نے کہا، شاید یہ بات اب پکی ہوئی۔ مگر ذہن نے یہ دلیل ماننے سے انکار کر دیا۔ نہیں نہیں۔ فرخ بدل گئی ہے، اور میں نے محسوس کیا واقعی اب آپ میرے کمرے میں کم آتی ہیں اور خط بھی محض اس لئے پڑھتی ہیں کہ بس یہ پڑھنے کا سلسلہ جاری رہے۔ ہاں کبھی کبھی آپ اپنے تعریفی فقرے پر اترا ہی لیتیں کہ بے اختیارانہ گنگناتے ہوئے دریچے پر جھک جاتیں۔ اور میں لرز اٹھتی۔ آپ محبت نہیں کرتیں فرخ آپا۔ آپ وہ عورت ہیں جو صرف تعریف چاہتی ہیں۔ ایسی عورت ہمیشہ بھٹکتی ہے۔ اور دن تیز رفتاری سے گذر گئے۔ دنیا کہتی ہے وقت پر لگا کر اڑتا ہے اور میں نے محسوس کیا وقت کبھی تو پروں کو سمیٹ کر اڑتا ہے کبھی پر پھیلا کر، پھڑپھڑا کر۔ اور ان دنوں وقت پر سمیٹ کر اڑ رہا تھا۔ اس میں کوئی پھڑپھڑاہٹ نہ تھی۔

ہاں، اب میں کمرے کی دھندلاہٹوں میں روشن دان سے آنے والی روشن لکیروں میں اڑتے ذروں کی باتیں سنا کرتی تھی۔ میں نے ان روشن ذرات سے سنا تھا کہ زندگی تیزی سے بدل گئی ہے اور انسان نے زندگی کی قدر کو بدل ڈالا ہے۔ "نئی قدریں"۔ میں مسکرا دی۔ انسان کیا چیز ہے جس پر ہر ذرہ بھی تنقید کرتا ہے قدریں وہ کیا؟ — دیوان غالب کا مطالعہ کرتے ہوئے رک کر، میں نے تیز رفتار ذرے کو روک کر پوچھا — "پیارے نقاد! میں ہر روز تمہاری گفتگو سنتی ہوں۔ آخر تمہارا کیا مطلب ہے؟ کیا تم انسانی ترقی کے مخالف ہو؟"

ذرے نے میری پنسل کی باریک نوک پر بیٹھتے ہوئے کہا — تم اکیلے میں کیا سوچا کرتی ہو خاموش لڑکی! تمہیں نہیں پتہ زندگی کتنی بدل گئی۔ تم اپنی خاموشی اور تنہائی کے جال میں اتنی الجھ چکی ہو۔ تمہیں تنہائی کیا دیتی ہے؟

میں نے پنسل کی نوک کو دیوانِ غالب پہ پھیرتے ہوئے کہا۔ "پیارے ذرے! اس کتاب میں زندگی کی بڑی حقیقتیں ہیں۔ اس میں غالب نے لکھا ہے ؂

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

سمجھے تم کچھ اسے ؟"

اس نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔" انہی کتابوں نے تو تمہیں ایسا بنا دیا ہے۔ یہی خلوت تو آج کل کی سوسائٹی میں ٹو نگی پکاری جاتی ہے۔ تم اِس قید سے نکل آؤ۔"

" مگر تمہیں یاد نہیں، میں نے تم سے انسانی قدروں کا پوچھا تھا ۔ تم ناصح مت بنو۔"

" ہاں، مگر بتاؤ کبھی تم نے نغمے سنے ہیں کوئل کے؟" وہ ذرہ نوک پر اور بھی جم گیا۔

میں نے پلاسٹک کے گلابی ربن کو دیوان میں رکھ کر اسے تپائی پر رکھتے ہوئے کہا ۔" کوئل کے نغمے میری روح کی غذا ہیں ۔"

"مگر یہ نغمے آج کل کی زندگی کا سہارا ہیں"۔ اس نے اتنا کہا اور خاموش ہو گیا۔

" سہارا ؟ اے ننھے دوست ! کیا ساری دنیا دکھی ہے؟"

" نہیں ۔۔۔ نہیں ۔ وہ میری لرزتی ہوئی پنسل سے مضطرب ہو کر چلّایا۔" سن اے حقیقتوں کو تلاش کرنے والی خاموش روح! پہلے انسان اِن نعمتوں کو دل میں بسایا کرتا تھا مگر آج صرف کانوں سے سنتا ہے ۔"

" کیا مطلب ؟" میں اور بھی جھک گئی ۔

" آج نمائش ہے اور یہ زندگی کی ایک نئی قدر ہے۔ نمائش ۔ ہاں ..."

"میں سمجھ نہ سکی۔ میرے ننھے دوست"۔ مگر دوسرے ثانیہ ہوا کا تیز جھونکا اُسے اڑا کر کہیں دور لے گیا۔ یہ خواب نہیں، حقیقت ہے ۔ میں نے ذرے کے اڑ جانے پر چنار کے بلوریں پتے سے چھالیہ اٹھائی اور تیزی سے چبا ڈالی۔

وہ بڑی سہانی رات تھی۔ چاند کی بیسویں تاریخ کا چاند کہیں دور اندھیروں میں چھپا بیٹھا تھا ۔ میں نماز کے بعد دریچے میں کھڑی اپنے ذہنی سکون کے لئے کائنات کو دیکھنے لگی۔ مگر جیسے کائنات تو چاند کی کرنوں کی متلاشی تھی ۔ دُور دُور تک اندھیرا تھا۔ دائیں جانب کی بستی میں کہیں کہیں چراغ تھے۔ مگر میں نے اِن ایوانوں سے منہ موڑ کر اندھیری کائنات کو دیکھا جو کرنوں کے لئے تڑپ رہی تھی۔ اور میں نے دل کی گہرائی سے کوئل کو آواز دی ۔ " کوئل پیاری ! کائنات کی اس بیقراری اور محرومی پر صرف ایک درد بھرا نغمہ گا دے۔ کہ اس کی روح کو سکون ملے"۔ ہاں، اُس وقت میں نے سب کے لئے سکون کی دعا مانگی تھی کیونکہ میں خود سکون چاہتی تھی ۔ اور میں دھیرے سے مسکرائی ۔ میں بھی کتنی خود غرض ہوں ۔ حالانکہ کائنات تو روشنی چاہتی تھی ۔ مگر کوئل کی روح تو جیسے اندھیروں میں خود کہیں بھٹک گئی تھی۔ میں نے پلٹ کر کمرے میں دیکھا، میرے کمرے کی ہر چیز خاموش تھی۔ میں نے روشنی کی مگر روشنی بولی اور پھر خاموشی چھا گئی میں نے کتاب اٹھانے کی سوچی تھی کہ فرخ آپا آگئیں ۔ انہوں نے آتے ہی میرے کمرے کی روشنی بجھا دی ۔ اور دریچے کے پردے سمیٹ ڈالے۔ وہ اِن اندھیروں میں کوئی راز اگل دینا چاہتی تھیں ۔ میں نے خاموشی سے ان کی ہر حرکت برداشت کی اور دریچے میں آ گئی ۔ ہوا کے خاموش خاموش سے جھونکے میرے بالوں کو بکھیرتے تاریکی میں اضافہ کرتے کمرے میں داخل ہوئے ۔ یکایک جیسے کوئل کی روح زبان پر آ گئی ۔ اور کائنات کے اندھیروں پر ایک دکھ بھرا نغمہ لہرا گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے اس نغمے کو روح میں اُتارنا چاہا ہی تھا کہ فرخ آپا نے میرے بالوں کو چھو کر میرے آنچل کو مٹھی میں سمیٹتے ہوئے پوچھا ۔

" یہ پرندہ کیا کہتا ہے، بیٹا ؟"

یہ محبت اور موسیقی کی روح ۔ میں نے اندھیروں کو آنکھیں کھول کر دیکھا ۔ " فرخ آپا ! اس نغمے میں ایک ابدی لگن کا احساس ہے، ایک دکھ کی پکار ۔ غمناک موسیقی جس سے احساسات میں تڑپ پیدا ہوتی ہے ۔ آپ نے شاید صرف کوک سنی ہے یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ اس میں کونسا درد ہے ۔"

" درد اور احساس سمجھنے کا سارا حق تمہیں جو بخش دیا۔"

ہاں فرخ آپا، اِن الفاظ کو ادا کرتے ہوئے آپ کا لہجہ کبھی بڑا تلخ تھا ۔ مگر میں نے جان بوجھ کر اپنی کہانی جاری رکھی ۔ دراصل میں آپ ہی کو سب کچھ سنانا چاہتی تھی ۔ اور میں نے کہا:

"جب دنیا بنی تو کائنات بالکل خاموش تھی۔ خالق نے مرد بھیجا۔ مگر وہ اکیلا تھا۔ پھر خالق نے عورت کو تخلیق کیا۔ مگر جیسے کائنات ابھی نامکمل تھی، اس کی زبان لکنت زدہ تھی۔ اور جب عورت نے پہلی بار غلطی کی اور مرد اور عورت کی جدائی پر جنت کی ساری رعنائی ایک دم ہی سمٹ گئی تو سب سے پہلے جس نے مرثیہ گایا وہ یہی پیاری کوئل تھی۔ وہ المیہ موسیقی کا پہلا دن تھا اور غالباً محبت کی تڑپ کا بھی۔ اور یہ کوئل آج بھی اسی لئے روتی ہے۔ ہاں اگر عورت وہ غلطی نہ کرتی تو یقیناً وہ فردوسی بہاریں دنیا پر اتر آتیں بلکہ ابدی ہو جاتیں۔ مگر ہائے عورت۔"

"تو کیا تم اس سیاہ پرندے کے گیت سن کر مراقبے میں کھو کر صرف عورت کی غلطی اور بے وفائی ہی تلاش کرتی ہو؟ ہوں!"

مگر میں نے اس دن بھی اس "ہوں" کی کوئی پروا نہ کی۔ میں نے کہا تاکہ میں ان سے بہت ہی آگے نکل کر بالکل بے نیاز ہو چکی ہوں۔ مگر آپ نے کہا۔ "یاد رکھو، خالق نے عورت کو دلربائی بخشی تھی، اور کہا تھا کہ مرد کا دل خوش کر۔ مرد کی بے اعتنائی پر اس نے کسی اور کے خلوص پر دھوکا کھایا ہوگا، غلطی نہیں کی۔"

میں تڑپ اٹھی۔ یہ یونانی دوشیزاؤں ایسا بھوکا نظریہ مجھے قطعی قابل قبول نہیں۔ ہائے فرخ آپا، آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ عورت بیچاری مرد کی پسلی سے پیدا ہوئی، اسی لئے اس میں ذہن کی کمی اور دل کا افراط ہے۔ میں نے ان عورتوں کی اکثریت دیکھی ہے جنہوں نے ازل سے اپنے ذہن کو آدم کی پسلیوں میں چھپا کر دل سے سوچا۔ ورنہ ...

"بیتا جانے دو۔ تم زندگی کا ساتھ کیسے دوگی، زندگی تیزی سے بڑھے جا رہی ہے۔"

"ہاں اور اسی لئے اس میں احساس کی شدت نہیں۔ اور یہ بھاپ تحلیل ہو جائے گی۔" میرا تحت الشعور جیسے آپ سے مقابلہ ہی نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ ایک حقیقت کو بھی اگلوانا چاہ رہا تھا۔

"مگر یہ احساس کی شدت سے رینگتی ہوئی زندگی کم از کم مجھے تو پسند نہیں۔" آپ نے رعونت سے کہا۔

مگر یاد رکھئے، اس رینگتی زندگی میں گھمبیرتا ہے محض ولولہ نہیں۔ اس کے رینگنے سے آپ کو کیا؟

"اس لئے کہ واجد بھی ابھی تک احساسات کے پرانے بوجھ تلے رینگ رہا ہے۔" آپ کی زبان نے حقیقت اگل دی۔ ایک پھڑپھڑاتا ہوا پتہ میرے گال پر طمانچے کی طرح لگا اور میری نس نس میں اتر گیا۔ آپ میرے کمرے میں تاریکی کا اضافہ کر کے جانے کس وقت چلی گئیں۔ میں نے جب آنکھیں کھول کر دیکھا تو دریچے سے باہر چاند بالکل زرد اور پژمردہ تھا۔ کوئل نے جیسے ہماری گفتگو سن کر ایک آہ بھر کر گانا بند کر دیا تھا۔ مگر رات کی یہ گفتگو چڑھتے سورج کی کرنوں نے ہر جگہ سنا دی۔ اس ہفتہ بھر زندگی بڑی خاموش تھی۔ میری امی مجھے جائے نماز پر محو نماز یا تلاوت میں مصروف پا کر مطمئن ہو کر کہتی۔ "ہائے پتہ نہیں یہ لڑکیاں بدل کیوں جاتی ہیں۔ اللہ رحم کرے۔" ثاقبہ اور ثمانہ مضطرب سی ہو کر بے دلی سے ریڈیو کھول لیتیں اور بلیم کیاریوں میں پھرا کرتی۔ عسکری اور بشیر عورت کی بدلتی فطرت پر نئے نئے فقرے سنایا کرتے اور چھوٹی چچی بڑی خاموش ہو گئیں۔ مگر امی اور تائی اماں سر جوڑ کر بیٹھتیں اور نہ جانے کیا مشورے کئے جاتیں۔

دوپہر رنگین تو نہیں تھی جانے کیوں بادلوں نے اس کی سنہری رنگت پر اپنے پلو پھیلا دیئے تھے۔ میں برآمدے میں بیٹھی اپنی کشمیری امبرائیڈری سے دل بہلا رہی تھی کہ چند ذرے اڑتے ہوئے آئے اور میری باسکٹ میں دبک گئے۔ ایک نے دوسرے سے کہا۔ "آج ایک آندھی اٹھے گی۔" دوسرے نے کہا۔ "شاید کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔" میں نے امبرائیڈری اٹھا کر باسکٹ میں بند کر دی اور آسمان کی طرف دیکھا۔ دور دور تک بادلوں کے آنچل تو تھے مگر ہواؤں میں آندھی کے سانس نہ تھے۔ میں نے کمرہ بند کر کے صحن میں دیکھا۔ چیونٹیاں طوفان کی آمد پا کر اپنے انڈوں کو محفوظ مقام کی طرف لے جاتی نظر آئیں مگر فرش ان کے وجود سے پاک تھے۔ میں امی کے کمرے میں جا کر ان سے باتوں میں لگ گئی۔ وہاں سے نکلی تو اپنے کمرے میں آ کر ادب کی نئی قدروں پر ایک معلوماتی مضمون پڑھنا شروع کیا کہ ثاقبہ اندر آئی۔ اس کے چہرے پر ایک نئی خبر سنانے کا شوق تھا مگر شیلف کے نزدیک آ کر اس کے قدم تھم گئے

اُس نے خطوط کی ٹوکری میں اوپر ہی پڑا واجد بھیا کا خط اٹھایا، اور پڑھنے لگی۔ میری نظریں دوبارہ مضمون کی طرف آ گئیں مگر میرا ذہن خبر سننے کا منتظر رہا۔ عسکری داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر عجیب و غریب تھکن کا احساس تھا۔ مگر اس نے ثاقبہ کو دیکھا، خط کو پہچانا اور مسکرا دیا۔ اگر اس وقت وہ رو دیتا تو شاید میں الجھ جاتی مگر وہ مسکرا دیا۔ تو میں سارا المیہ سمجھ گئی بعض اوقات انسان دکھ کی کہانی سنانے سے قبل تمہید اً مسکراتا ہے۔ عسکری کی مسکراہٹ میں دکھ کی تمہید تھی اور پھر اس کی تھکن پر یہ مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ میں نے رسالہ بند کر کے اپنے آپ کو ہمہ تن گوش بنا لیا۔

اور جو کچھ میں نے سنا شاید ان الفاظ میں آپ سمجھ جائیں :

"ہماری اس ٹولی سے بہت دن ہوئے ایک کونج دور جا پڑی تھی ... مگر ... کی ساتھی ... انتظار سے اکتا کر ایک عقاب سے رشتہ جوڑنے کو اٹھی تھی۔ اور جیسے والدین کی مخالفت کے باوجود وہ رشتہ طے پا گیا۔"

"اور میں جیسے گہرائیوں میں ڈوب گئی جہاں زندگی کے عمیق اندھیرے میں اس بچھڑی ہوئی کونج کی دردناک آواز سنائی دی۔ اس میں ان ساری کی سی آہوں کا احساس تو تھا جو قافلے کے ساتھ چلتا ہوا اپنے بچھڑے ساتھی کو یاد کرے۔ مگر اس میں نہ تو انتقام لینے والے ناگ کی پھنکار تھی نہ شیر کی دھاڑ۔ تیرے واجد بھیا ..."

رفتہ رفتہ جب میں اندھیرے سے نکلی تو کمرے میں سب لوگ بول رہے تھے اور جیسے ثمانہ کی کسی بات کے جواب میں عسکری نے کہا۔

"ایک مرد جب کائنات میں لایا گیا تھا اس کے سامنے کائنات کا ٹھوس وجود تھا۔ مگر جب ایک عورت نے آنکھ کھولی تو اس کے سامنے ایک مرد تھا۔ عورت نے مسکرا کر اُسے دیکھا۔ مرد نے اُسے دیکھا اور کائنات کو اور خاموش ہو گیا۔" واجد میں بھی اُسی پہلے مرد کی سی صفات ہیں اور وہ ... رہے گا۔" میں عسکری کی اس زہر آلود گفتگو کو وقتی طور پر نگل گئی۔ اور سب کے جانے کے بعد میں نے خود اپنے ہاتھوں سے بنا کر گرم گرم سنہری قہوہ پیا۔ کوئل نے وہ در فردوس کی اُس بہار کا ... کا یا جو دنیا پہ اتر نہ سکی۔ اور میں نڈھال ہو گئی اُس دن میں نے پہلی بار رفعت حقیقت سے فرار پانے کی ... اور حقیقت میری ... میں آ گئی ... نے ... کو ... کے ... وقت ... [illegible]

واقعی ہم موسیقی میں ڈوب کر ہر غم کو اٹھا لیتے ہیں۔ مگر فرخ آپا میرے رویے میں اب بھی آپ کے لئے کوئی فرق نہ آیا تھا۔ میں نے آپ کو نئے انتخاب پر اُسی طرح مبارک باد دی اور بڑے خلوص سے آپ کے مستقبل کی خوشگواری کے لئے دعا مانگی۔ ہاں، واجد بھیا کے خطوط بڑے سنجیدہ ہو گئے اور جس دن آپ شہنائیوں کے ساتھ رخصت ہو رہی تھیں، مجھے واجد بھیا کا ایک لفافہ ملا جس میں چند سوکھے پتے تھے میں نے اُن پتوں کو ایک کتاب میں بند کر کے کتابوں بھری الماری میں کتابوں کے پیچھے ڈال دیا تاکہ نظر نہ آسکے۔ اور پھر ایک دن جب چچی واجد بھیا کے لئے دلہن تلاش کر لائی تھیں، مہمانوں کے چلے جانے کے بعد ثاقبہ نے پوچھا: "بیتیا آخر فرخ آپا کو قیصر میں نظر کیا آ گیا تھا؟ کیا عورت کپڑوں کے فیشن کی طرح اپنے احساسات بلکہ محبت کے نظریے بھی بدلتی رہتی ہے؟"

تو میں نے اس کے گال تھپتھپا کر کہا تھا... "عورت کائنات کی بڑی اہم مخلوق ہے ثاقبہ پیاری! جب وہ پہلی بار کائنات میں آئی تو مرد کی تنہائی کا سہارا تھی مگر رفتہ رفتہ واقعات نے اسے مختلف روپ دیئے اور ہر روپ کی عورت میں فرق ہو گیا۔ ایسی عورت بھی ہے جس کا نظریہ کبھی نہیں بدلتا۔ وہ بھی عورت ہے جو محبوب سے ٹوٹ کر محبت کرتی ہے۔ مگر جب اُسے حاصل نہیں کر پاتی تو اُسے یوں چاہتی ہے جیسے ماں ایک سرکش اور ضدی بچے کو جو اس کا نافرمان بھی ہو مگر اس کے جسم و جان کا ٹکڑا بھی۔ اور وہ عورت بھی ہے جو محبت نہیں کرتی، تعریف چاہتی ہے۔ ایسی عورتیں سانپوں کو گلے لگا لیتی ہیں۔ فرخ آپا بھی اگر ایسی ہوں تو حیرت کیوں ہو؟"

"سانپ کو؟" ثاقبہ لرز کر میرے نزدیک آ گئی اور ثمانہ نے ڈرتے ڈرتے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"ہاں، اُسے سانپ ہی کہہ ڈالو" میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "تم نے وہ مختصر افسانہ نہیں پڑھا۔ تم نے یقیناً نہیں پڑھا ہوگا ثاقبہ کیونکہ کتابیں پڑھنا تمہارے نزدیک ایک ذہنی اور جسمانی بیاری ہے۔ تمہیں وہ افسانہ سناؤں جس میں اسی عورت کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔ شاید یونان کے کسی شہر کا ذکر ہے ایک حسین عورت کی خلوت گاہ میں ایک سانپ داخل ہوا۔ عورت کانپی، ڈری اور بولی "تم اے اشرف المخلوقات کے دشمن! تم میری خلوت میں کیوں آئے ... [illegible]

سانپ نے پھن پھیلا کر کہا: "سنا ہے تمہارے ... عورت میں بڑے بڑے عقلمند اور ارباب اقتدار محفوظ تھا ... حسن کی ایک جھلک دیکھنے آتے ہیں۔ ملک کے ... معیار تمہارے تبسم کی ایک لہر سے اپنے آلات ... سے نئی دھن تیار کرتے ہیں۔ دانائے راز تمہارے برق پاش حسن کے سہارے اپنے ذہن کو صحت بخشتے ہیں۔ تمہارے تبسم میں موسیقی کا خزانہ ہے۔ اور میں وہ موسیقی سننے آیا ہوں..." اور عورت اپنے تعریفی کلمات میں کھو گئی کہ سانپ اس کے نزدیک تر آ رہا ہے... عورت پورے جوش سے مسکرائی اور سانپ نے اسے ڈس لیا۔" کمرے کے ذرے چلاتے رہے: "اے عورت! تیرے حسن و تبسم کی تعریف تیری سب سے بڑی کمزوری ہے۔" ثمانہ نے آنکھیں بند کر کے کہا "ہاں، عورت تعریف سے بہک جاتی ہے۔"

"اگر فرخ بھی بہک گئی تو میں اسے معاف کرتی ہوں" ثاقبہ نے بڑی فراخدلی سے کہا۔ مگر اس کی ماتھے کی سلوٹیں بتا رہی تھیں کہ وہ آپ سے ہمیشہ نفرت کرے گی۔

زندگی بڑی تیزی سے گزر رہی ... نے وقت کے پھڑپھڑاتے آنچلوں کو بڑی بے نیازی سے چھوڑ دیا۔ اور کہا۔ "اسے تیری ... جانا چاہئے۔" اور میں نے دودھ میں ابلی چھالیا چبا کر اور کہانی کہنے لگی... جانوں کہانیوں میں میں نے زندگی سے فرار چاہا تھا یا زندگی کے ساتھیوں کی حقیقتیں اگلی تھیں اور وہ لوگ جو میرے کرداروں کا عکس پہچان لیتے تھے وہ کہتے:

"بیٹا زندگی کے ساتھیوں کو لوں بے نقاب مت کرو۔ کہ دنیا ان سے نفرت کرنے لگے۔" مگر میں نے ان آوازوں کو جھٹک کر پنسل کو باریک کیا اور لکھنے لگی۔ حالانکہ زندگی بڑی چپ چاپ گزر رہی تھی واجد بھیا جب آتے ہنستے مسکراتے اپنی بیوی کی تعریفیں کرتے، بچوں سے کھیلتے۔ مگر ایک دن سرما کی خوشگوار دوپہر میں نمکین چائے پیتے ہوئے تاش کے پتوں سے نظر ہٹا کر انہوں نے مجھے کہا: "بیٹا حقیقت زہر ہوتی ہے۔ اسے ہر کوئی نہیں نگلتا۔ تم جانتی ہو محبت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک محبت جو ہر روز اپنے محبوب سے خراج چاہتی ہے، وہ ہر روز زبان سے ادا ہوتی ہے اور آخر اس محبت کا سارا اثاثہ باتوں اور تعریفی تبادلوں میں ختم ہو جاتا ہے۔ دوسری قسم محبت روح کی گہرائیوں میں اترا ہوا جذبہ ہے جو زبان سے اس لئے ادا نہیں کیا جاتا کہ کہیں ختم نہ ہو جائے۔ فرخ کی محبت زبان کا ولولہ تھا اور جسم کا مس، مگر میری زندگی کی اقدار محبت کی گہرائی۔ فرخ نے تعریف چاہی اُسے مل گئی میں نے زندگی سے محبت کی اور اُسے پا لیا۔"

مگر فرخ آپا! اس رات میں نے نہ توری کی ... لگائی نہ نماز پڑھی اور دیر تک سردی میں ٹھٹھرتے بوسٹ کیڑوں کی کراہیں سنتی رہی۔ میرے ہاتھ کے یہ سوکھے پتے لرز رہے ہیں۔ جانتی ہیں آپ یہ کونسے پتے ہیں؟ اگر زندگی کی کھوکھلی اقدار نے آپ کے ذہن سے ماضی کو کھرچ نہیں ڈالا تو آپ کو یاد ہوگا، جن دنوں مجھے پتے سکھانے کا جنون سا تھا، آپ نے امتحان کی کامیابی پر مجھ سے ویسا ہی جار مانگا تھا میں نے جار نہیں دیا بلکہ مٹی کے کونڈے کو نیلا رنگ کیا۔ اس میں پانی چھوڑ کر ننھے منے تازہ پھول ڈال کر آپ کی میز پر رکھ دیا۔ اس میں واجد بھیا کے رنگے ہوئے چند پتے بھی تھے۔ آپ اس نیلے کونڈے کو بڑی دیر تک نیلی جھیل کہا کرتیں اس کا پانی بدل کر ہر روز اس میں تازہ پھول ڈالتیں۔ مگر پتے نکال کر اس پر آپ نے اپنے جذبات لکھ کر واجد بھیا کو دیئے تھے جس دن نماز کے لئے وہ باہر چلے گئے۔ اور واجد بھیا نے اُس دن مجھے دیئے ... آپ ان کی کائنات سے نکل گئیں۔ ان پتوں پر لکھا ہے:

"زندگی۔ دل ... احساس محبت کا نام ہے۔ میرے سینے میں دل بھی ہے اور محبت بھی اور بخدا میں زندہ ... ہوں۔ میں نے محبت کی۔ مجھ سے محبت کی گئی اور یہ محبت میرے سینے میں یوں محفوظ ہے جیسے میری تحریر ان پتوں پر... میری محبت اس چاند کی مانند ہے جو ہر دن ابھرتا ہے۔"

اُف یہ سب زندگی کی ٹھوس حقیقتیں مجھے ان کتابوں سے بھی جھانک رہی ہیں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میرے اردگرد یہ کتابیں نہیں بلکہ آپ لوگوں کی داستانیں ہیں اور میں ان پر زہر آلود کہانیاں لکھتی ہوں میں یہ بھی محسوس کر رہی ہوں جیسے میں کوئل ہوں میرے اردگرد عورت کی غلطی نے ساری رعنائی کو مرجھا دیا ہے اور میں ان مرجھائی ہوئی بہاروں پر بیٹھ کر مرثیے گا رہی ہوں۔ مگر دیکھنا ذرا فاصلے پر کوئل بھی المیہ راگ گانے لگی ہے۔ وہ میری طرح اُن بہاروں پر آنسو بھرے گیت گا رہی ہے جو آئینہ سکیں کوئل کے سینے میں راز ہے اور درد سوکھے پتوں پر لکھا ہوا راز ہے اور زندگی کی حقیقت۔ خود میرے پاس ماضی کی داستانیں ہیں۔ درد اور محبت۔ مگر ہماری زبان میں فرق ہے۔ شاید انہیں کوئی نہ سمجھ پائے۔ مگر مجھے کوئل کی یہ درد بھری موسیقی سننے دو۔ اُف ہم تینوں ایک ہیں۔ کوئل، میں اور یہ سوکھے پتے! ●

علاقائی ادب:

عبدالقادر خٹک

یونس سیٹھی

مغربی پاکستان کے شمال مغربی سرحدی علاقے کو قدرت نے ہر نعمت اور دولت سے سرفراز کیا ہے۔ دلکش و دلفریب وادیاں اور برف پوش فلک بوس پہاڑ، بل کھاتی اٹھلاتی برفانی ندیاں اور تند و تیز دریا۔ سرسبز و شاداب چمن زار اور حدِ نظر تک پھیلے ہوئے چٹیل میدان غرض ایک طرف حسن فطرت قدم قدم پر دعوت نظارہ دیتا ہے تو دوسری جانب فضاؤں میں "یا قربان" کی گونجتی ہوئی دلنشیں صدائیں اس خطے کو فردوس گوش بنا دیتی ہیں۔ ایسی سنگلاخ مگر رومان پرور سرزمین نے جنگجو سپاہی بھی پیدا کئے اور جفاکش مجاہد بھی۔ نامور صوفیا کو بھی جنم دیا اور عالی مرتبہ شعرا کو بھی۔ جنہوں نے اپنے کمال و کلام سے عوام کے دلوں کو مسخر بھی کیا اور مسحور بھی۔ انہی عظیم مفکروں میں عبدالقادر خٹک کا بھی شمار ہوتا ہے جو پشتو کے مشہور و معروف شاعر خوشحال خاں خٹک کے صاحبزادے تھے۔ آپ ۱۶۵۳ء میں اکوڑہ خٹک کے مقام پر پیدا ہوئے۔ خٹک قبیلے میں خوشحال کی شاعری کے بعد انہی کے کلام کو قبول عام حاصل ہوا۔

سرحد کے اس جیالے فنکار کو اوائل عمر سے ہی شعر و شاعری سے رغبت تھی۔ ان کا وقت اگرچہ ادبی سرگرمیوں میں ہی صرف ہوتا تھا تاہم آپ اپنے آبائی فن سپہ گری سے بے بہرہ نہ تھے۔

اس مختصر سے مضمون میں عبدالقادر خاں کی شاعری پر سیر حاصل [illegible] کے منتخب کلام کا منظوم ترجمہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ قارئین کو پشتو کے اس بلند پایہ شاعر کا انداز فکر معلوم ہو سکے۔

بعض محققین نے آپ کے دواوین کی تعداد ۶۰ تک بتائی ہے لیکن آپ کی ان تصانیف میں سے جو چھپ چکی ہیں اور دستیاب ہو سکتی ہیں چند ہی ہیں۔ مثلاً

- "دَ اشعار و دیوان" جس میں مختلف موضوعات و عنوانات پر تقریباً ساڑھے تین ہزار اشعار ہیں۔
- "گلدستہ" عبدالقادر خاں کا یہ دیوان شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کی مشہور تصنیف "گلستاں" کا پشتو میں نہایت موثر ترجمہ ہے۔
- "نصیحت نامہ" یہ کتاب [illegible] میں لکھی گئی ہے۔
- "خلو پنبتا"۔ یہ مجموعہ پانچ سو سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہے۔
- "آدم خان درخوانئی" وادیٔ سوات کے مشہور و معروف عوامی رومان کو اس کتاب میں نظم کیا گیا ہے۔
- "یوسف زلیخا" تقریباً ساڑھے چار ہزار اشعار میں حضرت یوسفؑ کے واقعہ کا منظوم بیان ہے۔

ان چند تصنیفات سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ عبدالقادر خاں نے تقریباً ہر موضوع پر اپنا زور طبع صرف کیا ہے۔ آپ کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر شعر میں تخیل کی بلند پروازی اور اسلوب بیان میں [illegible] ہونے کے باوجود زبان بڑی آسان اور انداز حد درجہ موثر و دلنشیں ہے۔ آپ کے اشعار میں حسن و عشق [illegible] ہجر و وصال کے جذبات کے ساتھ ساتھ صوفیانہ نکات اور قومی احساسات کو بھی قاری [illegible] چلا جاتا ہے۔ وہ اگر کہیں موسم کی رنگینیوں سے متاثر ہوئے ہیں تو بے ثباتی عالم سے بھی ان کی نگاہ حقیقت شناس نے اغماض نہیں کیا۔ جہاں انہوں نے زندگی میں کامیابی سے ہمکنار ہونے کا راز آشکار کیا ہے وہاں انسان کو یہ بھی بتایا ہے کہ انسان کا منصب کیا ہے اور وہ کیسے صحیح انسان بنے غرض وہ نہ صرف ایک شاعر تھے بلکہ مصلح وقت بھی تھے۔ انہوں نے

شاعری کو ملی فلاح و تعمیر کے لئے ایک وسیلے کے طور پر برتا ہے اور اس وسیلے سے نوعِ انسان کو وحدتِ فکر و عمل، پاکیزگیِ گفتار اور بلندیِ کردار کی عملی راہیں سجھائی ہیں۔

عبدالقادر خان چونکہ خود ایک بہادر شجیع سپاہی بھی تھے اس لئے مستقل مزاج، جواں ہمت اور قربانی و ایثار کے جذبات رکھنے والے انسان کو بھی پسند کرتے تھے۔ چنانچہ ایک جگہ اس جذبہ کا اظہار یوں ہوا ہے:

رہتا ہے اسی مردِ جواں تک آباد چشمِ صفت جل کے کرے محفلیں آباد
ہرچند کہ خود اس کی قبا خون میں تر ہو ہنس ہنس کے گر اوروں کے دل کو کرتا ہے شاد

اور اس طرح عبدالقادر خان جہاں اپنی قوم کے نوجوانوں کے دلوں میں قربانی و ایثار کے جذبات ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں وہاں یہ بھی نہیں بھولتے کہ ظلم و تعدی ایک بہت بڑی اخلاقی کمزوری ہے کیونکہ ظالم جب ظلم کرنے پر آمادہ ہو جائے تو اسے خیر و شر اور اپنے پرائے کی بھی تمیز نہیں رہتی۔ چنانچہ وہ افرادِ ملت کی توجہ اس معاشرتی برائی کی طرف یوں مبذول کرتے ہیں:

شیوہ ہے ترا دل ہی دکھانا تو ستمگر اس زیست سے صد درجہ تجھے موت ہے بہتر
کب تک یونہی بھڑکیں گے ترے ظلم کے شعلے پھونکے گی یہی آگ کسی روز ترا گھر

اور اپنے اشعار کے ذریعے عبدالقادر خان قوم کو سعی پیہم اور جہدِ مسلسل کا پیغام بھی دیتے ہیں اور دلیری و جفاکشی کا درس یوں فرماتے ہیں:

بے جنگ و دو کامیابی کس کو ہوتی ہے نصیب حاصلِ مقصد کی خاطر جہدِ پیہم چاہیئے
شمشیر جس کی خون میں رقصاں رہے وہی میدانِ کارزار سے آتا ہے سرخرو

عبدالقادر خان نے اپنے اشعار سے ہمیشہ افرادِ ملت میں صحیح اسلامی روح بیدار کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے جہاں قوم کو جہد و عزم کی ترغیب دی ہے وہاں وہ حلم و رواداری کے عظیم اسلامی درس کو بھی نہیں بھولے:

برائی کرتے ہیں جو اُن سے نیکی کرتا ہوں اسی لئے تو ہر اک دل میں میں سمایا ہوں
نہیں ہے خوف مجھے ان کا جو ہیں آتش خو کہ میں مزاج میں مانندِ آب ٹھنڈا ہوں
ہیں نور و نار مرے ہی لئے کسی کو کیا مجھے خبر ہے میں پروانہ وار جلتا ہوں
نہیں گلہ مجھے غیروں سے کچھ بھی اے قادر کہ اپنے قلب و نظر کے سبب میں رسوا ہوں

"گلدستہ" میں حرص و آز کو چھوڑ کر انسانوں کو تھوڑے پر قناعت کرنے کی تلقین ایک جگہ یوں ملتی ہے اور اس زمانہ میں بھی کس قدر اچھی مثال و تلقین ہے:

جب قطرۂ حقیر پہ قانع ہوا صدف شہرت ہوئی گہر کی زمانے میں ہر طرف
چند ایک استخواں پہ جو قانع ہوا ہما دنیا کے ہر پرند پہ حاصل کیا شرف

ہمیں عبدالقادر خان کے کلام میں جہاں اس قسم کے تعمیری اشعار نظر آتے ہیں وہاں حسن و عشق کی چاشنی سے لبریز ہجر و وصال کے غم اور شادمانی کی جھلکیاں، موسمی رنگینیوں اور ماحول کی کیف آفرینیوں کے احساسات بھی وافر نظر آتے ہیں۔ ان کی غزلیں اور نظمیں مطالعہ کے لائق ہیں۔ مثلاً ابر و باد و باراں کی کیفیتوں سے متاثر ہو کر آپ نے اپنے دلکش و دلنشیں ماحول کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

بوندوں کی یہ رم جھم یہ طرب خیز فضائیں ہم رقص ہیں گلزار میں پھول اور ہوائیں
ہر رنگ کا سامانِ مسرت ہے میسر کب دیکھیے ساقی کے قدم رقص میں آئیں

اس قسم کے اشعار کے ساتھ ساتھ عبدالقادر خان کے کلام میں ہمیں بیشمار غزلیں اور نظمیں ایسی بھی ملیں گی جن میں تصوف و عرفان کے سرمدی جذبات کو نہایت خوش اسلوبی سے سمویا گیا ہے۔ مثال کے طور پر اس غزل میں آپ نے وحدت الوجود کی کیفیتوں کو یوں

(باقی صفحہ پر)

ملت کے پاسبان

احسان ملک

"تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں" - اور یہ تیغوں ہی کا سایہ تھا جس میں ۱۰ - جنوری کو تمام پاکستان کے عوام نے اپنے فوجی بھائیوں کے ساتھ مل کر یوم افواج پاکستان منایا - اور اسطرح ہماری تاریخ میں ایک اور یادگار دن کا اضافہ ہوا -

بعض رشتے عزیز ہوتے ہیں اور جوں جوں وقت گذرتا جاتا ہے وہ اور بھی عزیز ہوتے جاتے ہیں - کچھ ایسا ہی جذباتی و رومانوی رشتہ جمہور پاکستان اور ان پاسبانان قوم کے مابین بھی ہے جنھیں ہم پاکستان کی مسلح افواج کے نام سے یاد کرتے ہیں - بلاشبہ یہ رشتہ ایسا ہے جو مضبوط و مستحکم ہوتے ہوئے روز بروز خوشگوار سے خوشگوارتر ہوتا چلا جا رہا ہے - اور دور دور پھیلی ہوئی فضائیں ہوں یا زمین کی بے پایاں وسعتیں یا سمندروں کا پھیلاؤ بےکراں ، ہمیں ان پاسبانان قوم ہی کی جولاں گاہیں دکھائی دیتی ہیں جو اپنے اپنے طور پر شب و روز جمہور کے تحفظ کا مقدس فرض سرانجام دینے میں مشغول ہیں - یہ وہ پاسبانان ملت ہیں جن کی یاد ہمارے دلوں سے کبھی محو نہیں ہو سکتی - اور فضائیہ ہو یا بحریہ یا بری افواج ہم ان میں خلوص و صداقت کے وہ مظاہر پاتے ہیں جو ناموس قومی کے تحفظ کے ساتھ ساتھ دفاع قوم و ملت کا دشوارترین فرض بھی انجام دیتے ہیں -

یہ حقیقت ہے کہ جب سے پاکستان وجود میں آیا ہے افواج پاکستان ہی اس کا واحد صالح عنصر رہا ہے - جو قوم کے لئے سرمایۂ افتخار ہے - ان افواج کا دل حب وطن اور ملک و قوم کی بےلوث خدمت کے جذبہ سے سرشار رہا ہے اور ان کا دامن کبھی ان کثافتوں سے آلودہ نہیں ہوا جو ہمارے خودغرض اور بددیانت سیاستدانوں کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ بن کر نمایاں ہوئیں - ہم میں سے کس کو وہ وقت یاد نہیں - ہماری قومی زندگی کا سب سے نازک وقت - جب کہ پاکستان قائم ہوا اور آفات و

مصائب کے ہجوم نے ہمیں چاروں طرف سے اسطرح گھیر لیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا نحوست واقعی پس و پیش منڈلا رہی ہے - اور ہماری اس نوزائیدہ مملکت کا آخری وقت قریب آن پہنچا ہے - اس وقت بھی اگر ہماری نگاہیں کسی کی طرف اٹھتی تھیں تو وہ یہی قوم کا صالح ترین، جری اور بے باک عنصر تھا جس نے کبھی کسی سے شکست کھانا نہیں سیکھا تھا - جو حقیقتاً ہمارا بازوئے شمشیرزن تھا اور اس نے شدید ترین مصائب اور یاس و نا امیدی کے عالم میں بھی اپنی بےباکی و بلند حوصلگی کا ثبوت دیتے ہوئے مخالف عناصر کو شکست فاش دی - یقیناً ہمارے وطن اور ہماری قوم کی سلامتی اس نازک ترین زمانے میں بھی افواج پاکستان ہی کی رہین منت تھی -

اس کے بعد ایک سکوت کا دور، بہت ہی صبر آزما دور آیا جس میں خود غرض اور بددیانت سیاست‌داں من‌مانی کرتے رہے اور عوام کو ان کے جائز حق سے محروم رکھتے ہوئے برابر اپنے ہی جاہ و اقتدار کا سامان کرتے رہے، اپنے ہی عیش دوام کے سنہری محل تعمیر کرنے میں مشغول رہے - یہ ہماری تاریخ کا ایک نہایت ہی تاریک اور پرآشوب دور تھا - جو ہمیں آہستہ آہستہ تباہی و بربادی کے مہیب غار کی طرف لے گیا اور کچھ عجب نہ تھا کہ اگر رحمت حق بروقت جوش میں نہ آتی تو ہماری نوزائیدہ مملکت اس اندھیرے غار میں ہمیشہ کیلئے گم ہو جاتی - اس دوران میں ہماری افواج برابر اپنے اندرونی نظم و نسق اور مضبوطی و استحکام ہی میں منہمک رہیں - ان کا مقصد ایک اور صرف ایک تھا - وطن عزیز اور قوم شکستہ حال کا دفاع - فضائی، بحری اور بری افواج اپنے آپ کو ساز و سامان سے لیس کر کے زیادہ سے زیادہ مضبوط بناتی رہیں تاکہ اگر، خدانہ خواستہ، قوم پر کوئی بہت برا وقت آ جائے تو اسکے توانا، پرخلوص اور کارآزمودہ بازو آگے بڑھ کو اسے سنبھال لیں - ملک میں خودغرض اور وطن‌دشمن تخریبی عناصر جو کھیل کھیل رہے تھے وہ انہیں بخوبی معلوم تھا - لیکن انہوں نے اس ہتیار کو تیار کرنے ہی پر توجہ موکوز رکھی جسے وقت پر قوم کی حفاظت کے لئے کام میں آنا تھا - ,, ٹائیبنی ،، کے الفاظ میں انہوں نے اتنا عرصہ عزلت‌گزینی اختیار کئے رکھی اور اندر ہی اندر اپنی صلاحیتوں کو جلا دیتی رہیں - تاآنکہ حالات زمانہ انہیں یہ دعوت نہ دیں کہ :

تو شمشیری ز کام خود بروں آ
بروں آ از نیام خود بروں آ

ہماری افواج کو، جس کے عوام و خواص، سب نے حکیم ملت‌رح ہی کے ارشادات اور تعلیمات سے

کسب فیض کرتے ہوئے ذھنی نمو حاصل کی تھی ان کا یہ سبق خوب یاد رکھا تھا کہ :

بانشہٴ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن

اور یہ نشہٴ درویشی محض چلہ‌کشی یا مراقبہ نشینی نہ تھی بلکہ چپکے ھی چپکے جمعیت پیدا کرنا تھا جو ھماری افواج کو وقت آنے پر اپنی غیر معمولی توانائی کے ثبوت کا موقع دے۔

ملت کے پاسبان قوم کی زبوں حالی، انسانی اقدار کی پائمالی اور مذھب کی رسوائی کا افسوسناک منظر دیکھتے رہے۔ اور یہ احساس ان کے دل میں خلش کرتا رھا کہ قوم برابر قعر مذلت میں غرق ھوتی چلی جا رھی ھے۔ اور قوم کے دشمن ھی اسکے سیاہ و سفید کے مالک و مختار بنے بیٹھے ھیں۔ لیکن تا بکے! آخر ان کا پیمانہٴ صبر لبریز ھوگیا اور پھر چشم زمانہ نے دیکھا کہ:

ھوئے احرار مات جادہ پیما کس تجمل سے
تماشائی شگاف در سے ھیں صدیوں کے زندانی

پاسبانان ملت نے بےحد جراٴت کے ساتھ فیصلہ کن قدم اٹھایا اور ۲۷ - اکتوبر کو وہ انقلاب عظیم پیدا کیا جس سے ھماری تاریخ میں ایک نئے، مہتم‌بالشان دور کا آغاز ھوتا ھے۔ اور ھماری حیات ملیہ ایک نئی شاھراہ پر گامزن ھوتی ھے۔ در اصل یہ محض انقلاب نہ تھا۔ یہ ھماری قوم کو حیات تازہ کی نوید تھا۔ اور اس آزادی سے روشناس کرانے کی تازہ کوشش جس سے وہ غاصب عناصر کے ھاتھوں محروم ھوچکی تھی۔ اس عہد آفریں واقعہ کے بعد افواج پاکستان سے جو کارھائے نمایاں صادر ھوئے ان کا تذکرہ تحصیل حاصل ھے۔ یہ ھماری تاریخ ملت کا ایک حیرت‌انگیز باب ھیں اور ایسی خاموش فتوحات پر مشتمل جن کا سلسلہ ایک سیل بےزنہار کی طرح برابر جاری ھے۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان اور ان کے اولوالعزم رفقائےکار کی زیر قیادت افواج پاکستان انقلاب آفرینی کے جذبہٴ بےاختیار سے اس طرح سرشار ھیں کہ انھوں نے نہ صرف قومی مفاسد کو ملیامیٹ کر دیا ھے بلکہ تمام نظام حیات ھی کو بدل ڈالا ھے۔ اور یہ ذوق و شوق کسی سرسری جذبہٴ عمل یا توانائی کی ھنگامی رو کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک مستقل و مسلسل احساس کا نتیجہ ھے۔ جس کا والہانہ پن آئیندہ زیادہ مہتم‌بالشان کارناموں کی خبر دیتا ھے۔

اس عمل تطہیر کے بعد جس نے تمام نظام زندگی کو تندرست و توانا بنا دیا اور ملک میں صحیح فضا پیدا کردی، اگلا نہایت اھم اقدام یہی تھا کہ عوام کو ان کا حق دلایا جائے اور انکی اپنی منتخب کی ھوئی نمائندہ حکومت قائم کی جائے جو بقول صدر پاکستان ھمارے قومی مزاج اور ملکی آب و ھوا سے مطابقت رکھتی ھو۔ اسکی صحیح شکل ,,بنیادی جمہوریتوں،، ھی میں دکھائی دیتی ھے۔ جنکا پاکستان بھر میں اھتمام کیا گیا۔ اور اب نمائندہ حکومت کے قیام کے بعد مناسب دستور کی تشکیل ھی واحد معاملہ رہ گیا ھے جس پر خصوصی توجہ دی جا رھی ھے۔

اس وقت جب ملک بھر میں انتخابات ختم ہو چکے ہیں اور بنیادی جمہوریتیں عملی طور پر وجود میں آ چکی ہیں، نیز انقلابی حکومت نے زندگی کے ہر شعبہ میں بنیادی اور نہایت دوررس قسم کی اصلاحات صادر کر کے تمام بڑے بڑے معرکے سر کر لئے ہیں، یہ برمحل موقع تھا کہ افواج پاکستان، جنہوں نے اپنی ساری جد و جہد قومی خدمت اور جمہور کو بر سر اقتدار لانے کیلئے صرف کردی انکو اپنے ان محبوب عوام سے قریب تر لایا جائے - چنانچہ ۱۰ - جنوری کو جو ,,یوم افواج پاکستان،، منایا گیا اس میں در حقیقت یہی احساس کارفرما تھا - افواج نے جو کارہائے نمایاں انجام دئے وہ ان کیلئے صرف اس وجہ سے مایۂ افتخار ہیں کہ ان کے ذریعہ ہی عوام کو ان کا حق، ان کی برتری، حاصل ہوئی - ان حالات میں خود عوام ان کو کیسے فراموش کر سکتے تھے - وہ کیسے بھول سکتے تھے کہ ان کی افواج نے انہیں کیا کچھ دیا ہے - ان کے دل میں کیسے از خود یہ امنگ نہ پیدا ہوتی کہ وہ پاسبانان ملت سے ملیں، ان کو قریب سے دیکھیں اور یہ اندازہ لگائیں کہ وہ ان کے لئے کیا کچھ کر رہے ہیں کیسے کر رہے ہیں - کس ذوق و شوق اور ولولہ و آہنگ سے کر رہے ہیں - اور کس ساز و سامان کے ساتھ، کیسے کیسے سربراہوں کی زیر قیادت -

لہذا ,,یوم افواج پاکستان،، کا خیال بہت عمدہ اور بہت بروقت خیال تھا - اس نے پاکستانی عوام - چھوٹوں، بڑوں، سب کو اپنے حفاظت کرنے والوں سے ملنے اور اپنے اندر ایک نیا جوش، ایک نیا ولولہ پیدا کرنے کا موقع دیا - عوام مہمان تھے اور فضائی بحری اور بری افواج ان کی میزبان - دونوں میں یکساں گرمجوشی تھی - جس سے باہمی اعتماد اور محبت کا سلسلہ اور بھی آگے بڑھ چکا ہے، اور بھی نتیجہ خیز ثابت ہو رہا ہے-

وہ دن، اسکی چہل پہل، اسکی ہماہمی اور اسکی خوشگوار فضا ہمیشہ یاد رہے گی جب کہ عوام اور فوج ایک دوسرے سے گلے ملے — ادھر مشرقی پاکستان کے گوشے گوشے میں اور ادھر مغربی پاکستان کے ہر حصے میں - ڈھاکہ ہو یا کراچی، پشاور ہو یا راولپنڈی، حیدرآباد ہو یا لاہور ہر کہیں ذوق و شوق اور تپاک کا ایک ہی عالم تھا- جیسے تمام شہروں میں جان پڑ گئی ہو، ان کے رگ و پے میں زندگی کی ایک نئی روح دوڑ گئی ہو- کراچی میں رہنے والوں نے کراچی سے لیکر ڈرگ روڈ تک کیا کیا ہنگامے مشاہدہ نہیں کئے - گویا یہ بھی عید کا دن تھا - ایک خاص قومی عید کا دن - اور یہ اس لئے اور بھی باعث مسرت ہے کہ عوام اور پاسبانان ملت کی باہمی محبت و یگانگت خود پاکستان کے لئے ایک فال نیک ہے - اور ہم اس میں ایک شاندار مستقبل کے کتنے ہی خوش آئیند آثار پاتے ہیں-

عوام زندہ باد!

افواج پاکستان زندہ باد!

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان زندہ باد!

پاکستان زندہ باد!

غزل

تابش دہلوی

کثرتِ جلوہ میں ہے جلوۂ یکتائی بھی
وہ جو رعنائی بھی ہو، پیکرِ رعنائی بھی

ایک تنہا ترا غم، اپنے ہزاروں ارماں
میری تنہائی نہیں ہے مری تنہائی بھی

یہ تغافل کہ ہمیں پر ہے توجہ تیری
یہ تعلق کہ نہیں ہم سے شناسائی بھی

وہ فریبِ نگہ و دل بھی نہیں ہیں شاید
جن بہاروں سے نہ بہلے ترے سودائی بھی

کم نہیں مجھکو یہ اعزازِ تعلق اے دوست
تجھ سے منسوب ہوئی ہے مری رسوائی بھی

نعمتیں دے کے دیا حوصلۂ حسنِ قبول
درد کے ساتھ ملی مجھکو شکیبائی بھی

تم محبت کے ثناخواں تو بہت ہو تابش
یہ بتاؤ کہ محبت تمہیں راس آئی بھی

مشتاق مبارک

آنسو جو مرے زینتِ مژگاں ہی رہیں گے
حالات کے گیسو بھی پریشاں ہی رہیں گے

پابوس رہِ شوق میں ہر گام ہوں کانٹے
ہم نازکشِ حسنِ گلستاں ہی رہیں گے

نرگس ہی نہیں اس چمنِ دہر میں حیراں
آئینہ صفت آپ بھی حیراں ہی رہیں گے

اس زلفِ سیہ فام کی تاریک فضا میں
ہم مثلِ مہ و مہرِ درخشاں ہی رہیں گے

صرفِ خس و خاشاکِ چمن جن کی نظر ہے
نامحرمِ اندازِ بہاراں ہی رہیں گے

جذبات کی دنیا متغیر نہ ہو جب تک
دل محوِ ثنائے رخِ جاناں ہی رہیں گے

اترے گا کسی طرح نہ کیفِ غمِ جاناں
ہم تلخئ حالات پہ خنداں ہی رہیں گے

دل جن کے نہیں درد کی لذت سے شناسا
وہ منحرفِ عظمتِ انساں ہی رہیں گے

ہے منفرد انداز سخن جن کا مبارک
دنیائے ادب میں وہ نمایاں ہی رہیں گے

غزل

محبؔ عارفی

ہر ذرے کی نظر سے برستی ہیں وحشتیں
چھوڑا یہ لا کے ہوش نے کس دشت میں ہمیں

ساقی نہ چھیڑ نگہِ التفات سے
ایسا نہ ہو کہ غم کے پیالے چھلک پڑیں

لڑتا ہوں ان سے، دل میں تمنا ہے صلح کی
کھاتا ہوں زخم لذتِ مرہم کے شوق میں

کیا دستبردِ شوق سے بچتا غرورِ حسن
پابستہ خود جنوں بھی ہے زنجیرِ ہوش میں

باختگی میں عشرتِ ساحل ہے موج کو
واماندگی کی تہہ سے ابھرتی ہیں منزلیں

تم رنگ و بوئے غنچہ سے ہو بلبلو ہلاک
اب کیا ہے ان کے پردہ میں کام اس سے کیا تمہیں

اٹھی نقاب سطح تو پھر قعرِ بحر کیا
اچھا ہے رازِ حسن پہ پردے پڑے رہیں

موجیں اٹھی ہیں بحرِ عدم میں کہیں کہیں
ہستی میں ہم کو کیا نظر آتا ہے کیا کہیں

ہم ہیں اسیرِ حلقۂ تدبیر یا بھنور
اس دھن میں ہیں کہ وسعتِ دریا سمیٹ لیں

کیوں کر نہ ہاتھ اٹھاؤں محبؔ ضبطِ شوق سے
دیکھو نہ ان کی ضبطِ تبسم کی کاوشیں

شاہد عشقی

شہرِ نگاراں میں پھرتے ہیں ہم آوارہ رات ڈھلے
شاید کوئی دریچہ وا ہو، شاید کوئی دیپ جلے

کوئی غم آگیں نغمہ چھیڑے، کوئی میر کے شعر پڑھے
کم کم درد کی کلیاں مہکیں، پل پل غم کی رات ڈھلے

ویراں ویراں دل کی بستی، سونی سونی راہِ وفا
ایسے کٹھن رستے پہ کوئی دو چار قدم تو ساتھ چلے

چاک ہر اک گل کا دامن اور آوارہ ہر موجِ صبا
جیسے مجھ سے مل نہ سکا ہو کوئی بچھڑتے وقت گلے

ختم ہوا ہے عشقیؔ ہم پر سلسلۂ وحشت زدگاں
شاید کوئی شخص ہمارے بعد وفا کا نام نہ لے

فن:

مشرقی پاکستان کا ایک مصوّر

(حمید الرحمٰن)

جلال الدین احمد

اِنجل روڈ (کراچی) پر پاکستان آرٹس کونسل کی نئی عمارت کا ایک حصہ اب تقریباً مکمل ہو چکا ہے۔ اس کے ڈیزائن کی خوبی اور تعمیری زینت کا کچھ احساس تو دیکھنے والے کو بیرونی نظارہ سے ہی ہو جاتا ہے اور جب ناظر اس عمارت میں داخل ہو کر اِدھر اُدھر نگاہ ڈالتا ہے تو اسے ہر طرف ذوق، خوش سلیقگی اور ترتیب و آرائش، نفاست و حسن کاری کی رعایت نظر آتی ہے۔ عمارت کی نچلی منزل افتتاحی جلسوں کے لئے مخصوص ہے اور یہاں تقریباً ایک ہزار آدمیوں کی نشست کی گنجائش ہے۔ اس سے اوپر پہلی منزل ہے، جس کا وسیع و عریض ایوان عام طور پر فنونِ حاضرہ کی نمائشوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سے اوپر دوسری اور تیسری منزلیں ابھی تک تعمیر کے آخری مراحل سے گذر رہی ہیں۔

پچھلے دنوں اس عمارت میں مشرقی پاکستان کے ایک نوجوان مصوّر حمید الرحمٰن کی نقاشی کی نمائش ہوئی۔ یہ نمائش کئی اعتبار سے چونکا دینے والی تھی اور اگر ناظر ذہنی طور پر اس کے لئے تیار نہ ہو تو بہت ممکن ہے جب وہ یہاں پہنچے تو اس کے تصوّر کو ایک دھچکا سا لگا ہو، کیونکہ مصوّری کے یہ نمونے عام ڈگر سے ہٹ کر تھے اور انفرادی تجربوں کے اظہار کے لئے جو پیرایہ مصوّر نے منتخب کیا تھا وہ پہلی نظر میں بڑا غیر اطمینان بخش معلوم ہوتا تھا۔

کراچی میں اس ۳۱ سالہ مصوّر کی یہ پہلی بڑی نمائش تھی لیکن جو لوگ اس سے پہلے اس کی تصویریں دیکھ چکے ہیں انہیں بھی اس نمائش میں مصوّر کے نئے کام کے نمونے ایک سوالیہ نشان پیش کرتے نظر آئے۔ ان میں فکر و تعمق کے کئی ایسے پہلو تھے جو گہرے مطالعہ کے مستحق تھے۔

حمید الرحمٰن کے کام کو اگر "بصری جائزے" کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ ان میں رنگا رنگی ہے۔ نیاپن ہے بلکہ ایک چونکا دینے والا عنصر ہے جو خیال کو مہمیز دیتا اور فکر کو انگیز کرتا ہے۔ اس کے نقوش کو ذرا غور سے دیکھنے پر ناظر کا یہ تاثر ہوتا ہے کہ مشرقی پاکستان کا یہ مصوّر بزمِ فن میں ایک نئی "گفتار" اور "لہجہ" لیکر آیا ہے۔ اس کے "نطقِ فن" کو سمجھنے کے لئے ناظر کو بھی ذہن و فکر کو غیر معمولی حرکت دینے کی ضرورت ہے ورنہ تعبیرات و معنی تک رسائی ممکن نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ حمید الرحمٰن نے اپنے فن کے لئے جو "نطق و آہنگ" تخلیق کیا ہے اس میں انفرادیت ہے اور بڑا انوکھاپن ہے۔ ایسی فنی تخلیقات کو سمجھنے اور اس کی تعبیرات کو اپنانے کے لئے ناظر کا اپنا ذوق اور احساسِ مفاہمت کا موجود ہونا بڑا ضروری ہوتا ہے کیونکہ جب تک آپ فنکار کے کام کے ساتھ کوئی ذہنی مفاہمت نہ رکھیں اس وقت تک اس کے "فکر" اور "لہجۂ موقلم" کو سمجھنا ذرا مشکل ہے۔ حمید الرحمٰن کے فن میں بنیادی تاثریت ضرور موجود ہے اور وہی وسیلہ بنتی ہے اس کے کام کی صحیح جانچ کے لئے، مگر اس کا انحصار قدرتی طور پر، دو باتوں پر ہوتا ہے۔ فن کار کی فن پر گرفت، کام میں چابکدستی اور موضوع کے برتنے میں وہ چیز جسے شعر والے "چونچلا" کہتے ہیں ——— دوسری طرف خود ناظر کی طبیعت میں بھی "آمد" ہو یعنی اس کے "نطق" کو پا لینے کے لئے ایک ذہنی آمادگی موجود ہو۔ پیام کے لئے ہر دو طرف افہام اور تفہیم کے واضح وسیلے اور علامتیں موجود نہ ہوں تو پیام مبہم رہتا ہے۔ چنانچہ اس مصوّر کے کام کو سمجھنے کے لئے بھی ناظر کی اپنی کاوش، نظر کی گہرائی اور ہمدردانہ توجہ کی ضرورت ہے، بلکہ حسِ تفہیم کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ ناظر کو ایسے فن پارے کی بات تک پہنچنا اپنی ہی کاوش پر زیادہ منحصر ہوتا ہے اور پھر اسے جو راحت و تسکین ملتی ہے وہ بڑی پائیدار اور معنوی ہوتی ہے۔

مصوّری و نقاشی کی نمائشوں میں اب جو لوگ جاتے ہیں ان سے پرانے بزرگ سرپرستوں، مربیوں اور نمائش بینوں سے کچھ زیادہ ہی توقعات وابستہ کی جاتی ہیں۔ خیر، یہ مسئلہ ایک جدا بات ہے۔

ان چند سالوں میں بالخصوص یہ صدی، یہ دنیا، جس طرح برق رفتاری سے ترقی کرتی رہی ہے اس کا حال ایسا ہو گیا ہے کہ ہم سائنس کی ترقی اور نئی دریافتوں کے باب میں ذہنی طور پر تیار بیٹھے رہتے ہیں — بلکہ انہیں بے چون و چرا تسلیم ہی کر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ادب میں بھی اگر کوئی "نیا دھماکہ" ہو جائے تو اس کی تقدیم میں لبیک لبیک کہنے لگتے ہیں — مگر جہاں تک نقش گری کا میدان ہے وہاں ہم فن کی عصری روح اور اور اس کے اظہار کے نمونوں پر کچھ ماضی کی طرف ہی لوٹتے رہتے ہیں بلکہ نئی ہیئتوں کے ساتھ اپنے ادراک اور فہم کو ہم آہنگ کرنے میں متامل رہتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ روحِ عصر کے ان پیکروں کو قبول کرنے میں یہ ہچکچاہٹ کیوں ہوتی ہے۔

علوم مادّی و معاشری کے معاملے میں تو ہمارا عالم یہ رہتا ہے کہ معلوم و معروف تصورات و حقائق اگر نئی دریافتوں اور نظریوں کے باعث منہدم ہو جائیں تو ادھر یا بہ جلد، ہم اپنے آپ کو ان سے متفق کر ہی لیتے ہیں بلکہ آخر سپر ڈالنے پر مجبور رہتے ہیں۔ لیکن جب کوئی تخلیقی فنکار حقائقِ اشیاء کا نیا ادراک نئے زاویوں سے ہمارے سامنے لیکر آئے اور اس کی تعبیرات کچھ چونکا دینے والی ہوں، اسلوب میں انوکھا پن ہو تو ہم کہہ اٹھتے ہیں کہ یہ تو لوگوں کو "بنانے" کی کوشش ہے اور بالکل کھلی ہوئی۔ ہم اس "ہتھکنڈے" کو خوب سمجھتے ہیں اور اس طرح "بے وقوف" بننے کے لئے تیار نہیں!

حمید الرحمٰن کو بھی اس مسئلہ سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ مشرقی پاکستان کے اس مرنجاں مرنج، نرم گفتار، اور کم سخن مصوّر سے اکثر یہ سوال کیا گیا ہے کہ آپ آخر بناتے کیا ہیں؟ بلکہ بعض مربی و ہمدرد قسم کے بزرگ تو اسے یہی سمجھاتے ہیں کہ "تم ایسے نقوش کیوں بنا رہے ہو جن سے ذہن کو دھچکا لگتا ہے اور ڈراؤنے خواب کی سی کیفیت قلب و نظر پر مرتسم ہو جاتی ہے۔ تم مناظر لذیذ و خوش نظر بنانے پر خوب قادر ہو، اچھے اچھے حسین مناظر اور فردوسی چہروں کو آخر کیوں کینوس پر منتقل نہیں کرتے؟"

اپنی یہ تعریف سنکر مصوّر خوش تو ہو جاتا ہے مگر "بہکتا" نہیں۔ اس تعریف سے اس کا اطمینان نہیں ہوتا کیونکہ لوگ اس کی بات کو پا نہیں سکے۔ وہ بڑی ملائمت سے کہا کرتا ہے کہ فن میں صرف "شیرینی" اور "تناسب" کا ہی جوہر نہیں ہونا چاہیئے۔ فن میں ہوتا یہ ہے کہ آپ کی نظر وہ چیزیں ڈھونڈتی ہیں جنہیں آپ پہلے ہی سے جانتے ہیں لیکن کیا اکثر یہ نہیں ہوتا کہ ہم اپنی آگاہی اور وجدان کی سرحدوں کو اور آگے بڑھائیں اور پھر آرٹ میں آپ وہ چیز پا جائیں جسے آپ پہلے سے نہ جانتے تھے!"

"بہرکیف یہ تو واقعہ ہے کہ فن عرصۂ حیات کی جادہ پیمائی ہے اور آپ کے قدم جتنی بھی نئی راہوں پر چل سکیں نئی نئی منزلیں پاتے چلے جائیے" شرح و انکشاف کا نتیجہ علم و دانش کی دنیا میں کاوش کا ہی تقاضہ کرتا ہے اور جب ادراک معانی ہو جائے تو وہ خود اپنا انعام ہوتا ہے۔ حمید کہا کرتا ہے کہ "ہمارے ملک میں کوئی سو سال سے نرم و نازک، پٹی ہوئی سی جذباتی مصوّری تو ہو ہی رہی ہے مگر اب وقت آگیا ہے کہ اس میں قوت، شوکت اور توانائی لائی جائے۔ اب ہم جو لوگ نئے اوضاع سے کام لے رہے ہیں، نئے موضوع اور نیا اظہار کینوس پر لا رہے ہیں وہ صرف اپنے پیکروں کو کسی نہ کسی طرح منتقل کر دینے کا عمل نہیں ہے بلکہ ہم نئی نئی ہیئتوں کے صنم تراش رہے ہیں اور ان کا سمجھنا آپ کا تعاون چاہتا ہے"۔

تلخی یا چڑچڑے پن کا شائبہ قطعی نہیں ہوتا مگر وہ مضبوط لہجے میں یہ ضرور کہتا ہے کہ "آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میں اس طرح کے نقش کیوں بناتا ہوں۔ کیا مجھے قدرت نے وہ بصیرت نہیں دی ہے کہ میں بنگال کے دریاؤں اور کشتیوں کو ان پہلوؤں سے دیکھ سکوں جو ان کا "صحیح" روپ ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ "صحیح" روپ کیا ہے؟ کسی شے کا صحیح روپ دیکھنے کے لئے ہم سب کو ہی کئی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان میں سب سے بڑی چیز بصیرت کا وہ شعلہ ہے جو "ذوقِ تماشا" کو صحیح راستہ پر گامزن رکھتا ہے اور ذہن و فکر کو کام میں لانے کی وہ سعیٔ بلیغ جس کے بغیر آپ کسی بھی فن پارے کی تہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس کے لئے کاوش اور کچھ تجربۂ ناظر کے لئے از حد ضروری ہے"۔

اگر کسی جدید سائنسداں، فلسفی (اور غالباً ناول نگار) نے بھی یہ بات کہی ہوتی تو ہم دوڑ کر اس کی پذیرائی کرتے اور پھر اسے مان بھی جاتے لیکن اب جبکہ یہی بات کسی فنکار کے لبوں سے ٹپکی ہے تو ہم ساکت کھڑے منہ تکتے رہتے ہیں بلکہ مذبذب اور مشکوک سے رہتے ہیں کہ یہ کیا بات بنی —؟ ہم تو بحث کو یہاں تک

طول دیتے ہیں کہ نقوش اور صورت گری سے اگر تسکین ولی حاصل نہ ہو تو پھر کوئی بات ہی نہیں بنی۔ اسے بہر طور خوش آئند ہونا چاہیئے نہ کہ ذہن کو الجھا دینے اور منتشر کر دینے کا نتیجہ برآمد ہو اور ہمارا ذہن مجہول ہو کر رہ جائے۔

گفتگو اگر اس نہج پر چل نکلے تو حبیب بڑی معذرت کے ساتھ عرض کرے گا:

"مجھے اس کا تو علم نہیں کہ دوسرے جدید فنکار اپنی صفائی میں کیا کہا کرتے ہیں، مگر جہاں تک میری اپنی فہم کا تعلق ہے میں تو اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ فن اب بھی حیات کے ایک "خود جوش ردِعمل" کا ہی نام ہے ـــ حیات بڑی پیچیدہ چیز ہے اور اس قدر گوناگوں کہ ہم کو ہر وقت اس کے لئے تیار رہنا چاہیئے کہ کون کس طرح منزل تک پہنچا اور اظہار تاثر کے لئے اس نے کیا نیا میدان سر کیا بلکہ جہاں ہم نئے فنکار بھی نہ پہنچ سکیں ناظر خود مضمرات کے پردے چاک کر سکے اور ایک معانی کا معرکہ سر کر لے۔"

وہ کہتا ہے: "اس سے ایک بات تو صاف ہو گئی کہ ہم جدیدئین نہ تو دانستہ "تجریدی" بننے کی کوشش کرتے ہیں نہ حقائق کی طرف سے نظریں ہی چراتے ہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہم کو جو شے جیسی بھی نظر آتی ہے اسے اپنے تصور اور اپنی ہیئت و لہجہ میں ظاہر کرتے ہیں۔ اس لئے اگر اصطلاحی تعریف کا دائرہ ذرا آپ آگے بڑھا دیں تو ہمارے کاموں کی روح تک پہنچنا کچھ بھی مشکل نہیں۔ یہ گفتارِ عصر ہے۔ اس زبان کو سمجھنے کی کوشش کیجیے"۔

یہ گفتارِ عصر اس بیسویں صدی کی "لسانِ فن" ہے ـــ اس سے زیادہ بلیغ تعریف شاید ممکن نہ ہو کیونکہ اس عہد کے فن کو اسی عہد کے اظہار کی ضرورت تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی ایک مصور و نقاش کے کام کو تاثر انگیز یا پردہ کشائے حقیقت نہ بھی پائیں مگر اس سے انکار ممکن نہیں کہ ایسے نقوشِ پا کی رہنمائی میں ہم کئی نئی منزلوں تک پہنچ سکتے ہیں۔ (ترجمہ: ظفر قریشی)

باب مراسلات:

ڈاکٹر شوکت سبزواری صاحب، رکن عبدالحق اکیڈمی، اردو کالج، اردو روڈ کراچی تحریر فرماتے ہیں:

بابائے اردو کی تصویریں، تحریریں اور مکاتیب۔

عبدالحق اکیڈمی کی طرف سے مئی ۱۹۶۰ء میں بابائے اردو کا نود (۹۰) سالہ یوم پیدائش بڑے اہتمام سے منایا جا رہا ہے۔ اس موقع پر دوسری بہت سی تقریبات کے ساتھ ایک علمی نمائش بھی منعقد کی جائے گی جس کا ایک شعبہ بابائے اردو کی ذات گرامی سے متعلق ہوگا۔ اس میں بابائے اردو کی تصویریں اور تحریریں رکھی جائیں گی۔ جن حضرات کے پاس مولوی صاحب قبلہ کی تصویریں اور تحریریں ہوں وہ مندرجہ بالا پتہ پر بھجوا دیں۔ نمائش کے بعد یہ اشیاء پوری حفاظت کے ساتھ متعلقہ حضرات کو واپس کر دی جائیں گی۔ اس موقع پر مولوی صاحب کے مکاتیب کا مجموعہ بھی شائع کیا جا رہا ہے۔ میں ان تمام حضرات سے جن کے پاس مولوی صاحب قبلہ کے خطوط ہیں، درخواست کرتا ہوں کہ وہ یہ خطوط یا ان کی نقلیں مجھے ارسال کر دیں۔ اصل خطوط کی صورت میں نقلیں رکھ کر خطوط فوراً واپس کر دیے جائیں گے۔

نقد و نظر

وادیٔ سندھ کی تہذیب

از: محمد ادریس صدیقی
(محکمۂ آثارِ قدیمہ پاکستان)
صفحات: (۲۸۰)
طباعت: نسخ اردو ٹائپ
قیمت: ۸/۶ روپے
ملنے کا پتہ: مکتبۂ نیا راہی۔ کراچی ۔

ادریس صدیقی صاحب نے یہ کتاب بڑے ذوق وشوق کے ساتھ تلاش وتحقیق کے جملہ تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے لکھی ہے — اس کے بعض حصے کتابی شکل میں اشاعت پذیر ہونے سے پہلے "ماہِ نو" میں شائع ہوئے۔ موئنجو دارو اور ہڑپہ یعنی آج کل کے پاکستان کی سرزمین کی ثقافت کا پہلا گہوارہ جو پانچ ہزار سال پرانا ہے، کی تہذیبیں اب محققین و ماہرین آثار کا دی کی کوششوں سے منظرِ عام پر آچکی ہیں اور ان گمنام بستیوں کی داستان پاستان پر سے صدیوں پرانی گرد و غبار کی تہیں ہٹ چکی ہیں — ایسے علمی اور تحقیقی موضوعات پر کتابوں کی بڑی کمی ہے، بالخصوص قدیم ثقافت اور آثارِ باقیہ کے ادب پر تو شاید "آثار الصنادید"۔ "واقعات دار الحکومت دہلی" اور غرابت نگار" کے علاوہ چند ہی کتابوں کا ذکر مناسب سمجھا جائے۔ صدیقی صاحب کی یہ کتاب بلا تامل آثاری ادب کے اُن چند بڑے نمونوں کے ہمدوش رکھی جاسکتی ہے۔ مصنف کی یہ کتاب کئی سال کی کاوش کا نتیجہ اور مطالعہ و تحقیق کا نچوڑ ہے۔ ہڑپہ، موئنجو دارو اور دیگر نواحی بستیوں کے رہن سہن اور تہذیب و تمدن کی داستان ایک سیرِ گذراں کے طور پر سامنے آتی چلی جاتی ہے جو بیان کی دلکشی اور روانی کا نتیجہ ہے۔ رسم الخط کے باب میں بہت سے پہلو زیادہ بسیط گفتگو کے متقاضی تھے۔ بالخصوص مولانا ابو الجلال ندوی نے اپنی تحقیق اور قرأت رسم الخط کے نتائج کو جن شواہد اور دلائل کے ساتھ "ماہِ نو" کے صفحات میں پیش کیا ہے وہ آسانی کے ساتھ رد نہیں کئے جاسکتے۔ ضرورت تھی کہ جرح و قدح کی خوردبین سے انہیں دیکھا جاتا۔ ممکن ہے وہ قدیم سندھی رسم الخط کا عقدہ حل نہ کرسکیں۔ لیکن قدیم بین الاقوامی روابط پر جو روشنی انہوں نے ڈالی ہے وہ نہایت اہم حیثیت رکھتی ہے۔ اور پھر یہ بات کافی وزن رکھتی ہے کہ اگر ہم ہر جگہ اس رسم الخط کا سراغ تلاش کرتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ اس سلسلہ میں عراق و عرب و شام کی طرف بھی رجوع نہ کریں اور انہیں بالکل نظر انداز کردینے ہی پر زور دیں؛ حالانکہ قدیم شاہراہوں کا جو نقشہ کتاب کی وصلی پر دیا گیا ہے اور ان علاقوں کے روابط تمام تر اسی رجحان کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ بہرکیف، کتاب کی مجموعی افادیت مسلم ہے۔ طباعت اچھی ہے مگر کئی جگہ املا، انشا اور تصحیح کے نقائص کچھ اس قسم کے واقع ہوئے ہیں کہ ان سے ذوقِ کتاب بینی مجروح ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مثلاً 'نذر' کی جگہ 'نظر'۔ 'رجحان' کی جگہ 'رجحان'۔ 'اکسیر' کی جگہ 'اکثیر'۔ 'گھٹیا' کی جگہ 'گٹھیا' 'کاسۂ سر' کی جگہ 'کاسہ'۔ 'کندہ' کی جگہ 'کنندہ'۔ 'پس منظر' کی جگہ 'پسِ منظر' وغیرہ وغیرہ۔

کتاب پچاس کے قریب خاکوں اور تصویروں سے آراستہ ہے جن سے ایامِ کہن کے خد و خال اور بھی ابھر آتے ہیں اور تخیل اس طرح جاگ اٹھتا ہے کہ ہم ان تہذیبوں اور قوموں کا بخوبی تصور کرسکتے ہیں جنہیں گزرے ہوئے ہزارہا سال گزر چکے ہیں۔ ان حالات میں کون ہے جو مصنف کی اس دعوت پر لبیک نہ کہے کہ

ع زدستم آستیں بردار و گوہر را تماشا کن (ظ۔ق)

باغ و بہار
(میر امّن دلّی والے کا)

تدوین و ترتیب: ممتاز حسین
ضخامت: تقریباً ۳۰۰ صفحات
ناشر: اردو ٹرسٹ۔ کراچی
قیمت: ۶/۸ روپے

"باغ و بہار" (میر امّن دلّی والے کا) اردو کے ان چند قصوں

میں سے ہے جس کی داستانی خوبی اور اس وقت کی دلی کی ستھری زبان
اسے ہمیشہ ہی "باغ و بہار" رکھے گی۔ اور چار درویشوں کے یہ قصّے لوگوں
کے تصوّر اور حیرت فزائی کے لئے ہمیشہ ہی کام کرتے رہیں گے۔ اس کتاب
کی خوبی اس سے ہی ظاہر ہے کہ اس کے بے شمار ایڈیشن (اور اکثر غلط
سلط یا ایسی ترمیم کے ساتھ جس میں اُس وقت کی املا، انشا تک کو
بدلنے کی کوشش کی گئی) شائع ہو چکے ہیں مگر اس کا ایسا نسخہ جو کئی
مستند، کئی متداول اور کئی کمیاب، بلکہ نایاب، نسخوں سے مقابلہ کرنے
کے بعد شائع کیا گیا ہے، اب تک شائع نہیں ہوا تھا۔ اردو ٹرسٹ کراچی
کی یہ پہلی کوشش اس کے آئندہ پروگراموں کی جھلک کے ساتھ ادب
دوست طبقوں میں بڑی مسرت کے ساتھ دیکھی جائے گی۔ ممتاز حسین
مرتبِ نسخہ نے اس ایڈیشن میں خصوصی کاوش سے کام لیا ہے۔ جو ایسی
تالیف کے لئے ازبس ضروری تھا اور انہوں نے ہماری توقعات سے
پورا انصاف کیا ہے۔ تالیفِ نسخہ پر بحث و نظر کے ساتھ اور داستانوں
کی مجموعی اہمیت پر ایک جائزہ خاصے کی چیز ہے۔ کلاسیکی ادب کی اس خدمت
کو ہر جگہ سراہا جائے گا۔ کتاب میں کئی ابواب مثلاً میر امن کے بیان کے مطابق دلی
کی معاشرت اور فرہنگ لغات اور حاشیوں اور حوالوں کا اضافہ اس کتاب کی افادیت
کو بہت بڑھا دیتا ہے۔ کتاب پڑھتے وقت بہت سے محاورے، الفاظ اور اسمائے
اشیا غیر مانوس معلوم ہوتے ہیں مگر اس فرہنگ نے بہت سی دشواریاں سہل کر دی
ہیں اور پرانے ادب کے بے شمار الفاظ، حوالے اور محاورے جو زبان کی تاریخ
و تدریجی صلاحیت کی طرف رہنمائی کر سکتے ہیں اس طرح محفوظ ہو گئے ہیں۔ اس
فرہنگ اور حوالوں نے کتاب کی تفہیم و توقیر میں بہت اضافہ کر دیا ہے کیونکہ
بہت سے لفظ، بہت سی باتیں، بہت سے محاورے معاشرے کے انقلاب کے
ساتھ ساتھ یا تو بدل گئے یا اپنی صحیح "بیٹھک" پر نہ رہے۔ اس سلسلے میں مرتب
کو کتنے کنویں جھانکنے پڑے ہوں گے وہ تحقیقی کام کرنے والوں کے دل سے
پوچھئے۔ مثلاً "پن سوئی"۔ "تالیفہ"۔ "تلپھنا"۔ "تامی"۔ "منڈیاں کسنا"۔
"چارقب"۔ وغیرہ۔

مقدمۂ فرہنگ اور حواشی ہی اس نسخہ کی اصل روح ہیں اور
حسب معمول ممتاز حسین صاحب کی دوربین نظر، تجسّس و تحقیق کے ماتھے
اور ان کے حسِ نقد کے "سرچ لائیٹ" سے منور ہے۔

کتاب اردو ٹائپ میں بڑے اہتمام و نفاست کے ساتھ طبع
ہوئی ہے مگر اتنے بڑے غلط نامے کا کتاب میں شمول ایک تنہا ایسی جگہ
کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ امید ہے آئندہ اشاعت کے موقع پر یہ
اغلاط درست ہو جائیں گی اور نئی اغلاط سے ایسی ستھری
کتاب پاک رہے گی (ظ۔ ق)

مسئلہ تعددِ ازدواج

از: مولانا شاہ محمد جعفر ندوی پھلواروی
ناشر: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ پاکستان، لاہور
قیمت: ۱/۱۲ روپے

مولانا شاہ محمد جعفر ندوی کچھ عرصہ سے اسلامی موضوعات (بالخصوص
بعض متنازعہ مسائل) پر جدید فکر و تفحص سے مضامین اور کتابیں تحریر
کر رہے ہیں جن میں اس قسم کے مسائل کا ایک عقلی پہلو اور اپنے
حاصلِ مطالعہ اور اخذ نتائج کو پیش کیا جاتا ہے۔ مسئلہ تعدد ازدواج
بھی ہمارے معاشرہ کے ان چند اہم مسائل میں سے ہے جس پر خالص
علمی، فقہی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے گفتگو کی ضرورت ہے۔ مولانائے
موصوف نے ازدواج اور معاشرہ جدید کے تقاضوں کے موضوع پر شرعی
نقطۂ نظر سے ایک متوازن نقطۂ نظر پیش کیا ہے اور معاشرتی مسائل
کے حل میں مدد دی ہے۔ (ظ۔ ق)

گاما

از: خواجہ محمد شفیع دہلوی
ناشر: ہمدرد اکیڈمی۔ نیو ٹاؤن کراچی ۵
قیمت: ۲/۸ روپے

یہ کتاب رستمِ زماں گاما پہلوان کی زندگی اور ان کے ورزشی
کارناموں کے تعارف کا مرقع ہے جسے اس فن (کشتی گیری) کے ایک
ادا شناس، خواجہ محمد شفیع نے اپنی مخصوص البیلی طرز میں پیش کیا ہے۔
نامورانِ ملک خواہ وہ کسی فن و میدان کے ہوں اکثر قومی ہیرو کی
حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اور ان کا تذکرہ اور کارہائے نمایاں سے
آگاہی اپنی ثقافت کے پہلوؤں سے آگاہی کے مترادف ہے۔" ہمدرد
اکیڈمی" کی یہ پیشکش بہت سلیقہ کے ساتھ پیش کی گئی ہے اور مصنف
کے بیان کی خوبی، معلومات کی فراہمی اور ان کی زبان کے ایک مخصوص سجاؤ
نے اس حکایت کو اور بھی لذیذ بنا دیا ہے۔ (ظ۔ ق)

نقوش (ظرافت نمبر)

"نقوش" (لاہور) کے ہر شمارہ کی امتیازی خصوصیت ہے۔ نہایت عمدہ

کتابت و طباعت اور دیدہ زیب گیٹ اپ۔ یہ شمارہ بھی انہی اوصاف کا حامل ہے حسنِ ترتیب سے قطع نظر اردو کے نامور مزاح نگاروں کے برجستہ کارٹون بھی جابجا زینت افروز ہیں۔ اور ان کی تیاری میں خاصی ذہانت اور قلم کاری سے کام لیا گیا ہے۔

حسبِ معمول یہ شمارہ بھی ایک خاص نمبر ہے جس کو اردو ظرافت اور فکاہیہ نگاروں کے متعلق مضامین کا مجموعہ قرار دینا بے جا نہ ہوگا۔ قاری کو اس دلچسپ صنف کے ارتقائی منازل سے روشناس کرنے کے لئے ممتاز مزاح نگاروں کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح کے عہد بعہد نمونے اور مظاہر بھی پیش کر دیئے گئے ہیں جن سے اس کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے۔ اور ظرافت کا مطالعہ کرنے والوں کو مآخذ کے لئے سرگرداں ہوئے بغیر وہ مواد دستیاب ہو جاتا ہے جس پر وہ اپنے نقد و نظر کی بنیاد رکھیں۔

ظرافت کے متعلق ہمارے نظریات کا سرچشمہ مغرب ہی کے ارباب نکتہ داں ہیں۔ اس لئے ان سے جس قدر استفادہ کیا جاتا اسی قدر شمارے کا تنقیدی حصہ زیادہ وقیع ہوتا۔ لیکن کہیں بھی ہربرٹ سپنسر کی اس موضوع پر نہایت فاضلانہ تحقیق اور پروفیسر تھارن ڈائیک کی دو ضخیم جلدوں کا تذکرہ نہیں کیا گیا جن میں ظرافت کے متعلق نظریات کا احاطہ کرتے ہوئے ایک نیا نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے۔

بایں ہمہ "نقوش" کے اس شمارے کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

(ر۔ خ)

شاہ کار

الٰہ آباد (خاص نمبر) ـــ صفحات (۴۰۰) قیمت تین روپے

پاکستان اور ہندوستان میں شائع ہونے والے اردو رسائل و جرائد کی کثرت اور متفرق نوعیت کو دیکھتے ہوئے ایسے رسائل کی اہمیت ظاہر ہے جو قارئین کو ان کے منتخب پاروں سے روشناس کرائیں۔ پاکستان میں "نقش" اور "جائزہ" اور ہندوستان میں "شاہ کار" انتخاب تک اس کے جو شمارے سامنے آچکے ہیں ان سے فراہمی و انتخاب مضامین میں خاصی کاوش اور سلیقہ نظر آتا ہے۔

یہ شمارہ لازماً ان تخلیقی کوششوں ہی کا آئینہ دار ہے جو متعلقہ دور میں بروئے کار آئیں۔ مضامین اور افسانوں کی حد تک ان کی سطح نہ زیادہ بلند ہے نہ پست لیکن نظموں اور غزلوں میں ایک اکتا دینے والی یکسانیت ہی یکسانیت نظر آتی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے گویا انہیں صرف "ضرورتِ شعری" ہی کے لئے انتخاب کیا گیا ہے۔ اس سے ابتدا میں ایک تنقیدی جائزہ کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی ہے۔

(ر۔ خ)

ہم قلم

صفحات (۸) قیمت ۲ر

ملنے کا پتہ: ۲۰۱۔ اکسیلسیر ہوٹل۔ کراچی

رائٹرز گلڈ کی حیثیت ایک قلمی برادری کی ہے۔ اور اس کی شاخ کراچی کے اس اولین پرچے میں اس کی جھلک نظر آتی ہے یہ پرچہ بظاہر اسی وجہ سے شائع ہونا شروع ہوا ہے کہ ہم قلموں کو گلڈ کی کارروائیوں سے باخبر رکھا جائے۔ اور اس کی فی الحال موزوں صورت یہی ہو سکتی تھی کہ یہ اطلاع نامہ ہوتے ہوئے اس کی سرگرمیوں کا عکس بھی ہو ممکن ہے اہل قلم کی توقعات بلند تر ہوں۔ لہٰذا گلڈ کی طرف سے بہت جلد ایک وقیع تر اقدام کی امید ہے۔ (ر۔ خ)

★

رسید کتب

ریویو کے لئے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

کتاب	مصنف / مترجم	ناشر
اڑان:	(مجید شاہد)	گوشۂ ادب چوک انارکلی لاہور
جدید طبی ایجادات	(ترجمہ)	اردو اکیڈمی سندھ۔ کراچی
سرگزشت غزالی	(مولانا محمد حنیف ندوی):	ادارۂ ثقافت اسلامیہ پاکستان۔ لاہور
مقاصد تعلیم	(ترجمہ سید محمد تقی مدیر جنگ)	اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی
تیز ہوا اور تنہا پھول	(منیر نیازی)	مکتبہ کاروان ۲ ایبک روڈ انارکلی لاہور
انوار انبیاء		شیخ غلام علی اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور
ابو الطیب متنبی	(تالیف: پروفیسر سید جلیل الرحمن اعظمی)	ادارۂ تصنیف آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی
نغمۂ کارواں	(نظر حیدر آبادی)	سلطان حسین اینڈ سنز۔ بندر روڈ۔ کراچی
اردو دائرۂ معارف اسلامیہ		دانش گاہ پنجاب لاہور
ترجمہ و متن قرآن کریم تقطیع کلاں		تاج کمپنی کراچی
جادو کی کتاب	(رحمٰن مذنب)	
اردو کا دربار (تمثیل)	(راجہ محمد شریف)	کل پاکستان انجمن ترقی اردو شاخ جامعہ قریشیہ لاہور
نبضِ دوراں	(شور علیگ)	مکتبۂ افکار۔ رابسن روڈ۔ کراچی
زہرا	(حقیقت نورانی)	ماڈرن بک ڈپو سیالکوٹ چھاؤنی
خاندانی منصوبہ بندی	(مرزا بشیر احمد ایم۔ اے)	ربوہ
تلوک چند محروم	(جگن ناتھ آزاد)	ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ۔
اردو شاعری کا انتخابی سلسلہ	(جگن ناتھ آزاد)	انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ
خواب و تعبیر		کتاب منزل کشمیری بازار لاہور
شعر و حکمت	حکیم نیر واسطی	بیرون مستی گیٹ لاہور

جانشینیٔ غالب کا مسئلہ بقیہ ص ۲۵

اور آخر میں مرزا نے ایک بیت اپنی طرف سے اضافہ کی ہے۔ چونکہ اصل مثنوی اور اس پر مرزا کا اضافہ فائدے اور لطف سے خالی نہیں ہے اسلئے ہم اس کو یہاں نقل کرتے ہیں:
ناظم کہتا ہے ؎

شنیدم کہ در روزگارِ کہن — شدہ عنصری شاہ صاحب سخن
چو او رنگ از عنصری شد تہی — بہ فردوسی آمد کلاہِ شہی
چو فردوسی آمد بسر در کفن — بہ خاقانی آمد بساطِ سخن
چو خاقانی از دارِ فانی گزشت — نظامی بہ ملکِ سخن شاہ گشت
نظامی چو جامِ اجل درکشید — سرِ چترِ دانش بہ سعدی رسید
چو اورنگ سعدی فرو شد ز کار — سخن گشت بر فرقِ خسرو نثار
ز خسرو چو نوبت بہ جامی رسید — ز جامی سخن را تمامی رسید

اس کے بعد جو کمی ناظم کے بیان میں رہ گئی تھی اس کو مرزا نے یوں پورا کیا ہے ؎

ز جامی بہ عرفی و طالب رسید — ز عرفی و طالب بغالب رسید

اب ٹیپ کا آخری بند یا شعر بھی ملاحظہ ہو جو غالب کی وفات کے بعد حضرت علائی نے اپنے فوٹو گروپ، خاندانِ لوہارو (۱۸۸۲ء) کی پیشانی پر درج فرمایا ؎

علائی چو بر جائے غالب نشست — ورق بر درید و قلم در شکست

گویا ناظم ہروی کی نظم کو علائی نے اپنے نام پر ختم کیا۔ اسی فوٹو کے نیچے علائی نے اپنا یہ شعر بھی تحریر کیا ؎

منم کہ شہرتِ فضلم رسیدہ تا آفاق — منم کہ صیتِ کمالم رسیدہ بر اطراب

علم و ادب کے یہ نیرِ اعظم اور نیرِ اصغر دونوں شاہجہاں آباد کے اُفق میں روپوش ہو گئے۔ مہرولی، دِلی کی خاکِ پاک ان اجسامِ خاکی کی "امین" بنی۔ گنجِ ادب کے یہ مخزن، یہ دونوں تودۂ خاک بھی ۱۹۴۷ء کے خونچکاں انقلاب میں زمین کے برابر ہو گئے لیکن اُن کی کرنوں سے، جو کبھی فضا میں جلوہ گر تھیں، آج بھی دُنیائے ادب بدستور جگمگا رہی ہے۔ نہ خلیفہ اوّل رہے نہ خلیفہ ثانی، مدار ہے نام اللہ کا۔

عبدالقادر خٹک : بقیہ صفحہ ۴۸

سلجھانے کی کوشش کی ہے:

ذرہ میں آفتاب میں گل میں بہار میں — ہوتا ہے جلوہ گر وہی لیل و نہار میں
بیتا ہے دل مرا وہ کبھی ہو کے جلوہ ریز — گیسو و چشمِ ساقی و رخسارِ یار میں
پرتو ہے اس کے حسنِ فسوں ساز کا تمام — تنویرِ شمع و دلکشیِ لالہ زار میں
قادر وہ ذرے ذرے میں آئے نظر تجھے — ایماں اگر ہو پختہ ترے قلبِ زار میں

پشتو کے ایک تاریخی مشاعرہ میں جسمیں اس دور کے مشہور و معروف شعراء معز اللہ خان، اشرف خان، عثمان خان، غفور خان اور اوّل خان نے شرکت کی تھی عبدالقادر خان نے بھی اپنی ایک نظم پیش کی جو پشتو شاعری کی صنف "بدلہ" کے انداز میں کہی گئی تھی۔ اس نظم کو حاصلِ مشاعرہ قرار دیا گیا، ہر کہ و مہ نے بیحد پسند کیا، اس کے چند اشعار کا ترجمہ پیشِ خدمت ہے:۔

میری طرح الفت میں کوئی نہیں دیوانہ — راحت سے ہوں بے پروا آرام سے بیگانہ
کل وصل سے شاداں تھے اور آج جدا ہم ہیں — بیدرد زمانہ کا شیوہ ہے بدل جانا
دیکھی نہ سنی ہم نے اسد ایسی فسوں کاری — نظروں سے تو تڑپانا گفتار سے بہلانا
سچ پوچھو تو اے ہمدم جینا ہے یہی جینا — ہو پیش نظر ہر دم جب جلوۂ جانانہ

پشتو ادب کا یہ مایۂ ناز شاعر جس نے زندگی کے ہر پہلو کو گہری نظر سے دیکھا اور اس کا ہر زاویہ سے مطالعہ کیا، جس نے انسان کو اس کی خامیوں سے آگاہ کر کے سادہ و پاکیزہ زندگی بسر کرنے کی تلقین کی جس نے اشعار کی صورت میں نہایت لطیف پیرائے میں پند و نصائح کے جواہر پارے لٹا کر دلوں کو اعلیٰ اخلاقی قدریں عطا کیں جس نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ ادبی اور اصلاحی سرگرمیوں کے لئے وقف کر دیا جس نے پشتو ادب کو بیش بہا اور بے مثل افکار و اشعار کی دولت بخشی ۱۲۳۳ھ میں اس جہان فانی کو چھوڑ گیا مگر ہمارے لئے عمل، خلوص، نیت، جرأت، سوز اور حیات کی اونچی قدروں کو عملی جامہ پہنانے کا درس دے گیا جسے آج بھی فرزندان وطن اپنا آدرش بنا کر تعمیر وطن و ملت کا کام لے سکتے ہیں۔

★

لیکن، خدانہ کرے...!

روٹی کا ٹکڑا بچی کے ہاتھ سے چھن گیا، لیکن توبہ، توبہ،
خدانہ کرے کہ روٹی مہیا کرنے والے سر پر نہ رہیں۔ پھر بھی
دنیا نے بہت سے ایسے افسانے دیکھے اور سنے ہیں۔
آج کی دنیا میں ان سے بچنے کی بھی ایک صورت
موجود ہے۔ یعنی بیمہ پالیسی بال بچوں کے تحفظ کی اچھی تدبیر
جدید دنیا میں ایک عام اصول بن چکی ہے

ڈاک خانے کا بیمہ

اہل و عیال والے لوگوں کیلئے

بعض مخصوص فوائد رکھتا ہے۔

ڈاک خانے کی بیمہ پالیسی حاصل کیجئے

شرح کم منافع زیادہ

UNITED

D.A.F.P.- 3/53-

کی

اشاعت خاص

یوم پاکستان کی تقریب سعید پر "ماہ نو" اپنی سابقہ روایات کے مطابق ایک وقیع اور ضخیم شمارۂ خصوصی شائع کر رہا ہے جسے معنوی اور صوری اعتبار سے بہمہ وجوہ ایک قابل قدر پیشکش کا درجہ حاصل ہوگا۔

انقلاب نو کے بعد سے ملک ترقی واصلاح کی جن راہوں پر گامزن ہوا ہے اور ترقی و کمال کی جو منازل اس وقت اس کے سامنے ہیں ان کا ایک مکمل جائزہ قارئین کے سامنے لایا جائے گا۔ ادب، فن، ثقافت اور ملت و معاشرہ کا ہر ہر گوشہ نیّر انقلاب کی نئی کرنوں سے جس طرح دمک اٹھا ہے اس کی کیفیت دیدنی ہے اور اس کی حکایت گفتنی و شنیدنی بھی۔ اس روداد کو دستاویزی تسلسل و ترتیب اور تزئین و آرائش کی خوبیوں سے مزین کر کے یکجا صورت میں لایا جا رہا ہے۔

ملک کے نامور ادبا، شعرا اور فنکار اس
کام میں ہمارا ہاتھ بٹا رہے ہیں اور امید ہے کہ یہ
اشاعت خصوصی اپنی ادبی و ثقافتی روایات اور
زینت و آرائش کے تقاضوں کو پورا کرنے کے باب
میں ایک یادگار پیشکش ہوگی۔

★

ایجنٹ

اور

مشتہرین حضرات اپنی ضرورتوں سے ادارہ کو فی الفور مطلع فرمائیں

★

ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳، کراچی

وادیٔ سوات

عظیم پشتو شاعر، خوشحال خان خٹک
(۱۶۱۲ء ——— ۱۶۸۹ء)
(خوشحال خان خٹک کے فرزند، عبدالقادر خٹک کی شاعری پر مضمون صفحہ ۷۴ پر ملاحظہ فرمائیے)

علاقہ شمال مغربی سرحد

افاغنہ کا مشہور پرجوش ''خٹک رقص''

چناروں کی قطاریں
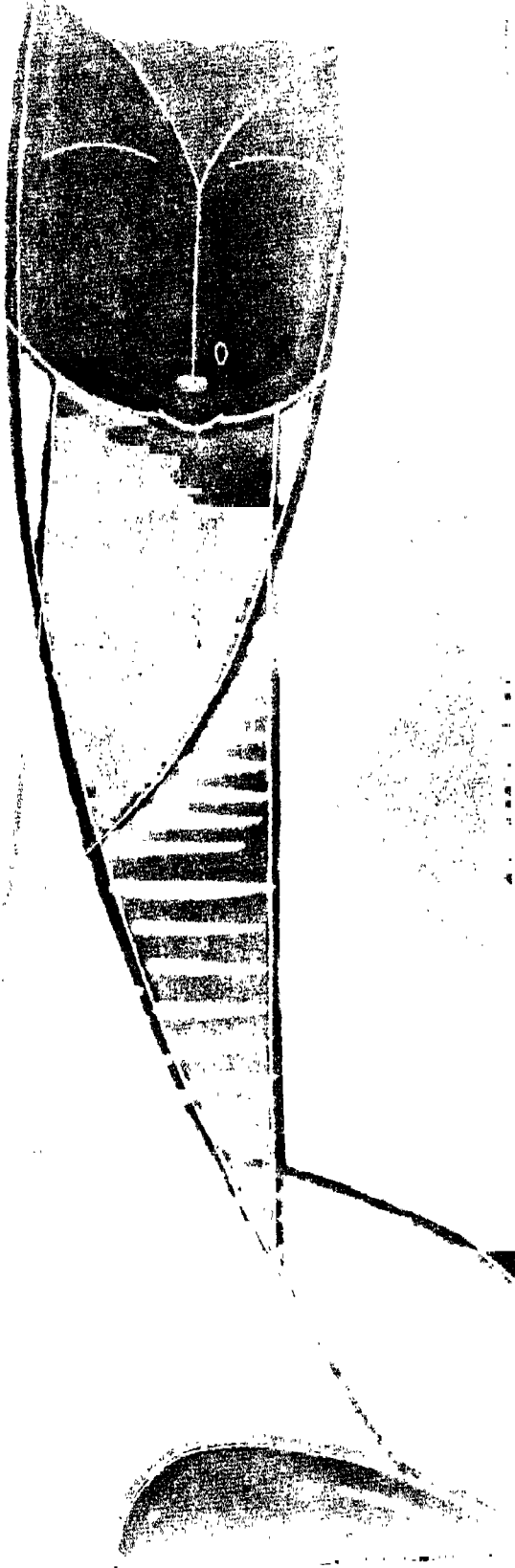
ادارہ

مطبوعات پاکستان

کی

تازہ پیشکش

ضخامت ۱۲۰ صفحات

قیمت ۱ روپیہ ۸ آنے

ادارہ مطبوعات پاکستان ،

پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳

کراچی

مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس میکلوڈ روڈ ۔ کراچی
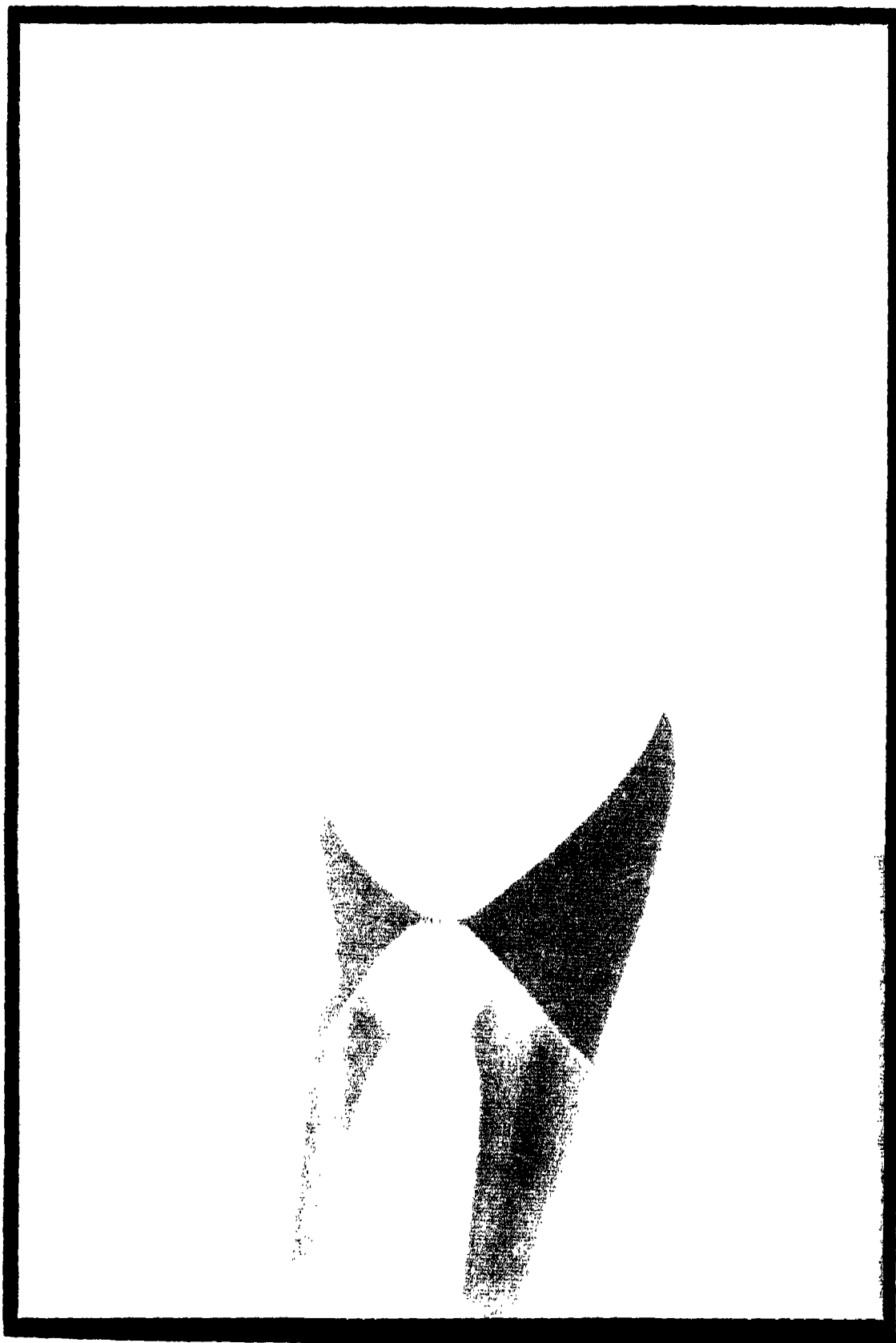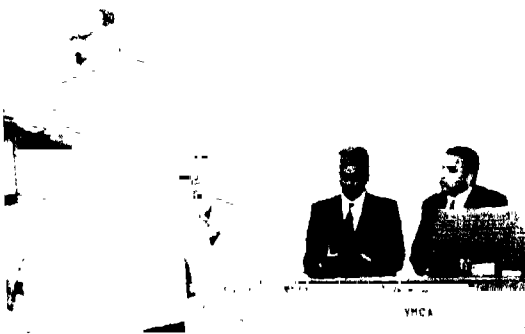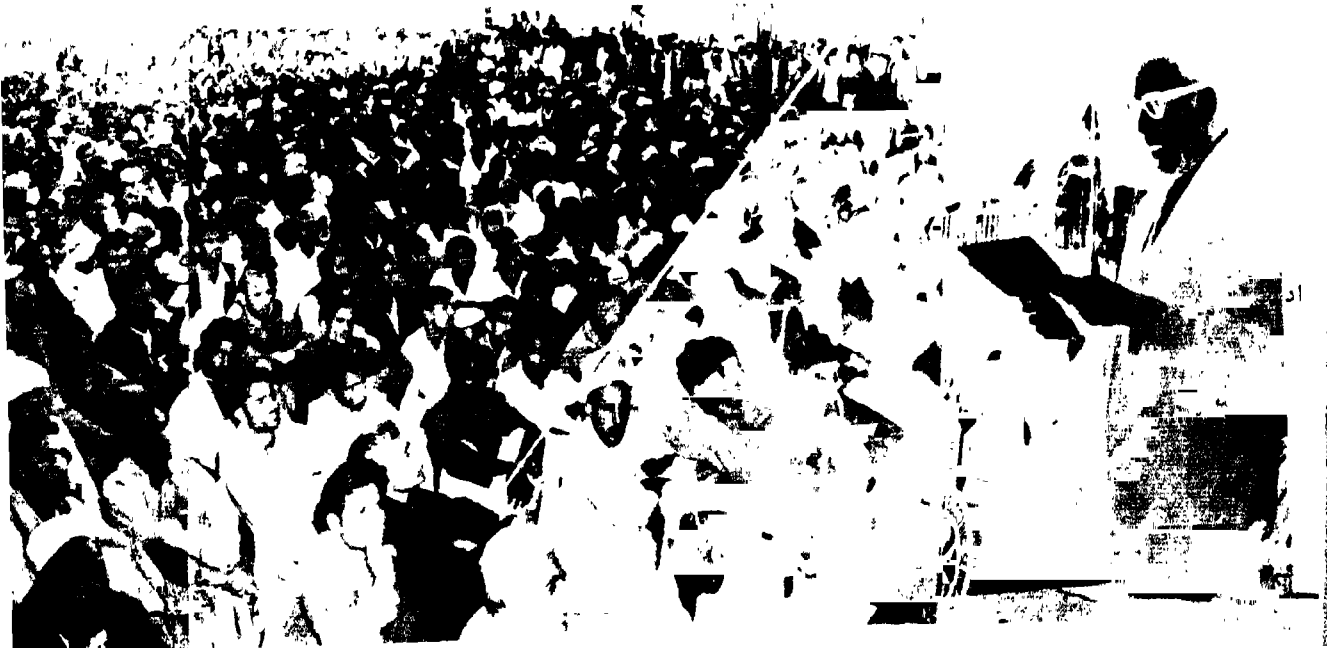
سِنکارا کے روزانہ استعمال سے
روزے کو راحت بنایئے
بہت سے روزہ داروں کیلئے تو یہ کوئی نئی بات نہ ہوگی کیونکہ وہ پہلے
ہی سِنکارا کو آزما چکے ہیں اور جانتے ہیں کہ یہ تکان دور کرنے
اور تازہ دم ہونے کا بہترین ذریعہ ہے۔
یوں تو سِنکارا ہر موسم میں یکساں مفید اور صحت بخش ہے
لیکن رمضان میں اس کا استعمال آپ کیلئے اور بھی ضروری ہے۔
سِنکارا ایک مکمل اور متوازن ٹانک ہے جو نہ صرف آپ کو
روزے میں دن بھر بشاش رکھتا ہے بلکہ صحت کو مستقل
فائدہ پہنچاتا ہے۔
رمضان المبارک میں سِنکارا کے روزانہ
استعمال سے ضروری قوت اور توانائی حاصل
کیجئے اور روزے کو راحت بنایئے۔
Cinkara
سِنکارا
حیاتین آمیز ٹانک
ترکیب استعمال
بوقت سحر
ڈیڑھ بڑا چمچہ استعمال کرنے سے دن بھر کیلئے
مکمل غذائیت حاصل ہوجاتی ہے۔
بوقت افطار
ایک خوراک استعمال کرنے سے توانائی
بحال ہوجاتی ہے۔
ہمدرد
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان - کراچی - ڈھاکہ - لاہور - چاٹگام

SUNSHINE
Glaxo

چہرے کی خوبصورتی
برقرار رکھنے کے لئے
پونڈز
اِستعمال کیجئے
اپنی جلد کو صاف اور ملائم بنانے کے لئے یہ لطیف
اور فرحت بخش کریم استعمال کیجئے۔ یہ جلد کی ہر تہ سے
میل اور باسی میک اپ کو دور کر کے جلد کو حیرت انگیز طور
پر صاف، تازہ اور چکنی بنا دیتی ہے۔
CLEANSING
POND'S
Cold Cream
FOUNDATION
POND'S
Vanishing Cream
یہ نہایت سفید اور ملائم کریم خراب موسم سے
آپ کی جلد کی حفاظت کرتی ہے اور اسے چھوٹے
چھوٹے نقائص سے پاک کر کے حسین بنا دیتی
ہے۔ اسے اپنی جلد کی حفاظت کیلئے ویسے ہی
استعمال کیجئے یا جلد کو پاؤڈر کے لئے موزوں تر
بنانے کے لئے استعمال کیجئے۔
چہرے کو نہایت دلکش بنانے کے لئے اِن دونوں کریموں کا استعمال کیجئے۔
اب آسانی سے دستیاب ہیں
پونڈز کولڈ کریم :- بڑا سائز۔ دو روپے آٹھ آنے۔ چھوٹا سائز۔ ایک روپیہ چھ آنے۔
پونڈز وینشنگ کریم :- بڑا سائز۔ دو روپے آٹھ آنے۔ چھوٹا سائز۔ ایک روپیہ چھ آنے۔
اس قیمت سے زیادہ نہ دیجئے۔
ساختہ پاکستان برائے چیسبرو پونڈز انکارپوریٹڈ
لائسنس یافتہ
ڈاج اینڈ سیمور انڈسٹریز (پاکستان) لمیٹڈ کراچی
DS 1120

جلد ۱۳

شمارہ ۳

خاص نمبر مارچ ۱۹۶۰ء

بتقریب یومِ پاکستان

مدیر: رفیق خاور — نائب مدیر: ظفر قریشی

چندہ سالانہ
پانچ روپے آٹھ آنے

شائع کردہ:
ادارۂ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

خاص نمبر - فی کاپی
ایک روپیہ چار آنے

پاکستان میں وضعِ نو

پروفیسر رشبروک ولیمز

جس ملک نے حال ہی میں اپنی ایک علیحدہ قومیت کو ہیئت دی ہو اس کے موجودہ منظر سیاست پر گفتگو کرتے وقت کوئی بھی پختہ کار مبصر ہو گا وہ احتیاط و تامل برتے گا کیونکہ اس کا خیال یہ ہوتا ہے کہ نکتہ چینی کا حق اگر وہ اس نئی مملکت کے عوام کے سپرد کر دے تو وہ زیادہ بہتر ہے۔ میرا خیال ہے اس خصوص میں یہ بات اس وقت اور بھی زیادہ صادق آتی ہے جب مبصر کوئی انگریز ہو۔ میں اس وقت جس مملکت کا ذکر کر رہا ہوں وہ حال تک انگریزی راج میں رہی ہے۔

میں پاکستان ایک بار پھر آیا تھا یہاں کچھ پرانے دوستوں سے ملاقات رہی تو کچھ نئے شناسا بھی پیدا ہوئے آپ کے معاشرہ میں جس طرح تپاک اور اظہار تکریم کیا جاتا ہے میں اس سے بہت متاثر ہوا۔ اس گرم جوشی اور تپاک سے مراسم ملاقات ادا ہوئے کہ شاید وہ رسمی نہ تھے ورنہ میزبان و مہمان کے رسمی رشتے سطحی ہی رہتے ہیں — خلیق بالطبع ہونے کی بات جب ہی پیدا ہوتی ہے کہ عوائد رسمیہ سے ہٹ کر ہم آزادی سے مل جل سکیں۔ مجھے بھی یہ ترغیب ذہنی ہوئی کہ آپ سے رسمی تکلف سے بالا رہ کر ملوں جلوں — یہ ترغیب اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ میرے ہموطنوں میں سے جب بھی کوئی یہاں آتا ہے تو آپ حضرات اس سے مناسب تکریم سے پیش آتے ہیں۔

لیکن ایک چیز جو مجھے ہمیشہ ہی متاثر کرتی رہی ہے وہ آپ صاحبوں کی وہ قومی خصوصیت ہے جسے میں نے آپ میں ہمیشہ ممتاز بھی پایا اور مستحسن بھی، اور وہ یہ کہ آپ پاکستانی صاف گوئی کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ جب آپ کسی غیر ملکی کو اپنا دوست، ہمدرد اور بہی خواہ سمجھ لیں تو پھر اس سے اس بات کے بھی متوقع رہتے ہیں کہ وہ آپ سے صاف صاف کھری کھری باتیں کہے جو آپ ہی کی صاف گوئی کی طرح ہو۔ مجھے یقین ہے کہ میں اور آپ دونوں ہی اس بات سے واقف ہیں کہ دنیا میں بہت سی اقوام و ملل — جن میں بعض بڑی بھی ہیں — اس بات کی خواہاں رہتی ہیں کہ کوئی غیر ملکی ان کے ہاں جو جو کچھ دیکھے اس کی تعریف کئے جائے اور اگر اس کی داد و تحسین میں کوئی شائبہ بھی (خواہ وہ کتنا ہی ملائم و مؤدبانہ کیوں نہ ہو) شامل ہو جائے تو اپنی گہری ناراضگی کا اظہار کئے بغیر نہیں رہتیں۔ وہ صاف گوئی کی خواہاں تو رہتی ہیں لیکن اگر کوئی رائے ذرا بھی ان کے اُس اونچے اندازے سے جو وہ اپنے بارے میں لگا کے بیٹھی ہیں مختلف ہو جائے تو پھر وہ منہ پھلا کر بیٹھ جاتی ہیں۔ میں نے یہ بات پاکستان میں نہیں پائی۔ بلکہ یہ دیکھا کہ یہاں لوگ نکتہ چینی کا خیر مقدم کرتے ہیں بلکہ خامیاں گنوانے کی دعوت دیتے ہیں بشرطیکہ آپ کو یہ یقین ہو جائے کہ کہنے والا آپ کا مخلص اور سچا بہی خواہ ہے۔

پاکستان کو اپنی آزاد ہیئت ملی بھی نہ تھی کہ میں سالہا سال سے آپ کا واقف تھا۔ اب اس چیز نے آپ کے اس مہمان پر یہ فرض بھی ڈال دیا کہ رائے دیتے وقت مکمل دیانت سے کام لے۔ آپ کے قومی مسائل کی بابت مجھے اس جذبہ کے علی الرغم کچھ کہنا ضروری ہو جاتا ہے۔ حصول آزادی کے بعد بھی مجھے اس ملک میں آنے کا کئی بار شرف حاصل ہوا ہے اور شخصی طور پر میں کئی باتوں سے متاثر ہوا ہوں۔ انگریز۔ پاکستانی دوستی کے باب میں اگر میں کوئی خدمت کر سکتا ہوں تو اس کا بہترین ذریعہ یہی تاثرات ہو سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں جن نکات کی طرف اشارہ کروں گا ان کو برطانیہ میں ابھی تک اچھی طرح سمجھا نہیں گیا ہے۔ اس لئے پاکستان کے حالیہ واقعات کے سلسلے میں وہاں بڑی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ اہل پاکستان کو یہ شکوہ ہے کہ ان کے ملک میں جو حالات افق پر ابھرے ہیں "اور جو آپ کی تاریخ کا بہت بڑا موڑ ہیں" ان کا صحیح تخمینہ لگانے میں انگریز بالکل ناکام رہے ہیں۔

بہت سے انگریزوں اور پاکستانیوں میں رشتۂ مودت عرصے سے چلا آ رہا ہے۔ ان شخصی روابط محبت سے قطع نظر ویسے بھی اہل برطانیہ میں پاکستانیوں کے لئے جذبہ محبت ضرور موجود ہے۔

اب اگر ان اسباب کا ہیں تجزیہ کرنے بیٹھوں تو اس مقالہ کے موضوع سے بہت دور جا پڑوں گا اس لئے صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہوگا۔ اس کی کچھ تو وجہ یہ بھی ہے کہ ہم انگریز روایتی طور پر ایسی قوموں کی بڑی قدر کرتے ہیں جو اپنی مشکلات و آلام کو ضبط و تحمل سے برداشت کرتے ہوئے آگے بڑھنے کی سعی کرتی رہتی ہیں اس جذبۂ مودّت کی دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انگریزوں کی طبیعت میں ایک گہرا جذبہ یہ ہوتا ہے کہ معاملات حیات میں کھلاڑیوں کی اسپرٹ" ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ ادھر یہ بات بھی ہے کہ آپ لوگوں میں جو سپاہیانہ شجاعت اور کڑک پن ہے وہ ہمیں بہت بھاتا ہے۔ اسی طرح آپ کی خارجہ پالیسی میں ایک کھرا پن بھی ہے جسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے کیونکہ آپ لوگ سیاست میں غیر جانبداری کے نظریہ کو مہمل سمجھتے ہیں اور اس سیدھی سی بات کو جانتے ہیں کہ اگر کسی ملک کی کوئی اہمیت ہے تو اس کے دوست بھی ہوں گے اور دشمن بھی۔

اہل برطانیہ میں آپ لوگوں کے لئے جذبات گرم جوشی ضرور موجود ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ یہاں عام آدمی کچھ حیران بھی ہے کہ آپ کے ہاں کیا ہو رہا ہے۔ پاکستان سے برطانیہ واپس آنے کے بعد مجھے جن چند چیزوں نے سب سے زیادہ متاثر بلکہ ملول کیا ہے، وہ غلط فہمی ہے جو یہاں پاکستان کے بارے میں انگریزوں میں پائی جاتی ہے اور یہ کہ پاکستان اپنے اُس نصب العین سے ہٹ گیا ہے جو اس کو وجود میں لایا تھا طالع آزما خود غرض لیڈروں نے اسے اپنی حرص کا شکار بنا لیا اور اب اس کے قدم تنزل کی راہ پر ہی پڑ رہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ایسی بے بنیاد باتیں انگریزوں کے اعلیٰ طبقے میں نہیں سنی جاتیں اور نہ ان طبقوں ہی میں جو دونوں ممالک کے مابین تعلقات و روابط پیدا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ پھر بھی ایسے خیالات ضرور سننے میں آئے اور ایسے لوگوں کی زبانی جن سے توقع تھی کہ وہ کچھ زیادہ ہی باخبر ہوں گے۔ اگر ان غلط باتوں اور غلط فہمیوں کی صحت نہ کی گئی تو کچھ وقت گزرنے پر وہ بڑی نقصان رساں ثابت ہوں گی اس صورت حال کا جو ہمت افزا پہلو ہے وہ نظر انداز نہیں ہونا چاہئے اصل کیفیت یہ ہے: اگر ایک دفعہ تمام حقائق سامنے آ جائیں تو ان کا ردعمل فوری اور سرگرم ہوتا ہے۔ میں نے ایک بار نہیں کئی بار انگریز سامعین کے سامنے بڑی وضاحت کے ساتھ یہ بات رکھی ہے کہ آپ کے ہاں جو انقلاب آیا ہے اس کا اصل مفہوم کیا ہے۔ مجھ سے کہا جاتا ہے۔ ہم بتا نہیں سکتے کہ آپ کی باتیں سن کر ہمیں کس قدر اطمینان ہوا ہے ہمیں پہلے ہی یقین نہ تھا کہ پاکستان اس راہ پر گامزن ہو جائے گا جس پر مصر اور انڈونیشیا ہو چکے ہیں، مگر پارلیمنٹ ٹوٹنے اور مارشل لا لگنے سے ہم کو ایک ذہنی دھچکا ضرور لگا تھا۔

آپ کے ہاں جو حالیہ انقلاب آیا ہے اس کے مقاصد اور نوعیت کے باب میں جو غلط فہمیاں میرے اہل ملک میں پائی جاتی ہیں ان میں کئی کافی خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہیں۔ میں اپنی حد تک ان کے ازالہ کی جس قدر بھی کوشش کر سکتا ہوں اس سے دریغ نہیں کرتا۔ بالخصوص دو وجوہ کی بنا پر۔ ایک یہ کہ میں مورّخ ہوں، دوسرے، میں موجودہ نسل کے ان افراد میں سے ہوں جنہیں قائداعظم محمد علی جناح؟ اور سر محمد اقبالؒ کو جاننے اور ان کی صفات و کمالات کے جاننے کا فخر حاصل رہا ہے۔ اس وجہ سے میں اپنے ان دیگر ہم قوموں کے مقابلہ پر، جن کا یہ پس منظر نہ ہو، زیادہ صاف اور واضح طور پر سمجھ سکتا ہوں کہ آپ کی موجودہ حکومت کیا کرنے کی سعی کر رہی ہے۔

انگریزوں میں روایت پرستی کا جذبہ بڑا شدید ہوتا ہے اور جب ان کو یہ بتایا جائے کہ آپ کے انقلاب کا مقصد یہ رہا ہے کہ ان دو عظیم ہستیوں نے آپ کے لئے جو منہاج متعین کی تھی اس پر آپ کو دوبارہ چلانے کے لئے یہ انقلاب لایا گیا ہے تو یہ بات فوراً انگریزوں کی سمجھ میں آ جاتی ہے۔ مگر اس بات سے انکار کرنا بھی بے وقوفی ہوگی کہ میرے ملک میں سب سے بہی خواہان پاکستان کے گلوں میں جو پھانس سی چبھتی معلوم ہوتی ہے وہ دو باتوں کی وجہ سے ہے۔ ایک پارلیمان کا ٹوٹ جانا۔ دوسرے مارشل لا کا نفاذ۔ مگر جب میں یہ توضیح کرتا ہوں کہ یہ پارلیمان کس نوعیت کی تھی اور وہ کس طرح آپ کو کھائے ڈال رہی تھی اور یہ مارشل لا کس طرح کام کر رہا ہے یعنی نظم و نسق

خلیفہ

عمل : عبدالرحمن چغتائی

فوجی تحکم کے تلے نہیں کام کر رہا ہے بلکہ سول حکام کے تعاون کے ساتھ ملک کی بہتری و بہبودی کا سامان کر رہا ہے تو پھر سلا منظر ہی آنکھوں کے سامنے بدل جاتا ہے۔ آپ کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ ہم انگریز اس طرح کی حکومت کے خوگر ہیں جس کی بنیاد آزاد رائے عامہ پر ہو اور اس کا اظہار بالفعل کے خفیہ ووٹ کے ذریعہ کیا گیا ہو۔ اب جو حکومت بھی اس نمونہ کی نہ ہو ہم اسے شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ ہماری یہ افتادِ طبع کس طرح متشکل ہوئی ہے، اس کی جڑ تاریخ میں جا کر ملتی ہے۔ ہمیں ابھی تک کراموِیل کے "میجر جنرلوں" کی یاد آتی ہے جنہوں نے شخصی آزادیوں پر کڑی چوکیاں بٹھا رکھی تھیں۔ ہم یہ بھی نہیں بھولتے کہ ان دونوں عالمی جنگوں کے دوران میں کیسے کیسے قاعدے قانون خود ہمارے ہاں لگائے گئے۔ پھر بھی ہمارے تصور پر جو چیز چھائی ہوئی ہے اور جسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے، وہ ہے ہمارا نظام پارلیمانی جو بڑا ہی قدیم ہے۔

اس قدامت نے یہ فائدہ پہنچایا کہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا رہا ہم حکمرانی کے نقائص دور کرتے چلے گئے اور اسے اپنی ضروریات کے مطابق بناتے چلے گئے، اور یہ کہ ان کی بنیاد پارلیمانی نظام سے بھی پرانی ہے یعنی شہریوں میں احساسِ ذمہ داری کی روایت، نیز مقامی انتظامات اور اداروں میں لوگوں کی رضاکارانہ و بلا معاوضہ خدمات۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم لوگ رائے زنی کرتے وقت یہ اصل بنیادی بات بھول جاتے ہیں کہ دوسرے ممالک خاص کر ہم سے کم سیاسی عمر رکھنے والے ملک، ایک جدا کیفیت کے حامل ہوتے ہیں۔ پس وہاں حکومت خواہ وفاقی ہو یا صوبائی، غلط رو اور بداعمال ہو جائے اور پارلیمان غیر نمائندہ ہو تو پھر کوئی علاج ہی باقی نہیں رہتا بجز اس کے کہ ہر چیز کو نیا نیا کر کے پھر سے نظام کو جاری کیا جائے۔

کسی ملک میں دوسرے ملک کی نسبت معلومات کس حد تک پہنچی رہتی ہیں، اس کا انحصار وقت پر ہوتا ہے اور یہ بالکل فطری ہے۔ اس لئے برطانیہ میں پاکستان کی بابت جس قدر بھی غلط فہمیاں ہیں ان کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اکتوبر سے قبل کا پانچ سالہ دور رہا ہے۔ گرمجوش سے گرمجوش محبِ پاکستان کے دل میں بھی جذباتِ تشویش ضرور پائے جاتے تھے کہ آخر اس ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ مثلاً یہ کہ قائداعظم کی ولولہ انگیز قیادت نے قومیت کا جو شعلہ سینوں میں روشن کر دیا تھا اور ان کی قیادت نے مشکلات کو، جو باہر کی دنیا کے لئے ناقابلِ تسخیر دکھائی دیتی تھیں، جس طرح ختم کر دیا تھا، بالکل بجھ چکا ہے، کم از کم وقتی طور پر ہی سہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ کے ملک میں ریشہ دوانیوں، سازشوں، دھڑے بندیوں اور بے اعتمادیوں نے سیاسی زندگی میں گہری جڑ پکڑ لی تھی جس نے آپ کے ملک کی ساکھ باہر بھی گرا دی اور اندر بھی سالمیت و استحکام کو متزلزل کر دیا۔ ادھر آپ کے جو بہترین کارآشنا سرکاری ملازم تھے ان کے حوصلے بھی پست ہو چکے تھے، صلاحیتیں مفلوج اور ان کا جوشِ عمل ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ آپ کی زندگی کے سب سے جانے پہچانے اور ہر دلعزیز عوام قائدین مایوس ہو کر خدمتِ وطن سے ہی کنارہ کش ہو گئے تھے۔ عوام حوصلہ ہار بیٹھے۔ پس پردہ سازشوں نے روز روز انتظامیہ کا بدلنا ایک معمول بنا دیا تھا۔ ظاہر تھا کہ اہم و فوری اہمیت کے قومی مسائل پس پشت جا پڑے۔

اس ناگفتہ بہ حالت کا کچھ کچھ حال تو انگریزوں کے علم میں بھی آتا رہتا تھا۔ اس لئے جب اکتوبر میں یہاں انقلاب آیا تو جن لوگوں کو پاکستان کی بابت براہِ راست صحیح واقفیت نہیں تھی، ان میں قدرتی طور پر یہ رجحان ہوا کہ یہ انقلاب کسی بہتر اور نئے عہد کا آغاز نہیں ہے بلکہ نقطۂ عروج ہے زوال اور مفاسد کا۔ آپ کے ملک میں پچھلے چند سالوں میں جو نوبت پہنچ چکی تھی اسے دیکھ کر اگر کوئی شخص یہ رائے قائم کرتا تھا تو غلطی متوقع تھی، اور میں نے جن عناصر کی طرف ابھی اشارہ کیا ہے ان کے ساتھ اس بات کو دیکھا جائے تو غلط فہمیوں میں اضافہ ہونا کچھ بجا نہ تھا۔ غلط فہمیاں برطانیہ میں وہ پیدا ہوئیں بلکہ اب تک بعض حلقوں میں موجود ہیں۔

آپ کے ہاں اس نئے دور میں جو چند نمایاں اچھے کام ہوئے ہیں ان میں بعض پر اظہار رائے کرنے میں لوگ محتاط و متامل بھی رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہماری اس روش نے آپ کو ناقابل بھی کیا ہو گا۔ میں اس سلسلے میں صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔

مگر اس بھدی بات پر روشنی پڑتی ہے۔
جس وقت مارشل لا کا قاعدہ ۱۹۵۸ء جاری ہوا تو اس وقت
میں پاکستان میں موجود تھا اس لئے میں اس کے دور رس نتائج
کی بابت خود معلومات فراہم کر سکتا تھا یعنی یہ کہ اس قاعدہ
کے جاری ہونے سے مذہبی، معاشرتی، سیاسی اور معاشی زندگی
میں کیا انقلاب آئیگا اور کیا اصلاح ہوگی۔ جن لوگوں نے یہ قاعدہ
مرتب کیا تھا اور جن پر اس کے چلانے کی ذمہ داریاں عائد
ہوتی تھیں ان میں چند حضرات سے اس کی بابت گفتگو کا بھی شرف
مجھے حاصل ہوا۔ لہذا مجھے اچھی طرح یہ معلوم ہو سکا کہ اس قاعدہ
کے اجرا کی اصل لِم کیا ہے اور آپ کے ملک کی ترقی میں یہ کس
طرح ایک نقطۂ انقلاب ثابت ہو رہا ہے۔ میں نے اس کی
وسعت کا بھی احاطہ کیا، مگر جب میں انگلستان واپس آیا تو دیکھا
کہ نسبتاً چند ہی لوگ اصل بات سے پوری طرح واقف ہیں اور
جو کچھ جانتے بھی تھے ان کا رجحان بھی نکتہ چینی کی طرف ہی تھا
مثلاً یہ کہ اصلاحات اراضی پر وہ ناک بھوں چڑھاتے تھے یعنی یہ کہ
"جاگیرداروں سے زمین لے کر مزارعوں میں زمین بانٹ دینے" کا تصور ان کی سمجھ میں نہیں
آتا تھا کہ علمی کتابوں میں دیئے ہوئے نظریوں اور اصول و قواعد
کے نظریات سے وہ مطابق نہیں دکھائی دیتا تھا۔ یعنی ان کی نظریاتی
تشفی نہیں ہوتی تھی حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ آپ کے ملک میں جو اصلاحات
اراضی ہوئی ہیں وہ بڑی ممتاز و نمایاں خصوصیات کی حامل ہیں اور
ان کو نافذ کرنا بڑا جرأت مندانہ اقدام ہے اس سے پاکستان کا نظام
اراضی ہی یکسر نہیں بدل جائے گا بلکہ آپ کے ہاں جو سیاسی مفلد
پیدا ہو گئے تھے، ان کا سرچشمہ بھی بالکل بند ہو جائے گا پاکستان کے اس
انقلابی اقدام کو سمجھنے میں میرے ہم وطن بری طرح ناکام رہے ہیں۔
میرے پاکستانی احباب ہمارے اس رویہ پر ضرور متاسف ہوتے ہوں گے
اور میرا خیال ہے کہ میں ان احباب کا شریک تاسف ہوئے بغیر نہیں
رہ سکتا۔

میں سمجھتا ہوں آپ کے ملک کی موجودہ کیفیت کو ہم انگریز
اب آہستہ آہستہ سمجھتے جا رہے ہیں۔ بالکل تازہ شہادت تو یہی ہے کہ
پاکستان میں جو انگریز تجار بزنس کر رہے ہیں ان میں یہ رجحان پیدا ہو
رہا ہے کہ پاکستان میں اب انگریزوں کو اپنی تجارت میں روپیہ لگانے

میں کوئی باک نہیں ہونا چاہئے۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ ایک شخص
نے مجھے ایک رسالہ لا کر دیا اس کا نام ہے "ACHIEVEMENT"۔
یہ بزنس اور صنعت کے مسائل سے مخصوص ہے۔ میں نے جس شمارہ کو
دیکھا اس میں اس رسالہ کے اپنے نامہ نگار کے کچھ تاثرات چھاپے گئے
تھے جو اس وقت پورے ایشیا کے سفر پر گیا ہوا تھا۔ وہ پاکستان بھی آیا
اور یہاں کے انقلاب کو دیکھ کر اس نے بزنس کرنے والوں کے زاویۂ نظر
سے بھی اس انقلاب کو دیکھا۔ اس مضمون پر موٹی سرخی دی گئی تھی؛
"برطانوی کمپنیوں کے لئے اب پاکستان میں روپیہ لگانا بیکار آمد ہے"۔ اس
مضمون میں درآمد کنندگان کی مشکلات کا بھی معقول نظر سے جائزہ لیا
گیا تھا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ خراج تحسین بھی پیش کیا گیا ہے کہ اس وقت
پاکستان میں دور عمل ہے۔ کام کرنے کی ایک لگن ہے۔ اور "کچھ کرنے" کا
انداز فکر کارفرما ہے۔ تجارت اور سیاست میں جو مفاسد پیدا ہو گئے تھے
ان کا استیصال ہو چکا ہے۔ آخر میں اس نے یہ پیش بینی بھی کی ہے کہ صدر
پاکستان جنرل (اب فیلڈ مارشل) محمد ایوب خان ملک میں ایک مستحکم
معیشت پیدا کرنے میں یقیناً کامیاب ہو جائیں گے۔ میں نے اس رائے کو
ایک حرف بحرف کے مصداق جانا ہے اور اندازہ لگایا ہے کہ پاکستان
کی طرف اب جو برطانوی ہوا کا رخ رہے گا وہ کس نوعیت کا ہوگا۔
یہاں جو بزنس مین کام کر رہے ہیں، ان کی بابت یہ مشہور ہے کہ وہ
بڑے باخبر ہوتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر وہ کچھ کر بھی نہیں سکتے۔
اب یہ لوگ جیسا محسوس کریں گے اور جانیں گے اس کا اثر دوسروں پر
بھی پڑے گا۔ پھر یہ باخبری اور حلقوں تک وسیع ہو گی اور ایک عمومی
رائے تشکیل پائے گی۔
جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں اگر کوئی غیر پاکستانی آپ کی
نئی حکومت پر یا ان چیزوں پر جو اس کے اقتدار میں آنے کا موجب
ہیں، فیصلے صادر کرنے بیٹھ جائے تو یہ ایک نوع کی گستاخی ہوگی مگر
جب خود میرے اہل ملک نے بارہا مجھ سے کہا کہ آجکل کے پاکستان اور
اس انقلاب کی بابت لب کشائی کروں تو میں مجبور ہو گیا کہ ان کے سوالوں
کا جواب تیار کروں۔ ایسے جوابات جو مجھے بھی مطمئن کر سکیں اور میرے
سوال کنندگان کو بھی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے پاکستانی احباب کو بھی
یہ جواب پسند آئیں گے یا نہیں مگر اتنی بات ضرور کہوں گا۔ یہ جواب میرے
مرتب کئے ہوئے نہیں ہیں بلکہ ان کا سرچشمہ وہ عظیم ہستی ہے جسے چند

بڑی اور پرانی عظیم پاکستانی ہستیوں میں شمار کیا جاتا ہے گا۔ میری مراد سر محمد اقبال سے ہے۔

اس سال (۵۹ء) جب میں اپنے وطن واپس آیا تو اقبال سوسائٹی کی طرف سے ایک دعوت صدارت ملی۔ یہ سوسائٹی ہر سال لندن میں اقبال کے یوم وفات پر جلسہ کیا کرتی ہے۔ میں نے اس موقع پر اقبال کی کتابوں کو ٹٹولا اور جو اوراق میری نظر سے گزرے ان میں مجھے ایسے مقامات مل گئے جن سے معلوم ہو سکتا تھا کہ اس عظیم مفکر و شاعر کے تصور میں ایک اسلامی مملکت کا کیا خاکہ تھا۔ یا یوں کہیے کہ اس مملکت کا تصور و نصب العین اس نے کیا طے کیا تھا۔ اقبال صرف اس بات پر مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ سکتا تھا کہ اس کی اہمیت و ضرورت پیش کر دی یا اس کی مادی سرحدیں تک سمجھا دیں۔ اسے تو یہ خلش بھی تھی کہ اس مملکت کے خصائص کو بھی اپنے پیغام میں واضح کر دے۔ تاکہ جب اس مملکت کا قیام ہو اور اس کے کوئی معنی ہوں تو افراد ملت اور معاشرہ میں ان کے مقام و موقف کا تعین ہو جائے۔ اقبال کے اس تصور کو اس وقت بھی کوئی پاکستانی بھلا نہیں سکتا۔ اقبال نے بتایا ہے کہ اس مملکت کے آٹھ بنیادی اصول ہوں گے۔

پہلی بات تو یہ تھی کہ مملکت کا وجود دین وحدت کے پرستاروں سے عبارت ہوگا کیونکہ اس چیز کے بغیر اخوت انسانی پر مبنی کوئی بھی پالیسی یہ مملکت وضع نہیں کر سکیگی۔ دوسری بات اس نے یہ سمجھائی تھی کہ ایسے لوگ اس مملکت کی خدمت پر مامور ہوں جو اپنی ذات کو پس پشت ڈال کر وطن کی خیر و فلاح کو مقدم رکھ سکیں۔ جب تک ایسی بے لوث سرشاری کام کرنے کی نہ ہو اور ایسے صالحین کام نہ کر رہے ہوں، اس وقت تک مملکت مستحکم نہیں ہوگی۔ تیسرا نکتہ یہ تھا کہ دستور عمل طے کیا جائے۔ یعنی یہ کہ پورے نظام مملکت اور عوام و خواص کا باہم رشتہ کن بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ چوتھا تصور یہ تھا کہ ایک معین و مخصوص مرکز ثقل وجود میں لایا جائے یعنی ایک خطۂ ارض جہاں ایسے لوگ بسے ہوئے ہوں جن کا عقیدہ ایک اسلامی مملکت میں سامان زیست و بود کا متلاشی ہو اور انہیں یہ آزادانہ حاصل ہوں پانچواں نکتہ تصور و مقصد تھا۔ یعنی ایک ایسا نصب العین جس کی طرف مملکت اور افراد قوم دونوں ہی کو اپنے قوائے عمل راجع کرنے تھے۔ چھٹا مسئلہ تھا عناصر فطرت کی تسخیر، جس میں یہ تصور بھی مضمر تھا کہ جن نوجوانوں نے تسخیر فطرت کو اپنا مخصوص مطالعہ و تجربہ بنا کر فتوحات حیات کی منزلیں طے کی ہیں ان کے ساتھ پورا و جان عملی تعاون کیا جائے۔ ساتویں بات جو اقبال ہمیں سمجھا گئے یہ تھی کہ اس مملکت میں معاشری احساس اور جذبۂ شہریت وجود میں لایا جائے۔ جب یہ احساس قوی ہو کر آگے بڑھے گا تو بڑی سطح پر قومی دائرہ میں قوم اپنی سود و بہبود کو تشکیل کر سکے گی اور شہریوں میں یہ احساس ذمہ داری، قوم و ملک کو بنائیگا۔ آخری بات، جو کسی بات سے کمتر اہمیت کی نہ تھی، خواتین ملت کے باب میں تھی۔ یعنی انہیں معاشرہ میں مناسب و معقول مواقع ترقی بخوبی فراہم کئے جائیں۔

اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو کچھ ایسے ہی خیالات و اصول تھے جنہوں نے قائد اعظم کو تشکیل پاکستان کے اہم کام میں متأثر کیا۔ قوم بنانے کا وہ جذبہ جو ان کے دست عمل میں آکر اپنا کام کر گیا اور پاکستان کے ابتدائی مراحل میں جو طلسماتی ترقی منظر پر آئی یہ سب اسی نصب العین کا فیضان اور قائد کی شخصیت کا طفیل تھا یعنی جب منزل پر پاکستان پہنچ گیا آج تک کوئی قوم نہ پہنچی تھی مگر قائد اعظم کی وفات کے بعد اور ان کے بہترین جانشین کی شہادت کے بعد منظر پر جو بھی ہستیاں آئی ہیں بڑی چھوٹی ہستیاں تھیں اور یہ سب اصول ان کی راہ نمائی کا ساتھ چھوڑ گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قوم میں وہ زوال در آیا جس کے گذشتہ اکتوبر کے انقلاب تک بہت ہی المناک صورت اختیار کر لی۔ میرا تصور یہ ہے کہ انقلاب جو اب آیا ہے قوم کو پھر ایک بار ان صالح اصولوں کی طرف موڑ رہا ہے اور ۱۹۴۷-۴۸ء میں جن حیرت انگیز مساعی نے پاکستان بنوا دیا تھا اور دنیا ششدر رہ گئی تھی اب ان عناصر کو پھر پا لینے کی جستجو ہے۔ جب میرے اہل ملک آج کے پاکستان کے بارے میں اور جو کچھ یہاں ہو رہا ہے، اس کے بارے میں پوچھتے ہیں تو میں یہ سب کچھ کہہ ڈالتا ہوں۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ قوم دوسرا جنم لے رہی ہے اور یہ قوم ان اسباب کو پھر دریافت کر رہی ہے جنہوں نے اسے عظمت دلائی تھی۔ اس وقت وہ اپنے تمام وسائل و قوائے عمل کو اس بات پر مرکوز کئے ہوئے ہے کہ اپنے محب وطن ، قومی رہنماؤں کی قیادت میں وہ ہارا ہوا میدان پھر جیت لے۔ وہ میدان جس میں صحیح و حوصلہ مندانہ قیادت کے موجود نہ ہونے کے باعث وہ کئی سال سے بھٹک رہی تھی ✦

"شمعوں کی قطار"

(دورِ انقلاب کا جائزہ)

اللہ بخش یوسفی

حدِ نگاہ تک شمعیں ہی شمعیں، مینارہ ہی مینارے
انقلابی حکومت کے قائم ہونے سے لے کر اب تک برابر نظر آتے
ہیں۔ ایک ہی جانب نہیں بلکہ میدانِ حیات میں "ہر سو، ہر طرف"
اور بقولِ غالب "چراغانِ دوالی" کی طرح "صف بہ صف" اور
یہ سلسلہ یہیں نہیں رک جاتا ایک "خدا بھی گزرگاہِ خیال" نئی
نئی شمعوں کے ان گنت جلووں سے "چراغاں" معلوم ہوتی ہے۔
(اس مضمون میں آپ کو انہی حسینانِ نور کی جھلک دکھائی دے گی۔ (مدیر)

آج سے بیس برس پہلے جس مملکت کے حصول کے لئے ۱۹۴۰ء
کی تاریخی قرارداد پیش کی گئی تھی وہ سات ہی برس بعد قیامِ پاکستان پر
منتج ہوئی۔ اس وقت دنیا کی آنکھیں اس سرزمین کی طرف لگی تھیں۔
اقوامِ عالم اس نوزائیدہ مملکت کے اقدامات کو دیکھ رہی تھیں۔ بہت دن
گزرنے نہ پائے تھے کہ بابائے ملت داعیِ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ چاہئے
تو یہ تھا کہ اس دورِ ابتلا میں ہمارے زعما اخلاص و نیک نیتی کا مظاہرہ
کرتے، امانت و دیانت کے مجسمے بن کر قوم کو بامِ ترقی کی طرف لیجانے
کی سعی کرتے۔ مگر افسوس! ایسا نہ ہوا۔ ملت کو ترقی کے بجائے تنزل کے
راستہ پر ڈال دیا گیا۔ اور وہی افراد جن سے ملک و ملت کی اُمیدیں
وابستہ تھیں ذاتی اغراض کی آبیاری کرنے لگے۔ رشوت خوری اور
دوست پروری شروع ہوئی، مالدار کو مالدار تر بنا دیا گیا، ملازمینِ حکومت
نے مال و زر جمع کرنے کو اپنا شعار بنا لیا۔ اس طرح اخلاقی پستی کا یہ دردناک
منظر دیکھنے میں آیا کہ نام نہاد قومی نمائندے بازیگروں کی طرح شعبدے
دکھانے لگے۔

ملت فاقہ کشی پر مجبور ہو گئی۔ بیرونی ممالک میں وقار باقی
نہ رہا۔ عوام مایوسی کے عالم میں آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔ آخر جنرل
محمد ایوب خاں کی شکل میں ایک مردِ مجاہد نمودار ہوا اور اس نے میدانِ
عمل میں قدم رکھا۔ نام نہاد قومی حکمراں سرگشتہ و حیراں ایک دوسرے
کی شکل دیکھ رہے تھے۔

مارشل لا کا نفاذ کچھ کم پریشان کن بات نہیں، زمانہ قریب
میں کئی فوجی انقلابات رونما ہوئے ہیں۔ لوگ ان سب کا طریقۂ کار
دیکھ چکے تھے۔ ان میں کیا کچھ نہ ہوا؛ گولیاں چلیں، قتل مقاتلے ہوئے،
تختۂ دار پر لاشیں لٹکتی نظر آئیں اور مہینوں بلکہ سالوں ملک میں صحیح طور
پر امن قائم نہ ہو سکا۔ ان حالات میں عوام کا خوف و ہراس کچھ بیجا
بھی نہ تھا۔ جنرل محمد ایوب خاں کے الفاظ میں یہی خیال کیا جا سکتا
تھا کہ "حکمرانوں کے ایک ٹولہ کی بجائے دوسرا ٹولہ برسرِ اقتدار آ گیا
تھا" لیکن غروبِ آفتاب کے ساتھ جب نجات دہندۂ وطن جنرل
محمد ایوب خاں کے یہ الفاظ سنائی دئے کہ:

"ہمارا مقصد جمہوریت کو بحال کرنا ہے۔
ایسی جمہوریت جسے ہمارے عوام سمجھ سکیں اور
اس پر عمل پیرا ہو سکیں"

اور نفاذِ مارشل لا کے بعد ایک گولی تک نہ چلی، خون کا ایک قطرہ
تک نہ گرا، روزمرہ کے کاروبار میں کوئی فرق نہ آیا، ریل گاڑیاں،
ڈاک و تار، آمد و رفت میں کوئی رکاوٹ دکھائی نہ دی۔ حتّٰی کہ
حسبِ معمول طلبا اور طالبات بھی بلا کسی ہچکچاہٹ یا خوف کے جوق
در جوق درسگاہوں کی طرف گامزن نظر آئیں، تو عوام کے چہرے
چمک اٹھے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ جو کچھ ہو رہا ہے انہیں کی بہتری کے لئے
ہو رہا ہے۔

پھر ۲۷ر اکتوبر کو انقلاب نو کی مستقل نوید آئی۔ اس دن
جنرل محمد ایوب خاں نے اپنے گیارہ رفقا یا وزرا کے ساتھ انقلابی
حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے کر محنت و استقلال سے
فرائض کی ادائیگی شروع کر دی۔ اور جہاں سابقہ حکمراں "پہلے بولو
پھر تولو" کے مقولہ پر عمل پیرا ہو کر نت نئی سکیمیں مرتب کرتے رہے، لفظی

سے عوام کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ وہاں اس انقلابی حکومت نے "پہلے تولو پھر بولو" کو اپنے لئے مشعل راہ بنایا۔ اس نے ہر سکیم کو سوچ سمجھ کر عوام کے سامنے پیش کیا اور جلد سے جلد اسے عملی جامہ پہنا دینے کی سعی کی۔ چنانچہ گزشتہ سال کے واقعات پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ انقلابی حکومت نے کس حیرت انگیز طریقہ پر وہ کام کر دکھایا جو سابقہ حکومتیں دس گیارہ سال میں بھی سرانجام نہ دے سکی تھیں۔ مثلاً سمگلنگ کو دور گذشتہ میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی رہی۔ حکومت، اس کی روک تھام کا کوئی بندوبست نہ کر سکی اور کرتی بھی کیسے جبکہ خود عمال حکومت اس کی پشت پناہی کر رہے تھے؛ نتیجہ یہ کہ باہر سے بلا محصول مال درآمد کیا جانے لگا تو اندر سے چوری چھپے ملکی ضروریات کی اشیاء برآمد ہونے لگیں۔ ملک میں ہر چیز کی کمی پیدا کر دی گئی۔ عوام چلا اٹھے لیکن صاحبانِ اقتدار کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ انقلابی حکومت نے اولین فرصت میں اس مرض کی تشخیص کی اور اس کا علاج سوچا۔ دنیا یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ سمندر نے سونا اگلنا شروع کیا۔ اور صرف کراچی میں پچیس من سے زائد سونا ملا۔ سرحدوں پر انتظامات ہوئے۔ رفتہ رفتہ ملک کو اس مصیبت سے نجات مل گئی۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ چور بازاری کا دور دورہ تھا۔ تاجروں نے دل کھول کر عوام کو لوٹنا شروع کیا۔ قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں کھانے پینے اور عام ضروریات زندگی کا مہیا ہونا مشکل ہو گیا حتیٰ کہ مریض مرنے لگے اور علاج کے لئے دوائی نہ خرید سکے۔ سمگلنگ بند ہوتے ہی حکومت نے اشیاء پر کنٹرول کیا تو چھپے ہوئے خزانے کھلنے لگے۔ بازار میں اشیاء کی ایسی بہتات ہوئی کہ دکانوں کو چھوڑ فٹ پاتھ پر ڈھیر لگائے جانے لگے اور قیمتوں میں ۳۰ سے ۴۰ فیصدی تک کمی نظر آنے لگی۔

سمگلنگ اور چور بازاری کرنے والوں نے جہاں آنکھیں بند کئے دونوں ہاتھوں سے عوام کو لوٹا وہاں حکومت کو اس آمدنی کا ٹیکس تک نہ دیا۔ انقلابی حکومت نے اعلان کر دیا کہ پوشیدہ دولت کو ظاہر کر دیا جائے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ ایسے لوگوں کی تمام ناجائز جمع کردہ دولت ضبط کر لی جاتی لیکن ایسا نہ ہوا۔ حکومت نے انتہائی نرمی سے کام لے کر اس کو ہاتھ نہ لگایا۔ صرف ایک حصہ بطور ٹیکس وصول کیا اور سات کروڑ روپے ترقیات عامہ کے کاموں پر خرچ کرنے کا فیصلہ کیا۔

ظاہر ہے کہ گزشتہ دور میں ملک کی مالی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اندرون ملک اور بیرون ملک دونوں جگہ مالی مشکلات سد راہ ہو رہی تھیں۔ چنانچہ مالی حالت کا جائزہ لیتے ہوئے اسے مستحکم کرنے کے ذرائع سوچے جانے لگے۔ زرمبادلہ کا بہت بڑا حصہ ان اشیاء کی خرید پر صرف ہو رہا تھا جو ملک میں پہنچ کر ہم دوسرے ممالک کو چوری چھپے بھیج رہے تھے۔ چور بازاری نے بھی مالیات کا توازن خراب کر رکھا تھا۔ اور زرمبادلہ کے بقایا کی کمی دوسرے ممالک میں ہماری ساکھ پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ حکومت نے ایک ایک کونہ چھان مارا۔ تجارت اور درآمد برآمد کے لئے نئے قواعد وضع کئے۔ ملک کی حالت سدھرنے لگی اور جہاں ستمبر ۱۹۵۸ء میں ہمارے زرمبادلہ کو ۱۲۱٫۲ کروڑ بنایا گیا تھا وہاں انقلابی حکومت نے اپنی مستعدی سے اسے جون ۱۹۵۹ء میں ۴۰۰ کروڑ تک پہنچا دیا تھا۔

اس کے بعد ایک اور عمل تطہیر شروع ہوا یعنی سرکاری افسروں کی اصلاح۔ گزشتہ دور کے مصائب پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں قومی صاحبانِ اقتدار کے ساتھ بہت سے سرکاری افسر بھی برابر کے شریک رہے۔ انقلابی حکومت ان سے بھی غافل نہ رہی۔ اس نے دیکھا کہ ان میں سے بعض نے تو مال و زر کو عزیز جانا اور بعض ایسے تھے جن میں کام چوری کی عادات راسخ ہو چکی تھی۔ چنانچہ حکومت کی مشین کی صفائی کے لئے ایک قانون نافذ کر دیا گیا اور اس کے تحت سکریننگ کمیٹیاں قائم کر دی گئیں۔ ان کمیٹیوں نے پوری طرح چھان بین کے بعد فیصلہ دیا تو بقول فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں مفادِ ملت کے پیش نظر بہت سے ایسے افسروں کو نکالنا ضروری ہو گیا جنہیں کاروبار حکومت کا وسیع تجربہ تھا۔ چنانچہ جن افسروں کے خلاف اس طرح کا کاروائی ہوئی ان میں مرکزی حکومت کے افسران درجہ اول کے ۱۳۸، درجہ دوم کے ۲۲۱ اور ۱۳۰۳ دوسرے ملازمین تھے۔ پاکستان بھر میں ایسے افراد کی تعداد تین ہزار تھی جنہیں ملازمت سے برطرف کیا گیا۔ یا پنشن دے کر علیحدہ کیا گیا یا جن کے عہدوں میں کمی کر دی گئی۔

ساتھ ہی ساتھ تعمیر ملت کی طرف ٹھوس قدم اٹھائے گئے۔ جن میں اولین حیثیت زرعی اصلاحات کو حاصل ہے۔ پاکستان میں ابتدا ہی سے زراعتی املاک چند ہزار نفوس کے قبضہ میں تھی۔ بڑے بڑے زمیندار سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ کسان بچارا پشت ہا پشت سے زمیندار کے لئے

ان اراضی سے سونا پیدا کرنے کے باوجود خود غریب و نادار رہا۔ اس کی کمائی ہوئی دولت زمیندار کے خزانہ کی زینت بنی اور اسے کسی وقت زمین پر مالکانہ حقوق حاصل نہ ہو سکے۔ انقلابی حکومت نے قائد اعظمؒ کے اس قول کو دہرایا کہ "کسان کی خوشحالی سے پاکستان کی خوشحالی بڑھے گی" پھر دیکھا کہ زمیندار اپنی تمام املاک کو ضروریات ملک کے لئے استعمال بھی نہیں کر رہا تھا۔ اس نے دولت کے نشہ میں اس طرف توجہ ہی نہیں دی جس سے ہر سال لاکھوں ایکڑ اراضی بنجر ہو رہی تھی۔ بنا بریں تحقیقات کے لئے ۲۳ نومبر ۱۹۵۸ء کو ایک کمیشن مقرر کیا گیا جس نے ۲۴ جنوری ۱۹۵۹ء کو اپنی رپورٹ پیش کر دی۔ اس پر جنرل محمد ایوب خاں نے زرعی اصلاحات کا اعلان کر دیا۔ یہ زرعی دنیا میں ایک یادگار انقلاب تھا۔ اس کے باعث کوئی زمیندار پانچ سو (۵۰۰) ایکڑ نہری اور ایک ہزار ایکڑ بارانی زرعی اراضی سے زائد پر قبضہ نہ رکھ سکے گا۔ البتہ باغات وغیرہ کے لئے ڈیڑھ سو ایکڑ مزید رکھنے کی اجازت ہوگی۔ بقیہ اراضی حکومت اپنے قبضہ میں لے گی۔ وہ بھی مفت نہیں۔ ۲۵ سال میں بہ اقساط اس کی قیمت بھی ادا کر دے گی۔ قابض مزارعوں کو املاک کا مالک بنا دیا جائیگا اور دوسرے کسانوں میں جو اراضی تقسیم ہوگی وہ آسان قسطوں میں اس کی قیمت ادا کریں گے۔ اس فیصلہ کے مطابق مغربی پاکستان میں زمینداروں سے ۲۱۵۴۵۳۶ ایکڑ زمین حاصل ہوگی جس پر کوئی ۲۵۸۵۴۱ کسان آباد کئے جا سکیں گے۔ دوسرے کسانوں کو دوسرے علاقوں میں سرکاری املاک دی جائیگی اور ان کی سہولت کے لئے حکومت نے تقاوی قرضوں کے لئے تیس لاکھ روپے کی رقم بھی علیٰحدہ کر دی ہے۔ اس طرح صدیوں کے جکڑے ہوئے کسان زمینداروں کے چنگل سے چھٹکارا حاصل کر لیں گے۔

زرعی اصلاحات پر توجہ کرنے کے علاوہ نئی حکومت نے ملک کا ایک دوسرا اہم مسئلہ بھی اپنی عملی تحویل میں لے لیا۔ بے خانماں اشخاص کی آباد کاری۔ پاکستان کو ابتدا ہی سے مہاجرین کی آباد کاری کا نہایت اہم مسئلہ درپیش رہا ہے لیکن اس کا کوئی حل تلاش نہ کیا جا سکا۔ ہر وزارت نے برسر اقتدار آ کر اس کی اہمیت پر زور دیا۔ کوئی تحریر کوئی تقریر کوئی بیان ایسا نہ تھا جس میں اس کی اہمیت بیان نہ کی گئی ہو۔ بوقت ضرورت مہاجرین ہی کا نام استعمال کیا جاتا رہا۔ لیکن عملاً ان کی آباد کاری کی طرف کوئی اقدام نہ ہوا۔ جو لوگ فٹ پاتھوں پر پڑے تھے وہ وہیں پڑے رہے اور جو جھونپڑوں میں مقیم تھے جھونپڑوں ہی میں رہے۔ اس طرح ان بیخانماں لوگوں نے وعدۂ فردا پر پورے گیارہ سال گذار دئے۔ انقلابی حکومت کے اراکین یہ حالات اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ وہ اس دردناک منظر سے کیسے متاثر نہ ہوتے۔ انہوں نے اس مسئلہ کو اسی اہمیت کی نظر سے دیکھا جس سے اسے دیکھا جانا چاہئے تھا۔ بے خانماں آبادی کا جائزہ لیا گیا۔ پتہ چلا کہ صرف کراچی میں چھ لاکھ بے خانماں دن رات مصائب و آلام کی زندگی گذار رہے ہیں۔

کام کرنے کا تہیہ کر لیا جائے اور حقیقی طور پر کام کرنے کی نیت ہو تو کوئی مشکل نہیں رہتی۔ چنانچہ حکومت نے پہلے ہی اقدام میں چالیس ہزار کوارٹر تعمیر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جن پر تقریباً چھ کروڑ اڑتیس لاکھ لاگت آئے گی۔ دنیا یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ کس طرح لفٹننٹ جنرل محمد اعظم خاں کی زیر نگرانی پانچ ماہ کے مختصر عرصہ میں پندرہ ہزار کوارٹر کورنگی کی نئی بستی میں تیار ہو گئے جن میں مہاجرین کو آباد بھی کر دیا گیا ہے۔ آباد کاری کے سلسلہ میں ایسے ہی اقدامات پورے پاکستان میں کئے جا رہے ہیں۔ یہ سب کام اپنی جگہ نہایت اہم تھے مگر صدر ایوب نے اعلان کیا تھا کہ وہ عوام کو ان کا حق یعنی جمہوریت حقیقی معنوں میں واپس دلائیں گے۔ چنانچہ ان کے اور ان کی حکومت کے جس طرح اور وعدے سچے ثابت ہوئے اسی طرح بحالیٔ جمہوریت کا وعدۂ ایوبی بھی پورا ہو کر رہا کیونکہ خلوص عمل اور سعیٔ پیہم موجود تھی۔ ملک میں بنیادی جمہوریتوں کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ اس طریقۂ انتخاب میں یہ طے کیا گیا ہے کہ ہزار ڈیڑھ ہزار بالغ رائے دہندگان اپنے حلقہ میں اچھی طرح دیکھ بھال اور جان پہچان کے ایسے ہی افراد کو منتخب کریں گے جو ان کے مفاد کے نگراں بن سکیں۔ یہ ابتدائی جمہوریت ہوگی۔ ایسی چھوٹی چھوٹی جمہوریتوں کے صدر مل کر تحصیل کونسل بنائیں گے۔ تحصیل والے مل کر ضلع اور ضلع والے اپنی اپنی کمشنری کی کونسلیں بنائیں گے۔ ملک بھر میں یہ انتخابات مکمل ہو چکے ہیں اور صدر پاکستان کے انتخاب کے بعد یکم مارچ ۱۹۶۰ء سے یہ بنیادی جمہوریتیں اپنا کام شروع کر دیں گی۔

انقلابی حکومت ملی اور ملکی ضروریات کے کسی بھی گوشہ سے بیخبر نہیں۔ اس نے بیک وقت ہر گوشے میں کام شروع کر رکھا ہے۔ چنانچہ یہ دیکھتے ہوئے کہ ہمارا "نظامِ تعلیم" انگریز کا مرتب کردہ ہے اور ہمارے مقاصد کے لئے مفید نہیں ہو سکتا، اس نے ایک تعلیمی کمیشن بھی مقرر

کر دیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ عدالتوں کا موجودہ طریقۂ کار بہت تکلیف دہ ہے۔ انصاف جلدی حاصل نہیں ہو سکتا اور اخراجات ناقابلِ برداشت ہو جاتے ہیں۔ اسی بنا پر ایک قانون کمیشن کا تقرر عمل میں آیا۔ مشرقی پاکستان میں زرعی اراضی کے محصولات کے سلسلہ میں مشکلات پیش آئیں تو وہاں کے لئے لگان کمیشن قائم کیا گیا۔ اسی طرح یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اناج اور دوسری اشیاء کی پیداوار کو کس طرح ترقی دی جا سکتی ہے "کمیشن برائے خوراک و زراعت" مرتب کیا گیا۔ سائنس کی ترقی، جہازرانی، پارچہ بافی، مشترکہ سرمایہ کے کاروبار کے قانون کی دیکھ بھال اور سنہری ریشہ یعنی پٹ سن کی پیداوار کے لئے علیحدہ علیحدہ کمیشن مقرر کئے گئے۔ دوسرا پانچسالہ منصوبہ منظرِ عام پر آ چکا ہے۔ اقتصادی حالت کو سنبھالنے کے ذرائع سوچے گئے، ملک میں بیمہ کے کاروبار پر توجہ دی جا رہی ہے، صنعتی معاملات پر حکومت کی توجہ مرکوز ہے۔ درآمد برآمد کرنے والوں کو سہولتیں دی جا رہی ہیں صحت عامہ کے نظام میں ردوبدل، ہسپتالوں میں بستروں کی تعداد میں اضافہ، ادویات کے حصول میں سہولتیں۔ غرض ہر شعبۂ زندگی میں ایک نئی زندگی دکھائی دے رہی ہے اور جمود کا طلسم ٹوٹ رہا ہے۔

ملکی و ملّی ضروریات کے ساتھ انقلابی حکومت مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی معاملات کی طرف بھی پوری سنجیدگی سے متوجہ ہوئی۔ اس نے دیکھا کہ گزشتہ دور میں کس غلط طریقہ سے مذہب کے نام کو استعمال کیا جاتا رہا تھا۔ کس طرح مذہب کے نام پر ذاتی اغراض پوری کی جاتی رہیں اور مسلمان روحِ اسلام سے دور ہوتے گئے۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے "اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا تاکہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کی وضاحت کرے، اسلامی تعلیم کو ہمہ گیر شکل میں پیش کرے اور اس نے جو احسانات دنیا پر کئے ان کی تحقیقات کے پہلو بہ پہلو تاریخ اسلام، فلسفہ اور نظامِ قانون (فقہ) کے سلسلہ میں تحقیق و تجسس کی ہمت افزائی کرے۔

مزدور کا مسئلہ بہت ہی اہم اور حل طلب تھا۔ صدیوں سے مزدور کے گاڑھے پسینے کی کمائی سے سرمایہ دار تو فائدہ اٹھا رہا تھا۔ لیکن اس محنت کش کی حالت میں کوئی فرق نہ آیا۔ اُسے کسی وقت بھی پیٹ بھر کھانے کو روٹی یا بدن ڈھانکنے کو کپڑا میسر نہ ہوا نہ سر چھپانے کو جگہ ملی نہ اس کے بچوں کی دیکھ بھال کا کوئی انتظام ہوا۔ انقلابی حکومت نے مزدور کی دنیا میں انقلاب پیدا کرنے کا اقدام کرتے ہوئے انہیں زندگی کی تمام سہولتیں مہیا کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان مزدوروں سے کام لینے والوں کو ہدایت ہوئی کہ وہ ان سے برابر کا انسانی سلوک کریں، تمام بنیادی سہولتیں مہیا کریں، ان کے علاج معالجہ کا خیال رکھیں اور رفتہ رفتہ مزدوروں کے لئے رہائشی مکان بھی تعمیر کرنا شروع کر دیں۔ مالک و مزدور کے باہمی اختلافات کے لئے پہلی بار انقلابی حکومت نے صنعتی عدالتوں کے قیام کا فیصلہ کیا ہے جن میں جج کے ساتھ مالکوں اور مزدوروں کا ایک ایک نمائندہ ہوگا۔ اور ایک ایسا اہم قانون بھی نافذ کر دیا گیا ہے کہ جو بقول جنرل برکی اپنی قسم کا واحد اور قابلِ تقلید قانون کہا جا سکتا ہے۔

پاکستان کے دارالسلطنت کا مسئلہ بھی قیامِ پاکستان کے وقت سے زیرِ بحث رہا ہے۔ ہر وزارت نے نیا دارالحکومت بنانے کے مسئلہ کو حل کرنے کی بے دلی کے ساتھ بغیر منصوبہ بندی کے کوشش کی اور یہ کوششیں بھی سیاسی داؤں پیچ کا شکار رہیں مگر انقلابی حکومت نے اس مسئلہ کو دوٹوک حل کر دیا۔ اس کے لئے پہلے تو ایک کمیشن مقرر کیا اور کمیشن کی رپورٹ پر غور و فکر کے بعد دارالسلطنت کو راولپنڈی کے قریب پوٹھوہار میں تبدیل کرنے کا آخری فیصلہ بھی کیا۔ اور قبل اس کے کہ جدید دارالسلطنت تعمیر ہو عارضی طور پر مرکزی حکومت کے ایک اہم حصہ کو انقلابی سال ختم ہونے سے قبل راولپنڈی کو منتقل بھی کر دیا۔

ملک کی تعمیری و اصلاحی ترقی کی نئی نئی راہیں کھلتی جا رہی ہیں اور اس کے ساتھ ملک کی ادبی و ثقافتی زندگی بھی نئے دور میں ایک نئی روح اپنے تن میں (جو ناتواں ہو چکا تھا) بیدار ہوتی محسوس کر رہی ہے۔ ادب و ثقافت حساس و باشعور معاشرہ کی ذہنی رہنمائی اور اس کے احساسات اور رجحانات فکر و نظر کو صحیح راہوں پر قائم رکھنے اور انہیں صحت مندانہ نمو دینے کے لئے لوازم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور کوئی ملک بھی محض مادی وسائل کو آگے بڑھا کر مکمل نمونۂ معاشرت کی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ادب و ثقافت کو کھلی ہوا میں سانس لینے کا موقع ملے، فنکاروں کی ہمت افزائی ہو اور ان کے لئے قوت لایموت میسر ہوتا رہے تاکہ وہ اظہار و نمو کے نئے نئے چراغ جلاتے اور صنم تراشتے رہیں۔

یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی ہے کہ اس نئے دور کے خالقوں نے ہمارے ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کے طبقے کو بھی سہارا دیا ہے اور وہ جو اب تک معاشرہ کا وجود ہوتے ہوئے بھی یوسف گم گشتہ کی طرح تھے اب ان کی ذات اور صفات بھی کوئی کام کی چیز مان لی گئی ہیں اور اس قافلہ کو بھی میر کارواں مل چکا ہے۔ وہی میر کارواں جس نے ملک کے دوسرے قافلوں کو بھی صحیح راہ پر ڈال دیا ہے۔ اب ملک میں قلم اور موقلم کے ان مجاہدین کو بھی مقام شرف و اعتنا میسر آ رہا ہے۔ ان کی مالی حالت بہتر بنانے اور مواقع ترقی پیدا کرنے کی سعی کی جا رہی ہے تاکہ نئے نئے وسائل نکال کر لوح و قلم کی پرورش کرنے والوں کی آسودگی کا سامان بھی بہم پہنچے اور ملک کا ادب و ثقافت معیار و مقداراً کے باب میں بھی وقیع و ممتاز بن سکے۔ اس ضمن میں خصوصیت سے "رائٹرز گلڈ" کے قیام کا ذکر کیا جا سکتا ہے، جبکہ برصغیر میں پہلی بار "ہم قلم" ایک راہ پر فی الواقع "ہم قدم" ہوئے ہیں اور اپنی سود و بہبود کی راہ پر عملی شعور کے ساتھ گامزن ہوئے ہیں۔ ادھر رنگ و موقلم کے حامیوں نے بھی نئے دور کی روح کو محسوس کر کے اسے مقید کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور گرد و پیش کی دنیا نے انہیں یہ آگاہی دینی شروع کر دی ہے کہ زندگی کا طاؤس فقط رنگ ہی نہیں ہے، اس سے بڑھ کر بہت کچھ ہے اور اس بہت کچھ کو انہوں نے محسوس کر کے اظہار کا جامہ بھی عطا کرنا شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ مثلاً حمید الرحمٰن (مشرقی پاکستان) اور صادقین (مغربی پاکستان) نے روح عصر کو اپنے کام میں داخل کر لیا ہے۔ صادقین نے "اسمگلر" کو ہمارے سامنے اپنی پوری "قامت و قیامت" کے ساتھ لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ اور ہم سے کہا ہے کہ اس کو خوب پہچان لو۔ نقاشی کی چند نمائشیں جو حال ہی میں منعقد ہوئیں وہ فنکاروں کے نئے کاموں کو سامنے لانے میں کامیاب ثابت ہوئیں۔

ادب و ثقافت کے ان پہلوؤں کو ملک میں ہمت افزائی اور اعتنا کی روشنی مل رہی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ کچھ بھاری بھرکم حقیقتیں بھی اپنا بھیانک منہ پھاڑے کھڑی ہیں۔ میرا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ملک میں آبادی کا اضافہ ہمارے وسائل کی کمر توڑنے کی حد تک پہنچ چکا ہے اور اگر ہم نے اپنی آبادی کو قابو میں نہ رکھا تو بڑے نقصان رساں نتائج پیدا ہوں گے اور صدیوں تک خسارہ کا سامان پیدا کرنے والے اسباب پیدا ہو جائیں گے۔ اس پہلو پر خود صدر مملکت ہمارے عوام و خواص کی توجہ مبذول کرا چکے ہیں اور خاندانی منصوبہ بندی کی تحریک کچھ سمجھدار اور دردمند لوگوں نے شروع کی ہے۔ خیال ہے کہ ملک کا فہمیدہ طبقہ اس کی اہمیت و ماہیت کو سمجھ کر اپنے دوسرے کم سمجھ ہموطنوں کو بھی سمجھائیگا اور جہاں جہاں اس کی تربیت کا اہتمام ہو چکا ہے لوگ اس کی طرف رجوع کریں گے۔ اگر ہم نے اپنی آبادی کے مسئلہ پر قابو نہ پا لیا تو ملک بہت سے مصائب کا شکار ہو جائے گا اور دوسرے شعبوں میں جو بھی ترقی ہوگی اس کا توازن بگڑ جائے گا۔

آخر میں عوامی رجحان اور گرمجوشی کی تازہ ترین مثال کا ذکر کئے بغیر اس جائزہ کو ختم کرنا ممکن نہیں۔ یوں تو اول دن سے ہی عوام نے اس دور کو اس کی برکتوں کے باعث لبیک کہا تھا مگر جیسے جیسے مسائل حل ہوتے جا رہے ہیں یا تکمیل کی منزل کے قریب آ رہے ہیں۔ اس دور کے ساتھ لوگوں کی گرویدگی اور شیفتگی اور بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ عوامی ردعمل، جوش و خروش اور تحسین کے جو مظاہرے "پاک جمہوریہ اسپیشل" کے سفر کے دوران جا بجا دیکھنے میں آئے وہ شاید برصغیر کی تاریخ میں بے نظیر کے علاوہ کسی لفظ سے تعبیر نہیں کئے جا سکتے۔ مغربی پاکستان میں اس اسپیشل کا پہلا سفر بخیر و خوبی ختم ہوا تو پھر مشرقی پاکستان میں بھی اس کا سفر حال ہی میں ختم ہوا۔ دونوں جگہ دور نو کے معمار کو دیکھنے اور اس کی سچی سچی، کام کی باتیں سننے کے لئے لوگ ٹوٹے پڑتے تھے۔ ان کا بے پناہ ہجوم ایک سیلاب آدم تھا کہ سب انتظاموں کے باوجود جوش عقیدت و مسرت میں بے قابو ہوا جاتا تھا۔ معمار دور نو نے خود عوام تک پہنچ کر ان کا دل جیت لیا۔ وہی بات ہوئی کہ وہ آیا اور دلوں کے قلعے مسخر کر کے چلا گیا۔

اس اسپیشل کا سفر ایک بڑا با مقصد سفر تھا۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے سوچا کہ زیادہ سے زیادہ افراد تک اس طرح بآسانی پہنچا جا سکتا ہے، ان کی مشکلات کو خود دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ دید اور شنید دونوں ذریعوں سے جب وہ عوام اور ان کی مشکلات کو جان لیں گے تو حل مسائل میں بڑی مدد ملے گی اور عوام کو ان کو دیکھنے کی مسرت کے علاوہ اس بات کا بھی احساس ہو جائے گا کہ اب ہماری مشکلات کو سننے والا اور فوری حل کے احکام جاری کر دینے والا بھی کوئی موجود ہے۔ اس کی عظمت اس کے کام کام کی عظمت ہے اور ہر شخص اس کا معترف۔

ایک اور آٹھ کروڑ

م - ج - احمد

۱۴ دسمبر کی رات کراچی سے ایک قافلہ چلا جس نے ہزاروں برس کا بوجھ اُٹھا رکھا تھا۔

اس قافلے میں کوئی دو سو آدمی تھے۔ قافلہ پہلے ۱۰۰۰ میل گھومتا ہوا پشاور پہنچا اور پھر ایک مہینے بعد ڈھاکے سے چل کر ۱۶۰۰ میل کا سفر طے کرتا ہوا راولپنڈی چلا گیا۔

اب اس قافلے میں آٹھ کروڑ آدمی شامل ہیں اور اسے صدیوں کا سفر طے کرنا ہے۔

جب یہ قافلہ چلا تو اس میں کوئی دو سو آدمی تھے جو تمام تہذیبوں، تمام نسلوں، تمام یقینوں اور تمام شبہات کی نمائندگی کر رہے تھے۔ اس میں درجہ سوم کے محنت کش تھے، باورچی، بیرے، صفائی کرنیوالے، مشینیں چلانے والے، ڈاک اور تار کے ملازمین تھے، فراشے، ٹائپسٹ، کلرک اور سٹینو گرافر تھے۔ اس میں درجہ دوم کے چھوٹے چھوٹے بے چین، غمزدہ اور بڑے افسروں کی خوشامد کر کے ان سے نفرت کرنے والے معمولی افسر بھی تھے اور تنیہ مضبوط، ہمچو من دیگرے نیست قسم کے بڑے افسر بھی جو انتظامی مشکلات کو چٹکیوں میں حل کر دیتے ہیں اور کبھی پیار سے کبھی گھُرکی سے۔ بڑے بڑے کام نکال لیتے ہیں اور پھر اپنے وفادار ماتحتوں کو بھول جاتے ہیں۔ صحافی تھے۔ آن بان والے نخریلے صحافی جو دنیا بھر کی سیاسی پیچیدگیوں سے "اندرونی" واقفیت رکھتے ہیں جو یک قلم اقوام متحدہ کی سیاست سے لے کر ایک تحصیلدار تک کی پالیسیوں پر لمحہ بھر میں حرفِ آخر لکھا کرتے ہیں۔ تیز طرار، پڑھے لکھے چوکس مستعد اور اپنے اخباری آقاؤں کے خوف اور وفاداریوں میں مبتلا صحافی۔ اس قافلے میں ادیب بھی تھے، شرمیلے، بامحبت، خود پسند، طرحدار ادیب جو کسی کے نہیں ہو سکتے اور کسی کے بھی ہو سکتے ہیں۔ ادیب حیران حیران اور شوقین سے لگتے تھے اور ڈری ڈری نظروں سے افسروں اور صحافیوں کو دیکھ رہے تھے جو کام اور بے کام اِدھر سے اُدھر دوڑتے پھرتے تھے اور جنہیں اس ٹرین میں ادیبوں کی موجودگی اسلئے مضحکہ خیز معلوم ہوتی تھی کہ یہ لوگ تو کچھ بھی نہیں کر رہے ہیں۔

اور ان سب میں شامل اور سب سے الگ دو آدمی اور تھے۔ ان میں سے ایک کا نام تھا خوش گمان اور دوسرے کا نام تھا بے یقین۔ خوش گمان اس ٹرین کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا اور ہر شخص کی بات غور سے سنتا تھا۔ بے یقین سخت بیزاری کے موڈ میں تھا۔ وہ ایک ایرکنڈیشنڈ کمپارٹمنٹ میں اوپر کی نشست پر سخت بدمزگی کے عالم میں لیٹا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔ اُسے اور بہت سی شکایتوں کے علاوہ ایک رنج یہ بھی تھا کہ اسے اوپر کی سیٹ ملی ہے اور اس کے ساتھ خصوصی طور پر کسی نوکر کا انتظام نہیں ہے۔ خوش گمان اس کے سامنے کی نشست پر بیٹھا ہوا کچھ پڑھ رہا تھا۔ وہ بے آرام ضرور تھا مگر اس کے چہرے پر کسی شکایت کے آثار نہیں تھے۔

گاڑی چلنے لگی۔ مستعد افسر اپنے اپنے ڈبوں میں آ کر بیٹھ گئے۔ صحافیوں نے ٹائپ رائٹر سنبھالے اور خبریں مرتب کرنے لگے، ادیب اپنی نشستوں پر لیٹ کر کتابیں پڑھنے لگے۔

بے یقین لیٹے لیٹے بے چین ہو رہا تھا۔

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیوں ہو رہا ہے؟"۔ اس نے خوش گمان سے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔" خوش گمان بولا۔ "کیوں ہو رہا ہے کا جواب تو میں بالکل نہیں دے سکتا اور کیا ہو رہا ہے یہ تم خود دیکھ لو۔"

"مثلاً میں کیا دیکھ لوں۔ لوگوں کو آتے جاتے، چلتے پھرتے، باتیں کرتے، سوتے جاگتے دیکھ لوں یا کچھ اور بھی ہو رہا ہے۔ تم بڑے گاؤدی آدمی ہو جی۔" بے یقین ہنستا گیا۔ خوش گمان بھی ہنستا گیا مگر وہ کچھ نہ بولا۔ اُسے خود معلوم نہیں تھا کہ کیا جواب دے۔

گاڑی چلتی گئی۔

اس گاڑی میں ایک آدمی ایک اکیلے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بالکل اکیلا تھا، اس کے دو تین ساتھی الگ جا کر سو گئے تھے، وہ اکیلا بیٹھا سوچ رہا تھا۔

خوش گمان اور بے یقین دونوں الگ الگ سوچ رہے تھے۔

صبح سے ہنگامہ شروع ہو گیا۔

اکیلا آدمی ریل سے اترا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے بہت سے لوگ بیٹھے تھے جو بولنے کے لئے بیتاب تھے۔ جب انہوں نے بولنا شروع کیا تو پہلے چند آدمی مؤدب اور کچھ ہکلاتے ہوئے سے نظر آئے مگر پھر وہ فرفر بولنے لگے۔

"آپ نے یہ دورہ کیوں شروع کیا ہے؟"

"کیا آپ کو احساس کمتری ہو گیا ہے کہ مارشل لا لگا کر جمہوریت اور الکشن وغیرہ میں پڑ گئے ہیں؟"

"صدر آئزن ہاور کشمیر کا فیصلہ کیوں نہیں کراتے؟"

"ہمارے گاؤں سے سڑک کیوں نہیں گذرتی؟"

"آپ مارشل لا، کب اٹھائیں گے؟"

"آپ مارشل لا، کیوں اٹھا رہے ہیں؟ ابھی ہمیں دو چار فصلیں آرام سے کاٹنے دیجئے۔"

"جناب صدر"

"جناب صدر میری بات سنئے۔"

"مجھے بولنے دیجئے جناب صدر"

"جواب دیجئے۔ میری بات کا جواب دیجئے۔"

"جناب صدر"

"جناب صدر"

گاڑی چلتی رہی۔ پہلا دن، دوسرا دن، تیسرا دن۔ ہر روز وہ اکیلا آدمی کئی کئی بار ٹرین سے اترتا ہے اور کبھی سینکڑوں اور کبھی ہزاروں اور کبھی لاکھوں آدمیوں کے آگے آ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور پھر چاروں طرف سے آوازیں آنے لگتی ہیں۔

"قیمتیں چڑھ گئی ہیں۔"

"بے ایمانی اب بھی ہو رہی ہے۔"

"سیم اور تھور نے زمینوں کو بنجر بنا دیا ہے۔"

"ہم بھوکے ہیں، ہم ننگے ہیں۔"

"آپ جمہوریت واپس کیوں کر رہے ہیں؟ کیوں۔ آپ خود کام کیجئے، ہم آپ کے ساتھ ہیں۔"

غیر ملکی صحافی زیادہ مستعد ہو گئے ہیں۔ ان کے پاس نہایت حساس مائیکروفون والے ٹیپ ریکارڈر ہیں۔ جہاں کوئی بولتا ہے وہ مائیکروفون اس کے آگے کر دیتے ہیں۔ بحثوں پر وہ ایک دوسرے کو آنکھیں مارتے ہیں۔ تلخیوں پر انکے منہ کھلے کے کھلے رہ جاتے ہیں۔ مقامی افسران روز بروز پریشان نظر آتے ہیں اور چپکے چپکے ٹرین کے ملاقاتیوں سے اپنے دکھڑے روتے ہیں۔

"اب دیکھئے وہاں وہ بالکل کھلے طور پر مجمع کے سامنے کھڑے ہو گئے ہیں اور سوال جواب کر رہے ہیں، بتائیے، اب ہم تو خوف کے مارے سوکھ رہے ہیں۔"

"اب دیکھئے وہ ادھر صفوں میں پہنچ گئے ہیں۔ بھئی ہماری بھی کیا نوکری ہے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔"

"نہیں صاحب، آپ لوگوں نے ہماری کوئی عزت نہیں رکھی اس شہر میں۔ نہ چلئے نہ کھانا۔ آخر حکومت تو ہمیں چلانی ہے۔ یہاں کے معززین ——"

"معاف کیجئے، آپ لوگوں میں خوشامدی درباری لوگ موجود ہیں ورنہ انہیں مشورہ دیا جاتا کہ عوام ووام کوئی چیز نہیں۔ اصل میں معاملہ معززین سے رکھنا چاہئے۔"

گاڑی چل رہی ہے۔ دو صحافی بدمزاج ہو رہے ہیں۔ ایک غصّے کے عالم میں ٹہل رہا ہے۔

"پاک جمہوریت۔ پاک جمہوریت۔ یار یہ کیا فراڈ ہے۔ ہم کس قصّے میں پھنس گئے ہیں۔ یہ ملک دو سو برس پیچھے جا رہا ہے۔ اپنی جان کی قسم یہ سب فراڈ ہے۔ اس میں کچھ نہیں ہے پیارے۔ یہ حکومت چل ہی نہیں سکتی۔ ان کے کوئی اصول نہیں ہیں۔ سب فراڈ ہے یار۔"

"آہستہ بول یار آہستہ!"

"ارے چھوڑ بھی، لعنت بھیج آہستگی پر۔ یہاں آج سب کی پول کھل گئی ہے۔ سالے ہم پڑھے لکھے لوگوں کو یوں تو بیوقوف بنانا ٹھیک نہیں ہے نا۔"

"چپ رہ یار چپ رہ۔ آخر بات کیا ہوئی۔"

"بات کیا ہوئی تھی۔ یہ بھی ویسے ہی ہیں یار۔ بس دیکھ

لیا نہیں کبھی۔"

"آخر ہوا کیا؟"

"ابے تجھے نہیں معلوم۔ جب سے گاڑی اس صوبے میں داخل ہوئی ہے پاکستانی مسلمانوں کے لئے شراب بند ہے۔ یہ سالے یورپین اپنی اپنی پی رہے ہیں۔ ہم شہر سے لاکر بھی نہیں پی سکتے۔"

"تو یار بے پئے گذار دے نا۔ آخر قانون وانون ہوتا ہی ہے۔"

"کیوں گذار دوں۔ یہ کیا قانون ہے۔ یہ کوئی روشن خیالی ہے بھئی۔ ارے میں ایک آزاد شہری ہوں۔ میں پینی چاہتا ہوں میں اپنی مرضی کا مالک ہوں، قانون کیا چیز ہے! کاہے کا قانون!"

"نہیں یار، یہ سب فراڈ ہے۔ اسی لئے یہ اسکیم، یہ حکومت، یہ ملک، یہ سب کچھ فراڈ ہے۔ سب فراڈ ہے۔ سب ــــ"

ٹرین چل رہی ہے۔

خوش گمان، بے یقین کے سامنے بیٹھا ہے۔ بے یقین ایک ذہین پڑھا لکھا آدمی ہے۔ وہ خوش گمان سے حقارت آمیز رویہ اختیار کئے ہوئے ہے۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے۔"

"اچھا ہی ہو رہا ہے۔"

"کیا اچھا ہو رہا ہے۔"

"ڈیولپمنٹ کا کام ہو رہا ہے۔ تعمیرِ نو کا کام ہو رہا ہے۔ یعنی شاید یہی کچھ ہو رہا ہے۔"

"کیا تعمیرِ نو، کاہے کی تعمیرِ نو؟"

"تعمیرِ نو۔ تعمیر۔ قوم کی تعمیر۔ ملک کی تعمیر۔"

"کھوکھلی جاہلانہ باتیں مت کرو۔"

(خاموشی)

بے یقین کھڑا ہو جاتا ہے۔

"سنو۔ بکواس مت کرو۔ یہ جو زمینداری ختم ہوئی جس پر سب اتنی بغلیں بجا رہے ہیں، یہ اس لئے نہیں کہ عوام کو فائدہ پہنچے بلکہ اس لئے کہ زمینداروں کی کمر ٹوٹ جائے اور وہ سر اٹھانے کے قابل نہ رہیں۔ خفیہ دولت جو نکلوائی تو صرف دھونس جمانے کے نتائج دیکھنے کے لئے۔ مہاجرین جو بسائے تو سیاسی استحکام اور مقبولیت حاصل کرنے کے لئے۔ افسر نکالے تو پرانی دشمنیوں اور ذاتی ناپسند کی بنا پر اور یہ پلان ولان جو ہے نہایت غیر دانشمندانہ ہے۔ اس میں کوئی بات کام کی نہیں ہے اور یہ جو بنی جمہوریت کا چکر ہے، تو یہ ہمیں باندھ کر معطل کر دینے کی ترکیب ہے۔ سمجھ گئے۔ یہ سب بے معنی باتیں ہیں۔ سمجھ گئے۔"

"سمجھ گیا۔"

"کچھ بولوگے نہیں۔"

"نہیں"

قافلہ چل رہا ہے۔

ریت کے میدان گزر رہے ہیں اور پڑھے لکھے لوگ ڈائننگ کار میں تاش کی بازی لگائے بیٹھے ہیں۔

"وَن نو ٹرمپ۔"

"ٹو سپیڈز۔"

"یار، تم کس کنونیشن کے ماتحت کھیلتے ہو۔"

پانٹر لڑ رہے ہیں اور ریت کے میدان گزر رہے ہیں۔ لائن کے دورویہ ہزاروں بھوکی آنکھیں اور پیاسی روحیں نعرے لگا رہی ہیں۔ زندہ باد۔ پائندہ باد۔ زندہ باد؟ یہ کس کو زندہ باد کہہ رہے ہیں؟ کیا اس اکیلے آدمی کو جو ایک اکیلے کمرے میں سفر کر رہا ہے۔ وہ ایک عام سا آدمی ہے جیسے سبھی لوگ ہوا کرتے ہیں۔ لمبا قد تو بہتوں کا ہوتا ہے، اچھی صحت بھی بہتوں کی ہوتی ہے، خوبصورت بھی بہت ہوتے ہیں، طاقتور بھی ہزاروں گزرے ہیں۔ پھر یہ کیوں زندہ باد کہہ رہے ہیں؟ یہ لوگ، یہ عوام، یہ ان پڑھ جانور نعرے کیوں لگا رہے ہیں؟

بے یقین تلملا رہا ہے۔

خوش گمان شوق سے دیکھ رہا ہے۔

"زندہ باد!"

"پائندہ باد!"

"فائیو سپیڈز"

"ڈبلڈ"

"ری ڈبلڈ"

"زندہ باد!"

"میں نے تو پارٹنر تم سے کسی امید پر کال بڑھائی ہے۔ تم یار

اچھا کھیلتے ہو۔ اور مجھے یقین ہے تمہارے پاس پتے بھی ہوں گے۔"

"زندہ باد!"

"زندہ باد!! پارٹنر زندہ باد!"

آٹھ کروڑ آدمی ایک پارٹنر کی کال بڑھا رہے ہیں۔ یہ کال ریت کے میدانوں اور سیم اور تھور سے مجروح زمینوں کے سینے چیر کر آ رہی ہے۔ پارٹنر اپنی ہمت افزائی پر مسکراتا ہے مگر پھر اپنے پتے غور سے دیکھنے لگتا ہے۔

ڈائننگ کار میں صحافی، ادیب، افسر اور غیر ملکی بھرے ہوئے ہیں۔ انہیں ریت کے میدانوں سے دلچسپی نہیں۔ وہ باہر نہیں دیکھ رہے دیکھیں کیا۔ باہر بنجر زمینیں، تار کے کھمبے اور مویشی ہیں۔ پاکستانی کسان بھی تو مویشی ہوتا ہے نا، سو وہ مویشیوں کو کیا دیکھیں۔ وہ سگریٹ پی رہے ہیں، اور تاش کھیل رہے ہیں اور شکایتیں جمع کر رہے ہیں۔

"آج کی خبریں نہ لاہور پہنچیں نہ کراچی۔ یہ تار آپریٹر میرا دشمن معلوم ہوتا ہے سالا۔ تمہاری خبریں پہنچیں؟"

"پہنچیں۔ ایک ایک لفظ پہنچ گیا۔"

"پھر میرا معاملہ کیوں خراب ہوا؟"

"وائرلیس کا معاملہ ہے، گڑبڑ ہو گئی ہوگی۔"

"کوئی گڑبڑ نہیں یار۔ پھر ایسی مشینیں لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں اس کے جوتے ماروں گا آج۔"

"ہزاروں لفظ جا رہے ہیں۔ شاید دوپہر تک کلیر ہو جائے۔ دیکھو نا کام کتنا ہے۔"

"کبھی تم بھی اب کوئی تعمیرِ نو والے وکیل ہو گئے ہو۔ ہر بات کی تشریح ضرور کرتے ہو۔"

"اور تم؟"

"چھوڑو یار۔" کوئی اور بولتا ہے "مثبت بات مت کیا کرو۔ مزا منفی باتوں میں ہی آتا ہے۔ کال دو کال ——"

"یہ سالا شوربا آج پھر خراب ہے۔"

"مکھن اور لاؤ۔ مرغی اور لاؤ۔ کیا یار اتنا بڑا نام اور کل پانچ کورس کا کھانا ہے۔ امریکہ میں تو ——"

"ارے یہ پورا ملک ہی بوگس ہے۔ یہاں تو آدمی وقت عزت کے ساتھ گذار دے تو بہت ہے۔ اب آج دیکھا تم نے ہمارے لئے کیسی پرانی موٹریں آئی تھیں اور بس تو جیسے کھڑ کھڑ کر رہی تھی ہم دور سے ہی دیکھ کے بھاگے۔"

ملتان پر ایک لاکھ آدمی جلسے میں آئے۔ انکے چہرے تمتمائے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا انہوں نے اس دن کپڑے بھی بدلے تھے۔ معمولی مگر اُجلے کپڑے۔ وہ صحت مند تھکے ہوئے لوگ اس اکیلے آدمی کی ہر بات خاموشی سے سن رہے تھے۔

بے یقین بہت خفا تھا۔

"یہ اتنے سارے لوگ کیوں اس قدر بے وقوف ہیں۔ کیوں آئے ہیں؟ اتنے آدمی تو ساری پولیس، ساری بسیں، ساری گاڑیاں بھی جمع نہیں کر سکتیں ضرور یہ لوگ خود آئے ہیں اور اسی لئے یہ بیوقوف ہیں۔"

"کیوں؟" خوش گمان مسکرایا۔

"اسلئے کہ اس ملک میں پارلیمنٹ توڑ دی گئی اور کل گیارہ آدمیوں کے ہاتھ میں سب اختیار آ گیا ہے اور یہ لوگ خوش ہیں۔ کیا انہیں خوش ہونا چاہئے؟"

"تم ناخوش ہو؟"

"ہاں"

"اگر تم کو ناخوش ہونے کا حق ہے تو انہیں خوش ہونے کا حق بھی ہے۔ تمہارا ان کا ووٹ برابر کا ہے نا۔"

"تم جاہل آدمی ہو۔ جانتے ہو تم جاہل آدمی ہو۔"

"مگر یہ آٹھ کروڑ ہیں۔ یہ اکثریت میں ہیں۔ تم دس ہو یا بیس۔ تم کافی ہاؤس اور ٹی ہاؤس کے شیر ہو جہاں تمہیں کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ تم دن بھر کی تھکن نفرت خیزی، تیزی طراری اور فقرے بازی سے دور کرتے ہو اور یہ راتوں کو بھی دنوں کے بوجھ اٹھائے بے خواب نیندیں سوتے ہیں۔ انہیں اچھے فقرے بولنے بھی نہیں آتے۔ انہیں تمسخر، استہزا، طنز کا کام بھی نہیں آتا۔ جانتے ہو تم کیا چاہتے ہو اور یہ کیا چاہتے ہیں؟"

"ہاں، ذرا بتاؤ تو۔"

"تم اپنی آگ میں جلتے رہنا چاہتے ہو۔ تمہارے اندر بے چینی کی آگ ہے اور یہ بڑی اچھی بات ہے۔ مگر تم اس کا استعمال

پاک جمہوریہ اسپیشل

عوام سے قریب آنے، ان کی مشکلات جاننے اور ان کا حل تلاش کرنے، نیز بنیادی جمہوریت کا مقصد عوام کو سمجھانے کے لئے صدر ایوب نے ملک کے دونوں حصوں کا دورہ کیا جہاں عوام نے جابجا بے پناہ جوش اور مسرت و عقیدت سے ان کا استقبال کیا

کراچی سے روانگی

صدر ایوب کی تقریر سننے کے لئے دور دور سے آئے ہوئے عقیدت مندوں کا ہجوم

چھوٹے بڑے سب ہی صدر ایوب تک پہنچنے کے لئے بیتاب

عوام کی دلی مسرت کا ایک مظاہرہ

پاک جمہوریہ اسپیشل:

اس سفر کا سب سے دلچسپ اور مفید بہاو سوال و جواب کی وہ بے تکلف محفلیں تھیں جن میں صدر ایوب نے لوگوں کے ہر قسم کے سوالوں کا بڑی خندہ پیشانی سے جواب دیا

مغربی پاکستان کی طرح مشرقی پاکستان میں بھی عوام کا وہی بے پناہ جوش و خروش دیکھا

نہیں جانتے۔ جانتے ہو تو کرنا نہیں چاہتے۔ کیونکہ اس میں محنت کرنی پڑتی ہے۔ تم محنت نہیں کرنا چاہتے۔ تم کو ایک گز زمین ملے تو ہزار گز مانگو گے اور ہزار گز ملے تو دس ہزار گز مانگو گے۔ مگر نہ تم ایک پر کام کرو گے نہ ہزار پر، تم صرف باتیں کرو گے۔ باتیں دلچسپ اور تیز باتیں۔ ناک چڑھا کر "اونہہ" کہہ دینے میں جو خود لذتی کا چسکا ہے۔ وہ کام میں نہیں پڑتا۔"

"ہوں۔ تو ہم بات نہ کریں۔ اب بات پر بھی پابندی ہے؟"

"نہیں۔ تم باتیں بنائے جاؤ۔ یہ لوگ کام کئے جائیں گے۔ پھر تم مر جاؤ گے اور یہ لوگ بھی مر جائیں گے اور دوسرے لوگ آجائیں گے۔ جن میں سے کچھ باتیں بنائیں گے اور کچھ کام کریں گے اور پھر ——"

"ہوں۔ تو کبھی کام سے کیا مطلب ہے تمہارا۔ یہ نہروں و سڑوں کا کام۔ پاور ہاؤس، چھوٹی بڑی صنعتیں، پُل، مسجد، چاہ، تالاب، خیر کے اسباب چاہتے ہو تم۔ فصلیں اچھی ہو جائیں۔ خوراک میں خود مکتفی ہو جائیں ہم۔ ہے نا۔ یہی چاہتے ہو؟ کشمیر و کشمیر مل جائے۔ زرِ مبادلہ جمع ہونے لگے۔ بیلنس آف پے منٹ۔ بیلنس آف پیمنٹ پر مر رہے ہو۔ سڑکیں بناؤ گے، ریلیں زیادہ ہوں، اسٹیمر زیادہ ہوں، جیٹ چلنے لگیں، کاغذ عمدہ بنے، تعلیم عام ہو۔ یہی کام ہیں نا؟"

"اس وقت تو یہی کام ہیں۔"

"بس؟"

"بس۔"

"اور دل و دماغ کہاں جائیں؟"

"اپنی اپنی جگہ رہیں اور کبھی کبھی تنہا بھی چھوڑ دو۔"

"ہوں! اور ان سب چکروں میں گیارہ آدمیوں کا چکر چلتا ہے اور یہ ایک اکیلا آدمی جو چاہے کرے۔"

"کام بھی تو اس ایک اکیلے آدمی نے شروع کیا ہے اور اب تو پھر الکشن بازی چل پڑی ہے۔ الکشن لڑو نا تم۔ کونسل میں آؤ، ضلع میں آؤ، صوبے میں آؤ اور پھر مرکز میں آؤ اور پھر جو جی چاہے کرو۔ باقیوں کو اپنے ساتھ ملاؤ پھر جہاں جو چیز غلط سمجھو اسے رد کر دو۔"

"کیسے رد کر دو؟"

"اپنی اکثریت بنا کر۔ اپنی پچھتر فی صدی اکثریت سے تم نیا دستور بنا لینا۔"

"یار اب تم بھی ایسی باتیں کرتے ہو۔"

اب خوش گمان غصے میں آجاتا ہے۔

"دیکھو میرے بے یقین بھائی! مشکل یہ ہے کہ ہمارے پاس لفظوں کی بڑی کمی ہے۔ میں اور زبانیں نہیں جانتا، معلوم ان میں کیسے بات کی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں دقت یہ ہے کہ مشکل تہ دار لفظ بہت کم ہیں اور ہم سادہ الفاظ بولتے ہیں۔ سادہ الفاظ پوچ اور گھٹیا معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً میں کہوں کہ ملک میں کام کی ضرورت ہے تو یہ بڑی سطحی اور لوکس بات لگتی ہے اور تم اپنی اکسفورڈ اور کیمبرج اور ہارورڈ کی تعلیم یاد کر کے آنکھوں میں آنسو بھر لاتے ہو تمہیں بڑے بڑے مقررین یاد آجاتے ہیں، بڑی بڑی کتابیں تمہاری آنکھوں کے آگے ناچنے لگتی ہیں اور تم یہ بھولے رہتے ہو کہ تم کس سرزمین پر کھڑے ہو۔ تم یہ بھولے رہتے ہو کہ یہاں ایک مانچسٹر ایک شکاگو نہیں ہے یہاں تو ٹنڈو آدم اور قصور اور کوہاٹ ہے سنتھال اور رانگامانی ہے۔

"تم امریکہ گئے ہو؟"

"گیا ہوں"

"تم نے ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ دیکھی ہے؟"

"دیکھی ہے"

"تم نے کولمبس کے ساتھ سفر کیا تھا"

"کیا مطلب؟ یہ کیا بکواس ہے؟"

"تم نہیں تھے نا اس کے ساتھ۔ بس تو تم نہیں جانو گے کہ کولمبس سے آئزن ہاور تک لوگوں کو کیا کچھ کرنا پڑا۔ تم تو تین ڈالر کی ایک کتاب خرید و گے جس میں اسپوتنک دور میں عالمی سیاسی پیچیدگیوں کی قسمیں بتائی گئی ہوں اور وہ پڑھ کر تم غمزدہ ہو جاؤ گے کہ کاش اس ملک میں ان میں سے آدھی پیچیدگیاں ہی پیدا ہو جاتیں تاکہ تمہاری شامیں اور بیر پارٹیاں اور کاک ٹیل پارٹیاں اچھی گذرتیں۔ یہاں مشکل یہ ہے کہ پورا ملک گھنے جنگلوں سے بھرپور امریکہ کی طرح پڑا ہوا ہے جس میں آٹھ کروڑ کولمبس گھوم رہے ہیں اور تم ان سب آٹھ کروڑ کولمبسوں کے سر پر پیر تسمہ پا کی طرح سوار ہو جانا چاہتے ہو کہ وہ جدھر جائیں تم دوسری طرف موڑ دو۔

میری بات مانوگے؟

"کہو، ماننا نہ ماننا تو میرے اختیار میں ہے"

"تم اپنے تسمے جیسے پاؤں ڈھیلے کرکے انگور کے کسی درخت کی چھاؤں میں بیٹھکر کاک ٹیل پیو اور کتابیں پڑھو — تم نے بارہ برس ایک تماشہ دیکھا۔ اب بارہ برس نہیں تو پانچ برس اور سہی۔ جو آدمی کام کرتا ہے وہ اپنے طریقے سے کرتا ہے دوسرے کے طریقے سے نہیں کرتا۔ تم ابھی ذرا ان پڑھ جانوروں کو آدمی بنا لینے دو، نہریں بہنے دو، پاور ہاؤس لگنے دو، صنعتیں جاری ہونے دو، تعلیم پھیلنے دو، مہاجروں کو بسنے دو، زمینداری ختم ہونے دو، تم آرام سے بیٹھو۔ جو کام کر رہے ہیں انہیں کام کرنے دو، پہلے گھر بننے دو، پھر گھر آراستہ کرنے کی باتیں کرنا۔ اس زمین پر بنیادیں پڑے پڑے جم گئی تھیں — معاف کرنا میں ایک ملکی زبان میں بول رہا ہوں —"

"بولے جاؤ۔ میں نہیں سن رہا!"

کوئی آدمی اکیلے آدمی کے ساتھ نہیں تھا اور ہوتا بھی تو اسکے ذہن کی تصویر کیسے لیتا؟ مگر خوش گمان نے اوپر لیٹے لیٹے ایک کیمرہ بنایا اور اس طرف لگا دیا جدھر وہ اکیلا آدمی بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ایک پردے پر اس کی تصویر اُبھری۔ اس نے دیکھا کہ وہ اکیلا آدمی یا تو پڑھتا ہے یا سوچتا ہے، یا کام کرتا ہے یا سوال و جواب کرتا ہے۔ اس اکیلے آدمی کے سامنے آٹھ کروڑ چہرے ہیں جن میں سے کچھ پر نفرت اور حسد کے آثار ہیں اور کچھ خوشی سے تمتمائے ہوئے ہیں اور باقی بے رنگ، بے کیفیت چہرے جیسے اپنے تاثرات کے منتظر کھڑے ہیں اور انہیں جیسے جیسے تاثرات ملتے جاتے ہیں ان کا اظہار ہوتا جاتا ہے۔ وہ اس اکیلے آدمی کا کام دیکھ رہے ہیں اور وہ اکیلا آدمی کام کر رہا ہے، اس کے ذہن کے کئی خانے ہیں کسی میں ماضی ہے کسی میں حال، کسی میں مستقبل کسی میں اسکیمیں کسی میں تجزئے، کسی میں انتظامی پیچیدگیاں۔ وہ یہ صاف طور پر جانتا ہے کہ اس نے روایات کے خلاف بغاوت کی ہے اور لوگ روایات کے باغیوں سے بدکتے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ ایک عام آدمی ہے اور ایک نہ ایک دن مر جائے گا اور اگر وہ بغاوت نہ کرتا تو اسے چند لوگ ضرور روتے اور کوئی خوش نہ ہوتا مگر اب یا تو آٹھ کروڑ آدمی روئیں گے یا آٹھ کروڑ آدمی خوش ہوں گے۔ اور یہی آٹھ کروڑ نہیں بلکہ اگلے آٹھ کروڑ یا دس کروڑ اور ان سے اگلے آٹھ یا دس کروڑ اسے اچھے یا برے لفظوں سے یاد کریں گے۔ اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ایک سچائی بھی ہوتی ہے جو نہ کسی کے رونے سے فروغ پاتی ہے نہ کسی کے ہنسنے سے مٹ جاتی ہے۔ اور یہ کہ اسے اس سچائی کی تلاش کرنی ہے۔ وہ یہ سب جانتا ہے اور اسی لئے اپنے بے حد و بے حساب اختیارات کے باوجود انہیں جذبات سے مغلوب ہو کر استعمال نہیں کرتا۔ وہ کھلے اعتراض سنتا ہے اور ڈھکے چھپے مخالفوں سے بھی واقف ہے۔ خوشامدیں اس کے گرد حصار ڈالے جاتی ہیں۔ طنز و تشنیع اس کے گرد الاؤ جلائے ہوئے ہیں۔ اس کا ملک اسے دیکھ رہا ہے۔ دوسرے ملک اسے دیکھ رہے ہیں۔ اس کے پیچھے تاریخ ہے۔ شاندار، پُر وقار، دولت مند تاریخ جہاں سے اسے سقراط، ارسطو، ڈیکارٹ، کارل مارکس جھانکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کے سامنے بھی تاریخ ہے جس میں ہزاروں پلوٹارک، ہزاروں طبری، ہزاروں ملا بدایونی، ہزاروں گبن، ہزاروں ہسٹی نظر آتے ہیں۔ وہ سقراط اور ارسطو کو بھلا سکتا ہے، مگر پلوٹارک، طبری اور بدایونی اور گبن کا وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتا جو اس کے بعد اسکی تاریخ لکھیں گے، نہ وہ اس طاقت کو دھوکہ دے سکتا ہے جو اس سے بڑی بڑی طاقتوں کو بگاڑ کر رکھ دیتی ہے اور جس کا نام عرفِ عام میں خدا ہے۔ خدا جو ماضی، حال اور مستقبل کا نام ہے، جو فوجوں، جہازوں، بموں اور دلیلوں کو لمحہ بھر میں خاک کر دیتا ہے، جسے نہ ماننے والے بھی اس کے مختلف نام رکھتے رہتے ہیں اور ان ناموں کو اپنی ناکامیوں کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ خدا، چانس — اتفاق، واہمہ، لاعلمی۔ وہ کچھ بھی ہو، وہ ہے اور یہ اکیلا آدمی جانتا ہے کہ وہ ہے۔ اور وہ اس کے آگے اپنی ایک ایک بات کا ذمہ دار ہے کیونکہ اب وہ آٹھ کروڑ آدمیوں سے متعلق ہے جو حال اور مستقبل کی امانت ہیں اور جن سے کھیلنے والوں کے انجام اچھے نہیں ہوئے۔ اس نے اپنی پشت پر آٹھ کروڑ آدمیوں کا بوجھ اٹھا لیا ہے اور ایک ایک قدم ناپ تول کر چل رہا ہے۔

خوش گمان، بے یقین کی طرف دیکھتا ہے جو آرام سے سو رہا ہے۔

اس کا سلکن لحاف ایک طرف ہوگیا ہے، اس کی سونے کی گھڑی پاس رکھی ہے، اس کا پارکر قلم اور "اسپوتنک دور کے مسائل" بائیں ہاتھ کو ایک خانے میں رکھے ہوئے ہیں۔ بیئر کی خوشبو کمرے میں پھیلی ہوئی ہے جس سے گوناگوں فلسفوں کی مہکیں آرہی ہیں۔

"زندہ باد!"

"پائندہ باد!"

فریدپور میں ایک لاکھ آدمی جمع ہیں۔ سنتھاہار میں پچاس ہزار۔ گوالندو کی بندرگاہ سے سینکڑوں چھوٹی چھوٹی کشتیاں میری اینڈرسن اسٹیمر کے ساتھ ساتھ چل پڑی ہیں۔ ان میں مشعلیں جل رہی ہیں۔ بنگالی ماہی گیر اکیلے آدمی کو اچک اچک کر دیکھ رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں مشعلیں ہیں۔ انہیں دلوں کے چراغ درکار ہیں اور دلوں کے چراغ اچھے بھات اور اچھے پٹ سن اور اچھے نیشکر سے جلتے ہیں۔ ایک وعدے ایک پیغام، ایک سیاسی داؤ، ایک نیشنل اسمبلی سے نہیں جلتے۔ ایک غزل سے نہیں جلتے۔ ایک افسانے سے نہیں جلتے۔ ان کا مخزن کافی ہاؤس اور ٹی ہاؤس اور پریس کلب نہیں ہے۔ نہ کالج ہے نہ یونیورسٹی۔ یہ چراغ معدے کی تہوں کے خلا پر کرنے سے جلیں گے۔ ان کے معدے میں چربی چاہیئے جس کے لئے زرمبادلہ چاہیئے۔ جس کے لئے سمگلنگ کم اور پیداوار زیادہ کرنی پڑے گی، جس کے لئے سیاسی استحکام ضروری ہے، جس کے لئے یہ اکیلا آدمی بہت دن منتظر رہا اور جس سے بے یقین خوش نہیں ہے کیونکہ اس کی کافی بدمزہ اور چائے ترش ہوگئی ہے اور ملک میں ترقیاتی منصوبے بنا کر ان پر عمل بھی کیا جا رہا ہے لیکن اخباروں میں چٹپٹے اداریئے نہیں ہیں، سیاسی پارٹیوں کی لڑائیاں نہیں ہیں جن سے پڑھے لکھے لوگوں کے ذہنوں کی جِلا ہوتی تھی۔ نئے بے نام نشان لوگ ابھر آئے ہیں اور کام کام پکارتے ہیں اور ایک آدمی پچاس برس کی عمر میں کام بتانے اٹھ کھڑا ہوا ہے۔

ٹرین جا رہی ہے۔

ٹرین بنگال کے سبزہ زاروں سے گذرتی ہے۔ پھر قافلہ اسٹیمر میں چلتا ہے، پھر ہوائی جہازوں میں اڑتا ہے۔ بے یقین کو یہاں بھی وہ نشست ملی جس کی کھڑکی جہاز کے پر کے اوپر کھلتی تھی۔ بے یقین، چٹاگام سے ڈھاکہ تک ایک خوشنما منظر سے محروم رہا اور کھول رہا ہے۔ اچھی نشست ایک چھٹ بھیئے صحافی نے دبالی ہے جس کی تنخواہ دو سو روپے ہے اور جو صرف بنگلہ جانتا ہے اور ایک موٹا بے استری کیا ہوا کوٹ پہنے ہوئے ہے اور برابر باتیں کئے جاتا ہے۔ اور بے یقین کی آمدنی اسے کھائے جاتی ہے۔ اس نے اپنی کتاب مضبوطی سے دونوں ہاتھوں میں پکڑلی ہے اور الفاظ خالی خولی اس کے آگے گھوم رہے ہیں کیونکہ اصل میں وہ اپنی خراب نشست سے جل رہا ہے اور اس صحافی کا دشمن بن گیا ہے۔

ہوائی جہاز اترتے ہیں اور لوگ موٹروں اور بسوں میں بیٹھ جاتے ہیں اور پھر اسٹیمر چلنے لگتے ہیں۔ غیر ملکی لوگ حیران ہیں۔ وہ ایک ایک بات نوٹ کرتے ہیں، وہ منتظر ہیں کہ کوئی ان کو (CULTIVATE) کرنے آئے کوئی ان سے لجاجت آمیز گفتگو کرے اور ان کی "ہمدردیاں" حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ وہ ایک ایک لفظ کا ترجمہ سنتے ہیں، ایک ایک سوال اور ایک ایک جواب کا اقتباس لکھتے ہیں، وہ بڑے بڑے مجمعوں کو پریشان نظروں سے دیکھتے ہیں۔ کہیں کوئی ہنگامہ نہیں، کوئی شورش نہیں۔ یہ وہ ملک ہے جہاں سائمن واپس جاؤ، ڈیوک واپس جاؤ کے نعرے لگ چکے ہیں، جہاں زبان تک کے معاملے پر گولیاں چلی ہیں، جہاں ایک فلینۃ بڑے بڑے پہاڑوں کو بھک سے اڑا دیتا ہے۔ یہاں سب لوگ اِس سے خوش کیوں ہیں؟

"کیا یہ سب لوگ نامرد ہوگئے ہیں؟"

"نہیں، کام میں لگ گئے ہیں!"

اکیلا آدمی جذباتی باتیں نہیں کرتا۔ اس بات سے خوش گمان بھی خوش نہیں ہے۔ وہ سیدھی سیدھی باتیں کرتا ہے۔ وہ کام کیلئے کہتا ہے۔ اس نے ایک نیا جمہوری تجربہ کیا ہے، وہ اس تجربے کی تبلیغ کر رہا ہے۔

تجربے اور ایجادیں اکیلے لوگ ہی کرتے ہیں اور ہر ایسے آدمی کو شروع میں ہی کشٹ اٹھانے پڑتے ہیں اور جو اس کے ساتھ ہوں انہیں طرح طرح کے الزام لگتے ہیں اور پھر یہ سب ختم ہو جاتا ہے اور تجربہ کامیاب ہو کر سب کی رگ رگ میں جاری ہو جاتا ہے۔ وہ وہ مسیح جس کے لئے کوئی سولی پر چڑھا دیا گیا، وہ کتابیں جن کے لانے والوں

کو پتھر مارے گئے، وہ یونیورسٹی جس کے بنانے والے کا مدتوں مذاق اڑایا گیا وہ سب آج جاری و ساری ہیں مگر معترضین آج بھی چولے بدل بدل کر چلے آ رہے ہیں۔

۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء سے ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۹ء تک کتنے بے یقین خوش گمان بن گئے — شاید لاکھوں کروڑوں۔

مگر بے یقین باقی رہے گا۔ بے یقین کا باقی رہنا ضروری ہے۔ یہ قافلہ خوش گمانوں کے لئے ہی نہیں ہے۔ بے یقینوں کے لئے بھی ہے۔ ان کے بغیر خوش گمانی کا وجود نہیں رہ سکتا۔ اکیلے آدمی کو بھی بے یقین چاہئیں۔ اکیلا آدمی کھیتوں، قصبوں، شہروں میں کام کرتا رہے گا اور کافی ہاؤس میں اس پر اعتراض ہوتا رہے گا اور کھیت ہرے بھرے ہو جائیں گے اور مل بننے لگیں گے اور سڑکیں نکل آئیں گی اور زرمبادلہ بچنے لگے گا اور تعلیم عام ہو جائے گی اور ہم اور کافی بدمزہ ہوتی رہے گی اور چائے تلخ۔ زندگی بہت گوناگوں چیز ہے۔ اکیلے آدمی! تم کام کرو۔ ہم اعتراض کریں گے۔ ہم تعریف بھی کریں۔ مگر ہم کو اعتراض میں مزہ آتا ہے اس طرح ہمارے دوست ہماری عزت کرتے ہیں۔ وہ ہمیں دانشمند اور بے چین جاننا ہی پسند کرتے ہیں ورنہ وہ ہمیں پسند نہیں کرتے کیونکہ ہم اسپوتنک دور کے "سیاسی مسائل" کے طالبعلم ہیں اور ہمیں دہقانوں، مزدوروں، بیواؤں، یتیموں، محتاجوں سے دلچسپی اتنی ہی ہے کہ ہم ایک نظم کہہ دیں یا مضمون لکھ دیں یا اداریہ کھینچ دیں۔ ہم نہ ان میں سے ہیں نہ ان کے مسائل سے گتھے ہوئے ہیں۔ تم ان کے لئے کام کرو اور ہم تم پر اعتراض کریں گے۔ اعتراض انسان کی جبلت ہے، اعتراض اور شکایت کے سوتے خشک ہو جائیں تو انسانی ارتقا ختم ہو جاتا ہے۔ تم کام کئے جاؤ، ہم باتیں بنائے جائیں گے۔ ہمیں نوکری دو گے تو وہ لے لیں گے، سیاحت کراؤ گے تو خوشی سے کریں گے، الکشن لڑواؤ گے تو خوشی سے لڑیں گے، ہم کو سب مراعات چاہئیں، ہم کو سب فوائد درکار ہیں، ہم کو سب وظیفے، نقدیاں، انعامات، سب کچھ چاہئے، وہ ہم ہر ایک سے لیتے رہے ہیں اور تم سے بھی لیں گے اور دو گے تب بھی باتیں بنائیں گے اور نہ دو گے تب بھی۔ ہم اپنا الگ کلچر رکھتے ہیں اور وہ ہے کافی ہاؤس کلچر۔ ہمارا کلچر ہمیں ٹھہر کر سوچنا اور کام کرنا نہیں سکھاتا۔ کام ہے بھی کہاں یعنی ہماری مرضی کا کام کیونکہ کام تو ہم اپنی مرضی سے کرنا چاہتے ہیں۔ مثلاً ہم سب صدرِ پاکستان ہونا چاہتے ہیں یا کم از کم محکمہ تعلقات عامہ کے ڈائرکٹر ہونا چاہتے ہیں اور ہم میں سے جو جو کچھ بنتے جائیں ان کو برا بھلا کہنا چاہتے ہیں اور جو کوئی آدمی کوئی مثبت بات کرے اسے خوشامدی، ٹوڈی، جاہل، زمانہ ساز، خود غرض اور بہت عزیز ہوا تو مجبور، غریب، محتاط کہہ کر دل ٹھنڈا کرنا چاہتے ہیں کیونکہ ہمیں منفی لہریں مثبت لہروں سے زیادہ جلد کھینچ لیتی ہیں۔

ہم بیس برس پہلے پاکستان کے نعروں سے بھی ایسے ہی دل برداشتہ تھے جیسے آج نئے پاکستان کے وجود سے ہیں۔ ہم اسوقت جناح اور لیاقت کا مذاق اڑاتے تھے اور ان پر صبح و شام اعتراض کرتے تھے۔ ہمیں اپنی کافی، اپنی چائے کے لئے ایندھن چاہئے۔ اکیلے آدمی ہمارا ایندھن سب بڑے اور چھوٹے لوگ ہیں۔ ہم کنفیوشس کو ذرۂ بے مقدار سمجھتے ہیں۔ ہم گوتم بدھ کو گاؤدی ملائم آدمی کہتے ہیں۔ ہم نے مسیح کو سولی پر چڑھا دیا تھا۔ ہم نے محمد کے پتھر مارے تھے۔ ہم نے بڑے بڑے فلسفیوں کو تاریک کوٹھریوں میں بند کرا دیا اور ان کی کتابیں تک جلا دیں۔ ہم نے مارکس کو جلا وطن کر دیا۔ ہم ہر نئی بات سے بلکہ ہر بات سے چراغ پا ہوتے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ ہم آئزن ہاور اور خروشیف، دونوں کو حقیر فقیر ناچیز سمجھتے ہیں۔ ہم تمہیں نہیں مانیں گے۔ ہم تمہیں مانیں تو ہماری کافی ٹھنڈی ہو جائے اور ہمارے دل و دماغ کھردری زمینوں کی طرح سوکھ جائیں۔ ہم اپنے گھروں میں بیرے اور خانساماں رکھنا چاہتے ہیں اور جب وہ مل جائیں تو ہم انہیں دال کھلا کر خود مرغی کھاتے ہیں۔ اور نہ ملیں تو دال کھا کھا کر پورے معاشرے، پوری دنیا کو گالیاں دیتے ہیں۔ تم جو چاہو کرو ہمیں اس سے سروکار نہیں کہ تم کیا کر رہے ہو۔ ہم تو یہی کہیں گے کہ تم کیوں کر رہے ہو؟ تم نے زمینداری ختم کر دی تو ہم نے اس میں کیڑے نکالے۔ تم ختم نہ کرتے تب بھی ہم کیڑے نکالتے۔ اب تم بنیادی جمہوریت کا تجربہ کر رہے ہو تو ہم اسے برا ہی کہیں گے جب وہ کامیاب ہو گیا تو ہم اس کے فوائد اٹھائیں گے اور پھر کسی اور بات کو برا کہیں گے۔ تم ٹرین چلاؤ تو ہم اس پر ہمارے ساتھ چلیں گے اور سیر کریں گے اور دن کو اچھے اچھے کھانے کھائیں گے

اور شام کو اعتراض کریں گے۔ یہ ہماری خلط میں ہے، یہ ہمارا خون ہے، یہ ہماری زندگی ہے۔ یہ نسلوں کا فرق ہے تم کو کام ملتے ہم کو اعتراض ملے ہم اپنا اپنا کام کئے جائیں۔

مغربی پاکستان کی ریتیلی ڈرائی سہی اور مشرقی پاکستان کی سرسبز و شاداب اور خاموں ماری زمین پر یہ قافلہ سولہ دن چلا اور اس میں کوئی پچاس لاکھ آدمی شریک ہوئے یعنی وہ جنہوں نے اکیلے آدمی کی تقریریں سنیں، اسے دیکھا اور اس سے سوال و جواب کئے۔ اور وہ جو اسے دیکھنے سرد راتوں میں بیل گاڑیوں اور چھوٹی کشتیوں میں اور پیدل پچاسیوں میل سے چل کر آئے اور پھر اسے نہ دیکھ سکے مگر پھر بھی ان کے تلووں کے کانٹے اور چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیوں اور طویل و عریض دریاؤں کی لہریں گواہ ہیں کہ ۔ اس قافلے میں ان کے دل شریک ہوئے۔

سو یہ سب کچھ پچھلے دو مہینے میں ہوا اور آٹھ کروڑ آدمیوں پر پھیل گیا اور یہ سب اس لئے ہوا کہ ڈیڑھ برس سے اس ملک میں ایک نیا اور اکیلا آدمی کام کرنے اٹھ کھڑا ہوا ہے جس نے بہت سے مسائل حل کر دئے ہیں اور بہت سے مسائل حل کرنا چاہتا ہے۔

اور ۔ اور اس اکیلے آدمی کو دو بے نیاز تجربہ کار بے خوف اور با اختیار جج بڑے غور سے دیکھ رہے ہیں اور وہ ہیں:

خدا اور مستقبل! خدا اور مستقبل!!

*

ای نگارم معنیٔ جمهوریت ٭ تو مبینی وحکومت نائبت
گر بچشم بینی زره برگشته ٭ لازم آید چاره برگشته
پیش جابر گفتن حق شد جهاد ٭ لب ز حق بستن بیفزاید عناد
پس چو موسیٰ فاش باز فرعون گو ٭ بندگان را رستگاری باز جو
هر که بخشد باز بتواند برد ٭ کرسی اعزاز بتواند برد
(مثنوی ہمدانی ۱۹۵۲ء)

خزاں سے بہار تک

بشیر فاروق

یادِ ایام کہ تھا ذہنِ سیاست بیمار
یاد آیا میکدہ مفلوج تھا ہر جذبہ کار
تھا کوئی گیسوئے سلسلۂ قیادت کا اسیر
تھا کوئی صوبہ پرستی کی اداؤں کا شکار
کوئی منصب کے لئے بیچ رہا تھا غیرت
تھا کوئی لیلیٔ مخلوط نیابت پہ نثار
نعرۂ ملتِ بیچون کسی کو مرغوب
بھول بیٹھا تھا کوئی ربط و اخوت کا شعار
جان دیتا تھا حریفانہ ادا پر کوئی
تھا کوئی اپنی وفاؤں کے سبب قابلِ دار
خونِ انسان کا انسان یہاں پیتا تھا
بندۂ جبر کو جینا بھی ہوا تھا دشوار
ملک و ملت کی وہ تقدیر بنے بیٹھے تھے
جن کا مسلک تھا، نہ ایماں تھا نہ کوئی کردار
ان کے افکار سے نالاں تھے سراسر جمہور
ان کے اطوار سے تھی ساری خدائی بیزار
خود اسی قصر کی بنیاد کے در پے تھے یہ لوگ
آہ جس قصر کے تھے قائدِ اعظمؒ معمار
ہم وہ ناداں کہ انہیں پیرِ مغاں سمجھے تھے
جو نہ میکش تھے نہ ساقی تھے نہ پیمانہ گسار
بانکپن چھین لیا عہدِ خزاں نے ہم سے
لوٹ لی بادِ مخالف نے گلستاں کی بہار
چشمِ افلاک سے حالات یہ دیکھے نہ گئے
اس سے دیکھا نہ گیا عظمتِ ملی کا فشار
ناگہاں قسمتِ اربابِ وطن جاگ اٹھی
کام آ کر ہی رہی درد کے ماروں کی پکار
کشورِ پاک کی بدنام سیاست بدلی
شکر صد شکر کہ ناکام قیادت بدلی

سیّارۂ گیتی خرام

جمیل نقوی

زمزمے سلطانیِ جمہور کے گاتی ہوئی
یوں چلی ہے ریل اسٹیشن سے لہراتی ہوئی
نشۂ جمہوریت میں ہر قدم پر جھومتی
کہکشانِ حرّیت کو وجد میں لاتی ہوئی
راز بتلاتی ہوئی آزادیٔ جمہور کے
جذبہ و احساسِ خودداری کو گرماتی ہوئی
مضطرب کرتی ہوئی نخوت پسندوں کے ضمیر
شر پسندوں کے دلوں پر تیر برساتی ہوئی
اپنے اعمالِ گذشتہ سے ہوں خود ہی شرمسار
خود غرض شکلوں کو یوں آئینہ دکھلاتی ہوئی
سرکشوں کو سرنگوں کرتی دیا احساس پر
زعمِ باطل توڑتی فتنوں کو ٹھکراتی ہوئی
دشت و صحرا سے گذرتی بستیوں پر ٹھیرتی
گلشنِ ملت کے ہر غنچہ کو مہکاتی ہوئی
لہلہاتی کھیتیوں کو بخشتی حسنِ دوام
وادیٔ مہران کے ذرّوں کو چمکاتی ہوئی
پنجند کی نقرئی لہروں سے موتی رولتی
راوی و جہلم کی موجیں رقص میں لاتی ہوئی
سینۂ آبِ رواں پر ڈولتی مستانہ وار
سرزمینِ ریشۂ زرّیں کو لچکاتی ہوئی
چائے کے باغوں کے ڈھلوانوں کے زیر و بم کے بیچ
بھینی بھینی خوشبوؤں کو اور پھیلاتی ہوئی

دھان کے کھیتوں کی ہریالی پہ نظریں ڈالتی
سبز پرچم کے تقدس کی قسم کھاتی ہوئی
شاعرِ مشرق نے جس کے واسطے کی تھی دعا
ہاں! وہی نورِ بصیرت عام فرماتی ہوئی

اے نقیبِ حرّیت، اے داعیِ امن و سلام
اے نفیرِ انقلاب، اے دشمنِ کہنہ نظام
اے نسیمِ جانفزا، اے کاشفِ رازِ چمن
اے صبا رفتار قاصد، اے سفیرِ تیز گام
اے سریع السیر پیکر، اے نشانِ اتحاد
اے امیدِ قوم، اے سیارۂ گیتی خرام
اے دلوں کو درس دیتی، عزم کا تنظیم کا
اے نشیدِ حرّیت، اے نعرۂ قلبِ عوام
کوہ پیما زلزلوں کا ہمہمہ تیرا سکوت
برق آسا ولولوں کو تیرے سینہ میں دوام
تجھ سے بینا دیدۂ تہذیب و چشمِ ارتقا
تو نے انساں کو سکھایا، زندگی کا احترام
تجھ سے باطل، اہلِ باطل کی ستم آرائیاں
تجھ سے برہم دشمنانِ ملک و ملت کا نظام
تیری ہیبت سے ہے زلفِ فکرِ کاذب منتشر
تجھ سے آساں اہلِ دانش پر جنوں کا اہتمام
تو نے ثابت کر دیا ہے با ہزاراں انقلاب

یوں زمانہ تھام لیتا ہے مقدر کی زمام
تو نے گرمایا فسردہ دل جوانوں کا لہو
تو کہ ہے نغمہ بہ لب، شعلہ بجاں، آتش بجام
تیرے پرتو سے چراغاں اتحادِ شرق و غرب
تیرے جلووں سے فروزاں اعتبارِ صبح و شام
تیرے محور پر لچکتی ہے کمر اقدار کی
تیرے مرکز پر سمٹتا ہے زمانہ کا نظام
تو ہے شکوہ سنج افتادِ جمودِ عصر سے
زندگی تیرا ترانہ، آگہی تیرا پیام
تو نے انساں پر کئے ہیں فاش اسرارِ حیات
ہے ترا ایک اک نفس عہدِ عمل انساں کے نام
تیرا مسلک اک نئی جمہوریت کی ابتدا
تیرا مقصد ملک میں اقدارِ صالح کا قیام
رہروِ درماندہ پا کے واسطے مہمیز ہے
تیرے نغموں میں حدی خوانوں کا سوز ناتمام

ہم نے دیکھے ہیں زمانہ کے ہزاروں انقلاب
رہزنی کا جوشِ مستی، رہنمائی کا شباب
ہر طرف چھائی ہوئی تھی اک بھیانک تیرگی
زندگی تھی یا سرِ شب نیم دیوانہ کا خواب
مسکراتی تھی زلیخائی ہوسِ دینار پر
یوسفِ عصمت سربازار، رسوا، بے نقاب
لیلیٔ احساسِ خودداری کا چہرہ خونچکاں
سینۂ آزادیِ جمہور زخموں سے خراب
بے کسی کی دھند میں لپٹے ہوئے ماہ و نجوم
بے بسی کی ظلمتوں میں بجھ رہا تھا آفتاب
سازشوں پر نازاں تھا اربابِ حل و عقد کو
شاطری تھی مدرسوں میں جزوِ تعلیمی نصاب
تل رہا تھا علم میزانِ عیارِ جہل پر
ثانیِ آئینۂ دانش تھا ہر عزت مآب
غیرت و احساس آغوشِ ہوس میں دم بخود
رقص فرما خلوتِ زاہد میں پیمانے شراب
دوڑتے پھرتے تھے طول و عرضِ پاکستان میں
ایک امت بے پیمبر، کتنے مرسل بے کتاب
جن کا ہر وعدہ شرابی، ہر عمل باد رہوا
جیسے اک کوزہ میں طوفاں جیسے ساغر میں حباب
دستِ آہن تھا لبِ آزادی گھنتا رہا
ہر ستم جائز ٹھہرتا تھا بنامِ سدِ باب
کاغذی تھا پیرہن ہر پیکرِ تعمیر کا
ایک منصوبہ تھا ہر لفظِ شکایت کا جواب
طوطی و نقارخانہ کا سماں درپیش تھا
گھٹ کے رہ جاتی تھی ہونٹوں میں نوائے سیماب
پانی پانی ہو گیا تھا اہلِ دانش کا لہو
اڑ چلی تھی غیرتِ قومی کی تلواروں کی آب
یک بیک گونجی فضاؤں میں صدائے مردِ حق
زندگی کے پاسبانو، زندگی سے اجتناب
جاگ بھی اٹھو کہ دورِ خود فراموشی گیا
تابکے یہ بے حسی، تاچند یہ غفلت، یہ خواب؟

آؤ مل کر اک جہانِ تازہ تر پیدا کریں
بطنِ شب سے ایک تابندہ سحر پیدا کریں
جن کی تابانی سے روشن ہو فرازِ آسماں
سرزمینِ پاک سے شمس و قمر پیدا کریں
قلب کی گہرائیوں میں بھر کے سوز و سازِ عشق
اپنے نالوں میں قیامت کا اثر پیدا کریں
ڈس رہی ہے زندگی کو میکدہ کی تیرہ رات
جامِ مے چھلکائیں، انوارِ سحر پیدا کریں
بخش دیں جو غم نصیبوں کو تب و تابِ حیات
قلبِ افسردہ میں وہ برق و شرر پیدا کریں
جن کی نظریں جھانک سکتی ہوں ضمیرِ عصر میں

وہ خودی بیدار، مستقبل نگر پیدا کریں
جن کے اک ادنیٰ تبسم سے بہاریں جاگ اٹھیں
وہ چمن آرا وہ اربابِ نظر پیدا کریں
روحِ آزادی میں پھر دیں گرمیِ تکمیلِ شوق
سوزِ دل پیدا کریں، سوزِ جگر پیدا کریں

آج پھر بیدار ہے چشمِ تقاضائے حیات
آج پھر حاصل ہے احساسِ غمِ دل کو ثبات
آج پھر دل میں چھلکتی ہے مئے حُبِّ وطن
آج پھر تقدیر نے تدبیر سے کھائی ہے مات
آج پھر دستِ تدبّر میں ہے فطرت کی زمام
آج پھر بدلا نظر آتا ہے نظمِ کائنات
آج پھر نشو و نما کی قوتیں بیتاب ہیں
آج پھر گندم کے ہر خوشہ میں غلطاں ہے حیات
آج پھر کھیتوں کی ہریالی ہے فردوسِ نظر
آج پھر دہقاں ہے بے پروائے بیم حادثات
آج پھر پھولوں کی شادابی سے روشن ہے چمن
آج پھر نغموں سے گونجا ہے جہانِ شش جہات
آج پھر محمود کے شانہ بہ شانہ ہے ایاز
آج پھر سرمایۂ انسانیت ہے حُسنِ ذات
آج پھر فرہاد کا تیشہ ہے سرگرمِ عمل
آج پھر پردیز ہے صیدِ زبونِ ممکنات
آج پھر بیدار ہے وہ نبض جو سکتے میں تھی
آج پھر ہشیار ہیں کہنہ مریضانِ سُبات
آج پھر جمہور کے سینوں کی دھڑکن ہے جواں
آج پھر فکر و عمل پر کھل گئی راہِ نجات
آج پھر فن کار کو آزادیِ اظہار ہے
آج پھر کھل کر بیاں ہوتے ہیں دل کے واردات
آج پھر دستِ تنظّم بستۂ قانون ہے
آج پھر مظلوم کی ہر جا سنی جاتی ہے بات

آج پھر نغمہ بجاں، ہر حلقۂ زنجیرِ عدل
آج پھر انصاف کے پنجے میں ہے ظالم کا ہات
آج پھر گردش میں ہے پیمانۂ ادراک و عقل
آج پھر ممکن ہے آسانی سے حلِّ مشکلات
آج پھر حقانیت ہے سرفراز و سربلند
سربسجدہ آج پھر کعبہ میں ہیں لات و منات
آج پھر دُنیا کی نظروں میں بھرم رکھتے ہیں ہم
جانتے ہیں خوب دنیائے سیاست کے نکات
ہم نے کردار و عمل کے زور پر جیتے ہیں دل
آج سب تسلیم کرتے ہیں ہمارے واجبات
ہم بیاں کرتے ہیں اقوام و ملل کے روبرو
زندگی سے بھی حسیں تر زندگی کے واقعات
نغمہ زن گلزار در گلزار داؤدِ خلیل
نوحہ گر بازار در بازار نمرودی صفات

منزلِ صبحِ بہاراں پر نظر رکھتے ہیں ہم
ہر قدم پہلے قدم سے تیز تر رکھتے ہیں ہم
ہر تمنا جادہ پیما، ہر نفس منزل نشاں
رہ نوردِ شوق ہیں عزمِ سفر رکھتے ہیں ہم
وسعتِ کون و مکاں ہر آرزو پر تنگ ہے
منظرِ تازہ بعنوانِ دگر رکھتے ہیں ہم
روحِ آزادی نہیں پابند قصرِ زرنگار
مثلِ شاہیں شش جہت پیشِ نظر رکھتے ہیں ہم
گل بداماں ہیں بفیضِ لذتِ خود آگہی
پھول ہونٹوں پر تو سینوں میں شرر رکھتے ہیں ہم
جس کی نظریں دور رس جس کا سخن قند و نبات
اپنی محفل میں ایک ایسا دیدہ ور رکھتے ہیں ہم
جب قسم کھاتے ہیں مردانِ جری کے سامنے
ہاتھ اپنا قبضۂ شمشیر پر رکھتے ہیں ہم

★

صبح در صبح

صہبا اختر

آبشارانہ ستاروں کے شرر کار و ضیا بار جزیروں سے گزرتی ہوئی رات
کبھی کرنوں کے سمندر میں رواں اور کبھی چاند کے ساحل پہ ٹھہرتی ہوئی رات
میری محبوب کی زلفوں کی طرح خلوتِ آفاق میں چھپ چھپ کے مہکتی ہوئی رات
نکہتِ گل کی طرح نیلوفری کاہکشاؤں میں نشہ بن کے بکھرتی ہوئی رات
کبھی زہرہ کبھی دامانِ ثریا کبھی ناہید کے آنچل پہ جھپٹتی ہوئی رات
سینۂ مشتری و قلبِ عطارد میں تب و تابِ تمنا سے دھڑکتی ہوئی رات
ہر نفس نیلمیں آفاق کے ہر طاق میں اک شمع کی مانند پگھلتی ہوئی رات
نمِ شبنم کی طرح سرو و صنوبر پہ اُجالوں کے دریچوں سے برستی ہوئی رات
دُور تک انجمنِ خواب میں ہر سانس پہ کلیوں کے تبسم سے چٹکتی ہوئی رات
کبھی اک پھول کی پلکوں میں سمٹتی کبھی اک شاخ کی باہوں میں لچکتی ہوئی رات
چوڑیوں کی طرح بجتی کبھی اک شوخ کی پازیب کی مانند جھنکتی ہوئی رات
کوئی دیکھے تو ذرا انجم و مہتاب کے زینوں سے سوئے خاک اُترتی ہوئی رات
ہالۂ نور کبھی دائرۂ رقص کبھی سلسلۂ رنگ بدلتی ہوئی رات
نوعروسانہ نئی صبح کی آغوش میں خود گرمیٔ انفاس سے ڈھلتی ہوئی رات

صبحِ افسونوں کا بکھرنے لگا ہر شہرِ صبا زاد پہ جادو جیسے
پاک جمہوریہ، مصروفِ سفر صندلی رمنوں میں خراماں کوئی آہو جیسے
اُفقِ نیلوفری پر رُخِ خورشیدِ درخشاں بھی ہوا رنگِ حیا سے گلنار
دیکھ کر عکسِ رخِ غنچہ فرد و ستانِ جواں سال و حسینانِ چنار و جیسے
صبحدم جاگ اٹھے خوابِ سحر گاہی کے نشوں میں کبھی آنکھ نہ کھلنے والے
ناوک انداز شعاعوں کا ہر اک ناوکِ زرکار ہوا دل میں ترازو جیسے
دور تک پھیلے ہوئے سرد گھنے سبز درختوں کی تگ و تاز کا پُر کیف سماں
صورتِ باد، پریشان کسی ساحرہ خواب کے بکھرے ہوئے گیسو جیسے
گاؤں گاؤں میں نئی دھوپ، نئی چھاؤں، نئے روپ کے ہنستے ہوئے گھر ٹوٹے
قریۂ شہد لباں، کوئے نگاراں میں بیک وقت اُڑی ایک سی خوشبو جیسے
دم بہ دم غرفۂ آلام سے صد ماہ و خورشید کے رقاص اُجالوں کا ظہور جیسے
زیست افسردہ و مغموم و پریشان و ہراساں نہ رہی ہو کسی پہلو جیسے
جوق در جوق اٹھائے ہوئے محنت کے نشاں، زمزمہ کارانِ دل و جاں موجود
رسنِ جبر مہ و سال میں بستہ نہ رہے ہوں کسی مزدور کے بازو جیسے

دامنِ سندھ پہ آزادی کے فسوں خیز تلاطم کے اٹھائے ہوئے بادل برسے
وہ چراغاں سا ہوا، قہقہے پھوٹے، وہ لب و عارض و رخسار کے کوندے لپکے
جھٹپٹے کا یہ سماں جیسے سرِ وادیٔ دل حسرت و امید کی شمعوں کا غبار
یہ کئی ریشمیں زلفوں میں نمِ شام کئی آتشیں چہروں میں سحر کے تڑکے
یہ ہمہ رنگ زمیں جیسے کسی خواب کے ارژنگ کے بکھرے ہوئے رنگیں اوراق
یہ صنم زاد فضا جس کے فسوں کارِ تبسم کے اثر سے دلِ آذر دھڑکے
نشۂ شکر و سرور و مۓ و مستی کی گھٹاؤں میں سرِ خاک یہ بارانِ نشاط
شاخ بر شاخ بہ ہر لغزشِ امواجِ صبا بادۂ شبنم کے کٹورے چھلکے
وہ ہمہ رقص ہمہ جذب ہواؤں کے لچکتے ہوئے خیموں کی طنابیں ٹوٹیں
وہ فضاؤں کے دھڑکتے ہوئے سینوں سے گھٹاؤں کے مہکتے ہوئے آنچل ڈھلکے
رات تو رات ہے زندانِ مہ و سال کی صبحوں کے دریچے بھی تھے جن سے محروم
ایک خورشید در آغوشِ تصور سے سرِ دامنِ احساس وہ شعلے بھڑکے
دیکھ کر قافلۂ عزم کی آغوش میں صد حلقہ بگوشانِ محبت کا ہجوم
خیر مقدم کے لئے وادیٔ مہران کے ذرات میں سوئے ہوئے سورج چمکے

آزادی آزادی مرے احساس کے طوفان بہ ہر دشتِ مغیلاں مری آہوں کے خرام
اے مسافر وطنِ پاک کی راہوں کے تجھے تجھ سے رفیقانِ محبت کا سلام
اس مسافت میں ترے ساتھ رہیں مجھ سے وطن دوست فقیروں کی دعائیں بن کر
صبح در صبح شعاعوں کے حنا رنگ شرارے تو ستاروں کے دئے شام بہ شام
ارضِ مہران سے تا وادیٔ کاغان فروزاں ہیں ہر اک دستِ حنائی میں چراغ
سورتِ برق سجانے لگی بنگال کی ہر زلف کو مشاطۂ خورشید خرام
تیری آنکھوں میں ہمہ وقت وطن اور وطن زاد بہاروں کے تصور رقصاں
تیرے ہونٹوں پہ ہمہ وقت محبت کے تر و تازہ کنول گلشنِ جمہور کے نام
قصرِ عشرت کے فلک بوس منارے ترے تیشے کی ہر اک ضربِ گراں سے لرزاں
دشمنِ خاصۂ خاصانِ طرب کوش مبارک ہو بہر گام تجھے [illegible]
لیکن افلاک سے تا خاک یہ بارانِ مۓ و کیف ابھی اک خواب [illegible]
ان فسوں زاد و شفق کار و شفق بار بہاروں کو مہِ خاک نہ مل جائے دوام
جگمگا جائے نہ جب تک وطنِ پاک کا ہر گوشۂ مسرت کی نئی کرنوں سے
دور ہو جائے نہ جب تک رخِ ایام سے ماضی کی بکھیری ہوئی گردِ آلام
حرفِ آغاز ہے یہ پاک سفر اور ابھی دور بہت دور ہے اس کا انجام
اے مسافر ترا مقسوم نہ راحت نہ کسی سایۂ دیوارِ چمن میں آرام

"رہ نوردِ شوق"

رئیس امروہوی

پلا ساقیا! بادۂ حُسن و نور
مئے پاک و طاہر، شرابِ طہور

کہاں تک یہ جام و سبو کی سبیل؟ — پلا ساقیا! ساغرِ سلسبیل
ترے نام سے ساقیٔ دل نواز! — درودِ عقیدت، سلامِ نیاز
فقط دادِ شوق و تمنا نہ دے — جو ہیاں کیا تھا تو پیمانہ دے
نہ کیوں بزم کی بزم ہو تاک میں — کہ یہ مے نہاں ہے رگِ تاک میں
نئے دور کا استعارا ہے یہ — نئی زندگی کا اشارا ہے یہ

نئی راہ؟ کہہ دورۂ انقلاب
نیا دور؟ یہ دورۂ کامیاب
ترقی کا پردہ کُشا دورِ نو
خوشا دورۂ نو، خوشا دورِ نو

نیا دور جو دورۂ نور ہے — عجب دورِ نو، چشمِ بد دُور ہے
شبِ ہجر آخر بسر ہو گئی — اٹھو سونے والو سحر ہو گئی
مبارک طلوعِ سحر کا سماں — اندھیروں کی اندھیر نگری کہاں
پئے محتسب کیوں نہ خود دے حساب — کہ ہے دَورِ مے، دورۂ انقلاب
وہی دولتِ جزو و کل لا کے دے — بضد خود ہے مُلّا کہ مَے لا کے دے
گُل دیگر از نخلِ مستی شگفت — یہ مفتی کا فتویٰ کہ جائز ہے مُفت
جو بے فیض ہے اس پہ غائز نہیں — قضا اس کی قاضی کو جائز نہیں
مے [illegible] نقلاب آج دے — کہ جو قلب و قالب کو معراج دے

جہاں منقلب تھا پئے انقلاب
مے انقلابی، مے انقلاب!

ارضِ پاک:

خُمِ غیر پہ ہاتھ کب تک دراز؟
مئے خانہ جاں! اے خانہ ساز!

اسی خُم اسی خاک سے عشق ہے — مجھے کشورِ پاک سے عشق ہے
یہی خاک ہے خاکِ بزمِ جم — اسی خم کے آگے مرا سر ہے خم

یہ سلمائے بنگال و پنجاب و سندھ — یہ دنیائے بنگال و پنجاب و سندھ
وہ بنگال، وہ مشرقی ارضِ پاک
وہ رنگین خطہ وہ گلپوش خاک

ندی پر کنول جیسے پانی میں آگ — مچھیروں کے گیت اور لہروں کے راگ
کناروں پہ گھر کشتیوں پر جماؤ — وہ مانجھی، وہ موجیں، وہ چپو، وہ ناؤ
وہ پانی میں بجتے ہوئے جل ترنگ — فضاؤں میں وہ بدلیاں رنگ رنگ
نظر کا فروغ اور دل کا فراغ — وہ دھانوں کے کھیت اور چائے کے باغ
وہ نارنگ سے بوٹے وہ سندر سے بن — خداداد گلزار، خود رو چمن
ہر اک دن بہاروں کی فصلِ جواں — ہر اک رات، برکھا کی رُت کا سماں
سماں ایسا پیارا کہ جی لوٹ پوٹ — وہ دریا کی چادر وہ سبزے کی گوٹ
کنول، پھول، برکھا کا بنگال دیس — جہاں آدمی زاد کا اور بھیس
وہ پشتوں کی غربت وہ نسلوں کے دکھ — وہ روٹھا ہوا ان سے صدیوں کا سکھ
نئی زندگی کی تمنا لئے — دلوں میں خدا جانے کیا کیا لئے
سفینوں کا رُخ ساحلوں کی طرف — رواں ہیں نئی منزلوں کی طرف

اُدھر ارضِ بنگالۂ دل نشیں
اِدھر سندھ و جہلم کی یہ سرزمیں

یہ خطہ، کراچی سے کاغان تک — یہ دنیا کہ خیبر سے بولان تک
خوشا مغربی پاک کی خاکِ پاک — شفق فام، آئینہ رو، تاب ناک
وہ آبادیاں جابجا پُر شکوہ — وہ دریا و بحر و بیابان و کوہ
ہوا پاک طینت، فضا خوش نہاد — کہیں حبس و خشکی کہیں برف و باد
کہیں دشت و کہسار، بنجر اُجاڑ — کہیں سبز و شاداب جنگل پہاڑ
مناظر کی جنت کی شہزادیاں — وہ کشمیر کی لالہ رُخ وادیاں
کہیں غنچہ و گل، کہیں خار و سنگ — زمیں گونہ گونہ، فضا رنگ رنگ
زبانوں پہ سب کی یہ راوی کا قول — عجب سندھ و جہلم ہے ڈانوا ڈول
کہیں آبِ جو کی طرح نرم رو — سمندر کی صورت کہیں تیز رَو

روش و ستم قسم اور مقسوم ایک — زبانیں کئی اور مفہوم ایک
عوام اس زمیں کے غیور و غریب — مگر اک نئی زندگی کے نقیب

جو مشرق سے مغرب ہم احساس ہے
بہت دور تاہم بہت پاس ہے

دورۂ صدرِ مملکت،

جو ہیں منزلِ شوق کے شہسوار
وہی شہسوارانِ منزل شکار

جو ہیں جادۂ عزم کے یکہ تاز — وہی یکہ تازانِ جادہ طراز
جو ہیں عرصۂ جہد کے تیز رَو — وہی تیز رو، برق پا، گرم رَو
وہی شاطرانِ بساطِ سخن — بساطِ سخن پر ہیں یوں مُہرہ زن

کہ ہے جس طرح سیل کی آبرو
تگ و تاز و رد و کد و جستجو

اُسی طرح اہلِ حکومت کا طور — سدا ایک دورہ سدا ایک دَور
ہمیشہ اُمورِ ریاست میں غرق — مگر زیرِ پاں ابلقِ سیل و برق
سفر ہو نہ کیوں حکمرانوں پہ فرض — کہ ہے طے شدہ معجزۂ طیُّ ارض
روانی، لطافت پسندوں کی خُو — سدا بند پانی سے آتی ہے بُو
ظفر کا نہ سایہ سفر کے بغیر — نسیمِ سحر کی طرح نرم سیر!
کہاں پا بہ گِل طالبِ جز و کُل؟ — رواں اور دواں صورتِ بوئے گُل

بہ تعمیلِ فرمانِ سیروا فی الارض
سفر، رہ روانِ ریاست پہ فرض

قیام اور عزلت میں رکھا ہے خاک — خوشا صدر کا دورۂ ارضِ پاک
کرشمہ تھا احساس و ادراک کا — سفر مشرق و مغربِ پاک کا
اِدھر مغربی پاک میں یہ نوید — کہ اے صدرِ ذیقدر، خوش آمدید!
اُدھر مشرقی پاک میں یہ کلام — کہ اے ناظمِ انقلاب، السّلام!
صدارت کا دورہ اِدھر سے اُدھر — حقیقت میں جمہوریت کا سفر

"پاک جمہوریت"

اُمیدوں کی دُنیا تو قدرت کی دین
چلی پاک جمہوریت کی ٹرین

ٹھہرتی، اٹکتی گذرتی ہوئی — زمینوں کو بیدار کرتی ہوئی
قیام ایک مرکز پہ جیسے نظر — سفر جیسے موجِ نسیمِ سحر
اقامت کہ دل میں کوئی آرزو — روانی کہ جیسے کوئی آبِ جُو

کراچی سے پہلے پہل وہ سفر — بنامِ خداوند ہر خشک و تر
وہ بحر و بیاباں میں اس کا عبور — ہزاروں کے جمگھٹ وہ نزدیک و دُور
وہ مزدور، وہ پیشہ ور، وہ کسان — نئی ہر جگہ خیر مقدم کی شان
عقیدت کی کیا کیا فسوں بافیاں؟ — ترانے، غزل، زمزمے، کافیاں
وہ بنگال کی پیت رسم اور ریت — وہ دُھن پیار کی، پیارے پیارے وہ گیت
وہ خیر مقدم میں فی الفور ناچ — وہ جشن اور جلسے وہ رقص اور ناچ
کراچی سے تا سلہٹ و چاٹ گام — عوامی ہجوم اور ہجومِ عوام
وہ مشرق کا مغرب سے یوں ارتباط — کہ لاہور و ڈھاکہ میں جشنِ نشاط

دلوں کا وہ باہم گرہ بین دین
خوشا پاک جمہوریت کی ٹرین

جہاں صدرِ ملت کے پہنچے قدم — گڑا تازہ جمہوریت کا عَلم
ہر اک نقشِ پا رہنمائی کی چھاپ — وہ جمہور و جمہوریت کا ملاپ
دلوں میں فراخی دلوں کے بقدر — خوشا دورۂ صدر سے شرحِ صدر
حسد کی توانائیاں گھٹ گئیں — تعصب کی تاریکیاں چھٹ گئیں
جہالت کے جمگھٹ تھے کیا کچھ، گئے! — شرارت کے آتش کدے بجھ گئے
جو تھے بد زباں اُن کے لب سِل گئے — عوام اپنے قائد سے گُھل مل گئے

قرار آ گیا ناصبوری گئی
یہ دورہ کہ آپس کی دوری گئی

یہی میرِ ملت کا سب سے خطاب
بہن بھائیو انقلاب انقلاب!

سُنو نعرۂ وحدت و اتحاد — کہو نظمِ جمہوریت زندہ باد!
سُنو مژدۂ تازہ و نو نو اشس — کہو عزمِ جمہور پائندہ باش
نئی زندگی ہے جو حسبِ مراد — کہو زندہ باد اور سنو زندہ باد

یہی صدرِ ملت کا سب کو پیام
کہ اے مجمع ہائے خواص و عوام

بصد جذب و احساس آیا ہوں میں — بہت دُور سے پاس آیا ہوں میں
اندھیرے دبے پاؤں جانے لگے — اُجالے وہ آئے وہ آنے لگے
جو راتیں کہ صدیوں سے تھیں بے چراغ — چراغوں سے اُن میں فروغ و فراغ
جو قیدی کہ صدیوں سے تھے قید و بند — وہ زنداں سے نکلے رَسا کر کمند

اجل اوجِ دار و رسن سے گری
وہ زنجیر کٹ چھٹ کے تن سے گری

نہ پاؤں میں بیڑی نہ گردن میں طوق
نئے ولولے ہیں نیا ذوق شوق

جہنم تھا خود جن کا حکمِ شدید
وہ شدّاد ہیں اب جہنم رسید

نئے طوق و زنجیر ڈھالے گئے
جو بل تھے بل ان کے نکالے گئے

نئے کار فرما، زمانہ نیا
زمانہ نیا، کارخانہ نیا

نئے سر سے ہاری بسائے گئے
جو ہارے ہوئے تھے جتائے گئے

نسیمِ سحر مشک بار آگئی
ہر اک گاؤں میں پھر بہار آگئی

چھڑا نغمۂ نو چمن جاگ اٹھا
وطن دوست چونکیں، وطن جاگ اٹھا

جو ظالم تھے ترکِ وطن کر گئے
جو تھے سخت جاں ڈر سے مر مر گئے

اُمنگیں جوانوں میں بانٹی گئیں
زمینیں کسانوں میں بانٹی گئیں

یہ کیا ہو گیا بات کی بات میں؟
نیا دور دورہ ہے دیہات میں

جو ضدّی تھے اب ضد پہ قائم کہاں
وہ مجرم کہاں وہ جرائم کہاں؟

اچانک جو دُنیا نے بدلی ہے جون
نہ اغوا نہ چوری نہ ڈاکہ نہ خون

مصیبت کے مارے سنبھلنے لگے
شرافت کے قانون چلنے لگے

شکار آج خود ہے شکاری پہ شیر
زبردست ہیں زیر دستوں سے زیر

اُڑو طائرو بال و پر کھل گئے
اُڑو، قید خانے کے در کھل گئے

جوانو! بڑھو روزِ عید آگیا
نظامِ جوان و جدید آگیا

بصیرت فزا، دل کشا، تابناک
خوشا صدر کا دورۂ ارضِ پاک

عمل آفریں اعتقاد آفریں
جہاد آفریں، اجتہاد آفریں

محبت کا انعام، الفت کا مول
عوام اور قائد کا یہ میل جول

یہی خاص کر رہنما کا ہے کام
کہ یکتا ہو، لیکن بنے از عوام

یہی اصلِ جمہوریت ہے یہی
کہ جمہوریت کی صفت ہے یہی

فقط ضبطِ جمہور و ربطِ عوام
نظام اور جمہوریت کا نظام

مسلسل ترقی، مسلسل عمل
یہی دورۂ صدر کا ماحصل

صفائی کی تنظیم، صحت کا عزم
زراعت کی اصلاح، صنعت کا عزم

مسائل میں جدّت پسندی نئی
وسائل کی شیرازہ بندی نئی

نئی زندگی قوم و جمہور کی
نئی شکل آئین و دستور کی

بھلا کنجِ عزلت میں رکھا ہے خاک
خوشا صدر کا دورۂ ارضِ پاک

ترقی کا پردہ کشا دورِ نو
خوشا دورۂ نو خوشا دورِ نو!

طلوعِ صبحِ روشن

حمایت علی شاعر

اے صبحِ وطن ہم ترے سورج کی لگن میں
جلتے رہے شب بھر مہ و انجم کی طرح چپ
سہتے رہے ہر ضربتِ سنگِ غمِ ایام
اشکِ سرِ مژگاں کے تلاطم کی طرح چپ
کہتے رہے افسانۂ دل بادِ صبا سے
غنچوں کے دہن بستہ تکلم کی طرح چپ
تکتے رہے حسرت سے ہر اک ابرِ رواں کو
پھولوں کے خزاں دیدہ تبسم کی طرح چپ
آدابِ غمِ عشق کا احساس کیا ہے
ہر حال میں اس دل نے ترا پاس کیا ہے

اے صبحِ وطن تو نے ہم آشفتہ سروں کو
گل ریز بھی دیکھا ہے شرر بار بھی دیکھا
فرہاد کی مانند کبھی تیشہ بکف بھی
مجنوں کی طرح خاکِ رہِ یار بھی دیکھا
سقراط کی مانند کبھی زہر بہ ساغر
عیسیٰ کی طرح زیبِ سرِ دار بھی دیکھا
منصور کی مانند کبھی کشتۂ حق بھی
ناکردہ گناہی کا سزاوار بھی دیکھا
تکریم کی ہر حال میں پندارِ جنوں کی
توہین نہ ہونے دی کبھی سوزِ دروں کی

اے صبحِ وطن تجھ کو یہ خورشید مبارک
لے آج کئے لیتے ہیں دامن کو رفو ہم
اب مل گئی ہر درد کو درماں سے فراغت
اب زخمِ جگر کو نہ رہی حاجتِ مرہم
اب پھولوں کی غم خوار ہیں سورج کی شعاعیں
اب ختم ہوئی کشمکشِ شعلہ و شبنم
اب مل گئے دل کو نئے عنوان جنوں کے
اب عشق کے ماروں کا ہے کچھ اور ہی عالم
مانندِ صبا اب ترے گلشن میں رہیں گے
خوشبو کی طرح پھولوں کے دامن میں رہیں گے

"اُمیدگاہِ انام"[1]

شاھد جمیل

۱۴ فروری سنہ ۱۹۶۰ء اور ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء بظاہر اتنے دور اور غیر متعلق! لیکن ان دونوں تاریخوں میں ایک گہرا تعلق ہے۔ تاریخیں دو ہیں مگر ان کی روح ایک ہے، واقعات دو ہیں مگر ان کا نتیجہ ایک ہے عوام کی برتری اور حقیقی جمہوریت کا عروج۔ ۲۳ مارچ وہ یادگار دن ہے جب ہم نے ایک دولتِ خداداد وجود میں لانے کا عزم کیا۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء وہ دن ہے جب ہم نے اسے بنا کر اس کے اندر قدم رکھا۔ اور ۱۴ فروری ۱۹۶۰ء وہ مبارک دن ہے جب ہم حقیقی پاکستان، حقیقی آزادی، حقیقی جمہوریت کی عظیم الشان دنیا میں داخل ہوئے۔ ایک معاصر کے الفاظ میں یہ محض ایک دن نہیں بلکہ جمہوریت کے ایوان کا وہ بڑا دروازہ ہے جس میں داخل ہو کر پاکستان ہمیشہ کے لئے ایک جمہوری ملک بن گیا۔ یہ پاکستان کی تاریخ کا پہلا صفحہ ہے جہاں سے پاکستان میں صحیح معنوں میں ۸ کروڑ انسانوں کی حکومت کا دور شروع ہوا۔ جب آٹھ کروڑ پاکستانی باشندوں نے اپنی خوشی اور مرضی سے بغیر کسی دباؤ اور ڈر کے پوری آزادی کے ساتھ اس ملک کے اعلیٰ ترین حاکم — صدر — کا انتخاب کیا۔

۲۳ مارچ وہ مبارک دن ہے جسے "یوم پاکستان" ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ایک حقیقی معنوں میں یادگار تاریخ۔ انمٹ، ناقابلِ فراموش! کیونکہ اس دن ایک پوری قوم نے یک دل و یک زبان ہو کر پاکستان کا تصور پیش کیا تھا، اس کا مطالبہ کیا تھا۔ آج ہم اس مبارک دن کو یاد کرتے ہوئے خوش ہیں کہ ۲۰ برس بعد ہی سہی ہم نے وہ حقیقی آزادی، وہ حقیقی پاکستان، وہ عوام کا مقدس پیدائشی حق، وہ سچی جمہوریت پھر پالی ہے جس نے اس تاریخی دن کو ہمارے دلوں کو گرمایا اور روحوں کو تڑپایا تھا اور جو ہمارا دلی منشاء و مقصود تھا۔

۱۴ فروری میں وہ سب کچھ شامل ہے جو ۲۳ مارچ اور ۱۴ اگست میں ہے کمل آزادی اور جمہوریت۔ لہٰذا ۱۴ فروری ہماری تاریخ میں ایک اور سنگِ میل، جمہوریت کی تاریخ میں ایک اور سنہری باب، ایک اور یادگار دن ہے۔ جب کہ ساری قوم نے بہ یک آواز مشرقی پاکستان سے لے کر مغربی پاکستان تک اپنے نجات دہندہ، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کو صدر منتخب کیا۔ جو بلاشبہ ہمارے دوسرے قائدِاعظم ہیں۔ عوام کے اپنے ہر دلعزیز صدر اور محبوب رہنما جن سے پاکستان کے روشن مستقبل اور قوم کی بہترین امیدیں وابستہ ہیں۔ یہ انتخاب حقیقی معنوں میں ایک یادگار انتخاب ہے۔ جمہوریت کا نقطۂ عروج اور اس جمہوری روح کا منطقی نتیجہ جو سالہا سال کی جدوجہد کے بعد پاکستان کی شکل میں بروئے کار آئی تھیں۔

وہ سلسلہ جس کی ابتدائی کڑی ۲۳ مارچ سنہ ۴۰ء تھی اس کی انتہائی کڑی ۱۴ فروری سنہ ۱۹۶۰ء ہے۔ جب کہ عوام نے بالآخر وہ سربراہ، وہ حکومت پالی ہے۔ جو خالصتہً جمہوری ہے۔ اور یوں بیداریِ جمہور کا فطری تقاضا آخرکار پورا ہو ہی گیا ہے۔

اگر جمہوریت کو دوبارہ زندہ کرنے کا شرف کسی فردِ واحد کو حاصل ہے تو وہ ہمارے محبوب و ہر دلعزیز سربراہ، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، کے سوا اور کوئی نہیں۔ جن کو حقیقی جمہوری احساس و جذبہ کے تحت ہی عوام نے اپنا نمائندہ منتخب کیا ہے اور یوں جمہوریت کا بول بالا کیا ہے۔ جن حالات کے تحت عوام سے اظہارِ رائے کے لئے کہا گیا، وہ اول تا آخر، مکمل طور پر، جمہوری لائحہ عمل کی نشان دہی کرتے ہیں۔ سب سے پہلے صدرِ پاکستان اور ان کے رفقائے کار نے ملک و قوم کے سر سے بد دیانت سیاست دانوں اور سیاسی جماعتوں کا کابوس اتارا، اس جبر و تشدد اور غاصبانہ جباری و قہاری کو دور کیا جو ذریعہ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب، کے مصداق "جمہوریت" کے

[1] جانتا ہوں کہ آج دنیا میں ۔ ایک ہی ہے امیدگاہِ انام ۔ غالب ۔ (مدیر)

ظلم سے معمور ہے جہاں افراد کی ہوسِ اقتدار کو دعوت خود دے رہی تھیں۔ ایک ایسی فضا پیدا کی جس میں ملت خود کو صحیح معنوں میں آزاد محسوس کرے اور اس کے تمام حقوق بحال کئے جائیں۔ اس کے بعد سنگینوں کی نوک پر نہیں بلکہ ایک خالص پاکستانی وضع کا جمہوری نظام قائم کر کے عوام کو موقع دیا گیا کہ وہ اپنے نمائندے آپ منتخب کریں پھر یہ احتیاط برتتے ہوئے کہ کوئی شخص اپنی ذمہ داریوں، آزادیٔ رائے، اختیارات اور حقوق سے ناواقف نہ رہے، انہیں بیداری پیدا کرنے اور پوری طرح آگاہ کرنے کے لئے وسیع ترین پیمانے پر مطلع و باخبر کرنے کا اہتمام کیا گیا تاکہ قائدِ قوم کا پیغام اور مقصود و منشاء تمام لوگوں کو پہنچ جائے۔ یہ پیغام کیا تھا؟۔ مشرقی و مغربی پاکستان کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک شہروں اور دیہاتوں میں ایک نرالی قسم کی ریل گاڑی میں صدرِ پاکستان کا سرد، ناخوشگوار موسم میں طویل طویل سفر جس میں ملک کے ممتاز ادیب، اربابِ فکر و نظر، ملکی و غیر ملکی اخبار نویس وغیرہ سب ہی شامل تھے۔ لوگ دور دور سے خود بخود کھنچے چلے آتے تاکہ وہ صدر سے ملیں۔ اور صدر انہیں ایک بڑے پُرشکوہ انسان یا آقا و مولا کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک عام، باخلوص انسان، ایک محبِ وطن، ایک سپاہی، ایک خادم، ایک مردِ باعمل، ایک خیر خواہ، ایک عام شہری کی حیثیت سے ملتے۔ وہ ان سے خود ملنے چلتے نہ کہ وہ انہیں ملنے آتے۔ اور وہ سب کے ساتھ بڑی ہی بےتکلفی سے بات چیت کرتے۔ ہمارے ملک کا غالب عنصر دیہات ہی میں تو رہتا ہے۔ اَن پڑھ، سیدھے سادے، سیاسی داؤ پیچ سے ناواقف لوگ جو بڑے بڑے مسائل تو کیا اپنے گھر اور آس پاس کی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی نہیں جانتے اِن کو ملکی مسائل سے آگاہ کرنا، انہیں خود حل کرنے کی دعوت دینا، انہیں جگانا، ان میں جمہوریت کی روح پھونکنا، سب سے اہم اور مقدم بات یہی تھی۔ صرف اس کے بعد ہی ان کے سامنے یہ نہایت اہم قومی معاملہ پیش کرنا مناسب تھا کہ وہ موجودہ صدر کو قابلِ اعتبار اور لائقِ اختیار سمجھتے ہیں یا نہیں تاکہ وہ اسے سوچ سمجھ کر اپنا صدر منتخب کریں۔ یہ نہیں کہ ان پر اوپر سے کوئی حاکم یا حکومت مسلط کر دی جائے جیسے وہ عوام نہیں بھیڑوں کا گلہ ہوں، بلکہ اپنے عوامی اختیارات اور سوجھ بوجھ سے کام لیتے ہوئے اپنا حاکم آپ چنیں۔

یہ دونوں سفر کیا تھے؟ مغربی اور مشرقی پاکستان کے بیچوں بیچ، عین دل میں سے گزر تاکہ انہیں جگایا جائے، مکمل طور پر باخبر کیا جائے

اور ۔۔۔ تو شہریِ زکام خود بروں آ ۔۔۔ کی دعوت دیتے ہوئے۔

جب یہ مقصد بوجہ احسن پورا ہو چکا اور جمہور، عام اس سے کہ وہ شہری ہوں یا دیہاتی، معاملہ کی نوعیت سے پوری طرح واقف ہو چکے تو صدر کے انتخاب کی نوبت آئی اور یہ سب سے اہم معاملہ ان کے سامنے اظہارِ رائے کے لئے پیش کیا گیا۔ کوئی قید، کوئی پابندی لگائے بغیر۔ ورنہ تاریخ کے بے شمار واقعات کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی مشکل بات نہ تھی کہ صدر عوام کی ذرا بھی پروا کئے بغیر ڈکٹیٹر کا رول اختیار کر لیتے۔ پاکستان میں ایسا نہیں ہوا۔ اس لئے کہ صدر بھی حقیقی جمہوریت کی روح سے سرشار ہیں اور انہوں نے اپنے عظیم الشان دورے سے عوام میں بھی یہی احساس پیدا کر دیا تھا۔ اس لئے انہوں نے تمام جمہور کی رائے سے صدر ہونا پسند کیا۔ یونین کمیٹیوں نے بالاتفاق ملک و قوم کے سب سے ہر دلعزیز رہنما، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، ہی کو صدر منتخب کرنا پسند کیا اور وہ اب ایک باقاعدہ منتخب صدر ہی کی حیثیت سے اس منصب پر فائز ہو کر قوم کی دیگر بلند تر و جلیل تر مقاصد کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں جن میں سے ایک دستورِ جدید کی تشکیل ہے۔ وہ دستور جو پاکستان کے لئے بہترین و مناسب ترین آئین کا ضامن ہوگا۔

اظہارِ رائے کی یہ دعوت اپنی قسم کی پہلی چیز ہے خالص جمہوری، ورنہ دنیا میں ہونے کو کیا نہیں ہوتا رہا۔ بالخصوص جب فوجی ڈکٹیٹروں نے زبردستی عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی ہو اور پیرِ تسمہ پا کی طرح ہمیشہ قوم کے شانوں پر سوار ہو کر اس کا گلا گھونٹ رہے ہوں۔ ہمارے یہاں بھی یہی کھیل بہ آسانی کھیلا جا سکتا تھا۔ اور کسی اظہارِ رائے کا تکلف کئے بغیر یہ امیرِ فوج مدت العمر ملک کا اعلیٰ ترین حاکم بھی رہ سکتا تھا۔ مگر یہ طرزِ عمل تمام تر غیر جمہوری ہوتا اس لئے اس اہم فیصلے کے لئے قوم ہی سے رجوع کیا گیا اور اس کو مالک و مختار بنا دیا گیا۔

اس امیرِ جنود نے خادمِ قوم ہی کی حیثیت میں رہنا پسند کیا۔ انہوں نے کوئی بات ذاتی خواہش کی بناء پر نہیں کی بلکہ جو کچھ کیا قوم ہی کی رضا و منشاء سے کیا ہے۔ ان دونوں میں سے کس کو ترجیح دی جائے۔ زور و زر یا عدل و انصاف؟ یہ سوال تھا جو فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے سامنے تھا۔ اور انہوں نے ایک کھرے سپاہی کی طرح دوسری بات ہی کو ترجیح دی۔ جو ان کے مزاج اور خادمِ ملت کے کردار سے پوری طرح

ہم آہنگ ہے اور ان کی بلند شخصیت کے شایان شان ہیں۔

بے شک امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کے پارٹی لیڈر عام انتخابات کے سلسلے میں دورے کیا کرتے ہیں لیکن ان دوروں کا مقصد تمام تر پروپگنڈا ہوتا ہے تاکہ کسی نہ کسی طرح پریہ کو شیشہ میں اتار لیا جائے۔ ایک سپاہی کو ایسے طریقوں سے جبلی طور پر نفرت ہوتی ہے۔ اور یہ صدر پاکستان کی جمہور پرستی کے بالکل منافی تھے۔

عوام سے ملنے، ان کے ساتھ گھل مل کر بات چیت کرنے، ان سے قریب تر آنے، ان کو سمجھانے اور خود سمجھے جانے کی خواہش نے انہیں اتنے طویل سفروں کی زحمت گوارا کرنے پر آمادہ کیا۔ تاکہ ان کا پُرخلوص پیغام گھر گھر پہنچ جائے۔ وہ خود عوام تک پہنچے نہ کہ عوام ان تک۔ اور پھر اس دورے کا سب سے بڑا مقصد تھا عوام کی تعلیم، ان کی تربیت تاکہ وہ ملک کے مسائل اور صورت حالات کو سمجھیں اور سوچ سمجھ کر قدم اٹھائیں خصوصاً صدر کے انتخاب میں۔ انہوں نے عوام کے دل میں گھر پیدا کر لیا۔ بلکہ وہ تو ان سفروں سے پہلے ہی ان کے دل میں گھر کر چکے تھے، ان کے چہیتے رہنما بن چکے تھے۔ اسلئے جو کچھ ان کے دلوں میں تھا وہی عملی طور پر بھی سامنے آیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اعتماد کا ووٹ دئے جانے سے پہلے ہی یہ اظہر من الشمس تھا کہ ہوا کا رُخ کس طرف ہے۔ چنانچہ تمام لوگوں نے بالاتفاق اس دوسرے قائدِ اعظم کو اپنا صدر منتخب کیا۔ صرف ووٹ دینے کے سلسلہ میں جو آزادی یونین کمیٹیوں کو دی گئیں وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ عوام کے اظہار رائے کا بندوبست کرنے کے لئے ایک الیکشن کمیشن قائم کیا گیا صدارتی بیلٹ کی نگرانی عدلیہ کے ایسے اراکین عالی کے سپرد کی گئی جن پر نہ حکومت کا اثر تھا نہ فوج کا۔ یعنی دونوں کے تسلط یا اثر سے آزاد اور آئین شناسی اور دیانت داری جن کی مسلّم اور معلوم۔ اس لئے یہ کہنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہو سکتی کہ اظہار رائے حکومت کے زیر اثر ہوا۔ چنانچہ بعض لوگوں نے بے دھڑک عدم اعتماد کا ووٹ بھی دیا۔ رائے دیتے وقت پرچی ڈالنے والے کے سر پر کوئی تلوار نہیں لٹکتی تھی۔ نہ ظاہر نہ پنہاں۔ ایک طرف نیلا نشان اور دوسری طرف فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کا عکس، جس کے حق میں وہ چاہے اپنی خوشی سے رائے دے دے۔ موصوف عوام کا دل تو پہلے ہی اپنے ہاتھوں میں لے چکے تھے۔ یہ ان کی شخصیت کا اقبال تھا اور ہم اپنی عقیدت کا خراج نذر کرنے کے لئے دل و جان سے مجبور۔ یہ موہنی جس میں پائی جائے اسے رائے لینے میں بھلا کیا دشواری ہو سکتی تھی۔

لہٰذا نتیجہ کے آثار پہلے ہی سے نمایاں تھے۔ اور وہی ہوا جس کی مدتوں پہلے توقع تھی۔ اس طرح جو بالکل جمہوری طور پر اظہار رائے کرایا گیا ہے، اس کو غیر ملکی غیر جانبدار مبصر دل نے بھی بے حد تحسین کی نظر سے دیکھا ہے۔ اور وہ پاکستان کے قائد کی غیر معمولی ہر دلعزیزی سے حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ یہ حقیقت ایسی بات ہے جو اقوام عالم میں نہ اپنی نظیر رکھتی ہے نہ مثال۔ وہ سماں دیکھنے کے لائق تھا جبکہ صدر پاکستان یعنی فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے منتخب ہونے پر، ۱۷ فروری کو گھر گھر چراغاں ہوا اور پاکستان کے ہر ہر شہر، ہر ہر گاؤں کی گلی گلی اور کوچے کوچے میں لوگوں نے خوشی سے خود بخود، اپنے ہی خرچ پر غریبوں، محتاجوں، بوڑھوں اور بچوں کو مفت کھانا کھلایا اور دل کھول کر مٹھائیاں بانٹیں اس سے زیادہ ہر دلعزیزی اور کیا ہو سکتی ہے؟

اور پھر اس زندہ دل انسان کا پیار، محبت اور بلند حوصلگی بھی دیکھئے کہ اس نے قوم کے نام ایک نشری پیغام میں صاف صاف کہہ دیا کہ جن لوگوں نے اس کے حق میں ووٹ نہیں دیا وہ بھی اس کے اپنے ہی ہیں۔ جس بنیاد پر ان کی شکایات قائم ہیں اس کو اور ان کی شکایات کو بھی دور کرنے کی پوری پوری کوشش کرے گا۔

جیسا کہ اظہار رائے کے نتائج سے معلوم ہوا ہے سو فیصدی سے تھوڑی ہی کم تعداد نے فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے حق میں ووٹ دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب قوم اپنے پُرخلوص "حرکی" زندہ دل، صاحب نظر اور جہاں دیدہ مدبر و قائد کی رہنمائی میں ایک اور نہایت مہتم بالشان دور ترقی میں قدم رکھ رہی ہے۔ یہ انتخاب درحقیقت قوم کی طرف سے صدر منتخب کو پروانہ ہے کہ وہ دستور کے نہایت اہم کام پر توجہ دیں اور اس کی جلد از جلد تکمیل کریں۔ چنانچہ اب ہمارے منتخب صدر پاکستان اب ایک ایسے دستور کی تشکیل پر توجہ مرکوز کر سکیں گے جو ہمارے لئے ہر اعتبار سے موزوں و مناسب ہو۔

خدا اس بہی خواہ ملت اور ان کے رفقائے کار پر اس نئے سفر کی منزلیں آسان کرے اور قوم کو اپنے چنے ہوئے صدر کی رہنمائی میں نہایت برق رفتاری سے آگے بڑھنے کی توفیق و ہمت عطا کرے۔

ہمارے منتخب صدر عوام کے اپنے صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان زندہ باد!

پاکستان زندہ باد!
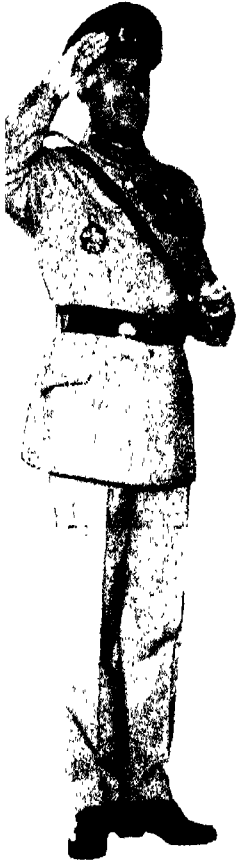
انتخاب صدر پاکستان :
فیلڈ مارشل محمد ایوب خان پر ملک کا کامل اعتماد

۲ :

۱ :

۱ - حلف اٹھانے کی رسم

۲ - حلف کے بعد قومی ترانہ (صدر کا اظہار احترام)

۳ - صدر اور صدارتی کابینہ

۴ - سارے ملک میں مسرت کا اظہار

۵ - ایوان صدر (راولپنڈی) پر چراغاں

۳ :

۴ :

۵ :
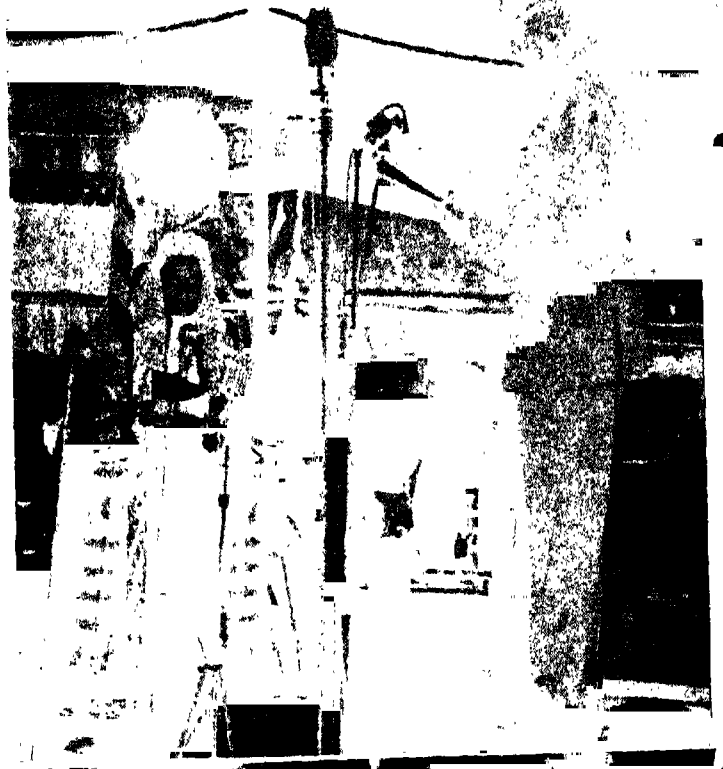
ورود شہنشاہ ایران

شہنشاہ ایران کے اعزاز میں گارد آف آنر

شہنشاہ ایران ـ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان اور جلال بایار ، صدر ترکی
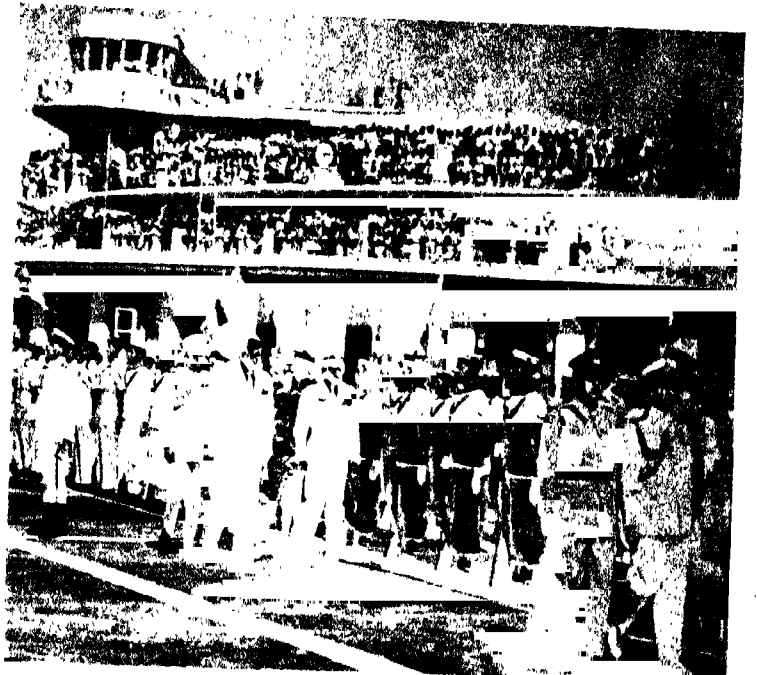
جلال بایار ، صدر ترکی ، کی کراچی میں آمد

ملکہ فرح پہلوی کا خواتین کی طرف سے خیرمقدم

عاصمہ حسین

ا۔ آئینِ بکا نام مبارک ہو جس سے ہوئی وطن کی شان نئی
اٹھا سپہ سالار جری ایسا، ڈالی قوم کے جسم میں جان نئی
تعمیر حصارِ ملت کی تدبیر ہوئی ہر آن نئی
ہر چار طرف اک غلغلہ ہے، گونج اٹھی ہے ایسی تان نئی

ب۔ "بنیادی جمہوریہ" کے خورشید کا جلوہ عام ہوا
نئی آب و تاب سے چمکا ہے، جمہور کی قسمت کا تارا
ہر ذرّہ فضائے ہستی کا، شمعوں کی طرح لو دے اٹھا
ہے کاہکشاں در کاہکشاں دنیائے عوام کا نظّارا

پ۔ پاکستان کی پاک زمیں بارانِ کرم سے شاد ہوئی
ہر بستیِ شرقی مغرب کی ہر طور سے اب آزاد ہوئی
تقدیر مہاجروں کی جاگی، یوں غیب ہی سے امداد ہوئی
برسوں کی مصیبت کی ماری مخلوقِ خدا آباد ہوئی

ت۔ تاریکی کا دور گیا، عیار سیاست دانوں کا
ظلمات کے بادل چھٹ بھی گئے اور زور گھٹا طوفانوں کا
جھم جھم تہو کے گھر چمکے اور نور بڑھا کاشانوں کا
تاریخ نے پھر سے پہچانا اب رنگ اور روپ انسانوں کا

ث۔ ثابت اور سیار سبھی تاثیروں میں ہم آہنگ ہوئے
اور قدر و قضا کے ہاتھوں میں طاؤس و رباب و چنگ ہوئے
یوں قوسِ قزح در قوسِ قزح آکاش پہ رنگ ہی رنگ ہوئے
نظارگیانِ ارض و سما اس رنگِ فسوں سے دنگ ہوئے

ج۔ جامِ اصلاح کا دور ہے، اصلاحوں کے جام پہ جام آئے
ہر آن نئے دو آتشہ سے سرمستِ نشاط عوام آئے
ملت کے جہاد میں بالآخر افواج کے ہاتھ ہی کام آئے
تھے صبح کے جلوے پہلو میں، ہر چند بوقتِ شام آئے

چ۔ چاک کیا دامانِ جفا، ہر قصرِ ستم کو چور کیا
جو داغ کہ دامنِ پاک پہ تھا، اس داغ کو آ کر دور کیا
ظلمت جو پرافشاں تھی ہر سو، اس ظلمت کو کافور کیا
پیراہنِ ملت کو دھو کر پاکیزہ مثالِ طور کیا

ح۔ حائل رہ تھی جو مشکل جوں سلسلہ ہائے کوہِ گراں
اس مشکل کو یوں دور کیا، نے نام رہا باقی نہ نشاں
اس طرح چٹانیں گرد ہوئیں، اڑتا نظر آئے جیسے دھواں
تھی برق ہی برق ادھر ہمت، واں موجِ بلا طوفاں طوفاں

خ۔ خیرِ خلائق کے جویا، یہی شام و سحر ہے دل میں لگن
یہی نعرہ لبوں پہ بیات و عدن: قربانِ وطن! قربانِ وطن!
تعمیر و ترقی کے ساماں، ہوں کوہ کہ صحرا، دشت کہ بن
ہر دم اصلاح کی تدبیریں، پاکیزہ ہو کیونکر خاکِ چمن

د۔ داد و دہش کی دھوم مچی، یہ قدر سخن، یہ جود و سخا
ہر جوہرِ قابل کی تحسیں، یہ معجزہ ہائے لطف و عطا
یہ چشمہ کہ فرطِ شوق سے ہے اک بحرِ کرم، طوفان نما
یاں ریزشِ قطرۂ خونِ جگر، واں موج گہر دے دیا دریا

ر۔ راہنما ہے وہ ہستی ہنگامۂ دوراں کہئے جسے
اک مردِ مجاہد شعلہ بجاں، اک [illegible] کہئے جسے
وہ سیلِ روانِ بے باکی، اُمڈا ہوا طوفاں کہئے جسے
وہ چارہ گرِ ملک و ملّت، ہر درد کا درماں کہئے جسے

ز۔ زرعی اصلاحات نہیے! "اعجاز اعجاز" کا غل ہر سو
ہے ریزشِ عام بادہ دمے تھے لوگ جہاں بے جام و سبو
طوفانِ مئے سرجوش خوشا کاسوں میں جہاں تھا صرف لہو
وہ کاہشِ تن، وہ زردیٔ رخ، یہ شانِ نمو، یہ سرخیٔ رو!

س۔ سندھ سے لے کر خیبر تک چلی پاک جمہوریہ ٹرین کیسی
دیکھی نہ سنی تھی دنیا نے کسی ملک میں اب تک ریل ایسی
پھر نیر کنول کے دیس میں بھی نگری نگری گردش ویسی
وہ دلوں کے بیچ عجیب سفر، کہاں شان میسر اس جیسی

ش۔ شوق ہے اس کا بے پایاں، ہر گام یہ اودھی منزل ہے
جہاں نیل گگن ساگر سے ملے، کب اسکی نظر میں وہ ساحل ہے
جس میں ہے نہ منزل نے ساحل، وہ نگری اس ہی کا دل ہے
بجلی ہے کہ بادل بادل ہے، دیپک ہے کہ محفل محفل ہے

ص۔ صدر جسے خود ملّت نے آنکھوں پہ بٹھایا، دل میں رکھا
ہر معرکۂ دشوار طلب بے زور و زر، سر جس نے کیا
اعجازِ محبّت جس کے لئے افسونِ سیاست سے ہے سوا
مصروفِ تدبرات اور دن تا وضع کرے دستورِ نیا

ض۔ ضمیر [illegible] سب کے لئے وہ بے اندازہ محبّتیں ہیں
گویا ہر گوشے میں جس کے آباد ہزاروں جنّتیں ہیں
اس قائدِ اعظم ثانی کی تخئیل میں لاکھوں رفعتیں ہیں
وہی شوکتیں ہیں، وہی عظمتیں ہیں، وہی حشمتیں ہیں، وہی طاقتیں ہیں

ط۔ طرق نئے، افکار نئے، انداز نئے، اشغال نئے
سانچے میں خلوص کے ڈھالے ہوئے اقوال نئے اعمال نئے
اوصاف نئے، اطوار نئے، اذکار نئے، احوال نئے
آفاق نئے، اعماق نئے، آکاش نئے، پاتال نئے

ظ۔ ظاہر و باطن یکساں ہیں، خاموش مگر خاموش نہیں
اے وائے وہ پیکرِ آب و گل جو پیکرِ آتش نوش نہیں
اے وائے وہ برقِ شعلہ بپا جو ابر میں غلغلہ کوش نہیں
اے وائے وہ شعلۂ جوالہ جو برق کے دوش بدوش نہیں

ع۔ عاصمہ شاعرہ برق نفس کیوں شمع صفت خاموش رہے
یہ دور، یہ بزم، یہ قدرِ سخن، پھر بھی نہ ترنّم کوش رہے
گر سحر ہے وہ، کیوں بزمِ جہاں محرمِ نوائے سروش رہے
یہ نطق سراپا برق رہے، یہ بزم سراپا جوش رہے

غ۔ غیب سے مردِ کار آیا اور ملّت کی تقدیر بنا
اٹھی نہ کوئی آواز کہیں اس طرح پلٹ ڈالی کایا
اک قطرۂ خوں بھی دامن پر اس پاک زمیں کے گر نہ سکا
اک دورِ وحشت خیز گیا، اک دورِ راحت خیز آیا

ف۔ فصلِ بہاراں آ بھی چکی اور مہکی ہر ہر پھلواری
ہریاول ہی ہریاول سے لہکی بہکی کیاری کیاری
کیا کامنی کامنی ہر شے ہے، کیا ہر صورت پیاری پیاری!
ہر بوٹا فرحِ زیبا کی طرح، ہر ڈالی ہے ناری ناری

ق۔ قمقمے نور کے روشن ہیں۔ یہ روشنیاں ہی روشنیاں
بادل کی قبا میں جھومتی ہیں کیا جل پریاں ہی جل پریاں
یہ نور کی مینائیں ہیں یا ہیں رس بھریاں ہی رس بھریاں
اور ترچھی ترچھی کرنوں سے یہ گل بیاں ہی گل بیاں

ک۔ کس کا فیض ہے یہ سارا، فیض فقط آپ ہی رب کا ہے
کس کا اعجاز ہے یہ سارا، اعجاز اسی محبوب کا ہے
یہ بھینی مہک یہ اجیارا، سب کس کا اسی ہی ڈب کا ہے
ہے کس کی نظر کا سحر نہیں، یہ سحر اس پیکر خوب کا ہے

گ۔ گلوں کی موہنی رت آئی، کلیاں ابھریں کنواری کنواری
اس پیاری رت میں ہر تی من کو لاگے پیاری پیاری
کیا کامنی کامنی بوٹیاں ہیں کھیتوں سے اٹھیں ناری ناری
وہ پیراہن لاچہ لاچہ، شیشہ آنچل ساری ساری

ل۔ لشکر لشکر شوکت ہے اور دھاک ہے ساری دنیا پر
افواجِ پاک کی عظمت کے قائل سکانِ بحر و بر
آہنگِ رجز سے گونجتے ہیں اقصائے جہاں تریں خشک اور تر
اک گام نشیب کراچی میں اک گام ہے تا اوجِ کشمر

م۔ محورِ سطوت و حشمت ہے اور اس کی ترقی بے پایاں
زینت دہ بابِ عالی ہیں، شہرت کے فسانوں کے عنواں
ابیات ابیات تجمل ہے، تمکین و حشم دیواں دیواں
ہے سلسلہ سلسلہ نشو و نما اور شانِ بقا دوراں دوراں

ن۔ نام ہے پاک دیار اس کا یہ مملکتِ ذی شان اپنی
دن رات نظاروں سے جس کے ہستی ہے سدا جوان اپنی
یہ دھرتی دھرتی اجلی سی یہ دھرتی سبز نشان اپنی
یہ دولتِ عرش نما اپنی، تعمیر بلند ایوان اپنی

و۔ وقت کی بات ہے اوجِ ملی، لو اپنے عروج کا وقت آیا
سمٹے تھے حدود میں ہم پہلے، اب اپنے خروج کا وقت آیا
ہوا طالع اخترِ سعد اپنا، کسرِ یا جوج کا وقت آیا
ہوئے برجِ اسد میں ہم داخل، ذیشان بروج کا وقت آیا

ہ۔ ہم پہ ہے ملک کی شان رکھنا اور صدر کی اپنے لاج رکھنا
جو کام ہو اوج و ترقی کا، اس کام سے ہر دم کاج رکھنا
اور محفلِ ہستی میں بڑھ کر ملت کے سر پہ تاج رکھنا
جو قوم و وطن کا پاس کرے، وہی صدر رکھنا وہی راج رکھنا

ی۔ یارب! ہزاروں دعائیں مری اور میری ہزاروں امیدیں بھی
مرے دل میں ہزاروں سنہری محل اور ان کی سنہری کلیدیں بھی
مجھے پردۂ غیب سے شام و سحر جاں بخش ہزاروں نویدیں بھی
فیضانِ خدائے پاک سے ہیں مقسوم ہزاروں عیدیں بھی

"طرحِ نو افگن"

(بنیادی جمہوریت اور اجتماعی ترقی)

مسیح الزماں

ایک ایسی جمہوریت جسے لوگ سمجھ بھی سکیں اور چلا بھی سکیں۔ صدر پاکستان نے ابتدا ہی میں اسی کا تو وعدہ کیا تھا۔ اور بڑی مسرت کی بات ہے کہ انھوں نے اسے پورا بھی کر دکھایا۔ انقلابی حکومت کی پہلی سالگرہ کے موقع پر، ۲۷ اکتوبر کو یہ اعلان جاری کر دیا گیا کہ ملک میں بنیادی جمہوریتیں قائم کی جائیں گی۔ ایک پانچ منزلہ نظام جس میں ہر ہر منزل پر عوام اور ارباب نظم و نسق ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کریں گے۔

آپ پوچھیں گے بنیادی جمہوریت کیا ہے؟ یہ بڑی سیدھی سادی بات ہے جس کے متعلق آپ آگے ہی کافی کچھ سن چکے ہوں گے۔ یہ ہے تو ایک سیاسی نظام لیکن ایسا جس میں زندگی کی اصلیتوں اور اعتدال کو پیش نظر رکھتے ہوئے تدریجی ارتقا پر زور دیا گیا ہے۔ جو پاکستان میں مارشل لا کے تحت نظم و نسق کی نمایاں خصوصیت رہا ہے۔ اس کی بنیاد اسی احساس پر ہے کہ جمہوریت کے معنی ہیں اکثریت کی حکومت، اور ہمارے ملک میں زیادہ تر لوگ دیہات ہی میں آباد ہیں۔ لہٰذا حکومت انہی کی ہونی چاہئے اور انہی کے واسطے ہونی چاہئے۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ ہمارے دیہات کے لوگ اکثر ان پڑھ اور جاہل ہیں۔ ان پر برسوں ایک اجنبی حکومت کے استعمار کا سایہ رہا ہے اور حاکم لوگ بڑے بن کر گویا انجان ناسمجھ بچوں کی دیکھ بھال کرتے رہے ہیں اور پھر ان میں مدتوں جاگیرداری نظام کا دور دورہ بھی رہا ہے۔ اس لئے وہ حکومت چلانے کے فن سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ نہیں نہ اپنے آپ پر اعتماد ہے اور نہ وہ اتنی صلاحیت ہی رکھتے ہیں کہ ان فرائض کو انجام دیں جو ایک جمہوری نظام لازماً شہریوں پر عائد کرتا ہے۔ ان کے لئے ہر وقت اندیشہ ہے کہ کہیں چالاک سیاست دان یا شورش پھیلانے والے چرب زبان لوگ اپنا الو سیدھا کرنے کے لئے انہیں دھوکہ نہ دیں۔ اس لئے یہ بات اشد ضروری ہے کہ یہ سمجھایا جائے کہ حکومت ہے کیا، اس میں وہ کیا حصہ لے سکتے ہیں، اور اسے چلانے کا بہترین طریقہ کیا ہے۔ اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ وہ پہلے نچلی سطحوں پر چھوٹے چھوٹے معاملوں میں حکومت کا کام چلائیں اور رفتہ رفتہ اتنا تجربہ حاصل کر لیں کہ وہ بعدہٗ اونچی سطح پر بڑے بڑے معاملات میں کاروبار حکومت کا اہتمام کر سکیں۔

اس نظام میں ایک اور بات بھی محسوس کی گئی ہے۔ یہ کہ ملک کا سب سے تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقہ سرکاری نظم و نسق چلانے والوں پر مشتمل ہے۔ بالفاظ دیگر یہی لوگ ملک کا ذہین اور دانشور طبقہ ہیں اور گزشتہ بارہ سال انہی کی بدولت حکومت کا نظم و نسق برقرار رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طبقہ نہ صرف روزمرہ کے انتظامی کاروبار کو چلانے کے لئے ملک کا سب سے اہم عنصر ہے، بلکہ قوم کو اپنی لمبی میعاد کی پالیسیاں تیار کرنے میں بھی مدد دے سکتا ہے۔ سچ پوچھئے تو موجودہ حکومت کی بلند نظری کا سب سے جرأت مندانہ پہلو یہی ہے کہ اس نے قومی زندگی میں نئی روح پھونکنے کے لئے اس عنصر کو کام میں لانے کا تہیہ کر لیا ہے۔

اب ذرا اس نظام کی مجمل کیفیت سنئے۔ اس کے مطابق مختلف حلقوں، تحصیلوں، ضلعوں، ڈویژنوں اور دونوں صوبوں میں کونسلیں قائم کی گئی ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ امور عامہ کے متعلق بحث و مباحثہ ہو، فیصلے ہوں۔ انتظامی حیثیت سے مغربی پاکستان کو اول تو دو صوبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اور یکے بعد دیگرے ڈویژن ہیں، ضلعے ہیں، تحصیلیں ہیں، دیہات ہیں، اور پھر ان کو مواقع بہم پہنچائے گئے ہیں کہ وہ خود ترقی دیں اور بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ ان کی بنیادی اکائیوں کا نام "یونین" ہے۔ جو دیہات میں "پنچایت" کہلائے گی اور شہروں میں "کونسل"۔ ان دونوں کے تقریباً منتخب ممبر ہوں گے ۱۰،

بلوچی رقص (بتقریب شادی)

نیزہ بازی: بلوچیوں کا محبوب مشغلہ

میلہ میں نیزہ بازی کا مظاہرہ

پانچ نامزد جو سرکاری ملازم نہیں ہوں گے۔ جوں جوں کونسلوں کی سطح بلند ہوتی جاتی ہے نامزد ممبروں کی تعداد کم اور منتخب ممبروں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ ضلعوں اور ڈویژنوں کی کونسلوں کے تمام غیر سرکاری ممبر حکومت کے نامزد ہوں گے۔ اور ۵۰ فیصدی نشستیں انہی کے لئے متعین ہوں گی اور باقی ۵۰ فیصدی سرکاری عہدداروں کے لئے۔ یونین پنچایتوں یا مقامی کونسلوں کی سطح سے اوپر تمام کونسلوں میں صدر ہمیشہ علاقے کا سرکاری افسر اعلیٰ ہی ہوگا۔

ممکن ہے یہ ادارے بحث مباحثہ کے اکھاڑے بن کر رہ جائیں۔ اور ذمہ داری منتشر ہو جائے۔ اس خطرے کی پیش بندی کے لئے تمام عاملانہ اختیارات صدر ہی کو سپرد کئے گئے ہیں۔ اور مشاورت کا کام اراکین کے سپرد ہے۔ امید ہے اس طرح صدر پوری آزادی سے اور مؤثر طور پر کام کر سکے گا۔

مزید تحفظ کے لئے ان جمہوری اداروں کو انتظامیہ کی مؤثر نگرانی کے تحت رکھا گیا ہے۔ ڈپٹی کمشنر، کمشنر اور گورنر ماتحت کونسلوں اور پنچایتوں کے نگراں حاکم مقرر کئے گئے ہیں۔ انہیں بنیادی جمہوریتوں پر وسیع اختیارات دیئے گئے ہیں تاکہ یہ ادارے ٹھیک طرح کام کرتے رہیں۔

بنیادی جمہوریت کے صدارتی حکم میں کونسلوں کے غیر سرکاری اراکین کی تین قسمیں مقرر کی گئی ہیں۔

منتخب اراکین وہ ہوں گے جو الیکشن جیت کر مقامی کونسلوں میں جگہ لیں۔ "نمائندہ" اراکین وہ ہوں گے جنہیں اراکین اختیار بلند تر سطح کے اداروں کے لئے چنیں اور "مقرر شدہ" اراکین وہ ہوں گے جنہیں نگراں حاکم مختلف سطحوں پر [illegible] مقامی کونسل بھی شامل ہے۔ [illegible] سے مقرر کرے ان مقرر شدہ اراکین کو بالائی کونسل کے سوا کوئی نہیں ہٹا سکتا۔

بنیادی جمہوریت میں اراکین کی حیثیت [illegible] ہوگی جیسے بے تنخواہ سرکاری ملازمین کی۔ وہ درحقیقت [illegible] مشنری کا جزو بن جائیں گے۔ ان کی حیثیت ایسی ہوگی جیسے کسی صنعتی کارخانہ [illegible] فورمین کی۔ وہ مزدوروں ہی میں شامل ہوتا ہے۔ اور [illegible] انہیں میں سے ترقی کر کے فورمین بنتا ہے۔ اور وہ منتظمین میں بھی شامل ہوتا ہے کیونکہ وہ مزدوروں پر نگرانی کا ذمہ دار رہتا ہے۔ اس کا تجربہ نیز وہ عزت جو اسے مزدوروں کی نظر میں حاصل ہوتی ہے، دونوں اپنے کاریگروں کا تعاون حاصل کرنے اور انتظامی پالیسی پر عملدرآمد کرانے میں اسے مدد دیتے ہیں۔ پھر ایک کاریگر کی حیثیت سے اس کا ذاتی تجربہ اور مزدوروں کے ساتھ ربط و تعلق اسے انتظامی پالیسی کی تشکیل میں بھی مدد دیتا ہے۔ لہٰذا ممکن ہے بنیادی جمہوریتوں کے اراکین ایک ایسا پل بن جائیں جو حکومت اور عوام کے درمیان ربط قائم رکھتا ہے۔

اگر بنیادی جمہوریت کے حکم نامے کا امعانِ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اختیارات کی تقسیم اور نمائندگی کی جو وضع اس میں متعین کی گئی ہے وہ ہمیشہ کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ جوں جوں لوگوں کی خود پر حکومت کرنے کی صلاحیت اور انتظامی تجربہ بڑھتا جائے گا، ان میں تبدیلیاں ہوتی رہیں گی۔ مذکورہ حکم میں سرکاری اراکین کی آخری حد تو مقرر کی گئی ہے مگر غیر سرکاری اراکین کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی۔

صدر پاکستان نے ایک ایسی جمہوریت کا وعدہ کیا تھا، جسے لوگ سمجھ سکیں۔ اس بارے میں جو قانون وضع کیا گیا ہے، اس کی خوبی یہ ہے کہ رائے دہندہ اور اس کا منتخب نمائندہ ایک دوسرے کے سامنے رہیں گے۔ منتخب رکن کی سرگرمیوں کا علاقہ ووٹ دینے والے کے اس قدر قریب ہوگا کہ وہ اس کے وعدوں اور کارگزاری کا بخوبی اندازہ کر سکے گا۔ اس طرح ووٹر کو اپنے ووٹ کی صحیح قدر و قیمت معلوم ہو جائے گی اور وہ یہ بھی سمجھ جائے گا کہ اسکے نمائندوں میں سب سے اہم کی جانچ پرکھ کیسے کی جائے۔

اس حکم کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ پہلی بار ایسا مضبوط سیاسی نظام قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو دیہات اور صوبے کے صدر مقام میں ربط پیدا کرے۔ قبل ازیں یہ کیفیت تھی کہ انتظامیہ تو عوام تک پہنچ جاتی تھی مگر سیاسی نظام کا دیہات کے ساتھ کوئی رابطہ نہ تھا۔ اس لحاظ سے موجود نظام نے اس خلا کو پُر کر دیا ہے جو برطانوی وضع کی جمہوریت میں باقی رہ گیا تھا۔ یہ نظام بالائی حلقوں میں تو جمہوری تھا لیکن اس سے نیچے تمام کا تمام بالکل بے سہارا تھا یعنی اس میں نیچے کے طبقوں کا باہمی تعاون مفقود تھا۔

اس لئے اس کی عمارت دھڑام سے نیچے آ رہی۔

نئے نظام نے حاکموں اور عوام کے درمیان ربط و تعلق کی [illegible] راہیں وا کر دی ہیں اور ساتھ ہی حکومت کے یکرخہ ہونے کی وجہ سے جو کمزوری پیدا ہو گئی تھی اس کو دور کر کے اس کی بنیاد مضبوط کر دی ہے۔

آپ پوچھیں گے بنیادی جمہوریت کی اس نئی اسکیم اور معاشری ترقی کے منصوبوں میں کیا تعلق ہے جو کچھ عرصہ سے ملک میں نمو پاتے رہے ہیں؟ دونوں کا مدعا یہ ہے کہ جو اجتماعی مقاصد ہمارے پیش نظر ہیں ان کے حصول میں عوام کو شریک کیا جائے۔ دونوں عوام کو کسی قدر ذمہ داری اور اختیار کو استعمال میں لانے اور زیریں سطح پر حکومت کے کچھ کام کرنے کے مواقع مہیا کرتے ہیں۔ دونوں معاشری بہبودی کے لئے مقامی وسائل کو، خواہ وہ انسانی ہوں یا مادی، کام میں لانے کے خواہاں ہیں۔ دونوں ملک کے آئندہ رہنماؤں کے لئے تربیت کا موقع بہم پہنچاتے ہیں۔ آخری بات یہ ہے کہ یہ دونوں دفتری سررشتوں پر اس امر کے لئے انحصار کرتے ہیں کہ ان کے واقف کار عمال مختلف سطحوں اور [illegible] طریقوں سے عوام میں قیادت اور رہنمائی کی صلاحیت پیدا کریں۔ جہاں تک ان کی تنظیمی وضع ہیئت، اختیارات اور انتظامی لائحہ عمل کا تعلق ہے۔ جمہوری خصوصیات دونوں میں بڑی شدت سے نمایاں ہیں۔

اس کے [illegible] کی تکنیک [illegible] میں کچھ فرق [illegible] ہے رائے عامہ پر اثر ڈالنے کے لئے اجتماعی ترقی [illegible] زیادہ تر ذہنی تربیت پر انحصار کرتی ہے اور ایسی [illegible] سے جو [illegible] [illegible] نہیں بہت زندہ [illegible] بنیادی جمہوریت کی بنیاد عوام کی رضا و منشا پر ہے جس کا [illegible] اظہار ان کے نمائندے [illegible] [illegible]۔

اجتماعی ترقی کا دامن ایسی ضرورتوں سے وابستہ ہے جنہیں ہم حقیقتاً [illegible] کریں۔ اس لئے کام تاخیر کے بغیر ممکن نہیں [illegible] جمہوریتوں کا کام اس نوعیت کا ہے کہ جو جو باتیں عوام کی بھلائی

کے لئے ٹھیک معلوم ہوئیں ان پر فوراً فیصلے کئے اور لوگوں کو ان سے بہرہ ور کر دیا گیا۔ جب تک بنیادی جمہوریتوں کے غیر سرکاری ارکین یہ اہلیت رکھتے ہیں کہ لوگوں کی ضرورتوں اور خواہشوں کی نمائندگی کر سکیں معاشرے کی ان ضروریات سے باخبر ہونے میں کوئی خلل پیدا نہیں ہو سکتا۔

مقامی حکومت کے کام کرنے والے حلقوں کا تعین خود قانون ہی نے کر دیا ہے۔ لیکن اجتماعی ترقی کے عامل حلقے اس بات پر موقوف ہیں کہ معاشرہ کس درجہ ترقی یافتہ ہے کس حد تک متحد ہو سکتا ہے اور ان مسائل کو جانچنے اور ان کو قبول کرنے پر تیار ہے یا نہیں جنہیں وہ اپنی بے خبری یا بے پروائی کے باعث محسوس نہیں کر سکا تھا۔ لہذا اجتماعی ترقی اپنا کام چلانے کے لئے ایک یا زیادہ گروہ ذیلی گروہ یا دیہی جماعتیں چن لیتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا مقصد کوئی خاص عارضی منصوبہ ہو یا بہت سے لمبی میعاد کے منصوبے ہوں۔

بنیادی جمہوریت کو اپنے سربراہ اسی طریقے سے چننے پڑتے ہیں اور ان وقفوں کے بعد جو اس قانون کے مطابق مقرر کئے جا چکے ہیں۔ لیکن اجتماعی ترقی کے ادارے سربراہوں کو پہچاننے، ان کی تربیت کرنے، چننے اور پوری طرح کام کا اہل بنانے کے لئے کئی طریقے اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً سب ہی لوگوں نے مل جل کر کسی کو خود ہی سربراہ مقرر کر لیا یا آواز بلند کسی کی تائید کر دی۔ یہاں تک کہ خفیہ پرچی کے ذریعہ [illegible] رائیں معلوم کر لی جاتی ہیں۔ "بنیادی جمہوریت" میں صدر کا منصب ضابطے قانون پر مبنی ہے۔ اس لئے اس کی حیثیت اور اختیارات بھی زیادہ ہیں۔ چونکہ "اجتماعی ترقی" کے صدر کی پشت پر قانون و آئین کی ایسی کوئی قوت نہیں ہوتی اس سے ممکن ہے کہ وہ اتنے اعتماد اور یقین کے ساتھ کام نہ کر سکے۔

غرض اجتماعی ترقی اور بنیادی جمہوریت دراصل ایک ہی سلسلۂ ارتقا کے دو مرحلے ہیں۔ ایک کا مقصد ہے کاموں کا جائزہ لینا، باضابطہ نہیں بلکہ آزمائشی۔ دوسرا بالکل منظم باضابطہ اور مستحکم۔

لہٰذا ہم بنیادی جمہوریت اور اجتماعی ترقی میں [illegible] [illegible] وسعت میں جو فرق محسوس کرتے ہیں وہ محض [illegible]

ہے، نوعیت کا فرق نہیں۔ بنیادی جمہوریت اور اجتماعی ترقی ایک ہی چیز کی زیادہ ترقی یافتہ شکلیں ہیں۔ جب بنیادی جمہوریتیں کام کرنے لگ جائیں گی تو دیہی ترقی کے کئے ہوئے کاموں یا جاری کاموں سے غیر متعلق نہ رہ سکیں گی بلکہ انہیں اپنائیں گی اور باقاعدہ اداروں کی صورت عطا کریں گی۔ یہ فرق نظری طور پر اہم نہیں اور عملی طور پر بڑے معمولی ہیں۔ لیکن ان کا دوبارہ بیان کرنا ضروری تھا تاکہ یہ حقیقت یاد رہے کہ "بنیادی جمہوریت" ایک حرکی تصور ہے اور جوں جوں معاشرہ اپنی صلاحیتوں کو نمو دیتا اور لوگوں کا خود اعتمادی کی طرف قدم بڑھتا جائے گا بنیادی جمہوریتوں کے جن جن درجوں پر جو بھی سربراہ ہیں انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ ہر مرحلہ پر کیا روش اختیار کریں۔

یہ تو ظاہر ہے کہ ایک طرف ترقی دیہات کی تحریک اور اجتماعی ترقی اور دوسری طرف مقامی حکومت کی سرگرمیوں کے سلسلے ایک دوسرے سے الگ نہیں۔ در اصل دنیا کے متعدد حصوں میں جو مطالعے کئے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جب معاشرہ ترقی کرتے کرتے ایک خاص درجہ تک پہنچ جاتا ہے تو جو کام یہ پہلے اپنی ترقی کے لئے خود بخود انجام دیتا رہا تھا وہ انہیں باقاعدہ اداروں کی شکل دینے کی ضرورت محسوس کرنے لگتا ہے۔ بعض لوگوں کو مقامی حکومت اور اجتماعی ترقی میں تضاد نظر آیا ہے۔ جہاں مقامی حکومت نہایت کمزور ہو وہاں اجتماعی ترقی کامیاب رہتی ہے۔ پھر بھی اجتماعی ترقی کی کامیابی اور بقا کا دار و مدار مقامی حکومت ہی کے استحکام پر ہوتا ہے کیونکہ اسے باقاعدہ مالی اور دوسری امداد اسی سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ تناقض یوں دور ہو جاتا ہے کہ ہم اجتماعی ترقی کو مؤثر مقامی حکومت کا زینہ خیال کریں۔ اس لئے یہ بات اجتماعی ترقی کا کام کرنے والوں کے لئے نہایت اہم ہو جاتی ہے کہ وہ مقامی حکومت کے لئے حمایت حاصل کرنے اور اس کو مضبوط بنانے کی کوششیں عمل میں لاتے جائیں۔

اجتماعی ترقی اور بنیادی جمہوریتوں میں جو گہرا تعلق پایا جاتا ہے اس کا مشاہدہ ہندوستان میں کیا جا چکا ہے۔ چنانچہ معلوم ہوا ہے کہ یہاں کے تین بہترین منصوبوں میں منصوبہ بنانے والے افسروں نے پنچایتوں اور امداد باہمی کی انجمنوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔

اسی طرح ایک افریقی تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح اجتماعی ترقی کے کارکنوں کے بنائے ہوئے دارالمطالعہ ناکام ثابت ہوئے کیونکہ اجتماعی حکومت اور مقامی حکومت کے بین تعاون کا فقدان تھا۔

بنیادی جمہوریت سے متعلق صدارتی حکم منتخب اداروں کے وجود کو تسلیم کرتا ہے اور بنیادی جمہوریت کی حدود میں ان کی ترقی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ چونکہ بنیادی جمہوریت کے انتظامی یونٹوں کا پیمانہ بڑا ہے اس لئے ممکن ہے بنیادی جمہوریت کے سب سے نچلے درجہ کا انتظامی یونٹ ایک عام گاؤں سے بڑا ہو۔ لہٰذا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترقی دیہات کے پروگرام کے تحت جو دیہی کونسلیں قائم کی گئی ہیں۔ یعنی زرعی و صنعتی ترقی دیہات کے ادارے بڑی حد تک حسب معمول کام کرتے رہیں گے اور بلند تر سطحوں پر بنیادی جمہوریت کی اعانت کرتے رہیں گے۔ بہت اچھا ہو گا کہ اہل دیہات کو اس بنیادی ادارے اور اس کے نظام عمل کو غیر رسمی طور پر ترقی دینے کا موقع دیا جائے۔ دیہات میں قانون کے ذریعہ زبردستی اتحاد پیدا کرنے کی کوشش دیہی زندگی پر برا اثر ڈال سکتی ہے۔ مثال کے طور پر ہو سکتا ہے کہ اس سے دیہات کے مختلف گروہوں میں دھڑے بندی اور بھی مضبوط ہو جائے۔ چنانچہ سر مالکم ڈارلنگ کی رپورٹ شاہد ہے کہ پنجاب کے ۵۰ فیصدی گاؤں ان کا شکار ہیں۔ اور ایک ایسے معاشرے میں جمہوریت اور انتخابات کی ترویج جس میں اخوت و یگانگت کے رشتے زیادہ ترقی پذیر نہیں ہوئے کچھ عجب نہیں کہ رنگ میں بھنگ پیدا کریں۔ ترقی دیہات کا پروگرام دیہاتیوں کی رضامندی سے کام کرنے کی تعلیم دے گا۔ اور اس طرح انہیں تیار کرے گا کہ وہ بتدریج جمہوریت کو سمجھیں اور اسے اس طرح چلائیں کہ وہ سب کے لئے باعث تسلی ہو۔

لیکن چند وجوہ کی بنا پر اندیشہ ہے کہ اگر ادارہ جاتی تحفظات نہ ہوں یا پیدا نہ کئے جائیں تو اجتماعی ترقی اور بنیادی جمہوریت میں رقابت اور کشمکش پیدا ہو جائے۔

چنانچہ اجتماعی ترقی کے پروگراموں سے متعلق اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ "سیلون، مغربی انڈیز اور افریقہ کے برطانوی علاقہ میں اجتماعی ترقی کے افسروں اور ان لوگوں کے مابین جو حکومت کو استوار کرنے کے ذمہ دار ہیں، کچھ رقابت اور کشمکش پائی جاتی ہے۔" اس رقابت کا سبب یہ ہے کہ ان کے فرائض اور ذمہ داریوں کی کماحقہٗ توضیح نہیں کی گئی۔ بہت سارا کام جو ترقی دیہات کا ادارہ سرانجام دے رہا ہے، بنیادی جمہوریت اسے بھگتانے سے قاصر ہے لیکن اس کے علاوہ اور بہت سا کام ہے جسے بنیادی جمہوریت کو اپنے ہاتھ میں لینا ہے۔ لہٰذا یہ مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے کہ ممکن ہے ترقی دیہات کسی کام کو کرنے کی اہل ہو لیکن بنیادی جمہوریت یہ چاہتی ہو کہ وہ اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لے حالانکہ وہ اس کی اہل نہیں اور نہ اسے کرنے کی نیت ہی رکھتی ہے۔ لیکن بنیادی جمہوریت کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ اس کام کو اپنے ذمہ لے لے۔

یہ بھی امکان ہے کہ دونوں اداروں کے افسران معاشرے میں اپنا مرتبہ یا اقتدار بڑھانے کے لئے آپس میں ٹکرا جائیں۔ اگر اس رقابت کی روک تھام نہ کی جائے تو ممکن ہے وہ ان کے دیگر اراکین میں بھی پھیل جائے۔ اور پھر اس کا سامنا کرنا مشکل ہو جائے۔

آخر میں ایک اور خطرہ کا تذکرہ بھی ضروری ہے چونکہ بنیادی جمہوریت کو قانون کی تائید حاصل ہے، اس لئے ممکن ہے روایتی لیڈر اس کی طرف رجوع ہوں چنانچہ اقوام متحدہ کی مذکورہ بالا رپورٹ [illegible] ممکن ہے روایتی لیڈر [illegible] اجتماعی ترقی کے پروگرام کی مخالفت کریں کیونکہ وہ [illegible] کے لئے خطرہ خیال کرتے ہیں۔ شاید وہ یہ پسند نہ کریں کہ موجودہ حلقۂ اختیار سے باہر کچھ قائد خود بخود پیدا ہو جائیں۔

[illegible] کرنے کے لئے جو دیگر ممالک سے اجتماعی ترقی کے پروگراموں اور مقامی حکومت میں پائی گئی ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ [illegible] میں کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے ان اداروں کا ایک دوسرے کا مدد و معاون ہونا ظاہر ہو، نہ کہ یہ ایک دوسرے کے حریف رہیں۔ یہ مقصد صرف اس طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ بنیادی جمہوریت اور انتظامیہ ترقی دیہات دونوں کے عملے کی نگرانی، تربیت اور رہنمائی کی ذمہ داری کو آپس میں مربوط کر دیا جائے۔ اس انتظام کے فوائد یہ ہیں کہ پروگرام کے عاملین، فرائض اور ذمہ داریوں کو متعین کر سکیں گے۔ جس سے نہ تو کام کی خواہ مخواہ تکرار ہوگی اور نہ وسائل ضائع جائیں گے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی یقینی ہو جائے گی کہ لوگوں کا "اپنی مدد آپ" کا جذبہ کند نہیں ہوگا اور نہ گاؤں میں عمل کی خرابی پیدا ہوگی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس بات کی ضمانت ہو جائے گی کہ دیہی کونسلیں اجتماعی ترقیاتی پروگرام کے تحت جن منصوبوں کو عملی جامہ پہنائیں گی وہ بنیادی جمہوریت کے تحت برقرار رہیں گی۔ اس طرح اجتماعی ترقیاتی پروگرام اپنی مدد آپ کے لئے سازگار حالات پیدا کرنے کا ذریعہ بن جائے گا۔ جس سے مقامی حکومت ایک موثر ادارہ بن جائے گی۔

علیٰ ہذا بنیادی جمہوریت ان اداروں اور قدروں کی محافظ بن جائے گی جو اجتماعی ترقی کے تحت بروئے کار آئیں گی۔

بنیادی جمہوریتوں اور دیہی ترقی کا عاملانہ نظم و ضبط ڈپٹی کمشنروں اور کمشنروں کے ہاتھ میں دے کر اس بات کو یقینی بنا دیا گیا ہے کہ یہ دونوں ادارے آپس میں پوری طرح مربوط ہو جائیں۔

اعلیٰ سطح پر ادارے قائم کر کے بنیادی جمہوریت ان سے بھی ان کی حیثیت کے مطابق اجتماعی ترقی کے لئے امداد حاصل [illegible] ہے۔ مگر سیاسی اعتبار سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ بنیادی جمہوریت ایک ایسے رابطہ کو ادارے کی شکل عطا کرتی ہے جو حکومت اور عوام کے مابین ہونا چاہئے [illegible] کوئی ذریعہ موجود نہ تھا۔ نیز بنیادی جمہوریت [illegible] عامہ کی طرف اس طرح ملتفت کرتی ہے کہ یہ غیر متوقع ملاقاتوں کے ساتھ اتفاقی ملاقاتیں بعض منتخب دیہات میں جہاں آسانی سے پہنچا جا سکے، رسا رسی کے دورے یا نیم خود بخود منعقد ہونے والے جلسے،

جس کا ماتحت عہدہ داروں نے بندوبست کیا ہو، زیادہ تسلی بخش ثابت ہوتا ہے۔ علاوہ بریں اس سے رائے عامہ کو ایک خاص وقار حاصل ہوتا ہے۔ اور حکومت اور عوام میں خیالات اور معلومات کا برابر تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ حکومت نے ان جمہوری اداروں کی پرورش اور ترقی کے سلسلہ میں اپنے ملازمین ان کی ذہانت اور لیاقت پر بھی بڑی ہی خوش اعتمادی ظاہر کی ہے یہ ایک بالکل نیا کام ہے اور افسران کے انداز نظر میں تبدیلی کا متقاضی ہے۔ ایک شدید خرابی جو ان حالات میں پہلے ہی محسوس کی جا سکتی ہے اور جسے منتظمین کو پہلے ہی سے اپنے طور پر حل کرنا ہوگا، یہ ہے کہ رفاہ عامہ کے ساتھ ساتھ نظم و ضبط کے تقاضے کیسے پورے کئے جائیں تاکہ دونوں کام بخوبی پورے ہوتے رہیں۔ نظم و ضبط کا ذمہ دار ہونے کی حیثیت سے ڈپٹی کمشنر کا فرض یہ ہے کہ مجرم کو قرار واقعی سزا دے، اس پر ذرا بھی رحم نہ کرے اور اس کے دل میں قانون کا ڈر پیدا کرے دوسری طرف رفاہ عامہ کا کفیل ہونے کی حیثیت سے لازم ہے کہ وہ مجرم کے ساتھ مہربانی سے پیش آئے ماسے بنیادی حفاظت مہیا کرے، اسے بتائے کہ وہ کیسے اچھی زندگی بسر کرسکتا ہے اور اس طرح اسے مستقل طور پر بہتر بنا دے۔ یہ وہ انتہائی صورت حال ہے جو امکاناً پیدا ہوسکتی ہے لیکن یہ ان مسائل پر نمایاں روشنی ڈالتی ہے جن کا نئی انتظامیہ کو اُس وقت سامنا کرنا پڑے گا جب کہ بنیادی جمہوریتیں وجود میں آجائیں گی۔ درحقیقت نظم و ضبط کا کام صرف باہر امن و حفاظت مہیا کرنا ہے اور اصلاحی کارکنوں کا اندرامن و حفاظت بہم پہنچانا ہے۔ ان دونوں کے میدان الگ الگ ہیں لیکن ان کی کوششیں ایک دوسرے کا کام پورا کرتی ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ افسر لوگ بے حد مصروف ہوتے ہیں، اور ڈپٹی کمشنر تو اور سب افسروں سے زیادہ مصروف ہوتے ہیں۔ اور بے حد گراں بار، اور جمہوریت ایسی چیز ہے جس کے لئے بڑا صبر و سکون اور وقت کرنے والی باتوں کو برداشت کرنے کی صلاحیت بھی۔ بسا اوقات جمہوری اداروں کے رہنماؤں کو ارا کین کی بچی پوچ باتیں اور فضول تقریریں بھی سننی پڑتی ہیں۔ اگر اکثریت کوئی فیصلہ کردے تو ان کا دل اتنا بڑا ہونا چاہئے کہ وہ اپنی مرضی یا کھلی رائے کے خلاف اسے قبول کرلیں۔

ان اداروں کو چلانے کے لئے ضروری ہے کہ سرکاری افسروں کو ان کے کام کا پورا پورا وقوف ہو۔ اس مقصد کے لئے ترقی دیہات کی پاکستانی اکادمی سے بہت فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ یہ وہ ادارہ ہے جس میں یہ تربیت دی جاسکتی ہے کہ عاملانہ اختیار حاصل ہونے پر کس طرح کارگزاری کی جائے تاکہ جو لوگ ان کے زیر اختیار یا سربراہی میں کام کررہے ہوں ان میں اپنے آپ پر بھروسہ اور خود اعتمادی پیدا ہو۔ اب تک ترقی دیہات کا پروگرام مغربی پاکستان کے ۸۰ فیصد سے کچھ کم رقبہ ہی پر حاوی رہا ہے۔ اگلے پانچ سالہ منصوبے کے ختم ہونے تک امید ہے یہ سارے صوبے پر حاوی ہوجائے گا۔ جن علاقوں میں ترقی دیہات کا سلسلہ نہیں پہنچ سکا تھا اور وہاں میدان خالی پڑا تھا، اب بنیادی جمہوریت نے خلا پورا کردیا ہے۔ ترقی دیہات اور بنیادی جمہوریت کے اس ربط باہمی کی یہ نمایاں خصوصیت ہے کہ جہاں کئی علاقے ایسے ہوں گے جنہیں ترقی دیہات نے بنیادی جمہوریت کے لئے تیار کیا ہو وہاں جلد ہی ایسے علاقے بھی پیدا ہوجائیں گے جنہیں بنیادی جمہوریت ترقی دیہات کے لئے تیار کرے گی۔

لہٰذا یہ خیال کرنے کے لئے کافی وجہ موجود ہے کہ ترقی دیہات اور بنیادی جمہوریت ایک دوسرے کو تقویت بہم پہنچائیں گی اور ایک ایسے جمہوری پاکستان کی ترقی اور نشوونما کا باعث ہوں گی جو مضبوط اور تندرست ہو۔

(ترجمہ و تلخیص)

خراجِ آخریں

محمود نظامی (مرحوم)

ن۔ م۔ راشد
حفیظ ہوشیارپوری

ن۔ م۔ راشد

★

گزشتہ ڈیڑھ برس میں میں نے کراچی اسٹیشن پر محمود نظامی کو تیز گام سے جب بھی رخصت کیا ہے گلے لگ کر رخصت کیا ہے۔ آج میں ابھی تیز گام سے اسے رخصت کرنے گیا تو اس نے ہاتھ تک نہیں ملایا۔ مجھ سے بات تک نہیں کی۔ کسی سے بھی تو ہاتھ نہیں ملایا۔ کسی سے بھی تو بات تک نہیں کی۔ حالانکہ آج کراچی اسٹیشن پر اس کے دوستوں کا بہت بڑا ہجوم تھا۔ جو اسے لاہور رخصت کرنے آئے تھے۔ آج وہ کسی سے بغلگیر نہیں ہوا۔ اس نے کسی پر فقرہ نہیں کسا۔ کسی پر پھبتی نہیں کسی۔ کل لاہور میں محمود نظامی کو سپردِ خاک کر دیا جائے گا اور اس کے مداح ہمیشہ کے لئے اس کی بذلہ سنجی اور سخن طرازی سے محروم ہو جائیں گے۔

ایسا دوست دار آدمی جس کو دوستوں کے بغیر چین نہیں پڑتا ہو۔ ایسا بذلہ سنج جس کی زبان سے فقروں کی پھلجھڑیاں چھوٹتی ہوں۔ ایسا بزم آرا جس کی موجودگی سے ہر محفل باغ و بہار بن جائے۔ ایسا مہمان نواز جس کے لئے "زندگی کی سب سے بڑی لذت مہمان نوازی ہو"!

یوں تو محمود نظامی سے وابستگی ایک زمانے سے چلی آتی تھی۔ اس زمانے سے جب ہم اور وہ لاہور کے دو مختلف کالجوں میں پڑھتے تھے لیکن ہمارے لئے فیضان کا سرچشمہ ایک ہی ذات تھی۔ تاثیر مرحوم کی جس کی محفلوں میں سالہا سال شریک ہوتے رہے۔ لیکن نظامی کے ساتھ وہ ملاقات جو نیویارک میں ہوئی کبھی فراموش نہیں ہو سکتی۔ میں نیویارک میں ابھی تازہ وارد تھا کہ چند ہی دنوں میں نظامی بھی کسی فیلوشپ پر وہاں پہنچ گئے اور ہوٹل میں قیام کیا جس میں میں مقیم تھا۔ یہ ساتھ چند ہفتوں کا رہا۔ دن بھر تو ہم لوگ اپنے اپنے کام میں لگے رہتے لیکن شام کو ہماری محفل جمتی۔ اس محفل میں دو آدمیوں کی جلوت نے وہ خلوت مہیا کی کہ شاذ ہی نصیب ہوتی ہے۔

ان محفلوں میں دنیا جہان کی باتیں ہوتی تھیں۔ مذہب کی باتیں۔ سیاست کی۔ ادب کی۔ فن کی۔ فلسفے کی۔ معاشرتی مسائل کی۔ اپنے اپنے پیشے کی۔ امریکہ اور امریکنوں کی۔ نظامی نہایت ہلکے پھلکے انداز میں ایسی ایسی پتے کی باتیں کہہ جایا کرتے تھے کہ آدمی گھنٹوں سر دھنتا رہ جاتا تھا۔ میں انہیں بہت سے امریکی گھروں میں لئے لئے پھرا۔ وہ جہاں بھی گئے اپنے ذہن کی براقی کا پائدار نقش چھوڑ آئے۔

نظامی نے اپنی عمرِ عزیز کا بڑا حصہ براڈکاسٹر کی حیثیت سے گذارا۔ ریڈیو سے انہیں صحیح معنوں میں عشق تھا۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ تنہا انہوں نے ریڈیو کے گوناگوں پروگراموں کے لئے جو مضامین یا بنیادی خیالات بہم پہنچائے وہ کسی اور کو نصیب نہ ہوا ہوگا۔ آج بھی ریڈیو کے اکثر پروگرام انکی اپج اور جدت طرازی کے ممنون ہیں۔

محمود نظامی کا سینتالیس برس کی عمر میں اس دنیا سے اٹھ جانا ہم سب کے لئے ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔ یہ عمر کی وہ منزل تھی جس میں ہم سب ان سے اور بھی پختہ تر اور وسیع تر کارناموں کی امید لگائے بیٹھے تھے۔ ان کی تالیفات ان کے ذہن کے اصل کمالات کی بہت کم نمائندگی کرتی تھیں لیکن "نظر نامہ" ان میں یقیناً زندۂ جاوید تصنیف ثابت ہوگی۔ ایسے دلچسپ اور متنوع مشاہدات اردو میں بہت کم پائے جاتے ہیں۔

(بہ شکریہ ریڈیو پاکستان کراچی)

حفیظ ہوشیارپوری،

"باغ و بہار انسان"

اب سے کوئی اٹھائیس برس پہلے کی بات ہے۔ میں گورنمنٹ کالج میں تھا ایک دبلا پتلا شخص آیا اور اس نے اتنی تیزی سے کچھ کہا کہ میں صرف یہ لفظ سن سکا "اسلامیہ کالج" "تاثیر" میں نے کان کھڑے کئے اس نے فقرہ دہرایا تو معلوم ہوا کہ اسلامیہ کالج سے تاثیر صاحب نے "بزم فروغ اردو" کے جلسے میں بلایا ہے اور پیغام لانے والے ہیں محمود نظامی جو بزم فروغ اردو کے سکریٹری ہیں یہ تھی نظامی سے میری پہلی ملاقات اور لاہور میں میری ادبی زندگی کا آغاز۔ چند ہی روز میں مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں انہیں برسوں سے جانتا ہوں پہلی ہی ملاقات کے بعد ان کی بے تکلفی بذلہ سنجی اور بے ریائی نے دل پر کچھ ایسے نقوش چھوڑے جو ہر نئی ملاقات کے بعد اور گہرے ہوتے گئے اور آج جبکہ وہ اس دنیا میں نہیں یہ نقوش اور بھی ابھر آئے ہیں۔

"اسلامیہ کالج" "تاثیر" "بزم فروغ اردو" اور "نظامی" اس زمانے کی ادبی زندگی میں ہم معنی لفظ تھے۔ ادھر مصرع ثانی ان لفظوں سے مرتب تھا "گورنمنٹ کالج" "بخاری" "اردو مجلس" اور "آغا حمید" یہ چند لفظ اس زمانے کی ادبی زندگی کی ایک پوری داستان بیان کر رہے ہیں جن کے نہایت اہم کردار ہم سے رخصت ہو چکے ہیں۔ نظامی ان دونوں محفلوں کی جان تھے لیکن وہ تنقید سے زیادہ تخلیق کے ماہر تھے تنقید ان کے بس کی بات نہ تھی تنقید کا مفہوم ان کے نزدیک اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ جو جی میں آیا منہ پر کہدیا۔

دوسری جنگ عظیم نے ہم دونوں کو آل انڈیا ریڈیو لاہور میں یکجا کر دیا اور یہیں نظامی کی ڈرامائی شخصیت اور جدت پسندی کے بہترین جوہر کھلے۔ ریڈیو کی فوری اور ہنگامی ضروریات کسی کا انتظار نہیں کرتیں نظامی کے چلبلے پن اور تیزیٔ طبع نے اس میدان کو اپنے لئے جتنا کارآمد پایا اس سے زیادہ اپنے آپ کو اس کے لئے مفید ثابت کیا۔ ریڈیو میں آکر ہمیں سب سے پہلے اس بات کا احساس ہوا کہ آسان زبان لکھنا اور پھر تیزی کے ساتھ) کتنا مشکل ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ نظامی کی زبان اور ان کے قلم نے ایک دوسرے سے کبھی ہار نہ مانی۔ اور یہ بات ان کی عام زندگی میں بھی نمایاں تھی۔

اس زمانے میں لاہور ریڈیو اسٹیشن کا ڈائرکٹر ایک ایسا سر پھرا انسان تھا جس کی دقتِ نظر اور مشکل پسندی ہمارے "سمندِ شوق" کے لئے تازیانہ کا کام دیتی موسیقی اور ڈرامے سے اس کی فطری دلبستگی اور اس کے انگریزی فارسی اور اردو ادب کے یکساں ذوق کی وجہ سے ہمیں نت نئی آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑتا۔ اور کبھی کبھی تو اس کی فہمائشیں سچ مچ تازیانے کی شکل اختیار کر لیتیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں نے سب سے پہلا ٹاکس شڈول بنایا تو اس نے ایک ایک موضوع کو غور سے دیکھا۔ چند موضوعات کی داد دی۔ سوالات کا ایک طویل سلسلہ شروع کیا۔ پھر ان سوالات کے جوابات کی تلاش کے لئے ایک ایسی بحث چھڑی جس سے موضوع فن اور ٹیکنیک کے اعتبار سے تحقیق اور جستجو کی نئی نئی راہیں کھلنے لگیں۔ اس قسم کی بحثیں شروع شروع میں بڑی صبر آزما معلوم ہوتی تھیں لیکن ہوتے ہوتے ان میں ایسی جاذبیت اور کشش محسوس ہونے لگی کہ یہ نہ صرف ہمارے ریڈیائی مشاغل بلکہ ہماری عام ادبی سرگرمیوں کا بھی ایک لازمی جزو بن گئیں ایسے ڈائرکٹر کی ذہنی صلاحیتوں کا ساتھ دینا کسی فرد واحد کے بس کی بات نہ تھی۔ اور یوں بھی ریڈیو میں باہمی تعاون کی جتنی ضرورت ہوتی ہے شاید اور کہیں نہ ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم سب نے مل کر ریڈیائی مسائل پر غور کرنا شروع کیا۔ ان مسائل کا احاطہ بہت وسیع تھا۔ ڈرامانگاری کے لوازمات۔ فیچروں اور دوسرے ادبی پروگراموں کی ٹیکنیک۔ تقریروں کے موضوعات' ریڈیو کی زبان۔ اعلانات۔ شعر و موسیقی کا امتزاج۔ صوتی اثرات' اناؤنسروں اور اداکاروں کی صلاحیتیں۔ اسٹیشن ڈائرکٹر کے کمرے میں یا ان کے مکان پر ایک ایک مسئلے پر گھنٹوں بحثیں ہوتیں۔ ان بحثوں میں کون کون لوگ شامل ہوتے؟ پیرزادہ رفیع سید امتیاز علی تاج چراغ حسن حسرت صوفی غلام مصطفےٰ تبسم۔ سید عابد علی عابد۔ پنڈت دینا ناتھ زتشی۔ آغا بشیر نظامی اور دوسرے حضرات۔

ہمیں حکم تھا کہ ہر روز نئے نئے خیالات اور اچھوتے موضوعات قلمبند کر کے لاؤ۔ حکم کی تعمیل آخر شوق میں بدل گئی شوق نے شغف کی صورت اختیار کی۔ اور شغف از خود رفتگی کی حد تک جا پہنچا کبھی صوتی اثرات کے تجربے ہو رہے ہیں۔ کبھی گانے کے لئے شعرا کے کلام کا انتخاب ہو رہا ہے کبھی ایک موضوع پر فار...

اردو کے اشعار جمع کئے جا رہے ہیں اور پھر اس بات پر گفتگو ہو رہی ہے کہ ان اشعار کو کس طرح ایک لڑی میں پرو دیا جائے۔ ادھر میز پر کاغذ جمع ہو رہے ہیں کہ اس کے لئے الگ اسٹاف نہ تھا۔ رات کو "ٹرانسمشن" چلانا ہے کہ یہ کام بھی ہمارے ہی سپرد تھا۔ ٹرانسمشن کے وقت نظامی کی عجیب حالت ہوتی دونوں ہاتھوں سے پتلون اوپر کو اٹھاتے ہوئے اسٹوڈیو سے کنٹرول روم اور کنٹرول روم سے اسٹوڈیو کی طرف بھاگے جا رہے ہیں۔ انہیں کچھ معلوم نہیں کہ یہ مختصر سا فاصلہ طے کرتے ہوئے وہ راستے میں کس کس سے ٹکرائے۔ اس بھاگ دوڑ میں وہ اپنے کام کو چھوڑ کر دوسروں کی امداد کے لئے بھی آ پہنچتے۔ ایک روز میں عورتوں کے پروگرام کی ریہرسل کرا رہا تھا۔ انہوں اتفاق سے لاؤڈ اسپیکر پر کچھ سنا، کھٹ سے میرے اسٹوڈیو میں آ دھمکے اور مائیکروفون کی پوزیشن بدل کر واپس چلے گئے۔

ریڈیو کو نظامی نے بہت کچھ دیا لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ وہ ابتدائی تجربے ہیں جنہیں ٹیکنیک اور فن کے اعتبار سے ریڈیائی ڈرامے کا سنگ بنیاد کہنا چاہیئے۔ ان دنوں صوتی اثرات کے ریکارڈوں کا بہت کم رواج تھا۔ اسٹوڈیوں کے اندر نئے نئے صوتی اثرات کے تجربے کئے جاتے جن کا تعلق کسی خاص ڈرامے سے نہ ہوتا۔ اور بعض دفعہ ان صوتی اثرات کی کامیابی کو آزمانے کیلئے چھوٹے چھوٹے مسودے لکھے جاتے نشر کرنے کے لئے نہیں، محض تجربے کے لئے۔ اس طرح نظامی کی تن دہی اور ذہانت نے ہمارے موجودہ ریڈیائی ڈرامے کی بنیادیں استوار کیں۔ اس فن میں نظامی کی کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے ریڈیو کو محض ایک ذریعہ معاش کے طور پر اختیار نہ کیا تھا بلکہ اپنی بھرپور شخصیت کے پورے اظہار کے لئے۔

زبان و قلم کی بے ساختگی اور روانی بڑی فراوانی کے ساتھ ان کے حصے میں آئی تھی۔ بولتے تو سننے والوں کے کان آنکھیں بن کر رہ جاتے لکھتے تو "قلم سے" "مو قلم" کا کام لیتے۔ گفتگو کے وقت فوراً بھانپ جاتے کہ آپ ان سے کیا کہنے کو ہیں۔ ان کی آنکھوں کے گوشے سمٹ جاتے اور ہونٹوں پر لطف مسکراہٹ کے ساتھ خفیف سی حرکت کا احساس ہوتا جیسے وہ اس بات کا جواب ذہن میں دہرا رہے ہوں جو آپ ابھی ان سے کہنے نہیں پائے۔

انہیں رات دن کوئی نہ کوئی دھن لگی رہتی۔ طبیعت میں ایک قسم کی بیتابی اور بے چینی تھی کسی بات کا انتظار ان کے لئے دوبھر ہو جاتا۔ اس سیمابی طبیعت نے ان کے ساتھ کچھ لطیفے بھی وابستہ کر دئے ہیں۔ ایک روز ہم سب کو بخاری صاحب مرحوم کے ہاں جانا تھا۔ یہ وقت سے دس منٹ پہلے ہی الیشور داس بلڈنگ (میکلوڈ روڈ) میں پہنچ گئے۔ اور اس زور سے انگلی رکھی کہ ملاقات کی گھنٹی کوئی ایک منٹ تک بجتی رہی آخر بخاری صاحب مرحوم باہر نکلے "گھر میں کوئی نہیں نوکر بازار گیا ہوا ہے بچے کھیلنے گئے ہوئے ہیں۔ اور آپ ہیں کہ دس منٹ پہلے چلے آ رہے ہیں۔ اور پھر یہ بھی نہیں سوچتے کہ گھنٹی کی آواز سن لی گئی ہے لیکن سننے والا مصروف ہے اور آپ اس کے کام میں مخل ہو رہے ہیں" یہ فقرے سن کر جن میں پطرس کے مخصوص طنز کے ساتھ ساتھ بزرگانہ متانت بھی شامل تھی نظامی صاحب ایسے رفوچکر ہوئے کہ مدتوں انہیں شکل نہ دکھائی دوسرے روز میں بخاری صاحب کے ہاں گیا تو گھنٹی کی تختی پر یہ لکھا تھا: ...ERIE... AND PATIENT

وہ سر پھرے اسٹیشن ڈائرکٹر جن کا میں ذکر کر چکا ہوں آج ہمارے ڈائرکٹر جنرل ہیں۔ جب یہ اسٹیشن ڈائرکٹر تھے تو نظامی ان کی "دریافت" تھے۔ جب یہ ڈائرکٹر جنرل بنے تو نظامی ان کے دست راست بن کر آئے لیکن افسوس کہ موت کے آہنی پنجے نے انہیں قبل از وقت آن دبوچا۔ رشید احمد کا دایاں بازو شل ہو گیا۔ ایک ذہین اور محنتی رفیق کار اٹھ گیا۔ احباب کی محفل ایک مخلص دوست سے خالی ہو گئی۔

نظامی کی سیمابی طبیعت نے انہیں کبھی چین سے بیٹھنے نہ دیا کراچی آنے کے بعد زیادہ تر دورے پڑ رہے ہے۔ ۹، فروری ۱۹۶۰ء کی صبح کو ان سے میری آخری ملاقات ہوئی۔ ۱۲، فروری کی صبح کو دفتر آتے ہی میں نے اپنے ایک رفیق کار سے کہا میں نظامی صاحب سے ملنے جا رہا ہوں اس نے کچھ اور ہی خبر سنائی۔ میں نے جلدی میں کچھ لکھا اور کاغذ کا پرزہ میز کے ایک خانے میں ڈال دیا۔ آج جو یہ پرزہ اٹھا کر دیکھا تو یہ لکھا تھا:

اب محفل احباب میں تو ہے بھی نہیں بھی
اک عقدہ ہے گویا ترے مرنے کا یقیں بھی

(داہنگ)

آہ کیا کہئے بچارا ہم سے بھی تھا آشنا! (مدیر)

"ابرِ رحمت دامن از گلزارِ من برچید و رفت"

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی (آنجہانی) کے یہ چند فارسی اشعار دراصل ایک منظوم مراسلہ میں جو انہوں نے ۱۹۴۳ء میں استاذی حافظ محمود شیرانی مرحوم کو تحریر کیا تھا۔ اس وقت حافظ صاحب انجمن ترقی اردو (ہند) (دریا گنج دہلی) میں مقیم تھے اور پنڈت کیفی ضلع لائل پور میں۔ ہمیں یہ یادگار اشعار حافظ محمود شیرانی مرحوم کے نواسے، جاوید محمود شیرانی صاحب نے عنایت فرمائے ہیں اور پنڈت کیفی کی ایک یادگار تحریر کے طور پر نذرِ قارئین ہیں:-

(مدیر)

مارِ نعمِ یک التفات آمد گرفتم نازِ حسن   در نیازِ عشق از مایاں چہ نقصاں دیدۂ

یاد ایامے کہ از برقِ تبسّم دائما   بزمِ یاراں را مثالِ طور رخشانیدۂ

اے کہ حرفت بودہ در بزمِ ادب فردوسِ گوش   رُو چرا از شائقینِ خویش گردانیدۂ

روزہا شد التجائے دوستاں از حد گزشت   پا مگر از جادۂ رنجیدگی نکشیدۂ

اے سرت گردم نہ ایں باشد طریقِ دوستی   گفتہ باید آنچہ از یاراں قصورے دیدۂ

رنجِ تست اے بندہ پرور رنجِ جملہ دوستاں

اے بُتِ طنازِ ما، از ما چرا رنجیدۂ

پاکستانی ادیبوں کا منشورِ آزادی

فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں

★

مجھے یہ محسوس کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ "پاکستان رائٹرز گلڈ" آج ۳۱ جنوری (۱۹۶۰ء) کو ڈھاکہ میں اپنی پہلی سالگرہ منا رہا ہے۔ پچھلے سال اسی تاریخ کو جب میں نے کراچی میں ادیبوں کے کنونشن کے ایک اجلاس میں شرکت کی تھی تو مجھے وہ کیفیت محسوس ہوئی "جو قلب کو گرما دے اور روح کو تڑپا دے" سے تعبیر کی جا سکتی ہے۔ میں اس وقت سے برابر آپ کی گلڈ کی رفتارِ ترقی کو بڑی گہری دلچسپی سے دیکھتا رہا ہوں اور یہ جان کر بڑا اطمینان ہوتا ہے کہ آپ اہل قلم نے اپنی بہبود کے لئے جو تنظیم قائم کی ہے اس کی بنیاد بہت معقول و مستحکم اصولوں پر ہے۔

میرا خیال ہے کہ آپ جیسے اہلِ علم و دانش کو کچھ زیادہ سمجھانے کی تو ضرورت نہیں ہو سکتی مگر ایک عام قاری کی حیثیت سے اگر کچھ کہنے کی اجازت دی جائے تو میں اتنا ضرور کہوں گا کہ اپنے آپ کو فکر و تصور میں بالکل آزاد، اظہار میں بے باک اور ماحول کی عکاسی میں بے دھڑک محسوس کریں۔ دیکھئے کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ کوئی اندیشہ یا مصلحت کوشی آپ کی بُرّشِ طبع کو کند کر دے۔ میں والٹیئر کی روح سے متاثر ہو کر یہ بھی کہہ دوں کہ آپ جو کچھ کہیں، ہو سکتا ہے کبھی مجھے اس سے اختلاف ہو، بلکہ کبھی اس پر میں احتجاج بھی کروں، لیکن جہاں تک آپ کے حقِ اظہار کا تعلق ہے میں ہمیشہ اس کے لئے سینہ سپر رہوں گا، بشرطیکہ اس کی زد یا ضرب خود ہمارے ملک کی بقا پر نہ پڑتی ہو۔

مجھے علم ہوا ہے کہ آپ نے کئی اہم کاموں کو انجام دینے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ میں عرض کروں گا کہ تخلیقی ادب کے ساتھ ساتھ آپ حضرات پاکستانی زبانوں کے ایک دوسرے میں تراجم کرنے کے سلسلے کی طرف بھی زیادہ سے زیادہ توجہ مرکوز رکھیں، خاص کر اردو اور بنگلہ سے ایک دوسرے میں تراجم پر۔

میں ملک میں تعلیم کی جو وضعِ نو قائم کرنا چاہتا ہوں وہ بھی آپ کے کاموں کے لئے ایک بڑا وسیع میدان مہیّا کرتی ہے۔ آپ اس سلسلے میں طلبا کے مختلف درجوں کے لئے ایسی نصابی کتب تحریر کر سکتے ہیں جو احساسِ وطن پر مبنی ہوں۔ یہ بڑی اہمیت کا کام ہے اور مجھے یقین ہے کہ گلڈ اس کام کو ضرور اپنے اہتمام میں لے سکے گی۔

کاش میں ڈھاکہ میں کچھ زیادہ دیر ٹھہر سکتا اور آپ کی پہلی سالگرہ کی تقریب میں شریک ہو سکتا مگر دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے ایسا کرنا میرے لئے ممکن نہیں ہے، مگر یقین رکھئے کہ میری بہترین تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں ✦

(محمد ایوب خاں)

روداد چمن

(پاکستان رائٹرز گلڈ کا ایک سال)

قدرت اللہ شہاب

آج کی صحبت میں میں صرف اتنا ہی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ پاکستان رائٹرز گلڈ کا بنیادی تصور کیا ہے۔

جب پچھلے سال اسی دن گلڈ کے قیام نے عملی صورت اختیار کی تو ہم میں سے اکثر جن میں خود میں بھی شامل ہوں یہ نہیں جانتے تھے کہ اس کے بعد کیا ہوگا لیکن ہماری خوش قسمتی تھی کہ ایک کے بعد دوسرا ادیب اپنے خوابوں کے شبستاں اور ایک کے بعد دوسرا انشاء پرداز اپنے سنہری روپہلی محلوں سے نکل نکل کر باہر آتا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم سب ایکسلسیر ہوٹل کراچی کے ایک کمرہ میں اکٹھے مل بیٹھ کر کچھ وقت گزارنے لگے جہاں گزشتہ ایک سال سے گلڈ کا مرکزی دفتر واقع ہے۔ اس کمرے کی کچھ نہ پوچھئے۔ اندھیرا اندھیرا سا، دم گھونٹنے والا کمرہ جہاں ٹھنڈی چائے کی ایک ذراسی پیالی بھی پینا چاہیں تو نہ جانے اس کی کیا قیمت ادا کرنی پڑے۔ اور جہاں بیرے ہماری طرف بُری طرح ناک بھوں پڑھا کر دیکھتے ہیں کیونکہ ہم نے ابھی تک اسے کرایہ دینے کا تکلف نہیں کیا اور نہ کچھ عرصے تک یہ زحمت گوارا کرسکیں گے۔ کیونکہ سچی بات یہ ہے کہ ہم میں اتنی توفیق ہی نہیں!

ادھر باہر کی دنیا میں بھی ہم سے کچھ نیک سلوک نہیں ہوتا۔ ہوٹل میں ٹھنڈی چائے سے خاطر تواضع ہوتی ہے تو باہر کوئی سخت سرد مہری سے پیش آتا ہے۔ بعض ایسے بندگان خدا بھی ہیں جو ہوٹل کے بیروں کی طرح ہمیں نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور ایسے بھی جو ہوٹل کے مالک کی طرح دعا مانگتے ہیں کہ ہمارا قصہ پاک ہو جائے تو وہ خوش ہو کر گھر گھر مٹھائی بانٹیں۔ اب کیا ضرورت ہے کہ میں اندر باہر یکساں سلوک بد تلخ نوائی کا سلسلہ آگے بڑھاؤں۔ کیونکہ میں اس سے تلخ کام ہونے سے تو رہا۔ میں تو ان حالات و واقعات پر نظر ڈالنے سے

دلی مسرت محسوس کرتا ہوں کہ جب سے ایک سال ہوا گلڈ کی باقاعدہ طور پر بنیاد رکھی گئی، ہوٹل ایکسلسیر کے اس چھوٹے سے کمرے میں کیا کچھ کارگزاری ہوئی ہے۔ اس سلسلہ میں میں آپ کو تفصیلات سے گراں بار نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن میں ایک بات ضرور کہوں گا۔ یقین جانیئے گلڈ کی تہہ میں جو تصور کارفرما تھا میں نے اسے اور اس کی خارجی ہیئت کو اسی طرح غیر محسوس مگر قطعی طور پر نشو و نما پاتے دیکھا ہے جس طرح کسی دوشیزہ کے گھنے گھنیرے لانبے لانبے چمکیلے گیسو۔ آج کوئی شخص خیبر سے لے کر کاکس بازار تک جائے تو محال ہے کہ آٹھ گھنٹوں کے اندر اندر کسی ایسے کمرے یا کٹیا یا چھوٹے سے گاؤں میں نہ جا نکلے جہاں کسی نے ہمارے گلڈ کا یہ بِلّہ یعنی قلم کی نشانی والا بلہ نہ لگا رکھا ہو اور آپ کا خیر مقدم کرنے کو تیار نہ ہو۔ اس باہمی رشتوں کے تانے بانے کو تیار ہوئے ایک سال سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ لیکن جہاں ایسے معاملات ہوں وہاں مدت کا سوال کچھ ایسا اہم نہیں۔ جو بات زیادہ اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ جو لوگ یہ بلہ لگائے ہوں اور جو نہ لگائے ہوں۔ وہ اسے محبت کی نظر سے دیکھیں نہ دیکھیں مگر اس کی برابر تعظیم کریں میں تو اس دن کو دیکھنے کا آرزومند ہوں جب کسٹم انسپکٹر آپ کا اسباب کھول کر نہ دیکھیں یا ٹکٹ چیکر آپ کا ٹکٹ دیکھنے پر اصرار نہ کریں۔ کیونکہ آپ نے یہ بلہ لگا رکھا ہے جو قابل اعتبار ہونے کی علامت ہے۔ وہ دن جبکہ کوئی رعونت کیش دفتری فرعون آپ کو دو دو گھنٹوں زحمت کش کے انتظار نہیں رکھے گا اگر آپ ایسا ملاقاتی کارڈ بھیجیں گے جس پر یہ علامت موجود ہو جو اسے خود بخود آپ کی تعظیم کرنے پر مجبور کر دے۔ وہ دن جب یہ بلہ نفرت کی بجائے محبت حقارت کی بجائے تعظیم اور شک و شبہ کی بجائے اعتماد پیدا کرے۔

یہ ہے وہ نصب العین جس کو حاصل کرنے کے لئے میں گلڈ کے ایک ناچیز کارکن کی حیثیت سے جدوجہد کر رہا ہوں۔ لیکن اس سلسلہ میں آپ کو تین باتوں کی تنبیہہ کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔

پہلی تنبیہہ تو میں خود اپنے آپ ہی کو کروں گا۔ یعنی ان لوگوں کو جو میری طرح گلڈ کے اراکین ہیں۔ ہمیں یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ گلڈ محض ایک ٹریڈ یونین ہے۔ یہ ایک تنظیمی جماعت ہے۔ ایسی جماعت نہیں جس کا کوئی مخصوص نظریہ ہو۔ گلڈ کا واحد نظریہ۔ اگر آپ مجھے اس اصطلاح کو برتنے کی اجازت دیں۔ ایک ہی ہے۔ فکر میں خلوص اور اس کو برتنے اور بروئے کار لانے میں حوصلہ اور آزادی سے کام لینا ـــــ اس کے علاوہ ہر کوئی اپنے دل کی دنیا کا بادشاہ ہے۔ اس لئے اگر کوئی شخص ادبی اور ذہنی سطح پر کچھ لکھتا ہے تو وہ ذاتی حیثیت سے لکھتا ہے۔ گلڈ کے ترجمان کی حیثیت سے نہیں۔ خواہ اس ادارہ میں اس کا منصب یا درجہ کچھ بھی ہو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہئے تاکہ اس کے متعلق کوئی غلط فہمی نہ رہے۔

اب دوسری تنبیہہ کی طرف آیئے۔ اس کا تعلق دفتری چودھرائت کے ان طبقوں سے ہے جو یہ شبہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں کہ ممکن ہے گلڈ سیاسی معنوں میں، بائیں بازو یا دائیں بازو کا حامی ہو جائے۔ نہیں۔ گلڈ کوئی سیاسی ادارہ نہیں ہے اور گلڈ اسی صورت میں ایک سیاسی ادارہ بن سکتا ہے جب ہم لوگوں کا خاتمہ کر کے ہماری لاشوں پر چلا جائے۔ اس سے قطع نظر میں پوچھتا ہوں، دائیں طور پر بایاں ہونے یا بائیں طور پر دایاں ہونے میں کیا برائی ہے؟ ہر تخلیقی فن کار فطرتاً ناصبور ہوتا ہے۔ وہ لازماً اپنے گرد و پیش کی صورت حال سے مطمئن نہیں ہوتا کیونکہ اسے ہمیشہ ایک ناقابل حصول نصب العین کی تلاش رہتی ہے تاوقتیکہ یہ ذہنی اضطراب کسی اندرونی یا بیرونی دباؤ یا ترغیب کے تحت تخریبی نہ بن جائے۔ ادب میں نہ کوئی دایاں ہے نہ بایاں۔ اس میں صرف ایک سمت ہے۔ صراط مستقیم۔ ... دائیں یا بائیں کو دبانے کی ہر کوشش کا ایک ہی نتیجہ ہوگا۔ یہ کہ ... کا رخ سیاسی دائیں بائیں کی طرف نہ ہو جائے۔ شاید ان میں سے ایک تلخ معلوم ہو اور دوسرا شیریں لیکن جہاں تک زندگی میں ایک خوشگوار توازن کا تعلق ہے یہ دونوں اس کے حق میں زہر ہیں۔

•

میری تیسری تنبیہہ ـــ یہ امیر لوگوں کے لئے ہے۔ ہمارا ملک ایسے لوگوں سے بھرا پڑا ہے جن کے جسم اور جان مال و زر کے ہجوم سے پھٹے پڑتے ہیں۔ ادھر ہم لوگ ادیبوں کی بھلائی کے لئے ایک بے نظیر منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے اہم کام کا بیڑا اٹھا رہے ہیں۔ اس کو اپنے ہی قومی وسائل سے کامیاب بنانا چاہتے ہیں کیونکہ بیرونی امداد کے لئے ہم دست سوال نہیں بڑھاتے۔ قبل ازیں ہمارے ہم وطن مالدار لوگوں نے فیاضی و کریم نوازی کے باب میں کیا کچھ نہیں کیا۔ ہم ادیبوں کے ساتھ نیک سلوک اور کار خیر ہے جو ان ارباب ثروت کی توجہ چاہتا ہے۔ مجھے ایک امیر آدمی کا قصہ یاد ہے۔ ان حضرت نے ایک فرانسیسی عطر کی بیس ہزار شیشیاں خریدی تھیں محض اس لئے کہ یہ ایک نازنین لڑکی کے جسم کو خوشبو میں بسانے کے کام آئیں۔ اور لڑکی بھی وہ جس کے ساتھ انہیں محبت نہ تھی، بلکہ محض ہوس تھی۔ میں ان صاحب کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اگر وہ ہماری گلڈ پر اس سے آدھا بھی کرم فرمائیں تو سارا ملک اور زیادہ شاعری اور زیادہ نثر کی خوشبو میں رس بس کر مہک اٹھے گا۔

خواتین و حضرات: آیئے ہم سب مل کر دعا کریں کہ اگلے سال جب ہم گلڈ کی دوسری سالگرہ منائیں گے تو اس کے نئے سیکرٹری جنرل کو ان تنبیہوں کو دہرانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ آخر یہ کام کوئی ایسا خوشگوار بھی تو نہیں +

★

مستقبل کی اردو

ڈاکٹر محمد صادق

زندہ زبانیں کبھی ایک سی نہیں رہتیں۔ ان میں آئے دن تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ نئے الفاظ، محاورات اور اسالیب بیان شیوع اور رواج پاتے ہیں اور پرانے بگڑتے اور مرتے چلے جاتے ہیں، تلفظ میں تبدیلیاں ہوتی ہیں اور معانی کا دائرہ وسیع یا تنگ ہوتا چلا جاتا ہے۔ گرامر اپنا راستہ بدلتی ہے۔ نئی چیزیں اور نئے خیالات اپنے نام ساتھ لاتے ہیں یا انہیں وضع کیا جاتا ہے۔ یہ اور کئی اور تبدیلیاں رفتہ رفتہ، نامعلوم طور پر معرض وجود میں آتی ہیں لیکن پرآشوب ادوار میں جب روایات کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے یا ایسے ادوار میں جب ایک مقابلۃً کم متمدن قوم کے ایک متمدن قوم سے سیاسی یا علمی روابط پیدا ہو جاتے ہیں، تو زبانیں نہایت سرعت سے بدلتی ہیں اور ترک و اکتساب کا فطری عمل شعوری شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اردو زبان نے جو اثرات فارسی اور انگریزی سے قبول کئے ہیں اور ان کی وجہ سے جو تبدیلیاں اس میں رونما ہوئی ہیں وہ اس کلیّہ کی واضح شہادت ہیں۔

مستقبل کی اردو پر اظہار خیال کرتے ہوئے میں ان اثرات کا محض اجمالاً ذکر کروں گا جو ایک مدت سے اس پر اثر انداز ہو رہے ہیں اور جن کا عمل مستقبل میں بھی بعینہٖ اسی طرح جاری رہے گا۔ البتہ وہ لسانی تبدیلیاں جو تشکیل پاکستان سے معرض وقوع میں آئیں گی اور آرہی ہیں، خصوصیت سے غور طلب ہیں۔ اور میں ان سے کسی حد تک مفصل بحث کروں گا۔

اردو زبان پر جو اثرات ایک عرصۂ دراز سے طاری ہو رہے ہیں، دو ہیں۔ اول فارسی زبان کا اثر، جس کا آغاز اردو کی ابتدا سے ہم کنار ہے۔ اور دوسرا انگریزی کا اثر جو بالخصوص ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد شروع ہوا۔ یہ دونوں اثرات مستقبل میں بھی بدستور جاری رہیں گے۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ فارسی اور عربی سے ہماری موانست اس عقیدت کا نتیجہ ہے جو بحیثیت مسلمانوں کے ہمیں ان زبانوں سے ہے۔ یہ خیال بہت حد تک درست ہے۔ لیکن یہاں یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ اول اول اردو، فارسی کے حریف کی حیثیت سے میدان میں آئی۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد جب سلطنت مغلیہ کا زوال شروع ہوا تو مسلمان فارسی سے بدظن ہو گئے۔ بالکل اسی طرح جیسے آجکل ہم انگریزی سے بدظن ہو رہے ہیں۔ انہیں اس بات کا عام احساس ہو گیا کہ فارسی پرائی زبان ہے۔ اور ان کے دلوں میں اپنی زبان کو ترقی دینے کی خواہش پیدا ہوئی لیکن اس تحریک کے بانی اور مؤید، خان آرزو، مظہر، سودا، میر، اور میر درد، سب کے سب فارسی کے عالم تھے۔ لہٰذا جب وہ فارسی کی تہذیب و تربیت کی طرف ملتفت ہوئے۔ تو انہیں اردو کو مالا مال کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ نظر آیا۔ یہ کہ فارسی خیالات، الفاظ، محاورات اور تراکیب کو اردو زبان میں منتقل کر دیا جائے۔ یہ سلسلہ آج تک برابر جاری ہے اور فارسی سے مواد مستعار لینا ہماری فطرت ثانیہ ہو گئی ہے۔ جب بھی ہم کسی نئے خیال یا علمی نکتہ سے دوچار ہوتے ہیں تو ہم معاً فارسی اور عربی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ زبانیں مدت سے ہماری علمی ضروریات کی کفیل رہی ہیں اور رہتی رہیں گی۔

اکثر سننے میں آتا ہے کہ فارسی اور عربی کے مستعار الفاظ اور مرکبات ہماری بے مائیگی یا کم مائیگی پر دلالت کرتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ یہ الفاظ اس لئے مستعار لئے گئے کہ ہمارے ہاں ان کے مرادف الفاظ نہ تھے۔ لیکن کسی زبان کی تہی دامنی کا واحد علاج الفاظ کی درآمد نہیں ہے۔ قومیں اپنے ملکی مواد سے نئے الفاظ، تراکیب اور مرکبات تیار کر لیتی ہیں اور اس کی ایک اچھی مثال جرمن زبان ہے۔ جس فراخ دلی سے ہم فارسی اور عربی الفاظ اپنی زبان میں داخل کرتے ہیں۔ اس کی مثالیں اور زبانوں میں بہت کم ملیں گی۔ انگریزی زبان نے بھی اجنبی مواد کو بہ افراط اپنے آپ میں سمویا ہے۔

لیکن نہایت خوش اسلوبی سے۔ نیز انگریز دیسی مواد یعنی اینگلوسیکسن کو حقارت سے نہیں دیکھتے۔ اس کے برعکس ہم دیسی مواد کو اسی ترحم آمیز یا نفرت آمیز نگاہ سے دیکھتے ہیں جس طرح ہم اپنے مفلس اقربا کو دیکھتے ہیں۔ اور انہیں درخور اعتنا خیال نہیں کرتے۔ مانا کہ فارسی اور عربی عنصر سے ہماری زبان میں وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس بھاری بھرکم مالِ غنیمت کو بمشکل اپنے کندھوں پر اٹھا رہی ہے۔ علاوہ ازیں اس سے زبان کے سیکھنے میں دشواریوں کا اضافہ ہو رہا ہے۔ دیکھیے تخلیقِ الفاظ کے لئے فارسی کس خوش اسلوبی سے اپنے ذاتی ذرائع اور وسائل استعمال کرتی ہے۔ کیا "خوش بین" اور "بدبین" "قنوطی" اور "رجائی" سے زیادہ آسان اور موزوں الفاظ نہیں اور "وائرلیس" کے لئے "لاسلکی" استعمال کرنا کونسی دانش مندی ہے جبکہ لفظ "تار" عرصۂ دراز سے ہمارے ہاں استعمال ہو رہا ہے؟ غالباً سب سے زیادہ کریہہ الصوت لفظ جو اردو میں ابھی ابھی داخل کیا گیا ہے "مندوبین" ہے۔ میری رائے میں ایسے اجنبی الفاظ کو داخلِ زبان کرنا اس کی خدمت نہیں بلکہ اس سے بدسلوکی کرنا ہے۔ بہر حال، جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے، فارسی اور عربی کے الفاظ اردو میں داخل ہوتے رہیں گے، جن کی وجہ سے وہ ادبی بوجھل بن جائے گی۔

پچھلے سو سال سے انگریزی اردو پر نہایت گہرے اثر ڈال رہی ہے انگریزی الفاظ یا تو براہ راست مستعار لئے گئے ہیں یا ان کو تراجم کے ذریعہ داخلِ زبان کیا گیا ہے، یا ان کے معانی کے پیش نظر نئی اصطلاحات مرتب کی گئی ہیں۔ الفاظ اور تراکیب سے گزر کر انگریزی اثر جملوں کی ساخت اور انداز فکر تک پہنچ گیا ہے۔ افراط و تفریط سے بچنا ہر حالت میں مستحسن ہے لیکن اس تاثر پذیری میں کوئی قباحت نہیں۔ تقسیم سے پہلے یہ کہہ کر ٹال دیا جاتا تھا کہ انگریزی کا یہ استیلا سیاسی غلبہ کی علامت ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ اثر بالکل پہلے کی طرح جاری ہے۔ انگریزی سے استفادہ درحقیقت ایک اعلیٰ تمدن کی خوشہ چینی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب تک علوم و فنون اور عام تمدن میں یورپ ہم سے آگے ہے، انگریزی کا غلبہ بدستور قائم رہے گا۔ مستقبل کی اردو میں انگریزی عنصر نہ صرف برقرار رہے گا بلکہ اس میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

آئیے اب دیکھیں کہ تعمیر پاکستان کا اردو کی نشو و نما پر کیا اثر ہوگا۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ پاکستان کی فضا اردو کیلئے سازگار ثابت ہوگی۔ قیام پاکستان سے پہلے اردو خطرے میں تھی لیکن اب جب کہ اردو پاکستان کی ملکی زبان قرار دی جا چکی ہے اس کا مقام متعین اور مستحکم ہو گیا ہے اور وہ ترقی کی راہ پر گامزن رہے گی۔ میری رائے میں ۱۹۴۷ء کا انقلاب اردو میں مستقل اور دور رس تبدیلیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ جن میں سے چند ایک کا ہمیں اس وقت سان گمان تک نہیں۔

اس انقلاب کا اردو زبان پر سب سے پہلا یہ اثر ہوا کہ اپنے سابقہ جنم بھوم[1] سے اس کا رشتہ ہمیشہ کے لئے منقطع ہو گیا۔ اردو دہلی اور لکھنؤ میں پروان چڑھی۔ وہاں کی زبان بالاتفاق مستند خیال کی گئی اور ہم سب نے اس کا تتبع کیا۔ اب ہمارے اور ان شہروں کے درمیان ایک ناقابلِ عبور خلیج حائل ہو چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ اب یہ شہر ہمارے لئے شمع ہدایت نہیں رہیں گے۔ اردو اپنے گھر سے بے گھر ہو کر ہمارے ہاں ایک پناہ گزیں[2] کی حیثیت سے آبسی ہے۔ اگرچہ ہم نے اس کا خیر مقدم کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ پھر بھی اس کی روایات کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے۔ اب یہ شہر اس کی نشو و نما نہیں کر سکتے۔

اگر یہ تعلق منقطع نہ ہوتا پھر بھی اردو کا ہندوستان میں پنپنا دشوار تھا جس زور و شور سے ہندوستان میں ہندی کا پرچار ہو رہا ہے اور اسے ہندوستان کی عام زبان بنانے کے منصوبے ہو رہے ہیں، ان کے پیش نظر اردو کا مستقبل نہ صرف دھندلا بلکہ تاریک نظر آتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو اردو سے بے حد دلبستگی ہے

---

[1] اردو کی جنم بھوم کے متعلق اختلاف رائے ہے۔ چنانچہ بعض سابق صوبہ پنجاب اور سرحد کو اس کا ابتدائی گہوارہ خیال کرتے ہیں۔ گو ان میں عملاً مقامی بولیوں ہی کا رواج رہا ہے۔ (مدیر)

[2] پناہ گزیں کی بجائے "مہاجر" زیادہ موزوں ہے۔ اگرچہ یہ بھی ایک حد تک ہی صحیح ہے کیونکہ اردو پاکستانی علاقوں میں برابر بھی بولی اور لکھی جاتی ہے۔ پھر اردو ہندوستان میں [illegible] زبان دانی کے سلسلہ میں سرگرمیاں بھی جاری ہیں۔ اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ آئندہ اس ملک میں ان پر کیا گزرے گی۔ آگے چل کر مضمون نگار نے بھی اس کی بخوبی وضاحت کر دی ہے۔ (مدیر)

لیکن اقتصادی ضروریات کے سامنے محض جذبہ کی کچھ حقیقت نہیں ہوتی۔ اردو کے پرستاروں کو خواہ وہ مسلمان ہوں یا ہندو، نہ صرف ہندی پڑھنی پڑتی ہے بلکہ اس میں مہارت و مہارت کامیابی کے لئے ازبس ضروری ہے۔ ریڈیو، اخبارات، لین دین، تجارت، ان سب میں ہندی کو دخل ہے۔ ممکن ہے سن رسیدہ اصحاب اس ہندی پرستی کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی ادبی اور لسانی روایات کو برقرار رکھیں، لیکن نئی پود اسی فضا کو قبول کرے گی جس میں وہ سانس لے رہی ہے۔ ان کی زبان پر ہندی الفاظ چڑھ رہے ہیں اور وہ وقت دور نہیں جب اردو انہیں اجنبی معلوم ہونے لگے گی۔ علاوہ ازیں ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ دہلی جس کی زبان فصاحت و بلاغت میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی، اب ہندوستان کا دارالحکومت ہے۔ ہندوستان کا کونسا علاقہ ہے جس کے باشندے اب وہاں آباد نہیں؟ ان سب کے اختلاط سے دہلی کی زبان ایک معجونِ مرکب بنتی جا رہی ہے جس میں غالب عنصر ہندی کا ہوگا۔ یہی حال لکھنؤ کا ہوگا۔ وہ روایات جنہیں لکھنؤ نے اب تک برقرار رکھا ہے، ہندی کے بڑھتے ہوئے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں گی۔

جس طرح کوئی آبادکار یا مہاجر اپنے وطن مالوف سے علیحدہ ہو کر اپنے ماحول کو سازگار بنانے کے لئے اپنے نئے ہمسایوں سے رشتۂ مؤانست استوار کرتا ہے، اردو کو بھی بالکل ایسا ہی کرنا ہوگا۔ پاکستان میں اردو اپنی معیاری نفاست اور صفائی برقرار نہیں رکھ سکے گی۔ اور اسے اپنے گرد و پیش کے حالات کو قبول کرنا پڑے گا۔ اور مرور ایام کے ساتھ ساتھ اس کی اصلی روایات کمزور ہوتی چلی جائیں گی۔ لیکن کہا جائے گا کیا پاکستان میں ایسے لوگ آباد نہیں جن کی مادری زبان اردو ہے؟ کیا وہ اس کی پاکیزگی کو برقرار نہ رکھ سکیں گے؟ اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ اپنی طرف سے پوری کوشش کریں گے۔ لیکن ان کی مساعی کامیاب نہ ہوں گی۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ یہ لوگ ملک کے مختلف حصوں میں منتشر ہیں۔ ان کے اردگرد صبح و شام، پنجابی۔ پشتو۔ بلوچی۔ سندھی بولی جاتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خود ان کے اثرات سے مامون و محفوظ رہیں۔ لیکن ان کے بچے اور آئندہ نسلیں اپنے ماحول کے اثر سے نہ بچ سکیں گی۔ وہ یہاں کے بچوں سے گھل مل جائیں گی۔ اور رفتہ رفتہ تعلیم، کھیل کود، گلی کوچوں میں ان کے ہمجولیوں کے الفاظ ان کی زبان پر چڑھ جائیں گے۔ یہ عمل بعد میں بھی جاری رہے گا۔ آپس کا میل جول، کاروباری معاملات، ملازمت، باہمی رشتہ داریاں، شادی بیاہ۔ ان سب کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے قریب تر آتے چلے جائیں گے۔ دریں حالات ناممکن ہے کہ ان کا لب و لہجہ اور زبان اپنی اصلی حالت برقرار رکھ سکے۔ ایک مہاجر نے اپنے مضمون میں جس کا عنوان "اردو اور پنجابی کا سنگم" ہے، اس امر کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

"..... میری اولاد بھی خود کو ہمسایہ بچوں کی صحبت میں اجنبی محسوس کرتی تھی۔ میرے بچے ان کی باتیں نہ سمجھ سکتے تھے۔ آخر آہستہ آہستہ ان پر ہمسایہ بچوں کا رنگ چڑھنے لگا۔ اور وہ پنجابی بولنے کی کوشش کرنے لگے لیکن اس کوشش میں ان کی اپنی زبان خراب ہونے لگی۔ اب یہ حالت ہے کہ وہ گھر میں اردو میں باتیں کرتے کرتے لاشعوری طور پر اکثر ایک آدھ پنجابی کا لفظ بھی بول جاتے ہیں۔ انہیں بہتیرا سمجھایا جاتا ہے لیکن وہ باز نہیں آتے ہیں۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ آہستہ آہستہ ان کی زبان کیا صورت اختیار کرے گی۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ چند برسوں میں وہ نہ اردو رہے گی نہ پنجابی۔" میری رائے میں یہ اثر اتنا گہرا نہیں ہوگا جتنا کہ وہ خیال کیا جاتا ہے۔ اور آخر کار مستقل طور پر وہی الفاظ داخل زبان ہوں گے جن کی ضرورت ہے۔

ہماری بولیوں کا ایک اچھا خاصہ عنصر ایک اور طرح بھی اردو میں داخل ہو جائے گا۔ اور اس کا داخل ہونا ضروری بھی ہے۔ یہ کام ہمارے ناول نویس، افسانہ نگار اور مضمون نگار سرانجام دیں گے۔ ان لوگوں کے پیش نظر سرشار کی لکھنوی فضا یا نذیر احمد کے موضوعات اور کردار نہیں ہوں گے۔ ان کے پیش نظر پاکستان کے مختلف علاقوں کے لوگ اور ان کی زندگی ہوگی اور اپنی تصانیف کو مقامی رنگ دینے کے لئے انہیں ایک ایسی زبان استعمال کرنی پڑے گی جس میں مقامی رنگ کی جھلکیاں ہوں۔ لیکن ادب میں واقعیت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ لوگوں کی بول چال ہو بہو نقل کی جائے۔ اگر ایسا ہو تو پنجابی زمیندار صرف پنجابی ہی میں گفتگو کرتا دکھائی دیا جائے گا۔ اور پٹھان پشتو میں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ افراد کا لب و لہجہ اور زبان قرین قیاس ہو۔ یا بظاہر صحیح معلوم ہو۔ یہ درست ہے کہ پاکستان کے لوگ اردو نہیں بولتے۔ لیکن اگر انہیں اردو بولتے دکھایا جاتا ہے تو یہ ازحد ضروری ہے کہ وہ لکھنؤ یا دہلی کے مخصوص محاورات استعمال نہ کریں ورنہ آپ پکار اٹھیں گے کہ یہ

یہ لوگ ہرگز پاکستانی نہیں۔ پس اپنے مضامین کو واقعیت کا رنگ دینے کے لئے مقامی رنگ آمیزی از حد ضروری ہے۔ یہ اصول دنیائے ادب میں ہر جگہ کام کرتا دکھائی دیتا ہے والٹر سکاٹ کی بہترین تصانیف وہی خیال کی جاتی ہیں جن کے افراد سکاٹ لینڈ کے باشندے ہیں اور جن کی زبان میں وہاں کے مخصوص محاورات اور الفاظ کو دخل ہے۔ مکالمے کی کامیابی یا واقعیت کا راز اسی امر میں مضمر ہے کہ افراد ایسی زبان میں گفتگو کریں جس کی ہم اُن سے توقع رکھتے ہیں اور یہاں سو فیصدی حقیقت نگاری کی ضرورت نہیں۔ ہر علاقے کے اپنے مخصوص محاورات۔ الفاظ اور جملے ہیں۔ جنکے باموقع استعمال سے مکالمہ قرین قیاس دکھائی دیتا ہے۔ یہ امر درحقیقت قیام پاکستان سے بہت پہلے سے جاری ہے اور ہمارے افسانہ نگاروں کی تصانیف میں مقامی رنگ صاف جھلکتا ہے۔ یہ مقامی رنگ جو پنجابی الفاظ اور ٹھیٹھ پنجابی محاورات کے ترجمے کی شکل میں ملتا ہے، ہمارے ادب میں دن بدن بڑھتا چلا جارہا ہے اور وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ عنصر بڑھتا ہی چلا جائے گا۔

دیکھیئے ذیل کی نظم میں شیر افضل[1] جعفری نے خالص پنجابی مواد کو کس خوش اسلوبی سے اردو میں سمویا ہے:

الھڑ سوانیاں ہیں — الھتی جوانیاں ہیں
چاندی کی گردنوں میں — سونے کی گانیاں ہیں
چرخے کے ساتھ گاتی — باہو کی بانیاں ہیں
چڑھتی ہوئی ندی کی — دل میں روانیاں ہیں
انداز سے گھماتی — رنگیں مدھانیاں ہیں
آنکھوں میں گفتگو سے — کیا بے زبانیاں ہیں
یہ پاک بازہیریں
بے تاج رانیاں ہیں

اگر یہ درست ہے کہ دہلی یا لکھنؤ کا مخصوص محاورہ اور وہاں کی عامیانہ زبان جسے انگریزی میں سلینگ کہتے ہیں، ہماری سماجی زندگی سے جوڑ معلوم ہوگی تو آخر کار اس کا کیا حشر ہوگا؟ میری رائے میں وہ صرف کتابوں میں رہ جائے گی۔ لکھے پڑھے لوگ اس سے علمی طور پر آشنا ہوں گے۔ لیکن وہ اردو کی روزمرہ یا عام طور پہ مستعمل زبان کا حصہ نہیں رہے گی۔

جو کچھ میں کہہ چکا ہوں اس سے ظاہر ہے کہ قیام پاکستان اردو کے حق میں نیک فال ہے۔ اردو ہماری مادری زبان نہ سہی لیکن وہ ہماری ایک ملکی اور قومی زبان ہے۔ بدیں وجہ اسے تمام مقامی بولیوں میں ممتاز حیثیت حاصل ہے اور رہے گی من حیث القوم ہم اسے کبھی اتنا قریب نہیں پائیں گے جتنا کہ مقامی بولیوں کو پاتے ہیں۔ لیکن مغربی علوم و فنون اس میں بدستور داخل ہوتے رہیں گے۔ جن کی وجہ سے اس کی وسعت اور اسلوب بیان میں لچک اور تنوع کا اضافہ ہوتا رہے گا۔ پھر چونکہ ہماری زبان نے فارسی اور عربی سے رشتۂ عقیدت استوار کر رکھا ہے ان مطالب اور معانی کے اظہار کے لئے ہم ان زبانوں کے الفاظ داخل زبان کرتے چلے جائیں گے۔ نیز ہماری بولیوں کی قربت کی وجہ سے خاص کر پنجابی۔ سندھی اور پشتو الفاظ اس میں داخل ہوتے رہیں گے۔ یہ الفاظ بیشتر خاص خاص علاقوں تک محدود رہیں گے۔ لیکن یہ توقع کی جاتی ہے کہ ان میں سے بعض اپنی حدود سے باہر نکل کر عام طور پہ اردو کا حصہ بن جائیں گے۔

علاوہ ازیں، جیسا کہ میں پہلے کہہ آیا ہوں، اردو کی پرانی روایات دن بدن کمزور ہوتی چلی جائیں گی اس لئے یہ امر بالکل قرین قیاس ہے کہ اردو کے مخصوص لب و لہجہ اور تلفظ میں بھی فرق آجائے گا۔ آجکل ہم دہلی یا لکھنؤ کے لب و لہجہ اور تلفظ کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ لیکن جب ان شہروں کی روایات مٹ جائینگی تو صحیح تلفظ کے لئے ہمیں ایک زندہ روایت کی بجائے لغات کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ بدقسمتی سے ہماری لغات نہایت دقیانوسی اصولوں پہ مرتب ہوئی ہیں۔ اور عام طور پہ مروجہ تلفظ کی بجائے فارسی اور عربی کے قدیم تلفظ درج کر دئے جاتے ہیں۔ حالانکہ بعض حالتوں میں اہلِ زبان نے ان میں تصرف کیا ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ سوائے اس کے کہ تلفظ میں بہت سی تبدیلیاں واقع ہو جائیں گی۔

---

[1] یہ ایک خالص پاکستانی زبان ہے جس کا سلسلہ شیر افضل جعفری نے شاعری میں بہت آگے بڑھایا ہے۔ سید فیاض محمود، منٹو، اے حمید، غلام الثقلین نقوی اور کئی لکھنے والوں نے خصوصاً جمیلہ ہاشمی نے اس رجحان کو نمایاں ترقی دی ہے۔
(مدیر)

اردو کی مسلمہ روایات سے انحراف کا ایک اور بھی سبب ہو سکتا ہے۔ یہ سبب نفسیاتی ہے۔ کل تک "اہلِ زبان" ہماری تحریر اور تقریر کو ہدف استہزا بناتے رہے۔ انہیں اپنے اہلِ زبان ہونے پر ناز تھا جس کی وجہ سے ان کے خلاف اندر ہی اندر ایک دبی ہوئی بغاوت اور تناؤ کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ اب چونکہ دہلی اور لکھنؤ کا عروج قصۂ پارینہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ ہمارے مصنف ان قیود کو خاطر میں نہیں لاتے اور زبان کے آزادانہ استعمال پر مصر ہیں۔

میں اس کشاکش کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا جب عنقریب اہلِ زبان ہی نہ رہیں گے تو یہ کشمکش بھی دور ہو جائے گی۔[1]

ایک لحاظ سے اردو کی حیثیت بالکل نرالی ہے۔ وہ پاکستان کی سرکاری اور بلادلی زبان ہے۔ لیکن وہ ملک کے کسی حصے میں بطور مادری زبان نہیں بولی جاتی۔ اسے بطور بدیسی زبان سیکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ بظاہر اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی لیکن غور کرنے پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ یہ اس کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ ایک ایسی کمزوری جس کا علاج نہیں۔ ہر زندہ زبان کا کہیں نہ کہیں بولا جانا ضروری ہے۔ اور اسی میں اس کے ارتقا کا راز مضمر ہے۔ یہ ہرگز ضروری نہیں کہ وہ تمام ملک کی مشترکہ زبان ہو۔ یا اس کے بیشتر حصہ میں بطور مادری زبان استعمال ہو۔ اس کے ارتقا کے لئے صرف اس امر کی ضرورت ہے کہ وہ کسی نہ کسی شہر، طبقہ یا گروہ کی مادری زبان ہو۔ اگر کسی جماعت کے افراد جن کی ایک مشترک زبان ہے ایک جگہ مل جل کر رہتے ہیں تو ان کی قوت تخلیق میں ان کا اجتماعی شعور بروئے کار آتا ہے لیکن اگر انہیں منتشر کر دیا جائے تو ان کی اختراعی طاقتیں سلب ہو جاتی ہیں یہی حال آجکل اردو کا ہے۔ وہ پاکستان کے کسی حصہ کی مادری زبان نہیں۔ اور اگرچہ اس کے بولنے والے لاکھوں کی تعداد میں ہیں لیکن وہ ایک دوسرے سے الگ تھلگ پڑے ہیں۔ اس لئے ان کی قوتِ اختراع و ایجاد کام میں نہیں آ سکتی۔ باقی رہی پاکستان کی اکثریت جو اسی ملک کی مختلف بولیوں کو بطور مادری زبان استعمال کرتی ہے اور جس کے لئے اردو محض سرکاری زبان ہے وہ اسے تخلیقی طور پر نہیں بلکہ تقلیداً استعمال کرتی ہے اس سے یہ مراد نہیں کہ اہلِ زبان قواعد و ضوابط کی پابندی سے آزاد ہیں اور زبان میں من مانے تصرفات کرتے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ وہ اشخاص جو کسی زبان کو بطور اجنبی زبان سیکھتے ہیں وہ اس کے قواعد سے سرمو تجاوز نہیں کرتے لیکن اہلِ زبان قواعد کی حدود میں رہتے ہوئے بھی اس میں نئی راہیں پیدا کرتے ہیں۔ جو بعد میں قواعد میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ وہ نئے الفاظ و محاورات بناتے ہیں جنہیں بعد میں سندِ قبول حاصل ہو جاتا ہے۔ بہرحال تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ جب کوئی زبان مادری زبان کے مقام سے گر جاتی ہے تو اس کی ترقی بھی ختم ہو جاتی ہے۔

جب تک لاطینی روم کی زبان رہی وہ بڑھتی اور ترقی کرتی رہی۔ لیکن جب حملہ آوروں نے روم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور اس کے بولنے والے باقی نہ رہے تو اس کا عروج بھی ختم ہو گیا۔ اس کے بعد صدیوں تک لاطینی مذہب اور علوم و فنون کی زبان رہی اور خانقاہوں اور مدارس میں اس کی تحصیل کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن وہ جہاں تھی وہیں رہی۔ یہ سچ ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں، اور اس کے بعد بھی، اس میں حسبِ ضرورت اضافے ہوتے تھے اور پرانے مواد کی ترتیب سے نئے الفاظ مرتب ہوئے لیکن یہ عمل سراسر مصنوعی تھا۔ یہی عمل اردو میں بھی جاری رہے گا۔ علمی ثقافتی اور سیاسی ضروریات کے پیشِ نظر نئے الفاظ اور اصطلاحیں وضع کی جائیں گی۔ اور معلوم ہو گا کہ زبان آگے بڑھ رہی ہے لیکن نہ تو اس کے قواعد میں تبدیلی ہو گی اور نہ اس میں نئی ضرب الامثال اور محاورات ہی پیدا ہوں گے۔ انگریزی اسالیب بیان سے متاثر ہو کر نئی تراکیب رواج پائیں گی۔ لیکن محاورہ، گرامر، معانی اور تلفظ میں کوئی معتدبہ تبدیلی نہ ہو گی۔

اردو زبان کو جس خطرے کا سامنا ہے وہ یہ نہیں کہ وہ ایک مخلوط زبان بن جائے گی۔ کیا وہ اس وقت ایک مخلوط زبان نہیں؟ اور اگر عربی اور فارسی کے مستعار الفاظ اس کے وقار کے منافی نہیں تو دیسی بولیوں کے الفاظ اس کی قدر و منزلت کے کیسے منافی ہو سکتے ہیں؟ یہ خیال کہ اردو میں دیسی بولیوں کے الفاظ کی بھرمار سے اردو ایک مخلوط زبان بن جائے گی، ایک بے بنیاد سی بات ہے۔ صحیح ہے ہماری بولیوں کے الفاظ اردو میں ضرور داخل ہوں گے۔ لیکن

---

[1] محض لسانی اور محلی پہلو کے علاوہ اس کا ایک اور نہایت اہم پہلو بھی ہے۔ اردو محض صحت لفظی اور قواعد زبان سے آگے بڑھ کر ادبی، ذوقی اور تخلیقی امور پر توجہ ہے اس وقت قدیم و جدید نگاہ میں سب سے نمایاں وجہ اختلاف یہی ہے۔ (مدیر)

یہ مواد اتنا ہوگا جتنا آٹے میں نمک۔ ایک اطالوی ماہر لسانیات کا کہنا ہے کہ جب ہم کوئی اجنبی زبان سیکھتے ہیں تو وہ اجنبی زبان نہیں بلکہ ہماری اپنی زبان مخلوط بنتی چلی جاتی ہے۔ اس کلیہ کی توثیق اس امر ہوتی ہے کہ جب ہم انگریزی بولتے ہیں یا لکھتے ہیں تو اپنی زبان کے الفاظ اس میں ہرگز داخل نہیں کرتے لیکن اردو یا پنجابی بولتے وقت ہم انگریزی الفاظ بے محابا بولتے چلے جاتے ہیں یہی کلیہ اردو پر بھی صادق آتا ہے۔ اردو سے بولتے یا لکھتے وقت ہم حتی الوسع کوشش کریں گے کہ دیسی الفاظ اس میں داخل نہ ہوں۔ ما ناکہ بولیوں کے الفاظ پہلے پہل بچوں کی زبان پر چڑھ جائیں گے لیکن اس کا ازالہ ممکن ہے۔ علمی اور ادبی سطح پر اختراع و ایجاد کا سلسلہ بند نہیں ہوگا۔ قیاس کی بنا پر حسب ضرورت اصطلاحات اور مشتقات وضع ہوتے رہیں گے۔ یا انہیں عربی اور فارسی سے مستعار لیا جائے گا۔ نیز انگریزی کا اثر مدت تک جاری رہے گا اور انگریزی نحوی تراکیب و اسالیب داخل زبان ہوتے رہیں گے۔ لیکن میری رائے میں اس سلسلے میں جو کچھ انگریزی سے لینا تھا لے لیا گیا ہے اور مستقبل میں کسی معتدبہ اضافے کی نہ توقع ہے اور نہ ضرورت ہی ہوگی۔

باقی رہا زبان کا قدرتی ارتقا یعنی تخلیق و اختراع، جذب و انجذاب، ترک و اختیار کے وہ قدرتی وسائل جو کسی خاص طبقہ کی کاوشوں سے تعلق نہیں رکھتے۔ بلکہ جنہیں کسی ملک کے باشندے من حیث القوم غیر شعوری طور سے پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً زبان کی ہیئت اور ساخت، محاورہ، صرف و نحو، تلفظ اور معانی، الفاظ میں تبدیلیاں اور دیگر تصرفات۔ اس میدان میں ترقی کے کوئی امکانات نظر نہیں آتے۔ زبان کی قدرتی نشوونما ابتدائے تہذیب سے انہیں لوگوں کا حصہ رہا ہے جو اسے بحیثیت مادری زبان کے استعمال کرتے ہیں۔ اور چونکہ اردو ہماری مادری زبان نہیں اور نہ بن سکتی ہے۔ لہٰذا اس کی قدرتی نشوونما رک جائے گی۔ میں اوپر کہہ آیا ہوں کہ کسی زبان کے بولنے والے قواعد و ضوابط کی پابندی کے باوجود اس کے آزادانہ استعمال سے اس میں تبدیلیاں اور اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ہم لوگ اردو کو تقلیداً استعمال کریں گے۔ لہٰذا اس میں ہماری ارتقائی طاقتیں بروئے کار نہ آسکیں گی۔

جس طرح سماجی زندگی میں جمہور کی خوشنودی، ان سے عمدہ تعلقات و روابط کی خواہش اور ان کی ناراضگی یا دشمنی کا خوف وضع داری کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، بالکل اسی طرح استاد کی تنبیہ و سرزنش، ہمعمروں کا ٹھٹھا اور ہول، بزرگوں کی حوصلہ افزائی زبان کے استعمال میں بے راہ روی کے مانع آتے ہیں۔

اوپر کے مباحث کا خلاصہ یہ ہے:

اردو زبان نے ابھی ابھی ایک نئی منزل میں قدم رکھا ہے۔ اور اپنے حالاتِ گردوپیش سے متأثر ہو کر وہ نئے ارتقائی منازل طے کر رہی ہے۔ اگرچہ یہ نقوش ابھی تک مبہم اور غیر متعین ہیں اور عام طور پر ہمیں ان کا احساس بھی نہیں پھر بھی ان کا پتہ لگانا کوئی مشکل کام نہیں وہ سطح زبان پر آہستہ آہستہ ابھر رہے ہیں اور جوں جوں وقت گذرتا جائے گا، وہ اور واضح ہوتے چلے جائیں گے۔

اردو کا رشتہ دہلی اور لکھنؤ سے منقطع ہو چکا ہے۔ کچھ ضرورتوں کی بنا پر اور کچھ غیر شعوری طور پر مقامی بولیوں کے خاص خاص الفاظ اردو میں داخل ہونے چلے جائیں گے۔ یہ الفاظ عام طور پر ان اصطلاحات پر مشتمل ہوں گے جو خاص خاص علاقوں کی قدرتی ساخت، پس منظر، روایات، قدرتی اور صنعتی پیداوار، اشیائے خورد و نوش، لباس، رسوم اور عقاید سے تعلق رکھتے ہیں۔ غالباً ان کا دائرۂ استعمال انہیں علاقوں تک محدود رہے گا۔ لیکن بالکل ممکن ہے کہ چند وجوہات کی بنا پر ان میں سے کئی ایک اپنے محدود دائرہ استعمال سے باہر نکل کر زبان میں ایک مستقل حیثیت اختیار کر لیں۔ تلفظ کے بارے میں ابھی تک دہلی اور لکھنؤ کا تتبع رہا ہے۔ اور اسے موجب افتخار خیال کیا جاتا تھا لیکن وہ دن دور نہیں جب بیاہ شادی اور باہمی میل جول کی وجہ سے ہمارے ہاں ایک مخلوط آبادی پیدا ہو جائے اس کے بعد اردو شاید ٹھیٹھ پنجابی، سندھی اور پشاوری لہجہ میں بولی جائے۔

اقدار کا مسئلہ

ریاض احمد

سب سے پہلے آپ کے سامنے اس امر کا اعتراف کر لینا چاہئے کہ اس عنوان کے سلسلے میں جو کچھ اکابر علماء نے لکھا ہے وہ سب کا سب اس وقت پیش نظر نہیں ہے۔ اور نہ مجھے اس پر پوری طرح آگاہی حاصل ہے ان سطور کی نوعیت زیادہ تر ایک عامی کے ابتدائی تاثرات کی سی ہے۔

اقدار کا مسئلہ بنیادی طور پر اخلاقیات کا مسئلہ ہے۔ وہ یوں کہ سب سے پہلے ایک معاشرہ میں اخلاقی پابندیاں ہی ان اقدار کی نشاندہی کرتی ہیں جنہیں حاصل کرنے کی انسان سعی کرتا ہے۔ اقدار کا تعلق اس طرح براہ راست عمل سے قائم ہو جاتا ہے۔ لیکن آپ اس بات کو شاید اس طرح قبول نہ کریں کہ اقدار کو بالعموم ایک مجرد حقیقت کی حیثیت ہی سے پیش کیا جاتا ہے۔ عمل تو ایک انفرادی نوعیت کی چیز ہے۔ جو نہ صرف یہ کہ مدارج حیات کے اختلاف کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ بلکہ اس میں یوں بھی آفاقیت شاید ممکن نہیں۔ آخر یہ کہ اصول مطلق ہے کہ دنیا بھر کے انسانوں کا عمل ایک خاص واقعہ کی رعایت سے ایک ہی انداز میں رونما ہو، اور قدر کے لئے یہ ضروری نظر آتا ہے کہ اس میں ایک ہمہ گیری ہو۔ اس کا اطلاق مختلف افراد اور مختلف مقامات پر ایک ہی طرح ہو سکے۔ اس لئے ایک خالصتہً علمی قدر رفتہ رفتہ تعمیم کے سانچوں میں ڈھلتی ڈھلتی بالآخر تجرید کی حدود میں داخل ہو جاتی ہے۔ حقیقت مطلقہ کے قریب رکھنے کے لئے اسے عملی انفرادیت کو ترک کرنا پڑتا ہے۔ اقدار کے سلسلے میں اختلاف کا سب سے بڑا سبب یہی ہے۔ بہر حال یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ بات یہاں سے چلی تھی کہ قدر بنیادی طور پر اخلاقیات کا مسئلہ ہے۔ اخلاق ایک ایسی چیز ہے، جس کے متعلق لغاوت گویا ہر شخص کا حق ہے۔ آخر یہ کیوں ہو کہ ایک نام نہاد ضابطۂ اخلاق کی پابندی کے لئے شخصی آزادی، شخصی عزت اور شخصی خواہشات کو ترک کر دیا جائے۔ اخلاقیات کے علماء اس مسئلہ پر بہت پریشان رہے ہیں۔ آخر ان میں سے ایک نے بنیادی اخلاقی قدر کے لئے زیادہ سے زیادہ افراد کی زیادہ سے زیادہ خوشی کا اصول دریافت کیا۔ اس زیادہ سے زیادہ میں پھر وہی قلیل سے قلیل بدقسمت جماعت غیر مطمئن رہ جاتی ہے جسے اس کا حق کوئی نہیں دلاتا۔ ایثار و قربانی بھی ایک قدر ہے۔ لیکن اس قدر کو اسی اصول کے حوالے سے زیادہ سے زیادہ افراد کی زیادہ سے زیادہ قربانی کے فارمولے میں کسی نے نہیں ڈھالا۔ ایک اتنی بڑی قدر سے آخر ایک اتنی بڑی تعداد کو محروم رکھنے میں کیا مصلحت تھی۔ ایک معمولی سی حقیر سی ہنگامی نوعیت کی چیز جسے آپ خوشی کہتے ہیں اس کے لئے ایک اتنی بڑی قدر جسے آپ ایثار کہتے ہیں۔ کیوں قربان کر دی جاتی ہے۔ ایک اور بات سوچئے۔ خوشی ایک قسم کا عملی نتیجہ ہے۔ ایثار ایک قسم کا سلبی مفروضہ ہے۔ ایک چیز حاصل ہوتی ہے۔ ایک چیز سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ جو کچھ تھا۔ یا جس کے ہونے کا امکان تھا، اسے بھی تلف کر دیا جاتا ہے۔ ظاہر یہ ہوا کہ اقدار دو نوعیت کی ہیں ایک مثبت، ایک منفی۔

مثبت اقدار کے حصول کے لئے جد و جہد کی جاتی ہے۔ انہیں آپ اوامر کہہ لیجئے۔ منفی اقدار ایک قسم کی پابندی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ جو ہمیں بعض ایسی چیزوں سے محروم رہنے کی تلقین کرتی ہیں۔ جنہیں ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ پابندی محض اس لئے لگائی جاتی ہے کہ بعض دوسرے لوگ ان چیزوں کے حصول سے محروم نہ رہ جائیں لیکن مثبت اقدار کی جد و جہد میں یہ تفاوت نہیں ملتا، کہ ایک حاصل کرے اور دوسرا کھو دے۔ اس طرح مثبت اقدار کا تعوق خود بخود ثابت ہو جاتا ہے اور اس پر ہمیں یقیناً خوش ہونا چاہئے کہ آخر مثبت ہی نے فتح پائی۔ لیکن جو سوال ذہن میں کھٹکتا رہتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ منفی اقدار میں ایک سے چھین کر دوسرے کو دینا کیوں روا رکھا جاتا ہے۔ ایک بڑی سطحی سی مثال لیجئے۔ ایک شخص کے پاس

دولت ہے۔ دوسرا اس دولت میں سے ایک حصہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس حصے سے پہلے شخص کی محرومی کوئی اتنا بڑا المیہ نہیں بنتا۔ لیکن دوسرا شخص جو اس سے مستقلاً محروم رہتا ہے۔ اس کے حق میں یہ یقیناً ایک المیہ بن جاتا ہے۔ فقر و فاقہ اور حاجت کو کوئی معاشرہ روا نہیں رکھنا چاہتا۔ لیکن عملاً اقدار کی رعایت سے اسی کی تلقین کرتا ہے۔ یہاں ایک اور تصور کا اضافہ کرنا پڑے گا۔ جو کہ ایک اور قدر سے منسلک ہے۔ یعنی حصول سے کہ بعض ذرائع جائز ہوتے ہیں اور بعض ناجائز۔ پابندی جائز ذرائع پر نہیں ہے، صرف ناجائز ذرائع پر ہے۔ لیکن جائز و ناجائز کا اصول ہمیشہ یکساں نہیں رہتا ہے؟

تھا جو نا خوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

اور اسی پر بس نہیں۔ فرض کیجئے استحصال اگر جاگیردار کی طرف سے ہو تو نا جائز۔ اور اگر ایک وقت میں اسی استحصال کو کوئی باغی گروہ، عمل میں لائے تو سنگین۔ دونوں ایک سے عمل میں مصروف رہتے ہیں۔ دونوں اپنے طور پر استحصال کو جائز کہتے ہیں۔ دونوں کے حامی بھی نکل آتے ہیں۔ دونوں کے مخالف بھی نکل آتے ہیں۔ اقدار کا اختلال بدستور قائم رہتا ہے۔

یہ اختلال ظاہر ہے کہ عملی حالات ہی کے حوالے سے پیدا ہوتا ہے، اگر عملی امکانات کو خارج کر دیا جائے اور پھر اقدار کا ایک نظام وضع کیا جائے تو شاید یہ مشکل باقی نہ رہے۔ اسی لئے اقدار اخلاقیات کی حدود سے نکل کر مابعد الطبعیات کے دائرہ عمل میں جا داخل ہوتی ہیں۔ انسان، کائنات اور خالق کائنات کے باہمی رشتے کے حوالے سے اقدار کے تعین کی کوشش میں صداقت مطلقہ کو نصب العین بنایا جاتا ہے۔ اور اسی صداقت مطلقہ سے خیرِ مطلق کا تصور اخذ کیا جاتا ہے۔ صداقت اور خیر اس مرحلے پر پہنچ کر عمل سے اپنا رشتہ منقطع کرنے پر مصر نظر آتی ہے اگر عمل کو درمیان سے نکال لیا جائے، تو پھر صداقت یا خیر کس مصرف کی رہ جاتی ہیں۔ صرف ایک چیز باقی رہ جاتی ہے۔ صداقت اور حقیقت کا شعور ایک ایسی آگاہی، ایک ایسا اطمینان، ایک ایسی طمانیت بخشتی ہے جس کے سامنے عملی حصول اور بے حاصل، بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اوامر اور نواہی کا ایک پورا نظام مذہب میں موجود ہے۔ اس کے ساتھ اوامر کے سلسلے میں بشارتیں اور نواہی کے سلسلے میں عذاب کا خوف بہ صراحت موجود ہے۔ ثواب و عذاب کا یہ وعدہ ایک ایسے عالم سے تعلق رکھتا ہے جس پر یقین ایمان کی شرط اول ہے۔ لیکن اس عالم کا عملی تجربہ کسی کو بھی حاصل نہیں، اس طرح یہ عالم پھر ایک تجریدی حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔ مثلاً اقبال نے بھی غالباً یہ کہا ہے کہ جنت و دوزخ مکان کے اس تصور سے ماوراء ہیں جس سے ہم آشنا ہیں۔ یہ شاید محض مقاماتِ نفس ہیں۔ اس کے لئے اگر آپ سند چاہیں تو اس ارشاد باری سے استنباط کرنا جائز اور برمحل ہوگا جس میں اولیاء اللہ کی صفت "ولاخوف علیہم ولا ہم یحزنون" ارشاد کی گئی ہے۔ اس استدلال کو اگر آپ قرین قیاس سمجھتے ہوں تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عملی طور پر اقدار کے اختلال کو رفع کرنے کے لئے اقدار کی تجریدی حیثیت کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اس تجریدی حیثیت میں ان کے نتائج جس عالم میں ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ عالم خارجی اعمال کی رزمگاہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک داخلی، ذہنی، باطنی، یا نفسی کیفیات کا عالم ہے۔ جو شخص حق اور صداقت پر آگاہ ہوتا ہے۔ اس کے لئے منفعت اور نقصان کے پیمانے بدل جاتے ہیں، موت و حیات کی حیثیت مٹ جاتی ہے۔ کبھی یوں ہوتا ہے کہ موت اس کے لئے عین حیات بن جاتی ہے۔ کربلا کی سختیاں اس کے لئے بے معنی ہو جاتی ہیں۔ ایک عارضی اور ہنگامی حیات کے لمحات اپنی کشش کھو دیتے ہیں ایک جاودانی حیات اپنی مسکراتی ہوئی فضائیں اس کے قدموں پر نچھاور کر دیتی ہے۔ موت و حیات کا فرق مٹ جاتا ہے۔ قوت و صولت، جاہ و حشمت۔ دولت و ثروت، جاہ و مال، غربت و مسکنت۔ بیچارگی اور بے بسی کے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہیں اور یوں ایک نئی قدر کا احساس انسانیت کو ارزانی ہوتا ہے۔ اس احساس کی نغمگی اور سرمدی سرود کو زندہ رکھنے کے جتن کئے جاتے ہیں۔ گویا ہم ایک ایسے مقام پر آ پہنچتے ہیں جہاں قدر کا معیار صرف احساس رہ جاتا ہے۔ قدر خارجی اور عملی حدود سے نکل کر خالصتاً ذہنی اور نفسی حدود میں داخل ہو جاتی ہے کچھ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس شخص کے ذہن میں بھی شاید یہی تصور تھا جس نے زیادہ سے زیادہ افراد کی زیادہ سے زیادہ مسرت کے پیمانے سے اخلاقی قدر کو متعین کرنے کی کوشش کی تھی مسرت محض ایک نفسی کیفیت ہی تو ہے۔ سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ اس کیفیت کے حصول کے لئے جو اسباب ذمہ دار ہوتے ہیں انہیں خارجی اور عملی دنیا سے نکال کر ذہنی عوامل اور نتائج سے منسلک کیا جا سکتا ہے

یا نہیں۔ مذہب کا حوالہ اوپر آچکا ہے۔ زمرۂ "لایحزنون" میں منسلک ہونے
والے شاید ذہنی عوامل اور نتائج ہی سے اپنی مسرتوں کو اخذ کرتے ہیں۔
مذہب کی اصطلاح میں آپ اسے روحانی مسرت اور اطمینان کہہ لیجئے۔

اس سارے تذکرے میں ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ عمل سے
نکل کر ذہن اور نفس کی دنیا میں آجائیں اور خارجی واقعات سے ہٹ
کر نفسی واردات پر توجہ کو مرتکز کرسکیں۔ لیکن اس کوشش میں ایک
چیز رہ ہی جاتی ہے۔ اسے آپ اصطلاحاً جمالی قدر کہہ لیجئے۔ مسرت کا
تعلق خواہش سے ہے یا خواہش کے حصول سے۔ عملی اندازہ کچھ
اس قسم کا ہے کہ مسرت خواہش کے حصول سے وابستہ ہے۔ دولت
پاکر خوشی ہوتی ہے۔ محبوب سے مل کر مسرت ہوتی ہے۔ لیکن دولت
پاکر کوئی مطمئن نہیں ہوتا۔ ۹۹ کے چکر میں پڑ جاتا ہے۔ اگر آپ اسے
صرف ایک مذاق یا لطیفہ سمجھتے ہیں تو یوں کہہ لیجئے کہ "ھل من مزید" کا ٹھگ
بن بیٹھتا ہے۔ محبوب کو پالیتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ وہ بات نہیں
جو اس کے تصور میں تھی۔ یا کئی اور جھگڑے کھڑے ہوجاتے ہیں ایک
شاعر کا قول یہ ہے کہ ؎

همه عمر با تو قدح زدیم و نه رفت رنج خمار ما
چه قیامتی که نمی رسی ز کنار ما بکنار ما

دوسرے نے کہا ہے ؎

گر ترے دل میں ہو خیال، وصل میں شوق کا زوال
موج محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

تیسرے نے لہجہ بدلا ؎

عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو، ہجر میں لذتِ طلب

حصول اور تصرف میں اگر کوئی بات ہوتی تو تینوں شعر بے معنی
ہوکر رہ جاتے۔ کہانی یوں ہے کہ خواہش کرنے والے کو جب یہ قوت
مل گئی کہ وہ جس چیز کو چھُولے وہی سونے کی ہوجائے تو اس کی ساری خوشی
مٹ گئی۔ اور جب بیمار شہنشاہ کو ایسے آدمی کی قمیص درکار ہوئی جو
خوش ہو تو، وہ آدمی جو خوش تھا، قمیص ہی نہ رکھتا تھا۔ گوتم بدھ کے
پاس جب غم کی ماری ہوئی عورت آئی تو اس نے نروان اس خیال
سے حاصل کیا کہ موت کا دکھ تو ہر کسی کا مقدر ہے۔ مسرت کی فراوانی اسے
تسکین نہ بخش سکتی تھی، دکھ کی ہمہ گیری اسے سکون عطا کرگئی۔ تو

پھر مسرت کو کہاں ڈھونڈیں۔

ایک شخص نے کہا کہ آرزو کو مٹا دو۔ تم خوش ہوجاؤ گے۔
لیکن نفس نے بار بار کہا کہ مسرت کی تلاش تو مجھے ہے۔ اور میری مسرت
میری خواہش سے وابستہ ہے۔ جب خواہش مٹ گئی تو مسرت کیسے کر
کیا کروں گا۔ بدھ نے مسرت کو یوں سمجھا کہ جب آواگون کا چکر مٹ
جائے گا، تو مسرت ہی مسرت رہ جائے گی۔ آواگون کا چکر زندگی
کا چکر ہے۔ نروان مرگ محض ہے۔ نہ زندگی، نہ موہ، نہ مایا، نہ خواہش
نہ مسرت۔ اوامر و نواہی دونوں سلسلے یکسر منقطع۔ خلائے محض میں کسی
چیز کا بھی تصور ممکن نہیں۔ مسرت تو در کنار، اطمینان بھی اختیاری ہی
رہ جاتا ہے۔ توحید کے پرستاروں نے اس گتھی کو یوں سلجھایا کہ حقیقتِ
کبریٰ سے مکمل وصال عین مسرت ہے ؎

جب کہ تجھ بن کوئی نہیں موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

یعنی نفس پھر ایک طرح سے بغاوت کر رہا ہے۔ اسے
اپنی خواہش اور اپنی خواہش کے مقصود کا احساس ہے۔ لیکن
اس کے ساتھ اسے اطمینان کی بھی تلاش ہے۔ اس تذبذب کا عذاب
بڑا ہی جاں کاہ ہوتا ہے۔ نہ یہ اوامر سے روگردانی ہے۔ نہ نواہی
کا ارتکاب لیکن اس کے ساتھ وہ عذاب عظیم موجود ہے۔ جسے کوئی
خارجی پیمانہ نہیں ماپ سکتا۔ یہ اقدار کا اختلال نہیں ہے نفس
کا اختلال ہے۔ جو اقدار کا ماخذ بھی ہے۔ اور محک بھی۔

بات الجھ چلی ہے۔ یہ قصہ جمالی اقدار کے تصور سے چلا تھا
اور یہاں جاکر ختم ہوا کہ خواہش اور اقدار کی جنگ میں ذہنی اختلال
کا شکار ہوجاتا ہے۔ اب نہ خواہش سے انکار ممکن ہے کہ فی الواقعہ
موجود ہوتی ہے۔ نہ اقدار سے انکار ممکن کہ ایک جبرِ مسلسل کا نام
ہے۔ جو باہر سے نفس پر عاید ہوتا ہے۔ اب تلاش اس امر کی
ہوئی کہ خواہش بھی رہے۔ اور اقدار کا جبر بھی باقی نہ رہے۔

ایک لمحے کے لئے رک جائیے۔ اور نفسیات کا وہ اصول
یاد کیجئے۔ جس کی رو سے اعمال کی اصل جبلت ہے۔ اعمال کی نہیں
بلکہ اعمال کے محرکات کی۔ عمل تو اضطراری بھی ہوتا ہے اور ارادی بھی۔

اضطراری عمل محرک اور عمل دونوں کے شعور سے غافل رہتا ہے۔ ارادی عمل دونوں پر آگاہ ہوتا ہے۔ جبلت محرک سے اغماض کرتی ہے۔ لیکن عمل سے آگاہی تو ایک طرف رہی۔ عمل کے نشے میں مست ہو جاتی ہے۔ جبر و اختیار کی بحث یہاں چھیڑنے کا محل نہیں ہے۔ لیکن جبلت جب تک محض جبر رہتی ہے۔ مثلاً حیوانی سطح پر تو وہ عمل اور محرک، اور اس سے وابستہ کیف میں تمیز نہیں کرتی۔ جب اختیار کی حدود میں، مثلاً انسانی سطح پر داخل ہوتی ہے تو محرک عمل اور کیف میں تمیز کرتی ہے۔ محرک کے عملی مقاصد اور نتائج کو نظر انداز کرتی ہے۔ اور عمل کو مقصودِ خاطر بنا لیتی ہے کہ کیف و مستی عمل کے ساتھ از خود وابستہ ہوتے ہیں۔ ایک جذباتی یا شہوانی سطح پر اس کی نوعیت کچھ ہوس یا خود غرضی کی سی ہوتی ہے۔ یعنی زیادہ سے زیادہ تمتع کی تمنا۔ اسی تصور کو جب تجریدی کسوٹی پر کسا جاتا ہے، تو اس کی صورت یوں بنتی ہے کہ کسی چیز سے خاص اس چیز کے لئے شغف یا انہماک ؎

جس کا عمل ہو بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے
طائرک بلند بال، دانہ و دام سے گزر

اب قدر کے تصور سے محرک اور نتیجہ دونوں خارج ہوتے ہیں۔ صرف قدرِ محض باقی رہ جاتی ہے۔ قدر کا یہ تصور مختلف سطحوں پر مختلف روپ دھارتا ہے۔ مذہب میں جزا و سزا کے خیال سے نہیں بلکہ اعلائے کلمۃ الحق کے لئے، معبود کی خالص، بے لوث محبت کے لئے۔ فلسفہ میں تلاشِ حق و صداقت کے لئے۔ سائنس میں نظریات کی تشکیل و تعمیر کے لئے، دنیوی معاملات میں مروجہ معاشری اقدار کی سربلندی کے لئے، میدان جنگ میں بہادری کے جوہر کے لئے یا شہادت کی جستجو کے لئے، لیکن ان سب مقامات پر نتائج پر نظر ہمیشہ مرکوز رہتی ہے۔ لیکن ابھی ایک اور سطح باقی ہے، جس میں نتائج کی بھی مکمل نفی ہو جاتی ہے۔ یہ سطح جمالیاتی سطح ہے۔ جہاں محرکات کو صرف ان کی جذباتی حیثیت ہی میں پہچانا جاتا ہے اور نتائج سے یکسر قطعِ نظر کر لیا جاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر دکھ یا مسرت مقصودِ خاطر نہیں رہتے۔ صرف ان سے وابستہ احساس اور تاثر کی حیثیت بنیادی ہوتی ہے۔ اس دنیا میں جبلی عمل سے وابستہ سرشاری سب سے بڑی قدر بن جاتی ہے۔ اسی سرشاری کو محرک اور نتیجہ سے علیحدہ کر لیا جاتا ہے اور پھر محض اسی کے حصول کو مطمحِ نظر بنا لیا جاتا ہے۔ جمالیاتی عمل میں حصول اور تمتع بے معنی لفظ بن جاتے ہیں۔ حسی تجربات اور واردات مقصود بالذات بن جاتے ہیں، جہاں دوسری سطحوں پر تعقل و ادراک یا نتائج و عواقب عمل کے رخ کو معین اور منضبط کرتے ہیں وہاں جمالیاتی عالم میں تخیل راہبری کرتا ہے۔ جب جمالیاتی اقدار کا مطمحِ نظر صرف جسم ہو وہاں حسی تخیل اپنے کرشمے دکھاتا ہے۔ عمل کے لئے نت نئی محرک صورتیں تخلیق کرتا ہے۔ جہاں جسم کے تقاضے ذرا دھیمے پڑے اور خود نفسی کیفیتوں کا ادراک بڑھا وہاں وجدان آگے بڑھتا ہے۔ جذب و سرور، سوز و مستی اور ایک لگن جو کسی وقت جبلی سطح پر صرف عمل کے تابع مہمل تھے، اب عین عین بن جاتے ہیں اور اس سارے عمل کا حاصل کیا ہوتا ہے۔ صرف ایک احساس یا ایک جذبہ کی شمع کا فروغ۔ حسن جبلی محرکات کا ذہنی بدل ہے۔

جمالیات کے مظاہر فنون لطیفہ ہیں۔ ان سے ہمیں پھر دو قدریں حاصل ہوتی ہیں۔ ایک مثبت دوسری سلبی یا منفی۔ پہلی کا نام حسن یا عشق قرار پاتا ہے۔ دوسری کو رندی کہہ لیجئے۔ ان معنوں میں کہ یہ نواہی کے ارتکاب سے باز رکھتی ہے۔ جمالیات میں نواہی کی ذیل میں وہ تمام محرکات اور عمل شامل ہو جاتے ہیں جن کا منبع و ماخذ یا جن کا مقصود جذبے یا احساس کے علاوہ کچھ اور ہو ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے

جمالیات کے اس اصول کو اگر آپ صرف شعر و ادب اور افسانہ و حکایات تک محدود رکھیں تو اس کی حیثیت سحر و افسوں کی رہ جاتی ہے یعنی یہ محض ایک اضافی یا فراری چیز بن جاتی ہے۔ اور یوں حسن یا عشق کی مثبت قدر بھی متزلزل ہونے لگتی ہے۔ لیکن جمالیات کے یہ مظاہر تو محض درسگاہیں ہیں۔ اس حسن طبیعت کی تربیت کے لئے طالبعلمانہ عشق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جیسے کسی نے 'عجم کا حسنِ طبیعت، عرب کا سوز دروں' کہا تھا۔

آغاز میں قدر کو ضابطہ اخلاق کا مترادف قرار دیا گیا تھا۔ اور مشکل یہ درپیش تھی کہ ضابطہ اخلاق اضافی یا ہنگامی حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔ جس سے مستقل قدر اخذ نہیں کی جا سکتی۔ جمالیاتی تربیت اگر اس مشکل کا کوئی حل سمجھا دے تو اس کی حیثیت قابلِ قبول ہوگی

بن جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک تو وہ بات یاد کیجئے کہ جب موت کے دکھ کا مداوا موت کی ہمہ گیری میں نظر آیا تھا۔ اور دوسری یہ کہ خواہش مٹ جائے تو غم مٹ جاتا ہے۔ یعنی احساس اور جذبہ کی تہذیب میں کسی مستقل قدر کا سراغ مل سکتا ہے۔ اخلاق نے احساس اور جذبے کی تہذیب خارجی دباؤ کے ماتحت کرنی چاہی۔ لیکن نفسیات والوں نے بتایا کہ دباؤ سے ایک وقفہ کے بعد گویا لاوا پھٹ پڑتا ہے اور زلزلے نمودار ہوتے ہیں۔ جمالیات والوں نے یہ بتایا کہ احساس اور جذبے کی تہذیب اس کے اظہار میں ہے۔ اس پر قدغن لگانے سے وہ بپھرتا ہے۔ یا مکر کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے۔ اظہار سے جذبے میں نکھار، سجاوٹ اور سجل پن ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں وسعت اور ہمہ گیری بھی پیدا ہوتی ہے۔ اس میں ایک ایسا شعور جاگتا ہے۔ جو صرف اپنے جذبے ہی کو نہیں پہچانتا۔ دوسرے کے جذبے کا احترام بھی کرتا ہے۔ وہ جلب منفعت اور حصول و ہوس کی حدوں سے آگے نکل کر ایثار کی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے۔ سپردگی کا ایک ایسا عالم وجود میں آتا ہے کہ راضی برضا کی صحیح تصویر روشن ہو جاتی ہے۔

یہ مقام کچھ عینیت پرستی کا سا ہے۔ دلیل کمزور ہوئی جاتی ہے۔ منطق ناقص اور جذباتیت غالب۔ لیکن صرف ایک بات کا اندازہ کیجئے۔ ایک بھکاری کو دھتکار دینے سے اخلاق کا اصول مجروح نہیں ہوتا۔ بھیک مانگنا گناہ ہے۔ ایک ملزم کو سزا دینے پر اخلاق کا ضابطہ اصرار کرتا ہے۔ ایک بچے کے کان اینٹھنے سے اس کا مستقبل سنورتا ہے۔ لیکن بھیک مانگنا گناہ کیوں ہے۔ اقبال کہے گا اس سے خودی کی نفی ہوتی ہے۔ ملزم کو سزا دینا کیوں ضروری ہے؟ اس لئے کہ اس کے جذبات نے دوسروں کے جذبات کی حدود کا احترام نہ کیا۔ بچے کے کان اس لئے اینٹھے گئے کہ اس کے نفس سے طغیان و سرکشی نکل جائے۔ لیکن جس نے فقیر کو دھتکار دیا اس نے فقیر کی خودی کی نفی ہی نہیں کی۔ اس کی خودی کی توہین کی ہے۔ جس نے ملزم کو سزا دی ہے۔ اس نے اسے انسانیت سے خارج اور شعور و احساس سے عاری سمجھا ہے۔ جس نے بچے کے کان اینٹھے ہیں اسے اس بات کا احساس نہیں کہ بچے کی انا بری طرح مجروح ہوئی ہے۔ تذلیل دوسرے کے جذبے کی توہین۔ کسی کی انا کی شکست اخلاقیات میں جرم ہے۔ آپ اس کے ساتھ ایک بڑا سا "مگر" چپکا دیتے ہیں۔ جو بالکل بے معنی ہے۔ قدر کے احساس و شعور کا انداز بدل ڈالئے۔ خودی کو جمالی صفات سے ہمکنار ہونے دیجئے۔ اقدار کے مسئلے کا حل خود بخود نکل آئے گا۔ مانگنے والا کا گدایانہ لہجہ۔ روتا بسورتا بچہ۔ اور ہتھکڑیاں بیڑیاں پہنے ہوئے انسان یقیناً کریہہ المنظر ہیں۔ اگر اس منظر کی کراہت کا احساس بیدار ہو جائے تو آخر کوئی کیوں اس منظر کو وجود میں آنے دے۔ آپ تصویروں میں ان غلاموں کو دیکھتے ہیں جن کی کھال کوڑوں کی مار سے ادھڑ گئی ہے تو آپ کی طبیعت اکراہ کرتی ہے لیکن آپ کو شاید اس امر کا احساس نہیں ہوتا کہ اسکول جانے سے انکار کرنے والا بچہ اسکول میں اپنے آپ کو بالکل اسی حالت میں دیکھتا ہے۔ علم اور تعلیم آخر ایسی بھیانک چیزیں تو نہیں ہیں۔ شوق ہو تو کوہکنی عین راحت نظر آنے لگتی ہے۔ اس ایک اتفاقیہ جملے سے متاً یہ خیال پیدا ہوا کہ جمالیات کی رو سے قدر کی اصل واساس شوق ہے۔ اسی کو پہلے کہیں حسن یا عشق کہا گیا تھا۔ گویا قدر کے احساس و شعور اور اس احساس و شعور کے بروئے کار لانے کے لئے اخلاقیات کے برعکس قوانین وضع کرنے اور ان قوانین کے منکرین پر حد جاری کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قدر کو باہر سے ٹھونسا نہیں جاتا۔ قدر از خود نفس کی گہرائیوں میں جنم لیتی ہے۔

اس امر سے انکار کی مجال نہیں کہ سزا معاشری اصلاح و بہبود کے لئے ناگزیر بن جاتی ہے۔ صرف اس امر کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ گناہ کا تصور فعل سے وابستہ نہیں۔ گناہ احساسِ قدر سے پیدا ہوتا ہے۔ اور جس طرح قدر مثبت یا منفی ہو سکتی ہے۔ اسی طرح قدر کا تصور بھی مثبت یا منفی ہو سکتا ہے۔ سزا کا تصور اقدار کے منفی تصور سے وابستہ ہے۔ اقدار کا مثبت تصور نہ گناہ کا ذکر کرتا ہے نہ سزا کا۔ مذہب کے ابتدائی دور میں قدر کا مثبت احساس اس طرح فراواں ہوتا ہے کہ منفی احساس اور اس سے پیدا ہونے والے تعزیری احکام محض زیب قرطاس ہی رہ جاتے ہیں۔ قدر کا مثبت احساس فرائض کی بنیاد ہے۔ جب یہ احساس ارزانی ہو تو جرم و تعزیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فرائض سے اغماض بے عملی کا نام ہے۔ بے عملی میں جرم کا ارتکاب ممکن ہی نہیں لیکن ابتدا میں مذہب صرف فرائض کی بجا آوری کا نام تھا۔ اور فرائض کی بجا آوری کے لئے ایک زبردست تحریک یا تحریص و ترغیب کا نام تھا۔ قرآن مجید کا سورہ سرود جرم و تعزیر کا احساس نہیں دلاتا۔ وہ تو ایک بشارت ہے۔ اطمینان قلب اور سرشاری کی۔

فقہی نظام کی تشکیل اس وقت وجود میں آتی ہے جب شوق مٹ جاتا ہے۔ قدر کا مثبت احساس باقی نہیں رہتا۔ طمانیت اور جذبۂ عمل کی سرشاری مٹ جاتی ہے۔ اس وقت انسان کا عمل جرم و تعزیر کے تصور سے آشنا ہوتا ہے۔ وہ امانت جس کی تفویض کے لئے روحِ کائنات نے ہر چیز سے سوال کیا لیکن کسی کو اتنا یارانہ تھا کہ اس بارِ امانت کو اٹھا لیتا بالآخر انسان کو تفویض ہوئی۔ یہ امانت شوق کی امانت تھی۔ علم اشیاء سے قدر کے مثبت احساس کی تشکیل ورنہ فرائض کی بجاآوری میں فرشتے کچھ کم تو نہ تھے۔ حیوان، نباتات، جمادات اور عالم علوی کی یہ مخلوق یعنی فرشتے انسان کے مقابلے میں صرف قدر کے احساس سے نابلد ہیں۔

مقام بندگی دیگر مقام عاشقی دیگر
ز نوری سجدہ می خواہی ز خاکی بیش ازاں خواہی

جوں جوں جذبۂ عمل زوال پذیر ہوتا ہے۔ اقدار کا منفی احساس بڑھتا رہتا ہے جس معاشرہ میں تعزیر و جرم کی شرح سخت گیر ہوگی اس معاشرے میں قساوت قلبی اور خود معاشرے کے نام نہاد محافظوں کا اپنا ضمیر جرم کے احساس سے آزاد نہیں ہوتا۔ ذرا خیال تو کیجئے، معاشرے کی اصلاح کا سب سے بڑا علمبردار انسان کی فلاح و بہبود کا عظیم ترین داعی۔ اپنے عمل، اپنے جذبے، اپنی دیانت اور اپنے خلق کی وجہ سے رحمۃ للعلمین کا لقب پاتا ہے۔ یہ بارگاہ جسے شاعر نے 'زعرش نازک تر' اور 'بعد از خدا بزرگ توئی' کے خطاب سے مخاطب کیا ہے، سراپا شفقت ہے۔ اس نے اسلام کو بزورِ شمشیر نہیں پھیلایا۔ اسلام تو اس کی شفقت، محبت، غریب نوازی۔ اور عفو و بخشش سے پھیلا تھا۔ مجرم بڑا شقی القلب انسان ہوتا ہے سوہ رحم کرنا نہیں جانتا۔ اگر وہ شقاوت قلبی کا اس حد تک شکار نہ ہوتا تو کبھی کسی کو قتل نہ کرتا۔ کبھی کسی سے اس کا مال نہ چھینتا۔ کبھی کسی کو اس کے حق سے محروم نہ کرتا۔ وہ معاشرہ جو سزا کے تعزیری یا انتقامی ضابطوں پر زور دیتا ہے اس کی رگوں میں جرم و گناہ اپنا زہر پھیلا چکے ہوتے ہیں۔ ایک صحت مند اور تندرست معاشرہ میں سزا کا صرف اصلاحی مفہوم ہی قابل قبول ہو سکتا ہے۔ در اصل قدر کا احساس فعل سے وابستہ نہیں ہوتا۔ محرک سے وابستہ ہوتا ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ الاعمال بالنیات اور اس سلسلے میں سورۂ کہف میں مذکور قصہ کو یاد کیجئے ع 'کشتیٔ مسکین و جان پاک و دیوار یتیم'۔

اس آئینے میں دیکھئے تو مکافاتِ عمل کا انداز ہی کچھ بدل جاتا ہے۔ کشتی کو عیب دار کرنا اور کسی بے گناہ کو قتل کرنا بھی عین سعادت بن جاتے ہیں۔ قدر کے مثبت احساس سے جرم یا گناہ کا کوئی تصور وابستہ ہو ہی نہیں سکتا۔

چنانچہ صرف جمالیات ہی میں نہیں مذہب میں بھی اس حقیقت کا شعور ملتا ہے کہ نتیجہ یا عملی امکانات کچھ ایسے اہم نہیں ہیں۔ کیفیت کا حصول مقصود خاطر ہے۔ کہیں اسے یوں بیان کرتے ہیں کہ اعمال کا انحصار نیت پر ہے۔ حسن نیت کے مقابلے میں اعمال کے اپنے عیب و صواب بے معنی بن جاتے ہیں کبھی اس بات کو یوں ادا کرتے ہیں ؎

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آدابِ فرزندی

نیت کی صحت و سلامتی اور فیضان نظر کا مسئلہ کچھ اس طرح ہے کہ ایک صاحب مدتوں کسی مرشد کی تلاش میں رہے۔ آخر مرشد ملا تو ایک کالا چور۔ وہ گھر سے اس نیت کے ساتھ نکلے تھے کہ جو بھی شخص سب سے پہلے سامنے آئے گا اُسی کے ہاتھ پر بیعت کر لوں گا۔ رات کی تاریکی میں کوئی مردِ خود آگاہ تو نہ مل سکا، ملا تو ایک عادی مجرم۔ اس نے بھی پیچھا چھڑانے کے لئے کہا کہ اچھا دو رکعت نماز پڑھئے۔ ان دو رکعتوں میں دونوں کی قلب ماہیت ہو گئی۔ اور دونوں قطبیت کے مقام پر جا فائز ہوئے۔ بات کچھ ایسی انوکھی نہیں۔ ایک قسم کی جذباتی اور حسی چھوت نے ایک دوسرے کو یوں متاثر کیا کہ عمروں کی منزلیں لمحوں میں طے ہو گئیں، اسی لئے تو کہتے ہیں ؂

طے شود جادۂ صد سالہ بآہے گاہے

شعر و ادب یا فن کے متعلق جب یہ کہا جاتا ہے کہ وہ جذبات کی تہذیب کرتے ہیں تو مطلب یہی ہے کہ وہ ایک حسی چھوت پیدا کرتے ہیں۔ اس چھوت سے جذبات اور احساسات میں لطافت اور شستگی پیدا ہوتی ہے یہ لطافت اور شستگی بعد میں غیر جمالی موثرات کو قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے اور اس طرح قدر کا صرف شعور ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ قدر عملی طور پر بروئے کار آتی ہے۔

کسی نے کہا تھا کہ حسن کے مدارج نہیں ہوتے۔ حسن یا ہوتا ہے یا نہیں ہوتا، حسن گویا ایک قسم کی صداقت ہے۔ اب ایک بات یا سچ ہوگی یا جھوٹ ہوگی سچ کے مدارج نہیں ہوا کرتے۔

سورج مکھی

عمل : حمیدالرحمان

سچ جھوٹ کا ملغوبہ تو ہو سکتا ہے۔ لیکن کسی درجہ بندی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم ایک صورت ابھی باقی ہے۔ ایک بچہ سچ بولتا ہے کہ اس نے مٹھائی کھائی تھی۔ اور ایک وہ بھی انسان ہے جو سرِ دار پہنچ کر سچ بولتا ہے۔ پہلی بات کو آپ کوئی اہمیت نہیں دیتے، لیکن دوسری چیز کو اہمیت دیتے ہیں۔ مدارج کا ایک تصور اس طرح در آتا ہے۔ یہ درجہ بندی سچ کی اپنی نوعیت کے اعتبار سے متعین نہیں ہوتی بلکہ اس چیز کی نسبت سے متعین ہوتی ہے۔ جس سے سچ متعلق تھا۔ اس درجہ بندی کا معیار آخر کس طرح مقرر کیا جائے گا۔ بچے کے سچ کا تعلق ایک ایسی حاجت یا خواہش سے ہے۔ جو محض اس کی ذات تک محدود ہے۔ اس سے نہ کسی کا کچھ بگڑتا ہے نہ سنورتا ہے۔ نہ اس سے خود ذات یا نفس کو کوئی استحکام یا ارتقا حاصل ہوتا ہے۔ دوسرا سچ خارجی دنیا میں کوئی انقلاب پیدا کرے یا نہ کرے۔ لیکن معنوی دنیا میں ایک عظیم آویزش ایک عظیم انقلاب کی نشاندہی کرتا ہے۔ دونوں میں فرق معنویت کا ہے۔ معنویت ایک خالصتاً ذہنی قدر ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ سچ کی درجہ بندی ذہنی عمل کی عظمت سے وابستہ ہے۔

حیوان اور انسان میں فرق ذہنی عمل ہی کے باعث پیدا ہوتا ہے۔ انسان حصولِ مُراد کے لئے حیوان کی قوت سے کام لیتا ہے۔ اسے ہل میں جوتتا ہے۔ اس سے گاڑی کھنچواتا ہے۔ لیکن آخر میں حیوان کو آپ خراجِ عقیدت پیش نہیں کرتے۔ صرف اس انسان کا ذکر کرتے ہیں جس نے حیوان کو اپنے کام کے لئے استعمال کیا۔ بھاپ میں ایک عظیم قوت مضمر تھی۔ ایک ذہنی عمل نے اس قوت کا راز دریافت کیا۔ قوت کو آپ نظر انداز کر جاتے ہیں۔ لیکن ذہنی عمل کے مصدر و منبع کو آپ نہیں بھول سکتے۔ چنانچہ قصہ کچھ یوں بنتا ہے کہ جب عاشق دریاؤں کو چیر کر، اور زندہ سانپ کے سہارے اپنی محبوبہ کے شبستانوں میں پہنچا تو محبوبہ نے کہا کہ کاش تم نے اتنی محبت اپنے رب سے کی ہوتی۔ اور عاشق پر جب اس بات کی حقیقت روشن ہوئی تو وہ امر ہو گیا۔ محبوبہ کی محبت کم سے کم ذہنی عمل کا تقاضا کرتی ہے معبودِ حقیقی سے محبت شعور کی معراج ہے۔ محبت کی نوعیت میں فرق نہیں آیا۔ لیکن ذہنی عمل کے اخراج سے اس کی سطح پست تر ہو گئی۔ ان دیکھے معبود کو پہچاننے کے لئے اور پھر اسے اپنی محبت کا مرجع و مقصود بنانے کے لئے ذہن کی جو جِلا درکار ہوتی ہے وہ جبلی مقصود کو پہچاننے میں صرف نہیں کرنی پڑتی۔ اب جمالیاتی قدر میں مدارج کا تعین اس طرح ممکن ہو جاتا ہے کہ اگر قدر کا تعلق جبلی حیوانی اور شہوانی سطح سے ہو تو اس میں عظمت یا بلندی پیدا نہیں ہوتی۔ جب یہی قصد ذہنی عوامل سے وابستہ ہو جاتی ہے تو اس میں ایک عظمت جھلکنے لگتی ہے۔ نفسیاتی اعتبار سے دیکھئے تو ترفع کا عمل بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ آپ جبلی اعمال کو ایک ذہنی عمل میں ڈھال لیتے ہیں۔

ذہنی عوامل کا ذکر آ گیا ہے تو لازماً پھر اخلاقیات — یا مابعد الطبعیات کا ذکر چھڑ جائے گا۔ یعنی اگر جمالیاتی جذب و سرود بلند تر مقاصد خیر یا حقیقت مطلقہ سے وابستہ ہوں تو ان میں عظمت پیدا ہو گی ورنہ نہیں ہو گی۔ تو پھر جمالیات کی تو اپنی کوئی قدر باقی نہ رہی۔ بات شاید یوں ہے کہ جمالیاتی قدر بنیادی قدر ہے۔ اس کا تقاضہ ذہنی، جذباتی اور حسی خلوص ہے ؎

خوب و ناخوبِ عمل کی ہو گرہ وا کیونکر
گر حیات آپ نہ ہو شارحِ اسرارِ حیات

اقدار کی دنیا میں تصنع اور بناوٹ یا احتسابی خلط روی بہت عام ہیں۔ حیوان کو یہ مشکل درپیش نہیں ہوتی۔ انسان کو مسلسل اس کے خلاف جہاد کرنا پڑتا ہے۔ جمالیاتی قدر کے ذریعے ہم جذبات اور احساسات میں ایک ایسی تہذیب، شائستگی اور شگفتگی پیدا کر لیتے ہیں کہ وہ ہر اس چیز سے گریز کرتے ہیں جو غیر حسن ہو۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس دنیا میں تصنع ممکن نہیں۔ آپ عشق کرتے ہیں یا نہیں کرتے۔ اور اسی لئے شاید کہنے والے نے یہ کہا تھا۔ حسن میں مدارج نہیں ہوتے۔ حسن یا ہوتا ہے۔ یا نہیں ہوتا۔ اور پھر اس سے بھی بڑی بات یہ کہ جمالیاتی قدر مقصود بالذات ہے یہ کسی دوسری قدر کی محتاج نہیں رہتی۔ نہ محرکات سے الجھتی ہے۔ نہ نتائج پر نظر رکھتی ہے۔ اپنے جذب و سرمستی اور ذوقِ عمل سے زندہ و پائندہ ہے ؎

شرحِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام
شورشِ طوفاں حلال، لذّتِ ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال، عشق پہ حاصل حرام
علم ہے ابن الکتاب عشق ہے اُم الکتاب ✦

(حلقۂ اربابِ ذوق۔ لاہور)

افسانہ :-

اصول کی بات

احمد ندیم قاسمی

" میرے چند احباب نے یہ افسانہ سنا تو ان میں سے ایک نے کہا کہ "اب تو ایسا نہیں ہوتا" اور میں نے عرض کیا کہ "صدیوں ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور اگر آج ایسا نہیں ہوتا تو خدا کرے آئندہ بھی ایسا نہ ہو"

یہ واقعہ میں نے اس لئے لکھ دیا ہے کہ ممکن ہے آپ اس افسانہ کی اشاعت سے جھجکیں۔ یہ افسانہ زرعی اصلاحات سے پہلے کے حالات کا ایک دلگداز عکس ہے۔ اور آئندہ کے لئے ایک تنبیہ بھی ہے اور ہماری حکومت کا نقطۂ نظر یقیناً یہی ہے"۔ (ندیم)

(بے شک "اب ایسا نہیں ہوتا" اور اس میں سارا زور "اب" پر ہے موجودہ انقلاب کا حقیقی مقصد تمام تر یہی ہے۔ مدیر)

★

"سو وہ تم ہو"۔ زمیندار نے عبداللہ کو سر سے پاؤں تک اور پھر پاؤں سے سر تک دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی" عبداللہ نے خاکساری کے وہ تمام تاثرات چہرے پر بکھیر لئے جن کے بوتے پر اس نے اب تک اپنی جان سے ہاتھ نہیں دھوئے تھے۔

"پر تم تو بوڑھے ہو" زمیندار نے جیسے اس پر تھوک دیا۔

عبداللہ ذرا دیر کے لئے بجھ گیا۔ پھر فوراً اپنی کمک کو پہنچا۔

"میری عمر تو سرکار یہی کوئی پانچ کم پچاس ہوگی"

"پانچ اوپر پچاس تو نہیں؟" زمیندار نے مسکرا کر بھری ہوئی چوپال پر نظریں دوڑائیں۔

"اوپر نیچے کا دھوکا تو ہو ہی جاتا ہے"

لوگ زور زور سے ہنسنے لگے اور زمیندار حیوان کی نے کو ایک مونچھ پر پھیرتا رہا۔ قہقہے رکے تو اس نے عبداللہ سے پوچھا۔

"جب تم پیدا ہوئے تھے تو ملکہ وکٹوریا کا راج تھا نا؟"

عبداللہ لوگوں کو ایک بار پھر ہنسنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا اس لئے فوراً بولا "جی یہ تو یاد نہیں، پر اتنا یاد ہے کہ ان دنوں ملکہ کا روپیہ چلتا تھا"

"اور سنو" زمیندار نے سب سے جیسے داد طلب کی۔ "ملکہ کا روپیہ تو ابھی کل تک چل رہا تھا" یکایک زمیندار کو جیسے کوئی بات یاد آگئی اور وہ رقت سے بولا۔ "ہا۔ کیا روپیہ تھا! سچی چاندی تھی۔ یوں کھنکتا تھا جیسے کٹوری بج رہی ہو۔ ہا۔ کیسے کیسے زمانے تھے جو لد گئے۔ مجھے یاد ہے۔ خدا بخشے بابا نے خوش ہو کر کبھی کسی مزارعے کو ایک روپیہ دیا تو اس نے ان کی جوتیاں اٹھا کر چوم لیں۔ اور آج کسی کو دس روپے بھی دے دو تو وہ دس روپوں کی طرف نہیں دیکھتا۔ دینے والے کے ہاتھ کی طرف دیکھتا ہے کہ شاید وہ دس روپے اور نکلے"۔

لوگ جو پہلے محظوظ ہو رہے تھے۔ سنجیدہ ہو گئے۔ پرلے کونے سے ایک آدمی بولا "اس زمانے میں تو سرکار، ایک روپے

سے لٹھے کی چادر بن جاتی تھی۔ آج دس روپوں میں کھدر کی چادر بھی نہیں بنتی"

زمیندار نے پیچوان کی نے کو پلنگ کی پٹی پر پٹخ دیا: "تو کیا میں نے تم سے لٹھے اور کھدر کا بھاؤ پوچھا تھا؟ کیا کبھی تمہارے باپ نے بھی لٹھے کی چادر باندھی ہے؟"

سناٹا چھا گیا۔ اس سناٹے میں سوائے عبداللہ کے کوئی شخص زمیندار کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ سب اپنی جوتیوں کی نوکوں یا تہمدوں کی تہوں کو درست کرنے لگے تھے۔ پھر جب اس سناٹے کو زمیندار کے پیچوان کی گڑگڑ نے توڑا تو سب نے ایک ساتھ زمیندار کی طرف دیکھا اور زمیندار نے جیسے سب سے پوچھا: "ہاں تو میں کیا کر رہا تھا؟"

کوئی آہستہ سے بولا: "ملک والے روپے کی بات ہو رہی تھی"

"ہاں۔ زمانے جو لد گئے" زمیندار نے ایک آہ بھری اور خاموش ہو گیا۔ ذرا دیر کے بعد پہلو بدل کر بولا: "کیوں بھئی سنا ہے وہ کرمے کی شادی پر تھلوں سے جو میراثی آئے ہیں وہ بلا کے شہنائی باز ہیں۔ ذرا انہیں بلاؤ تو چوپال پہ۔ ایک چوکی ہو جائے"

ایک نوجوان بولا: "جی ان کے ساتھ تو بڑے اچھے گانے والے بھی ہیں"

"ان سے بھی کہہ دو" زمیندار نے حکم دیا: "شام کی نماز کے بعد ہم اکتارے پر لجھے کی کافیاں سنیں گے۔ گلے دھو کے آئیں"

"جی اچھا" کتنی بہت سی آوازیں آئیں۔

زمیندار بولا: "تم لوگوں نے سنا ہو گا یہ کرما پہلے مجرہ کرانے کی سوچ رہا تھا اور ملتان جا کر قدرو کنجری سے بات بھی کر آیا تھا"

"جی" کسی نے تائید کی۔

"میں نے اسے کہلوا بھیجا تھا کہ اگر مجرہ کرانا ہے تو پہلے چوپال پر آ جاؤ تا کہ یہاں میں تمہاری چمڑی اتار کر رکھ لوں اور باقی کو مجرہ کرانے بھیج دوں۔ سارے گاؤں کو پلید کرنے چلا تھا بدبخت۔ ہم نے لڑکے کا یا کیا تھا صاحب ضلع کو بلوایا کہ ما بیاہ کرے تو قدرو کنجری کو بلوائے! حرامزادہ"

لوگ دو دو تین تین کی ٹولیوں میں آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ زمیندار ان کی باتیں سن نہیں رہا تھا مگر سمجھ ضرور رہا تھا۔ اسے معلوم تھا وہ اسی کی نیکی اور پرہیزگاری کی باتیں کر رہے ہیں۔ خود آسودگی کے

جذبے سے اس نے رخ بدلا اور سامنے دیکھا۔ عبداللہ جہاں کچھ دیر پہلے آ کر رکا تھا، وہیں جا کھڑا تھا۔ اور اس کے ہاتھ جو زمیندار کے پہلے سوال کا جواب دیتے ہوئے جڑ گئے تھے، اب تک جڑے ہوئے تھے۔ البتہ اب ذرا سے ڈھیلے ہو گئے تھے اور اس کے ایک انگوٹھے کے ناخن پر ایک مکھی ساکت و صامت بیٹھی تھی۔

"تم اب تک یہیں کھڑے ہو؟" زمیندار نے یوں پوچھا جیسے وہ کچھ دیر کے لئے سو گیا تھا۔ عبداللہ نے جواب میں جڑے ہوئے ڈھیلے ہاتھوں کو پھر سے اکڑا لیا۔

"اولاد ہے؟" زمیندار نے پوچھا۔

"جی۔ ایک بیٹی ہے۔ ایک بیٹا بھی تھا بے چارہ۔ خدا نے لے لیا"

"کیسے مرا؟"

"جی دق سے"۔

"تو پھر تمہیں بھی دق ہو گی"۔ زمیندار نے جیسے اس کے منہ پہ دوبارہ تھوک دیا۔ عبداللہ اپنی آنکھوں میں ریت ڈالے چپ چاپ کھڑا رہا جیسے مرض کی تشخیص اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔

زمیندار نے جیسے آخری فیصلہ سنانے سے پہلے پوچھا: "نام کیا ہے تمہارا؟"

"عبداللہ" وہ بولا۔

"تو پھر بڈّھا کہو۔ پورا نام کس نے پوچھا تھا؟"

عبداللہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"دیکھو بھئی بڈّھے۔ میں زمینوں کو جتواتا نہیں ہوں۔ میں تو انہیں کولھو میں پلواتا ہوں۔ اور یہ کولھو چلانے کے لئے مجھے بڑے بڑے مضبوط بیلوں جیسے کسان چاہئیں"۔ لوگوں کی ہنسی نے زمیندار کی بات کاٹ دی۔ وہ خود بھی ذرا سا مسکرایا۔ پھر بولا: "اور تم بڈّھے آدمی ہو۔ بال کھچڑی ہو رہے ہیں۔ ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ تم کیا ہل چلاؤ گے! اور پھر فرض کیا تم نے ہل چلایا۔ پر تم اکیلے آدمی ہو۔ بیمار پڑو گے تو کھیتوں کی رکھوالی کون کرے گا؟ بیٹی تو اپنے گھر چلی جائے گی۔ بیوی ہے؟"

"جی، ہے"

"چلو یہ تو اچھا ہے۔ بیوی تو ہے۔ بیوی ہونی چاہئے — ہل چلاتی نہیں پر چلواتی تو ہے"

لوگ پھر ہنسے۔

"تو یوں کہو کہ تم نمک حرام نکلے ہو" زمیندار بولا۔ "لڑکا ہوتا تو شاید تمہارا کام بن جاتا۔ اور یہاں تم بھاگ کیوں گئے پہلی زمینوں سے؟"

"بس اتنی بات ہوئی سرکار" عبداللہ نے جڑے ہوئے ہاتھوں میں سے ایک ہاتھ کے انگوٹھے کو انگلیوں کی پوروں تک لا کر کہا۔ "میں نے کہا۔ چنا مہنگا جا رہا ہے۔ بولے۔ نکل جاؤ"

"نکالا تو ٹھیک نکالا" زمیندار نے ایک بھوں اچکائی۔ "اب اگر میں ملک کے روپوں کی بات کروں اور کوئی لٹھے اور کھدر کا بھاؤ لے بیٹھے تو بتاؤ میں اس کے ساتھ کیا کروں گا؟ یہی کروں گا اور کیا کروں گا"

سب نے ایک دم ایک ساتھ پلٹ کر پرلے کونے کی طرف دیکھا جہاں ایک آدمی بوکھلا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

پہلو بدل کر زمیندار نے سامنے اصطبل کی طرف دیکھا جس میں مشکی، کمیت اور سفید رنگ کے تین گھوڑے توبڑوں میں منہ ڈالے کھڑے تھے۔ "کیوں بھئی۔ اب ٹھیک ہے نا؟" اس نے سارے مجمع سے پوچھا۔ "تھانیدار کے گھوڑے کو ادھر بھینسوں کے پاس بندھوا رہا ہے۔ تمہی میں سے کسی نے کہا تھا کہ ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کر دیتی ہے"

کوئی بولا۔ "اچھا خاصا ہے تھانیدار کا گھوڑا۔ پر ان گھوڑوں کے سامنے تو گدھا سا لگنے لگتا ہے"

قہقہوں کے ایک دور کے بعد زمیندار گھوڑوں، تھانے داروں اور روئی کے نرخوں کی باتیں کرنے لگا اور کچھ دیر کے بعد زمین سے تھپے ہوئے جوتے بڑی بے پروائی سے گھسیٹتا، چوپال سے اتر گیا۔ لوگ ایک دوسرے کے پاس کھسک آئے اور حقے گڑگڑانے لگے۔ اور عبداللہ اکیلا رہ گیا۔

وہ بہت اداس تھا۔ پہلے زمیندار نے اسے صرف اس لئے جواب دے دیا تھا کہ جب وہ شکار پر آیا تھا اور کھیتوں میں گھوڑے باندھے تھے تو عبداللہ نے ان کے لئے دانہ لاتے ہوئے بس اتنا کہہ دیا تھا کہ "آج کل چنا تو بہت اونچا جا رہا ہے سرکار"۔ اس نے یونہی روا روی میں یہ بات کہہ دی تھی جیسے کوئی موسم کی خرابی کا ذکر کر دے۔ مگر زمیندار نے اس کا کچھ اور مطلب لیا۔

"پوچھا۔ یہی چنا جو ہمارے گھوڑے کھا رہے ہیں؟"

"جی سرکار" عبداللہ نے کہا تھا۔

اور زمیندار نے پوچھا تھا۔ "خوب سوچ کر بتاؤ۔ بہت مہنگا ملا ہے نا؟"

"جی ہاں۔ بہت ہی مہنگا" عبداللہ نے پھر کہا تھا۔

اور زمیندار نے اسے چابک مارتے ہوئے کہا تھا۔ "نکل جاؤ یہاں سے نمک حرام کہیں کے۔ کتنے برسوں سے تم ہمارا دانہ کھا رہے ہو آج ہمارے گھوڑوں نے تمہارا دانہ کھایا تو دانے کے نرخ یاد آ گئے"

اور عبداللہ اس گھروندے سے نکل آیا تھا جس میں اس نے گیارہ برس گزارے تھے اور جب اسے لاٹھی پور گئے ہوئے بیٹے کی چٹھی ملتی تھی کہ میں مزدوری کر کے اپنے علاج کے لئے روپیہ کما لیتا ہوں اور آپ لوگ زیادہ فکر نہ کریں تو وہ اسی گھروندے کے آنگن میں گھنگنیوں کا دیگچا پکاتا تھا اور چڑیوں، کووں اور ڈالیوں میں بانٹ دیتا تھا۔ اسی کے آس پاس کے پیڑوں میں اس نے اپنی بیٹی ماکھاں کے لئے جھولے ڈالے تھے اور جب وہ ہل چلاتا تھا اور اس کی بیوی بیگاں اسے روٹی اور چھاچھ پہنچانے آتی تھی۔ تو ماکھاں جھولا جھولتی تھی اور گاتی تھی:

ڈاچیاں کچھا دے
ویر خیری آ دے
بابا میرا لسی پیوے
اماں میری لسی پیوے
ویر یاد آ دے
ڈاچیاں کچھا دے
ویر خیری آدے

اس وقت عبداللہ کا جی چاہا کہ اونچے اونچے سروں میں "ڈاچیاں کچھا دے" گانے لگے اور ساتھ ساتھ رونے لگے اور جب لوگ اس سے وجہ پوچھیں تو انہیں بتلائے کہ "میں نے عمر بھر اپنے ہاتھ کی حلال روزی کمائی ہے پر کل میں نے ایک گاؤں کی مسجد میں جا کر نماز کے بعد بھیک مانگی تھی اور جب میں بھیک مانگ رہا تھا تو میری غیرت میرے گلے میں چھریاں مار رہی تھی اور میری آنکھوں میں آنسو جلنے لگے تھے۔ پھر جب میں چار روٹیاں اور چار آنے لے کر بیوی

بیٹی کے پاس آیا تھا تو بیوی نے کہا تھا "کانپ کیوں رہے ہو؟ آج تم نے آنسو بیچ کر روٹی لی ہے۔ پہلے تم خون پسینہ بیچ کر زہر لے لیتے تھے۔ جھگڑ لڑا تو روٹی ہی کا ہے ماکھاں کے بابا۔ امام صاحب کو بھی آج اس مسجد میں روٹی نہ ملے تو کل کوئی دوسری مسجد ڈھونڈیں۔ اللہ اللہ کر وہ جب تریس کھانے گا تو بدلہ چکا دیں گے۔ چار روٹیاں لائے ہو۔ آٹھ اپنے ہاتھ سے پکا کر اور گھی لگا کر فقیروں کو نہ کھلاؤں تو ڈائن ہو کر مروں۔"

"تو کیا ہم فقیر ہیں؟" ماکھاں نے پوچھا تھا۔

اور میں نے بیوی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا جیسے وہ بولی تو میں مر جاؤں گا۔

عبداللہ اچانک اٹھا اور چوپال کے پچھواڑے کی طرف لپکا جہاں ایک کیکر کے نیچے وہ بیگاں اور ماکھاں کو بٹھا آیا تھا۔ اس نے دور ہی سے دیکھ لیا کہ وہ دونوں کیکر کے نیچے موجود نہیں ہیں۔ ذرا سا ٹھٹکا مگر پھر کیکر کے نیچے جا پہنچا اور اس کے تنے پر ہاتھ رکھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اچانک آشیانوں کی طرف جاتی ہوئی چڑیوں کا ایک بہت بڑا غول کیکر پر اترا اور اس کی ہر شاخ پر گیندیں سی لٹک گئیں۔ عبداللہ کو زندگی میں پہلی بار چڑیوں کا شور بہت برا لگا۔ اس نے پیچھے ہٹ کر کیکر کے تنے پر زور سے لات ماری اور سب گیندیں ایک ساتھ فضا میں اچھل کر غائب ہو گئیں۔ چڑیوں کے پروں کی جھپٹ میں آئے ہوئے کیکر کے پھولوں نے زمین پر بلدی سی بکھیر دی تھی اور آسمان پر ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں ایک گھنی بدلی میں سے ببزوں کی طرح نکلی پڑ رہی تھیں۔

عبداللہ چوپال کی طرف پلٹا تو سامنے سے اسے بیگاں آتی نظر آئی۔ اگر گلی میں سے ایک پنہاری نہ گزر رہی ہوتی تو وہ بیگاں کے پاس بھاگ کر پہنچ جاتا۔ پھر بھی وہ بظاہر تیز نہ چلتے ہوئے تیزی سے بیگاں کے پاس پہنچا مگر اس کے کچھ کہنے سے پہلے بیگاں ہی بولنے لگی "اِدھر ڈیوڑھی میں ایک زنانہ کسان خانہ ہے۔ ہم اس میں چلی گئی ہیں۔ سب نوکرانیاں بھی وہیں سوتی ہیں، بڑی اچھی لوگ ہیں ہمیں وہاں لے گئیں۔ پھر ہمیں چینی کی چائے پلائی۔ پھر اپنے اپنے دکھوں دردوں کی باتیں بھی ہوئیں۔ اس وقت ماکھاں ان کے ساتھ چائے کے برتن دھو رہی تھی۔ میں نے کہا میں تمہاری خبر لے آؤں۔ تمہیں چائے ملی؟"

"مجھے تو ابھی حقہ بھی نہیں ملا" عبداللہ نے کہا "پر تمہاری بات سن کر سمجھو چائے بھی پی لی۔ ویسے بیگاں ! کام بنتا نظر نہیں آتا۔ زمیندار

کے منشی کا پتہ لگاتا ہوں، وہ ملے تو اس کے پاؤں پکڑ لوں۔ تم بھی کسی نوکرانی سے زمیندارن کو کہلواؤ۔ کوسوں تک پھیلی ہوئی زمینیں ہیں۔ ایک آدھ بیگہ ہمیں مل جائے تو کیا بگڑ جائے گا ان بادشاہوں کا؟"

بیگاں وعدہ کر کے چلی گئی اور عبداللہ چوپال پر آ گیا۔ لوگ اٹھ گئے تھے۔ صرف ایک طرف سائیس بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ عبداللہ سیدھا اس کے پاس جا بیٹھا۔ سائیس نے حقہ اس کی طرف گھما دیا اور جب عبداللہ چند کش لگا چکا تو سائیں بولا "بڑا ہی برا زمانہ آ لگا ہے چاچا۔ پیٹ کے لئے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں۔ اب تم پکی عمر کے آدمی ہو کر یہ تمہارے آرام سے کھٹولے پر بیٹھ کر حقہ پینے کے دن تھے مگر ٹھوکریں کھاتے پھر رہے ہو در بدر کی۔ خدا اگر آدمی کا پیٹ نہ لگاتا تو کوئی مُفت کا نہ ہنستا۔ ذرا یہ بھاؤڑا لے کر گھوڑوں کی لید تو سمیٹ لو میں جا کر گودام سے تمہارے لئے کھٹیا نکال لاؤں۔"

عبداللہ چپکے سے بھاؤڑا اٹھا کر اصطبل کی طرف چلا گیا اور سائیس چوپال سے اتر گیا۔ شام کے بعد ایک آدمی عبداللہ کے لئے کھانا لے آیا۔ ذرا دیر بعد چوپال پر گاؤں والوں کا ریلا سا آ گیا۔ کھمبی چار پانچ لالٹینیں جلنے لگیں۔ مراثی بھی آ گئے اور ڈھولوں، شہنائیوں کو سر کرنے لگے۔ پھر جب زمیندار نے چوپال پر قدم رکھا تو بالکل وہ کیفیت چھا گئی جب سینما ہالوں میں فلم شروع ہونے سے پہلے بتیاں گل کر دی جاتی ہیں۔ پہلے شہنائی والے نے اپنا کمال دکھایا۔ پھر گانے والوں نے بلھے کی کافیاں اور علی حیدر کے دوہے سنائے۔ آخر زمیندار نے دس دس روپے کا ایک نوٹ ایک ہاتھ میں اور دوسرا نوٹ دوسرے ہاتھ میں پکڑ کر دونوں ہاتھ بلند کر دئیے۔ شہنائی والا آگے بڑھا اور ایک نوٹ لیکر سلام کرتا ہوا الٹے قدموں واپس چلا گیا۔ گانے والوں میں سے بھی ایک نے یہی کیا پھر سائیس نے آگے بڑھ کر فرش پر چادر بچھا دی۔ اور ایک دوتی رکھ دی۔ ہر شخص جیب میں ہاتھ ڈالے اور ڈبیک کھولے آگے بڑھا اور سب نے ایک ایک دونی چادر پر رکھ دی۔ عبداللہ کے لئے یہ سب باتیں نئی تھیں مگر دوسروں کی دیکھا دیکھی اٹھا اور مسجد سے بھیک میں ملی ہوئی چونی ڈبیک سے کھول کر اور آگے بڑھ کر زمیندار کے قدموں میں چادر پر ڈال دی اور ابھی وہ ایک دونی اٹھا لینے کی سوچ رہا تھا کہ زمیندار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور بولا "اچھا تو تم دتّے ہو؟" پھر وہ سب لوگوں سے مخاطب ہوا۔

بیٹھے لوگوں دیکھ رہے ہو اس بڈھے کو۔ تم سب نے ایک ایک دونی دی ہے اور اس نے یہ میرے سامنے جوتی لاکر رکھ دی ہے۔ یہ فرق ہے پرانے اور نئے زمانے میں۔ اسے کہتے ہیں وضعداری کہ روزگار رہے نہیں۔ زمینوں کی تلاش میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ ابھی میرے مزارعوں میں شامل نہیں ہوا مگر اصول کی بات، اصول کی بات ہے اور اس نے جوتی کھول کے رکھ دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں بھی کبھی پرانے لوگوں کو بہت پسند کرنے لگتا ہوں، نوجوان مزارعوں کو تو اتنا بھی پتہ نہیں ہوتا کہ زمیندار کی جوتی سیدھی کیسے کی جاتی ہے۔ جاؤ بھئی ڈٹ کے بیٹھ جاؤ۔ کھانا دانا تو مل گیا نا تمہیں؟"

"مل گیا سرکار" دلا مارے خوشی کے کانپ رہا تھا۔ "آپ کے بچے جئیں۔ آپ کی زمینیں پھلیں"۔

دونیوں کو گنا گیا اور انہیں برابر تقسیم کر کے شہنائی بجانے والے اور گویوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

اور جب محفل برخاست ہو گئی اور چوپال میں صرف ایک دیا جلتا رہ گیا تو عبداللہ اٹھ کر اپنے کھٹولے پر آ بیٹھا۔ چوپال کے صحن کے پرلے کونے پر چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں اور چاروں آدمی بار بار حقہ پی رہے تھے اور کھانس رہے تھے۔ عبداللہ کا جی چاہا کہ وہ ان کے پاس جا کر باتیں کرے مگر اتنے میں سائیں آ گیا اور اس کی پائنتی پر بیٹھ کر بولا "تمہاری بات تو کچھ بنتی ہوئی معلوم ہوتی ہے چاچا۔ تمہاری جوتی کام کر گئی۔ ایسی باتوں کا بہت خیال رکھتے ہیں سرکار۔ میں نے ابھی ابھی سنا ہے کہ وہ جس آدمی نے لٹھے اور کھدر کی بات کی تھی نا۔ اسے سرکار نے نکال دیا ہے۔ یوں سرکار کی خاص شکارگاہ والی زمینیں تمہیں ملنے والی ہیں۔ ایک تو ویسے ہی یہ زمینیں سونا اگلتی ہیں دوسرے مہینے میں دو بار نہیں تو ایک بار تو سرکار ضرور وہاں جاتے ہیں چھوٹی سی بنگلی بنی ہوئی ہے، وہاں ٹھہرتے ہیں اور شکار کھیلتے ہیں۔ تمہیں یہ زمینیں مل جائیں تو سمجھو تمہارے دلدر دور ہو گئے۔ پرانے مزارعوں نے سنا کہ بنگلی کا علاقہ تمہیں مل رہا ہے تو وہ اب چوکی کے بعد سرکار کے پیچھے پڑ گئے کہ ہم پرانے خدمت گار ہیں۔ اور ان زمینوں پر ہمارا حق زیادہ ہے مگر سرکار نے ڈیوڑھی کے اندر جاتے ہوئے بڑے مزے کی بات کہی۔ بولے "شاید پہلے میں کچھ سوچتا مگر اب تو اصول کی بات ہے۔ تمہیں جلانے کے لئے یہ زمینیں ڈتے ہی کو دوں گا۔ میں مٹھائی نہیں چھوڑوں گا چاچا"۔

عبداللہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سائیں کا شکریہ کس طرح ادا کرے۔ اچانک سائیں اٹھ کھڑا ہوا اور بولا "نہیں چھوڑوں گا مٹھائی"۔ اور پھر چلا گیا۔

اور عبداللہ نے کھٹولے پر لیٹتے ہوئے اتنی لمبی انگڑائی لی کہ اس کے تمام جوڑوں میں سے پٹاخے چھوٹنے لگے۔ پھر اس نے کچھ پڑھ کر اپنے چاروں طرف پھونکا، جوتے کا ایک بٹن کھول کر اپنے سینے پر پھونکی اور چادر اوڑھ کر سو گیا۔

ذرا سویا تھا کہ کسی نے اسے کندھے سے ہلا دیا۔ "کون ہے؟" اس نے پوچھا۔ وہ سائیں تھا۔ پائنتی کی طرف بیٹھتے ہوئے بولا۔ "دیکھو چاچا۔ بڑا ضروری کام ہے اس لئے تمہیں جگا دیا۔ وہ بنگلی والی زمین سرکار نے تمہارے نام کر دی تھی منشی سے بھی کہہ دیا تھا اور یہ بھی انتظام کر دیا تھا کہ صبح کو تم بیلوں کی ایک جوڑی بھی پسند کر لو۔ مگر اب معاملہ کچھ بگڑ گیا ہے۔ تم سے کچھ ہو سکتا ہے تو کر دو"۔

عبداللہ نے چادر اتار کر ایک طرف رکھ دی اور سائیں کے قریب ہو کر بولا "کیا ہو گیا ہے ایک دم۔ تم بتاؤ تو سہی مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا کروں گا"۔

سائیں آہستہ سے بولا "میں تمہیں لے چلتا ہوں ڈیوڑھی میں یوں کرو کہ تمہاری بیٹی ہے نا مالکاں۔ اس کو سمجھا دو"۔

"کیا سمجھا دوں؟ وہ کیا کرے گی؟" عبداللہ نے پوچھا۔

اور سائیں بولا "ارے چاچا۔ اس کو سمجھا دو نا۔ اس سے کہہ دو کہ مان جائے۔ آدھی رات ہونے کو آئی ہے اور وہ اب تک نہیں مانی۔ نہ وہ مانتی ہے۔ نہ اس کی ماں اسے مناتی ہے۔ اب اگر تم بھی نہ منا سکو تو سرکار کہتے ہیں کہ اپنی راہ لو۔ اصول کی بات ہے!

.:.

کچے محل کی رانی آئی رات ہمارے پاس
ہونٹ پہ رنگت، گال پہ لالی، آنکھیں بہت اداس
اے رانی تو جگ جگ جیوے ہاتھ میں لے مرے ہاتھ
اے راجہ میں آج تری، کل اور کسی کے ساتھ!
(عالی)

سنّاٹا

(ایک افسانوی تاثر)

ابن سعید

پاکستانی ہوائی سروس ـــــ جو ہفتہ میں دو مرتبہ کراچی اور لندن کا سفر طے کرتی، پاکستان اور انگلستان کے درمیان ایک غیر مرئی پُل تھی۔ اور بہت سے ایسے لوگ جنہوں نے کراچی کے اسٹاک ایکسچینج اور بازار کے گھٹتے بڑھتے نرخوں سے فائدہ اٹھا کر روپیہ پیدا کر لیا تھا۔ یا جو شعوری یا غیر شعوری طور پر ہمیشہ ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگ جانے کے عادی تھے۔ یا پھر اس سفر کو طے کرنے کی خواہش میں اپنا ماضی اور حال سب فراموش کر دینے پر ہی آمادہ ہو گئے تھے، ایسے بہت سے لوگ اس غیر مرئی، ان دیکھے پُل پر سے گزر کر کراچی سے لندن پہنچ جاتے۔ اور چلچلاتی دھوپ اور خاک سے لبریز ہواؤں اور جھونپڑیوں اور جدید اطالوی اور فرانسیسی وضع کے محلوں کی عجیب و غریب، پُراسرار، ناقابلِ فہم دنیا کو پیچھے چھوڑ کر لندن پہنچ جاتے۔ جہاں ایک قسم کی دائمی خنکی اور دُھند کے مرغولوں میں لپٹی ہوئی ایک وسیع دنیا اُن کا استقبال کرتی۔ یہ غیر مرئی پُل دراصل اُن دو خلیجوں کے درمیان حائل تھا جس کا ذکر برسوں پہلے فاسٹر[1] نے اپنے ناول میں کیا تھا۔ اور اس پُل کو عبور کرنے کے لئے اب محض ایک ہوائی ٹکٹ کی قیمت درکار تھی۔

اور سید سخاوت حسین جن کی بیوی دائم المریض تھیں، بچوں کی تعلیم کا بہانہ کر کے کسی نہ کسی طور اس پُل کو عبور کر کے کراچی سے لندن چلے آئے تھے۔ اور اب پٹنی کے ایک کاٹج نما مکان میں مقیم تھے۔

سید سخاوت حسین میں ممتاز کو اپنی پہلی ملاقات ہی میں ایک گہری دلچسپی محسوس ہونے لگی، سید صاحب انتہائی سرپرستانہ انداز میں کہنے لگے۔

"میاں صاحبزادے۔ بات یہ ہے کہ ساؤتھ کنسنگٹن پر جو وہ کمبخت جمشید ہے ہمیشہ اس کی دکان پر اور تو سب کچھ مل جاتا ہے۔ مگر یہ کمبخت پان نہیں ملتے ہیں۔"

پان اُن کے لئے ایک نعمتِ غیر مترقبہ تھی، اور ان کے علاوہ اُن اَن گنت کلرکوں اور افسروں اور بے دیوان شاعروں اور غیر مطبوعہ کتابوں کے مصنفوں اور اُن کے گھروں کی بے گنتی عورتوں کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ تھی۔ جو لندن میں اپنی زندگیاں بِتا رہے تھے۔ وہ پان کی خاطر اُس ہوائی سروس کی تاریخوں کا بے تابی کے ساتھ انتظار کرتے۔ اور ہوا بازوں کی خوشامدیں کرتے۔

ہوائی سروس کی آمد کی خوشی میں سفارت خانے میں کام کرنے والے ادنیٰ درجے کے ملازمین کی بیویاں بھی آپس کی کدورتیں فراموش کرنے پر آمادہ ہو جاتیں۔ اور جب ہوائی سروس کا دن قریب ہوتا تو آپس میں ایک نئی محبت اور یگانگت کی بنا ڈال دیتیں۔ اور پھر پُرانی ملاقاتوں کی تجدید ہوتی۔ ایک دوسرے سے ملتے رہنے کی قسمیں کھائی جاتیں۔ فریر روڈ اور پاکستان چوک اور ناظم آباد، پیر الٰہی بخش کالونی کی گلیوں کو یاد کیا جاتا اور پان کھانے اور کھلانے کا یہ سلسلہ کم از کم کچھ مدت کے لئے اُن کے آپس کے تعلقات میں ایک گرمی پیدا کر دیتا۔

ممتاز نے سید سخاوت حسین کو ستانے کی غرض سے کہا۔

"آپ لوگ بھی خوب ہیں۔ ایک طرف تو خود ہی جلاوطن ہو کر یہاں چلے آتے ہیں اور پھر یہاں آن کر میلاد شریف منعقد کئے جاتے ہیں، محرم منایا جاتا ہے۔ مشاعرے ہوتے ہیں جمشید کی دکان سے خرید کر اگر لوبان کی خوشبو سے گھر کو معطر کرتے ہیں گیس کے چولھے پر سری پائے پکاتے ہیں۔ اور ہوائی جہاز پر آئے پانوں کو حسرت سے دیکھنے لگتے ہیں۔ اور پھر یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ اسی دنیا میں برٹش میوزیم ہے۔ چلسی ہے، ہائیڈ پارک ہے۔

---

[1] ای۔ایم فاسٹر: A PASSAGE TO INDIA

فلیٹ اسٹریٹ ہے، ٹاور ہے، سوہو ہے! سفید فام عورتیں ہیں!"

ممتاز نے ابھی اپنی بات ختم نہ کی تھی کہ سید سخاوت حسین کے کمرے میں ایکا ایکی سکینہ وارد ہوگئی۔ سکینہ ان کی سب سے بڑی لڑکی تھی۔ پچھلے پانچ سال میں لندن نے اس کی زندگی میں زبردست انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ اپنے نیم دیہاتی قصبے سے نکل کر جہاں وہ ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں کے بعد کراچی پہنچی تو اُس کی عمر بس بارہ سال کی تھی۔ کراچی میں آکر پیر الٰہی بخش کالونی کے ایک چھوٹے سے کابک نما مکان میں اُس نے جوانی کی ابتدائی منزلیں طے کیں اور اُسی نواح کے ایک پرائیویٹ اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور پھر سید سخاوت حسین کی قسمت نے زور مارا تو وہ لندن پہنچ گئی۔ یہاں تو اس کے لئے دنیا ہی اور تھی۔ اب وہ ایک ہوم سائنس کالج میں ڈپلوما کورس کر رہی تھی۔ اور آکسفورڈ اسٹریٹ اور کنسنگٹن میں کپڑے والوں کی دکان پر سیل کی منتظر رہتی اور ہفتے میں ایک مرتبہ ایک فورن لینگویجز کلب میں اطالوی زبان سیکھنے کی غرض سے جاتی اور اپنے خالی اوقات میں کوئی چھوٹی موٹی نوکری کر کے سات آٹھ پونڈ ہفتہ کما لیتی۔

سکینہ کے یوں ڈرامائی انداز میں سید سخاوت حسین کے کمرے میں داخل ہونے پر تمام دفتر کی فضا میں ایک لہر سی دوڑ گئی۔ جیسے وہ سب کلرک جو اس وسیع کمرے میں بیٹھے تھے ایک دوسرے سے ایک بے آواز لہجے میں کہہ رہے ہوں۔

"یہ سکینہ بھی بہت دلچسپ لڑکی ہے!" دفتر کی فضا میں ایک ہلچل پیدا کر کے سکینہ ایک بے ساختگی کے ساتھ سید سخاوت حسین کی میز پر اُچک کے بیٹھ گئی۔

"ابو!" اس نے اِٹھلا اِٹھلا کر کہا۔ "آپ نے اب تک شوکت میاں کو ٹیلیفون نہیں کیا؟" سید سخاوت حسین نے چھالیہ کی ڈلی چباتے ہوئے کہا: "کیا کریں بیٹا فرصت ہی نہیں ہوتی" پھر ممتاز سے مخاطب ہو کے کہنے لگے: "شوکت میاں بھی اپنے ہی قصبے کے رہنے والے ہیں۔ ہفتے میں دو بار نہیں تو ایک مرتبہ ضرور ہمارے لئے پان لے آتے ہیں، کبھی کبھار قوام بھی۔ پر وہ..... کسٹم والے بہت پریشان کرتے ہیں۔ کہتے ہیں، ان پانوں کے ذریعے بھی بیماری کے کیڑے ولایت میں آسکتے ہیں۔ ان کو پہلے دوائی سے دھوؤ، تب لے جانا ملے گا!"

سکینہ ایک لمحے کے لئے ممتاز کی شخصیت کا جائزہ لینے لگی۔ مگر پھر اُسی اٹھلاہٹ کے ساتھ کہنے لگی: "بس ابو! آپ کو تو ہمارے کاموں کو ہی فرصت نہیں ہوتی۔ آپ نمبر بتا دیجئے ہم خود ہی فون کرلیں گے"۔ پھر وہ بلا تعارف ہی ممتاز سے مخاطب ہوگئی: "آپ ہوائی سروس کے شوکت میاں کو جانتے ہیں؟"

ممتاز نے جھوٹ بول دیا۔ "ہاں تھوڑی بہت تو.... واقفیت ہے!"

"تو پھر آپ ہم کو اُن کے پاس لے چلئے۔ وہ ہمارے لئے کراچی سے ایک سوغات لے کر آئے ہیں"۔

ہوائی کمپنی کے دفتر کی طرف جاتے ہوئے ممتاز نے سوچا کہ نہ جانے لڑکی کونسی سوغات کی منتظر ہے! —— وہ اب سکینہ کے قرب کو شدید طور پر محسوس کر رہا تھا۔ اچانک سکینہ نے اٹھلا کر اس سے ایک سگریٹ مانگ لیا۔

"ابو کو مت بتایئے گا۔ مگر ہمیں سگریٹ پینا بہت پسند ہے"۔ اس نے کہا۔

اُس کا سگریٹ پینے کا انداز کافی شوخ تھا۔ ممتاز نے سوچا کہ نہ جانے اس نے یہ سب طور کہاں پر سیکھے تھے۔ اس کو معاً خیال آگیا کہ کراچی اور لندن کے درمیان غیر مرئی پُل اس نوجوان تیکھی لڑکی کو پیر الٰہی بخش کالونی کی دُور افتادہ زندگی سے بہت زیادہ دُور لے آیا تھا۔ اور اگر اس پل پر سے گزر کر وہ دوبارہ کراچی جانے کا ارادہ کرے گی۔ تو نہ جانے کیا ہوگا!

وہ سوغات جس کے لئے سکینہ اس قدر بے تاب تھی۔ دراصل ایک ٹیپ ریکارڈر کا ٹیپ تھا جو کسی نے اس کے واسطے کراچی سے لندن بھیجا تھا۔ سکینہ نے ممتاز کو بتایا کہ اس فیتے پر بہت سے شاعروں کا مترنم کلام ریکارڈ کیا گیا تھا۔

اس سوغات کو پاتے ہی اس کی آنکھوں میں ایک نئی چمک ہویدا ہوگئی۔ اس نے کہا۔ "مجھے ترنم سے پڑھے ہوئے کلام سے بے حد عشق ہے۔ اگر آپ ہمارے گھر آئیں تو آپ بھی اس کلام کو سن سکیں گے"۔

ممتاز نے کہا۔ "شاید میں آ ہی جاؤں، کیونکہ کل تو میں

"بلاشر عام"

دور انقلاب کا مرقع نگار — صادقین

ایک تصویر (روغن ترابسی کی تکنیک)

ملک کا بدترین دشمن : "اسمگلر" ـــ ـــ (کردار اور کیفر کردار) (ملاحظہ ہو مضمون صفحہ ۱۱۱)

,, بہار ،،
عمل : رضیہ فیروز

,, خزاں ،،
عمل : طلعت

یہاں سے چلا ہی جاؤں گا"

"کہاں؟" سکینہ نے بیتابی کے ساتھ پوچھا۔

"واپس"۔ ممتاز نے کہا۔ "رخصت اے بزم جہاں وغیرہ وغیرہ"۔

سکینہ مسکرادی۔ مگر اس کی آنکھوں میں اب ایک کھوئی کھوئی سی کیفیت تھی۔

پر جب وہ دوبارہ ممتاز سے سگریٹ مانگ کر سلگانے لگی تو یہ کیفیت اس کی غائب ہوگئی اور وہ دوبارہ وہی شوخ نوجوان لڑکی ہوگئی جس کے سگریٹ پینے کے انداز میں ایک عامیانہ سی جھلک تھی اور وہ اپنے مخصوص اترامہٹ آمیز لہجہ میں کہنے لگی۔ "اچھا خدا حافظ — جاؤ تم بھی سدھارو!"

دن بھر ممتاز اپنے مختلف کاموں میں جتا رہا۔ وہ ایک عرصے سے یہاں لندن میں مقیم تھا اور اس کی زندگی بغیر کسی پروگرام کے گذرتی رہی تھی۔ مگر اب یہ چند آخری لمحے بہت قیمتی تھے۔ قیمتی اور اہم — اور ان چند لمحوں کے اختتام پر اس کو معلوم تھا کہ وہ ہوائی جہاز کی نرم گدیلوں والی سیٹ میں دھنس جائے گا۔ اور چار سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرنے والا ہوائی جہاز زمین کی مقناطیسی کشش کا مقابلہ شروع کردے گا۔ اور وہ سوچے گا کہ نہ جانے سکینہ کی آنکھوں میں وہ ایک مدھم مدھم کھویا پن پیدا بھی ہوا تھا یا یہ اس کا محض واہمہ ہی تھا۔

جب ٹیوب اور بس سے مسلسل چالیس منٹ تک سفر کرنے کے بعد ممتاز پٹنی میں سکینہ کے بتلائے ہوئے بس سٹاپ پر اترا تو اس کو اس علاقہ کی مضافاتی فضا میں خواہ مخواہ ایک اداس کیفیت نظر آئی۔ مگر اس وقت اُسے اس کیفیت پر زیادہ وقت صرف کرنے کی فرصت نہ تھی۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا سکینہ کی بتائی ہوئی ہدایتوں کے بموجب دس منٹ میں سید سخاوت حسین کے مکان پر پہنچ گیا۔ ڈرائنگ روم میں فرش پر سکینہ اور اس کے ہم عمر تین چار اور لڑکے لڑکیاں بے تکلفی کے ساتھ نیم دراز تھے ان کے درمیان ایک ٹیپ ریکارڈر رکھا ہوا تھا جیسے وہ سب کے سب اس سائنسی ایجاد کے گہرے پرستار ہوں!

ممتاز کو دیکھ کر سکینہ اچھل پڑی اور اپنے مخصوص بے تکان طریقے پر باتیں کرکے اس کا اوروں سے تعارف کرانے لگی۔ "آپ ذرا دیر سے پہنچے اگر آپ مقررہ وقت پر آتے تو آپ کو کافی کے ساتھ دہی بڑے بھی کھانے کو ملتے اب کافی پر ہی قناعت کرنی ہوگی —! یہ زاہدہ ہے یہ قمر یہ ریحانہ — یہ شاہد — یہ محمود!" وہ تیزی کے ساتھ بول رہی تھی۔ جیسے ایک ہی سانس میں بہت سی باتیں کہہ دینا چاہتی ہو یا شاید وہ تیز تیز بول کر اپنی گھبراہٹ کی سی کیفیت کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ تعارف کا سلسلہ ختم ہوا تو سکینہ بے تکلفی کے ساتھ اس کا ہاتھ کھینچتی ہوئی ٹیپ ریکارڈر کے پاس لے گئی — "تکلف برطرف آپ بھی یہاں ہمارے ساتھ زمین پر بیٹھ جائیے" اور وہ پھر اپنے ساتھیوں کو ایسے دیکھنے لگی جیسے اپنی باتوں پر داد طلب کر رہی ہو۔ وہ قالین سے زمینی فرش پر گدیلوں کے سہارے نیم دراز ہوگئے۔

اور سکینہ نے ٹیپ ریکارڈر کا سوئچ دبا دیا اور ٹیپ میں مقید ایک اداس مترنم آواز نے ایک غزل پڑھنی شروع کردی۔ رسمیہ انداز کے نپے تلے مصرعے غزل کی روایتی بندشیں پھر بھی ممتاز کو اس مترنم آواز کی اداس کیفیت متاثر کئے بغیر نہ رہ سکی۔ اور وہ سوچنے لگا کہ نجانے غزل کے اشعار یوں ترنم سے پڑھتے وقت شاعروں کا موڈ خواہ مخواہ کچھ اداس کیوں بن جاتا ہے۔ سکینہ متوقع انداز میں اس کی جانب دیکھنے لگی۔ جیسے وہ بھی یہی سوال اس سے کرنا چاہتی ہو! جب ممتاز نے سکینہ کی طرف دیکھا تو وہ کچھ جھینپ سی گئی۔ اور اپنے مخصوص انداز میں کہنے لگی۔ "یہ غزل تو نہ جانے کس کی ہے، مگر پڑھی ہمارے ایک عزیز نے ہے۔ اُن کی آواز میں بیحد ترنم ہے۔"

ٹیپ ریکارڈر کی مترنم اداس آواز ابھرتی گرتی رہی اور ممتاز کو اس ڈرائنگ روم سے قالین سے مزین فرش پر نیم دراز لڑکوں اور لڑکیوں سے پٹنی کی خاموش فضا سے ایک بیزاری سی محسوس ہونے لگی۔ ایک وحشت جیسے کوئی اَن جانا جذبہ اس کو ان سب چیزوں سے دور کھینچ کرلے جانے پر آمادہ تھا۔ نہ جانے اگر وہ اپنے کو اس جذبے کے بہاؤ پر چھوڑ دے تو وہ کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔

ڈرائنگ روم کی فضا میں ایک غزل کا اور شعر گونجا۔

آنکھوں میں ترے جلوے لئے پھرتے ہیں ہم لوگ
ہم لوگ کہ رسوا سرِ بازار ہوئے ہیں

سکینہ ایک دم سے بھدے پن کے ساتھ ہنس پڑی۔ اس نے کہا "نہ جانے رسوا سرِ بازار کیسے ہوتے ہیں"۔ اور وہ ممتاز کے چہرے کو ایک طنزیہ طور پر مسکرا مسکرا کر دیکھنے لگی۔ اس کی سہیلی اس کے اس فقرے پر ہنس پڑی۔ اور ممتاز کی بیزاری ایکدم سے اور بھی بڑھ گئی۔ اس نے کچکچا کر کہا "آپ لوگ اردو شاعری سے اور کسی اور چیز میں دلچسپی کیوں نہیں لیتے۔ اس کے بجائے کے بجائے فلمی گانے سنیئے۔ وہ آسانی سے سمجھ میں آسکتے ہیں۔ اور فلمی گویوں کی آواز میں ترنم بھی شاعروں سے زیادہ ہوتا ہے"۔ وہ شاید کچھ اور بھی کہتا لیکن وہ پھر کسی اضطراری جذبے کے ماتحت چُپ ہوگیا۔ سکینہ اور اس کے ساتھی اس کی بات پر برہم ہونے کے بجائے بے حیائی کے ساتھ ہنسنے لگے۔ اور پھر ٹیپ ریکارڈر پر کسی نے مجازؔ کی پرانی مانوس نظم "آوارہ" الاپنی شروع کردی وہ نظم جو آج سے بہت عرصہ پہلے ایک مستقل حزنیہ گونج بن کر بے گنتی نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے تحت شعور میں سماگئی تھی۔۔

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں
اے غمِ دل .....

پنڈی کی خاموش مضافاتی فضا میں رات کافی ڈھل چکی تھی۔ باہر تاریکی میں ہلکی ہلکی بوندیاں پڑ رہی تھیں جن کی ٹپ ٹپ ایک مسلسل تھاپ کی طرح ایک مدہم مدہم آہٹ کی مانند کبھی کبھی ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ ممتاز کے کانوں تک بھی پہنچ جاتی۔ وقت کا سمندر ایک سُرعت کے ساتھ ماضی کی جانب بہہ رہا تھا۔ اب چند لمحوں بعد رات بیت جائے گی اور سکینہ اور اس کے ساتھی، نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ماضی کی طرف بہہ جائیں گے۔ اور ممتاز خود اس ان دیکھے غیر مرئی پُل کے ذریعہ ایک اور دنیا میں پہنچ جائے گا۔

ممتاز کسی نہ معلوم غیر متعین جذبے کے ماتحت قالین پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ سکینہ کھوئے کھوئے انداز میں اس کو دیکھنے لگی۔ اس نے سکینہ کا شکریہ ادا کرنے کی غرض سے مناسب الفاظ تلاش کرنا چاہے لیکن سکینہ کے اس کھوئے کھوئے انداز نے اس کے ذہن میں ایک خلا پیدا کردیا۔ ممتاز نے جیسے اپنے تحت شعور کے اندرون ترین گوشے میں کسی ہستی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "نہ جانے یہ سکینہ جو ایک عامیانہ انداز میں سگریٹ پی سکتی ہے۔ اٹھلا اٹھلا کر باتیں کرسکتی ہے۔ اور جو بے معنی اور بے مقصد قہقہے لگا کر اپنے اردگرد مجتمع لوگوں کو اپنے عامیانہ انداز کا ایک جزو بنا لیتی ہے۔ یہ کبھی کبھی یوں کھوسی کیوں جاتی ہے؟ اس کی آنکھوں میں یہ ویرانی کیوں جھلک آتی ہے"۔ لیکن ممتاز کے تحت شعور نے اس کو کوئی بھی جواب نہ دیا۔ اور دوسرے لمحہ سکینہ کی آنکھوں کی چمک۔ اور خوشی عود کر آئی۔ بارش کی ٹپ ٹپ کے شور کے باوجود مجازؔ کی نظم کی موسیقی ممتاز کا تعاقب کر رہی تھی۔

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ پھر وہ چھوٹی پھلجھڑی
جانے کس کی گود میں جائے یہ موتی کی لڑی
ہُوک سی سینے میں اٹھی۔ چوٹ سی دل پر پڑی
اے غمِ دل ....

ممتاز تیز تیز قدموں سے بس اسٹینڈ کی جانب بڑھ گیا۔ اس نے اپنی برساتی کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ لیا۔ جیسے وہ یوں اس نظم کے تاثر کو اپنے تک پہنچنے سے روک دینا چاہتا ہو۔ مگر وہ مترنم آواز ہو بہو ویسے ہی گرتی ابھرتی رہی، اس کا پیچھا کرتی رہی۔ ممتاز نے سوچا کہ اب سکینہ ضرور اپنے کسی ساتھی سے پوچھے گی "بھیا سینے میں ہوک کیسے اٹھتی ہے"! اور وہ سب کے سب ایک عامیانہ انداز میں ہنس پڑیں گے۔ جیسے اس نے کوئی بہت ہی اسمارٹ فقرہ کس دیا ہو۔ اور ٹیپ ریکارڈر اپنا نغمہ بدل دیگا۔ راک اینڈ رول شروع ہوجائے گا۔ اور سکینہ اپنا سگریٹ ایش ٹرے میں رکھ دے گی اور اپنے سڈول اور خوب صورت جسم، اپنی آنکھوں کی شوخ چمک کو، اپنے تمام وجود کو راک اینڈ رال کے زیر و بم کے سپرد کردے گی اور وہ سفید فام لڑکی جس نے اسکفورڈ اسٹریٹ کی ایک بڑی اسٹور میں ممتاز سے بہت سی بیکار بہت سی فالتو باتیں کہی تھیں۔ وہ لڑکی اپنی کسی ساتھی شاپ اسسٹنٹ سے کہے گی۔ "گریٹ، روڈی، تم نے کبھی یہ محسوس کیا کہ یہ کالی رنگت والے خواہ مخواہ بات بات پر کیسے بیحد جذباتی بن جاتے ہیں، وہ کالی رنگت والا نوجوان، جو اس روز ہماری اسٹور میں آیا تھا، وہ شاید اب اپنے وطن کی سرزمین پر پہنچ چکا ہوگا اور وہ سوچ رہا ہوگا کہ اگر وہ اپنے جذبات کی رو میں بہک کر کسی فرنگی عورت کے جال میں پھنس کے رہ جاتا تو کیا ہوتا۔ "پُور فول"! اور پھر وہ سفید فام لڑکی اور اس کی ساتھی شاپ اسسٹنٹ اور سکینہ اور سب لوگ اپنی اپنی میکانکی زندگیوں میں منہمک ہو کے رہ جائیں گے۔ اور پنڈی کی فضا میں گونجتے گونجتے مجازؔ کی نظم کا ترنم آپ ہی آپ ایک بڑے سناٹے کا ایک حصہ بن کے رہ جائے گا!

(بشکریہ ریڈیو پاکستان کراچی)

دوسرا کنارہ

غلام الثقلین نقوی

رحمتے نائن نے کہا "شاداں ماشاءاللہ جوان ہو چکی ہے۔"

سیداں اناج پھٹک رہی تھی۔ اس نے چھاج کو ایک جھٹکا دیا اور کہا "لڑکیاں جوان ہو ہی جایا کرتی ہیں۔ تو نے کون سی نئی بات کی؟"

رحمتے نائن کھسیانی ہو کر یونہی ہنس دی۔ دوسرے لمحے اس نے سنجیدہ بنتے ہوئے کہا "چودھرائن! شاداں تو تیری چھوٹی بہن لگتی ہے۔ میں اسے دیکھتی ہوں تو تیری جوانی یاد آ جاتی ہے۔"

سیداں نے دھیمے سے کہا۔ کیسی باتیں کرتی ہو؟ گزرے دن کیوں یاد دلاتی ہو؟"

"نہیں..... میرا مطلب تھا..... شاداں تیری جوانی کی تصویر ہے۔ چنبے کی کلی کی طرح نازک۔ کنوار گندل ایسا لچکتا ہوا بدن۔ چودھرائن! تیری آنکھوں کا جادو پھر سے زندہ ہو گیا ہے۔"

سیداں نے مسکرا کر کہا "رحمتے! تو نائن نہیں میراسن ہے۔ تجھے کسی کے منہ پر تعریف کرنا خوب آتا ہے۔" "تیرا نائی کہہ رہا تھا چودھری کرم دین تو افیم کی پینک میں مست ہے جس کے گھر میں جوان لڑکی ہو، اسے بھلا نیند کیسے آ سکتی ہے۔"

سیداں کا چہرہ یکدم اداس ہو گیا۔ اس چہرے پر چند لمحے ہنسی کی دھیمی سی بہار تھی اور یہ ہنسی اس کی آنکھوں میں چمک رہی تھی۔ گزری ہوئی جوانی کا ایک لمحہ اپنی پوری آب و تاب سے زندہ ہو گیا تھا۔ بیس سال پہلے کی جوانی ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرتی ہوئی آئی تھی اور بیس سال کا گرد و غبار ڈھل کر مطلع نکھر آیا تھا۔ پھر بیس سال آنکھ جھپکنے میں گزر گئے تھے!

نائن نے کہا "نائی کہہ رہا تھا کہ اب شاداں بی بی کا بیاہ ہو جانا چاہیئے۔"

سیداں نے نائن کے چہرے پر ایک بھرپور نظر ڈال کر کہا "ہوں! اب پتہ لگا تو میری جوانی کے گن کیوں گا رہی تھی؟ نائیوں کا اور کام ہی کیا ہے؟ خیر سے نائی سے کہہ دینا تجھے اپنے 'لاگ' سے غرض ہے۔ فکر نہ کر شاداں کے بیاہ پر اتنا دوں گی کہ ساری عمر کسی سے نہ ملا ہو گا۔"

رحمتے نے خوش ہو کر پوری بتیسی نکال دی پھر اس نے متانت کا لبادہ اوڑھتے ہوئے کہا "اس گھر سے جھولیاں بھر بھر کر لیا ہے بی بی! لینے دینے کے سر پر خاک۔ ایک بات پوچھوں؟"

"کہو۔"

"شاداں کا ناطہ کہاں طے کیا ہے؟"

"کہیں بھی نہیں۔"

"تیرا نائی کہہ رہا تھا کہ چوہدری شاہ دین کا لڑکا شریف..."

"دیکھا جائے گا۔" سیداں نے تھوڑا سا چڑ کر کہا۔

رحمتے نائن نے حوصلہ نہ ہارا "میں نے تیرے نائی سے کہا شریف کے لچھن اچھے نہیں۔" اور پھر کچھ دیر سوچ کر اس نے ایک تیر اور چھوڑا "چوہدری لال دین کا بیٹا سرفراز....." نائن نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ سیداں نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا "سرفراز..... پر چوہدری تو اس گھر کا نام سننا بھی پسند نہیں کرتا۔ جب کبھی اسے نشے کی ترنگ سے ہوش آتا ہے تو وہ لال کے خاندان کی تباہی کی بات کرتا ہے۔" رحمتے نے محسوس کر لیا کہ چودھرائن اس رشتے پر خوش ہے۔ اس نے کہا "سنا ہے سرفراز نے دسویں جماعت کا امتحان پاس کر لیا ہے۔ چراغ لے کر بھی ڈھونڈو تو ایسا شریف لڑکا نہ مل سکے گا۔"

"ہاں..... ہاں..... پر چوہدری کو کون راضی کرے۔"

اور اس اثنا میں شاداں باہر سے آ گئی بکھری ہوئی دھوپ میں شاداں نو دمیدہ کلی کی طرح تر و تازہ لگ رہی تھی۔ شاداں دیہات کی روایات کے برعکس دھان پان تھی۔ اس کا جسم دبلا پتلا اور نازک تھا البتہ اس کے گالوں کے عین درمیان سرخیوں کے نقطے تھے جنہیں دھوپ

نے تمازت بخش دی تھی۔ بال سیاہ تھے اور آنکھیں شبنم کے قطروں کی طرح جھلمل جھلمل کر رہی تھیں۔ شاداں کی چال میں نئی نئی جوانی کا تازہ تازہ شعور تھا اور اس شعور میں غرور نہیں تھا لیکن بلوغت کی آمد آمد کا لوچ ضرور تھا اور ان دیکھی خوشبوؤں کے وہ لطیف سانس بھی تھے جو بہار کے آتے ہی فضاؤں میں رچ جاتے ہیں۔

وہ نائن کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے ٹھٹکی۔ پھر وہ آگے بڑھ کر وہاں آگئی جہاں سیداں بیٹھی ہوئی تھی۔ نائن نے اپنی نظر اس کے چہرے پر گاڑ دی۔ یہ نظر سر سے پاؤں تک چیونٹی کی طرح رینگتی رہی۔ یہ نظر شاداں کے ایک ایک انگ کو ٹٹول رہی تھی۔ شاداں بے چین سی ہوگئی۔ اس کے گال تمتمائے اور سرخیوں کے نقطے پھیلے۔ کانوں کی لویں تپنے لگیں۔ آنکھیں جھک گئیں اور پلکوں نے ان پر سایہ کر لیا تو نائن نے ایک قہقہہ لگا کر کہا "بالکل تیری تصویر ہے چودھرائن! تیری کوئی کسر بھی تو نہیں چھوڑی اس نے۔" شاداں شرماتے ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ کمرے کے اندر چلی گئی۔ سیداں نے چھاج ایک طرف رکھ کر نائن کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ پھر یہ نظریں اپنے آپ میں کھو گئیں اور اپنے آپ میں کھوئی ہوئی نظریں اپنے آپ سے بھی بے نیاز ہو گئیں۔ ان کا رشتہ اپنے ماحول سے ٹوٹ گیا تو نائن نے اٹھتے ہوئے کہا "میں جاؤں بی بی؟" سیداں نے بے خیالی میں سر ہلا دیا۔ نائن اٹھ کر چلی گئی تو شاداں باہر آنگن میں آگئی۔ اس نے سیداں سے پوچھا "ماں! یہ نائن کیا کہہ رہی تھی؟"

"کچھ بھی نہیں۔ یونہی ادھر ادھر کی باتیں۔"

"باقی اناج میں پھٹک دوں ماں؟" شاداں نے کہا۔

"نہیں تو اپنا کام کر۔" شاداں چپکے سے اندر گئی اور سوئی دھاگے والی پٹاری اٹھا لائی اور ماں کے پاس بیٹھ کر ایک دوپٹے پر پھول بوٹے کاڑھنے لگی۔ دونوں ماں بیٹی خاموش تھیں اور دونوں کام کرتے کرتے کچھ سوچ رہی تھیں۔ دونوں کے سوچتے ہوئے چہروں اور کھوئی کھوئی آنکھوں میں بڑی گہری مشابہت تھی۔ دونوں کی آنکھیں خواب دیکھنے کی عادی تھیں۔ آنگن میں دھوپ کھلی ہوئی تھی اور ایک کونے میں بکائن کا ایک درخت تھا جس پر نئے نئے پتے آئے ہوئے تھے اور ان میں پھدکتی ہوئی چڑیوں کا ایک جھنڈ تھا۔ یہ چڑیاں چہچہا کر اڑ رہی تھیں اور اڑ اڑ کر چہچہا رہی تھیں۔ بکائن کے نیچے پتوں میں سے چھنتی ہوئی دھوپ کے دھبے کانپ رہے تھے۔ سیداں نے آخری بار چھاج پھٹکا اور ایک چلبلاتی ہوئی نظر شاداں کے چہرے پر ڈالی اور اسے اپنا وجود شاداں کے جسم میں گھلتا ملتا محسوس ہوا۔ پھول کی خوشبو کی طرح جو نظر نہیں آتی لیکن فضا میں رس بس کر اپنا وجود بھی نہیں کھوتی۔ شاداں جوان تھی۔ کلی کی طرح نازک تھی اور سورج مکھی کے پھول کی طرح دھوپ اور چمک دمک کی طرف مائل تھی لیکن پھول کی نزاکت اندھیروں میں کب پنپ سکتی ہے۔ اندھیرے.... اور دنیا میں اجالا کہاں ہے؟ اندھیرے..... سیداں کی آنکھیں اداس ہو گئیں اور ان کے کونوں سے اندھیرے کا ایک غبار لپکا اور دھوپ کملا کر رہ گئی!

ڈیوڑھی میں کوئی کھنکارا اور پھر ایک نحیف و نزار جسم نے کھلے آنگن میں ایک منحنی سے سائے کا اضافہ کر دیا۔ سیداں چونک کر بیٹھ گئی۔ سائے میں سرد کپکپاہٹیں تھیں۔ اس کی نگاہیں ایک انجانے خوف سے کانپیں۔

"ماں بیٹی میں کیا ملی بھگت ہو رہی تھی؟" شاداں بھی چونک گئی۔

"کچھ بھی نہیں۔ تو نے ہمیں کوئی بات کرتے ہوئے سنا چودھری؟" سیداں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ چودھری کھلکھلا کر ہنسا "ہا ہا... ...آ.... ...آ..... آج تکئے میں بڑا مزا رہا۔" سیداں نے کوئی توجہ نہ دی۔ "سیداں"! چودھری نے اسے متوجہ کرنے کے لئے ذرا خشونت سے کہا "آج لالی کو تکئے میں بڑی جوتیاں پڑیں۔" سیداں کسمسا کر رہ گئی۔ اس کے حساس چہرے پر ناگواری کا ایک زخمی جذبہ ابھر کر چھا گیا اور ہونٹ زرد پڑ گئے۔ "ساری پنچائت نے اسے جھوٹا کیا۔ عدالت میں اگلی پیشی پر ساری برادری میرا ساتھ دے گی۔ پھر دیکھنا چودھری کرم دین کی زمانے بھر میں واہ واہ ہو گی۔ شاداں! جا اندر سے ایک کھاٹ تو اٹھا لا۔"

شاداں بادلِ ناخواستہ اٹھی اور کھاٹ اٹھا لائی۔ دھوپ میں چارپائی بچھ گئی تو چودھری نے اس پر بیٹھتے ہوئے کہا "تھوڑی سی کسر باقی رہ گئی ہے۔ برادری نے ساتھ دیا تو لالی بوریا بستر باندھ کے گاؤں سے چلا جائے گا۔ ہا ہا ہا...... چودھری نے قہقہہ لگایا اور یہ قہقہہ آہستہ آہستہ گہرائی میں ڈوبتا چلا گیا اور پھر خرخر کی آواز کے ساتھ گلے میں دم توڑ گیا۔ شاداں نے ایک کھیس تہہ کر کے چارپائی کے سرہانے پر رکھ دیا۔ چودھری نے ڈب سے چمڑے کی ایک تھیلی نکالی اور تھیلی میں سے ایک ڈبیا نکال کر اسے کھولا اور ایک گولی

زبان پر رکھ کر آنکھیں میچ لیں اور آہستہ آہستہ کھیس پر سر رکھ کر دراز ہوگیا۔ پتلے دبلے چوہدری بولے میرے چہرے پر مسرت کی ایک ترنگ آنکھ مچولی کھیلنے لگی۔

سیداں نے اناج اکٹھا کیا اور ایک گٹھڑی میں باندھ کر اندر رکھ دیا۔ شاداں مونڈھے پر بیٹھ کر پھول کاڑھنے میں مصروف ہوگئی۔ سیداں نے ایک نظر چوہدری کے چہرے پر ڈالی اور دوسری شاداں کے چہرے پر اور اس کے پتلے پتلے زرد ہونٹ کسی خفیہ جذبے کے تحت کانپتے رہے۔ اور اس کی آنکھوں کے کونوں میں نمی کا ایک غبار جمع ہو کر کپکپانے لگا۔ سیداں نے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھ لیں۔ چوہدری نے کروٹ بدل کر آنکھیں کھولیں، پلکیں جھپکائیں اور تیز دھوپ سے بچنے کے لئے پگڑی کا پلو آنکھوں پر کر لیا۔

اب سیداں کی آنکھوں میں نمی کا غبار نہیں تھا۔ ایک تلخ نفرت تھی جو کچلے ہوئے سانپ کی طرح بل کھا رہی تھی۔ اس نے دھیمے سے کہا "شاداں! تیرا باپ اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھود رہا ہے۔"

"کیوں ماں؟" شاداں نے حیران ہو کر کہا۔

"آج برادری اس کا ساتھ دے رہی ہے۔ کل اس کے منہ پر جوتی بھی مار سکتی ہے۔"

"ماں!" شاداں کی حیرت چیخ میں بدل گئی۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں شاداں! دنیا ہارے ہوئے کو پاؤں تلے روندتی ہے پر جیتنے والے کا سر بھی چپکے سے کاٹ لیتی ہے۔"

"پر ماں! ماموں لال نے بھی تو کبھی ہار نہ مانی۔"

"ہاں!" سیداں اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی۔

سارا جھگڑا ایک کھیت پر تھا۔ یہ کھیت چوہدری لال کی ایک لاولد ماسی نے اس کے نام ہبہ کر دیا تھا۔ کرم دین بھی اس زمین کا اپنے آپ کو حقدار سمجھتا تھا۔ مدت سے مقدمہ چل رہا تھا چوہدری کرم دین، چوہدری شاہ دین کے پاس مقدمہ لڑنے کے لئے تین کھیت رہن رکھ چکا تھا۔ چوہدری لال کوئی بڑا زمیندار نہ تھا پر تھا بڑا جگر دار بس۔ جھگڑے والے کھیت کی ساری آمدنی مقدمے کی نذر کر کے بڑے فخر سے کہتا "کنوئیں کی مٹی کنوئیں میں ہی لگ جایا کرتی ہے۔ اس میں افسوس کی کیا بات ہے؟" پھر لال اپنے ہاتھ سے کام کرنے کو عار نہ سمجھتا۔ منہ اندھیرے کام میں جٹتا تو شام تک ہل کی ہتھی سے ہاتھ نہ اٹھاتا۔ پھر جب پیشی کی تاریخ آتی تو اجلے کپڑے پہن کر عدالت میں جاتا۔ پنچایت میں بیٹھتا تو اس کی پگڑی کا طرہ ڈھیلا نہ پڑتا۔ برادری کو اس کی یہ پروقار ادائیں ایک آنکھ نہ بھائیں۔ اس لئے چپکے چپکے ایک ایک کر کے لوگ اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔

چوہدری لال میکے کی طرف سے سیداں کا قریبی تھا۔ سیداں کے ماں باپ مر چکے تھے اور سگے بھائیوں میں سے کوئی جوانی نہ پا سکا تھا۔ جب لال اور کرم دین کی آپس میں صلح تھی تو لال سیداں کا بھائی بن کر عید، شبرات کے تہوار پر اس کے گھر کچھ نہ کچھ ضرور بھجواتا یہی ایک دو روپیہ شکر اور سویاں اور سیداں کو محسوس ہوتا رہتا کہ اس کے میکے زندہ ہیں اور وہ سسرال والوں کے ہاں بے سہارا نہیں اور اب یہ سہارا بھی چھن رہا تھا اور سیداں کو اس بات کا بے انتہا قلق تھا۔ یہ جذباتی اور روحانی رشتہ ٹوٹ رہا تھا۔ دو خاندانوں میں مخالفت کی خلیج پھیل رہی تھی اور اب شاداں جوان تھی اور لال کا لڑکا سرفراز دسویں کا امتحان پاس کر چکا تھا۔ اس رشتے کا بیج مدت سے سیداں کے دل میں پرورش پا رہا تھا اور اب ننھا سا شگوفہ جڑ سے کٹ رہا تھا۔

سیداں مضطرب ہو کر اندر چلی گئی۔ زیادہ دیر تک دھوپ میں بیٹھے رہنے کی وجہ سے اس کا سر چکرا رہا تھا۔ اندر خنکی تھی اور اندھیرا۔ وہ دیوار کے ساتھ بچھی ہوئی چارپائی پر نڈھال اور نیم جاں ہو کر گر پڑی۔ اندھیرے میں رچی ہوئی خنکی تیکھے اور تیز احساس کا ایک تیر بن کر اس کے دل میں پیوست ہوگئی۔ اس کا جسم سن سے بیدار ہوا اور جاگ کر لرز گیا۔ ایک جھرجھری سی آئی اور رواں رواں رگِ خار کی طرح تن گیا۔ اس تھرتھری، اس چونکی ہوئی لرزش میں جہاں تسکین کے مرہم کی ٹھنڈک تھی وہاں ایک دلدوز کرب بھی تھا جیسے زندگی خارج ہو رہی ہو، حال ماضی کی طرف دوڑ رہا ہو اور مستقبل نے حال کی تلخیوں میں پناہ لے لی ہو۔ ایک عجیب سا احساس جس میں درد کی شدت بھی تھی اور اس درد میں لذت بھی تھی۔ صبح کے پھوٹتے ہوئے نور میں شام کے سائے بھی تھے اور شفق کی سرخیاں بھی رچ رہی تھیں اور ان میں سیداں کا ماضی بھی زندہ ہوگیا تھا۔ اس نے چارپائی کی پٹی پر سر رکھ دیا۔

"سیداں!" یہ آواز اس کے دل میں اتر گئی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ فضا خالی تھی۔ نہ جانے یہ آواز کون سے کونے سے ابھری تھی۔

لیکن یہ آواز بڑی میٹھی اور پیاری تھی۔ اس نے سوئے ہوئے نغمے کے دوسرے آہنگ کو روح میں رچا لینے کے لئے آنکھیں بند کر لیں ـــــ "سیداں!"

"ہاں ماں!"

"جا بیٹے کے اس بار اپنے باپ کو روٹی دے آ۔"

سیداں نے لسی کا مٹکا سر پہ رکھا اور کھدر کے رومال میں [illegible] لپیٹ لیں چپڑی ہوئی روٹیوں پر پسی ہوئی لال مرچیں اور نمک [illegible] تھا۔

کالو ڈر کے باہر دھوپ تھی اور بہار کی اس دھوپ میں ٹھنڈک بھی تھی اور تیزی بھی اور ریگستانی دھوپ کی ایک بل کھاتی ہوئی لکیر تھی جس کے دونوں طرف جوبن پہ آئے ہوئے کھیت تھے۔ اس کا باپ نالے کے پار والے کھیتوں میں تھا اور نالے کے دونوں طرف شیشم کے بڑے بڑے اور پرانے تناور درخت تھے۔ ان کے گھنے تیور میں ہریالی تھی اور روشنی کی تیز چمک اس ہریالی میں جذب ہو گئی تھی۔ نالہ سوکھا ہوا تھا اور نالے کے دونوں کنارے اونچے اونچے تھے۔ نالے کے اندر شیشم کا گھنا سایہ تھا اور اس گھنے سائے میں تاریک خنکیاں تھیں اور آسمان اس سائے میں چھپ گیا تھا۔ اس کی پیشانی پر تیز دھوپ شبنم کے چند قطرے نثار کر گئی تھی۔ وہ نالے کے عین درمیان گھنے سائے میں کھڑی ہو گئی اور شبنم پونچھنے لگی۔ ایک ڈالی کے پتے دھیرے دھیرے کپکپانے اور ہوا کا ایک چھوٹی موٹی جھونکا بڑی شوخی سے اس کی پیشانی کو چھو کر پتوں میں گم ہو گیا۔ سیداں اس شوخی پہ مسکرا دی اور اس مسکراہٹ کی ایک شوخ کرن سے ایک ہیولیٰ ابھرا۔ اس ہیولے نے اس کی مسکراہٹ میں سے جھانک کر کہا "چنبے کی کلی!"

سیداں بانسری کے نغمے کی طرح تھرتھرائی۔

"چنبے کی کلی!" سیداں نے سوچا "کون چنبے کی کلی؟"

"تو!" ایک نغمے نے تھرتھرا کر کہا۔ اب سیداں چھوئی موئی کی طرح سمٹ گئی "میں!" اور اسے باپ کی بھوک یاد آ گئی۔ اس نے ایک قدم بڑھایا۔ دوسرے نے رک کر کہا "سیداں! دیکھو تو سہی یہ کون ہے جس نے تجھے بانسری کا گیت بن کر پکارا؟" اور سیداں نے شرمائی نظریں اٹھائیں تو مسکراہٹ کے نقرئی غباروں سے دلاور کا چہرہ چاند کی ایک کرن کی طرح ابھرا۔ اس چہرے پر شوخی تھی اور آنکھیں اس سے باتیں کر رہی تھیں۔ اس نے سیداں کا راستہ کیوں روک لیا تھا؟ "وے! میرے رستے سے ہٹ جا۔ دیکھتا نہیں میں اپنے بابا کو روٹی دینے جا رہی ہوں۔" سیداں نے شوخی سے کہا اور دلاور نے رستہ چھوڑ کر اپنے دل سے کہا "سیداں! تیرا غصہ کتنا پیارا ہے!" اور سیداں نے نجانے کیسے اس کے دل کی سرگوشی کو سن لیا اور اس نے واقعی غصے میں آنا چاہا اور اس کا جی چاہا کہ لال انگارا بن کر کہے "جا! بڑا آیا سیداں سے پیار کرنے والا!" اور اس نے دلاور پر آگ برساتی ہوئی ایک نظر کا بھرپور وار کیا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا "چنبے کی کلی!" اور سیداں پھر چھوئی موئی کی طرح سمٹ گئی اور نظریں جھکا کر ہولے ہولے دوسرے کنارے پہ چڑھنے لگی ......

"ماں!" سیداں نے کوئی جواب نہ دیا "ماں!" سیداں نے آنکھیں کھول دیں۔ "تو سو گئی تھی کیا؟" شاداں نے پوچھا۔

"نہیں تو" سیداں نے ایک نیم وا خواب آلود نظر شاداں پر ڈالی "کیوں شاداں! تو مجھے اس طرح کیوں پکار رہی تھی؟"

"کچھ بھی نہیں۔ میں یونہی گھبرا گئی تھی۔ دیکھو تو سہی گھر میں کتنا سناٹا ہے!"

سیداں کی آنکھوں کے کونے تر ہو گئے۔ اس نے دیوار کی طرف منہ کر کے انگلیوں سے آنسو پونچھ لئے۔ باہر چارپائی چرچرائی چوہدری کرم دین نے کروٹ بدل کر آنکھیں کھول دیں۔ ان آنکھوں میں نیند اور بیداری عرصے تک آنکھ مچولی کھیلتی رہیں۔ دیر بعد آنگن کو خالی پا کر چوہدری نے کہا "سیداں!" سیداں نے کوئی جواب نہ دیا تو چوہدری نے چڑ کر کہا "ماں بیٹی نے پھر کوئی کہانی چھیڑ دی؟"

"کون سی کہانی؟" سیداں نے بجھی بجھی آواز میں کہا "ماں اگر بیٹی سے بات نہ کرے تو کس سے کرے؟"

"خالی آنگن سے!" چوہدری نے اٹھتے ہوئے خمار کی ٹوٹی ہوئی آواز میں کہا۔ سیداں نے پھر کوئی جواب نہ دیا تو چوہدری نے کہا "اس نے میرے گھر کو خالی دیکھ کر ......"

"کہو چوہدری! بات پوری کرتے کرتے کیوں رہ گئے؟" سیداں نے تھوڑا سا چمک کر کہا۔

چوہدری اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے آنکھوں پہ ہاتھ پھیرا مونچھوں کو درست کیا۔ سرہانے رکھی ہوئی پگڑی کو سر پہ جما کر

کہا "سیداں! تو نے ایک لڑکی کو جن کر بڑا تیر مارا۔ لوگوں کے آنگن بھر گئے پر تیرا کوکھ تو بنجر زمین کی طرح سوکھ گئی۔"

"چوہدری! تیری اس بات سے اب مجھے کوئی دکھ نہیں ہوتا۔" سیداں نے خشک آواز میں کہا۔

"دُکھ کیوں ہو؟ میں نے سدا تیرا خیال رکھا۔ اب تک دس سوکنیں لا بٹھاتا پر...." سیداں نے چوہدری کی بات کاٹ کر کہا، "اب لے آنا۔ تجھے روکتا کون ہے؟" اس سے پہلے سیداں چوہدری کے اس جملے پر چپکے ہو کر رو پڑتی تھی۔ آج اس کی بات میں تیزی اور تندی تھی۔ اس کا چہرہ غصے سے سُرخ نہیں تھا۔ بکھرا بکھرا چہرہ تنا ہوا تھا۔ البتہ آنکھوں میں دئے جل رہے تھے۔ چوہدری نے جوتیاں پہنتے ہوئے کہا "سیداں! آج تو نے پہلی بار آنکھ سے آنکھ ملا کر بات کی۔" سیداں خاموش رہ کر بدستور اسے تکتی رہی اور اس کی آنکھوں میں دئے ٹمٹماتے رہے۔ چوہدری نے اٹھ کر دروازے کی راہ لی تو سیداں کی بجائے شاداں رُکے ہوئے طوفان کی طرح پھٹ پڑی۔ اس نے سسکیاں بھریں تو سیداں نے بڑے پیار سے کہا "تو کیوں رو رہی ہے شاداں؟"

"ماں!" شاداں نے سیداں کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ سیداں طوفان میں ٹھہرے ہوئے مضبوط درخت کی طرح پہلے تن کر رہی۔ پھر ایک تیز ریلا آیا اور درخت بے بس ہو کر ہل گیا۔ آنکھوں کے دئے شوں شوں بجھ گئے۔ اس نے شاداں کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا "بیٹی! جب تک تیری ماں زندہ ہے تجھے کس بات کا ڈر؟"

"مجھے تیرا خیال ہے ماں۔"

"میری تو بیت گئی تو....." سیداں بات پوری نہ کر سکی۔

"ماں! ایک بات پوچھوں؟" شاداں نے بڑی معصومیت سے کہا۔

"پوچھو!"

"تو نے بابا کے گھر میں کوئی سکھ نہ پایا پر تو نے یہ پہاڑ ایسے دن کیسے بتائے؟"

"بیت گئے شاداں!"

"پر اس زندگی سے تو موت اچھی ہے۔"

"نہیں.... نہیں...." سیداں نے ماں بنتے ہوئے کہا۔ "کسی کو کیا پتہ شاداں! کیا خبر! دن بدلتے دیر نہیں لگتی۔"

کہنے کو تو سیداں یہ بات کہہ گئی پر اسے اپنی بات پہ خود شک ہوا۔ کیا یہ سچ تھا؟ سیداں آج سے بیس سال پہلے اس گھر میں آئی تھی۔ اس وقت کی یاد اب تک باقی تھی۔ آج اس دن کو یاد کرتے ہوئے بھی شرم آتی تھی۔ اس دن سیداں نے تقدیر کے سامنے یوں سر جھکا دیا تھا جیسے وہ قصائی کی چھری تلے آنے والی بھیڑ ہو۔ پھر وہ دن لمبا ہو کر اس کی ساری زندگی پہ چھا گیا تھا۔ آج تک وہ ایک دن نہ بدل سکا تھا۔ وہی ایک دن جو روپ بدل بدل کر آتا رہا۔ وہی ایک دن جو کسی چمکیلی دھوپ کے جلوے میں آتا، کبھی بادل اور دھند میں لپٹا ہوا۔ کبھی اندھیرا بن جاتا اور کبھی اجالا ہو۔ سیداں اس ایک دن کو بتا بتا کر زندہ تھی۔ نجانے کیوں؟

آنگن کی دھوپ سمٹ کر مشرق کی دیوار کے ساتھ جم گئی تھی۔ دھوپ زرد تھی اور دیوار کے ساتھ لپٹ کر کانپ رہی تھی۔ سایہ گہرا ہو رہا تھا اور اس میں ٹھنڈک بڑھ رہی تھی۔ سیداں کے جسم پر کپکپی کی ایک لہر آئی۔ اس نے کہا "شاداں بیٹی! اٹھ چولہا گرم کر۔ دیکھ تو سہی شام ہو رہی ہے۔" شاداں اٹھ کر چولہے کے پاس جا بیٹھی تو سیداں نے سوچا "یہ دن جو بار بار آتا ہے گزرتا کیوں نہیں؟"

"سیداں! تم ہر ڈوبتے ہوئے دن کے ساتھ، جب شام کے سائے گہرے ہوں گے، اپنے جی سے کہو گی یہ دن گزرتا کیوں نہیں؟"

"نہیں دلاور! دن گزر جائیں گے۔" سیداں نے روتے ہوئے کہا "اب کیا ہو سکتا ہے؟"

"سیداں! اس چھلے میں تجھے چناب کے اس پار لے جاؤں گا۔ ابھی چناب میں طوفان نہیں پر چناب بپھر گیا تو تجھے کنارہ نہیں مل سکے گا۔"

"نہیں" سیداں نے کہا اور دلاور نے اس پر حسرت کی ایک نگاہ ڈالی اور پھر چناب میں طوفان آگیا۔ پہاڑ جیسی لہریں کناروں کو توڑ کر نکل گئیں اور سیداں کو دوسرا کنارہ پھر کبھی نہ مل سکا۔

"اس میں میرا کیا دوش؟" سیداں نے زیرِ لب کہا۔

"دوش کس کا ہے؟" ایک آواز نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"تقدیر کا۔" سیداں نے جواب دیا "سوہنی چناب کی موجوں سے لڑی پر اسے کنارہ نہ مل سکا۔"

"لیکن تو نے لٹیرے بغیر ارمانوں کی سیداں۔ اب تو ہر روز چناب کی لہروں میں ڈوب ڈوب کر ابھرتی ہے اور ابھر ابھر کر ڈوب جاتی ہے۔" سیداں نے کانوں پہ ہاتھ رکھ لئے۔ وہ طوفان سے ڈر گئی تھی اور ایسا طوفان آیا بھی تھا پر اس نے گھپ اندھیری رات میں طوفان کا شور سنا تھا۔ اس میں سوہنی کی چیخیں تھیں، ہیر کے بین تھے اور صاحباں کے دل کا درد تھا۔

"میں نے آج تک شکایت نہ کی۔ میں ہر غم کو چپکے چپکے سہتی رہی۔ میرے ہونٹوں پر آہ تک نہ ابھری۔ میرا پیار میرے دل میں کلی کی طرح پھوٹا۔ میں نے کونپل کو پروان چڑھایا اور اسے کسی نے نہ دیکھا پھر میں نے اسے اپنے ہاتھوں مسل دیا۔" سیداں کی سرگوشیاں ہونٹوں تک پہنچ گئیں تو شاداں نے حیران ہو کر پوچھا "ماں تو کس سے باتیں کر رہی تھی؟"

"کسی سے نہیں۔" سیداں نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا اور پھر وہ اچانک چونک کر بولی "شاداں! دیکھ لٹیرے بغیر ارمان جانے والوں کا یہی حال ہوتا ہے۔"

"ماں!" شاداں کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

"آج پہلی بار میں نے تیرے باپ کی جلی کٹی باتوں کا جواب دیا۔ میں نے بیس سال اس گھر میں گذارے۔ میں نے ایک دن گزار کر یہی سمجھا کہ دوسرا دن میرا ساتھ دے گا پر وہ دن کبھی نہ آ سکا۔"

"ماں! پھر اس میں کس کا دوش ہے؟"

"میرا"

"نہیں تقدیر کا"

"شاداں!" سیداں کی آواز میں غصے کی چمک تھی "آج رحمتے نائن کہہ رہی تھی تو میری جوانی کی تصویر ہے۔ دیکھ شاداں! میں نے تقدیر پر بھروسہ کیا پر اس نے میرا ساتھ نہ دیا۔ تو بھی اگر میرے راستے پر چلی تو تقدیر تیرا گلا گھونٹ دے گی۔"

سیداں کا غصہ گلوگیر ہو گیا۔ شاداں کے روپ میں اس نے اپنی بے بس جوانی کو دیکھا تو اس کا غصہ ابلتے پانی کی طرح اس کی آنکھوں سے ٹپک پڑا۔ یہ جلتے بلتے آنسو آگ کے انگارے تھے۔ ان شعلوں نے ساری دنیا کو آگ لگا دی تھی۔ شاداں نے ماں کو روتے ہوئے دیکھا تو چولہا چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے ماں کے گلے میں بازو ڈال کر کہا "ماں! تجھے کیا ہو گیا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں شاداں! جا اپنا کام کر۔"

★

رحمتے نائن نے آنگن میں قدم رکھا تو سیداں نے جھٹ سے کہا "کیوں رحمتے! آج پھر کوئی نئی بات سوجھی ہے تجھے؟"

"نہیں تو بی بی!"

"پر تو دیکھتی ہے شاداں جوان ہو چکی ہے۔" سیداں کی مسکراہٹ میں طنز تھی۔

"ہاں بی بی...... تو نے کچھ سنا؟"

"نہیں تو......"

"چوہدری لال کو مقدمے میں ہار ہو گئی۔"

"پھر کیا ہوا!" سیداں نے مسکرا کر کہا "اس نے مقدمہ لڑا پر اپنے کھیت تو رہن نہ رکھے۔ ایک کھیت کے لئے تین کھیت رہن رکھ کر جیتنے والے کو کیا ملا؟"

"پر بی بی! گاؤں والے چوہدری لال کو ہار دے کر بہت خوش ہیں۔"

"آج ان کی باری ہے۔ کل چوہدری لال کی باری ہو گی۔"

"بی بی! شاداں کی بات کا کیا بنے گا؟"

"کیا بنے گا؟" سیداں کی لرزتی ہوئی آواز میں اچانک اٹھنے والی لہر کا جوش تھا "جب تک میں زندہ ہوں۔ شاداں کو کیا خطرہ ہے؟"

رحمتے نائن زمین پر بیٹھ گئی۔ اس نے ناخن سے زمین کریدتے ہوئے نظریں جھکا کر کہا "لوگ ایک اور بات بھی تو کہہ رہے ہیں۔"

"کیا؟"

"کیسے کہوں بی بی؟"

"کہو"

"چوہدری اپنا بیاہ رچا رہا ہے اس کلموہی ڈائن سے..... شاہ دین کی سالی سے....."

"کا؟" سیداں نے مسکرا کر پوچھا۔ رحمتے نائن نے اس مسکراہٹ کو دیکھا تو اس کا منہ حیرت کے مارے کھلا کا کھلا رہ گیا "بی بی..... بی بی....."

"رحمتے!" سیداں کی آواز میں خوشی کی لرزشیں تھیں "تیرے منہ میں گھی شکر۔ ذرا ٹھہر تو!" اور سیداں تیر کی طرح مکان کے اندر گئی۔ ایک تھال میں گڑ کی بھیلیاں رکھ کر جھپک سے آنگن میں آ گئی "لے رحمتے!

تیرا منہ تو میٹھا کرا دوں"۔ رحمتے نائن نے احتجاج کے لئے منہ کھولا تو سیداں نے ہنستے ہنستے ایک بھیلی اس کے منہ سے چھوڑ دی "بی بی! کیا کر رہی ہو یہ بھی کوئی خوشی کی بات ہے؟" اور سیداں کے ہاتھ سے بھیلی خود بخود گر پڑی اس کی ہنسی اس کے گلے میں پھنس گئی۔ تمتمایا ہوا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اور آنکھوں کی غیر فطری آگ بجھ گئی رحمتے نائن نے مڑ کر دیکھا تو شاداں کا آنسوؤں میں بھیگا ہوا چہرہ نظر آیا۔

"شاداں! تو رو رہی ہے۔ تیرے ماموں لال کو مقدمہ ہار نا پڑا پر مردانی چھوٹی سی بات کو کیا سمجھتے ہیں؟"

"نہیں ماں یہ بات نہیں"

"تیرا باپ دوسرا بیاہ کر رہا ہے تو کیا ہوا؟ مرد عورت کو سدا پاؤں کی جوتی" سمجھتے ہیں۔ جب چاہا بدل لیا"

"نہیں ماں یہ بات بھی نہیں"

"تو پھر کیا بات ہے شاداں؟"

"ماں!" شاداں کے آنسو بولنا چاہتے تھے لیکن بول نہ سکے لیکن شاداں چاہتی تھی کہ سیداں ان آنسوؤں کا لرزتا ہوا پیغام خود پڑھ لے۔ "ماں" شاداں نے مایوس ہو کر کہا" وہ شریف ہے نا!" اور شاداں کا بھیگا ہوا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا اور گالوں پر ٹپکے ہوئے آنسو بھی تمتما کر رہ گئے۔

"ہاں!" سیداں نے تڑپ کر کہا" ہاں کہو"

"نجانے کیوں؟ ماں!..... اس نے کئی بار میرا راستہ روک لیا ..... میں نے منہ سے ایک لفظ نہ کہا..... میں کترا کر نکل جاتی رہی اور نہ ماں! میں لاج کے مارے تجھ سے کچھ نہ کہہ سکی..... پر آج اس نے میری کلائی پر ہاتھ رکھ دیا..... میں نے ڈر کر کہا تو کیا چاہتا ہے بول۔ میرا ہاتھ چھوڑ دے میں اپنے بابا سے کہوں گی۔ اس نے ہنس کر کہا شاداں! تو تو اپنے گھڑے کی مچھلی ہے پر میں نے چاہا تھوڑا سا ہیر رانجھے کا کھیل بھی کھیل لوں۔ دیکھو شاداں! پیار کا رس تو میں اس وقت تیرے کانوں میں گھولوں گا جب تو گھونگٹ کاڑھے سر نہوڑائے اپنے پریتم کی راہ دیکھ رہی ہوگی..... آج..... یہاں..... نجانے سرفراز کہاں سے آ گیا اس نے کہا شریف گاؤں کی لڑکیوں پہ ہاتھ ڈالنا آسان نہیں شریف نے میری کلائی چھوڑ دی اور پھر وہ دونوں لڑ پڑے..... ماں! میں بھاگ آئی..... سرفراز!....."

"سرفراز مرد ہے شاداں! تو فکر نہ کر"

"پر ماں! شریف نے یہ کیوں کہا شاداں! تو تو اپنے گھڑے کی مچھلی ہے" سیداں کا بند بند غصے سے کانپ گیا اور رمیٹ سے ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا اور چوہدری کرم دین ہاتھ میں حقہ لئے آنگن میں آ گیا۔ اس کا طرہ آسمان سے باتیں کر رہا تھا اور مونچھیں سراسر فخر اور رجیت کے اظہار کے لئے تنا ہوا تھا۔ اس نے قہقہہ لگا کر کہا "چودھرائن! لال اگر ذرا سا غیرت مند ہو تو گاؤں سے منہ چھپا کر نکل جائے"

"چوہدری!" سیداں نے تن کر کہا" لال کو گاؤں سے نکلنے کی کیا ضرورت پڑی ہے؟ مرد ہار جیت کی پروا نہیں کرتے پر تو اگر غیرت مند ہے تو گاؤں چھوڑ کر کہیں منہ چھپا لے۔ اب لوگ تیری عزت پر ہاتھ ڈالنے لگ گئے ہیں"

"سیداں!" کرم دین نے کہا "میری عزت سے کھیلنا آسان نہیں۔ وہ کون ہے جس نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا؟" "شاہ دین کے لڑکے شریف نے گلی میں شاداں کی کلائی پکڑ لی۔ اس نے کہا شاداں! تو تو اپنے گھڑے کی مچھلی ہے" کرم دین نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ چارپائی پر بے دم ہو کر گر پڑا۔ اس کا طرہ خود بخود سرنگوں ہو گیا۔

"کیا کہا؟ شاہ دین کے لڑکے شریف نے! اسے اتنی بڑی جرأت کیسے ہوئی؟"

"تو نے تین کھیت جو اس کے باپ کے پاس رکھ دیئے ہیں"

کرم دین نے چارپائی پر لیٹ کر مری ہوئی آواز میں کہا "میں نے کھیت رہن رکھے سیداں! اپنی عزت رہن نہیں رکھی تھی" شاداں! ایک کھیس میرے سر کے نیچے رکھ دے" شاداں کھیس لے کر آئی تو کرم دین نے ایک نظر اس کے سراپے پر ڈالی اور اس ایک نظر میں حسرت کی تلخیاں بچی ہوئی تھیں۔

"سیداں! کاش تو ایک بیٹا بھی جن لیتی۔ آج میری عزت پہ ہاتھ ڈالنے کی جرأت کون کرتا"

"چوہدری!" سیداں نے کپکپاتے ہونٹوں سے کہا اور رو پڑی۔ چوہدری نے حقے کی نے پر منہ رکھ دیا اور آنکھیں موند لیں۔

★

"سیداں بی بی!" رحمتے نائن نے کہا۔

"کہو آج کون سی نئی خبر لے کر آئی ہو؟" سیداں نے تلخی سے پوچھا۔

(باقی صفحہ ۱۲۶ پر)

ڈرامہ،

"ستاروں کی چال"

انور عنایت اللہ

افراد

افضل :۔ ایک نوجوان۔ عمر تقریباً تیس سال۔
سیمیں :۔ افضل کی جوان بہن جو اس سے تقریباً تیرہ سال چھوٹی ہے
ظہیر :۔ ایک دولتمند نوجوان۔ عمر تقریباً چھتیس سال
صفیہ :۔ افضل کی منگیتر۔ عمر تقریباً پچیس سال۔

[افضل کے کمرہ سے پردہ اٹھتا ہے۔ اس فلیٹ میں صرف ایک کمرہ خاصا کشادہ ہے دائیں طرف لکڑی کی اسکرین لگا کر اس کے دو حصے کئے گئے ہیں جو حصہ نظروں سے اوجھل ہے وہ دونوں بھائی بہن کی خوابگاہ کا کام دیتا ہے۔ بقیہ حصہ کو ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ بائیں طرف، ونگ میں اس فلیٹ کا صدر دروازہ ہے جو اندر سے بند ہے۔ اس سے ذرا پرے ایک کھڑکی جس پر ریشمی پردے پڑے ہیں۔ دروازوں پر بھی پردے لٹکے ہوئے ہیں۔ اسٹیج [illegible] ایک اور دروازہ ہے جس کی دوسری طرف غالباً باورچی خانہ اور غسل خانہ ہے۔ کمرہ خاصے معقول فرنیچر سے سجایا گیا ہے۔ ایک طرف فٹ لائٹ کے قریب تپائی پر ٹیلیفون رکھا ہے۔ سینٹر ٹیبل پر رسالے پڑے ہیں۔ ایک رسالہ صوفے پر کھلا پڑا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ابھی کوئی بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ ریڈیو بھی کھلا ہوا ہے، دھیمی سی آواز ہے۔ پردہ اٹھنے پر اسٹیج خالی ہے۔ شام کا وقت۔ ایک ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے اور کچھ دیر تک بجتی رہتی ہے۔ کوئی نہیں آتا۔ پھر خوابگاہ میں سے سیمیں تیزی سے اسٹیج پر آتی ہے حسین ناک نقشہ۔ صحت مند جسم۔ اس وقت صرف شلوار اور قمیص میں ہے۔ غالباً وہ اندر کپڑے بدل رہی تھی۔ دوپٹہ جلدی میں بھول آئی ہے۔ سر کے بال کھلے ہیں۔ ہاتھ میں کنگھی۔ وہ ریسیور اٹھاتی ہے]

سیمیں : ہیلو! مسٹر فضل رسیڈنس ہیئر۔ جی کون؟ ان کے اسٹینو! کتنی دیر لگے گی صاحب کو! ۔ اچھا، کیا نام بتایا آپ نے؟ مہربانی کر کے ذرا آہستہ فرمایئے ۔ بشیر صاحب! ۔ جی؟ ۔ ظہیر صاحب! اچھا، دیکھئے صاحب کانفرنس سے فارغ ہوں تو ان سے کہئے گا میں باہر جا رہی ہوں، لیکن گھر پر ملازم رہے گا ۔ جی شکریہ ۔

(ریسیور رکھ دیتی ہے اور پھر کچھ سوچ کر ایک نمبر ملاتی ہے اس وقت گنگنا رہی ہے)

سیمیں : ہیلو! دیکھئے مجھے شاہد صاحب سے بات کرنی ہے ۔ جی! ۔ کہیئے گا میں شمسی ۔ بہتر! (وہ ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر گنگنانے لگتی ہے۔ چند لمحوں کے بعد) ہیلو! کون شاہد! ۔ سیمیں ہیئر ۔ ارے بھئی بالکل تیار ہوں۔ ابھی تو صرف (دستی گھڑی دیکھ کر) چھ بجے ہیں۔ شو تو ساڑھے چھ بجے شروع ہوتا ہے۔ ہاں ہاں، پہنچ جاؤں گی یہ فون کس نے ریسیو کیا تھا؟ ۔ لینڈ لیڈی صاحبہ! عجیب شئے ہیں یہ بھی! جب بھی فون کرتی ہوں نام ضرور پوچھتی ہیں۔ دراصل میں نے فون اس لئے کیا تھا کہ تمہیں اخباروں کے بارے میں یاد دلاؤں۔ بھولنا نہیں، کل میرا سکول بند ہے دن بھر مکان ڈھونڈوں گی خدا حافظ! (ریسیور رکھ دیتی ہے۔ مڑ کر ریڈیو بند کر دیتی ہے اور تیزی سے خوابگاہ میں چلی جاتی ہے۔ جاتے ہوئے کنگھی کئے جاتی ہے۔ اسٹیج ایک بار پھر خالی ہے۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ کی گھنٹی بجتی ہے۔

(سیمیں اندر ہی سے جواب دیتی ہے)

سیمیں : (چیخ کر) کون ؟ ۔ زمان خان ؟ ۔ دروازہ کھلا ہے ، حد ہو گئی بھئی ! اب آ رہے ہو !

(دروازہ آہستہ سے کھلتا ہے اور صفیہ داخل ہوتی ہے۔ وہ دبلی پتلی نازک سی لڑکی ہے۔ یوں تو وہ عمر میں سیمیں سے بڑی ہے لیکن ایسی معلوم نہیں ہوتی شکل صورت بھی سیمیں سے بہت اچھی ہے۔ اس وقت ہلکے گلابی رنگ کی سادہ ساڑی میں ملبوس ، سر کے گھونگریالے بال شانوں تک کٹے ہوئے چہرہ پر ہلکا سا میک اپ)

صفیہ : (اندر آ کر) کہاں کی تیاری ہے سیمیں ؟ (پرس تپائی پر رکھ کر صوفہ پر بیٹھ جاتی ہے اور ایک باتصویر رسالہ اٹھا کر دیکھنے لگتی ہے)

سیمیں : (اندر سے) اوہ ! صفیہ باجی ! معاف کیجئے ، میں نے زمان ہو گا۔ کمبخت دوپہر تک کی چھٹی لے کر گیا تھا۔ آپ بیٹھئے۔ بس میں ابھی آئی۔

صفیہ : کہاں کی تیاری ہے : پکچر

سیمیں : جی ہاں ، لاہور سے ایک سہیلی آئی ہوئی ہے

صفیہ : سہیلی ؟

سیمیں : (فوراً ، جی ہاں خوابگاہ سے باہر آ جاتی ہے اور باہر جانے کے لئے تیار ہے۔) آداب صفیہ باجی !

صفیہ : (بزرگانہ انداز میں ، جیتی رہو بیٹیا ! (مسکرا کر) کونسی فلم ہے ؟ میں بھی چلوں تمہارے ساتھ ؟

سیمیں : (گھبرا کر) آپ ؟ ہاں ہاں کیوں نہیں ۔ لیکن ۔ آج پہلا دن ہے ۔ ہم نے کئی دن ہوئے بکنگ کرا رکھی تھی (بیٹھ جاتی ہے)

صفیہ : (مسکرا کر) گھبراؤ نہیں سیمیں بیگم ! ہم نے تو یوں ہی مذاق کیا تھا ۔ ویسے ہم آپ کے ان "سہیلی صاحب" سے خوب واقف ہیں ! ۔

سیمیں : جی ! اوہ صفیہ باجی ، آپ بھی ۔ !

صفیہ : ۔ (فوراً) ارے بھئی ، گھبراؤ نہیں ۔ ہم تو تمہارا ساتھ دینگے ہی (سنجیدگی سے) لیکن سیمیں ! تمہارے بھائی جان اس انتخاب سے سخت خفا ہیں ۔

سیمیں : کیوں باجی ؟ کیا خرابی ہے شاہد میں ؟ بھائی جان نے اپنے لئے لڑکی خود ہی چنی ۔ اب یہی حق وہ مجھ سے کیوں چھیننا چاہتے ہیں ؟

صفیہ : صرف اس لئے کہ ان کا خیال ہے تم ابھی ناتجربہ کار ہو اور یہ دنیا بے حد مکار ہے سیمیں ۔

سیمیں : جی ہاں ، جیسے میں دودھ پیتی بچی ہوں ! بھائی جان اپنی پسند کی شادی کر رہے ہیں مجھے یقین تھا وہ مجھے بھی اپنی پسند سے شادی کی اجازت دے دینگے ۔ لیکن اب لگتا ایسا ہے جیسے مجھے مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا ۔

صفیہ : (خشک لہجے میں ، اپنی پسند کی شادی کر رہے ہیں ! (یوں کہتی ہے جیسے اس نے سیمیں کی بقیہ باتیں سنی ہی نہیں ، وہ تو چار سال سے اپنی پسند کی شادی کر رہے ہیں !

سیمیں : چار سال ؟ منگنی کو چار سال ہو گئے ؟ ! (جیسے یہ کہنا چاہتی ہو کہ وقت کتنی تیزی سے گذر جاتا ہے)

صفیہ : ۔ (آہستہ سے) ہاں ، چار سال ! (مختصر سا وقفہ ۔ دونوں خیالوں میں کھو جاتی ہیں)

سیمیں : ۔ (آہستہ سے) میں جانتی ہوں آپ لوگوں کی شادی اب تک کیوں ملتوی ہوتی رہی ۔ میں یہ بھی جانتی ہوں ۔ یہ چار سال آپ دونوں کے لئے کس قدر پہاڑ سے گذرے ہوں گے ۔ اس کمبخت شہر میں دنیا کی ہر نعمت مل جاتی ہے ۔ مگر نہیں ملتا تو گھر ہی نہیں ملتا ۔ بھائی جان کو پچھلے مہینے اپنے گزیٹیڈ ہونے کی اتنی خوشی صرف اسی لئے ہوئی تھی کہ انہیں یقین تھا اب انہیں سرکاری گھر ضرور مل جائے گا ۔ پھر بھی سنا ہے انہیں کئی مہینے انتظار کرنا ہو گا ۔

صفیہ : ۔ (خاصی بیزاری سے ، کئی مہینے ۔

سیمیں : ۔ مجھے سخت شرمندگی ہے صفیہ باجی ! میری وجہ سے آپ لوگوں کی شادی کھٹے میں پڑ گئی ہے ، لیکن دیکھئے ۔ شاید جلد ہی کوئی صورت نکل آئے ۔

صفیہ : ۔ (اکتا کر) کیا صورت نکل آئے گی ؟ میں نے سنا ہے شاہد بھی اب تک بے گھر ہی ہیں ۔

سیمیں : جی ہاں ، لیکن ہم دونوں نے چھوٹے موٹے فلیٹ کی

کوشش شروع کر دیتا ہے۔ آجکل بہت سے گھر خالی
ہو رہے ہیں۔ (یکایک گھڑی دیکھ کر) اف او! چھ بجے
ہو گئے۔ (جلدی سے اٹھ کر) معاف کیجئے۔ شاید انتظار
کر رہے ہوں گے۔ آپ کچھ دیر انتظار کر لیجئے گا۔ بھائی جان
آ ہی رہے ہوں گے۔ ان کے کوئی دوست بھی آ رہے ہیں۔
کوئی ظہیر صاحب! اچھا خدا حافظ صفیہ باجی! (تیزی سے
پرس لے کر چلی جاتی ہے۔ اس کے جانے کے بعد صفیہ
ٹھنڈی سانس لیتی ہے۔ اٹھ کر ریڈیو تک جاتی ہے اور
ایک اسٹیشن ٹیون اِن کرتی ہے۔ یکایک صدر دروازہ کی
گھنٹی بجتی ہے تو وہ مڑ کر دیکھتی ہے۔ گھنٹی دوبارہ بجتی ہے
وہ جا کر دروازہ کھولتی ہے۔ افضل داخل ہوتا ہے ــــ
سانولا رنگ قبول صورت۔ سر کے بالوں سے پتہ چلتا ہے
جیسے بہت جلد گنجا ہو جائے گا۔ سوٹ پہنے ہوئے ایک
ہاتھ میں چرمی بیگ۔ دوسرے میں کئی تھیلیاں، چہرہ سے
تھکا ہوا لگ رہا ہے)

افضل:۔ (صفیہ کو خلاف توقع دیکھ کر خوشی سے) اوہ! صفو؟
تم؟ کب آئیں؟

صفیہ:۔ ابھی ابھی آئی ہوں۔ (دروازہ بند کر کے مڑتی ہے۔
افضل کے ہاتھ سے اس کا بیگ لے لیتی ہے۔ وہ تھیلیاں
ایک طرف میز پر رکھ دیتا ہے۔ دونوں بیٹھ جاتے ہیں)

افضل:۔ سیمیں چلی گئی؟

صفیہ:۔ ابھی ابھی گئی ہے تمہیں آج بہت دیر ہو گئی۔

افضل:۔ ہاں، آجکل کانفرنسیں ہو رہی ہیں۔ روز چھ بج جاتے
ہیں۔ اچھا ہوا تم آ گئیں۔ میرا ارادہ آج رات کھانے کے
بعد تمہارے یہاں جانے کا تھا۔

صفیہ:۔ چائے لے آؤں؟

افضل:۔ ہاں، سر میں سخت درد ہے۔ (پیشانی کو دائیں ہاتھ
سے دباتا ہے) زمان کہاں ہے؟

صفیہ:۔ چھٹی لے کر گیا تھا، اب تک نہیں آیا۔ میرے خیال میں
تم نہا لو تو تھکن دور ہو جائے گی میں اتنی دیر میں چائے
بنا لوں گی (رک کر) سنا ہے کوئی ظہیر صاحب آنے والے ہیں

افضل:۔ ہاں چائے ان ہی کے ساتھ پی لیں گے۔ (گھڑی دیکھ کر)
چھ بجے آنے کو کہا تھا۔ چھ پچیس ہو گئے۔

صفیہ:۔ کون ہیں یہ؟ میں نے تو کبھی تم سے ان کا نام نہیں سنا

افضل:۔ خاصا کام کا لڑکا ہے۔ ظہیر قادری نام ہے۔

صفیہ:۔ ظہیر قادری؟ وہی تو نہیں جن کی نئی کوٹھی پر رقص و سرود
کی محفل جمی تھی، اور اس میں کئی فلم اسٹاروں نے حصہ
لیا تھا! یاد نہیں تمہیں! پبلک نے گانا سننے کے لئے دھاوا
بول دیا تھا! پولیس کو آنا پڑا تھا۔ اردو اخباروں میں تو
بڑی تفصیلی خبریں آئی تھیں۔

افضل:۔ اچھا! اپنی مصروفیت کا یہ عالم ہے کہ اخبار پڑھے
مہینے ہو گئے۔

صفیہ:۔ تم کب سے جانتے ہو انہیں؟ سنا ہے لکھپتی ہے۔

افضل:۔ ہاں اس وقت سے جانتا ہوں جب ان کے والد
امپورٹ لائسنسوں کے لئے ہمارے دفتر کے چکر
کاٹا کرتے تھے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے یہ لوگ لکھپتی
بن گئے باپ مرے تو اکلوتے بیٹے کو کئی لاکھ کی جائداد مل گئی
شہر میں چار نہایت عمدہ کوٹھیاں ہیں ان کی۔

صفیہ:۔ چار کوٹھیاں؟ تب تو برخوردار کے عیش ہوں گے۔

افضل:۔ مسکراتا ہے (آہستہ سے) دراصل آج میں نے ایک
خاص مقصد کے لئے بلایا ہے۔

صفیہ:۔ خاص مقصد کے لئے؟

افضل:۔ ہاں۔ (رازدارانہ لہجے میں) میں سیمیں کو اس سے ملانا
چاہتا ہوں۔ بڑا اسمارٹ لڑکا ہے صفو۔

صفیہ:۔ (یکایک سب کچھ سمجھ کر) اوہ! تو یہ بات ہے، لیکن افضل
سیمیں کو شاہد سے محبت ہے۔

افضل:۔ جانتا ہوں، اسی لئے تو سخت پریشان ہوں۔

صفیہ:۔ تمہیں شاہد سے کیا شکایت ہے؟

افضل:۔ سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ اس کے پاس رہنے کو
علیحدہ گھر نہیں ہے۔ (اسے سمجھاتے ہوئے) اوہ صفو!
یہ بات تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتی کہ سیمیں کی شادی
شاہد سے اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک اس کے

پاس علیحدہ گھر نہ ہو وہ ایک جگہ پے انگ گیسٹ کے طور پر رہتا ہے جہاں سب کنوارے ہی رہتے ہیں۔ وہاں سیمیں کیسے رہ سکے گی؟ میں چاہتا ہوں اب اس کی شادی جلد سے جلد ہو جائے۔ آخر ہم دونوں کب تک صرف منگیتر ہی رہیں گے؟

صفیہ :۔ تو جناب نے اسی لئے آج ایسے نوجوان کو چائے پر بلایا ہے جو حسین ہے، دولتمند ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ جس کی ایک نہیں بلکہ چار نہایت عمدہ کوٹھیاں ہیں؟

افضل :۔ (خوش ہو کر) شاباش! اب دعا کرو میری اسکیم کامیاب ہو جائے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں اپنی زندگی سے اکتا گیا ہوں۔ منگنی کو چار سال ہو رہے ہیں اور شادی صرف اس لئے نہیں ہو سکتی کہ اس کمبخت ایک کمرہ کے فلیٹ میں جوان کنواری بہن بھی رہتی ہے۔ (یکایک فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ وہ اٹھ کر ریسیور اٹھاتا ہے)

افضل :۔ ہیلو! افضل ہیر۔ کون؟ ظہیر صاحب؟ — ہاں بھئی — بس آ جاؤ۔ کتنی دیر لگے گی؟ — بیس پچیس منٹ؟ بہت بہتر، ہاں۔ چوتھی منزل پر ہے۔ باہر میرے نام کی تختی لگی ہے۔ خدا حافظ! (ریسیور رکھ دیتا ہے) بس وہ آ ہی رہا ہے۔ (جھنجھلا کر) یہ سیمیں کہاں چلی گئی؟ اس کا تو اب گھر میں جی ہی نہیں لگتا۔ ظہیر بے حد مصروف آدمی ہے بڑی مشکل سے تو اس نے وقت نکالا ہے۔ نہ جانے پھر آئے یا نہ آئے۔ مجھے تو اس لڑکی نے بہت ستا رکھا ہے۔

صفیہ ہو سکتا ہے سہیلی نے روک لیا ہو تم فکر نہ کرو۔ میں اس کے سامنے سیمیں کی ایسی تعریفیں کر دوں گی کہ وہ بغیر دیکھے ہی ریجھ جائے گا مطمئن رہو۔

افضل :۔ ارے! میں نے تو مہینے بھر سے تعریفیں کر کے اس کا اشتیاق بڑھا رکھا ہے۔ اسی لئے تو سخت کوفت ہو رہی ہے۔

صفیہ :۔ تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو۔ جاؤ نہا لو۔ ہو سکتا ہے سیمیں لوٹ آئے۔ اور نہ بھی آئی تو میں معاملہ سنبھال لونگی۔ تم نہانے میں خاصا وقت لیتے ہو کہیں وہ آ نہ جائے۔

افضل :۔ اب تو دنیا خدا کے حوالے ہے (ٹھنڈی سانس لے کر) میں چائے کے لئے کچھ چیزیں لیتا آیا ہوں۔ (یہ کہہ کر وہ

خوابگاہ میں چلا جاتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد کچھ سوچ کر صفیہ اٹھتی ہے۔ غور سے خوابگاہ کی طرف دیکھتی ہے جیسے یقین کر لینا چاہتی ہو کہ افضل اندر ہی ہے پھر چپکے سے ریسیور اٹھاتی ہے اور ایک نمبر ڈائل کرتی ہے۔ نظریں خوابگاہ ہی کی طرف ہیں)

صفیہ :۔ (آہستہ سے) ہیلو؟ کون نادر؟ صفیہ ہیر۔ سنو بھئی۔ آج رات کا پروگرام منسوخ۔ ہاں ہاں، ہے کچھ ایسی ہی بات۔ تم چاہو تو کل کی بکنگ کرا لینا بھئی، نرے احمق ہی رہے۔ اس وقت نہیں بتا سکتی۔ کل کالج سے فون کر لوں گی۔ خدا حافظ۔

(یکایک افضل خوابگاہ سے باہر آتا ہے۔ اس وقت وہ بیدنگ گاؤن میں ہے، نہانے جا رہا ہے)

افضل :۔ (دور ہی سے) کسے فون کر رہی تھیں؟

صفیہ :۔ (گھبرا کر) فون؟ (ریسیور اب تک ہاتھ میں ہے) ہاں، ایک سہیلی نے آج رات کھانے پر بلایا تھا۔ اسے بتا رہی تھی کہ آج وہاں نہ پہنچ سکوں گی۔ پتہ نہیں یہاں کتنی دیر ہو جائے۔

افضل :۔ (خوش ہو کر آگے بڑھتا ہے) تم نے بہت اچھا کیا صفو! ظہیر کے جانے کے بعد ہم چل کر کہیں باہر کھانا کھائیں گے۔ پھر وقت ملا تو پکچر دیکھیں گے۔ خدا کی قسم! زندگی اس قدر مار بڈ ہو گئی ہے کہ تم سے ہنسے بولے مہینوں ہو گئے۔

(صفیہ کے چہرے سے ایسا لگتا ہے جیسے اس پروگرام سے اسے کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی۔ افضل کو اس کا احساس ہو جاتا ہے۔ وہ صفیہ کے قریب جا کر اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں سے تھام لیتا ہے اور غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہتا ہے)

افضل :۔ (آہستہ سے) بات کیا ہے صفو! آج کچھ بجھی بجھی سی لگ رہی ہو! (وہ خاموش رہتی ہے اور نظریں نیچی کر لیتی ہے) کیا مجھ سے خفا ہو؟ یہ ٹھیک ہے کہ پچھلے دنوں میں نے تمہیں نگلکٹ کیا۔ لیکن صفو! کیا تمہیں یقین نہیں کہ میں تمہیں دیوانہ وار چاہتا ہوں؟ میرا بس چلتا تو خدا کی قسم! آج سے چار سال پہلے تم سے منگنی کی بجائے شادی کر لیتا۔

صفیہ : (فوراً) لیکن کیا کروں، رہنے کو مناسب مکان ہو

تب نا۔

افضل :۔ (حیرت سے) صفو؟

صفیہ :۔ ہاں افضل! اگر تم واقعی مجھے دیوانہ وار چاہتے تو جناب افضل حسین شمسی! آج میں تمہاری بیوی ہوتی، کہ ایک منگیتر نہیں۔ خیر چھوڑو ان فضول سی باتوں کو۔ جاؤ نہالو۔ اب ظہیر صاحب آ ہی رہے ہوں گے۔

افضل :۔ (ہچکچا کر) مجھے بے حد افسوس ہے کہ تم نے مجھے غلط سمجھا (بھینچ کر) کمبخت ظہیر کو بھی آج ہی آنا ہے۔

صفیہ :۔ ظہیر کو گالیاں نہ دو۔ اب تو وہی تمہاری مشکل آسان کر سکتا ہے۔

افضل :۔ تمہیں آج میرے ساتھ باہر چلنا ہوگا صفو! تم سے تفصیلی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔

صفیہ :۔ اچھا بابا، چلیں گے۔ تم جا کر نہا تو لو۔ خاصا وقت لگاتے ہو۔ اب وہ آ ہی رہا ہوگا۔

(افضل کو زبردستی کھینچ دیتی ہے۔ اس کے بعد ریڈیو آن کرتی ہے، ٹھنڈی سانس لے کر صوفے پر بیٹھ جاتی ہے اور اس کی پشت پر سر ٹیک کر آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ پس منظر میں دھیمی دھیمی اداس موسیقی۔ یکایک گھنٹی بجتی ہے۔ وہ چونک کر آنکھ کھولتی ہے اور غور سے سنتی ہے۔ باہر کوئی ہے۔ وہ اٹھ کر دروازہ کھولتی ہے)

صفیہ :۔ تشریف لائیے۔ (ظہیر داخل ہوتا ہے۔ خاصا خوش شکل نوجوان ہے۔ گورا رنگ، بھولا چہرہ، قیمتی نفیس سوٹ پہنے ہوئے آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک)

ظہیر :۔ (اندر آ کر) معاف کیجئے۔ افضل صاحب ہیں؟ مجھے ظہیر کہتے ہیں۔

صفیہ :۔ جی ہاں، آپ تشریف رکھئے (غور سے اس کا جائزہ لیتی ہے۔ ظہیر شکریہ کہہ کر آگے بڑھتا ہے اور صوفے پر بیٹھنے کے بعد کوٹ کے بٹن کھولتا ہے) وہ ابھی ابھی دفتر سے آئے ہیں، منہ ہاتھ دھو رہے ہیں۔ سگریٹ لیجئے۔ (تپائی پر سے سگریٹ کیس اٹھا کر اس کے حوالے کرتی ہے۔ وہ شکریہ کہہ کر لیتا ہے اور جیب سے لائٹر نکال کر سلگاتا ہے)

یہ بتائیے، آپ چائے پئیں گے یا کافی؟

ظہیر :۔ جی تکلف کی ضرورت نہیں، ۔۔ میں ۔۔۔

صفیہ :۔ (فوراً) جی نہیں، تکلف کاہے کا۔ چائے کا وقت ہے۔ تو کافی ٹھیک رہے گی نا؟

ظہیر :۔ جی ہاں۔

صفیہ :۔ (اٹھ کر) معاف کیجئے، میں ابھی آئی۔ (چلی جاتی ہے۔ اس کے بعد افضل غور سے گرد و پیش کا جائزہ لیتا ہے۔ پھر ایک رسالہ اٹھا کر ورق گردانی شروع کر دیتا ہے۔ اس دوران میں ریڈیو پر کوئی تقریر شروع ہو جاتی ہے۔ صفیہ چند لمحوں کے بعد لوٹ آتی ہے اور آتے ہوئے ریڈیو بند کر دیتی ہے۔ وہ قریب ہی دوسرے صوفے پر بیٹھ جاتی ہے)

صفیہ :۔ ابھی آپ کے آنے سے پہلے افضل آپ ہی کا ذکر کر رہے تھے۔

ظہیر :۔ اچھا! نوازش ان کی۔ میں نے بھی ان کی زبانی آپ کی اتنی بہت سی تعریف سنی ہے کہ (ہچکچاتے ہوئے) یعنی مجھے ملاقات کا خاصا اشتیاق تھا۔

صفیہ :۔ (دلچسپی سے) اچھا!

ظہیر :۔ (فوراً) جی ہاں۔ میرا خیال ہے وہ آپ کو بہت چاہتے ہیں۔ (یکایک صفیہ کچھ سوچتی ہے اور غور سے اسے دیکھنے لگتی ہے)

ظہیر :۔ (اسے خاموش دیکھ کر) معاف کیجئے، آپ نے میری صاف گوئی کا برا تو نہیں مانا۔

صفیہ :۔ جی نہیں، میں خود بے حد صاف گو ہوں۔ سوچ رہی تھی آپ کو کہاں دیکھا ہے۔

ظہیر :۔ جی، میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ یوں لگ رہا ہے جیسے ہم پہلے بھی مل چکے ہیں۔ غالباً کسی جلسے ولسے میں۔

صفیہ :۔ جی نہیں، میرے کالج کے اوقات بڑے نامعقول ہیں۔ اسی لئے میں برسوں سے کسی جلسے میں نہیں گئی۔

ظہیر :۔ کچھ عجیب بات ہے سیمیں صاحبہ! مجھے یقین ہے ۔۔ یعنی ۔۔ ہم ضرور مل چکے ہیں!

(صفیہ سیمیں کے نام پر چونکتی ہے۔ اب سمجھ میں آ جاتا ہے کہ

ظہیر اسے سیمیں سمجھے ہوئے ہے)

ظہیر :۔ ہو سکتا ہے۔ ہم دونوں ایک ہی کالج میں رہے ہوں۔ آپ کس کالج میں تھیں؟

صفیہ :۔ (فوراً) معاف کیجئے ظہیر صاحب! میں سیمیں نہیں، صفیہ ہوں، صفیہ کلیم افضل میرے منگیتر ہیں (ظہیر کے چہرہ پہ بالکل ہونقوں کا سا رنگ ہے۔ وہ حیرت سے منہ کھولے اسے دیکھ رہا ہے)

ظہیر :۔ (حیرت سے) یعنی آپ؟ حیرت ہے! (ہنس کر) بھئی کمال ہو گیا۔ معاف کیجئے۔ افضل صاحب نے اپنی بہن کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا اور سیمیں کی جو تصویر میں نے ذہن میں بنائی تھی، وہ آپ پر بالکل پوری اترتی ہے یعنی اعلیٰ تعلیم یافتہ حسین۔ معاف کیجئے (رک کر) کیا نام بتایا آپ نے؟ صفیہ کلیم؟ (کچھ سوچ کر) پاکستان کے قیام سے پہلے آپ کہاں تھیں؟

صفیہ :۔ ناگپور میں۔ بچپن وہیں گذرا۔ کیا آپ کا تعلق بھی سی پی سے ہے؟ (یوں کہتی ہے جیسے اسے بھی کچھ یاد آ رہا ہے۔

ظہیر :۔ جی ہاں، بالکل۔

صفیہ :۔ اوہ! (رک کر) آپ کے والد صاحب کا نام منشی — یعنی — معاف کیجئے مسٹر قدیر خاں تو نہیں تھا؟

ظہیر :۔ (فوراً) جی ہاں، غلامی لائنز میں رہتے تھے ہم۔ ہمارے پڑوس میں ایک ڈاکٹر صاحب رہتے تھے۔ ہومیوپیتھک — کلیم الدین صاحب نام تھا ان کا۔ عجیب اتفاق ہے (خوشی سے) ان کی ایک لڑکی تھی، منی سی صفن نام یعنی معاف کیجئے۔ صفیہ بانو!

صفیہ :۔ (خوشی سے فوراً) جی ہاں جی ہاں۔ بالکل ٹھیک یاد آیا آپ کو۔ صفیہ میں ہی ہوں! اس کا مطلب یہ ہوا کہ ظہرو آپ ہیں۔ منشی۔ معاف کیجئے۔ چچا قدیر کے اکلوتے صاحبزادے! (خوشی سے اٹھ کر اس کے قریب اسی صوفے پر بیٹھ جاتی ہے) دنیا واقعی کتنی مختصر ہو گئی ہے ظہیر صاحب۔

ظہیر :۔ یہ لیجئے۔ ظہیر صاحب۔ یعنی ہم تو ظہرو ہوا کرتے تھے صفیہ صاحبہ۔

صفیہ :۔ صفیہ صاحبہ؟؟؟ (دونوں ایک ساتھ ہنستے ہیں)

ظہیر :۔ اچھا بھئی صفن ہی سہی۔ تمہیں وہ جہانگیر باغ کی شامیں یاد ہیں جب ہم بندروں کا منہ چڑایا کرتے تھے؟

صفیہ :۔ جی ہاں، کیسے بھول سکتی ہوں! یہ دیکھو (بلاؤز کی آستین ہٹا کر ایک زخم کا نشان دکھاتی ہے) — یہ دیکھو، ایک بندر نے نوچ لیا تھا۔

ظہیر :۔ میں نے پتھر برسائے تھے۔ اور پھر چوکیدار نے پکڑ کر میری ٹھکائی بھی کی تھی۔ (ہنس کر) آج خوب ملاقات ہوئی، میں نے تو یہاں آ کر اپنے تمام بچپن کے دوستوں کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ تمہیں بھی برسوں ڈھونڈتا رہا۔ چچا کیسے ہیں؟ اور وہ تمہاری چھوٹی بہن — کیا نام تھا اس کا؟ — رضیہ؟

صفیہ :۔ ابا کا تو ۱۹۴۸ء میں انتقال ہو گیا تھا۔ امی میرے ساتھ رہتی ہیں۔ رضیہ اس سال بی اے کا امتحان دے گی۔ چچا قدیر — (یکایک رک کر) مجھے ابھی ابھی افضل نے بتایا کہ چچا قدیر کا انتقال ہو گیا۔

ظہیر :۔ ہاں صفن! اب چار سال سے سارا کاروبار میں نے سنبھال رکھا ہے۔ (اشتیاق سے) چچی کیسی ہیں؟ خیریت سے تو ہیں نا؟ اماں کے مرنے کے بعد کتنا خیال رکھتی تھیں وہ میرا! کہاں رہتی ہو تم؟

صفیہ :۔ پاکستان چوک میں ایک چھوٹا سا فلیٹ ہے۔ رضیہ، رفیعہ اور حفیہ بھی اب بڑی ہو گئی ہیں۔ حفیہ کو تو تم نے بھلایا نہ ہوگا اسے وہی منی سی گڑیا جسے تم پیٹھ پر لادے لادے پھرتے تھے!

ظہیر :۔ (پیار سے) میں نے اپنے عزیز دوستوں کو کبھی نہیں بھلایا منی!

صفیہ :۔ (چونک کر) منی —؟ (ظہیر پیار سے اسے دیکھ رہا ہے)

ظہیر :۔ (آہستہ سے) ہاں، تم مجھے چنے پکارا کرتی تھیں منی۔ بھول گئیں؟ دادی اکثر کہا کرتیں: یہ چنے منی کی جوڑی کتنی اچھی ہے! (کچھ سوچ کر) چلو منی، دادی سے مل آئیں۔

صفیہ :۔ دادی؟ وہ بھی یہیں ہیں!

(باقی صفحہ ۱۰۲ پر)

بنگلا لوک کہانی

"آئینہ بی بی"

یونس احمد

مشرقی پاکستان کی سوندھی سوندھی مٹیوں اور قوس قزحی فضاؤں میں ان گنت لوک گیت اور لوک کہانیاں روپوش ہیں۔ ان کہانیوں اور گیتوں میں بنگال کے صحیح رنگ روپ ملتے ہیں۔ ان میں ملاحوں کے دلوں کی دھڑکنیں ہیں، چرواہوں کے دلرس نغمے ہیں۔ ان کے اندر اُن کنواری ناریوں کے جذبات کی دبی ہوئی چنگاریاں ہیں جو پنگھٹ کنارے اپنے محبوب کا انتظار کر رہی ہیں۔ بارہ ماشی گیت، اساڑھ میں ندیوں نالوں کا شور، جاڑے کی ماتمی شامیں بھادوں کی چاندنی راتیں، بسنت میں رنگ برنگ کے پھولوں پر بھونروں کی وارفتگی ـــ ان موسموں کی مختلف کیفیتوں کا اندازہ لگانا ہو تو ان منظوم لوک کہانیوں کو پڑھئے جن کے خالق کاشتکار اور ملاح ہیں۔ گاؤں دیہات کے اِن اَن پڑھ شاعروں نے زندگی کے ہر پہلو کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ وہ اپنی کہانیوں میں لفظوں کے جال نہیں بنتے اِن کی زبان سیدھی سادی مگر پُر اثر ہے، وہ رمزیت اور اشاریت سے گریز کرتے ہیں۔

"آئینہ بی بی" بھی مشرقی پاکستان کی نہایت پُر اثر لوک کہانی ہے۔ اس میں عشق و محبت کی دل سوزی و دل گرفتگی ہے، گاؤں کی گوری کا حسنِ ضیا پاش عشق کی چشم نیم باز کو خیرہ کر رہا ہے۔ دل کی ہر دھڑکن گیتوں کی پھوار بن رہی ہے۔ سہمی سہمی ہوئی عطر بیز سانسیں کھیتوں میں دھان کے خوشوں کو ہلا رہی ہیں۔ گاؤں کے نوجوان کاشت کار محمود نے آئینہ بی بی کے چندن جیسے روپ کو دیکھا اور اس کی زبان سے بے اختیار نکل گیا۔

دیس میں اپنے سندر سندر پیارے پیارے پھول
اس ناری کے روپ کے آگے سب ہے لیکن دھول

محمود کا جذبۂ عشق آئینہ بی بی کے حسن معصوم کو تپا گیا۔ وہ ندی کنارے دم بخود نگاہیں نیچی کئے کھڑی رہی، اس کا چہرہ شرم کے مارے شفق زار بن گیا۔ وہ نوجوان کے سامنے سے بھاگ جانا چاہتی تھی لیکن قدم سو سو من کے ہو گئے۔

محمود بچپن ہی میں یتیم ہو گیا تھا۔ اس کی ماں نے دکھ جھیل کر اسے پالا پوسا اور بڑا کیا۔ سولہ سال کی عمر ہوئی تو اس نے ہل بیل سنبھال لئے۔ کاشت کاری شروع کر دی۔ شب و روز کی محنتوں کا پھل جلد ہی مل گیا۔ دھان کے خوشے سر اٹھانے لگے۔ ہواؤں میں بھینی بھینی خوشبو پھیل گئی۔ بیٹے کی محنت کا پھل ماں کو سرور و کیف دے گیا۔ اس نے پیر صاحب کی درگاہ میں منت مانی تھی۔ منت پوری ہو گئی۔ اس کی کٹیا کے در و بام جھوم اٹھے اور یک بارگی دعاؤں کے لئے اس کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھ گئے:

مرے پُتر کو آہنی کاٹھ دے
یہاں سورما کی طرح وہ جئے!

محمود سچ مچ گبرو جوان تھا۔ اس کے انگ انگ سے شجاعت و مردانگی کا چشمہ پھوٹ رہا تھا۔ گاؤں کی گوریاں اسے دیکھتیں اور کٹ کٹ جاتیں۔ مگر:

کاٹے نہیں کٹتے ہیں دن جیٹھ مہینے کے
اور آنکھیں جھپکتے ہی ہو جاتی ہے پربھات

محمود کو کسی کل چین نہیں۔ نہ جانے یہ کیسی چبھن ہے۔ اسے کسی پہلو آرام نہیں ملتا۔ ایک انجانا سا درد ہے جس کے باعث اس کا من بیکل ہو رہا ہے۔ اب کھیت میں اس کا جی نہیں لگتا۔ اب ہل بیل اسے خوشی نہیں دیتے۔ اتو:-

"آم پاکے، جام پاکے کاگا بولے را"

اور "کاگا" کی کائیں کائیں دم بھر کے لئے امید بندھا جاتی ہے کہ اس

هرن — عمل : سجاد

کی کٹیا میں ضرور کوئی مہمان آنے والا ہے۔ لیکن اس کی کٹیا میں کوئی نہیں آیا۔ اس کی ماں کی امیدیں بھی پانی کا بلبلہ ثابت ہوئیں حالانکہ :

اسی مہینے گھر ہیں بنائے بن کے سارے پنچھیوں نے
بہو نہ آئی ہائے لیکن بھاگ جلی کی کٹیا میں!

اب اساڑھ کا مہینہ بھی آگیا۔ میگھ رانی کی سواری دور دور تک جانے لگی۔ سوکھی ندیاں جل تھل بن گئیں۔ گاؤں کے نوجوان کمائی کے لئے دور دیس جانے لگے۔ جدھر آنکھیں اٹھتی ہیں بادبان اڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ محمود نے بھی دُور دیس جانے کا قصد کیا۔ بھلا ماں کا دل کیسے مانتا۔ اس نے بیٹے کی منت سماجت کی۔ اسے بہلایا پھسلایا مگر وہ نہ مانا۔ ماں کی آنکھوں میں اساڑھ کے بادل سماگئے۔ محمود رخصت ہونے لگا۔ آسمان کالی بدلیوں سے ڈھک گیا اور دیکھتے دیکھتے اس کی ناؤ آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔ چھ ماہ جدائی میں بیت گئے مگر محمود کا کچھ پتہ نہ چلا۔

محمود کی ناؤ ایک انجانے دیس کے کنارے آکر رکی۔ اس نے ندی کنارے اُگے ہوئے درخت کی جڑ سے اپنی ناؤ کو باندھا۔ وہ گاؤں کے اندر داخل ہوا۔ کچھ دور چلنے کے بعد اس کی نگاہ ایک کٹیا پر پڑی، چوکھٹ پر ایک بڈھا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ بڈھے نے محمود کو بلایا اور اس سے اپنی کیفیت بیان کرنے لگا۔ اتنے میں آئینہ بی بی ندی سے گاگر بھر کر آگئی۔ اس نے ایک اجنبی جوان کو دروازے پر دیکھا تو :۔

شرم کے مارے لال ہوا منہ، تھر تھر کانپے، گا[1]
جانا چاہا پر نہیں اٹھے کنیا کے دو پا[2]

محمود، آئینہ بی بی کے روپ رنگ کو دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ ایسا بے پناہ حسن اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے سر کے کالے کالے بال پاؤں کو چھو رہے تھے، آنکھوں میں کٹاری تھی۔ جسم کے انگ انگ میں جادو سمایا ہوا تھا۔ اس کی زبان سے بے اختیار نکل گیا!

دیس میں اپنے سندر سندر پیارے پیارے پھول
اس ناری کے روپ کے آگے سب ہے لیکن دھول

محمود نے بڈھے سے جب اپنا تعارف کرایا اور ماں باپ کے نام بتائے تو اس کی آنکھیں رو پڑیں۔ بڈھے نے کہا۔ "زمانہ ہوا جب میں اور تمہارے باپ دوست تھے۔ وہ بھی کیا دن تھے ہائے۔" محمود کو اپنے باپ کے بارے میں بہت سی باتیں سن کر بہت خوشی ہوئی۔ اس نے بڈھے کو سلام کیا اور مؤدب ہو کر کھڑا ہوگیا۔ کچھ دیر تک اس کی نگاہیں آئینہ بی بی کے چہرے کا طواف کرتی رہیں۔ پھر وہ رخصت ہوگیا اور اس کی ناؤ پورب دیس کی سمت بہنے لگی۔

محمود کی روانگی کے بعد آئینہ بی بی کی کیفیت دگرگوں ہونے لگی۔ اب اس کی آنکھیں کسی چت چور کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اب اس نے اپنے من میں محبت کا دیپ جلتا ہوا محسوس کیا۔ وہ کھوئی کھوئی سی رہنے لگی۔ شام ہوتی اور کٹیا میں چراغ جلانا بھول جاتی۔ ندی کنارے پنیاں بھرن کو جاتی مگر آنکھیں کسی اور کو تلاش کرتیں اور دل ہی دل میں کہتی جاتی :۔

اپنے نگر میں کس نگری سے بہہ کر آئی نیّا رے
کس نے من میں تیر چلایا، بول ذرا پُردیا رے ؟
کون بھلا بوجھے گا پیارے اپنے من کو روگ ہے کیا
جیتا ایسا روگ ہے بندھو جس کی نہیں ہے کوئی دوا

لیکن محمود ناؤ لے کر آگے بڑھتا گیا۔ اب پورب سے بہہ کر آنے والی ہوائیں اس کے من میں کانٹے چبھونے لگیں۔ اس کا جی بکل ہونے لگا۔ اس نے کچھ دیر کے لئے آنکھیں بند کرلیں۔ لیکن آنکھیں بند کرنے کے بعد بھی اسے چین نہ آیا۔ آئینہ بی بی اس کے سامنے اس طرح کھڑی تھی جیسے آسمان کی گود میں تنہا ایک تارہ جگمگا رہا ہو۔ تین ماہ اس طرح بیت گئے۔ وہ پھر آئینہ کے گاؤں میں واپس آگیا۔ اس نے جتنے مال و اسباب خریدے تھے سب منہ مانگے دام میں بیچ دیئے۔ اس کا من آئینہ سے ملنے کے لئے تڑپ رہا تھا۔ مگر جب کٹیا کے اندر داخل ہوا تو وہاں آدمی تھا نہ آدم زاد۔ اس کے احساسات و جذبات میں جیسے بجلی سی کوند گئی۔ وہاں سے مایوس و نامراد لوٹ گیا۔ کتنے گاؤں گھوم گھوم کر اس نے آئینہ کی تلاش کی مگر لاحاصل۔ اب وہ اپنی جھولی پھیلا کر گھر گھر جانے لگا۔ کہیں سے اس کو بھیک مل جاتی۔ کوئی اسے گالیاں دیتا۔ کسی نے اس کو اچکا اور لفنگا سمجھا!

---

[1] گا: جسم [2] پا: پاؤں۔ بنگلا میں پاؤں کو پا کہتے ہیں۔

کسی نے پاگل اور دیوانہ گردانا۔ اس طرح تین گاؤں کے اس نے پھیرے لگا لیے۔

جب شام کا اندھیرا پھیل گیا تو محمود نے دوسرے گاؤں کا راستہ لیا۔ اس وقت گاؤں کی جھونپڑیوں سے دھوئیں کے بادل نکل رہے تھے۔ وہ تھک ہار کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ اس نے رات اسی کے نیچے بسر کرنے کی ٹھانی۔

صبح ہوئی تو اس نے اپنا سفر پھر شروع کیا۔ وہ جھولی پھیلا کر بھیک مانگتے مانگتے ایک دروازہ کے پاس آیا کہ اس کی نگاہ ایک لڑکی پر پڑی۔ جھولی ہاتھ سے گر پڑی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ آنکھیں ساون بھادوں بن گئیں۔ محمود نے کہا:۔

"یہ روپ دھارن میں نے تمہارے لئے کیا ہے پیاری۔
تمہاری تلاش و جستجو میں نہ جانے کہاں کہاں مارا پھرا، کتنے گاؤں کی خاک چھانی۔
یہ سلسلۂ لامتناہی چھ مہینے سے جاری تھا۔
جس نے مجھے اس روپ میں دیکھا پاگل سمجھا۔
پیاری میں چاول اور پیسے کی بھیک نہیں مانگتا ہوں۔
میں تو تمہاری جوانی کی بھیک مانگتا ہوں۔
میں تو تمہاری جوانی کی بھیک مانگتا ہوں، چلو اپنے دیس لوٹ چلیں۔"

آئینہ نے روتے روتے جواب دیا ——

"ظالم باپ کا سایہ سر سے اٹھ چکا ہے، یہ ماموں کا گھر ہے۔
چھ ماہ سے میں بھی آنکھوں سے گنگا بہا رہی ہوں
جہاں جی چاہے مجھے لے چلو پیارے!
پریت سے بڑھ کر اس دنیا میں کچھ بھی نہیں۔
پریت ہی تو رتن ہے، پریت ہی جتن اور گلے کا ہار ہے۔"

ماموں کے لڑکے سے آئینہ کی نسبت طے پائی تھی لیکن وہ محمود کے ساتھ فرار ہو گئی اور اس کے گھر میں آ کر اس نے محمود سے شادی کر لی۔ دونوں بہت خوش تھے۔ محمود جب کبھی بازار جاتا آئینہ اس سے فرمائش کرتی ——

"پیارے تم میرے لئے کنگھی ضرور لانا —— اور ہاں نتھ اور آسمانی رنگ کی ساڑھی بھی!
میں یہ ساڑی پہن کر ندی کنارے جاؤں گی اور تم مجھے دیکھ کر مسکراؤ گے۔
پیارے خوشبودار تیل لانا بھی نہ بھولو۔"

خوشی اور مسرت کے یہ دن مختصر ثابت ہوئے۔ محمود نے پھر دور دیس جانے کی ٹھانی۔ اساڑھ کے اس مہینے میں وہ دور دیس جا کر زیادہ سے زیادہ پیسے کمانا چاہتا تھا۔ آئینہ کو جب معلوم ہوا تو اس کی آنکھوں تلے تاریکی چھا گئی۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کی زندگی کا سورج گہنا گیا ہے۔ وہ اداس ہو گئی۔ اس کا دل بھر آیا اور اسی عالم بے قراری میں وہ محمود سے مخاطب ہوئی:۔

"پیارے مجھے چھوڑ کر تم دور دیس نہ جاؤ۔
تمہارے بنا یہ پہاڑ سے دن کیسے کاٹوں گی۔
جوانی کے دنوں میں شوہر تو پھولوں پر بھونرا جیسا ہوتا ہے۔
پیارے نہ جاؤ!
دیکھو ندی کیسا شور مچا رہی ہے،
میں اپنی اس بھری جوانی کو کیسے سنبھال کر رکھوں گی؟
میرے پاس نہ تو سونا ہے۔ نہ چاندی ہے اور نہ پیتل،
دل میں بس ایک آس ہے تمہاری، اسے نہ توڑو!"

لیکن محمود نہ مانا اور اپنے دوستوں کو لے کر دور دیس روانہ ہو گیا۔ چند ہی دنوں کے بعد یہی دوست واپس آئے اور آئینہ کو اطلاع دی کہ ناؤ ڈوب جانے کی وجہ سے محمود بھی زندہ نہ بچ سکا۔ اس خبر کو سن کر آئینہ کو اتنا صدمہ ہوا کہ وہ پاگل ہو گئی اور گھر سے نکل گئی۔ کسی طرح وہ ندی کنارے آئی تھی کہ ایک خانہ بدوشوں کی ناؤ کنارے آ لگی۔ اس میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ ان عورتوں سے اس نے اپنی حالت زار بیان کی۔ اس کی روداد غم سن کر وہ اس حد تک متاثر ہوئیں کہ انہوں نے اس کو اپنی ناؤ میں رہنے کی اجازت دیدی۔ اس کے علاوہ ان خانہ بدوش عورتوں نے محمود کی تلاش میں آئینہ کی مدد بھی کی لیکن "چاند محل" نہ ملا۔ مسلسل تلاش و جستجو کے بعد آئینہ مایوس نہ ہوئی۔ تین سال تک امیدوں کا گھروندا بنتا اور بگڑتا رہا۔ یکایک ایک دن چرواہے کی زبانی معلوم ہوا کہ جہاں ندی ختم ہو جاتی ہے وہیں "چاند محل" ہے۔ اور اس "چاند محل" میں ایک دلہن شام سے چراغ جلاتی ہے۔ یہ سن کر

آئینہ بی بی خانہ بدوش ناری کا لباس پہن کر باہر نکلی۔ اس نے جوڑا بھی ویسا ہی باندھا۔ گلے میں تعویذ گنڈے تھے اور سر پہ بوجھ۔

ندی پار کر کے آئینہ ٹھیک "چاند محل" کے قریب پہنچ گئی۔

درخت اسی طرح سرسبز تھے اور ان کی شاخوں میں پرندوں نے آشیانے بنا رکھے تھے۔ یہیں اس کا عیش کدہ تھا۔ جہاں اس نے کتنی حسین راتیں گزاری تھیں۔ اس نے جلدی جلدی "چاند محل" میں داخل ہونا چاہا مگر پاؤں سو سو من کے ہو گئے تھے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ آج تین سال کے بعد وہ اپنے گھر آئی ہے۔ آج وہ اپنے چیت چور سے ملے گی۔ خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے ساڑھی کے آنچل سے آنسوؤں کو پونچھا۔ صحن میں مہندی کا درخت اسی انداز سے کھڑا نظر آیا۔ یہ مہندی کا درخت آئینہ نے اپنے ہاتھ سے لگایا تھا۔ اس "چاند محل" کے در و دیوار میں اس کے کتنے سپنے سانس لے رہے ہیں، اس کی تمناؤں کے کتنے دیپ جل رہے ہیں مگر اس "چاند محل" پر آج اس کا اختیار نہیں۔ محمود یعنی اس کے چیت چور نے دوسری شادی رچالی ہے اور اب اس گھر پر اس کی نئی بیاہتا کا راج ہے۔

اس کی ساس اسے پہچان نہ سکی، اس نے پوچھا :۔

اے لڑکی کون ہے تو؟ کہاں سے آ رہی ہے؟ اس طرح نہ رو"

اور آئینہ نے جواب دیا :

کیا بتاؤں میں کون ہوں — ہاں اتنا یاد ہے

کہ جب میں روتی تھی تو تم تڑپ اٹھتی تھیں اور اپنے

آنچل سے میرے آنسو پونچھتی تھیں

مگر اب میری ڈھارس بندھانے والا بھی کوئی نہیں"

ساس نے پوچھا

"تو کیا تم واقعی آئینہ ہو جس کے غم میں روتے روتے میری آنکھوں کی روشنی کم ہو گئی ہے۔ آؤ میرے پاس آؤ اب تم اپنی دکھی ماں کو چھوڑ کر نہ جاؤ" اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی مگر آئینہ نے خون کا گھونٹ پی کر جواب دیا "نہیں میں اس گھر میں نہیں آؤں گی، ہرگز نہیں۔ اب میں یہاں ایک پل کے لئے بھی نہیں رہ سکتی" اور اتنا کہہ کر آئینہ ناؤ میں بیٹھ گئی اور اس نے دل ہی دل میں کہا :

پنکھ پکھیرو چاند محل کے تم سے اتنا کہتی ہوں

اس کو میرے آنے کی سُن گُن تک نہ ہو پائے

میرے من کی آشا کیا ہے، اتنی سی بس آشا ہے

سکھی رہے چیت چور سجنوا من میرا اور کیا چاہے

آئینہ بی بی کی ناؤ چل پڑی — بہت دور — یہاں تک کہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ اور جب محمود گھر واپس آیا اور اسے معلوم ہوا کہ آئینہ اسے تلاش کرتے کرتے چاند محل تک آئی تھی اور کسی نے اسے روکا تک نہیں تو اس کا ذہن مفلوج ہو گیا۔ وہ گھر سے نکل گیا اور پھر واپس نہ آیا۔

★

شمعوں کی قطار

بقیہ صفحہ ۱۶

صدرِ پاکستان اور وزراء نئے دارالحکومت میں منتقل ہو چکے ہیں۔ اس متوقع اور حیرت انگیز کامیابی پر صدر مملکت پاکستان، انکے رفقاء، حکام اور باشندگانِ پاکستان جس قدر بھی اظہار مسرت کریں کم ہے۔ گزشتہ دس گیارہ سالہ مصائب و آلام سے نجات دینے پر ملک جس قدر بھی فخر و ناز کرے بجا ہے۔ اور گزشتہ یکسالہ کارہائے نمایاں کو دیکھتے ہوئے بجا طور پر توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ انقلابی حکومت پاکستان کے مستقبل کو اپنے انقلابی کارناموں سے اور بھی چار چاند لگائے گی۔ دنیا میں پاکستان سربلند ہوگا، اس کے باشندے صحیح معنوں میں آزادی سے ہمکنار ہو کر فخر سے اپنا سر بلند رکھ سکیں گے۔ اور جب صدر پاکستان کے وعدے کے مطابق آئین کمیشن بھی اپنا کام شروع کر دے گا، جس کا اعلان کیا جا چکا ہے، اور انقلابی حکومت کی سرپرستی میں "جدید آئین" مرتب ہو جائے گا، تو یقین ہے کہ دنیا کی بہت سی حکومتیں اسی طرح اس پر رشک کریں گی جس طرح ہمارے بلا خون بہائے فوجی انقلاب پر رشک کیا جا رہا ہے۔

پاکستان پائندہ باد!

فریاد کی لے

دیویندر ستیارتھی

کمرے میں بک شیلف کے پیچھے گرد کی تہوں میں لپٹی، دیوار کے سہارے کھڑی کی ہوئی "رُدر وینا" پڑی تھی جس پر مکڑی نے جالا تن رکھا تھا۔ نیلی روشنی میں ڈوبے ہوئے کمرے میں ستار بجتا رہا اور میری روح کی جھیل میں نیل کنول کھلتا چلا گیا۔

پھر سجاد بھائی نے عیسٰی فاروق کی بات چھیڑ دی جس کی موت کے بعد ہی وہ یہ ستار خرید پائے تھے۔ عیسٰی فاروق کی زندگی ہی میں وہ یہ ستار کیوں نہ خرید سکے، یہ سوال میرے ذہن میں رہ رہ کر خلش کرتا تھا۔

"دیکھا آپ نے میرا ستار کتنا بھیگ کے بولتا ہے"، سجاد بھائی مسکرا کر بولے "بڑے ٹھاٹھ کا ستار ہے۔ دوہرے ٹھاٹھ کا۔ ابھی پچھلے دنوں پانچ چھ طربیں ٹوٹ گئی تھیں۔ خود ہی بیٹھ کر لگاؤں گا کسی روز۔ پھر دیکھئے اور بھی سُر میں بجے گا۔"

بک شیلف میں کتابیں بالکل سجا کر نہیں رکھی گئی تھیں۔ میں نے ہاتھ لگا کر دیکھا۔ ان پر بھی گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ بک شیلف پر رکھے ہوئے گلدان کے پھول بھی مرجھا چکے تھے۔ ان کی پتیوں پر بھی گرد جمی ہوئی تھی۔ مجھے یہ محسوس ہوتے دیر نہ لگی کہ سجاد کے ستار کی بھی ایک کہانی ہے جس پر گرد کی موٹی تہیں جمی ہوئی ہیں۔

نیلے بلب والے ٹیبل لیمپ کا شیڈ بھی نیلے رنگ کا تھا۔ اور اس شیڈ پر جمی ہوئی گرد کی تہہ اس بات کی ضمانت تھی کہ سجاد بہت دنوں بعد اس کمرے میں آئے ہیں۔

ستار پر سجاد بھائی کا نغمہ بہت دور نکل گیا تھا۔ اور میں مناسب مقامات پر واہ واہ کرتا رہا۔ نیلی روشنی میں سجاد کا سانولا چہرہ بڑا ہی پیارا لگنے لگا۔ اس وقت مجھے امیر خسرو کی یاد آئی جنہوں نے رُدر وینا میں ضروری تبدیلیاں کر کے ستار ایجاد کرتے ہوئے نغمہ کو آواز دی تھی۔

میں نے کہا "سجاد بھائی، یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ موسیقی کے موجودہ ساز صدیوں میں جا کر مکمل ہوئے ہیں۔ پہلے وقتوں میں تو یہ ساز بہت ہی سادہ رہے ہوں گے۔ اب ستار ہی کو لو۔ پہلے کسی پرانے راگ کے رسیلے ایک لرزتے ہوئے تار کو جھنجھناتے ہوئے سن کر رُدر وینا، وچتر وینا اور سرسوتی وینا جیسے ساز ایجاد کئے ہوں گے۔ پھر صدہا سال بعد امیر خسرو نے ستار کو ایجاد کرتے ہوئے یہ سوال دہرایا کہ روپ رنگ کے جادو کو اب کس سحر کا انتظار ہے؟"

"میں نے تو اسے بہت دنوں سے ہاتھ ہی نہیں لگایا!" سجاد بھائی کہتے چلے گئے، "ویسے وہ بھی اسی عیسٰی فاروق سے لے لی تھی۔ الاپ کرنا ہو تو یہی وینا ٹھیک ہے۔ لیکن گت کا مزا تو ستار کے بغیر کہاں؟"

سجاد نے ستار کی اتنی تعریف کر ڈالی کہ مجھے کہنا پڑا "ستار تو بہت دیکھے ہیں، مگر ویسے اس میں ایسی کیا بات ہے؟" وہ بولے "اتنا بھیگ کے بولنا، کیا یہ معمولی بات ہے؟"

اس خیال سے کہ وہ برا نہ مان جائیں، میں نے یہ شکایت بالکل نہ کی کہ کمرے میں جگہ جگہ گرد کیوں جمی ہے اور وہ صفائی کی طرف سے اتنے بے پروا کیوں ہیں۔ بک شیلف پر رکھا ہوا الارم والا ٹائم پیس بھی تو اسی کی طرف اشارہ کر رہا تھا کہ اس گھر کو ابھی تک بسانے والی نصیب نہیں ہوئی۔

ستار پر سجاد کو پورا اعتماد تھا۔ ان کی انگلیاں خوب چلتی رہیں اور لمبے ریاض کی سوگند کھاتی چلی گئیں۔

میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا "تو گھر آباد کرنے کا کوئی ارادہ نہیں؟"

"ارے یہ بھی کرلیں گے ایک نہ ایک دن" انہوں نے ستار کی کھونٹی کسنے ہوئے کہا "لیکن کیا یہ اتنا ہی ضروری ہے؟" اور پھر وہ قہقہہ لگا کر بولے "بس ہمیں کوئی ثروت نسا مل ہی جائے گی!"

ثروت کی بات میں مجھے اجنبیت نظر نہیں آئی میں اور بھی تن کر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا ثروت کا قصہ پیچھے ہوگا پہلے ستار کی کہانی کے کواڑ کھولو۔"

"اس کی کہانی کے کواڑ کھلوا کر کیا کروگے؟" سجاد جیسے سپنے میں بول رہے ہوں، اور انہوں نے دوسرا نغمہ چھیڑ دیا جسے سنتے سنتے میرے تخیل میں روپہلے ستونوں اور سنہرے کٹاؤ دار محرابوں والا سُر منڈپ گھوم گیا۔ ستار کے سرگم رگ رگ میں اتر رہے تھے۔

میں نے کہا "واہ واہ! سچا سُر تو قدم قدم پردے چلاتا ہے۔ قدم قدم پہ دیپ آرتی اتارتا ہے"۔

"باتیں پیچھے ہوں گی۔ پہلے ستار سنو" سجاد نغمہ کی لَے بڑھانے چلے اور میں اپنے سر کو کرسی کی پشت پر ٹیک کر بیٹھ گیا۔ لَے ثروت کا آنچل تھام کر آگے بڑھتی گئی۔ نغمہ ساز کی بند آنکھیں نغمے کے پاتال میں اترتی گئیں اور میری نگاہیں راگ کی وسعتوں میں تیرتی چلی گئیں۔ یکایک میرے منہ سے نکل گیا "بہتے پانی میں ہاتھ ڈالنا تو ہر لڑکی کو پسند ہوتا ہے لیکن ستار میں شاید ہر لڑکی رس نہیں لے سکتی۔ ایک بات بتاؤ۔ کبھی ثروت کو بھی تم نے ستار سنایا ہے؟"

"اس کی بات چھوڑو" سجاد نے جیسے ٹالنا چاہا۔ "اسے اتنی سمجھ ہی کہاں تھی۔ ایک بار ٹیپ ریکارڈر پر اس نے میرے ستار کے دو تین بول ضرور محفوظ کر لئے تھے۔ اب کون جانے وہ بول اس نے اب تک سنبھال کر رکھ چھوڑے ہیں اور انہیں کبھی کبھی سن لیتی ہے یا اس نے وہ نغمے مٹا کر کسی دوسرے گیت کے بول بھر لئے ہوں۔ ٹیپ ریکارڈ کی بات تو ایسی ہی ہے۔ چھوڑئیے!"

انہوں نے "چھوڑئیے" کچھ اس انداز سے کہا جیسے وہ ثروت کی کہانی کو بھی گرد کی موٹی تہہ کے نیچے دبا کر رکھنا چاہتے ہوں۔

"تو کیا تم ستار سکھانے جایا کرتے تھے؟" میں نے کہا "خیر اسے چھوڑو، پہلے ستار کی کہانی سناؤ"۔

"تم نے پہلے بھی کسی ساز کی کہانی سنی ہے؟" سجاد نے مسکرا کر کہا "عیسیٰ فاروق یہ ستار اس لئے نہیں بیچتا تھا کہ یہ ستار کے یہاں مرمت کے لئے آیا تھا اور جس کا یہ ستار تھا وہ سات برس سے اسے لینے نہیں آئی تھی"۔ پھر تھوڑی دیر چپ رہ کر وہ گنگنانے لگا۔

"گوری سوئے سیج پر، مکھ پہ ڈالے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چہو دیس

مجھے یہ محسوس ہوتے دیر نہ لگی کہ سجاد کی ستار کی کہانی بہت مزیدار ہوگی۔ ستار بجانے اور اسکی تیاری سے بھی کہیں زیادہ مزیدار۔ اور میرے تصور میں ستار کے موجد، امیر خسرو کا وہ دوہا جیسے گھنگھروؤں کی جھنکار بن کر گونج اٹھا۔

خسرو کے اس دوہے میں سانجھ کی جو منظر کشی کی گئی تھی، وہ کسی جدید مصور کی دلکش تصویر کی طرح سامنے ابھری۔ جیسے ہمارے اور خسرو کے دور میں چند گھڑیوں کا فاصلہ بھی نہ رہ گیا ہو۔

"یہ ستار کس نے مرمت کے لئے عیسیٰ فاروق کی دوکان پر بھیجا تھا؟" میں نے حیرت سے پوچھ لیا۔

"ثروت کی ماں نے" سجاد مسکرائے۔

مجھے بڑی گدگدی سی ہوئی۔ کیونکہ میں نہ جانتا تھا کہ یوں یکدم کہانی کا دامن ثروت سے جا ملے گا۔ میں نے کہا "کمرے میں صفائی کا انتظام کرو۔ ثروت کبھی بھولی بھٹکی یہاں آ نکلی تو کیا کہے گی؟"

خالص لکھنؤ وضع کے کرتے پاجامے میں سجاد کی شخصیت نیلے بلب کی نیلی روشنی میں اور بھی جاذب نظر معلوم ہو رہی تھی۔ ثروت کا ذکر سن کر وہ شرما گئے۔ "چھوڑو۔ کیا وہ اب تک میرے لئے یونہی بیٹھی ہوگی؟" انہوں نے بات ٹالنی چاہی۔ جیسے وہ اب تک اپنے تصور میں اپنے ارمانوں کی اس کہانی کی گونج سن رہے ہوں جو انہوں نے ثروت کے سامنے بیان کی تھی۔

"کیا ثروت اپنے چہرے پر پاؤڈر کی موٹی تہہ جمایا کرتی تھی؟ اور یہ بھی بتاؤ اس کا دلپسند شعر کونسا تھا؟" میں نے سجاد کا کندھا جھنجھوڑ کر پوچھا۔

"اسے تو بس ایک ہی شعر پسند تھا ؎

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے
نالہ پابندِ نَے نہیں ہے"

سجاد گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

"اور ثروت کی ماں خسرو کا دوہا گاتی ہوگی" میں نے

سنجیدگی سے کہا۔

"خسرو کا وہ دوہا تو ہر کسی کو پسند آئے گا"

سجاد نے بتایا کہ جب وہ ثروت کو ستار سکھانے جاتے تو ماں بیٹی میں یہ بحث چل پڑتی کہ ستار سیکھنے کے لئے بڑے ٹھاٹھ کا ستار ہونا چاہیئے یا معمولی سا۔ ثروت کہتی "میں تو تمہارے والے ٹھاٹھ کے ستار پر ہی نیا سبق لوں گی" اس کی امی تھی کہ اس بات کے لئے مطلق راضی نہ ہوتی۔ اس کا بھاؤ نہ بدلنا تھا نہ بدلا۔ وہ تو ثروت کی یہ بات سن کر ہمیشہ چونک پڑتی اور جھنجلا کر کہتی "تمہیں کب سے سمجھا رہی ہوں۔ اپنے ستار کو تو میں کسی کو بھی ہاتھ نہ لگانے دوں گی۔ دیکھتی نہیں، میں نے تو کبھی عیسٰی فاروق پر بھی اتنا بھروسہ نہیں کیا کہ اسے مرمت کے لئے اس کی دوکان پر بھیج دوں۔ ہمیشہ اس کو یہاں آ کر کھونٹی وغیرہ لگانی پڑتی ہے۔ چاہے اسے راضی کرنے کے لئے مجھے کتنی بار بھی اس کی دوکان پر جانا پڑے "

میں نے کہا "تم نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ ثروت اپنے چہرے پر پاؤڈر کی ہلکی سی تہہ جماتے وقت بھی وہی فریاد کی کوئی لے نہیں ہے، والا شعر گنگناتی ہوگی۔ اور دیکھتی ہوگی کہ ایک لہراتی ہوئی زلف اس کے دائیں گال کو چھو گئی۔ جیسے یہ سچ مچ کسی فریاد کی لے ہو۔ سچ مچ بتاؤ کیا ثروت کو بھی نیلے بلب کی نیلی روشنی پسند تھی؟ ستار بجاتے وقت اس کا چہرہ پہلے سے کہیں زیادہ نرم پڑ جاتا ہوگا۔ اور وہ تو ہمیشہ پلکیں جھکا کر ستار بجانا پسند کرتی ہوگی اور اس کا انداز یقیناً ایک مشرقی لڑکی کا انداز ہوگا "

سجاد نے بتایا کہ اس کی امی کسی کے دل کو ٹھیس تو نہیں لگانا چاہتی تھی۔ لیکن یہ راز کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ستار کی مرمت کے سلسلے میں اسے عیسٰی فاروق پر ذرا بھی اعتماد کیوں نہیں تھا۔ جب ثروت اپنی بالکونی میں سج دھج کر بیٹھتی اور ستار بجاتی یوں معلوم ہوتا کہ وہ عمرِ رفتہ کو آواز دے رہی ہے۔ ویسے اسے ستار بجاتے سننا تو عیسٰی فاروق کو بھی پسند تھا۔ سارے شہر میں اس کے ستار کی دھوم تھی۔ اور بڑے بڑے موسیقار تہہ دل سے یہی چاہتے تھے کہ کسی طرح بیگم اشفاق کا ستار ان کے ہاتھ لگ جائے۔

"لیکن یہ راز کسی کو بھلا کیسے معلوم ہوتا" سجاد مسکرا کر بولے "یہ بات تو ثروت کے ابا جان بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ ستار بیگم نے خریدا تھا یا وہ کسی کے تحفے کی یادگار تھی جسے وہ اپنے ساتھ جہیز میں لائی تھی "

میں نے کہا "تم مجھ سے چھپا رہے ہو۔ میرا تو خیال ہے یہ ستار کسی زمانے میں خود عیسٰی فاروق نے ہی بیگم اشفاق کی نذر کیا ہوگا!"

"تم نے کیسے بوجھ لیا؟" سجاد الاؤ میں سوکھے پتے ڈالنے کے انداز میں بولے "ثروت کے ابا جان سے یہ بات آج تک پوشیدہ رکھی گئی کہ بیگم کی اٹھتی جوانی میں عیسٰی فاروق نے اسے دے ڈالا۔ شاید بیگم ستار کی مرمت کے بہانے اسے اپنے یہاں بلا کر ان دنوں کی یاد تازہ کر لیتی تھی "

"یہ بات ثروت کو تو ضرور معلوم ہوگی "

"بالکل نہیں "

"اب آجکل بیگم اشفاق اور ثروت کہاں ہیں؟"

"کوئی نہیں جانتا"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"عیسٰی فاروق کو مرنے سے پہلے سات سال تک یہ راز معلوم نہ ہو سکا "

"یعنی بیگم ستار کو مرمت کے لئے عیسٰی فاروق کی دکان پر بھیجنے کو تو راضی ہو گئی تھیں۔ پھر اس کی سدھ بدھ لینے کا خیال ہی چھوڑ دیا۔ ایسا کیونکر ہوا؟ اس سے پہلے تو وہ کبھی ایک گھڑی کیلئے اس ستار کو اپنے سے جدا نہیں کرتی تھی "

سجاد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ ہی شعر گنگنانے لگا......

"پہلے یہ بتاؤ تمہارے پاس یہ ستار آئے کتنا عرصہ ہوا؟"

"تین سال"

"تو گویا دس سال سے بیگم ثروت اس شہر سے غائب ہیں؟"

سجاد نے نرم اور دھیمے انداز میں کہا "مجھے یقین ہے ثروت کی ابھی شادی نہیں ہوئی ہوگی "

"وہ کیسے؟"

"اس نے وعدہ کیا تھا کہ شادی کرے گی تو مجھ سے ورنہ ساری عمر......"

"آخر شادی میں رکاوٹ کیا تھی؟"

"بیگم نہیں مانتی تھیں۔ حالانکہ ثروت کے اباجان نے کہہ دیا تھا کہ اگر ثروت یہی چاہتی ہے تو کیا مضائقہ ہے"

"تو پھر کیا رکاوٹ تھی؟"

"کیا بتاؤں۔ اس روز سے مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ پہلے میری ٹیوشن چھوٹ گئی پھر میرے لئے ثروت کو گھڑی پل کیلئے دیکھنا بھی محال ہو گیا بیگم نے یہ شہر چھوڑ دیا۔ نہیں نہیں یہ ملک ہی چھوڑ دیا"

"یعنی وہ اپنے خاوند اور بیٹی کے ساتھ کہیں باہر چلی گئیں؟"

"جی ہاں"

"اور جاتے ہوئے یہ ستار عیسٰی فاروق کے پاس کیوں چھوڑ گئیں؟"

"اب یہی تو نکتے کی بات ہے"

"عیسٰی فاروق نے تمہیں کچھ تو بتایا ہوگا"

"وہ تو یہی کہتا رہا کہ بیگم ضرور آئیں گی ایک دن اور اسکے لئے بلکہ کئی بار اصرار کرنے پر ہی اس کی مرمت کی جائے گی"

"اور وہ لوٹ کر نہ آئیں"

"جیسے سات برس بیتے ویسے ہی تین برس اور بیت گئے۔ اور آج تک نہ وہ آئیں نہ ثروت۔ وہ جہاں بھی رہیں خوش رہیں۔ انہیں میری یاد بھی ضرور آتی ہوگی"

"کیا تمہاری خاطر ہی بیگم اور ثروت نے یہ ملک چھوڑ دیا"

"بات تو کچھ ایسی ہی ہے" سجاد نے رومال سے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا "لیکن ایسا کیوں ہوا، یہ میں آج تک نہیں سمجھ سکا۔ آخر انہیں ملک چھوڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ چاہتے تو یہاں رہتے ہوئے بھی مجھ سے قطع تعلق کر سکتے تھے"

سجاد کے جسم میں تھرتھری سی پیدا ہوئی۔ بولے "بیگم کے لئے عیسٰی فاروق کے دل میں محبت کی آگ ضرور سلگتی تھی۔ یہ بات مجھ سے چھپی ہوئی نہ تھی۔ جب وہ اس کی دکان پر یہ درخواست کرنے آتی کہ وہ اس کے گھر پر جاکر اس کے ستار کی نئی کھونٹی لگا آئے تو وہ کچھ اس طرح مسکراتی اور پھر آنسو بہاتی کہ عیسٰی پہلے تو یہی رٹ لگاتا رہتا کہ دیکھئے بیگم ہم دکان کھول کر بیٹھے ہیں تو کوئی نہیں آتا بے ایمان کیوں سمجھے کہ اپنا ستار مرمت کے لئے ہماری دکان پر نہ بھیج سکے۔ وہ بہت جھنجھلاتا لیکن دھیرے دھیرے بیگم کی مسکراہٹ اور پھر اس کے آنسو اس کے منہ سے یہ لفظ نکلوا کر ہی چھوڑتے "اچھا بیگم صاحبہ میں آجاؤں گا"

میں سمجھ گیا۔ عیسٰی فاروق سے بیگم اشفاق کو واقعی محبت تھی۔ "مگر ثروت کو حاصل کرنے کے لئے تم نے عیسٰی فاروق سے مدد کیوں نہ لی؟"

"عیسٰی فاروق کی تو وہ بات تھی کہ اندھے کے ہاتھ پر بیگم نے سونے کی مہر رکھ دی اور اندھا یہی کہتا چلا گیا کہ یہ تو کھوٹا سکہ ہے"

"تو اب ثروت کا کیا بنے گا؟"

"وہ تو ایک روز میری ہو کر ہی رہے گی۔ وہ ضرور آئے گی"

"خیر یہ بات چھوڑو۔ یہ بتاؤ یہ ستار تمہیں کیسے ملا؟"

"جب تک عیسٰی فاروق زندہ رہا اس ستار کو بیچنے سے برابر انکار کرتا رہا۔ کیا بتاؤں یہ ستار اس کی دکان میں فرش پر دیوار کے ساتھ پڑا رہتا، گرد سے اٹا ہوا۔ میں جب بھی اس کی دکان پر جاتا، وہ میرے دل کی بات سمجھ کر کہتا "دیکھو مجھ سے امانت میں خیانت کرنے کی کبھی کوئی بات نہ کرنا۔ میں وہ ستار بالکل نہیں بیچ سکتا۔ کیونکہ مجھے یقین ہے بیگم آئیں گی اور آکر کہیں گی میرا ستار کہاں ہے؟" اور اس وقت وجد میں آکر وہ خسرو کا دوہا الاپتا۔ اور جب اس کی زندگی کی سانجھ اتر آئی تو وہ جاتا ہوا اپنے بیٹے سے کہہ گیا کہ وہ بیگم اشفاق کا ستار بالکل نہ بیچے۔

میں نے آنکھوں میں شرارت بھر کر کہا "اور عیسٰی فاروق کے مرنے کے بعد جب تمہارا داؤ چل گیا"

"جی ہاں۔ آخر میں نے عیسٰی فاروق کے بیٹے کو راضی کر ہی لیا کہ وہ میرے لئے اس ستار کی مرمت کر ڈالے لیکن سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ اس کی تونبی ٹوٹ گئی تھی۔ اور اتنی بڑی تونبی کہیں بھی نہیں ملتی تھی"

"پھر یہ تونبی کہاں سے ملی؟"

"یہ ایک نیگرو لڑکی سے ہاتھ لگی جو میری گرد دنیا پر کھ گئی تھی"

"وہ کیسے؟"

"وہ وائی ڈبلیو سی اے میں رہتی تھی اور ایک روز عیسیٰ فاروقی کی دوکان پر اپنے وائلن کی مرمت کرانے آنکلی۔ میں وہاں بیٹھا تھا اس نے وہ ٹوٹا ہوا ستار دیکھا اور باتوں باتوں میں بتایا کہ اسی کے سائز کی ایک فالتو تونبی اس کے پاس پڑی ہے۔ عیسیٰ فاروقی کے لڑکے نے اس سے میرا تعارف کرا دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ زرد روبینا بجانے میں میرا شہر بھر میں جواب نہیں۔"

"تو وہ تمہاری تعریف سن کر تم پر فریفتہ ہوگئی!"

"وہ تو چاہتی تھی کہ مجھ سے شادی کرلے"

"اور تم نہ ملنے؟"

"میں نے ٹھیک کیا اور جہاں بھی ثروت رہتی ہے اس نے بھی ٹھیک ہی کیا ہوگا۔ اس نے تو میری خاطر خوبصورت سے خوبصورت لڑکے کا ہاتھ جھٹک دیا ہوگا۔ اب میری مشکل یہ ہے کہ وہ نیگرو لڑکی میرے ستار پر ہی نہیں، خود ستار نواز پر ہی ریجھ گئی ہے۔ اسے لاکھ ٹالنے کی کوشش کرتا ہوں وہ مانتی ہی نہیں کبھی تو ثروت میرے پاس آئے ہی گی۔"

"تو پھر وہ اب تک تمہارے پاس آئی کیوں نہیں؟"

"اسے بھی کسی کی موت کا انتظار ہوگا جیسے اس ستار کو میرے پاس چلے آنے سے پہلے عیسیٰ فاروقی کی موت کا انتظار تھا"

میں نے کہا "یہ تو ظلم ہے کہ تم اپنی محبوبہ کے لئے اس کی ماں کی وفات کا خیال کرو۔"

سجاد کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ جیسے وہ کہہ رہے ہوں وہ بہت مجبور ہیں۔

کمرے کے کونے میں گرد سے اٹی ہوئی وینا پڑی تھی اور ایک شیلف پر رکھے ہوئے گلدان میں مرجھائے ہوئے پھولوں پر بھی گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی نیلے بلب والے ٹیبل لیمپ کے نیلے شیڈ پر بھی گرد کی تہہ بہار کا منہ چڑا رہی تھی۔

سجاد بولے "ثروت آ تو جائے۔ میں اس کے سامنے بیٹھ کر یوں ستار بجاؤں گا جیسے ماضی کے کانوں میں سُر کے جھمکے اور ماتھے پر سُر کے چاند کا ٹیکہ لگانا بائیں ہاتھ کا کھیل ہو، وہ خود دیکھ لے گی کہ میں نے اس کے لئے محبت کے پھولوں کو مرجھانے نہیں دیا۔"

میں نے ہنس کر کہا "وعدہ کرو کہ تم ثروت کی یاد میں کمرے کی صفائی کا خیال رکھا کرو گے۔ اتنی گرد تو ٹھیک نہیں"

"گرد سے کیسے بچا جائے!" سجاد نے جھنجھلا کر کہا "کئی کئی دن تو میں یہاں آتا ہی نہیں۔ کسی نہ کسی گھر رات گذارنے کی صورت پیدا ہو جاتی ہے اور میں وہیں رہ جاتا ہوں۔"

"جب گھر میں کوئی سہاگن نہ ہو تو ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"ہو نہ ہو۔ ٹھاکر کا ستار تو ہے جسے میں ثروت کی امی کی طرح کبھی اپنے سے الگ نہیں کرتا۔ ساڑھے تین سو روپے ادا کرنے پڑے تھے عیسیٰ فاروقی کے بیٹے کو پانچ قسطوں میں۔ دن بھر موسیقی سکھاتا ہوں۔ ایک سے ایک بڑھ کر لڑکی آتی ہے۔ لیکن ثروت کا چہرہ نہیں بھولتا۔ اسی طرح جس طرح عیسیٰ فاروقی کو بیگم اشفاق کا چہرہ نہیں بھولتا تھا۔ وہ سات برس اس نے کس کس طرح تڑپ تڑپ کر گذار دیئے، کوئی مجھ سے پوچھے۔"

میں نے کہا "تو تم ہمیشہ اس ستار کو اٹھائے اٹھائے پھرتے ہو؟"

سجاد بولے "کیا بتاؤں رات کو سوتے میں اٹھ کر پاس پڑے ستار کو ٹٹول کے دیکھ لیتا ہوں کہ کوئی اسے لے تو نہیں گیا!"

اور تھوڑی خاموشی کے بعد گرد سے اٹی ہوئی زرد وینا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "جیسے زرد وینا سے امیر خسرو نے ستار بنایا ویسے ہی اللہ میاں نے بیگم اشفاق کی بیٹی ثروت کو پیدا کیا۔ ایک دن آئے گی آنے والی آکے رہے گی۔ آخر فریاد کی بھی لَے ہے!" اور پھر وہ تھوڑی خاموشی کے بعد بولے "اس نیگرو لڑکی کو ایک نہ ایک روز یہ وینا دینی ہی ہوگی۔"

اور وہ ستار پر انگلیاں چلاتے ہوئے بولے "آؤ میں تمہیں ثروت کی یادوں کے شبستان میں لے چلوں۔ تم اسے دیکھ کر خود بخود خسرو کا وہ دوہا گنگنانے لگ جاؤ گے۔"

اتنے میں کسی نے دروازے پر دستک دی اور سجاد نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔

وہ نیگرو لڑکی اندر آئی اور لجاتی ہوئی بولی "میری وہ زرد روبینا کہاں ہے؟"

(باقی صفحہ ۱۰۲۰ پر)

افسانہ

واپسی

عنایت اللہ

اس کی آنکھ کھل گئی۔

اکتوبر کی آخری رات کی خنک ہوا کے جھونکے کھلی ہوئی کھڑکی کے باریک ریشمی پردوں سے اٹکھیلیاں کرتے ہوئے اس کے تھکے ہارے اعصاب اور سوچ بچار کے مارے دل و دماغ کو سہلا رہے تھے۔ اس نے انگڑائی لی اور کھڑکی کی طرف دیکھا۔ چاند کوٹھی سے ذرا ہی دور شیشم کے پیڑ کی اوٹ میں اونگھ رہا تھا مگر وہ تھکی ہوئی چاندنی کی کرنوں سے بھرتا جا رہا تھا۔ چاند کے سامنے شیشم کی جھومتی ہوئی شاخیں کمرے میں چاندنی کی لہریں پیدا کر رہی تھیں۔ اس نے پلنگ کے پاس رکھی ہوئی تپائی سے گھڑی اٹھا کر چاند کی روشنی میں وقت دیکھا۔ صبح کے چار بج رہے تھے۔ اس کے بستر سے اٹھنے میں تو ابھی چار پانچ گھنٹے باقی تھے۔ اس نے گھڑی رکھ کر ایک بار پھر شیشم کی گھنی شاخوں میں سے جھانکتے ہوئے چاند کو دیکھا۔ اس نے گزشتہ نو برس میں کئی چاندنی راتیں کراچی جا کر ہاکس بے، کلفٹن اور سینڈز پٹ میں گزاری تھیں۔ یہی چاند ہوتا تھا۔ اور یہی چاندنی لیکن اس نے اس میں یہ روح افزا دلکشی نہیں دیکھی تھی جو وہ آج کی سحر دیکھ رہا تھا۔ اس نے چاند کو اتنی غور سے دیکھا ہی کب تھا۔ شاید اس لئے کہ سمندر کے کنارے ٹھنڈی ریت پر وہ اپنی کار سے ذرا دور وسکی کے نشے میں نت نئی ناظورہ کے پہلو میں بدمست بیٹھا ہوتا تھا اور چاند بادلوں کی اوٹ میں کبھی چھپتا کبھی اوٹ سے جھانکتا، سمندر کی لہروں کی اوٹ میں چھپ جاتا تھا۔ راوی میں چاندنی رات میں اس نے چاند کو کبھی نہیں دیکھا تھا حالانکہ وہاں دو چاند ہوتے تھے۔ ایک آسمان کی وسعت میں اور دوسرا راوی کی لہروں پہ تیرتا ہوا۔ لیکن اس کی نگاہیں دائیں طرف دخترِ رز اور بائیں طرف دخترِ ناز آفریں میں الجھی رہتی تھیں۔

اس نے زندگی کی ان گنت راتیں کھلی فضا میں کھلی ہوئی چاندنی میں گزاری تھیں لیکن چاندنی میں یہ نکھار نہ تھا جو وہ آج دیکھ رہا تھا۔ تھکا تھکا سا چاند اسے کچھ یاد دلا رہا تھا۔ حسن کی یہ تھکن یا تھکن کا یہ حسن وہ پہلی بار نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے بھی ایسا ہی حسن — اس نے غیر ارادی طور پہ سر بائیں طرف کیا۔ اس کے پلنگ کے ساتھ لگے ہوئے پلنگ پہ زاہدہ سو رہی تھی۔ چاندنی میں اس کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے چہرے کی عجیب خوبصورتی اس شہزادی کی تصویر پیش کر رہی تھی جو شہزادے کے انتظار میں سو گئی ہے۔ اس نے زاہدہ سے نظریں ہٹا کر پھر چاند کی طرف دیکھا۔ چاندنی کی لہروں میں ہلکا سا تلاطم پیدا ہوا اور اس میں سے ایک یاد ابھری جو لہروں پہ تیرنے لگی۔

گیارہ برس پہلے کی ایسی ہی ایک رات تھی جب زاہدہ ہر نئی نویلی دلہن کی طرح اس کے کمرہ عروسی میں داخل ہوئی تھی۔ وہ رات بھر اسے دیکھتا رہا تھا۔ منتظر عشق نے جانے کتنے سجدے بکھیر دیئے تھے جنہیں حسن نے اپنی نظروں نظروں میں چرا کر حجاب کے پردوں میں چھپا لیا تھا اور اس سہانی رات نے آج ہی کی طرح ایک سحر کو جنم دیا تھا۔

اسے یاد آیا کہ صبح کے چار بج رہے تھے جب اس نے زاہدہ کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر دیکھا تھا۔ اس معصوم کمسن اور شباب سے دہکتے ہوئے چہرے پر ایسی ہی تھکن تھی جیسی وہ آج، گیارہ سال بعد، صبح کے اس چاند میں دیکھ رہا تھا۔ اس صبح زاہدہ کی پلکیں جھکی جھکی تھیں۔

آج اسے اس چاند میں وہ گیارہ برس پہلے والی زاہدہ نظر آئی اور رات جس کے انتظار میں اس نے تیس برس گزار دیئے تھے۔ آج بھی وہی زاہدہ تھی۔ گیارہ برس پہلے کی طرح۔ پورے گیارہ برس اس نے تمام راتیں اسی پلنگ پہ گزاری تھیں لیکن اس قرب میں اب کتنی دوری پیدا ہو گئی تھی۔ ان کے درمیان ایک

خلیج حائل ہو گئی تھی جو گذشتہ چند برسوں سے وسیع تر ہوتی جا رہی تھی
فرق صرف یہ تھا کہ برسوں پہلے یہاں اتنے قیمتی پلنگ نہیں تھے۔
سستی سی قسم کے دو نواڑی پلنگ تھے۔ ایک وہ جو اُس نے شادی
سے پہلے ایک ماہ پہلے صرف پچیس روپوں میں خریدا تھا اور مزدور
کی اجرت بچانے کے لئے خود ہی سر پہ اٹھا لایا تھا۔ دوسرا زاہدہ
کے جہیز کا تھا جو اس کے ماں باپ نے قلیل سی آمدنی میں سے اٹھارہ
روپوں میں خریدا تھا۔ گیارہ برس پہلے یہ محل نما دو منزلہ کوٹھی نہیں
تھی، لاہور کے ایک کونے میں گھٹیا سا مکان تھا جس کے گھٹیا پن
میں بھی ایک دلگداز سکون تھا۔ اُس وقت اُس کی چھوٹی سی کریانے
اور سگریٹوں کی ایک دکان تھی، لاہور سے کراچی تک پھیلا ہوا زمین
دوز کاروبار نہیں تھا۔ گیارہ برس پہلے وہ کبھی کبھی نماز پڑھ لیا کرتا
تھا، اسے کبھی "حج" کی نہیں سوجھی تھی۔ اب ان دو پلنگوں کے
درمیان تین "حج" ہزاروں تولے سونا اور پورا جیرہ عرب آگیا تھا!

اُس نے ایک بار پھر زاہدہ کی طرف دیکھا اور کروٹ بدل کر
سونے کی کوشش کی لیکن اسے نیند نہ آئی حالانکہ رات سوچتے سوچتے
اسے ایک بج گیا تھا۔ غالباً ڈیڑھ بجے اس کی آنکھ لگی ہوگی۔ ابھی
چار ہی بجے تھے کہ آنکھ کھل گئی اور نیند بھی غائب ہوگئی۔ روزمرہ
کے معمول کے مطابق اس کی آنکھ ساڑھے آٹھ بجے کھلنی چاہئے تھی۔
وہ دوسری کروٹ سے سو گیا۔ آنکھیں بند کیں مگر دوسرے ہی لمحے
اس کی آنکھیں کھل کر شیشم کی ڈالیوں پہ جھولتے ہوئے چاند کو دیکھ
رہی تھیں۔ اُس نے جھنجھلا کر کروٹ بدل لی۔ اُس طرف اُسے زاہدہ
کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ اکتا کر پیٹھ کے بل ہو گیا۔ اور چھت میں لٹکتے
ہوئے پنکھے کو دیکھنے لگا۔

اُسے یقین ہو گیا کہ اب وہ سو نہیں سکے گا۔ اس کی نگاہیں اندرونی
سے بھرے ہوئے کمرے میں آہستہ آہستہ گھومنے لگیں جیسے وہ اجنبی
مہمان کی طرح آج پہلی بار اس کمرے میں داخل ہوا ہو اور یہ ساز و سامان
اور شاہانہ فرنیچر جو اُس نے اپنی آسائش کے لئے خریدا تھا جیسے اس کا
اپنا نہیں تھا اور نہ اس کو اس کمرے میں رہنے کا ہی کوئی حق تھا حالانکہ
گزشتہ آٹھ برس سے وہ اس میں رہ رہا تھا اور زاہدہ کے روکنے اور
منت سماجت کے باوجود یہاں شراب پیتا اور پی کر آتا تھا۔
وہ آج کی سحر کسی چیز کو نہیں دیکھنا چاہتا تھا لیکن اس کی
نگاہیں اسے سب کچھ دکھا رہی تھیں۔ وہ سامنے قد آدم آئینہ اور
سنگار میز جو بنانے والے نے تو عورتوں کے لئے بنایا تھا۔ لیکن
اس نے ساڑھے تین سو روپوں میں اپنے لئے خرید کے رکھا ہوا
تھا۔ یہ دو پلنگ ساڑھے پانچ سو کی مالیت کے تھے۔ تپائیاں اور
ان کے اوپر گلدان جن پر سونے کا پانی چڑھا ہوا تھا۔ نائیلون کے
پردے دیواروں کے ساتھ آویزاں نیم برہنہ عورتوں کی تصویریں
اور فرش کے پورے سائز کا نہایت قیمتی قالین۔ صرف چھت کی گلکاری
پر اُس نے دو ہزار روپیہ صرف کیا تھا۔ یہ اس کے سونے کا کمرہ تھا جو
کوٹھی کی دوسری منزل میں تھا۔ اس کی نگاہیں بند دروازے سے نکل
کر کوٹھی کے تمام کمروں اور غلام گردشوں میں گھومنا چاہتی تھیں لیکن
اُس نے انہیں بمشکل روک لیا اور انہیں پلکوں میں بند کر لیا۔
اُس نے پلکوں کے اندھیرے میں پناہ ڈھونڈی تھی لیکن اس اندھیرے
میں سے کچھ خیال محسوس پیکر اور تلخ حقائق بن کر اس کے سامنے آگئے
اُس نے سٹپٹا کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ چاند جو اسے ابھی ابھی اچھا لگا
تھا اور اسے شب عروسی یاد دلا گیا تھا اب اس کا منہ چڑا رہا تھا۔
تھکے ہوئے دماغ میں خیالوں کا سیل امڈ آیا۔ پھر وہی خیال، پھر
وہی باتیں، جنہیں وہ رات ڈیڑھ بجے نیند میں ڈبو چکا تھا جوں کی
توں موجود تھیں۔

وہ اٹھ بیٹھا۔ جیسے ہارا ہوا بادشاہ زخمی ہو کر غار میں آچھپا ہو۔
وہ آج بیس پچیس روز سے اسی ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔
گیارہ برس پہلے کا دور اور آج کا وقت اسے چکی کے پاٹوں کی طرح
پیس رہا تھا۔ اسے کوئی راہِ فرار نظر نہیں آرہی تھی۔ اسے صرف اسی
قدر اطمینان تھا کہ وہ نئے قانون کی زد سے بچ گیا ہے لیکن اس
کی لاکھوں کی دولت ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ اس کے ہاتھ میں اس
وقت صرف دس ہزار روپیہ تھا۔ باقی تمام اُس نے اپنے ایک
حصہ دار کو پیشگی ادا کر کے باہر بھیج دیا تھا لیکن مال کراچی کی بندرگاہ
سے پچاس میل دور سے ہی واپس چلا گیا تھا۔ مال بھی گیا اور حصہ دار
بھی مع رقم لاپتہ! اسے معلوم تھا یہ دولت ناجائز اور غیر قانونی تھی
وہ کسی عدالت میں اس نقصان کا دعوےٰ نہیں کر سکتا تھا۔ حصہ دار
وقت کا فائدہ اٹھا گیا تھا۔ ۲۸ اکتوبر کی صبح ہی بحیرۂ عرب کے اس
کنارے کے بیوپاریوں نے اُس پار کے کاروباریوں کو اطلاع بھیجی

تھی کمال روک لو، خطرہ ہے۔

خطرہ تو ٹل گیا تھا لیکن اس کا تین لاکھ روپیہ جو اس نے اس امید پر حصہ دار کو دے دیا تھا کہ چھ لاکھ ہو جائے گا، بحیرۂ عرب پر تیرتا ہوا عرب کی ریت میں مل گیا تھا۔ اب اس کے پاس دس ہزار روپیہ، ایک کوٹھی کراچی میں اور ایک لاہور میں رہ گئی تھی۔ ایک کار تھی۔ دونوں کوٹھیوں پر اس نے لکیر پھیر دی کیونکہ دونوں متروکہ جائداد تھیں اور دونوں کی تعمیر تو غیر قانونی۔ نئی حکومت نے متروکہ جائداد کے ظاہر کرنے کے احکام اور احکام کی خلاف ورزی کی سزاؤں کا اعلان کر دیا تھا۔ کار اسے اب سفید ہاتھی کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ وہ آسمان سے گر پڑا تھا لیکن کس بے ڈھب طریقے سے۔

اُس نے بستر پر بیٹھے بیٹھے سر گھٹنوں پہ رکھ لیا اور اپنے آپ کو حقائق کے سپرد کر دیا۔ لمحات نہایت آہستہ آہستہ گذر رہے تھے۔ اخباروں کی ہر روز نت نئی خبریں اور اس کے اپنے خیالات کی تلخیاں سنسناتی ہوئی گولیوں کی طرح اس کے وجود سے پار ہوتی جا رہی تھیں۔ اُسے اخباروں پہ غصہ آنے لگا جو اس قسم کی خوفناک خبریں شائع کر رہے تھے۔ اُس نے سوچا کیا خوب زمانہ تھا کہ کسی وزارت کے ٹوٹنے کی خبر آتی تھی۔ آئے دن نئے وزیر بنتے تھے۔ وہ انہیں دوست بناتا ایک آدھ کو اپنے کاروبار کا حصہ دار بناتا۔ پھر کیا مجال جو کراچی کی بندرگاہ پر کوئی اس کے مال کو آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ لے۔ لیکن یہ انقلاب! وہ تڑپ اٹھا جیسے اس کے سارے جسم میں درد کی ٹیس اٹھی ہو۔ کمرے میں ایسا سکوت تھا کہ نائلون کے پردوں کی لرزش بھی سنائی دے رہی تھی۔ وہ پلنگ سے اٹھا، ہاری ہوئی سی ایک انگڑائی لی۔ اور کھڑکی کے قریب جا کر باہر اس انداز سے جھانکا، جیسے کوئی قیدی لوہے کی سلاخوں میں سے اُس دنیا کو دیکھ رہا ہو جو اس قدر قریب ہوتے ہوئے بھی کتنی دور ہو جاتی ہے۔

وہ شب بیداری، تفکرات سے بوجھل دماغ اور گناہوں سے بوجھل ضمیر کو سنبھالتا ہوا پیچھے گھوما اور قالینوں پر بے آواز پا خراماں خراماں چلتا ہوا زاہدہ کے سرہانے جا رکا۔ وہ سو رہی تھی — گہری نیند اُس نے سوئی ہوئی نسائیت اور اس کی معصومیت کو برسوں بعد محسوس کیا۔ اور یہ بھی دیکھا کہ زاہدہ کے بھولے بھالے چہرے پر وہی برسوں پہلے کی رونق ہے لیکن آنکھوں کے گرد اور ہونٹوں کے کونوں میں شکوے تڑپ رہے ہیں: "میں نے غربت میں تیرا ساتھ دیا ہے۔ تجھے دولت ملی تو غیر ہو گئی!" اُسے یوں لگا جیسے زاہدہ کی لطیف سی سانسیں اُسے بآوازِ بلند کہہ رہی ہیں "کیا تیری محبت کو جیتنے کے لئے میں بھی خود فروش بن جاؤں؟ تو کارے کر میرے دروازے پر آئے اور میں تیرے ساتھ چل پڑوں؟ تو غیر عورت کی راہ میں دولت بچھاتا ہے، میں نے تیری راہ میں آنکھیں بچھائی ہیں جن راہوں پہ تو ہر شام نکل جاتا ہے میں اُن پر آنسو بکھیرتی ہوں۔ تو نے سچ کہے ہیں میں نے تیرا دل ہاتھ میں لینے کی کوشش کی ہے کہ سچ اکبر ہے۔ مگر پہلے تو مجھ سے کھچا کھچا رہنے لگا، اب دو سال ہوئے میرے ساتھ کلام کرنا بھی چھوڑ گیا ہے۔"

وہ سوئی ہوئی زاہدہ کو دیکھتا رہا۔ اس کا ایک ہاتھ لاشعوری طور پر اس کی پیشانی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ رات کا سکوت ہیبت ناک گڑگڑاہٹ سے لرز اٹھا۔ وہ چونکا اور لرز کر پیچھے ہٹ گیا۔ راوی کے پل پر مال گاڑی گزر رہی تھی۔ اُس نے بکھرے ہوئے خیالوں کو پھر چن لیا اور دونوں ہاتھ زاہدہ کے پلنگ پر رکھ کر ذرا سا جھکا۔ ہوا کے جھونکوں نے جیسے اسے کہا "تجھے دولت ملی تو زاہدہ تجھے بری لگنے لگی۔ کہاں گئی وہ دولت؟ آج تیرے پاس دولت نہیں رہی۔ اسمگل کیا ہوا سونا بحیرۂ عرب اور شراب کی لہروں میں بہہ گیا ہے۔ دولت کراچی اور لاہور کی ہوس رانیوں نے چوس لی۔ کچھ رشتہ کے بھائی اور ماں باپ اسے تیری زوجیت میں دینے کے فریب میں کھا گئے۔ تیرے پاس آج کیا رہ گیا ہے؟ — جرائم۔ گناہوں کا بوجھ تیری روح کو کچی شاخ کی طرح توڑ چکا ہے۔ پہلے تو نے دولت کو سمیٹا تھا، اب گناہوں کو سمیٹ لے۔ یہی تیری پونجی ہے!"

اس کے اپنے ضمیر کی آوازیں اس کے چہرے پر زناٹے دار تھپڑ مار رہی تھیں۔ اُس نے چاہا زاہدہ کو جگائے، اس کے قدموں پر سر رکھ کر گناہوں کا اعتراف کرے۔ اس سے کہے "تو ہی میری پناہ ہے، تو ہی میری ہم سفر ہے۔ میں تھک گیا ہوں، ہار گیا ہوں مجھے تھام لے۔" لیکن اُس میں اقبالِ جرم کی ہمت نہیں تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ لاہور کے ہنگامے سوئے ہوئے تھے۔ راوی جاگ رہا تھا۔ لہروں کا ہلکا ہلکا شور فضا میں خنک سا ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔ وہ سلیپنگ سوٹ میں ہی سڑک پہ چلا پہنچا اور مسجد کی طرف چل پڑا۔ تھوڑی دور اسے چھوٹی سی ایک دکان نظر آئی۔

جس میں چند کنستر اور بوریاں رکھی ہوتی تھیں۔ دال، مرچ، مصالحہ، چاول اور اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی چیزیں۔ چند ایک سگریٹ، بیڑیاں اور ماچسیں ہوتی تھیں۔ الغائی تین روپے کی روز آمدنی ہوتی تھی۔ چھوٹا سا گھر تھا۔ بڑا سارا گھر تو واہگہ کے اُس پار رہ گیا تھا۔ اسے یہی چھوٹا سا گھر اچھا لگنے لگا تھا۔ پھر زاہدہ اس گھر میں داخل ہوئی تو اسی محدود سی چار دیواری میں کس قدر وسعت پیدا ہو گئی تھی! زندگی، شگفتگی اور ٹھہرے ہوئے بجھے تلے سے رومان کی لہروں پر تیرتی جا رہی تھی۔

اُسے وہ دن بھی یاد آیا جب اس کا ایک عزیز دوست اس کے پاس دکان میں بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے ایک گاہک کو گولڈ فلیک کا پیکٹ ساڑھے آٹھ آنے میں دیا۔ یہ نو برس پہلے کا واقعہ تھا۔ گاہک چلا گیا تو دوست نے کہا تھا "نیک بخت! کیوں روزی کے پیچھے لٹھ لئے پھرتے ہو۔ یہ سگریٹ آج چودہ آنے میں بک رہا ہے۔ وہ بھی سو منتوں کے بعد۔ اور تم؟" اور دوست نے اسے ایسا ہنر سکھا دیا تھا کہ تمام سگریٹ، کنستروں اور بوریوں کے نیچے غائب ہو گئے۔ پھر چودہ آنے اور کچھ منت سماجت کے بعد ایک ایک پیکٹ نکلنے لگا۔ اس سے پہلے وہی پچاس ڈبیوں کا پیکٹ جس میں سے وہ بصد مشکل دو روپے منافع کماتا تھا۔ اب اسے پچیس کے بدلے پچیس روپے دینے لگا۔

اسی دوست نے اسے سفید چینی بلیک کرنے کا ہنر سکھا دیا تھا اور ڈپوسے بوگس کارڈوں پر ایک روپیہ ایک آنے سیر خریدی ہوئی چینی دو روپے سیر بکنے لگی۔ چھوٹا سا گھر بڑا ہونے لگا۔ اور دکان چھوٹی نظر آنے لگی۔ ایک سال کے اندر اندر دکان غائب ہو گئی، زمین کے اندر چلی گئی، پھر زمین کے اندر ہی اندر کراچی تک جا پہنچی اور کراچی سے عرب تک! پھر حج کے لئے پاسپورٹ بنے۔

پہلے حج کے لئے وہ اکیلا گیا تھا اور باقی دو حجوں میں اس کا سارا "کنبہ" ساتھ گیا تھا۔ کراچی کی ایک رسوا عورت اس کی "اہلیہ"، ایک اور اس کی "بیٹی" اور دو جرائم پیشہ لڑکے اس کے "بیٹے" بنے ــــ جعلی پاسپورٹوں پہ ان حجوں نے لاکھوں روپوں، ایک کار اور دو کوٹھیوں کو جنم دیا۔ پھر حج کی ضرورت نہ رہی کیونکہ سمندر کے اُس پار زمین دوز ایجنسی قائم ہو چکی تھی اور دولت تیرتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ زاہدہ نے دولت کی بھول بھلیوں میں اپنے خاوند کو تلاش کرنے لگی لیکن خاوند اس سے دور ہی دور ہوتا جا رہا تھا۔ وہ آج کراچی تو کل لاہور

ہوتا۔ دوپہر گھر میں اور رات ـــــ اگر وہ کبھی کبھار بھولے بھٹکے رات گھر میں گزارتا بھی تو زاہدہ سے قریب ہوتے ہوئے بھی اُس سے بہت ہی دور رہتا۔ اس کی نظر میں زاہدہ ایک دو سالوں میں ہی پرانی ہو چکی تھی۔

زاہدہ نے شکوے کئے، روئی بھی۔ اُن دنوں کی معصوم اور بھولی بھالی محبت کے واسطے بھی دیئے جب وہ اسے دکان پر روٹی دینے جایا کرتی تھی اور دروازے میں کھڑی اس کا انتظار کیا کرتی تھی۔ لیکن وہ کوسوں دور نکل گیا تھا۔ نئے ماڈل کی کار کی رفتار بہت تیز تھی، اور دولت کا نشہ اس سے کہیں زیادہ تیز تھا۔ زاہدہ آخر تھک ہار کر چپ ہو گئی اور اس انتظار میں گھر کے ایک کونے میں پھینکی ہوئی بیکار شے کی طرح بیٹھ گئی کہ اس کا خاوند ایک نہ ایک دن اُس کی دنیا میں واپس آ جائے گا لیکن اسے بہت کم امید تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ابھرتے ہوئے محلات چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں کو اجاڑ دیا کرتے ہیں۔ اُس نے کتنی ہی پاکدامن بیویاں دولت کے انباروں میں دفن ہوتے دیکھی تھیں اور ان انباروں میں سے نئی سے نئی بیویوں کو اُبھرتے دیکھا تھا۔

وہ راوی کی طرف چلا جا رہا تھا اور گزرتے ہوئے وقت کے لمحات اس کے سر کے اوپر شہد کی بھڑکی ہوئی مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہے تھے۔ وہ سر جھکائے جا رہا تھا کہ لاشعوری طور پر اس کی گردن بائیں طرف گھوم گئی۔ اسے چھوٹا سا کوٹھی نما مکان نظر آیا۔ اس کے قدم ایک عادت کے تحت رکنے لگے۔ یہ رعنا کا گھر تھا۔ وہ سترہ اٹھارہ برس کی نوجوان اور شوخ رعنا جس کا رشتہ اس کے بھائی اور ماں باپ اچھی قیمت پر دینا چاہتے تھے۔ اس نے اس کی خاطر آٹھ دس ہزار روپیہ لٹا دیا تھا اور ایک کار کا وعدہ بھی کیا تھا۔ اس کے بھائی اور ماں باپ کھاتے جا رہے تھے اور بھائی در پردہ کسی اور بڑے گاہک کی تلاش میں پھر رہے تھے۔ رعنا بھی ان سودے بازیوں سے واقف تھی اور وہ اُسے خوب بنا رہی تھی۔

اُس نے اس گھر کو دیکھا تو غصے کا ایک شعلہ اس کے سارے جسم کو جلا گیا۔ اُس نے سوچا ۲۸ر اکتوبر کے بعد حالات نے کیسا پلٹا کھایا ہے کہ چند روز ہوئے وہ رعنا کے ہاں اسے پکچر پہ لے جانے کے لئے گیا تو اس نے بے رُخی سے کہہ دیا "میری طبیعت خراب ہے" اور اس کے دونوں بھائیوں نے ایسی ہی بے رُخی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ غصے میں ان پر برس پڑا تھا اور کہا تھا۔ "تم لوگ میرا آٹھ دس ہزار روپیہ کھا چکے ہو۔

اور تم نے اپنی بہن کا رشتہ دینے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ میں چاہوں تو .....“

جانے وہ کیا کچھ کہنا چاہتا تھا کہ رعنا کا بڑا بھائی، جو بلیک میلنگ میں ماہر تھا، نہایت احترام سے اس کی بات کاٹتے ہوئے بول پڑا تھا۔ ”حاجی صاحب! آپ کو تو خود علم ہونا چاہئے کہ آپ حاجی نہیں ہیں۔ آپ اسمگلر ہیں اور اب بھاگے ہوئے مجرم! کون جانے آپ کو کس وقت مارشل لا، والے پکڑ کے لے جائیں۔ سی آئی ڈی ہمارے گھر کے بھی چکر کاٹ چکی ہے۔ فوجی کسی کو بخشیں گے نہیں۔ ہم اپنی بہن کی زندگی تباہ نہیں کرنا چاہتے“۔ اور وہ باقی باتیں سنے بغیر وہاں سے لوٹ آیا تھا۔

اور آج؟ دولت گئی، رعنا ہاتھ سے گئی، زاہدہ کو الگ ناراض کیا۔ اب زاہدہ کی پاکیزہ دنیا میں واپس جائے تو کیسے؟ وہ دھتکار نہ دے۔ وہ یہ طعنہ نہ دے بیٹھے کہ تم تو دوسری شادی کرنا چاہتے تھے۔ کہاں ہے وہ دوسری؟

اُس کے قدم رک رہے تھے۔ اُسے بہت کچھ یاد آیا اور وہ رکتے ہوئے قدموں کو گھسیٹتا ہوا تیز چل پڑا۔ رعنا کے مکان سے بہت دور اور بہت جلدی بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اُس کے بند دروازے کے عقب سے جیسے اس پر کسی نے فقرہ چست کر دیا تھا اور ایک طنزیہ قہقہہ۔ ”حاجی صاحب! آؤ شادی کر دگے؟ دس ہزار لگیں گے۔ ہے کچھ پاس پلے؟“ وہ اور تیز چل پڑا۔

وہ راوی کے کنارے بیٹھ گیا۔ صبح کی سپیدی پھیلنے لگی تھی۔ پرندے گھونسلوں سے نکل کر دریا کے کنارے پانی پینے بیٹھ رہے تھے، اڑ رہے تھے۔ ماہی گیروں کی دو کشتیاں دور بہتی جا رہی تھیں۔ اُس نے کنارے پر بیٹھ کر پاؤں پانی میں رکھ دیئے۔ اس کا انگ انگ جل رہا تھا۔ ٹھنڈے پانی کی خنکی اس کے دماغ تک پہنچ گئی۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور لمبی لمبی سانسیں لیں۔ چڑیوں کا ایک غول اس کے سر کے اوپر سے گزر گیا۔ اُس نے آنکھیں کھول دیں اور گرد و پیش کو نظر بھر کے دیکھا — ایک ایک چیز کو اور قدرت کے ایک ایک رنگ کو۔ صبح کی سپیدی کو دیکھا شفق کی مسکراہٹ کو دیکھا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک انوکھا سا قرار اس کے ریشے ریشے میں سرایت کرنے لگا۔

قدرت کی یہ بارش اُس نے پہلی بار دیکھی تھی۔ پانی کی روانی کو اُس نے پہلی بار محسوس کیا تھا۔ سامنے دریا کے اُس پار درختوں کے جھنڈ نکھرتے جا رہے تھے ستارے چینی کے ذرّوں کی طرح پگھل کر صبح کے نور میں تحلیل ہو گئے تھے۔ لہروں کا جل ترنگ اور پرندوں کی طرح طرح کی بولیاں ایک ہی راگ پہ منظم تھیں۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ تھکے ہوئے ضمیر نے کرب آلود انگڑائی لی۔ اس کے جلے ہوئے سینے سے آہ نکلی۔ ایک ہوک!

”اے صبح کے نور کے خالق! میں نے تین بار تیرے حبیبؐ کی تربت کی بے ادبی کی ہے۔ میں نے تیرے نام پر قوم کو دھوکے دیئے ہیں۔ تو خدا ہے، میں بندہ ہوں۔ میں نے گناہ کئے۔ شاید اس لئے کہ ایک دن راہ پہ آجاؤں گا اور تو بخش دے گا۔ میرے مالک! اپنی اس صبح کے نور کا ایک ذرہ میرے سینے میں سمو دے۔ صرف ایک ذرہ! میں بھٹک گیا ہوں۔ راہ دکھا دے“۔

سارسوں کا جھنڈ اس کے سر کے بہت اوپر سے چاند کی شکل میں اُڑتا جا رہا تھا۔ اس کے دماغ میں ایک خیال آیا جیسے اندھیرے میں ایک کرن۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ اور حقائق کا جائزہ نئے سرے سے لینے لگا۔ اسے یہ اطمینان ضرور تھا کہ وہ نئے قانون کی زد سے باہر تھا۔ کیونکہ پہلا مال فروخت ہو چکا تھا اور دوسرا مال واپس ہو چکا تھا۔ اُس نے دریا کے کنارے کھڑے کھڑے طے کر لیا۔ ”کاریں بیچ دوں گا۔ لاہور کی کوٹھی والا فرنیچر وغیرہ فروخت کر کے دونوں کوٹھیاں حکومت کے حوالے کر دوں گا۔ اور اچھا سا ایک مکان بنوالوں گا جس میں زاہدہ نئی نویلی دلہن کی طرح آباد ہوگی“۔

وہ بہت تیزی سے واپس آ رہا تھا۔ ضمیر نے ایک جھٹکے سے سارا بوجھ راوی میں پھینک دیا تھا۔ جب وہ کوٹھی میں داخل ہوا تو سورج نکل رہا تھا۔ وہ بیش قیمت فرنیچر اور سامان زیبائش و آسائش سے آراستہ کمروں میں سے گزرتا ہوا سونے کے کمرے میں جا پہنچا۔ زاہدہ کو آواز دی اور پلنگ پر لیٹ گیا۔

آج برسوں بعد اس کی آواز میں وہی چاہت اور وہی محبت تھی جو آٹھ نو برس پہلے تھی۔ زاہدہ نے اسی آواز کے انتظار میں یہ لمبے لمبے سال کوٹھی کے ایک کونے میں رو رو کر گزار دیئے تھے۔ وہ بھاگی ہوئی آئی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اسے اس کے خاوند نے بلایا ہے۔ آج برسوں بعد اس کے منہ سے وہ اپنا نام سن رہی تھی۔ وہ کمرے میں آئی تو اُس نے اُسے اپنے پاس بلایا۔

زاہدہ ایک اجنبی کی طرح اس کے پاس کھڑی ہو گئی۔ اس نے اسے اشارے سے پلنگ پہ بیٹھنے کو کہا وہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔ دریا سے واپس آتے وقت اس نے کتنی باتیں سوچی تھیں جو وہ زاہدہ سے کہے گا لیکن وہ سامنے آئی تو کوئی بات منہ سے نکل نہ سکی۔ اس نے زاہدہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اپنی پیشانی پہ رکھ دیا۔ اس ہاتھ کے لمس نے جیسے اس کے وجود کا سارا زہر چوس لیا۔ سینے میں باتوں کا طوفان امڈ آیا جسے وہ سنبھال نہ سکا۔ اس کے منہ سے ایک آہ نکلی اور وہ صرف اسی قدر کہہ سکا۔ "زاہدہ"! اس کے ہونٹ کانپ کے رہ گئے!

زاہدہ چند دنوں سے اس کی گھبراہٹ اور بے تاب کیفیت دیکھ رہی تھی۔ وہ ساری بات بھانپ چکی تھی۔ وہ ملک کے عظیم انقلاب اور نئی حکومت کی سرگرمیوں سے آگاہ تھی۔ اُس نے خاوند کو خفت سے بچانے کے لئے کہا "آپ کہیں باہر چلے گئے تھے؟"

"ہاں" وہ بصد مشکل کہہ سکا۔ "ذرا راوی کی طرف سیر کو نکل گیا تھا۔"

"کس وقت؟"

"ابھی ابھی۔" اُس نے بلاوجہ جھوٹ بولا۔ "تھوڑی ہی دیر ہوئی۔"

زاہدہ کی باتوں اور انداز نے اسے سنبھالا دیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن جھینپ گیا۔ زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

"آپ کہتے ہیں آپ ابھی ابھی گئے تھے۔" زاہدہ نے پیار سے کہا۔ "صبح کی سیر اچھی ہوتی ہے۔ آپ اتنی جلدی واپس آ گئے۔ ذرا دیر اور ......"

"ہاں زاہدہ!" اُس نے بے بس ہو کر زاہدہ کا دوسرا ہاتھ بھی پکڑ کر اپنے قریب کرتے ہوئے دکھ بھری آواز میں کہا۔ "میں واپس آ گیا ہوں۔"

اُس کے آنسو جاری ہو گئے۔ جنہیں زاہدہ نے ڈوپٹے سے یوں پونچھ ڈالا جیسے خدا نے اس کے ضمیر سے گناہوں کی نمی پونچھ ڈالی ہو ۔

★

"ستاروں کی چال" بقیہ ص۸۶

ظہیر:۔ ہاں زندگی کے آخری دن پورے کر رہی ہیں۔ میرے ساتھ رہتی ہیں۔ تم سے مل کر بخدا انہیں بے انتہا خوشی ہوگی۔ چلو، اٹھو منّی۔

صفیہ:۔ (اٹھتے ہوئے) چلو۔ (ظہیر اس کا ہاتھ تھام لیتا ہے۔ دونوں دروازے کی طرف بڑھتے ہیں۔ پھر ظہیر ٹھٹک جاتا ہے)

ظہیر:۔ ارے! ہم نے ــ یعنی افضل صاحب؟

صفیہ:۔ (خشک لہجے میں) تم افضل کی فکر نہ کرو۔ وہ بالکل برا نہیں مانیں گے (طنزاً) بڑے فراخدل ہیں وہ (اشتیاق سے) ہم دادی سے مل لیں تو پھر تم ہمارے یہاں چلے چلنا۔ امی بیچاری کل ہی ناگپور ـــــــــــ!

(باتیں کرتے ہوئے اسٹیج سے باہر چلے جاتے ہیں۔ دروازہ بند ہونے کے چند لمحوں بعد افضل تیار ہو کر اسٹیج پر آتا ہے۔ اسٹیج خالی دیکھ کر خاصا پریشان لگتا ہے۔ وہ ادھر ادھر دیکھ کر چیختا ہے)

افضل:۔ صفیہ؟ صفیہ؟ کہاں ہو بھئی تم دونوں؟

(پردہ اچانک گرتا ہے)

"فریاد کی لے" بقیہ ص۹۶

سجاد کی انگلیاں ستار پر چلنے لگیں۔ معلوم ہوتا تھا عروس بہار کی اجنبی نگاہ فریاد کی لے کے ساتھ اٹھ رہی ہے۔ اس کے منہ سے نکلا "معلوم نہیں ستار کس کے لئے رو رہی ہے؟"

میرے تصور میں بیگم اشفاق اور عیسٰی فاروق کے چہرے غلط ملط ہو رہے تھے اور ان پر ثروت اور سجاد کے چہرے اپنے نقوش اجاگر کر رہے تھے۔

نیگرو لڑکی نے اٹھ کر کونے میں پڑی گرد روینا اٹھا لی اور اسے رومال سے صاف کرنے لگی۔ پھر وہ بک شیلف کی کتابیں رومال سے صاف کرتے ہوئے انہیں سجا کر رکھتی چلی گئی۔ بار بار اس کی نگاہ سجاد کی طرف اٹھ جاتی تھی جن کے سر کے بال ثروت کے انتظار میں آدھے سے زیادہ سفید ہو گئے تھے اور انگلیاں گرد سے اٹے ہوئے اس کمرے میں نغمے کے پھول کھلا رہی تھیں۔

فکاہیہ

موت آتی ہے پر نہیں آتی

سعید احمد رفیق

نقل کفر کفر نباشد۔ مشہور مقولہ ہے "ایک دن مہمان" دوسرے دن مہمان تیسرے دن ۔۔" سنا تو یہ آپ نے بھی ہوگا اور آپ کی طرح ہم نے بھی سن رکھا تھا۔ لیکن سوچتے تھے، مہمان کی یہ تعریف کیسے ہوسکتی ہے۔ یا وہ خدا نخواستہ "بے ایمان" کیسے بن سکتا ہے؟ دانے دانے پر مہر ہوتی ہے، جو آتا ہے اپنی قسمت کا کھاتا ہے۔ کچھ دن رہتا ہے اور پھر چلا جاتا ہے۔ وہی بات کہ

> زندگی انساں کی ہے مانند مرغ خوشنوا
> آکے بیٹھا شاخ پر کچھ چہچہایا، اڑ گیا!

ایک عرصہ بعد ملنے اور ساتھ رہنے سے جو خوشی اور مسرت حاصل ہوتی ہے، اس کا تو کوئی حساب ہی نہیں۔ لیکن صاحب اب تو ہم بھی ایمان لے آئے کہ یہ مقولہ سو فیصدی صحیح ہے۔ بس ذرا سی تصحیح کی ضرورت ہے۔ ہونا یہ چاہئے کہ "ایک دن کا مہمان عذاب جان۔ دوسرے دن کا بے ایمان اور تیسرے دن کا ۔۔۔" لاحول ولاقوۃ۔

ہمارے ایک نامور ادیب دوستوں سے بڑے پریشان تھے اور ایک ادیبہ بچوں سے۔ لیکن یقین کیجئے اگر ان میں سے کسی کو بھی اس جنس سے واسطہ پڑ جاتا تو دوست اور بچے بسا غنیمت معلوم ہوتے ـــ بھلا دوست بھی کوئی ایسی چیز ہے جس کے متعلق یہ کہا جائے کہ "مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا"۔ دوست کا کیا، کبھی آئے کبھی نہ آئے۔ اور آئے تو آکر چلا جائے۔ نہ ہوئے مہمان جو آنا تو جانتے ہیں، جانا نہیں جانتے۔ اور رہے بچے تو خدا کی ایسی نعمت ہے جو ہو تو مصیبت اور نہ ہو تو ارمان۔ مگر بچے اور مہمان کا کیا مقابلہ؟ ایک کے جانے کا ڈر اور دوسرے کے تشریف لے جانے کی تمنا۔ ڈر تو کبھی کبھار سامنے آہی جاتا ہے۔ لیکن تمنا تو کبھی بھی پوری نہیں ہوتی وہ تمنا ہی کیا جو پوری ہو جائے، جو حسرت نہ بن جائے۔ اور وہ مہمان ہی کیا جو آکر چلا جائے۔ نہ مہمان کو عقل آتی ہے کہ چلا جائے ـــ نہ ملک الموت کو کہ اس بلائے بے درماں کو لے جائے۔ اور بیچارہ میزبان کہ "موت آتی ہے پر نہیں آتی"۔

کوئٹہ کو تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔ ہل اسٹیشن کہلاتا ہے۔ ویسے تو یہاں ہلز یعنی پہاڑیاں بھی بہت سی ہیں، اور ایک اسٹیشن بھی ہے۔ لیکن ایک کو دوسری چیز سے کوئی واسطہ نہیں۔ پہاڑیاں الگ ہیں اور اسٹیشن الگ۔ بہرحال ہے کوئٹہ ہل اسٹیشن۔ ہو یا نہ ہو بہرحال کہلاتا یہی ہے، اور کیوں نہ کہلائے۔ صرف تین چار مہینے تو دن میں زیادہ سے زیادہ چار یا پانچ گھنٹے درجۂ حرارت تقریباً سو رہتا ہے۔ یہاں موسم گرما اکیلا نہیں آتا بلکہ اپنے ساتھ مہمان بھی لاتا ہے۔ خدا کی اس مخلوق کی بھی بے شمار قسمیں ہیں۔ بعض مہمان خطرہ کی گھنٹی بجا کر آتے ہیں۔ دوست اور رشتہ دار اپنی تشریف آوری کی اطلاع تار سے دیتے ہیں اور اپنے دوستوں کی آمد کا مژدہ خط کے ذریعے سناتے ہیں۔ بعض حضرات تو اس قسم کے بیکار تکلفات کے بھی قائل نہیں۔ وہ اپنی آمد کی اطلاع دینے خود ہی تشریف لے آتے ہیں۔ آپ نہایت آرام سے گھر میں بیٹھے ہیں، لیٹے ہیں، کھانا کھا رہے ہیں یا گھر والی سے گھر کیاں۔ وہ آپ سے ناراض ہیں یا آپ ان سے خوش۔ بہرحال بچوں کو گھرک رہے ہیں، مار رہے ہیں۔ کچھ نہ کچھ تو کر ہی رہے ہیں کہ دروازہ کھٹکھٹایا گیا اور مہمان صاحب موجود! غالب کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی کہ جب موت کے لئے دن کا وقت معین ہے تو پھر رات کو نیند کیوں نہیں آتی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اسے لاشعوری طور پر اس بات کا خوف تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے

ہم سو رہے ہوں اور موت ہماری اس غفلت سے فائدہ اٹھا کر چپکے سے آجائے۔ اور جب ہم بیدار ہوں تو معلوم ہو کہ ہم غائب۔ ہم تو مر بھی چکے۔ نہ معلوم موت کے بعد اس قسم کی باتیں سوچنے کا موقع ملتا بھی ہے یا نہیں۔ لیکن مہمان کی آمد کے بعد تو سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں سلب ہو جاتی ہیں اور بڑی مشکل یہ ہے کہ موت کے لئے بقول غالبؔ دن کا وقت معین ہے (اگر آپ کو غالبؔ کے شعر کے معنی صحیح نہیں معلوم تو میرا کیا قصور؟ کسی اسکول ٹیچر سے پوچھ دیکھئے۔ وہ ایسی تشریح کرے گا کہ نہ آپ زندہ رہیں گے نہ موت آسکے گی۔ عالم برزخ اسے ہی تو کہتے ہیں نا) لیکن مہمان کے لئے وقت کی بھی کوئی قید نہیں۔

یہ وقت کا مسئلہ بھی بڑا عجیب ہے۔ ایک مرتبہ ہمیں فلسفہ پڑھنے کا شوق ہوا۔ اپنے خیال میں پڑھا اور خوب خوب پڑھا۔ فلسفہ کوئی ایسی چیز تو ہے نہیں کہ سمجھ میں آجائے۔ وہ فلسفہ ہی کیا جو سمجھ میں آجائے۔ اتنا تو معلوم ہے کہ مادہ اور ہیولیٰ کیا ہوتا ہے لیکن یہ زمان کا مسئلہ، یقین کیجئے کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا۔ زماں، مکاں، دوراں، لامتناہیت، قدیم، حادث، اور پھر فارابی، غزالیؔ، ہیگل، برگساں، اقبالؔ اور آگے آئیت! لیکن یہ مسئلہ اب حل ہو گیا ہے۔ مہمانوں کی آمد نے اس مسئلہ لاینحل کو اس طرح سمجھا دیا ہے کہ بھلائے نہیں بھولتا۔ مہمان کا جب جی چاہے آئے۔ اور آکر کبھی نہ جائے۔ بلکہ آنے کا سوال ہی نہیں۔ وہ تو ہمیشہ سے موجود ہے اور ہمیشہ موجود رہے گا۔ وہ ازلی اور ابدی ہے موت صرف ایک مرتبہ آتی ہے۔ اور مہمان اس وقت تک آتے رہتے ہیں۔ جب تک موت نہیں آتی۔ نہیں صاحب وہ تو موت کے بعد بھی آتے ہیں۔ اور سنا ہے بہت آتے ہیں۔ خیر آتے رہیں، ہمیں کیا، کبھی تو انہیں بھی ...

مہمان خدا کی رحمت ہے۔ بے شک، بلکہ اس سے بھی ایک نقطہ زیادہ۔ قلیل آمدنی، چھوٹا سا مکان، ماشا اللہ، کئی کئی بچے اور ایک سے ایک تمیز دار۔ ویسے تو بچے کبھی کبھار غلطی سے کہنا مان بھی جاتے ہیں۔ لیکن کوئی مہمان آیا اور بچوں کو پورن سوراج ملا۔ جانتے ہیں، اب کوئی کچھ کہہ تو سکتا نہیں۔ یہاں چڑھ وہاں چڑھ۔ یہ لے وہ پھینک۔ کشتی مار پیٹ۔ آپ خاموش ہیں نہ کچھ کر سکتے ہیں نہ کچھ کہہ سکتے ہیں۔ لال پیلی آنکھیں کئے بیٹھے ہیں، لیکن بیوقوف ہیں بچے جو آپ کی طرف دیکھیں۔ انہیں جو موقع ملا ہے اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھائیں۔ مہمان صاحب شروع میں دو چار دن تو بچوں سے کچھ لاڈ پیار کرتے ہیں اور جب بچے لاڈ پیار شروع کرتے ہیں تو گھبرانے لگتے ہیں۔ اب بھلا اس کا کیا علاج؟ ان سے پوچھئے آپ نے شروع ہی میں بچوں کو سر کیوں چڑھایا تھا کہ اب ان سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک صاحب تھے تو "فارغ البال"۔ نوکر پر بہت خفا ہوئے، کہنے لگے تم بہت سر چڑھ گئے ہو۔ یہ حضرت تھے حقیقتاً سر چڑھے۔ (یقین کیجئے حضرت سعدیؔ کی نصیحت کا اس سے کوئی تعلق نہیں) معصومیت سے کہنے لگے۔ "صاحب مجھے پھسلنا تو نہیں ہے"! پھر تو یہ مہمان صاحب ایسے گئے، جیسے خود ان کے سر سے سینگ۔ اور اب تک تو ہم ان سے محفوظ ہیں۔ دیکھئے کب تک محفوظ رہتے ہیں اور وہ صاحب کب تشریف لاتے ہیں۔ خیر مجھے اس نوکر کا پتہ معلوم ہے۔ ذرا آئے تو دوا نہیں۔

آپ کہیں گے یہ قلیل آمدنی کا کیا ذکر ــــ دانے دانے پر مہر ہوتی ہے۔ مہمان آتا ہے اپنی قسمت کا کھاتا ہے پھر بھلا کیا فکر، میں بھی قسمت کا قائل ہوں۔ قائل نہ ہوں تو کیا کروں، مجبوری کا نام صبر ہے۔ مہمان اپنی قسمت کا کھاتا ہے۔ اور دانے دانے پر مہر ہوتی ہے۔ لیکن ان مہر شدہ دانوں تک رسائی اور انہیں اپنے گھر لانے میں جو خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے، نہ معلوم یہ ہماری قسمت میں کب اور کیوں لکھا گیا منکر نکیر اس کا حساب بھی رکھتے ہیں یا نہیں، اور صرف دانوں ہی پر تو مہر ہوتی ہوگی۔ یا باقی تمام چیزوں پر بھی۔ ہمیں تو خطوط وغیرہ کے سوا اور کہیں نظر نہیں آتی۔ گھر کی کونسی ایسی چیز ہوتی ہے جو مہمان صاحب اپنے لئے وقف نہ کر لیں۔ بعض مرتبہ تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ گھر اپنا گھر نہیں۔ یہاں کی کوئی چیز اپنی نہیں۔ ہر چیز پر قبضہ غاصبانہ کر لیا گیا ہے۔ نہ معلوم ان مہمانوں کو کتابوں اور رسالوں سے کیوں اتنا بیر ہوتا ہے کبھی یہ کتاب اٹھاتے ہیں اور کبھی وہ رسالہ۔ تمام کتابوں اور رسالوں کا ڈھیر بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ اور پھر اس پہ ستم ظریفی کہ نئی نئی

تجاویز۔ آپ نے سلیم صاحب کا "کبوتر" دیکھا۔ ابن۔ اکرم کا "معبود" پڑھا۔ "چراغ" کتنا پیارا رسالہ ہے۔ اور "فلم ڈکٹیٹر" کیا کہنے ہیں اس کے۔ آپ بھی یہ کیا خشک اور بیکار کتابیں اور رسالے پڑھتے ہیں جی چاہتا ہے اُن حضرات پر تو بس نہیں، اپنا ہی سر پھوڑ لیں۔ نہ قلم کا پتہ نہ پیڈ کا۔ دوات پنسل غائب۔ ڈاک نہ کا پتہ نہیں معلوم حضرت کو، اس لئے لفافے اور ٹکٹ بھی ختم۔ غرض ایک مصیبت عظمیٰ ہے یہ جنس جسے لوگ مہمان کہتے ہیں۔ خدا بچائے اس بلائے بے درماں سے اور اگر وہ بھی نہ بچا سکے تو! ارے ایسے کفر کے کلمے زبان پر نہیں لاتے۔ توبہ توبہ!

مہمان کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے کم خطرناک وہ ہیں، جو صرف سیر و تفریح کی غرض سے کوئٹہ آتے ہیں۔ بعض مرتبہ اکیلے ہوتے ہیں لیکن اکثر دوستوں کے ساتھ اور کبھی کبھار مع اہل و عیال۔ ان میں سب سے اچھی بات یہ ہوتی ہے کہ آ کر جاتے نہیں بھول لیتے۔ ہفتہ عشرہ تک ان پر سیر و تفریح کا دورہ پڑا رہتا ہے صبح ہوئی اور یہ گھر سے نکلے۔ اور رات کو پھر آن موجود! شروع میں ایک دو دن ہمراہ چلنے پر اصرار کرتے ہیں اور پھر ناامید ہو کر کتابوں کے کیڑے، کا خطاب دے کر جان بخشی کر دیتے ہیں۔ لیکن رات کو سیر سے واپس آنے کے بعد تمام دن کی روئیداد سنائیں گے اور داد کے متمنی ہوں گے نصیحتیں کرنا تو مہمان کا پیدائشی حق ہے، لیکن اس قسم کے مہمان زیادہ نصیحتیں نہیں کرتے۔ انہیں وقت ہی نہیں ملتا! جلد ہی چلے جاتے ہیں۔ گھر کو مسافر خانہ سمجھتے ہیں اور صرف رات کو قیام کرتے ہیں۔

دوسری قسم کے وہ مہمان ہوتے ہیں جو گرمی سے بچنے کے لئے وادئ شال میں پناہ لینے آتے ہیں اور صرف دو ایک مہینے قیام کرتے ہیں۔ یا عموماً دوستوں کے ساتھ ہوتے ہیں اور صرف اس بنا پر مہمان بننے پر مجبور ہوتے ہیں کہ "فی الحال ہوٹل میں انتظام نہیں ہو سکا" روزانہ کسی نہ کسی ہوٹل کا نام لے کر اطمینان دلاتے رہتے ہیں کہ کل اس میں کمرہ ضرور خالی ہو جائے گا۔ اور یہ... لیکن وہ کبھی نہیں آتی۔ گرمیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ اور یہ مہمان تشریف لے جاتے ہیں۔ چلتے ہوئے بہت بہت شکریہ ادا کرتے ہیں، اور یقین دلاتے ہیں کہ آئندہ سال ہوٹل میں قیام فرمائیں گے۔

اگلے سال پھر آتے ہیں۔ مہمان بن کر ہوٹل میں جگہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہماری قسمت میں وہی گردش لیل و نہار!

مہمان کی تیسری قسم بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ یہ اپنے آپ کو بیمار کہتے ہیں۔ کسی ڈاکٹر کے مشورے سے صحت کی تلاش میں کوئٹہ آتے ہیں۔ اور اس وقت تک قیام کرتے ہیں جب تک میزبان میں ذرا سی بھی سکت باقی رہتی ہے۔ اس کی موت کا انتظار غالباً اس لئے نہیں کرتے کہ آئندہ سال کہاں دوسرے میزبان کو تلاش کرتے پھریں گے اور بیکار پریشان ہوں گے۔ یہ آتے ہیں اور اس طرح آتے ہیں کہ تمام گھر کو ہسپتال بنا دیتے ہیں اور گھر والوں کو مریض! اور خدا کی شان خود ڈاکٹر بن بیٹھتے ہیں۔ یہ نہ کرو۔ وہ مت کرو۔ وہ نہ کرو۔ یہ مت کرو۔ یہ صرف نہ اور مت جانتے ہیں اور ہر وقت ان کی گردان کرتے رہتے ہیں نفی کی دنیا میں رہتے ہیں۔ نصیحتیں تو سب ہی مہمان کرتے ہیں لیکن اس قسم کے مہمان تو نصیحتوں کے سوا اور کچھ کرتے ہی نہیں ہر وقت نصیحتیں، ہر کسی کو نصیحتیں۔ اور پھر ہر موقع پر اپنی مثال۔ "دیکھئے آپ رات کو اتنی دیر نہ پڑھا لکھا کیجئے۔ ورنہ میری طرح آپ کو بھی عینک لگانی پڑے گی۔" اب ان حضرت کو کون بتلائے کہ پڑھ لکھ کون مسخرا رہا تھا۔ حساب لگا رہے تھے کہ اس مہینے گزر کس طرح ہو گی۔ "آپ کا یہ شاقب تو ٹھیک ہے۔ لیکن یہ جاآلب بہت نٹ کھٹ ہے معلوم ہوتا ہے کہ پڑھتا پڑھاتا کچھ نہیں۔ اور دیکھئے، آج پوچھ رہا تھا، کب جائیں گے آپ؟" جی چاہا کہہ دو بچہ ہے، جذبات پر قابو نہیں رکھ سکا، دل کی بات زبان پر آ گئی۔ لیکن اگر اتنی ہمت ہوتی تو پھر یہ مہمان آتے ہی کیوں؟ "آپ کی شہلا کا تلفظ بہت غلط ہے۔ ذرا خیال رکھئے۔" ہنسی ضبط کرنے کی کوشش میں منہ دوسری طرف کر لیا۔ لیکن ادھر بھی ہنسی - بلکہ ہنسی کا دورہ۔ اور بچے پوچھ رہے ہیں۔ "امی کیا بات ہوئی؟ ہنس کیوں رہی ہو امی؟" اب کیا بتائیں کہ ہنس نہیں رہے! اپنی قسمت کو رو رہے ہیں۔ کاش ہماری قسمت بھی ایسی ہوتی کہ کسی کے مہمان بن سکتے!

اس مرتبہ ایک نئے قسم کے مہمان سے واسطہ پڑا۔ زندگی

میں بہت سی تمنائیں ہیں۔ بہرحال ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ خدا اس قسم کے مہمان سے سابقہ نہ ڈالے! دوپہر کا وقت تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ کھولا۔ تو ایک صاحب عجیب غریب حلیہ میں موجود، سر پر تکلوں کی ٹوپی، قمیص اور پاجامہ بوسیدہ، جوتے ندارد۔ "آپ نے مجھے پہچانا" — "معاف کیجئے نہیں"۔ "دیکھئے میں نے آپ کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا"۔ "شکریہ" "تو کیا آپ مجھے حقیقتاً نہیں پہچانے؟" "میں صرف ضرورتاً جھوٹ بولتا ہوں۔ ہمیشہ نہیں"۔ "دیکھئے آپ سے بہاولپور میں ملاقات ہوئی تھی"۔ اور اس کے بعد انہوں نے رشتہ جو بتایا تو میں صرف اتنا سمجھا کہ اگر حضرت نوحؑ تک نہیں تو حضرت آدمؑ تک ہمارا ان کا شجرہ نسب ضرور مل جاتا ہوگا۔ اور پھر اس رشتہ پر "آپا" کی تصدیق چاہی۔ "آپا" ہم سے بھی زیادہ جاہل۔ لیکن صاحب وہ مہمان ہی کیا جو ٹل جائے۔ آئے اور اس طرح آئے کہ کپڑے اور جیب خرچ تک ہمارے ذمے! فرمانے لگے۔ "جیکب آباد کے اسٹیشن پر گاڑی تبدیل کرنی تھی (نہ معلوم کونسی گاڑی؟) گاڑی کے انتظار میں آنکھ لگ گئی۔ کھلی تو دیکھا کہ بستر اور سوٹ کیس سب غائب! بمشکل تمام یہاں پہنچا۔ بہاولپور بھائی کو بھی خط لکھ دیا ہے۔ جلد ہی وہاں سے منی آرڈر آجائے گا۔ بس دو ایک دن کی بات ہے"۔

لیکن یہ منی آرڈر نہ آنا تھا نہ آیا۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے یہ حضرت شاعر بھی تھے۔ شعر کے معاملے میں میرا ذوق اس قدر بلند ہے کہ میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ تک کے اشعار بغیر تصحیح کے نہیں پڑھتا۔ اور پھر پڑھتا اس انداز سے ہوں کہ آپ کیا کوئی شخص بھی اس پر شعر ہونے کا گمان تک نہیں کرسکتا! میرے ایک دوست ہیں۔ انہوں نے ایک مرتبہ ہاتھ جوڑ کر مجھ سے استدعا کی تھی کہ خدا کے لئے میں شعر نہ پڑھا کروں۔ وگرنہ وہ خودکشی پر مجبور ہوجائیں گے! خون ناحق کا میں قائل نہیں۔ اس لئے اب شعر نہیں پڑھتا، صرف کہتا ہوں۔ ہاں تو یہ صاحب شاعر بھی تھے۔ اور سنانے کے مرض میں گرفتار۔ اور سناتے تھے گا گا کر۔ شاعری اور اس پر موسیقی۔ کس کس کی تعریف کی جائے۔ انشا کو تو عظیم بیگ سے صرف یہ شکایت تھی کہ۔ "بحر رجز میں ڈال کے بحر رمل چلے" — لیکن یہاں تو یہ حال تھا کہ۔ بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے۔ سنئے اور سر دھنئے۔ ان حضرت کا نہیں اپنا۔ ان کے صرف دو کام تھے! شعر سنانا اور نصیحتیں کرنا۔ نہیں صاحب! ایک اور بھی کام تھا۔ منی آرڈر کا انتظار! اور چونکہ منی آرڈر آہی نہ چکتا تھا، اس لئے تار بھیجنے کے لئے روپے بھی دینے پڑتے تھے۔ نجات کی صرف ایک صورت تھی۔ کہ کسی بہانے اسٹیشن پر لے جاکر بہاولپور کا ٹکٹ ان کے حوالے کیا جائے اور جب تک گاڑی روانہ نہ ہوجائے، پلیٹ فارم سے نہ ہٹا جائے۔ بہرحال خدا خدا کرکے وہ مہمان صاحب تشریف لے گئے۔ اس کے بعد کئی مرتبہ وہ مختلف سڑکوں پر نظر پڑے۔ لیکن اس ڈر سے کہ کہیں وہ مجھے دیکھ نہ لیں میں نے انہیں دیکھا ہی نہیں۔ جان بچی لاکھوں پائے۔

اب پھر گرمیاں آرہی ہیں۔ دیکھئے اس مرتبہ کیا گزرتی ہے۔ گزرنی کیا ہے، جب تک مہمان نہیں گزر جاتے ہمیں خوب معلوم ہے کہ ہم پر کیا گزرے گی —

مرد ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر! ✦

ہڑپے کا کتبہ

مجید امجد

ہڑپے سے . زمانۂ قبل از تاریخ کے جو نوادر کھدائی
میں دریافت ہوئے ہیں ان میں ایسے کتبے بھی ہیں جن پر رقم
شدہ پُراسرار تحریریں اور تصویریں آج تک پڑھی نہیں جا سکیں۔
حال ہی میں چند کوششیں جو اس بارے میں ہوئی ہیں،
ان کو قطعی نہیں کہا جا سکتا۔ چند کتبوں پر بیلوں کی تصویریں
ہیں جن کے معانی فکرِ شاعر پر یوں اجاگر ہوتے ہیں :

بہتی راوی! تیرے تٹ پر
کھیت اور پھول اور پھل !
تین ہزار برس بوڑھی تہذیبوں کی چھل بل،
دو بیلوں کی جیوٹ جوڑی،
اک ہالی، اک ہل !

سینۂ سنگ میں بسنے والے خداؤں کا فرمان :
"مٹی کاٹے، مٹی چاٹے،
ہل کی انی کا مان !
آگ میں جلتا پنجر۔ ہالی۔ کاہے کو انسان!"

کوئی مٹائے اس کے ماتھے سے یہ دکھوں کی ریکھ !
ہل کو کھینچنے والے جنوروں ایسے اس کے لیکھ،
تپتی دھوپ میں تین بیل ہیں۔ تین بیل ہیں۔ دیکھ!

لہ ہاری کا ماضی خواہ کچھ بھی رہا ہو، اس کا حال اور مستقبل
"انقلابِ نو" کی بدولت اتنا ہی درخشاں ہے جتنا اس کا
ماضی تاریک تھا۔ (مدیر)

براق شاہیں

شیر افضل جعفری

یہ شاہیں کلب کے پری چال کوتل
یہ جن پہ ہوں قربان غزلوں کے چھل بل
یہ براق خمرے، یہ مصری کی ڈلیاں
یہ نقرے فرشتے، یہ طوبےٰ کی پھلیاں
یہ سیماب زادے، یہ لرزاں بتاشے
یہ گورے نچھے، یہ ابرق تراشے
یہ چمکیلے چمکیلے سلمہ ستارے
یہ جلووں کے ٹکڑے یہ بجلی کے پارے
یہ ناچیں تو موروں کو بھی رشک آئے
یہ ٹہلیں تو بادِ صبا غارکھائے
یہ دوڑیں تو دوڑ میں ہار جائے
یہ ابھریں تو قدموں تلے چاند آئے
یہ جوبن کی جھیلوں کے چوپائے نکلے
انہیں دیکھ کر ہون سیلانے بھی گھلے
قطاران کی جیسے ہو گوٹا کناری
حسیں، بھاؤنی، دلربا اور پیاری
یہ نخریلے، گھڑ دوڑ میں دندنائیں
تو بانکے ہرن چوکڑی بھول جائیں
کبھی موج میں آکے یہ ہنہنائیں
تو نیزے بھی ساتھ ان کے ملہار گائیں
خمیں گردنیں، ریشمیں گانیاں ہیں
فدا ان پہ شیروں کی سلطانیاں ہیں

لہ "شاہین حیدری کلب" سرگودھا میں حسین و براق
گھوڑوں کی انجمن ہے۔ "براق شاہین" اسی کے سفید براق اور
"شیر مست" نقروں کی طرف اشارہ ہے۔ "شیر مست" وہ
جانور ہوتا ہے جس نے ماں کا پورا دودھ پیا ہو۔ (مدیر)

غزل

ضمیر اظہر

ایسا بھی کوئی دل ہے کہ قید الم نہیں
اِس دامِ رنگ رنگ سے امکانِ رم نہیں

جلتا ہے سارا جسم تفکر کی آنچ سے
سوزِ حیات سوزِ محبت سے کم نہیں

قربِ ستم سے یوں ہوئے سارے ستم عزیز
میرے لئے جہاں میں کوئی اب ستم نہیں

امید و یاس و بیم کی منزل عجیب ہے
رُکنے کی تاب ہی نہیں چلنے کا دم نہیں

آسان ہیں ابھی مری گُنجان مشکلیں
ان گیسوؤں کے ان میں ابھی پیچ و خم نہیں

یوں کھو گئے غبار میں چُپ چاپ کارواں
جیسے کہ ان کا کوئی بھی نقشِ قدم نہیں

راضی رضائے یار پہ ہر حال میں ہیں ہم
اک گونہ بیخودی ہے غمِ عیش و غم نہیں

اظہرؔ حیات و موت کا رشتہ عجیب ہے
اب تک یہ ایک راز ہے ہم ہیں کہ ہم نہیں

قمر جمیل

طائرِ جاں کی خبر لاتی ہے
کوئی آواز اگر آتی ہے

جانے کس سمت ہوا کی زنجیر
کھینچ کر مجھکو لئے جاتی ہے

قالبِ جاں میں زمانے کی بہار
آئینہ دیکھ کے شرماتی ہے

شام ہوتی ہے تو پھر کاہشِ جاں
رات کے روپ میں لہراتی ہے

کیسا عالم ہے کہ تنہائی بھی
در و دیوار سے ٹکراتی ہے

کائنات اپنے خدا کے مانند
ایک ذرے میں سمٹ آتی ہے

ہمنشیں میرے قریب اور نہ آ
یہ کلی سائے سے کمھلاتی ہے

کبھی ہم پر بھی جمیلؔ آئی تھی
وہ قیامت جو گذر جاتی ہے

غزل

احمد ظفر

چاند نے مجھ سے چپکے چپکے کچھ تو کہا ہے
رات نے جیسے پیار سے تیرا نام لیا ہے

تو اک بھولی بسری بات ہے اس دنیا میں
وقت نے جانے مجھ سے کیا کیا چھین لیا ہے

جب بھی تیرے درد نے دل میں کروٹ لی ہے
میں یہ سمجھا شاید کوئی پھول کھلا ہے

پہلے چپ کی آگ میں دل نے جلنا سیکھا
اب جو بات کروں تو میرا دل جلتا ہے

سنگ اٹھاتے ہیں کیوں مجھ پر دنیا والے
میرا دل تو جنبشِ لب سے ٹوٹ گیا ہے

میرا اندھا پن بھی میرے کام نہ آیا
دل کی آنکھوں نے وہ منظر دیکھ لیا ہے

میرے زخم تو رفتہ رفتہ بھر جائیں گے
تیری سوچ کو جانے کیا انداز ملا ہے

دل کو ظفرؔ یہ کس کی آہٹ سی آئی ہے
ویرانے میں جیسے کوئی ساز چھڑا ہے

شیدا گجراتی

گلوں کے لب پہ تبسم کا نام بھی تو نہیں
بھرے چمن میں کوئی خوش خرام بھی تو نہیں

کسے خبر کہ دلِ مضطرب پہ کیا گزری
نگاہِ دوست کا مفہوم عام بھی تو نہیں

نئے جہاں کے تقاضے نئے سہی لیکن
برائے دل کوئی تازہ پیام بھی تو نہیں

ہم اپنی تشنگیٔ بیکراں کہاں لے جائیں
بقدرِ شوق و طلب اہتمام بھی تو نہیں

حدیثِ درد کہیں بھی تو کیا کہیں ان سے
بہت دنوں سے پیام و سلام بھی تو نہیں

بہ ایں خلوصِ دل و جاں، بہ ایں جنونِ وفا
پیامِ شوق، طرب کا پیام بھی تو نہیں

بقدرِ لذتِ سوز و گداز دل کے لئے
متاعِ درد متاعِ دوام بھی تو نہیں

حیات محرمِ اسرارِ عشق کیا ہو گی
دل و نگاہ میں وہ ربطِ تام بھی تو نہیں

جنوں شریکِ غمِ کائنات ہے شیداؔ
خرد حریفِ غمِ صبح و شام بھی تو نہیں

غزل

مشتاق مبارک

وہ بیقرار نہیں جلوۂ قمر کے لئے
ترس رہے تھے جو رعنائی سحر کے لئے

نہ زلفِ شام نہ رنگینیٔ سحر کے لئے
تڑپ رہا ہوں ترے حسنِ معتبر کے لئے

بہ فیضِ عشق ہوں اب اس مقام پر کہ جہاں
قدم قدم پہ ہیں رنگینیاں نظر کے لئے

دل و نگاہ نے کیا کیا فریب کھائے ہیں
رہِ حیات میں اک خضرِ دیدہ ور کے لئے

دم پیچ و خم بھی ہمارا نصیب ہو کے رہے
جو وقف تھے کبھی اس زلفِ منتشر کے لئے

خود اپنی ذات کا عرفاں نہ ہو سکا اس کو
تڑپ رہا ہے جو تسخیرِ بحر و بر کے لئے

ہر ایک منظرِ بزمِ جہاں ہے خوب مگر
خلش ہے دل میں بدستور خوب تر کے لئے

نہ جانے دیدہ و دل فرشِ راہ ہیں کب سے
کسی کی ایک نظر، صرف اک نظر کے لئے

یہ التفات کہ ہر چند مختصر ہی سہی
یہ التفات بھی کافی ہے عمر بھر کے لئے

تو اپنے دل کی بصیرت کو رائیگاں نہ سمجھ
یہی تو آئینہ ہے فرقِ خیر و شر کے لئے

ہماری لغزشِ پا کس قدر مبارک ہے
کہ راہ ہو گئی آسان راہبر کے لئے

جگن ناتھ آزاد

باغباں کا شکوہ اب کیا کریں زمانے سے
ہم کہ خود نکل آئے اپنے آشیانے سے

کس طرح بیاں ہو گی حالِ دل سنانے سے
جو گذر گئی دل پر تیرے مسکرانے سے

حیف اُس مسافر پر جس کو یہ نہیں معلوم
کس نے اُس کو لوٹا ہے اور کس بہانے سے

یہ تو ناصحِ مشفق آگ ہے محبّت کی
یہ تو اور بھڑکے گی اس طرح بجھانے سے

قطعہ

وقت کے تقاضے سے ہم چمن کے شیدائی
آشیاں کو چھوڑ آئے گرچہ اک زمانے سے
مانگتا ہے دل اب تک خیر آشیانے کی
اتنا ربط ہے باقی دل کو آشیانے سے

★

فن:

دورِ انقلاب کا مرقع نگار - صادقین

حق نواز حیات

اس میں کوئی شک نہیں کہ دورِ انقلاب کی فضا ادب و فن کیلئے بہت خوشگوار ثابت ہوئی ہے۔ وہ گھٹا گھٹا ماحول جس نے ہم سب کے اعصاب اور دل و دماغ پر بڑا بھاری دباؤ ڈال رکھا تھا، ایسے اٹھا ہے کہ ہمیں اپنے جسم و جاں میں یکایک فرحت بخش تازگی کا احساس ہوتا ہے جیسے یک بیک کتنے ہی روزن کھل گئے ہوں۔ اور ان کے ذریعہ دل و جاں کو بشاشت بخشنے والی ہوا اور پیاری پیاری سہانی سی روشنی اندر آگئی ہو اور ہماری رگ رگ اور ریشے ریشے میں رس بس گئی ہو۔

یہ کیف زا احساس ایک دو لوگوں تک ہی محدود نہیں بلکہ سب میں علی العموم نظر آتا ہے۔ اور پھر شاعروں، ادیبوں، فنکاروں کا تو کہنا ہی کیا۔ وہ تو عام انسانوں سے کہیں زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ وہ زیادہ شدت سے گرد و پیش کی فضا میں خفیف سی خفیف تبدیلی کو بھی آناً فاناً محسوس کر لیتے ہیں اور اس کی طرف شدت و تیزی کے ساتھ ردِ عمل بھی کرتے ہیں۔

جب ماحول میں گھٹن ہی گھٹن ہو تو طبیعتوں میں ترنگ کیسے پیدا ہو اور ذہن کیسے کشادہ ہوں! یہی حادثہ تو تھا جس سے ہمارے شاعر، مصور، گویّا، افسانہ نویس "مدتوں دوچار رہے" جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے فیضان کے سوتے بند ہو گئے۔ اہلِ فن اپنے اپنے گوشۂ خلوت میں گم ہو گئے اور انہوں نے اپنے ارد گرد کی دنیا سے بہت کم سروکار رکھا۔ آخر ان کے لئے اس بیرونی دنیا میں ایسی کشش ہی کیا تھی کہ وہ اس کی طرف خوشی سے اعتنا کرتے اور کوئی شاعر اپنا قلم یا مصور اپنا موقلم ہاتھ میں لے کر زندگی کے کسی اہم واقعہ یا کسی مایۂ ناز ہستی کی تصویر کھینچتا؟

لیکن جونہی دورِ انقلاب طلوع ہوا، ساری قوم کے ساتھ اہلِ فن کی دنیا بھی بدل گئی اور یہ کیفیت ہو گئی کہ

پھر بہار آئی قفس کا در کھلا

اس نئی بہار کی دل خوش کن فضا میں سب اپنے ماحول میں دلچسپی لینے لگے۔ فنکاروں نے بھی محسوس کیا کہ:

خلوت کی گھڑی گذری جلوت کی گھڑی آئی
چھٹنے کو ہے بجلی سے دامانِ سحاب آخر

اور فی الحقیقت بجلی سے دامانِ سحاب چھوٹ گیا۔ اہلِ فن نے دورِ انقلاب کی عکاسی میں دلچسپی لینا شروع کی اور ایک جواں سال مصور صادقین نے تو بڑے وسیع کینوس پر اس کے بعض اہم پہلوؤں کو رنگ در وغن کے روپ میں پیش کیا اور اس اہتمام سے کہ ان پر حقیقت کی بجائے شوخ و رنگین خوابوں کا گمان ہو۔ اس کامیابی کا سہرا جہاں مصور کے سر ہے وہاں دورِ انقلاب کی کارفرمائیوں کو بھی کچھ کم دخل نہیں جو فنکار کے ذوق و شوق کے لئے تازیانہ ثابت ہوئیں۔ اور ایک صادقین ہی نہیں کتنے ہی باکمال اور بھی ہیں ۔ مصور، مغنّی، اداکار۔ جو اپنے اپنے طور پر نئی فضا سے متاثر ہو کر فن کی دنیا میں ایک نئی ہماہمی ایک نئی ہلچل پیدا کر رہے ہیں۔ اسقدر کہ پچھلے دنوں جو آرٹ سنیٹر کراچی میں قائم کیا گیا تھا، اس کی عمارت ابھی سے

دامانِ نظر تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار
گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

کی مصداق معلوم ہوتی ہے۔

صادقین کوئی ایسا مصور نہیں جس نے ابھی ابھی سر ابھارا ہو۔ وہ ایک مدت سے مصوری کر رہا ہے اور اپنے ہم چشموں میں کافی امتیاز حاصل کر چکا ہے۔ دیکھنے میں شاید اس تیس سالہ نوجوان

میں کوئی بڑی بات نظر نہ آئے۔ ایک چھوٹے قد کا دھان پان، چپ چاپ، سیدھا سادا شخص شاید آپ اسے لڑکا ہی خیال کریں۔ لیکن اس کی مصوری جیسے مشکل فن میں مہارت اتنی ہی زیادہ ہے۔ اور پھر اس کا دوسروں سے مختلف اپنا ہی ایک انداز ہے جو خاصا نمایاں اور واضح بھی ہے۔ وہ جس شور و مستی سے اپنے کام میں منہمک ہوتا ہے، وہ اس کے قد و قامت اور مریضانہ وضع کو دیکھتے ہوئے حیرت انگیز ہے۔ اسے فن کے ساتھ وہی لگن ہے جو ایک حساس اور پرخلوص فن کار کو ہونی چاہیئے۔ اور کچھ عجب نہیں کہ بعض مشاہیر کی طرح جنہیں قدرت نے عمدہ صحت سے محروم رکھا تھا، عمر گریزپا کے احساس نے اسے اور بھی اہمیت کے ساتھ سرگرم کار کر دیا ہو۔ بہر حال یہ محض قیاسات ہیں۔ حقیقت صرف یہ ہے کہ اس نوعمر نقاش نے تھوڑی ہی مدت میں ایسی اعلیٰ صلاحیتوں کا ثبوت دیا ہے جن کی توقع بالعموم زیادہ پختہ عمر کے ارباب فن سے کی جاتی ہے۔ اس نے آرٹ کے ایسے متنوع اور اہم نمونے پیش کیے ہیں جو پاکستانی مصوروں کی تخلیقات میں نمایاں درجہ رکھتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ اچھی شراب مدتوں میں جاکر تیز ہوتی ہے۔ اسی طرح اچھا فن کار بھی برسوں کے ریاض کے بعد فنی الجملہ تکنیکی مہارت پیدا کرتا ہے اور صادقین کو ابھی عمر کی کتنی بہاریں دیکھنا نصیب ہوئی ہیں کہ اس سے غیر معمولی مشاقی کی توقع کی جا سکے۔ تاہم اتنا ضرور ہے کہ اس اعتبار سے جو بھی کمی ہو اسے یہ ہونہار مصور اپنے ذوق و شوق، اپنے والہانہ پن سے پورا کر لیتا ہے۔ اور یوں فن کے تقاضے بڑی حد تک پورے ہو جاتے ہیں۔

صادقین ایک بہت تیز مصور ہے۔ بے حد زود قلم جتنی تیزی سے اس کا ذہن سوچتا ہے اتنی ہی تیزی سے وہ نقوش پر نقوش بنائے جاتا ہے۔ اور ہم اس کی تیز دستی سے حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اسے تصویریں بنانے میں زیادہ کاوش نہیں کرنا پڑتی۔ اس کا موقلم ہوا کی طرح سبک ہے اور اسی کی طرح سبک سیر بھی۔ چند تیز تیز جنبشیں اور نقش تکمیل کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور سال سوا سال سے تو جیسے دورِ انقلاب نے اس کے جسم ناتواں میں نئی روح پھونک دی ہے۔ وہ دھڑا دھڑ تصویریں کھینچے چلا جاتا ہے۔ جن سے ایک نہیں کئی نگار خانے آراستہ ہو سکیں۔

اگر دورِ انقلاب کے کارناموں میں ایک یہ بھی شمار کیا جائے کہ اس نے اس شوخ فکر و تیز دست نقاش کو اس کے بعض کارہائے نمایاں کو اجاگر کرنے کی تحریک دلائی تو بے جا نہیں۔ اور یہ دیکھتے ہوئے کہ انقلاب اپنے جلو میں کیا کچھ لایا ہے۔ اور ملک و ملت اس باب میں افواجِ پاکستان کے کس قدر ممنون ہیں تو یہ کچھ محلِ تعجب بھی نہیں۔ درحقیقت یہ ساری قوم کا جذبۂ تشکر ہی ہے جس نے اس کے ایک حساس فرد کے تاثرات کی راہ سے تین نقوش میں راہ پائی ہے۔ جن کا اس کے دیگر نقوش کے برعکس یہاں خصوصیت سے ذکر لازم ہے۔ کیونکہ صدر پاکستان کا انتخاب افواجِ پاکستان کے حسنِ کارکردگی اور مقبولیت پر پوری طرح مہر تصدیق ثبت کر دیتا ہے۔

ان نقوش کی نوعیت دو وجہ سے منفرد ہے۔ اول ان کا پیرہن کاغذی نہیں۔ اسی لیے یہ مصور کی شوخیٔ تحریر یا اپنی ناپائداری کے فریادی بھی نہیں۔ نقاش نے ان میں سے دو کے لیے ٹھوس گتے کی دیوار نما زمین تلاش کی ہے۔ اس لیے ان کا کینوس بھی بہت وسیع ہے اور یہ ناظر کے دیدہ و دل پر اتنا ہی کشادہ اثر بھی مرتب کرتے ہیں۔ دوسرے ان میں کچھ نئے طریقے برتے گئے ہیں جن سے نقاش کی اپج ظاہر ہوتی ہے اور وہ اعجازِ فکر بھی جو فن کار کو نادر حالات میں نادر تدابیر اختیار کرنے کی تحریک دلاتا ہے۔ جہاں تک زیر بحث نقوش کا تعلق ہے فن کاری کی بدیع الاسلوبی کے ساتھ ہی ساتھ ایجاد کی ندرت بھی نمایاں ہے۔

دورِ انقلاب سے پہلے ناجائز درآمد برآمد نے ہماری قومی زندگی میں کیا کچھ آشوب و ابتری پیدا نہیں کی۔ اس لئے انقلابی حکومت کا ایک مہتم بالشان کارنامہ یہ بھی تھا کہ اس نے اس فتنۂ عظیم کا سر کچل دیا۔ مصور کے ذہن نے اپنے دیگر ہم وطنوں کی طرح اس کارِ نمایاں کو پوری شدت سے محسوس کیا۔ چنانچہ صادقین نے ماری پور (کراچی) کی "سنٹرل ایکسائز اور لینڈ کسٹمز کلب" کے لئے ایک داستانی یا ڈرامائی قسم کی تصویر تیار کی ہے جس میں انقلاب سے پہلے اور انقلاب کے بعد کی صورتِ حال کو اجاگر کیا گیا ہے۔ بعض حلقوں میں ناجائز درآمد برآمد کرنے والوں کو "قابوچی" کہتے ہیں۔ اور ہمارے خیال میں یہ نام اس نقش کا پورا پورا حق ادا کرتا ہے۔

دراصل "اسمگلر" کی تصویریاں متعدد فنکاریوں میں سے ایک ہے

مزار حضرت سید احمد شہید رح

مزار حضرت سید شاہ اسماعیل شہیدرح (دہلوی)

پرانی بستی

مسجد : (حضرت سید احمد شہیدرح کی عارضی مستقر)

مشہد بالاکوٹ

برصغیر میں اسلامی نشاۃالثانیہ کے مفکر
و مجاہد شاہ اسماعیل شہیدرح (دہلوی)
اور حضرت سید احمد شہیدرح (رائے بریلوی)
کے مزارات

دریائے کنہار (جو بالا کوٹ کے وسط سے گذرتا ہے)

: ۱

: ۳

: ۲

: ۴

دیہی تعمیر و ترقی

۱- گھریلو صنعتوں کے گر

۲—تعلیم کا بڑھتا ہوا شوق

۳—اپنے گاؤں میں صفائی کا کام

۴—اچھی شہریت کا آغاز

جو مصادقین نے مذکورہ کلب کے لئے تیار کی ہیں۔ اور اس کے وسیع و عریض اور نہایت خوبصورتی سے آراستہ ہال کی زینت ہیں یہ تصویر مذکورہ محکمہ کی کارگذاریوں کو نہایت موثر و برجستہ پیرایہ میں پیش کرتی ہے۔ دائیں ہاتھ، عرض کی طرف، کشادہ دیوار پہ ۱۸۔۲۰ فٹ لمبا، سات آٹھ فٹ چوڑا پینل ہے۔ اور جب وہ اجلی چادر اٹھائی جاتی ہے جو اس کو گرد و غبار سے بچاتی ہے تو ناجائز درآمد برآمد کرنے والوں کی کارستانیوں سے پردہ اٹھتا ہے۔ اور تجریدی واقعیت تمثیل اور رنگ و روشن کی زبان میں، جیسے ہم کچھ تو فی الفور ہی سمجھ جاتے ہیں اور کچھ کے متعلق قیاس آرائیاں کرتے ہیں، سماج دشمن انسانوں کی "زیر زمین" کارروائیوں کا کچا چٹھا بھی سامنے آجاتا ہے اور اس کے مقابلہ میں لیدۂ بھلے مانس شہریوں کی آسودہ اور خوشحال زندگی بھی سامنے آجاتی ہے۔ یہ تصویر بھی مرکب ہے، مفرد نہیں۔ کئی الگ الگ کڑیوں کا سلسلہ جس کے متعلق یہاں چند جستہ جستہ اشارے ہی کئے جاسکتے ہیں۔

درمیانی حصہ یا نقش میں یہ بتایا گیا ہے کہ شیطنت کس طرح کھل کھیل رہی ہے۔ اسمگلر کا کالا پیسہ کس طرح برے کاموں پر ہی ضائع جاتا ہے۔ مالِ حرام بود بجائے حرام رفت! اس کے پیچھے شیطانوں کی لین ڈوری نظر آتی ہے۔ جن کے سروں پر سینگ ہی سینگ ہیں۔ کالے بھجنگے دیو، ایک کے پیچھے دوسرا، جو انسان کو برائی پر اکساتے ہیں۔ ناجائز طریقوں سے حاصل کی ہوئی دولت۔ نوٹ کے نوٹ، ہاتھ بڑھا کر کسی عصمت فروش عورت کو پیش کئے جارہے ہیں۔ نیچے تاش کے بکھرے ہوئے پتے بتا رہے ہیں کہ یہ ٹھکانہ جوا بولکا اڈہ ہے۔ اوپر سے شاید کوئی انسان کی خطاؤں اور لغزشوں پر رحم کھانے والی شفیق ہستی برائی کے اس افسوسناک منظر کو دیکھ رہی ہے۔ تجریدی آرٹ سے انسان نما شکلوں اور لباسوں کا اشتباہ پیدا کرنے میں بڑی حکمت سے کام لیا گیا ہے۔ اور ذہن کبھی ایک ترتیب پیدا کرتا ہے کبھی دوسری۔ پرے، دروازے کے پاس ملت کے نگہبان فوجی اور محکمہ اکسائز و کسٹم کے کارکن بھی دکھائی دیتے ہیں۔ جو ایسے قوم دشمن لوگوں کو کیفر کردار تک پہنچاتے ہیں۔ دائیں پہلو میں غالباً ایک اچھے شہری اور اس کے کنبے کی تصویر ہے۔ جو محنت و مشقت اور حلال کی کمائی پر تنگی ترشی سے گذر اوقات کرتا ہے۔ اور اس کی زندگی میں سکون و اطمینان کا دور دورہ ہے۔ صحن میں کبوتر دانہ چگ رہے ہیں، بچہ کھیل رہا ہے، لڑکی ہاتھ میں سیب لئے ہوئے ہے۔ اور اس طرح کی مطمئن فضا دوسری اشکال سے بھی جھلکتی ہے۔

دوسرے نقوش کی نوعیت اور بھی مختلف ہے۔ ان میں سے ایک "منگلا ڈیم پروجکٹ" کے لئے منگلا (مغربی پاکستان) میں بنایا گیا ہے۔ دیکھتے ہی ایک انوکھے رقص کا منظر دل و نظر پر چھا جاتا ہے۔ اور ہم خود بخود ترقی کا احساس کرنے لگ جاتے ہیں جس سے اس کو موسوم کیا گیا ہے۔

تیسرا نقش۔ اگر اسے نقش کہا جاسکے کیونکہ "ترقی" کی طرح اس میں بھی تراش خراش کی تکنیک برتی گئی ہے جس کی میں ابھی تشریح کروں گا، "سر دسنر کلب کراچی" کے لئے اس کے دارالمطالعہ میں تیار کیا گیا ہے۔ وہ طلسمی سے گھوڑے اور ان کے سوار، ان کے آگے بڑھنے کا انداز ہی بتا رہا ہے کہ یہ لوگ حدیث شریف اطلبوا العلم ولو کان بالصین کے مصداق چار دانگ عالم میں تلاش علم کے لئے رواں دواں ہیں۔ اور ان کی یہ تلاش ایک تلاش جاوداں ہے۔ گھوڑوں کے پاؤں اٹھانے کا طمطراق آمیز انداز ہی بتلائے دیتا ہے کہ وہ ہو بہو "تیز ترک گام زن" کی روح سے سرشار ہیں۔

شاید اس ضمن میں مذکورہ حدیث کا حوالہ محض ایک فقرہ یا زیب داستاں معلوم ہو لیکن غور کرنے پر اس سے کچھ وسیع تر قرائن بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اور ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ مصور محض مشرقی ہی نہیں بلکہ اس کا ذہن اسلامی روایات میں رچا ہوا ہے۔ جیسے تجریدی آرٹ کی شکل میں چغتائی کی روح سرایت کر گئی ہو۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کا تمثیلی اور علامتی انداز بھی۔

تلاش کا تصور رہبری، باساز و یراق، نیزہ بردار شہسواروں اور ان کے طلسمی حقیقی ہوائی گھوڑوں سے ظاہر کیا گیا ہے جیسے ان میں کچھ کچھ براق کی شان پرواز ہو۔ لہٰذا تلاش علم محض مجازی و دنیاوی علم ہی کی تلاش نہیں بلکہ ساوی علم کی تلاش بھی ہے۔ جیسے یہ صوفیائے کرام کی "طلب" ہو یعنی جامع ترین علم و عرفان اور الہیت کی تلاش۔ (منزل ماکبریاست) گھوڑوں کے آگے ہاتھ بڑھا کر اٹھائی ہوئی بڑی کمعب قسم کی کتاب ہے۔ آپ اسے کتاب علم کہہ لیجئے یا قرآن مجید۔

کیونکہ اس میں معارف کونین پنہاں ہیں اور اسی کی روشنی میں انسان کی تلاش علم جہد بہ جہد اور دور بہ دور آگے بڑھتی ہے۔ اور بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ آسمان کی بلندی پر کوئی سری و تمثیلی شکل کلید زر پیش کر رہا ہے۔ یہ شاید آسمان کی کلید ہے یا تمام علوم و اسرار کی۔ اسکی ہر طرح توجیہ کی جا سکتی ہے۔

اس اہتمام کے ساتھ کچھ عجب نہیں کہ یہ شہسوار کوئی معمولی شہسوار نہ ہوں بلکہ ادبلئے قدیم کے مرغوب پیرایہ بیان میں "غازیان بیشۂ حکمت" اور "مجاہدین بادیۂ عرفاں" ہوں۔ جو ذوق جہاد میں "ملت قلعہ افلاک یا اسرار پر حملہ کناں ہوں"۔ ایسے فارسان عرصۂ شہود و وجود جو مکاں سے گذر کر لا مکاں کی حدود تک پہنچنے کے لئے کوشاں ہوں۔ ان کی غازیانہ شان ان کے تیر کشا دست کے علاوہ مضبوطی و اولوالعزمی سے تولے ہوئے نیزوں سے بھی ظاہر ہے۔ تصویر سکونی نہیں، حرکی ہے۔ ایک مسلسل حرکت کی آئینہ دار۔ اس تلاش مسلسل میں انسان کو ہر لحہ ہوشیار اور متحرک رہنا پڑتا ہے۔ اسلئے تیروں سے یوں ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اب چھوٹنے کے چھوٹے اور انہوں نے اپنے صید کو جا لیا۔ کیسا صید؟۔ یہ نہ تصویر میں واضح ہے اور نہ ایسا ہونا ہی چاہیئے۔ کیونکہ عشق کی طرح علم کی کون انتہا لایا؟ کائنات کا راز تو ہمیشہ راز ہی رہے گا اور انسان اس کی تلاش میں سرگرم۔ براؤننگ اور اقبال کے تصور کے مطابق۔ تھم گئی جس دم تڑپ سیماب سیم خام ہے۔ اس لئے تیر و سناں، دونوں ہتیاروں کا رخ ایک پُر اسرار شخصیت کی طرف نظر آتا ہے جو کہیں دھندلکوں میں روپوش ہے۔ اس گوشہ میں جہاں کلید زر کسی مرغ ہوائی کے پنجے میں نظر آتی ہے۔ یہ کلید کا تصور بھی قدامت کا طلسمی انداز لئے ہوئے ہے کیونکہ اس کا تذکرہ مشرق و مغرب کی باستانی داستانوں میں بار بار نظر آتا ہے۔ اور سری اہمیت رکھتا ہے۔

ظاہر ہے کہ رہرو راہ طلب کی جد وجہد کبھی ختم نہیں ہوتی۔ ایک مقام طے ہوا تو اس کی جگہ دوسرا موجود ہے۔ ایک حریف پنجہ فگن زیر ہوا تو اس کی جگہ دوسرا تیار ہے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

یہی وجہ ہے کہ دور دائیں کونے میں ایک فاختہ کا نقش دکھائی دیتا ہے۔ جو سکون کی علامت ہے فرض کیجیے علم کی راہ میں سیارہ بہ سیارہ پرواز کرنے والا انسان کسی وقت چاند تک پہنچ جائے۔ پھر بھی اس کا سفر ختم نہیں ہوگا۔ کیونکہ "ان ستاروں کے پرے اور بھی دنیائیں ہیں" نامعلوم! اور انہیں کی طرف انسان کی سعی تلاش کا رخ ہے۔ تصویر میں پرواز کرنے والوں کو چاند سے گذرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ کیونکہ انسان اسپوٹنک کے ذریعہ چاند تک پہنچ چکا ہے اور یوں اس نقش کی تاریخ بھی متعین ہو جاتی ہے۔ گویا ایلیٹ کے الفاظ میں مصور کو پورا پورا "معاصرانہ شعور" حاصل ہے۔ اور اس نے قدیم روایات اور جدید حقائق و مشاہدات کو آپس میں آمیز کر کے ایک خالصتہ جدید شاہکار تخلیق کیا ہے۔ سرسیجا یہ نقش اسی دور ہی کی پیداوار ہے۔ اور بالکل دائیں طرف جو اٹھی وضع کا ڈیزائن ہے وہ اس کی مزید تصدیق کرتا ہے۔ جیسے یہ ایک یادگار تاریخی مہر ہے۔ اور وہ مشعل جو پہلے سوار نے دایاں ہاتھ آگے بڑھا کر اٹھائی ہوئی ہے، تلاش کی نوعیت اور خود ذوق تلاش پر روشنی ڈالتی ہے۔ وَسَخَّرَ لَكُمْ فِی اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ کی مفصل تشریح۔

ان امور سے فکر وخیال کے دیگر متلازم سلسلے خود بخود ابھرتے چلے آتے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ہمارے حکیم ملت علامہ اقبالؒ نے زمان کے متعلق کیا کچھ کہا ہے۔ لاتسبوا الدھر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کی حدیث مشہور ہے۔ کیونکہ اسلامی تصور کے مطابق خدا خود دھر ہے۔ اسی تصور سے کام لیتے ہوئے گھوڑوں کے چہرے گھڑیال جیسے بنائے گئے ہیں۔ اور "مسلسل حرکت زماں" کا نقش پیش کرتے ہیں۔ اور انسان خود کیا ہے؟ "شہسوار اشہب دوراں"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصور کا کاسلامی کے ساتھ ہی تخیلات اقبال میں کسقدر گہرا ڈوبا ہوا ہے۔

کبھی کبھی فن کاروں کی ذہنی پرواز حیرت انگیز طور پر ایک ہی مقام پر جا نکلتی ہے۔ ڈاکٹر خالد کی نظم "راہ دیکھی نہیں" ہو بہو اسی تصویر کا لفظی روپ معلوم ہوتی ہے یا پھر صادقین کا نقش اس نظم کا تصویری روپ:-

"راہ دیکھی نہیں اور دور ہے منزل میری
کوئی ساتھی نہیں، میں ہوں مری تنہائی ہے
دیکھتی ہے مجھے حیرانی سے تاروں کی نگاہ
دور، ان سے بھی کہیں دور مجھے جانا ہے

اس بلندی پہ اڑا جاتا ہے تو سبز میرا
کہکشاں گرد سی دیتی ہے دکھائی مجھ کو
رفعتِ عرش سے ملتا ہوا مبہم سا شرار
مری منزل ہے کہاں یہ کبھی سوچا ہی نہیں
اس کی فرصت ہی کسے دل میں مگر رہتا ہے
درد۔ وہ درد کہ ہے جس سے تمنا جیتا ب
چاند کچھ راہ مرے ساتھ ہوا تھا لیکن
رہ گیا دور کہیں ہار کے ہمت اپنی
زہرہ کہنے لگی، اے بزم فلک کے قاصد
زرد رو پہلی ہی منزل میں ہوا تو کیونکر
جب کہ وہ خاکیٔ بے مایہ بڑھے جاتا ہے
پست ہر ایک بلندی کو کئے جاتا ہے"

اب "تراش خراش" کے بارے میں کچھ سنئے۔ بقول مصور یہ نادر تکنیک ایجاد کردہ ہے۔ اولاً تو نقاشی برتی گئی ہے یعنی روغن پر روغن تہ بر تہ، تو بہ تو۔ لیکن اس کے بعد ایک اور عمل شروع ہوتا ہے جو اسے نقاشی کی بجائے کچھ اور بنا دیتا ہے۔ روغن تراشی۔ کیونکہ نقاش کوئی تیز نکیلی دھار کی چیز لے کر بعض جگہوں پر رنگوں کو چھیل دیتا ہے۔ اس طرح جو رنگ وہ جس جگہ چاہتا ہے اس کو برآمد کر لیتا ہے۔ اور یوں لگتا ہے جیسے نقش رنگین پنسل سے بنائے گئے ہوں۔ جیسے رنگوں میں جان پڑ گئی ہو، وہ بول اٹھے ہوں۔ ان میں ایک جنبش، ایک حرکت، نظر آتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ چمک دمک، نزاکت اور بلور نما شفاف وضع بھی۔ دارالمطالعہ کی پرسکون فضا کے حسب حال اس نقش میں بھی ایک سکون آفریں کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ جیسے اس کے رنگ اور روغن چپکے ہی چپکے دل پر سکوت کا افسوں پھونک رہے ہوں۔

یہ نقش محض تجریدی نہیں۔ خطوط اور اشکال کا معجون مرکب ہے جو بسا اوقات روکھا پھیکا اور غیر خوش آیند معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ اس میں ایک غیر معمولی دلکشی نظر آتی ہے۔ یہ حقیقت، واقعیت اور تصوریت سب کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ اور سب کے مخصوص اثرات بھی۔ جو اس کی جامعیت کے ضامن ہیں۔ ان کے ذریعہ مصور کچھ کہنا چاہتا ہے جو اس کا اولیں مقصود ہے۔ اور تجریدی انداز میں بدلی ہوئی حقیقی اشکال سے اس کا شوقِ اظہار بھی ظاہر ہوتا ہے اور رسمی اظہار بھی۔

ظاہر ہے کہ جہاں فن کی نوعیت تمثیلی ہو وہاں ہر قسم کی توجیہوں اور تشریحوں کے لئے میدان کھلا ہوتا ہے۔ ہم چاہیں تو اس کو بہت وسیع معنی عطا کر دیں اور چاہیں تو دائرہ کو تنگ کرتے کرتے ایک ہی نقطہ پر لے آئیں۔ چونکہ یہ نقش ہمارے زمانے، یعنی دورِ انقلاب میں بنایا گیا ہے۔ اور وہ بھی "سرد سبز کلب" کے لئے، اس لئے بعض نے اس کو ہماری انقلابی حکومت کی مہم سے تعبیر کیا ہے جو اس نے شروع ہی سے تاریک عناصر کے خلاف جاری کر رکھی ہے۔ اور وہ بھی خالص اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جن کی علامت قرآن مجید ہے۔ اس لحاظ سے اس کا ہدف وہ پُراسرار ہستی ہے جو کلیدِ زر کو اپنے پنجے میں پکڑے ہوئے ہے۔ اور کچھ چمگادڑ جیسی بھیانک اور ڈراؤنی معلوم ہوتی ہے۔ جب یہ چیز تیر کا شکار ہو جائے گی تو انسان کی ترقی کے راستے کی تمام رکاوٹیں دور ہو جائیں گی۔ اس طرح تصویر کی معنویت محدود ہو جاتی ہے۔ اور مبصرانِ فن کی حیثیت سے ہمارے لئے یہی مناسب ہے کہ ہم توضیح و تشریح کا دروازہ کھلا رہنے دیں۔

جب ہم سفید گتے کی زمین پر کھنچے ہوئے نقش پر آخری بار مجموعی نظر ڈال کر رخصت ہوتے ہیں تو ہمارے ذہن میں ایک سوال باقی رہ جاتا ہے۔ کیا یہ سارے متفرق اجزا جو کچھ حقیقی ہیں اور کچھ تمثیلی، وحدت کے رشتے میں منسلک ہو گئے ہیں یا نہیں۔ اور وہ تناسب کے اصول پر بھی پورے اترتے ہیں یا نہیں؟ ممکن ہے بعض اذہان وحدت کی بجائے کثرت سے زیادہ متاثر ہوں اور ان کا یہ احساس بے جا بھی نہ ہو کیونکہ فن جب بھی مرکب اور پیچیدہ صورت اختیار کر لیتا ہے تو اس میں یہی سوال پیدا ہوتا ہے، رہا تناسب کا سوال تو اس وضع کی مصوری میں اس کو چنداں ضروری خیال نہیں کیا جاتا۔

بایں ہمہ یہ امر موجبِ تشفی ہے کہ ان نقوش کو دیکھنے کے بعد ہم غم ہائے روزگار سے بوجھل دل لے کر رخصت نہیں ہوتے بلکہ ہمیں اپنے اردگرد امید ہی امید اور شادمانی ہی شادمانی کی روشن فضا دکھائی دیتی ہے۔ ہمارا دل آغازِ بہار کی ہری ہری کونپل کی طرح لہرا اٹھتا ہے یا اس کلی کی طرح جھوم جھوم اٹھتا ہے جس میں یہ کیف آفریں رُت پہلے پہل اپنی روح پھونکتی ہے۔

سلاطین بنگال: ۸

خلجی دور

(۱۱۹۵ء تا ۱۲۲۷ء)

سید فیضی

مؤرخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ نویں صدی عیسوی میں بنگال نے عالم اسلام سے کافی ربط وضبط پیدا کر لیا تھا۔ اس تعلق کی باہمی کڑیاں اُن عرب تاجروں کے ہاتھوں استوار ہوئی تھیں جو سمندر کے ساحلی علاقوں کے ساتھ تجارتی مراسم رکھتے تھے۔ ان عرب تاجروں کے ساتھ کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے تھے جنہیں سیر و سیاحت کی زندگی عزیز تھی اور ان میں اکثریت صوفیا اور مبلغین حضرات کی ہوا کرتی تھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس قسم کے لوگوں نے عام طور پر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بود و باش اختیار کر لی تھی اور یہیں خلق خدا کی خدمت میں اپنی زندگی صرف کر ڈالی تھی۔ بنگال کی سرزمین اس لحاظ سے بہت اہمیت رکھتی ہے کہ دور اُفتادہ ہونے کے باوجود اسلامی اثر و نفوذ یہاں بہت تیزی سے سرایت کرتا رہا۔ یہ صوفیا حضرات کی جدوجہد کا نتیجہ تھا کہ بنگال میں شجرِ اسلام کی آبیاری ہوتی رہی اور سیاسی فتوحات کا دور شروع ہونے سے قبل ہی مسلمانوں کا تہذیب و تمدن یہاں جڑیں پکڑ چکا تھا۔ اصل میں ۱۲۰۰ء سے بنگال مسلمانوں کے قبضے میں آتا ہے لیکن تین سو سال کا یہ درمیانی عرصہ جس میں بنگال مسلمان تاجروں اور درویشوں کے لئے سیاحانہ آمد و رفت کے اسباب فراہم کرتا رہا۔ مذہب اسلام کی ترویج و اشاعت کا وہ شاندار دور ثابت ہوا ہے، جو آج بھی سرزمینِ بنگال کے لئے آئینہ ہے۔ غالباً یہی وہ تبلیغی جذبہ تھا جس کے تحت بنگال نے مسلمان حملہ آوروں کو اپنی جانب متوجہ کیا اور اس میں اوّلیت کا سہرا ایک ایسے غیر معروف شخص کے سر رہا جو ہندوستان سے دور سینکڑوں میل کی مسافت طے کرنے کے بعد تن تنہا یہاں پہنچا اور اپنی بہادری، عزم، جد و جہد اور مستقل مزاجی کی بدولت تاریخ میں ملک اختیار الدین محمد بختیار خلجی کے نام سے مشہور ہو کر فاتحِ بنگال کہلایا۔

سلطان محمود غزنوی کو آنکھیں بند کئے ابھی ڈیڑھ سو سال ہی گذرے تھے کہ اسلامی فتوحات کا رُکا ہوا سیلِ بے پناہ ایک دفعہ پھر بہہ نکلا اور دریائے سندھ کی مشرقی جانب رُخ کئے تیرھویں صدی عیسوی میں شمالی ہندوستان تک پھیل گیا۔ اس کی بڑھتی ہوئی موجیں اُسی وقت کناروں سے آشنا ہوئیں جب بختیار خلجی نے جنوبی بہار کے مشرقی علاقوں میں پرچمِ توحید کو بلند کر کے بھاگیرتی اور کراتویہ دریاؤں کے کنارے تک اپنی قلمرو میں شامل کر لئے۔ کون جانتا تھا کہ خلجی نسب کی یہ پژمردہ شاخ جو سرسبزی و شادابی کے نام کو ترس رہی تھی ایک دن خود چمنستانِ بنگال کی شگفتگی کا باعث بنے گی اور وہ محمد بختیار جو بے سر و سامانی کی حالت میں گھر سے غریب الدیار ہو کر نکلا تھا ایک دن سلطان الدنیا و الدین کے لقب گرانمایہ سے نوازا جائے گا لیکن وقت کی بوڑھی آنکھیں گواہ ہیں کہ ۱۱۹۵ء میں یہی غیرت مند انسان جب اپنے آبائی وطن گرم سیر کے علاقے پر حسرت و یاس کی نگاہیں ڈالتے ہوئے نکلا تو اس کے قدم خود بخود ہندوستان کی طرف اٹھنے لگے۔ تلاش معاش کی سرگردانی نے کچھ عرصہ بعد اسے شہاب الدین غوری کے لشکر میں پہنچا دیا لیکن قد و قامت کی غیر موزونی اور شکل و صورت کی بدنمائی اُسے افواجِ سلطانی میں کوئی جگہ نہ دلا سکی۔ دل برداشتہ ہو کر دلی کا رُخ کیا کہ شاید قطب الدین ایبک کے دربار میں گوہرِ مقصود ہاتھ آئے۔ یہاں بھی نصیب نے یاوری نہ کی ؎

ملک خدا تنگ نیست — پائے گدا لنگ نیست

کے مصداق سیر و سیاحت کرتا ہوا بدایوں پہنچ گیا۔ یہاں کے سپہ سالار ملک ہزبر الدین نے اس پر رحم کھا کر تنخواہ دار ملازم کی حیثیت سے پاس رکھ لیا۔ بختیار کی مطلق العنان طبیعت اس ننگ کو کب گوارا کر سکتی تھی۔ چٹانوں میں بسیرا کرنے والا شاہین قصرِ سلطانی کے گنبد کو نشیمن نہیں بنا سکتا تھا۔ چنانچہ یہاں سے علیحدہ ہو کر وہ اودھ پہنچا جہاں کے حاکم ملک حسام الدین نے اپنی فراستِ نظری سے بختیار کی قدر و قیمت کو بھانپ لیا اور اسے

موجودہ مرزاپور کی جنوب مشرقی جانب دو پرگنے بطور جاگیر عنایت کر کے اپنے صدر مقام سے کافی فاصلے پر متعین کر دیا۔ ان حدود میں ابھی تک کسی اسلامی لشکر کا گذر نہیں ہوا تھا اور ظاہر ہے کہ بختیار کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی جگہ موزوں نہ ہو سکتی تھی جہاں وہ اپنی طبیعت آزاد کے پوشیدہ جوہر دکھا سکتا۔

اپنی جاگیر کو محفوظ رکھنے کے خیال سے بختیار نے پہلے وہیں کے چھوٹے چھوٹے راجاؤں کو مطیع کیا اور بعد ازاں منیر اور بہار کے اضلاع پر دست درازی شروع کر دی۔ اس کی بڑھتی ہوئی جنگجویانہ ناموری نے بہت جلد ان خلجی اور ترکمان سپاہیوں کو اس کے پرچم تلے اکٹھا کر دیا جو طلب معاش کی خاطر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں آوارہ و پریشان پھرا کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ قطب الدین ایبک کے کانوں میں بھی بختیاری فتوحات کی خبریں پہنچ رہی تھیں۔ سلطنت دہلی بھی اس ابھرتے ہوئے ستارے کی چمک دمک کو دیکھ رہی تھی اور اسے یقین تھا کہ افق بنگال پر یہ ستارہ اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ چمک کر رہے گا۔ چنانچہ بختیار کی کوششوں کو سراہتے ہوئے اُسے خلعت و آفریں سے نوازا گیا۔ قرب و جوار کے علاقے تو پہلے ہی سے اُس کے زیر نگیں آ چکے تھے۔ اب اس کی فتح جو طبیعت نے اور بڑی وسعتوں کو ناپنا شروع کیا۔ حصار بہار نظروں میں تھا یہی طے پایا کہ اس سرزمین کفر کو نور ایمان سے جگمگایا جائے۔ بختیاری لشکر ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح بہار کی طرف بہنے لگا اور آن کی آن میں اس کے چاروں طرف پھیل گیا۔ بہار کے رہنے والے سر منڈے بھکشو مقابلے کی تاب نہ لا کر اس آتش حرب کا ایندھن بننے لگے اور اسلامی لشکر نے کسی روک ٹوک کے بغیر یہاں پرچم اسلام نصب کر دیا۔ بعد میں جب مسلمانوں کو اس بات کا علم ہوا کہ حصار بہار در اصل "وہار" یعنی مدرسہ تھا اور وہ بھکشو جنہیں لقمۂ شمشیر بنایا گیا تھا، یہاں کے طالب علم تھے تو انہیں بہت افسوس ہوا اور آئندہ خیر سگالی کے جذبے کے ماتحت اس تمام مفتوحہ علاقے کو بہار کا نام دے دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ بہار میں اس وقت کئی ایک بودھ عبادت گاہیں تھیں جو بیک وقت مکاتب و مدارس بھی کہلاتی تھیں اور یہ قلعہ جس پر بختیار نے ۱۱۹۹ء میں اپنا پرچم لہرایا تھا اسی قسم کی ایک عبادت گاہ تھا جسے مرکزی حیثیت حاصل تھی اور جس کا نام "اودنتا پورہ وہارا" تھا۔ ۱۲۰۰ء میں بہار پر حملہ کرنے کی دوبارہ ضرورت محسوس ہوئی۔ اس دفعہ پورے بہار کو بزور شمشیر قبضے میں لایا گیا اور خلجیوں نے مضبوطی سے وہاں اپنے پاؤں جمانا شروع کئے۔

ادھر بنگال راجہ لکشمن سین کی راجدھانی بنا ہوا تھا۔ کفر والحاد کی یہ سرزمین بختیار کی آنکھوں میں کھٹک رہی تھی۔ چنانچہ وہ بہار سے فارغ ہو کر اپنی فوجیں لئے سیدھا بنگال پہنچ گیا۔ راج محل پر قبضہ کرنے کی یہ تجویز ہوئی کہ فوج کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا جائے جو تھوڑے تھوڑے وقفے سے یکے بعد دیگرے شہر میں داخل ہوں اور راجہ سینا کا مقابلہ کر کے اسے شکست فاش دیں۔ اس کام کے لئے بختیار نے خود پہل کی اور ۱۹ سواروں کو ہمراہ لئے ندیہ شہر میں داخل ہو گیا۔ جون ۱۲۰۱ء کی گرمیاں اپنے شباب پر تھیں۔ سورج نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ ندیہ کے راجہ اور پرجا آرام سے اپنی اپنی جگہ فروکش تھے کہ ۱۹ منچلوں کا یہ مختصر سا قافلہ اس جھلستی ہوئی گرمی میں راج محل کی طرف مستانہ وار بڑھا چلا جا رہا تھا۔ مزاحمت کرنے کے لئے جو بھی آگے آیا، تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ شہر بھر میں اجنبیوں کی آمد سے چیخ پکار مچی ہوئی تھی۔ راج محل کی ہاہاکار سے فضائیں گونج رہی تھیں لیکن حملہ آوروں کی تلواریں میان سے باہر نکل چکی تھیں اور زیادہ وقت گذرنے نہ پایا تھا کہ راج محل اور راج سنگھاسن پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ تازہ دم بختیاری فوجیں دستہ در دستہ پیچھے چلی آ رہی تھیں اور لکشمن سین بال بال بسلامت کشتی میں سوار ہو کر راہ فرار اختیار کر چکا تھا۔ راج محل پر اسلامی جھنڈا لہرا رہا تھا اور سچ پوچھئے تو مسلمانوں کو بختیار کی سرکردگی میں وہ شاندار فتح حاصل ہوئی تھی جس نے بنگال میں ہندو کی خود مختاری کا طلسم توڑ کر رکھ دیا تھا۔ ندیہ کو فتح کرنے کے بعد بختیار نے خلجی امرا کو یہاں متوطن کیا اور خود گوڑ کو مسخر کرنے کے ارادے سے آگے بڑھا۔ تاریخ وہ تفاصیل پیش کرنے سے قاصر ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ بختیار نے کب اور کس طرح گوڑ پر فتح پائی۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ گوڑ فتح کر کے جو کچھ مال غنیمت ہاتھ لگا اسے سمیٹ کر بختیار یہاں سے نکلا اور بہار کے راستے ہوتا ہوا ملک قطب الدین کی خدمت میں زمین بوس ہوا۔ قطب الدین نے ابھی ابھی کالنجر، مہوبہ اور کالپی کی فتوحات کو مکمل کیا تھا۔ چنانچہ قطب الدین کو نذرانہ پیش کر کے وہ اپنے مفتوحہ علاقوں کو واپس ہوا اور ۱۲۰۳ء سے ۱۲۰۵ء تک یہاں انتظامی معاملات کو سدھارنے میں مصروف رہا۔ اس دوران میں بختیار نے بت شکنی بھی کی، مسجدیں بنوائیں، مکاتب و مدارس قائم کئے اور تبلیغ مذہب کے کاموں میں بھی پیش پیش رہا۔

تبت کی مہم بختیار کا آخری معرکہ تھا جس کی ناکامی سے وہ جانبر نہ ہو سکا۔ یہ مہم اس نے کیوں اختیار کی۔ تاریخ اس کا جواب دینے سے قاصر ہے۔ کیا ہندوستان کی وسیع سرزمین اس کی فتح مندیوں کے لئے ناکافی تھی؟ کیا مہاراجہ لکشمن سین کی حریفانہ سرگرمیاں دب چکی تھیں؟ کیا شمالی ہند کے میدانوں میں ہندو راجدھانیوں نے اسلام قبول کر لیا تھا — نہیں!! تو پھر بختیار کی نگاہوں میں تبت، چین اور ترکستان کے مناظر کیوں گھوم اٹھے؟ ان سوالوں کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی معرکہ پسند طبیعت کے ہاتھوں مجبور تھا ؎

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں
وہ گلستاں کہ نہ ہو جس کی گھات میں صیّاد

اس کے کانوں نے یہ داستانیں سُنی ہوئی تھیں کہ ان پہاڑی علاقوں میں سونے کی کانیں موجود ہیں۔ وہ ان قیمتی ذخائر کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔۔۔ نہیں! وہ اپنی متجسس طبیعت کے باعث متمنّی تھا کہ ترکستان پہنچنے کا چھوٹے سے چھوٹا راستہ معلوم کر لے۔ بہر حال تبت کی مہم اس کا سوچا سمجھا ہوا اقدام تھا۔ اہل بنگال کے لئے یہ کوئی ایسی جگہ بھی نہیں تھی جس کے نام سے وہ ناواقف ہوں بلکہ اس کے برعکس پال خاندان کے راجاؤں کے زمانے سے تبت نے پیشواؤں اور دھرم پرچارکوں کی بود و باش کے سبب مذہبی مقام ہونے کی حیثیت حاصل کر لی تھی اور تبت کے تجارت پیشہ لوگ دارجلنگ کے راستے جنوبی بنگال کے سالانہ میلوں ٹھیلوں میں اکثر شریک ہوا کرتے تھے۔ ۱۲۰۶ء کے اواخر سرما میں بختیار ایک لشکر جرار لئے جس میں دس ہزار گھڑ سوار تھے، دیوکوٹ سے تبت کی مہم پر روانہ ہوا۔ راستے کی دشوار گزاریوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ بردھان کوٹ نکل کر پہاڑی سفر شروع ہوا اور اسے طے کر کے بختیاری لشکر سولہویں دن ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں پہاڑی باشندوں سے مقابلہ ہوا۔ وہ غضب کا رن پڑا کہ بختیاری لشکر نے پہاڑی حملہ آوروں کے چھکے چھڑا دئے۔ لیکن رسد ختم ہو جانے اور دشمن کے ہر وقت گھات میں لگے رہنے کی وجہ سے سلطان کی فوجوں کو ہزیمت کا منہ دیکھنا پڑا اور اتنی بڑی مسلح فوج میں سے معدودے چند سپاہی سلطان کے ساتھ جان بچا کر خستہ و خراب حالت میں دیوکوٹ پہنچے۔

بختیار کی اس ناکامی نے نصف صدی بعد تک بنگال کی تاریخ پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ اس دوران میں ہندو راجاؤں کو اپنی کھوئی ہوئی قوت جمع کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ گو زمین کمی سپاہ کے باعث دامان سلطنت کی وسعتیں بھی رکی ہوئی تھیں اور بہار کا علاقہ جہاں سے بختیار کو بہ آسانی لشکری مل جایا کرتے تھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بنگال سے علیحدہ ہو چکا تھا۔ اندرونی خلفشار کا یہ عالم تھا کہ اخلاقی قدریں روز بروز زوال پذیر ہو رہی تھیں اور مرے کو مارے شاہ مدار ادھر بنگال کی سرزمین میں فتنہ و فساد کی آگ مشتعل ہو رہی تھی۔ یہی وہ دکھ تھے جن کا احساس بختیار کے لئے سوہان روح بنا ہوا تھا۔ شرم و ندامت کے باعث وہ بہت کم باہر نکلتا تھا اور کسی کے ہاتھوں قتل ہو جانے کا اندیشہ ہر وقت اس کے سر پر سوار رہتا تھا۔ ان خطرات نے اسے صاحب فراش بنا رکھا تھا آخر ایک روز جبکہ بنگال کا یہ فاتح مرگ و زیست کی کشمکش میں گرفتار تھا؛ علی مردان خلجی نے اپنے خنجر کے ایک ہی وار سے، اس کے دیوکوٹ پہنچنے کے صرف تین ماہ بعد ۱۲۰۶ء میں اسے عذاب زیست سے نجات دیدی —

●

ملک اختیار الدین محمد بختیار خلجی بنگال کے قرون وسطی کا دھما گردانا جاتا ہے جس کے ہاتھ کی چُنی ہوئی دیواروں نے آج سارے مشرقی پاکستان کو اپنی آغوش میں لے رکھا ہے۔ اس نے آزادی کی فضاؤں میں پرورش پائی تھی، آزاد رہ کر زندگی بسر کی اور ایک عظیم فاتح کہلاتے ہوئے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ موت نے اتنی مہلت بھی نہ دی کہ وہ اپنی فتوحات کو مستحکم کر لیتا اور ان کے در و بست میں اپنی منصرمانہ قابلیتوں کا اظہار کرتا۔ یہ واقعہ ہے کہ بختیار اپنے ہم عصر فاتحوں میں بے جگری، جاں سپاری اور دلاوری کے لحاظ سے بے نظیر تھا اور اگر اس میں کچھ ذاتی کمزوریاں تھیں تو ان کا سبب ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی اور پے بہ پے کامیابی حصول تھا۔ اُس کے عہد میں ملکی انتظام کا طریقہ قبائلی جاگیرداری پر مشتمل تھا اور اس کے تحت ملک کے بیشتر علاقے ترک یا خلجی افسروں کی تحویل میں رہا کرتے تھے۔ ہر افسر اپنے علاقے کا خود مختار سردار سمجھا جاتا تھا۔ اس علاوہ سلطان نے سرحدوں پر بڑی بڑی صوبیداریاں قائم کر رکھی تھیں جو خلجی خاندان کے تین بڑے سرداروں یعنی علی مردان، حسام الدین محمد شیران کے سپرد تھیں۔ اس طرح پورے بنگال پر خلجیوں کی حکومت جھنڈا لہرا رہا تھا اور اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بعد کی تا

بنگال پر بالعموم اس کا بہت گہرا اثر ہوا ہے۔

بختیار خلجی کے سانحۂ قتل کے بعد ایک عرصے تک بنگال خانہ جنگیوں کا گہوارہ بنا رہا اور یہ بھڑکتی ہوئی آگ کہیں ۱۲۱۲ء میں جا کر علی مردان کے خون کے چھینٹوں سے ٹھنڈی ہوئی۔ ادھر محمد شیران کو جب اپنے ولیِ نعمت سلطان بختیار کے قتل ہو جانے کی خبر پہنچی تو وہ فوراً لکھنور سے اپنے لشکر سمیت دیوکوٹ آ گیا کہ علی مردان کو اس کے کئے کی سزا دے۔ علی مردان اس وقت اپنی جاگیر گھوڑا گھاٹ میں پناہ گزیں تھا۔ بختیار کے مراسمِ عزا سے فارغ ہو کر محمد شیران نے علی مردان پر چڑھائی کی اور گرفتار کر کے اسے زنداں میں ڈال دیا۔ امرائے خلج نے متفقہ طور پر محمد شیران کو لکھنوتی کا حاکم منتخب کر لیا اور ۱۲۰۸ء میں وہ ملک عزّ الدین محمد شیران خلجی کے نام نامی سے سربرآرائے سلطنت ہوا۔ یہ زمانہ داخلی اور خارجی خلفشار کا زمانہ تھا۔ بنگال سے باہر اہم واقعات رونما ہو چکے تھے۔ سلطان معز الدین غوری کا قتل، قطب الدین ایبک کی تاجپوشی اور دریائے سندھ کے اس پار غزنی، فیروزکوہ اور خراسان کے حاکموں کی باہمی چپقلش ـــــ ان تمام حالات نے رفتارِ وقت کو اور بھی تیز بنا رکھا تھا۔ کہنے کو تو شیران لکھنوتی کے تاج و تخت پر متصرف تھا لیکن حقیقت ہے کہ ہر خلجی امیر کے دل میں اس وقت خود سلطان بن جانے کی لگن موجود تھی۔ شیران ایک مردِ جنگجو، کارآزمودہ سپاہی اور دانش پژوہ انسان ہونے کے باوجود امرائے خلج کی ریشہ دوانیوں کے سامنے اپنے آپ کو مجبورِ محض پاتا تھا۔ ایک طرف اپنے امیروں کی سازشیں تھیں تو دوسری جانب سلطنت دہلی کی طرف سے خوف و ہراس تھا۔ بہرکیف اپنے وقار کو قائم رکھنے کے لئے اس نے تمام امرا کے مناصب برقرار رکھے اور علی مردان کے حامیوں سے بھی کسی قسم کی بازپرس نہ کی نتیجتاً سلطان کے اس غیر دانشمندانہ فعل کی وجہ سے بہار کا سارا مفتوحہ علاقہ خلجیوں کے زیرِ اقتدار سے نکل کر سلطان قطب الدین کے ممالکِ محروسہ میں شامل ہو گیا۔

گھوڑا گھاٹ میں علی مردان کے فرار ہو جانے سے بنگال کے امن و سکون میں پھر اضطراب پیدا ہو چکا تھا۔ علی مردان نے دہلی پہنچ کر سلطان ایبک کے دربار میں پناہ ڈھونڈ لی اور اسے ملک عزّ الدین کے خلاف لشکرکشی پر آمادہ کیا۔ قطب الدین نے اپنے صوبیدار اودھ قیماز رومی کو لکھنوتی پر چڑھائی کرنے کا حکم دیا تاکہ وہ بنگال میں امرائے خلج کے باہمی مناقشات کو دور کرنے کی کوشش کرے اور بباطن بنگال کو سلطنت دہلی سے منسلک کر دے۔ قیماز ابھی دریائے کوسی عبور کر کے بنگالہ میں داخل ہی ہوا تھا کہ گنگا راکے خلجی حاکم حسام الدین نے بڑھ کر اس کا شاہانہ استقبال کیا اور حاجبانہ مراسمِ خدمات بجا لایا۔ ملک عزّ الدین کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ دیوکوٹ چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ قیماز نے دیوکوٹ پر قبضہ کر لیا اور اسے حسام الدین کے تصرف میں دے کر خود اودھ کو واپس ہوا۔ اس انتظام کی رو سے خلجی جاگیریں بھی دیوکوٹ کی عملداری میں شامل تھیں جہاں سلطان دہلی کا گماشتہ برسرِ حکومت تھا۔ قیماز کو اودھ جاتے ہوئے راستے میں علم ہوا کہ ملک عزالدین نے خلجی امیروں کو جمع کرتے پھر دیوکوٹ پر حملہ کرنے کا تہیہ کیا ہے۔ چنانچہ وہ راستے ہی سے واپس لوٹا اور ملک عزّ الدین کو شکست دے کر سنتوش (ضلع بوگرہ) کی طرف بھگا دیا۔ ملک عزّ الدین کو اپنی فرمانروائی کے سال بھر کے مختصر عرصے میں مسلسل مایوسیوں اور ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا اس لئے دوبارہ دیوکوٹ پر حملہ آور ہونے کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ چنانچہ زندگی کے باقی ماندہ ایام سنتوش ہی میں گزار کر وہ رہگرائے عالمِ بقا ہوا۔

حسام الدین ۱۲۰۸ء سے ۱۲۱۰ء تک سلطانِ دہلی کا باجگذار حاکم بن کر لکھنوتی اور اس کے گرد و نواح پر حکومت کرتا رہا۔ یہاں تک کہ سلطان قطب الدین نے علی مردان کو ترکوں کے ایک بڑے لشکر کے ساتھ لکھنوتی کا گورنر بنا کر بنگال روانہ کیا۔ علی مردان کسی مزاحمت کے بغیر ۱۲۱۰ء میں بنگال وارد ہوا۔ حسام الدین نے امرائے خلج کی معیت میں اس کا استقبال کیا اور عنانِ حکومت اس کے سپرد کر کے خود لکھنوتی میں گوشہ گزیں ہو گیا۔ علی مردان اب بلا شرکتِ غیر بنگال کا مطلق العنان حاکم تھا۔ اتنے میں خبر پہنچی کہ اس کے ولیِ نعمت سلطان قطب الدین ایبک نے سفرِ آخرت اختیار کر لیا ہے۔ سلطان کی وفات حالات کی ابتری کے لئے ایک اور تازیانہ ثابت ہوئی کیونکہ معزّی اور قطبی امیروں میں سلطان کی جانشینی کے لئے جھگڑے شروع ہو چکے تھے۔ لاہور اور دہلی ان جھگڑوں کا مرکز بنے ہوئے تھے جہاں آرام شاہ اور التمش کو ہندوستان کے تخت و تاج کا وارث سمجھا جاتا تھا۔ ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ملتان اور سندھ میں ناصر الدین قباچہ نے علمِ بغاوت بلند کر رکھا تھا۔ بنگال میں علی مردان خلجی نے جلد اختیارات سنبھال لئے تھے۔ اس طرح "منہاج سراج" کے بیان کے مطابق

ہندوستان چار ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکا تھا اور لکھنوتی کے علاقے پر خلجی ملک اور سلاطین پوری طرح قابض تھے۔

علی مردان اب سلطان علاء الدین کے لقب سے بنگال کی قسمت کا مالک بنا ہوا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بہترین سپاہیانہ قابلیتیں رکھتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ بہت خونریز اور قتال تھا۔ سینکڑوں خلجی امیر اس کے ظلم و ستم کا نشانہ بن چکے تھے۔ اس کے خوف سے رعایا تھر تھر کانپ رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ باجگذاری اور خراج کی رقمیں بن مانگے وصول ہو رہی تھیں اور سرکاری خزانہ روز بروز معمور ہوتا جا رہا تھا۔ حکومت اور دولت کے اس نشے نے علی مردان کا دماغ خراب کر دیا تھا اور وہ اپنے آپ کو عالم اسلام کا فرماں روا سمجھنے لگ گیا تھا۔ خوشامدی اور دھوکے باز لوگ اس کے اس خبط سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا رہے تھے۔ رعایا علیحدہ تشدد کا شکار بن رہی تھی۔ آخر خلجیوں کی رگِ حمیت پھڑکی اور انہوں نے سردار حسام الدین کی سرکردگی میں سازشی طریقے سے علی مردان خلجی کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور اس طرح بختیار خلجی کا خونِ بیگناہ رنگ لا کے رہا۔

تمہارے کشتوں کا خونِ ناحق چھپے گا کیونکر بروزِ محشر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا

حسام الدین نے اپنے خلجی امرا کے اصرار پر سلطان غیاث الدین کا لقب اختیار کر کے زمامِ سلطنت کو سنبھالا اور اپنی پہلی توجہ اس جانب منعطف کی کہ لکھنوتی میں اپنے اقتدار کی جڑیں مضبوط کرے اور علی مردان کے ساتھ دہلی سے جو ترک سپاہی آئے تھے انہیں اپنے ساتھ ملائے رکھے۔ اس دوران میں اسے ہندو راجاؤں کا بھی مقابلہ کرنا پڑا جس میں اسے شکست ہوئی۔ ۱۲۱۲ء میں سلطان نے لکھنوتی کو ہندو تغلب سے واگذار کروانے کی کوشش کی اور بڑے شدید محاصرے کے بعد یہ علاقہ سلطان کی تحویل میں آگیا۔ یہیں سے سلطان کی آئندہ فتوحات کی ابتدا ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ کھوئے ہوئے علاقوں کی بازیافت کے ساتھ بہت سے نئے علاقے بھی مل جاتے ہیں۔ تھوڑے ہی عرصے میں اپنی قوت مجتمع کر کے سلطان نے پورے بنگال کو زیر قبضہ لانے کی کوشش شروع کر دی اور اس غرض کے لئے اپنے پایۂ تخت کو دیوکوٹ سے لکھنوتی لے جانا بہتر سمجھا۔ چنانچہ ۱۲۱۹ء میں سرکاری طور پر لکھنوتی کو حکومت کا صدر مقام قرار دے دیا گیا۔ یہاں سلطان نے کئی ایک نادر تعمیری اصلاحات نافذ کیں جن سے اس علاقے کی مقامی حیثیت میں قابل قدر اضافہ ہو گیا۔ سلطان کے زمانے میں لکھنوتی اور بہار بارہ سال تک امن و امان کا گہوارہ بنے رہے یہاں تک کہ ۱۲۲۵ء میں سلطان التمش نے بنگال پر پہلا حملہ کیا۔ لکھنوتی سے سلطنت دہلی کے تعلقات تو علی مردان کے عہد ہی سے منقطع ہو چکے تھے۔ التمش تخت و تاج سنبھالتے ہی بدایوں، بنارس، قنوج اور اودھ کی طرف متوجہ ہوا۔ بنگال اور بہار پر بھی اس کی نگاہیں جمی ہوئی تھیں۔ راستے میں کچھ ایسے حالات کا سامنا ہوا کہ لکھنوتی کے حاکم کو اپنا باجگذار بنا کر صلح کر لی۔ ادھر بہار میں ملک علاء الدین جانی کو حاکم بنا دیا جسے غیاث الدین نے شکست دی اور وہ بہار کو پھر اپنے قبضے میں لے آیا۔ سلطان التمش کو خبر ملی تو وہ غیاث الدین کی بدعہدی پر مصلحتاً خاموش رہا۔ کچھ عرصہ بعد التمش نے اودھ کی تسخیر کے لئے اپنے خلف اکبر شاہزادہ نصیر الدین محمود کو ایک بڑی فوج دے کر روانہ کیا تو اسے غیاث الدین کو بدعہدی کا مزا چکھانے کی تاکید بھی کر دی۔ چنانچہ نصیر الدین محمود نے پہلے لکھنوتی پر حملہ کیا۔ غیاث الدین اس وقت ہندو راجاؤں کے خلاف نبرد آزما تھا۔ یہ خبر ملتے ہی فوراً لکھنوتی کی طرف واپس ہوا لیکن شاہزادے کا لشکر پہلے ہی سے شہر میں داخل ہو کر باسن کوٹ پر قبضہ کر چکا تھا۔ غیاث الدین نے بڑی بے جگری سے شاہی افواج کا مقابلہ کیا لیکن تقدیر غنیم کا ساتھ دے رہی تھی۔ بالآخر وہ اپنے سپہ سالاروں سمیت گرفتار ہوا اور ۱۲۲۷ء میں شہزادے کے حکم سے ان سب کو تہِ تیغ کروا دیا گیا۔

غیاث الدین کا ۱۴ سالہ عہدِ حکومت سلطنت اور رعایا کے لئے امن و خوشحالی کا زمانہ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ چنگیز خان خراسان اور ماوراء النہر کے اسلامی مرکزوں کو پامال کرتا ہوا بڑھ رہا تھا اور بمصداق ع خدا شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد، ہندوستان کی اسلامی ریاستیں روز بروز قوت حاصل کر رہی تھیں کیونکہ ترکمانی دستوں کے دستے نقل مکانی کر کے مغرب کی سمت ایشیائے کوچک میں اور جنوب مشرق کی سمت بنگال تک پھیلتے چلے آ رہے تھے۔ اس طرح نہ صرف اسلامی ہندوستان کی عسکری قوتوں میں اضافہ ہو رہا تھا بلکہ یہ ایک اسلامی تہذیب و تمدن کا اہم مرکز بن رہا تھا جو حملۂ مغول سے خوف کھائے ہوئے لوگوں کو جمنا اور مہا ندی کے ساحلوں تک

(باقی صفحہ ۷۲۴ پر)

مشہد بالاکوٹ

عارف حجازی

چاروں طرف گہری کہر چھائی ہوئی تھی اور شہر بالاکوٹ وہاں کے پُراسرار پہاڑ خاموش وادیاں نگاہوں سے ابھی تک اوجھل تھے دریائے کنہار کے بہنے کی مترنم آواز تنگ گھاٹی اور کہستانی وادیوں میں گونجتی ہوئی سنائی دے رہی تھی جیسے کسی نے زندگی کے خوابیدہ تاروں کو چھیڑ دیا ہو۔ زندگی کا یہ سیل رواں، خاموش دھندلی صبح اور ایسے میں بالاکوٹ کی خونیں آشام تاریخ کے بارے میں سوچ کر دل میں جیسے ایک ہلچل مچی ہوئی تھی اور میرے قدم تیزی سے مسجد کی جانب اٹھ رہے تھے۔

مسجد تک پہنچنے میں کافی لمبا فاصلہ طے کرنا تھا۔ راستہ بھر ذہن میں جیسے تاریخ کا ایک ایک ورق کھلتا چلا گیا۔ اسلام جب ایران اور افغانستان کے راستے برصغیر ہند میں پہنچا تھا تو وہ اپنی بہت کچھ تازگی اور زندگی کھو چکا تھا۔ ترک پٹھان مغل فاتحین کے اسلام میں کوئی شبہ نہیں لیکن مذہب اور تہذیب رفیع کرنے کے لئے ان کی روحانی قوت ناکافی تھی اور ان کی حالت ایسی تھی کہ ان کی دینی اصلاح کی جاتی لیکن یہ فاتحین اپنی کامرانی اور فتحمندی کے نشے میں چُور بتکدۂ ہند کو برباد و تاراج کرکے عظیم الشان سلطنتیں قائم کرنے میں مصروف ہو گئے اور اپنی ضرورت کے مطابق احکام اور قوانین نافذ کرتے رہے۔ ان میں سے چند ہی ایک ایسے تھے جنہوں نے عین اسلام کے مطابق اپنی حکومت قائم کی ہو۔ پھر ایک زمانہ ایسا بھی گزرا کہ مذہب حکومتِ وقت کی سرپرستی اور حمایت سے محروم ہو گیا۔ عہد اکبری میں تو کفار و ملا کفر اور الحاد پھیلاتے رہے۔ اگر ہندوستان میں اس زمانے میں اسلام کے دو عظیم المرتبت پیشوا حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی علیہ رحمۃ اور شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ (دہلوی) پیدا نہ ہوتے تو بہت ممکن تھا کہ اسلام یا تو فنا ہو جاتا یا پھر اس کی اتنی بگڑی ہوئی صورت ہوتی جیسے اور مذاہب کی ہے۔ ان بزرگان دین کی خیر و برکت نے اسلام کے قدم سرزمین ہند میں اتنی مضبوطی سے جما دیئے تھے کہ آئندہ کی راہیں ہموار ہو گئی تھیں، بعد آگے چل کر اسلام کے احیاء

میں ہندوستان کے ایک جلیل القدر فرمانروا اور خدا ترس دین دار بادشاہ محی الدین اورنگ زیب عالمگیر مرحوم نے بھی بہت شاندار کام انجام دیا لیکن اس کی موت کے کچھ عرصہ کے بعد سلاطین تیموریہ صرف خانقاہ نشین ہو گئے۔ ان کا سنبھلنا دشوار ہو گیا اور اس طرح اسلام کی مرکزیت میں پھر شگاف پڑ گئے۔ مسلمانوں کو کمزور پا کر بیسیوں فتنوں نے سر اٹھایا۔ دکن سے لے کر دہلی تک مرہٹے چھا گئے تھے۔ پنجاب میں افغانستان کی حدود تک سکھوں کا راج تھا۔ اور ہندوستان کے ساحلوں پر یورپی قوموں خصوصاً انگریز کا قبضہ تھا اور ان کا کافی اثر و رسوخ قائم ہو چکا تھا۔ ان حالات کے مقابلے کے لئے اگر کوئی باقی رہ گیا تھا تو وہ ترکشِ اسلام کا آخری خدنگ سلطان ٹیپو شہید تھے لیکن یہ ترکش بھی ۱۷۹۹ء میں نابید ہو گیا تو اسلام کی شیرازہ بندی کے سارے امکانات ختم ہو گئے۔ اور ملک کے گوشے گوشے میں اسلام بہت کمزور ہو گیا۔ کہیں قوت کے آثار باقی نہ رہے۔ ہر جگہ بدنظمی ہو گیا۔ مسلمان قوم ہر شعبۂ زندگی میں تنزل پذیر ہو گئی اور زراعت اور تجارت بھی تباہ ہو گئی۔ علم دین کے راستے مسدود ہو گئے۔ مسجدیں ویران ہو گئیں۔ بداعتقادی نے جاہل مسلمانوں کو اسلامی نظریۂ حیات اور تعلیمات سے کوسوں دور کر دیا اور وہ تعویذ، گنڈے، فقیروں اور دیوانوں پر اعتقاد کرنے لگے چنانچہ جہاں ایک طرف مسلمانوں کی سیاسی قوت فنا ہو چکی تھی وہاں دوسری طرف معاشرتی و تمدنی انحطاط نے انہیں مشرکانہ رسوم اور بدعات کا عادی بنا دیا تھا۔ خصوصاً پنجاب کے مسلمانوں کی حالت سب سے بدتر ہو چکی تھی۔ رنجیت سنگھ اور دوسرے سکھوں کے گھرانوں میں مسلمان اور افغان عورتیں لونڈیوں اور باندیوں کی خدمات انجام دیا کرتی تھیں۔ اذان اور گاؤکشی سخت ممنوع تھی اور بات بات پر مسلمانوں کے گھر، جائداد اور املاک ضبط کر لی جاتی۔ انہیں کسی قسم کی مذہبی و تمدنی آزادی نہ تھی۔ مساجد کی کھلے عام بے حرمتی کی جاتی تھی۔ لاہور کی بادشاہی مسجد سکھ پلٹن کا اصطبل

تھی۔ ان حالات اور ذہنی غلامی نے انھیں اتنا اخلاقی طور پر گرا دیا
تھا کہ بقول علامہ اقبال ؎

خالد شمشیر قرآں را ببرد
اندراں کشور مسلمانی بمرد

مسلمانوں کے اس زوال و انحطاط کے زمانے میں قدرت
نے حضرت سرہندیؒ اور حضرت مجدد دہلوی کے فضل و کمال کے دو آتشہ
سے رائے بریلی کے نمک میں ایک الیاسہ آتشہ تیار کیا جس نے مسلمان
قوم کے تن بے جان میں پھر سے اسلام کی روح پھونک دی تھی اور یہ
روح مقدس حضرت سید احمد شہیدؒ (رائے بریلوی) تھے جنھوں نے
اسلام کی حفاظت اور تجدید دین کا بیڑا اٹھایا۔ مسلمانوں کو ذلت
اور پستی سے نکال کر پھر انھیں ان کے قدموں پر کھڑا کر دیا۔ اور شاہ سید
اسمٰعیل شہیدؒ (دہلوی) جیسے بزرگان دین نے سید صاحبؒ کی تحریک اسلامی
کو ایسے چار چاند لگائے۔ اور یہ تحریک اس شان و شوکت سے ابھری
کہ سارے ہندوستان میں اس کا عام چرچا ہو گیا۔ حضرت سید صاحبؒ
کی اس تحریک اسلامی کے بارے میں ایک انگریز مورخ ڈاکٹر سر ولیم ہنٹر
(جو اس تحریک کا سب سے بڑا دشمن تھا) اپنی تصنیف "مسلمانان ہند"
میں لکھتا ہے ؎

"یہ لوگ ..... بے لوث بے غرض تھے
ان کا طریق زندگی ہر شبے سے بالاتر تھا ....
ان کا اصل کام تزکیہ نفس اور اصلاح دین تھا۔
میرے لئے یہ قطعی ناممکن ہے کہ میں ان کی عزت
تعظیم کئے بغیر ان کا ذکر کروں .... یہاں تک
مجھے اس تحریک کا علم ہوا ہے میں یقین سے کہہ سکتا
ہوں کہ یہ وہابی مبلغین بہت بڑے روحانی پیشوا
تھے اور کم سے کم خود غرض لوگ تھے۔ ان کی تحریک
بڑی منظم اور ہمہ گیر تھی۔ ان میں ایسے دین دار اور
خدا ترس رہنما تھے جنھوں نے اپنی علمی اور عملی زندگی
بہترین نمونہ پیش کر کے بہت تھوڑے عرصے میں اپنی
تحریک کو ہندوستان کے کونے کونے میں پھیلا دیا
اور لاکھوں مسلمان ان کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔"

ایک اور جگہ ایک دوسرا متعصب مورخ جیمس رکینلی بنگالی مسلمانوں کے
بارے میں لکھتا ہے:۔

"وہ کمزور اور بزدل بنگالی مسلمان خونخواری
اور جوش جہاد میں افغانوں سے کسی طرح کم نہ تھے۔"

ان غیر ملکی مورخوں کے تاریخی حوالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی
ہے کہ اس تحریک میں کتنی جان تھی اور اس زمانے میں ایک ایسی ہی تحریک
کی سخت ضرورت تھی۔ خصوصاً پنجاب کے مسلمانوں کی حالت ایسی تھی
کہ سید صاحبؒ کی ساری توجہ انھیں غلامی اور پستی سے نکالنے کی طرف
مرکوز ہو گئی۔ اور سب سے پہلے اس وقت اسی کی ضرورت بھی تھی کہ
"مردے از غیب برون آید و کارے بکند" ۔ یہ سعادت ازل سے
پشاور سے راس کماری تک چھ کروڑ مسلمانوں میں رائے بریلی (یوپی)
کے ایک اولوالعزم سیدؒ کی قسمت میں تھی کہ وہ کفر اور ظلم کے خلاف جہاد
کرے۔ اگرچہ اس تحریک اسلامی کے بانی حضرت سید احمد شہیدؒ کو اور
ان مسلمانوں کو جو ان کے ہمرکاب تھے لاکھوں دشواریاں جھیلنے کے بعد
بھی کامرانی نصیب نہ ہوئی اور قوم کے غداروں نے سینکڑوں سازشیں
کیں لیکن یہ تحریک ختم نہ ہو سکی۔ اور اسی بالاکوٹ کے مقام پر یہ بزرگان
دین اسلام کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ (اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ
رَاجِعُوْنَ ؕ)

مگر بقول مولانا محمد علی جوہر مرحوم ؎

قتل حسینؑ اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اور یہ بات یہاں بھی صادق آئی حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ
سید اسمٰعیل شہیدؒ اور ہزاروں فدایان اسلام کے شہید کئے جانے کے بعد
بھی اسلامی تحریک اور قومی آزادی کی جدوجہد کی بنیادوں کو پھر بھی
کوئی غدار سے غدار ٹس سے مس نہ کر سکا۔ اس قومی جہاد اور آزادی کا آخری
معرکہ اسی بالاکوٹ کی تنگ وادیوں میں ہوا تھا۔

میں نے چلتے چلتے جب تاریخ کی اس خونیں داستان کے بارے
میں سوچا تو جیسے میرا دل جوش حریت سے زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اور
میں اس پر غور کرتا ہوا جب مسجد میں داخل ہوا تو نماز ہو چکی تھی۔ لوگ واپس
ہو رہے تھے۔ ہلکی ہلکی روشنی میں لوگوں کی کالی کالی اور سفید داڑھیاں اور
عمامے صاف نظر آ رہے تھے۔ میں مسجد سے ہوتا ہوا آگے بڑھ کر دریا پہ
پہنچا جہاں ٹھنڈے پانی سے وضو کیا تو ایسا محسوس ہوا جیسے میرے اندر کا

سویا ہوا مجاہد جاگ اٹھا ہے پھر میں تیزی سے مسجد کے اندر آیا جس کے فرش پر سوکھی ہوئی نرم نرم گھاس بچھی ہوئی تھی اور میرا ملاقاتی عزیب شاہ ایک کونے میں بیٹھا ہوا تلاوت میں مصروف تھا۔ میرے نماز سے فارغ ہونے تک اس نے بھی فرصت پائی ـــ ہم دونوں ایک دوسرے کو سلام کر کے مسجد سے باہر نکلے اور ٹہلتے ہوئے دریا کے ایک اونچے کنارے پر آگئے۔ جہاں سے لوہے کے رسوں کا تنگ پل صاف نظر آ رہا تھا اور دریائے کنہار کسی آزاد اور منچلے جانباز کی مانند پتھریلے کناروں سے زور آزمائی کرتا ہوا، سنگ ریزوں اور گول گول پتھروں سے کھیلتا ہوا بہہ رہا تھا۔ اور اس کے صاف و شفاف دھاروں پر سورج کی ارغوانی کرنیں پڑتے ہی جیسے قوس قزح کی رنگینیاں جھلکنے لگی تھیں۔ ہم دونوں تھوڑی دیر تک دریا کے کنارے کھڑے پر کیف مناظر میں محو رہے اور پھر باتیں کرتے ہوئے سید احمد شہیدؒ کے مزار کو جانے والے راستے پر روانہ ہو گئے۔

دریا سے تھوڑی ہی دور پر مزار تھا۔ مزار پر جانے کیلئے ایک تنگ گلی سے ہو کر ہم ایک چار دیواری میں داخل ہوئے جہاں کئی قبریں تھیں۔ ان میں سب سے اونچی قبر سید صاحبؒ کی تھی۔ قبر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر پھر مجاہد کبیر کی پاکیزہ زندگی کی یاد تازہ ہو گئی۔ چاروں طرف گہری خاموشی اور سکوت تھا نہ وہاں کوئی مجاور تھا نہ چادر تھی نہ بجھے ہوئے پرانے رکھے تھے لیکن درختوں اور جھاڑیوں میں سرخ جھنڈیاں لٹک رہی تھیں۔

سرِ خاکِ شہیدے برگ ہائے لالہ می پاشم
کہ خونش با نہالِ ملتِ ما سازگار آمد

پھر ہم دونوں وہاں سے سید شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا مزار دیکھنے روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک بھٹیار خانے میں ناشتہ کیا۔ اور قدیم بالاکوٹ کے سامنے ایک پہاڑی ندی کو عبور کیا جس میں چاروں طرف سے چشموں کا پانی بہہ کر آ رہا تھا اسی کے کنارے ایک کھیت میں حضرت سید شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی پختہ قبر تھی جس کے چاروں طرف دیوار کھنچی ہوئی تھی۔ ہم شاہ صاحبؒ کے مزار کی زیارت [illegible] ندی کے کنارے تھوڑی دیر سستانے کی غرض سے بیٹھ گئے اور [illegible] دیر تک باتیں کرتے رہے۔ عزیب شاہ [illegible] اور سمجھدار نوجوان تھا اور اسے ان شہیدانِ ملت سے بڑی عقیدت تھی۔ گفتگو کے دوران میں بار بار اس کی آواز جیسے بھرا اٹھتی اور وہ خاموش ہو جاتا اور اس طرف دیکھنے لگتا جدھر اونچے اونچے پہاڑوں میں کاغان روڈ بل کھاتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی اور اس کے آگے بڑھ کر چوٹی پہاڑوں کی سربلند چوٹیاں دھوپ سے جھلمل جھلمل کر رہی تھیں عزیب شاہ نے سب سے اونچی چوٹی کی جانب اشارہ کر کے مجھے بتایا کہ جوان پہاڑوں میں سب سے اونچی چوٹی نظر آ رہی ہے وہ "موسیٰ کا مصلیٰ" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے متعلق روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام برفپوش چوٹی پر مصلے بچھائے مصروفِ عبادت ہیں اور انسان کی نجات کے لئے خدا سے دعا کرتے رہتے ہیں۔

یہ سنا تو میں مسکرا دیا۔ میں نے کہا: "یہ روایت بھی خوب ہے"

اور پھر ہم دونوں قدیم بالاکوٹ میں آئے جہاں ایک نانبائی کی دکان پر دوپہر کا کھانا کھایا اور وہیں تھوڑی دیر بیٹھے اخبار پڑھا اور اس کے بعد اس سمت نکل آئے جہاں میدانِ جنگ تھا۔ یہ مٹی کوٹ کے دامن میں ایک چھوٹی سی وادی تھی اور اس کے پیچھے فلک پیما پہاڑوں کی چوٹیاں نظر آ رہی تھیں۔ وادی ختم ہوتے ہی دیودار اور چیڑ کے گھنے جنگل تھے جن سے یہ پہاڑ ڈھکے ہوئے تھے۔ اسی مقام سے تھوڑی دور پر ایک مسجد تھی جس میں سرسبز درخت لگے ہوئے تھے۔ یہ وہی تاریخی مسجد ہے جہاں مجاہدین کا مرکزی دفتر تھا اور فوج کشی کے احکامات

یہیں سے جاری کئے جاتے تھے۔ میں نے ایک طائرانہ نگاہ [illegible] دیکھا جو پہاڑوں کے دامن میں [illegible] تنگ ہو گئی تھی اسی تنگ وادی میں مجاہد کبیر اور سکھ فوجوں میں آخری خونریز جنگ ہوئی تھی یہی وہ میدان تھا جہاں حق اور باطل فیصلہ کن جنگ کے لئے [illegible] ہوئے تھے۔ اس وادی کو پھر ایک بار اسی طرح دیکھ کر جنگ کا پورا [illegible] کے سامنے کھنچ گیا۔

راجہ شیر سنگھ نے دو مختلف [illegible] اپنی تمام فوج [illegible] نوجیں ہٹا کر بالاکوٹ میں جمع کر دی تھیں [illegible] تیں لشکر گاہ بنائی تھی بالاکوٹ تک پہنچنے [illegible] ایک پہاڑ تھا [illegible] راستہ تھا جو خطرناک تھا اور گھنے درختوں [illegible] کے درمیان سے گزرتا تھا اور جسے صرف مقامی لوگ [illegible] دوسرا واقف نہ تھا اور دوسرا راستہ ایک [illegible] پل سے ہو کر [illegible] آتا تھا۔ سید صاحبؒ نے ان دونوں راستوں کی ناکہ بندی کر رکھی تھی لیکن دشمن کے مقابلہ میں ناکہ بند فوج بہت کم تھی۔ اس کے [illegible] شیر سنگھ کی اتنی ہمت نہ ہو سکی کہ وہ ان دونوں ناکوں پر حملہ [illegible] ہو کے

بعد وہ بالاکوٹ کی تسخیر سے مایوس ہو کر لاہور واپس جانے ہی والا تھا کہ ناکوں کے محافظ دستے میں سے کسی غدار نے اس پہاڑی راستے کا پتہ بتا دیا۔ چنانچہ راجہ کی بہت بندھی اور اس نے ایک دن پچھلی رات سے تیاری کر کے اچانک دونوں ناکوں پر زبردست یلغار کر دی۔ ادھر سید صاحبؒ کو خبر ہوتے ہی مجاہدوں کا لشکر پہاڑوں پر چھا گیا اور اپنی جان ہتھیلیوں پر رکھ کر لڑتے رہے۔ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ جوشِ جہاد سے سرشار بڑی مردانگی سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اتنے میں لوگوں نے دیکھا کہ حضرت سید احمدؒ بھی فوج میں نہیں ہیں۔ ان دونوں بزرگوں کے شہید ہوتے ہی تمام مجاہدین نے اور زیادہ جوش و خروش سے دشمن کا مقابلہ کیا۔ آخر غنیم کی بھاری فوج اور توپخانے کے آگے مٹھی بھر فوج زیادہ دیر مقابلہ نہ کر سکی اور وہ تمام لوگ ایک ایک کر کے شہید ہو گئے جو ہر حیثیت سے اسلام اور مسلمانوں کے لئے بلاشبہ مرکب تھے۔ — آج بالاکوٹ کی اس تنگ وادی میں ہزاروں مجاہدین خاک میں مل کر خاک ہو چکے ہیں۔ سکھوں نے روایت کے مطابق حضرت شاہ شہیدؒ اور سید صاحب شہیدؒ کے جسدِ مبارک کو شناخت کرا کے نہایت احترام سے اسلامی طریقے پر دفن کروا دیا۔[1]

اسلامی تاریخ کے اس خونیں باب کا سارا منظر نگاہوں کے سامنے اجاگر تھا۔ اس وقت میرا دل چاہ رہا تھا کہ کاش میں بھی ان مجاہدین میں شریک ہو سکتا۔ پھر خیال آیا کہ تیرہویں صدی میں اس تحریک نے جو تنظیم اور سیاسی اثرات چھوڑے تھے پھر وہ کسی طرح نہ مٹ سکے اور باوجود مسلمانوں کے اپنے مقصد میں شکست کھانے کے ان میں بھی اصلاحی اور سیاسی شعور اور زیادہ بڑھ گیا تھا۔ چنانچہ ان بزرگانِ دین کی شہادت کے بعد سے لے کر قیامِ پاکستان تک کی تاریخ اور اس کے سیاسی پہلوؤں کا بغور جائزہ لیا جائے تو ہماری آزادی کی جد و جہد اور تحریک اسلامی کی ساری کڑیاں سید صاحبؒ شہید کی تحریک سے جا ملتی ہیں۔ یہی وہ تحریک تھی جس نے مسلمانوں میں نیا سیاسی شعور پیدا کر دیا تھا۔ اسی اجتماعی احساس نے ۱۸۵۷ء میں بھی اپنی جولانیاں دکھلائی تھیں اور پھر اس سیاسی شعور کا میدان اتنا وسیع ہو گیا کہ ٹھیک نوے سال کے بعد یعنی ۱۹۴۷ء میں ہماری تحریکِ اسلامی اور آزادی کی جنگ نے پاکستان کی عظیم الشان مملکت کی بنا ڈالی اور جس مشن کو حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ لے کر اٹھے تھے اسی مشن کو آخر قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ نے پورا کر کے ان بزرگانِ دین کے اسمائے گرامی کو ہماری قومی تاریخ میں اور زیادہ اجاگر کر دیا۔

گو آج ہم میں یہ بزرگانِ دین موجود نہیں ہیں لیکن ان کی قومی خدمات اور کارنامے ایسے ہیں جن کی وجہ سے ان کے مبارک نام تاقیامت ہماری قومی تاریخ میں قائم و دائم رہیں گے۔!!

★

[1] "سوانح احمدی"

خلجی دور: — بقیہ صفحہ ۱۲۰

کھینچ کر لایا تھا۔ لکھنوتی کو اس وقت علوم و فنون میں مرکزی حیثیت حاصل تھی اور سرزمینِ بنگال کو قدرت نے علی مردان جیسے ظالم کی جگہ غیاث الدین ایسا حلیم، منصف مزاج اور علم دوست سلطان دے رکھا تھا۔ وہ ظاہر و باطن بادشاہانہ خصائل کا مالک تھا۔ بنگال کا یہ پہلا خود مختار فرماں روا تھا جس نے اپنے نام کا سکہ جاری کیا، علم و فن کی سرپرستی فرمائی اور رفاہ عامہ کے کاموں میں حصہ لیا۔ اس نے جنوبی بہار کو دوبارہ اپنی قلمرو سے ملحق کیا اور اس کی سرحدیں دہلی اور اودھ کو چھوتے ہوئے شمالی بہار سے ہم آغوش ہونے لگیں۔ غیاث الدین نے فتح بنگال کی بنیادوں کو اس طرح مستحکم کیا کہ اس کی وفات کے سو سال بعد انہی بنیادوں پر بلبن کے خاندان نے بڑی بڑی عظیم الشان عمارتیں کھڑی کر کے صفحاتِ تاریخ میں اپنے لئے باعزت جگہیں وقف کرا لیں۔

"میرے ریسن و!"

(کارٹون۔ ریحان)

جو گوش نصیحت نیوش ہے۔ اگرچہ میں کہاں اور غالب کہاں۔ اور نہ میں حالی ہوں جو مصلح قوم بن کر یہ طرز خطاب اختیار کر سکوں: اے ماؤ' بہنو' بیٹیو۔ اور بھائیو! گو میرا خطاب آپ ہی سے ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ دنیا کی عزت آپ ہی کے دم سے ہے۔ اور آپ جانیں عزت یعنی تعظیم کا مسئلہ اور سب مسئلوں سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ اور پھر آجکل کے زمانے میں! کسی نے ٹھیک ہی تو کہا تھا کہ:۔

میر صاحب زمانہ نازک ہے
دونوں ہاتھوں سے تھامئے دستار

اور پھر میر صاحب یا شیخ صاحب پر کیوں جائیے۔ قوموں کا بھی یہی حال ہے۔ اگر ان کا دنیا میں وقار ہے تو سب کچھ ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔ اللہ بخشے! شہنشاہ ظرافت' لسان العصر اکبر الہ آبادی نے کیا خوب کہا تھا:

"واہ کیا ڈھج ہے میرے بھولے کی
رنگ کولے کا ہیٹ سولے کی!"

آج بھی رنگ کولے سے بھی بڑھ چڑھ کر سہی۔ ہیٹ تو ضرور سولے کی ہوگی۔ یہ باہر کی چیز

رنگ کولے کا ہیٹ سولے کی!

ہی تو ہے - اپنے وطن کی تو نہیں - اور پھر بات بھولوں اور سولوں تک ہی نہیں رہتی - جہاں بھولے ہوں وہاں بھولیاں بھی ہوں گی - اور ہیٹ کی جگہ اسکارف وغیرہ لے لیتے ہیں اور یہ چیزیں بھی تو محض نام لینے ہی کیلئے چن لی گئی ہیں - ورنہ بقول حکیم ملت رح :

,,چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں،،

یہ مسئلہ ایک بہت بڑے مسئلے کا جزو ہے — اپنی صلاحیتوں، اپنے ساز و سامان، اپنی پیداوار، اپنے وسائل سے منہ موڑ کر دوسروں کی طرف رخ کرنا - اپنے قومی ذرائع کو ترقی دینے سے پہلوتہی - آئیے ہم تھوڑی دیر سولہ ہیٹ اتار کر دماغ کو ذرا ٹھنڈی ہوا لگنے دیں اور سکون دل سے کچھ کام کی باتیں کریں -

نہ ملا کھیت کو کچھ روز جو پانی نہ سہی !

ہم مشرق کے مسکینوں کا دل واقعی مغرب میں بری طرح جا اٹکا ہے - حضرت اکبر کے زمانے میں بوٹ تھا تو ڈاسن کا اور اب جانے اس کی جگہ کون کون سے جوتے چلتے ہیں ! قماش ہے تو بدیسی - مشینیں ہیں تو غیر ملکی - اور تو اور ملکی بلیڈ کی وہ دھار کہاں جو ولایتی کی ہے - جو ہیں تو ''بارلی موتیوں،، کی شکل میں - گندم ہے تو ''فلیکس'' کے روپ میں - گھڑیوں کا بدیسی میک کہاں اور دیسی مال کہاں - صاف بات ہے جب ہماری نظروں میں بدیسی کپڑے ہی جچیں تو یہاں کے کارخانے اچھا مال کیوں اور کیسے تیار کریں ؟

یہ جو میں نے کھانے پینے کا ذکر کیا تو خدانخواستہ ! اس سے میری یہ مراد نہیں کہ میں آپکو فاقوں سے دیکھنا چاہتا ہوں یا یہ کہ آپکو ''تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس،، کی تعلیم دوں - بلکہ سچ پوچھئے تو فاقوں اور تن کی عریانی کا جتن تو آپ خود کرتے ہیں
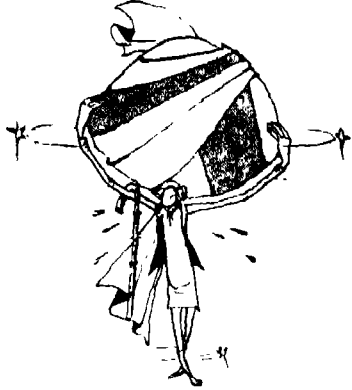
دونوں ہاتوں سے تھامئے دستار !

کہ دھڑادھڑ پرایا مال خریدنے چلے جاتے ہیں اور اپنے ملک کی دولت اندھادھند باہر دھکیلتے جاتے ہیں - اس طرح زر مبادلہ کی بچت کا پلہ تو ہمیشہ دوسروں ہی کی طرف جھکا رہے گا -

اس سب سے بڑی نعمت کو لیجئے جو قدرت نے ہمیں عطا کی ہے — ہمارے وطن عزیز کی پیاری مٹی - اتنا سونا اگلنے والی - وہ سونا جو پیداوار، معدنیات، آبی وسائل کتنی ہی شکلوں میں سامنے آتا ہے - مگر ہم اسے لفظاً ومعناً ٹھکرا دیتے ہیں - اور اسکا سبب محض ہماری لاعلمی ہے ، بے حسی ہے - ہر سال دھنواں دھار بارشیں ہوتی ہیں اور اس اکسیر جیسی مٹی کو بہا لے جاتی ہیں - نیچے بیکار، بانجھ مٹی، کھردری چٹانیں رہ جاتی ہیں جن سے کچھ بھی تو نہیں نکلتا - بڑے بڑے کھیت چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ جاتے ہیں - جن میں کھیتی باڑی بھی مشکل اور محنت و مشقت کا نتیجہ بھی برائے نام - پھر جوں جوں پودے کم ہوتے جاتے ہیں، پانی کے ریلے زور شور سے آتے ہیں - پھر ہم اپنی نادانی سے اس مصیبت کو کچھ اور بھی بڑھا لیتے ہیں - غم نداری بز بخر - جہاں بکری پالنا خود ایک درد سر ہے - وہاں یہ

ایک اور خطرے سے بھی خالی نہیں - جو بھی ہری چیز ہو، یہ جانور اسکے حق میں بلا ہے - اور انجان دیہاتی، اسے کم خرچ جان کر اسکے ریوڑ کے ریوڑ پالتے جاتے ہیں - چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں ہری بھری جگہیں صاف ہوجاتی ہیں - سیلاب اور بھی زور شور سے آنے لگتے ہیں اور دریا اتنے چڑھتے ہیں کہ گاؤں کے گاؤں، شہر کے شہر بہا لے جاتے ہیں - یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہمارے ملک میں زمین کی ٹوٹ پھوٹ کی رفتار دنیا میں سب سے زیادہ ہے - اور اس سے بے اندازہ نقصان ہوتا ہے جو برابر بڑھتا ہی چلا جارہا ہے - ہم نے نادانی سے جنگلوں کے جنگل صاف کر ڈالے ہیں - اور انکی جگہ کوئی درخت نہیں آگائے - اور اب اس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں - کیا یہ ہمارا فرض نہیں کہ جنگلات جیسی اہم قومی دولت کو محفوظ رکھیں، اسے ترقی دیں - ہم زمین سے طرح طرح کی فصلیں اگاتے ہیں تو اس کی طاقت بھی بڑھانی چاہئیے اور اسکے لئے کچی یا کیمیاوی کھاد برتنی چاہئیے - رہی بی بکری، تو اگر ہم اسکی جگہ بھیڑیں پالیں تو گوشت، اون، دودھ، سب کچھ ملے گا - اور قومی دولت بھی بڑھے گی -

''دونوں جہاں ہیں اب تو مرے اختیار میں''

دنیا میں جو بھی چیز ہے اس کا ذخیرہ لامحدود نہیں - غذا، ایندھن، پانی، تیل، دھاتیں وغیرہ جتنا ہم ان کو برتتے چلے جاتے ہیں اتنی ہی یہ چیزیں کم ہوتی جاتی ہیں - یہاں تک کہ ان کا قحط پڑنے لگیگا - اور ہم چیخنے لگیں گے کہ چائے کم ہوگئی، چاول نہیں رہے، گندم نہیں، لکڑی نہیں، کوئلہ نہیں، وغیرہ وغیرہ - ہم صنعتیں چلاتے ہیں، کارخانے بناتے ہیں - یہ بے شک بڑی فائدہ کی بات ہے - لیکن اس میں اس طرح کی چیزیں ہی تو کام آتی ہیں - اور پھر قدرتی طور پر کچے سامان کا توڑا پڑتا ہے - یہ چیزیں کہاں سے آئیں؟ بعض لوگ اپنا شوق پورا کرنے کیلئے رات دن شکار کھیلتے ہیں - اسکے لئے ایک تو گولیاں، کارتوس باہر سے لانے پڑتے ہیں - دوسرے جنگلات کی دولت—جانور اور پرندے بھی کم ہوتے جاتے ہیں -

ہم نے دن رات ات گت کھانے کی قسم کھا رکھی ہے اور وہ بھی گوشت - لیکن یہ نہیں سوچتے کہ اسطرح ہماری ایک بڑی قیمتی قومی دولت کم ہوتی جا رہی ہے - جس سے اب سچ مچ ہمارے لئے ایک مسئلہ پیدا ہوگیا ہے -

یہ شوقینی بعض اوقات بڑی عبرتناک ثابت ہوتی ہے - لیجئے ہم یہاں کسی بڑے ٹھاٹھ‌دار ہوٹل میں بیٹھے ہیں، شراب ارغوان کا دور چل رہا ہے اور کسی دوسرے ملک سے مہ جبین رقاصاؤں کا ایک حشر آفریں طائفہ آیا ہوا ہے - جس کی جیبیں کیا کچھ نہیں بھری گئی ہوں گی - ہم نے اپنا شوق پورا کرنے کے لئے یہ جنس تو درآمد کرلی - لیکن ادھر ہسپتال میں ایک مریض دم توڑ رہا ہے - اور اسکے لئے کوئی نہایت ضروری، جان بچانے والی دوا موجود نہیں - اسلئے کہ ہم نے اسکو فضول سمجھکر درآمد ہی نہیں کیا - اگر ہم نے ایسی چیزیں منگوائی ہوتیں تو ہزاروں لاکھوں جانیں ضائع نہ جاتیں - بے شک ہم یہاں بھی رہے ہوتے ہیں اور بڑی بڑی مہنگی لیکن ادھر کوئی شخص

بھوکا مر رہا ہوتا ہے! پھر سوڈا اور سگریٹ ہیں تو بڑی معمولی چیزیں - سگریٹ سے غم غلط ہوتا ہے، دل بہلتا ہے - اور سوڈے سے چھوٹے چھوٹے نفیس بلبلے پیدا کرنے والی میٹھی گیس پیدا ہوتی ہے - لیکن اسکو تیار کرنے کے لئے مشینی سامان اور سرمایہ کہاں سے آتا ہے اور ان کی شکل میں ہمیں کتنی قومی دولت سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے؟

آپ کہیں گے ہم بھی کیسی فضول باتیں کرنے لگ گئے - ہم صاحب لوگ ٹھہرے اسلئے ہزاروں ٹن ٹائلٹ پیپر درآمد کرتے ہیں - آپ جانتے ہی ہونگے کہ یہ شے لطیف کیا ہے - پھر فلموں کو دیکھئے - یہ ایک ایسی چیز ہے جس سے آنکھیں تو خوش ہوتی ہی ہیں لیکن ہمیں اپنی پونجی دوسروں کو نذر کرنی پڑتی ہے -

ہم طرح طرح کی مشینوں، فریجیڈیئر، اور کاروں وغیرہ کے دیوانے ہوتے چلے جاتے ہیں - جن کیلئے ہمیں دوسروں کا زہر بار ہونا پڑتا ہے -

یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ دنیا میں کارکن اور سرمایہ برابر بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں - اور انکو کام میں لگائے رکھنا ضروری ہے - جس کے

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی!

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں!

لئے قدرتی وسائل لازمی ہیں - وہ کہاں سے آئیں؟ ہماری زمینی دولت، معدنی دولت، جنگلاتی دولت وغیرہ وغیرہ کب تک ہمارا ساتھ دے سکتی ہے؟ لہذا ہمیں ان دولتوں کو صرف کرنے میں

''گرچہ چھوٹی ہے ذات بکری کی
کتنی اونچی ہے بات بکری کی''

احتیاط سے کام لینا چاہئے، ان کی حفاظت کرنا چاہئے، جیسے بھی ہو سکے انہیں بڑھانا چاہئے -

ہمارے دیہاتی بھائی بھی اس دوڑ میں کچھ پیچھے نہیں - گاؤں میں شادی بیاہ، مرنے جینے اور دوسرے موقعوں پر رسموں ریتوں کے سلسلے میں کیا کچھ نہیں ہوتا - پھر کتنے ہیں جو سال کا ایک تہائی حصہ یونہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے گذار دیتے ہیں - چوپال میں دن رات چوکڑی جمی رہتی ہے اور دے غپوں پر غپیں لڑائی جاتی ہیں - اسطرح قومی وقت بھی، جو ایک نہایت اہم قومی دولت ہے، ضائع ہو جاتا ہے - پیسہ بچےگا تو اس سے امداد باہمی کی انجمنیں چلائی جاسکیں گی، گھریلو دستکاریوں کو مدد دی جاسکے گی، صنعتی ترقی کے نئے نئے امکانات پیدا ہونگے - قومی دولت کچھ روپے پیسے، صنعت و حرفت ہی تک محدود نہیں - ہمارے طور طریق، پوشاک تہذیب، روایات، علوم و فنون - یہ بھی تو بڑا اہم قومی سرمایہ ہیں - اسکو بھی تو سنبھالنے سنوارنے، بڑھانے کی اتنی ہی ضرورت ہے - مگر یہاں سوال ذرا عمرانی نوعیت کا بن جاتا ہے - اور سچ پوچھئے تو یہ ناچیز نہ اکبر الہ آبادی ہے نہ اقبال اور نہ ٹوائن بی جو اس موضوع کی داد دے سکے - اسلئے بہترین داد یہی ہے کہ جو کچھ میں اپنی دانست میں دوسری دانائی کی باتیں کہ چکا ہوں، انہیں پر اکتفا کروں *

دوسرا کنارہ — بقیہ صفحہ ۸۱

"لوگ کہتے ہیں چوہدری نے شاداں کا رشتہ طے کر دیا"

"چوہدری نے؟" شاداں نے حیران ہو کر کہا "اس نے مجھ سے کوئی بات نہ پوچھی؟"

"شاہ دین کے لڑکے شریف کے ساتھ"

"چوہدری کی غیرت کو کیا ہوا رحمتے؟ میں اگر زندہ رہی تو یہ رشتہ کبھی طے نہیں ہو سکتا"

"بی بی! تیری بات کون پوچھے گا؟ چوہدری ایک کھیت اور رہن رکھ رہا ہے۔ لوگ کہہ رہے ہیں شاداں کے ہاتھ پیلے کر کے وہ اپنا گھر بھی بسا لے گا"

"مجھے چوہدری کی دوسری شادی پر کوئی دکھ نہیں رحمتے! پر شاداں میری بیٹی بھی تو ہے"

"بی بی! میں نے جو کچھ سنا تجھے بتا دیا" رحمتے نائن نے کہا اور جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ نائن کے جانے کے بعد سیداں چند لمحوں تک یوں کھڑی رہی جیسے زمین کے ساتھ چپک گئی ہو۔ اس کا جسم بت کی طرح بے حس و حرکت تھا۔ اس کی آنکھوں میں بیس سال کا سارا دکھ منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ پھر شاداں نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا "ماں! تجھے کیا ہو گیا ہے؟" سیداں نے دکھ بھری ایک نظر شاداں پر ڈالی اور یہ نظر شاداں کے جسم کو پار کر گئی۔ اس نے تھرتھرا کر ماں کا بازو چھوڑ دیا۔

"شاداں! کیا تو چناب کے اس پار جانا چاہتی ہے؟"

"ہاں!" شاداں نے تڑپ کر کہا۔

"دیکھ میں نے تجھے وقت پر بچا لیا ہے۔ سوچ لے اگر چناب بپھر گیا تو تجھے دوسرا کنارہ نہ مل سکے گا"

"ہاں!" شاداں کا جسم کانپا اور ہونٹ تھرتھرا کر زرد پڑ گئے!

کیا آپ ٹائر میں ہوا کا صحیح دباؤ

نہ رکھنے کے قصوروار ہیں؟

پٹرول کی بچت کرنے کے لئے ٹائر میں ہوا کے دباؤ کی جانچ کیجئے

ایسے ٹائر جن میں ہوا کم ہو، نہ صرف جلد ضائع ہو جاتے ہیں بلکہ سڑک پر ٹائر کے زیادہ رگڑ کی وجہ سے آپکی کار میں پٹرول بھی زیادہ خرچ ہوتا ہے۔ ہمیشہ اپنی گاڑی کے ٹائروں میں ہوا کے دباؤ کو کار کے ساتھ ملنے والی ہدایات کے مطابق صحیح رکھئے اور اس طرح پٹرول کی بچت کیجئے۔

اور ہر میل پر پیسے کی بچت کے لئے

موبل گیس

استعمال کیجئے۔ اسکی ہائی کمپریشن سے آپکی کار زیادہ میل چلتی ہے

موبل آئل

کے استعمال سے آپ کی کار کا انجن زیادہ عرصہ تک کارآمد رہتا ہے

ایٹلانٹک کے یہ دونوں پراڈکٹس زیادہ کفایت کی ڈرائیونگ کیلئے مشہور ہیں

اسٹینڈرڈ ویکیوم آئل کمپنی (محدود ذمہ داری کے ساتھ یو۔ ایس۔ اے میں قائم شدہ) کراچی۔ ڈھاکہ۔ لاہور۔

نزلہ؟
کھانسی؟
اس کا فوری علاج
لیکوفروٹا
یہ بچوں کے لئے بھی نہایت مفید ہے
آج ہی
ایک شیشی
خرید لیجئے
تجارتی تفصیلات کے لئے

حکومت نے حال ہی میں دوسرے پنچسالہ منصوبے کا خاکہ عوام کے سامنے پیش کیا ہے۔ یہ منصوبہ ملک کی غربت اور ناداری کو ختم کرنیکی مہم میں پہلا بڑا قدم ہے۔ اس منصوبے کی تکمیل میں تقریباً ۱۹۰۰ کروڑ روپے خرچ آئیگا۔ عظیم الشان کارخانے اور ورکشاپ، نئی نہریں، بند اور زرعی ادارے، اسکول کالج اور ہسپتال، اس نئے منصوبے کے تحت بڑی تعداد میں تعمیر کئے جائیں گے۔ ان تعمیری منصوبوں کی کامیابی کا انحصار بڑی حد تک سیمنٹ پر ہے۔ زیل پاک سیمنٹ فیکٹری آج ملک کی ترقی کیلئے بڑی مقدار میں سیمنٹ تیار کر رہی ہے۔

ZEALPAK زیل پاک پاکستان کی مایۂ ناز صنعت

زیل پاک سیمنٹ فیکٹری لمیٹڈ۔ حیدرآباد

مینیجنگ ایجنٹس:۔ پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

ZP/20 manhattan

پاکستان شاہراہِ ترقی پر

ہمارے نئے باتصویر کتابچوں کا سلسلہ

ملک کی اہم صنعتوں پر ادارۂ مطبوعات پاکستان نے مصور کتابچوں کا سلسلہ حال ہی میں شروع کیا ہے۔ جو ملک میں اپنی افادیت اور نفیس آرائش و طباعت کی خوبیوں کے باعث بہت مقبول ہوا ہے۔ یہ کتابیں ہر موضوع سے دلچسپی رکھنے والے ماہروں سے مرتب کرائی گئی ہیں اور ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ملک کی اہم صنعتوں پر مختصر مگر مکمل معلومات، اعداد و شمار اور اہم حقائق، عام پڑھنے والوں کی دلچسپی اور استفادہ کے لئے پیش کئے گئے ہیں۔

ہر کتابچہ آرٹ پیپر پر چھپی ہوئی بارہ صفحے کی نفیس تصاویر دیکھنے سے ہر صنعت کے مختلف مراحل تیاری وغیرہ کی کیفیت پوری طرح ذہن نشیں ہو جاتی ہے۔

ہر کتاب میں جدید ترین معلومات اور اعداد و شمار پیش کئے گئے ہیں جن سے ہر ملکی صنعت کی رفتار ترقی کا پورا جائزہ ہر شخص کے سامنے آ جاتا ہے۔

استفادۂ عام کے پیش نظر ہر کتابچہ کی قیمت صرف چار آنے رکھی گئی ہے۔ یہ کتابچے اب تک شائع ہو چکے ہیں،

پٹ سن کی صنعت	سیمنٹ کی صنعت
چائے کی کاشت اور صنعت	کپڑے کی صنعت
اشیائے صرف	ماہی گیری
کاغذ کی صنعت	ذرائع آبپاشی کی صنعت
پن بجلی کی صنعت	غذائی مصنوعات

شکر سازی: رنگین تصاویر، نفیس آرائش، قیمت ۸ر

ادارۂ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس ۱۲۱، کراچی

شاندار نئی کتابیں

جمال زندگی (مصور ایڈیشن) مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی فرماتے ہیں:
خواجہ بدرالاسلام فروغی ایک تعمیری ذہنیت رکھنے والے صاحب دل ہیں اور ملی و اسلامی مفکر۔ یہ انتہائی دلچسپ کتاب انہی کے عمر بھر کے مشاہدات و محسوسات کا عکس جمیل اور علم و حکمت اور خلوص و محبت کا شگفتہ اور چھلکتا شاہکار ہے۔ ایک ایسی مشعل جس سے ذہن و دماغ کے تمام گوشے روشن و منور ہو جاتے ہیں اور زندگی کامیابی و مسرت سے بھر جاتی ہے اچھوتے اور نادر عنوانات پر یہ خیال افروز کتاب شروع کرتے ہی آپ جھومنے لگیں گے۔ قیمت چار روپے۔

نشان محفل الطاف فاطمہ ایم۔ اے کی تحریر میں بلا کی دلکشی اور غضب کا تیکھا پن ہے ان کا یہ حسین و جمیل اور بیحد دلچسپ ناول دنیائے ادب میں ہلچل ڈال دے گا۔ خواتین کے تمام ناولوں کا سرتاج اور سال رواں کا بہترین ضخیم ناول۔ قیمت دس روپے۔

بچوں کی نفسیاتی تربیت (باتصویر) سید ابوالحسن نغمی نے وسیع مطالعہ اور گہرے ذاتی تجربے کی بنا پر کئی سال کی محنت سے یہ بیحد مفید کتاب لکھی ہے۔ قیمت پانچ روپے۔

ہجر و وصال مولانا ابوالکلام آزاد کے عظیم الشان مقالات کا نادر مجموعہ قیمت چار روپے

نغمہ: ایم۔ اسلم کا انتہائی دلچسپ نیا ناول جو ان کے تمام ناولوں کا سرتاج ہے قیمت ۹ روپے

ایم۔ اسلم کے دیگر حسین و جمیل ناول

نام	قیمت	نام	قیمت
تیر نگاہ	۴/۸	ساون	۵/-
صبا	۴/۸	در توبہ	۳/۸
حنا	۷/-	چراغ محفل	۶/-
ممتاز	۱۰/-	فاتح مکہ	۴/-
ریحانہ	۶/-	معرکۂ بدر	۶/-
دوشیزۂ پاکستان	۶/-	خونی سفر	۵/-
سوز عشق	۴/-	غزالۂ صحرا	۷/۸
آخری رات	۴/۸	خون شہیداں	۴/۸
خونی مزدور	۴/-	تیغ ابدالی	۵/۸
میری کہانی	۴/-	فاتح قسطنطنیہ	۵/-
خواب جوانی	۴/-	فتنۂ تاتار	۵/-
سیدھی لکیر	۶/۸	پاسبان حرم	۴/-

فنی کتب

نام	قیمت
طبیب مرغی خانہ	۴/-
تجارتی مرغی خانہ	۳/-
کامیاب مرغی خانہ	۳/-
سطح فیل مرغ	۳/-
طبیب مویشی	۴/-
گلۂ بھینس یا ڈیری فارمنگ	..
رموز باغبانی	۴/-
غذائی اجناس	۲/-
قیمتی فصلیں	۲/-
روغنی بیج اور دالیں	۲/-

فہرست کتب مفت طلب فرمائیں

دار البلاغ۔ لاہور، ۵

پاکستان آرٹس کونسل

کراچی

(پاکستان میں فنی و ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز)

سامنے کا رخ

بالائی منزل پر ایوان نمائش (بیرونی منظر)

زیریں منزل میں ایک کشادہ ایوان

ادارہ
مطبوعات پاکستان
کی
تازہ پیشکش

ضخامت ۱۲۰ صفحات
قیمت ۱ روپیہ ۸ آنے

ادارہ مطبوعات پاکستان،
پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳
کراچی

ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا ۔ مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس میکلوڈ روڈ ۔ کراچی
مدیر: رفیق خاور